

[illegible] قابل [illegible] کتب

[illegible] ہیں اگر آپ نے ابھی تک ملاحظہ نہیں فرمائیں تو اپنی پہلی فرصت میں طلب کیجئے

ان اشتہار کو ضرور ملاحظہ فرمائیے

خونیں تحریکیں } اس کتاب میں تاریخ اسلام کی ان تمام حشر انگیز و انقلاب پرور تحریکات کا تذکرہ ہے جن کے ایک ایک اشارے پر شہنشاہوں کو رقص کرنا پڑا۔ مصنفہ مولانا اظہر امرتسری۔ قیمت [illegible]

نادر شاہ اور ستارا } اس نے قفقاز کی پہاڑیوں سے گنگا کی وادیوں تک تمام سلطنتوں اور راجہ مہاراجوں کو اپنے ترکمانی گھوڑے کے سموں سے روند دیا لیکن جب اس نے عشق و محبت کی [illegible] میں قدم رکھا [illegible] نادر شاہ درانی اور راجپوت دوشیزہ ستارا کی [illegible] تاریخی ناول۔ قیمت [illegible]

زرتشت اعظم کا رومان } [illegible] جب عشق و محبت کے میدان میں آتا ہے تو اپنے دامن عصمت کو گناہ و ہوس کی آلائشوں سے محفوظ رکھتے ہوئے کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ قیمت [illegible]

تاریخی افسانے } تاریخ میں ایسے افسانے بھی ملتے ہیں جن کے ہیرو عظیم الشان شخصیت کے مالک ہونے کے باوجود محبت سے [illegible] ہوئے اس کتاب میں [illegible] ایسی ہی شخصیتوں کے حالات ہیں [illegible] مولانا احمد ایم۔ اے۔ قیمت [illegible]

روسیو کی سیہ کاریاں } [illegible] روسیو کا شمار دنیا کے مشہور فلاسفہ میں ہوتا ہے۔ یہ [illegible] آپ بیتی ہے۔ جس میں روسیو نے اپنی رنگین [illegible] زندگی کو بے نقاب کیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

ربیعہ } ترکی کے [illegible] ادیب [illegible] کا ایک معرکۃ الآراء دلچسپ اور انقلاب انگیز ناول جس کو خواجہ [illegible] نے شگفتہ اردو زبان [illegible] ہے۔ [illegible]

کتاب التقدیر } علامہ ابن قیم کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ جس میں مسئلہ قضا و قدر کے ہر پہلو پر عقلی و نقلی دلائل کی رو سے بحث کی گئی ہیں جو اس قدر دلچسپ ہیں کہ آپ ساری کتاب پڑھنے پر مجبور ہونگے۔ آٹھ سو صفحات بڑا سائز قیمت رعایتی ایک روپیہ بارہ آنے ... [illegible]

دنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل } اسلامی دنیا کی سیاست پر ایک مورخانہ اور سیاست آموز کتاب جس میں تمام اسلامی ممالک کی سیاست کا تجزیہ بہترین انداز میں کیا گیا ہے از مولانا اظہر امرتسری۔ قیمت ... [illegible]

موتیوں کا درخت } جرجی زیدان کا ایک شاہکار ناول جس میں ملکہ شجرۃ الدر کی رومانی زندگی کے حالات درج ہیں۔ قیمت ... [illegible]

روپ متی اور باز بہادر } باز بہادر اور روپ متی کی محبت کا ڈراما حسن و عشق میں ڈوبا ہوا تاریخ [illegible] ایک ورق از [illegible] قیمت [illegible]

ماہ و انجم } [illegible] افسانوں کا مجموعہ ہر افسانہ نیاز عشق اور ناز حسن کی بولتی چالتی تصویر ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ... [illegible]

تاج شاہی حسن کے قدموں میں } ہسپانیہ، فرانس اور یورپ کے دوسرے بادشاہوں کی رومانی داستانیں۔ قیمت [illegible]

لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری } قاضی عبد الغفار کی دو شاہکار تصانیف جنہیں آپ بار بار پڑھنے پر مجبور رہیں گے

[illegible]

[illegible] ہندوستان بھر میں تمام علمی و ادبی معیاری رسائل [illegible] چھپتا ہے!

جلد ۱۹ — فہرست مندرجات جنوری ۱۹۴[illegible]ء — نمبر ۲

حافظ محمد عالم ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس [illegible] میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر [illegible] لاہور سے شائع کیا

ملاحظات

مروجہ تقویم کے مطابق ہم ایک نئے سال میں قدم رکھ چکے ہیں۔ ہم سرمایہ کاری اور سرد جنگ کے شعلوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ بین الاقوامی حالات پہلے سے بھی زیادہ خوفناک اور پیچیدہ صورت اختیار کر رہے ہیں لہذا نیا سال اگر پرانے سال کے مقابلہ میں زیادہ ہولناک لرزہ خیز اور خونی ثابت ہو تو عجب نہیں۔ سمندری رستے مخدوش ہو چکے ہیں۔ بین الاقوامی تجارت پر تشنج کی سی کیفیت طاری ہے وسائل آمد و رفت محدود ہیں۔ اس لئے کاغذیوں نے کاغذ کی قیمت میں پندرہ بیس گنا اضافہ کر دیا ہے۔ ہندوستان کے اخبارات موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ حکومت ہند کے رکن صنعت و تجارت نے صاف کہہ دیا ہے کہ اپریل سے پہلے کاغذ کے بازار میں کسی آسانی کی توقع رکھنا بیسود ہے۔ کیونکہ حکومت ہند کو وہ تمام جہاز جو کناڈا سے کاغذ ہندوستان لا سکتے تھے گیہوں مہیا کرنے کے لئے درکار ہیں۔ ان حالات میں قارئین خود ہی ہمارے احساس بیچارگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ قدم قدم پر حوادث کی بجلیوں کا ہجوم ہے۔ رستہ کٹھن ہے۔ منزل مقصود پردۂ تاریکی میں ہے۔ تاہم ادارہ "عالمگیر" ان فراوانی تاریکیوں میں بھی شمع ادب کو پوری طرح ضوفشاں رکھنے کا تہیہ کر چکا ہے لیکن جب تک قارئین کا تعاون شامل حال نہ ہو ہماری مساعی مشکور ہو نہیں سکتیں۔ لہذا ہم شائقین ادب سے پرزور درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس نازک وقت میں اپنے مقبول ترین ماہنامے کو اپنی بہترین توجہ کا مستحق قرار دیں۔ اور اس کے تین طریقے ہیں (۱) عالمگیر کی سالانہ خریداری قبول فرمائیں (۲) اپنے حلقۂ احباب میں "عالمگیر" کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش فرمائیں [illegible] عالمگیر [illegible] مطبوعات طلب فرمائیں کیونکہ اس شعبہ کی آمدنی "عالمگیر" [illegible] ہے۔ امید ہے [illegible] عالمگیر اس [illegible] پر لبیک کہیں گے۔

[illegible]

زیر نظر اشاعت

از:- ادارہ

لکھنا چاہئے۔ کیونکہ جو مضامین اس میں بوجہ قلت [illegible] ان میں سے اکثر اس اشاعت میں شامل ہیں۔ [illegible] ارشد فارسی و عربی ادب پر محققانہ نظر رکھتے ہیں [illegible] ادب کی مختصر تاریخ پر روشنی ڈالی ہے جو شائقین ادب کے لئے زیادہ معلومات افزا ثابت ہوگی۔ مولانا محمد اسمٰعیل نے "[illegible]" میں حقیقت و افسانہ کو اس خوبی سے ممتزج کیا ہے کہ حقیقت کی خشکی میں بھی افسانہ کی رنگینی نظر آنے لگتی ہے۔ قریشی محمد عبداللہ نے تاریخی کتب کی چھان بین کے بعد شہنشاہ اورنگزیب کی حرم [illegible] کے سوانح حیات پیش کئے ہیں۔ افسانوں میں "[illegible]" امتیازی نشان کا مستحق ہے جناب پنڈت جالندھری کا ترجمہ مندرجہ [illegible] "نہ معلوم کیوں" اور "جنرل بیدن کی داستان معاشقہ" [illegible] ہیں۔ جو جذب و تاثیر کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں۔ منظومات کا حصہ حسب سابق بلند پایہ ہے۔

آہ! شیخ عبدالحمید

یہ خبر انتہائی درد و کرب کے ساتھ حوالہ قلم کی جاتی ہے کہ ۲ جنوری ۱۹۴۳ء کی صبح کو ہمارے عزیز شیخ عبدالحمید اس دار فانی سے رحلت کر گئے مرحوم شیخ عبدالرحمٰن سابق منیجر "عالمگیر" [illegible] کے برادر اصغر اور حافظ صاحب قبلہ کے نسبتی بھائی تھے۔ مغفور نے عین عالم شباب میں داغ مفارقت دیا اس لئے یہ سانحہ اور بھی زیادہ صبر آزما ہے۔ مرحوم ایک برس سے بیمار تھے علاج [illegible] آب و ہوا کے واسطے بھی ہر ممکن کوشش سے کام لیا گیا لیکن [illegible] حالات بالآخر مرگ [illegible] پر ختم ہوئی خداوند کریم مرحوم کو آغوش رحمت میں جگہ دے اور اعزا و خاندان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اخبار و افکار

جامعہ اسلامیہ علی گڑھ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تعلیمی روشنی کا سب سے پہلا مینار ہے جس کی شعاعوں نے اسلامی ہند کے ذہن و دماغ کو جدید تعلیمات سے آگاہ کیا لیکن یونیورسٹی کے وسیع ترین حلقہ میں بھی کوئی ایسا گوشہ نہ تھا جس میں اسلامی علوم و معارف کی تدریس و تعلیم کے لئے گنجائش ہو لیکن بفضلہ تعالےٰ یہ کمی بھی پوری ہو رہی ہے۔ اعلیٰحضرت خسرو دکن نے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی اس تجویز کو منظور کر لیا ہے کہ مسجد زہرا کے پہلو میں اسلامی علوم و معارف کے لئے اعلیٰ درجہ کی درسگاہ کھولی جائے۔

یہ ارادہ قابل صد ہزار تحسین ہے کیونکہ جدید تعلیم کے زہر کا مسموم اثر اسلامی علوم و معارف ہی سے دور ہو سکتا ہے۔ اعلیٰحضرت خسرو دکن کی علوم پروری و عالم نوازی تو بے مثال حیثیت رکھتی ہے۔ حضور کے سایہ حمایت میں جو درسگاہ چلے گی وہ افادیت کے اعتبار سے جامعہ الازہر مصر سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ اور اس درسگاہ کے باعث علی گڑھ کا تعلیمی مرتبہ قاہرہ کی طرح اونچا ہو جائے گا۔ کیونکہ قاہرہ میں اس وقت دو جامعے ہیں (۱) جامعہ ازہر (۲) جامعہ مصریہ۔ جامعہ ازہر میں تو صرف اسلامی علوم و معارف کی تعلیم دی جاتی ہے اور جامعہ مصریہ کے حلقے میں جدید علوم و فنون کا سلسلہ جاری ہے۔ لہٰذا جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی جامعہ مصریہ کے فرائض انجام دے رہی ہے اسی طرح جامعہ اسلامیہ جامعہ ازہر کی ہندوستانی قائم مقام ہو سکے گی۔ جہاں یہ کام قابل تحسین ہے وہاں اس امر کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ جامعہ اسلامیہ علی گڑھ کا قیام دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کی ترقی و کامیابی پر اثر انداز نہ ہو سکے کیونکہ یہی جامعے ہیں جن سے ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کا اولین چشمہ ابلا تھا۔ امید ہے ہماری معروضات کو شرف توجہ کا مستحق سمجھا جائے گا۔

از:- ادارہ

سر سکندر حیات خاں کی وفات

سردار سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب ۲۶/۲۷ دسمبر کی درمیانی رات کو اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم کی وفات جہاں سیاسی و آئینی دنیا کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے وہاں ان کی جدائی خدام اردو کو بھی رلائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مرحوم کے عہد حکومت میں صوبہ پنجاب کا ذریعہ تعلیم اردو قرار دیا گیا۔ اور انھوں نے پنجاب اسمبلی میں اردو تقریروں کے لئے فضا سازگار بنانے کی کوشش کی اس کے علاوہ مسلمان روزناموں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے اور اردو سے انھیں خاص لگاؤ تھا اس لئے سر سکندر حیات خاں کی موت دنیائے اردو کے لئے بھی افسوسناک صدمے سے کم نہیں خداوند کریم مرحوم کو آغوش رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان مرحوم کو اردو کا مخلص ترین خادم بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

علوم کے خون سے ہولی

غیر ہندوستانی کاغذ کی درآمد کا مسئلہ تو عرصہ سے کھٹائی میں پڑا ہوا ہے لیکن ہندوستانی کاغذ بھی نایاب ہو رہا ہے ہمارے ملکی کارخانوں میں جتنا کاغذ تیار ہوتا ہے اس کا نوے فیصدی حصہ حکومت اٹھا لیجاتی ہے اور جو دس فیصدی عوام کیلئے چھوڑا جاتا ہے اس پر کاغذ فروشوں کی تاجرانہ حرص بھی اس طرح مسلط ہے جس طرح سانپ خزانے پر بیٹھا ہوتا ہے۔ حکومت نے کہنے کو تو کاغذ کا نرخ بھی مقرر کر رکھا ہے لیکن کاغذ خریدنے جائیے تو سرکاری نرخ سے چار پانچ گنا بھاؤ پر بھی بڑی کوشش و کاوش کے بعد میسر آئیگا اور وہ بھی ضرورت کے مطابق نہ ہوگا۔ اس قحط کے باعث علوم و معارف کی اشاعت بھولا ہوا افسانہ بن رہی ہے۔ ہم حکومت سے صاف سوال کرتے ہیں کہ علوم کے خون سے ہولی کھیلے جانے کی کب تک اجازت دی جائے گی بجائے اس کے کہ ارباب حکومت دوسروں کو کاغذ کی ضروریات کم کرنے کی تلقین کرتے ہیں تو وہ اپنی نصیحت کا خود کیوں بیکار سمجھتے ہیں۔ اگر حکومت بھی کاغذ کے استعمال میں کفایت شعاری سے کام لے تو اس قحط کا بہت کچھ علاج ہو سکتا ہے۔ کیا اس گزارش کو قابل توجہ سمجھا جائے گا؟ (ادارہ)

کشتیٔ نوح

وہ ہمارے دل میں ہے آنکھوں سے پھر روپوش ہے

حضرت نوح ناروی

دل بھی غایب ہو گیا وہ شوخ بھی روپوش ہے — گھر مرا خالی ہے اب سونی مری آغوش ہے
چرخ پر بدلی اٹھی ہے لطفِ نوشا نوش ہے — ہوش میں اپنے کوئی آئے یہ کس کو ہوش ہے
دیکھکر اپنی ادا کو آپ وہ بیہوش ہے — کس بلا کی ہے جوانی کس غضب کا جوش ہے
میں ہوں اے جوشِ جنوں وہ خوگرِ زندانِ غم — حلقۂ زنجیر مجھکو حلقۂ آغوش ہے
آئینہ حیران، درباں دم بخود، احباب چپ — جس کو دیکھو بزمِ جاناں میں وہی خاموش ہے
تو پلائے جا تجھے کیا اس سے اے ساقی غرض — ہوش کس کو آگیا ہے کون ابھی بیہوش ہے
مجھ سے بڑھکر ہے مری تصویر تیری رازدار — سو طرح کی بات سنتی ہے مگر خاموش ہے
وہ بھی نکلے میرے دل سے دل بھی پہلو سے گیا — اب ہے کیا آغوش میں آغوش ہی آغوش ہے
کیا پری سے دیں تجھے نسبت ہم اے رشکِ پری — تو ہمارے روبرو ہے اور وہ روپوش ہے
وہ ملے مجھ سے مرا دل ان کے دل سے مل گیا — آج دُہرا لطف، دُہرا رنگ، دُہرا جوش ہے
تم نکل جاؤ مرے قابو میں آکر کیا مجال — حلقۂ گیسو نہیں، یہ حلقۂ آغوش ہے
جلوۂ معشوق کو چشمِ بصیرت چاہئے — وہ ہمارے دل میں ہے آنکھوں سے پھر روپوش ہے
سامنا ہوتا ہے جب ان کا تو یہ رہتا نہیں — کیا تمہارا جوش بھی ناصح ہمارا ہوش ہے

میکشی سے نوح کی نیت کبھی بھرتی نہیں
کوئی ساغر نوش ہوگا وہ تو دریا نوش ہے

حقایق و معارف

خط نستعلیق اور اُس کے اساتذہ

از جناب خان صاحب حکیم محمد علی خاں ماہر

اہل عجم ہمیشہ سے جدت پسند اور حسن پرست واقع ہوئے ہیں جب ان کو خط نسخ میں بعض عیب نظر آیا تو اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ نسخ میں ہر دائرہ اول سے آخیر تک یکساں رہتا تھا اور حرفوں میں کسی قدر ناہمواری تھی یعنی دائرے گول نہ تھے بلکہ نچلا حصہ چپٹا ہوتا تھا جس میں کونے یا ناوئے نکل آتے تھے۔ لہذا انھوں نے حروف میں نقاشی (شان مصوری) پیدا کی اور حروف کی نوکیں، گردنیں اور نیچے کا حصہ باریک کر دیا اور دائرے گول بنائے۔ اور اس خط کا نام نستعلیق قرار پایا۔ خط نستعلیق یا قلم فارسی بقول علامہ ابن ندیم خط کیراموز سے ماخوذ ہے۔ جو خط کوفی کی ایک شاخ ہے جس کے یہ معنی ہوئے کہ خط تعلیق اصلاح شدہ عربی خط سے ماخوذ ہے۔

لفظی ترکیب سے ظاہر ہے کہ نستعلیق کا ماخذ "نسخ تعلیق" ہے جب خط نے میم کو حذف کر دیا تو نستعلیق رہ گیا۔ اساتذہ فن اور ارباب لغت کا بھی یہی قول ہے لیکن غور کرنے سے حقیقت کھلتی ہے کہ نستعلیق کی ایجاد میں جمالیاتی خطوں کی شان پیش نظر تھی جو ایران میں جاری تھے۔ علم خط کے علاوہ اہل عجم نے علوم و فنون کی بھی عربوں سے زیادہ خدمت کی ہے جس کی تفصیل کشف الظنون وغیرہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ دور حاضر میں بھی ایران، ہندوستان پر فوقیت رکھتا ہے۔ نسخ اور تعلیق کے اساتذہ موجود ہیں اور عام مراسلت کا قلم شفیعہ ہے۔

نستعلیق کتابی خط ہے جو ایران اور ہندوستان وغیرہ میں جاری ہے اور مراسلت کا قلم شفیعہ ہے جو نہایت خوبصورت ہے۔ نستعلیق کے حسن قبول کی بڑی دلیل یہ ہے کہ لفظ نستعلیق سے متعدد محاورات ایجاد ہوئے جو زبان زد ہیں۔ ایرانی ابجد میں ۳۲ حروف ہیں کیونکہ عربی ابجد میں پ۔ چ۔ ژ۔ اور گ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

خواجہ میر علی تبریزی۔ خط نستعلیق کے موجد خواجہ میر علی تبریزی مشہور ہیں جو امیر تیمور کے عہد (۸۰۷ھ) کے ناموں خطاطوں میں سے تھے اور ہمارے مدیر النظیر مانے گئے ہیں لیکن ملا ابو الفضل دیباچہ مرقع بادشاہی (البم) تعلقات خوشنویسان ہند و ایران مرتبہ شاہ جہانگیر میں لکھتے ہیں کہ میں نے امیر تیمور کے زمانے سے قبل کی نستعلیق کی وصلیاں دیکھی ہیں۔ لہذا امیر علی تبریزی خط نستعلیق کے موجد نہیں ہو سکتے۔ ابو الفضل کی شہادت نہایت معتبر ہے میر علی خط نستعلیق کے موجد نہیں ہیں بلکہ اس کا موجد کوئی اور تھا جو ہنوز تحقیقات طلب ہے لیکن یہ امر بلا شک و شبہ قابل تسلیم ہے کہ میر صاحب نستعلیق کے مصلح اول ہیں اور صرف ان کے حسن عمل سے نستعلیق کو یہ عروج حاصل ہوا ہے جس کی تکمیل میں میر صاحب کے شاگردوں کا بھی خاص حصہ ہے۔

مولانا غلام محمد دہلوی نے اپنے تذکرہ خوشنویسان میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ میر علی اگرچہ نستعلیق کے موجد نہیں ہیں لیکن انھوں نے اس خط کو قواعد مقرر کئے اور نوک پلک میں خاص نزاکت پیدا کی۔ علامہ ابو الفضل نے میر علی کے نامور شاگردوں میں مولانا جعفر تبریزی اور مولانا اظہر اور مولانا سلطان علی مشہدی کا نام لیا ہے۔ مولانا جعفر شاہ رخ میرزا کے زمانہ میں تھے اور اظہر ان کے ہمعصر تھے لیکن سلطان علی کا درجہ سب سے بلند ہے۔ مولانا جعفر نے میر علی کے علاوہ اظہر کی وصلیوں سے بھی کامل نفع اٹھایا ہے۔ ابو الفضل کی تقلید میں میر علی کے شاگردوں کے مختصر حالات ہم اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

میر علی کو اپنے شاگردوں میں سلطان علی مشہدی پر فخر تھا کیونکہ انھوں نے سب سے زیادہ استاد کی خدمت کی ہے اور میر صاحب کے حالات ایک مثنوی میں لکھے ہیں۔ میر علی خطاطی کے ساتھ شاعری کا ذوق بھی کمال رکھتے تھے۔ میر صاحب کے مقلدین میں ایرانی اور ہندی دونوں ہیں لیکن ہندوستان میں کشمیر سے نستعلیق کو بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ سعد یار اکبری کا نامور خوشنویس محمد حسین کشمیری کا بھی زمرہ میں شامل ہے اور خطاطان ترکستان بھی میر علی کے مقلد ہیں۔ میر صاحب کی وصلیوں کا بڑا ذخیرہ ایران اور انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ آٹھویں صدی کے اخیر تک میر صاحب [illegible]

میر علی کے ہم [illegible] شیراز

میر[illegible] خراسانی ہیں۔ ان اساتذہ کی شان خداداد تھی

میرزا سلطان علی مشہدی — میرعلی کے نامور شاگرد ہیں

سلطان حسین تیموری کے عہد میں تھے اس نے ان کو قبلۃ الکتاب کا خطاب دیا تھا۔ ان کی قلم سے لکھی ہوئی مستقل کتابیں اور وصلیاں موجود ہیں ستاسی سال سے زیادہ عمر پائی عابد وزاہد تھے تمام عمر مشہد مقدس میں قیام رہا۔ ۹۱۹ھ میں انتقال کیا (انتقال کا سنہ غلط ہے کیونکہ ان کی دو قلمی کتابیں مورخہ ۹۲۴ھ کی موجود ہیں) تصنیف میں فن خطاطی پر ایک رسالہ یادگار ہے جس کے قلمی نسخے جابجا موجود ہیں اخیر عمر تک لکھتے رہے اور زور قلم قائم رہا نستعلیق میں خوشنویسی کے بادشاہ تھے۔

تاریخ تیموری کی تیاری میں مشہور مصور بہزاد کے ساتھ کام کیا تھا۔ بابر نے اپنی تزک میں ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔ علی شیر بیگ کے حکم سے کئی کتابیں لکھیں۔ میرزا کے مشہور شاگرد حسب ذیل ہیں۔ ۱۔ سلطان محمد خنداں۔ سلطان محمد نور ۳۔ علاؤ الدین محمد ہروی ۴۔ زین الدین محمود عبدی نیشاپوری ۵۔ محمد قاسم شادی شاہ ۶۔ محمد عبداللہ ہروی ۷۔ میرعلی الکاتب ہروی۔ یہ سب اساتذہ فن ہیں اور انھوں نے خط میں شان دلربائی پیدا کی ہے۔ علامہ ابوالفضل نے ان کے علاوہ نستعلیق کے استادوں میں مولانا محمد اوبہی (اوبہ ہرات کا ایک گاؤں ہے) اور ہجرانی کا نام بھی لیا ہے۔

سلطان علی کے ہمنام حسب ذیل خطاط تھے۔ ۱۔ سلطان علی قائنی، ۲۔ سلطان علی تبریزی ۳۔ سلطان علی خراسانی (مشہدی) ۴۔ سلطان علی قزوینی ان چاروں کی وصلیاں ہندوستان میں بکثرت موجود ہیں مگر میرزا سلطان علی مشہدی ان سب کے سرتاج تھے۔ ان کے علاوہ محمد مراد کشمیری شیریں قلم بھی سلطان علی اور میرعلی کے مماثل تسلیم کئے گئے ہیں۔

میرعلی الکاتب ہروی — ہرات کے باشندے اور سید تھے مشہد مقدس میں سلطان علی سے نستعلیق کی تکمیل کی۔ اور استاد سے بڑھ گئے۔ شاعری اور خطاطی میں اول اپنے باپ محمد رفیقی سے اصلاح لی اور اس کے بعد زین الدین محمود عبدی کے شاگرد ہوئے۔ شاعر بھی تھے اور مجنوں تخلص تھے۔ فن خطاطی پر دو رسالے نظم میں لکھے ہیں خصوصاً وہ رسالہ جس میں خطوط سبعہ کے قواعد نظم کئے ہیں بہت مشہور ہیں۔ اپنی تعریف میں متعدد رباعیاں اور اشعار لکھے ہیں ۹۰۹ھ میں رسم الخط پر ایک رسالہ لکھا ہے جو برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے یہ رسالہ سلطان علی کے نام پر معنون ہے۔ ۹۳۵ھ میں ملکی بدامنی کی وجہ سے ماوراء النہر چلے گئے اور سلطان اوزبک [illegible] ۹۴۲ھ کے ملازم ہوئے اور [illegible] کے استاد مقرر ہوئے بعد سلطان عبدالعزیز بخارا کے ملازم ہوئے۔ یہاں رہ کر گلستان اور مطلع الانوار امیر خسرو لکھی گلستان پیرس کی لائبریری میں اور مطلع الانوار پٹنہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

میرعلی تبریزی اور ان کے شاگردوں کے بعد ابوالفضل نے مولانا میرعلی ہروی کو نستعلیق کا استاد تسلیم کیا ہے۔ میرعلی ہروی نے تکمیل فن کے بعد اپنے اساتذہ کے خلاف ایک جدید روش نکالی اور عجیب و غریب تصرفات کئے جو آج تک یادگار ہیں باوجود اس کمال کے میر صاحب سلطان علی مشہدی کی نمکینی خط کے معترف تھے۔ مرقع بادشاہی (جہانگیر) میں میرعلی ہروی کی بھی وصلیاں تھیں۔ ایک قطعہ میں اصول خوشنویسی لکھے ہیں۔ وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؎

چند روادی خط سکینی اے دل تنگ و پیچ ۔۔۔ بشنو ایں نکتہ و چنداں مشو [illegible] بال
ہیچ چیز است کہ تا جمع نہ گردد باہم ۔۔۔ ہست خطاط شدن نزد خرد امر محال
قوت دست وقوف زخط و دقت طبع ۔۔۔ طاقت محنت و اسباب کتابت بکمال
گر ازیں پنج قصوریست یکے را حقا ۔۔۔ ندہد فائدہ گر سعی نمائی صد سال

تقریباً سنہ ۹۵۱ھ میں انتقال کیا لیکن سنہ وفات میں اختلاف ہے صحیح یہ ہے کہ ۹۵۷ھ کے بعد فوت ہوئے کیونکہ سام میرزا نے کتاب تحفۂ سامی میں اور ۹۵۷ھ میں بقید حیات لکھا ہے۔ میرعلی کے بعد درجہ بدرجہ نستعلیق کے استاد حسب ذیل ہیں۔ ملا محمد حسن تبریزی۔ میر سید احمد مشہدی۔ ملا حسن علی مشہدی۔ ملا شاہ محمد نیشاپوری۔ میر معز کاشی۔ میرزا ابراہیم اصفہانی۔

میر عماد الحسینی — نستعلیق میں امام فن ہیں۔ اصفہان میں بابا شاہ کی شاگردی کی اور ملا محمد حسین، سلطان علی مشہدی اور میرعلی کی وصلیوں سے نفع اٹھایا۔ خط نستعلیق کے مذکورہ بالا اساتذہ کے بعد میر عماد الحسینی اور آقا عبدالرشید دیلمی دو استاد اور ہیں اور خوشنویسی کے یہ پانچ ستون ہیں جن سے خطاطی کی عمارت قائم ہے اور ایران سے ہندوستان تک جس قدر مشہور خطاط گزرے ہیں ان کا سلسلۂ شاگردی انھیں پانچ تک ختم ہو جاتا ہے اور اس فن کے چار مدرسے لاہور۔ آگرہ۔ دہلی اور لکھنؤ میں میر عماد اور آقا دیلمی کی ذات سے قائم ہوئے۔

میر عماد نستعلیق نگاری میں ضرب المثل ہیں اصفہان میں درویشانہ وضع سے رہا کرتے تھے اور شاہ عباس صفوی کے دربار سے تعلق تھا۔ شاہ کے حکم سے شاہنامہ فردوسی لکھنا شروع کیا تھا اور ابتدائی ستر بیت لکھ کر پیش کئے جس کا صلہ شاہ نے ستر تومان (ایک ایرانی سکہ) دیا جب انعام کو میر صاحب نے خلاف شان سمجھ کر واپس کر دیا۔ اس شان بے نیازی سے شاہ عباس ناراض ہو گیا اور یہ ناراضی یہاں تک بڑھی کہ میر صاحب کو ۱۰۲۴ھ میں بعمر ۶۳ سال حمام میں قتل کرا دیا [illegible]

[illegible] تھا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر نے جب یہ واقعہ سنا تو رد [illegible] شاہجہان میر عماد کو میرے پاس بھیج دیتا تو میں ان کے [illegible]

[illegible] میں شاہجہان سب سے زیادہ قدردان تھے۔ کسی میر صاحب نے ایک وصلی پیش کی تو شاہجہان نے اسے منصب یک صدی عطا فرمایا۔ اس وصلی پر یہ قطعہ تحریر تھا۔

ای برابر گر ما گشته جهالست ترا — محرومی از صحبت احباب طالست ترا
دیب ... گوشه تنها خود خلل افتاد — عشق ما نیز ز اسباب جهالست ترا

الفقیر المذنب میر عماد الحسینی غفر اللہ ذنوبہ سنہ ۱۰۲۳

اس قطعہ کے ایک سال کے بعد قتل ہوئے۔ یہ وصلی مسٹر اجیت گھوش ایڈووکیٹ ہائیکورٹ کلکتہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

آقا عبدالرشید دیلمی قزوینی ـ یہ آقا رشید کے نام سے مشہور ہیں۔ میر عماد کے بھانجے، داماد اور انہی کے شاگرد تھے۔ میر علی، میر عماد اور آقا کی وصلیوں کی شناخت کرنا اور ان کی تحریر میں امتیاز کرنا بہت دشوار کام ہے۔ میر عماد کے واقعہ قتل سے خوفزدہ ہو کر آغاز حکومت شاہجہانی میں آقا داخل ہندوستان ہوئے۔ لاہور ہوتے ہوئے تباہی اور خستہ حالی میں آگرہ پہنچے۔ لباس میل کچیل سے موم جامہ بن کر بوسیدہ ہو گیا تھا۔ آقا نے شاہجہان کی خدمت میں یہ قطعہ لکھ کر پیش کیا۔

آیا بجسته خصلے که ساکنان فلک — برآستان تو دارند میل دربانی
چه حاجت است که گویم حال خسته خود — که حال خسته دلان را تو خوب میدانی

شاہجہان نے اس قدر خوشنودی ظاہر فرمائی اور [illegible] خوشنویس اور شہزادہ دارا شکوہ کا استاد مقرر کیا اور عہدہ سہ ہزاری منصب مقرر فرمائے اور حکم دیا کہ خط نستعلیق کو ہندوستان میں عام رواج دیا جائے۔

آقا کا مرتبہ کتابت میں بہت بلند تھا۔ اکثر فن ان کو [illegible] سمجھتے ہیں۔ خدمت اتالیقی کے علاوہ شاہجہان نے خدمت بیوتات پر سرفراز کر دیا تھا۔ امیر خان سر رہتے تھے۔ آگرہ میں شاندار عمارتیں اور مسافر خانے تعمیر کئے۔ بڑھاپے تک مشق جاری رہی۔ سنہ ۱۰۸۱ھ یا ۱۰۹۵ھ میں بمقام آگرہ عہد عالمگیر میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ اس صاحب کمال کا جانشین کوئی نہیں پیدا نہیں ہوا۔ میر علی تبریزی کا سلسلہ آقا رشید پر ختم ہو جاتا ہے۔

آقا کے شاگردوں میں شاہزادہ دارا شکوہ ـ محمد اشرف خواجہ سرا ـ سیدائی اشرف ـ میر عبدالرحمن ہروی اور میر حاجی بہت مشہور ہیں۔

آقا عبدالرشید کا طبقہ متاخرین پر سب سے بڑا احسان ہے جس نے ائمہ فن پیدا کئے اور ہندوستان کے چاروں دارالخلافوں یعنی آگرہ ـ لاہور ـ دہلی اور لکھنؤ میں انہیں کی ذات گرامی سے فن خطاطی عروج پر پہنچا ـ ان کی وصلیاں ان کی زندگی میں جواہر کے مول فروخت ہوتی تھیں۔

لاہور ـ آگرہ ـ دہلی اور لکھنؤ کے جملہ اساتذہ میر علی تبریزی کو نستعلیق کا آدم اور میر عماد کو آدم ثانی تسلیم کرتے ہیں۔ آج ہندوستان میں جس قدر خطاط ہیں ان کی شاگردی کا سلسلہ میر عماد اور آقا عبدالرشید پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

ذوقؔ

واسطے نظارۂ قاتل کو فرصت چاہیے — اور یہاں فرصت کسے جو کیجیے فرصت طلب

غالبؔ

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی — وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

احسان وزیرآبادی

وین ظلم دیگر است که آن تیغ آبدار — فرصت نمی دهد که شکایت کند کسے

وفا و جفا

جفا کے گلے پر وہ کہتے ہیں مجھ سے جفا بیوفائی میں شامل نہیں ہے

از جناب قاضی محمد ریاض الدین [illegible]

نہیں تم کو ملنا ہی مجھ سے گوارا تو پھر ان بہانوں سے حاصل نہیں ہے
سمجھتے ہو مشکل تو مشکل ہے، ورنہ، جو مشکل نہ سمجھو تو مشکل نہیں ہے

مرے پاس کہنے کو یوں جان بھی ہے، مرے پاس ہونے کو کیا دل نہیں ہے
مگر یہ ہے ناشاد وہ ہے پریشاں غرض آپ کے کوئی قابل نہیں ہے

یہ کیا زندگی ہے کہ میں جی رہا ہوں، مگر لطف جینے کا حاصل نہیں ہے
وہ لطفِ طبیعت وہ تسکینِ خاطر، وہ فرحت وہ جمعیتِ دل نہیں ہے

یہ دورِ مے و جام بے کیف ہے سب کہ پہلو میں وہ راحتِ دل نہیں ہے
وہ ہم تو ہیں لیکن نہیں وہ طبیعت، وہ محفل تو ہے رنگِ محفل نہیں ہے

ہزار اُس پہ تھا خون کا مجھ کو دعویٰ مگر اس طبیعت کو اپنی کروں کیا
مرے منہ سے روزِ جزا وقتِ پرسش یہ نکلا کہ یہ میرا قاتل نہیں ہے

یہ کج بحثیاں ہوں تو کیا بات سلجھے، کوئی ان سے جیتے تو کس طرح جیتے
جفا کے گلے پر وہ کہتے ہیں مجھ سے جفا بیوفائی میں شامل نہیں ہے

جو تھے ولولے یاس و غم نے مٹائے، جو تھے حوصلے خاک میں سب ملائے
کبھی واقعی میرا دل میرا دل تھا مگر اب یہ میرا دل، میرا دل نہیں ہے

ریاض ان سے مل [illegible] نہ [illegible] کہ پہلی طرح [illegible] ابھر [illegible]
محبت وہ [illegible] تھا ہر اک [illegible] کسی کی [illegible] شامل نہیں ہے

ترکی ادبیات

مختصر تاریخ

از جناب حافظ رشید احمد ارشد خان مشرقی

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ترکی زبان اپنے وطن سے دور جا کر غیر ملک میں بار آور ہوئی اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب ترکوں نے ایشیائے کوچک میں اپنی حکومت قائم کی تو وہاں کے ایک حاکم امیر قرمان نے جو قونیہ کا حاکم اور شیخ نور الدین صوفی کا بیٹا تھا اپنے علاقے میں ترکی زبان کو پہلے پہل سرکاری زبان قرار دیا۔ اس سے پیشتر وہاں فارسی حکومت کی سرکاری زبان اور عربی دینی و علمی زبان تھی۔ سرکاری زبان بنتے ہی اس علاقے میں جسے آج کل مملکت ترکیہ یا ٹرکی کے نام سے پکارا جاتا ہے ترکی زبان پھیلنی شروع ہوئی اس کے بعد خاندان عثمانیہ کے زیر سایہ اس نے علمی و ادبی زبان بننے کا رنگ ڈھنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ ورنہ اس سے پیشتر اپنے اصلی وطن ترکستان میں یہ محض بول چال کی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔

قدیم ترکی ادب

دوسری زبانوں کے قدیم لٹریچر کی طرح ترکی ادبیات کا قدیم سرمایہ بھی محفوظ نہیں ہے اور نہ تاریخی معلومات کی بنا پر اسلام سے قبل ترکی ادب کی کسی تصنیف کا پتہ چلتا ہے۔ اسلامی عہد میں بھی کافی عرصہ تک ترکی زبان میں کوئی علمی و ادبی تصنیف نہیں تحریر کی گئی۔ اس کا قدیم ترین سرمایہ کچھ نظمیں ہیں جو چند بزرگوں نے تصوف و اخلاق پر تحریر کی تھیں۔ ان میں سے ایک بزرگ احمد یسوی ہیں جنہوں نے صوفیانہ میں اپنی نظمیں ترکی میں کہی تھیں۔ صاحب موصوف طریقہ یسویہ کے بانی تھے۔ ترکی کے دوسرے لہجہ "آغوزیہ" میں قدیم ترین نظمیں سلطان ولد بہاء الدین کی ہیں جو حضرت مولانا جلال الدین رومی کے صاحبزادے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کے والد مولانا رومی فارسی شاعری کے آفتاب بن کر چمکے اور بیٹے ترکی شاعری کے خورشید درخشاں بنے جس کی کرنیں ابد الآباد تک ترکی شاعری کو منور کرتی رہیں گی۔ بہر حال اس طرح ترکی شاعری کی بنیاد دیباچہ کے طور پر تصوف پر قائم ہوئی۔ یا ان کے بعد کے قدیم شعرا ترکی زبان میں صوفیانہ اشعار لکھتے رہے اور عربی و فارسی کے وسیع سرمایہ سے فائدہ اٹھا کر

انہوں نے ترکی زبان میں سلاست، روانی، پاکیزگی اور بلند خیالی پیدا کی۔ ان دونوں شاعروں کے برخلاف ایک اور قدیمی شاعر یونس نے عوام کی بول چال میں انہی کی ذہنیت کے مطابق چند نظمیں کہی تھیں اور وہ بھی ترکی ادب کا قدیم ترین سرمایہ ہیں۔ ان میں عوام کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

قدیم شعراء میں عاشق پاشا بھی مشہور شاعر تھے۔ ایک اور شاعر غازی فاضل نے سلیمان بن ارخان کے معرکہ گیلی پولی اور دیگر کارناموں پر رزمیہ نظمیں لکھ کر ترکی زبان میں رزمیہ شاعری کی بنیاد ڈالی۔ شیخ کرمیان نے فارسی کی عاشقانہ مثنویوں کی طرز پر محمد اول و مراد کے زمانے میں مثنوی شیریں خسرو لکھی۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد یزیجی اوغلو نے محمدیہ کے عنوان سے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور تاریخی حالات پر ایک تاریخی مثنوی تحریر کی اور اس طرح مختلف اصناف کی مثنویوں کے ذریعے ترکی شاعری کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ لیکن ابھی تک ترکی غزل گوئی کسی نے معراج کمال پر نہ پہنچایا تھا تاہم اس سلسلے میں ایک تاتاری شہزادہ علی شیر نوائی نے بہت شہرت حاصل کی وہ نہایت عمدہ غزل گو شاعر تھا۔ مگر جس شخص نے ترکی غزل گوئی کا بہترین طریقہ نکالا وہ محمد ثانی کا وزیر احمد پاشا تھا۔ اب ترکی شاعری سلطانی دربار میں پہنچ کر امراء و وزراء نیز سلاطین و خلفاء کے تفنن طبع کا ذریعہ بن گئی ہم چنانچہ تمام خلفائے عثمانیہ شعر و ادب کا نہایت عمدہ مذاق رکھتے تھے اور عام طور پر اکثر سلاطین خود بھی شعر کہتے تھے۔ مگر ان تمام سلاطین عثمانیہ میں جس سلطان کے اشعار بلند ترین درجہ پر پہنچے ہوئے وہ سلطان سلیم اول مشہور فاتح تھا۔ اس کا دور ادبی اور علمی حیثیت سے بھی نہایت کامیاب تھا۔ اسی کے زمانے میں کمال پاشا زادہ ترکی میں یوسف زلیخا تحریر کی اور گلستان کے جواب میں نگارستان لکھی۔ کمال پاشا زادہ کا ایک ہمعصر مسیحی شاعر تھا اس نے حمد بہاریہ نظمیں لکھ کر ایرانی شاعری کا بہاریہ مستقل طور پر احول پیدا کیا۔

ترکی نثر کا آغاز

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہر زبان میں نثر سے پہلے نظم کا ذخیرہ تیار ہے اور کافی عرصے کے بعد نثر کا آغاز ہوتا ہے۔ بعینہ یہی ترکی نثر ال ہے کیونکہ یہاں بھی قدیم نظم کا کافی ذخیرہ ہو جانے کے بعد ترکی بالآخر معمولی طریقے سے ترجمہ کی گئی چنانچہ دیگر زبانوں کی طرح ں نثر کا آغاز بھی قصہ کہانیوں سے ہوتا ہے۔ اس کے قدیم ترین بنے شیخ زادہ اور سنان پاشا کی تصانیف ہیں شیخ زادہ نے ترکی ں چالیس وزیروں کی کہانی تحریر کی اور اس کتاب کو مراد ثانی کی ت میں پیش کیا۔ سنان پاشا نے بھی جو محمد فاتح کا وزیر تھا، نثر ں ایک کتاب تحریر کر کے نثر نگاری کا ایک عمدہ نمونہ قائم کیا۔ اس [illegible]ھ میں انتقال ہوا۔

ان کے بعد ترکی نثر میں کافی کتابیں تحریر ہوئیں۔ ان میں سے قدیم مورخین اور قدیم نثر نگاروں کا مختصر ذکر مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) علی چلبی نے انوار سہیلی کا ترجمہ کر کے ہمایوں نامہ کے نام سے سلیمان ں کی خدمت میں پیش کیا جو بہت مقبول ہوا (۲) سعد الدین آتالیق مراد لث المتوفی ۱۰۰۸ھ نے عثمانی خاندان کی ایک مفصل تاریخ ترکی نثر ں تحریر کی جس میں ابتدا سے لے کر سلیم اول تک کے تاریخی حالات ندرج تھے۔ اس کا نام تاج التواریخ تھا۔ اس تاریخی تصنیف سے ی ادب میں عمدہ تاریخ نگاری کا آغاز ہوا جس کی بڑی حد تک کمی تھی۔ س کے بعد نعیمات نے تاریخ عثمانی کے نام سے ایک تاریخی کتاب لکھی ں کا زمانہ [illegible] تا [illegible] تھا اور اس کی تاریخ میں اپنے پیشرو زیادہ سادہ گوئی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ مراد رابع کے زمانے میں ایک ہور ترکی سیاح اولیا نے اپنی سیر و سیاحت کا حال ایک سفرنامے ں تحریر کیا تھا۔ اور اس طرح اس نے ترکی ادب میں سفرنامہ کی صنف آغاز کیا۔

ا کبرلی زادہ بھی ترکی زبان کا مشہور عالم و فاضل تھا۔ اس نے اریخ کی اور تاریخ حیات تحریر کیں۔ یہ کتاب تاریخ و سیرت میں نہایت ہم [illegible] کے لئے ماخذ کا کام دیتی ہے سے عالم علامہ [illegible] نے بھی اس قسم کی ایک کتاب تحریر کی تھی [illegible] مقبول ہوئی۔

[illegible] ترکی قوم کی ایک [illegible] کے نام سے [illegible] اس نے کشف الظنون کے نام سے عربی، فارسی اور ترکی کے مصنفین اور ان کی تصنیفات پر ایک مبسوط کتاب تحریر کی جو ان زبانوں کی تصنیفات کا حال معلوم کرنے میں اب تک محققین کے لئے مشعل راہ ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے لیکن اس کے ذریعے بے شمار ترکی تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے ترکی زبان میں بھی اس قسم کی متعدد کتابیں تحریر کیں جن کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا ۱۰۶۷ھ میں انتقال ہوا۔ مگر ترکوں کی طباعت اس وقت ہوئی جب ہنگری کے ایک صاحب نے عربی لغت صحاح جوہری کا ترکی میں ترجمہ کیا جو ۱۱۴۱ھ میں ہوا۔

قدیم دور کے شعراء

سلیمان اعظم کے زمانے میں ترکی شاعری نے بے حد ترقی کر لی تھی کہ اگر ہم مشہور شعرا کے نام گنائیں تو ان کی ایک طویل فہرست ہو جائے گی تاہم مشہور ترین شعرا یہ ہیں (۱) محمد بن سلیمان بغدادی الملقب بہ فضولی (۲) باقی (۳) سیفی (۴) نابی (۵) ندیم (۶) شیخ غالب مولوی (۷) نفیسی شاعر۔

محمد بن سلیمان فضولی نے در اصل بغداد میں نشو و نما پائی تھی اور وہ کافی عرصے تک بغداد میں رہا تھا۔ وہ عربی فارسی کا متبحر عالم تھا لیکن اس نے ترکی زبان ہی میں شعر کہنا پسند کیا۔ اس کا شمار ترکی شعرا کے طبقہ اول میں ہے۔ وہ سلیمان کا ہمعصر تھا۔ اس کے متعلق [illegible] کے مایہ ناز ادیب اسمٰعیل حبیب نے اپنی کتاب ترکی ادبیات کی جدید تاریخ میں یہ رائے زنی کی ہے "وہ جذبات رنج و غم کا بہترین مصور ہے" اس کا انتقال ۹۶۳ھ میں ہوا۔

باقی کا عہد ۹۳۳ھ سے ۱۰۰۸ھ تک رہا۔ وہ بہت بڑا عالم تھا۔ مرثیہ نگاری میں اس نے کافی شہرت حاصل کی۔ بقول اسمٰعیل حبیب اس نے اپنی شاعری سے لوگوں میں احساس غیرت اور عصبیت کا جوہر پیدا کیا۔

سیفی ارض روم کا باشندہ تھا۔ قصیدہ گوئی میں اس نے کافی شہرت حاصل کی اور اپنی قدرت زبان و بیان کا ثبوت دیا۔ اہل ذوق شعرائے قدیم میں اسے دوسرے درجے پر شمار کرتے ہیں۔ یہ احمد اول کے زمانے میں ہوا تھا۔

نابی ترکی زبان کا مشہور غزل گو شاعر تھا جس نے مشہور فارسی شاعر صائب کے رنگ میں غزل گوئی اختیار کی اور اسی وجہ سے اس کے کلام میں صائب کا رنگ صاف نمایاں ہے۔ اس نے [illegible] کا زمانہ دیکھا تھا۔

[illegible] سلطان [illegible] کے زمانے تک زندہ رہا۔
معقول [illegible] تھا ترکی شاعری میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے انہیں
[illegible] اس کے متعلق لکھتا ہے: اس کی شاعری میں نشاط و طرب کی رنگ
حالت [illegible] گئی تھی۔

نفیسی شاعر سلطان مراد رابع (۱۰۳۲ھ سے ۱۰۴۹ھ تک) کی مصاحب خاص تھی اور قدیم شاعر خواتین میں وہی ایسی خاتون ہے جس نے ترکی ادب میں لافانی شہرت حاصل کی نقاد مذکور اس کے متعلق ان الفاظ میں رطب اللسان ہے

"وہ ایسی [illegible] تھی جس میں شان و شوکت اور عظمت کی لہریں تلاطم خیز تھیں"

شیخ غالب مولوی سلیم ثالث کے زمانے کا شاعر تھا۔ وہ ۱۱۷۰ھ سے ۱۲۱۳ھ تک زندہ رہا حسن و عشق اس کا شاہکار ہے اس نے شعر گوئی کے لئے ایک نئی طرز نکالی۔ ترکی نقادوں کی رائے میں [illegible] قدیم میں اس کا درجہ [illegible] سب سے بڑا ہے اس کی شاعری میں رنگ [illegible] کے خیالات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

مذکورہ بالا ممتاز ترین شعرا کے علاوہ رتعی، لامی، نزاتی، یحییٰ بیگ، شفتی، ابو السعود، [illegible] نبی [illegible] بھی قدیم شعرا میں اپنی طرز کے مشہور شاعر ہیں۔

دورِ متوسط کے شعرا

قدیم شعرا کے بعد کا زمانہ حقیقت میں دور عبوری ہے جس میں مغربی ادبیات کا اثر ترکی ادب پر زیادہ نمایاں ہونے لگا تھا۔ مگر اس سے پیشتر مغربی تہذیب و تمدن نے یہ اثر ڈالا تھا کہ یورپ کی تیز روشنی کے سامنے ترکی شعرا کی شعر و شاعری کی [illegible] تقریباً ماند پڑ گئیں یہاں تک کہ بالآخر ترکی شاعری مردہ ہو گئی اور ترکی ادب کی ترقی رک گئی۔ کیونکہ نوجوان ترک دوسری قدیم چیزوں کی طرح قدیم طرز شاعری کو فرسودہ سمجھ کر چھوڑ چلے تھے۔ ایسی حالت میں شعر و شاعری میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ۱۲۴۷ھ میں سلطان محمود ثانی نے نوجوانان ترک کو یورپ کی نظموں کا ترکی میں ترجمہ کرنے کی طرف مائل کیا۔ اس تحریک نے ترکی شاعروں میں پھر دلچسپی پیدا کی اور نوجوان شعرا کو مغربی شعرا کی بہترین نظموں کو ترکی زبان میں منتقل کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی مگر دور ما بعد کے ادبی و علمی انقلاب بھی اس وقت تک [illegible] نہیں ہو سکا جب تک کہ سیاسی انقلاب کے لئے کامیاب جد و جہد نہ کی جائے کیونکہ سیاسی انقلاب

بعد جدید میں ایک نئے ادب کی بنیاد [illegible] کے تحت جب [illegible] پاشا نے [illegible] سیاسی انقلاب کے [illegible] اس وقت ترکی ادب [illegible] بھی ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ سیاسی و ادبی انقلاب کے [illegible] نے بھی [illegible] کی مگر سیاسی مصروفیات کی بنا پر وہ ادبی تحریک کے [illegible] نہیں بن سکے اس لئے ادبی تحریک کی قیادت [illegible] پاشا اور شناسی آفندی نے سنبھالی [illegible] پاشا ۱۲۴۶ھ سے ۱۳۰۶ھ تک زندہ رہے۔ انہوں [illegible] مسلسل سرگرمیوں [illegible] نئے دور کے لئے موافق زمین تیار کر گئے [illegible] ایک جادو بیان شاعر تھے۔ انہوں نے ترکی شاعری کا قالب بدلا اور [illegible] میں نئی روح پیدا کی۔ ان کے بعد شناسی آفندی نے اس تحریک کو [illegible] ترقی دی [illegible] انہوں نے فرانسیسی زبان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی [illegible] شعرا [illegible] براہ راست استفادہ کیا تھا [illegible] انہوں نے [illegible] ادبیات کو بھی اسی رنگ میں ڈھالنا چاہا۔ چنانچہ انہوں نے [illegible] کی نظموں کا ترجمہ [illegible] میں شائع کیا اور [illegible] ادبی صحافت کی [illegible] ڈالی۔ اس طرح انہوں نے ترکی نثر اور انشا پردازی کو [illegible] لفظی سے نجات دی [illegible] شناسی کو سیاسی مصروفیات اور وطنی تحریکات [illegible] ترکی ادب میں اپنی تصنیف کا لافانی ذخیرہ چھوڑ جاتے [illegible] افسوس ہے کہ وہ [illegible] ترکی ادب کی زیادہ خدمت نہ کر سکے [illegible] انہوں نے [illegible] اور نقاد کی ایسی جماعت تیار کر لی تھی جنہوں نے ان کے مشن کو کامیاب کیا اور [illegible] نثر کا قالب بدل کر انہیں نئے روپ میں سجایا۔ ان کے ساتھ [illegible] اور [illegible] نے اس انقلابی تحریک میں زبردست کام انجام دیا تھا

عاکف پاشا کے علاوہ [illegible] پاشا نے بھی ترکی شاعری کے [illegible] میں جان ڈالی نیز [illegible] کے [illegible] ضیا پاشا نے ترکی [illegible] ایسے قدیم اسلوب میں [illegible] کے مطابق تھا [illegible] جدید [illegible] کی آمیزش ایسی خوش اسلوبی سے کی تھی کہ دونوں [illegible] اس کو پسند کرتے تھے ضیا پاشا ۱۲۴۱ھ سے [illegible] تک زندہ رہے [illegible] مشہور [illegible] شاعر تھے۔

دورِ جدید

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] کہ اس [illegible] ترکی ادبیات [illegible]
[illegible] کے بہت [illegible] اس دور [illegible] کامیاب [illegible] کا سہرا
[illegible] کے سر ہے جو اس دور کا [illegible] انداز
[illegible] تھا۔ اس نے ترکی شاعری، ڈراما اور [illegible]
[illegible] یا خوش قسمتی تھا کہ اس [illegible] ادیب [illegible] اور
[illegible] صاحب [illegible] کی کوششوں سے اردو [illegible] میں
[illegible] ہو گئے ہیں۔

تقریباً اسی زمانے میں یوسف کمال نے چند مغربی ناولوں کو ترکی میں [illegible] کر کے اس صنف کو ترکوں میں مقبول بنایا اور احمد مدحت نے ترکی [illegible] پر فسانے لکھ کر قومی فسانوں کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرح احمد وفیق [illegible] نے [illegible] میں فرانس کے مشہور ڈرامہ نویس مولیر کے تین [illegible] کا ترجمہ ترکی ماحول میں منتقل کر کے ترکی ادب میں [illegible] پیش کیا۔ سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ ترکی کے بہترین شاعر عبدالحق حامد [illegible] ترکی میں خود ساختہ منظوم ڈرامے تحریر کئے۔

بہترین شاعر

عبدالحق حامد اس دور کا بہترین شاعر تھا۔ وہ ۱۲۶۸ھ میں پیدا ہوا [illegible] کے متعلق مشہور نقاد اسمٰعیل حبیب کی یہ رائے ہے

"اس کے کلام میں ترکی ادبیات کے دور اول کے شعرا کے کلام کا [illegible] صحیح انداز میں موجود ہے اور ایرانی شعرا میں سے حافظ، سعدی، رومی، خیام کا تخیل اور مغربی شعرا میں کورنی، راسین، ہیوگو اور شیکسپیر کے کلام کی روح موجود ہے۔" ان الفاظ کے بعد حامد کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ترکوں کا مایۂ ناز شاعر ہے چنانچہ اسمٰعیل حبیب نے اپنی کتاب "ترکی ادبیات کی جدید تاریخ" میں ۱۱۵ صفحے [illegible] حامد کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے

محمد امین [illegible] اس دور کا مشہور شاعر ہے وہ [illegible] ۱۲۸۶ء [illegible] اس نے [illegible] نظمیں لکھی ہیں۔ وہ شاعر [illegible] کہ اس نے [illegible] خیالات کی ترجمانی کی [illegible] میں [illegible] تھا اس کی شاعری کا [illegible] تک [illegible] پر رہا۔

[illegible] ذیل ہیں۔

[illegible]

میں [illegible] قدر [illegible] پیدائش [illegible] میں ہوئی جس [illegible] میں پیدا ہوا۔ خالد ضیا [illegible] بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کے طرز بیان ملک کی نوجوان شعرا نے پیروی کی اور مدت تک ان کا مقرر کردہ معیار نوجوان شعرا و ادبا کے لیے مشعل راہ بنا رہا۔

ادبیات ملی

جنگ عظیم کے اختتام پر ترکی میں جو انقلاب ہوا اس سے ایک قومی و ملی تحریک پیدا ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاطینی رسم الخط کا اجرا ہوا اور عربی و فارسی کے الفاظ خارج کرنے کی تدریجی کوشش کی گئی۔ اس کمالی دور میں جو ادب پیدا ہوا وہ "ادبیات ملی" کے نام سے موسوم ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ دور جدید جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا ۱۹۰۸ء کے انقلاب جمہوریت کا نتیجہ تھا جس میں نامق کمال بک اور عبدالحق حامد کا تتبع کیا گیا۔ اس کے بعد ایک اہم ادبی انجمن "فجر آتی" کے نام سے قائم ہوئی جس کے ارکان نے ابتدا میں توفیق فکرت اور خالد ضیا کے طرز کی پیروی کی۔ لیکن ان کی زیادہ تعداد بعد میں قومی ادب کی تحریک میں جذب ہو گئی۔ اس ادبی حلقہ کا مسلک تھا کہ ادب برائے اثر ہے اور یہ قومی ادب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ لیکن اس کے باوجود تین شاعروں نے اپنا اپنا مخصوص طرز قائم رکھا۔ ان میں سے احمد ہاشم قدیم قواعد عروض کا سختی سے پابند رہا۔ وہ موسیقی اور شاعری کے باہمی رشتے کے متعلق بھی مخصوص خیالات رکھتا تھا۔ دوسرا شاعر یحییٰ کمال تھا۔ جو ۱۹۱۲ء کے بعد کافی مقبول ہوا۔ ادبی نقطۂ نگاہ سے اس کے خیالات احمد ہاشم سے مختلف تھے وہ اپنے اشعار میں موسیقیت پیدا کرنے کے لئے نئے نئے راستے نکالتا تھا۔ تیسرا شاعر محمد عاکف تھا۔ یہ قومی شاعری کے اثر سے بالکل بچا رہا۔ یہ اتحاد اسلامی کا حامی اور قدیم قواعد عروض کا [illegible] تھا۔ یہ مغربی اثرات سے بالکل متاثر نہیں ہوا۔ تاہم وہ آسان زبان میں اپنے ہم وطنوں کی زندگی کی حقیقی تصویر کھینچنے میں کامیاب رہا اس کی غزلیات میں بلند خیالات پائے جاتے ہیں وہ شاعر [illegible] تھا اور جمہوریت کی حوصلہ افزائی نے اس کو بلند مرتبہ پر پہنچایا۔

ضیا گوک الپ

ادبیات ملی کی تحریک نے مختلف ادبی انجمنوں اور ان کی تحریکوں [illegible] اور خاص کر رسالہ "قلمک" اور "ترک یوردو"

نے اس بارے میں زبردست کام سرانجام دیا۔ رفتہ رفتہ جنگ بلقان کے اختتام پر اس تحریک نے بہت زور پکڑا۔ اس وقت اس تحریک کا روح رواں ضیا گوک الپ تھا جو بہت بڑا فلسفی ادیب و شاعر تھا۔ وہ اپنے یونیورسٹی کے مقالات تقاریر مضامین اور نظموں کی بنا پر نوجوانان وطن میں کافی رسوخ رکھتا تھا اس لئے اس نے ادبیات ملی کی تحریک کو جنگ بلقان سے لے کر جنگ عظیم کے اختتام تک نہایت تندہی سے چلایا۔ جنگ عظیم کے اختتام پر وہ مالٹا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اور اس کے تھوڑے عرصے کے بعد وہ فوت ہو گیا۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ اس کی کتاب "جو لویوں اساس لری" میں مل سکتا ہے جو انگورہ میں ۱۹۲۳ء مطابق ۱۳۳۹ھ میں طبع ہوئی تھی۔

ادبیات ملی کی تحریک کے کامیاب ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی ادب بہت وسیع اور عام فہم ہو گیا وہ ہر قسم کے لوگوں کی زندگی کا آئینہ دار بن گیا اور ہر قسم کے خیالات اس میں ادا ہونے لگے یہاں تک کہ ترکی ادب کی شیرینی بیان اور نزاکت تخیل کی تمام زبانوں میں شہرت ہو گئی۔ اور ترکی زبان بھی دیگر ترقی یافتہ مغربی زبانوں کی برابری کی دعویدار بن گئی۔

اس تحریک کے شعرا میں فاروق نافذ اول درجے پر ہے۔ اس نے اپنی آخری نظموں میں اناطولیہ کے مناظر پیش کئے ہیں اس کے بعد خالد حنفی انیس بہیج، یوسف ضیا، خالد فخری، نجیب فاضل اس دور کے بہترین مشہور شاعر ہیں۔ ان تمام شعرا پر ضیا گوک الپ اور یحییٰ کمال کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے

جدید نثر نگار

عہد حاضر میں ممتاز ترین نثر نگار شخصیت خالدہ ادیب خانم کی ہے انہوں نے ابتدا میں ناولوں اور فسانوں کے بجائے انشاء ان گوہلق کی طرز کی کتابیں تحریر کرنی شروع کیں جن میں اناطولیہ کی جد و جہد آزادی کا نقشہ کھینچا گیا تھا جو اثر کے عمر سیف الدین بھی اعلیٰ پایہ کے مختصر افسانے چھوڑ گیا ہے جن میں سے ایک شاہکار ادب ملی کے شاہکار ہیں۔ رفیق خالد نہایت آسان زبان میں لکھتا ہے وہ اپنی کتاب مملکت مکتبہ میں اناطولیہ کی زندگی کو آشکار کرتا ہے اور ایک حقیقت نگار انشا پرداز ہے۔ یعقوب قدری بھی اپنے ناولوں میں ایک طرز نگار اور صوفی شاعر معلوم ہوتا ہے فالح رفقی اور روشن اشرف بھی مشہور نثر نگار ہیں۔ ناول نویسوں میں حسین رحمی شاد لوری نے اپنے ناول "قلی قوشو" کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کی ہے ترکی کے جدید فسانہ نویسوں نے ایک خاص رنگ پیدا کر لیا ہے اس قسم کے جدید فسانے اردو میں ترکی فسانے کے نام سے ... آبادی مدیر ہند جدید نے منتقل کئے ہیں۔

ترکی ڈراما: ترکی ڈراما ابھی ترقی پذیر ہے لیکن چونکہ وہ فرانسیسی ڈراما کی طرز پر قائم کیا گیا ہے اس لئے فرانسیسی راگ اور ناٹک کی ... طبقات اس کی راہ میں حائل ہو رہے ہیں تاہم

خلوتِ سوز و ساز

بخششِ عام دیکھ کر یاس نے آسرا دیا

از: حضرت دل شاہجہانپوری

یہ اثرِ وفا لیا، یہ صلۂ وفا دیا — عشق کی بارگاہ میں حسن نے سر جھکا دیا

اپنے کمالِ شوق نے دیکھ لیا دکھا دیا — خلوتِ سوز و ساز میں حسن کو جگمگا دیا

یاد ہیں آج تک وہ دن محوِ بہار تھی نظر — خلد کے پھول کھل گئے جب بھی مسکرا دیا

خضر و مسیح کیلئے وقفِ حیاتِ جاوداں — وقفۂ زندگی ہمیں صورتِ نقشِ پا دیا

حسرت و شوق رائگاں جذبۂ عشق بے اثر — چند یہ دل کے داغ تھے ہم نے جنہیں مٹا دیا

طرزِ روش نشاطِ جاں زیرِ قدم سکونِ دل — فتنۂ دہر جو اٹھا اس کو وہیں دبا دیا

ٹھوکریں کھا کے جا بجا پہنچے ہم اس مقام تک — بخششِ عام دیکھ کر یاس نے آسرا دیا

وہم تھا اور کچھ نہیں حسن کو سمجھ رہے تھے دل — ہم نے بیاضِ عشق سے لفظِ غلط مٹا دیا

منظرِ خوشگوار ہے یہ اثرِ بہار ہے — دامنِ کوہ و دشت کو خلدِ نظر بنا دیا

کوئی طلوعِ صبح کا ہجر میں منتظر رہے — ہم نے چراغِ زندگی شام ہی سے بجھا دیا

پہلے ضمیر نام تھا اس میں کسے کلام ہے
شعر و سخن کے ذوق نے پھر ہمیں دل بنا دیا

مشغلہ ہی ختم کر دیا اس لئے کہ فرمائش پر لکھنا مجھے ناممکن تھا کبھی تو ایک رسالہ چار چار افسانے لے اڑتا لکھ دیتا اور کبھی ایک سطر نہ لکھی جاتی۔" "آپ نے ادب پر بڑا ظلم کیا!" ایک طالب علم نے میری بات کاٹ کر کہا غیر ارادی طور پر میری آنکھیں خوبصورت لڑکی پر جم گئیں میں نے دیکھا وہ رومال ہی جی ہاں ریشمی رومال میں اپنی نقرئی ہنسی جذب کرنے کی کوشش کر رہی ہے طالب علم کو پھر ٹالتے ہوئے میں نے کہا تمہیں بتا تو چکا ہوں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ تمہارے افسانے اصلاح سے مستغنی ہیں اب رہی تکنیک یا فن تو وہ بھی میں بہت کچھ بتا چکا۔

"میں خود نہیں آتی نہ معلوم کونسی کشش ہے جو مجھے کھینچ لاتی ہے" اس نے کرسی کے ہتھے سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم آج کلاس میں ہنسی کیوں تھیں" میں نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا اس کا جواب ایک اور ہنسی تھی کچھ جاذب اور کچھ بیگانی میں کوشش پر غور کرتا رہا رات بھر نہیں بلکہ کئی دن اسی کے ساتھ ہنسی پر بھی سوچتا رہا "نقرئی ہنسی" "ریشمی رومال" نہ معلوم کیوں؟

کئی دن سے میں اپنے کمروں میں تبدیلی دیکھ رہا تھا۔ ہر جگہ سگریٹ کی راکھ تھی نہ کاغذات بکھرے تھے نہ الماری میں کتابیں گرا پڑی تھیں۔ آج جو پکڑا گیا میں کلب سے جلد ہی چلا آیا۔ لباس کے کمرے سے کپڑے بدل کے کتب خانہ میں گیا تو فریدہ جھاڑن لئے میز صاف کر رہی تھی۔

"یہ کیا!" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہوتا کیا کتابیں بے ترتیب تھیں میز کباڑ خانہ معلوم ہوتی تھی اور کمرہ باورچی خانہ میں نے کہا خالی بیٹھے بیٹھے کیا کروں یہی کام کرنے لگی۔"

"اچھا تو آپ ہی یہ رحم فرماتی ہیں۔ میں کہتا تھا کہ یا اللہ کون میرے کمروں میں یہ گڑبڑ مچاتا ہے۔"

"خوب تو یہ کہئے کہ آپ صفائی اور درستی کو گڑبڑ سمجھتے ہیں کیوں نہ ہو ہیں تو آخر آپ بھی مرد!"

مرد۔ عورت میرے ذہن میں پہلی مرتبہ یہ احساس پیدا ہوا کہ عورت بدامان... محبت... عشق کے علاوہ زندگی کی ترتیب و نظم میں بھی ضروری ہے۔ رات بھر مجھے خواب میں عورت جھاڑن۔ صفائی۔ شریک حیات وغیرہ ایسے نظر دکھائی دیئے

نہ معلوم کیوں؟

شاید ہی کوئی رسالہ فریدہ کے افسانہ سے خالی ہوتا لڑکوں کی چھیڑ چھاڑیاں بھی اب نہ تھیں اب وہ درجہ میں اچھی نظروں سے دیکھی جاتی تھی اور میں نہ معلوم کیوں خوش ہوتا۔

ایک دن حسب معمول وہ آئی گفتگو میں کہنے لگی "آپ نے افسانہ نویسی کیوں ترک کر دی"۔

"نہ معلوم کیوں" میں نے کہا لیکن پھر چونک کے بات کی تلافی کی "اس کی وجہ تو تم کو میں پہلے دن بتا چکا تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ میں لکھنے سے بہت گھبراتا ہوں"۔

"تو آپ بولتے جایا کیجئے اور میں لکھتی جایا کروں"۔

"فرض کرو اگر ایسا بھی ہو تو میری فرصت کا وقت رات کو ہے مگر تم"

"مگر کیا ہے میں اس وقت بھی آسکتی ہوں"۔

"لیکن تمہارے ماں باپ معترض نہ ہوں گے رات گئے تک تمہارا غیر حاضر رہنا یقیناً وہ اس کو گوارا نہ کریں گے"۔

"میرے ماں باپ کاش وہ منع کرنے والے زندہ ہوتے" اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا اس کی کالی آنکھیں ڈبڈبا چلی تھیں

"ارے کیا کہا تمہارے والدین مر چکے ہیں"!

"ہاں! اس کو عرصہ ہوا اتنا عرصہ کہ مجھے خواب سا یاد ہے"۔

"تو پھر تم اپنے کسی عزیز کے پاس رہتی ہو؟"

"عزیز دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا الاقارب کالعقارب یہ تو کچھ بھی نہیں کہئے کہ والد مرحوم کی خدمات کے عوض مجھے سرکاری وظیفہ نہ مل گیا ہوتا تو میری تعلیم تو کجا زندگی مشکل ہوتی چھوڑیئے اس قصہ کو ہاں تو آپ تو اس امر کو ناپسند نہیں کریں گے کہ میں رات کو آجایا کروں"۔

"نہ معلوم کیوں" میں نے کہہ دیا کہ میں تو اس کو بھی ناپسند نہیں کرتا کہ تم ہمیشہ کے لئے یہاں چلی آؤ"۔

اس کا چہرہ شرم سے تمتما اٹھا۔ جھکی ہوئی نظریں یہ تھا اس کا جواب!

ہماری شادی ہو گئی۔ نہ معلوم کیوں۔ اور پھر ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک رسالہ میں میرے نام سے ایک افسانہ چھپا ہے۔ میرے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی اور یہ مختصر سا نوٹ پڑھ کے جو ایڈیٹر نے ہیڈ نوٹ میں لکھا تھا کچھ بھی خوشی سے افسانہ شائع کرتے ہوئے ادیب موصوف کو تہنیت

پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے پھر ادب کو عورت بخشنا شروع کر دی
اور پھر تقریباً کئی سال ایسے ہی نقرے گزرے کالج میں بھی
تذکرہ ہونے لگا میں خاموش رہا۔ نہ معلوم کیوں؟
افسانوں میں بالکل بیرا نگ تھا اور مجھے خود حیرت تھی
سنیئے لوگ اب فریدہ کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرینگے!
اگر یہ بات تھی جبھی تو ہم کہتے تھے کہ یہ "ڈل لڑکی" اور
یہ گہرے اور چلبلے افسانے!
ع چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں

آخر میں ایک دن "اشاعت" کے دفتر جا پہنچا اور ان
سے مسودہ کا مطالبہ کیا ایڈیٹر نے بڑی خندہ پیشانی
سے مسودہ لا کے میرے سامنے رکھ دیا میں حیرت
میں رہ گیا۔ "فریدہ کی تحریر"
اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا فریدہ کا اس پہ میرا
مونوگرام ... میں فوراً گھر آیا فریدہ نے حسب معمول
مسکرا کے میرا خیر مقدم کیا میں نے کہا کیوں جناب یہ کیا
حرکت ہے کمرہ صاف کرتے کرتے دل پہ ہاتھ صاف
کر دیا۔ اور اب میری شہرت اور نام بھی۔
وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور میں بھی ——
نہ معلوم کیوں۔!

دخترِ رز

نظیری

زماشاطۂ بستاں صداقِ می طلبد — ہنوز دخترِ رز در سراچۂ علبی ست

سودا

دخترِ رز سے اگر تو باندھ دے میرا نکاح — خوب کھلوائینگے اے مُلّا تجھے شکرانہ ہم

ذوق

دخترِ رز نے وہ اعجاز دکھائے سرِ بزم — رات یاروں کے وہاں غسل و وضو ٹوٹ گئے

امیر مینائی

ملی ہے دخترِ رز لڑ جھگڑ کے قاضی سے — جہاد کر کے جو عورت ملے حرام نہیں

ریاض خیر آبادی

جنابِ شیخ اُلجھتے ہیں کس تعلق پر — یہ دخترِ رز کے کوئی رشتہ دار ہیں تو نہیں

داغ

دخترِ رز ہے بڑی تیز مزاج اے واعظ — تیرا کیا منہ ہے اسے تجھ ہیں بھرنے والے

یہ کون آ رہا ہے؟

از:۔
حضرت اظہر امرتسری

مسرت کی کرنیں چمکتی ہیں ہر سو محبت کا مہتاب جلوہ نما ہے
مرے گھر کا ہر ذرہ شمعِ درخشندہ بن بن کے روشن ہوا چاہتا ہے
یہ کون آ رہا ہے؟ یہ کون آ رہا ہے؟

مرے بربطِ دل کا ہر تار مدت سے محرومِ حرکت ہوا جا رہا تھا
مگر مرتعش ہے اب ایسی ادا سے کہ جیسے ہمیشہ سے نغمہ سرا تھا
یہ کون آ رہا ہے؟ یہ کون آ رہا ہے؟

یہ کون آ رہا ہے کہ شمعیں ستاروں کی بجھ بجھ کے روشن ہوئی جا رہی ہیں
شعاعیں مہِ آرزو کی شبِ نوجوانی کی آغوش میں ناچتی ہیں
یہ کون آ رہا ہے؟ یہ کون آ رہا ہے؟

یہ عارض پہ غازہ یہ ہونٹوں پہ سرخی یہ آنکھوں سے کاجل کے دلکش اشارے
کرم میں لطافت غضب میں ہلاکت جسے چاہے چھوڑے جسے چاہے مارے
یہ کون آ رہا ہے؟ یہ کون آ رہا ہے؟

یہ عنبر فشاں عطر کے پالے گیسو ادا سے بنائے سنوارے سنگارے
یہ افشاں چنی مانگ جو کہکشاں کی حمائل فلک کے گلے سے اتارے
یہ کون آ رہا ہے؟ یہ کون آ رہا ہے؟

یہ سیب ذقن جس کی خوشبو سے روحِ بہار و گلستاں کو بھی وجد آئے
یہ غنچہ سا مُنہ جو ہو محوِ تبسم تو کانٹا بھی گل کی طرح کھلکھلائے

یہ کون آرہا ہے؟ یہ کون آرہا ہے؟

یہ عارض یہ صبحِ بنارس کا جلوہ یہ آنکھوں میں شامِ اودھ کی سیاہی
یہ سفاک نظریں خدا ہی بچائے، ہلاکت ہلاکت تباہی تباہی

یہ کون آرہا ہے؟ یہ کون آرہا ہے؟

نشہ حسن کا نوجوانی کی مستی اک اک گام پر لغزشوں کا مچلنا
یہ نازک خرامی، یہ رُک رُک کے چلنا یہ گرتے ہوئے ہر قدم پر سنبھلنا

یہ کون آرہا ہے؟ یہ کون آرہا ہے؟

یہ مستانہ نظروں میں دلکش نوائیں، یہ رنگیں تبسم میں شیریں ترانہ
حکایت محبت کی، اُلفت کا قصہ، کرم کی کہانی، وفا کا فسانہ

یہ کون آرہا ہے؟ یہ کون آرہا ہے؟

یہ جھنکار پازیب کی یا قیامت کی بربط کی فتنہ بداماں صدائیں
خدا کی خدائی کو بیتاب کر دیں کسی کو اٹھائیں کسی کو گرائیں

یہ کون آرہا ہے؟ یہ کون آرہا ہے؟

یہ کون آگیا میرے ظلمتکدہ میں اُٹھائے ہوئے آفتابِ محبت
کہ آخر مری شامِ رنج و الم پر یہ بھی چھانے لگی صبحِ عیش و مسرت

یہ کون آگیا ہے؟ یہ کون آگیا ہے؟

ہمالیہ کے سفید دیو

افسانہ و حقیقت

از مولینا محمد اسمٰعیل ناصح ایڈیٹر اخبار آئینہ

قصہ کہانی کی پرانی کتابوں میں حتیٰ کہ شاہنامہ جیسی نیم تاریخی کتابوں میں بھی ہم دیوؤں کا تذکرہ پڑھتے ہیں لیکن ہم انہیں ان کے عجیب الخلقت ہونے کی بنا پر محض ایک فرضی ہستی اور خیالی دیو ہی یقین کرتے رہے ہیں تاہم شاہنامہ میں رستم کے ہفت خوان کے سلسلے میں جب ایک سفید دیو کی تنومندی اور غیر معمولی تن و توش کا ذکر پڑھتے ہیں تو ہمارا یقین شک میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کیا اگلے زمانہ میں کوہ قاف کے علاوہ بحر خضر کے کنارے واقعی کوئی ایسی قوم آباد تھی جو چہل تن اور شیر افگن کے جابر کا صحیح معنوں میں مصداق تھا یا محض ویسی ہی کوئی پُر فریب خیالی ہستی تھی جو رستم کی طرح خدائے فردوسی کی نہیں بلکہ تخیل فردوسی کی تخلیق تھی، اس نے رستم کے شاندار کارناموں کا فخریہ بیان کرنے کے باوجود خود ہی اس کے روشن چہرے پر ایک مبہم نقاب ڈال دیتا ہے کہ ؎

منش کردہ ام رستم داستاں — وگرنہ یلے بود در سیستان

اس قسم کی کوئی غیر معمولی ہستی کو قاف کی دیو جسے آج کل کی اصطلاح میں قفقاز بھی کہا جاتا ہے، سنگلاخ زمین میں قدیم الایام میں بستی بھی تھی اور اگر تھی تو حقیقتاً اس کی مدبھیڑ ہوئی بھی تھی یا نہیں لیکن اس قسم کی ایک عجیب و غریب قوم ہمالیہ کی ترائی میں حال ہی میں متحقق ہوئی ہے، اسے سائنس دانوں نے تو برفانی (SNOW MAN) کا لقب دیا ہے مگر اس کا جو حلیہ بیان کیا جاتا ہے وہ ایک سینگ کو چھوڑ کر جو اس کے سر پا کنیٹوں پر موجود نہیں ہوتی ہر لحاظ سے روایتی دیوؤں کی قوم سے مشابہت تامہ رکھنے کے باعث میں اسے دیو سفید کے نام سے موسوم کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں سطور ذیل میں میں اس قوم کے کچھ حالات تحقیقات کے بعد پیش کرنا چاہتا ہوں جو امید ہے قارئین کرام کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

ایک عجیب و غریب واقعہ

اوّل اوّل اس عجیب الخلقت مخلوق کے روئے زمین پر وجود کا شہرہ اس وقت ہوا جب ۱۹۳۰ء میں ضلع جلپائی گوڑی (شمالی بنگال) کے ایک دیہہ میں صبح کے وقت لوگوں کی بندہ ایسی غیر معمولی ساخت کے نقوش زمین پر مرتسم پائے گئے جو ۲۲ انچ لمبے تھے نیز بہت تھوڑا اسی نمونہ کے کچھ اور نقوش مشرقی بنگال کے علاقہ میں مشاہدہ کئے گئے۔ خود کلکتہ میں بھی پچھلے سال اسی قسم کا ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا جس نے محققین کی توجہ از سر نو اس مسئلے کی طرف منعطف کر دی۔ ہوا یہ کہ وسط ۱۹۳۳ء کی ایک رات کو ایک نوجوان بنگالی بیٹھک روڈ کے ایک کمرے میں سو رہا تھا کہ دفعۃً کے قریب

وہاں کھڑکھڑاہٹ کی آواز بلند ہوئی اور اس کی نیند ٹوٹ گئی، اُس نے دیکھا کہ وسط کمرہ میں ایک دراز قد و عظیم الجثہ شخص کھڑا ہوا ہے، اس کا سر اگر آسمان سے باتیں نہیں کر رہا ہے تو کم از کم چھت سے ضرور لگا ہوا ہے، یہ نظارہ دیکھ کر اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ بچتا بچاتا کمرے سے باہر نکل بھاگا اور ہمسائے کے مکان میں پناہ لی، سویرا ہو جانے پر جب وہ کئی آدمیوں کے ہمراہ مکان کا جائزہ لینے کو لوٹا تو دیو غائب غلہ ہو چکا تھا مگر اس کی آمد کی علامت صریح اُس کے نقوش پا کی پیمایش کی تو طول میں ۲۲ انچ اور عرض میں [illegible] نکلے یعنی اس دیو نژاد ہستی کے تلووں کی رگیں تک اُبھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ انسپکٹر موصوف نے ان نقشوں کے فوٹو بھی لئے اور احتیاط کے طور پر اس حصّہ مکان کو [illegible] کر دیا عرصہ تک یہ مکان زیارت گاہ عام بنا رہا، اگرچہ دروازہ کے مقفل ہونے کے باعث لوگ صرف کھڑکیوں سے جھانک کر ایک نظر دیکھ لینے پر اکتفا کرتے رہے غالباً کسی ایسے ہی نشان کف پا کے متعلق حضرت حافظ نے پیشین گوئی کی ہوگی ؎

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود — سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

یہ دیو تو خود اس طرح غائب ہوا کہ کلکتہ اور اس کا نواح تو کیا روئے زمین پر پھر کہیں اس کا وجود موہوم خواب میں بھی کسی کو دکھائی نہ دیا لیکن اس کی یہ ہیبت یاد شدت سے عوام کالانعام کے دل و دماغ میں عرصہ تک ہراس پیدا کرتا رہا کہ اور بندہ بشر کا کے مصداق ایک معمول سے زیادہ لمبے تڑنگے ہم جنس پر بھی دیو کا شبہ اس غریب کی کافی مرمت کر دی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس واقعہ کے چند روز بعد شام کے وقت ایک دیو قامت آدمی جس کا قد ۸ فیٹ ۲ انچ تھا اسی جنبی کی سڑکوں پر چلتا ہوا نظر آیا۔ از بسکہ وہ غیر معمولی حد تک چوڑا چکلا واقع ہوا تھا عوام کی ظاہر بین نگاہوں کو خاصہ دیو معلوم ہونے لگا چنانچہ انہوں نے اُسی مکان والا خوفناک دیو کا گمان کر کے اس پر کثیر تعداد میں ہجوم کر دیا۔ یہ غریب چونکہ اصل معاملہ سے بے خبر تھا، اس صورت حال پر سخت حیران تھا۔ آخر اسے بھاگ نکلنے میں اپنی خیریت نظر آئی عوام نے "دیو دیو" کا شور مچا کر کچھ اس قدر مرعوب کر دیا تھا کہ بیچ جس گھر میں پناہ لینے کے لئے گھستا تھا اس کا دروازہ بھی اُسے بند پاتا تھا اس سے بھی مصیبت یہ تھی کہ جب کبھی وہ بشدت بے بسی اپنے مجمع سے اپیل کرنے کے لئے اس کی طرف رخ کرتا تو وہ خوف مارے دہشت کے اس کے آگے سے شور مچاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوتے اور بعض دل والے لوگ سنگ و طفلوں سے اُس کی تواضع کرنے پر اُتر آتے۔ [illegible]

ہز ہائی نس والی گجے مقامات تک پہنچا اور یہاں بیٹھا مگر پھر پولیس کو جب تحقیقات سے پتہ چلا کہ وہ مہاراجہ ٹیہری گڑھوال کا ایڈی کانگ یا باڈی گارڈ [illegible] ہے۔ جسے مہاراجہ صاحب نے محض اس کی دیوقامتی کی بناء پر اپنی ملازمت میں رکھ لیا ہے تو اس نے عزت کے ساتھ ایک ٹیکسی پر سوار کرکے اس کی قیام گاہ پر پہنچا دیا لیکن وہ اب بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتا اور مہاراجہ صاحب کے محل کو بھی اس خیال سے گھیر لیا کہ وہاں ایک دیو جا گھسا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ محل والوں کو چٹ کر جائے یا اور کسی قسم کا نقصان پہنچائے اور جب ہجوم کسی طرح سمجھانے پر بھی ٹلنے کو راضی نہ ہوا تو مہاراجہ کو ان کے لئے مجبوراً پولیس کی امداد طلب کرنی پڑی۔

برفانی آدمیوں کے متعلق روایات

یہ بات عوام و خواص سب کو تسلیم ہے کہ اس نوع کی ایک دیو ہیکل قوم کوہ ہمالہ کی تلہٹی میں آباد ہے، عوام تو اعتقاداً اور روایتاً مگر خواص تحقیقات و مشاہدات کی بناء پر اس کے اس علاقہ میں موجود ہونے کے قائل ہیں اہل تبت کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں سفید فام دیوؤں کی ایک قوم رہتی ہے اور از روئے غائت توہم پرستی اس اعتقاد کی نسبت سے ان میں اس قوم کے متعلق طرح طرح کی عجیب روایتیں اور حکایتیں مشہور ہیں۔ یہاں کے واقف کار لوگوں کا اس عجیب الخلقت قوم کے حلیہ و عادات و خصائل کے متعلق یہ بیان ہے کہ اس کا طبقہ ذکور دس فیٹ سے تیرہ فیٹ تک دراز ہوتا ہے اور سینہ کم از کم چار فیٹ چوڑا ہوتا ہے، وہ بلحاظ رنگت سیاہ فام ہوتا ہے اور یہی رنگ اسے ہمالیہ کی سفید سفید برفوں میں ممتاز کر دیتا ہے، البتہ بدن پر بکثرت سفید رنگ کے موٹے اور لمبے بال ہوتے ہیں اس کا سینہ اس کی بانہیں اور کندھے ابھرے ہوئے ہوتے ہیں ہاتھ جیسے ہیں درندہ جانوروں کی طرح لمبے لمبے ناخن ہوتے ہیں، اس قدر دراز کہ گھٹنوں تک کی خبر لاتے ہیں پاؤں اتنے طویل کہ عام آدمیوں کے پاؤں سے ۲۴ انچ لمبے اور ۱۰ انچ چوڑے ہوتے ہیں، سر گوریلا بندر سے مشابہ ہوتا ہے جس کے نیچے تنگ پیشانی اور ابھری ابھری ابروئیں ہوتی ہیں نظر آدمی کی نظر سے تیز ہوتی ہے، چنانچہ وہ اتنی دور تک کی چیزیں بخوبی دیکھ سکتا ہے جتنی انسان کی تیز سے تیز نگاہ کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی، اس کی خوراک پودوں کی جڑ، درختوں کی چھال، جنگلی پھل اور چاول ہوتا ہے۔ اور باوجودیکہ وہ گوشت نہیں کھاتا پھر بھی اس کی جسمانی طاقت ہمارے دس آدمیوں کے برابر ہوتی ہے چنانچہ خاصے تناور درخت کو جڑ سے بلا تکان اکھاڑ دیتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں اس کی صنف نازک (عورت یا مادہ) کا یہ حال ہے کہ وہ مرد سے زیادہ دراز قد اور سیاہ فام ہوتی ہے۔ باوجودیکہ اس کے پاؤں بعض سے چھوٹے ہوتے ہیں تاہم اس کا قدم نسبتاً تیز اور لمبا ہوتا ہے، وہ اتنی چست ہوتی ہے کہ مجال نہیں کہ کوئی اس کے سامنے سے بچ کر نکل جائے البتہ طاقت میں باوجود گوشت خور ہونے کے اس کے مساوی ہوتی ہے، وہ خوفناک اور خونخوار بھی ذرا زیادہ ہوتی ہے، چونکہ آدمی کا گوشت اسے بہت مرغوب ہے اس لئے وہ انسان کا شکار بڑی بے رحمی کے ساتھ کرتی ہے، چنانچہ جب کوئی بدنصیب انسان اس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پہلے اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالتی ہے، بعدہ اس کا گلا کاٹ کر اپنے تیز پنجوں سے سارے بدن کا تکہ بوٹی کر ڈالتی ہے اس بناء پر تبت والے اپنی اولاد کو بچپن ہی سے اس کی گرفت سے بچنے کا طریقہ سکھاتے ہیں، انہیں بتایا جاتا ہے کہ اگر اتفاقاً اس کا سامنا ہو جائے تو نشیب کی سمت راہ فرار اختیار کرنی چاہیئے، کیونکہ بخلاف نر کے اس کے پنجے اندر کی طرف مڑے ہوئے ہونے کے باعث وہ نیچے کی طرف تیزی سے نہیں چل سکتی اور اگر سنبھل سنبھل کر نہ چلے تو اس کے ٹھوکر کھا کر گر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور اس کی تائید میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ کچھ لوگ کہیں جا رہے تھے کہ ناگہاں وہ سامنے سے نمودار ہوئی، اس نے دیکھتے ہی ان کا ایک خوفناک قہقہے سے استقبال کیا، تمام لوگ خوفزدہ ہو کر نشیب کی طرف بھاگے، اور تو سب لوگ اس کی رسائی سے بہت دور نکل کر محفوظ ہو گئے مگر ایک آدمی جو بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا پکڑا گیا جسے اس نے وحشیانہ طور پر چیر پھاڑ دیا ایک اور واقعہ ایک قلی کا بیان کردہ ہے کہ ایک ایسی مخلوق نے جس کی نصف صورت انسان (عورت) اور نصف بن مانس کی سی تھی ایک بار اس کے چچا کو رگیدا تھا۔ وہ نشیب کی طرف بھاگا، یہ انسان نما جانور بھی اس کے پیچھے اسی تیزی سے چلی [illegible] ایک مقام پر ٹھوکر کھا کر گری اور چٹانوں سے ٹکرا کر مر گئی۔ دوسرے دن اس کا چچا کئی آدمیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا اور لاش کو نذر آتش کرکے واپس چلا آیا۔

اس قوم کا مسکن ہمالیہ کی گھاٹی بتائی جاتی ہے، کیونکہ اب تک اس کے جتنے اثر نظر آئے وہ زیادہ تر اسی علاقہ میں نظر آتے رہے ہیں، کوہ ایورسٹ کی وہ مشہور مہم جو سنہ ۱۹۲۱ء میں اس چوٹی کا انکشاف کرنے کیلئے ہمالیہ پر چڑھائی کرنے گئی تھی اس کے ایک رکن کا بیان ہے کہ جب یہ مہم چڑھتے چڑھتے کوئی تیرہ ہزار فیٹ کی بلندی پر پہنچی تو وہاں برف میں پاؤں کے کچھ نشان نظر آئے، ان میں سے بعض تو عام انسانوں کے پاؤں جتنے تھے، مگر بعض اتنے لمبے چوڑے تھے کہ راوی کا قدم صرف اس کے چوتھائی حصہ میں سما سکا پھر وہ ایک دوسرے سے غیر معمولی فصل پر واقع تھے ایک اور جرمن مکتشف نے جو کسی زمانہ میں ہمالیہ پر چڑھنے کی جرأت کر چکا تھا بیان کیا ہے اس نے برف میں پاؤں کے کچھ تازہ نشانات مشاہدہ کئے جو طول و عرض میں انسانی قدم سے بہت بڑے تھے، آج سے ستر پچھتر برس پہلے کا مہانگ میں جو دار جلنگ کے قریب ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں واقع ہے ایک انگریز کو بھی ایسی عجیب الخلقت مخلوق دکھائی دی جس کا آدھا دھڑ انسان اور آدھا بن مانس سے مشابہ تھا کہتے ہیں کہ اب اس قوم کی نسل رو بہ انحطاط ہے۔

برفانی آدمی کی سچی کہانی

سلسلۂ کلام کو ختم کرتے ہوئے ہم یہاں ایک مستند ترین شہادت درج کر دینا چاہتے ہیں جس سے اس عجیب الخلقت اور پُراسرار ہستی پر جو آنکھوں سے مخفی چلی آتی ہے۔ یہ شہادت جتنی مستند ہے اتنی ہی دلچسپ بھی ہے اور اگرچہ یہ صحیح واقعات پر مبنی ہے مگر اس کے پڑھنے سے بالکل افسانہ کا سا لطف حاصل ہوتا ہے۔ یہ بیان کپتان ڈی اوسن (D'Auvergne) سپرنٹنڈنٹ وکٹوریہ میموریل کا ہے جنہوں نے ۱۹۳۹ء کے دسمبر میں "تبت کا برفانی آدمی" کے عنوان سے بنگال انڈیا ہیرالڈ کلکتہ والے ایڈیشن سے نشر کیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:۔

گزشتہ دس پندرہ سال کی مدت میں اخباروں نے بارہا "تبت کے کریہہ المنظر برفانی آدمیوں" کا تذکرہ کیا ہے۔ میں آپ کو اپنے ایک ذاتی مشاہدہ کا حال سناؤں گا جو اس موضوع پر سے پردہ اٹھا سکتا ہے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ میں اپنے چند تاتاری دوستوں کے ہمراہ تسانگ تسو کی درمیانی پہاڑی راہ سے جا رہا تھا کہ سوئے اتفاق سے میرے ٹٹو کا قدم پھسلا اور وہ مجھے لیکر ۶۰ فٹ نیچے برف کے ایک گڑھے میں جا گرا۔ اس حادثہ کی وجہ سے مجھے تسو ہیو نام کے ایک موضع میں کوئی ایک ہفتہ تک صاحبِ فراش رہنا پڑا۔ بدقسمتی سے وہاں میں برف کوری کا شکار ہو گیا۔ کچھ وقت تک تو میں ہر قسم کا علاج کراتا رہا۔ لیکن ایک روز ایک ضعیف العمر لامہ نے مجھے صلاح دی کہ میں تسو کے شمال میں گار کا سفر کروں اور وہاں کے سب سے بڑے دھرم سالہ سے ملوں جو ان پہاڑیوں کے ایک غار میں رہتا ہے کیونکہ وہی ایک شخص ہے جو میرے اس مرض کو دور کر سکتا ہے۔

چنانچہ مجبوراً میں اسی حال میں وہاں سے روانہ ہوا کہ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور میرے دونوں رفقاء سفر باری باری سے میرے ٹٹو ہانکے لئے جاتے تھے۔ ان برف پوش پہاڑیوں کی مسافت دس روز میں طے ہوئی۔ گار تک کی راہ ۹۰ میل سے زیادہ نہ تھی، مگر پہاڑیوں پر برف اتنی گہری پڑی ہوئی تھی کہ ہمیں وہاں تک پہنچنے میں دس روز لگے اور اگر میرے رفقاء سفر کے پاس بندوقیں نہ ہوتیں تو برفانی بھیڑیئے ہم لوگوں کا قصہ کب کا پاک کر دیئے ہوتے۔ راستے میں چور والے رہتے تھے، یہ لوگ ڈاکہ زنی کے لئے مشہور ہیں۔ ان لوگوں کا گروہ ایک تنگ راستہ سے ایک چھوٹی سی دو فرلانگ تک پہاڑ کے ساتھ ہو لیا ہم سب لوگ اس خانقاہ کے اندرونی صحن تک چلے گئے اور وہاں سے ایک صندوق میں داخل ہوئے وہاں پہنچ کر ہمارے ساتھی بدھ کی ایک چھوٹی سی مورت کے آگے جو ایک اونچے تخت پر رکھی تھی ڈنڈوت کرنے جھکے۔ پھر یہاں سے ہم لوگوں کو ایک چھوٹے سے حجرے میں لے جا کر بٹھا دیا گیا اور آرام کرنے کے لئے کہا گیا۔ چونکہ یہاں بکثرت گرم کھانے پینے

ہوئے تھے۔ اس لئے ہم لوگ عافیت سے رہے۔ اور جلدی نیند آگئی۔

ہم لوگ بہت تھکے ہوئے تھے اس لئے گہری نیند سو گئے۔ پچھلی رات کو دفعتاً سے میری آنکھ کھل گئی پہلے تو میں سمجھ نہ سکا کہ معاملہ کیا ہے مگر دماغ پر زور دینے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کوئی شخص مجھے کہیں اٹھائے لئے جا رہا ہے۔ ان دنوں میرا وزن دو من سے زیادہ تھا یہی نہیں کہ وہ شخص مجھے بغل میں دابے ہوئے پہاڑیوں پر بسہولت تمام چڑھ جایا کرتا تھا، بلکہ تھوڑے تھوڑے وقفہ پر پہاڑی طوطے کی طرح ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر چھلانگیں لگاتا جاتا تھا۔ گھبراہٹ میں میں نے دو ایک بار بولنے کی بھی کوشش کی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے بعد یقیناً میری آنکھ لگ گئی تھی کیونکہ جب دوبارہ میں بیدار ہوا تو میں نے اپنے آپ کو ایک پست چوبی مچان پر پڑا ہوا پایا جن کمبلوں میں لپٹا ہوا تھا اُن میں سے بعض کو نکال پھینکا اور انگڑائی لینے کو اٹھا۔ اتنے میں قریب سے آواز آئی "ترو تک پورا جی خوش آمدید، اب تم میرے مہمان ہو۔" اس قول کو سن کر میری ڈھارس بندھی۔ میں نے جواب دیا۔ "آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت نہ ہوگی کہ میری بینائی زائل ہو گئی ہے۔ اور اس لئے میں کما حقہٗ اپنی احسان مندی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ تاہم میرا قیاس ہے کہ آپ ہی دونرُ مولا ہیں جن سے میں ہم کلامی کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔"

جیسے جیسے دن گزرتے گئے دونرُ مولا اور میرے درمیان دوستی کی پینگیں بڑھتی گئیں اور ہماری گفتگو میں بے تکلفی کی شان پیدا ہوتی گئی، ایک دن وہ کہنے لگا۔ میری روانگی کا زمانہ قریب آ رہا ہے اور میں مسرت کے ساتھ اس روانگی کا منتظر ہوں۔ چونکہ تمہاری آنکھیں بھی اچھی ہو چکی ہیں، اس لئے تم بھی مجھ سے رخصت ہونے والے ہو۔ لیکن قبل اسکے کہ رخصت ہو میں ایک ایسی بات تم کو بتا دینا چاہتا ہوں جسے تم خود بھی یہاں آنے کے بعد جاننے کے مشتاق ہو۔ اتنا کہہ کر اس نے بلند آواز سے ایک عجیب بولی میں کچھ کہا میں نے خود اپنی کسی کے ننگے پاؤں چلنے کی آواز سنی۔ دونرُ مولا نے کہا وہ دیکھو جو شخص تم کو پہاڑی راستوں سے یہاں لایا تھا تمہارے بغل میں کھڑا ہم دونوں کی طرف تاک رہا ہے۔

اب میرا اشتیاق پرجوش حد تک بڑھ گیا تھا۔ میں نے کہا میں تو اسے نہیں دیکھ سکتا مگر آپ کی بڑی نوازش ہوگی اگر آپ اس کی کیفیت ذہن نشین کرا دیں۔ تو اجمالی کیفیت جو کچھ بھی آپ مناسب تصور فرمائیں۔ اس نے جواب دیا بہت خوب۔ قد میں وہ چار دو گز یعنی ۸ فٹ ہے اور بدن بھرا ہوا ہے اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں اور سیاہی کی طرح کالے بالوں سے ڈھکا ہوا ہے اور وہ شیر کی کھال کی لنگوٹی پہنتا ہے۔ تم نے اچھا کیا اگر میں اس کا تذکرہ لینا چاہو تو برا نہ مانے گا

ایک عرصے سے پہاڑی علاقوں میں اس کے جسم سے بہت لاغر ہو رہا ہے۔ اس کے بعد وہ اس شخص نے پہچان لیا، جب وہ صدمے سے ہنس پڑا، میں کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس آدمی نے اپنے عجیب ہاتھوں میں اس کو تھام لیا اور اپنے جسم سے مس کرایا۔ جو بالکل پلپلا بدن معلوم ہوتا تھا مگر کہ اس کے سارے جسم پر لمبا مبالغہ دو انچ لمبے روئیں تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی لمبی گردن، قوی بازوؤں اور آہنی رگ پٹھوں پر پھیرا۔ اگرچہ میں خود بھی قد آور واقع ہوا ہوں، یعنی میرا قد ۵ فٹ ۱۰ انچ ہے پھر بھی اس کا سر چھونے کی خاطر مجھے اپنی ایڑیوں کے بل کھڑا ہونا پڑا۔

پہاڑی جن

میں نے صداقت کیا منتظر! لوگوں کا خیال ہے ان پہاڑوں میں بھوت پریت رہتے ہیں۔ بتاؤ تو سہی یہ شخص فی الحقیقت انسان ہے۔ اس بڈھے نے ہنس کر کہا ہاں بھئی وہ بالکل تمہارے جیسا انسان ہے۔ مجھے تمہاری حیرت پر تعجب نہیں تاہم میں تمہیں تھوڑا بہت سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

بہت زمانے کی بات ہے ایک قبیلہ شمال کے دور دراز ملکوں سے کسی جابر فرمانروا کے ظلم و جور سے تنگ آ کر بھاگ نکلا تھا۔ سالہا سال کے غور و تعاقب کے بعد یہ پچھلے لوگوں کی ایک مختصر سی جماعت ان پہاڑیوں میں پناہ گزین ہوئی۔ یہ معقول ہے مگر جب ان کی اولاد جوان ہوئی تو وہ اپنے والدین سے لمبے نکلے اور جیسے جیسے ان کی نسلیں بڑھتی گئیں ان کا قد و قامت بھی ترقی کرتا گیا۔ حتیٰ کہ گذشتہ ۔ سال میں ان کی ہیئت اس شخص جیسی ہو گئی ہے۔ رہی یہ بات کہ ان کے ڈیل ڈول میں اس غیر معمولی انقلاب کا سبب کیا ہے تو سالہا سال کے غور و فکر نیز اس اطلاع کی بنا پر جو مجھے اس شخص کے دادا اور باپ سے بہم پہنچی تھی میری سمجھ میں ایک ہی وجہ آئی اور وہ یہ کہ جو دہ اس وادی کی برفانی آب و ہوا بلوٹی میں بھی کچھ مخصوص کیمیائی اجزا موجود ہیں۔

ایک دن شام کو میں اپنی عادت کے لئے کوئی موزوں جگہ تلاش کرنے میں مصروف تھا کہ مجھے سفید بادلوں سے ڈھکی ہوئی ایک عجیب و غریب چیز برف پر پڑی ہوئی نظر آئی۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ وہ کوئی مردہ ریچھ ہے، مگر ذرا قریب سے معائنہ کرنے پر مجھے وہ ایک عظیم الجثہ آدمی معلوم ہوا۔ اس کی سیاہ آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے امداد کا طالب ہے۔ نہ میں اس کی بولی سمجھ سکا نہ وہ میری۔ اس کے جسم پر خون کے دھبے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ بری طرح زخمی ہوا اور اس کے ایک دوسرا فتادہ شے کی طرف اشارہ کرنے سے میں اور بھی معاملہ کی تہ کو پہنچ گیا۔ وہ ایک برفانی شیر کی لاش تھی۔ اصل یہ ہے کہ اس نے اس کو اپنے لٹھ سے ہلاک کر دیا تھا، مگر شیر نے بھی اس کو پھاڑ ڈالا تھا۔ بڑی مشکل سے میں اس آدمی کو اٹھا کر ایک کھوہ میں لے گیا۔ میں نے اس کے زخموں کی مرہم پٹی شروع کی اور ایک ماہ کے بعد وہ چنگا ہو کر اپنے لوگوں سے جا ملا۔ ہم لوگ محض اشارے کنایہ سے بات چیت کرتے تھے، لیکن دونوں ایک دوسرے کا مطلب بخوبی سمجھ جاتے تھے، بلکہ میں تو اس کی عجیب و غریب بولی سے بھی قدرے آشنا ہو گیا تھا۔

اس واقعہ کو پندرہ سال گزر گئے۔ ایک روز رات کو میں نے آدھے بولی میں ایک آواز سنی جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ یہ وہی شخص تھا جو پندرہ سال ہوئے مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ اپنے دس سالہ بچے کو جو کسی اندرونی مرض میں مبتلا تھا، لیتا آیا تھا۔ میں نے اس بچے کا علاج شروع کیا اور وہ اچھا ہو گیا۔ یہ وہی لڑکا ہے جو اس وقت تمہاری بغل میں کھڑا ہے۔ یہ سب اسی قبیلہ کے لوگ ہیں، مگر انہیں انتہائی حماقت سے "پہاڑی جن۔ جنت کے برفانی حیوان" وغیرہ ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

قطعہ

از:- جناب علی احمد

حسن کی رہگذر ارے توبہ — دو قدم چل کے کھویا جاتا ہوں
چاہتا ہوں کہ اس طرف دیکھیں — دھیمے دھیمے سُروں میں گاتا ہوں
کارواں ہوں نہ کارواں کا جرس — گرد ہوں اٹھ کے بیٹھ جاتا ہوں
لیکے ساغر وہ آرہے ہیں علی — میں ابھی سے بہکتا جاتا ہوں

...؟ سے!

جاتے جاتے بھی دل دکھائے جا!

حضرت ماہر القادری

ہاں اُسی دُھن میں گیت گائے جا — اور دل کی لگی بڑھائے جا
میرے تیروں سی کر مجھے گھائل — میری غزلیں مجھے سنائے جا
تجھے میرے رُبابِ دل کی قسم — ساز کی لَے میں لَے ملائے جا
میری وارفتگی کی داد بھی دے — میری باتوں پہ مسکرائے جا
بھیرویں ہو کہ سوہنی یا دیس — وقت کی چیز گنگنائے جا
ہلکی ہلکی جماہیاں لیکر — میری آنکھوں کی نیند اُڑائے جا
میں جو غزلیں پڑھوں ترنم سے — تو بھی کچھ بول گنگنائے جا
دیکھکر پھر گھڑی٭ کلائی کی — طاقتِ ضبط آزمائے جا
اہلِ محفل کے واسطے بیڑے — مسکراتے ہوئے بنائے جا
دامنِ دل کا اور کیا ہو گا — اس کی تو دھجیاں اُڑائے جا
دوسروں سے بڑھا کے ہاتھ ملا — جاتے جاتے بھی دل دُکھائے جا
"اب ملاقات تم سے کب ہو گی؟" — اتنا کہہ کر قدم بڑھائے جا

شعر و نغمہ کی آڑ میں ماہر
تو اُسے دردِ دل سُنائے جا

٭ وقت بہت ہو گیا

امنگیں

نوشتہ :- والٹر سکاٹ

ترجمہ :- جناب احمد شجاع پاشا۔ بی۔ اے

پیش لفظ

والٹر اسکاٹ کا نام ادبی دنیا میں کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں - وہ ایک زبردست شاعر اور عظیم المرتبت ناول نویس تھا - اس سے پیشتر قارئین عالمگیر کی خدمت میں اس کی مشہور نظم کا ترجمہ "پریم کا جادو" کے نام سے پیش کر چکا ہوں - "امنگیں" اس کی شہرۂ آفاق ناول " Kenilworth " کا خلاصہ ہے - جس کے ہر کردار کا خمیر "امنگوں" کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے - کسی نے سچ کہا ہے کہ جو شخص امنگوں کو اپنے دل کے آغوش میں پرورش کرتا ہے کبھی سکھ چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتا اس کے خیالات کبھی سکون آشنا نہیں ہوتے - اسکاٹ نے بھی اس دلدوز المیہ میں یہی کچھ دکھایا ہے - اس ناول کے سب اداکار ہیرو - ہیروئن - ولن - سائیڈ ہیرو - سائیڈ ہیروئن غرضیکہ سب کے سب امنگوں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں - میں نے جان بوجھ کر بعض ایسے اداکاروں کے نام نکال دیئے ہیں جن کے بغیر افسانے کے جسم اور روح کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا - درحقیقت افسانہ صرف اتنا ہی ہے مگر اسے ناول بنانے کے لئے اسکاٹ نے بہت سے مناظر اور بہت سے کرداروں کا اضافہ کیا ہے جو افسانے کی روح اور بدن سے کافی فاصلے پر ایک نیا "سب پلاٹ" بناتے ہیں - "سب پلاٹ" بھی نہیں بلکہ یوں کہئے کہ مزاح کے لئے اور ضخامت بڑھانے کے لئے ان کی موجودگی ضروری تھی اور ان کی عدم موجودگی سے ہماری کہانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا - ہو سکتا ہے کہ یہ افسانہ تاریخی اہمیت رکھتا ہو مگر میں نے اس زمرے میں چھان بین کرنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی بہرحال افسانہ بہت اچھا ہے - مصنف کا نام ہی اس بات کا ضامن ہے - اور پھر والٹر اسکاٹ کی یہ کتاب اس کی تصانیف میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے

(ا - ش - پ)

پہلا باب (۱)

وہ خوبصورت لڑکی

وہ خوبصورت دیہاتی لڑکی اپنے باپ کے گھر سے اچانک غایب ہو گئی - اس کا بوڑھا باپ اور اس کا منگیتر ٹریسیلین دونوں کلیجہ مسوس کر رہ گئے - انہیں پردے کے پیچھے کوئی بڑا اور مضبوط ہاتھ کام کرتا دکھائی دے رہا تھا - وہ بیچارے کمزور اور ناتوان تھے - ایک معمولی گاؤں کے رہنے والے کیا کرتے - بےچارہ ناچار خاموش ہو رہے - ایمی کا حسن چاند تاروں کو شرماتا تھا - وہ حسین تھی اور بلا کی حسین ـــ

ٹرلیسلین اس پر جان چھڑکتا تھا وہ بھی ٹرلیسلین کو دل سے چاہتی تھی دونوں نے بارہا شاہ بلوط کے سائے کے نیچے بیٹھ کر کبھی الگ نہ ہونے کے عہد کئے تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے پر کامل اعتماد تھا۔ ٹرلیسلین کو اپنی محبوبہ کی گمشدگی کی خبر سن کر ناقابل برداشت صدمہ ہوا۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ جدائی کی قیامت انگیز گھڑیوں کا بھیانک خیال کرکے اس کا دل دھڑکا اور دھڑک کر اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں آنسو ڈھلکنے لگے۔ ایک بوڑھا دل اس بے پناہ صدمے اور ایسی سخت چوٹ کی کیونکر تاب لا سکتا تھا مگر مجبوری انسان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتی ہے ——— اور دماغ معطل کر دیتی ہے۔

"صبر کیجئے" ٹرلیسلین نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "ایمی مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔"

"یہ تو مجھے بھی یقین ہے" بوڑھے نے بمشکل تمام آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا "مگر کیا کیا جائے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"یہ کام اسی ظالم رچرڈ وارنے کا ہے۔ وارنے نواب لیسٹر کا دست راست ہے۔ نواب کو اس کی تلوار پر بھروسہ ہے اور کمینے غلام کو اپنے آقا کی ہمدردی پر۔ وہ جانتا ہے کہ نواب ملکۂ انگلستان کے نادان اور بزدل دل پر حکومت کرتا ہے۔ اپنے خداداد حسن کی وجہ سے۔ اسے علم ہے کہ اس کے جرائم کی سزا دینے والا الزبتھ کے عہد میں کوئی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ کام اسی بدطینت شخص کا ہے۔ اس کا ہمارے گاؤں میں آنا بغیر مقصد کے نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی گل کھلا کے رہے گا۔ یا تو نواب سسکس کا کوئی غریب حامی موت کے گھاٹ اتارا جائیگا اور یا اس کم ہمت نواب کے کسی کمزور ساتھی کی شامت آئے گی۔ وہی ہوا۔ میری تلوار کئی دفعہ میان سے باہر نکلنے کو تڑپی۔ کئی دفعہ میرے خنجر کے ہونٹ پیاس کی وجہ سے خشک نظر آئے۔ مگر میں چپکا ہو رہا۔ قسم ہے زمین و آسمان پیدا کرنے والے کی۔ اب میں خاموش نہ رہونگا۔ ایمی کا پتہ لگاؤں گا۔ اور وارنے کو اس کے گناہوں کی سزا دونگا۔"

تلاش شروع ہوئی گاؤں گاؤں قصبہ قصبہ، شہر شہر ٹرلیسلین دن بھر ایمی کی جستجو میں سرگرداں رہتا اور شام کو کسی سرائے میں قیام کرتا۔ بالآخر ایک رات ——— جب وہ گوسلنگ کی مشہور سرائے میں بیٹھا اپنے تفکرات کو شراب میں غرق کر رہا تھا اسے کسی نئے مسافر کی آمد کی خبر ملی۔ نیا مسافر چہرے بشرے سے اجڈ معلوم ہوتا تھا۔ گنوار اور وحشی ——— نہ تو اسے بات کرنے کی تمیز تھی نہ بیٹھنے کا سلیقہ!

وہ دیوانوں کی طرح بے تحاشا شور مچا رہا تھا۔ ٹرلیسلین حیرت سے اس دیوہیکل انسان کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ اس بیوقوف کو نہیں جانتے شاید ———" کھانے کی م
پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

"جی نہیں!" ٹرلیسلین نے جواب دیا۔

"یہ ہمارے گوسلنگ صاحب کا بھتیجا ہے۔ ایک مغرور ملاز
آج خدا جانے کتنی مدت کے بعد اس قصبے میں آیا ہے۔ مائیکل نام ہے
اس کا شاید!" ٹرلیسلین دلچسپی سے باتیں سن رہا تھا۔ اسے قا
کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والوں سے قدرتی طور پر مح
تھی۔ اس نے کرسی کھینچی اور مائیکل کے پہلو میں جا بیٹھا۔ مائیکل ا
پرانے دوستوں کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ بعض کی موت پر اظہار ر
کر رہا تھا اور بعض کے اب تک زندہ رہنے پر تعجب۔ "ٹونی فاسٹر"
نام پر وہ چونک اٹھا اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی

"وہ کمبخت کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہیں ہے" اس کے ایک ساتھی نے جواب دیا۔

"کیا کرتا ہے ———؟"

"ہوائی مرغا ہے فاسٹر۔ ملکہ میری کے عہد میں وہ کیتھولک
اور آج کل چونکہ ملکہ الزبتھ پراٹسٹنٹ ہے اس لئے وہ بھی....

"مگر رہتا ہے کہاں وہ....؟"

"وہ سامنے جو شاہ بلوط کے درختوں کے درمیان ایک عا
محل نظر آتا ہے اس میں...."

"ٹونی فاسٹر اور محل؟" مائیکل کی نظروں میں حیرت کا اظہار تھ

"یہ بھی ایک راز ہے مائیکل ——— عوام کہتے ہیں اس
پاس ایک خوبصورت لڑکی رہتی ہے!"

"ایک خوبصورت لڑکی؟" ٹرلیسلین کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔

"جی ہاں!" اس شخص نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہو
"ٹونی اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لڑکی واقعی خوبصور
کام پر سے آتے ہوئے بعض اوقات میں نے بھی اسے دیکھا ہے۔
فاسٹر کو اس لڑکی کا محافظ مقرر کیا ہے۔ اور بوڑھا ونٹ
دن بڑے آرام سے گزار رہا ہے۔"

"اچھا!" مائیکل اچھل کر بولا "ٹونی اس سے بھی ملاقات ہو

"آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ہمراہ چلوں ———"
نے کہا ———

[illegible] مجھے کچھ اعتراض تو نہیں۔ مگر میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟"

"یونہی ــــ ایک تو آپ کا ساتھ، دوسرے اس شخص کو دیکھنے کی خواہش!"

"چلئے گا، اگرچہ بہت سویرے مجھے اور کام بھی ہیں۔"

"بہتر ہے!"

صبح وہ شاہ بلوط کے درختوں والے محل میں جاتے دیکھے گئے۔ مائیکل نے زور سے آہنی دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟ ــــ" اندر سے آواز آئی۔

"مجھے ٹونی فاسٹر سے ملنا ہے۔ ذرا ضروری کام ہے۔"

دروازہ بعجلت کھول دیا گیا۔ وہ ایک سجے سجائے کمرے میں پہنچے۔ ٹرلیسلین آرام سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور مائیکل اپنی عادت کے مطابق کمرے کی تمام چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ ٹونی فاسٹر [illegible] تھا۔ ایک بوڑھے جسم پر سفید بالوں والا ایک بڑا سا سر لئے ہوئے۔ مائیکل اور ٹرلیسلین کو دیکھ کر پہلے تو وہ کچھ گھبرایا۔ مگر پھر اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر مائیکل سے لپٹ گیا۔ دونوں دوست ملے۔ ٹرلیسلین چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔

"تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں ــــ!" کچھ توقف کے بعد مائیکل نے کہا۔

"مگر آپ؟" فاسٹر نے ٹرلیسلین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کون ہیں؟"

"میرے ایک نئے دوست ہیں!"

"تمہاری ہی قسم کے؟"

"او ہوں! یہ تو بہت نیک اور شریف معلوم ہوتے ہیں۔"

"تو آؤ دوسرے کمرے میں آؤ۔" پھر ٹرلیسلین سے "آپ تشریف رکھیے، ہم ابھی آتے ہیں۔" ٹرلیسلین پھر کرسی میں دھنس کر ان کے متعلق سوچنے لگا۔

وہ انہی خیالات میں گم جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا۔ اسے کسی کی چاپ سنائی دی۔ اور دوسرے لمحہ اس کی محبوبہ ایمی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ایمی... ٹرلیسلین کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"ایمی... !" ٹرلیسلین کی زبان سے بمشکل یہ لفظ نکلا۔

"ہاں ٹرلیسلین! مگر تم یہاں کہاں؟"

"اوہ! ابھی کچھ نہ پوچھو ــــ تمہیں تلاش کرتا کرتا یہاں پہنچا ہوں۔ والد نے مجھے بہت تنگ کیا ہے ــــ میں اس سے ضرور انتقام لوں گا۔"

"خواہ مخواہ گرم ہونے کی ضرورت نہیں ٹرلیسلین! یہ میرے محبوب شوہر کا قلعہ ہے میں یہاں رہتی ہوں۔"

"محبوب اور شوہر ــــ!" ٹرلیسلین کا دماغ چکرا گیا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے رقص کرنے لگے۔ وہ ایمی سے آج کیا سن رہا تھا۔ ایمی کا محبوب کون تھا۔ کیا وہ شادی کر چکی تھی؟ کیا وہ ٹرلیسلین کو نہ چاہتی تھی؟ اور اس خیال کے آتے ہی اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"کیا کہہ رہی ہو ایمی؟" وہ تڑپ کر بولا۔

"اپنے محبوب شوہر کا ذکر کر رہی ہوں۔" ایمی نے متانت سے جواب دیا۔

"اس کمینے......"

"بس ٹرلیسلین!" ایمی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میرے آقا کے خلاف ایک لفظ زبان سے نہ نکلے۔"

ٹرلیسلین نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ آسمان اور زمین لٹو کی طرح گھوم رہے تھے۔ جیسے اس کے سر پر کسی نے پوری قوت سے لٹھ دے مارا ہو۔ اس کی محبت کا یہ انجام۔ وہ شاہ بلوط کے درختوں کے سائے میں کئے ہوئے عہد، وہ تاروں کی چھاؤں میں الگ نہ ہونے کی قسمیں! ــــ اس کی گذشتہ زندگی کے واقعات ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے گزرنے لگے۔

"ایمی! تم اپنے بوڑھے باپ پر رحم کھاؤ ــــ!" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"میرا باپ؟ ــــ انہیں کیا ہوا ہے؟"

"تمہارا باپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے ــــ وہ سخت بیمار ہے۔"

"میں اپنے آقا کی اجازت لے کر اسے دیکھنے آؤں گی۔"

"ظالم عورت تجھے میرے ساتھ چلنا ہو گا۔" ٹرلیسلین بپھرے ہوئے شیر کی طرح آگے بڑھا۔ ایمی گھبرا گئی۔ وہ بھاگی بے تحاشہ دوسرے کمرے کی طرف۔ ٹرلیسلین نے اس کا تعاقب کیا۔ ٹونی اور مائیکل نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا ــــ اور ــــ ایمی ہانپتی ہوئی آئی اور فاسٹر کے سیاہ لبادے میں چھپ گئی۔ فاسٹر نے نتھنے پھڑکنے لگے وہ ٹرلیسلین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شعلہ بار آنکھوں سے ــــ

"نکل جاؤ۔ ایکدم یہاں سے نکل جاؤ ———!" ٹرلسیلین ہونٹ کاٹتا ہوا باہر نکل گیا۔
"اور بٹ۔" اس نے کہا۔ "پھر عورت ہے؟"

اور رچرڈ وارنے کی آمد پر ٹونی فاسٹر کو معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت نوجوان نواب سسکس کا حامی اور نواب لیسٹر کا دشمن ایمی کا منگیتر ٹرلسیلین تھا۔

دوسرا باب (۲)

امنگیں

زمانہ اچھا بھی تھا اور برا بھی۔ انگلستان پر ملکہ الزبتھ حکومت کر رہی تھی۔ لوگ خوش حال بھی تھے اور نوابوں کے ظلم و ستم سے بھی نالاں تھے۔ شاہی دربار کیا ملک بھر میں دو تون بہت طاقتور مانے گئے تھے۔ لیسٹر کا خوبصورت نواب اور سسکس کا نواب۔ ملکہ بھی ان دونوں کے زیر اثر تھی۔ کبھی ایک کا پلڑا بھاری ہو جاتا کبھی دوسرے کا۔ انگلستان کے گلی کوچوں میں یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ نواب لیسٹر اور ملکہ کی بہت جلد شادی ہو جائیگی۔ نواب کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی دن انگلستان کا بادشاہ بن کر زریں تاج پہن کر تخت شاہی پر بیٹھے گا۔ اور اس کا دشمن سسکس ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔ ٹرلسیلین آج تک اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایمی نے اسے ٹھکرا کر ایک کمینے انسان رچرڈ وارنے سے شادی کر لی ہے۔ مگر یہ بات حقیقت سے بعید تھی۔ وہ دراصل ملک کے طاقتور نواب لیسٹر کی چہیتی بیوی تھی۔ اسی نواب کی خاطر اس نے اپنا گھر بار۔ منگیتر۔ باپ سب کو چھوڑا تھا۔ اس کے دل میں ایک امنگ تھی بڑا بننے کی۔ بعض اوقات وہ اکیلے میں بیٹھ کر سوچتی کہ جب نواب اسے اپنے ساتھ ملکہ کے دربار میں لے جائے گا تو وہ دوسری شہزادیوں کے ساتھ ملکہ کے تخت کے پاس بیٹھے گی۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ اس کی شادی کو صیغۂ راز میں کیوں رکھا جا رہا ہے۔ بیوقوف دیہاتی لڑکی نواب کا جاہ و حشمت دیکھ کر مرعوب ہو گئی۔ اسے محبت تھی تو ٹرلسیلین سے۔ مگر ٹرلسیلین ایک معمولی آدمی تھا۔ وہ اسے کیا دے سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنی دولت کہاں تھی۔ وہ اپنے آپ کو ایک معمولی شخص کے ساتھ وابستہ کر کے اپنی زندگی تباہ نہ کرنا چاہتی تھی۔ ایک طرف محبت تھی اور دوسری طرف امنگ ——— اور امنگ کا پلڑا بہت بھاری تھا۔ ادھر تو نواب لیسٹر تھا جس کی بیوی بن کر وہ دنیا کو خرید سکتی تھی۔ ہزاروں غلاموں سے سلامی لے سکتی تھی۔ لاکھوں لونڈیوں پر حکومت کر سکتی تھی۔ جس کی وجہ سے اسے یورپ کی عظیم الشان ملکہ کی صحبت بھی میسر آ سکتی تھی۔ اور ادھر ٹرلسیلین تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کا چھوٹا سا شخص۔ نہ وہ اسے اتنی عزت دے سکتا نہ وہ اتنی دولت لا سکتا تھا۔ وہ کیا کر سکتا تھا؟ اسے گاؤں میں رہ کر کیا مل سکتا تھا؟ دیہاتیوں کے پرسوز گیت۔ ڈھور ڈنگروں کی گھنٹیوں کی جھنجھناتی ہوئی آوازیں۔ شاہ بلوط کے سر بفلک درختوں کے لمبے سائے۔ چھوٹی چھوٹی سرسبز گھاٹیاں۔ درد بھرے راگ الاپتے ہوئے میٹھے پانی کے جھرنے۔ نیچے نیچے مکان، کچے جھونپڑے۔ ایک غیر معمولی امن۔ ایک غیر معمولی سکوت، اور وہ اس امن و سکون کی زندگی سے بیزار تھی۔ محلوں میں رہنے کے خیال نے اسے جھونپڑے چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بھول گئی، سب کو بھول گئی اور رنگینیوں کی دنیا میں کھو گئی۔ سچی خوشی اور حقیقی مسرت دے کر اس نے عارضی خوشیاں مول لے لیں۔

وہ انسان جس کا خمیر امنگوں کی مٹی سے اٹھایا گیا ہو کبھی ایک حال پر قناعت نہیں کرتا۔ نواب لیسٹر کا بھی یہی حال تھا۔ اسے ایمی سے محبت تھی مگر وہ شادی کی تشہیر نہ کر سکتا تھا۔ امنگیں اس کے دل میں بھی کروٹیں لے رہی تھیں۔ انگلستان کی حسین ملکہ اسے چاہتی تھی اور اغلب تھا کہ اس سے شادی کر کے اسے بادشاہ بنا دے۔ جنگ تھی۔ ایک خوفناک جنگ، امنگوں اور معصوم محبت کے درمیان۔ شاہی تخت کی بازی تھی اور محبت کو مات ہو رہی تھی۔ اسی وجہ سے آج تک نواب لیسٹر کی خفیہ شادی کا کسی کو علم نہ تھا۔ وہ اکثر راتوں کو ایک ملازم کا بھیس بدل کر ایمی سے ملنے آتا ——— رات کی تاریکی میں

یسٹر کو اپنے پھیلاؤ میں چھپا لیتی تو نواب اپنے اس دور اُفتادہ
عہ کو رونق بخشتا اور سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے سے پیشتر
سنسان وادی ایک سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں سے
ج اٹھتی۔ آج ایمی مسرت سے پھولی نہ سماتی تھی۔ اس کی حسین
ھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر سرخیاں
ڈر رہی تھیں۔ اس کا محبوب شوہر آنے والا تھا۔ کتنی مدت کے بعد
س کے دل میں طوفان سا برپا تھا۔ جانے وہ اس سے کیا کہنا چاہتی
ی۔ کتنی باتیں کہنے کی خواہش تھی اس کے دل میں — اسے برا معلوم
تا تھا کہ اس کا خاوند جسے ملک میں ہر کوئی قدر و منزلت کی نگاہ سے
یکھتا تھا اس کی ملاقات کے لئے ایک نوکر کا بھیس بدل کر آئے۔
ہ اس نے نواب سے استدعا بھی کی تھی کہ وہ آئندہ شہزادوں کا
سا لباس پہن کر آئے۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی رعنائیوں
کا جائزہ لیا۔ وہ شہزادی کے قیمتی لباس میں کتنی حسین معلوم ہوتی
ی۔ اس کے گداز سینے کے ہلکے سے ابھار پر سچے موتیوں کا ایک بیش
بہت ہار تھا۔ کانوں میں نفیس ہیرے کے آویزے۔ وہ آج خوش
ی اور خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ ٹرلیسلین کا خیال بھی اس
کے لئے سوہان روح تھا۔ وہ اگر تمام عمر ایڑیاں رگڑتا رہے جب
ی اس قسم کا ایک ہیرا اس کی نذر نہ کر سکتا تھا۔

خادمہ نے نواب کی آمد کی اطلاع دی۔ ایمی کے چہرے پر سرخی کی
ایک خفیف سی لہر دوڑ گئی۔ وہ قدرے شرمائی، سمٹی اور منتظر نگاہوں
سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ نواب لیسٹر اندر داخل ہوا۔ اس نے
شہزادوں کا سا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا بھاری بھرکم جسم اس زندو
لباس میں بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ایمی دوڑ کر اپنے شوہر
سے لپٹ گئی۔ اور بچوں کی طرح اسے پیار کرنے لگی۔

"آج آپ نے میرا کہا مان لیا۔" وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "اس لباس
میں آپ سج رہے ہیں۔"

"اور تم مہارانی کے لباس میں کتنی حسین معلوم ہوتی ہو؟" نواب نے کہا۔
ایمی شرما گئی۔ وہ نواب کے سفری جوتے اتارنے لگی۔

"تم کیوں تکلیف کرتی ہو۔" نواب نے اس کے ریشمی بالوں پر انگلیاں
پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہ کام تو خادمہ کا ہے۔"

"میں بھی تو آپ کی خادمہ ہوں۔"

"تم تو میری رانی ہو۔"

ایمی کا چہرہ دمکتے ہوئے پھول کی طرح کھل گیا۔ رانی ملکہ کا لفظ اس

اس کے دل میں اتر گیا اور وہ اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت عورت
سمجھنے لگی — رات کو کھانے کے بعد ایمی نے کہا۔

"آپ کب تک اس طرح چھپ چھپ کر مجھ سے ملنے آیا کریں گے۔ میں
چاہتی ہوں کہ شادی کی تشہیر کر دی جائے۔"

"ابھی نہیں ایمی — !" نواب نے متانت سے جواب دیا۔ "ابھی
وقت نہیں آیا۔"

"میں تو اس روز کی منتظر ہوں جب میں شاہی لباس پہن کر آپ
کے ساتھ ملکہ کے دربار میں جاؤں گی۔"

"وہ روز بھی آ جائے گا ایمی!"

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" ایمی نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میرے والد بیمار ہیں — اجازت ہو تو میں ان سے مل آؤں۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"آج ٹرلیسلین آیا تھا۔"

"ٹرلیسلین ادھر یہاں ... !" نواب گھبرا سا گیا۔ اس کا رنگ پیلے
کے خشک پتے کی طرح زرد ہو گیا۔ اسے اپنی امنگوں کے محل گرتے ہوئے
دکھائی دیئے۔ اس کی خفیہ شادی کی تشہیر، ملکہ کی خفگی، اس کی بے عزتی
اور نواب سسکس کی عزت — اس کے دماغ کے پردے پر خیالوں
کا بے پناہ ہجوم سرسراتا ہوا گذر رہا تھا۔

"کیوں —؟" ایمی نے پوچھا۔

"وہ نواب سسکس کا دوست اور میرا دشمن ہے۔ اس کا یہاں
آنا خطرناک ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے تمہاری آرزوئیں کبھی پوری
نہیں ہو سکتیں۔ تم رانی نہیں بن سکتیں۔"

ایمی کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے کبھی ٹرلیسلین سے محبت تھی۔

"وہ بہت اچھا آدمی ہے۔" اس نے رکتے ہوئے کہا۔

"نہیں، وہ اچھا آدمی نہیں، اسے قتل کرانا پڑے گا۔"

ایمی کا دماغ چکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ دل
زور زور سے دھڑکنے لگا۔ رنگ زرد پڑ گیا۔ مگر کچھ دیر بعد وہ اپنے پراگندہ
جذبات پر قابو پانے کے قابل ہو گئی۔ اور جب صبح جاتے وقت نواب نے
رچرڈ وارنے کو ٹرلیسلین کے قتل کا حکم دیا تو ایمی کو مطلق رنج نہ ہوا۔ آخر
محبت پر غالب آ چکی تھیں۔

تیسرا باب (۳)

حسن اور کشمکش مرگ و زیست

ملکہ اپنے دربار میں تخت پر بیٹھی داد طلب نگاہوں سے نواب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ درباری سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ دربار میں غریبی کا سکوت اور مفلسی کا سناٹا تھا۔ منتظر نگاہیں ملکہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ٹرلیسلین نے ملکہ کے حضور وارنے کے خلاف ایک عرضداشت ارسال کیا تھا اور آج اس کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

حسین ملکہ نے کہا: "ٹرلیسلین! ہم نے تمہاری شکایت سنی۔ وارنے کون ہے؟"

نواب لیسٹر کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ اس کے ہونٹ غیر ارادی طور پر کانپنے لگے۔ وارنے درباریوں کے بے پناہ ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور ملکہ کے سامنے جھک گیا۔

"وارنے ——!" ملکہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "تمہارے خلاف جو الزام ہے تم نے اسے سنا؟"

"ملکۂ عالم!" وارنے نے دھیمے سے جواب دیا۔

"تم سر رابرٹ کی لڑکی ایمی کو بھگا کر لے گئے اور اس سے شادی کی؟"

"ملکۂ معظمہ! اس کی مرضی کے خلاف کچھ کام نہیں ہوا۔"

"وہ اپنی خوشی سے تمہاری بیوی بنی؟"

"جی ——!"

نواب لیسٹر نے شعلہ بار نگاہوں سے وارنے کی طرف دیکھا۔ کیا وہ اپنی بیوی کی شان میں ایسے گستاخانہ کلمات سن سکتا تھا۔ کیا وہ اس کی منکوحہ نہ تھی۔ کیا وارنے ایسا کمینہ انسان جو نواب کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت رکھتا تھا ملکہ انگلستان کے سامنے ہماری ایمی کو اپنی بیوی کہہ سکتا تھا؟ اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔ مگر مصلحت نے اسے کچھ کہنے سے باز رکھا۔ اس نے یہ ذلت برداشت کر لی —— صرف ملکہ کی خفگی کے خوف سے۔

"ٹرلیسلین!" ملکہ نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"ملکۂ عالم ——!"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ ایمی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ اس کا والد بھی رضامند نہیں۔ حضور انصاف کریں۔"

"نواب لیسٹر! کیا وارنے آپ کا ملازم ہے؟"

"عالم پناہ ...!" نواب لیسٹر کا دل دھڑکا اور دھڑک کر اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ افشائے راز کے خیال سے اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

"کہو نواب ہم تم سے خفا نہیں ہوں گے۔" ملکہ نے کہا۔

"ملکہ وارنے میرا ہی ملازم ہے۔"

"تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ تمہارے ایک ملازم کی غلطی سے تم پر حرف نہیں آ سکتا۔ دیکھو ٹرلیسلین تمہاری شکایت قابل قبول نہیں۔ تمہیں اس لڑکی سے کیا سروکار؟"

"محترمہ! وہ میری منگیتر تھی۔ اس کا والد زیست اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ خود حاضر خدمت نہیں ہو سکتا۔ اس نے مجھے یہ حق دیا ہے کہ میں اس کے بوڑھے دل کی پکار ملکۂ انگلستان کے گوش گزار کر سکوں۔ محترمہ! میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ پردے کے پیچھے کوئی مضبوط ہاتھ کام کر رہا ہے۔"

"چپ رہو گستاخ انسان ... تم ہمارے سامنے ملک کے طاقتور نواب لیسٹر کی شکایت کر رہے ہو۔" ملکہ تڑق کر بولی۔

"عالم پناہ! گستاخی معاف۔"

"جاؤ صبر سے کام لو۔ ایمی کی محبت نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔ کسی کے دل پر تم قابو نہیں پا سکتے۔ اس کا جسم تمہارے قبضے میں آ سکتا ہے مگر روح پر قابض ہونا سخت مشکل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس لڑکی کو حاضر کیا جائے تاکہ ہم خود اس سے گفتگو کر سکیں۔ نواب لیسٹر! آئندہ دربار آپ کے قلعہ کینلورتھ میں ہوگا۔ کیا آپ ہمیں مہمان بنانے کے لئے تیار ہیں؟"

"بسر و چشم ملکۂ معظمہ!" دربار برخواست ہوا لیکن نواب لیسٹر کے دل پر ایک بھاری بوجھ پڑ گیا۔ اسے ایمی کو حاضر کرنا ہوگا۔ اور

ر وہاں اس مختصر ادی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا ملکہ کو اس کی خفیہ دی کا علم ہو جائے گا۔ اور اسے قید کر کے قلعہ لندن کی ایک تاریک ٹھری میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کی طبیعت پریشان تھی۔ حد درجہ یشان۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا چاروں طرف تاریکیاں پڑا جاتے تھیں۔ محنت اور امنگوں میں خوفناک جنگ ہو رہی تھی۔ اس غور ہو گم بیٹھے تھے اور دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے وارنے کو رو کرکے لئے طلب کیا۔

"یہ تم نے آج کیا کیا۔ میری بیوی کو اپنی بیوی ظاہر کر کے میری ذلتی کی ہے تم نے....."

"میں نے کیا کیا" وارنے نے متانت سے جواب دیا۔ "اپنے کی عزت بچائی تھی۔ میرا آقا شاہی تخت سے بہت دور نکل گیا سے کھینچ کر قریب لایا۔ ملکہ کی نظروں میں اسکی وقعت بڑھا دی"

"مگر اب کیا ہوگا... ایمی اگر وہاں آ گئی تو قلعی کھل جائے گی"

"آپ فکر نہ کیجئے.... میں سب انتظام کر لوں گا"

"کیا کرو گے" نواب نے مستفسرانہ اس کی طرف دیکھا۔

"مہارانی سے التجا کرونگا کہ وہ قلعہ میں کچھ دیر کے لئے میری بن جائے" نواب کے گال غصّے سے سرخ ہو گئے۔

"پھر وہی بیہودگی —— اس کا کیا مطلب ؟"

"اس کے بغیر چارہ نہیں۔ آپ جانتے ہیں ملکہ آپ کو کس قدر چاہتی دنیا جانتی ہے کہ لیسٹر کا نواب ایک روز ملکہ کے پہلو میں انگلستان شاہ بن کر تخت پر بیٹھے گا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک معمولی کے لئے تخت کو ٹھکرا دیا جائے —— عورت ، اور وہ عورت تا بھی ہو"

وارنے ! تم لیسٹر کی مہارانی پر جھوٹا الزام لگا کر زندہ نہیں رہ سکتے"

"میرے آقا ! وہ ٹرلیسلین کو چاہتی ہے"

"زبان بند کرو وارنے —— میں اس سے زیادہ کچھ نہیں سن سکتا"

"اس نے سیکڑوں بار آپ سے کہا کہ آپ ملکہ کے سامنے اسے ی تسلیم کر لیں"

اس نے سچ کہا۔ میں کب تک بزدل اور کمینے انسان کی طرح دھوکا دیتا رہونگا"

"مگر آپ جانتے ہیں اس کا انجام کیا ہوگا ؟"

"جانتا ہوں —— !"

موت —— ! ملکہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ سمجھے گی کہ کہ آپ اسے بیوقوف بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ وہ سمجھے گی کہ آپ اس کے معصوم جذبات سے کھیلتے رہے ہیں۔ عورت اور پھر طاقتور عورت کا انتقام جو ملک کے سیاہ و سفید کی مالک ہو بہت زیادہ لرزہ خیز ہوگا۔ اور اس کے بعد آپ کی جائیداد ایمی کے پاس ہوگی ، اور پھر ٹرلیسلین ہوگا ، وہ ہوگی اور چاندنی راتیں ہونگی"

نواب لیسٹر گہری فکر میں ڈوب گیا۔ اس کی نگاہیں دور افق پر جمی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی بساط سے بڑھ کر سوچ رہا ہو۔

"مگر وہ مجھے دل سے چاہتی ہے" کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔

"یہ بھی اس کی چال ہے میرے آقا۔ آپ کا دل محبت کے معصوم جذبات سے لبریز ہے مگر ایمی آپ کو فریب دیکر ذلت اور گمنامی کے قعر عمیق میں دھکیلنا چاہتی ہے۔ آپ جانتے ہیں ٹرلیسلین نواب سسکس کا پروردہ ہے اور نواب سسکس آپ کا بدترین دشمن ، یہ ایک طاقتور انسان کی گہری چال ہے"

نواب پھر سوچ میں ڈوب گیا —— ایمی کا معصوم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اور ہونٹوں کے کنارے ایک نامعلوم جذبے کے تحت لرز رہے تھے۔

"تو کیا کیا جائے ——"

"اگر وہ میری بیوی بننے کے لئے تیار نہ ہوئی تو میں آپ کے راستے کا کانٹا دور کر دونگا"

نواب پر ایک بجلی سی گری —— "کیا تم میری محبوب بیوی کو مار دوگے ؟" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ کی امنگوں کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ہے جسے دور کئے بغیر آپ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے"

نواب خاموش ہو گیا۔ اس کے دل میں ایک ہنگامہ برپا تھا ایک طوفان تھا جو تھم نہ سکتا تھا خیالوں کا ایک سیلاب تھا جو رک نہ سکتا تھا۔ کیا ایمی اس کے رستے میں روڑے اٹکا رہی تھی۔ کیا وہ اسے بادشاہ نہ بننے دیگی۔ کیا اس کے ہوتے ہوئے وہ ملکہ سے شادی نہ کر سکے گا۔ نہیں ، یہ ناممکن ہے۔ اُف ! اس کی سر لٹک گیا۔ آگبر الزبتھ اور ایمی کا مقابلہ ہی کیا۔

"کیا حکم ہے ؟" وارنے نے پوچھا۔

"تم جو کہتے ہو ٹھیک ہے" نواب نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ایمی کی لرزہ براندام کر دینے والی موت کا نقشہ اس کی آنکھوں میں کھنچ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آگئی اور اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ تاج پہنے ہوئے ملکہ کی پہلو میں بیٹھا ہے۔ لوگ "شاہ انگلستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگا رہے ہیں۔ اور ایمی جیسی سینکڑوں لڑکیاں اس کی خدمت کے لئے دست بستہ کھڑی ہیں۔ وہ جب بیدار ہوا تو اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا — اور امنگیں اس کے ناتوان وجود پر قابو پا چکی تھیں —!

چوتھا باب (۴)

فرار

وارنے نے بہتیرا کہا۔ بہت سمجھایا۔ ڈرایا۔ دھمکایا۔ منت سماجت کی مگر ایمی نے اس کی بیوی بننے سے انکار کر دیا۔ ظالم انسان نے اب دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے اپنے ایک خاص آدمی کو بھیجکر ڈاکٹر کو بلایا۔ اور ایمی کے پانی میں زہر کی آمیزش کر دی۔ ایمی کو اپنی جان کی فکر تھی۔ وہ اپنے کھانے پینے کی بہت احتیاط کرتی تھی اور پھر اس کا خیال تھا کہ وارنے اسے من گھڑت کہانیاں اور قصے سنا کر رام کرنا چاہتا ہے۔ اسے اپنے شوہر نواب لیسٹر پر پورا اعتماد تھا وارنے کی موجودگی اسے ناگوار گذرتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے خاوند سے کہہ کر اس بدمعاش کو قرار واقعی سزا دلائے۔ وارنے کی طرف سے اس کے دل میں ایک مبہم سا جذبۂ خوف اہمیت پکڑتا جا رہا تھا۔ وہ وارنے کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے علم تھا کہ وارنے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے نواب کو غلط راستے پر لیجا رہا ہے اور جب اس نے پانی کی بدلی ہوئی رنگت دیکھی تو اس کا شبہ مبدل بہ یقین ہو گیا اس نے اپنی وفادار خادمہ کو اپنے ساتھ ملایا اور رات کی تاریکی میں کیلنور تھ کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ جہاں ملکہ اور نواب سسکس، نواب لیسٹر کے مہمان تھے۔ ان کی فراری کا کسی کو علم تک نہ ہوا۔

پانچواں باب (۵)

دھوکے

ٹرلیسلین نے جب ایمی کو قلعہ میں دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ سب کی دوربین نگاہوں سے بچتی۔ چھپتی چھپاتی قلعہ کے باغیچہ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بہت دبلی ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ چہرہ بے رونق تھا اور ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔

"ایمی —!" اس نے دھیمے سے کہا۔ ایمی چونک پڑی۔

"کون ؟ — ٹرلیسلین ؟"

"ہاں — تم یہاں کیسے ؟"

"ایک ضروری کام کی وجہ سے آئی ہوں مگر دیکھو ٹرلیسلین حتی الامکان میری موجودگی کو چھپانے کی کوشش کرنا ش"

"مگر سنو تو —!"

"آ .... مجھے فرصت نہیں" اور وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ رات کے کھانے کے بعد ملکہ نے وارنے اور ٹرلیسلین دونوں کو طلب کیا۔ نواب سسکس اور نواب لیسٹر بھی وہا ں

دیکھ رہے تھے۔ سکس مسرور تھا اور لیسٹر مغموم!

ملکہ نے پوچھا: "وارنے تم اپنی بیوی کو لائے؟"

"ملکہ عالم وہ سخت بیمار ہے۔ حاضر خدمت نہیں ہو سکتی۔"

"عالم پناہ!" ٹریسیلین نے آگے بڑھ کر مودبانہ کہا۔ "گستاخی معاف۔ وہ بیمار نہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے آج اسے یہاں دیکھا ہے۔"

"تم نے؟"

"جی —— آج صبح۔"

نواب لیسٹر کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے، سر گھومنے لگا اور وہ دھڑام سے فرش پر آ رہا۔ اس پر غشی کی حالت طاری تھی۔ ملکہ بعجلت اس کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا نواب کو؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کوئی ہے۔ ارے کوئی ہے.... ڈاکٹر بلواؤ...... جلدی۔"

نواب نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا سر اب بھی چکرا رہا تھا۔ زمین اور آسمان چکر کاٹتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

"کیا ہوا نواب صاحب؟" ملکہ مسکرا کر بولی۔

"ملکہ عالم! خدا شکر، ان کی طبیعت کچھ علیل ہے۔"

"وارنے اپنے آقا کو تھامو۔ اور انھیں ان کے کمرے میں لیجاؤ۔"

گھگھیاتا ہوا وارنے آگے بڑھا اور بیہوش لیسٹر کو اٹھا کر اندر چلا گیا۔ ملکہ کی نظریں حیرت کے آثار لیے ہوئے تھیں —— جب نواب کو ہوش آیا تو وارنے اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ نواب اس کے نتھنوں سے نکلتی ہوئی گرم گرم سانس کو اپنے گالوں پر محسوس کر رہا تھا۔ وارنے کی آنکھوں میں ظلم و ستم کروٹیں لے رہے تھے اور نواب کی آنکھوں میں کرب و اضطراب۔

"اٹھئے آقا۔ حوصلہ کیجئے نا۔ ملکہ کیا سمجھے گی؟" وارنے نے کہا۔

"وارنے! یہ تم نے کیا کیا؟" نواب گلوگیر آواز میں بولا۔

"میں نے ایمی کے پانی میں زہر کی آمیزش کر دی تھی۔ مگر نہ جانے وہ کس طرح بچکر نکل آئی۔"

"اور تمہیں معلوم بھی نہ ہوا؟"

"بالکل نہیں۔"

"تو اب کیا ہوگا۔ ملکہ دھوکے میں کب تک رہیگی۔ کبتک لسے اندھیرے میں رکھا جائیگا۔ سنو وارنے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ یہ امنگوں اور محبت کا قصہ ہے۔ میں ابھی سرِ ماننا نہیں چاہتا اسے جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہاں سے لے جاؤ۔ لیجاؤ اسے یہاں سے لے جاؤ۔"

"صبر و ضبط سے کام لیجئے سب کام ٹھیک ہو جائینگے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ دنوں بعد آپ کی اور ملکہ کی شادی ہو جائیگی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ایمی کا پتہ لگاتا ہوں اور اسے بھگا کر لے جاؤں گا۔"

چھٹا باب (۶)

یہ پاگل ہے

ملکہ نے جب نواب لیسٹر کے قلعہ کینلورتھ کے خاص باغ میں ایک خوبصورت اجنبی عورت کو دیکھا تو وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ وہ عورت سراسیمہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ ملکہ کو دیکھ کر وہ اور سراسیمہ ہو گئی۔

"تم کون ہو؟" ملکہ نے پوچھا۔

"میں —— میں —— ایمی رابسرٹ۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"ایمی رابسرٹ —— تم —— رچرڈ وارنے کی بیوی؟"

"نہیں میں اس کی بیوی نہیں۔ میں اس شیطان سے ڈر کر آپ کی پناہ میں آنا چاہتی ہوں۔"

"وہ تمہارا خاوند نہیں؟"

"نہیں ملکہ عالم، ابھی ابھی وہ مجھے بڑی طرح پیٹ رہا تھا۔ میں بھاگ کر چھپنے کے لئے اس باغ میں آئی ہوں۔"

"یہ کیا معاملہ ہے؟" ملکہ نے پوچھا۔

"عالم پناہ! نواب لیسٹر سب کچھ جانتے ہیں۔"

"نواب لیسٹر، وہ سب کچھ جانتے ہیں؟"
"جی ــــ!"
"ادھر آؤ ــ میرے ساتھ ــ چوبدار ــ ارے او چوبدار۔"
"ملکہ معظمہ ــ!"
"نواب لیسٹر اور وارنے کو بلاؤ۔"
ایمی کا دل دھک سے رہ گیا۔ دونوں آ گئے۔ لیسٹر لڑکھڑاتا ہوا، متفکر و متردد چہرہ لئے۔ وارنے ہنستا ہوا مسکراتا ہوا۔
"وارنے!" ملکہ غصے سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ "تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟"
"ملکہ! یہ میری بیوی ہے۔"
"میں اس کی بیوی نہیں۔" ایمی چلائی۔ "مجھے اپنے دامن میں پناہ دیجئے۔"
"وارنے! کیا نواب لیسٹر کو اس کے متعلق کچھ علم ہے؟"
"م... م... مجھے...؟" نواب کانپنے لگا۔
"ہاں آپ کو!"
"مجھے ــ مجھے ــ؟"

"عالم پناہ!" وارنے تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔ "نواب صاحب اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ میری بیوی ہے۔"
"مگر یہ کیا کہتی ہے؟"
"ملکہ معظمہ مجھے ابھی ابھی اپنے خاص ڈاکٹر کا پیغام پہنچا کہ ایمی پاگل ہو گئی ہے۔"
"پاگل ــ؟"
"میں پاگل نہیں، عالم پناہ مجھے بچائیے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کچھ نہیں ہوا ہے ــ میں پاگل نہیں ــ" وہ دیوانوں اور سودائیوں کی طرح چلا رہی تھی۔ ملکہ کا چہرہ اتر گیا۔
"یہ پاگل ہے۔" وارنے نے اپنے الفاظ دہرائے۔ ایمی زخم خوردہ بلی کی طرح جھپٹی۔
"ایمی واقعی پاگل ہو گئی۔ وارنے اس کا علاج کرو۔"
ملکہ نے دھیمے سے یہ الفاظ ادا کئے ــ اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ساتواں باب (۷)

اور آخرکار

وارنے کی روانگی کے بعد نواب لیسٹر کو اپنی بیوی ایمی کا خیال آیا، اس کا مغموم چہرہ، اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں، حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی نظریں۔ اس کی چیخ پکار۔ پھر اسے وارنے کا خیال آیا۔ وہ ظالم انسان جس کے مشورے سے اس نے ملکہ کو آج تک دھوکے میں رکھا اس کا ستم، اس کی سنگدلی۔ ایمی کی تنہائی اور مصیبت۔ وہ بے یار و مددگار تھی۔ اس کا ٹریسلین اور اس کے باپ کے سوا اور تھا ہی کون؟ اور آج ملکہ کے سامنے اسے پاگل بنا دیا گیا۔ وارنے کی بیوی تو وہ پہلے ہی قرار دی جا چکی تھی۔ ایمی کا خیال آیا اور اس کی آنکھوں میں برستی بدلیاں بھر آئیں۔ وہ رویا اور جی بھر کر رویا۔ روتا رہا اور بہت دیر تک روتا رہا۔ ملکہ نے بھی دو ایک مرتبہ اسے بلوایا مگر اس نے علالت کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔ شام کے قریب خادم نے اطلاع دی کہ نواب سسکس کا آدمی ٹریسلین اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔

اس نے اجازت دیدی۔ مسٹر ٹریسلین آداب بجا لا کر اندر داخل ہوا۔
"میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" ٹریسلین نے کہا۔
"کیا بات ہے؟"
"آپ کی آنکھیں سرخ ہیں۔ آواز بھاری ہے۔ معاف فرمائیے اگر آپ کی طبیعت علیل ہو تو میں پھر حاضر خدمت ہو سکوں گا۔"
"نہیں ٹریسلین!" نواب نے نرمی سے کہا۔ "کہو جو کچھ کہنا ہے۔"
"مجھے وارنے کے متعلق شکایت ہے۔"
"تمہیں شکایت ہے، وارنے کے متعلق؟" آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے نواب کے رخساروں کو تر کرتے ہوئے زمین میں جذب ہو گئے۔
"میں آپ کو رنج نہیں پہنچانا چاہتا۔" ٹریسلین نے پھر کہا۔
"کہو ٹریسلین! مجھے گالیاں دو۔ ہاتھ اٹھا کے کوسو۔ جتنا جی چاہے برا کہو۔ کہو ٹریسلین خاموش کیوں ہو۔ تمہارا قصور ہوا

"تمھیں معلوم نہیں میں ہوں"
"آپ — آپ!" — ڑلیسلین نے تعجب سے پوچھا۔
"ہاں! میں — میں کا شوہر نہیں ہیں ہوں — میں نے اس کے بوڑھے والد اور تمھیں صدمہ پہنچایا ہے۔ میں نے ہی یہ ظلم کیا ہے۔ میرے ہی ہاتھوں سے اس کی زندگی تباہ ہوئی ہے۔ میرے ہی ہاتھوں تم برباد ہوئے ہو۔ افسوس! یہ میں نے کیا کیا"
"کیا کیا آپ نے آپ اتنے مغموم کیوں ہیں؟"
"مغموم ہونے کی یہی وجہ ہے ڑلیسلین۔ آہ اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا۔ امنگیں میرے دل پر کیوں غلبہ پا چکی تھیں؛ محبت کی چنگاری سرد کیوں ہو چکی تھی؟"
"مگر نواب صاحب قبلہ پھر بتائیے تو آپ نے کیا کیا؟"

"تم جانتے ہو ایمی میری امنگوں کے رستے میں ایک زبردست رکاوٹ تھی — وارنے اس کانٹے کو دور کرنا چاہتا ہے"
ڑلیسلین ایکدم کھڑا ہو گیا۔
"وہ کہاں گیا ہے؟"
"میرے شمالی قلعے میں۔ ڑلیسلین تم میرے اصطبل سے عمدہ سا گھوڑا لو۔ میری تلوار لو۔ جاؤ وارنے کا پیچھا کرو۔ ایمی کی زندگی خطرے میں ہے۔ پیشتر اس کے کہ کمینہ انسان اسے موت کے گھاٹ اتار دے تم وہاں پہنچ جاؤ اور اسے قتل کر دو۔ ہاں اسے زندہ نہ چھوڑنا۔ میں تمھارے ساتھ ہوں میں تمھاری مدد کروں گا۔ تم جلد جاؤ۔ میں ملکہ کے پاس جا کر سب کچھ بتا دوں گا بس تم چلے جاؤ۔"
ڑلیسلین نے گھوڑا لیا اور شمالی قلعہ کی طرف سرپٹ چھوڑ دیا۔

آٹھواں باب

مسلا ہوا پھول

مغربی آسمان کے پیاسے ہونٹ آفتاب جہانتاب کے خون حیات کا آخری قطرہ بھی چوس چکے تھے۔ شام کا اداس اندھیرا پست و بلند پر مسلط ہو چکا تھا۔ وحشت اپنے خوفناک پر پھیلا رہی تھی۔ دہشت اپنا خوفناک منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔ رات زخمی ناگن کی طرح دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی۔ ڑلیسلین کا گھوڑا ٹیلے۔ کھڈیں۔ خندقیں پھاندتا بھاگا چلا جا رہا تھا۔ سرپٹ — فراٹے بھرتا ہوا — اور جب وہ قلعے کے قریب پہنچا۔ ایک نامعلوم جذبے سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ قلعہ کی دیواروں پر اداسی کا پرچم لہرا رہا تھا — شاہ بلوط کے بڑے بڑے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہوا آہیں بھر رہی تھی اور تاریکی دنیا کو نگل جانے کے لئے تیار تھی — ڑلیسلین نے گھوڑا آگے بڑھایا — ہر چہار طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی! — مہیب خاموشی — لحد کی خاموشی — گورستان کے سکوت کی مانند — ڑلیسلین کا دل دھڑک رہا تھا — وہ گھوڑے سے اتر کر دھیرے دھیرے آگے بڑھا

قلعے کی دیوار کے پاس — تاریکی کے ظلمت آفریں جزروں میں شاہ بلوط کے درخت کے نیچے اسے کچھ چیز پڑی ہوئی معلوم ہوئی، وہ آہستہ سے اور آگے بڑھا — اور اس چیز کی طرف متوجہ ہوا — ایک عورت کی لاش وہاں پڑی تھی — اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے — جسم کا بند بند ٹوٹا ہوا تھا۔ جیسے کسی نے پھول کو مسل کر پھینک دیا ہو۔ عورت کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا — اس کی سانس بند تھی — نبض ساکت تھی — ڑلیسلین نے لاش کو الٹ پلٹ کر دیکھا — اس کا دل دھڑکا اور دھڑک کر اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا — ایمی، اس کی محبوبہ کا مسخ شدہ چہرہ اس کے سامنے تھا — اس کا چہرہ بہت ڈراؤنا ہو چکا تھا — صرف دو — کھلی ہوئی — بے نور — بے رونق آنکھیں — ٹکٹکی لگا کر — ڑلیسلین کے چہرے کی طرف — دیکھ رہی تھیں —!

آہ! — غریب ایمی کا حسرتناک انجام —!



خطرہ اور لاپروائی

کیا آپ سمندر کی طوفانی لہروں میں گھرے ہوئے،

ورنہ کبھی اس وقت جب کہ آپ ایک تختے کے سہارے تیر رہے ہوں اطمینان کے سگرٹ پی سکتے ہیں؟ ——— نہ معلوم آپ کا کیا جواب ہو مگر ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ آپ عام جسمانی کمزوری اور جاڑوں میں اتنے زبردست خطرات سے دوچار ہوتے ہوئے بھی کوئی پروا نہیں کرتے ——— کیا آپ کو معلوم ہے کہ عام جسمانی کمزوری ہر خطرہ کو دعوت دیتی ہے؟ اور کیا آپ کو معلوم ہے کہ سردیوں میں ذرا سی بے احتیاطی کس قدر مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اگر آپ ان خطرات سے آگاہ ہیں تو پھر ہمدرد کا ماء اللحم دو آتشہ کیوں استعمال نہیں کرتے؟ یہی ایک ایسی چیز ہے جو آپ کو ان تمام خطرات سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ قیمت فی بوتل پانچ روپے،

نمونہ کی شیشی سوا روپیہ

آپ اپنے لیے آج ہی خریدیے

رسالہ ہمدرد نوجوان رسالہ ہمدرد شباب مفت طلب کیجیے

ہمدرد دواخانہ لال کنواں دہلی

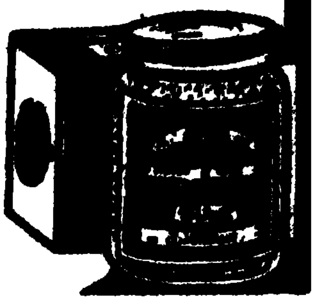




شاہنشاہ اکبر اور بیربل

اکبر نے بیربل سے دریافت کیا "سب سے اچھا ہتھیار کون سا ہے؟" بیربل نے جواب دیا "اوسان" شاہنشاہ نے بیربل پر ہاتھی چھوڑ دیا۔ وہیں ایک کتا سوتا تھا، بیربل نے اسے ہاتھی پر دے مارا۔ ہاتھی الٹا بھاگ گیا۔ واقعی اوسان بڑی چیز ہیں۔ ہوائی حملے میں بھی اگر اوسان قائم رہیں تو جان بچ سکتی ہے۔ دوبارہ قوت مردمی حاصل کرنے کے لیے بندر کے غدود کے پیوند، بجلی اور شعاعوں کے علاج اور نقالوں کی بازاری دوائیں، اوسان خطا ہونے کی علامات ہیں۔

دوبارہ جوان ہونے اور ہمیشہ غضب کی قوت قائم رکھنے کا بالکل صحیح، سب سے آسان، سب سے زیادہ مؤثر اور نہایت کم خرچ طریقہ برقی اثر "معجون شباب آور" کا استعمال ہے۔ اس سے زندگی کے تاریک راستے روشن ہو جاتے ہیں۔ نوجوانی کا سمندر ابل پڑتا ہے عیش و عشرت کی گھڑیاں آپ کا انتظار کرنے لگتی ہیں اور اولاد کی خوشی نصیب ہوتی ہے۔ قیمتی اجزا سے بنائی جاتی ہے۔ لاکھوں مایوس اصحاب فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ آپ بھی آج ہی منگا لیجیے۔



قیمت فی شیشی (۵ تولے)، پانچ روپے۔ نمونہ کی شیشی ایک روپیہ۔

رسالہ ہمدرد نوجوان اور رسالہ ہمدرد شباب دواخانہ سے مفت طلب فرمائیے۔

کیفیات

بڑھ رہی ہے کشتیِ اُمید طوفاں کی طرف

از حضرت ہادی مچھلی شہری

جا رہا ہوں میں جنونِ فتنہ ساماں کی طرف
دستِ وحشت کو بڑھائے جیب و داماں کی طرف

یہ کوئی لازم نہیں جائے بیاباں کی طرف
دشت کھنچکر آئے خود اک پابجولاں کی طرف

اُس کا جلوہ اور شوقِ دید یارب خیر ہو
بڑھ رہی ہے کشتیِ اُمید طوفاں کی طرف

باغباں محوِ جمالِ لالہ و گل ہے اگر
دیکھتا ہوں میں بھی اپنے زخمِ خنداں کی طرف

مسکرانا پھر مرے زخمِ جگر کے ظرف پر
پہلے دیکھو تم ذرا اپنے نمکداں کی طرف

کوئی دیکھے یہ نیا اعجاز تاثیرِ کشش
درِ قفس کا ہوتا جاتا ہے گلستاں کی طرف

چارہ جوئی کیا کرے فرقت میں امیدِ وصال
ایسے دل کی جس کو رغبت ہی ہو حرماں کی طرف

ہمنفس گلشن میں یاد آئیگا مجھکو زخمِ دل
کس طرح دیکھونگا میں گلہائے خنداں کی طرف

قیدِ ناکامی میں بھی ربطِ چمن باقی رہا
ہے نگاہِ واپسیں میری گلستاں کی طرف

دیکھئے رہتی ہے کب تک ذوقِ آزادی کی شرم
کھینچ رہا ہوں خود بخود میں آج زنداں کی طرف

مختلف دستِ جنوں کی نسبتیں ہیں ہجر میں
اک گریباں کی طرف ہے ایک داماں کی طرف

بدگمانی خاکِ مدفن سے مری اتنی بھی کیا
جا رہے ہیں دیکھتے وہ اپنے داماں کی طرف

کیا نویدِ فصلِ گل لایا ہے سودائے جنوں
بڑھ رہا ہے ہاتھ کیوں میرا گریباں کی طرف

کیا انہیں اپنے سکونِ دل کی کچھ پروا نہیں
دیکھتے ہیں کیوں وہ اک آشفتہ ساماں کی طرف

کیا پہنائی جا رہی ہیں وحشیوں کو بیڑیاں
آج یہ جھنکار سی کیسی ہے زنداں کی طرف

ان کے جلوے کے سوا اس آئینے میں کچھ نہیں
شوق سے دیکھیں وہ میری چشمِ حیراں کی طرف

خار کی کثرت میں ہے فکرِ تحفظ رائگاں
دیکھتا ہے کون ہادی چاکِ داماں کی طرف

شہنشاہ اورنگ زیب کی حرمِ اوّل

دلرس بانو بیگم

از جناب محمد عبداللہ قریشی بی اے

اکبر اعظم کے دورِ حکومت میں قندھار کا علاقہ سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا گیا تھا۔ قندھار اس زمانے میں میرزا مظفر حسین کے قبضہ میں تھا۔ جو ایران کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ تیموریوں نے اس خاندان کی عزت کو ہر طرح برقرار رکھا اور ان کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ میرزا مظفر حسین کا مرتبہ بڑھانے کی خاطر اس کی لڑکی سے شہزادہ خسرو کی شادی کر دی گئی اور اس کے بھائی میرزا رستم کی دو بیٹیاں پرویز اور شہریار کے عقدِ نکاح میں آئیں۔ میرزا رستم کا بیٹا شاہنواز خاں تھا جو دربار میں بڑا اثر اور رسوخ رکھتا تھا۔ اس کی لڑکی دلرس بانو کی شادی ۱۰۴۶ھ میں عالمگیر کے ساتھ قرار پائی۔

دلرس بانو صمصام الدولہ میرزا شاہنواز خاں صفوی کی پلوٹھی کی لڑکی تھی۔ اس کی زندگی کے حالات کسی مؤرخ نے نہیں لکھے۔ البتہ اس کی شادی کا تذکرہ بعض تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

۲۹ شعبان ۱۰۴۶ھ کو بادشاہ کی طرف سے ساچق روانہ کی گئی۔ ساچق میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ کے جواہر بیش بہا کپڑوں کے تھان، مرصع زیورات اور برتن وغیرہ تھے۔ ساچق کے ساتھ جانے کیلئے موسوی خاں صدر الصدور، میر جملہ میر بخشی، مکرمت خاں میر سامان، خلیل اللہ خان اور چند بیگمات منتخب کی گئیں۔ چونکہ دارا شکوہ اور شاہ شجاع کی شادی کا تمام بندوبست بیگم صاحبہ (جہاں آرا) نے کیا تھا اس لئے بادشاہ نے حکم دیا کہ اس شادی کے تمام اخراجات وہ خود برداشت کریگی۔ شہزادہ اورنگ زیب ان دنوں دولت آباد میں تھا۔ بادشاہ نے حکم بھیجا کہ شہزادہ فوراً دارالسلطنت پہنچے۔ چنانچہ اورنگ زیب ڈبل مارچ کرتا ہوا ماہ ذیقعد کی آخری تاریخوں میں آگرہ پہنچا۔ باغ نور میں اس کے رہنے کا انتظام کیا گیا۔ بادشاہ کو جب شہزادہ کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اس نے پدری کے جوش میں مندرجہ ذیل رباعی اپنے دستِ خاص سے لکھ کر شہزادہ کے پاس روانہ کی۔ رباعی:۔

بشگفتہ اگر زود درآئی چہ شود — یا تافتہ پیش از خبر آئی چہ شود
زود آمدنت کفر بشوقم در راست — از زود اگر زود ترآئی چہ شود

ذی الحج کی پہلی تاریخ کو یمین الدولہ آصف خاں، خانِ دوران بہادر نصرت جنگ، علامی افضل خاں، سید خان جہاں، شائستہ خاں، جعفر خاں اور شہزادہ مراد بخش اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے بادشاہ کے حضور میں کورنش کے لئے لے گئے۔ بادشاہ نے اسے آغوش میں لیا، پیار کیا، اور خلعت خاص عنایت فرمایا۔ شہزادہ نے اس موقعہ پر ایک ہزار اشرفی بطور نذر اور اسی قدر رقم بادشاہ پر سے نچھاور کرنے کے لئے پیش کی۔

۵ ذی الحج کو بادشاہ کا روز وزن تھا۔ بادشاہ نے اس تقریب پر دس لاکھ روپیہ اسے عطا کیا اور حکم دیا کہ اس رقم کو شادی کا سامان درست کرنے میں صرف کیا جائے۔

اس کے بعد شاہی نجومیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے علم کے رو سے شادی کی تقریب کے لئے کوئی نیک ساعت مقرر کریں۔ چنانچہ انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ ۸ مئی نہایت مبارک تاریخ ہوگی۔

شادی سے دو ایک روز پیشتر حنابندی کی رسم ادا کی گئی۔ ہندوستانی طریقے کے بموجب دلہن کے باپ نے نہایت شان و شوکت سے مہندی روانہ کی۔ اس جلوس میں بہت سے لوگ شامل تھے۔ امرا کی بیویاں بھی دولہا کے مکان پر گئیں۔ جلوس کے آگے آگے شادیانے بج رہے تھے اور آتشبازی چھوڑی جا رہی تھی۔ دولت خانہ خاص میں حنابندی کی محفل برپا ہوئی اور رنگارنگ کی آتشبازی سے زمین بقعۂ نور بن گئی۔ بادشاہ کے حکم سے یمین الدولہ آصف خاں دوسرے امیروں کو ساتھ لیکر اس محفل میں حاضر ہوا۔ چنانچہ اس کی نگرانی میں حنابندی کی رسم ادا کی گئی۔ دیوان خاص کے ایک جانب پردہ لگایا۔ بعد ازیں اس پردہ کے پیچھے آئیں۔ شہزادہ نے اپنے ہاتھ اور پاؤں اوپر بڑھائے اور انہوں نے مہندی لگائی۔ بعد ازاں شہزادہ کو دلہن کے گھر کا آیا ہوا جوڑا پہنایا گیا۔ عطر لگایا گیا اور مصری سے اس کا منہ میٹھا کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی پان، مٹھائیاں اور دیگر خوراکیات سے حاضرین کی تواضع کی گئی اور مغنیوں کی نغمہ سرائی سے اس محفل کو دلچسپ بنایا گیا۔

دوسرے روز برات تھی۔ نجومیوں نے اس تقریب کے لئے جو وقت مقرر کیا تھا وہ پو پھٹنے سے چار گھڑی پہلے کا تھا۔ وقت معینہ سے پہلے

یمین الدولہ آصف خاں شہزادہ مراد اور چند دیگر امرا شاہزادہ اورنگ زیب
کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ اس وقت دریائے جمنا
کے کنارے شاہی محل میں مقیم تھا۔ وہاں سے وہ شہزادہ کو دریا کے راستے
بادشاہ کے حضور میں لائے۔ شہزادہ جب اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں
حاضر ہوا آکر کورنش بجا لایا۔ بادشاہ نے اسے خلعت خاص عنایت کیا اور
ہیرے موتیوں کا طرہ اس کی دستار پر لگایا۔ اس کے علاوہ کئی قسم کے
تحفے تحائف عطا کیے جن میں قسم قسم کے جواہرات، جمدھر خنجر، پھول
کٹارہ، جمدھر، قیمتی گھوڑے، عمدہ عمدہ ہاتھی شامل تھے۔ اورنگ زیب تسلیمات
بجا لایا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ شہزادہ مراد بخش یمین الدولہ اور دوسرے
امیر دولہا کی رکاب میں نواب شاہنواز خاں کے محل میں تشریف
لے جائیں چنانچہ برات کا جلوس بڑے تزک و احتشام سے روانہ ہوا۔
شہر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا ہر جگہ سرود و انبساط کی محفلیں گرم
تھیں لوگ سڑکوں کے دو رویہ کھڑے شہزادہ پر پھول، گلاب
اور عطر چھڑک رہے تھے جگہ جگہ آتش بازی چھوڑی جا رہی تھی۔
چراغاں نے اس کی شان کو دوبالا کر رکھا تھا جب یہ جلوس دلہن
کے محل کے قریب پہنچا۔ تو بہت سے امراء اس کی پیشوائی کو آئے۔
شاہجہان کشتی کے ذریعے وہاں پہنچا۔ قاضی [illegible] نے نکاح پڑھایا دلہن
کا مہر چار لاکھ روپیہ مقرر ہوا۔ نکاح کے بعد ایک پر تکلف دعوت
دی گئی جس میں دونوں جانب کے امرا نے حصہ لیا۔ ملک الشعراء
کلیم ہمدانی نے اس واقعہ کی تاریخ کہی جو ذیل میں درج ہے ؎

جہاں کردہ سامان بزم نشاطے | کہ گلبانگ عیشش بگردوں رسیدہ
قران کردہ سعدین و زیں سال قرانے | فرح خیز و فرخندہ دوراں ندیدہ
ز پیوند ایں گلبن باغ دولت | زمانہ گل عیش جاوید چیدہ
فلک رتبہ اورنگ زیب آنکہ ایزد | سزاوار تایید عیشش دیدہ
نہال برومند بستان دولت | کہ اقبال در سایہ اش آرمیدہ

خرد بہر تاریخ تزویج گفتا
دو گوہر بیک عقد دوراں کشیدہ
۱۰۴۶ھ

اس کے بعد رخصتی ہوئی۔ ۱۴ مئی کو اورنگ زیب کے محل میں جہاں
شاہجہاں بھی موجود تھا عروس والوں کی پیشوائی کی گئی۔ امرا میں شادی
کے تحائف تقسیم کیے گئے تحفہ لینے والا سب سے پہلے بادشاہ کے حضور
میں اور اس کے بعد شہزادے کے حضور میں مجرا بجا لاتا۔
سوموار ۱۹ ذی الحجہ کو بادشاہ اورنگ زیب کے محل میں تشریف لایا۔
شہزادہ نے پا انداز اور نثار کی رسوم ادا کیں اور پیشکش کے طور پر
جواہرات، مرصع آلات اور قیمتی اشیا بادشاہ کے حضور میں نذر گذرانیں
بادشاہ نے جان نثاران سلطنت کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔
شہزادہ تین ماہ اپنے باپ کے پاس آگرہ میں رہا اور اس کے بعد
بیگم کو ہمراہ لے کر دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔ بیگم کا باپ چھ مہینے میں ایک
دفعہ بیٹی کو دیکھنے آتا۔ اور دوسرے تیسرے مہینے چند روز کے لئے
اپنے ہمراہ لے جاتا۔ عالمگیر کے عہد حکومت میں وہ صوبہ داری گجرات
کے منصب پر فائز تھا۔

دلرس بانو بیگم کے بطن سے پانچ بچے پیدا ہوئے جن میں دو لڑکے
اور تین لڑکیاں تھیں سب سے بڑی زیب النساء تھی جو ۱۰ شوال
۱۰۴۸ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۶۳۸ء کو دولت آباد میں پیدا ہوئی اور
۱۱۱۰ھ میں بمقام دہلی فوت ہو کر تیس ہزاری باغ میں دفن ہوئی تھی
وہ اپنی علمی عقلی اور شعری قابلیت کی وجہ سے سارے ہندوستان
میں مشہور تھی۔

بیگم کی دوسری بیٹی زینت النساء بیگم تھی جو یکم شعبان ۱۰۵۳ھ
مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۶۴۳ء کو اورنگ آباد کے مقام پر پیدا ہوئی تھی اور
اٹھاسی برس قمری کی عمر پا کر مئی ۱۷۲۱ء (مطابق ۱۱۳۳ھ) میں بمقام دہلی
فوت ہوئی تھی وہ اپنے اخلاق کی بلندی اور اپنی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے
خاص عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ اس کی تعمیر کی ہوئی شاندار مسجد
دریا گنج دہلی میں "زینت المساجد" یا "کنواری کی مسجد" کے نام سے آج
تک موجود ہے۔ اسی مسجد کے ایک گوشے میں اس کی قبر کا نشان بھی
ہے۔ مگر کہتے ہیں ۱۸۵۷ء کے بعد جب دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ
ہو گیا۔ تو گوروں نے اس کی نعش کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا۔

بیگم کی تیسری لڑکی زبدۃ النساء تھی جو ۲۶ رمضان ۱۰۶۱ھ مطابق
۲ ستمبر ۱۶۵۱ء کو ملتان میں پیدا ہوئی تھی اور جس مہینے عالمگیر نے انتقال
کیا غالباً اسی مہینے میں فوت ہوئی تھی۔

بیگم کا بڑا بیٹا محمد اعظم تھا جو ۱۲ شعبان ۱۰۶۳ھ مطابق ۲۸ جون
۱۶۵۳ء کو برہان پور کے مقام پر پیدا ہو کر عالمگیر کے بعد ہندوستان
کے تخت و تاج کا وارث بنا تھا۔

بیگم کا چھوٹا لڑکا محمد اکبر تھا جو ۱۲ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ مطابق
۱۱ ستمبر ۱۶۵۷ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا تھا۔

دلرس بانو بیگم کے علاوہ عالمگیر کے حرم میں تین بیویاں اور بھی
تھیں — نواب بائی، اورنگ آبادی، دربائی اور دے پوری — مگر

جس قدر انسیت بادشاہ کو اس سے تھی کسی اور سے نہ تھی۔ اس کی بڑی وجہ اس کا کثیر الاولاد ہونا تھا۔ اس کے ساتھ وہ نہایت بیدار مغز اور عالی ہمت بھی تھی۔ فصاحت و بلاغت اور سلیقہ شعاری میں یکتائے زمانہ تھی۔ اور بیداری میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اس کی فیاضی سے بہت سے غریب اور مسافر فیضیاب ہوتے۔ اور اس کی داد و دہش کی شہرت سن کر لوگ دور دور سے آکر متمتع ہوتے تھے۔ اس کی یہ سب خوبیاں شہنشاہ کی خوشنودیٔ مزاج کا باعث تھیں۔

بیگم کی تمام زندگی امن سے گذری۔ اس کی وفات ۸ اکتوبر ۱۶۵۷ء کو اورنگ آباد میں ہوئی جس کی وجہ شہزادہ محمد اکبر کی پیدائش تھی عالمگیر کو اس کی وفات سے از حد صدمہ ہوا۔ اس نے اورنگ آباد میں اس کی تربت پر ایک عظیم الشان مقبرہ بنوایا۔ جو آج تک اس کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور مرنے کے بعد اسے رابعۃ الدورانی کا خطاب دیا۔ جو اس کے لئے بیحد موزوں تھا۔

بیگم کے اخلاق و عادات میں یہ بات سب سے نمایاں تھی۔ کہ وہ صائب الرائے تھی۔ اسے اپنے آپ پر اتنا اعتماد تھا۔ کہ جو رائے وہ ایک دفعہ قائم کر لیتی تھی اسے بہت کم بدلتی تھی۔ وہ اپنے فیصلے کی خود بھی پابندی کرتی تھی۔ اور دوسروں سے بھی منوا کر چھوڑتی تھی۔ البتہ وہ اپنے خاوند کے جذبات کا خاص احترام کرتی تھی اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کو ہر چیز پر مقدم سمجھتی تھی۔ اس نے اپنی نگرانی میں اپنے بچوں کو جس قسم کی تعلیم و تربیت دلوائی وہ اس کی اپنی پاکیزگیٔ نفس کی دلیل ہے۔ اور زیب النساء اور زینت النساء اس کی بہترین مثالیں ہیں جن کی ذات میں وہ تمام خوبیاں جمع تھیں جو دختران اسلام میں ہونی چاہئیں۔

اسلام سے والہانہ شیفتگی۔ مذہبی رسوم کی سختی سے پابندی۔ اور ریاضت و عبادت میں انہماک دلرس بانو بیگم کی زندگی کے خاص جوہر تھے۔ اس کا کردار عام عورتوں سے اعلیٰ اور اس کا رحم و کرم مذہبی پابندیوں سے بالا تھا۔ اس کی بخشش و عطا ہندو مسلم میں تمیز نہ کرتی تھی۔ جو جس چیز کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ اسے عنایت کر دی جاتی تھی۔ ہماری موجودہ تعلیمیافتہ اور روشن خیال خواتین کو اس "رابعۃ الدورانی" کی زندگی سے سبق لینا چاہئے۔

نوائے راز

اے میں قربان جلوہ گر ہو تم ؟

از حضرت ابوالفاضل راز چاندپوری

سچ تو یہ ہے کہ دیدہ ور ہو تم
بے خبر میں ہوں، باخبر ہو تم

واقفِ رازِ خیر و شر ہو تم
خوش خیال اور خوش نظر ہو تم

آشنائے رموزِ کُن فیکوں
رازِ ہستی سے باخبر ہو تم

جس سے روشن ہے مطلعِ اُمید
شامِ غربت میں وہ سحر ہو تم

کون ہے یہ حریفِ جلوۂ طور
اے میں قربان جلوہ گر ہو تم

دشتِ غربت میں، راہِ ہستی میں
میں سمجھتا ہوں ہم سفر ہو تم

ایک نسبت ہے نسبتِ موہوم
بینوا میں ہوں تاجور ہو تم

میں ہوں گمنام، واقعی گمنام
اور تم ؟ خیر، نامور ہو تم

اُف، یہ بیداد اور دادگری
صاحبِ فن ہو، باہنر ہو تم

بات کہنے کی تو نہیں لیکن
سخت گمراہ، راہبر ہو تم

راز دو عیب ہیں یہی تم میں
صاف گو اور حق نگر ہو تم

قبرستان میں لیڈی ڈاکٹر

(ایک یونانی طبیب کے قلم سے)

وہ قبرستان میں نہایت تیزی کے ساتھ دوڑتی پھر رہی تھی۔ اسکے ہاتھ میں ایک خوبصورت نوٹ بک اور ایک پنسل تھی۔ ہر قبر پر جاتی تھی۔ سرہانے لگے ہوئے پتھر کو غور سے پڑھتی تھی۔ اور اسکے بعد اپنی نوٹ بک میں کچھ یادداشت لکھ لیتی تھی۔ میں یہ دیکھکر حیران رہ گیا۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنیکی بے چینی ہوگئی مگر میں بہت دیر اسکی حیرت انگیز حرکتیں کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوچکی اور قبرستان کے دروازہ کی طرف جانے لگی تو میں یکایک اسکے سامنے آکھڑا ہوا۔ معاف کیجئے گا ڈاکٹرنی صاحبہ آپ آج کس الجھن میں ہیں اور یہ کیا کررہی ہیں۔ اس پر انہوں نے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو اسکی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ وہ کچھ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ کیا بتاؤں حکیم صاحب میں کیا دیکھ رہی تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس پورے قبرستان میں عورتوں کی قبریں زیادہ ہیں۔ اور بچوں کی قبریں بھی بہت زیادہ ہیں۔ لیکن مردوں کی کم ہیں۔ مجھے بہت دن سے یہ معلوم کرنے کی بے چینی ہوری ہے کہ آخر ہم غریب عورتوں سے موت کو ایسی کیا دشمنی ہے کہ اس کا ہاتھ سب سے زیادہ ہمیں پر پڑتا ہے اور جب ہماری طرف سے نظر پھرتی ہے تو ہمارے کلیجہ کے ٹکڑوں کو ہمیشہ کے لئے سلا دیتی ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے کیا مردوں نے اس چڑیل کو رشوت دیدی ہے۔ مردوں کی گردن پر اسکا ہاتھ کیوں نہیں جاتا۔

اُس نے یہ دردناک گفتگو کچھ ایسے غم انگیز لہجہ میں کی کہ میرا دل ہل گیا میں نے کہا میڈم! آپکا خیال ٹھیک ہے۔ موت عورتوں سے زیادہ محبت کرنے لگی ہے۔ مگر اسکی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ کہ آجکل ہمارے ہندوستان کی عورتیں گذشتہ زمانہ کی عورتوں سے کہیں زیادہ نازک ہوگئی ہیں۔ اور چونکہ ہمارے ملک کی آب ہوا میں بہت کچھ خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اسکے علاوہ عورتیں کچھ غذاؤں میں بد پرہیزیاں کرتی ہیں تو انہیں طرح طرح کی بیماریاں ہوجاتی ہیں۔ اور جب بیمار ہوتی ہیں تو اپنے مردوں سے اس کا تذکرہ تک نہیں کرتیں۔ اور کہتی ہیں کہ ہمیں اپنی بیماریوں کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ چنانچہ انجام کار اس کا نتیجہ وہ خود بھگتنے پر مجبور ہوتی ہیں اور اپنے مردوں کو بھی مشکلات میں پھنسا دیتی ہیں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ آجکل ہندوستانی عورتیں زیادہ تر سیلان الرحم یعنی سفید پانی کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ اسے بعض لوگ سفید بیلری بھی کہتے ہیں کیونکہ جب عورت سیلان الرحم کی مریض ہوجاتی ہے تو اس کے خفیہ بدن سے ایک سفید رنگ کی لیسدار اور بدبودار رطوبت مسلسل خارج ہوا کرتی ہے اور اگر اس کا کوئی علاج نہ کیا جائے تو عورت کا خاتمہ کردیتی ہے۔ اگر عورتیں اس خطرناک بیماری میں مبتلا ہوتے ہی کسی ذریعہ سے اپنے گھر کے مرد کو اسکی اطلاع کردیا کریں۔ تو پھر رونا ہی کس بات کا ہے۔ اور اگر انہیں شرم آتی ہے تو

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۔ ۔ دہلی

کو خود خط لکھکر دوا "روک" کی ایک شیشی منگا کر استعمال کرلیا کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوا سے یعنی "روک" سے سیلان الرحم جیسے خطرناک مرض کو بہت جلد آرام ہوجاتا ہے اور عورت بالکل تندرست ہوجاتی ہے اور سفید رطوبت پھر خارج نہیں ہوتی۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ سیلان الرحم کی مریض عورت اپنے مرض کی وجہ سے دن بھر اداس رہتی ہے۔ کمزور ہوجاتی ہے۔ اسکے ناف تلوں میں یا تو ہر وقت درد رہنے لگتا ہے یا ہر مہینہ خاص دنوں میں سخت درد ہوتا ہے اور بیچاری منہ لپیٹ کر کسی تنہا کمرے میں پڑی رہتی ہے۔ کسی سے ذکر تک نہیں کرتی۔

کاش ان نادان عورتوں سے کوئی کہدے کہ وہ زنانہ دواخانہ کی اس مشہور دوا "روک" کو استعمال کرکے سیلان الرحم کی مصیبتوں سے نجات پالیں۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ دوا "روک" سیلان الرحم کی بے نظیر دوائی ہے۔ ایک شیشی روک کی قیمت صرف تین روپے ہے اور بارہ سات آنے محصول پارسل کے خرچ ہوتے ہیں۔ ہر منگانے والی کا نام پوشیدہ ہی رہتا ہے۔ کسی کو بھی دکھایا نہیں جاتا۔

وہ میری یہ بات سنکر قبرستان سے چلی گئی۔ اور گھر پہنچکر تمام شہر میں اعلان کردیا کہ دوا "روک" سیلان الرحم کی بے مثال دوا ہے

جنرل بورس مارکووچ کی داستانِ معاشقہ

عہدِ زار کا ایک رومان

از جناب رحمت علی صابر نوری

موسم سرما شباب پر تھا، شام ہی سے برفباری ہو رہی تھی، تمام روئے زمین پر پھیلی ہوئی برف کا فرش بچھا ہوا تھا اور اس کے اوپر سے "سینٹ پیٹری" کے قید خانہ کی فصیلیں سیاہ رات کی تاریکی میں عجیب دیووں کی طرح سر اُٹھائے کھڑی تھیں، اُن کی ہیبت ناک و پُرسکوت بلندی ... کے نیچے بسنے والے شہریوں کی بےبسی کا مذاق اُڑاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جنہیں اُن ... ہمہ گیر قوت ہر وقت لرزاں و ترساں رکھتی تھی۔

ہر طرف موت کی سی خاموشی مسلط تھی، مگر جنرل بورس مارکووچ شہر ... گیر و مطلق العنان ... وزیر کے کمرۂ مطالعہ میں اس وقت خلافِ معمول روشنی ہو رہی تھی۔ کمرے کی آرائش و زیبائش ... بیش قیمت ساز و سامان سے اُس کی شان و شوکت، ہیبت و جبروت اور اولوالعزمی ... اصول پسندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ دیواریں ... سے آرائش کردہ دبیز رنگا رنگ ... سے آراستہ تھیں ... طرف کونے میں ایک الماری تھی جس میں سرکاری کاغذات نہایت قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ وسط کمرہ میں ایک میز اور اس کے پاس ہی دبیز گدّے والی بلند پشت کرسی تھی۔ میز پر نقرئی قلمدان اور پاس ہی طلائی "پیپر ویٹ" سے دبے ہوئے چند قلمی مسودے ... تھے۔ ایک طرف دیوار پر شہنشاہ زار کی قدِ آدم تصویر ایک پُراسرار متانت کے ساتھ ... کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تپائی پر تازہ پھولوں کا گلدستہ کمرے کی فضا کو معطر کر رہا تھا۔ میز کے ... طرف شاہ بلوط کے ڈیسک پر مختلف مجلد کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں اور اس ... میں نہ جانے کتنے گنہگاروں کے ساتھ ساتھ بیگناہوں کے نامۂ اعمال مقفل تھے۔

ایک مشرقی پردے سے چھپا ہوا دروازہ کھلا اور جنرل بورس اندر داخل ہوا۔ اس نے ... بھاری فوجی اوورکوٹ اتار کر ایک طرف صوفے پر ڈال دیا اور قالین ... آتشدان کی طرف بڑھا اور چند لکڑیاں اُس میں ڈال دیں، کچھ عرصہ ... بے مروّت نگاہوں سے اُٹھتے ہوئے شعلوں کو گھورتا رہا، پھر ایک معنی خیز تبسم اس کے ... مونچھوں والے سخت چہرے پر نمودار ہوا۔ اس نے گھنٹی بجائی، افسر کے داخل ہوتے ہی اس ... ہونٹوں سے تبسم رخصت ہو گیا اور چہرے پر گہری سنجیدگی اور درشتگی کے تاثرات ... جنہیں دیکھ کر ... اور اس کے تمام ماتحت کانپ اُٹھتے تھے۔

"میرے احکام پر عمل ہوا؟" اس کی بھاری آواز کمرے میں گونج اُٹھی۔

"جی حضور والا"

"اچھا" کہہ کر بورس ایک صوفے پر دراز ہو گیا۔ "اب تم جا سکتے ہو کپتان مگر ... پیچھے جانا شاید مجھے پھر تمہاری ضرورت پڑے!!"

[illegible]

بوڑھا وہ ڈریسنگ کے قریب جا کر ... چند مسودات کو اُٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے رک رک کر بولا "گستاخی معاف"! اس کے لہجے میں ... تھرتھراہٹ تھی "مگر آپ سزائے موت کے بارے میں آخری حکم دینا بھول گئے ہیں ......!"

"نہیں" بورس نے تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "میں بھولا نہیں...... اچھا اب تم جا سکتے ہو!"

افسر فوجی سلام کر کے باہر نکل کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا بیٹھا۔ جو ایک آگ کے الاؤ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے اپنے افسرِ اعلیٰ کی درشت مزاجی اور سنگدلی کا تذکرہ کر رہے تھے۔

جنرل بورس ساکت و صامت بیٹھا آتشدان سے اُٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھتا رہا، پھر یکایک اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کمرے میں چھپتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے بلند آواز میں بولا "وقت مقررہ آپہنچا" اُس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم کھیلنے لگا۔ "کتنی حیرت انگیز بات ہے" وہ بڑبڑانے لگا "وہ چیز جس کی میں نے تمنا کی تھی جسے میری طاقت اور دولت حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی، اب خود بخود میری آغوش میں آ رہی ہے یعنی مزوسکی کاؤنٹ ایک خوبصورت عورت کی رضامندی اور وہ بھی بغیر کسی جبر و اکراہ کے،...... اُف!"

اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ صوفے سے اُٹھا اور میز کے قریب پہنچ کر دراز کا قفل کھولا اور اس میں سے ایک خوشبو میں بسا ہوا کاغذ کا پُرزہ نکالا۔

"حضورِ والا! وہ پڑھنے لگا "بجائے اس کے کہ آپ میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمائیں، میں خود ہی آدھی رات سے ایک گھنٹہ پیشتر در دولت پر حاضر ہونے کی سعادت حاصل کروں گی۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ میری آمد کی کسی کو اطلاع نہ ہو حتیٰ کہ محل کے سنتری اور پہرہ دار بھی اس سے واقف نہ ہو سکیں، ہماری ملاقات کا علم میرے اور آپ کے سوا کسی کو نہ ہونا چاہئے......"

اس نے دلبستگی سے کاغذ کے پرزے کو اوپر اٹھایا اور اُسے بےاختیار چوم لیا۔ "ہاں یہ ملاقات میرے اور تمہارے درمیان بحیثیت ایک راز کے پوشیدہ رہنا...... میری پیاری سونیا! کسی کو بھی تمہارے آنے یا جانے کا علم نہ ہو گا، برف تیزی سے پڑ رہی ہے اور ... وقت فرش زمین پر تمہارے چھوٹے نازک اور ننھے پاؤں کا نشان تک باقی نہ چھوڑے گی"

[illegible]

ذکر بولا۔

"کیونکہ وہ افلاس و نکبت، آنسوؤں اور آہوں کی زندگی جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں، اس عیش و عشرت، اس ظاہری ٹیپ ٹاپ اور اس پُر تصنع زندگی سے بدرجہا بہتر ہے جس میں محض دکھلاوا ہی دکھلاوا ہے، وہ زندگی مال و دولت سے خالی ہو تو ہو، مگر خلوص و سچائی اس میں اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اور ممکن ہے، میری حیثیت کی بعض عورتیں اس ظاہری نمائش اور شہرت و عزت کی دلدادہ ہوں۔ مگر میں نہیں۔"

"ظاہری شہرت و عزت!" بورس بیقرار سا ہو کر بولا "میڈموازیل وسیلوف بس، تم نے میری باتوں کا غلط مطلب سمجھا، میں آخر کار ایک سپاہی ہوں اور ممکن ہے اظہار مطلب کے لئے میں نے شاعرانہ موشگافیوں کو پیش نظر نہ رکھا ہو جن کی آپ ہمیشہ سے عادی ہیں میرا مطلب صرف یہ تھا کہ آپ اگر پسند کریں تو میں آپ سے نکاح کرنے کے لئے تیار ہوں ...... کیا آپ میری بیوی بننا منظور کریں گی!"

"آپ کی بیوی"! وہ حیران ہو کر بولی۔ اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی "وہ معاف فرمائیں، مجھے معلوم نہ تھا۔ مگر یہ ناممکن ہے۔"

"ناممکن ہے"! وہ اپنے خیالی محلوں کو زمیں بوس ہوتے دیکھ کر بولا "تو آپ بتا سکتی ہیں، کہ آپ یہاں کیوں آئیں! اور وہ بھی ان حالات کے ماتحت کہ خواہ مخواہ دیکھنے والے کو شبہ ہو جائے کہ شاید اس کی تمنائیں بر آنے والی ہیں ...."

"میں آج کی رات یہاں کیوں آئی۔ شاید آپ نہیں جانتے اور شاید آپ کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس طرح کی ملاقات کیلئے میں نے کتنی دعائیں مانگی تھیں، خدا سے التجائیں کی تھیں، کہنے کو میں پہلے بھی آ سکتی تھی مگر اس وقت میرا مقصد پورا نہ ہو سکتا اور شاید اس قسم کی بے ضرر تنہائی بھی میسر نہ ہوتی، آج قضا و قدر نے وہ تمام کاوٹیں دور کر دیں جو میری راہ میں سنگ گراں ثابت ہو رہی تھیں۔"

"صاف صاف کہو میڈموازیل! میں تمہاری گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکا!!"

"آپ کیوں سمجھنے لگے ایکسی لینسی" وہ طنزیہ لہجے میں بولی "مجھے آپ سے انتقام لینا تھا، ہر چند یہ اقدام حد درجہ خطرناک تھا۔ مگر مجھے آپ کی بیقراری اور محبت سے یقین تھا کہ مجھے کوئی گزند نہ پہنچ سکے گا اور یہ کہ حسب وعدہ آپ پہرہ دار دل کو محل سے ہٹا چکے ہیں ....." یہ کہتے ہی اس نے اپنے گون کے سینے سے ننھا سا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور نالی جنرل کے سینے کی طرف اٹھا دی۔

وہ بدستور سنجیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا "میری ذات سے آپ کو تکلیف پہنچی، کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں" اس کی نگاہیں ایلا ورکے بدلے ہوئے حسین تمتمائے ہوئے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"مجھے نہیں آپ نے مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی" اس نے فوراً جواب دیا "مگر اسے جسے میں جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں، آپ کے بیرحم احکام سے پابند آلام ہونا پڑا، کبھی آپ نے نکولائی ڈراوسکی نامی نوجوان کا نام سنا ہے!"

"مجھے اس قابل قدر نوجوان سے شناسائی کا فخر حاصل نہیں، وہ کون ہے! کوئی رقاص یا اداکار ......؟"

"اس کا نام اس فہرست میں شامل ہے جنہیں دار پر کھینچنے کا حکم آپ دینے والے ہیں" وہ جل کر بولی "ان کاغذات میں وہ حکم نامہ بھی موجود ہے جس پر آپ آخری حکم صادر کرنیوالے ہیں" اس نے ہاتھ سے ڈیسک پر رکھے ہوئے کاغذوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تیس مرد اور عورتیں جنہیں سزائے موت دی جانے والی ہے، مجھے معلوم ہے" وہ اسی متانت کے ساتھ بولا۔

"ان میں سے کئی ایک تو اتنے کم عمر ہیں کہ مشکل سے اپنے بھلے برے کی تمیز کر سکتے ہیں۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسا "مگر سیانے اتنے کہ اتنی بڑی حکومت کے نظام کو تہس نہس کرنے کی اسکیم بنا سکتے ہیں۔ اتنے کم عمر کہ ہمارے قابل احترام شہنشاہ کی جان لینے کی سازش کر سکتے ہیں۔"

"نکولائی ڈراوسکی میرا منگیتر ہے" وہ اس کے طنز کی پروا نہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ میرے دل و جان کا مالک ہے۔ دنیا میں تنہا وہی آدمی ہے جسے میں سچے دل سے اور بے پایاں محبت کرتی ہوں، اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں کیوں اس بے صبری سے اس گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔"

جنرل بورس نے ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگا "اچھا تو تم میرے خلوص و نیک نیتی پر یقین رکھتے ہوئے یہاں مجھے قتل کرنے کی نیت سے آئیں۔"

"یہ اس صورت میں ہوگا جب آپ اسے رہا کرنے سے انکار کر دیں۔ بصورت دیگر میں اس کی جان کے بدلے آپ کی جان بخشی کر سکتی ہوں"

"تب میڈموازیل ضرور مجھے ہلاک کر دو، کیونکہ میرا جواب نفی میں ہے"

"کیا آپ کا یہی مطلب ہے!" اس نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"ابھی تم نے فرض کا ذکر کیا تھا" وہ تیز لہجے میں بولا "اگر تمہیں اپنا فرض پیارا ہے تو میں بھی اپنا فرض بجا لانے میں کسر نہ اٹھا رکھوں گا اور اس سے مجھے محبت و زندگی کوئی بھی نہ روک سکے گی۔ اچھا اب گولی چلاؤ ...... !!!"

جب اس نے جنرل کے تمغوں سے بھرے ہوئے سینے کی طرف ریوالور اٹھایا تو اس کا ہاتھ زور زور سے کانپنے لگا آخر کار ایک دلدوز چیخ کے ساتھ اس نے ریوالور پھینک دیا اور اس کے پاؤں سے لپٹ گئی "تمہیں نہیں مار سکتی

نہیں ہو سکتی۔" اور جب اُس نے اُس مہلک آلے کو اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ اُس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر بولی۔ "آپ یقین کریں ایکسیلنسی! نکولائی بے گناہ ہے۔"

اُس نے اپنے شانوں کو حرکت دی اور ڈیسک کے قریب سے گزر کر اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور متبسم نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں ایک انسان ہوں میڈموازیل! میرے سینے میں دل ہے پتھر نہیں تم اُس کی بیگناہی کا ثبوت دو۔ میں اُسے رہا کر دوں گا۔"

"وہ بیگناہ ہے میں کہتی ہوں۔"

"قانون ثبوت چاہتا ہے میڈموازیل"

"ثبوت"! اُس نے گھٹنوں کے بل جھک کر کہا "اُس کی بیگناہی کا ثبوت میری خطاؤں میں پوشیدہ ہے کیونکہ وہ میری ہی وجہ سے قانونِ وقت کا مجرم بنا"

وہ دوبارہ مسکرایا۔ "قانون ان پُر پیچ باتوں کو نہیں مانتا محترم خاتون"۔

"آپ کی تسلی کیلئے میں تمام واقعہ مختصراً عرض کرتی ہوں۔ چند سال پہلے میں ایک انقلابی پارٹی کی سرگرم ممبر تھی۔ اُن کا پروگرام موجودہ نظامِ حکومت کو درہم برہم کرنا تھا۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مجھے محسوس ہونے لگا۔ کہ حقوق آزادی تشدد و خونخواری سے حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ تب نکولائی میری زندگی میں آیا اور اس کی بے پناہ محبت نے مجھے تمام باتوں سے بے خبر کر دیا۔ میرے پاس کچھ کاغذات تھے، میں نے وہ نکولائی کو دکھائے، اُس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں انہیں تلف کر دوں۔ میں نے وعدہ کر لیا، مگر انہیں تلف کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس عرصے میں انقلابی تحریک زور پکڑ گئی۔ میں گھبرا گئی، کیونکہ کاسیک اور خفیہ پولیس کے افسر گھروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ نکولائی میری وجہ سے سخت پریشان تھا، اُسے ہماری پارٹی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر مجھے خطرے میں گھرا ہوا دیکھ کر اُس بہادر، بُردبار اور مستقل مزاج نوجوان نے ہمت نہ ہاری اور وہ تمام کاغذات مجھ سے تلف کرنے کی نیت سے لے لئے۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ انہیں ضائع کر سکتا۔ آپ کے آدمیوں نے اُسے گرفتار کر لیا"

آخری لفظ کے زبان سے نکلتے ہی وہ دلشکستگی کے عالم میں سسکیاں لیتی ہوئی صوفے پر گر پڑی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ چند لمحوں تک بورس تیز نگاہوں سے اُس کے جھکے ہوئے سر اور لرزتے ہوئے شانوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور دراز میں سے ایک فائل نکال کر کوئی کاغذ تلاش کرنے لگا۔

چند منٹ کے بعد اُسے مطلوبہ دستاویز مل گئی اور وہ اُسے ہاتھ میں لئے ہوئے حسینہ کی طرف مخاطب ہوا "یہ دیکھو میرے ایجنٹ کی رپورٹ ہے" اُس کے لہجے میں تند اور تحکمانہ قانونی بُو آ رہی تھی۔ "جب نکولائی ڈرانسکی گرفتار ہوا اور تلاشی لی گئی تو اُس نے اپنی بیگناہی کا اظہار کیا۔ مگر یہ اطلاع بہم پہنچانے سے انکار کر دیا کہ وہ کاغذات اُسے کہاں سے ملے، جو اُس کی جامہ تلاشی سے برآمد ہوئے تھے اور وہ آج تک پولیس کی سختی کے باوجود اپنے سابقہ بیان پر قائم ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی بے گناہی پر بھی مصر ہے"۔

"پولیس کی سختی"۔ اُسے معلوم تھا، کہ اس چھوٹے سے فقرے سے اس کا کیا مطلب تھا۔ وہ کانپ اُٹھی اور مضبوطی سے اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

جنرل بورس دوبارہ بولا "میڈموازیل! اُن کاغذات میں ایک مکتوب برآمد ہوا تھا جس کا ایک صفحہ غائب ہے، اگر آپ اس گمشدہ صفحے کو پیش کر سکیں تو شاید آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں سچ مانا جا سکتا ہے۔ مگر میں آپ کو یاد دلا دینا چاہتا ہوں کہ اُس کے جرم کا بار بہر حال دوسرے کے کندھوں پر پڑ جائے گا"۔

خاموشی چھا گئی اور وہ غور بھری نگاہوں سے اُس کے نرم و نازک ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا جو کبھی آپس میں بے اختیار مل جاتے تھے اور کبھی علیحدہ ہو جاتے تھے، آخر کار اس کی ہمت اس کے خوف پر غالب آ گئی۔ اُس نے اپنا سر اُوپر اُٹھایا اور آہستہ آہستہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور خاموشی کے ساتھ اپنے سینے سے ایک تہ کیا ہوا پرزہ کاغذ نکالا اور اُس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ "یہ ہے وہ گمشدہ ورق ایکسیلنسی! اب آپکو یقین آ جائے گا۔ کہ میں سچ کہہ رہی تھی"۔ وہ ابھی حیرت بھری نگاہوں سے اُس پرزہ کاغذ کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ دوبارہ چلا کر بولی "اس شہر میں آپ صرف شہنشاہ زار ہی کے قائمقام نہیں ہیں بلکہ عدل و انصاف کے نمائندے بھی ہیں۔ اب نکولائی کو رہا کر دو اور مجھے اُس کی جگہ گرفتار کر لو۔ آپ نے سنا ایکسیلنسی! اُسے آزاد کر دیجئے۔ اور میں اُس کی جگہ پھانسی کے تختے پر . . . . . ."

"جلد بازی اچھی نہیں میڈموازیل" وہ اُسے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے بولا "آپ جو کچھ کہتی ہیں ذرا سوچ سمجھ کر کہیں . . . ."

"میں نے سوچ لیا ہے میں اُسے آزاد کرانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتی ہوں کیونکہ میں مجرم ہوں، پیشے کے لحاظ سے میں ذلیل اور درجۂ انسانیت سے گری ہوئی ہستی سہی، مگر میرے پہلو میں دل ہے، دل میں درد محبت ہے۔ میں اپنے جرم میں کسی بیگناہ کو پابند آلام دیکھنا نہیں چاہتی ہوں۔ میں آپ کی جیل کی سختیاں جھیلنے کو تیار ہوں۔ میں . . . . . ."

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے خاموش کر دیا اور بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا "میں اُجڈ اور نڈر سپاہی ہی سہی مگر محبت کی مجبوریوں سے خوب واقف ہوں، میں نے تم سے محبت کی۔ لیکن یہ میری بدقسمتی تھی کہ اُس میں مجھے کامیابی نہ ہوئی اور اب تک یہ حال ہے کہ میں تمہارے بغیر زندہ رہنا محال سمجھتا ہوں۔ نفسیاتِ انسانی سے پوری نہ سہی، تھوڑی بہت واقفیت مجھے ضرور ہے اور میں تمہارے درد کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں، محض تمہاری خاطر میں اتنا کر سکتا ہوں کہ ہر چند نکولائی ڈرانسکی کے خلاف فردِ جرم لگ چکی ہے، پھر بھی اُسے سزائے

سخت سزا دی جائیگی۔۔۔۔۔۔"

"خدا کا شکر ہے" بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔

"بلکہ اس کے بدلے چار سو دوسرے قیدی اس جرم میں عوام الناس کے سامنے ذبح کئے جائیں گے"

یہ سنتے ہی وہ خوف و دہشت سے لرز کر پیچھے ہٹ گئی اور اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔

"ابھی وقت ہے۔ کہ تم اپنا پاگلانہ اعتراف جرم واپس لے لو۔ اُسے پہلے چند دنوں کے بعد درد کا احساس بھی نہ ہوگا۔۔۔"

"مگر یہ ہی دیوانی" وہ روتے ہوئے گلے سے بولی" اتنے بڑے ہجوم کے سامنے سزا پانے کے بعد وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔ کیونکہ وہ بیگناہ ہے۔۔۔۔"

بورس نے اس کے الفاظ کو اَن سنا کر دیا اور بولا "میڈم مواریل ہم اس پرزہ کاغذ کو جلا دیتے ہیں۔ کیونکہ یہی تمہارے جرم کا آخری ثبوت ہے اور اس رات کا باقی واقعہ ہمارے سینوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن رہے گا۔"

"نہیں نہیں میں اعتراف جرم کا ایک لفظ بھی واپس لینے کے لئے تیار نہیں ہوں میں ضرور اس کی جگہ لوں گی۔ مجھ سے ایک بیگناہ آدمی اپنی جگہ سزا پاتے ہوئے دیکھا نہ جائیگا۔ میں ایسی زندگی سے مرنا بہت بہتر سمجھتی ہوں مگر اعتراف جرم سے انکار نہ کروں گی"

اس نے کاغذ جلانے کے لئے اٹھایا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا "خدا کے لئے سونیا سوچو جلد بازی سے کام نہ لو" اس کی آنکھوں میں ایک نیا خوف رقص کر رہا تھا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتی مجھ میں اتنی جرأت نہیں" وہ عزم صمیم کے ساتھ بولی "اپنے خونخوار کتوں کو بلایئے میں تیار ہوں"

ایک قدم آگے بڑھ کر وہ اس کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر اس نے منہ کو اوپر اٹھایا "میں تمہیں دل و جان سے پیار کرتا ہوں۔ میڈم مواریل۔ سوچو یہ کوئی مذاق کی بات نہیں موت و حیات کا معاملہ ہے اگر تم زندہ بچ گئیں تو چلنے پھرنے کے قابل نہ رہو گی کوڑوں کی مار سے تمہاری کھال اتر جائے گی نہیں نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔۔۔۔۔"

"میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے میں تیار ہوں"

"میرے خدا! میڈم مواریل تم پاگل ہو گئی ہو۔ دیکھتی نہیں کہ تمہاری اس ضد میں کتنی بڑی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس کے لہجے میں غصے کا عنصر غالب تھا۔

"نہیں میں اپنے ارادے سے باز نہیں آ سکتی"۔ وہ متانت بھرے لہجے میں بولی "میں محبت کرتی ہوں ایسی محبت جسے روسی جیلخانے کی سلاخیں، کوڑوں کی مار بھی فنا نہیں کر سکتی۔ اس کی محبت تیز و تند نشے کی طرح میرے دل و دماغ پر طاری ہو چکا ہے اور یہی کیفیت عمر بھر رہے گی"

"اف عورت کی اندھی محبت!" جنرل زیر لب بڑبڑایا اور پھر خیالات میں غرق کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یکایک وہ چلتے چلتے اس کے قریب آ کر رکا "تم بیوقوف ہو اور میری نظروں میں تمام محبت کرنے والے پاگل ہیں: ۔۔۔۔۔ ہر چند یہ میرے مسلک انصاف کے خلاف ہے پھر بھی تم سے دوبارہ استدعا کرتا ہوں کہ خدا کے لئے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔۔۔"

"مجھ سے بار بار نہ کہلوائیے ایکسیلنسی! میں فیصلہ کر چکی ہوں"

اس نے قلم نکال کر سرکاری کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور پھر گھنٹی بجا دی۔ گھنٹی بجتے ہی ایک نوجوان افسر اندر داخل ہوا، ہز ایکسیلنسی کے حسین مہمان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"تمہیں اس خاتون کے ہمراہ سینٹ پیٹرز کے جیلخانہ تک جانا ہوگا" جنرل تحکمانہ لہجے میں بولا اور پھر اس کے ہاتھ میں مہر شدہ مکتوب دے کر کہا "اور اس کو خود اپنے ہاتھوں سے کمانڈنٹ کو دینا ہوگا" وہ رکا اور غور بھری نظروں سے محبت کی راہ میں قربان ہونے والی خاتون کے سفید چہرے کو دیکھنے لگا، جس نے اسے بھی محبت کا ایک نہ بھولنے والا سبق دیا تھا "پھر اس کے بعد تم اس خاتون اور اس کے ہمراہی نوجوان کے ہمراہ سرحد تک جانا، تاکہ یہ صحیح سلامت سرحد پار کر جائیں۔ اچھا محل کے خفیہ دروازے پر میرا انتظار کرو!" افسر نے سلام کیا اور جانے کے لئے گھوما۔ دروازے کے قریب ہز ایکسیلنسی کی آواز ایک دفعہ پھر اس کے کانوں تک آئی۔ وہ گھوما "یاد رکھو! خاموشی اکثر ترقی کا باعث ہوتی ہے سمجھے!" ایڈی کیمپ نے دوبارہ سلام کیا اور باہر نکل گیا۔ جنرل دوبارہ کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا، کاغذات کی دیکھ بھال کرنے لگا، مگر ایک ہلکی سی سسکی نے اسے منہ اوپر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

"اوہ میڈم مواریل! آؤ، تم انتظار کیوں کر رہی ہو۔ کیا تم دیکھتی نہیں میں تنہا ہوں۔ یہاں میرے قریب آ جاؤ۔۔۔۔۔" اس کے لہجے سے ہمدردی کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ آگے بڑھ آئی۔ "آپ نے اسے آزاد کر دیا" وہ ہچکیوں کے درمیان رک رک کر بولی اور پھر اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر سونیا نے اس کے ہاتھ کو سے تھام لیا اور اپنے تپتے ہوئے ہونٹ اس پر جما دیئے "خدا آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے ایکسیلنسی!" وہ پرجوش بوسے کے بعد بولی۔

"آنسو مت بہاؤ میڈم مواریل!" جنرل روندھے ہوئے گلے سے

"قسمیں تمہارا محبوب مل گیا۔ اب اُس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
"میں آپ کے اس احسانِ عظیم کا کس طرح بدلہ دے سکتی ہوں ایکسیلنسی!"
جنرل نے اُس کے پھول سے نازک ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور غمگین نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میڈم ماڑیلا تمہاری محبت نے ایک ہم ایسے وفادار سپاہی کو شہنشاہ روس کا غدار بنا دیا۔ ۔ ۔ اور وہ شیریں خواب جو مجھ سا بیوقوف بڈھا ایک عرصے سے دیکھ رہا تھا قضا وقدر کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے منتشر ہو گیا" اُس نے آہ بھری "اگر ناگوارنہ ہو تو کیا مجھے وہ پھول عنایت کر سکتی ہو جو تمہارے سینے پر لگا ہوا ہے اور جب کبھی اس کی پتیاں زرد ہو

مرگی کی لاثانی دوا

مرگی کیورر جسٹرڈ - مرض مرگی کتنا ہی پرانا ہو اس کے چند خوراکوں سے فائدہ معلوم ہونے لگتا ہے اور چند روز کے مسلسل استعمال سے مکمل صحت ہو جاتی ہے ایک ماہ کی دوا کی قیمت دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

ڈاکٹر مہدی حسین اینڈ سنس ڈاکخانہ سکندر پور ضلع بلیا

...یت کے پورے وارثوں کی دیواریں بنا دیا آپکی حفاظت کریگی

اگر نہیں

...کے متعلقین کی یقیناً حفاظت کر سکیں گے بشرطیکہ آپ ہمارے پاس بیمہ شدہ ...سول افراد کے لئے اقساط مقررہ میں بغیر کسی اضافے کے جنگی خطرات کی ذمہ ...لی جاتی ہے۔ سابقہ اداشدہ بیمہ جات کی رقم ۲۶،۰۰،۰۰،۰۰۰ روپے سے ...۵۔ بیمہ جات رواں کی مالیت ۸۵،۵۰،۰۰،۰۰۰ روپے سے زیادہ ...۱۹۴۲ء کے لئے سالانہ آمدنی قریباً ۵،۰۰،۰۰،۰۰۰ روپے۔ کل ...یہ ۳۰،۰۰،۰۰،۰۰۰ روپے

...ل داس سونی ایف سی آئی (لاڈ بزنگ) ایف۔ آر۔ ای۔ ایس (لندن)
مراتب سکریٹری

...ٹل گورنمنٹ سیکورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۴/۴ سی - دی مال - لاہور
بمبئی ——— قائم شدہ ۱۸۷۴ء



آنریبل ڈاکٹر سر محمد ظفر اللہ خاں صاحب کے سی آئی ایس

ایجنٹ جنرل متعینہ چین تحریر فرماتے ہیں

"میرے بائیں بازو کا پھوڑا جو میں نے آپ کو دکھایا تھا مجھے پچھلے دو سال سے تکلیف دے رہا تھا میں نے اس پر کئی ایک دوائیں برتیں لیکن سب بے فائدہ۔ میں بمسرت کہتا ہوں کہ "دلروز" کی دو چھوٹی شیشیوں نے اس کو بالکل اچھا کر دیا جس کے لئے میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔" (ترجمہ انگریزی)

دلروز (رجسٹرڈ)

بغیر اپریشن، ڈریسنگ اور نہانے کی ممانعت کے ہر قسم کے پھوڑے پھنسی - لاہور سور - ناسور - بھگندر - داد - کھرالی - گلٹی - چنبل - چنڈی - مسہ و مہاسہ کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیتی ہے۔ قیمت عہ - عہ - ۸ ر

حکیم طاہر الدین اینڈ سنز

دلروز ویلا ——— فیروز پور روڈ ——— لاہور

شیریں خواب کی پریشانی کی یاد دلایا کریں گی۔ ۔ ۔ ۔ اچھا شب بخیر!

اُس نے نہایت ملائمت کے ساتھ اُسے سہارا دیکر گاڑی سے باہر نکالا

زمانے کا پیغام

نظم

از حضرت محمود اسرائیلی

زندہ کرتا ہی رہا دنیا کو ہر دن آفتاب
دن پلٹتے ہی رہے ہم رنگِ اوراقِ کتاب

آبشاروں سے نئے نغمے نکلتے ہی رہے
موج کی تحریریں دریا بھی بدلتے ہی رہے

بحر کے سانچوں میں تیغِ موج ڈھلتی ہی رہی
اور حبابوں کی کٹوری بھی پگھلتی ہی رہی

ریگِ صحرا اپنے ٹیلے منتقل کرتا رہا
اور غباروں میں بگولا اپنا دم بھرتا رہا

صحنِ عالم کچھ نئے گلشن کھلاتا ہی رہا
اور ہر گلشن نئی خوشبو سنگھاتا ہی رہا

چرخ پر کلکِ شفق کرتی رہی نقش و نگار
اور دکھاتی ہی رہی ہر لحظہ تازہ شاہکار

تیرے دل کی سطح پر خاکہ جو اک بوسیدہ ہے
کیا غضب ہے آج تک تو اس کا ہی گرویدہ ہے

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی و ادبی معیاری ماہناموں میں سب سے زیادہ چھپتا ہے!

جلد ۳۹ — فہرست مضامین ماہ مارچ ۱۹۴۳ء — نمبر ۳

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا سے شائع کیا۔

عالمگیر تاریخ نمبر ۱۹۴۳ء

تاریخی مضمونوں، تاریخی افسانوں، تاریخی ڈراموں اور تاریخی نظموں کا لاثانی مرقع

قارئین سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ کاغذ بالِ ہما کی طرح بازار میں نایاب ہو چکا ہے اور اگر تھوڑی بہت مقدار میں دستیاب بھی ہو جائے تو نرخ اس درجہ گراں ہوتے ہیں کہ ایک اوسط درجے کا ماہنامہ اسے خریدنے کی استطاعت نہیں پاتا۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ حکومت ہند کی طرف سے اخبارات کیلئے "جو کوٹا سسٹم" مقرر ہے "عالمگیر" اس سے بھی استفادہ نہیں کر سکا۔ ان مشکلات کے باوجود ادارہ عالمگیر محض قادر مطلق کے بھروسے پر "تاریخ نمبر" کی اشاعت کا اعلان کر رہا ہے۔ "تاریخ نمبر" حسب سابق یکم اپریل ۱۹۴۳ء کو منظر عام پر آجائیگا۔ یہ "تاریخ نمبر" کن علمی و ادبی اور تاریخی و تحقیقی خصوصیات کا حامل ہوگا؟ اس کا جواب "عالمگیر" کے گزشتہ "تاریخ نمبر" ہی دے سکیں گے۔ ادارہ عالمگیر اسے ہر لحاظ سے بلند پایہ، وقیع اور دلکش بنانے کی کوشش میں شبانہ روز مصروف ہے۔ مضامین اور افسانے فراہم ہو چکے ہیں جن پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نمبر تاریخی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کریگا اور اس کے تقریباً ۱۳۶ صفحات میں مورخانہ تحقیق و تجسس کی ایک حیرت انگیز کائنات سمٹی ہوئی نظر آئیگی۔ "تاریخ نمبر" عالمگیر کے سالانہ خریداروں کی خدمت میں مفت پیش کیا جائیگا!

ضخامت ۱۳۶ صفحات

قیمت ایک روپیہ

مینیجر "عالمگیر" لاہور

ملاحظات

انجار نویس کی مثال اس گلچیں کی سی ہے جو محض اپنے ذوق جمالیات کو
رنے کیلئے کالے کوسوں کا سفر اختیار کرے۔ اور دشوار گزار پہاڑوں وَ
ادیوں میں گھوم کر گلہائے رنگارنگ جمع کرے اور ان کا ایک باصرہ نواز
تیار کرکے تنہا لطف اندوز نہ ہونا چاہیے بلکہ دوسروں کو بھی "دعوت
دے۔ اور انتظامی مصارف سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک برائے
چندہ عاید کردے۔ "عالمگیر" برابر اُنیس برس سے اسی حسین مشغلہ" میں
ہے اور حوادث زمانہ کی انقلاب انگیزیاں بھی اس کے پائے استقلال
ن پیدا نہیں کرسکیں لیکن آرام کرسی پر لیٹ کر ایک عام اخبار بین
ن مشکلات و مصائب کے طوفان کا تصور بھی نہیں کرسکتا جس میں سے
لک جریدہ نے یہ گلدستہ مضامین تیار کیا ہوتا ہے۔ ہم بھی اس درد آفریں
چھیڑ کر قارئین کے آرام و سکون میں خلل نہیں ڈالنا چاہتے لیکن تفصیل
ئے بغیر عالمگیر کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ؎

صد نالۂ شب گیرے صد صبح بلاخیزے
صد آہ شرر ریزے ایک شعر دلآویزے

کاغذ کی گرانی کا تذکرہ ان صفحات میں بارہا ہوچکا ہے اور جی تو نہیں چاہتا
ماہ بھی یہی راگ الاپا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے کاغذ کا مسئلہ اس درجہ اہم
ہے کہ اسی پر رسالہ کی حیات و موت کا دارومدار ہے۔ اس لئے مجبوراً
پنے "درد دل" میں قارئین کو بھی شریک کرنا پڑتا ہے۔ اس میں شک
جب سے طوفان جنگ برپا ہوا ہے ہر چیز کی قیمت میں دن دگنا
ہوگنا اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن جتنا اضافہ کاغذ کے نرخوں میں ہوا ہے
ید کسی ضروری شے کی قیمت میں نہ ہوا ہوگا۔ چنانچہ جنگ سے
غذ کا جو رِم اڑہائی تین روپیہ میں بآسانی مل جاتا تھا اور ہم اس
آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے۔ اب ۳۵۔ ۴۰ روپے
دستیاب نہیں ہوتا۔ عام اخبارات کے پاس تو "سرکاری کوٹے"
ہیں جن کے ذریعہ سے وہ انضباطی نرخوں پر کاغذ کے حصول کا
بست کرلیتے ہیں لیکن "عالمگیر" اس "چشمہ فیض" سے بھی محروم ہا
ئے قدرتی طور پر ہمارے مجموعی مصارف میں پندرہ بیس گنا
ہوچکا ہے اور اس کے مقابلہ میں ذرائع آمد مسدود ہوچکے ہیں

آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

قارئین یہ سن کر تعجب کریں گے کہ "عالمگیر" کے ایک صفحہ کی لاگت تیرہ چودہ روپے سے کم نہیں ہے۔ گویا اگر رسالہ کی ضخامت ساٹھ صفحے ہو تو ایک پرچے پر کم سے کم سات آٹھ سو روپیہ خرچ آتا ہے لیکن قارئین سے ہم صرف چھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے چندہ وصول کررہے ہیں اب آپ خود ہی غور فرما لیجیئے کہ ہمارا سالانہ بجٹ متوازن کیونکر ہوتا ہوگا؟ اس کا جواب یہ اور صرف یہ ہے کہ "ہذا من فضل ربی"۔

ان حالات کے باوجود عالمگیر کو زندہ رکھنے کے لئے ہر ممکن قدم اٹھایا جارہا ہے اور ہماری دلی خواہش ہے کہ شمع عالمگیر کو جنگ کی آندھیوں کے ہجوم میں بھی روشن رکھا جائے۔ چنانچہ ہم پوری کوشش کررہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح عالمگیر کا سفینہ جنگ کے خونیں طوفان میں سے گزر کر امن و عافیت کے ساحل پر پہنچ جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب تک قارئین کی معاونت شامل حال نہ ہو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ؎

مابداں مقصد عالی نتوانیم رسید
ہاں مگر لطف شما پیش نہد گامے چند

لہٰذا قارئین سے درخواست ہے کہ وہ نہ صرف اپنی خریداری کا سلسلہ قائم رکھیں بلکہ عالمگیر بکڈپو سے مطبوعات بھی طلب فرما کر عالمگیر کے فنڈ کو تقویت پہنچائیں۔

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ "عالمگیر" کا حلقہ معاونین روز بروز وسیع ہو رہا ہے لیکن ہمارے وسائل چونکہ محدود ہیں اس لئے ہم اپنے دامن کو ان کی خواہش کے مطابق تو پھیلا نہیں سکتے البتہ ہمیں اس دن کا انتظار ہے جب جنگ کا طوفان ختم جائیگا۔ "جنگ کے آقا" تخریب کے بعد تعمیر میں مصروف ہونگے، سمندری رستے صاف ہوجائیں گے بازاروں میں کاغذ کے گٹھے پھر سے نظر آنے لگیں گے، ان کاغذ فروشوں کی اکڑی ہوئی گردن میں خم پیدا ہوجائیگا جو آج خریدار سے سیدھے منہ بات بھی کرنا پسند نہیں کرتے اور ہم عالمگیر کے گلکدہ کو زمانہ قبل از جنگ کی طرح ایک مرتبہ پھر آراستہ و پیراستہ کرکے امیر مینائی کے الفاظ میں قارئین سے کہہ سکیں گے ؎ قاضی و محتسب شہر سدھارے حج کو
میکشو! خوب ہوئی حلق کی دربان گئے

سخنہائے گفتنی

تاریخ نمبر کے مضامین

"تاریخ نمبر" شایع کرنے کا ارادہ تو نہ تھا لیکن ادارہ عالمگیر "اقدام معکوس" یا "جمود عارضی" کا قائل نہیں ہے۔ لہذا گوناگوں مشکلات کے باوصف ہم یہ اعلان کرنے میں مسرت محسوس کرتے ہیں کہ حسب معمول یکم اپریل کو عالمگیر کا معرکۃ آرا تاریخ نمبر شایع ہوگا جس میں تحقیقی مقالات کے دوش بدوش تاریخی افسانے اور تاریخی ڈرامے بھی شامل ہونگے اس کے علاوہ ہندوستان کے مسلم الثبوت شعرائے کرام کا تازہ کلام بھی ہدیہ قارئین ہوگا۔ مضامین کا حصہ مکمل ہو چکا ہے جو اہل قلم معاونین تاریخی ڈرامے یا تاریخی افسانے ارسال فرمانا چاہیں وہ اپنے رشحات گرامی ۱۵ مارچ تک دفتر میں ضرور بھیجدیں لیکن ڈراما یا افسانہ کسی صورت میں بھی عالمگیر کے تین یا چار صفحات سے زیادہ نہ ہو ورنہ عدم اشاعت کی شکایت بسود ہوگی۔

چار آنے کے ٹکٹ

جن معاونین کرام کی خریداری کا سلسلہ "خاص نمبر" یا "سالانہ نمبر" سے شروع ہوتا ہے تاریخ نمبر ان کی خدمت میں بلاقیمت ارسال ہوگا لیکن اگر وہ چاہتے ہیں کہ تاریخ نمبر ان کو بحفاظت مل جائے اور ڈاک میں گم نہ ہو تو یہ اعلان پڑھتے ہی چار آنے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں تاکہ تاریخ نمبر ان کی خدمت میں بصیغۂ رجسٹری روانہ کیا جائے کاغذ چونکہ بیحد مہنگا ہے اس لئے عدم وصولی کی شکایت آنے پر "تاریخ نمبر" دوبارہ نہ بھیجا جا سکے گا۔ ٹکٹوں کے ساتھ خریداری نمبر کا حوالہ ضرور ہو ورنہ تعمیل نہ ہو سکے گی۔

تاریخ نمبر کے وی پی

جن معاونین کرام کا سالانہ چندہ ماہ مارچ میں ختم ہوتا ہے۔ "تاریخ نمبر" ان کی خدمت میں آئندہ سال کے چندہ کے لئے بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا۔ امید ہے وہ اپنی ادب نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے وی۔ پی ضرور وصول فرمالیں گے۔

نمبر خریداری

دفتر عالمگیر اپنے کرمفرماؤں کی ہر جائز شکایت کو رفع کرنے کے لئے تیار ہے لیکن خریداروں کی تعداد چونکہ بہت زیادہ ہے اور منیجر کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ہر خریدار کا نام و پتہ زبانی یاد

قارئین کی توجہ کیلئے

از:- ادارہ

رکھ سکے اس لئے معاونین کرام کو خط و کتابت میں اپنے "خریداری نمبر" کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے یہ نمبر چٹ کے اوپر دائیں کونے میں لکھا ہوتا ہے۔ از راہ نوازش نوٹ فرما لیا جائے کہ آئندہ ایسے شکایت ناموں کی تعمیل نہ ہو سکے گی جن میں خریداری نمبر کا تذکرہ نہ ہوگا۔

اگر پرچہ نہ ملے

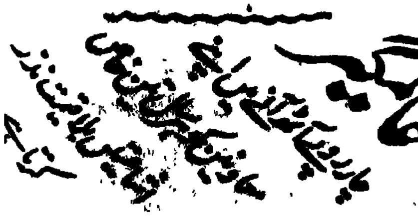
عالمگیر ہر ماہ خریداروں کی خدمت میں دو مرتبہ پڑتال کرکے حوالہ ڈاک کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بعض حضرات کو شکایت ہوتی ہے کہ انھیں پرچہ نہیں ملا۔ اس صورت میں پہلے تو مقامی ڈاکخانے سے استفسار کرنا چاہیئے اس کے بعد اسی ماہ کی ۱۵ تاریخ سے پہلے پہلے دفتر کو مطلع کیا جائے۔ ورنہ پرچہ دوبارہ ارسال خدمت نہ ہو سکے گا۔ یہ اچھی طرح نوٹ کر لیا جائے۔

"عالمگیر" کا نمونہ

بعض حضرات عالمگیر کا نمونہ "مفت" طلب فرماتے رہتے ہیں۔ بظاہر اس تکلف کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ "عالمگیر" ۱۹ برس سے باقاعدہ شایع ہو رہا ہے اور اب محتاج تعارف نہیں۔ لہذا بہتر تو یہی ہے کہ جو شائقین عالمگیر کا نمونہ ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں وہ کسی نیوز ایجنٹ یا وہیلر کے کسی ریلوے بک سٹال کے یہاں دیکھ لیں اگر یہ بھی ممکن نہ ہو سکے تو دفتر میں نمونہ کے لئے چھ آنے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہو سکے گی۔

مطبوعات کی قیمتوں میں اضافہ

کاغذ چونکہ بیحد مہنگا ہو چکا ہے اس لئے یکم مارچ سے "عالمگیر بکڈپو" کی تمام مطبوعات کی قیمتوں میں ۲۵ فیصدی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ زیر نظر اشاعت میں عالمگیر بکڈپو کی نظر ثانی کی ہوئی فہرست کتب شائع کی جا رہی ہے۔ قارئین اور تاجران کتب نوٹ فرمالیں۔



[حق]ائق و معارف

مادی اور روحانی انقلابات میں فرق

از ـــــــ مولنا ابوالکلام آزاد

ا ایک تماشا گاہ حوادث ہے جس کے مناظر دم بدم متغیر
ہتے ہیں اُس کا نقاب جسم و صورت ایک جلوۂ نیرنگی و بوقلمونی
ادث و انقلابات عالم کے ہاتھوں ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔
ہے اور تجدد و تبدل کے قانون سے کائنات کی کوئی
نہیں جس طرح انسان کی عظیم الشان آبادیوں اور بحر و بر
ڑے رقبوں میں انقلابات و تبدلات ہوتے رہتے ہیں۔
ن غیر مرئی ذرّوں میں بھی ایک محشر تغیرّ اور رستخیز تجدّد
ہیں سے جسم کائنات کے اجزاء طبیعیہ ترکیب پاتے ہیں
قدر چھوٹے ہیں کہ انہیں انسان کی چشم غیر مسلح نہیں

، انقلابات کا ایک بڑا نمونہ مظاہر فطرت کا نمود اور کائنات
، تغیرات طبیعیہ ہیں جو آغاز تکوین سے جاری ہیں اور جنہوں
علوم کتنی مرتبہ کرۂ ارضی کا نقشہ بدل دیا ہے۔ مثلاً وہ
طبیعیہ جن کی وجہ سے دریا خشک ہوگئے۔ زمین کے
ے رقبے سمندر میں مل کر فنا ہوگئے، دریاؤں نے اپنا
دیا اور اپنی روانی کی جگہ خشکی کے بڑے بڑے ٹکڑے
یئے۔ بحر اطلانطک میں کبھی بے شمار جزیرے تھے آج
ی دریائی موجیں اسی میں اُٹھتی ہیں۔ بحر عرب اور قلزم
ان بہت بڑا حصۂ ارضی حائل تھا۔ مگر چند قرون حوادث
ے بعد اتنا کہ رہ گیا کہ با آسانی ملا دیا گیا۔ یا مثلاً وہ انقلابات
فشاں پہاڑوں کے پھٹنے سے آئے اور دُور دُور تک انہوں
سطح بدل دی۔ یا وہ ہولناک زلزلے جنہوں نے ایک
و تہ و بالا کر دیا اور خشکی کے نشیب میں بالائی سطح کے
ئے۔ اسی طرح وہ انقلابات ارضیہ جو علم طبقات الارض
یہ سے ہمیشہ آتے رہتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے
بدلتے، خشکیوں کے قطعات غرق ہوتے اور
ی اور زندگی کی جگہ موت طاری ہو جاتی ہے۔
شہ گاہ ہستی کا ایک بہت بڑا منظر وہ تغیرات

بھی ہیں جن کے طوفان ملکوں اور قوموں کے اندر اُٹھتے ہیں۔ اور بڑی بڑی آبادیوں کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ حتّٰے کہ آبادیوں کی جگہ ویرانیوں سے مبدّل ہو جاتی ہے۔ صحراؤں کی جگہ شہر بس جاتے ہیں۔ زندگی کی رونق پر موت کا سناٹا چھا جاتا ہے اور انسانی عیش و نشاط کے بڑے بڑے محل مدفن قبور و مقبرہ اموات و خرابۂ سلب و نہب ہو کر نابود و مفقود ہو جاتے ہیں۔

وکم اھلکنا من قریۃ ـ اور کتنی ہی آبادیاں ہیں جنہیں ہم
بطرت معیشتھا فتلک ـ نے ہلاک کر دیا حالانکہ اسباب
مساکنھم لم تسکن من بعدھم ـ حیات و معیشت سے وہ مالا مال
الا قلیلا وکنا نحن الوارثین ـ تھیں۔ یہ بربادی کے خرابے اور
تباہی کے کھنڈر انہی لوگوں کے گھر ہیں جو پھر آباد نہ ہو سکے اور آخرکار اُن کے مال و متاع کے ہم ہی وارث ہوئے۔

سکندر اعظم نے ایران کو جلا کر تباہ کر دیا، ایرانیوں نے بابل کی اینٹیں بجا دیں، بخت نصر نے بیت المقدس کو ویران کر کے بنی اسرائیل کو کئی قرنوں تک مقید رکھا، رومیوں نے ایشیا اور افریقہ کی آبادیاں بارہا غارت کیں۔ تاتاریوں کے اوّلین ظہور نے روئے الکبرٰے کی تاریخ ختم کر دی تھی۔ اور جرمنی کے وحشیوں نے تمدن قدیم کا نقشہ بدل دیا تھا۔ وتلک الایام نداولھا بین الناس۔

لیکن یہ تمام انقلابات عالم جسم و ظاہر کے تغیرات ہیں جو صرف دریاؤں اور خشکیوں کو، آبادیوں اور صحراؤں کو پہاڑوں اور جنگلوں کو، انسانوں کے بسائے ہوئے شہروں اور اُن کے مکانوں کی اینٹوں اور پتھروں کو بدل دیتے ہیں۔ اور اُن کے اندر سلطان تغیر و تقلب کی قوت اس سے زیادہ طاقتور نہیں ہوتی۔

لیکن اِن انقلابات سے بھی بالاتر ایک عالم تغیر و تبدل ہے جس کے انقلابات کی حکومت صرف مادے کی نمود اور جسم کی صورت ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی آگے تک نکل گئی ہے۔ پہلے قسم کے انقلابات مٹی کے ذروں، اینٹ پتھر

کے مکانوں اور انسان کے جسموں اور صورتوں کو بدل دیتے ہیں۔
پر یہ انقلابات رُوحوں اور دلوں کی کائنات کو منقلب کر ڈالتے
ہیں اس عالم کے بحرِ ذخار کے طوفان دُنیا کے طوفانوں کی طرح نہیں
ہیں جو سمندروں میں اُٹھتے ہیں اور کناروں سے ٹکرا کے رہ جاتے
ہیں بلکہ اس کی موجوں کا منبع آسمان کے اُوپر ہے، جہاں سے وہ
جوش کھاتی ہوئی اُبلتی ہیں، اور کرۂ ارضی کی سطح پر گرتی ہیں۔

اس کے اندر جب زلزلے اُٹھتے ہیں تو صرف زمین کے محدود
رقبوں ہی کو جنبش نہیں دیتے بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پُورے کرۂ
ارضی کو ہلا دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کی پیدا کی ہوئی جنبش نظامِ اعتقاد و
عمل کے اندر حرکت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے آتش فشاں پہاڑوں
کی آتش فشانی صرف پتھروں کے اُڑانے ہی میں صرف نہیں ہو جاتی
بلکہ جب اس کے پہاڑ پھٹتے ہیں تو انسانی اعتقادات و اعمال
کی بڑی بڑی اقلیموں کو اُڑا کر نابود کر دیتے ہیں۔ پہلے قسم کے
انقلابات شہروں کو ویران کرتے ہیں، پر یہ انقلاب وہ ہیں
جو دلوں کی اُجڑی ہوئی بستیوں کو آباد کر دیتے ہیں۔ اُن کی فتح و
تسخیر جسم و زمین کی ہوتی ہے، مگر ان کا احاطہ قلب و
معنی کا ہوتا ہے۔ وہ زمین کی تبدیلیاں ہیں جو زمین والے
انجام دیتے ہیں، مگر یہ آسمانی تبدیلی ہے جسے ارواحِ سماویہ
کا نزول و ورود پُورا کرتا ہے۔ وہ ویرانی اور موت لاتے ہیں۔
مگر یہ آبادی اور زندگی کی بشارت دیتے ہیں۔ وہ جسموں کو بدلتے
ہیں جو فانی ہیں، مگر یہ رُوحوں کو بدل دیتے ہیں جو دائمی زندگی
پاتی ہیں۔ ان کا شہریار زمین کے رقبوں اور انسان کے جسموں کو مسخر
کرتا ہے تا اپنی بادشاہت کا تخت بچھائے، پر اس اقلیم کا
فاتح جب اُٹھتا ہے تو زمین کی جگہ آسمان کی برکتوں اور انسانوں
کے جسموں کی جگہ اُن کی رُوحوں کو فتح کرتا ہے تا خدا کے تخت
جلال و کبریائی کا اعلان کر دے!

فی الحقیقت یہی تغیرات دُنیا کے اصلی انقلابات ہیں
جن سے کائنات انسانیت کا نقشہ حیات و ممات ممتاز و بدلتا
رہتا ہے اور جن کی بدولت دُنیا کی سعادت و ہدایت کا قیام
اور عالم انسانیت کی ابدیت رُوحانی و امنیت قلبی کو بقا

ہے۔ ان رُوحانی انقلابات کے آگے مادّی انقلابات پامال
ہیچ ہیں اور اُن کے سلطان تجدد و تبدل کی دائمی و عالمگیر
طاقت کے آگے زمینوں اور مکانوں کے انقلابات کچھ حقیقت
نہیں رکھتے۔ اُن کی ہستی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ زمین کے چند
رقبوں کو بدل دیں یا چند لاکھ انسانوں کو نابود کر دیں لیکن
یہ انقلابات کروڑوں انسانوں کے اُن اعتقادات و اعمال
کو بدل دیتے ہیں جو صدیوں سے اُن کے دلوں میں جاگزیں
ہوتے ہیں، اور اُن عالمگیر گمراہیوں اور تاریکیوں کو نابود
کر دیتے ہیں جو تمام سطح ارضی پر چھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ دریاؤں
کو خشک کر دینا آسان ہے اور زمین کو سمندر بنا دینا مشکل
نہیں، پر کروڑوں رُوحوں اور دلوں کو بدل دینا بہت مشکل ہے
جس کی قوت مادّہ کی طاقتوں کو نہیں دی گئی۔

سکندر اعظم نے نصف دُنیا فتح کر لی لیکن وہ ایک
دل کو بھی فتح نہ کر سکا۔ رومیوں نے کیسے کیسے عظیم الشان شہر
بسا دیئے لیکن دلوں کی اُجڑی ہوئی بستی نہ بسا سکے۔ بخت نصر
اتنا طاقتور تھا کہ ایک پُوری قوم کو اس نے قید کر لیا اور ستر
برس تک غلام بنائے رکھا، لیکن بایں ہمہ وہ اُن میں سے
ایک دل کو بھی اپنا غلام نہ بنا سکا۔ ایرانیوں نے بابل کے لاکھوں
انسانوں کو قتل کر دیا۔ لیکن وہ ایک رُوح کی گمراہی کو بھی قتل
نہ کر سکے۔ بلاشبہ دُنیا میں بڑے بڑے مادی انقلابات
گزر چکے ہیں، جنہوں نے عجب نہیں کہ درمیان کی زمینیں کاٹ
کے سمندروں کو باہم ملا دیا ہو، لیکن کسی کی طاقت یہ
نہ کر سکی کہ ایک انسان کو بھی اس کے خدا سے ملا دے، حالانکہ
وہ اس سے دُور نہیں: ونحن اقرب الیہ منکم ولکن
لا تبصرون۔

پس مادی طاقتوں کی تبدیلیاں کتنی ہی مہیب اور
ہولناک ہوں مگر وہ عظمت و جلال نہیں پا سکتیں جو رُوحانی
انقلابات کے ایک چھوٹے سے چھوٹے ظہور کو
حاصل ہے۔

حلقۂ آغوش

"جتنے دیوانے ہیں لڑتے ہیں کہ ہم کو ہوش ہے"

از:- مولانا اظہر امرتسری

عالمِ امکاں ترے ہی رعب سے خاموش ہے
ورنہ ذرہ ذرہ صد ہنگامہ در آغوش ہے

تنگ ہے کیوں مجھ پہ یارب عرصۂ عیش و نشاط
یہ بھی کوئی اس حسیں کا حلقۂ آغوش ہے

کس کا نغمہ چاندنی کی موج میں ہے جلوہ گر
عالمِ شب کا ہر اک ذرہ سراپا گوش ہے

فائدہ جامِ ازل سے کیا کہ میں بیہوش تھا
لطف تو جب ہے پلاؤ اب کہ مجھکو ہوش ہے

آج جو کچھ دیکھتا ہوں کل سمجھتا تھا وہی
عالمِ امروز کیا تعبیرِ خوابِ دوش ہے

پوچھ اے حسن اس سے خاموشی کی باتوں کا مزا
جو تری تاکیدِ گویائی پہ بھی خاموش ہے

ہر طرف جلوہ نما ہے اپنی ہی فطرت کا عکس
اس جہاں کا ذرہ ذرہ آئینہ بردوش ہے

کاش کچھ اڑتے ہوئے ہوش اس کا دے جائیں جواب
چشمِ ساقی پوچھتی پھرتی ہے کس کو ہوش ہے

زندگی کی رات کا انجام بھی ہے دیدنی
شمع سر دھنتی ہے بیمارِ حزیں خاموش ہے

کس نے باہیں ڈال دیں میرے گلے میں پیار سے
دل تو کہتا تھا کہ وہ بیگانۂ آغوش ہے

میں اٹھا سکتا تو ہوں اس کی نگاہوں سے نقاب
لیکن اے دل کس طرح ثابت ہو تجھ کو ہوش ہے"

دیکھتا ہوں جس طرف ہیں الفت و عشرت کے پھول
باغِ دنیا ہے کہ تیرا حلقۂ آغوش ہے

ہوش والوں کو ملایا کس کی چشمِ مست نے
"جتنے دیوانے ہیں لڑتے ہیں کہ ہم کو ہوش ہے

کون ہے زندہ جسے ہے آرزوئے زندگی
جو ہے دنیا میں وہ تابوتِ فلک بردوش ہے

چپ ہوں تو پردے پردے میں تڑپ اٹھتی ہے بزم
میری خاموشی حجابِ نالۂ پُرجوش ہے

ان اشارات کے نشے سے بل کھاتا ہوا
ہر تجلی صبح کی کھولے ہوئے آغوش ہے

شاید اظہر توڑ کر توبہ ہوا ساغر بکف
میکدے میں شام ہی سے شورِ نوشا نوش ہے

نہ جانے کیوں؟

بھرپور چاندنی رات تھی۔ صحن میں آرام کرسی پر رخشاں آپا اپنے جسم کو ڈھیلا کئے پڑی تھیں۔ ان کی خوبصورت آنکھیں اس طرح کھلی ہوئی تھیں جیسے وہ کوئی بہت ہی دردناک منظر دیکھ رہی ہوں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے گھنگھریالے بال جو چوٹی کے بندھنوں سے کسی سرکش کی طرح آزاد تھے ہوا کے نرم نرم مسلسل جھونکوں سے ان کے سفید رخساروں پر ننھی ننھی سپنولیوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ ان کے عنابی لب انتہائی محویت میں کسی نوشگفتہ کلی کی طرح کھلے ہوئے تھے جس میں سے ان کے دانت آبدار موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں برآمدے کے ایک ستون سے سہارا لئے ان کی یہ دلکش خود فراموشی دیکھ رہی تھی۔ گو میرے لئے ان کی یہ محویت کچھ نئی نہ تھی۔ وہ کچھ دنوں سے اکثر کچھ کھوئی کھوئی سی رہتیں۔ ان کی ہر وقت تھرکتی رہنے والی پتلیاں اب ساکت رہا کرتیں ان کے قہقہوں میں وہ پہلی سی بے فکری اب مفقود تھی۔ اب ان کی دلکش گفتگو میں غم کی تلخیاں جھلکتی تھیں۔ بارہا میں نے دیکھا کہ بات کرتے کرتے وہ کچھ اس طرح خاموش ہو جاتیں جیسے کچھ بھول گئی ہوں۔ میں ان کی یہ حالت دیکھتی اور دل ہی دل میں بہت کڑھتی۔ کئی بار میں نے چاہا کہ ان سے ان کی حالت پر گفتگو کروں لیکن نہ جانے کیوں میں اپنے ارادے کو ملتوی کرتی رہی۔

"رخشاں آپا!" میں نے انہیں چونکا دیا۔

"کہو شاداں!" وہ مجھے عجیب عجیب نظروں سے تکنے لگیں۔

"یعنی آپ تو بالکل غیر حاضر رہنے لگیں۔" میں ان کے دل کو ٹٹول رہی تھی۔ ان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ میں نے بات بدل کر کہا۔

"واہ! آپ تو بالکل آدم بیزار ہو کر رہ گئیں۔ اللہ نہ کرے آپ جیسا کوئی بے مروت ہو۔ کوئی چاہے کوئی ٹھکرائے۔"

میرے آخری فقرے پر وہ کچھ پریشان سی ہو گئیں۔

"اب تو بہت باتونی ہو گئی ہے۔" وہ پہلو بدل کر بولیں اور پھر میرے منہ پر پیار سے ایک ہلکا سا تھپڑ مار دیا۔

"تو پھر چلئے نا وہاں۔"

دلگداز رومان

از محترمہ ہاجرہ مسرور

"کہاں بھئی؟" وہ کرسی پر کسمسا گئیں۔

"روفی بھائی کے پاس۔ تھوڑی دیر تاش کھیلیں گے۔ بیچارے کل تو چلے جائیں گے اپنی سسرال۔" میں نے ان کا سرد ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ارے ٹھہر تو چلتی ہوں۔ تو نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔" وہ طوعاً و کرہاً میرے ساتھ ہو لیں۔

روفی میرے رشتہ کے بھائی تھے۔ وہ اکثر ہم لوگوں کے بلانے سے آجاتے تھے اور اب کی تعطیلوں میں بھی ہم لوگوں نے کھینچ ہی بلایا تھا حالانکہ قاعدے سے تعطیلیں ان کو اپنی سسرال میں گزارنا چاہئے تھیں روفی بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ مگر میں سب کو چھیڑتے خصوصاً رخشاں آپا کے تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے رہتے تھے۔

"اخاہ! آئیے آئیے آپا جان!" روفی اپنے مخصوص انداز میں تاش پھینٹتے ہوئے بولے۔ وہ رخشاں آپا کو چڑھانے کی غرض سے آپا جان ہی کہا کرتے تھے۔ وہ مسکرا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"بھئی کون کس کا پارٹنر رہے گا؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو آپا جان کو ہرگز اپنا پارٹنر نہ بناؤں گا کیونکہ مجھے تو ان کو ہرانے میں لطف آتا ہے۔" وہ آنکھیں گھما کر بولے۔

"نہ بنایئے، یہ تمنا کس کافر کو ہے۔" آپا کھسیا کر رہ گئیں۔

"اچھا رخشاں تم اور شاداں میں اور کہکشاں پارٹنر رہیں گے۔" وہ جلدی سے بولے۔

"اچھا آپ پہلے میرے لئے سگریٹ تو سلگایئے۔" وہ رخشاں سے کہنے لگے۔

روفی کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ رخشاں آپا ہی سے سگریٹ جلوایا کرتے تھے۔ شاید انہیں اسی میں مزا آتا تھا۔ آپا نے ایک سگریٹ جلا کر ان کی طرف بڑھا دی۔ میں نے دیکھا کہ سگریٹ دیتے ہوئے ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"اچھا جناب ذرا سگریٹ پی کر میں تازہ دم ہو جاؤں تو آپ کو

شروع کردوں۔" انھوں نے ایک لمبا کش لے کر کہا۔

"میں تو ویسے ہی ہارے بیٹھی ہوں۔" انھوں نے مایوسی کے لہجہ میں کہا۔ رونی بھائی نے تاش بانٹے۔ اور کھیل شروع ہوگیا۔ رونی بھائی ہے۔ میں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ آپا بڑی خوشی سے بولیں، "آپ ہار کیوں گئے؟"

"جب کسی کو ہرانا ہو تو پہلے خود ہار جائیے۔" رونی بھائی بولے۔ رخشاں آپا کے ہاتھ سے چھوٹ کر کچھ تاش میز پر گر گئے۔ "جی! آپ بڑے کھلاڑی ہیں۔" وہ رنجیدہ ہو کر بولیں۔ کھیل پھر شروع ہوا۔ ایک مرتبہ میں نے ان کو پان کا پتہ ڈالنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیوقوفوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے نظریں نیچی کرلیں۔

"عجیب آدمی ہیں۔" میں نے اپنے دل میں کہا۔

انھوں نے پتہ پھینکا۔

یہ کیا؟ حکم کا غلام؟ اسے وہ رونی کی ملکہ لے اڑی آپا کا غلام۔ میں جھلا گئی۔

"کھیلئے نا؟" میں نے کہا۔

"کھیل تو رہی ہوں۔" وہ بولیں۔

آخری پتے میز پر سرکائے گئے۔

"اُف آپ نے تو ہرا دیا۔" میں غصے سے بولی۔

"کس کو ہرایا میں نے؟" وہ چونک کر بولیں۔

میں خاموش ہوگئی۔ کھیل پھر شروع ہوا ہم ہارے اور متواتر ہارتے رہے۔ آپا تو ایسی کھوئیں کہ بس! —— چال "پھول" کی ہے تو "پان" پھینک رہی ہیں۔ ایک بھی تو گت کا نہ ڈالا۔ وہ تو جیسے شرط لگا کر ہار رہی ہوں۔ میں نے اکتا کر پتے میز پر دے مارے۔

"آپ بڑے ویسے ہیں۔" میں نے رونی بھائی کو غصے سے دیکھ کر کہا۔

"یعنی کیا؟" وہ انجان بن کر بولے۔ ان کا اطمینان بھی قابل دید تھا۔ منہ سے سگرٹ کے دھوئیں کے دائرے بنا رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کو صلواتیں سنائیں۔

"بڑے آئے کھلاڑی کے بچے۔"

"میں ہار گئی۔ کیوں ہے نا؟" وہ رونی بھائی کی طرف جھک کر سرگوشی کرنے لگیں۔ ان کے چہرے پر حد درجہ مایوسی تھی لیکن وہ بظاہر ہنس رہی تھیں۔ ایک تلخ سی ہنسی۔ میرا دل الٹنے لگا۔ رونی بھائی نے اپنی پیٹھ کرسی کی پشت سے لگا لی۔ وہ تھوڑی دیر تک رخشاں آپا کو ایسی نظروں سے دیکھتے رہے جس میں محبت، لاچاری اور معذرت تھی۔ اُن کی انگلیوں میں دبی ہوئی سگرٹ اب ان کی آنکھوں کو جلا رہی تھی انھوں نے محویت کے عالم میں جلتی ہوئی سگرٹ کو چٹکیوں میں مسل ڈالا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک انگڑائی لے کر بولے۔ "اب مجھکو نیند آرہی ہے۔" رخشاں آپا تیزی سے اٹھ کر چلی گئیں۔ اور ان کے پیچھے میں اور کہکشاں۔ میں نے دیکھا رخشاں آپا سیدھی باغ کی طرف چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کہکشاں سے باتیں کرتی رہی۔ جب کہکشاں خود ہی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تو میں بھی سیدھی باغ کی طرف چلدی۔

میرے دماغ میں رونی اور رخشاں آپا کی باتیں سرسرا رہی تھیں میں روشوں پر چلتی ہوئی آپا سے ذرا دور کھڑی ہوگئی۔ وہ بید مجنوں کی ایک شاخ پکڑے کچھ سوچ رہی تھیں۔ ان کے رنگین دوپٹے کا آنچل سبز گھاس پر لوٹ رہا تھا۔ اور ان کا سڈول جسم بے حس و حرکت تھا۔ سفید دودھ جیسی چاندنی میں وہ چابکدست سنگتراش کا شاہکار مجسمہ معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے قریب جا کر ان سے کہا۔

"کیا سوچ رہی ہیں آپا؟"

وہ چونک کر میری طرف پلٹیں۔

"شیطان کہیں کی۔ میں تجھکو یاد کر رہی تھی۔" وہ بات بنا کر کہنے لگیں۔

"سچ! ابھی تو میں آگئی۔ بھلا آپ کسی کو یاد کریں اور وہ آپ کی طرف نہ کھنچے۔" میں راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں کرید رہی تھی۔

"کیسے مانوں؟" وہ بہک کر بولیں۔

"کیا کوئی کمبخت ایسا بھی ہے جو آپ کی طرف نہ کھنچے۔"

"ہاں!" وہ رَو میں کہہ گئیں لیکن جلد ہی ان کو اعتراف کی حقیقت معلوم ہوگئی سنبھل کر بولیں۔ "یعنی تو۔"

"اونہوں، بالکل جھوٹ، وہ کوئی اور ہوگا۔"

"اب تو بہت چل نکلی ہے کمبخت باتونی!" وہ اپنی باتوں پر مزاح کا پردہ ڈال رہی تھیں۔ انھوں نے بید مجنوں کی ٹہنی ہاتھ سے چھوڑ دی اور مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"رخشاں آپا! مجھ سے نہ چھپایئے۔" میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اور انھوں نے جلدی سے اپنی نظریں نیچی کرلیں۔ پھر نہایت بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ ان کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

چاند کی ٹھنڈی روشنی میں میں نے دیکھا وہ بہت زیادہ غمگین ہو رہی تھیں ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔" میں واپس ہونے لگی۔

" ادھر تو آ — اب کہاں چلی میرے زخموں کا معاینہ کرکے " انھوں نے مجھے پکارا۔

" تو پھر بتایئے نا، یہ زخم کیسے لگے " میں ان کے بالکل قریب گئی۔

محبت اور مصلحت کی کشمکش میں آپا نے اپنا چہرہ شرم سے جھکا لیا۔

" اوں ہوں، یوں نہیں، شروع سے بتایئے " میں نے کہا۔

" محبت کی کوئی ابتدا اور انتہا نہیں " ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

" بھئی یوں نہیں کام چلے گا۔ کچھ سرا تو معلوم ہو "

" بس یہ سمجھ لو کہ سگریٹ سلگاتے سلگاتے خود بھی سلگنے لگی "

" یعنی آپ بھی رونی بھائی سے محبت کرنے لگیں " میں حیرت سے تقریباً چیخ اٹھی۔

" نہیں بلکہ خود بخود ہوگئی۔ وہ اطمینان سے چاند کو دیکھنے لگیں۔

" اچھا یہی سہی پھر کیا ہوا ؟ "

" جب آگ لگ گئی تو شعلے بھی بلند ہوئے "

" اور انھوں نے بھی دیکھا ؟ " میں نے پوچھا۔

" ہاں انھوں نے جوانی کی چیخ پکار سے متاثر ہو کر مصلحت کے چھینٹوں سے اس آگ کو بجھانا چاہا "

" تو بجھ گئی نا ؟ "

" نہیں اور بھڑک اٹھی " رخشاں آپا کے ہونٹ مرتعش ہوگئے شاید وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھنے لگی۔ بیچاری آپا پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھا گئیں۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ ان کی مسکراہٹوں میں کتنے غم پنہاں ہیں۔ آہ رونی سے تو ان کی شادی بھی غیر ممکن ہے۔ لیکن نہیں وہ مرد ہیں اور مرد کی ٹھوکروں میں خاندانی پابندیاں ہیں۔ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں

میں رونی بھائی کے کمرے کی طرف تیزی سے بڑھی میرا دماغ خیالات کی کشمکش سے پھٹا گیا۔

" کہاں ؟ " آپا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

" رونی سے سمجھنے " میں غصے سے لال پیلی ہو کر بولی۔

" نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا پاسباں کیوں ہو " انھوں نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور بنچ پر بیٹھ گئیں۔

" پھر کیا کروں ؟ " میں نے ہار کر کہا۔

" کچھ نہیں مجھے اسی آگ میں جلنے دے۔ تو کیا جانے اس جلن کا مزا ؟ "

" یعنی ؟ " میں مجسم سوال بن گئی۔

" میری بھولی بھالی رازداں۔ چاہنے میں جو لطف ہے وہ چاہے جانے میں کہاں — ؟ "

انھوں نے ایک کھوکھلا قہقہہ بلند کیا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنسے جا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی گھنی پلکوں پر دو آنسوؤں کے چمکتے ہوئے قطرے تھرانے لگے ؎

نہ مژگاں سے ڈھلکے نہ ضبط نے گرنے دیئے آنسو
یہ دریا خشک ہو کر رہ گیا اپنے کناروں پر

میرا گلا بھر آیا اور میں باوجود کوشش کے ان سے کچھ نہ کہہ سکی — ایک مرتبہ میں نے ان کے چہرے کو بغور دیکھا اور انھوں نے بھی مجھ کو دیکھا — اور پھر

" نہ جانے کیوں — " ؟ میں ان سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی — !!

خمریات

(از حضرت وفا دوبائیوی)

چھلک رہا ہے جگر اس طرح سے تپاں ہو
لطف جینے میں نہیں کیا خاک کوئی جی تپاں ہو
شب تو مستی تمنا شرابی نہ سہی
غم غلط کرنے کو بیٹھ تو سہی جی پالی لیتا ہو

کام آ گئی کس طرح تیری سخاوت ساقی
بیچین بہت ہے اب طبیعت ساقی
شوخی سی ہی مے سے صراحی کو لگا کر
بہشت بھی اس لئے ہے نعمت ساقی

بیخودی

کہاں ہے راستہ آکر دکھائے بیخودی مجھکو

از حضرت ہادی مچھلی شہری

حقیقت سے شناسا کر رہی ہے بے کسی مجھکو ۔ نظر آتی ہے ہر آنسو میں پنہاں زندگی مجھکو
نہ منزل کا تعیّن ہے نہ جادے کی کوئی پروا ۔ خدا جانے کب آئے گا طریقِ رہروی مجھکو
بھلا اک اک قدم پر ٹھوکریں کب تک کوئی کھائے
قیامت ہو گئی ہے شاہراہِ زندگی مجھکو
کہیں جوشِ محبت میں نہ اشک آنکھوں سے نکلیں
سہارا دے خدا کے واسطے اے خامشی مجھکو
رموزِ کیفِ حسن و عشق سے واقف ہوں میں ہمدم
جو گریہ شمع کا پروانہ کی دی بیخودی مجھکو
ابھی تو ہوش میں اپنے بہ صد مشکل میں آیا تھا
اُسی جانب چلی پھر لیکے ظالم بیخودی مجھکو
زمانہ دمبدم رنج و الم کا گھٹتا جاتا ہے
نئی ہر سانس میں ملتی ہے گویا زندگی مجھکو
میں رازِ دردِ دل کو آج طشت از بام کرتا ہوں
کرے شرمندہ جتنا چاہے عہدِ خامشی مجھکو
بنایا بے نیازِ این و آں مجھکو مصائب نے ۔ نہ مرنے کی کوئی پروا نہ جینے کی خوشی مجھکو
میں آپے سے گزرتا جا رہا ہوں کیا قیامت ہے
کہاں پہنچائے گا آخر مذاقِ بیخودی مجھکو
اگر جینا یہی ہے ایسے جینے سے میں باز آیا ۔ ہوئی جاتی ہے دو بھر زندگی پر زندگی مجھکو
گزرگاہِ خودی سے منزلِ عرفاں نہیں ملتی
کہاں ہے راستہ آکر دکھادے بیخودی مجھکو
ہوئی جاتی ہے ترکِ آرزو سے آرزو پیدا
ملی جاتی ہے ختمِ زندگی سے زندگی مجھکو
کہاں جا کر یہ دیکھوں سلسلہ اب ختم ہوتا ہے
خودی کو میں مٹاتا جا رہا ہوں بیخودی مجھکو

محبت بے نیازِ جادہ و منزل ہی اچھی ہے
نہیں زیبا ہے ہادی خضر کی بھی رہبری مجھکو

نادر شاہ افشار

تحقیقی مقالہ

از مولوی نور احمد خاں فریدی فاضل السنۂ شرقیہ

دگر بدست عرب خیمہ زن کہ بزم عجم
مے گذشتہ و جام شکستنی دارد

گلۂ جفائے وفانما

بقول مولانا شبلی مرحوم جو واقعات جس قدر زیادہ شہرت پکڑ جاتے ہیں اسی قدر ان کی صحت زیادہ مشتبہ ہو جاتی ہے۔ دیوار قہقہہ۔ چاہ بابل، آب حیوان، مار ضحاک، جام جمشید سے بڑھ کر کس واقعہ نے شہرت عام کی سند حاصل کی ہے۔ لیکن کیا ان میں ایک بھی اصلیت سے کچھ علاقہ رکھتا ہے؟"

حقیقت یہ ہے کہ اکثر واقعات کسی خاص وقتی سبب سے شہرت کے منظر پر آ جاتے ہیں پھر عام تقلید کے اثر سے جو خاصہ انسانی ہے شہرت عام کی بنا پر لوگ اس پر یقین کرتے چلے جاتے ہیں اور کسی کو تحقیق و تنقید کا خیال تک نہیں آتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ مسلمات عامہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان بے اصل "مسلمات عامہ" میں ایک "نادر شاہ کی سفاکی" کی لرزہ خیز داستان بھی ہے۔ میں یہاں غیر مسلم مورخین کے اقتباسات پیش نہیں کرونگا۔ بلکہ پنجاب کے ایک "نغز گو شاعر" اور "جادو بیان ادیب" حضرت "خضر تمیمی" کے ایک "جگر پارے" کا حوالہ دونگا۔ جو انھوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کے ہفتہ وار "پنچایت" لاہور میں شایع کرایا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"آج سے دو سو سال پہلے ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ کرنال میں مغلوں نے اس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ آخر کار محمد شاہ بادشاہ دہلی اور نادر شاہ میں صلح ہو گئی اور اس تقریب میں محمد شاہ نے ایک مجلس عیش و نشاط ترتیب دی۔ طرح طرح کے کھانوں، جادو اثر گانوں اور شراب ارغوانی سے فاتح مہمان کی میزبانی کے مراسم ادا کئے گئے۔ ادھر تو دربار میں رنگ رلیاں منائی جا رہی تھی اور ادھر ایک سنگر خانے میں کسی منچلے نے یوں ہی بے پرکی اڑا دی کہ واہ رے محمد شاہ رنگیلے! آخر بادشاہی چال چل گئے نا! نادر شاہ کو بادشاہی حمام میں چار تلماقنیوں اور اردا بیگیوں کے ہاتھ سے مروا ڈالا۔ ہوتے ہوتے یہ گپ دلی میں عام ہوئی اور لوگوں نے ایرانی لشکر کے سپاہیوں کو بے وارث سمجھ کر ان پر حملے شروع کر دیئے۔"

یہاں تک تو مضمون بالکل صحیح ہے اس سے آگے قابل اعتراض حصہ شروع ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) اور آن کی آن میں تین چار ولایتی جان سے مارے گئے۔

(۲) نادر شاہ کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دربار شاہی کو چھوڑ چھاڑ تلوار سونت لی اور قتل عام کا حکم دے دیا۔

(۳) آناً فاناً کشتوں کے پشتے لگ گئے اور تین دن تک دہلی میں اس قدر خون بہایا گیا کہ ہلاکو کے ہاتھوں بغداد اور صلیبی سپاہیوں کے ہاتھوں بیت المقدس کے کشت و خون کی یاد بھی ماند پڑ گئی۔

قتل عام

اس حصہ مضمون سے حسب ذیل نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

(۱) نادر شاہ کی فوج کے صرف تین چار سپاہی قتل ہوئے۔

(۲) اتنی سی بات پر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور دربار شاہی کو چھوڑ چھاڑ شہر میں پہنچا اور قتل عام کا حکم دیدیا۔

(۳) تین دن تک دہلی میں قتل عام ہوتا رہا۔

(۴) نادر شاہ ہلاکو اور صلیبی بھیڑیوں سے بھی زیادہ سفاک تھا۔

ہمیں بیحد افسوس ہے کہ ہم "خضر" صاحب کی ان اہم تصریحات سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ نادر شاہ عہد آخر کا اولوالعزم سلطان تھا۔ اس نے نہ تو بغیر معقول اسباب کے ہندوستان پر حملہ کیا۔ نہ وہ دہلی میں قتل عام کرنا چاہتا تھا۔ اس کی فوج کے سات آٹھ سو سپاہی مارے گئے۔ مگر اس نے رات اس انتظار میں گذار دی کہ شاید دہلی والے اس خونریزی سے باز آ جائیں۔

صبح کو سوار ہو کر شہر میں محض اس غرض سے گیا کہ لوگ اسے زندہ دیکھ
لیں گے اور سپاہ کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کرنے سے ہاتھ روک لیں
مگر دہلی والوں پر بدبختی اور نحوست کا بھوت سوار تھا انھوں نے
روا اور نہ ہوم فعل سے دستکش ہونے کی بجائے نادر شاہ پر پتھر پھینکنے
کر دیئے اور بندوقوں سے فیر کئے جس سے نادر شاہ کا ایک مصاحب
ہو گیا۔ ساتھ ہی دیکھا کہ جا بجا ایرانی جانباز کٹے پڑے ہیں اب "خضر"
ہی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ اگر وہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ
سے مسجد روشن الدولہ کے قریب کھڑے ہوتے تو کون سی صورت
کرتے۔ خدا معلوم انھوں نے تین چار ایرانی سپاہیوں کا قتل اور
تین دن کا قتل عام کس تاریخ میں مطالعہ کیا ہے۔ عام تواریخ
امر پر اتفاق ہے کہ دو پہر تک قتل عام ہوا اور صرف وہاں تک جہاں
قزلباشوں کی لاشیں پڑی تھیں۔

اب ہم اس جلیل القدر عادل بادشاہ شہریار کی مختصر سی سوانح حیات
رتے ہیں تاکہ اگر خضر صاحب کے مضمون سے عوام کو کچھ غلط فہمی ہوئی
ہو اس کا مداوا ہو سکے۔

نادر شاہ افشار

نادر شاہ ایرانی کو سب جانتے ہیں۔ مؤرخوں نے اس کی تصویر بڑی
بھیانک کھینچی ہے۔ ایران کے سرحدی ممالک اور ہندوستان کے لوگ
اسے "قہر الٰہی" اور "غضب خداوندی" کا نمونہ تصور کرتے تھے۔ لیکن نادر
بحقیقت ظالم و جابر بادشاہوں اور قزاقوں اور بدا عمالوں کی سزادہی
کے لئے منتقم حقیقی نے بھیجا تھا۔ چنانچہ دہلی کے قتل عام کے موقعہ پر جب ایک
شاہی امیر نے اس سے کہا۔

"اے نادر! اگر خدائی، خدا را بندگان درکار، وگر پیغمبری پیغمبر را
امت درکار، و اگر پادشاہی، پادشاہاں را رعیت درکار، مگر تو کیستی
کہ رانمی خواہی؟" (یادگار سلطنت) تو اس نے حقارت آمیز ہنسی
ہنس کر جواب دیا۔

"نہ خدایم، نہ پیغمبرم، نہ پادشاہم کہ مرا بندگان و امت و رعیت
درکار باشند۔ من یک قہر خدایم کہ بر شما مستولی شدہ"۔ [1]

دراصل نادر ایران کا نجات دہندہ تھا جو خاندان صفویہ کی تلوار
اور افغانوں کی معرکہ آرائیوں سے نیم بسمل ہو رہا تھا۔ نادر میں غیر معمولی
اوصاف تھے۔ وہ غارتگروں اور لٹیروں کے گھر میں پیدا ہوا لیکن ایسا
مستعد، مستقل مزاج، جفاکش، بات کا دھنی اور ارادے کا پکا تھا کہ اس
گمنام گڈریئے نے انھیں اوصاف کی بدولت ایران، افغانستان اور
ترکستان و ہندوستان کی پولیٹکل بے چینیوں کا قلع قمع کر دیا۔

ایشیا کا یہ نامور سپہ سالار ذات کا افشار ترکمان تھا۔ اس کے
آباؤ اجداد پہلے ترکستان میں رہتے تھے۔ جب مغلوں نے ترکستان پر
غلبہ پالیا تو وہ یہاں سے نقل مکانی کر کے آذربائیجان میں آکر سکونت پذیر
ہوئے اس کے والد امام قلی نے مشہد مقدس کے شمال میں ابیورد کے مقام
میں رہائش اختیار کی۔ اسی مقام پر ۲۸ محرم سنہ ۱۱۰۰ھ میں یہ شیر دل انسان
کتم عدم سے عالم وجود میں آیا۔ دادا کے نام پر اس کا نام بھی نادر قلی رکھا گیا
اس نے ایام طفلی میں بے شمار تکالیف اور مصائب برداشت
کیں۔ سترہ برس کی عمر میں ازبکوں کے ہاتھ اپنی والدہ سمیت گرفتار ہوا،
اور چار سال تک قید رہا۔ والدہ انہی ایام میں آب و گل کی قید سے آزاد
ہو کر ملک عدم کو روانہ ہوئی اور خود جس طرح بھی بن سکا ازبکوں کی
قید سے رہا ہو کر اپنے وطن مالوف میں پہنچا۔ چونکہ جاہ طلب مزاج پایا تھا
اس لئے اپنی قوم کے چند جانبازوں کو جمع کر کے ملک پر تاخت و تاراج
کرنے لگا۔ [2] رفتہ رفتہ اس کی بہادری اور دلیری خراسان کے اطراف
واکناف میں مشہور ہو گئی۔ چونکہ ازبکوں کی جنگ میں اس سے غیر معمولی
شجاعت ظہور میں آئی تھی اس لئے گورنر خراسان نے اس کو فوج کے

---

[1] میں نہ خدا ہوں، نہ پیغمبر ہوں نہ بادشاہ ہوں کہ مجھے بندوں کی یا
امت و رعیت کی ضرورت ہو۔ میں تو ایک قہر الٰہی ہوں کہ تم پر
برس رہا ہوں۔

[2] تاریخ گلزار شاہی

[3] تاریخ ملکم صاحب

[4] ملک پر تاخت و تاراج کرنے کا خیال نادر کو ازبکوں کی اس سفاکی کو دیکھ کر
پیدا ہوا جس سے کہ اسے قید میں چار سال کاٹنے پڑے تھے اور جہاں
کہ اس کی مادر مہربان نے مصیبتوں اور تکلیفوں میں جان بحق تسلیم کی تھی
چونکہ حکومت کمزور پڑ چکی تھی اس لئے نادر نے ازبکوں سے انتقام لینے کی خاطر
جمعیت فراہم کر کے تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کیا۔ (فریدی)

• از "ہندوستان پر حملے"۔
اے نادر! اگر تو خدا ہے تو خدا کو بندے درکار ہیں اور اگر پیغمبر ہے تو پیغمبروں
کو امت درکار ہوتی ہے اور اگر بادشاہ ہے تو بادشاہوں کیلئے رعیت کا ہونا
لازمی ہے مگر تو کون ہے کہ تجھے کسی کی ضرورت نہیں؟"

ایک دستے پر افسر مقرر کر دیا۔ جہاں یہ ذاتی قابلیت سے ایک ہزار سوار کے افسر کے درجے تک ترقی کر گیا۔

نادر کی سیف زبانی

ایک[1] موقع پر گورنر خراسان نے نادر سے کوئی بات پوچھی۔ نادر نے اختلاف ظاہر کیا۔ گورنر کو اس اختلاف کی توقع نہ تھی اس نے غصہ میں آکر نادر کو تازیانے لگوائے لیکن نادر نے اس زجر و توبیخ کی کچھ پروانہ کی اور وہی کہتا رہا جس کی اس کے ضمیر نے شہادت دی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا کہ ایک بہت بڑے افسر کے سامنے اس کی ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے اپنے استقلال اور ضمیر کی پیروی کا ثبوت دیا۔

بہر کیف[2] نادر اس واقعہ سے غضبناک ہو کر مشہد کو خیرباد کہتا ہوا کلات میں اپنے چچا کے یہاں پہنچا جو قبیلہ افشار کی قلیل سی جماعت کا سردار تھا۔ اس نے نادر کے طور طریق سے خائف ہو کر صلاح دی کہ اپنے سرباز رفقا کو گردش دیکر کسی قلعہ پر قبضہ کر لے۔ حکومت کے کل پرزے ناکارہ ہو چکے ہیں کوئی مقابلہ کا خیال تک نہ کرے گا۔ چنانچہ نادر نے دوبارہ اپنی جمعیت کو فراہم کیا۔ ان ایام میں افغانوں نے اصفہان اور خراسان پر حملہ کر کے ان پر اپنا عمل دخل کر لیا تھا جس سے دولت صفویہ کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا اور راہزنوں و قزاقوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ چونکہ نادر نے بہادری اور شجاعت میں بڑا نام پیدا کر لیا تھا اس لئے یہ سب قزاق اور راہزن اس کے سایہ تلے جمع ہونے لگے اور تھوڑے سے عرصہ میں نادری علم کے نیچے تین ہزار نبرد آزما مسلح جوان جمع ہو گئے۔ نادر نے ان دلیروں کے ساتھ بگولے کی طرح خراسان پر جا کر حملہ کیا جس سے افغان بری طرح پسپا ہو گئے اور نادر نے ان کو انتہائی ذلت اور ناکامی کے ساتھ خراسان سے نکال دیا۔

نادر کو جاگیر کا عطیہ

آج کل ان دنوں ایران کے تخت پر شاہ طہماسپ صفوی رونق افروز تھا، چونکہ طبیعت نرم پائی تھی اس لئے سلطنت کے چاروں گوشوں میں بدامنی اور شورش پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں سے کوئی سر اٹھاتا تھا اسے جاگیر اور منصب دیکر حکمت عملی سے اپنا مطیع بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ چنانچہ جب اسے معلوم ہوا کہ نادر نے خراسان اور اس کے نواح پر قبضہ کر لیا ہے

تو اس نے از راہ قدردانی خراسان، مازندران، سیستان اور کرمان کے علاقے جو تقریباً تقریباً اس کے دست تصرف سے نکل چکے تھے اسے عطا کیئے اور اپنے ایک جلیل القدر امیر کے ہاتھ "لقب سلطانی" کا فرمان اور تاج مرصع ارسال کیا لیکن چونکہ سلطانی لقب سے دوسروں کے حسد کا احتمال تھا اس لئے نادر نے قبول نہ کیا۔ انہی ایام میں نادر نے اپنے بڑے بیٹے رضا قلی کی شادی سلطان حسین مرحوم کی صاحبزادی سے کی۔ چونکہ افغان ہر وقت ایرانی مقبوضات پر حملے کرتے رہتے تھے اس لئے نادر ان کا سخت دشمن تھا۔ اس کی انتہائی تمنا یہ تھی کہ ان کا اچھی طرح سے صفایا کر دے تاکہ پھر ملک میں بدامنی نہ ہو سکے لیکن ایرانی امرا جن کے قبضہ و اثر میں شاہ طہماسپ تھا کاروبار سلطنت میں نادر کی نہ چلنے دیتے تھے

خطابات و اعزازات کی ضبطی

جب نادر کو اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق اس نے بادشاہ کو صاف لفظوں میں لکھ بھیجا۔

"وقت[1] آگیا ہے کہ بادشاہ اس بات کا فیصلہ کر دے کہ ایسے افغانوں کی نسبت جو ملک والوں کو تنگ کر رہے ہیں کیا کرنا چاہیئے؟"

بادشاہ کو جب یہ رقعہ ملا تو ارا کین دربار نے جو نادر سے جلتے تھے بادشاہ کو بھڑکایا جس پر اس نے نادر کے تمام خطابات اور اعزازات جو خراسان کے سپہ سالار کی حیثیت سے اسے عطا کر رکھے تھے ضبط کر لئے اور اس سے جواب طلب کیا کہ اس نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے براہ راست اس قسم کا خط کیوں لکھا ہے۔ نادر نے جواب میں تحریر کیا کہ۔

"خود[2] غرض لوگوں اور ملک کے بدخواہوں کے اثر میں آکر رعایا سے لڑائی مول لینا بادشاہ کی شایان شان نہیں ہے۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ نادر بادشاہ پر غالب آگیا اور اسے نالائق امرا اور وزرا کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لئے مشہد لے گیا۔

ترکی اور ایران کا معاہدہ

۱۷۲۹ء[3] کے اوائل میں ترکوں اور ایرانیوں میں اس لئے جنگ چھڑ گئی کہ ترکوں نے نادر کی خواہش کے مطابق آذربائیجان کو خالی نہ کیا۔ ترک اس جنگ میں قریباً قریباً ہر جگہ پسپا ہوتے رہے۔ اس دوران

---

[1] از پیسہ اخبار [2] تاریخ ملکم صاحب [3] تاریخ ملکم صاحب

[1] ہندوستان پر حملے [2] تاریخ حریت اسلام [3] ہندوستان

افغانوں نے خراسان پر حملہ کر دیا۔ جس پر نادر کو مجبوراً محاذ پر جانا پڑا پیچھے چونکہ میدان خالی تھا ترکوں نے فائدہ اٹھا کر کمزور طبیعت بادشاہ طہماسپ صفوی سے اپنے مفید مطلب صلح کا معاہدہ کرا لیا۔ نادر اس شرمناک معاہدے پر سخت برافروختہ ہوا۔ پہلے تو اس نے معاہدہ کی نرم شرائط پر اعتراض کیا اور کوشش کی کہ کسی طرح یہ معاہدہ منسوخ ہو جائے مگر جب کامیابی نہ ہوئی تو اس نے سلطان المعظم (ترکی) کو صاف طور پر کہلا بھیجا کہ یا تو وہ صوبہ آذربائیجان خالی کر دے ورنہ آمادہ جنگ رہے۔ یہ صرف زبانی دھمکی نہ تھی بلکہ اصفہان میں بھی نادر نے اعلان کر دیا کہ ترکی معاہدہ کی دفعات ایرانی مفاد کے خلاف ہیں اس لئے ناموس وطن کی خاطر ہر فرزند وطن مرنے مارنے پر تیار رہے۔ یہ سنہ ۱۷۳۱ء کا واقعہ ہے۔ نادر بادشاہ سے ملا اور تمام حالات اور ان کے نتائج اس کے سامنے رکھے۔ کمزور طبیعت بادشاہ نے زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر قرائن سے بتایا کہ وہ ترکی کے معاہدہ کو پسند کرتا ہے۔ نادر نے کونسل میں یہ معاملہ رکھ کر زوردار تقریر کی اور بادشاہ کی کمزوری کو ملک کی تباہی اور بربادی کا باعث بتایا۔ جس پر ۱۷۳۲ء میں شاہ طہماسپ صفوی کو معزول کر کے اس کے ہشت ماہہ بچے عباس کو تخت نشین کیا اور خود لشکر شاہی کو اپنے قبضہ میں کر کے برق و باد کی طرح بغداد کو روانہ ہوا۔ اگرچہ احمد پاشا گورنر بغداد نہایت شجاع اور منتظم آدمی تھا۔ لیکن نادر کو علم ہو چکا تھا کہ اگر عثمانی افواج اس کی امداد کو نہ پہنچ سکیں تو اسے شکست دینا کوئی مشکل نہ ہوگا۔ اس لئے بارہ ہزار نبرد آزما جانباز بغداد کے محاصرے پر چھوڑ کر افواج عثمانی کی طرف متوجہ ہوا جو ایک لاکھ کے قریب سامرہ کے نواح میں خیمہ لگائے پڑی تھیں گھمسان کا رن پڑا اور ایرانی سواروں نے عثمانی سواروں کو پامال کر کے بھگا دیا۔ مگر عثمانی پیادوں نے ہمت سے کام لے کر اس پامردی سے مقابلہ کیا کہ نادری افواج کو منہ کی کھانا پڑی۔ عثمانی گولہ اندازوں نے دو دفعہ ایسے کاری گولے پھینکے کہ نادر کا گھوڑا گر کر سرد ہو گیا اور خود نادر بھی بری طرح سر کے بل زمین پر آ رہا۔ ایرانی علمدار نے سمجھا کہ نادر ختم ہو گیا۔ جھنڈے کو پھینک بھاگ نکلا۔ باقی فوج نے بھی راہ فرار اختیار کی ابھی یہ خبر بغداد میں نہ پہنچی تھی کہ اہل شہر نے ایرانی سپاہ پر پہلے سے حملہ کر دیا۔ اور شکست فاش دی۔ بقول ترکوں کے اس معرکہ میں ساٹھ ہزار اور بقول ایرانیوں کے بیس ہزار ایرانی کام آئے اور اسی قدر عثمانی لشکر کا نقصان

پکڑ سوار ہو ہمدان کا رخ کیا۔ اور بجائے اس کے کہ اپنے لشکریوں کو لعنت ملامت کرتا تحسین و آفرین کی اور طعن و طنز کے بجائے ان کا حوصلہ بڑھایا اور جنگ میں ان کا جس قدر نقصان ہوا تھا اس کی تلافی کی بلکہ پہلے سے دگنا کر دیا اور دشمن سے انتقام لینے کی ترغیب دی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تین ماہ کا عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ نادر پہلے سے دگنا لشکر لے کر بغداد کی دیواروں کے نیچے آ پڑا۔

عثمانی جرنیل کی فتح و نصرت کی خبر جب قسطنطنیہ میں پہنچی تو اس کے حاسدوں نے حیلہ اور فریب سے اسے امداد اور سامان رسد پہنچانے میں تاخیر کرنا شروع کی۔ یہاں تک کہ افواج کی تنخواہیں بھی نہ بھیجیں۔ شکستہ خاطر جرنیل نے اپنی پوری قوت کے ساتھ نادر کا مقابلہ کیا۔ مگر نادر کی تازہ دم نوجوں کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور پہلے ہی حملے میں ترکوں کے قدم اکھڑ گئے۔ عثمانی جرنیل تخت رواں پر سوار تھا۔ جب لڑائی کا یہ نقشہ دیکھا تو ہوا خواہوں نے اسے گھوڑے پر سوار کیا کہ شاید جان بچا لے جائے مگر ایک ایرانی سپاہی کی نظر اس کے قیمتی لباس پر جا پڑی اس نے پہچان کر ایسا تیر مارا کہ اس کے گلے میں ترازو ہو کر رہ گیا۔ اور فوراً اس کا سر کاٹ کر نادر کے پاس لے گیا۔

نادر نے اس کے سر کی تعظیم کی اور حکم دیا کہ کمال عزت و توقیر سے اس کے سر اور دھڑ کو عثمانی لشکر میں بھجوا دیا جائے تاکہ اسے دفن کر سکیں اور خود گورنر بغداد سے صلح کر کے کلات کو روانہ ہو گیا کیونکہ وہاں محمد خاں بلوچ نے بغاوت کر دی تھی اور ابھی یہ بمشکل وہاں پہنچا تھا کہ پرچہ لگا کہ عبداللہ پاشا گورنر مصر سلطان روم کے حکم سے ساٹھ ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادوں کو ہمراہ لے کر انتقام لینے کو بڑھا چلا آتا ہے۔ اس لئے کلات کا ارادہ فسخ کر کے باز کی طرح مڑا اور شیر کی طرح گرج کر دشمن پر جا جھپٹا۔ عبداللہ پاشا کے دو ٹکڑے کئے اور اتنی بڑی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر طفلس اور گنجا کو فتح کیا۔ جب ارا کین سلطنت عثمانی نے ایرانیوں کی یہ جانبازی دیکھی تو صلح کے طالب ہوئے چنانچہ اکتوبر سنہ ۱۷۳۴ء میں ترکوں کو ان شرائط پر جو نادر نے تین سال پیشتر اپنی خواہش کے مطابق پیش کی تھیں راضی ہونا پڑا اور اس صلح نامہ کی رو سے انھوں نے ایران کے تمام شمالی صوبجات واپس کر دیئے۔

نادر کا استقلال

[نادر] نے جب اپنے آپ کو میدان میں تن تنہا پایا تو کسی فوجی کا گھوڑا

ایران کا تاج نادر کے قدموں میں

(تاریخ ملکم صاحب) ان ایام میں شاہ عباس کے انتقال کی خبر پہنچی،

نادر نے دیکھا کہ اب ایران کے تاج کو اس طرح کمزور اور نااہل افراد کے سر کی زینت بنانا ملک اور قوم کو مزید خطرات میں پھنسانا ہے اس لئے اس نے عید نوروز کی تقریب پر "جیز لگائے مغاں" کے موقعہ پر ایک بڑا دربار قائم کیا۔ بیان کرتے ہیں کہ ایک لاکھ سے زاید امراء، منصبدار اور افراد عساکر شامل ہوئے۔ سب کے عیش و آرام کے لئے مکانات تیار کر لئے گئے تھے۔ میرزا مہدی کے بیان کے بموجب عید کے دن صبح کو جملہ رؤسا اور اکابر کو مخاطب کر کے نادر نے ایک فاضلانہ تقریر کی اور کہا۔ "حضرات! ملک کو دشمنوں کے ہاتھ سے آزاد کرنے کا جو فرض تھا میں نے ادا کر دیا ہے اور مادر وطن کو افغانوں۔ روسیوں اور رومیوں کے ہاتھوں سے بچا لیا ہے۔ اب جس کو شہنشاہی کے لائق دیکھو تخت پر بٹھا لو"

تمام امرا نے متفق ہو کر جواب دیا کہ "شہنشاہی کے لائق صرف وہی شخص ہے جس نے مملکت کو دشمن کے تصرف سے آزاد کرایا ہے اور اب فقط وہی اس کی حفاظت کر سکتا ہے"

نادر نے بادشاہ بننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "اس قسم کا خیال میرے دل میں مطلقاً پیدا نہیں ہوا" چنانچہ ایک ماہ تک یہ امر زیر بحث رہا۔ امرا نادر کو تخت قبول کرنے کے لئے مجبور کرتے رہے اور وہ انکار کرتا رہا۔ آخر الامر جب اصرار حد سے تجاوز کر گیا تو مجبوراً نادر نے بادشاہی قبول کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا اور کہا کہ "حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد یکے بعد دیگرے چار خلفا نے امر خلافت کو انجام دیا ہے۔ شاہ اسمٰعیل صفوی نے اس مذہب کو ترک کر کے شیعہ مذہب کو رواج دیا جس سے سلطنت کی چولیں ہل گئیں۔ اگر آپ حضرات میری بادشاہی پر اتفاق کرتے ہیں تو آپ کو مناسب ہوگا کہ اس مذہب کو ترک کر کے مذہب اہلسنت والجماعت اختیار کریں اور امام جعفرؓ کو سالار مذہب بنائیں"

مجتہد ایران کی حق گوئی

تمام لوگوں نے اس تبدیلی کو پسند کیا مگر مجتہد اعظم خاموش رہے انہیں اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے مجبور کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ "مذہب کی رہنمائی کے واسطے ہمارے پاس قرآن (احکام الٰہی) اور احادیث رسالت پناہی موجود ہیں۔ مذہب میں ایجاد و اختراع اور تغیر و تبدل کرنا دنیاوی بادشاہوں کا کام نہیں۔ مجھے امید ہے کہ جلالت مآب اپنے دور حکومت کو ایک قائم شدہ مذہب کے بیخ و بن سے اکھیڑنے کی کوشش سے شروع نہ کریں گے ورنہ نتیجہ نہایت خوفناک ہوگا"

مگر چونکہ اکثریت اس انقلاب پر اپنی رضامندی کا اظہار کر چکی تھی اس لئے مجتہد اعظم کی آواز وہیں دبا دی گئی اور فرمان ہوا کہ اس امر کو خواص و عوام کی آگاہی کے لئے مشتہر کیا جائے۔ چنانچہ بموجب روایت میرزا مہدی ۲۴ر شوال ۱۱۴۸ھ ۲ ساعت اور بیس دقیقہ دن سے گزرنے پر تاج شاہی نادر کے سر پر رکھا گیا۔ "الخیر فی ما وقع" تاریخ جلوس نکلی۔ نادر نے مرصع تخت پر اجلاس کیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اس کے بعد ملکی رسوم کے بموجب جلوس نکالا گیا اور نادر کے نام کا سکہ جاری کیا گیا۔ اس کے ایک طرف یہ شعر نقل کیا۔ ؎

سکہ بر زر کرد نام سلطنت را در جہاں
نادر ایران زمین و خسرو گیتی ستاں

اور دوسری طرف وہی تاریخ اجلاس "الخیر فی ما وقع" کندہ کیا اس کے بعد نادر شاہ نے اصفہان کا رخ کیا اور کچھ عرصہ وہاں رہ کر لشکر کو ہر طرح سے لیس کر کے تسخیر قندہار کی غرض سے روانہ ہوا۔

بختیاریوں کا انسداد

ان دنوں محمود علی جانی کا بھائی حسین علی خاں قندہار کا حاکم تھا، اور نادر شاہ نے قندہار پر حملہ کرنے سے پیشتر مناسب جانا کہ ایران کی سلطنت کو ہر طرح سے باغیوں کی فتنہ پردازیوں سے محفوظ و مصئون کر دے تاکہ اس کی غیر حاضری میں کوئی مفسد شر انگیزی نہ کر سکے چونکہ بختیاریوں نے اصفہان کے اطراف میں تاخت و تاراج کا کر بد امنی پھیلا رکھی تھی اس لئے پہلے ان کا استیصال لازمی سمجھا گیا۔ کوہستان اصفہان سے شوستر تک تمام علاقہ بختیاریوں کی ستم ظریفیوں کا شکار ہو رہا تھا اور چونکہ ان پہاڑوں میں غاریں بکثرت تھیں اس لئے خطرے کے ایام میں ان میں چھپ جاتے تھے۔ ظاہراً یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا مطیع و منقاد کرنا محض ناممکن ہے لیکن نادر شاہ نے ایک ماہ کے قلیل عرصہ میں ان پر جینا دوبھر کر دیا علی مراد خاں سردار ان کا مارا گیا اور باقی جو نادری تلواروں سے بچ رہے تھے اپنے لشکر میں شامل کر کے مورد عنایات شاہی کیا۔ یہی بختیاری تھے جنہوں نے نادر شاہ کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر قندہار کی مہم میں ایسی جوانمردی دکھائی کہ مغلوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔

قندہار پر حملہ

الغرض اسی ہزار فوج کے ساتھ نادر شاہ خراسان اور سیستان کے راستہ سے قندہار کو روانہ ہوا۔ راستہ میں کوئی قابل ذکر واقعہ ظہور میں

بلیکن جب قندھار پہنچا تو کیا دیکھا کہ ایک کوہ وقار قلعہ ہے جس کی ا کے کنگرے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ مضبوطی کا یہ عالم ہے کہ کا پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ تسخیر آسان نظر نہ آئی اس لئے حکم دیا کہ شہر ل بندی کر دی جائے تاکہ اطراف و حوالی سے سامان رسد نہ پہنچ سکے پھر اس کے مقابل میں اور ایک شہر کی بنیاد ڈالی اور اسے نادر آباد کے سے موسوم کیا۔ تھوڑے سے عرصہ میں ہی یہ شہر آباد ہو کر کافی پر رونق پکڑ ۔ مگر چونکہ قندھار میں ذخیرہ اجناس کافی تھا اس لئے انہیں مطلقاً پریشانی ئی۔ نادر شاہ نے جب یہ تدبیر پوری اترتی نہ دیکھی تو پاس کے پہاڑ یں چڑھا دیں جو قندھار کی فصیل سے ملا ہوا تھا اس سے اہل قندھار ت ہراساں ہوئے اور حسین علی خاں نے امیر بلخ سے کمک طلب کی اور وہ قندھار کو روانہ ہونے والا تھا کہ نادر شاہ کو اطلاع ہو گئی۔ اس نے اپنے بیٹے رضا قلی کو بارہ ہزار فوج کے ساتھ اس کے مقابلے کو روانہ کیا۔ شہزادہ نے امیر بلخ کو شکست فاش دی اور بلخ پر قبضہ کر کے بخارا کے ارادے سے جیحون کو عبور کیا۔ اوزبک اپنی فوج کے ساتھ مقابل ہوا۔ مگر منہ کی کھائی۔ رضا قلی آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ نادر شاہ کا فرمان پہنچا۔ فوجیں روک لو اور چنگیز خاں کی اولاد اور ترکمان قبائل کو پریشان نہ کرو۔ چنانچہ شہزادہ اپنے والد کے فرمان پر سر تسلیم خم کر کے واپس چلا آیا۔ نادر شاہ نے اپنے جانباز اور سعادتمند بیٹے کے استقبال کے لئے منجھلے شہزادے مرزا نصر اللہ کو روانہ کیا اور جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو تخت سے اتر کر بیٹے کو گلے سے لگایا اور انعام و اکرام سے مالامال کر کے معزز و مفتخر فرمایا ۔

جامِ تضمین

بر غزل فانی مرحوم

بجناب خالد حسن قادری،

راز الفت اس طرح نظروں سے سمجھانا نہ تھا
یوں فریبِ جلوہ دیگر بھی تو بہکانا نہ تھا
آ کے تھا جس طرح جانا جا کے کیا آنا نہ تھا
"دل کی صورت میرے پہلو سے تمہیں جانا نہ تھا
اور گئے بھی تھے تو جانِ بیوفا کیوں ہو گئے"

حسنِ بے پروا کی ہے ہر فتنے فریبِ التفات
کیا نئی کچھ دعوتِ غم ہے فریبِ التفات
عشقِ مضطر کے ہے کیوں درپے فریبِ التفات
کیا سنانا چاہتا ہے اے فریبِ التفات
خیر ہے لب آج مطلب آشنا کیوں ہو گئے"

گور کو سمجھے تھے خالد اپنی منزل بعدِ مرگ
وہ بھی اب ثابت ہوا اک وہمِ باطل بعدِ مرگ
کیا خبر تھی ہیں بہت گرداب و ساحل بعدِ مرگ
"اور فانی بڑھ گئی بیتابیٔ دل بعدِ مرگ
کیا کہیں مر کر گرفتارِ بلا کیوں ہو گئے"

ستم ایجاد تھے جانِ وفا کیوں ہو گئے
ڈبوتا تھا سفینہ ناخدا کیوں ہو گئے
ب اثر سے دشمنی تھی پھر دعا کیوں ہو گئے
شمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے
"تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے"

ل طرف عالم ہلاکِ غم کی روپوشی کا ہائے
ک طرف جلوہ پشیمانِ ستم کوشی کا ہائے
س قدر دلدوز تھا منظر وہ سرگوشی کا ہائے
پھر نہ کہنا وہ کسی مجبورِ خاموشی کا ہائے
وہ جنازے پر مرے کہنا خفا کیوں ہو گئے

دل کو احساسِ جفا عین مسرت ہو گیا
ہر ستم اہلِ وفا کو وجہِ راحت ہو گیا
کارگر آخر ہمارا سحرِ الفت ہو گیا
کیا تمہیں اندازۂ جذبِ محبت ہو گیا
چشمِ بد دور اب ستم حد سے سوا کیوں ہو گئے

راہِ شوق

لُٹ گیا جب سے آشیاں حسرتِ بال و پر نہیں

از حضرت نثار اٹاوی

آہ کو یہ گِلا رہا اُس پہ کوئی اثر نہیں — حُسن پہ کیا گزر گئی عشق کو کچھ خبر نہیں

اب مجھے غم نہیں، نہ ہو قوتِ سیر اگر نہیں — لُٹ گیا جب سے آشیاں حسرتِ بال و پر نہیں

عشق کی نالہ کاریاں، گریہ پہ منحصر نہیں — بھیگ رہی ہیں آستیں دیدۂ شوق تر نہیں

ضبط سے ہی مجھکو انحراف صبر سے دل کو اختلاف — بات یہ ہے خطا معاف آپ کی وہ نظر نہیں

جانبِ منزلِ گراں بڑھ ہی گئی رواں دواں — شکر کہ راہِ عشق میں فتنۂ راہبر نہیں

درد نے اُٹھ کے بارہا اس کو جگہ بتائی ہے — اب یہ نصیبِ دل کوئی تیر ہی کارگر نہیں

وہ تو کہو کہ شامِ غم، عمر نے دے دیا جواب — ورنہ وہ کون رات ہے جس کے لئے سحر نہیں

سُست قدم تھے مہر و ماہ، رہ گئے مثلِ گردِ راہ — کوئی بھی راہِ شوق میں اب مرا ہمسفر نہیں

کیوں یہ جبینِ راز دار، وقفِ حرم رہے نثار

سجدہ گزارِ پائے یار، بندۂ بام و در نہیں

مزدور

رقت انگیز ڈراما

از جناب افضل عابدی

پہلا منظر

(رامو اور دھرمو دو مزدور راستے میں باتیں کرتے ہوئے آ رہے ہیں رامو
بیں چڑھی ہوئی ہیں۔ کبھی غصہ آ جاتا ہے کبھی صبر سے کام لینے لگتا ہے)
مو۔ تو کیا رامو تمہیں مالک نے نوکری سے ہمیشہ کے لئے الگ کر دیا؟
اب تمہیں وہ نوکر ......
و۔ (کچھ غصہ کی حالت میں) میں اب ان کے یہاں نوکری کرنا بھی نہیں
چاہتا۔ مزدور میں بھی جان ہوتی ہے۔ وہ بھی محسوس کرتے ہیں اپنی
عزت اور بے عزتی کو۔
مو۔ لیکن تم سے قصور کیا ہوا تھا رامو؟
و۔ یہی قصور کیا کچھ کم ہے کہ میں ایک مزدور ہوں۔ مجھے اپنا پیٹ
بھرنے کے لئے دوسروں کے پاس جانا پڑتا ہے۔ چار ٹکڑوں کیلئے .....
(کچھ الفاظ منہ تک آ کر رک جاتے ہیں)
مو۔ بڑی گول مول باتیں کر رہے ہو رامو! میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے
...... (رامو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں)
ارے! رو رہے ہو تم تو! کیوں؟ کیا بات ہوئی آخر بھائی؟
و۔ (اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے رامو نے دبی زبان میں
کہا) کیا پوچھتے ہو دوست! (ایک لمبی سانس لیکر) مجھے اپنی حالت
پر چھوڑ دو۔ اب مجھے نوکری کی ضرورت نہیں ....؟
مو۔ کیا پاگل پن سوار ہو چلا ہے تم پر رامو؟
و۔ پاگل پن ہی تو سوار نہیں ہوتا دھرمو۔ یہی تو میں چاہتا ہوں اب
کس کے لئے نوکری .... (آواز نکل نہیں سکتی)
مو۔ کیوں اب کیا ہو گیا؟ کیا کوئی نئی بات ہو گئی۔ ایسا تو تم نے
کبھی (رامو زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ آنکھوں سے آنسو مسلسل گرتے جاتے
ہیں) پھر رونے لگے تم رامو آخر بات کیا ہے؟
ــ (ایک لمبی سانس بھر کر) جس کی خاطر میں اپنی بے عزتی سہہ لیتا تھا
اب وہ ....
ــ کیا تمہاری بیوی! .... وہ بیمار تو تھی ......؟

رامو۔ ہاں، وہی دھرمو! وہی اس مالک کی بےمنٹ چڑھا دی میں سے
اس پر بھی اس ظالم کا دل نہیں پسیجا۔ اسے ذرا بھی رحم نہ آیا۔
دھرمو۔ میں کچھ نہیں سمجھا رامو۔
رامو۔ اب سمجھنے کے لئے کچھ رہا بھی نہیں دوست! کیا ہوگا سمجھ کر بھی
؟.... (کچھ پاگل پن میں کہنے کی کوشش کرتا ہے) وہ بیمار تھی
گھر میں ایک پیسہ بھی نہ تھا اس کی دوا کے لئے۔ اس پنچ نے ایک
پیسہ بھی نہیں دیا..... ایک پیسہ..... ایک پیسہ بھی نہیں دیا
کہاں سے لاتا آخر میں دوا۔

دوسرا منظر

(رامو گھر کے دروازے سے کچھ دور کھڑا ہے۔ سڑک پر ایک نل لگا
ہوا ہے۔ رامو اسی کے قریب ایک خالی شیشی ہاتھ میں لئے کھڑا ہے بال
بکھرے ہوئے ہیں جس سے وہ پریشان حال معلوم ہوتا ہے)
رامو۔ (اپنے آپ) ڈاکٹر پیسہ لئے بغیر دوا نہیں دیتا۔ پیسہ اسے انسانی
زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ کتنا کہنے پر بھی اسے یقین نہ آیا۔
کہ میرے پاس ایک پائی بھی ...... پھر کوئی ادھار بھی تو ایک
پائی نہیں دیتا۔ دراصل میرے پاس ہے ہی کیا۔ جس کے بھروسہ پر
کوئی مجھے ادھار دے سکے؟..... میرے وعدے کی قیمت ہی
کیا ہے؟ وعدہ کی قیمت بھی دولت سے پرکھی جاتی ہے دنیا میں۔
.... (ایک لمبی سانس لیکر نل کے اطراف گھری ہوئی دیوار پر بیٹھ
جاتا ہے) آج میں اس قابل بھی نہیں کہ اس کا ...... غریب کو کوئی
حق نہیں اس دنیا میں زندہ رہنے کا .... اس کی حالت کتنی نازک
ہو گئی ہے۔ جس وقت اسے یہ معلوم ہوگا کہ میں اس کے لئے دوا کا بھی
انتظام نہیں کر سکا تو اس کے معصوم دل پر.... اب کیا کروں میں
اس وقت (کچھ سوچتا ہے) خالی شیشی لے جانے سے تو یہی اچھا ہے کہ
میں اس میں پانی بھر کر لے چلوں۔
(نل سے پانی بھر کر شیشی ہاتھ میں لئے ہوئے گھر میں داخل ہوتا ہے
ایک ٹوٹی سی چارپائی پر اس کی بیمار عورت پڑی ہوئی ہے۔ آنکھیں بند ہیں

سرہانے کی طرف زمین پر بیٹھ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ عورت آہستہ سے آنکھیں کھول دیتی ہے۔

عورت۔ (نحیف لہجہ میں) ناتھ!

رامو۔ اب کیسی طبیعت ہے؟

عورت۔ آ ـــ اچھی ہے ناتھ۔ تمہیں اتنی دیر کہاں ......؟

رامو۔ (بات کاٹ کر) دوا لینے میں دیر ہو گئی تھی ـــ بڑی بھیڑ تھی ڈاکٹر صاحب کے یہاں۔

عورت۔ اور تنخواہ دے دی مالک ......

رامو۔ اس کی کیا فکر ہے تمہیں؟ (ماتھے پہ ہاتھ پھیر کر) لو بیٹھ کر ذرا دوا پی لو۔ دوا پینے سے طبیعت ٹھیک ہو جائیگی۔

عورت۔ (آنکھیں میچ کر) انھوں نے دی ہوگی تنخواہ۔ آپ نے کل سے کھانا ......

رامو۔ (بات کاٹ کر) نہیں جی! میں نے کھا لیا کھانا۔ تم دوا پی لو۔ ہمارے مالک بہت اچھے آدمی ہیں۔ سب پوری تنخواہ دے دینگے بیچارے بڑے مہربان ہیں وہ مجھ پر۔

عورت۔ آپ نے کل سے کھانا نہیں کھایا۔ میں جانتی ہوں (غصہ کی حالت میں) وہ کمینہ تنخواہ نہیں دیگا۔ یہ مالدار لوگ ہم مزدوروں کو کام کرنے پر بھی تنخواہ نہیں دینا چاہتے ناتھ ......

رامو۔ تم تو پاگل ہو گئی ہو جی۔ دوا پی لو، تنخواہ مل جائیگی۔ ہمارے مالک بڑے نیک آدمی ہیں۔ وہ کسی کا پیسہ نہیں رکھ سکتے۔

عورت۔ وہ تنخواہ ....

تیسرا منظر

(راستہ میں رامو ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے دھرمو پاس ہی کھڑا ہے)

دھرمو۔ (غصہ میں آکر) مالک نے تنخواہ نہیں دی۔

رامو۔ (آہ بھر کر) میں جسے پیار کرتا تھا اس کا علاج بھی ..... مزدور کی زندگی یہی ہے دھرمو۔ تم جانتے ہو .....؟

دھرمو۔ (بات کاٹ کر غصے سے) یہ دولت کا غرور ہے رامو۔

رامو۔ (کھڑا ہو کر) یہی بات ہے دوست! لیکن ایک مزدور کی مزدوری رکھ کر وہ دولت مند رہ سکے گا؟

دھرمو۔ کیا اب بھی تنخواہ نہیں ......؟

رامو۔ (بات کاٹ کر) ہاں! آج اس نے دولت کے غرور میں مجھے ٹھکرا کر ......!

چوتھا منظر

(رامو کا مالک اکیلا بیٹھا ہوا ہے۔ رامو کو نوکری پر آئے دو دن ہو گئے ان دو دنوں میں ایک دو بار آیا بھی ہے تو کام کرنے کے لئے نہیں صرف تنخواہ لینے کے لئے مالک آپ ہی آپ بڑبڑا رہا ہے۔)

مالک۔ میں اب رامو کو ایک دن کے لئے بھی اپنے یہاں نوکر نہیں رکھنا چاہتا۔ کتنے کمینے ہوتے ہیں یہ مزدور بھی۔ مالک کا رتی بھر کام نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ گھر بیٹھے ہی انھیں تنخواہ دے دی جائے ..... ہوں ..... میں یہ سب کچھ سمجھتا ہوں۔ کسی کی کیا مجال جو مجھ سے بچ کر نکل جائے .... کتنا بھولا بنتا تھا یہ رامو، جس وقت پہلی بار کام کرنے آیا تھا؟ ..... لیکن اب .... ہوں .... آج برابر دس بارہ روز سے دیکھ رہا ہوں کہ ہر روز دیر سے آتا ہے اور جلد ہی چھٹی پانے کی کوشش کرتا ہے۔ میرے کام کو بیگار سمجھنے لگا ہے.... کچھ بھی ہو.... اب میں اسے اپنے یہاں رکھنے کو تیار نہیں.... میں نے چپراسی سے کہدیا ہے کہ جونہی وہ کام پر آئے تو مجھ سے ..... (چپراسی آتا ہے)

چپراسی۔ حضور رامو آیا ہے۔

مالک۔ (غصہ میں) آیا ہے! اچھا اسے فوراً میرے سامنے لاؤ۔

چپراسی۔ جو حکم سرکار۔

مالک۔ (اپنے آپ) آیا ہے! آیا ہے! ٹھیک وقت پر آیا ہے معلوم ہوتا ہے کسی سے جان گیا ہے میری ناراضی .... کچھ بھی سہی .... میں اسے اب .... (رامو داخل ہوتا ہے)

رامو۔ کیا حکم ہے مالک؟

مالک۔ تم آ گئے؟

رامو۔ جی مالک۔

مالک۔ رامو! میں آج سے تمہیں نوکری سے علیحدہ کرتا ہوں۔

رامو۔ (گھبرا کر) نوکری سے سرکار؟

مالک۔ ہاں نوکری سے۔ نوکری آرام کرنے کے لئے نہیں ہے بیار کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ مالک کا پیسہ حرام کا نہیں ہوتا۔ اس لئے جی توڑ کر محنت کرنی پڑتی ہے۔

رامو۔ پھر سرکار ......؟

مالک۔ (بات کاٹ کر) میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ میں آج ـ

الگ کرتا ہوں۔ کل سے کام پر نہ آنا۔

و۔ (کچھ سنبھل کر) مالک میں کہاں جاؤنگا بھلا نوکری سے علیٰحدہ ہوکر؟

ل۔ میں کچھ نہیں جانتا اس کے بارے میں۔ بغیر کام کئے نوکری دینا۔

و۔ لیکن سرکار!

ل۔ (بات کاٹ کر) میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔

و۔ (کچھ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا اور کچھ دل کو مضبوط کرکے) جو حکم....! (یہ کہہ کر بھی رامو کھڑا رہا)

ل۔ اب کس لئے کھڑے ہوئے ہو میرے سامنے... نکل جاؤ..... نکل جاؤ اسی وقت یہاں سے..... نکل جاؤ۔

و۔ مالک.....!

ل۔ کیا مالک؟

و۔ سرکار میری تنخواہ......

ل۔ (غصہ میں آکر) تنخواہ..... تنخواہ... کس بات کی تنخواہ چاہتے ہو؟ میں بارہ دن سے برابر دیکھ رہا ہوں جو تم کام کر رہے ہو۔ جاؤ... ایک پائی بھی نہیں ملے گی۔

مو۔ (غصہ میں) تو کیا آپ میری تنخواہ بھی نہیں دینا چاہتے؟

ل۔ ہاں... ہاں... سیدھی طرح چلے جانا چاہتے ہو یا......

مو۔ (بات کاٹ کر) مالک! اب برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں مزدور ہوں۔ آپ سے بھیک نہیں مانگ رہا ہوں۔ میں اپنی محنت کا صلہ چاہتا ہوں۔ یہ میں آپ سے لیکر ہی رہوں گا۔

لک۔ معلوم ہوتا ہے تو سیدھی طرح سے باہر نہیں جائیگا۔ میں....

امو۔ سیدھی طرح کی بات نہیں مالک! میں تنخواہ چاہتا ہوں۔ وہ میرا حق ہے اور میں اسے لیکر ہی رہوں گا۔

مالک۔ (انتہائی غصہ کی حالت میں) چپراسی.... چپراسی....!

چپراسی۔ جی حضور!

مالک۔ اسے باہر نکالو۔ (چپراسی راموسے کمزور ہے۔ پھر بھی مالک کا حکم پاکر آگے بڑھتا ہے۔)

رامو۔ (چپراسی سے) دیکھو بھائی تو دور ہی رہنا۔ میرے جسم کو ہاتھ نہ لگانا۔ میں نے تجھ سے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ نہ کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

مالک۔ (غصہ میں آکر) کہنا چاہتا ہوں کا بچہ۔ قانون چھانٹتا ہے۔ چپراسی!... چپراسی! کیا کر رہے ہو تم؟ باہر نکالو اسے۔

(چپراسی آگے بڑھتا ہے۔ اکیلا رامو کو نکال نہیں سکتا۔ مالک اور نوکروں کو چلا کر بلاتا ہے۔ پانچ سات آدمی مل کر رامو کو مارپیٹ کر باہر نکال دیتے ہیں۔)

پانچواں منظر

(رامو اور دھرمو اپنی پرانی جگہ پر دکھائی دیتے ہیں)

رامو۔ (غصہ میں) میں اپنی تنخواہ اس کمینے سے وصول کرکے ہی رہونگا۔

دھرمو۔ اب کیا.....؟

رامو۔ نہیں دھرمو... نہیں... (غصہ سے آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں) نہیں... میں... تم... تم نہیں جانتے دھرمو.....

دھرمو۔ (بات کاٹ کر) اچھا اب چلو بھائی، یہ مالدار لوگ....

رامو۔ نہیں دھرمو... میں بھی مزدور ہوں... میرے دماغ میں آگ بھڑک چکی ہے۔ یہ اسے بھی جلا کر رہے گی دھرمو!

(دونوں اپنے گھر چلے جاتے ہیں) (ہندی سے)

قطعہ

لبوں کر رہا ہے ضبط کی تلقین چارہ گر
پابندِ رسم و راہ ہوا جا رہا ہوں میں

سوگند تیرے جلوۂ ذرہ نواز کی
تفسیرِ مہر و ماہ ہوا جا رہا ہوں میں

ت انکھڑیوں کی اُف یہ اشارے میں کیا کہوں
سرتاقدم گناہ ہوا جا رہا ہوں میں

(علی احمد)

یادِ ایام

نظم

از حضرت شفق ٹونکی

کے جلوؤں میں

کبھی وہ دن بھی تھے جب صبح کی آغوش میں اکثر
ملا کرتے تھے ہم تم بے تکلف سبزہ زاروں پر
صبوحی صبح کی پیتے تھے پھولوں کی پیالوں سے
کیا کرتے تھے کسب کیف فطرت کے جمالوں سے
دلوں میں آرزوئیں تھیں نگاہوں میں اجالا تھا
جہاں اپنے علاوہ دوسرا کوئی نہ ہوتا تھا
سکون افروز لمحے لطف تنہائی بڑھاتے تھے
ستارے بھی حجابِ آسماں میں منہ چھپاتے تھے
زمیں بھی اک مسرت تھی فلک بھی اک مسرت تھا
فنا اندوز ہر لمحہ بہشت نور و نزہت تھا
وہ پہروں گفتگو بانہوں میں بانہیں ڈال کر باہم
وہ گھنٹوں شوق کی جذبات میں بھیگا ہوا عالم
وہ کیف ناتمام شوق کا حاصل ملاقاتیں
وہ حسن و عشق کے قصے نشاط و رنگ کی باتیں
وہ رسم و راہ کی تنظیم کا آپس میں اک اعلان
وفائے مستقل کا درمیاں وہ عہد وہ پیماں
وہ ضبطِ شوق پر چھائے ہوئے آثار برہم سے
وہ چھپ چھپ کر ملاقاتیں نگاہِ اہلِ عالم سے
اگرچہ گل بداماں ہے بہار سبزہ زار اب تک
اسی انداز پر باقی ہے رقص آبشار اب تک
وہی ہیں رنگ و بو کی بارشیں فردوس رعنائی
وہی موج نسیم صبح میں ہے جذب و گہرائی
وہی مستوں گھٹائیں ہیں وہی سرشار برساتیں
وہی شور آفریں دن ہیں وہی خاموش ہیں راتیں
غرض ہر دل کشی اپنی جگہ موجود ہے اب بھی
جبینِ صبح کے انوار، زلفِ شام کی مستی
مگر اک تم نہیں تو کچھ نہیں ان جلوہ زاروں میں
اداسی چھا رہی ہے ہر طرف رنگیں بہاروں میں

محبت خیز وہ رنگیں فضائیں یاد ہیں اب بھی؟
تصوّر میں وہ دلکش جنتیں آباد ہیں اب بھی؟

ام کے سائے میں

ہیں اب بھی یاد وہ رنگین شامیں صبحِ بستاں کی
ڈھلا کرتی تھیں جن میں روز صبحیں سرو ریحاں کی
ادائے شوخ سے نوخیز کلیاں مسکراتی تھیں
بہاریں رنگ و بو کی شبنم و کوثر بہاتی تھیں
سماعت کو عطا اک کیف لامحدود کرتا تھا
تکلم غنچہ و گل کا، ترنم آبشاروں کا
فضائے شام کے جذبات خیز اس نور و نزہت میں
شفق کے احمر و امواج طوفانِ صباحت میں

پسِ گلگشت جب آبِ رواں کے پاس آتے تھے — کنارِ نہر ہم تم مسکرا کر بیٹھ جاتے تھے
سنا کرتے تھے یکسر گو ہو کر ہم وہ موسیقی — ہوا و موج کے پیہم تصادم سے جو بہتی تھی
قیامت آفریں تھیں شوخیاں ارمان بھرے دل کی — کیا کرتے تھے سیرِ ہمکناری موج و ساحل کی
تبسم سے تکلم سے ادائے حسن ساماں سے — مجھے تم چھیڑتی تھیں گدگدا کر چشمِ خنداں سے
زمیں سے آسماں تک آرزوئیں جگمگاتی تھیں — ادھر میں مسکراتا تھا ادھر تم مسکراتی تھیں
محیطِ ہر نفس تھی گلفشانی شادمانی کی — یونہیں گلبار رہتی تھیں بہاریں زندگانی کی
دلوں میں موجزن جذبات کے طوفان ہوتے تھے — حدیثِ شوق کے قائم نئے عنوان ہوتے تھے
جوانی مسکراتی تھی جب آغوشِ محبت میں — نظر آتی تھی دنیا غرقِ طوفانِ مسرت میں،
فضائے دہر تھی معمورۂ انوار و زیبائی — تھی موجِ ہر نفس اک کردگارِ حسن و رعنائی
مجھے تم سے تکلف تھا نہ تم کو عذر تھا مجھ سے — مقدس تھے وہ کتنے دلنشیں لمحے محبت کے

سرور و شوق کا دلکش فسانہ یاد ہے تم کو؟
وہ حسن و عشق کا اب بھی زمانہ یاد ہے تم کو؟

برسات کی اندھیری رات میں

وہ ساون کی اندھیری رات کی ہیبت بدامانی — وہ تنہائی کا عالم وقت کی خاموش سامانی
وہ مستانہ گھٹاؤں کا مسلسل جھوم کر آنا — زمیں سے آسماں تک وحشتوں کا چھاونی چھانا
ہوائے سرد کے نمناک جھونکوں کی وہ سرشاری — وہ ہیجاں آفریں جذبات میں آثارِ بیداری
وہ مطلق بے صدا ماحول، آدھی رات کا عالم — شباب و شعر و نغمے سے بھری برسات کا عالم
ٹٹیری کی سرود آگیں نوائیں آسمانوں پر — پپیہے کی صدائے درد کا نشتر رگِ جاں پر
وہ کوئل کا ترنم بہنے والی موج کی صورت — وہ لحن افروز طاؤسی ملاریں، نغمۂ جنت
وہ مینڈک کی صدائیں جھینگروں کی نغمہ پیرائی — کہ جیسے ہر در و دیوار سے بجتی ہو شہنائی
ہے اب تک یاد مجھ کو وہ نظر افروز نظارہ — وہ رنگین و جواں منظر، وہ ہیجاں خیز نظارہ
وفورِ ناز سے یا غلبۂ کیفِ دل و جاں سے — تمہارا جھوم جانا اک ادائے کفر ساماں سے
مرے بازو پہ لہراتی ہوئی عطر آفریں زلفیں — ہواؤں سے مسلسل جنبشوں میں عنبریں زلفیں
کبھی خاموش فطرت سے تمہارا ہم زباں ہونا — کبھی سازِ ہوا و ابر پر نغمہ فشاں ہونا
تمہاری نازشوں سے محفلِ ہستی دمکتی تھی — جہاں تم مسکراتی تھیں وہیں بجلی چمکتی تھی
فضائیں دفعتاً جب صاعقہ بر دوش ہوتی تھیں — وہیں تم بے تکلف مجھ سے ہم آغوش ہوتی تھیں
یونہیں پہروں نشاط و رنگ میں لمحے گزرتے تھے — نئے طوفان اٹھتے تھے نئے جذبے ابھرتے تھے

سلامِ شوق اس گذرے ہوئے عہدِ درخشاں کو
تھا جن سے انتسابِ زندگی ایامِ دوراں کو

معیارِ حُسن

دلگداز کہانی

از محترمہ خدیجہ مستور

"تم بالکل چغتائی کا مرقع معلوم ہوتی ہو" فرید کہتا۔
"اُوں!" وہ شرما جاتی اور جلدی سے دوسری باتیں کرنے لگتی۔
"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ بھلا بتاؤ تو کیوں؟" فرید اس کے
ے سلونے چہرے کو گھور کر کہتا۔
"تو پھر میں کیا کروں؟" وہ زور سے ہنس پڑتی اور فرید بھی قہقہے
لگتا۔

شکیلہ کا چچا زاد بھائی ایم اے کا امتحان دینے کے بعد چھٹیاں
نے چچی کے یہاں آیا ہوا تھا۔ اور شکیلہ کی ماں کا خیال تھا کہ وہ اپنی
بیٹی شکیلہ کی شادی فرید سے کریں گی کیونکہ خاندان میں اتنا قابل
ور کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ گو فرید صورت کے لحاظ سے ہیٹا ہی تھا
اعلیٰ تعلیم نے اس میں ایک عجیب شان پیدا کر دی تھی جس سے وہ
اچھا لگتا۔ شکیلہ بھی اسے پسند ہی نہ کرتی بلکہ چاہتی تھی۔ اور
طبعی رجحان بھی شکیلہ کی طرف تھا۔ شکیلہ کی ماں فرید کو زیادہ
یادہ وقت شکیلہ سے مبادلۂ خیالات کرنے کا دیتیں
گھنٹوں کسی دلچسپ موضوع پر بحث کیا کرتے۔ شکیلہ ہمیشہ فرید
بے زبانی کے آگے سر جھکا دیتی۔ لیکن کچھ دن سے وہ فرید سے اپنی
منوا کر چھوڑتی۔ کیونکہ شکیلہ کی ماموں زاد بہن حور بھی خالہ کے بلانے
چھٹیاں گزارنے آئی تھی اور دوران بحث میں وہ شکیلہ ہی کی
سے بولا کرتی تھی۔ اور فرید بھی اس کی باتوں میں بہت دلچسپی لیا کرتا

چھوٹی سی گول میز پر چائے کا سامان سجا ہوا تھا۔ اور پیالیوں سے
بھاپ نکل کر بل کھاتی، ہوا کے ٹھنڈے جھونکے سے اٹھکھیلیاں
ایک نامعلوم سمت کو اڑی جا رہی تھی۔ وہ تینوں چائے پیتے
دوسرے کو بحث میں شکست دینے کے لئے بڑھ بڑھ کر بول
موضوع بحث عورت کا حُسن تھا۔
اگر سانولی ہے لیکن خدوخال خوبصورت ہیں تو وہ ہزار
اچھی لگے گی" شکیلہ نے کہا۔ کیونکہ وہ جانے کتنی بار
اپنے سانولے سلونے حسن کی تعریف فرید سے سن چکی تھی۔
"خوب! کیا بات کہی ہے تم نے۔ لیکن ذرا یہ تو بتاؤ کہ دو لڑکیاں
ایک جگہ بیٹھی ہیں۔ خدوخال دونوں کے خوبصورت لیکن ایک صبیح،
دوسری ملیح، تو دیکھنے والے کی پہلی نظر کس پر پڑے گی اور کون زیادہ
نظروں میں جچے گی؟" فرید نے چائے کا گھونٹ پی کر پوچھا۔
شکیلہ کی صراحی دار گردن تن گئی۔ پھر اس کا سر جھک گیا۔ اسے
ایسا محسوس ہوا کہ فرید اس کے سانولے رنگ کی تذلیل کر رہا ہے۔ حور نے
اپنی عزیز سانولی سلونی بہن کو غور سے دیکھا اور اس طرح سر ہلا کر بولی جیسے
کچھ سمجھ گئی ہو۔
"لیکن یہ تو بتایئے فرید بھائی کہ ان لڑکیوں کو دیکھنے والا کون ہو سکتا ہے؟"
"ایک مرد" فرید نے اس کے حسین چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔
"اور وہ مرد خوبصورت ہو گا یا بدصورت؟" حور نے کیتلی سے چائے
انڈیلتے ہوئے پوچھا۔ فرید کچھ سٹپٹا سا گیا لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔
"مرد کا خوبصورت ہونا کوئی ضروری نہیں۔ وہ صرف تعلیم یافتہ
ہونا چاہئے۔ یہی اس کا حُسن ہے" فرید نے کہا۔ کیونکہ اس وقت وہ اپنے
خیالات کا اظہار کر رہا تھا اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ خود ایک بگڑے
ہوئے نقشے اور کالی رنگت کا انسان تھا۔ سامنے دو لڑکیاں تھیں ایک،
بیحد حسین، دوسری جاذبِ توجہ۔
"خوب!" حور نے ایک مترنم قہقہہ لگایا اور فرید کو ایسا محسوس ہوا
کہ کسی نے یکلخت پیانو کے پردوں پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔
"تو بس ایسے مرد کو چاہئے کہ وہ بھی کسی تعلیم یافتہ بدصورت عورت
کو دیکھے۔ اگر مرد کے لئے حُسن ضروری نہیں تو یہ بھی ضروری نہیں کہ کسی حسین
لڑکی کو اپنی بدصورت نگاہوں سے دیکھ کر اس کے چہرے کو میلا کر دے"
شکیلہ زور سے ہنسی اور فرید کے لبوں پر ایک کھسیانی سی ہنسی آتے
آتے رہ گئی۔
"کیوں، حق کیوں نہیں؟ خدا نے مرد کو افضل بنایا ہے"
فرید نے حور کو تپڑانے کی غرض سے کہا کیونکہ جب کوئی بحث میں

مذہب کو لاتا تو وہ بہت بپھر جاتی۔

"اچھا — لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ خدا نے جو حقوق کبھی آپ کو دیئے تھے وہ آپ کی بڑھتی ہوئی زیادتیوں کو دیکھ کر چھین لئے۔ اب تو اس کا یہ حکم ہے اور قاعدے سے بھی یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک بدصورت مرد ایک بدصورت عورت کو دیکھے اور اسی سے شادی کرے اور خوبصورت مرد خوبصورت عورت سے" حور نے چہک کر کہا۔ اور فرید زور سے ہنس پڑا۔

"کیوں نہ ہو۔ تم اپنے نام کی حور ہو۔ خدا کے احکام سے پہلے تم باخبر نہ ہو گی تو اور کون ہوگا؟" فرید نے اسے جھینپتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور وہ کچھ شرما سی گئی۔

"یہ تو میں جانتی نہیں لیکن آپ ہی بتائیے کہ قرآن پاک یا حدیث میں کس جگہ آیا ہے کہ مرد چھانٹ چھانٹ کر حسین عورتوں کو تکیں اور شادی کا موقع آئے تو کوئی حسینہ تلاش کریں۔"

"اُفوہ! چھوڑو حور اس بحث کو۔ مجھے فرید بھائی کے معیارِ حُسن سے کیا مطلب۔ میری نظر میں تو ہندوستانی حسن یہی ہے کہ خد و خال خوبصورت سرو قامت اور سانولا رنگ" شکیلہ نے اپنا نقشہ الفاظ میں پیش کیا۔

"بالکل درست!" حور نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"لیکن میں تو عورت کے اس حُسن کا شیدا ہوں کہ صبیح چہرہ، چشم آہو، لانبے خمدار بال اور سرو قامت" فرید نے ہو بہو حور کے حسین مجسمے کا نقشہ کھینچ دیا اور اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھ کر ہیالی مُنہ سے لگا لی حور شرما گئی جس سے اس کا رنگ گلابی ہو گیا اور اس نے شکیلہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے کی رنگت اُڑی ہوئی تھی۔

فرید حور کی طرف کھنچا جا رہا تھا وہ اس سے کترا رہی تھی اور شکیلہ پر جیسے غم کی بدلیاں چھا رہی تھیں۔ اس نے حور سے بات کرنا بہت کم کر دی اور فرید سے بھی الگ الگ رہتی۔ زیادہ وقت وہ اپنے کمرے میں نہ معلوم کیا کیا سوچ کر گزار دیا کرتی۔ اسے اس کا بیحد افسوس تھا کہ حور فرید سے اس قدر بے تکلف ہی کیوں ہوئی جبکہ جانتی تھی کہ میں اسے پسند کرتی ہوں۔ میری محبت کا دم بھرتی تھی اور اب مجھی سے ہی یہ چالبازیاں۔ کبھی اسے فرید پر غصہ آتا کہ کم [illegible] حور کو دیکھ کر پھسل گیا۔

حور شکیلہ کی [illegible] تنگ آ کر جلد ہی اپنے گھر چلی گئی، اور شکیلہ کو بھی اس کے جانے سے کسی قدر مسرت سی ہوئی لیکن وقتی۔

چونکہ فرید اس کے جانے کے بعد کھویا کھویا سا رہتا۔ آخر اس نے بھی چلنے کی تیاری کر دی۔ شکیلہ کی ماں نے جانے سے ایک دن پیشتر کہا، "بھیا میں چاہتی ہوں کہ اب تمہاری شادی ہو اور میں بھی اپنی تمنائیں پوری کر دوں۔" انھیں امید تھی کہ ضرور ضرور شکیلہ کے لئے استدعا کریگا۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی تو مجھے ملازمت بھی نہیں ملی۔ شکیلہ نے سنا تو اس کے دل پر ٹھیس سی لگی۔

"بیٹی شکیلہ! ذرا یہ خط تو پڑھ کر سناؤ۔ کیا لکھا ہے تمہارے ماموں نے مجھے تو کمبخت سجھائی بھی نہیں دیتا۔" شکیلہ کی ماں نے اسے خط دیتے ہوئے کہا۔ شکیلہ نے پڑھنا شروع کیا۔

"عزیز بہن! شاید تمھیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ حور کی شادی فرید کے ساتھ عید کی پانچ تاریخ کو مقرر ہوئی ہے۔ تمہاری شرکت ضروری ہے اور ———"

شکیلہ کے ہاتھ سے خط چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ یہ کہتی ہوئی کمرے میں چلی گئی کہ آپ ہی پڑھئے مجھے سخت چکر سا آ رہا ہے۔ لیکن وہ کیا پڑھتیں انھیں تو کوفت ہو رہی تھی کہ اتنا اچھا لڑکا ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر یہ سوچ کر صبر آ گیا کہ شکیلہ نہ سہی حور بھی تو اپنی ہی بچی ہے۔ دوسرے دن وہ تو بھائی کے یہاں جانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئیں اور شکیلہ کے دل پر ہر وقت چرکے سے لگتے تھے وہ دن میں کئی ہی بار چھپ چھپ کر روتی۔

شام کی ٹرین سے شکیلہ اور اس کی ماں شادی میں شرکت کے لئے جانے والی تھیں کہ بارہ بجے کی ڈاک سے شکیلہ کے ماموں کا خط ملا۔ لکھا تھا شادی ملتوی کر دینا پڑی۔ کیونکہ حور کی ایک سہیلی سے معلوم ہوا کہ حور فرید سے شادی کرنے پر راضی نہیں۔ مجھے افسوس تو اسی بات کا ہے کہ کیوں پہلے ہی میں نے حور سے اس معاملہ میں رائے نے لی۔ زندگی تو اُسے گزارنا تھی نہ کہ مجھے۔ عین وقت پر سارا کیا دھرا خاک میں مل گیا۔ اور ——"

شکیلہ کی ماں نے خط بھی پورا نہ سنا اور حور کی دیدہ دلیری پر اپنی زبان کے جوہر دکھانے لگیں اور شکیلہ خوش تھی نہ معلوم کیوں؟

دوسرے دن شکیلہ کے نام ایک خط حور کا آیا اور دوسرا فرید کا شکیلہ کی ماں کے نام — جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ جلد ہی چچی کی قدمبوسی کو آنے والا ہے۔ شکیلہ نے حور کا لفافہ اطمینان سے کمرہ بند کر کے کھولا۔ لکھا تھا۔

"شکیلہ پیاری! غالباً تم مجھ سے بدگمان ہو گی۔ اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ میں نے تمہاری بے اعتنائی دیکھ کر تم سے کچھ بھی نہ بتایا کیونکہ اس وقت تمھیں کبھی یقین نہ آتا۔ اس دن جو چائے پیتے وقت گفتگو ہوئی تھی اس کے بعد ہی انھوں نے اظہار محبت بھی کر دیا۔ میں اس دن کی باتوں سے معاملہ کی تہ تک پہنچ گئی اور جانتی تھی کہ یہی ہوگا۔ میں نے ان کی لغو باتوں کا اس وقت کوئی جواب نہ دیا گو مجھے سخت تاؤ آ رہا تھا کہ وہ تمہاری جیسی لڑکی کی محبت ٹھکرا کر مجھ سے محبت جتا رہے ہیں حالانکہ میں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا کہ ایک بدصورت مرد کو کوئی حق نہیں کہ وہ اپنی بدصورت نگاہوں سے دیکھ کر کسی حسین لڑکی کے چہرے کو میلا کرے۔ گو وہ سب مذاق تھا میں نے تو حفظ ماتقدم کے لئے کہہ دیا تھا لیکن تم ان کی جرات تو دیکھو کہ محبت کا اظہار تو کیا ہی تھا یہاں آ کر شادی کا پیغام بھی دیدیا۔ بھلا منظور ہونے میں کیا دیر لگتی اور میں انتہائی کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئی۔ بالآخر یہی سمجھ میں آیا کہ کسی سہیلی کے ذریعہ سے ابا تک اپنے خیالات پہنچا دوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری بات مان لی گئی اس کے بعد ایک خط فرید کے نام بھی لکھ کر چپکے سے ڈلوا دیا۔ جانتی ہو میں نے کیا لکھا؟ [illegible] بات یعنی آپ بدصورت ہیں اس لئے آپ کو کوئی حق نہیں کہ مجھ سے شادی کریں۔ اچھا بھئی اب رخصت ہوتی ہوں ہاں اب اپنے فرید کو سنبھال کر رکھنا۔ کہیں پھر ڈگ مگ نہ ہو جائیں۔ سبق تو میں نے ایسا پڑھایا ہے کہ اب اس کی امید نہیں۔" تمہاری حور

خط پڑھنے کے بعد شکیلہ کے دل میں پہلی مرتبہ فرید کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا ہوئے۔ لیکن شان محبت لئے ہوئے۔ وہ سوچنے لگی کہ اب فرید کیوں آ رہا ہے؟

"چچی جان! میں چاہتا ہوں کہ . . . . ." فرید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں ہاں کہو نا! کیا اسی وقت سیر کے لئے جانا چاہتے ہو؟ کریم سے کہہ دو تانگہ لے آئے اور ہاں اگر شکیلہ جائے تو اسے بھی ساتھ لے جانا۔ تمہاری بہن نہ معلوم کیوں چپ چپ پھرا کرتی ہے۔" وہ فرید کی بات کاٹ کر جلدی جلدی اتنی باتیں کہہ گئیں اور فرید نے نظر اٹھا کر دیکھا تو شکیلہ دالان میں کھمبے کا سہارا لئے کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔

"جی نہیں، میں چاہتا ہوں کہ ——" وہ پھر اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

"ارے چائے پینا چاہتے ہو۔ دیکھو ابھی منگواتی ہوں۔ اے ہے چار تو بج گئے اور رحیمن نے ابھی تک چولھا بھی نہیں جلایا۔ بات اصل یہ ہے کہ بیچاری کچھ بیمار رہتی ہے۔ ایک لڑکی بھی جاتی رہی جس کا غم اور بھی کھائے

لینا ہے۔ خیر بھتیا معاف کرنا ابھی بنوا آتی ہوں"۔

"نہیں چچی، میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی غلامی میں لے لیں!" فرید نے آخر جی کڑا کرکے کہہ ہی دیا۔

"اوہ یہ بات ہے۔ میں تمھارے چچا سے ذکر کروں گی اور مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، اور نہ پہلے تھا۔ تم ہی نے ——"

"ارے چچی چھوڑیے ان باتوں کو ——" وہ بات کاٹ کر کہنے لگا "وہ تو مجھے اپنے گھر والوں کی مرضی سے مجبوراً کرنا پڑا تھا"۔ وہ بات بنا رہا تھا، اور شکیلہ کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھرتھرا اٹھی۔

"خیر تم اطمینان رکھو"۔ چچی نے کہا۔ ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

فرید نے چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے کہا "شکیلہ مجھے معاف کر دو میں تمھاری طرف سے غافل ہو گیا تھا"۔

"کیسی غفلت فرید بھائی؟" اس نے پیالی لبوں سے ہٹا کر پوچھا۔

"شکیلہ اس قدر تغافل نہ برتو۔ تم مجھے چاہتی تھیں لیکن میں نے تمھاری محبت کی قدر نہ کی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا شکیلہ۔ مجھے معاف کرکے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دو"۔ اس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔

"لیکن میں نے تو کبھی آپ سے محبت کا اظہار کیا نہیں پھر آپ، یہ کیسے سمجھ بیٹھے کہ میں آپ کو چاہتی ہوں"۔

"مجھے تو معلوم تھا شکیلہ۔ خیر اب غصہ تھوک دو۔ انشاء اللہ ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے"۔ وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ بدصورت ہیں اس لئے آپ کو کوئی حق نہیں کہ ——" شکیلہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرانے لگی اور فرید کو ایسا محسوس ہوا کہ کمرے کی ہر چیز اس کے سامنے رقص کر رہی ہے اور چھت اس پر ٹوٹی پڑتی ہے۔ اس کا ہاتھ کانپا اور پیالی میز پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے کبھی شکیلہ کا دل فرید نے توڑ ڈالا تھا لیکن اس وقت اس کا دل بھی ٹوٹ گیا تھا۔

"فرید بھائی چائے پیجئے!" وہ اس طرح بولی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"پیالی ٹوٹ گئی"۔ وہ کھوئی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تو کیا ہوا آپ کے لئے دوسری پیالی حاضر ہو جائیگی"۔ وہ دل پر لگنے والے انداز سے بولی اور پھر اس کے لبوں سے ایک قہقہہ نکل کر کمرے کی فضا میں گونج اٹھا۔

فرید نے دوسرے ہی دن اپنا بستر باندھ لیا۔ شکیلہ کی ماں پوچھتی ہی رہیں کہ ابھی سے کہاں چلے لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور آٹھ بجے کی ٹرین سے روانہ ہو گیا۔ جس وقت وہ جا رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے نہ معلوم کیوں۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ آدمی کو جو کرو پوری لینے دوڑا۔ نہ پوری ملی نہ آدھی۔

رُباعیات

از حضرت [illegible]

جب تک نہ شراب رنگ پہ آئے گی
شیشے میں شراب جا کے اترائے گی
دنیا میں جسے حرام کہتے ہیں سب لوگ
عقبیٰ میں وہی حلال بن جائے گی

ہر شے کی جوانی ہی مزا دیتی ہے
پر لطف کہانی ہی مزا دیتی ہے
ہاں دختِ رز کا رنگ بھی [illegible] الگ
پر سب کو پرانی ہی مزا دیتی ہے

اللہ جوانی کا بھی کیا عالم تھا
دل [illegible] مخمور تھا متوالا تھا
اور [illegible] جوانی کی دعا
پانی میں شراب کا مزا آتا تھا

الاعتزال والمعتزلہ

مختصر تاریخ

از جناب محمد اسحٰق ایوبی مالیگانوی ایم اے

اعتزال کیاہے؟ اعتزال کے لغوی معنی ہیں کنارہ کش ہونا، علیحٰدگی اختیار کرنا۔ لیکن مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ تھا جو معتزلہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس فرقہ کا بانی مبانی واصل بن عطاء (المتوفی ۱۳۱ھ) ہے۔ یہ شخص پہلے پہل حضرت امام جعفر الصادق کا شاگرد تھا۔ بعد ازاں امام حسن بصری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ایک روز مسئلہ "الوعد والوعید" چھڑا ہوا تھا۔ الوعدیہ کا خیال تھا کہ مسلمان صاحب ایمان کو گناہوں سے کوئی ضرر نہ پہنچے گا بلکہ کافر باوجود نیکیوں اور عبادتوں کے ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہے گا۔ (لا تضر مع الایمان معصیتہ۔ ولا تنفع مع الکفر طاعتہ) الوعیدیہ کی رائے تھی کہ جو مومن بغیر توبہ کئے مرجائے اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہو تو وہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہے گا۔ (ان المومن اذا مات بلا توبۃ وکان مرتکبا الکبائر فھو ھالک خالد فی النار ولا ینفعہ ایمانہ) امام حسن البصری ہنوز اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ واصل بن عطا نے بیچ میں دخل دینا شروع کر دیا اور کہا کہ گنہگار مسلمان نہ مومن رہے گا نہ کافر بلکہ اس کی جگہ دونوں کے درمیان ہوگی (منزلۃ بین المنزلتین) امام صاحب کو بُرا معلوم ہوا اور واصل کی طرف روئے سخن کر کے کہا "واصل ہم سے الگ ہوگیا" (اعتزل عنا) اس وقت سے واصل کا مذہب مذہب الاعتزال کہلایا اور اس کے پیرو معتزلی پکارے جانے لگے معتزلہ جمع ہے معتزلی کی۔

اعتزال کی ابتدا

اعتزال کن حالات کے ماتحت ظہور میں آیا؟ واصل بن عطاء نے ایک خاص مسئلے پر اختلاف کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ معتزلہ کا ایک علیحدہ فرقہ بن گیا۔ اور ان کے خاص عقاید ہوگئے۔ اعتزال کی ابتدا در اصل یونان کی آمد سے شروع ہوتی ہے (وکانت آراء المعتزلۃ قد ابتداء موسسھا واصل بن عطا فدرس المتھا، وفی اولھم الفلاسفۃ الیونانین ولاسیما الطبیعین منھم کارسطو فاخذوا یطبقون تلک المبادی علی عقلیاتھم، فحکموا العقل فی الوحی، وعرضوا العقائد الدینیۃ علی القواعد المنطقیۃ ورفعوا ماناق منھا العقل البشری، فتوصلوا الی انکار الآیات والعجائب والی ان الانسان حر خالق لاعمالہٗ وتجاسروا فقالوا ان القرآن مخلوق) بعد کے معتزلہ کے عقائد اپنے بانی واصل بن عطا سے زیادہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے سرگروہ یونان کے حکما خصوصاً ارسطو اور اسی کے شاگردوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے۔ سب سے پہلے نظام نے یہ کام شروع کیا۔ وہ مبادیات فلسفہ کو عقلیات سے تطبیق کرتے تھے۔ اس کے بعد وحی میں بھی عقل سے کام لینے لگے۔ دینی عقائد کو منطقی قواعد پر پرکھتے تھے اور جس چیز سے عقل انسانی انکار کرتی تھی اسے بھی وہ اپنے عقیدوں میں سے نکالنے لگے۔ یہاں تک کہ معجزات انبیا اور معجزات کلام ربانی سے انکار کیا اور کہنے لگے کہ انسان آزاد ہے اور اپنے اعمال کا آپ خالق ہے انہوں نے یہاں تک جرات کی کہ قرآن کو مخلوق ثابت کرنے لگے۔

فلسفہ اور اسلام

(۱) غیر زبانوں کی کتابوں کے ترجمہ کا کام خلیفہ منصور (۷۵۴-۷۷۵ء) کے عہد سے جاری ہوا۔ اور ایک مدت تک بڑے اہتمام سے جاری رہا۔ یہ کہنا تقریباً صحیح ہے کہ یونان۔ اطالیہ۔ صقلیہ اور اسکندریہ کا کوئی علمی سرمایہ ایسا باقی نہیں رہا جو ترجمہ کے ذریعہ عربی زبان میں منتقل نہیں ہوا۔ ہارون الرشید (۷۸۶-۸۰۹) نے "بیت الحکمت" کی بنیاد ڈالی جس میں پارسی۔ عیسائی یہودی اور ہندو مترجمین نوکر تھے اور فنون وحکمت کے متعلق تصنیف اور ترجمے کرتے رہتے تھے۔ اپنے زمانہ خلافت میں مامون الرشید (۸۱۳-۸۳۳) نے قیصر روم کو خط لکھا کہ ارسطو وغیرہ فلاسفہ کی جتنی تصانیف مل سکیں دارالخلافہ کو روانہ کی جائیں۔ قسطنطین نے فلسفہ کی تمام کتابیں ہر جگہ سے جمع کر کے ایک مکان میں مقفل کر دی تھیں۔ اور جتنے تاجدار اس کے بعد تخت نشیں ہوئے قفلوں کی تعداد بڑھاتے گئے۔ ارکان دولت نے متفق اللفظ قیصر روم سے عرض کیا۔ کہ فلسفہ اگر مسلمانوں میں پھیلا تو ان کے مذہبی جوش کو ٹھنڈا کر کے رہے گا۔ چنانچہ قیصر نے پانچ اونٹ لاد کر

خاص فلسفہ کی کتابیں ماموں کے پاس روانہ کیں۔ کچھ اور لوگ اسی غرض کے لئے آرمینیا۔ مصر۔ شام۔ سائیپرس میں روانہ کئے تاکہ فلسفہ کا تصنیفات بہم پہنچائیں۔

حجاج بن یوسف کوفی۔ قسطا بن لوقا بعلبکی، ابوحسان، سلمان حنین بن اسحق، سہل بن ہارون، ابوجعفر یحیی ابن عدی۔ محمد بن موسیٰ خوارزمی حسن بن شاکر، احمد بن شاکر، محمد بن شاکر، علی ابن العباس بن احمد جوہری لیعقوب بن اسحق کندی، یوحنا بن ماسویہ، ابن البطریق۔ یحیی بن ابی المنصور وغیرہم ماموں کے دربار کے مشہور مترجم اور بیت الحکمت کے مہتمم تھے ان مترجموں میں سے اکثر کی تنخواہیں آج کل کے حساب سے ڈہائی ڈہائی ہزار روپیہ ماہوار تھیں۔

(۲) مذہبی آزادی اور حریت فکر کی وجہ سے فلسفہ کی اشاعت خوب ہوئی ہر چیز عقل و دانش کی کسوٹی پر پرکھی جانے لگی۔ لہذا مسلمانوں میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا جس نے علم الکلام کی ترویج کی۔ یہ لوگ متکلمین کہلائے ان کا واحد مقصد اسلام کو فطری مذہب قرار دینا تھا۔ یہ اسلام کی مدافعت کی خاطر فلسفہ پڑھتے تھے۔ فلسفیوں کے حربے سے فلسفیوں کو شکست دی جاتی تھی۔ زہر کا علاج زہر سے کیا جاتا تھا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن مذہبی آزادی نے مکاروں کو کھل کھیلنے کا موقع دیا۔ چنانچہ اس زمانے میں بہت سے جھوٹے نبی (؟) بھی پیدا ہوئے۔

(۳) غیر مسلموں کو درس و تدریس کے جلیل القدر عہدوں پر فائز کیا جاتا تھا اور ترجمہ و تصنیف کے فرائض ان کے سپرد کئے جاتے تھے۔ ان ذرائع سے انھوں نے کمزور عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالدیئے۔

عقاید معتزلہ

(۱) ان افعال الخیر من اللہ وافعال الشر من الانسان وان اللہ تعالیٰ یجب علیہ رعایۃ الاصلح للعباد۔ نیک کام خدا کی ہدایت سے ہوتے ہیں اور برے افعال کا ذمہ دار انسان ہوتا ہے۔ خدا کو چاہئے کہ نیک بندوں کی دیکھ بھال کرے۔

(۲) ان القرآن مخلوق محدث لیس بقدیم (قرآن بعد میں پیدا کیا گیا ہے۔

(۳) ان اللہ تعالیٰ لیس بمرئی یوم القیامۃ (اللہ تعالےٰ قیامت کے روز آنکھوں سے دکھائی نہ دیگا)

(۴) ان المومن اذا ارتکب الذنب مثل الزنا وشرب الخمر کان فی منزلۃ بین المنزلتین یعنون بذالک انہ لیس بمومن ولا کافر۔ اگر

ب ایمان نے گناہ کبیرہ مثل زنا و شراب خواری کا ارتکاب کیا تو وہ
ں کے درمیان رہے گا۔ یعنی وہ مسلمان رہے گا نہ کافر۔

۵) ان من دخل النار لم یخرج منہا۔ (جو دوزخ میں جائے گا۔ وہ
سے ہرگز نہ نکل سکے گا۔

۶) ان الایمان قول و عمل و اعتقاد۔ (ایمان کے معنی زبان سے ادا
کے مطابق عمل کرنا اور اس پر یقین رکھنا ہیں۔

۷) ان اعجاز القرآن فی الصرف عنہ لا انہ فی نفسہ معجز ولو لم یصرف
من معارضتہ لأتوا بما یعارضہ۔ (قرآن میں واقعتہً معجزہ نہیں ہے
ں کو مقابلہ کرنے اور پیش جانے کی قوت سے محروم کر دیا گیا تھا ورنہ
ر قرآن کا جواب دیتے۔

۸) ان المعدوم شئ۔ معدوم بھی چیز ہے۔

۹) ان الحسن والقبح عقلیان (خوبی اور زشتی کا انحصار عقل پر ہے)

۱) ان اللہ تعالیٰ حی لذاتہ لا بحیاۃ و عالم لذاتہ لا بعلم ولا قدرۃ،
تعالیٰ کی کوئی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنی ذات سے زندہ ہے
ذات سے چیزوں کو جانتا ہے ورنہ اس کو قدرت یا علم نہیں ہے۔

اہل اعتزال میں بھی کئی فرقے تھے۔ الھذیلیۃ۔ الثمامیۃ۔ الجاحظیہ
۔ یہ فرقے اپنے قائم کرنے والوں کے نام سے منسوب ہیں۔ ابو الھذیل
۔ ثمامہ بن اشرس۔ ابو عثمان عمر ابن بحر الجاحظ ان فرقوں کے
۔ ابو الھذیل کے مذہب اعتزال میں ثمامہ بن الشرس نے دس نئے
اضافے کئے۔ جس میں ایک یہ ہے کہ جو شخص غور کرنے کے بعد خدا
ن سکا اگر خدا کا انکار کر دے تو معذور ہے۔ (فالجاہل معذور) اور
عذاب نہ ہوگا۔ جاحظ، نظام کا شاگرد تھا اور اس کے دس اصول
میں سے ایک یہ ہے۔ الجواہر و صدہا خالدۃ لا یجوز ان تفنی' اما
ض تتبدل۔ جوہر ہی ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں ورنہ عرض بدلتے
ہیں۔ اس مسئلے میں جاحظ یورپ کے لیبنز فرقہ وحدات
Monadolog سے قریب تر ہو جاتا ہے۔

عروج اعتزال

ب اعتزال کی ترقی مامون الرشید کے عہد خلافت میں ہوئی خاندان
ت نے جو اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے رہنما تھے اس کو شیعہ
سکھائے بڑا ہوا تو بھی یہی صحبت رہی۔ فضل بن سہل جو
وزیر اور حکومت کے ارکان تھے مامون پر ایسے محیط تھے کہ
آنکھوں سے دیکھتا اور انہی کے کانوں سے سنتا تھا۔ یہ
دونوں شیعہ تھے اور ان کے اقتدار نے کل دربار پر اپنا رنگ جما لیا تھا،
اخیر میں معتزلی اپنے فضل و کمال کی وجہ سے باریاب ہوئے۔ مامون کی
قابل طبیعت نے ان کے عقاید کو خیر مقدم کہا۔ اس کے مذہبی اعتقادات
اسی کی ذات تک محدود رہتے تو غنیمت ہوتا اور شاید اس کا دامن جبر و
اکراہ کے داغ سے پاک ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ حدوث قرآن کے مسئلے میں
مامون نے نہایت سختی سے کام لیا۔ یہی مذہبی جنون تھا جس نے اس کی تمام
خوبیاں غارت کر دیں۔ اس کے نزدیک اس مسئلے سے انکار کرنا گویا اصل
توحید سے انکار کرنا تھا۔ سنہ ۸۲۷ء میں شام کے اضلاع سے اس نے اسحٰق
خزاعی گورنر بغداد کو ایک فرمان بھیجا جس کا مختصراً مضمون یہ تھا: امیر المومنین
کو معلوم ہوا ہے کہ عموماً تمام مسلمان جو شریعت کی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتے
قرآن کے قدم کے قائل ہیں۔ حالانکہ خود قرآن کی متعدد آیتوں سے اس کے
خلاف ثابت ہے۔ یہ لوگ بدترین امم اور ابلیس کی زبان ہیں۔ بغداد
کے تمام قاضیوں کو جمع کر کے یہ فرمان سنا دیا جائے اور جسے انکار ہو اُسے
ساقط الاعتبار مشہور کر دیا جائے۔ مامون کو اس پر بھی تسلی نہ ہوئی۔ سات
بڑے بڑے عالموں کو جو مذہبا بہت اقتدار رکھتے تھے اپنے پاس طلب کیا
اور دو روز گفتگو کی۔ یہ سب لوگ اس مسئلہ میں مامون کے خلاف تھے مگر تلوار
کے ڈر سے وہ کہہ آئے جو ان کا دل نہیں کہتا تھا۔ جب یہ لوگ مامون کے
ہمزبان بن گئے تو اس نے اسحٰق کے نام دوسرا فرمان بھیجا کہ ممالک اسلامیہ کے
تمام علما اور مذہبی پیشواؤں کا بیان لیا جائے اس حکم کی پوری پوری تعمیل
ہوئی اور سب کے بیانات ان کے خاص الفاظ میں قلمبند کر کے مامون کے
پاس بھیج دیئے گئے۔ اس کے جواب میں مامون نے جو کچھ لکھا وہ اس کے
جنون مذہبی کا ہذیان تھا۔ تمام محدثین اور فقہا میں سے ایک بھی نہیں بچا
جس پر رشوت خوری، دروغگوئی۔ بے علمی۔ حماقت شعاری کا الزام نہ
لگایا گیا تھا۔ فرمان میں یہ چنگیزی حکم بھی تھا کہ جو لوگ اس عقیدے سے
باز نہ آئیں پابزنجیر روانہ کئے جائیں تاکہ میں خود اپنے سامنے، اتمام حجت کر کے
ان کی موت و حیات کا فیصلہ کر دوں۔ اسحٰق نے یہ فرمان مجمع عام میں پڑھ
کر سنایا جس کی ہیبت نے بڑے بڑے ثابت قدموں کے عزم کو متزلزل کر دیا
اور سب کے سب سچائی اور آزادی کو خیرباد کہہ کر مامون کے ہمزبان ہو گئے
علامہ قواریری و سجادہ البتہ کسی قدر مستقل رہے مگر جب پاؤں میں بیڑیاں
ڈال دی گئیں اور ایک رات اس سختی میں گزری تو ثابت ہو گیا کہ ان لوگوں
کو اپنے عزم و استقلال کی نسبت جو حسن ظن تھا وہ صحیح نہ تھا صرف امام حنبل
اور محمد بن نوح اس معرکہ میں ثابت قدم رہے جس کے صلہ میں پابزنجیر
ہو کر طرطوس روانہ کئے گئے۔

مون کو پھر معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے اس مسئلہ کو تسلیم کر لیا تھا انہوں نے تقیہ کیا تھا وہ
ر افروختہ ہوا اور ان لوگوں کو سنت حکم دیا کہ آستانۂ دولت پر حاضر
ں - ایک جم غفیر جس میں ابو حسان زیادی - نصر بن شمیل - قواریری
ار - علی بن مقاتل - بشر بن الولید وغیرہ شامل تھے پولیس کی حراست
م کو روانہ کیا گیا - یہ لوگ رقہ تک پہنچ چکے تھے کہ مامون کے مرنے
ی - جس کا اثر عام مسلمانوں پر جو کچھ ہوا ہو لیکن ان بیکسوں کے لئے
ے نہایت جانفزا مژدہ تھا -

۲۱۸ھ میں مامون نے انتقال کیا اس کے بعد المعتصم باللہ معو
ں (۸۴۲ - ۸۳۳) خلیفہ ہوا - یہ بھی معتزلی المذہب تھا - اور مامون
کی ہوئی بدعت پر سختی سے عمل پیرا تھا - بہت سے علما و فقہا کو کڑی
دی گئیں - امام حنبل پر بہت ظلم توڑے گئے کوڑوں سے ان کی
اضع کی جاتی تھی - امام صاحب رقہ میں محبوس تھے - آپ کو بغداد
یا گیا اور ایک مجلس مناظرہ منعقد کی گئی - عبدالرحمن بن اسحق اور
احمد بن داؤد نے امام موصوف سے تین روز تک مناظرہ کیا لیکن آپ نے
ِآن کا اعتراف نہ کیا - (ولم یقل بخلق القرآن) آخر کار خلیفہ کے
ے آپ کو کوڑے لگائے گئے - حتیٰ کہ آپ بیہوش ہو گئے - (فضرب
احدا الی ان اغمی علیہ)

۲۲۷ھ میں معتصم فوت ہوا - اس کے بعد الواثق باللہ (۸۴۷ - ۸۴۲)
خلافت پر متمکن ہوا - یہ بھی اپنے باپ اور چچا کے جیسے مذہب الاعتزا
ل سے قائم رہا اہل سنت پر اس نے بہت سختیاں کیں اور محنہ کی بدعت
ی کی (فاظهرها اظهر من المحنة) امام حنبل کو حکم دیا کہ خبردار آپ سے کوئی نہ ملے
جس شہر میں ہوں وہاں آپ نہ رہیں - ناچار امام صاحب نے گوشہ نشینی اختیا
ر کر لی - آپ باہر نہ نکلتے تھے تاہم اپنے عقیدہ پر نہایت ثابت قدم رہے

زوال معتزلہ

بالآخر واثق باللہ کا زمانہ بھی گزر گیا - اب المتوکل علی اللہ (۸۶۱ - ۸۴۷ فوت) خلا
فت ہوا - اس نے ۲۳۴ھ میں اعتزال کا قلع قمع کیا اور نئے سر سے
سنت رسول اللہ کو جاری کیا - المسعودی کا بیان ہے کہ ملت اسلامیہ
میں معتزلہ سے زیادہ بدعتیں اور کسی نے داخل نہیں کیں (ولم یکن فی
الملة الاسلامیة اکثر بدعة منهم -)

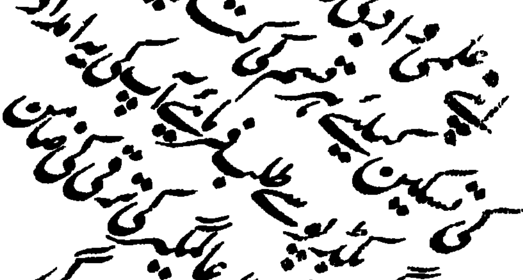
مذہب الاعتزال واصل بن عطاء کے زمانے سے شروع ہوا اس کا
زور مامون کے عہد میں ۸۲۷ء سے متوکل کے اضطہاد معتزلہ ۸۵۱ء
تک رہا بعد ازاں امام احمد حنبل اور ابو الحسن الاشعری وغیرہ کی کوششوں
سے اعتزال کا زور بالکل کم ہو گیا -

اہل اعتزال میں بڑے بڑے ادیب، عالم، شاعر، حکیم تھے - حقیقت یہ ہے
کہ اسلام میں فنون حکمیہ و علوم عقلیہ کی ترقی معتزلہ کے دم سے تھی - اعیان
معتزلہ میں سے بعض کے نام درج ذیل ہیں -

واصل بن عطاء - الجاحظ - ابو الہذیل العلاف - ابراہیم النظام
احمد بن حابط - بشر بن المعتمر - معمر بن عباد السلمی - ابو موسیٰ - عیسیٰ
الملقب بالمزدار والمعروف براہب المعتزلہ - ثمامہ بن اشرس،
ہشام بن عمرو الفوطی - ابو الحسین بن ابی عمرو الخیاط - استاذ الکعبی
ابو علی الجبائی استاذ الشیخ ابی الحسن الاشعری - ہاشم عبدالسلام
- ابو القاسم الصاحب - اسمٰعیل بن عباد، زمخشری - الفراء النحوی
السیرافی - وغیرہ

استدراک

(۱) تاریخ الخلفا - جلال الدین سیوطی -
(۲) کشکول - بہاؤ الدین العاملی
(۳) الجاحظ - سلسلۃ الروائع ۱۹۱۸ء فواد افرام البستانی،
(۴) الکلام - مولنا شبلی نعمانی
(۵) المامون مولنا شبلی نعمانی
(۶) A. SHORT HISTORY OF THE Saracens: S. Amir Ali
(۷) Muslim Theology :- D.B. Macdonald
(۸) Encyclopaedia of Islam



عورت

نظم

حضرت امین حزیں سیالکوٹی

کشش، خلوص، محبت، حیا، فدائیت — یہی تو چار عناصر ہیں فطرتِ زن کے
صفات پھولوں کے موجود ہوں تو سب گل ہیں — یہ خواہ صحنِ چمن کے ہوں خواہ ہوں بن کے

کشش سنگار ہے ظاہر کی ہو کہ باطن کی — خلوص سے ہے محبت زوال سے بالا
حیا حریمِ تجلی ہے اور فدائیت — نظر کو رخصتِ سُبحان ربی الاعلیٰ

کشش ہے رنگ مگر بُو حیا ہے اس گل کی — بغیر بُو کے اگر پھول ہو تو کچھ بھی نہیں
ہے اصل چیز تو رہوار طبع پاک سرشت — نمود ہی کی نری جھول ہو تو کچھ بھی نہیں

حیا نقاب ہے عورت کے حسنِ خوبی کی — یہ اُٹھ گئی تو ہے عورت متاعِ بازاری
یہ ہے تو سجدہ گہِ عجز ہے حریم اُس کا — نہیں تو زن ہے سراپا فتور و عیاری

چراغ خانہ ہے جبتک یہ شمعِ ایمنِ دل — عصا و دستِ کلیمی ہے سوز و ساز اس کا
نشاطِ قلبِ حزیں التفاتِ چشم اُدہر — پیامِ زیست اِدھر صرف دلنواز اس کا

ازل سے دعوتِ سجدہ ہے مظہرِ تخلیق — نگاہِ غیر کو یہ دعوتِ نظارہ نہیں
زبانِ حال سے گویا ہے مانعِ فطرت — یہ شاہکار ہے جب تک زن آشکارہ نہیں

نگاہِ پاک سے پردہ نہیں حقیقت کو — ازل کے روز سے فطرت کا ہے یہی دستور
ہے یہ بھی ایک حقیقت مگر بہ شکلِ مجاز — ہوس کی آنکھ سے عورت اگر رہے مستور

پکارتی ہے یہ جب بھی مقامِ مادر سے — فرشتے عرش پہ لے جاتے ہیں دعا اس کی
گدا سے تا بہ شہنشاہ اس کے حلقہ بگوش — سکونِ دل کی ہے ضامن امیں رضا اس کی

مِیاں بیوی کا افسانہ

اِن دونوں میں بیحد محبت تھی۔ ایک دُوسرے کو چاہتے تھے۔ لوگ
۔ تھے یہ سارس کی جوڑی ہے اور ان دونوں کی زندگی پر رشک
نے تھے۔ بیوی حسین تھی۔

بیوی حسین تھی اور شوخ بھی، انہی شوخیوں میں اسکی زندگی بہار
ہی تھی۔ شوہر اسکی اداؤں کا دیوانہ تھا لیکن واہ رے انقلاب!...
... وقت کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ پتہ نہیں کیوں یہ خوبصورت پھول
بانے لگا۔ شوہر گھبرا گیا۔ بے چین ہو گیا۔ بیوی کے خوبصورت چہرہ
اسیاں چھا گئیں۔ اور رفتہ رفتہ ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے اُس کا
ن ہوا میں بکھر گیا ہے۔ دیکھنے والے کہنے لگے۔ دق کی بیماری ہے کیونکہ
رفتہ اس کا چلنا پھرنا بہت ہی کم ہو گیا تھا۔ چہرہ پر زردی چھا گئی تھی
ڑ آئے، حکیم آئے، طرح طرح کے علاج ہوئے۔ لیکن مریضہ کا چہرہ
تا ہی چلا گیا۔ وہ خود کچھ نہ کہتی تھی۔ چپ تھی۔ یہاں تک کہ اس کی
لی کے لالے پڑ گئے۔ چہرہ بھیانک ہو گیا۔ یہ وہی خوبصورت اور حُسن کا
عورت تھی جو کبھی شوہر کی نظروں میں سمائی رہتی تھی۔ آج اس کا یہ حال
بلکہ شوہر بھی بچنے لگا۔ مرد کی محبت بے نقاب ہو گئی اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ
عورت کے حُسن سے اور اسکی جوانی سے محبت کرتا ہے عورت سے نہیں۔

سخت بیماری کے باوجود وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ مگر کرتی کیا۔ اتفاق
بات کہ اس نے ایک دن کسی اخبار میں کچھ پڑھ لیا۔ وہ سمجھ گئی اُسے کیا بیماری
ہے۔ اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ ساتھ ہی اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس بیماری
لی علاج کیا ہے۔ چنانچہ اس نے مسہری پر لیٹے لیٹے ایک خط لکھا اور نہ
کہاں سے دوا کا پارسل منگا لیا۔ اور دوا شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ
ں نے دیکھا۔ اُسکے چہرے پر پھر رونق آنے لگی اور رفتہ رفتہ وہ پھر
بصورت پھول بن گئی۔ اور وہی شوہر جو کل تک الگ رہنے لگا تھا پروانہ
طرح اسکے چاروں طرف چھا گیا۔ (شمع پھر روشن ہو گئی تھی اور پروانہ کا آنا
ردی ہو گیا تھا۔)

بہت دن بعد پتہ چلا کہ وہ سیلان الرحم یعنی لیکوریا کی بیمار تھی

اور وقت بے وقت سُفید پانی خارج ہونے لگا تھا جو رفتہ رفتہ بڑھ گیا
اور بیماری خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ چہرہ کا رنگ روپ اڑ گیا۔ اتفاق سے
اس نے دَوا "روک" کی خبر اخبار میں پڑھ لی۔ جس سے اُسے معلوم ہوا کہ لیکوریا
کی بیماری کیلئے یہ دوا سب سے بڑا علاج ہے۔ چنانچہ اُس نے

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دَواخانہ اے۔بی ۲۶۳ دہلی کو

خط لکھکر دَوا "روک" کی شیشی بذریعہ وی۔پی پارسل منگائی اور استعمال
کی۔ تیسرے دن سفید پانی کا آنا بند ہو گیا۔ اور پوری شیشی ختم ہونے تک بیماری
کا نام نشان بھی نہ رہا۔ اُسکے بعد اُس نے بیشمار سہیلیوں کو دَوا "روک"
کا حال بتایا۔ اور ان میں سے جس کسی کو بھی لیکوریا کی بیماری تھی۔ اُس نے
دَوا "روک" کے استعمال سے صحت حاصل کر لی۔ ایک شیشی دَوا "روک" کی
قیمت تین روپے ہے۔ پارسل پر سات آنے محصول لگتا ہے۔

نوٹ: سیلان الرحم یعنی لیکوریا کی بیماری کیلئے دَوا "روک" اتنی بہترین
ثابت ہوئی ہے کہ آج ہزاروں حکیم ڈاکٹر لیکوریا کی مریض عورتوں کو صرف
اسی دَوا کا مشورہ دیتے ہیں۔ کیونکہ دَوا "روک" کے استعمال شروع کرنے کے
تیسرے ہی دن سُفید پانی گرنا بند ہو جاتا ہے۔ لہذا جن عورتوں کو ضرورت
ہو مندرجہ بالا پتہ پر خط لکھکر دَوا "روک" منگالیں۔ ایک ہی شیشی سے
یہ بیماری ختم ہو جاتی ہے۔

واضح رہے کہ دَوا "روک" تقریباً چودہ سال سے تمام ہندوستان
میں مشہور ہے اور نہایت تیزی کے ساتھ ہندوستانی عورتوں میں
مقبول ہوئی ہے۔ چونکہ تیسرے ہی دن سفید پانی گرنے کو بند کر دیتی ہے
اسلئے ہزارہا عورتیں محض اس خوبی کے باعث اسکی گرویدہ ہیں۔ اور جب
ان کی کوئی سہیلی لیکوریا کے مرض میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ تو وہ
یہی تاکید کرتی ہیں کہ دَوا "روک" استعمال کرو تاکہ دیکھتے دیکھتے
بیماری ختم ہو جائے۔ اور یہی حقیقت ہے کہ ہمیشہ ہی اُن کا یہ کہنا
سچ ثابت ہوتا ہے۔ ٹیلیفون نمبر ۱۲۹۶۸

دُوربین

نفسیاتی افسانہ

از جناب سید علی ملتانی منشی فاضل

"بلقیس ــــ بلقیس ــــ کہاں ہو تم؟"

جب میں نے اپنی بیوی کو کئی بار اس طرح پکارا اور کوئی جواب نہ پایا تو وہ دوربین جسے میں آج دن بھر تجربہ گاہ میں بناتا رہا تھا ایک ہاتھ میں لئے سیدھا ڈریسنگ روم کی جانب روانہ ہوا۔ کیونکہ مجھے تجربہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ میری بیوی جسے آئینے کے سامنے پہروں کھڑے رہنے کی بیماری ہے جب کوئی جواب نہ دے تو یقیناً یا تو وہ پڑوس والے گھر میں گئی ہوتی ہے یا پھر ڈریسنگ روم میں کھڑی شہزادی نرگس کی طرح اپنا عکس دیکھنے میں ایسی مصروف ہوتی ہے کہ اسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں رہتی۔ کمرہ میں جا کر دیکھا تو وہ سچ مچ ایک خوبصورت ساڑھی زیب تن کئے ہار سنگھار کرنے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "آہا! آپ آ گئے۔ میں تو راہ دیکھ ہی رہی تھی۔ آج رات پیریڈائیز سینما چلنا ہے۔ بی پڑوسن کہتی تھیں بہت ہی اچھی فلم ہے"۔

میں نے آج سارا دن سخت جدوجہد کے بعد دوربین اس لئے تیار کی تھی کہ آج شام کو اس کے ذریعے سے اپنی بیوی کو فضائے آسمانی میں تیرنے والے نورانی اجسام کی سیر کراؤں گا۔ اور اس سے کہوں گا کہ بھلی مانس! دیکھ آئینہ کے سامنے پہروں کھڑے رہ کر اپنا وقت گنوانا اچھا ہے یا آسمان میں چلنے پھرنے والے خوبصورت سیاروں اور برجوں کا نظارہ کرنا؟ جس سے نہ صرف آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور ہوتا ہے بلکہ ذہن کی بھی ترقی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ "آم کے آم گٹھلیوں کے دام" کی کہاوت کے بموجب ہمیں ملک اور قوم کی خدمت کا بھی موقع ملتا ہے۔ اگر مادام کیوری کی طرح تو بھی اپنے خاوند کی معین و مددگار ہو تو کیا عجب کہ وہ اور اس کے ساتھ تو بھی ایک دن علم نجوم کا درخشندہ تارا بن کر چمکے۔

مگر معلوم ہوتا ہے جس طرح میں آج دن بھر اسے تارے دکھانے کے خواب دیکھتا رہا وہ بھی ٹھیک اسی طرح تارے دیکھنے کے خواب دیکھتی رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میرے تارے زہرہ، مشتری، مریخ، عطارد اور زحل وغیرہ تھے اور اس کے تارے خورشید، نجمہ، تارا، یہ دیو داد دیوتے۔ بالآخر مجھی کو جھکنا پڑا۔ بیگم صاحبہ کی جیت ہوئی اور

ہم دونوں کھانا کھا کر سینما چل دیئے۔

فلم درمیانہ درجے کی تھی۔ اگر اس میں چند ایک سُریلے گانے نہ ہوتے تو شاید ہی کوئی متنفس دیکھنے جاتا۔ ہندوستانی فلمکاروں کو چاہئے اور کچھ آتا ہو یا نہ آتا ہو لیکن اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ انہیں عوام کا دل لبھانا خوب آتا ہے۔ چنانچہ اس فلم میں بھی ڈائرکٹر صاحب نے ہنسی مذاق کے واقعات کچھ اس خوبی و مناسبت کے ساتھ پیوست کر دیئے تھے کہ میرے جیسے سنجیدہ آدمی کو بھی ہنسی آ گئی۔ میری بیوی کا تو ہنسی کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے فلم ختم ہوئی اور ہم گھر پہنچے۔ چونکہ رات بہت گزر چکی تھی اور سویرے کالج جانا تھا اس لئے میں نے دوربین دکھانے کا کام کل پر ملتوی کر دیا۔

دوسرے دن اٹھا تو گھڑی نے سات بجائے تھے۔ مجھے صبح سویرے اٹھنے کی عادت ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے آنکھ دیر سے کھلے تو ہوا خوری ترک کرنا پڑتی ہے جس کا میں بچپن سے عادی ہوں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبیعت دن بھر سست اور مرجھائی ہوئی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اکثر سویرے ہی سو جایا کرتا ہوں۔ مگر گزشتہ رات تو بیگم صاحبہ کا دل اور دماغ دونوں پر راج تھا۔ یہ سب باتیں اس وقت مجھے یکسر بھول گئی تھیں۔ اب یاد کرنے سے کیا ہو سکتا ہے۔ پہلے تو میں نے سیر کے لئے باغ میں جانے کا ارادہ کیا مگر گھڑی دیکھ کر یہ ارادہ بدلنا پڑا ورزش کرنے کی ٹھانی اور بستر سے نیچے اتر کر ہلکی سی ورزش کرنے لگا۔ مگر دوران ورزش میں مجھے یاد آیا کہ جس موضوع پر آج مجھے لکچر دینا ہے اس کی تیاری بالکل نہیں کی مجبوراً ورزش کو بھی چھوڑ دیا اور غسل کرنے کے بعد مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔

ابھی مطالعہ کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بیگم صاحبہ ایک سیاہ لمبی نلکی ہاتھ میں لئے میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں اور پوچھنے لگیں کہ یہ کیا ہے؟ دیکھا تو دوربین تھی جو میں نے گزشتہ رات عجلت کے مارے کھانے کے کمرے میں چھوڑ دی تھی۔ میں نے جواب دیا "یہ دوربین ہے اور تمہارے لئے گزشتہ رات لایا تھا"۔

"میرے لئے کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ بھی میری طرح ستارہ شناس نہیں۔ اور ہم دونوں مل کر رات کو ستاروں اور آسمان میں ہونے والے تغیرات کا مطالعہ کریں"

"معاف رکھئے مجھے اس کام سے۔ میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہدیا ہے کہ میں پروفیسر نہیں بننا چاہتی۔ پھر آپ میرے لئے اتنی تکلیفیں کیوں کر رہے ہیں؟ عیسیٰ بدین خود۔ موسیٰ بدیں خود"

"یہ بات ہے!"

"جی ہاں"

"اچھا تو آپ ناشتہ کر لیجئے"

میں نے جھٹ پٹ ہاتھ دھوئے۔ ناشتہ زہر مار کیا اور وقت سے بھی کچھ پہلے کالج کی طرف چلدیا۔ اپنی کوششوں کے ناکامیاب ہونے کا کس کو رنج نہیں ہوتا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو یہ میری تویں کوشش تھی جو ناکام ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اچھی اچھی کتابوں۔ بہترین اخباروں اور رسالوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریز اور ہندوستانیوں کے ذریعہ سے کئی بار اپنی بیوی کا رنگ ڈھنگ بدلنے کی کوشش کی تھی مگر سب بے سود۔ وہ کتابیں پڑھتی تھی تو صرف وہی جو بیوٹی کلچر (فن تجمیل) پر لکھی گئی ہوں اور اخبارات و رسائل دیکھتی تو صرف فیشن کے کالم اور انگریز اور ہندوستانیوں سے فائدہ اٹھاتی تو صرف یہی کہ ان کے پہناوے اور چال ڈھال کی بندریا کی طرح اس خوبی سے نقل اتارتی تھی کہ بعض اوقات پہچاننے میں بھی دھوکا ہو جاتا تھا۔

ایک دن کی بات ہے۔ ابھی کافی سویرا تھا۔ میں حسب معمول بستہ سے اٹھ کر لیکچر کی تیاری کے لئے بجلی کی روشنی میں مطالعہ کرنے لگا۔ جب سات بجنے میں پندرہ بیس منٹ باقی رہ گئے تو انگریز استانی کے پہنچنے کا وقت قریب دیکھ کر میں اٹھنے کی تیاری کرنے لگا۔ ابھی کتاب بھی بند نہ کی تھی کہ دروازے کی طرف سے گویا شاہی لہجہ میں میرے کانوں نے یہ سنا۔ "کیا بیگم ساہبہ (صاحبہ) اندر تشریف رکھتی ہیں؟" یہ خیال کر کے کہ میم صاحبہ تشریف لے آئی ہیں میں نے جواب میں عرض کیا۔ "میم صاحبہ آپ اندر تشریف رکھئے۔ میں انہیں جلد سے جلد یہیں بھیج دیتا ہوں" لیکن جب کرسی سے اٹھ کر دروازے کے پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ میم صاحبہ نہیں بلکہ ہماری بیگم صاحبہ ہیں جو اپنی استانی کے سے کپڑے پہنے میرا جواب سننے کے بعد بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہی ہیں۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس اور بیگم صاحبہ کے مذاق کا پتہ چلا اور ہم یک وقت کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ مگر جلد ہی مجھے یاد آ گیا کہ ایسی

سے عورتیں بگڑ جاتی ہیں اس لئے جھٹ ہی سنجیدہ بن کر کہا۔

"بلقیس آئندہ ایسی شرارت نہ کرنا۔"

میں کب کالج پہنچا؟ کلاس کیسے شروع ہوئی؟ کیا لکچر دیا اور لکچر کے ختم ہونے کے بعد لائبریری میں کیسے پہنچا؟ ان سب باتوں کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔ لیکن ہاں جب پرنسپل صاحب نے (جو اتفاق سے وہاں نکلے تھے) مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مسٹر عزیز! خیر تو ہے؟ آج تم بڑے پریشان نظر آتے ہو۔" تو مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ میں اس وقت کالج میں ہوں اور اپنے محترم و مکرم استاد کے سامنے جو صرف استاد ہی نہیں بلکہ میرا افسر بھی ہے۔ میں نے تعظیم بجالانے کے بعد عرض کی۔

"آنجناب سچ فرماتے ہیں۔ میں سخت پریشان ہوں۔ میں خود بڑی دیر سے یہی سوچ رہا تھا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو اپنی رام کہانی سناؤں اور مشورہ کا طالب ہوں لیکن خوش قسمتی سے آپ ہی یہاں تشریف لے آئے اب امید ہے مجھے لمبی تمہید بھی نہیں باندھنا پڑیگی جس کے لئے میں اتنی دیر سے سوچ رہا تھا۔"

پرنسپل صاحب نے کہا۔ "تو پھر آپ میرے کمرے میں چلے آئیں۔ یہاں بات چیت کرنا اچھا نہیں۔ شاید کوئی اور پروفیسر بھی آجائے۔"

چنانچہ ہم دونوں کمرے کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں میں قارئین کو اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ پرنسپل صاحب میرے استاد ہیں۔ آج سے چند برس پہلے جب میں اسی کالج میں پڑھتا تھا تو پرنسپل صاحب بحیثیت ایک پروفیسر کے کام کرتے تھے اور کلاس بھر میں محنتی ہونے کی وجہ سے انھیں مجھ سے بہت انس تھا۔ میں ابھی ولایت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ اخبارات کے ذریعے سے مجھے آپ کے پرنسپل بننے کی خبر ملی۔ چنانچہ میں نے ایک مبارکباد کا تار آپ کے نام ارسال کیا۔ اس تار کا جواب انھوں نے ایک رقعہ کے ذریعہ سے دیا جس میں یہ خواہش بھی ظاہر کی گئی تھی کہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ کے ماتحت کام کروں۔ میری موجودہ نوکری بھی گویا آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ایسے شخص سے میں نے اپنا احوال و اقعی چھپانا مناسب نہ سمجھ کر اپنی کہانی الف سے لیکر ی تک سنا دی۔

جب پرنسپل صاحب میری کہانی مختصر طور پر سُن چکے تو کسی قدر مسکرانے کے بعد بولے۔ "عزیز! معلوم ہوتا ہے کہ تم ابھی تک کالج کے لڑکوں کی طرح بچہ ہو لہذا مجھے بھی تمھیں مثال کے ذریعہ ہی سے سمجھانا ہوگا۔ اچھا جیسے ہی کلاس ختم ہو میرے کمرے میں چلے آنا۔ آج ہم دونوں ایک ساتھ گھر چلیں گے۔"

جب آخری کلاس بھی ختم ہوگئی تو میں پرنسپل صاحب کے کمرے میں پہنچا۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ اتنے میں چند اور لوگ بھی ملنے کے لئے آگئے۔ مگر پرنسپل صاحب نے انھیں جلد از جلد رخصت کر دیا اور مجھے ساتھ لیکر گھر پہنچے اور پہنچنے کے ساتھ ہی اپنے چھوٹے بیٹے کو آواز دی جب وہ حاضر ہوا تو بولے۔

"بیٹا! تم نے مجھے اس دن ایک چڑیا کا تماشہ دکھایا تھا۔ کیا آج بھی دکھا سکو گے؟"

"ہاں ابا۔"

"تو پھر دکھا دو بیٹا! میں نے آج تمھارے بھیا سے اس کا ذکر کیا تھا۔ وہ ٹھہرے ولایت سے لوٹ کر آئے ہوئے۔ کہتے ہیں جب تک اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں ہرگز نہ مانیں گے۔"

"اچھا تو آپ تشریف رکھیں۔ میں پہلے یہ دیکھ لوں کہ وہ موجود ہے یا دانا دنکا چگنے گئی ہے۔"

ہم ابھی صوفے پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ دوڑتا ہوا آیا اور بولا "ہاں ابا وہ یہیں ہے اور کنوئیں کے منڈیر پر بیٹھی ہے۔ آپ لوگ یہ چادر (تپائی سے چادر آگے بڑھاتا ہے) اپنے اوپر ڈال لیں۔ میں اسے ابھی یہاں بلاتا ہوں۔"

جب ہم لوگوں نے چادر اپنے اوپر ڈال لی اور مورتی کی طرح بے حس و حرکت ہو کر بیٹھ گئے تو اس نے الماری میں سے آئینہ نکال کر میز پر رکھ دیا ابھی ایک منٹ بھی نہ گزرا تھا کہ ایک خوبصورت نوجوان چڑیا چڑ چوں چڑ چوں کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور آئینہ پر بیٹھ کر اپنے عکس سے چونچ لڑانے لگی۔ کبھی ادھر بیٹھتی تھی کبھی اُدھر، کبھی نیچے کبھی اوپر مگر چونچ مارنا بند نہ ہوتا تھا۔ اچانک میری نظر کنوئیں کی منڈیر پر جا پڑی دیکھا تو وہاں ایک ہٹا کٹا چڑا بیکسوں کی سی صورت بنائے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنا مُنہ پرنسپل صاحب کے کان کے پاس لے جاکر پوچھا۔ "یہ چڑا کیوں بیٹھا ہے۔ کیا اسی کا خاوند تو نہیں؟" انھوں نے بھی اپنے مُنہ کو میرے کان کے پاس لے جاکر جواب دیا۔ "ہاں، تیرا بھائی (یعنی اس چڑیا کا خاوند) ہے صنف نازک (خواہ وہ انسانی ہو خواہ حیوانی) کے مزاج کی افتاد ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے۔ خصوصاً جب وہ کمسن بھی ہو کیا تم نے چڑیا کو غور سے نہیں دیکھا بالکل بچہ معلوم ہوتی ہے۔" میں نے یہ تماشہ دیکھ کر کان ہی کان میں پرنسپل صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

ادھر تو ہم ان باتوں میں مصروف تھے ادھر صاحبزادہ صاحب سرکس کے کھلاڑی کی طرح دوسرے کام میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے اب آئینہ اٹھا کر اپنے سینہ پر رکھ لیا تھا۔ اور آنکھیں بند کر کے بستر پر

ہو گئے تھے۔ آئینہ دیکھنے کی دیوانی چڑیا بھی اڑ کر وہیں پہنچی اور پھر
کھٹ کرنے کے کام میں مصروف ہوگئی۔ صاحبزادے نے جب یہ
دیکھ لیا کہ چڑیا غافل ہے تو اسے جھٹ سے پکڑ لیا اور چلا کر بولا۔
"چادر گرا دیجئے۔ پیچھے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ جب ہم لوگوں
نے چادر گرا دی تو آپ نے فاتحانہ انداز میں ہمارے استفسار کے بغیر
چڑیا کی ساری کہانی الف سے ی تک سنائی اور بالآخر چڑے کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "یہ اس کا خاوند ہے۔ لیکن چڑیا کی طرح دلیر نہیں
آئینہ سے بہت ڈرتا ہے"۔ کوئی پندرہ بیس منٹ یہ عجیب و غریب
تماشہ دیکھنے کے بعد میں ہر دو صاحبان کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے اپنے
دفتر کی طرف روانہ ہوا۔

میں بہت سخت مزاج واقع ہوا ہوں لیکن حقائق سے نہ میں
نے آج تک روگردانی کی ہے نہ کروں گا۔ جب مجھے کوئی بات صحیح صحیح
معلوم ہو جاتی ہے تو اس کے ماننے سے کبھی نہیں جھجکتا۔ آج مجھ پر ایک
بہت بڑی حقیقت منکشف ہو چکی تھی۔ یعنی جس طرح بچوں کو کھیل سے
(جو ان کی فطرت کا جزو ہے) روکا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح عورتوں کو ان
کے ہار سنگار کرنے اور خود بینی کی عادت سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ میں
نے اپنے قیام انگلستان کے دوران میں چند ایک انگریز عورتیں ضرور
دیکھی تھیں جو ہار سنگار پر بہت زیادہ وقت صرف کرتی تھیں۔ اور بعض اوقات
راہ میں چلتے ہوئے بھی کچھ عورتوں کو آئینہ ہاتھ میں لیکر پوڈر وغیرہ لگاتے
دیکھا تھا۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ وہ آوارہ عورتیں تھیں۔ لیکن آج چڑیا کا
تماشہ دیکھ کر مجھے اپنے سب نظریئے بدلنے پڑے۔

راستہ میں ایک فرنیچر والے کی دوکان ملی۔ دیکھا تو ایک بہت
ہی خوبصورت ڈریسنگ ٹیبل شو میں رکھا ہوا تھا۔ مقابلہ کیا تو ہمارا ڈریسنگ
اس کے سامنے بالکل ہیچ تھا۔ دل نے کہا کہ اسے خریدنا چاہیئے مگر نقد روپے
جیب میں نہ تھے اور چک بک غالباً گھر میں ہی ہوگی۔ پھر مجھے یاد
آیا کہ نہیں کل رات اسے الماری میں رکھنے کا موقع ہی نہ ملا تھا
ضرور میری جیب ہی میں ہوگی۔ دیکھا تو وہ بھی جیب میں موجود تھی
بس پھر کیا تھا دکان میں داخل ہو گیا۔ قیمت پوچھی اور چک کاٹ دیا
چلتے چلتے خیال آیا کہ کچھ آئینے بھی بھیج دوں تو اور اچھا ہوگا۔ چنانچہ
تین قد آدم آئینے بھی خرید لئے جو سنہرے چوکھٹے میں جڑے ہوئے تھے
اور سب کو قلیوں کے ذریعہ گھر بھیج دیا۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ ابھی کچھ خامی باقی ہے۔ مگر کس چیز کی، مجھے
ابھی تک معلوم نہ ہو سکا تھا۔ سوچتے سوچتے خیال آیا کہ عورتیں صرف
آئینے کے آگے ہی نہیں کھڑی رہتی ہیں بلکہ آرائش کے لئے کچھ لگاتی بھی
ہیں۔ پوڈر، لپ اسٹک وغیرہ وغیرہ تو کسی دکان پر چلنا چاہیئے۔ راستے
میں ایک انگریزی دوا فروش کی دکان پڑتی تھی جہاں میں اکثر لیبارٹری
کا سامان خریدنے جایا کرتا تھا۔ دل نے کہا چلو وہیں چلیں۔

دکان میں پہنچا تو دکاندار نے یہ سمجھ کر کہ آج بھی کوئی لیبارٹری
کا سامان خریدنا آیا ہوں حسب عادت کیمیکل ڈیپارٹمنٹ کی طرف
لے جانا چاہا مگر میں نے اس سے کہا کہ اب کے میں کوئی کیمیائی چیز
خریدنے نہیں آیا بلکہ عورتوں کے استعمال کی چیزیں لینے آیا ہوں آپ
مہربانی فرما کر مجھے اچھی سے اچھی چیزیں بتایئے۔ مجھے کسی کو تحفہ دینا ہے۔

دوا فروش نے پہلے تو میرے منہ کی طرف غور سے دیکھا اور پھر
اچھا حضور کہہ کر ٹائلیٹ ڈیپارٹمنٹ میں لے آیا۔ یہاں ایک چھوڑ
بیسیوں ہار سنگار کی چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ فیس پوڈرس۔ باتھ پاؤڈرس
ڈسٹنگ پاؤڈرس۔ نیل پالش۔ فیس کریم۔ ویزلین۔ اسنو۔ بریلینٹائنز
لپ اسٹک۔ روج۔ آئی بروپنسلس۔ یوڈی کولون۔ لیونڈر واٹرس
باتھ سالٹس۔ ہیر آئلس۔ ہیر شیمپو۔ عطریات اور صابون وغیرہ وغیرہ
ہر ایک کی بیسیوں قسمیں اور درجنوں میکر (بنانے والے)
یہ فرانس کی ہے تو وہ امریکہ کی۔ یہ جرمنی کی ہے تو وہ انگلستان کی۔
غرض کہ ایک اچھا خاصہ عجائب خانہ تھا کسے انتخاب کرتا اور کیسے؟ آخر
میں نے دکاندار سے کہہ دیا۔ "بھائی مجھے تو ان باتوں کا کچھ علم نہیں
آپ ہی ان چیزوں میں سے ایک ایک چیز جو سب سے اچھی کمپنی کی
بنائی ہوئی ہو مجھے دے دیجئے۔ اگر پسند نہ ہوگی تو واپس بھیج دونگا"
چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ایک اچھا خاصہ بنڈل باندھ کر اس نے بل بھی
میرے سامنے لا رکھا۔ یہاں بھی ایک چک لکھ دیا اور بنڈل لیکر گھر
کو روانہ ہوا۔

گھر پہنچا تو دیکھا کہ بلقیس دوربین لئے صدر دروازے
طرف دیکھ رہی ہے۔ مجھے دیکھا تو کھکھلا اٹھی۔ میں سمجھ گیا کہ
ہو مجھے الٹا دیکھ کر ہنس رہی ہے۔ کیونکہ وہ دوربین محدب شیشے
سے صرف ستارے دیکھنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ ستاروں میں تو الٹا
سیدھے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ جب میں بہت قریب پہنچ گیا
وہ ہنس کر بولی۔

"آپ تو اس نگوڑی دوربین میں بالکل الٹے معلوم ہوتے
سر نیچے اور پاؤں اوپر"

اس پر میں نے جواب دیا۔ "بلقیس! تم بالکل سچ کہتی

ابھی تک تمہیں یقین نہیں آیا کہ اب میں پہلے سے اُلٹا ہوگیا ہوں۔ لو یہ بنڈل لے لو۔ تمہارے سنگار کی چیزیں ہیں اور کیا ابھی تک ڈریسنگ ٹیبل اور آئینے نہیں پہنچے؟"

"پہنچے ہیں اور میں نے انہیں اپنی جگہ پر رکھوا بھی دیا ہے!"

"ہم دونوں آج پہلی مرتبہ ایک دوسرے کی گردن میں باہیں ڈال کر آئینوں کا معاینہ کر رہے تھے۔ دوربین ابھی تک بلقیس کے ہاتھ میں تھی اور وہ بیحد مسرور نظر آتی تھی۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں بھی بہت مسرور اور اصلاح کا پہلے سے زیادہ امیدوار تھا۔

مدح و ذم

لطفِ بیداد کم نہ ہو جائے

حضرت علامہ محوی لکھنوی

ختم شوقِ ستم نہ ہو جائے — خلشِ درد کم نہ ہو جائے
اس قدر دل کو حسرتِ پابوس — خود یہ نقشِ قدم نہ ہو جائے
جی دھڑکتا ہے اے مری اُمید — تو بھی پامالِ غم نہ ہو جائے
ننگِ وحدت ہے یہ دوئی کا رنگ — ہست بھی کیوں عدم نہ ہو جائے
اور تھوڑی سی جان باقی ہے — لطفِ بیداد کم نہ ہو جائے
کوئی روتا رہے لہو جب تک — حسرتِ دل رقم نہ ہو جائے
آنکھ میں قہر اور لب پہ ہنسی — کہیں یہ اس میں ضم نہ ہو جائے
دل کو برباد کیجیے، لیکن! — خاک زیرِ قدم نہ ہو جائے
روکئے اپنی شوخ نظروں کو — شوقِ مشقِ ستم نہ ہو جائے
جلوۂ حسن بے نقاب نہ ہو — عام یہ ذوقِ غم نہ ہو جائے
شیخ ہے اور طواف شام و سحر — میکدہ بھی حرم نہ ہو جائے
بڑھتی جاتی ہے خستگی دل کی — ہمتِ ضبط کم نہ ہو جائے

کون نرگس کہے اُن آنکھوں کو
مدح محوی یہ ذم نہ ہو جائے

آستاں سے دُور

بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دُور

از حضرت شاد عارفی

میں اب سے دُور، تھا جو ترے آستاں سے دُور
کیا دَور زندگی تھا مجالِ بیاں سے دُور

تدبیر دیکھئے مگر پاسباں سے دُور
رُکتا ہوں اس گلی میں تو اس کے مکاں سے دُور

اُس انجمن سے دُور ہوں اس مہرباں سے دُور
جھوٹی مسرّتوں کے فریبی جہاں سے دُور

ساقی کو جانتا ہوں یقین و گماں سے دُور
پیتا ہوں جا کے زاہدِ تسبیح خواں سے دُور

جاتا ہے کون اُٹھ کے ترے آستاں سے دُور
تو وہ نہیں، قریب یہاں سے وہاں سے دُور

سجدوں کو ٹھوکروں سے جہاں واسطہ پڑے
رکھے خدا عدو کو بھی اُس آستاں سے دُور

جھوٹی تسلیوں سے نتیجہ نہیں مگر
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دُور

میں اور التماسِ نوازش، نہیں نہیں
مانا لبِ سوال نہیں ہیں زباں سے دُور

اُس کا سوال کچھ ہے تو میرا جواب کچھ
میں رازداں کے ساتھ ہوں دل رازداں سے دُور

ہے کارواں سے اتنی عقیدت سو کس لئے
یہ کارواں سے دُور ہے وہ کارواں سے دُور

اُس انجمن میں فرقِ قریب و بعید کیا
جو پاس ہیں وہ ہیں نگہِ مے فشاں سے دُور

پہلو میں گُدگُدا کے وہ "حسنِ شہاب رنگ"
جاتا ہے جیسے تیر نکل کر کماں سے دُور

کل بھی اسی جگہ پہ ملاقات کی رہے
تیرے مکاں سے دور نہ میرے مکاں سے دُور

رہ رہ کے برقِ فکرِ رسا کوندتی نہیں
ہوتا نہیں ہوں جب میں کسی مہرباں سے دُور

ابکی خزاں کا دَور قیامت سے کم نہیں
ابکی خزاں کے بعد چمن ہے خزاں سے دُور

ہم پر جو ہنس رہے ہیں یہ لوگ ہیں جنھیں
ہے آسماں زمیں سے زمیں آسماں سے دُور

پہلی نظر میں شاد جہاں جانتے ہو تم
ہوتا ہے میرے شعر کا مطلب وہاں سے دُور

حضرت قلندر رب اور غالب کی ملاقات!

تاریخ ادب کا ایک غیر متعارف ورق

جناب پیر غلام دستگیر نامی

تذکرہ غوثیہ مطبوعہ ۱۳۱۲ھ میں مولوی شاہ گل حسن صاحب قادری نے اپنے مرشد مولانا سید غوث علی شاہ صاحب قلندر پانی پتی متوفی ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء کے ملفوظات ایسے دلکش انداز میں جمع کئے ہیں ان میں میرزا غالب کی ملاقات کا ذکر بڑا دلچسپ ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایک روز ہم میرزا نوشہ کے مکان پر گئے نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آن کر لے گئے۔ تمام حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا میرزا صاحب! ہم کو آپ کی یہ غزل بہت ہی پسند ہے علی الخصوص یہ شعر ؎

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو   تیرے کوچہ کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے (اس کے بعد مرزا نوشہ کی غزل جس کا مطلع ہے ؎

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی   میری وحشت تری شہرت ہی سہی

درج ہے)

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا ہے کہ تیسرے دن زینت المساجد دہلی میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجئے مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لئے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ میخوار، روسیاہ گنہگار مجھکو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف "فسانہ عجائب" لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی بہترین ہے کہا چہار درویش (باغ و بہار مصنفہ ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء) کی۔ میاں رجب علی بولے اور فسانہ عجائب کیسی ہے؟ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے۔ اجی لاحول ولا قوۃ اس میں لطف زبان کہاں ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔

اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں جب ... صاحب ... رکھا اور کہا کہ ظالم پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے۔ یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر ہم سے نادانستگی میں ہو گیا۔ آیئے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم ان کے ہمراہ ہو لئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد میرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے۔ جناب مولوی صاحب! رات میں نے فسانہ عجائب کو بغور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں۔ نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہو گی اور کیونکر نہ ہو اس کا مصنف جواب نہیں رکھتا۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور در حقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المومن من سلم المسلمون من یدہ و لسانہ (یعنی مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمانوں کو ضرر نہ پہنچے)

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ "تم کو کسی سے محبت بھی ہے"؟ کہا ہاں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے۔ پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں اور ہم ان کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں۔ کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آ سکتی ہے؟

ایک روز گل حسن راقم حضرت غوث کی خدمت میں حاضر تھا کہ کسی شخص نے مرزا نوشہ صاحب کے انتقال کی خبر سنائی۔ آپ نے فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

کہاں دھوتی رہ گیو اور نہ مجھ بے انکار
اہرن کو ٹھکو مٹے اور اٹھ گئے سیت لوہار
سدا نہ پھولیں توریاں اور سدا نہ ساون ہو
سدا نہ جوبن تھر رہے اور سدا نہ جیوے کوئی

عدم ہے یا کوئی کوئے صنم ہے　　چلی جاتی ہے وہاں خلقت خدا کی

نہایت خوب آدمی تھے۔ عجز وانکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجہ غایت اور خلیق از حد تھے۔ ایک روز جو ہم ان کے پاس گئے تو انھوں نے اپنے یہ دو قطعہ پڑھے تھے؂

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار　　ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند　　حق را بسجودے و نبی را بدرودے

یعنی اگر تجھے موقع ملے تو ساقی، گوئیے، شراب اور راگ کو غنیمت جان اور اس قوم میں سے نہ ہو جو خدا کو سجدے اور نبی کو درود سے فریب دیتے ہیں۔ دوسرا قطعہ تھا

بروز حشر الہٰی چو نامۂ عملم　　کنند باز کہ آں روز باز خواہ من است
بکن مقابلہ آں را بسرنوشت ازل　　اگر زیادہ و کم باشد آں گناہ من است

یعنی قیامت کے دن جب میرا نامۂ اعمال کھلے تو یا اللہ اس کا اس سرنوشت سے مقابلہ کر لینا جو روز ازل سے میرے لئے مقدر ہوئی۔ پھر اگر اس سے کم و بیش ہو تو میرا گناہ۔ (کیسا لطیف مضمون ہے)

غالب رند مشرب، بے شر، رحمدل تھے اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ ہمارے محب بھی چل دیئے؂

ندی ناؤ کا بیٹھنا پلک ایک کی پریت　　پل میں بچھڑے جات ہیں یہی جگت کی ریت
ہم دیکھیں جگ جات ہے جگ دیکھے ہم جائیں　　ہم تو بیٹھے راہ پر کس کس کو سمجھائیں

بتِ ارمن

نظم

از حضرت عاصم جے پوری

وہ حسن کی تصویر مجھے کیا نظر آئی
بنتی ہوئی تقدیرِ تمنا نظر آئی

جس رات وہ برقِ نظر افزا نظر آئی
وہ رات متاعِ شبِ اسرا نظر آئی

ہر آن میں ارمانِ محبت نظر آیا
ہر بات امینِ مے و مینا نظر آئی

یوں اس کو محبت کی نگاہوں نے سنوارا
سر تا بقدم حسن کی نشا نظر آئی

رفتار میں رعنائی رقصِ مترنم
گفتار میں رنگینیٔ صہبا نظر آئی

جس طرح سمٹ جاتے ہیں گھبرائے ہوئے بادل
آراستہ یوں زلفِ چلیپا نظر آئی

زینت میں صناعت کی ضرورت بھی مسلّم
عادت بھی تصنع سے مبرّا نظر آئی

میں دور رہا گو اسے بیگانہ سمجھ کر
لیکن وہ مرے دل کی شناسا نظر آئی

ہونے کو حسیں اور بھی تھے بزم میں لیکن
دیکھا تو فلورا ہی فلورا نظر آئی

جس وقت جہاں اے بتِ ارمن* تجھے دیکھا
دنیا مجھے کچھ اور ہی دنیا نظر آئی

لب پر ترے نغموں کو مچلتے ہوئے دیکھا
ٹھوکر میں تری رقص کی دنیا نظر آئی

جب تو نے کہی کان میں کچھ بات تو مجھ کو
رنگینیٔ گفتار دوبالا نظر آئی

اغماض بھی تھا تیرا گوارا مجھے لیکن
اغماض میں بھی شانِ مدارا نظر آئی

غازہ نہ چھپا تیرا اگر اپنی ہر انگشت
اکثر مجھے شاخِ گلِ رعنا نظر آئی

عادی تو نہ تھی پان مرے ہاتھ سے کھایا
پھر یوں کہ نظر محوِ تقاضا نظر آئی

ہے میرے لئے ناز کی یہ بات کہ تجھ کو
بیجا نہ مری شوخیٔ بیجا نظر آئی

تصویر کا وعدہ نہ ہوا درخورِ ایفا
یہ نظم سزاوارِ تقاضا نظر آئی

لگتا نہیں عاصم دلِ وحشی کہیں ورنہ
دل لگنے کی صورت مجھے کیا کیا نظر آئی

* ارمن: سلسلۂ کوہ قاف کا ایک علاقہ جو حسن خیز ہونے کی وجہ سے پرستان مشہور ہے۔ (عاصم جے پوری)

قُلی

افسانہ

جناب اختر ملیح آبادی

میرا تبادلہ ہو گیا تھا۔ دہلی سے لکھنؤ آ رہا تھا۔ میرے ساتھ ڈبے میں ثریا تھی اور ثریا کی گود میں معصوم نگہت سو رہی تھی۔ ڈبہ پورے کا پورا خالی تھا اس لئے گھر کا کمرہ معلوم ہو رہا تھا۔ ریل انتہائی تیزی سے اُڑی جا رہی تھی ریل اور ہوا میں مقابلہ ہو رہا تھا۔ ریل چلاتی چیختی، شور مچاتی، کراہتی، عمر کی طرح لمبی اور سانپ کی طرح بل کھاتی بھاگی جا رہی تھی۔ ہرے بھرے کھیت، امڈتے دریا۔ آموں کے بلند درخت، ابلتی نہریں سب پیچھے چھوٹتے جا رہے تھے پرندے ریل کی گھڑگھڑاہٹ سن کر ہوا میں اڑ رہے تھے۔ جنگل کی ٹھنڈی ہوائیں بے روک ٹوک ڈبہ میں آتیں اور ثریا کی سیاہ لہرائی ہوئی زلفوں کو چھیڑ کر چلی جاتیں۔ کبھی اس کے دھانی دوپٹے کو سر سے ڈھلکا دیتیں، تو کبھی اس کے سیب جیسے رخساروں کو چوم کر بھاگ جاتی تھیں۔ ثریا مسکراتی اور ڈبہ سے باہر دور خلا میں کچھ ڈھونڈنے لگتی تھی۔

اخبار پڑھتے پڑھتے میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا ثریا باہر دور کسی چیز کو گھور رہی ہے۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ پھر گنگنانے لگی۔ جگر کا یہ شعر تھا ؎

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا ہے تو لیکن
کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں؟

پھر دوپٹہ سے آنکھوں کو پونچھ لیا۔ میرے پوچھنے سے ثریا چونک پڑی میں نے پوچھا: "تم رو رہی ہو؟" ثریا نے ہنسنے کی کوشش کی اور جواب دیا "جی نہیں ٹھنڈی ہوا سے آنسو نکل آئے۔" تھوڑی دیر تک میں ثریا کے متعلق سوچتا رہا اور پھر اخبار پڑھنے لگا۔

اب سورج مغرب کی طرف سرخ پردے کے پیچھے چلا گیا تھا۔ دوسرے پرندے اپنے آشیانوں کی طرف واپس آ رہے تھے۔ کسان دن بھر کام کرنے کے بعد کاندھوں پر ہل رکھے گنگناتے آ رہے تھے اور میں بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔ بچپن یاد آیا تو اسی کے ساتھ لاپتہ اصغر بھی یاد آیا، جس کی وجہ سے میرا بچپن کھیلتے کودتے گزرا تھا ـــــ میں ثریا اور اصغر دن، دن بھر کھیلا کرتے تھے۔ سردی ہو یا گرمی، برف گرتی ہو یا لو چلتی ہو ہم تینوں کو بس کھیل سے مطلب تھا۔ کھیل پر اکثر ہمیں سزا بھی ملتی تھی

لیکن ہم باز نہ آتے۔ اصغر نئے نئے کھیل کھیلتا تھا۔ کبھی فقیر کے روپ میں آتا تو کبھی مہاجن بنتا۔ کبھی لولا تو کبھی اندھا۔ اصغر جب ثریا کو یا مجھے مغموم دیکھتا تو ہمیں ہنسانے کے لئے طرح طرح سے منہ بناتا۔ جانوروں کی بولیاں بولنے لگتا جب گدھے کی طرح چلاتا تو ثریا ہنس دیتی تھی جب کہانیاں سنانے پر آتا تو کئی کئی گھنٹے گزر جاتے تھے۔ پریوں کے قصے، عشق و محبت کے افسانے۔ راجہ رانی کی داستانیں۔ شیخ چلی کے من گھڑت افسانے۔ دیوؤں کی بھیانک کہانیاں۔ غرض کہ اصغر کو ہزاروں کہانیاں یاد تھیں۔ ثریا کو کہانیاں بہت پسند تھیں۔ وہ انہیں بڑے غور سے سنتی تھی اور پھر اصغر کی پیچ دار باتیں سونے پر سہاگہ کا کام کرتی تھیں۔

چاندنی راتیں آتیں تو خوب کھیل کھیلے جاتے تھے۔ کبھی "اندھا مرغا" کھیلا جاتا تو کبھی آنکھوں پر پٹی باندھ کر گھر ڈھونڈنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ کبھی کوڑی کھائی جاتی تھی۔ یہ چہل پہل سب اصغر کی وجہ سے ہوتی تھی۔

لیکن پڑھنے میں اصغر سب سے پھسڈی تھا۔ ماسٹر کی صورت دیکھتے ہی اصغر کے پیٹ میں درد ہونے لگتا تھا۔ چھٹی ملتے ہی درد غائب ہو جاتا تھا اور دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر لمبی لمبی تسلیمیں کرتا، تھرکتا اور ناچتا تھا۔ میں تو ہنسی روک لیتا تھا لیکن ثریا ہنس دیتی تھی۔ اس پر ماسٹر صاحب اپنے خاص انداز میں پوچھتے تھے۔ "اوں، اوں، یہ کیسی ہنسی ہے" ثریا جواب دیتی: "اوں اوں یونہی!" اب تو مجھے بھی ہنس پڑتا تھا اور ماسٹر صاحب ہم دونوں کا سر لڑا دیتے تھے۔ اصغر تو بھاگ کر اندر ہو جاتا اور ہم دونوں طوطوں کی طرح ریں ریں کیا کرتے تھے۔

اصغر شاید ہی مہینے میں دو چار دن پڑھتا ہو۔ ورنہ روز کوئی نیا بہانہ کر کے چھٹی لے لیتا تھا۔ لیکن جس دن پڑھتا تو خوب پٹتا تھا۔ ماسٹر صاحب اسے "مرغا" بنا دیتے تھے۔ اصغر بلا تکلف مسکراتا ہوا اٹھتا اور مرغا بن جاتا گویا وہ خود یہی چاہتا تھا اور اس کی مراد بر آئی ہو۔ کئی گھنٹے وہ یونہی کھڑا رہتا آخر کار ماسٹر صاحب کو شکست ہوتی تھی اور اسے معاف کر دیتے تھے۔ دوسرے دن پھر سبق سنا جاتا تو کورا نکلتا۔

صاحب مارتے مارتے تھک جاتے تھے۔ لیکن اصغر سبق یاد نہ کرتا تھا گویا اسے ضد تھی۔

اصغر نے ہزاروں گھونسلے اجاڑ دیئے تھے۔ ہزاروں چڑیوں کی جان لے چکا تھا۔ کوئی ایسا گھونسلہ نہ تھا جس کو اصغر نوچ کھسوٹ نہ چکا ہو۔ چڑیاں اصغر کی صورت دیکھتے ہی اڑ جاتی تھیں۔ امی اکثر اصغر کو منع کرتی تھیں اور کہتیں: "اصغر! کیا کرتے ہو۔ بے زبانوں کو کیوں ستاتے ہو۔ کیوں ان کے گھونسلے ویران کرتے ہو۔ کہیں بے زبانوں کا صبر تم پر نہ پڑے۔ بے زبانوں کی بددعاؤں سے ڈرو۔" لیکن اصغر وہی کرتا جو اس کا دل کہتا تھا، ایک دن چڑیا اپنے بچے کو پھرا رہی تھی کہ اصغر نے غلّہ مارا۔ چوٹ سے بچہ بلبلا اٹھا اور وہیں گرا اور مر گیا۔ بیچاری ماں چیخنے چلانے لگی۔ دوسرے غلّے نے چڑیا کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس طرح ایک نہیں دو معصوم جانیں مٹی میں مل گئی تھیں۔ اس روز امی بہت ناراض تھیں اور اصغر کو بہت باتیں سنائی تھیں۔

ایک روز جب دونوں وقت مل رہے تھے اصغر فاختہ کے بچے اتارنے درخت پر چڑھا۔ چوٹی پر سے پھسلا اور زمین پر آ رہا۔ اصغر کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا۔ کئی ماہ تک اصغر پلنگ پر پڑا رہا لیکن اس تکلیف میں بھی یہی کہتا رہا "چڑیوں نے مجھے بددعا دی۔ اچھا سمجھ لونگا۔ اپنی چوٹ کا بدلہ ضرور لے کر رہونگا۔ ایک چڑیا بھی نہ چھوڑوں گا" —— زور سے ریل کوکی۔ سامنے سیٹ پر ثریا بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ یہی اس کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

ثریا رومانی کتاب پڑھ رہی تھی۔ پیٹھ کے پیچھے مخملی گدّہ رکھا تھا بائیں ہاتھ میں کتاب تھی اور سیدھے ہاتھ کی انگلی رخسار پر رکھے تھی۔ دھانی باریک دوپٹہ جس میں جوڑ اچکا ٹکا تھا سینہ پر پڑا تھا۔ ثریا کی بڑی سیاہ آنکھیں۔ لمبی کالی پلکوں میں اس طرح چھپی ہوئی تھیں جس طرح پتیوں میں کھلا ہوا پھول چھپ جاتا ہے۔ لمبا چہرہ، باریک گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ۔ چوڑی پیشانی اور ہلکے گلابی رخسار بجلی کی روشنی میں اور سرخ ہو گئے تھے۔ ثریا بیچ سے سیدھی مانگ نکالے تھی۔ مانگ ایک لمبی سیدھی شاہراہ معلوم ہو رہی تھی۔ لمبے سونے کے آویزے پکے پھل کی طرح لٹک رہے تھے جو ذرا سی جنبش سے ہلنے لگتے تھے۔ ثریا کے سینے کا اتار چڑھاؤ معلوم ہو رہا تھا جیسے دریا کی لہریں اٹھکیلیاں کر رہی ہیں —— میں ثریا کے حسن کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ ثریا نے میری زندگی کو رنگین بنا دیا ہے۔ اگر ثریا نہ ہوتی یا میں ثریا سے الگ کر دیا جاتا تو میری زندگی پگڈنڈی کی طرح خشک اور ویران ہو جاتی۔

گاڑی برابر اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ میں نے سر باہر نکال کر دیکھا، دور سے سٹیشن نظر آ رہا تھا۔ بجلی کے قمقمے اندھیرے میں اس طرح چمک رہے تھے جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتے ہیں۔ میں اٹھا، کوٹ پہنا، ٹائی درست کی۔ پتلون پر ایک نظر ڈالی اور ثریا کو گہری محویت سے بیدار کیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ دوپٹہ ٹھیک کیا اور سٹیشن کا انتظار کرنے لگی۔

گاڑی بھیانک گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ جس طرح ایک ستائی ہوئی لڑکی روتی، پیٹتی، چلاتی، ماں کی گود میں آ کر گر پڑتی ہے اور اپنا دکھ ماں کو سناتی ہے —— فوراً ہی مختلف قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی قلی کو پکار رہا تھا تو کوئی پھل والے کو پکار رہا تھا۔ کہیں قلی کم پیسے ملنے کی وجہ سے لڑ جھگڑ رہا تھا۔ مسافر گاڑی سے اتر رہے تھے اور نئے مسافر خالی جگہوں پر بھوکے گیدڑوں کی طرح جھپٹ رہے تھے —— میرے ڈبہ میں بھی کئی قلی گھس آئے اور لڑنے لگے، ایک کہنے لگا "ابے ہٹ! میں نے پہلے ہاتھ رکھا تھا۔" دوسرا بولا "بابوجی سے چلا کر میں نے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔" تیسرا مطمئن لہجہ میں بولا۔

چلو بھاگو میں اسباب اٹھاؤں گا۔" اور چوتھا قلی دروازے کے پاس خاموش کھڑا تھا۔ میں نے ان تینوں کو الگ کیا اور چوتھے قلی کو اشارہ کیا کہ اسباب اٹھائے۔ تینوں قلی اسے گھورتے اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

قلی کا نمبر ۱۴۱ تھا۔ دبلا پتلا آدمی تھا۔ لمبی داڑھی تھی چہرے پر غربت کے نقوش ابھرے تھے۔ آنکھیں شیشے کی طرح چمک رہی تھیں اور دنیا کی بے ثباتی کا رونا رو رہی تھیں۔ پیشانی پر کئی داغ تھے اور ایک ہاتھ میں خم تھا۔ قلی نے سامان اٹھایا۔ میں نے ثریا کا ہاتھ پکڑا جو قلی کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اور باہر کی طرف چلا۔ راستہ میں ثریا سے چلا ہی نہ جاتا تھا۔ ایکدم سے اس پر کمزوری طاری ہو گئی تھی۔ وہ چند قدم چلتی اور قلی کو مڑ کر دیکھتی جو پیچھے سامان رکھے آرہا تھا ــــ یکایک ٹھوکر لگی اور ثریا گر پڑی۔ قلی زور سے چلایا "بیگم صاحبہ گر پڑیں۔" جلدی سے چند قلی دوڑے آئے۔ میں نے ثریا کو اٹھایا اور ایک قلی کو ٹیکسی لانے کا حکم دیا۔ ثریا کو سہارا دیکر ٹیکسی میں بٹھایا۔ اسباب رکھوایا اور قلی کو ایک آنہ دیا۔ اس پر قلی مری ہوئی آواز میں بولا "بابوجی! صرف ایک ہی آنہ؟" میں نے گرج کر کہا "اور کیا چاہتے ہو؟" وہ بولا "آپ ہی لوگوں سے مجھے مل جاتا ہے میں بہت غریب ہوں۔ رحم کیجیئے۔" وہ بات بھی پوری نہ کر پایا تھا کہ موٹر نے جھٹکا کھایا اور آگے بڑھ ہی جانا چاہتا تھا کہ فرش پر روپیہ گرنے سے جھنکار پیدا ہوئی۔ قلی کی آواز آئی "بابوجی آپ کا روپیہ گر گیا ہے" موٹر آگے بڑھ گیا تھا صرف ثریا کمزور آواز میں کہہ رہی تھی۔ "روپیہ گرا نہیں قلی کو دیا ہے۔"

گھر پہنچ کر اس واقعہ پر میں نے بہت غور کیا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ دل میں کچھ باتیں کھٹک رہی تھیں۔ ثریا کا یکایک بیہوش ہونا۔ قلی کو دیکھ کر حواس کھونا ــ روپیہ کا دینا ــ صبح کا اخبار دیکھا تو ایک خبر نے مجھے پریشان کر دیا۔ لکھا تھا "ایک حادثہ ــ کل رات کو اتفاقی طور پر ایک قلی جس کا نمبر ۱۴۱ تھا ریل کی جھپٹ میں آکر مر گیا۔ قلی کا نام اصغر تھا۔" خبر پڑھتے ہی اخبار گر پڑا۔ اور دل میں عجیب و غریب خیال آنے لگے۔ وہی اصغر جو بہت شریر تھا۔ جس نے ایک مرتبہ ماسٹر صاحب کو ڈرا دیا تھا جس کی باتیں ثریا کو بہت پسند تھیں جو بہت کہانیاں سنایا کرتا تھا جس کی باتوں میں ثریا بہت دلچسپی لیتی تھی جو ایک عرصے سے لاپتہ ہو گیا تھا اور باوجود تلاش کے نہ مل سکا۔ کیا وہی اصغر قلی کے بھیس میں تھا جس کو میں نے نہیں پہچانا لیکن ثریا پہچان گئی تھی۔

آج مجھ پر ایک راز ظاہر ہوا اور وہ بھی اتفاقی طور سے کہ ثریا اصغر کو چاہتی تھی۔ اپنی محبت کو آج تک ثریا نے چھپایا تھا وہ اصغر کو چاہتی تھی لیکن اس کی مجھ سے شادی ہوئی اس طرح اس کی محبت کا خون ہوا۔ لیکن وہ ایک شوہر پرست بیوی کی طرح میری خدمت کرتی رہی۔ آج سے میرے دل میں ثریا کی عزت اور بڑھ گئی۔ واقعی وہ ایک پھول کی طرح تھی جو اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے مسکراتا ہے ــــ میں نے ثریا سے اس خبر کو چھپا ڈالا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا اس طرح اس کے دل کو صدمہ پہنچے گا۔ آج بھی اگرچہ اب قلی زندہ نہیں ہے لیکن ثریا کے دل میں اصغر کی محبت اب بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

سوز و گداز

بات کرنی تھی کچھ مگر نہ ہوئی

از جناب وزیرزادہ قمر عثمانی جوناگڈھ

زندگی چین سے بسر نہ ہوئی
غم کی روداد مختصر نہ ہوئی

کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
نہ ہوئی شام غم سحر نہ ہوئی

اس کی ناکامیاں ہیں قابل دید
دید ہی جس کو عمر بھر نہ ہوئی

اللہ اللہ کسی کا رعبِ جمال
بات کرنی تھی کچھ مگر نہ ہوئی

میرے دل کے سیاہ خانے میں
کبھی امید جلوہ گر نہ ہوئی

دل تو روتا رہا محبت میں
وضعداری سے آنکھ تر نہ ہوئی

ان کے جلووں میں رہ گئی کھو کر
نگہِ شوق کارگر نہ ہوئی

جو ہوئی تھی شروع الفت میں
پھر وہ امید عمر بھر نہ ہوئی

سب پہ تیری ہوئی نگاہ کرم
مگر اک صرف میرے سر پہ نہ ہوئی

نغماتِ ٹیگور

ترجمہ:۔

جناب عبدالرحمٰن

کھلونے

ایک شخص محل کے بچوں کے لئے کھلونے بنایا کرتا تھا۔

ہر سال محل میں کھلونوں کا ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ اُس کے فن کی وجہ سے لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

جب اس کی عمر اسّی برس کی ہوئی تو شہر میں ایک اور کھلونے بنانے والا آیا۔ جس کا نام کشن لال تھا۔ وہ جوان تھا اور کھلونے بھی نئی طرز کے بناتا تھا ـــــ وہ اپنے کھلونوں کو قصداً ادھورے چھوڑ کر رنگ بھر دیتا تھا۔

نئی طرز نے کہا۔ "دلیری اسے کہتے ہیں۔"

پرانی طرز نے جواب دیا۔ "دلیری نہیں یہ تو محض بیباکی ہے۔"

لیکن نیا زمانہ ہمیشہ نئے مذاق پیدا کر لیتا ہے۔ ننھی شہزادیوں نے کہا۔ "ہمیں نئی طرز کے کھلونے چاہئیں۔" پرانے ملازموں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن شہزادیوں کو ضد سی ہو گئی تھی۔

بوڑھے کی دکان میں اب بچوں کے لئے کوئی جاذبیت نہ رہ گئی تھی۔ اس کے رکھے ہوئے کھلونوں کی قطاریں اسے اس طرح گھورتی تھیں جس طرح لوگ ساحل پر کھڑے ہو کر آنے والی کشتی کو دیکھتے ہیں۔

دو سال کا زمانہ گزر گیا۔ لوگ بوڑھے کا نام تک بھول گئے ـــــ کشن لال محل میں کھلونے بنانے والوں کا سردار بن گیا۔

بوڑھا ضعیف ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنا پیٹ تک بھرنے کے لئے مشکل سے کما سکتا تھا۔ ایک روز اس کی بیٹی نے جس کی شادی ہو چکی تھی، اپنے بوڑھے باپ کو بلا کر کہا۔ "اب ہمارے ہی گھر میں آ جاؤ پتاجی! ـــــ اور اپنے آخری دن آرام اور چین سے بسر کرو۔"

بوڑھے کی بیٹی تمام دن اپنے گھر کے کام کاج میں مشغول رہتی تھی اور اس کا شوہر مٹی کے دیئے بنا کر گاؤں میں بیچتا تھا۔

بوڑھا جس طرح زمانہ اور مذاق کے تغیر سے ناآشنا تھا اسی طرح وہ اس حقیقت سے بھی ناواقف تھا کہ اس کی نواسی اب چھوٹی بچی نہیں بلکہ سولہ برس کی جوان لڑکی ہے۔

وہ کھیت میں بیٹھ کر کوّے ہانک رہا تھا۔ اس کی نواسی نے آ کر اس کے گلے میں بازو حمائل کر دیئے ـــــ خوشی سے بوڑھے کی تمام ہڈیاں چرچرا گئیں۔

"میرے لئے کوئی کھلونا بنا دو نانا!" اس نے کہا۔

"لیکن تم میرے کھلونے پسند نہ کرو گی بیٹی۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"تم سے بہتر کھلونے اور کون بنا سکتا ہے؟"

"کیوں، کشن لال بناتا ہے نا؟"

"کشن لال بیوقوف ہے۔"

دونوں کافی دیر تک بحث کرتے رہے۔ آخرکار بوڑھا اپنے اوزار اور تھوڑی سی مٹی لے آیا اور عینک چڑھا کر کھلونے بنانے کے لئے بیٹھ گیا۔

"لیکن بیٹی! کوّے اناج نہ کھا جائیں گے؟"

"کھیت کی رکھوالی میں کرتی ہوں۔"

دن کی روشنی دھندلی ہو رہی تھی۔ شام کے وقت دور سے آنے والے مویشیوں کی گھنٹیوں کی آواز آ رہی تھی۔ لڑکی دن بھر کوّے ہانکتی رہی اور بوڑھا اس کے لئے کھلونے بناتا رہا۔

ایک صبح جب بوڑھا کھلونے بنانے میں مصروف تھا اس کی بیٹی ذرا تیز تیز اس کے پاس آئی۔

"گھر کا کام کاج کرنے کے لئے اب تو شبھدرا کافی ہوشیار ہو گئی ہے" بیٹی نے باپ سے کہا۔ "وقت برباد کرنے میں تم اس کی بیجا مدد کر رہے ہو اب اس کے گڑیاں کھیلنے کے دن نہیں ہیں۔"

"ضرور ـــــ!" بوڑھے نے کہا۔ "لیکن میں تو یہ کھلونے محل کے لئے تیار کر رہا ہوں۔ میں شبھدرا کی شادی میں اسے زیور دینے کے لئے کچھ روپیہ کمانا چاہتا ہوں۔"

اس کی بیٹی مغموم سی ہو گئی۔ "لیکن تمہارے کھلونے کون خریدیگا پتا؟" اس نے گری ہوئی آواز سے کہا۔

بوڑھے نے اپنا سر جھکا لیا مگر شبھدرا اپنا سر ہلا کر بولی۔ "میں دیکھونگی نانا کے کھلونے کون نہیں خریدتا!"

دو دن کے بعد شبھدرا نے اپنی ماں کو ایک طلائی سکہ لا کر دیا۔
"ـــ ا کے کھلونوں کی قیمت" لڑکی نے کہا۔
اس کی ماں نے پوچھا "تم نے یہ سکہ کہاں سے پایا؟"
"محل سے ـــــ!"
بوڑھے نے ہنسکر کہا "دیکھا! کاش میری بینائی درست ہوتی اور
...نوں میں رعشہ نہ ہوتا"
شبھدرا کی ماں بہت خوش ہوئی۔
"ایسے ہی سولہ سکّے اور ہوں تو شبھدرا کے گلے کی زنجیر تیار ہو جائے"
بوڑھے نے کہا "فکر نہ کرو۔ زنجیر جلد ہی تیار ہو جائیگی"
شبھدرا نے بوڑھے سے آہستہ سے کہا "میرے لئے دولھا ڈھونڈنے
...سی کو بھی زحمت نہ کرنی ہوگی"
بوڑھے نے ہنسکر اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے۔
معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھا ایک بار پھر جوان ہو گیا ہے۔ وہ روز
...ت کے نیچے بیٹھ کر اپنی نواسی شبھدرا کے لئے کھلونے بناتا اور وہ
...ے بکتی تھی۔
ایک ایک کر کے سولہ سکّے آگئے اور شبھدرا کے لئے ہار خرید لیا گیا۔
ماں نے کہا "اب صرف دولھا کے ملنے کی دیر ہے"
شبھدرا نے بوڑھے کے کان میں آہستہ سے کہا "دولھا بھی تیار ہے نانا"
بوڑھے نے پوچھا "آخر وہ تمہیں کہاں ملا تھا بچی؟"
شبھدرا نے کہا "جب پہلی بار کھلونے بیچنے میں محل گئی تو پھاٹک
...دربان نے روک کر مجھ سے پوچھا "تم کیا چاہتی ہو؟" میں نے
...ا ـــ "میں محل میں کھلونے فروخت کرنے آئی ہوں" اس نے
کہا کہ "شہزادیوں کو تمہارے کھلونے پسند نہ آئیں گے" اور اس نے
مجھے محل میں جانے نہ دیا۔ میں روتی ہوئی گھر لوٹ رہی تھی کہ ایک
شخص نے مجھے روک کر کہا "مجھے ان کھلونوں میں کچھ تبدیلی کر لینے دو۔
وہ آسانی سے فروخت ہو جائینگے" کاش تم بھی اس شخص کو پسند کرو نانا،
میں اس کے ساتھ شادی کر کے بہت خوش ہونگی"
"اس وقت وہ کہاں ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔
"وہ ـــ وہاں ـــ اس پیپل کے نیچے"
دولھا کمرے میں آیا۔ بوڑھے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اوہ! یہ تو کشن لال ہے"
کشن لال نے آگے بڑھ کر بوڑھے کے پاؤں چھوئے۔
"جی ہاں، میرا نام کشن لال ہے"
بوڑھے نے کشن لال کو اپنے سینہ سے لگا کر کہا "پہلے تم نے میرے
مٹی کے کھلونے چھینے اور آج میرے دل کا کھلونا بھی چھین رہے ہو"
شبھدرا نے اپنے بازو بوڑھے کی گردن میں ڈال کر کہا "لیکن نانا یہ
(کشن لال) میرے ساتھ تمہیں بھی لے جائیں گے"

مکمل ہم آہنگی

شب و روز — اے دوست! میں اسی ہم آہنگی کے لئے تڑپتا ہوں جو دوست کی طرح
گرسنہ اور بیباک ہو ـــ مجھے جیت لے۔ مجھ پر غالب آ جا۔ میرے ملبوسات اور میرا حجاب
ہٹا دے۔ میری آنکھوں سے نیند اور دماغ سے خوابوں کو محو کر دے۔ میرے لئے دنیا کو
معدوم کر دے۔ زمان و مکان مٹا دے اور پھر ہم دونوں کو ایک ایسی دنیا میں جہاں حیات اور
روشنی مفقود ہوں بے حجاب اور جمال سے معمور ہو جانے دے۔

نوائے نوشا نوش

از :-
جناب مقبول حسین احمد پوری

ہوئی بادِ بہار بادہ فروش
جو نہ مے نوش ہو نہیں ذی ہوش

کھل گئے غنچہ وش لبِ خاموش
ہر طرف ہے نوائے نوشا نوش

کر دیا سحر چشمِ ساقی نے
اب کسی کا نہیں کسی کو ہوش

دل کے ارمان کیوں نہ ہوں بیدار
حسرتیں ہیں اُمید کی ہمدوش

لہر سی زندگی کی دوڑ گئی
غم بھی ہے کیفیت سے ہم آغوش

اُن نگاہوں میں کیا تھا کیا کہئے
برق وش کوئی شے ہوئی روپوش

ہم تو مقبول ایک مدت سے
ہوئے محرومِ عقل و دانش و ہوش

تبدیلی

نہ وہ دل رہا، نہ وہ ہم رہے، نہ وہ زندگی ہے نہ وہ جہاں
نہ وہ کوہسار، نہ جوئبار، نہ سبزہ زار نہ گلستاں
جو زمیں تھی باغِ ارم کبھی، وہ زمیں بھی ہو گئی آسماں

جو ذرا میں صبح سے شام ہو، وہی دن پہاڑ سا ہو گیا
جو کبھی نشیمنِ عیش تھا، وہ چمن اُجاڑ سا ہو گیا
جو خزاں ہے وہ بھی بہار تھی، مگر اب بہار بھی ہے خزاں

نہ وہ دل میں کیفیتیں رہیں، نہ رہا وہ نشتر نگاہ میں
کبھی ہم بھی محوِ خمار تھے، وہ خمار حل ہوئے آہ میں
وہ شباب خواب سا ہو گیا، وہ بہارِ عمر کی اب کہاں

نقد و نظر

نقد و نظر

مصنف :- پروفیسر حامد حسن قادری
پبلشر :- شاد اینڈ کمپنی - حکیم وصی روڈ - آگرہ
تقطیع :- ۲۰×۳۰/۱۶ ۳۰۲ صفحات قیمت تین روپے،

اُردو ادب میں تنقید کو اتنی منصفانہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی جتنی ہونا چاہئے - اکثر نقاد میانہ روی سے کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ موضوعِ تنقید کو یا عیب جوئی کا تختۂ مشق بنالیا جاتا ہے یا خوشامد اور مداحی سے زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی کوشش کی جاتی ہے - لیکن زیرِ نظر کتاب اس عیب سے بڑی حد تک پاک نظر آتی ہے - اس خصوصیت کے باعث اسے صحیح تنقید نگاری کا نمونہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا - فاضل مصنف نے جہاں عیوب اور لغزشوں کا صحیح جائزہ لیا ہے وہاں محاسن و فضائل کے اظہار میں بھی بخل سے کام نہیں لیا - اگرچہ کہیں کہیں "اعتدال" کے گلے میں "تشدد" کی باہیں حائل نظر آتی ہیں لیکن یہ قصور مصنف کا نہیں بلکہ اُردو کے ادبی ماحول کا اثر ہے جس کی آغوش میں فنِ تنقید پرورش پا رہا ہے - بایں ہمہ کتاب مجموعی طور پر فنِ تنقید کا شاندار کارنامہ کہلانے کی مستحق ہے - غالب کی شرحوں پر جس جامعیت سے تبصرہ کیا گیا ہے اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ تحسین و سپاس کے ساتھ ہوتی رہے گی - "عروضی غلطیوں" والا مضمون بھی قابلِ مطالعہ ہے - اگرچہ اس میں بعض "آزادیوں" کو بھی "قیود" ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے - لیکن مصنف کے استدلال کا فولادی قلعہ آسانی سے مسمار نہیں ہو سکتا - بعض اعتراضات تو اس درجہ مستحکم ہیں کہ ان کے جواب میں صرف اعترافِ عجز ہی پیش کیا جا سکتا ہے اور اس مقالے کے ذریعے سے ان غلط فہم اور [illegible] حضرات کی قابلیت کا بھرم پوری وضاحت کے ساتھ کھول [illegible] کچھ نہ جاننے کے باوجود "سب کچھ جاننے" کے جہلِ مرکب میں [illegible] سابق تبصرہ مقالے بھی اپنے اپنے موضوع کے پیشِ نظر افادی [illegible] امید ہے کہ یہ کتاب تنقیدی ادب میں بیش بہا اضافہ کا باعث [illegible] تنقید [illegible] کی کوشش کریں گے -

جدید مطبوعات

ادارہ

خطباتِ جناح

پبلشر :- ادبستان - لاہور
تقطیع :- ۲۰×۳۰/۱۶ ۱۹۲ صفحات مجلد قیمت [illegible]

یہ قائداعظم محمد علی جناح کے ششش سالہ خطبات کا مجموعہ [illegible] میں قائداعظم کی دس تقریروں کا ترجمہ ہے - ترجمے کی زبان خوش [illegible] جو حضرات اسلامی ہند کے سب سے بڑے لیڈر کی سیاسی راہ عمل [illegible] ہونا چاہتے ہیں یہ کتاب ان کے لئے بہترین رہنما ثابت ہوگی - ابتدائی صفحات میں قائداعظم کی داستانِ حیات بھی ہے - لیکن اس کے [illegible] سے موصوف کے سیاسی عقائد کے متعلق کوئی فیصلہ کن نظریہ قائم نہیں کیا جا سکتا - اگر اس بات کو حذف کر دیا جاتا تو کتاب اور بھی شاندار ہو [illegible] سرورق پر قائداعظم کی تصویر بھی ہے - لیکن اس تصویر پر کارٹون کا گمان ہوتا ہے -

نامۂ تہدید

مصنفہ :- آنسہ محمودہ رضویہ
پبلشر :- انجمن ترقیِ اُردو کراچی
تقطیع :- ۲۰×۳۰/۱۶ ۵۴ صفحات قیمت دو روپے

یہ آنسہ محمودہ رضویہ کے بارہ مضامین کا مجموعہ ہے [illegible] کے ذریعہ سے اسلامی تاریخ کے بعض واقعات پر روشنی ڈالی [illegible] لیکن مصنفہ نے ان مضامین کو "اسلامی افسانوں" کا مجموعہ قرار دیا [illegible] حالانکہ ان مقالات میں افسانہ نگارانہ اسلوب کی کوئی جھلک نہیں [illegible] افسانے قرار دینا جہاں افسانویت پر ظلمِ عظیم ہے وہاں تاریخی و[illegible] کی بھی حقیقت قائم نہیں رہ سکتی -

بہرحال موصوفہ کی تلاش و جستجو قابلِ تحسین ہے - امید [illegible] اس کتاب کو حوصلہ افزائی کی نظروں سے دیکھا جائے گا - کتاب [illegible] قیمت میں تخفیف کے لئے گنجائش ہے -

گورو نانک

مصنف:- سید نذیر ترمذی

ناشر:- شمیم احمد سلیم [illegible] سپار منزل۔ برکت علی روڈ لاہور

[illegible] ۱۲۷ صفحات قیمت ایک روپیہ

یہ حضرت بابا نانک کی منظوم داستان حیات ہے۔ بابا نانک توحید کے وہ مشعل بردار تھے جن کی تبلیغ و ہدایت سے اس قوم نے [illegible] قبول کر لیا [illegible] عبادات و نیازات [illegible] نانک کو بھی مظہر [illegible] نانک کا پیغام اور نانک کا مقام [illegible] احترام کا مستحق سمجھا جائے گا۔ نذیر صاحب نے [illegible] بابا صاحب کی داستان حیات کو نظم [illegible] اس نظم کی تعریف و تنقید کا یہ موقع نہیں لیکن [illegible] نظر انداز کر دینا بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے [illegible] تحسین و حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ کتاب کا [illegible] سے منسوب کی گئی ہے اس کی وجہ [illegible] نظر نہیں آتی۔ کیونکہ بابا نانک کی شخصیت [illegible] سیاست و وزارت کے لئے [illegible] دنیوی [illegible] نہیں ہو سکتا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ نذیر صاحب [illegible] انتساب سیاسی و وزارت سے [illegible] کی جگہ کسی [illegible] سے وابستہ کر دیتے [illegible] حضرت بابا صاحب کی روح مبارک [illegible] خوش ہو جاتی۔

اُردو عربی ترجمہ

مولفہ:- پروفیسر حسن الاعظمی عالم ازہر یونیورسٹی۔ مصر

تقطیع:- [illegible] ۲۲۰ صفحات قیمت درج نہیں۔

ناشرین- حاجی ملک دین محمد اینڈ سنز- بل روڈ- لاہور

اُردو سے عربی ترجمہ سکھانے کیلئے ہندوستان کی درسگاہوں میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کو مستند قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اول تو وہ ایسے اساتذہ نے تیار کی ہیں جن کی پرورش خالص عربی ماحول میں نہیں ہوئی۔ دوسرے وہ ان اصول پر مبنی ہیں جو آج سے صدیوں پہلے مروج تھے لہذا ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو عربی زبان کے جدید قاعدوں کو مدنظر رکھ کر لکھی جائے۔ یہ کمی پروفیسر محمد حسن الاعظمی نے بوجوہ تمام پوری کر دکھائی ہے "اُردو عربی ترجمہ" میں طلبہ کی ذہنیت و نفسیت کے مطابق ایسے ایسے آسان جملے لکھ دیئے گئے ہیں کہ مبتدی بھی ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔ پروفیسر حسن الاعظمی ازہر یونیورسٹی کے عالم ہیں اور قاہرہ کی جامعہ مصریہ میں ایم۔ اے کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ آپ کو عربی زبان پر جو قدرت اور عبور حاصل ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ آپ کی ایک تصنیف ازہر یونیورسٹی کے جشن ہزار سالہ کے لئے حکومت مصر اپنے خرچ پر چھاپ رہی ہے اس کے علاوہ آپ متعدد [illegible] تصانیف کر چکے ہیں اور آپ کی لسانی قابلیت کا اعتراف اہل زبان [illegible] لہذا "اُردو عربی ترجمہ" کی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا امید ہے [illegible] کی تمام [illegible] اس گرانقدر تصنیف کو داخل نصاب منظور کر کے فاضل مصنف [illegible] کی [illegible] اور عربی [illegible] کے طلبہ اُردو [illegible] چاہتے ہیں وہ بھی اس تصنیف [illegible]

پھولوں کے ساتھ خار

از:-

جناب ایم، ہلال پریمی

[illegible] دل پہ اگر حکمراں رہا [illegible] کی بزم میں وہ کامراں رہا

پھولوں کا رنگ دو روزہ کبھی جاوداں رہا [illegible] حال میں کسی کا زمانہ کہاں رہا

پھولوں کے ساتھ خار نشیمن کے ساتھ برق [illegible] بہار کے دورِ خزاں رہا

[illegible] ہے مرا رازدارِ غم [illegible] کہاں ہی جب نہ مرا رازداں رہا

دراصل شاہکار ہے انسانیت کا وہ [illegible] رنج و غم میں بھی جو شادماں رہا

سب کو کبھی کسی سے شکایت نہیں رہی

دشمن بھی اے ہلال مرا مہرباں رہا!

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی، معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

عالمگیر تاریخ نمبر سنہ ۱۹۴۳ء

جلد ۳۹ —— فہرست مندرجات ماہ اپریل ۴۳ء —— نمبر ۵

مقالات!

تاریخی افسانے اور رُومان

منظومات

غزلیں

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا

ملاحظات

تاریخ نمبر کے بعد سالانہ نمبر

از:— ادارہ

یوں لائے ہم یہاں گل صدپارہ کر کے جمع — دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا

اس سال تاریخ نمبر شائع کرنے کا ارادہ تو نہیں تھا لیکن عین وقت پر ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا کہ موجودہ مشکلات کے پیش نظر "عالمگیر" کے سالانہ پروگرام ں کوئی ردّوبدل کیا جائے۔ لہذا گزشتہ اشاعت میں محض قادرِ مطلق کے بھروسے پر "تاریخ نمبر" کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اور اب اسی کے فضل و کرم سے یہ اشاعت خصوصی یہ قارئین ہے۔ تاریخ نمبر کی تیاری کیلئے اگرچہ بہت زیادہ مہلت نہ مل سکی تاہم مطالعہ کے بعد قارئین خود محسوس کریں گے کہ اس میں تمام خصوصیات موجود ہیں جو عالمگیر کے گزشتہ تاریخ نمبروں کے لئے باعث فخر اور موجب امتیاز رہی ہیں۔ ادارۂ عالمگیر خودستائی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا لیکن اظہار حقیقت چونکہ جرم ہیں ہے اس لئے ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ صحیح و صالح ادب پیش کرنا عالمگیر کا ابتدا ہی سے نصب العین رہا ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے عالمگیر کو قائدانہ حیثیت حاصل ہے ردو ادب انقلاب کے دروازے پر کھڑا ہے اس لئے اگر بعض حامیانِ ادب کے ہوش ٹھکانے نہ رہیں تو تعجب نہیں یہی وجہ ہے کہ بعض نومشق ادیبوں اور افرنجیت زدہ پروفیسروں کی زبان پر "جدید ادب — جدید ادب" کا نعرہ تو نظر آتا ہے۔ لیکن ؏ کس نہ دانست کہ منزل گہِ معشوق کجاست ان لوگوں کو خود بھی معلوم نہیں ہے کہ اُن کے ادب کی ناؤ کس طرف بہتی جا رہی ہے۔ ادب جدید کا تجزیہ کیا جائے تو اس "پٹارے" میں وہ سب کچھ موجود ہے جو کفر و الحاد، عریانی و ناشائستگی، بیہودگی و شیطنت کی گندی جھولیوں میں ہونا چاہئے۔ لیکن یہ آتشِ معصیت کے ل کھاتے ہوئے شعلے اپنے دامن میں اس روشنی کی ہلکی سی کرن بھی نہیں رکھتے جو انسانی ذہن و دماغ کو تہذیب و انسانیت اور شرافت و حریت کی راہ دکھا سکے۔ یہ سینۂ ادب پر رِستے ہوئے ناسور ہیں جن کی عفونت آفریں آلائش کے باعث دماغ انسانیت کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچ رہا ہے۔ "عالمگیر" نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ اس بے راہ روی سے دامن بچا کر راہِ راست پر گامزن رہے "تاریخ نمبر" اس کا تازہ ترین ثبوت ہے۔ امید ہے قارئین اسے وقعت و قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

ناسپاسی ہوگی اگر ہم ان اہل قلم معاونین کا بصمیم قلب شکریہ ادا نہ کریں جنہوں نے صد درجہ قلیل مہلت کے باوجود ہماری درخواست پر اپنے جواہر افکار بھیج کر "تاریخ نمبر" کو زینت و رونق بخشی۔ اس اشاعت خصوصی کی کامیابی کا سہرا درحقیقت اُنہی کے سر ہے۔

"تاریخ نمبر" کے بعد ایک اور خاص نمبر کا اعلان بظاہر ناممکن ہے لیکن قارئین یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ یکم جون ۱۹۴۳ء کو حسب معمول "عالمگیر" کا سالانہ نمبر شائع ہوگا۔ گوناگوں مشکلات و حالات کے باوجود اس نمبر کو ہر جہت سے کامیاب اور دلکش بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ مفصل اعلانات آئندہ اشاعت میں درج کئے جائیں گے۔ اہل قلم معاونین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے بہترین مضامین نظم و نثر زیادہ سے زیادہ ۲۰ اپریل تک دفتر میں بھیج دیں تاکہ بروقت کتابت و طباعت کا انتظام ہو سکے۔ اس تاریخ کے بعد موصول ہونے والے مضامین "سالانہ نمبر" میں جگہ نہ پا سکیں گے۔ افسانہ یا مضمون عالمگیر کے چار صفحات سے کسی صورت میں زیادہ نہ ہو۔

اخبار و افکار

شذرات

از ـــ ادارہ

دیسی ریاستیں اور اردو

دیسی ریاستوں میں اردو زبان کو جس تعصب و عناد کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے وہ بہت زیادہ افسوسناک ہے۔ مثلاً ریاست گوالیار میں اردو زبان کو ہمیشہ امتیازی درجہ حاصل رہا ہے لیکن کچھ عرصہ سے اس ریاست کے حکام نے بھی سابقہ روایات کو پس پشت ڈال دیا ہے چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ گوالیار کے سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے عام فہم الفاظ کی بجائے سنسکرت آمیز ہندی کے الفاظ داخل کئے جا رہے ہیں۔ مثلاً "مجموعہ ضابطہ فوجداری" کا ترجمہ "اپرادھ سنبدھی ودھی کا سنگرہ" کیا گیا ہے اور "قانون" کو "ادوگم ترشران" کہا جاتا ہے۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو ریاست کا طرز عمل برطانوی ہند کے اردو داں طبقہ کو اضطراب و تشویش میں مبتلا کئے بغیر نہ رہے گا۔ ہمیں امید ہے کہ مہاراجہ صاحب اس ناگوار روش کی اصلاح کریں گے۔ گوالیار کے علاوہ جے پور میں بھی اردو زبان سے سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا جا رہا ہے۔ بلکہ دیوان صاحب کے بعض احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت جے پور اردو زبان کو اپنے علاقے سے بیدخل کرنے پر تلی ہوئی ہے چنانچہ کچھ عرصہ ہوا غالباً مہاسبھائی شورش سے متاثر ہو کر دیوان صاحب نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ جے پور کی عدالتوں اور محکموں میں ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو رائج کیا جائے۔ "ہماری زبان" کا بیان ہے کہ اس حکم پر بڑی مستعدی اور سرگرمی سے عمل ہو رہا ہے ہماری سمجھ میں نہیں آسکا کہ آخر زبان کے مسئلہ کو فرقہ پرستی کی دھندلی عینک سے کیوں دیکھا جاتا ہے؟ کیوں نہیں ان معاملات پر خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی جاتی؟ کاش مہاراجہ صاحب جے پور اصلاح احوال کی جانب توجہ مبذول فرمائیں۔ ان دونوں ریاستوں کے مقابلہ میں حکومت جموں و کشمیر کا طرز عمل اطمینان بخش نظر آتا ہے۔ ستمبر [illegible] میں اردو کو ابتدائی مدارس کے لئے مشترک ذریعہ تعلیم قرار دینے کے احکام صادر کئے گئے تھے۔ اب ان احکام کو عمل و حقیقت کی راہ پر ڈال دیا گیا ہے چنانچہ ابتدائی مدارس کے لئے ہندی اردو کا ایک مشترک فرہنگ [illegible] تیار کرایا گیا ہے جو ان دونوں زبانوں کے آسان آسان الفاظ [illegible]

ہے۔ یہ فرہنگ چونکہ ایک ایسی کمیٹی کے زیر نگرانی تیار ہوا ہے جس کے صدر خان بہادر جعفر علی خان اثر تھے۔ لہذا امید کی جاتی ہے کہ یہ فرہنگ بہت زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت کشمیر جلد ہی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی طرف توجہ کرے گی۔

قرآنک لائبریری

عربی زبان و ادب کی تعلیم و ترقی اور مقبولیت و جاذبیت کا سرچشمہ قرآن کریم ہے۔ لہذا قرآنی علوم و معارف کی تجلیاں جس قدر [illegible] گی اسی قدر عربی کی مقبولیت روشنی میں آسکے گی۔ ہمیں مسرت ہے کہ [illegible] دوست مسلمان اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں۔ اور اس [illegible] روشن ترین مظہر قرآنک لائبریری [illegible] سامنے ہے۔ یہ دار المطالعہ اپنی عدیم النظیر خصوصیتوں کے باعث صرف پنجاب ہی میں نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں امتیازی حیثیت [illegible] قرآنی علوم و تعلیمات حقائق و معارف اور تشریح و تفسیر [illegible] جن کے متعلق اس مطالعہ گاہ میں بیش بہا اور بیش قیمت [illegible] اور کتابوں کے انتخاب میں اعتقادی تعصب [illegible] اختلاف اور لسانی تخصیص کو نزدیک تک آنے نہیں دیا گیا [illegible] سے دور جدید تک اور اعتقادی ماحول سے [illegible] اور منقولوں کی مشہور و کمیاب تالیفات موجود ہیں۔ ان [illegible] کے پیش نظر قرآنک لائبریری [illegible] تعاون کی مستحق ہے [illegible] گرمجوشی اور تعاون [illegible] احمد قریشی بانی و مہتمم [illegible] بنانے کی کوشش کریں گے۔

[illegible]

قرانُ السعدین

علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کی ایک مجلس کی رُوداد

مولانا ظفر علی خاں کے خامۂ بہار آفریں سے

[illegible] کی بات ہے [illegible] دنیا جنگ فرنگ کا پردہ اٹھا کر اس کی تباہ کاریوں کے نتائج دیکھنا چاہتی تھی۔ اسلامی ممالک انقلاب کے دھماکے سے [illegible] فرنگ فتح و نصرت کے نشہ جنوں خیز میں جھوم جھوم کر محو گلگشت تھی۔ زمانہ تارک متحدہ حکومت اپنے آئینہ کو تعریض و تنقید کے پتھر سے بچا کر اختیارات خصوصی کے دامن میں چھپا چکی تھی۔ اس لئے مولانا ظفر علی خاں کے قلم کو حریم سیاست میں تا محرمانہ نظر ڈالنے کی اجازت نہ تھی۔ آپ نے لاہور سے "ستارۂ صبح" تو جاری کر ہی لیا تھا۔ اس اخبار کا دامن اگرچہ سیاسی تنقید کے [illegible] سے محروم تھا لیکن اس میں علم و ادب کے جو شگفتہ پھول ڈالے جاتے تھے اس کی نکہت مشام [illegible] تک علمی دنیا کا دماغ مسرور ہے۔ ذیل کا مقالہ اسی عہد گلفشاں کی ایک بہار آفریں یادگار ہے (ادارہ)

لاہور آنے کا اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ گاہے ماہے لسان توحید علامہ اقبال سے نیاز حاصل ہو جاتا ہے اور ان سے [illegible] طبیعت کے انقباض کو جو کثرت کار اور ہجوم افکار کا نتیجہ ہے مبدل بہ انشراح کر دیتی ہیں۔

دو ایک دن ہوئے علامہ موصوف سے حسب معمول نیاز حاصل ہوا۔ ہم نے کہا کچھ تازہ فکر کی ہو تو سنائیے۔ کہنے لگے مولانا جامی کے ایک مطلع پر ایک شعر ہوا ہے سن لیجئے۔ پہلے انھوں نے یہ مطلع پڑھا ؎

آنکہ از حلقۂ زر گوش گرانست او را
چہ غم از نالۂ خونیں جگرانست او را

کون ہے جو اس بے مثل مطلع کو سن کر سر نہ دھنے گا۔ مولانا جامی کے کلام میں تغزل کا جو رنگ ہے اور اس میں جو حلاوت اور شیرینی [illegible] ہے اس کی کیفیت سے ارباب ذوق سلیم نا آشنا نہیں لیکن اس شعر میں تو مولانا اپنے آسمان فکر کے نقطۂ نصف النہار [illegible] نظر آتے ہیں لفظی اور معنوی رعایتیں اس [illegible] انداز میں دست و گریباں ہیں کہ پڑھ کر بے اختیار وجد آ جاتا ہے۔

فارسی میں گران کے معنی ایک تو ثقیل کے ہیں جو اس لفظ کا مفہوم متعارف ہے اور دوسرے معنی اس حالت میں جب یہ لفظ گوش [illegible] واقع ہو [illegible] ثقل سماعت کے ہیں۔ شعر کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ وہ شخص بے پروا جس کے کانوں میں سونے کی بالیاں پڑی [illegible] کان ڈھیرے ہوئے جاتے ہیں (یا برعایت معنوی بہرے ہوئے جاتے ہیں) ان خونیں جگر عشاق کی [illegible] ہوئے ہیں اس لئے کہ اس کی بے نیازی کی کفیل اس کی گران گوشی ہو چکی ہے۔

یہ شعر [illegible] دوسری زبان کی رعایت لفظی کو اصلی شان میں ظاہر کر سکے۔ جامی کے شعر [illegible] طرح ہوا ہو حلاوت ہو سکتے ہیں جو فارسی جانتے ہیں۔

اب اقبال کا شعر [illegible] کیا خوب فرماتے ہیں ؎

[illegible] گدائے کہ ز ہندو پسر الست او را

[illegible] ہے اور وہ [illegible] آفرینندہ کون و مکاں کے آستانۂ وحدت پر

سجدہ ریز ہے۔ جس کا سر خدائے قدوس کی بے نیازی کی بارگاہ میں جھکا ہوا ہے۔ جو نطق کو مبدء فیاض کے پیرایہ کمال کی تکمیل تحریں ادا سمجھتے ہیں اس شعر کی نزاکتوں کی داد دے سکیں گے۔

کاشی اور سومنات کے صنمخانوں میں معبودان ہند کے سنگیں ہونٹوں پر ازل سے سکوت کی جو مُہر لگی ہوئی ہے اس کا نقش ہزارہا سال ہوئے عراق کے ایک ساحلی شہر کے بت کدہ میں بھی مرتسم تھا اور آذر کی صنعت گری نے اس کے ارتسام میں اپنا کمال دکھایا تھا۔ دین حنیف کا وہ وحید العصر موسس، لقب مسلم کا وہ سب سے پہلا حقدار ابراہیم جس پر خدا کی سو سو رحمتیں ہوں ایک دن صنمکدے میں گیا۔ اس سے پہلے نجم و آفتاب و ماہتاب کی افلیت کا تقابل اس کے سینہ میں خلاق ارض و سما کا نور عالم آرا چمکا تھا۔ اب صنمخانے کے معبودان باطل کی خموشی سعادت کے اس فرزند اعظم کو معبود حقیقی کے نطق مطلق کا درس دینے والی تھی۔ اس نے ایک تبر لے کر تمام بتوں کا سر توڑ ڈالا اور صنم شکنی کی اولیت کا شرف حاصل کرنے کے بعد تبر کو سب سے بڑے بت کے گلے میں ڈال دیا جب پجاری آئے اور انھوں نے اپنے دیوتاؤں کی یہ حالت دیکھی تو ابراہیم سے غضبناک ہو کر پوچھا یہ کیا ماجرا ہے۔ ابراہیم نے تعریض منترہ کے اس لہجہ میں جو بعض دفعہ بلاغت کی جان ہوتا ہے اور جو مذہب کی تاریخ میں اس موقع سے زیادہ کامیابی کے ساتھ کبھی نہیں برتا گیا جواب دیا کہ مجھ انسان ضعیف البنیان سے کیا پوچھتے ہو۔ اپنے اس سب سے بڑے خدا سے پوچھو اگر اس میں نطق ہے تو بتا دے گا کہ "بت شکن" کون ہے؟

ہماری کم مایہ بیانی کو یہ توفیق کہاں مرحمت ہوئی ہے کہ ان حقائق عالیہ کا حق ایضاح ادا کر سکے جو تصویر قرآن حکیم نے کھینچی ہے فراغ الی الھتھم فقال الا تاکلون ۝ مالکم لا تنطقون ۝ فراغ علیھم ضربا بالیمین ۝ فاقبلوا الیہ یزفون ۝ قال اتعبدون ما تنحتون ۝ واللہ خلقکم وما تعملون ۝ ترجمہ:- پھر ابراہیم ان کے بتوں کے جھگٹے میں جا داخل ہوئے اور ان سے کہنے لگے کہ تم کھانا کیوں نہیں کھاتے ہو اور تم کو کیا ہو گیا ہے کہ بولتے چالتے نہیں۔ یہ کہہ کر وہ بتوں پر پل پڑے اور اپنے دہنے ہاتھ سے ان پر ضربیں لگانی شروع کیں، وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو پجاری آگئے ابراہیم نے ان سے کہا کہ جن سنگیں بتوں کو خود تمہارے ہاتھوں نے تراشا ہے ان کو کیوں پوجتے ہو۔ تمہارا پیدا کرنے والا اور تمہارے مصنوعات کا پیدا کرنے والا تو اللہ ہے اسی کی پرستش کیوں نہیں کرتے؟ بت کو اگر طاقت گفتار دی جاتی تو وہ جناب خلیل اللہ کا ہمصفیر ہو کر یہی گلہ واگذاری کرتا۔ اقبال کا شعر ایک کوزہ ہے جس میں توحید کا یہ دریا بھر دیا گیا ہے۔ فافہم وتدبر۔

ایک اور مطلع ہے جو غالباً شیخ علی حزیں کا ہے کہ ؎

از بنارس نروم معبد عام است اینجا ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

شری رامچندر جی مہاراج اور شری لچھمن جی مہاراج کے حسن معنوی کا زمانہ تو گزر گیا۔ اس حسن لازوال، اس جمال بیمثال کا اگر نظارہ کرنا ہو تو راماین کے بھوجے بسر سا ورات کو اٹ کر دیکھیے۔ آج کل تو دنیا میں اس حسن کی صرف شان محدود رہ گئی ہے۔ حزیں نے جب یہ شعر کہا تھا تو صبح بنارس کی ہر تجلی اس کی بصارت میں جلوہ ریز ہوئی ہوگی۔

ہمارے شاعر نے زمین حزیں کی لی اور اس کی خاک پر اپنی شراب معنی کا جرعہ اس طرح گرایا ؎

ہست ایں میکدہ و دعوت عام است اینجا قسمت بادہ باندازۂ جام است اینجا

حزیں کا مطلع لاجواب ہے۔ لیکن اقبال نے بھی اپنے مطلع پر کچھ کم زور طبیعت صرف نہیں کیا ہے۔ اور اس کا دوسرا مصرع تو پڑھنے والا

دو شعر سنکر ڈاکٹر اقبال چپ ہو گئے۔ ہم نے کہا کیوں حضرت کیا اندیشہ ہائے ہاں اسی قدر تھا۔ ہنس کر فرماتے ہیں ؎

بفہم ہیچ مضموں جز بلب بستن نمی آید   خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

ہم نے عرض کی کہ یہ اڑن گھائیاں کسی اور کو بتائیے گا ہم سے یہ فقرے آپ نہیں چل سکتے۔ آپ تو دریائے شعر ہیں۔ وہ موتی آپ نے تہ میں ڈال رکھے ہیں کچھ ان کی بانگی بھی تو دکھائیے۔ مثنوی اسرار خودی کے دوسرے حصے کے صدہا اشعار دُر مکنوں کی طرح آپ حافظے کی ڈبیا میں بند ہیں اس درج گوہریں کا ڈھکنا بھی تو کھولئے اور دو ایک موتیوں کی درخشانی و غلطانی کی بہار اور دکھائیے۔ کہنے لگے کہ بھئی تم بڑے بیڈھب ہو میں اپنی دولت سینت سینت کر رکھتا ہوں مگر تم آکر اس پر چھاپہ مار ہی جاتے ہو۔ اچھا تم بھی کیا یاد کرو گے۔ قرآن حکیم کی صفت و ثنا میں دو شعر عرض کئے ہیں ملاحظہ ہو ؎

آنکہ دوش کوہ بارش بر نتافت   سطوت او زہرۂ گردوں شگافت
بنگر آں سرمایۂ آمال ما   گنجد اندر سینۂ اطفال ما

ان اشعار آبدار کو سن کر ہم جھوم جھوم گئے قرآن مجید کی مشہور آیت ہے۔ انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنھا و اشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا ہ اس آیت کی تفسیر میں ہمارے مفسرین نے اپنی جودت طبع کے گوناگوں کرشمے دکھائے ہیں لیکن جو نکتہ اقبال کی فکر فلک پیما کو سوجھا ہے شاید کسی کے ذہن میں نہیں آیا۔

جناب باری کا ارشاد ہے کہ ہم نے بار امانت کو آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کے حوالے کیا لیکن اس کی ہستی فرسا بوجھ کی تاب نہ لا سکا، زمین اس بار گراں کی متحمل نہ ہو سکی، پہاڑ اس کے تحمل کے تصور سے لرز اٹھے کسی کو بھی اس کے اٹھانے کی توفیق نہ ہوئی سب نے متفق اللفظ ہو کر اس حمالی سے انکار کر دیا۔ آخر انسان ظلوم و جہول ہی نے اس کی ہامی بھری کہ میں اس بار کو اٹھاتا ہوں۔

شیراز کے لسان الغیب نے اس آئت کی تفسیر اپنی شور انگیز ادا میں اس طرح کی ہے ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید   قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

مولانا جامی نے بھی اپنی ادائے خاص میں اس آیہ کریمہ کی رنگین تفسیر یوں کی ہے ؎

پر تو حسنت نہ گنجد در زمین و آسماں   در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

یہ دونوں اشعار رہتی دنیا تک ادب آگہان عجم کی زبان پر رہیں گے لیکن ہمارے لسان توحید کا خیال ہی نرالا ہے۔ اقبال نے اپنے شعر میں یہ نزاکت پیدا کی ہے کہ اول تو "بار امانت" سے مراد "قرآن مجید" لی ہے۔ اور حقیقت میں اس سے بڑھکر صحیح اور لطیف مفہوم بار امانت کا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ مفہوم ہمارے مفسرین کرام کو بھی سوجھا ہے۔ لیکن ایک نئی بات جو اقبال نے پیدا کی ہے وہ یہ ہے کہ اس بار گراں کو جس سے دب کر آسمان، زمین اور پہاڑ نالہ کرنے لگے تھے مسلمان بچوں کے سینہ کی ودیعت قرار دیا ہے کہ اس کے سمانے کے لئے یہی نہانخانہ موزوں ہو سکتا ہے۔ اور پھر انسان ظلوم و جہول کی تعریف بچوں پر کیسی صادق آتی ہے۔ بلکہ پڑھکر اور فلسفہ و حکمت سے آشنا ہو کر تو قرآن ایک عاقل و بالغ انسان کے سینہ میں سما ہی جائیگا لیکن ایک چار سال کے بچے کے دل و دماغ میں آیات قرآنی کا اتر جانا شاعرانہ پہلو سے اس بات کا مداعیت نواز ثبوت ہے کہ قرآن کا بار امانت انسان ظلوم و جہول نے اٹھا لیا۔ اس لئے کہ انسان کی شان ظلومی و جہولی کی اولیں تصویر عہد طفولیت ہی ہے۔

پھر وہ بچہ جس کا سینہ اس امانت کا گنجینہ بن چکا ہے۔ جب بڑا ہوگا تو کیا سے کیا ہو جائے گا؟ کوئی ہے جو اس حقیقت سے انکار کر سکے کہ خلافت و نیابت الٰہی کی تمام شانیں اس میں جمع ہو سکیں گی۔ اس کے پاؤں زمین کے بجائے آسمان پر ہونگے اس کا سر عرش بریں کے تکیہ پر ہوگا۔ آفتاب و ماہتاب اس کی محفل جلال و جمال کے مشعل بردار ہوں گے۔ ہوائیں اس کی نامہ بر ہوں گی۔ ابر نوبہار اس کی سقائی کرے گا۔ بلقیس اس کی کنیز ہوگی۔ سلیمان اس کی تصویر شکوہ و احتشام ہوگا۔ سکندر اس کا آئینہ دار ہوگا۔

یہ وہ امکانات ہیں جو قرآن نے ایک طفل مسلم کی چھپی ہوئی قابلیتوں کے نہاں خانے کی ودیعت کر رکھے ہیں اور اقبال کے دونوں شعر اس حقیقت کبریٰ کے چہرہ کشا ہیں۔

قرآن مجید و فرقان حمید کا ذکر مسلمان کے حق میں وہی اثر رکھتا ہے جو حدی خواں کا نغمۂ اشتر تیز گام کے لئے اور گراں محملوں کی سُبک روی کا یہی علاج ہے ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی　　حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

اور علامہ اقبال کا عنقائے فکر تو عرفی سے بھی اونچا آشیانہ رکھتا ہے۔ وہ غالب کے ہم نوا ہو کر کہہ سکتے ہیں۔ ع

ناقۂ شوقم و جبریل حدی خوانِ من است

یہ شعر ہمیں سنا کر خود بخود وجد میں آگئے۔ اور کہنے لگے کہ لو اور بھی سنو! عرب کے جاہل بدو کو جس عجاز قرآن نے حکیم بنا دیا۔ اس کی بادیہ نشینی کو بزم تمدن کی صدر نشینی سے بدل دیا۔ اس کی شتربانی میں شانِ جہاں بانی پیدا کر دی۔ اس کے پاؤں کی خاک کو اکسیر بنا کر دکھا دیا۔ وہ یہی قرآن ہے ؎

آں جگر تابِ بیابانِ کم آب　　چشم او احمر ز سوزِ آفتاب
خوشتر از آہو رم جمازہ اش　　گرم چوں آتش دمِ جمازہ اش
رختِ خواب افگندہ در زیرِ نخیل　　صبحدم بیدار از بانگِ رحیل
دشت سیر از بام و در نا آشنا　　ہرزہ گرد از حضر نا آشنا
تا دلش از گرمیٔ قرآں تپید　　موجِ بے تابش چو گوہر آرمید
از جہانبانی نوا زد ساز او　　مسندِ جم گشت پا انداز او
شہرہا از گردِ پایش ریختند　　صد چمن از یک گلش انگیختند

ان اشعار کو سن کر قلب و دماغ میں عجیب جنوں انگیز لذتوں کا ہجوم ہوا وہ دیر تک اپنا اثر قائم رکھیں گی۔ اور جب [illegible] ہونے لگے تو پھر ہم علامہ اقبال سے عرض کریں گے کہ اب کچھ اور ارشاد ہو [illegible] لیکن ع　　لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

ایک نہ ایک

چل ہی جاتا ہے ترا تیرِ نظر ایک نہ ایک — مل ہی جاتا ہے نشانے کو جگر ایک نہ ایک
چشم پوشی وہ کریں لاکھ مری حالت سے — پڑ ہی جاتی ہے اچٹتی سی نظر ایک نہ ایک
ہے شبِ وصل کبھی اور شبِ ماہ کبھی — گھر مرے آکے چمکتا ہے قمر ایک نہ ایک
خار و گل سے چمنِ عشق کی بھی زینت ہے — میری پلکوں میں ہے لختِ جگر ایک نہ ایک
کیا مرقع ہے تصوّر بھی کہ اچھی صورت — آتی ہے آئینۂ دل میں نظر ایک نہ ایک
ہاتھ خالی نہیں جاتے وہ کسی محفل سے — دل اُڑا لیتی ہے دزدیدہ نظر ایک نہ ایک

نخلِ اُمیّد کو سرسبز خدا رکھے جلیل
ہاتھ آتا ہے مرے روز ثمر ایک نہ ایک

جلیل

شاہی کھنڈر

ہے بزمِ فنا کی خوش مذاقی فانی — میکش فانی ہے اور ساقی فانی
ہے صرف یہ حاصلِ حکایاتِ حیات — باقی فقط اک خدا ہے، باقی فانی

یہ مادیت کے ہیر پھیر اچھے ہیں — بے بادۂ روح، جو ہیں سیر، اچھے ہیں
صدیاں بیتیں مگر ہیں قائم اب تک — انسان سے پتھر کے یہ ڈھیر اچھے ہیں

کچھ عظمتِ ماضی کے نشاں باقی ہیں — کچھ نقش و نگارِ رفتگاں باقی ہیں
گو ایک ہی مٹی سے بنے تھے لیکن — برباد ہوئے مکیں، مکاں باقی ہیں

کیا کیجئے فطرت کے ان احسانوں کو — انسان پہ ترجیح ہے حیوانوں کو
محلوں میں ہے مور و مار کی جائے قیام — اور جھونپڑے ملتے نہیں انسانوں کو

ہے باعثِ انتشار ترتیب یہاں — چلتی نہیں فلسفے کی تہذیب یہاں
تعمیر کے خبط میں اُلجھنے والے — تعمیر کا مفہوم ہے تخریب یہاں

ساقی ہے نہ بادہ ہے نہ میخانے ہیں — باقی ٹوٹے سے چند پیمانے ہیں
یہ سُرخ عمارتیں نہیں ہیں غافل — کچھ خون سے لکھے ہوئے افسانے ہیں

کچھ تو کہو دُنیا سے گزرنے والو — کیوں خاک پہ سوتے ہو سنورنے والو
کس طرح گوارا ہوئی تاریکیٔ گور — اے چاندنی راتوں میں نکھرنے والو

ان محلوں پہ جب چاند چمکتا ہوگا — نازش پہ کمالِ حُسن یکتا ہوگا
اے سیکری! اس وقت نظر بھر کے تجھے — مشکل ہی سے کوئی دیکھ سکتا ہوگا

عشرت نہیں اہتمامِ عبرت ہے یہاں — جلوت نہیں انتظامِ خلوت ہے یہاں
رخصت ہوا طمطراقِ شاہنشاہی — اب ایک فقیر کی حکومت ہے یہاں

سیماب اکبرآبادی

؎ فتح پور سیکری

بربط نواز

عہدِ اکبری کا ایک دلگداز افسانہ

از:۔ جناب علی احمد بی۔ اے

شہنشاہ اکبر کی بہت سی بیویاں تھیں۔ حرم شاہی مختلف مذاہب کی حسین عورتوں سے معمور تھا۔ ان میں ایک خوبصورت راجپوت شہزادی بھی تھی۔ یہ حسین لڑکی ایک راجہ کی بیٹی تھی۔ اور جب وہ دلہن بن کر آگرہ آئی تو اس کے باپ نے خادمائیں، باورچی، گانے بجانے والی عورتیں اور اس کے آرام و آسائش کی تمام چیزیں اس کے ساتھ کر دیں۔ راجکماری کو اپنا گھر چھوڑتے ہوا بہت دکھ ہوا۔ اور اس نے بھیگی ہوئی آنکھیں اور لرزتے ہوئے دل کے ساتھ میکے کی سرزمین کو خیرباد کہا۔ دار السلطنت آگرہ میں شادی کی رسم ادا ہوئی اور جب وہ حرم شاہی میں پہلی مرتبہ داخل ہوئی تو حرم والیوں میں اس کی غیر معمولی جھجک اور شرم کی بڑی ہنسی اڑائی گئی۔ راجکماری اپنی چلبلی اداؤں اور معصومانہ شوخیوں کے سبب بہت جلد بادشاہ کی چہیتی رانی بن گئی۔ اس کے ساتھ آئی ہوئی عورتوں میں ایک باندی تھی جو بربط بجاتی تھی۔ یہ ایک خاموش اور سنجیدہ لڑکی تھی جو اپنے ساز اور اپنے نغموں سے اپنی مالکہ کا دل بہلاتی۔ یہ میٹھے اور سریلے گیت رانی کو ان بیتے ہوئے دنوں کی یاد دلاتے جو اب اس کے لئے خواب اور افسانہ بن چکے تھے۔ جب تک بربط نواز گاتی رہتی۔ راجکماری خود کو فراموش کر کے تخیلات کی سرزمین میں کھوئی ہوئی جنتوں کو ڈھونڈا کرتی۔

اس نئی رانی سے بادشاہ کی دلچسپی نے حرم سرا کی دوسری بیگمات میں آتش رقابت بھڑکا دی۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں اور ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگیں۔ اور شاہی کانوں تک بات پہنچائی گئی۔ اکبر کو سخت حیرت اور تشویش ہوئی۔

ایک دن اس نے کہا۔ "میری راجپوت بیگم! میں تمہاری اس بربط نواز باندی کو پسند نہیں کرتا۔"

"کیوں جہاں پناہ؟" وہ حیران ہو کر بولی۔ "اس کا کون سا فعل خاطرِ عالی کی [illegible] کا باعث ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" اکبر نے کہا۔ "بجز اس کے کہ تم اس کی بہت شائق معلوم ہوتی ہو۔ جب وہ گاتی یا بجاتی ہے تو تم مجھے بھول جاتی ہو اور وہ مستقل طور پر تمہارے ساتھ رہتی ہے۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوتی۔"

"نغمہ میری جان ہے۔" راجکماری نے جواب دیا۔ "اور میرے مالک جب آپ میرے پاس نہیں ہوتے تو میں اسی طرح مفارقت کی [illegible] کاٹتی ہوں۔"

بادشاہ خاموش ہو گیا لیکن اہل حرم کی سرگوشیاں تیز ہوتی گئیں اور اکبر بار بار بربط نواز عورت کے متعلق رانی کو ٹوکتا رہا۔ ایک روز اچانک رانی کے کمرے میں داخل ہوا۔ رانی ساز کی جھنکار اور نغموں کے اس طوفان میں ڈوبی ہوئی تھی جو ساز بجانے والی کے گلے سے اُمڈ رہا تھا۔ اکبر کچھ دیر تک انتظار کرتا ہوا کھڑا رہا۔ راجکماری اپنی ننھی ہتھیلیوں پر گالوں کو سہارے ہوئے آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ شہنشاہ نے اپنی نظریں نغمہ نواز پر ڈالیں۔ اس کی مستقل اور گہری آواز کمرے میں گونج رہی تھی اور اس کی آنکھیں مالکہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"کتنا درد ہے اس آواز میں؟" اکبر نے سوچا اور [illegible] اس باندی کو چلے جانے کا حکم دیا۔ اس نے فوراً تعمیل کی اور کمرہ چھوڑ دیا۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ نہایت ترش لہجہ میں رانی سے کہا۔ "میں اس بربط نواز کو پسند نہیں کرتا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ پھر کبھی تمہارے کمرے میں آئے۔"

رانی نے ایک میٹھی ہنسی کے ساتھ شہنشاہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔ "جہاں پناہ اتنی بدگمانی! شاید محبت نے آپ کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آپ ہی کی محبت تو میری آنکھوں میں چمک رہی ہے۔ آپ ہی تو میری زندگی کے سورج ہیں۔ میں اس لڑکی کو صرف اس کے گانے کی خاطر پسند کرتی ہوں کیا آپ میری ویران تنہائیوں میں میرے اس لطیف مشغلے سے محروم کر دینا چاہتے ہیں؟"

لیکن اکبر کی آواز میں وہی تناؤ تھا "میں اس کی نظریں پسند نہیں کرتا۔ کاش وہ کبھی تمہارے کمرے میں نہ آئے۔"

راجپوت رانی نے التجا کی "میرے مالک! [illegible] میں جدائی کی گھڑیاں تنہا کیونکر گزار سکوں گی؟ یہ ساز [illegible]

پتی دیو! یہ داسی آپ کی

ہیں۔ خدا کے لئے مجھے ان سے جدا نہ کیجئے۔

ان ہے۔"

اس کی میٹھی التجا اور اس کے دلفریب انداز نے شہنشاہ کے غصہ کو

فور کر دیا اور پھر اس نے کچھ نہ کہا۔

لیکن چند شاموں کے وقفہ کے بعد وہ پھر اچانک اس کے کمرہ میں

گیا اور پھر اس بربط نواز کو وہیں پایا۔ راجکماری اپنے بستر پر نیم دراز

تھی اور اس کے پاؤں کے قریب ہی باندی ہمیشہ کی طرح بیٹھی ہوئی مصروف

چنگ و رباب تھی۔ راجکماری بربط نواز کے نغموں میں ایسی کھوئی ہوئی

تھی کہ اکبر کے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ بادشاہ کچھ دیر خاموش کھڑا

رہا۔ اور پھر قریب آتے ہوئے سخت لہجہ میں بولا۔ "میں اس بربط نواز کو

پھر ایک بار تمہارے کمرے میں پا رہا ہوں، اس کا مطلب؟"

رانی کچھ دیر کے لئے گھبرا گئی پھر بولی۔ "جہاں پناہ! مجھ سے قصور ہوا

میں نے آپ کو تشریف لاتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"اس سے کیا۔ تم نے دیکھا ہے یا نہیں۔" شہنشاہ نے نگاہوں سے

نگاہیں ملاتے ہوئے غصے سے کہا۔ "تم نے اسے گانے کے لئے اپنے پاس بلایا

تھا کیوں؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اس بربط نواز کو تمہارے کمرے کے

اندر دیکھنا نہیں چاہتا اور تم نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی۔"

"عالی جاہ درست فرماتے ہیں۔ مگر....."

"میں تمہارا کوئی عذر سننا نہیں چاہتا۔" اکبر اعظم نے جلدی سے کہا

"تمہاری بے وفائی حکم عدولی کا نتیجہ ہے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ تم مجھ سے جو راز

چھپا رہی ہو وہ مجھ پر فاش ہو چکا ہے۔ تمہاری بربط نواز باندی عورت

نہیں مرد ہے۔ وہ عورت کے بھیس میں تم سے محبت کرتا ہے۔ افسوس تم نے

وفاداری کے بجائے مجھ سے بیوفائی کی۔"

راجکماری کچھ دیر کے لئے سکتہ میں آگئی۔ پھر اکبر کا ہاتھ تھامتے ہوئے

بولی۔ "میرے سرتاج! میرے مالک، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

شہنشاہ نے نفرت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "نادان عورت! میں نے

جو کچھ کہا ہے اس پر یقین رکھتا ہوں۔"

راجکماری کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے اور اس کا چہرہ بھیانک طور

پر زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی خالی خالی نظریں اکبر کو گھور رہی تھیں۔

اکبر کہتا گیا۔ "مجھے یقین ہے یہ عورت نہیں بلکہ مرد ہے ——— جسے

تم چاہتی ہو۔"

رانی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ بربط نواز نے آگے بڑھ کر کہا۔ "جہاں پناہ

[illegible] میں مرد ہوں۔"

رانی یہ سن کر بادشاہ کے قدموں پر گر پڑی [illegible]

[illegible] ایک مرد ہے۔"

"جہاں پناہ! میں نہیں جانتی تھی کہ میری بربط نواز ایک مرد ہے۔"

اکبر حقارت سے ہنسا اور پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔ "میں یہ جانتا تھا۔"

"میری داستان سنئے! میں آپ دونوں کو سمجھاؤں گا ——— میرا بربط

نواز نے کہا۔

"اچھا کہو، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" اکبر نے بے پرواہی سے کہا۔

"بادشاہ سلامت! جب راجکماری ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ میں

راج محل میں جایا کرتا تھا اور راجہ کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا۔ راجکماری

بھی ان میں شامل تھی۔ رفتہ رفتہ میں اس سے مانوس ہوتا گیا۔ یہاں تک

کہ خود اُسے یا کسی اور کو علم ہوئے بغیر میں اسے ایک دیوی کی طرح پوجنے

لگا۔ اور پوجتا رہا۔ زمانہ دھیرے دھیرے گزرتا گیا اور ہم چھوٹے سے

بڑے ہو گئے۔ زنانہ محل میں میری آمد و رفت بند ہو گئی لیکن میں اسے

بھلا نہ سکا۔ وہ میرے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ پھر اچانک ایک دن یہ

خبر اڑی کہ راجکماری جہاں پناہ کے حرم کی زینت بننے والی ہے۔ اور

راجہ کو ایک ایسی بربط نواز عورت کی ضرورت ہے جو رانی کے ساتھ آگرہ

جا سکے۔ تو میں نے اپنی جان کی بازی لگا کر بھیس بدلنے کی ٹھان لی اور

اس فریب میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اس معاملے میں نہ کسی نے میری مدد کی

اور نہ کسی کو کچھ علم ہوا۔ میں نے کسی پر اعتماد نہیں کیا۔ نہ ہی کسی کو اپنا

راز دار بنایا۔ جو کچھ کیا میں نے بذات خود کیا۔ میں نے ہی جرم کیا

میں ہی سزا کا مستحق ہوں۔ راجکماری بالکل نردوش ہے۔ وہ آپ

سے محبت کرتی ہے۔ اور آپ ہی اس کے دیوتا ہیں۔ میں صرف اس کے

قریب رہنا چاہتا تھا۔ اس کی خدمت اور اس کا حکم بجا لانا ہی میرا مقصد

تھا۔ شہنشاہ عالم یقین کریں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ایک

لفظ صحیح ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اور اکبر نے ایک خاص انداز سے مسکرا کر

کہا۔ "تم دونوں نے اپنا اپنا پارٹ نہایت خوبی سے ادا کیا ہے

کہ یہ راز طشت از بام ہو چکا ہے میں اس نیلے ہوئے افسانے [illegible]

نہیں کر سکتا۔"

"بادشاہ سلامت یقین کریں یا نہ کریں یہ افسانہ نہیں [illegible]

ہے۔ راجکماری میرے بھیس بدلنے سے [illegible] اس

کو کچھ پتا نہیں کیا۔ وہ تو آپ [illegible]

[illegible]

[illegible] ہوئے۔"

[illegible] ایک جھلک [illegible] رانی [illegible] اس پر [illegible] ایک جھپتی
[illegible] نظر ڈالتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس عجیب و غریب داستان کو سن کر اکبر کو حیرت تو ضرور ہوئی، [illegible] اس کا دل مطمئن نہ ہوا اور گمان یقین میں نہ بدل سکا۔ وہ رانی [illegible] مخاطب ہوا اور مدھم آواز میں بولا۔

"میں یہی سمجھتا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میری وفادار رانی ہو [illegible] افسوس تم مجھے فریب دے رہی تھیں۔ اور میں تمہاری جوانی اور [illegible] معصومیت سے دھوکا کھاتا رہا۔"

"میرے مالک! مجھ پر یقین کیجئے۔" رانی روتی ہوئی بولی۔ "بربط نواز [illegible] جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے۔ میں اس فریب سے بے خبر تھی۔ میں آپ [illegible] وفادار رانی ہوں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ سچ کہتی ہوں میں [illegible] آپ کے بغیر جی نہیں سکتی۔ مجھ پر اعتماد کیجئے، جہاں پناہ!"

اکبر کچھ دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی راجکماری نے گردن اٹھائی اور پھر سر [illegible] پڑی ہو گئی۔ اس کا خوبصورت کنول جیسا چہرہ موت کی طرح زرد تھا، [illegible] اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اس کی روح کا درد جھلک رہا تھا۔

اس واقعہ کا حال اور شہنشاہ کے عتاب کی خبر تھوڑی سی دیر میں [illegible] شاہی زنانخانے میں پھیل گئی۔ اور کچھ ہی دیر میں راجکماری کی ساری [illegible] دائیں اور حرم سرا کی دوسری تمام مامائیں کمرہ میں جمع ہو گئیں۔ رانی [illegible] نظریں اٹھا کر ان سب کو دیکھا اور اس کے چہرے کی سنجیدگی نے سب کو مورتوں کی طرح خاموش کر دیا۔

"کاغذ اور قلم لاؤ۔" اس نے اپنی ایک خادمہ سے کہا۔ "میں اپنی سچائی اور وفاداری کا ثبوت پیش کروں گی۔"

تب اس نے اپنی ایک بانہہ کو عریاں کیا۔ اور کمر پٹہ میں سے ایک تیز چاقو نکال کر اپنے نرم سفید گوشت میں ایک بڑا شگاف کر دیا [illegible] شریانیں کٹ گئیں اور خون کی تیز دھاریں بہنے لگیں۔ رانی نے اپنی [illegible] کے اس ابلتے ہوئے خون میں قلم کی نوک ڈبو کر لکھا۔

"میرے پیارے! میرے مالک! میں اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے مر رہی ہوں!"

تماشائیوں میں سے کسی کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اسے روک سکے [illegible] جہرے اس کو جوش عقیدت کا ایک عمل تھا — یہ ایک پرستش [illegible] زندگی کے خون کی بہتی ہوئی دھار جا رہی تھی۔ وہ یہ دکھانا [illegible] کہ اس کی زندگی کے لہو کا ایک ایک قطرہ اس کا اپنا نہ تھا،

اور عورت کی زندگی ہی کیا جب شوہر اسے ٹھکرا دے۔

اس نے اپنی زندگی کے خون سے لکھا ہوا محبت نامہ خادمہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"اسے بادشاہ کے ہاتھ میں دینا۔"

خادمہ جس وقت خونیں محبت نامے کے ساتھ کمرہ شاہی میں داخل ہوئی تو شہنشاہ بے چینی سے ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اور جب اس کی نظریں گھبرائی ہوئی خادمہ پر پڑیں تو وہ سمجھ گیا کہ ضرور کوئی بات خلاف معمول ہوئی — اکبر نے کاغذ ہاتھ میں لے کر جلدی سے پڑھا۔ اسے [illegible] پھر پڑھا۔

اکبر جس وقت کمرے کے اندر پہنچا رانی بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔ بادشاہ نے اس کا سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نوجوان بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔ ان میں آنسو تھے — نہ جانے غم کے تھے یا خوشی کے — ہونٹوں پر ایک پھیکی سی ہنسی آئی جس کا عکس اس کے تمام چہرے پر پھیل گیا۔ تب ایک آہ — ایک ہچکی — اور موت!

ہندوستان کا بادشاہ بیقرار ہو کر کمرے سے چلا گیا۔ اور حرم سرا کی ساری عورتیں وہاں سمٹ آئیں۔

شہنشاہ کئی دنوں تک بے چین رہا اور چہرے سے افسردگی ٹپکتی رہی۔ اس نے اس راجپوت رانی کی باقیات پر ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کیا۔ کہتے ہیں کہ اکبر نے نصف شب کو اکثر اس کے اطراف بربط کی جھنکار سنی۔ — ان نغموں کی صدا — جو بربط نواز اپنی ملکہ کے لئے چھیڑا کرتا تھا۔

دو شعر

[illegible]

[illegible]

آغاز و انجام

ایک اک نے تھرتھرائی پردہ ہائے راز میں
کس غضب کی دلکشی تھی حسن کی آواز میں

انتہائے جور دیکھی ابتدائے ناز میں
اس کے یہ معنی ہوئے انجام تھا آغاز میں

جب شب فرقت تڑپ کر میرے دل نے آہ کی
کروٹیں لینے لگے وہ خوابگاہ ناز میں

دل لگا کر یوں منایا ہم نے جشن ذوق و شوق
رنج و غم کو دعوتیں دیں عشق کے اعزاز میں

آہ نے منہ سے نکل کر کھو دیا غم کا بھرم
کھل گیا جب راز دل تو رہ گیا کیا راز میں

اے نگاہ شرمگیں اٹھ کر یہ عقدہ کھول دے
سحر میں اعجاز ہے یا سحر ہے اعجاز میں

صرف اک شغل قفس ہے اپنی آزادی کی دھن
ورنہ کچھ رکھا نہیں اب قوت پرواز میں

دیکھ کر اپنی ادائیں خود وہ عاشق ہو گئے
عشق کے آداب ہائے حسن کے انداز میں

آہ کرنا شغل ٹھہرا خاطر مغموم کا
اک صدائے دل شکن ہے اب بھی ٹوٹے ساز میں

لاکھ کوشش کیجئے لیکن نتیجہ کچھ نہیں
ہے خدائی کی فراست گم خدا کے راز میں

جو اثر کے ساتھ میرے دل سے نکلی تھی فغاں
جذب ہو کر رہ گئی وہ آپ کی آواز میں

سحر تو پھر سحر ٹھہرا سحر کا چرچا نہیں
ہے وہ کافر جو کرے شک آپ کے اعجاز میں

ناوک دلدوز نے اس کی خبر لی دور سے
آگیا شامت کا مارا جو عدو کے ناز میں

اللہ اللہ نغمۂ فرحت اثر کی دلکشی
جیسے وہ بیٹھے ہوئے ہوں پردہ ہائے ساز میں

باطنی ادراک سے جانچ اس کو اے ظاہر پرست
ہے خدا کا راز بھی شامل بشر کے راز میں

وہ مرے شیون کو سن کر شاد کیوں ہونے لگے
کچھ نہیں بس غم ہی غم ہے غم بھری آواز میں

جس طرح دل میں نگاہ ناز نے گھر کر لیا
کاش دل بھی گھر کرے یونہی نگاہ ناز میں

وقت پر حاجت کماں کی جس کو پیش آتی نہیں
ایک تیر ایسا بھی ہے انداز تیرانداز میں

ہم بھی تیرے ہو گئے تو بھی ہمارا ہو گیا
اب نہ کیوں گاڑھی چھنے باہم نیاز و ناز میں

ایک صورت پر وہ قائم کب رہے انجام تک
خواب لطف و عیش کے دیکھے تھے جو آغاز میں

[illegible] بھی اٹھ گئی شعلے ادھر اٹھنے لگے
کوئی بجلی تو نہیں تیری نگاہ ناز میں

کیوں اداؤں پر کسی کی ہم اٹھائیں اب نگاہ
خوبیاں سب آ گئیں کھنچ کر ترے انداز میں

ذکر کیا دس بیس کا مضمر ہیں لاکھوں واقعات
ایک میرے، ایک تیرے، ایک دل کے ساز میں

کیا کروں تشریح تم سے اپنے ضبط آہ کی
سیکڑوں معنی ہیں پنہاں لفظ بے آواز میں

اور سب دنیا کی چیزوں سے اثر جاتا رہا
حسن کے جادو میں ہے یا عشق کے اعجاز میں

کس قدر دشوار تر تھا حسن فطرت کا طلسم
کھو گئے ہم خود ہی اپنی جستجوئے راز میں

نوح اب انجام طوفاں دیکھ کر ہیں دم بخود!
اپنے رونے کو ہنسی سمجھے تھے وہ آغاز میں

نوح ناروی

ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ

تحقیقی مقالہ

از:- مولوی نور احمد خاں ملتانی

ایران کے فتنہ و فسادات کے فرو ہونے پر جب شاہ طہماسپ صفوی
ت موروثی پر قدم رکھا تو محمد شاہ شہنشاہ ہند نے اس کو تخت نشینی
رکباد کہی۔ مگر اسے اس فتنہ کے استیصال پر تہنیت بھیجنے کا
ہنگ آیا۔ بلکہ حسین علی خاں والی قندھار سے جو سلطنت ایران کا
تھا دوستانہ خط و کتابت شروع کر دی جس پر شاہ ایران نے ایک امیر
الت کے طور پر ہندوستان بھیجا اور ان ایام کے حادثات کا ذکر کرتے
ے اخیر میں لکھا کہ۔

کہ بخت افاغنہ اپنی سزا کو پہنچ کر چوہوں کی طرح ادھر
ادھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اگر ہندوستان کا رخ کریں
تو انہیں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔

گر محمد شاہ نے مہمل سا جواب دے کر ایلچی کو لوٹا دیا اور جب عباس
تخت ایران پر بیٹھا تو اس نے پھر ایک امیر کو سفیر بنا کر بھیجا۔ اور یہی
رش کی۔ اس سے بھی وہی سلوک ہوا۔ جب نادر شاہ مسند نشین ہوا
ر لباشی معتبر برہان الملک محمد امین خاں کی وساطت سے دربار دہلی
بھیجے۔ ایک مکتوب برہان الملک کے نام تھا اور دوسرا محمد شاہ کے نام
یہ ہوا کہ سفرا کو رستہ میں چوروں نے لوٹ لیا اور سیکڑوں دقتوں
ہزاروں خطروں سے دہلی پہنچے اور مکاتیب نادر شاہی پیش کر کے
فض سفارت سے عہدہ برآ ہوئے لیکن چونکہ مراجعت کی طاقت نہ
تھے اس لئے وہیں پڑے رہے۔ جب نادر شاہ افغانوں کو ایران سے
تا ہوا قندھار تک آیا۔ کچھ افغان تو قلعہ بند ہو بیٹھے اور کچھ نکل کر کابل
ہندوستان میں پھیل گئے۔ نادر شاہ نے قندھار کا محاصرہ کر لیا اور محمد خاں
کو جو امرائے صفویہ میں سے تھا۔ دوبارہ سفیر بنا کر دہلی کو روانہ
سابقہ سلوک کی شکایت تحریر کی۔ جب محمد خاں نے خط پیش کیا۔
کر کے جواب بھیجنے میں ساکت ہو گئے اور جتنا اس نے رخصت
ر کیا فائدہ نہ ہوا۔ در اصل تردد یہ تھا کہ (قصص ہند) کی خطا و
کتابت کا اس سے جواب بھی نہیں گیا۔ اب جواب کیا لکھیں۔
تو اس میں نادر شاہ کو لکھیں کیونکہ وہ اصل میں نادر قلی ہے

کوئی خاندانی پادشاہ نہیں ہے (سیر المتاخرین) اور محمد خاں ایلچی کے ٹھہرانے
کا مقصد یہ تھا کہ دیکھ لیا جائے۔ شاید حسین خاں افغان و اہل قندھار
نادر شاہ پر فتح پالیں اور جواب لکھنے کی حاجت ہی نہ رہے۔ جب قندھار
کے محاصرے نے طول کھینچا تو نادر شاہ نے چند سوار دہلی بھیجے کہ محمد خاں
کے توقف کی وجہ دریافت کرائیں مگر پھر بھی نہ جواب ملا نہ رخصت ملی،
ادھر ایک سال کے محاصرہ کے بعد نادر شاہ نے قندھار کو فتح کر لیا اور حسین
خاں کو مازندران میں قید کر دیا۔ حسین خاں کے شکست خوردہ رفقا بھاگ
کر ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گئے اور یہاں انہیں فوج میں ملازم
رکھ لیا گیا۔

اس وقت سلطنت ہند کے سیاہ و سفید کا مالک صمصام الدولہ بنا
ہوا تھا۔ جب اس کا اقتدار بڑھ گیا تو اس کی طبیعت میں اعوجاج سا
پیدا ہو گیا۔ ہر کام میں جو کچھ سوچتا اور اپنے خیال میں اس کا جو علاج تجویز
کرتا اس کام کی خرابی کا باعث بنتا اور نقصانات ظہور میں آتے۔

ناصر خاں صوبیدار کابل مرد صالح مگر غافل انسان تھا اور اس کا
اکثر وقت شکار میں صرف ہوتا تھا اور جب بھی شکار سے مراجعت کرتا
عبادت اور تلاوت میں مشغول ہو جاتا اور تنخواہ نقدی صوبہ کابل جو حضور
سے جاتی تھی صمصام الدولہ امیر الامرا نے بے وجہ جان کر موقوف
کر دی تھی۔ راستے اور دروں کی حفاظت سے نہ صوبیدار نے سروکار
رکھا نہ امیر الامرا کو اس کا خیال آیا۔ اس سبب سے محافظ رستہ میں نہ
رہے اور بنا بر اشتہار سستی سلطنت نوکروں اور عمال سرکار کے دلوں پر
بازپرس کا خیال اٹھ گیا۔ کسی کو کسی سے خوف و ہراس اور غرض و التماس
نہ رہا۔ اس لئے جہاں جو کوئی جو کچھ چاہتا تھا کرتا تھا اور ہر راہ سے
جو آتا اور جاتا اس کی نہ بادشاہ اور امیر الامرا کو خبر ہوتی نہ وہ دریافت

---

[1] در ہر کار رہر آنچہ می اندیشید۔ و صلاح کار بزعم غلط کار خود
می فہمید۔ باعث فساد آں کار گردیدہ مفاسد کلی بحال آں
بظہور می رسید۔

کرتے کہ کیوں خبر نہیں پہنچی ؟ (مولف)

افغان پہاڑی چوہوں کی طرح کوہستان کابل میں دوڑے دوڑے پھرتے تھے لیکن سلطنت ہند کو نہ اپنی بدنظمی کا خیال آتا نہ ایرانی حکومت کے جذبات کی کچھ پاس خاطر کی جاتی۔ مکاتیب کا جو حشر ہو رہا تھا وہ ظاہر تھا۔ اگر نادر شاہ ان کا قلع قمع کئے بغیر لوٹ جاتا تو وہ موقع پاکر پھر چڑھ آتے جیسا کہ پہلے کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ (سیر المتاخرین)

الغرض نادر شاہ کابل کے قریب پہنچا اور کوتوال قلعہ کو پیغام دیا کہ "ما را بہ مملکت محمد شاہ کارے نیست۔ اما ایں حدود چوں معدن افغان ست۔ و معاددے گریختگان نیز با ایشاں پیوستہ اند غرض استیصال ایں قوم است۔ ہراس بخویش راہ ندادہ در مراسم مہمانداری کوشند"۔ اور خود کابل کے قریب جا کر خیمہ زن ہوا۔

(قصص ہند) کابل کے حاکم نے نہایت اضطراب سے عرضی لکھی۔ چنانچہ وقت خریطہ پہنچا بادشاہ مہتاب باغ میں "عالم آب" کا تماشہ دیکھ رہے تھے اور سامنے ناچ ہو رہا تھا۔ چونکہ اس وقت نہایت سرور کا عالم تھا ی کو لیکر گوشہ اس کا شراب میں ڈبویا اور یہ مصرع پڑھا۔ ع

ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

(مولف) ادھر "بے معنی" دفتر "مئے ناب" میں "غرق" ہوا ادھر نادر شاہ ایک ہی حملے سے کابل کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ (سیر المتاخرین) پھر ں آدمی محمد خاں کے توقف کی وجہ دریافت کرنے کے لئے دہلی روانہ ئے جو جلال آباد کے قریب مارے گئے اور ایک بچ کر واپس کابل پہنچا اور پنی حالی کیا۔ نادر شاہ اپنے آدمیوں کے قتل کی خبر سن کر بے قرار ہو گیا۔ اور لال آباد کا رخ کیا۔ اور قتل عام کا حکم دیا۔ کمال یہ ہے کہ ان دس آدمیوں ے قاتلوں کے لئے محمد شاہ کے دربار سے خلعتیں بھی معین ہو چکی تھیں۔

قصص ہند) اور دربار کا یہ حال تھا کہ عام خبروں کے علاوہ کابل لاہور وغیرہ کے حاکموں کی عرضیاں بھی آتی تھیں اور کوئی خبر نہ لیتا تھا۔ بلکہ جب لوگ نادر شاہ کے آنے کی خبریں دیتے تو امرائے دربار سن کر خفا ہوتے اور کہتے کہ لوگوں کے گھر بہت بلند ہیں۔ دور سے نادر شاہ کا لشکر دکھائی دیتا ہے۔

(سیر المتاخرین) یہاں سے نادر پشاور کا عازم ہوا رستہ میں ناصر خاں حاکم کابل خیبر کی وادی میں افاغنہ کی فوج سے راہ روکے بیٹھا تھا نادر شاہ نے پیغام بھیجا کہ "من در فلاں روز خواہم رسید۔ بہتر آنکہ از سر راہ برخیزی"۔ مگر وہ نہ ہٹے۔ نادری لشکر حرکت میں آیا۔ ناصر خاں کی فوج وادی میں تہ تیغ ہوئی اور خود زندہ قزلباشوں کے ہاتھ لگا۔ نادر شاہ نے اعزاز سے خلعت دی اور پشاور کے راستے لاہور روانہ ہوا۔

اب تک امرائے دہلی کو یہ خیال تک نہ تھا کہ نادر شاہ اس طرح ہندوستان پر چڑھ آئے گا مگر جب متواتر وحشتناک خبریں پہنچیں تو محمد شاہ نے آصف جاہ کو جو گرگ باراں دیدہ و سرد و گرم روزگار چشیدہ اور تجربہ کار سپہ سالار تھا دکن سے طلب کیا تا کہ اگر کوئی سانحہ پیش آئے تو اس کی صلاح سے اس کا تدارک کیا جا سکے۔ نادر شاہ نے اٹک کو کشتی سے عبور کرنا تھا کہ مملکت پنجاب میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی خاص کر شہر لاہور میں قیامت برپا ہو گئی۔ ہر شخص لوٹ مار کرنے پر آمادہ ہو گیا اور ہزاروں قطاع الطریق۔ رہزن اور قزاق پیدا ہو گئے جس سے امن عنقا ہو گیا۔

نادر شاہ جب راوی کے قریب پہنچا تو زکریا خاں اپنی جمعیت سے راضی برضا ہو کر مقابلے کو نکلا۔ نادر شاہ نے گھوڑا راوی میں ڈال دیا اور لشکر سمیت عبور کر گیا۔ قزلباش سواروں کو زکریا خاں کے لشکر کے مقابل بھیجا اور بزور بازو قلعہ فتح کر کے اندر داخل ہوا۔ زکریا خاں نے عریضہ بھیج کر امان کی التماس کی۔ نادر شاہ کے حضور میں آیا اور عزت خلعت سے سرفراز ہوا یہاں سے نادر شاہ از سر نو تیار ہو کر شاہجہان آباد کو روانہ ہوا۔

محمد شاہ نے نادر شاہ کی آمد سنی تو شاہجہان آباد سے نکل کر کرنال کو روانہ ہوا اور نہر علی مرداں خاں کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ لشکر کے گرد توپخانہ قائم کر کے ایک دوسرے کے ساتھ زنجیرہ بند کیا۔ اور خود عافیت کے اس قلعہ میں محصور ہو بیٹھا۔ نادر شاہ نے دو تین مرتبہ لاہور سے لشکر شاہی کے پہنچنے تک محمد خاں ایلچی کے رخصت کرنے کے لئے پیغام بھیجے۔ ایلچی ہمراہ تھا اور اسے رخصت نہیں دیتے تھے۔ اس وقت معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس کے ٹھہرانے میں کیا مصلحت تھی۔ صمصام الدولہ نے راجہ جے سنگھ سوائی وغیرہ راجپوت سرداروں کو جن کی قوت اور شجاعت پر حکومت کو بھروسہ تھا طلب کیا مگر وہ آج کل کا بہانہ کر کے ٹال گئے۔

لہ ہمیں محمد شاہ کی سلطنت سے سروکار نہیں لیکن چونکہ یہ حدود افغانوں کی جائے پناہ بنی ہوئی ہے اور اب چند افغان بھاگ کر ان سے آملے ہیں اس لئے ہمارا مقصد صرف اس قوم کا استیصال کرنا ہے۔ کسی قسم کا خوف و خطر دل میں نہ لائیں اور مراسم مہمانداری میں کوشش کریں۔

لہ میں فلاں وقت پہنچ جاؤں گا بہتر ہے کہ رستہ چھوڑ کر پیچھے ہو جاؤ۔

بھی اپنی جگہ سے ... بادشاہ کو سلطنت مغلیہ کے مدبر اور شجاع امیر
الملک کا انتظار تھا۔ جب اس کی فوج کے علم نظر آئے تو بادشاہ
یار اعظم صمصام الدولہ کو استقبال کے لئے بھیجا۔ منگل ۱۵ ذیقعدہ
یہ کو خاندوراں لشکر سے آدھے کوس تک استقبال کے لئے گیا اور
الملک کو اعزاز و اکرام سے بادشاہ کی خدمت میں لے آیا۔ حکم ہوا کہ
امرا کے لشکر کے قریب خیمہ زن ہو۔ برہان الملک جائے ماموره پر
اپنے خیمہ و بنگاہ کا انتظار کرنے لگا۔ (قصص ہند)

برہان الملک کی فوج توپ خانے کی پشت گری سے ان دنوں بہت
بھی۔ اتفاقاً جس دن وہ آکر لشکر میں شامل ہوا نادر شاہ بھی قریب
یا تھا اور یہاں کسی کو خبر بھی نہ تھی۔ برہان الملک نے دربار کی بے
ئی کی شکایتیں کر کے کوچ کی تیاری شروع کر دی۔ اسی دن گھسیارے
ہی کچھ بدحواس دوڑے آئے کہ ہم جنگل میں گھاس کھودنے گئے تھے،
ی قراولوں[1] نے کچھ آدمیوں کو گرفتار کر لیا اور ہم بھاگ کر یہاں پہنچے
۔ امرا نے جمع ہو کر پھر گفتگو شروع کی۔ اتنے میں خبر آئی کہ چند قزلباش
بی برہان الملک کے ڈیروں پر ہاتھ صاف کر گئے۔ برہان الملک لوکا
کر اٹھ کھڑا ہوا کہ صاحب[2] اب کون سی بات باقی ہے جس کا انتظار
ائے اسی وقت فوج لے کر لڑنے کو روانہ ہوا۔ مگر خاندوراں نے
شاہ کو اطلاع دی۔ آصف جاہ بولا کہ تھوڑا[3] دن باقی ہے۔ برہان الملک
رکنا چاہئے کیونکہ لشکر ان کا منزلیں طے کرتا ہوا آیا ہے۔ اس وقت
وقع جرأت کرنا مناسب نہیں۔ کل توپ خانہ سامنے رکھ کر اور سب
رکو ترتیب دے کر بندوبست سے لڑیں تو مناسب ہے۔ بادشاہ نے
بات خاندوراں کو کہلا بھیجی۔ خاندوراں سنتے ہی بگڑ کر بولا۔ بڑے
وس کی بات ہے۔ ایسا جوانمرد سردار آقا کے نمک پر نثار ہونے جائے

اور ہم پہلو میں بیٹھے اس کے مرنے کا تماشا دیکھیں۔ چنانچہ بادشاہ کو کہلا
بھیجا کہ برہان الملک[1] اب مقابلے پر جا کھڑے ہوں گے اس لئے واپس
بلانا قرین مصلحت نہیں۔ ساتھ ہی خود ہاتھی پر بیٹھ کر مقابلے کے لئے
روانہ ہوا اور آدھ کوس کا فاصلہ چھوڑ کر برہان الملک کے پہلو میں
فوج کو صف آرا کر دیا۔

نادر شاہ بھی سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور فوج کے تین حصے کر کے
ایک کو اپنے ساتھ رکھا اور دو کو دونوں کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ قزلباشوں
نے برابر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں عیش پروردہ فوجیں
پریشان ہو گئیں۔ بہت سے سردار مارے گئے اور خاندوراں زخمی
ہو کر میدان سے پھرے۔ یہاں شکست کی ہوا اڑتے ہی خاندوراں کے
خیمے ڈیرے لٹ کر سب کارخانوں کی خاک اڑ گئی تھی۔ اتنا بھی نہ تھا
کہ نیم جان لاشے کو سائے میں رکھیں۔ غرض ایک بے چوبہ کہیں سے
لے کر اس میں آتارا۔ اتنے میں بادشاہ کی طرف سے چند خواجہ سرا آ گئے
اور آصف جاہ وغیرہ بھی عیادت کو پہنچے۔ تھوڑی دیر میں اس بیچارے
نے ذرا آنکھ کھولی اور آہستہ سے آتنا کہا کہ خیر ہم نے تو اپنا کام کر لیا
اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ مگر اتنا کہتے ہیں کہ بادشاہ کو نادر کے
پاس اور نادر کو شہر میں نہ لے جانا۔ جس طرح سے ہو سکے اس بلا کو
یہیں سے ٹال دینا۔

ادھر برہان الملک اور اس کے چند رفیق میدان میں رہ گئے
تھے۔ وہ جوانمرد ہاتھی پر بیٹھا تیر مار رہا تھا کہ قزلباش چاروں طرف
سے گھر آئے۔ ایک جوان نیشاپوری اس کا ہموطن گھوڑا اڑا کر پہنچا
اور آواز دی۔[1] "اے محمد امین! دیوانہ شدہ بکہ جنگ می کنی و بچہ اعتماد
جنگ می کنی۔"

قراول چند سرداروں کا مجموعہ ہوتا ہے جو فوج سے آگے بڑھ کر کئی کئی
ں تک گھوڑے مارتا پھرتا ہے۔ تاکہ دشمن کی فوج اور گرد و پیش کے
لات کی خبر رہے اور موقع پا کر دست برد بھی کر جاتا ہے۔
چنیں رو داده من برائے حمایت فوج فا ساب خود می روم۔
تھوڑے از روز باقی مانده و لشکر برہان الملک از ماندگی راه نیاسوده
... و تعجیز و دیز امروز نیست۔ برہان الملک را حکم شود که عجلت را
... گذشته بجائے خود باشد و فردا به ہیئت مجموعی توپ و توپخانہ
... رو گزاشته بر دشمن باید تاخت تا باقبال بادشاہی کارے از پیش
(سیر المتاخرین ...)

[1] برہان الملک دور تر رفته چه عجب که دشمن آویخته باشد۔ چنیں فدوی جاں نثار
را بکشتن دادن و اعانت نہ نمودن بعید از مردی و مروت و خلاف قانون
دولتخواہی و مصلحت است۔ دیگراں ہر چہ خواستہ باشند بکنند من خود بکمک برہان الملک
می روم۔[2] ما خود کار خود را تمام کردیم۔ شما دانید و کار شما۔ ایں قدر میں
گویم کہ پادشاہ را بملاقات نادر شاہ و نادر شاہ را بشاہجہان آباد
نخواہید برد و بہر کیف دانید و توانید از ہمیں جا ایں بلا را بگردانید
[1] اے محمد امین! دیوانہ ہو گیا ہے۔ کس سے لڑ رہا ہے اور کس کے
بھروسے پر جنگ کر رہا ہے۔

برہان الملک نے ہاتھ روک لیا۔ قزلباش نے نیزہ زمین پر گاڑا، گھوڑے کی باگ ڈور اس سے باندھی اور جھپٹ کر سانپ پکڑ بچھونے کے اندر جا بیٹھا۔ برہان الملک ایران کے دستوروں سے واقف تھا۔ کمان ہاتھ سے رکھ دی اور اپنے آپ کو پنجۂ تقدیر کے حوالے کیا۔ قزلباش ہاتھی کو گھیر کر اپنے لشکر میں لے گئے۔ نادر شاہ نے جرم بخشی کر کے عنایت فرمائی اور چونکہ شام ہو گئی تھی فوج لے کر اپنی خیمہ گاہ کی طرف پھرا۔ برہان الملک کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھایا۔ چنانچہ اس نے مصلحت آمیز باتیں کر کے نادر شاہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ حضور ایک معقول نذرانہ لیں اور یہیں سے واپس تشریف لے جائیں۔ نادر شاہ اس بات پر راضی ہو گیا۔ برہان الملک نے ایک عریضے میں یہ سب حال اپنے بادشاہ کو لکھا اور رکھنا آصف جاہ کو لکھا کہ تم آؤ اور اس امر کا فیصلہ کر دو۔ یہاں سب دریائے حیرت میں غرق بیٹھے تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے اور حیران تھے کہ کیا کرنا چاہئے۔ یہ خبر سنتے ہی خوش ہو گئے۔ محمد شاہ نے فوراً آصف جاہ کو روانہ کیا۔ (سیر المتاخرین) آصف جاہ نے برہان الملک کی وساطت سے شرف باریابی حاصل کیا اور نہایت نیازمندی سے گزارش کی کہ دو کروڑ روپے بطور تاوان جنگ کے لے لیجئے اور یہیں سے واپس تشریف لے جائیے۔ نادر شاہ نے منظور کر لیا جس پر آصف جاہ قول و قرار کو پختہ کر کے شاداں و فرحاں محمد شاہ کی خدمت میں آیا اور اس معاملے کو اپنی کارگزاری اور خود تجویز کئے ہوئے لباس میں پیش کیا۔ اور بمقتضائے حرص و آز منصب امیر الامرائی کا طالب اور امیدوار خلعت ہوا۔ چونکہ بادشاہ سخت ہراساں ہو رہا تھا اس لئے اس کی رضا کو مقدم جان کر اسی وقت روز شنبہ ۱۹ ذیقعدہ سنہ ۱۱۵۱ھ کو مرتبہ امیر الامرائی اور خلعت بیش بہا سے معزز و ممتاز فرمایا لیکن غریب برہان الملک کی کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔

(قصص ہند) دوسرے دن محمد شاہ کی ملاقات کی ٹھہری۔ بادشاہ ادھر سے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ادھر سے نادر نے اپنے بیٹے کو استقبال کے لئے بھیجا۔ وہ رستے میں آ کر ملا۔ بادشاہ نے تخت رواں کو زمین پر رکھوا کر ملاقات کی۔ اس نے فرزندانہ طور سے معانقہ کیا اور ہم رکاب ہو کر نادر شاہ کے پاس لے گیا۔ نادر شاہ بھی لب فرش تک استقبال کو آیا۔ اپنی مسند پر نہایت تعظیم سے بٹھایا۔ اس کے بعد برادرانہ و دردمندانہ باتیں شروع کیں۔ چائے آئی۔ اس کا دور چلنے لگا۔

نادر شاہ اس وقت برک کی قبا اس پر قراقلی یعنی سیاہ پوست بڑے کا خفتان[1] اس پر ایک بھرکی چغہ پہنے بیٹھا تھا۔ سر پر کلاہ پاپاخ تھی۔ ادھر محمد شاہ شبنم کا کرتہ ڈھاکے کی ململ کا جامہ پہنے تھے اور سر پر جو دستار رکھی اس سے بھی گھبراتے تھے۔ برابر پنکھا ہوتا تھا۔ نادر شاہ سے کہا کہ رخت شما بسیار گرم است برتن گرانی نمی کند؟[2] نادر شاہ نے آہ سرد بھر کر کہا کہ برادر جان من ہمیں رخت گرم است کہ ما را از ایران تا بہ اینجا رسید۔ لطافت لباس شما است کہ نگذاشت از دہلی تا بہ اینجا حرکت کنید۔[3]

غرض بادشاہ نے ہنسی خوشی یہاں سے مراجعت کی۔ برہان الملک وہاں امیر الامرائی کے منصب کو اپنا حق سمجھے بیٹھا تھا۔ اس نے جب آصف جاہ کے خلعت و خطاب کا حال سنا تو بہت بگڑا اور نادر شاہ کو کہا کہ حضور نے کیا غضب کیا جو ہندوستان کے قارونی خزانے چھوڑ کر دو کروڑ روپے پر رضامند ہو گئے۔ یہ رقم تو فقط غلام ادا کر سکتا ہے اور بادشاہی خزانے اور امرا اور مہاجنوں کے گھرانوں کے کیا ٹھکانے ہیں۔ البتہ شہر یہاں سے چالیس کوس ہے حضور وہاں تک تکلیف فرمائیں۔ نادر شاہ خوش ہو گیا اور اسی وقت آصف جاہ کو بلا بھیجا۔ وہ خوشی خوشی پھر حاضر ہوا۔ اسے حکم ملا کہ تم ٹھہرو اور اپنے بادشاہ کو بلا لو۔ آصف جاہ نے کہا کہ عہد نامے میں یہ نہیں ٹھہرا تھا۔ نادر نے کہا کہ ملک و سلطنت اور بادشاہ کی عزت و آبرو سے ہمیں کچھ تعرض نہیں۔ ہم فقط ایک ملاقات اور کرنا چاہتے ہیں۔ آصف جاہ نے ناچار بادشاہ کو لکھا۔ بہت سے امرا اور نوکر چاکر ادھر سے ساتھ چلنے کو تیار ہوئے مگر وہ فقط عمدۃ الملک وغیرہ چند امیروں اور چند خواجہ سراؤں کو لے کر گئے۔ نادر شاہ نے عزت و احترام کے ساتھ الگ خیمے میں اتروایا اور کہا کہ بھائی محمد شاہ! سلطنت اور دربار کا سامان مع حرم سرا کے منگوا لو اور خاطر جمع سے یہیں رہو۔ لشکر میں بھی حکم بھیج دیا کہ جو چاہے ہمارے لشکر میں چلا آئے اور جو چاہے دلی چلا جائے۔ بعد اس کے اپنا فرمان اور بادشاہ کا شقہ اپنے ایک سردار کو دے کر شہر روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی قلعدار سے کنجیاں لے لیں اور سب کارخانوں پر قبضہ کر لیا۔ لشکر کے لوگ پریشان ہو کر بھاگے۔ بہتوں کو دیہاتیوں نے

---

[1] یہ لمبی ٹوپی بھی پوست برہ یعنی سیاہ دنبے کی کھال کی ہوتی ہے۔
[2] آپ کا لباس بہت گرم ہے۔ کیا آپ کو گراں نہیں گزرتا۔
[3] پیارے بھائی! یہی گرم پوشاک ہے کہ مجھے ایران سے یہاں تک لے آئی اور آپ کے لباس کی لطافت ہے کہ آپ کو دہلی سے یہاں تک حرکت کرنے کی اجازت نہیں دی۔

وٹ بکر باندھ دیا جہاں سے بچے وہ راستے کے گوجروں نے مارے جتنے بچے تو ننگے بھوکے گھر پہنچے۔ دوسرے دن نادر شاہ بھی شاہ کو لیکر چلے اور دلی میں داخل ہوئے۔ (مولف) چونکہ شہر میں سخت افراتفری ہو رہی تھی اس لئے فتحمند سلطان نے اپنی فوج ظفر موج کے ایک دستے کو شہر کی حفاظت کے لئے بھیجا اور حکم دیا کہ "ہر کس از لشکر سلطانی اگر بالنسبہ باہالیٔ ملک حرکتے خلاف کند۔ فی الفور گوش او دماغش برید او را مثلہ کنند۔"

اگر لشکر سلطانی سے کوئی شخص شہر والوں سے کوئی جھگڑا اور فساد کرے فی الفور کان اور کھوپڑی اس کی کاٹ کر مثلہ کریں۔ چنانچہ تین چار دن نہایت اطمینان سے گزرے پانچویں دن عید قربان آئی۔ مسجد میں خطبہ نادر شاہ کے نام سے پڑھا گیا اور چونکہ دہرا دربار تھا اس لئے بڑی دھوم کا تزک واحتشام ہوا۔ (قصص ہند) مگر قربانی اس عید کی عجیب قسم کی ہوئی۔ یعنی عصر کے وقت تک تمام شہر میں امن وامان سے عیش وعشرت ہو رہی تھی جو دفعتاً بھنگڑ خانے میں بیٹھے بیٹھے ایک بھنگڑ بولا واہ محمد شاہ رنگیلے! آخر بادشاہی پیچ کھیل ہی گیا۔ دوسرا بولا۔ کیا؟ اس نے کہا حرم سرا میں موقع تاک کر ایک قلماقنی سے مغلے کو مروا دیا، ہوائی دفعتہً اڑی اور ہوا کی طرح تمام شہر میں پھیل گئی۔ غضب یہ ہوا نادری سپاہی جو ایک ایک دو دو گلی کوچوں میں بے تکلف پھرتے تھے انھیں لوگوں نے بے وارث سمجھ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ رات نادر کو خبر پہنچی اس نے فوج کو حکم دیا کہ "اپنی جگہ پر قائم رہو اگر تم پر چڑھ آئیں تو جواب دو ورنہ چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

ساتھ ہی چند معتبر امرا بھیجے تاکہ لوگوں کو سمجھائیں سکے (تاریخ ظلم صاحب) "خبر بے پا وخطر در دست است۔" یعنی خبر بے بنیاد اور خطرہ سامنے ہے۔ بجائے اس کے کہ فتنہ فرو ہوتا ان امرا کو بھی انھوں نے وحشیانہ طور پر قتل کر دیا۔ ستم یہ ہوا کہ امرائے دہلی جن ایرانی سپاہیوں کو اپنے محلات کی حفاظت کے لئے لے گئے تھے انھیں بھی بلوائیوں کے سپرد کر دیا جو نہایت بیدردی سے بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیئے گئے۔

اگرچہ نادر کو بل چل کی خبر پہنچ رہی تھی لیکن اس نے بڑے ضبط وتحمل کے ساتھ وہ رات محل میں بسر کی اور صبح کو طلوع آفتاب کے وقت سوار ہو کر شہر کو روانہ ہوا کہ (قصص ہند) شاید مجھے زندہ سلامت دیکھ کر یہ طوفان تھم جائے اور دہلی کے قتل عام کا وقت بھی نہ آئے۔ مگر شہر کے لوگوں نے اس پر بھی پتھر پھینکنے شروع کر دیئے بلکہ بندوقیں بھی ماریں۔ یہاں تک کہ ایک مصاحب کا پہلو زخمی ہوا۔ فریزر صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

"نادر باکسانیکہ در دور آں بودند۔ آں شب را در سرائے خود گذرانید و در طلوع فجر سوار شدہ در میان شہر رفت وخواست۔ تاشورش مردم را فرو نشاندنا این معنی سبب ازدیاد شورش عوام شدہ۔ سفاہت آغاز کردند"

ساتھ ہی نادر نے دیکھا کہ جابجا ایرانی غریب الوطنوں کے لاشے پڑے ہیں۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر معلوم ہونے لگی کہ کرنال کے معرکہ جنگ میں تو کل تین ولایتی مریں اور بیس آدمی زخمی ہوں اور شہر میں بے خبر صدہا سپاہی اس طرح ضائع ہو جائیں۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور قتل عام کا حکم دے کر کہہ دیا کہ جہاں تک کوئی قزلباش مرا ہوا نظر آئے ایک آدمی جیتا نہ رہے۔

یہ کہہ کر ترپولئے تک آیا اور روشن الدولہ کی مسجد میں آ کر قتل عام کی علامت ظاہر کی یعنی تلوار کھینچکر مسجد میں بیٹھ گیا۔ گلی کوچوں میں خون کے نالے بہہ گئے اور گھروں میں آگ لگ کر زمین سے آسمان تک دھواں دھار ہو گیا۔ نادر شاہ کا غصہ خدا کا قہر، بادشاہ اور امیر سب دیکھتے تھے اور دم نہ مار سکتے تھے۔ ایک بڑھا خواجہ سرا محمد شاہ کے پاس روتا ہوا آیا اور کہا کہ حضور کے باپ دادا کی رعیت سب قتل ہو گئی۔ بادشاہ بھی آبدیدہ ہوئے اور اتنا کہا کہ ؎

دیدۂ عبرت کشا قدرت حق را ببیں
شامت اعمال ما صورتِ نادر گرفت

یعنی عبرت کی آنکھیں کھول کر خدائے بے نیاز کی قدرت دیکھ کہ ہماری شامت اعمال ہی نے نادر کی صورت اختیار کر لی۔ بقول ظلم صاحب بہادر محمد شاہ اپنے دو وزیر ہمراہ لیکر نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی رعایا کی جان بخشی کے لئے سفارش کی۔ نادر نے جو شہنشاہ ہند کو شکستہ حالت میں دیکھا بیقرار ہو گیا اور کہا۔ "بادشاہ ہندوستان خاید کہ بخشش ببدر رود۔" (شہنشاہ ہندوستان کی سفارش کو کسی طرح ٹالا نہیں جا سکتا) فوراً قتل عام موقوف کرنے کا حکم دیا۔

تاریخ ظلم صاحب بہادر وفریزر صاحب معاصر نادر شاہ فارسی

لہ قصص ہند

لیکن مولوی محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ "آخر دوپہر کے قریب جب عالم میں کہرام مچ گیا تو سب نے آصف جاہ سے رجوع کی وہ تلوار گلے میں ڈالے نادر کے سامنے جاکھڑا ہوا اور رونے لگا۔ نادر شاہ کے دل میں بھی خدا نے رحم ڈالا۔ پوچھا "چہ می خواہی؟" اس نے یہ شعر پڑھا ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

یعنی اب کوئی نہیں رہا۔ جسے تو اپنی تیغ ناز سے قتل کرے۔ ہاں البتہ اگر مخلوقات کو زندہ کرکے دوبارہ قتل کرے۔ نادر نے شرما کر سر جھکا لیا تلوار میان میں کی اور کہا کہ "بریش سفیدت بخشیدیم (تیری سفید ڈاڑھی کا لحاظ کرکے معاف کیا)۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے محمد شاہ آیا ہو اور ساتھ ہی آصف جاہ بھی آپہنچا ہو۔ بہر کیف اسی وقت شہر میں ایرانی نقیب اور چاؤش امان امان کہتے ہوئے دوڑے اور پل کے پل میں امن ہو گیا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نادر شاہ کا اپنی فوج پر کس قدر ضبط تھا۔ سلطنت کے کاروبار کے ساتھ دونوں بادشاہوں کی صحبتیں پھر بدستور جاری ہو گئیں۔

ایک دن بادشاہ نے نادر کی دعوت کی۔ ایک ایک خدمت ایک ایک امیر کے سپرد ہوئی۔ کھانے کے بعد جب چائے آئی تو عمدۃ الملک نواب امیر خاں نے پیالی چائے کی بھری مگر جب دینے لگا تو سوچا کہ اگر پہلے اپنے آقا کو دوں تو ادھر نادر ہے ایسا نہ ہو کہ ابھی سر اڑا دے اور اگر نادر کو پہلے دوں تو آئندہ بھی اپنے دربار میں منہ دکھانا ہے یہاں اس کی تیزی طبع کا جوہر کام آیا یعنی محمد شاہ کے سامنے پیالی کرکے کہا کہ "شاہاں بہ شاہاں می دہند" یعنی فدوی کی لیاقت نہیں کہ عالیجاہ بادشاہ کو چائے دے آپ اپنے دست مبارک سے دیجیئے چنانچہ دونوں بادشاہ خوش ہوئے اور دونوں کے اہل دربار نے اس انداز خوشنما پر تحسین و آفرین کی۔

ایک دن نادر شاہ کو پیٹ میں گرانی معلوم ہوئی۔ محمد شاہ سے حال بیان کیا۔ اسی وقت علوی خاں حکیم آیا اور نبض دیکھ کر دواخانے کے داروغہ کو اشارہ کیا چنانچہ کشتی مرصع پر زر نگار خوان پوش پڑا ہوا آیا۔ خوان پوش اٹھایا تو ایک مرصع مرتبان میں گلقند الماس کا چمچہ برابر دھرا۔ گنتا جمنی کا نبات رتی ماشے سمیت وزن کے اندازے کے لئے ساتھ موجود تھا اور حکیم سوچتا تھا کہ کس قدر گلقند اس میں سے نکالے اور وزن کرکے کھلانے کو دے۔ نادر شاہ نے خود مرتبان اٹھا لیا اور کھول کر دیکھا۔ بعد اس کے دو انگلیاں اندر ڈال کر چار نوالوں میں مرتبان خالی کر دیا۔ چونکہ اس میں خوشبودار دوائیں بھی ملی ہوئی تھیں اچھا معلوم ہوا اور کہا کہ "حلوائے خوب است دیگر بیارید" (یعنی عمدہ حلوا ہے اور لاؤ)۔

ایک دن نادر شاہ ہوا کھانے کو سوار ہوا۔ محمد شاہ نے کہا کہ ایران میں ہاتھی نہیں ہوتا۔ آج انہیں ہاتھی پر سوار کرو۔ جب ہودج میں جا کر بیٹھا تو آگے فیلبان کو دیکھا پوچھا "ایں کیست؟" (یہ کون ہے؟) لوگوں نے کہا کہ "فیلبان است۔ ایں را می راند" (یہ مہاوت ہے جو ہاتھی کو چلاتا ہے) فیلبان سے کہا۔ "عنانش بمن بدہ" (اس کی لگام میرے حوالے کرو) اس نے عرض کہ قبلہ عالم! فیل عنان ندارد باشارہ سرپایم راہ می رود" (قبلہ عالم ہاتھی کے لگام نہیں ہوتی اشاروں سے چلتا ہے) ناک چڑھا کر بولا "بنشانید کہ فرود آئیم۔ مرکبے کہ عنانش بدست غیر باشد سواری را نشاید" یعنی بٹھا دو تاکہ ہم نیچے اتر آئیں۔ ایسی سواری جس کی لگام دوسروں کے ہاتھ میں ہو چڑھنے کے لایق نہیں۔"

محمد شاہ کے اہل نشاط میں ایک کنچنی تھی۔ نور بائی اس کا نام تھا اور ناچ گانے کے علاوہ حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ گویا منہ سے پھول جھڑتے تھے ایک دن نادر شاہ نے بھی اس کا گانا سنا۔ چنانچہ بہت محظوظ ہوئے۔ کچھ انعام دیا اور کہا کہ "نور بائی رُوئے ہند را سیاہ کن بیا کہ با ہمراہت بریم۔"

یہ سنتے ہی بائی جی کا دم بند ہو گیا اور ساری لطیفہ گوئیاں بھول گئیں۔ دل میں ڈریں کہ خوش ہو کر ساتھ لے چلا ہے اگر ذرا خفا ہوا تو خدا جانے ناک کاٹ لے آنکھ نکال لے۔ پیٹ چاک کر ڈالے۔ غرض اسی وقت یہ غزل گائی ؎

من شمع جانگدازم تو صبح دلکشائی	سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی
نزدیکت ایں چنینم دور آں چناں کہ گفتم	نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

نادر شاہ بہت خوش ہوا اس کا مطلب سمجھ کر اپنے ارادے سے در گذرا۔

(سیر المتاخرین) اس عرصہ میں نصر اللہ میرزا اپنے بیٹے کی شادی ایک شہزادی سے کی جو حضرت شاہ جہاں بادشاہ کی اولاد میں سے تھی اس کے بعد بموجب عبارت امرائے ہنود بحوالہ کاغذات دارالانشائے شاہی ریاست بھوپال مختلف ذرائع سے بتفصیل ذیل نقود و جواہر حاصل کیے۔

نقد از خزانہ سلطنت	۸ کروڑ
جواہر از جواہر خانہ شاہی	۱۵ کروڑ
آلات طلائی	[illegible]

تخت طاؤس واسباب متفرقہ از خوشبوخانہ اباورچیخانہ توپخانہ فراشخانہ وغیرہ	۱۵ کروڑ
آصف جاہ نظام الملک	۴ کروڑ
نواب المنصور خاں صفدر جنگ	۲ کروڑ
صوبہ اودھ	۲ کروڑ
صنبلی خانہ خاندوراں وظفر خاں میر آتش وقمرالدین خاں ...	۱ کروڑ
لطف اللہ خانہ داروغہ جواہر خانہ	۹ لاکھ
نواب محمد خاں بنگش	۷ ¾ لاکھ
متصدیان دفتر عماید شہر	۲ کروڑ
شیخ سعد اللہ خاں دیوان	۳ ½ لاکھ
راجہ ناگرمل دیوان خالصہ	۳ لاکھ
ستیہ رام خزانچی	۲ ½ لاکھ
سبحان رائے وکیل	۲ ¾ لاکھ
نونده رائے	۲ لاکھ ۲۰ ہزار
متفرق جواہر ونقدی	۴ لاکھ
	۵۴ کروڑ ۷۳ لاکھ دس ہزار

یعنی کل تقریباً پونے چون کروڑ روپیہ کا اثاثہ نادر شاہ کے تصرف میں آیا۔

(تاریخ ملکم صاحب) القصہ نادر شاہ کی مدت اقامت دہلی میں ۵۸ یوم تھی۔ قبل اس کے کہ وہ دہلی سے رخصت ہو۔ محمد شاہ سے خلوت میں باتیں کیں بعض مورخین کا خیال یہ ہے کہ ملک داری کے معاملات میں اسے مشورے دیئے۔ اس کے بعد امرا اور اعیان سلطنت کو طلب کر کے اطاعت اور محمد شاہ کی ہوا خواہی کی سفارش کی اور اس بارے میں بڑی تاکید کی اور اس مضمون کا فرمان اطراف وجوانب کے حکام کو ارسال کیا کہ

"من[۵] ومحمد شاہ یک روحیم در دو بدن۔ اگر خدانخواستہ
خبر طغیان شما بالنسبہ بہ پادشاہ گوش زد من شود
نام شمارا از صفحۂ خلقت محو خواہم کرد۔"

اگرچہ بالجملہ امرائے دہلی سے نادر شاہ نے اچھا سلوک کیا۔ لیکن اس حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انھیں کتنی ژرف نگاہی سے پہچانا ہوا تھا۔ ایک روز نادر شاہ نے قمرالدین خاں وزیر اعظم سے پوچھا۔

"چند[۶] زن در سرائے داری؟"

"کہا۔ "ہشت[۱] صد و پنجاہ۔"

نادر نے خدام کی طرف منہ کر کے کہا۔ "صد[۲] و پنجاہ زن دیگر از سرائے بخانہ وزیر بفرستند تا منصب یک ہزاری داشتہ باشد۔"

(از روزنامہ کادہ) محمد شاہ نے اگرچہ اپنا سارا خزانہ نادر شاہ کے سپرد کر دیا تھا لیکن ایک گرانبہا ہیرا جو کئی ولایتوں کی قیمت کے برابر تھا اس نے اپنی دستار میں چھپا رکھا تھا اور اسے نادر کی تحویل میں دینے کو تیار نہ تھا لیکن اس کی ایک کنیز نے جو اس راز سے واقف تھی نادر شاہ کو اس امر سے آگاہ کر دیا۔ چنانچہ آخری بار جب نادر شاہ نے امرائے ہند کو طلب کر کے بڑی مجلس آراستہ کی یگانگی اور رابطہ کے اظہار کے لئے کہا کہ جی چاہتا ہے کہ دستار بدل بھائی بن جائیں۔ اس پر فوراً اپنی کلاہ محمد شاہ کے سر پر اور اس کی دستار جس میں کوہ نور پوشیدہ تھا اپنے سر پر رکھ لی۔

بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ محمد شاہ کی جان پر بن گئی مگر پاس وضع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور کمال صبر وضبط سے اس صدمہ جانکاہ کو پی گیا۔ نادر شاہ کو اس کے استقلال اور سکون سے وہم گزرا کہ شاید الماس مذکور دستار میں نہیں ہے۔ لیکن جونہی خلوت میں دستار کو کھولا اور نظر اس الماس پر پڑی تو حیرت سے چلا اٹھا۔ "کوہ نور۔" اسی روز سے اس ہیرے کا نام کوہ نور پڑ گیا۔

الغرض ۷ صفر ۱۱۵۲ھ کو نادر شاہ دہلی سے طبل مراجعت بجاتے ہوئے رخصت ہوا اور ڈیرہ جات کابل اور پنجاب کے ان علاقوں کو جن کا روپیہ کابل کی فتح میں لگا ہوا تھا ہندوستان سے نکال کر اپنی سلطنت میں داخل کیا۔

---

[۱] آٹھ سو پچاس

[۲] ایک سو پچاس عورتیں وزیر کے محل میں اور بھیجی جائیں تاکہ انھیں یک ہزاری منصب حاصل ہو جائے۔

[۵] میں اور محمد شاہ ایک جان دو قالب ہیں۔ اگر بادشاہ کے خلاف تمہاری سرکشی کی خبر پہنچی تو تمہارا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دوں گا۔

[۶] آپ کے محل میں کتنی عورتیں ہیں؟

[illegible]

شاہجہاں کا اضطراب

ایک طویل رزمیہ نظم کے چند بند ہیں نظم کا موضوع وہ جنگ ہے جو دارا اور اس کے بھائیوں میں ہوئی تھی
یہ وہ مقام ہے جہاں راجہ جسونت سنگھ شاہجہاں سے رخصت ہو کر اورنگ زیب سے مقابلہ کیلئے جا رہا ہے

جسونت سا دلیر سپہدار و قلعہ گیر
جرأت میں بے مثال شجاعت میں بے نظیر
لیکر ادھر سے ساتھ چلا لشکر خطیر
آراستہ بہ تیغ و تفنگ و کمان و تیر
قصدِ وغا بہ دشمنِ دارا کئے ہوئے
اک فرضِ ناگوار گوارا کئے ہوئے

فرمایا تھا یہ شاہ نے رخصت کے وقت بھی
خود میرے دل کے ٹکڑوں نے کی ہے یہ سرکشی
صورت مصالحت کی نکل آئے گر کوئی
طے کرنا سارے قضیوں کو با صلح و آشتی
کہنا کہ شاہ بابا ہے بیمار و ناتواں
لیکن ابھی ہے اپنی رعیت کا پاسباں"

یہ بھی کہا تھا "ان کو یہ دینا مرا پیام
آہنگِ جنگ کس سے ہے کیوں ہے یہ اہتمام
آراستہ صفوف ہیں تیغیں ہیں بے نیام
واجب تھا تو ہے باپ کا کچھ تم کو احترام
کہنا یہ کہہ رہا تھا ستم دیدہ باغباں
تم جس کے پھول ہو نہ اجاڑو وہ گلستاں"

یہ بھی کہا تھا "اُن سے یہ کہنا بہ احتیاط
واضح ہے سرکشی سے تدبّر کا انحطاط
بھائی ہو چاہیئے تھا کہ باہم ہو اختلاط
ہوتا مفید بہرِ حکومت یہ ارتباط
سایہ میں جس کے تم نے گزارے ہیں ماہ و سال
خود اپنے ہاتھوں کاٹ رہے ہو وہی نہال"

یہ بھی کہا تھا "میرے عزیزانِ نامدار
کرتے ہو شاہ بابا کو کیوں زندہ در مزار
کس دن کے واسطے ہے یہ شورش یہ گیر و دار
کیا ہو گا تم بھی جاؤ گے جب پیشِ کردگار
بدلہ وہاں ہمارے ستانے کا پاؤ گے
گردن پہ خونِ خلقِ خدا لے کے جاؤ گے!

یہ بھی کہا تھا "تم ہو مرے پارہ ہائے دل
مجھ ناتواں کو تم نے کیا اور مضمحل
باہم معاندت کا مجھے غم ہے مستقل
یہ زخم مرتے مرتے بھی ہونگے نہ مندمل
مرحوم ماں کی روح کو تڑپا رہے ہو تم
بھائی ہو ایک گود کے پالے ہوئے ہو تم"

۔ا۔ اللہ افسر

الپتگین کی داستان معاشقہ

شجاعت آفریں رومان

از :- جناب رحمت علی صابر [illegible]

سنہ ۱۳۸۵ء کا آغاز تھا ---!

ایک صیقل گر کے جھونپڑے سے سائبان میں ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی سامنے حد نگاہ تک پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے سلسلے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اس کی عمر بمشکل سترہ اٹھارہ برس ہوگی مگر اپنی خوبصورتی اور دلکش خدوخال کے اعتبار سے وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی ایک شاہزادی سے کسی طرح کم معلوم نہ ہوتی تھی۔ اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، پیوستہ ابرو، فراخ پیشانی، بیضوی چہرہ، بھونرے کی طرح سیاہ بال جو شانوں پر ایک حسین انداز میں بکھرے ہوئے تھے اس کے گندم گوں رنگ پر عجب بہار دکھا رہے تھے۔ اس نے اپنی صندلیں کلائیوں میں سیاہ رنگ کی تین تین چوڑیاں پہن رکھی تھیں اور کانوں میں نیلے کانچ کے آویزے بڑے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی نیلے رنگ کی چست چولی اور پھولدار لہنگا دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ موسم بہار کی کوئی رنگین تیتری ہے جو صحن چمن کی آوارہ خرامی سے گھبرا کر سکون آفریں تنہائی میں پناہ گزیں ہے۔ وہ ایک غریب صیقل گر کی اکلوتی لڑکی تھی جس کی ماں کا بچپن ہی میں انتقال ہو چکا تھا۔ اور بوڑھے باپ نے حتی المقدور بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش کی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب امیر تیمور کی خون آشام فوجیں مشرقی ایشیا میں قتل و غارت کا بازار گرم کرتی ہوئی مملکت روم کو تاراج کرنے کی نیت سے آگے بڑھ رہی تھیں۔

طیرزہ اس حسین و جمیل دوشیزہ کا نام تھا۔ وہ متواتر کئی دن سے فوجی دستوں کو پہاڑی وادی میں سے گھوڑوں پر سوار گزرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ سڑک جس پر یہ سوار فوج گزرتی تھی۔ اس کے جھونپڑے سے مکان سے نصف میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ اس کا باپ کاروبار جنگ کی وجہ سے بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ صیقل کے پہیے کو گھمایا کرتی تھی اور اس کا بوڑھا باپ سپاہیوں کی تلواریں، خنجر اور نیزے تیز کیا کرتا تھا۔ اس کی دکان پر ہمیشہ ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ طیرزہ کو فوجی [illegible] سے [illegible] تھی اور محبت بھی [illegible] وہ پہیہ گھماتے [illegible] انتہائی معصومیت کے ساتھ ان سے جنگ کے واقعات دریافت کیا کرتی تھی اور جنگجو سپاہی حتی الامکان نہایت دلنشین پیرایے میں میدان جنگ کے واقعات سناتے۔ اس کے باپ نے شہسواری کی اسے بڑی اچھی تعلیم دی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ فوجی سپاہیوں کی ذات سے خاص دلچسپی لیتی تھی۔

ایک بوڑھی "جپسی" عورت اس نواح میں دست شناسی کے لئے مشہور تھی۔ وہ طیرزہ کے گھر میں بھی کبھی کبھی آتی تھی اور طیرزہ اسے خالہ اماں کے نام سے پکارتی تھی۔ ایک دن جو وہ آئی تو طیرزہ نے انتہائی شوق اور معصومیت کے ساتھ کہا "خالہ اماں! آپ روز ہزاروں کے ہاتھ دیکھتی ہیں۔ ایک دن میرا بھی تو ہاتھ دیکھ دو۔"

بڑھیا نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے نرم و نازک ہاتھ کو اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں لیکر دیکھنے لگی۔ کتنے ہی دیر تک وہ اس کے گداز ہاتھ کی لکیروں کا مطالعہ کرتی رہی جن پر صیقل کا پہیہ گھمانے کی وجہ سے جابجا گھٹے پڑ گئے تھے۔ آخر بولی "تیرا مستقبل بڑا شاندار ہے۔ زندگی بڑے عیش و عشرت سے گزرے گی مگر ابتدا میں ناقابل بیان مشکلوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔۔۔۔۔ اور ہاں ایک شہسوار سے ہوشیار رہنا۔ اس کی ملاقات تمہارے لئے رنج و محن کا باعث ہوگی۔"

لڑکی یہ عجیب و غریب پیشینگوئی سن کر گھبرا سی گئی۔

بڑھیا پھر بولی "میری بچی! تمہیں عالم شباب میں عشق و محبت کی دشواریوں اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ تمہاری پرسکون زندگی کو تاراج کرنے والا ایک حسین و جمیل نوجوان ہوگا۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور سر کے بال گھونگھریالے ہونگے۔ وہ عالی مرتبہ اور خوشحال گھرانے کا چشم و چراغ ہوگا۔ اس کے سینے میں محبت بھرا دل ہوگا۔ وہ بہادر سپاہی اور ایک بہت بڑی ریاست کا مالک ہوگا۔ اور۔۔۔۔۔ یہ کیا؟" وہ ذہنی کی لکیر سے ملتی ہوئی ایک عمودی لکیر کو دیکھ کر کانپتے ہوئے بولی "اس شہسوار سے بہت ہوشیار رہنا میری بچی!" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

نوجوان دوشیزہ جو محبت کے خوابوں میں کھو گئی تھی یکایک اس شہسوار کا دوبارہ ذکر سن کر چونک گئی۔ [illegible] وہ شہسوار اور وہ سیاہ چشم نوجوان ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں؟"

بڑھیا نے کہا: "یہ میں پھر کسی دن بتاؤنگی۔"
مگر اسے دوبارہ بتانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

بڑھیا چلی گئی تو حسین و جمیل صیقل گرد دوشیزہ اپنے سائبان کے پائے کا سہارا لیکر کھڑی ہو گئی اور متجسسانہ نظروں سے سامنے کی وادی میں سے گزرتی ہوئی سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ صبح کے گئے ہوئے فوجی دستے واپس آ رہے تھے۔ کچھ سوچ کر وہ نیچے اُتری اور بے تحاشہ سڑک کی طرف بھاگی۔ فوجی دستے کے آگے آگے ایک افسر اپنے چنکبرے گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس نے اس حسین تیتری کو دیکھا تو دستے کی رہنمائی چھوڑ کر اس نے اپنے گھوڑے کی باگ اس کی طرف موڑی۔ طیرزہ کا دل بڑے زور سے دھڑک اُٹھا اور بڑھیا کی پیشینگوئی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ "سیاہ آنکھوں والے شہسوار سے ہوشیار رہنا" اور وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ مردانہ حسن کا ایک بےمثل نمونہ۔ بھرے بھرے بازو۔ فراخ سینہ۔ چہرے پر ایک عجیب جلال برس رہا تھا۔

وہ اب بالکل اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اور گھوڑے نے انتہائی ملائمت کے ساتھ اپنا مُنہ لڑکی کی طرف بڑھایا۔ تمام گھوڑے طیرزہ سے محبت کرتے تھے۔ طیرزہ نے محبت سے اس کے مُنہ پر ہاتھ پھیرا۔ اور اوڑھنی سے اس کی آنکھوں پر جمی ہوئی گرد کو صاف کرنے لگی۔ پھر یکایک اس نے گھوڑے کے مُنہ سے اپنے شاداب رخسار ملا دیئے۔ افسر جو ایک محویت کے عالم میں اس حسین و جمیل دوشیزہ کو دیکھ رہا تھا اپنے گھوڑے سے اس طرح اس کا پیار دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا "میری مہ جبیں حسینہ! تم اس ویرانے میں کہاں رہتی ہو؟"

طیرزہ کا گندم گوں چہرہ اپنی تعریف سن کر دمک اُٹھا۔ اس نے شرمائی ہوئی نگاہوں سے افسر کی طرف دیکھا۔ وہ معصومیت کی ساحرانہ قوتوں سے کام لے رہی تھی۔ افسر ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ "میری پیاری! تم بہت ہی حسین ہو۔" وہ دوبارہ بولا۔ "تم گھوڑوں کو بہت چاہتی ہو۔" بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

"مجھے ان سے محبت ہے۔" اس نے اسی سادگی سے جواب دیا۔

"تو تمہیں ان کے سواروں سے بھی محبت کرنا چاہئیے۔" وہ لہجہ استدلال میں بولا "اگر تم نے میرے گھوڑے کے مُنہ کو چوما ہے تو اس شرف سے مجھے کیوں محروم رکھتی ہو؟"

طیرزہ نے تیز نظروں سے سوار کی طرف مُنہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ مرد میدان اس کی غضبناک نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور لہجہ معذرت میں بولا۔ "معاف کرنا ننھی خاتون! میرے مُنہ سے چند ایسے الفاظ نکل گئے جو ہرگز مجھے نہ کہنے چاہئیے تھے۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کی باگ موڑی اور مزید کچھ کہے بغیر رخصت ہو گیا۔ طیرزہ حیرت و پریشانی بھری نگاہوں سے جاتے ہوئے سوار کی طرف کھڑی دیکھتی رہی اس کے کانوں میں رہ رہ کر پیشینگوئی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کیا یہ وہی سیاہ چشم سوار تھا جس سے ہوشیار رہنے کی اسے ہدایت کی گئی تھی۔ مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔

اسی طرح خیالات میں غلطاں پیچاں اس نے جو نیچے وادی کی طرف دیکھا تو آگے پیچھے کتنے ہی سوار اور پیدل دستے آ رہے تھے۔ گھوڑوں کے سموں سے تمام جنگل گونج رہا تھا اور گرد اُڑ اُڑ کر آسمان تک پہنچ رہی تھی۔

کچھ سوار دستے پڑاؤ کی طرف واپس جاتے ہوئے پختہ سڑک کو چھوڑ کر پگڈنڈی پر سے ہوتے ہوئے طیرزہ کی جھونپڑی کے عین قریب سے گزرے ان کے پاس توپیں اور بارود سے لدی ہوئی گاڑیاں تھیں اور ان کے پیچھے پیچھے نقارہ و طبل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ فوجی بینڈ اپنی واپسی کی تانیں اُڑا رہا تھا۔ طبل جنگ کی آواز فضا میں کم ہوتے ہوتے گم ہو گئی اور سائبان کے نیچے کھڑی ہوئی طیرزہ بے مدعا نگاہوں سے گم ہوتے ہوئے فوجی دستوں کو دیکھتی رہی۔ سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی کا تسلط ہو رہا تھا۔ دن بھر کے تھکے ہارے کسان اپنے گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ پرندوں کی ٹولیاں بسیرے کی تلاش میں ادھر ادھر اڑتی پھر رہی تھیں۔

طیرزہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی پر ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی ٹیکے وادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں گاڑی کی پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ دور جانب مغرب گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس وسیع وادی میں چند ہی روز کے مختصر سے عرصے میں کتنی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ سامنے کے میدان میں چھپر بندوں نے بانسوں اور گھاس پھوس کی امداد سے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا دی تھیں۔ کچھ میلے کچیلے مزدور گدھوں پر ضروری سامان لادے ہوئے پہاڑ کی دوسری طرف سے قطار باندھے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا یہاں کوئی نئی بستی بسائی جانے والی ہے یا ان جھونپڑیوں سے کوئی دوسرا کام لیا جائے گا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس کے کان میں پھر نقاروں کی گرج سنائی دینے لگی۔ چھپر بند اپنا کام ختم کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ اس کے بعد پہلے سے بھی زیادہ فوجی لباس میں ملبوس ہو ا ہ

آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انھوں نے اپنے سروں پر چمکدار خود پہن رکھے تھے یہ پہلے فوجیوں سے بالکل مختلف تھے ان کے لانبے لانبے برچھے۔ نوکیلے نیزے تلواریں اور سنگین دار بندوقیں دھوپ میں چمک چمک کر آنکھوں میں چکا چوندھ سی پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے آج تک اس قسم کے زرق برق لباس والے سپاہی نہ دیکھے تھے۔ یکایک اسے خیال آیا۔ کہیں یہ شہنشاہ کے باڈی گارڈ تو نہیں اور یہ خیمے کہیں انھیں کے لئے تو تیار نہیں کئے گئے۔ ایشیا کے اس عظیم المرتبت اور باجبروت شہنشاہ تیمور کے جنگی کارناموں کی چار دانگ عالم میں دھوم تھی۔ طیرزہ نے بھی سُنا تھا کہ عنقریب وہ انسانی خون سے ہولی کھیلنے والا شہنشاہ آنے والا ہے اور یہ شاید سامنے کا میدان ہی میدان جنگ بننے والا ہے۔ جبھی تو اتنی تیاریاں کی گئی ہیں۔ ایک طرف تو اس کے دل میں خوف و ہراس جاگزیں تھا اور دوسری طرف اسے اپنے باپ کے کاروبار کے چل نکلنے کی خوشی تھی۔ کیونکہ گرد و نواح میں تلواروں اور نیزوں کو صیقل کرنے کی ایک اسی کے باپ کی دکان تھی۔ امن و سکون کے زمانے میں وہ بھوکوں مر رہے تھے مگر جنگ کے ذریعے سے خدا ان کی روزی کا سامان کر رہا تھا سو وہ خوف سے لرز بھی رہی تھی اور کسی اندرونی جذبے کے ماتحت اس کا چہرہ گلنار بھی ہو رہا تھا۔

نقاروں کی آواز اب صاف اور قریب سنائی دے رہی تھی۔ اب شاید مغل شہنشاہ خود آ رہا ہے۔ چڑھتے ہوئے سورج کی روشنی میں سواروں کے خود زرہ بکتر اور نیزے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پیدل سپاہ کے بعد شہسواراوران کے پیچھے کوہ پیکر ہاتھیوں کا مسلح دستہ تھا اور انہی پر بڑے بڑے نقارے رکھے ہوئے تھے۔ اب وہ سمجھ گئی کہ چھپر بندوں نے مغل شہنشاہ اور اس کی تاتاری اور مغل فوج کے قیام ہی کے لئے یہ جھونپڑے بنائے ہوں گے۔ خچروں، گدھوں پر ضروری سامان کے علاوہ گھوڑوں کے لئے دانہ گھاس اور فوج کی خوراک لدی ہوئی تھی۔ وہ ملکوں پر ملک فتح کرتے ہوئے مغربی ایشیا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تاتاری اپنی بے رحمی، شقاوت قلبی اور سنگدلی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ بڑے بڑے جوانمردوں کے ان کے نام ہی سے پتے پانی ہو جاتے تھے۔

فاتح اعظم شہنشاہ تیمور، وہ لنگڑا باجبروت شہنشاہ اپنے سرسبز شہر سمرقند کی طرف واپس جا رہا تھا اس کی فاتح فوجیں کتھائی فتح کر چکی تھیں مہینوں کی شبانہ روز جنگ نے تمام فوجیوں کو مضمحل کر دیا تھا۔ وہ سکون و راحت کے متلاشی تھے اور یہ ان کا آخری سفر تھا۔ اس کی فوجیں جن میں ترک تاتاری۔ مغل۔ یوگری اور ترکمان شامل تھے اپنے اپنے گھر لوٹنے کی خوشی میں مگن تھے مال غنیمت چھکڑوں، اونٹوں اور گاڑیوں پر لدا ہوا تھا ہزاروں غلام اور لونڈیاں ساتھ تھیں جنھیں فاتح فوجیں اپنے ساتھ قید کر کے لائی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ حرم کی رنگین گاڑیاں بھی تھیں جنھیں امیر تیمور کی محبوب ترین لونڈی بھی تھی جنھیں عوام "عروس فرغانہ" کے نام سے یاد کرتے تھے

تمام فوجیں آہستہ آہستہ ان خیموں میں جاگزیں ہو گئیں۔ شہنشاہ کا اپنا خیمہ سُرخ بانات کا تھا۔ جن کے اوپر ہلالی پرچم لہرا رہا تھا اور باہر ننگی تلواریں لئے ہوئے مسلح جوان پہرہ دے رہے تھے۔ کیونکہ جہاں تیمور کے قہر و غضب سے دنیا تھر تھراتی تھی وہاں اس کے ایسے دشمن بھی تھے جو اس کی جان لینے میں بھی دریغ کرنے والے نہ تھے۔ طیرزہ خاموشی سے پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھی ہوئی مغل شہنشاہ کے لاؤ لشکر کا تماشہ کر رہی تھی، اس کا ننھا سا دل کسی نامعلوم قوت کے ماتحت لرز رہا تھا۔

وہ ابھی اپنے گھر میں آئی ہی تھی جو محض پھوس کے چند کمروں پر مشتمل تھا کہ باہر سڑک پر اسے ایک سوار اور چند اردلی اپنے گھر کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ "صیقل گر! صیقل گر!!" ان میں سے ایک سائبان کے سامنے کھڑا ہو کر آوازیں دینے لگا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ یکایک سوار کی نگاہ اٹھی اور کھڑکی کے سامنے اسے ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ ہر چند اس کا لباس میلا اور پھٹا ہوا تھا مگر اس کے چہرے کی چمک دمک چھپائے نہ چھپتی تھی۔ سوار کی شوق بھری نگاہیں اس کے موزوں قد اور سڈول اعضا کا جائزہ لینے لگیں۔ اس کے گول بھرے بھرے بازو کھڑکی کی سلاخوں پر تھے۔ اوڑھنی کا پلو سینہ سے سرک گیا تھا اور ابھرے ہوئے سینہ نے اس کے دل و دماغ میں آگ سی لگا دی۔ غزال کی طرح نشیلی اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گھونگھریالے بال، لانبی صراحی دار گردن نگینے کے لئے چھوٹا سا منہ سرخ ہونٹ۔ سوار نے اپنی بھوری مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ اپنے چہرے کو چغہ کی آستین سے صاف کیا۔ اور پھر پر شوق نگاہوں سے اس حسین دوشیزہ کی طرف دیکھنے لگا۔

طیرزہ بھی غور بھری نگاہوں سے اس کے خد و خال کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ دراز قد کا ایک تندرست و توانا جوان تھا۔ سرخ و سپید چہرہ شوخ مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ بھرے بھرے بازو۔ چوڑا چکلا سینہ خمدار ابرو اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں جو اس کے خوبصورت چہرے پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ یکایک وہ آگے بڑھا اور مسکرا کر بولا: "محترم خاتون! اس گھر کا مالک کہاں ہے۔ میں اپنے دستہ کی تمام تلواریں اور نیزے آج ہی رات کو صیقل کروانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مالک مکان ......"

"ہاں ہاں' بڑی خوشی سے آپ کے حکم کی تعمیل کی جائیگی پاشا!!" وہ بولی "میرا باپ ہی اس گھر کا مالک ہے۔ وہ اس وقت گھوڑے کے لئے گھاس لینے گیا ہے"

طیرزہ نے ایک دفعہ پھر شہ سوار کی طرف دیکھا سیہ چشم تاتاری شوق بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی پگڑی کا طرہ اسے کسی اعلیٰ فوجی اعزاز کا مالک ظاہر کر رہا تھا۔

"تو کیا میں وہ تلواریں اور نیزے ابھی بھیجدوں؟" شہسوار نے پوچھا۔

"جب بہتر سمجھیں" طیرزہ بولی۔ "اگر میرا گھوڑا ہوتا تو میں ابھی آپکے ساتھ ہی چل کر لے آتی"

"اچھا تو آپ شہسواری جانتی ہیں" وہ حیران ہوکر بولا۔ اس نے اپنے ایک اردلی کو حکم دیا کہ جاکر فوراً گھوڑا لائے اور وہ انتہائی ادب کے ساتھ تعمیل حکم کے لئے رخصت ہو گیا۔ طیرزہ کو معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے دستہ کا کپتان ہے۔

دونوں پہلو بہ پہلو گھوڑوں پر سوار چل دیئے۔ طیرزہ کی زندگی میں یہ پہلا دن تھا جو وہ ایک عالی مرتبہ فوجی کپتان کے ہمراہ گھوڑے پر سوار جا رہی تھی۔ جب وہ پیدل فوج کے خیموں کے بعد شہنشاہ کے خیمہ کے قریب سے گزرے تو طیرزہ کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ وہ اس باجبروت وسطوت شہنشاہ کی فوج میں سوار جا رہی تھی جس کے نام ہی سے دنیا تھرا اٹھتی تھی۔

یکایک سوار ایک سبز رنگ کے خیمہ کے سامنے رکا اور کود کر اپنے گھوڑے سے اتر گیا۔ پھر اس نے انتہائی نزاکت کے ساتھ طیرزہ کو سہارا دیکر اتارا اور اندر لے جاکر ایک دبیز صوفے پر بٹھا کر بولا "میں ابھی جاکر تلواروں اور نیزوں کو لدوا کر آپ کے مکان پر بھیجنے کا انتظام کرتا ہوں گھبرایئے گا نہیں میں ابھی لوٹ کر آتا ہوں" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

طیرزہ حیرت و شوق بھری نگاہوں سے خیمہ میں چاروں طرف نظریں دوڑانے لگی۔ خیمہ آرائش و زیبائش سے مبرا تھا۔ تاہم مکین کی نفاست پسندی اور پرشوکت زندگی کا آئینہ دار تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ہی گاؤ تکیہ لگا تھا اور اس کے پاس ہی منقش چوبی پلنگ پڑا تھا۔ دیوار پر غلاف میں لپٹی ہوئی مقدس کتاب لٹک رہی تھی۔ دوسری طرف چند اونی چغے اور ریشمی ملبوس قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ طہرانی پشمینے کی چادر تہ کر کے پلنگ کی پائنتی پر رکھی ہوئی تھی۔ تلوار۔ نیزہ، تیر و کمان۔ ڈھال اور زرہ بکتر بڑی نفاست کے ساتھ ایک چوکی پر رکھے ہوئے تھے۔

چند منٹ بعد سوار لوٹ آیا۔ اس نے دوسرے کمرے میں لباس تبدیل کیا۔ اتنے میں خادم خاصہ لیکر آگیا۔ اور اس نے طیرزہ کو بھی عزت کے ساتھ اپنے ساتھ شریک طعام کر لیا۔ دونوں کھانا کھاتے وقت ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں سورج غروب ہو گیا۔ اور طعام سے فارغ ہوتے ہی کپتان نے خیمہ سے باہر جماعت کے ساتھ نماز ادا کی اور طیرزہ حیرت وشوق بھری نگاہوں سے ان کے خضوع و خشوع کو خیمے میں کھڑی دیکھتی رہی۔ جب وہ دوبارہ آیا تو اس کے خوبصورت چہرے پر بشاشت وشوق کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے بے اختیار طیرزہ کو اپنی آغوش میں لے کر اس کا منہ چوم لیا۔

دوسری صبح جب منہ اندھیرے ہی طبل جنگ بجا تو طیرزہ خلاف توقع اس سڑک پر موجود تھی اور متجسسانہ نگاہوں سے اپنے عاشق زار کو تلاش کر رہی تھی۔ پیدل فوج کے بعد جب سوار فوج کا دستہ اس کے قریب آیا تو اس نے اپنے محبوب کپتان کو زرہ بکتر سے مسلح اپنے سیاہ گھوڑے پر سوار دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ فوراً اپنے گھوڑے سے اتر آیا اور اس کے نرم و گداز ہاتھ کو ہاتھ میں لیکر بولا۔

"میری تمناؤں کی حور! میں اپنے آقا و ولی نعمت تیمور کے حکم سے اوگوریز کے فرمانروا کے قلعہ پر دھاوا بولنے والا ہوں جس نے شہنشاہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ بے حد شجیع اور نبرد آزما حکمران ہے۔ اس کی فوج تربیت یافتہ اور قلعہ حد درجہ مضبوط ہے اگر مجھے خدا پاک نے فتح عنایت کی تو شام تک واپس آجاؤں گا۔ بصورت دیگر تم اسے بطور یادگار کے اپنے پاس رکھ لینا"

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک طلائی تمغہ اور سکوں کی ایک تھیلی نکال کر اس کے ہاتھ میں دی۔

طیرزہ اپنے خوابوں کی تاساجی دیکھ کر بے اختیار رونے لگی۔ اس نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

"گھبرانا نہیں۔ میرے لئے دعا کرنا کہ خدا مجھے مظفر و منصور واپس لائے" یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

"نہیں میرے آقا! مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ آپکے بغیر میں یہاں نہ رہ سکوں گی۔ میں ڈرنے والی نہیں" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب سسکیوں سے کانپ رہے تھے۔

نوجوان التیگین نے حیرت و مسرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"مصطفٰے! جاؤ میرا دوسرا ریشمی لباس لے آؤ۔"
مصطفٰے نے گھوڑے کو موڑا اور چند منٹ بعد ہی لباس لیکر آگیا۔ الپتگین نے اپنے ہاتھوں سے اسے لباس پہنا کر اس کے سر پر خود اڑھا دیا اور خوشی سے مسکرا کر بولا۔ "واللہ یہ لباس تو تمہارے جسم پر خوب پھبتا ہے تم تو حقیقتاً ایک تاتاری معلوم ہوتی ہو۔ اچھا چلو۔ اس گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔" مصطفٰے نے گھوڑا اس کی طرف بڑھا دیا۔

اب وہ اپنے محبوب کپتان کے ہمراہ گھوڑے پر سوار اوگری سردار کی ...ی کے لئے جا رہی تھی۔ اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ پندرہ ...جنگل کے بیچوں بیچ چلتے ہوئے جب وہ پہلی مرتبہ کھلے میدان میں ...ؤ انھیں سامنے افق کی گہرائیوں سے بلند ہوتے ہوئے ندی کے کنارے ...الدین اوگری کے سنگین قلعہ کے برج نظر آئے۔ تاتاریوں نے کاندھوں ...سے کمانیں اتار لیں۔ تیر سیدھے کر لئے اور پوری مستعدی کے ...قلعہ کی طرف بڑھے۔ جب وہ قریب پہنچ گئے تو حکم ملتے ہی انھوں ...نے فصیلوں پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ اوگرے کا سردار کہیں ...گیا ہوا تھا۔ محصورین نے بڑی تندہی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ دونوں ...طرف سے تیروں کی بارش ہوتی رہی۔ یکایک چند تاتاری رسی کی سیڑھی ...سے قلعہ کی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور انھوں نے اندر ...قدم رکھتے ہی قتل عام کر کے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔

قلعہ کے اندر فوج اور سامان جنگ بہت کم تھا۔ اس لئے جنگ فوراً ...ختم ہو گئی۔ فاتح فوج نے تمام سامان پر قبضہ کر لیا۔ ہزاروں انسان ...آن کی آن میں موت کی آغوش میں سلا دیئے گئے۔ اور سیکڑوں سپاہی ...گرفتار کر لئے۔ جب تاتاری وہاں سے مال و متاع لوٹ کر باہر نکلے تو رات ...کے اندھیرے میں دور دور تک آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے دکھائی دیتے ...تھے۔ وہ ابھی مشکل سے نصف فرلانگ دور گئے ہوں گے کہ یکایک ...سیکڑوں تیر ایک ہی دفعہ سائیں سائیں کرتے ہوئے تاتاری فاتحین پر ...برسے۔ اور کتنے ہی چیخیں مار کر گھوڑوں سے نیچے گر گئے۔ اوگری ...سردار اپنی مہم سے واپس آگیا تھا۔

چودھویں کا چاند آسمان پر جلوہ گر تھا۔ تاتاری پہلے تو بہت ...گھبرائے۔ مگر جلد ہی سنبھل گئے۔ اور لڑائی ہونے لگی۔ طیرزہ اپنے ...محبوب کے پہلو میں گھوڑے پر سوار دونوں فوجوں کے بہادروں کی ...بہادری اور جوانمردی کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں ...خوف تھا تو صرف یہ کہ کہیں اس کا محبوب اس آفت کا شکار نہ ہو جائے ...اس کا نازک سا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یکایک اُسے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے الپتگین نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑی اور اس مقام کی طرف بڑھا جہاں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی چند منٹ تک اس کی پگڑی کا زرّیں طرّہ طیرزہ کو نظر آتا رہا۔ پھر اوگری کی تازہ دم فوج نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور الپتگین نظروں سے گم ہو گیا۔ طیرزہ اس ہیبتناک منظر سے چیخ اٹھی اس نے مصطفٰے کو ادھر ادھر ڈھونڈا مگر اس کا بھی کہیں پتہ نہ تھا۔ عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ طرفین پوری شدت کے ساتھ داد شجاعت دے رہے تھے۔ وہ ابھی کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کے گھوڑے کے پہلو میں ایک تیر آ کر لگا۔ عربی نسل کا گھوڑا بیخ پا ہو گیا۔ ایک دو دفعہ پھنکارا، اور پھر جدھر کو منہ اٹھا بھاگ نکلا۔

طیرزہ بمشکل گرتے گرتے بچی۔ نہ جانے کب تک اور کس حال میں وہ اس کی ایال سے لپٹی رہی۔ گھوڑا اپنی پوری رفتار کے ساتھ جنگل میں سے جھاڑیوں کو پھاندتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔ یکایک اسے ٹھوکر لگی اور طیرزہ توازن قائم نہ رکھ سکنے کی وجہ سے گر پڑی۔ پھر اسے ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں ہے؟

جب اس کی آنکھ دوبارہ کھلی تو وہ ایک دبیز قالین پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر جا بجا پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اور اس کے پاس ہی اس کے خوابوں کا شہزادہ سینے اور سر پر پٹیاں باندھے ہوئے جھکا کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان بھرا تبسم تھا۔ اور آنکھیں اسے ہوش میں پاکر شوق و مسرت سے چمک رہی تھیں۔

"کیوں کیسی طبیعت ہے؟" اس نے پوچھا۔

طیرزہ نے پر شوق انداز میں صورت اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "اچھی ہوں۔" اور اس کے گلے میں زخمی ہاتھ حائل کر دیئے۔

باہر فوجی بینڈ فتح کے شادیانے بجا رہا تھا۔ اتنے میں اس کا بوڑھا باپ لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور اپنی بیٹی کو ہوش میں پاکر اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بے اختیار جاری ہو گئے اور اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔

اس کے صحتیاب ہوتے ہی امیر تیمور نے دونوں کی شادی کر دی۔

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیے

آثار وقت

پڑنے لگتی ہیں جبین چرخ پر جب سلوٹیں — غم کے لمحے سوچنے لگتے ہیں ہم کیونکر کٹیں
دیکھیے لاتی ہے اب دنیا میں کیا کیا انقلاب — آسمانوں کی یہ انگڑائی زمیں کی کروٹیں
تھرتھراتا ہے فلک پر شعلۂ بانگ جرس — کاروان بزم نو کی مل رہی ہیں آہٹیں
خون تھوکا منہ بندھی کلیوں نے یوں گلزار میں — ٹیسیں لگ کر جس طرح انگور زخموں کے پھٹیں
دیدۂ خورشید سے اڑنے لگیں چنگاریاں — زہر کی بودے رہی ہیں لیلیٰ شب کی لٹیں
گردش افلاک کو بھی کچھ خبر ان کی نہیں — موت کی راتیں ہیں بڑھ جانے سے شاید کچھ گھٹیں
اٹھ رہے ہیں شش جہت سے نعرہ ہائے انقلاب — اہل دنیا سے کہو اب جی اٹھیں یا مرمٹیں

پچھلے پہر کو حسن خوابیدہ

پچھلی شب کو حسن خوابیدہ کا عالم کچھ نہ پوچھ — تازگی وہ جسم جاناں کی، وہ مہکی کروٹیں
صندلی ماتھے پہ میٹھی نیند کا گہرا فسوں — وہ کمر تک ناگنوں کی طرح بل کھائی لٹیں

زہر سے بڑھکر تو قاتل جام عشرت تھے فراق
ان پیالوں کی نہ چھپیں آہ تو نے تلچھٹیں

فراق گورکھپوری

برامکہ

آتش کدہ زردشت کی انقلاب افروز چنگاریاں!

از:- مولانا اظہر امرتسری

"اگرچہ میں بلخ جا رہی ہوں لیکن میرے بطن میں تمہاری امانت ہے۔"

ایک آتش پرست عورت نے عبداللہ بن مسلم سے کہا۔ یہ الفاظ ہیں جن سے تحریک برامکہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ لیکن ان الفاظ کے پردے میں کوئی افسانہ ہے یا نہیں؟ یا واقعی ایک مغ زادی اپنے بطن میں اسلامی نسل کی یادگار لیکر روانہ ہوئی تھی؟ اس کا جواب تو آئندہ سطریں دے سکیں گی۔

آج سے دو تین ہزار برس پہلے کی بات ہے بلخ آتش پرستوں کا مرکز تھا۔ اسی سرزمین سے حضرت زرتشت نے ظہور کیا تھا۔ اسی مقام سے دین زرتشتی کا طوفان اٹھا اور پرانے دینوں کو خس و خاشاک کی طرح بہاتا ہوا ایران کی طرف بڑھا۔ ایران میں مقدس آگ سلگانے کے بعد افغانستان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس ملک کے جس گوشے میں اس طوفان کی موجیں پہنچیں وہاں دین زرتشتی کے سوا کسی عقیدے کے لئے گنجائش نہ رہی۔ مجوسیوں کی مذہبی چنگاریوں نے شمالی ہندوستان میں بھی متعدد آتش کدوں کی بنا ڈالی۔ لیکن وہ زمانے کی مرطوب ہواؤں کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے۔ یہ زمانہ تھا جب مجوسی دین کا سورج نصف النہار پر تھا اور اس کی روشنی وسطی ایشیا سے شمالی ہندوستان کے در و دیوار تک پھیلی ہوئی تھی۔ بلخ کا سب سے بڑا آتش کدہ "نوبہار" مجوسیوں کا قبلۂ دین تھا۔ اس آتش خانے کی ہر چنگاری دلوں کے لئے مذہبی حرارت کا سامان مہیا کرتی تھی۔ اس آگ گھر کے ہر شعلے کی زبان سے زرتشت کا پیغام سنائی دیتا تھا۔ اس بیت النار کا ہر شرر عقیدتوں اور ارادتوں کے سجدوں کی بھیڑ میں مسکراتا تھا۔ اس آتشکدے کا پیر مغاں مجوسیوں کا پیشوائے اعظم تھا جس کے گرد غیر مجوسی دوشیزاؤں اور مغ بچوں کا ہجوم رہتا تھا۔ یہ لڑکیاں لڑکے دیوتاؤں کی حفاظت میں تھے اس لئے ان کی عفت و پاکیزگی کو فرشتے کی عصمت سے بھی زیادہ قابل اعتماد سمجھا جاتا تھا لیکن زمانے نے ایک ناگوار کروٹ لی۔ آگ کا طلسم کچھ عرصہ کے لئے ختم ہو گیا۔ پیر مغاں کی سرداری کا تاج نوک شمشیر پر نظر آنے لگا۔ اور دین زرتشتی کو سر چھپانے کے لئے جگہ ڈھونڈنا پڑی لیکن اسے زمین کے کسی گوشے میں بھی جگہ نہ ملی۔ یہ انقلاب سکندر اعظم کے بھیس میں یونان سے برپا ہوا تھا۔ سکندر کا سیلاب نصرت اناطولیہ کی حدیں پھاند کر ایران میں داخل ہوا اور دارا کو شکست دینے کے بعد ان تمام ملکوں صوبوں اور علاقوں پر چھا گیا جہاں جہاں دین زرتشتی نے اپنے آتشکدے روشن کر رکھے تھے۔ چنانچہ خون کی بارش سے تمام آتشکدے بجھ گئے اور دین زرتشت لاوارث یتیم کی طرح جائے پناہ ڈھونڈنے لگا۔ ادھر کیانی شوکت نے دم توڑا ادھر بلخ کے "نوبہار" سے بھی خاک اڑنے لگی۔ ہزاروں برس کی بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی راکھ بن کر رہ گئی لیکن زمانے نے ایک اور انقلاب کو پیدا کیا۔ زخم خوردہ ایرانی پھر اٹھے انہوں نے ملک کو زنجیر غلامی سے آزاد کر لیا۔ اور اس دور آزادی میں ساسانیوں کا خورشید اقتدار نکلا۔ جس کی روشنی میں ایرانی تہذیب و معاشرت نے حیات بعد از ممات کی راہ دیکھی۔ چنانچہ ساسان اول نے "نوبہار" کی راکھ میں سے دبی ہوئی چنگاریاں نکالیں۔ یہ وہی چنگاریاں تھیں جسے دین زرتشت کی آخری سانس کہا جاتا تھا لیکن ساسان اول نے آتشخانوں کو نئی شان بخشی۔ پیر مغاں گمنامی کی خلوت سے نکلا۔ نوبہار نے پھر عقیدتمندوں کی محفل کو رونق بخشی۔ مغ بچوں کے ہجوم اس کے قدم لینے لگے۔ مغ زادیوں نے اپنی سریلی اور لطافت آفریں آواز میں خوشی کے گیت گائے۔ آتشخانے کے ہر شعلے نے لبیک لبیک کر کے دین زرتشتی کے احیاء کا اعلان کیا۔ مجوسیوں کی اعتقادی زندگی کے پیکر میں نئی روح اچھلنے لگی لیکن یہ زمانہ بھی گرمی کے بادلوں کی طرح زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ ۳۲ھ میں مسلمانوں کا سیل نصرت مرو سے بلخ کی جانب بڑھا اور اس طوفان نصرت سامان کے ریلوں سے ٹکرانا مجوسی آتشکدوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ چنانچہ "نوبہار" کچھ اس طرح بجھا کہ آج تک اس کی راکھ سے ایک ادھ بجھی چنگاری بھی نہ اٹھ سکی۔ لیکن اس سرد خاکستر سے تحریک برامکہ کا قالب تیار کیا گیا ہے جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے۔ لہٰذا ہم آتشخانوں کی سیر کا سلسلہ یہیں ختم کرتے ہیں اور اپنے حقیقی موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

(۱)

برامکہ کی اصلیت

"نوبہار" کے پیرمغاں کو برمغ کہا جاتا تھا۔ جسے عربوں کی بول چال نے برمک بنا دیا۔ یہی برمک ہے جس سے تحریک برامکہ منسوب ہے لیکن اس صورت حال کے پس منظر پر چھپلتی ہوئی سی نظر ڈال لیجیئے۔

۳۱ھ میں حضرت عثمان غنی کی خلافت کا زمانہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن عامر ایران کے عامل اعلیٰ تھے۔ ان دنوں بلخ کے مجوسیوں نے مسلمانوں کی مخالفت پر ترکوں سے اتحاد کر لیا اور یہ متحدہ گروہ مسلمانوں کے مقابلے میں آگیا۔ ابن عامر مرو سے چلے۔ مقامی بغاوتوں کو دباتے بلخ پہنچے۔ ترکوں اور مجوسیوں کی ہزاروں تلواریں مجاہدین کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ آخر لڑائی ہوئی۔ ترک اور مجوسی بڑی بہادری سے لڑے لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ آخر پریشانی کی حالت میں بھاگ نکلے۔ اس شکست کے بعد دین زرتشت کا شیرازہ بھی پریشان ہوگیا۔ کیونکہ وہ جس سیاسی ستون کے سہارے کھڑا تھا وہ تو یزدجرد کی ہلاکت ہی سے گر چکا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اس کے آثار تک بھی مٹا دیئے اس کے بعد کچھ عرصے تک دنیا ڈھونڈتی رہی کہ "نوبہار" کہاں ہے؟ برمک کہاں گیا؟ اور آتشخانے کی آگ سے عقیدتوں کا رشتہ جوڑنے والے کہاں روپوش ہوگئے؟ لیکن مجوسی چوٹ کھا کھا کر ابھرنے کے عادی تھے اس لئے مسلمانوں کی گرفت جس وقت بھی ڈھیلی ہوئی انھوں نے بجھے ہوئے آتشکدہ کو دوبارہ شعلہ زار بنا لیا اور اس کی تپش سے اپنے خون ...رش وبغاوت کی حرارت بھی عطا کرتے رہے لیکن مسلمان ہر سیاسی ...ش کو خاموشی کی نیند سلانا جانتے تھے اس لئے مجوسیوں کی ہنگامہ ...یاں کسی نتیجہ خیز مرحلے پر نہ پہنچ سکیں۔ البتہ آتش پرستوں کو مذہبی ...دی حاصل تھی لیکن وہ اعتقادی آزادی کے پردے میں سیاسی قوت کی ...رش کرتے رہے۔ آخر اس قوت کو سازشوں کی خلوت سے باہر لانے کا ...ت بھی آگیا۔ چنانچہ ۸۶ھ میں جب ولید بن عبدالملک کی بادشاہی ...ں تو آتش پرستان بلخ نے بغاوت کر دی۔ اس زمانہ میں قتیبہ ابن مسلم ...ی حاکم خراسان تھے انھوں نے بلخ پر چڑھائی کی۔ آتش پرستوں نے مقابلہ ...لیکن زیادہ دیر تک ٹھہر نہ سکے۔ قتیبہ نے ان کے تمام قلعوں کی اینٹ ...ے اینٹ بجا دی۔ دفاعی استحکامات کا خاتمہ کر دیا اور کثیر التعداد مجوسی ...ؤں اور عورتوں کو گرفتار کرکے مرو لے آئے۔ انھی اسیر عورتوں میں ...ملعدوم کی بیوی "بہار" بھی تھی جسے قتیبہ کے بھائی عبداللہ بن مسلم کی پناہ میں آنا پڑا۔ کچھ عرصے کے بعد مجوسیوں کے ہوش ٹھکانے آگئے انھوں نے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کی۔ آخر عہدنامہ مرتب ہوا جس کی رُو سے مجوسیوں نے اطاعت قبول کر لی اور مسلمانوں نے اسیروں کی واپسی پر اظہار رضامندی کیا۔ اس لئے بہار کو بھی عبداللہ بن مسلم سے جدا ہو کر بلخ جانا پڑا لیکن اس نے جاتے ہوئے کہا کہ

"میں تم سے حاملہ ہو چکی ہوں۔ اگرچہ بلخ جا رہی ہوں لیکن میرے بطن میں تمھاری امانت موجود ہے"

یہ واقعہ خدا جانے حقیقت پر مبنی ہے یا محض مورخانہ افسانہ طرازی کا کرشمہ ہے؟ اس مسئلے پر تاریخی معلومات سے بحث نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ مورخین اسلام نے اس افسانہ یا حقیقت کے پس وپیش پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بہر حال اس عورت نے بچہ جنا جس کا نام خالد برمکی تھا۔ یہی وہ خالد ہے جو یحییٰ برمکی کا باپ اور جعفر برمکی کا دادا تھا اس لئے اسے تحریک برامکہ کا بانی کہا جا سکتا ہے۔

(۲)

عروج وترقی کی طرف

خالد برمکی ناز ونعم کے آغوش میں پلا۔ اس زمانے میں تعلیم وتعلم کے جتنے ذرائع میسر آسکتے تھے خالد نے سب سے فائدہ اٹھایا۔ جب وہ طفولیت کی وادی سے دشت جوانی کی طرف جا رہا تھا تو اس کی ملاقات ایک شیعہ داعی سے ہوگئی یہ داعی مذہبی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اموی حکومت کے خلاف سازشوں کا جال بھی بچھاتا پھرتا تھا۔ خالد نے اس سے بات چیت کی۔ حب اقتدار تو اس کے دماغ کا جزو بن ہی چکا تھا۔ اس لئے شیعہ داعی کی باتیں خالد کو متاثر کئے بغیر نہ رہیں کیونکہ داعی نے اس کے سامنے ایک وسیع سکیم پیش کی تھی جس کے مطابق اموی حکومت کا تختہ اُلٹا جا سکتا تھا۔ خالد ایک انقلاب انگیز زلزلے کو عالم وجود میں لانے کا تمنائی تھا۔ اس لئے وہ داعی کے ساتھ ہوگیا اور ۲۲ برس تک ایران کے مختلف صوبوں میں سیاسی اضطراب کی آگ بھڑکاتا پھرا۔ ۱۲۴ھ میں جب اس کی زندگی جوانی کی شورشوں سے دامن چھڑا کر عمر کمال تک پہنچ چکی تھی تو وہ امام ابراہیم عباسی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امام ابراہیم ہاشمیوں کے سب سے بڑے لیڈر تھے انھیں تمام عباسیوں، علویوں اور فاطمیوں نے اپنا نمائندہ منتخب کر رکھا تھا۔ وہ اموی حکومت کے خلاف جتنے انقلابات اور جتنی شورشیں رونما تھیں سب کی عنان اختیار امام صاحب ہی کے ہاتھ میں تھی خالد نے امام کو اپنے عزم وارادہ سے آگاہ کیا۔ اس کی باتوں میں معقولیت

...شکل وصورت، رفتار بھی اور عادات واطوار سے راسخ العزمی ٹپکتی ...امام نے اسے اپنی مصاحبت میں لے لیا۔ اور جب ابومسلم خراسانی کو ...اسی تبلیغ کے لئے ایران بھیجا گیا تو خالد بھی مشیر خصوصی کی حیثیت سے ...اس کے ہمراہ تھا۔ ابومسلم کے لئے خالد کی رفاقت کس درجہ مفید و سازگار ...ثابت ہوئی یہ ایک علیحدہ بحث ہے جو زیر نظر موضوع سے متعلق نہیں ...ہو سکتی۔ مختصر یہ ہے کہ خالد کی سیاسی بصیرت اور عملی قابلیت ابومسلم کے لئے ...فارغ راہ ثابت ہوئی۔ اگر یہ تجربہ کار مشیر اس کے ساتھ نہ ہوتا تو ابومسلم ...کو اتنی جلدی کامیابی نہ ہوتی۔ خالد دماغی صلاحیتوں کا مالک تو تھا ہی تیز ...بہادر اور جرأت مند بھی تھا لہٰذا خالد کی کوششیں مسجد کے منبر سے ...لڑائی کے میدان تک ابومسلم کی معاون رہیں۔

جب عباسیوں کی سرگرمیاں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ بنوامیہ کی حکومت مٹ گئی اور اس کے کھنڈروں پر دولت عباسیہ کی تعمیر ہوئی تو ابومسلم نے تمام بڑے بڑے عہدوں پر اپنے حامیوں کو متمکن کرانا شروع کر دیا۔ خالد کو سب سے زیادہ ابومسلم کا اعتماد حاصل تھا۔ وہ اس کے لئے عہدہ بھی ممتاز چاہتا تھا تاکہ خالد کو اپنی حیرت انگیز صلاحیتوں کے اظہار و استعمال کا موقع مل سکے۔ وہ اسے وزیر اعظم بنانا چاہتا تھا لیکن وزارت عظمیٰ کی کرسی پر ابوسلمہ خلال بیٹھا تھا اسے خلیفہ ابوالعباس عبداللہ سفاح کا اعتماد حاصل تھا۔ اس لئے ابوسلمہ خالد کی راہ ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا لیکن جہاں ابومسلم کا سازشی ہاتھ پہنچ سکتا ہو وہاں کون سی رکاوٹ رہ سکتی تھی؟ ابومسلم نے ایک فدائی کو خراسان سے بھیجا جس نے موقع پاتے ہی ابوسلمہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا اب خالد کے لئے رستہ صاف تھا۔ ابومسلم نے سفاح کو لکھا کہ خالد برمکی کو وزیر اعظم بنا لیجئے۔ اس سے بہتر مدبر میسر نہیں آ سکتا۔ سفاح بھی خالد کی خدمات سے اچھی طرح واقف تھا اور ابومسلم کی سفارش تو اس کے لئے الہام کے بعد سب سے زیادہ تعمیل کی مستحق تھی۔ خالد کو وزیر اعظم بنا لیا گیا۔ اس کے بعد خاندان برامکہ کا عروج شروع ہوا۔ خالد نے قلمدان وزارت سنبھالتے ہی تمام محکموں کو درست کیا۔ شعراء و علماء کے لئے وظائف مقرر کئے۔ یتیموں اور بیواؤں کے لئے امداد و اعانت کا انتظام کیا۔ اور سخاوت و فیاضی کے وہ دریا بہائے جس سے عراق میں مفلسی و تنگدستی کا نام تک نہ رہا۔ عوام اسے خلیفہ سے بھی زیادہ محبوب اور قابل احترام سمجھتے تھے اس کے علاوہ اس نے تدبر اور سیاسی حکمت عملی سے نظام حکمرانی کو بھی ترقی و عروج کی انتہائی منزل تک پہنچا دیا۔

سفاح کی وفات کے بعد خلافت عباسیہ کے تخت پر منصور جلوہ گر ہوا۔ اس حکمران نے بھی خالد ہی کو وزیر اعظم بنائے رکھا لیکن یہ خلیفہ ابومسلم کے اقتدار کو عباسی وقار کے لئے مستقل خطرہ سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ خراسانی انقلابی اگر میدان سیاست میں اسی طرح آگے بڑھتا رہا تو عباسی حکومت کو بھی اس کے پیچھے بھاگنا پڑے گا۔ لہٰذا اس نے ابومسلم کو قتل کرا دیا اس سانحے سے خالد کی رگوں میں عصبیت کا جوش کروٹیں لینے لگا۔ اس کی ایرانی غیرت نے پہلو بدلا لیکن وہ مدبر تھا۔ دور اندیش اور حقیقت شناس تھا اس لئے دل کی آگ کو زبان تک نہ لا سکا۔ لیکن اس خاموشی کے پردے میں بھی وہ ایسی سکیم چھپائے بیٹھا تھا جو عمل پذیر ہوتے ہی ایرانیت کے فتنے کو خاک ہلاکت سے اٹھا سکتی تھی لیکن اس کے سکون و سکوت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابومسلم کے قتل کو زمانہ کا معمولی واقعہ سمجھتا ہے۔ مگر خلیفہ منصور بھی پرسکون موجوں میں طوفانی خروش ڈھونڈ لیا کرتے تھے انھوں نے سمجھ لیا کہ خالد کی خاموشی میں کوئی سیاسی ہنگامہ پرورش پا رہا ہے۔ انھوں نے خالد کو رخصت پر بھیج دیا لیکن خالد ان ایام میں بھی پراسرار خاموشی کا اظہار کرتا رہا اس لئے خلیفہ کو یقین ہو گیا کہ خالد وفادار ہے۔ اس کے دل میں انتقامی جوش کے لئے گنجائش ہی نہیں۔ خلیفہ نے خالد کو پھر بلایا اور موصل کا والی مقرر کر دیا۔ اور اپنے بیٹے مہدی کا اتالیق بھی بنا لیا۔

(۳)

عہد اقتدار

خالد کی فیاضی سے برامکہ کی سخاوت و مقبولیت کا وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ خلیفہ کی حاکمانہ آوازیں بھی اس میں دب کر رہ گئیں۔ خالد اگرچہ ولایت موصل کا حاکم تھا لیکن سلطنتوں کے بنانے اور بگاڑنے میں اس کا ہاتھ وزیر اعظم سے بھی زیادہ کام کرتا رہا۔ منصور کی وفات کے بعد جب خلیفہ مہدی کا زمانہ آیا تو انھوں نے خالد کو از سر نو وزیر اعظم بنا لیا۔ اس کے بعد خالد نے اپنے اثر و رسوخ سے بہت زیادہ فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ جہاں تک ممکن تھا ہر بڑے عہدے پر ایرانی سردار کو مقرر کیا گیا۔ یہ طریقہ بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ قلیل عرصے میں ہی عباسی خلافت پر ایرانیت کا اثر چھا گیا۔ تمام ایرانی سردار اور مقربین خالد کی طرح صرف ایک ہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ایرانی شوکت کو از سر نو زندہ کیا جائے لیکن یہ لوگ دور اندیش تھے اس لئے اپنی سرگرمیوں کو اس درجہ پوشیدہ رکھتے تھے کہ حکومت کی ہوا بھی ان کی سازش کے شعلوں تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ خالد کا بیٹا یحییٰ، مہدی کے فرزند ہارون کا اتالیق تھا۔ اس لئے حرم شاہی میں بھی برمکیوں کا اثر کار فرما رہا تھا۔ بادشاہ کوئی کام بھی ان کی مرضی کے بغیر

ما۔ یہاں تک کہ ولیعہد کا تقرر اور شہزادوں اور شاہزادیوں کے
طے بھی خالد اور یحییٰ کے مشورے سے ہوتے تھے۔ آخر ۱۶۳ھ میں
انتقال ہو گیا۔ لیکن وہ ایرانی عروج کا جو خاکہ بنا چکا تھا اس میں
بھرنے کے لئے اپنے بیٹے یحییٰ کو چھوڑ گیا۔ یحییٰ کی عمر اس وقت
س کی تھی لیکن وہ سیاسی حکمت عملی، ایرانیت پرستی اور احتیاط
میں اپنے باپ سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس کی سیاسی چالیں دام
زمیں کی طرح اس وقت معلوم ہوتی تھیں جب حریف مبتلا ہو جاتا
وہ ایسی آتش خاموش تھا جس کے شعلے میں جہاں سوزی کا سامان تو
ہے مگر دنیا کی آنکھیں اسے سرد راکھ ہی کا ڈھیر دیکھتی ہیں۔ یحییٰ
ش اس زمانے میں ہوئی تھی جب حکومتوں اور سلطنتوں کو نہ بنتے
ی تھی نہ بگڑتے تاخیر ہوتی تھی۔ اسی کشمکش میں وہ جوان ہوا اور
سے عمر کمال تک سیکڑوں انقلابات سے گزرنا پڑا تھا اس لئے
اعتدال پسند اور تجربہ کار انقلابی تھا جو اپنی سیاسی فراست کے
آگ کو بھی پانی میں چھپا سکتا ہے۔ اس نے ایرانی سرداروں کو ایک
ں سازش کے ذریعہ سے منظم کیا اور اس کے بعد اس سازش کے تعلق
نداد کو بلخ سے ملا دیا لیکن کوئی غیر ایرانی اس کارفرمائی سے واقف
سکا۔

جب خلیفہ ہادی کا زمانہ آیا تو یحییٰ وزارت عظمیٰ کی گدی پر متمکن ہو گیا
زمانے میں یحییٰ نے ہارون رشید کو خلیفہ بنانے کے لئے نتیجہ خیز کام کیا
یٰ کا اثر و رسوخ کارفرما نہ ہوتا تو شاید ہارون کو تخت خلافت پر
کا موقع نہ ملتا۔ اس اجمال کی مختصر سی تفصیل بھی سن لیجئے۔ خلیفہ مہدی
ی وفات سے پہلے اعلان کیا تھا کہ میرے بعد میرا بیٹا ہادی خلیفہ ہوگا
ہادی کے بعد ہارون کو خلیفہ بنایا جائے گا۔ لوگوں نے اس فیصلے کو
م کرلیا تھا اور ہادی و ہارون کے ہاتھ پر بیعت بھی کرلی تھی۔ لیکن
ہادی نے زندگی کے آخری ایام میں اس قرارداد کو نظر انداز کردیا اور
بیٹے جعفر کو ولیعہد بنانے کی ٹھان لی۔ جعفر اگرچہ نابالغ تھا لیکن خلیفہ
ر نظر تھا اور خلیفہ کا فیصلہ بھی امرائے سلطنت کے لئے وحی آسمانی
کم نہیں ہوتا اس لئے ملک کے طول و عرض سے جعفر کی تائید و حمایت
آوازیں اٹھنے لگیں۔ لیکن اکیلا یحییٰ تھا جو مہدی کے فیصلے کو برقرار
چاہتا تھا اور اس کی تمام ہمدردیاں ہارون کے ساتھ تھیں اس لئے
شیعہ آبادی بھی ہارون ہی کو بہتر سمجھتی تھی لیکن ہادی اپنے بیٹے
انشین بنانے پر تلا بیٹھا تھا۔ یحییٰ نے اسے سمجھایا اس کے ساتھ
مہدی کی ایرانی النسل ماں خیزران کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا وہ

وہ بھی ہارون کی حمایت کرنے لگی لیکن ہادی بھی اپنی دھن کا پکا تھا اس
کا عزم و ارادہ یہاں تک جا پہنچا کہ ہارون کو جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ
شکار کے بہانے سے نکلا اور بغداد سے دور قصر مقاتل میں مقیم ہو گیا۔
اب صرف خیزران اور یحییٰ ہی رہ گئے تھے جو ہارون کے حامی و معاون
تھے۔ مہدی بھی انتقامی جوش سے مشتعل تھا۔ اس نے سب سے پہلے خیزران
کے تمام اختیارات ضبط کرلئے اس کے بعد یہ کہن سال بیگم امور سلطنت
میں دخل دینے کے قابل نہ رہی۔ لیکن یحییٰ کا مقابلہ مشکل تھا کیونکہ اس
کی مدبرانہ قابلیت ہی تمام شہنشاہی حربوں کا تسلی بخش جواب تھی تاہم
عباسی نقار خانے میں اس بلخی طوطی کی آواز کون سنتا تھا؟ ہادی بدستور
جعفر کو خلیفہ بنانے بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ اگرچہ اس عزم و اقدام
کے لئے ہادی کے پاس کوئی وجہ جواز نہ تھی لیکن جہاں قوت ہو وہاں
وجہ جواز پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ بایں ہمہ اسے معلوم تھا
کہ یحییٰ سے پالا پڑا ہے جس کا باپ خلافت امیہ کی بنیادیں متزلزل
کرچکا ہے اور جو ابو مسلم کے ہاتھ میں سازش کے نیام میں چھپی ہوئی تلوار
اور زہر کا پیالہ بھی دیکھ چکا ہے لیکن وہ یحییٰ کی طرف سے بے فکر تھا کیونکہ
یہ برمکی مدبر اپنے عزم و ارادے کو وفاداری و خیر سگالی کے تہ در تہ پردوں
میں چھپانے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن ہادی کا خیال تھا کہ صرف ہارون
کی موت ہی سے یہ فتنہ دب سکتا ہے اگر یہ کام آسان نہ ہو تو ہارون کو
اس درجہ مرعوب کیا جائے کہ وہ خود بخود حق ولیعہدی سے دست بردار
ہو جائے۔ اس سکیم کے پیش نظر ہارون کو بلایا گیا لیکن وہ علالت کے
بہانے سے اس بلاوے کو ٹال گیا۔ آخر ہادی خود موصل گیا اور ہارون کو
ساتھ لیکر دار الخلافت کی طرف روانہ ہوا۔ جب شاہی قافلہ بمقام عیسیٰ
یاد قریہ پہنچا تو ڈیرے ڈانڈے ڈال دیئے۔ شب بستری کا سامان کیا گیا
یہ ۱۴ ربیع الاول ۱۷۰ھ کی رات تھی۔ جب ۱۵ ربیع الاول کا سورج
نکلا تو ہادی اپنے بستر پر مُردہ پایا گیا۔ یہ سانحہ کیوں وقوع پذیر ہوا؟ مورخین
کا بیان ہے کہ خیزران اور یحییٰ نے ایک کنیز کو رازدار بنالیا تھا۔ اور
اسی کے ذریعہ سے ہادی کو زہر دیا گیا اور اتفاقات نے بھی اس سازش
کی حوصلہ افزائی کی۔ کیونکہ ہادی بیمار تھا اس لئے اس کی موت کو کسی غیر
معمولی سبب کا نتیجہ نہ سمجھا گیا۔ ہادی کی موت کے ساتھ ہی جعفر کی جانشینی
کا قصہ بھی پاک ہو گیا۔ اس کے بعد ہارون رشید خلیفہ منتخب ہوئے چونکہ
یہ خلیفہ یحییٰ کا مرہون منت تھا اس لئے برمکیوں کی ہر بات اس کے لئے
مستحق تعمیل تھی۔ اس کے علاوہ ہارون یحییٰ کے بیٹوں فضل و جعفر کا
رضاعی بھائی بھی تھا لہٰذا وہ یحییٰ کو والد محترم کہہ کر پکارا کرتا تھا۔

ہارون کے عہد میں تحریک برامکہ کا سورج نصف النہار تک پہنچ لیا۔ اب یحییٰ نے خیال کیا کہ خالد کی آخری تمنا کو پورا کرنے کا اس سے اچھا موقع میسر نہیں آسکتا۔ اس نے سازش کا سلسلہ ذرا زیادہ وسعت کے ساتھ پھیلانا شروع کردیا۔ یحییٰ سخاوت و فیاضی کے میدان میں حاتم سے بھی کوسوں آگے تھا۔ جس مفلس کو دیکھا مالامال کر دیتا۔ جو گدا اس کے دروازے پر آتا امیر کبیر بن کر جاتا۔ تمام شعرا اس کے وظیفہ خوار تھے اور اس زمانے میں پراپگنڈے کا سب سے بڑا اور موثر ذریعہ شاعری ہی تھی کیونکہ شاعر جس امیر کی شان میں کچھ کہتا وہ لوگوں کی زبانوں پر۔ مطربوں کے سازوں پر اور مسجدوں کے منبروں پر بیک وقت گھومنے لگتا۔ یحییٰ نے اس پروپیگنڈے سے خوب فائدہ اٹھایا۔ چونکہ ہارون کے خزانہ شاہی پر اس کے ہاتھ تھے اس لئے اس کا دست سخا جس طرف اٹھتا سونے اور چاندی کا موسلا دھار مینہ برسا جاتا تھا۔ اس کی فیاضیاں یہاں تک موثر ثابت ہوئیں کہ عہد عباسیہ کا سب سے بڑا شاعر ابو نواس بھی قصیدہ گوئی کے وقت یحییٰ کو خلیفہ پر ترجیح دیتا تھا۔

(۴)

ہولناک انجام

یحییٰ برمکی کی فیاضیوں اور سخاوتوں کا حال اگر تفصیل سے لکھا جائے تو اس کام کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہوگی کیونکہ برمکی بعض اوقات ہمیں ایسی بلندی پر دکھائی دیتا ہے جہاں حاتم طائی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ کوئی شاعر نہ تھا جس کی جھولی میں یحییٰ کے عطا کئے ہوئے دینار نہ ہوں۔ کوئی عالم نہ تھا جس کا کیسہ اس نے زر و جواہر سے بھر نہ دیا ہو۔ کوئی نادار نہ تھا جو یحییٰ کے دروازے پر گیا ہو اور امیر کبیر بن کر واپس نہ گیا ہو۔ اسی فیاضی کے باعث اس نے سارے عالم اسلامی کا دل مٹھی میں لے رکھا تھا۔ اس کی مقبولیت و محبوبیت کے مقابلے میں خلیفہ کی ہردلعزیزی بھی کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بہت بڑا سیاس اور مدبر تھا وہ تلوار کا کام محبت سے لینا جانتا تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ تمام عہدوں پر ایرانیوں کو متمکن کر دیا۔ گویا عباسی خلافت کے نام پر ایرانی حکومت قائم کرکے دکھا دی۔ لیکن یحییٰ کی شخصیت تمام حلقوں پر حاوی تھی اس لئے اس کے خلاف کسی معترض کی زبان نہ کھل سکی یہاں تک کہ خلیفہ بھی دم مارنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ صوبہ خراسان اور دوسرے ایرانی علاقوں میں تو خصوصیت سے برمکیوں کا طوطی بول رہا تھا۔ اور بعض مورخین تو یہاں تک لکھ چکے ہیں کہ ایران میں مقامی عنصر کو اس درجہ تقویت پہنچائی گئی تھی کہ اس کی ایک حرکت ہی خلافت عباسیہ کو مشرقی مقبوضات سے محروم کر سکتی تھی۔ لیکن فساد و شرارت کے اجزا کو کبھی منظم ہونے کا موقع نہ ملا اس لئے سیاسی اضطراب چھوٹی چھوٹی شورشوں سے آگے بڑھنے کے قابل نہ ہو سکا۔ ۱۷۸ھ میں یحییٰ کو خراسان کا گورنر بنا دیا گیا اس نے اپنی ملکانہ قوت سے ایرانیوں کو از سر نو طاقتور بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ پانچ لاکھ عجمیوں کی فوج مرتب کی گئی لیکن ابھی وہ اپنا کام پورا کرنے نہ پایا تھا کہ خلیفہ نے اسے واپس بلا لیا اور وزارت عظمیٰ کا قلمدان پیش کیا۔ لیکن یحییٰ کے آتے ہی ایران کے ذرے ذرے سے بغاوت و شرارت کے چشمے ابل پڑے۔ ایرانی نوجوانوں نے نظام حکومت کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ خلیفہ نے موسیٰ بن عیسیٰ کو ایران کا گورنر بنا کر بھیجا۔ موسیٰ عرب تھے اور ہاشمی ہونے کے باعث ایرانی سازشوں سے وابستہ نہ ہو سکتے تھے اس لئے یحییٰ اور اس کے دونوں بیٹوں فضل و جعفر نے اس تقرر کی مخالفت کی لیکن خلیفہ نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ برمکی اپنی بات منوانے میں ناکام رہے ورنہ اس سے پہلے ادھر کوئی مطالبہ یحییٰ کی زبان پر آیا اُدھر خلیفہ نے سر تسلیم خم کر دیا۔ لیکن موسیٰ کے بارے میں یحییٰ کو مایوس ہونا پڑا۔ موسیٰ جب ایران پہنچے تو ان کے ساتھ ہی برمکیوں کی سازشیں بھی پہنچ گئیں ایرانیوں نے جگہ جگہ شورش و بغاوت کا بازار گرم کر دیا لیکن موسیٰ ہر فتنے کو خوش اسلوبی سے دباتے رہے۔

جب ایرانیوں کو معلوم ہوا کہ شورش و بغاوت کا تجربہ ناکام رہا ہے تو انھوں نے حکمت عملی سے کام لینا شروع کر دیا۔ مختلف ذرائع سے پراپگنڈا کیا گیا کہ موسیٰ اپنی خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے فوجی بغاوت کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ دربار خلافت میں یحییٰ اور اس کے بیٹوں کا اثر و اقتدار کارفرما تھا اور خلیفہ ان کی بات مانتا تھا اس لئے موسیٰ کے خلاف جتنی خبریں موصول ہوتی تھیں انھیں افسانہ بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن خلیفہ پر حقیقت روشن ہو چکی تھی۔ اسے ذاتی ذرائع سے معلوم تھا کہ جو الزام موسیٰ پر عاید کیا جا رہا ہے اس کی مجرمانہ حیثیت سے خود برمکی لپٹے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہارون رشید خود ایران گیا جب بمقام رے پہنچا تو موسیٰ استقبال کی غرض سے آگے اور نیاز و عقیدت کا اظہار کیا۔ جب وہ خلیفہ کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مستند اور معتبر معلومات سے ثابت کیا کہ سارے ایران میں برمکیوں آگ پھیلا رکھی ہے۔ وہ عباسی خلافت کے خلاف وسیع سازش کر ہیں۔ خلیفہ کو پہلے بھی صورت حال سے آگاہی تھی لیکن موسیٰ کی

نے شبہ کو یقین سے بدل دیا۔ بایں ہمہ خلیفہ سیاسی طور پر بہت زیادہ وسیع الظرف اور بلند حوصلہ تھا اس نے برمکیوں سے کسی قسم کی باز پُرس نہ کی بلکہ حسن سلوک میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ برمکی شہرۂ آفاق مدبر ہونے کے باوجود اس ہلاکت انگیز ہنگامے سے بے خبر رہے جو خلیفہ کی معنی خیز خاموشی میں چھپا ہوا تھا۔ وہ ابومسلم کا قصاص لینے اور ایرانی حکومت کو عالم وجود میں لانے کے لئے بدستور کوششیں کرتے رہے۔

خلیفہ جب ایران سے واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ سازش کا حلقہ ایرانیوں ہی تک محدود نہیں بلکہ یہ آگ تو عباسی خاندان تک بھی پہنچ چکی ہے، برمکیوں نے عبدالملک بن صالح کو جو ہارون رشید کے دادا کا بھائی تھا، اپنے ساتھ ملا رکھا ہے اور ابن صالح کو خلافت کا لالچ دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جعفر بن یحییٰ برمکی نے یحییٰ بن عبداللہ علوی کو بھی رہا کر دیا ابن عبداللہ بہت بڑے انقلابی تھے انھوں نے خروج کیا تھا لیکن انہیں شکست کھانا پڑی تھی۔ اس کے بعد ابن عبداللہ جعفر کی نگرانی میں تھے لیکن جعفر نے انھیں رہا کر کے فتنہ و بغاوت کے لئے رستہ صاف کر دیا۔ اس واقعے سے خلیفہ کے صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہو گیا لیکن اس نے اپنے عزم و ارادہ پر خاموشی کا پردہ ڈالے رکھا۔ آخر وہ خونیں رات بھی آ گئی جس کا دامن برمکی خون سے رنگین کیا گیا۔

۱۸۷ھ کو جب صفر کا ہلال جلوہ دکھا کر غایب ہوا تو خلیفہ انبار میں تھا۔ وہ خیمہ سے باہر آیا۔ ادھر اُدھر گھومنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ امرا اس کی غیر معمولی حالت کو حیرت سے دیکھتے تھے لیکن خلیفہ کی آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں کوند رہی تھیں اس لئے کسی شخص کو دریافت حال کی جرات نہ ہو سکی۔ آخر رات اپنی زندگی کے درمیانہ حصے تک پہنچ گئی۔ خلیفہ نے اپنے غلام مسرور کو بلایا اور اس سے کہا۔ "مسرور ـــ! مسرور! جاؤ جعفر کا سر کاٹ لاؤ۔ لیکن دیکھنا مسرور کسی کو خبر تک نہ ہو"

مسرور یہ سنتے ہی کانپ اٹھا۔ وہ حیران تھا کہ ماجرا کیا ہے؟ بادشاہ ـے شخص کو قتل کرانا چاہتا ہے جو اسے بھائی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ یہ ـکر ہو سکتا ہے؟ مسرور خاموشی سے کھڑا تھا اور اس کی خاموشی سے ـدول حسرتیں جھانک رہی تھیں۔ خلیفہ نے اسے چپ چاپ دیکھ کر مسرور! خاموش کیوں ہو؟ جاتے کیوں نہیں۔ دیر کرنے سے فائدہ؟" ـنے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔ "امیرالمومنین ـــ!" امیرالمومنین ـــ!" خلیفہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "خاموش رہو ـر تعمیل کرو"

مسرور کا قدم تو مشکل سے اُٹھتا تھا لیکن وہ آقا کے حکم سے مجبور تھا آخر وہ تھوڑی دیر کے بعد آیا۔ اس کی بغل میں جعفر کا آغشتہ بخون سر تھا لیکن آنکھوں میں آنسوؤں کا ہجوم تھا۔ کیونکہ مسرور بھی برمکی خاندان سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتا رہا۔ اس کے بعد یحییٰ و فضل کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اور جہاں جہاں بھی کوئی برمکی یا خاندان برامکہ کا ہوا خواہ موجود تھا گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح ایک ہی رات میں وہ تحریک منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی مر گئی جو عباسیہ کی جگہ ایرانی عروج کو برسرکار لانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد خلیفہ نے اعلان کر دیا کہ جو شاعر برامکہ کا مرثیہ کہے گا اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ برمکیوں کے ساتھ ہی عبدالملک بن صالح اور دوسرے سازشیوں کو بھی قید کر دیا گیا۔

ـــــــ (۵) ـــــــ

افسانہ اور حقیقت

خاندان برامکہ سے بہت سے افسانے وابستہ ہیں جو اس کی تباہی کے بعد محفلوں کی زینت بنے رہے۔ اگر ہم ان تمام افسانوں کو ایک جگہ جمع کریں تو اس مجموعہ کے سامنے طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدیں بھی بے کیف نظر آئیں گی۔ اکثر افسانے تو افسانوی حیثیت سے آگے نہیں بڑھ سکے مگر بعض میں تاریخی رنگ بھی بھرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ طبری نے خاندان برامکہ کی تباہی کا جو سبب لکھا ہے اس کے لفظ لفظ سے کذب و دروغ اور غیر ذمہ دارانہ بہتان طرازی کی بو آتی ہے۔ اس مورخ نے اپنے فرائض کو بالکل نظر انداز کر دیا اور محض ایک بے سروپا کہانی پر کورانہ اعتماد کر لیا۔ یہ اتنی بڑی لغزش ہے جس کے باعث طبری کی تمام علمی و تاریخی صلاحیتوں کا ایوان بھی متزلزل نظر آتا ہے۔ چنانچہ طبری نے جو کچھ لکھا اس کا مفہوم یہ ہے کہ۔

> ہارون رشید کی ایک بہن کا نام عباسہ تھا جس سے خلیفہ کو بہت زیادہ محبت تھی۔ اسی طرح جعفر بن یحییٰ برمکی بھی خلیفہ کا عزیز ترین دوست تھا وہ اس سے ایک لمحہ بھی جدا نہ ہونا چاہتا تھا۔ خلیفہ، عباسہ اور جعفر تینوں مل کر شراب پیا کرتے تھے۔ محفل ناؤ نوش میں عباسہ بھی جعفر کی طرح کسی تکلف کے بغیر شریک ہوا کرتی تھی۔ اس میل جول کے باعث خلیفہ نے عباسہ کا نکاح جعفر سے باندھ دیا تھا تاکہ پردہ و حجاب کی مجبوریاں دور ہو جائیں۔ بایں ہمہ خلیفہ نے دونوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ خانگی زندگی کے حقیقی تعلقات قائم نہ کئے جائیں

لیکن جعفر و عباسہ اس حد سے آگے بڑھ گئے اس لئے خلیفہ مشتعل
ہو گیا اور اس نے خاندان برامکہ کا خاتمہ کر کے ہی دم لیا"۔
یہ ہے وہ کہانی جس میں طبری کی مورخانہ جہالت نے تاریخ کا رنگ
بھرا اور آنے والے افسانہ نگاروں کے لئے ایک مذموم یادگار کے طور پر
چھوڑ گیا۔ اس کہانی کی لغویت کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے
کہ اس کا ذکر کسی ہمعصر واقعہ نگار یا مورخ نے نہیں کیا۔ بلکہ یہ واقعے سو
پورے سو برس بعد کی پیداوار ہے۔ اگر جعفر و عباسہ کا واقعہ صحیح ہوتا تو
اسے زمانہ ہارون رشید کے علوی اور فاطمی پراپگنڈے کے لئے کیوں نہ
ساری دنیا میں پھیلا دیتے؟ ان لوگوں کو تو عباسیوں کے خلاف اگر رائی
بھی میسر آجاتی تھی تو اسے پہاڑ بنا کر پیش کرتے تھے اور برمکی تو ایرانی ہونے
کے باعث علویوں کے بہت زیادہ عقیدتمند بھی تھے اس لئے یہ کیونکر
ممکن تھا کہ علوی اس واقعہ کو آندھی کی طرح عرب و ایران میں نہ
پھیلا دیتے۔ کیونکہ یہ بات اگر عوام تک پہنچ جاتی تو ہارون الرشید کی
خلافت ذلت۔ رسوائی کی اس گہرائی میں جا گرتی کہ آج اس کا پتہ تک
نہ چلتا۔ لیکن کوئی واقعہ ہوتا تو علوی اس سے فائدہ اٹھاتے۔ لہذا یہ محض
طبری کی اختراع ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خلیفہ نے اگر اپنی مرضی سے
عباسہ کو جعفر کے نکاح میں دے دیا تھا تو پھر اسے جنسی تعلقات پر کیونکر
اعتراض ہو سکتا تھا۔ زن و شوہر کا رشتہ ہی اس غرض سے قائم کیا
جاتا ہے۔ اگر یہ غرض ہی پیش نظر نہ ہو تو پھر عام انسانی رسم و رواج
کے علاوہ شریعت اسلامیہ کی رو سے بھی نکاح حقیقی معنی میں نکاح نہیں ہوتا
اگر خلیفہ اپنی بہن کو مردانہ قربت سے دور ہی رکھنا چاہتا تھا تو پھر اس
نے عباسہ کو جعفر کی زوجہ کیوں بنایا؟ کیا خلیفہ جعفر سے ڈرتا تھا؟ اس
کا جواب طبری اور اس کے افسانہ نگار دوستوں کی کہانیاں نہیں دے
سکتیں لہذا جعفر و عباسہ کا افسانہ تاریخ کے دامن پر ایک شرمناک دھبہ
ہے جسے مٹائے بغیر حقیقت کی روشنی ظاہر نہیں ہو سکتی۔
اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ خلیفہ کو شراب نوشی کے وقت ایک
ہم جلیس کی ضرورت رہتی تھی تو یہ مقصد ان ہزاروں پری پیکر کنیزوں
سے پورا ہو سکتا تھا جو ہر وقت ایوان شاہی میں مست خرامی کرتی
رہتی تھیں آخر خلیفہ کو اس مذموم و ملعون شغل میں اپنی حقیقی بہن ہی
کو شریک کرنے کی کیوں ضرورت پڑی؟ عقل و بصیرت تو اس بات کو
مان نہیں سکتی۔ اس کے علاوہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ذلیل ترین شرابی
[illegible]

ذلیل اور اوباش لوگوں کی طرح بھی خاندان کی عزت اور اپنی رسوائی کا
احساس نہ ہو۔ لہذا یہ افسانہ شرارت پر مبنی ہے۔ اگر طبری نے مورخانہ
فرائض سے آنکھیں بند کر لی تھیں تو وہ کم سے کم میخوارانہ نفسیات
پر غور کر لیتا تو بھی اسے معلوم ہو جاتا کہ کوئی شرابی اپنی بہن کے سا[تھ]
ساغر و پیمانہ کا نام تک نہیں لے سکتا۔ لیکن طبری کو انسانی نفسیات
واسطہ ۔۔۔؟ ۔۔۔ سے

از حجاب امشب نظیری بادہ بر سجادہ ریخت
پارسا آداب میخوردن نمی داند کہ چیست

ایک اور بات بھی غور طلب ہے کہ عربوں اور خصوصاً ہاشمیوں کو
اپنی عصبیت اور خاندانی شرافت پر فخر ہوتا ہے لیکن جب اس افتخار
سے بادشاہی بھی ہم کنار ہو جائے تو اس کی شان کا اندازہ نہیں لگایا
جا سکتا۔ ہارون نہ صرف ہاشمی تھا بلکہ خاندان عباسیہ کا سب سے بڑا
بادشاہ بھی تھا اس لئے عقل اس بات کو بھول کر بھی تسلیم نہیں کر سکتی
کہ ایک ہاشمی بادشاہ اپنی بہن کو ایک مجوسی الاصل ملازم کے حلقہ زوجیت
میں پھینک دے۔ اور ملازم بھی وہ جس کے دادے کی ولدیت کے متعلق
اب تک کوئی تحقیقی رائے قائم نہیں ہو سکی۔ اس لئے جعفر و عباسہ کے
نکاح کا افسانہ صرف جاہلانہ گمراہی کا مرہون منت ہے۔ رہا یہ سوال
کہ ہارون خراب نوش تھا۔ اس کا جواب طبری بھی نہیں دے سکا طبری
اور اس کے تمام حلیفوں کو اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ہارون ضرورت سے
زیادہ پابند صوم و صلوٰۃ تھا۔ اب ذرا سوچیے کہ جو شخص سر شام ہی بد مستیوں
میں آجائے وہ عشا کی نماز کیونکر پڑھ سکتا ہے اور پھر جو شخص عشا
کے بعد نشہ و مستی کی نیند سو جاتا ہے وہ صبح صادق کو بیدار ہو کر دوگانہ
فجر کس طرح ادا کر سکتا ہے اس لئے ہارون رشید کی میخواری بھی ا[فسانہ]
کا ذبانہ افسانہ کا ایک باب ہے جس کے ذریعہ سے عباسہ کو جعفر کی ز[وجہ]
بنا دیا گیا۔ اور پھر اسی رشتۂ زوجیت کو خاندان برامکہ کی تباہی و بربادی
کا سبب قرار دیا گیا۔ اکثر مورخین تو یہاں تک لکھ چکے ہیں کہ ایک
ہارون رشید دستر خوان پر بیٹھا تھا جب کھانے چنے گئے تو ہار[ون]
ایک رکابی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت ہارون کا طبیب خا[ص]
جبریل یہودی بھی پاس بیٹھا تھا۔ اس نے فوراً کہا کہ اس رکا[بی]
سے آپ نہ کھائیے۔ خادم اس رکابی کو اٹھا کر لے گئے۔ دو[سرے]
خلیفہ کو معلوم ہوا کہ یہ پالک تھی جس سے منع کیا گیا تھا جبر[یل]
[illegible]

آپ شراب نہیں پیتے اس لئے میں نے آپ کو اس کے استعمال سے منع کیا تھا۔ اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ ہارون شراب سے کوسوں دور تھا لہذا عباسہ و جعفر کو محفل شراب و مینا میں لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
ان حقائق کے پیش نظر آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ بعض مورخین غیر ذمہ داری کے میدان میں جاہلوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں رہی برامکہ کی تباہی تو اس کا سبب ہی ملوکانہ مصلحتیں تھیں جو برامکہ کو بام عروج پر چڑھانے کا باعث ہوئیں کیونکہ ملوکیت ہر چیز اور ہر تعلق کو ملوکانہ اغراض ہی سے دیکھنے کی عادی ہے اب عباسہ کی بھی سن لیجئے اس کا نکاح محمد بن سلیمان سے ہوا تھا محمد کی وفات کے بعد اس کی دوسری شادی ابراہیم بن صالح بن علی عباسی سے کی گئی اب وہ مقام آگیا ہے جہاں ہم تحریک برامکہ کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکتے اس لئے اس تذکرہ کو ختم ہی کرنا بہتر ہے۔

غزل

اللہ عجب عالمِ حسرت، شبِ غم ہے — ویران نگاہوں میں نہ ہستی نہ عدم ہے
ہے ختم کہانی مگر آنکھوں میں تو دم ہے — صورت وہ اگر اب بھی دکھا جائیں کرم ہے
پروانہ بھٹک جائے جواب بھی تو ستم ہے — جو شمعِ کلیسا ہے وہی شمعِ حرم ہے
آثار ہیں پیدا سحرِ وصل کے شاید — نکہت کی طرح روح مری مائلِ رم ہے
یہ ہوشِ وفا اور یہ احساسِ مصیبت — اے تکملۂ شوق محبت ابھی کم ہے
دشواریٔ منزل ہے فقط ہوشِ طلب تک — بیخود جو ہوا ہوں تو نہ جادہ نہ قدم ہے
مل جائے جہاں تو وہی گھر گھر ہے ہمارا — ہستی ہے تو ہستی ہے عدم ہے تو عدم ہے
شاید ہے پرستش کی یہی آخری منزل — اب دیر مرے پیش نظر ہے نہ حرم ہے
مجھ کو ہو کس امید پہ احساسِ محبت — قربانِ تغافل نہ ستم ہے نہ کرم ہے
ساقی ترے الطاف کا ممنون ہوں لیکن — پیمانے میں جو کچھ ہے مرے ظرف سے کم ہے

یہ ذوقِ شفیق اور یہ طبیعت کی قناعت
مٹی کا پیالہ بھی مجھے ساغرِ جم ہے!

شفیق کوٹی

عدالتِ فاروقی رضی اللہ تعالیٰ عنہم

جو لہرایا سوادِ شام پر اسلام کا پرچم
تو کچھ نیند جاگ اٹھا ضمیرِ جبلہ بن ایہم
اٹھا اور اٹھ کے یثرب کی طرف با تخت و تاج آیا
بہ شاہانہ حشم آیا بہ طمطراقِ مزاج آیا
مآلِ ارتداد و کفر سامانی سے بے بہرہ
نظر ظلمت شناسا، ذہن دھندلا، خوشنما چہرہ
تمیز و عقل و اندیشہ پہ مبہم خواب سے طاری
مثیلِ "مبتلائے شدتِ کابوس" بیداری
اسی صورت، اسی حالت، اسی انداز میں جبلہ
اسی کیفیتِ جامِ شتاب آغاز میں جبلہ
مدینے کی سکونت کے لئے با کر و فر آیا
نہ تھا شائستۂ انجامِ مستقبل، مگر آیا
صدائے نعرۂ اللہ اکبر جا بجا گونجی
بڑے چھوٹے لٹاتے تھے جز اک اللہ کی پونجی
گلے ملنے لگے بڑھ کر مہاجر اور انصاری
پئے اظہارِ ہمدردی، پئے توقیر دینداری
اسے فاروقِ اعظم نے لگایا اپنے سینے سے
بسایا قلبِ نو مسلم، خلافت کے پسینے سے
رئیسانہ وظائف دیکے فکرِ بیش و کم کھویا
اصولاً ہنس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔ گویا
فروغِ دنیوی بخشا تو اعزازِ مناسب بھی
...ع برتری بھی سطوت فرقِ مراتب بھی

مگر یہ سب مراعاتِ خجستہ شرع کی حد تک
ہوئی لغزش تو درّوں سے نہ چھوٹے زیبِ مسند تک

زرا سی بات پر اک دن اسی جبلہ بن ایہم نے
نوازا تھا جسے دلداریٔ فاروقِ اعظم نے
"مسلمانِ فرازہ" کو سرِ بازار پیٹا بھی
جھنجوڑا بھی، دھکیلا بھی، گرایا بھی، گھسیٹا بھی
ڈھل آئے بیکسی کی ریش گرد آلود پر آنسو
بدن کانپا، زباں ٹھٹکی، بندھی ہچکی، لگے اچھو
حضورِ عدلِ فاروقی جونہی پہنچا یہ فریادی
اخوت نے جلالِ بے اماں کی روح گرما دی
صفاتِ درگذر، انصاف کا پہلو بدل آئے
نظر میں رعب، سرخی آنکھ میں، تیوریہ بل آئے

ہوا ارشاد کیوں؟ تو نے طمانچہ اس کو مارا تھا
کہا جُبلہ نے مجھکو میری غیرت نے اُبھارا تھا

کیا دریافت پھر، آخر قصور اس کا خطا اس کی
بہ جائے خود تجھے جائز تھی پاداشِ سزا جس کی

کہا جُبلہ نے بازاری نکموں کی خطا کیسی
رئیسانہ سماعت میں غریبوں کی صدا کیسی

کسی مفلس کے بارے میں قصور و بے قصوری کیا
کوئی الزام رکھ کر پیٹنا ایسا ضروری کیا

سبب ہو یا نہ ہو نرمی غریبوں کو نہیں سجتی
اسی دنیا میں تالی دونوں ہاتھوں سے نہیں بجتی

عدالت بول اٹھی، اسلام کے اندر یہ نازیبا
جنونِ خود روی میں اس کو تھپڑ یا اسے گھونسا

قصور اس کا اگر تھا بھی تو آ کر مجھ سے کہنا تھا
یہ ہے اسلام کی دنیا یہاں آپے میں رہنا تھا

یہاں آنا تھا اور لانا تھا میرے روبرو اس کو
امورِ شرع کے اندر خودی کی جرأتیں کس کو

بہ قانونِ شریعت، میں خلیفہ تھا، بیاں لیتا
ثبوتِ حق و باطل پر بری کرتا سزا دیتا

کہا جُبلہ نے میں جس کی سزا پر آپ قادر تھا
"حضورِ عدل" اس دعوی کی نوعیت سے قاصر تھا

تو از روئے شریعت تم پہ عاید ہے قصاص اس کا
تجھی پر کچھ نہیں موقوف، جیسا جرم ہو جس کا

عدالت جرم کو لیتی ہے شخصیت کو کیا جانے
ترازو میں برابر ہیں یگانے اور بیگانے

جُبلہ

اجازت دیجیئے مجھکو کہ اس مذہب سے پھر جاؤں
جہاں نادار انساں کو طمانچے پر سزا پاؤں

فاروق اعظم

مجھے اب سوچنا ہو گا علاجِ نیتِ بد بھی
طمانچے کا قصاص اس وقت، پھر "الحاد" کی حد بھی

جُبلہ

رعایت چاہتا ہوں آج کی شب سوچ لینے کی
پشیمانی کے ہاتھوں زعم کا مُنہ نوچ لینے کی

مساواتِ شریعت عجبِ جُبلہ کو نہ راس آئی
لبھانے کیلئے دل ظلمتِ غفلت اساس آئی

ردائے شب میں رہوارِ انانیت کیا پویا
مگر اس "بیچ نکلنے" پر بہ بامِ مرگ تک رویا

شاد عارفی،

طبیّہ عجائب گھر کے متعلق دو قابل قدر آراء

نواب احسان علی خاں صاحب آف مالیر کوٹلہ صدر شیعہ کانفرنس

مجھے طبیّہ عجائب گھر قادیان دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی حکیم عبدالعزیز خاں صاحب اس طبیّہ عجائب گھر کے مالک ہیں انھوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے ہر قسم کی یونانی اور ویدک نادر ادویہ جمع کی ہیں اس کے علاوہ خاں صاحب ہر قسم کی مرکب ادویہ تیار کرتے ہیں اور ان کی تیاری میں اس بات کا خاص اہتمام رکھتے ہیں کہ ہمیشہ تازہ اور اعلیٰ درجہ کی ادویہ استعمال کریں۔ ادویہ کے علاوہ مختلف قسم کے جواہرات ادویہ میں استعمال اور نمائش کی غرض سے اس طبیّہ عجائب گھر میں موجود ہیں تمام ادویہ کی قیمت نہایت مناسب ہے اور حاجتمند لوگوں کے فائدہ اٹھانے کا نہایت اچھا موقع ہے"

خواجہ محمد حیات صاحب ممبر جنرل کونسل (وافسر پبلسٹی) انجمن حمایت اسلام لاہور

"آج کاروباری سلسلہ میں مجھے قادیان آنے کا اتفاق ہوا۔ ایک مکان پر طبیّہ عجائب گھر کا بورڈ دیکھ کر اشتیاق دید ہوا۔ میں جناب حکیم عبدالعزیز خاں صاحب مالک طبیّہ عجائب گھر کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے نہایت محبت اور دلی خلوص کے ساتھ مجھے اپنے جمع کردہ نوادرات دکھلائے۔ بیش قیمت بحری اشیاء صدف مروارید۔ مرجان، عنبر وغیرہم خالص اور اصلی کے علاوہ معدنیات از قسم یاقوت یشب۔ زہر مہرہ۔ لاجورد۔ قلب الحجر۔ پکھراج وغیرہ جمادویات میں شامل ہوتے ہیں نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی مہیا کی گئی ہیں۔ حکیم صاحب کی یہ خاص فیاضی ہے کہ مرکبات میں یہ اشیاء خالص استعمال ہوتی ہیں قیمتیں جو مجھے بتلائی گئی ہیں حیران کن ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ ایسی خالص ادویات اس قدر قلیل قیمت پر کس طرح فروخت ہو سکتی ہیں۔ دراصل حکیم صاحب کو طب یونانی اور یونانی ادویات کو سریع الاثر ثابت کرنے کا عشق ہے اور وہ اسی وجہ سے خسارہ برداشت کر رہے ہیں۔ میں نے حکیم صاحب کے پاس جڑی بوٹی۔ زعفران، جدوار وغیرہ تبتی و نیپالی کستوری وغیرہ کی ایسی اقسام دیکھی ہیں جو مجھے زندگی میں آج ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ حکیم صاحب نہایت خوش خلق اور مہمان نواز ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پبلک اس مفید ادارے سے فائدہ اٹھائے اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتی رہے۔" 22—2—43

طبیّہ عجائب گھر قادیان نہایت اعلیٰ اور خالص ترین مفردات مثلاً مشک، زعفران، عنبر، مروارید، یاقوت، زمرد، فیروزہ، کہربا، ست سلاجیت، جدوار، قلب الحجر، نیز کشتہ جات ہر قسم و مرکبات مثلاً حب جواہر مہرہ، عنبری، ازد جام عشق، لبوب کبیر، سونے کی گولیاں، اکسیر اعظم، روح نشاط وغیرہ وغیرہ کے باعث ہندوستان بھر میں شہرت حاصل کر چکا ہے۔

مکمل فہرست ادویہ مفت طلب فرمائیں

طبیّہ عجائب گھر قادیان

چینی کی گڑیا

تاریخ چین کا ایک رنگین باب

از:۔ شبلی بی کام

جنرل چیانگ کائی شیک کا رومان

چین کے "مرد مجاہد" کے چہرے میں بظاہر کوئی دلکشی نہیں ہے۔ لیکن
ں کی چھوٹی چھوٹی پراسرار آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک خاص قسم کی
اذبیت اور کشش موجزن ہے۔ اور یہی وہ مقناطیسیت تھی جو ایک
ہی جمال چینی دوشیزہ کے دل پر بھی اثر کئے بغیر نہ رہی۔

چیانگ کائی شیک ۱۸۸۶ء میں صوبہ چکیانگ کے ایک گاؤں چیکاؤ
ں پیدا ہوا۔ اس نے ٹوکیو کے ملٹری سٹاف کالج میں فوجی تعلیم پائی،
یکن اس کی طبیعت بچپن ہی سے حساس اور رومانیت پسند واقع ہوئی
تی۔ اس نے اپنی جوانی کا اکثر حصہ جاپان کی نزہت بار فضاؤں میں گزارا
ہے۔ اور یہی ماحول اس کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے بغیر نہ رہ سکا۔

چیانگ نے جب وادی شباب میں قدم رکھا تو اس کے دل میں
چین کی سرسبز وادیوں اور دیہاتی مرغزاروں کی سیاحت کا شوق پیدا
ہوا۔ چنانچہ وہ کوہ و دمن کو عبور کرتا ہوا ایک جھیل کے کنارے آیا۔ موسم
بہار کی آمد آمد تھی۔ نسیم صبح گاہی کے فرحت انگیز جھونکے ارد گرد کی پھلواڑیوں
میں اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ نوجوان چیانگ اس منظر سے اتنا متاثر
ہوا کہ وہیں جھیل کے کنارے ہری ہری دُوب پر بیٹھ گیا۔ اور قدرت
کی گلکاریوں سے محظوظ ہونے لگا۔ اس کے روئیں روئیں سے مسرت
پھوٹ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر ناچنے لگ جائے۔ آج اسے
پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ زندگی ایک طویل قہقہے کا نام ہے۔ ابھی
س کی نگاہیں جھیل کی ہلکی ہلکی موجوں پر پھسل رہی تھیں کہ ایک دلآویز
گنگناہٹ نے اس کی محویت کا شیرازہ پریشان کر دیا۔ اس نے پیچھے
مڑ کر دیکھا تو ایک خوبصورت لڑکی نظر آئی۔ جو اپنے پھول دار لہنگے میں
ل "چینی کی گڑیا" معلوم ہوتی تھی — وہ باغیچے میں سے سفید سفید
ں اکٹھا کر کے گلدستہ بنا رہی تھی۔ نوجوان چیانگ اٹھ کر کھڑا ہو گیا
ی گڑیا" بے اختیار اس کے قریب آ گئی — دونوں کی نگاہیں

ملیں — اور جھک گئیں۔

"تم کون ہو؟ — میرا مطلب یہ ہے کہ تمہارا نام کیا ہے"؟ آخر
چیانگ نے جرات کر کے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ اور لڑکھڑاتے ہوئے
لہجہ میں دریافت کیا۔

"می لنگ"! دوشیزہ نے موسیقی نواز آواز میں جواب دیا۔ اور اپنی
نگاہوں کی شراب اس کی عمیق آنکھوں کے پیمانے میں انڈھیل دی۔

"می لنگ؟" چیانگ نے دہرایا۔ "می لنگ اچھا نام ہے۔ کم سے
کم مجھے پسند ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ مسکرا دیا۔ اور اس کے ہاتھوں میں
پکڑے ہوئے سفید پھولوں کو دیکھنے لگا۔ "چینی نام عام طور پر دلکش ہوتے
ہیں۔ لیکن ذرا یہ تو بتاؤ! ان بچارے پھولوں نے کون سی خطا کی ہے؟
کہ تم نے اس بے پروائی کے ساتھ ان کو شاخوں سے توڑ لیا ہے؟"

"کل میری سالگرہ ہے۔" می لنگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں ان
گلدستوں سے اپنے کمرے کو سجاؤں گی۔ اور آخر پھول توڑنے ہی کے لئے
تو ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔ پھول توڑنے ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن شاید
تمہیں معلوم نہیں کہ جب ان کو توڑ لیا جاتا ہے تو ان کی دلکشی زائل
ہو جاتی ہے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد یہ مرجھا جاتے ہیں۔" اس کی نظریں
می لنگ کی نظروں سے الجھ گئیں اور وہ بولتے بولتے چُپ ہو گیا۔ می لنگ
جھینپ سی گئی۔

"تم تو اچھے خاصے فلسفی نظر آتے ہو۔ اب بھلا میں کیا جواب دے
سکتی ہوں مجھے ایسی باتوں کے جواب نہیں آتے۔ اگر تم کہتے ہو تو یہ لو
میں ان پھولوں کو پرے پھینک دیتی ہوں۔"

"نہیں نہیں۔" چیانگ نے اس کے ہاتھوں کو روکتے ہوئے کہا،
میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ یہ پھول قدرت نے تمہارے ہی لئے پیدا کئے ہیں

نے جی چاہے توڑ لو۔ اگر کہو تو میں بھی تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"شکریہ!" می لنگ نے مسکرا کر گردن جھکا لی۔

"تم بڑی بھولی بھالی ہو۔" یہ کہہ کر چیانگ پلٹا۔ اور ایک شاخ سے چند خوبصورت پھول توڑے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ لو۔ میری طرف سے اپنی سالگرہ کا تحفہ —!"

"میری سالگرہ تو کل ہے۔"

"کل؟ لیکن میں کل تمھیں کیسے مل سکوں گا؟"

"کل ہمارے گھر میں بہت سے مہمان آئیں گے۔ تم بھی چلے آنا۔ مجھے تمھاری باتیں اچھی لگتی ہیں۔ میں اپنی بہن سے بھی تمھارا تعارف کراؤں گی"

دراصل می لنگ اس کی نگاہوں کا شکار ہو چکی تھی۔ اور چیانگ؟ — اس کی تو خواہش ہی یہ تھی کہ "چینی کی گڑیا" کو آنکھوں میں بٹھا کر کہیں روپوش ہو جائے۔ ان پہاڑوں کے اس پار چلا جائے۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک دوشیزہ کے دام عشق میں گرفتار ہوا تھا۔ اس نے دفور لذت سے ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ وہ پھر باتیں کرنے لگی۔ می لنگ ہنس ہنس کر اس سے مخاطب ہو رہی تھی۔ اور ایک اجنبی لڑکی کا یوں ہنس ہنس کر باتیں کرنا، چیانگ کے دل پر بجلیاں گرا رہا تھا —!

یہ حسین لڑکی خاندان سونگ سے تعلق رکھتی تھی اور جب چیانگ کو معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر سن یات سین کی بیوی کی منجھلی بہن ہے تو اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ڈاکٹر سن یات سین چین کا مشہور انقلابی لیڈر تھا۔ اور چیانگ کی ہمیشہ خواہش رہی تھی کہ اس کے ساتھ دوستانہ مراسم پیدا کرے می لنگ کے ساتھ اس کی اتفاقی ملاقات تائید غیبی سے کم نہ تھی۔ چنانچہ وہ بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ اور دیر تک نیلگوں جھیل کے کناروں پر ٹہلتے رہے۔

سالگرہ سے اگلے دن وہ پھر اسی نیلگوں جھیل کے کنارے آکر ملے — می لنگ نے اس روز ہلکے آسمانی رنگ کی ریشمی پوشاک زیب تن کر رکھی تھی۔ اور اس کے عارض گلگوں پر شباب کھیل رہا تھا۔ اس کی پرورش اگرچہ خالص امریکی ماحول میں ہوئی تھی۔ لیکن اس کے عضو عضو سے "چینیت" ٹپک رہی تھی۔ اس نے اپنی مرمریں باہیں نوجوان چیانگ کی کمر میں حمائل کر دیں اور وہ دونوں دیر تک جھیل کے کنارے ٹہلتے رہے۔ جب سورج غروب ہو گیا اور رات کی تاریکی نے زمین کے پست و بلند کو ڈھانپ لیا تو می لنگ نے رخصت ہوتے وقت چیانگ کی تاریک آنکھوں میں اپنی میگسار نظریں گم کرتے ہوئے کہا۔

"چیانگ! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" اور چیانگ کو محسوس ہوا جیسے یہ اسی کے دل کی آواز ہے۔ اس نے بے اختیار می لنگ کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ اور اس کی ناک کی پھنگل پر اپنی ناک کی پھنگل رکھ دی۔

اس کے بعد چیانگ کو مسز سن یات سن سے تعارف حاصل ہو گیا اور وہ اکثر اس کے گھر آنے جانے لگا۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں جب چین موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا چیانگ نے انقلابی تحریک میں اس درجہ سرگرمی سے حصہ لیا کہ ڈاکٹر سن یات سین حیران رہ گیا۔ اور اسے کیومن ٹانگ کی مستقل مجلس کا صدر بنا دیا می لنگ اب اس سے بہت زیادہ مانوس ہو چکی تھی۔ اور ایک روز جب وہ مکان کے پائیں باغ میں تنہا بیٹھے تھے تو چیانگ نے اپنی محبوبہ کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دباتے ہوئے کہا۔

"می لنگ! میں انقلابی تحریکوں میں بہت زیادہ مصروف رہتا ہوں اگر تم اپنے مستقبل کو میرے دامن سے وابستہ کر دو تو میری بہت سی پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں۔"

"چیانگ پیارے! میں تو پہلے ہی چاہتی تھی کہ ہم دونوں کی شادی ہو جائے تاکہ ہم ملک کی بہتری کے لئے زیادہ سرگرمی سے کام کر سکیں لیکن ..."

چیانگ کے آزمودہ کار چہرے پر زردگی کے بادل چھا گئے۔ وہ "لیکن" نہ سننا چاہتا تھا۔ اسی لفظ کے اگلے فقرے پر اس کی ساری زندگی کا دارومدار تھا۔ وہ گھبرا سا گیا۔

"لیکن کیا —؟" وہ اکھڑی ہوئی آواز میں بولا۔

"لیکن بات یہ ہے پیارے چیانگ! تم دین مسیحی کے پیرو نہیں ہو اس لئے میرے والدین تمھارے ساتھ میری شادی کرنے پر رضامند نہ ہوں گے۔"

چیانگ پر جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مذہبی قیود ان کی پاکیزہ محبت میں حائل ہو سکیں گی — تا وہ گہری سوچ میں کھو گیا — کیا اسے محض شادی کی خاطر اپنا مذہب تبدیل کر لینا چاہیے؟ کیا چین کے قوم پرست اسے گوارا کر سکیں گے کیا وہ عیسائی ہونے کے بعد بھی اپنے ملک و قوم کی خدمت سرانجام دے سکے گا —؟ یہ وہ خیالات تھے جن پر غور کرتے کرتے اس کا دماغ اٹھا۔ اور وہ ڈاکٹر سن یات سین کے مکان سے باہر نکل آیا۔

دو سال اسی کشمکش میں گزر گئے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں جب سن یات سین کا آفتاب حیات موت کے افق میں روپوش ہو گیا۔ تو چیانگ کا

قومیت پسندوں کی قیادت سنبھال لی۔ اور انقلابی تحریک کے سلسلہ میں ہانکو، شنگھائی اور کنٹن وغیرہ کے دوروں میں مصروف رہا لیکن ابھی تک اسے دماغی سکون میسر نہ آیا تھا۔ ادھر می لنگ بار بار لکھ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد شادی بیاہ کا انتظام کرے۔

آخر چین کے مرد مجاہد نے ایک روز فیصلہ کر لیا ـــ! وہ اپنی محبوبہ کی خوشی کے لئے دین مسیحی اختیار کرنے پر رضامند ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں دونوں شادی کی مسرت بخش زنجیروں میں جکڑے گئے۔ جس کے بعد ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ می لنگ آج "میڈم چیانگ کائی شیک" کہلاتی ہے اور اُسے ہر کام میں شوہر کے دوش بدوش دیکھا جا سکتا ہے ـــ!

(طبعزاد)

پیامِ حیات

حُسنِ ازل کو دیکھ لے پردۂ جانِ پاک میں — ایسی نظر ہے اب کہاں عرصۂ آب و خاک میں
موسمِ گل گزر چکا، بند ہوا درِ نشاط — بیٹھ گئی عروسِ مے چھپ کے حریمِ تاک میں
اُف رے فریبِ کائنات، عشق ہی صرفِ ننگ و نام — اب وہ کرامتیں کہاں دامنِ چاک چاک میں
عقل کی نارسی نے کی، دعوتِ آسماں قبول — جلووں کا اک ہجوم تھا گرچہ حجابِ خاک میں

ہائے وہ عہدِ گل کہ تھا بزم میں دَورِ جام بھی
بادہ بھی تھا بقدرِ ظرف اور صلائے عام بھی

اُٹھ کہ نگارِ صبح نے رُخ سے اُٹھا دیا نقاب — راہ بدل رہی ہے پھر گردشِ ماہ و آفتاب
مطربِ نغمۂ ازل! نشترِ تیز چاہیئے — جاگ رہی ہے نبضِ ہوش، قلبِ جنوں ہے محوِ خواب
اس ترے جہل پر نثار علم و یقین و عقل و ہوش — روزِ الست جو ہوا تیری بنائے انتخاب
بھول سکی نہ کائنات، معرکۂ نیاز و ناز — حُسن کی بزمِ امتحان، اور وہ عشق کا جواب
تو نے دیا چمن کو رنگ، رنگ کہ نور بن گیا — تو نے کیا کلی کو پھول، پھول کہ ہو گیا گلاب
عشق کا راگ تیری لَے صبحِ ازل کا وہ سکوت — حُسن نے بیخودی میں آپ بڑھ کے اُٹھا لیا رباب
عام ہے دعوتِ نظر دیدۂ شوق چاہیئے — حُسن ہے اب بھی گرمِ سیر زلف بدوش و بے حجاب

اُٹھ کہ جبیں سیاہ ہے شاہدِ کائنات کی
شمع بھڑک رہی ہے پھر انجمنِ حیات میں

علی حیات
حیدرآبادی

خواجہ حافظؒ اور اس کے ہمعصر سلاطین

کلام حافظ کا تاریخی پس منظر

از :- حضرت فریدیؔ

خواجہ حافظ کے سن شعور سے تقریباً ایک سو برس پہلے چنگیز خانی
ں سے اسلامی دنیا تہ و بالا ہو چکی تھی۔ اب اگرچہ چنگیز کی اولاد اسلام
سین و جمیل سراپا پر مفتون ہو کر جوق در جوق "دین الٰہی" میں داخل
رہی تھی اور گلبن اسلام کی ننگ دھڑنگ شاخوں پر ہری بھری
بلیں پھوٹ رہی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی سیاسی بدنظمی اور طوائف الملوکی
عالم تھا کہ اس سے ایران کے روڑے کنکر کو بھی پناہ نہ تھی ۔ اسی
دل میں خواجہ حافظ نے زندگی کی تیس منزلیں طے کر کے "وادیٔ شباب"
قدم رکھا اور اپنی آنکھوں سے عبرت انگیز واقعات مشاہدہ کئے لیکن
لہ خواجہ کا کلام اس وقت دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکا تھا اس
ہر حاکم اور ہر فرمانروا نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان دنوں شیراز
میر ابو اسحٰق حاکم تھا۔

امیر ابو اسحٰق

امیر ابو اسحٰق بے حد عادل اور ادب نواز حاکم و تاجدار تھا۔ اس کے
یر حاجی قوام الدین حسن نے شیراز میں ایک اسلامی درسگاہ قائم کی
رخواجہ حافظ کو شیخ الدرس مقرر کیا۔ یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا،
اسحٰق خواجہ کے قدردان تھے۔ بر سر دربار خواجہ کا کلام سنتے اور انعامات
کرتے تھے۔ ۷۵۴ھ میں امیر مظفر الدین اپنے لاؤ لشکر سمیت
ڑھ آیا۔ ابو اسحٰق نے اگرچہ مردانہ وار مقابلہ کیا مگر شکست کھائی
معرکے کے چار پانچ سال بعد اصفہان کے مقام پر مارا گیا۔ خواجہ
س کے قتل کی خبر سنی تو ان کا دل تڑپ اٹھا اور ذیل کا درد
یہ لکھا ؎

ا سر کوئے قوام منزل بود	دیدہ را روشنی از خاک درت حاصل بود
کا حسن دگل از اثر صحبت پا	بزبان لب دم آنچہ ترا در دل بود
دوست نباشم ہرگز	چہ تواں کرد کہ سعی من و دل باطل بود
بود اسحاقی	خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود
، حافظ	کز سر پنجہ شاہیں قضا غافل بود

ذیل کی غزل حاجی قوام الدین حسن کی شان میں ہے۔ مقطع میں
حاجی قوام کی فیاضی اور قدردانی کی طرف اشارہ ہے۔ اسلوب بیان
اور ندرت خیال ملاحظہ ہو ؎

عشقبازی و جوانی و شراب لعل فام	مجلس انس و حریف ہمدم و شرب مدام
ساقی شکر دہاں و مطرب شیریں سخن	ہم نشین نیک کردار و حریف نیکنام
شاہدے در لطف پاکی رشک آب زندگی	دلبرے در حسن و خوبی غیرت ماہ تمام
بادہ گلرنگ و تلخ و تیز خوشخوار و سبک	نقلے از لعل و نگار نقلے از یاقوت جام
بزمگاہ دلنشیں چوں قصر فردوس بریں	گلشنے پیرامنش چوں روضۂ دارالسلام
صف نشیناں نیک خواہ و پیشکاراں باادب	دوستداراں صاحب سر و حریفاں دوستکام
غمزۂ ساقی بیغمائے خرد آہختہ تیغ	زلف دلبر از برائے صید دل گسترده دام

نکتہ سنج بذلہ گو چوں حافظ شیریں سخن
بخشش آموز جہاں افروز چوں حاجی قوام

امیر مبارز الدین مظفر

امیر مبارز الدین سپاہیانہ مزاج کا آدمی تھا اس لئے ارکین سلطنت
اس کی سخت گیری سے نالاں تھے۔ چنانچہ بہت جلد معزول کر دیا گیا اور
آنکھوں میں تیل کی سلائیاں پھرا دی گئیں۔ بایں ہمہ چونکہ خواجہ پر گاہ
بگاہ اس کے الطاف و اکرام کی بارش ہوا کرتی تھی اس لئے اس کے
عزل پر خواجہ نے پردرد مرثیہ لکھا جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

شاہ غازی خسرو گیتی ستاں	آنکہ از شمشیر او خوں مے چکید
گر بیک حملہ سپاہے شکست	گہ بہوئے قلب شیراں مے درید
عاقبت شیراز و تبریز و عراق	چوں مسخر کرد وقتش در رسید

آنکہ روشن بد جہاں بینش بد و
میل در چشم جہاں بینش کشید

جلال الدین شاہ شجاع

یہ بادشاہ خود بھی عالم فاضل تھا۔ اور دربار کو بھی علما و فضلا سے

راست رکھتا تھا۔ خواجہ حافظ سے تو اسے خاص عقیدت تھی۔ اور خواجہ نے بیسوں غزلوں میں اسے یاد کیا ہے۔ ایک مقام پر تو امیر کی سعادتمندی سے اثر پذیر ہو کر اتنا کچھ کہہ گئے کہ جس کی خواجہ جیسے متوکل درویش سے توقع نہ ہو سکتی تھی ؎

جبین و چہرۂ حافظ خدا جدا نہ کند
زخاک بارگہِ کبریائے شاہ شجاع

یعنی خدائے عزوجل حافظ کی پیشانی اور چہرے کو شاہ شجاع کی بارگاہ سے جدا نہ کرے۔

انہی ایام میں خواجہ فقیہہ عمادی نام ایک بزرگ تھے جن سے امیر و شہزادوں کو بیحد عقیدت تھی۔ انھوں نے ایک بلّی پال رکھی تھی جس کے متعلق لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ "نماز" پڑھتی ہے اس پر خواجہ حافظ نے ایک غزل لکھی جو بہت جلد زبان زد خواص وعوام ہو گئی ؎

عابد نہادہ دام و سر حقہ باز کرد — آغاز مکر با فلک حقہ باز کرد
ساقی بیا کہ شاہد رعنائے صوفیاں — دیگر بجلوہ آمد و آغاز ناز کرد
اے دل بیا کہ ما بہ پناہ خدا رویم — زانچہ آستیں کوتہ و دست دراز کرد
اے کبک خوش خرام کہ خوش میروی بناز — غرّہ مشو کہ "گربۂ عابد" نماز کرد

حافظ مکن ملامت رنداں کہ در ازل
مارا خدا از زہد و ریا بے نیاز کرد

اس غزل سے عمادی صاحب کے حلقہ میں خواجہ حافظ کے خلاف سخت جوش پیدا ہو گیا۔ بعض شہزادوں نے بھی بُرا منایا ایک موقع پر کہ جب دربار علما اور فضلا سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور علمی مباحثے ہو رہے تھے کسی نے خواجہ کا یہ شعر پڑھ دیا ؎

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے از پسِ امروز بود فردائے

مخالفین نے کہا کہ خواجہ نے اس شعر میں قیامت سے انکار کیا ہے امیر بھی چونک پڑا اسی وقت ہرکارے دوڑائے گئے کہ خواجہ کو فی الفور دربار میں حاضر کیا جائے۔ آپ بے نیازی کے عالم میں خراماں خراماں تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ شعر میرا ہے مگر مخالفین نے اس کا ماقبل نہیں پڑھا ورنہ اس مغالطے میں نہ پڑتے چنانچہ اسی وقت ایک شعر موزوں کر کے یوں نغمہ سرا ہوئے ؎

[illegible]
[illegible]

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے گر از پسِ امروز بود فردائے

ترجمہ:۔ ایک عیسائی صبح کے وقت میخانے کے دروازے پر کھڑا دف و نے بجاتے ہوئے کیا خوب کہہ رہا تھا کہ اگر اسلام یہی ہے جو حافظ رکھتا ہے تو پھر آج کے بعد کل کیوں ہو؟

اس پر بادشاہ اور اہل دربار کھلکھلا کر ہنس پڑے اور حریف خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

امیر قطب الدین محمود

کچھ عرصہ بعد امیر قطب الدین محمود نے بادشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور شیراز کا امن مفقود ہو گیا۔ خواجہ حافظ گھر کو خیرباد کہہ کر اصفہان چلے گئے جب شیراز کی خانہ جنگی ختم ہو گئی اور امیر قطب الدین مطلق العنان تاجدار بن بیٹھا تو اس کے وزیر عماد الدین محمود نے رقعہ لکھ کر آپ کو بلوا بھیجا۔ مگر آپ نہ گئے اور قاصد کے ہاتھ ایک غزل لکھ کر بھیج دی جس کے صلہ میں وزیر نے خواجہ کے شایان شان انعام و اکرام اور تحف و ہدایا ارسال کئے۔ غزل مذکور کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود — بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود
بباغ تازہ کن آئین دین زردشتی — کنوں کہ لالہ برافروخت آتش نمرود
ز دست شاہد سیمیں عذار عیسیٰ دم — شراب نوش و رہا کن حدیث عاد و ثمود
چو گل سوار شود بر ہوا سلیماں وار — سحر کہ مرغ در آید بنغمۂ داؤد

بیار جام لبالب بیاد آصف عہد
وزیر ملک سلیماں عماد دیں محمود

سلطان زین العابدین

یہ بادشاہ ۷۸۶ھ میں اورنگ نشین ہوا شکل و صورت میں یوسف ثانی اور طور و اطوار میں اپنے زمانے کا حجاج تھا۔ اراکین سلطنت اس کی سفاکی سے نالاں اور رعایا جان سے بیزار تھی۔ خواجہ حافظ کو اگرچہ بذات خود اس سے کوئی شکایت نہ تھی۔ لیکن ابنائے وطن کی مصیبت پر ان کا دل چیخ اٹھا اور ایسی غزلیں لکھیں جن میں تاریخ اور سیاست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس دور کے کلام کا نمونہ پیش ہے جس میں شاعر رعایا کی زبوں حالی اور ملک کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے بادشاہ کے ظلم و ستم کا [illegible] لطیف اشارے کرتا ہے اور رحم [illegible] ہے۔ ؎

بہ ملازمانِ سلطاں کہ رساند ایں دُعا را
کہ بہ شکرِ پادشاہی ز نظر مراں گدا را

دربارِ سلطانی تک میرا یہ پیغام کون پہنچائے گا کہ پادشاہی کے شکریہ
ے بینوا کو نظر سے مت گرا۔

چہ قیامت است جاناں کہ بعاشقاں نمودی
رخِ ہمچو ماہ تاباں دلِ ہمچو سنگِ خارا

یہ کیا قیامت ہے کہ تم اپنے خیر سگالوں سے ایسا سلوک کر رہے ہو
رہ تو ماہ کامل کی طرح منور ہے مگر دل سنگ خارا کی طرح سخت ہے۔

دل عاشقاں بسوزی چو عذار برفروزی
تو ازیں چہ سود داری کہ نمے کنی مدارا

جب تم جلوہ فرما ہوتے ہو تو اپنے جاں سپاروں کے دل آزردہ کرتے ہو
ن سے کیا حاصل ہوتا ہے کہ تم ان سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔

مژہ سیاہت ار کرد سوئے خونِ ما اشارت
ز فریبِ او میندیش و غلط مکن نگارا

اگرچہ تیری سیاہ پلکیں میرے قتل کا حکم دے رہی ہیں لیکن دیکھنا
ے فریب میں آکر ایسی غلطی نہ کرنا۔

دل مستمند ما را بہ شکنج زلف بُردی
مشکن دلِ ضعیفم بنواز ایں گدا را

تونے میرے دردمند دل کو اپنی زلفوں کے پیچ میں پھنسا لیا ہے
ے دل زار کو شکستہ نہ کر اور مہربانی سے پیش آ۔

ز فریبِ چشمِ جادو دلِ دردمند خوں شُد
نظرے فگن بہ حالش بُتِ دلربا خدا را

تیری جادو نگاہی سے میرا دردمند دل خون ہو رہا ہے۔ اے حسین
ب! خدا کے لئے میری حالت پر رحم کر۔

چو طبیبِ دردمنداں لبِ لعلِ یار باشد
دلِ دردمند عاشق ز کہ جوید ایں دوا را

دردمندوں کی دوا لب لعلیں میں ہے۔ عاشق کا دردمند دل
ماں سے تلاش کرے۔

خبرے ز حالِ حافظ بہ یار باز گوئید
رسد مگر ز زلفش اثرے مشام ما را

محبوب کو ہماری بدحالی کی ایک بار پھر اطلاع دو ممکن
خوشبو ہم تک پہنچ سکے۔

سلطان سے خطاب کیا گیا ہے۔ تیسرے

اور آٹھویں شعر کو ملاحظہ کیجئے۔ خواجہ کتنی بیباکی سے بادشاہ کی بدسلوکی پر صدائے احتجاج بلند کر رہا ہے ؎

صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را — کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را
شکر فروش کہ عمرش دراز باد چرا — تفقدے نکند طوطیِ شکر خا را
غرورِ حسن اجازت مگر نداد اے گل — کہ پرسشے نہ کنی عندلیبِ شیدا را
بہ شکر آنکہ توئی بادشاہِ کشورِ حسن — بیاد آر غریبانِ دشت و صحرا را
بحسنِ خلق تواں کرد صیدِ اہلِ نظر — بدام و دانہ نگیرند مرغِ دانا را
چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی — بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را
ندانم از چہ سبب رنگِ آشنائی نیست — سہی قدانِ سیہ چشمِ ماہ سیما را
جز ایں قدر نتواں گفت در جمالِ تو عیب — کہ خالِ مہر و وفا نیست روئے زیبا را

در آسماں چہ عجب گر ز گفتۂ حافظ
سماعِ زہرہ برقص آورد مسیحا را

سلطان احمد جلائر والی بغداد

جن دنوں امیر قطب الدین محمود اور شاہ شجاع آپس میں برسر پیکار تھے بغداد کے تخت پر سلطان احمد رونق افروز تھے۔ انھوں نے بھی خواجہ حافظ کی خدمت میں تحفے تحائف ارسال کئے اور زادراہ بھیجکر بغداد آنے کی دعوت دی۔ آپ بھی جانے کے لئے تیار ہوئے مگر لڑائی کے باعث شیراز سے نہ نکل سکے اور مجبوراً ایک غزل مدحیہ انداز میں لکھ کر قاصد کی معرفت سلطان کو بھجوا دی۔ اس غزل کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

احمد اللہ علی معدلۃ السلطانی — احمد شیخ اویس حسن ایلخانی
خان بن خان شہنشاہ شہنشاہ نژاد — آنکہ مے زیبد اگر جان جہانش خوانی
دیدۂ نادیدہ باقبال تو ایمان آورد — مرحبا اے بچنیں لطف خدا ارزانی
گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم — بُعدِ منزل نبود در سفرِ روحانی
از گل فارسیم غنچۂ عیشے نشگفت — حبذا دجلۂ بغداد و مے ریحانی

اے نسیمِ سحری خاکِ رہِ یار بیار
تا کند حافظ ازاں دیدۂ جاں روحانی

الغرض اگرچہ حافظ بغداد نہ جا سکے مگر مدت العمر اس ک میں تڑپتے رہے جیسا کہ ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

رہ نبردیم بمقصودِ خود اندر شیراز
خورم آں روز کہ حافظ رہِ بغداد برد

سلطان محمود شاہ بہمنی

اس زمانہ میں دکن کے تخت پر سلطان محمود شاہ بہمنی فرمانروائی کر رہا تھا
بادشاہ نہایت بلند حوصلہ، فیاض اور علم دوست سمجھا جاتا ہے۔ اس کے
مد فرخ عہد میں دکن امن و عافیت کا گہوارہ بنا ہوا تھا اور علما و فضلا
مور و ملخ کی طرح بہمنی دربار میں جمع ہو رہے تھے۔ جناب حافظ کو بھی
دکن دیکھنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ سلطان کے وزیر اعظم فیض اللہ کو
علم ہوا تو اس نے خوش ہو کر دعوت نامہ مع زادِ سفر ارسال کیا۔ اور ساتھ
ہی کہلا بھیجا کہ "حضرت ضرور تشریف لے آئیں ہم لوگ چشم براہ ہیں۔
جناب کو بعافیت تمام شیراز تک واپس بھی پہنچا دیا جائے گا۔" خواجہ
تیار تو تھے ہی دعوت نامے نے مہمیز کا کام کیا۔ وزیر اعظم کی بھیجی ہوئی اشرفیوں
میں سے کچھ تو قرضہ میں دیدیں۔ کچھ مفلس بھانجوں میں تقسیم کیں اور باقی
کمر سے باندھ دکن کو چلدیئے۔ لیکن ابھی دو تین منزلیں ہی طے کی تھیں
کہ بلدز کے مقام پر ایک مفلس دوست مل گیا۔ کل اشرفیاں اسے دے
ڈالیں اور خود تہی دست ہو کر رہ گئے۔ اتفاق سے خواجہ صمد گازرونی
اور خواجہ زین العابدین ہمدانی ایران کے دو مشہور تاجر ہندوستان
جا رہے تھے۔ انہیں خواجہ کی فیاض طبعی اور قلاشی کا علم ہوا تو وہ آپ کی
خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا آپ شوق سے دکن تشریف لے چلیں
ہم آپ کے سفر کا کل خرچ برداشت کرینگے۔ چنانچہ یہ قافلہ ہرمز کی بندرگاہ
تک آ پہنچا۔ یہاں سلطانی کشتیاں خواجہ کا انتظار کر رہی تھیں۔ سوءِ
اتفاق سے ابھی خواجہ حافظ سوار بھی نہ ہوئے تھے کہ بادِ مخالف چل
پڑی اور سمندر کی لہریں اٹھ اٹھ کر موجیں مارنے لگیں جس سے ساحل
پر اچھا خاصہ تلاطم اور تموج برپا ہو گیا۔ خواجہ حافظ ڈر گئے اور کشتی پر
سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی وقت فی البدیہہ چند اشعار موزوں کئے
اور تاجروں کی معرفت سلطان دکن کو بھجوا دیئے۔ ۵

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بمے بفروش دلق ما کزیں خوشتر نمی ارزد
شکوہ تاجِ سلطانی کہ بیم جاں درو درج است
کلاہ دلکش است اما بدردِ سر نمی ارزد
بس آساں مے نمود اول غمِ دریا بہ بوئے سود
غلط گفتم کہ ہر موجش بہ صد گوہر نمی ارزد
برو گنجِ قناعت جو۔ بہ کنجِ عافیت بنشیں
کہ یکدم تنگ دل بودن بہ بحر و بر نمی ارزد
چو حافظ در قناعت کوش و از دنیائے دوں بگذر
کہ یک جو منتِ دوناں بہ صد من زر نمی ارزد

جب وزیر اعظم کی معرفت سلطان کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو اس نے
سخت افسوس کیا اور فرمایا "گو خواجہ نے تو ہمارے لئے تکلیف فرمائی تھی،
لیکن ہماری بدقسمتی کہ ہم اس سعادت سے محروم رہے"۔ اسی وقت سلطان
نے ملا محمد قاسم مشہدی کی معرفت ایک ہزار اشرفیاں اور ہندوستانی
تحف و ہدایہ خواجہ کی خدمت میں ارسال کئے۔

سلطان غیاث الدین فرمانروائے بنگالہ

سلطان محمد تغلق کے عہد میں جہاں دکن اور جونپور کے صوبے خود مختار
ہو گئے وہاں بنگال کے ناظم حاجی الیاس نے بھی بغاوت کا جھنڈا کھڑا کر دیا
تھا۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں یہاں سلطان غیاث الدین شرقی حکومت
کرتا تھا۔ فیروز شاہ نے اس ملک کو فتح کرنے کی ہر چند کوشش کی مگر ناکام رہا
انجام کار دونوں کی صلح ہو گئی اور فیروز شاہ واپس لوٹ گیا۔ اس بادشاہ
نے ۷۶۹ھ سے ۷۷۵ھ تک چھ سال حکومت کی۔ یہ بڑا عادل اور ادب
نواز تاجدار تھا۔ اس کے دور میں بنگال بے حد سرسبز اور رعایا آسودہ
تھی۔ ایک بار بادشاہ جلدی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ حکمائے دربار نے خارجی
علاج کے سلسلہ میں ایک قسم کا غسل بھی تجویز کیا۔ چنانچہ یہ خدمت سلطان
کی تین مشہور خادماؤں کے سپرد کی گئی جن کے نام سرو، گل اور لالہ تھے
انھوں نے بڑی کوشش سے سلطان کی تیمارداری کی اور مجوزہ غسل دیتی
رہیں یہاں تک کہ بادشاہ کو آرام آ گیا۔ غسل صحت کے بعد بادشاہ نے بہت
بڑا جشن کیا جس میں ان خادماؤں کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا گیا اور
ان کی اس قدر عزت افزائی کی کہ محل کی بیگمات کو بھی رشک آنے لگا اور
حسد سے انھیں "غسالہ" کہنے لگیں۔ یہ واقعہ بادشاہ نے سنا تو وہ
قہقہہ مار کر ہنسا اور دفعتہً اس کے منہ سے نکلا۔ ۶

ساقی حدیثِ سرو و گل و لالہ می رود

یعنی اے ساقی سرو و گل و لالہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ بادشاہ نے بڑی
کوشش کی مگر اس کا دوسرا مصرعہ ذہن میں نہ آ سکا۔ درباری شعرا کو بھی
طبع آزمائی کی دعوت دی گئی مگر سب عاجز رہے۔ بادشاہ خواجہ حافظ کی
شہرت سن چکا تھا۔ جب درباری شاعروں سے یہ عقدہ حل نہ ہو سکا تو اس
نے اپنے خادم خاص یاقوت کی معرفت یہ مصرعہ خواجہ کی خدمت میں شیراز
ارسال کیا اور ساتھ ہی زادِ راہ کے طور پر بہت بڑی رقم بھیجکر خواجہ کو
بنگال آنے کی دعوت دی۔ مگر خواجہ تو ان دنوں گھر کی چار دیواری میں

منکشف ہو چکے تھے۔ انھوں نے معذرت کے ساتھ بنگال آنے سے انکار کر دیا اور مصرعہ طرح پر غزل لکھ کر یاقوت کے حوالے کی۔ جب یہ غزل سلطان کے ملاحظہ سے گزری تو وہ حیرت و استعجاب سے ششدر رہ گیا کیونکہ حافظ کے بلند پایہ کلام کی جملہ خصوصیات کے علاوہ مطلع میں اصل واقعہ کی طرف اشارہ بھی تھا۔ یعنی خواجہ نے "ثلاثہ غسالہ" کے پردے میں سرو، گل اور لالہ کی مکمل داستان بیان کر دی تھی۔ اور چونکہ بادہ نوشوں کی اصطلاح میں ان پیالوں کو بھی "ثلاثہ غسالہ" کہتے ہیں جو مے نوش صبح سویرے پیا کرتے ہیں۔ اس لئے جہاں سلطان اس غزل سے خاص طور پر لطف اندوز ہوا وہاں اراکین دربار اور بامذاق حضرات بھی اس سے مستفیض ہوئے بغیر نہ رہے۔ غزل مذکور کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود — وین بحث با "ثلاثہ غسالہ" می رود
مے دہ کہ نو عروس چمن حد حسن یافت — کار این زمان بصنعت دلالہ می رود
آن چشم جادوانۂ عابد فریب بین — کش کاروان سحر بدنبالہ می رود
خوی کردہ مے خرامد و بر عارض سمن — از شرم روئے او عرق از ژالہ می رود
باد بہاری وزد از بوستان شاہ — وز ژالہ بادہ در قدح لالہ می رود
طی مکان ببین و زمان در سلوک شعر — کین طفل یک شبہ رہ یکسالہ می رود
ایمن مشو ز عشوۂ دنیا کہ این عجوز — مکارہ می نشیند و محتالہ می رود
چون سامری مباش کہ زر دید و از خرے — موسیٰ بہشت و از پے گوسالہ می رود

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین
خامش مشو کہ کار تو از نالہ می رود

تیموری حملہ

۷۸۹ھ میں امیر تیمور ایران پر حملہ آور ہوا۔ تاتاری فوجیں کالی آندھی کی طرح فارس کے مطلع پر چھا گئیں۔ سلطان زین العابدین لشکر فراہم کر کے شیراز سے نکلا مگر شکست کھا کر تستر کی طرف بھاگ گیا۔ تیمور نے جی کھول کر شیراز کو لوٹا۔ بڑے بڑے امرا کے گھر تباہ و برباد ہو گئے۔ شرفا کے لئے جینا دوبھر ہو گیا۔ علما و فضلا حیران و سرگرداں گلیوں میں مارے مارے پھرنے لگے۔ خواجہ نے بچشم خود اس انقلاب کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ دل بیتاب ہو گیا۔ اور جگر پاش پاش۔ نالہ کے ساتھ اس نے ملک و ملت کی تباہی پر نوحہ خوانی کی۔ شیخ سعدی کے مرثیے کے بعد خواجہ کی اس غم انگیز غزل کا درجہ ہے۔ دنیا کے شعرا کے مراثی اور شہر آشوب اس کا لگا نہیں کھا سکتے۔ جدت طرازی اور زور کا یہ عالم ہے کہ اب بھی جب کوئی پڑھتا ہے گلوگیر ہو جاتا ہے ؎

این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم — ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم
ہر کسے روز بہی می طلبد زین ایام — مشکل آنست کہ ہر روز بتر می بینم
ابلہان را ہمہ شربت ز گلاب و قند است — قوت دانا ہمہ از خون جگر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان — طوق زرین ہمہ در گردن خر می بینم
دختران را ہمہ جنگ است و جدل با مادر — پسران را ہمہ بدخواہ پدر می بینم
ہیچ رحمے نہ برادر بہ برادر دارد — ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم

پند حافظ بشنو خواجہ برو نیکی کن
کہ من این پند بہ از در و گہر می بینم

یاری اندر کس نمی بینیم یاران را چہ شد — دوستی کی آخر آمد دوستداران را چہ شد
آب حیوان تیرہ گون شد خضر فرخ پے کجاست — خون چکید از شاخ گل باد بہاران را چہ شد
صد ہزاران گل شگفت و بانگ مرغی بر نخاست — عندلیبان را چہ پیش آمد ہزاران را چہ شد
لعلی از کان مروت بر نیامد سالہاست — تابش خورشید و سعی ابر و باران را چہ شد
زہرہ سازے خوش نمی سازد مگر عودش بسوخت — کس ندارد شوق مستی میگساران را چہ شد
کس نمی گوید کہ یارے داشت حق دوستی — حق شناسان را چہ حال افتاد یاران را چہ شد
گوئے توفیق و کرامت در میان افگندہ اند — کس بمیدان در نمی آید سواران را چہ شد

حافظ اسرار الٰہی کس نمی داند خموش
از کہ می پرسی کہ دور روزگاران را چہ شد

حکیم مظفر حسین صاحب اظہر دہلوی حیات حافظ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مندرجہ بالا مرثیے خواجہ نے امیر تیمور کے دوسرے حملے کے بعد لکھے تھے۔ جب کہ سلطان منصور بہادرانہ لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ حالانکہ امیر کا دوبارہ حملہ ۷۹۵ھ میں ہوتا ہے اور خواجہ حافظ ۷۹۱ھ میں وفات پا جاتے ہیں اور سلطان منصور خود شریک جنازہ ہوتا ہے اس لئے اظہر صاحب کی روایت وقیع معلوم نہیں ہوتی۔

خواجہ حافظ امیر تیمور کے دربار میں

امیر تیمور خواجہ کے علمی کمالات سے پہلے متعارف ہو چکا تھا۔ شیراز کے قیام کے دوران میں اس نے خواجہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ آپ جب دربار میں حاضر ہوئے تو ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ امیر نے پوچھا کیوں خواجہ صاحب یہ آپ ہی کا شعر ہے؟ ؎

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا!

خواجہ نے قہرمان تاجدار کی اس پرسش پر نہایت بیباکی سے جواب دیا "جی ہاں! یہ میرا ہی شعر ہے"۔

امیر نے خشمگیں لہجہ میں گرج کر کہا "خواجہ صاحب! کیا آپ کو معلوم نہیں ہیں نے سمرقند و بخارا کو کتنی جانفشانی اور جفاکشی سے فتح کیا ہے اور کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کیوں؟ صرف ان شہروں کو بارونق بنانے کے لئے کیونکہ یہ علاقہ میرا وطن مالوف ہے اور مجھے بیحد محبوب ہے۔ مگر آپ اپنے شیرازی صنم کے خال سیاہ کے معاوضہ میں دے ڈالنے کا تہیہ کر لیا ہے اور وہ بھی محض اس لئے کہ وہ آپ کی دلجوئی کرے۔ یہ کیا بات ہے؟"

خواجہ حافظ نے متانت کے ساتھ فوراً عرض کیا "جناب والا! ایسی ہی غلط بخشی اور فضول خرچی کا نتیجہ ہے کہ آپ مجھے اس حال میں دیکھ رہے ہیں کہ میں اپنے مخاطب کی فیاضی کا امیدوار ہوں کیونکہ قلاش و نادار ہو گیا ہوں"

امیر اس لطیفہ پر پھڑک اٹھا اور انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ امیر تیمور نے جب شیراز سے بخارا کو مراجعت کی تو یہاں کے اکثر باکمال لوگوں کو اپنے ہمراہ لے گیا اور خواجہ حافظ بھی ان میں شامل تھے لیکن واقعات اس روایت کی تکذیب کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بخارا جا کر خواجہ بہت جلد لوٹ آئے ہوں۔ بہرکیف شاہ یحییٰ کی حکومت کے آغاز میں خواجہ کا شیراز میں ہونا ثابت ہے۔

امیر نصرت الدین یحییٰ

چونکہ سلطان مظفر کے فرزند شہزادہ نصرت الدین یحییٰ حاکم یزد نے امیر تیمور کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اس لئے جب وہ شیراز سے واپس جانے لگے تو اس نے اس شہر کی حکومت بھی شہزادہ یحییٰ کو تفویض کر دی۔ یہ حاکم نہایت عادل اور قابل شخص تھا۔ اس نے کاروبار سلطنت کو اس عمدگی سے شروع کیا کہ دوست دشمن سب واہ واہ کر اٹھے اور خواجہ نے خوش ہو کر یہ غزل اس کی مدح میں لکھی۔

گر نبودے شاہ یحییٰ نصرت الدین از کرم
کار ملک و دیں ز نظم و اتفاق افتادہ بود
حافظ آں ساعت کہ ایں نظم پریشاں می نوشت
طائر شوقش بدام اشتیاق افتادہ بود

امیر منصور حاکم تستر

ابھی شہزادہ یحییٰ کو شیراز پر حکمرانی کرتے چند ہی سال گزرے تھے کہ سلطان زین العابدین کا چچا امیر منصور اپنی موروثی مملکت کو فتح کرنے کے لئے شیراز پر چڑھ آیا۔ شاہ یحییٰ نے ہر چند مقابلہ کیا۔ مگر حریف کے اقبال کے آگے کوئی چال کارگر نہ ہو سکی۔ اور نہایت بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد امیر منصور نے کوس لمن الملکی بجایا اور شیراز پر عدل و انصاف سے حکومت کرنی شروع کی۔ اس تاجدار کو بھی خواجہ سے دلی عقیدت تھی اور گاہ بگاہ ان کی خدمت میں تحفے تحائف بھیجا کرتا تھا۔ خواجہ نے بھی اس کی حکومت کو خوش آمدید کہا اور تہنیت کے طور پر چند اشعار موزوں کر کے ارسال کئے۔

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید نوید فتح و بشارت بمہر و ماہ رسید
جمال بخت ز روئے ظفر نقاب کمال عدل بفریاد دادخواہ رسید
سپہر دور خوش اکنوں زند کہ ماہ آید جہاں بکام دل اکنوں رسد کہ شاہ رسید
مرو بخواب کہ حافظ ببارگاہ قبول
ز ورد نیم شب و درس صبحگاہ رسید

اسی عادل باذل سلطان کے عہد میں ۲۱ ذی الحجہ ۷۹۱ھ بروز دوشنبہ بوقت عشا دنیا کا بہت بڑا شاعر، بہت بڑا صوفی اور بہت بڑا فیلسوف ہمیشہ کے لئے دنیا کو اپنے غم میں سوگوار چھوڑ کر چل بسا اور شیراز کا وہ بلبل ہزار داستان جس کے نغموں سے ہند، سندھ اور ایران و عراق گونج رہے تھے دفعتہ خاموش ہو گیا۔

جنازے پر شیراز کے تمام امیر و فقیر موجود تھے۔ خود سلطان منصور بھی شریک تھا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ خواجہ کے کلام سے کفر و الحاد کا ترشح ہوتا ہے اس لئے نماز جنازہ نہ ہونی چاہیئے۔ اس پر اختلاف ہو گیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ دیوان حافظ منگوا کر اس بارے میں استخارہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ جب کھولا گیا تو یہ شعر نکلا ؎

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ
کہ گرچہ غرق گناہ است میرود بہشت

اس پر سب نے اتفاق سے نماز جنازہ ادا کی۔ اور "خاک مصلیٰ" میں شمشاد کے درخت کے نیچے دفن کیا۔ ۸۵۶ھ میں بابر بادشاہ کے وزیر نے خواجہ کے مزار پر خوشنما گنبد تعمیر کیا۔ اور کریم خاں زند نے اپنے عہد میں خواجہ کی قبر پر سنگ مرمر لگوایا۔ اور پاس ہی ایک خانقاہ بنوائی۔ خواجہ کے کلام کو قدیم سے قبولیت عامہ کا فخر حاصل ہے۔ اس وقت دنیا کی تقریباً ہر زبان میں اس کے دیوان کے تراجم موجود ہیں۔

بھول جاتا ہوں

تری نظروں کا مفہوم اے ستمگر بھول جاتا ہوں
سمجھتا ہوں مگر سب کچھ سمجھ کر بھول جاتا ہوں

نظر آتا ہے جب کوئی خضر وش رہنما مجھکو
وہ سادہ دل ہوں انجامِ سکندر بھول جاتا ہوں

بھلا بیٹھا ہوں اپنے آپ کو تو پھر تعجب کیا؟
جنوں کی دُھن میں تم کو بھی میں اکثر بھول جاتا ہوں

اُٹھا دے مسجد و مندر کے پتھر میرے رستے سے
کہ اُن کو دیکھتے ہی میں ترا در بھول جاتا ہوں

بتا دو اور ہی کوئی طریقہ دل کی فرحت کا
تمھارا نام تو میں بندہ پرور بھول جاتا ہوں

تمنائی تو جنت کا ہوں لیکن کیا کروں واعظ
صراحی دیکھتے ہی جامِ کوثر بھول جاتا ہوں

اگر سر کو جھکانے ہی سے ہوتا ہے ادا سجدہ
تو لیجے آج ہی سے آپ کا در بھول جاتا ہوں

مجھے یاد آئے کیونکر دل کی ارمانوں کا افسانہ
کہ تم کو دیکھ کر دل کو بھی اکثر بھول جاتا ہوں

حرم میں جا پہنچتا ہوں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
وفورِ بیخودی میں دوست کا گھر بھول جاتا ہوں

چلو وعدہ ہی کر لو اس میں کیا نقصان تمھارا ہے
کہ میں ہر بات کو تم سے بھی بڑھکر بھول جاتا ہوں

نہیں جب کچھ بھی یاد آتا تو ان کی یاد آتی ہے
وگرنہ میں تو اظہر کو بھی اظہر بھول جاتا ہوں

اظہر امرتسری

تیمور اعظم

ایمان افروز افسانہ

از :- جناب سید احسان علی شاہ بی۔اے

"اللہ اکبر اللہ اکبر ـــ!"

قراقرم کے ایک دور افتادہ موضع کتنک کی ایک خوبصورت سبک سی مسجد کے بلند مینار سے یہ آواز گونجی۔ اور کتنک کی مختصر سی آبادی کا بیشتر حصہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں سجدہ ہائے نیاز پیش کرنے کے لئے بیتابانہ مسجد کی طرف چل پڑا۔ سنماز ہوئی۔ آج مسجد خلاف معمول نصف سے زیادہ بھری ہوئی تھی نمازی بید مطمئن تھے اور ایک دوسرے کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اس طمانیت قلب اور اطمینان ذہنی کی وجہ یہ تھی کہ موضع کتنک کے روحانی مقتدا اور اس مختصر سی مسجد کے خدا رسیدہ امام مولانا شیخ جمال الدین کئی دن تک حجرہ نشین رہنے کے بعد آج پھر مسجد میں رونق افروز ہوئے تھے۔ اور امامت فرما رہے تھے۔

جس زمانہ میں ہلاکت مجسم چنگیز اپنے خونخوار لشکر کے ہمراہ وسط ایشیا کے وسیع میدانوں، بلند و بالا پہاڑوں اور طویل و عریض دریاؤں کو اپنے خونیں گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندتا ہوا بخارا پہنچا اور جب بخارا کی مسلم آبادی کے خون سے تاریخ عالم کے صفحات پر سرخ حرفوں میں جبر و قہر کی ایک عبرتناک داستان لکھی تھی، اس وقت علماء، فقہا، اور محدثین کا ایک مرنجاں مرنج گروہ اس خونخوار ڈاکو کے ہاتھ لگ گیا۔ اس مقدس جماعت کو قراقرم لے جایا گیا۔ طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں اور آخر انھیں کتنک جیسی دور افتادہ جگہ میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ بلکہ یوں کہئے کہ محبوس کر دیا گیا۔ لیکن یہ خدا کے پرجوش پرستار اپنے خدا کا نام بلند کئے بغیر نہ رہ سکے۔ وحشی تاتاریوں کے انسانیت سوز مظالم انھیں اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرنے سے نہ روک سکے۔ حضرت مولانا جمال الدین جو اس مقدس گروہ میں شامل تھے نہایت پرجوش مبلغین کے پیشرو تھے۔ آپ کی تحریک سے یہاں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی گئی اور پانچ وقت کی نماز باجماعت شروع ہو گئی۔ مولانا عالم باعمل ہونے کے علاوہ خدا رسیدہ ولی بھی تھے۔ اور بعض اوقات آپ سے ایسی باتوں کا ظہور بھی ہو جایا کرتا تھا جس سے معمولی عقل والے دنگ رہ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ کے روحانی فیوض عام تھے۔ خدا نے آپ کی زبان میں بے پناہ اثر دیا تھا۔ لوگ دھیمی دھیمی، میٹھی میٹھی، پرلطف باتوں کو سن کر لوگ جھوم جھوم جاتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر کتنک کے وحشی تاتاری جو اس وقت آفتاب پرستی کی علت میں مبتلا تھے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور کتنک کا غالب حصہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ ان نو مسلموں پر شیخ صاحب کا بہت اثر تھا۔ اور یہ سب آپ کو اپنا روحانی مقتدا سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تک شیخ صاحب موصوف گوشہ نشین رہے۔ اس وقت تک مسجد کچھ سونی سونی سی معلوم ہوتی رہی۔ لوگ آتے بیدلی سے نماز پڑھتے اور چلے جاتے نہ وہ چہل پہل تھی، نہ ٹھٹھا تھی، نو مسلم کچھ اداس اداس سے نظر آتے تھے۔

اور آج، چند دنوں کی صبر آزما جدائی کے بعد جب مولانا نے حجرے سے برآمد ہو کر نماز کی امامت فرمائی، تو مسجد پر ایک دفعہ پھر بہار سی آگئی۔ وہ خاموشی جو اتنے دنوں تک در و دیوار پر مسلط رہی تھی ایک ایمان افروز ہنگامے میں بدل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسجد کی دیواریں مسکرانے لگی ہیں۔

لیکن اس عالم چہل پہل اور دبی گھٹی مسرت کے درمیان مولانا کا چہرہ افسردہ سا نظر آتا تھا۔ کچھ اترا اترا سا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہیں۔ اس کے علاوہ نماز پڑھاتے وقت بھی ان کی آواز میں لرزش تھی، ایک ہلکی سی کپکپی جسے رقت کہا جا سکتا تھا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھے تو سب حیران رہ گئے مولانا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے ابل پڑے اور انھوں نے گڑگڑا کر دعا فرمائی۔

"الٰہی! تیرے قہر سے پناہ چاہتا ہوں۔ الٰہی! تیرے قہر سے پناہ چاہتا ہوں ـــ!" یہی الفاظ بار بار ان کی زبان پر آتے تھے۔ وہ سجدے کر رہے تھے بار بار ـــ اپنی پیشانی گھس رہے تھے۔ رو رہے تھے، انتہائی کرب انگیز لہجہ میں کہہ رہے تھے ـــ "یا الٰہی! گنہگار تیری رحمت کے امیدوار ہیں ـــ یہ کمزور دنیا، یہ مغرور ربع مسکوں تیرے قہر کی تاب نہ لا سکے گا۔ الٰہی تیرے قہر سے پناہ چاہتا ہوں ـــ" اور ابھی لوگوں کی حیرت مٹی نہ تھی کہ وہ سجدے میں گرتے گرتے گھبرا کر اٹھے، منہ پھیر کر حیران نمازیوں کی طرف دیکھا۔ اور آنسو پونچھتے ہوئے پرجلال لہجہ میں بولے۔

"لوگو! کتنک کے رہنے والو! تمھیں برائیوں سے ڈرایا گیا تھا

قوت، جو خدا نے مجھے عنایت کی تھی میں نے استعمال کی اور تمھیں گناہوں سے بچنے کی ہدایت کی۔ میں نے تمھیں عذاب الٰہی سے ڈرانے کی ہر ممکن تدبیر کی لیکن میری تمام تدبیریں اکارت گئیں، میری تمام کوششیں رائگاں ثابت ہوئیں۔ تم پر اثر نہ ہوا۔ تم نے زبان سے یہ دعویٰ کیا کہ خدا ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول، لیکن دل سے کبھی اس کا اقرار نہ کیا۔ تمھارے دل پر واحد خدا کی حکومت کبھی قائم نہ ہو سکی۔ تم حاکم سے ڈرتے رہے۔ تم محصول لینے والے سے کانپتے رہے۔ لیکن ان سب سے بڑے حاکم، اعمال کا مواخذہ کرنے والے، اس سب سے بڑے محتسب کا تمھیں شمہ بھر خوف نہ ہوا۔ تم نے نمازیں پڑھیں اور حالت نماز میں اپنے فائدے اور نقصان کا سوچتے رہے تم نے روزے رکھے لیکن دکھاوے کے لئے، تم نے عبادت کی لیکن شہرت کے لئے، تم نے خدا کا نام لیا لیکن عزت کے لئے۔ تم نے ہادی عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دم بھرا لیکن دوزخ سے بچنے اور بہشت حاصل کرنے کی لالچ میں ـــ تم نے اپنے اوپر بڑے بڑے ظلم کئے کتک والو! تم نے ارحم الراحمین کو قہر مجسم بنا دیا۔ تمھاری بداعمالیوں نے اس کے رحم و کرم کے دروازے بند کر دیئے تم پر ـــ قہر الٰہی کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلکنے والا ہے ـــ اس بستی پر خدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے ـــ تباہ کر دی جائیگی یہ بستی، اینٹ سے اینٹ بجا دی جائیگی اس کی، بھاگو اگر تم بچنا چاہتے ہو! ـــ میں جا رہا ہوں ـــ میں ہمیشہ اپنا فرض ادا کرتا رہا ـــ آخری فرض بھی ادا کر دیا میں نے ـــ میں نے تمھیں اطلاع دیدی میں نے تمھیں بتا دیا ـــ"

مولانا کی زبان اور کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گئے اور کچھ دیر پُرحسرت نگاہوں سے مبہوت لوگوں کی طرف دیکھنے کے بعد لڑکھڑاتی آواز میں بولے۔ "میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ تمھارے درمیان آرام سے گذارا ہے۔ میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ تم ایک اچھے ہمسائے اور شریف میزبان ثابت ہوئے ہو ـــ لیکن اس کے باوجود قہر الٰہی کو ٹال دینے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ الوداع میرے دوستو! ـــ خدا تم پر رحم کرے۔"

مولانا لڑکھڑاتے ہوئے صفوں میں سے گزرنے لگے۔ لوگ چند لمحوں کے لئے دم بخود کھڑے ان کی طرف دیکھتے رہے اور پھر یکایک ایک کہرام سا مچ گیا ـــ گویا منجمد تختہ آب کسی معجز اثر گرمی کی قوت سے ایکدم پگھل کر جوش کھانے لگا۔ "عذاب الٰہی؟" ـــ "کیسا؟" ـــ "اور کیوں؟" ـــ یہ الفاظ تھے جو ایک ہمہمہ بن کر اٹھے اور مسجد کی دیواروں سے سر پھوڑنے لگے۔

لیکن مولانا نے ان مختلف سوالات کا جواب تک نہ دیا۔ و گھُس پل کر جس طرح بھی ان سے بن پڑا مسجد سے نکل گئے۔ ان کے سا موذن تھا ـــ ایک چھریرے جسم کا مضبوط نوجوان آدمی! یہ دونوں بستی سے نکل کر ویرانے میں داخل ہو گئے۔

بھیانک رات۔ بھائیں بھائیں کرتا ہوا جنگل اور تنہائی! ـــ م رات ہی کو چند ضروری چیزیں لینے کے لئے واپس کتک چلا گیا تھا۔ ا مولانا تن تنہا ریت کے ایک ٹیلے کی آڑ میں چادر بچھا کر لیٹ گئے تھے۔ تو خیر کیا آئی ہوگی۔ البتہ جوں توں کر کے رات گزری۔ نماز فجر مولانا نے انتہائی خضوع و خشوع کے ساتھ ادا کی اور درد بھرے دل کے ساتھ دعا کی پھر ٹیلے کے سایہ میں بیٹھ کر موذن کا انتظار کرنے لگے۔

سورج آہستہ آہستہ اُبھرا ـــ افق پر بکھرے ہوئے ابرپاروں پر آگ کے گولے کی طرح لڑھکتا ہوا بلند ہوا، اس میں حدت پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اور بلند ہوا ـــ اور بلند ہوا ـــ اور آہستہ آہستہ ریگستان رنگیلا نصف النہار کو چھونے لگا۔ لیکن ابھی تک موذن کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مولانا نے کئی مرتبہ ٹیلے کی بلندی پر چڑھ کر ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر کتک کی طرف دیکھا لیکن جلتی ہوئی بالو کے بیکراں سمندر کے علاوہ انھیں اور کچھ نظر نہ آیا ـــ وہ پھر مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔

اب پیاس بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ بھوک بھی اپنا رنگ جمانے لگی تھی۔ قدرت کے تقاضے آہستہ آہستہ تیز اور پھر تیز سے تیز تر ہونے لگے تھے لیکن مولانا اب بھی اپنے ساتھی کے انتظار میں ٹیلے کے سائے میں بیٹھے تھے۔

یکایک مولانا کی پشت کی طرف کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ مولانا نے گھبرا کر دیکھا ـــ موذن ـــ ان کا ساتھی اوندھے منہ زمین پر پڑا اس طرح ہانپ رہا تھا جیسے زخمی ہرن کچھار کے منہ پر گر کر سانس لینے کی کوشش کرتا ہے۔

مولانا کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور انھوں نے حیرت سے پوچھا "خیریت! کیا بات ہے؟ ـــ یوں گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"پیرومرشد!" موذن نے ہانپتے ہوئے کہا "کتک پر عذاب الٰہی پوری شدت کے ساتھ وارد ہوا ہے۔"

مولانا نے پہلی مرتبہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، اس کا سر نہیں اس کے جسم کا ایک ایک حصہ ریت سے ڈھنکا ہوا تھا۔ اس کی ریت تھی۔ اس کی ناک پر ریت تھی ـــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ و

سمندر سے نہا کر نکلا ہے۔

"خدا کے وعدے سچے اور اٹل ہوا کرتے ہیں میرے دوست! — وہ یہی کہا کرتا ہے کر دکھاتا ہے۔"

"اُف! پیرومرشد! خوف سے میرا دم گھٹا جاتا ہے۔"

"اپنے دل کو مضبوط رکھو موذن! سچے رستہ پر چلنے والوں کو آنچ نہیں آتی۔ اور جن کا رستہ جھوٹا ہوتا ہے ان کی منزل مقصود بھی جھوٹی ہوتی ہے — مجھے بتاؤ تم نے کیا دیکھا؟"

"پیرومرشد! مجھ میں تاب نہیں اس کے بیان کی، اف میرے خدا! رحم رحم — !"

"خدا کا رحم اس کے قہر سے بہت بڑا ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت سب کوئی اس کا رحم چاہے۔ مجھے بتاؤ تم نے کیا دیکھا؟ اور تسلی رکھو تم امان پانے والوں میں سے ہوگے۔"

"پیرومرشد! میں حضور سے جدا ہو کر چلتا چلتا کوئی آدھی رات کے قریب گھر پہنچا، چاروں طرف کہرام سا مچا ہوا تھا۔ مسلمان اپنا اپنا اسباب اٹھائے جا رہے تھے اور کچھ جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔"

"الحمد للہ! مسلمان بچ گئے۔"

"میرا یہی قیاس ہے پیرومرشد! کہ ساری مسلم آبادی راتوں رات تنک چھوڑ گئی تھی۔ اور آفتاب پرست کفار ان کا مذاق اڑاتے رہے، وہ کہتے تھے کہ ایک دیوانے کی بڑ تھی جسے تم نے سچ سمجھ لیا۔ مجذوب نے آواز لگا دی اور تم اُٹھ بھاگے لیکن مسلمانوں نے طنز و طعن میں بجھے ہوئے ان نشتروں کی پروا نہ کی اور جتنی جلدی ہو سکا چل دیئے۔ میں اس سفر کی وجہ سے بہت تھک گیا تھا۔ اس لئے فوراً واپس نہ لوٹ سکا۔ یونہی کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔ لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔ اور صبح نماز کے وقت نیند کھلی۔ میں گھبرا کر اٹھا اور چلنے کے لئے کمر باندھنے لگا۔ مکان سے مسجد دکھائی دی۔ صبح کے مقدس دھندلکے میں لپٹے ہوئے وہ فلک گیر مینار، اور ایک قطب سے دوسرے قطب تک پھیلے ہوئے وہ گنبد! آہ! پیرومرشد، میرا دل پگھل گیا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ صبح صادق کی دھندلی فضا "اللہ اکبر اللہ اکبر" کا مانوس نعرۂ طیبہ سننے کے لمحوں کے لئے ساکت سی ہوگئی ہے۔ اشجار ایک شان متانت کے کھڑے ہیں اور منتظر ہیں کہ کب موذن مینار پر کھڑے اور خدائے پاک کو پکارے۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا پیرومرشد! — مجھے لگتا تھا پیرومرشد کہ میناروں کی خاموش زبان کہہ رہی ہے "حیرت! — اور موذن نہیں آیا؟" اور میں یہ برداشت نہ کر سکا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ آخری دفعہ — ایک بار اور اپنی پیاری مسجد کو خدا کا پیغام سنا کر جاؤں گا۔ کنک والوں کو ایک دفعہ پھر خدائے واحد کی طرف بلاؤں گا — اور میں یہ سوچ کر پیرومرشد مینار پر چڑھ گیا۔

لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ کنک کی آبادی اس کا نام پھر سنے — اس کا پیام پھر اس کے کانوں تک پہنچ جائے۔ میں نے ابھی ہاتھ کانوں پر رکھے ہی تھے کہ ایک عجیب و غریب قسم کی بارش شروع ہو گئی۔ یہ پانی نہ تھا، برف بھی نہ تھی۔ بلکہ آسمان سے ریت برس رہی تھی۔ اور اس شدت کے ساتھ برس رہی تھی کہ دیکھتے دیکھتے گلیاں ڈھک گئیں۔ چھتیں نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ چند لمحوں کے لئے تیرہ بخت آفتاب پرست گلیوں میں ادھر ادھر بھاگے پھرے۔ دیواروں کی آڑ میں چھپے۔ درختوں پر چڑھے لیکن ریت کا بڑھتا ہوا سیلاب ان میں سے ہر ایک کو اپنے نیچے میں میں دینے کے لئے بڑھا آ رہا تھا۔ پیرومرشد! ان میں سے کوئی زندہ نہ بچ سکا۔

میں نے مینار پر سے یہ واقعات دیکھے اور گھبرا گیا۔ مجھے اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اسی گھبراہٹ کی حالت میں میں مینار پر سے اُترتا ہوا بھاگا۔ لیکن دروازہ بند تھا اور دروازے کے باہر ریت انبار در انبار تکیہ لگائے کھڑی تھی۔ کون ہٹاتا اس قوی دشمن کو؟ میں پھر بھاگا ہوا اوپر گیا گھبرایا گھبرایا چاروں طرف دیکھنے لگا — ریت کے تودے لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہے تھے اور ان بڑھتے ہوئے انباروں میں کنک کی بلند و بالا عمارتیں ڈوبتی جا رہی تھیں۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورتیں سب اس آسمان سے گرتی ہوئی بے رحم موت کے جبڑوں میں پستے جا رہے تھے مجھ سے یہ نہ دیکھا گیا پیرومرشد — میں برداشت نہ کر سکا۔ میرے ہاتھ خود بخود اٹھے اور میری آنکھیں چھپا دی گئیں۔

میں نہیں جانتا کہ کب تک مینار پر آنکھیں بند کئے اکڑوں بیٹھا رہا ہوں۔ ریت مجھ پر برس رہی تھی۔ میری سانس رکی جا رہی تھی — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بے پناہ ریت نے ہوا کو بھی اپنے نیچے دبا دیا ہے — اور — اور — پیرومرشد! مجھے یقین ہو گیا کہ میں بھی عتاب الٰہی کا نشانہ بنایا جاؤں گا۔ میرے گناہ اور میری لغزشیں ان کفار سے کم نہیں۔ اور میں عنقریب اسی ریت کے انبار کے نیچے ہوا کے ایک ذرے کے لئے تڑپتا ہوا مر جاؤں گا۔ اور میں اسی موت کے لئے جس کا کوئی علاج نہ تھا۔ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔

یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا — نہیں، میری بند آنکھوں نے دیکھا کہ آپ مینار کے نیچے ریت پر کھڑے ہیں اور پکار رہے ہیں۔ میں نے دفعتہً آنکھیں کھول دیں اور دیکھا ریت کا پہاڑ مینار کی بلندیوں تک بڑھتا

پیاسا آرہا ہے۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر مینار پر سے چھلانگ لگادی ــــ اور گرتا پڑتا، دھنستا، بچتا بچاتا، ریت میرے سر پر برس رہی تھی، اور میں بھاگتا گیا، یہاں تک کہ اب ــــ پیرو مرشد! اتنا شدید عذاب ــــ ایسا خونخوار عذاب۔۔۔!"

مولانا کی آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے۔ انھوں نے گھگھیائی آواز میں کہا: "میرے دوست! خدا تم پر رحم فرمائے۔ عذاب الٰہی سے جتنا ممکن ہو دور رہنا چاہئے ــــ چلو، اسی وقت چل پڑیں۔"

پانی گل کے ارد گرد بڑا وسیع و عریض جنگل تھا، جس میں شکار کے جانور بکثرت مل جایا کرتے تھے۔ اسی لئے تاتاری حکمران جب کبھی انسانی شکار سے اکتا جاتے تھے تو "منہ کا مزہ بدلنے کے لئے" اس جنگل کے جانوروں پر اپنی شمشیر زنی اور نیزہ بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ مولانا جمال الدین اور ان کا ساتھی موذن بھی عذاب الٰہی سے محفوظ رہنے کے لئے سارا دن اور ساری رات چلنے کے بعد اسی جنگل میں وارد ہوئے۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ تخت تاتار کا جواں سال اور آتشیں مزاج ولیعہد خان تغلق تیمور اسی جنگل میں شغل شکار میں مصروف ہے۔ یہ دونوں معصوم آدمی سارا دن اور ساری رات کے سفر سے چور چور آئے اور آتے ہی ایک گھنے درخت کے سائے میں لیٹ گئے۔ چندے توقف کے بعد مولانا نے فرمایا۔

"پانی مل جاتا ــــ تو شاید بچنے کی امید ہو جاتی۔"

یہ سنتے ہی عقیدتمند موذن اٹھا۔ اور پانی کی تلاش میں نکلا۔ گھنے جنگل میں جگہ جگہ پانی کے تالاب ہوتے ہیں۔ موذن کو پانی کی تلاش میں زیادہ دقت نہ اٹھانی پڑی لیکن پانی لیکر واپس آیا تو عجیب منظر دیکھا۔ خون آشام تاتاری سپاہی اپنے مخصوص پستہ قد گھوڑوں پر سوار ہاتھوں میں لمبے لمبے بھالے لئے مولانا کو گھیرے کھڑے تھے اور ان پر سوالات کی اتنی بے پناہ بارش کر رہے تھے کہ مولانا سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا۔

موذن کے دل میں آئی کہ آگے بڑھ کر اپنے پیرو مرشد کے لئے جان دیدے لیکن پھر رک گیا۔ کچھ کھٹکا اور آخر ایک درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔

اتنے میں ایک تاتاری جوان، سپاہیوں کا افسر معلوم ہوتا تھا آگے بڑھا اور ڈپٹ کر مولانا سے بولا۔ "شہزادہ ذیوقار کا حکم تھا کہ اس نواح کی ساری آبادی شغل شکار میں شہزادہ والاتبار کی مدد کرے اور تم ــــ یوں اپا ہج بنے بیٹھے ہو۔ کیا یہ شکار ہمارا ہے تم نے خان عالم کے لئے؟"

تعجب سے ان لوگوں کا منہ تکنے کے سوا مولانا سے اور کچھ نہ بن پڑا افسر کو اور غصہ آگیا۔ اس نے اپنی ظالم ٹھوکر مولانا کے پاؤں پر جمائی اور ماتحت سپاہیوں کو حکم دیا: "اس کے ہاتھوں میں رسیاں باندھ دو۔ اور شہزادہ عالی تبار کے دربار میں لے چلو۔ اس گستاخ کو ایسی سزا ملے گی کہ آسمان کا جگر بھی کانپ اٹھے گا۔"

یہ غریب افسر کیا جانتا تھا کہ وہ دین حقہ کے کسی مبلغ کو گرفتار کرکے لئے جا رہا ہے۔ اور قدرت کے پراسرار ہاتھوں نے اس مرد مجاہد کو کیونکر ان وادیوں کی طرف کھینچ لیا ہے۔ مولانا کو دست بستہ تیمور کے خیمہ میں حاضر کر دیا گیا۔

صاحبقران خوں آشام تیمور کی جوانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی کشیدہ قامت اور مضبوط دست و بازو، بھرا بھرا چہرہ اور سانولی رنگت میں جھلکتا ہوا جوانی کا گرم سرخ خون ــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شام کے دھندلکے میں شفق کی رنگینیاں گھول دی گئی ہیں۔ پتلی ستواں ناک، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور ان پر لانبی لانبی جھکی ہوئی گھنی پلکیں۔ کشادہ پیشانی پر تڑپتی ہوئی سی سلوٹیں۔ اور باریک پیوست ہونٹوں کے گوشوں میں کانپتا ہوا سا غضبناک جلال۔ چوڑے سینہ پر قیمتی پتھروں سے گندھی ہوئی چمڑے کی صدری ــــ تیمور حسین بھی تھا، جوان بھی ــــ غضبناک بھی تھا اور شعلہ خو بھی، لیکن ان سب کے بعد دیکھنے والے سمجھ جاتے تھے کہ ذکاوت اور ذہانت اس حسین کشادہ پیشانی کی ہر سلوٹ میں انگڑائیاں لے رہی ہے۔ اس کا جسم جتنا مضبوط، زورآور اور دبدبے والا تھا، اتنا ہی اس کی چمکدار آنکھیں ایک خاص قسم کی روحانی کشش کی حامل تھیں۔ اس کی آنکھوں کو ایک نظر دیکھ لینے سے محسوس ہونے لگتا تھا کہ ان بڑی بڑی کالی آنکھوں سے ایک صاف، پاکیزہ اور منزہ روح جھلک رہی ہے۔

امت الحبیب بیگم، تاتاری خاندان کی شعلہ رو حسینہ اس وقت بھی تیمور کے ساتھ تھی، امت الحبیب بیگم ایک نازک اندام حسینہ اور نازو ادا کی پوٹ ہی نہ تھی بلکہ وہ ایک سپاہی عورت تھی۔ شمشیر زنی میں بڑے بڑے مرد اس کا لوہا مانتے تھے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ آگے چل کر تاریخ بتاتی ہے کہ امت الحبیب بیگم نے اپنی قیادت میں کئی لڑائیاں لڑیں اور تیمور کے دشمنوں کو ایسی ایسی شکستیں دیں جن کا ذکر تاریخ بڑے فخر کے ساتھ کرتی ہے۔

لیکن آج امتہ الحبیب صرف ایک حسینہ تھی۔ گو اس کے نسائیت آلود چہرے پر اب بھی مردانہ سطوت اور جلال نظر آتا تھا۔ تاہم آج وہ صرف اپنے محبوب کی محبوبہ تھی ــــ تیمور شکار کے لئے آیا تو امتہ الحبیب اس سے جدا نہ ہو سکی۔ وہ بھی ساتھ ہی چلی آئی ــــ یہ دونوں شہ

خیمہ میں بیٹھے تھے۔ امت الحبیب قدرے فاصلے پر کھڑی اپنے محب کا حسین چہرہ دیکھ رہی تھی اور تیمور اپنے شکاری کتے کو خنزیر کا گوشت کھلا رہا تھا۔

یکایک دربان نے آکر سات سلام عرض کئے اور سینہ پر ہاتھ باندھ کر مودّبانہ سر جھکائے بولا۔ "آقائے نامدار! چند نمکخوار ایک بوڑھے گستاخ کو گرفتار کرکے لائے ہیں اور حضوری کے طالب ہیں۔"

تیمور نے کتے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے حکم دیا۔ "پیش کیا جائے۔"

حکم کی دیر تھی۔ خیمہ کے پردے اُٹھے۔ اور سپاہی مولانا جمال الدین کو پا بہ زنجیر گھسیٹتے ہوئے لے آئے۔ سپاہی سجدے میں جھک گئے لیکن مولانا سیدھے کھڑے رہے۔ ان کی گردن میں کبھی خم نہ پیدا ہوا۔ تیمور اپنے کتے کے ساتھ ایسا مشغول تھا کہ اس نے سر بھی نہ اٹھایا لیکن امت الحبیب بیگم نے اس بوڑھے دہقان کی گستاخی کو دیکھ لیا۔ وہ برداشت نہ کرسکی ــــ شعلہ کی طرح بھڑکی، تڑپی اور پیچ و بل کھاتی ہوئی مولانا کے سامنے آگئی۔

"تمھیں معلوم نہیں کہ تم خان اعظم کے ولیعہد کے دربار میں حاضر ہوئے ہو ــــ؟ سجدہ پیش کرو اپنے آقا کے قدموں میں۔"

تیمور نے چونک کر دیکھا اور محبوبہ کے آتشیں رخساروں پر غیظ و غضب کی ابھریں لہریں دیکھ کر مسکرانے لگا۔ مولانا نے تیمور کی دھیمی سی مسکراہٹ کو فال نیک سمجھا اور ادب سے عرض کی۔ "اپنے آقا کے قدموں میں یہ غلام دن میں پانچ دفعہ سجدے پیش کرتا ہے شہزادی صاحبہ! اور آقا جانتے ہیں کہ غلام کے سجدے ہمیشہ مخلصانہ رہے ہیں ان میں ظاہر ... نام کو نہیں ہوتی۔"

"ہم عبودیت کے اس اظہار پر خوش ہوئے۔" تیمور نے آگے بڑھتے ہوئے ... لیکن یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے سپاہی ہمارے ایک مخلص فرماں ... کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالے ہوئے ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں؟"

"آقائے نامدار!" افسر نے سجدہ پیش کرنے کے بعد عرض کیا۔ "شہزاد... ا یہ حکم تھا کہ بانی گل اور اس کے نواح کے علاقوں میں رہنے والے ... ے غلامان شاہ حضور آقا کے شغل صید و شکار میں جان و دل سے ... ریں اور کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ شکار شہزادۂ عالم کی ... مت میں پیش کیا جائے۔ لیکن یہ بوڑھا درخت کے تنے سے لگا ... ا رہا اور بالکل بیکار تھا۔ یہ امر صریحاً حکم عدولی تھی اس لئے غلامان سلطنت ... اسے گرفتار کرکے دربار میں پیش کر دینے کو اپنا فرض سمجھا۔"

"تم نے اپنا فرض ادا کیا۔ اور ہم خوش ہیں کہ ہماری فوج ظفر موج کے سپاہی ہمارے ہر حکم کی تعمیل میں جان لڑا رہے ہیں۔"

"لیکن ولیعہد سلطنت مجرم کی طرف توجہ نہیں فرما رہے۔" امۃ الحبیب نے کہا۔ "مجرم کا فیصلہ ہونا چاہئے۔"

"ہاں ہوگا ــــ لیکن امۃ الحبیب! نہ معلوم کیوں آج ہم خلاف معمول بہت زیادہ خوش ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ کسی کو ہمارے ہاتھ سے گزند نہ پہنچے۔"

"لیکن شہزادہ عالم! اگر اس قسم کے گستاخوں کو قرار واقعی سزا نہ دی گئی تو کنیز کو خوف ہے ملک میں ابتری پھیل جائیگی اور چنگیز اعظم کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیں گے۔"

"تم نے غلط کہا امۃ الحبیب! چنگیز اعظم کے خواب اور خان اعظم ہلاکو کے کوہ شکن ارادے اس کی اولاد کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہے ہیں۔ اور جب تک آل چنگیز کا آخری فرد دنیا میں باقی رہیگا یہ خواب قائم رہے گا۔ ان خوابوں کو پورا ہونا پڑے گا۔ گستاخ مجرم! ہمارے احکام کی اطلاع بانی گل کے ہر فرد کے کانوں تک پہنچا دی گئی تھی۔ ہمیں اپنے سپاہیوں اور قاصدوں پر پورا بھروسہ ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تیری بدنصیب ہڈیوں نے ہمارے غیظ و غضب کو للکارا۔ کیوں ہمارے ارادوں کی تکمیل میں رخنہ اندازی کی گئی؟"

"شہزادۂ عالم! غلام......"

"شہزادۂ عالم کے سامنے سر بسجدہ ہوکر جواب دے گستاخ!" امۃ الحبیب نے ڈپٹ کر کہا۔ "آل چنگیز اپنے قوانین کی پیروی سختی سے کرانے کے عادی ہیں۔"

"غلام کی ناعاقبت اندیشی غلام کو ایک خوفناک جسارت پر مجبور کر رہی ہے۔ شہزادی صاحبہ! غلام کو غلامان محمدی میں سے ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس لئے غیر از اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی جرأت غلام میں نہیں۔"

"تیرا یہ مغرور سر ایک لمحہ کے بعد تیری گردن پر نہ ہوگا۔ اگر آئین چنگیزی کی پابندی نہ ہوئی۔" امۃ الحبیب سراپا شعلہ بن کر بولی۔

"اگر خود شہزادی صاحبہ کی تلوار اس حقیر گردن کو سر کے بوجھ سے آزاد کرا دینے کے لئے اٹھے تو غلام اسے سعادت سمجھے گا۔"

"تو تجھے انکار ہے؟"

مولانا نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"سپاہیو ــــ!" امۃ الحبیب اس سے زیادہ برداشت نہ کرسکی "گردن اڑا دو اس ناہنجار کی۔"

"ٹھہرو امۃ الحبیب!" تیمور نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ــــ

پے کے اس سفید کھرّے میں جوانی کی گرمیاں اور جرأتیں پنپتی ہوئی
تی ہیں۔ جو تیمور کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کر رہا ہے وہ
شخص نہیں ہو سکتا۔ مجرم ہمارے سوال کا جواب ابھی تک نہیں دیا گیا۔"
" شہزادۂ عالم! غلام ہانی محل کا باشندہ نہیں۔ غلام آج ہی کتک سے
وارد ہوا ہے۔ تمام رات اور کل سارا دن پا پیادہ چلنے کی وجہ
س قدر نڈھال ہو چکا تھا کہ درختوں کے گنجان سائے کو غنیمت جا
یں بیٹھ گیا۔ غلام کو احکام تیموری سے آگاہی نہ تھی۔"
" تیرے جیسے بہادر جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ ہمیں تم پر اعتبار ہے
ن ہمارے حضور میں سجدہ ریز نہ ہونے کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اس
ہم مطمئن نہیں ہوئے۔ ہم تمہاری بہادری کی دل سے قدر کرتے
لیکن آئین چنگیزی کا پاس و ادب ہمیں اپنے عزیز ترین خیال
بھی زیادہ عزیز ہے۔"
" مجھے شہزادۂ عالم کی نرمی سے شکایت ہے۔" امتہ الحبیب میں اب
ر کی تاب نہ تھی۔ "یہ شخص جو ہمارے کتے سے بھی زیادہ ذلیل ہے
نے عفو و کرم کا حقدار نہ تھا۔"
" خوب!" تیمور نے ایک بلند آہنگ وحشیانہ قہقہہ لگایا۔ "ہماری
تہ الحبیب تو شاعرہ ہوتی جا رہی ہیں۔ مجرم ہمارے سوال کا جواب دو
ر اگر اس سوال کا جواب شافی نہ ملا تو یقیناً تمہاری سزا بہت سخت
و گی؟ بولو تم اچھے ہو یا ہمارا کتا؟"
" شہزادۂ عالم!" مولانا نے ادب سے کہا۔ "اگر غلام ایمان کی دولت سے
الامال ہے تو غلام اس کتے سے اچھا ہے۔ اور اگر میں اس سے تہی دست
و یہ کتا غلام سے بدرجہا بہتر ہے۔"
"کیا ۔۔۔؟ کیا کہا تم نے؟ ہم سمجھے نہیں۔"
" غلام نے یہ عرض کی تھی کہ اگر غلام کو ایمان کی دولت ملی ہے تو
غلام اس کتے سے بہتر ہے اور اگر نہیں تو یہ کتا غلام سے بہتر ہے۔"
" ایمان ۔۔۔؟" یہ کون سی زبان کا لفظ ہے جو ہماری سماعت سے
ٹکرایا ہے مجرم!"
مولانا نے سر بلند کیا اور لجاجت آمیز آواز میں جواب دیا۔ "انسان
کو خدا نے پیدا کیا شہزادۂ عالم! ۔۔۔ اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے
مالک کے اور اپنے پیدا کرنے والے ہی کو اپنا حقیقی معبود سمجھے۔ اسی کے
سامنے سر نیاز جھکائے۔ اسی کو اپنا رازق اور اسی کو اپنا آقا و مولا سمجھے
انسان کے اس فرض کو شریعت حقہ نے ایمان کا نام دیا ہے اور جو
لوگ اپنے اس فرض کو بحسن و خوبی انجام دیتے ہیں ایماندار کہلاتے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" اس دنیا کا پیدا کرنے والا آفتاب ہے۔ یہ
دنیا آفتاب کی وجہ سے ظہور میں آئی۔"
" غلام کی زبان شہزادۂ عالم کے اس خیال کی تائید کرنے سے قاصر ہے"
" تمہارا مذہب؟ کس مذہب کے پیرو ہو تم؟" تیمور نے قدرے
حیران ہو کر پوچھا۔
" غلام کو غلامان محمدی میں ہونے کا شرف حاصل ہے۔"
" صاف کہو ۔۔۔ کیا مذہب ہے تمہارا؟"
" اسلام ۔۔۔!"
" مسلمان ہو تم؟"
" شہزادۂ والا تبار۔"
" ہم سمجھ گئے۔ آل چنگیز میں سے بعض حاکم اسی مذہب میں شامل
ہو گئے تھے۔ لیکن ۔۔۔ ہاں! ان سب کو تہ تیغ کر دیا گیا تھا۔ ہمیں
یاد ہے ۔۔۔ لیکن ہم اکثر سوچا کرتے ہیں کہ یہ لوگ اتنی شدید مخالفتوں
کے باوجود اسلام لانے پر کس طرح تیار ہو سکے؟ مجرم تمہارا نام کیا ہے؟"
" غلام کو جمال الدین کہہ کر پکارا جاتا ہے ۔۔۔ شہزادہ عالم!"
" تو جمال الدین، ہم اکثر تخلیہ میں سوچا کرتے ہیں کہ آل چنگیز کا
گرم مزاج خون تمہارے اس مذہب کو کس طرح قبول کر سکا۔ لیکن اس
پر بہت کچھ سوچنے کے باوجود ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ ہم جاننا
چاہتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟"
" شہزادۂ عالم! غلام عرض کریگا۔ لیکن غلام بوڑھا ہے۔ سفر بہت
کر چکا ہے۔ تکان جسم کی ہڈی ہڈی توڑے ڈالتی ہے۔ اگر شہزادہ عالم تشریف
رکھیں تو غلام عرض کرنے کی جسارت کرے گا۔"
تیمور نے ایک نظر امتہ الحبیب کی چڑھی ہوئی چتونوں پر ڈالی
اور پھر نیم خند مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "امتہ الحبیب بہت ناراض ہے
لیکن آج ہم بہت خوش ہیں۔ اگر یہ دلچسپ مشغلہ ہو جائے تو برا کیا ہے
بیٹھو امتہ الحبیب تم بھی سنو۔"
امتہ الحبیب جلتی کڑھتی دوسرے خیمہ میں چلی گئی ۔۔۔ اور تیمور ہنس
کر ایک طرف ہو بیٹھا۔
مولانا نے تقریر شروع کی۔ کچھ تو مولانا کے انداز بیان میں جادو
تھا۔ اور بیان اسلام کا۔ سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ مولانا نے کچھ ایسے موثر
طریقہ سے اسلام کی باتیں بیان کیں کہ تیمور کے مسکراتے ہوئے ہونٹ
آہستہ آہستہ سمٹ گئے ۔۔۔ اور اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی
متانت چھا گئی۔ اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں، اس کے ہونٹوں

اور اس کے نتھنوں سے ایک عظیم انہماک اور مکمل بیخودی کا اظہار ہونے لگا۔ وہ ہمہ تن محو، خدا کا پاک کلام اور مولانا کی زبان فصاحت التیام سے اس پاک کلام کی تفسیر سنتا رہا۔ سرور کونینؐ کی بے لوثی، آپ کا عظیم ایثار اور خلق کے متعلق سنتے سنتے تیمور کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس پر نئی دنیا کے دروازے کھولے جا رہے ہیں۔ اسے ایک ایسا راستہ دکھایا جا رہا ہے جو اپنی شان کا نرالا راستہ ہے۔

اور جب مولانا نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا — "تو شہزادۂ عالم! اس کمبل پوش عرب نے دنیا کو یہ پیغام دیا اور اس دین کی طرف بلایا ہے اس دین کو ہم اسلام کہتے ہیں اور یہ نہ صرف ہمارے بلکہ سارے عالم انسانیت کے لئے ہے۔ خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی قوم یا کسی ملک کے لئے نہیں بلکہ سارے عالم کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔"

تو تاتاری شہزادے کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے بہت جبر کیا بہت روکا لیکن آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ وہ اس اپنی کمزوری کو ظاہر کرنا چاہتا تھا اس لئے ایک جھوٹا کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر بولا۔

"ہم تمہاری باتیں سن کر بہت خوش ہوئے جمال الدین —! تمہیں رہا کیا جاتا ہے۔"

"شہزادہ عالم!" مولانا نے انکسار سے کہا۔ "ذرہ نوازی ہے۔ لیکن کیا واقعی آپ دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ جو پیغام سرور دو عالم کی زبان سے دیا گیا تھا وہ خدا کا پیغام نہیں؟ کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام آپ کے لئے نہیں؟ آپ اس کی ہمہ گیر برکات سے حصہ نہ لینگے — شہزادہ عالی جاہ —؟"

تیمور نے دور افق میں آنکھیں گاڑے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ ہی سے باتیں کر رہا ہے۔ "ایسے کلام کے خدا کا کلام ہونے میں کیسے شک ہو سکتا ہے جمال الدین! — اور ایسے بہادر آدمی کو کون جھوٹا کہہ سکتا ہے جو تن تنہا ایک وحشی قوم کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو جائے؟ ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جد بزرگوار چنگیز خاں مرحوم نے بہت بڑا جرم کیا تھا۔ گناہ کیا تھا انھوں نے۔ ہلاکو خاں کی تلوار کو اسلام کی حفاظت کے لئے اٹھنا چاہئے تھا۔ یہ دونوں سچے لوگ تھے اور سچوں کی قدر کرنا جانتے تھے لیکن بھول ہو گئی ان سے — بھول ہو گئی۔"

"شہزادۂ عالم —!" مولانا نے خوشی سے پکارا۔ "تو اس بھول کو آپ ٹھیک کر دیجئے۔ آپ سچ کی حمایت میں تلوار اٹھائیے"

"شاید کوئی ایسا وقت آ جائے۔" تیمور نے اسی دھیمی آواز میں کہا۔

"شاید —! شاید فرمایا حضور نے؟ بھٹکے ہوئے راہی کو جب ٹھیک راستہ کا پتہ مل جائے شہزادہ عالم! تو پھر پس و پیش کیسی؟ کہئے شہزادۂ عالم اشہدان لاالٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہ ورسولہٗ۔"

"کیسا میٹھا کلام ہے جمال الدین —! کیسی پر لطف بات ہے۔ خدا ایک ہے اور محمدؐ اس کا بندہ بھی ہے اور رسول بھی — بندہ بھی اور رسول بھی — کتنی شان ہے اس میں؟ — کتنی عظیم سچائی؟"

"تو شہزادۂ عالم! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ سچائی آپ کو پکار رہی ہے، بہادروں کا شیوہ سچائی کا اعلان ہے۔"

"ہم کریں گے!" تیمور نے بلند آواز سے کہا۔ "اس سچائی کا اعلان ہمارے ہاتھوں ہوگا۔ ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ چنگیز اعظم اور ہلاکو کے نام پر سچائی کو کچل دینے کا دھبہ لگا ہوا ہے۔ ہم اس دھبے کو صاف کئے بغیر نہ رہیں گے۔ لیکن —!" اس کی آواز دھیمی پڑ گئی اور جیسے مجبور ہو کر وہ بولا۔ "ابھی وقت نہیں آیا جمال الدین! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اس سچائی کا اعلان کریں گے لیکن اس وقت جب تاتار کی زمام سلطنت ہمارے ہاتھوں میں ہوگی۔ اس وقت تم ہمیں وعدہ یاد دلانا۔"

کئی سال بیت گئے۔ زمانہ کی کروٹوں نے کئی انقلاب برپا کئے اور ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ خان تغلق تیمور تخت تاتار پر بحیثیت خان کے متمکن ہو گیا۔

ایک دن ابھی پو پھٹی ہی تھی۔ ستارے آنکھیں جھپک رہے تھے کہ کسی کی مترنم آواز "اللہ اکبر، اللہ اکبر" نے اس کے خوابوں کا شیرازہ پریشان کر دیا — وہ رات بہت دیر تک جاگتا تھا اور یہ ارادہ لیکر سویا تھا کہ صبح کافی دن چڑھے تک سوتا رہے گا۔ لیکن اس کی کھڑکی کے نیچے کسی جگانے والے نے پکار پکار کر کہنا شروع کیا۔ "نماز نیند سے اچھی ہے۔ عبادت نیند سے اچھی ہے۔"

اور تیمور چونک کر اٹھ بیٹھا۔ چند لمحوں تک وہ اس عجیب و غریب پیغام کو سنتا رہا اور جب خاموشی طاری ہو گئی تو غیر شعوری طور پر اس پیغام کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے لگا۔ چندے غور کرنے کے بعد جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے جھنجھوڑ کر اس خیال کو ذہن سے ہٹا دیا۔ اور پھر سونے کے لئے کروٹیں بدلنے لگا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی میٹھا پکار رہا ہے۔ "نماز نیند سے اچھی ہے۔"

وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ صبح ہو گئی۔ رات کی بیخوابی کا کسل تیمور کی طبیعت کو سخت برافروختہ کئے ہوئے تھا۔ اس لئے پہلا حکم جو اس کے ہونٹوں سے جاری ہوا یہ تھا کہ اس شخص کو پابہ زنجیر دربار میں

کیا جائے جس نے رات اسے پریشان کیا ہے۔"

حکم کی دیر تھی ایک نوجوان آدمی حاضر کر دیا گیا۔ تیمور نے اسے دیکھتے ہی پر عتاب لہجہ میں کہا۔ "کون ہو تم؟ اور اس طرح رات کو ہماری کھڑکی کے نیچے پکارنے کی جرأت کیونکر ہوئی تمہیں؟"

"میرا نام خان اعظم!" اسیر نے لجاجت سے کہا۔ "ارشد الدین ہے اور میں شیخ جمال الدین کا بیٹا ہوں۔"

"جمال الدین؟" تیمور نے بھنویں سکوڑتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! خان اعظم! والد محترم وفات پاچکے ہیں۔ اور مرتے وقت انھوں نے مجھے وصیت کی تھی کہ خان اعظم تیمور کو ان کا وعدہ یاد دلا دیا جائے انھیں مرتے وقت سخت افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنا فرض ادا کئے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ مجبور ہو کر یہ فرض مجھے تفویض کیا گیا ہے۔ میں نے دربار سلطانی میں رسائی حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن تدبیر کی لیکن دربار عالی کے پہرہ داروں نے مجھے قدمبوسی کی سعادت سے محروم رکھا۔ مجبور ہو کر میں نے خدا کا پیغام خان اعظم کی سماعت تک پہنچانے کا یہ رستہ نکالا ــــ جرم کیا ــــ سزا کے لئے تیار ہوں ــــ لیکن اس کے ساتھ ہی خان اعظم کو ان کا وعدہ یاد دلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"ارشد الدین!" تیمور نے پر جلال آواز میں کہا۔ "ہمیں وعدہ یاد آگیا۔ اور ہم تمھارے شکر گزار ہیں۔ ہم نے تمھارے والد سے وعدہ کیا تھا کہ خان اعظم چنگیز اور ہلاکو کی غلطی صاف کی جائے گی۔ اور آج ہم اعلان کرتے ہیں کہ تیمور کی تلوار اسلام کی حفاظت کے لئے ہے۔ وہ بت کدہ جس نے کعبہ کی بنیادیں ہلانے کی قسم کھائی تھی کعبہ کے استحکام کے لئے مزدور پیش کرتا ہے۔"

تیمور تخت سے نیچے اتر آیا اور ارشد الدین کو سینے سے لگا کر بولا ــــ "مجھے وہ کلام سکھاؤ میرے بھائی! جس سے روح تمام غلامیوں سے آزاد ہوتی ہے ــــ!"

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور لکھئے ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہو سکے گی

آئینۂ مستقبل

خود جو اپنی زندگی کا رازداں ہو جائیگا
وہ زمیں کا تاج فخرِ آسماں ہو جائیگا

رفتہ رفتہ زخمِ دل جب خونچکاں ہو جائیگا
یہ بھی اک میری ہی رنگیں داستاں ہو جائیگا

اے مری اُمیّد اگر دل کامراں ہو جائیگا
یہ غمِ جاناں متاعِ رائگاں ہو جائیگا

چارہ گر سے پوچھتا ہوں واہ ری سادہ دلی
کیا علاج دل ہی دردِ نہاں ہو جائیگا

رُخ سے اُٹھے تو نقاب آئے تو وہ مستِ شباب
کائناتِ دل کا ہر ذرّہ جواں ہو جائیگا

میری ہر منزل، نئی منزل کا دیتی ہے پتہ
یُوں تو رستے ہی میں گم ہر کارواں ہو جائیگا

چھوڑ دیگی تو جو میرا ساتھ اے زندہ دلی
میں تو کیا سارا گلستاں بے زباں ہو جائیگا

آرزوئے یک نظر تھی، یہ نہ تھی ہم کو خبر
رشکِ ایمن آشیاں کا آشیاں ہو جائیگا

قفس میں آئے کیا۔ آئی گلستاں میں بہار
ہر فغاں نا آشنا اب نغمہ خواں ہو جائیگا

ے مژہ تک ہی نمودِ قطرۂ خونِ جگر
خاک پر ٹپکا تو بے نام و نشاں ہو جائیگا

یت بھی بیچارگی کی، بیکسی کی موت بھی
ہم نہ سمجھے تھے کہ یہ رنگِ جہاں ہو جائیگا

ٹ گیا یہ غم اگر تیری محبت کی قسم!
حاصلِ عمرِ رواں سب رائیگاں ہو جائیگا

ہ نگاہِ لُطف پرور رہنمائی تو کرے
سوئے منزل کاروانِ دل رواں ہو جائیگا

نگِ سجدہ ہے تعیّن صبر اے جوشِ سجود
خود جبینِ بندگی ہر آستاں ہو جائیگا

جائے اک نظر بابِ حریمِ ناز پر
ذرّہ ذرّہ میرے دل کی داستاں ہو جائیگا

وائیاں تاجِ وفا معراجِ عشق
دل وہی دل ہے جو رسوائے جہاں ہو جائیگا

ہیں بڑھنے والے بڑھ چلے
ایک گردِ کارواں اِک کارواں ہو جائیگا

آ بے تو اس غمکدے میں وہ نگارِ نازنیں
برق درآغوش میرا آشیاں ہو جائیگا

آپ کی ٹھوکر سلامت تربتِ دل ہے کجا
یہ نشانِ زندگی بھی بے نشاں ہو جائیگا

کروٹیں لالوں نے، دیوانوں نے لیں انگڑائیاں
اب بیاباں بھی جوابِ گلستاں ہو جائیگا

سونے والو! جاگنے والے تمھیں بھولے ہیں لوں
یاد جب آئیگی اک قصہ بیاں ہو جائیگا

حکم ہو تو آستیں اپنی جھٹک دے چشمِ تر
آستاں کا ذرہ ذرہ گلستاں ہو جائیگا

لٹ گئی دل کی جوانی دل ہے اس کی کیا بساط
رفتہ رفتہ وہ بھی نذرِ امتحاں ہو جائیگا

اک نئی طرحِ چمن ڈالیں قفس میں ہمصفیر
ڈالی ڈالی پر پھر اپنا آشیاں ہو جائیگا

کم نہ ہو مشقِ ستم، پامالِ غمِ دل ہو کہ ہم
اور حسن و عشق کا کچھ امتحاں ہو جائیگا

اپنی دنیا اپنا مستقبل بنالیں گے اسیر
زندگی کا ولولہ جس دن جواں ہو جائیگا

درسِ حکمت لے مرے دیوانگیٔ شوق سے
بے نیازِ رہنما ہر کارواں ہو جائیگا

کیوں قفس پر بجلیاں گرتی نہیں اے سوزِ غم
کچھ نہ کچھ یوں تو جوابِ آشیاں ہو جائیگا

فطرتِ بلبل بدل سکتی نہیں قیدِ قفس!
آج ہے جو زمزمہ، وہ کل فغاں ہو جائیگا

اُس لبِ نازک پہ ہو موجِ تبسم تو رواں
پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، گلفشاں ہو جائیگا

وہ چمن ہو یا قفس، نغمہ نہ ہو، نالہ سہی
دردِ دل اپنا بہر صورت بیاں ہو جائیگا

قیدِ تنہائی نہ ہو صیاد تو کچھ غم نہیں
کوئی تو پیدا قفس میں ہمزباں ہو جائیگا

عشق ہے منشائے فطرت، درد ہے مقصودِ حسن
ایک دن یہ رازِ پنہاں بھی عیاں ہو جائیگا

عقل کے پھندے سے جس دن پا گیا یہ دل نجات
بے نیازِ کاوشِ سود و زیاں ہو جائیگا

ہم نہ کہتے تھے کہ محوی اس جوانی پر نہ بھول
یہ چمن بھی ایک دن نذرِ خزاں ہو جائیگا

محوی صدیقی

میں کیوں مرگئی؟

(ایک ہندوستانی عورت کے جذبات، عالم خیال میں)

مجھے مرے ہوئے کئی ہفتے ہو چکے تھے اور مجھے یاد ہے کہ میری موت پر تقریباً تمام رشتہ داروں نے اور میری سب سہیلیوں نے بڑے زور شور سے ماتم بھی کیا تھا اور جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میرے خاوند کو میری موت کا اتنا رنج ہوا کہ وہ کئی دن تک دفتر نہیں گئے لیکن میں مجبور تھی۔ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر کسی زندہ آدمی سے بات کہنے والی طاقت مجھ سے چھین لی گئی تھی۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ اب میں دنیا کے کسی باشندے سے قیامت تک نہ مل سکتی ہوں نہ ان سے کوئی بات کر سکتی ہوں۔ لیکن تمام باتوں کے باوجود ایک کانٹا تھا جو میرے دل میں اندر ہی اندر چبھ رہا تھا۔ "میں کیوں مرگئی؟" یہ ایک سوال تھا جس کے حل کرنے اور جواب جاننے کے لئے میری روح بے چین تھی۔

میں اٹھی۔ سارا قبرستان چھان مارا، اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر یہ ہزاروں لاکھوں قبریں کیوں بن گئیں۔ اور یہ لوگ کیوں مرے۔

ایک فہرست میں نے بنانی شروع کر دی۔ بچوں کو چھوڑ کر عورتوں اور مردوں کی پوری تعداد میں نے لکھ لی اور حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ عورتیں زیادہ مری ہیں۔ یہ دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آخر عورتوں سے موت کو کیا دشمنی ہے۔ یہ بے زبان طبقہ کیوں موت کے گھاٹ اترتا جا رہا ہے۔ سوچتی رہی۔ غور کرتی رہی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر میں نے ایک اور فہرست بنانے کا ارادہ کیا۔ اب مجھے یہ جاننا تھا کہ یہ عورتیں کس لئے زیادہ مریں اور کس مرض میں زیادہ مریں۔

فہرست تیار ہو گئی۔ میں نے حساب لگایا۔ اسی فیصدی بے زبان عورتیں نسوانی امراض میں اپنی زندگی دے بیٹھی تھیں۔ اور ان میں بھی سب سے زیادہ تعداد ایسی عورتوں کی تھی جو اپنی زندگی میں سیلان الرحم یعنی سفید پانی کی مریض تھیں۔ ان کے مردوں نے یا خاوندوں نے لاپروائی کی۔ وقت پر اس بیماری کی خبر نہ لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بیماری یعنی لیکوریا کی وجہ سے اور کئی بیماریاں پیدا ہو گئیں۔ پھر بھی ان کے غافل مردوں نے کچھ توجہ نہ کی یہاں تک کہ ان کا مرض لاعلاج ہو گیا۔ اور وہ آخر کار موت کے خوفناک پنجہ میں پھنس گئیں۔ مجھے یہ سب باتیں معلوم کر کے بڑا رنج ہوا۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوستانی لوگ سیلان الرحم یعنی لیکوریا کی بیماری کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اور بہت سے تو جانتے بھی نہیں کہ سیلان الرحم کسے کہتے ہیں۔

کاش ان مردوں کو معلوم ہوتا کہ شریف عورتیں اپنی زبان سے ایسی بیماریوں کا ذکر نہیں کیا کرتیں۔ اس لئے انھیں خود ہی ان کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اگر وہ کسی قابل حکیم ڈاکٹر سے پوچھیں کہ سیلان الرحم کیا ہے تو وہ بتا دے گا کہ اس مرض میں ایک سفید رنگ کی لیسدار رطوبت عورت کے خفیہ بدن سے خارج ہوتی رہتی ہے۔ اور عورت دن بدن کمزور اور سست ہوتی چلی جاتی ہے۔ کمر میں اور پیٹ میں زیر ناف درد ہوتا ہے۔ تمام جسم میں بے کلی ہوتی ہے۔ بھوک بند ہو جاتی ہے۔ سر چکراتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ بیماری خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور پھر لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔

پھر ہم کیا کریں۔ جو لوگ یہ پوچھتے ہوں کہ لیکوریا کی بیماری کا علاج کیسے ہو اور ہم کیا کریں۔ ان کو بتانے کے لئے میں لکھتی ہوں کہ اگر وہ اس عورت کو جو سیلان الرحم یعنی لیکوریا کی مریض ہو، ایک شیشی دوا "روک" استعمال کرا دیں۔ تو یہ بیماری فوراً دور ہو جائے۔ کیونکہ یہ دوا ہزار ہا جگہ تجربہ میں آ چکی ہے۔ اور اس بیماری کا تیر بہدف علاج ہے۔ استعمال شروع کرنے کے تیسرے دن ہی سفید رطوبت نکلنا بند ہو جاتا ہے۔

مکہ مکرمہ کے تاریخی آثار

تحقیق جدید کی روشنی میں!

از :۔ الحاج مولوی عبدالقیوم ندوی

وہ سرزمین جہاں ہمیشہ سے انبیاء کرام اور اولیائے عظام کے قدم پڑتے رہے اور جو ایک عالم کے عوام و خواص کا مرجع رہی۔ جہاں قیامت تک ملائکہ کا نزول ہوتا رہے گا اور جہاں دن کے ہر حصے اور رات کے ہر لحظہ میں خداوند کریم کے انوار و افضال کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ جہاں جناب سرور کائنات محمد رسول اللہ صلعم نے ولادت فرمائی اور عمر کا اکثر و بیشتر حصہ گزارا۔ اور جہاں سے کلام الٰہی کا چشمۂ فیض اُبلا اس مقدس سرزمین کا گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ باعث افتخار اور قابل توجہ ہے۔ اس مقالہ میں ہم اس کے اُن خاص خاص آثار کو تحقیق کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں جن کا تاریخ اسلام سے ایک گہرا تعلق ہے اور جن کو معلوم کئے بغیر تاریخ اسلام کا طالب کبھی اطمینان کی سانس نہیں لے سکتا۔

جبل نور و غار حرا

جبل نور و غار حرا مکہ سے جانب شرق قریب ۳ میل کے فاصلہ پر ہے بلند ہے۔ اس کے اندر ایک غار ہے جسے غار حرا کہتے ہیں۔ پہلے یہ حرا کے نام سے مشہور تھا مگر بعد میں اسے جبل نور کہا جانے لگا۔ اندر کے لئے بہت تنگ راستہ ہے۔ خصوصاً حجاج کے اژدہام کے موقع داخل بڑی مشکل سے ہو سکتا ہے۔ اندر تقریباً ۳ گز طویل اور ۲ گز عریض ہے۔ یہی وہ مقدس اور متبرک ترین غار ہے۔ جہاں سے اسلام کی ابتدا ہوئی۔ حضرت جبریل امین سب سے پہلی وحی اور نبوت کا سب سے پہلا پیام اسی مقام پہ لے کر آئے تھے۔ اور اسی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب ختم نبوت عطا ہوا تھا۔ نبوت سے پہلے حضور تین تین دن متواتر اس میں عبادت فرماتے۔ جب کھانا ختم ہو جاتا تو گاؤں سے لے جاتے۔ (بخاری شریف باب بدء الوحی)

غرض کہ اس غار اور اس پہاڑ کو جو فضیلتیں اور بزرگیاں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے عطا فرمائیں وہ حیطۂ تحریر سے باہر ہیں۔ اس لئے عربوں نے بعد میں اسے جبل نور کا نام دیا۔ حضور صلعم کا اس پہاڑ پر چڑھنا ثابت ہے اس لئے باہمت حجاج اس پر برکت کے خیال سے چڑھتے ہیں۔ غار کے دروازے پر آج کل پولیس کا پہرہ رہتا ہے۔ عموماً اونٹ والوں سے پولیس بڑی سختی سے پیش آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اونٹ کا مالک عموماً سواری کو غار سے کافی دور اتار کر واپس چلا جاتا ہے۔ اس کے قریب مقام "شق صدر" ہے جہاں حضور صلعم کا سینۂ مبارک چاک کر کے فرشتوں نے نور و حکمت کے خزانے بھرے تھے۔ قرآن حکیم میں اس کا تذکرہ موجود ہے اور بخاری شریف اور دیگر کتب صحاح میں بھی اس واقعہ کا مفصل ذکر ہے۔ جبل نور کے متعلق قدیم تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اور بھی بہت سے انبیاء کو اس جگہ بڑے بڑے کمالات حاصل ہوئے تھے۔ سیدنا داؤد علیہ السلام کے متعلق روایت ہے کہ ایک بار آپ سے کوئی لغزش ہو گئی۔ جس کا آپ کو بے حد صدمہ تھا جب آپ حج کو آئے تو ایک روز غار حرا کے قریب بھی ٹھہرے۔ یہاں آپ نے دعا مانگی وہ قبول ہوئی اور خطا معاف ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی مشہور ہے کہ آپ نے کچھ روز اس پہاڑ پر قیام فرمایا اور لوگوں کو دین حق کا پیغام پہنچایا۔ حضرت شعیب علیہ السلام جو حافظ ابن عساکر کی تصریح کے مطابق آخر میں اپنے موسوملی کے ہمراہ مکہ شریف میں مقیم ہو گئے تھے اکثر اسی غار میں عبادت کیا کرتے سیدنا یحییٰ علیہ السلام یہاں عبادت کے لئے تشریف لاتے اور فرماتے مجھے بذریعہ وحی بتایا گیا ہے کہ یہ انتہائی مقدس مقام ہے۔ حضرت یوشع بھی جب ایک بار حج کو آئے تو اس مقام کی زیارت فرمائی اور دیر تک گریہ وزاری کرتے رہے۔ الغرض قدیم زمانے سے یہ مقام مرجع خلائق رہا ہے اور قدیم و جدید تاریخوں میں اسے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔

جبل ثور

مکہ سے جانب جنوب تقریباً ۶ میل کے فاصلہ پر جبل ثور ایک وسیع و عریض پہاڑی کا نام ہے۔ جو کافی بلند ہے۔ اس کے اندر ایک غار ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں بھی ہے۔ "اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا" (جب وہ دونوں غار میں تھے اور اس نے اپنے ساتھی سے کہدیا تھا کہ غم نہ

نہمارے ساتھ ہے) بوقت ہجرت آنحضرت صلعم اور آپ کے رفیق سفر
رت صدیق اکبرؓ کی پہلی منزل اس میں ہوئی تھی۔ صحیح بخاری کی
یت سے ثابت ہے کہ آپ نے یہاں تین دن قیام فرمایا۔ احادیث و
سیر اور تاریخ میں یہ واقعہ تفصیل سے موجود ہے۔ یہ غار انتہائی
وار گزار راستہ پر واقع ہے۔ اور اندر داخلہ کے لئے رستہ اس درجہ
ے اور دشوار گزار ہے کہ آدمی سیدھا داخل نہیں ہوسکتا ہے۔ اندر
نہ کافی جگہ ہے۔ علامہ جوہری کی تحقیق کے بموجب یہ غار ۱۳ فٹ ۹
طویل اور گیارہ فٹ ۸ انچ عریض ہے۔ ۳۰۶ھ میں خلیفہ مقتدر
ندر نے اس جگہ سنگ مرمر کا فرش بچھا دیا تھا مگر اب اس کا کوئی نشان
ں ہے۔ ۱۲۹۱ھ میں ترکوں نے بھی ترمیم و آرائش کی تھی لیکن
لاب زمانہ نے وہ بھی باقی نہیں چھوڑی۔ یہ پہاڑ قدیم زمانہ سے ہی
ت و شہرت کا حامل ہے۔ علامہ جوہری اس کے نام کی وجہ تسمیہ یہ
تے ہیں کہ چونکہ عربوں کو جانور بہت مرغوب تھے جو ان کے مدار زندگی
، لہذا اکثر ان کے ناموں پر محبوب چیزوں کے نام رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ
ں اور قبائل کے نام بھی انہی کے ناموں پر رکھتے تھے مثلاً قہر۔ اسد
۔ غزال۔ ذئب۔ وغیرہ چنانچہ اسی بنا پر اس پہاڑ کا نام ثور رکھا گیا۔
ر کے معنی بیل کے ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ شروع میں اس کی بناوٹ
ں سے مشابہ تھی لہذا اس کا نام ثور پڑ گیا۔ علامہ فہد مکی فرماتے ہیں
ثور بن مناۃ جو قدیم زمانے میں بہت معزز شخص تھا اس میں رہا
تھا اس لئے اسی کے نام سے اس پہاڑ کو منسوب کیا گیا۔ (تاریخ ام القریٰ)

جبل عسیر

مکہ سے شمال میں تقریباً ۷ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ طویل اور عریض
سلہ چلا گیا ہے اس میں کئی غار ہیں اس کا تذکرہ حدیث میں بھی آیا ہے
حضرت نے فرمایا کہ میں مدینہ کی زمین کو اسی طرح حرم قرار دیتا ہوں
س طرح ثور و عسیر پہاڑوں کے درمیان مکہ کا حرم ہے۔" صاحب معجم نے
س کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور طول و عرض وغیرہ کی تشریح کی ہے (حاشیہ
مبدا ہیہ والنہایہ جلد اول صفحہ ۱۶۴)

جبل ثبیر

مزدلفہ میں ایک اونچا اور طویل پہاڑی سلسلہ ہے جو مزدلفہ سے
ی جاتے ہوئے بائیں جانب پڑتا ہے اسے جبل ثبیر کہتے ہیں۔ شروع میں
حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں عبادت کے لئے جایا کرتے تھے۔ مگر بعد

بعد میں اپنی عبادت کے لئے غار حرا کو مقرر فرمایا تھا۔ علامہ فاسی لکھتے
ہیں حضرت عائشہ اس جگہ اعتکاف فرمایا کرتی تھیں۔ ایام جاہلیت میں
یہاں بڑے بڑے جشن منائے جاتے تھے اور کئی کئی روز میلہ لگا رہتا تھا۔
علامہ جوہری نے لکھا ہے کہ اس کے اندر سونے کی کانیں ہیں اور کہیں کہیں
ہیرے بھی موجود ہیں۔ اسلام سے پہلے اس جگہ کئی لڑائیاں ہوئیں مگر
چونکہ وہ ہماری بحث سے خارج ہیں اس لئے انھیں نظر انداز کیا جاتا
ہے۔ مشرکین قریش مزدلفہ سے اس وقت تک نہ جاتے جب تک
سورج نہ نکلتا اور کہتے "اشرق علینا ثبیر" آنحضرت صلعم نے یہاں
سے قبل طلوع آفتاب کوچ کرنے کا حکم دیا ہے۔

جبل بوقبیس

خانہ کعبہ کے قریب ہی جنوب میں ایک بلند اور طویل پہاڑ ہے جسے
جبل بوقبیس کہتے ہیں۔ احادیث میں آیا ہے کہ جب طوفان نوح میں خانہ
کعبہ منہدم ہوگیا تو حجر اسود کو فرشتوں نے اس میں چھپا دیا تھا۔ مصنف
اعلام بتلاتے ہیں کہ ایک روایت میں حضرت آدم کی قبر اسی پر ہے۔ علامہ
ذہبی تاریخ آدم میں لکھتے ہیں کہ حضرت شیث علیہ السلام اس پر آئے۔
اور ان پر بعض صحیفے اترے اور آخر میں غار ابوقبیس میں اپنے والد آدم
کے ساتھ مدفون ہوئے۔ اس پہاڑ پر ایک طرف مسجد بنی ہوئی ہے
جسے مسجد سیدنا بلال کہتے ہیں۔ ایک حصہ میں چند پیالوں کے نشان بنے
ہوئے ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک بار آنحضرت صلعم مع چند صحابہ
کرام کے اس جگہ تشریف فرما تھے اور کئی وقت کے فاقے سے تھے کہ حضرت
جبریل علیہ السلام آسمان سے ان آسمانی برتنوں میں کھانا لیکر اترے تھے،
جن کے نشانات پہاڑ پر بنے ہوئے ہیں۔ اس کے ایک طرف معجزہ
شق القمر کا نشان بنا ہوا ہے۔ آنحضرت صلعم نے کھڑے ہوکر چاند کو اشارہ
فرمایا تھا اور اس کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ مورخین کا اس میں اختلاف ہے
بعض مقام شق القمر اسی کو بتلاتے ہیں اور بعض منیٰ کو بتاتے ہیں۔ مگر مشہور
یہی ہے کہ وہ مقام بوقبیس پر ہے۔ اسی پہاڑ پر شروع شروع آنحضرت صلعم
نے اسلام کی آواز بلند فرمائی تھی۔ سارے اہل مکہ میں آپ نے توحید و رسالت
کی خبر دی تھی۔ اس پہاڑ کے اسی قسم کے فضائل و مناقب کو دیکھ کر بعض
محدثین کرام نے فرمایا ہے کہ مکہ مکرمہ میں جبل بوقبیس سے زیادہ افضل
اور اشرف کوئی پہاڑ نہیں ہے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اس پہاڑ
میں ہیرے کی بیشمار کانیں ہیں مگر ان کا دستیاب ہونا سخت دقت طلب
ہے۔ اس پہاڑ کے ایک کونہ میں مقام نوح ہے۔ جہاں آپ نے طوفان

میں بیٹھ کر عبادت فرمائی تھی۔ (تاریخ ابو اسحق فاکسی)

جبل صفا و مروہ

کعبہ سے جنوب مشرق کی جانب یہ دونوں پہاڑ واقع تھے۔ اب زمین سے تقریباً دو دو گز ان کی اونچائی باقی رہ گئی ہے جہاں زینے اور محراب بنوا دیئے گئے ہیں۔ آج کل ان دونوں کے درمیانہ حصہ میں بڑا شاندار بازار لگتا ہے۔ ان کے درمیان میلین اخضرین ہیں۔ یہ اس بات کے نشان ہیں کہ حاجی اس فاصلہ کو دوڑ کر پورا کریں۔ پہلے زمانہ میں میلین اخضرین تک یہ دونوں پہاڑ تھے اور میلین کی جگہ وادی تھی جہاں حضرت ہاجرہ نے سعی فرمائی تھی۔ مگر سیلابوں نے اس وادی کو پُر کر کے اونچا کر دیا ہے۔ دونوں پہاڑوں کا درمیانہ فاصلہ ۴۹۰ گز اور چوڑائی ۱۲ گز ہے۔ صفا سے میل اصغر تک ۷۷ گز کا فاصلہ ہے۔ میلین کا درمیانہ فاصلہ ۷۵ گز اور دوسرے میل سے مروہ تک ۲۹۱ گز ہے۔ سات پھیروں میں تقریباً پونے دو میل کی مسافت پڑ جاتی ہے۔ آنحضرت صلعم جس رستے سے کوہ صفا پر گئے تھے۔ اس جگہ مسجد حرام میں ستون نصب ہیں جو رکن عالی سے ۴۶ گز انگریزی کے فاصلہ پر ہیں اور سامنے باب الصفا کا نہایت شاندار دروازہ لگا ہوا ہے۔

اس کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ صفا منسوب ہے حضرت آدم صفی اللہ کی طرف کیونکہ شروع شروع آپ اس پر تشریف فرما ہوئے تھے اور مروۃ "امرۃ" سے ہے جس کے معنی عورت کے ہیں چنانچہ حضرت حوّا اس پر تشریف فرما ہوئی تھیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ صفا و مروہ اس عورت اور مرد کا نام تھا جنہوں نے قدیم زمانے میں حرم شریف میں بدکاری کی تھی جس سے ان کو پہاڑ کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور بعد میں انہی کے نام سے دونوں پہاڑیوں پر بُت رکھ دیئے گئے تھے مگر پہلی وجہ کو ترجیح دی گئی ہے۔

درحقیقت یہ دونوں پہاڑ اللہ تعالےٰ کے پرعظمت نشانات ہیں حضرت ہاجرہ ان پر چڑھ کر بیتابانہ انداز سے اپنے لخت جگر اسمٰعیل کے لئے پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں۔ آپ چونکہ محض خلوص و اخلاص اور باری تعالےٰ کے حکم کی اطاعت میں اس جگہ قیام پذیر ہوئی تھیں اور یہ دوڑنا بھی محض اسی کی ذات کے لیے تھا۔ اس لئے خدا تعالےٰ نے نہ صرف اس ادا کو سارے عالم کے حجاج کے لئے تاقیامت واجب کر دیا بلکہ ان پتھروں کے ڈھیروں کو جن پر یہ واقعہ تھا "ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ" کہہ کر اپنا شعار بنایا اور ان کی تعظیم کرنے والوں کو تقویٰ قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا "ذالک ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب"۔

شعب ابی طالب

مکہ کے مشرقی حصے میں دور تک پہاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ اس کے قرب و جوار کی زمین کو شعب ابی طالب کہتے ہیں۔ یہ ساری زمین ابی طالب عم رسول صلعم کی ملکیت میں تھی۔ ابتدائے اسلام میں آنحضرت اور آپ کے ساتھیوں کو اعلان حق کی پاداش میں اہل قریش نے اس میں دو سال چند ماہ محصور رکھا تھا۔ یہ زمانہ بیحد سخت اور مسلمانوں کے لئے بیحد صبر آزما اور ابتلا و آزمائش کا تھا۔ ایک صحابی کی روایت ہے کہ ہم لوگ اس زمانہ میں سوکھے چمڑے دھو کر اور آگ پر بھون کر کھاتے اور ساتھیوں کو کھلاتے تھے" (طبقات ابن سعد) اس جگہ کی حاضری سے وہ تمام مصائب سامنے آجاتے ہیں، اور اعلان حق کا جوش پیدا ہوتا ہے۔

وادی محصب

مکہ سے نکل کر منیٰ جاتے ہوئے چند فرلانگ پر یہ وادی پڑتی ہے پہلے اس جگہ گھنے سایہ دار درخت تھے مگر اب پہاڑیاں اور ایک مسجد باقی ہے جہاں حضور نے مع اپنے ساتھیوں کے آرام فرمایا تھا۔ ہر حاجی کو چاہیے کہ منیٰ سے واپسی کے وقت کچھ دیر ٹھہر کر مکہ شریف میں داخل ہو مگر بہتر یہ ہے کہ عصر، مغرب اور عشا کی نماز یہاں ادا کرے اور کچھ دیر آرام لیکر مکہ میں داخل ہو جیسا کہ آنحضرت صلعم سے لیکر اب تک بزرگان دین کا دستور رہا ہے۔

جبل عرفات

عرفات کے میدان کے تین طرف ایک مسلسل پہاڑی سلسلہ ہے جس نے تین طرف سے اس میدان کو گھیر رکھا ہے صرف جانب مکہ کھلا ہوا ہے۔ اس پہاڑی سلسلہ کو جبل عرفات اور اس میدان کو میدان عرفات کہتے ہیں یہ میدان جس میں حجاج ٹھہرتے ہیں دو میل چوڑا اور دو میل لمبا ہے۔ پورے میدان میں کنکریلی ریت ہے اور کہیں کہیں پہاڑی گھاس اُگی ہوئی ہے اسے "عرفات" اس لئے کہتے ہیں کہ حضرت آدم اور حوّا کے درمیان پہلی ملاقات اسی جگہ ہوئی تھی۔ یا اس لئے کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام گوشوں کے آدمیوں سے بیک وقت تعارف اور ملاقات ہوتی ہے۔ لیکن سب سے صحیح یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو اس جگہ معرفت حق حاصل ہوئی تھی۔ اسی کی یادگار کے طور پر اس دن اور اس جگہ لوگوں کو جمع کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ اسی طرح معرفت حق حاصل کر کے اطاعت ربانی کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔

جبل رحمت

میدان کے وسط میں جبل رحمت ہے جہاں آنحضرت صلعم نے دعا مانگی تھی اس جگہ پتھر کا ایک ستون بطور یادگار نصب ہے جس پر روشنی ہوتی ہے۔ یہ پہاڑ زمین سے تقریباً ۹۰ فٹ بلند ہے اس جگہ دعا مانگنا افضل اور ٹھہرنا مستحب ہے اس پر ایک مسجد ہے جو صخرات کے نام سے مشہور ہے اسی کے قریب سیاہ پتھروں کا فرش ہے جو آنحضرت صلعم کا موقف ہے یہیں امام خطبہ دیتا ہے۔

وادی عرفہ

مسجد نمرہ سے مغربی جانب تھوڑی دور پر وادی عرفہ ہے جہاں چھوٹے چھوٹے چند پہاڑ ہیں۔ ان کے درمیان ایک میدانی شکل پیدا ہوگئی ہے، یہ حصہ میدان عرفات سے خارج ہے۔ لہٰذا اس میں قیام نہ کرنا چاہئے ورنہ وقوف عرفات نہ ہوگا نہ ہی حج ہوگا اس لئے جہاں تک ہو سکے مسجد نمرہ یا جبل رحمت کے قریب قیام کرے اس میں اجر و ثواب بھی زیادہ ہے۔

جبل مزدلفہ

مزدلفہ کا وسیع و عریض میدان ہے جہاں حج کے بعد عرفات سے آکر رات گزاری جاتی ہے۔ اس میدان کی حد عرفات کے میدان کے سرے سے وادی محسر تک ہے جس کا درمیانہ فاصلہ ۴۳۰۰ گز کے قریب ہے میدان کے اختتام پر جبل مزدلفہ ہے۔ جو اب صرف دو گز او نچا رہ گیا ہے۔ اس پر مشعر حرام ہے۔ جس کا تذکرہ قرآن حکیم میں ان الفاظ میں ہے۔" فاذا افضتم من عرفات فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام"۔ (جب تم عرفات سے گزر چکو تو مشعر حرام کے نزدیک اللہ تعالےٰ کو یاد کر لیا کرو) اسے "مشعر الحرام" اس لئے کہتے ہیں کہ مشرکین مکہ اسلام سے قبل یہاں اپنے جانوروں کو نشان لگاتے تھے اور قربانی کے لئے خاص کر دیتے تھے۔ اس رسم کو عربی میں "شعار" اور اس جگہ کو "مشعر" کہتے ہیں۔ اسی مشعر الحرام اس لئے بھی کہتے ہیں کہ اس کے پاس دعا کرنا اور ذکر و فکر میں مصروف رہنا حج کے شعار میں داخل ہے۔ امام غزالیؒ نے اسے ترجیح دی ہے۔ امام ابن العربی فرماتے ہیں کہ "شعار" علامت کو کہتے ہیں اور یہ چونکہ وقوف مزدلفہ کی علامت ہے لہٰذا اسے "مشعر الحرام" کہتے ہیں کیونکہ یہ حرم مکہ میں داخل ہے۔

اسے مزدلفہ اس لئے کہتے ہیں کہ حضرت حوا اور آدم کے دلوں میں اسی جگہ الفت پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے حکم ہے کہ یہاں مومنین و مومنات کے دلوں میں الفت و محبت کی دعا مانگی جائے۔ مزدلفہ کا تیسرا نام "جمع" بھی ہے۔ عبداللہ بن مسعود سے جو بخاری و مسلم میں روایت ہے اس میں لفظ "جمع" ہی بولا گیا ہے۔

وادی محسر

منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ہے۔ یہاں ابرہہ مع اپنی فوجوں کے ہلاک ہو گیا تھا جو ہاتھیوں کی ایک بڑی فوج لے کر خانہ کعبہ کو تباہ کرنے آیا تھا یہ واقعہ حضور کی پیدائش کے سال ہے۔ اس کا تذکرہ سورۂ فیل پارہ عم میں بھی ہے۔ اس جگہ سواری کو تیز کر دینا چاہئے جیسا کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت سواری تیز فرما دیا کرتے تھے (ابن ماجہ، ابوداؤد)

جبل نوبی

کہا جاتا ہے کہ اس جگہ حضرت عمر ابن الخطابؓ کی ولادت ہوئی تھی مصنف اعلام کہتے ہیں کہ ۱۴ ربیع الاول کو آپ پیدا ہوئے تھے۔ مکہ کے فقرا ہر ماہ کی ۱۴ تاریخ کو اس جگہ جاتے ہیں اور عبادت و ریاضت وغیرہ میں مصروف رہتے ہیں۔ بعض علماء نے اس جگہ کو بھی قبولیت دعا کے لئے مخصوص فرمایا ہے۔ (اعلام مصنفہ ۹۸۵ھ)

جبل ضب

یہ منیٰ میں ایک زبردست اور عظیم الشان پہاڑ ہے۔ مسجد خیف اسی کے شمالی دامن میں واقع ہے۔ مشہور ہے کہ اس پر ستر رسولوں نے عبادت کی ہے۔ آنحضرت صلعم بھی کبھی کبھی بغرض زیارت اس پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ علامہ فاکسی نے تاریخ مشعر الحرام میں لکھا ہے کہ اس میں چاندی اور تانبے کی بہت سی کانیں ہیں اور لوہا بھی بکثرت موجود ہے۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں کسی بادشاہ نے اس کا تجربہ کیا تھا تو اس نے بہت سی دھاتوں اور لوہے چاندی کا پتہ لگا لیا تھا۔

جبل خندمہ

جبل بوقبیس کے پیچھے ایک بہت بڑا پہاڑ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فاکہیؒ روایت کرتے ہیں کہ اس پہاڑ میں ستر انبیا کے مزارات ہیں۔

علامہ فاکسی نے اس کی بڑی بزرگی بیان کی ہے۔ اور اعلام میں لکھا ہے کہ اس کی زیارت مقبول اور دعا مستجاب ہے (اعلام صفحہ ۳۱۰)

غارِ مرسلات

اسی پہاڑ میں غار مرسلات ہے جو مسجد خیف سے تقریباً ۱۰۰ گز کے فاصلہ پر ہے۔ غار میں اوپر کی طرف ایک گول سا نشان ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ آنحضرت صلعم کے سر مبارک کا نشان ہے۔ لوگ برکت کے خیال سے اس میں اپنا سر گھسانتے ہیں۔ سورہ مرسلٰت اسی غار میں نازل ہوئی تھی۔ بخاری شریف میں اس غار کا تذکرہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روائت کے سلسلہ میں آیا ہے۔ یہ غار اکثر لوگوں کو معلوم نہیں ہے مگر اس کے باوجود شدید اجتماع ہوتا ہے۔

حجر مدّعا

یہ دشینہ کدا کے پاس پتھروں کا ایک ٹیلہ سا ہے۔ یہاں سے خانہ کعبہ نظر آتا تھا۔ اور لوگ تبرکاً اس جگہ کھڑے ہوکر رویت کعبہ کے وقت دعا مانگتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بھی اس جگہ دعا مانگی ہے۔ اور دوسرے صحابہ کرام نے بھی۔ حالانکہ حضور صلعم کے متعلق کسی مستند ذریعہ سے اس جگہ کھڑا ہونا ثابت نہیں علامہ قاضی جمال الدین محمد ابوالبقا ابن ضیاء الحنفی نویں صدی ہجری کے بڑے مورخ اور علماء سے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت تک اس جگہ سے خانہ کعبہ نظر آتا تھا۔

حافظ نسفی بیان کرتے ہیں کہ اس جگہ دعا قبول ہوتی ہے خواہ کعبہ نظر نہ آئے کیونکہ یہ بزرگان دین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دعاؤں کی قبولیت کی جگہ رہ چکی ہے۔ (مراۃ الحرمین ابراہیم رفعت پاشا)

تاریخ کا پیغام

اس فنا آباد عالم میں وہی مرتا نہیں — زندگی سے ہے جو خائف، موت سے ڈرتا نہیں
ڈھونڈتے پھرتے ہیں جلوے حسن کی جائے قرار — اب بھی اے غافل تو دامانِ نظر بھرتا نہیں
انتہائے خندہ ہستی سے واقف ہے وہی — جو شرر کی طرح رقصِ بے محل کرتا نہیں
چومتی ہیں پاؤں اس کے اک جہاں کی رفعتیں — جو سکوں دشمن، تلاشِ عافیت کرتا نہیں
آدمیت لوحِ ہستی پر ہے نقشِ بے فروغ — آدمی اس میں اگر رنگِ عمل بھرتا نہیں
دل کو چھلکائے گا کیا اک قطرۂ صہبائے غم — یہ وہ ساغر ہے کہ دریا سے بھی جو بھرتا نہیں

رمزِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ سے وہی ہے آشنا
زیرِ خنجر بھی جو شبلی! موت سے ڈرتا نہیں

شبلی بی کام

ایک آدمی کی قیمت پانچ روپے (صہ ۵)

علم کیمسٹری کے ماہروں نے انسانی جسم کے اجزا کی قیمت چھ روپے بتائی ہے۔ گویا ایک پورا انسان جو اپنے آپ کو مرد کہے
ہیں فروخت ہو سکتا ہے۔ مگر ایسے انسان جو اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم سے چربی، فاسفورس، چونا، شکر، فولاد، منگنیز
نکال پھینکتے ہیں ان کی قیمت **دو پیسہ بھی نہیں رہتی**۔

بچپن کی بری عادتیں ہوں یا جوانی کی بدچلنی ہو۔ ان سے تمام ڈھانچہ بگڑ جاتا ہے۔ جسم سے اوپر کی سات چیزوں قدرت نے
ا کے مطابق ہر انسانی مشین کو چلانے کے لئے دی ہیں۔ ان کو جب کوئی دور اندیش انسان ضائع کر دیتا ہے تو وہ طرح طرح
ن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور قوت مردانہ کی کمزوری، ندامت، سستی، وقت سے پہلے بڑھاپا، کام کرنے کے بعد تکان کا محسوس ہونا جیسی
دباتی ہیں۔ پھر ایسے مرد اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ کیونکہ ان کی انرجی جواب دے دیتی ہے اور شادی کے نام سے گھبرانے لگتے ہیں
جسم میں ان قیمتی اجزا کو سائنٹفک طریقہ سے دوبارہ داخل کر کے بہت جلد گئی ہوئی جوانی کو واپس لانے کا راز معلوم ہو گیا۔

سات دن میں جوانی کس طرح مل سکتی ہے

بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ جوانی کو لوٹانے کا علاج صرف سات دن میں ہو جاتا ہے۔ مگر ان سات دنوں کے اندر پورن برہمچاری رہنا ضروری ہے
طریقہ سے یہ علاج کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس لئے صرف انہی لوگوں کو یہ کورس استعمال کرنا چاہئے جو سات دن تک برہمچاری رہنے کا اقرار
علاج میں دو دوائیں ہوتی ہیں۔ ایک کھانے کی اور ایک لگانے کی، دونوں دوائیوں کے کورس کا نام "ری جووین" ہے۔ کھانے
پہلی خوراک حلق سے اتری اور اس نے تمام اعصاب کو ہوشیار کرنا شروع کر دیا۔ اور کمزوری کو اس طرح بدن سے نکالنا شروع کر دیا جیسے گند
، لگانے کی دوا بھی اپنے ایک قطرے کا کمال دکھاتی ہے۔ مریض خود حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں بجلی کی طرح لہریں دوڑنے لگتی ہیں
کا سمندر امڈ پڑتا ہے۔ اس کورس میں عجیب و غریب صفات بند ہیں۔ اگر کوئی تندرست انسان ایک دفعہ بھی استعمال کرلے تو جوانی کا پورا سماں دیکھ لے
ت۔ پورے کورس کی قیمت پانچ روپے ہے۔ ڈاک خرچ نو آنے (۹) علاوہ۔

(یہ کورس صرف ان ہی لوگوں کو بھیجا جائے گا جو سات دن تک ضبط سے کام لینے کا اقرار کریں گے)

لیبری دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۴۱ کلاں محل (اے، ایل) دہلی

سول ایجنٹ برائے پنجاب میکرو ٹریڈرز ——— سرکلر روڈ بالمقابل اڈہ شاہ عالمی لاہور
لاہور ایجنٹ ——— چوپڑہ میڈیکل ہال بیرون لوہاری گیٹ
امرتسر ایجنٹس ——— سری رام گنگا رام کیمسٹ ہال بازار شیخ تیرتھ اینڈ کو امرتسر و کراچی بندر روڈ
سیالکوٹ ایجنٹ ——— رام رکھا مل اینڈ سنز کیمسٹ ریل بازار

ہولناک دورِ جنگ

شفق کے خون میں ڈوبا ہوا ہے مہرِ مہیب دہکتے لوہے کی صورت ہیں تیر اُس کے قریب
فلک پہ برقِ جہاں سوز کی گرج ہے عجیب نگاہِ برہم انجم پلٹ رہی ہے نصیب
ہزاروں رنج و ستم بیگناہ سہتے ہیں
جبینِ دہر کے تیور کچھ اور کہتے ہیں

بپھر کے جنگ کی دیوی نے سونت لی تلوار نگاہیں غیظ کے آتشکدے زباں خونخوار
خدا ہی جانے کہ کس کس کا یہ کریگی شکار فلک بھی بھول گیا اپنی شوخیٔ رفتار
جو مہر و مہ تھے درخشاں وہ آج گہتے ہیں
جبینِ دہر کے تیور کچھ اور کہتے ہیں

بساطِ دہر کی اب ہو چکی ہے قطع و بُرید رواں ہے آتشِ سیّال کی طرح سے حدید
فلک سے ٹوٹ کے گرتے ہیں سیکڑوں خورشید یہ غالباً ہے کسی انقلاب کی تمہید
ہزاروں خون کے چشمے اُبل کے بہتے ہیں
جبینِ دہر کے تیور کچھ اور کہتے ہیں

ریاضِ دہر میں اب گُل کہاں مہکتے ہیں ہوائیں گیس ہی جس سے بشر سسکتے ہیں
زمیں پہ ذرّے نہیں ہیں شرر چمکتے ہیں فضا میں بم نہیں پیکِ اجل لپکتے ہیں
وحوش کی طرح غاروں میں لوگ رہتے ہیں
جبینِ دہر کے تیور کچھ اور کہتے ہیں

مری سمجھ میں ابھی تک یہ راز آ نہ سکا زمانہ شمعِ محبت یہاں جلا نہ سکا
یہ اپنے چہرے سے داغِ جفا مٹا نہ سکا زمیں کی پیاس کو خونِ بشر بجھا نہ سکا
سُنا ہے اس میں کچھ اہلِ کرم بھی رہتے ہیں
جبینِ دہر کے تیور کچھ اور کہتے ہیں

محمود اسرائیلی

ڈسرائیلی کا رومان

سابق وزیر اعظم برطانیہ کی زندگی کا ایک رنگین باب

از:- میر فیصل

ڈسرائیلی راتھ شائلڈ کے یہاں گیا تو راتھ شائلڈ کی ملازمہ نے اس سے درخواست کی "کیا آپ میری این کے ہمراہ کھانا تناول کرنا پسند فرمائیں گے؟"

ڈسرائیلی نے جواب دیا "اس غیر دلچسپ باتونی عورت کے علاوہ مجھے ہر دوسری اذیت گوارا ہے"

لیکن ملازمہ کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ کر فوراً ہی بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولا۔ "بہرکیف.... دعوت کو رد کرنا مجھے اخلاقی طور پر گوارا نہیں"

اس کے بعد وہ واسکوٹ کی جیب میں دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے ڈالے کھانا کھانے کے لئے علیحدہ کمرے میں چلا گیا۔

چند مزید ملاقاتوں کے بعد ڈسرائیلی اس نتیجہ پر پہنچا کہ میری این اگرچہ باتونی اور غیر دلچسپ ہے لیکن سیاسی مسائل کے متعلق اس کی رائے بہت سنجیدہ اور وزنی ہوتی ہے۔ میری این شادی شدہ تھی۔ اس کا شوہر مسٹر لوئس وندھم پارلیمنٹ کا رکن تھا۔ انتہائی نفرت کے اظہار کے بعد انسانی جذبات کی رَو فطری طور پر بالکل مخالف سمت اختیار کر لیا کرتی۔ ادھیڑ عمر "میری این" اپنی عمر سے کئی سال چھوٹے ڈسرائیلی کی مداح و قدرداں بن گئی۔ ڈسرائیلی بھی اسی چیز کی تلاش میں تھا۔

مصیبت کی طرح راحت بھی تنہا نہیں آتی۔ ادھر ڈسرائیلی کو حقیقی قدرداں اور بے لوث عقیدتمند میری رسائی ملی۔ ادھر ملکہ وکٹوریہ سریر آرائے سلطنت ہوئی اور ڈسرائیلی کا برسوں سے سویا ہوا بخت بھی ایک انگڑائی لے کر بیدار ہوا۔ پارلیمنٹ کی رکنیت کی آرزو اس کے تصورات میں کروٹیں لینے لگی۔ انتخابی مہموں میں یوں تو اس سے پہلے ڈسرائیلی کئی مرتبہ ناکام ہو چکا تھا لیکن اب کی مرتبہ لارڈ ڈینڈ ہرسٹ کی قدامت پسند پارٹی اور میری این کے رسوخ سے اسے بہت کچھ امید تھی۔ چنانچہ اس پارٹی کو نمائندگی کا حق ملا تو میری این کے رسوخ کے امتحان کا وقت بھی آیا۔ محبت ڈسرائیلی کے آڑے آئی اور مسٹر لوئس وندھم اپنی بیوی کی پرزور سفارش سے اس امر پر رضامند ہو گیا کہ وہ اپنے مشترکہ حلقہ نمائندگی میں ڈسرائیلی کو امیدوار بننے کی اجازت دے۔ قدامت پسندوں کا اس حلقہ میں کافی زور تھا۔ میری این تمام انتخابی مہم میں ڈسرائیلی کی دست راست ثابت ہوئی اور بالآخر ڈسرائیلی کی دیرینہ آرزو بر آئی۔

ڈسرائیلی کو پارلیمنٹ کا رکن بنے ابھی چھ ماہ ہی گزرے تھے۔ لارڈ میلبورن وزیر اعظم بن چکے تھے۔ ڈسرائیلی حزب مخالف کا رکن رکین تھا۔ ریل گاڑی نئی نئی ایجاد ہوئی تھی اور لوگ غیر معمولی دلچسپی اور خوف سے ریل گاڑی کے سفروں پر تبصرہ کر رہے تھے۔

ڈسرائیلی کے لئے پارلیمنٹ کی کارروائیاں اور میری این کی ذات اس ایجاد کی دلچسپی سے کہیں زیادہ دلفریب تھے۔ اس کی پہلی تقریر کا مخالفین غل غپاڑے سے استقبال کر چکے تھے۔ دوسری تقریر کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی تھی۔ لیکن ڈسرائیلی کو ان ابتدائی ناکامیوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ البتہ میری این کی دلجوئی وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسے خوش رکھنے کے لئے وہ ہر چیز قربان کر سکتا تھا اور اسے یقین تھا کہ میری موجودگی میں "میری این" ہمیشہ خوش رہے گی۔ لیکن تقدیر کے نوشتے اٹل ہوتے ہیں۔

دفعتہ میری این کے شوہر نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ پل بھر میں میری این کا سہاگ لٹ گیا۔ ڈسرائیلی کو اپنے سیاسی رفیق اور میری این کے صدمے کے باعث اس واقعہ پر دوگونہ رنج ہوا۔ میری این کا گھر جو ہر وقت مسرت و شادمانی کا مرکز بنا رہتا تھا ایک ماتم کدہ بن گیا۔ ملاقاتی خوش گپیوں کے بجائے تعزیت کی نیت سے آنے لگے۔ دوستانہ خطوط کے بجائے تعزیت کے خطوط کا تانتا لگ گیا۔ میری این کو ہر واقف نے صبر کی تلقین کی اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اگرچہ محبت کو بھی بعض اوقات رسوم کا پابند رہنا پڑتا ہے لیکن ڈسرائیلی نے اس رسمی شے کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر میری این کو تحریر کیا۔

"یہ فطری امر ہے کہ ایسے شدید مصائب کے بعد جن سے تم حال میں دوچار ہوئی ہو اور ایسی شدید پریشانیوں کے بعد جو تمہیں مجبوراً برداشت کرنا پڑیں گی تم اپنے دل

میں تنہائی اور غم واندوہ کے جذبات محسوس کروگی۔یہ فطری اور لازمی ہے لیکن تمھیں ماضی پر کفِ افسوس نہیں ملنا چاہیئے ممکن ہے کہ تمھارا مستقبل تمھارے لئے امید ومسرت سے لبریز ہو۔تمھاری اس مصیبت میں میرے مشورے، میری رفاقت سے جو کچھ تمھاری بہبودی اور دلجوئی کیلئے ہوسکتا ہے تمھیں اس پر اعتماد رکھنا چاہیئے۔"

ملک الموت گھر کے جس دروازے سے نکلتا ہے۔اسی دروازے سے بہت سی ابتلائیں بھی اندر داخل ہوجاتی ہیں۔دنیا سے میری این کے شوہر کا وجود کیا اٹھا۔ڈسرائیلی سے اس کے تعلقات پر جو پردہ سا پڑا ہوا تھا وہ بھی اٹھ گیا۔یوں بھی دنیا دو محبت بھرے دلوں کو باہم دیکھنے کی روادار نہیں لیکن ڈسرائیلی کو میری این کا فریفتہ پاکر لندن کی بے فکر سوسائٹی نے مخالفت کی ایک قیامت برپا کردی۔ہر مجلس میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور جس کے منہ میں جو آیا بولنے لگا۔

"میری این معقول جائداد غیر منقولہ کی مالک ہے اور شوہر کی جانب سے چار ہزار پونڈ ماہوار آمد کی بھی حقدار ہے۔اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔"

"ڈسرائیلی کو پارلیمنٹ کی رکنیت کی آرزو تھی۔وہ پوری ہوچکی اب بیوی اور دولت کا مسئلہ باقی رہ گیا تھا مگر وہ بھی میری این کی ذات سے حل ہوجائے گا۔"

"رنگیلے اور فضول خرچ ڈسرائیلی کو اس وقت دولت کی شدید ضرورت ہے۔آخر اس کے قرضوں کی ادائگی کی بھی کوئی صورت ہونا چاہیئے۔"

یہ تو مردوں کی گفتگو کا خلاصہ تھا۔عورتیں مردوں سے بھی بڑھ چڑھ کر حسد اور نکتہ چینی پر تلی ہوئی تھیں۔وہ علانیہ میری این کا مذاق اڑاتیں اسے طعنے دیتیں اور جب غیبت میں گفتگو کرتی تھیں تو اس بات پر مذاق اڑایا کرتیں کہ میری این کو یہ بھی معلوم نہیں کہ پہلے رومیوں کا عروج ہوا یا یونانیوں کا۔ان کے نزدیک میری این کا مذاق ہر جہت سے پست تھا۔حتیٰ کہ فرنیچر اور کپڑوں کے انتخاب میں بھی میری این بہت بدمذاق سمجھی جانے لگی۔اور ان کی گفتگو عموماً اس فقرے پر ختم ہوتی کہ۔

"یقیناً ڈسرائیلی جیسے نوجوان کو ایسی کودمغز، پھوہڑ اور بدسلیقہ عورت سے بدرجہا اچھی بیوی مل سکتی ہے۔"

ایک مرتبہ اس شوروغوغا کی گونج ڈسرائیلی کے کانوں تک پہنچی تو



تو اس نے نہایت تحمل سے کہا: "اگر وہ سوسائٹی کے نزدیک تربیت یافتہ یا ذہین نہیں تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ میں نے انتخابی مہم کے موقعہ پر اسے دیکھا ہے۔ اس کی رائے سنجیدہ، مدلل اور صائب ہوتی ہے۔ وہ اپنے فرائض نہایت مستعدی سے سرانجام دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں وہ حاضر جواب نہیں لیکن معاف کیجئے۔ میں باہر تو حاضر جوابی کا مداح ہوں لیکن اپنے مکان کی چار دیواری کے اندر اس کا روادار نہیں ——— مجھے تسکین کی ضرورت ہے۔ مجھے ایک سچی غمگسار اور مخلص رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے جس کی محبت مستقل اور بے لوث ہو ———"

ڈسرائیلی کے اس بیان پر سوسائٹی کی فضا میں نفرت کا ایک اور طوفان پیدا ہوا اور مخالفت بدستور بڑھتی چلی گئی۔

ڈسرائیلی نہایت تحمل اور خاموشی سے ان ذاتی حملوں اور عام مخالفت کو برداشت کرتا رہا۔ کیونکہ وہ اس کا عادی تھا، وہ برطانیہ کے ایک زبردست وزیراعظم کا دماغ رکھتا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک ذہین ادیب اور کامیاب مدبر کا دل تھا۔ لیکن میری این کے پہلو میں صرف ایک دل تھا۔ اور وہ بھی عورت کا کمزور دل ———!

لیکن ڈسرائیلی کو ابھی اس کا احساس نہ تھا اس نے بلا سوچے سمجھے میری این سے شادی کی درخواست کر دی۔

میری این نے ایک سال کی مہلت مانگی۔ ڈسرائیلی نے اس رسم کو جلد از جلد انجام دینے پر زور دیا لیکن جب میری این ایک نہ مانی اور اپنی بات پر اڑی رہی تو ڈسرائیلی کا ماتھا بھی ٹھنکا ———!

ناکامی اپنے سیاہ پر پھیلائے ڈسرائیلی کی کرنِ امید کو اپنے سینے سے بھینچ کر نابود کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جس محبت کو وہ اپنی زندگی کا سہارا سمجھتا تھا وہ اب برباد ہو چکی تھی۔ میری این اب ظاہری طور پر اس سے کنارہ کش سی ہو چکی تھی۔ اب ڈسرائیلی کبھی بھولے بھٹکے سے اس کے مکان پر جاتا تو غیر مردوں کی محفل میں میری این کو گھرا ہوا پاتا۔ آخر کہاں تک ضبط کرتا؟ اس نے تحریر کیا۔

"میں تمہارے ملاقاتیوں پر رشک تو ضرور کرتا ہوں لیکن حسد نہیں کرتا ——— جب شہباز تمہیں الوداع کہتا ہے تو گدھ تمہیں گھیر لیتے ہیں۔ اگر مجھے صحت، صحیح دماغ اور تمہاری مشتاق محبت ملے تو مجھے یقین ہے کہ میں دنیا کو فتح کر سکتا ہوں۔"

——— لیکن میری این نے اس خط کی کوئی پروا نہ کی۔ وہ بدستور اپنے دوسرے دوستوں سے دلچسپی لیتی رہی۔ اس نے ڈسرائیلی کا کوئی خیال نہ کیا اور ڈسرائیلی نے مجبوراً دوسری مرتبہ اپنے قلم کو جنبش دی۔

"میں محبت اور جدائی سے نباہ نہیں کر سکتا۔ محبت میرے نزدیک اس محبوب کا دائمی لطف رفاقت ہے جس پر میں دل و جان سے فدا ہوں۔ میں تمہارے ہر خیال، تمہارے ہر تصور، تمہاری ہر دلکشی، حتیٰ کہ تمہارے ہر احساس میں تمہارا رفیق بننا چاہتا ہوں۔ ایسا رفیق جو کبھی جدا نہ ہو ——— مجھے اس کی پروا نہیں کہ کہاں ———؟ جنت ہو ——— سطح زمین ہو یا ——— تہِ آب ———!"

اس مکتوب کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ ڈسرائیلی نے ملاقات کی درخواست کی۔ ملاقات کے دوران میں میری این نے ڈسرائیلی پر ذاتی حملے کئے۔ اس پر وہ تمام الزام لگائے جو اب تک سوسائٹی کی جانب منسوب ہوتے چلے آئے تھے۔ اس نے ڈسرائیلی کو لالچی اور مطلب پرست کا خطاب دیا۔ اسے صاف صاف کہہ دیا کہ میری دولت کے باعث مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ میں اپنے نفع و نقصان کو خوب سمجھتی ہوں۔

ڈسرائیلی نے لاکھ لاکھ سمجھایا لیکن وہ ایک نہ مانی اور آخر وقت تک اپنی ضد پر اڑی رہی۔ ڈسرائیلی مایوس اور بے نیل مرام اپنے گھر پہنچا۔ ملاقات نے اس کی تمام امیدوں کو پامال کر دیا تھا۔ اسے صدمہ تھا۔ وہ مایوس ہو چکا تھا میری این اس سے علانیہ بیزار تھی اور سوسائٹی اس کے خلاف کی آگ پر تیل چھڑکنے کے لئے ہر وقت موجود تھی لہٰذا ڈسرائیلی کی امید کا ٹمٹماتا ہوا ستارہ سیاہ بادلوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا لیکن وہ آخری دفعہ اپنی صفائی پیش کر دینا چاہتا تھا چنانچہ اس نے لکھا

"خدا کی قسم جہاں تک دنیوی اغراض کا تعلق ہے تمہارا رشتہ میرے لئے سودمند نہیں۔ جو شے سوسائٹی پیش کر سکتی ہے وہ میرے اختیار میں ہے مجھے کسی شہزادی کا محبوب بننا مقصود نہیں ہے مجھے قارون کو طلائی خزانے بھی شادی پر مجبور نہیں کر سکتے جس محبوب ہستی کو میں اپنی زندگی کا رفیق بنانا چاہتا ہوں اس کی صفات کہیں زیادہ اعلیٰ ہیں میری فطرت تقاضا کرتی ہے کہ میری زندگی ایک اعلیٰ محبت ہو زمانہ آئے گا کہ تم مجھے جدائی، عزت اور مایوسی کے جذبات کے ساتھ یاد کرو گی۔ پھر تمہیں وہ اخلاص مند پرجوش دل یاد آجائیگا جسے تم تباہ کر چکی ہو گی پھر تمہیں وہ جوہر یاد آئیگا جسے تم دھوکہ دے چکی ہو گی۔"

عین عالم مایوسی میں لکھا ہوا خط کیوپڈ کا تیر تھا جو عین نشانے پر لگا۔ میری این کے شکوک و شبہات نے حقیقی محبت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

ٹوڈر مل

فلک کو آج تک ہے یاد وہ دَورِ جہانبانی
سکون و امن تھا جب ہند کا عنوانِ پیشانی

زمانا کشورِ نکبت کو جب تاراج کرتا تھا
شہنشاہِ جلال الدین اکبر راج کرتا تھا

محبت، آشتی جب ہندو و مسلم کا ایماں تھی
فضا جب اتحاد و صلح کی گہوارہ جنباں تھی

خزاں کی بدلیاں جب ہند پر چھانے نہ پائی تھیں
نشیمن پر چمک کر بجلیاں آنے نہ پائی تھیں

فروزاں کر رہے تھے نورتن دربارِ اکبر کو
یہ نہریں دے رہی تھیں اور کچھ وسعت سمندر کو

ان اہلِ فن میں رتبہ خاص ٹوڈر مل کو حاصل تھا
وزیرِ مملکت تھا، باہنر تھا، مردِ کامل تھا

وہ ٹوڈر مل شہِ اکبر کا جس کو راز داں کہیے
وہ ٹوڈر مل جسے دیوانِ کُل ہندوستاں کہیے

وفادار و مشیرِ خاص و شمعِ رہنما کہیے
ہمایوں بخت و عالی ہمت و جنگ آزما کہیے

وہ بانی و مبانیٔ حکمت و آئینِ ملکی کا
وہ مبدا مالیاتِ ہند کا، ماہر ریاضی کا

ترانے عرصہ ہائے جنگ کی محبوب تھے اُس کو
سنان و تیغ کے سائے بہت مرغوب تھے اس کو

نہاں تھے اُس کی تدبیروں میں شمشیر زنی کے جوہر بھی
جھکا دیتا تھا اُس کی سامنے گردن مقدر بھی

دفاتر میں زبان فارسی لازم اُسی نے کی
نہ ہے، در پردہ اُردو کی بنا قائم اُسی نے کی

سُنہرا باب ہے تاریخ میں ان کارناموں کا
زمانہ آج تک ہی مست ایسے تُند جاموں کا

زبانِ ہند پر ہیں گیت اب بھی اُس کی عظمت کے
شوالے آسماں سے بھی ہیں اونچے اُس کی شہرت کے

علی احمد



ایک نے کہا۔ بہن کیا بتاؤں اب تو شاید مرنے کا وقت آگیا ہے۔ روز بروز میرا حال پتلا ہوتا جا رہا ہے۔

دوسری نے کہا۔ یہ عورتوں کے پیچھے ایسی مصیبت لگی ہے کہ ہر مہینہ پانچ چھ دن رو رو کر کٹتے ہیں۔

تیسری نے کہا۔ جب مجھے ماہواری شروع ہوتی ہے تو میرا جسم پھوڑے کی طرح دُکھنے لگتا ہے۔

چوتھی نے کہا۔ اور میرے ...... جب شروع ہوتے ہیں تو میری کمر میں اور پنڈلیوں میں اور ناف کے نیچے بہت ہی سخت درد معلوم ہوتا ہے

پانچویں نے کہا۔ اور بہن مجھے تو یہ دن قیامت معلوم ہوتے ہیں۔ دن بھر سر چکراتا ہے۔ پنڈلیوں میں اور پیٹ میں ہر وقت ایک اینٹھن سی رہتی ہے

چھٹی نے کہا۔ مجھے ایک نئی تکلیف ہے۔ ایک مہینہ میں دو مرتبہ ہوتے ہیں۔ بہت ہی کمزور ہوگئی ہوں۔

ساتویں نے کہا۔ میں اس تکلیف میں مبتلا ہوں کہ رک رک کر آتے ہیں۔ اور بہت ہی درد ہوتا ہے۔

آٹھویں نے کہا۔ میری تکلیف سب سے الگ ہی ہے۔ کئی کئی مہینے بعد ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہوتے ہیں تو بس ایسی تکلیف کے ساتھ کہ توبہ ہی بھلی۔

نویں نے کہا۔ میرے ساتھ یہ مصیبت ہے کہ ماہواری کے ساتھ ساتھ سفید پانی کی بھی کثرت ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے بدن میں سے کوئی جان کھینچ رہا ہے۔ کبھی پہلے رطوبت جاتی ہے کبھی بعد۔

کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیوں ہے

یہ سب عورتیں ماہواری ایام کی مریض ہیں۔ اگر ماہواری ایام بغیر درد کے باقاعدہ ہر مہینہ وقت مقررہ پر آجایا کریں تو کبھی ان میں سے کوئی تکلیف نہ ہو۔ ہندوستان کی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں عورتوں کو معلوم ہے۔ اور انہوں نے ذاتی تجربہ کیا ہے کہ اگر کوئی عورت مندرجہ بالا تکلیفوں میں سے کسی ایک یا بہت سی تکلیفوں کا شکار ہو جائے تو اسے بہت جلد تندرست کرنے کیلئے دوا "**کورس**" سے بہتر ہندوستان میں دوسری دوا نہیں ہے۔ دوا "کورس" استعمال کرنیکے بعد عورت کو ہر مہینہ نہایت پابندی کیساتھ مقررہ وقت پر صحیح مقدار میں بغیر کسی تکلیف اور بغیر کسی درد کے ماہواری ایام آنے لگتے ہیں۔ "کورس" کی ایک شیشی کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ جن بہنوں کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹرز زنانہ دواخانہ۔ اے۔ بی ۲۴ دہلی کو ایک خط لکھکر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں۔ محصول پارسل پر سات آنے خرچ ہوتے ہیں۔ ٹیلیفون نمبر ۹۲۶۰

کاشی کاری کی شاہکار

مغلوں کے فنِ تعمیر کا ایک نیم متعارف پہلو

از:۔ محترمہ وحیدہ عزیز بی-اے

مغلوں کے فنِ تعمیر میں "پچی کاری" اور "منبت کاری" کو جو اہمیت ل ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں یہ فن ایران سے ۔ جہاں اینٹوں کی دیواروں پر آنچ سے مومی رنگ چڑھانے کا عام دستور ۔ اس فن کو "مٹ چینا کا کام" یا "کاشی کاری" بھی کہتے ہیں۔ کاشان ں عراق کا ایک شہر ہے۔ یہاں چونکہ مٹی اور چینی کے ظروف پر بیل ے بنانے کا عام رواج تھا اس لئے یہ فن "کاشی کاری" کے نام سے مشہور یا۔ عربوں نے یہ فن یورپ کو بھی سکھایا۔ چنانچہ اٹلی میں مدتوں تک نوں پر نقاشی کی جاتی رہی ہے اور ان نقشی ظروف کو "میجو لیکا" (Majolica) کہتے تھے۔ ویسے تو ہندوستان کی تقریباً تمام مغلیہ توں میں کاشی کاری کے محیر العقول نمونے موجود ہیں۔ لیکن لاہور کا ۔ ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس قلعہ کی پچی کاری دیکھ کر بآسانی جا سکتا ہے کہ وہ ان نقش و نگار کی نقل ہے جو سولھویں اور سترھویں ی کے ایران میں مروج تھے۔ اس میں شک نہیں کہ پشاور میں کنشک ستوپ سے ایسی اینٹیں برآمد ہوئی ہیں جن پر پچی کاری کی گئی ہے لیکن کا یہ مطلب نہیں کہ یہ فن ایران سے نہیں آیا۔ پچی کاری یا کاشی کاری ور فن فروغ دینے والے دراصل مسلمان ہی تھے اور ان کے اہتمام بالشان موں کا ثبوت مغلیہ عمارتوں میں اب بھی موجود ہے۔

کاشی کاری کے شاہکار زیادہ تر پنجاب میں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ رہ رکن عالم ملتان، مقبرہ سکندر لودھی خیرپور، مسجد وزیر خاں لاہور چوبرجی لاہور میں کاشی کاری کے نادر نمونے پائے جاتے ہیں۔ یہ منبت ہا پہلے دستور کے مطابق ہموار اینٹوں پر نہیں کی گئی بلکہ تختی کی زمین ایک ایک دو دو انچ ابھری ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کافی مشکل لیکن ابھرے ہوئے نقش و نگار کی دلکشی سے کون انکار کر سکتا ہے؟

دہلی اور دوسرے مقامات کی شاہی عمارتوں میں کاشی کاری کا ز غالباً ۱۵۰۰ء سے ہوا۔ چنانچہ مقبرہ سکندر لودھی خیرپور میں اس کے ائی نمونے نظر آتے ہیں۔ مقبرے کی اندرونی محرابوں کی تزئین اینٹ وں سے کی گئی ہے جن پر بیل بوٹے اور ہندسی نقشے کندہ ہیں۔ اسی طرح محرابوں کی درمیانہ جگہ میں "نقش گلاب" بنائے گئے ہیں جن میں اینٹوں کے نیلے نیلے ٹکڑوں سے مرصع کاری کی گئی ہے۔ وزیر خاں کی مسجد میں بھی کاشی کاری کے حسین ترین شاہکار موجود ہیں۔ بادی النظر میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی دیواروں پر رنگ سے بیل بوٹے ڈالے گئے ہیں حالانکہ یہ سب جڑائی کا کرشمہ ہے۔ ہر پھول، ہر پتہ اور سفید زمین کا ہر ٹکڑا علیحدہ علیحدہ تیار کرکے گارے میں پیوست کیا گیا ہے۔ لیکن ان اجزا کو ایسی ہنرمندی اور چابکدستی سے مرتب کیا گیا ہے کہ بانیٔ مسجد کے حق میں بے اختیار دعا نکلتی ہے۔ بعض مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کی ترصیع کے لئے چین سے ماہرین فن کو طلب کیا گیا تھا۔ لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔

پچی کاری کا ایک اور نمونہ چوبرجی لاہور میں ملتا ہے۔ اس باغ کا صرف ایک دروازہ باقی رہ گیا ہے جس پر فیروزہ، لاجورد اور کہربا، کے ٹکڑوں سے منبت کاری کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ "گلابی باغ" اور "علی مردان خاں کے مقبرے" کے دروازوں پر بھی اس فن کے کمالات کا مظاہرہ موجود ہے۔ ان آثار سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ سترھویں صدی عیسوی میں ان عمارتوں کا شمار لاہور کی بہترین شاہی عمارتوں میں ہوتا تھا۔

رنگ آرائی کے لحاظ سے لاہور کا شاہی قلعہ امتیازی درجہ کا مستحق ہے۔ ایک ایسی دیوار کا تصور کیجئے جو پانچسو گز لمبی اور سولہ گز چوڑی ہو۔ یعنی جس کا رقبہ آٹھ ہزار مربع گز سے زیادہ نہ ہو اور اس پر چینی کے مرصع ٹکڑوں سے منبت کاری کا اعجاز دکھایا گیا ہو۔ اس دیوار پر نہ صرف بیل بوٹے ڈالے گئے ہیں بلکہ تصویریں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر تصویریں مغل بادشاہوں کی درباری زندگی سے متعلق ہیں اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے حد درجہ معلومات افروز ہیں۔ بعض تختیوں پر ہاتھیوں کی لڑائی کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ بعض پر ہندسی نقشے کھینچے گئے ہیں اور بعض پر گلکاری کی گئی ہے۔ لیکن پھولوں میں امتیاز کرنا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ پانچ چھ رنگ استعمال کرنے کے باعث

انکی ہیئت کتنا ئی بڑی حدتک غیر قدرتی ہو چکی ہے۔

یہ تزئین و آرائیش سترھویں صدی کے فن رنگ آرائی کی مرہون منت ہے۔ اس لحاظ سے شاہجہاں کے عہد میں کاشی کاری کا فن بہت زیادہ ترقی یافتہ نظر آتا ہے۔ شاہی قلعہ کے بیرونی دروازے سے گزرتے وقت محل کے ساتھ اور خارجی دیواروں کے درمیان پچاس گز کی ایک جگہ نظر آتی ہے۔ جس پر کاشی کاری کے بعض نادر و نایاب نمونے موجود ہیں، "رو کار" کا بیشتر حصہ روغنی تختیوں سے مزین ہے۔ جن پر جڑائی کا کام کیا گیا ہے۔ اور جن پر انسانوں گھوڑوں اور ہاتھیوں کی تصویروں کے علاوہ برجوں اور فرشتوں کی تصویریں بھی بنائی گئی ہیں۔ چند مناظر طلوع آفتاب کے ہیں جو غالباً شاہجہاں کے "صاحبقران" ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

دیواروں کی عام ترصیع و تزئین کا طریقہ بہت سادہ ہے۔ محرابوں اور قوسوں کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا ہے جن پر افقی انداز میں روغنی تختیاں لگا دی گئی ہیں۔ اور ان پر ہندسی نقشے، بیل بوٹے اور تصویریں کندہ ہیں۔ تصویروں کے موضوع میں تنوع کا خیال رکھا گیا ہے۔ عام طور پر پرندوں، اونٹوں کے قافلوں، پھٹے کھروں والے بھوتوں، اژدہاؤں، دیوتاؤں اور اسپ سواروں کی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ ایک تختی پر چار اسپ سوار دکھائے گئے ہیں جو پولو یا "چوگان" کھیل رہے ہیں کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں یہ کھیل آگ کے انگاروں سے کھیلا جاتا تھا۔

"ثمن برج" میں کاشی کاری اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہے۔ اگرچہ بعض تصویریں حوادث زمانہ کا شکار ہو چکی ہیں۔ اور دیوار کے اس حصے پر سکھوں کی مشق ستم کے نشان بھی نظر آتے ہیں تاہم جو کچھ موجود ہے وہ نگاہوں کو خیرہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ سکھوں نے دو دفعہ اس قلعہ پر گولہ باری کی تھی۔ ایک جنوری ۱۸۴۱ء میں دوسرے ستمبر ۱۸۴۳ء میں۔ اس حملہ سے محرابی طاقچوں کے درمیان منقش تختیوں کی لگری کو جو نقصان پہنچا وہ ناقابل بیان ہے۔

"ثمن برج" کی تزئین میں گہرے نیلے رنگ کی ہاتھیوں کی لڑائی کا منظر خاص طور پر قابل دید ہے۔ ان میں سے ایک تصویر سفید زمین پر بنائی گئی ہے۔ مہرہ ہاتھی پر دو مہاوت ہیں تاکہ اگر ایک لقمہ اجل ہو جائے تو دوسرا آگے کر اس کی جگہ لے لے۔ یہ منبت کاری اس وجہ سے بھی نمایاں ہے کہ اس میں دونوں غضبناک جانوروں کو صلیب نما مشعلوں کے ذریعہ سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ بھی

نمانہ کی ایک عجیب و غریب رسم تھی ۔ اس کے علاوہ بعض تختیوں پر
ہزاآمیز لڑائی کے مناظر بھی پیش کئے گئے ہیں ۔ یہ دیکھ کر تعجب
ہے کہ بعض گھوڑے بیجان اور پالتو ہیں ۔ گویا لکڑی کے
لئے گئے ہوں ۔ یک کوہانی اونٹوں کو بھی دیکھ کر ہنسی آجاتی ہے
، باختری اونٹوں کے سنجیدہ مُنہ اور ہلکی پھلکی گردن کی تصویر نہایت
ی سے کھینچی گئی ہے۔

شاہی حرم کی دیواروں پر بھی چینی سے گلکاری کی گئی ہے ۔ لیکن
ول کے بجائے یہاں دو آدمی بگل بجاتے ہوئے دکھائے گئے ہیں اس
ادہ شاہی پیادوں کی بھی بعض نفیس تصویریں بھی موجود ہیں۔

شہنشاہ جہانگیر کو جانوروں سے محبت تھی شاید اسی لئے اس
مد کی کاشی کاری میں بکری اور بندر کو اہمیت حاصل ہے ۔ بندر کو
ب و غریب لباس پہنایا گیا ہے ۔ اور بکری کو اس کا آقا سبز پھرکیوں
یک سلسلہ پر توازن کرتا ہوا دکھایا گیا ہے ۔

ایک اور تصویر سیاہ نیلے اژدہا کی ہے جو ایک نیلی سفید بکری کا
تعاقب کر رہا ہے ۔ اژدہا کے پاؤں پر چھوٹے چھوٹے پَر ہیں جو اسے اڑائے
لئے جا رہے ہیں ۔ شکار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا ہے ۔ گویا اس تیز رفتاری کے
سبب پر غور کر رہا ہو ۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ بادشاہ کی خوابگاہ
میں اس قسم کی خوفناک تصویریں بنانے سے کیا مقصد ہے؟

شاہجہاں کی وفات کے بعد کاشی کاری کا فن تقریباً ناپید
ہوگیا اور اب اس کے آثار ملتان کے سوا کہیں نظر نہیں آتے ۔ ملتان
میں مٹ چینا کا کام عام طور پر مسجدوں، مقبروں اور عمارتوں کی
تزئین و آرائش کے لئے ہوتا ہے ۔ اور اس مقصد کے لئے صرف سیاہی
مائل نیلے، سبز، پیلے اور سفید رنگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے نقش و نگار
بھی بہت سادہ اور عام ہوتے ہیں ۔

تعجب ہے کہ اس موضوع پر یورپی تو کیا کسی ہندوستانی مورخ نے
بھی قلم نہیں اٹھایا ۔ مجھے امید ہے کہ ماہرینِ فن توجہ فرما کر اس موضوع
پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈال سکیں گے ۔

اشارات

عشق ہے آنسو حُسن تبسم اپنی اپنی قسمت ہے
ایک گرا اور خاک میں گُم ہے ایک نظر کی جنت ہے،

تیرے کرم کی تیرے ستم کی یعنی تیری حاجت ہے
لیکن میں یہ کہہ نہیں سکتا مجکو تجھ سے اُلفت ہے

دل کی دنیا خالی خالی آنکھ کی محفل سُونی سُونی،
لُوٹ لی رونق اُن کی نظر نے جن کی دید کی حسرت ہے،

گاہ کرم ہے گاہ ستم ہے، عشق ہے سادہ حُسن فسونگر
میں کیا سمجھوں آپ کو مُجھ سے اُلفت ہے، یا نفرت ہے؟

اشکِ مسلسل غم کی کہانی، سادہ سادہ، رنگیں رنگیں
تم نہ سنو گے، کون سُنے گا، ایسی کس کو حاجت ہے!

بدلی بدلی اُن کی ادائیں، ترچھی ترچھی اُن کی نگاہیں
شوق و تمنا نذرِ ستم ہیں دل میں یاس و حسرت ہے

روٹھنے والا جب سے روٹھا بھولنے والا جب سے بھُولا
دل میں خلش ہے آنکھیں پُرنم، لب پر ذکرِ محبت ہے

اُن کی محفل، اُن کے جلوے، میری نظریں، میرے ارماں
واہ رے فرحت کیا کہنا یہ جنت بھی کیا جنت ہے!

فرحت شاہجہانپوری

جنگ عظیم کی ایک شام

جان گالزوردی کا ایک ڈراما

ترجمہ :- جناب عزیز احمد

کردار :- ایک فوجی افسر ایک لڑکی،

ایک خالی کمرہ، پردے کھینچے جاتے ہیں اور گیس کے قمقمے کھینچ کر نیچے کر دیئے جاتے ہیں، فرنیچر اور دیواریں سبزی مائل نظر آتی ہیں۔ بائیں جانب ایک آتشدان اور ایک چھوٹی سی میز ہے۔ جس کے پاس ایک کھڑکی ہے اور اس پر پردہ پڑا ہے۔ میز پر ایک معمولی برتن میں سنبل کی تازہ ڈالیاں رکھی ہوئی ہیں۔ سیدھی طرف کے دروازے سے ایک لڑکی اور ایک نوجوان فوجی افسر داخل ہوتے ہیں۔ لڑکی کا لباس سیاہ، سر پر ہیٹ، چہرے پر باریک جالی کی نقاب اور ہاتھوں میں جمیئی رنگ کے دستانے ہیں۔ نوجوان افسر کا قد لمبا، تروتازہ شاداب چہرہ، بھوری ہنستی ساتی آنکھیں اور پاؤں میں تھوڑا سا لنگ ہے۔ لڑکی جو بہت بے تکلف معلوم ہوتی ہے گیس کی روشنی کے پاس جاتی ہے تاکہ قمقموں کو اوپر کھینچ دے۔ لیکن فوراً ہی وہ اپنا خیال بدل کر کھڑکی کے پاس آتی ہے اور پردہ ہٹا کر کھڑکی کے پٹ کھول دیتی ہے۔ چاند کی خنک روشنی کمرے کے اندر داخل ہوتی ہے۔ کھڑکی کے باہر دور درختوں کے جھنڈ نظر آتے ہیں۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑی باہر دیکھتی ہے لیکن فوراً ہی کانپتے ہوئے اپنا رخ کمرہ کی سمت پھیر لیتی ہے۔

نوجوان افسر :- آخر معاملہ کیا ہے؟ جب میں نے تم سے گفتگو کی تو تم رو رہی تھیں

لڑکی :- (اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے) کوئی بات نہیں، کتنی رنگین شام ہے۔ اور کچھ نہیں۔

نوجوان افسر :- (اسے دیکھتے ہوئے) پھر تو لطف اٹھاؤ۔

لڑکی :- (اپنی ہیٹ اور نقاب اتارتے ہوئے۔ اس کے سر کے بال سنہرے ہیں) لطف اٹھاؤں۔ تم میری طرح تنہا نہیں ہو۔

نوجوان افسر :- (کھڑکی کی طرف لنگڑا کر آتے ہوئے۔ کچھ مشتبہ ہو کر) تم کیونکر یہاں تک پہنچ سکیں؟ کیا ایسا کرنا زندگی کو یاس انگیز اور پرخطر بنانا نہیں ہے؟

لڑکی :- ہاں، یہ سچ ہے کیا تم زخمی ہو گئے تھے؟

نوجوان افسر :- میں آج ہی ہسپتال سے نکلا ہوں۔

لڑکی :- جنگ بھی کتنی دہشتناک چیز ہے، دنیا پر تمام مصیبتیں اور تمام بلائیں جنگ ہی کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں۔ اور یہ ختم کب ہوگی؟

نوجوان افسر :- (کھڑکی پر جھکتے ہوئے اور غور سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے) تم کس قومیت سے تعلق رکھتی ہو؟

لڑکی :- (اسے گھورتی ہے اور فوراً ہی نظریں ہٹا لیتی ہے) روسی!

نوجوان افسر :- کیا تم سچ کہتی ہو۔ میں اب تک کسی روسی لڑکی سے نہیں ملا۔ (لڑکی دوبارہ اسے گھورتی ہے) اگر یہ بات معلوم ہو جائے تو ضرور تم پر کوئی آفت آ جائیگی۔

لڑکی :- (اس کے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) اس وقت تک نہیں جب تک تم جیسا نیک اور شریف نوجوان میرے پاس موجود ہے (وہ مسکراتی ہے اور اس کی مسکراہٹ اس کی گفتگو کی طرح ملائم اور پر اعتماد ہوتی ہے) تم اس لئے ٹھہر گئے کہ میں غمزدہ تھی اور دوسرے اس لئے کہ میں خوبصورت ہوں۔ میں مردوں سے دور بھاگتی ہوں اور شاید تم بھی .....

نوجوان افسر :- ان معمولی مردوں کو تم نے ان کے بہترین روپ میں نہیں دیکھا جب ان کی جاں نثاری کا جذبہ قابل تحسین ہوتا ہے۔ اور تعجب خیز بھی۔

لڑکی :- (اپنی بھوری خوبصورت آنکھیں اس کی طرف پھیرتے ہوئے) میرا خیال ہے کہ تم ان میں بھی وہی جذبہ اور وہی احساس دیکھتے ہو جو تم میں ہے۔

نوجوان افسر :- نہیں، یہ بات نہیں، تم نے غلط سمجھا۔ جب ہم نے دشمن پر حملہ بول دیا اور میں زخمی ہو گیا تو یہی معمولی سپاہی اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے تھے۔

لڑکی :- (بدلی ہوئی آواز سے) اور شاید دشمن بھی اسی بہادری سے لڑ رہا تھا،

نوجوان افسر - تم ٹھیک کہتی ہو - میں نے بھی یہ محسوس کیا -

لڑکی - تم ایک بُرے آدمی نہیں ہو - میں بُرے آدمیوں کو کسی قدر ناپسند کرتی ہوں -

نوجوان افسر - عوام دراصل بُرے نہیں ہوتے - وہ صرف آدمیوں کو پہچانتے ہیں -

لڑکی - تم بہت بھولے ہو بالکل بچوں کی طرح نادان - ہے نا؟

(نوجوان افسر اس کی بات پسند نہیں کرتا اور غصہ کی علامت اس کے چہرے پر ظاہر ہوتی ہے - لڑکی ناز سے اس کی طرف دیکھتی ہے)

لڑکی - (پرشوق ہوکر) لیکن میں تمھیں اس لئے پسند کرتی ہوں کہ تم بہت بھولے ہو - ایک اچھے آدمی کو پانا ان دنوں ایک نعمت ہے -

نوجوان افسر - (جلدی سے) تنہائی کے خیال سے؟ کیا تمھارا کوئی روسی محبوب نہیں ہے؟

لڑکی - (بغیر سمجھے ہوئے) روسی؟ نہیں کوئی روسی دوست نہیں (جلدی سے) کیا تم کسی نغمہ میں کھوئے ہوئے تھے جب تم نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا -

نوجوان افسر - ہاں کچھ ایسی ہی بات تھی -

لڑکی - اور میں بھی —— میں بھی موسیقی کی دلدادہ ہوں -

نوجوان افسر - میرا خیال ہے کہ تمام روسی موسیقی کے شایق ہوتے ہیں -

لڑکی - (اس پر ایک نظر ڈال کر) نہیں گانا سننے ہمیشہ جاتی ہوں، جب میرے پاس روپیہ ہوتا ہے -

نوجوان افسر - کیا مطلب؟ کیا آج کل تم اتنی تنگدست ہو -

لڑکی - ہاں، اس وقت میرے پاس صرف ایک تنلنگ ہے (وہ نہایت تلخی سے مسکراتی ہے اور یہ مسکراہٹ اسے پریشان کر دیتی ہے - وہ کھڑکی کی ٹیک لگائے لڑکی کی طرف جھکتا ہے)

نوجوان افسر - کیا میں تمھارا نام دریافت کر سکتا ہوں؟ تمھارا نام کیا ہے؟

لڑکی - میری - میں اسی نام سے موسوم ہوں، شاید تمھارا نام پوچھنا مناسب نہ ہو -

نوجوان افسر - (ہنستے ہوئے) تم ایک ناقابل اعتماد ہستی ہو - کیا یہ ٹھیک نہیں؟

لڑکی - تم ٹھیک کہتے ہو - ایسا سمجھنے کی کافی وجہ ہے - تم اس چیز کو نہیں سمجھتے!

نوجوان افسر - میرا خیال ہے کہ تم ہم سب کو بیرحم اور نامہذب سمجھنے میں حق بجانب ہو؟

لڑکی - (کھڑکی کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے جہاں چاند کی شعاعیں اس کے غازہ آلود رخسار پر پڑ رہی تھی) میرے پاس ایسے وجوہ اور ثبوت موجود ہیں جو مجھے ہر لمحہ ڈرتے رہنے پر مجبور کرتے ہیں - اور اس وقت تو میں خوفناک طور پر گھبرا گئی ہوں میں کسی شخص پر بھروسہ نہیں رکھتی - میرا خیال ہے کہ تم نے اب تک سیکڑوں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا -

نوجوان افسر - ہم نہیں کہہ سکتے - یہ اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب دست بدست لڑائی ہو اور مجھے اب تک اس کا موقع نہیں ملا -

لڑکی - لیکن اگر تمھیں چند آدمیوں کے قتل کرنے کا موقع مل جائے تو غالباً تم بہت خوش ہوگے؟

نوجوان افسر - میں خوش ہونگا؟ میرا تو یہ خیال نہیں ہے - ہم سب اس معاملے میں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں - ہم دشمن بھی ہو تو ایک دوسرے کو قتل کرنے میں خوشی محسوس نہیں کرتے - ہم میں سے اکثر کا یہی خیال ہے کہ ہم اپنا فرض بجا لاتے ہیں اور کچھ نہیں -

لڑکی - آہ! یہ ایک خوفناک حقیقت ہے - مجھے ڈر ہے کہ میرے بھائی قتل کر دیئے گئے ہونگے -

نوجوان افسر - کیا تم نے کوئی ایسی خبر سنی ہے؟

لڑکی - خبر؟ میں نے اب تک اپنے ملک کے کسی آدمی کے متعلق کوئی خبر نہیں سنی - کاش میرا کوئی ملک نہ ہوتا - جو کچھ میرا اپنا تھا - اب نہیں رہا - ماں، باپ، بھائی، بہن کوئی بھی نہیں رہا - میرا خیال ہے کہ اب میں ان کو دوبارہ نہ دیکھ سکونگی - جنگ سب کچھ برباد کر ڈالتی ہے - نہ صرف یہ بلکہ دلوں کو بھی توڑ دیتی ہے - (وہ ایک آہ بھرتی ہے) تم جانتے ہو - جب تم میرے پاس آئے تو میں کیا سوچ رہی تھی؟ میں اپنے متعلق سوچ رہی تھی - چاندنی راتوں میں وہاں کے لب جو نظاروں کے متعلق، اگر میں انھیں دوبارہ دیکھ سکوں تو میں بے پایاں مسرت محسوس کرونگی - کیا تم کبھی اپنے وطن سے دور رہ کر وطن کے لئے تڑپے ہو؟

نوجوان - ہاں خندقوں میں مجھے بھی اپنے وطن کی یاد ستاتی رہی ہے لیکن دوسروں کے ساتھ رہ کر اس قسم کا خیال دل میں لانے سے شرم آتی ہے کیونکہ سب کی ایک ہی حالت ہوتی ہے -

لڑکی - آہ! یہ سچ ہے - لیکن مجھے کیا محسوس ہوتا ہے؟ تم خود ہی اندازہ لگا سکتے ہو؟ میں ایک ایسی جگہ ہوں جہاں ہر شخص مجھے ناپسند کرتا ہے اور نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے اور مجھے گرفتار کر کے شاید جیلخانہ میں ڈالنے کیلئے تیار ہے -

نوجوان افسر۔ (جھک کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے۔

لڑکی۔ (نرم آواز میں) تم پہلے آدمی ہو جو میرے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کر رہے ہو۔ میں تم سے اب کوئی بات نہ چھپاؤں گی۔ میں روسی نہیں بلکہ جرمن ہوں۔

نوجوان افسر۔ (اسے گھورتے ہوئے) حسین لڑکی! اس کی کسے پروا ہے کہ تم کس قومیت سے تعلق رکھتی ہو۔ ہم عورتوں کے خلاف جنگ نہیں کر رہے ہیں۔

لڑکی۔ (اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے) تم بہت اچھے لڑکے ہو میں تم سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ کیا تم اچھائیاں دیکھنے کی تمنا نہیں کرتے۔ اگر تم ایسا کرو تو یہ واقعی پہلی چیز ہوگی۔ کیونکہ دراصل لوگوں میں اچھائیاں نہیں ہوتیں۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔

نوجوان افسر۔ (ہنستے ہوئے) تمھاری مثال ایسے فلسفیوں کی سی ہے جو دنیا میں صرف برائیوں ہی کو دیکھتے ہیں۔

لڑکی۔ اگر میرے خیالات ایسے ہی ہوں تو میں کتنی مدت تک زندہ رہ سکتی ہوں؟ کیا تم بتا سکتے ہو؟ ممکن ہے دنیا میں اچھے آدمی بھی ہوں لیکن میں ان سے ناواقف ہوں۔

نوجوان افسر۔ میں ان کی ایک کثیر تعداد کو جانتا ہوں۔

لڑکی۔ (اس پر جھکتے ہوئے) کیا تم کبھی جیل خانہ میں نہیں رہے؟

نوجوان افسر۔ میرا خیال ہے کہ کبھی نہیں۔

لڑکی۔ اچھا فرض کرو میں اب بھی ایک اچھی لڑکی ہوں جیسا کہ پہلے تھی اور تم مجھے اپنی ماں اور بہنوں کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہو کہ یہ ایک جرمن لڑکی ہے، جو بیکار ہے، نہ اس کے پاس روپیہ ہے، نہ اس کا کوئی دوست ہے۔ تب وہ کہیں گے ہمیں یہ سن کر بہت افسوس ہوا، لیکن ایک جرمن لڑکی —— یہ کہہ کر وہ جلد ہی اپنے ہاتھ دھونے چلے جائیں گے۔

(افسر خاموشی سے اسے گھورتا رہتا ہے)

لڑکی۔ کیا تم میرا مطلب سمجھے؟

نوجوان افسر۔ (آہستہ سے) مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ عوام کی طرح آدمیوں کو پہچاننے میں غلطی کریں گے۔

لڑکی۔ نہیں یہ بات نہیں، وہ لوگ ایک جرمن لڑکی کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں گے۔ خواہ وہ ایک نیک لڑکی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اب میں اچھی ثابت ہونا بھی نہیں چاہتی۔ کیونکہ میں ریاکار نہ بنوں گی۔ میں نے برا بننا سیکھ لیا ہے۔ اچھے لڑکے! کیا تم مجھے پیار نہ کرو گے؟ (وہ اپنا چہرہ اس کے قریب لاتی ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر وہ گھبرا جاتا ہے اور پیچھے ہٹ جاتا ہے)

نوجوان افسر۔ اپنا چہرہ اتنا قریب نہ لاؤ۔ میں تمھارا بوسہ نہ لونگا۔ اگر تم برا نہ مانو۔ (وہ اسے نظریں گاڑ کر دیکھتی ہے جس میں تعجب اور سوال کے انداز پوشیدہ ہوتے ہیں) یہ نادانی ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ تم جانتی ہو ہسپتال کی زندگی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ انسان بالکل بدل جاتا ہے۔ لیکن تم جانتی ہو۔ میرا مقصد تمھاری ہتک کرنا نہیں ہے۔ اتنا قریب نہ آؤ۔

لڑکی۔ تم تو ایک تماشا ہو۔ (وہ رک جاتی ہے) کیا یہ غلط ہے؟ کیا تم ہم لوگوں کو اتنا ناپسند کرتے ہو؟

نوجوان افسر۔ (جلدی سے پلٹ کر) ناپسند؟ میں کچھ نہیں جانتا۔

لڑکی۔ میں اپنے لوگوں سے بھی نفرت کرتی ہوں۔ بہت زیادہ نفرت؛ کیونکہ یہ جنگ انہی لوگوں نے شروع کی ہے۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں تمام لوگوں سے نفرت کرتی ہوں۔ جرمنوں نے تمام دنیا کو اتنی مصیبت میں کیوں ڈال دیا ہے۔ انھوں نے تمام دنیا کو بدترین بنا دیا ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص ایک دوسرے کو ناپسند کرتا ہے۔ ہر جگہ برائی کی امید کی جاتی ہے۔ انھوں نے مجھے بھی برا بنا دیا ہے۔ میں اب کسی چیز پر بھروسہ نہیں رکھتی۔ اس دنیا میں بھروسہ بھی کس پر رکھا جا سکتا ہے؟ کیا یہاں خدا کا وجود ہے؟ نہیں، ایک مرتبہ جب میں انگریز بچوں کی اتالیق تھی۔ ان کو دعا سکھاتی تھی۔ اس وقت میں خدا، مسیح اور محبت پر یقین رکھتی تھی اور اب میں کسی بات پر یقین نہیں رکھتی۔ اور کوئی بھی شخص جو جھوٹا اور بیوقوف نہیں ہے۔ کسی چیز پر بھی یقین نہیں رہ سکتا۔ میں کسی ہسپتال میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ میں غریب لڑکوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن لوگ مجھے نکال دینگے کیونکہ میں جرمن ہوں۔ خواہ ذاتی طور پر میں نیک اور شریف ہی کیوں نہ ہوں، ہر جگہ یہی حال ہے۔ جرمن میں، فرانس میں، روس میں، ہر جگہ —— کیا تم سمجھتے ہو کہ میں مسیح، خدا، اور محبت پر یقین رکھتی ہوں؟ نہیں، ہم سب جانوروں سے بدتر ہو گئے۔ تم خیال کرتے ہو گے کہ میری زندگی نے مجھے خود تباہ کر دیا ہے۔ یہ درست نہیں میں جن لوگوں میں تھی۔ وہ تمھاری طرح نہیں تھے۔ وہ صرف مجھے زندہ رکھنا چاہتے۔ ایسے لوگ جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے

اور بہت نیک جانتے تھے، انھوں نے اپنی گفتگو سے، اپنی نفرت انگیزی سے اور اپنی ناپسندیدگیوں سے جنگ شروع کی۔ اور ہم سب کو موت کے غار میں دھکیل دیا۔ تمھاری طرح نیک لڑکوں کو بھی مار ڈالتے ہیں اور غریبوں کو جیلخانوں میں بھر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں لوگو! تم اپنی نفرت کو بڑھاتے جاؤ۔ ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہو — (نوجوان افسر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے چہرے سے حزن و ملال کی علامات ظاہر ہوتی ہے۔ لڑکی اپنی نظروں سے اس کا پیچھا کرتی ہے)

لڑکی — اچھے لڑکے ہو تم! میری باتوں کو بُرا نہ مانو۔ اگر تمھیں میری گفتگو پسند نہیں تو لو میں ایک چوہیا کی طرح خاموش ہو جاتی ہوں۔

نوجوان افسر — نہیں نہیں، تم باتیں کرتی جاؤ۔ لیکن میں تمھاری ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا،

(وہ بھی کھڑی ہو جاتی ہے اور دیوار سے ٹیک لگاتی ہے۔ اس کے سیاہ کپڑوں پر اور سفید چہرے پر چاند کی شعاعیں پڑنے لگتی ہیں۔ اس کی آواز مدھم سے صاف اور پھر تیز ہو جاتی ہے)

لڑکی — اچھے لڑکے! ادھر دیکھو، کیا یہ بھی کوئی دنیا ہے، جہاں لاکھوں انسان بے قصور موت کا شکار ہو رہے ہیں؟ کیا یہ رہنے کے قابل دنیا ہے؟ تم لوگ کہتے ہو یہ بہادری اور جرأت کا مظاہرہ ہے نہیں بلکہ لوگوں نے انسانیت کو بھلا دیا ہے، اور میں نے بھی سب کچھ کھو دیا ہے۔ لیکن میں اپنے وطن کے لوگوں کے متعلق سوچتی ہوں۔ آخر انھیں کیا سوجھی تھی کہ یہ جنگ شروع کر دی۔ میں وہاں کے اور یہاں کے تمام لوگوں کی حالت پر غور کرتی ہوں۔ وہ اپنے محبوبوں سے بچھڑ جاتے ہیں۔ سیکڑوں آدمی جیلخانوں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اچھے لڑکے جب میں ان باتوں پر غور کرتی ہوں تو کیا یہ دنیا خوبصورت معلوم ہوتی ہے (وہ خاموش کھڑا رہتا ہے اور اسے گھورتا ہے) اچھے لڑکے ادھر دیکھو، ہم دونوں زندہ ہیں ہمارے جسموں میں روح ہے اور ایک دن ہماری زندگی ختم ہو جائے گی۔ بس یہی ہماری زندگی کا اور جنگ کا ماحصل ہے۔

نوجوان افسر — نہیں صرف اسی قدر نہیں بلکہ جنگ اور زندگی کا کوئی اور مقصد بھی ہے۔

لڑکی — (نرمی سے) تم خیال کرتے ہو کہ جنگ مستقبل کے لئے لڑی جا رہی ہے تم اپنی زندگیاں ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے لئے وقف کر رہے ہو یہی بات ہے نا؟

نوجوان افسر — ہمیں اس وقت تک لڑنا ہے جب تک ہم فتحیاب نہ ہو جائیں

لڑکی — جب تک تم فتحیاب نہ ہو جاؤ۔ میرے ہم وطن بھی یہی کہتے ہیں۔ سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ اگر ہم جیت گئے تو دنیا کی حالت بہتر ہو جائے گی لیکن دنیا کی حالت کبھی بہتر نہ ہوگی۔ بلکہ وہ بدتر ہو جائے گی۔ (وہ پلٹ جاتا ہے اور اپنی ہیٹ کو ہاتھ لگاتا ہے۔ لڑکی کی آواز اس کا پیچھا کرتی ہے) مجھے اس کی پروا نہیں کہ جنگ کون جیتے گا۔ مجھے اس کی بھی فکر نہ ہوگی اگر میرا وطن ہار گیا میں ان سے نفرت کرتی ہوں۔ وہ جانور ہیں، بالکل جانور۔ اچھے لڑکے نہ جاؤ لو میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ (وہ اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکالتا ہے اور ان کو میز پر رکھ کر لڑکی کے قریب جاتا ہے)

نوجوان افسر — شب بخیر —!

لڑکی — (صاف طور پر) کیا واقعی تم مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو؟ کیا تم مجھے اس قدر ناپسند کرتے ہو۔

نوجوان افسر — ہاں —!

لڑکی — کیوں؟ میں ایک جرمن ہوں اسی لئے نا؟

نوجوان افسر — نہیں، اس لئے نہیں،

لڑکی — تب تم ٹھہرتے کیوں نہیں؟

نوجوان افسر — کیونکہ تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔

لڑکی — کیا تم میرا ایک بوسہ نہ لوگے؟

(وہ جھکتا ہے اور اپنے لب اس کی پیشانی پر رکھ دیتا ہے۔ لڑکی فوراً ہی اپنا سر پیچھے کر لیتی ہے اور اپنے لب اس کے لبوں سے پیوست کر دیتی ہے اور اس سے لپٹ جاتی ہے۔)

نوجوان افسر — (فوراً کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں نہ جاؤں گا۔ میں بدتہذیب نہیں ہوں۔

لڑکی — (ہنستے ہوئے) تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ تھوڑی دیر مجھ سے باتیں کرو کیونکہ مجھ سے باتیں کرنے والا یہاں کوئی نہیں۔ کیا تم نے بہت سے جرمن قیدیوں کو دیکھا ہے؟

نوجوان افسر — ہاں! بہت سے۔

لڑکی — رائن کے باشندے بھی؟

نوجوان افسر — ہاں وہاں کے لوگ بھی،

لڑکی — کیا وہ بہت غمزدہ اور رنجیدہ دکھائی دیتے تھے؟

نوجوان افسر — بعض تو واقعی رنجیدہ نظر آرہے تھے اور بعض اپنے قید ہو جانے پر خوش تھے۔

لڑکی — کیا تم نے سائن کی کبھی سیر کی ہے؟ آج وہاں کی رات بھی دلکش ہوگی وہاں فرانس میں بھی آج چاندنی رات ہوگی اور یہاں کے سے دلکش اور کیف بار مناظر وہاں بھی ہونگے۔ آج کی رات ہی لوگ درختوں کے نیچے اپنے دلبروں سے ملاقات کریں گے اور محبت کے پیمان کریں گے، لیکن جنگ کے دوران میں ایسی باتیں کرنا کیا بیوقوفی نہیں ہے؟ اب تو زندہ رہنے میں کوئی لطف نہیں۔

ان افسر — خطرات ہی میں رہ کر زندگی گزارنے میں لطف ہے اگر تم جیسے خیال کے بہت سے لوگ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیں تو باقی لوگوں کی زندگی جو تم سے متفق ہیں بہت قابل قدر ہو جائے گی (وہ خاموش ہو جاتا ہے اور اپنے جذبات کا اظہار ایسی لڑکی کے سامنے کرتے ہوئے خجالت محسوس کرتا ہے۔ جو کسی چیز پر یقین نہیں رکھتی)

ی — اچھے لڑکے تم کس طرح زخمی ہوئے؟

ان افسر — کھلے میدان میں دشمن پر حملہ کرنے سے۔

ی — جب تمہیں حملہ کا حکم دیا گیا تو کیا تم خوف زدہ نہیں تھے؟ (وہ اپنا سر ہلاتا ہے اور ہنستا ہے)

ان افسر — نہیں، ہم آپس میں ہنس رہے تھے۔

ی — (اس کو گھورتے ہوئے) تم ہنس رہے تھے؟

ان افسر — اور ... جب مجھے ہوش آیا تو سب سے پہلے میری نظر جس چیز پر پڑی وہ ہمارے کرنل کا چہرہ تھا جو مجھے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس دے رہا ہے۔ اگر تم میرے کرنل کو دیکھو تو مجھے یقین ہے کہ تم دنیا میں بعض چیزوں پر یقین کرلو۔ مگر ہر برائی کی تہ میں ایک نیکی موجود ہے۔ ایک دن سب کو مرنا ہے۔ اور اگر ملک کے لیئے ہی جان دی جائے تو اس سے بہتر نیکی اور کیا ہو سکتی ہے؟

ی — (جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی ہے) نہیں، اب میں دنیا کی کسی چیز پر بھروسہ نہیں رکھتی۔ اپنے ملک پر بھی نہیں، میرا دل مردہ ہو چکا ہے۔

وان افسر — یہ تمہارا وہم ہے ورنہ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔

کی — اگر میرا دل مردہ نہیں ہے۔ تو کیا تم خیال کرتے ہو۔ میں اپنی زندگی آرام سے بسر کر سکونگی۔ رات بھر گلیوں میں پھرتے ہوئے جھوٹ موٹ کے اجنبیوں کو پسند کرتے ہوئے۔ کبھی کوئی مہربانی کا لفظ سنے بغیر — زبان بند کئے، مبادا میرا جرمن ہونا ظاہر ہو جائے۔ تم جانتے ہو، میری باتیں صرف ہوائی نہیں ہوتیں۔ میں چیزوں کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھتی ہوں۔ آج رات میں کسی قدر جذباتی ہوگئی ہوں۔ چاند بھی بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں اب صرف اپنے لئے جیتی ہوں۔ میں نہ تو کسی چیز پر یقین رکھتی ہوں نہ کسی کی پروا کرتی ہوں۔

نوجوان افسر — بات ایک ہی ہے۔ ابھی تم اپنے عزیزوں کے لئے اظہار افسوس کر رہی تھیں اور ان کی تکلیفوں اور غموں کو یاد کر رہی تھیں اور ہم وطن قیدیوں کا نوحہ کر رہی تھیں۔

لڑکی — یہ درست ہے۔ کیونکہ وہ مصیبت اور تکالیف برداشت کر رہے ہیں۔ اور ان کی تکلیفیں اور مصیبتیں میری طرح ہی ہیں۔ میں اپنی ہمدرد آپ ہوں، بس اور کچھ نہیں، جو میں کر رہی ہوں اسے بخوبی جانتی ہوں، میرے ذہن میں خوشی پیدا نہیں ہو سکتی۔

نوجوان افسر — اور شاید اپنے دل میں بھی نہیں۔

لڑکی — اچھے لڑکے! تم بہت ضدی ہو۔ لیکن ہم صرف محبت کرتے ہیں اپنی ذات سے، کسی اور سے نہیں۔ (اس کی آواز میں درشتی سی محسوس ہوتی ہے۔ دور کہیں اخبارات فروخت کرنے والا چھوکرا چلا رہا ہے۔ اس کی انگلیاں نوجوان افسر کی انگلیوں میں پھنس جاتی ہیں۔ وہ غور سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ غازہ اور پوڈر کے باوجود وہ ایک عجیب آوارہ اور دل میں کھب جانے والے حسن کا نمونہ تھی)

نوجوان افسر — (جلدی سے) نہیں ہم صرف اپنی ذات ہی سے محبت نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ میں اس کی تشریح نہیں کر سکتا۔

(اخبارات فروخت کرنے والے چھوکروں کی آوازیں اب نزدیک تر ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ ان آوازوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ لڑکی کی باہیں اس کے بازوؤں میں ہیں۔ وہ بھی سننے کی کوشش کرتی ہے اب آوازیں اور قریب آجاتی ہیں اور لمحہ بھر میں ہر طرف سے لوگ امنڈ کر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ خوشی سے لوگوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں — "شاندار فتح، — برطانیہ کی فتح — دشمن کے کئی ہزار سپاہی قید کر لئے گئے — دشمن کی کامل شکست" یہ خبریں اسے خوفناک مسرت سے تقریبا پاگل کر دیتی ہیں۔ وہ کھڑکی سے باہر اپنی ہیٹ ہلاتے ہوئے مسرت سے چیخ اٹھتا ہے۔ وہ گلی میں دوڑ جانے کے لئے پلٹتا ہے — لڑکی خاموش کھڑی رہتی ہے — وہ کچھ سوچنے لگتا ہے

پھر ٹھہر جاتا ہے اور لڑکی کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہے۔ لڑکی ہاتھ ہٹا لیتی ہے اور ان نوٹوں کو گرا دیتی ہے جو اس نے لڑکی کے ہاتھ میں رکھے ہوتے ہیں لڑکی "سان کو لے لو۔ میں تمہاری انگریزی رقم نہ لونگی۔ ان سب کو لے لو (پھر وہ فوراً ہی ان کو چاک کر ڈالتی ہے اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے۔ وہ کھڑا اسے گھورتا ہے۔ میز کا سہارا لئے ہوئے ایک لمحہ ٹھہر کر وہ دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ جب وہ چلا جاتا ہے لڑکی اسی طرح کھڑی رہتی ہے۔ جس کے کانوں میں مسرت اور شادمانی کی آوازیں آ رہی ہیں۔ پھر وہ اپنا سر جھکا لیتی ہے اور آنسوؤں کی لڑیاں اُس کے رخساروں پر بہنے لگتی ہیں۔

لڑکی "شکست — کامل شکست — صرف ایک شلنگ — (پھر وہ دفعتہً بیٹھ جاتی ہے اور گانے لگتی ہے۔ اپنی پوری آواز سے "رائن موت کی آغوش میں —!" اور کمرے سے باہر مجمع یہ گاتا ہوا گزرتا ہے — "برطانیہ زندہ باد —"

—— (پردہ گرتا ہے) ——

ایک شام

کیا صوبۂ بہار کی رنگین شام ہے ‏— توبہ کا نام جس جگہ لینا حرام ہے
آتا ہے شیشہ لیکے فلک ماہتاب کا ‏— پارہ چڑھا ہوا ہے زمیں کے شباب کا
مینا چھلک رہی ہے فلک کی گلاس میں ‏— کشمیر کی ہیں جھیلیں شفق کے لباس میں
یوں بادلوں میں بگلوں کی سیمیں قطار ہے ‏— گردن میں آسمان کے بیلے کا ہار ہے
رنگیں شفق ہے مہکے ہوئے کوہسار پر ‏— یا شمع جل رہی ہے وطن کے مزار پر
ہیں محوِ غسلِ حسن کی رنگین تتلیاں ‏— جھیلوں کے کان میں ہیں ستاروں کی بالیاں
ہر اک شجر ہے سبز دوشالہ لئے ہوئے ‏— ہر ایک شاخِ گل ہے پیالہ لئے ہوئے
فرشِ زمیں پہ سبزے کے قالیں بُنے ہوئے ‏— غنچے ہیں یا چمن میں ستارے چُنے ہوئے
ہر اک کلی کے اوس سے مُنہ ہیں دُھلے ہوئے ‏— ہیں گویا میکدے کے دریچے کھُلے ہوئے
ہر پنکھڑی سے گرتے ہیں نغموں کے آبشار ‏— چھیڑا ہے بوندیوں نے گلستاں میں اک ستار

مہکی ہوئی جو عطر سے فرقِ بہار ہے
یہ عکسِ نورِ مشعلِ رخسارِ یار ہے

سروش ملیح آبادی

بساطِ سخن!

اُردو شاعری کے آغاز سے اس وقت تک کے مشاہیر شعرا کے کلام کی نمایاں خصوصیات

متقدمین دورِ اوّل

امیر خسرو دہلوی

ترے مذاق کا ممنون آب و رنگِ سخن   رکھا گیا ترے دستِ قوی سے سنگِ سخن
نکل سکا جو نہ اس وقت تنگ نکائے سے   چبھو دیا دلِ شاعر میں وہ خدنگِ سخن

ہوئے نشاطی و نوری و نصرتی، وجہی   رہِ سخن میں ترے اتباع پر مجبور
رہے نہ ہوش میں غواصی و جنیدی بھی   ملا کچھ ایسا تری طرزِ نو میں کیف و سرور

متقدمین دورِ ثانی

ولی دکنی اورنگ آبادی

ولی رموزِ حق آگاہ و حق شناس ولی   ادب میں خاص جگہ ریختے کو تو نے ہی دی
بھلا سکا نہ کوئی تیری اوّلیت کو   کہ ہے جنوب سے شہرت شمال تک تیری

مضمون اکبر آبادی

سخن میں بھر دیئے افسون نئے نئے تو نے   حقیقتاً لکھے مضمون نئے نئے تو نے
کہ جیسے غیب کی آواز تھی تری آواز   خیال نظم کئے یوں نئے نئے تو نے

شاہ مبارک آبرو اکبر آبادی

دیارِ شعر میں کی شاہراہِ نو ایجاد   عجیب تھی تری طبعِ رسا کی کچھ افتاد
دماغ و روح سے کی تو نے آبیاریٔ شعر   مذاقِ شاہ مبارک! تجھے مبارکباد!

خان آرزو اکبر آبادی

ہے یاد آج بھی وہ طرزِ گفتگو تیری   ہر ایک بزمِ سخن میں تھی آرزو تیری
بلندیاں ترے شعروں کی کوئی کیا سمجھے   مذاقِ عام سے ہٹ کر ہے جستجو تیری

مرزا مظہر جانِ جاناں اکبر آبادی

کمالِ اس ادا سے کیا تو نے وا درِ اُردو   ہر ایک شعر تھا بے شبہ مظہرِ اُردو
ہیں تیرے شعر صفا بار و منونگار ہنوز
تو آسمانِ سخن پر تھا خاورِ اُردو

شاہ حاتم دہلوی

جہاں میں ابھی محسوس ہے کمی تیری   زمینِ شعر ابھی تک ہے ماتمی تیری
دیئے جواہرِ رنگیں زبانِ اُردو کو   ہے یادگار ادب میں یہ حاتمی تیری

متوسطین دورِ اوّل

مرزا رفیع سودا دہلوی

ترے سخن کا نظیر و عدیل کوئی نہیں   قصیدہ گوئی میں تیرا مثیل کوئی نہیں
نہیب ہجو سے ڈرتے تھے تیری شاہ و گدا   ترے کمال میں اب تک دخیل کوئی نہیں

خواجہ میر درد دہلوی

یہ بہت کیا ہے یہ طوفانِ ہستی کیا ہے   تجھے خبر تھی کہ عرفان و آگہی کیا ہے
ہر ایک شعر ہے درس و پیام کا حامل   ہے ایک مبلغِ اخلاق شاعری کیا ہے

میر تقی میر اکبر آبادی

یہ حال ہوتا ہے اشعار کو ترے پڑھ کر   کہ جیسے روح میں چبھ جائیں بیدار نشتر
وہ میٹھے بول، وہ لطفِ بیاں، وہ طرزِ بیاں   ہوا ہے اور نہ ہوگا کوئی ترا ہمسر

میر حسن دہلوی

بہت ہی لطف ترے رنگِ سادگی میں ہے   کمال زورِ قلم تیرا مثنوی میں ہے
جو بات تجھ میں تھی سب کو ہے اتفاق اس پر   وہ بات سب میں نہیں ہے کسی کسی میں ہے

متوسطین دورِ ثانی

جرأت لکھنوی

وہ سادہ سادہ اشارات وہ نزاکتِ شعر   وہ حسن و عشق کے جذبات وہ حلاوتِ شعر
تماشہ گاہِ جہاں میں تو بے بصر تھا مگر   عطا ہوئی تھی تری طبع کو بصارتِ شعر

آتش لکھنوی

کہیں نشاط کے تیور کہیں غموں کے نشاں   ترے سخن میں تھیں رنگینیاں عجب پنہاں
تو وہ ہے جس نے کیا استوار اردو کو
ہے آج بھی تری ممنون "صرف و نحوِ زباں"

مصحفی امروہوی

رہِ سخن میں نئے کارواں کو ساتھ لیا   اور اس کو ہمتِ منزل رسی کا درس دیا
کلام کیا ہو تری طبع کی روانی میں   کوئی حریف ترا زود گوئی میں نہ ہوا

نظیر اکبرآبادی

جگہ دی شعر میں رسم و رواج کو تو نے   سمجھ لیا تھا جہاں کے مزاج کو تو نے
وطن کو درسِ پیامِ اتحاد کا دیکر   بہت بلند کیا "ارضِ تاج" کو تو نے

متاخرین دورِ اوّل

ناسخ لکھنوی

تری نظر نے کیا ایک صبح و شام کا رنگ   سخن میں ہے ترے موجود خاص و عام کا رنگ
کہیں نیاز کہیں ناز اور کہیں شوخی   بہت ہی جاذبِ دل ہے ترے کلام کا رنگ

آتش لکھنوی

لگا دی آگ سخن نے ترے خدائی میں   تو یادگار ہے اپنی فسوں نوائی میں
بیک نظر جو اتر جائے روح تک دل سے   وہ لطف ہے ترے اشعار کی صفائی میں

ذوق دہلوی

ہوا ہے اور نہ ہوگا فسوں نوا تجھ سا   دماغ و دل تھا ترا علم و فضل کا دریا
تو باکمال تھا ہر صنفِ شاعری میں مگر   سمجھ سکا نہ کوئی آج تک ترا رتبا

مرزا غالب

کہے نہ کیوں تجھے دنیا خدائے شعر و سخن   بیاں تجھی سے ہوا ارتقائے شعر و سخن
دماغِ شعر تری فکر سے ہے عرش نشیں   بلند تو نے ہی کی ہے نوائے شعر و سخن

مومن دہلوی

گرفتگی ہے بیاں میں زباں سوز و گداز   تری طرح کوئی شاعر ہوا نہ زمزمہ ساز
ترا کلام ہے اک سیلِ قلزمِ اسرار   ملا نہ ہائے ابھی تک کسی کو یہ انداز

میر انیس لکھنوی

جو رزم گاہ کی منظر کشی پہ تو آئے   تو خوں زمین و فلک کے گردوں سے بہہ جائے
ہے یادگار ترا فنِ مرثیہ گوئی   ترے سخن سے فصاحت نے مرتبے پائے

مرزا دبیر لکھنوی

بیاں جو رزم و شہادت کا تو نے حال کیا   زباں کی تیغ سے الفاظ کو حلال کیا
کسی سے ہو نہ سکی تیرے رنگ کی تقلید   ترے کلامِ بلاغت نے یہ کمال کیا

تیر شکوہ آبادی

عطا ہوئی تھی تجھے فطرتاً نفیرِ سخن   نوا سے تیری رہا مطمئن ضمیرِ سخن
ترا کمالِ سخن رامپور میں چمکا   تو اپنے وقت کا تھا واقعی منیرِ سخن

امیر و شیفتہ و رند اور خواجہ وزیر   قلق، نسیم، امانت، صبا و شاہ نصیر
ہر ایک میں تھیں نمایاں خصوصیاتِ سخن   جہانِ شعر میں کہتے نہ تھے یہ اپنی نظیر

متاخرین دورِ ثانی

راسخ دہلوی

تو ایک زندۂ جاوید شخصیات میں ہے   خصوصیت سی نمایاں تری حیات میں ہے
سند میں آج بھی ملتے ہیں سب ترے اشعار   یہ دسترس تجھے حفظِ محاورات میں ہے

تسلیم لکھنوی

مذاقِ شعر سے آگاہ و خوش نوا تسلیم   سمجھتے ہیں شعرا تجھ کو قابلِ تعظیم
کمال کر دیا استاد کے تتبع میں   ترے کلام سے قائم ہے رنگِ فکرِ نسیم

امیر مینائی لکھنوی

زمینِ شعر و سخن اے امیر مینائی   ہے اب بھی نغمہ زنِ ہند تیری شہنائی
جگر، جلیل و دل اب تک ہیں یادگار تری   ہے جن سے طورِ سخن کو فروغِ سینائی

مرزا داغ دہلوی

فصاحتوں کے خدا، سوز و ساز کے محرم   بلند ہند میں سب سے رہا ترا پرچم
یہ معجزہ ہے ترا آج تیرا ہر شاگرد   جہانِ شعر میں ہے ایک ہیرِ اعظم

جلال لکھنوی

جلال شاعرِ شیوہ بیاں کلیمِ سخن   بجا ہے تجھ کو کہا جائے گر حکیمِ سخن
زبان و شعر و ادب تجھ سے فیضیاب ہوئے   قواعد اور ضوابط ہوئے ندیمِ سخن

حالی پانی پتی

ادیب و مجتہدِ عصر، خواجۂ حالی   ادب کی جان، چمنِ نظم و نثر کے مالی
ترے دماغ نے تجدید کی قدامت کی   رہِ سخن میں نئی داغ بیل اک ڈالی

اکبر الہ آبادی

تو رازِ پستیٔ تہذیب کھولنے والا   تو قومِ مُردہ کی نبضیں ٹٹولنے والا
فضائے شعر میں اصلاح بالمزاح کے ساتھ   نبات و قند کو کانوں میں گھولنے والا

سرور جہاں آبادی

تو اپنی ہستیٔ مغموم کو بھی بھول گیا   مئے سخن میں کچھ ایسا تجھے سرور ملا
ہے شاعری تری درد و اثر کا آئینہ   گداز تیری نوا میں تھا فطرتاً پیدا

شاد عظیم آبادی

ہے تیرے شعر کی اخلاق و فلسفہ بنیاد   ہر ایک بزمِ سخن میں رہے گی تیری یاد
جواں ادب ہوا "فکرِ بلیغ" سے تیری   زبان و فن کا تجھے مانتے ہیں سب نقاد

ریاض خیرآبادی

خصوصیت تجھے حاصل ہے وضعداری میں   تکلفات نہیں تیری سادہ کاری میں

ہ عمر مئے شعر تو نے چھلکائی — ہے تیرا ہاتھ بھی اُردو کی آبیاری میں

مضطر خیرآبادی

ہے تجھکو کہیں گر مصوّرِ جذبات — ہیں جانِ شعر ترے واردات و حسیات
ں تو اہلِ ادب تجھ سے بے خبر ہیں مگر — ضرور تڑپے گی تیرے سخن سے نبضِ حیات

اسمٰعیل میرٹھی

ا سکیگی نہ تجھکو یہ محفلِ ایجاد — ہے ملک و قوم کے بچوں کے دل میں تیری یاد
نگی سب تری نظمیں زبان زدِ عالم — ہو چکی "نہر" کی۔ یا ہو وہ "دال کی فریاد"

دورِ حاضر - نشاۃ اوّل

ڈاکٹر سر محمد اقبال

م شعر و سخن، راز آشنائے خودی — رہیگی زندہ ابد تک تری نوائے خودی
اک "مفکرِ اعظم" تھا اہلِ مشرق میں — اسی لئے تجھے کہتے ہیں سب خدائے خودی

سیماب اکبرآبادی

یبِ شاعرِ مشرق امام و عالمِ فن — رہے گا تا بہ ابد ہند میں ترا چرچا
امِ شام و سحر لاکھ کروٹیں بدلے — نہ کر سکے گا مگر تجھ سا "مجتہد" پیدا،

اصغر گونڈوی

ے کلام میں پیوست کیفِ روحانی — تری نگاہ رسا اہلِ دل کی عرفانی
ھے تجھے وہ جسے عرش بوسیاں ہوں نصیب — تجھے وہ سمجھے جو رکھتا ہو ذہنِ قآنی

عزیز لکھنوی

انکھار مذاقِ سخن کو تجھ سے ملا — بنائی اک حدِ فاصل میانِ بین و بکا
ے کلام میں رنگینیاں ہیں سوز بھی ہے — عزیز ملک ہمہ گیریوں سے اپنی ہوا

حکیم آزاد انصاری

بس ہے صنعتِ ترصیع اور کہیں تکرار — ترے کلام میں ہے صنعتوں کی اک بھرمار
لا سنت اور صفائی بھی ہے سخن میں ترے — ہے بول چال پہ گویا تری غزل کا مدار

احسن مارہروی

بس قدر ہیں بجا فنِ شعر پر تجھکو — ملی تھی ایک فضا آشنا نظر تجھ کو
ے کلام میں تھی سادگی و پرکاری — رہا پسند تغزل بھی سادہ تر تجھ کو

نوح ناروی

یار شعر میں فیضانِ نوح جاری ہے — سمندر اک تہِ دامانِ نوح جاری ہے
میں زبان کا جیسکا ہو موج موج اثر — زبان میں ابھی "طوفانِ نوح" جاری ہے،

آغا شاعر قزلباش دہلوی

احت اور سلاست ترے کلام کی جان — کھلا ہوا تھا تغزل میں تیرے لطفِ بیان
کہ ناز ہے دہلی کو شاعری پہ تری — ہوا نہ تجھسا کوئی شاعرِ شگفتہ بیان

سائل دہلوی

رئیسِ ملکِ سخن گستری و پیشرو داغ — مئے کہن سے لبالب بھرا ہے تیرا ایاغ
فصاحتیں بھی ہیں تیری فصاحتوں کی ثنا — تو خاندانِ نواب فراغ کا ہے چراغ

بیخود دہلوی

امینِ طرز و بیانِ فیضِ گستر دہلی — ترا جواب نہیں اے سخنورِ دہلی
غزل قدیم ہے تیری، مگر بہت رنگین — بجا ہے تیرا لقب ماہِ انورِ دہلی

جلیل مانکپوری

فصیحِ وقت کہوں تجھ کو یا "امام الفن" — ہزار میں نہیں چھپتا ہے تیرا رنگِ سخن
ترا کلام ہے روحِ امیر مینائی — شرف یہ ہے کہ ہے "استادِ شاہِ ملکِ دکن"

صفی لکھنوی

کسے لپند نہیں رنگِ لکھنوی تیرا — جمود خیز ہے گو دورِ آخری تیرا
ہے یادگار ابھی تک تری غزل کا شباب — مٹے گا نام نہ اس بزم سے کبھی تیرا

آرزو لکھنوی

جدید طرز کے موجد فروغِ بزمِ جلال — کبھی کلام میں تھا تیرے رنگِ یاس و ملال
مگر اب اس میں باندازِ سادگی ہے چمن — ہے تابناک بہر حال تیرا ماضی و حال

ثاقب لکھنوی

کہوں میں لکھنوی تجھکو کہ اکبرآبادی — مسلّم اہلِ ادب میں ہے تیری استادی
تری غزل میں متانت بھی ہے صفائی بھی — علو ہے تیرے تغزل کا سنگِ بنیادی

وحشت کلکتوی

ادیبِ نکتہ رس دبیرِ ماہرِ بنگال — ہوا نہ تجھ سا کوئی اور شاعرِ بنگال
ترے کلام کی لذت سے نیند آتی ہے — کہوں تجھے میں سخنور کہ ساحرِ بنگال

پنڈت کیفی دہلوی

عطا ہوا ہے تری فکر کو وہ نقدِ سخن — کہ تھام لیتا ہے نظروں سے شعر کا دامن
ہزار شعر میں لذت نہیں ترے لیکن — ہے تجھ سے پھر بھی سرور آشنا زبانِ وطن

مرزا بزم آفندی اکبرآبادی

بہارِ باغِ سخن، یادگارِ بزمِ منیر — نگاہ و دل میں چبھے ہیں ترے کلام کے تیر
ہے تو اسیر و جلال و امیر کا ہم عصر — تری غزل میں ابھی تک ہے شوخی و تاثیر

قمر بدایونی

ترے کلام نے جادو نہیں کیا کس پر — نہ پوچھ مجھ سے تو اپنی غزل کا جذب و اثر
تھی تجھ میں سادگیِ میر و لذتِ مومن — تو علم و فن میں بھی رکھتا تھا اک عمیق نظر

فانی بدایونی

مفکرِ غمِ ہستی، مصورِ جذبات، — تری غزل کا ہر اک شعر ایک نغمِ حیات
تجھی پہ ختم ہے اندازِ دلنشیں تیرا — تو ہے پیمبرِ سوز و گداز و حسیات

چکبست لکھنوی

انڈیل دی مئے حبِ وطن پیالے میں   رکھا نہ فرق کوئی مسجد اور شوالے میں
ترے سخن میں ہے آزادیوں کی وہ نکہت   جو پائی جائے کسی نو شگفتہ لالے میں

ظفر علی خاں

ترے کلام کا موضوع گو سیاست ہے   مگر نہ پوچھ کہ کس درجہ اس میں قوت ہے
ہر ایک شعر میں ہنگامہ سا جہنم سا   ہر ایک لفظ ترا خالقِ قیامت ہے

حسرت موہانی

ترے بیاں کی حلاوت، تری زباں کا نکھار   سبک خرام ہو گلشن میں جیسے بادِ بہار
جبھی تو کہتے ہیں سب تجھکو بادشاہِ غزل   ہے حسن و عشق پہ مطلق تری غزل کا مدار

آغا حشر کاشمیری

تو اپنے دور کا شاعر بھی تھا ادیب بھی تھا   عروج "اردو ڈراما" کو صرف تجھ سے ملا
ہزار کوششیں تقلید کی ہوئیں لیکن   ہوا نہ ہند میں کردار آفریں تجھ سا

دل شاہجہاں پوری

فروغِ بزم امیر اعتبارِ ملکِ سخن   ہوا نہ تنگ غزل کا تری کبھی دامن
ہے امتزاجِ قدیم و جدید تیرے یہاں   اور اس طرح کہ نہ چھوٹے زمامِ شعر و فن

شفق عماد پوری

کہیں کلام ہے سادہ ترا کہیں ہے ادق   کہیں طلوعِ شفق ہے کہیں غروبِ شفق
ہے اعتراف سبھی کو کمال کا تیرے   سخنوروں نے لئے علم و فن کے تجھ سے سبق

مرزا یاس یگانہ چنگیزی

تجھے جو پاس تھا تو خدا کی قسم یگانہ تھا   ہر اک زباں پہ ترا رس بھرا ترانہ تھا
یگانہ جب سے ہوا سوز و ساز ختم ہوا   تری غزل کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا!

ناطق ــــ گلاؤٹھی

ترا کلام ہے گو بادۂ کہن ناطق   ہے آشکار مگر اس سے رنگِ فن ناطق
یہ سادگی، یہ زباں، یہ محاورات کا لطف   حسین ہے ترا بوسیدہ پیرہن ناطق

تاجور نجیب آبادی

بلندیوں پہ ادب کی مقام ہے تیرا   یہ مانتا ہوں کہ سادہ کلام ہے تیرا
تو ہے ادیب بھی شاعر بھی اور ناقد بھی   بلند گلشنِ اردو میں نام ہے تیرا

کیفی حیدر آبادی

تو بعید نہیں ترا علم و فضل بے پایاں   احاطہ فکر و سخن کا تری نہیں آساں
"ادب برائے ادب" تیرے شعر کا مقصد   مگر یہ لطف کہ ہے اس میں لطف کا ساماں

آسی لکھنوی

سخنوری سے عیاں تیری ذوقِ نقد و نظر   تو لکھنوی ہے ترا رنگ دہلوی ہے مگر
ترے کلام میں ہے قوتِ بیان و زباں   اور اس کے ساتھ ہی ہلکا سا ایک جذبِ اثر

دورِ حاضر نشاۃ ثانی

جوش ملیح آبادی

تری نوا سے لرزتے ہیں قصر و ایواں   تری صدا سے دہلتا ہے سینۂ دوراں
تو انقلاب کا سب سے بڑا پیامی ہے   مصوری ہے تری شاعری کہ آتش فشاں

جگر مراد آبادی

تری غزل سے عیاں تیرا عالمِ مستی   کلام میں مئے جذبات ہے، مگر مستی
سپردگی بھی ہے، وارفتگی بھی کیف بھی ہے   ہے حسن و عشق کی پیغامبر تری ہستی

احسان دانش

ترے دکھے ہوئے دل کی پکار تیرا کلام   الٹ کے رکھ دیا سرمایہ داریوں کا نظام
کہیں ہے سوز کہیں آہ اور کہیں ہے کراہ   جہانِ شعر میں تجھکو ملے گا اوجِ دوام

حفیظ جالندھری

غزل میں نغمگی اور نظم میں روانی ہے   اور اس سے بڑھ کے تری طرزِ خوش بیانی ہے
رہیں گے گیت ہمیشہ لبِ ادب پہ ترے   مجھے یقین ہے تری ذات جاودانی ہے

ساغر نظامی

ہر اک غزل تھی تری نقش جادۂ مشرق   ہر ایک نظم تھی میخانہ زادۂ مشرق
مگر وہ کیف ترا قبلِ وقت ختم ہوا   چھلک چکا جو چھلکتا تھا "بادۂ مشرق"

بہزاد لکھنوی

پسندِ عام ہے رنگِ مذاقِ عام تیرا   ہر ایک لب پہ ہے بزمِ طرب میں نام ترا
یہ مانتا ہوں کہ ہے سادہ بھی اور سستا بھی   ہے جذب و کیف کا حامل مگر کلام ترا

اثر لکھنوی

ترے کلام میں اک کیف ہے مگر کم کم   تو ایک ساز ہے ایسا، ہو جس کے سُر مدھم
نہیں غزل میں تری شور و شیون و فریاد   شگفتگی سی ہے ہلکے گداز سے محرم

ماہر القادری

غزل میں تیری حلاوت ہے نظم میں جذبات   ہے ان صفات کا مجموعہ ایک تیری ذات
جو صرف شاعرِ جادید ہی میں پائی جائیں   سخنوروں کو نہ کڑوی لگے یہ میری بات

علی اختر حیدر آبادی

تو صرف اخترِ ارضِ دکن نہیں اختر   تمام ہند کو ہے ناز تیری نظموں پر
ترے قلم کی روانی کہیں نہیں رکتی   شباب کا ہو ترانہ کہ قوم کا منظر

اختر شیرانی

شباب و شعر کو ہم رنگ کر دیا تو نے   جوانیوں سے بڑا کام لے لیا تو نے
مگر ہے شیب کا پیغام تیرا اکسل شباب
جواں رہا نہ بہت دن یہ کیا کیا تو نے؟

رئیس صدیقی جوالاپوری

توا پنے وقت کا ہے کامیاب نظم نگار — نگاہِ اہلِ ادب میں نہ کیوں ہو تیرا وقار
ترا کلام ہے شعر و ادب کا گنجینہ — تری روش پہ ہے مستقبلِ سخن کا مدار

اعجاز صدیقی اکبرآبادی

یہ کس پہ تبصرہ کرنے چلی زبانِ ادب — "غزل ہے روحِ زباں اور نظم جانِ ادب"
جو خود نگاہ میں اپنی ہو ننگِ شعر و سخن — ہو اس کی فکر کا کیوں معترف جہانِ ادب

اعجاز صدیقی اکبرآبادی

عالمگیر کی سالانہ خریداری قبول فرما کر علم و
ادب کی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیے

احکام عالمگیری

"احکام عالمگیری" کے عنوان سے "عالمگیر" کے کسی گزشتہ پرچے میں میں نے
بتباسات فارسی کی اصل احکام عالمگیریؒ سے ترجمہ کرکے پیش کئے تھے
ی روشنی میں ہم حضرت عالمگیر کی سیرت کو بغور مطالعہ کرکے دیکھ سکتے ہیں
کام عالمگیری کا پیرو پروفیسر جادوناتھ سرکار اور دیگر مؤرخین کے عالمگیر
ں قدر مختلف ہے اس میں شک نہیں کہ انسان ضعیف البنیان ہے
ئے بمقتضائے فطرتِ انسانی حضرت عالمگیرؒ میں بھی کچھ خامیاں ہو سکتی
. دیکھئے پنجۂ عالمگیری شہزادہ اورنگ زیب کے متعلق شاہجہاں کا خیال
ہرتا ہے :۔

نگر بوم وشعور اورنگ زیب اقتضائے کند کہ متحمل این
امر خطیر تواند شد امابحالت ستم عظیم ورنوع انسانی اوست۔ تا
دوست کر اخواہد دلیلش بکہ باشد۔

("احکام عالمگیری صفحہ ۵ احکام ۴")

لیکن ان چند فروگزاشتوں کی بنا پر کتنی بڑی نادانی ہوگی، اگر ان کے
رو شعورٔ بے مثل سیاستدانی، بے نظیر حکمرانی اور لاجواب عسکری قابلیت
انکار کردیا جائے۔ اور نہ صرف انکار بلکہ انتہائی تنگ نظری اور عدم فراخدلی
ت دیتے ہوئے بے دلیل باتیں کہی جائیں۔ اور بے بنیاد الزام لگائے جائیں
اگر حضرت عالمگیرؒ کی سیرتِ مبارکہ، واقعات اور احکامات کی مدد سے عصبیت
ینک اتار کر پڑھی جائے۔ تو سلطنتِ مغلیہ کا یہ مایہ ناز شہنشاہ آسمان
رلت و سیاست کا ایک ایسا ستارہ نظر آتا ہے جس کی خیرہ کن روشنی میں
بیں کی آنکھیں مچندھیا کر رہجاتی ہیں۔ اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے
اہ سیاہ دھبوں کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا۔ برعکس اس کے جن لوگوں کو
ت کے فیاض ہاتھوں نے بصارت کے ساتھ ساتھ دولتِ بصیرت سے بھی

لہ "احکام عالمگیری" کے نام سے ایک کتاب عبدالحمید خاں پنجۂ عالمگیری نے
لکھی تھی۔ اس میں مختلف دلچسپ واقعات جن سے حضرت عالمگیرؒ کی سیرت
پر روشنی پڑتی ہے۔ درج کئے ہیں یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی ۱۹۱۲ء میں
سر جادوناتھ سرکار نے مع انگریزی ترجمہ اور حضرت عالمگیرؒ کی سوانحعمری
شائع کی تھی۔ اب یہ کتاب پھر نایاب ہے۔

شہنشاہ اورنگزیبؒ کی سیرت

از:۔ جناب خالد حسن قادری

مالا مال کیا ہے۔ اور جن کے دامن شہرت پر طرفداری بیجا کا داغ نہ لگ سکا
وہ دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے :۔

"اکبر، اکبر کا بیٹا، اکبر کا پوتا اور پڑپوتا سب سے زیادہ
عظیم الشان اور طاقتور شہنشاہ تھے۔ جو چشمِ فلک نے آج
تک دیکھے ہیں۔" (ترجمہ از وقائع عالمگیری)

اب میں چند واقعات پیش کرتا ہوں۔ جو سیرت عالمگیرؒ کو نئے انداز
میں پیش کرتے ہیں :۔

عدل مابین خُدام شاہی

یار علی بیگ داروغہ سوانح نے اطلاع کی کہ بزرگ امید خاں نے بھری
محفل میں صوبۂ بہار کے سوانح نگار عبدالرحیم خاں کو برا بھلا کہا۔ اور ذلت
کے ساتھ نکلوا دیا۔ اگر اس حرکت پر امید خاں سے بازپرس نہ کی گئی تو دوسرے
سوانح نگار صحیح واقعات لکھنے سے گریز کریں گے۔ اور صرف خانہ پُری کے
لئے صوبائی حکومت کے تذکرے رہ جائیں گے۔ اگر جنابِ اقدس نے اس
ضرب المثل پر عمل کیا کہ "نزلہ بر عضوِ ضعیف مے ریزد" تو غلاموں کو اطاعت
کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے گا۔

حضرت عالمگیرؒ نے اس پر لکھا "چونکہ بیچارہ (حضرت عالمگیرؒ خود
ضعیف ہے اس لئے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو ضعیف سمجھتا ہے ھو القوی
صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ لیکن ادنیٰ کو اعلیٰ پر ہرگز مسلط نہ کرنا
چاہئے۔ سوانح نگار کو عزل منصب و برطرفی خدمت کی سزا اور صوبہ دار
کے منصب میں سے پانچ سو کی کمی کی جاتی ہے اور دوسرے صوبہ میں
تبادلہ کیا جاتا ہے۔

پابندیٔ قانون

روح اللہ خاں جس کا اصلی نام میر حسن تھا۔ شاہی اعتبار اور التفات
وعنایات کے سبب بخشی گری دوم، داروغہ تنخواہ اور داروغہ مطبخ کے عہدہ
تک پہنچ گیا تھا۔ باوجودیکہ اس کا منصب سہ ہزاری تھا۔ اور خواص میں
بھی شامل ہوگیا تھا۔ پھر بھی دربار کے دروازے کے قریب کھڑا ہوتا تھا اس
نے وزیر اعظم اسد اللہ خاں کی معرفت بادشاہ سلامت کے پاس عرضی

بخوبی کہ میرا منصب سہ ہزاری ہے۔ اور فیض اللہ خاں نائب داروغہ کا صرف ہفتصدی ہے اگر مجھے منصب ہفتصدی عطا کر دیا جائے۔ اور نائب داروغہ بنا دیا جائے۔ تو حضور کے فضل و کرم اور بندہ نوازی سے بعید نہ ہوگا۔

حکم ہوا ــــ " اس شرط کے ساتھ کہ اسے (روح اللہ خاں کو) ان ہر دو خدمات سے کہ جن پر مامور ہے برطرف کر کے ہفتصدی عطا کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔"

بعد میں اسد اللہ خاں نے عرض کیا ــ " پھر کس جگہ کھڑا ہوا کرے "

حکم فرمایا ــــ " اور تو کہیں جگہ نہیں ہے۔ مگر ہاں میرے سر پر کھڑا ہو جائے۔" اس کے بعد فرمایا ــــ اگر کسی ایک قانون کی خلاف ورزی کی جائے۔ تو تمام ضوابط میں خلل پڑ جاتا ہے۔ حالانکہ ہم نے کسی ایک قانون کے بھی خلاف نہیں کیا ہے۔ مگر لوگوں کو اس قدر جرأت ہو گئی ہے کہ قوانین و ضوابط کے درہم و برہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر یہی قاعدہ جاری ہو گیا تو بڑی دقت ہو گی۔

خلاف ورزی آداب دربار پر بازپرس

صوبۂ بنگال کی اطلاع سے بادشاہ سلامت کو معلوم ہوا کہ ابراہیم خاں جو بنگال کا گورنر ہے ازراہ تفخر و غرور چارپائی پر بیٹھ کر دربار منعقد کرتا ہے۔ قاضی محدثین اور فقہائے اسلام نیچے فرش پر بیٹھتے ہیں۔ اس طرح ان کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ عرضی پر حکم ہوا۔ " مدار المہام وزیر اعظم حسب الحکم مقدس معلّٰی صوبہ دار مذکور (ابراہیم خاں) کے نام خط لکھیں کہ اگر کسی مرض کے سبب زمین پر نہیں بیٹھ سکتا۔ تو نا صحیابی اس کی اجازت ہے۔ کہ وہ چارپائی پر بیٹھے) لیکن اپنے اطبا کو ہدایت کرے کہ وہ جلد از جلد علاج کریں چونکہ سوانح نگار کا منصب بڑھایا جاتا ہے اور ایک صدی کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے وہ سوانح نگاری کے واسطے مناسب نہیں۔ ابراہیم خاں کو لکھیں کہ وہ اپنے صوبہ میں اس کو فوجداری عطا کریں۔ تاکہ وہ بھی سوانح نگاروں کی سوانح نگاری کی لذت سے آشنا ہو جائے اور بیا رطل خاں کسی دوسرے سوانح نگار کو جو با وقار اور ہوشیار ہو مقرر کریں۔

قدردانی شعرا

کامگار خاں پسر جعفر خاں نے عرضی بھیجی۔ کہ مرزا محمد نعمت خاں عالی نے بدطینتی سے اس خانہ زاد کی شادی[1] پر چند اشعار لکھے ہیں

---

(۱) دستور معظم جعفر خاں مرحوم کے صاحبزادہ کامگار خاں کا عقد ۱۰۸۵ھ ؁ جمیلہ بیگم دختر حیدر آبادی کے ساتھ ہوا۔ یار لوگوں کو مذاق کی سوجھی۔ نعمت خان عالی ہجو نامہ لکھوایا اور ایسا انتظام کیا کہ تا قیامت مشہور

ــــ کہ اس تحریک[2] کا منشا جائز تھا۔ لیکن یہاں التقائے ساکنین (دو ساکن حروف کا اجتماع) ہے۔ اس کے علاوہ بھی اور فضیحت کی باتیں اس میں درج کی ہیں گو یہ غلام خاص و عام میں رسوا ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ حضور ایسی تنبیہ فرمائیں گے۔ کہ آئندہ ایسی خرافات کی جرأت نہ ہوگی (اس بات کو) حضور سے عرض کرنا واجب تھا۔

بقنط واجب پر حضور نے لکھا۔ حرام تھا۔ پھر عرضی پر لکھا ــــ یہ احمق خانہ زاد چاہتا ہے۔ کہ ہم کو بھی اپنی رسوائی میں شریک کرے۔ اور وہ (نعمت خان عالی[3]) جو چاہے ہمارے متعلق کہہ کر مشہور عالم کر دے، اس نے پہلے بھی کوئی تسمہ باقی نہ لگا رکھا تھا لیکن ہم نے اس کی تلافی انعام و اکرام سے کی تاکہ وہ پھر اس فعل کا مرتکب نہ ہو لیکن

ہو گیا۔ کامگار خاں نے خفت و ندامت میں بادشاہ سلامت کے پاس عرضی بھیجی کہ خانِ عالی بدطینتی کی وجہ سے رسوا کر رہے ہیں (از وقائع عالمگیری ص ۲۶)

(۲) کامگار خاں نے خان عالی کے نوشتہ ہجو نامہ کے کسی شعر کا جو ا نہیں سب سے زیادہ ناگوار ہوگا۔ ترجمہ لکھا ہے۔ اصلی شعر نہیں لکھا۔ ورنہ مطلب بالکل واضح ہو جاتا۔ بہرحال خان عالی نے اپنے شعر میں 'تحریک' یعنی حرکت دینا اور التقائے ساکنین یعنی دو ساکنوں کا اجتماع ضرور استعمال کیا ہوگا۔ اور غالباً کامگار خاں اور ان کی عروس کو ساکنین اور شادی کو التقائے ساکنین بنایا ہوگا۔ جو قدرتاً کامگار خاں کو ناگوار ہوا ہوگا۔

(۳) عالی تخلص تھا۔ اور محمد نام۔ ان کے آبا و اجداد شیراز کے خاص اطبا میں سے تھے۔ مرزا کے والد فتح الدین ان کو شیراز لے گئے۔ اور وہیں تعلیم دلوائی، فارسی تو خیر مادری زبان تھی۔ لیکن عربی میں بھی انہوں نے مختلف علوم و فنون پڑھے۔ اور عالمانہ قابلیت پیدا کی۔ حکمت کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہندوستان آئے ہنر کے قدردان عالمگیر نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ملازمانِ خاصہ میں داخل کیا۔ ۱۱۰۵ھ میں مرزا کو خطاب نعمت خاں مرحمت ہوا۔ اور داروغہ باورچی خانہ کی خدمت سپرد ہوئی جو اس زمانہ کے معتبر امیر کو دی جاتی تھی۔ عالمگیر اور محمد اعظم کی وفات کے بعد بہادر شاہ کے دربار میں داخل ہو کر دانشمند کا خطاب حاصل کیا۔ وقائع نعمت خان علی مثنوی عشق وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ وقائع نعمت خان عالی میں عالمگیر کی ہجو کی ہے۔ اور جگہ جگہ اپنے خبث باطن کا اظہار کیا ہے، عالمگیر کے جانشین بہادر شاہ نے اس کو کورس میں داخل کیا یہ کتاب، عالمگیر کے سامنے لکھی گئی تھی۔ اور اس کو بھی اس کا علم ہو گیا تھا۔ لیکن وہ فراخ دل اور علم خرمن کا قدردان تھا۔ اس نے اپنی ذات پر نعمت خان عالی کے حملے برداشت کر لئے لیکن اس باکمال کو جس نے جاو بیجا کہنے میں کچھ تسمہ نہ لگا رکھا تھا۔ کچھ نہ

اس کے باوجود بھی اس نے کمی نہ کی ۔

(اس بات پر) زبان کاٹنے اور گردن مارنے کا مقدور نہیں ہے جلتے رہیں اور تباہ کرتے رہیں۔ رفیق لا یرا فقک ولا یفارقک نہ تو رفاقت ہی کرتا ہے نہ پیچھا ہی چھوڑتا ہے ۔

حراست شہزادہ کام بخش

شہزادہ محمد کام بخش کے وقائع نگار اور ناظر کے خطوط سے معلوم ہوا کہ قلعہ جنجی کی فتح کے بعد خان نصرت جنگ نے اس خیال سے کہ دشمن کی پانچ ہزار سے زیادہ فوج اطراف میں موجود ہے۔ شہزادہ کو کوچ اور قیام کے بارے میں احتیاط سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ وہ درشتی سے پیش آئے اور فرمایا کہ "ہمیں اختیار ہے کہ جب چاہیں کوچ کریں"۔

بات یہاں تک پہنچی کہ آپس میں رنجش ہو گئی۔ اور خان نصرت نے دربار کا مجرا ترک کر دیا۔ اور صرف جب شہزادہ سوار ہو کر نکلتا۔ اس وقت مجرا کر لیتے یہاں تک کہ چہار شنبہ ۹ ذی القعدہ (۱۳ جولائی ۱۶۹۲ء) کو دوپہر کے وقت جب شہزادہ شاہی خیمہ میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک شخص کو خان نصرت کو بلانے کے واسطے بھیجا۔ اس نے آنے میں دیر کی۔ چار آدمی پے در پے بھیجے اسی سلسلے میں خان مذکور کے ہرکاروں نے خبر دی کہ شہزادہ نے اپنے مقامی بھائی کی امداد سے تمہارے گرفتار کرنے کی تدبیر کی ہے ۔ اور ناظر کی تحریر سے بھی معلوم ہوا کہ بات درست ہے خان نے ان خبر رسانوں کو بلایا اور بطور گواہ کے ہمراہ لے کر ہاتھی پر سوار ہو کر راؤ دلپت بندیلہ کے ساتھ شہزادہ کے خیمہ میں داخل ہو گیا ۔ اس خیمہ کو جس میں دربار منعقد ہوتا تھا۔ ہاتھی نے سونڈ سے اکھاڑ پھینکا۔ شہزادہ نے یہ حال دیکھ کر محل سرا میں بھاگ جانا چاہا۔ راؤ دلپت نے آ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اور گھسیٹتا ہوا ہاتھی کے قریب لایا۔ خان نے اشارہ کیا کہ اپنے ہاتھی پر بٹھا لو۔ چنانچہ اسی طرح سے چار کوچ کئے گئے۔ شب و روز شہزادہ راؤ دلپت کے ساتھ رہا اور اسی کے خیمہ میں ٹھیرا۔

اس عرضی پر تحریر فرمایا ؎

پرستار زادہ نیاید بکار   اگر چہ بود زادہ شہریار

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے پسر ناخلف کا کیا علاج کیا جو میں کروں؟ خان نصرت جنگ احمق نہیں ہے ۔ جو اس کو برا کہے۔ وہ خود برا ہے۔ اس نابکار شریر و فسادی کو لانے کے لئے بیجاپور تک خان نصرت جنگ اس کے ساتھ رہیں۔ اس کے بعد جملۃ الملک اور وزیر اعظم کے سپرد کر دیں۔" بیجاپور کے گورنر کے نام ایک فرمان بھیجا "ایک ہزار سوار اس کی محافظت کے لئے ساتھ کرو اور میرے پاس بھیج دو۔ خان نصرت جنگ تو مفتوحہ ممالک مثلاً قلعہ جنجی وغیرہ کی حفاظت کے لئے روانہ ہو جائیں اور جب فرمان (شاہی) ان کی طلبی کا پہنچے حاضر ہو جائیں"۔ عرضی کے حاشیہ پر تحریر فرمایا۔

"اس لڑکے کی خاطر جو آیہ یُمْدِدْکُمْ کے مصداق ثابت ہو چکا ہے۔ کیوں میں اپنے دوست پر جو اچھا نوکر بھی ہے اور اجابک ثلاث[1] کے مصداق بھی ہے خفگی بیجا کروں۔ خصوصاً جب وہ قریبی رشتہ دار خالہ زاد بھائی بھی ہے اور انعام و اکرام کے لائق بھی ہے

فیض خسروانہ

شہنشاہ نے بہرہ مند خاں سے جو اس زمانہ میں عہدہ بخشی (تقسیم تنخواہ)

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ :۔ کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے ملا عبد القادر بدایونی نے سخت تنقید کے ساتھ اکبر کے حالات لکھے۔ تو جہانگیر نے کتاب کو ضبط کر لیا۔ اگر عالمگیر ہمارے مؤرخین کا بیان کردہ عالمگیر ہوتا۔ تو خانِ عالی کو مفتوحہ ممالک میں نفرت انگیز خیالات کی اشاعت کے جرم میں نہایت عبرتناک سزا دے سکتا تھا۔ خان عالی نے ۱۱۰۲ھ میں حیدر آباد میں کیا (وقائع عالمگیر بے مکتوبات کے نام)

[1] دکن کی فتح کے بعد دستور معظم اسد اللہ خاں نے عالمگیر سے عرض کیا کہ آپ ہندوستان تشریف لے چلئے دکن میں اب کام نہیں رہا۔ عالمگیر نے انکار کر دیا۔ تو خان موصوف نے جل کر کہہ مارا۔ دکن میں رہتے رہتے سب کا جی بھر گیا ہے۔ دہلی یاد آ رہی ہے ؎

نشستن چناں قوی کہ برداشتنش   کارے اگر نیست خدا بردارد

عالمگیر نے سنا اور ہنس کر خاموش ہو رہا۔ ذیل کے اشعار بھی ہجو کے ہیں لیکن عالمگیر قدردان تھا۔ ان کو سن کر چہرہ پر شکن بھی نہ پڑی۔ اور پھر دیر تک غور کر کے اس مسئلہ کو فراموش کر دیا۔

فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۔ شعر دیدہ بحر رمل باشد بسے اشنا بیات

فقرو فاقہ حیلہ دست طمع بود اظہار   آنچہ باشد نوکران بادشاہ اور دکن

چیست اشتقاء روپیہ کبریت احمر اشرفی   کیمیا از شدن یک ہفتہ پیش ابوالحسن

غیبہ چنبر کہ مسخ بادش و تابش سراب

فرش دالان سطح زمین لباس ہم جلد بدن

(وقائع عالمگیر صفحہ ۶)

[1] انڈیا آفس لائبریری کے قلمی نسخہ نمبر ۳۳۸۸ میں مندرجہ ذیل عبارت اور ہے۔ "حاشیہ پر تحریر فرمایا۔ کلام افلاطون احبابک ثلث من مشرک فی منحک و فی محنک و فی سفولک (ترجمہ) تو تین آدمیوں کو دوست سمجھ جو تیرا شریک نمک ہو یا شریک محنت ہو یا شریک سفر ہو

ہوا مور تھا۔ فرمایا۔" موسوی خاں عرف مرزا معز فطرت از راہِ غرور کبھی مجھے اپنی ضروریات کے بارے میں عرضی میں بھیجتا ہے۔ حالانکہ وہ بہت پریشانی میں ہے جب تک وہ ہم سے عرض حال نہ کرے گا ہم کوئی توجہ نہ کریں گے۔ تم یہ پیغام اس تک پہنچاؤ اور اس کے جواب میں اس کی عرضی پیش کرو۔ چنانچہ پیغام سننے کے بعد موسوی خاں نے عرضی دی کہ علمائے مجالی حسبی عن مقالی (آپ کا علم میرے حال کے متعلق مجھ سے زیادہ ہے)

در طلب ما بے زبانان لمعت پروانہ ایم ۔۔۔ سوختن از عرض مطلب پیش ما آسان تر است

(طلب کرنے میں ہم بے زبان پروانے کی امت میں سے ہیں جل جانا عرض مطلب کی بہ نسبت میرے لئے بہت آسان ہے)

شما ز غرور غلامی زبان عرض خاموش ۔۔۔ مرا براہ خطا ایں صدا ہا انداخت

(غرور خدمت کے سبب میری زبان عرض حال سے قاصر ہے مجھ کو ان اچھے کاموں نے (غرور خدمت) غلط راستہ پر ڈال دیا ہے)

ازموج فیض بحر کرم را قرار نیست ۔۔۔ اہل سوال بیہودہ ابرام میکنند

(فیض و بخشش کی موج سے بحر کرم کو قرار و سکون نہیں ہے سائل خواہ مخواہ بیکار سوال کرتے ہیں)

عرضی پر تحریر فرمایا۔ "حقیقتاً صحیح لکھا ہے۔

بے زبانی مے کشاید بند ہائے سخت را ۔۔۔ در قفس طوطی ز گفتار سخن گردد اسیر

(بے زبانی سخت سے سخت بند کو بھی کھول دیتی ہے طوطی قفس میں صرف اپنی شیریں بیانی کے سبب سے ہے)

لیکن؎

ہیچ مردے در پئے اصلاح خوئے خویشتن ۔۔۔ در قفس طوطی ز گفتار سخن گردد اسیر

(کوئی انسان بھی اپنی عادات کی اصلاح کی فکر میں نہیں ہے جس کسی کو میں نے دیکھا وہ اپنی عادات کی تزئین میں مشغول دیکھا۔

حدیث شریف کے مطابق السلطان ظل اللہ سلطان خدا کا سایہ ہے۔ جب شاہ وقت اپنے نوکروں سے عرض مطلب کے واسطے کہے اور وہ ایسا معقول جواب اس خوبی سے دیں تو ان پر انعام و اکرام نہ کرنا اخلاق سے بعید ہے۔

مرزا معز مشہد کا رہنے والا تھا حضرت اورنگ زیب کی ہمشیرہ نسبتی سے شادی ہوئی تھی ۱۰۹۸ھ میں مقتر کا دیوان بنایا گیا۔ جون ۱۶۸۹ء میں دکن کا دیوان مقرر ہوا۔ مئی سنہ ۱۶۹۰ء میں انتقال کیا۔

نوائے راز

صہبائے محبت سے جو سرشار نہیں ہے
میخانۂ ہستی میں وہ ہشیار نہیں ہے

وہ رندِ بلا نوش جو خوددار نہیں ہے
کمظرف ہے، خودکام ہے، میخوار نہیں ہے

رندانِ صفاکیش ہیں افسردہ و غمگیں
کیا بات ہے، کیا ساقی خوش کار نہیں ہے

کہتے ہیں کہ میخوار گنہگار رہے، ہو گا!
میخوارِ محبت تو گنہگار نہیں ہے

خوش رنگ ہے، خوشبو ہے، مگر ساقی مغرب
مینا میں ترے بادۂ اسرار نہیں ہے

مانا کہ ہر اک صورتِ منصور ہے حق گو
لیکن کوئی حق کیش سرِ دار نہیں ہے

یہ ماہِ ضیا بار، یہ خورشیدِ جہاں تاب
صد حیف! کوئی طالبِ دیدار نہیں ہے

افسوس کہ تو حسنِ عمل کا نہیں قایل
قسمت کا پلٹ دینا تو دشوار نہیں ہے

جس سوزِ محبت سے ہے روشن مرا سینہ
خوش ہوں کہ کوئی اس کا طلبگار نہیں ہے

یہ بزم، یہ اربابِ سخن اور یہ خموشی
شاید کوئی مستِ مئے افکار نہیں ہے

لایا ہے کہاں راز تو یہ جنسِ گراں ارز
بازارِ سخن مصر کا بازار نہیں ہے

راز چاندپوری

لمعات

اسرارِ حسن و عشق کا حامل بنا دیا
پیرِ مغاں نے دل کو مرے دل بنا دیا

فطرت کی مصلحت کو سمجھنا محال ہے
معصوم حسن دوست کو قاتل بنا دیا

ناکامیاں ہی ضامنِ انجامِ کار تھیں
کیوں جلوۂ امید کو باطل بنا دیا

تدبیرِ خود نما کی بھی کوئی بساط تھی
تقدیر ہی نے فائزِ منزل بنا دیا

ساقی کی چشمِ لطف عجب کام کر گئی
ناقص کو اک نگاہ سے کامل بنا دیا

خضرِ طریقِ عشق کے قربان جائیے
گمراہ کو بھی رہبرِ منزل بنا دیا

کیا پوچھتے ہو مجھ سے بتاؤں میں کیا تمھیں
کیوں رازِ دل کو زینتِ محفل بنا دیا

اختر یہ میرے حسنِ نظر کا کمال ہے
ذرّوں کو مہر و مہ کا مقابل بنا دیا

اختر انصاری

دو پرانے

فردوس صحرا کے آغوش میں پروان چڑھی، نزہت آفریں جوانی جِر
جسن جہاں سوز کی جلوہ سامانیوں میں مہتاب کی طلعت زائیاں کراتی
ئی معلوم ہوتی تھیں۔

اور اس روز شام کو بھی وہ چشمے پر قبیلہ کی لڑکیوں کے ہمراہ پانی
رنے گئی تھی۔ بھوری بھوری اُداس پہاڑیوں کی پشت پر خون اگلتا ہوا
ورج نڈھال ہو رہا تھا۔ زرد زرد کمہلائی ہوئی کرنیں ندی کے پانی پر
نپ رہی تھیں۔ فردوس نے پانی سے لبریز گھڑا اٹھایا۔ لیکن تنہا اس قدر
ری برتن سنبھالنا اس دھان پان سی جان کے بس کی بات نہ تھی۔ کئی
کوشش پر بھی جب وہ کامیاب نہ ہوئی تو اس نے ایک تجسس انگیز
ر چاروں طرف ڈالی۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ دور درختوں کے جھنڈ میں
ائی لڑکیوں کے ہلکے ہلکے قہقہے چاندی کی گھنٹیوں کی سی سیمیں جھنکاریں بکھیر
ہے تھے۔ سامنے اونچے سے ٹیلے پر گاؤں بسا تھا۔ اندھیرے میں اُبھی
ئی میلی میلی جھونپڑیوں سے ابھرتے ہوئے دھوئیں کے پیچ فضا میں اژدہے
طرح فضا میں بل کھاتے ہوئے رینگ رہے تھے۔ وہ دیر تک ایک خواب
سے عالم میں کھڑی ان کو تکتی رہی۔ سب لڑکیاں اب جا چکی تھیں آخر
اس ہوکر بالو کے ایک تودے پر بیٹھ گئی۔

سطح آب پر کپکپاتی ہوئی سسکتی روشنیاں برف آسا ہوتی جا رہی
یں۔ دن کی چتا بجھ رہی تھی۔ سلگتی ہوئی شام دھندلکوں میں سمانے لگی
سے بیٹھے زیادہ دیر نہ گزری ہوگی کہ گاؤں سے آنے والی پگڈنڈی پر
موں کی دھیمی دھیمی چاپ تھرائی۔ فردوس نے غور سے دیکھا۔ درختوں
ابناک سایوں میں لپٹا کوئی آ رہا تھا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی قریب
پر اس نے آنے والے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا
ان سے پوچھا۔

کون طاؤس ۔۔۔؟"

"ارے فردوس! تو اب تک یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟" طاؤس نے
تعجب ہوکر پوچھا۔ پھر نزدیک آکر کہنے لگا "اتنی دیر تک یہاں
یٹھی نہ رہا کرو۔"

ہوں! کیا ہوا؟"

چینی ترکستان کی ایک کہانی

از:- جناب شوکت صدیقی

"اب تو بڑی ہوگئی ہے!"

"پھر کیا ہوا ۔۔۔؟"

"عجیب لڑکی ہے" وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ "اتنی بڑی
ہوگئی اب تک عقل نہ آئی۔"

جل کر فردوس نے منہ بچکا کر کہا "تمہارے تو عقل ہے۔ بڑے آئے
دہاں سے"

طاؤس خاموش ہوگیا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی اپنی
جگہ پر چپ بیٹھی رہی۔ شام کی سیاہیاں خمدار پیچ بکھیرتی برابر تاریکی
میں سماتی جا رہی تھیں تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"طاؤس ذرا میرا گھڑا اٹھوا دو۔ اب بہت دیر ہوگئی"

"میں نہیں اٹھواؤں گا"

اور چپ چاپ ریت کے ایک ڈھیر پر جاکر بیٹھ گیا۔ فردوس کھڑی
اُسے دیکھتی رہی۔ طاؤس بیٹھے بیٹھے یونہی ایک قبائلی گیت گنگنانے لگا
اندھیرے کے کالے کلوٹے جبڑے پھیلتے جا رہے تھے۔ تاریکیاں اُمنڈتی
آ رہی تھیں۔ فردوس کو اب گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ آخر وہ اُس کے
پاس پھر گئی۔

"اٹھوا دو میرا گھڑا۔ دیکھو نا کتنا اندھیرا ہوگیا۔ ماں ناراض ہوں گی
طاؤس ۔۔۔!"

"تو میں کیا کروں؟" اور پھر گانے میں محو ہوگیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولی چپ
چاپ اپنی جگہ پر جاکر بیٹھ گئی۔ طاؤس نے گانے کے دوران میں کئی بار نظریں
گھما گھما کر اس کی جانب دیکھا۔ مگر وہ اسی طرح گم سم بیٹھی رہی۔ مجبوراً اسے
اٹھ کر اس کے پاس جانا پڑا۔ "اچھا چل میں تیرا گھڑا اٹھوا دوں۔ میں اب
جا رہا ہوں۔ فردوس نے کوئی جواب نہ دیا ۔۔۔ آخر طاؤس نے اس کا
شانہ جھنجھوڑ کر کہا۔

"اٹھتی ہو یا نہیں؟ میں اب ٹھہرنے کا نہیں"

فردوس نے گردن اٹھا کر نظریں اس کے چہرے پر بکھیر دیں۔ گہری
فروش آنکھوں کے آبی پردوں پر سیمیں جھلملاہٹیں رینگ رہی تھیں۔ وہ
مری ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"طاؤس! تم مجھے اتنا کیوں ستاتے ہو؟ ابھی پرسوں شام ہی کا ذکر ہے کہ تم نے درخت پر سے کود کر مجھے کس بُری طرح ڈرایا تھا۔ جی دہل کر رہ گیا وہ تو کہو گلنار آگئی ورنہ جانے میرا کیا حال ہوتا" یہ کہتے کہتے اس کی پلکیں بھیگ گئیں اور آپس میں گتھ گئیں۔ طاؤس گھبرا گیا۔ "ارے رو رہی ہے، کیا تو سمجھتی ہے کہ تجھے سچ مچ ستاتا ہوں۔ وہ تو میں ہنسی کر رہا تھا۔ واہ رے پگلی؟" اور پھر اوڑھنی کے آنچل سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ "بھلا میں اپنی فردوس سے ناراض ہو سکتا ہوں"

وہ چپ تھی۔ نظریں نیچے بالو پر جذب تھیں۔ ہلکے گلابی ہونٹ مسکراہٹوں سے لرزے جا رہے تھے۔ کتنی نازک اور معصوم تھی وہ ۔۔۔ گھنے درختوں کی اوٹ سے بہنے والی کنواری ندی کی طرح شرمیلی جو پچھلی رات کی اچھوتی چاندنی میں نکھر کر جوان ہو رہی ہو۔

"نہیں بولو گی میری شہزادی؟"

"کیا ۔۔۔؟"

اور اس نے ٹھوڑی اٹھا کر لبوں کو چوم لیا۔ وہ تلملا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"تم بڑے بُرے ہو؟"

"نہیں نہیں ۔۔۔" وہ مسکرانے لگا۔ "لاؤ گھڑا اٹھوا دوں۔ دیکھو کتنا اندھیرا ہو گیا ۔۔۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ طاؤس نے ہاتھ بڑھا کر گھڑا اٹھوا دیا۔ اور دونوں چل کھڑے ہوئے۔

طاؤس کے مجبور کرنے پر فردوس نے ایک دیہاتی گیت چھیڑ دیا۔ نغمہ فروش آواز کی لوچ سے کائنات کے ذرے ذرے سے موسیقیاں تڑپنے لگیں۔ فضا بہجت افروزیوں میں سما کر مسکرانے لگی۔ دونوں یونہی دوش بدوش پگڈنڈی کے سنگلاخ سینے کو روندتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ یکایک مشرق کی جانب کھڑی ہوئی سرنگوں پہاڑیوں پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی تیز تیز آوازیں گونجنے لگیں۔ دونوں نے گھوم کر دیکھا۔ کچھ سوار پہاڑی پر سے اتر رہے تھے۔ فردوس گھبرا کر بولی۔

"یہ کون لوگ ہیں طاؤس! مجھے ڈر معلوم ہو رہا ہے۔ یہ ہمارے گاؤں کے نہیں معلوم ہوتے"

"ہاں، مگر تو ڈر کیوں رہی ہے؟ سوداگر لوگ ہوں گے۔ چین خطائی سے آ رہے ہیں۔ بہت بڑا ملک ہے اور بہت دُور۔ وہ جہاں سے روز صبح سورج نکلتا ہے نا۔ ہر سال بہار کے موسم میں یہ لوگ آتے ہیں جب پہاڑوں پر جمی ہوئی برف پگھلنے لگتی ہے"

"لیکن ابھی بہار کا موسم کہاں آیا؟"

"ایسی جلدی آگئے ہوں گے" وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ حالانکہ اس کے قدم تیز تیز قدم اٹھ رہے تھے۔ "اچھا جلدی چل ۔۔۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے"

ٹاپوں کی آوازیں نزدیک آتی جا رہی تھیں۔ فردوس کا دم پھولنے لگا

"طاؤس! مجھ سے اب نہیں چلا جاتا"

"وہ سامنے ہی تو گاؤں ہے"

"نہیں اب ٹھیر جاؤ"

"بس دو قدم اور"

"نہیں نہیں، اب نہیں" اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ "ان کو یہاں سے چلا جانے دو" آخر طاؤس کو بھی رکنا پڑا۔ اس نے گھڑا اتروایا اور دونوں سمٹ کر ایک طرف ہو گئے۔

گھوڑے درختوں سے ہوتے ہوئے اب بالکل سامنے آگئے۔ دن بھر کی ہنگامہ خیزیوں میں جاگی ہوئی کائنات ظلمت کے خواب افروز سایوں میں لپٹی ہوئی اونگھ رہی تھی۔ نیلگوں پہاڑوں سے کالے کوسوں دور، ادھر افق مغرب میں ہلکی کافوری روشنی سسک رہی تھی جیسے مُردے کے چہرے پر سمٹا ہوا نور۔ گھوڑے قریب آگئے۔ پھیکی پھیکی برف ایسی سفید روشنی میں دونوں نے دیکھا۔ چار شخص گھوڑوں پر سوار چلے آ رہے ہیں۔ نزدیک آ کر انھوں نے باگیں کھینچ لیں اور ایک شخص جو سب میں بلند و بالا معلوم ہوتا تھا اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو ۔۔۔؟"

"ہم اسی گاؤں میں رہتے ہیں" طاؤس نے جواب دیا۔ فردوس بولتی ہی کیا مارے خوف کے اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ سمٹی سمٹائی طاؤس کی پشت پر کھڑی تھی۔

"اور یہ تمھارے ساتھ کون ہے؟"

"یہ ۔۔۔؟ یہ فردوس ہے"

اس کی گھبراہٹ پر وہ شخص خفیف سا مسکرایا۔ "اچھا کیا یہی ابھی گا رہی تھی۔ ہاں یہی ہوگی۔ ہم اس کی آواز ہی سن کر تو ادھر آگئے۔ طاؤس کی جان میں جان آئی۔ کسی قدر ہمت بڑھی۔ "جی! یہ بہت ہی اچھا گاتی ہے بہت اچھا ۔۔۔!"

"اچھا! یہ بتاؤ قلعہ کو کوئی راستہ ادھر سے بھی جاتا ہے؟"

"یہ رہا ۔۔۔ ان پہاڑیوں کے پیچھے ہی تو ہے"

"راستہ جانتے ہو؟"

"جی!"

"اچھا—" اور اس نے پلٹ کر پاس کھڑے ہوئے سوار کی طرف دیکھا واز! تم اس کو اپنے ساتھ بٹھالو۔"

"بہت خوب عالیجاہ!"

دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ان کا بادشاہ، جان و ل کا محافظ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ جس کا نام سن کر قبائل کے بڑے بڑے درباؤں کا زہرہ آب ہو جاتا دونوں نے ہاتھ باندھ کر تعظیم سے سر جھکا دیئے دشاہ طاؤس سے کہنے لگا۔

"ڈرومت—! تم تو بہت اچھے آدمی ہو۔ ہم تم کو اپنی فوج میں اخل کر لینگے۔"

"عالیجاہ"

"اچھا تم ان کے پاس گھوڑے پر بیٹھ جاؤ!"

نواز نے اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ بادشاہ فردوس کی طرف دیکھنے لگا

"ہمیں تمھارا گانا بہت پسند آیا!"

"عالیجاہ!" وہ لرزتی ہوئی آواز سے بولی۔

بادشاہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ دوسروں نے بھی گھوڑے بڑھا دیئے

دیکھتے ہی دیکھتے تمام گھوڑے ایک ایک کر کے درختوں میں سما گئے۔

لحظہ بھر تک تو فردوس ہکا بکا سی کھڑی ان کو جاتے دیکھتی رہی پھر زور سے چیخ پڑی—"نہ جاؤ طاؤس! نہ جاؤ" لیکن شاید اس نے سُنا نہیں۔ وہ تھرتھرا کر ایک خزاں دیدہ پتے کی طرح فرش پر بیٹھ گئی۔

ادھر طاؤس گھوڑے پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اب وہ فوج میں داخل ہو جائیگا۔ اور جب فوجی لباس میں گھوڑے پر سوار ہو کر شان سے گاؤں میں جائیگا تو سب کیسی نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھیں گے۔ اور فردوس وہ تو خوشی سے پھولے نہ سمائیگی۔ اب یوں بات بات پر رومٹھا نہ کریگی جانتی نہیں کہ اب میں شاہی فوج کا آدمی ہوں—— یہ سوچتے سوچتے وہ کئی بار مسکرا دیا۔

مگر جب وہ واپس گاؤں پہنچا تو اس کے سارے سہانے خواب بکھر گئے فردوس وہاں نہ تھی۔ وہ تو کب کی بادشاہ کے محلوں میں پہنچ چکی تھی۔ شہنشاہ کو اس کا گانا جو پسند آ گیا تھا۔

ملکہ ایک لہرائے ہوئے خواب کی طرح چنار کے ان عفریت پیکر درختوں تلے سے گذر رہی تھی جن کی پھنگیوں پر چاند کی زرتار شعاعیں ہُن برسا رہی تھیں۔ آخر وہ فوارے کے پاس مرمریں چبوترے پر جا کر بیٹھ گئی۔ پاس اُگے ہوئے شمشاد کے ایک خزاں رسیدہ درخت پر بلبل پھڑپھڑائی۔ چند سوکھے پتے کھڑکھڑائے۔ خاموشیاں چونکیں اور پھر وہی ماتمی سکوت۔ پھر ہوا کی دبی دبی سسکیوں میں اُبھی نشپت پر پیروں کی آواز اُبھری۔ ملکہ نے پلٹ کر دیکھا۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں سائرہ آ رہی تھی۔ اس نے وہیں سے پوچھا۔

"سائرہ—؟"

"ملکۂ عالم—!"

"تم چلی کیوں آئیں؟"

"کنیز نے سوچا آپ تنہائی سے اکتا رہی ہونگی!"

"نہیں! تم جانتی ہو یہ شاہی باغ ہے اور تمھارا وہاں ہونا ضروری۔"

"بہت بہتر ملکہ عالم!"

سائرہ اُلٹے قدموں واپس لوٹ گئی۔ ملکہ پھر خاموشی میں ڈوب گئی چاند کے طلائی جسم کے پاس ایک ہلکا سا بھورا بادل رینگتا ہوا آ گیا۔ روشنی پھیکی پڑنے لگی۔ فضا اداس ہو گئی۔ دور پہاڑیوں کے دامن میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں گونجیں۔ ملکہ چونک پڑی۔ گھوم کر دیکھا۔ سامنے سائرہ جا رہی تھی۔ ملکہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سائرہ! جلد پہنچو۔"

"بہت خوب ملکہ عالم!"

سائرہ تیز تیز قدموں سے اس طرف چلنے لگی۔ ملکہ بھی آگے بڑھی۔ اژدہے کی طرح خم کھایا ہوا نتھا مُنا بادل مہتاب کو اگلنے لگا۔ پھیکے پھیکے خاکستری سائے تابناک روشنی میں مسکرانے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد سائرہ طاؤس کے ہمراہ ملکہ کے سامنے آئی اور کورنش ادا کر کے لوٹ گئی۔ طاؤس نے کسی قدر جھک کر کہا۔

"ملکہ معظمہ! طاؤس کا آداب قبول ہو۔"

"تمہارا آداب نہیں قبول کیا جائے گا۔"

"غلام کا قصور؟"

"سننا چاہتے ہو؟"

"ملکہ عالم ——!"

"تم نے ایک بھولی بھالی دوشیزہ کو محبت کے سنہرے جال میں جکڑ بند کیا۔ پھر اسے یونہی پابجولاں چھوڑ کر چلے گئے۔ ایسے کہ کبھی بھول کر خبر ہی نہ لی۔ اس غریب پر کیا گزری؛ تمہیں اس سے کیا واسطہ۔ ہم امید ہے تم اپنے جرم سے انکار نہ کرو گے۔"

"بھلا میں کس منہ سے انکار کر سکتا ہوں۔" طاؤس نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ "لیکن ملکہ عالم اس نے میرے لوٹنے تک کا انتظار ہی کب کیا —؟ شہنشاہ کی عنایات میں وہ سب کچھ بھول گئی۔ یہ بھی کہ کسی کی اُمیدیں اس کی عنایت سے زندہ تھیں۔"

"تم بھول رہے ہو۔ وہ ایک عورت تھی —— دوسروں کے رحم و کرم پر جینے والی گڑیا۔"

"ملکہ عالم ——!"

"اپنی صفائی میں ثبوت مہیا کرو ہم سماعت کریں گے۔"

"مجھے اب کچھ نہیں کہنا۔ ملکہ عالم! کیا زندگی سزا ہی بھگتے بھگتے گزر جائیگی۔"

"ہم نے تمہیں معاف کیا۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "بہت بنے ہوئے ہو کیسے بھیگی بلی کی طرح مسکین بنے کھڑے ہو۔"

"مجبور تھا۔ ملکہ جو ٹھہریں۔" وہ بے تکلف ہوا جا رہا تھا۔ "مگر فردوس نے کتنی خطرناک راہ اختیار کی ہے۔ اچھا اب مجھے واپس جانا چاہئے۔ میرا یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں۔"

"چلے جانا۔ ایسا بھی کیا خوف۔ گھبراؤ نہیں۔ تمہارے شہنشاہ آج شکار پر تشریف لے گئے ہیں۔ آؤ قصر نشاط میں اطمینان سے باتیں ہونگی۔"

"تمہاری خوشی ——!"

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

طاؤس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "فردوس! بہتر ہوتا کہ تم مجھے یہاں نہ لاتیں۔ یہ تمہارے حق میں مفید نہ ہوگا۔ چاہے مجھے کتنے ہی صبر آزما مصائب سے گزرنا پڑے مگر مجھے گوارا نہیں کہ تم پر حرف آئے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر طاؤس یہ آگ تو اب مجھ سے دبائے نہیں دبتی۔"

"انجام پر بھی غور کیا؟"

"بہت! آخر اتنی مدت تک سوچتی کیا رہی؟ مگر اس وقت تم ان باتوں کو چھیڑ کر اس دو گھڑی کی خوشی کو خدا کے لئے برباد نہ کرو۔ ان دکھڑوں کو رٹتے رٹتے اب تو میرا کلیجہ پک گیا۔"

"برا مان گئیں۔ اچھا اب کچھ نہ کہونگا۔"

"یہاں بیٹھو۔" اور مسند زرنگار پر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ اور خود لپک کر مئے ارغوانی سے لبریز ایک صراحی اور چند جام اٹھا لائی۔ پھر ایک جام بھر کر سامنے رکھ دیا۔

"پی لو ——!"

طاؤس نے چپ چاپ جام اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ فردوس پاس رکھے ہوئے بربط کے نزدیک بیٹھ گئی۔ اس کی موم بتی کی سی کافوری انگلیاں تاروں پر مچلنے لگیں۔ دھیمی دھیمی موسیقیاں۔ کمرے کی خموشی میں جھنکار بر نغمے تڑپ کر بکھر گئے۔ فضا کھلکھلا اٹھی۔ طاؤس جام پر جام چڑھاتا گیا آخر صراحی خالی ہو گئی۔ اس نے فردوس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ "بس!" او صراحی سامنے رکھدی۔

"زیادہ ٹھیک نہیں، تم اس وقت شاہی محل میں ہو۔"

"طاؤس اتنا تنگ ظرف نہیں فردوس! یہ شراب ہے۔ شرافت کو پرکھنے کی کسوٹی ——!"

"جو تم مناسب سمجھو۔"

اور اٹھ کر دوسری بھری ہوئی صراحی اُٹھا لائی۔ ایک جام بھر کر د طاؤس نے گردن بڑھا کر دونوں ہونٹ اس پر جذب کر دیئے اور بازو پھیلا کر فردوس کے مخملیں پیکر کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولی — باہر درختوں سے اُلجھتی ہوئی ہوا کی دبی دبی سرگوشیاں لرز رہی تھیں۔ کونے میں رکھے ہوئے اگردان کے عطر زا لپٹے لہراتے ہوئے خوشبو بکھیر پھیلا رہے تھے۔ فردوس نے اپنا سر اس کے خوبصورت بازو پر ٹکا دیا۔ طا نے جام خالی کر کے بکھرے ہوئے بالوں کے مرغولوں میں اپنی انگلیاں پھرا ہوئے چہرہ جھکا دیا۔ گرم گرم جھلسی ہوئی سانسیں فردوس کے رخسار

بکھر گئیں۔ دفعتہً حریری پردے لرزے۔ سائرہ گھبرائی ہوئی داخل ہوئی
نے سراسیمہ ہو کر پوچھا۔

"خیر تو ہے سائرہ ــــ؟"

"غضب ہو گیا ملکۂ عالم! جہاں پناہ معلوم کیوں شکار پر سے لوٹ آئے۔"

سائرہ نے جملہ پورا ہی کیا تھا کہ باہر کنیزوں میں بادشاہ کی آمد کا
غلہ مچ گیا ــ اور لحظہ ہی بھر میں زرنگار پردے لہرائے۔ بادشاہ اندر
خل ہوا۔ فردوس یونہی ہکا بکا سی اس کو تکتی رہ گئی۔ سائرہ دبک کر
دوں کی آڑ میں ہو گئی۔ وہ ایک لمحہ تک کھڑا تحیر زا نظروں سے دونوں
کتا رہا۔ پھر گرج کر بولا۔

"کون؟ طاؤس! اور پھر شاہی حرم میں۔"

طاؤس نے سر جھکا لیا۔ فردوس کسمسانے لگی۔ وہ تیز تیز قدموں سے
ـ کران کے پاس آیا اور فردوس کا بازو پکڑ کر جھٹکے سے اٹھایا۔ "فردوس
نت یہ کیا؟ آخر اپنی رذالت دکھا ہی دی۔" فردوس کے ہونٹ لرز کر
گئے۔ زبان سے چوں تک نہ کی۔

"اچھا ــ!" بادشاہ چیخ کر بولا ــــ اور ساتھ ہی ہاتھ قبضہ پر جا پہنچا
بے تعداد جھلملاہٹیں برساتا ہوا باہر نکل آیا۔ "محبت دیکھی ہے ـــ تو
بدولت کا غصہ بھی دیکھ لو فردوس!"

فردوس نے منہ لٹکا دیا۔ طاؤس جھپٹ کر نزدیک آ گیا۔ "عالیجاہ!
سور میرا ہے۔ اس کا نہیں۔ سزا کا مستحق تو میں ہوں۔"

بادشاہ کی بھنویں سمٹ کر مل گئیں۔ "طاؤس! ہمارے حضور میں اور
سیارت۔ کیا تم سزا سے بچ جاتے۔ اچھا پہلے تم ہی لو۔ نکالو تلوار۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے عالیجاہ؟" طاؤس نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ "طاؤس اپنے
نشاہ کے سامنے کیسے تلوار اٹھا سکتا ہے۔"

"باتیں نہ بناؤ طاؤس! ہم جانتے ہیں تمھیں ہمارا کس قدر خیال ہے
مصلحتوں پر ڈاکہ ڈالو۔ عزت کو کچل ڈالو۔ منہ پر تھوک دو۔ پھر کہو کہ میں
پرستش کرتا ہوں۔ خاک جھونکنے کی کوشش مت کرو۔"

"لیکن عالی جاہ ــــ"

"چپ رہو۔ اگر تمھیں ہمارا ایسا ہی خیال ہے تو ہمارے حکم کی تعمیل
ں نہیں کرتے۔ نکالو تلوار ــــ!"

آخر طاؤس کو تلوار نکالنا ہی پڑی۔ بادشاہ کا چہرہ سرخیوں سے شفق رنگ
رہا تھا۔ پیشانی پہ سلوٹیں پڑی تھیں ــــ وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے
ئے طاؤس پر جھپٹ پڑا۔

بادشاہ پے در پے حملے کئے جا رہا تھا۔ جھنجلا جھنجلا کر، پھر پھر کر،

لیکن طاؤس نے مطلق پیش قدمی نہ کی۔ وہ خاموشی سے برابر اس کے وار
روک رہا تھا۔ آخر بادشاہ نے کڑک کر کہا۔

"طاؤس! موت سے بھاگ رہے ہو۔ بزدل نہ بنو، تم سپاہی
کی توہین کر رہے ہو۔"

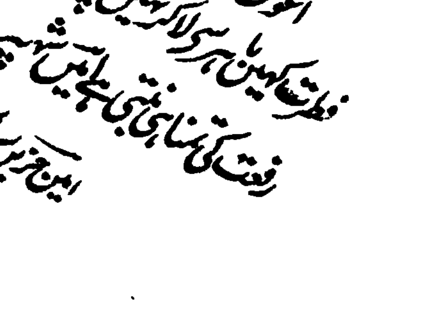
اور ساتھ ہی اس نے تیزی سے حملہ کر دیا۔ طاؤس خود کو بچا نہ سکا
خنجر پیشانی پر سے چھیلتا ہوا نکل گیا۔ خون کی ایک دھار بہ نکلی۔ تمام
چہرے پر لال لال لہو پھیل گیا۔ اپنا خون دیکھ کر سپاہی اندھا ہو جاتا ہے
طاؤس بھول گیا کہ اس کا مدمقابل اس کا اپنا آقا ہے۔ اس نے جھلا کر حملہ
کیا۔ بادشاہ بچنے کے لئے ایک طرف ہٹا۔ درمیان میں بربط آ گیا۔ وہ
اس سے الجھ کر لڑکھڑا گیا ــــ سر سامنے آ گیا ــــ طاؤس کی تلوار اٹھ چکی
تھی ــــ فردوس کونے میں دبکی سہمی ہوئی نظروں سے یہ بھیانک
منظر دیکھ رہی تھی۔ بادشاہ کو لڑکھڑاتے دیکھ کر وہ سرعت سے سامنے
آ گئی ــــ تلوار روشنیاں پھیلاتی ہوئی تلملائی۔ ایک دلدوز چیخ ابھری
دونوں نے دیکھا ــــ تلوار فردوس کے سینہ میں پیوست تھی۔

طاؤس کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ گیا ــــ "یہ کیا کیا تم نے
فردوس؟"

"اچھا ہی ہوا۔ فیصلہ یوں ہی ہونے والا تھا ــــ میں خود کو مٹا
سکتی ہوں لیکن شہنشاہ پہ آنچ آتے نہیں دیکھ سکتی ــ ان کی ذات
سے وطن عزیز کی کتنی ہی امیدیں وابستہ ہیں ــ" اور پھر بادشاہ کی
طرف منہ موڑ دیا ــــ "اب تو جھگڑا مٹ گیا۔ طاؤس کو معاف کر دو۔"
یہ کہہ کر گردن ایک طرف ڈال دی۔

بادشاہ چیخنے لگا ــــ "فردوس! فردوس!"

طاؤس ایک شوریدہ سر مخبول کی طرح لڑکھڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔



عورت کی ظاہری جوانی

عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہو کر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو یہ بہت بدصورتی کہلاتی ہے ایسی عورت میں شباب کی کشش ختم ہو جاتی ہے یہ خرابی عورت کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ ہر سال بچوں کو دودھ پلانے پر مجبور ہو جائے یا کسی بیماری یا بداحتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہو کر بدنما معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر دیتے ہیں

ایسی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آسکتی ہے

سائنس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوئی ہے۔ جس کے استعمال سے عورت کے ڈھیلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ گول اور سخت ہو کر عورت کو از سر نو جوان لڑکی کے روپ میں پیش کرنے لگتے ہیں۔ اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں۔ یہ لگانے کی دوا ہے اور اس کا نام "برسٹین" ہے یہ ہی دوا ہے جسکی بدولت ابتک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں اور اب وہ کافی عمر کے باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اسکے ہر روز کا استعمال عورت ثابت کرتا ہے کہ کتنی جلدی اسکے سینہ میں دوبارہ ابھار اور سختی پیدا ہو رہی ہے۔ جن عورتوں کو ضرورت ہو

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔بی ۲۴ دہلی کے پتے پر خط لکھکر ایک شیشی "برسٹین" بذریعہ وی۔پی پارسل منگا لیں۔ ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی بنا دیگی اور اس کے سینہ کی یہ سب خرابیاں دور ہو کر مستقل ابھار اور سختی پیدا کر دیگی۔ ایک شیشی "برسٹین" کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر صرف آٹھ آنہ محصول لگیگا۔ **نوٹ:۔** اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے۔ تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچہ کے دودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی اور بچہ نہایت اطمینان کے ساتھ دودھ پیتا رہیگا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔

میں بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتی

عورت میں یہ خواہش اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ کسی بیماری کے باعث اتنی کمزور اور ناتواں ہو گئی ہو کہ بچہ کی پیدائش کی سخت مشکلات کا سامنا نہ کر سکے یا بعض عورتیں اپنی مفلسی کی وجہ سے بھی زیادہ اولاد سے گھبراتی ہیں ایسی عورتوں کو چاہیے کہ سائنس کی ایجاد دوا روہیل سے فائدہ اٹھائیں۔

جبتک چاہو بچہ نہیں ہوگا

دوا روہیل کے استعمال میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عورت جب تک چاہے اولاد سے محفوظ رہ سکتی ہے اور ماہواری ایام میں بھی کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں پڑتی۔ یعنی ماہواری بدستور ہر ماہ آتی رہیگی۔ دوا کی ایک شیشی میں [illegible] ترکیب استعمال کے لائق دوا ہوتی ہے۔ اور اسکے استعمال کی صورت یہ ہے کہ عورت ...... سے دس منٹ پہلے ایک خوراک روہیل کھائے تو پھر اسکے بعد...... اس رات عورت کو "بچہ کی امید" نہیں ٹھہر سکتی۔ چنانچہ عورت جبتک ...... سے پہلے یہ دوا کھالیا کریگی حمل نہ

جب چاہو بچہ ہونے لگے گا

اور جب عورت اس دوا کا استعمال ترک کر دیگی تو پھر جس طرح عام طور پر عورتوں کے ہاں بچے ہوتے ہیں پھر اسکے ہاں بھی ہونے لگے گا۔ دوا کے استعمال سے عورت کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا جس عورت کو ضرورت ہو،

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے بی ۲۴ دہلی کو خط لکھکر دوا روہیل کی شیشی بذریعہ وی۔پی پارسل منگا لیں۔ شیشی کی قیمت چار روپے آٹھ آنے ہے۔ پارسل پر [illegible] نہ لگیگا۔

ٹیلیفون نمبر [illegible]

مشاہیرِ عالم اور اُن کے پیشے

معلومات افروز مضمون

از:- جناب عزیز گورکھپوری

فی زمانہ دور بین نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ دُنیا کو کسی آن کسی لمحے چین
-اس کا ایک ایک سکنڈ اپنے اندر ہزاروں کروٹیں "لئے" آتا ہے۔
نقلابوں میں سے ایک اہم انقلاب "سرمایہ و محنت" اور "اونچ نیچ" کا
زمانہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ غریبی امیری نیچ اونچ کوئی چیز نہیں
ب و نسب پر فخر ——!

کسی کے محض سید اور پنڈت ہونے کی وجہ سے اُسے امام نہیں مانا جا سکتا۔
مانہ کی اکثر تحریکیں مساوات و برابری کا پیغام دے رہی ہیں۔ کسی کو
پیشہ اختیار کرنے سے ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔

بطور مشتے نمونہ از خروارے ان مشہور ہستیوں کے اسما اور پیشے درج
اتے ہیں جن کے فکر و عمل سے ایک زمانہ فیضیاب ہوتا رہا ہے۔ اور
شخصیتیں دینوی اور دنیاوی اعتبار سے قابلِ تقلید و نمونہ ہیں۔

اسماء	پیشے
ت آدمؑ	سب سے پہلے باوا آدم نے کپڑا بُنا۔
ت حوا	آدم پشمینہ تیار کیا کرتے تھے حوا اُسی کے متعلق امور انجام دیا کرتیں۔
ت ابراہیمؑ	کاشتکاری کرتے اور کپڑا فروخت کیا کرتے تھے
اسمعیلؑ	شکار کیا کرتے تھے۔
صالحؑ	کمبل بُنا کرتے تھے۔
شیثؑ	کپڑا بُنتے تھے۔
داؤدؑ	لوہاری، خود و زرہ آپ کی ایجاد ہے۔
لوطؑ	کاشتکاری و خیاطی
لقمانؑ	نجاری و خیاطی
نوحؑ	نجاری
زکریاؑ	نجاری
سلیمانؑ	کھجور کی پتی سے چٹائی اور پنکھے بنانا،
عیسیٰؑ	اپنی والدہ کے کاتے ہوئے سوت سے موزی بنا تے تھے۔
حضرت موسیٰؑ	بکریاں چرایا کرتے تھے۔
〃 شعیبؑ	بکریوں کے گلے کے مالک تھے اور زراعت بھی کرتے تھے۔
آنحضرت صلعم	بکریاں چرائیں، تجارت اور حمالی بھی کی
حضرت ابو ایوب انصاریؓ	پارچہ بافی
〃 ابو طلحہ انصاریؓ	پارچہ بافی- اور بغلی قبر کھودتے تھے۔
〃 ابوبکر صدیقؓ	بزازی
〃 عثمانؓ	بزازی
〃 علیؓ	کاشتکاری
〃 عبداللہ بن مسعودؓ	کاشتکاری
〃 جندب بن الارتؓ	لوہاری
〃 سلمان فارسیؓ	ٹوکرے فروخت کرتے تھے۔
〃 ابو عبیدہ بن الجراحؓ	صندوقی قبر کھودتے تھے۔
〃 زبیر بن عوام	خیاطی
〃 عثمان بن طلحہ	خیاطی
〃 ولید بن مغیرہ	لوہاری
〃 ابو حنیفہؒ	ریشمی کپڑا فروخت کرتے تھے۔
جنید بغدادیؒ	بزازی
اسماعیل الحائک	کپڑا بُنتے تھے۔ شام کے مفتی تھے۔
〃 جرثومۃ النساج تابعی	کپڑا بُنتے تھے اور محدث تھے۔
شیخ فریدالدین عطار	عطاری
ابو نعیان	مالی کا کام
خواجہ بہاءالدین	کمخواب کی فروختگی۔
شیخ خیر النساجؒ	کپڑا بُنتے تھے۔
شیخ احمد ہروانی	کپڑا بُنتے تھے

شیخ ابوعلی وفاق	آٹا بیچتے تھے۔
امام نووی کے مرشد شیخ لیسین	حجام
اورنگزیب	قرآن کی کتابت
ناصرالدین	ٹوپی بنایا کرتے تھے۔
جرمنی کا آمر ہٹلر	اس کا باپ محکمہ چنگی میں ادنیٰ ملازم تھا اس نے خود خشت سازی۔ مزدوری اور رنگ سازی کی ۔
اٹلی کا ڈکٹیٹر مسولینی	لوہار کا لڑکا ہے۔
ترکی کا صدر اتاترک	چنگی کے ادنیٰ ملازم کا لڑکا تھا۔
روس کا آمر جوزف سٹالین	موچی کا لڑکا ہے۔
دنیائے سائنس کا بادشاہ ایڈیسن	اخبار فروشی
ملک الشعرا یونان ہومر	معمولی زمیندار کا لڑکا۔
حکیم و فلاسفر سقراط	بڑھئی کا لڑکا۔
انگلستان کا شاعر شیکسپیر	لکڑی فروش کا لڑکا۔
فرانس کا شہنشاہ نپولین	معمولی سپاہی

ملکہ فرانس جوزیفائن	تمباکو فروش کی لڑکی۔
تیل کا بادشاہ راکفیلر	معمولی دکاندار کا ملازم
ملک الشعراء روم فرصل	ایک غریب قلی کا لڑکا تھا۔
امریکہ کا صدر جنرل گرانٹ	چمڑا رنگنے والے کا بیٹا
امریکہ کا محب وطن ابراہیم لنکن	ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔
امریکہ کا مشہور کروڑپتی جانڈان میکر	ایک دوکان پر سولہ روپیہ ماہوار کا نوکر تھا
ملکہ روس کیتھرائن	فوج میں خادمہ تھی۔
مشہور بادشاہ نادر شاہ	ایک غریب گڈریا تھا۔
اکبر کا ایک رتن راجہ بیربل	بان کی رسیاں بنانے والا تھا
وزیراعظم انگلستان ریمزے میکڈانلڈ	ایک سکاٹ کسان کا لڑکا تھا۔
قطب الدین ایبک	نیشاپور کے بازار میں فروخت شد تین روپے کا غلام
سلطان مصر ابن برقوق	ایک معمولی غلام تھا۔
ہنری فورڈ	ایک بھٹی پر چھ آنے یومیہ کا ملازم
رضا شاہ پہلوی	فوج کا معمولی سپاہی اور غریب کسان کا لڑکا

آہستہ آہستہ

مری جانب ہے اُلفت کی نظر آہستہ آہستہ
بسے گا پھر تمناؤں سے گھر آہستہ آہستہ

ابھی اک ایک دو دو گھونٹ آخر شیخ پیتا جا
تجھے ہو جائیگی عادت مگر آہستہ آہستہ

محبت کی خلش ابھی ہے لیکن دل نہیں عادی
اُتر پہلو میں اے تیرِ نظر آہستہ آہستہ

الٰہی خیر کیا سرگوشیاں ہیں میری بالیں پر
کچھ اُن سے کہہ رہا ہے چارہ گر آہستہ آہستہ

خدا جانے مجھے کو سا گیا ہے یا دُعائیں دیں
وہ کچھ کہتے گئے مُنہ پھیر کر آہستہ آہستہ

اکیلا ہی میں شاید منزلِ مقصود پہ پہنچوں
کہ چھٹتے جا رہے ہیں ہمسفر آہستہ آہستہ

ہماری شامِ ہجراں کی بڑھی جاتی ہے طولانی
لٹک آئے ہیں گیسو تا کمر آہستہ آہستہ

کبھی رکھنے نہ دو اغیار کو سر اپنی چوکھٹ پر
مٹا دیں گے تمھارا سنگِ در آہستہ آہستہ

ابھی جلدی نہ کر اے رازؔ اُلفت آزمانے میں
کہ ہوتا ہے محبت کا اثر آہستہ آہستہ

نجل شاہ راز

آج!

یاد آئی ہے جو اُس کی نرگسِ مستانہ آج — ذرہ ذرہ دے رہا ہے دعوتِ پیمانہ آج
کیا اُسے معلوم کیا گلشن ہے کیا ویرانہ آج — غرق اپنی وحشتوں میں ہے دلِ دیوانہ آج
میکشوں کے واسطے جب وقف ہی میخانہ آج — کیوں میانِ شوق حائل ہو خطِ پیمانہ آج
اک نگاہِ مست ساقی نے کیا مجھکو خراب — کیا ہوئی آخر وہ میری ہمّتِ رندانہ آج
پھر ہجومِ آرزو نے مجھکو رسوا کردیا — اُس کے آگے پھر تڑپ اُٹھا دلِ دیوانہ آج
لاؤ کردوں زندگی کو ایک نالے میں تمام — آؤ بھردوں ہستیٔ بے کیف کا پیمانہ آج
گُل کے پہلو میں نظر آتا نہیں اک خار بھی — کیا چمن سے ہو کے گزرا ہے کوئی دیوانہ آج
تیرے ملنے کی خوشی اور اپنے کھوجانے کا غم — بھر رہا ہے دو طرح دل ایک ہی پیمانہ آج
میکدے پر جھوم کر آیا جو ہے ابرِ بہار — شیشہ و خم تک نہ کیوں پہنچے خطِ پیمانہ آج
ایگاں ثابت ہوا آخر نہ جانبازی کا شوق — شمع کی لَو بڑھ رہی ہے جانبِ پروانہ آج
میکدہ تیرا سلامت، میکشوں کی تیرے خیر — میرے ساقی توڑ دے پابندیٔ پیمانہ آج
میکشوں کے واسطے ساقی کا اذنِ عام ہے — اور بڑھ جائے الٰہی وسعتِ میخانہ آج
ہوش تو دیکھو کہ ساقی ہی کے قدموں پر گرا — کس قدر سلجھی ہوئی تھی میری لغزشِ مستانہ آج
میکشی کا لُطف کچھ دورِ مسلسل ہی میں ہے — شیشۂ مے سے جُدا ساقی نہ ہو پیمانہ آج
تشنہ کامی رنگ لائیگی مری ساقی ضرور — خُم سے حسرت بھر کے نکلے گا ترا پیمانہ آج
گریۂ رنگیں ہے میری داستانِ درد استاں — کہہ رہا ہے اشک کا ہر قطرہ اک افسانہ آج
یہ ہجومِ میکشاں، جامِ مسلسل کا یہ دَور — محتسب آکر کرے اندازۂ میخانہ آج
یہ کمالِ آرزو یہ انتہائے جذبِ شوق — شمع کو لے کر نہ اُڑ جائے کہیں پروانہ آج
چارہ سازی سے بدل جائے نہ رنگِ زندگی — بے نیازِ راحت و غم ہے دلِ دیوانہ آج
دو طرف سے رُونما ہے ایک ہی رنگِ کشش — دل ہوا جاتا ہے صرفِ کعبہ و بتخانہ آج

داغِ دل میں وہ ضیا وہ نُور اب باقی نہیں
گُل ہوا جاتا ہے کیوں ہادی چراغِ خانہ آج

ہادی مچھلی شہری

جنگ کی پیش خبری

کیرو کا تاریخی افسانہ

ترجمہ:۔ جناب جمیل احمد کندھاپوری ایم۔اے

اگست ۱۹۱۴ء میں جب پر امن دنیا کے اُفق پر جنگ عظیم کے بادل چھا گئے اور توپوں اور بندوقوں کی گرج کانوں میں گونجنے لگی تو بظاہر یوں معلوم ہوا جیسے دنیا اس کے لئے تیار نہ تھی اور کسی کو اس کا گمان تک نہ تھا کہ اس قدر جلد دنیا میں خون کی ہولی کھیلی جانے والی ہے ——— مگر اس امر کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ اس ناگہانی آفت کے آنے سے بہت پہلے ان لوگوں نے جو اس دنیا سے منہ موڑ چکے تھے اور جنہوں نے اپنی زندگی میں یہاں کے معاملات کے انصرام میں نمایاں حصہ لیا تھا عنقریب پیش آنے والے خطرات سے دنیا والوں کو متنبہ کر دیا تھا ——— آغاز جنگ سے پیشتر انھوں نے اس دنیا کے باشندوں کو آنے والی تباہی اور خونریزی سے متنبہ کرنے کی بہت زیادہ کوشش کی تھی۔ میں اس امر کے ثبوت کے لئے اس جگہ وہ واقعہ درج کرتا ہوں جو وی آنا میں مجھے پیش آیا۔ یہ آنے والے اہم واقعات کی کھلی کھلی اطلاع تھی۔ اگرچہ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ان اطلاعات کی اہمیت کا احساس اس وقت تک خود مجھے نہ ہو سکا جب تک توپوں کی گرج دنیا میں سچ مچ گونجنا شروع نہ ہو گئی۔

۱۹۱۳ء کے اوائل میں میں وی آنا میں تھا۔ میں ایک ایجاد و اختراع کے سلسلہ میں بلایا گیا تھا جسے میں ان دنوں مکمل کر رہا تھا۔

پچھلی مرتبہ جب میں لندن میں تھا تو میرے قابل قدر دوست کاونٹ وان ہان برگ Count von Holtzberg مجھ سے ملنے آئے تھے جو جرمنی کے طبقہ امراء کے رکن اور بین الاقوامی امن کے مخلص حامی تھے انھیں علوم مخفیہ سے خاص شغف تھا اور فوق الفطرت باتوں میں بہت دلچسپی

... سے وہ

... دی ... شہزادی ... کی ... اول

... تھی گرچہ وہ اس ... اور حل کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے

... تھی کہ اس زمانے میں واقعی ایسی باتیں لوگو معلوم ہوتی تھیں۔

جب کاونٹ کو یہ معلوم ہوا کہ میں وہی آنا چاہتا ہوں تو انھوں نے

... درخواست کی کہ میں ان شہزادی زنیسکی (ZinisKy) ...

... ایک پراسرار نسل کی خاتون تھی اور ان دنوں وہی تنہا

... میں اسے غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل تھا۔

اس خاتون ... کہ مرحوم شہنشاہ نکولا کے والد کی نسل سے

... کا دعوی کیا تھا۔ مگر اس کا یہ دعوی روسی دولت سرا نے قبول نہ کیا

اس وجہ سے اب اس نے وہاں اقامت اختیار کر لی تھی۔ پیرو گراڈ

... میں وہ زیادہ تر مشہور پراسرار راہب ہیلیوڈر کے

... تھی، جس سے ایک بار خود میں بھی پیرو گراڈ میں مل چکا تھا۔ شہزادی

... کے توسط سے علوم مخفیہ کی مبادیات سے واقفیت حاصل

... تھا

خاص ... بلکہ وہ ایک ...

عجیب ... کے تعلقات دو لفظوں وہی کا نام ...

سے کیا ...

لہذا جب وہی آنا پہنچا تو مجھے اس خاتون سے ...

کی ملاقات ... پولستان ... ایک

عالیشان عمارت میں تھی جس کی عمر کئی سو سال ہوگی

شہزادی زنیسکی کو میں نے بہت زیادہ حسین ...

بہت پرمعنی تھا۔ اس نے میرا خیر مقدم بہت ... کمرے

نہایت وسیع مگر پست کمرے میں جہاں کسی گوشے ...

تھا۔ روشنی کا انتظام چاندی کے ایک چھوٹے سے لیمپ سے ...

ایک صوفے پر بہت سے قرمزی تکیوں کے سہارے لیٹی تھی۔ اس ...

کے جسم پر سبز رنگ کی پوشاک تھی جس پر سنہری ستارے ...

خوب چمک رہے تھے۔

بید کی ایک ٹوکری اس کے قریب ہی تپائی پر ...

دیکھا ٹوکری کا ڈھکنا کبھی کبھی کچھ اوپر اٹھتا اور ...

آگے کو نکلتا اور پھر اندر ہو جاتا۔

"ہاں ہاں" اس نے نہایت شستہ انگریزی میں ...

جیسا کہ اس کی بات سے بعد میں معلوم ہوا وہ کافی عرصہ لندن میں ...

چکی تھی۔ "میں دیکھتی ہوں یقیناً ... آپ کو سلام ...

اتنا کہہ کر اس نے پرندے جیسی ایک انوکھی آواز بلند کی۔ ...

عمل کو کئی بار دہرایا۔ اس کے بعد ایک بڑا سانپ اس ٹوکری میں سے

نکل آیا اور ایک عجیب انداز سے اپنے سر کو جنبش دینے لگا۔ ...

آہستہ وہ بل کھاتا ہوا شہزادی کے قریب آیا اور اپنے جسم کو ...

گیا۔ یہ ایک بہت بڑا ہندوستانی ناگ تھا۔

"یقیناً میرا یار غار ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "یہ حکمت ودانائی

... دیوتا راست کا اوتار ہے جو بنارس میں رہتا تھا۔ جب میں

ہندوستان گئی تھی تو وہیں ایک فقیر نے یہ سانپ مجھے دیا تھا۔ ...

جس سے میں پہلی واقف تھی۔"

اس گفتگو کے دوران میں ... نے اپنی خوفناک گردن ...

اور آہستہ آہستہ اپنی مخصوص آواز میں ... لگا۔ جیسے وہ

... کے ساتھ اپنے سر کو جنبش دے رہا تھا۔

... دلچسپ تھی۔ اس نے مجھے بتایا ...

تگیز طور پر راسپوٹین نے زار اور زارینہ پر قبضہ کر لیا تھا ـــ اور اُن
وق الفطرت مجلسوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جو ونٹر پیلیس" (سرمائی محل)
بں منعقد کی گئیں ۔ اور جن میں سے ایک میں پطرس کی روح نمودار ہوئی
ور زار کو اس کی عنقریب پیش آنے والی تباہی سے متنبہ کیا ۔

اس سلسلے میں ہم پیش آگاہی کے علم کے متعلق آپس میں باتیں کرنے لگے
یکایک شہزادی نے کہا ۔

"کیرو ! اگر آپ کو ان باتوں سے اتنی زیادہ دلچسپی ہے جیسا کہ مجھے آپ
ی باتوں سے محسوس ہو رہا ہے ' اور اگر آپ اپنے سینے میں قوی دل رکھتے ہیں
و کل شام کو آپ میرے ساتھ سینٹ سٹیفن کے بڑے گرجا میں چلیں ۔ وہاں
یں روحوں کا ایک تجربہ کر رہی ہوں ۔ اس کا میں آپ کو یقین دلاتی ہوں
ہ یہ تجربہ عام فرسودہ تجربوں سے بہت مختلف ہوگا ! مگر خیر ' آپ تو
یقیناً ان چیزوں کے عادی ہیں ۔"

مجھے اعتراف ہے کہ اس تجویز میں مجھے کشش محسوس ہوئی ۔ اگرچہ میں
س وقت اپنے دل میں یہ سمجھ رہا تھا کہ شہزادی اپنی صلاحیتوں کی مبالغہ آمیز
تعریف کر رہی ہے ۔ بہرحال غروب آفتاب کے بعد ہم سینٹ سٹیفن کے گرجا
طرف روانہ ہوئے ۔

میری دوست شہزادی نے بتایا کہ ہم اس وقت مُردوں کے رکھنے کے
تہ خانوں میں جا رہے تھے ۔ جو قرون وسطیٰ کی اس عجوبہ صنعت عمارت کی
ایک امتیازی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں ۔ اور یہ کہ اس مقبرہ میں داخل ہونے کا
وہ ارادہ کرتی تھی جس کے اندر سادائے کے نامور شہزادہ یوگین اور ہیپسبرگ
خاندان کے بہت سے متوفی ارکان کی قبریں تھیں ۔

"مگر یقیناً شہزادی ۔" میں نے کہا ۔ "آپ مقبرہ کے معبد میں ہرگز داخل
نہیں ہو سکتیں ۔ یقیناً اس کی نگہبانی کامل طور پر ہوتی ہوگی اور علاوہ ازیں ۔"

شہزادی نے ایک قہقہہ بلند کیا اور اپنے دستی بیگ میں سے ایک
چھوٹی سی عجیب و غریب چابی نکالی ۔

"میرے عزیز کیرو !" اس نے کہا ۔ "چونکہ آپ علوم مخفیہ سے اچھی طرح
واقفیت رکھتے ہیں ' اس لئے آپ جانتے ہوں گے کہ اس پیشہ والوں کو
بہت سے مددگار احباب میسر آ جاتے ہیں ۔ خوش نصیبی سے مجھے بیرن سٹینٹ
(جو بعد کو بدقسمت شہنشاہ کارل کے لارڈ چیمبرلین مقرر ہوئے) سے بعض
باتیں کہنے کا موقع ملا اور مجھے مُردوں کے رکھنے کے ان تہ خانوں اور دوسرے
مقبروں کے اندر جانے کی اجازت حاصل ہے ۔"

"ان کے علاوہ ! ـــ اس نے پھر پراسرار انداز میں کہا ۔ "ایک پوشیدہ
غلام گردش مُردوں کے تہ خانوں سے ہو فبرگ امپیریل پیلیس تک گیا ہے '
جو گرجا کے جنوب مغرب میں واقع ہے ۔ قصر شاہی کے بعض ارکان علوم
کے بہت شائق ہیں اور مجھے علم ملبشین میں اپنا آرٹ دکھانے کا موقع ملا ہے ۔"

اس طرح باتیں کرتے ہوئے ہم آخر کار ان لاتعداد مخفی دروازوں
میں سے ایک کے سامنے پہنچ گئے ۔ جن میں سے ہو کر پُرپیچ تہ خانوں تک پہنچنے
کی راہ بنی ہوئی ہے ۔ ان میں سے ایک کو اس کے ایک دوسری چابی سے
کھول دیا ۔ جو اس کے ہاتھ میں تھی اور ایک برقی مشعل کی مدد سے ہم تنگ و تاریک
غلام گردشوں میں سے گزرتے گئے جن کے دونوں طرف الماریوں میں تابوت
رکھے ہوئے تھے ۔ سچ مچ اس سے زیادہ بھیانک مقام میں نے اب تک اپنی
زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا ۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک دیو قامت آہنی دروازہ کے
سامنے پہنچ کر رک گئے ! ور یہ بھی ایک چابی سے کھل گیا ۔ جو شہزادی کے
ہاتھ میں تھی ۔ اس میں سے گذر کر ہم جلد اس مقبرہ میں پہنچ گئے جو ۱۳ ۱۵ء میں
جلیل القدر شہنشاہ فریڈرک سوم کی لاش کے لئے بنایا گیا تھا اور اس کے
بعد سادائے کے نامور شہزادہ یوگین کا معبد مقبرہ تھا ۔

مُردوں کی اس سرزمین پر ایک عجیب پراسرار سکوت طاری تھا '
شہزادی کی زندہ دلی اور چہل پہل رخصت ہو گئی ۔ نہ جانے کیوں وہ کچھ

دیر تک کسی خیال میں غرق رہی۔ پھر اپنے بیگ میں سے ایک موم بتی نکالی اور اسے روشن کرکے ایک گمز و بخی پر رکھدیا جس سے خانۂ گرجا میں روشنی پھیل گئی۔ یا یوں سمجھئے کہ اس کی کمزور شعاعوں کے باعث تاریکی اور بھی زیادہ شدت سے محسوس ہونے لگی۔

"آپ جانتے ہیں کیرو!" اس نے اپنے ادھیڑپن سے چونک کر کہا۔ "کہ آسٹریا کی مقتول ملکہ الزبتھ کو (جو جنیوا میں ۱۸۹۷ء میں دشمنوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دی گئی تھی) اس کا یقین تھا کہ وہ شہزادہ یوگین کی شریک حیات کی روح ہے جس نے اب نیا جسم حاصل کر لیا ہے اور پیشتر ازیں کہ وہ کیپوچن گرجا کے مقبرے کے تہ خانے میں دفن کی جائے، ایک عجیب خواہش کے بموجب جس کا اظہار اس کی وصیت میں کیا گیا تھا، اس کی لاش چند دنوں کے لئے اس جگہ بھی لاکر رکھی گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں اکثر کہا کرتی تھی کہ اس کی روح اس جگہ منڈلایا کریگی۔"

اتنا کہہ کر وہ پھر خاموش ہوگئی۔ میں اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو بیرت استعجاب سے دیکھ رہا تھا۔ پراسرار قدیم عمارت، سنہرے کٹہرے، مُردوں کے ڈھال جن پر ہتھیاروں کی تصویریں بنی تھیں اور سڑے ہوئے جھنڈے۔

دفعتہً شہزادی نے سکوت کے طلسم کو توڑا ۔۔۔۔

"کیرو! کیا آپ کو یقین ہے کہ مُردوں کو ہم پھر اس سرزمین آب و گل میں کچھ دیر کے لئے بلا سکتے ہیں؟"

پیشتر ازیں کہ میں اُسے جواب دیتا اس کی آنکھوں نے ایک عجیب پراسرار انداز اختیار کر لیا۔ اور فضائے بسیط کو گھورنا شروع کر دیا۔ آہستہ سے اس نے اپنے دراز بازوؤں کو اٹھایا۔ پھر اپنے ہاتھ اس طرح پھیلائے جیسے وہ کوئی التجا کر رہی ہے۔

"لب کشا ہو اے روح!" اس نے بلند آواز میں کہا۔ "لب کشا ہو مستقبل کے سربستہ راز ان لوگوں پر آشکار اکر جو ابھی بقید حیات ہیں۔"

اسی وقت دروازے پر مسلسل چار مرتبہ دستک ہوئی ۔۔۔ لوہے کے اس بھاری بھرکم دروازے پر جو اس مقبرہ کو ایک دوسرے شاہی مقبرے سے جدا کرتا تھا۔

میں نے اس وقت اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھنے کی بے انتہا کوشش کی ۔۔۔ پھر بھی مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اس وقت ایک بھیانک خوف افزا احساس میرے دل و دماغ پر مسلط ہو گیا۔ گرد و پیش کا ماحول حد درجہ دہشتناک تھا ۔۔۔ اور پھر چند ہی لمحوں میں میں نے دیکھا کہ بادل جیسی کوئی چیز دروازے کے سامنے رونما ہوئی۔ فضا میں تیرتی ہوئی یہ آگے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے آہستہ آہستہ آخر ایک عورت کی شکل اختیار کر لی۔ چند ہی لمحوں میں یہ ہم سے بہت زیادہ قریب ہو گئی۔

شہزادی اس وقت اپنے گھٹنوں کے بل ایستادہ تھی ۔۔۔!

"یہ تو ملکہ ہیں!" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "آسٹریا کی جلیل القدر ملکہ الزبتھ"

اب تک یہ پیکر مجھ سے بہت قریب آچکا تھا۔ اور مجھ سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر سامنے کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا یہ پیکر ایک عورت کا تھا، خوبصورت اور بارعب جس سے شاہانہ وقار ٹپکتا تھا۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھی اور اس کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا صلیب تھا۔

ہم ابھی حیرت و استعجاب سے اس پیکر کو گھور ہی رہے تھے کہ ایک آواز خانہ گرجا میں پیدا ہوئی۔ یہ بلند تھی اور صاف اور اس مقام میں گونج رہی تھی۔

"صدمہ! ۔۔۔ صدموں کا صدمہ ... کیا کسی نے مجھ جیسا صدمہ بھی برداشت کیا ہے؛ ہائے! ماں کا خونچکاں سینہ، جس کو موت کے بیرحم تیر نے گھائل کر دیا۔"

دفعتہً میرا ذہن آسٹریا کی ملکہ الزبتھ کے صدمۂ عظیم کی طرف منتقل ہو گیا اور مجھے یاد آ گیا کہ اس کا لڑکا روڈولف، آسٹریا ہنگری کا ولیعہد ایک ناگہانی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ اور اس کی لاش پہلے اسی گرجا میں رکھی گئی تھی۔

آواز پھر یوں آنے لگی ۔۔۔!

"مصیبت دُنیا پر نازل ہو رہی ہے ... مصیبت ماؤں پر آ رہی ہے انھیں دھاڑیں مار مار کر رونا ہوگا ۔۔۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈیگا۔ بہت جلد وہ وقت آ رہا ہے جب دنیا میں خون کی ہولی کھیلی جائیگی اور قومیں ایک دوسرے کے خلاف مصروف پیکار ہو جائیںگی۔ خاندان ہیپسبرگ کا زوال ہوگا ۔۔۔ اور اس کی تباہی لوگوں کو درس عبرت دیگی۔"

آہستہ آہستہ وہ سایہ دھندلا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ہماری نظروں سے بالکل غائب ہو گیا۔ اس وقت میرے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی کیونکہ مقبرے کا تہ خانہ حیرت انگیز طور پر بھیانک اور دہشتناک معلوم ہو رہا تھا ۔۔۔ شہزادی اپنے گھٹنوں کے بل استادہ رہی۔ کبھی کبھی اس کے لبوں سے سسکی سی نکل جاتی اس کے بعد اپنا سر اٹھا کر اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا ملکہ کی باتوں کا مطلب جنگ تو نہیں؟ مگر آخر کس کے خلاف؟"

ہم پھر یہ لب خانہ گرجا میں سے باہر نکلے اور مُردوں کے رکھنے کے اداس اور بے رونق تہ خانوں میں سے گزرنے لگے۔

اس وقت ہر چہار طرف فنا پذیری کے آثار پھیلے ہوئے تھے اور میرے دماغ کے ہر ہر گوشے میں روح کی یہ پیشین گوئی گونج رہی تھی "بہت جلد دنیا میں خون کی ہولی کھیلی جائیگی ۔ اور قومیں آپس میں مصروف پیکار ہو جائینگی"

راستہ طے کرکے جب ہم شہزادی کی اقامت گاہ میں پہنچے تو بیٹھ کر ہم دونوں نے ہونے والی باتوں کا حساب لگایا اور فوراً ظاہر ہوگیا کہ ۱۹۱۴ء میں کوئی بہت بڑی جنگ شروع ہوجائیگی۔

میں اس سچی کہانی کے اس حصے کو اس حیرت انگیز واقعے کا ذکر کئے بغیر ہرگز ختم نہیں کرسکتا جو شہزادی کی المناک موت کے ساتھ وابستہ ہے۔

جب میں شہزادی زلیکی سے رخصت ہونے لگا تو اس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملاکر عجیب پراسرار انداز میں کہا ــــ "بہت ممکن ہے ہماری یہ ملاقات بالکل آخری ہو کیونکہ شاید میری موت کو زیادہ عرصہ باقی نہیں۔ مگر جب کبھی یہ واقع ہوگی تو اپنی طرف سے میں تمھارے سامنے ایک ایسی دلیل پیش کردونگی جسے تم غلط نہ سمجھ سکوگے۔"

اس کے بعد میں اس سے رخصت ہوا اور لندن چلا آیا۔ کئی سال گذر گئے نومبر ۱۹۱۶ء کی ایک رات میں اپنے گھر میں بیٹھا فسوں گری کے موضوع پر ایک پرانی کتاب پڑھ رہا تھا جسے ایک قدیم غیب داں نے سپرد قلم کیا تھا۔ بہت دیر تک پڑھتے رہنے کے بعد میں نے کتاب بند کرکے سامنے کی میز پر رکھدی اور یونہی غیرارادی طور پر اپنی نظریں آتشدان پر جمادیں اور جلتے ہوئے سرخ ایندھن کا تماشہ دیکھنے لگا۔

چند ہی سکنڈ بعد مجھے دفعتہً یوں نظر آنے لگا جیسے انگیٹھی کے دہکتے ہوئے انگاروں میں سے کوئی سانپ باہر نکل رہا ہے۔ اس کی درخشاں کھال روشنی میں خوب چمک رہی تھی۔ حیرت سے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ آگ میں سے نکلا اور جس جگہ میں بیٹھا تھا وہاں آتا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ خوفناک جانور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھتا آرہا تھا۔ اور میں اپنی نظریں اس کی طرف جمائے تھا۔ ٹھیک میری کرسی کے سامنے آکر وہ ٹھہر گیا۔ اور اپنی گردن بلند کرلی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس کے سر کے دونوں جانب خوب چمک رہی تھیں۔

میرے ذہن میں فوراً خیال آیا ــــ یقیناً شہزادی زلیکی کا عزیز سانپ! ــــ کیا یہی اس کی موت کی دلیل تو نہیں؟"

وہ مجھ سے اور بھی قریب ہوگیا۔ اس کے بعد دھندلکے میں سے شہزادی زلیکی کی شکل ابھری ــــ پریشان' مضطرب اور مجنونانہ۔ میں خوف سے چیخ اٹھا ــــ طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ میرے ہوش وحواس اس وقت مجتمع ہوئے جب میں نے دیکھا کہ آتشدان کی آگ بجھ چکی ہے اور رات کی تاریکی دن کے اجالے سے بدل گئی ہے ــــ یہ واقعہ اس قدر موثر تھا کہ میں نے اسی وقت اسی جگہ اپنے روزنامچہ میں اس کو درج کرلیا۔

کچھ دنوں بعد مجھے کاونٹ وان ہان برگ کا ایک خط موصول ہوا۔ انھوں نے لکھا تھا: "ابھی ابھی مجھے خبر ملی ہے کہ شہزادی زلیکی نے لوڈا پسٹ میں خودکو نشانہ پستول بناکر خودکشی کرلی۔ مگر مرنے سے پہلے اس نے اپنے عزیز سانپ کو ہلاک کردیا۔"

جنگ عظیم کے شروع ہونے سے ایک سال پیشتر مجھے لندن میں کاونٹ وان برگ کی معیت میں ایک "مجلس" میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ ان کے بہت سے احباب جو اس دنیائے آب وگل سے منہ موڑ کر بالائی سرزمین میں جاچکے تھے آئے اور ان سے باتیں کیں۔ ان میں ایک بوڑھا جرمن پروفیسر بھی تھا جسے کاؤنٹ نے فوراً پہچان لیا۔ کیونکہ بچپن میں وہ اس پروفیسر کے شاگرد رہ چکے تھے۔ اس بوڑھے پروفیسر نے نہایت، واضح طور پر مگر لرزتی ہوئی آواز میں' جیسے فرط جوش سے اس کی زبان لرز رہی تھی کاونٹ وان برگ سے درخواست کی کہ وہ اپنی تمام جائداد فروخت کرکے جلد سے جلد انگلستان سے روانہ ہوجائے۔

"میں یہ پاگل پن نہیں کرسکتا" کاونٹ نے جواب دیا "میں انگلستان میں رہنا چاہتا ہوں، میری طبیعت اس ملک سے ابھی سیر نہیں ہوئی۔ آخر ایسی باتوں سے آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم میری بات مانو" پروفیسر نے جواب

ا" اب وقت زیادہ نہیں۔ تمھیں جلد سے جلد اس ملک سے نکل جانا چاہیے
ب سال کے اندر ہی اندر انگلستان، جرمنی اور آسٹریا کے درمیان جنگ
جائے گی"۔

"کیا مہمل بات ہے" کاونٹ نے جواب دیا "ایسی جنگ ہرگز
ن نہیں۔ میرے بوڑھے استاد۔ شاید مرنے کے بعد بھی آپ کے دل سے
لستان کے خلاف تعصب دور نہیں ہوا۔ جرمنی اور آسٹریا کے موجودہ باشندے
ل نہیں ہیں کہ ایسی جنگ کے خواب دیکھیں"۔

فرط جوش سے مغلوب ہو کر روح نے پھر جواب دیا۔ "جنھیں خدا مٹانا چاہتا
ہے، برباد کرنا چاہتا ہے۔ سب سے پہلے وہی پاگل بن جاتے ہیں، میرے بچے!
غلط نہیں کہہ رہا۔ جرمنی اور آسٹریا اپنے پاگل پن سے واقعی ایسی حرکت
بیٹھیں گے۔ میں چند اور باتیں بتائے دیتا ہوں۔ شروع میں وہ فتحیاب
تے نظر آئیں گے۔ وہ اپنے دشمن پر ہر جگہ بھاری ہوتے دکھائی دیں گے، مگر
بھی پانسہ پلٹ جائے گا۔ انھیں شکست کا منہ دیکھنا ہوگا۔ وہ
ال ہو جائیں گے اور انھیں دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا ہونا پڑیگا —
— یہ ایک طویل جنگ ہوگی، اور اس کے اختتام پر جو صلح ہوگی، وہ
گ سے بدتر ہوگی"۔

کاونٹ وان وان برگ نے روح کی ان باتوں کی طرف توجہ نہ دی۔ ان کے کانوں پر مطلق جوں نہ رینگی۔ وہ انگلستان میں ڈٹے رہے۔ تاآنکہ کچھ ہی عرصہ بعد جنگ کے ہولناک بادل سر پر چھا گئے۔ اور بھاگنے کا موقع نہ رہا۔ جنگ شروع ہوتے ہی جرمنوں کی جو پہلی جماعت نظر بند کی گئی اس میں کاونٹ وان برگ بھی تھے۔

روحوں کی طرف سے اس دنیا والوں کو دو اطلاعات دی گئیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا — مگر ان کے علاوہ ایک تیسری اطلاع بھی دی گئی البتہ اس میں شک نہیں، اس کا تعلق خاص میری ذات سے تھا۔

پنجشنبہ اگست ۱۹۱۳ء کو میں نے اپنے گھر میں ایک مجلس منعقد کی۔ میں ان دنوں اپنے لائحہ عمل کے متعلق بہت سے منصوبے بنا رہا تھا اور میرا ذہن اس وقت ان تجاویز سے پُر تھا۔ دفعتًا ایک روح جو اس سے پیشتر بھی کئی مرتبہ کئی موقعوں پر مجھ سے ہمکلام ہو چکی تھی نمودار ہوئی اور پر زور انداز میں کہا — "تم اپنے منصوبوں کو جامہ عمل نہ پہنا سکو گے — بہت جلد انگلستان اور سارے یورپ میں ایک خوفناک جنگ کا آغاز ہو رہا ہے ۱۹۱۴ء کے کسی نہ کسی مہینہ میں یہ شروع ہو جائے گی — مگر ابھی سے اس کے لئے تیار ہو جاؤ"۔

میں نے یقین نہیں کیا۔ اور اپنے منصوبوں کے مطابق کام کرتا رہا یہاں تک کہ ایک سال بعد جنگ چھڑ گئی اور تمام کام درہم برہم ہو گئے۔

نقد و نظر

سرگزشت غالب

مولفہ: میرزا محمد بشیر ایم-اے بی-ٹی لیکچرار ایم-ایس-جے کالج بھرتپور
اسٹیٹ ۲۰×۳۰/۱۶ ۹۶ صفحات قیمت درج نہیں حضرت مصنف سے طلب کیجئے
یہ میرزا غالب کی داستان حیات ہے جس کا ماخذ خود انہی کے خطوط دیوان
ہیں۔ فاضل مصنف نے مکتوبات غالب میں جہاں ان کی داستان زندگی کا
کوئی ٹکڑا دیکھا اسے اٹھا لیا اور جب تمام ٹکڑے مہیا ہو گئے تو انہی کی تنظیم
سے یہ کتاب مرتب کی گئی۔ جو اپنی نوعیت و خصوصیت کے اعتبار سے "غالبیات"
میں بیش بہا اضافے کا باعث ہے۔ اس کے مطالعہ سے غالب کی کہانی انہی
کی زبانی سنی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں زمانہ غالب کے سیاسی و علمی پہلو بھی
معلومات کی روشنی میں نظر آسکتے ہیں۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن اختصار سے
جامعیت کا پہلو اس درجہ نمایاں ہے کہ اس کے مقابلے میں ضخیم و جسیم کتابیں بھی
نہیں لائی جا سکتیں۔ (ل-ل)

قدسی

از حضرت نفیس خلیلی ناشر تاج کمپنی لمیٹڈ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ۱۰۸ صفحات ۱۲ار
حضرت نفیس خلیلی ان ترقی پسند شعرا میں سے ہیں جو اصلاح و بیداری
کا پیغام تیر و نشتر کی زبان سے دیتے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی
ہے جس میں نفیس نے فخر موجودات حضور سرور دو عالم صلعم کی ابتدائی زندگی
کا عالم افروز جلوہ نکش نظم کے آئینے میں دکھایا ہے لیکن واقعہ نگاری کے
ساتھ ساتھ ملت خفتہ کے پہلو میں میٹھی میٹھی چٹکیاں لے کر اسے جگانے کی
بھی کوشش کی گئی ہے۔ انداز بیان شاعرانہ نکتہ آفرینیوں سے
معمور ہے اور صاف و سادہ الفاظ کے کوزے میں عبرت و بصیرت اور فصاحت و
بلاغت کا دریا بند کر کے دکھایا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب بہت زیادہ مقبول
ہوگی تاج کمپنی اس کی اشاعت پر مستحق تحسین ہے۔ (و-ق)

نئی راہیں

مرتبہ قمر تسکین ناظم حلقۂ احباب ترقی پسند موہنی روڈ لاہور

جدید مطبوعات

از:— ادارہ

تقطیع ۲۲×۲۹/۱۶ ۱۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ
یہ ملک کے مقتدر ادیبوں کے ۱۵- افسانوں کا مجموعہ ہے۔
افسانہ نگاروں میں اختر اورینوی- راجندر سنگھ بیدی- احمد ندیم
میرزا ادیب- علی عباس حسینی، اشفاق بی کام، مدن شن- جمیل احمد
اور کرشن چندر ایسے پختہ مشق ادیب بھی شامل ہیں- افسانوں کے
انتخاب میں بلند معیار کا دامن نہیں چھوڑا گیا- اس لئے یہ
مجموعہ مقبولیت و حوصلہ افزائی کا مستحق ہے- کیونکہ اس کے مطالعہ
سے ۱۵- افسانہ نگاروں کے اسلوب نگارش اور سحر طرازی کا
اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کتاب "محترم عنایت اللہ ٹھیکیدار مجھلی"
سے معنون ہے۔ راقم حروف انتہائی غور و فکر کے باوجود اس معمے
کو حل نہیں کر سکا کہ فن افسانہ نگاری کی ترقی و توسیع میں ماہی فروشانہ
ٹھیکیداری کو کتنا دخل ہے۔ (ل-ل)

شعر و شاعری

(علم معانی)

از سید محمد بدیع الزماں ایڈووکیٹ جائسی۔
تقطیع ۲۲×۲۲/۸ ۱۰۶ صفحات- قیمت عہ
ملنے کا پتہ:- دفتر ماہنامہ "خیابان" الہ آباد
علم معانی اس زمانے کی دولت محفوظ ہے جب نظم و نثر
کا دامن لفظی و معنوی رعایتوں اور نکتہ آفرینیوں سے معمور
ہوتا تھا لیکن جو لوگ ادب و زبان کو علمی بلندی پر دیکھنا چاہتے
ہیں ان کے لئے آج بھی اس علم و فن کی ضرورت ہے۔ فاضل
مصنف کی محنت و قابلیت سے انکار نہیں ہو سکتا انہوں
نے علم معانی کے پیچیدہ اور دقیق از فہم نکات و رموز
کو بھی عام فہم اور دلنشیں پیرائے میں سمجھانے کی
کامیاب کوشش کی ہے۔ دلدادگان ادب کو اس کتاب سے
مستفید ہونا چاہئے۔ (و-ق)

پیغام رسول

مصنفہ:۔ سید شفاء احمد ٹیکنیکل انجینیر سب ڈویزنل افیسر
ضخامت:۔ ۱۲۸ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ:۔ رضا کمال بکڈپو۔ فاروق گنج۔ لاہور

فلسفہ و منطق اور طریقت و تصوف کے مباحث محض فروعی ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل چیز ذات باری کی صفات حسنہ نجذاب کاملہ ہے جو قرآن حکیم کی تعلیمات پر غور کرنے کے بعد انسان حاصل ہوتا ہے اور یہی وہ کلید ہے جس کی مدد سے مسائل دینیہ کے تمام ایک لحظہ کھل سکتے ہیں —— یہ ہے وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے د سید شفاء احمد صاحب کی یہ قابل قدر تصنیف گھومتی ہے۔ فاضل مصنف یال ہے کہ انسانی عقل اور حقیقت کبریٰ کے درمیان متعدد پردے ل ہیں جن کو دور کرنے کے لئے نفس و وجدان کے دروازے کو کھٹکھٹانے ضرورت ہے اور یہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا خلاصہ ہ مصنف نے ان تمام بیہودہ مسائل اور بے معنی رسوم کے خلاف آواز دکی ہے جن کی ظلمت نے اسلام کے منور چہرے کو چھپا رکھا ہے۔ سید صاحب استدلال میں دردمندی۔ خلوص۔ اور نیک نفسی کی جھلک ہے لئے تعلیم یافتہ طبقہ کو خصوصاً ان کے خیالات و افکار کا ژرف نظری ے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ (ع۔ش)

عربی بول چال (دو حصے)

مولفہ:۔ حافظ عبدالرحمٰن امرتسری ضخامت ۱۸×۲۲/۸ ایکسو صفحات
ت ۱۲ر ملنے کا پتہ:۔ ملک سراج دین اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

حافظ عبدالرحمٰن امرتسری کو علوم عربیہ پر جو قدرت اور دسترس حاصل وہ محتاج بیان نہیں۔ "عربی بول چال" آپکی تصانیف میں امتیازی درجہ

کی مستحق ہے اس کا ۲۳واں ایڈیشن ہمارے سامنے ہے اس میں فاضل مولف نے اپنے وسیع تجربات کی روشنی میں ترمیم و اضافہ کر دیا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ ایک فرہنگ پر مشتمل ہے جس میں انگریزی کی تقریباً بارہ سو جدید اصطلاحات کے عربی مرادفات درج کئے گئے ہیں۔ یہ حصہ اخبار نویسوں، مترجموں اور مصنفوں کے لئے علی الخصوص مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ کاغذ کی حوصلہ شکن گرانی کے باوجود قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔ (ع۔ش)

کتاب الصرف

مولفہ حافظ عبدالرحمٰن امرتسری ضخامت ۱۸×۲۲/۸ ۱۳۶ صفحات
قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ ملک سراج الدین اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

یہ عربی زبان کے علم الصرف پر ایک جامع و مانع کتاب ہے جس کا ۲۳واں ایڈیشن اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ فاضل مولف نے اپنے زور قلم سے عربی زبان کی گرامر کے تمام گوشوں کو بہت زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ مبتدی اس سے بآسانی استفادہ کر سکیں گے۔ اسباق و امثال کی ترتیب و تدوین لائق داد ہے۔ عربی کے طلبہ کو اس کتابچے کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے (ع۔ش)

کتاب النحو

مولفہ:۔ حافظ عبدالرحمٰن امرتسری ضخامت ۱۸×۲۲/۸ ۸۸ صفحات
قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ ملک سراج الدین اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

صرف کے ساتھ نحو سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا کتاب الصرف کے دوسرے حصہ "کتاب النحو" کا مطالعہ بہت زیادہ استفادے کا مستحق ہے۔ سبقوں کی تقسیم اور امثلہ مشقی کا التزام کتاب الصرف کے مطابق ہے۔ (ع۔ش)

مریضانِ چشم کیلئے دورِ حاضرہ کی قابلِ فخر ایجاد

پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ

سوائے پیدائشی اندھے کے آنکھوں کی تمام بیماریاں مثلاً موتیابند ہر قسم کا لاموتیابند چیچک سے ضائع آنکھیں۔ آنکھ کا بیٹھ جانا۔ ٹینٹ (آنکھ کا ڈھیلا باہر نکل آنا) پتلی کا پھٹ جانا۔ آنکھ کا چوٹ سے ضائع ہونا۔ ناخونہ۔ جالا۔ پھولا۔ ککرے۔ پڑبال۔ ہائی مایوپیا و مایوپیا ہر قسم۔ آنکھ کی خارش۔ آنکھ کی دھند۔ رتوند (رات کو نظر نہ آنا۔ دن اندھا (دن کو نظر نہ آنا) عینک لگانے کی عادت۔ ڈھلکا گھیری۔ آنکھوں سے پانی بہنا۔ کالی پتلی کا ورم۔ آنکھ کا دکھنا۔ سفید جگہ کا ورم۔ پتلی کا سکڑ جانا یا پھیل جانا وغیرہ وغیرہ کے لئے اکسیر ہے عرصہ پندرہ برس سے اپنی غیر فانی شہرت کے لحاظ سے دنیا بھر سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے۔ ذائد از 375000 آنکھوں کے لاعلاج مریض جن کو آنکھوں کے ماہر ترین معالجوں نے لاعلاج قرار دیا تھا اس اکسیر کے استعمال سے مکمل طور پر شفا پا چکے ہیں۔

ہمارے مریضوں میں سے وصول شدہ ہزاروں قابلِ اعتماد راؤں میں سے چند ایک کا خلاصہ۔

نواب بہادر کپتان محمد عبد السمیع نواب طالب نگر ریاست برادر آنریبل سر نواب آف چھتاری سابق گورنر یو۔پی —— "آنکھوں کے امراض کے وہ سینکڑوں مریض جنہیں مشہور ماہرینِ امراض چشم لاعلاج تصور کر چکے تھے پرل کلوریم آئی ڈراپ کے استعمال سے آنکھوں کی نظر حاصل کر چکے ہیں۔

موتیابند۔ شریمان پنڈت ایس۔ ایل بہار گوبی۔ اے۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ایف۔ آر۔ جی۔ ایس بیرسٹر ایٹ لا فرزند دیوان بہادر پنڈت دامودر داس آئی۔ ایس۔ او۔ ایڈیشنل کمشنر میواڑ و وزیر اعظم ریاست جودھپور۔ ادھیاپور اور بھرت پور لکھتے ہیں۔ "پرل کلوریم آئی ڈراپ کے ایک ماہ کے استعمال سے میری آنکھوں سے موتیا بند بالکل دور ہو گیا ہے۔ میں نے خوشی میں دیا گھ ڈالا اور اس خوشی میں ڈیڑھ من مٹھائی تقسیم کی ہے اس کے موجد کا بہت ممنون ہوں اور میری رائے میں یہ دوا دنیا کا نوواں عجوبہ ہے۔ لالہ رامچند مالک فرم موتہ اینڈ سنز کیمسٹ گوجرانوالہ اپنے خط ۲۹ مارچ ۱۹۴۳ء میں تحریر فرماتے ہیں۔" میرے ایک مہربان (گورنمنٹ پنشنر) جو گوجرانوالہ کے ایک معزز خاندان (خان بہادر) کے ایک رکن ہیں جو عرصہ دراز سے آنکھ کی بیماری میں مبتلا ہیں میں نے ان کو آپ کی شیشی پرل کلوریم۔ آئی ڈراپ رجسٹرڈ کی دی ان کو کافی فائدہ ہے اور عینک کی ضرورت اس کے استعمال سے کم ہو گئی ہے۔ واقعی دوائی نے جادو کا اثر کیا ہے۔ مہربانی فرما کر ایک درجن پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ کی چھوٹی شیشیاں قیمتی دو روپے آٹھ آنے فوراً ارسال فرما دیں"۔

ککرے اور ہائی مایوپیا۔ خان بہادر فتح الملک حضرت علیخاں وزیر اعظم ریاست سوات لکھتے ہیں۔ "پرل کلوریم آئی ڈراپ نے میری آنکھوں کو توقع سے زیادہ فائدہ پہنچایا۔ اور میں بہت خوش ہوں"۔

قیمتیں!

اسپیشل پوٹینسی ۔۔ روپے بارہ آنے۔ نارمل پوٹینسی بڑی چار روپے بارہ آنے۔ نارمل پوٹینسی چھوٹی دو روپے آٹھ آنے۔ پیکنگ اور محصولڈاک علاوہ۔ اسپیشل پوٹینسی کی دوائی منگوانے کے لئے مبلغ پانچ روپے پیشگی آنے چاہئیں۔

ایجنسیاں ہندوستان بھر میں قابلِ اعتماد دوا فروش سے طلب کیجئے۔ یا براہ راست پتہ ذیل سے

پرل اینڈ کمپنی رجسٹرڈ کوٹھی نمبر (اے۔ ایل) ایبٹ روڈ لاہور

عالمگیر بکڈپو کی نظر ثانی کی ہوئی فہرست کتب

اُردو کی وہ بینظیر کتابیں جو آپکے ادبی ذوق کو آسودہ کر سکتی ہیں

اسلامی و تاریخی تصانیف

ۃ الاسلام قرآن حکیم کے حقائق و معارف عالیہ پر ایک مکمل اور سوط
رہ جس میں اسلامیان عالم کو اجتماعی حیات و موت کا آخری پیغام دیا
ہے۔ مولوی محمد سعید کی معرکہ آرا تصنیف جسے اخبارات و اکابر نے دور حاضر
یم الشان تصنیف قرار دیا ہے ضخامت ۴۰۰ صفحات ۲۰×۲۶/۸ رعایتی
ت تین روپے کے بجائے اڑہائی روپے للعہ

یلئے اسلام کا ماضی و مستقبل - اسلامی دنیا کی سیاست پر ایک
یخانہ اور سیاست آموز تبصرہ۔ ترکی - ایران، افغانستان، عراق، عرب
، یمن، فلسطین، شام، مصر، الجزائر، طرابلس اور تیونس وغیرہ کی مبسوط
یخ از مولانا اظہر امرتسری قیمت عہ

یں تحریکیں - تاریخ اسلام کی انقلاب آفریں تحریکات کا تذکرہ
لاب، بغاوت، جنگ د آزادی کی پر جوش داستانیں - از مولانا
ر امرتسری قیمت عہ/۱۲

اب التقدیر علامہ ابن قیم کی شہرۂ آفاق تصنیف کا اردو ترجمہ
یں مسئلہ قضا و قدر کے ہر پہلو پر دلکش انداز میں روشنی ڈالی گئی
ضخامت آٹھ سو صفحات قیمت دو روپے

یقت و افسانہ حضرت مولانا ظفر علی خاں کی تازہ ترین تصنیف
یں حضرت مولانا نے متعدد تاریخی رسائل کا اپنے مخصوص رنگ
حاکمہ کیا ہے۔ قیمت عہ/۱۲

تاریخی اور غیر تاریخی ناول

ندر شاہ اور ستارا - نادر شاہ درانی اور راجپوت دوشیزہ
تارا کا دل آویز رومان جس کو جناب شبلی بی کام نے شگفتہ اردو
کا لباس پہنایا۔ ضخامت اڑہائی سو صفحات سے زاید۔ بہترین لکھائی
اور چھپائی قیمت عہ

زرتشت اعظم کا رومان وہ بلند پایہ تاریخی ناول جس کی ہر سطر
کیف و سرور اور عشق و محبت کی آئینہ دار ہے۔ از جناب سید احسان علی
شاہ بی۔اے۔ قیمت عہ/۱۲

ربیعہ ترکی کی مایہ ناز ادیبہ خالدہ خانم کا ایک معرکہ آرا انقلابی
ناول جو اردو دان طبقہ میں بیحد مقبول ہو رہا ہے مترجم جناب شبلی بی کام
ضخامت ۴۰۰ صفحات کے قریب قیمت للعہ

موتیوں کا درخت علامہ جرجی زیدان کے شاہکار کا اُردو ترجمہ ملکہ
مصر شجرۃ الدُر کی رومانی داستان - مترجمہ جناب حکیم حسرت
لکھنوی قیمت عہ/۱۲

روسو کی سیہ کاریاں - مفکر اعظم روسو کی ہیجان خیز اور جذبات
انگیز آپ بیتی - مترجمہ جناب تیرتھ رام فیروزپوری ضخامت
پونے دو سو صفحات قیمت عہ ر

محبوبہ قیروان - علامہ جرجی زیدان کا ایک معرکہ آرا تاریخی ناول
جو قیروان کی ایک دوشیزہ سے متعلق ہے ۲۶۰ صفحات قیمت عہ/۱۲

سلامبو (دو حصے) شہرہ آفاق فرانسی انشا پرداز گستیو فلابیر
کا شہ پارہ مترجمہ مولانا عنایت اللہ بی۔اے دہلوی دونوں حصوں
کی ضخامت ساڑھے سات سو صفحات قیمت ہر دو حصص تین روپے

داستان - دنیا کی رنگین ترین اور دلچسپ ترین کتاب،
از پیرا لوئی قیمت تین روپے

پھُریری - مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم کا آخری کارنامہ۔ یہ
ناول ان کی تمام تصانیف میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ قیمت عا/۲

پریم کا جادو - سنسکرت ادب کے مستشرق ایف۔ ڈبلیو بین کے
چار شاہکار ناول ایک جلد میں جو رنگینی اور دلآویزی میں اپنی مثال نہیں
رکھتے۔ مترجمہ جناب سراج الدین نظامی قیمت للعہ/۲

خواب فراموش - یورپ کے ایک ممتاز ترین ناول نویس کا
مہتم بالشان کارنامہ قیمت ایک روپیہ - عہ ر

گسٹاپو۔ نازی خفیہ پولیس کے مظالم کی خونچکاں داستان قیمت ۸ر

افسانے اور ڈرامے

تاریخی افسانے ۔ تاریخ ہند کے تین طویل ترین افسانے ۔یعنی نورجہاں یوسف عادل شاہ اور آتش انتقام جو دو سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں از مولانا احمد ایم۔اے ۔قیمت ۱۲ر

روپ متی اور باز بہادر۔ باز بہادر اور روپ متی کی داستان محبت کا ڈراما ۔جو بیحد مقبول ہو چکا ہے از محشر عابدی۔قیمت ۱۴ر

ماہ و انجم ۔ جناب کوثر چاند پوری کے وجد آفریں افسانوں کا مجموعہ ۔ ہر افسانہ نیاز عشق اور ناز حسن کی بولتی چالتی تصویر ہے ہر افسانہ بیحد دلچسپ ۱۲ر

تاج شاہی حسن کے قدموں میں ۔روس، آسٹریا، سویڈن ، ہنگری، ہسپانیہ ، ناروے ، کے تاجداروں کی رومانی داستانیں بیحد رنگین کتاب ۔ قیمت ۸ر

پرواز خیال ۔ مختصر ڈراموں کا حسین ترین مجموعہ ۔یہ وہ ڈرامے ہیں جو سکولوں اور کالجوں میں بآسانی کھیلے جاسکتے ہیں قیمت ۵ر

ہوائی قلعے ۔ مسٹر کرشن چندر۔ایم۔اے کے دلکش مضامین اور لطیف افسانوں کا دلپذیر مجموعہ ۔ قیمت ۸ر

خار و گل ۔ اُردو کے مشہور ادیب ایم۔ایم۔اسلم کے بہترین افسانوں اور افسانوں کا مجموعہ قیمت ساڑھے تین روپے ۔

ڈاچی اور دیگر افسانے ۔ مسٹر اوپندر ناتھ اشک کے گیارہ سیاسی و معاشرتی افسانوں کا مجموعہ قیمت ۸ر

مصری افسانے مصر کے مشہور افسانہ نگار سید مصطفےٰ لطیفی کے بہترین افسانے قیمت ۱۱۲ صفحات قیمت ۸ر

مزاحی افسانے اور مزاحی غزلیں

[illegible]لطافت ۔ ملا رموزی کی مزاح نگاری کا بہار آفریں نمونہ جس میں اخلاقی تمدنی اور سیاسی امور پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اڑہائی سو صفحات قیمت عہ

شادی ۔ ملا رموزی کی تقریب شادی پر ان کی خود نوشت تصنیف۔ دلکش مضامین کا مجموعہ اڑہائی سو صفحات قیمت عہ

پرواز لق لق ۔ اُردو کے صاحب طرز مزاح نویس حاجی لق لق کی قہقہہ آفریں نظمیں ۔قیمت ۸ر

لقلقہ ۔ لق لق دیکھنا ہو تو لاہور کے چڑیا گھر میں جاؤ۔گھر بیٹھے اس کی ملاقات کرنی ہو تو لقلقہ منگاؤ ۔ماڈرن غزلیں اور پولیٹکل نظمیں ہنسی اور قہقہہ کا امتزاج قیمت ۸ر

حاجی لق لق کے افسانے ۔ حاجی لق لق کے دلچسپ مزاحی افسانے جن کو پڑھتے وقت آپ کا کمرہ زعفران زار بن جائے گا۔ ۸ر

خطوط کی ستم ظریفی ۔ میرزا عظیم بیگ چغتائی کی قہقہہ بدوش اور ظرافت پاش تصنیف ۔ قیمت بارہ آنے ۱۲ر

تسلیمات علیکم ۔ اُردو کے مشہور ادیب ایم۔ایم۔اسلم کی تازہ تصنیف جو دراصل سولہ مزاحی مضامین کا مجموعہ ہے قیمت ۸ر

خطوط، روزنامچے، ڈائریاں

لیلےٰ کے خطوط ۔ وہ کتاب جسے لوگ باربار پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔اگر آپ نے ابھی تک ملاحظہ نہیں فرمائی تو آج ہی طلب فرمایئے مصنفہ قاضی عبدالغفار قیمت عہ

مجنوں کی ڈائری ۔ لیلےٰ کے خطوط کے ساتھ مجنوں کی ڈائری ملاحظہ فرمایئے۔ جس میں ایک نفس پرست مرد کی نفسیات کو آشکار کیا گیا ہے ۔ قیمت عہ

روزنامچے ۔ بادشاہ، ایڈیٹر، مزدور، طوائف، حکیم، ایکٹرس، سکول ماسٹر، اور فلسفی وغیرہ وغیرہ کے دلچسپ روزنامے۔ از حضرت ماہرالقادری۔قیمت عہ

ایوان تصور ۔ بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کی انگریزی منظومات کا اُردو ترجمہ ۔ قیمت دو روپے ۔

تاریخ مسلم لیگ ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی مکمل۔ مبسوط اور مستند تاریخ اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی عہ

کالیراس ۔ ۱۲ر
نازی ازم ۔ ۶ر
کامیاب مرغی خانہ ۔ ... ... عہ
تجارتی مرغی خانہ ۔ ... ... عہ
طبیب مرغی خانہ ۔ ... ... عہ

ملنے کا پتہ :۔ **عالمگیر بکڈپو سید مٹھا بازار۔ لاہور**

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۹ فہرست مندرجات ماہ مئی ۱۹۴۳ء نمبر ۴

عالمگیر سالانہ نمبر ۱۹۴۳ء کی مختصر فہرست مضامین زیر نظر اشاعت کے صفحہ ۶ و ۷ پر ملاحظہ کریں

... نے ... میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا

ملاحظات

موجودہ جنگ سے تقریباً تمام سرمایہ دار اور کاروباری ادارے جی کھول کر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن رسائل وجرائد کی ترقی کے رستے میں نئی نئی مشکلات کا ہجوم نظر آ رہا ہے۔ کاغذ کی گرانی و نایابی ہی مالکان جرائد کے لئے کچھ کم پریشان کن نہ تھی کہ اب حکومت ہند کے نئے قانون نے ان رسائل وجرائد کے لئے جن کے پاس بدقسمتی سے "اخباری کوٹے" نہیں ہیں۔ اخباری کاغذ کا حصول ناممکن بنا دیا ہے۔ عالمگیر کو "کوٹا سسٹم" کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کا موقع نہیں مل سکا اس لئے کاغذ مہیا کرتے وقت ہمیں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کے تذکرے سے ہم قارئین کو پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اخباری کاغذ نہ ملنے کے باعث ہم دیسی کاغذ خریدنے پر مجبور ہیں جس کی وجہ سے ہمارے مصارف میں ہر ماہ سیکڑوں روپیہ کا ناقابل برداشت اضافہ ہو چکا ہے چنانچہ اس مرتبہ بھی اعلیٰ درجہ کا دیسی کاغذ استعمال کیا گیا ہے اور اگلے مہینہ "سالانہ نمبر" بھی اسی کاغذ پر شایع کیا جائیگا۔ انشا‌ء اللہ

سالانہ نمبر کے مضامین نظم ونثر کی فہرست پر (جو اسی اشاعت میں شایع ہو رہی ہے) ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکے گا۔ کہ جنگ کی ظلمتوں کے باوجود عالمگیر کی درخشاں روایات کو تاریکی کا سامنا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی روایات و تابانیوں میں پہلے سے بھی زیادہ چمک دمک پیدا ہو رہی ہے۔ چنانچہ سالانہ نمبر میں جو افسانے شایع کئے جا رہے ہیں وہ ترقی یافتہ ادب کے بہترین نمونے ہیں اور قارئین ان کو پڑھ کر یقیناً محظوظ ہوں گے۔ مقالات کے انتخاب میں خاص احتیاط کی گئی ہے اور صرف ایسے مضامین درج کئے جا رہے ہیں جو کسی نہ کسی جہت سے اردو ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ منظومات کا حصہ بھی خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔ اس میں نوجوان شاعروں کے دوش بدوش ہندوستان کے چیدہ چیدہ اساتذہ سخن بھی شریک ہو رہے ہیں۔

زیر اشاعت (ماہ مئی) کا افتتاح مولانا ظفر علی خاں کے ایک پر معارف مقالہ سے ہوتا ہے جس میں آپ نے حضور سرورِ دو عالم (فداہ امی وابی) کی چند اہم تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ اُمید ہے قارئین اس مضمون کو آنکھوں سے لگا کر اس پر عمل کر کے سعادت دارین حاصل کرینگے۔

" فن نیرنجات پر مورخانہ نظر" مولوی بشیر احمد کا ایک بہت زیادہ دلچسپ مقالہ ہے جس میں شعبدہ بازی کی تاریخی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مولوی صاحب تحقیق کے میدان میں بڑے بڑے محققین کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے مضامین ہمیشہ مستند ٹھوس اور قابل قدر ہوتے ہیں۔ مولوی نور احمد خاں فریدی نے "نادر شاہ افشار" کی زندگی پر ایک نئے نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون تین اقساط میں ختم ہوا ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ باذوق حضرات نے اسے بہت زیادہ پسند کیا۔ نوابزادہ جاوید قیصری نے فرخ آباد کے ایک غیر معروف شاعر" بھکو شاہ" سے قارئین کا تعارف کرایا ہے۔ انداز بیان بھی پرلطف ہے۔ مولوی محمد اسحٰق مالیگانوی کا مضمون "جنگ اور تمدن" اگرچہ بہت زیادہ مختصر ہے۔ تاہم انھوں نے تفصیل کو بھی اختصار کے آئینہ میں دکھا دیا ہے۔ افسانے سب کے سب بلند پایہ اور دلکش ہیں۔ "ہنسی ہنسی میں" اور "شریک حیات" طبع زاد کہانیاں ہیں اور سچ پوچھئے تو ہر لحاظ سے بہت خوب ہیں۔ "چرائے ہوئے فقرے" مرہٹی زبان کے ایک شاہکار کا ترجمہ ہے جس کی کردار نگاری خاص طور پر جاذب توجہ ہے۔ "نہ معلوم صاحب" اور "سنگتراش" انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ اور اپنے اپنے رنگ میں حد درجہ کامیاب ہیں۔ حصہ نظم میں۔ ہادی مچھلی شہری۔ نثار اٹاوی، شفق مینائی، استاد عارفی اور شفق ٹونکی ایسے مشاہیر شعرا کا تازہ ترین کلام بھی شامل ہے۔ امید ہے قارئین پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے۔

چار آنے کے ٹکٹ

جن معاونین کرام کا سالانہ چندہ ابھی ختم نہیں ہوا وہ "سالانہ نمبر" بذریعہ رجسٹری بحفاظت حاصل کرنے کے لئے چار آنے کے ٹکٹ بواپسی ڈاک دفتر میں بھیجدیں۔ بعض خریدار حضرات ہمارے اعلان کے باوجود توجہ نہیں فرماتے اگرچہ "سالانہ نمبر" اُن کی خدمت میں بھیجتے وقت بھی انتہائی احتیاط سے کام لیا جائیگا لیکن رستہ میں چونکہ گم ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے مینجر عالمگیر پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تمام ایسے حضرات جن کا چندہ ختم نہیں ہوا سالانہ نمبر بحفاظت حاصل کرنے کیلئے چار آنے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں اور اپنے نمبر خریداری کا حوالہ بھی ضرور دیں۔

ادارہ

عالمگیر سالانہ نمبر ۱۹۴۳ء

قیمت سالانہ نمبر صرف ایک روپیہ

ضخامت ۲۰۰ صفحات

علم و تاریخ اور ادب و شعر کا ہنگامہ پرور شاہکار

اس میں شک نہیں کہ آج کل خاص نمبر تو کجا عام اشاعتوں کیلئے بھی بازار سے کاغذ لانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، تاہم عالمگیر کا جذبۂ خدمت علم و ادب چوٹ کھا کھا کر ابھرتا ہے چنانچہ موجودہ اضطراب انگیز تاریکیوں کے ہجوم میں بھی ہندوستان کے مقتدر ترین ماہنامہ عالمگیر نے فیصلہ کیا ہے کہ حسب معمول "سالانہ نمبر" کی ضیا پاشیوں سے ایوان علم و ادب کو منور کیا جائے لہذا یکم جون ۱۹۴۳ء کو عالمگیر کا معرکہ آرا سالانہ نمبر بہترین سفید کاغذ پر شائع کیا جائے گا جس کی دماغ افروز اور کیف پرور خصوصیات کا اندازہ ذیل کی فہرست مضامین سے ہو سکتا ہے۔

مقالات

حقائق و معارف ——— مولانا ظفر علی خاں

بلند پایہ مقالہ۔ جس کی سطر سطر سے ادبی رنگینیاں جھلک رہی ہیں۔

خارجیہ ——— مولانا اطہر امرتسری

اس ولولہ انگیز تحریک کی خونیں داستان جس نے اسلامی دنیا کو تین سو برس تک انقلاب کے آغوش میں پھینکے رکھا عبرت افروز مقالہ۔

اکبر اعظم کے آخری ایام ——— مولوی نور احمد خاں

مغربی مؤرخین نے اکبر اعظم کی موت کے متعلق یہ کہہ کر قسم قسم کے شبہات پیدا کر دیئے ہیں کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ اس محققانہ مقالہ میں مستند تاریخی حوالوں کے ذریعہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ اکبر کی وفات طبعی حالات کے ماتحت ہوئی۔

شاہان مغلیہ کے باغات ——— شبلی بی کام

باغات کا نام سنتے ہی انسان جھوم اٹھتا ہے۔ اس تحقیقی مقالہ میں اُن بہار آفریں باغوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو مغل بادشاہوں نے ہندوستان میں لگائے تھے۔ اور جن کے آثار اب تک موجود ہیں۔

منظوم خطوط ——— میرزا محمد بشیر ایم۔ اے

منظوم خطوط اردو شعر کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ اس موضوع پر یہ مختصر مضمون پڑھنے کے قابل ہے۔

ابن رشد ——— مولوی محمد شعیب

قرطبہ کے جلیل القدر فلسفی کی اسلامی خدمات پر ایک اجمالی تبصرہ۔

افسانے اور ڈرامے

دلدل ——— میرزا ادیب بی اے

ایک حقیقت افروز افسانہ جس میں سوسائٹی کے ایک بھیانک رخ کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اور جو طویل مشاہدہ اور مطالعہ کے میرزا صاحب نے اپنے مخصوص رنگ میں لکھا ہے۔

ایک نسخہ ——— ڈاکٹر شفیق الرحمان

یہ کسی ڈاکٹر یا حکیم کا نسخہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا عجیب و غریب نسخہ ہے جس کی تندرست حضرات کو بھی ضرورت رہتی ہے۔ لطیف مزاح کا نادر نمونہ۔

صہبا ——— خدیجہ مستور

اس کا خیال تھا کہ مشرقی عورت کے لئے شوہر ہی اس کی دنیا ہے لیکن کیا شوہر بھی اس نظریئے کا حامی ہے؟ دلگداز افسانہ۔

بیوی کا امتحان ——— اے سکار۔ رشدی

طرز جدید کا دلچسپ افسانہ۔ ایک ایکٹ کا طربیہ۔ جس میں ایک بار ایٹ لا نوجوان اور ایک بی۔ اے پاس لڑکی حصہ لیتے ہیں۔

شرابی ——— آسی رام نگری

وہ شرابی تھا۔ آوارہ تھا، اوباش تھا۔ اسے دنیا کی کوئی پروا نہ تھی۔ آخر کیوں ——؟ نفسیاتی افسانہ۔

وصیت نامہ ——— ممتاز حسین

زندگی کے اتار چڑھاؤ کا رومان انگیز نقشہ جو خطوط کی شکل میں کھینچا گیا ہے۔

رھی محبّت ——— پروفیسر حامد حسن قادری

ادیبانِ نو کی ادبیات جدیدہ کا ایک طنزیہ افسانہ۔ جس میں
...ط انشا پردازوں کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔

...نیز ——— ظفر واسطی

لڑائی کے بعد دوستی۔ رنجش کے بعد ملاپ۔ کتنی پر لطف بات
رومان انگیز واقعہ۔ یہ افسانہ بھی اسی محور کے گرد گھومتا ہے۔

...لی ——— اختر ملیح آبادی

بات یہ تھی کہ فردوس مجھے بہت ستاتی تھی۔ میں نے اس کی شرارتوں
...لینے کا ارادہ کر لیا تھا" اور اس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ کس طرح
...یا، رومانی افسانہ۔

...ئی ہوئی نگاہیں ——— مولوی امام الدین رامنگری

یہ کہہ کر سوشیلا چپ ہو گئی۔ اور کھوئی ہوئی نگاہوں سے دور
...کے پار دیکھنے لگی"۔ اس کے دماغ میں کن خیالات کا ہجوم تھا؟

...یں—! ——— طفیل ملک

خوشی کے کئی موقعے آئے اور گذر گئے۔ لیکن ایک گھرانہ ایسا بھی
...ماں بہار کے زمانہ میں بھی خزاں کا دور دورہ رہتا تھا۔ تفصیل اس
...اش افسانے میں پڑھئے۔

منظومات

موجِ فصاحت ——— حضرت جلیل
سوزِ نو ——— حضرت سیماب اکبر آبادی
لطفِ زبان ——— حضرت نوح ناروی
عشق زندہ باد ——— حضرت دل شاہجہانپوری
بہار ——— حضرت حامد اللہ افسر
بیٹے کی شادی ——— حضرت شاد عارفی
صبح مستقبل ——— حضرت نثار اٹاوی
نوائے راز ——— حضرت راز چاندپوری
اپنی حور سے خطاب ——— حضرت شفق ٹونکی،
آج کل ——— حضرت اعجاز صدیقی
گھٹائیں ——— حضرت شورش ملیح آبادی
ہسم ——— حضرت منظر صدیقی
آہ و فغاں ——— حضرت خمار بارہ بنکوی

علاوہ ازیں

حافظ ٹانڈیپوری۔ جوہر چاندوڑی۔ دل جالندھری۔ بسمل شاہ راز۔ خلیق برہانپوری۔ مہر عثمانی۔ نشاط سعید۔ اثر گوالیاری۔ شفا ندوی
سلیم ندوی۔ وحید بلاسپوری۔ خلیل شیر کوٹی وغیرہ وغیرہ کا تازہ ترین کلام

مقالات مدیری

اخبار و افکار ——— حقائق و معارف ——— تحقیق و تصحیح ——— نقد و نظر

اخبار و افکار

حکومت ہند نے "عالمگیر" کو اخباری کاغذ کے حصہ رسدی میں شریک کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ معاصر "خیام" نے اس موضوع پر ایک پر زور شذرہ سپرد قلم کیا ہے۔ جو اس امید کے ساتھ درج ذیل ہے کہ شاید کامرس ڈیپارٹمنٹ کو اس مسئلہ پر ہمدردانہ ہوشمندی کی نظر ڈالنے کا موقع مل سکے۔ اردو ہندوستان کے ایک معتدر ماہنامے کو کشاکش زلیست کی صعوبتوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ ترمیم شدہ نیوز پیپر کنٹرول آرڈر کے ماتحت کسی "غیر کوٹا یافتہ" رسالے کے لئے اخباری کاغذ کا حصول ناممکن ہو چکا ہے۔ اس لئے مشکلات کے ... دروازے کھل رہے ہیں لہذا حکومت ہند سے پر زور استدعا کی جاتی ہے کہ وہ اس بے انصافی کا ازالہ کرے اور "عالمگیر" کا کوٹا منظور کر کے دنیائے ادب کو ممنون ہونے کا موقع بخشے۔ (مدیر)

جب حکومت ہند کی طرف سے اخباری کاغذ کی بہم رسانی کو کوٹا سسٹم کے مطابق ہونے کا اعلان ہوا۔ تو اکثر مالکان اخبارات و رسائل نے اپنی درخواستیں متعلقہ افسر کے پاس بھیج دیں۔ لیکن بعض رسائل کے کارکنوں نے درخواستوں کی ترسیل میں قدرے تامل سے کام لیا۔ یہ محض ایک اصطلاحی غلطی تھی جسے جرم سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا لیکن حکومت ہند کے شعبہ درآمد نے ذراسی بات کو بھی افسانہ بنا دیا۔ چنانچہ اس قسم کے رسائل کو اس لئے کوٹا نہیں عطا کیا گیا کہ ان کی درخواستیں وقت مقررہ کے بعد موصول ہوئیں۔ ان رسائل میں لاہور کا مشہور ترین مجلہ "عالمگیر" بھی شامل ہے۔ جو کثیر الاشاعت اور مقبول و مشہور ہونے کے علاوہ ۱۹ برس سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اور اس عرصہ میں اس کی ایک اشاعت کو بھی التوا و تاخیر کا سامنا نہیں ہو سکا۔ باایں ہمہ ایک اصطلاحی غلطی پر اسے اُن تمام مراعات سے محروم کیا گیا ہے جو حکومت ہند کے نزدیک بھی رسائل کا فطری حق ہیں موجودہ پابندیوں سے پہلے تو "عالمگیر" والے مہنگے داموں کاغذ حاصل کر لیتے تھے اس طرح اگرچہ ناقابل برداشت مالی نقصان ہوتا تھا لیکن کام تو چلتا رہتا تھا۔ مگر نئی قیود کے باعث اخباری کاغذ صرف وہی اخبار و رسالہ حاصل کر سکتا ہے جسے حکومت ہند کا اجازت نامہ حاصل ہو۔ اس ... کے بعد "عالمگیر" کو جن مصائب و مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے ان کا تصور بھی کوئی اخبار نویس برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن ... حکام کے ہاتھوں میں کاغذ کی تقسیم کا رشتہ ہے وہ اس دردمظلومی سے بے خبر ہیں۔ اور یہ افسوسناک بے اعتنائی اس حکومت کے عہد میں حد درجہ افسوسناک ہے جو صحافت کے مخلصانہ تعاون کی خواہشمند ہے۔ اور جس نے کوٹا سسٹم جاری کر کے اخبارات کو موت کے شکنجے سے چھڑا لیا ہے۔ کیا "عالمگیر" اردو صحافت میں شامل نہیں؟ اگر ہے تو ایک ۱۹ برس سے باقاعدہ شائع ہونے والے مقبول و مشہور رسالے کو ناقابل برداشت آزمائش میں کیوں ڈالا جا رہا ہے؟ اگر حکومت ہند کے کاغذی کارکن عالمگیر کی اصطلاحی غلطی ہی پر اسے دفعہ ۳۰۲ کا مرتکب خیال کرتے ہیں تو اسے عملاً کیوں نہیں بند کر دیتے؟ کیونکہ بسلا نہ زندگی سے شہیدانہ موت بہر حال بہتر ہے۔ لیکن ہمیں اُمید ہے کہ حکومت ہند اتنی افسوسناک ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوگی۔ بلکہ عالمگیر کو بھی کوٹا عطا کر کے فرض شناسی کا ثبوت دیگی۔ ہم اس سلسلے میں پنجاب کے شیر صحافت نواز چودھری محمد حسین افسر انچارج پریس برانچ کی توجہ بھی مبذول کراتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ چودھری صاحب بھی اپنے صوبے کے ایک مشہور ترین رسالے کی حیات و بقا کے لئے مناسب جد و جہد سے کام لیں گے علاوہ ازیں ہم مولانا ظفر علی خاں قبلہ سے بھی متوقع ہیں کہ آپ اس کے معاملہ میں اُردو صحافت کی نمائندگی کا قابل فخر ثبوت دیں گے۔

(خیام۔ ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء)

حقائق و معارف:۔

سحر حلال

حضور سرور کائنات صلعم کی تقریریں!

وَمَا ینطق عن الھوٰی ۔ ان ھو الّا وحی یوحیٰ ٥

کہتے ہیں حکیم سولن کی ایک نظم نے روما کو دوبارہ عزیز العزیمۃ ومنبع النال بنا دیا تھا۔ انطونی کی ایک تقریر نے جولیس سیزر کے قاتلوں کو روئے زمین سے ناپید کر دیا تھا۔ شیکسپیر کے ایک ڈرامے سے تمام یورپ میں ادبی بیداری کی روح پھیل گئی تھی۔ لارڈ بائرن کے ایک قصیدے نے یونان کو استقلال پر فائز کیا تھا۔ سقراط کے ایک مکالمے نے فلسفہ مابعد الموت کی بنیادیں استوار کر دی تھیں۔ مرسیلیہ (مارسیلز) کے ایک نغمے سے فرانس کو جوش آ گیا تھا۔ لارڈ میکالے کی صرف ایک اسپیچ ہندوستان میں تعلیم جدید کا باعث بنی تھی۔ یہ اور اسی قبیل کی تمام دوسری مثالیں بے شبہ قابل فخر ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کی تو یہ بضاعت ہی ہے مگر یہ گنج شائیگاں مشرق کو بھی مغرب سے بھی کم عزیز نہیں۔ ہم بھی انہی روایات پر نازاں ہیں اور تحریر و تقریر میں انہی سے اسناد بھی کرتے ہیں۔

یہ عزیز مثالیں ہم کو اپنے سے بھی عزیز تر ہیں لیکن آیئے ایک دوسری مثال اور بھی ملاحظہ فرمایئے۔ جس نے دنیا کی تیس کروڑ آبادی کو معبودان باطل کی غلامی سے نکال کر خداوند قدوس کا پرستار بنا رکھا ہے جس نے اجسام ہی کو نہیں۔ ارواح کو بھی نجات کی راحت منزل دکھائی۔ جس کی تلقین سے دنیا میں سب سے پہلے تعلیم عام ہوئی جس کی تہذیب نے زمانہ میں سب سے پیشتر خود شناسی و خداشناسی کے فرق مراتب بتلائے۔ اور تربیت ظاہرہ و معاشرت ظاہرہ کے سبق اس وقت نوع انسان کو دیئے جب کوئی ان الفاظ کے مفہوم سے بھی آشنا نہ تھا۔ یہ امی گویا بزبان فصیح "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو ام القریٰ میں "از الف آدم و میم مسیح" ام الکتاب کا درس دینے تشریف لائے تھے۔ ذیل میں آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی چند تقریریں درج کی جاتی ہیں جو سارے زمانے کیلئے مشعل افروز ہدایت ہوئیں اور سارے اہل زمانہ کو رشد و رشاد کے صراط مستقیم پر لائیں۔

۱

اے بنی نوع بشر! تمہیں چند مبادی مرحمت ہوئے ہیں کہ انہی کے ساتھ تم کو اپنا آغاز و انجام وابستہ کرنا چاہیئے اور مبادی کے ساتھ تمہاری انتہا بھی ہے کہ اسی پر تم کو منتہی ہونا لازم ہے۔ جس شخص کو نعمت ایمان عطا کی گئی وہ دو خطروں سے گھرا ہوا ہے۔ ایک خطرہ گذشتہ مدت ہے جو گزر بھی چکا۔ اور مسلمان نہیں جانتا کہ خدا اس خطرے کو ٹالے گا۔ یا نہ ٹالے گا۔ اس لئے بندے کو چاہیئے کہ اپنے نفس [illegible] اصلاح نفس بنائے۔ اور اپنی دنیا ہی کو سرمایہ آخرت قرار دے۔ مبارک ہے وہ جوانی جو بڑھاپا آنے سے پہلے اپنے مصرف صحیح میں آ چکی ہو [illegible] فلاح ہے [illegible] زندگی جو موت آنے سے قبل اپنا مقصد پورا کر چکی ہو۔ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے دست تصرف میں محمدؐ کی جان ہے کہ مرنے کے بعد کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اس زندگی کے گلے شکووں کا دفتر کھولا جائے اور نہ اس دنیا کے بعد کوئی دار القرار ہے۔ ہے تو جنت ہے یا دوزخ ---!

۲

مجھے میرے پروردگار نے نو وصیتیں فرمائیں۔ یہی وصایائے نہ گانہ میں تمھیں کرتا ہوں۔

(الف) پہلی وصیت یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں اخلاص کو اپنا شعار بنایا جائے۔

(ب) قلب کی حالت سکون و طیش میں سر رشتۂ اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ (ج) غنی اور فقر کسی حالت میں بھی میانہ روی ترک نہ ہو (د) جو ظلم کرے اس کو معاف کیا جائے (ہ) خطا کا جواب عطا سے دیا جائے (و) قطع رحم کرنے والے کے ساتھ صلۂ رحم ہو۔ (ز) خموشی میں شانِ فکر پیدا ہو (ح) نطق سراپا تذکیر ہو (ط) نگاہ ― نگاہِ عبرت ہو۔

— ۳ —

بے فائدہ قیل و قال سے۔ اسراف و تبذیر سے اور عرض و حاجت کی کثرت سے میں نے تمہیں منع کیا ہے۔ شارع عام پر بیٹھنا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔ اگر بیٹھنا ہی ہو تو نگاہیں نیچی کر لو۔ اور ہر چھوٹے بڑے۔ واقف و ناواقف کیلئے نعمت سلام عام کرو۔ جو گمراہ ہوں انہیں سیدھے راستہ پر ڈالو۔ اور جو ناتواں ہوں اُن کی دستگیری کرو۔

— ۴ —

کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ بدترین آدمی کون ہے؟ (ا) جو تنہا کھائے (ب) فائدہ نہ پہنچائے۔ (ج) اور اپنے غلام کو تازیانے لگائے۔ کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ اس سے بھی بُرا انسان کون ہے۔ اس سے بھی بُرا انسان وہ ہے جو لوگوں سے بغض رکھے اور لوگ اس سے بغض رکھیں۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے اچھا ہے۔ لہذا پہلے ان کوتاہ دستوں کی خبر لو جو تمہارے دست نگر ہوں۔

— ۵ —

تمہارا تقویٰ اللہ ہی کیلئے سزاوار ہے۔ اس حق سے عہدہ برآ ہو۔ اُس کی رضا جوئی میں جہد بلیغ کرو۔ یقین جانو کہ دنیا فانی ہے اور عقبیٰ ہی کو بقا ہے۔ موت کے بعد جو زندگی آنے والی ہے اس کیلئے تیاری کرو دنیا کے ساتھ تمہارا تعلق ایسا ہونا چاہئے گویا وہ ایک نمود بے بود تھی اور آخرت کے ساتھ تمہیں ایسا لگاؤ ہونا چاہئے گویا وہ ایک نقش اصلی و حقیقی ہے۔ تم لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ جو شخص بھی اس مہمان سرائے دُنیا میں مقیم ہے اس کی حقیقت ایک مہمان سے بڑھکر نہیں۔ جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے مستعار ہے۔ مہمان کوچ کر جانے والا ہے۔ اور عاریت آخر واپس لے لی جانے والی ہے۔ یہ بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ دُنیا ایک مائدہ عارضی ہے جس سے نیکوکار و بدکار سبھی لقمہ اندوز ہیں اور آخرت ایک حقیقت ہے کہ اس پر ایک باجبروت شہنشاہ حکمراں ہے۔ خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جس نے فرمانِ اجل کے نفاذ اور سر رشتۂ عمل کے انقطاع سے پہلے کہ جب تک اس کا رشتہ حیات دراز تھا اور اُس کے دوش انفاس پر پڑا تھا بہ نگاہ امعان اپنے نفس کا احتساب کیا اور اپنی مشت خاک کو ٹھکانے لگا...

یہ تقریریں کیا ہیں؟ خدائے بزرگ و برتر کی شان اکملیت کے مظاہر ہیں۔ حقانیت کے قطروں کے سمندر ہیں۔ کہتے ہیں کہ دریا کوزے میں بند نہیں لیکن جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اعجاز نہانی نے اپنے ان پانچ خطبات میں جنہیں نظام حق و صداقت کے ارکان پنجگانہ کہنا چاہئے۔ معاد کے ان تمام اسرار کو جمع کر دیا ہے۔ جن پر دماغ انسانیت، موہبت یزدانی کے انوار سے مستفید اور فیوض سے مستفیض ہو کر پہنچ سکتا ہے۔ کہا جاتا کہ ایک شخص کی ذات میں سارا عالم جمع نہیں ہو سکتا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پانچ تقریروں نے اس دعوی کو باطل کر دیا ہے۔ یقیناً خدا قدرت ہے کہ نہ صرف ایک عالم بلکہ اٹھارہ ہزار دنیاؤں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جمع کر دیئے۔

(مولانا) ظفر علی خاں

حجابات

کہنے کو تو کیا کچھ ترے جلوؤں میں نہیں ہے
بیدرد بتا میری تمنا بھی کہیں ہے

سجدے کے لئے کیوں مری بیتاب جبیں ہے
ایسا تو نہیں منزلِ مقصود یہیں ہے

اِک جلوۂ رنگیں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
نادیدہ نگاہوں کو یہ دُنیا ہے نہ دیں ہے

اتنا تو سمجھتا ہوں کہ سجدے میں جبیں ہے
اب تیرے تصوّر میں نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

زاہد تجھے کافر جو میں کہدوں تو غلط کیا
انکارِ مئے ناب سے کیا کفر نہیں ہے

اللہ رے اس دیدۂ حیراں کی مصیبت
جس نے تجھے دیکھا بھی ہے دیکھا بھی نہیں ہے

اتنی بھی نہ مایوس شبِ غم ہو کسی کی
مرنا بھی میسّر نہیں جس کا کہ یقیں ہے

ہاں بندگیِ شوق کے جوہر نہیں مٹتے
ہر ذرّے میں پنہاں مری تصویرِ جبیں ہے

ہر پائے طلب جانبِ منزل نہیں اُٹھتا
رَہرو ہے کہیں اور رہِ مقصود کہیں ہے

کچھ منزلیں یہ بھی رہِ عرفاں میں نہیں شاید
اب دل کو خیالِ حرم و دَیر نہیں ہے

یہ ربط کہ بے تیرے نہیں مجھکو ذرا چین
یہ ضبط کہ گویا مجھے اُلفت بھی نہیں ہے

تو ڈھونڈ رہا ہے حرم و دیر میں جس کو
زاہد! مرے ٹوٹے ہوئے دل میں وہ مکیں ہے

وہ پوچھتے ہیں مجھ سے میں کیا اُن سے بتاؤں
گویا مری اُمید کی صورت ہی نہیں ہے

معلوم نہیں اب بھی حجابات ہیں کتنے
ہادی تجھے کیا جلوۂ جاناں کا یقیں ہے

ہادی مچھلی شہری

افسانہ

ہنسی ہنسی میں

اُس نے خط پڑھنا شروع کیا - لیکن مشکل سے چند ہی سطریں پڑھی
ہونگی کہ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں - گھبرا کر نیچے دیکھا - لکھا
تھا "صرف تمہاری لتا" اور خط آیا تھا رادھا بھون آگرہ سے - پیشانی
پر یہی پتہ درج تھا - وہ اور چکرا گیا - آگرہ میں اس کا کوئی شناسا نہ تھا -
پھر اس نام کی کسی لڑکی کو تو وہ جانتا بھی نہ تھا - مگر یہاں حساب ہی
دوسرا تھا - جانتا تو رہا ایک طرف وہ تو جیسے اس کے لئے دیوانی ہو رہی
تھی - تحریر کے لفظ لفظ سے محبت کی مجبوریاں اُجاگر تھیں - بیقراری اور
دلی کلفتوں کی روداد میں تغافل شعاریوں کا گلہ تھا -
ایک بار نہیں کئی بار اس نے پورا خط پڑھ ڈالا - ممکن ہے کچھ اندازہ
ہو جائے - لاکھ سر کھپایا مگر اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا - آخر یہ تسلیم کرتے
ہی بن پڑی کہ یہ خط اس کا نہیں ہو سکتا - اس کا اس تحریر سے دور کا بھی
واسطہ نہ تھا - دو ایک لڑکیوں کو وہ جانتا ضرور تھا مگر یونہی سی جان پہچان
تھی - کبھی کبھار ملاقات ہو گئی تو گھڑی دو گھڑی بات کر لی - وہ بھی ادھر
ادھر کی - بس اس سے زیادہ اس کے کسی سے تعلقات بڑھنے کی نوبت
نہ آئی - آج تک اس سے کسی لڑکی نے محبت نہ کی تھی نہ ہی اسے اب
تک کوئی ہستی ملی تھی جس پر وہ اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتا - جو اس
کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچا دیتی - اس شدت کا اظہار محبت تو کسی
ایسے ہی سے کیا گیا تھا جس کے کان ان پیار بھری باتوں سے آشنا ہو چکے
تھے ——— اور وہ ——— وہ تو ان میٹھے بولوں کے لئے ترس رہا تھا - ہر نوع
وہ کسی طرح بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ یہ خط اسی کو بھیجا گیا ہے - کسی
دوسرے ہی کا ہوگا - شاید غلطی سے پوسٹ مین اسے دے گیا ہے - اس
نے لفافہ اٹھا کر دیکھا - اسی کا نام لکھا تھا اور پتہ بھی ——— وہ پھر غور
کرنے لگا - مگر کوئی اُمید افزا نتیجہ نہ نکلا - اسے خط سے اُلجھن ہونے لگی
دماغ پر بوجھ سا چھانے لگا - آنکھیں جیسے کھٹکنے لگیں - وہ کچھ بوکھلا
سا گیا - جی چاہا کہ اس کے پرزے پرزے کر ڈالے کسی نے یونہی شرارت
سے لکھ دیا ہوگا - نہ یہ ہوگا نہ آئندہ دماغ سوزی کرنا پڑیگی -
اس نے لفافہ اٹھایا - احتیاطاً ایک بار پتہ پر پھر نظر ڈالی تو وہ

چونک پڑا سب کچھ ٹھیک تھا مگر بنگلے کا نمبر کچھ اور ہی تھا اس کے لبوں
پر خفیف سا تبسم بکھر گیا "بیٹھے بٹھائے بیکار کی کوفت" ایک شکستہ
انگڑائی لیکر وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا جیسے کسی بڑی مصیبت سے
جان چھڑا کر بھاگا ہو اور گنگناتا ہوا آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا -
لفافہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا - اُسے اپنے اس ہمنام سے رشک
ہونے لگا جس کا یہ خط تھا - ایک عورت کی محبت زندگی کو کتنا سہانا
بنا دیتی ہے - ہر وقت نظروں میں ایک چاند سا مکھڑا بسا ہو - کانوں
میں ہر گھڑی لوچدار سریلی آواز گونجا کرے - جھکتی پلکوں کے آغوش میں
شرمائی ہوئی مست انکھڑیوں کا تصور - پھول سے نرم نرم پیکر کو دبوچ
کر رسیلے لبوں کو چوم لینے کی بیتاب تمنا - اُف ! ایسی پیاری زندگی
کیا کہنے ! اس کا سینہ لمبی لمبی سانسوں سے پھول گیا - رگیں کپکپا
اٹھیں - کتنی عجیب بات ہے - وہ اُسی کے پڑوس میں رہتا ہے
اور اس کا ہمنام بھی - ایک لڑکی مخمور جوانی اس کے لئے پروانہ وار
بیقرار ہے - وہ ہے کہ اس کو خاطر میں نہیں لاتا - کاش وہ اُس کی
جگہ ہوتا - ایک تھلسی ہنسی آہ دل کی گہرائیوں سے ابھر کر اُس کے
ہونٹوں پر پھیل گئی -
کرسی کا بازو تھامے وہ دیر تک خوابناک نظروں سے لفافہ کو تکتا
رہا - پھر آہستہ سے اٹھا کر میز پر ڈال دیا کہ کسی ملازم کے ہاتھ بھجوا دیگا
لیکن ساتھ ہی اسے خیال آ گیا کہ یہ کام اسے خود ہی کرنا پڑے گا - لفافہ
خط نکالتے وقت بُری طرح پھٹ گیا تھا کسی کا خط پڑھ لینا یوں بھی
بُری بات ہے - پھر اس قسم کا خط ——— ! اسے اپنی غلطی پر ندامت ہونے
لگی - اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خود ہی جا کر خط دے اور
اظہار معذرت کرے - اس طرح وہ اس ہستی سے بھی نیاز حاصل کر سکتا
تھا جس کو وہ خود سے زیادہ خوش قسمت سمجھتا تھا -
خط رکھ کر وہ تھکا ہوا سا ایک کرسی کھینچ کر اُس پر جا بیٹھا لیکن
جلد ہی اٹھ کھڑا ہوا - اسے یاد آ گیا کہ خط میں بہت تاکید کے ساتھ
لکھا تھا کہ ایک شادی کے سلسلے میں لکھنؤ جاتے ہوئے شام کو

وہ کا پور قیام کریگی — ملنے کے لئے اصرار تھا - اس کی طبیعت کچھ نڈھال ہو رہی تھی - مگر وہ تیار ہو گیا - کئی دن پیشتر کا روانہ کیا ہوا خط یوں ہی دیر سے ملا تھا - اگر اور دیر ہو جاتی تو اس بیچاری کی آرزو آرزو ہی رہتی - اور یہ اسے کسی صورت میں گوارا نہ تھا - جھٹ پٹ کپڑے بدل وہ اسی وقت چل کھڑا ہوا - ابھی مکان تلاش کرنا تھا - نہ معلوم کتنی دیر میں پتہ لگے -

لیکن اسے تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی - سڑک کی پہلی موڑ پہ تین چار مکانوں کے بعد اسی کا مکان تھا - ایک ملازم بھی باہر ہی کھڑا ہوا مل گیا - جاتے ہی اس سے پوچھا - "پریم کمار بابو ملیں گے؟"

ملازم نے بے علمی ظاہر کی "یہاں تو کوئی پریم کمار بابو نہیں رہتے یہ تو ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ ہے"

وہ پھر تعجب میں گھر گیا - بنگلے کا نمبر اب کی وہ بہت احتیاط سے خط پہ تحریر کیئے ہوئے نمبر سے ملا چکا تھا - اس نے نوکر ہی کو انجان ٹھہرایا "معلوم ہوتا ہے تم ابھی نئے ملازم ہوئے ہو - اندر جا کر دریافت کرو - دیکھو وہ ہونگے"

وہ ہنسنے لگا "بھلا اس گھر میں مجھ سے زیادہ کون واقف ہوگا - آج دس برس سے کچھ اوپر ہو گئے مجھے اس گھر میں نوکری کرتے"

اب وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کہے - اتنا پرانا ملازم اور گھر والوں کو نہ جانے - دراصل وہ یہاں نہیں رہتا - اُسے چپ دیکھ کر نوکر بولا - "پتہ کہاں کا دیا تھا؟"

"اسی بنگلے کا"

اتنے میں کھٹ پٹ کرتا ہوا کوئی پشت کے دروازے سے باہر آیا ملازم کہنے لگا "لیجئے ڈاکٹر صاحب کی بٹیا آ رہی ہیں ان سے شاید کچھ پتہ چل جائے"

اس نے اس طرف گردن گھما کر دیکھا - سیاہ کنارے کی سفید ساڑی میں لپٹی ایک خوبصورت سی لڑکی ادھر ہی آ رہی تھی - نوکر کو کھڑا دیکھ کر بے تکلفی سے کہنے لگی - "تم ابھی تک گئے نہیں؟"

"بس جا ہی رہا تھا، آپ آ گئے" ملازم نے اس کی طرف اشارہ کیا "یہ کچھ پوچھ رہے ہیں"

لڑکی نے اب تک اُس کو نہ دیکھا تھا - نظر پڑتے ہی شرما گئی - ڈھلکا ہوا ساڑی کا پلو سینہ پہ ڈالتے ہوئے نزدیک آئی - "کہئے!"

"مسٹر پریم کمار سے ملنا ہے"

"پریم کمار؟" وہ سوچنے لگی - "یہاں تو کوئی صاحب اس نام کے نہیں"

ملازم جھٹ سے بول اٹھا - "دیکھیئے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا"

لڑکی نے اس بدتمیزی پہ اسے گھور کر دیکھا تو وہ چل کھڑا ہوا - وہ کہنے لگا -

"اس بنگلے کا نمبر ۱۲۰ ہے نا؟"

"جی ہاں"

"تب تو وہ یہیں رہتے ہوں گے"

"شاید - مگر مجھے تو معلوم نہیں"

"میں آپ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں"

"یہ میں نے کب کہا" وہ مسکرانے لگی - اور وہ گھبرایا کہ کہیں اسے غلط فہمی نہ ہو جائے کہ محض شرارت سے یونہی پریشان کر رہا ہوں - اُس نے صاف کہدیا - "بات یہ ہے کہ پوسٹ مین کی غلطی سے ان کا ایک خط میرے پاس آ گیا ہے - اتفاق سے میرا نام بھی یہی ہے اور پتہ بھی - یہیں نزدیک ہی رہتا ہوں - صرف بنگلے کا نمبر دوسرا ہے"

وہ چونک کر بولی "کیا نام بتایا آپ نے پریم کمار؟"

"جی!"

"اوہ، تو لایئے وہ خط مجھے دید یجئے"

"معاف کیجئے گا - یہ خط تو مجھے انہی کو دینا چاہیئے"

"آپ اطمینان رکھیں، انہی کو مل جائے گا" وہ مسکرا دی -

"لیکن غلطی سے میں نے اپنا خط سمجھ کر لفافہ کھول ڈالا ہے اس لئے" شرمندہ ہو کر اس نے سر جھکا لیا -

"کوئی بات نہیں"

"پھر بھی اُن کے علاوہ میں کسی کو نہیں دے سکتا - کچھ ایسی ہی بات ہے - اور آپ تو —" وہ مسکرا دیا - "انھیں جانتی بھی نہیں ضروری خط ہے - آج شام سے پہلے پہلے اُن کو مل جانا چاہیئے"

"آپ نے ٹھیک کہا - اس گھر میں ان کو کوئی بھی نہیں جانتا - مگر سب جانتے بھی ہیں"

اُس کی سمجھ میں یہ گتھی نہ آئی - ہکا بکا سا اس کا منہ تکنے - وہ ہنسنے لگی - "آپ کو یہ سن کر اور تعجب ہوگا کہ میرا ہی نام پریم کمار ہے" اس کے کہنے کے مطابق وہ اور حیرت زدہ ہو گیا گھبرا کر بولا - "آپ کا نام اور پریم کمار"

"جی ہاں! بات دراصل یہ ہے کہ جس زمانے میں ہم ہی اے کر رہے تھے ہمارے کالج میں ایک ڈراما کھیلا گیا "پریم لتا" میں نے ہیرو کا پارٹ کیا تھا اور آشا تھی ہیروئن - پہلے بھی وہ میری بہت گہری فرینڈ تھی مگر اس ڈرامے کے بعد سے تو وہ سچ مچ مجھے پیار کرنے لگی - اس میں ہمارے

نام تھے پریم کمار اور لتا دیوی - یہ نام اس کو کچھ اس قدر بھائے کہ وہ انہی ناموں کو ہر جگہ استعمال کرنے لگی - وہ ہے بھی کچھ شریر - اس میں بھی بس اس کی شرارت ہے - خط بھی اسی قسم کے لکھتی ہے - کئی بار منع کر چکی ہوں - مگر وہ باز نہیں آتی - کیا کیا جائے اب خط کا جواب بھی نہیں دیتی ہوں ——"

پریم کو اب خط دیدینے میں کیا تامل ہو سکتا تھا - "خوب -" وہ جیب سے خط نکالنے لگا - وہ اس کے مزید اطمینان کے لئے کہنے لگی - 'رادھا بھون آگرہ سے آیا ہوگا -" اس نے چپ چاپ خط اس کے ہاتھ میں دیدیا -

"شکریہ! بہت تکلیف اٹھائی آپ نے -"

"بینا! اسے بینا! یہاں آؤ بیٹی -" اندر سے آواز آئی - وہ ادہر متوجہ ہوئی - "آئی ماں جی!" اور پھر پریم سے کہا "میں ابھی آئی -" تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہ اندر چلی گئی -

کچھ دیر تک وہ کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا اور جب وہ آتی نظر نہ آئی تو چل کھڑا ہوا - سوچا اب یہاں ٹھہرنا فضول ہے - کوئی کام بھی نہ تھا - مگر گھر آکر یوں چلے جانے پر وہ پچھتانے لگا - ذرا دیر اور ٹھہر جاتا تو ہرج ہی کیا تھا - کہہ گئی تھی تو آتی ضرور - کچھ باتیں ہی ہوتیں - جتنا وقت اس کے پاس گزر جاتا وہی غنیمت تھا - بینا مرد تو مرد جس کی چاہت عورتوں کے دلوں میں گھر جائے بھلا اس کی رد چیں کیوں نہ بے چین ہو جائیں - دراصل وہ ہے بھی محبت کرنے کے قابل - لیکن اب اس کے لئے سوچنا بیکار تھا - شاید ہی ملنے کا موقع ملے - یہ سوچتے سوچتے اس کے دل پر ایک بوجھ سا چھا گیا - ساری امنگیں سرد پڑ گئیں -

لیکن اسے چین نہ آیا - شام ہوتے ہوتے وہ پھر وہاں جا پہنچا - دور ہی سے اس نے دیکھا - سفید رنگ کی ایک فٹن پھاٹک پر کھڑی تھی دو لڑکیاں اندر سے نکل کر اس پر سوار ہوئیں - بینا کو اس نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا - اور دوسری ——؟ اس کے متعلق اسے غور کرنے کی ضرورت نہ ہی کیا تھی؟ فٹن چلنے لگی تو وہ سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ چلنے لگا اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے - دل دھڑک رہا تھا - گردن ذرا سی گھما کر بار بار کنکھیوں سے پشت کی طرف دیکھ لیتا - وہ نزدیک آتی جا رہی تھی اور اس کے دل کی دھڑکن تیز —— پاس آکر فٹن ٹھہر گئی - ہولے ہولے دھڑکتا ہوا اس کا دل ایک بار زور سے اچھل پڑا - ٹانگیں کپکپا گئیں اندر سے بینا نے آواز دی -

"مسٹر پریم کمار ——!"

اس کی مراد بر آگئی - "جی" اور نزدیک چلا گیا -

"آپ نے تو میرے آنے تک کا انتظار بھی نہ کیا اور چلے گئے - میں تو ماں جی سے بس دو باتیں کرکے لوٹ آئی تھی -"

"مجھے گھر پر ایک ضروری کام تھا -"

"آج نہ ملتے تو بڑا دکھ ہوتا - دیکھئے یہ ہیں لتا دیوی -" بینا نے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کیا - اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "نمستے" اور پریم نے بھی ہاتھ جوڑ دیئے - "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی -" بینا کہنے لگی "ابھی ہم لوگ آپ ہی کی باتیں کر رہے تھے - اس خط سے آپ کو بہت پریشانی ہوئی - وہ تو کہئے آپ تھے - کوئی اور ہوتا تو آج ہی آگرہ کا سفر نہ کرتا تو ایک خط تو رادھا بھون کی طرف روانہ ہو چکا ہوتا -" پھر لتا کی طرف دیکھ کر کہا "اب ایسی شرارت نہ کرنا -" لتا کھسیانی ہو گئی - بات کا رخ بدلنے کے لئے کہنے لگی - "میرا ٹیلی گرام تم کو مل گیا تھا - مگر بینا نے اس پر کوئی توجہ نہ دی - پریم سے پوچھنے لگی - "کہاں جا رہے ہیں اس وقت آپ؟"

وہ جانتا ہی تھا کہ اس وقت وہ لوگ کہاں جا رہی ہیں - ایک بار تو چوک ہو گئی تھی - ابکی اس نے اس مناسب موقع کو نہ چھوڑا - کہنے لگا "ذرا اسٹیشن تک جا رہا تھا - ایک صاحب سے ملنا ہے -"

"تب تو ٹھیک ہے - ہم لوگ بھی تو اسٹیشن ہی جا رہے ہیں - آیئے کچھ باتیں ہی ہو جائینگی - لتا دیوی ساتھ ہیں -"

وہ چپ چاپ اندر جا کر سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گیا - لتا نے سہمی ہوئی نظروں سے دونوں کو دیکھا - اس کا خوف ٹھیک ہی نکلا - بینا تمام راہ اسے ستاتی رہی - پریم کی ذات سے اسے بہت مدد مل رہی تھی لتا کچھ بولی مگر اس کی چلی نہیں - مجبوراً چپ سادھتے بن پڑی - ہاں اس مدت میں وہ بینا سے خاصہ بے تکلف ہو گیا اور لتا کی نظروں میں اجنبی نہ رہا -

اسٹیشن پر پہنچے تو ٹرین تیار ہی کھڑی تھی - لتا کے پتا باہر ہی رخ بیٹھے تھے - پریم کو ساتھ دیکھ کر لتا سے بولے "میں نے آپ کو پہچانا نہیں" وہ کچھ گھبرا سی گئی - نہ معلوم کیوں - دراصل وہ اس کے متعلق ٹھیک سے کچھ جانتی بھی نہ تھی - آہستہ سے اس سے بولی "معاف کیجئے" اور بات بنانے کے لئے پتا سے یونہی کہدیا - "آپ مسٹر پریم کمار ہیں بینا کے پرائیویٹ ٹیوٹر -"

وہ کچھ اونچا سنتے تھے بولے "کیا کہا؟ منگیتر؟ منگیتر ہیں؟ بھئی سندر جوڑا ہے - میں ڈاکٹر صاحب کی پسند کی تعریف کرونگا - کر رہے ہیں آج کل آپ؟"

"پڑھ رہا ہوں"

انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا زور سے کہا۔ "بھئی ذرا زور سے بولو۔ مجھے کم سنائی دیتا ہے"

بینا کٹی جا رہی تھی۔ "چاچا جی کے کان تو بہت بُرے ہیں"

تنا کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ دہری ہوئی جا رہی تھی۔ پریم بھی مسکرانے لگا۔ ان کی باتوں کا جواب نہ دے سکا۔ تنا کے تپانے جو سب کو ہنستے دیکھا تو چپ ہو گئے۔ سمجھ گئے کہ ان کی باتوں پر ہنس رہے ہیں۔ پیٹھ موڑ کر مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اب تنا کی بن آئی تھی لگی بینا کو چھیڑنے۔

"مسٹر پریم مٹھائی کھلائیے۔ یوں مفت میں منگنی نہ ہونے دونگی"

"میں تو ہر وقت تیار ہوں۔ مگر آپ بینا دیوی کی مہمان ہیں۔ وہ بُرا مان جائینگی" اس نے بینا کی طرف دیکھا اور اس نے بھی۔ دونوں کی نظریں ملیں اور پھر جھک گئیں۔ ادھر گارڈ نے سیٹی دیکر سبز جھنڈی لہرائی۔ انجن بُری طرح چنگھاڑا۔ تنا کے تپانے گھبرا کر چلانا شروع کیا۔

"اب چلی آؤ۔ گاڑی چلنے والی ہے"

وہ بینا کے پاس گئی۔ "اچھا اب چل رہی ہوں۔ پھر ملوں گی" لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ تنا پریم کو نمستے کرتی ہوئی اندر جا بیٹھی۔

گاڑی چلنے لگی تو تنا نے چیخ کر کہا۔ "پریم بابو میں مٹھائی کھائے بغیر چھوڑوں گی نہیں۔ ذرا بارات سے لوٹ آؤں"

وہ صرف مسکراتا رہا۔ گاڑی دور جا چکی تھی۔ پھر کہتا بھی کیا؟ تنا کھڑکی سے مُنہ نکالے جھانکتی رہی۔ دونوں دور تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور جب پریم نے پلٹ کر دیکھا تو بینا وہاں نہ تھی۔ نہ معلوم کب کی جا چکی تھی ——!

شوکت صدیقی لکھنوی

بھول جاؤں

نشاط و کیفِ جاں کو بھول جاؤں
میں اور پیرِ مغاں کو بھول جاؤں

کچھ ایسی تو پلا آنکھوں سے ساقی
شرابِ ارغواں کو بھول جاؤں

نہ سوجھے کوئی پستی و بلندی
زمین و آسماں کو بھول جاؤں

ستم میں کر تو پیدا ایسی جدّت
کہ جورِ آسماں کو بھول جاؤں

بھلا ایسی توقع —— اور مجھ سے
تم ایسے مہرباں کو بھول جاؤں

نیا بابِ محبّت کا ہو آغاز
پرانی داستاں کو بھول جاؤں

ارے صیّاد ناممکن ہے مجھ سے
قفس میں آشیاں کو بھول جاؤں

تقاضا ہے یہی اب دشمنوں کا
کہ میں اردو زباں کو بھول جاؤں

بتوں کے عشق میں کس طرح اے رازؔ
خدائے دو جہاں کو بھول جاؤں

سید بچل شاہ رازؔ

مضمون

فن نیرنجات پر ایک طائرانہ نظر

دیگر علوم متبرہ کی طرح فن نیرنجات بھی ہندوستان ہی کا گرانبار احسان ہے۔ ہندوستان کی قدیم سنسکرت اور پراکرت کتابوں کے مطالعہ نے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچاتی ہے کہ اس ملک میں فن کیمیا۔ سیمیا اور لیمیا کے جاننے والے بکثرت تھے۔ کیونکہ تارک الدنیا رشی اور منی اشخاص کی کثرت تھی اور بقول مولانا روم سہ

کیمیا و سیمیا و لیمیا ایں نہ باشد جز بذاتِ اولیا

اہل ہند اس کے اہل بھی تھے۔ کیمیا میں ہفت احباب و ہفت ساگر نامی کتابیں مشہور ہیں۔ سیمیا کے اصل معنی اس طلسم کے ہیں جس کی وجہ سے روح کا انتقال دوسرے بدن میں کیا جا سکے۔ اور ایسی اشیائے موہوم جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہ ہو۔ لیمیا سے مراد ان شعبدوں سے ہے جو اشیا کی لاگ سے اپنا رنگ یا ہیئت بدل سکیں۔ جیسے گندھک کے دھوئیں سے سرخ پھول کا سفید ہو جانا۔ یا گل گڑھل کا عرق چھری پر مل کر اس سے لیموں تراشنا جس کی وجہ سے لیموں سے خون کی طرح سرخ رنگ ٹپکتا ہے۔ بعض اوقات اشیا کے مس یا تعلیق سے فائدہ حاصل کرنا بھی فن لیمیا ہی کی بدولت میسر ہوتا ہے۔ جیسے مرگی کے لئے عود صلیب کا گردن میں تعلیق کرنا۔ کھانسی کے لئے برگ سداب کا گلے میں باندھنا جلد دانت برآمد ہونے کے لئے کہربا کا ہاتھ پر باندھنا۔ طاعون کے لئے درونج عقربی یا پپیتے کا تعلیق کرنا، درخورد سال بچے کے نیند میں ڈرنے کے لئے بلور کا سرہانے رکھنا وغیرہ وغیرہ

اگرچہ آج کل فن کیمیا مفقود ہے تاہم لیمیا و سیمیا کے جاننے والے صدہا سادھو سنیاسی ہر جگہ اپنا الو سیدھا کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض آہنی خاردار پلنگڑیوں پر برہنہ بیٹھے ہوئے یہ جتانا چاہتے ہیں کہ ان کے سخت اجسام میں نوکدار اشیاء کیلیں یا کانٹے اثر نہیں کرتے۔ کوئی اپنی کھڑاؤں پر گھونگچی سفید کا لعاب مل کر بغیر کھونٹیوں کے چل کر تیا ہے کوئی لنگر بگڑ یا چرخ کے چمڑے پر آسن جمائے سطح آب پر بہا چلا جاتا ہے کوئی ایک قسم کی پتیوں کو ہاتھ پیروں پر مل کر بھڑوں کے چھتوں یا مگس عسل کے چھال میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ کوئی حنظر گھی کوار پیروں کے تلوؤں پر مل کر آگ پر چلنے کی مشق کرتا ہے۔ ہندوستان میں دعا یا منتر پڑھ کر ناک۔ کان چھیدنے والے فقرا بھی موجود ہیں جن کے لب لگاتے ہی خون بند ہو جاتا ہے۔ بعض فقرا ہاتھ پاؤں۔ سر کاٹ کر پھر لب لگا کر جوڑ دیتے ہیں۔ اس فن خاص میں خاندان رفاعیہ مہارت تامہ رکھتا ہے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے زمانہ میں اجیپال جوگی اتنا بڑا ساحر تھا کہ وہ آسمان سے پتھر برساتا تھا اور ہوا میں اڑتا تھا۔ حبس دم کر کے صدہا برس زندہ رہنے والے سادھوؤں کی سمادھیاں کھدائی کر کے بارہا منظر عام پر لائی گئی ہیں۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان نے کوئی تاریخی ثبوت ان واقعات کے متعلق ضبط تحریر میں لانے کی کوشش نہیں کی۔

عربی عملیات کی کتابوں میں کہیں کہیں طلطم ہندی کا پتہ چلتا ہے جس نے عرب و عجم کے چند اشخاص کو فن سحر و عزائم سے بہرہ اندوز کیا تھا ہند کی طرح فارس۔ یونان۔ رومتہ الکبریٰ اور چین بھی ساکت ہیں حالانکہ چین کی قدامت مسلم ہے۔ بابل و نینوا اور قراطجنہ کی تاریخ سے بھی علم سحر نیرنجات پر کما حقہ روشنی نہیں پڑتی۔ حالانکہ ہندیوں کی طرح یہ اقوام قدیمہ فن سحر و عزائم میں کافی دسترس رکھتی تھیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ جملہ اقطاعئے عالم میں صرف مصر ایسا ملک ہے جس کی تاریخ کامل طور پر محفوظ ہے۔ اس میں قبل از طوفان نوح اور بعد از طوفان نوح کے فرمانروایان متقدر کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ چنانچہ مولوی سید علی حسن خاں صاحب مرحوم نے "طلائع المقدور من مطالع الناہور" میں: ان ساحرین اور ماہرین علم نیرنجات کا حال درج فرمایا ہے جو مصر میں قبل از طوفان نوح ہو گزرے ہیں۔ ہم ان کا اقتباس بغرض معلومات درج ذیل کرتے ہیں۔

نقراوش حبابہ بن مصرائیم کاہن و طلسم دان تھا۔ اس نے شہر میں متعدد اعجائب بنائے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ وسط شہر میں سیاہ پتھروں کی دو مورتیں بالمقابل نصب کی گئی تھیں۔ دونوں مو کے درمیان ہو کر جو چور گزرنا چاہتا اسے مورتیاں گرفت میں لے!

یں۔ اسی بادشاہ کا پوتا (نبیرہ) زبردست ساحر تھا۔ شیر پر سوار ہوتا تھا
باطین کو مسخر کر رکھا تھا۔ اپنے باغ میں ایک ایسا درخت لگا رکھا تھا
ایں ہر قسم کے پھل نکلتے تھے۔ بوقت شب چہرے پر کوئی چمکیلی چیز
لیتا تھا جس سے لوگ بیحد خائف ہوتے تھے۔

شاہان مصر قدیم میں عریاق نامی بادشاہ تھا۔ اس نے ایک نحاسی
رخت اس صنعت کا بنایا تھا کہ اس پر جو پرندہ آکر بیٹھتا بیہوش ہو جاتا
ا۔ بہ اسے پکڑ لیتا تھا۔ جادو کے بل بوتے پر پرائی مستورات کا اغوا کیا
یا تھا۔ ہاروت و ماروت اسی کے عہد میں تھے۔ لوجیم ربن نقاوش کے
مد میں کوؤں کی اس قدر کثرت ہوئی کہ ہری بھری کھیتیاں کھا گئے
س نے فن لیمیا کی بنا پر ملک کے ہر چہار گوشوں میں ایسے منتر نصب کئے
تمام کوے دفع ہو گئے۔ اسی بادشاہ نے ایک قبہ سات ستونوں پر
ائم کیا تھا۔ اس میں سات دروازے لگائے تھے۔ ہر دروازے پر
یک ایک بت نصب تھا جس کے سامنے جب دو لڑنے والے نائے جاتے
وہ بت زیادتی کرنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ سوریہ نامی
ادشاہ نے جسے بانی اہرامات بتایا جاتا ہے ایک ایسا آئینہ شہر میں
صب کر رکھا تھا جس میں جملہ اقلیمیں نظر آتی تھیں اور اس سے قحط
طوفان کا حال ظاہر ہوتا تھا۔ اسی بادشاہ نے ایک ایسی مورت بنائی
تھی کہ عورت گود میں بچہ لیئے ہوئے تھی۔ عورت کے مس کرنے سے عورت
کا مرض رفع ہوتا تھا اور بچے کو مس کرنے سے بچے مرض سے نجات پاتے
تھے۔ کتاب مذکور میں یہ بھی درج ہے کہ ہر ہرم پر خازن روحانی مقرر
ہے۔ آج یہ قول صداقت پر مبنی نظر آتا ہے کیونکہ جب توت عنخ (آمن)
کی نعش نکالنے کا کام جاری تھا کئی اشخاص کو اپنی جان سے ہاتھ
دھونا پڑا تھا۔ اس سے قبل اہرام سے نکالی ہوئی جملہ نعشوں نے بھی
یہی اثر دکھایا تھا۔ چنانچہ برٹش میوزیم میں رکھی ہوئی نعشوں کے متعلق
بھی ۔۔ روایات مشہور ہیں۔

علامہ سیوطی نے اپنی کتاب تعدد تاریخ میں درج فرمایا ہے کہ بعد از
طوفان نوح بھی مصر نے اپنی ساحرانہ عظمت قائم رکھی۔ چنانچہ لغطر یم
کے عجائب خانے میں پانی کا ایک ایسا ستون تھا جو نہ بہتا تھا نہ گرتی
سے پگھلتا تھا۔ اس عجائب خانے میں ایک حوض فلسطین نام تھا جس پر
پرواز کرتا ہوا اگر کوئی پرندہ گزرتا تو وہ فوراً حوض میں گر پڑتا تھا۔
یہاں ایک خاص ستون بھی گڑا تھا جس کی وجہ سے شہر میں
حشرات الارض داخل نہ ہو سکتے تھے۔ شہر الوامات میں ایک ایسی
عورت نصب کی گئی تھی جس کو چھونے سے نامرد سحر کی قوت رجولیت

عود کر آتی تھی۔ اسی شہر میں ایک اور منتر تھا جس کو مس کرنے سے عورت
کے دودھ آجاتا تھا۔ ایک شہر میں ایسی تمثال روحانی نصب کی گئی تھی جو
بدکار مرد و عورت کو پکڑ لیتی تھی۔ سناؤش نامی بادشاہ نے شہر کے گرد ایسے
طلسمات بنائے تھے جن کے سر وحشی جانوروں کی طرح اور ہاتھ آدمیوں کے
سے تھے ان سے جلب منافع اور دفع مضار کا کام لیا جاتا تھا۔ اسی بادشاہ نے
ایک ایسا قبہ بنایا تھا جو بادل کی طرح موسم سرما و گرما میں برستا تھا،
قبے کے نیچے سبز پانی بھرا ہوا تھا جس سے ہر مرض کا علاج کیا جاتا تھا۔
مرقونس بادشاہ نے ایسا درہم بنایا تھا جس کے ساتھ اگر کوئی چیز تولی
جاتی تو وہ وزن میں دس گنا زیادہ ہوتی تھی۔ کاشم (فرعون ششم) نے
کئی طلسمات بنائے تھے منجملہ ازاں ایک تنور تھا جس میں بغیر آگ کے
گوشت بھونا جاتا تھا۔ اور روٹیاں پک جاتی تھیں ایک ایسی ہانڈی تھی
جو بے آگ بخت و پز کرتی تھی۔ ایک ایسی چھری تھی جس پر بہایم خود بخود
گر کر ذبح ہو جاتے تھے۔ مصر میں ایسے حمام بھی تھے جو خود بخود گرم ہوتے تھے
خزائن مصر میں ایک ایسا درہم تھا جو کسی کے پاس نہ ٹھہرتا تھا۔ حوالی مصر
میں ایک ایسا ظرف پایا گیا تھا جس میں پانی ڈالتے ہی تیمر ہو جاتا تھا۔
مصر کے ایک بادشاہ نے ایسا آئینہ بھی بنایا تھا جس میں معمولی بیمار صورت
دیکھتا تو شکل دکھائی دیتی اور اگر جانبر نہ ہونے والا مریض دیکھتا تو اس
کی صورت نظر نہ آتی۔ دلوکا بنت زبا کو مصر کی ایک رانی تھی۔ اس نے
ایک ساحرہ کی مدد سے کر وسط شہر منف میں ایک گھر اندرون قلعہ تعمیر کر کے
اس کے ہر چہار جانب ہاتھیوں، خچروں، گدھوں، گھوڑوں اور آدمیوں
کی مورتیں بنوائیں۔ اور کہا جدھر سے دشمن آئے گا ادھر کی مورتیں
حرکت کر سکیں گی اور مورتوں کے جن اعضا و جوارح کو توڑا جائے گا
دشمن اور اس کی فوج کے وہی اعضا ٹوٹ جائیں گے۔ چنانچہ اس کو بخوبی
مدد پہنچتی تھی اور ساحرہ کا کہا سچ ثابت ہوا۔

مندرجہ بالا واقعات اگرچہ تاریخی ہیں مگر مرور ایام کے تہ در تہ
غلافوں میں پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ قارئین کرام انہیں
مشکوک نگاہوں سے دیکھیں۔ مگر اسی مضمون میں آگے چل کر درج ہونے
والے شاہ جہانگیر کے عہد کے تعجب انگیز شعبدوں کا حال پڑھ کر تسلیم
کرنا پڑے گا کہ مصر کے ساحروں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے مبالغہ آمیز
نہیں ہے۔ سحر کی طاقت کو قرآن کریم نے بھی مانا ہے۔ چنانچہ قصہ ہاروت
و ماروت اس امر کا شاہد ہے۔ حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں فرعون نے جو
جادو دکھایا تھا وہ نظر بندی کا کھیل ہونے کی وجہ سے سیمیا کی قسم سے تھا
شاہ جہانگیر کے دربار میں بنگالہ کے چند شعبدہ باز آئے تھے

ہوں نے ۱۹ حیرت انگیز شعبدے دکھائے تھے۔ ان کا ذکر خود شاہ جہانگیر نے اپنی تزک میں کیا ہے۔ ان میں سے چند شعبدوں کا حال ہم بغرض تفنن طبع ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) شعبدہ بازوں نے دعویٰ کیا کہ جس قسم کا درخت کہو ہم زمین سے اگا دیں گے۔ انہوں نے جس قسم کا درخت چاہا وہ اگ آئے گا۔ چنانچہ شعبدہ بازوں نے ان کے گرد چند چکر کاٹے۔ جس نے جس درخت کی خواہش کی وہ پھوٹنے لگا۔ خان جہاں نے درخت توت طلب کیا۔ کسی نے آم کا درخت اگایا کسی نے سیب کا کسی نے جوز کا کسی نے نارجیل کا۔ حالانکہ ان کے سوا کسی نے شمالی ہند میں درخت نہ دیکھا تھا۔ سب درختوں میں پھول لگے پھل آئے۔ جوز کے پھولوں سے دربار معطر ہوگیا۔ آم اس قدر شیریں اور پُر ذائقہ تھے کہ ہر ایک نے اعتراف کیا کہ ایسے عمدہ آم کبھی کھانے میں نہ آئے۔ سیب بھی نہایت لذیذ تھے۔ اس کے بعد درختوں پر خوش آئند پرندے چہچہانے لگے اور ایسی دلآویز نغمہ سنجی کی کہ کسی پرندے سے تمثیل نہیں دی جاسکتی۔ آخر پرندے اڑ گئے اور درخت زمین میں غائب ہوگئے۔

(۲) ایک بڑی سی خالی دیگ منگوا کر اس میں بہت پانی بھر کر بیس من چاول ڈالدیئے گئے۔ دیگ کے نیچے آگ نہ تھی۔ دیگ خود بخود جوش میں آئی۔ چاول کھد کھد کرنے لگے۔ دیگ سے کھانے کی خوشبو آنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد دیگ کھول کر سو برتنوں میں کھانا نکالا گیا نہایت خوش مزہ اور نرم وگداز تھا۔ مزید براں اندر سے سو کباب نکلے ہر برتن میں ایک ایک کباب رکھدیا گیا۔ اتنا لذیذ تھا کہ ہر کھانے والا انگلیاں چاٹتا رہ گیا۔

(۳) شعبدہ بازوں نے اپنے پاس سے ایک فوارہ نکال کر زمین پر رکھدیا اس کے گرد تین بار طواف کیا۔ فوارہ فوراً اڑنے لگا۔ اس میں سے ہر دم نئے نئے رنگ کا پانی دس گز بلند ہوکر مینہ کی طرح برستا تھا اور زمین معلوق تر نہ ہوتی تھی۔ جب فوارے کو اٹھا کر دوبارہ زمین پر رکھا گیا تو اس میں سے عجیب وغریب آتش بازی کی مہتاب وغیرہ نکلنے لگے اور یہ بار بار ہوتا رہا!

(۴) ایک شخص بادشاہ کے روبرو آکر بیٹھ گیا اور لیٹ گیا۔ دوسرا آیا اور جست کرکے پہلے کے کاندھے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ تیسرے نے ایک کر دوسرے شخص کے پاؤں پر اپنا پاؤں جما دیا۔ چوتھے شخص نے تیسرے کے پاؤں پر سر رکھدیا اور الٹا کھڑا ہوگیا۔ اسی طرح سات آدمی یکے بعد دیگرے ایک پر ایک سر کے بل کھڑے ہوگئے جس کی وجہ سے سو گز کی لاٹھی بن گئی۔ اس کے بعد ایک شخص آیا جس نے سب سے نیچے کے آدمی کے دونوں پاؤں پکڑ کر زمین سے اٹھالیا اور اپنے کندھے پر رکھ کر صحن میں گشت کرنے لگا۔

(۵) ایک کپڑے کی تھیلی لائی گئی جس کو خوب الٹ پلٹ کر یہ بتایا گیا کہ بالکل خالی ہے۔ بعد ازاں جو ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو دو خوش رنگ مرغ نکلے۔ زمین پر چھوڑتے ہی اس قدر لڑے کہ پروں سے آگ نکلنے لگی جامنی پردہ کھینچا گیا۔ جو ہٹایا تو دو چکوریں لڑتی ہوئی دکھائی دیں اور ان کا چہچہانا باہمی جھگڑا چکوروں کے مانند تھا۔ پھر پردہ کیا گیا۔ اور اٹھایا تو دو سانپ لڑتے نظر آئے جن کا رنگ قرمزی تھا اور بعض سبز تھے۔

(۶) دو خیمے منگا کر کسی قدر فاصلے پر کھڑے کئے گئے۔ اور ان کے پردے اٹھا کر ناظرین کو بتایا گیا کہ بالکل خالی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دو آدمی لنگوٹ کسے ہوئے اندر داخل ہوئے اور آواز دی کہ چرند و پرند کی قسم سے جو جانور درکار ہو حاضر کیا جائے گا۔ اور ان کی لڑائی بھی دکھائی جائے گی۔ خان زماں نے متبسم ہوکر کہا "بھلا شتر مرغ کا جوڑا تو نکالو اور ان کی لڑائی کی شان دکھاؤ" فوراً دو شتر مرغ خیمے سے برآمد ہوئے اور اس شد و مد کے ساتھ لڑے کہ ان کے سر لہولہان ہوگئے۔ اس کے بعد مرزا خرم (شاہجہاں) نے دو نیل گایوں کی فرمائش کی۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی اور دو نیل گائیں لڑتی نظر آئیں۔ الغرض جس جانور کے لئے خواہش ظاہر کی جاتی وہ خیموں سے برآمد کیا جاتا تھا۔

(۷) ایک کمان اور ۵۰ تیر منگا کر ایک شعبدہ باز نے تیر چلے میں رکھ کر آسمان کی طرف چلایا اور تیر اوپر جاکر رک گیا۔ دوسرا تیر مارا وہ پہلے تیر سے جا لگا اور اس کے نیچے لٹک گیا۔ الغرض پچاسوں تیر اسی طرح اوپر تلے جم کر ہوا میں معلق ہوگئے۔ اور اوپر سے نیچے تک ایک لکیر سی بن گئی۔ اس کے بعد جو تیر پھینکا تو وہ تمام تیروں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہوا چلا گیا اور سب تیر جستہ جستہ زمین پر آگرے۔

(۸) ایک شعبدہ باز نے طشت پانی سے بھرا۔ اور ایک سرخ پھول ہاتھ میں لیکر کہا کہ "حضور جو رنگ پسند فرمائیں وہی رنگ پھول اختیار کریگا" یہ کہہ کر جو پھول کو طشت میں غوطہ دیا تو زرد تھا پھر جو غوطہ دیا تو آبی ہوگیا۔ پھر جو ڈبو کر نکالا تو سبز تھا۔ الغرض جتنی بار غوطہ دیا اتنی بار رنگ بدلتا رہا۔

(۹) ایک پانی کا آفتابہ منگا گیا۔ اس میں پانی ڈالا اور ٹونٹی سے بہانا شروع کیا۔ آفتابے سے کئی مشک پانی بہایا گیا۔ پھر بھی لوٹا خالی نہ ہوا۔ جوں کا توں لبریز تھا۔

(۱۰) دس خالی مرتبان منگا کر سب کے روبرو سرپوش سے ڈھک

گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب سرپوش دور کئے گئے تو کسی مرتبان
میں خالص تھا کسی میں مربہ کسی میں اچار اور کسی میں ساقی عروسان
کی ایک مشہور شیرینی تھی۔ الغرض سب مرتبانوں میں جدا جدا
مزہ اشیائے خوردنی بھری ہوئی تھیں۔

(۱۱) شاہی کتب خانے سے گلستاں طلب کی گئی۔۔۔ سب کو دکھا کر جزدان
میں رکھ کر بادشاہ جہانگیر کے ہاتھ میں دی گئی۔ دیکھا تو دیوان حافظ تھا۔
جزدان میں ڈال کر نکالا تو دیوان اہلی شیرازی تھا۔ غرض جتنی دفعہ
نئی دفعہ نئی کتاب نکلی۔

(۱۲) ایک شعبدہ باز نے آسمان کی طرف نگاہ کر کے کہا کہ "حضور عالی!
اوپر راجہ اندر کی دیوؤں کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے۔ میں راجہ اندر
کی مدد کے لئے جاتا ہوں بیوی کو حضور کی نگرانی میں چھوڑتا ہوں۔ زندہ رہا
تو واپس آؤنگا۔ ورنہ جس طرح پسند خاطر ہو بیوی کا انتظام کر دیجئے گا
پھر باریک سی رسی نکالی۔ اس کا ایک گولا بنا کر آسمان
کی طرف اچھالا۔ وہ سیدھا ہوا میں تن گیا۔ شعبدہ باز اس کی مدد سے
چڑھ کر نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رسی سرخ ہو گئی
اس میں سے خون ٹپکنے لگا۔ پھر شعبدہ باز کا پاؤں زمین پر گرا۔ (۳۱)
دوسرا پاؤں نیچے آ پڑا۔ پھر دونوں ہاتھ زمین پر آ پڑے۔ پھر سر
تن سے جدا ہو کر نیچے آ پہنچا۔ اور بعد ازاں دھڑ زمین پر گرا۔ شعبدہ باز کی
بیوی نے یہ حال دیکھا گریہ و زاری شروع کی کہ میں اپنے مردہ خاوند کے
ساتھ ستی ہونا چاہتی ہوں بادشاہ نے ہر چند اسے ڈرایا دھمکایا باز رکھنا
چاہا مگر وہ نہ مانی اور مردہ شوہر کے اعضا کو گود میں لئے ہوئے چتا میں کود
پڑی اور چشم زدن میں راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔ چند منٹ بعد مرد صحیح و
سالم اتر آیا۔ دربار شاہی کی خدمت میں تسلیم کر کے عرض کیا کہ میں تو
جیتا جاگتا ہوا واپس آ گیا۔ بادشاہ نے کہا۔ بیوی اپنے اوپر ہونے کے بعد
بڑے جلال حضور کے چند دیگر کاٹ کاٹ کر گر پڑے۔ اس نے تیری بیوی
سب کو لے کر ستی ہو جانے کی اجازت طلب کی۔ اس کی محبت اور گریہ
و زاری دیکھ کر ہم نے مجبوراً اجازت دینا پڑی۔ کہا حضور عالی! غریب عاجز
پیٹ پوری ... واپیاں ملک کے لئے زیبا نہیں۔ مجھے یقین نہیں
کہ وہ ستی ہو گئی۔ وہ ضرور زندہ ہے۔ اور آپ نے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔
بات دیجئے کہ اسے آواز دوں۔ بادشاہ نے ہنس کر کہا اچھی بات ہے عورت
کو آواز دیگی۔ شعبدہ باز نے بیوی کو نام لے کر پکارا تو عورت فوراً
بادشاہ کے تخت کے پیچھے سے نکل آئی اور مودبانہ سلام کیا۔ جملہ حاضرین
عش عش کرنے لگے۔

سفرنامہ ناصر الدین شاہ قاچار میں بھی چند شعبدوں کے واقعات
درج ہیں جو چنداں تحیر خیز نہیں تاہم مورخانہ حیثیت رکھتے ہیں اس
لئے ہم قارئین کرام کو لطافت اندوزی نے کا موقع دیتے ہیں۔ دوران
سفر بلجیم میں ایک شعبدہ باز (شعبدہ باز) نے شاہ قاچار کو چند شعبدے دکھلائے
جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) لوگوں کی جیبوں سے چند گھڑیاں نکالیں اور کہا دیکھو وقت
کیا ہے۔ سب نے متفق الکلمہ ہو کر کہا تین بجے ہیں۔ پھر ایک سے کہا۔
دیکھو تمہاری گھڑی میں چار بجے ہیں۔ دوسرے سے کہا تمہاری گھڑی میں
آٹھ بجے ہیں۔ تیسرے سے کہا تمہاری گھڑی میں دو بجے ہیں تو واقعی اس
کی گھڑی میں سوئیاں دو ہی کے ہندسے پر تھیں اور ہر ایک کی گھڑی میں
شعبدہ باز کے کہنے کے مطابق وقت تھا۔

(۲) ایک بڑا سا قفل کنجی سے بند کر دیا۔ سب نے دیکھا لگا ہوا تھا
حاضرین سے کہا فرمائیے کتنے عدد گننے کے بعد قفل کھلے گا۔ بارہ کے عدد پر
بارہ کا عدد پورا ہوا ہی تھا کہ قفل کھل گیا۔

(۳) معتمد الملک سے کہا۔ کاغذ پر چند جملے تحریر کیجئے انھوں نے لکھا
اور کاغذ موڑ کر شعبدہ باز کے ہاتھ میں دیدیا اس نے بند شدہ کاغذ کو سب
کے سامنے جلا دیا الماری میز کے خانے سے ایک بڑا سا ملفوف لفافہ نکالا جو
سربمہر تھا۔ اور معتمد الملک کو چاک کرنے کے لئے کہا۔ چاک کرنے پر دوسرا لفافہ
برآمد ہوا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے میں ملفوف لفافے نکلے۔ آخری لفافہ
میں وہ چٹھی نکلی جس پر معتمد الملک کی تحریر تھی۔

(۴) چار بڑے بڑے پیسے ایک صندوقچے میں جدا جدا رکھے اور
صندوقچہ ایک آدمی کے ہاتھ میں دیا۔ پھر کسی قدر فاصلے پر ایک میز رکھی۔
میز پر چینی کا گلدان رکھا اور کہا اے پیسو! صندوقچے سے نکل کر گلدان
میں چلے آؤ۔ پیسے جھنکار کے ساتھ گلدان میں جاتے ہوئے دکھائی دیئے
صندوقچہ دور تھا اور پہلے گلدان سب کے سامنے خالی بتا چکا تھا۔

اسی طرح ممالک عثمانی کے سفر کے دوران میں بھی چند شعبدے
دیکھے ان کا مختصر حال درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(۱) شعبدہ باز نے ایک باریک لکڑی نکالی۔ جس میں کسی قسم کا
سوراخ نہ تھا۔ اس پر جونہی ہاتھ پھیرا اس سے کناری نام کا ایک پرندہ
نکلا جو اڑ کر ایک طرف جا بیٹھا۔ یہ پرندہ چڑیا کے برابر تھا۔ پھر اعتضاد الدولہ
سے یاقوت کے نگینے کی انگشتری مانگی اور میز پر دو لیموں رکھ دیئے اور
کہا ان میں سے ایک لیمو پسند کر لیجئے۔ دوسرے لیمو کو کاٹ کر بتایا
کہ اس میں کچھ نہیں ہے۔ انگوٹھی اوپر اچھالی کہ گم کر دی پھر پرندے کو

بلبل دل کر ہاتھ میں غائب کر دیا۔ پھر پسند کردہ لیموں کو کاٹا۔ اس میں سے کناری نکلی۔ جس کے پاؤں میں سرخ دھاگہ تھا اور دھاگے سے انگوٹھی بندھی ہوئی تھی۔

(۲) شعبدہ باز نے صدر اعظم سے ایک رومال یعنی دستی مانگا۔ اسے چاقو سے ٹکڑے کر کے ایک بندوق کی نلکی میں بھر کر نلکی بندوق میں نصب کر دی۔ بعد ازاں ایک صاف شفاف دستی لیکر اسے جلا کر خاک سیاہ کر ڈالا۔ خاک منہ سے پھونک کر اڑا دی۔ پھر چار سگار کی ڈبیاں نوکروں کی جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیں اور صدر اعظم سے کہا کہ ایک انتخاب کر کے اٹھا لیجئے۔ بعد ازاں شعبدہ باز نے ایک سگریٹ توڑی اس میں سے ایک زندہ قمری نکلی جس کے پاؤں میں صدر اعظم کی دستی بندھی تھی۔ اس کے بعد اس سگریٹ کی ڈبیہ سے دوسری دستی نکالی۔ جو صدر اعظم کے ہاتھ میں تھی۔ دستی باوجود جلائے جانے کے ثابت اور بے عیب تھی۔

(۳) اس کے بعد شہزادہ اعتضاد الدولہ کی انگشتری لے کر میز پر رکھ دی۔ پھر اٹھا کر دور پھینک دی۔ دو تربوز میز پر رکھے۔ ایک پسند کرنے کے لئے کہا۔ انتخاب شدہ تربوز کو کاٹا تو مرغی کا انڈا برآمد ہوا۔ انڈا توڑا تو اس میں سے ایک سالم اخروٹ برآمد ہوا۔ اخروٹ کو توڑنے کے لئے کہا تو اندر سے اعتضاد الدولہ کی انگوٹھی برآمد ہوئی۔ اور تمام حاضرین متحیر ہو گئے۔

بشیر احمد بُرہانپوری

تازہ قیامت

اک تازہ قیامت تھی وہ سرشار جوانی
سرشارِ جنوں خیز و فسوں کار جوانی

وہ حسنِ جہاں سوز طرب بار و گل اندام
تھا مجھ سے مسافر کے لئے موت کا پیغام

وزدیدہ نظر، جرأتِ آدم کا فسانہ
لغزیدہ قدم، صبحِ قیامت کا ترانہ

ہنستی ہوئی آنکھوں میں سحر تاب سیاہی
ہے دل میں ابھی نقش مرے نیم نگاہی

ہر گام پہ اک فتنۂ محشر کو اٹھاتی
سوئے ہوئے جذباتِ محبت کو جگاتی

پلکوں کے اشاروں پہ نظر تول رہی تھی
یا خلدِ محبت کے وہ در کھول رہی تھی

ڈر ہے کہ مری صبح کو وہ شام نہ کر دے
پردیس[1] میں آوارہ و بدنام نہ کر دے

نظر حیدرآبادی

[1] یہ نظم میں نے لاہور کے دوران قیام میں کہی تھی۔

غزل

بجھی بھی گر میری شمعِ ہستی تو رونقِ انجمن رہے گی
کلی جو ٹوٹے گی شاخِ گُل سے شریکِ خاکِ چمن رہے گی

ہماری بالیں پر آئینگے، وہ یقیناً آئینگے، ہاں مگر کب؟
نہ جب ان آنکھوں میں دم رہیگا نہ جب یہ تابِ سخن رہیگی

اُجاڑنے والے آشیاں کے، یہ غور کر لے غریب بُلبل
قفس سے چھوٹیگی پھر کسی دن تو کیا یونہی بیوطن رہیگی؟

حقیقتِ نعرۂ انا الحق کسی نے سمجھی، کوئی نہ سمجھا
مگر ہمیشہ زباں زباں پر حدیثِ دار و رسن رہیگی

یہ میں نے مانا کہ آپ مجھکو مٹا بھی دینگے تو کچھ نہ ہوگا
مگر یہ دُنیا مری تباہی پہ مدّتوں نوحہ زن رہیگی

کیا ہے تو نے جو ذبح اس کو تو اپنے دامن میں بھی چھپا لے
زمانہ پوچھے گا نامِ قاتل جو نعشِ دل بے کفن رہیگی

بہت سے غم ہیں نثارؔ لیکن یہ سوچ کر مُسکرا رہا ہُوں
کھلی رہی جو کلی خزاں میں وہ پردہ دارِ چمن رہیگی

نثار اٹاوی

افسانہ

شریکِ حیات

جب مل کی سیٹی کی کانپتی ہوئی آواز کارخانے اور آس پاس کے مکانات پر لہراتے ہوئے دھوئیں میں ڈوب گئی اور تمام مشینیں آخری گھڑ گھڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گئیں تو ممدو نے چارخانے کے رومال سے اپنے کپڑوں پر لگی ہوئی روئی جھٹکی اور جوتے پہن کر باہر نکل آیا۔ اس کا دل ایک ناقابلِ بیان مسرت محسوس کر رہا تھا اور خوشی کے مارے اس کا جی چاہتا تھا کہ سڑک پر خوب اچھلے کودے اور قہقہے لگائے۔ گو دن بھر کی محنت سے اس کا چہرہ سوکھ گیا تھا اور جسم کا ہر عضو تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا پھر بھی اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہونٹ عجیب انداز میں تھرتھرا رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے کئی مسکراہٹیں اس کے سینے کی گہرائیوں سے باہر نکلنے کے لئے مچل رہی ہوں۔

مل کے پھاٹک سے مزدور مکھیوں کی طرح بھنبھناتے ہوئے نکل رہے تھے۔ سورج کی الوداعی کرنیں سڑک پر چھائے ہوئے گرد و غبار کے بادل کو چیرتی ہوئی ان کے الجھے ہوئے بالوں اور میلے میلے کپڑوں پر زرد رنگ بکھیر رہی تھیں۔ مزدوروں کے پژمردہ چہروں پر ہلکا ہلکا سا اطمینان جھلک رہا تھا کیونکہ انھیں تنخواہ ملی تھی اور وہ دن ان کے پیٹ بھر کھانا کھانے کا تھا۔ کچھ مزدور پھاٹک کے کنارے کھڑے کابلی پٹھانوں اور سود خوار بنیوں کا قرضہ چکانے میں مصروف تھے اور کچھ سڑک کے موڑ والی تاڑی کی دکان پر جمع ہو کر شور مچا رہے تھے۔ باقی ماندہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گھروں کو جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مزدور ایک بھدی سی تان چھیڑ دیتا تھا جو جلد ہی سڑک کی چیخ پکار کے درمیان سہم کر رہ جاتی تھی۔ اگرچہ ہر کسی کو اس بات کا احساس تھا کہ تنخواہ کے پیسے ایک یا دو ہی دن میں ختم ہو جانے والے ہیں۔ پھر بھی ان پیسوں کی عارضی موجودگی نے ان کے دماغوں سے آنے والی مصیبتوں کا احساس دور کر دیا تھا اور انہیں چند لمحوں کے لئے اطمینان بخش دیا تھا۔

ممدو کے دماغ میں مختلف قسم کے خیالات آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اور وہ اپنی دھن میں مگن اکیلا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت اسے زیادہ فکر گھر پہنچنے کی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچ جائے۔ ممدو کی خوشی کا یہ سبب نہ تھا کہ اسے تنخواہ ملی تھی۔ تنخواہ تو اسے ہر ماہ ملا کرتی تھی پھر تنخواہ لیتے وقت جب اسے اس بات کا احساس ہوتا کہ مہینہ بھر ہڈیاں توڑنے اور خون پسینہ ایک کرنے کا معاوضہ اسے صرف دس روپے ملتا ہے تو بجائے خوش ہونے کے اس کا جی رونے کو چاہتا اور اس کے زرد زرد چہرے پر اداسی کی ایک تہ چڑھ جاتی تھی۔ اس وقت وہ اس لئے خوش تھا کہ اس کے پاس تنخواہ کے روپے ملا کر پورے پچاس روپے جمع ہو گئے تھے اور وہ امیر میاں کے پاس جا کر اس کی لڑکی سے اپنی شادی کی بات چیت پکی کرا سکتا تھا۔ اور اس طرح اپنے ان خوابوں کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا جو عرصے سے اس کے دماغ میں پرورش پا رہے تھے۔

ممدو ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ جب نوعمری ہی میں اس کے والدین مر گئے اور اس کا گاؤں میں کوئی ٹھکانا نہ رہا تو وہ شہر چلا آیا تھا۔ برسوں تک ادھر ادھر مارا مارا پھرنے اور ہوٹلوں میں برتن دھونے کے بعد اسے مل میں نوکری مل گئی تھی۔ جہاں وہ ایک سال سے ملازم تھا دن بھر وہ کام کرتا اور شام کو اپنی کوٹھری میں آکر پڑ رہتا تھا جو اس نے ایک روپیہ ماہوار کرایہ پر لے رکھی تھی۔ کھانا وغیرہ وہ ہوٹل میں کھا لیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ زندگی کا اور کوئی مقصد اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ عرصہ تک زمانہ کی ٹھوکریں سہنے کے بعد اسے یہ زندگی غنیمت معلوم ہوتی تھی اور مل کی ملازمت نے اسے ایک قسم کا اطمینان بخش دیا تھا ہاں کبھی کبھی جب وہ بیمار ہو جاتا یا کوئی حادثہ اس کی روح کو افسردہ کر دیتا تو اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کے پاس بیٹھ کر اس کا جی بہلائے۔ اس کی روح پر چھائے ہوئے غم کو دور کرے۔ مل کی ملازمت کے بعد یہ خواہش اکثر اسے بیتاب کرتی رہتی تھی۔

امیر میاں سے اس کی ملاقات اچانک طور پر رستے میں ہوئی تھی۔ امیر میاں ممدو کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ لیکن چند مہینے سے اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر میں آبسا تھا۔ امیر میاں نے ممدو کو پہچان لیا اور اسے اپنے گھر لے گیا جو ممدو کی کوٹھڑی سے تقریباً ۵ میل دور تھا۔ وہاں مم

امیر میاں کی لڑکی کو دیکھا اور زندگی میں پہلی بار کسی عورت کی طرف کشش محسوس کی۔ عورتیں وہ کئی قسم کی دیکھ چکا تھا۔ میلے میلے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی سڑی بسی عورتیں جن کے سینے مریض بکریوں کی طرح لٹکے رہتے تھے اور جن کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے چہرے آم کی چوسی ہوئی گٹھلیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ یہ عورتیں مل میں کام کرتی تھیں۔ اور پھر اس نے ایسی عورتیں بھی دیکھی تھیں جو سائیکلوں اور موٹروں پر سوار ہو کر اپنی ساڑیوں یا دوپٹے کے پلؤوں کو لہراتی ہوئی جایا کرتی تھیں۔ جن کے ہونٹ گلاب کی کلی کی طرح کھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور گالوں پر تازہ سیب کا دھوکا ہوتا تھا۔ ان عورتوں کو دیکھ کر کبھی اس کے دل میں کسی قسم کا احساس پیدا نہ ہوا تھا۔ اور وہ انھیں معمولی راہگیروں سے زیادہ وقعت نہ دیتا تھا۔ مصیبتوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی آندھی نے اس کی نوجوانی کو پنپنے نہ دیا تھا اور پیٹ کی آگ نے اس کی تمام خواہشات کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔

لیکن جب سے اس نے امیر میاں کی لڑکی کو دیکھا تھا اسے اپنے اندر ایک زبردست انقلاب محسوس ہونے لگا تھا۔ اب اسے اکثر راتوں کو نیند نہ آتی تھی اور طبیعت بےچین رہا کرتی تھی۔ اسے اپنے اعضا کھنچتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اور کوئی نامعلوم سی خلش اس کے سینے میں پیدا ہونے لگتی تھی۔ امیر میاں کی لڑکی ناجو کے بھرے ہوئے جسم اور سالونی صورت کا تصور اس کے دماغ میں ہر دم مسلط رہتا تھا اور نہ جانے کیوں اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس لڑکی کے اس قدر قریب ہو جائے کہ اس کا گرم گرم سانس اس کے رخساروں سے مس ہونے لگے۔ یہ خیال کرتے ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور اس کے بدن میں سنسنی پیدا ہونے لگتی تھی۔ شدت جذبات سے وہ ہانپنے لگتا تھا۔

وہ امیر میاں سے کئی مرتبہ مل چکا تھا۔ امیر میاں اس سے ہمیشہ ہمدردی کا اظہار کرتا رہتا تھا اور نہایت خوش خلقی سے پیش آتا تھا۔ آخر کار ایک دن ممدو نے اپنی دلی خواہش کا اس کے سامنے اظہار کر دیا۔ امیر میاں اسے اس صورت پر اپنا داماد بنانے پر راضی ہو گیا کہ وہ پچاس ساٹھ روپے اپنے پاس جمع کر لے۔

— — — —

ممدو اسی طرح اپنی اردگرد کی دنیا سے بےتعلق ہو کر اور اپنے دماغ میں ہوائی قلعے تعمیر کرتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا۔ کوٹھری میں جا کر اس نے ایک پوٹلی میں سے روپے نکالے۔ کچھ دیر تک وہ ان روپوں

گنتا رہا اور اُن کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ان کو رومال میں باندھ کر وہ امیر میاں کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ کئی دنوں کے بعد امیر میاں کے گھر کو جا رہا تھا۔ اور امیر میاں کی لڑکی ناجو کو دیکھنے کی خوشی میں اسے بھوک بھی محسوس نہ ہوئی تھی۔

جب وہ امیر میاں کے مکان کے نزدیک پہنچا تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور ٹانگوں میں ہلکا ہلکا ارتعاش پیدا ہونے لگا۔ اس کی رفتار بھی دھیمی پڑ گئی۔ آخرکار وہ امیر میاں کے گھر پہنچ گیا۔ امیر میاں گھر میں نہیں تھا اس لئے اُسے برآمدے میں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران میں ناجو کی گداز باہوں کا تصوّر اس کے دماغ کو تھپکیاں دیتا رہا اور اس کے پازیب کی جھنکار، جو مکان کے اندر سے کسی شفاف جھرنے کی طرح بہتی ہوئی آرہی تھی۔ اس کی روح میں اہتزاز پیدا کرتی رہی۔

اسے زیادہ دیر بیٹھنا نہ پڑا۔ امیر میاں جلد ہی واپس آگیا۔ ممدو کو دیکھ کر اس نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا "کہو ممدو کیسے آنا ہوا؟ بہت دنوں کے بعد تم آئے ہو" ممدو نے کھڑے ہو کر شرماتے ہوئے کہا "جی! کچھ نہیں، یونہی آگیا تھا" امیر میاں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور گھر کے اندر چلا گیا۔ ممدو کو یہ لمحات نہایت صبر آزما معلوم ہوئے آخرکار امیر میاں گھر سے باہر آیا اور رومال سے مُنہ پونچھتے ہوئے رُک رک کر کہنے لگا۔ "ہاں ممدو! تم سے ایک بات کہنا تھی۔ تم نے جو ایک دن ناجو کے لئے کہا تھا نا؟" ممدو کا دل انتہائی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا۔ امیر میاں کہتا گیا۔۔۔ "مجھے سخت افسوس ہے۔ ناجو کی ماں نے اس کی بات چیت ہمارے گاؤں کے مالگذار سے پکی کر لی ہے۔ میں اس بارے میں بالکل مجبور تھا۔ اور پھر تم جانتے ہی ہو آج کل زمانہ خراب ہے اور ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ لڑکی پیسے سے، گہنے پاتے سے خوش رہے۔ خیر تم گھبراؤ نہیں۔ میں تمھاری بات کہیں اور ٹھہرا دونگا"

ممدو کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُسے بے خبری کے عالم میں گھونسا مار دیا ہو اس کی نگاہوں کے سامنے چنگاریاں برسنے لگیں۔ اور مکان کی چھت اُس کے اوپر گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ وہاں نہ ٹھہر سکا اور باہر نکل آیا۔ تمام دنیا اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اور تصوّرات کا محل جو کئی دن سے اس کی نگاہوں میں جھلمل جھلمل کر رہا تھا اب پگھلے ہوئے لاوے کی طرح اُس کے دماغ میں اُبل رہا تھا۔ وہ سڑک پر چلنے لگا۔ اسے کوئی خبر نہ تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے

وہ یونہی بے مقصد چلتا گیا۔ جب وہ بازار کے نکڑ پر پہنچا تو کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے ساتھ مل میں کام کرنے والا مزدور موہن کھڑا تھا۔ موہن نے شراب پی ہوئی تھی۔ اس نے ممدو کو دیکھ کر اس کی حالت بھانپ لی اور پوچھا "کہو دوست! اتنے ناراج کیوں ہو؟" ممدو کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے دل کے آبلوں کو چھیڑ دیا ہو۔ اُس نے کوئی خیال نہ کیا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے۔ شدّت جذبات سے اس کا گلا بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جب طبیعت ہلکی ہوئی تو اُس نے رُک رُک کر سارا حال موہن کو سنا دیا۔ آخر میں نہایت بیکسی کے انداز میں کہنے لگا۔ "موہن! میں اکیلا ہوں مجھے ایک ساتھی کی ضرورت تھی"

موہن نے اُس کی باتیں سن کر ایک قہقہہ لگایا اور اُس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔ "ارے یار۔ تم تو پاگل ہو۔ رونے کے بدلے خوشی مناؤ۔ سادی کر کے تم کو کیا مل جاتا۔ تم دس روپے میں اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ نہیں پال سکتے تھے۔ ہم کو دیکھو سادی کر کے پچھتا رہے ہیں۔ سادی کا مجا تو ان لوگوں کو ہے جن کے پاس روپیا ہے تھوڑے ہی سال میں پھاکے کرنے اور بچّے جننے کے بعد تمھاری بیوی مریل کُتیا کے سمان ہو جاتی اور پھر تم یہ ساری باتیں بھول جاتے۔ عورتیں تو ہمیں بجار میں بھی مل جاتی ہیں۔ پھر سادی کی کیا جرورت۔ ہم گریبوں کے لئے بیوی جیون ساتھی نہیں سراپ ہے۔ اس کا کام بس اتنا ہے کہ وہ ہمیں پیسوں کے لئے تنگ کرے اور ہر سال میں ایک بچّہ جن دے۔ ادھر آؤ ہم تم ایسا جیون ساتھی بتائیں جو تمہارے دُکھ کو منٹوں میں بھگا دے اور پھر تم اُس کو کبھی نہ چھوڑو۔ ہم گریبوں کے لئے یہ جیون ساتھی بہت ہی اچھا ہے"

اس نے ممدو کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے تاڑی خانے میں لے گیا۔ جب موہن کے اصرار پر ممدو نے ایک گھونٹ کڑوی شراب اپنے حلق میں اتاری تو اسے ایسا محسوس ہُوا جیسے اس کے دماغ میں اُبلنے والا لاوا بھاپ بن کر اُڑ گیا ہے۔ اور دو نرم نرم بازو اس کو اپنی آغوش میں لے کر تھپکیاں دے رہے ہیں۔۔۔۔۔ اُس نے شاید اپنا ساتھی پا لیا تھا۔۔۔!

مخدوم فخری

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری کا لکھنا ضروری ہے

مقالہ

نادر شاہ افشار

۳

نادر شاہ کا تدبّر

ملکم صاحب بیان فرماتے ہیں کہ جب نادر شاہ ایران کو واپس جا رہا تھا رستہ میں اطلاع ہوئی کہ بعض شاہی جواہرات کو لشکریوں نے چھپا لیا ہے۔ فوراً لشکر کو روک دیا۔ اور کہا تمام لشکریوں کی تلاشی لی جائے، جواہر دستیاب کر کے خزانہ شاہی میں داخل کئے جائیں۔ اگرچہ لشکریوں نے اس امر کو ناپسند کیا لیکن اطاعت کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اور یہی نادر شاہ کے کمال نظم و نسق کی دلیل ہے جو اسے اپنے لشکر پر حاصل تھا۔

ملکم صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مجھے ایران کے جن امرا کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ نادر شاہ کی اس حرکت کو تدبیر پر محمول کرنے کی بجائے بخل اور حرص پر بلکہ کہتے تھے کہ نادر جانتا تھا کہ "سگ بہ زنجیر اولیٰ و عسکر مستغنی بکار زار نمی رود"۔ بایں ہمہ عام طور پر وہ اپنے لشکریوں سے مروت اور مہربانی کا سلوک کرتا تھا۔ میرزا مہدی بیان کرتے ہیں کہ قندہار کی فتح میں چھ ماہ کی تنخواہ سپاہیوں کو انعام کے طور پر دی گئی تھی۔ اور فتح کرنال کے بعد اس سے دگنا انعام مرحمت ہوا۔ اور جب دہلی سے روانہ ہونے لگا تو پیش از پیش انعام سے اپنے سپاہیوں کو خوش کیا۔

سپاہیانہ حکمت عملی

پھر گرمی کی شدت، اور کمی آب دریا کی ناواقفیت سے لشکریوں کو بے انتہا پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے ان کی رفتار بہت سست ہو گئی۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آتی دفعہ تو لشکریوں کے تنگے زیرے ہلکے تھے تو جلدی بڑھتا آیا تھا۔ مگر اب غنیمت کے مال سے گراں بار ہو رہی تھیں۔ ہر سپاہی اچھا خاصہ سیاطی بنا ہوا تھا۔ پہاڑ اور دریاؤں کے عبور کرنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ خاص کر راستے گزرنے پر انھیں بڑی تکلیف کا سامنا ہوا۔ اسی وقت معلوم ہوا کہ کابل کے کوہستانی لوگ لشکر شاہی پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ نادر نے دیکھا کہ اس وقت میری حالت سوداگر کی ہے۔ نہ کہ سالار فوج کی۔ اگر کچھ گڑبڑ ہوئی۔ تو ہندوستان کا جو خزانہ لے کر جا رہا ہوں۔ یہ راستہ ہی میں بٹ جائے گا۔ اس لئے اپنے آدمی بھیجے کہ انھیں کافی رقم دیکر اس ارادہ سے باز رکھیں۔ چنانچہ یہ خطرہ بآسانی ٹل گیا۔ اور نادر شاہ بخیر و خوبی ہندوستان کا مال و دولت اور کوہ نور جیسے ہندوستان کے جگر کے ٹکڑے کہیں تو بیجا نہ ہوگا اپنے ملک میں لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نادر شاہ محض لڑاکا سپاہی نہ تھا بلکہ جہاں اسے حکمت عملی سے کام لینا پڑتا تھا وہاں تلوار کو میان میں رکھ کر درہم و دینار سے بھی مطلب نکال لیتا تھا۔ الغرض جب نادر شاہ باطمینان تمام اپنی سرحد میں پہنچ گیا۔ تو اگرچہ اس کا لشکر آرام کرنے کا خواہشمند تھا۔ مگر نادر شاہ خوب جانتا تھا کہ لشکر کے آرام طلب ہونے کا انجام ملک کی بدنامی ہے۔ اس لئے اس نے فوراً امرکوٹ پر حملہ کرنے کا خاکہ تیار کر لیا۔

نادر شاہ کا استقلال

امرکوٹ صوبہ سندھ کا صدر مقام تھا اور نادر شاہ نے عہدنامہ کے بموجب اسے سلطنت ایران میں شامل کر لیا تھا۔ مگر چونکہ امرکوٹ ایک مضبوط قلعہ تھا اور اس کے چاروں طرف اسی کوس تک بے آب و گیاہ میدان تھا اس لئے اس صوبہ کا گورنر نور محمد خاں لٹی نادر شاہ کی طرف توجہ نہ کرتا تھا۔ نادر شاہ نے اس پر حملہ کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ ذکریا خاں (صوبیدار لاہور) و شاہنواز خاں پسر ذکریا خاں نے بادشاہ کے مافی الضمیر پر مطلع ہو کر کہا۔ "قلعہ مذکور مشتاد کروہ از ہر طرف دور خود آب ندارد و لشکر در نواح آں از بے آبی اقامت نمی تواند نمود" [1]

---

[1] قلعہ مذکور اپنے گرد کے چاروں طرف اسی کوس تک پانی نہیں رکھتا۔ لشکر اس نواح میں بے آبی کی وجہ سے ٹھہر نہ سکیگا۔

جواب دیا کہ" اگر تُنی مذکور بر آسمان رفتہ پایش کشیدہ می آرم واگر در زمین خزیدہ موئے سرش گرفتہ می کشم"۔ [1]

شاہ نواز خاں کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ ہمراہ لیا اور حکم دیا کہ تین دن کی خوراک ساتھ باندھ لیں۔ شام کو کوچ کرکے دوپہر کو وہاں جا پہنچا۔ شاہ نواز خاں سے پوچھا" اے فرزند می توانی کہ آبے بہم رسانی" [2] اس نے عرض کیا" قبلہ عالم! آب جز اندرون قلعہ وجود ندارد" [3] اس کا اتنا کہنا تھا کہ عنان اسپ اٹھا قلعہ کا رُخ کیا۔ اہل قلعہ نے جب نادر شاہ کو زیر فصیل دیکھا تو" الامان" پکار اٹھے۔ نور محمد خاں نے بغیر کسی عہد و پیمان کے قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور نادر شاہ فاتحانہ طور پر اندر داخل ہوا۔ لیکن کسی ایک متنفس کو بھی آزار نہ پہنچایا۔ نور محمد خاں سے خلوت میں پوچھا" از تو سخنے می پرسم اگر راست گفتی رستی۔ وگرنہ بسیاست خواہی رسید"۔ [4]

خان نے دست بستہ کہا۔" مجال ندارم کہ غیر از راستی سخنے در حضور گذارش نمایم"۔ [5]

نادر شاہ نے کہا کہ" بایں قلعہ و سامان سبب استنکاف و فرمانبرداری بلا توقف چہ بود"۔ [6]

جواب دیا۔" نفس الامر ایں است کہ بزرگے بمن گفتہ بود کہ اگر والیٔ ایران یعنی حضرت نادر شاہ داعیہ تو کند اعتماد بر قلعہ و اسباب خود نکردہ غیر از فرمانبرداری خیال دیگر نخواہی کرد۔ چراکہ ما بہ شاہ اقبالے دارد اگر عساکر عالم و جبال و بحار برآویزآیند ہمہ بسر در آیند"۔ [7]

نادر شاہ زیر لب مسکرایا اور کہا کہ اگر وہ بزرگ آپ سے پھر ملے تو ہمارا اسلام کہنا۔ اور سندھ کی حکومت اس شرط پر دوبارہ اس کو تفویض کی کہ آئندہ وہ ایران کو خراج ادا کیا کریگا۔

سندھ کی فتح کے بعد نادر شاہ ہرات کو روانہ ہوا اور اس جگہ جواہر اور مال غنیمت جو ہندوستان سے اٹھا لایا تھا لوگوں کے دکھانے کے لئے قرینے سے رکھا اور محمد شاہ کے تخت طاؤس پر جو انواع و اقسام کے جواہر سے مرصع تھا جلوس کرکے داد عیش دی۔ اس وقت تک ایرانیوں نے ہاتھی نہ دیکھا تھا صرف تصویریں ہی دیکھی تھیں۔ اب جو نادر شاہ ہزاروں دیو پیکر ہاتھی ہندوستان سے لایا تو لوگوں کے تعجب کی انتہا نہ رہی اور وہ اسے شاہ پور ثانی اور دوسرا نوشیرواں بلکہ ان سے بھی بزرگ خیال کرنے لگے۔ مزید براں نادر شاہ نے رعایا کو تین سال کا خراج معاف کر دیا۔ جس سے لوگوں کے دل میں اس کا وقار اور بڑھ گیا۔ بادشاہ ہندوستان سے اس قدر ارباب طرب اور مغنی ہمراہ لایا تھا کہ لوگوں کو گمان یہ ہوا کہ بادشاہ اپنی بقیہ عمر گوشہ عافیت میں بیٹھ کر عیش و عشرت سے گزارے گا۔ لیکن نادر لشکر کے بیکار ہونے سے بڑا گھبراتا تھا لہذا ہرات میں چند یوم داد عیش دے کر وہاں سے چل پڑا اور میرزا رضا قلی سے ملاقات کی جو اس کا بڑا فرزند تھا اور جسے ہندوستان جاتے وقت اپنا قائم مقام چھوڑ کر گیا تھا۔ نیز باقی شہزادگان کو بھی تحف و ہدایا اور خلاع فاخرہ دیکر خورسند کیا۔

بخارا پر نادر شاہ کی یلغار

نادر شاہ کی غیر حاضری میں بخارا کے بادشاہ نے موقع پاکر خراسان کے اطراف پر حملے کئے تھے۔ اس لئے نادر شاہ نے سب سے پہلے قشون قاہرہ کا ادھر کو رخ کیا۔ ابوالفیض خاں والی بخارا جو اندنوں ازبکوں کا سردار تھا اور اپنے آپ کو چنگیز خاں کی اولاد بتاتا تھا نادر کی روانگی سے ہراساں ہوا۔ وزیر کو بھیجا کہ جاکر آپ معذرت سے بادشاہ کی آتش قہر کو سرد کرے۔ نادر شاہ نے اس کے وزیر کی ملاقات نہایت عزت و توقیر سے کی۔ اور کہا کہ اگر" ابوالفیض خاں اپنی اور اپنی مملکت کی سلامتی چاہتا ہے تو اسے فی الفور فرمانبردارانہ طریق پر حاضر ہونا چاہئے" اور اسی وقت جب بادشاہ اور وزیر کی آپس میں بات چیت ہو رہی تھی لشکر شاہی نے بخارا کی طرف کوچ کر دیا۔ اور پانچ روز کے اندر دریائے جیحون کو عبور کرکے بخارا سے بارہ میل کے فاصلے پر جاکر کیمپ لگا دیا۔ ابوالفیض خاں کو اور کوئی صورت بچاؤ کی نظر نہ آ

---

[1] اگر تُنی مذکور آسمان پر چلا جائے تو میں اس کے پاؤں کھینچ کر نیچے لے آؤں گا اور اگر زمین میں دھنس جائے تو سر کے بالوں سے نکال کھینچوں گا۔

[2] اے فرزند! کیا تو کہیں سے پانی لاسکتا ہے؟

[3] قبلہ عالم! سوائے قلعہ کے پانی کا ملنا ناممکنات سے ہے۔

[4] تجھ سے ایک بات پوچھتا ہوں اگر سچ کہا تو بچ جائیگا ورنہ جان سے مارا جائیگا۔

[5] بندہ کی کیا مجال ہے کہ بغیر سچائی کے کوئی سخن حضور میں عرض کرے۔

[6] اتنے مضبوط قلعہ اور اتنے وافر سامان کے ہوتے ہوئے بلا توقف فرمانبرداری اختیار کرنے میں کیا راز ہے؟

[7] اصل ماجرا یہ ہے کہ ایک بزرگ نے مجھ سے کہا تھا کہ نادر شاہ تجھ پر حملہ کرے تو بلا چون و چرا قلعہ اس کے حوالے کر دینا۔ کیونکہ اقبال نادر شاہ کے ہمرکاب ہے۔ اگر تمام جہان کے لشکر، پہاڑ اور سمندر تک بھی مقابلہ کو آئیں۔ مُنہ کی کھائیں گے۔

خود اپنے اُمراء کی معیت میں نادر شاہ کے حضور میں حاضر ہوا اور تاج شاہی کو نادر شاہ کے قدموں میں ڈال دیا۔ نادر شاہ نے انتہائی احترام کے ساتھ ابوالفیض خاں کو اپنے یہاں ٹھہرایا۔ رہنے کو شاندار خیمہ عطا کیا اور چند یوم کے بعد بخارا کی حکومت دوبارہ اُسے مرحمت کی اور دریائے جیحون کو دونوں سلطنتوں کی حدفاصل قرار دیا۔ نیز اپنے بھتیجے کی شادی اس کی لڑکی سے کی۔ پھر یہاں سے خوارزم کا عزم کیا اس علاقہ کا امیر البرز مقابلے کو نکلا۔

خوارزم پر چڑھائی

ابوالفیض خاں نے چند آدمیوں کی معرفت نصیحت آمیز مکتوب بھیجا کہ نادر شاہ سے لڑنا قسمت سے لڑنا ہے۔ اطاعت ہر حال میں مناسب ہے۔ مگر تقدیر کے اس ہیٹے پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ اُن آدمیوں کو جو خطوط لے کر آئے تھے قتل کر دیا۔ اس پر نادر شاہ غصہ سے تڑپ اُٹھا اپنی فوج ظفر موج سے نہ صرف البرز کو شکست دی بلکہ اسے بیس ہزار اُمراء سمیت نہایت ذلت سے قتل کیا۔ اور اس کی مملکت طاہر خاں کو عطا کی۔ اسی سال یعنی ۱۱۵۳ھ میں قلات کی جانب گیا اور چونکہ ایام طفلی ہی سے نادر شاہ کو اس علاقے سے وابستگی تھی اور اس خیال سے کہ اپنی عمر کا آخری حصہ اس علاقہ میں بسر کرے۔ حکم دیا کہ یہاں حسین و جمیل محلات تعمیر کئے جائیں اور رفاہ عامہ کے لئے سڑکیں۔ تالاب۔ مدرسے اور شفا خانے بنائے جائیں۔ اور زراعت کو ترقی دی جائے۔ فرمان جاری کیا کہ تمام خزائن کو قلات میں منتقل کیا جائے۔

قلات کے محلات

کینز صاحب لکھتے ہیں کہ قلات کے چاروں طرف بلند پہاڑ ہیں۔ جن میں صرف دو درے ہیں اور اس کے بعد جب سات میل اوپر کو جاتے ہیں سطح ظاہر ہوتی ہے جس کا محیط تقریباً بارہ میل ہے۔ اور جس میں چھوٹے چھوٹے بیشمار چشمے ہیں۔ غلّہ اور میوے وہاں بکثرت ہوتے ہیں۔ اس جگہ کے لوگ صرف ایک پر در میں بسر اوقات کرتے ہیں اس وقت ان عمارات میں سے صرف دو بُرج اور ایک چھوٹا سا محل باقی رہ گیا ہے۔ اور جب اس سطح سے گزر کر پندرہ میل اوپر کو جاتے ہیں تو پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچتے ہیں۔ یہاں ایک اور عالم نظر آتا ہے اگرچہ یہ قطعہ پہلے قطعے کے برابر وسیع اور کشادہ نہیں ہے مگر زرخیزی میں اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اور درختوں کی قطاریں فردوس بریں کی یاد دلاتی ہیں یہ بھی چھوٹے چھوٹے دو برج بنے ہوئے ہیں جو قلعے کے استحکام کے کام آتے ہیں۔ درحقیقت قلات کی تسخیر میں جو سب سے بڑی دقت پیش آتی وہ یہی رستے کی صعوبت ہے۔ اور چونکہ یہ بُرج پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہیں اس لئے پہاڑ پر سے اگر کوئی پتھر پھسل پڑے تو اگرچہ دشمن کی تباہی موجب نہ بن سکے گا لیکن "سدراہ" ضرور ہوگا۔ یہی وجوہ تھے جن کی بنا پر نادر شاہ نے اس مقام کو اپنی رہائش کے لئے پسند کیا۔

نادر شاہ کے قتل کی سازش

کچھ عرصہ قلات میں رہنے کے بعد بادشاہ نے مشہد مقدس کا رخ کیا جسے اس نے دارالسلطنت قرار دے رکھا تھا۔ تین ماہ یہاں بسر کئے اس وقت نادر شاہ کو تخت شاہی پر بیٹھے پانچ سال گزر چکے تھے اور ان پانچ سال میں پانچ بادشاہوں کو مغلوب کیا۔ یعنی اشرف و حسین دو افغان امیر۔ محمد شاہ شہنشاہ ہندوستان، ابوالفیض خاں بادشاہ بخارا، البرز فرمانروائے خوارزم اور ایران کی سرحدوں کو چاروں طرف سے محفوظ کر دیا تھا جو شمال میں دریائے جیحون اور مشرق میں دریائے سندھ تک پہنچتی تھیں۔ اگرچہ رعایا اس امر کی منتظر تھی کہ پہلے لشکر عثمانی کو دجلہ اور فرات کے ساحلوں سے ہٹایا جائے لیکن ننگ و ناموس کا تقاضا یہ تھا کہ ابراہیم خاں کا انتقام پہلے لیا جائے۔ یہ بادشاہ کا بہادر اور شریف بھائی تھا۔ نادر کو اس پر پورا اعتماد تھا۔ وہ نہایت دلیری اور جانبازی سے جنگ لزگی میں مارا گیا تھا۔ اس کے مارے جانے پر نادر شاہ اس کے بچوں سے بمثل اپنی اولاد کے سلوک کرتا تھا چنانچہ نادر شاہ نے اپنے لشکر کو لزگیوں سے بدلہ لینے کے لئے روانہ کیا اور خود بھی عقب میں ان کی امداد کو روانہ ہوا مگر مازندران کے جنگل سے گزرتے وقت ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا جس سے ایرانیوں کی تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ صورت یہ ہوئی کہ اس جنگل میں بادشاہ پر کسی نے درخت کی آڑ سے فیر کر دیا۔ جس سے اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا اور گھوڑا گر کر مر گیا۔ رضا قلی مرزا نے کہ اس وقت بادشاہ کے ساتھ تھا فی الفور اس شخص کے پیچھے گھوڑا دوڑایا اس کے ساتھ ہی بہت سے بہادر سوار دوڑے مگر خاردار جھاڑیوں کے سبب اُسے گرفتار نہ کر سکے۔ اور دشمن گھنے جنگلوں میں چھپ چھپا کر بھاگ گیا مگر انجام کار چند دنوں میں گرفتار ہو گیا۔ مرزا مہدی کہتے ہیں کہ یہ شخص نیک قدم نام دلاور یمنی کا ایک غلام تھا جس نے آقا مرزا ولد دلاور

کے اغوا کرنے پر اس امر کا ارتکاب کیا۔ آقا مرزا کیفر کردار کو پہنچا۔ اور
نیک قدم سے چونکہ جاں بخشی کا اقرار ہو چکا تھا اس کی آنکھوں میں
سلائی پھروا کر چھوڑ دیا۔ اگرچہ اس واقعہ کا نادر شاہ پر بُرا اثر ہوا مگر
اس نے اپنا ارادہ فسخ نہ کیا اور جب داغستان پہنچا تو لزکیہ قبائل جان
سے ہاتھ دھو کر مقابلہ میں نکل آئے اور کوہستانی ماحول نے ان کی بہادری
میں اور اضافہ کیا۔ اس قدر شدید مقابلہ ہوا کہ ایرانی جانباز گھبرا اٹھے
نیز ایسے موقع پر ایک اور پریشان کن صورت یہ پیدا ہوئی کہ روسیوں
نے اس خوف سے کہ اگر نادر شاہ کو لزکیوں پر غلبہ ہو گیا تو شاید ہمارے
علاقے پر حملہ نہ کر دے بشتدر خاں کے موقع پر اپنی پوری قوت سے
مقابلے کے لئے اتر آئے۔ جس پر جنگ کے دو محاذ بن گئے اس لئے نادر
شاہ کو اس مہم سے معمولی مفاد اور زیادہ نقصان پر واپس ہونا پڑا۔

بیٹے سے بدگمانی

ان دنوں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ مازندران کے جنگلوں میں جو اس پر
حملہ ہوا تھا وہ اس کے بڑے بیٹے مرزا رضا قلی کے اشارے ہی سے ہوا تھا۔
فی نفسہ میرزا اگرچہ رشید اور لائق تھا مگر اس کے ساتھ ستمگیر اور ظالم
بھی تھا۔ ملکم صاحب اس خبر کے ذمہ دار ہیں کہ جب نادر شاہ ہندوستان
کی مہم پر گیا ہوا تھا تو ایران میں اس کی موت مشہور ہو گئی تھی۔ اس پر
میرزا نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور شاہ طہماسپ کو جو سبزوار
میں قید تھا قتل کر دیا۔ جب بادشاہ کو بیٹے کی اس [illegible] سازش اور جرم کا یقین ہو گیا تو نہایت مہربانی سے
فرمایا کہ اگر اپنی خطا کا اقرار کر کے معذرت طلب کرے تو اس کے قصور
سے درگذر کیا جائے گا۔ رضا قلی نے اپنے جرم کا اعتراف تو کر لیا مگر معافی
نہ مانگی اور کہا "فخر من است کہ عالمے را از چنگ ظالمے رہائی دہم"[1]
جس پر نادر شاہ نے دل پہ پتھر کی سِل رکھ کر اپنے جگر گوشے کو اندھا کرنے
کا حکم دیا۔ چنانچہ اس بہادر اور مدبر شہزادے کی آنکھیں نکال دی
گئیں۔ رضا قلی درد و کرب کو ضبط کرتے ہوئے بولا "تو چشم مرا نکندی
بلکہ چشم چراغ ایران را کور کردی"[2] جوان بیٹے کے اندھے ہونے
پر نادر شاہ کو بڑا صدمہ ہوا اور اس نے اس جرم پر کہ جو امرا حاضر تھے
انھوں نے میرے لختِ جگر کی سفارش کیوں نہ کی تیغِ سیاست سے قتل کرا دیا۔

نادر شاہ کی آخری جنگ

ایرانیوں کو بصرہ اور بغداد کے فتح کرنے کا شوق عرصہ سے دامنگیر
تھا۔ معلوم ہوا کہ ایروان کے موقع پر عسکرِ عثمانی بڑے ساز و سامان سے
حملے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ نادر شاہ نے شیر کی طرح انگڑائی لی اور
اپنے جانبازوں کی فوج کو ہمراہ لے اسی میدان میں دوبارہ لڑنے کو
روانہ ہوا جہاں دس سال پہلے عثمانیوں کو شکست فاش دی تھی۔
مگر عثمانی فوج کا کمانڈر خائف ہو کر بھاگ نکلا اور اپنے سپاہیوں کے
ہاتھوں مارا گیا۔ جس پر فوج کو بھی ایرانی لشکر نے گاجر مولی کی طرح کاٹ
کر رکھ دیا۔ یہ آخری فتح تھی جو ایران کے اس قہرمان تاجدار کو نصیب ہوئی
انہی ایام میں نادر شاہ کے بیٹے مرزا نصر اللہ نے عثمانی لشکر کے ایک
اور دستہ کو دیار بکر کے مقام پر شکست دی۔ لیکن چونکہ نادر شاہ کو
اپنے امرا سے ایک گونہ بے اطمینانی سی ہو چکی تھی اس لئے ترکوں
سے صلح کر لی۔ طے پایا کہ:—

(۱) طرفین کے قیدی رہا کر دیئے جائیں۔

(۲) مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے راستہ میں ایرانی حاجیوں کی
غور و پرداخت کی جائے۔

(۳) عراق اور آذربائیجان کے علاقے سلطنت ایران سے
متعلق سمجھے جائیں۔

نادر شاہ کا قتل

ملکم صاحب و میرزا مہدی کی ہرد و مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے
کہ نادر شاہ کا چونکہ اہلسنت والجماعت کے مذہب کی طرف میلان تھا
اس لئے شیعہ امرا پر اسے اعتماد نہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ ایرانی رعایا سے
وہ ہر وقت فکرمند رہتا تھا۔ زیادہ بھروسہ اسے افغانوں اور ترکمانوں
پر تھا اور اس کی فوج زیادہ تر ان دو گروہوں پر مشتمل تھی۔ ایرانی امرا
جو عوام میں اثر و نفوذ رکھتے تھے یا سلطنت کے ذمہ دار عہدوں پر
تعینات تھے کسی نہ کسی بہانہ سے قتل ہونے لگے۔ جس پر رعایا کے
دل میں بادشاہ کے خلاف نفرت سی پیدا ہو گئی۔ ملکم صاحب کے الفاظ
یہ ہیں —!

"نادر شاہ بہت رجحانے کہ بمذہب اہلسنت داده بود۔
مرکم باد مائل نبود۔ بدیں سبب ملکیانے کہ ہنوز معتقد مذہب شیعہ
بودند اعتماد نداشت۔ یا بعبارت اخریٰ۔ از جمیع اہالیان ایرا

---

[1] مجھے فخر ہے کہ ایک جہان کو ایسے ظالم سے نجات دلاؤں۔
[2] تو نے مجھے اندھا نہیں کیا بلکہ چراغ ایران کو بجھا دیا ہے۔

ایمن نبود۔ زیادہ اعتمادے کہ داشت۔ با افاغنہ و ترا کمہ بود کہ در لشکر وے بودند۔ امرائے ایں دو طائفہ در نزد وے کمال احترام داشتند و ہر یک از امرائے ایران کہ صاحب اقتدار بودند یا در مزاج مردم رسوخے داشتند۔ بہ بہانہ از پائے در آورد ایں کار رہا بالطبع سبب تنفر طباع و انزجار قلوب گشتہ در اطراف مملکت ہر جا سرے بود۔ گردن کشید"

مختصر ایران کے گوشہ گوشہ میں بغاوت کی آگ پھیل گئی۔ فارس شیروان اور مازندران نے تو بیک وقت اطاعت کا جوا کندھے سے اتار پھینکا۔ بادشاہ کا غضبناک ہونا یقینی تھا۔ ہر روز باغی امرا گرفتار ہو کر پیش ہوتے اور تیغ بے دست سے قتل کر دیئے جاتے۔ پہلے ایک ایک امیر قتل کیا جاتا پھر جہاں سے بغاوت کے شعلے اٹھتے وہاں قتل عام کا حکم دیدیا جاتا۔ بیان کرتے ہیں کہ جن دنوں نادرشاہ اپنے بھتیجے علی قلی خاں کی تادیب کے لئے سیستان گیا ہوا تھا چار آدمیوں نے جن میں محمد علی خاں افشار اور صالح بیگ شامل تھے۔ دربار شاہ ان کے قتل کا ارادہ رکھتا تھا اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ رات کو موقع پا کر بادشاہ کو قتل کر دیں۔ ۱۱ جمادی الثانی ۱۱۶۰ھ کی رات کو جب بادشاہ فتح آباد کے ... خیمہ میں بے خبر پڑا سوتا تھا قتل کرنے کو آمادہ ہو گئے۔ چونکہ ... کسی کو ان کے متعلق پتہ اور شبہ نہ ہوا ... داخل ہوئے بادشاہ اپنے تالوں کی آہٹ سے چونکا ... آدمیوں کو کمال پستی سے مار گرایا۔ مگر صالح بیگ ... کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ ساٹھ سال کا تجربہ سلطان ... کرنے پر ... گیا۔ اس طرح خون آشامی کی وہ ... ایران ... اور ہندوستان کے وسیع ملک ... بیک ... رہی تھی ... تکمیل کر گئی۔ ع

بیک گردش چرخ نیلوفری

نہ نادر بجا ماند و نے نادری

نادرشاہ کا نسب

اگرچہ بعض مورخین نے نادرشاہ کو ممتاز ترین خاندان سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر حقیقت پر ملمع ... نہیں ڈال سکے۔ اصل یہ ہے کہ نادرشاہ قبیلہ افشار کے ایک معمولی پوستین دوز امام قلی کا بیٹا تھا۔ اور خود نادر نے خاندانی ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا

بلکہ اکثر وہ اپنی اس کمزوری پر ملول رہتا تھا۔ اس کی تصدیق اس امر سے ہو سکتی ہے کہ جب دہلی کے شاہی خاندان میں اس نے اپنے لڑکے مرزا نصراللہ کو بیاہنا چاہا تو لڑکی والوں نے کہا بھیجا "رسم ما چنیں است کہ داماد باید تا ہفت پشت خود را برشمار دو لقبنا سازند"[1]

نادر نے قاصد سے کہا کہ "بگو۔ کہ داماد شما پسر نادرشاہ است و نادرشاہ پسر شمشیر و پسرزادہ شمشیر ہمچنیں تا ہفتاد پشت برشمار"[2]

نادرشاہ کی اولاد

نادرشاہ نے اپنے بڑے فرزند رضا قلی میرزا کو تو خود امرا کے بہکانے سے اندھا کر دیا تھا۔ نصراللہ مرزا امام قلی اس کے دو سال بعد کے عرصے میں مارے گئے۔ شاہرخ مرزا کی آنکھیں بھی نکال لی گئیں۔ اس طرح ۱۱۶۳ھ تک نادرشاہ کی آل و اولاد کا ایران میں نام نشان تک نہ رہا۔ افسوس کہ اپنے خاندان کو بنانے میں نادرشاہ نے جتنی کوششیں صرف کیں سب برباد ہو گئیں۔ سچ ہے ع

تقدیر کن۔ بندہ تقدیر زند خندہ

[3] نادرشاہ ایران جیسی قدیم اور عظیم الشان سلطنت کا شہنشاہ تھا اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنے بچوں کو عام سپاہیوں میں بھرتی کرا کر ... رفتہ رفتہ سپہ سالاری کے منصب تک پہنچاتا اور جس عہدے پر اس کا کوئی فرزند ہوتا اس عہدے کی اس کو تنخواہ بھی دلاتا مگر وہ ... یہ لڑکے صرف نازو نعمت ہی میں پرورش پاتے رہتے اور دوسرے امرازادوں یا شاہزادوں کی طرح اپنی نالائقیوں کی وجہ سے اہل دربار کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے رہتے۔ تو یہ سلطنت اور یہ عروج جو اس محنت اور جانبازی سے حاصل ہوا ہے صرف میرے ہی دم تک رہے گا۔ اس کا بڑا بیٹا رضا قلی جب لفٹیننٹی کے عہدہ پر پہنچا تو نادرشاہ نے ایک تکمنائٹ کے ذریعے سے یہ امر اچھی طرح اس کے ذہن نشین کر دیا کہ کسی جرم یا فرائض منصبی میں غفلت کرنے کی پاداش میں اسے ایسی ہی سخت سزا دی جائیگی جیسی دوسروں کو دی جاتی ہے

---

[1] ہماری رسم یہ ہے کہ داماد وہ ہو جو اپنی سات پشتوں کا شمار کر کے خاندان بتا سکے۔

[2] اس سے کہہ دو کہ تمہارا داماد نادرشاہ کا لڑکا ہے اور نادرشاہ تلوار کا بیٹا اور تلوار کا پوتا ہے۔ اسی طرح ستر پشتوں تک گنتے چلے جاؤ۔

[3] ہندوستان پر حملہ۔

اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ نادر شاہ جب ہندوستان آیا تو رضا قلی مرزا نے باپ کی عدم موجودگی میں عہدہ نائب السلطنت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور بیدار مغزی سے انجام دیئے۔

نادر شاہ کی خفیہ پولیس

نادر شاہ نے خفیہ پولیس کا تقرر بھی کیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ اہلکاروں اور عام رعایا کے حالات کی خبریں پہنچانے کے علاوہ گورنروں اور صوبیداروں کے خیالات سے بھی بادشاہ کو اطلاع دیا کرتے تھے اور رعایا کے ساتھ جو بے انصافیاں اور سختیاں ظالم حکام کی طرف سے ظہور میں آتی تھیں ان کی رپورٹیں بادشاہ تک پہنچاتے تھے ان کی رپورٹوں کے خوف سے گورنر اور دیگر حکام رعایا پر ظلم و ستم کرنے سے ڈرتے تھے۔ بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ہم رعایا پر عدل و انصاف سے حکومت کریں تاکہ نادر شاہ کی خوشنودی مزاج حاصل ہو۔

نادر اور نادر شاہ میں فرق

نادر شاہ تفکرات سلطنت سے آزاد ہونے کے لئے آزادی و بے تکلفی کی محفلیں منعقد کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کا حکم تھا کہ ایسی صحبتوں میں امور سلطنت کے متعلق ذکر تو کجا اشارۃً تک نہ کیا جائے کسی شخص کو یہ جرأت نہ تھی کہ وہ بے تکلفانہ گفتگو کی بدولت نادر شاہ کو اپنا دست تصور کرے اور اس دوستی پر نازاں ہو کر پبلک کے معاملات میں دخل دینے لگے چنانچہ ایک مرتبہ دو آدمیوں نے ایسی ہی غلطی کی۔ نادر شاہ نے فوراً ان کو توپ دم کرا دیا اور کہا "جو شخص نادر (اصلی نام) اور نادر شاہ (بادشاہی نام) میں تمیز نہیں کر سکتا۔ وہ نالائق منہ لگانے کے قابل تو کیا زندہ رہنے کے بھی لائق نہیں۔" (تاریخ حریت اسلام)

نور احمد خاں فریدی

تجلیات

حقیقت زیست کی لفظوں میں کب سمجھائی جاتی ہے
اُلجھ جاتی ہے اتنی جس قدر سُلجھائی جاتی ہے

مری رودادِ غم شاید کہیں دُہرائی جاتی ہے
ستارے مرتعش ہیں چاندنی تھرائی جاتی ہے

خدا جانے دفورِ شوق میں کیا کہہ گیا اُن سے
پشیمانی سی کچھ اُن کی نظر میں پائی جاتی ہے

ترنّم ریز ہے یہ کون میرے بربطِ دل پر
فضائے زندگی پر بیخودی سی چھائی جاتی ہے

کلی جیسے چٹک جاتی ہے سورج کی شعاعوں سے
اُنہیں یوں دیکھ کر دل پر مسرّت چھائی جاتی ہے

کہاں ہے وہ مئے رنگیں ترے شیشوں میں اے ساقی
مرے خمخانۂ پندار میں جو پائی جاتی ہے

محبّت میں طبیعت پر کوئی قابو نہیں چلتا
اُلجھنے پر بڑی مشکل سے یہ سُلجھائی جاتی ہے

چمکتا ہے یہ اُن کا جلوۂ رنگیں نگاہوں میں
کہ اک برقِ مجسم سامنے لہرائی جاتی ہے

ہُوا کرتی ہے قدرِ آدمی حُسنِ تکلّم سے
یہ وہ نایاب شے ہے جو بہت کم پائی جاتی ہے

شمیم گُل، بہارِ خُلد اور سرمستیٔ عالم
تمھاری یاد میں شامِ تمنّا پائی جاتی ہے

کبھی ایسی بھی ساعت مہر آتی ہے محبت میں
کہ اظہارِ تمنا میں بھی مشکل پائی جاتی ہے

مہر عثمانی

رنگِ شفق

ہوا ہے جب بشر عالم میں ہمدردِ بشر پیدا
نہ ہو کیوں آدمی کا آدمی کے دل میں گھر پیدا

دھواں ہو آگ سی، پتھر سے ہو جائے شرر پیدا
نہ ہو تو میرے نالوں سے کسی دل میں اثر پیدا

جمالِ حق نما کی ہی تجلّی ذرّے ذرّے میں
جو آنکھیں ہوں پئے نظّارہ کر حسنِ نظر پیدا

زمیں پر کیوں نہ آغوشِ جبیں سی گر پڑیں سجدے
جو سر رکھتے ہی بتخانے میں کعبے کا ہو در پیدا

سیاہی دل کی ہو کافور باطن صاف کر اپنا
شبِ تاریک سی ہوتا ہے خود نورِ سحر پیدا

چمن میں ہمصفیرانِ چمن ہیں منتظر تیرے
بہار آنے سے پہلے کر قفس میں بال و پر پیدا

ریاضت جان ہے شادابیٔ نخلِ تمنا کی
شجر میں کاوشوں سی ہوتے ہیں تازہ ثمر پیدا

حرم ہو دیر ہو سجدے جگہ اپنی بنا لیں گے
جبینِ شوق خود کر لیگی کوئی سنگِ در پیدا

یہی قبلہ، یہی کعبہ، یہی عرشِ معلّے ہے
خدا کا گھر ہے دل بندے کا کر لے دل میں گھر پیدا

فرشتے بول اٹھیں آمین تیرے ہاتھ اُٹھانے پر
دُعا سے پہلے لازم ہے زباں میں ہو اثر پیدا

مٹاتا کون ہے اب صفحۂ ہستی سے نام اُن کا
نشاں اپنا مٹا کر ہو گئے جو نامور پیدا

دلیلِ کارواں بن نقشِ پائے کارواں ہو کر
کریگی راہ تیری راہرو سے راہبر پیدا

بیاباں تک پہنچنے کا یونہی رستہ نکل آئے
سرِ شوریدہ سے دیوارِ زنداں میں ہو در پیدا

مرے لفظوں میں اب کہنا تجھے جا کر یہ جو کہنا
نیا مضمون کوئی پھر ہوا ہے نامہ بر پیدا

رہیگا خاک سادہ صفحۂ نیرنگیٔ گردوں
شفق ہوتا ہے ہر شام و سحر رنگِ دگر پیدا

شفق رضوی مینائی

افسانہ

چُرائے ہوئے فقرے

پربھاکر نے کھڑک پور کی کچہری میں جو اتنا نام پیدا کیا تھا اس کے دو اسباب تھے۔ اول تو یہ کہ وہ اپنا کام بروقت اور بخوبی انجام دیتا تھا دوسرے نوجوان ہونے کے باوجود وہ فضولیات میں نہ پڑتا تھا۔ اس کی طبیعت مکروفریب سے ملوث نہ ہوئی تھی۔ وہ مستقل مزاجی سے سختیاں جھیل کر ترقی کر رہا تھا۔ اس کی طبیعت کا رجحان ہمیشہ نیکی کی طرف رہتا تھا۔ دنیا میں اسے اپنی ذات اور اپنے کام سے غرض تھی، گزشتہ چار سال کے عرصہ ملازمت میں وہ ایک روز بھی لیٹ نہ آیا تھا اور نہ کبھی بھول کر ہیڈ کلارک کی طعنہ زنی کا شکار ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کچہری کی "مجلس کارکناں" نہ صرف اس سے محبت کرتی تھی بلکہ اس کے حالات دیکھ کر متعجب بھی تھی۔ کیونکہ عین عالم شباب میں اس قدر محتاط زندگی گزارنے والے بہت کم ان کی نظر سے گزرے تھے۔ ان کی متفقہ رائے تھی کہ کلارک نو صاحب کی "جی حضوری" کرنا اور نوجوان آدمی کا "گرفتار دام محبت" ہونا یہ دونوں باتیں اصول فطرت کے عین مطابق ہیں۔

(۲)

پربھاکر کی مجلس احباب کا "اصول فطرت" صحیح ثابت ہونے کو تھا۔ ... نام ایک نوجوان حسین لڑکی کی زنجیر محبت میں گرفتار ہو چکا تھا ... کے بتا نا ... ایک سکول ماسٹر تھے اور کوئی پندرہ روز ... ان کا ... کھڑک پور میں ہوا تھا۔ ان کا کنبہ صرف دو افراد ... تھا ایک تو ... خود ... دوسرے ان کی نوجوان بن بیاہی لڑکی اندو جب وہ گاڑی میں اپنا اسباب لائے تو انہیں کوئی موزوں اور عمدہ ... نہ ملا۔ اس لئے انہیں چند روز کے لئے ہیڈ ماسٹر کے گھر مقیم رہنا ... لیکن اس طرح کتنے روز گزارے جا سکتے تھے۔ بالآخر انہیں ایک ... کے خالی ہونے کی اطلاع ملی۔ ماسٹر صاحب اس کمرے کو دیکھنے گئے لیکن وہ ان کی ضرورتوں کے لحاظ سے تنگ نظر آیا۔ اسی عمارت کی ... منزل پر ایک وسیع کمرہ ضرور تھا لیکن اس میں پربھاکر فروکش تھا۔ ... نرائن راؤ نے مالک مکان سے گزارش کی کہ وہ پربھاکر کو اپنا ... خالی کر کے نیچے کی منزل میں سکونت اختیار کرنے پر آمادہ کریں۔

لیکن مالک مکان نے صاف جواب دیدیا کہ میں پربھاکر کو اس معاملہ میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا۔ آپ براہ راست اس سے گفتگو کرلیں چنانچہ وہ خود پربھاکر سے ملے۔ اس وقت اندو بھی ان کے ہمراہ تھی۔ حیرت اور مسرت کی بات ہے کہ پربھاکر نے ماسٹر صاحب کی رائے فوراً قبول کرلی اور اپنا اسباب نچلے کمرے میں لے جانے کا وعدہ کیا۔ اس اولین ملاقات کے بعد ہی ماسٹر صاحب اور خصوصاً اندو کے دل پر پربھاکر کا ایک گہرا نقش بیٹھ گیا۔ شکریہ کے چند الفاظ وہ گنگنائی لیکن پربھاکر انہیں سُن نہ سکا۔ تاہم جب وہ بول رہی تھی تو اس کے نازک ہونٹوں کی دلکش جنبشوں نے پربھاکر کو مسحور کرلیا۔

کل کرنی کے بارے میں حسب منشا بڑا کمرہ مل جانے سے نرائن راؤ اور اندو کو ہیڈ ماسٹر کے لڑکوں کی شرارتوں سے نجات مل گئی لیکن پربھاکر ایک عجیب پھندے میں گرفتار ہو گیا۔

جب سے اندو اس جگہ رہنے کے لئے آئی اور پہلی مرتبہ جب اس کی نگاہ ہول سے اندو کو دیکھا تو پربھاکر کی زندگی میں بڑا بھاری انقلاب واقع ہوا۔ دفتر کے اوقات کے علاوہ اس کے فرصت تمام ساعتیں کمرے کی چہار دیواری میں کٹنے لگیں۔

ایک مدت سے اس کا دستور تھا کہ وہ صبح سویرے نلکے پر غسل کرنے جاتا تھا۔ اپنے اس دستور العمل کو بالائے طاق رکھ کر اس نے باڑے میں کنوئیں پر غسل کرنے کی ابتدا کی اور اب وہیں نہانے لگا طبعاً خاموش رہنے کے باعث اس کا حلقۂ احباب بھی بہت محدود تھا۔ جن چند لوگوں سے اس کی شناسائی تھی اس نے ان سے بھی ملاقات ترک کردی۔ اگرچہ وہ اپنی عادت کے مطابق دفتر کا کام بخوبی انجام دیتا تھا لیکن اب اس کی طبیعت کام سے بیزار رہنے لگی۔ وہ لکھنے لگتا لیکن خیالات کی رو میں بہ جاتا اور وقت کا بیشتر حصہ اسی طرح گزر جاتا۔ اگرچہ پہلے بھی وہ چھیل چھبیلا بن کر رہتا تھا لیکن اب اُسے آرائش و زیبائش کا خبط سا ہو گیا تھا۔

پربھاکر کی روش میں اس قدر تبدیلی، اتنا تغیر کس طرح ہوا اس

کا احساس خود پربھاکر کو بھی نہ ہوا۔ اور ہوتا بھی کیسے۔ اس کے خیالات تو اندو کے گرد و پیش گھوم رہے تھے۔

—— (۳) ——

دن گزرتے جا رہے تھے۔

پربھاکر میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب اسے دفتر کی بہ نسبت اپنے گھر کی کشش روز افزوں محسوس ہونے لگی۔ اس لئے وہ دفتر کو جانے اور وہاں سے شام کو لوٹنے میں بڑی عجلت سے کام لیتا۔ اس روز بھی حسب معمول وہ دھاندلی سے گھر جا رہا تھا۔ جب وہ نالے کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اندو وہاں ایک چشمے میں پانی بھر رہی ہے۔ اس نے اپنی رفتار سست کر دی اور اس سے گفتگو کرنے کے لئے موضوع سخن تلاش کرنے لگا۔ لیکن گفتگو کے لئے کوئی موزوں فقرہ اس کے ذہن میں نہ آیا۔ اس نے چاہا کہ اندو سے دریافت کرے۔ "معلوم ہوتا ہے پانی کے لئے آئی ہو"۔ لیکن یہ تو آنکھوں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس قسم کا سوال حماقت پر مبنی ہوگا۔ اس خیال سے یہ سوال اس نے اپنے ذہن سے نکال دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کسی حسین دوشیزہ سے بولنے کا موقع ملے تو گفتگو کے لئے موزوں فقرے کون سے ہوتے ہیں وہ اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ کیا کہے اور کیا بات چیت کرے۔ آخر جب وہ اندو کے قریب پہنچا تو اندو نے گفتگو میں پہل کی۔ اس نے پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو دفتر سے چھٹی مل گئی ہے"

"ہاں —— !"

"آج دوپہر کو بڑی گرمی تھی"

"ہاں —— !"

"تھوڑی دیر پیشتر جب میں یہاں آئی تو گھڑا رکھ کر پانی میں پاؤں لٹکائے دیر تک بیٹھی رہی"

"ٹھیک —— !"

اندو نے اتنی پہل کی تھی تو پربھاکر کو چاہیئے تھا کہ وہ اندو کو دیر تک مصروف گفتگو رکھتا۔ اور اسے باتوں ہی باتوں میں راہ پر لے آتا۔ لیکن اس سے یہ بھی نہ ہو سکا اسے موزوں اور معنی خیز الفاظ یاد نہ آ سکے۔ نہ ہی اس کے دماغ نے موزوں فقرے پیش کئے۔ اسی لئے اس کا جواب ایک لفظ سے زیادہ طول نہ پکڑتا تھا۔ اسی وجہ سے اندو نے گھڑا اٹھایا اور گھر کی راہ لی۔ پربھاکر نے اس کے ہمراہ جانا مناسب نہ سمجھا اور دوسرا رستہ اختیار کیا۔

اندو سے مبادلۂ خیالات کے ایسے کئی مواقع پربھاکر نے کھو دیئے اس کی خواہش تھی کہ وہ اندو سے خوب خوب باتیں کرتا رہے۔ نارائن راؤ اس پر بیحد مہربان تھے۔ اس لئے اندو سے باتیں کرنے اور ہنسنے بولنے کے لئے کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی۔ نہ کوئی معترض تھا۔ شام کو جب وہ دفتر سے لوٹتا تو اس کا بیشتر وقت نارائن راؤ کے کمرے میں چائے نوشی اور تفریحی مشاغل میں گزرتا تھا۔ اندو بھی وہاں موجود ہوتی تھی ایسے اوقات میں اگر نارائن راؤ کا کوئی ملاقاتی آ جاتا تو وہ اندو اور پربھاکر کو کمرے میں بیٹھا ہوا چھوڑ کر چلے جاتے لیکن یہ تمام خلوتیں اور تنہائیاں پربھاکر کی بے زبانی کے باعث رائیگاں جاتی تھیں۔ تنہائی کا موقع آنے تک وہ عالم تخیل میں محبوب سے ختم نہ ہونے والی باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس کے تختۂ دل پر رنگین و شاداب مرغزار شگفتہ ہو جاتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ٹھہراتا کہ اس سے یہ کہوں گا وہ کہوں گا لیکن جب وقت آتا تو اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکتا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس لئے حالات کی موافقت کے باوجود اسے اندو سے جو محبت تھی اس نے کوئی ظاہری صورت اختیار نہ کی۔ محبت اگر دل کی عمیق گہرائیوں ہی میں رہے تو اس کی نشو و نما کیسے ہو سکتی ہے؟

—— (۴) ——

پربھاکر کی اس بے زبانی کا چند روز کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ اندو نے اس سے گفتگو کرنے کے موقعوں کو قصداً ٹالنے کی امکانی کوشش کی اوقات تنہائی کو صرف ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے برباد کر دینا، اسے منظور نہ تھا۔ پربھاکر جو اپنی ہمدید حیات محبت کے بعد ہمیشہ اندو ہی کے متعلق سوچتا رہتا تھا اندو کے اس خیال کو بھانپ گیا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کے لئے کون سا علاج تجویز کرے۔ اور آئندہ کئی روز تک اسے یہ علاج سوجھتا یا نہ سوجھتا یہ نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک روز جب وہ دفتر سے نہایت تیز قدمی سے واپس آ رہا تھا اور اسے اندو اور رگھوناتھ نالے میں کھڑے باہم مصروف گفتگو نظر آئے تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

رگھوناتھ کھڑک پور کے اسی سکول میں جہاں اندو کے پتا ملازم تھے ڈرائنگ ماسٹر تھا۔ اس کی شادی کے ہونے نہ ہونے کا کسی کو علم نہ تھا کیونکہ جب اس سے اس بارے میں پوچھا جاتا تو وہ بلطائف الحیل ٹال دیتا تھا۔ ڈرائنگ ماسٹر کی بجائے وہ اس قصبہ میں "ماتوفی پرندہ"

کے نام سے خاص طور پر مشہور تھا- نارائن راؤ کے گھر بھی وہ بعض اوقات آتا رہتا تھا لیکن نہ معلوم کیوں نارائن راؤ اُسے بڑی حکمت عملی سے فوراً رخصت کر دیتے تھے-

اندو کا اس طرح بے حجابانہ رگھوناتھ سے گفتگو کرنا پربھاکر کو ایک آنکھ نہ بھایا- اس نے محسوس کیا کہ میری محبت کی دنیا میں ایک رقیب پیدا ہو گیا ہے- اس کے سینے میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی- پھر یہ رقیب معمولی نہ تھا- اندو کا اس سے بے حجابانہ کھلے دل سے باتیں کرنا اس بات کا پختہ ثبوت تھا کہ وہ اُسے پسند کرتی ہے-

اس سے پیشتر اندو پربھاکر سے بے توجہی سے باتیں کرتی تھی- اور اب محبت میں ایک رقیب پیدا ہو گیا تھا- اس لئے پربھاکر کو اس کا بڑا رنج ہوا- اس نئی مصیبت کو جس کا اسے وہم و گمان بھی نہ تھا دور کر کے اندو کی محبت پر کس طرح فتح حاصل کی جائے یہ کسی طرح اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا-

(۵)

پربھاکر کو غور و فکر کے بعد اس مسئلہ کا حل نظر آیا-

ایک رات بستر پر لیٹے لیٹے دیر تک سکون و اطمینان سے غور کرنے کے بعد اُسے اس مصیبت سے نجات پانے کا ایک رستہ نظر آیا- اور یہ رستہ اُسے آپ اپنی طبیعت کی جانچ کرنے کے بعد معلوم ہوا، نہ کہ اندو اور رگھوناتھ کی حرکات و تعلقات پر غور کرنے کے بعد---!

وہ خود بخود غور کرنے لگا کہ اندو مجھ سے گفتگو کے موقعوں کو بچانے لگی ہے اور رگھوناتھ سے بڑے ذوق و شوق سے مصروف گفتگو رہتی ہے- آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ یہی نا کہ میں اپنی بے زبانی سے کام رہا ہوں اور رگھوناتھ باتونی ہے- شاید اس کا لب و لہجہ بھی دلفریب ہوتا ہے- صاف ظاہر ہے کہ اگر میں اندو کے خیالات اور توجہات کو اپنی طرف مبذول کرنا چاہوں تو مجھے اس سے خوب خوب باتیں کرنی چاہئیں لیکن بے معنی گفتگو سے کچھ حاصل نہ ہوگا- معنی خیزی اور خوش ادائیگی سے گفتگو کرنا ہوگی اس کا اثر یہ ہوگا کہ وہ رگھوناتھ کی طرف متوجہ نہ ہو سکے گی-

لیکن مجھے تو آسان پیرائے میں بھی گفتگو کرنا نہیں آتی تو میں ایسی رنگین گفتگو کس طرح کر سکوں گا؟ گر ٹائپنگ بُک کیپنگ- اکاؤنٹنسی کی جو مختلف کلاسیں جاری کی جاتی ہیں ان کے ساتھ ہی ناتجربہ کار نوجوانوں کے لئے پریم شاستر کے سبق سکھانے والے مکتب عشق و محبت یہ لوگ کیوں نہیں کھولتے؟ ہر چند اس قسم کا کوئی مکتب موجود نہ تھا لیکن پھر بھی پربھاکر کا یہ مشکل سوال حل ہو ہی گیا-

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کسی سے سُنا تھا یا پڑھا تھا کہ ناولوں کے متعلق نہایت عمدہ ہوتے ہیں- خصوصاً ہیرو اور ہیروئن نہایت عمدہ، رنگین اور معنی خیز فقرے ادا کرتے ہیں- اسی لئے اس نے اس قسم کے بلند پایہ ناول خریدنے کا فیصلہ کیا- اس کا دل انتہائی اطمینان محسوس کر رہا تھا-

یہ طے کرنے کے بعد اس رات کو وہ بڑی گہری نیند سویا-

(۶)

ایک روز شاید اتوار کی تعطیل کا موقع پا کر وہ قریب کے ایک شہر میں گیا اور وہاں سے "انجن" اور "رنجن" نام دو ناول خرید لایا- کتب فروش کے لاتعداد ناولوں میں سے اس نے یہی دو ناول کیوں منتخب کئے- اس کی صحیح وجہ؟ اخبارات و رسائل نے ان کے متعلق نہایت بیش قیمت آراء کا اظہار کیا تھا؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ ان میں سے ایک ناول کے مصنف نے اپنی تصنیف کسی عورت "اندو" کے نام سے معنون کی تھی اور دوسرے ناول کی ابتداء اس جملے سے ہوئی تھی کہ "اندو نے وہ ساری رات بیداری میں بسر کی"-

یہ کہنا غالباً مبالغہ میں داخل نہ ہوگا کہ اس کے بعد پربھاکر نے ان ناولوں کا مطالعہ انتہائی شوق و ذوق اور محنت و جانفشانی سے کیا- اس نے ان ناولوں کو تین مرتبہ بغائر دلچسپی اور توجہ سے پڑھا مطالعہ کے دور چہارم میں معنی خیز جملوں پر سرخی سے نشانات لگائے اور انہیں زبان زد کرنے کی مشق جاری کی- تین چار روز میں اس نے کوئی دس پندرہ عمدہ عمدہ فقرے زبانی رٹ لئے اور جب یہ فقرے نوک زبان ہو گئے تو وہ اندو سے تنہائی میں گفتگو کرنے کے موقع کا متلاشی رہا-

خوش قسمتی سے اُسے یہ موقع بھی بہت جلد ہاتھ آ گیا- اُس نے کسی بات میں کسی مقام پر پڑھا تھا کہ "جب کسی معاملے میں کامیابی کے آثار نظر آئیں تو تمام مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں"- اس جملے کی صحت کا احساس اسے ان ناولوں کے مطالعہ کے دوران میں ہوا-

ایک روز صبح کے وقت نارائن راؤ نے پربھاکر کو اپنے گھر بلا کر کہا- "پربھاکر! میں قریب کے گاؤں جا رہا ہوں- وہاں کے چند طلبہ نے ہماری دعوت کا انتظام کیا ہے- ہمارے مدرسہ کا پورا اسٹاف اس دعوت میں شریک ہو رہا ہے- اندو یہاں اکیلی ہے- اتوار کی تعطیل کی وجہ سے تمہیں بھی آفس کے جھمیلوں سے فرصت ہے- اس لئے تم دونوں میری واپسی تک گھر ہی پر رہو- میں رات کو سات آٹھ بجے

تک لوٹ آؤں گا۔"

پربھاکر "جی" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اور دل ہی دل میں ملہائن راؤ کا شکر گزار رہا۔ "مدرسہ کا پورا اسٹاف اس دعوت میں شریک ہو رہا ہے" اس کا یہ مطلب ہے کہ رگھوناتھ بھی گاؤں جائے گا۔ اور میں سات بجے شام تک بلا شرکت غیرے اندو کی رفاقت میں رہوں گا۔ اس سے خوب خوب باتیں ہوتی رہیں گی ―― خوبی تقدیر اسی کو کہتے ہیں۔ لو بھئی پربھاکر مزے ہیں تمہارے۔ ۷ بجے شام تک پربھاکر نے رٹے ہوئے جملوں میں سے ایک فقرہ بھی اندو سے دوران گفتگو میں نہ کہا۔

――(۷)――

چار بجے ان دونوں نے مل کر چائے پی۔ اس کے بعد پربھاکر نے اندو سے کہا۔ "آؤ اب ہم سیر کو چلیں۔"

"سیر کو؟ پتاجی تو ہیں مگر بیٹے کے لئے گئے ہیں۔"

"خوب! فقروں کا لفظی ترجمہ تو نہیں کیا جاتا۔ بعض اوقات ان سے دوسرے مفہوم بھی اخذ کئے جاتے ہیں۔ نہیں؟"

"اچھا یہ بات ہے۔ اب تک میں فقروں کا مفہوم سمجھنے کی یہ نئی ترکیب نہ جانتی تھی۔ لیکن پتاجی کے بیان سے تم نے کون سا مفہوم اخذ کیا ہے؟"

"میری واپسی تک گھر ہی پر رہو۔ اس فقرے کا مفہوم یہ ہے کہ میں واپس آؤں۔ اس وقت تک اندو کو تنہا چھوڑ کر تم کہیں باہر نہ جاؤ ہم دونوں سیر کو جا رہے ہیں۔ گویا ہم تمہارے پتا کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ کیوں ہے نا ٹھیک؟"

اندو نے کوئی جواب نہ دیا لیکن مسکرا کر پربھاکر کے ذہن میں بجلیاں گرائیں۔ اس کے بعد دونوں تفریح کے لئے روانہ ہو گئے۔

نہ جانے آج اندو پربھاکر سے اتنی خوش کیوں تھی اور پہلے کی بہ نسبت زیادہ مہربان۔ یاد کئے ہوئے فقروں کا استعمال جس رستہ سے موزوں ہوگا وہ رستہ پہلے ہی پربھاکر نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا، سٹیشن کا رستہ چھوڑ کر وہ نالے کی طرف مڑا اور وہ دونوں نالے کے کنارے کنارے ٹھنڈی ہریالی پر خراماں خراماں چلنے لگے۔

پربھاکر نے اندو کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔ "کسی محبوب ہستی کے ہمراہ رستہ کس قدر جلد طے ہو جاتا ہے۔ ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔"

اندو نے اس کی طرف تعجب خیز نگاہوں سے دیکھا۔ پربھاکر کی زبان سے اس قدر معنی خیز فقرہ ادا ہونے کی اُسے خواب میں بھی امید نہ تھی۔ تھوڑی دور چل کر پربھاکر ٹھٹھکا۔ سامنے سے ایک تیز رفتار نالہ بہتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ لیکن اس مقام پر گہرائی کے باعث روانی میں سکون پیدا ہو گیا تھا۔ نالے کے اس سکون کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا۔

"جہاں بہاؤ پرسکون ہوتا ہے وہاں پانی زیادہ گہرا ہوتا ہے۔"

"بالکل درست خیال ہے تمہارا۔" اندو نے کہا۔ "ایک دفعہ میں یہاں کپڑے دھونے آئی تھی۔ میں نے جونہی پانی میں پاؤں ڈالا بڑی گہرائی معلوم ہوئی۔ کیا کہوں میں اس وقت کس قدر گھبرا گئی تھی۔"

اس کے بعد تھوڑی دور جا کر پربھاکر پھر رکا۔ نالے کے دونوں جانب درختوں کی اونچی اونچی شاخیں ایک دوسرے سے مل گئی تھیں ان پر جنگلی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں گویا ایک قسم کی محراب سی بن گئی تھی ؎

وہاں ہر شاخ اک محراب سی تھی
ہوائے سرد بھی پُرخواب سی تھی

درختوں کی اس کمان کے نیچے نالے کا شور حد درجہ دلکش معلوم ہوتا تھا۔ چند سفید بگلے ہریاول پر ادھر اُدھر خوش خرامیاں کر رہے تھے۔ دور کہیں دور کسی درخت پر ایک پرندہ کچھ عجیب قسم کی شیریں آواز میں میٹھے گیت گا رہا تھا۔ ڈالیوں پر ادھر اُدھر چڑیاں پھدکتی پھرتی تھیں۔ پربھاکر نے اونچے اونچے درختوں کی شاخوں کی طرف دیکھتے ہوئے اندو سے کہا۔

"کیوں اندو، یہاں کا قدرتی منظر کتنا حسین کتنا پیارا ہے۔"

وہ درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہاں کتنا دلفریب نظارہ ہے۔ اس گھنی جھاڑی میں کچھ عجیب سکون اور شانتی محسوس ہوتی ہے۔ اگر اس منظر کی تصویر اتاری جائے تو کیا ہی اچھا ہو!"

"یہ تو درست ہے لیکن اس بہار آفریں منظر کی عکاسی کون کر سکتا ہے۔"

"تمہارا خیال بجا ہے۔" اندو نے کہا۔ "اس مقام کی سی حسین تصویر کوئی نہیں کھینچ سکتا۔"

"کوئی نہیں، کیونکہ فطرت بجائے خود ایک عجیب صنعت ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد پربھاکر کو محسوس ہوا کہ میں یاد کئے ہوئے تمام فقرے بہت جلد ختم کر رہا ہوں اس لئے وہ ہریالی پر بیٹھ گیا۔ اندو بھی اس کی داہنی جانب بیٹھ گئی۔ اور وہ دونوں مختلف قسم کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ ادھر کی کچھ اُدھر کی۔

تھوڑی دیر کے بعد پربھاکر اٹھا۔ ڈھاک کے پتے اور کانٹے لا کر کشتی نما دو پیالے تیار کئے (رجن ناول کے ہیرو نے ہیروئن کے ساتھ تفریح کو جاتے وقت کچھ اسی قسم کی حرکات کی تھیں۔ یہ پربھاکر کو معلوم تھا) ان پیالوں سے دونوں نے پانی پیا اور دونوں نے وہ پیالے بہاؤ پر

چھوڑ دیئے۔ ڈوبتے تیرتے بہتے ہوئے ان پیالوں کو دیکھ کر پربھاکر نے کہا
"دو شخصوں کا ایک ہی جگہ بیٹھ کر پانی پینا کتنے گہرے تعلقات کا موجب ہوتا ہے۔"

اندو اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں پربھاکر کی محبت اور حسن اعتقاد نمایاں تھا۔ اور اس کے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔

اس کے بعد تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ دو چار لمحے توقف کے بعد پربھاکر نے کہا۔

"ہم بڑی دیر تک آرام سے بیٹھے رہے۔ اگر آرام بھی حد سے سوا ہو جائے تو طبیعت میں ایک قسم کی اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پربھاکر سے پوچھا۔

"کتنے بجے ہیں؟"

کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھ کر اس نے جواب دیا۔

"پونے چھ۔"

"تو پھر جلدی [illegible] ابھی اب آتے ہی ہوں گے۔ اتنا وقت گزر گیا [illegible] مجھے خبر تک [illegible]۔"

"تم قریب ہوتی ہو تو مجھے وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔"

[illegible] اندو [illegible] گئی اور کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "آج تم کچھ عجیب گل کھلا رہے ہو۔"

"تیرے لب الفاظ زبان کے لئے باعث اذیت نہیں ہوتے۔" پربھاکر نے کہا

اندو [illegible] مسکرا دی۔

دونوں [illegible] کے لئے روانہ ہوئے۔

[illegible] پربھاکر نے کہا۔

"[illegible] ہو تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ [illegible] ہمارے [illegible]"

اندو [illegible] اس کے چہرے پر زردی [illegible] سرخی چھا گئی۔

پربھاکر نے اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہا۔

"آج کا دن [illegible] مسرت و شادمانی [illegible] ہوئے ہے سکھ اور شانتی سے بھرپور ہے۔ ایسا خوش نصیب دن اپنی زندگی میں آج تک میں نے نہیں دیکھا۔"

اندو نے اپنی نازک کلائی پربھاکر کی گرفت سے چھڑائی اور نگاہیں [illegible]۔

آسمان پر [illegible] ہوا تھا۔ بادل ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے گویا ہنگامہ [illegible] ہو رہی تھی۔ دونوں نے آسمان کی طرف دیکھا

کالے بادل سیاہ مست ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اندو نے گھبرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"برکھا کے آثار نظر آ رہے ہیں۔"

"زندگی میں بارش بھی ہونا چاہئے اس کے بغیر بسنت کی بہار آفرینیاں کا لطف نہیں آتا۔ اور نہ بہار کی سوندھی سوندھی خوشبو حاصل ہوتی ہے۔"

اندو نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ وہ دونوں تیز قدمی سے چل نکلے۔ باڑے میں پہنچ کر پربھاکر اپنے کمرے کے قریب ہی رک گیا اور اندو زینہ چڑھ کر اوپر جانے لگی۔ تو پربھاکر نے اس سے کہا۔ "محبت کرنے والوں کی جدائی میں ایک طرح کی مسرت ہوتی ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" اندو کھلکھلا کر ہنس پڑی اور دوڑتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

کمرے میں آ کر پربھاکر نے کوٹ اتارا اور بستر پر دراز ہو گیا وہ تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔ اندو سے باتیں کرتے وقت ہر چند وہ خوش ہو رہا تھا لیکن موزوں فقروں کا برمحل استعمال کرتے وقت اسے دماغی کاوش بھی برداشت کرنا پڑی تھی۔ اس قدر دماغی محنت اپنی زیست میں اس نے کبھی نہ اٹھائی تھی۔ لیکن وہ اس کوفت کو فوراً بھول گیا۔ اس کا کام قیاس و امید سے زیادہ کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کی شادمانیوں اور مسرتوں کی کوئی حد نہ تھی۔ اس کارنامے کی کامیابی پر اس نے اپنے آپ کو بہت شاباش کہی۔

——(۸)——

اندو سے شادی کے متعلق وہ اسی روز پوچھنا چاہتا تھا لیکن بادلوں کی نفاقیہ گرج اور شور و غل کے باعث وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

تین دن کے بعد ——!

رات کا وقت تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے وہ دونوں تنہائی کے عالم میں چوک میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ روزانہ چند فقرے زبانی یاد کر لینے کے بعد وہ رات کو اندو کی ملاقات کے وقت ان فقروں کو مناسبت سے استعمال کرتا تھا۔ چند روز سے اس کا یہی دستور العمل تھا۔

اوپر آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے اندو سے کہا۔

"ان گنت ستاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا حسین نظارہ مجھے تمہارے حسن کے مقابلے میں پھیکا معلوم ہوتا ہے۔"

اس پر "توبہ" کہہ کر اندو نے اپنی ہنس کی سی لانبی گردن موڑی لیکن اس کے لب و لہجہ اور چہرے کی علامات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ فقرہ سن کر وہ بے حد محظوظ ہوئی ہے۔

اس زرّیں موقع کو ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے فائدہ اٹھانا چاہئے یہ سوچ کر اس نے جرأت کی۔ یعنی اندو سے اپنی شریک حیات بننے اور شادی کر لینے کی درخواست کی۔

اندو نے شرماتے اور لجاتے ہوئے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب نارائن راؤ سے بھی مختلف ذرائع سے شادی کے معاملہ میں گفتگو کی گئی تو وہ بھی بخوشی آمادہ ہو گئے۔

شادی کے لئے قریب کی ایک تاریخ مقرر کی گئی لیکن یہ "قریب" بھی اکیس روز سے کم بعید نہ تھا۔ اور اکیس روز کی یہ طوالت پربھاکر کے لئے باعث اذیت ثابت ہو رہی تھی۔ کیونکہ ناولوں کے ضروری ضروری فقروں کو از بر کرتے کرتے وہ بیحد اکتا چکا تھا۔ لیکن شادی کی تمام رسوم انجام پانے تک یہ ڈراما جاری رکھنا بہرحال ضروری تھا، اس ڈرامے کی وجہ ہی سے تو پربھاکر نے اندو کی محبت پر فتح پائی تھی جیسے جیسے ایک ایک دن گزرتا جاتا تھا پربھاکر کے دل و دماغ کا بار بھی ہلکا ہو رہا تھا۔

——(۹)——

شادی میں صرف نو روز باقی رہ گئے تھے۔ شادی کے دعوت ناموں کا مسودہ نارائن راؤ کو دکھانے کے لئے پربھاکر دفتر سے چھٹی ملتے ہی گھر آ رہا تھا۔ باڑے میں داخل ہوتے ہی وہ اپنی جیب سے کنجیاں نکال کر اپنے کمرے کی طرف مڑا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا پایا تو اس کے سینہ میں دھڑکن پیدا ہو گئی۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔

جس روز سے وہ ناول خرید کر لایا تھا کمرے کو قفل لگانا نہ بھولتا تھا نہ ہی کبھی بھول کر اندو کو وہاں آنے دیا تھا۔ اس کا ایوان محبت در اصل مکالمے کی خوبیوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔ کم از کم اس کا یہی خیال تھا۔ اور مکالمے کی یہ خوبیاں ناولوں سے مستعار لی گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کے قریب پہنچا اور اندر جھانک کر دیکھنے لگا۔ آرام کرسی پر دراز ہو کر اندو "انجن" ناول کے نشانات لگائے ہوئے فقرے باآواز بلند پڑھ رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر پربھاکر ہکّا بکّا رہ گیا اسے محسوس ہوا کہ انتہائی محنت و جانفشانی سے تعمیر کی ہوئی محبت کی عمارت ڈھے رہی ہے اس کے دل سے ایک آواز آئی کہ "اگرچہ اندو کی غیر محدود محبت کے حصول کے لئے میں نے یہ چال چلی لیکن اب اندو کا مجھ سے شادی کرنا ناممکن ہو گیا ہے"

وہ بڑی مشکلوں سے اندر پہنچا اور قریب ہی ایک میز پر سہارا لیکر اندو سے پوچھنے لگا۔

"کیوں اندو! تم نے وہ سرخ نشانات والے فقرے پڑھ لئے ہیں
بدحواسی کے آثار پربھاکر کے چہرے سے نمایاں تھے۔

اندو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور کتاب کرسی پر رکھ کر مسکرا
ہوئے کہنے لگی۔ "ہاں میں نے وہ فقرے پڑھ لئے ہیں اور ان کے مط
کے بعد یہ بخوبی جان گئی کہ تم مجھے اپنے کمرہ میں کیوں نہ آنے دیتے
آج تم کمرے کو قفل لگانا بھول گئے۔ اس لئے میں تمہارا خلوص
سے شکریہ ادا کرتی ہوں"

"تو میں یہ سمجھ لوں کہ اب ہمارا رشتہ شادی ٹوٹ گیا"

"کیوں؟ یہ کس وجہ سے؟ ہرگز نہیں، ناولوں کے اُن ف
کو پڑھ کر تمہاری فریب کارانہ چال کا علم ہونے پر میں اپنے آپ کو ک
اور مجھے خود اپنی ذات پر غصہ آیا"

آخری فقرہ کا مفہوم پربھاکر نہ سمجھ سکا۔ اس لئے وہ چشم حیر
اندو کی طرف دیکھنے لگا۔ اندو نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تم عمدہ
گفتگو سے واقف نہیں ہو۔ تمہیں خوب خوب باتیں کرنی نہیں
اس لئے درمیان میں کچھ دن تک میں نے تم سے گفتگو کرنا کم کر د
اس وقت میں نے کتنی بڑی حماقت کی تھی۔ یہ میں آج سمجھ گئی۔ م
میرا خیال تھا کہ خوب باتیں کرنے والا رفیق حیات ملے تو زندگ
شانتی سے بیت جائیگی لیکن میرا یہ خیال غلطی پر مبنی تھا۔ تم نے
کام ضرور لیا لیکن میری محبت کے حصول کے لئے نا؟ ناولوں کے
پڑھنے کے بعد تمہاری رنگین گفتگو سے تصنع ٹپکتا تھا۔ اس کا علم
مجھے ہوا اسی طرح میں نے یہ بھی پتا چلا یا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کر
میں ایسی بے لوث، غیر محدود محبت کو کس طرح خود اپنے پیروں
اندو کا آخری فقرہ سن کر پربھاکر پر جو کیفیت طاری
کسی ناول میں اس کی نظر سے نہ گزری تھی۔ اس کے بدن میں
کچھ اس طرح پیدا ہوئی کہ اسے اس کا احساس بھی نہ ہوا۔

اندو محبت کے دام میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اس نے پر
میں نگاہیں ڈال کر اس سے پوچھا۔ "انجن" ناول کھولتے
پہلا فقرہ کون سا پڑھا تھا جانتے ہو؟"

"کون سا؟ میں کیا جانوں!"

"دل کی گہرائیوں میں جو جذبات پرورش پاتے ہیں وہ
ہوتے ہیں ان الفاظ سے جو صرف زبان سے ادا کئے جاتے ہیں"

غلام محمد ناظر الہ (مرہٹی زبان سے)

ممکنات

دُنیائے مسرت کے لمحے اب اس سے کیا کم ہو جائیں
ہونٹوں پہ ہنسی آنے والی ہو آنکھیں پُرنم ہو جائیں

توہینِ زمانہ کہلائیں، رُسوائے عالم ہو جائیں
ہم میں جو روابط قائم ہیں ممکن ہی نہیں کم ہو جائیں

جب قسمت کے ہاتھوں تدبیریں درہم برہم ہو جائیں
ہم اُس کے در پر جا بیٹھیں غم جھیلیں بے غم ہو جائیں

میں جس سے محبت کرتا ہوں وہ کیسا ہے؟ کیا عرض کروں
افکار مصوّر ہو جائیں، اشعار مجسّم ہو جائیں

وہ منظر، اُف وہ منظر، اک شاعر کو قیامت ہوتا ہے
ہر صبح کسی کے شانوں پر جب گیسو برہم ہو جائیں

احباب کو ایسے گلشن میں کانٹے بونے سے کیا حاصل
جب عہد مکرر ہو جائے جب وعدے پیہم ہو جائیں

یوں رفتہ رفتہ اُس کے جلوے دھیمے پڑتے جاتے ہیں
جس طرح سحر کے اُجلے اُجلے تارے مدھم ہو جائیں

حالات کو ہر ہر موقع پر اک بھیس بدلنا لازم ہے
کانٹوں میں دامن بن جائیں پھولوں پہ شبنم ہو جائیں

یہ ہوتا ہے جب حسن محبت کا رتبہ پا جاتا ہے
وہ کہتے ہیں تم اُلفت میں بدنام نہ ہو، ہاں ہم ہو جائیں

منزل کے صدمے سہہ سہہ کر اس در تک تو آ پہنچا ہوں
اب آگے قسمت ہے صدمے بڑھ جائیں یا کم ہو جائیں

ہم اُس کو آنکھ سے اوجھل کہنے کا مطلب کیا لیتے ہیں
وہ آنکھ سے اوجھل ہو تو نظارے درہم برہم ہو جائیں

تسلیم کہ اس کے چہرے سے پھولوں کی رنگت ملتی ہے
رنگت کے یکساں ہونے میں کیوں معنیٰ مدغم ہو جائیں

اربابِ ادب اور "نغمہ" اب اے شاد وہ دن بھی دور نہیں
موسیقی کی طوفان میں آ کر بحریں "سرگم" ہو جائیں

شاد عارفی

نوٹ: [illegible] خرید سکتے۔

سوانح

پھکّو شاہ فرّخ آبادی

رہے نام سائیں کا ——— واہ میاں پھکّو شاہ، خدا تمھارا نام جگتی جوت تک رکھے۔ کیا خوب آدمی تھے۔ نہ نام کا پتہ نہ نشان کا ——— رند مئے توحید کہیں سے فرّخ آباد آگئے تھے۔ فقیر آدمی نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی پروا۔ جو جس نے دیدیا کھالیا۔ جہاں جگہ ملی وہیں پڑ رہے۔ نہ پڑھے نہ لکھے مگر ذہن اس بلا کا کہ دیدہ نہ شنید ——— جب باتیں کرتے تو معلوم ہوتا جیسے کوئی موتی پرو رہا ہے۔ فقرا کے مجمع میں فقیر، صوفیوں کی محلسوں میں صوفی۔ پابند صوم وصلوٰۃ کبھی مندر میں پوجا کر رہے ہیں تو کبھی مسجد میں سجدوں پر سجدے ———!

پستہ قد، خوبرو، سر منڈا ہوا۔ زرد کپڑے زیب جسم۔ کپڑے کیا ایک نیچا کرتا۔ ایک تہ بند۔ سر پر زرد ٹوپی۔ لوہے کی کھڑاؤں پہنے۔ ہاتھ میں پھولوں کا پنکھا لئے کبھی جنگل میں منگل منا رہے ہیں تو کبھی محفل میں بیٹھے ہزار بوستاں کو مات کر رہے ہیں۔ بچپن سے کسی پردہ نشین پر شیدا ہوئے اور ایسے ہوئے کہ دنیا جہاں سے گئے گذرے۔ نہ شادی کی علت پالی نہ بچوں کا وبال سر لیا۔ تمام عمر تجرد میں کاٹ دی کبھی کسی کے آستان گیر نہ بنے۔ نہ خود گھر بنایا نہ کسی کو اپنے لئے بنانے دیا۔ نواب [illegible] حسین خاں بڑی عزت فرماتے تھے۔ منشی مادھو لال قمر کے ہم عصر اور برابر کے کہنے والے تھے۔ کون منشی مادھو رام جن کے سیکڑوں اشعار [illegible] زبان زد خلائق ہیں۔ اس اُمّی شاعر کے آگے منشی جی کا چراغ شہرت [illegible] نہ جلا ایک حاسد تھے اور ایک محسود۔ مگر اللہ رے رواداری، [illegible] مشاعرہ ختم ہونے کو ہوتا اور یہی دو بزرگ پڑھنے کو رہ جاتے [illegible] پہلے پڑھنے کی کوشش کرتا۔ اور اکثر بازی منشی مادھو رام قمر [illegible]۔ منشی جی منیر شکوہ آبادی کے جانشین اور لائق شاگرد [illegible] اور فارسی کے اچھے ادیب ہونے کے علاوہ خوش فکر ہندی شاعر [illegible] ان کا دیوان انقلاب روزگار کے ہاتھوں نایاب ہے اور اس کا [illegible] فرخ آباد کی "ٹاؤن ہال لائبریری" میں محفوظ ہے۔

[illegible] کے مذہب کا علم ہوا۔ کوئی اُن کو ہندو کہتا کوئی مسلمان گردانتا۔ جب ان سے سوال کیا جاتا تو ہنسکر کہتے بھائی ہم نہ ہندو نہ مسلمان ——— پھکّو شاہ ہیں چاہے مسلمان جانو چاہے ہندو۔ عیدگاہ میں نماز کے لئے جاتے اور عید اضحیٰ کے موقع پر قربانی کرتے۔ ہولی کے روز رنگ کھیلتے اور دیوالی کی رات چراغ جلاتے۔ عجب مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ پھکّو شاہ فن سپہگری میں طاق بلکہ شہرۂ آفاق تھے۔ شہسوار ایسے کہ شریر سے شریر گھوڑے پر بیٹھا دیکھئے مجال نہیں کہ جسم میں جنبش آجائے۔

پھکّو شاہ کا پنکھا مشہور تھا۔ وہ کہیں ہوں۔ کوئی موسم ہو، ان کا پنکھا ضرور اُن کے ہاتھ میں ہوگا۔ ایک مرتبہ نواب سلطان عالیہ کے یہاں مشاعرہ تھا۔ فرخ آباد کے سب ہی شعرا موجود تھے۔ کسی نے پھکّو شاہ کا پنکھا چھپا دیا۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو سلطان عالیہ کی بارگاہ میں فی البدیہہ یہ شعر کہہ کر عرض رسا ہوئے ؎

کیا جانئے کس کا وہ ہُوا ہوگا ہوا خواہ
مجھ بندۂ ناچیز کا پنکھا نہیں ملتا

لوگوں نے ہنسکر پنکھا ڈھونڈ دیا۔ سلطان عالیہ صاحبہ نے اس شعر پر سو ڈیڑھ سو روپیہ کی لاگت کا دوپٹہ نذر کیا۔

ایک مرتبہ شوق چرایا کہ لکھنؤ جائیں۔ منشی نیّر فرخ آبادی کے ہمراہ لکھنو پہنچے۔ منیر شکوہ آبادی کے توسل سے اساتذہ لکھنؤ سے متعارف ہوئے۔ چنانچہ جب مرزا آتش کے یہاں پہنچے تو اس وقت سوئے اتفاق سے کوئی شاگرد اپنی غزل سُنا رہا تھا۔ ایک شعر پر (جس میں اُس نے "چاروں پہر نہیں باندھا تھا) مرزا آتش نے بڑی تعریف فرمائی اور داد طلب نگاہوں سے پھکّو شاہ اور نیّر صاحب کو دیکھا۔ نیّر صاحب سو رادب سے خاموش رہے مگر پھکّو شاہ مُنہ پھٹ تھے بولے یہ بھی کوئی شعر ہے اور فی البدیہہ یہ شعر کہہ کر تمام محفل کو پھڑکا دیا ؎

دن رات میں کبھی تو ذرا مُنہ سے ہاں کرو
ایسی بھی کیا نہیں ہے کہ آٹھوں پہر نہیں

چھ ماہ لکھنؤ میں قیام کیا۔ اسی دوران میں میر باقر رضا داستان گو سے بھی تعلقات ہوگئے۔ ان کو کسی ضرورت سے مرشد آباد جانا تھا، لیکن جن رئیس کے یہاں ملازم تھے وہ اپنی دلچسپی کے باعث اجازت نہ دیتے تھے۔ انھوں نے اس کا تذکرہ پیکو شاہ صاحب سے کیا۔ آپ نے کہا اپنی جگہ مجھے رکھاتے جائیے۔ میں ایک مہینہ تک داستان کہہ آیا کروں گا تب تک آپ واپس آجائیں گے۔ غرضکہ تیسرے دن سے جانے لگے۔ مگر داستان گو صاحب ایک مہینہ کا وعدہ کرکے گئے تھے اور تین مہینے میں واپس آئے۔ پیکو شاہ صاحب روز جاتے تھے اور داستان کہہ آتے تھے۔ جب داستان گو صاحب واپس آئے تو شاہ صاحب سے معذرت کے بعد پوچھا کہ اب آپ داستان کہاں تک سنا چکے ہیں فرمایا کہ آپ کہاں پر چھوڑ گئے تھے انھوں نے جواب دیا کہ عمر عیار کو باغ سیب کے دروازے پر چھوڑ کر گیا تھا۔ چنانچہ جواب دیا کہ اب اس کا ایک پیر باغ سیب کے اندر ہے اور ایک باہر۔ میر باقر رضا یہ سنکر سخت پشیمان ہوئے۔

جس زمانے میں لکھنؤ میں قیام پذیر تھے تقریباً روزہی شاہ مینا کے مزار پر حاضری دیا کرتے تھے۔ مگر ان کی شوخی طبع کی یہ کیفیت تھی کہ باوجود انتہائی عقیدت کے اپنی ادبی شوخی سے باز نہ آئے اور یہ شعر لکھ کر اپنا فرض پورا کردیا ؎

یہ مینا لائے ہیں دیکھو تو صاحب
اٹھو بھی آؤ چکھو شاہ مینا

۱۸۹۰ء میں شاہ صاحب بعمر ایک سو بیس سال انتقال فرماگئے مرنے سے قبل نواب ظفر حسین خاں صاحب کو بلوا کر کہا فقیر مسلمان تھا۔ مسلمان مر رہا ہے۔ اس کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقہ پر کی جائے لیکن مرنے کے بعد ہندو اور مسلمانوں میں تکفین کے مسئلہ پر بحث تکرار ہوئی۔ آخر کار رائمس کی خواہش کے مطابق مہدی باغ میں ان کو دفن کیا گیا جس میں ہندو اور مسلمان سب نے شرکت کی۔

جاوید قصری ایم۔ اے

میخانے میں

مئے گلرنگ نہ سمجھے کوئی پیمانے میں
آفتاب آج اُتر آیا ہے میخانے میں

یہ نیا رنگ ہے ساقی ترے میخانے میں
لوگ کوثر کو پیا کرتے ہیں پیمانے میں

لوگ کھنچ کھنچ کے چلے آتے ہیں میخانے میں
کیا کشش ہے مرے ٹوٹے ہوئے پیمانے میں

دستِ نازک سے چھری پھیر بھی دو گردن پر
چار چاند اور لگا دو میرے افسانے میں

بادہ نوشوں سے کہو شیخ سے جا کر کہدیں
آج جنت کی پری آئی ہے میخانے میں

کوچۂ یار کو جنت سے یہی ہے نسبت
فرق ہوتا ہے جو گلزار میں ویرانے میں

اُس کی للچائی ہوئی آنکھ تو ہے وہ نہ سہی
میں تو کہتا ہوں کہ زاہد بھی ہے میخانے میں

صُبح کا کیف بھی ہے شام کی رنگینی بھی
کیا کمی ہے مرے ٹوٹے ہوئے پیمانے میں

زر پرستوں کو کوئی کان میں کہدے یہ اثرؔ
دیر لگتی نہیں قسمت کے پلٹ جانے میں

عبدالغنی اثرؔ

افسانہ

نہ معلوم صاحبہ

مارے حیرت کے میں نے ناول میز پر رکھ دی۔ نہ معلوم آواز سُن کر وحشت سی کیوں محسوس ہونے لگی۔ کمرے میں دو تین قدم ہی چلا تھا کہ محبت کے بے پناہ جذبات پہلو میں انگڑائیاں لینے لگے۔ آئینہ دیکھا تو مایوسی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ بالآخر میں نے سوچا مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور ناول پڑھنا شروع کر دیا۔

نصف صفحہ بھی بخوبی نہ پڑھنے پایا تھا کہ وہی آواز سنائی دی۔

"اجی ـــ دروازہ کھولئے"

صاف طور پر کسی دوشیزہ کی سُریلی آواز تھی۔ میں حیران تھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ آج ہی اس مکان میں وارد ہوا ہوں اور آج ہی درمیانی دیوار کے دروازے سے یہ بے ہنگم صدائیں آنے لگی ہیں۔ خیر بھتنی چڑیل اور ڈائن کا تو میں قائل ہی نہیں۔ ہو نہ ہو کوئی کالج کی نٹ کھٹ چھوکری ضرور ہے۔ کالج کے لونڈوں کو ملازمت کی تلاش رہتی ہے اور چھوکریوں کو چاہنے والوں کی۔ خدا غارت کرے اس تہذیب کو ـــ مگر آج کل کا فیشن یہی ہے ـــ مجھے اس سے کیا ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

یہ سوچتے ہی میں ناول پڑھنے لگا۔

پانی کے قطرات بھی اگر پتھر پر مسلسل گرتے رہیں تو اس میں سوراخ کر دیتے ہیں۔ میرے پہلو میں دل تھا اور ادھر نسوانی آوازیں۔ کہاں تک برداشت کرتا۔ جس انسان کا شجرۂ نسب حضرت آدم تک پہنچتا ہو اس کا عورت کی باتیں سن کر ٹھٹک جانا عین فطرت ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ مجھے اس آواز سے کوئی سروکار نہیں۔ میرا دل ان خرافات سے پاک ہے لیکن اب یہ حالت تھی کہ دل بلاوجہ دھڑک رہا تھا۔ دل بے قابو سا ہوا جا رہا تھا۔ میں فلاسفروں کی طرح سوچنے لگا۔

"عام خیال کے خلاف دل کی زندگی اس کی مسلسل دھڑکن نہیں۔ بلکہ وہ چیز ہے جو اس کی غیر معتدل دھڑکن کا باعث ہوئی لیکن دل کی واردات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ لڑکی بڑی واہیات سی معلوم ہوتی ہے، اللہ بچائے اس کے نشتر غمزوں سے۔ آدھی رات گئے پرائے مرد سے دروازہ کھلوانا چہ معنی دارد؟ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ مگر یہ کہاں کی شرافت ہے۔ ممکن ہے پاگل ہو۔ ہذیان بک رہی ہو۔ سنا بھی ہے کہ عورتوں میں یہ مرض عام ہوتا ہے۔ مگر عشق بھی تو انسان کو پاگل بنا دیتا ہے یہ بھی ایک ہی رہی۔ نہ میں نے اس کو دیکھا نہ اس نے مجھے ـــ نادیدہ عشق؟ ہاں ہو تو سکتا ہے مگر بظاہر اس کا امکان نظر نہیں آتا۔ اس عشق میں بھی غائبانہ تعارف کی شرط لازمی ہے۔ یہ تو مجھے نادیدہ عشق سے بھی بڑھ کر کوئی اچھوتی قسم کا عشق نظر آ رہا ہے۔

خواب میں بڑبڑا سکتی ہے۔ مگر خواب میں بھی اس قسم کے کلمات کا دہرانا بیداری کے کسی حادثہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے ـــ یہ عشق کیا ہے۔ اچھا خاصہ معمہ ہے ـــ اور کیوں نہ ہو عورت کی ہر بات معمہ ہوتی ہے۔ اور عورت خود بھی معمہ ہوتی ہے۔ جسے مرد ساری عمر میں بھی حل نہیں کر سکتا۔

بہرحال میرا تجسس اور اشتیاق بنیے کے سود در سود کی طرح بڑھنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر آواز آئی تو میں نے اپنے آپ کو غیر شعوری طور پر دروازے کے قریب کھڑا پایا۔ مجھے سخت تعجب ہوا۔ وہ تو خیریت گزری کہ چند الفاظ میرے ہونٹوں تک آ کر رک چکے تھے۔ ورنہ معاملہ ہی دگرگوں ہو جاتا۔ دل ہی دل میں بہت پشیمانی سی محسوس ہوئی کہ میں کیا کہنے والا تھا۔ آدھی رات گئے پرائی بہو بیٹیوں سے بات کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ نہ معلوم کیا صورت حال پیش آتی۔ کہیں ڈانٹ ہی پلا دیتی۔ چھوٹتے ہی کہہ دیتی۔ کیا تمہارے گھر میں مائیں بہنیں نہیں ہیں۔ کوئی دیکھ لیتا یا سُن پاتا تو پھر ـــ؟ تو بہ ہی بھلی ہو جاتی۔

میں متوحش سا ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تو اچانک میری نظر کلینڈر پر پڑی۔ تاریخ کو دیکھتے ہی میرے پاؤں کی زمین نکل گئی۔ پہلی اپریل تھی میں نے فوراً دروازے کو غور سے دیکھا تو میرے کمرے کی جانب کوئی چٹخنی وغیرہ ہی نہ تھی۔ اگر واقعی ان نہ معلوم صاحبہ کو دروازہ کھولنا ہوتا تو مجھے تکلیف دیئے بغیر میرے غریب خانے میں آ سکتی تھیں، یہ دوسری بات ہے کہ اپریل فول انھیں خود بنانا پڑتا۔ لیکن جان بچی لاکھوں

پائے۔ خدا کا شکر ہے بیوقوف نہیں بنا۔ اسی ادھیڑ بن میں ہارے جواری کی طرح لمبی تان تک سو گیا۔

دوسرے دن صبح بالوں میں کنگھی کر رہا تھا کہ پھر دروازے کا ریڈیو بجنے لگا۔ پروگرام شاید کچھ بدل چکا تھا۔ اس مرتبہ غلط فہمی کا تو خیال تک بھی نہ گزرا البتہ طبیعت میں ایک چڑ سی ضرور پیدا ہوئی اور وہ بھی محض اس لئے کہ آج اپریل کی پہلی تاریخ نہ تھی۔ کل والا واقعہ تو ہنسی مذاق ہو سکتا تھا۔ لیکن آج کی آواز سراسر میری ہتک تھی۔ میرے کیریکٹر پر ایک بازاری حملہ تھا۔ میں نے احتیاطاً کئی بار کلینڈر کو دیکھا۔ دور سے بھی نزدیک سے بھی۔ انگلیوں پر دنوں کا حساب لگایا۔ یادداشت پر زور بھی دیا۔ مگر تاریخ جو تھی وہی رہی۔ اور مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ آج کوئی نیا گُل کھلنے والا ہے۔

آواز آئی ——— "میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آپ باور کیجیئے"۔

ایک دو مرتبہ اُس نے یہی الفاظ دہرائے تو میری طبیعت خواہ مخواہ مسرور سی ہونے لگی۔ غصہ کافور ہونے لگا۔ میں نے دل میں کہا "کچھ بھی ہو ہے دلچسپ لڑکی ——— !"

سکوت طاری ہوا تو نہ معلوم میرے پہلو میں دل کیوں بلیوں اُچھلنے لگا۔ میں سیٹی بجاتے ہوئے کوٹ پہن رہا تھا کہ اُس نے کہا۔

"بیوقوف ہو تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔ کون کہتا ہے میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اُلّو کہیں کا ——— !"

یہ الفاظ سُن کر میں حیران رہ گیا۔ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ آخر یہ کیا ستم ظریفی ہے۔ مکان میں رہنا تک دوبھر ہو گیا ہے۔ یہ نواب کی بیٹی چاہتی کیا ہے۔ محبت بھرے الفاظ میں پہلے تو محبت کا دعویٰ اور پھر فوراً ہی اپنے دعویٰ کی تردید کے ساتھ مہذب گالیوں کی بوچھاڑ۔ لاحول ولا قوۃ نہ معلوم اس نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ کہیں ہسٹریا کا دورہ تو نہیں پڑ رہا اسے ——— یا تو دیوار سے باتیں کر رہی ہے یا مجھ سے۔ مگر ایسی محبت سے بھی خدا بچائے جس کے اظہار پر پڑوسیوں تک کو شُبہ ہونے لگے۔ یہ تو میری صریحاً ہتک ہے ——— بے حیا کہیں کی۔

میں یہی سوچتے ہوئے کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا کہ آواز آئی ———

"کون سی چیز تمھیں میری محبت پر مائل کر سکتی ہے ——— میں تم سے محبت کرتی ہوں"۔ وغیرہ وغیرہ

میں نے کرسی پر بیٹھ کر ایک گہری سانس لی اور تذبذب میں سر کھجلانے لگا

آخر یہ کیا معمہ ہے۔ فوراً ہی روّیہ تبدیل کرنے کا کیا باعث ہے۔ میرے ہونٹوں پر یہ خیال کرتے ہی ایک مسکراہٹ ابھی کھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ اس نے پھر بیوقوف اور اُلّو کا خطاب دیا۔ اور میرے ہوش ٹھکانے آئے۔

ناچار میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آج اس دانتا کلکل کا فیصلہ ہی کر کے باہر جاؤں۔ گربہ کشتن روز اوّل۔ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ مگر معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ اگر آواز دوں اور اپنے ہی کمرے میں کھڑا ہو کر ڈانٹوں تو عین ممکن ہے کہ یہ فوراً پینترا بدل لے۔ اور اپنے بھائی۔ باپ، ماں یا کسی چاہنے والے کی دہائی دینے لگے۔ مفت میں بلوہ ہو جائے لوگ تو اسی کو معصوم بتائیں گے۔ ڈانٹ والا خط لکھوں تو یہ بھی اپنے دشمن کے ہاتھ میں اپنے ہی خلاف عدالتی ثبوت مہیا کرنے کے برابر ہوگا۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور کرنا چاہیے۔ کوئی دوست آجائے تو کیا کہے۔ مفت کی بدنامی مول لینا بھی کوئی عقلمندی ہے۔

میں انہی خیالات کی کشمکش و پیچ میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے پھر گالیوں والے جملے کو دہرایا۔ میری طبیعت پہلے ہی سے جھنجھلائی ہوئی تھی اس پر غضب ہوا کہ اس کمبخت نے ابکی بار یہ الفاظ کچھ اس بُری طرح سے چبا چبا کر کہے کہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مارے غصہ کے میرا بدن کانپنے لگا اور میں جوش میں آکر عین دروازے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

پہلے تو میں نے زور زور سے گلا صاف کیا۔ کھنکھارنے کی ناکام کوشش دمہ کے مریضوں کی طرح کھانستا بھی رہا مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز سنتا ہے؟ وہ بدستور بکتی ہی چلی گئی۔ میں نے دو تین مکّے تان کر دروازے پر رسید کئے۔ تمام کمرہ گونج اُٹھا۔ دوشیزہ بھی خاموش ہو گئی میں مکّے مارتا ہی چلا گیا۔ ہاتھ تھکے تو پاؤں جھاڑنے شروع کر دیئے جب [illegible] تھک گیا تو میں نے آخری طور دونوں ہاتھوں سے ایسا وار کیا کہ [illegible] کی بنیادیں ہل گئیں۔ میں ابھی ہانپنے ہی لگا تھا کہ دوسری جانب [illegible] آواز آئی۔

[illegible] کون صاحب اس طرف دروازے پر ہتھوڑے چلا رہے تھے؟"

میں نے جوش میں آکر کہا۔ "معلوم صاحبہ! آپ ابھی ابھی کہاں [illegible] کر رہی تھیں؟"

جھنجھلا کر بولی۔ "میں تو اپنی فلم کا پارٹ یاد کر رہی تھی۔ مجھے کٹاری [illegible] ایکٹریس کہتے ہیں —— میں تو جانتی ہوں مجھے آج ہی مکان [illegible] پڑے گا۔"

[illegible] بہ!" میں نے کہا۔ "معاف کیجیئے گا۔ میں بھی آج حسب معمول مکّے بازی کی ورزش کر رہا تھا۔ خاکسار کو گاما پہلوان کہتے ہیں۔ آج اکیلا ہی ہوں۔ کل سب پٹھے بھی آئینگے۔ تو لطف آئے گا۔"

کٹاری جان نے کوئی جواب نہ دیا۔ نہ معلوم کیوں ——؟

میر فیصل

بساطِ سخن

عالمگیر کے "تاریخ نمبر" میں صفحہ ۹۱ پر "بساطِ سخن" کے عنوان سے جو نظم شایع ہوئی ہے اس میں کتابت کی چند غلطیاں رہ گئی ہیں اور ایک قطعہ بھی چھوٹ گیا ہے ناظرین تصحیح فرمالیں۔

میر تقی میر اکبر آبادی

تیسرا مصرع ہے "وہ میٹھے بول، وہ لطف بیاں، وہ طرزِ بیاں"۔ پہلے "بیاں کی جگہ "زباں" ہے۔

مصحفی امروہوی

دوسرا مصرع ہے " اور اُس کو ہمت منزل رسی کا درس دیا"۔ اور کی جگہ "پھر" ہے۔

مومن دہلوی

پہلا مصرع ہے "گرفتگی ہے بیاں میں، زبان سوز و گداز"۔ زباں کے بعد "میں" رہ گیا ہے۔ مصرع یوں ہے ع گرفتگی ہے بیاں میں زباں میں سوز و گداز

راسخ دہلوی

تیسرا مصرع ہے "سند میں آج بھی ملتے ہیں سب ترے اشعار"۔ ملتے کی جگہ "لیتے" ہے۔

آغا حشر کاشمیری

دوسرا مصرع ہے "عروجِ اُردو ڈراما کو صرف تجھ سے ملا"۔ "ڈراما" کی جگہ "ڈرامے" ہے

نظم کے دورِ حاضر نشاۃِ اوّل میں یہ قطعہ شامل کر لیا جائے۔

محوی لکھنوی

ہرا بھرا ہے بہت کچھ ترے سخن کا نہال　　ترے کلام میں پیوست رنگ ماضی و حال
جواہرات ادب سب کے دامنوں میں بھرے　　لٹائی ارضِ جنوبی میں یوں متاعِ شمال

ایک مطالعہ

جھلملی

مریض نے بمشکل تمام اپنے زرد اور بے جان پپوٹوں کو حرکت دی اور ایک ہی لمحہ بعد اپنی بے نور آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دیوار پر گھنٹے نے دو بجائے اور کمرے کی گہری خاموشی کو لرزا دیا۔ مریض کو وقت کی اہمیت کا زیادہ احساس پیدا ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ پھر چاروں طرف نظر دوڑائی اور کروٹ بدل کر سڑک پر کھلتی ہوئی کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ جہاں نیچے سڑک کے کنارے ایک شاندار عمارت کے پہلو میں نصب کیا ہوا بجلی کا لیمپ اپنے دھندلے سے شیشوں میں سے روشنی کی مدھم شعاعیں پھیلا رہا تھا۔ لیمپ کے بالکل اوپر دوسری منزل میں ایک جھلملی دار دروازہ کچھ اس طرح بند معلوم ہوتا تھا گویا کھلنا چاہتا ہو۔

مریض نے کروٹ بدلی۔ میز پر رکھی ہوئی دوا کی شیشی اُسے موت کا فرشتہ معلوم ہونے لگی لیکن یہ دیکھ کر کہ اس میں صرف ایک خوراک باقی رہ گئی ہے اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ منزل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ کمرے کی فضا میں اسے بے شمار بھنگے اُڑتے ہوئے معلوم ہونے لگے اور فضا میں اُڑتا ہوا ہر بھنگا اُسے "اوشا" کی شکل میں تبدیل ہوتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

" اوشا!" مریض نے گہری سانس کے ساتھ کہا۔ اور پھر گھبرا کر خود ہی چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کہ کسی نے سنا تو نہیں۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی زیادہ بیتاب پروانہ کے کاغذی شیڈ پر زور سے ٹکرانے کی آواز خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔ بجلی کا اونچا لیمپ کاغذ کے جاپانی شیڈ میں سے جس پر کسی دور دراز مقام کا منظر نقش تھا ہلکی ہلکی روشنی پھیلا رہا تھا۔ مریض اس منظر کو بغور دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً پھر اس کی نظر کھڑکی میں سے گزرتی ہوئی سڑک کے لیمپ پر پہنچی اور فوراً ہی بعد جھلملی پر جو بدستور بند تھی۔ اسے آہستہ آہستہ کھلتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔

سڑک پر سے کوئی آوارہ کتا بھونکتا ہوا گزرا اور اس کی مکروہ آواز نے قرب و جوار کے سکون کو برباد کر دیا۔ سکون! جس کی مریض کو اس وقت بہت ضرورت تھی۔ مریض کے چہرے پر کھچاؤ کے آثار پیدا ہوئے لیکن جیسے جیسے کروہ آوازوں کی خاموشی میں جذب ہوتی گئی اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک آ گئی۔ جب وہ آواز غائب ہو گئی تو وہ پہلے سے زیادہ انہماک کے ساتھ جھلملی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

لیمپ کے گرد بیشمار پروانے چکر لگا رہے تھے "کیا وہ بھی کوئی پروانہ ہے لالٹین کے نیچے ساری دنیا گھوم رہی ہے — میں ہوا میں اُڑ رہا ہوں۔ لالٹین کی روشنی کم کیوں ہو رہی ہے' ہاں مگر یہ ہوا میں بھنگے کیوں اُڑ رہے؟"

شاید کھانسی نے ان تصورات کا شیرازہ پریشان کر دیا۔ اور مریض اُٹھ بیٹھا لیکن پھر گر پڑا۔ بوتل میں پڑا ہوا تھرمامیٹر نکال کر مُنہ میں رکھا اور پھر گھنٹے کو بغور دیکھنے لگا گھنٹے کی ٹِک ٹِک میں اسے اپنی منزل قریب آتی معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد تھرمامیٹر نکال کر دیکھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر آئی اور غائب ہو گئی۔ مردنی کے آثار میں دبی ہوئی مسکراہٹ جیسے کوئی تصویر ہنس رہی ہو۔ بے جان ہنسی!

" محبت! کیا اتنا لطیف جذبہ بھی بھیانک ہو سکتا ہے؟ اوشا — تم اوشا — اس کے پرچے — میرا عکس — دنیا — ہاں دنیا کہتی ہے محبت گناہ — کیا میں نے گناہ کیا ہے؟ گناہ کتنا بھیانک لفظ ہے — ہمارا اپنا ہوا بدنما۔ بدصورت نقش — ہاں ایسے ہی جیسے آئینہ میں اپنی ہی صورت آئینہ! انسان کا بہترین رفیق — مکمل رازدار سب کچھ دیکھنے پر بھی خاموش جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں — مگر — مگر یہ ہوا میں بھنگے کیوں ہیں؟ — اف میرا دل — لالٹین — جھلملی — اوشا — !"

مریض کی خوفناک چیخ سے نرس جاگ اٹھی جو آرام کرسی پر بیٹھی تھی: "کیا ہوا بابو صاحب؟" مریض نے اس کی طرف گھور کر دیکھا: "با کون! تم کون ہو! لالٹین — جھلملی — بھنگے — دنیا — نمک کی قدرت کے دماغ کا سہانا تخیل — بھیانک خواب — وقت — کی روح اُڑا چلا جا رہا ہے — ریل کی طرح — دنیا اس کے ساتھ ہے — دونوں فنا کی طرف جا رہے ہیں — وہ جو عیش سے لذ[?] اور وہ جو ساتھ دوڑ رہے ہیں — دوڑ — ایک خطرناک دوڑ کوئی کوئیں کی طرف دوڑ رہے — ٹن — ٹن — ٹن —

— سلق … دناداہ کتنہ دلفریب — جیسے کوئی برسات کا زہریلا کیڑا —" مریض اسی طرح بکتا رہا اور نرس پھر سو گئی۔ صبح جب نرس کی آنکھ کھلی تو مریض کھڑکی کی چوکھٹ پر سر رکھے جھکا ہوا تھا اور اس کی نظریں سامنے جھلملی پر قائم ہو کر رہ گئی تھیں — جھلملی جوں کی توں بدستور بند تھی!

خلیل الرحمان شارق بی۔اے

زود پشیماں!

کیا سمجھتی ہو کہ مجھ سے دور رہ جاؤ گی تم!
خود تڑپتی جاؤ گی مجھکو بھی تڑپاؤ گی تم

پاؤ گی لیکن نہ ہرگز بھی کسی شے میں سکوں
گو حسیں جلوؤں سے اپنے دل کو بہلاؤ گی تم

میکدہ بردوش جب ہونگی فضائیں باغ میں
اپنے پہلو میں کسی شے کی کمی پاؤ گی تم

خندۂ گل میں تبسم میرا آئے گا نظر
سارے عالم پر مجھے چھایا ہوا پاؤ گی تم

یاد آئیگی تمھیں رہ رہ کے میری گفتگو
اپنے اقرارِ وفا پر آپ شرماؤ گی تم

پاؤ گی فرصت جو تم میرے تصوّر سے کبھی
عہدِ ماضی کے حسیں خوابوں میں کھو جاؤ گی تم

ڈوبتی جاؤ گی تم بحرِ تصوّر میں مگر،
اس سمندر کی کبھی ہرگز نہ تہ پاؤ گی تم

اپنی نادانی پہ نادم ہو کے شرماؤ گی
دوش پر سر رکھ کے پھر سو طرح سمجھاؤ گی تم

ڈال کر گردن میں میری اپنے بازو مرمریں
بیخودی میں "عفو کر دو مجھکو" کہہ جاؤ گی تم

جس طرح قطرات شبنم غنچۂ نرگس پہ ہوں
اس طرح آنکھوں میں آنسو اپنی بھر لاؤ گی تم

مرمریں ہاتھوں سے بالوں کو مرے سلجھاؤ گی
جس طرح سے بن پڑے گا مجھکو پرچاؤ گی تم

لیکن اپنے غمزہ و ناز و ادا کا تم جواب
میری جانب سے مکمّل خامشی پاؤ گی تم

ٹوٹ جائے گا یہ پھر رنگین خوابوں کا طلسم
پھر اسی دُنیائے کیف و کم میں آ جاؤ گی تم

جس طرح معصوم بچّہ چونکتا ہے خواب سے
چونک کر پھر اس طرح سے ہوش میں آؤ گی تم

پاؤ گی لیکن نہ جب اپنے قریں مجھکو تو پھر
دیکھ کر چاروں طرف بے طرح گھبراؤ گی تم

یاد آئیگی تمھیں اُس وقت میری التجا
اپنی نادانی پہ بھی رہ رہ کے پچھتاؤ گی تم

لیکن اُس دم آئے گا دریائے غیرت جوش میں
شرم کے جذبات سے غصّہ میں بھر جاؤ گی تم

"اونہہ کیا پروا ہے مجھکو میری اب جائے بلا"
یہ کہو گی تو مگر کیا اس کو کر پاؤ گی تم

رہ سکے گی ہاں یہ حالت تو نہ تھوڑی دیر بھی
پھر اسی رَو میں اسی طرح سے بہہ جاؤ گی تم

پھر وہی حالت وہی منظر وہی رنگین خواب
پھر وہی گھبراہٹیں دل کی وہ پیہم اضطراب

خالد حسن قادری

مقالہ

جنگ اور تمدن

تمدن کی ترقی اور انحطاط

روئے زمین پر مختلف ممالک میں مختلف قسم کے تمدن نمودار ہوئے لیکن ہر کمالے را زوالے کے مصداق ہر تہذیب کو زوال پذیر ہونا پڑا۔ چنانچہ بابل شام۔ عرب۔ ایران، یونان، مصر اور روم کے تمدن کی طرح وسطی امریکہ میکسیکو [illegible] جنوبی ہند۔ ہند چینی اور جاوا کی ثقافت نے ایک حد تک وسعت قبول کی۔ بعد ازاں ان کا انحطاط شروع ہوا۔ صرف چین اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ قدیم کلچر کا تنزل مرحلہ بہ مرحلہ نہیں ہوا۔ بلکہ بعض بیرونی جنگجو اقوام کی بے محابا مداخلت سے زوال شروع ہو گیا۔ بعض حالات میں ہمیں انحطاط کا حقیقی سبب معلوم نہیں ہوتا۔ جزیرہ نمائے ملایا روڈیشیا (Rhodesia) اور الاسکا کے مستعمرات معدنیہ (Mining settlements) بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ پرانے متمدن ممالک کے باشندے عموماً امن و امان سے زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ علوم و فنون کی ترقی میں روز و شب کوشاں رہتے تھے۔ پھر بیرونی وحشی جنگجو اقوام ان پر حملہ آور ہوتی تھیں اس طرح کلچر کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔

زمان البیت (Dynastic Age) کے شروع میں ہورس کے پیرو (Followers of Horus) مشرق سے آئے اور مصر پر چھا گئے۔ سامی زبانیں بولنے والی قومیں جنھوں نے دول عکاظ کی بنیاد ڈالی بابل اور ایلم پر قابض ہو گئیں اور بحیرۂ روم تک پھیل گئیں۔ یہ لوگ مصری تمدن سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ سنحاک عکاظ (Sargon of Akkad) ان کا سب سے بڑا بادشاہ تھا (۲۵۵۰ ق۔م) کسائٹ (Kassites) ان کے بعد آئے اور بابل کو زیرنگیں کر لیا (۱۷۶۰ - ۱۱۰۰ ق م) ہائکساس (Hyksos) نے ۱۶۸۰ ق م میں مصر پر چڑھائی کی۔ [illegible] ۱۵۰۰ قیام کے قریب ملک بدر کئے گئے۔

یورپ میں آریائی زبانیں بولنے والی قوموں نے کلچر کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ ہائکساس کے بعد ڈورین لوگوں نے (Dorians) کریٹ (Crete) کے عجیب و غریب تمدن کا خاتمہ کیا۔ ۵۰۰ ق م میں سیلٹ زبان بولنے والوں نے وسطی یورپ کا تہس نہس کیا۔ رومنوں کی وجہ سے بحیرہ روم کی تہذیب ان کی دست برد سے محفوظ رہی۔ رومنوں نے اٹرسکن (Etruscans) یونان اور کارتھیجا کے لوگوں سے Carthagians خوشہ چینی کی تھی۔ پس ازاں ٹیوٹنوں (Teutons) کا فتنہ رومن سلطنت کو برباد کرتا رہا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ثابت ہو گیا کہ جنگجو قومیں متمدن ممالک کی سرحدوں سے نمودار ہوتی رہی ہیں۔ جس تمدن سے وحشی اقوام نے استفادہ کیا اسی کو انھوں نے برباد کرنے کی کوشش کی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان کا مسقط الراس کسی قدیم ثقافت کا پتہ دیتا ہے۔ ٹیوٹن لوگوں کا وطن سکنڈے نیویا ہے۔ یہاں پتھروں کے آثار قدیمہ کسی پرانی تہذیب کی موجودگی پر دلالت کرتے ہیں کلٹی اور رومن لوگوں کا کلچر یہاں کے لوگوں پر بڑی حد تک اثر انداز ہوا ہے۔ ٹیوٹنوں کی طرح کلٹ لوگوں نے تمدن میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ یونانیوں اور اٹرسکنوں نے انھیں تمدن کی روشنی بخشی۔ عام طور پر مہذب ممالک نے وحشی اقوام کے نوجوانوں کو [illegible] طاق کیا۔ تمدن و بربریت کا یہ اتصال ثقافت یافتہ اقوام کے لئے کبھی سود مند ثابت نہ ہوا۔

یلغار کے وجوہ

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ غیر متمدن اقوام نے تہذیب یافتہ ممالک پر یلغاریں کیوں کیں؟ ایک وجہ تلاش معاش ہے۔ دوسرا سبب ہوس ملک گیری ہے۔ وحشی لوگوں کی پرورش کا حال تاریخ میں [illegible] ملے گا۔ افریقہ کے بانتو (Bantu) اس بارے میں زیادہ مشہور ہیں۔ مشرقی افریقہ [illegible] کی ہائی لینڈ سے یہ نمودار ہوئے [illegible]

کیا۔ سوڈان کے جنوب کی طرف بڑھے۔ اور بشمین اور ہوٹنٹونس
(Bush men & Hottentots) نکال باہر کیا۔
پر مصری تہذیب کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ امریکہ کے ازٹیکس
(Atzecs) جن کی حکومت میکسیکو میں تھی۔ جنگجو اقوام میں
پیش ہیں۔ ٹیوٹنوں اور تاتاریوں کی مانند ان لوگوں نے بھی ترقی
تہذیب سے خوشہ چینی کی ہے۔

تشدد فطری ہے یا غیر فطری؟ اس مسئلہ میں اہل الرائے میں
اختلاف ہے۔ دنیا کی تمام جامع الطعام اقوام میں (Food
Gathering Communities) یہ خاص
پائی جاتی ہے کہ خانگی اور اجتماعی زندگی میں وہ نہایت امن پسند
ہوئی ہیں۔ ذاتی معاملات میں تشدد کا اظہار مفقود ہے۔ من
القوم وہ کبھی دست و گریبان نہیں ہوتیں۔ یورپ کی قبل از
کی جامع الطعام قومیں محاربہ میں دلچسپی کا اظہار نہیں کرتیں۔ انھوں
پتھر کے زمانے میں پتھر کے اوزار نہیں بنائے۔ لکڑیوں کے آلات
بنائے ہیں سولیوٹرین زمانے میں (Solutren
Period) انی (Spear Heads) بنائی گئی
لمڈالینین مرحلہ میں (Magdalenion Stage)
یوں کے برچھے (Harpoons) مصنوع ہوئے۔
رغانی میں پہلے شومیر (Sumer) اوزار بنائے جاتے
ہے۔ لیکن سوسا اور اناؤ کی (Susa & Anau) پہلی آبادیاں
قسم کے اوزار سے ناواقف معلوم ہوتی ہیں۔

جنگ کی ابتدا و ترقی

ابتدائے آفرینش سے انسان اپنی مدافعت اور ترقی کے لئے
مختلف ذرائع پر غور کرتا رہا ہے۔ اپنی پرورش اور حفاظت کے لئے
اس نے پتھر کے آلات ایجاد کئے۔ پتھر کا زمانہ گذر جاتا ہے۔ دھات کا
زمانہ آتا ہے۔ تانبے۔ پیتل اور لوہے کے اوزار بنائے جاتے ہیں اور ظروف
بنائے جاتے ہیں۔ انسان ترقی کے میدان میں بہت آگے نکل جاتا ہے
لیکن جنگ ہنوز "منظم تشدد" کی شکل میں ظاہر نہ ہوئی تھی۔ انسانی
سوسائٹی کی پیداوار کا یہ لازمی جزو نہیں ہے۔ بلکہ اس کی ابتدا نظام اجتماعی
(Class system) کے ساتھ ہوتی ہے۔ ریاستوں کی تخلیق
نے جنگ کے شعلوں کو کافی حد تک ہوا دی ہے۔ جنگ کی ابتدا ہو گئی

اس میں ترقی بھی ہوتی رہی۔ اب اس کا سدباب محال ہوگیا ہے۔

(الف) شمالی اور جنوبی مصر کی عداوت:۔ مشرق قدیم کے تاریخی زمانوں سے تعلیم محاربہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ شمالی اور جنوبی مصر کی عداوت سے تشدد آمیز مناقشہ کی ابتدا سمجھنا چاہیئے لیکن اس وقت مقابلہ اکا دکا ہوتا تھا کیونکہ ہنوز کسی مستقل فوج کی تنظیم نہ ہوئی تھی۔ مگر جب صاحب اقتدار امیر یا سردار غصب ریاست کی نیت سے شاہ وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے لگے۔ مستقل فوج اور منظم مجادلہ کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس زمانے سے لوگوں کو لڑائی لڑنے کے لئے ملازم رکھنا پڑا۔ خوف حریف۔ ذاتی ملکیت، تملیک اقتدار، خواہش مستزاد اور جذبۂ انتقام نے جنگ کی ترقی میں کافی حد تک ہاتھ بٹایا ہے۔

(ب) قتل الملک:۔ مستقل طریقہ تشدد کی پہلی مثال بادشاہ کے قتل کی رسم ہے۔ اہل مصر اور شومیر کے خیال میں ملک کی خوشحالی کا انحصار بادشاہ کی طاقت اور جلال پر تھا۔ جیسے ہی اس میں ضعف وناتوانی کے آثار پائے جاتے ویسے ہی اس کا سر اڑا دیا جاتا۔ کچھ عرصہ بعد اس رسم میں تبدیلی کی گئی۔ بادشاہ کی بجائے دوسرا شخص معمول تجویز ہوا۔

ایک دلچسپ حقیقت اور قابل غور امر یہ ہے کہ بابل والوں کی ماتا دیوی تب ہی سے خونخوار ہوگئی۔ ورنہ اس سے پہلے وہ سعید اور امن پسند خیال کی جاتی تھی۔

(ج) انسانی قربانی:۔ پرانی تہذیب کی اشاعت کے بعد انسانی قربانیوں کا رواج شروع ہوا۔ ہندوستان اور امریکہ میں اس رواج کا بڑا زور رہا۔ جامع الطعام اقوام نے پرانی تہذیب کے لوگوں کے اختلاط سے انسانی قربانی، حیوانی قربانی، مردم خوری اور منظم محاربہ وغیرہ رسوم قبیحہ کی پیروی کی۔

(د) صید الراس:۔ جزائر شرق الہند (Archipelago) میں ابھی تک صید الراس (Head-hunting) کی رسم جاری ہے۔ بورنیو میں جب کفن ودفن یا کاشتکاری کے لئے سر کی ضرورت ہوتی ہے تو دیہات کے لوگ ایک گروہ کی شکل میں باہر نکلتے ہیں اور کمینگاہ میں بیٹھے شکار کا انتظار کرتے ہیں۔ پہلے ہی مسافر کا سر اڑا دیا جاتا ہے، اگر بدقسمتی سے ان کی موجودگی کا پتہ چل جائے تو خفیف سی جنگ بھی چھڑ جاتی ہے لیکن کھلے میدانوں کی لڑائی کا کوئی نشان نہیں تھا۔

(ہ) نظام ثنیہ۔ قدیم تمدن کے سیاسی ومعاشرتی دستور کی بنیاد نظام ثنیہ (Dual organization) پر قائم تھی۔ آسٹریلیا کے مشرقی جزائر (Polynesia) اور ہندوستان میں اس کی بین مثال موجود ہے۔ جنگ مہابھارت اسی نظام ثنیہ کا نتیجہ تھی۔ کورو اور پانڈو ایک ہی خاندان کی دو شاخیں تھیں۔ یہ نظام نہایت غارت گر قوت تھا۔ اسی سلسلہ میں امریکہ کے دو بادشاہ شاہ کیچے (Kiche) اور شاہ اکیبلا (Kiballa) کے درمیان کی جنگ قابل ذکر ہے۔ نیوگنی کی قدیم دو قومیں ہنوز آپس میں کشت وخون کر رہی ہیں۔ یہ احساس تنفر جو دونوں قوموں کو ورثتاً ملا ہے۔ اکثر ملکوں کو تباہ کرکے رہا ہے۔

فوجی کل:۔ ممالک متحدہ کے ریڈ انڈین دو نمایاں گروہوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ طائفہ جامع الطعام (Food gatherers) اور طائفہ صانع الطعام (Food Producers) اول الذکر گروہ قطعاً امن جو ہے۔ لیکن آخر الذکر قوم ہمیشہ جنگ وجدال میں مصروف رہی ہے۔ دراصل صانع الطعام اپنی نسل کو باقاعدہ حربی تعلیم دیتا ہے۔ ہندوستان میں بھی ذات پات کی تمیز چاروں فرقوں کے افراد کو کردار ومعاشرت میں مخصوص کئے رہی۔ لہذا فوجی کل Military Machine

ع انسان کی تخریب میں بڑا قوی ذریعہ عمل ہے۔

جنگ کے نتائج

ب و حکومت (church & State) کے اختلاف

غث اکثر ممالک میں کشت وخون کا بازار گرم رہا ہے۔ جنگ وجدال
ے سے ہزاروں گھر برباد ہوتے ہیں۔ لاکھوں معصوم جانیں ضائع ہوتی
صدہا آباد ممالک برباد ہوتے ہیں لیکن سلسلہ محاربہ اختتام پذیر نہیں ہوتا۔
کی کوئی قوی وجہ ہوگی۔ دراصل جنگ غلاموں کو آزادی بھی دلاتی ہے
م عدل وامان کے لئے کامیاب حربہ بھی ہے۔ اقتصادی ومعاشی مسائل کے
کرنے میں امداد بھی ملتی ہے لیکن شراب کی طرح اس میں شر زیادہ اور
رکم ہے۔

انسداد۔ جنگ کا انسداد ممکن بھی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ مستقبل
ے ہاتھ میں ہے لیکن کوشش شرط ہے۔ اختلافات اجتماعیہ کو دور کرکے
نظام اقتصاد کو درست کیا جائے۔ قوموں کے شریفانہ احساسات کا خیال رکھا
جائے رنگ ونسل کی تفریق کو دور کیا جائے۔ انسانی تعلقات کی راہ میں روڑا
اٹکانے والے جذبات کو کچل دیا جائے۔ اپنی ذات کو صحیح طور پر سمجھنے کی
کوشش کی جائے۔ خلق خدا کی مخلص امداد فرض کی حیثیت سے کی جائے۔ موجودہ
تمدن اگر ہمیں اتنا نہ سکھا سکا تو کچھ نہ سکھا سکے گا۔

محمد اسحٰق مالیگانوی ایم اے

سلمیٰ!

تجھ پہ جاں قرباں ہے دل نثار ہے سلما
تو مری محبت کی کردگار ہے سلما!

ہر نفس میں اک کوثر ہر نظر میں اک جنت
زندگی کی عشرت کا لالہ زار ہے سلما!

خواب ہو کہ بیداری کسل ہو کہ سرشاری
رات دن تصوّر میں جلوہ بار ہے سلما!

زندگی کی چلمن ہو یا نفس کا پردہ ہو
تیری ہر رگ و پے سے آشکار ہے سلما!

چاندنی سی چھٹکی ہے شبستانِ ہستی میں
حُسن کی فضاؤں میں نورُ بار ہے سلما!

جب سے تو نے چھوڑا ہے ٹونک کی فضاؤں کو
اس نگر کا ہر ذرّہ سوگوار ہے سلما!

خامشی سی طاری ہے پستی و بلندی پر
وحشتوں کا ہر جانب کاروبار ہے سلما!

حُسن و عشق کی اک دن جو سُرورگاہیں تھیں
آج ان میں عبرت کا اقتدار ہے سلما!

وہ جگہ جہاں اکثر جشنِ عیش رہتا تھا
آہ اب وہ ویراں سا اک دیار ہے سلما!

بام و در پہ چھائی ہے اک اُداس تاریکی
حسرتوں کا اک منظر یہ مزار ہے سلما!

انجمن ہو یا خلوت، گیند گھر ہو یا دفتر
ہر جگہ نیا رنگِ اضطرار ہے سلما!

مضطرب سا رہتا ہوں، رات دن تڑپتا ہوں
دل تری جدائی سے بے قرار ہے سلما!

یوں ترے تصوّر نے مجھ کو گھیر رکھا ہے
چاند جیسے جلوؤں سے ہم کنار ہے سلما!

اک تری جدائی سے اک ترے نہ ہونے سے
زندگی کا ہر نشہ کسل بار ہے سلما!

اب نہ وہ ہوائیں ہیں، اب نہ وہ گھٹائیں ہیں
باغ کا ہر اک منظر بے بہار ہے سلما!

اب نہیں وہ رنگینی شام کے مناظر میں
اب نہ صبح میں اگلا وہ نکھار ہے سلما!

تیرے عہدِ فرقت میں کھُل گیا یہ راز آخر
زندگی جدائی میں ایک بار ہے سلما!

جس طرح بھی ممکن ہو اب تو جلد تر آجا!
چشمِ شوق کو تیرا انتظار ہے سلما!

اپنے دستِ نازک سے آکے کر رفو اس پر
ضبط کا مرے دامن تار تار ہے سلما!

اس قدر قریں ہو کر تیرا دُور ہو جانا
یہ ادا محبت میں ناگوار ہے سلما!

ظلم ہیں شفق سے یہ بے نیازیاں تیری
جو بہر طرح تیرا جاں نثار ہے سلما!

جو تجھے ہر اک شے سے ماورا سمجھتا ہے
وہ ترے تغافل کا یوں شکار ہے سلما!

زندگی کی وہ ساعت کاش جلد تر آئے
پھر سفر سے تو اپنے کامیاب گھر آئے

شفق ٹونکی

افسانہ

سنگتراش

اپنے تخلیق کئے ہوئے حسن سے چابکدست سنگتراش کی دلچسپی اور پسندیدگی بڑھتے بڑھتے ایک والہانہ شیفتگی میں تبدیل ہوگئی۔عورت کے اس مجسمے پر وہ اس قدر نازاں ہوگیا۔کہ اسے اپنے عہد کے فن سنگتراشی کا فقید النظیر شاہکار تصور کرنے لگا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کائنات کی کوئی شے اس سے زیادہ حسین اور خوبصورت نہیں ہے۔ اکثر وہ جذبۂ بیتاب کی شدت وافزونیت سے مجبور ہوکر اپنا سرِ نیاز مجسمہ کے قدموں پر رکھدیتا تھا —— اور وہ ایسا کیوں نہ کرتا؟ —— اس کی نگاہ میں یہ مجسمہ فن کاری کا ایک ایسا اعلیٰ نمونہ تھا جسے سعی انسان کی آخری منزل کہا جاسکتا ہے۔

وہ شب و روز دیوتاؤں کے حضور میں گڑگڑا کر التجائیں کرتا اور رو رو کر دعائیں مانگتا کہ —— "اے دیوتاؤ! اس مجسمہ میں زندگی کی کمی ہے۔۔ صرف زندگی —— تم اس میں زندگی کی روح پھونک دو۔ [illegible] جاوداں عطا کردو۔ اس کے بعد دنیا کا کوئی فانی انسان مجھ سے زیادہ خوش قسمت نہ ہوگا۔"

اس نے مجسمہ کے چاروں طرف قد آدم آئینے لگائے تاکہ جس طرف بھی نگاہ اٹھے وہی حسین مجسمہ نظر آئے۔ اس کے نازک نازک خوبصورت بازوؤں کو جواہرات اور بیش قیمت زیورات سے مزین کیا اور اس کے لئے پھولوں کا ایک حسین تاج تیار کرنا تو اس کا روزمرہ کا معمول تھا لیکن اس کی روح کو اطمینان وسکون میسر نہ ہوا —— اس کی آنکھوں میں اطمینان کی ہلکی سی جھلک بھی نمودار نہ ہوئی۔ دن کی آہوں اور رات کے نالوں کے ساتھ اس کی مضطربانہ دعاؤں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

دیوتا اس کی منت سے تنگ آچکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس سے پیشتر ایسے ہی موقعوں پر اس کے ہم پیشہ لوگوں کے حق میں کیا کیا خراب نتائج برآمد ہوچکے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ جب تک سنگتراش کی آرزو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے اس وقت تک اس کی روح کو مطمئن نہ ہونا چاہئیے —— !

کچھ مدت گزر جانے کے بعد بڑے دیوتا نے کہا —— "اگرچہ سنگتراش کی آرزو تکمیل کے آخری مرحلہ پر پہنچ چکی ہے لیکن جب تک ہم اس [illegible] اٹھانا مناسب نہیں ہے۔"

ایک دیوی نے اپنے باپ کے آگے دست بستہ اور سرِ خمیدہ ہوکر کہا —— "اس معاملہ میں محتاط رہنے کی ہمارے لئے سخت ضرورت ہے اگر ہم نے ایک مرتبہ بھی غلطی کا ارتکاب کیا تو پھر آئندہ نتائج پر قابو پانا ہمارے لئے [illegible] دشوار ہوجائیگا۔"

اس کے بعد سب [illegible] متفق الرائے ہوکر سنگ تراش کو ایک ایسے عالم میں پہنچا [illegible] بے نیاز ہوکر فکر و الم سے کوسوں دور ہوگیا —— وہ اپنی محبوبہ کے سنگین قدموں پر سر رکھ کر سوگیا —— سب دیوی دیوتا بالائی حصہ سے اس کے نگارخانے میں داخل ہوئے اور اس حسین مجسمہ کو پرشوق نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

بڑے دیوتا نے کہا —— "یہی وہ مجسمہ ہے جس نے اس بیچارے کے دل کو محبت کی آتشیں شعلوں میں جھلس ڈالا ہے۔ لیکن ٹھہرو —— ذرا صبر سے کام لو —— ہمیں اس وقت تک اپنی طاقت وقوت کا مظاہرہ نہ کرنا چاہئیے جب تک ہم اس معاملہ میں نسائی طریق پر غور و خوض نہ کرلیں ہمیں اس وقت تک منتظر رہنے کی ضرورت ہے جب تک اس کے اعضاء میں زندگی کی لہر دوڑنا شروع نہ ہوجائے۔"

ایک دیوی بولی —— "ہمیں حزم واحتیاط کی سخت ضرورت ہے جہاں تک ممکن ہو احتیاط سے کام لیا جائے۔"

بڑے دیوتا نے اپنی انگلیاں مجسمہ کی آنکھوں پر پھیریں۔ یکایک [illegible] کے ساتھ ادھر سے ادھر حرکت کرنے لگیں۔"

وہی دیوی جو اس معاملہ میں انتہائی سنجیدگی سے حصہ لے رہی تھی۔ اور مکمل تدبر و بصیرت کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھر بولی۔ "محتاط! —— محتاط!! —— اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو اس کے دماغ میں فتور ہے —— یہ فہم وادراک سے تہی داماں معلوم ہوتی ہے —— یہ چند درجہ بدمذاق ہے۔"

بڑے دیوتا نے اپنے دستِ روح نواز سے مجسمہ کے ہونٹوں کو [illegible] چھوتے ہوئے کہا۔

"اے عورت! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ ہم دیوتا ہیں —— وہ قابل احترام دیوتا! جو بہت سی اشیاء کے خالق ہیں۔ اور جنھوں نے بہت سی چیزوں کو حیات جاودانی بخشی ہے —— ہم مختار ہیں۔ جسے چاہے زندگی دیں اور جسے چاہے موت ——!"

"لیکن تجھے —— تجھے ہم نے نہیں بنایا ——" دیوی نے مجسمہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"درست —— بالکل درست!" بڑے دیوتا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ صحیح ہے کہ ہم نے تجھے نہیں بنایا ہے۔ تجھے اس نے بنایا جس کا سر تیرے قدموں میں پڑا ہوا ہے۔ ہم تو اس کی پیہم دعاؤں اور مسلسل التجاؤں سے مجبور ہو کر تجھے زندگی اور صرف زندگی دینے آئے ہیں تاکہ تیری رگوں میں زندگی کو موجیں مارتے دیکھ کر مطمئن ہو سکے۔ [illegible] تجھے زندگی کی طلب ہے یا نہیں؟"

مجسمہ [illegible] بول [illegible] —— [illegible] سنگتراش [illegible] [illegible] طرف [illegible] دیوتا [illegible] دیوی [illegible] حسن [illegible] اس کے بعد اُس کی نگاہ سنگتراش پر پڑی۔ پھر اُن اوزاروں [illegible] تخلیق میں اس کے معاون تھے۔ مجسمے پر ایک بیتابانہ کیفیت طاری ہو گئی اور وہ ایک دم چلا کر بول اُٹھا۔

"دیوتاؤ —— دیوتاؤ! میں طالب ہوں، میں خواہشمند ہوں زندگی کی —— حیات کی —— مجھے زندگی عطا کر دو —— مجھے حیات بخش دو!"

وہی دیوی پھر بول اُٹھی "بس بس —— بس اب میں جاتی ہوں۔ اے دیویو اور دیوتاؤ تم بھی [illegible] انجام [illegible] نہ آیا —— میں دیکھ چکی —— [illegible]"

دیوی اتنا کہہ کر [illegible] مجسمہ [illegible] —— گویا وہ [illegible] تھی۔ اور اب دیوتاؤں نے آہستہ آہستہ بیدار [illegible]

اس کے بعد دیوتا نے خوابیدہ سنگتراش کو جگانا چاہا تاکہ وہ اپنی [illegible] خواب کی [illegible] تعبیر پاکر مسرور و مطمئن ہو سکے لیکن [illegible] حسین عورت [illegible] ساتھ پیچھے کو دھکیل دیا اور چلا کر کہنے لگی "[illegible] دو —— [illegible] —— ہرگز نہ جگاؤ"

بڑے دیوتا نے کسی قدر پیچھے ہٹ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کی یہ خواہش [illegible] فطرت کے عین مطابق ہے۔ وہ اپنے شکار کو حالت خواب ہی [illegible] چاہتی ہے"

عورت نے سنگتراش کے قریب پڑے ہوئے اوزاروں میں سے ایک آہنی قلم اور ایک ہتھوڑا اٹھالیا۔ اور ہتھوڑے کی ایک ہی ضرب سے قلم سنگتراش کے سر میں گاڑ دیا۔ ایک ہی لمحہ میں سنگتراش کی خوابیدگی ابدیت کے تمام منازل طے کر گئی۔ سنگتراش کی موت کا یقین کامل حاصل کر لینے کے بعد عورت نے آہنی قلم اس کے سر سے باہر نکالا۔

بڑے دیوتا نے اس تعجب انگیز حادثے کو دیکھ کر غضب آمیز آواز میں کہا۔ "دغاباز۔ مکار۔ فریبی! یہ تو نے کیا کیا۔ تو نے اسے کیوں مار ڈالا اس نے کس قدر محنت کے ساتھ تجھے بنایا۔ پھر کس قدر پیہم اور درد انگیز التجاؤں کے بعد تجھے زندگی دلائی۔ لیکن تو نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا یہ بے رحمانہ اور ناروا سلوک ——!"

عورت نے کہا۔ "تم میری مرضی میں دخل انداز نہیں ہو سکتے۔ [illegible] کیا حق تھا [illegible] بری [illegible]! [illegible] قدر لمبی بنا لئے۔ میرے پاؤں اتنے چھوٹے [illegible] اس [illegible] ایک آنکھ دوسری آنکھ سے بڑی کیوں بنائی؟ —— اسے [illegible] حق نہیں تھا —— ہرگز نہیں تھا۔ دیوتاؤ! تم بھی سُن لو۔ خوب [illegible] سن لو —— اگر تمھیں سنگتراش پیدا کرتے ہیں تو اہل نظر اور فہیم [illegible] سنگتراش پیدا کرو ورنہ دنیا کو سنگتراشوں کے وجود کی کوئی ضرورت نہیں —— اب تمہاری باری ہے۔ تمہارے سر میں بھی ایک آہنی قلم گاڑنے کی ضرورت ہے —— تمہیں بھی موت کی لذت سے دوچار ہونا چاہئے ——!"

بڑے دیوتا کا غیظ و غضب اب صبر و تحمل کی حدود سے آگے بڑھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آتشیں شعلے نکلنے لگے۔ اور اس نے عورت کو اپنے طاقتور ہاتھوں سے گھسیٹ کر اس جگہ کھڑا کر دیا جہاں وہ پہلے ایک بیجان مجسمے کی حالت میں کھڑی تھی۔ پھر اسے حسب سابق [illegible] روح سنگین بت بنا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دیوتاؤں نے محسوس کیا کہ ہم نے اسے دوبارہ [illegible] اس کی نفرت کو حیات جاودانی عطا کر دی ہے۔

اس بے روح حسین عورت کی ہر ادا سے گستاخی برس رہی تھی اس کے ایک ہاتھ میں آہنی قلم اور دوسرے میں وہی ہتھوڑا تھا۔ جو اس کے وجود اور سنگتراش کی موت کا سبب بنا تھا۔ (ترجمہ)

(نوشتہ:۔ [illegible])

امتیاز نسیمی

باغ بادشاہی (کھجوہ)

"کھجوہ ضلع فتحپور (یو-پی) میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جسے دَورِ مغلیہ میں کشتری کی حیثیت حاصل تھی۔ جس وقت اورنگ زیب کا ٹڈی دَل لشکر شجاع کی مختصر فوج کو چاٹ گیا اور ہزیمت خوردہ شہزادہ مشرق کی طرف بھاگ نکلا تو فاتح نے اس مقام کا نام فتوح آباد" رکھا۔ جو رفتہ رفتہ اپنے سلف یعنی کھجوہ کے نام سے مشہور ہوگیا اور یہ باغ بادشاہی کے نام سے چند عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ویران باغ، اس سے ملحق تالاب جس کی فصیل جا بجا ہوائے انقلاب کی نذر ہو چکی ہے۔ وسعت نگاہ تک نظر آنے والی سڑک کے دو رویہ کارواں سرائے جواب صرف چمگادڑوں اور بکیہ والوں کی اقامت گاہ ہے اور سب سے زیادہ سربفلک نیم شکستہ عمارتیں سیاحوں کی نگاہوں کے لئے اب بھی ان تمام خوبیوں کا دُھندلا سا عکس اپنے اندر رکھتی ہیں جو مغلیہ دور کے فن تعمیر کا طرۂ امتیاز ہیں۔

شوکتِ شاہی پہ بُنیادیں تری تھیں استوار
تجھ سے کتراتا تھا دورِ گردشِ لیل و نہار

تیرے کھنڈروں سے عیاں ہے شانِ گم گشتہ تری
چشمِ بینا دیکھتی ہے عظمتِ رفتہ تری

جذب ہیں ان جھاڑیوں میں بلبلوں کے چہچہے
دفن تیری خاک میں ہیں گلرخوں کے قہقہے

بابِ عالی پر ترے اب تک ہیں پرچم کے نشاں
آج بھی ہے تیرے میناروں سے ٹکراتی اذاں

تیری قسمت کی طرح نغمے ترے خاموش ہیں
تیری صورت خاک میں جلوے ترے روپوش ہیں

چپّہ چپّہ تیرا گویا دفترِ پارینہ ہے
تیری سطوت کا [illegible] آسماں آئینہ ہے

عظمتِ معمار زندہ ہے تری تعمیر سے
ہے جمالِ خواب باقی خواب کی تعبیر سے

اب نہ روئیگی ترے انجام پہ دُنیا کبھی؟
لُٹ گیا وہ کارواں تو حسن کی منزل تھا کبھی

مظفر حسن فاروقی

عشق کی کرشمہ سازیاں



دس بجے



پربھات کی تازہ ترین پیشکش

کالج لائف کی رومانی داستان "دس بجے"

پربھات فلم کمپنی کا تازہ ترین شاہکار "دس بجے" ۲۸ رمئی سے پیلیس لاہور میں ریلیز ہو چکا ہے۔ یہ فلم جہاں بھی پیش کی گئی حد درجہ مقبول ہوئی اور بلا مبالغہ اس کا شمار ملک کے بہترین رومانی شاہکاروں میں ہو رہا ہے "پریس شو" دیکھنے سے معلوم ہوا۔ کہ یہ فلم پربھات کی فلمی روایات کے مطابق ہے۔ "دس بجے" کالج لائف کی ایک ایسی داستان ہے جس میں اکثر لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنی زندگی کی جھلک نظر آئے گی۔ اس کا ڈرامائی پلاٹ فلم کو بہت زیادہ بلند کر دیتا ہے۔ عشق و محبت اور ایثار و قربانی کی اس سے بہترین مثال پیش کرنا ممکن نہیں تھا "دس بجے" وہی فلم ہے جس کی ڈائرکشن کے فرائض پربھات کے ہونہار اور نوجوان ہدایت کار راجہ نینے نے ادا کئے ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ راجہ نینے صنعت فلمسازی کا موجودہ عجوبہ ہیں کیونکہ دراصل وہ اس صنعت کی رُوح رواں ہیں۔ راجہ نینے نے "دس بجے" تیار کر کے دنیائے فلمسازی میں ایک مہتم بالشان فریضہ ادا کیا ہے اور وہ پربھات کی روایات کو بھی برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں "دس بجے کا دائرہ عمل" "دس بجے" کی تفصیلات اور "دس بجے" کی تکمیل اتنی ہی دلکش و دلفریب ہے۔ جتنی "نقارے کے ٹریڈ مارک" سے متوقع ہو سکتی تھی علاوہ ازیں یہ فلم فنی لحاظ سے بھی ترقی یافتہ ہے۔ راجا نینے چند برس پہلے معمولی کلینپر تھے۔ اور سٹوڈیو میں یہ ادنیٰ ترین ملازمت ہے لیکن اب وہ ترقی کرتے کرتے "ڈائرکٹر" کے عہدے پر پہنچ چکے ہیں۔ دراصل انہوں نے اپنے لئے رستہ خود بنایا۔ اور محض قابلیت کے زور سے ایک قابل رشک پوزیشن حاصل کی۔ الغرض نقادوں کی متفقہ رائے ہے کہ "دس بجے" پربھات کی بہترین فلم ہے۔ اہل صنعت جانتے ہیں کہ کیوں؟ یہ فلم پربھات کی روایات کے مطابق ایک بہترین آدمی نے تیار کی ہے۔ "دس بجے" کے اداکاروں میں پی بینرجی، ارملا، وسنت ٹھینگڈی، مایا جی راؤ بے بی شکنتلا خاص طور پر قابل ذکر ہیں +



آج ہی پربھات کا شاہکار پیلیس میں ملاحظہ فرمائیں

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

عالمگیر

سالانہ نمبر

جلد ۱۴　　سنہ ۱۹۴۳ء　　نمبر ۱

فہرست مندرجات ماہِ جون سنہ ۱۹۴۳ء

علمی و ادبی مضامین

افسانے اور ڈرامے

منظومات

ملاحظات

"عالمگیر" کا سالانہ نمبر ۱۹۴۳ء پیش خدمت ہے ---- !

اس اشاعت سے "عالمگیر" اپنی ادبی زندگی کے بیسویں برس میں قدم رکھ رہا ہے - یہ بیس سال کن مشکلات و مصائب کے ہجوم میں گذرے؟ خدمتِ علم و ادب کی راہ میں ہمیں کن دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کرنا پڑا؟ ہم ان سوالات کا جواب دیکر قارئین کو اس لذت و مسرت سے محروم نہیں کرنا چاہتے جو زیرِ نظر "سالانہ نمبر" مطالعہ کرتے وقت طبعی طور پر ان کے دل و دماغ میں پیدا ہوگی - البتہ ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ راہ کی دشواریوں کے باوجود "عالمگیر" دوسرے رسائل و جرائد کی بہ نسبت منزلِ مقصود سے زیادہ قریب ہے - اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ موجودہ جنگ کی معاشی ہولناکیوں کے باوجود "عالمگیر" کی معنوی خصوصیات میں کوئی فرق نہیں آیا - اور اس کے سالانہ نمبروں اور خاص نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ اسی طرح وسیع ہے جس طرح زمانہ قبل از جنگ میں نظر آتا تھا قارئین کو معلوم ہے کہ حکومت ہند کی پراسرار مصلحتوں نے اخباری کاغذ کے لئے "عالمگیر" کا کوٹا منظور نہیں کیا - تاہم اس لحاظ سے بھی "عالمگیر" کی امتیازی شان کو برقرار رکھا گیا ہے - چنانچہ سالانہ نمبر اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ پر چھاپا جا رہا ہے - اس میں شک نہیں کہ اس سرفروشانہ اقدام سے ہمارے ماہانہ مصارف میں سینکڑوں روپے کا اضافہ ہو چکا ہے لیکن دو گز زمین کے بدلے چونکہ "بیاباں گراں نہیں" ہو کرتا اسلئے ہمیں یقین ہے کہ اس بے مثل ایثار کا جواب حوصلہ افزائی سے دیا جائیگا - اور علمی و ادبی حلقے "عالمگیر" کو ہمیشہ زیرِ مطالعہ رکھیں گے

"سالانہ نمبر" کا آغاز مولانا ظفر علی خاں کے حقائق و معارف سے ہوتا ہے - آج سے کچھ عرصہ پہلے مولانا نے "ادبیات اسلام" کے عنوان سے ایک معرکہ آرا تصنیف شروع کی تھی - یہ مضمون اسی کا ایک باب ہے - امید ہے قارئین اس تاریخی شراب سے بہت زیادہ محظوظ ہو سکیں گے - مولوی نور احمد خاں فریدی "تاریخی غلط فہمیوں" کے ازالہ کے لئے خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں - زیرِ نظر اشاعت میں آپ نے ان شکوک و شبہات کو دور کیا ہے جن کا مرکز اکبر اعظم کی موت کو بنا لیا گیا تھا - مولوی صاحب نے مستند تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ اکبر کی وفات زہر سے نہیں بلکہ طبعی حالات کے ماتحت ہوئی - "زبان غیر کیا آتی نہیں اپنی زباں برسوں" - مولوی بشیر احمد برہان پوری کا ایک تنقیدی مقالہ ہے جس میں اردو کے بعض الفاظ کی تحقیق و تصحیح کی گئی ہے یہ مقالہ بہت زیادہ محققانہ اور سیر حاصل ہے - لیکن کہیں کہیں مولوی صاحب نے عام ادیبوں کی تحریر کو بطور سند پیش کیا ہے جو مناسب نہ تھا - "منظوم خطوط" اور "ابن رشد" بھی اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے خوب ہیں - افسانوں میں "دلدل" (از مرزا ادیب) امتیازی شان کا مستحق ہے - یہ افسانہ دورِ جدید کی ترقی یافتہ افسانہ نویسی کا آئینہ دار ہے - کیونکہ اس میں پلاٹ کی بہ نسبت "نفسیاتی تحلیل" پر زور دیا گیا ہے اور افسانوی لباس میں ایک ایسی طنز پوشیدہ کر دی گئی ہے جس کا احساس پڑھنے والوں کو خود ہی ہو جاتا ہے

"ایک نسخہ" ڈاکٹر شفیق الرحمان کا ایک مزاحی افسانہ ہے - جو انہوں نے اپنے مخصوص رنگ میں سپردِ قلم کیا ہے - "صہبا" ایک سوز و گداز سے لبریز افسانہ ہے جو محترمہ خدیجہ مستور لکھنوی نے لکھا ہے افسانہ بیحد کامیاب ہے ! "آہیں" ملک طفیل کے قلم کا رہینِ منت ہے - ایک مفلس کی نفسیاتی تصویر کشی اس سے بہتر کیا ہو سکتی تھی "شمشیر و کتاب" ایک مشہور تاریخی واقعہ پر مبنی ہے فضل حق قریشی کے سحر کار قلم نے مٹے ہوئے نقوش میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے - تراجم میں بیوی کا امتحان اور کھوئی ہوئی نگاہیں خاص طور پر جاذبِ توجہ ہیں - منظومات کا حصہ ہندوستان کے بیشتر اساتذہ سخن کے کلام پر مشتمل ہے اور یہ فخر صرف "عالمگیر" ہی کو حاصل ہے کہ وہ اتنے اچھے اچھے شاعروں کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے

ادارہ

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھیے

اخبار و افکار

ریاست جے پور اور اُردو زبان

تاریخ مہر میں مختصر طور پر اُن ریشہ دوانیوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ جو ہندو مہاسبھائیوں کی طرف سے جے پور اور گوالیار ایسی مقتدر ریاستوں میں اردو زبان کے خلاف ہو رہی ہیں۔ اب ہمیں انجمن ترقی اُردو (ہند) کی طرف سے "ریاست جے پور اور اُردو زبان" کے عنوان سے ایک پمفلٹ موصول ہوا ہے جس میں ان حالات و واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے جن کے ماتحت ریاست جے پور میں اردو دشمنی کی تحریک شروع ہوئی۔ اس پمفلٹ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۱۹۲۱ء تک جے پور میں اردو ہندی کی منازعت کا نشان تک بھی موجود نہ تھا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ریاست کی دفتری زبان مغلوں کے وقت سے چلی آتی ہے اس میں شک نہیں کہ لسانی اتحاد کے دشمن وقتاً فوقتاً حکام ریاست کو اردو کے خلاف مشتعل کرتے رہے لیکن مہاراجہ سوائے مادھو سنگھ آنجہانی نے ان کی بدآموزی کو بے پرائی کی ہنسی سے ٹال دیا۔ اور ریاست میں اردو کو بدستور پنپنے کا موقع ملتا رہا لیکن مہاراجہ صاحب کی وفات کے بعد جے پور میں ایک "ہندی پرچارنی سبھا" قائم کی گئی جس کے صدر مشہور فرقہ پرست ٹھاکر کلیان سنگھ جی نامی تھے۔ اس سبھا کے قیام کا نتیجہ یہ ہوا کہ جے پور کے سرکاری دفتروں میں ہندی کی سرکاری حیثیت تسلیم کرا لی گئی۔ اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں ہندی حروف کے استعمال کی باقاعدہ اجازت بھی مل گئی۔ ان اقدامات کے بعد قدرتی طور پر ہندی پرستوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور وہ نڈر ہو کر اردو کو ریاست سے جلا وطن کر دینے کے ناپاک منصوبے باندھنے لگے۔ تاہم ۱۹۴۲ء تک جے پور کے دفتروں میں اردو اور ہندی دونوں زبانیں کو یکساں درجہ حاصل رہا۔ بلکہ عملی طور پر ہندی کے مقابلہ میں اردو کو ہر لحاظ سے ترجیح دی جاتی تھی۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں جب مرزا سر اسمٰعیل نے جے پور کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا۔ تو فرقہ پرست عناصر کو ابھرنے کا موقع مل گیا اور وہ ریاست کی حدود میں اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے پر زور دینے لگے۔ چنانچہ ایک صاحب پنڈت رام چندر شرما نے محض اس بنا پر بھوک ہڑتال شروع کر دی کہ جب تک جے پور کی عدالتوں دفتروں اور مدرسوں میں اردو کی جگہ ہندی رائج نہ ہو جائیگی۔ وہ برت نہ توڑیں گے۔ دوسری طرف پراونشل راجپوتانہ ہندو سبھا اور جے پور مہاسبھا نے پوری قوت سے پنڈت جی کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور برملا کہہ دیا کہ جب تک ان کے مطالبات کو منظور نہ کیا جائے گا وہ حکام ریاست کو چین سے نہ بیٹھنے دینگے۔ یہ دھمکی کارگر ہوئی اور ۲۸ جنوری ۱۹۴۳ء کو مرزا سر اسمٰعیل نے ایک میمورنڈم شائع کیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت جے پور اپنے دفاتر میں دیوناگری حروف کا اجرا کرنا چاہتی ہے لیکن اردو طرزِ تحریر استعمال کرنے پر بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اب چاہئے تو یہ تھا کہ ہندی پرست عناصر اس اعلان سے مطمئن ہو جاتے۔ لیکن انہوں نے سوچا کہ جب معمولی سی شورش سے اتنے عظیم الشان نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ تو کیوں نہ اس شور و ہنگامہ کا دائرہ اتنا وسیع کیا جائے کہ ریاست سے اردو کا نام و نشان ہی ناپید ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور آخر حکومت جے پور کا پبلسٹی آفیسر ایک ایسا اعلان شائع کرنے پر مجبور ہو گیا۔ جس کے بین السطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکام جے پور اردو کی جگہ ہندی کو فروغ دینا چاہتے ہیں جب مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) نے یہ صورت حال دیکھی تو وہ مضطرب ہوئے بغیر نہ رہے اور انہوں نے ایک پیغامبر کے ذریعے سے مرزا صاحب کو اس بے انصافی کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن مرزا صاحب نے ٹال مٹول کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔ اس طرزِ عمل سے ظاہر ہے کہ ہندو مہاسبھا کا تیر نشانہ پر لگ چکا ہے۔ اور وزیر اعظم جے پور اس کے زخم کا انتقام بیچاری اردو سے لینا چاہتے ہیں لیکن ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اردو کو کل ہند حیثیت حاصل ہو چکی ہے اس لئے وہ تو حکومت جے پور کے مٹائے نہ مٹ سکے گی البتہ مرزا صاحب کی اپنی شہرت و نیکنامی کا مستقبل خطرے سے خالی نہیں ہے اور ہمیں اندیشہ ہے کہ مقامی ہنگامہ ایک ایسے کل ہند طوفان کی صورت اختیار کر لیگا جس کا مقابلہ جے پور کے لیے بہت دشوار ہو جائیگا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ مرزا صاحب اپنی اس روش پر غور کریں اور سیاسی دباؤ سے متاثر ہونے کی بجائے اس مسئلہ پر خالص علمی و ادبی نقطۂ نظر سے نظر ڈالیں۔

(ادارہ)

موجِ فصاحت

بہار آنے کو ہے سرسبز گلشن ہوتا جاتا ہے
زمانا جام برکف، گل بدامن ہوتا جاتا ہے

خدا جانے چمن کی سیر کو کون آنے والا ہے
شگوفے پھول، اک اک پھول گلشن ہوتا جاتا ہے

نقط دو حرف آئینے ہیں احوالِ عنادل کے
قفس آباد، ویراں ہر نشیمن ہوتا جاتا ہے

جنوں کو ساتھ لیکر کون آیا سیرِ گلشن کو
گریبانِ سحر ہر گل کا دامن ہوتا جاتا ہے

کوئی آتا ہے شاید پھول تربت پر چڑھانے کو
کہ مجمع بلبلوں کا گردِ مدفن ہوتا جاتا ہے

میں اپنے چشم و دل کی روشنی جس کو سمجھتا تھا
ستم ہے وہ چراغِ بزمِ دشمن ہوتا جاتا ہے

دمِ نظارہ پھول اتنے رخِ رنگیں نے برسائے
نگاہِ شوق کا کوتاہ دامن ہوتا جاتا ہے

خزاں شاید قریب آئی جو بدلا رنگ بلبل کا
فغاں ہر زمزمہ ہر نغمہ شیون ہوتا جاتا ہے

جلیلؔ اللہ رکھے شاہِ عثماں کو دکن جن سے
ہمائے بخت و دولت کا نشیمن ہوتا جاتا ہے

جلیل
(فصاحت

حقائق و معارف

ادبیاتِ اسلام

دورِ جاہلیت کے ایک مقولے کا تاریخی پس منظر

دورِ جاہلیت کا ایک بہت ہی پرانا مقولہ ہے۔ "ان غداً لناظرہٖ قریب۔" یعنی "آنے والا کل نظر سے منتظر فرد اقریب" سب سے اول ادب کی انگشتری میں حکیمانہ جامعیت کا یہ نگینہ جس نے جڑا وہ قراد بن اجدع تھا۔ جس نے نعمان بن منذر تاجدارِ حیرہ کا زمانہ پایا تھا۔ کہ بقول غالب ۵۸۵ء سے ۶۰۲ء تک فرمانروا رہا۔ اس مثل کی شانِ تمثیل بیان کرنے سے پہلے ہم علامہ ابو الفرج اصفہانی کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ جس کا ذہن نشین ہو جانا اس مثل کی تاریخی حیثیت جاننے کے لئے ضروری ہے۔

نعمان بن منذر عرب کے بت پرستانہ تمدن میں ایک ناقابل رشک شہرت رکھتا ہے۔ شراب اس کی گھٹی میں پڑی تھی اس کی سیہ مستانہ بادہ گساریوں کے افسانوں سے کتاب الاغانی کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ظالمانہ استبداد اس کا شیوہ خاص تھا۔ ایک ذرا سی بات پر بگڑ کر کسی شخص کو قتل کر دینا اس کا ایک معمولی ہتھکنڈا تھا۔ خالد بن مضلل اور عمرو بن مسعود اس کے ندیمِ تمام رفیق تھے۔ جو محفل نائے ولوش میں اس کے برابر کے شریک تھے ایک رات مجلس عیش و طرب حسبِ معمول برپا تھی۔ اور نعمان ان دونوں محبانِ بادہ پیما کے ساتھ بیٹھا ہوا جام پر جام خالی کر رہا تھا۔ کہ کسی بات پر دونوں دوستوں کی اس سے تکرار ہو گئی۔ شراب کے نشے میں ہوش و حواس تو بجا تھے ہی نہیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ عالمِ غضب میں حکم دیا کہ دونوں کو اسی وقت زندہ گاڑ دیا جائے۔ وہاں کیا دیر تھی خدام ادب دونوں یارانِ شراب کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین میں گاڑ دیا۔

صبح جب نعمان کی آنکھ کھلی تو اگرچہ خمر دوشیں کا خمار تھوڑا بہت سر میں تھا۔ لیکن عقل ایک حد تک ٹھکانے آچکی تھی رات کے واقعہ کو ابھی موجِ فراموشی بہا لے گئی تھی۔ اہالی و موالی سے پوچھا کہ خالد و عمرو کہاں ہیں؟ انہوں نے عرض کی۔ کہ حضور وہ تو حسب الحکم رات ہی زمین میں زندہ گاڑ دیئے گئے تھے۔ نعمان نے سنتے ہی سر پیٹ لیا۔ متاعِ ہوش و حواس پر پشیمانی کی بجلی ہی تو گر پڑی اور جزع و فزع کرتا ہوا اپنے دوستوں کی قبر پر پہنچا۔ تلافیٔ مافات کی اور شکل تو نکلنی محال تھی۔ البتہ دونوں قبروں پر اس نے دو مخروطی مینار بنوا دیئے۔ اور اس دن سے یہ عہد کر لیا کہ سال میں دو دن دونوں گزرے ہوئے دوستوں کی یادگار کے لئے وقف کر دے گا۔ دونوں دن وہ ہر ایک کی قبر پر جا کر ماتم کیا کرتا تھا۔ ان ایام دوگانہ میں سے ایک کا نام "یوم البؤس" تھا۔ اور ایک کا "یوم النعیم"۔ یوم نعیم والے دن جو شخص اول اول اس کو ملتا تھا اسے وہ سو کالے اونٹ بخش دیتا تھا۔ اور یوم بؤس کو جس شخص سے اول اول اس کی مڈبھیڑ ہوتی اسے ایک ظربیان یعنی کالی جنگلی بلی سے کراس کی گردن مروا دیتا۔ اور اس کے خون سے دونوں میناروں کو لیپا جاتا۔ اسی مناسبت سے یہ دونوں مینار غزیین یعنی آغشتہ بخون کے نام سے موسوم ہو گئے تھے جن بدنصیبوں کے خون سے یہ مینار مدتوں ارغوانی ہوتے رہے۔ ان میں جاہلیت کے مشہور شاعر عبید بن الابرص کا بھی شمار ہے۔ اب ہم مثل زیرِ تبصرہ کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

نعمان بن منذر ایک دن اپنے گھوڑے "مدحوم" پر سوار ہو کر شکار کے قصد سے باہر نکلا۔ لاؤ لشکر ہمراہ تھا جنگل میں نکل کر ایک

گورخر پر نظر پڑی۔ جس نے شکاریوں کا ہجوم دیکھتے ہی فراٹے بھرنے شروع کئے۔ نعمان نے گھوڑا پیچھے ڈالا۔ کہ وہ بھی ہولے سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ جو سوار ہمرکاب تھے انہوں نے بہت تگ و دو کی۔ لیکن در نعمان کی گرد کو نہ پاسکے۔ شکار تو خدا جانے کہاں کہاں نکل گیا۔ لیکن نعمان جنگل میں اکیلا رہ گیا۔ اور رستہ بھی بھول گیا۔ دن بھر ادھر ادھر مارا مارا پھرا۔ پھر جنگل کی بھول بھلیاں سے نکلنے کی کوئی صورت نکال نہ سکا۔ آفتاب بھی ڈھل چلا تھا۔ اور ہوا میں جاتیں کرتا ہوا ویرانہ شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں چھپ جانے کے قریب آگیا۔ اتنے میں دور سے نعمان کو ایک خیمہ نظر آیا۔ تھکے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا کر وہ اس خیمہ کے قریب پہنچا۔ اور صاحب خیمہ کو آواز دی۔ خیمہ میں بنو طے کا ایک شخص حنظلہ نامی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ حنظلہ نے جب ایک اجنبی کی آواز سنی تو باہر نکل آیا اور مسافر کو دیکھ کر پوچھا۔ کیا چاہتے ہو؟ نعمان نے کہا کہ جنگل میں رستہ بھول گیا ہوں۔ اور رات گزارنا چاہتا ہوں۔ اعراب بادیہ اپنی مہمان نوازی کے لئے شہرۂ آفاق ہیں۔ اور طے کا قبیلہ تو اس وصف میں امتیاز خاص رکھتا ہے۔ مہمان کا نام پوچھے بغیر حنظلہ نے اھلاً و سہلاً کہا اور گھوڑے کے دانہ چارہ کا انتظام کر کے مہمان کو خیمہ کے اندر لے گیا۔ حنظلہ کے پاس اس وقت بجز ایک بکری کے جس کا دودھ اس کے خوان کی بہترین نعمت تھی۔ اتفاق سے اور کچھ موجود نہ تھا۔ بیوی کو الگ لے جا کر کہنے لگا۔ کہ آج رات ہمارے ہاں یہ مہمان شب باش ہوتا ہے۔ اور وضع قطع سے معزز معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خاطر مدارات اس کی حیثیت ہی کے لحاظ سے ہونی چاہئے۔ لیکن تم نے مجھ سے ابھی ابھی کہا تھا کہ گھر میں پھوٹی بھانگ تک موجود نہیں۔ اب بتاؤ کیا کیا جائے۔ گھر والی نے بھی بڑا دل پایا تھا۔ کہنے لگی کہ بکری تو ہے ہی۔ اسے ذبح کر ڈالو۔ کباب اس کے گوشت کے لگائے جائیں گے کچھ گیہوں بھی ایسے ہی موقع کے لئے رکھ چھوڑے تھے۔ آٹا پیس کر کچھ روٹیاں پکا لونگی۔ غرض نان و کباب سے نعمان کی تواضع کی گئی اور وہ پیٹ بھر کر آرام سے سو رہا۔

صبح اٹھ کر نعمان نے اپنے عالی حوصلہ میزبانوں کا شکریہ ادا کیا اور چلتے وقت کہنے لگا کہ برادر عرب! میں بادشاہ نعمان ہوں۔ تمہاری مہمان نوازی کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ جو کچھ مانگنا ہو مانگ لو حنظلہ نے کہا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ وہ وقت کبھی آئیگا۔ اگر کچھ مانگنا ہوگا تو انشاء اللہ اسی وقت مانگ لوں گا

حنظلہ سے رستہ پوچھ کر نعمان تو اپنے دار الحکومت حیرہ کو چلا گیا۔ اور حنظلہ کے لئے کچھ دنوں کے بعد یہ واقعہ خواب و خیال ہو گیا اس پر ایک زمانہ گزر گیا۔ اور گردش لیل و نہار اپنا رنگ لائی۔ دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج کسی کی ہے تو کل کسی کی۔ بیچارہ حنظلہ جو پہلے صاحب جاہ و مکنت تھا۔ اب مفلوک الحال ہو گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ میاں بیوی کو کئی کئی دن فاقے سے گزر جاتے تھے۔ اسی عالم عسرت میں ایک دن بیوی نے میاں سے کہا۔ کہ بادشاہ حیرہ نے تم سے حسن سلوک کا وعدہ کیا تھا۔ کیوں نہیں دربار میں جا کر بادشاہ کو وہ وعدہ یاد دلاتے کہ ہماری یہ بپتا دور ہو۔ یہ بات حنظلہ کی سمجھ میں بھی آگئی۔ اور گھر سے نکل کر سیدھے حیرہ کی راہ لی۔

قضا کار یہ دن نعمان کا یوم بؤس تھا۔ حنظلہ پہلا شخص تھا جس پر آج نعمان کی نظر پڑی۔ نعمان نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور کہا۔ تم وہی طائی تو نہیں جس کے گھر میں ایک رات میں شب باش ہوا تھا۔ حنظلہ نے کہا ہاں۔ میں وہی طائی ہوں۔ اور حضور میرے ہی یہاں فروکش ہوئے تھے۔ نعمان نے بصد تاسف میں جواب دیا۔ تم اس دن کے علاوہ کسی اور دن مجھے آ کر کیوں نہیں ملے۔ اس بیچارے کو اس واقعہ کا کیا علم تھا۔ کہنے لگا۔ مجھے اس کی مطلق خبر نہ تھی۔ نعمان نے جواب دیا۔ کہ آج کا ڈراؤنا دن وہ دن ہے کہ اگر اول اول میں اپنے بیٹے کو بھی دیکھ پاؤں تو اس کے قتل سے بھی مجھے کوئی طاقت روک نہ سکیگی۔ بہر حال جو تمہیں سوال کرنا ہے کرو اور منہ مانگی مراد پاؤ۔ لیکن اپنے آپ کو مقتول سمجھو۔ حنظلہ نے کہا کہ زخارف دنیوی کو لے کر میں کیا چاٹوں گا۔ جب کہ میری جان ہی کی امان نہیں۔ نعمان نے کہا اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ تمہارا قتل ہو جانا اٹل ہے حنظلہ نے جواب دیا کہ اگر میری قسمت میں یہی لکھا ہے تو میں اس پر شاکر ہوں۔ لیکن آپ سے اتنی مہلت چاہتا ہوں کہ مجھے ایک دفعہ گھر ہو آنے دیجئے تاکہ میں اپنے اہل و عیال سے مل لوں۔ اور جو کچھ مجھے وصیت کرنی ہے کر آؤں۔ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر میں پھر آپ کے پاس لوٹ آؤں گا۔ نعمان نے کہا کہ مجھے تمہاری یہ خواہش منظور ہے۔ بشرطیکہ کسی شخص کو اپنا ضامن چھوڑتے جاؤ۔ اس وقت نعمان کے درباریوں میں قبیلہ بنی شیبان کا ایک شخص شریک بن عمرو بن قیس تھا۔ کہ اس کی کنیت ابو الحوفزان تھی۔ اور وہ نعمان کا ہمدم "الردفہ" رجا و دربردار تھا۔ حنظلہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اور کہا

اس سے یوں مخاطب کیا۔

یا شریک یا ابن عمرو
هل من الموت محاله
یا اخا کل مضاف
یا اخا من لا اخا له
یا اخا النعمان فك الیوم
ضیفا قد اتى له
طالما عالج کرب الموت
لا ینعم باله

یعنی :۔ اے شریک اے عمرو کے بیٹے کیا موت سے رستگاری بھی ممکن ہے اے وہ کہ تو ہر شخص کا بھائی ہے۔ جو تجھ سے تعلق پیدا کرے اور جس کے کوئی عزیز و قریب نہ ہو۔ تو اس کا عزیز و قریب ہے۔ اے نعمان کے بھائی۔ آج تو ایسے شخص کو نجات دلا۔ جو نعمان کا مہمان ہو کر آیا تھا۔ وہ کب سے موت کی سختیاں برداشت کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے دل کو قرار تک نہیں۔

پتھر کا دل بھی ہوتا۔ تو اس دردناک التجا کو سنکر متاثر ہو جاتا لیکن نعمان کا مصاحب الرادفہ کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ صاف انکار کر دیا کہ میں تمہارا ضامن نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہر شخص ابو الموفزائی ہی نہ تھا۔ پاس ہی سے ایک خدا کا بندہ قراد بن اجدع کھڑا تھا۔ جسے قبیلہ بنی کلب سے نسبت تھی۔ آگے بڑھ کر نعمان سے کہنے لگا۔ کہ میں حنظلہ کی ضمانت دیتا ہوں۔ اگر وقت مقررہ پر نہ لوٹے تو میری گردن اس کی جگہ حاضر ہے۔ نعمان نے ایسے بڑے یرغمال کے موجود ہوتے ہوئے مزید حجت نہ کی۔ اور حنظلہ کو پانسو اونٹ دے کر ایک سال کی مہلت پر گھر جانے کی اجازت دی۔ اور اس کے ضامن کو صاف طور پر جتا دیا کہ اگر یہ سال بھر کے بعد اسی دن حاضر نہ ہوا تو تمہاری خیر نہیں

اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا۔ اور نعمان کے یوم البؤس کو صرف ایک ہی دن رہ گیا۔ نعمان اس شبہ میں زمانہ کی روش اور فطرت انسانی کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے حق بجانب تھا کہ حنظلہ کبھی اپنا وعدہ وفا نہ کرے گا۔ چنانچہ اس دن کی شام کو جس کی اگلی صبح یوم البؤس کی خون چکاں ہلتیں اپنے ساتھ لانے والی تھیں۔ نعمان نے قراد سے کہا کہ ما اراك الا هالكا غدا۔ یعنی تو مجھے اس طرح نظر آ رہا ہے کہ کل ہلاک ہو جائیگا۔ قراد نے جھٹتے ہی جواب دیا۔

فان یك صدر هذا الیوم ولى
فان غدا لناظره قریب

یعنی ؎

بام سے گھر پھینک دے امروز طشت
ہے نظر سے منظر فردا قریب

اس شعر کا یہی دوسرا مصرع ہے جو آج تک ضرب المثل چلا آتا ہے۔ مثل کی تاریخ تو پوری ہو گئی۔ لیکن ناظرین جاننا چاہتے ہوں گے کہ قراد بن اجدع کے ایثار و فدویت اور حنظلہ کے وعدے کی شان ایفا کا خاتمہ کسطرح پر ہوا۔ اس لئے اس حکایت لذیذ تر کو ہم دراز تر کرتے ہیں۔

دوسرے دن صبح سویرے نعمان بن منذر گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے خیل و حشم کے ساتھ حسب معمول "غریین" کی طرف روانہ ہوا اور دونوں مناروں کے درمیان پہنچکر ٹھہر گیا۔ بیچارے قراد کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ نعمان نے حکم دیا کہ اسے قتل کیا جائے لیکن وزراء نے عرض کی کہ اس کے قتل میں جلدی نہ کیجئے ابھی تو دن چڑھ رہا ہے۔ کیا عجب ہے کہ حنظلہ ایفائے عہد کرے اور شام ہونے سے پہلے آ پہنچے۔ نعمان اگرچہ ظالم تھا۔ لیکن مہمان نوازی کی وہ خواہش جو ایک احسان مند عرب کا سب سے بڑا وصف ہے اس رات کی یاد میں جو اس نے طائی جبہ کے اندر جنگل میں گزاری تھی رہ رہ کے اس کے دل میں چٹکیاں لیتی تھی۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ حنظلہ قتل ہو۔ اسی لئے یوم البؤس کی بھینٹ قراد ہی کے سر کو بنایا جاتا تھا۔ اور اس کے قتل میں جلدی کرتا تھا۔ لیکن وزراء کا اصرار بھی ایسا نہ تھا کہ ٹل سکے۔ بادل ناخواستہ اس نے قراد کے قتل کو شام تک ملتوی کر دیا۔

آفتاب کائنات کی مسافت کو طے کرتا ہوا آخر افق کی مغربی منزل میں پہنچا۔ لیکن ابھی تک حنظلہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ "نطع" یعنی وہ مدور چرمی بساط جس پر خونیوں کی گردن ماری جاتی ہے۔ بچھی ہوئی تھی قراد صرف ایک لخت باندھے قتل ہونے کے لئے تیار اس پر کھڑا تھا۔ جلاد کے تیغہ کی براش رگ گلو سے ہم زبان ہونے کے لئے منتظر تھی۔ مجرم کے خویش و اقارب غم کی تصویر بنے کھڑے تھے اور اس کی بیوی دردناک لے میں یہ بین کر رہی تھی۔

ایا عین بکی قراد بن اجدعا
رهینا لقتل لا رهینا مودعا
اتته المنایا بغتة دون قومه
فامسى اسیرا حاضر البیت اضرعا

یعنی ؎

احداث کے غم میں ہے مری آنکھ اشکبار ہو
یہ بیرِ نعمان قتل ہے کب وا گزار ہو !!
آئی اسی کو مرگ متفاجات قوم میں !
بے چارگی کی موت سے کس کو فرار ہو

اس عالمِ کرب و بلا میں ایک شخص دور سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ قریب تھا کہ جلاد کا تیغہ فراد کی گردن پر گرے ۔ حاضرین یک زبان ہو کر بولے کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ جو شخص آرہا ہے کون ہے ۔ جلاد کو چاہیئے کہ اپنا ہاتھ روکے رکھے لتنے میں وہ شخص قریب آ گیا۔ دیکھا تو حنظلہ تھا۔ نعمان نے جب اُسے دیکھا تو اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ اور کہا کیا چیز تھی ۔ تجھے واپس لائی حنظلہ نے جواب دیا وہ اس زمانہ کی عربیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے سمجھنے لگا کہ مجھے پاس عہد کشاں کشاں موت کی طرف سے آیا

نعمان نے حیران ہو کر پوچھا وہ کیا قوت تھی ۔ جس نے تجھے پاس عہد پر برانگیختہ کیا۔ حنظلہ نے کہا کہ وہ قوت میرا دین ہے ۔

حنظلہ کی اس بات کا نعمان کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے اسی وقت فراد اور حنظلہ کا خون تو معاف کر دیا اور یوم بوس دیوم نعیم کی یادگار منانی بھی چھوڑ دی ۔ ساتھ ہی اس نے حکم دیا کہ غربیین کو بیوند زمین کر دیا جائے ۔ اب اس دن سے اس کی زندگی ہی بدل گئی وہ بے اختیار پکار اٹھا

واللہ ما ادری ایھما اوفی واکرم اھذا
الذی نجا من القتل فعاد۔ ام الذی ضمنہ ؟
واللہ لا اکون الام الثلاثۃ ۔

یعنی خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ ان دونوں میں زیادہ باوفا اور شریف کون ہے ؟ وہ جو قتل سے بچ گیا تھا مگر پھر قتل ہونے کے لئے واپس آیا یا وہ جس نے اپنی جان کی ضمانت دی خدا کی قسم میں ان دونوں شریفوں میں تیسرا لئیم نہ رہوں گا بلکہ ان جیسا بنوں گا

ظفر علی خاں

اک بار مسکرانا

میری مصیبتوں پر ہرگز نہ دل دکھانا ۔۔۔ اشکوں کی تم کو سوگند اک بار مسکرانا
مجھ سے نظر ملا کر ہرگز نہ لڑکھڑانا ۔۔۔ بے درد ہے یہ دنیا سنگدل ہے زمانا
کیوں برق وش نگاہیں دربھٹک رہی ہیں ۔۔۔ اے خرمنِ تجلّی حاضر ہے آشیانا
سنتی رہی جوانی دکھ درد کی کہانی ۔۔۔ میں اپنے آنسوؤں میں کہتا رہا فسانا

جوشِ غم و الم میں تسکین پا رہا ہوں
اے جانِ محبت پلکوں سے گر نہ جانا

قمر [illegible]

عصرِ جدید

عالمِ تاریک اگر لمعہ بداماں ہے تو کیا - اس سیاہی پر فریبِ نور غلطاں ہے تو کیا
کل اسی میں کودتا ہوگا سمندِ انقلاب - آج جولاں گاہِ عشرت قصرِ سلطاں ہے تو کیا
کل تو ہوگا ایک ہی دیں، اور وہ انسانیت - آج دنیا رزمگاہِ کفر و ایماں ہے تو کیا
کل حیاتِ تازہ لے کر آئے گا عصرِ جواں - آج آغوشِ اجل میں پیرِ دوراں ہے تو کیا
کل تلاطم سے بھی ساحل کا لیا جائے گا کام - آج کشتی مشق گاہِ جوشِ طوفاں ہے تو کیا
کل سکوتِ بندگی ہوگا قیامت در کنار - آج شورِ خواجگی فتنہ بداماں ہے تو کیا
کل قبائے ظلم ہوگی اور دستِ انتقام - آج مظلومی اگر سر در گریباں ہے تو کیا
کل گڑے ہوں گے ترے ہونٹوں میں حریت کے دانت - آج مملوکوں کے رونے پر تو خنداں ہے تو کیا
دوڑتا ہے پتے پتے میں بہارِ نو کا خوں - آج پامالِ خزاں رنگِ گلستاں ہے تو کیا
کل مؤذن کی رجز خوانی ہی دے گی درسِ جوش - آج مسجد میں سکوتِ مرگ ساماں ہے تو کیا
دوشِ مستقبل پر آنے کو ہے عصرِ نوجواں - یہ جہانِ پیر وقفِ مرگِ حرماں ہے تو کیا

انقلاب اک سنتِ حق ہے جو ٹل سکتی نہیں
کون کہتا ہے کہ یہ دنیا بدل سکتی نہیں

اظہر امرتسری

سوزِ نو

کسی نے بھی حفاظت سے نہ رکھا اپنے خرمن کو
خزاں ہشیار ہی کرتی رہی یارانِ گلشن کو

ضرورت سوزِ نو کی ہے مرے ذوقِ تپیدن کو
ذرا پھر طور سے آواز دینا برقِ ایمن کو

یہ نقشِ مستقل سمجھا کیا تعمیرِ گلشن کو
ہوائیں جنبشیں دیتی رہیں شاخِ نشیمن کو

ہلا دینا تھا نعروں سے جمود آبادِ گلشن کو
ابھی تو یاد ہونگی میری تکبیریں نشیمن کو

خدانخواستہ کیوں ہو گراں یارانِ گلشن کو
ملی ہے نغمہ سامانی مرے اندازِ شیون کو

یہی خود گلچیں تھا خود ہی باغباں تھا خود گل افشاں تھا
کوئی آئینۂ ماضی میں دیکھے میرے گلشن کو

جنوں میں کوئی آنسو پونچھنے والا نہیں ملتا
ترستی ہیں اب آنکھیں آستین و چاکِ دامن کو

گری گھبرا کے اک چھوٹی سی کم مایہ پہاڑی پر
دلِ موسیٰ نظر آیا نہ شاید برقِ ایمن کو

خزاں کی اور مری نیت میں فرقِ قتل و غارت ہے
مٹا سکتا نہیں لیکن لٹا سکتا ہوں گلشن کو

نگاہِ ابر میں پھول اور کانٹے سب برابر ہیں
محبت اک نظر سے دیکھتی ہے دوست دشمن کو

جنوں کھینچے لئے جاتا ہے، دامن بھی گریباں بھی
مگر احساس ہوتا ہے گریباں کو نہ دامن کو

خدا کا نام لے "آگے بڑھو" کہنے سے کیا حاصل
ابھی دل کھینچنا آتا نہیں میرے نوازن کو

نہیں ممکن کہ مر کر بھی سکوں حاصل ہو گردش سے
ابھی بننا ہے صبحِ حشر میری شامِ مدفن کو

کسی نے دفن ہوتے نعش پروانہ نہیں دیکھی
جو ہیں آزاد محبس جانتے ہیں کنجِ مدفن کو

نمازِ صبح کی بنیاد ڈالی میں نے گلشن میں
بنایا خو گرِ سجدہ سرِ شاخِ نشیمن کو

سرِ شاخِ نشیمن بیٹھ کر جب چہچہاتا ہوں
مری گلبانگِ آزادی جگا دیتی ہے گلشن کو

محبت عقل کے بس کی نہیں، راہِ جنوں پر چل
کہ رہبر سے زیادہ آگہی ہوتی ہے رہزن کو

رہے محدود ہو کر فطرتِ نشو و نما کب تک
نئی انگڑائی لینی چاہئے دیوارِ گلشن کو

نہیں ایسا معمّہ کوئی جس کا حل نہ ہو ممکن
سلجھنا چاہئے سیماب میرے دل کی الجھن کو

سیماب اکبرآبادی

افسانہ

دلدل

کوٹھی کے مختلف چھوٹے بڑے کمروں میں سے تیزی کے ساتھ گذرتا ہُوا وہ اپنے کمرے میں پہنچا اور دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا کر پلنگ پر اس طرح گر پڑا جیسے ایک لمبی غیر دلچسپ مسافت طے کرنے کے بعد اس کا جسم تھکاوٹ سے چُور چُور ہو چکا ہے۔ شام کے وقت اس قسم کی ذہنی خستگی سے دوچار ہونا قریب قریب اس کا معمول ہو چکا تھا۔ اور آج بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔ وہ انتہائی کوشش کرتا کہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے اردگرد کے حالات پر غور و فکر کرنا چھوڑ دے۔ موجودہ پریشانی اور بےچینی کو باہر نکال کر دل و دماغ کے دروازے کو بند کر کے مقفل کر دے۔ چنانچہ گوناگوں تفریحات میں حصہ لینے کی کوشش کرتا رہتا۔ طرح طرح کے رنگین مشاغل میں مصروف رہتا۔ لیکن جیسے ہی تنہائی نصیب ہوتی، یہ خلش جو دن بھر اس کے دماغ کی رگوں پر رینگتی رہتی تھی یک دم آدھ جلے کوئلے کی سی صورت اختیار کر لیتی۔ اور وہ دیر تک سر جھکائے سوچ بچار میں غرق رہتا۔ پہلے پہل یہ خلش اُس کے دل میں اُس وقت پیدا ہوئی جب وہ ایک تماشا کنسرٹ میں شریک ہونے کے لئے اپنے ایک دوست کو ہمراہ لینے کی غرض سے اس کے گھر پہنچا۔ اس کا دوست جرابوں کے کئی جوڑے سامنے رکھے اپنے نوکروں پر بُری طرح بگڑ رہا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس وقت اس کے پسند کے سوٹ کے رنگ کی جرابیں کہیں بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ اور کسی اور رنگ کی جرابیں پہننا وہ اپنی شان اور اقتدار کے خلاف سمجھتا تھا یہ دیکھ کر معاً اس کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا۔ آخر اس کے دوست کے اضطراب کی حقیقی وجہ کیا ہے؟ محض تکلف، صرف ایک رسم کی پابندی صرف ایک فیشن کی غلامی۔ وہ اپنے دوست کی بڑھتی ہوئی بےچینی کو دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی اس کے اپنے دماغ میں بھی ایک قسم کی بیقراری سر اُٹھا رہی تھی۔ اس کا تکلف پسند دوست مطلوبہ جرابیں وقت پر حاصل نہ کر سکا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کنسرٹ میں بھی شامل نہ ہوا۔

اُس نے اپنی زندگی میں بےشمار تفریحی اجتماعات میں عملی حصہ لیا تھا لیکن نہ معلوم کیا بات تھی کہ اس کنسرٹ میں اُس نے جو کچھ دیکھا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ تاثر اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلا تاثر تھا اس رات وہ گھر پہنچا تو خیالات کا ہجوم بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کی طرح اس کے دماغ کو پریشان کر رہا تھا۔ وہ دیر تک اپنی موجودہ پریشانی کا جائزہ لیتا رہا اور آخر وہ اسی عالم میں سو گیا۔

اُس دن کے بعد وہ سرود و نغمہ کی کئی محفلوں میں شریک ہوتا رہا مختلف قسم کی کلبوں سے سرگرمی کا اظہار کرتا رہا۔ مگر ہر وقت نفرت اور بیچارگی کا ایک ملا جُلا احساس اس کے دل میں گہرائیوں میں کروٹیں لیتا رہتا تھا۔ اور آج اس احساس نے شدید صورت اختیار کر لی تھی۔ ابھی ابھی وہ ایک دعوت میں شامل ہونے کے بعد واپس آ رہا تھا، اس دعوت میں اونچی سوسائٹی کے کئی معزز رکن شامل تھے۔ حسین و جمیل لڑکیاں بھی تھیں اور خوش پوش نوجوان بھی —— ہر ایک کا چہرہ خنداں، شاداب اور مسکراہٹیں برساتا ہُوا۔ ہر طرف لونڈر، پوڈر اور غازے کی بہاریں، اور ہر جانب رنگ رنگ کے قیمتی سوٹوں اور رنگین و ریشمی ساریوں کا طُوفانِ رنگ و بُو۔ جیسے کسی بہار آفریں چاندنی رات میں سبزہ زاروں میں جابجا کھلے ہوئے شاداب پھول —— جب تک دعوت منعقد رہی وہ کھویا کھویا اپنے خیالات میں غرق کبھی ادھر دیکھتا تھا کبھی اُدھر ——

اور اس وقت کہ وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا تھا، یہی مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہماری سوسائٹی اب اس منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں تصنع اور ریاکاری ہی زندگی کا نصب العین بن چکا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگا جیسے ذہنی کوفت کے پے در پے حملوں سے نڈھال ہو چکا ہے —— ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہا ہے، جہاں لوگوں کی روحیں زخمی پرندوں کی طرح سینوں کی چار دیواری میں ہر وقت پھڑپھڑاتی رہتی ہیں اور جہاں بناوٹ اور ظاہرداری نے سچی خوشی کو اس طرح مجروح و پامال کر دیا ہے۔ جس طرح ایک گندی دلدل کا تعفن قریب رکھے ہوئے پھولوں کی خوشبو کو اپنے اندر جذب کر لے یکایک اس کی نظر سامنے میز پر پڑی۔ میز کے ایک کونے میں چینی کا ایک کھلونا مخمل کی ایک چھوٹی سی گدی میں دھنسا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کیا ہمارا موجودہ تصنع میں ڈوبا ہوا ماحول ایک دلدل نہیں ہے جس کے اوپر مخمل بچھی ہوئی ہے اور ہماری سوسائٹی اس دلدل میں دھنستی چلی جا رہی ہے۔

نفرت وکراہت کے شدید جذبے کے زیر اثر وہ پلنگ سے اُٹھ بیٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا - دو تین بار چکر لگانے کے بعد اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کی فضا کثیف دھوئیں سے بھر گئی ہے اور اُس کا دم گھٹ رہا ہے - اُس کی نظر تصویروں، کتابوں کی الماری اور دیوار سے لگے ہوئے کلاک پر سے پھسلتی ہوئی پھر میز کے کونے پر جا پڑی، مخمل، دلدل، تصنع، جھوٹے قہقہے، لونڈرا اور پوڈر میں چھپے ہوئے چہرے، پھڑپھڑاتی ہوئی زخمی ہوئی روحیں —— خیالات اس کے ذہن میں پے در پے چلے آرہے تھے - یکایک اُسے اپنی جیب میں کوئی چیز چبھی - اب اسے معلوم ہوا کہ اُس نے عالم بے اختیاری میں چینی کے کھلونے کو اپنی جیب میں ڈال لیا ہے - چند لمحوں تک اُس کی انگلیاں کبھی چینی کے کھلونے کو اور کبھی مخمل کی گدّی کو چھوتی رہیں —— اُس نے کھڑکی کھول دی، سرد ہوا کا ایک فرحت زا جھونکا اس کے بالوں اور چہرے کو مس کرتا ہوا گزر گیا - ایک عارضی سکون کی کیفیت اس کے تپش زدہ دماغ پر چھا گئی - اُس نے نظر اُٹھائی ایک پرندہ فضا میں آزادی کے ساتھ اُڑتا ہُوا افق کی لامحدود نیلاہٹوں میں غایب ہو رہا تھا - اُس نے کرسی کو کھڑکی کے قریب کھسکایا اور اس میں بیٹھ کر ان واقعات میں کھو گیا جو دو سال پیشتر اس کی زندگی میں رونما ہو چکے تھے - دو سال ہوئے وہ اس قدر علیل ہو گیا تھا کہ بمشکل چارپائی سے اٹھ بیٹھ سکتا تھا - اُس وقت ڈاکٹروں نے اُس کے والد کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے مریض بیٹے کو کسی گاؤں میں بھیج دے چنانچہ وہ ایک صاف ستھرے گاؤں میں بھیج دیا گیا - جہاں چند ماہ ہی میں اُس نے بیماری کے خوفناک چنگل سے نجات حاصل کر لی -

ان واقعات کو یاد کرتے ہی گاؤں کی سادہ اور حیات افروز معاشرت کی یاد اُس کے دل کو تڑپانے لگی - ہر طرف بکھرے ہوئے سادہ اور دلکش مناظر، ہر لحہ چلتی ہوئی ٹھنڈی اور معصوم ہوا، جا بجا گھنے درختوں کی خواب آلود چھاؤں، اور چھوٹے بڑے پودوں کے پاؤں میں سے گذرتی ہوئی ترنم ریز ندی —— اس کا دل کتنا چاہتا تھا کہ اس فضا میں آزادی کے ساتھ دوڑتا پھرے - اُس کی ہواؤں میں ہمیشہ ہمیشہ سانس لیتا رہے یہاں جیون راگ کتنا مدھرا، کتنا میٹھا ہے - تمام گاؤں میں تصنع نام کو نہیں - کہیں بھی ریاکاری کا نشان نہیں، ان لوگوں کی سادہ زندگی [illegible] میں ڈوبی ہوئی زندگی، اس بشاشت اور آزادی کی شبنم سے دھلی ہوئی پاکیزہ مسرت کا تصور بھی نہیں کر سکتی جو گاؤں والوں کو حاصل ہے - یکایک اس کی نگاہوں کے سامنے ایک شاداب چہرہ ناچنے لگا،

"مریم —— !" اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہریں دوڑنے لگیں، کتنی حسین، کتنی خوبصورت ہے یہ گاؤں کی سادہ فطرت لڑکی؛ چند دن ہی میں مجھ سے بے تکلف ہو گئی تھی - اور وہ اپنے بالوں میں نرم نرم لمبی لمبی انگلیوں کو کنگھی کرتے ہوئے محسوس کرنے لگا -

اس نے کلاک کی طرف دیکھا اور پھر اسی تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلنے لگا جس تیزی سے کمرے میں داخل ہوا تھا -

ایک رات سفر کرنے کے بعد وہ علی الصبح نور پور کے مختصر سے سٹیشن پر پہنچ گیا - گاڑی سے اُتر کر اُس نے گاؤں کی خاموش اور صبح کے خواب آور دھندلکے میں لپٹی ہوئی معصوم وسعتوں پر نظر ڈالی، اور اس کی رگ رگ، ریشے ریشے میں کیف و سرور کی لہریں دوڑنے لگیں - اسے محسوس ہوا گویا ایک خوفناک دلدل سے جست لگا کر باہر نکل آیا ہے - اور اپنے پھیپھڑوں کی رگوں میں جمے ہوئے زہریلے مادے کو سانس کے ذریعے نسیم سحر کے لطیف اور ٹھنڈے جھونکوں میں اُگل رہا ہے - اُسے اپنا سینہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ کشادہ محسوس ہونے لگا، روح سے نہ معلوم بارگراں سرکنے لگا - اور دل و دماغ کے بعض گوشوں میں رُکا ہوا خون پھر گردش کرنے لگا - وہ سٹیشن سے باہر نکلا اور نہر کے پُل پر کھڑا ہو گیا - اُس کے عین سامنے ایک رنگین تیتری کبھی پانی پر جھکے ہوئے ایک پودے کی شاخ پر آ بیٹھتی تھی اور کبھی نہر کے اوپر اُڑتے اُڑتے دور جا نکلتی تھی - نہر کے دوسری طرف کچھ دُور ایک بکری کا بچہ آزادی کے ساتھ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہا تھا - ایک درخت کے نیچے چند مرغ اور مُرغیاں مسرت کے عالم میں مٹی اور گھاس میں اپنی روزی تلاش کر رہی تھیں - اُس نے لمبا سانس لیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا - ہر طرف مسرت، ہر طرف معصومیت ہر طرف آزادی، اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کا وجود ہوا کے ان ٹھنڈے جھونکوں میں تبدیل ہو جائے - صبح کا دُھندلکا بنکر ان ہر طرف پھیلی ہوئی وسعتوں میں جذب ہو جائے - اس آزادی کے ساتھ بہتی ہوئی ندی کی لہروں میں کھو جائے - مرغوں اور مرغیوں کے ہجوم میں سے نکل کر ایک مُرغ نے بانگ دی اور اپنے پر پھڑپھڑانے لگا، اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ مُرغ کو اپنی گود میں اُٹھا لے - اُسے اپنے سینے سے لگا لے - اس کی روح اُس کے کشادہ سینے میں اُڑ [illegible]

وہ اب اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے لگا - اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنا مکان بنوائے گا - شہروں کا سا عالیشان مکان نہیں بلکہ کہ مکان جیسا گاؤں میں ہوتا ہے - زیادہ سے زیادہ دو منزلہ

آگے ایک باغ اور اس کے وسط میں ایک فوارہ یا یا ایک تالاب —— مگر نہر کی موجودگی میں تالاب ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ آب پاشی میں خود حصہ لے گا۔ اپنی نگہداشت میں سب کام کرائے گا اور کھیتی باڑی کا کام کتنا دلچسپ ہے۔ شہر سے اپنے مطلب کی کتابیں بھی لے آئے گا۔ خدا کا شکر ہے اس کا باپ بیٹے کے معاملات میں زیادہ دخل دینے کا عادی نہیں ہے۔ وہ یقیناً بیٹے کی آرزو کو دوسرے لوگوں کی طرح ایک واہمہ خیال نہیں کرے گا۔ اور —— یکایک اسے معلوم ہوا کہ بیتابی کے عالم میں نہر سے کافی دُور نکل آیا ہے۔ اب اس کے سامنے گاؤں کے مشہور مالدار زمیندار خدا بخش کا مکان نظر آرہا تھا۔ جس کے یہاں وہ مہمان کی حیثیت سے کئی بار رہ چکا تھا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے مکان کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے لحیم وشحیم آدمی سے کہا "ذرا زمیندار کو باہر بھیج دیجیئے۔ کہیئے شہر سے انور آیا ہے۔" موٹا آدمی رام رام کہتا ہوا اس سے کچھ دُور ہٹ گیا۔ اور اپنے مُنہ سے داتن نکال کر بولا —— "وہ یہاں نہیں ہے۔ ٹھٹھاں شیخاں میں ہوگا۔" اور جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا مکان کے پیچھے غایب ہوگیا۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ ٹھٹھاں شیخاں کی طرف قدم اُٹھانے لگا۔

ایک لڑکا اسے ایک کچے مکان کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک عورت باہر آئی۔ اُس کے مُنہ سے ابھی خدا بخش کا نام ہی پوری طرح نہیں نکلا تھا کہ وہ عورت دروازے کے اندر اشارہ کرکے چلی گئی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ دالان میں ایک ہڈیاں نکلا انسانی جسم زمین پر لوٹ رہا تھا اُس کا سر پھٹ چکا تھا۔ اور اُس میں سے سیاہ خون نکل رہا تھا۔ اچانک ایک مانوس آواز اس کے کانوں میں آئی —— "یہ خدا بخش ہے بابوجی!" یہ الفاظ کہنے والا خدا بخش کا بڑا بھائی احمد تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "پچھلے سال طغیانی آئی —— تمام فصلیں تباہ ہوگئیں —— بھوکے مر رہے ہیں ہم لوگ۔"

انور نے خاک پر لوٹتے ہوئے آدمی کے قریب جا کر دیکھا۔ سخت بدبو سے اس کا سانس رُکنے لگا۔ خدا بخش کے زرد چہرے کے قریب ٹوٹی ہوئی بوتل کے چند ٹکڑے بکھرے پڑے تھے —— وہ جلدی سے ہٹ گیا۔

احمد کہنے لگا —— "بھابی صدمے سے مرگئی —— اب مریم ہی بچوں کو سنبھالتی ہے۔"

اب انور نے دیکھا۔ کچھ دُور ایک نحیف و نزار بڑھیا ہاتھ میں سوکھی روٹی لیئے دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ اور چار چھوٹے چھوٹے بچے جن کے بڑھے ہوئے پیٹ زمین سے جا لگے تھے اور ٹانگیں غلاظت سے لت پت، روٹی کی طرف ہاتھ بڑھائے بُری طرح چیخ رہے تھے۔ بچوں کو دیکھتے دیکھتے اس کی نظر اس کیچڑ بھرے پانی پر پڑی جو بہ بھاگتے ہوئے چند کیڑوں مکوڑوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے دیکھا کہ کیچڑ میں سے کچھ جاندار چیزیں باہر نکلنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

میرزا ادیب

کہانی

ہماری ہے دُنیا میں اتنی کہانی — فقط دل کی خاطر لٹادی جوانی
مزہ آرہا ہے نہ ہے زندگانی — تڑپتی ہے ہر گام اپنی جوانی
عجب شے ہے یہ ماجرائے جوانی — کہو تو حقیقت سنو تو کہانی
غمِ دُوریٔ دوست کچھ بھی نہیں ہے — الٰہی عطا کر غمِ جاودانی
جو ہم نے بتایا — تو دل کچھ نہ سمجھا
جو دل نے بتایا تو ہم نے نہ مانی

انجم جامعی

لُطفِ زبان

اِن رموزِ عشق تک پہنچے بڑی مشکل سے ہم
حُسن کے جلووں سے تُم ہو تُم سے دل ہے دل سے ہم

اس کو پوچھیں خضر سے یا بیخودیٔ دل سے ہم
رہ گئے پیچھے کہ آگے بڑھ گئے منزل سے ہم

ساتھ اس کا دے سکیں گے عشق میں مشکل سے ہم
دل اُٹھائے ہاتھ ہم سے ہاتھ کھینچیں دل سے ہم

اُس میں شوخی کس قدر اس میں ہے کتنا اضطراب
باخبر اپنی نظر سے تم ہو اپنے دل سے ہم

اور بھی اے بحرِ غم اکبار مڑ کر دیکھ لیں
اب دوبارہ کیا ملیں گے چھوٹ کر ساحل سے ہم

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اگر سچ ہے یہ بات
اُن کے دل کا راز کیوں پوچھیں نہ اپنے دل سے ہم

دشت پیمائی نے بخشا جوشِ وحشت میں عروج
گرد بن کر کیوں نہ لپٹیں پردۂ محمل سے ہم

چاہیے دُنیا ہی میں دُنیا کی باتوں کا عوض
آپ بھی ملئے اُسی دل سے ملیں جس دل سے ہم

صُبح کا تارا بتائے گا شبِ غم کا مآل
اپنی مشکل کر سکے آساں بڑی مشکل سے ہم

شک اگر کچھ اس میں ہو تو کر کے ٹکڑے دیکھیے
ایک دل کیا چاہتے ہیں آپ کو سو دل سے ہم

کیا کہیں شوقِ شہادت میں جو گذری جان پر
اب گلے ملتے ہیں چل کر خنجرِ قاتل سے ہم

جب گزارش کی ملا دو تم نہ اس کو خاک میں
اُس نے سمجھایا یہ کہہ کر کھیلتے ہیں دل سے ہم

اس طرح طوفانِ بحرِ عشق میں ہیں بے نیاز
پیشتر ہی ہاتھ گویا دھو چکے ساحل سے ہم

اپنے اپنے وقت پر برگشتہ دونوں ہو گئے
اوّل اوّل ہم سے دل اور آخر آخر دل سے ہم

جادۂ عشق و وفا میں شغل اچھا مل گیا
دل کو بہلاتے ہیں فکرِ دُوریٔ منزل سے ہم

پوچھنے کا حکم ملتا تو کسی دن پوچھتے
آپ کے دل کی حقیقت آپ ہی کے دل سے ہم

برق دل پر گر پڑے یا چرخ سر پہ پھٹ پڑے
بے اُٹھائے تیرے اُٹھنے کے نہیں محفل سے ہم

اور ایسا کون مونس، کون ہے ایسا رفیق
اپنے دل سے دُور کر دیں درد کو کس دل سے ہم

جا رہے ہیں سُرخ روئی کا تماشا دیکھنے
خون میں اپنے نہا کر کوچۂ قاتل سے ہم

شعلہ و برق و شرر کی جستجو ہے اس لئے
سب کو دیکھیں گے ملا کر اضطرابِ دل سے ہم

ہو گئے ٹھنڈے جفا و جور کے جلتے چراغ
کھینچ کر اک آہ یوں اُٹھے تری محفل سے ہم

چار دن کی زندگی میں ہاتھ اُٹھائیں کس طرح
شوق سے ہم ذوق سے ہم عشق سے ہم دل سے ہم

اُس جگہ اک یادگارِ عشق بننی چاہیے
بیخودئ شوق میں گذرے ہیں جس منزل سے ہم

عشق میں دونوں ہیں، ٹوٹیں گے ایک ساتھ
اضطرابِ دل ہے ہم سے اضطرابِ دل سے ہم

بزمِ قاتل میں تمنائے شہادت لے گئی
بے دھڑک پہنچے تڑپتے لوٹتے بسمل سے ہم

وہ نگاہِ شوخ سرگرمِ جفا ہوتی نہیں
جب یہ صورت ہے تو باز آئے سکونِ دل سے ہم

کیا خبر راہِ وفا میں آئیں کیا کیا آفتیں
دوسری منزل کو جا پہنچیں پہلی ہی منزل سے ہم

تو بھی دل والا ہے کیا دل کو نہ ہو گی قدرِ دل
اپنے دل کا فیصلہ چاہیں گے تیرے دل سے ہم

جامۂ ہستی کسی دن چاک کر کے دیکھ لیں
کھا چکے دھوکا بہت اس پردۂ محمل سے ہم

ضبطِ اُلفت کے نتیجے تک پہنچ ہی جائیں گے
چُپکے چُپکے کچھ نہ کچھ کہہ سُن کر اپنے دل سے ہم

رہ گیا دُنیا میں دُنیا کا تماشہ دیکھنا
کس گھڑی جاتے ہیں اُٹھ کر اس بھری محفل سے ہم

امتحاں گاہِ وفا میں یہ طریقہ چاہیے
صورتِ قاتل کو دیکھیں دیدۂ بسمل سے ہم

ہجر و بیباک آج ہوتے نوح تو وہ جانتے
شوق سے کس شوق سے دل سے ملے کس دل سے ہم

نوح ناروی

تاریخی

اکبر اعظم کے آخری ایام

مغربی مورخین کو ہندوستان کے سلاطین سے خدا واسطے کا بیر ہے وہ ان کے محامد و محاسن کو بھی اس گھناونے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ صاف مزاجوں کو ان سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کسی صحیح واقعہ کو اس کی اپنی شکل میں پیش کیا ہو۔ میں اپنے پہلے مضامین میں اس قسم کی ہزاروں مثالیں دے چکا ہوں۔ آج ناظرین کی توجہ اکبر اعظم کی موت کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ جہانگیر اعظم نے اپنی دونوں "توزکوں" میں والد کی وفات کے حال کو نہایت شرح و بسط سے لکھا ہے اور تمام مشرقی مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ شہنشاہ جلال الدین اکبر طبعی موت مرے تھے۔ مگر مغربی مورخین کو دیکھئے کہ اپنے مستند اور واضح واقعہ کو بھی تشکیک و شبہات کی عینک سے دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ بعض نے تو یہاں تک علی الاعلان لکھ دیا ہے کہ اکبر زہر سے فوت ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو پادری کے ٹرڈیلون:-

"اکبر زہر کی **گولیاں** کھانے سے مرا"

اسی طرح شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ "اکبر نے راجہ مان سنگھ کو زہر کی گولی سے مارنا چاہا مگر اس کی موت نہ آئی تھی۔ اس کے خاصہ دان کے ایک خانہ میں پان رہتا تھا۔ دوسرے میں چورن کی گولیاں تیسرے میں زہر کی گولیاں۔ پس جس امیر کو وہ مارنا چاہتا تھا۔ پان میں زہر کی گولی ڈال کر دے دیتا تھا۔ اس طرح اس نے بہت سے امیروں کو مار ڈالا یہ زہر کی گولیاں اس قسم کی تھیں۔ جیسا کہ آج کل ان کی دھوم ہے کہ ہومیوپیتھک کے مریضوں کو ڈاکٹر دے دیتے ہیں۔"

اس کے بعد یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں کہ "یہ صحیح ہے کہ اکبر زہر کی گولیوں سے مرا۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اکبر نے یہ گولی اتفاق سے کھائی یا ارادۃً کسی نے اس کو زہر کی گولی کھلائی۔ توزک کی تحریر سے بڑا شبہ اس امر میں ہوتا ہے۔ حکیم علی جو اکبر کا معالج تھا اس پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے اکبر کے علاج میں بڑی غلطی کی۔ جہانگیر نے اس کو سزا دی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکیم علی نے اکبر کو زہر کی گولی جہانگیر کے ایما سے دی۔"

اب ویلر صاحب کے ارشادات ملاحظہ ہوں جو سب سے زیادہ افسوسناک ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "جس بیماری سے اکبر مرا اُس کا بیان کچھ کھل نہیں سکتا۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں باپ کے مرنے کا جو حال لکھا ہے وہ مشتبہ ہے صاف صاف نہیں۔ اس کی تحریر کہے دیتی ہے کہ اکبر کے مرنے میں کوئی ایسی بات تھی جس کو وہ چھپانا چاہتا تھا۔"

اب میں قارئین عالمگیر کے سامنے جہانگیری توزکوں کے وہ حصص پیش کرتا ہوں جو اکبر کی موت سے متعلق ہیں۔ اور بعض مقامات پر "کارنامہ جہانگیری" کے اقتباسات ہیں جو جہانگیرنامہ۔ تاریخ مسلم شاہی اور اقبال نامہ جہانگیری کے اساس پر مرتب کیا گیا ہے۔ جہانگیری عبارت محتاج تعارف نہیں۔ اس کا انداز بیان اور طرز تخاطب خود بخود اپنا پتہ دے دیتا ہے۔ اس مضمون سے جو محض تالیف کا درجہ رکھتا ہے آپ پر واضح ہو جائے گا۔ کہ مغربی مورخین کا یہ قیاس کس قدر بودا اور بعید از حقیقت ہے۔ اور ساتھ ہی آپ یہ دیکھ کر قلبی فرحت محسوس کریں گے کہ اکبر مسلمان پیدا ہوا۔ مسلمان رہا اور مسلمان ہو کر فوت ہوا جو لوگ اُسے بداعتقاد، بے دین اور مرتد سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اکبر کی صرف اس زندگی کا مطالعہ کیا ہے جو ابوالفضل کے ساتھ بسر ہوئی۔ جہانگیر نے ۱۶۰۲ء میں بغاوت کیوں کی اور نرسنگھ سے ابوالفضل کا خاتمہ کیوں کرایا گیا۔ یہ بھی محتاج بیان نہیں رہتا۔

(توزک جہانگیری) "بروز دوشنبہ ۴ جمادی الاول ۱۰۱۴ھ مطابق ۱۶ دسمبر ۱۶۰۵ء کو میرا باپ عین شدت مرض میں اپنے عزیز کی خاطرداری سے غذا اور میوے نوش جان کرتا تھا۔ اور بہ سبب کے یہ غذا اور میوے اُسے ہضم نہ ہوتے تھے۔ اسی حالت میں بادشا امین الدولہ پر ناراض ہوا کیونکہ وہ جُوا کھیلتا تھا اسے لعنت ملامت کی کہ تو اس عمر میں جُوا کھیلتا ہے۔ اس غیظ و غضب کی وجہ سے بم پر امراض نے غلبہ کیا۔ بدہضمی بھی ہوئی۔ دن بھر ایک کھیل کا دانہ میں نہ گیا۔ منگل کو یہ حال رہا۔ بدھ کے روز بادشاہ کو شوربہ کھانے مشورہ دیا گیا۔ پھر ایک دن بادشاہ حکیم علی سے کچھ ناراض ہوا۔ جواب دیا کہ میں نے علاج اچھا سوچا ہے بشرطیکہ وہ مزاج کے مو حضور خود اپنی غمخواری اور پرہیز نہیں فرماتے۔ محل کے اہل حر

ماش کی کھچڑی خوب گھی میں بھُون کر حضور کے روبرو رکھی اور حضور نے اسے نوش جان فرمایا۔ معدہ ضعیف تھا اس نے ہضم نہ کیا۔ اسہال ہوا حکیم مظفر نے کہا۔ کہ حکیم علی نے بڑی غلطی کی کہ اول بیماری میں بادشاہ کو تربوز کھلا دیا۔ میں نے نیک اندیشی سے یہ سوچا کہ خواہ حکیم مظفر نے یہ بات سچ کہی ہو خواہ خود غرضی سے کہی ہو میں حکیم علی کو غرض آمیزی کے گمان سے پامال غضب نہیں کرونگا۔ اگر قضائے الٰہی اور حکیموں کی غلطیاں درمیان میں نہ ہوتیں تو کاہے کو کوئی مرتا۔ اگرچہ میں نے حکیم علی پر اس قدر مہربانی کی مگر تہ دل سے میرا اعتقاد حکیم علی سے برگشتہ ہو گیا ان دنوں میں دو تین گھڑی دن رہے ہر روز باپ کی عیادت کو جاتا بادشاہ کا ضعف روز بروز بڑھ رہا تھا۔ بروز سہ شنبہ ۵ جمادی الآخر کو دوا کھلانے کی تقریب سے باپ کے حضور میں صبح کو گیا۔ ایک بار صحت مزاج کے زمانہ میں والد بزرگوار نے مجھے یہ نصیحت کی تھی کہ "بابا اس جگہ نہ آیا کرو۔ اور اگر آیا کرو تو اپنے سپاہی اور آدمی اپنے ساتھ لایا کرو۔ میں نے اسی وقت سے باپ کے اس حکم کی تعمیل کرنا چاہی۔ آنے جانے میں احتیاط شروع کی۔ ایک دن قلعہ میں اپنی جمعیت کے ساتھ آیا۔ دوسرے دن بادشاہ سے پوچھے بغیر جماعت نے قلعہ کے دروازوں کو محکم بستہ کیا اور قلعہ کے برجوں پر توپیں چڑھا دیں۔ بروز پنجشنبہ ۷۔ جمادی الآخر کو میں نے اس جماعت کے نفاق سے خائف ہو کر قلعہ میں جانا ترک کیا۔"

(کارنامہ جہانگیری) "بادشاہ کی بیماری کے دوران میں سلطنت کے جملہ امور خان اعظم کے ہاتھ میں آئے۔ جب اس نے دیکھا کہ بادشاہ کی شمع حیات بجھنے کو ہے تو اس نے رائے مان سنگھ سے جو بڑا صاحب اقتدار تھا مشورہ کیا کہ سلطان خسرو (فرزند جہانگیر بادشاہ) کو شہنشاہ بنائے۔ ان دو امیروں کے برابر کوئی صاحب اقتدار نہ تھا۔ ان میں سے خسرو راجہ مان سنگھ کا بھانجا اور خان اعظم کا داماد تھا۔ انھوں نے سلیم کی گرفتاری کا ارادہ کیا کہ جب وہ اپنے روزانہ دستور کے مطابق کورنش کے لئے دولت خانہ میں آئے تو اسے گرفتار کر لیں۔ مگر یہ نہ سمجھے کہ کہیں آفتاب پر خاک پڑ سکتی ہے اور تقدیر کی تحریر کو دغابازی کی گزلک محو کر سکتی ہے؟ دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست!

دوسرے روز سلیم کشتی میں بیٹھ کر حسب دستور بادشاہ کی کورنش کے لئے گیا۔ جب کشتی قلعہ کے نیچے آئی تو میر ضیاء الملک قزوینی سراسیمہ و پریشان شہزادے کے پاس کشتی میں کود کر آیا۔ اس نے بادشاہ کے قریب مرگ ہونے اور سازش مذکور کی خبر سنائی! تو شہزادہ سلیم نے اپنی کشتی الٹی پھرائی اور اپنے گھر میں آ کر غمزدہ ہو بیٹھا۔"

(توزک جہانگیری) رائے مان سنگھ نے اپنی تجویزہ و صلاح سے قطب خان کو مطلع کیا۔ کہ وہ اس کے ساتھ شریک ہو۔ اس نے اپنی عرضداشت کے ساتھ اس سازش کے کاغذ کو میرے پاس بھیج دیا۔ جتنے دن میں قلعہ میں نہیں گیا۔ باپ کے دیکھنے کی محرومی سے میرا دل جلتا تھا۔ مگر میں آدمیوں پر درد دل ظاہر نہ کرتا تھا۔ دل کو خدا سے لگا کے دم نہ مارتا تھا۔

کار خود را بخدا باز گذاری حافظ
اے بسا عیش کہ با لطف خداداد کنی

عقلائے کارواں مثل میراں صدر جہاں و میر ضیاء الدین قزوینی و خواجہ اویس ہمدانی کو اپنے درد اور آزار پر مطلع کرتا انھوں نے شاہ ایران کا ایک واقعہ جو اسی قبیل کا تھا میری تسلی و تشفی کے لئے سنایا جب میں نے دولت خواہوں اور مخلصوں کے مشورے سے قلعہ کا جانا بالکل چھوڑ دیا تو اپنے بیٹے پرویز کو باپ کی خدمت میں بھیجا اور یہ عذر کیا کہ میرے سر میں درد تھا اس لئے حاضر نہ ہو سکا۔ والد بزرگوار نے جب یہ سنا۔ تو اپنے ہاتھ اٹھا کر خدا سے میری صحت کی دعا مانگی خواجہ اویس کو میرے پاس بھیجا اور کہلا بھیجا کہ "اگر ہو سکے تو تم حاضر ہو۔ عمر پر کچھ اعتبار نہیں ہے۔ اس مرض اور شدت میں مجھ سے دوری کہاں مناسب ہے؟ میرے بعد تو میرا ولیعہد ہوگا۔" جب منافقوں نے یہ حال دیکھا تو مسلمانوں نے قرآن شریف پر اور ہندوؤں نے نمک پر قسم کھائی کہ ہم سب کی بات ایک رہے۔ شیخ فرید بخاری نے کہا کہ اپنے کام کی درستی کی فکر کرو۔"

(کارنامہ جہانگیری) "خان اعظم اور راجہ مان سنگھ نے دوسرے امیروں سے مشورہ کیا کہ شہزادہ اعظم سلطان سلیم کے خصائل سب کو معلوم ہیں اور شہنشاہ جو اس کی نسبت اچھی رائے رکھتا ہے وہ بھی سب جانتے ہیں کہ اسے منظور نہیں ہے۔ وہ اس کا جانشین ہو۔" جب یہ بات کہی گئی تو سمند خاں نے چلا کر کہا۔ کیا بکتے ہو۔ شہزادہ سلیم کے ہوتے اس کے بیٹے کا تخت پر بٹھانا ہمارے چغتائی تاتاریوں کی رسم و آئین کے خلاف ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ خان ایک امیر کبیر تھا۔ اور خاندان شاہی سے دور کا رشتہ رکھتا تھا۔ یہ کہہ کر مجلس سے اٹھ کر چلا گیا۔"

(توزک جہانگیری) مرزا کوکہ خان اعظم جس نے مسلمانوں اور ہندوؤں سے عہد لیا تھا۔ خسرو کو پیغام بھیجا کہ بادشاہی حضور کو مبارک ہو مگر مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں باپ بیٹے مل کر ایک زبان ہو کر دونوں طرف ہم کو خوار و رسوا نہ کریں۔ ان بیہودہ باتوں

کے جواب میں خسرو نے کہا کہ جب تم نے میرے لئے بادشاہی مقرر کی ہے تو پھر اُن شبہات کے ذکر سے کیا فائدہ؟ راجہ اور خسرو دونوں کی خاطر جمع ہوئی۔ خسرو نے راجہ مان سنگھ سے کہا کہ بادشاہ میں کچھ جان باقی نہیں ہے۔ اسے سکھپال میں حرکت کی تاب نہیں ہے۔ اگر بادشاہ سکھپال میں مر گیا تو ہم سب کی بڑی بدنامی ہوگی۔ پس بادشاہ کا قلعہ سے باہر چلنا مصلحت کے خلاف ہے۔ یہ نصیحت راجہ مان سنگھ کو بھی نیک معلوم ہوئی۔ جب بادشاہ کچھ ہوشیار ہوا تو اس سے پوچھا کہ شہزادہ سلیم کے پاس ایک عالم جمع ہے۔ اس نے قلعہ آگرہ کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اگر بادشاہ کا حکم ہو تو دریائے جمنا کے اس پار تشریف فرما ہوں اور جب صحت ہو تو دریا سے اس طرف پھر چلے آئیں۔ بادشاہ نے فرمایا یہ حال کس لئے ہُوا کیا شہزادہ سلیم کے لئے قلعہ کا دروازہ بند کر دیا ہے کہ اس نے لشکر کشی کر کے محاصرہ کیا ہے؟ چیں بجبیں ہو کر خدمت گاروں کے ہاتھوں سے دوسری طرف کروٹ لی۔ مرزا عزیز کوکہ نے جس کی سرشت نفاق پر بنی تھی اس طرف گیا جس طرف بادشاہ مُنہ کئے لیٹا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ خسرو کے باب میں کیا حکم ہے تو بادشاہ نے فرمایا کہ:-

"حکم تو خدا کا حکم ہے اور ملک خدا کا ملک ہے۔ مجھے ہر سانس کے ساتھ ہزار آس ہے۔ مگر تم نے مجھے مُردہ سمجھ لیا ہے جو ایسی باتیں کرتے ہو۔ شاید میں دنیا میں جیتا رہوں اور اگر میرا وقت رحلت آ پہنچا ہے تو میں نے الہ آباد میں جہانگیر کی لشکر نوازی، رعیت پروری اور اخلاص کی باتیں دیکھی ہیں جو سلطنت اور بادشاہی کے لئے درکار ہے۔ اُس کی مہر و محبت میرے دل سے باہر نہیں ہوئی ہے۔ گو اس نے وسوسہ شیطانی سے میرے ساتھ کچھ دن سرگردانی کی۔ وہ میرا بڑا بیٹا اور ولیعہد ہے اور ہمارے تورہ (آئین) میں جب تک بڑا بیٹا ہو کسی اور کو بادشاہی نہیں پہنچتی۔ میں نے خسرو کو بنگالہ کی بادشاہی چھ مہینے کے لئے عنایت کی۔"

(کارنامہ جہانگیری) شہزادہ سلیم جب میر ضیا کے کہنے سے اپنے گھر آیا تھا تو احمق جمع ہو کر کہہ رہے تھے کہ حضور ایسے غافل بیٹھے ہیں آپ کے دشمنوں نے اپنا کام کر لیا۔ اور خسرو کو تخت پر بٹھا دیا اور انھوں نے قلعہ پر توپیں حضور کا محل اُڑانے کے لئے لگا دیں۔ شہزادہ سلیم ان احمقوں کے کہنے سے قریب تھا کہ اپنی کشتی میں سوار ہو اور بھاگ کر جان بچائے کہ شیخ رکن الدین آیا جو شہزادہ کے ملازموں میں سب سے زیادہ بہادر اور نیک تھا۔ اور بہت سی سپاہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس نے شہزادہ کو سمجھایا کہ آپ مستقل رہئے اور دیکھئے کہ دو گھنٹے میں کیا ہوتا ہے۔ شہزادہ اپنے اس بہادر کے نصائح سُن ہی رہا تھا کہ مرزا شریف آن پہنچا اُس نے کہا دشمنوں کی جماعت شکستہ ہو گئی ہے۔ اور مرتضیٰ خاں حضرت کے پاس آنے کو ہے۔ یہ سُن کر شہزادہ بہت مسرور ہوا اور اپنے آدمیوں کی ہمت بندھوانے لگا کہ دلاور بیگ آیا۔ پھر میر مرتضیٰ بارہہ کے سادات کرام کے ساتھ داخل ہوا اور کورنش کر کے اس نے شادیانہ کے نقارے بجانے کا حکم دیا۔ مگر شہزادہ نے منع کر دیا کہ شہنشاہ سخت علیل ہے۔ باجہ بجانا مناسب نہیں۔ اب آدمیوں کا اجتماع شہزادہ کے پاس ہونا شروع ہوا۔ خان اعظم بھی شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے آئے۔ اور مجرا بجا لائے۔ شہزادہ نے اس پر خسروانہ عنایت فرمائی اور اس کی اس حرکت کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ جب راجہ مان سنگھ نے دیکھا کہ پانسہ پلٹ گیا ہے۔ اور مقربات کی اور ہی صورت ہو گئی ہے تو وہ سلطان خسرو کو اپنے گھر لے گیا۔"

(توزک جہانگیری) میرے پاس میراں صدر جہاں و میر جمال الدین حسین و عبدی خواجہ نے واجب العرض بھیجی جس کا مضمون یہ تھا کہ بادشاہ خسرو سے ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ تو اپنے باپ کو شاہ بھائی کہا کر۔ بھائی کے معنی ہندی زبان میں برادر کے ہیں پس التماس یہ ہے کہ حضور اس کے ساتھ برادرانہ سلوک فرمائیں۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ بادشاہ مجھے ہمیشہ بابا کہتا تھا۔ تو چاہئے تھا کہ میں اس وقت تمہارا بادشاہ ہوتا۔ پسر ہرگز برادر و پدر نہیں ہو سکتا۔ امرا اس جواب کو سن کر شرمندہ اور اپنے کئے پر پشیمان ہوئے۔ سب میری بندگی اور اطاعت پر دل نہاد اور اپنے عجز کے معترف ہو گئے۔ سوا مرزا کوکہ کے سب نے عرضداشت لکھی جس میں سب نے گوشہ نشینی و خلوت گزینی کی التماس کی۔ میں نے کہا کہ میں نے تمہارے سابقہ حقوق کے پیش نظر تمہاری چھوٹی بڑی تقصیریں معاف کیں۔ اور ایسی معاف کیں کہ جس پر بے تقصیر آدمیوں کو حسرت ہے۔ کہ کاش ہم بھی تقصیر کرتے تو بادشاہ ہم پر ایسی عنایت کرتا جو قصور واروں پر کی ہے۔ میں نے اپنا گوشۂ خاطر جو عنایت و لطف کا مخزن ہے تم کو مرحمت کیا۔ تم کو اس گوشے سے بہتر اور کون گوشہ ملے گا۔ باوجود اس عنایت اور لطف بے اندازہ کے اگر اختلا ترک کرنے اور گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مصر ہو تو میں تمہار التماس قبول کرتا ہوں۔"

بروز شنبہ ۹ جمادی الآخر کو شیخ فرید بخاری نے آن ملازمت اختیار کی۔ ملازمت میں پیش دستی کرنے کے سبب سے ا صاحب السیف والقلم کا خطاب عنایت کیا اور شمشیر مرصع و خنجر اور اسپ با زین مرصع اور ایک لاکھ روپیہ عنایت کیا۔ دوسر

ان راجہ مان سنگھ ملازمت کے لئے آیا۔ اس پر بھی میں نے بہت عنایت کی اس کے بعد میرے پاس راجہ مان سنگھ کے ساتھ خسرو اور مرزا کوکہ آئے مرزا کوکہ نے عرض کیا کہ کل ملک بنگالہ کی حکومت خسرو کو مرحمت ہوئی اور اس کے ساتھ پایندہ خاں مغل کو بھیجا جائے گا۔ اگرچہ یہ صلاح وقت نہ تھی۔ میرے اوائل سلطنت میں خسرو مجھ سے علیحدہ کیا جائے اور میرے معتقدین کی بھی صلاح یہی تھی۔ مگر میں نے ان کی التماس کو قبول کیا۔ اور حکم دیا کہ ابھی کشتی میں سوار ہو کر دریا پار چلے جاؤ۔ بعد واقعہ پدر میں تم کو خود خدمت کرونگا۔

بادشاہ نے اپنا خلعت خاصہ اور دستار مبارک جو سر پر پہنے ہوئے تھے میرے لئے بھیجی اور پیغام دیا کہ "اگرچہ تجھ کو ہمارے نہ دیکھنے کی تاب ہے، لیکن ہم کو بغیر تیرے ایک لحظ قرار و آرام نہیں ہے۔"

جب بادشاہ کا خلعت و پیغام میرے پاس آیا۔ میں نے ادب کے ساتھ خلعت پہنا اور قلعے کے اندر گیا اور باپ کے حکم کی اطاعت کی۔ بروز منگل ۱۲ جمادی الاول کو میرے باپ اور مرشد کا نفس تنگ ہوا اور وقت رحلت نزدیک آگیا۔ اس نے فرمایا کہ بابا کسی آدمی کو بھیجکر میرے کل امرا اور مقربوں کو بلا تاکہ میں تجھ کو ان کے سپرد کروں اور ان سے اپنا کہا سنا معاف کراؤں۔ انھوں نے برسوں میری ہمرکابی میں جانفشانی کی ہے۔ میں نے خواجہ اویس ہمدانی کو بھیجا۔ اس نے سب امرا کو حاضر کیا اگر ہر ایک کا نام لکھا جائے تو طوالت ہوگی۔ اول بادشاہ نے سب کی طرف منہ کر کے ان سے اپنا کہا سنا معاف کرایا اور یہ اشعار پڑھے جن کا مصرعہ اول یہ ہے۔ع امن و آسائش دوران مرا یاد آرید

(چونکہ اشعار صحیح چھپے ہوئے نہیں ہیں لہذا مفہوم درج کیا جاتا ہے)
میرے دربار کی شان و شوکت اور احکام کی سطوت کو یاد کرو۔ میرے توبہ کرنے و تسبیح پڑھنے کے شاہد رہنا در غلاف کعبہ بنوانے کو یاد رکھو۔ میری خاک پر اپنی محبت کے سبب سے سرخ آنسو گراؤ اور اپنی صبح کی عبادت میں میری روح کو یاد کرو۔

برشما باد کہ چوں باد خزانی گذرد
بر چمن دست زر افشان مرا یاد آرید
آں کہ سینہ کہ درد عالمے می گنجید
یا نیم نفس برآورد تنگی کرد

میں نے کہا کہ بادشاہ کا آخر دم ہے۔ وہ بڑا سعادتمند ہے جو اس وقت میرے باپ کی خدمت کرے۔ میں گریاں و بریاں بادشاہ کی خدمت پر متوجہ ہوا اور زار زار رونا شروع کیا۔ باپ کے مبارک قدموں پر سر رکھ دیا اور تین دفعہ اس کے گرد صدقہ ہوا۔

شگون کے واسطے باپ نے اپنی شمشیر خاصہ کی طرف جس کا نام "فتح الملک" تھا اشارہ کیا کہ اسے اٹھا کر میرے سامنے تو کمر میں باندھ، میں نے فوراً اسے باندھ کر سجدہ کیا۔ تسلیم و بندگی اور آداب بجا لایا۔ قریب تھا کہ رونے سے میرا دم گھٹ جائے۔ چارشنبہ ایک پہر سات گھڑی رات گئے باپ کی روح نے پرواز کی۔ مرتے وقت باپ نے فرمایا کہ میران صدر جہاں کو بلا کہ وہ کلمہ شہادت پڑھے۔ جس کے پڑھوانے میں میں نے اس لئے تامل کیا تھا کہ مجھے امید تھی حیات بخش لم یزلی مجھے حیات تازہ عنایت فرمائے گا۔ میران صدر جہاں آیا اور دو زانو مودب ہو کر کلمہ شہادت پڑھنا شروع کیا۔ باپ نے مجھے بلا کر گردن میں ہاتھ ڈالا اور کہا کہ بابا اب میرے وداع کا آخری وقت ہے۔ پھر میں تجھے نہیں دیکھ سکونگا ہرگز ہرگز میرے پردگیان حرم سے نظر لطف نہ اٹھانا اور جو روزینے مقرر ہیں وہ باقاعدہ ادا کرتے رہنا۔

نوکران من و اتباع مرا بعد از من
خستہ و زار و دل افگار فراموش مکن
در نگہداشتن یکیک آنچہ گفتم
ہمہ را گوش بمن دار فراموش مکن

ان بیتوں کے پڑھنے کے بعد میران صدر کی جانب توجہ فرمائی۔ اور اشارہ کیا کلمہ شہادت پڑھ۔ پھر اپنی زبان سے کلمہ شہادت باآواز بلند پڑھا اور میران صدر کو فرمایا کہ تو میرے سرہانے بیٹھ کر سورہ یٰسین و دعائے عدیلہ پڑھ تاکہ میری جان آسانی سے نکلے۔ جب میران صدر نے سورہ یٰسین پڑھ کر دعائے عدیلہ کو ختم کیا تو بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور جان آفریں کو جان سپرد کی۔

تجہیز و تکفین ۔ جسم مبارک کو آب گلاب سے دھویا۔ اور مشک و کافور سے معطر کیا۔ اس کی نعش کے ایک پایہ کو میں نے اور تین پایوں کو میرے تین بیٹوں نے کندھے پر اٹھایا۔ اور جب قلعہ کے دروازے پر پہنچے تو یہاں سے میرے فرزندوں، مقربوں اور مخلصوں نے دوش بدوش سکندرہ تک پہنچایا۔ وہاں زمین میں دفن کیا۔

تا جہاں بود چنیں بود و چنیں خواہد بود
ہمہ را عاقبت کار ہمیں خواہد بود

تعمیر مقبرہ ۔ جہانگیر پیادہ پا اپنے باپ کی قبر کی زیارت کو گیا۔ لکھتا ہے ۔ "اگر ہو سکتا تو میں پلکوں اور سر کے بل زیارت کو جاتا۔ میرے باپ نے میری ولادت کے لئے فتحپور سے اجمیر تک پیدل ...

کوس ہے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار کی زیارت کے لئے پیادہ پا سفر کیا اگر میں بسرو چشم اس راہ کو طے کروں تو کیا بات ہے۔ الغرض میں اس کی زیارت سے مشرف ہوا مقبرہ کی عمارت جو تیار ہوئی تھی وہ میرے نزدیک خاطر خواہ نہ تھی۔ مجھے اس عمارت کا ایسا بنوانا منظور نہ تھا کہ جہان کی سیر کرنے والے اس کے برابر دنیا میں کسی اور عمارت کا نشان دے سکیں۔ جب اس کی تعمیر ہو رہی تھی تو کمبخت خسرو کے سبب سے مجھے لاہور جانا پڑا بد سلیقہ معماروں نے اُسے اپنے طور پر بنا دیا۔ آخر الامر اس میں بعض تصرفات کئے گئے سا در سار ار روپیہ خرچ ہو گیا۔ تین چار سال اس کی تعمیر میں صرف ہو گئے۔ میں نے حکم دیا کہ دوبارہ ماہر معمار صاحب توقف اتفاق کر کے بعض جگہوں کو اس نوع پر کہ قرار پائی تھی گرا دیں۔ رفتہ رفتہ ایک عالیشان عمارت منصۂ شہود پر جلوہ گر نظر آنے لگی۔ پھر مقبرہ کے اطراف میں نہایت وسیع اور دلفریب باغ لگوایا اور داخلی دروازہ بیحد بلند بنایا گیا۔ جس پر مرمریں منار تعمیر کیے گئے۔ مجملاً پندرہ لاکھ روپیہ اس عمارت پہ خرچ ہوا۔

(توزک جہانگیری)

نور احمد خاں فریدی

حاصلِ آرزو

سوچتے ہیں رات دن کیا چاہتے ہیں دل سے ہم
کوئی عالم ہو نظر آتے ہیں کچھ سائل سے ہم

روح گھبرائی ہوئی سی، دل سکوں ناآشنا
بیقرارانہ گزر جاتے ہیں ہر منزل سے ہم

ہر نفس موجوں میں جھولا جھولتی ہے زندگی
آنکھ کھولی ہے یہیں واقف نہیں ساحل سے ہم

ملتی ہے ہر خستگی پر اُن کے دامن کی ہوا
مضمحل ہوتے نہیں آوازۂ باطل سے ہم

چھیڑتی رہتی ہیں پیہم تُرشیوں پر تُرشیاں
آپ میں آتے تو ہیں لیکن بڑی مشکل سے ہم

دل سی نازک چیز اور دُنیا کی سنگیں سختیاں
آ گئے ہیں تنگ اپنے جوہرِ قابل سے ہم

دل اسیرِ آب و گِل، نظریں رہینِ آب و گِل
موڑ لیں مُنہ کس طرح دُنیائے آب و گِل سے ہم

آج پھر کچھ زیرِ لب فرما کے وہ شرما گئے
پا چکے تسکین اپنے جذبۂ بسمل سے ہم

حاصلِ ہر آرزو وہی خالقِ ہر آرزو
مطمئن ہوتے نہیں کوکبؔ کسی حاصل سے ہم

کوکب شاہجہانپوری

بہار

پھر بہار آئی ہوائے خوشگوار آنے لگی | پھر کوئی شے چپکے چپکے دل کو اکسانے لگی
پھر گلوں کے دل میں کچھ شعلے سے بھڑکانے لگی | پھر چمن کی ہر روش پر آگ دہکانے لگی
تاک کی بیلوں میں جب پہنچی تو بل کھانے لگی | تاک کی بیلوں سے جب نکلی تو لہرانے لگی
پھر ہواؤں کو ہری شاخوں میں اُلجھانے لگی | پھر چمن میں زلف کو سنبل کی سلجھانے لگی
پھر ہنسی بن کر لبوں پر پھول کے چھانے لگی | پھر خوشی بن کر کلی کے دل میں لہرانے لگی
پھر پھلوں میں روٹھ کر بیٹھی بہ اندازِ لطیف | پتیوں کے جھانج سے پھر دل کو بہلانے لگی
پھر نچھاور کی گلوں پر لعلِ رمانی کی چھوٹ | پھر زمرد کرکے حل سبزے پہ پھیلانے لگی
ڈگمگائی پھر چٹانوں کی بلندی دیکھ کر | پھر سنبھل کر آئینہ ندی کو دکھلانے لگی
چھپ گئی لے بن کے کوئل کے رسیلے راگ میں | آم کی کلیوں پہ خوشبو بن کے لہرانے لگی
پھر ہوئی جھنکار سی پیدا وہ دل کے تار میں | پھر وہ چرواہے کے نغموں کی صدا آنے لگی
چھپ کے نکلی پھر چمن سے گل بداماں شاد شاد | بستیوں پر پھر چمن کا عطر برسانے لگی
ذرہ ذرہ کو مسرت کی جھلک سے بھر دیا | ذرہ ذرہ میں مسرت کی جھلک پانے لگی
پھر چھڑے خاموش نغمے پھر رچی خاموش بزم | پھر ہر اک شے اس جہاں کی ناچنے گانے لگی
اُس طرف بوڑھوں کی باتوں کو بنایا جاندار | اِس طرف بچوں کو جست و خیز سکھلانے لگی
آگئیں پھر نوجوانوں کی اُمنگیں جوش پر | چال اُن کی اس زمیں کے دل کو دہلانے لگی
جب وہ خود آگاہ نکلے جھومتے مستانہ وار | ساری دُنیا اُن کے قدموں میں نظر آنے لگی
کر دیا مسرور یکساں خواجہ و مزدور کو | اک طلسمِ رنگ و بو سے وجد میں لانے لگی

جب لکھی افسر نے اس پر ایک البیلی سی نظم
خوش ہوئی اتنی کہ ہر مصرعہ پہ اترانے لگی

حامد اللہ افسر

افسانہ

صہبا

صہبا نے سرعت ڈھلکے ہوئے دوپٹے کو سنبھال کر جام کو نیم وا آنکھوں سے ۔۔۔۔ دفتر جانے کی تیاری میں مشغول تھا۔

"جام! نہ معلوم کیوں میری طبیعت صبح و شام کچھ بھاری سی ہو جاتی ہے۔" اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر بولی۔

"دشمنوں کی کہیں نظر نہ لگ جائے۔ کیسی تو تندرست ہو رہی ہو۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"لیجئے تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ آپ مجھے تندرست کہہ کہہ کر نظر [illegible]" صہبا نے منہ بنا کر کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں بھلا اپنی صہبا کے نظر لگاؤں گا۔ جام کی گردش تو صہبا ہی کے دم سے ہے۔" جام نے اسے گہری نظروں سے دیکھ کر کہا اور اس کا چہرہ فرط شرم سے گلابی ہو گیا۔ وہ بے ساختہ اپنا آنچل انگلیوں میں لپیٹنے لگی۔ جام کی انگلیاں شیروانی کے بٹنوں پر تھیں اور نگاہیں اس کے کیف آور چہرے کی بلائیں لے رہی تھیں۔

"تو اب جائیے نا دفتر ورنہ دیر ہو جائیگی۔" وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر بولی۔

"اچھا جاتا ہوں۔" اس نے محویت سے چونک کر کہا۔ اور سائیکل اٹھا کر باہر نکل گیا۔ جب تک وہ دکھائی دیا صہبا اسے کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر آ کر تھکن سے آرام کرسی پر لیٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے درد کرتے ہوئے سر کو دھیرے دھیرے دبانے لگی۔

صہبا قدرت کا حسین شاہکار کہے جانے کے لائق تھی جس کے لئے جام جیسا مردانہ حسن کا مالک برسوں چاک گریباں پھرا تھا۔ اور جب صہبا کے والدین نے اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اس نے اپنی جان عزیز دریا کی پرشور لہروں کے سپرد کر دی تھی لیکن یہ کہئے کہ زندگی تھی جو عین وقت پر بچا لیا گیا ورنہ وہ تو کب کا مر چکا ہوتا۔ زمین اپنا بدلہ لے چکی ہوتی۔ ایک بار کیا ہزار بار [illegible] اپنا سمجھ [illegible] حساب کر چکے ہوتے دنیا والوں نے اسے کب [illegible] لیکن [illegible] آ ہی گئی اور خالی جام صہبا سے بھر گیا۔

جام نے گھبرا کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ سوچنے لگی۔ مجھے کس قدر چاہتے ہیں وہ۔ ذرا سے بخار سے پریشان ہو گئے۔ دفتر سے آ کر کھانا بھی نہیں کھایا۔ اگر خدانخواستہ میں مر گئی تو ان کا کیا حال ہو گا۔ طبیعت تو کئی ماہ سے خراب رہتی ہے۔ خدا کرے [illegible] بخار اتر جائے تو —— قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔

"صہبا! ڈاکٹر صاحب آ گئے۔"

"اچھا مجھے چادر اڑھا دیجئے۔"

"اونہہ کہیں ڈاکٹر سے بھی پردہ ہوتا ہے۔" وہ یہ کہتا باہر نکل گیا۔ اور ڈاکٹر کو ساتھ لئے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر کی نگاہیں پلنگ کی طرف اٹھیں اور ایکلخت جھک گئیں۔ پیشانی پر چمکتے ہوئے پسینے کے قطرے [illegible] آنکھیں [illegible] ڈھلک آئے اور بڑھتے ہوئے قدم ایک لمحے کے لئے رک گئے لیکن فرض کی تلخ حقیقت نے اسے جلد ہی سنبھال دیا۔ وہ اسٹیتھو اسکوپ کانوں میں لگائے پلنگ کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نبض دیکھی۔ پھیپھڑے اور سینہ دیکھا۔ پھر نسخہ لکھ کر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"چائے پی لیجئے ڈاکٹر صاحب!" جام نے کہا۔ وہ ڈاکٹر سے ربط پیدا کرنا چاہتا تھا۔

"اوہ! تکلیف نہ کیجئے۔"

"بھلا تکلیف کا ہے کی۔" اس نے خادمہ کو چائے لانے کا اشارہ کیا۔ ملازمہ نے ایک چھوٹی سی میز پر چائے کا سامان سجا دیا۔ ڈاکٹر کی نظریں ایک دوبارہ [illegible] کی طرف اٹھیں اور جھک گئیں۔ اس کی پیشانی [illegible] چائے پینے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ جام نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! بخار آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"مسٹر جام! مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے [illegible] دق شروع ہو گئی ہے۔" ڈاکٹر نے کار میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"دق ۔۔۔؟ دق ۔۔۔؟" جام تھرا اٹھا۔

"پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں [illegible]" [illegible] نے کار اسٹارٹ کر دی۔ جام نے جلدی سے پانچ روپے کا نوٹ [illegible] کی طرف

"اس کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے کہا اور کار روانہ ہونے

ڈاکٹر روز آتا اور دوائیں تبدیل کرتا - حال پوچھتا اور کچھ ہمدردانہ جملے کہہ کر رخصت ہو جاتا - وہ بہت ہی انہماک سے علاج کر رہا تھا - اچھی سے اچھی دوائیں خود ہی مہیا کرتا - اس نے اب تک فیس کا ایک پیسہ بھی نہ لیا تھا - لیکن صہبا کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی - صہبا کا غم جام نے بھی چند دن کیا لیکن کہاں تک؟ صہبا کے حسن کے ساتھ اس کی محبت بھی فنا ہو گئی - صہبا کے پچکے ہوئے رخسار - دھنسی ہوئی آنکھیں - سر پر ایک دو بال اور کیفیت و نزار جسم، جام کی حسن پرست آنکھوں کے لئے شکست فاش تھے - وہ اس کمرے کا رخ کرتے ہوئے بھی کانپتا - جہاں صہبا سارا دن سینہ دبائے کھانستی رہتی - اس نے وطن سے اپنی خالہ کو بلا لیا تھا کہ دوا وغیرہ پلانے کا کام اسے نہ انجام دینا پڑے - اس کی خالہ دن بھر پلنگ پر بیٹھی پان کھایا کرتی یا ملازمہ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی - جب وہ دوا پلاتی تو اپنا پلو بچا کر کہ پلنگ سے چھو نہ جائے - وہ کبھی کبھی رحیمن کو زور سے مخاطب کر کے کہتی -

"سنتی ہو بی رحیمن! بزرگ کہتے ہیں کہ جب دق آتی ہے تو پہلے ناخن سے قبر کھود لیتی ہے"

"ہاں بیوی! بڑی ناشاد بیماری ہے" وہ جواب دیتی - صہبا سب سنتی اور آنسو اس کی بے رونق آنکھوں سے بہہ کر تکیے میں جذب ہونے لگتے -

ایک روز جام نے دفتر سے آکر خالہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا "خالہ! یہ تو آپ جانتی ہیں کہ میں صرف ساٹھ روپے ماہوار کا ملازم ہوں جس میں آدھی تنخواہ علاج پر صرف ہو جاتی ہے - وہ تو کہئے ڈاکٹر مہربان ہے ورنہ معلوم نہیں کیا ہوتا - پھر گھر کا خرچ اور ملازمہ کی تنخواہ اب بتائیے کیسے گزر ہو - میں تو اس بیماری سے عاجز آ گیا ہوں - پورے پانچ مہینے ہو گئے"

"بیٹا ٹھیک کہتے ہو - دق کی مریض نے کیا ہونا ہے - تمہارا جیسے ماں باپ ہی نہ رہے کہ وہیں بھجوا دیتی"

"اچھا اگر آپ کی مرضی ہو تو اچھا! اسپتال میں کیوں نہ داخل کر دوں"

"ہاں بیٹا ضرور کر دو - یہ بات تو اب تک میری سمجھ میں نہ آئی تھی - اور ہاں بیٹا اب تم کیوں نہ اپنا گھر بسانے کی فکر کرو - صہبا تو اب اچھی ہونے سے رہی - اگر تم کہو تو تمہارے ماموں کی لڑکی کا پیغام دیدوں - چاند جیسا چہرا ہے"

جام کی آنکھوں کے سامنے ریحانہ کا خوبصورت مجسمہ پھر گیا - گول چھوٹا سا تمتماتا ہوا چہرہ گھنگھریالے پریشان بال -

"خالہ ابھی سے کیا ضرورت ہے - پھر دیکھا جائے گا"

"لیکن اس کی تو کئی جگہ سے بات چیت آئی ہے - لڑکی بھی ہاتھ سے نکل جائے گی"

"خیر جیسی آپ کی مرضی - اچھا تو کل میں انہیں داخل کر دونگا"

"کیسی ہو صہبا!" جام نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا -

"اچھا! آج آپ کو فرصت مل ہی گئی"

"تم جانتی ہو کہ آج کل سر کھجانے کی بھی مہلت نہیں ملتی - ہاں میرا خیال ہے کہ تم کو اسپتال میں داخل کر دوں"

"اسپتال! مجھے وہاں نہ داخل کیجئے - چند روزہ زندگی اپنے پاس ہی گزر جانے دیجئے"

"لیکن تمہیں وہاں ہر طرح سے آرام ملے گا - پھر خالہ بھی جانے کو کہہ رہی ہیں - تمہاری تیمارداری کون کرے گا؟"

"بہت بہتر! میں تیار ہوں"

"تم گھبرانا نہیں میں روز دیکھنے آیا کرونگا"

صہبا نے اپنا منہ پھیر لیا - وہ جانتی تھی کہ اب میں سب پر بار ہو رہی ہوں - دنیا تنگ اور تاریک تھی - جام تھوڑی دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا اور صہبا ہوں ہاں سے جواب دیتی رہی - جب جام کمرے سے گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی -

---

دق کا ماہر ڈاکٹر خیرات خانے میں دق کے مریضوں کو دیکھ رہا تھا - کمرے کی فضا غم آلود تھی - مایوسی و ناشادی ہر طرف مسلط تھی - اور مایوسی کا خوفناک بھوت بڑے بڑے سفید دانت نکالے قہقہے لگا کر انسانی بیکسی و مجبوری کو دیکھ کر خوشی سے رقص کر رہا تھا - دنیا کی بدترین بیماری میں مبتلا مریض بحالت بے بسی پڑے کراہ رہے تھے - ڈاکٹر مریضوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتا ادھر ادھر پھر رہا تھا - مریض چلا رہے تھے -

"ڈاکٹر صاحب بخار بہت تیز چڑھتا ہے"

"حضور کھانسی سے برا حال ہے"

"سرکار! پاؤں پر ورم بہت ہو گیا ہے"

"ان داتا! اس دوا سے فائدہ نہیں، رحم کیجئے"

ڈاکٹر چلا اٹھا - "خاموش رہو! شور کیوں کرتے ہو؟ تم سب اچھے ہو جاؤ گے"

اب ڈاکٹر کے قدم اس طرف اٹھ رہے تھے جہاں عورتوں کے متحرک ڈھانچے اپنے حسن گذشتہ کی یاد میں تڑپ رہے تھے - جب ان کے پاس تندرستی تھی حسن تھا ناز و ادا تھے تو اس وقت ان کے اشاروں پر ناچنے والے بھی بہت تھے - ایک عورت پاس کی دوسری عورت سے کہہ رہی تھی -

"بہن! تم کو کیا معلوم کہ میں کتنی حسین تھی آہ! آج تم مجھے دیکھ کر اپنا مُنہ پھیر لیتی ہو۔ کتنے ہی لوگوں نے میرے دروازے پر جان دی ہے۔ کتنے ہی میرے گانے پر جھومنے والے تھے اور کتنے ہی میرے رقص کرنے پر رقص کرتے تھے"۔

ایک عورت بول اُٹھی۔ "ٹھیک کہتی ہو بہن! میرے ہی شوہر نے مجھے یہاں چھوڑ دیا"۔

ڈاکٹر کے جوتوں کی کھٹ پٹ نے سب کو خاموش کر دیا۔ وہ باری باری سب کو دیکھنے لگا۔ بعض عورتوں نے شرم سے اپنے چہرے چھپا لیئے۔ دفعتاً ڈاکٹر کی نگاہ صہبا پر پڑی اور ایک ہلکی سی مسرت کی کرن اس کے تمتمائے ہوئے چہرے پر رقص کر گئی۔ وہ اس کے پلنگ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"خاتون صہبا! آپ یہاں؟"

"ہاں ڈاکٹر گھر کی مالکن کے لئے ایک کمرے میں بھی جگہ نہ رہی"۔

"وہ تو میں جانتا ہی تھا" وہ زیرلب بڑبڑایا۔ "آپ فکر نہ کریں خاتون صہبا!" اُس نے زور سے کہا۔

صہبا نرم و نازک تکیہ پہلو میں دبائے کروٹیں بدل رہی تھی۔ نرس کرسی پر بیٹھی سر جھکائے نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ کمرے کی فضا خاموش و پُرسکون تھی کسی کسی وقت دُور سے نرسوں کی موسیقی پرور آواز سُنائی دے جاتی۔ صہبا کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ذہنی خلفشار میں مبتلا ہے نقاہت سے نیم وا آنکھیں کسی گہری فکر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یکایک وہ نرس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"نرس — !"

"ہاں — !" وہ چونک پڑی۔

"کیا بجا ہے؟"

"تین — !"

"ملنے کا وقت چار ہی بجے سے شروع ہوتا ہے نا؟"

"ہاں — !"

اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ شاید زندگی کا کوئی بھیانک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اور وہ اسے دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ وہ دیر تک اسی حالت میں پڑی رہی۔ پھر ایک کروٹ کے بعد اس نے کراہ کر پوچھا۔

"اب کیا بجا ہے نرس؟"

"ساڑھے تین — !"

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت وہ جام کو بے طرح یاد کر رہی تھی۔ ہسپتال آئے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ لیکن وہ صرف ایک بار اسے دیکھنے آیا تھا۔ جب وہ خیرات خانے میں تھی اسے اس وقت اس کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے کہ جام کی گردش تو صہبا ہی کے دم سے ہے۔ اُف! مرد جو کچھ کہتے ہیں بھول جانے ہی کے لئے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی جام ہے جس نے اس کی تمنا پر اپنا جان دریا ——— وہ سوچتے سوچتے چونک پڑی اور سینہ ہاتھوں سے دبا کر پوچھا۔

"نرس! اب کیا بجا ہے؟"

"چار بجکر دس منٹ"۔

"وہ مجھے کبھی دیکھنے نہ آئیں گے"۔

"کون — ؟"

"کوئی نہیں نرس!"

"لائیے ٹمپریچر لے لوں"۔

"لے لو"۔

اس نے تھرمامیٹر چند منٹ مُنہ میں لگا کر دیدیا۔

"آج تو بخار صرف تو ہے اور کھانسی بھی بہت کم آئی"۔

"ہاں — !"

پانچ بجے اور پھر چھ۔ تاریکی آہستہ آہستہ دُنیا پر چھا رہی تھی۔

صہبا کو ہسپتال میں رہتے ہوئے پورا ماہ ہو گیا۔ ڈاکٹر کے التفات نے اسے دوبارہ زندگی بخشی تھی۔ اب اس کے چہرے سے تندرستی کی تمام علامتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ خوفناک ڈھانچہ نرم و گداز جسم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ آدھ آدھ گھنٹہ تک چہل قدمی کیا کرتی لیکن کوئی تھکن نہ محسوس ہوتی۔ وہ کبھی ٹہلتے ٹہلتے بیٹھ کر سوچنے لگتی کہ ڈاکٹر نے اس پر اتنی مہربانیاں کیوں کیں۔ خیرات خانے سے اُٹھا کر وارڈ میں کیوں رکھا۔ ممکن ہے اُسے مجھ سے ہمدردی ہو لیکن خیرات خانے میں اور بھی تو عورتیں تھیں ان پر کیوں نہ مہربان ہوا۔ کیا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے؟ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایک مدقوق سے محبت کرنا جو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو۔ یہ مرد کی فطرت کے خلاف ہے۔ پھر وہ جام کے متعلق سوچنے اور اُس کی بیوفائی پر آنسو بہانے لگی۔

تقریباً آٹھ بجے ہونگے۔ ہسپتال کے گرد و نواح میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کسی مریض کے کراہنے کی دلشکن آواز فضائے بسیط کو چیرتی ہوئی سنائی دیتی۔ چاند کی اُداس پھیکی کرنیں کھڑکی سے داخل ہو کر صہبا کے پلنگ پر پھیل رہی تھیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ ہوا کے ایک عطر بیز جھونکے نے اس کے بالوں کو پریشان کر دیا۔ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ اُس

دم گھٹنے لگا۔ نرس نے بھی رات کا رہنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کس سے بولے؟ اپنے دل کو کیسے بہلائے؟ اب وہ اسپتال میں رہنا نہ چاہتی تھی۔ وہ اپنے پاس جانے پاس جانا چاہتی تھی۔ آج ڈاکٹر بھی اُسے دیکھنے نہ آیا ورنہ چھٹی کے لئے کہتی۔ وہ صرف گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ ہر طرف ایک سناٹا۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر پلنگ پر گر پڑی۔

"خاتون صہبا! میں آجاؤں؟"

"تشریف لایئے۔" وہ ڈاکٹر کی آواز سُن کر کھڑی ہوگئی۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"اچھی ہوں۔" اس نے کرسی ڈاکٹر کی طرف بڑھا دی۔ "تشریف رکھئے۔"

"آپ اب آرام کیجئے۔ میں پوچھنے چلا آیا تھا۔"

"شکریہ! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

ڈاکٹر کرسی پر بیٹھ گیا۔ صہبا نے رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔

"شاید اب تو میں بالکل اچھی ہوں۔"

"جی ہاں!"

"تو پھر مجھے چھٹی دیدیجئے۔"

"شوہر کے پاس جایئے گا؟" وہ بےچینی سے کرسی پر کسمسایا۔

"ہاں شریف عورت کے لئے اس کا شوہر ہی اس کی دنیا ہے۔"

"اچھا تو میں ابھی شوفر سے کہہ دونگا وہ صبح آپ کو پہنچا دیگا۔"

صہبا خاموش ہوگئی اور ڈاکٹر کا غمناک چہرہ تکنے لگی۔ پھر گلے پر ہاتھ پھیر کر مشکل بولی۔

"ڈاکٹر! میں آپ کے احسانات تازیست نہ بھول سکوں گی۔"

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔"

"تو پھر یہ سب کیا تھا؟" اس نے اس طرح کہا جیسے وہ آج سب کچھ پوچھ رہی تھی۔

"مجھے خود نہیں معلوم کہ یہ سب کیا تھا۔" اس نے جواب دیا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "اچھا اب اجازت دیجئے۔" اس نے کہا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ صہبا ڈاکٹر کو ایک لاینحل معمہ سمجھ رہی تھی۔ لیکن نہ معلوم کیوں وہ اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس کر رہی تھی۔

دوسرے دن آٹھ بجے کار پھاٹک کے پاس کھڑی تھی۔ ڈاکٹر صہبا کو رخصت کرنے نہ آیا۔ شوفر نے کار اسٹارٹ کی۔ صہبا نے خدا حافظ کہا۔ لیکن وہ کوشش کے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

کار تھوڑی دیر بعد صہبا کے گھر کے آگے کھڑی تھی۔ وہ آہستہ سے اُتری پاؤں خوشی سے من من بھر کے ہو رہے تھے۔ آج وہ جام سے ملے گی۔ وہ اسے تندرست دیکھ کر کتنا خوش ہوگا اور اپنی تمام بدعنوانیوں کی معافی مانگے گا ان خیالات کے آتے ہی وہ مست شرابی کی طرح جھوم گئی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہونا چاہتی تھی۔ کہ ایک باریک سی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ وہ دروازے کی درازوں سے اندر جھانکنے لگی۔ جام کے زانو پر ریحانہ سر رکھے لیٹی ہوئی تھی اور وہ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا رہا تھا۔ صہبا زیادہ دیکھنے کی تاب نہ رکھتی تھی۔ وہ پیچھے مڑی۔ شوفر کار اسٹارٹ کر رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ سے رُکنے کا اشارہ کیا۔ اور ایک محویت کے عالم میں کار پر بیٹھ گئی۔

"کہاں چلوں بیگم صاحبہ؟"

"جہاں سے آئے ہو۔"

کار ہوا سے باتیں کرتی ذرا سی دیر میں اسپتال کے سامنے کھڑی تھی۔ ڈاکٹر پھاٹک کے پاس اس طرح ٹہل رہا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔

"آپ آگئیں خاتون صہبا؟"

"ہاں!"

"کیوں ——؟"

"میں اپنے شوہر کی خوشیوں میں کانٹا بن کر چبھنا نہیں چاہتی۔" یہ کہتے ہوئے اُس کے پاؤں لڑکھڑائے۔ ہونٹ کانپے اور چہرہ خزاں رسیدہ پتی کی طرح زرد پڑ گیا۔ وہ زور سے کانپی۔ ڈاکٹر اُسے سہارا دینے کے لئے آگے بڑھا لیکن اس سے پہلے وہ زمین پر گر کر بیہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر نے دیکھا تو اُسے تیز بخار چڑھا تھا۔

پھر وہی وارڈ تھا۔ ایک نرس خاموش سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھی ڈاکٹر نے انتہائی کوشش کی کہ صہبا کی گرتی ہوئی حالت سنبھل جائے لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ دو ماہ کے اندر وہ موت کے کنارے لگ گئی۔ ڈاکٹر اس کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ دو دن سے تو اس کی حالت انتہائی بدتر تھی۔ سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے دو راتیں جاگ کر کاٹیں۔

آج کی رات صہبا کی آخری رات تھی۔ نرس سر جھکائے سرہانے کھڑی تھی۔ ڈاکٹر کرسی پر بیٹھا نبض دیکھ رہا تھا۔ کمرے پر موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا اور صہبا کی تیز تیز سانسیں خاموشی میں تیرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور ڈاکٹر کو اپنی طرف جھکنے کا اشارہ کیا۔

"کیا ہے خاتون صہبا؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ڈاکٹر! جام ملے تو کہنا کہ صہبا ختم ہوگئی لیکن جام پھر بھی گردش کرتا رہا۔"

"اچھا —!"

صہبا نے آنکھیں بند کر لیں چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔ ہر آنے والی سانس پر آخری ہونے کا گمان ہوتا۔ صہبا نے ایک آخری حسرت زدہ نگاہ ڈاکٹر پر ڈالی جن میں نہ معلوم کیا کیا تھا۔ دو ہچکیاں آئیں اور تیسری کے ساتھ اس کی روح پرواز کر گئی۔ ڈاکٹر بےچین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اور حسرتناک آواز میں بولا۔

"نرس! خاتون صہبا چل بسیں۔"

"ہاں بڑی تکلیف تھی۔" وہ اُداس ہو رہی تھی۔

"نرس!" اس نے کھوئی ہوئی آواز میں پکارا۔

"جی —!"

"اب تم جا کر آرام کرو۔ آج فرصت مل گئی۔"

"بہت اچھا۔"

نرس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے صہبا کے سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے اور آنکھوں سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا وہ سِسک سِسک کر رو ... یہاں تک کہ صہبا کے ہاتھ تر ہوگئے۔ پھر اس نے گھٹنے زمین پر ٹیک کر صہبا کے ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لئے اور چند منٹ تک اس کے پرسکون مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔ چاند کی اُداس کرنیں اس کے مُردہ جسم پر لوٹ رہی تھیں۔ ڈاکٹر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

خدیجہ مستور لکھنوی

فریبِ تخیّل

جو نیچی نگاہیں کسی نے اُٹھا دیں
مِرے دل کی دُنیا میں شمعیں جلا دیں

پکارا جو دل نے کہ مسجود آیا
مری حسرتوں نے جبینیں جھکا دیں

اِن آوارہ کلیوں سے اللہ سمجھے
مجھے دیکھ کر زیرِ لب مسکرا دیں

نسیمِ سحر ہمرکاب اُن کے آئی
گلستاں نے پھولوں کی شاخیں جھکا دیں

خرابات ہے اور بدمستیاں ہیں
بہاروں نے ظلمت کی راہیں دکھا دیں

فضا مرتعش ہے جہاں مرتعش ہے
پپیہے نے کچھ ایسی تانیں لگا دیں

ٹپکنے لگے اشک آنکھوں سے پیہم
سُنانی تھیں جو کچھ وہ باتیں سُنا دیں

اس انداز سے ہم کو ظالم نے دیکھا
شبِ ہجر کی واردانیں بھلا دیں

جو تم ہنس پڑے ہنس پڑا سارا گلشن
فضائیں بھی کچھ سوچ کر مسکرا دیں

فریبِ تخیّل یہ کب تک کہاں تک
ستاروں نے بھی اپنی شمعیں بجھا دیں

عزیز احمد

صبحِ مستقبل

مِٹ گئے گرانقلاب آرائیِ محفل سے ہم
پھر عیاں ہونگے حجابِ صبحِ مستقبل سے ہم

ہیں ابھی نا آشنا شاید مذاقِ دل سے ہم
لوٹ آتے ہیں تلاطم دیکھکر ساحل سے ہم

راہبر جب راہزن بنجائیں کوئی کیا کرے
قافلے لُٹتے رہے دیکھا کئے منزل سے ہم

مضطرب جذبات، دل بیتاب، نظریں بیقرار
کیا اسی عالم میں اُٹھ جائیں تری محفل سے ہم؟

ابتدا وہ تھی کہ ہنس دیتے تھے دل کی چھیڑ پر
انتہا یہ ہے کہ اب رونے بھی ہیں مشکل سے ہم

ناخدا کی کیا ضرورت عزمِ محکم چاہئے
خاک ہوکر خود بخود مل جائینگے ساحل سے ہم

موت ہی آئے کوئی تسکین کی صورت تو ہو
حاصلِ غم چاہتے ہیں کچھ غمِ حاصل سے ہم

قطرۂ شبنم لرز اُٹھا، کلی ہنسنے لگی
زندگی کا راز کہنا چاہتے تھے دل سے ہم

ظرفِ دل وسعت بداماں، ہمتیں طوفاں نواز
بس چلے اپنا تو دریا چھین لیں ساحل سے ہم

اپنے دل کی موت کا باعث کہیں ہم ہی نہ ہوں
آؤ کچھ پردے اُلٹ دیں چہرۂ قاتل سے ہم

ڈوب کر اپنا اُبھرنا معجزہ تھا اے نثار
جب کھلیں آنکھیں بہت نزدیک تھے ساحل سے ہم

نثار اٹاوی

مقالہ

منظوم خطوط

یہ تو سب پر روشن ہے کہ اُردو نثر کے سرمایۂ بہار میں ایک بڑا حصّہ خطوط کا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اُردو نظم نے بھی باوجود مشکلات اور پابندیوں کے خطوط پیش کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نثر کے مقابلہ میں یہ منظوم خطوط جو ردیف و قوافی میں چھپے ہوئے ہیں تعداد میں بہت ہی کم ہیں مگر رنگ و بُو میں کم نہیں ؎

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند (طالب آملی)

اُردو شاعری میں یہ مترنم مکتوبات خاص طور سے مثنوی قطعہ وغیرہ میں لکھے گئے ہیں۔ یوں تو غزل نے بھی پیام و سلام کو اپنے موضوعات میں ایک نمایاں درجہ دیا ہے اور مکاتبت کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو غزل کی دسترس سے بچا ہو۔ نامہ۔ نامہ نویسی۔ نامہ بر۔ انتظار نامہ۔ جواب نامہ وغیرہ ایسے موضوع ہیں جن کو غزل نے نئے ڈھنگ اور سو رنگ سے پیش کیا ہے۔ کبھی کبوتر کو پیغامبر بنایا۔ کبھی برگ حنا پر خط لکھا۔ اور اکثر خط کا مضمون لفافہ دیکھ کر بھانپ لیا۔ بیجا نہ ہوگا اگر غزل کے چند مشہور شعر یہاں پیش کر دیئے جائیں ؎

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرض ستمہائے جدائی کا

لکھ چکے خط جا چکا خط گر یہی حالت رہی
ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

نامہ بر تو ہی بتا تو نے تو دیکھے ہونگے
کیسے ہوتے ہیں وہ خط جن کا جواب آتا ہے (قمر)

لکھے خط اُن کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

اس بات کو نہ بھولنا چاہئے کہ شاعری جو زندگی کی سچّی ترجمان ہے تشنۂ تکمیل رہ جاتی اگر وہ تحریر کے ایک ایسے وسیلے کو نظر انداز کر دیتی جس پہ ہمارے اظہار خیال کا بہت کچھ دار و مدار ہے۔ چنانچہ مثنوی نے اس حقیقت نفس الامر کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے افسانے میں خط و کتابت کو مناسب جگہ دی۔ افراد قصّہ کے خطوط کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہمارے آپ کے مکاتیب کو ہے۔ مثنوی میرحسن میں شہزادہ بینظیر نے مسعود شاہ کو خط لکھا ہے اور بدر منیر سے شادی کی درخواست کی ہے اس منظوم خط میں نثر کی طرح القاب و آداب کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے تعارف و اظہار مدعا بڑی خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے ؎

"کہ اے شاہ شاہاں و اے فخر جم
....
فریدوں نشان و سکندر نژاد   مراد جہاں و جہان مراد
میں وارد ہوں یاں ایک مہمان غریب   لے آئے ہیں مجھکو مرے یاں نصیب
نوازش سے اپنے کرم کیجیئے!   غلامی میں اپنی مجھے لیجیئے
جہاں پر ہے روشن کہ میں ماہ ہوں
ملک زادہ ابن ملک شاہ ہوں" (میرحسن)

گلزار نسیم میں وہ خط جو ایک بھائی نے بہن کو لکھا ہے اختصار و اظہار مطلب کے نقطۂ نظر سے لاجواب ہے۔ وہ مقام دیکھیئے جہاں تاج الملوک کی اعانت کے لئے دیو اپنی بہن کے نام ایک سفارشی خط لکھتا ہے

"اے خواہر مہرباں سلامت
....
پیارا ہے مرا یہ آدمی زاد   رکھیو اسے جس طرح مری یاد
انسان ہے چاہے کچھ جو سازش   مہماں ہے کیجیو نوازش
باپ اس کا ہے اندھے پن سے مجہول   مطلوب بکاولی کا ہے پھول
دل داغ اس کا برائے گل ہے   نرگس کے لئے ہوائے گل ہے" (نسیم)

انشاءاللہ خاں انشا کے دیوان ریختی میں منظوم خطوط کی بعض اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ نظم میں نثر کی سی روانی و سلاست ہے۔ اور طرز بیان میں ایک دلکشی و جدت ہے۔ یہ اہل کمال اپنے منظوم خطوط میں محض مطلب نویسی اور قافیہ پیمائی نہیں کرتے بلکہ ادبی لطافت اور شاعرانہ جادو بیانی و کفر سامانی کا مرقع پیش کرتے ہیں ؎

"مشفقا مدظلہ العالے   بعد اظہار اشتیاق و نیاز
ملتمس یہ کہ خط جو لکھ بھیجیں   تو اسے چاہیئے کوئی ہمراز
سو تو کمبخت ٹھنڈی سانس ہوا   اور اپنا نہیں کوئی دمساز
دل پہ چوبیسے سو جانتا ہے اسے   پاک پروردگار بندہ نواز
جی نگوڑا ترس گیا ہے ہے   اب تو سننے کو آپ کی آواز
کر مصیبو نچیو نہ تم سفر میں کہیں   اور پڑھا کیجیو پانچ وقت نماز

عمر کوتہ سفر کی ہے مشہور   چلنے والے کی عمر ہے سودراز
واقعی سچ کہا ہے آتشا نے
بیچ دُنیا کے ہے نشیب و فراز

آتشا کا یہ مختصر منظوم خط یا رقعہ بھی نہایت دلچسپ ہے ؎

"میرزا صاحب الطاف نشان سلمۂ
بعد اظہارِ تمنا یہ اجی ہو معلوم
اتنی مدت سے سدا ہارے نہ کبھی خط لکھا
ہم کو اک پیسے کے کاغذ سے بھی رکھا محروم

چند باکمال شعرا نے وہ انداز سخن اختیار کیا کہ منظوم مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ اور "ہجر میں وصال کے مزے" لینے لگے۔ مرزا غالب نے اپنے طرز نامہ نگاری کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اصول یہاں بھی صادق آتا ہے "ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہِ بے آب ہے۔ ابرِ بے باراں ہے۔ نخل بے ثمر ہے۔ خانہ بے چراغ ہے چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو ہم زندہ ہیں۔" اکبر الہ آبادی علامہ شبلی کو اپنے ظریفانہ انداز میں لکھتے ہیں ؎

"آتا نہیں ہم کو قبلہ قبلی   بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات   کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا   سمجھو اُس کو پلاؤ قلیا"

علامہ شبلی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "کل میر اکبر حسین صاحب جج سابق کے یہاں سے دعوت کا رقعہ آیا تھا۔ میں نے جواب لکھا ؎

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں ممنوں ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں [۱]
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی!
جیتے جی مُردہ ہوں، مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

اکبر کا وہ مشہور خط جو انھوں نے بہتم "پیام یار" کے نام لکھا ہے منظوم خطوط نویسی کا اچھا نمونہ ہے۔ ؎

نامہ نہ کوئی یار کو پیغام بھیجئے!

[۱] یہ رقعہ واقعہ گزند پا کے بعد لکھا گیا ہے۔ ۲۳ نومبر ۱۹۰۷ء

اقبال کی جدت پسند طبیعت نے خط کو ایک نئے طرز سے نظم کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ یورپ سے کسی نے علامہ مرحوم سے جلال الدین رومی رح کے متعلق سوال کیا ہے۔ خط یہ ہے۔

یورپ سے ایک خط
(از بال جبریل)

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحرِ پُر آشوب و پر اسرار ہے رومیؒ
تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی
اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام
کہتے ہیں چراغ رہِ احرار ہے رومی

ادب اردو میں منظوم خطوط کو بھی اہمیت دینا چاہیئے۔ یہ مترنم خطوط معاشری، لسانی و ادبی حیثیت سے ہمارے شعرا کی جدت تخیل کے عرفانی صحیفے ہیں۔

میرزا محمد بشیر ایم۔ اے

مزاحی

ایک نسخہ

ہم یہ چھوٹا سا نسخہ نہایت خلوص دلی سے بتاتے ہیں۔ یہ چند بیتیوں سے اخذ شدہ ہے۔ پہلے پہل ہمارا ارادہ تھا کہ اسے یسینہ رکھا جائے لیکن چونکہ اب ہم اس سے بے نیاز ہیں اس لئے شائع کرانے میں چنداں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ یہ نسخہ باعمل (جو سمجھیں) تسخیر بزرگان کے لئے ہے ——— یعنی بزرگوں کو مسحور نے کے لئے۔

آپ شاید مسکرا دیئے ہوں ——— لیکن جن حضرات کو بزرگوں پر کرنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ انھیں ضرور پتہ ہوگا کہ یہ عمل کتنا مشکل ہے رگ کسی قسم کے تعویذ۔ گنڈوں اور حیلوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ نہ فس عجز و انکساری مسخر کر سکتی ہے۔ ظاہری شان و شوکت اور اکڑ ن کے لئے چھچھوری چیزیں ہیں۔ شکل و صورت کی وہ ذرا پروا نہیں کرتے

ہمیں اس نسخے کا پتہ تب چلا جب ہم ایک "بزرگانہ انٹرویو" میں بری طرح فیل ہوئے اور کئی مہینے تک ہمیں احساس کمتری رہا کہ ہمارا سر نہ اٹھ سکا۔

بات یوں تھی کہ ہمارا ایک انٹرویو تھا۔ ایک بزرگ ہماری قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ یہ ہماری ناتجربہ کاری تھی کہ نہ تو ہم نے ان بزرگ کے متعلق کچھ دریافت کیا اور نہ یہ پتہ لگایا کہ انھیں اچھا کیا لگتا ہے؟ اور وہ کن کن باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ بس ہم اپنے بناؤ سنگار میں لگے رہے۔ جب ہم اُن کے سامنے پیش ہوئے تو ہمارا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا، لب خشک تھے۔ ہم نے آیت الکرسی پڑھی۔ وہ ایک بڑے مہربان اور مشفق بزرگ ثابت ہوئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔

وہ بولے: "آج کا دن کچھ اداس سا ہے"

"جی نہیں" میں نے کہا: "آج تو سورج خوب چمک رہا ہے۔ آپ کی کوٹھی کے چاروں طرف جو پھول ہیں وہ خوب مسکرا رہے ہیں۔ اُن پر تتلیاں ناچ رہی ہیں اور آپ کا شوفر بھی قہقہے لگا رہا تھا۔

"ہوں! خیر!! ہوگا!!! ——— ویسے آج کل سردی بہت جلد شروع ہوگئی ہے۔ ابھی نومبر کے مہینہ سے یہ حال ہے۔ خدا خیر کرے۔ آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ کہیں نمونئے وغیرہ نہ شروع ہو جائیں"۔

"نہیں قبلہ! سردی ابھی کہاں شروع ہوئی ہے۔ کل تو میں تالاب میں تیر رہا تھا۔ اسے ہم خنکی ضرور کہہ سکتے ہیں۔ سردی نہیں۔ اصلی سردی تو کہیں جنوری میں شروع ہوگی"۔

انھوں نے چائے کی ایک چسکی لگائی اور عینک لگا کر مجھے گھور کر دیکھا

میں نے ذرا اپنی ٹائی ٹھیک کی اور پینترہ بدلا۔

"تم کچھ بے چین سے ہو رہے ہو برخوردار، کہیں تمہارے پیٹ میں درد تو نہیں؟"

"پیٹ میں درد؟ ——— آج تک میرے پیٹ میں کبھی درد نہیں ہوا" میں نے سینہ پھلا کر کہا۔

"آج تک نہیں ہوا؟" وہ بڑے تعجب سے بولے "غضب خدا کا"۔

میں چائے بنانے لگا۔ ویسے تو میں پیالی میں شکر کے ساڑھے تین چمچے ڈالتا ہوں۔ ان کے سامنے صرف ایک چمچہ ڈالا۔

"ارے یہ تم شکر کیوں تھوڑی ڈال رہے ہو؟ ——— کہیں تمھیں ذیابیطس تو نہیں؟"

"ذیابیطس؟ ذیابیطس کیا ہوتا ہے قبلہ؟"

"ایک مرض ہوتا ہے!" وہ بولے۔

"اچھا تو پھر یہ ہوگا کوئی بڑھاپے کا مرض۔ اس عمر میں مجھے ذیابیطس وغیرہ کہاں ہو سکتے ہیں؟"

"تو تمھیں سچ مچ پتہ نہیں تھا کہ ذیابیطس کیا ہوتا ہے؟"

"جی نہیں ——— !"

"لاحول ولاقوۃ!" اُنھوں نے پھر چائے کی چسکی لگائی اور عینک نیچی کرکے مجھے گھورا۔ میں نے ایک پیالی ہی پر قناعت کی اور رومال سے لب پونچھنے لگا۔

"اور پیو، برخوردار"

"جی نہیں، بس!"

"شاید تمھیں ڈر ہو کہ زیادہ چائے گُردوں کے لئے نقصان دہ ہوگی، کیوں ——— ؟"

" جی نہیں، ویسے میں چاے تو اس قدر پیتا ہوں کہ کیا عرض کروں پندرہ پندرہ پیالیاں پی جاتا ہوں لیکن میرے گُردے تو بالکل تندرست وتوانا ہیں " میں نے عرض کیا۔

" تو تمھارا دل ضرور دھڑکتا ہوگا "

" وہ ــــ ذرا معاف کیجیے ــــ دل تو ہر شخص کا دھڑکتا ہے "

" نہیں، یوں نہیں ــــ ویسے دھما دھم دھما دھم کرتا ہوگا۔ غشی ے دَورے پڑتے ہونگے۔ رات کو گھبرا جاتے ہوگے۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ آجاتا ہوگا " وہ بولے۔

" بدقسمتی سے مجھے کچھ بھی نہیں ہوتا " میں بولا۔

" تو تمھیں آج تک کوئی مرض نہیں ہوا ؟ "

" جی نہیں ــــ ! "

" تو گویا تم بالکل تندرست ہو؟ " وہ تقریباً چیخ کر بولے۔

" جی ہاں ! ــــ اور پھر خود ہی خیال فرمائیے، میری عمر ہی کیا ہے؟ رزش کرتا ہوں، اچھی اچھی کتابیں پڑھتا ہوں۔ کوئی فکر نہیں ہے ھر تندرست نہ ہوں تو اور کروں بھی کیا ؟ "

ــــ یہاں ہمارا انٹرویو ختم ہوگیا۔ ہمیں اگلے روز پتہ چلا کہ م فیل ہوگئے تھے۔ اور ہمارے متعلق کہا گیا تھا کہ لڑکا نہ صرف بے پروا ہے بلکہ اناڑی بھی ہے۔ ہمیں کچھ پتہ نہ چلا کہ آخر یہ بے انصافی ہمارے اتھ کیوں کی گئی۔ لیکن چند ہی دنوں بعد ایک اور دوست ملے جن کے اتھ کسی بزرگ نے بالکل یہی سلوک کیا تھا۔ ہم نے اس معاملے پر بڑا ر کیا۔ راتیں جاگ کر گزار دیں۔ صبح شام یہی سوچتے رہے۔ آخر ہمیں ہ چل گیا۔ چنانچہ جب ہمارے ایک کھلاڑی دوست کو ایک خنک ی بیج کو زکام ہوگیا۔ اور انھیں کسی لڑکی سے اس بُری طرح محبت ہوئی اُن کی حالت مخدوش ہوگئی۔ تب انھیں بھی بڑی کوششوں کے بعد ی قسم کے انٹرویو سے سابقہ پڑا۔ صاحب انٹرویو حسب معمول ایک رگ تھے ــــ ہم سب کچھ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ہم نے اُن صاحب کو علیحدگی یہ نسخہ بتا دیا۔ اُنھیں ایک ایک بات یاد کرا دی گئی۔ ری ہرسل ہ گئے۔ چنانچہ جب پورا اطمینان ہوگیا تو انھیں بزرگ کے سامنے بھیجا گیا۔

اب ہم آپ کو اُن کا انٹرویو بتاتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ہمارے دوست کا نام سلطان تھا۔

سلطان صاحب نے ہدایات کے بموجب دو روز سے حجامت نہیں ہ کر ہڑتال بھی کی۔ لباس بھی فضول سا پہن کر گئے۔ جب انٹرویو کے لئے گئے تو چہرا اور بھی بیزار بنا لیا۔ اُن بزرگ سے ملے، وہ مسکرائے ادہر سلطان صاحب نے بُرا سا مُنہ بنا لیا۔

سلطان بولے۔ " آج دن کتنا اُداس ہے ؟ "

" واقعی بہت اُداس ہے " بزرگ بولے۔

" صبح سے گرد وغبار کا خول چھایا ہوا ہے۔ آپ کی کوٹھی کے سارے پھُول مُرجھائے ہوئے ہیں۔ آپ کا شوفر بھی کچھ بیمار نظر آتا تھا " سلطان بولے۔

" واقعی ؟ " بزرگ بولے۔ اُن کے لہجہ میں مسرّت کی جھلک تھی۔

" جی ہاں ! اور یہ موسم بھی عجب مصیبت ہے۔ ہمیشہ وقت سے پہلے ہی موسم شروع ہو جاتا ہے۔ گرمیوں میں گرمیوں سے پہلے ہی گرمیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اُدھر سردیوں میں بھی سردیاں سردیوں سے پہلے ہی شروع ہوتی ہیں۔ اور اس وقت نہیں ہوتیں جب دراصل سردیاں شروع ہونی چاہیئے تھیں۔ اب کس قدر گرمی ہے۔ ہر وقت سن سٹروک (Sun Stroke) کا ڈر رہتا ہے "

" تمھیں کبھی ہوا سن سٹروک ؟ " بزرگ بولے۔

" جی ہاں، کئی مرتبہ۔ پچھلے سال تو تقریباً ہفتہ وار ہوا کرتا تھا اس مرتبہ خدا کا فضل ہے "

" خوب ! چاے پیوگے نا ؟ "

" نہیں قبلہ ! میں تو چاے کے پاس بھی نہ پھٹکوں گا، گردوں کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ پچھلے دنوں مجھے " خندلیق الترایب " ہوگیا تھا۔ اور اس کے علاوہ " طبیع الموقوف " اور " جمیع الخسارہ " بھی دیر تک رہے "

" اچھا تو یہ مرض تمہیں چاے پینے سے ہوتے تھے ؟ "

" جی ہاں ! اور ہاں مجھے ذیابیطس بھی ہونے لگا تھا "

" پھر ــــ ؟ "

" بس بال بال بچ گیا۔ اب ہر وقت یہی ڈر رہتا ہے "

ان بزرگ کے چہرے پر شفقت کے آثار نمودار ہوگئے۔ انھوں نے شربت منگوایا۔ سلطان صاحب نے گلاس ہاتھ میں لیا اور ان کا ہاتھ ہدایت نمبر ۶ کے مطابق لرزنے لگا۔

بزرگ چونک کر بولے۔ " ارے یہ ہاتھ کانپ رہا ہے تمھارا ؟ "

" جی ہاں، جب میں گھبرا جاؤں تو ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں "

" تو تمھیں رعشہ ہے گویا ؟ "

" جی ہاں " رعشۃ الاعصابی " بھی اور " رعشۃ الدماغی " بھی "

" بڑی خوشی ہوئی سُن کر " اور انھوں نے اپنی کرسی کھینچ کر سلطان

صاحب کے پاس کر لی۔

"آپ بھی پیجئے نا شربت قبلہ؟" سلطان بڑی مسمسی صورت بنا کر بولے۔

"برخوردار! شربت سے میرے پیٹ میں بائیں طرف درد ہونے لگتا ہے۔"

"اور مجھے تو نہ صرف بائیں طرف ہوتا ہے، بلکہ دہنی طرف بھی، اور کمر میں بھی ——— سب جگہ تکلیف شروع ہو جاتا ہے۔"

"سبحان اللہ! تو کیا سارے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے؟"

"جی ہاں! اور جوڑوں میں بھی۔" سلطان بولے۔

"کیا کہا، جوڑوں میں بھی؟" بزرگ مسرت سے مغلوب ہو کر بولے۔

"جی ہاں ——— !" سلطان نے کہا۔

"لیکن تمہاری صحت تو ماشاء اللہ بہت بہت اچھی ہے۔ تمھیں اتنی بیماریاں ہو کس طرح گئیں؟"

سلطان نے ہدایت نمبر ۹ پر عمل کرتے ہوئے کہا "قبلہ! یہ بھی کوئی بیماریاں ہیں۔ یہ تو ہر شخص کو ہوتی ہیں ——— اور پھر میں تو بس درشنی پہلوان ہوں۔"

"تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ لو اور شربت پیو۔ پیٹ کے درد کا علاج کیا ہے بھلا؟"

"مجھے سب بیماریوں کے علاج زبانی یاد ہیں۔ کبھی فرصت کے وقت عرض کروں گا۔"

"سچ مچ!" وہ اپنی کرسی اور نزدیک لے آئے۔

"پرسوں، یعنی پندرہ تاریخ کو شام کے چار بجے سے مجھے ہائی بلڈ پریشر (High Boold Pressure) شروع ہو گیا ہے۔" سلطان بولے۔

"مبارک ہو۔" بزرگ چہک کر بولے "کیا ہوتا ہے یہ؟"

"اجی خون کا دباؤ زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور خون جسم کے کونے کونے میں ٹکریں مارنے لگتا ہے۔"

"اوہ! خون کا دباؤ، وہ تو میرا بھی زیادہ ہے۔" وہ بولے۔

"اچھا، آپ کا دل دھڑکتا ہوگا۔ جیسے دھما دھم ——— دھڑام دھڑام۔"

"ہاں ——— ہاں ——— !"

"اور آپ رات کو گھبرا جاتے ہوں گے۔"

"بالکل ——— !"

"اور آپ کے سر میں بے تحاشہ درد ہوتا ہوگا؟"

"واقعی ——— !"

"بس مجھے بھی یہی ہے ——— !"

"اس کا علاج؟"

"مجھے معلوم ہے۔ کبھی پھر عرض کروں گا انشاء اللہ۔"

غرض کہ اس قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ اُن بزرگ کی کرسی سلطان صاحب کے نزدیک آ گئی حتیٰ کہ دونوں کرسیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ اگلے روز سلطان صاحب کا نتیجہ نکلا۔ وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس تھے۔ فوراً ہی وہ شادی پر اُتر آئے اور آج کل وہ ہمارے پاس بیماریوں کی کتابیں لینے آیا کرتے ہیں۔ موٹی موٹی بیماریوں کے آثار اور علاج اُنھیں زبانی یاد ہیں۔

ایک بات ہم بھول گئے۔ وہ یہ کہ اگر کسی صاحب کو انٹرویو سے پہلے یہ پتہ چل جائے کہ اس گھرانے کے خاندانی مرض کون کون سے ہیں تو اُن سا خوش قسمت کوئی نہ ہوگا۔ فوراً کسی ڈاکٹر سے مل کر ان بیماریوں کے متعلق چھوٹے چھوٹے لیکچر سُن لئے جائیں۔

اور حجامت اور لباس کے متعلق بھی نہیں بھولنا چاہئے۔ ہاں۔

شفیق الرحمٰن

گھٹائیں

گردوں پہ بہکتی ہوئی آتی ہیں گھٹائیں
خود روتی ہیں اوروں کو رلاتی ہیں گھٹائیں

لچکا کے جھکتی ہوئی شاخوں کی کمر کو
جھولا سا شگوفوں کو جھلاتی ہیں گھٹائیں

پوشاک کبھی سرخ ہے اودی کبھی دھانی
کس طرح دلھن بن کے لجاتی ہیں گھٹائیں

بند آنکھیں کیے باغ میں کمسن ہیں جو کلیاں
کنگن انھیں بوندوں کا پہناتی ہیں گھٹائیں

کاندھے پہ اٹھائے ہوئے پھولوں کی صراحی
میخواروں کے شانوں کو ہلاتی ہیں گھٹائیں

دیکر رخِ پژمردہ پہ برسات کی چھینٹیں
سوئے ہوئے سبزے کو جگاتی ہیں گھٹائیں

دل ہے جو کڑک، سانس نسیمِ سحری ہے
گردوں کی دھڑکتی ہوئی چھاتی ہیں گھٹائیں

ہیں جمپئی کرنوں کا سبنھالے ہوئے سہرا
دولھا ہے فلک اور براتی ہیں گھٹائیں

کھلتی ہیں جو آنکھیں تو چھلکتی ہے گلابی
برسات میں کیا نیند کی ماتی ہیں گھٹائیں

ہے قوس کہ پھیلائے ہوئے چرخ پہ بازو
آغوش میں رندوں کو بلاتی ہیں گھٹائیں

گردش میں ہیں پانی پہ حبابوں کے پیالے
دریا کو بھی میخانہ بناتی ہیں گھٹائیں

پھونکوں سے بجھاتی ہے شرارت سے ہوا بھی
جب برق کی قندیل جلاتی ہیں گھٹائیں

جس طرح اڑے ذہن سے طاؤسِ تخیل
یوں بالوں کو کھولے ہوئے جاتی ہیں گھٹائیں

تقویٰ کی سرورش آج حفاظت نہیں ہوتی
آنکھوں میں بھی ڈورے بنی جاتی ہیں گھٹائیں

سرورش ملیح آبادی

"زبانِ غیر کیا آتی نہیں اپنی زباں سے"

جہاں تک ہمیں علم و آگاہی حاصل ہے۔ ہم نہایت وثوق کے ساتھ دعوے زنی کر سکتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ نہایت اہمیت رکھتا ہے زباں دانی کا دارومدار قوتِ بیان اور زورِ تقریر پر منحصر ہے۔ خلاقِ عالم نے قوتِ بیان اور طلاقتِ لسان باشندگانِ دہلی کو بدرجۂ اتم عطا فرمائی ہے۔ اسی بنا پر وہ گھنٹوں تڑاق پڑاق گفتگو کئے جاتے ہیں۔ انہیں اس طرزِ گفتگو پر ناز ہے۔ اور یہی صحیح معنوں میں روزمرہ کہلاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قوتِ بیان ہر زمانے میں ہیبتِ عظمیٰ اور عطیۂ کبریٰ تسلیم کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ نے اپنا اثر قائم کرنے کے لئے جنابِ باری میں التجا کی تھی کہ "بارِ الٰہا! مجھے اپنے بھائی ہارون سے تقویت پہنچا کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے۔" انگلستان کا مشہور شاعر و ادیب گولڈ اسمتھ تحریری مقالات میں معجز نمائی کیا کرتا تھا۔ مگر بوقتِ تقریر طوطے کی طرح ٹیں ٹیں کر کے سامعین کے دلوں پر نفرت و حقارت کے جذبات چلا دیتا تھا۔ قوتِ بیان کی وجہ سے لہجہ بنا رہتا ہے۔ اور روزمرہ شستہ ہو جاتا ہے سرسید علیہ الرحمۃ ہر دو صفات سے متصف تھے اس لئے ان کے متبعین حالی، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد نے آسمانِ شہرت میں چار چاند لگا دئے بہترین انشا پرداز یا شاعر وہی مانا جا سکتا ہے۔ جو برجستہ الفاظ، موزوں محاورات اور شستہ روزمرہ پر کامل دسترس رکھتا ہو ورنہ اس کی زبان روکھی پھیکی اور بے لطف معلوم ہوگی۔ خواہ وہ دہلی کا روڑا ہو یا لکھنؤ کی اینٹ۔ زبان اور طرزِ بیان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مولانا ذکاء اللہ اور سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ کی زبان انشا پردازی کے چٹخارے سے عاری ہے۔ اسی طرح فراق کی زبان اس قدر شیریں و پُر لطف نہیں جیسی مولانا نذیر احمد، راشد الخیری اور مرزا فرحت اللہ بیگ کی مانی جاتی ہے۔ مولانا نذیر احمد بجنوری ہونے کے باوجود نہایت شستہ و برجستہ اردو زبان استعمال کر گئے ہیں۔ اور کمترین کے عندیہ میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بیگماتی محاورات کو اردو سے روشناس کیا ہے۔ زبان کے علاوہ مزاح نگاری میں بھی مولانا نے موصوف نے منشی سجاد حسین کے دوش بدوش گامزنی کی ہے۔ باشندگان لکھنؤ میں رتن ناتھ سرشار، منشی سجاد حسین اور مرزا محمد ہادی رسوا نے شستہ زبان لکھی ہے۔ مابعد کے حضرات میں چکبست لکھنوی اور مولانا نثر نے بھی کافی طور پر زبان کی خدمت کی ہے۔

روزمرہ کا تعلق حروفِ روابط کے صحیح استعمال پر مبنی ہے۔ جس طرح انگریزی زبان میں حروفِ روابط کے صحیح استعمال پر روزمرہ کا دارومدار ہے۔ اسی طرح اردو اور دیگر زبانوں کا تعلق بھی حروفِ روابط کے صحیح استعمال پر منحصر ہے۔ لکھنؤ نے دہلی کی پیروی کا جُوا قبل از وقت اپنے کاندھے سے نکال پھینکا۔ اور کوس لِمَنِ المُلک بجانے لگے۔ اگرچہ ناسخ اور دیگر شعرائے لکھنؤ نے یہ دعوےٰ کیا ہے کہ ع

روزمرہ وہ کہا اہلِ زباں مان گئے

لیکن کمترین کی رائے یہ ہے کہ اہلِ لکھنؤ ناپختگی کی حالت ہی میں دعوائے زباندانی کر بیٹھے۔ کیونکہ آتش، ناسخ اور ان کے ہمعصر شعرائے لکھنؤ نے حروفِ روابط کے صحیح استعمال میں جگہ جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ مثلاً کھلنا یہ لفظ ظاہر ہونا یا معلوم ہونا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا استعمال زمانۂ میر سے تاحال دہلی میں پر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ناسخ اور آتش نے بجائے پہ کھلنا کے کو کھلنا باندھا ہے جیسے

دکھایا آئینہ فکر نے جب صفائے آب درِ سخن کا
دہن کو جوہر کھلا زباں کا۔ زباں کو عقدہ کھلا دہن کا
(آتش)

فنا کے بعد کھلا دل کو عشق کا پردہ
تمام ہو کے ہوئے ہم کمالات واقف
(ناسخ)

تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا (غالب)

بستگی دل کو ہے کیوں زلف گرہ گیر کے ساتھ
کیا سبب کچھ نہیں کھلتا یہ معمہ ہم پر
(ذوق)

کھلا نہ ہم پہ کوئی رازِ دہر صد افسوس
تمام نکتہ شناسوں کو آزما دیکھا (میر تقی)

اب اہلِ لکھنو بھی دہلی کے تتبع میں کو کھلنا کے بجائے پر
کھلنا ہی استعمال کرنے لگے ہیں۔ جیسے

رونے سے میرے کھل گیا عالم پہ دردِ عشق
ہچکی جو آئی منہ سے کلیجہ نکل گیا !!
(شوق قدوائی)

کھلیں گی حشر میں دنیا کی خواہشیں تم پہ
دعائے غیب سے نتیجہ دمِ سحر لیتا (تمنا لکھنوی)

خبر کرنا کے ساتھ اہلِ لکھنؤ سے کا استعمال کرتے ہیں۔ اور
اہلِ دہلی "کو" لکھتے ہیں۔ جیسے

لگا رہا ہوں مضامین تازہ کے انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو (انیس)

کردے خبر اس خانہ برانداز سے کوئی
روتا ہے کہیں درد کی آواز سے کوئی (جلال لکھنوی)

کیونکر خبر کریں گے کسی بے خبر سے ہم
زخمی ہوئے ہیں آپ کے تیرِ نظر سے ہم (خبر الہ آبادی)

خبر ہونے کا ایک استعمال اور ہے۔ جیسے احمد قاسم سے خبر نہ ہوا یعنی واقف نہ ہوا۔ اس محاورے کا استعمال اہلِ دہلی اور لکھنو دونوں نے کیا ہے۔ مگر جدید دور کے شعرا اسے قابلِ ترک سمجھتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:-

ناکارہ جو نہ بیوی سے اب تک خبر ہوا
قربان اس حیا کے نو سال بھر ہوا (جان صاحب)

اگر تدبیر بن پڑی تو چھت کاٹ کر مال اڑا لیں گے۔ اور کوئی خبر نہ ہوگا۔ (سجاد حسین لکھنوی)

لاہور وغیرہ کے حاکموں کی عرضیاں بھی آتی تھیں۔ لیکن کوئی خبر نہ ہوتا تھا۔ (محمد حسین آزاد دہلوی)

صحیح زبان کی جانچ اس وقت بھی کی جاتی ہے جب کسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ مثلاً امیر مینائی نے اپنے دیوان میں جب باب الجیم فارسی میں لفظِ کھینچ بطور ردیف باندھا تو صرف وہی محاورے لئے جو ٹھیٹ اُردو تھے اور زبانوں پر رواں تھے۔ لیکن شوق نیموی بہاری نے جب کھینچ کی ردیف میں غزلیں کہیں تو اس میں فارسی محاوروں کا ترجمہ کر دیا ہے جو اردو زبان پر بار گزرتا ہے۔ جیسے آہ کھینچ۔ نالہ کھینچ۔ زندگی سے ہاتھ کھینچ۔ دار پر کھینچ۔ خود کو اس قدر نہ کھینچ۔ بارِ غم کھینچ۔ انتظار کھینچ۔ سائبان کھینچ۔ آنکھ میں سرمہ کھینچ۔ محنت کھینچ۔ عشقِ گلِ رخسار کھینچ وغیرہ وغیرہ۔ شاید اسی بنا پر ماہر زبان امیر مینائی نے یہ شعر کہا ہے :-

اردو زباں وہی ہے حقیقت میں اے امیر
جس میں کہ فارسی کا کوئی شائبہ نہ ہو

کسی زبان کا محض لفظی ترجمہ کرنے سے کوئی خوبی پیدا نہیں ہوتی۔ چنانچہ مجد الدین فیروز آبادی نے جب قاموس اللغات کی ترتیب و تدوین شروع کی۔ تو حصولِ زبانِ عرف کی غرض سے ایک عرب نژاد عورت کو حبالہ نکاح میں منسلک کیا۔ ایک رات چراغ بجھانے کے لئے عربی میں اُقْتُلِی السِّرَاجَ (چراغ کو قتل کردو) کہا۔ بیوی ہنس پڑی اور کہا اسی برتے پر تتا پانی؟ کیا اسی معلومات کی بنا پر لغات لکھو گے؟ فارسی میں چراغ بجھانے کے معنی میں چراغ را بکُش کہنا صحیح ہے۔ مگر اس کا عربی میں لفظی ترجمہ غلط ہے۔ عربی میں اَطْفِئِ السِّرَاجَ کہتے ہیں جس کے معنی ہیں چراغ بجھا دو۔

مقررہ اصطلاحات کے علاوہ ہر زبان میں مخصوص حروفِ ربط استعمال کئے جاتے ہیں جیسے انگریزی میں اِن دی مارننگ (صبح میں)، عربی میں عَلَى الصَّبَاحِ (صبح پر)، فارسی میں بصبح (صبح کو)، حَیَّ عَلَى الصَّلٰوۃ (نماز پر آؤ) اردو میں نماز کے لئے آؤ کہنا صحیح ہے۔ اسی طرح لفظِ معنی کا استعمال دہلی میں میں کے ساتھ ہوتا ہے۔ عربی، فارسی اور انگریزی میں بھی میں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے لیکن اہلِ لکھنؤ میں کے بجائے پر کا استعمال کرتے ہیں۔ جلال لکھنوی۔ خواجہ عشرت اور صاحب فرہنگ شفق نے ان معنی پر لکھا ہے۔ اکبر الہ آبادی۔ حسرت موہانی۔ ڈپٹی نذیر احمد اور ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے ان معنی میں یا ان معنوں میں تحریر فرمایا ہے۔ اور تو اور خود امیر مینائی نے بھی امیر اللغات میں معنی کے بعد میں ہی کا استعمال کیا ہے۔

بازی لے جانے کا استعمال صرف "سے" کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جیسے ؎

(۱) دخل کیا ہم سے محبت میں جو بازی لے جائے
غیر کے ہاتھ یہ میدان رہا ہے نہ رہے (داغ)

(۲) سب سے آخر کو لے گئی بازی
ایک شائستہ قوم مغرب کی (حالی)

(۳) ذرا انصاف سے کہئے کہ اس طویل عرصے میں ہم نے کوئی فرد ایسا بھی پیدا کیا ہے جو جذبات نگاری میں تیر سے بازی لے گیا ہو۔ (آفسر میرٹھی)

سبقت لیجانے کا استعمال میر امن نے "سے" کے ساتھ کیا ہے۔ مولانا آزاد۔ نذیر احمد۔ راشد الخیری اور پروفیسر نواب علی نے "پر" کے ساتھ کیا ہے۔ سید علی بلگرامی نے "تمدن عرب" میں "سے" کے ساتھ لکھا ہے۔ مگر ہماری رائے میں "پر" کے ساتھ زیادہ صحیح ہے ہاں گوئے سبقت لے جانے کا استعمال "سے" کے ساتھ ہوتا ہے مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) راج معمار بلاؤ جو اس زمین پر شاہانہ عمارت بنائیں کہ طاقِ کسریٰ اور قصرِ نعمان سے سبقت لیجائے۔ (میر امن)

(۲) کبھی مشائیوں سے کرتا تھا میں پیش روی
کبھی لے جاتا تھا اشراقیوں پر میں سبقت (ذوق)

(۳) اگر کلیم بچ جاتا۔ تو وہ نیکی اور دینداری میں اپنے سب بھائی بندوں پر سبقت لے جاتا۔ (نذیر احمد)

(۴) جگر ہوتا ہے ٹکڑے میکشی سے تیری فرقت میں
مئی گلرنگ سبقت لے گئی ہے آبِ آہن پر (آتش)

(۵) معاذ اللہ خدا وند کریم جابر نہیں۔ اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔ (پروفیسر نواب علی)

(۶) جب اور شخصوں کو ان مضامین کا علم ہو جائے گا۔ تو میرے لئے کونسا فخر باقی رہے گا جس کی بنا پر میں اوروں پر سبقت لے جاؤں گا۔ (مولوی ذکاء اللہ)

(۷) اس خصوصیت میں کوئی قوم عربوں سے سبقت نہیں لے جا سکتی۔ (تمدن عرب)

(۸) کارگاہِ عالم میں چند ایسی ہستیاں بھی ہیں جو بظاہر سیدھی سادی اور کم استعداد نظر آتی ہیں لیکن چند ہی سال میں اپنی محنت و جفاکشی کے بل بوتے پر اوروں سے گوئے سبقت لے جاتی ہیں۔ (کوثر چاندپوری)

لفظِ مجاز کا استعمال اردو میں اس طرح ہوتا ہے۔ جیسے وہ آنے کا مجاز نہیں۔ تم جانے کے مجاز نہیں بعض اشخاص اس کا غلط استعمال کرتے ہیں جیسے مجھے آنے کا مجاز ہے تمہیں جانے کا مجاز نہیں۔ پہلا استعمال صحیح ہے۔ اور اس کو مستندینِ زبان نے مسلّم مانا ہے ہر دو اقسام کی مثالیں درج ذیل ہیں

(۱) دل کی بری بھلی کو سمجھ لے پیامبر
کیا دخل دیں کہ اس کے نہیں ہیں مجاز ہم (داغ)

(۲) میں آپ سے کچھ علیحدہ کہنا چاہتا ہوں۔ تاکہ آپ سمجھ لیں کہ میں راز ظاہر کرنے کا مجاز ہوں یا نہیں (حرم سرا)

(۳) اپنے ذاتی معاملات میں ہم کو مجاز نہیں کہ جو چاہیں کریں۔
(ساقی نومبر ۴۲ء)

(۴) ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ مختارِ مذکور میری جانب سے عدالتی یا غیر عدالتی کارروائی کرنے کا مجاز ہے (سید جالب دہلوی)

(۵) اس لاج میں صرف وہی اشخاص شریک ہو سکتے ہیں۔ جو روح کی موزونیت کے لحاظ سے مجاز ہوں (شرر)

(۶) یہ سُن کر زباد کو غصہ آیا۔ اور کہا "قاضی صاحب! مقدمہ چلائیے۔ آپ کو زیادہ گفتگو کرنے کا مجاز نہیں ہے" (مرزا حیرت)

لفظِ مانع کے ساتھ حسب موقع و محل کا۔ کو۔ سے۔ میں کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے

(سے) جو امر حیرت کا موجب تھا۔ وہی ان کو کلیم کے روکنے سے مانع تھا۔ (نذیر احمد)

(کی) اس کی پابندی اور سخت گیری اس کی ترقی کی مانع ہے۔ (سر سید)

(سے) بادشاہِ وقت اس راز کے اظہار سے مانع ہوا۔
(ناصر نذیر فراق)

(کو) حاجت اُس کو صدرِ اعظم کے پاس جانے پر مجبور کرتی تھی لیکن اختلافِ رائے اس کو مانع تھی۔ (نذیر احمد)

(سے) آنحضرت صلعم نے اس خیال سے کہ قریش مکے کی زیارت سے مانع ہوں گے دیدہ و دانستہ ان کی رائے کے مطابق کام کیا۔ (مرزا حیرت دہلوی)

(میں) وہ اشخاص جو ہماری بیش بہا جانوں کی حفاظت میں مانع آتے ہیں۔ (سید جالب دہلوی)

دکو) لیکن مسلمانوں کے بڑھے ہوئے جوش کو کوئی چیز
مانع نہ ہوئی۔ (پروفیسر نواب علی)

(سے) دل لگا کر آپ بھی غالبؔ ہمیں سے ہوگئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب ہمیں (غالبؔ)

(کا) اختلافِ عقائد ایک ایسا امر تھا کہ وہ دلوں میں
اتحاد پیدا کرنے کا مانع تھا۔ (ہماری زبان)

لفظ درشن کا استعمال اردو والے واحد و جمع دونوں طرح کرتے ہیں۔ ہندی زبان جاننے والے صرف جمع میں استعمال کرتے ہیں۔ آج کل جمہور کا رجحان جمع کی جانب نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ بھاشا کا لفظ ہے اور بھاشا کے پنڈت یا کبیشر اس کا استعمال جمع ہی میں کرتے ہیں۔ اس لئے ہماری رائے میں اردو میں بھی بحالتِ جمع استعمال کرنا ہی اولیٰ و انسب ہوگا۔ مثالیں ملاحظہ فرمایئے :-

(۱) شیخ کو تصویر عنایت ہوئی۔ اس نے سامنے کھونٹی سے لٹکا دی۔ جب جی چاہا درشن کر لئے (سجاد حسین)

(۲) کفارِ عرب میلے میں جمع ہوتے تھے۔ اور بتوں کا درشن کرتے تھے۔ (پروفیسر نواب علی)

(۳) خانِ خاناں امیروں سے سوا فقیروں کے یار تھے۔ ان کی سرکار میں جوگی جی کے بھی درشن ہوئے۔ (آزاد دہلوی)

(۴) مندر کے پجاری اس مورتی کو بے نقاب کرتے اور جاتریوں کو درشن کرائے جاتے۔ (بیانِ نیپال از سید طالب دہلوی)

(۵) تجلی روزنِ دل سے عیاں ہے
جھروکے سے ہوا درشن کسی کا (داغ دہلوی)

(۶) بزمِ تیموری برہم ہونے کے بعد ۱۹۱۱ء میں لال قلعہ کو یہ فخر حاصل ہوا کہ مہابلی نے رعایا کو اپنے درشن دئے۔
(ناصر نذیر فراق دہلوی)

(۷) تا بسط جی پردیس سدھارے، میں تڑپوں دین رین
ان کے درشن کیسے پاؤں، ترسیں دونوں نین [تابسط مبتلا]

لفظِ ماہر کا استعمال حسبِ موقع و محل **کا۔ سے۔ میں** کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جیسے

کا۔ ولی نے ایسی غزلیں کہی ہیں۔ جن کی ردیف دستا ہے مجھ پر اس کے معنی منکشف نہ ہوئے۔ جو زبانِ ہند کا ماہر ہو وہ جانتا ہوگا۔ (امام بخش صہبائی)

میں۔ فن تاریخ میں جو ماہر ہے اس پہ یہ راز خوب ظاہر ہے۔ (نظم طباطبائی)

سے۔ دیکھتے ہی شکلِ رازِ دل سے ماہر ہوگئے
پھر نہ وہ ٹالے ٹلے جس بات کے سر ہوگئے (داغ دہلوی)

کے۔ ڈاکٹر منظور احمد عربی اور جرمن زبان کے بہت اچھے ماہر تھے۔ (ہماری زبان دہلی)

میں۔ یہ عیسائی خاتون علمِ نباتات میں بڑی ماہر تھیں۔ (مرزا عظیم بیگ چغتائی)

سے۔ بڑے بڑے شاعر اس فن سے ماہر تھے جو تاریخ نکالنے میں بے حد مغز پاشی کرتے تھے۔ (نثار علی شہرت)

کے۔ یہ عشق کے فن کے ماہر ہیں
ان سے پوچھو تم کیا جانو (اثر لکھنوی)

سے۔ میں جانتا ہوں کہ بعض مصنفین جو اردو زبان سے ماہر نہ تھے۔ انہوں نے عربی کی پیروی کی ہے (محو بہ عشرت)

رشک و حسد کرنا کے ساتھ عموماً **پر** کا استعمال ہوتا ہے مگر بعض حضرات **سے** بھی لکھ جاتے ہیں۔ ہماری رائے میں بغض یا دشمنی کے معنوں میں **سے** کا استعمال ہی صحیح ہے۔ جیسے اس کو مجھ سے حسد ہے۔ یا احمد کو قاسم سے رشک ہے۔ لیکن احمد قاسم پر جلتا ہے۔ یا اس کا برا چاہتا ہے ان معنوں میں **پر** کا استعمال صحیح ہے۔ جیسے وہ مجھ پر رشک کرتا ہے یا احمد محمود پر حسد کرتا ہے۔

(۱) مجھے آتا ہے رشک اس رندِ آشام پر ساقی
نہ جو دعِ ماکدر سمجھے نہ جو خذ ما صفا جانے (ذوق)

(۲) اگر دشمن کو مجھ پر حسد ہوتا ہے تو ہوا کرے میں اس کی پروا نہیں کرتا (نذیر احمد)

(۳) رشک ہے دشمن کو میرے طالعِ بیدار پر (آتش)

(۴) اگر اسے مجھ پر حسد ہوتا تو وہ میرے بال بچوں کو اچھے کپڑے پہنے دیکھ کر کیوں باغ باغ [illegible] (رضیہ اختری)

(۵) پھر مجھ کو رشک ہے اسی مستِ مدام پر
جس کی کبھی کشتی نہیں موقوف جام پر (آزاد دہلوی)

(۶) جو حسد کسی کو تجھ پر ہو تو ہے یہ تیری خوبی
کہ جو تو نہ خوب ہوتا تو وہ کیوں حسود تھا (ذوق)

چونکہ مرزا داغ۔ احمدی بیگم حفیظ جالندھری وغیرہ نے

رشک و حسد کے ساتھ "سے" کا استعمال کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید دہلی میں اس کا رواج ہو چلا ہے جیسے

(۱) اہلِ جنت کو بھی آیا اس سے رشک
جس کسی نے دل میں گھر پیدا کیا (داغ)

(۲) اگر وہ اپنے بھائی سے حسد نہ کرتا۔ تو اس کا یہ حال ہرگز نہ ہوتا۔ (احمدی بیگم)

(۳) یہ ہے وہ شخص جس نے میرے شوہر کو قتل کیا۔ اور اس سے دل میں حسد کرتا تھا۔ (حفیظ جالندھری)

(۴) وہ اپنے مغرور ہمسائے سے حسد کرنے لگے (انیا چیچی)

ظاہر ہونا۔ روشن ہونا۔ منکشف ہونا کے ساتھ پر کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:۔

(۱) ولی نے ایسی غزلیں کہی ہیں جن کی ردیف دِشتا ہے۔ مگر مجھ پر اس کے معنی منکشف نہ ہوئے (امام بخش صہبائی)

(۲) حضور پر روشن ہے۔ کہ لشکرِ منصور کے اس قدر قیام کرنے سے ملک آشیانہ چغد و بوم ہو گیا ہے (آزاد دہلوی)

(۳) تری تو ذات پہ روشن ہے جزو کل کا حال
بھلا ہے پردے میں رکھئے مرے جنوں کا خیال (سودا)

(۴) ابن الوقت نے نوبل صاحب کا حال کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ (نذیر احمد)

(۵) فلورا دل ہی دل میں گھلتی رہی لیکن اصل راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ (مرزا ناصر)

(۶) فنِ تاریخ میں جو ماہر ہے۔ اس پہ یہ راز خوب ظاہر ہے۔ (نظم طباطبائی)

لفظِ مقدم کے ساتھ کبھی پر لگایا جاتا ہے۔ اور کبھی سے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے:۔

(۱) مقدم صدق پر ہے کذب گو ظاہر میں فائق ہے
کہ پہلے صبح کاذب بعد اس کے صبحِ صادق ہے (ذوق)

(۲) روئے انور سے مقدم ہے تری زلفِ سیاہ
عید کے روز سے اول رمضان کی شب ہے (آتش)

(۳) جن لوگوں نے روزمرہ کی پابندی کو سب سے مقدم سمجھا ہے۔ ان کے کلام میں بھی زبان کی لغزشیں پائی جاتی ہیں (حالی)

(۴) ان سے بڑھ کر کون زُہد کرے گا۔ جنھوں نے احتیاطاً اپنی حاجتوں پر دوسروں کی حاجتوں کو مقدم سمجھا۔ (نذیر احمد)

(۶) گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا
بندے سے مگر ہوگا حق کیونکر ادا تیرا (حامی)

(۷) مزاج کی موافقت اور خیالات کی یکسانیت پر خواہشوں اور ارادوں کا میل سب سے مقدم ہے۔ (راشد الخیری)

(۸) میں اس لئے بیاہی گئی ہوں۔ کہ شوہر کی آسائش کو اپنی آسائش پر مقدم سمجھوں۔ (بنت الوقت)

لفظِ شاق کا استعمال کو اور پر کے ساتھ کیا جاتا ہے میرے خیال میں پر کا استعمال قابلِ ترجیح ہے۔

(۱) شاق کیونکر نہ ہو عاشق کو جدائی تیری (آتش)

(۲) باپ کی رضامندی اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ اور ایک ایک لمحہ اس پر شاق تھا۔ (نذیر احمد)

(۳) لڑکی کا آزادانہ پھرنا مجھ پر بعید شاق گزرتا تھا (راشد الخیری)

لفظِ فائق کا استعمال پر اور سے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جیسے:۔

(۱) عورت کا جذبہ تاجِ شاہی سے فائق ہے (راشد الخیری)

(۲) بھاشا اصلی حالت کے ادا کرنے میں کل زبانوں پر فائق ہے۔ (آزاد دہلوی)

(۳) عبث فوق دیتا ہے خود کو تو ناداں
کیا اس نے ہر اک پہ انساں کو فائق (امتد)

(۴) چونکہ انساں ہے سب پہ فائق
مشہور ہے اشرف الخلائق (محمد اسمٰعیل)

لفظِ باہر کا استعمال کے اور سے کے ساتھ ہوتا ہے ان دونوں کے محلِ استعمال جدا جدا ہیں مثلاً:۔
اندر سے باہر نکلنے کے لئے سے کا استعمال کرتے ہیں جیسے:۔ وہ یکایک گھر سے باہر نکلا۔ اور معمولی حالت میں کے لگاتے ہیں۔ جیسے ہم رات بھر شہر کے باہر رہے۔
یہ بات خیال میں رکھنے کے قابل ہے کہ نکلنے اور جانے کے معنوں میں اس کا استعمال سے کے ساتھ ہی صحیح ہے جیسے وہ کبھی باغ سے باہر نہیں جاتا۔ اہلِ لکھنؤ ہر حالت میں کے کا استعمال کرتے ہیں۔ مگر عقل سے باہر۔ سمجھ سے باہر۔ طاقت یا بوتے سے باہر۔ آپے سے باہر۔ جامے سے باہر۔ بیان سے باہر۔ ان جملہ محاورات میں سے کا استعمال ہی صحیح ہے۔ مثالیں درج ذیل ہیں:۔

(۱) حکم ہوا کہ شہر کے باہر ایک شامیانہ کھڑا کیا جائے اور تمام بڑے بڑے سردار بلائے جائیں (آزاد دہلوی)

(۲) آپ بھی فرطِ غضب سے آپ سے باہر ہوئے
کر چکے تلوار کو جب میان سے باہر حسین (نوح ناروی)

(۳) ہفتاد و دو فرقۂ حسد کے عدد سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حساب سے ہیں (ذوق)

(۴) محلے والوں نے لاکھ سر مارا۔ مگر ایک نہ مانی۔ اور بستی کے باہر ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا لی (سجاد حسین)

(۵) چاندنی میں بھی نکلتی تھیں نہ جو سیدانیاں
کھینچ لایا غم انہیں پردے سے باہر دھوپ میں (نوح ناروی)

(۶) مولوی مظہر علی صاحب لاہور میں اس کو دروازے کے باہر بچانے گئے۔ (اردوئے دلی)

(۷) بادشاہ کے حکم سے شہر کے باہر بہت دور ایک عالیشان مکان ضروری سامان سے آراستہ کیا (آزاد دہلوی)

(۸) باہر قدم نکالیں جو ہم گھر سے کیا مجال
یہ خوف ہے کہ آپ سے باہر نہ ہو سکیں (ناسخ)

(۹) وہ ایک پیڑول ہے جو ہماری دسترس اور اختیار سے باہر ہے۔ (ناصر نذیر فراق دہلوی)

(۱۰) کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی (غالب دہلوی)

آفریں اور شاباش کے ساتھ پر اور کو دونوں حروفِ ربط کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے:۔

کو شاباش:۔ مجھے قبر میں بلی کے بچے کی خبر ہو جاتی تو ہرگز نہ لینے دیتی۔ وہیں بچہ کو آتی۔ اللہ رے دیدہ تیرا قبر میں گھس کر بچہ لائی۔ شاباش ہے تجھ کو۔ (ناصر نذیر فراق دہلوی)

کو آفریں:۔ آزاد آفریں ترے لطفِ زبان کو
لے کروٹ اب ہی رات دن آسمان کو (آزاد دہلوی)

" حیرت اس پر ہے کہ جس میں شانِ خودداری نہیں
آفریں اس کو جو کوئی عشق میں رسوا ہوا (نوح ناروی)

کو شاباش۔ شاباش ہے تجھ کو کہ اتنے دنوں کی محبت خاک میں ملا دی (راشد الخیری)

پر آفریں۔ یہ سن کر بادشاہ حیران ہوا۔ اور تمام اہلِ دربار نے عورت کی مردانہ ہمت پر آفریں کی۔ (آزاد دہلوی)

پر آفریں:۔ حسرت تری شگفتہ بیانی پر آفریں (حسرت موہانی)
" مگر آفریں ہے ہندوستان کے سنگ تراشوں پر جو سنگِ خارا پر ایسی تصویریں بناتے ہیں۔ جو بہزاد و مانی کو پرے بٹھاتی ہیں۔ (ناصر نذیر فراق دہلوی)

کو آفریں۔ نہیں جچتا کوئی حسیں تم کو
آفریں ہے صد آفریں تم کو (داغ دہلوی)

" نہ اک آہ کی زخم سو سو اٹھائے
تجھے آفریں ذوق صد آفریں ہے (ذوق)

پر شاباش۔ شاباش ہے تمہاری ملکرامی پر کہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ (ناصر نذیر فراق)

پر شاباش۔ میاں نے بیوی سے کہا۔ " شاباش ہے تیری عقلمندی پر کہ اس وقت کمال ہی کر دیا ہے (راشد الخیری)

شاباش کہنا کے ساتھ حرف پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے:۔ اس کا خیال تھا۔ کہ اس فیصلے پر نواب صاحب شاباش کہیں گے۔ (سجاد حسین)

تحسین کے ساتھ پر کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے:۔
جن حضرات کو کچھ مذاق ہے وہ سمجھ جائیں گے۔ اور حضرت میر درد کے کلام پر کمال تحسین کریں گے (ناصر نذیر فراق دہلوی)

فوقیت لے جانا۔ فوق لے جانا۔ فضیلت لے جانا شرف لے جانا کا استعمال پر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں سید احمد دہلوی نے ان مصادر کے استعمال کی ایک مثال بھی تحریر نہیں کی۔ تاکہ کم از کم مطالعہ کنندگان ان کے ساتھ استعمال ہونے والے حرفِ ربط سے واقف ہو جاتے مثالیں ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) ہاتھی کی جھول اس قدر نفیس اور دیگر ساز و سامان اس قدر قیمتی ہوتا ہے۔ کہ اس کی زیب و زینت پر کوئی چیز فوق نہیں لے جا سکتی (سفر نامہ برنیئر)

(۲) چند طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جو ذکاوتِ طبع اور حسنِ بیان کی بدولت دوسروں پر فوقیت لے جاتی ہیں۔ (دیباچہ طوفانِ نوح)

---

(۳) ع سب کے مضموں پر مرے مضموں فضیلت لے گئے (ناسخ)

(۴) گل پر شرف ترا گلِ خوش رنگ لے گیا (آتش)

(۵) اب تفوق ہے مجھ کو جہاں پر لے گئی فوق تو آسمان پر (نظم طباطبائی)

نوٹ: تفوق ہونا۔ فضیلت ہونا۔ شرف ہونا کے ساتھ بھی پر ہی کا استعمال ہوتا ہے جیسے :-

(۱) احمد کو قاسم پر تفوق ہے (۲) عالم کو جاہل پر فضیلت ہے (۳) حرمین شریفین کو جملہ بلادِ عالم پر شرف حاصل ہے۔

ہنسنا اور رونا: ہنسنا کے ساتھ پر آتا ہے۔ اور رونا کے ساتھ کو لکھا جاتا ہے۔ جیسے :-

ہم دشمنوں پر ہنستے ہیں۔ لوگ اپنے خویش و اقارب کو روتے ہیں

ناسخ و آتش نے جن کا روزمرہ کامل تھا۔ بجائے پر ہنسنے کے سے ہنسنا یا کو ہنسنا باندھا ہے۔ حالانکہ ان کے اُستاد مصحفی نے پر ہنسنے کا استعمال کیا ہے۔ چند مثالیں درجِ ذیل کی جاتی ہیں :-

(۱) فلک جب کسی کو ہنساتا ہے مجھ پر
میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں (مصحفی)

(۲) لگا اک وار پورا ہے جگر حسرت کی اے قاتل
تری تلوار پر ہر بادہانِ زخم ہنستا ہے (ذوق دہلوی)

(۳) میری ناکامی پہ کیوں ہنستا ہے غیر
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے (غالب دہلوی)

(۴) جو روئے حال پہ اپنے وہ کیا کسی کو ہنسے
وہ دل دکھائے کسی کا جو دردمند نہ ہو (آتش)

(۵) غنچۂ گل کو نہ ہنسنا تھا تری صورت سے (پر)
چھوٹے سے منہ کو سزاوار نہیں یہ باتیں (آتش)

(۶) ہنسی آتی ہے اس گل کو ہماری اشکباری سے (پر)
کہیں شمشاد بھی کرتے ہیں وحشت نہر جاری سے (ناسخ)

(۷) خود ہنستے ہیں اغیار سے ہنسواتے ہیں مجھ کو
یہ زورِ ہنسی ہے کہ رلا جاتے ہیں مجھ کو (ناسخ)

(۸) جو لوگ اوروں کی عادات و اطوار پر ہنستے ہیں۔ وہ موردِ طعن و تشنیع ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ (ذکاء اللہ دہلوی)

مثال نمبر (۷) کا شعر روزمرہ دہلی کے مطابق نہیں ہے۔ سچ پوچھا جائے۔ تو روزمرۂ دہلی کے مطابق مصرعہ اولیٰ اس طرح چاہئے تھا۔ ع

خود ہنستے ہو اغیار کو ہنسواتے ہو مجھ پر۔

جس طرح ہنسنا کے ساتھ پر آتا ہے۔ اسی طرح رونا کے ساتھ کو باندھا جاتا ہے۔ جیسے :-

کیوں نہ ہم روئیں مقدر کی پریشانی کو
کیا یہ گیسو ہے تمہارا کہ سنور جائے گا (داغ)

کھل گئیں آنکھیں جو سر پہ صبحِ پیری آگئی
عمر بھر اس کھیل کو اس نیند کو رویا کیئے

کسی کی بدنصیبی یا حسرت پر رونے کے معنوں میں پر ہی کا استعمال زیادہ انسب مانا جاتا ہے۔ جیسے :-

حسرت پہ اس مسافرِ بےکس کی روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے (جلیل)

"کے" کا استعمال: کے بمعنی کو عام طور پر دہلی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے :

کسی کے چوٹ لگنا۔ یا کسی کے زخم آنا وغیرہ۔ نظم طباطبائی نے ۱۹۱۲ء کے الناظر کے ایک پرچہ میں عنترہ بن شداد کی ایک نظم کی تشریح کرتے وقت اس کے ایک عربی شعر کا اس طرح ترجمہ کیا ہے :-

(اصل شعر) فَطَعَنْتُہُ بِالرُّمْحِ ثُمَّ عَلَوْتُہُ
بِمُہَنَّدٍ صَافِی الْحَدِیْدَۃِ مِخْذَمِ

(ترجمہ) میں نے ایک برچھی اسے ماری۔ پھر شمشیر ہندی کھینچے ہوئے اس پر جا پڑا۔

اہلِ دہلی اسے ماری کے بجائے اُس کے ماری لکھتے اور بولتے ہیں۔ اسی طرح مجھے یا مجھ کو کے بجائے میرے۔ تجھے یا تجھ کو کے بجائے تیرے۔ تمہیں یا تم کو کے بجائے تمہارے ہمیں اور ہم کو کے بجائے ہمارے تحریر و تقریر میں استعمال کرتے ہیں۔ آتش۔ ناسخ۔ غالب اور ذوق اس کے سختی سے پابند نہ تھے۔ لیکن مابعد کے شعرا اور انشاپردازوں نے اس کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ جیسے :-

(۱) نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی تیغ کسی پر کسی کے آن لگی (دیا شنکر نسیم)

(۲) کیا خوشنما ہے سبزۂ خط گرد خال کے
بیٹھے ہوئے ہیں خضر جنابِ بلال کے (جلیل)

(۳) صلوبن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اس نام کے سنتے ہی میرے آگ لگ گئی (مرزا رسوا)

(۴) راستے ہی میں میرے لڑکی پیدا ہوئی پھر نہیں معلوم کیا ہوا۔ (ناولِ نیک انجام)

(۵) اگر زچہ کے دودھ نہ اُترے تو اُسے ستاور پھنکائی جاتی ہے۔ (راشد الخیری)

(۶) ہنس ہنس کے مجھ کو دیکھ کے وہ پوچھتے ہیں داغ
کم بخت کوئی چوٹ تو تیرے لگی نہیں! (داغ)

(۷) لیکن شکر ہے کہ ہمارے کوئی بھاری چوٹ نہیں لگی۔ (رسوم دہلی)

(۸) جناب سیدہ نے عرض کیا: "میرے درد ہے۔" (الزہرا)

(۹) لیلی کے چیچک نکلی تھی۔ وہ اب اچھی ہیں۔ حور بانو کے آج نکلنی شروع ہوئی ہے (حسن نظامی)

(۱۰) اس کے گرمی دانے نکل آئے ہیں (راشد الخیری)

(۱۱) اگرچہ عورت کے داڑھی نہیں ہوتی۔ تاہم گردن کی زیادہ چربی جبڑوں اور دانتوں کی حفاظت کرتی ہے (سید قابل دہلوی)

طرف کا محلِ استعمال: طرف سے پہلے یعنی دہنے جانب اگر کوئی اضافی لفظ آئے۔ تو حرف "کی" کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے:۔ گھر کی طرف۔ باغ کی طرف۔ میری طرف ہماری طرف۔ لیکن طرف کے ماقبل دہنا۔ بایاں۔ دونوں۔ چاروں دوسرے۔ تیسرے وغیرہ الفاظ ہوں تو کی کے بجائے کے لگایا جاتا ہے جیسے:۔ گھر کے دونوں طرف۔ باغ کے چاروں طرف وغیرہ۔

دوسری مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) اس قصبے کے دوسری طرف گھاٹ کے کنارے موضع سوتانہ واقع ہے۔ (عزیز مرزا)

(۲) تصورِ آسماں کے اس طرف اک گیت گاتا ہے
تمہیں اور مجھ کو اس دھن کوئی نغمہ سناتا ہے
(سلام مچھلی شہری)

(۳) اس وقت ہمارے چاروں طرف کوئی دیوار نہیں ہے ہم چمن میں پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں (ناصر نذیر فراق دہلوی)

(۴) زمین کا وہ قطعہ جس کے دونوں طرف بحیرہ روم لہریں لے رہا تھا۔ (آفتابِ دمشق)

(۵) جھیل کے چاروں طرف جس طرح آتے تھے نظر
زیر و بالا۔ اونچے نیچے گھر قطار اندر قطار (حالی)

(۶) برات کے دونوں طرف بتیوں کی روشنی۔ فتابوں کی چمک اور کنولوں کی جگ مگ جگ مگ عجب بہار دکھا رہی تھی (رشید احمد دہلوی)

(۷) دیکھتے کیا ہیں کہ انگریزوں کے بائیں طرف کچھ لاشیں تڑپتی پڑی ہیں۔ (نذیر احمد)

(۸) بعض لوگ فرش پر اور بعض برآمدے کے دائیں طرف ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ (آزاد دہلوی)

کرائے کو لینا۔ کرائے پر لینا۔ زمانۂ قدیم میں صرف کرائے لینا مستعمل تھا۔ بعد ازاں پھر یہ لینا استعمال میں آیا پھر کرائے کو لینا جاری ہوا۔ اور موجودہ زمانے میں کرائے پر لینا صحیح مانا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بلحاظ روزمرہ حروفِ ربط کے استعمال میں ہمیشہ فرق ہوتا رہتا ہے مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) دوسرے دن پاکیزہ کپڑے کرائے منگوا پہن کر اس کے گھر گیا۔ دیکھتے ہی اس نے تعظیم کی۔ (خرد افروز اردو)

(۲) کرائے رہنے کو سودائے زلف میں بننے
کوئی جو حلقۂ زنجیر میں مکاں ہوتا (ناسخ)

(۳) یہ کون رام کرن ماماڑی؟ یہ صاحب انہیں کی دکان میں کرایہ رہتے ہیں۔ (سجاد حسین)

(۴) مقدور والوں نے سو سو دو دو سو روپے دے کر مکان کرائے کو لئے (پھول والوں کی سیر)

(۵) وہ مجھ سے لیں عوضِ نقدِ بوسہ۔ خانۂ دل
کرائے پر جو ہو منظور ان کو گھر لینا
(شمشاد لکھنوی)

اہلِ دہلی **کف** اور **جھاگ** کا استعمال جمع میں کرتے ہیں لیکن اہلِ لکھنو ہر دو الفاظ واحد میں لکھتے ہیں ہر دو امثال ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) فردوسی تھوڑی دیر تلی کی نظر سے نظر بچرائے رہی۔ آخر اسے تاب نہ ہوئی۔ بیہوش ہو کر گری اور اس کے منہ میں جھاگ آ گئے۔ (ناصر نذیر فراق دہلوی)

(۲) لڑکی کے منہ سے کف جاری تھے۔ اور غشی کی انتہائی کیفیت اس کے چہرے پر طاری تھی (افضلِ حق قریشی)

(۳) کتے کے منہ سے گو بجلی آنا زبر آمد ہوتی ہے۔ اور جھاگ باہر نکل آتے ہیں۔ (سرسید)

(۴) "مسٹر آنند بولیں بخار زیادہ چڑھا ہے سانس اکھڑا اکھڑا آ رہا ہے۔ شاید کف جم گئے ہیں"۔

(۵) مسلسل چیختے چیختے بڑھیا کے منہ میں کف آگئے۔
(تمغۂ شیطانی)

(۶) غصہ ور آدمی کی باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ اور سانس جلد جلد چلنے لگتا ہے (سر سید)

(۷) قلزم کے بدن میں لگ گئی آگ
منہ پر غصے سے آگیا جھاگ (جوالا پرشاد برق)

(۸) حسین کی درخواست سنتے ہی شیخ کو جلال آگیا۔ اور منہ میں کف بھر آیا۔ (فردوس بریں)

یقین۔ اعتبار۔ بھروسہ۔ گھمنڈ۔ اعتماد کا استعمال پر اور کا کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسے:۔

(۱) ان کو ہے حسن پر گھمنڈ مجھ کو ہے عجز پر گھمنڈ (نوح ناروی)

(۲) گھمنڈ تھا مجھے جن جن کا سب وہ بھاگ گئے
حواس و ہوش و شکیب و قرار بے تیرے (حبیب علی سحر)

(۳) ہیمیو بقال اپنے فدائیوں کی فوج اور تین سو ہاتھی لئے کھڑا تھا۔ اسے اپنی فوج کا بڑا گھمنڈ تھا۔ (آزاد دہلوی)

(۴) مری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیر باقی
انہیں مرنے ہی کا اب تک نہیں اعتبار ہوتا (امیر مینائی)

(۵) جہاں میں اپنا کسی کو کبھی رازدار نہ کر
یہ بیوفا ہے زمانے پہ اعتبار نہ کر (آغا شاعر)

(۶) میں نے تمہارے لئے اپنی ہستی مٹا ڈالی۔ آخر مجھ پر بھروسہ نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ (رشد الخیری)

(۷) مجھے اس کی ہمدردیوں پر یقین ہے۔
قسم کھا رہا ہے غم جاوداں سے (قمر زیدی)

(۸) مانا کہ ابا جان نے میری غلطیاں معاف کرنے کی ٹھان لی ہے لیکن مجھے اس کا یقین نہیں آتا۔ (نذیر احمد)

۹. نہ مجھے یقین کسی کا نہ ہے اعتماد ان پر
وہ ہزار جاں سے چاہیں نہیں دل کو صبر آتا (ظہیر دہلوی)

کونین:۔ لفظ کونین کا استعمال اہل دہلی اور متبعین دہلی جمع کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر جگر مراد آبادی نے اسے مونث باندھا ہے جیسے

(۱) کیوں نہ گھر بیٹھے ہمیں انجمن آرائی ہو
دل کے ہر گوشے میں کونین سمٹ آئی ہو (جگر مراد آبادی)

(۲) کونین جس کے ناز سے جکڑے ہوئے ہیں داغ
میں ہوں نیاز مند اسی بے نیاز کا (داغ)

(۳) کونین میرے آگے حاضر ہیں سر خمیدہ
کیا ہے مری نظر کے انداز بلیغ بیں (سیماب)

لیل و نہار کا استعمال جمع میں کیا جاتا ہے۔ جیسے:۔

(۱) اگر یہی لیل و نہار ہیں تو بس قصہ ہی پاک ہے۔
(فسانۂ عجائب)

(۲) جب سے ترے رخ و گیسو کا تصور ہے مجھے
عیش و آرام سے کٹتے ہیں مرے لیل و نہار (حشمت لکھنوی)

(۳) نہ شام قبر کی وحشت نہ صبح حشر کا ہول
فراق یار کے لیل و نہار دیکھ چکے (بحر)

رمضان اور محرم کا استعمال عموماً واحد کے ساتھ ہوتا ہے کبھی کبھی عزت و حرمت کے لحاظ سے رمضان کو جمع کی حالت میں بھی لکھتے ہیں۔ مگر محرم کا استعمال واحد ہی میں ہوتا ہے جیسے

ریل نے دو دن میں پہنچایا رمضان ایک دن کے بعد آیا
(۱) لوگ سب سحریاں مناتے ہیں رمضان مجھ کو کھائے جاتے ہیں (داغ)

(۲) گرمی کے موسم میں رمضان شریف آگئے۔ تو پھر ان کی جان پر آ بنتی ہے (ناصر نذیر فراق)

(۳) جب کہ رمضان آتا ہے۔ تو دو دو مائیں کام کرنے کے لئے رکھ لی جاتی ہیں۔ (راشد الخیری)

(۴) حسرت موہانی نے قید و بند کی حالت میں رمضان جیل میں گزارا۔ (علی گڑھ میگزین)

(۵) اب کے دسہرے میں محرم آ پڑا ہے۔ دیکھئے کیسی گزرے۔
(مدینہ بجنور)

(۶) لوگ لوٹے جاتے تھے کہ شہید کربلا کا واسطہ۔ آحمد ی مصطفےٰ کا صدقہ ہمیں لکھنو کا محرم دکھا دو (رتن ناتھ سرشار)

اہل زبان سے جب کسی مکان کے تبدیل کرنے کے بارے میں پوچھا جائے کہ فلاں شخص تبدیل مکان کر کے کہاں گئے ہیں؟ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ وہ اس مکان سے یا محلے سے اٹھ گئے ہیں یا دوسرے مکان میں اٹھ آئے ہیں۔ یہ بالکل سچی کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی بات ہے۔ ان کی مثالیں کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں جیسے:۔

(۱) میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں۔ بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرائے کی لے کر رہتا ہوں (اردوئے معلی غالب)

(۲) میں نے اسی محلے میں خاصہ مکان لے رکھا ہے۔ شام ہوتے

نی وہاں اٹھ جائیں گے۔ (سجاد حسین)

اہل زبان اس کو قمیص، جبہ وغیرہ جسم میں پہننے کے بجائے گلے میں پہننا، گلے میں ڈالنا یا بدن کے معنوں میں مرف گلے میں وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے :

(۱) ڈالی ادھر گلے میں اُدھر پڑ گئے ہو گئی
اس رشک ماہ نے پہنی قبا نے کتاں عجب (ناسخ)

(۲) اگلے برس کی کرتی گلے میں ہے اس میں گرمی کہاں بدوسری کرتی بازار سے خرید لو (راشد الخیری)

(۳) اتنے میں مرزا صاحب اس ہیئتِ کذائی کے ساتھ برآمد ہوئے گلے میں ڈھیلا ڈھالا کرتہ۔ ٹانگوں میں چوڑا پاجامہ۔ پاؤں میں ہلکی سی کٹ پاتیاں (نذیر احمد)

(۴) سر پر ٹوپی نہ گلے میں انگرکھا۔ آنشا آخری عمر میں صرف ایک مرزائی اور گمشتا پہنتے تھے۔ (آبِ حیات)

(۵) جمنا داس کی دھوتی اور پگڑی تار تار تھی گلے میں پھٹا ہوا کرتہ تھا۔ (ناصر نذیر فراق)

اہلِ دہلی مندرجہ ذیل الفاظ کا استعمال جمع میں کرتے ہیں یعنی دوسرے لفظ کے ساتھ جمع کی نشانی لگا دی جاتی ہے اور حروفِ ربط لگانے کے بعد صرف دوسرے لفظ کی جمع کی جاتی ہے۔ جیسے :-

بہو بیٹیاں۔ ساس نندیں۔ جڑی بوٹیاں۔ میز کرسیاں۔ لونڈی باندیاں۔ گائے بھینسیں۔ بھیڑ بکریاں۔ وغیرہ۔

حروفِ ربط لگانے کے بعد مندرجہ بالا الفاظ اس طرح لکھے جاتے ہیں جڑی بوٹیوں کا۔ بھیڑ بکریوں سے۔ لونڈی باندیوں پر۔ میز کرسیوں سے۔ گائے بھینسوں میں۔ تعویذ گنڈوں میں۔ ملا سیانوں کا۔ لنگڑے لولوں پر۔ بھوت بھتنوں کا۔ ڈوم دھاڑیوں سے راگ راگنیوں کا۔ کچہری عدالتوں میں۔ لونڈی غلاموں کا۔ بھائی بندوں سے۔ گاڑی گھوڑوں سے۔ رتھ پالکیوں کا۔ وغیرہ۔

اہلِ دہلی ایک ماں ایک بیٹی۔ باپ اور ایک لڑکا۔ نند اور ایک بھاوج۔ چچا اور ایک بھتیجا۔ بہن اور ایک بھائی۔ ماموں اور ایک بھانجا وغیرہ۔ خویشوں میں گفتگو ہو۔ تو دوسرے لفظ کو جمع کرتے ہیں۔ جیسے :-

(۱) دونوں ماں بیٹیاں گفتگو کرتی ہوئی چلی جا رہی تھیں (راشد الخیری)

(۲) مدت ہوئی باپ بیٹیوں میں گفتگو نہیں ہوئی۔ (مولانا عبد الحق)

(۳) جب دیکھو نند بھاوجوں میں جھائیں جھائیں ہو رہی ہے۔ (عظیم بیگ چغتائی)

(۴) دونوں ماں بیٹے اس مصیبت کو یاد کر کے رو رہے تھے (راشد الخیری)

(۵) اس رات کو ماں بیٹیاں پاؤں پھیلا کر آرام سے سوئیں۔ (ناصر نذیر فراق)

(۶) اہل دربار نے چچا بھتیجوں پر جواہرات نثار کئے (قصص ہند)

(۷) یہ بھائی بہنوں کی وہ محبت تھی جس کا اب کہیں پتہ نہیں ملتا۔ (سید احمد دہلوی)

سونے میں سہاگہ :- یہ مثل مشہور ہے لیکن راشد الخیری نے سونے پہ سہاگہ لکھا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں سونے میں سہاگہ لکھا ہے۔ ذیل میں دونوں مثالیں درج ہیں۔ ان میں شمشاد کی مثال صحیح ہے :-

(۱) اول تو کنواری ساس پھر عمر میں چھوٹی اور سونے پر سہاگہ یہ کہ آپس کی رشتہ داری۔ (راشد الخیری)

(۲) بیمار تھے صحت ہوئی نکھرا جوبن
عشاق سے ملنے لگے دونی ان بن
سنتا ہوں کہ ان روز دنوں وہ بیمار ہیں پھر
سونے میں سہاگہ اسے سمجھو ہمہ تن (شمشاد لکھنوی)

شادی مرگ کا استعمال :- یہ بغیر اضافت کے استعمال ہوتا ہے۔ اس کا اصل مصدر شادی مرگ ہونا ہے۔ ناصر نذیر فراق نے ذیل کے جملے میں بے اضافت ہی لکھا ہے :-

تعجب ہے والدین اپنے بچوں کو دیکھ کر شادی مرگ کیوں نہ ہو گئے (ناصر نذیر فراق)

شعراء اسے بغیر اضافت کے باندھتے آئے ہیں لیکن حسرت موہانی نے اضافت کے ساتھ باندھا ہے :-

(۱) ترے بیمار کو گر اپنے جینے کی تمنا ہو
فلک بھی سن کے ہنستے ہنستے شادی مرگ عیسیٰ ہو (ذوق)

(۲) جانِ عاشق نثارِ دوست ہوئی
شادیِ مرگ کا بہانہ ہوا (حسرت موہانی)

بشیر احمد برہانپوری

عشق زندہ باد!

بڑھ گئے ذوقِ نظر کی آخری منزل سے ہم
حسن بن کر خود ہی نکلے پردۂ حائل سے ہم

اس نتیجے تک تو پہنچے سعیٔ بے حاصل سے ہم
چھا گئے منزل پہ ہم گزرے ہیں جس منزل سے ہم

بارگاہِ حسن میں اے عشق رکھنا آبرو
ضبط کا اقرار کرتے ہیں دھڑکتے دل سے ہم

دیکھنا طغیانیٔ بحرِ محبت دیکھنا
ڈوب کر ابھرے تو خود ٹکرا گئے ساحل سے ہم

جوشِ مینا، دورِ ساغر، کیفِ بادہ سب غلط
اُٹھ گئے انگڑائیاں لیتے ہوئے محفل سے ہم

کاش اتنا ہی بتا دے اے نگاہِ عشوہ کار
پھر کبھی اس زندگی میں مل سکیں گے دل سے ہم

ہر نظر روادِ حسرت، ہر نفس تمہیدِ یاس
باخبر ہیں زندگی، حال و مستقبل سے ہم

کشتیٔ اُمید لرزاں، عشق بحرِ موجزن
دل تلاطم آشنا، ناآشنا ساحل سے ہم

اب جدھر کا حوصلہ ہو لے چل اے وارفتگی
ہو چکے آزاد ہر اندیشۂ منزل سے ہم

مست ہیں ہی سہی، ہاں پھر وہی طرزِ نگاہ
کیف میں ڈوبے ہوئے اٹھیں تری محفل سے ہم

تہ نشیں ہونا ہے پیغامِ پناہِ مستقل
"عشق زندہ باد" یہ آواز دیں ساحل سے ہم

ایک مسلک، ایک مرجع، ایک مقصد، ایک حال
دل ہمارا ہمنوا ہے، بے تکلف دل سے ہم

ہو گئے خواب و خیال اے دل وہ آزادی کے دن
اب قفس میں سانس لیتے ہیں بڑی مشکل سے ہم

دلؔ شاہجہانپوری

ردِ عمل

افسانہ

تھوڑی سی شراب پی کر اُس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ پھر لکھنا شروع کیا۔ "دنیا مجھے آوارہ، شرابی۔ اوباش اور ہوس پرست کہتی ہے۔ تم جانتے ہو کیوں کہتی ہے ۔۔۔؟ اس لئے کہ میں ہر وقت مست و مخمور رہتا ہوں۔ اس لئے کہ میں لال شربت پیتا ہوں ۔۔۔ اس لئے کہ میں اپنی ہوس کے ساتھ کھل کر کھیلا ہوں ۔۔۔ یہ خطابات اس کا صلہ ہیں۔

آپ چونکیں نہیں، جب آپ نے مجھے چھیڑا ہے تو میں سب کچھ کہہ کر ہی خاموش ہونگا۔ اب نہ مجھے شرم آتی ہے۔ نہ جھجک محسوس کرتا ہوں۔ آپ ہی بتائیے کس کا لحاظ کروں؟ کس سے جھجکوں؟ کس کے لئے شرم کروں؟ اور کس کے لئے نیک اطوار اور پارسا بنوں؟

میں نے جسے پیار کیا ہے اس کا نام آج تک نہ جان سکا۔ آپ متعجب نہ ہوں میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ نام تو جانے دیجئے دو چار دفعہ کے سوا زیادہ گفتگو کرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ ہم ایک دوسرے کو اشاروں کنایوں ہی سے مائل و متوجہ کرتے تھے۔ کسی سینما یا رستوران میں ملتے تو میں ہوتا گلاب اور وہ ہوتی گلابی! وہ کتنی حسین تھی ۔۔۔؟ اس کے جواب میں یہی کہونگا کہ شاعر کے تخیل سے بھی حسین تر! اگر نام جاننے کے لئے آپ بیتاب ہوں تو ریکھا سمجھ لیجئے۔ میں بھی اسے اسی نام سے یاد کرتا ہوں۔ آج وہ مجھ سے بہت دور ہے۔ پھر بھی میں اسے بھول نہ سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ اب بھی اپنے مرمریں ہاتھوں کو موڑ کر ان پر اپنے گلابی رخساروں کا بوجھ دیئے ہوئے نوخیز کلی کی طرح مسکرا رہی تھی اس کا حسین چہرہ چودھویں کا چاند اور مسکراہٹ چاندنی۔ سکرپاش چاندنی معلوم ہو رہی ہے۔

۱۹۴۲ء کا اختتام تھا۔ کلکتہ پر جاپانی طیاروں کے حملوں کی افواہیں باشندگان کلکتہ کو خائف و مبہوت بنا رہی تھیں۔ شہر انتہائی سرعت سے خالی ہو رہا تھا۔ انہی دنوں کلکتہ کا ایک معزز بنگالی کنبہ لکھنؤ میں وارد ہوا ریکھا اسی کنبے کی ایک لڑکی تھی۔ کلکتہ کے مارٹیر سکول میں اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ انگریزی خوب بولتی تھی۔ اور وہ انگریزی بولنے کی جتنی شائق تھی اس سے زیادہ شوق و اہتمام سے اپنے یاقوتی ہونٹوں کو مزید سُرخ بنانے کے لئے ان پر لپ سٹک لگاتی تھی۔ اور جب وہ مسکراتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے شفق مسکرا رہی ہو! اس وقت اس کا چہرہ ہی گلگوں نہ ہوتا بلکہ سارا جسم سرخ ہو جاتا۔ سُرخ گلاب کی طرح۔ یقین کیجئے میں نے ایسا فردوسی حسن کہیں نہیں دیکھا۔ ریکھا حسن و جوانی کا دلنواز پیکر تھی۔

عنفوان شباب میں مَیں ریکھا سے متعارف ہوا تھا۔ اس وقت تک میرے دل کا دامن دودھ کی طرح سفید اور چاندنی کی طرح نکھرا ہوا تھا۔ لیکن اس سے ملنے کے بعد وہ سادہ نہ رہ سکا۔ اور اس پر ریکھا کی کبھی نہ مٹنے والی تصویر۔ رنگین تصویر مرتسم ہو گئی۔

میری اس کی ملاقات بھی انوکھے ہی انداز سے ہوئی۔ اس روز کافی ہاؤس میں غیر معمولی رش تھا۔ میں ایک گوشے میں بیٹھا کریم ہاٹ کافی پی رہا تھا کہ ہجوم کے دھکّے سے بچنے کے لئے ریکھا وہیں آپڑی۔ اس وقت کوئی کرسی خالی نہ تھی۔ اور اس ہاؤس میں طلبہ کے ہجوم میں ان کے زہرخند اور سرگوشیوں سے دوچار ہوتے ہوئے اس حالت میں زیادہ دیر تک کھڑا رہنا بھی اس کے لئے ناممکن تھا۔ میں نے ازراہ اخلاق و ہمدردی اور ہاں اسے ہمدردی ہی کہئے۔ اپنی کرسی سے اُٹھ کر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس سے کہا "بیٹھ جایئے۔ میں دوسری کرسی لے لونگا۔" میں اس کے اظہار تشکر کا انتظار کئے بغیر دوسری طرف چلا گیا۔ وہ احسان مندی کے بار سے دبی ہوئی میری کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کے بعد ہی سے گاہے ماہے ہماری دید شنید ہو جاتی۔ اور رفتہ رفتہ جب ہماری بے تکلفی کسی حد تک بڑھی تو میں نے ایک روز پوچھا۔
"تمھارا نام کیا ہے ۔۔۔؟"
"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔
"آخر کوئی نام تو ہوگا؟"
"ہوگا مجھے تو پتہ نہیں۔" اس نے ویسے ہی ہنستے ہوئے کہا۔
"اچھا شام کو کہاں رہتی ہو؟"
"شام کیا؟ ۔۔۔" اس نے تعجب سے پوچھا۔
"یعنی شام کو؟" میں نے کسی قدر مسکرا کر کہا۔

"ایں۔۔۔۔ شام کیا ۔۔۔؟" اس نے سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ میں اب سمجھا کہ آنکھوں والا سکول کی فارغ التحصیل بنگالی لڑکی کے لئے لفظ "شام" کے معنی نہ سمجھنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یعنی ایوننگ ٹائم؟"

وہ اب سمجھی اور بولی۔ "گھر ہی میں تو رہتی ہوں۔"

"تو باہر کیوں نہیں نکلتیں ۔۔۔؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھنڈا لگتا ہے۔" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ اس نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ "میں تو اب تک کلکتہ چلی گئی ہوتی۔ لیکن وہاں بوم گرنے سے اب نہیں ہو نے سکتا ہے۔"

"اچھا ۔۔۔؟" میں نے اُسے خوش کرنے کیلئے قدرے زور دیکر کہا۔

"آپ کی کوٹھی مال روڈ پر ہے؟" اس نے پر اشتیاق انداز سے پوچھا۔

"کوٹھی تو نہیں۔ ہاں جھونپڑی اسی طرف ہے۔"

دوران گفتگو میں چلتی چلتی وہ پارک کی جھاڑیوں میں اُلجھ گئی۔ میں نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ تو وہ بے اختیار کھینچی ہوئی میری طرف چلی آئی۔ دفعتہً میرا سارا جسم مرتعش ہو گیا۔ میں نے کمال عجلت سے اُسے علیٰحدہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب چل رہا ہوں۔ کبھی کبھی ملا تو کرو۔"

وہ نمستے کہہ کر چلی گئی۔ اور اس کے بعد ایسی ہی بے سروپا باتوں کے سہارے ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔

وقت گزرنے لگا ۔۔۔ اور وقت کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے تعلقات بھی گہرے ہوتے گئے۔ لیکن میں پاگل کب سے ہوا ۔۔۔؟ شراب کب سے پینے لگا ۔۔۔؟ آوارہ گردی کب سے کرنے لگا ۔۔۔؟ یہ بھی سنئے! ابھی تو آپ تصور بھی نہ کر سکے ہونگے کہ اتنی جلدی ہمارا زوال کیونکر شروع ہوا؟

انسان حالات کا اسیر ہے۔ حالات ہی اسے پستی سے بلندی پر پہنچاتے اور بلندی سے پستی میں دھکیل دیتے ہیں۔

میرے علاوہ ایک اور نوجوان ریکھا کی زلف گرہ گیر کا اسیر تھا۔ ٹیگور! ایک چلتا ہوا تیز و طرار، آوارہ، اوباش نوجوان۔ اور یہ بات میرے لئے حد درجہ اذیت دہ تھی۔ حالانکہ میرے متنبہ کرنے پر ریکھا نے مجھے مطمئن کرنے کے لئے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ جب آتا ہے تو سیٹی بجاتا ہے لیکن ہم اُدھر نہیں دیکھتیں۔ لیکن میں ہر وقت ایک نامعلوم فکر و تردد محسوس کرتا رہتا تھا میرے دل میں رشک و رقابت کی آگ آہستہ آہستہ ہر وقت سلگتی رہتی۔ تھی۔ ریکھا کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے ٹیگور اکثر کوشاں رہتا تھا۔

بڑا دن تھا۔ اس موقع پر ہر بڑے شہر کے گورے چمڑے والوں کی رنگ رلیاں اپنی آخری حدود تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس روز وہ بڑے دن کے نام پر جو بھی کریں سب روا اور بجا سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس روز معزز اور باعزت خاندان کی عورتوں کا بازار میں نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

دولت و حکومت اور جاہ و ثروت کے نشے میں چور گورے چمڑے والے انسان نما درندے اپنی ہوس رانیوں اور اوباشیوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت گنج کی سڑکوں پر پھر رہے تھے۔ ان کے پیچھے سیکڑوں تماشائی شور و غل کرتے۔ صدائے بے ہنگام لگاتے ان کے جوش و ولولہ میں اضافہ کر رہے تھے۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ برقی قمقموں کی روشنی سے حضرت گنج بقعۂ نور بن رہا تھا۔ میں دوستوں کے ساتھ سیر کر کے واپس آرہا تھا۔ دفعتہً ریکھا کی کھڑکی کی طرف نظر گئی۔ تو دیکھا وہ کھڑی ہوئی سامنے دیکھ رہی ہے۔ اس کے اس طرح سامنے دیکھنے سے میری حیرت و استعجاب کی حد نہ رہی۔ میں نے اسے دیکھا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ پہلے تو وہ بھی جھجکی۔ لیکن معاً اس کی جھجک بیباکی سے بدل گئی۔ میرے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے ٹیگور مجھے دیکھ نہ سکا۔ میں نے پہلے وہیں سے ریکھا کو اندر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ شاید سمجھ کر بھی نہیں سمجھی۔ اس کی یہ جرأت و بیباکی دیکھ کر میرا سر چکرانے لگا۔ میں پاگلوں کی طرح چیخ اٹھا۔ "کھڑکی بند کرو ۔۔۔!"

کھڑکی بند ہو گئی۔ وہ بھی جیسے میرے اس انداز سے حیرت زدہ تھی ٹیگور تو مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھ گیا۔ مجھے اک گونہ اطمینان ہوا۔ میں آگے بڑھا۔ سمجھا ریکھا سے غلطی ہو گئی تھی۔ اس نے تلافی کر دی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے دیکھنے کے لئے واپس آیا تو دیکھا وہ پھر سرگرم دید ہے قریب کے کلاک ٹاور کی سوئیاں ساڑھے نو سے آگے بڑھ چکی تھیں۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں تیر کی طرح بڑھ کر ریکھا کی کھڑکی کے نیچے پہنچ گیا۔ اس نے مجھے وہیں سے دیکھا۔ لیکن اس کی بیباکیوں اور عشوہ طرازیوں میں کوئی کمی نظر نہ آئی۔ شدت احساس سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ دنیا مجھے ناچتی سی معلوم ہوئی اور میں لڑکھڑانے لگا۔

ساری رات بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ طرح طرح کے خیالات دل میں اٹھتے رہے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ریکھا کے برتاؤ میں یکا یک یہ تغیر کیونکر رونما ہوا؟ جس نے اب تک میرے اوپر جان چھڑکی یکایک یوں بدل سکتی ہے ۔۔۔؟ میں سوچ بھی نہ سکا کہ عورتوں سے محبت اور اعتماد کی توقع رکھنا ہی عبث ہے۔ جو ریکھا میری آنکھ

اشاروں پر رقص کرتی رہی۔ میرے تبسم زیرلبی پر تھرک اٹھتی تھی۔ میرے ارمانوں اور آرزوؤں کو اس طرح پامال کر دیگی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں ہو رہا تھا۔

ریکھا دوسرے روز نہ ملی۔ تیسرے روز خود ہی پاس آئی۔ میں نے دیکھا اس کے عنابی ہونٹوں پر پہلے ہی کی طرح مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"کچھ تو ضرور ہے" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اب ہم نہیں بولے گا"

"بات کیا ہے؟" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"بات تو کچھ بھی نہیں ہے" وہ ایک خشک ہنسی ہنس کر بولی۔

"پھر کیوں نہ بولو گی؟" میرے الفاظ میں درد تھا۔

"نہیں، اب ہم نہیں بولے گا"

"نہیں بولے گا؟" قدرے غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے میں نے پھر پوچھا

"ہاں نہیں بولے گا"

مجھ میں اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ تھی۔ میں سیدھے گھر آ کر بستر پر گر پڑا۔ کانوں میں ریکھا کے وہی الفاظ بار بار گونج رہے تھے۔ آسمان پر چاند مسکرا رہا تھا۔ ہر طرف چاندنی پھیل رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چاند ازراہ تمسخر کہہ رہا ہو:۔ "اب ہم نہیں بولے گا" گھڑی کی ٹک ٹک، یکلخت جیسے آواز دے رہی تھی۔ "اب ہم نہیں بولے گا" ہر چیز مسکرا مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ "اب ہم نہیں بولے گا" میں نے کانوں میں انگلیاں ڈالتے ہوئے۔ اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔

اس کے بعد سے ریکھا پہلے کی ریکھا نہ رہی۔ اب وہ مجھ سے دور دور رہنے لگی۔ یہاں تک کہ میں اس کی دید سے بھی محروم رہنے لگا۔ یہ سب کچھ ہونے پر بھی مجھے یقین تھا کہ ریکھا میری ہے اور ہمیشہ میری رہے گی۔ کبھی چاہتا جاؤں اور ریکھا کو روک کر اس سے ساری باتیں صاف صاف کہہ دوں کہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ اس روز کا جواب تو دیتی جاؤ۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہر نوجوان تمہیں ہوس کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ خاص کر شیکھر تو تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ اس کے بہت سے ذرائع ہیں۔ اگر وہ تمہیں سینما، پارک یا کہیں اور تنہا مل جائے تو اس سے جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ چونکہ میں ہمیشہ سے تمہارا بہی خواہ رہا ہوں۔ اس لئے تمہیں نفع و نقصان سے آگاہ کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ لیکن نہ جانے کیوں تم اُلٹی ناراض ہو گئیں۔ تمہیں چاہئے تھا کہ پہلے مجھے میری غلطی سے آگاہ کرتیں۔ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیتیں۔ لیکن تم نے تو میرے لئے دروازہ ہی بند کر دیا۔ تمہاری مرضی مجھ سے بولو یا نہ بولو۔ جس کے ساتھ جی چاہے رہو سہو۔ سیر و تفریح کرو۔ لیکن اپنی عزت و آبرو کے تحفظ کا ہمیشہ خیال رکھو۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔

لیکن جب میں دوسرے روز ریکھا کے یہاں گیا۔ تو دیکھا مکان خالی پڑا تھا۔ وہ اپنے کنبے کے ساتھ مکان چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی تھی۔ اس کی جدائی کا صدمہ میرے لئے ناقابل برداشت ہو گیا۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔

ریکھا کے بعد اگر دنیا میں مجھے کسی نے سنبھالا۔ میرے تسکین خاطر کا موجب بنا تو یہی لال شربت ہے۔ دنیا جسے شراب کے ذلیل نام سے موسوم کرتی ہے۔ میں اسے پی کر اتنا مدہوش ہو جاتا ہوں کہ مجھے ریکھا کی سُدھ بُدھ بھی نہیں رہتی۔ میں اس کے نشے میں دنیا کو بھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور دنیا سمجھتی ہے کہ میں شرابی ہوں۔ آوارہ ہوں۔ اوباش ہوں۔ لیکن مجھے دنیا کا کوئی خوف، کوئی لحاظ نہیں، اور لحاظ بھی کیوں ہو۔ جب اسے میری پروا نہیں تو میں اس کی پروا کیوں کروں؟ مجھے تو اب شرابی ہی بننے میں سکون و راحت ملتی ہے۔"

اتنا لکھنے کے بعد قلم میز پر رکھ کر اس نے پھر شراب پینا شروع کر دی۔ اور اس وقت تک پیتا رہا جب تک نشے میں چور ہو کر اس کا جسم کرسی پر لڑھک نہ پڑا۔

(ترجمہ)

آسی رامنگری

احساس کے دو رخ

۱۔ خواب

رات دیکھا تھا ہمنشیں اک خواب — لبِ دریا ہے اور شبِ مہتاب
آ رہی ہے نوائے خوش آہنگ — لئے ساقی کھڑا ہے جامِ شراب
کچھ بھی تعبیر ہو و لیکن آج — یاد آتے ہیں صبح سے احباب
دل ہے بیچین روح بھی بیکل — پڑ گئے جیسے پردہ ہائے حجاب
جب سے دیکھا یہ خواب اے ہمدم — زندگانی ہے خوابِ عالمِ خواب

۲۔ بیداری

گھٹا چھائی ہوئی تھی آسماں کی روح سوتی تھی — ہوائیں سرد آہیں بھر رہی تھیں رات روتی تھی
کوئی لڑتا ہو جیسے ہر طرف تاریک بادل سے — صدائیں آ رہی تھیں ہاؤ وہو کی دورِ جنگل سے
فضا تاریکیوں میں گھر کے آہِ سرد بھرتی تھی — اندھیری رات میں سرما کی دیوی بین کرتی تھی
کہیں کوٹھے پہ اپنے اس بھیانک رات میں کوئی — بجا کر بانسری یوں کہہ رہا تھا "بیت کب سوئی"
کسی کی یاد تازہ ہے کھلے ہیں دل کے دروازے — مگر شاعر کا غم کہنے لگا اس دھن پہ آوازے
کہ تم اے فاقہ مستو جز محبت اور کیا جانو! — ہوئے ہو بیبسی میں مست فکر و غور کیا جانو!
نہ سوئی ہو تمہاری بیت، لیکن زندگی سوئی — تمہارے دل کی دولت، روح کی تابندگی سوئی
تمہاری بیبسی پر آسماں بھی خون روتا ہے — زمیں کا ذرہ ذرہ رو کے اپنی جان کھوتا ہے
سمجھ لو ہر بنِ مو سے، تمہارے خون بہتا ہے — بہت مایوس ہو کر بیبسی میں رو کے کہتا ہے

"یہ کیسی زندگی ہے گریۂ پیہم نہیں جاتا
لہو پانی ہوا جاتا ہے لیکن جسم نہیں جاتا"

(سید) مقبول حسین احمد پوری

شعبہ محنت

تاریخی ڈراما

تسخیرِ قلب

افرادِ مجلس

۱- ہابیلہ :- ملکہ نازان
۲- زراغلوم :- ملکہ کا وزیر جنگ
۳- آرتمس :- زنانہ فوج کا سپہ سالار
۴- سلومی - درباری مغنیہ اور مشیر خاص
۵- زرقہ :- شاہ تروجیم
۶- سمسون :- اس کا وزیر اعظم
۷- منقیاس :- راہب۔ عقل و دانش میں یکتا
۸- ابیلارد :- پیغامبر
دربان کنیزیں وغیرہ

پہلی مجلس

ملک نازان کا پایۂ تخت۔ قلعہ شاہی میں ملکہ ہابیلہ کا [illegible]خاص۔ وہ تخت سے اتر کر پریشانی کے عالم میں ٹہلتی کچھ [illegible] رہی ہے۔ ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں صف بستہ [illegible] انداز میں کھڑی ہیں۔ مردوں میں وزیر اعظم، فوج کا سردار اور [illegible]۔ عورتوں میں زنانہ فوج کی سپہ سالار، مشیر خاص اور کنیزیں۔ [illegible] پردہ اٹھنے پر ایک لمحہ خاموشی رہتی ہے۔

ہابیلہ :- تمام امرائے سلطنت اور مصاحبین خاص اس وقت [illegible] تم سب کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ شہنشاہ تروجیم، دلوں کے [illegible] زرقہ بجلی کی طرح چمک کر ہمارے ملک نازان کی خاک میں [illegible] سے ہمارے سروں پر آپہنچا ہے۔ ملک میں جا بجا پھیلی ہوئی [illegible] علدن، چونکہ فضا میں کسی نے نہیں لوٹا؟ دشمن کا دل ہلا دینے [illegible] سپاہیوں کی ہمت بلند کرنے کے لیے لڑائی کا نقارہ کیوں [نہیں بج]ایا؟ اطمینان و سکون کی کیفیات ابھی تک تمہارے دل و دماغ پر کیوں ایسے طاری ہیں؟ کیا اس راہوتی کی نیند سے صرف اس وقت [بیدار] ہوگے جب دشمن کی فوجیں بے روک ٹوک ہمارے شہر میں گھس آئیں اور ہمیں ذلیل و خوار کر جائیں؟

زراغلوم :- ذی شان ملکہ! تباہی کے اس ہولناک سیلاب کے سامنے جس کو زرقہ اپنے ساتھ لایا ہے ہماری فوجی قوت پایاب ندی کی ایک معمولی لہر ہے۔ اس ہیبت ناک زلزلے کے مقابلے میں جو صلح نہ کرنے کی صورت میں برپا ہونے والا ہے۔ ہماری شہر پناہ مٹی کے ٹیلے پر [کھڑی] ہوئی کچی دیوار کی مانند ہے۔ یقین مانیے ہمارا یہ قلعہ آتشیں گولوں کی تباہ کاریوں سے ہوا کے جھونکوں پر اڑتے ہوئے کاغذی پرندوں کی طرح تباہ ہو جائے گا۔

ہابیلہ :- تو کیا تمہاری رائے میں زرقہ سے مقابلہ کرنے کی بجائے اطاعت قبول کر لینا زیادہ مناسب ہے؟

زراغلوم :- بے شک! اس نازک موقع پر جنگ شروع کرنا انتہائی ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دینا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ صلح اور اطاعت کا پانی چھڑک کر لڑائی کے سبب شعلوں کو بجھا دیں۔

ہابیلہ :- زراغلوم! تم وزیر جنگ ہو، اس قدر بزدلی اور کم ہمتی

کے الفاظ تمہاری زبان سے سن کر جی چاہتا ہے کہ سب سے پہلے تم ہی کو نشانۂ اجل بنا دیا جائے لیکن آرتمس! تم ابھی تک کیوں خاموش ہو۔ زنانہ فوجوں کی سپہ سالار کو بھی اپنا خیال پیش کر دینا چاہیئے۔

آرتمس:- خداوند ایزیرس کی مہربانی سے ہماری ملکہ کو ہر جنگ میں عظیم الشان کامیابی نصیب ہو۔ آپ کی یہ ادنیٰ کنیز قیامت تک گوارا نہیں کر سکتی کہ اپنے پیارے وطن کو دنیا کی سب سے بڑی لعنت یعنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھے ہتھیار ڈالنے سے بہتر موت کی آغوش میں سو جانا ہے۔

ہابیلہ:- شاباش! آرتمس شاباش، تمہاری جرأت لائق تحسین ہے کس طرح ممکن ہے کہ فاران کی پاک سرزمین جن کی پیشانی میرے جلیل القدر باپ کے عظمت پسینے سے آج تک بھیگی ہوئی ہے۔ دشمن کے سپاہیوں کی جولانگاہ بن جائے اور حرم [illegible] اپنے داغ خوں میں ان کی [illegible] بن پنہ عفتوں میں [illegible] عشرت دیئے لگیں۔ بےغیرتی کی زندگی بسر کرنے سے بہتر ہے کہ ننگ ناموس کے لئے خودکشی کر لی جائے۔

آرتمس:- [illegible] ملکہ نے نام [illegible] زنانہ فوج [illegible] غلط ہو [illegible] شہر پناہ کی [illegible] سے دشمن کی [illegible] فوج پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دے [illegible] معلوم ہے کہ [illegible] کی بجلی [illegible] [illegible] ہو۔

ہابیلہ:- بہت خوب! میری طرف سے [illegible] کی [illegible] ہو۔ تو [illegible] پیش کر دو [illegible] زنانہ لباس [illegible] تعلوم کے سپاہیوں کو [illegible] [illegible] مرز [illegible] ہے سوگوار دامن میں منہ چھپائے پڑے ہیں۔

زاغلوم:- بس دیوتا ملکہ [illegible] آپ کے زیر [illegible] [illegible] [illegible] جنگ سے انکار [illegible] [illegible] ہوں کہ میرے جوش [illegible] سے [illegible] بس [illegible] اور زنانہ فوج سے بھی آگے بڑھ کر [illegible] دیں گے۔

آرتمس:- ہماری ملکہ کی نگاہوں میں جادو اثر ہوتی ہے۔ ذرا سی [illegible] خیال بدل گیا۔

زاغلوم:- دراصل دشمن کی بے [illegible] فوج دیکھ کر ہماری ہمت پست ہو گئی تھی لیکن اب ملکہ عالیہ کے پرجوش [illegible] ہمارے کمزور [illegible] [illegible]

[illegible] اپنے وطن کی عزت و آبرو کا سوال آج اپنا فرض کو پیار کر کے [illegible] مقام کو نبھا کا رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں اجازت دیجئے کہ دشمن کے مقابلے کے لئے ڈٹ جائیں۔

ہابیلہ:- اگر یہ بات ہے تو فوراً جنگ کا اعلان کر دیں ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔

[illegible] ہاں حاضر ہو کر آداب بجا لاتا ہے۔

[illegible]:- ملکہ ہابیلہ کی خدمت عالیہ میں شہنشاہ [illegible] کا بھیجا ہوا پیغام رسید موسیٰ کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے جس کا نام ابیلارد ہے۔

ہابیلہ:- تعجب ہے شاہ [illegible] کا پیغامبر [illegible] نخوت ہے [illegible] اچھا [illegible]

[illegible] سپاہیوں کی حراست [illegible] ابیلارد داخل ہوتا ہے۔

ابیلارد:- [illegible] آداب بجا لا کر ہمارے شہنشاہ [illegible] کے [illegible] ملکہ ہابیلہ کی خدمت میں [illegible] بھیجا ہے [illegible] عالی ہے کہ اطاعت قبول کر لینا آپ کے حق میں بہتر ہے ورنہ [illegible] شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔

ہابیلہ:- [illegible] جاؤ۔ واپس جاؤ۔ اور میری جانب سے [illegible] ہوئے نیلے سے کہہ دو کہ یہ دوسرے ملکوں کی [illegible] ہے جسے آسانی سے فتح کر لیا جائے۔ یہ فاران [illegible] یہاں جنگجو نطلیموس کی بیٹی ملکہ ہابیلہ حکومت کرتی ہے۔

ابیلارد:- ہمارے شہنشاہ کا فرمان ہے کہ آپ کی تقدیر کی گردش اور ہماری فوجوں کا سیلاب آپ کو اطاعت قبول کرنے کے لئے مجبور کر دے گا۔

ہابیلہ:- ہرگز نہیں۔ ایسی دھمکیاں حقیقت سے کوسوں دور ہوتی ہیں۔ ان سے کہہ دینا کہ عنقا کا آشیانہ بہت بلند ہوتا ہے۔ [illegible] ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ اس خیالِ خام کو دل سے نکال دو۔

ابیلارد:- اس کے علاوہ اور کوئی پیغام ہے؟

ہابیلہ:- ہاں ان سے کہہ دینا کہ ہمارے محفوظ شہر میں کھانے پینے کی چیزیں کثرت سے موجود ہیں۔ اور ان میں کبھی کمی نہ ہو سکے گی تم شہر کا محاصرہ کئے پڑے رہو چاہے قیامت کے لئے [illegible] ہمارا بال تک بیکا نہ کر سکو گے۔

[illegible] اس کے علاوہ اور کوئی اور پیغام ہے؟

ہابیلہ:- ہاں۔ ان سے کہہ دینا کہ ہماری مردانہ اور زنانہ دونوں فوجیں لڑائی کے لئے کمر ہمت کس چکی ہیں۔ اور عنقریب شہر پناہ سے اپنے زہر بجھے تیر برسانے والی ہیں۔ جب اپنا جسم چھلنی کرانا ہو سامنے آجائے۔ بس اس کے سوا اور کوئی پیغام نہیں ہے۔

بیلارد:- بہت بہتر ملکۂ عالیہ۔ خادم آداب بجا لاتا ہے۔
(سپاہی بیلارد کو لے جاتے ہیں۔ ایک مختصر خاموشی رہتی ہے)

ہابیلہ:- سنا تم نے۔ سر کچھرے زرقہ نے کتنی جرأت سے کام لیا ہے۔

زر غلوم:- خیر! اب زیادہ دیر کھیٹرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فوراً سرگرمیٔ عمل کے ساتھ جنگ شروع کر دی جانی چاہئے۔ زرقہ والوں کو گستاخی کی سزا مل جائے گی۔

ہابیلہ:- بے شک ــــ اور ہاں آرٹمس! میں خود تمہارے ساتھ چل کر دشمن کے سپاہیوں کا نظارہ کروں گی۔ مجھے دیکھنا ہے وہ تیروں کے ساتھ گھائل ہو کر کس طرح تڑپتے ہیں۔ کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گی۔

آرٹمس:- بسر و چشم۔

ہابیلہ:- اچھا۔ اب دربار برخاست ہوتا ہے۔

سب لوگ:- ملکۂ عالیہ کا اقبال بلند ہو۔

(آہستہ آہستہ سب جانے لگتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

دوسری مجلس

ملکہ ہابیلہ کا خاص کمرہ۔ شاہانہ مسند اور دیگر سامان آرائش۔ [illegible] افسردہ و غمگین حالت میں ٹہل رہی ہے۔ درباری مغنیہ [illegible] کے ساتھ گا رہی ہے لیکن اسے محسوس ہوتا ہے کہ ملکہ اس موسیقی سے لطف اندوز نہیں ہو رہی۔ آخر وہ رک جاتی ہے اور [illegible] کی صورت اختیار کرتی ہے۔

سلومی:- اے چاند کی کرنوں سے تخلیق پانے والی حسین [illegible] کی واحد حکمران! میں نے اپنے جسم کی تمام [illegible] دلفریب اور لطیف نغموں کی شکل میں پیش کر دیا۔ مگر تیری [illegible] نصیب نہ ہوئی۔ آج تیرے چہرے کی افسردگی شگفتہ [illegible] ہوں محروم ہے۔ شاید کس ملک کے دلنشین نغمے تیرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ وہ کون سے گلے کا شیریں ترانہ ہے جس کا اثر تیرے دل و دماغ پر طاری ہے۔ مجھے بتا۔ میں اسی لے میں اسی تال سُر کے ساتھ گانے کی کوشش کروں۔ اور اگر اب میرے گیت تجھے نہیں بھاتے میرا کمال فن تیری نگاہ سے گر گیا ہے۔ تو پھر صاف صاف کہہ دے۔ کیوں نہ میں [illegible] اپنی زبان کو کاٹ دوں۔ ساز کو توڑ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاؤں۔

ہابیلہ:- نہیں نہیں سلومی! یہ بات نہیں ہے۔ تو غلط سمجھی۔ تیری موسیقی نوائے سروش سے بھی زیادہ پاکیزہ اور بلند ہے۔ وہ میری روح کی تازگی کے لئے ایک نعمت عظیم ہے۔ بہت ہی جادو اثر ہے۔ لیکن اس وقت عارضی طور پر [illegible] چھپ گئی ہے۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور تیروں کی سنسناہٹ میں دب گئی ہے۔ نغمے کے طلسمات جنگ کی ہولناکیوں میں کھو گئے ہیں۔ آج لڑائی کو جاری ہوئے تین دن گزر چکے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

(ایک آہ سرد کے ساتھ سر جھکا کر مسند پر بیٹھ جاتی ہے)

سلومی:- یہ عذر لنگ ہے اور میں اسے کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ اپنی پریشانیوں کا جو سبب تو نے بیان کیا، وہ چاند کے اس عکس کی مانند ہے جو ٹھہرے ہوئے پانی پر پڑ رہا ہو ــــ غیر حقیقی اور بے بنیاد۔ میں جانتی ہوں کہ میری بہادر ملکہ بذات خود میدان کارزار میں شمشیر بکف لڑ سکنے کی ہمت رکھتی ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ وہ تلوار کی محض جھنکار سے اس قدر پریشان ہو جائے۔ ضرور کوئی گہرا راز ہے جس کو سینے میں چھپا رکھا ہے ــــ

ہابیلہ:- تو خوب سمجھی سلومی! بے شک وہ راز ہے ــــ میرے دل کا عمیق راز جسے خود میں نے بھی آج تک نہ سمجھا تھا مگر اب سمجھ گئی ہوں۔ [illegible] حقیقت حکومت کرنے سے زیادہ لطف محبت کرنے اور محبت کئے جانے میں ہے ــــ

نہیں انسان ازل میں عشق کی خاطر بنا
[illegible] لائق نہیں [illegible]

سلومی:- ــــ [illegible] بہت خوب اور کون سا خوش [illegible] جوان ہے [illegible] کا [illegible] تجھے بھی [illegible]

ہابیلہ:- [illegible] صرف اپنے ہی [illegible] رکھے گی!

سلومی:- اوہو! محبت [illegible] ہی میری ملکہ

کو اس کنیز پر اعتماد نہیں رہا۔

ہابیلہ: بگڑی نہ بن سلومی! — چل جانے دے — خیر یہ بتا پرسوں دشمن کی فوجوں کا نظارہ کرنے میں جب میں آتش کے ساتھ شہر پناہ تک گئی تو کیا تو بھی میرے ہمراہ تھی؟

سلومی: زندگی کے وہ کون سے لمحے ہیں جب میں اپنی ملکہ کو تنہا چھوڑتی ہوں؟

ہابیلہ: اچھا بتا اس وقت تو نے شاہ زرقہ کو دیکھا تھا جو بڑی آن بان کے ساتھ اپنی فوجوں کو ترتیب دینے اور اپنی جوشیلی تقریر سے ان کی ہمتوں کو بلند کرنے میں مصروف تھا۔

سلومی: کیوں نہیں ہماری فوج میں صرف وہی ایک ہستی تھی جس پر نظر پڑنے کے بعد پلٹ نہیں سکتی تھی۔

ہابیلہ: (دل تھام کر) آہ! تو نے یہ کہہ کر میرے دل میں محبت کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا میں چاہتی ہوں کہ پھر اس کا دیدار نصیب ہو۔ میں اسے دیکھتی رہوں اور مسلسل دیکھتی رہوں۔ آتش عشق کے شعلے میرے تن بدن کو جلاتے رہیں حتیٰ کہ میرا وجود دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو جائے میں بالکل معدوم ہو جاؤں — بس محبت کی معراج یہی ہے —

سلومی: تو پھر نیک کام میں انتظار کی کیا ضرورت ہے لڑائی رکوا کر اس پہیلے کا پیغام بھیج دو۔ دلی مراد پوری کرنے کی صرف یہی ایک تدبیر ہو سکتی ہے۔

ہابیلہ: ہرگز نہیں سلومی! کیا تو چاہتی ہے کہ میں بالکل صاف لفظوں میں ارمان لوں۔ اس طرح میرے پندار نسائیت کو صدمہ پہنچے گا۔ میں اپنی آرزوئے بسر دگی کو بھی ایک نئے انداز سے پیش کروں گی — مجھے ارادتاً ایک مبہم طریقۂ بیان اختیار کرنا پڑے گا — جا — اپنا قلمدان اٹھا لا میں شاہ زرقہ کو ایک پیغام بھیجنا چاہتی ہوں۔

سلومی: بہت بہتر — ابھی لیجئے —

(قلمدان سنبھال کر لکھنے کیلئے بیٹھ جاتی ہے)

ارشاد ہو ملکۂ عالیہ!

ہابیلہ: لکھو (آہستہ آہستہ بولتے ہوئے) سرزمین فاران کی واحد حکمران ملکہ ہابیلہ کی طرف سے شاہ زرقہ کو سلام پہنچے تین دن کے محاصرے نے ثابت کر دیا ہے کہ بادشاہ سلامت کے لئے کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس آزمائش کو کافی جان کر اپنے وطن کی طرف لوٹ جائیں لیکن اس سے بھی زیادہ مفید مشورہ یہ ہے کہ وہ شہر پناہ عبور کرنے سے قبل قلعہ کا مینار فتح کر لیں۔ اصل کامیابی صرف اسی طرح ممکن ہے۔

سلومی: اور کچھ؟ —

ہابیلہ: بس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ پڑھ کر سناؤ۔

سلومی: (بلند آواز میں پڑھتے ہوئے) سرزمین فاران کی واحد حکمران ملکہ ہابیلہ کی طرف سے شاہ زرقہ کو سلام پہنچے تین دن کے محاصرے نے ثابت کر دیا ہے کہ بادشاہ سلامت کے لئے کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی لہٰذا مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس آزمائش کو کافی جان کر اپنے وطن کی طرف لوٹ جائیں لیکن اس سے بھی زیادہ مفید مشورہ یہ ہے کہ وہ شہر پناہ عبور کرنے سے قبل قلعہ کا مینار فتح کر لیں۔ اصل کامیابی صرف اسی طرح ممکن ہے (معمولی لہجہ میں) لیکن یہ کیا بات ہوئی شہر پناہ عبور کرنے سے پہلے قلعہ کا مینار فتح کرنا کس طرح ممکن ہے۔

ہابیلہ: یہ مت پوچھ سلومی! یہ ایک دلچسپ پہیلی ہے۔ ایک سربستہ راز ہے اور جس کے لئے ہے اس کو حل کرنے دے۔ بس تیرا فرض یہ ہے کہ اس تحریر کو ابھی اس وقت کسی نہ کسی طرح شاہ زرقہ کے پاس بھیج دے اور نتیجے کی منتظر رہ۔

سلومی: بہت بہتر۔ جو فرمان عالیہ ہو۔

تیسری مجلس

شاہ زرقہ اپنے وزیر جنگ اور دیگر مصاحبین کے ساتھ شاہی خیمے کے اندر مصروف گفتگو ہے۔ راہب منقیاس بھی موجود ہے۔ سب کے چہروں سے افسردگی اور پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔

زرقہ: لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آخر اس محاصرے کا انجام کیا ہو گی۔ جنگ کو جاری ہوئے تین دن گزر گئے۔ اور کوئی معقول نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ مخالف فوج کے سپاہی نہ صرف تیر چلا رہے ہیں۔ بلکہ اینٹ پتھر، چھوٹی ٹہریاں، روئی کے ٹکڑے اور پرانی جوتیوں کے لتھڑے تک ہماری فوجوں پر پھینکنے سے باز نہیں آتے۔ زنانہ فوج کی عورتیں ہماری ہمت پر ہنستی ہیں۔ انہیں منہ چڑاتی ہیں اور وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ فلک بوس پہاڑوں کو عبور کرنا آسان ہے لیکن ان کی شہر پناہ تک رسائی بھی مشکل ہے۔ لہٰذا تم سب مجھے بتاؤ۔

ہمیں کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

شمسون:- کچھ سمجھ میں نہیں آتا عقل حیران ہے۔ محاصرہ کئے پڑے رہنا محض بیکار ہے اور واپس چلے جانا بدنامی اور بے عزتی کا باعث ہوگا۔ ہمارے سپاہیوں کی تعداد آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں سے زیادہ ہے لیکن ہمارے تیر بلند فصیل کے کنگورے تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ہوا کے جھونکے ان کا رخ بدل دیتے ہیں اور ہمیں یہ بھی یقین ہو گیا ہے۔ شہر کے اندر سامان خورد و نوش کا معقول انتظام ہے۔ اس لئے ملکہ ہابیلہ بالکل مطمئن اور بے فکر ہے وہ کسی عنوان اطاعت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی۔

زرقہ:- یہ تو مجھے بھی اچھی طرح معلوم ہے لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس مصیبت سے نجات کس طرح مل سکتی ہے۔ کیوں منقیاس! تم کیوں خلاف توقع بالکل خاموش ہو؟ کوئی رائے کیوں نہیں دیتے؟ تم ہمیشہ اپنے مفید مشوروں سے میری مدد کرتے رہے ہو۔ کیا اس موقع پر تم اپنی عقل و دانش گھر پر چھوڑ آئے تھے۔

منقیاس:- بالکل فکر نہ کیجئے۔ عالیجاہ! قدرت کے بھید نرالے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ وہ ستارہ اقبال کب اور کس طرح ہماری نگاہوں کے سامنے روشن ہوگا۔ جو ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے اور ابھی تک ظلمت اور تاریکی میں روپوش ہے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ غیب سے ندائیں آئیں اور لوگوں نے ان کے مطابق عمل کیا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے لئے بھی کوئی آسمانی پیغام فضاؤں کے دوش پر چلا آ رہا ہو۔ بہرحال ہمیں خدا کی ذات سے ناامید نہ ہونا چاہیئے۔

(ایلچی اندر داخل ہوتا ہے)

ایلچی:- (آداب بجا لا کر) عالیجاہ! ابھی ابھی ایک تیر آ کر گرا جس کے سرے پر یہ تحریر بندھی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ ہابیلہ نے کوئی پیغام اس ترکیب سے بھیجا ہے۔

زرقہ:- شمسون! دیکھو یہ کیا چیز ہے۔ اگر کوئی پیغام ہو تو پڑھ کر سناؤ۔

(شمسون کاغذ کھول کر پڑھتا ہے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد)

شمسون:- بے شک عالیجاہ! یہ ایک پیغام ہے۔ ذرا غور سے سنئے۔ لکھا ہے (سرزمین غزال کی واحد ملکہ ہابیلہ کی طرف سے شاہ زرقہ کو سلام پہنچے)

زرقہ:- (مسکرا کر) نوازش کا شکریہ۔

شمسون:- (پڑھتے ہوئے) تین دن کے محاصرے نے ثابت کر دیا ہے کہ بادشاہ سلامت کے لشکر کی کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔"

زرقہ:- کوئی نئی بات نہیں ہمارا بھی یہی خیال ہے۔

شمسون:- لہٰذا مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس آزمائش کو کافی سمجھ کر اپنے وطن کی طرف لوٹ جائیں۔

زرقہ:- اوہو۔ اتنی جرأت۔ تم دیکھتے ہو منقیاس! اس مشورے میں ایک زبردست طنز پنہاں ہے۔ بتاؤ ہم اسے کس طرح برداشت کر سکتے ہیں۔

منقیاس:- اس وقت عالیجاہ کو بہت غصہ آ رہا ہے لیکن اس قسم کے بیانات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جاتا ہے۔

زرقہ:- خیر دیکھا جائے گا۔ شمسون! کیا یہی پیغام ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے—

شمسون:- اور بھی ہے عالیجاہ! (پڑھتے ہوئے) لیکن اس سے بھی زیادہ بہتر مشورہ یہ ہے کہ وہ شہر پناہ کو عبور کرنے سے قبل قلعہ کا مینار فتح کر لیں۔ اس کی کامیابی صرف اسی طرح ممکن ہو سکتی ہے۔"

زرقہ:- کیا مطلب؟ — شہر پناہ عبور کرنے سے قبل مینار فتح کر لیں۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے؟ انہیں معلوم کرو شمسون!

شمسون:- اصل عبارت یہی ہے عالیجاہ! معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت کاتب سے کوئی غلطی ہو گئی ہے—

منقیاس:- ایسے پیغامات نظر ثانی کے بغیر نہیں بھیجے جاتے۔ میرا خیال ہے کہ اس پیچیدہ عبارت میں کوئی گہرا راز پنہاں ہے۔

زرقہ:- راز واز کچھ نہیں محض بکواس ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ ملکہ نے ہماری دماغی پریشانیوں کا اندازہ لگا لیا ہے اور وہ ایک بے معنی عبارت سے ہماری عقل اور زیادہ خراب کر دینا چاہتی ہے۔ شہر پناہ عبور کرنے سے قبل مینار فتح کر لیا جائے— لغو— بالکل لغو۔

منقیاس:- لغو نہیں عالیجاہ! معنی و مفہوم سے لبریز ہیں۔ اس کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔

زرقہ:- اگر تم سمجھ گئے ہو تو بیان کرو۔

منقیاس:- میں بادشاہ سلامت سے دریافت کرتا ہوں کہ بتائیے— ایک فوج کا مینار کہاں ہوتا ہے؟—

زرقہ:- (تعجب سے) فوج کا مینار؟— اس سے بھی زیادہ لغو اور بے معنی بات ہے۔ مینار شہر یا قلعے کا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک جگہ قائم ہوتے ہیں اور فوج ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتی رہتی

ہے۔ ہرگز وہ مینار نہیں ہو سکتی۔

منقیاس: اچھا پھر ایک سوال دہراتا ہوں۔ بتائیے فوج کا مینار کون ہوتا ہے؟ ––

زرقہ: کیسی باتیں کر رہے ہو۔ منقیاس! فوج جانور اور آدمیوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس مینار کی ہمیشہ ایک بے جان تعمیر ہوتا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے فوج کا مینار بالکل بے معنی بات ہے۔

منقیاس: میں پھر پوچھتا ہوں۔ بتائیے۔ فوج کا مینار کسے کہہ سکتے ہیں؟

زرقہ: اوہ میں سمجھ گیا۔ فوج کا مینار اس جرنیل کا دل ہے جس کے اشارے پر فوج لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ مثلاً میں اپنی فوج کا مینار ہوں۔

منقیاس: بے شک۔ یہ جواب بالکل صحیح ہے۔ مجھے اس سے زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

زرقہ: واہ واہ۔ انداز بیان کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ ملکہ ہابیلہ دلیر اور بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ عقلمند بھی ہے۔ واقعی مینار کو فتح کئے بغیر شہر پناہ کو عبور نہیں کیا جا سکتا –––– اچھا اب میں ابیلارد کی موجودگی میں تخلیہ چاہتا ہوں۔ سب لوگ چلے جاتے ہیں۔ ابیلارد! تو نے ملکہ ہابیلہ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس کی شکل و شباہت میرے سامنے بیان کر۔

ابیلارد: عالیجاہ! وہ رعنائی نسائیت کی جیتی جاگتی تصویر ہے نسوانی حسن کی بہترین مرقع ہے۔ وہ بادلوں کے تنگ گوشوں میں کھیلتی ہوئی شفق کی طرح نظر فریب حیرت انگیز اور جادو اثر ہے۔

زرقہ: کیا وہ جوان ہے۔

ابیلارد: جوان! –– بالکل جوان ہے عالیجاہ! اس کی نوخیز جوانی شبنم کے ان قطروں کی طرح پاکیزہ اور دل آویز ہے جو صبح کے وقت پھولوں کا منہ چومتے نظر آتے ہیں۔

زرقہ: اور کچھ بتا۔

ابیلارد: کیا عرض کروں عالیجاہ! وہ شگوفہ کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس کی تخلیق آہستہ خرام ندیوں کی سبک روی، کوندتی ہوئی بجلیوں کی چمک جھلملاتے ہوئے تاروں کے تبسم، آتشیں شعلوں کی لپٹ اور ان سے لرزتے ہوئے سایوں سے مل کر ہوئی ہے –– صرف اس کی آنکھوں کا نظارہ موسم بہار کی سہانی راتوں میں دیکھے ہوئے خواب سے زیادہ

دلفریب ہے۔

زرقہ: بس بس۔ اس سے زیادہ بیان نہ کر۔ اب مجھے اسے دیکھنے کی آرزو دل میں پیدا ہو گئی ہے ––

چوتھی مجلس

ملکہ ہابیلہ اپنے خاص کمرے میں ایک گم گشتہ ترتیب بکھری ہوئی پھولوں کی پتیوں و غیرہ اور بے ترتیبی سے سمجھی ہوئی چیزیں مسل رہی ہے –– سہومی اپنا ستار لئے چھوٹی سی تپائی پر بیٹھی ہے لیکن اس کے تاروں میں جنبش نہیں ہے۔ دونوں اپنے اپنے خیالات میں محو ہیں۔ تیز قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ دو کنیزیں ایک شخص کو حراست میں لئے داخل ہوتی ہیں۔ ملکہ ایک دم چونک پڑتی ہے۔ دونوں کنیزیں آداب بجا لاتی ہیں۔

ایک کنیز: ہماری ذی وقار ملکہ کو اس جنگ میں فتح و نصرت نصیب ہو۔ صدر دروازے کے پہرہ داروں نے اس اجنبی کو گرفتار کر کے ہمارے سپرد کیا ہے تاکہ آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

ہابیلہ: یہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟

دوسری کنیز: باوجود کوشش کے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ یہ چاہتا ہے کہ خود آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرے۔

ہابیلہ: تم دونوں اسے چھوڑ کر باہر چلی جاؤ۔ تاکہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے بیان کر سکے۔

(کنیزیں چلی جاتی ہیں اور ملکہ تخت پر بیٹھ جاتی ہے نووارد جو دراصل زرقہ ہے۔ ملکہ کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر آغاز گفتگو کرتا ہے)

زرقہ: سرزمین تاران کی ذی وقار ملکہ! ایک قیدی کی حیثیت سے تیرے حضور شرف باریابی حاصل کرنا میرے لئے باعث فخر ہے۔

ہابیلہ: میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ تم کون ہو اور یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟

زرقہ: میں بادشاہ زرقہ کا مشیر خاص ہوں۔

ہابیلہ: تم بادشاہ کے مشیر خاص ہو تو اسے مشورہ دو کہ اس طرح محاصرہ کئے رہنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

زرقہ: بے شک یہ سب کا یہی خیال ہے لیکن تیرے بھیجے ہوئے حسن و طوفان نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اس وقت

اس مصیبت سے بچنے کی تدبیر معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

ہابیلہ: کیسا طوفان؟ میں نے ایسی جرأت کبھی نہیں کی۔

زرقہ: بلاشبہ تیرا مبہم سا پیغام میرے لئے طوفان عظیم ہے۔ اگر میں اسے حل نہ کرسکا تو بادشاہ کے قول کے مطابق میری عزت و آبرو بلکہ میری زندگی خطرے میں ہے۔ بادشاہ کو مجھ پر اعتماد ہے۔ جو باتیں اس کی سمجھ میں نہ آتی تھیں انہیں میں حل کر دیتا تھا یہی وجہ ہے کہ میدان جنگ میں بھی اس کے ہمرکاب رہتا ہوں لیکن یہ معمہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ خود میری عقل بھی اس کو حل کرنے سے قاصر رہ گئی۔

ہابیلہ: پھر اب تم کیا چاہتے ہو؟

زرقہ: جیسا کہ میں [illegible] اس معمہ کا صحیح حل معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ کی خوشنودی [illegible] حاصل نہیں [illegible] ہوں سے [illegible] ملکہ کو [illegible]

ہابیلہ: یہ میرے لئے ناممکن ہے [illegible] کہ [illegible] سے رضامند ہو جاؤں

زرقہ: اگر یہ ممکن نہیں تو مجھے اجازت دے کہ میں حضور میں رہ کر خود اس راز کی حقیقت معلوم کر لوں۔

ہابیلہ: صرف یہاں رہ کر تم کچھ بھی معلوم نہ کرسکو گے

زرقہ: کیوں نہیں۔ یہ آنکھیں مجھے سب کچھ بتا دیں گی — یہ [illegible] ہیں جن کے سائے میں سحر و طلسمات [illegible] کی [illegible] بادشاہ نے مجھے پوری طرح آسودہ [illegible] سے ساتھ [illegible] دیکھ لینے دے میں نے سنا ہے کہ ان کا نظارہ موسم بہار کی سہانی راتوں میں دیکھے ہوئے خواب سے زیادہ لطیف ہے پھر نیند سے بیدار ہونے کے بعد جس طرح بہت سے خوابوں کی تعبیر معلوم کر لی جاتی ہے اسی طرح تیا شی میں معمہ کو حل کر لوں گا۔

ہابیلہ: تمہاری مرضی — اچھا سلومی ہمارے ان [illegible] مہمان کو [illegible] سنا سیت سناؤ۔ اس کی خاطر مدارات ہمارا فرض ہے۔

(سلومی [illegible] ملکہ ہابیلہ اگر اضطراب تب تو بڑھ جانا مقصود ہے تو نے آج اول و زحمت جنبش کیوں نہیں دی جاتی۔

ہابیلہ: [illegible] میں موسیقی کے فن لطیف سے ناآشنا ہوں۔

زرقہ: [illegible] ہے جب عام گفتگو میں تیرے لب و لہجہ کی شیرینی خوش الحان پرندوں کو منقار زیر پر کر دینے کے لئے کافی ہے تو نہ جانے نغمہ سرا ہو جانے پر ان کی عشرت سامانیاں کیا رنگ لائیں۔ لہذا گم [illegible] رکھ جا — حتیٰ کہ میرے جسم و [illegible] تیرے

سامنے ہم آہنگ ہو کر گنگنانے لگے۔

{سلومی اپنا ستار ہابیلہ کو پیش کر کے الگ ہٹ جاتی ہے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ گانا شروع کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے}

زرقہ: (گانا ختم ہونے پر) ملکہ ہابیلہ! صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ لہٰذا اب اجازت دے کہ میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔

ہابیلہ: لیکن وہ معمہ [illegible] کا حل معلوم کر لیا ہے؟

زرقہ: خوب اچھی طرح — اپنے بادشاہ کے سامنے جب یہ داستان بیان کروں گا تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سمائے گا۔

ہابیلہ: پہلے میرے سامنے بیان کرو تاکہ میں اندازہ لگا سکوں کہ تم نے سمجھنے میں غلطی تو نہیں کی

زرقہ: بیان کرنے کی ضرورت نہیں کل صبح جب بادشاہ کا [illegible] مینار پر ہو جائے گا تو اس وقت تم خود جان لو گی کہ میں نے سمجھنے میں غلطی نہیں کی — اچھا اب رخصت ہوتا ہوں مجھے اجازت ہو گی۔

ہابیلہ: [illegible] سے اب اور کب ملو؟

زرقہ: کل صبح شہر پناہ کے باہر صدر دروازے کے سامنے۔ بادشاہ نور سحر کے پھولوں سے کھیلتے ہوئے آئے گا میں بھی اس کے ہمراہ آؤں گا تاکہ مینار کے سامنے میں [illegible] کا شرف حاصل [illegible]

(زرقہ تیزی سے چلا جاتا ہے۔ ہابیلہ [illegible] رہ جاتی ہے [illegible] خاموشی [illegible] ہے}

ہابیلہ: سلومی! تو نے بھی — یہ اجنبی کون تھا؟

سلومی: مینار نے اپنے مالک کو پہچان لیا ہے۔

ہابیلہ: بالکل ٹھیک ہے سلومی! یہ زرقہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ خود بادشاہ [illegible] بدل کر یہاں آیا تھا۔

سلومی: [illegible] کہ شہر پناہ کو عبور کرنے سے پہلا [illegible] لے

پانچویں مجلس

شہر پناہ کے سامنے کھلا میدان۔ جو گل بوٹوں کی افراط سے گوشۂ چمن بنا ہوا ہے۔ پردہ اٹھنے پر ایک طرف سے ملکہ ہابیلہ اپنی [illegible] اور دوسری طرف سے شاہ زرقہ بادشاہ دو وفادار داخل ہوتے ہیں۔ [illegible] سلطنت اور دیگر مصاحبین ہمراہ ہیں۔ دونوں کے ہاتھوں [illegible] پھولوں کے گجرے ہیں۔ قریب پہنچ کر ملکہ جھکنے لگتی ہے مگر

[illegible] کو روک کر [illegible] رہنا دیتا ہے ملکہ کبھی [illegible] ہے۔ موسیقی کی تانیں فضا میں بلند ہوتی ہیں جو رفتہ رفتہ تیز ہوتی جاتی ہیں۔ زرقہ: میری ملکہ!

[illegible]

آج کل

فطرت کی انجمن میں چراغاں ہے آجکل
ذرّوں کی گود میں مہ تاباں ہے آجکل

وہ دردِ دل کے روح میں مہماں ہے آجکل
منظور چارۂ غمِ پنہاں ہے آجکل

یکسوئی نگاہ پریشاں ہے آجکل
ہر شے سے حُسنِ دوست نمایاں ہے آجکل

اے سوزِ عشق تیری توجہ کا شکریہ
تاریکیوں میں دل کی چراغاں ہے آجکل

کیا چیز ہے تری نگہِ التفات بھی
آنکھوں سے غم کی چوٹ نمایاں ہے آجکل

تدبیر کوئی حسنِ خود آرا سے پُوچھئے
تقدیرِ عشق سر بگریباں ہے آجکل

ڈر ہے اُچٹ نہ جائے تغافل وشوں کی نیند
لب پر مرے فسانۂ دوراں ہے آجکل

شاید وہ جلوہ ریز ہیں کلیوں کے بھیس میں
مہکی ہوئی فضائے گلستاں ہے آجکل

کیا زحمتیں نگاہ کو دوں سوئے ماسوا
منظور مجھکو اپنا ہی عرفاں ہے آجکل

آکر سنوار دیں وہ گریباں کی دھجیاں
دیوانۂ بہار پریشاں ہے آجکل

جو فصلِ گل میں شانہ کشِ زلفِ دوست تھیں
اُن انگلیوں میں دل کا گریباں ہے آجکل

ویراں سرائے عشق ہو یا کائناتِ حسن
ہر چیز اپنے رُخ سے پریشاں ہے آجکل

رکھتی نہیں جو فصل کوئی موت و زیست میں
وہ شے شریکِ قسمتِ انساں ہے آجکل

میں ہوں کہ اعتمادِ اسیری میں ہوں اسیر
سب کہہ رہے ہیں وَا درِ زنداں ہے آجکل

لاؤں کسے نگاہِ پرستش ترے لئے
اُن کا خیال بھی تو گریزاں ہے آجکل

اعجاز اور فکرِ سخن، اتفاق ہے
ورنہ حقیقتہً وہ پریشاں ہی آجکل

اعجاز صدیقی اکبرآبادی

سوانح

ابن رُشد

علم کے اکثر شعبوں کی طرح فلسفہ پر بھی عرب کی تہذیب کا احسان ہے
لام چھٹی صدی عیسوی میں ظہور میں آیا۔ اور ملک عرب میں جو ظلمت
، چھلا تی ہوئی دھوپ، لوؤں کی لپیٹ اور باد صرصر کے طوفان کے
مشہور تھا۔ جہاں تہذیب و تمدن کا نام تک نہ تھا۔ جہاں جہالت و
بربیت درجہ کمال کو پہنچ چکی تھی، ایک لمحہ میں امن و اخوت اور تہذیب و
ان کا سمندر موجزن نظر آنے لگا۔ اس غیر معروف ریگستان میں بہت
محققین پیدا ہوئے جو مغرب و مشرق میں پھیل گئے۔ اس نوزائیدہ
م نے علم کے مختلف شعبوں پر قدر دانی سے نظر ڈالی۔ یہ تو ظاہر
کہ علم کا سنگ بنیاد ماضی بعید میں ڈالا جا چکا تھا۔ لیکن ابھی تک
م تھا عربوں کی علم نوازی نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا اور
ج علم کی کوئی ایسی شاخ نہیں۔ جو عربوں کے احسان سے انکار کر سکتی
یہی وجہ ہے کہ عربوں کی موجودہ تہذیب اور قدیم تمدن کے درمیان
خاص تعلق ہے۔ عربوں نے قدیم تہذیب کو نئے رنگ میں ڈھالا
اس طرح قدیم و جدید تہذیب میں اتحاد پیدا ہو گیا۔

عرب فلسفی ابن رشد ابو ولید محمد بن احمد ابن احمد ابن رشد کی
پیدائش بمقام قرطبہ ۵۲۰ھ مطابق ۱۱۲۶ء میں ہوئی۔ اس کی پیدائش
کے ایک ماہ بعد اس کے دادا کا انتقال ہو گیا۔ جو بہت مشہور و معروف
فقیہ تھا۔ ابن رشد کی ابتدائی زندگی مسلم الثبوت اساتذۂ عہد کے زیر تعلیم
علم الٰہیات، فقہ، ریاضی، طب اور فلسفہ پڑھنے میں گذری۔ یوسف
اول جو سنہ ۵۵۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ وہ عربی ادب کا فاضل تھا۔
فلسفہ سے اسے خاص شغف بلکہ عشق تھا۔ اس نے فلسفہ کی
بہت سی کتابیں جمع کی تھیں۔ اپنے وزیر ابو بکر ابن طفیل کو اس نے
فلسفیوں اور ادیبوں کو اکٹھا کرنے کا کام تفویض کیا تھا۔ اس جماعت
نے شہنشاہ کے دربار کی زینت تھی۔ ابن رشد بھی شامل تھا۔ اس طرح
ابن رشد سے یوسف کو تعارف حاصل ہوا۔ اگر ہم ابن رشد کی زندگی
کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا۔ کہ وہ فطرۃً فلسفی تھا۔ ابن رشد صرف
تیرہ برس کا تھا۔ جب اس کے استاد اومپیس نے ۵۵۳ھ میں وفات پائی
تاہم اس کم سنی میں اس نے کافی علم حاصل کر لیا تھا۔ اومپیس کو

ارسطوئے اندلس" کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنے ہونہار شاگرد کو فلسفہ اور
ساتھ ہی ساتھ ادب کی تعلیم دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔
اس نے فلسفہ پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے بعض
"ارسطو" کے موضوع پر ہیں۔ فلسفہ کے مختلف شعبوں پر اس کی متعدد
تصانیف ہیں جن میں اس نے اپنی تحقیق درج کی ہے۔ اومپیس نے
جس کام کو شروع کیا۔ اس کی تکمیل اس کے شاگرد ابن رشد نے کی۔

بہت افسوس کی بات ہے کہ کسی اسلامی لائبریری میں اس کی
کتابیں موجود نہیں ہیں۔ البتہ ان میں سے بعض یورپ میں محفوظ ہیں
اس کی تصنیف "الوداع" کا عبرانی ترجمہ فرانس کی پبلک لائبریری
میں اب تک موجود ہے۔

ابن رشد کا دادا قرطبہ کا قاضی تھا۔ اور وہ خود ۵۶۵ھ میں
اشبیلیہ کا قاضی مقرر ہوا تھا۔ محمد بن مغیث قاضی قرطبہ کی وفات کے بعد
اس کا تبادلہ وہیں ہو گیا۔ اس کی عمر اس وقت صرف ۲۷ برس تھی
جب وہ قاضی اعلیٰ مقرر ہوا۔ اور اندلس سے مراکش تک کے علاقے
اس کے زیر قضا آگئے۔ وہ مختلف مقامات میں گیا۔ عدالت اعلیٰ اس
کے ماتحت تھی۔ وہ اس منصب جلیلہ پر پچیس سال تک فائز المرام رہا
المنصور ابن یوسف نے اسے اپنا طبیب خاص مقرر کیا۔ وہ اس سے
فلسفہ کے مسائل اور ان کا اسلام کے عقائد و مسائل پر اثر کے موضوع
پر بحث کرنے میں مسرت محسوس کرتا تھا۔ لیکن اس جہان فانی کی دوسری
چیزوں کے مانند اس کے اقبال و مسرت کے ایام قریب اختتام تھے۔
تھوڑے ہی عرصہ میں وہ تباہ و برباد ہو گیا۔ یہ واقعہ طویل، حیرت انگیز اور
حسرتناک ہے۔

مؤرخین کو اس کے زوال کے حقیقی اسباب میں اختلاف ہے بہرکیف
یہ ظاہر ہے کہ ناواقفوں کی جماعت قیاسی مطالعہ کو نفرت کی نگاہ سے
دیکھتی تھی تا آخر کار بغض و حسد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ لوگ اسے
زندیق کہنے لگے۔ اگرچہ المنصور کو اس سے بہت محبت تھی۔ لیکن عوام
میں اس کے فیصلوں کے خلاف ہیجان برپا ہو گیا۔ اس لئے وہ اس کی
مدد نہ کر سکا۔ اگر ابن رشد کے عقائد اسی تک محدود رہتے تو شاید

لوگ اس قدر دور نہ نکل جاتے لیکن بدقسمتی سے وہ منصف اعلیٰ اور طبیب خاص تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے خیالات نے مذہبی فضا کو زہریلے جراثیم سے بھر دیا ہے۔ اس کے حریفوں کو بہت اچھا موقع مل گیا اور وہ لوگ بآسانی اس شعلہ کو بھڑکانے میں کامیاب ہو گئے۔ المنصور آخر کار اپنی رعایا سے بدظن ہو گیا۔ اور ابن رشد اور اس کے تلامذہ کو آزمائش عام کا حکم دیا۔ ایک جماعت کثیر جس میں تمام علماء شامل تھے قرطبہ کی مسجد میں جمع ہوئی۔ ابن رشد کو اس کے اعزاز سے محروم کر دیا گیا۔ اور قرطبہ کے نزدیک یہودیوں کے ایک چھوٹے سے گاؤں الیسانہ میں جلا وطن کر دیا گیا۔ لیکن عوام اتنی بڑی سزا سے بھی مطمئن نہ ہوئے۔ اس لئے المنصور کو مجبوراً فلسفہ اور منطق کی کتابوں کو جلا ڈالنے کے خاص احکام صادر کرنا پڑے لیکن المنصور خود ایک بہت بڑا فلسفی اور فلسفے کا دلدادہ تھا اس لئے فطرۃً فلسفہ کی یہ توہین برداشت نہ کر سکا چنانچہ اس نے ابن زہر کو جو خود بہت مشہور فلسفی تھا۔ کتابوں کو جلانے والی جماعت کا سرگروہ مقرر کیا۔ المنصور کی اس حرکت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور اشبیلیہ کے ایک شخص نے یہ درخواست بھی بھیجی کہ ابن زہر خود فلسفی ہے۔ اس لئے وہ مخالفین کی رعایت کر سکتا ہے۔ لیکن شکایت کرنے والوں کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ فلسفہ کی کتابوں کو جلا ڈالنے کی تحریک کرے۔

ابن رشد کو بہت سے آدمیوں کے ساتھ جلا وطن کر دیا گیا تھا اس کی ہر قدم پر تذلیل ہوئی۔ وہ خود رقمطراز ہے کہ سب سے بڑی تکلیف کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب چند جاہل متعصب اشخاص نے مجھے نماز کے لئے قرطبہ کی مسجد میں نہ جانے دیا۔ المنصور اس کی جلاوطنی کو برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ جب لوگوں کے عارضی جذبات سرد ہو گئے۔ تو اسے مراکش بلا لیا گیا۔ آفتاب اقبال نے بدلیوں سے جھانکا۔ وقت آ گیا تھا کہ اسے صبر آزما تکالیف کا ثمر ملے لیکن بے وقت موت نے اس کی تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا۔ ۵۹۵ھ میں وہ المنصور کی وفات سے ایک سال پہلے انتقال کر گیا۔ المنصور کے ساتھ اندلس میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت ختم ہو گئی۔ اور ابن رشد کے ساتھ فلسفہ کے آسمان کا ایک ستارہ درخشندہ غروب ہو گیا۔ ابن رشد نے کئی بچے چھوڑے جن میں سے بعض قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ابن رشد صابر، متحمل اور بہت دلیر تھا۔ وہ عرصہ دراز تک قاضی رہا لیکن کبھی اپنی تفصیل [illegible] کی کوشش نہ کی جو کچھ اس نے کمایا اپنے وطن اور قوم [illegible] پر خرچ کر دیا۔ وہ اتنا متحمل تھا کہ اگر [illegible] مدت دراز تک قاضی رہا لیکن کبھی موت کی سزا نہ دی۔ اس کا ذاتی شغل مطالعۂ کتب تھا۔ "اپنی زندگی میں صرف دو روز اس نے کتاب نہ پڑھی ایک اپنے نکاح کے دن دوسرے اپنے باپ کی وفات کے دن"

اس کی خاص تصانیف میں فقہ، قواعد علم نجوم اور فلسفہ پر رسالے ہیں۔ ابن الابار کے قول کے مطابق اس کی تصانیف دس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ طب پر اس کی خاص کتاب کلیات ہے اور بوعلی کی طبیہ نظم کی شرح ہے فلسفہ میں اس کا شاہکار ارسطو کی شرح ہے۔

یورپ میں ابن رشد کی کتابوں کی اشاعت اور یورپین تمدن پر ان کے تاثرات کا بیان بہت طویل ہو گا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں جب بیت المقدس کے لئے مسلمانوں اور یورپیوں میں جنگ ہو رہی تھی تو عیسائیت اور اسلام میں آگ اور پانی کا بیر تھا لیکن جلد ہی یورپینوں کو اسلامی ممالک میں جانے کا موقع مل گیا۔ اور مسلمانوں سے معاہدہ ہو گیا تب انہیں مسلمانوں کی تہذیب اور ادبی فوقیت کو تسلیم کرنا پڑا۔ یورپ کی اس وسیع الخیالی پر جتنا بھی رشک کیا جائے کم ہے۔ وہ مذہبی لحاظ سے اسلام کا پکا دشمن تھا لیکن دوسری جانب عربوں کے فیاض منبر پر جگہ حاصل کرنے کے لئے ہمہ دم تیار۔

ٹولیڈو (طلیطلہ) کا لارڈ بشپ پہلا شخص تھا جس نے اسلامی تصانیف فلسفہ کے عربی سے لاطینی میں ترجمہ کرنے کے لئے ایک انجمن قائم کی۔ اس انجمن کے کچھ افراد یہودی تھے جن کو عربی ادب اور زبان پر کافی عبور حاصل تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور دنباح ہے جو اسپانیہ سے آیا تھا۔ ان لوگوں نے بوعلی سینا اور فارابی کی بہت سی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اسی اثنا میں عربی کتابوں کا ترجمہ صقلیہ میں شروع ہوا لیکن یہ محض ابتدا تھی۔ عربی فلسفہ کی حقیقی اشاعت فریڈرک ثانی (جرمنی کا رومی شہنشاہ) سے شروع ہوئی۔ اس کی طبیعت فلسفیانہ تھی۔ اور مذہبی جماعت نے اس کی جتنی زیادہ تعریض کی۔ اسی قدر اسے فلسفہ سے زیادہ محبت ہوتی گئی اس نے صقلیہ کے ایک باشندے سے عربی بھی سیکھی تھی۔ اس کے دربار میں [illegible] تعداد کے علماء موجود تھے۔ اسی وقت ابن رشد کے یہودی تلامذہ نے اندلس چھوڑا۔ اور تمام یورپ میں پھیل گئے۔ یہودی اور [illegible] نے جو فرانس چلے گئے تھے۔ ابن رشد کی تصانیف کا عبرانی زبان میں ترجمہ کیا جب فریڈرک نے [illegible] ترجموں کو [illegible] کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ [illegible]

وہ باری تھا، شکاشلہ میں ایک کتاب لکھی جو ابن رشد سے ماخوذ تھی میکائیل اور ہرمن نے بھی اس میدان میں بہت کام کیا۔ غرض کہ تیرہویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے ابن رشد کی تقریباً تمام کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوگیا۔

لیکن ابھی ابن رشد کے خیالات یورپ میں پھیلنے بھی نہ پائے تھے کہ مختلف عیسائی فرقوں نے ان کی پوری طرح متحدہ مخالفت شروع کی ۱۲۰۰ء میں ایک شاندار جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں ابن رشد کے معتقدوں کو کافر اور ارسطو و بو علی سینا کے مطالعہ کو ممنوع قرار دیا گیا۔ ابن رشد کا سب سے بڑا مخالف سینٹ طامس تھا جس نے اس کے خلاف بہت سی کتابیں لکھیں، بہت سے مصنفوں نے سینٹ طامس کی تقلید کی اور عرب کے فلسفہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا بہرحال اگرچہ مذہبی فرقوں نے عرب کے فلسفہ کی پوری طور سے مخالفت کی۔ مگر یہ [illegible] کی طرح پھیل گیا۔ وہ جماعتیں عرصہ دراز تک متحد نہ رہ سکیں اور فرانسسکنز نے بو علی سینا اور ابن رشد کی کھلم کھلا طرفداری کی۔ فرانس کی مذہبی تعلیم کی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ صوبجات نے طامس کی اقتدا کی۔ لیکن پیرس کے دارالعلوم نے ابن رشد کی حمایت کی ان احتجاجوں اور مخالفتوں کے باوجود ابن رشد کا فلسفہ چودہویں صدی میں تمام یورپ میں پھیل گیا۔ اور جب لوئی یازدہم نے فرانس کے نظام تعلیم میں اصلاح کرنی چاہی۔ تو پروفیسروں کو ابن رشد کے ارسطو پر رسالوں کو نصاب میں شامل کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح بغیر تعرض کے ابن رشد کا فلسفہ تمام یورپ میں مطالعہ کیا جانے لگا۔ اور اس کے مطالعہ کا مرکز اطالیہ میں پیڈوا کا دارالعلوم تھا۔

[ماخوذ از:۔ (۱) ڈے بور کی تاریخ فلسفۂ اسلام
(۲) پروفیسر رینان کی حیاتِ رشد۔
(۳) مقالاتِ شبلی
(۴) ابن رشد مصنفہ مولوی یونس صاحب فرنگی محلی]

محمد شعیب رہبر شیخوپوری

ہوشیار ہو جائیے

جب انسان طاقت سے اندھا ہو کر کھیلتا ہے تو اسکی جوانی بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اسے کہتے ہیں کہ جوانی کو پانی کیطرح بہا دیا پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ مایوس ہو کر اسوقت کیلئے رویا کرتا ہے اسکی تمنائیں دل مسوس کر رہ جاتی ہیں اسکو ناکامی اور شرمندگی ہونے لگتی ہے۔ ایسے ہی تمام نوجوانوں اور ۴۰ سال کی عمر کے حسرت نصیب لوگوں کیلئے مندرجہ ذیل مجربات تیار کئے گئے ہیں جن کے متعلق اسوقت لاکھوں انسان بلند آواز سے کہہ رہے ہیں کہ اکسیری دواخانہ دہلی کی ادویات نے دوبارہ جوانی بخشدی۔ ان دواؤں کی ایجاد نے آج ہندوستان کے کونے کونے میں اپنے اثر کا سکہ بٹھا دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مردانہ بیماریوں کے علاج کیلئے اس دواخانہ کا نام بہت بلند ہے جہاں پورا طبی بورڈ ہروقت ادویات کی تحقیقات اور مریضوں کی خدمات کیلئے کام کرتا رہتا ہے، اگر آپ بھی کسی پوشیدہ بیماری میں مبتلا ہیں تو مندرجہ ذیل دواؤں کا استعمال کیجئے اور چند ہی روز میں پھر جوان بن جائیے۔ اگر ایک بھی دوا غلط ثابت ہو تو ایک سو روپیہ انعام دیا جائیگا جھوٹ بولنا حرام ہے۔

مقوّی طِلاء

اس صدی کا انمول اور بے بہا جوہر ہے۔ اس حیرت انگیز تیل کی تاثیر سے ایک منٹ میں فائدہ ہوتا ہے۔ نہ آبلہ و چھالے کا ڈر۔ لگاتے ہی جذبات میں فوراً بیداری ہو جاتی ہے۔ ایک شیشی کے استعمال سے خواہ کسی قسم کے نقائص پیدا ہو گئے ہوں مثلاً کجی، لاغری، کم خواہشی، رگوں کا پھول جانا۔ دھت پر شرمندہ ہو جانا وغیرہ کو دور کر کے طاقتور بنا دیتا ہے۔ یقین کیجئے کہ اس سے بہتر طلاء آپ کو نہیں ملے گا۔ اس کے استعمال سے رگوں، پٹھوں میں نئی زندگی اور جوش جوانی پیدا ہو جاتا ہے، ناکارہ کو قابل فخر مرد بنا دینا اس طلاء کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ہمیشہ کے لئے مردانہ کمزوری کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔ نہایت زود اثر اور قطعی بے ضرر ہے۔ نئی روح، نئی زندگی اس طلاء کے استعمال سے مل جاتی ہے۔ یہ دوا تمام ملک میں اپنی زود اثری کا سکہ بٹھا چکی ہے قیمت فی شیشی ... روپے ہے رعایتی دو روپے۔ محصول دس آنے علاوہ۔

رَیانین

شدید قسم کے جریان اور احتلام کو دعویٰ کے ساتھ بیس دن میں دور کرتی ہے پیشاب سے پہلے یا بعد قطرے کا گرنا، مادہ کا پتلا پڑ جانا، سر چکرانا، دل دھڑکنا، دماغ کا کمزور رہنا، خواہش کا زائل ہو جانا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ جانا یہ سب جریان کی علامتیں ہیں۔ اس دوا کے استعمال سے مادہ گاڑھا ہو کر کافی مقدار میں پیدا ہوتا ہے، فربہی اور تر و تازگی پیدا ہو جاتی ہے شیشی کے استعمال سے تمام عمر کے لئے جریان کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔ یہ دوا جواہرات سے تولنے کے قابل ہے۔ ہزارہا نامردوں کو بامراد بنا دیا ہے ہندوستان کے علاوہ دیگر ملکوں میں بھی اس دوا کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اس دوا کے استعمال کے بعد طبیعت میں چستی، دل میں جوانی کی امنگ اور ... کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، فوراً آزما کر دیکھئے۔ قیمت فی شیشی تین روپے رعایتی دو روپے محصول ڈاک دس آنے علاوہ۔

ثُروقتی

امساک کیلئے اس سے بہتر دوا اور بے ضرر، تمام مضر صحت، نشہ آور اجزاء سے پاک مل جائے تو ہم ایک ہزار روپیہ انعام دینے کو تیار ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہماری اس ایجاد سے امساک کی پوری قوت پیدا ہوگی۔ سرعت کی شکایت دور ہو جاتی ہے وقت پر ندامت اور خجالت سے بچا لیتی ہے۔ اسکے استعمال سے امساک کی قوت مستقل طور پر قائم ہو جاتی ہے۔ آپ ان گولیوں کو ضرور ... گھر کی تمام راحت مل جائے گی۔ قیمت فی شیشی ایک درجن گولیاں رعایتی دو روپے۔ محصول ڈاک دس آنے علاوہ۔

نوٹ:۔ اکٹھی تینوں ادویات منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف ہوگا۔

اکسیری دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۴۱ کلاں محل (اے، ایل) دہلی

ہندوستان کے ہزاروں انسان اپنے ہاتھوں جوانی کو برباد کر بیٹھے

بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ جوانی بڑھانے کا علاج ہوتا ہے مگر ان دنون
کے اندر پاس جانیکا پرہیز بہت ضروری ہے کیونکہ اس علاج کی پوشیدہ ترکیب کے اصول
مین خرابی آجاتی ہے۔ اس لئے صرف انہی لوگوں کو یہ کورس استعمال کرنا چاہئے جو ضبط سے کام
لینے کا اقرار کرین عجیب طاقت چوتھے دن ہی پیدا ہونے لگتی ہے بس اس طاقت کو روک لینے سے انسان برسوں جوان رہ سکتا ہے اور اسکی قوت کم نہیں ہوتی
اس علاج مین دو دوائیں ہوتی ہین ایک کھانے کی ... ملک لگانے کی، دونوں دوائیوں کے کورس کا نام "**رس جووین**" ہے۔ کھانے کی
کی پہلی خوراک حلق سے اتری اور اس نے تمام اعصاب کو ہوشیار کرنا شروع کر دیا۔ اور کمزوری کو بدن سے اس طرح نکالنا شروع کر دیا
گندہ دور کر دی۔ لگانے کی دوا بھی اپنے اثر کا کمال دکھاتی ہے۔ عضو پر پھیلتے ہی مریض خود حیرت زدہ ہو جاتا ہے کیونکہ
مین بجلی کی طرح لہرین دوڑنے لگتی ہین۔ اور طاقت کا سمندر ابل پڑتا ہے۔ اس کورس مین عجیب و غریب صفات بند ہین۔ اگر کوئی تندرست
انسان ایک دفعہ بھی استعمال کرے تو جوانی کا پورا سماں دیکھ لے۔ پورے کورس کی قیمت پانچ روپے محصول ڈاک دس آنے علاوہ
(یہ کورس صرف ان ہی لوگوں کو بھیجا جائے گا جو صبر سے کام لینے کا اقرار کریں گے)

اکسیری دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱ کلان محل (اے، ایل) دہلی

سول ڈسٹری بیوٹر برائے پنجاب میسکرو ٹریڈرز نمبر ۹ ریلوے روڈ لاہور۔ لاہور ایجنٹ ۔ چوپڑہ میڈیکل ہال بیرون لوہاری گیٹ
امرتسر ایجنٹس ۔ سری رام گنگا رام ہال بازار ۔ جے تیرتھ اینڈ کمپنی ہال بازار۔ کراچی ایجنٹ ۔ جے تیرتھ اینڈ کمپنی بندر روڈ

آئیں

دلگداز کہانی

کئی بار عیدیں آئیں اور گزر گئیں۔

لوگوں نے چمکتے ہوئے بھڑکیلے کپڑے پہنے۔ لذیذ و مرغن کھانے پکائے اور مولوی جی نے ٹوٹی ہوئی مسجد کے شکستہ منبر پر کھڑے ہو کر اپنی سفید ریش کو ہلا ہلا کر یتیموں اور بیواؤں کی امداد کے لئے بھی کہا۔ لیکن ——

عید کے دن حسب معمول کڑاہ چڑھائے گئے۔ خوشیاں منائی گئیں مگر کسی نے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ آج کتنے گھروں میں کراہوں کے دھوئیں کی بجائے دل کو ہلا دینے والی آہیں اُٹھ رہی ہوں گی۔

داتا کے دربار کے شمال کی جانب سات آٹھ کوس کے فاصلے پر بستی رحیم خاں ہے۔ چند ٹوٹے پھوٹے بوسیدہ اور بدنما بانس کے ونپڑے جن پر مٹی تھوپ دی گئی ہے۔ اور جن کی چھتوں پر عورتوں اور مردوں کے میلے کچیلے کپڑے پڑے ہوتے۔ ننگے اور بھوکے بدن مفلوک الحال نحیف و نزار شب و روز کولہو کے بیل کی طرح کام کرنے والے انسان بستے ہیں۔

وہ اس بستی میں اپنے ننھے کے ساتھ رہتی تھی۔ دن بھر رسیاں بٹ کے اپنے کھاتے پیتے گھرانوں کی اپنے بچے کی پرورش کے لئے خدمت کیا کرتی۔ اور چکی پیستے پیستے اس کا دن کٹ جاتا۔ اندھیرے میں دو چار لقمے زہر مار کر کے بچے کو اپنی آغوش میں لیکر کھاٹ پر دراز ہو جاتی۔ جاڑے کی لمبی راتیں اور گرمی کے پہاڑ سے دن اُسے چکی پیسیں پیسیں گزار دئے۔ اور چکی کی گھمر گھمر کی آواز بستی میں ایک دھند سے غبار کے ساتھ گونجا کرتی۔

چکی کی گھمر گھمر میں وہ اکثر اس حد تک کھو جاتی کہ اناج ختم ہو جاتا اور خالی چکی کے پاٹوں کی گھسر گھسر اس کے دل کی دھڑکن میں ڈوبنے لگتی۔

بستی کے نزدیک ایک چوگان تھا جس میں سے دو ایک تنگ سی پگڈنڈیاں بل کھاتی ہوئیں ادھر ادھر کو نکل گئی تھیں اور چوگان کے گرد کی سفید میلی کچیلی دیواریں مائی لسباں کی کمر کی طرح جھکی ہوئی تھیں اور کئی ایک جگہ سے اینٹیں نکل آئی تھیں۔

دن کی روشنی میں رسیاں اور بستی کی دوسری غریب عورتیں اپنا اپنا کام لے کر چوگان میں آ بیٹھتیں اور رسیاں کی چکی کی گھمر گھمر میں کوئی نہ کوئی بات چھڑ جاتی۔ بیاہ۔ بیماری۔ یا موت کی بات۔ ایک ہاتھ مٹکا مٹکا کر کچھ کہتی۔ دوسری ناک پر انگلی رکھ کر سنتی۔ اور تیسری لجا کر ناک میں گنگناتے ہوئے بیچ ہی میں بول اُٹھتی اور باتوں ہی باتوں میں سورج مسجد کے سفید گنبد کے پیچھے چھپ جاتا۔

اس کے ننھے کا ابا۔ ایک بارعب اور باہمت چہرہ۔ اس کی آنکھوں کے تیرتے ہوئے آنسوؤں میں جھلکنے لگتا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس صبح و شام کولہو کے بیل کی طرح کام کرنے والوں کی چھوٹی سی جماعت زندگی کی سڑک پر مدتوں سے بھٹکتی چلی جا رہی تھی۔ ان بیچاروں کی نگاہیں سامنے کی پھیلی ہوئی سڑک پر جم جاتیں جو لا انتہا معلوم ہوتی۔ صبح و شام وہ اسی سڑک پر چلتے۔ اور ہر روز طلوع آفتاب کے ساتھ ہی وہ اسی سڑک پر روانہ ہو جاتے اور شام کو سورج غروب ہو جانے کے بعد کہیں جا کر انہیں لوٹنا پڑتا۔ نحیف جسم مرجھائے ہوئے چہرے، جن کی زندگی درد اور بھوک پیاس سے لبریز تھی۔

دھوپ ہو یا بارش، بیماری ہو یا صحت ہر حال اور ہر موسم میں وہ اپنے بھاری بھرکم گندے جسموں کو ناتواں ٹانگوں کی مدد سے اسی سڑک پر گھسیٹتے چلے جاتے۔ اور یہ لاہور کو جانے والی گرد و غبار کے ڈھیروں سے اٹی ہوئی سڑک جھلسا دینے والی دوپہروں اور سردیوں کی ٹھٹھرا دینے والی صبحوں کو انہیں یہیں سے گزرنا پڑتا۔

اپنی محنت کشی اور مصائب سے پُر زندگی کے باوجود خوش اور مطمئن رہتے تھے۔ دنیا کی چوٹیں سہتے ہوئے بھی جئے جا رہے تھے پھٹی پھٹی بھٹکی بھٹکی آنکھیں ——

بستی کے ذیلدار کی لڑکی کی شادی تھی۔

"اور ننھے"

"جی حضور"

"یہ لکڑیاں چیر دینا" . . . "شاہدرے سے جا کر بھوسا بھی لے آنا اور . . ."

"جی، میری طبیعت ذرا . . ."

"کیا کیا" تپتے ہوئے تانبے کی طرح ذیلدار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "تجھے میرے حکم سے انکار کرنے کی بھی جرأت ہو گئی۔"

ذیلدار نے گھورتے ہوئے کہا۔ "او حرامی"

"جی نہیں ذیلدار صاحب" حرامی نتھے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ اس کی آواز کچھ ایسی گھٹی ہوئی تھی۔ کہ اس سے دراصل بزدلی ظاہر ہو رہی تھی۔

ذیلدار احمد یار خاں، جو بہت ہی متمول اور کرخت آدمی تھا بستی کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں اس کا کافی اثر تھا۔ اور جب وہ غصے سے گرجتا۔ تو غریبوں کی دنیا میں ایک کہرام سا مچ جاتا۔ جھونپڑوں کی دیواریں لرزنے لگتیں۔ لنگوٹے اور پھٹے ہوئے تہبند ہوا میں لہرانے لگتے۔ سہمی ہوئی شکلیں کانپ جاتیں چونکہ وہ بستی میں ایک غیر معمولی عہدے پر مامور تھا۔ اس لئے اس کی حکم عدولی کی کسی کو جرأت نہ تھی۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنا کہاں کی دانائی ہے؟

نتھا فوراً حکم کی تعمیل کرنے لگا۔

دو بار شاہدرے سے ہو آیا۔ چار گھنٹوں سے متواتر کلہاڑی چلا رہا تھا۔ پسینے سے تر تھا۔ ہانپ رہا تھا۔ تھک کر بیٹھ گیا۔ دور سے ذیلدار کی سفید پگڑی کا پھُندنا ہوا میں لہرایا۔ تو اُٹھ بیٹھا ہاتھ اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ کمر سیدھی نہ ہوتی تھی آنکھوں تلے اندھیرا ہو رہا تھا۔ سر میں چکر آ رہے تھے۔ پھر بھی اپنا کام کئے ہی چلا جاتا تھا۔ کوئی گھنٹے بھر بے دم ہو کر وہیں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

گامو نے نتھے کی حالت دیکھ کر کہا "یار یہ ذیلدار بڑا ظالم ہے اور . . . ."

نتھو بولا "گامو، ذرا آہستہ آہستہ بولو۔ کہیں سے سن لے گا تو بس"

اور نتھے نے جھلس دینے والے آفتاب کے نیچے جلتی ہوئی زمین دھکتے ہوئے افق کو دیکھا گرد جس نے آسمان کو دھندلا کر دیا تھا۔ اور زیادہ ہو گئی۔ اور جب گرم ہوا۔ اس کے گرد چکر لگانے لگی۔ تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا دم گھٹا جا رہا ہے اور اچانک ہی اس کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر گر پڑی۔ اس کی آنکھوں کا رُخ یکدم بدل گیا۔ اس کا چہرہ تمتما کر یکایک نیلگوں ہو گیا۔ اس کا منہ کھُل گیا اور گردن بل کھا کر رسی بن گئی۔ اس نے ایک درد و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ ماری اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اور ——

ریشماں کی، اندر کو دھنسی ہوئی زرد آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ خالی چکی کے پاٹوں کی گھسر پھسر کی آواز ختم ہو جاتی۔ اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔

چکی کی گھمر گھمر بستی کی فضا میں شور مچا رہی تھی۔ ریشماں کا ننھا لالو مائی لسباں کے پوتے ساجو کے ساتھ کھیلنے میں مشغول تھا۔ ننھا لالو آج بہت خوش تھا۔ ورنہ ہر وقت اس کے چہرے پر اداسی اور افسردگی چھائی رہتی۔ اسے، دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی سخت ممانعت تھی۔ لڑکوں کے قہقہے اس کے کانوں میں گونجتے تو اس کی رگ رگ میں بے کسی اور بے بسی کی سوئیاں سی چبھنے لگتیں۔ اس کا جی دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کو چاہتا اور وہ اس بات کا انتظار کرتا رہتا۔ کہ کھیلنے والے لڑکوں میں سے کوئی لڑکا آئے اور اسے اپنے ساتھ لے جا کر اپنے کھیل میں شریک کرے۔ اور آج خلافِ معمول ماں کی اجازت کے بغیر وہ مائی لسباں کے پوتے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کھیل ہی کھیل میں دونوں آپس میں جھگڑنے لگے۔ "اماں" لالو زور زور سے چیخنے لگا۔ اور مسجد سے مائی لسباں کا داماد نور داد نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلا۔ باپ کو سامنے دیکھ کر مائی لسباں کا پوتا شیر کی طرح غرانے لگا۔ اور لالو کو زور زور سے پیٹنے لگا۔ لالو کی بھرائی ہوئی آواز سن کر ریشماں چوگان سے دوڑی دوڑی آئی۔ نور داد کو سامنے دیکھ کر ساکت و صامت کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اپنے لالو ہی کو کوسنے لگی۔

"چل۔ کئی مرتبہ تجھے سمجھایا۔ لیکن تو ہے کہ باز ہی نہیں آتا"

اور لالو زور زور سے چیخنے اور چلانے لگا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو کانپ رہے تھے۔ جیسے کسی چھوٹے سے گڑھے کے برساتی پانی میں ڈوبتے ہوئے سورج کی کوئی پتلی سی کرن پڑ رہی ہو

رات کو لیٹے لیٹے اچانک لالو کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ چلانے لگا "اماں۔ اماں"

مائی لبساں کا پوتا اسے پیٹ رہا تھا۔ اور نوردا د اس کے سامنے خاموش کھڑا اپنے بچے کی فتح پر مسکرا رہا تھا۔ ریشماں جاگ اٹھی۔ لالو چیخ رہا تھا۔

"کیا ہوا میرے چاند" ریشماں اپنے چاندکو آغوش میں بھینچتے ہوئے بولی۔

"ماں" لالو تھر تھر کانپ رہا تھا۔ "ساجو مجھے مارتا ہے"۔ اور نورداد کا چہرہ لالو کی ننھی ننھی آنکھوں کے سامنے کسی ڈراؤنے بھوت کی طرح پھر گیا۔ کسی خاص جذبہ سے مسحور ہو کر بولا "اماں میرے ابا کہاں ہیں۔ تو کہتی تھی ناکہ عید کو آئیں گے۔ عید تو کبھی کی گذر چکی ہے۔ اور اب پھر عید آنے والی ہے۔ بتاؤ۔ اماں میرے ابا کہاں چلے گئے ہیں۔ ماں تم رو رہی ہو۔ تو کہتی تھی ناکہ کھیلنا بند کرو گے تو تمہارے ابا لوٹ آئیں گے۔ بول ماں، کب لوٹیں گے وہ، اللہ میاں کی قسم اب میں ساجو کے ساتھ کبھی نہ کھیلوں گا۔"

لالو خاموش ہو گیا اور کالی کوٹھڑی کی دیواریں سسکیوں سے لرزنے لگیں۔

ماہ رمضان المبارک تھا۔ ریشماں اپنا خواب و خور حرام کرکے محنت و مشقت میں جان کھپا کر لالو کے اخراجات کی کفیل بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنے لالو کو عید کے موقع پہ نئے کپڑوں میں ملبوس دیکھنا چاہتی تھی۔ اگر نئے کپڑے میسر نہ آسکیں تو کم از کم اس کے گلے میں نئی قمیص تو ضرور ہو۔

اس کا معمول تھا کہ وہ رمضان کے مہینے میں جمعے کے جمعے داتا کے در پر جا کھڑی ہوتی۔ جب نمازی نماز پڑھ کر باہر نکلتے تو وہ اپنا ہاتھ پھیلا دیتی۔ اور نہایت عاجزی سے سوال کرتی "بابا خدا کے واسطے ایک پیسہ"۔

وہ جانتی تھی کہ دربار میں آنے جانے والے لوگ بالعموم سادہ مزاج اور مہربان ہوا کرتے ہیں۔ اس کا یہ خیال غلط نہ تھا۔ دربار میں آنے جانے والے دو چار پیسے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے اور انہیں دعائیں دیتے وقت ریشماں کے جسم کا رُواں رُواں کانپ جاتا۔ بڑی سوچ بچار اور کوششوں کے بعد لالو کے لئے نئی قمیص سل کر تیار ہوئی۔

محنت اور مشقت اور سارا دن کولہو کے بیل کی طرح کام کرنے سے ریشماں بیمار پڑ گئی۔ کالی کوٹھڑی میں جہاں چولہا جلتا ریشماں اپنے لالو کے ساتھ کھاٹ پر لیٹی رہتی۔

حسب معمول عید آئی۔

بستی کے لوگ جشن منانے لگے۔ بڑے بڑے درختوں پہ جھولے پڑے۔ شوخ اور شریر بچے رنگین لباس پہنے اچھل کود رہے تھے چولھوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ پکوان پکائے جا رہے تھے کڑاہ چڑھے ہوئے تھے۔ اور تمام فضا لطیف آوازوں اور مترنم قہقہوں سے گونج رہی تھی

ریشماں کا چولھا سرد تھا۔ ننھا لالو اپنے ہم عمروں کو نئے نئے بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ خدا جانے اس کے ننھے سے دل میں کونسے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ اس کی مغموم و اداس آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اور اچانک ہی ساجو مائی لبساں کا پوتا سنہرا لباس پہنے، پانی کے ایک ریلے کی طرح اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور لالو کی نظریں کھلونے بیچنے والے شخص پر جا پڑیں۔ اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ "ماں" اس کی نگاہیں کھونٹی پر جہاں اس کی نئی قمیص ٹنگی ہوئی تھی۔ جم گئیں۔ ریشماں نے لالو کے چہرے پر اپنی نگاہیں گاڑ دیں۔ جیسے ماں کی نگاہوں میں کچھ پنہاں تھا۔ اس کے پاؤں تھر تھرانے لگے اور اس کی خواہشات سے لبریز نگاہیں ماں کے بھدے سوکھے ہوئے جسم پر جم گئیں۔

سورج کی روشنی میں لالو کے ننھے ساتھیوں کے بھڑکیلے کپڑے چمک رہے تھے۔ اور ان کی مسرت سے بھرپور آوازیں، بلند قہقہے اس کے کانوں میں مسلسل گونج رہے تھے۔

گلاب جامن، برفی، جلیبیاں۔ رس گلے۔ مٹھائی والے کی آواز دم گھٹنے والی تاریک کوٹھڑی میں سنائی دی۔۔

"رس گلے، گلاب جامن اور میٹھا میٹھا شیرہ" لالو خیالی دنیا میں چٹ پٹے چٹخارے لینے لگا۔ اس کی سوکھی ہوئی زبان منہ میں بڑی تیزی سے پھرنے لگی۔

اچانک ہی جیسے ایک بہت زور کا دھماکا ہوا۔ اور لالو بیچارے کے کان پھٹنے لگے۔ اس کے ننھے ساتھیوں کی ہا ہا ہا . . . . .

"ایلو ـــــ مداری آگیا" اس کے ساتھی چلا رہے تھے ساجو ہنس رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے درمیان سفید چمکتے ہوئے دانت مسکرانے لگے۔ جیسے وہ لالو کو کچا ہی چبا جائے گا۔ اس کے ننھے ساتھیوں کی مسرتوں سے لبریز نقل و حرکت، بلند قہقہے۔

لالو مسکرانے لگا۔ اور اس کی ہلکی سی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس کی بیتاب نگاہیں تیزی سے آس پاس کا جائزہ لینے لگیں۔ اس کے ہونٹ بے ساختہ طور پر کھلے اور ایک بلند قہقہہ کوٹھڑی میں گونج گیا۔ جیسے مائی بساں کی کمر کی طرح جھکی ہوئی دیواریں گر پڑیں اور وہ چند لمحوں کے لئے بھول ہی گیا کہ اس کی ماں بیمار ہے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ ریشماں نے آنکھ کھولی۔ اور ایک یاس انگیز حسرت میں ڈوبی ہوئی نظر تمام کوٹھڑی کا گشت لگانے کے بعد لالو کے میلے کچیلے جسم پر جم گئی۔ اور پھر آنکھ بند کئے عید کے شور وغل کو سننے لگی۔

مولوی جی نے ٹوٹی ہوئی مسجد کے شکستہ منبر پر کھڑے ہو کر غریبوں اور بیکسوں کی امداد کے لئے بھی کہا . . . . لوگ عید گاہ سے ہنسی خوشی لوٹ رہے تھے۔ ایک آدمی بچوں کے انبوہ میں گھرا ہوا ہوا میں اڑنے والے ربڑ کے ہلکے پھلکے غبارے بیچ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بانس تھا۔ اور بانس کے ساتھ سرخ، سبز، نیلے، بسنتی، انگوری رنگ کے عجیب عجیب گولے بندھے اڑ رہے تھے۔

"کاش میں بھی وہاں ہوتا۔"

لالو کی یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ ترقی کرنے لگی۔ جلد ہی اسے خیال گزرا کہ اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ اس کی ماں بیمار ہے اس نے بڑی ہمت اور ضبط سے کام لیا۔ مگر آنسو اس کی آنکھوں میں تیرنے لگے۔

ریشماں نے دیکھا اور اس کی اندر کو دھنسی ہوئی زرد آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس کا جی بھر آیا۔ اپنے بچے کا منہ سر چوما۔ سوچا اگر اسے نئی قمیص پہنا دوں تو شاید ——

نئی قمیص پہن کر لالو پیسوں کے لئے ضد کرنے لگا "یہ بھی لینا ہے اور وہ بھی لینا ہے۔"

گلاب جامن، رس گلے، برفی، مٹھائی والا اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

"رنگ برنگے ہوائی گولے"۔ اس کے ساتھیوں کے انبوہ میں گھرا ہوا وہ شخص ان کی مسرتوں سے لبریز نقل و حرکت بلند قہقہے اچانک ہی ریشماں کا سانس اکھڑنے لگا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا دم گھٹتا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کا رخ یکدم بدل گیا۔ اور اس کا چہرہ تمتما کر ملگجوں ہو گیا

اس کا منہ کھل گیا اور گردن میں کھاکر اس کا گولا ایک زینے کی طرح نظر آنے لگا دنیا ایک دھندلی سی گیند کی مانند دکھائی دے رہی تھی

اس نے بولنے کی کوشش کی۔ مگر ایک ہچکی نے اس کا کام تمام کر دیا۔

اور کوٹھڑی کی خستہ دیواریں۔ لالو کے نالہ و بکا کی دلدوز صداؤں کے ساتھ گونجنے لگیں۔ کھاٹ پر ریشماں کا جسد بے جان پڑا تھا۔ اور لالو کی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی آہیں! بستی کے لوگ لالو کو دلاسہ دینے لگے لیکن لالو روئے جا رہا تھا چلائے جا رہا تھا "امی تم کہاں ہو۔"

"گلاب جامن۔ رس گلے مٹھائی والا ادھر سے گزرا میٹھا میٹھا شیریں چٹ پٹے چٹخارے"

"گلاب جامن لو گے"۔ ایک شخص بولا۔

"نہیں نہیں" دوسرے نے کہا "لالو تو برفی کھائے گا"

"بلاؤں اسے میں" تیسرے نے آگے بڑھ کر کہا "کیوں لالو"

"نہیں نہیں، مجھے کچھ نہیں چاہئے" لالو رو رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ "مجھے امی کے پاس لے چلو، مجھے امی کے پاس لے چلو۔" اور اچانک ایک بہت زور کا دھماکہ ہوا۔ اس کے ننھے ساتھیوں کی ہا ہا ہا۔ مداری، مداری، تماشہ "آؤ تمہیں بندر کا تماشہ دکھائیں" ساجو کا ابا۔ مائی بساں کا داماد زور سے بولا۔

"نہیں نہیں" لالو روئے جا رہا تھا۔ "میری امی تم کہاں ہو میری امی تم کہاں ہو"

ساجو مائی بساں کا پوتا ہاتھ میں ہوائی گولہ پکڑے ہوئے دوڑا دوڑا آیا لالو کو روتے ہوئے دیکھ کر بولا "لو میرے پاس بہت ہیں اور لے لونگا، لو اب تو خوش ہو لالو"

"نہیں نہیں" لالو کہہ رہا تھا "ساجو مجھے امی کے پاس لے چلو"، اور اس نے اپنا منہ موڑ لیا۔ اور کالی کوٹھڑی میں اس کی آہیں تیرنے لگیں۔

اس کی مضطرب آنکھوں سے آنسو امڈ امڈ کر مٹی میں جذب ہو رہے تھے۔ اس کی فسردہ نگاہیں اپنے ننھے ننھے ساتھیوں کے انبوہ میں گھرے ہوئے شخص پر جا پڑیں۔ نیلے پیلے، سفید، سرخ، سبز، سیاہ ربڑ کے ہلکے پھلکے ہوا میں اڑنے والے غبارے۔

اتنے میں ایک بوڑھی عورت نے اٹھ کر لالو کو اپنی آغوش میں لے لیا اور اس کے گلے سے نئی قمیص اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور ایک میلی سی پھٹی ہوئی قمیص اسے پہنا دی۔ لالو روئے جا رہا تھا چلائے جا رہا تھا روتے روتے اس کی گھگھی بندھ گئی تھی "مجھے امی کے پاس لے چلو مجھے امی کے پاس لے چلو —— میری امی تم کہاں ہو"

اس کی آنکھیں بڑی تیزی سے حرکت کر رہی تھیں کبھی مردہ ماں کے زرد سوکھے ہوئے چہرے پر جم جاتیں اور کبھی کھونٹی پر لٹکی ہوئی نئی چمکتی ہوئی قمیص پر۔ اور کالی کوٹھڑی میں لالو کی آہیں تیرنے لگیں۔

طفیل ملک

"ہم"

کسبِ فرحت کیا کریں منظر مہِ کامل سے ہم
متصل ہونے کو ہیں آزادئ کامل سے ہم
ہے ہمارے ہی لئے قانونِ جبر و اختیار
کشتئ اُمید طوفانِ فنا میں گھر گئی
کوئی کہہ تو دے کہ ہے منزل رسی شرطِ حیات
شورشِ طوفاں کا اندازہ ہمیں ہو کس طرح
ہو اگر دل پر حقیقت میں ہمیں کچھ اختیار
ہم نے تعمیر دو عالم کا کیا ہے تکملہ
رہبری کے روپ میں ہونے لگی ہے رہزنی
اس جہنم زار کو جنت بنانا ہے ہمیں!
دیکھئے ہوتی ہے کس کی فتح اور کس کی شکست
بھیک دے جلوؤں کی اپنے یا سزائے آرزو
خود نمائی کے رواجِ کہنہ کو کرنا ہے ترک
کیا مٹائے گی شرارت بندگانِ عیش کی
شمعِ آزادی سے کرنا ہے دلوں کو منجلی
ایک ہی ہوتا اگر اپنا طریقِ جستجو
سرد آئی ہے نظر پھر گرمئ بزمِ حیات
شاہراہِ نو کی جانب اُٹھتے جاتے ہیں قدم
یہ سنا ہے حسن بھی ہے آج کل صرفِ جہاد
پا شکستہ ہو کے کیوں بیٹھیں کہ ہمت ہی جواں

آج کل آتش بجاں ہیں اضطرابِ دل سے ہم
آئے ہیں اس منزلِ نو تک بڑی مشکل سے ہم
جانتے ہیں وہ کہ ہیں مجبور اپنے دل سے ہم
اور وہ بھی جب، کہ تھے نزدیک تر ساحل سے ہم
سرفروشانہ گذر سکتے ہیں ہر منزل سے ہم
کھیلتے رہتے ہیں امواجِ سرِ ساحل سے ہم
کام جو چاہیں وہ لے سکتے ہیں اپنے دل سے ہم
اب بھی ہنس ہنس کر گزر سکتے ہیں ہر مشکل سے ہم
کیوں نہ پھر ہو جائیں بدظن رہبرِ منزل سے ہم
بے تعلق کیوں رہیں دُنیائے آب و گل سے ہم
آج کل دست و گریباں ہیں حق و باطل سے ہم
اب تو کچھ لے کر ہی جائیں گے تری محفل سے ہم
تا بہ کے اُلجھے رہیں گے موجِ بے ساحل سے ہم
فطرتاً اک ربط رکھتے ہیں خدائے دل سے ہم
درس لیں گے کچھ نہ کچھ پروانۂ محفل سے ہم
ایک ہی آواز سنتے سازِ ہر محفل سے ہم
کیوں نہ کچھ شعلے اُڑائیں پھر جہانِ دل سے ہم
ہوتے جاتے ہیں شناسا اپنے مستقبل سے ہم
اب بچائیں گے نظر کو پردۂ محمل سے ہم
آؤ کچھ حاصل نکالیں سعئ لاحاصل سے ہم

جو کبھی گونجے تھے منظر حریت کی ساز پر
اب بھی وہ نغمے سنا کرتے ہیں اپنے دل سے ہم

منظر صدیقی اکبرآبادی

شاہانِ مغلیہ کے باغات

سرسبز و شاداب باغوں اور چمنستانوں کا نام سنتے ہی انسان جھوم اٹھتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں کیف و سرور کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور وہ عیش و نشاط کی ایک ایسی پُرفضا دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں نکہتِ گل کی مشام افروزیوں۔ بادِ بہاری کی اٹکھیلیوں عندلیبوں کی نغمہ سرائیوں اور چاندنی راتوں کی نزہت باریوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

باغات کی ابتدائی تاریخ

باغوں سے انسان کی دلچسپی ہبوطِ آدم سے آج تک یکساں ہے آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے ایک باغ ہی میں قیام کیا تھا۔ شداد نے جزیرۃ العرب میں ایک ایسا دلکش باغ تعمیر کیا کہ روئے زمین پر سمائی جنت کا نقشہ کھینچ گیا۔ بابل کے معلق باغوں کا تذکرہ آج بھی ماہرینِ فن کو ورطۂ حیرت میں گم کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں پھولوں اور پھلوں کی کاشت کا سلسلہ تاریخ کے ابتدائی دور سے جاری ہے۔ بودھی ادبیات اور سنسکرت کے ڈراموں میں باغوں کے حوالے جابجا موجود ہیں۔ شروع میں بودھی معبدوں کے اردگرد بے شمار درخت لگا دئے جاتے تھے۔ یہی بے ترتیب جھنڈ بعد کو جاپانی اور چینی طرز کے گلستانوں کی صورت اختیار کر گئے۔ لیکن باغوں کی صحیح شکل و صورت اس وقت نمودار ہوئی جب مغل بادشاہ گھٹاؤں کی طرح ایران اور وسط ایشیا کی گھاٹیوں سے اُمنڈ کر آئے اور ہندوستان کے زرخیز میدانوں پر ان کے علوم و فنون کی بارش ہونے لگی۔

افغانوں اور پٹھانوں نے اپنے فنِ تعمیر کا زور تو پیکر قلعوں اور جگمگاتی ہوئی مسجدوں پر تو صرف کیا لیکن وہ اپنی عنانِ توجہ باغوں کی طرف موڑ نہ سکے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا وقت زیادہ تر جنگ و جدل کی مصروفیتوں میں گزرا اور انہیں اتنی مہلت نہ مل سکی کہ باغوں کی ترتیب و تدوین ہاتھ میں لے سکیں۔ البتہ فیروز شاہ کے عہد میں (۱۳۵۱ء سے ۱۳۸۸ء تک) چونکہ ہندوستان میں نسبتاً امن و امان کا دور دورہ تھا۔ اس لئے فیروز آباد (دہلی) کے اردگرد تقریباً ایک سو باغات لگائے گئے جن میں سے آج کل ایک بھی نظر نہیں آتا۔ تقریباً دو صدیوں کے بعد ۱۵۲۶ء میں بابر نے ہندوستان میں فاتحانہ قدم رکھے اور جمنا کے کنارے شاہی عمارتوں کے علاوہ ایک باغ بھی تعمیر کیا جس کا نام "رام باغ" تھا۔ یہ ہندوستان کا پہلا مغلیہ باغ تھا۔!!

ایرانی اثرات

اُس زمانہ میں ایران اور ترکستان کا علم الاشجار بہت زیادہ ترقی یافتہ تھا اور باغوں کی لطافت و بہار آفرینی کے قصیدے ایران کے شعرا بھی پڑھا کرتے تھے چنانچہ سعدی شیرازی نے تو اپنے دیوانوں کا نام بھی "گلستان" اور "بوستان" رکھا تھا۔ سعدی "گلستان" کے دیباچے میں لکھتے ہیں "بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے مناسب خیال کیا ہے کہ باغ جنت کی طرح "گلستان" کے بھی آٹھ حصے کروں۔ تاکہ پڑھنے والا اکتا نہ جائے" دراصل اسرائیلی روایات کے مطابق باغ کے آٹھ درجے اس کے "کمال" پر دلالت کرتے ہیں۔ سعدی کے علاوہ حافظ و خیام نے بھی باغوں کی تعریف میں دلنشین نغمے چھیڑے ہیں۔ دراصل ایران کی قدیم شاعری باغ و بلبل کی داستانوں پر مشتمل ہے اور وسط ایشیا کے باقی ممالک بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔

مسلمانوں سے پہلے زردشتیوں اور بابلیوں نے بھی فنِ باغبانی کو بہت زیادہ فروغ دیا۔ اس لئے قدرتی طور پر شاہانِ مغلیہ کے باغوں میں قدیم آرٹ کی جھلک نظر آتی ہے چنانچہ مغلیہ باغوں کا عام طرز یہ ہے کہ ایک چوکور احاطہ ہوتا ہے جس میں اشجار و انہار کی ایک وجد آفریں جنت آباد کر دی جاتی ہے۔ داخلی دروازہ خاص طور پر پُرشکوہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آنے جانے کے لئے چاروں طرف ایک ایک دروازہ رکھا جاتا ہے۔ باغ کے ہر کونے پر ایک برج تعمیر کیا جاتا ہے۔ روشوں اور کیاریوں کے درمیان سے ایک بل کھاتی ہوئی ندی گزرتی ہے جس میں تیز خرامی پیدا کرنے

کے لئے جا بجا آبشار بنا دئے جاتے ہیں۔ آبشاروں کے نیچے بڑے بڑے حوض اور تالاب ہوتے ہیں جن میں فوارے نصب کر دئے جاتے ہیں تاکہ ان کی پھوار سے منظر کی جاذبیت میں اضافہ ہو سکے۔ شامیانہ عام طور پر باغ کے وسط میں بنایا جاتا ہے جہاں سے باغ کی بہار آفرینیوں کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ جگہ دوپہر کے وقت کشمیر سے بھی زیادہ خنک، آرام دہ اور فرحت آور ثابت ہوتی ہے۔ درختوں کی ترتیب یہ ہے کہ ندی کے کنارے گلاب کے پھول لگائے جاتے ہیں۔ ان کے پس منظر کے طور پر سرو، سپاری اور چنار کے درخت اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ مربع کیاریوں میں ثمردار بوٹوں کی بہتات ہوتی ہے۔ کونوں میں آم کے بڑے بڑے پیڑ ہوتے ہیں جن کے نیچے گھاس کا کھلا میدان ہوتا ہے جو عام طور پر کھیل کود، تفریح اور گانے بجانے کی محفلیں سجانے کے کام آتا تھا۔

شاہی چار باغ

ہندوستان میں مغلیہ باغبانی کی تاریخ کا آغاز شہنشاہ بابر کی آمد سے ہوا۔ اگرچہ اس نے اپنی عمر کے ۴۵ برس جنگ وجدل کی مصروفیتوں میں بسر کئے۔ لیکن تزک بابری میں جگہ جگہ باغوں کا تذکرہ موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لڑائی کے غبار انگیز بادلوں میں بھی اسے پھولوں پھلوں کی مسرت افزا چمک دمک دکھائی دیتی رہی۔ چنانچہ جنگ کے سلسلہ میں وہ جہاں بھی جاتا، پھول، پرندے اور جانور اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتے تھے۔ ایک دفعہ وہ افغانستان کی پہاڑیوں میں سفر کر رہا تھا۔ تو اس نے دیکھا کہ وادیوں میں لالہ کے خودرو پھول اگے ہوئے ہیں۔ جب میں نے شمار کرنے کو کہا تو معلوم ہوا کہ کم سے کم ۳۲ اقسام کے لالہ موجود ہیں۔ ایک لالہ کی خوشبو گلاب سے ملتی جلتی تھی۔ لہٰذا میں نے اسے "گل لالہ" کا نام دیا۔ یہ پھول صرف میدان شیخ میں ہوتا ہے۔ انہی پہاڑیوں میں پغمان سے نیچے لالہ صد برگ ہوتا ہے لیکن جس پھول کو بابر "لالہ صد برگ" کا نام دیتا ہے وہ در اصل گل کوکنار کا بڑا پھول تھا۔ اس کے بعد بابر نے سمرقند کے باغات کا تفصیلی ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر کو بچپن ہی سے باغبانی کا شوق تھا۔ ۱۵۲۶ء میں جب اس نے شمالی ہند کو فتح کر لیا۔ تو آگرہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ اور یہاں آکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ترکوں کی روایات کے مطابق "شاہی چار باغ" کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن بدقسمتی سے آگرہ کے میدانی علاقہ میں وہ سہولتیں اور آسانیاں میسر نہ تھیں جو کابل اور سمرقند کی پہاڑیوں میں قدرتی طور پر موجود تھیں۔ مثلاً آگرہ میں پہاڑیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے باغ کے مدارج قائم نہ کئے جا سکتے تھے۔ اسی طرح آب پاشی کا انتظام بھی مشکل تھا۔

تزکِ بابری کا بیان

چنانچہ بابر خود کہتا ہے "ہندوستان میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہاں مصنوعی ندیاں نہیں ہیں۔ میں نے جہاں بھی قیام کیا مجھے رہٹوں اور نہروں کا بندوبست کرنا پڑا۔ آگرہ پہنچ کر میں نے جمنا کو محض اس غرض سے عبور کیا کہ "چار باغ" کے لئے مناسب میدان تلاش کروں لیکن مجھے کوئی جگہ پسند نہ آئی۔ اس لئے میں متنفر ہو کر واپس چلا آیا۔ اس کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ چار باغ تعمیر نہ کروں گا لیکن پھر خیال آیا کہ آگرہ سے بہتر جگہ کہاں مل سکے گی۔ مجبوراً یہیں کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے میں نے ایک بہت بڑا کنواں کھدوایا تاکہ غسل خانوں کے لئے پانی میسر آسکے۔ اس کے بعد ایک تالاب بنوایا جس کے چاروں طرف املی کے درخت تھے۔ پھر ایک تالار تعمیر کیا گیا۔ جو سنگین محل کے سامنے اب بھی موجود ہے۔ اس کے بعد باغات اور محلات کی بنیادیں رکھی گئیں۔ میں نے محل کے ہر کونے میں باغ لگوائے۔ ہر باغ میں گلاب اور نرگس کے پھول لگائے گئے۔ ہندوستان میں ہمیں تین آفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گرمی، آندھی اور گرد و غبار۔ غسل خانوں میں ان تینوں مصیبتوں سے نجات مل جاتی تھی۔ خلیفہ شیخ زین اور یونس علی وغیرہ نے دریا کے کنارے ایک وسیع قطعہ زمین حاصل کر کے عملی پیمانے پر کام شروع کیا۔ اور لاہور و دیپالپور کی طرح رہٹ سے آبپاشی کا انتظام کیا۔ ہندوستانیوں نے اس قسم کے عالیشان محل اور پر بہار باغ کبھی نہ دیکھے تھے اس لئے انہوں نے ساحل جمنا کو کابل کا نام دیا۔

محلوں کے پائیں باغ

تزک بابری کے اس طویل اقتباس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بابر نے ہندوستان میں کس قسم کے باغوں کی طرح ڈالی۔ مغلوں نے زیادہ زور محل وقوع پر دیا چنانچہ شاہانِ مغلیہ کے حسین ترین

باغات ان مقامات میں ہیں جن کو آب وہوا وغیرہ کے لحاظ سے بے نظیر کہا جا سکتا ہے چنانچہ ویری ناگ، واہ، پنجور، کشمیر اللہ بچے پور میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں عجیب بات یہ ہے کہ بابر نے ہر باغ کا آغاز ایک کنویں سے کیا۔ پھر ایک تالاب بنوایا جس کے اردگرد املی کے درخت لگوائے۔ اس کے بعد طلار کی تعمیر کا حکم دیا۔ دراصل بات یہ ہے کہ مغلوں کے نزدیک باغ کے بغیر شاہی محل کوئی معنی ہی نہ رکھتا تھا۔ اس لئے وہ جب بھی اپنے لئے مکان تیار کراتے تو باغوں کا انتظام ضرور کر لیتے تھے۔

جمنا کے بائیں کنارے بابر نے "رام باغ" کے نام سے جو محل بنوایا وہ جہانگیر اور نورجہاں کے زمانے میں بھی زیر استعمال رہا۔ یہی وہ باغ ہے جہاں بابر کو باغ نوروز کابل میں دفن کرنے سے پہلے عارضی طور پر پیوند خاک کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ رام باغ کا نام اٹھارویں صدی کے مرہٹوں سے لیا گیا۔ بدقسمتی سے اب اس باغ کے آثار ناپید ہو چکے ہیں۔

رام باغ اور "چینی کا روضہ" کے درمیان زہرہ باغ ہے جو بابر کی ایک بیٹی زہرہ کی ملکیت میں تھا۔ کہتے ہیں اس باغ میں کم و بیش ساٹھ کنویں تھے۔

سکندرہ کا باغ

آگرہ سے ساڑھے پانچ میل کے فاصلے پر شمال کی جانب سکندرہ ہے جہاں اکبر مدفون ہے۔ مقبرہ ایک "میدانی چار باغ" میں ہے جس کا نقشہ کابل و سمرقند کے باغوں سے مختلف ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے یعنی اس جگہ وہ سہولتیں میسر نہ آ سکتی تھیں جو پہاڑی علاقوں میں ہوتی ہیں۔ مقبرے کے چوگرد ایک دیوار ہے۔ چاروں کونوں میں تالاب ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی نہروں کے ذریعے سے پانی آتا ہے۔ مقبرے کی تعمیر میں زیادہ تر لودھی اور چینی آرٹ کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ یہ مقبرہ خود اکبر نے بنوانا شروع کیا تھا۔ ہیول لکھتا ہے کہ "اس مقبرے کی ساخت عام مغلیہ عمارتوں سے قدرے مختلف ہے۔ اور اسلامی رسم و رواج کے برخلاف مقبرے کا رخ مکہ کی بجائے مشرق کی طرف ہے"۔

آگرہ، دہلی اور لاہور کے اردگرد بیسیوں مقبرے یا اُن کے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں۔ یہ قبرستانی باغ مسلمانوں کے آرٹ میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ مغل شہزادوں اور مغل اُمرا کا دستور تھا کہ شہر سے باہر تفریح گاہیں بنوا لیتے تھے۔ جو بعد از اں اُن کے مقبروں کا کام دیتی تھیں۔ عام طور پر بارہ دری اس مقصد کے لئے مخصوص رہتی تھی۔ مالک کی تدفین کے بعد باغ کو وقف میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اور پھل پھول فقیروں اور مسکینوں میں بانٹ دئیے جاتے تھے۔

اکبر (۱۶۰۵ - ۱۵۵۶) کو بھی باغات میں کافی دلچسپی تھی۔ لیکن اُتنی نہیں جتنی اس کے دادا بابر یا پوتے جہانگیر کو تھی صاحب "آئین اکبری" لکھتے ہیں شہنشاہ کے نزدیک پودے اللہ کی رحمت کا نشان ہیں۔ وہ ان کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ ماہرین علم الاشجار کو ایران اور توران سے بلایا گیا ہے۔ لہذا پھولوں اور پھلوں کی غور و پرداخت بڑی محنت سے ہو رہی ہے۔

جمنا کے اُس پار اعتماد الدولہ کا مقبرہ بھی ہے۔ جس کا باغ شاہانِ مغلیہ کے باغات میں امتیازی شان کا مالک تھا۔ یہ حسین ترین مقبرہ نورجہاں نے اپنے باپ میرزا غیاث بیگ کی یاد میں تعمیر کرایا تھا۔

روضہ تاج محل کا باغ

روضہ تاج محل کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کہ اب اس موضوع پر خامہ فرسائی گستاخی ہوگی۔ عام طور پر مقبرہ مغلیہ باغات کے عین وسط میں ہوتا ہے۔ لیکن تاج محل کے باغ کا ڈیزائن اس لحاظ سے مختلف ہے کیونکہ وسط میں مقبرے کی بجائے سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا تالاب ہے جس کے چاروں طرف گھاس کے چوکور میدان اور روشیں ہیں۔ شاہجہاں نے تاج محل کا نقشہ بناتے وقت روایات پارینہ سے انحراف کیوں کیا؟ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ دریا کے کنارے ایک چٹان تھی جس پر یہ مقبرہ استوار کر کے منظر کی سحر آفرینی میں اضافہ لیا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شاہجہاں دریا کے دوسرے ساحل پر ایک اور تاج محل اپنے لئے بھی بنوانا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ دونوں تاج محلوں کو دریا کے پُل کے ذریعہ سے آپس میں ملا دیا جائے۔ بعض مؤرخین کا نظریہ یہ ہے کہ شاہجہاں اس مقبرے کو ہر وقت نگاہ کے سامنے رکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے تاج محل دریا کے کنارے اونچی جگہ پر بنوایا۔ تاکہ قلعہ معلیٰ کے برآمدے میں سے نظر آتا رہے۔ آخری عمر میں چونکہ شاہجہاں اسی برآمدے میں لیٹا رہتا تھا۔ اس لئے یہی قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے۔

برنیر نے یہ باغ ۱۶۶۰ء میں دیکھا تھا ۔ اگرچہ وہ بات بات میں فرانسی آرٹ کو ترجیح دیتا ہے ۔ لیکن اس باغ کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے بغیر وہ بھی رہ نہیں سکا ۔ لیکن جن متعدد چمنستانو کا اس نے ذکر کیا ہے ۔ وہ اب ناپید ہو چکے ہیں ۔ اور ان کی جگہ یورپی طرز کے گلستانوں نے لے لی ہے ۔ سرو کے درخت بھی دوبارہ اُگائے گئے ہیں ۔ اسی طرح درمیانہ تالاب کے کناروں پر جو کھجوروں کے درخت ہیں ۔ وہ بھی انگریزی عہد سے تعلق رکھتے ہیں ۔

توزک جہانگیری اور باغات

جہانگیر نے اپنی "توزک" میں متعدد باغوں کا تذکرہ کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے آگرہ کے ایک بابری باغ میں سپاری کا ایک درخت دیکھا جو نو سے فٹ سے کم بلند نہ تھا ۔ اکبر کے مقبرے میں سرو ۔ سپاری ، صنوبر اور چنار کے درخت لگائے گئے ہیں ۔

جہانگیر نے ایک باغ سرہند میں لگوایا ۔ اس کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ "جب میں باغ میں داخل ہوا ۔ تو میں نے اپنے آپ کو ایک سایہ دار رستے پر پایا جس کے دونوں طرف بیشمار گلاب کے پھول تھے ۔ پرے سرو ، چنار اور صنوبر کے درخت لہلہا رہے تھے ۔ اس رستہ سے گزر کر ہم ایک چمنستان میں پہنچے جس کے پھولوں کے رنگ و نور سے آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو رہی تھی ۔"

جہانگیر ہندوستان کے جن اہم شہروں میں بھی گیا ۔ وہاں اُس نے باغوں کی داغ بیل ڈالی ۔ "توزک جہانگیری" میں وہ لکھتا ہے ۔ کہ میں نے ایک باغ دیکھا جس میں آم کے ایک سو پیڑ تھے ۔ لیکن اُن کے عین درمیان ایک بہت بڑا بڑ کا درخت بھی تھا ۔ ایک اور موقع پر اُس نے "نگینہ باغ" کی سیر کی ۔ جس میں لال لال پکے ہوئے انگوروں کے گچھے عجب بہار دے رہے تھے ۔" احمد آباد میں وہ ایک چھوٹے سے باغیچے میں پہنچا ۔ جہاں کی انجیریں بڑی مزیدار تھیں ۔" اس کے علاوہ احمد آباد کے باغات میں اُس نے سُرخ گلاب ، سنگترے ، ناشپاتی اور سیب کے درخت بھی دیکھے ۔

انگوری باغ

آگرہ کے قلعہ معلیٰ میں بیشمار لہلہاتے ہوئے باغات تھے جن کی لفظی تصویر کشی نکولائی منوچی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے "دہلی اور لاہور کے باغ ندیوں اور نہروں سے اٹے پڑے تھے جو اُچھلتی کودتی ہوئی سنگ یشب اور مرمر کے حوضوں میں جا گرتی تھیں ۔ ہر جگہ فوارے اپنی بہار دکھا رہے تھے پھولوں کی خوشبو سے دماغ معطر ہوا جا رہا تھا ۔ بڑے بڑے ثمردار درخت نہ لگائے گئے تھے ۔ تاکہ منظر کی دلکشی میں فرق نہ آئے ۔ تالابوں میں چھوٹی چھوٹی خوبصورت مچھلیاں دوڑتی پھرتی تھیں ۔" نکولائی منوچی کے یہ تاثرات "مچھی بھون اور انگوری باغ" سے متعلق ہیں ۔ افسوس اب یہ باغات بالکل اُجڑ چکے ہیں ۔ بھرت پور کے جاٹ حوضوں اور تالابوں کا مرمر اکھاڑ کر لے گئے ۔ اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ لارڈ ولیم بنٹنک نے فروخت کر ڈالا ۔ تاہم مچھی بھون کی بہ نسبت انگوری باغ کی حالت قدرے بہتر معلوم ہوتی ہے ۔ یہ باغ " خاص محل " کے سامنے ہے ۔ اور اس کے تین طرف چھت دار رستہ ہے ۔ یہ باغ در اصل بیگمات کے استعمال کے لئے تھا ۔ اس کے عین وسط میں ایک چبوترا ہے جس میں ایک تالاب بنا دیا گیا ہے ۔ یہاں سے چاروں طرف سیڑھیاں اترتی ہیں ۔ کیاریوں اور چمنوں کے گرد پتھر کی باڑ لگائی گئی ہے اور علم ہندسہ کے اصول کو مدِ نظر رکھا گیا ہے ۔ بعض لوگ کہتے ہیں ۔ یہاں پتھر کی ایک "جعفری" بھی تھی ۔ جس پر انگور کی بیلیں چڑھا دی گئی تھیں ۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس باغ کو "انگوری باغ" کہتے تھے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نام انگوری بیلوں کے اُن نقش و نگار کی نسبت سے تھا ۔ جو شاہجہان نے بصرف زر کثیر "یاسمن برج" کی دیواروں پر بنوائے تھے ۔

قلعہ معلیٰ اگرچہ حوادثِ زمانہ کا شکار رہ چکا ہے ۔ اور اس میں متعدد مرتبہ لوٹ مار ہو چکی ہے ۔ تاہم انگوری باغ کی دیواروں اور محرابوں سے اب بھی نسائیت ٹپکتی ہے ۔ اور سیاح پر جادو کئے بغیر نہیں رہتی ۔ اگر باغ میں کھڑے ہو کر "یاسمن برج" کو دیکھا جائے تو منظر حد درجہ فرحت ناک ہوتا ہے ۔ البتہ سنگ مرمر کا وہ جنگلہ جو لارڈ کرزن نے بنوایا تھا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتا ہے ۔

دہلی کے باغات

اب ہم آگرہ سے دہلی آتے ہیں ۔ یہ وہ دار السلطنت ہے جس کی تاریخ یدھشٹر سے شروع ہوتی ہے مغلوں کے زمانہ میں اس کا نام شاہجہان آباد" تھا ۔ فرگوسن کا بیان ہے کہ مشرق کے اس عظیم الشان شہر میں لال قلعہ سے لے کر چاندنی چوک تک باغوں

اور نہروں کی ایک حیرت انگیز جنت آباد تھی" لیکن اب اس جگہ بلند و بالا عمارتوں، ٹراموے، موٹروں، بسوں اور راہگیروں کے ہجوم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ شاہجہان آباد کے جنوب میں دریا کے قریب "مقبرہ ہمایوں" واقع ہے جس کے ساتھ ایک باغ بھی ہے یہ باغ تیرہ ایکڑ مربع زمین کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ خوش قسمتی سے اس کی ابتدائی صورت اب بھی بڑی حد تک باقی ہے۔ نہروں اور فواروں کی مرمت کر دی گئی ہے۔ لیکن پھلوں کے درخت مفقود ہو چکے ہیں۔ اس باغ کا ڈھلان جنوب کی طرف ہے۔ اخیر میں چھوٹے چھوٹے جھرنے بنے ہوئے ہیں جن میں دریا کی لہریں ناچتی رہتی ہیں ایک کونے میں ایک برج بنا ہوا ہے جس میں کھڑے ہو کر دریا کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس باغ کے ڈیزائن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ابتدائی مغلیہ باغوں کا عمومی نقشہ کیا ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانہ میں آبپاشی کا انحصار زیادہ تر دریاؤں یا تالابوں پر ہوتا لیکن ایران اور ترکستان میں چونکہ دریاؤں کی تعداد زیادہ نہ تھی اس لئے نہروں سے کام لیا گیا۔ ابتدائی مغلیہ باغوں میں نہروں اور حوضوں کی تعداد تو کم ہو گئی۔ البتہ ان کی چوڑائی میں اضافہ کر دیا گیا حتیٰ کہ جہانگیر کے زمانہ میں بیس بیس فٹ کی چوڑی نہریں کھودی گئیں۔ مقبرہ ہمایوں کے باغ میں نہروں کی تعداد اگرچہ بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں چوڑائی بھی بہت کم ہے۔

ہمایوں کے مقبرے اور گھاٹی کے درمیان صفدر جنگ کا مقبرہ ہے جو ہمایوں کی وفات کے دو سو برس بعد ۱۷۵۳ء میں تیار ہوا اس باغ کے مرکز میں مقبرہ ہے۔ چار نہریں ہیں جو باغ کو سیراب کرنے کے علاوہ بارہ دریوں اور آرام کمروں کو بھی پانی مہیا کرتی ہیں۔ یہ باغ کسی زمانہ میں ثمردار درختوں سے بھرپور تھا۔ لیکن اب نہروں کی بجائے مقبرے کے چاروں طرف چار بڑے بڑے حوض بنا دیئے گئے ہیں۔

دہلی کا شالامار باغ

مقبروں کے پائیں باغات کے علاوہ دہلی میں ایک شالامار باغ بھی تھا جس کا ذکر اکثر سیاحوں اور مورخوں نے کیا ہے لیکن اب اس کے آثار بڑی حد تک ناپید ہو چکے ہیں۔ یہ باغ شاہجہان کی ایک بیوی عزالنسا نے شالامار باغ کشمیر کے نمونے پر بنوایا تھا۔ اس زمانہ کے مشہور مورخ محمد صالح نے اس باغ کا تذکرہ "شاہجہان نامہ" میں کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے "اس باغ میں اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ اس کا رقبہ تین سو مربع گز تھا۔ اس کی دو منزلیں تھیں۔ پہلی منزل دوسری منزل کی بہ نسبت ۹ فٹ اونچی تھی دونوں کے درمیان تین سو گز لمبی اور بیس فٹ چوڑی ایک نہر تھی۔ جو تمام عمارتوں کے گرد گھومتی گھامتی آبشاریں بناتی، ایک بہت بڑے تالاب میں جا گرتی ہے۔ یہ باغ چار برس کے عرصہ میں مکمل ہوا۔ اور اس پر دو لاکھ روپیہ خرچ آیا" یہ شالامار باغ لال قلعہ سے چھ میل دور شاہی سڑک کے کنارے واقع تھا۔ برنیر کہتا ہے کہ دسمبر ۱۶۶۴ء میں جب اورنگ زیب لاہور اور کشمیر کے دورے پر نکلا تو سب سے پہلا پڑاؤ اسی باغ میں کیا۔ یہی وہ باغ تھا جس میں اورنگ زیب کی رسم تاج پوشی ادا ہوئی۔ شاہ عالم کے زمانہ میں دسمبر ۱۷۹۳ء اس باغ کو لفٹیننٹ فرینکلن نے بھی آ کر دیکھا۔ وہ لکھتا ہے "اس باغ کی بہت سی قیمتی چیزوں کو لوٹ لیا گیا ہے"۔ سنہ ۱۸۰۳ء کے بعد اس باغ میں "برٹش ریزیڈنٹ" کا قیام تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بھی اس باغ کی مرمت نہ کر سکا ۱۸۲۴ء کے موسم سرما میں بشپ ہیبر اس جگہ آیا۔ وہ لکھتا ہے "جس شالامار باغ کا مسٹر مور نے لالہ رخ میں تعریف کی ہے، وہ اب بالکل اجڑ چکا ہے"۔ لیکن بشپ صاحب بھول گئے کہ جس باغ کا ذکر ٹامس مور نے اپنی مثنوی میں کیا ہے۔ وہ دہلی کا نہیں۔ بلکہ کشمیر کا شالامار باغ ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اس باغ کو مالکوں سے چھین کر فروخت کر دیا گیا۔ تاہم اس کے کچھ کچھ آثار اب بھی موجود ہیں۔

روشن آرا باغ

سبزی باغ کے مغرب میں "روشن آرا کا باغ" ہے۔ روشن آرا شاہجہان کی بیٹی تھی جو ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اس باغ کی دو دیواریں منہدم ہو چکی ہیں۔ بارہ دری کا حصہ بگڑ چکا ہے۔ روشیں بمشکل ہی پہچانی جا سکتی ہیں جہاں آرا کو اسی باغ میں دفن کیا گیا تھا۔

دہلی سے باہر اور بھی متعدد باغوں کے آثار ہیں۔ ان تاریخی نقطۂ نگاہ سے وہ بہت زیادہ اہم نہیں ہیں۔ البتہ قلعہ کے اندر قلعہ کے باغات خاص اہمیت رکھتے ہیں قلعہ شاہی کی مغربی دیوار کے پاس خندق کے نزدیک ایک بہت

میدان تھا جس کے دونوں طرف پانی کی نہر جھکتے ہوئے باغات تھے "دیوانِ عام" کے عقب میں بھی زنانہ باغات تھے جن کا مسٹر برنیر نے بھی لکھا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے "ہر کمرے کے دروازے کے نزدیک پانی تھا۔ ہر طرف باغات تھے جن کے سایہ دار کنج راستے روشیں اور فوارے دیکھ کر انسان باہر کی دھوپ کو بھول جاتا تھا۔" محل کی چار دیواری میں دو بڑے بڑے باغات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ حیات بخش باغ اور مہتاب باغ۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ان باغوں کا حلیہ بھی بگڑ چکا ہے۔ عہد مغلیہ کی تصویریں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان باغوں کا نقشہ اگرچہ ایک ہی ہے۔ تاہم وہ علیحدہ علیحدہ چار دیواریوں میں تعمیر کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک باغ کا رقبہ پانسو مربع فٹ تھا۔ لیکن دوسرا پانسو فٹ لمبا اور ساڑھے تین سو فٹ چوڑا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک بہت بڑا حوض تھا جس کے وسط میں فواروں سے گھری ہوئی بارہ دری تھی۔ ان باغوں کی عمارتیں اب بھی موجود ہیں۔ اور ان میں سے ایک کو "بھادوں" اور دوسری کو "ساون" کہتے ہیں۔

مہتاب باغ تو ناپید ہو چکا ہے۔ لیکن حیات بخش باغ کے آثار ابھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

لاہور کے مغلیہ باغات

مغلوں کے میدانی باغات میں لاہور کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ موسم گرما کی صعوبتوں سے بچنے کے لئے مغل بادشاہ بالعموم کشمیر میں پناہ لیا کرتے تھے۔ لیکن وسائل آمدورفت چونکہ ترقی یافتہ نہ تھے۔ اس لئے اُن کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ اور دہلی کی رونق میں بھی کمی واقع ہو رہی تھی۔ جہانگیر کے زمانہ میں مغلیہ سلطنت کا پایۂ تخت دہلی کی بجائے لاہور قرار پایا۔ چنانچہ اس شہر کی وسیع پیمانے پر تزئین و آرائش شروع ہو گئی۔ قلعے کے اندر باغوں کے درمیان شاہی محلات تعمیر کئے گئے۔ شیش محل کے سامنے نولکھا میں اب بھی متعدد فواروں اور چبوتروں کے نشان موجود ہیں۔ جو عظمتِ پارینہ کی یاد دلاتے ہیں۔ قلعے کے اندر پھلواڑیاں اور گلستان اگرچہ اب تک موجود رہا۔ لیکن ان کی ہیئت انگریزی سانچے میں ڈھل چکی ہے۔

شاہدرہ میں دریائے راوی کے کنارے نورجہاں نے دلکشا باغ تعمیر کرایا تھا جس میں شہنشاہ جہانگیر مدفون ہے۔ اس باغ کا رستہ تاج محل کی طرح ایک سرائے میں سے ہو کر جاتا ہے۔ عمارتیں عالیشان ہیں۔ اور اُن کے دروازے بھی پُرشکوہ ہیں۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ مسقف آرام گاہوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ان کمروں میں بیشمار محافظ اور ملازم رہتے تھے۔ تاکہ درباریوں اور مہمانوں کی خاطرداری کر سکیں۔ جہانگیر کا مقبرہ دوسرے احاطے کے عین وسط میں ایستادہ ہے۔ باغ کا نقشہ سکندرہ کے باغ سے مشابہ ہے۔ مقبرے کے اردگرد آٹھ بڑے بڑے چبوترے ہیں۔ نہریں اگرچہ بہت زیادہ کشادہ نہیں ہیں۔ تاہم سکندرہ اور مقبرۂ ہمایوں کی نہروں کے مقابلہ میں بہت چوڑی ہیں۔ اور ان کے کناروں پر سرو کے درختوں اور پھولوں کی قطاریں منظر کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہیں۔

اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا بیگم بھی باغوں کی تعمیر میں کسی اور شاہی بیگم سے پیچھے نہ تھی چنانچہ اس نے "چوبرجی" باغ تعمیر کیا جو لاہور سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ہے اب اس باغ کا صرف داخلی دروازہ باقی رہ گیا ہے جس پر نقاشی کا کام کیا گیا ہے۔ زیب النساء نے یہ باغ اپنی ایک خادمہ کو عطا کر دیا۔ اور اپنے لئے نواں کوٹ میں ایک اور باغ تعمیر کیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ زیب النساء اسی باغ میں مدفون ہے۔ لیکن جدید تحقیق سے یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے۔

شالامار باغ لاہور

لاہور کا مشہور ترین باغ "شالامار" ہے جو شالامار باغ کشمیر کے نمونے پر شاہجہاں نے بنوایا۔ اس باغ کی تعمیر علی مردان خاں نے سنہ ۱۶۳۷ء میں شروع کی۔ اس کا رقبہ ۵۲۰ × ۲۳۰ مربع گز ہے۔ اس کی تین منزلیں ہیں۔ شروع میں موجودہ رقبہ کے باہر بھی باغات کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ لیکن ہماری نظر صرف موجودہ "شالامار باغ" تک محدود رہے گی۔ یہ باغ دراصل دو "چار باغوں" کو ایک زینہ کے ذریعہ سے ملا کر تعمیر کیا گیا ہے وسط میں ایک بہت بڑا تالاب ہے جس کی سطح کافی بلند ہے اس کے تین طرف بارہ دریاں ہیں۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا چبوترہ ہے جس تک پہنچنے کے لئے سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا ہے تالاب کے چوفیر جو روش ہے۔ اُس میں پھولوں کے لئے کیاریاں

بھی بنائی گئی ہیں۔ ان کیاریوں کی شکل [illegible] کی طرح ہے۔ اور [illegible] ہے [illegible] نکلتی ہے۔ ان تینوں میں رنگ برنگے لیمو اور سرو کے درختوں کے علاوہ رنگ برنگ کے پھول لگائے گئے تھے۔ شالامار باغ لاہور کی پہلی اور دوسری منزلوں میں نہر کی چوڑائی بیس فٹ سے کم نہیں ہے۔ اور اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فوارے نصب کر دیئے گئے ہیں نہر کے دونوں طرف سڑک ہے جس پر چھوٹی چھوٹی پختہ اینٹوں کا فرش ہے۔ بارہ دریوں کا اکثر حصہ سکھوں کے عہد میں تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ تاہم ان کی مرمت کر دی گئی ہے جس بارہ دری کو "ساون بھادوں" کہتے ہیں۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ علی مردان خاں کے ذہن میں اس باغ کا خاکہ کیا تھا۔ پہلی منزل کی بارہ دری کی دیوار کے سامنے میں جو بہت بڑا تالاب ہے اس میں پانی جھرنوں میں سے ہو کر آتا ہے اور یہ منظر حد درجہ فرحت انگیز ہوتا ہے۔ اسی تالاب کے کنارے شاہی تخت بھی ہے جو خوش قسمتی سے زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہا۔ شاہجہاں اسی پر بیٹھ کر باغ کی بہار آفرینیوں سے لطف اندوز ہوتا تھا شالامار باغ کی مشرقی دیوار میں شاہی غسل خانے ہیں جن میں نہروں کے ذریعے سے پانی آتا تھا۔

سب سے نچلی منزل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی مغربی اور مشرقی دیواروں میں پرشکوہ داخلی دروازے ہیں جن کی نقاشی قابل دید ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں آمدورفت کے لئے مغربی دیوار کا دروازہ مخصوص تھا۔ دراصل مغل بادشاہ ہمیشہ نچلی منزل سے باغ میں داخل ہوتے تھے۔ اوپر کی منزل صرف بیگمات اور شہزادیوں کے لئے وقف رہتی تھی۔

اس باغ کا مفصل تذکرہ "بادشاہ نامہ" میں موجود ہے چنانچہ محمد صالح لکھتا ہے "اوپر کی منزل پھلواریوں اور چمنستانوں پر مشتمل تھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سفیدے اور چنار کے درخت لگائے گئے تھے جن کے سایہ میں گھاس کے چبوترے تھے تاکہ بادشاہ اور بیگمات آرام کر سکیں۔"

اس باغ کا منظر بارش کے وقت علی الخصوص دلکش ہوتا ہے۔ ہر سال مارچ کے آخری اتوار کو اس جگہ چراغوں کا میلہ ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لئے ہزاروں دیہاتی اور شہری جمع ہوتے ہیں۔

جھیل ڈل کے کنارے

کشمیر جانے کے لئے عہد قدیم میں تین رستے تھے۔ ایک بھمبر اور پیر پنجال میں سے ہو کر جاتا تھا۔ دوسرا جمنا اور ویری ناگ سے گزرتا تھا۔ تیسرا کشن گنگا اور جہلم کی وادیوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ مغل بالعموم آخری رستہ استعمال کرتے تھے مسافت چونکہ کافی تھی اس لئے جگہ جگہ پڑاؤ بنائے گئے تھے۔ اور ان ہی قیامگاہوں کے قریب مغل بادشاہوں نے حسب عادت باغ بھی تعمیر کر دیئے تھے۔ حسن ابدال اور واہ بھی اسی رستے میں ہیں۔ کہتے ہیں کہ واہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے زمانہ سے یہاں ایک پرفضا باغ تھا جس کو دیکھ کر اکبر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "واہ۔ باغ!" چنانچہ اس جگہ کا نام ہی واہ رکھ دیا گیا۔ جہانگیر نے اس جگہ ایک شاہی محل بھی تعمیر کر دیا۔ تقریباً ایک سو تیس برس ہوئے مور کرانٹ نے واہ کی سیر کی تو ذیل کے تاثرات قلمبند کئے "واہ باغ تقریباً $\frac{1}{2}$ میل لمبا اور $\frac{1}{8}$ میل چوڑا ہے۔ اس کے اردگرد ایک دیوار ہے جو بڑی حد تک شکستہ ہو چکی ہے دروازے اور مینار بھی خستہ حالت میں ہیں۔ مشرقی کونے میں پتھر کے دو بڑے بڑے حوض ہیں۔ مغرب میں کیاریاں اور چمن ہیں درمیان میں ایک شاہی آرامگاہ تعمیر کی گئی ہے"۔ اس باغ کے آثار حسن ابدال کے قریب اب بھی موجود ہیں۔

سرینگر میں داخل ہونے سے پہلے وولر جھیل کو کشتیوں کے ذریعے سے عبور کیا جاتا تھا۔ اس جھیل کے قریب نورجہاں نے ایک باغ تعمیر کرایا جس کا نام "داروغہ باغ" تھا۔ لیکن اب اسے "لالہ رخ باغ" کہتے ہیں۔

کشمیر میں سب سے پہلے جو مغل بادشاہ داخل ہوا وہ اکبر تھا۔ اس نے سرینگر میں "ہری پربت" کے نام سے ایک قلعہ بنوایا اور ڈل کے قریب ایک دلکش باغ کی بنا ڈالی۔ اسے "نسیم باغ" کہتے ہیں۔ اور اس کا شمار ہندوستان کے حسین ترین باغوں میں ہوتا ہے۔ یہ باغ جھیل کی سطح سے کافی بلند ہے۔ اور اس جگہ چونکہ ہر وقت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے محسوس ہوتے ہیں اس لئے اکبر نے اس کا نام "نسیم باغ" رکھا۔

"نسیم باغ اور قلعے کے درمیان ایک چھوٹی سی جھیل ہے جس کے ایک کونے میں "نگین باغ" کے آثار اب تک موجود ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ ڈل کے کنارے بے شمار ٹوٹی پھوٹی دیوارو
اور چبوتروں کے آثار ملتے ہیں جو کسی زمانہ میں مغلوں کے حسین
ترین باغات تھے ڈل کے اس پار دنیا کا مشہور ترین باغ
"شالا مار" ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جگہ سرینگر کے راجہ پروار سینا
دوم نے ایک چھوٹا سا گاؤں آباد کیا تھا جس کا نام "شالا مار"
تھا۔ سنسکرت میں اس کے معنی "محبت کا گھر" کے ہیں جہانگیر
نے اسی گاؤں کے کھنڈروں پر ۱۶۱۹ء میں "شالا مار باغ"
کی بنا ڈالی۔ اس باغ کے بیرونی احاطے میں "دیوانِ عام" اور
اندرونی احاطے کے وسط میں "دیوانِ خاص" ہے۔

نشاط باغ اور چشمہ شاہی

ایک اور باغ جو ڈل کے کنارے تعمیر کیا گیا "نشاط باغ"
کہلاتا ہے۔ یہ باغ نور محل کے بھائی آصف خاں نے بنوایا تھا
نشاط باغ اپنے سحر انگیز مناظر کے لحاظ سے تمام مغلیہ باغات
میں امتیازی درجے کا مستحق ہے۔ اس کے بارہ زینے ہیں۔ جو
سورج کے بارہ برجوں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ۱۶۳۳ء
میں جب شاہجہان نے یہ باغ دیکھا تو اس کا جی چاہا کہ آصف
خاں سے اسے خرید لے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ اس پہ کہتے ہیں کہ
شاہجہان نے اس ندی کو بند کرا دیا۔ جو نشاط باغ کی آبپاشی
کرتی تھی۔ لیکن آصف خاں کے ایک وفادار ملازم نے
جان پر کھیل کر راتوں رات ندی کا بند توڑ دیا۔ جب
شاہجہان کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے ناراض ہونے کی
بجائے بہادر ملازم کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ پہلے اس
باغ تک جانے کے لئے کشتی پر سوار ہونا پڑتا تھا۔ لیکن اب
ایک سڑک تیار کر دی گئی ہے۔ "نشاط باغ" کی سب سے
بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بے شمار مرمریں تخت ہیں۔
ڈل جھیل کے قریب کی پہاڑی پر "چشمہ شاہی" واقع
ہے۔ جس کی سحر آفرینیوں کا تذکرہ حیطۂ قلم سے باہر ہے!
سرینگر سے اگر جموں کے راستے واپس آئیں تو بیشمار چھوٹے
چھوٹے باغوں کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل وہ مقامات
ہیں جہاں درباری پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ ان میں سے وہ باغ
خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جو بیج بہاری کے مقام پر دریائے جہلم
کے کنارے واقع ہے۔ پہلے اس کا نام "دارا شکوہ کا باغ"
تھا۔ لیکن اب اسے "وزیر باغ" کہتے ہیں۔ یہ باغ اپنے حسـ
ترین پس منظر کی وجہ سے یادگار حیثیت رکھتا ہے۔
"وزیر باغ" کے بعد "ویری ناگ باغ" آتا ہے جو ا
کو خاص طور پر محبوب تھا۔ "ویری ناگ" دراصل اس ناگ کو
ہیں۔ جو کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ یہاں ایک چشمہ بھی ہے
دریائے جہلم کا منبع ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ مقام ...
مقدس ہے۔ چشمے کے نزدیک ایک شاہی محل بھی ہے ...
میں نور جہاں اور جہانگیر نے کئی رومان انگیز راتیں بسر کیں
کی خواہش تھی کہ انہیں یہیں دفن کیا جائے لیکن کسی وجہ
اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔
"ویری ناگ باغ" سے اوپر کی طرف "اچھی بل باغ" ہے
گرمیوں میں بہترین پُر فضا مقام ثابت ہو سکتا ہے!

پنجور باغ

مغلوں کے میدانی باغ پھولوں کے نہ ہونے کی و
اجڑ چکے ہیں۔ ڈل کے زینہ در زینہ باغوں کا حلیہ بگڑ چکا
کشمیر کے وہ باغ جو قدرتی چشموں کے کنارے واقع تھے۔ ا
پہلے کی طرح دلکش نہیں رہے۔ لیکن پنجور کا باغ اب بھ
اسی طرح سرسبز و شاداب ہے جس طرح اورنگ زیب کے ز
میں نظر آتا تھا۔ اور اسی باغ پر شاہان مغلیہ کے باغا
کی تاریخ کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ باغ کالکا کے قریب ہے اور ا
تزئین و آرائش کا ذمہ دار فدائی خاں تھا جس کے زیر نگرانی لاہو
بادشاہی مسجد تیار ہوئی تھی۔ پنجور کا مقام تاریخی حیثیت رکھتا
اور اس کے نزدیک جو کتبے موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ
چشمہ کورو پانڈوؤں کے زمانہ میں بھی موجود تھا۔ ابوریحان ...
نے ۱۰۳۰ء میں دیکھا۔ اس کی آن بان اور شان و شو
کا اندازہ صرف عینی مشاہدے سے ہو سکتا ہے۔
افسوس! باغوں کی جس تاریخ کا آغاز بابر نے کیا تھ
اس کا آخری باب اورنگ زیب کے زمانہ میں پایۂ تکمیل تک پ
تاہم اس سلسلہ میں مغل بادشاہوں نے جو کچھ بھی کیا۔ ا
دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے باغبانی کے فن کو ز
رکھنے کے لئے کس قابلِ تعریف اور بے نظیر خوش ذوقی
ثبوت دیا۔

یہ ہیں عورتوں کی آوازیں

ایک عورت نے دوسری عورت سے کہا

ایک نے کہا: بہن کیا بتاؤں اب تو مرنے کا وقت آگیا ہے۔ روز بروز میرا حال پتلا ہوتا جا رہا ہے۔

دوسری نے کہا: یہ تو ایک پیچھے ایسی مصیبت لگی ہے کہ ہر مہینہ پانچ چھ دن رو رو کر کٹتے ہیں۔

تیسری نے کہا: جب مجھے ماہواری شروع ہوتی ہے تو میرا تمام جسم پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا ہے۔

چوتھی نے کہا: اور میرے ...... جب شروع ہوتے ہیں تو میری کمر میں اور پنڈلیوں میں اور ناف کے نیچے بہت ہی سخت درد معلوم ہوتا ہے

پانچویں نے کہا: اور بہن! مجھے تو یہ دن قیامت معلوم ہوتے ہیں۔ دن بھر سر چکراتا ہے۔ پنڈلیوں میں اور پیٹ میں ہر وقت ایک اینٹھن سی رہتی ہے۔

چھٹی نے کہا: مجھے ایک نئی تکلیف ہے۔ ایک مہینہ میں دو مرتبہ ہوتے ہیں۔ بہت ہی کمزور ہو گئی ہوں۔

ساتویں نے کہا: میں اس تکلیف میں مبتلا ہوں کہ رک رک کر آتے ہیں اور بہت ہی درد ہوتا ہے۔

آٹھویں نے کہا: میری تکلیف سب سے الگ ہے۔ چھ چھ مہینے بعد ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہوتے ہیں تو بس ایسی تکلیف کے ساتھ کہ توبہ ہی بھلی۔

نویں نے کہا: میرے ساتھ یہ مصیبت ہے کہ ماہواری کے ساتھ ساتھ سفید پانی کی بھی کثرت ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے بدن میں سے کوئی جان کھینچ رہا ہے۔ کبھی پہلے رطوبت جاتی ہے کبھی بعد۔

کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیوں ہے

یہ سب عورتیں ماہواری ایام کی مریض ہیں۔ اگر ماہواری ایام بغیر درد کے باقاعدہ ہر مہینہ وقت مقررہ پر آ جایا کریں تو کبھی ان میں سے کوئی تکلیف نہ ہو۔ ہندوستان کی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں عورتوں کو معلوم ہے اور انہوں نے ذاتی تجربہ کیا ہے کہ اگر کوئی عورت مندرجہ بالا تکلیفوں میں کسی ایک یا بہت سی تکلیفوں کا شکار ہو جائے تو اسے بہت جلد تندرست کر دینے کیلئے دوا "**کورس**" سے بہتر ہندوستان میں دوسری دوا نہیں ہے۔ دوا "کورس" استعمال کرنے کے بعد عورت کو ہر مہینہ نہایت پابندی کے ساتھ مقررہ وقت پر صحیح مقدار میں بغیر کسی تکلیف اور بغیر کسی درد کے ماہواری ایام آنے لگتے ہیں۔ "کورس" کی ایک شیشی کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے جن بہنوں کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ نمبر ۲۳ دہلی

کو ایک خط لکھ کر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں۔ پارسل پر صرف نو آنے محصول ڈاک لگے گا۔

آہ وفغاں

جو منکرینِ عشق بہت شادماں رہے
اکثر اُنھیں کی آنکھ سے دریا رواں رہے

دشمن رہے زمین عدو آسماں رہے
مجھکو یہ سب قبول جو تُو مہرباں رہے

اتنا کرم بھی مجھ پہ مرے آسماں رہے
میرا جو حال ہو سو ہو وہ شادماں رہے

ایسا بھی ایک دَورِ مسرّت گزر گیا
ہنسنے کی آرزو تھی اور آنسو رواں رہے

دل مُبتلائے غم ہے مگر اس کا کیا علاج
جبتک وہ سامنے رہے ہم شادماں رہے

رکھّے خدا امان میں اُس زخمِ عشق سے
جو عُمر بھر رُلائے مگر بے نشاں رہے

کرتا تو ہوں فغاں میں کسی کے حضور آج
لیکن لبوں تک آکے فغاں جب فغاں رہے

یہ ظلم بس مجھی کو مُبارک ہو ناصحا!
وہ اور خدا نخواستہ ناشادماں رہے

اللہ رے اقتدار جبینِ نیاز کا
دیر و حرم بھی ساتھ رہے ہم جہاں رہے

جن کو تھا نازِ تیز روی راہِ عشق میں
اکثر وہی خمار پسِ کارواں رہے

خمار بارہ بنکوی

افسانہ

اندھی محبت

"غلطِ مشہور" دنیا میں بہت ہے - اگر کوئی کتاب لغت ایسی مرتب ہوتی جس میں بعض معروف و متداول کلمے درج ہوتے تو یقیناً حرف "غین" میں یہ بھی لکھا جاتا -

"غلطِ مشہور" اس چیز کو کہتے ہیں کہ سب لوگ اس کے معنی میں متفق ہوں لیکن کوئی شخص اس مفہوم کی صحت پر غور نہ کرے اور سب اس کو غلط معنوں میں استعمال کریں۔

بہرحال "اغلاطِ مشہور" عالم میں بہت پائے جاتے ہیں - لکھنؤ کی نزاکت آگرہ کے جوتے - یورپ کا فیشن - ہندوستان کی وضعداری یہ سب "غلط مشہور" ہیں - انہی مشہور غلطیوں میں سے ایک یہ ہے کہ مرد کہتے ہیں "عورت وجہ بدبختی ہے" لیکن میں ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ غلط مشہور ہو گیا ہے بلکہ صحیح طور پر اس کے عوض کہنا چاہئے کہ "مرد وجہ بدبختی ہے"۔

اب آپ منتظر ہوں گے کہ میں اس دعویٰ کو کیونکر ثابت کرتا ہوں -

کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ فطرت و طبیعت کی شہادت سے بہتر نہیں ہوتا - یعنی انسانوں کی سیرت و سرگزشت سے کوئی مثال لائی جائے - میں بھی چاہتا ہوں کہ اپنے دوست علی رشید ادیب معروف کی زندگی سے اس مسئلہ کا ثبوت مہیا کروں کہ مرد سبب بدبختی ہے - اور بدبختی بھی کس کی؟ اس ہستی کی بدبختی جس کو آپ اب تک اپنی بدبختی کا سبب سمجھتے رہے ہیں - اس کی بدبختی جس کو شعرا صانعِ مطلق کا شاہکار کہتے ہیں جس کو مصورین بہترین ماڈل بتلاتے ہیں - جس کو اہلِ زہد و تقویٰ مرکزِ فساد ٹھہراتے ہیں جس کو علمائے اجتماعیات منشاء بدبختی و خوش وقتی تجویز کرتے ہیں غرض جس کو ہر شخص کچھ نہ کچھ جانتا اور کہتا ہے - بجز میرے کرمفرما شیخ عبدالواجب کے کہ وہ اس کو کچھ نہیں جانتے - اور یہ نہ جاننا اس لئے ہے کہ ہمارے شیخ صاحب اپنے اطوار و کردار کو مشہور ضرب الامثال کے مطابق رکھتے ہیں - چنانچہ ان کی یہ لاعلمی بھی "انگور کھٹے" والی مثل کو ثابت کرتی ہے

میں کہہ رہا تھا کہ وہ ایسی ہستی ہے جس کو ہر شخص کچھ نہ کچھ سمجھتا ہے اب میں آپ سے معمے حل نہیں کراتا بلکہ بتائے دیتا ہوں کہ وہ ہستی "عورت" ہے - ہاں عورت وہی دیباؤں کا حیوان جو آپ کے اشک و آہ سے کھیلتا ہے -- وہی روباہ دُم بریدہ جو کبھی پارک اور سینما میں کبھی پارٹی اور کالج میں شائستہ و ذی شعور نوجوانوں کو ایک نگاہ کے اشارے پر نچاتی ہے -

اب میں نے دعویٰ کیا ہے کہ مرد سبب بدبختی ہے عورت کے لئے تو اجازت دیجئے کہ اپنے مدعا کو ثابت کروں -

میرے رفیق و ہم پیشہ علی رشید ایک مکمل جوان ہیں - شاید صورت کے لحاظ سے مکمل ہوں سیرت کے اعتبار سے نہ ہوں بہرحال مکمل ضرور ہیں خصوصاً اپنے وضع و قطع، تراش و خراش میں تو ہر عیب و نقص سے مبرا و منزہ ہیں - علی رشید آگرہ میں ایک ہی شخص ہیں جو فیشن اور وضع ایجاد کرتے ہیں - آپ کو ضرور یہ اتفاق پیش آیا ہوگا - کہ آپ نے کوئی کپڑا درزی کو دیا ہوگا - اور اس کی تراش و فیشن میں آپ سے اور درزی سے جھگڑا ہوا ہوگا - اس نے ایک طرح کا کالر اور کف بنائے ہوں گے آپ کسی دوسری وضع کے پسند ہوں گے - آپ درزی سے دست و گریبان ہونا چاہتے ہوں گے - اس نے کہا ہوگا کہ آپ کو اپنی پسند کا اختیار ہے - لیکن میں نے جیسے کالر کف بنائے ہیں - یہ مسٹر علی رشید کا فیشن ہے - اور آپ یہ سنکر بالکل مطمئن ہو گئے ہوں گے اور پھر اس کو پہن کر پارک میں ٹہلتے وقت اس تصور سے مسرور ہوئے ہوں گے کہ آپ علی رشید کا نوایجاد فیشن پہنے جا رہے ہیں -

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ علی رشید کو مجھ سے بھی زیادہ جانتے ہیں - لیکن شاید آپ اُن کے ایک عیب سے آگاہ نہ ہوں گے - اتفاق سے یہ ان کا سب سے بڑا عیب ہے بلکہ کہنا چاہئے ان میں بس ایک یہی عیب ہے اس لئے کہ میرے ہم پیشہ رفیق عزیز میں اس کے علاوہ کوئی عیب نہیں اور وہ عیب یہ کہ علی رشید کو ادبیات سے عشق ہے - یہ اُن کا عیب اس لئے گنا جاتا ہے کہ آج کل ادیب و شاعر ہونا فیشن میں داخل نہیں ہے - پہلے میں شامل ہے - میر و نظیر کے زمانے میں اس کا فیشن تھا -

اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ میرے رفیق عزیز کے اس بڑے یا چھوٹے عیب سے چشم پوشی فرمائیں اور از راہ کرم اس کا خیال نہ کریں - لیکن چونکہ ہم اور آپ سب اس حمام میں برہنہ ہیں - اس لئے ہم اگر آپس میں علی رشید کے اس عیب کا تذکرہ کریں تو کچھ عیب نہیں -

یورپ سے واپس آنے کے تیسرے مہینے خدا جانے کیسا جنون علی رشید
[سر] میں سمایا کہ انھوں نے اس عیب کو ظاہر کرنے کا ارادہ کرلیا - یعنی
[ایک ایسی کتاب] تصنیف کی جو اپنے اور مصنف کیلئے حیات جاوید کی
[ضا]من ہوجائے - وجہ تالیف غالباً یہ تھی کہ لوگوں کو یقین ہوجائے کہ مسٹر
[علی] رشید واقعی یورپ سے تعلیم پاکر آئے ہیں -

ہر شخص کو معلوم ہونا چاہئے کہ ابھی مصنفین داستان امیر حمزہ و
[طلس]م ہوشربا کا خون سرد نہیں ہوا ہے - اور اگر ان اساتذہ زبان کا خون
[سب] کی رگوں میں جاری نہیں ہے - تو کم سے کم بیسویں صدی کے اس
[جوا]ن خوش لباس وخوش رفتار کی رگوں میں تو ضرور دوڑ رہا ہے -

خلاصہ یہ کہ علی رشید نے ایک ڈراما لکھا، جس کا ٹائیٹل پیج یہ تھا -
[ہ]م نہیں ہیں" یا "بچو خاموش رہو" رشحہ قلم علی رشید تازہ ولایت
[او]ر دیباچہ کی جگہ یہ عبارت درج تھی - "یہ داستان شب یکشنبہ
[...] اپریل کو باوجود نہایت شدید گرمی - آگرہ کی شبانہ باد سموم اور درجہ
[حر]ارت کی آتش فشانی کے بغیر وسیع ہال میں پانچہزار ۳۲ حاضرین کے
[سا]منے جو سب کے سب ارباب علم وفضل سے اور جن کا داہنا ہاتھ دو
[...]ے تک بائیں ہاتھ سے جدا نہ ہوا بلکہ مسلسل صدائے رعد آسا
پیدا کرتا رہا - نہایت شان وشوکت اور اداکارانہ مہارت کے ساتھ تمثیل
کی گئی اور ۳۲ بار احسنت ومرحبا کے نعروں سے اور ۹۶ مرتبہ تالیوں
سے خراج تحسین وصول کیا"

شب تمثیل کی صبح کو یکایک میرے عزیز دوست کی شہرت نے شہر
آشوب کی کیفیت اختیار کرلی - اس شہرت سے علی رشید کی ایک اور
دیرینہ آرزو بھی پوری ہوگئی -

دس برس سے وہ اس فکر میں تھے کہ ٹوپی کو سر پر بائیں طرف کج
رکھنے کی جگہ داہنی طرف آڑی رکھیں - لیکن اس عجیب وضع کی جسارت
نہ ہوتی تھی - آخر تمثیل کے دوسرے روز صبح کو بڑے اطمینان واعتماد
سے "کج کلاہ طرف راست" بن کر نکلے اور شہرت کا مزہ دیکھو کسی نے عیب
جوئی نہ کی بلکہ جس نے دیکھا مبارکباد دی کہ واقعی خوب وضع نکالی -

اس نمائش وتمثیل سے دو روز بعد مسٹر علی رشید کو خیال آیا
کہ اگر تھیٹر ہال میں چار یا پانچہزار سے زیادہ مجمع نہیں سما سکتا تو آخر
تمام ابنائے وطن اور اہل ملک کا کیا قصور ہے کہ وہ ابدالآباد تک
اس ڈرامے کے حظ وسرور سے محروم رہیں - اگر سرکار نے گاؤں گاؤں
ریل نہیں نکالی اور کمپنیوں نے موٹر سروس جاری نہیں کی کہ لوگ جوق



اس تمثیل کو دیکھنے کے لئے آسکیں تو آخر ہم کیوں ان کو اپنی طرف سے بے بہرہ اور حرماں نصیب رہنے دیں۔

چنانچہ مسٹر علی رشید نے اپنے ڈرامے کو طبع و شایع کرانے کا ارادہ کر لیا۔ خیال آیا کہ اگر صرف اُردو میں شایع کیا جائے تو یہ خود غرضی اور جانب داری ہو گی۔ تمام عالم کے منتظر و مشتاق لوگ کیونکر مستفید ہوں گے۔ اس لئے میرے عزیز دوست اور محترم ہم پیشہ علی رشید نے [illegible] کی کہ اس تمثیل [illegible] کی [illegible] زبانوں [illegible] اُردو اور [illegible] زبانوں کے ترجمے بڑی آب و تاب کے ساتھ [illegible] ادب پر جلوہ گر ہو گئے۔ لیکن تیرہ زبانوں میں طباعت ترجمہ زبان عبرانی کے وقت فاضل مصنف کے ذہن رسا نے یہ باریک نکتہ پیدا کیا کہ صرف رشید کا نام تعارف کے لئے کافی نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس کے بعد جو ترجمہ شایع ہو اس کے ساتھ مصنف کی تصویر بھی شامل ہونی چاہیئے۔

مسٹر علی رشید جو تصویر کھنچوائیں وہ کوئی عام فوٹو نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بڑے غور و خوض کی ضرورت ہے۔ یہی سبب ہے کہ علی رشید پورے ۳۲ روز اپنے کمرے میں بند رہے۔ ایک قد آدم آئینہ جو اُن کے مرحوم پدر بزرگوار فرنگستان کے نویں سفر سے سوغات لائے تھے۔ اپنے سامنے لگایا اور اپنے چشم و ابرو، روئے سر، دست و پا، نشست و برخواست، حرکات و سکنات کا آئینہ میں مطالعہ کرتے رہے۔ آخر اس ہیئت پر رائے قائم ہوئی کہ میز سامنے ہو۔ داہنے ہاتھ میں کتاب اور بائیں ہاتھ میں قلم ہو اور قیافہ نہایت مفکرانہ و فاضلانہ ہو تاکہ ہر شخص فوٹو کو دیکھتے ہی سمجھ جائے کہ یہ خوش سیما و خوش لباس شخص فاضل انشا پرداز کامل شاعر اور زبردست فلسفی ہے۔

آخر اکبر آباد و صنعت بنیاد کے ۶۲ فوٹو گرافروں نے یہ فوٹو لیا۔ اور وہ بھی ایک ایک نے ساٹھ ساٹھ بار۔ ان سب میں سے پروفیسر اطہر علی خان ماہر خصوصی عکاسی کا فوٹو میرے عزیز دوست اور ہم پیشہ ادیب شہیر کو پسند آیا۔ اور اس کی پلیٹ تیاری و طباعت کے لئے لندن بھیجدی گئی۔ اس میں ایک ذرا سی دشواری پیش آئی یعنی اس زمانہ میں اسٹیمروں کی آمد و رفت محدود و مسدود اور طویل و صبر آزما تھی اور مسٹر علی رشید ڈراماٹسٹ کی روح سات سو برس پہلے شیخ سعدی کی چشم بصیرت کے روبرو مجسم ہو کر ان سے لکھوا چکی تھی ——— ع نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال گھاس کو پاؤں کے نیچے اُگنے کا موقع دینا میرے دوست کے اصول کے خلاف تھا۔ بلکہ کسی سنگ و خشت کو بغیر تہ و بالا کئے نہ چھوڑنا اُن کے دستور العمل میں داخل تھا۔ اس لئے تو فوٹو پلیٹ ہوائی جہاز کے ذریعہ لندن روانہ کی گئی اور اس کی تین لاکھ بارہ ہزار کاپیاں چھپ کر آگئیں۔

اب دیکھیے کس طرح ایک شخص کی خوش نصیبی دوسرے شخص کی بدبختی کا سبب بنتی ہے۔ میرے دوست کی یہ حسین تصویر گجراتی زبان کے ترجمہ تمثیل کے ساتھ شامل ہو کر ایک قلب ستم کش کی حرماں نصیبی اور قطع رشتہ حیات کا باعث بن گئیں۔

کراچی میں ایک دوشیزہ تھی کہ تمام بحر بنگال اس کے ایک تار گیسو میں بندھا ہوا تھا اور سارا [illegible] کشمیر اس کے ایک خال رخسار کا اسپند تھا ایک روز یہ دوشیزہ بت خانہ میں تھی کہ یکایک اس کے دل میں عشق کے دیوتا کی خدائی کے متعلق شک پیدا ہوا۔ دیوتا بڑے غیرت مند تھے ہیں۔ فوراً ہر طرف سے اس پر نفرین ہونے لگی۔ مندر سے واپسی پر ایک کتب فروش کی دکان کے سامنے سے گذری۔ اس حسینہ نے "بیسویں صدی کی تاریخ ادبیات" کی ۳۲ جلدوں میں میرے رفیق عزیز اور ہم پیشہ ادیب مسٹر رشید علی کا نام پڑھا تھا۔ اور ان کی تصانیف کے مطالعہ کا شوق اس کے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ اب اس دکان پر گجراتی زبان کا ترجمہ تمثیل نظر آیا تو بیتاب ہو گئی اور فوراً کتاب خرید لی اور ایک گلی میں کھڑی ہو کر کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ لیکن سب سے پہلے مصنف کے فوٹو پر نظر پڑتے ہی اس عصمت کی دیوی کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور پھر جب مست و بے خود گھر کو واپس آئی تو یہ حال تھا کہ ع

دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

اب زیادہ طول دینے سے کیا حاصل۔ خلاصہ یہ کہ چار سال عشق پنہاں کی شورش خاموش میں گذر گئے۔ اور آخر زندگی سے مایوس ہو کر اپنے جسم نازک کو سمندر کی نذر کر دیا۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ میرے رفیق و ہم پیشہ ایسے واقعات کے خوگر تھے۔ یا شاید اس حادثہ کو اپنے جمال و کمال کا خراج سمجھتے تھے انھوں نے اس حرماں نصیب و ناکام حیات کی روح کو ایک آہِ حسرت کے لایق بھی نہ سمجھا۔

اس صورت میں مجھے حق ہے کہ یہ دعویٰ کروں کہ مرد سبب بدبختی ہے۔ اور اس کے معکوس کو یعنی اس مقولے کو کہ "عورت وجہ بدبختی ہے" غلط مشہور سمجھوں۔

حامد حسن قادری

بھول جا

سوچ نہ مسکرا بھی دے دیدۂ نم کو بھول جا
ہنس کے گذار زندگی رنج و الم کو بھول جا

ہاں بھی نہ کر، نہ کر نہیں مست رہے تری جبیں
سر کو جھکا بھی دے کہیں دیر و حرم کو بھول جا

پھر نہ ملے گی زندگی، چھوڑ نہ لطفِ بیخودی
اُن کے کرم کو یاد کر اُن کے ستم کو بھول جا

سوزشِ غم کی فکر کر، دیدۂ نم کی فکر کر
صبحِ حرم کی فکر کر، شامِ حرم کو بھول جا

اُن کے ہی در پہ سر جھکا، اُن کی گلی میں جان دے
اپنی قسم کا دھیان رکھ، اُن کی قسم کو بھول جا

کس کو نصیب بے بسی، ملتی ہے کس کو بیکسی
فقر کو جان زندگی، جاہ و حشم کو بھول جا

درد بڑھے تو شکر کر، دل بھی جلے تو شکر کر
غم کو خوشی بنا کے دیکھ، سوزشِ غم کو بھول جا

تجھ کو نہیں ہے کچھ کمی، غم میں نہاں ہے ہر خوشی
خوب ہے دامن تہی، دستِ کرم کو بھول جا

سجدۂ شوق اصل ہے، وقت و مقام نقل ہے
تیری جبیں کی خیر ہو، نقشِ قدم کو بھول جا

پھولا پھلا ہے باغِ دل، جلنے بھی دے چراغِ دل
دولتِ غم ہیں داغِ دل، دام و درم کو بھول جا

سجدۂ غم وہاں سہی، سود نہیں زیاں سہی
سنگِ درِ بتاں سہی، سنگِ حرم کو بھول جا

بہزاد لکھنوی

ایک ایکٹ کا طربیہ

بیوی کا انتخاب

۔۔۔ افرادِ ڈراما ۔۔۔

نرائن:۔ بار ایٹ لا۔ ممالک خارجہ کا تعلیم یافتہ۔ مہذب۔ کامیاب۔ مالدار۔ قانون داں۔ ترقی یافتہ خیالات کا مالک۔ ۲۷ سالہ خوبصورت نوجوان اور غیر شادی شدہ۔

وِملا:۔ بی۔ اے۔ ایک بیس سالہ حسین لڑکی۔

شنکر:۔ نرائن کا ملازم لڑکا۔

مقام:۔ نرائن کے شہری بنگلے کا ایک کمرہ

وقت:۔ سنہ ۱۹۵۰ء کی ایک بہار آفریں صبح۔

(آسمان صاف و شفاف ہے۔ سورج کی سنہری کرنیں فرحت بخش معلوم ہو رہی ہیں۔ طائران خوش الحان محو نغمہ سرائی ہیں۔ بادِ نسیم فضا میں خوشبوئیں بکھیر رہی ہے۔ تمام دنیا سکر و نشاط کے عالم میں انگڑائیاں لے رہی ہے۔ پردہ اُٹھتا ہے۔ نرائن اپنی لکھنے کی میز کے قریب بیٹھا ہوا ہے اور سگریٹ پی رہا ہے۔ پاس ہی ایک کتاب پڑی ہے۔ کبھی کبھی اس کی ورق گردانی کرتا ہے)

شنکر:۔ نمستے سرکار، باہر کوئی نوجوان خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں انھیں اندر بلا لوں سرکار؟

نرائن۔ ایک نوجوان خاتون؟ ۔۔۔ اوہ ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ اندر بلا لو ۔۔۔ (شنکر جاتا ہے)

(دو سیکنڈ بعد وِملا ایک حسین لڑکی شاندار لباس میں اندر داخل ہوتی ہے۔ نرائن اور وِملا مصافحہ کرتے ہیں۔ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے اور پہلی ہی نظر میں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو جاتے ہیں)

نرائن۔ نمستے مس وِملا! میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ تشریف رکھئے۔

وِملا۔ بہت بہت شکریہ! آپ سے ملاقات کر کے انتہائی خوشی حاصل ہوئی میں آپ کے اشتہاری اعلان ہی کے سلسلے میں آئی ہوں کیونکہ آپ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔

نرائن۔ ہاں۔ ہاں مجھے معلوم ہے! یہاں آنے کا مطلب۔ بہت بہت شکریہ! میرا خیال ہے کہ یہاں آنے کے متعلق میں نے آپ کو تکلیف نہیں دی۔ مگر اب تو آپ تشریف لے آئی ہیں۔ کوئی بات نہیں ۔۔۔ ہاں اب ہمیں اصل موضوع پر آنا چاہئے ہی سرمایہ ہے۔ جیسا کہ کسی عقلمند نے ایک بار کہا تھا مجھے ہے کہ آپ نے یہ اشتہار والا طریقہ ضرور پسند کیا ہوگا۔ آ ہیں خوشی اور مسرت کے لئے میرے پاس ہر شے موجود ہے اس کے جس سے لوگوں کے کہنے کے مطابق ایک مرد کی ز مکمل ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مجھے ایک بیوی کی ضرو اسی لئے میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

وِملا۔ نہایت شریفانہ خیال ہے۔ میں آپ کو اس معقول پ مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

نرائن۔ یہ ملاقات کا طریقہ بہترین شریک حیات کو حاصل کر اچھا ذریعہ ہے۔ چنانچہ میں نے بیوی بننے کی خواہش رکھنے کے لئے یہ اشتہار دیا کہ میرے پاس درخواستیں بھیجیں اُن میں سے منتخب لڑکیوں سے ملاقات کر دوں۔ یہ کا طریقہ ہے اور اسی کی بدولت آپ یہاں تشریف ا

وِملا۔ بیشک بہت خوب۔ بیکم ہے۔

نرائن۔ مجھے کُل ۱۰۷ درخواستیں موصول ہوئیں۔ ان ہمراہ تصاویر بھی تھیں۔ ان میں سے میں نے ۔۔ کا

کے لئے کیا۔ بقیہ کو مسترد کر دیا۔ فیصلہ کا معیار حسن، تربیت اور دماغ پر مبنی تھا۔ حسن اور تربیت کا اندازہ درخواستوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ میں قبل ازیں دو اُمیدواروں سے ملاقات کر چکا ہوں۔ آپ اس فہرست میں تیسرے نمبر پر ہیں کیونکہ درخواستوں میں حروف تہجی کی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔ آپ کا نام مجھے معاف کیا جائے اگرچہ بہت دلکش ہے کیونکہ وہ مجھے پسند ہے۔ حروف تہجی کے لحاظ سے فہرست میں نیچے آتا ہے۔

وملا - کچھ پروا نہیں۔ مجھے اپنے نام کے متعلق کوئی شکایت نہیں۔ میں اس سے پوری طرح مطمئن ہوں۔

نرائن - پہلی دو امیدواروں سے کل اور پرسوں میں نے ملاقات کی تھی۔ میں نے شوہر کے متعلق ان کا رویہ پسند نہیں کیا۔

وملا - صد افسوس! آپ کو یہ بتلانے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا کہ وہ کیوں ناکام رہیں؟

نرائن - بالکل نہیں۔ میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ میں نے انھیں نہایت ہی معقول وجوہ کی بنا پر مسترد کر دیا۔ پہلی نے کہا تھا کہ مجھے گھریلو معاملات میں کوئی دخل نہیں دینا چاہئے۔ میں نے اُس سے اتفاق نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ ایک مکمل بیوی کو اپنے شوہر کا تعاون حاصل کرنا چاہئے اور اُس کے مشوروں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

وملا - بیشک، مجھے آپ سے پوری طرح اتفاق ہے

نرائن - دوسری امیدواروں نے یہ ارشاد فرمایا کہ جب مجھے اپنے موکلوں سے رقم ملے تو میں فوراً اس کے حوالے کردوں۔ اور یہ حق صرف اسی کو حاصل ہوگا کہ وہ کس طرح اسے خرچ کرے مجھے گھر کے میزانیہ سے کوئی سروکار نہ ہوگا سوائے روپیہ فراہم کرنے کے مجھے ایک عورت کی اس مہمل رائے سے بڑی کوفت ہوئی۔ آپ کیا فرماتی ہیں؟

وملا - بلاشبہ میں آپ کی طرف ہوں۔ ایک بیوی کی طرف سے ایسا مطالبہ غیر منصفانہ ہے۔

نرائن - مجھے خوشی ہے کہ آپ متفق ہیں۔ اب ہمارے سامنے امتحان کا کام ہے۔ میں آپ سے چند سوالات کرونگا اور آپ کو نہایت قابلیت سے ان کے جوابات دینا پڑیں گے۔ گھبرایئے مت، معمولی سا امتحان ہے۔ آپ کو ذرا حاضر دماغی سے کام لینا چاہئے۔

وملا - بہت مناسب ہے۔ لیکن اگر آپ کسی خاص فرقہ کو ترجیح دینے کے آرزومند ہیں تو میرے لئے کامیابی کے بہت کم مواقع ہیں، میں کسی بھی فرقہ سے تعلق نہیں رکھتی۔

نرائن - خوب! میں کسی فرقہ کو ترجیح نہیں دینا چاہتا۔ مجھے صرف امیدوار کی ضرورت ہے۔ خواہ وہ کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھتی ہو۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں وسیع المشرب اور جمہوریت پسند ہوں۔ اب وملا ——— ! ار ——— معاف کیجئے، نام لینے سے آپ ناراض تو نہیں ہو گئیں۔ سچ جانئے یہ اتنا دلکش اور شیریں نام ہے کہ میں اس کے شروع میں "مس" کا اضافہ کرکے اس کے حسن کو مجروح کرنا نہیں چاہتا۔

وملا - مجھے آپ کا نظریہ پسند ہے۔ آپ بالکل مجھے نام لے کر پکار سکتے ہیں مجھے اس پر قطعی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میرے تمام دوست مجھے وملا ہی کہتے ہیں۔

نرائن - بہتر ہے۔ ہم ایک دوسرے سے بہت زیادہ ہم آہنگ نظر آرہے ہیں۔ ہاں تو سنئے میرا نظریہ شادی بہت بلند اور اعلیٰ ہے۔ شادی ایک روحانی ارتباط کا نام ہے۔ اس میں دو روحیں محبت کی سنہری زنجیر میں ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں اور اسی محبت میں زندگی کی ساری رنگینیاں اور مسرت آفرینیاں پنہاں ہیں۔

وملا - خوب! آپ تو شاعری فرما رہے ہیں۔ مجھے شاعری سے کوئی واسطہ نہیں۔ سکول میں میں اس سے بیحد گھبراتی تھی۔

نرائن - خیر اس سے آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ بہت جلد اس سے مانوس ہو جائیں گی ——— ار ——— میرا مطلب ہے ——— اگر آپ نے امتحان پاس کر لیا۔ میں غیر شعوری طور پر بعض اوقات اپنے پیشہ سے متعلق الفاظ استعمال کرنے لگتا ہوں ——— ہاں تو شادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ نے اس کے متعلق کوئی نظریہ تو قائم نہیں کیا؟

وملا - میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ البتہ اس کا تصور ضرور کیا ہے۔ مجھے اس کے متعلق کوئی معلومات نہیں ہیں۔ لیکن میں نے سُنا ہے کہ شادی ایک محصور قلعہ کی مانند ہے۔ جو لوگ باہر ہیں وہ اس کے اندر جانے کے متمنی ہیں۔ اور جو اندر ہیں وہ باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں!

(دونوں زور سے قہقہہ لگاتے ہیں)

نرائن - اہاہا! میں نے بھی شاید کچھ ایسا ہی سُنا ہے۔

وملا۔ شادی کرنے سے آپ کو ایک ہمدرد اور مونس مل جاتا ہے جو آپ کے مصائب و مشکلات میں پوری طرح شریک رہتا ہے۔

نرائن۔ اہا! اگر آپ یہ تو بتایئے کہ واقعی آپ کو شادی میں کوئی دلچسپی ہے؟ کیا آپ کے خیال میں کامیاب ازدواجی زندگی ناممکن ہے؟

وملا۔ جی، ایسا نہیں ہے۔ مجھے شادی پر یقین ہے اور (شرماتے ہوئے) ایک اچھے نوجوان سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کئی کامیاب شادیوں کا علم ہے۔ جب ہماری کالج کیپٹن مالتی نے شادی کی تو ہر شخص نے یہی کہا کہ یہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ بہترین ہاکی کھیلنا چاہتی تھی۔ اس کی تیزی و طراری سے سب واقف تھے جب کبھی ہمارے ہوسٹل کے گرد ہاکر بلا وجہ جمع ہو جاتے تو وہ اپنی ہاکی اسٹک سے اُن کی خوب خبر لیتی تھی۔ اور اس کا شوہر ایک مرنجاں مرنج نوجوان تھا۔ جس کی تفریحی سرگرمیاں صرف شطرنج تک محدود تھیں۔ ہمیں امید تھی کہ مالتی کی شوخیاں اس کے سیدھے سادے اور متین و سنجیدہ شوہر کے لئے باعث اذیت ثابت ہونگی۔ مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ہم غلطی پر تھے۔ وہ اس وقت نہایت مسرور زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی ایک ایسا نمونہ ہے جو اپنی نظیر آپ ہے۔ ان کی اب ایک چھوٹی سی لڑکی بھی ہے۔ علاوہ ازیں (شرماتے ہوئے) ہر لڑکی دراصل ماں ہے۔

نرائن۔ اہا! مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں اس اتوار میں مالتی سے دوستی کرنے کی کوشش کرونگا۔ اچھا اب ہمیں امتحان کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔

وملا۔ ہاں ذرا یہ تو بتایئے نتیجہ کا اعلان کب ہوگا؟ کیا مجھے مئی کے دوسرے ہفتہ تک تو انتظار کرنا پڑے گا جس طرح یونیورسٹی کے امتحانات کے لئے بیقرار رہنا پڑتا تھا۔

نرائن۔ نہیں ——— نہیں ——— امتحان ختم ہونے ہی میں نتیجہ بتا دونگا اگر آپ امتحان میں کامیاب ہو گئیں تو آپ میری بیوی کی حیثیت سے منتخب کر لی جائینگی۔ اور اگر خدانخواستہ آپ ناکام رہیں تو پھر آپ جا سکتی ہیں۔ جس کا مجھے افسوس ہوگا۔

وملا۔ آپ کو افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں آپ سمجھدار آدمی ہیں اور میں ایسے آدمیوں کو پسند کرتی ہوں میں نامعقول شوہر کو کبھی پسند نہ کرونگی۔ مگر فرض کیجئے کوئی امیدوار آپ کے معیار پر پوری نہ اُتری تو کیا انتخاب عمل میں آ سکیگا؟

نرائن۔ یہ صرف خیال ہے۔ اگر کوئی امیدوار موزوں ثابت نہیں ہوئی تو پھر انتخاب عمل میں نہیں آئے گا۔ میں سمجھتا ہوں ایسے دوسرے امتحان تک مجھے کنوارا ہی رہنا پڑے گا۔ قواعد و ضوابط وہی ہیں جو دوسرے امتحانوں میں ہوتے ہیں۔ کوئی سفارش قابل قبول نہ ہوگی۔

وملا۔ مجھے معلوم ہے۔

نرائن۔ ہاں تو آپ کا نام وملا ہے؟

وملا۔ جی ہاں! وملا!

نرائن۔ آپ کی تعلیمی صفات؟

وملا۔ بی۔ اے، سنسکرت دوسری زبان۔ تاریخ اور موسیقی اختیاری مضامین

نرائن۔ کیا کہنے ہیں جب ہماری شادی ہو جائیگی تو آپ مجھے گانا بھی سنایا کرینگی۔ ۔ ہاں مگر امتحان میں پاس ہونے کی صورت میں ——— آپ کی لمبائی، وزن اور قد کیا ہے۔

وملا۔ ۵ فٹ ۴ انچ۔ ۱۱۲ پونڈ اور ۲۰۔

نرائن۔ کالج میں علاوہ تعلیم کے آپ کی اور کیا سرگرمیاں رہیں؟

وملا۔ میں ہوسٹل کی سکریٹری اور باسکٹ بال کلب کی کیپٹن تھی۔ مقابلہ حسن میں پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ کئی دوڑوں میں کامیاب رہی۔

نرائن۔ اخاہ! یہ تو بڑا کارنامہ ہے ——— واقعی آپ کا حسن انعام کے قابل ہے۔

وملا۔ (شرماتے ہوئے) شکریہ!

نرائن۔ اب میں آپ کا دماغی امتحان لیتا ہوں۔ میں عام معلومات کے سوال پوچھوں گا۔ اور آپ کو اپنا وسیع مطالعہ اور دقیق مشاہدہ ظاہر کرنا پڑے گا۔ مجھے مختصر جوابات پسند ہیں۔ طویل جوابوں اور بے معنی تاویلوں سے میں گھبراتا ہوں۔ انگریزی ادب کے متعلق اب میں آپ کی معلومات جاننا چاہتا ہوں۔ ایک صبح بائرن کو کیا پیش آیا؟

وملا۔ ایک صبح بائرن بیدار ہوا اور اُس نے اپنے آپ کو شہرت کی دیوی کی آغوش میں مسکراتے ہوئے پایا۔

نرائن۔ ٹھیک ہے۔ اچھا اب یہ بتایئے شکسپیر کے نام سے کس نے لکھا؟

وملا۔ بعض بیکن کا نام لیتے ہیں۔ کچھ والٹر ریلیج کو بتاتے ہیں۔ اور چند لوگوں نے تو ملکہ الزبتھ تک کا نام لے دیا ہے۔ مگر میں اس مسئلہ پر نہایت بے باکی سے اظہار خیال کرتی ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شکسپیر نے طلبہ کے لئے کیسی مصیبت پیدا کر دی ہے چارل

میں اسے یہاں اتنا اہم خیال نہیں کرتی۔ کئی ایسی بیویاں ہیں۔ جو شیکسپیر کی نکتہ چینی سے کبھی خفیف نہیں ہوتی ہیں۔

نرائن - اچھا! مجھے خود اس کے متعلق کوئی چیز معلوم نہیں۔ میں نے ایک اچھا سوال سمجھ کر آپ سے پوچھا تھا۔ اب ذرا ریاضی کی طرف آئیے۔ ایک سوال کا زبانی جواب دیجئے۔ ایک آدمی ایک کام کو دو دن میں کرتا ہے اور ایک عورت اس کو تین دن میں کرتی ہے بتائیے وہ دونوں مل کر اُسے کتنے دنوں میں کرینگے؟

وملا - پانچ دن میں!

نرائن - پانچ؟ کس طرح؟

وملا - یہ تو معمولی سمجھ کی بات ہے۔ تین اور دو مل کر پانچ ہوئے جب وہ دونوں مل کر کام کریں گے تو یقیناً باتیں بھی کریں گے۔ کچھ نہیں تو لڑنا ہی شروع کر دینگے۔ اس لئے دو اور تین پانچ ہوئے۔

نرائن - میرے خیال سے آپ کا جواب صحیح ہے۔ ان معاملات میں میری معلومات بہت زیادہ نہیں ہے۔ مجھے ایسے کام کرنے کا تجربہ نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں آپ کے جواب سے آئین سٹائین بھی شرما جائے گا۔ یہ بجا، صحیح ہے۔ اچھا بتائیے سیب نیچے کیوں گرتا ہے؟

وملا - نیوٹن کے کلیہ کشش ثقل کے باعث سیب نیچے گرتا ہے۔

نرائن - بہت خوب۔ یہ مشکل سوال تھا۔ میرا خیال تھا۔ آپ ایسے شاید بگاڑ دینگی بہت کم لڑکیاں اس سوال کا صحیح جواب دے سکیں گی۔ اب آپ سے کیمیا کے متعلق کچھ پوچھتا ہوں۔ جب موم بتی جلتی ہے تو کیا چیز ضائع ہوتی ہے؟

وملا - کتاب میں لکھا ہے کہ جب موم بتی جلتی ہے تو کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ مگر کتابوں اور کلاس روم سے باہر حقیقت یہ ہے کہ جب وہ جلتی ہے تو موم بتی اور روپیہ جو آپ نے اس کے لئے ادا کیا ہے ضایع ہوتے ہیں۔

نرائن - ہیرے اور کوئلے میں کیا فرق ہے؟

وملا - ایک ہیرا ہے اور دوسرا کوئلہ۔ دنیا بھر میں ان کے درمیان یہی فرق ہے۔ میرے خیال سے تمام شادی شدہ مرد اس فرق کو جانتے ہیں جب ان کی بیویاں شادی کی سالگرہ کے موقع پر ہیرے کے ہاروں کا مطالبہ کرتی ہیں۔

نرائن - آپ تو خوب جواب دے رہی ہیں۔ اب ذرا تاریخ کی ورق گردانی فرمائیے۔ منشور اعظم پر کہاں دستخط ہوئے تھے؟

وملا - غالباً سطح کاغذ پر شرائط کے نیچے۔

نرائن - بالکل درست۔ کیا خوب! اس سے پہلے کبھی یہ بات یہ دماغ میں آئی ہی نہ تھی۔ ملکہ ازبتھ نے تخت پر آتے ہی کیا کیا؟

وملا - یقیناً وہ اس پر آ کر بیٹھی ہو گی۔ کسی بھی ہوشیار عورت نے تخت شاہی پر اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا ہوگا۔

نرائن - ٹھیک ہے۔ شہنشاہ لوئی چہاردہم خاص طور پر کس کے لئے ذمہ دار ہے؟

وملا - لوئی پانزدہم کے لئے۔

نرائن - ہاہا۔ ایہ صحیح تاریخ ہے۔ دیکھئے آپ جغرافیہ میں کیسی ہیں۔ تو بتائیے راس اُمید کہاں ہے؟

وملا - جب میں اسکول میں تھی تو وہ افریقہ میں ہوا کرتی تھی۔ یہ چار سال پہلے کی بات ہے۔ اور اب نقشے بدل رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اٹلس کے رنگ بھی تبدیل ہو رہے ہیں۔ صرف خط استوا ہی ایک ایسا خط ہے جو نہیں بدلا ہے۔ لیکن کچھ بھی ہو وہ فرضی خط ہے۔ لہٰذا جغرافیہ میں کسی کا امتحان ایک ہی نکتہ پر لینا مشکل ہے۔

نرائن - یہ بہت شاندار جواب ہے۔ مجھے جغرافیہ سے زیادہ دلچسپی نہیں لیکن چونکہ میں اپنی بیوی کی تعلیم کو مکمل دیکھنا چاہتا ہوں، اس لئے آپ سے یہ سوال کر دیا تھا۔ کیا آپ یہ بتائینگی کہ برطانوی سلطنت پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

وملا - اس سلسلے میں ایک آئرش نے خوب کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کو برطانویوں پر رات کے وقت بھروسہ نہیں ہے۔ اور غالباً اسی لئے چیمبرلین آنجہانی اپنے ساتھ ہر وقت چھتری رکھتے تھے۔

نرائن - مذہب کے متعلق آپ کا کوئی خاص نظریہ ہے؟

وملا - پورٹ و غیرہ پر تمام دنیا کے بڑے بڑے مندروں کی تصاویر کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ مجھے میرے والد نے مجھے اپنی سالگرہ کے موقع پر تحفتہً دیئے تھے۔ میرا کوئی خاص مذہبی نظریہ نہیں ہے۔

نرائن - کیا آپ کبھی کسی کی محبت میں مبتلا ہوئی ہیں۔

وملا - شاید آپ کا مقصد آغاز شباب کے عشقیہ دوروں سے ہے ہاں میرے کئی شریف دوست ہیں۔ میرے خیال میں ان میں سے چند مجھ سے محبت بھی کرتے تھے مگر وہ صرف نوجوانی کے گذرے ہوئے تصورات ہیں۔ اگر تمام لڑکے جو مجھ سے محبت کرتے تھے مجھ پر ایک ایک نشان ثبت کر دیتے تو میں اس وقت شاید ایک حسین گورخر سے کم نہ ہوتی۔

نرائن — اہاہاہا — بہت دلچسپ جواب ہے۔ میں لڑکیوں کو شوخ اور خوش مزاج ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہاں یہ بتائیے کھانا کس طرح پکاتے ہیں اور گھر کے دوسرے کاموں کو کس طرح انجام دیتے ہیں؟

وملا — بہت اچھی طرح —! اگر گھر میں ہمارے ایک ملازم تو ضرور ہوگا اور میرے خیال میں آپ کو ایک بیوی کی ضرورت ہے نہ کہ خادمہ کی

نرائن — جی ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میں صرف بیوی ہی چاہتا ہوں۔ مگر ہمیں ناگہانی ضروریات کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ فرض کیجئے کہ نوکر بھاگ جائے یا کسی خوشگوار صبح کو غائب ہو جائے تو پھر ہم کیا کریں گے۔ ہم بھوکوں مرنے سے تو رہے؟ آپ کو اس وقت ضرور باورچیخانہ میں جانا پڑے گا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

وملا — کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں تیار رہنا چاہئے؟

نرائن — ہاں، میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو منتخب کر لیا جائے؟

وملا — خوب، میرا خیال ہے کہ ایک دو دن کے لئے جب تک ہمیں نیا نوکر نہ مل جائے ہم بھوکے نہیں رہ سکتے۔

نرائن — کیسی اطمینان بخش بات کہی ہے آپ نے بھی! کیا آپ ستار بجا سکتی ہیں؟

وملا — بہت اچھی طرح۔

نرائن — میں بھی اس کا دلدادہ ہوں۔ یہاں ہماری دلچسپی ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ آپ کون سے اداکار کو پسند کرتی ہیں؟

وملا — نیکی رونی —!

نرائن — آپ کو کالج میں سب سے زیادہ کس چیز سے محبت رہی؟

وملا — چھٹیوں سے۔

نرائن — اہاہاہا — اور سب سے زیادہ نفرت؟

وملا — امتحان سے۔

نرائن — آپ کون سے کھیل کھیلتی ہیں؟

وملا — میں کالج میں ٹینس، ہاکی اور باسکٹ بال کھیلا کرتی تھی۔ اب کالج چھوڑنے کے بعد صرف ٹینس کھیلتی ہوں۔ گھر میں ایک کورٹ تو ضرور ہوگا؟

نرائن — بالکل، میں ٹینس کا بڑا رسیا ہوں۔

وملا — اور میں بھی اسے پسند کرتی ہوں۔

نرائن — آپ کا گانا کیسا ہے؟

وملا — قابلِ برداشت — جب میں گاتی ہوں تو ہمسایوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ، مجھے مار رہے ہیں۔

نرائن — یہ تو بہت اچھا ہے۔ مجھے موسیقی سے خاص لگاؤ ہے لیکن میں صرف اس وقت گاتا ہوں جب غسل خانے میں ہوتا ہوں، اب ذرا ایک سنجیدہ سوال آتا ہے۔ "کیا آپ صغرسنی کی شادی کے امتناعی قواعد پر یقین رکھتی ہیں؟

وملا — اس پر بحث کرنا آسان نہیں۔ اس کا انحصار اس بچے پر ہے جس کا تعلق اس مسئلہ سے ہو۔ بچوں کی تین قسمیں ہیں۔ بعض کی ابتدا ہی میں شادی ہو جاتی ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو تدریج شادی کیلئے تیار ہوتے ہیں۔ اور بعض پر شادی جبراً اکڑوں دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ کا صحیح حل معلوم کرنے کے لئے آپ کو متعلقہ بچے کی نفسیات سے واقف ہونا چاہئے۔

نرائن — بھئی بہت خوب تشریح ہے۔ میں اسے معقول جواب سمجھتا ہوں۔ یہ چیز ہم انجمن اصلاح معاشرت کے پاس پہنچا دیں گے ہاں ضبط تولید کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

وملا — اب تک میں نے اس کے متعلق زیادہ غور نہیں کیا ہے۔ میرے خیال میں ابھی اس بارے میں مجھے متشوش ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ امتحان ختم نہیں ہوا ہے۔

نرائن — آپ شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ ایک بچے کی دیکھ بھال کس طرح کی جاتی ہے؟ ایک اچھی بیوی اور ماں کو اس سے پوری طرح واقف ہونا چاہئے۔

وملا — میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس بارے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئیگی۔ ہر ایک لڑکی جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے درحقیقت ایک ماں ہے اور یہی چیز مجھ پر منطبق ہوتی ہے جب وقت آئے گا (شرم سے دُہری ہو کر) تو میں ایک اچھی ماں بھی ثابت ہونگی

نرائن — یہ بات مسرت بخش ہے۔ کیا آپ غازہ استعمال کرتی ہیں؟

وملا — مجھے بناؤ سنگار کی عادت نہیں ہے۔ مگر اپنی روزانہ کی آرائش ضرور کرتی ہوں۔ مگر یہ ایک ایسی چیز ہے جسے مرد نہیں سمجھ سکتے مزید براں جب گاندھی جی آزادئ تقریر کے لئے لڑتے ہیں تو یہ کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے کہ شوہر اپنی بیویوں کو آرائش کی آزادی سے بھی محروم رکھیں۔

نرائن — اُف! میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ میں کسی طرح بھی آپکے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا۔ میں نے تو صرف کچھ یونہی دریافت کرنے کی غرض سے یہ سوال کر دیا تھا — ہاں علم حیوانات کے متعلق ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔

وملا۔ اُف! مہربانی فرماکر علم حیوانات کو اپنے نصاب سے خارج کر دیجئے میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ مجھے صرف یہی معلوم ہے کہ حشرات الارض دوجنسی ہوتے ہیں اور اُن کی سوسائٹی میں بشرطیکہ ان کا کوئی وجود ہے مسائل شادی۔عشق ومحبت۔خلع وطلاق یا اس قسم کی دوسری چیزوں کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ اس کے سوا حیوانات کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اگر آپ حیوانیات کے بارے میں امتحان لینے پر مُصر ہیں تو مجھے ڈر ہے کہ اس میں ناکام رہونگی۔

نرائن۔ اچھا گھبرایئے مت میں اپنے پہلے سوالات سے مطمئن ہوں حیوانیات کو نصاب سے خارج کر دیا جائے گا۔

وملا۔ شکریہ! میرے خیال سے یہ زندگی کا آخری امتحان ہوگا۔ مجھے امتحانوں سے سخت نفرت ہے۔ اب کیا تحریری جانچ بھی ہوگی؟

نرائن۔ ارے نہیں، میں اپنے سوالات ختم کر چکا۔ گھنٹی بج چکی اور امتحان ختم ہو چکا۔ میں آپ کو مبارکباد کہتا ہوں۔ آپ امتحان میں نہایت شاندار نمبروں سے کامیاب ہو گئی ہیں۔ آپ کی نفسیاتی اور جسمانی صفات بہت بلند ہیں۔ میں آپ سے اپنی بیوی بننے کی استدعا کرتا ہوں کیا آپ اس جگہ کو واقعی پُر کر سکتی ہیں؟

وملا۔ (شرماتے ہوئے) میں بھی ایسا ہی خیال کرتی ہوں۔

نرائن۔ آپ کے خاندان کی طرف سے تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟

وملا۔ قطعاً نہیں، یہ "میری شادی ہے اور اس معاملے میں کوئی شخص دخل نہیں دے سکتا۔

(نرائن وملا کے پاس جاکر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔)

نرائن۔ اچھا تو اب ہر ایک چیز ٹھیک ہے نا؟ ہمیں "ہنی مون" کے لئے کہاں چلنا چاہیئے؟

وملا۔ آپ جو مقام پسند کریں گے۔ میرے لئے موزوں ہوگا۔ جو راجہ کو پسند ہے وہی رانی کو۔

نرائن۔ خوب! بس تو پھر ہمیں اوٹی چلنا چاہیئے۔ شنکر ادھر آؤ۔

(شنکر داخل ہوتا ہے)

نرائن۔ دیکھو اگر کوئی مجھے پوچھے تو کہہ دینا کہ میں پندرہ روز تک نہیں مل سکتا۔ ہم فوراً ہنی مون کے لئے اوٹی جا رہے ہیں۔ یہ تمہارے آقا کی بیوی آ رہی ہیں۔ اس گھر کی نئی مالکہ۔ سمجھے؟

شنکر۔ حضور مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں ہمیشہ یہی دعا کیا کرتا تھا کہ سرکار کی شادی کسی سندر دیوی سے ہوجائے۔ حضور میری ناچیز مبارکباد قبول کیجئے۔ مجھے اُمید ہے کہ میں ضرور اتنا خوش قسمت ہونگا کہ حضور کے بچے کو اپنے زانوؤں پر کھلایا کرونگا۔

(شنکر جاتا ہے)

نرائن۔ تم نے سُنا اس نے کیا کہا تھا! یہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ اور ہم ایک دوسرے سے اب کس قدر قریب آگئے ہیں۔

(وملا مسکراتی ہے اور شرم کے مارے دُہری ہوجاتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیتے ہیں۔ جن میں کیف وسرور کی لہریں ناچ رہی ہیں۔ اور نرائن وملا کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے)

نرائن۔ اُف! تمھاری آنکھیں کس غضب کی ہیں۔ جب میں اُن کو دیکھتا ہوں تو ایک ایسی سہانی دنیا میں کھو جاتا ہوں جہاں مسرت ہی مسرت ہے۔

وملا۔ (مسکراتے ہوئے) کیا تمہارا مطلب ہے کہ میری آنکھیں اس دُنیا میں نہیں ہیں؟

نرائن۔ اہاہا! جانمن اب میں کیا بتاؤں؟

(دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوجاتے ہیں۔ اور نرائن اپنی منتخب بیوی کے ہونٹوں پر مُہر محبت ثبت کر دیتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

اے۔آر۔رشدی

(بھوپالی)

اپنی حور سے خطاب

نا چشیدہ کیف ہے ناواقفِ عشرت ہے تُو
سر سے لیکر پاؤں تک ظالم تری لذّت ہے تُو
رس بھری آواز ہے دلچسپ باتیں ہیں تری
بیخود و سرشار دن ہیں مست راتیں ہیں تری
یہ جوانی اور ثمر افشاں بہارِ زندگی
یہ تمناؤں کی رُت یہ موسمِ دوشیزگی
مرمریں یہ حُسن یہ نکھرا ہُوا جوشِ شباب
جیسے آغوشِ شفق میں چودھویں کا ماہتاب
ہر نفس کے مشکبو پردے میں اک دلکش اُٹھان
ہر نظر کی جنبشِ نَو پر قیامت کا گمان

آنکھ کی جنّت، بساطِ قلب کی تزئین حُور
حور، میری حور، میری رُوح کی تسکین حور

رُوئے خنداں پر ترے فردوس کی صبحیں نثار
عنبریں زلفیں تری کاشانۂ شامِ بہار
ابروئے پُرخم ترے تصویرِ محرابِ حرم
دامنِ مژگاں کی ہر جنبش میں رقصِ کیف و کم
چتونوں میں نُور کی پریاں تبسّم آفریں
با طریقِ دلنشیں و با ادائے بہتریں
تیری مہتابی جبیں حُسنِ سحر کا آئینا
تیرا چہرہ آفتابی تیرا مُکھڑا پُرضیا
میکدے آنکھوں کے گلگوں جام چھلکاتے ہوئے
ہر نظر میں سیکڑوں کوثر سے لہراتے ہوئے

جان و دل کی زندگی جذبات کی تمکین حور
حور میری حور، میری رُوح کی تسکین حور

تیرے رخساروں پہ صُبحِ عید کی آرائشیں
تیرے کیفِ لب میں قند و شہد کی آمیزشیں
ہر خموشی سحر آگیں، ہر تکلّم حشر ساز
ہر ترنم رُوح پرور، ہر تبسّم دل نواز
ہر شرارت اک قیامت، ہر تڑپ دیوانہ گر
غمزہ دلکش، عشوہ کافر، ہر ادا کفرِ نظر
نُطق میں اک جذب، اک نازک لچک انداز میں
چال میں بیباک مستی، شوخیاں ہر ناز میں
ہر لبِ رنگیں و خنداں ایک قاشِ ماہتاب
ہر نفس میں ایک دل آویز و موزوں اضطراب

تو ریاضِ خُلد کا اک پھُول ہے رنگین حور
حور، میری حور، میری روح کی تسکین حور

ذوق میں رنگینیاں ہیں شعریت میں لذّتیں — فکرِ شاعر کو ہیں حاصل تجھ سے کیا کیا عشرتیں
جب تصوّر کے حجابوں میں سما جاتی ہے تُو — شعر کے پردے میں کر لیتا ہوں تجھ سے گفتگو
جب کبھی کھِلنے کو ہوتا ہے مرے دل کا کنول — ڈھونڈ لیتی ہیں نگاہیں تجھ میں موضوعِ غزل
ہے شریکِ ہر وقت تُو موزونیٔ افکار میں — مُسکراتی ہے مری ہر نظمِ گوہربار میں
ہو نہ درپردہ اگر تیرا تصوّر مہرباں — فکرِ شاعر کس طرح ڈھالے کوئی شعرِ جواں

صُبح سے شاداب نسیمیں پھُول سے رنگین حور
حور، میری حور، میری روح کی تسکین حور

دیکھ اٹھا کر آنکھ او بیگانۂ احساسِ ہوش — احمریں سینے کی موجیں ہو گئیں طوفاں بدوش
سادگی میں اب نئی رنگینیاں۔ پنپنے کو ہیں — شوخیوں میں حُسن کی رعنائیاں ڈھلنے کو ہیں
ذرّے ذرّے میں نمودِ آرزوئے دید ہے — ہر نفس کو انتظارِ جشنِ صُبحِ عید ہے
لالہ و گُل سے رواں ہیں رنگ و بو کے آبشار — آئینوں پر آ رہا ہے مستقل تازہ نکھار
ڈال دے اب شوخیٔ اندازِ عریاں پر حجاب — ہو نہ جائے مستیٔ نظارہ سے دُنیا خراب

تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں تیرے خوشہ چین حور
حور، میری حور، میری روح کی تسکین حور

تو چمن میں وہ کلی ہے نازشِ فصلِ بہار — پڑ رہی ہیں جس پہ گلچیں کی نگاہیں بار بار
کر رہا ہے باغباں دستِ ہوس جس پر دراز — ڈالتا ہے جس پہ ہر صیّاد اپنا دامِ آز
تو کلی ہے اور فطرت ہے تبسّم بر جبیں — پھُول بن کر خندۂ رنگیں نہ فرمانا کہیں
پھُول بن کر جب چمن میں "نور" پھیلائیگی تُو — اپنی نزہت کو خزاں کی گود میں پائیگی تُو
دیکھ اپنے جوہرِ دوشیزگی سے ہوشیار — مستقل خطرے میں ہے تیری جوانی کی بہار

خوبرو، نوخیز، خوش انداز و پُر تزئین حور
حور، میری حور، میری روح کی تسکین حور

صاحبزادہ شفیق ٹونکی

افسانہ

پہیلی

میں کمرے میں تنہا بیٹھا ناول پڑھ رہا تھا۔ میں سب طرف سے غافل بس ناول پڑھنے میں منہمک تھا۔ ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ باہر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی بہت دھیرے دھیرے آ رہا تھا۔ ایک سایہ ادھر سے اُدھر چلا گیا ـــــ لیکن میں برابر ناول پڑھتا رہا اور باہر ذرا بھی توجہ نہ کی لیکن ـــــ ناول پڑھتے پڑھتے مجھے خیال ہوا کہیں فردوس نہ ہو ـــــ؟ یہ خیال آتے ہی میں نے کتاب میز پہ رکھی اور کمرے سے باہر آ گیا!

بات یہ تھی کہ فردوس مجھے بہت ستاتی تھی۔ میں نے ان شرارتوں کا بدلہ لینے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن وہ مجھے اپنی جھلک تک دکھانا نہ چاہتی تھی اور میں نے اسے دیکھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں زینہ والے کمرے کی طرف چلا۔ درز سے جھانکا۔ فردوس کمرے میں کھڑی، بکھرے ہوئے سیاہ بالوں کو سلجھا رہی تھی اور گنگناتی جاتی تھی۔ کالے لمبے بال اس طرح اوپر سے نیچے کی طرف لٹک رہے تھے جیسے بہت سے سانپ بل کھا رہے ہوں۔ اس کا خوبصورت چہرہ سیاہ زلفوں میں بدلی کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ دھاری دار بہت مہین قمیص، ریشمی شلوار اور بیلدی دار باریک دوپٹہ اوڑھے تھی جو شانوں پر پڑا تھا۔ میں ابھی فردوس کو دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ دروازہ ہوا کے زور سے کھل گیا ـــــ فردوس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ زور سے "اوئی" کہا اور چھلانگ مار پردے کی اوٹ میں ہو گئی۔ یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہوا اور بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ فردوس دوسرے کمرے میں جا چکی تھی اور میں جانتا تھا۔ اب وہ یہاں آنے کی نہیں۔ میں اپنے کمرہ میں آیا، کپڑے پہنے اور کھیلنے چلا گیا ـــــ!

وہ بڑے اچھے دن تھے۔ نہ کوئی فکر تھی نہ دکھ ـــــ جب فردوس آ جاتی۔ تو وہ دن میری زندگی کے سنہرے دن بن جاتے تھے۔ میں سب کچھ بھول کر بس فردوس میں کھو جاتا تھا ـــــ!!

رات کو جب پڑھنے بیٹھا تو میز پر رکھی ہوئی تصویر کو دیکھ کر حیرت ہو گئی ـــــ تصویر کو کسی نے بگاڑ دیا تھا۔ میرے منہ پر کسی کی طرح چھوٹی بڑی داڑھی اُگائی تھی۔ ایک طرف کی مونچھ لمبی تھی۔ اور دوسری چھوٹی۔ عینک ناک کے آخری حصہ پر اس طرح اٹکائی گئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا اب گری اور اب گری۔ گاندھی ٹوپی پہنائی گئی تھی۔ اور نیچے لکھا تھا۔ "ہم بھی کیا لاجواب اُلو ہیں لیکن مصور کا نام نہیں تھا ـــــ میں سمجھ گیا۔ فردوس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ قیمتی تصویر کو اس طرح خراب کر دیا گیا تھا۔ فردوس نے ایک اور شرارت کی تھی۔ کتاب تو میں نے بند کر دی اور بدلہ لینے کی سوچنے لگا۔ ایک نئی اسکیم دماغ میں آئی۔ میں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا ـــــ

فردوس کی عادت تھی صبح منہ، ہاتھ دھو کر سنگھار میز کے پاس جاتی اور چہرہ کو خوب رنگتی تھی ـــــ تھوڑی دیر بعد میں نے قہقہوں کی آوازیں سنیں۔ فردوس کے ہونٹ تو سیاہ تھے۔ اور رخساروں پر بجائے غازہ کے راکھ ملی ہوئی تھی ـــــ میں نے رات کا بدلہ لے لیا تھا اور میں خوب زور زور سے ہنس رہا تھا کہ فردوس نے۔ وہ کمرے کے پاس سے جاتے۔ جلتے کہہ گئی "میں شکست دے کے رہوں گی" میں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ فردوس بھاگ گئی ـــــ!

جوں ہی میں کمرے میں داخل ہوا۔ فردوس نے چھلانگ ماری اور بھاگ جانا چاہا۔ میں نے لپک کر فردوس کو پکڑ لینا چاہا۔ فردوس کا دوپٹہ ہاتھ میں آیا۔ جسے وہ چھوڑ گئی تھی۔ فردوس بھاگ کر اپنے کمرے میں ہو گئی۔ فردوس تو چلی گئی تھی۔ لیکن کمرہ خوشبو سے بسا پڑا تھا۔ دوپٹہ عطر سے مہک رہا تھا ـــــ کمرہ کی حالت عجیب تھی۔ کتابیں اِدھر اُدھر پڑی تھیں۔ بستر زمین پر تھا۔ کپڑے بکھرے پڑے تھے میرا تصویروں کا البم۔ ریکٹ اور چند اور چیزیں بھی غائب تھیں جنہیں فردوس اپنے ساتھ لے گئی تھی ـــــ!!

فردوس کمرے میں بیٹھی تھی اندر سے دروازہ بند تھا۔ میں نے فردوس سے کہا:۔

"فردوس میری چیزیں تو واپس کر دو۔"

فردوس ہنسی پھر کہنے لگی "ایک چیز نہ واپس ہوگی"

"یہ کیوں؟"

"آپ نے میرے سنگھار کا سامان رکھ لیا ہے۔"

"اوہ۔ تو تم نے بدلہ لیا ــــ اچھا وہ میں واپس کئے دیتا ہوں"

"لائیے، ابھی لائیے"

میں نے کمرہ میں جا کر فردوس کے سنگھار کا سامان لیا۔ اور واپس آ کر کہا۔

"لو اپنی امانت"

"خرابت تو نہیں کیجئے گا۔ دروازے سے دور رہئے گا نا؟"

"تم بہت شکی ہو۔ اچھا دروازہ کھولو میں کچھ نہ کروں گا۔"

فردوس نے دروازہ کھولا۔ اور اپنی چیزیں لے کر پھر دروازہ بند کر لیا۔ اور ہنس ہنس کر کہنے لگی۔

"جاہیئے کوئی چیز بھی واپس نہ ہوگی۔"

"تم نے دھوکا دیا۔ اگر پہلے معلوم ہوتا۔ تو میں ایک چیز بھی نہ دیتا۔" اس کے جواب میں فردوس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ وہ اپنی فتح پر ہنس رہی تھی۔ بہت دق کرنے کے بعد کہنے لگی۔

"پہلے اپنی ہار کا اقرار کیجئے تب چیزیں واپس ہوں گی۔"

"فردوس میں تمہارے مقابلہ میں ہمیشہ ہارتا رہوں گا فتح کا کبھی خواب تک دیکھ نہیں سکتا۔"

اس جملے کا مطلب شاید فردوس سمجھ گئی تھی ــــ اُس نے فوراً چیزیں واپس کر دیں لیکن میری ایک تصویر رکھ لی ـــ!!

میں نے چاء پیالی میں انڈیلی۔ دودھ ڈالا پھر شکر ملائی ایک گھونٹ پیا ہی تھا۔ کہ سر چکرا گیا۔ چاء میں بلا بل مرچیں ملی تھیں۔ چاء میں نے پھینک دی فوراً پاس والے کمرے سے ہنسنے کی آواز آئی یہ فردوس تھی جو اپنی جیت پر خوش ہو رہی تھی۔ فردوس ایسی شرارتیں بہت کرتی تھی۔ ایک مرتبہ نے فردوس نے نمکین کھیر اور میٹھی کڑھی کھلائی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ فردوس لڑکی تھی۔ اور کھانا پکانے کے فن سے ماہر تھی۔ اور میں اس فن سے قطعی ناواقف تھا۔

ایک دن میں کمرے میں بیٹھا تھا۔ تالا باہر کی کنجی میں لٹکا تھا نہ معلوم کب فردوس آئی۔ اور دروازے بند کر کے تالا لگا گیا۔ اور چلی گئی۔ جب میں نے باہر نکلنا چاہا تو معلوم ہوا دروازے بند ہیں۔ سمجھ گیا۔ فردوس کی شرارت ہے اتفاق سے کوٹھے پر کوئی آیا ہی نہیں۔ اور کئی گھنٹے مجھے جیل میں بند رہنا پڑا۔ اتفاق سے دانش ادھر سے گذری۔ جب اس نے تالا کھولا۔ دانش مجھ سے بار بار پوچھتی تھی "بھیا! یہ کس کی شرارت ہے۔" اور میں صرف ہنس کر چپ ہو جاتا تھا ــــ!!

ان شرارتوں کے بعد مجھے بھی تنہائی ملتی۔ تو فردوس کا خیال مجھے اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ یہ نہیں کہ میں فردوس کی شرارت کا کیسے جواب دوں ــــ بلکہ یہ کہ میں فردوس کو اپنا بنا لوں تو کیا عیب ہے؟ فردوس خوبصورت تھی۔ شوخ اور حاضر جواب لڑکی تھی۔ میں نے فردوس میں بہت سی اچھائیاں پائی تھیں۔ اور اسی وجہ سے فردوس کی قدر میرے دل میں بہت تھی۔ وہ حد درجہ باحیا اور مشرقی طرز کی لڑکی تھی۔ اپنے ریشمی جسم کے پہلو میں ایک مہربان دل رکھتی تھی۔ شوہر پرست تھی۔ اس میں وہ سب باتیں موجود تھیں جو ایک مشرقی لڑکی میں ہوتی ہیں۔ اس مسئلہ پر جب سوچا۔ دل نے فردوس کا نام لیا۔ آنکھیں تو پہلے ہی فردوس کی ہو چکی تھیں۔ اب دل بھی فردوس کا ہو چکا تھا ـــ!!

ایک دن میں فردوس کی خوابگاہ کی طرف جا نکلا۔ کمرہ خالی تھا۔ میں کمرے میں چلا گیا۔ سوچنے لگا کس طرح فردوس کو ستاؤں وہ بھی میرے کمرے میں آ کر مجھے ستاتی ہے۔ سرہانے میز پر ایک لفافہ رکھا تھا۔ میں نے یہ خیال کر کے لے لیا کہ اس میں فردوس کی کسی سہیلی کے خط ہوں گے یا پھر اس نے گھر کے لئے لکھے ہوں گے۔ کمرے میں اگر لفافہ کھول کر خط دیکھے تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ــــ وہ تمام خطوط میرے نام تھے۔ کئی خط تھے۔ جن میں فردوس نے لکھا تھا۔ کوئی لمبا تھا تو کوئی مختصر۔ میں نے تمام خطوط پڑھ ڈالے۔ اب فردوس میرے سامنے سچے روپ میں کھڑی تھی۔ میں نے فردوس کے بارے میں جو خیال کیا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ مجھے ابھی تک یہ نہیں معلوم تھا۔ کہ فردوس میرے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔ لیکن یہ خط ایک پکار کر فردوس کی محبت کا یقین دلا رہے تھے۔ خط خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ خط کسی لڑکی نے لکھے ہیں۔ جنہیں وہ بہت عزیز رکھتی ہے ایک خط میں فردوس نے لکھا تھا۔

"میں تو شمع ہوں اور شمع بے زبان ہوتی ہے۔ وہ محبت میں جل کر خاک ہو جاتی ہے۔ لیکن محبت کو ظاہر ہونے نہیں دیتی۔" پروانے خود شمع کو جلتا دیکھ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔" ایک دوسرے خط میں فردوس نے لکھا تھا "تم میرے دل کا حال جاننا چاہتے ہو۔ تو چاندنی رات کے چاند سے پوچھ لو۔ ہنستے ہوئے پھول سے، جلتی ہوئی شمع سے یا پھر مسکراتے تاروں سے۔ میں نے ان سب کو اپنے دل کا راز بتا دیا ہے۔ تم ان سے پوچھ لو وہ تمہیں بتا سکتے ہیں۔ لیکن میرے ہونٹ یونہی بند رہیں گے ——!" آج مجھے فردوس کے دل کی باتیں معلوم ہو گئیں۔ فردوس کے راز مجھ پر عیاں ہو گئے تھے۔ اب میں آسانی سے فردوس کو اپنی محبت پیش کر سکتا تھا۔ اور میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ فردوس کو جدا نہیں کروں گا ——!!

فردوس کے آنے سے پہلے خط میں وہیں رکھ دینا چاہتا تھا۔ تاکہ فردوس کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ میں نے اس کا راز معلوم کر لیا ہے۔ اس طرح میں فردوس کو ایک اور شکست دینا چاہتا تھا۔ جونہی میں دروازے کے قریب آیا مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ فردوس روتی جاتی تھی۔ اور بڑبڑاتی جاتی تھی۔ "ہائے اللہ اب میں کیا کروں۔ میں تو اب منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہی۔ یہ انہوں نے کیا کیا؟ مجھے کیوں ستایا ...ے خط کیوں لے گئے ....." اب مجھے احساس ہوا کہ ...نے فردوس کو شکست دی نہیں۔ بلکہ اس کا دل توڑ ...بات۔ یہ میری بہت بڑی غلطی تھی۔ میں نے فردوس کے دل ...ل زخم ڈال دئے تھے۔ اب ان زخموں کو کیسے مندمل کیا جا ...سکتا تھا۔ اب میں اس کی کیونکر تلافی کر سکتا تھا۔ میں نے آہستہ ...سے دروازہ کھولا۔ فردوس بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس ...کا سارا جسم گلاب کی شاخ کی طرح کانپ رہا تھا۔ اور وہ پھوٹ ...پھوٹ کر رو رہی تھی۔ بال بکھرے تھے۔ تکیہ آنسوؤں سے تر ...ہو گیا تھا۔ کمرے کا سامان ادھر ادھر منتشر پڑا تھا۔ اور کمرے ...میں سسکیوں کی آواز کے سوا بالکل سناٹا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ...مر گیا ہے۔ فردوس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل بھی رونے ...لگا۔ پلنگ کے قریب پہنچ کر میں نے دھیرے کہا۔ "فردوس خدا کے لئے چپ ہو جاؤ اب نہ رو۔" اس جملے نے فردوس کو اور دکھ پہنچایا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاید وہ آنسوؤں کا بچا کھچا سرمایہ بھی لٹا دینا چاہتی تھی۔ یکایک وہ کھڑی ہو گئی میرے مدمقابل آج نہ اسے پردہ کا خیال تھا نہ خود کو چھپانے کا۔ وہ میرے سامنے اس حال میں کھڑی تھی۔ دوپٹہ بستر پر پڑا تھا۔ بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ سرخ تھا۔ پیشانی تکیہ پر رگڑنے کی وجہ سے سرخ دھبہ پڑ گیا تھا۔ اور آنکھیں رونے کی وجہ سے بے نور ہو چکی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ اور آنسو کا ایک قطرہ پلکوں پر اٹکا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ آج گنگا، جمنا میں سیلاب آ گیا ہے۔ آنکھوں سے آنسو اس طرح گر رہے تھے۔ جیسے بھرے جام سے شراب کے قطرے گرتے ہیں۔ اس کے سینے میں تلاطم برپا تھا۔ وہ ضبط نہ کر سکی۔ اور کہنے لگی۔ "آپ یہاں سے میرے خط لے گئے تھے؟ کیوں گئے تھے؟ آخر آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ نے مجھے کیوں ستایا کیوں دکھ دیا۔ آپ نے ایسا کر کے مجھے تمام زندگی کے لئے دکھ دیا ہے۔ اور یہ دکھ مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا۔" فردوس کی آواز دھیرے دھیرے بڑھتی جاتی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ سینہ کا اتار چڑھاؤ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا گرم پانی پتیلی میں ابل رہا ہے۔ یکایک فردوس پھر ابل پڑی "آپ نے خط کیوں پڑھے؟ آپ نے بہت بڑی غلطی کی ... آپ نے خود کو مجھ سے دور کر دیا .... اچھا اب جائیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔ مجھے تمام زندگی رونا ہے، دکھ سہنا ہے جائیے۔ جائیے یہاں سے چلے جائیے ... آپ جیت گئے اور میں ہار گئی۔ اور یہ ہار شاید مجھے زندہ بھی رہنے نہ دے ... آپ جیت گئے اور میں ہار گئی۔ اور یہ ہار شاید مجھے زندہ بھی رہنے نہ دے .... آپ جیت گئے اور دنیا میں ہمیشہ جیتتے رہئے گا۔ میں ہار گئی اور ہمیشہ ہارتی رہوں گی۔" چند منٹ کی خاموشی کے بعد فردوس نے مجھے دیکھا۔ مسکرانے کی کوشش کی۔ ہونٹوں پر اگرچہ پھیکی ہنسی تھی لیکن دل اور آنکھیں رو رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگی۔ "اچھا خدا حافظ ہم دونوں شاید پھر نہ مل سکیں۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی جو ختم ہو گئی —— اب آپ جائیے خدا کے لئے جائیے۔ میں تو زندگی بھر روتی رہوں گی آپ کہاں تک مجھے روتے دیکھئے گا —— جائیے خدا کے لئے

جائیے —— میری آخری بات مان لیجئے اور یہاں سے چلے جائیے
میں بھاری قدموں سے باہر نکلا۔ میرے نکلتے ہی فردوس نے چیخ ماری اور گر پڑی —— ! میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ آج پہلی مرتبہ کمرے میں آکر پلنگ پر لیٹ گیا !

فردوس کے کمرے سے کبھی کبھی رونے کی آواز آجاتی تھی۔ تمام رات وہ بخار میں بھنتی رہی۔ کچھ دن بعد وہ اپنے گھر چلی گئی اور پھر کبھی نہ آئی۔ اس واقعہ کو آج زمانہ گذر گیا ہے اتنی مدت کے بعد بھی فردوس میرے لئے ایک پہیلی ہے اس پہیلی کی کیا بوجھ ہے۔ یہ آج تک میں سوچتا رہتا ہوں۔ بقول شاعر ؎

کیوں میں نے محبت کی کیوں آپ نے نفرت کی

بعد میں فردوس کا ایک خط آیا تھا لکھا تھا: "غلطی سے آپ کی ایک تصویر میرے پاس رہ گئی تھی۔ میں اسے دینا بھول گئی تھی۔ روانہ ہے۔ یہ آپ کی چیز ہے۔ اور آپ ہی کے پاس رہنی چاہئے —— !"

اس طرح فردوس نے مجھے بالکل بھلا دیا۔ خط پاکر مجھے بیتے ہوئے دن پھر یاد آگئے فردوس کی شرارتیں یاد آئیں اس کا چھپ چھپ کر مجھے ستانا یاد آیا۔ پھر وہ دن بھی یاد آیا جس دن میں نے فردوس کے خط چھپ کر پڑھے تھے۔ —— پھر اس کے بعد کے وہ تمام واقعات یاد آئے جنہوں نے میری زندگی الگ تباہ کر دی۔ اور فردوس کو بھی برباد کر دیا تھا —— کیا فردوس مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی؟ فردوس کی شرارتیں کیا محبت کی تمہید نہ تھیں؟ اور دل کہتا "فردوس میں تم سے محبت کرتی تھی" اور یہ سچ ہے —— لیکن آخر فردوس کی محبت، نفرت میں کیوں تبدیل ہو گئی؟ فردوس مجھے کیوں بھلا دیا ہے؟ فردوس میرے لئے ایک پہیلی ہے —— اور یہ پہیلی شاید تمام زندگی پہیلی ہی رہے گی —— !

اختر ملیح آبادی

نوائے راز

احساس خود نمائی ہوتا ہے بیخودی میں !! — پنہاں نشہ خودی ہے صہبائے زندگی میں
دیتا ہوں درس الفت دنیا کو بیخودی میں — بھرتا ہوں رنگ فطرت تصویر زندگی میں
مست مئے محبت گمراہ ہو نہ جائے — رنگ خودی بھی شامل ہے ذوق بیخودی میں
لاریب وہ خدا تھا، بیشک وہی خدا تھا — دیکھا تھا جس کا جلوہ بت خانۂ خودی میں
اہل جہاں کی فطرت شاید بدل گئی ہے — اخلاص دوستی میں اب ہے نہ دشمنی میں
یہ عاشقی ہے ظالم ! توہین عاشقی ہے — انجام پر نظر ہے آغاز عاشقی میں
اہل نگاہ اس کو کہتے ہیں خام کاری — ہوتی ہے سرگرانی جو دور میکشی میں
ویرانۂ جہاں میں دیکھا ہے میں نے اکثر — ہوتا ہے قصر رفعت تعمیر بیکسی میں
میری نظر سے دیکھو نیرنگ بزم عشرت — پنہاں ہیں سو تکلف اک حسن سادگی میں
کرتا ہے خود پرستی انسان بے محابا — ایسی بھی ایک منزل آتی ہے عاشقی میں
اے راز ان کو کہنا وقف غزل سرائی
باقی ہیں تار جتنے اب ساز زندگی میں

راز چاندپوری



گرمیٔ شوق

اپنی خودداری پہ گر قائم رہا میرا ضمیر
آج یہ کس راہ پر بڑھنے لگے میرے قدم

طالبانِ دید پر دیر و حرم کی قید کیا
اب وہاں ہوں میں، جہاں تو ہے نہ اپنا ہوش ہے

ایک دن آواز دے گی خود تری محفل مجھے
دے رہی ہے چار جانب سے صدا منزل مجھے

تجھ کو ملنا ہے تو ان پردوں سے باہر مل مجھے
لے چلی ہے کس طرف دیوانگیٔ دل مجھے

میرے خوں میں آج پھر کچھ گرمیاں ہیں شوق کی
آج پھر آساں نظر آتی ہے ہر مشکل مجھے

وحید بلاسپوری

لے چلا

جب جنوں وحشی کو تیرے سوئے زنداں لے چلا
ان کی محفل سے کوئی یہ ساز و ساماں لے چلا

ساتھ اپنے اک اسیرِ دام اک حرماں نصیب
دیکھئے پھر آج کس کا امتحاں منظور ہے

راس آئیں کاش مجھ کو بادیہ پیمائیاں
لاؤ اب سوتے ہوؤں کو خواب سے چونکا بھی دو

ایک وہ جن کو میسّر ہو گیا دیدارِ یار
حسن کی خودداریوں سے عشق کی عزت گئی

ساتھ وہ اپنے گلستاں کا گلستاں لے چلا
داغِ دل، دردِ جگر، چاکِ گریباں لے چلا

اور کیا لیتا بس اک یادِ گلستاں لے چلا
سوئے مقتل پھر کوئی شمشیر براں لے چلا

اب جنوں مجھ کو بیاباں در بیاباں لے چلا
یہ خیال ان کو سوئے گورِ غریباں لے چلا

ایک میں جو مرتے مرتے دل میں ارماں لے چلا
موت کا بیمارِ الفت منتِ احساں لے چلا

اس کو کہتے ہیں اثر دردِ محبت کا اثرؔ
ان کی محفل میں مجھے خود ان کا درباں لے چلا

اثر گوالیاری

افسانہ

کھوئی ہوئی نگاہیں

زندگی میں بعض ایسے واقعات بھی پیش آجاتے ہیں جن کی یاد مدت العمر فراموش نہیں ہوتی۔ ڈاکٹری کے امتحان میں کامیاب ہوتے ہی مجھے ملازمت مل گئی۔ اور میں پنجاب کے ایک دور افتادہ چھوٹے سے شہر کے ہسپتال میں بھیج دیا گیا وہاں یو۔پی کے باشندے بالکل نظر نہ آتے تھے جو دو چار تھے بھی انہوں نے اپنی صوبائی خصوصیات ترک کر کے پنجابی طرز معاشرت اختیار کر لی تھی۔

یہاں اول اول نریندر ناتھ سے میری راہ و رسم پیدا ہوئی۔ جو یہاں کے پوسٹماسٹر تھے۔ میری طرح یہ بھی نئے نئے یہاں آئے تھے۔ وہ تھے تو عمر میں مجھ سے کچھ زیادہ لیکن تھے بڑے زندہ دل اور رنگین مزاج۔ رفتہ رفتہ ان سے میرے تعلقات کافی وسیع ہو گئے۔ اور ہم میں کوئی تکلف باقی نہ رہا۔

میں ہسپتال سے فارغ ہو کر نریندر بابو کے ہاں چلا جاتا۔ نریندر کا اسلوب گفتگو نہایت شگفتہ اور دل آویز تھا۔ وہ اپنی سیر و سیاحت کے واقعات اور زندگی کے مشاہدات و تجربات خوب مزے لے لے کر سناتے۔ دن بھر کے کاموں کا کسل اور تکدر نریندر کی باتوں سے دور ہو جاتا۔

نریندر بابو کی بیوی کملا دیوی بھی نہایت خوش مزاج خاتون تھیں۔ میں ان کو بھابی کہا کرتا تھا۔ ان کے ہاتھ کی چائے مجھے بہت پسند تھی۔ شام کا کھانا بھی اکثر مجھے انہی کے یہاں کھانا پڑتا تھا۔ اعزہ و احباب سے اس قدر دور ہونے کے باوجود نریندر بابو اور کملا دیوی کے خلوص و محبت کے باعث مجھے یہاں کسی طرح کی کمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور نہایت لطف و مسرت سے دن گذر رہے تھے۔

ایک روز ہسپتال سے میری چھٹی تھی۔ میں ٹہلتا ہوا پوسٹ آفس چلا گیا۔ نریندر بابو اپنے کاموں میں منہمک تھے میں ان کے پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہ ان کو کاموں سے اطمینان ہو گا۔ تو کچھ بات چیت کروں گا۔

اس دوران میں پوسٹمین آیا۔ اور نریندر بابو کے سامنے ایک لفافہ رکھتے ہوئے بولا۔ "بابو! آج بھی اس آدمی کا پتہ نہیں چلا"

نریندر بابو نے کاغذوں پر جھکے ہی جھکے خشونت آمیز لہجے میں کہا۔

"نہیں ملا تو لفافہ کو پھاڑ کر ردی میں ڈال دو۔"

میں نے یہ دیکھنے کے لئے کہ کس کے نام کا خط ہے جس کا پتہ نہیں چلتا۔ پوسٹمین کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اسے معلوم تھا۔ کہ پوسٹماسٹر صاحب سے میرے کتنے گہرے تعلقات ہیں۔ اس نے کسی پس و پیش کے بغیر لفافہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

یہ خط ولایتی ڈاک سے آیا تھا۔ اور مکتوب الیہ کا نام رنبیر سنگھ تھا۔ لفافے پر بیشمار ڈاک خانوں کی مہریں ثبت تھیں۔ میں نے لفافے کو کھول کر دیکھا۔ آٹھ صفحے کا طویل خط تھا۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ پردیس میں گزرا تھا میری پرورش و پرداخت بھی پردیس ہی میں ہوئی تھی۔ اس لئے زندگی میں ہمیشہ خطوط سے واسطہ پڑتا رہا۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ مجھے خطوط سے ایک خاص دلچسپی ہو گئی تھی۔ پھر بھی بے تکلف احباب کی بیویوں کے خطوط کے سوا میں نے دوسروں کے خطوط کبھی نہ دیکھے تھے۔ لیکن اس خط کے دیکھنے کے لئے میرا دل نہ جانے کیوں بیتاب ہو گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ یہ کوئی معمولی خط نہیں بلکہ ایک المناک اور دلگداز سرگزشت محبت ہے ورنہ میں کبھی اس کے پڑھنے کا حوصلہ نہ کرتا۔ خط حسب ذیل تھا:-

پیارے رنبیر!

تم نے دریافت کیا ہے۔ کہ سوشیلا سے میری راہ و رسم کیسے ہوئی اور بعد کے واقعات کیا ہیں۔ میں دیکھتا ہوں تمہیں بھی رومان سے دلچسپی ہوتی جا رہی ہے۔ اچھا سنو۔

صبح کا دلکش اور طرب آفریں وقت تھا۔ میں چہل قدمی کرتا ہوا رتن پور اسٹیشن تک چلا گیا۔ وہیں بالکل رومانی طور پر سوشیلا سے میری ملاقات ہوئی۔ تمہیں تعجب ہو گا کہ جو سوشیلا انتہا درجے کی قدامت پرست اور شرمیلی لڑکی تھی وہ اس قدر جدت پسند اور شوخ و بیباک کیسے بن گئی لیکن ہمیں اس سوال سے کوئی بحث نہیں۔ مجھے تو واقعات بیان کرنا ہے۔

میں سوشیلا کو اس سے قبل بھی یہاں کئی بار دیکھ چکا تھا۔

جب صبح چہل قدمی کرکے وہ لوٹتا ہوتا۔ وہ سفید جنگلی پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں لئے راستے میں ملتی۔

میں ایک روز کیشو بابو کی کوٹھی میں گیا۔ وہاں پھر سوشیلا سے میرا سامنا ہو گیا۔ اس روز پہلی مرتبہ مجھ کو پتہ چلا کہ سوشیلا کیشو بابو کی نواسی ہے۔ اگر مجھ کو پہلے معلوم ہو جاتا کہ سوشیلا اتنے بڑے دولتمند اور جاگیردار خاندان کی لڑکی ہے تو میں اس کی جانب رخ کرنے کا بھی حوصلہ نہ کرتا۔ میں ایک غریب آدمی کا بیٹا، مجھے تو بڑے آدمیوں کے تصور سے بھی وحشت ہوتی تھی لیکن اس روز سوشیلا کو دیکھ کر میرا دل اس طرح کھل اٹھا۔ جیسے شاخ گل پر کسی شاداب و شگفتہ کلی کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اس روز سے میں ایک عجیب خواب دیکھنے لگا۔ جھونپڑے میں رہ کر محل کا، سیم و زر اور ہیرے جواہرات کا۔ بڑا آدمی بننے کا۔ اس لئے کہ سوشیلا بڑے گھر کی بیٹی تھی۔

اس کے بعد سال کے سال بھر میں نینی تال گیا۔ تو وہاں بھی ایک صبح کو سوشیلا سے ملاقات ہو گئی۔ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ندی سبز و شاداب کوہستان کے درمیان خوش خرامی کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ نوخیز آفتاب کی زرتار کرنیں ندی کی شوخ و متبسم موجوں کے ساتھ خوش فعلیاں کر رہی تھیں۔ درختوں کے بیچ سے گذرتی ایک پگڈنڈی دور تک چلی گئی تھی۔ میں کسی خیال میں محو اسی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ یکایک میری نظر سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ تو کیا دیکھتا ہوں سوشیلا چلی آ رہی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ مجھے دیکھے میں جلدی سے ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا جس سوشیلا کے خواب دیکھنے میں میں نے کتنی راتیں جاگ کر گذار دی تھیں۔ میری وہی دنیائے شوق و تمنا بالکل میرے پاس سے گذر رہی تھی۔ میں اس وقت خود کو کس قدر خوش نصیب اور مراد مند تصور کر رہا تھا۔

اس روز تو سوشیلا نے مجھے نہیں دیکھا لیکن دوسرے روز ندی کے کنارے مجھ سے اس کی آنکھیں چار ہو گئیں۔ وہ جارجٹ کی نفیس ساری اور حسین بلاؤز میں ملبوس تھی۔ کلائی پر ایک نازک قیمتی گھڑی زیب دے رہی تھی۔ اس روز دیر تک ہم دونوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ آہ ان گھڑیوں کے کیف و سرور سے آج بھی میرا دل معمور ہے۔ اور ان باتوں کی لذت و شیرینی کو اب تک میرا ذوق سماعت فراموش نہیں کر سکا ہے۔

اس کے بعد ہمارے تعلقات اور روابط سرعت تمام منازل ترقی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ہم ایک روز رشتۂ محبت منسلک ہو گئے۔

اب ہماری ہر صبح اور ہماری ہر شام ندی کی الھڑ [illegible] رومانی قہقہوں سے کیف اندوز ہونے میں گذرنے لگی۔ ہم ہرے بھرے شاخساروں کے جھرمٹ میں ندی کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے دور دور تک نکل جاتے تھے۔ آہ لشاط آگیں اور کیف آفریں تھے۔ وہ ایام! ان روشن دنوں کی یاد آج بھی یاس و ناامیدی کی تاریکی میں اس طرح ضوفشاں ہے جیسے برسات کی سیاہ راتوں میں جگمگاتے ہوئے تارے۔

چھ ہفتے نینی تال رہ کر میں وطن واپس چلا آیا۔ گھر واپسی کے بعد میں اکثر سوچتا۔ اتنے بڑے گھر کی لڑکی سے محبت کا کرنا درست نہیں۔ آج سوشیلا مجھ کو قدر و محبت کی نگاہ سے دیکھتی ہے ممکن ہے کل وہ مجھے ایک معمولی آدمی سمجھ کر مجھ سے کشیدہ اور متنفر ہو جائے۔ اس خیال کے پیش نظر میں نے کہ سوشیلا کی محبت کو دل سے یکسر محو کر دوں لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں جتنا اس سے دور ہونے کی کوشش کرتا اس کی جانب اور کھنچتا چلا جاتا۔ اس کی ساون بھادوں کی کالی گھٹاؤں جیسی رومانی آنکھوں میں کچھ جادو ہی ایسا تھا۔

تم یہ سن کر خوش ہو گے۔ زبیر! کہ سوشیلا کے متعلق میرا یکسر غلط ثابت ہوا۔ اس نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا کہ میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی ہوں۔ اور وہ ایک لکھ پتی زمیندار کی لڑکی ہے۔ اس نے دل کھول کر مجھ سے محبت کی اور کامل خلوص کے ساتھ۔ اس نے خود کو میری محبت کے لئے جیسے [illegible] کر دیا۔ نہ جانے میری کتنی چاندنی راتیں سوشیلا کی معیت میں گذریں اور کتنی خنک دوپہر نہر کے کنارے شاخساروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں سوشیلا کے ساتھ۔ وہ زمانہ تھا کہ ہماری ہر صبح ہمارے لئے ایک جدید سامان کیف و سرور لے کر طلوع ہوتی تھی۔ اور ہماری شام ایک نیا سامان مسرت و انبساط لے کر آتی تھی۔ اس طرح ہماری زندگی میں موسم سرما کی شبنم سے جگمگاتی کتنی صبحیں گذر گئیں اور موسم بہار کی رنگین اور کیف بار شامیں اور موسم برشگال کے جذبات خیز و ولولہ انگیز دن اور موسم گرما کی طرب ناک چاندنی راتیں ہم نے اپنی زندگی کے عین رومانی زمانے میں ایم۔ اے پاس کیا اور ایک کالج کی پروفیسری کے لئے میری نامزدگی ہو

گئی میرا خیال تھا۔ اب سوشیلا کے ساتھ میری محبت جلد ہی ازدواجی
حیثیت میں تبدیل ہو جائے گی لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میں ایک روز سوشیلا کے ہاں گیا۔ تو اس کے والد نے مجھ سے کہا۔ کہ چونکہ میرے پاس ولایت کی کوئی تعلیمی ڈگری نہیں اس لئے مجھے سوشیلا کا خیال ترک کر دینا چاہئے۔ ان کے اس انتباہ نے یک لخت میرے مستقبل کی فلک بوس طلسمی عمارت کو کس طرح پاش پاش کر دیا ہو گا۔ رنبیر! اس کا تم بخوبی اندازہ کر سکتے ہو۔ لیکن سوشیلا سے مجھے کچھ ایسی ویسی محبت نہ تھی۔ کہ میں آسانی سے اس کا خیال ترک کر دیتا۔ میں نے عزم بالجزم کر لیا کہ جیسے بھی ممکن ہو گا ولایت جاؤں گا۔ اور وہاں سے کوئی نہ کوئی ڈگری لے کر ہی واپس آؤں گا۔ میں سوشیلا کے لئے کیا نہیں کر سکتا تھا رنبیر؟ اس کے بعد کن کن زحمتوں اور جانفشانیوں سے روپے کا انتظام ہوا۔ اس کا کم و بیش تمہیں بھی علم ہے۔

میں نے اپنے ولایت جانے کے ارادے کا اظہار سوشیلا سے نہیں کیا تھا۔ اس پر بھی جب ایک روز وکٹوریہ میموریل ہال میں اس سے ملاقات ہوئی اور اسے میرے ارادے کا پتہ چلا۔ تو اس نے سختی سے مخالفت کی۔ لیکن جب اسے یقین ہو گیا۔ کہ میں رکنے والا نہیں تو وہ لگی اپنے گلے کا طلائی ہار اتار مجھ کو دینے۔ وہ میری مالی حالت سے واقف تھی شاید اسی لئے وہ ہار دے رہی تھی لیکن میں نے وہ ہار لینا منظور نہ کیا۔ آج سوچتا ہوں۔ کہ یہ اچھا ہی ہوا۔ میں جس روز جہاز پر سوار ہونے والا تھا سوشیلا بھی مجھے رخصت کرنے آئی تھی۔

مجھے ولایت میں رہتے تقریباً ڈیڑھ برس کا عرصہ گزر چکا تھا میں ایک روز آکسفورڈ اسٹریٹ میں بس اسٹینڈ کی طرف جا رہا تھا کہ یکایک کیدار ناتھ شرما سے ملاقات ہو گئی جس زمانے میں ہندوستان میں تھا میری طرح اسے بھی سوشیلا سے مجنونانہ محبت تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ سنگاپور کی سیاحت کے دوران میں سمندر کے کنارے ایک نوجوان سے جس کا نام پرتاپ سنگھ تھا۔ سوشیلا کی ملاقات ہوئی۔ اور ہندوستان واپس آ کر دونوں باہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ کیدار ناتھ نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ سوشیلا کو مجھ سے محبت نہ تھی۔ وہ محض مجھے فریب دے رہی تھی۔ لیکن تم نے تو سوشیلا کو دیکھا نہیں رنبیر! اس ایسی بھولی بھالی دوشیزہ کے متعلق فریب کاری کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ہندوستان پہنچتے ہی سوشیلا فرط مسرت سے پاگل ہو جائے گی۔

تم خیال کرتے ہو گے دوست کہ سوشیلا کی شادی ہو جانے کی اطلاع سے مجھے انتہائی صدمہ پہنچا ہو گا۔ لیکن تمہارا یہ خیال درست نہیں۔ سوشیلا نے میرے سینے میں محبت کا جو لافانی چراغ روشن کر دیا تھا۔ وہ ہوا کے اس جھونکے سے گل ہونے والا نہ تھا میں تو اب بھی دعا کرتا ہوں۔ کہ اس کی زندگی جس کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ شاد و بامراد رہے۔

ادھر دو مہینے ہوئے ہوں گے۔ گھر کے خط سے معلوم ہوا کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے میں نے طے کر لیا ہے۔ کہ اب ہندوستان واپس نہ آؤں گا۔ جب وہاں کوئی مجھ سے محبت کرنے والا نہیں۔ اشیرباد دینے والی ماں بھی موجود نہ رہیں تو وہاں کس کے لئے آؤں؟ جیسے تیسے یہیں زندگی گذار دوں گا۔

اب کچھ اور لکھنے سے مجبور ہوں دوست۔ موم بتی تقریباً گل ہو چکی ہے۔ باہر بھی بلا کی تاریکی ہے معلوم ہوتا ہے۔ دنیا یکسر ظلمستان بن کر رہ گئی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں یہ میرے مستقبل کی پیشینگوئی تو نہیں ہے؟ کیا اب میں اپنی زندگی میں کبھی روشنی کی کوئی شعاع نہ دیکھوں گا؟

تمہارا رمیش"

ایک بدنصیب نوجوان کی داستان غم پڑھ کر میرا دل اندوہ و غم سے لبریز ہو گیا۔ انگلستان کے سفر کے لئے بے چارے نے کیا کچھ کاوشیں نہ کی ہوں گی۔ وہاں کی تمام دلچسپیوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے کس طرح اس نے رات دن ایک کر دیا ہو گا۔ تا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر ہندوستان لوٹ آئے۔ مگر اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا سارا محل کس طرح تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کی طبیعت اس قدر بجھ گئی کہ اس نے وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ رمیش کی ناکامی کے احساس نے تھوڑی دیر کے لئے مجھ پر سخت افسردگی طاری کر دی۔

کچھ دنوں کے بعد بعض ایسی صورتیں پیش آئیں۔ کہ مجھے پنجاب چھوڑ کر وطن چلا آنا پڑا۔ یہاں کچھ دنوں اعزہ و احباب کے ساتھ رہ جانے کے بعد مجھے باہر جانا شاق معلوم ہونے لگا چنانچہ میں نے وطن ہی میں پریکٹس شروع کر دی۔ سال سوا سال تو

میری پریکٹس نہایت کامیاب رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگوں سے تعلقات اتنے وسیع ہو گئے کہ اب مجھے فیس بھی کوئی نہ دیتا تھا۔ کتنے لوگ دوا کی قیمت دینا بھی مراسم محبت کے منافی سمجھنے لگے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔ تو مجبوراً مجھے وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ خوش قسمتی سے مجھے سی پی کے ایک سٹی ہسپتال میں ملازمت مل گئی اور میں وہاں چلا گیا۔

یہاں آنے کے تین چار مہینے بعد کا تذکرہ ہے۔ میں ایک روز ہسپتال کے آفس روم میں بیٹھا تھا کہ ہسپتال کا مدراسی ڈاکٹر اندر آیا اور سامنے کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا "یار سنتے ہو؟ کل جو نئی لیڈی ڈاکٹر آئی ہے اسے آج میں نے دیکھا۔ بڑی خشک مزاج معلوم ہوتی ہے۔ اس نے تو مجھ سے رخ ہی نہیں ملایا لیکن ہمیں اپنی کوشش سے باز نہ آنا چاہئے بڑی خوبصورت عورت ہے جس طرح بھی ممکن ہو اس سے ربط و ضبط پیدا کرنا ضروری ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

رنبیر کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شرارت آمیز تبسم جھلک رہا تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چلا گیا۔

دوسرے روز بلا قصد لیڈی ڈاکٹر سے میرا سامنا ہو گیا اور تعارف بھی۔ اس نے مجھ سے انگریزی میں باتیں کیں۔ میں اس کے لہجۂ تکلم اور اس کی وضع و پوشش سے سمجھ گیا۔ کہ وہ ایک بنگالی دوشیزہ ہے۔ اس کے حسن و جمال میں ایک خاص کشش و ملاحت تھی۔

ہسپتال کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میں نے کہا "آپ بنگالی ہیں شاید؟"

"جی ہاں میرا نام سوشیلا رانی بوس ہے" اس نے ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

"سوشیلا رانی بوس! یہ نام تو کچھ گوش آشنا سا معلوم ہوتا ہے" یہ کہتے ہوئے ایک بھولی بسری سرگزشت میرے دماغ میں چٹکیاں لینے لگی۔ رمیش کی محبوبہ کا بھی تو یہی نام تھا وہ تو ایک بڑے رئیس کی بیٹی ہے۔ وہ ہسپتال کی ملازمت کب کرنے لگی؟ یہ کوئی دوسری عورت ہوگی۔ ایک۔ نام کی نہ جانے کتنی عورتیں ہوں گی۔

چند ہی روز میں سوشیلا سے میری گہری راہ و رسم ہو گئی وہ اکثر میرے ہاں آنے جانے لگی۔ میں بھی اس کے ہاں چلا جاتا۔ سوشیلا کے ساتھ میرے روابط دیکھ کر ہسپتال کے ڈاکٹر اور کارکن مجھ سے رشک کرنے لگے موقع پا کر مجھ پر فقرے چست کرنے اور مجھے بنانے سے بھی وہ باز نہ آتے۔

مجھے یہاں رہتے ایک سال کا عرصہ ہو گیا۔ بسنت پنچمی کا تہوار قریب تھا۔ لیکن یہاں کے لوگوں میں اس تہوار کی کوئی امنگ نہ تھی۔ مجھے گاؤں کی یاد ستانے لگی۔ السی اور سرسوں کے پھولوں سے تمام دیار گلزار بنا ہوگا۔ ہولی کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ آموں کے باغ بور سے لد گئے ہوں گے۔ نہر کے صاف و شفاف نیلے پانی میں کنول کے سرخ سرخ پھولوں کی کیسی بہار ہوگی۔ سرخاب اور سارس قطار در قطار تیر رہے ہوں گے۔ گاؤں کی البیلی دوشیزائیں پیلے پیلے بسنتی لہنگے پہنے شوخی سے گنگناتی اور جوانی کے گیت گاتی پنگھٹ پر جمع ہوتی ہوں گی۔ ایسے رومانی خطے کی جدائی کے احساس نے مجھ پر ایک غم انگیز کیفیت طاری کر دی۔

بھیا دوج کا دن تھا۔ سوشیلا نے مجھے اپنے ہاں سہ پہر کے ناشتے کی دعوت دی تھی میں غسل کر کے کپڑے بدل کر ٹھیک وقت پر اس کے ہاں پہنچ گیا۔ آج اس کے جسم پر ہسپتالی لباس نہ تھا۔ وہ سیاہ کنارے کی سفید ساری اور باریک ریشمی بلاؤز میں ملبوس تھی۔ اس وضع و لباس نے اسے حد سے زیادہ حسین و دلفریب بنا دیا تھا۔

سوشیلا نے مجھے دیکھتے ہی نیم شگفتہ کلی کی طرح مسکرا کر کہا۔ آپ نے بہت دیر کر دی ہیں کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔

"ممکن ہے دیر ہو گئی ہو۔ میں تو اپنے نزدیک وقت ہی سے آیا ہوں۔"

"جی ہاں وقت ہی سے آئے ہیں، ذرا گھڑی دیکھئے۔"

سوشیلا نے اپنی حسین کلائی میرے سامنے کر دی جس پر ایک نازک رسٹ واچ بندھی ہوئی تھی۔ میں چپ رہ گیا۔

سوشیلا بولی "چلئے ناشتہ کر لیا جائے۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے"

ہم دونوں ناشتہ کرنے بیٹھے۔

میں نے پوچھا "سوشیلا دیوی! ناشتہ تمہاری مدراسی نوکرانی نے تیار کیا ہے؟"

"وہ پکانے کی ایسی چیزیں؟ اس کا پکایا ہوا کھانا آپ کے سامنے آئے تو آپ اس کھانے کو دیکھ کر ہی سیر ہو جائیں۔ اور بغیر کھائے اٹھ جائیں۔"

یہ کہہ کر سوشیلا ہنسنے لگی۔

"تو یہ سب چیزیں خود تمہاری پکائی ہوئی ہیں۔ پھر تو تمہیں کھانا پکانے میں خاصی مہارت حاصل ہے۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم دونوں برآمدے میں کرسیوں پر آ بیٹھے۔ میرے ہاتھ میں ایک طبی رسالہ تھا۔ اس کے اوراق الٹتے ہوئے میں نے کہا۔ "تم نے کتنا اچھا کھانا پکایا تھا۔ آج بہت دنوں کے بعد میں نے جی بھر کر کھانا کھایا ہے۔ میری نوکرانی کو پکانا سکھا دو گی؟"

"کیا تمہاری نوکرانی اچھا کھانا نہیں پکاتی؟" سوشیلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک روز اس کے ہاتھ کا کھانا کھاؤ۔ تو تمہیں خود پتہ چل جائے"

"اچھا چلوں گی کسی روز"

"تم خود سے پکانے لگیں یا کسی نے سکھایا ہے تمہیں؟"

"میں نے اپنی نانی سے کھانا پکانا سیکھا ہے۔ وہ رتن پور میں رہتی تھیں۔ انہیں کھانے پکانے کا بڑا شوق تھا۔ بہت اچھا پکا نا جانتی تھیں۔"

رتن پور کا نام سن کر میں چونک پڑا۔ میں نے تعجب آمیز لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم رتن پور کی رہنے والی ہو سوشیلا؟"

سوشیلا بولی۔ "میں رتن پور کی رہنے والی تو نہیں لیکن میری عمر کا بیشتر حصہ رتن پور ہی میں گزرا ہے۔ وہاں کے سب سے بڑے جاگیر دار بابو کیشو ناتھ میرے حقیقی نانا تھے۔"

ایک لمحہ حرماں نصیب اور ناکام محبت رمیش کا پورا خط میرے دماغ میں گردش کر گیا۔ میں سوچنے لگا۔ تو کیا یہ وہی سوشیلا ہے جس نے رمیش کو گرویدہ محبت بنا کر رنگین و درخشاں آرزوؤں اور امیدوں کے پر بہار اور جگمگاتے ہوئے مستقبل کو زیر و زبر کر دیا۔

میں سوشیلا سے ایک عزیز کی طرح محبت کرتا تھا لیکن اس خیال نے میرے دل میں اس کے متعلق ایک جذبۂ نفرت پیدا کر دیا۔ جی چاہا ابھی اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے بنگلے میں چلا جاؤں۔ لیکن مزید تحقیق کی غرض سے اپنے دل پر جبر کر کے میں بیٹھا رہ گیا۔

میں نے پوچھا۔ "تو کیا تمہیں پہلے رمیش سے محبت کرنا تھی۔ اس کے بعد تم نے پرتاپ سنگھ سے شادی کر لی؟"

اس سوال نے تھوڑی دیر کے لئے سوشیلا پر سکتہ کی سی کیفیت طاری کر دی پھر وہ اپنے کو سنبھال کر بولی۔ آپ کو میری شادی کی بات کیسے معلوم ہوئی؟ کیا کدارناتھ سے آپ کی ملاقات ہے؟ اس بدمعاش کے جھوٹے پروپگنڈے نے مجھے اس حالت کو پہنچایا۔" یہ کہتے کہتے سوشیلا خاموش ہو گئی، فرط جذبات سے اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔

اس نے پھر پوچھا۔ "آپ کو یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

میں نے خط کا تمام مضمون سوشیلا کو سنا دیا۔

میں نے اپنی بات پوری کر کے سوشیلا کی طرف دیکھا۔ تو اس کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ سوشیلا کا گریۂ خاموش اس کی بے بسی پر کھلی ہوئی شہادت دے رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سوشیلا بے وفا نہیں ہو سکتی بے شک ساری شرارت کیدار ناتھ کی تھی۔

سوشیلا کی آنکھیں اب بھی برس رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ "سوشیلا! صبر و ضبط سے کام لو۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد رمیش پر حقیقت حال کا انکشاف ہو گا۔ تو اس کا دل تمہاری طرف سے صاف ہو جائے گا۔ اس کو تم سے سچی محبت ہے"

اس پر سوشیلا دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بے اختیار [illegible] روتی ہوئی بولی۔ "اب نرلیش ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں سے ان کی واپسی ناممکن ہے۔"

وفور گریہ سے سوشیلا کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ خود میرے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اتفاقاً رمیش کا خط میرے ہاتھ آ جانا۔ اور اسی طرح اتفاقی طور پر سوشیلا سے ملاقات ہو جانا۔ پھر پیار کی باتیں میرے اندر ایک خاص ڈرامائی کیفیت پیدا کر رہی تھیں

تھوڑی دیر بعد سوشیلا نے سر اوپر اٹھایا۔ اس کے رخسار دل پر اشکوں کا اثر اب تک موجود تھا۔ میں نے اس کی کنول سی بھیگی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آخر واقعہ کیا ہے سوشیلا؟"

اس نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہنا شروع کیا۔ ولایت جانے کے کوئی دو سال بعد تک ان کے خطوط برابر میرے پاس آتے رہے۔ اس کے خطوط کی رفتار میں کمی آنے لگی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ خطوں کی آمد بند ہو گئی۔ میں سمجھ گئی کہ اکثر نوجوانوں کی طرح رمیش بھی وہاں کسی حسینہ کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ اس خیال سے میرے دل کو سخت صدمہ [illegible] ولایت جاتے وقت میں رمیش کو رخصت کرنے گئی تھی، انہوں نے جہاز پر [illegible] کھڑے ہو کر نہایت دلگداز لہجے میں کہا تھا۔ دیکھو سوشیلا مجھے بھول نہ جانا۔

رمیش کے ان آخری الفاظ کو یاد کر کے میرے دل میں سخت اشتعال پیدا ہوتا، جی چاہتا ولایت جا کر رمیش سے ملوں اور پوچھوں کہ کیوں کس کس کو بھول گیا؟ میں نے تمہیں بھلا دیا۔ یا تم نے مجھ کو؟

آخر میں نے اپنے جذبوں سے مجبور ہو کر ولایت کے لئے روانہ ہو گئی، میں نے رمیش کو اس کی اطلاع نہیں دی۔ میرا خیال تھا کہ یکایک وہاں پہنچ کر ان کو ناگہاں مسرور کروں گی۔

ولایت پہنچ کر میں اس سینہ سے ملی جس سے رمیش محبت کرنے گئے تھے اس سے معلوم ہوا۔ مالی دقتوں کی وجہ سے انہوں نے اس مقام کو چھوڑ دیا۔ اب وہ ایک فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ میں وہاں پہنچی۔ چھٹی کا وقت ہو چکا تھا مزدوروں کے غول کے غول فیکٹری سے باہر نکل رہے تھے۔ ایک غول میں میں نے نریش کو بھی دیکھا۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ اپنی آنکھوں پر اعتبار کر دوں نریش کی ایسی ناگفتہ بہ اور تکلیف دہ حالت تھی۔ اب نہ اس کی وہ صحت نہ توانائی تھی۔ نہ اس کا وہ رنگ روپ، چہرہ زرد بے رونق ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے، جسم پر دوسرے مزدوروں کی طرح سیاہ کپڑے۔ نریش کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل کے ٹکڑے ہوئے جا رہے تھے۔

نریش کسی خیال میں گم آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے یکایک انہوں نے سر اوپر اٹھایا۔ اور ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ بے اختیار میری طرف بڑھے۔ ان کا افسردہ چہرہ بیساختہ شگفتہ ہو گیا۔ اور ان کی دھنسی ہوئی آنکھیں بے اختیار مسکرا پڑیں۔

میرے کہنے کے مطابق نریش نے فیکٹری کی ملازمت چھوڑ دی۔ ہر روز دھندلکے کے پردے کو چاک کرکے بہ شکل ایزدی آفتاب کی طرح ہماری مسرت و شادمانی اور کیف و نشاط کا آفتاب پھر محبت کی فضا کو روشن کرنے لگا۔ ہم دونوں سمندر کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے دور دور تک چلے جاتے اور تھکنے کے بعد کسی گھنے سایہ دار درخت تلے بیٹھ جاتے۔ جس طرح ہمارا ٹہلنا کیف آگیں ہوتا۔ اسی طرح کہیں بیٹھ جانا بھی لطف و سرور سے خالی نہ ہوتا۔ کھانے کا ضروری سامان بھی ہم اپنے ساتھ رکھتے۔ کیسے دلکش اور عیش آفریں تھے ہماری زندگی کے وہ ایام! ان کی یاد سے آج بھی دل بھر آتا ہے۔

اسی طرح عیش و عشرت کے ساتھ زندگی کے دن گزارتے ہوئے بہار کی ایک طرب آفریں حسین صبح کو ہم دونوں باقاعدہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ہم نے اپنی زندگی کے اس نہایت مسرت آگیں تقریب پر کوئی خاص اہتمام تو نہ کیا۔ پھر بھی ہم نے معمول از خوشبو سے اپنی خوابگاہ کے سجانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اور کمال ذوق و شوق سے سہاگ رات منائی۔

قانونی طور پر ایکدوسرے کے رفیق زندگی بننے کے بعد ہم نے ہنی مون منانا طے کیا۔ دریائے رائن کی ساحلی دلفریبیوں سے کیف اندوز ہوئے پمپائی کے آثار قدیمہ دیکھے، سوئیٹزرلینڈ کی آبشاروں کا لطف اٹھایا۔ اس طرح کئی مہینوں کی دلچسپ اور طرب انگیز سیر و تفریح کے بعد ہم لندن واپس آئے۔ یہاں آکر رمیش نے کلاس سنبھالا اور ہم نے ڈاکٹری کی تعلیم شروع کی۔ ہماری زندگی نہایت مسرت و اطمینان سے گزرنے لگی۔

لیکن نہ جانے کیوں رفتہ رفتہ رمیش کی صحت خراب ہو گئی اور وہ ہر وقت افسردہ اور مضمحل رہنے لگے علاج کی کوئی کوشش سازگار نہ ہوئی۔ ایک روز ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا کہ مرض کے جراثیم عرصہ سے اندر اندر کام کر رہے تھے لیکن جب تک جسم میں طاقت تھی۔ ان کا اثر نمایاں نہیں ہوا۔ اب صحت کی امید بہت کم ہے۔

ڈاکٹر کی اس رائے نے ہم دونوں کو پریشان کر دیا۔ میں رمیش کو لے کر سوئٹزرلینڈ گئی لیکن وہاں جا کر بھی کچھ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔ موت و زندگی کی اس کشمکش میں موت ہی کامیاب ہوئی۔

یہ کہتے ہوئے سوشیلا پر رقت طاری ہو گئی۔ اور وہ کئی منٹ تک سسکتی رہی۔ پھر اس نے اپنے کو سنبھال کر کہا۔ میں ان کو لے جا کر برف کے تودوں کے درمیان سلا آئی لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ آج بھی وہاں لیٹے ہوئے میرے خواب زندگی کے شکستہ ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔“

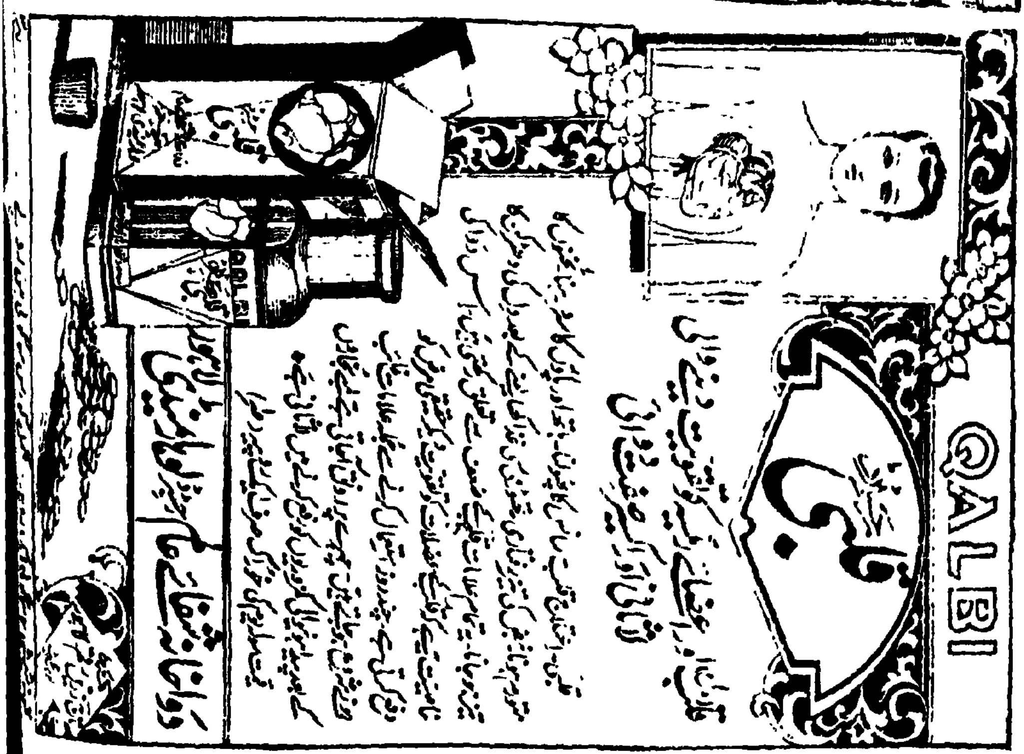
یہ کہہ کر سوشیلا چپ ہو گئی۔ اور کھوئی سی دور افق کے پار دیکھنے لگی۔ میں بھی دیر تک خیالات کے ہجوم میں گم رہا۔

خیالات کی یورش کم ہوئی تو دیکھا شام ہو چلی تھی اور سوشیلا کی نظریں اسی طرح افق پر جمی ہوئی تھیں۔

آج بھی زندگی کی شام میں گزرے ہوئے واقعات و ایام کو یاد کرتا ہوں تو سب سے پہلے سوشیلا کی افق میں کھوئی نگاہوں کا منظر دماغ میں تازہ ہو جاتا ہے —— !!

ابو محمد امام الدین رامنگری


JIRYANI


QALBI

بدتمیز

دسمبر کی پچیس ۲۵ تاریخ تھی اور جمعہ کا دن !

جگدیش کو ایک دوست سے ملنے جانا تھا۔ اُس نے جی کڑا کرکے سائیکل اٹھائی اور چل دیا۔ سائیکل چلانی اس نے نئی نئی سیکھی تھی۔ صرف دو چار دفعہ مشق کی تھی اور وہ بھی کشادہ اور کم سفر سڑکوں پر۔

یہ دہلی کا ذکر ہے۔ اُس کا دوست موری گیٹ رہتا تھا۔ اور وہ نئی دہلی۔

"ملب روڈ تو خوب چوڑی ہے۔ اس پر کوئی ایسا بہت زیادہ ٹریفک بھی نہیں ہوتا۔ لہذا جگدیش آسانی سے چلتا رہا۔ لیکن جب ہٹھائی کے پل کے قریب پہنچا تو اول تو چڑھائی پر زور لگانا پڑا اور دوسرے ٹریموے کی لائنوں سے پہیوں کو مشکل سے بچایا۔ سڑک پر کیچڑ بھی ہو رہی تھی۔ کیونکہ ایک دن پہلے ہلکی سی بارش ہو چکی تھی۔ خیر بچ بچا کر وہ پل پر پہنچ گیا۔ لیکن پل پر پہنچا تو ایک دم پشت سے کار کے ہارن کی آواز آئی اور سامنے سے ٹرام ہوتی دکھائی دی۔ اور دائیں ہاتھ سے ایک تانگہ آ رہا تھا۔ جگدیش گھبرا گیا۔ تاہم اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اپنے انتہائی بائیں پہ سائیکل چلانے لگا۔ لیکن اس کے فکروں میں اضافہ کرنے کے لئے اچانک ایک عورت۔ ایک نوجوان لڑکی اور ایک چھوٹا سا لڑکا دائیں جانب سے بائیں جانب آ گئے۔ جگدیش نے عورت سے تو سائیکل بچالی۔ لیکن لڑکی سے بچائی ہی تھی کہ پہیہ اُن میں پھنسنے لگا۔ اس نے ایک دم ہینڈل گھمایا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ پہیہ لائن سے نکل کر لڑکی سے ٹکرا گیا۔ جگدیش نے فوراً اپنی ٹانگیں زمین پر ٹیک دیں اور دوسرے لمحہ نیچے اُتر آیا۔ پہیہ گارے میں سے لت پت ہو رہا تھا۔ لڑکی کے بھورے رنگ کے اوورکوٹ پر چھاپ جیسا لگا گارا لگ گیا۔ لڑکی نے ایک تیز نظر جگدیش پر ڈالی اور حقارت اور غصہ سے بولی: "ٹائی لگا کر چلے آتے ہیں سائیکل چلانی آتی نہیں" اور اس کی ماں نے کہا "آنکھیں نہیں ہیں منہ پر؟"

جگدیش کو لڑکی کے اوورکوٹ خراب ہونے کا افسوس ضرور تھا مگر اس کے غصہ اور حقارت کے الفاظ نے اُس کی خودی کو اُبھارا۔ اگر لڑکی ایک لمحہ ——— ہاں صرف ایک لمحہ اور خاموش رہتی تو جگدیش اپنے کوٹ کی جیب سے اپنا ریشمیں رومال نکال کر اُس کے اوورکوٹ کا گارا صاف کرنے لگتا اور نہایت لجاجت سے معافی مانگتا۔ مگر وہ تو ایک دم تیز ہو گئی تھی اور پھر اس کی ماں بھی بول پڑیں۔ لہذا جگدیش نے بھی اسی قسم کی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اوورکوٹ پہن کر چلی آتی ہیں اور سڑک عبور کرنی آتی نہیں"

اور سائیکل پر سوار ہو کر چلا گیا۔

لڑکی دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ جگدیش کے منہ پر تڑاق سے ایک چانٹا رسید کر دے۔ مگر وہ تو جا چکا تھا۔

"کتنا بے ادب تھا وہ۔ اور کتنا ڈھیٹ اور کتنا مغرور" لڑکی کا غصہ اور زیادہ تیز ہو گیا اور پھر اس کے چھوٹے بھائی نے گویا جلتی آگ پر مٹی کا تیل چھڑک دیا۔

"کوٹ تو بالکل خراب ہو گیا"

لڑکی نے اپنے سر کو ایک خاص انداز سے جنبش دی اور چل پڑی۔ چھوٹے بھائی کے فقرے نے اس کے غصے کے جذبات اور زیادہ مشتعل کر دئے تھے۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اُسے اس طرح ناراض کیا۔ اس کا کوٹ خراب کر دیا۔ اور نہ معافی مانگی نہ کوٹ صاف کرنے کی کوشش کی۔ اور نفرت کی نظر ڈال کر چل دیا۔ اس کی یہ ساری حرکتیں لڑکی کے لئے ناقابل برداشت تھیں اور بالکل عجیب۔ اُس نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ جہاں ذرا سی غلطی پر (I am sorry) کہا جاتا تھا۔ جہاں بات بات پر معافی مانگی جاتی تھی۔ کہاں یہ کہ اتنی بڑی حماقت پر بھی جگدیش نے جھوٹے منہ سے افسوس کا اظہار نہ کیا۔ اُسے

حیرت تھی کہ بوٹ سوٹ پہننے والا نوجوان موجودہ زمانے کی تہذیب سے اتنا نابلد کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ جنس لطیف کا ادب نہ کرے۔ یا اپنی غلطی پر افسوس ظاہر کر کے معافی کا خواستگار نہ ہو۔ پھر کیا اس نے جان بوجھ کر میری توہین کی ہے۔ کیا اس نے مجھے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ دو چار لفظوں میں اپنی شرمندگی اور تاسف کا اظہار کر دے۔ اس میں میری کیا غلطی تھی سڑک تو ہم عبور کر ہی چکے تھے۔ اس کی مسکراہٹ میں کیسا لاابالی پن تھا — بیہودہ اور مغرور۔ اے کاش میں نے فوراً زور سے اس کے گالوں پر ایک تھپڑ لگا دیا ہوتا۔

انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں وہ اپنی کوٹھی پہنچ گئے آج اُسے پٹرول ختم ہونے پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ اگر پٹرول کے کوپن ختم نہ ہو چکے ہوتے تو پیدل کیوں چلتے اور کیوں یہ ناگوار واقعہ پیش آتا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ پٹرول ہی نہ ہونے کی وجہ سے تو جلدیش نے سائیکل چلانی سیکھی تھی۔ ورنہ پٹرول پر پابندی ہونے سے پہلے وہ بھی کبھی موٹر کار سے نیچے پاؤں نہ اتارتا تھا۔

کوٹھی پہنچ کر سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا۔ کہ برش لے کر کوٹ سے سوکھی ہوئی مٹی جھڑانے لگی۔ وہ اس ناخوشگوار واقعہ کی یادگار جلد سے جلد مٹا دینا چاہتی تھی لیکن زور زور سے برش رگڑنے کے باوجود بھی دھبہ نہ مٹا اور جوں جوں وہ دھبہ چھڑانے میں ناکام رہی اس کے دل میں دھبہ لگانے والے کی طرف سے اتنی ہی زیادہ نفرت بڑھتی گئی۔ اور اتنا ہی زیادہ اُسکے گودی پن، حماقت اور بیہودگی پر غصہ آتا رہا۔

پھر کئی دن وہ اپنی سہیلیوں سے اُس کی بیوقوفی اور جہالت کا ذکر کر کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہی۔ اور اسے دسیوں قسم کے نا۔۔۔ سے یاد کرتی رہی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے دل سے دھبہ اور دھبے والے کا خیال مٹنے لگا۔ اور مٹتے مٹتے تقریباً بالکل ہی مٹ گیا۔ پھر بھی وہ اس کے غرور اور اُس کی حقارت کی نظر نہ بھلا سکی اور جب یہ دونوں چیزیں اُسے یاد آتیں۔ تو اس کے دل میں نفرت کی ایک نئی لہر سی پیدا ہو جاتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔

پھر ایک دن اُس کی ماں نے اس سے کہا کہ لیلا آج ذرا احتیاط سے کپڑے بدلنا کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ اُس کے دل میں ماتا جی کی یہ بات کھٹکی۔ مہمان تو ان کے یہاں اکثر آتے رہتے تھے۔ لیکن ماتا جی نے پہلے کبھی ایسی ہدایت نہ کی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے کپڑے تو ہمیشہ ہی صاف رہتے تھے پھر انہیں تاکید کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ اُسے اپنے ماتا پتا کی پچھلے دو دن کی گفتگو کے کچھ فقرے یاد آ گئے اور وہ مسکرا کر غسل خانے میں چلی گئی۔

⁂

آرائش سے فارغ ہو کر وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلی گئی اور "چاند" پڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کی ماں آئی اور نرمی سے بولی "لیلا مہمان آ گئے ہیں۔ میں ان کے پاس جاتی ہوں تم ذرا چائے لے کر آ جانا۔"

ماں کی بات پر ایک مرتبہ اور اُسے تعجب ہوا۔ جب کوئی مہمان آتا تھا تو روزمرہ کی طرح چائے لانے کی خدمت ہمیشہ نوکر انجام دیتا تھا۔ آج ایسا کون مہمان ہے کہ لیلا کو چائے لانے کے لئے کہا گیا۔ اس کے جی میں آیا کہ انکار کر دے۔ مگر ان کی نظر دیکھ کر چپ ہو گئی۔

جب وہ چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ تو اُس نے دیکھا کہ اس کی ماتا کی عمر کی بشاش چہرے والی ایک عورت کرسی پر بیٹھی ہے اور اس کے برابر ایک نوجوان بیٹھا ہے۔ اس عورت کے بالمقابل اس کی اپنی ماں بیٹھی تھی۔ دروازے کی طرف نوجوان کی پشت تھی اس لئے لیلا اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔ وہ نیچے نیچے قدم اٹھاتی ہوئی ان کے قریب گئی اور میز پر ٹرے رکھ کر ادب سے عورت کو نمستے کیا۔ اور انہیں نمستے کر کے جو اس نے نوجوان کی جانب دیکھا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ ایک دم اُس کے جی میں آیا کہ ٹرے اُٹھا کر واپس چلی جائے اور جاتی جاتی کہہ جائے کہ ایسے بدتہذیبوں کے لئے اُن کے یہاں نہ چائے ہے نہ جگہ۔ لیکن ابھی وہ اس قسم کی کوئی حرکت نہ کرنے پائی تھی کہ اس کی ماں نے کہا "انہیں نمستے کر دلیلا"۔ ماں کے حکم کی تعمیل میں لیکن بادل ناخواستہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور پیشانی تک لے جا کر چھوڑ دئے۔ پھر اُس کی ماں نے کہا "بیٹھ جاؤ" صرف ایک کرسی خالی تھی۔ نوجوان کے مقابل والی۔ لیلا کو اُسی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ لیکن اس نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ اس بدتمیز سے کوئی بات نہ کرے گی۔ وہ مجبور تھی۔ ماتا پتا کی عزت کا پاس

اسے مجبور کر رہا تھا۔ ورنہ نوکر کو حکم دے کر اس نوجوان کو فوراً کوٹھی سے باہر نکلوا دیتی۔ پُل والا سارا واقعہ اس کی نظروں میں پھر گیا تھا اور واقعہ کے ساتھ نوجوان کا غرور اور بدتہذیبی بھی یاد آ گئی تھی۔

ماں کے کہنے سے وہ چائے بنانے لگی۔ سب سے پہلے اُس نے نوجوان کی ماں کی پیالی میں شکر کے دو چمچے ڈالے۔ نوجوان بولا چائے بناتے وقت شکر کا صرف ایک چمچہ ڈالنا چاہیئے۔ اگر کوئی زیادہ شکر ڈالنے کا عادی ہو تو وہ بعد میں اور لے سکتا ہے۔ لیلا نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور جب اس کی پیالی میں شکر ڈالی تو بھی دو ہی چمچے ڈالے۔ اس کی ماتا بولیں "ان کے پاس تو ایک چمچہ ڈالنا تھا" لیکن وہ جب بھی کچھ نہ بولی۔

پھر چائے پینے کے دوران میں نوجوان نے کئی دفعہ کوشش کی کہ براہِ راست لیلا سے گفتگو کرے۔ لیکن ہر دفعہ ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اور کئی مرتبہ لیلا کی ماں کو کہنا پڑتا کہ یہ بہت ہی شرمیلی ہے۔ میں ہر چند سمجھاتی رہتی ہوں کہ اتنی بے جا شرم و حیا اچھی نہیں ہوتی۔ لیکن اس پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ اور ساتھ ہی لیلا سے بھی کہتیں "جواب کیوں نہیں دیتی یہ کیا پوچھ رہے ہیں" لیکن لیلا اسی طرح نظریں جھکائے خاموش بیٹھی چائے پیتی رہی۔

جگدیش کوئی بیوقوف تو تھا نہیں کہ لیلا کی ماں کی بات کو سچ مان لیتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ جو لڑکی ایک اجنبی پر ناراض ہو کر اس کی ٹائی پر یا سائیکل چلانے پر نکتہ چینی کر سکتی ہے۔ وہ کتنی شرمیلی ہو سکتی ہے۔ بہر حال وہ اس سے سوال کرتا رہا اور اس کی ماں اُس کی طرف سے جواب دیتی رہی۔

جب وہ ماں بیٹا چلے گئے تو لیلا کی ماں اُس پر بہت ناراض ہوئی۔

"آخر آج تجھے کیا ہو گیا تھا۔ تو یوں گونگے کا گڑ کھا کر کیوں بیٹھ گئی تھی۔"

لیلا نے جواب دیا "ماتا جی آپ نے اس لڑکے کو نہیں پہچانا — یہ تو وہی بدتمیز تھا جس نے مٹھائی کے پل پر میرا اوور کوٹ خراب کر دیا تھا۔

اس پر اس کی ماں نے چڑ کر کہا "تو نے آج بد تمیزی کا ثبوت دیا ہے!"

⁂

جگدیش کی ماں کو لیلا بہت پسند آئی۔ خاص طور پر اس کا خاموش رہنا تو انہیں بہت پسند آیا۔ اور اس کی یہ سادگی تو ان کے دل ہی میں اُتر گئی کہ جگدیش نے گو ہدایت کر دی تھی کہ چائے کی پیالی میں شکر کا ایک چمچہ ڈالنا چاہیئے۔ لیکن اس نے جگدیش کی پیالی میں بھی دو ہی چمچے شکر ڈالی۔

اور جگدیش کو تو گویا ضد ہو گئی تھی کہ شادی کرنی ہے تو لیلا سے نہیں تو کرنی ہی نہیں۔

لہٰذا ان کے یہاں سے پیغام گیا۔ اُدھر لیلا کے ماں باپ بھی ہر طرح سے اپنا اطمینان کر چکے تھے۔ انہوں نے بخوشی منظور کر لیا۔ لیکن لڑکی کی رضامندی لینی بھی ضروری تھی۔ اور لیلا راضی نہ ہوتی تھی۔ اُس نے دبے الفاظ سے کہہ دیا تھا کہ ایسے بدتمیز اور مغرور سے میرا نباہ نہ ہو سکے گا۔ ماں باپ نے اور زور دیا تو خاموش ہو گئی۔ غریب ہندوستانی لڑکی ماں باپ کے حکم کے آگے سر جھکانا ہی جانتی ہے۔ سرکشی کرنا نہیں جانتی

⁂

شادی کی پہلی رات وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں گردن جھکائے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ آج شب ان سے کیا گفتگو کی جائے۔ اتنے دن کے سوچ بچار کے بعد اُس نے یہ تو محسوس کر لیا تھا کہ اُس کے دل میں جگدیش کی طرف سے جو نفرت تھی وہ صرف نفرت نہ تھی بلکہ محبت کی ایک صورت تھی اور اب تو در اصل وہ اپنے دل میں اُس کے لئے کچھ بہت ہی زیادہ محبت محسوس کرنے لگی تھی۔

پھر بھی آج وہ اُسے سائیکل [illegible] کے متعلق سبق دینا چاہتی تھی خواہ اس کا انجام [illegible] ہو۔ ماتا پتا کا حکم میں نے مان لیا۔ اب اگر یہ ٹھیک ہو گئے اور ایک دفعہ — ہاں صرف ایک دفعہ اُس دن کے واقعہ پر اظہار ندامت کر دیا تو بہت اچھا اور اگر پھر [illegible] انہوں نے پھر اُسی غرور اور [illegible] سے کام لیا تو — تو وہ آج اپنی تمام خوشیوں کی ہانڈی [illegible] رہی تھی اور شکست کے خوف سے اُس کا دل کانپ رہا تھا۔

سہیلیاں مذاق کرنے لگیں [illegible] سوچ میں بیٹھی

ہو تھوڑی سی دیر اور باقی ہے پھر وہ آ ہی جائیں گے۔ آج تو تمہیں ہمارا پاس بیٹھنا بھی ناگوار گزر رہا ہوگا ۔اس دن کوٹ پر دھبہ لگانے پر تو اتنی بگڑی تھیں آج دیکھیں ———

اس نے ان میں سے کسی کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ البتہ اپنے بالکل پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کے پہلو میں زور سے چٹکی لے لی۔ وہ لڑکی پھدکتے ہوئے بولی "بہن چٹکیاں لے لے کر کیوں بھگاتی ہو ہم تو خود ہی چلے جاتے ہیں اور اٹھ کر چل دی اور اس کے ساتھ دوسری لڑکیاں بھی کھلکھلا کر ہنستی ہوئی چلی گئیں۔

یہ آہستہ آہستہ بلاتی بھی رہی۔ مگر اب کوئی نہ آئی۔

ان کے جاتے کے کچھ دیر بعد ہی قدموں کی چاپ کی آواز آئی۔ اس نے جلدی سے نظر اٹھا کر دیکھا جگدیش بغل میں ایک بڑا سا پیکٹ لئے کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر وہی شریرانہ اور پرغرور تبسم کھیل رہا تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے دروازہ بند کیا اور پھر سیدھا اس کے پاس آ کر پیکٹ اپنے دونوں ہاتھوں میں آگے کو بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں معافی چاہتا ہوں کہ اس روز میری غلطی سے آپ کا اوور کوٹ خراب ہو گیا تھا۔ اس کے بدلے میں یہ اوور کوٹ پیش کرتا ہوں ———

لیلا کی آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو بھر آئے۔

ظفر واسطی

آسمانی کھیل

تصور میں مرے اک دلنشیں دوشیزہ رہتی ہے!
میں اکثر ساتھ اس کے سیر کرتا ہوں ستاروں کی
سنہرے آسمانوں کی روپہلے کوہساروں کی
نہ پوچھ اے ہمنشیں کیا کیا ہوا کرتا ہے راتوں میں
ستاروں سے بھی کچھ آگے نکل جاتے ہیں باتوں میں
ابھی تک یاد ہے وہ بادلوں کو چومتے جانا!
وہ اکثر کہکشانی راستوں پر جھومتے جانا!
وہ نغموں کا اُبلنا ہر ادا ہر بات سے اُس کی
وہ اکثر چھیڑ زہرہ کے حسیں نغمات سے اس کی
کبھی پازیب کی جھنکار سے ناہید زاروں میں
بپا کرنا قیامت سی اشاروں ہی اشاروں میں
کبھی مہتاب سے نظریں ملانا اور چھڑا دینا
کبھی دو چار تاروں کو مچل کر گدگدا دینا!
کبھی نورانی ٹھنڈک میں وہ رضوانی خوشی توبہ
وہ چاندی سے بدن میں اک سنہری کپکپی توبہ
یکایک وہ کبھی جذبات کے طوفان میں بہنا
مری آغوش میں آکر فرشتوں کو بُرا کہنا
کبھی کچھ عرش کے موتی پرِ جبریل سے لینا
مری آنکھوں کو شرماتے ہوئے پھر ان کو دے دینا
غرض یہ صبح تک اک محویت اور لاکھ نظارے
کبھی زلفوں کے بادل ہیں کبھی رخسار کے تارے
تصور میں مرے اک دلنشیں دوشیزہ رہتی ہے

نظر حیدرآبادی

نقد و نظر

ترجمہ انگریزی (قرآن مجید)

از مولانا عبدالماجد دریابادی ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ ۱۳۶ صفحات قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ :۔ تاج کمپنی لیمٹڈ ریلوے روڈ لاہور +

قرآن حکیم کے متعدد انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور اب غالباً اس مقدس فریضہ کی انجام دہی کے لئے بہت زیادہ کاوش و محنت کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو سکتی کیونکہ عربی و انگریزی کی معمولی شد بد رکھنے والا بھی انگریزی کے مختلف تراجم کو سامنے رکھ کر ایک ترجمہ اپنے نام سے مرتب کر سکتا ہے ۔ تاہم اس کام کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا خصوصاً اگر ایسے اہل قلم اس طرف توجہ کریں جو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے ہوں ۔ تو قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں بہت زیادہ قوت پیدا ہو سکتی ہے ۔ اس وقت ہمارے سامنے پہلے سپارے کا انگریزی ترجمہ ہے جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم کا رہین منت ہے ۔ مولانا دریابادی عربی و اسلامی علوم پر جو کاملانہ دسترس رکھتے ہیں ۔ وہ محتاج تصریح نہیں ۔ لہٰذا یقین کیا جاتا ہے کہ قرآن حکیم کے انگریزی ترجمہ میں بھی انہیں کسی اعتقادی لغزش کا سامنا نہ ہوگا ۔ اس ترجمہ میں اگرچہ علامہ عبداللہ یوسف علی کی لسانی سحر کاری اور ادبیانہ شگفتگی نہیں ہے ۔ تاہم عالمانہ جھلک ضرور موجود ہے ۔ جگہ جگہ آیات کی لغوی، صرفی، نحوی، تاریخی اور جغرافی تشریح بھی کر دی گئی ہے ۔ ناشرین نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہر ماہ ایک سپارے کا ترجمہ شائع کر دیا کریں گے ہمیں امید ہے کہ مکمل ہونے پر یہ ترجمہ ادبیات عالم میں ایک بیش بہا اضافے کا موجب ہوگا اور انگریزی دان حضرات اس کے مطالعے سے اپنی دنیوی و اخروی نجات کا سامان کر سکیں گے +

دینِ اسلام

مصنفہ :۔ چودھری افضل حق مرحوم

ضخامت :۔ ۲۰×۳۰/۱۶ ۲۴۸ صفحات ۔

قیمت درج نہیں ہے ۔

ناشرین :۔ تاج کمپنی لیمٹڈ ریلوے روڈ لاہور +

اس کتاب کے نام سے دھوکہ ہوتا ہے کہ شاید اس میں دین اسلام کے اصول و عمل پر گفتگو کی گئی ہے ۔ لیکن دراصل یہ ان مختصر مضامین کا مجموعہ ہے ۔ جو چودھری افضل حق مرحوم نے "نماز" کے موضوع پر شاعرانہ رنگ میں لکھے تھے ۔ کہیں کہیں عمل و جہاد کی تلقین بھی کی گئی ہے ۔ چودھری صاحب مرحوم کا خامۂ بہار آفریں ادبیانہ گلفشانیوں کے لئے خاص طور پر مشہور تھا ۔ اس خالص دینی کتاب میں بھی ان کے مخصوص رنگ کی جھلک موجود ہے ۔ اگر چودھری صاحب مرحوم کے سیاسی خیالات سے اغماض کیا جائے اور ان کے طرز استدلال میں علمی جواہر ریزے ڈھونڈنے کی سعی ناکام نہ کی جائے تو خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے یہ کتاب یقیناً پڑھنے کے قابل ہے +

ماہر کے سلام

از خانصاحب حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآبادی

ضخامت :۔ ۲۰×۳۰/۱۶ ۳۲ صفحات قیمت درج نہیں ہے ۔

ملنے کا پتہ :۔ محمود منزل ۔ روشن آرا روڈ دہلی ۔

یہ حضرت ماہر اکبرآبادی کے ۲۶ سلاموں کا مجموعہ ہے ۔ ہمیں فاضل مصنف کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ "سلام میں زورِ طبیعت کا مظاہرہ نہیں ہوتا ۔ بلکہ جوشِ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے" ۔ لہٰذا اس مجموعہ کو اسی اصول کی روشنی میں دیکھنا چاہئے تمام سلام آسان زمینوں میں کہے گئے ہیں ۔ اس لئے مجالسِ عزا میں بہ آسانی گا کر پڑھے جا سکتے ہیں ۔ شائقین مندرجہ بالا پتہ سے طلب کریں +

مُدرّسُ العربیہ

مصنفہ :۔ پروفیسر محمد حسن الاعظمی عالم ازہر
قاضی ظہیر الدین احمد ایم اے +

ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ ۲۸۰ صفحات قیمت درج نہیں ہے

ناشرین :۔ مکتبہ المعارف لاہور +

پروفیسر محمد حسن الاعظمی جب سے ہندوستان آئے ہیں عربی علوم کی نشر و اشاعت کے لئے قابل رشک سرگرمی کا اظہار کر

رہتے ہیں۔ اب انہوں نے "مُدرس العربیۃ" کے نام سے عربی گرامر پر ایک جامع و مانع کتاب لکھی ہے جس کا پہلا حصّہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یوں تو صرف و نحو پر بیشمار رسالے لکھے گئے ہیں لیکن اعظمی صاحب کی زندگی کا بیشتر حصّہ چونکہ جامعہ ازہر اور جامعہ مصری کے خالص عربی ماحول میں گزارا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر ان کی تصنیف میں ترقی پسندانہ رنگ غالب ہے ہماری رائے میں یہ کتاب مبتدی و منتہی کے لئے یکساں مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ اس لئے جامعہ پنجاب کے ارباب بست و کشاد کو چاہیئے کہ مُدرس العربیۃ کو سکولوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل کریں +

دیوانِ مضطر

از:۔ قاری شاہ عبدالمجید مضطر مظفرپوری
ضخامت $\frac{20 \times 30}{16}$ ۱۵۹ صفحات۔ قیمت غیر مجلد عہ۔

ملنے کا پتہ:۔ مدرسہ جامع العلوم مظفرپور +

مضطر مظفرپوری صوبہ بہار کے ایک پختہ مشق اور خوش گو شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ حال ہی میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔ مولوی عبدالسلام ندوی کا مقدمہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مضطر صاحب ابتدا میں اپنے بڑے بھائی حافظ شاہ رحمت اللہ تلمیذ حضرت داغ دہلوی سے اصلاح لیتے رہے اس کے بعد حضرت آرزو لکھنوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کے کلام میں رنگ قدیم کی جھلک نمایاں ہے۔ تاہم وہ لکھنو کے مبتذل رنگ سے متاثر نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری میں موسیقیت اور جذبات نگاری کا عنصر بھی موجود ہے۔ مضامین عام طور پر تصوف و اخلاق اور یاس و قنوط پر مشتمل ہیں نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

دل کے بہلانے کو فرقت میں اٹھائی جو کتاب
وائے تقدیر کہ وہ درد کا دیوان نکلا

~~~~~~

تیرا سوال دونوں جہاں کا سوال ہے
یعنی خدائی مانگ رہے ہیں خدا سے ہم

~~~~~~

انہی کی زندگی اچھی انہی کی موت بھی اچھی
جو تم پر جان دیتے ہیں جو تم پر مرنے والے ہیں

~~~~~~

کسی کے وعدۂ فردا میں ہے مسیحائی
بہت بڑا یہ سہارا ہے زندگی کے لئے

~~~~~~

الٰہی شیخ کی دستار کو سلامت رکھ
عجیب چیز ہے رندوں کی دل لگی کے لئے

~~~~~~

کہکشاں

مصنفہ:۔ محمودہ رضویہ
ضخامت: $\frac{20 \times 30}{8}$ ۱۶۰ صفحات قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اردو کراچی +

محترمہ رضویہ مدیرۂ مجلہ "ہندوستانی" اس لحاظ سے یقیناً خوش قسمت ہیں کہ جو کچھ لکھتی ہیں وہ نقد و احتساب کے بغیر کتابی صورت اختیار کر لیتا ہے "کہکشاں" غالباً ان کے مضامین کا پانچواں مجموعہ ہے اور شروع سے اخیر تک "ٹیگوری طرز" کے ادبی ٹکڑوں پر مشتمل ہے اگرچہ اس صنفِ ادب کو اب زوال آچکا ہے۔ اور اردو ادب میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ تاہم مصنفہ کے واردات و حسیات میں تاثیر موجود ہے۔ اس لئے قارئین کو یہ مجموعہ منگا کر دیکھنا چاہیئے +

ثروت آرا بیگم

مصنفہ:۔ حمیدہ سلطانہ +
ضخامت: $\frac{20 \times 26}{8}$ ۳۳۲ صفحات
قیمت عہ/۲

ناشرین:۔ دفتر "ادیب" دہلی +

مولانا عبدالحلیم شررؔ اور منشی پریم چند کے بعد اردو میں کوئی قابلِ ذکر طبعزاد ناول نہیں لکھا گیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ناول نویسی کا دور ختم ہو چکا ہے اور گزشتہ چند برس سے اردو ادب کا رجحان مختصر افسانہ نویسی کی طرف نظر آتا ہے۔ تاہم حمیدہ سلطانہ صاحبہ کا یہ ناول مستحق توجہ ہے لائق مصنفہ کا بیان ہے کہ "یہ ناول اُس وقت ضابطۂ تحریر میں لایا گیا۔ جب میں پوری چھ ماہ کی طویل علالت کے بعد بستر سے اُٹھی تھی۔ اور مجھے بیکاری کا وقت کاٹنے کے لئے ایک تفریحی مشغلہ کی ضرورت تھی" اس کے باوجود ناول میں بیمار ذہنیت کے اثرات نہیں ہیں۔ بلکہ اسے انتہائی ہوشمندی سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ ناول کا پسِ منظر دہلی کا ایک ایسا گھرانہ ہے جو بورژوا سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ ممکن ہے دقیق ۴۴

۴۴ بینوں کو یہ ناول فنی معائب سے یکسر پاک نظر نہ آئے۔ تاہم اسے پڑھ [illegible]
ہے اس لئے باذوق حضرات کو اس کے مطالعہ سے مستفید ہونا
~~~~~~

لبِ دریا کا رومان

رہے گا یاد مجھ کو وہ سماں اس زندگانی میں — لبِ دریا ملا کرتے تھے جب ہم تم جوانی میں
وہ تیرا گنگنانا، مسکرانا، دیکھ کر مجھ کو — وہ میری نے نوازی انتہائے شادمانی میں
ترا وہ روٹھ جانا، پھر مرا تجھ کو منا لینا — یہی اک دل لگی ہر وقت تھی عہدِ جوانی میں
نگاہِ مست سے مجھ کو اشارے جب تو کرتی تھی — مرا دل جھومنے لگتا تھا کیفِ شادمانی میں
ترے رنگیں لبوں پر اسطرح رقصاں تبسم تھا — ہو رقصاں چاندنی مہتاب کی جسطرح پانی میں
ہے مجھ کو یاد سنتے سنتے افسانہ محبت کا — ترا شرما کے کنکر پھینکنا وہ بہتے پانی میں
وہ وقتِ بادہ نوشی تیری انگڑائی پہ انگڑائی — وہ تیرا سونپ دینا خود کو آغوشِ جوانی میں
ستارے جھانکتے تھے آسماں کے روزنوں سے جب — تھے ہم مصروف اسدم حالِ دل کی ترجمانی میں
فلک پر ماہِ تاباں کھے رہا تھا اپنی جب کشتی — تلاطم سا بپا تھا سیم گوں دریا کے پانی میں
ہوائیں تیز تھیں موجوں میں تھا اک کیفِ ہیجانی — مری کشتی بہی جاتی تھی موجوں کی روانی میں
وہ امواجِ پریشاں کا مری کشتی سے ٹکرانا — وہ پیہم اس کے ہچکولے تلاطم خیز پانی میں
ترا گھبرا کے کہنا "چلو مجھ کو کنارے پر — مجھے ڈر ہے کہیں ہو غرق یہ کشتی نہ پانی میں"
دمِ رخصت ترا پھر عہد کرنا مجھ سے ملنے کا — تجھے مایوس ہو کر چومنا جوشِ جوانی میں
میں تیرا منتظر بیٹھا ہوں اب تک بر لبِ دریا — کہ تو وعدہ نبھانے آئے شاید زندگانی میں
الٰہی عود کر آئے وہ دورِ آولیں پھر سے — کبھی دریا پہ جو گزرا تھا عہدِ نوجوانی میں

نشاط اب تک تجھے وہ اپنی نظروں میں بسائے ہے
ہے اب تک حکمراں تو اس کے دل کی راجدھانی میں

نشاط سعید

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی معیاری ماہناموں میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۱۴ | فہرست مندرجات جولائی سنہ ۱۹۴۳ء | نمبر ۱

...محمد عالم ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے عالمگیر پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر سید مٹھا بازار لاہور سے شائع کیا!

ملاحظات

گزشتہ مہینے علمی و ادبی حلقوں نے جس گرمجوشی کے ساتھ "عالمگیر" کے سالانہ نمبر کا خیر مقدم کیا وہ بہت زیادہ حوصلہ افزائی کا موجب ہوا۔ ہمیں آج کل جن ناقابل عبور دقتوں کا سامنا ہو رہا ہے وہ قارئین سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ایک طرف حکومت ہند نے اخباری کاغذ کی درآمد کے لئے عالمگیر کا "کوٹا" منظور نہیں کیا دوسری طرف کاغذ کی منڈیوں میں "بلیک مارکٹنگ" کا دور دورہ ہے کاغذ فروش اول تو کاغذ فروخت کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتے لیکن اگر وہ روپہلی ٹکلیوں کی جھنکار سے متاثر ہو جائیں تو منہ مانگے دام لئے بغیر کاغذ کا ایک تختہ بھی اپنے پُراسرار گوداموں سے باہر نہیں نکالتے۔ بعض کاغذیوں نے "کاپی سازی" کا کاروبار شروع کر رکھا ہے تاکہ قانون کے البرز شکن گرز سے بچتے ہوئے جیب کو زیادہ سے زیادہ گرم کیا جا سکے۔ پھر کاغذ فروشوں نے بازار میں اپنے گماشتے چھوڑ رکھے ہیں جن کے عرض کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ بازار میں یہ کہکر سنسنی پھیلاتے پھریں کہ کاغذ آج ہی خرید لو۔ ورنہ مستقبل قریب میں اس کا ایک پرزہ بھی نہ مل سکے گا۔ معاشیات کی زبان میں وہ ان سانڈوں Bulls کا پارٹ ادا کر رہے ہیں جو اپنی گردنیں ہمیشہ اکڑا کر رکھتے ہیں شاید انہی مشکلات و مصائب سے گھبرا کر ہمارا ایک دہلوی معاصر دم توڑنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود "عالمگیر" کا مستقبل خدا کے فضل و کرم سے بہت زیادہ روشن اور تاباں ہے۔ بھاؤ کے تیز ہونے کے باوجود عالمگیر کا سفینہ معاشی طوفان خیزیوں کا مقابلہ کرتا ہوا ساحل کامرانی کی طرف بڑھتا رہے گا۔ ہمیں امید ہے کہ معاونین عالمگیر ہماری مخلصانہ خدمات پر اعتماد رکھیں گے اور اس نازک وقت میں زیادہ سے زیادہ تعاون کا ثبوت دینگے جس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے حلقۂ احباب میں عالمگیر کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش فرمائیں اور عالمگیر بکڈپو سے علمی و ادبی مطبوعات طلب کریں کیونکہ اس شعبہ کی آمد بھی عالمگیر کے فنڈ میں جمع ہو جاتی ہے۔

زیر نظر شمارہ مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے بہت زیادہ خراج تحسین کا مستحق ہے۔ مقالات میں مولانا ظفر علی خاں کا ایک تاریخی شاہپارہ "عبری شاعری" ہے جس کے مطالعہ سے عربی ادب کا وہ دور سامنے آجاتا ہے۔ جب علم و فضیلت کے اظہار کے لئے بحث و مناظرہ سے کام لیا جاتا تھا۔ حضرت "شاہین" کا مقالہ "اردو و ہندی نزاع" مختصر ہونے کے باوجود جامع اور ٹھوس ہے۔ مولوی نور احمد خاں نے فخر میسور سلطان حیدر علی کے اصل سوانح حیات قلمبند کئے ہیں کاش اس قسم کے مضامین درسی کتب میں شامل کئے جا سکیں۔ "زہرہ کا جام" انگریزی کے شہرۂ آفاق ناول نویس رائیڈر ہیگرڈ کے ایک ناول سے ماخوذ ہے۔ ہیگرڈ کا زور قلم تاریخ کے مٹے ہوئے نقوش میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ یہ خوبی اس افسانہ میں بھی نمایاں ہے۔ "پیاس" کا پلاٹ اگرچہ احمد ندیم قاسمی کی "بگلی" سے ماخوذ ہے تاہم طرز ادا چونکہ مختلف ہے لہذا قارئین کو تند مکرر کا مزہ دے سکے گا۔ محترمہ آشا سنہلا نے ہندی کے ایک دلگداز شاہکار کا ترجمہ پیش کیا ہے امید ہے وہ آئندہ بھی اس قسم کے تراجم بھیجتی رہا کریں گی۔ "یاد نہ کر دل حزیں" جناب صابر نور محلوی نے اپنے خاص انداز میں لکھا ہے اور ہر جہت سے کامیاب ہے۔ منظومات کا حصہ بھی حسب سابق بلند پایہ اور وجد آفریں ہے۔ حضرات علی اختر، حامد اللہ افسر۔ اظہر امرتسری، نظر حیدر آبادی۔ زیب عثمانیہ، اور عروج زیدی کا کلام خاص طور پر مستحق تبریک ہے۔

ادارہ

بنسی دھر کپور اینڈ سنز

رسائل و جرائد کو کاغذ کے حصول میں جن ناقابل بیان دقتوں کا سامنا ہو رہا ہے اس کا تذکرہ ان صفحات میں بارہا ہو چکا ہے۔ حکومت ہند نے دیسی کاغذ کے "انضباطی نرخ" تو مقرر کر دیئے ہیں لیکن ان فریب کاریوں کا پردہ چاک نہیں کر سکی جن کے سہارے کاغذ کے گماشتوں نے بازار میں لوٹ مچا رکھی ہے اس فروگذاشت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کنٹرول نرخ پر تو کاغذ کا ایک شیٹ بھی دستیاب نہیں ہوتا البتہ کئی گنا قیمت پیش کرنے پر جتنا کاغذ درکار ہو بلا حیل و حجت مل جاتا ہے۔ بایں ہمہ یہ معلوم کر کے بیحد مسرت ہوئی کہ بنسی دھر کپور اینڈ سنز امرتسر ایجنٹ بنگال پیپر ملز اپنے گاہکوں کو کنٹرول نرخ پر کاغذ مہیا کر رہے ہیں اور جتنا کاغذ انہیں کارخانے سے ملتا ہے اسے "بلیک مارکیٹ" کی جنس بنانے کے بجائے ضرورتمندوں کو دیتے

(باقی بر صفحہ ۷ کالم ۲)

اخبار و افکار

پنجاب اُردو کانفرنس

پنجاب اُردو ادب اور اُردو زبان کی جو بے لوث خدمت انجام دے رہا ہے اُس کی قدر و قیمت کا احساس یو۔پی۔ بہار، اور دکن کو بھی ہے لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اُردو کو ابھی تک پنجاب میں "قومی زبان" کا درجہ عطا نہیں ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دیہات میں اُردو زبان کا خاطر خواہ پروپیگنڈا نہیں کیا گیا۔ دوسرے پنجاب یونیورسٹی اسے انگریزی کی طرح مضمون کا درجہ دینے سے ہمیشہ گریز کرتی رہی ہے۔ اب پنجاب کے چند باہمت نوجوانوں نے ان نقائص کو دور کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ چنانچہ "پنجاب اُردو کانفرنس" کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس کے سامنے فی الحال دو مقاصد ہیں اول پنجاب کے طول و عرض میں "اُردو بولو" کی تحریک شروع کی جائے تاکہ شہروں کے علاوہ دیہات کے باشندے بھی اُردو میں دلچسپی لینے لگیں دوسرے جامعہ پنجاب کے ارباب بست و کشاد پر زور دیا جائے کہ وہ ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح پنجاب یونیورسٹی میں بھی "اُردو" کو ایک باقاعدہ مضمون قرار دیں۔ ان تجاویز کی معقولیت سے چونکہ انکار نہیں ہو سکتا اس لئے ذیل میں صرف سکریٹری صاحب پنجاب اُردو کانفرنس کا گشتی مراسلہ درج کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے ہمیں امید ہے کہ حکومت پنجاب ان تجاویز پر ہمدردانہ ہوشمندی کی روشنی میں غور کریگی۔

"پنجاب اُردو کانفرنس کی مجلس منتظمہ نے کانفرنس کے انعقاد سے پہلے چند بنیادی مسائل کے متعلق اپنا کام خاموشی سے شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں کام کرنے والے اور فاضل حضرات پر مشتمل متعدد سب کمیٹیاں بنا کر پیش نظر پروگرام کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک سب کمیٹی نے "اُردو بولو" کی تحریک کا سارا ابتدائی کام سنبھال لیا ہے۔ تعلیمات کی سب کمیٹی کی طرف سے حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں ایک میمورنڈم ... پیش کیا گیا ہے کہ پنجاب میں اُردو کو اوّلین قومی زبان کا جو مسلمہ درجہ حاصل ہے وہ اسے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے عملی طور پر تسلیم کرائیں۔ ہماری یونیورسٹی اگرچہ ظاہری طور پر مشرقی علوم کی ترویج و ... سے خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ اور اس کی اساس بھی مشرقیات کے ... و ارتقا کے مقصد پر رکھی گئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ عملی طور پر مشرقی زبانوں خصوصاً اُردو کو یونیورسٹی کی وہ توجہ حاصل نہیں جس کی اس سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے۔ ملک کی متعدد یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم ایک باقاعدہ مضمون کی صورت میں ایم۔اے کے درجہ تک دی جاتی ہے لیکن ہمارے ہاں میٹریکولیشن کے بعد اس کا کوئی درجہ نہیں۔ ایم۔اے تو سرے سے غائب ہے۔ ایف۔اے اور بی۔اے میں بھی اسے ایک زاید اختیاری مضمون کی حیثیت دی گئی ہے۔ اور امتحانات میں ایک سو پچاس کی بجائے اس کے صرف پچاس نمبر رکھے گئے ہیں۔ یہ صورت حال اس صوبے کی یونیورسٹی کے لئے جہاں غیر سرکاری طور پر اُردو کی سب سے زیادہ خدمت ہو رہی ہے اگر شرمناک نہیں تو اور کیا ہے؟

وائس چانسلر صاحب کی طرف سے کمیٹی کو جو جواب وصول ہوا ہے، اگرچہ وہ بہت کچھ امید افزا نہیں۔ لیکن حوصلہ شکن بھی نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اُردو کے سب ہی خواہ اس معاملے میں متفق ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس ضروری اصلاح کے نفاذ میں کامیابی حاصل نہ ہو۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس بارے میں اپنی رائے سکریٹری پنجاب اُردو کانفرنس کو لکھ کر بھیج دیں تاکہ مناسب موقع پر اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔" پتہ۔ معرفت ادبی دنیا لاہور

بقیہ صفحہ ۶

پر تقسیم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس فرم نے کچھ کاغذ "عالمگیر" کو بھی مہیا کیا ہے۔ کاغذ کی یہ مقدار اگرچہ "عالمگیر" کی ضروریات کے مقابلہ میں بہت قلیل ہے تاہم اس افراتفری کے زمانہ میں میسرز منشی دھرکپور کی یہ کرمفرمائی بھی ہمارے انتہائی شکریئے کی مستحق ہے اور ہم میسرز منشی دھرکپور اور اُن کی شاخ لاہور کے منیجر صاحب کی خوش خلقی اور دیانتدارانہ طرز عمل کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ عالمگیر پریس جنگ سے پہلے بھی اس فرم سے کاغذ خریدتا رہا ہے اور آئندہ بھی اپنے بہترین تعاون کا یقین دلاتا ہے ہمیں امید ہے کہ میسرز منشی دھرکپور کاغذ کی تقسیم میں قدرے فراخدلی سے کام لینگے اور حسب وعدہ آئندہ کاغذ کی زیادہ مقدار عالمگیر کو بہم پہنچا کر ہمیں مزید شکریہ کا موقع دینگے۔ اس طرح اس نقصان کی کچھ تلافی ہو سکے گی۔ جو بیس سال سے باقاعدہ شایع ہونے والے رسالہ "عالمگیر" کو سرکاری کوٹا نہ ملنے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

منیجر

اشارات

کنکھیوں سے نہ مجکو دیکھ انوکھے بانکپن والے
بنا دیتے ہیں باتوں کا بتنگڑ انجمن والے

انا الحق کہہ رہے ہو شیخ لیکن جانتے بھی ہو
کھڑے ہیں گوش بر آواز ابھی دار و رسن والے

یزید و شمر ہیں خنجر بکف کربلا کا میداں ہے
نہ جانے کس جگہ سوئے پڑے ہیں پنجتن والے

نیا پیماں عدو سے باندھتے تو ہو مگر سن لو
کروگے کیا اگر کچھ کہہ اُٹھے عہدِ کہن والے

اُٹھایا کس کشمکش کو تری بیباک نظروں نے
کہ دل پر ہاتھ رکھکر چیخ اُٹھے انجمن والے

خروشِ نیل و دجلہ سے یہی آواز آتی ہے
ہلاکِ خوابِ محکومی ہیں کیوں گنگ و جمن والے

اُٹھا ہے کوئی تیری انجمن سے ڈھونڈنے جس کو
چراغِ انجمن لیکر اُٹھے ہیں انجمن والے

کھڑا ہوں شوق کی جھولی پسارے میں بھی مدت سے
کوئی پھول اس طرف بھی اے گلستان و چمن والے

قفس میں ہچکیاں آتی ہیں امواجِ صبا سے کیوں
الٰہی خیر مجکو یاد کرتے ہیں چمن والے

گرفتاری کی شب کا ماجرا مت پوچھ اے ہمدم
چمن والوں کو میں رویا مجھے روئے چمن والے

مجھے رنجِ غریبی کیا ہو اظہر جب سمجھتا ہوں
وطن میں بھی تو کہتے تھے غریب اکثر وطن والے

اظہر امرتسری

حقائق ومعارف

نوشیروان اور نعمان کا مناظرہ

عربوں نے مناظرے کے لئے جو طریقہ نکالا تھا اس کا ایک قاعدہ کلیہ یہ تھا کہ مناظر لکی نظیر لک یعنی لفظ "مناظرہ" اور "نظیر" دونوں کا مادہ ایک ہی ہے۔ لہذا اپنے حریف کو حقیر نہ جانو اور ناحق کوشی سے اس پر غالب آنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ مناظر بھی تمہاری ہی نظیر ہے۔ اس بارے میں ابن القطامی نے ایک عظیم و جلیل مناظرہ کی روایت ثبت بر تاریخ کی ہے جو عربوں کے متعلق ایران میں ہوا تھا۔

عرب کا وہ حصہ جس کا دارالملک "حیرہ" تھا ساسانی سلطنت کی سیادت اس پر سایہ فگن تھی۔ کسریٰ نوشیروان ان دنوں ایران کا شہنشاہ تھا جس کی سطوت سارے ایشیا ہی پر طاری نہ تھی بلکہ دولت و ماکو بھی اس کے سامنے سر [illegible] اور ممالک ماتحت رکھنے کی ضرورت تھی۔ ایران نے اس کے متعدد علاقے چھین لئے تھے جن کی واپسی تک اسے متوقع رہنا ضروری تھا۔

تخت گاہ ایران (مداین) میں نوشیروانی دربار منعقد ہے۔ عظمائے مملکت و امرائے سلطنت صف بستہ کھڑے ہیں۔ داخلی وفود اور خارجی سفارتیں خاص طور پر حاضر دربار ہیں۔ روما اور چین، ہندوستان اور عرب نے بھی اپنے قائم مقام بھیجے ہیں۔ جو قومیت بہ نوبت سریر نوشیروانی کو بوسہ دیتے ہیں اور مؤدبانہ انداز میں اپنے اپنے ملوک کی ہوا باندھتے ہیں۔ اپنے اپنے ممالک کی یاد خوانی کرتے ہیں۔ عرب کا قائم مقام نعمان بن منذر تاجدار حیرہ تھا جو سب سے آخر میں پیش ہوا۔ مگر سب سے اول "اگر دیر آمدم شیر آمدم" کے فلسفہ عملیہ سے اسی نے ارکان دربار کو روشناس کرایا۔ تقریر کرتے وقت اس کا بیان یہ تھا کہ قوم عرب کی حریف دنیا بھر کی قومیں تہذیب و شائستگی میں نہیں ہو سکتیں۔ یہ اتنا بڑا بول تھا کہ نوشیروان کی جلالت و جبروت کو خصوصیت سے ناگوار گزرا کہ عربوں کی تعریف اور اتنی تعریف کہ ایرانی قوم پر بھی انہیں ترجیح دی جائے۔ [illegible]

کسریٰ نے اس احساس سے نعمان کو جن لفظوں [illegible] کیا ان کا ماحصل یہ تھا۔

نعمان! قوم عرب اور دوسری قومیں میرے دائرہ اختیار سے باہر نہیں۔ دنیا بھر سے جو وفد میرے پاس آتے ہیں میں نے ان سب کے حالات دیکھے ہیں اور ان کے خصائص کو جانتا ہوں۔ کوئی قوم ایسی نہیں جس کی نسبت میری ایک خاص رائے نہ ہو۔ بصیرت نافذہ نے سریرہ تیرہ کی جانب میری رہنمائی کی ہے۔ اور میں نے رومیوں میں یہ خصوصیت پائی ہے کہ مالوف الاجتماع عظیم التسلط کثیر المدن، وثیق البنیان ہیں۔ وہ ایک مذہب بھی رکھتے ہیں جو حلال و حرام سے ممتاز کرتا ہے۔ نادانوں کی سفاہت کو بڑھنے نہیں دیتا۔ درجاہلوں کو ایک نظام کے ماتحت رکھتا ہے۔ ہندوستانی قوم بھی ان خصائص میں رومیوں کی شریک ہے۔ خصوصاً حکمت ہند، طب ہند، وسعت انہار، شیرینی اثمار، طیب اشجار، عجائب صنعت، دقت حساب، کثرت تعداد کہ ان سب میں ہندوستانی قوم کی فوقیت ناقابل انکار ہے۔ اہل چین بھی اسی منزلت کے نمایاں ہیں۔ بالخصوص چینیوں کی بکثرت دستکاریاں، شہسواریاں اور جو ہمرو یاری، آلات حرب و آہن گری میں ان کی بلند پائیگی کہ یہ باتیں ان کے مخصوصات میں ہیں۔ پھر ان کا ایک بادشاہ بھی ہے کہ انہیں مجتمع و منظم رکھتا ہے۔ عربوں میں تو کچھ بھی نہیں۔ امور دین و دنیا و نشان حشم و قوت سے خصائل محمودہ میں کوئی ایسی چیز میں نے ان میں نہیں دیکھی جو ان کی فضیلت پر دلیل ہے۔ ان میں ذلت و خواری ہے۔ وحشی جانوروں کے سرگرداں طائروں کے ساتھ ان کی بود و باش ہے۔ نقر و فاقہ میں اپنی اولاد تک قتل کر ڈالتے ہیں۔ ایک ایک کو کھا جاتا ہے اور کھائے جاتا ہے۔ دنیا کے مادہ نعیض پر یہ الوان طعام

پھٹے ہوئے ہیں مگر وہ اس منبر سے اٹھا دیئے گئے ہیں۔ زمانہ کا محل تشریفات اصناف لباس سے آراستہ ہے۔ مگر وہاں سے وہ نکال دیئے گئے ہیں۔ [illegible] روزگار ہیں کیسے کیسے شیریں ولطیف مشروبات ہیں۔ مگر [illegible] کی نوبت آتی ہے۔ تو پیالے سے لب تک منزلوں کی مسافت ہو جاتی ہے۔ تماشاگاہ [illegible] میں کیسے ملاہی ملذوذات ہیں۔ مگر کوئی ایک بھی ان کو نصیب نہیں۔ مطعومات وماکولات میں اُن کی جان اونٹ کے گوشت پر جاتی ہے اور یہ عجیب شے سب سے لذیذ مانی جاتی ہے۔ یہ وہی گوشت ہے جسے اکثر درندے بھی نہیں کھاتے کیونکہ یہ نہایت ثقیل، نہایت دیر ہضم نہایت مورث امراض ہے۔ اور یہ وہی اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں مگر عرب اس پر بھی نازاں ہیں ؎

دائم چہ خواہی کردنا	اشتر سراحی گردنا
پنبہ نخواہی خوردنا	گردن درازی می کنی

عربوں کی دناءت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ کوئی مہمان آ جائے تو رات کی بات اس کو سونے کے لئے جگہ دینے کو اہم الاعمال سمجھتے ہیں۔ اور معمولی معیار انسانیت کو بطور [illegible] شرافت پیش کرتے ہیں۔ مہمان کو اگر ایک دو نوالے کھلا دیئے تو یہی غنیمت بارد خاندان بھر کو ابد الآباد تک کے لئے [illegible] دینے کے لئے کافی ہوگی۔ تو وہ عربوں کے اشعار [illegible] اس پر گواہ ہیں۔ مرد اس پر فخر کرتے ہیں اور عورتیں اس کے گیت گاتی ہیں۔ البتہ اس [illegible] کہتے ہیں کہ دیار یمن دیار عرب کا سرمایہ دار نہیں یمن بے شک آثار و مآثر ہیں۔ زرہ و خفتان ہیں آبادیاں ہیں [illegible] ایسے امور ہیں جو بعض انسانی امور سے کسی قدر [illegible] چلتے واقع ہوئے ہیں مگر یہ وہی یمن تو ہے جس کے باشندوں [illegible] اور مملکت کی تشیید میرے جد امجد نے کی تھی اور دشمنوں سے اس کو محفوظ رکھا تھا۔ بایں ہمہ عجیب حالت ہے اور طرفہ کیفیت ہے کہ اس ذلت وقلت پر، اس فقر وفاقہ پر، اس خواری وخستگی پر لازم تو یہ تھا کہ عربوں میں سکون ہوتا، مسکنت ہوتی۔ مگر بوالعجبی تو یہ ہے کہ وہ اس پر بھی نازاں ہیں۔ اتراتے ہیں۔ انسانیت میں بھی اپنے آپ کو بڑھاتے ہیں اور بیٹھے اگلی صف میں بٹھاتے ہیں۔

نوشیرواں جب تک یہ تقریر کرتا رہا۔ نعمان بن منذر خاموش تھا۔ روئے زمین کی کسی حکومت کو فرّ وشکوہ کی نموداریوں میں ساسانیوں سے دعوائے ہمسری نہ تھی، اور نوشیرواں تو دولت ساسانیہ کا دُرّۃ التاج تھا۔ اس کی چیرگی کو دیکھنے ہو [illegible] خیرگی ہوتی، اگر عرب اس کے منہ آتے۔ نعمان کی شخصیت خود بھی کوئی بہتر نمونہ عربیت نہ تھی عجمیت اس میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ اور عجمی طمطراق کا وہ دلدادہ تھا۔ پھر بھی وہ عرب تھا۔ اگرچہ ایک کمزور عرب تھا اور عرب کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو جب قوم کے لئے بات آ پڑے گی تو سارے جہان کا زور اس کی زبان میں آجائے گا۔ نعمان کا عربی خاصۂ عزت نفس یا قبیلہ و قوم پرستی اس وقت ہر احتیاط اور دور اندیشی پر غالب آگیا۔ کسریٰ کی قہاری اُسے مرعوب نہ کرسکی۔ وہ مبہوت نہ ہوا۔ قلب میں تذبذب نہ آیا۔ اور تاجدار ایران سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اصلح اللہ الملک! جس قوم کو تجھ سا بادشاہ ملے وہ کیوں نہ سامی الفضل عظیم الخطب عزیز المنزلت [illegible] بایں ہمہ بادشاہ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے بغیر شائبۂ رد و تکذیب میرے ذہن میں ہر ایک کا جواب حاضر ہے۔ اگر ناخوش نہ ہوں تو عرض کروں"۔

کسریٰ نے اجازت دی۔ تو نعمان نے یوں تقریر شروع کی:۔

ایہا الملک! اس مناظرہ میں تیری قوم کی فضیلت و برتری موضوع بحث ومحل نظر نہیں کہ عقل وعلم میں بسط محل وایوان میں بجھبوحۂ عز وشان میں، اس قوم کے کیا کہنے جس پر تیرے آبا واجداد کی سلطنت اور تیری ولایت اور دولت کے باعث خدا کا فضل وکرم نازل ہو۔ لیکن دوسری قوموں کا تو نے تذکرہ کیا ہے ان میں سے جو قوم عرب کی قرین ومقابل قرار دی جائے تو میزان اعتبار میں اسی کا پلہ بھاری ہوگا۔ اور اہل عرب ہی بڑھ چڑھ کر نظر آئیں گے۔

کسریٰ نے پوچھا آخر کس بات میں عرب بڑھ چڑھ کے نظر آتے ہیں؟

نعمان نے کہا۔ عزت ومنعت میں، حسن وجمال میں بأس وہیبت میں، جود وسخاوت میں، حکمت لسان میں

شتت عقل ہیں۔ اُلفت وخودداری ہیں۔ پاس ووفا ہیں۔ عزت
اور منعت کا یہ عالم ہے کہ قوم عرب ہمیشہ سے نیرے اُنہی
آبائے کرام کی ہمسایہ چلی آتی ہے جو کشور گیر اور کشور شکن تھے
جہاں آباد جہاں بان تھے۔ لشکر کش اور قلعہ کشا تھے۔ یہاں
ہم عرب کی آزادی میں کوئی مزاحم نہ ہوسکا۔ کوئی اُن پر حاکم
ہونے کی طمع نہ کرسکا۔ کوئی ان سے مقصد برار نہ ہوسکا۔
پشت اسپ اُن کے قلعے ہیں۔ روئے زمین ان کا گھر ہے
آسمان ان کی چھت ہے۔ تلواریں ان کی سپر ہیں۔ ثبات و
استقلال ان کا اثاثہ ہے۔ خوش روئی اور خوش رنگی میں ہندو
چین ونسل پر عربوں کی ترجیح ظاہر ہے۔ نسب وحسب
میں غیر قوموں کا تو یہ حال ہے کہ اپنے اجداد ومورثین اور
اوائل سے ناواقف ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی سے اس کے باپ
سے کچھ ہی اوپر کی پشتوں کی نسبت سوال کیا جائے تو کوئی
صحیح جواب نہ دے سکے گا۔ بخلاف اس کے عربوں میں کون
ہے جو اپنے سارے نسب نامہ کو من اولہ الی آخرہ محفوظ نہ
رکھتا ہو۔ اسی طرح احاطۂ حساب وحفظ انساب میں کوئی ان
کا سہیم وعدیل نہیں۔ افراد نہ اپنے آپ کو غیر قوم کا بتاتے ہیں
نہ غیر خاندان سے منسوب کرتے ہیں نہ دوسروں کو اپنا باپ
بناتے ہیں۔ عربوں کی سخاوت ایسی ہے کہ ایک بہت ہی ادنیٰ
درجے کا عرب مثلاً ایک جوان اونٹنی یا ایک بوڑھا اونٹ رکھتا
ہے کہ یہی اس کا متاع حیات اور مدار کفاف ہے۔ اسباب
معیشت میں ماورا اُس کے ہر ایک بہ دنیاب وسیلے سے محروم
ہے۔ سواری، باربرداری، کھانے پینے میں سب کچھ اسی پر
انحصار ہے کہ ناگاہ شب کو ایک شخص آتا ہے اور خیمہ کا دروازہ
کھٹکھٹاتا ہے۔ یہ ایسا مہمان ہوتا ہے کہ ایک پارہ گوشت اور
آب اس کی ضیافت کے لئے کفایت کرتا ہے۔ مگر عرب
کی ہمت دیکھی ہے کہ وہ اپنا ہی اونٹ ذبح کر ڈالتا ہے اور
اس کی خاطرداری میں کہ ذکر خیر ویادگار جمیل کا باعث ہے اپنا
تمام دنیاوی اثاثہ قربان کردیتا ہے۔ حکمت لسان میں اللہ
تعالیٰ نے انہیں لطف سخن زور رونق کلام وحسن بیان وزبان
دانی ومعرفت اشیاء وضرب المثل وبلاغت وصف
واختیار عطا فرمایا ہے کہ دوسری جنس کی زبانیں زبان
عرب کے بالمقابل کچھ بھی نہیں۔ عربوں کے گھوڑے بہترین
گھوڑے ہیں۔ ان کی عورتیں عصمت وعفت میں دنیا جہان
کی عورتوں پر فائق ہیں۔ ان کی پوشاک سب سے اچھی ہے
ان کی کانیں سونے چاندی کی ہیں۔ ان کے پہاڑوں کے
کنکر پتھر خزف ریزے ہیں۔ اور اُن کے اونٹ تو ایسے ہیں
کہ نہ اس قسم کی کسی دوسری سواری پر پتھر ہوسکتا ہے اور نہ
دشت وبیابان بے سپر ہوسکتا ہے۔ عرب اپنے دین اور
شریعت کے ساتھ اس درجہ قوی تمسک واعتصام رکھتے
ہیں اور زہد ونسک میں اتنا مبالغہ کرتے ہیں کہ ان کے جینے
تک محترم ہیں۔ شہر تک محترم ہے۔ ایک محترم گھر تک موجود
ہے جس کا حج کیا جاتا ہے عبادت کی جاتی ہے۔ قربانیاں کی جاتی
ہیں اور اس گھر کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ ایک شخص دیکھتا
ہے کہ اس کے باپ بھائی کا قاتل وہاں موجود ہے۔ اور وہ
اس سے انتقام بھی لے سکتا ہے اور قتل بھی کرسکتا ہے۔
مگر اس گھر کی حرمت وکرامت اور اس مذہب کا اعزاز و
اکرام اُسے ایسا کرنے سے روک دیتا ہے۔ پاس وفا کی یہ شان
ہے کہ ایک شخص نظر بھر کے دیکھ لیتا ہے یا آنکھ سے اشارا
کردیتا ہے اور وہی عہد وپیمان ہوجاتا ہے۔ جو اس وقت تک
ٹوٹ نہیں سکتا جب تک کہ اس کی جان تک نہ جاتی رہے
ایک شخص زمین سے ایک لکڑی اٹھا لیتا ہے اور قرضدار
کے پاس اپنے قرضے میں اُسے گرو رکھ دیتا ہے۔ پھر کیا ممکن
ہے کہ قرض ادا نہ ہو۔ اور اس کے عہد میں فرق آئے۔ ایک
شخص کو خبر ملتی ہے کہ فلاں اس کے زیر سایہ آ گیا ہے۔ یہ
پناہ گیر بعض اوقات ہی دور دراز فاصلہ کا ہوتا ہے اور پناہ
دہندہ سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا۔ مگر عرب کے زیر سایہ آ
جانے کے بعد اگر کسی قبیلہ کی جانب سے اس پر حادثہ
پیش آیا تو جب تک اس قبیلہ کو فنا نہ کر ڈالے گا دم نہ
لے گا یا پھر اسی جد وجہد میں خود اس کا قبیلہ فنا ہوجائے۔
ایک مجرم جس سے کوئی سابقۂ معرفت نہیں۔ کوئی رشتہ و
قرابت نہیں۔ ارتکاب جرم کے بعد آتا ہے اور ایک عرب
کی پناہ میں آجاتا ہے۔ اب اس عرب اور اس کے خاندان
کی جان ومال اس پناہ گیر پر فدا ہوجائے گی۔ قتل اولاد کا
جو الزام عربوں پر ہے اس کی حقیقت محض اس قدر ہے کہ
کچھ لوگ تنگ دستی اور غیرت ازدواج کے باعث اپنی لڑکیاں

یہ الماکِب۔ تو نے یہ بھی کہا ہے کہ عربوں کی بہترین غذا اونٹ ہے۔ یہ سچ ہے اس لئے کہ دوسری غذائیں نہایت حقیر سمجھ کر عربوں نے ترک کر دی ہیں اور ایسی غذا پسند کی ہے جو اجل الماکل و افضل المطاعم ہے۔ انہی اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں۔ یہی کھانے کے کام آتے ہیں۔ کہ بیشتر جانوروں میں یہی کثیر اللحم طیب اللحم۔ رقیق اللبن۔ قلیل الفاظہ۔ عاد المضغ ہیں۔ اونٹ کا گوشت جس طرح کھایا اور پکایا جاتا ہے، اس خصوصیت میں کوئی دوسرا گوشت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیا عرب اس لئے قابلِ عظمت نہیں کہ ان میں ایک دوسرے کو کھلائے جاتا ہے اور وہ کسی ایسے شخص کے مطیع نہیں ہوتے جس کی سیاست ان سب کو مجتمع کر سکے؟ کسی ماہر سیاست کی اطاعت کی ضرورت تو اس قوم کو لاحق ہوتی ہے جو اپنے آپ کو ضعیف و کمزور دیکھ کر دشمنوں کے حملے سے ڈرتی ہے کہ اسے تباہ نہ کر ڈالیں اور اس کی آزادی سلب نہ کر لیں۔ اس اطاعت کی حاجتمند کوئی بڑی سلطنت ہوتی ہے جس کا کوئی ایک گھرانا کہ سب پر اس کے فضائل مرجح ہوں۔ مطاع مانا جاتا ہے۔ لوگ اپنی عنانِ اختیار اسی مطاع کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ اور اسی کے مطیع ہو جاتے ہیں۔ عربوں کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ نہ وہ ضعیف اور کمزور ہیں۔ نہ ان کی آزادی پر کوئی حملہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی فاتح ان کی شجاعت کا حریف ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ وہ سب کے سب بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔ مگر کسی کو خراج و محصول نہیں دینا چاہتے۔ بادشاہ یمن کی جو حالت بیان کی ہے اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بادشاہ کے جدِ امجد کو ایسے وقت دیارِ یمن سے تعلق پیدا ہوا تھا جبکہ اہلِ یمن کا قدیم تمدن پہلے سے موجود تھا۔ ملک منتظم۔ امر مجتمع۔ حکومت قائم۔ تہذیب مستقیم۔ بادشاہ کے دادے ایسے وقت میں آئے تو کس حال میں آئے۔ اس حال میں آئے کہ مطرود تھے، مردود تھے، مسلوب النعمت تھے ملک بدستے از رنالی کر رہے تھے۔ عرب اگر اعانت نہ کئے ہوتے۔ مدد نہ دیئے ہوتے تو معلوم نہیں دادے جان کی کیا گت بنی ہوتی اور کیا کچھ حادثہ پیش آتا۔

نعمان جب تقریر کر چکا تو کسریٰ نے مدح و تحسین کی اور شہنشاہی خلعت عطا فرمایا۔

ظفر علی خاں

"نیا ادب"

شاعر

اہلِ اسرار ہیں اور شیوۂ عام اے ساقی ۔۔۔ یہ نظامِ کہن اب بھی تو ہے خام اے ساقی
زندگی کیا ہے؟ کچھ اجزائے پریشاں سرِ خاک ۔۔۔ سازِ ہستی ہے یہی رقصِ دوام اے ساقی
عصرِ حاضر بھی ہے گم کردۂ اوہام ہنوز ۔۔۔ صبح کی آڑ میں ہے ظلمتِ شام اے ساقی
عقل اک سمت اور اک سمت صف آرا ہے خیال ۔۔۔ کس کشاکش میں ہے دُنیا کا نظام اے ساقی
اس گلستاں میں کسی کو نہیں آزادیٔ سیر ۔۔۔ عجزِ دانش نے بچھائے ہیں وہ دام اے ساقی
اب بھی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں خوشا حسنِ خیال ۔۔۔ مئے احمر کے چھلکتے ہوئے جام اے ساقی
روحِ آزاد کو اک بندِ گراں ہے ہر سانس ۔۔۔ اور آزاد ہیں دُنیا کے غلام اے ساقی
مجلس آرا ہے بعنوانِ مشیّت اب بھی ۔۔۔ وہی سلطانیٔ اندیشۂ خام اے ساقی
روپ بدلا ہے نیا عقل کی رسوائی نے ۔۔۔ اور پھر کیا ہے حقیقت کا مقام اے ساقی

خونِ مزدور سے ہیں بزمِ طرب کے جلوے
مئے ہوئی اب ترے رندوں پہ حرام اے ساقی

ساقی

شاعرِ تلخ نوا، صبح کے آثار بھی دیکھ ۔۔۔ ظلمتِ شب میں برستے ہوئے انوار بھی دیکھ
تیری فطرت میں ہے گر نکتہ سرائی کا جلال ۔۔۔ بطنِ گیتی میں جو پنہاں ہیں وہ اسرار بھی دیکھ
تو کہاں اور کہاں عقل کے ویراں خد و خال ۔۔۔ نغمۂ شوق بھی سُن، ہستیٔ کردار بھی دیکھ
چھیڑ اے مطربِ اسرار، سرودِ ازلی ۔۔۔ حسن کو انجمنِ ناز میں سرشار بھی دیکھ

ظلمتِ خاک نہیں، دیدۂ بینا کے لئے — ان حجابوں کو اُٹھا، روح کو بیدار بھی دیکھ
یہ مہکتی ہوئی کلیاں، یہ نظامِ مہ و مہر — دیکھ فطرت کی رعنائیٔ اسرار بھی دیکھ
لذتِ خوابِ نشیمن کا تصوّر کب تک — برق کو شاخِ نشیمن پہ شرر بار بھی دیکھ
نکتہ چینی ہی نہیں نغمہ سرائی کی دلیل — جو شکستہ ہیں ترے ساز میں وہ تار بھی دیکھ
شرحِ اسرارِ ازل بھی ہے بقدرِ توفیق — جنس کو نام نہ رکھ، طبعِ خریدار بھی دیکھ

کون کہتا ہے کہ با ایں ہمہ آزادیٔ سیر!
تُو پرافشانیٔ مُرغانِ گرفتار بھی دیکھ

شاعر

لفظ بے روح ہیں بے ربط بیاں اے ساقی — ناز جس پر ہے یہی ہے وہ زباں اے ساقی؟
یہ حقیقت کا تصوّر، یہ حدیثِ "اقرار" — وُہی دُنیا ہے وہی خوابِ گراں اے ساقی!
پر وہ ساز میں ہے اب مرے دل کی آواز — تلخ ہے گو مرے نغموں کی زباں اے ساقی!
پوچھ تو خاکِ گلستاں سے کبھی رازِ بہار — کون ہے اہلِ چمن کا نگراں اے ساقی
بجلیاں خرمنِ دہقاں پہ تڑپتی ہی رہیں — کون سُنتا ہے غریبوں کی فغاں اے ساقی
دیکھ افسردہ حقائق ہیں نہ اُلجھا مجھ کو — مَیں کہاں اور یہ اوہام کہاں اے ساقی
کر چکی دانشِ منزل کو بہت دن گمراہ — وہ مشیت کہ یقیں ہے نہ گماں اے ساقی
کھیل ہیں دیدۂ "بیدار" کے ایمان و یقین — وہم ہیں وہم، یہ "انوارِ نہاں" اے ساقی
رسم و آئیں پہ نہ رکھ مستی و رندی کی بناء — توڑ دے، توڑ دے ہر بندِ گراں اے ساقی

بیمِ فردا سے کروں عشرتِ امروز تباہ

[illegible] اے ساقی

ساقی

دُور پہنچی ہے زبوں کاریٔ اربابِ خرد
سازِ نو چھیڑ نہ دے پھر کوئی فطرت کا جلال
دل شاعر ہے اک آئینہ روشن، جس میں
جیسے ہوتے ہیں، نظر آتے ہیں ویسے خد و خال
زہر اس عصرِ غلامی کا ہے نبضوں میں تری
پر فشاں نزع کے عالم میں ہیں جس کے مہ و سال
جس پہ اے نکتہ سرا تھا کبھی کونین کو ناز
خاک کے مول بکی جاتی ہے وہ جنسِ کمال
وہی محفل ہے، حدیثِ مئے و مینا ہے وہی
خود تری فکر ہے بے ربطیٔ اجزا سے نڈھال
وہ بھی کیا دن تھے کہ ہر ذرّے کو تھی مہر سے لاگ
یہ بھی کیا دن ہیں کہ خود مہر کو ہے شوقِ زوال
عشرتِ سیرِ گلستاں ہے بہ اندازۂ ظرف
وہ بھی ہیں جن پہ گراں ہو نفسِ بادِ شمال
خواب ہے دہر جو دل محرمِ اسرار نہ ہو
خاک ہے حُسن، جو تشنہ نہ ہو ترا ذوقِ جمال
سازِ محنت کو نہ چھو، تار ہیں اس کے نازک
خام ہے تُو، ترے نغموں میں ابھی سُر ہے نہ تال
دیکھ وہ آتا ہے تانے ہوئے سینہ مزدور
تُو نے دیکھا بھی ہے مزدور کی سیرت کا جمال؟
تُو حوادث سے پریشان، وہ حوادث کا حریف
تجھ کو محنت سے گریز اور وہ محنت میں نہال
کروٹیں لیتی ہے ہونٹوں پہ ترے موجِ شراب
یہ ترے جینے کا انداز، وہ مزدور کا حال
غور سے دیکھ ترے دیدہ و دل پر تو نہیں
عیش و دولت کے یہ پھندے، مئے و مینا کے جال
آڑ میں حریتِ فکر کی یہ ذوقِ نشاط
ہے تو چلتی ہوئی سرمایہ پرستی کی یہ چال
ایک ذرّے کی حقیقت سے بھی آگاہ نہیں
تُو مشیت کو سمجھتا ہے کہ ہے خوابِ خیال
تُو نے خود الٹی ہے میخانۂ مشرق کی بساط
کم نہ تھا جامِ جہاں بیں سے ترا جامِ سفال

ڈھل گیا غیر کے سانچوں میں ترا حُسنِ نظر
یہی ہوتا ہے زمانے میں غلامی کا مآل!!!

علی اختر حیدرآبادی

زہرہ کا جام

یہ انگریزی کے سحر کار ناول نویس رائیڈر ہیگرڈ کے ایک ناول "بیلشزار" کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ ابتدائی حصوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سنہ ۵ قبل مسیح میں جب بابلیوں کی سازش کے نتیجہ میں شام کا بوڑھا فرمانروا ابیبال ہلاک ہوا تو اس کی نوجوان ملکہ اثاریہ بابل سے انتقام لینا چاہتی تھی مگر اُسے اپنے کمزور بازوؤں پر بھروسہ نہ تھا۔ لہٰذا وہ فرعونِ مصر سے مدد لینے کے لئے مصر پہنچی اور دریائے نیل کے کنارے خیمہ زن ہو کر اپنے پیغامبروں کو فرعون کے پاس بھیجا تاکہ اُسے اپنی آمد کی غرض سے مطلع کریں۔ اُدھر فرعون نے حالات سے آگاہ ہو کر اپنے بیٹے رموس کو ملکہ موصوف کے خیر مقدم کے لئے اس کی قیام گاہ تک بھیجا۔ یہی رموس اس قصے کا ہیرو ہے جو آپ بیتی سُنا رہا ہے۔

ملکہ اثاریہ کے پیغامبر جن میں سے ایک پہلے ہی ہماری آمد کی اطلاع دینے ملکہ کی خدمت میں روانہ ہو چکا تھا، ایک ہی گھنٹہ میں ہمیں وہاں لے پہنچے جہاں ان کی قیام گاہ کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ خیموں کا رنگ لیلیٔ شب کی طرح سیاہ تھا۔ وہ عربی خیموں کی طرح اونٹوں کی اُون سے بنے ہوئے تھے۔ وسط میں ایک سرخ اور نیلی دھاریوں والا گنبد نما شامیانہ دُور سے دکھائی دے رہا تھا۔ گنبد کی چوٹی پر ایک عجیب قسم کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کے شاہی نشان کا اگلا سرا چابک دست خیاط نے تراش کر سر کو نہ بنا دیا تھا۔ اس کے دونوں طرف سنہرے تارے منقش تھے۔ جو شب تاریک میں کرمکِ شب تاب کا سماں پیش کر رہے تھے۔

یقیناً یہ ملکہ اثاریہ کا خیمہ ہے! میں نے اندازہ لگایا۔ یہ کیسی ملکہ ہوگی؟ ایک سیاہ فام کریہہ اور کہن سالہ۔ حالانکہ میری شاہراہِ زندگی پر کسی شامی عورت کا گزر نہ ہوا تھا تاہم میرا قیاس تھا کہ شامی عورتیں بھری چہرہ اور حور تمثال ہوتی ہیں۔ میرے خیالات کی نقاشی ایک پیکرِ خوبی کا مجسمہ تیار کرنے میں مصروف تھی۔

اب ہم اونٹوں کی دو لمبی لمبی قطاروں کے بیچ سے گزر رہے تھے۔ اکثر اونٹ جگالی میں مصروف تھے۔ میں ایک عربی گھوڑے پر سوار تھا۔ اسپ تازی اس بے کیف منظر اور کثیف فضا کی تاب نہ لا سکا۔ وہ چمکا۔ بدکا اور سرپٹ ہو گیا۔ انتہائی کوشش کے باوجود بھی میں اسے باگ نہ دے سکا۔ سپاہی میری مدد کو لپکے لیکن اکثر اس کے سموں کا شکار ہو کر رہ گئے۔ دھار یار

خیمے کے سامنے پہنچتے ہی گھوڑے کی ایک ٹانگ طناب کے ساتھ اُلجھی اور وہ پیٹ کے بل زمین پر آ رہا۔ میں بھی اس کی پشت پر سے اُلٹا اور قلابازیاں کھاتا ہوا خیمے کے اندر جا پہنچا۔ ریتلی زمین ہونے کی وجہ سے میری ہڈیاں محفوظ رہیں۔ البتہ میری سانس شرابی کی طرح پھولی ہوئی تھی۔ ایک بدمست شرابی کی طرح!

میرے کانوں میں کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ نہایت شیریں آواز، جیسے مطربہ نے رباب کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ چند اور قہقہوں نے اس کی تقلید کی۔ غالباً یہ کنیزوں اور غلاموں کی داد تھی۔ یہ حرکت میری طبیعت پر سخت گراں گزری، میں ان کی تحقیر آمیز ہنسی پر انہیں متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ میں فرعونِ مصر کا سفیر ہوں اور یہ مذاق تمہارے حق میں بہتر نہ ہوگا۔

"یہ بات؟ فرمائیے کیا فرعون کے سفیر ایسے ہی اس کے حضور میں حاضر ہوا کرتے ہیں؟ جیسے . . . . . " ایک آواز نے جس میں ست . . . . . دو . . . . کہا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا "اگر وہ اونٹوں کی بدبو سے گھوڑوں کو چمکانے کے لئے اور رسیوں کا جال اُن کے گھوڑوں کو اُلجھانے کے لئے پھیلا چھوڑیں"۔

میرے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس لئے میں بیہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک صوفے پر دراز پایا۔ میرے کانوں میں ایک آواز آ رہی تھی ——— یونانی اور بابلی ... زبان میں ——— میری تیمارداری کے لئے ... رہے تھے۔

"سر کو آہستہ آہستہ اٹھاؤ۔ ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھ دو۔" سیلی آواز نے ذرا تحکمانہ انداز میں کہا: "احمق نہیں کی اکیلے تجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا کہ زخم کو جھٹکا نہیں لگنا چاہئے۔ ہٹ دور ہو مجھے اتارنے دے۔" ہاتھ ذرا احتیاط سے سینہ بند اتار لے۔ اور چھاتی برہنہ چھوڑ دے تا کہ تازہ ہوا پہنچتی رہے۔ کیسا سرخ و سپید ہے مصری کا جسم۔ اُف کتنا حسین جوان ہے۔ مر جاؤں اس پر سچا طر۔ یہ فخر کر سکتی ہے۔ یقیناً کسی معزز خاندان کا ضرور ہے۔ اگر معاملہ بگڑ گیا تو سارا بابلیوں اور خیمہ نشینوں کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ لاؤ شراب لاؤ۔ آہستہ آہستہ اس کے حلق میں ٹپکاؤ۔ اوں اوں اتنی مت ڈالو، کیا غرق کرو گی اسے بیوقوف۔ مجھے دو پیالہ۔ کیا یہ بڈھا ابھی تک نہیں آیا۔ اگر نہیں آیا تو جب آئے تو اسے کہہ دینا کہ واپس چلا جائے۔ ہمیں مجھے ایسے بے پروا طبیب کی جو اس طرح دیر لگاتا ہے۔"

میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ بلکہ یوں کہئے مجھے محسوس ہوتا تھا آنکھیں کھلتی نہیں کہ کسی کی غزالی آنکھوں کا سامنا ہوا۔ شربتی اور نرگسی آنکھیں۔ میں عمر بھر ان آنکھوں کو فراموش نہیں کر سکتا۔ پھر میں نے وہ کچھ دیکھا جو مجھے دیکھنا نہ چاہئے تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے میرے سر کو سہارا دیتے ہوئے تھی اس کی کھنچی ہوئی متبسم انشاب میری چھاتی سے چھو رہی تھی۔ بجلی کے دونوں تاروں کا آپس میں ملنا تھا کہ برقی رو نے میرے جذبات میں تلاطم برپا کر دیا۔

"میں فرعون مصر کا سفیر ہوں۔ اُس نے پیغام دیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میں نے فرعون سے پڑھا ہوا سبق دہرانا شروع کیا تھا کہ میری آواز خفیف ہو گئی۔

"خیر چھوڑو پیغام کو۔" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔ "یہ پیغام کل بھی دیا جا سکتا ہے۔ اتنی عجلت کیا ضرور ہے۔ تم یہ انگوری شراب تھوڑی سی اور پی لو اور آرام سے سو جاؤ۔"

میں نے ایک جام پیا اور سو گیا۔ شک ہے کہ میں اب خطرے سے دور نکل چکا تھا۔ یہ جام میرے لئے جام شفا ثابت ہوا۔ شراب بہت خوش ذائقہ تھی۔ اس نے میرے جسم میں حرارت پیدا کر دی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں ہر چیز کا جائزہ لینے کے قابل ہوں۔ خیمے کے جس حصے میں میں لیٹا ہوا تھا وہ غیر معمولی خوش نما اور خوبصورت تھا۔ دیواروں کے اندر کی طرف زریں چٹائیاں آویزاں تھیں۔ چٹائیاں ایسی خوبصورت تھیں کہ ان کے ساتھ ریشمیں پردے بھی حقیقت نہیں رکھتے تیز روشنی سے اُن کی چمک اور بھی دوبالا ہو گئی تھی۔ ایک جانب لکڑی کی ایک خوشنما میز پڑی تھی جس پر سونے چاندی کے ظروف جگمگا رہے تھے۔ میز کے ارد گرد آبنوس کی سفری کرسیاں قرینے سے رکھی تھیں اور ان پہ سرخ مخملی گدے گلاب اور بنفشہ کی یاد تازہ کرتے تھے۔ شامیانے کے ساتھ چاندی کے فانوسوں میں شعلے تڑپ رہے تھے جن کی روشنی سے ہر چیز جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ سب رخصت ہو گئے صرف ایک خوش وضع لڑکی جس کے گھونگریالے بالوں کو ایک زرد رنگ کا فیتہ گستاخی سے روکے ہوئے تھا۔ اب میرے پاس کھڑی تھی۔ مجھے محو خواب سمجھ کر مجھ پر ٹکٹکی غور سے دیکھا اور فوراً ہی مجھے تنہا چھوڑ کر خیمے کے کسی دوسرے حصے میں چلی گئی۔

میں کمرے میں اکیلا نرم نرم بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک سیاہ بادل پر سوار ہوں جس کے گرد زمین چکر کھا رہی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بادل کی پچھلی جانب بہت دور ایک سیاہ دیوار میں سے ایک بچہ نکلا اور دن کی روشنی میں آ گیا۔ اس کے بعد مجھے اپنی زندگی کے گزشتہ معمولی معمولی واقعات بھی یاد آنے لگے جنہیں میں بالکل بھول چکا تھا۔ مجھے اپنی ماں کے وہ الفاظ یاد آتے جو اس نے ایام طفلی میں میرے ننھے ننھے کانوں میں کہے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے نرم و گداز رخسار میری چھوٹی سی پیشانی سے مس ہو رہے تھے اور میں اس کی گود میں پڑا پوچھ رہا ہوں۔ "اماں بھلا میں کس لئے یہاں آیا تھا اور یہاں کیوں ٹھہرا ہوا ہوں؟"

وہ جواب میں کہہ رہی تھی: "مجھے معلوم نہیں میرے بچے لیکن مرنے کے بعد دیوتے تمہیں بتائیں گے کہ ایسا کیوں ہوا۔"

وقت ندی کے پانی کی طرح بہا چلا جا رہا تھا۔ ہاں میں دیکھ رہا تھا کہ ایک دریا بہہ رہا ہے جس کی لہروں پر میں اپنی زندگی کا محل تعمیر کر رہا ہوں۔ یہ محل شاخ صنوبر پر کسی پرندے کے

گھونسلے کی طرح نظر آتا تھا۔ اس کے بعد مجھے یاد آیا کہ میں گھوڑے پر سے گر گیا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ..... پھر وہی آسمان، وہی تشویش انگیز اور پریشان کن خیالات۔ بہت سی حسین چیزیں ایک ایک کر کے میرے سامنے آئیں جو آہستہ آہستہ بدنما اور بعد ازاں ڈراؤنی شکلوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ غالباً یہ میرے مستقبل کی تکلیفیں اور راحتیں تھیں جو اپنے اپنے تحائف میرے سامنے پیش کر رہی تھیں۔ پھر ایک سیاہ دیوار نظر آئی جو شب تاریک کی مانند بھیانک تھی۔ یہ یقیناً میری موت تھی۔ میں اس دیوار پر سے پھلانگ جانے کے لئے کوئی رستہ تلاش کر رہا تھا لیکن بے سود۔ میں نے حدِ نگاہ تک دیکھنا شروع کیا۔ اچانک ایک دروازہ نظر آیا۔ اس کے اندر ایک بہت بڑا شہر تھا جس میں ہزارہا مندر اور باغیچے تھے۔ ہر طرف دیوتا سیرت اور فرشتہ صورت انسان چہل قدمی کرتے دکھائی دیتے تھے۔

دفعتہً میری آنکھ کھل گئی۔ میں حیران و ششدر سوچنے لگا وہ شہر کہاں ہوگا؟ یہ کونسی دُنیا تھی؟ یہ ایک پریشان خواب تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کسی روحانی قوت نے میری پیدائش سے موت کے حالات مجھے دکھا دیئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سیاہ دیوار کے پیچھے موت کا دیوتا ہو اور یہ خوبصورت شہر میری زندگی کا آئینہ ہو۔ یہ خواب بے معنی نہ تھا کیونکہ بعد کے زمانہ نے بتا دیا کہ میرے دشمن ایک ہیبت ناک صورت بنائے میری زندگی کی راہ روکنے کے لئے میرے منتظر تھے۔

رات یقیناً نصف سے زیادہ گزر چکی تھی اور فضا میں مکمل سکوت تھا۔ ہاں "کبھی جاگتے رہو" کی صدا اس سکوت کو توڑ دیتی یا پھر کہیں دور کوئی کُتا بھونکنے لگتا جس کا جواب گیدڑ ترکی بہ ترکی دیتے تھے شمع دانوں کی بتّیاں دیواریں، دھوئیں سے دُھندلا چکی تھیں۔ اس لئے کمرے میں روشنی بھی مدہم نظر آتی تھی دفعتہً مجھے ایک انسانی سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ خوف و ہراس کی ایک لہر میرے سراپا میں رینگنے لگی اور میں چیخنے ہی کو تھا کہ مجھے ایک حسین چہرہ نظر آیا۔

"کون ہو تم؟" میں نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

ایک شیریں اور دلکش آواز نے جواب دیا "اے فرعون کے سفیر۔ شہزادے رموس! میں ہوں تمہاری میزبان اٹاریہ! جو کبھی ملکہ تھی"

"آپ اس وقت کیوں آئی ہیں ملکہ؟"

"تمہاری دیکھ بھال اور تیمارداری کے لئے، تم میرے مہمان ہو نا؟"

"یہ معمولی خدمت کسی غلام یا دایہ کے سپرد کی ہوتی خاتون"

"نہیں شہزادے۔ تمہاری نگہبانی کسی کمتر کا کام نہیں۔ اس کے علاوہ اگر آپ کے قریب کوئی روح کے حالات جاننے والا ہو تو؟"

"کیا آپ اس علم سے واقف ہیں خاتون؟"

"ہاں! یہ روحانی علم میں نے شامی ماہروں سے پڑھا ہے"

"پھر تو آپ سمجھ چکی ہوں گی خاتون! کہ میرے اور اپنی قسمت میں کیا لکھا ہے؟"

"کیوں نہیں شہزادے۔ ہماری زندگیاں ایک کتاب کی طرح مختلف ابواب پر مشتمل ہوتی ہیں جس کا پہلا باب کاتبِ تقدیر کے زرنگار قلم سے لکھا ہوتا ہے۔ اور باقی ابواب امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تیار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تمہاری زندگی ایک لمبی کہانی ہے۔ بہت لمبی جس کا کچھ حصہ دردناک بھی ہے اس وقت اتنی باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ کیونکہ اس آدھی رات کے وقت میں اکیلی تمہارے پاس آئی ہوں"۔

"تو پھر آپ کی تشریف آوری کا مطلب؟"

"پہلے تو اس لئے کہ دیکھوں تم کیسے ہو۔ تمہارے گرنے کا حادثہ بہت زیادہ تشویش ناک تھا۔ دوسرے اس لئے کہ اگر تمہاری حالت اچھی ہو تو فرعون کا پیغام سُنوں"۔

"پیغام بالکل مختصر ہے خاتون۔ وہ یہ کہ فرعون آپ کی عرضداشت کا جواب کل دیگا۔ لیکن افسوس کہ پیغام دیر میں پہنچا"

"دیر تو نہیں ہوئی رموس! پیغام اتنا مختصر ہے کہ کوئی مطلب بر آری نہیں ہو سکتی۔ دراصل بات یہ ہے کہ فرعون نے جاسوسی کا اہم کام تمہارے سپرد کیا ہے تاکہ تم جا کر اُسے میرے حالات سے مطلع کر سکو"!

جب اُس نے یہ الفاظ ادا کئے، وہ میرے قریب ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی اپنی ٹھوڑی کو ہتھیلی کا سہارا دیتے اپنی بڑی بڑی شربتی آنکھیں جو ایک شرابی کی طرح مست و بے خود تھیں میرے چہرے پر جمائے میرے دل میں اُترنے کی خاموش

کوشش کر رہی تھی لیکن میں خاموش رہا! . . . . .

"تم جواب نہیں دیتے رموس! اس لئے کہ دے نہیں سکتے، خاموش رہنا آسان ہے لیکن . . . . . لو! میں خود ہی تمہیں سب کچھ بتائے دیتی ہوں جس کے جاننے کی تمہیں خواہش ہے۔ میرا خاوند بوڑھا آنیبال مرتے وقت مجھے وصیت کر گیا تھا کہ میں بابلیوں کی یورش سے اپنے ملک کو محفوظ رکھوں۔ اسی غرض سے اس نے مجھے دیوتاؤں کی قسم دلائی تھی۔ افسوس میں اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اپنا وعدہ پورا نہ کر سکی باوجودیکہ میرے ملکی دیوتاؤں کے پجاریوں نے مجھے یہاں آنے سے منع کیا میں مصر سے امداد مانگنے یہاں چلی آئی ہوں میں جانتی ہوں کہ تنہا شامی بابل کی طاقت کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ شہزادے رموس! مجھے بتاؤ کیا تمہیں فرعون مصر، ہماری مدد کریگا؟ بس یہی ایک امید باقی ہے۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا خاتون" میں نے جواب دیا۔ "البتہ میرا خیال ہے کہ فرعون آپ کی ضرور مدد کریگا کیونکہ مصریوں کے دلوں میں بابل کے خلاف کچھ شکایات ہیں۔ آپ فرعون سے مل کر اس معاملے پر گفتگو کریں۔ میں نہیں جانتا اس کا کیا خیال ہو۔ بہرحال آپ اُسے خوش کرنے کی کوشش کریں۔"

"میں اُسے کس طرح خوش کر سکتی ہوں رموس؟ میرے پاس طلائی زیورات، جڑاؤ گہنے، اور ریشمی کپڑے ہیں۔ لیکن ایسی چیزیں اُسے خوش نہیں کر سکتیں کیونکہ اُس کے پاس مصر کی دولت موجود ہے۔ میں اُس کے ساتھ وفاداری کا وعدہ کر سکتی ہوں لیکن میرا اعادۂ وفاداری بے معنی اور عبث ہے۔ البتہ اس کا وعدہ میری رعیت کی طرف سے ہونا چاہئے تھا جو یہاں سے بہت دُور شام میں ہے۔"

"آپ کی قوم نے فرعون کے پاس بھیجنے کو نہایت موزون سفیر چنا ہے خاتون۔ فرعون حسین عورتوں کو بے حد محبت کی نظر سے دیکھتا ہے۔"

"کیا تم مجھے حسین سمجھتے ہو رموس؟" اس نے دلکش اور شیریں آواز میں دریافت کیا۔ "کیا میں واقعی حسین ہوں؟ یہی کچھ میری تسکین کا باعث ہے؟" اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کلام کو جاری رکھا۔ "کیا فائدہ اُس خوبصورتی کا جس کو سراہنے والا ہی موجود نہ ہو؟"

"میں عشق و محبت کی باتوں سے بہت کم واقف ہوں خاتون! تاہم ابھی تلاش بھی تو ختم نہیں ہوئی ہے۔"

جواب دینے سے پہلے اُس نے میری طرف غور سے دیکھا: "تم ٹھیک کہتے ہو رموس، ابھی تلاش ختم نہیں ہوئی۔"

وہ اُٹھی اور شراب کا ایک پیالہ بھر کر مجھے دیا اور خود بھی ایک جام بھرا۔ دو گھونٹ پیئے اور باقی آہستہ آہستہ زمین پر انڈیل دیا گویا دیوتاؤں کی نذر کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ میرے پاس آ کر مجھ پر اتنا جھک گئی کہ اُس کی گرم گرم سانس میری پیشانی سے ٹکرا رہی تھی شاید مجھے سُلانے کے لئے لوری تھی۔ اب وہ خیمے کے اُس حصے کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ غالباً شراب میں کوئی دوا ملا دی گئی تھی۔ کیونکہ اُس کے اس ایک ہی جام نے میرے سر اور گلے کا درد بہت ہلکا کر دیا، نیند کا غلبہ بڑھ گیا اور میں خواب میں اس حسین ملکہ کے جاذب نظر حُسن سے لُطف اندوز ہونے لگا جب مجھے جگایا گیا تو سورج کی روشنی بڑھ رہی تھی، ایک غلام جو غالباً میری بیداری کا منتظر تھا۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر فوراً باہر چلا گیا۔ اور ایک سفید ریش بوڑھے کو اپنے ساتھ لے آیا۔ بوڑھے نے ایک عجیب قسم کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔

"حضور والا!" بوڑھے نے ٹوٹی پھوٹی یونانی زبان میں کہنا شروع کیا۔ "میں شاہی طبیب ہوں اور آپ شاہی مہمان۔ افسوس میں کل شام حادثے کے وقت غیر حاضر تھا۔ وجہ یہ تھی کہ میں چند بوٹیوں کی تلاش کو چلا گیا تھا۔ وہ بوٹیاں یہاں مصر کے جنگلوں میں پیدا ہوتی ہیں، اور صرف چاند کی روشنی میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ ابھی ایک ہی گھنٹہ ہوا کہ میں واپس آیا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں حکیم صاحب!" میں نے جواب دیا۔ "آپ کو مطلوبہ بوٹیاں تو مل گئیں؟"

"جی حضور! میں بہت سی لے آیا ہوں۔ گو مجھے اُن کے نام یاد نہیں لیکن اُن کی صفات سے خوب واقف ہوں مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری مالکہ مجھ سے سخت ناراض ہیں کیونکہ آپ کے اتفاقیہ گر جانے کے وقت میں حاضر نہ تھا۔ شکر ہے کہ آپ کی صحت اب نسبتاً بہتر ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ کی گردن پر شدید زخم آیا ہے۔ ہاں! آپ کے کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔ ذرا مجھے دیکھنے کی اجازت دیجئے؟"

اُس نے ملازموں کو پکارا جنہوں نے آتے ہی میرے بستر کے گرد چند پردے کھڑے کر دیئے۔ اُس نے میرے کپڑے اُتار کر میرے جسم کا معائنہ شروع کیا۔ میری چھاتی پر جگہ جگہ کان لگا کر سنا اور میرے تمام جسم کو اپنی انگلیوں سے ٹٹول کر دیکھا۔

"ورزش سے، یا کسی دیوتا کی عنایت سے آپ نے ایسا سڈول اور مضبوط جسم پایا ہے آقا!" اُس نے کہا۔ "آپ کا بدن محبت اور جنگ، دونوں کے لئے مضبوط ہے۔ ان دو زخموں کے سوا آپ کو کوئی ضرب نہیں آئی۔ ایک یہ گردن پر اور دوسرا یہاں سر کی پچھلی جانب۔ ہڈیاں سب کی سب صحیح و سالم ہیں۔ اب آپ ذرا کھڑے ہو جائیں تاکہ میں مرہم لگا کر پٹیاں باندھ دوں۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ اُس نے زخموں کو پہلے صاف کیا۔ پھر مرہم لگا کر پٹیاں باندھ دیں۔ میں نے کپڑے پہن لئے۔ اس کے بعد مجھے میرے ساتھیوں کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ لوگ بے تابی سے میرے منتظر تھے۔ میں نے اُن کے ساتھ کھانا کھایا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے ملکہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم ملا۔ لہٰذا میں پھر اسی گنبد نما دربار یہ خیمے میں پہنچا۔ ملکہ ایک نفیس کرسی پر جلوہ فگن تھی۔ میں تعظیماً جھکا۔ ملکہ نے بھی جھک کر اس کا جواب دیا۔ اُس نے بڑی بڑی مخمور آنکھوں سے میری طرف کچھ اس طرح سے دیکھا، جیسے میں اُس کے سامنے اجنبی ہوں اور وہ مجھے پہلی بار دیکھ رہی ہے۔ میں نے اُس کے قیمتی لباس کو دیکھا جس پر اس کے دراز گیسو لہراتے ہوئے اُس کے حسین چہرے کو گھٹاؤں سے نکلتے ہوئے چاند کی طرح چمکا رہے تھے۔ اُس نے پہلے تو میرے اتفاقیہ گر جانے پر اظہارِ تاسف کیا اور کہا کہ یہ حادثہ چونکہ ملازموں کی غلطی سے ہوا ہے اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ دوسرے بتایا کہ میں حکیم سے دریافت کر چکی ہوں کہ چوٹ چنداں خطرناک نہیں ہے۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فرعون کا پیغام دیا۔ وہ مسکرائی اور کہا کہ یہ پیغام کچھ نتیجہ خیز نہیں۔ سوا اس کے کہ فرعون کے دوسرے پیغام کا یہیں انتظار کیا جائے۔ اس کے علاوہ اُس نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کرتے ہوئے کہا کہ حکیم کے مشورے کے مطابق تم ابھی سواری کرنے کے قابل نہیں ہو اس لئے تمہیں ابھی کچھ دیر یہیں قیام کرنا چاہئے۔ وہاں ٹھہرنے کی امید پا کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ کیونکہ میرا دل اس مہوش کے حسنِ دلفروز کا زیادہ سے زیادہ نظارہ کرنے کا متمنی تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے ساتھی کو جو درجے اور اعتبار کے لحاظ سے موزوں تھا دو محافظوں کے ہمراہ فرعون کی طرف پیغام دے کر بھیجا۔ جس میں عرض کیا گیا تھا کہ اتفاقیہ حادثہ ہو جانے کے باعث میں سواری کے ناقابل ہوں۔ صحت کی بحالی تک مجھے اسی جگہ قیام کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ شام ہونے سے پیشتر ہی وہ محافظ دوسرا پیغام فرعون کی طرف سے حکمنامہ لے آئے۔ جس میں مجھے ضروری اجازت دے دی گئی تھی۔ اور حکم دیا گیا تھا کہ جب میں سواری کے قابل ہو جاؤں تو ملکہ آنایہ کو بھی اپنے ساتھ دارالحکومت تھالکس لے آؤں۔

اس حکم کے مطابق میں اس فطرت کی لاڈلی کے ناز و نخرے سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک رات اور وہاں ٹھہر گیا۔ میرے آرام کے لئے ملکہ کے قریب ہی ایک خیمہ مخصوص کر دیا گیا تھا اور ساتھ ہی مطلع کر دیا گیا تھا کہ مجھے شام کا کھانا ملکہ اور اس کے درباریوں کے ساتھ کھانا ہوگا۔ شام ہوتے ہی میں دعوت پر جا پہنچا۔ دورانِ خورد و نوش میں ملکہ ہی کے ساتھ میری گفتگو رہی غالباً ملکہ کے سوا اور کوئی یونانی زبان نہ جانتا تھا۔ کھانے سے فراغت ہوئی تھی کہ ملکہ کا اشارہ پاتے ہی تمام درباری ہم دونوں کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ رات سخت گرم تھی۔ ملکہ نے کہا "اگر آپ کی مرضی ہو تو ذرا اس چٹکتی ہوئی چاندنی میں کھلی ہوا کھانے باہر چلیں۔ کسی محافظ کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ آپ یہاں بھی اتنے ہی محفوظ ہیں جتنے فرعون کے دربار میں۔"

میں نے رضامندی ظاہر کی۔ اُس نے کسی کو پکارا، دو لونڈیاں حاضر ہوئیں۔ اُس نے ایک سے کچھ کہا۔ وہ گئی اور ایک ہلکا سا چغہ لے آئی۔ اُس چغے سے ملکہ کے خوش نما لباس اور چمکدار زیورات کو اس طرح چھپا لیا جیسے مشرقی حسینہ کے حسنِ عالمتاب کو برقع ڈھانپ لیتا ہے۔ میں نے بھی ایک ہلکا سا چغہ پہن رکھا تھا۔ اب ہم خیموں کے ساتھ ساتھ پیدل جا رہے تھے۔ تھوڑی دور جا کر ایک ریت کا ٹیلہ نظر آیا جس کے پیچھے پرانے زمانے کے مندروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ یہ مندر بے حد شکستہ ہو چکے تھے۔ مندروں کی لمبی قطار کے ساتھ ساتھ دریائے نیل بل کھاتا ہوا خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ یہی نیل مصر کی سرحد قائم

ہے۔ اب ہم ٹیلے کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں لونڈیاں جو ہمارے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھیں کہیں نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں میں خاموش رہا کیونکہ میری دلی خواہش تھی کہ وہ ماہ جبین و نازنین شامی تینزی میرے ساتھ یکہ و تنہا ہو۔ ہم ایک مندر کے دروازے پر پہنچے اور اندر جانا ہی چاہتے تھے کہ ایک گیدڑ مندر سے نکل کر ایسے دوڑا جیسے شب تاریک میں اڑنے والا پرندہ سر سے گزر جاتا ہے مگر دکھائی نہیں دیتا۔ تاہم گیدڑ کا بھاگ کر نکل جانا اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ مندر میں کوئی متنفس نہیں ہے۔

مندر کے اندر پچھلی دیوار کے قریب زہرہ کا بت ایستادہ تھا۔ زہرہ کو پہچاننا کوئی مشکل بات نہیں۔ بت کے سر پر دو سینگوں کے درمیان ہلالی شکل اسے زہرہ کا بت ثابت کر رہی تھی۔ ملکہ اپنے ٹوٹے ہوئے پتھر پر جو زہرہ کے پاؤں کے قریب دیوار کے سائے میں پڑا تھا بیٹھ گئی اور مجھے اپنے پہلو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے تعمیل کی۔

"یہ کونسی دیوی ہیں؟" اس نے پوچھا "جو اپنے حسین زنانے چہرے پر حیوانوں کے سے سینگ پہنے ہوئے ہے؟"

"زہرہ محبت کی دیوی" میں نے جواب دیا "بعض لوگ انہیں دیوتاؤں کی ملکہ بھی کہتے ہیں۔"

"بہت خوب! ہر ملک میں اس دیوی کا یہی نام ہے۔ یہ دیوتاؤں اور انسانوں کی ملکہ اس ویرانے میں صدیوں سے کھڑی محبت کے جاودان ہونے کو ثابت کر رہی ہیں۔ رات کیسی خوبصورت ہے۔ دیکھو! چاند بادلوں سے گھرے ہوئے آسمان پر چمک رہا ہے۔۔ دیکھو اس کی سنہری کرنیں نیل کے بہتے ہوئے پانی پر کس طرح بچھا رہی ہیں۔ سنو! یاسمین کے پھول ہیں۔ ہم کیسی خوشگوار سرسراہٹ پیدا کر رہی ہے۔ یقیناً یہ رات زہرہ کو مرغوب ہوگی بلکہ محبوب۔۔۔۔۔۔" اچانک اس نے اپنے شاعرانہ کلام کو منقطع کر کے دریافت کیا "کچھ اپنے حالات بتاؤ شہزادہ رموس؟"

"مجھے یہ درجہ نہ دیجئے ملکہ" میں نے منع کیا "اگر کوئی سن لے کہ میں شہزادہ[1] کہلاتا ہوں تو شاید کوئی مصیبت آن پڑے

آپ بجھے نواب کہہ سکتی ہیں۔"

"یہ درجہ نے تم پایا؟" اس نے کہا "زہرہ اور ماہ کامل کے سوا ہماری گفتگو کوئی اور سن نہیں رہا۔ ہاں اب کچھ اپنی زندگی کے حالات بھی بتاؤ؟"

میں نے اسے اپنی چھوٹی سی کہانی جہاں تک فرعون اور میری ماں کے ساتھ تعلق رکھتی تھی سنا دی۔ تب اس نے کہا "لیکن تم نے نصف بات سنائی ہے رموس! جس کا دوسرا نصف حصہ ابھی باقی ہے۔ ابھی زہرہ کا حصہ باقی ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" میں نے اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لئے سر کو جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے کہ تم نے اپنی محبت کا کوئی ذکر نہیں کیا، مجھے ان کے متعلق بتاؤ جن سے تم نے اپنی زندگی میں محبت کی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ عورت کی فطرت سب سے زیادہ محبت کی باتیں اور الفت کے تذکرے پسند کرتی ہے؟"

"میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی خاتون۔"

"اگر یہ سچ ہے تو ایک محبت سے لبریز جام تمہارے اور صرف تمہارے لئے موجود ہے جس کے لبوں سے آج تک شراب نہیں چھلکی رموس! سنو! ہم دونوں اس وقت زہرہ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ اس لئے مجھے جھوٹ کہنے کی جرات نہیں ہو سکتی میں اگرچہ عمر میں تم سے بڑی ہوں لیکن میں نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی۔"

"حالانکہ آپ بیوہ ہیں؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں ایک بڈھے کی بیوہ! جس نے میرے ساتھ صرف اس لئے شادی کی تھی کہ میں ایک معزز خاندان سے ہونے کے علاوہ فہیم اور دولت مند ہوں۔ میں نے بھی رضامندی اس لئے ظاہر کر دی کہ وہ قوم کی بہتری کا خواہاں تھا۔ مگر بڑھاپے کی وجہ سے کما حقہ کام کو سرانجام نہ دے سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اس قوم کی خدمت کرنے کا موقع مل جائے گا جو بابلیوں سے بے حد نالاں تھی۔ آبیال میرے باپ کی طرح تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ ایک محبوب باپ جس کی وصیت کو پورا کرنے کے لئے میں نے یہ لمبا سفر اختیار کیا ہے تاکہ فرعون سے مدد حاصل کروں۔ مگر وہ بھی مددگار ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔"

---

[1] رموس فرعون کی ملکہ کے بطن سے نہ تھا بلکہ ایک حرم سے تھا اس لئے شہزادہ نہ کہلا سکتا تھا۔

مَیں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

"آپ بے حد حسین ہیں خاتون! یہ عالم فریب آنکھیں جو چشم آہو سے بھی زیادہ حسین ہیں۔ یہ قمری کی سی کافوری گردن نیلی نیلی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی قدرتی کھینچ تان مردوں کے مقابلہ میں قیامت ہی تو ہے۔ باوجود ان تمام صنعتوں کے شام میں آپ کو کوئی بھی ایسا لطیف فطرت نہیں ملا جو ان تشنہ آنکھوں کی پیاس بجھاتا؟"

"جب تک میرا مالک زندہ تھا، مَیں اندھی تھی اور حق زوجیت وفاداری سے ادا کرنا چاہتی تھی" اس نے جواب دیا۔

"اور کیا اب وہ حق فوت ہو گیا ہے خاتون؟"

"آہ! میں جواب دینے کے قابل نہیں۔ مَیں اب ایک ایسا خاوند تلاش کرنا چاہتی ہوں جس کی ملکہ بن کر میں اپنی آزادی کو بحال رکھ سکوں۔ عورت کے لئے شادی سے بڑھ کر کونسی غلامی ہے؟ حالانکہ مَیں محبت کرنا ضرور چاہتی ہوں کاش کہ میں حاصل کر سکوں . . . . . چلو یہاں سے چلیں۔ اب مَیں تمہارے مصر کی زہرہ کا مطلب جان گئی ہوں۔ یہ دیوی محبت کا سبق دیتی اور پیار کی طرف راغب کرتی ہے۔ مجھے اپنے دل کو روکتے روکتے عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن امنگیں ہیں کہ اُمڈتی ہوئی چلی آتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ محبت ایک ایسا زیور ہے جو انسان کی بربادی کا باعث ہو سکتا ہے۔ ہم جو کچھ بھی یہاں کر رہے ہیں۔ اچھا نہیں۔ ہم موت کے سائے میں بیٹھے ہیں۔ بربادی گھات لگائے ہوئیں گھور رہی ہے۔ آؤ چلیں کیونکہ ہم دونوں ابھی جوان ہیں۔ موت اور زہرہ کے پھندے سے آزاد . . . . . کیا تم زہرہ کو مذاق سمجھتے ہو "تم نہیں"؟

اس نے میری طرف گھومتے ہوئے اپنی خمار آگیں پلکوں کو اٹھا کر اپنی مخمور آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں جو زہرہ کے سائے میں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"مَیں نہیں جانتا" مَیں نے نیم بے ہوشی میں جواب دیا کیونکہ اس کی مست آنکھیں میرے ہوش و حواس پر قبضہ جما چکی تھیں: "کسی دیوی کے ساتھ ٹھٹھا بے حد خطرناک ہوتا ہے خاتون! خصوصاً زہرہ کے ساتھ، میرا خیال ہے کہ اب یہاں سے چلا جانا ہی دانائی ہے۔ تمہاری زلفوں کی مشک مجھے آپے سے باہر کئے دیتی ہے۔ میرا دماغ اس کشتی کی طرح ہچکولے کھا رہا ہے، جو طغیانی میں تھپیڑوں کے نرغے میں آ چکی ہو۔ زہرہ نے میرے دل کو پکڑ لیا ہے"!

"ہاں میری بھی یہی کیفیت ہے، زہرہ نے ہم دونوں کو شکار کر لیا ہے"! اُس نے شیریں مگر دھیمی آواز میں جواب دیا۔

ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور کسی فوری جذبہ کے ماتحت ہمارے ہونٹ ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہو گئے گویا ہم ایک ہی تھے۔ اس طرح ہم نے زہرہ کے مندر میں جام محبت پیا ——— !

(رائیڈر ہیگرڈ)

محمد علی قصوری

واقعات

شرف الدین سلیم علوی

جہاں کا رنگ بدلا جا رہا ہے ۔۔۔ فلک آنکھیں دکھاتا جا رہا ہے
فضائے باغ ہے کیا آج رنگیں ۔۔۔ وہ کوئی گنگناتا جا رہا ہے
خدا حافظ متاعِ جان و دل کا ۔۔۔ ہمارا گھر ہی لوٹا جا رہا ہے
تماشائی بنے ہیں اہلِ دنیا ۔۔۔ تماشا ہے کہ ہوتا جا رہا ہے
یہ بچپن ہے کہ برگِ گل سمجھ کر ۔۔۔ ہمارے دل سے کھیلا جا رہا ہے
مرا رونا نہ ٹھہرا کھیل ٹھہرا ۔۔۔ وہ ظالم مسکراتا جا رہا ہے
تری رحمت کے آگے حشر کے دن ۔۔۔ مرے عصیاں کو تولا جا رہا ہے
کہانی درد کی ان کو سنا کر
سلیم زار روتا جا رہا ہے

سُنائیں کیا؟

فردوسِ گوش ہوں مرے دل کی صدائیں کیا
آہوں کے ساز پر تمہیں نغمے سُنائیں کیا

سوزِ درونِ عشق کو اپنے مٹائیں کیا
تم نے جو دل میں آگ لگا دی بجھائیں کیا

آنکھیں ترے فراق میں آنسو بہائیں کیا
انمول موتیوں کے خزانے لُٹائیں کیا

تقلید ہو سکی نہ کسی سے کلیمؑ کی
جلوے کسی کے طور پہ بجلی گرائیں کیا

آنکھوں میں اشک، روح پریشان دل فگار
ایسے میں تم بتاؤ کہ ہم مُسکرائیں کیا

دادِ وفا کی جب کوئی امید ہی نہیں
ہم داستانِ دردِ محبّت سنائیں کیا

غم دے کے تم نے دل کو بنایا ہی غم پسند
اب ہم مسرّتوں کو گلے سے لگائیں کیا

ضبطِ فغاں کی شرط محبّت میں ہے مگر
جو حال رنگِ رخ سے عیاں ہو چھپائیں کیا

ہر شے حسین ہے ترے کیفِ جمال سے
دُنیائے رنگ و بُو میں تجھے بھول جائیں کیا

نقشہ کھنچا ہُوا ہے تری جلوہ گاہ کا
آنکھوں میں اب حسین مناظر سمائیں کیا

تکمیل جذبِ عشق کی منظور ہے ہمیں
دستِ جنوں سے جیب و گریباں بچائیں کیا

اب آ گیا ہے راہِ محبّت میں وہ مقام
گھبرا رہا ہے دل قدم آگے بڑھائیں کیا

کیوں مسلکِ خلیق کا لیں آپ امتحاں
وہ ہے وفا پرست اُسے آزمائیں کیا

خلیق برہانپوری

ادب

اردو ہندی کا نزاع

اب تک ہماری قومی پالیسی، جنگ کرانے والات میں مسلسل پسپائی کی رہی ہے۔ ہم نے عربی چھوڑی، فارسی لی، فارسی چھوڑی، اردو اختیار کی۔ اب برادران وطن کا اصرار ہے کہ اردو بھی چھوڑ دو ہندی اختیار کرو لیکن یقین کیجئے کہ اگر ہم ہندی اختیار بھی کر لیں تب بھی یہ لوگ ہم سے خوش نہیں ہوں گے۔ قرآن پاک کا فیصلہ بالکل صاف اور واضح ہے :-

ولن ترضیٰ عنک الیھود ولا النصٰریٰ حتیٰ تتبع ملتھم۔ (اور ہرگز خوش نہ ہوں گے تم سے یہودی اور نہ عیسائی جب تک تم پیروی نہ کرو ان کے دین کی) یعنی یہودی بھی تم سے کبھی رضامند ہوں گے اور نہ نصاریٰ ہی تم سے راضی ہوں گے تا وقتیکہ تم ان ہی کا مذہب اختیار نہ کرو۔ ترجمہ ڈاکٹر نذیر احمد)

اس فساد کی ابتدا ۱۸۰۰ء سے ہوئی جبکہ صاحبان نو آموز کے لئے فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ اور کالج کے منشیوں نے (خدا اُن کی روح کو شرمائے) بیٹھے بٹھائے بلا وجہ اور بغیر ضرورت یہ شوشہ چھوڑا۔ للو جی لال نے جو اردو کے زبان دان اور اردو کتابوں کے مصنف بھی تھے، اس کی بنا ڈالی۔ وہ اس طرح کہ اردو کی بعض کتابیں لے کر انہوں نے ان میں سے عربی فارسی لفظ چن چن کر الگ نکال دیئے اور ان کی جگہ سنسکرت اور ہندی کے ناموس لفظ بٹھا دیئے بس ہندی بن گئی۔ جدید ہندی کی تاریخ سے جو واقف ہیں وہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس کی ابتدا اسی طرح سے ہوئی" (خطبات عبدالحق ص ۱۱۲)

لیکن ۱۸۶۷ء سے ان اختلافات میں شدت پیدا ہو گئی بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ ہندوؤں کی اس قومی مجلس میں جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی، اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جا بجا

اس کے لئے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہو گئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں تھیں" (حیات جاوید ص ۱۴۰)

بعض حضرات کو یہ خیال ہے کہ ذرا نہ علی گڑھ یعنی سرسید مرحوم نے ذہنیت نقشیں کو کانگرس کی مخالفت کی۔ اس وجہ سے یہ جھگڑا پیدا ہوا لیکن یہ بات غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس وقت کانگرس کا کہیں وجود بھی نہ تھا۔ اس کے متعلق سرسید نے اپنی تحریروں میں جا بجا بحث کی ہے۔ خطوط سرسید میں نواب محسن الملک کے نام ایک خط ہے جو لندن سے ۲۹۔ اپریل ۱۸۷۰ء کو لکھا گیا ہے۔ اس میں سرسید لکھتے ہیں :-

"ایک اور مجھے خبر ملی ہے جس کا مجھے کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو خط فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انہوں نے سین ٹیفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اردو کے ہندی میں ہو اور ترجمہ کتب بھی ہندی میں ہو، یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار ہوا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ مسلمان علیحدہ ہو جائیں گے"۔ (خطوط سرسید ص ۶۶)

سرسید نے علی گڑھ کے تعلیمی سروے میں بھی اس نزاع پر روشنی ڈالی ہے۔

"تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح پر کوشش کریں۔ مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ

اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور شاہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے مٹا دیا جائے، اس وقت مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے پھر نہایت درستی اور اپنے تجربہ اور مشاہدین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اسی سے ہوئی۔

تہذیب کے آغوش میں وطنیت اور قومیت کا سب سے دل فریب لیکن خطرناک سبق تھا جو بھارتی حکومت کے اسکول کے جو میل جول اور مغربی تعلیم اور انگریزی آئین و دستور نے یہاں کی پائیت دی۔ اور ہندو میں وطنیت کے جذبہ کو ابھارا۔ جیسے ہی انہیں یہ برتری اور سواہی دیانند ہیرز کی تحریروں اور تقریروں سے ہندوستان وطن کے ساتھ دلی لگاؤ ہو کہ مستقر کیا اور انہوں نے اپنی ایام کا رخ ویدوں کی طرف پھیر لینے کا تہیہ کر لیا بقول علامہ مولوی عبدالحق صاحب گورو کل قائم ہوئے جن میں سنسکرت پڑھنا اور سنسکرت بولنا لازم تھا۔ ویدک زمانہ کی معاشرت کی نقل کی جانے لگی۔ ننگے پاؤں پھرنا، ایک بے سلی چادر اوڑھنا لپیٹنا جنگلوں میں رہنا، آسمان کے نیچے سونا وغیرہ قومی شعار پایا۔ اسی قومیت کے جذبے مقدس قدامت اور ماضی کے غرور اور نام نہاد نئی آزادی اور لسانی تعلیم نے اس میں نشے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ طرح طرح سے اپنی نئی حیثیت اور انفرادیت جتلانے لگے اور جس طرح ایک بے وقوف عورت نے اپنی خوبصورت انگوٹھی دکھانے کی خاطر گھر کو آگ لگا دی تھی انہوں نے بھی بنے بنائے گھر کو بگاڑنا شروع کیا۔ سب سے پہلے نزلہ اردو زبان پر گرا۔ اس کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ اسلامی عہد کی پیداوار تھی۔

لسان العصر حضرت اکبر آبادی نے خوب لکھا ہے ؎

یہ کہتے تھے اک لالۂ با وقار
کہ عربی حروف اب تو ہم پر ہیں بار
رکی ہے انہیں سے ہماری نمود
یہ مسلیں تو ثابت ہوا اپنا وجود
کہاں کا حرام اور کہاں کا حلال
بنے حضرت علی رہیں رام لال

سر انٹونی میکڈانلڈ کے عہد حکومت میں یہ آگ جو سیاسی اور معاشرتی تحریکوں کی وجہ سے دبی پڑی تھی پھر بھڑکی۔ نواب محسن الملک نے اردو کی حمایت میں پُر زور تقریر کی۔ اس تقریر کا یہ مصرع "عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" اب تک زبانوں پر چڑھا ہوا ہے لیکن نواب صاحب نے علی گڑھ کالج کو نقصان پہنچنے کے ڈر سے اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی۔ پھر مالوی جی کی شدھی اور سنگھٹن نے اس نزاع کو اور فروغ دیا۔ اپریل ۱۹۳۵ء میں مہاتما گاندھی نے "ہندی، یعنی ہندوستانی" کا شوشہ چھوڑ کر جلتی آگ پر تیل لنڈھا دیا۔ اس کے شعلے آج تک فضا میں نظر آتے ہیں۔

پروپیگنڈے کے دو بڑے اصول ہیں ایک تو یہ کہ وہ مسلسل اور متواتر کیا جائے دوسرا یہ کہ اصلی مقصد پر خوبصورت پردے ڈالے جائیں اور لوگ پردوں کے نقش و نگار کو اصلی مقصد سمجھیں۔ یہ پروپیگنڈے کے ان اصول سے ہمارے ہم وطن واقف ہیں اور انہوں نے ان پر عمل بھی کیا ہے۔ گاندھی جی کے بٹن دباتے ہی ہندو قومیت کی پوری مشین حرکت میں آ گئی۔ اور کانگریس سے لے کر سب سے نیچے ہندو جماعتیں بھی "ہندی ہندوستانی" کو فروغ دینے اور اردو کے جائز حقوق کو پامال کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ اس مسلسل اور متواتر پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہے کہ خود ہماری عقلیں سلب ہو گئیں اور بعض حضرات ہندوؤں کے اس "ہم رنگ زمین" دام میں ایسے گرفتار ہوئے کہ اپنی زبان ہی بھول گئے۔ البشیر کے پرچے اٹھا لیجئے آپ کو ہماری اردو دشمنی کا نہایت عبرت آموز نمونہ نظر آئے گا۔ "برطانی مار و جماز" "شاخت جہاں گرد کے قسم کے الفاظ" واقعات عالم" اور دوسرے عنوانات کے ذیل میں اکثر و بیشتر ملیں گے اس پرچے کے ایڈیٹر پاؤش بجنور اٹاوہ کے "سر سید" خان بہادر بشیر الدین ہیں۔ ع

فریاد سعدی از دل نا مہربان دوست

ذیل میں ہم اس اخبار کے چند فقرے نقل کرتے ہیں۔ جو ایک سرسری نظر میں جمع کر لئے ہیں۔ ع

دگر ہا شنیدستی ایں ہم شنو

"Propaganda Boom": P. 68 ۱؎

۱۷۔ فروری ۱۹۴۲ء عنوان "واقعات عالم"۔ ص ۸ "برطانی مار وجہازوں . . . نے ان پر زبردست حملہ کیا"

۱۴ مئی ۱۹۴۲ء۔ عنوان واقعات عالم ص ۸ "ہندساگر"

۱۵۔ دسمبر ۱۹۴۲ء عنوان واقعات عالم ص ۶ "شانت مہاساگر"

" " " " ص ۶ "کورل ساگر"

" " " " ص ۷ "وابیس کی کھاڑی"

۷۔ فروری ۱۹۴۳ء۔ کالم ۳ ص ۲ "جب مہاڈوں کو گرفتار کرلیا گیا . . . ۔" "ہندوستان کی اتر پچھمی سرحد کے بچاؤ کے انتظامات"

۲۔ فروری ۱۹۴۳ء کالم ۱ ص ۴ "ہندوستان کی فوجی کمان کے ایک ملے جُلے اعلان میں کہا گیا ہے"

۳۔ مارچ ۱۹۴۳ء عنوان "روئداد جلسہ خاص اٹاوہ میونسپل بورڈ اٹاوہ۔ کالم ۱ ص ۴ "بائی لاز نسبت محمد الف لاگو کردیئے گئے ہیں"

۱۸ مئی ۱۹۴۳ء کالم ۲ ص ۵ "راجدھانیوں کے . . . حلقوں میں"

۲۵ مئی ۱۹۴۳ء کالم ۱ ص ۵ "جس نے گذشتہ گریڈ میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا تھا یا گریڈ کی کسی سازش میں شریک نہیں تھا"

آج کل ہر طرف یہ شور برپا ہے کہ سادہ اور آسان زبان لکھو۔ یہ بظاہر نہایت معقول بات ہے اور مشکل سے کسی بدبخت کو اس پر اعتراض ہوگا لیکن اس شہد میں جو زہر ملا ہوا ہے اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کرسکتا۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بعض حلقوں میں ہندی کے ثقیل بھونڈے اور بے میل الفاظ بھرتی کردینا اور سپاٹ، بے جان اور بے لطف عبارت لکھنا انشاپردازی کا کمال سمجھا جاتا ہے گویا زبان اور محاورہ کی چاشنی، الفاظ کی گھلاوٹ اور فصاحت کی شیرینی کوئی چیز ہی نہ ہوئی۔ ہم سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ آسان زبان لکھو تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ آسان اور فصیح زبان لکھو بلکہ دراصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی اردو کو مسخ کرلو۔ اس کی تاریخ اور ارتقاء کی داستان مٹا ڈالو اور ہر وہ لفظ جس کا عربی اور فارسی سے علاقہ ہے اردو کے دائرہ سے خارج کردو۔ اس کے لئے ہم کسی طرح تیار نہیں۔ عربی اور فارسی چھوڑ کر ہم جس مفاہمت کی منزل پر آکر ٹھہرے ہیں اور جس کا نام اردو ہے اس سے ہم ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ اردو کتنی زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ اس کی آغوش ہر زبان کے الفاظ کے لئے کھلی ہوئی ہے بشرطیکہ اُن میں خود بھی انضمام کا مادہ ہو۔ اردو "فلاں ابن فلاں" کی قائل نہیں ہے اور نہ بہ حیثیت ترقی یافتہ زبان کے اس کی قائل ہوسکتی ہے۔ سادہ اور مشکل لکھنا حالات اور ضرورت پر منحصر ہوتا ہے کہ لکھنے والا کیا چاہتا ہے اور کس کے لئے لکھنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ مسئلہ یوں اور بھی ٹیڑھا ہے کہ آسان اور مشکل اضافی کلمے ہیں۔ ممکن ہے جو بات میرے لئے آسان ہو وہ آپ کے لئے مشکل ہو اور جو آپ کے لئے آسان ہو وہ میرے لئے مشکل ہو۔ اردو کی جڑیں عوام کی تحریکوں اور کوششوں میں ملتی ہے اس لئے اس کا تعلق کبھی بھی عوام سے منقطع نہیں ہوسکتا۔

بالفرض اگر آپ نیائے منتری نے اُن "دیگ دھندوں کی سوچی۔۔۔" کی قسم کی عبارتیں لکھنے بھی لگیں تو اس کے بعد آپ سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اس کو قرآن کے "رسم الخط" کے بجائے ناگری میں لکھئے اس لئے کہ "اکثریت" اسی کو پسند کرتی ہے ع

این رشتہ بہ انگشت نہ پیچی کہ دراز است

اردو پر ہندی کی اس معاندانہ روش سے ہمیں نقصان پہنچ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم ان حملوں کی مدافعت بھی انہیں ہتھیاروں سے کریں جو ہمارے مخالفین کے پاس ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہتھیار زنگ آلود اور پرانے ہیں اور خود ہمارے گھر میں پھوٹ ہے۔ ہمارے قومی اور سیاسی نظام میں گندے اور ٹھہرے ہوئے پانی کی بو آنے لگی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ گھر کی حالت درست نہ ہو۔

ابھی اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ شری لکھن لال چترویدی صدر ہندی ساہتیہ سمیلن ہردوار کو روپوں میں تولا گیا۔ یہ رقم ہندی ساہتیہ کی ترقی میں صرف ہوگی۔ سمیلن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ریڈیو کی زبان کے خلاف ایک وفد حکومت ہند کے انچارج محکمہ اطلاعات سے ملاقات کرے اور احتجاج کا ایک دن مقرر کرے جو تمام ہندوستان میں منایا جائے۔ اس مصنوعی زبان کے خلاف جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی جارہی ہے پروٹسٹ ہمیں کرنا چاہئے تھا لیکن ہماری سرگرمیاں "ہندساگر" کے

نماق ہی تک محدود رہیں اور برادران وطن نے گرمی سخن دکھلانے کے بجائے عملی قدم اٹھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ اب اردو ہندی کے اختلافات انتہا کو پہنچ چکے ہیں ؏

این تنگا فیست کہ تا دامن ایماں رفتست

یہ خیال کہ سمجھوتا ممکن ہے، بالکل عبث ہے۔ ہندی ہندی والوں کو مبارک، اردو اردو والوں کو۔ ہماری ہندی اور ہندی والوں سے کوئی لڑائی نہیں۔ ہم ان کا بُرا نہیں چاہتے۔ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی کے پردہ میں اردو کا گلا نہ گھونٹا جائے جیسا کہ بہار وغیرہ میں کیا جا رہا ہے۔

ہم نے اب تک اپنا وقت برادران وطن کے سمجھانے میں صرف کیا اور بتلایا کہ جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ ملکی اتحاد کے لئے نقصان دہ ہے۔ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترک میراث ہے۔ اور دونوں کے اتحاد و اختلاط کی نشانی ہے لیکن اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں۔

لہم قلوب لا یفقہون بہا ولہم اعین لا یبصرون بہا ولہم اذان لا یسمعون بہا،

یہ بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی جارحانہ معاندت ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم انجمن ترقی اردو کو مضبوط بنائیں اور اردو کے تحفظ و بقا اور نشر و ترویج و اشاعت کے لئے تمام کوششیں صرف کر دیں ؎

اے کہ آسودہ نشینی لب ساحل برخیز
کہ ترا کار بہ گرداب و نہنگ ست ہنوز

"شاہین"

اندھیرا

اُف یہ تہذیب و تمدّن کی چمکتی ہوئی رات — چاند تاروں کے یہ بے جام لرزتے ہوئے ہات
چند ہیجان سے شعلوں کو ہوا دیتے ہوئے — چند آنکھوں کو مئے ہوشربا دیتے ہوئے
دُور، ہر گام پہ بکھرے ہوئے آلام سے دُور — دُور، آغاز و خروشِ غمِ انجام سے دُور
دُور، بیواؤں کی پُر درد نواؤں سے بھی دُور — سینکڑوں ماؤں کی مجبور دُعاؤں سے بھی دُور
شب کے سناٹے میں روتی ہوئی آہوں سے بھی دُور — لاکھوں سلماؤں کی گھُلتی ہوئی باہوں سے بھی دُور
خواب میں خواب کی تعبیرِ پریشاں بن کر — کبھی رآون کبھی چنگیز کے ارماں بن کر
خونِ راحت سے بجھاتے ہوئے آلات کی بھوک — سڑتے جسموں سے مٹاتے ہوئے جذبات کی بھوک
ان گنت صدیوں کی مجبور گراں جانی پر — فکرِ انسانی کی سہمی ہوئی تابانی پر
شیطنت! ایک نئے روپ میں چھاتی ہی رہی — روشنی بن کے اندھیرے کو چھپاتی ہی رہی!

عیشِ منزل نہ سہی، قطع سفر ہی کر دے
کوئی خورشید نکل آئے سحر ہی کر دے

نظر حیدرآبادی

طرزِ جدید کا افسانہ

پیاس

اور یہ دیکھو، جوانی کی فردوسی رعنائیوں میں ڈوبا ہوا پیکرِ حیات سراپا شعر مجسم نغمہ —— پری چہرہ نسیم"۔ انجم نے پوسٹ کارڈ سائز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:۔

"معلوم ہوتا ہے صانعِ ازل نے اس کے خمیر میں خودداری کے ساتھ سنجیدگی کو بھی کوٹ کوٹ کر دیا ہے"۔

"یہ پسند نہیں" نعیم نے واپس کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر یہ دیکھو —— دستِ سیمیں کی مخروطی انگلیوں میں سرخ گلاب کا شگفتہ پھول اور ریلی آنکھوں میں جوانی کا خمار —— نرگس کی شاخ کی طرح لچکیلی کمر"۔ انجم نے دوسری تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ بھی پسند نہیں —— اس کی آنکھوں سے وفا مفقود ہے"۔ نعیم نے جواب دیا۔

"ہا ہا ہا —— ملائک فریبِ حُسن کا نادر شاہکار"۔ انجم بولا "کافر جمال حسینہ سیتا دیوی۔ یہ تو تم کو پسند ہونی ہی چاہئیے نخلِ زیبت کی نوزائیدہ شاخ کی طرح نازک اور عطرِ مدارِ حسینہ کی خمدار زلفوں کی طرح ملائم ——"

"مجھے یہ بھی پسند نہیں انجم"! نعیم بولا "خود زندگی کا بوجھ جسے گراں معلوم ہو وہ محبت کا بار کیونکر اُٹھا سکتی ہے —— میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ تم مجھے یہ تصویریں نہ دکھایا کرو۔ نہ معلوم کیوں مجھے ان کے دیکھنے سے اُلجھن سی ہونے لگتی ہے ایک موہوم سی خواہش میرے دل میں پیدا ہوتی ہے اور میں پہروں اس مبہم جذبہ کی اہمیت پر غور کرتا رہتا ہوں لیکن پھر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔

"بے وقوف نعیم"، انجم نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ "نہ معلوم تم کس قسم کے گاؤدی انسان ہو۔ بہارِ جوانی کی یہ حسین کلیاں جب تمہیں پسند نہیں تو دنیا میں رہنے کا بھی تم کوئی حق نہیں رکھتے۔ کیا تمہیں اب بھی، وہ سردی کی یہ طویل اور بھیانک راتیں گذارنے میں بھی کوفت محسوس نہیں ہوتی؟ جوان ہوتے ہوئے بھی جوانی کی غرض و غایت سے بے خبر ہو، جانتے ہو قدرت کا قانون اٹل ہوتا ہے؟ جوانی کے چاروں طرف جو یہ جلوے، رنگینیاں، کیف اور سرمستیاں بکھری پڑی ہیں۔ ان کا لمس ہی حیاتِ انسانی میں انقلاب کے شرارے پھونک دیتا ہے۔ انہیں چھو کر تو دیکھو تمہاری متانت خود تمہیں کسی انمول شے کے حصول کی طرف راغب کر دے گی، اور تم اپنا طائرِ خیال کسی ایسی فضا میں محوِ پرواز پاؤ گے، جہاں شباب کی دیوی جوانی کے دیوتا کے سامنے سرنگوں ہو رہی ہے۔ بہت دور وہ دیکھو شفق کی گلگوں تابش میں دوشیزۂ فطرت اپنی تمام جلوہ سامانیوں سے مرصع ہو کر تمہیں دعوتِ نظارہ دے رہی ہے"!

نعیم نے بالکل غیر شعوری طور پر سامنے کی طرف دیکھا۔ جہاں شاہ بلوط کے گرد بن بوس درختوں کے اس طرف گرجا کا سنہرا کلس نظر آ رہا تھا اور شام کے سرمئی دھندلکے میں شاما کا جوڑا ایچی پر بیٹھا ہوا محوِ اختلاط تھا۔

اُسے یوں محسوس ہوا جیسے واقعی افق پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں اسے کسی خاص زبان میں کوئی خوشگوار پیغام دے رہی ہیں۔ ایسے الفاظ میں جن کی لطافت وہ محسوس تو کر رہا تھا لیکن سمجھ نہیں سکتا تھا۔ کیوں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض اوقات دل میں ایک تیز —— بہت ہی تیز ہیجان سا اُٹھتا ہے —— شریانوں میں تیز تیز خون دوڑنے لگتا ہے، اور کبھی کبھی اسے اپنی زندگی میں کسی خاص جزو کی کمی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ پھر اُس نے اپنے دماغ پر کافی زور دے کر سوچنا شروع کیا کہ ایسا کب ہوتا ہے ——؟

اس کا جواب بھی اسے فوراً مل گیا کل جب وہ اپنے ماموں ٹھیکیدار کے کارخانے میں یونہی بلا مقصد چلا گیا تو وہاں اُس نے بالکریوں کی بہت سی حسین اور لڑکیوں کو کام کرتے دیکھا تھا۔ اینٹ، گارا، چونا اور کنکریٹ کے تودوں کے درمیان

ان کی محبوس زندگی پروان چڑھ رہی تھی۔ انہی میں چودہ پندرہ برس کی ایک چھوکری بھی تھی — منجری — آفتاب کی تمازت سے اس کے رخسار تمتماتے رہتے تھے۔ جب اس نے جھکی جھکی اور دبی دبی نظروں سے نعیم کی طرف دیکھا تھا تو اُس کے دماغ میں بہت سی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں اور اُس کی قریب قریب ایسی ہی حالت ہوگئی تھی جس کے متعلق وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

وہ پھر سوچنے لگ گیا کہ ایسا تو پہلے کبھی نہ ہوتا تھا۔ پچھلے چند مہینے سے اس میں یہ تغیر ہو رہا تھا۔ وہ کیسی ہی حسین یا خوبصورت شے دیکھتا پہلے اس کے تاثرات دیرپا نہ ہونے تھے۔ راہ چلتے سکول جاتے یا کبھی کبھی چہل قدمی کرتے ہوئے جب وہ مال پر سے گزرتا تو وہاں اُسے کئی خوبصورت چہرے نظر آتے "ایونگ آف پیرس" کی خوشبو اُس کے مشامِ جان کو معطر کر دیتی۔ نمانہ وو نہ میں لپٹے ہوئے چہروں کی مسکراہٹوں میں اور ملبوسات کی لطیف سرسراہٹوں میں پہلے اُس کے لئے کوئی کشش نہ تھی۔ کوئی جاذبیت نہ تھی۔ وہ پہلے اگر کبھی دیکھتا تھا تو محض ایک غیر شعوری جذبہ کے ماتحت۔ اور اس قسم کے کیف زا مناظر اس کے بحرِ تخیل کی ساکت و جامد سطح پر جذبات کی لہریں پیدا نہ کرتے تھے۔ لیکن اب —— ہاں اب بتدریج اس میں ایک نمایاں تبدیلی ہونے لگی تھی۔ بھرپور شباب سے تمتماتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر اس کے دماغ کی وسعتوں میں آندھی چلنے لگتی۔ طوفان رونما ہونے سے جو کیفیت سمندر کی سطح پر رونما ہوتی ہے وہی اس کی بھی ہو جاتی۔ اس کے من ساگر میں بھی جوار بھاٹا آ جاتا اور وہ سوچنے لگتا تھا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے، وہ کئی دن سے اس فلسفہ میں اُلجھا ہوا تھا لیکن یہ گتھی سلجھ نہ سکی تھی —— آج بالکل غیر ارادی طور پر اس حقیقت کا انکشاف انجم کی زبان سے ہو رہا تھا اس کے نزدیک یہ بہت ہی راز کی بات تھی جو انجم کی زبان سے نکل گئی تھی۔ جوان ہوتے ہوئے بھی جوانی کی غرض و غایت سے بے پرواہ ہو، وہ پھر سوچنے لگا کہ آیا وہ جوان ہو رہا ہے۔ سینہ کا خالی گوشت سے بھرتا جا رہا تھا۔ ٹھوڑی کے نیچے کا روآں بڑھنا شروع ہو گیا تھا کئی چھوٹے چھوٹے سیاہ بال اُگ آئے تھے پیشانی اُبھر آئی تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا تھا کہ زندگی میں روز بروز کچھ کمی ہوتی جا رہی ہے ایسی کمی جسے پورا کرنے کے لئے اُسے زبردست قربانی کرنا پڑے گی۔ سنہری بچپن کی قربانی —— زمین گول ہے —— وہ پھر سوچنے لگا کہ آیا فی الواقع جوان ہو رہا ہوں ——؟

"یہ تمہاری خاموشی تمہیں مجذوب نہ بنا دے"۔ انجم نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا "کسی تالاب میں پانی کا مستقل قیام اُسے متعفن کر دیتا ہے۔ زندگی بھی ایک تالاب ہے۔ بہتا ہوا رواں دواں تالاب۔ اس میں بھی لہریں اُٹھتی ہیں۔ موجوں کا زیر و بم اس کی سطح کو متزلزل کر دیتا ہے۔ اور وہ پھر سکون آشنا ہو جاتا ہے۔ یہی زندگی کا فلسفہ ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ ایک راز ہے۔ قدرت کا راز"

"سب کچھ سہی، لیکن میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں"

انجم نے مختصر جواب دیا۔

"پھر بھی ——"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ زندگی کے مختصر وقفہ کو کرب میں نہیں طرب میں بسر کرنا چاہئے"

"یہ بات ہے"

"ہاں"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ان کے قہقہوں کی آوازیں بتدریج فضا میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی غائب ہوگئیں۔ اور نعیم کا سر خود بخود جھک گیا۔ گویا وہ اثبات میں جواب دے رہا ہو۔

"جاؤ تمہیں نماز کو دیر ہو رہی ہے"! انجم نے طنزیہ لہجہ میں کہا اور نعیم چونک سا پڑا۔ جیسے وہ گہری نیند سے چونک پڑا ہو اس نے سر اٹھا کر دیکھا، شام ہو چکی تھی۔ دن کا سعادت مند فرزند مادرِ شب کی آغوش میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا اور نیلے آسمان پر کوئی کوئی ستارا ٹمٹما رہا تھا۔

"اور تم ——" نعیم بولا۔

"مجبوری —— مجھے جانا بھی کافی دور ہے۔ اچھا —— اجازت"

انجم کے چلے جانے کے بعد نعیم بہت دیر تک سوچتا رہا اس کے خیالوں کی لامحدود وسعتوں میں صحرائی حسن کی چنگاریاں

اڑاتی ہوئی سی محسوس ہونے لگیں منجری کے بوسیدہ لباس اور گرد آلود بالوں نے اس کے تخیل میں قوس قزح کی سی رنگینیاں پیدا کر دیں۔ اسے اپنے کمرے کی دیواریں تھمتی ہوئی سی محسوس ہونے لگیں یہ اندیشہ کہ وہ ان میں پس کر رہ جائیگا لیکن ایک نامعلوم سرور کے خمار نے اس کی پلکیں بوجھل کر دیں اور وہ نیند کی گود میں سرنگوں ہو گیا۔

آج نیند میں بھی اسے عجیب و غریب خواب نظر آتے رہے فردوسِ حسن کے شاہکار اپنی جنبشوں اور کیف آگیں نظر کنوں سے اس کے جذبات میں ہل چل مچاتے رہے۔ شباب سے مدہوش دوشیزاؤں کی [illegible] مسکراہٹیں اس کے سکون قلب کو مضطرب کرتی رہیں [illegible] متناسب اعضا، [illegible] اس کے تخیل کو محصور کئے رہیں —— وہ تمام رات ایسے ہی خوابوں کے جزیرے کی سیر کرتا رہا۔ اور جب صبح بیدار ہوا تو اس کے دل میں کئی ایسی امنگیں پیدا ہو رہی تھیں جن کو سمجھنے سے وہ خود بھی قاصر تھا۔ قلب کی دھڑکن حدِ اعتدال سے گزرتی ہوئی محسوس ہوئی —— وہ ایک خمار آلود انگڑائی لیتا ہوا اٹھ بیٹھا:

جب وہ تبدیل لباس کے بعد سنگار میز کے قریب آیا تو بہت دیر تک ملبوسات کی شکنیں درست کرتا رہا۔ سر کے بال سنوارنے میں بھی اس نے کافی کاوش سے کام لیا اور جب کوٹھی سے نکل کر صدر دروازہ سے گزر کر سڑک پر آیا تو سورج اپنی چوتھائی مسافت طے کر چکا تھا۔ سرما کی دھوپ خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ اسے تمام رات خوابوں میں نظر آنے والے خوبصورت چہرے خوشنما موٹروں میں ادھر ادھر گزرتے ہوئے بھٹکتے تھے۔ سڑک پر کافی چہل پہل تھی۔ یکایک اس کے قریب ایک تانگہ تیزی سے گزر گیا اور شوخ عنابی کامدانی کی ساری کا آنچل ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر تانگہ میں بیٹھی دوشیزہ کی طرف دیکھا لیکن اس نے حقارت سے اپنا منہ پھیر لیا۔ نعیم کو ایسا محسوس ہوا کہ عینک کے دونوں شیشے گرد آلود ہو گئے ہیں جن میں سے صاف طور سے نظر نہیں آ سکتی۔ اس نے اپنے رومال سے دونوں شیشے صاف کئے، دکانوں کو ہوتے سامنے مکان کے لامتناہی سلسلہ پر نظر ڈالی۔ چھتوں پر نہ معلوم کس قدر کنواریاں دھوپ سینک رہی

ہوں گی، ایک کھڑکی کھلی اور ایک خوبصورت چہرے نے سر باہر نکالا اور نعیم سے نگاہ ملتے ہی کھڑکی کو زور سے بند کر لیا۔ افق کے کنارے پھر سمٹنے شروع ہو گئے اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ دلدل میں پھنسا ہوا ایک غلیظ سنگریزہ ہے جس کے چاروں طرف بدبودار کیچڑ لپٹی ہوئی ہے۔

اسے بہت دنوں پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا اور اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ بہت دن پہلے جب وہ کمسن ہی تھا اس کے چھوٹے چچا پڑوس کی ایک لڑکی سے محبت کرتے تھے اور ایک مرتبہ شام کے دھندلکے میں اس نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب دیکھا تھا۔ کئی سال پہلے کے واقعہ نے اس کے سازِ حیات کے خاموش تاروں کو ایکدم جھنجھوڑ دیا اور ان میں سے متعدد نغمے بیکبارگی پھوٹ نکلے۔ اس کی روح گونج اٹھی اور جسم میں ایک سرور انگیز جھنجھناہٹ پیدا ہو کر غائب ہو گئی۔ اس نے چلتے چلتے ایک جھرجھری لی۔ اب وہ کافی دور نکل آیا تھا بارہ بج چکے تھے۔ اور مسلسل تین گھنٹے تک بغیر کسی جگہ آرام کئے چلتا رہا۔ اس طویل سفر کے احساس سے اس کی پنڈلیوں میں کھچاوٹ سی محسوس ہونے لگی اور وہ آرام کی غرض سے شاہراہ سے کترا کر سامنے والے باغیچہ کی طرف چل دیا۔

دھیرے دھیرے چلتے ہوئے وہ سرسبز مرغزار میں پہنچ گیا۔ ہری ہری دھوپ سورج کی استوار کرنوں کے انعکاس سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ ایک فرلانگ کے فاصلہ پر نہر گنگناتی بہہ رہی تھی اور مچھلی کے کئی شکاری ایکھ کے کھیتوں کے اُس پار بیٹھے ہوئے شکار کھیل رہے تھے۔ وہ بھی میونسپلٹی کی ایک بنچ پر جو سیرگاہ میں مختلف زاویوں پر لگائی گئی تھیں سستانے کے لئے بیٹھ گیا۔

یکایک اسے چوڑیوں کے بجنے کی لطیف جھنکار سنائی دی، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا یاسمن کی جھاڑیوں کے پیچھے ایک گندمی رنگ کی لڑکی گھاس کھود رہی تھی۔ بیضوی چہرہ، تمتماتے ہوئے رخسار، سڈول بازو، بکھرے ہوئے بال اور افلاس کے تلخ تجربہ سے متاثر آنکھیں جھجکی جھجکی دبی دبی آنکھیں گھاس چھیلنے کے لئے جب کھرپے کو ایک خفیف جھٹکے سے زمین کے سینہ پر چلاتی تو خود بھی جھوم جاتی۔ سرخ سوزی کی

میل خوری گھگھری، جھینٹ کی انگیا اور زرد رنگ کے کسی موٹے کپڑے کی ملگجی اوڑھنی جو سر سے بار بار پھسل جاتی تھی۔ جب تھوڑی سی گھاس چھیل کر نا شپانی کی جڑ میں جہاں اور بھی گھاس جمع تھی ڈالنے کے لئے اُٹھتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی انگیا کے تمام بند ٹوٹ جائیں گے اور جب پھر گھاس چھیلنے کے لئے بیٹھتی تو وہ پھول سی جاتی، وہ اسے ٹھیک کر پھر چھیلنے کے لئے بیٹھ جاتی اور اس کی چوڑی چوڑی نیلی پیلی چوڑیوں کی جھنکار میں پھر فردوسی نغمے کی گونج پیدا ہو جاتی۔

نعیم کے تمام خیالات منتشر ہو گئے جو خواب اس کو آج کل کی راتوں میں سلسلہ وار نظر آ رہے تھے اُس کی ایک تعبیر ملنے لگی وہ سیرگاہ کی تنہائی کو بُری طرح محسوس کرنے لگا، اور جب لڑکی نے اسی کی بنچ کی طرف کا رخ کیا تو وہ سراسیمہ ہو گیا اُس کے دماغ میں عجیب عجیب بے ہنگم راگ گونج اُٹھے کسی جو سفر کارواں کی طرح اُس کے دماغ میں لاتعداد گھنٹیاں بجنے لگیں، اور جب لڑکی اسی کے قدموں کے پاس بیٹھ کر، اس بنچ کے نیچے رکھی ہوئی مٹی کی ٹھلیا میں سے آبخورے میں پانی انڈیل کر پینے لگی تو اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ سینہ میں چنگاریاں سی اُٹھنے لگیں اور حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ پوری ٹھلیا میں پانی دیکھ کر اُسے شدت سے پیاس محسوس ہونے لگی اُس نے کافی کوشش کے بعد مدھم لہجہ میں کہا۔

"تھوڑا سا پانی ہمیں بھی پلا دو۔"

"کھارا ہے ہو بابو جی!" لڑکی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ اور نعیم کو ایسا محسوس ہوا کہ حسین رقاصاؤں نے کوئی کیف زا نغمہ چھیڑ کر دیا ہے۔

"چُلو سے پی لوں گا" اُس نے جواب دیا اور ہاتھ کا چُلو بناتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جب وہ پانی پلانے کے لئے ٹھلیا کو دونوں ہاتھوں کے سہارے اُٹھا کر جھکی تو کائنات اُس کی طرف جھکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے گندمی رخساروں پر خون کی سرخی جھلکنے لگی اور انگیا — انگیا ضرورت سے زیادہ تن گئی۔ پانی کا پہلا گھونٹ نعیم کے حلق سے اُترا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ پانی کی جگہ آبِ حیات پی رہا ہے ٹھلیا نصف سے زیادہ ختم ہو گئی تھی لیکن اس کی تشنگی دور نہ ہوئی تھی وہ اس ٹھنڈے پانی کا ایک ایک گھونٹ کوثر و تسنیم کے جرعات سمجھ کر پیتا رہا۔ اور جب وہ تین چوتھائی پانی پی چکا، تو لڑکی خود ہی رکتے ہوئی بولی:-

"جا دہ جل نہ پیو بابو جی!"

وہ لڑکی کے الفاظ سے چونک سا پڑا، اس نے ہاتھ روکتے ہوئے اس جان چھوکری کی طرف دیکھا۔ گھاس کے چند تنکے اس کی زلفوں میں اٹک رہے تھے اور نیم کا ایک خشک پتہ اپنی شاخ سے جدا ہو کر اُس کے داہنے رخسار کے قریب بالوں میں لرز رہا تھا۔

"تم کہاں رہتی ہو لڑکی؟" نعیم نے استفسار کیا۔

"وہ موتی گپھا میں" لڑکی بولی۔ "جہاں گوتے منڈلاوت ہیں وہیں ہماری جھونپڑی ہے۔ ماتا پرلوک سدھار گئی ہیں اور بابو وہاں رہتے ہیں۔"

"تمہارے باپو کام نہیں کرتے؟" نعیم نے بات کو طول دینے کے لئے دریافت کیا۔

"اس باغ کی دیکھ بھال تمہی کو کرنا پڑتی ہے کیا؟"

"کرنے کا ہے ناہیں" وہ لجاتے ہوئے بولی "کام کاج تو وہی کرتے ہیں۔ پرنتو آج دامو کی ایک بوتل پی کر وہ مدہوش پڑے ہیں۔ میں گھاس چھیلنے کے لئے آئی ہوں۔ کچھ پیسے مل ہی جائیں گے۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"روپا!"

نعیم کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس نے روپا نہیں روپ وتی کہا ہے اور دادی اماں سے کہانیوں میں سُنی ہوئی پریاں اس کی آنکھوں میں ناچ رہی ہیں، وہ بولا:-

"کیا کرو گی تم پیسوں کا؟"

"پیسے تو بہت کام آوت ہیں۔" وہ جذباتی لہجہ میں بولی۔

"دسہرے کے دن شنو تھیل کے ہاتھ میں کانسی کے کنگن دیکھ کر جب میں نے باپو سے ویسے ہی لانے کو کہا تھا تو وہ بولے تھے روپا! یہ سب پیسے کی مایا ہے اور ہمارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں — پیسے؟ پیسے تو سب ہی کام آوت ہیں چمکتے ہوئے کنگن بھی تو پیسوں ہی سے آتے ہیں نا؟"

"اوہ — اب میں سمجھا!" نعیم نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو گویا تم گھاس کے پیسوں سے کنگن خریدنا چاہتی ہو —" بول

"ہاں باپوجی!" اس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔
"تو پھر ایک بات بتاؤں تمہیں؟"
"ہاں!"
"شہر میں میری کنگنوں کی بہت بڑی دکان ہے تمہیں بہت اچھے کنگن لا دوں گا۔"
"شوبھا سے بھی زیادہ چمکیلے!"
"ہاں شوبھا سے بھی زیادہ چمکدار ـــــ ذرا دکھاؤ تو نہی ہاتھ!"

لڑکی نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور جب نعیم نے اپنا صاف نازک ہاتھ اُس کے میلے ہاتھ پر رکھا تو اس کے تمام بدن میں برقیاں سی چلنے لگیں۔ ناک کے نتھنے تیزی سے پھڑکنے لگے پیشانی پر بہت سی رگیں ایک ساتھ اُبھر آئیں۔ اور شاید لڑکی کے جسم میں بھی بجلی سی دوڑ گئی۔ خنک ہوا کے باوجود پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پر عود کر آئے۔ نعیم کا ہاتھ جب بازو کلائی تک اور کلائی سے واپس بازو تک پھسلتا چلا جاتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ فرشتوں نے جنت کی سب سے لطیف لذت کو اُس کے گرد آلود ہاتھ کے لمس میں چھپا رکھا ہے۔ روپا سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ سانس تیزی سے آ جا رہا تھا یکایک کسی جنگلی جانور کے بھاگنے سے پتوں کی آواز سن کر وہ چونک پڑی اور بولی:۔
"بھری دوپہر میں اگر کوئی ہمیں دیکھ پائے تو؟"
"ہاں ـــــ تو پھر شام کو!"
"ہوں ـــــ رات کو!"
"آؤ گی نا؟"
"ہاں!"
"نہیں!"
"اچھا!"
"روپا" اُس کے بوڑھے باپ نے اُسے پکارا اور وہ موسم بہار کے پھولوں پر منڈلاتی ہوئی تتلی کی طرح تھرکتی ہوئی چلی گئی۔

سمندر کی سطح پر طوفان آنے سے پہلے جو کیفیت ہوتی ہے وہی تمام دن نعیم کے دل کی بھی ہوتی رہی۔ ایک مبہم انتشار اور خفیف اضطراب کی مخلوط کیفیت اس پر طاری رہی۔ شام کو جب آفتاب کی آخری کرن افق مغرب کے جگر میں ڈوب گئی اور پرندے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹنے لگے تو نعیم تبدیل لباس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کافی دیر تک وہ بالوں کو ترتیب دے کر لباس کی شکنیں درست کرتا رہا اور جب کافی جھٹپٹا ہو گیا تو اُس نے کوئی خوشبودار تیز روح رومال میں جذب کر کے کوٹ کے کالر کی نیچے والی جیب میں رکھا اور ہلکے نیلے رنگ کے کاغذ میں لپٹے ہوئے کانچ کے کنگن اُس نے اندر کی جیب میں محفوظ کر لئے پھر وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا برآمدہ میں آیا جہاں اُسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا ـــــ باورچی خانہ میں بنّی ماما کی خانساماں سے ہنس کر بولنے کی آواز آ رہی تھی اور چوکیدار کے چھپر میں سرسوں کے تیل کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔

ایک گھنٹہ کے بعد جب نعیم پارک کے دروازے پر سائیکل سے اترا تو کافی تاریکی پھیل چکی تھی۔ وہ شاہراہ کو نظر انداز کر کے گلاب کی جھاڑیوں اور ملکۂ شب کی روش پر سے ہوتا ہوا اس بنچ کے نزدیک پہنچ گیا جس کا تصور اُسے دوپہر سے گھیرے ہوئے تھا۔ یہاں بیٹھ کر اُس کے دل میں ایک عجیب سا جذبہ پیدا ہوا اور اُس کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا دماغ نصف گھنٹہ تک شاعرانہ بنا رہا۔ اور جب فلک کی رو سے ایک ستارہ ٹوٹ کر اور کائنات کے ظلمت کدہ پر مبہم پر تو ڈالتا ہوا منزل حیات کی طرف روانہ ہوا تو اُسے پشت کی جانب چند خشک پتے چٹکتے ہوئے محسوس ہوئے اور جب اُس نے مڑ کر دیکھا تو شکستہ ستارے کی روشنی میں روپا چلی آ رہی تھی۔ اس کا دل پھیلنا شروع ہوا۔ اور اُسے خود اپنے دل کی موجودہ گنجائش تنگ محسوس ہونے لگی تنفس کی رفتار تیز ہو گئی اور بدن پر چیونٹیاں زیادہ تیزی سے رینگنے لگیں۔
"آ گئیں روپا!" اُس نے قدرے مدھم لہجہ میں کہا۔
"اور تم بھی!" روپا نے آہستہ سے جواب دیا۔
"لائے ہو کنگن؟"
"ہاں ـــــ لو خود ہی جیب میں سے نکال لو!"
اور روپا جب اس کی جیب میں سے کنگن نکالنے کو جھکی، تو اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اُس کے بوڑھے باپ کے اگائے ہوئے سب پھولوں کی خوشبو ایک دم اس کی ناک کی راہ سے دماغ میں سما گئی ہے، اور جب اس نے کنگن کی جوڑی کو کاغذ میں سے نکال کر دیکھا تو وہ خوشی سے نیم بے خود ہو کر بولی:۔

"کیا قیمت ہے ان کی؟"

"کچھ نہیں" نعیم بولا "جا سے ہی ہاں تو بنتے ہیں۔ کچھ قیمت نہیں ہے روپا!"

"سچ"

"ہاں ——— سچ"

"تم کتنے دیالو ہو بابو!"

نعیم جواب میں صرف مسکرایا ——— اور بولا:۔

"آؤ کچھ دیر باتیں کریں ——— چنبیلی کی وہ روش جہاں تم دوپہر گھاس چھیل رہی تھی صاف ہے نا؟"

"ہاں"

"آؤ۔ وہیں باتیں کریں گے!"

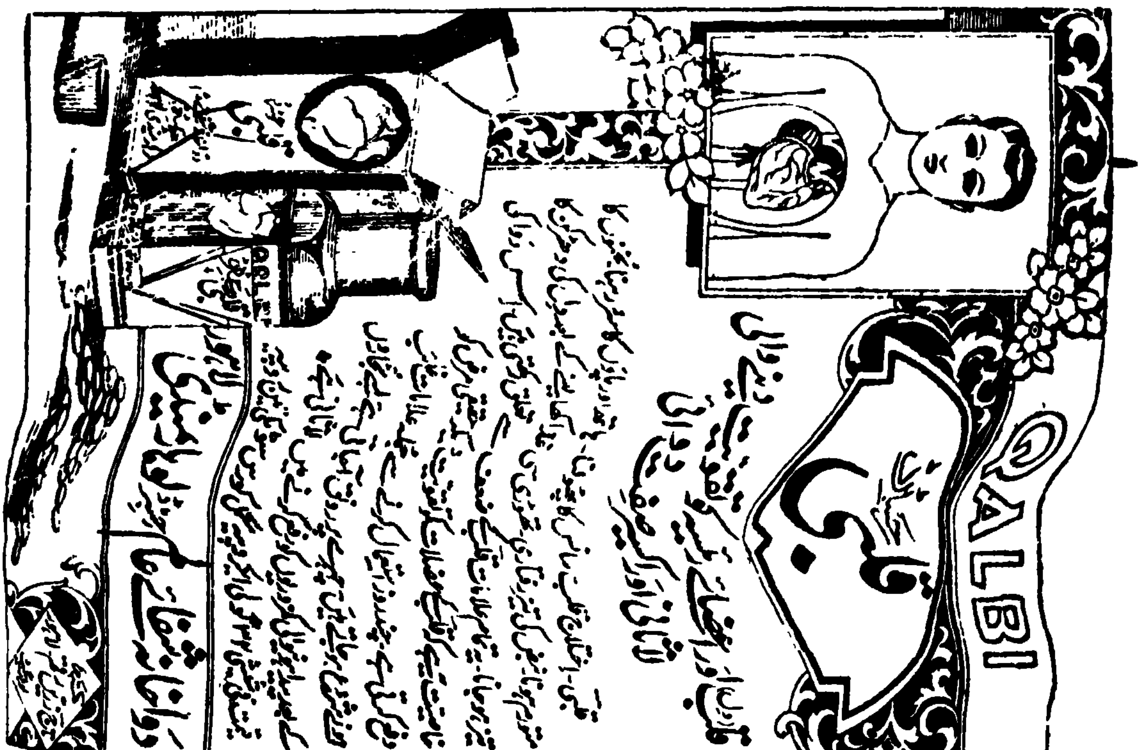
دونوں پودوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔

کچھ دیر بعد جب روپا شکست اور مضمحل رفتار سے اپنی جھونپڑی کی طرف روانہ ہوئی تو اُس کے اعضاء میں تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ بال بکھر گئے تھے۔ ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرنے کے باوجود خشکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور بوجھل پلکوں پر کچھ آنسو آ کر جم گئے تھے۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ جا رہی تھی ——— یکایک شاہ بلوط کے درخت پر کوئی پرند پھڑپھڑایا اور جب اُس نے درخت کی سب سے بلند چوٹی پر گھونسلا لینے کے لئے سر اٹھایا تو اس کی نگاہیں بالکل غیر ارادی طور پر سڑک کے موڑ پر لگے ہوئے بجلی کے ایک کھمبے پر پڑ گئیں جس کے سامنے سے ایک سائیکل تیزی سے دوڑی جا رہی تھی۔

(پلاٹ ماخوذ)

حمید صحرائی (میرٹھ)

بہترین کتابیں منگانے کیلئے ہمیشہ عالمگیر بکڈپو کو خط لکھئے



عروج کلام

اُٹھے اگر تو مر کے اُٹھینگے یہاں سے ہم   یہ عہد کر چکے ہیں ترے آسماں سے ہم
تنگ آ گئے ہیں کوشش ضبطِ فغاں سے ہم -   ٹکرا نہ دیں زمیں کو کہیں آسماں سے ہم
لایا ہے رشکِ غیر ہمیں اُس مقام پر   خود اپنی ذات سے بھی ہیں کچھ بدگماں سے ہم
کب تک شبِ فراق ان کو گنا کریں   تارے ہی توڑ لائیں نہ کیوں آسماں سے ہم
افسوس اُس کے دل میں بھی قدرِ وفا نہیں -   جس کے لئے بُرے ہوئے سارے جہاں سے ہم
ہم جانتے ہیں حاصلِ کون و مکاں تجھے   مانگیں گے تجھ کو مالکِ کون و مکاں سے ہم
پھولوں پہ منحصر ہے نہ کلیوں پہ منحصر -   رکھتے ہیں ربط و ضبط بھرے گلستاں سے ہم
اِس سادگی کی داد کوئی مہربان دے   امیدِ لطف رکھتے ہیں نامہرباں سے ہم
یارانِ قافلہ تو رفاقت نہ کر سکے   اب کھیلتے ہیں گردِ پسِ کارواں سے ہم

اعداء کی کوششوں سے مٹے گی نہ یہ عروج
رکھتے ہیں عشق خدمتِ اردو زباں سے ہم

عروج زیدی بدایونی

سوانح

سلطان حیدر علی!

اپنی قسمت پہ تو اے میسور بیحد ناز کر   خاک سے اٹھا ہے تیری اک فخر روزگار

سلطان حیدر علی میر فتح علی قلعدار بالاپور کا لڑکا تھا۔ ابھی چار سال کا معصوم بچہ ہی تھا کہ باپ صوبیداروں کی خانہ جنگی میں مارا گیا۔ سنتے قلعدار کو اس کے خاندان سے دشمنی تھی۔ اس نے میر صاحب کے گھر کا تمام سامان لوٹ لیا۔ یہاں تک اٹھا۔ ہ ہزار روپے بقایا کا مطالبہ کیا۔ حیدر علی کی دکھیا ماں نے ہزار کوشش کی لیکن یہ گراں بہا رقم دیتا نہ کر سکی جس پر سنگ دل قلعدار نے حیدر علی اور اس کے حسن بھائی کو دو بڑے بڑے نقاروں میں بند کر کے اوپر سے چمڑا منڈھوا دیا اور حکم دیا کہ جب تک بقایا وصول نہ ہو یہ لڑکے اسی طرح بند رہیں اور نوبت خانے پر رکھوا کر خوب زور سے بجائے جائیں۔

نقارے کی قید۔ خدا کی قدرت ننھی سی جان ماں کی گود سے نکلی تو نقارے کی آغوش نصیب ہوئی۔ اور پھر دیر سے تاپڑ توپ کی جگر خراش صدا۔ دنیا دیکھتی تھی اور جگر تھام کے رہ جاتی تھی۔ ادھر ماں کا جگر پاش پاش ہو رہا تھا عین اس وقت جبکہ ناظورہ عالم میں یہ ظالمانہ کارروائی ہو رہی تھی۔ اوپر آسمان پر تقدیر بیٹھی مسکرا رہی تھی کہ حیدر علی کا نقارے میں بند ہو کر اس کی پر ہول اور گونج دار آواز کا سننا اس کے لئے سزا نہیں بلکہ تربیت گاہ ہے۔ ایک وقت ایسا آئیگا کہ اگر ایک طرف اس کے نقارے کی چوٹ سے پونا کے در و دیوار ہل جائیں گے تو دوسری طرف خلیج بنگالہ کی لہروں میں ارتعاش پیدا ہو جائے گا۔ الغرض قلعدار کے اس ظلم کا چرچا جب مشہور ہوا تو ارکاٹ کے ایک ساہوکار نے روپیہ ادا کر کے ان دونوں بھائیوں کو چھڑا لیا اور سرنگاپٹم میں ان کے چچازاد بھائی حیدر صاحب کے پاس بھیج دیا۔ وہ میسور ریاست کی پیادہ فوج کے سپہ سالار تھے۔ انہوں نے اپنے ان بھتیجوں کی بڑی محبت سے پرورش کی اور سپہ گری کے سارے ڈھنگ سکھائے۔ ان میسور کے راجہ نے مشرقی راجاؤں پر حملہ کر کے اکثر علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور اُن کے بندوبست کے لئے اُسے قابل آدمیوں کی ضرورت تھی۔ حیدر صاحب نے موقعہ پا کر حیدر علی کو وزیر اعظم سے ملایا۔ نیک دل وزیر نے جوہر قابل دیکھ کر اُسے رسالدار کے طور پر فوج میں بھرتی کر لیا۔ جہاں اُس نے اتنی ترقی کی کہ میسور کی فوج کا سپہ سالار بن گیا۔

میسور کی حکمرانی۔ ۱۷۵۳ء میں میسور کے راجہ نے اپنی نادانی سے نندراج جیسے وفادار اور قابل وزیر اعظم کو ملازمت سے ہٹا دیا اور اس کی جگہ کھانڈے راؤ نام ایک برہمن کو اپنا وزیر بنایا۔ یہ ایک چالاک آدمی تھا اور حیدر علی کے طفیل اس منصب پر پہنچا تھا۔ بجائے اس کے کہ اپنے محسن کے پاؤں دھو دھو کر پیتا۔ الٹا اس کے درپے ہو گیا۔ اور راجہ کو ورغلا کر حیدر علی کو مٹانے کے لئے مرہٹوں کو بلا بھیجا۔ چنانچہ عین اُس وقت جب حیدر علی اپنے محل میں بے خبر سوتا تھا ساٹھ ہزار مرہٹوں کا لشکر جرار سرنگاپٹم کے قریب آ پہنچا۔ حیدر علی نے راتوں رات اپنا سامان لدوا کر آنی کل کی سرحد میں پہنچوا دیا۔ اور وہاں سے لشکر تیار کر کے مرہٹوں اور کھانڈے راؤ کو شکست دی۔ پھر سرنگاپٹم پہنچ کر راجہ کو تخت سے اتار کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور راجہ اور رانیوں کے لئے بیش بہا وظیفہ مقرر کر دیا۔

ف۱ سلطان حیدر علی سے پہلے سلطنت میسور صرف ۳۳ قریوں پر مشتمل تھی۔ سلطان نے وسعت دے کر اس کا رقبہ اسی ہزار میل سے بھی زائد کر دیا اور اس سلطنت میں ریاست میسور کی حیثیت ایک جاگیر دار کی سی رہ گئی (باقی اگلے صفحہ پر)

مرہٹوں کے حملے ۔ سلطان نے ریاست کے اندرونی انتظامات سے فارغ ہوکر سرحد کی طرف توجہ کی اور سابق راجہ کی کمزوری سے جو علاقے مرہٹوں نے لے لئے تھے۔ اس نے لڑجھگڑ کر واپس لینے شروع کئے مرہٹوں نے کئی بار بڑی طاقت سے حملے کئے لیکن صورت حال یہ رہی کہ جب مرہٹوں کی فوج کسی سپہ سالار کی ماتحتی میں آتی تو انہیں سلطان کی فوج سے شکست کھانا پڑتی ۔ چنانچہ گوپال راؤ نے مرتبہ میسور پر حملہ آور ہوا ۔ منہ کی کھائی لیکن جب مادھو راؤ اپنی پوری قوت سے ادھر کا رخ کرتا بالعموم سلطان کو ناکامی ہوتی ۔ کیونکہ اتنے بڑے لشکر سے احمد شاہ ابدالی ایسا بادشاہ جیسے جرنیل نوٹ سکتے تھے ۔ مگر بیس پچیس ہزار فوج کا مالک حیدر علی مقابلہ نہ کرسکتا تھا ۔ ۱۷۶۳ء میں مادھو راؤ نے جب میسور پر حملہ کیا تو اس کے لشکر کی تفصیل یہ ہے ۔

مرہٹے ۔ ایک لاکھ سوار ۔ پنڈارے ساٹھ ہزار ۔ اور سوار ۔ دکنی ۔ پچاس ہزار تفنگ انداز ۔ ایک بڑا توپ خانہ بھی اس کے ہمرکاب تھا ۔ اس کثرت کے باوجود سلطان حیدر علی اس ثابت قدمی سے اپنی بہادری کے جوہر دکھاتا کہ پیشوا کی فوج سراسیمہ ہوجاتی تھی ۔ کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ سلطان کی قواعددان اور جان نثار فوج نے ایسا توڑ

دار حملہ کیا کہ لاکھوں کی سپاہ بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگ کر دامن کوہ میں جاچھپی ۔ مگر چونکہ جمعیت بہت زیادہ ہوتی تھی ۔ اس لئے سلطان اکثر اوقات تاوان جنگ ادا کر کے صلح کرلیتا تھا ۔

انگریزوں کے حملے ۔ اب تک سلطان حیدر علی نے انگریزوں سے جنگ نہ کی تھی ۔ اور وہ خواہ مخواہ اُن کی دشمنی خریدنا نہ چاہتا تھا لیکن ۱۷۶۷ء میں نظام کی تحریک سے سلطان کے ملک بالاگھاٹ پر انگریز چڑھ آئے ۔ لیکن شیر دل سلطان نے انہیں بُری طرح پسپا کیا جس پر اُنہوں نے چودہ لاکھ روپیہ دے کر صلح کرلی ۔ ۱۷۸۰ء میں نظام اور مرہٹوں نے مل کر پھر سلطان پر حملہ کیا ۔ مگر اس دفعہ بھی سلطان کو فتح ہوئی اور دس لاکھ روپے سے صلح کرلی ۔

۱۱۹۴ھ میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ ہوکر نظام اور مرہٹوں نے سلطان کو انگریزوں سے جنگ کرنے پر اکسایا ۔ مگر جب یہ منچلا جرنیل میدان میں نکلا تو وہ دونوں پیچھے ہٹ گئے ۔ ارکاٹ کے مقام پر کرنیل بیلی صاحب سے مقابلہ ہوا جس میں سلطان کو فتح ہوئی ۔ اور کرنیل بیلی زندہ گرفتار ۔ جنرل کوٹ نے کلکتہ سے آکر سلطان پر بڑی سرعت سے حملے کئے مگر کچھ بگاڑ نہ سکے ۔ آخر کار جنرل کوٹ نے سنواس راؤ کی معرفت سلطان کو صلح کا پیغام بھیجا جسے تاوان جنگ کے بعد فوراً قبول کرلیا گیا ۔ اور سلطان نے اُسی وقت اپنی تلوار میان میں بند کر کے ملازم کے حوالے کی کہ غلاف کر کے اسلحہ خانہ میں رکھ دی جائے اور خود ارکاٹ کا قلعہ خالی کرکے واپس میسور کو چلا آیا ۔

جنرل سمتھ کا حملہ ۔ یہاں تو جنرل کوٹ اور نواب کے درمیان صلح اور دوستی کے قول و قرار ہوئے ۔ اُدھر کلکتہ میں کمپنی نے فرانسیسیوں سے اعلان جنگ کردیا اور اُن کی کوٹھیاں گرادیں چنانچہ جب یہ حکم مدراس پہنچا تو گورنر مدراس نے بھی پانڈیچری پر حملہ کر کے فرانسیسیوں کی تمام کوٹھیاں گرادیں ۔ گورنر پانڈیچری

حاشیہ صفحہ ۳۶) جس پر سلطان نگراں رہا ۔ راجہ از دمناسب اسی طرح قائم رہے جس طرح پہلے تھے کے موقعہ پر راجہ کا جلوس اسی شان و شوکت سے نکالا اور اس تقریب پر راجہ جو دربار منعقد کرتا ۔ اس میں ن کی طرف سے بھی نذر گزاری جاتی تھی ۔ سلطان کے الکل آسان تھا کہ اس ریاست کا نام و نشان مٹا بحیثیت مسلمان ہونے کے اُنہوں نے احسان کا ن ہی سے دیا ۔ اور اسی سلوک کا نتیجہ ہے کہ آج خاندان تخت میسور پر حکمران ہے ۔ مگر آج کل کی حکمت کیا جائے کہ مؤرخین تعصب اور طلب منفعت کا حیدر علی کو غاصب سلطنت کہہ رہے ہیں ۔
(از سلطنت خداداد صفحہ ۲۳)

[1] فاسدے از مندراج رسیدہ ۔ خدائے داند کہ جز باچہ گفت اما گورنر و جمیع اصحاب انگلشیہ کلکتہ را تشویشے بوظاہر گشت و در فکر تخمیس زیدہ از دو آراستن لشکر و جنرل کوٹ را مکلف رفتن بمندراج شدند ۔ و از بنگالیان مالدار فریب بہاب کرورد روپیہ قرض سودی گرفتند (۱۶ ۸ سیر المتاخرین)

نے بھاگ کر سلطان کے ہاں پناہ لی۔ شرافت مجسم سلطان نے اپنے مہمانِ عزیز نے گورنر مدراس کو سفارشی خطوط لکھے۔ مگر گورنر مدراس نے لکھ بھیجا کہ "آپ کو اس بات میں دخل دینے کا کچھ حق نہیں"۔ اس سے سلطان کی غیرت کا خون کھول اٹھا۔ اور وہ بگولے کی طرح پھلچری پہنچا اور فرانسیسی گورنر کا تمام مال اور اسباب اُسے واپس دلا دیا۔

کونسل نے برہم ہو کر جنرل سمتھ کو اس مہم پر روانہ کیا۔ اُس نے آتے ہی سلطان کے غیر محفوظ قلعے فتح کر لئے۔ سلطان نے نظام کو امداد کے لئے پکارا اور اپنے بہادر فرزند ٹیپو سلطان کو پانچ ہزار فوج کے ساتھ مدراس پر حملہ کرنے کو بھیجا جس نے جاتے ہی مدراس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ادھر نظام اور سلطان کی فوجوں نے مل کر جنرل سمتھ پر حملہ کیا۔ جب انگریزی فوج کو بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے پوری قوت سے نظام کے لشکر پر حملہ کر دیا جسے وہ سنبھال نہ سکا۔ اور اس کا لشکر بدحواس ہو کر بھاگ اُٹھا۔ لیکن سلطان نہ صرف خود ثابت قدمی سے جما رہا۔ بلکہ اس نے نظام کی فوج کو بھی مستقل مزاجی سے دوبارہ جمع کر لیا اور جو سامان نظام میدانِ جنگ میں چھوڑ گیا تھا وہ اُس کے پاس بھجوا دیا۔

دوسرے دن سلطان اپنے لشکر کو لے کر نظام کی جگہ آ کھڑا ہوا۔ مگر جنرل سمتھ کا نشان تک نہ تھا اور وہ اسی بر لشتے نامِ ظفرمندی پر قناعت کر کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اب اُس نے چاروں طرف ہرکارے دوڑا کر یہ مشہور کیا کہ سلطان کو شکست ہوئی۔ اور اُسے اتنا نقصان ہوا۔ سلطان کی بوڑھی ماں جو بیدنگر میں اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہی تھی بیٹے کی اس فرضی شکست کی داستان سُن کر مضطرب ہو گئی اور چار سو میل کا فاصلہ چند دن میں طے کر کے سلطانی لشکر کے قریب آ پہنچی۔

سلطان کو علم ہوا تو محبت سے جی بھر آیا۔ فوراً اپنے شہزادوں کو ہمراہ لے کر استقبال کو نکلا۔ تین میل کے وسیع میدان میں فوج بھی پیشوائی کے لئے صف بندی کر کے کھڑی ہوئی۔ ماں نے اپنے اُس نیچے کا جسے زیر تقا یا ادا نہ کرنے پر نقاروں میں بند ہونا پڑا تھا۔ یہ جاہ و جلال دیکھ کر سر سجدے میں رکھ دیا۔ اور بیٹے پوتوں کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ سلطان اپنے شہزادوں سمیت والدہ کے جلو میں روانہ ہوا۔ جب سواری لشکر کے قریب پہنچی تو اس نے فوجی مجرا ادا کیا اور توپیں سر ہوئیں چونکہ لڑائی کا موقعہ تھا۔ اس لئے بیگم صاحبہ دو دن ٹھہر کر واپس تشریف لے گئیں۔

منگلور کی مہم سلطان ادھر لڑائی میں مصروف تھا۔ اُدھر بمبئی کی انگریزی فوجوں نے موقعہ پا کر منگلور پر ہاتھ صاف کر لیا۔ شہزادہ ٹیپو سلطان جوانی کی ترنگ میں یلغار کرتا ہوا منگلور پہنچا۔ اور مختلف صوبوں سے فوج جمع کر کے شہر پر حملہ بول دیا۔ سلطان کو ولی عہد کی روانگی کی اطلاع ہوئی تو بھی ساٹھ میل یومیہ کے حساب سے کوچ کرتا ہوا اُس وقت یہاں پہنچا، جبکہ شہزادہ شہر کو فتح کر چکا تھا۔ باپ کو صرف ان تین باتوں میں

میں آیا — موقعہ دیکھا — میدان مار لیا

ساری رام کہانی بیان کر دی۔ یہ سن کر اولوالعزم باپ نے بہادر فرزند کو گلے سے لگا لیا اور دیر تک چمٹائے رکھا پھر اس خوشی میں بیٹے پر سے زر و جواہر تصدق کئے۔ مسکینوں اور محتاجوں کو کھانا کھلایا۔ اور فوج کو شاباش۔ نیز ایک ماہ کی تنخواہ انعام میں دی۔

صلح کا فرمان۔ اس سے ایک سال بعد اگرچہ طرفین میں جنگیں ہوتی رہیں مگر کسی کا کوئی خاص نقصان نہ ہوا۔ مدراس سے جو رپورٹ ولایت کو جاتی تھی۔ اُس میں یہی لکھا جاتا تھا کہ اب ہم فتح کرتے ہیں یا اب یہ فوائد حاصل ہونے والے ہیں۔ مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا۔ اس لئے کمپنی کے دانا سرپرستوں نے مسٹر ڈیری کو صلح کا یہ فرمان دے کر ہندوستان روانہ کیا کہ

"مدراس کے گورنر اور کونسلیوں کو واجب اور
لازم ہے کہ نواب حیدر علی خاں کے ساتھ دوستی
اور آشتی کی بنا قائم کریں اور اس کی شرائط صلح
مان لی جائیں"۔

چنانچہ مسٹر ڈیری نے مدراس پہنچتے ہی ایک وکیل کو پیغامِ صلح دے کر سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔ سلطان نے جواب دیا کہ محض نامہ و پیام سے کام نہیں چلے گا۔ میں خود وہیں آتا ہوں۔ وہیں عہدنامہ لکھیں گے۔ پھر اپنی بھاری توپوں، سامانِ جنگ اور پیدل سپاہیوں کو تو اس نے پیچھے واپس کر دیا اور خود ستاسی برس کی عمر میں بانکے ترچھے جوان سپاہی کی طرح یلغار کرتا ہوا ایک سو تیس میل کا سفر طے

...ن دن میں طے کرکے دفعتہً مدراس جا پہنچا اور کونسل مدراس ...ہلا بھیجا کہ اب جو شرطیں طے کرتا ہوں کرلی جائیں۔ کونسل کے مسٹر ڈیپری اور مسٹر بوشیر کو وکیل بنا کر بھیجا۔ ...ب اُن سے کمال اخلاق اور محبت سے پیش آیا۔ اور ان ...ئط پر صلح کرلی کہ "جو ملک فریقین نے فتح کیا ہے واپس ...دیا جائے اور فریقین میں سے کسی پر کوئی حملہ کرے تو ...را فریق اس کی مدد کرے"

کمپنی بہادر نے ۱۵ اپریل ۱۷۶۹ء کو صلح ہوجانے پر ایک ...وپ والا سلطان کے نذر کیا۔ اور گورنر مدراس نے عمدہ ...ن پیش کئے۔ ادھر سے بھی ان کو قیمتی سامان اور ...بہا جواہرات عنایت کئے گئے۔ اور انگلستان تک ...ح کا اعلان ہوگیا۔

...ر علی مدراس کے قلعہ کی خاطر شاید سب نہیں جانتا ...ہے کہ فوج ما برائے سہ چار ہزار گز زمین رائگاں ...نے تواں داد۔ اگر حق تعالے مدد ما نماید دو انگلیش ...شدند تا چند درین قلعہ خواہد بود (سیر المتاخرین ص۔۔)

...ر علی نے اپنی فتح کی یادگار مدراس میں اس طرح چھوڑی ...کے حکم سے انگریزوں نے ایک کتبہ قلعہ سینٹ جارج ...زے پر لگایا جس میں بتلایا گیا کہ گورنر مدراس اور ...نسل حیدر علی کے آگے دو زانو ہوئے بیٹھے ہیں۔ اور ...ایک ممبر کی ناک جو ہاتھی کی سونڈ کے مشابہ بتلائی گئی ...ھینچ رہے ہیں جس میں سے اشرفیاں گر رہی ہیں۔ ...ایک طرف صلحنامہ ہاتھ میں لئے ہوئے اپنی تلوار ...ہاہے (از مسٹر الفریڈ لائل)

...ریخ ہند ماتم کر رہی ہے کہ باوجود اس جنگی فراست ...کے حیدر علی نے ایک ایسی فاش غلطی کی جس کے ...ہندوستان مستقل اور مستعبد کی زندگی بسر کر رہا ہے ...کا عہدنامہ لکھا نہ جاتا تو ہندوستان کی تاریخ آج ...ی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارنامے داستان ...یادہ حیثیت نہ رکھتے۔ بہرکیف حیدر علی نے زندہ ...رہنے دو کے مقولہ پر عمل کرکے اپنی سچی اسلامی ...دنہ دنیا کے آگے پیش کر دیا (سلطنت خداداد ص۔۔)

مرہٹوں کی جنگ ۱۷۷۱ء

۱۷۷۱ء میں مرہٹوں کی ایک بڑی فوج گوپال راؤ کی سپہ سالاری میں میسور پر چڑھ آئی۔ سلطان نے اقرارنامہ کے بموجب گورنر مدراس سے امداد مانگی۔ مگر وہاں پر جوں تک نہ رینگی۔ نظام بھی وقت پر امداد سے کترا گیا۔ اس لئے سلطان نے محض اپنی قوت بازو کے بھروسے پر دشمن سے ٹکر لی اور اُسے شکست فاش دی۔ دوسرے سال مادھو راؤ پیشوا خود ٹڈی دل لشکر لے کر ملک میں آگھسا۔ لیکن سلطان کی اقبال مندی نے یہاں بھی اپنا کام کیا اور پیشوا اور اس کا لشکر بیمار پڑگیا جس سے پیشوا جولائی ۱۷۷۲ء میں صلح کرکے واپس لوٹ گیا۔ اب سلطان نے انگریزوں کی دوستی سے مایوس ہوکر فرانسیسیوں سے صلح کرلی اور اُن کے تعاون سے ہر طرح سے اپنی فوج کو آراستہ کرلیا۔ اور انتقام لینے کی غرض سے بہت سے ندی نالے عبور کرتا ہوا کرناٹک کے میدان میں گھس گیا اور دریائے کرشنا سے کاویری تک کے تمام علاقے کو روند ڈالا۔ کرنیل بیلی اپنی فوج لے کر شمالی سرکار سے مدراس کی کمک کو چلا آتا تھا کہ پلی لور کے مقام پر سلطان کی فوج پر حملہ آور ہوا۔ مگر شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ آخر گورنر جنرل نے سر ایئر کوٹ کو سلطان کے مقابلے کے لئے مدراس کو روانہ کیا محمود بندر کے مقام پر تمام دن کی جنگ کے بعد سلطان کی فوج پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئی۔ اسی طرح ویلور بھی سلطان کے قبضے سے نکل گیا مگر بوڑھے سلطان کے عزم و استقلال میں فرق نہ آیا۔ اور وہ برابر ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ مقابلہ کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جنرل کوٹ کو اس نے اچھی طرح سے دق کردیا۔ انہی دنوں میں بمبئی کی افواج نے قلعہ ماہی فتح کرلیا۔ سلطان نے شہزادہ ٹیپو سلطان کو ادھر روانہ کیا۔ اُس نے کئی روز کی جنگ کے بعد اُسے فتح کرلیا۔ اور سلطان بذاتِ خود گوڈلور۔ پرماکویل کو فتح کرتا ہوا وندیوش جا پہنچا۔ سر ایئر کوٹ نے مضطرب ہوکر اپنی ساری فوجوں کو جمع کرکے ادھر کا رخ کیا اور پولی لور کے مقام پر سلطان کے لشکر کو شکست دی۔ مگر میسور کے بوڑھے سلطان پر اس کا ذرہ بھر اثر نہ ہوا۔ اور ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ اُس نے ایک خاص مقام پھکینگاہ قائم کرکے انگریزی

فوج کے ایک دستہ کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔

"یہ لڑائی آخری صف آرائی تھی جو دو نامی گرامی بہادر اور ماہر فن سپہ سالاروں کے درمیان ہوئی۔ اور دونوں بذات خود سرگرم کارزار ہو کر اپنی بہادری، ہوشیاری اور دانائی کا کمال ارباب سیف کو دکھا گئے۔"

علالت اور وفات چونکہ اس جنگ کے فوراً بعد برسات شروع ہو گئی۔ اس لئے دونوں سپہ سالاروں نے کارومنڈل کے ساحل پر جنگ موقوف کر دی۔ اور سلطان ارکاٹ سے سولہ میل شمال کو خیمہ زن ہوا۔ یہاں اس کی پشت پر زہریلا پھوڑا نکلا جس سے اس کی ساری پیٹھ بھڑوں کے چھتے کی طرح داغدار ہو گئی۔ سلطان نے لشکر کے شور و غل سے بچنے کے لئے شہر ارکاٹ میں سکونت اختیار کی۔ اور بڑی احتیاط سے ملکی اور مالی انتظامات کے لئے احکام جاری کئے تاکہ گورنروں کو اس کی بیماری کا علم نہ ہو سکے۔ اس اثنا میں ایک جاسوس جنرل کوٹ کے مرنے کی خبر لایا۔ نواب نے اس کے تدبر اور جنگی قابلیت کی تعریف کی اور فرمایا کہ اس صفت کا کوئی جنرل دیکھنے میں نہیں آیا۔ ۶۔ دسمبر ۱۷۸۲ء کو شام کے وقت سلطان نے پوچھا کہ آج کونسی تاریخ ہے۔ عرض کیا کہ محرم کی چاند رات ہے۔ اس پر نواب نے غسل کیا۔ نئی پوشاک پہنی۔ بستر بدلوایا۔ کلمہ اور درود شریف کا ورد کیا اور کچھ پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیرا۔ مسکینوں اور محتاجوں میں کثرت سے روپے پیسے تقسیم کئے۔ اسی وقت دس ہزار سوار مدراس کی طرف روانہ کئے۔ ولی عہد کی طلبی کے لئے فرمان لکھوایا۔ پھر چند منٹ کامل خاموشی کے بعد ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ تاریخ وفات "حیدر علی خاں بہادر" (۱۱۹۵ھ) ہوئی۔ سلطان کا جنازہ سرنگاپٹم میں لے گئے۔ اور وہاں دفن کر کے اس پر نہایت عالیشان مقبرہ تعمیر کیا گیا جو اب تک سلطان کی عظمت اور جلال کا ہر رہرو کو درس دیتا نظر آتا ہے۔

حیدر علی خاں ان پڑھ تھا۔ مگر بڑا منتظم اور لائق بادشاہ تھا۔ اس کا حافظہ بہت قوی تھا۔ جو بات ایک بار سن لیتا وہ اُسے ہمیشہ یاد رہتی تھی۔ پانچ زبانوں میں اچھی طرح بول سکتا تھا۔ ہر دفتر کی پڑتال خود کرتا اور کسی کی رعایت نہ کرتا تھا۔ ہندو مسلمان سب اس کی نگاہ میں برابر تھے۔ اگر کوئی قصور کرتا تو اُسے سخت سزا دیتا تھا۔

ایک دفعہ اُس نے اپنے ولی عہد شہزادہ ٹیپو سلطان کو اپنے ہاتھ سے کوڑے لگائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ غریبوں اور مظلوموں کے لئے اس سے زیادہ رحم دل بھی کوئی نہ تھا۔

نور احمد خاں فریدی

آنسو

اے دوست مری آنکھ کے تارے ہیں یہ آنسو — بے مایہ سمجھ کر انہیں یوں خاک میں مت پھینک

مایوسِ محبت کے سہارے ہیں یہ آنسو — رہنے بھی دو للہ انہیں مجھ سے نہ چھینو!

بچ بچ کے ذرا آپ رہا کیجئے ان سے

طوفان ہیں، بجلی ہیں، شرارے ہیں یہ آنسو

جلیل شیرکوٹی بی۔اے

بندہ نوازی

عام اتنی خلق میں خوئے ایازی ہوگئی
خواجگی نا آشنائے دل نوازی ہوگئی

نائبِ صورت گرِ ہستی ہے انساں کا وجود
اس جہاں میں یہ حقیقت بھی مجازی ہوگئی

سجدہ ریزی سے حصولِ مدّعا ہو یا نہ ہو
میری طبع کفر پرور تو نمازی ہوگئی

ذکر آیا ہم غریبوں کا بھی اُن کی بزم میں
چارہ سازی ہوگئی بندہ نوازی ہوگئی

اُس طرف پھولوں نے سوچا آگیا رُخ پر نکھار
اس طرف شبنم نے سمجھا سرفرازی ہوگئی

حامد اللہ افسر میرٹھی

"کل رات کو"

خوبیٔ قسمت سے تھے وہ میرے گھر کل رات کو
کیا کہوں ہر شے تھی فردوسِ نظر کل رات کو

ہم یہ سمجھے آگئے اب جنّت الفردوس میں
ہوگیا جب اُن کے کوچے میں گزر کل رات کو

وائے قسمت ہنس رہا تھا بزمِ دشمن میں کوئی
اور ہم روتے تھے گھر میں بیٹھ کر کل رات کو

ہجر کی سختی کا عالم کچھ نہ پوچھ اے ہم نشیں
جو گزرنا تھی وہ گزری جان پر کل رات کو

آج جو تشریف لائے میرے کاشانے میں آپ
یہ تو فرمائیں کہاں تھے جلوہ گر کل رات کو؟

مطرب و مے کا چمن میں ہو چکا تھا انتظام
خوب ہی ہوتا وہ آجاتے اگر کل رات کو

رازؔ کیوں دیتے ہو اپنی پارسائی کا فریب
ہم کو ہے معلوم جاتے تھے جدھر کل رات کو

سیّد پچل شاہ رازؔ

افسانہ

جھلسے ہوئے انگارے

"بھیّا! کب تک چلو گے؟ بھوک لگی ہے۔"

"بد تمیز بھوک لگی ہے۔ کیوں بھوک لگی ہے؟ جب روٹی نہیں مل سکتی تو آخر کیوں بھوک لگتی ہے؟" نراش نے غصے سے کانپتے ہوئے بچے کو ڈانٹ دیا اور سنسان رستے پر بدستور چلنے لگا۔ منتشر خاموشیاں رفتہ رفتہ فضا میں سمٹ آئیں۔ دہکتے ہوئے انگاروں نے بچے کو سہما دیا تھا۔ وہ اپنے بھیا کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"پیر جلتے ہیں؟ اشوک؟" نراش کی کرخت آواز نے بچے کو سہما دیا۔ اُس نے پہلے تو دیکھا تارکول کی تپتی ہوئی سڑک کو، پھر اس کی نگاہیں جا پڑیں اپنے برہنہ نازک پیروں پر جن کے آبلے ابھی ابھی پھوٹے تھے۔ لیکن اُس نے جواب دیا: "نہیں.... نہیں بھیّا نہیں جلتے۔"

"نہیں جلتے! ہاں جلیں گے کیوں۔" اس کی کرخت آواز بھرا سی گئی تھی: "جب روٹی نہیں ملتی تو بھوک کیوں لگے گی۔ سایہ نہیں تو پیر کیوں جلیں گے۔" نراش کی آنکھیں یکایک اشوک کے پیروں پر جا پڑیں اور پھوٹے ہوئے آبلے پہ جم کر رہ گئیں۔ اشوک کی گھبرا کر چیخ نکل گئی۔

"نہیں بھیا یہ اب کا نہیں ہے.... درد نہیں کرتا" مگر اس کی ننھی ننھی پلکوں پہ ایک آنسو نمودار ہوا اور وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔

"بھیّا رات ہوگئی!"

"رات ہوگئی تو کیا ابھی دن ہی تھا؟ اوہ! ابھی رات شروع نہیں ہوئی...... ہونے دو اندھیرا ہونے دو۔"

"اندھیرا" اشوک کی معصوم روح سہم گئی۔

"بھیّا اب تو بہت سے چھالے پڑ گئے۔ آگے چلا نہیں جاتا"

"چھالے؟" جیسے خود نراش کی روح کے آبلوں میں کسی نے سوئی چبھو دی ہو۔ وہ وہیں رک گیا۔

"اشوک یہاں رک جاؤ" اور نراش نے اُسے اپنے زانو پر لٹا لیا اور اُس کا ایک ہاتھ سہلاتے بولا:۔

"اشوک تو نے روٹی کھائی؟" بچے کانپ کر عجلت سے بولا

"ہاں.... ں.... کھائی تھی.... ی۔"

نراش نے جواب سنا اور اس کا دل موم کی طرح پگھلنے لگا۔ اور بولا۔ "اشوک میرے بھیّا آج میں نے تجھے کتنا ڈانٹا تیری معصوم نگاہوں کو اپنی زہریلی نظروں سے جھلس ڈالا۔ مگر کیا تو سمجھتا ہے میں ظالم ہوں؟ بھوک کو نہیں جانتا؟ آبلوں کے درد کا مجھے احساس نہیں ہے؟ بول نا!"

اشوک سے تو کوئی جواب بن نہ آیا لیکن نراش نے محسوس کیا کہ اُس کے زانو پر رکھے ہوئے سر کو ہلکی سی جنبش ہوئی اور آنسو کا قطرہ اس کے زانو پر بہ نکلا اور بس۔

گزشتہ زندگی کی تلخ حقیقتوں نے اُس کے زاویہ نظر کو تاریک بنا دیا تھا۔ دُنیا کا ذرہ ذرہ اس کی مایوسی اور نفرت و حقارت کے جذبے کو بھڑکاتا تھا۔ وہ ایک قنوطی تھا جب اُسے مجبوراً اس دُنیا سے آمنے سامنے ہونا پڑتا تو اس کی سوچ بھبک اٹھتی۔ وہ چاہتا کہ اپنی سرخ دہکتی آنکھوں سے دُنیا کو جلا کر خاک کر دے۔ لیکن دُنیا سے اس درجہ نفرت کے بعد بھی بھائی کی محبت تھی جو اس کی کشتی حیات کو ساحل دُنیا سے دور نہ جانے دیتی تھی۔ چنانچہ تلاش کرنے پر بالآخر اُسے ایک رائے بہادر کے یہاں پرائیویٹ سکریٹری کی جگہ مل گئی

"نراش بابو! آپ تو ہر وقت کام میں لگے رہتے ہیں۔ کام تو پھر بھی ہو سکتا ہے۔ آج میں آپ کو کام نہ کرنے دوں گی۔ اُٹھئے!" رائے بہادر کی لڑکی آشا یہ کہتے ہوئے سامنے آکر کاغذات کو سمیٹنے لگی۔ نراش اُٹھ تو کھڑا ہوا لیکن بھنویں تن گئیں۔ پیشانی پر شکن پڑ گئے اور وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر چل دیا۔ آشا حیران رہ گئی لیکن پھر نہ جانے کس جذبے کے ماتحت بول اُٹھی: "ہاں نراش بابو! آج آپ کو ہمارے ساتھ سینما جانا پڑے گا اور ضرور۔"

نراش کو شاید اُس کی باتوں سے غرور کی بو آئی وہ کرخت

لہجے میں بولا "کام آپ کرا سکتی ہیں لیکن سینما جانے کے لئے مجھے تنخواہ نہیں ملتی!" اور غصے سے باہر نکل گیا۔

آشا پر جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ اس کا حلق سوکھ گیا۔ وہ ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس کی آنکھوں میں خون لوٹ کر آیا تو وہ اٹھی اور دردناک نگاہوں سے خالی کرسی کو دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

آفتاب کی آتشیں شعاعیں سطح ارض سے ٹکرا کر فضاؤں میں سنسناہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ زمین کا ذرہ ذرہ کرۂ نار بن رہا تھا۔ آسمان گرم تانبے کی طرح تمتما رہا تھا۔ خشک بخارات سینۂ گیتی کی حرارت و تپش کو چوس کر بگولوں کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ نراش کی وحشت انگیز نظریں اس پیاسے کبوتر پر گڑی ہوئی تھیں جو آسمان کی تپتی ہوئی وسعتوں میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

"نراش بابو! اس وقت آپ باہر کیا کر رہے ہیں؟" آشا نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے آواز دی۔ اور پھر بیتاب ہو کر نراش کے قریب پہنچ گئی۔

"دیکھو دیکھو" نراش چلا دیا۔ آفتاب کی شعاعوں سے کبوتر کے بازو جھلس گئے۔ اور وہ پھٹ سے زمین پر آ گرا۔

"یہی تو زندگی ہے نا" نراش سوکھے گلے سے بولا۔

"نراش بابو!" آشا گھبرا کر بولی "دیکھئے تو آپ کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ پسینہ میں شرابور ہو رہے ہیں اندر چلئے!"

نراش کھویا کھویا سا اندر چلا آیا۔

"نراش بابو!" آشا کہہ رہی تھی "آپ ہمیشہ کس خیال میں گم رہتے ہیں؟ آپ کی آنکھوں کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے آپ دنیا سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں۔ مانتی ہوں دنیا گناہ اور بدی کا ایک دہکتا ہوا انگارہ ہے۔ لیکن آپ خود کو اس میں کیوں جھلسائے ڈالتے ہیں؟ محبت آپ کے نزدیک محض ایک کھیل ہے۔ کیا آپ میری محبت ......" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ جذبات کا سیلاب امنڈ آیا۔ مگر نراش باہر جا چکا تھا۔ آنسوؤں کا دیپک تاریکیوں میں گم ہو گیا!

نراش کوٹھی سے نکل کر گھر کیونکر پہنچا؟ اسے معلوم نہیں لیکن گھر پہنچتے ہی اس نے اشوک کو بیمار پایا۔ اس کا تمام غم و غصہ جذبات کی نرم رو میں بہہ گیا۔ وہ گھبرا گیا اور احتیاط کی ہدایات دے کر چلا گیا۔ آدھی رات کے وقت اشوک کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ اچانک باہر سے رونے کی آواز آنے لگی۔ کوئی چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اشوک بخار کی بیہوشی میں ان چیخوں کو سن کر چونکنے لگا۔ اس کی حالت بگڑنے لگی۔ نراش جھلا کر باہر آیا۔ باہر اندھیرا تھا۔ اس مکان میں جہاں سے رونے کی آواز آ رہی تھی داخل ہوتے ہی اس کا سر چوکھٹ سے ٹکرایا۔ اندر پہنچتے ہی وہ غصے سے پاگل ہو کر بولا "کیوں چلاتے ہو تم لوگ۔ آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ آخر مر کیوں نہیں جاتے تم"

"میری ماں ..... مر گئی" کسی کی باریک سسکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"مر گئی تو ......" نراش کی نگاہیں لاش سے ٹکرا کر کسی دو آب دیدہ آنکھوں سے جا لڑیں۔ اس کی سرخ دہکتی ہوئی آنکھیں سرد پڑ گئیں۔ انگاروں نے سرد پانی کی آغوش میں منہ چھپا لیا۔ آواز نرم جذبات کی رو کی طرح مدھم ہو گئی۔

"تمہارا اب کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں صرف میری ماں تھی!" اور اس کی آنکھوں کے اتھاہ ساگر سے دو موتی چھلک کر خاک میں گرتے ہی جذب ہو گئے۔ نراش دیکھ رہا تھا۔ یہ آنسو کتنی جلدی خاک میں گر کر سوکھ جاتے ہیں اور ان کا صرف ایک میلا سا داغ رہ جاتا ہے صرف ......"

اور آخر نراش نے اس یتیم بے سہارا لڑکی کرونا کو اپنے یہاں اشوک کی تیمارداری کے لئے رکھ لیا۔ طوفان کی مانند بھٹکنے والے خزاں کے مارے پتے نے انگاروں کے آغوش میں پناہ لی۔ انگاروں کے آغوش میں ــــ!!

"آشا تم نے زندگی کی تبسم ریزیاں دیکھی ہیں اس کے خونیں آنسو نہیں دیکھے۔ تم نے گلاب کی شگفتگی دیکھی ہے، اس کی جھلسی ہوئی پنکھڑیاں نہیں دیکھیں۔ زندگی کی جلترنگ کے نغمے سنے ہیں، لیکن کسی سوکھے ریگستان میں کسی پیاسے کی کراہ نہیں سنی۔ محبت کی گدگداہٹ دیکھی ہے لیکن کسی فراق کے مارے کی تڑپ نہیں دیکھی۔ تمناؤں کی تلخ زندگی

کے مزار پر کس طرح گھاتی ہے تم نہیں جانتی۔ امید و آرزو کے شراب میں انسان اپنے سوکھے ہونٹوں کو زبان سے چاٹتے ہوئے کس طرح جھلستا رہتا ہے کیا کبھی جان سکو گی"۔

"لیکن نراش بابو! . . . . ؟" اور آشا نراش کے قدموں پر گر پڑی ——— جب کسی ڈوبتے ہوئے کو بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی اور ہاتھ پاؤں تھک کر چور ہو جاتے ہیں تو روح پر ایک قسم کی تاریکی سی طاری ہو جاتی ہے۔ بیخودی اور غنودگی سی روح کو اپنے آغوش میں چھپا لیتی ہے اور آخر روح کے ایک کونے میں نہ جانے کہاں سے ایک امید کی ایک کرن پھوٹ نکلتی ہے کہ ابھی کوئی انگلی سے پکڑ کر بچا لے گا"۔ بالکل یہی حالت کچھ دیر تک آشا کی رہی۔ آخر جب غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی لرزتی کرنیں کھڑکی کے شیشے سے ہو کر اس کی پلکوں پر پڑنے لگیں تو وہ اٹھی۔ کمرے میں ہر طرف خاموشی تھی صرف سامنے کی دیوار پر ایک مکھی مکڑی کے جالے میں پھنس کر بھنبھنا رہی تھی۔

نراش آشا کی کوٹھی سے سیدھا اشوک کے کمرے کی طرف چلا۔ اس کی جھلسی ہوئی روح اشوک ہی کے آغوش میں اطمینان و سکون پاتی تھی۔ اشوک کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی آنکھیں کسی کی آنکھوں کے اتھاہ ساگر میں کھو گئیں۔ اس کی نگاہوں کی حرارت کم ہو گئی۔ تنا ہوا چہرہ غیر اختیاری طور پر سرد پڑ گیا۔ اور نراش کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ دو آنکھیں اسے بھلے گئیں۔ وہ اس دھارے کے سامنے نہ ٹھہر سکے گا۔ وہ دروازہ ہی سے لوٹ گیا۔ مگر کرونا ——— جب اسے دیکھتے ہی نراش کے حسین چہرے کا رنگ اڑ جاتا، نگاہیں سرد پڑ جاتیں اور ابرو سمٹ جاتے تو ایک لمحہ کے لئے اسے نظر آ جاتا حسین سا چہرہ۔ ہرن جیسی چمکتی حسین آنکھیں . . . . . اور . . . . . . اور کرونا بھی کھیلنے لگی، انہی انگاروں سے!

"رائے بہادر کی لڑکی نے رات خودکشی کر لی!" دوسرے دن نراش نے صبح کو سنا۔

"نوکر! یا ابھی میری زندگی کی خاکستر میں اپنی چنگاریاں باقی ہیں جو زندگی بھر کو جھلس سکتی ہیں؟" وہ خاموش تھا۔ اس کے قدم بڑھ رہے تھے اور بے اختیار گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ آخر وہ اشوک کے کمرہ کے دروازے پر جا پہنچا۔ اندر سے اشوک اور کرونا کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اشوک کہہ رہا تھا: "کرونا دیوی اب میں تم کو کہا کروں گا . . . . . بھابی!" اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پہلے تو کرونا کے ارغوانی رخسار جل اٹھے لیکن ذرا سے توقف کے بعد اشوک کو اپنے آغوشِ محبت میں دباتے ہوئے بولی: "اور میں کہا کروں گی تم کو . . . . . . !"

"اشوک!" نراش کی خوفناک آواز سے کمرے کی فضا کانپ اٹھی۔ دونوں نے دیکھا نراش دروازے پر کھڑا تھا۔ وحشت خیز نگاہیں، سرخ بھبکتی آنکھیں۔ سیاہ روکھا چہرہ۔ کھڑے ہوئے سوکھے بال۔ اشوک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا ——— !

اشوک تین دن تک بیہوش رہا۔ کندن نوکر نے کئی دفعہ آ کر بتایا کہ کرونا بھی بیمار پڑی ہے، بولتی تک نہیں۔ کھانا بھی نہیں کھاتی۔ مگر نراش نے جیسے سنا ہی نہیں۔ دنیا اس کے لئے تاریک تھی۔ ڈاکٹر کہہ گیا تھا: "بچنے کی کوئی امید نہیں دل کو سخت صدمہ پہنچا ہے"۔

نوکر باہر گیا تھا۔ اشوک کے جسم کو حرکت ہوئی۔ ہونٹ کانپے: "بھیا . . . . . ا . . . . . یا . . . . . . !"

نراش نے چونک کر اس کا سر اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا باہر سے دو آدمیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک آواز سنائی دی: "کیوں بھیا! سورج بادلوں کی اوٹ میں آ گیا ہے یا واقعی چھپ گیا ہے؟"

جواب میں آواز سنائی دی: "نہیں بھیا! سورج تو چھپ گیا ہے"۔

نراش نے سنا اور جیسے سینکڑوں بجلیاں اس کے دماغ میں گھس گئی ہوں جھپٹ کر اشوک کے چہرے کی طرف دیکھا سر ڈھلک کر ہاتھوں سے گر پڑا تھا۔ نراش کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ اٹھا۔ ہونٹ ہل رہے تھے "ہاں سورج چھپ گیا ہے"۔ اور قدم باہر کی جانب اٹھ رہے تھے۔

"بھیا!" نوکر کندن دوڑتا ہوا اندر آیا: "بھیا آج تو کرونا کو دیکھ آؤ۔ اس کا آخری وقت ہے!"

اس کی آواز خالی مکان کے ہر گوشے سے گونج کر واپس آ گئی۔ کوئی جواب نہ آیا۔

آشا لتا سنہا (بی اے) (ترجمہ)

حقائق

اشارا ہو نہ جانا کچھ اگر منزل کی آنکھوں سے
عیاں تھی گمرہی ہر رہبرِ کامل کی آنکھوں سے

یہ کس دلدادۂ سعی و عمل کو ڈوبتے دیکھا
کہ پیہم اشکِ حسرت ہیں رواں ساحل کی آنکھوں سے

زمیں والوں کو تحقیقِ مقامِ حُسنِ فطرت کے
اشارے ہوتے رہتے ہیں مہ کامل کی آنکھوں سے

خود آگاہی میں اس کا مرتبہ ہے خضر سے بڑھ کر
وہ رہزن دیکھتا ہے خود کو جو منزل کی آنکھوں سے

غنیمت ہے کہ اس دُنیا میں، اس نفرت کی بستی میں
محبت جھانک لیتی ہے تری محفل کی آنکھوں سے

یہ اہلِ ہوش سے کہہ دو کہ دُنیائے حقائق کو
نہ دیکھیں زیبؔ جیسے بندۂ غافل کی آنکھوں سے

زیب عثمانیہ لدھیانوی

چراغاں

عشق میں حضرتِ دل جان کو قرباں کر دو
تم بھی دنیا میں اک کارِ نمایاں کر دو

دم لبوں پر ہے مرے درد کا درماں کر دو
بندۂ حُسن تو ہوں بندۂ احساں کر دو

چارۂ وحشتِ دل بعد میں ہو جائے گا
اپنی زلفوں کو ابھی اور پریشاں کر دو

کب سے ویران پڑی ہے مرے دل کی بستی
اب تو اس اُجڑے بیاباں کو گلستاں کر دو

ایک دو سانس ہی کا اب تو رہا ہے قصّہ
آؤ اور آ کے یہ مشکل مری آساں کر دو

اپنے داغوں کو چھپا رکھنا ہے کس دن کے لئے
آج اے حضرتِ دل تم بھی چراغاں کر دو

ہم اسیرانِ محبت کا ٹھکانہ ہے کہاں
امتحاں کے لئے تم وا درِ زنداں کر دو

اپنے ہاتھوں سے پلا بھی دو مئے عشق مجھے
کب سے کافر ہوں مجھے آج مسلماں کر دو

عبدالغنی آثر گوالیاری

دیہاتی افسانہ

یاد نہ کر دلِ حزیں!

سالہا سال پہلے کے گزرے ہوئے واقعات میرے دماغ میں اس طرح تازہ ہیں گویا کل ہی کی بات ہو۔ میں انہیں فراموش کر دینا چاہتا ہوں۔ دل سے محو کر دینا چاہتا ہوں۔ تمنا ہے کہ اپنے پرسوز ماضی کو بھول جاؤں۔ اپنے آپ کو بھول جاؤں۔ جب تاریخ عالم کے اہم سے اہم واقعات ذہن سے نکل چکے ہیں الجبرا کے فارمولے جنہیں رات رات بھر جاگ کر رٹا کرتا تھا حافظے سے مٹ چکے ہیں۔ اقلیدس کی شکلیں لوحِ دل سے محو ہو چکی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ زمانہ طالب علمی کا وہ واقعہ جسے سانحہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کیوں اب تک یاد ہے۔ میں اسے بھول نہیں سکتا معبود! کیوں نہیں مجھے کسی ایسے حادثے سے دوچار کر دیتا کہ ماضی میرے دل و دماغ سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ مگر کب کبھی ایسا ہو سکے گا ...!

نمبرداری میرے ابا کو وراثت میں ملی تھی اور اسی عہدے کی بدولت اُن کے اجداد نے منصب حاصل کیا۔ مجھے مانا تھا۔ مگر میرے مستقبل کے بارے میں ابا جان کے خیالات بہت بلند تھے۔ وہ مجھے تحصیلدار بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ یہی ایک عہدیدار ایسا ہے جس سے گاؤں والوں کو ہمیشہ واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اور اس کے رعب و دبدبے سے ہر کسان چھوٹا ہو یا بڑا ہر دم تھرتھراتا رہتا ہے۔ اس لئے جیسے ہی میں نے انٹرینس پاس کیا مجھے لائل پور کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ اس وقت میری عمر بھی سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ میں شروع ہی سے شگفتہ مزاج۔ زندہ دل اور ملنسار طبیعت کا مالک تھا۔ اس لئے چند ہی روز میں میرے بے شمار دوست بن گئے۔

ہوسٹل میں میرا "روم میٹ" اختر نامی ایک قبول صورت نوجوان تھا۔ مگر بے حد خاموش اور تنہائی پسند! اسے نہ تو کسی کھیل سے دلچسپی تھی۔ نہ وہ لڑکوں سے گھل مل کر ملتا تھا۔ تمام لڑکے بھی اس سے کچھ دور دور ہی رہتے تھے۔ اسے سپرنٹنڈنٹ صاحب کی ستم ظریفی ہی کہئے کہ اُس نے ایک گونگے بہرے نوجوان کو مجھ سے باتونی اور چنچل مزاج کے ساتھ نتھی کر دیا تھا۔ مجھے ایک پل بھی خاموش بیٹھنا دوبھر تھا اور وہ تھا کہ گھنٹوں خاموش رہ کر گزار دیتا۔ دو تین روز تک تو میں صبر کرتا رہا آخر ایک دن میں نے ایک دوسرے کلاس فیلو کے ساتھ رہنے کا انتظام کر لیا۔

اُس دن شام کو میں سامان اُٹھا کر دوسرے کمرے میں منتقل ہو رہا تھا کہ اختر کہیں سے گھومتا ہوا آ پہنچا۔ مجھے سامان سمیٹتے دیکھ کر وہ کتنی دیر تک حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا جب میں سوٹ کیس اُٹھا کر باہر نکلنے لگا۔ تو وہ کمرے کی دیوار سے پیٹھ لگا کر بے مدعا ہی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا "جا رہے ہو شفیق بھائی!" اُس کے لبوں پر مضمحل سا تبسم اور آنکھوں میں المناک سی چمک تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اچھا جائیے!" وہ مجھے خاموش دیکھ کر دوبارہ بولا "میں کسی کو اپنے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ جہاں اتنے دن تنہا رہ کر گزار دیئے ہیں، وہ بھی گزر ہی جائیں گے۔ تاہم اتنا دکھ ضرور ہے کہ آپ کی صحبت سے زیادہ دن تک فیضیاب نہ ہو سکا۔ آپ آئے تھے تو امید بندھی تھی کہ میری سوگوار تنہائی کا خاتمہ ہو جائے گا مگر میرا یہ خیال غلط نکلا ..... خیر اس میں کسی کا کیا قصور! میری تقدیر ہی ایسی ہے۔ میں کسی کو بھی اپنا دوست نہیں بنا سکتا۔ مجھے کوئی پسند نہیں کرتا ...... سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔"

..... اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

"نفرت کرتے ہیں" میں نے گھبرا کر کہا "آخر کیوں؟"

"اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں۔ میں کیا کہوں۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ میں وہ بدنصیب ہستی ہوں جسے دوسروں کی خطاؤں کی وجہ سے مطعون کیا جاتا ہے۔ گنہگار کوئی دوسرا تھا۔ مگر سزا مجھے مل رہی ہے۔ آخر آپ ہی کہئے۔ میرا اس میں کیا قصور ہے۔ میری ذات کہاں تک موردِ الزام ٹھہرائی جا سکتی ہے۔ کیوں مجھے دوسروں کے کردار و افعال کی وجہ سے مطعون کیا جاتا ہے۔ کیوں مجھے ذلیل سمجھ کر ٹھکرایا جاتا ہے۔ میں تم سا ہی انسان تو ہوں

اور انسانوں کے سے سلوک کا متمنی ہوں "

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو اختر! میں تمہاری ایک بھی بات نہیں سمجھا"

"اب میں اس کے سوا کیا کہوں۔ کہ میں حقیقتاً قابل نفرت ہستی ہوں۔ اگر میں ذلیل نہ ہوتا تو آپ کا سا بلند خیال اور روشن مزاج نوجوان ہرگز مجھ سے نفرت کرنے پر مجبور نہ ہوتا۔ جانیے۔ یہ کالج شریفوں کے بچوں کے لئے ہے۔ میرا تعلق ایک بدنام اور ذلیل گھرانے سے ہے۔ میں یہاں کس طرح رہ سکتا ہوں۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ بہت دور، اتنی دور، جہاں سوسائٹی کے خون آشام بھیڑیئے میری گرد کو بھی نہ پا سکیں جہاں ان کی انگشت نمائی اور طعنہ زنی کو میں سُن نہ سکوں گا۔ جہاں اُن کے زہر میں بجھے ہوئے فقرے میرے دل کی گہرائیوں تک اتر انداز نہ ہو سکیں گے۔ جہاں اُن کے دل و دماغ کو برما دینے والے تیز و تند نشتر جراحتوں کے لئے موجود نہ ہوں گے۔ کوئی اس تحقیر و ذلت کو کب تک برداشت کر سکتا ہے۔ میں اس ذلیل ماحول سے، سوسائٹی کے اس غیر تربیت یافتہ گروہ کی دسترس سے دور بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ اور پھر کبھی اس طرف آنے کی جرأت نہ کروں گا۔ یہ میری حماقت تھی جو میں نے اعلیٰ تعلیم کی تمناؤں میں جگہ دی۔ اور امی کو مجبور کر کے کالج میں نام لکھوایا مگر اب معلوم ہوا کہ میری یہ حرکت بھی سوسائٹی کے نام نہاد لیڈروں کی نظروں میں ایک ناقابلِ معافی جرم تھا، ایک ناقابل ۔۔۔ گناہ ۔۔۔ مجھے شریفوں کے بچوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور پڑھنے کا کوئی حق نہیں!" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"اختر!" میں نے ملائمت سے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا "کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں اگر یہاں سے جا رہا تو تمہاری بے وجہ خاموشی اور تنہائی پسندی سے تنگ آ کر، مجھے کوئی ایسی بات معلوم نہیں جس نے مجھے علیحدگی پر مجبور کیا در حقیقت کوئی ایسی بات ہے تو ضرور کے لئے مجھے بتاؤ۔ اس کے سدباب کی کوشش کروں گا"

اختر آنسو خشک کرتے ہوئے بولا "آج نہیں تو کل تمہارے دوست حقیقت حال سے آگاہ کر دیں گے۔ مجھ سے اس دلدوز داستان کے بیان کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں وجہ سے میں نشانہ تضحیک بنایا جاتا ہوں۔ ہاں اس کے سدباب کا سوال تو آپ بھی میری طرح بے دست و پا ہیں۔ کوئی انسان تنہا سوسائٹی کے سخت گیر قوانین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ عیوب پر دراصل فی الحقیقت یہ عیب ہے کہ کوشش و ہمت سے نہیں زر و مال سے پردہ ڈالا جا سکتا ہے۔ اور بدقسمتی سے یہ مجھے حاصل نہیں۔ میں آپ کی ہمدردی کا مشکور ہوں اور التجا کرتا ہوں کہ آپ جلد از جلد مجھ سے دامن کشاں ہو جائیں ورنہ میری وجہ سے لوگ آپ کو بھی ذلت و حقارت کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور یہ مجھے کسی حال میں بھی منظور نہیں۔ ہماری سوسائٹی کے قوانین مجرم کو سزا دینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ البتہ بے گناہوں پر اس کا دست تظلم بڑی جلد دراز ہو جاتا ہے"

"میں تمہیں چھوڑ کر نہ جاؤں گا اختر! مجھے سوسائٹی کا خوف ہے نہ دنیا کا ڈر۔ کوئی مجھے تم سے ہمدردی کرتے دیکھ کر اگر انگشت نمائی کرتا ہے تو کرنے دو۔ مجھے اس کی پروا نہیں" یہ کہہ کر میں جلدی جلدی وہ تمام سامان دوبارہ اٹھا لایا جسے دوسرے کمرے میں رکھ آیا تھا۔ سب لڑکے حیرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

اس رات نذیر نے وہ زہرہ گداز اور دلدوز واقعہ مجھے سنایا جس کی بنا پر تمام لڑکے اور کالج کے وہ بلند خیال پروفیسر جنہیں معلم الاخلاق ہونے کا دعویٰ تھا۔ جو نئی پود کے دل و دماغ پر بلند خیالی اور عالی ہمتی کو جلا کرنے کے مدعی تھے جن کے اوضاع و اطوار اور کردار و افعال نوجوان طبقہ کے لئے خضر راہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اتنے ذلیل فعل اور مکروہ حرکت کے مرتکب ہو گئے اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کوئی کس طرح امید کر سکتا ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں رہ کر لڑکے بلندیٔ اخلاق اور پاکیزگی خیال کے سبق سیکھتے ہوں گے۔ نہیں انہیں پست خیالی اور تنگ ذہنیت کا درس دیا جاتا ہے۔ اور یہ درس دینے والے خود اُن کے معلم ہوتے ہیں۔ خود ساختہ معیار اخلاق کے پابند تہذیب کے نمونے، نام نہاد ضابطہ معاشرت کے ترمیم دینے والے، سوسائٹی کے یہ قابل قدر افراد اتنی پست ذہنیت اور گھناؤنی طبیعت کے مالک ہوں گے۔ کوئی کس طرح یقین کر سکتا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے۔

نذیر کہنے لگا۔ اختر کے ابا جن دنوں امرتسر میں پولیس

انسپکٹر کے عہدہ پر مامور تھے۔ وہاں اُنہیں شہر کی ایک طوائف
سے والہانہ محبت ہوگئی۔ احباب کا خیال تھا کہ جذباتی دور ہے،
جب شباب کا نشہ کافور ہوگا تو وہ خود بخود راہِ راست پر آجائینگے
مگر ایک دن اُنہیں یہ سُن کر سخت حیرت ہوئی کہ آصغر کا سا اونچے
گھرانے کا نوجوان ایک طوائف سے شادی کرنے پر آمادہ ہے
اُنہوں نے حتی الامکان سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ مگر پانی سر
سے گزر چکا تھا۔ اس لئے کسی کی بھی نصیحت کارگر نہ ہو سکی۔ جب
اُن کے گھر والوں کو خبر ہوئی تو بہت جز بز ہوئے۔ ماں باپ
نے خاندانی وقار کا واسطہ دلایا۔ بدنامی اور رسوائی کے خوف سے
مرعوب کرنا چاہا۔ جب اس طرح کامیابی نہ ہوئی تو خاندانی عزت
اور وقار کو قائم رکھنے کے لئے عاق کر دینے کی دھمکی دی۔ شباب
کا زمانہ تھا۔ بے فکری کے دن۔ ماضی و حال کے خوشگوار دور
نے مستقبل پر پردے ڈال رکھے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے
اپنا ارادہ نہ بدلا اور چند روز بعد شادی کر لی۔ اس طرح ایک مستقل
مزاج اور بلند خیال نوجوان نے دُنیا اور خاندان کی پروا نہ کرتے
ہوئے سوسائٹی کی ایک ٹھکرائی ہوئی خاتون کو اس کا کھویا ہوا
وقار واپس دلانے کا عزم مصمم کر لیا۔ قدیم خیال باپ نے جوش
غضب میں اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا کر چھوڑا اور اُسے
وراثت سے عاق کر دیا۔ مگر ان کی جبین پر بل تک نہ آیا۔ رشتے
داروں کے جگر پاش کر دینے والے طعنے سُنے۔ لوگوں کی اُٹھتی
ہوئی اُنگلیوں کا نشانہ بنا۔ مگر جس راہ پر اُس نے قدم رکھ دیا تھا
اس سے پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا۔ اپنے لئے اتنی بڑی قربانی دیکھ
کر طوائف نے اپنے آپ کو اُن کے قدموں میں ڈال دیا اور اپنی
قدیم روش کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اُنہی کی ہوگئی۔

اُنہیں دمے کا پرانا عارضہ تھا۔ ڈاکٹری مشورے کے
مطابق اُنہوں نے قبل از وقت پنشن لے لی اور بیوی اور دونوں
بچوں سمیت شہر کی سکونت ترک کرکے اپنے آبائی گاؤں میں آ
بسے۔ دورانِ ملازمت میں اُنہوں نے کافی دولت پیدا کر لی تھی
اس لئے زمین و مکان خریدنے میں اُنہیں کوئی دقت نہ ہوئی۔
اُن کے جیتے جی تو کسی کو اُن کے خلاف لب کشائی کی ہمت نہ
ہوئی۔ مگر اُن کے مرتے ہی دور و نزدیک کے رشتے داروں نے
وہ دھوم مچائی کہ توبہ بھلی۔ مگر اُس نیک سیرت خاتون نے بڑی
جوانمردی کے ساتھ اُن کے طعنوں اور دل آزاریوں کو برداشت
کیا اور نہایت مستعدی اور خاموشی کے ساتھ اپنے دونوں بچ
کی تربیت میں مصروف رہی اور یہی دونوں بچے اختر اور نا سر
بہن نسیمہ ہیں۔ نیک دل ماں نے بچوں کی غور و پرداخت میں
جس سلیقہ شعاری کا ثبوت دیا ہے وہ بذاتِ خود ایک قابل
کارنامہ ہے جس پر بجا طور پر ہر شریف عورت فخر کر سکتی
اختر کو آپ نے دیکھا ہے، کتنا نیک دل، شریف اور ذ
نوجوان ہے بلیمہ نہ صرف ذہین و سلیقہ شعار ہی ہے بل
امورِ خانہ داری میں ماہر ہونے کے علاوہ سینے پرونے میں
اپنا جواب نہیں رکھتی"۔

نذیر نے ٹھنڈی آہ بھری اور سلسلہ کلام جاری رکھ
ہوئے بولا: دنیا نے اختر کے خلد آشیانی ابا کی اولوالعزمی ا
مستقل مزاجی کی قدر نہیں کی۔ لوگ اُس جذبے کو نہیں سمجھ
جس کے پیشِ نظر اُنہوں نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا۔
رشتہ دار جنہوں نے مرحوم سے محض اس بنا پر قطع تعلق کر
تھا کہ اُس نے ایک طوائف سے شادی کر لی ہے۔ اب
کی بیوہ اور لاوارث بچوں کو محض اس لئے تنگ کر رہے ہیں
وہ مجبور ہو کر کہیں چلے جائیں اور اُنہیں بنا بنایا ایک عالیشا
مکان، زرخیز زمین ہاتھ آجائے۔ اور وہ روپیہ بھی مل جا
مرحوم نے کمال دور اندیشی سے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت
اور شادی کے لئے بینک میں جمع کر رکھا ہے۔ ہماری سو
کے افراد کتنے خود غرض ہیں۔ ہمارے نظامِ معاشرت میں ا
خامیاں ہیں جو فوری اصلاح کی محتاج ہیں"۔
کتنی دیر تک ہم خیالات میں گم بیٹھے رہے۔

اگلے ہفتے میں اختر کو مجبور کرکے اپنے گھر لے گیا۔
جب کبھی دو چار چھٹیاں ہوتیں میں اسے اپنے ہمراہ لے جا
اس طرح ہم دونوں میں گہرے تعلقات ہوگئے۔ ایک دن
کی چھٹیوں سے پہلے اُس نے مجھ سے درخواست کی کہ
روز کے لئے میں اُن کے یہاں چلوں۔ میں نے ٹالنا چاہا
وہ مصر ہوا تو مجھے مجبوراً جانا پڑا۔ میں گیا تو اس کی امی نے
ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور میری خاطر مدارات میں کچھ اس اہتما
کام لیا کہ بے اختیار میرے دل میں اُن کے لئے عزت کا
محبت پیدا ہوگیا۔ نسیمہ جو اختر سے بمشکل دو سال چھوٹی

پہلے تو میرے سامنے آتی ہی نہ تھی مگر اس کی امی کے مجبور کرنے پر آئی تو میں حیران رہ گیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اُس سے زیادہ خوبصورت اور بھولی بھالی دوشیزہ آج تک نہیں دیکھی تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ میرے سامنے کچھ اس طرح سمٹی سمٹائی دروازے میں کھڑی رہی کہ میں باوجود کوشش کے اس کی طرف دیکھنے کی جسارت نہ کر سکا۔

پہلے چند روز تک وہ مجھ سے شرماتی رہی۔ مگر بعد میں اختر مجھے بتایا کرتا تھا کہ وہ بڑی آزادی سے مجھ سے ملنے لگی۔ میں جب وہاں سے واپس آیا ہوں تو میرا دماغ اختر کی امی کی بے اندازہ نوازشوں کے نقوش اور نسیمہ کی بھولی بھالی صورت اور سیدھی سادی باتوں کی تصویر بھی مرتسم تھی۔

میں نے اُسے بھولنے کی انتہائی کوشش کی۔ اُس کے خیال کو دل سے نکالنے کی ہر ممکن سعی کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ جس دن مجھ پر اس امر کا انکشاف ہوا کہ میں نادانستہ طور پر نسیمہ سے محبت کرنے لگا ہوں تو آپ یقین کریں میں سارا دن اور ساری رات خیالات کے بحر بے پایاں میں غوطہ زن رہا۔ مجھے اپنی اس پست اخلاقی اور معیوب حرکت پر حد سے زیادہ ندامت ہوئی۔ میں شرم کے مارے اختر سے بھی آنکھیں چار نہ کر سکتا تھا۔ حالانکہ میرا راز اس وقت تک مجھ ہی تک محدود تھا۔

اس کے بعد دو تین دفعہ اختر نے مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی مگر میں بہ لطائف الحیل ٹال گیا۔ سچ پوچھئے تو میں نسیمہ کو دیکھنے کے لئے بھی ترس رہا تھا اور وہاں جانے کی ہمت بھی نہ ہوتی تھی۔ میں نسیمہ سے دیوانہ وار محبت بھی کرتا تھا اور اس سے دور رہنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ آپ میرے اس متضاد عمل سے نہ جانے کیا خیال فرمائیں۔ مگر جہاں تک میری محبت کا تعلق ہے میں نسیمہ کی رسوائی یا بدنامی کا باعث نہ بننا چاہتا تھا۔ اور پھر یہ بھی خوف دامنگیر تھا کہ اگر اختر میری محبت سے واقف ہوگیا تو وہ میرے بارے میں کیا خیال کرے گا۔ میں اپنی محبت کا خون گوارا کر سکتا تھا۔ میں اپنی مناقب کی دل میں پرورش پانے والی آرزوؤں کو قربان کر سکتا تھا۔ مگر نسیمہ کی رسوائی اور اختر کی نظروں میں ذلیل ہونا گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب پھر اختر کے ہمراہ اُس کے گھر نہ جاؤں گا۔ اور اس پر شاید میں کچھ عرصہ کے لئے قائم رہتا کہ یکایک اختر کی امی کے بیمار ہونے کا خط آیا اور وہ چھٹی لے کر گھر چلا گیا۔

میں ان کی خیریت و عافیت کی خبر پانے کا منتظر رہا۔ مگر وہ تین ہفتے گزر گئے۔ اختر نے نہ تو کوئی خط ہی لکھا نہ کسی دوسرے ذریعے ہی سے کوئی خبر بھیجی۔ میں پریشان تھا کہ اور سے میری حالت غیر تھی۔ نہ جانے کیوں اس گھرانے سے مجھے دلی لگاؤ ہوگیا۔ آخر خدا خدا کر کے اختر کا ایک مختصر سا خط آیا جس میں اُس نے بڑے شدومد سے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ایک دفعہ ضرور آؤں۔ اور میری طلبی اُس کی امی کے اصرار پر تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے رخصت حاصل کی اور وہاں گیا تو فی الحقیقت اُن کی حالت خراب تھی۔

گاؤں میں ایک حکیم صاحب تھے آج تک انہی کا علاج ہو رہا تھا۔ مگر افاقے کی کوئی صورت نہ دیکھ کر میں نے اختر سے پوچھا کہ کہیں گرد و نواح میں ڈاکٹر بھی مل سکتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ مرید بالا کے ہسپتال کے سوا جو یہاں سے نو میل دور ہے کوئی ڈاکٹر اس نواح میں نہیں رہتا۔ اُس کے روکنے کے باوجود میں سائیکل لے کر گیا اور ڈاکٹر کو لے آیا۔ ہفتے بھر کے علاج کے بعد اختر کی امی کو کچھ افاقہ ہوا تو میری جان میں جان آئی۔ نسیمہ اور اختر تو اس لئے پریشان تھے کہ ان کی امی علیل تھی اور میں دونوں کو پریشان دیکھ کر پریشان تھا۔ اور سچ پوچھو تو نسیمہ کا رونا مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے تک اپنی امی کی چارپائی سے لگی بیٹھی رہتی۔ میں مجبور کرتا۔ اختر زور دیتا۔ مگر وہ وہاں سے نہ ٹلتی اور نہ کچھ کھاتی پیتی تھی۔ مجھے خوف ہوا کہ اگر اُس نے اپنی صحت کی طرف سے اسی طرح بے پروائی برتی تو وہ دن دور نہیں جب اس کے لئے بھی ڈاکٹر کی امداد کی ضرورت پڑے۔ خدا خدا کر کے اختر کی امی کا بخار ٹوٹا اور ایک مدت کے بعد میں نے پہلی مرتبہ نسیمہ کے خوبصورت مگر اُترے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ میرا دل نہ جانے کیوں یہ دیکھ کر پھول کی طرح کھل گیا۔

ایک دن شام کو میں باہر کی بیٹھک میں تنہا لیٹا ہوا تھا

آخر ابھی ہسپتال سے دواے کر نہ لوٹا تھا کہ اتنے میں نسیمہ اندر والی کھڑکی سے کمرے میں داخل ہوئی اور میز پر چائے کی پیالی رکھتے ہوئی بولی: "خیریت تو ہے؟ آپ یہاں تنہا لیٹے ہوئے کیا سوچ رہے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ یونہی لیٹا ہوا تھا" میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا: "کہو چچی کی طبیعت کیسی ہے، دوا پلا دی؟"

"ابھی ابھی پلا کر آئی ہوں۔" اُس نے چائے کے پیالے میں چمچہ چلاتے ہوئے کہا، اور پیالہ میری طرف بڑھا دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر نسیمہ کھڑکی کی کنڈی میں انگلی پھنسا کر کھڑی ہو گئی اور دھیمی آواز میں کہنے لگی: "شفیق بھیا! آپ نے اس موقعہ پر امداد کر کے جو احسان ہم پر کیا ہے اُسے ہم مرتے دم تک نہیں بھول سکتے۔"

"احسان! میں نے کونسا احسان کیا ہے نسیمہ! تم بھول رہی ہو، یہ تو ایک انسانی فرض تھا جس کے ادا کرنے کی میں نے کوشش کی۔"

"آپ چاہے کچھ کہیں مگر ہم اسے نہیں بھول سکتے۔ خدا ہی جانتا ہے، اگر آپ نہ پہنچ گئے ہوتے تو شاید امی کا کیا حال ہوتا۔ اور ہم بہن بھائی پہ کیا گزرتی۔ جبکہ گاؤں بھر میں ہمارا ایک بھی ہمدرد نہ تھا۔"

"کسی کی ہمدردی سے کچھ نہیں ہوتا نسیمہ!" میں نے چائے کا خالی پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "خدا مسبب الاسباب ہے، وہ کوئی نہ کوئی ذریعہ پیدا کر ہی دیا کرتا ہے۔"

وہ مسکرا کر تشکر آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میرے معبود! اُس کی پلکوں پر چند ننھے ننھے ستارے چمک رہے تھے۔ میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اُس نے یکایک سوال کیا: "اور کتنے روز کی چھٹی ہے؟"

"چھٹی تو کب کی ختم ہو چکی۔ اب تو چار روز سے غیر حاضری لگ رہی ہو گی۔ چچی کو صحت ہو گئی۔ اب ارادہ ہے کہ کل چلا جاؤں۔"

"پھر کب آئیے گا؟" اُس نے پوچھا۔ چہرے پر امید و یاس کے ملے جلے جذبات نمایاں تھے۔

"امتحان قریب ہے، اس لئے جلد نہ آسکوں گا۔"

اُس نے یہ سُن کر آہ بھری اور جب جھک کر پیالہ اُٹھانے لگی۔ تو ٹپ ٹپ دو آنسو اُس کی آنکھوں سے گرے۔

"نسیمہ!" میں نے ملائمت سے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: "تم رو رہی ہو۔ کیوں؟"

"نہیں۔ میں کہاں رو رہی ہوں۔" اُس نے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

"پگلی رو بھی رہی ہے اور انکار بھی کرتی ہے۔ کیا مجھے نہ بتائے گی؟" میں نے شفقت سے اس کے ہاتھ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا: "بتا دے نسیمہ . . . . ."

. . . . . . وہ سسکیاں لینے لگی۔

"نسیمہ!"

وہ اور بھی زور زور سے رونے لگی۔

میں گھبرا کر اُٹھا: "نسیمہ! آخر تجھے ہوا کیا ہے۔ کچھ کہو تو"

اُس نے ایک دفعہ منہ اوپر اُٹھایا: آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ یا وحشت! تو اس گریہ زاری کا باعث میں تھا۔ میرے ہی جانے کا سُن کر وہ رو رہی تھی۔ کیا میری طرح اُسے بھی مجھ سے محبت ہو گئی۔ میں نے یونہی پوچھا: "اگر میں نہ جاؤں تو خوش ہو گی!" یہ کہہ کر میں اُٹھ کر اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

اُس نے حیرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا، اور پھر سسکیاں لیتے ہوئے میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے محبت سے اُس کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا:۔

"نسیمہ! جس راز کو میں اتنے دنوں سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا۔ آج تم پر ظاہر کر رہا ہوں میں تم سے محبت کرتا ہوں نسیمہ! بے اندازہ اور بے پایاں محبت . . . . ." اس کے بعد محبت کے نہ ٹوٹنے والے عہد و پیمان ہوئے، اور میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں ابا سے کہہ کر ضرور ہی انہیں شادی پر راضی کر لوں گا۔ ان کے نہ ماننے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ نسیمہ نے اعتراف محبت کے طور پر کہا کہ وہ بھی جس دن سے اُس نے مجھے دیکھا تھا، والہانہ محبت کر رہی تھی۔ میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

میں جلد ہی واپس آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے آگیا۔ آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ تقدیر میری راہ میں اس طرح رکاوٹیں حائل کر دے گی۔ میں جب کالج پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری کی اطلاع میرے گھر پہنچا دی گئی تھی۔ دو روز

پہلے میرے ابا آئے تھے۔ بہت گھبرائے ہوئے تھے چونکہ نذیر کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں کہاں گیا ہوں۔ اس لئے اُس نے اُن کی پریشانی دور کرنے کے لئے اُس نے بتا دیا تھا کہ میں اختر کے یہاں گیا ہوں بس اس کا اتنا کہنا ہی غضب ہوگیا۔ باقی حال لڑکوں اور کالج کے پروفیسروں نے اختر کے خاندان کے بارے میں اُن کے گوش گزار کر دیا۔ یہ سُن کر وہ بہت حیران ہوئے۔ انہیں یقین نہ آتا تھا کہ ان کی زیر سرپرستی پرورش پایا ہوا بچہ اس قدر سرکشی کرے گا۔ اُن کی نظروں میں اس سے بڑھ کر کوئی جرم ہی نہ ہو سکتا تھا کہ اُن کا لڑکا طوائف کے لڑکے کا دوست ہو۔ اور مراسم اتنے گہرے ہوں کہ اُسے وہ اپنے گھر لائے اور خود اُن کے یہاں جائے۔ کسی مظلوم کی مدد کرنا، کسی بیمار کی عیادت کے لئے جانا اُن کی نظروں میں خاندانی عزت و وقار کو خاک میں ملانے کے مرادف تھا۔ وہ اسے کسی حالت میں بھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ان کا نورِ نظر ایک بازاری عورت کی خبر گیری کرے۔ جو گناہ کے ماحول میں پروان چڑھی ہو اور خاندانی عزت و ناموس کو اس طرح پس پشت ڈال کر کالج سے غیر حاضر رہ کر اس کی تیمارداری کرے، اور جاتے وقت دھمکی دیتے گئے کہ اگر وہ دو دن کے اندر اندر واپس نہ آیا تو میں خود اسے لینے جاؤں گا، اور پھر اُسے اپنی بریت میں بہت کچھ کہنا پڑیگا۔ میں کسی حال میں بھی اُسے اتنی سرکشی اور خود سری کی اجازت نہیں دے سکتا۔

میں گھر گیا، تو میری درگت بنی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میرے ابا نے نہ صرف مجھے کالج ہی جانے سے منع کر دیا۔ بلکہ آیندہ سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھنے سے روک دیا۔ اُن کی نظروں میں میرا تعلیم جاری رکھنا میری تباہی و بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی اپنے خاندان کے وقار و عزت کو خاک میں ملانے کے لئے تیار نہ تھے۔ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ میرا مستقبل تاریک ہو جائے۔ انہیں یہ منظور تھا کہ میری زندگی کی تمناؤں کا خون ہو جائے۔ میری آرزوؤں کا قبل از وقت گلا گھونٹ دیا جائے۔ مگر وہ اس بات کے حق میں نہ تھے کہ میں پڑھ لکھ کر ایسی حرکت کا ارتکاب کروں جس سے اُن کی بدنامی و رسوائی ہو۔

میں نے لاکھ خوشامدیں کیں۔ امی سے کہلوایا۔ رشتہ داروں سے سفارشیں کروائیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے میرے دل میں اب کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی تمنا نہ تھی بلکہ اس معصوم دوشیزہ سے کیا ہوا وعدہ تھا جسے میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں تھا جو میرے عہد و پیمان پر مطمئن بیٹھی تھی جس کو میں نے یقین دلا دیا تھا کہ میں اس سے شادی کرونگا اور اپنے والد صاحب کو راضی کر لوں گا، مگر جو اس معمولی سی تیمارداری کے جرم میں اپنے بیٹے کے سلسلۂ تعلیم کو منقطع کر دے، اُس باپ سے یہ امید رکھنا کہ وہ ایک ایسی شادی کے لئے تیار رہیگا۔ ایک مجنونانہ خیال تھا۔ میری تمناؤں کا خون ہو رہا تھا۔ میری جوان آرزوؤں پر پانی پھرا جا رہا تھا۔ مگر میں اُف نہ کر سکتا تھا۔

اب میرا کام دن بھر اپنے کمرے میں پڑا رہنا تھا۔ جانا بھی تو کہاں جانا کہیں دل ہی نہ لگتا تھا۔ اندر باہر میرے لئے برابر تھا۔ سینے میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ جو مجھے کہیں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی۔ امی نے دو ایک دفعہ کھیتوں کی طرف جانے کے لئے کہا۔ انہیں مجھ سے ہمدردی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ چونکہ مجھے کالج جانے سے روک دیا گیا ہے۔ اس لئے افسردہ خاطر اور کھویا کھویا سا رہتا ہوں۔ مگر انہیں کیا خبر تھی کہ میری افسردگی سلسلۂ تعلیم کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اپنے مقاصد میں اپنے ارادوں میں ناکامی کی وجہ سے تھی۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے اور میں ناکامی کے بحرِ بے پایاں میں پڑا غوطے کھا رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ رہ رہ کر یہ خیال بے چین کر رہا تھا کہ میں اپنے مستقبل کا فیصلہ ابا کے منہ سے سُن چکا ہوں۔ مگر نسیمہ میرے وعدوں پر مطمئن بڑی بے چینی سے میری راہ دیکھ رہی ہوگی میں اُسے کس طرح اپنی نامرادی اور ارادوں کی ناکامی سے مطلع کروں۔

نسیمہ کے یہاں سے آئے ہوئے مجھے چھ مہینے گزر گئے۔ اختر کے کئی خط آئے، جن میں وہاں آنے ... لئے اصرار

ہوتا تھا۔ اب اُس نے بھی کالج کو خیرباد کہہ دیا تھا اور بڑی بیقراری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں بھی وہاں جانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ مگر جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہائے مجبوریاں محبت کی!

میری طویل خاموشی کی وجہ سے سب حیران تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ میں کن مجبوریوں میں گھرتا رہوں۔ بارہا ارادہ کیا کہ انہیں اپنے ابا کے ظالمانہ سلوک اور بے جا پابندیوں سے مطلع کر دوں۔ مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہو رہا۔

کچھ دن بعد اختر کا پھر ایک خط آیا جس میں نسیمہ کے علیل ہونے کا لکھا تھا اور مجھ سے بڑی شدومد کے ساتھ اصرار کیا تھا کہ میں ایک دفعہ وہاں ضرور آؤں۔ میں ابھی سوچ رہا تھا کہ نسیمہ کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا پہلا مکتوب ملا۔ اس میں اس نے جس پیرائے میں میری بے وجہ خاموشی اور بے اعتنائی کا شکوہ کیا تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ میری راہ دیکھ رہی تھی اور لکھا تھا کہ اگر اب بھی نہ آئے تو میں زندہ نہ رہ سکوں گی کیا اتنی جلدی بھول گئے . . . . . .

میں نے تہیہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو، میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ خفیہ ہی خفیہ میں نے سامانِ سفر درست کر لیا۔ اور اختر کو اپنے ارادے سے مطلع کر دیا۔ خیال تھا کہ صبح کسی کو خبر دیئے بغیر روانہ ہو جاؤں گا۔ مگر افسوس میں گلی صبح نہ جا سکا۔

والدہ صاحبہ عرصہ سے صاحبِ فراش تھیں۔ رات کو اُن کی حالت یکایک غیر ہو گئی۔ والد صاحب گھر پر نہ تھے اس لئے ڈاکٹر وغیرہ کو بلانے اور دیگر انتظامات مجھے کرنے پڑے۔ متواتر تین ہفتے تک وہ موت و حیات کے درمیان لٹکتی رہیں۔ اور جب انہیں کچھ صحت ہوئی تو میں دوبارہ سامانِ سفر درست کرنے لگا دوپہر کی ڈاک سے دو خط آئے ایک اختر کا تھا اور دوسرا نسیمہ کا۔ لفافہ مڑا تڑا تھا جیسے کسی نے عرصہ تک جیب میں رکھ چھوڑا ہو۔ میں نے بڑی بے صبری سے پہلے نسیمہ کا خط کھولا۔ آہ میرے خدا! اس نے میری طرف سے بے امید ہو کر یہ آخری خط لکھا تھا۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ میں اتنا سنگ دل اور دغاباز آشنا ثابت ہونگا اس مختصر سے مکتوب میں واردات قلب کی وہ پرسوز داستان مرقوم تھی کہ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ بسترِ مرگ پر پڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے خط کے مطابق مجھے ایک ہفتہ پہلے وہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مگر جب میں نہ پہنچا تو اُس نے آخری خط لکھا جسے اس نے امی اور اختر سے چھپا کر کسی بچے کے ہاتھ ڈاک میں ڈلوانے کا انتظام کیا تھا، اور وہ اُسے شاید جیب میں رکھ کر بھول گیا جس کی وجہ سے وہ مجھے دو چار روز بعد ملا۔ خط کے لفظ لفظ سے اُس کی محبت و وفاداری آ رہی تھی۔ آخری دفعہ پھر اُس نے اپنی محبت کی قسم دے کر اصرار کیا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے میں ایک دفعہ صرف ایک مرتبہ اُسے اپنا منہ دکھا جاؤں . . . . میں تڑپ اُٹھا اور بے اختیار اُس کے مکتوب محبت کو چوم لیا سینے سے لگا لیا۔ میری وفا شعار نسیمہ . . . . !

مگر آہ . . . . جب میں نے اختر کا خط کھولا۔ تو آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ دلیس تک میرا انتظار کرنے والی نسیمہ۔ مجھے آخری بار دیکھنے کی تمنا لے کر داغِ مفارقت دے چکی تھی . . . . . . میں اس سے زیادہ نہ پڑھ سکا۔ شدتِ غم سے بے ہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو میں اور دیگر رشتہ دار میری چارپائی کے گرد گھبراہٹ اور پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں مہینوں بسترِ علالت پر ایڑیاں رگڑتا رہا۔ مگر دل کی لگی بجھ نہ سکی۔ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مرنے سے بچ گیا۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ نسیمہ کی موت کے بعد میں زندہ ہی کب ہوں۔

عصمت علی صابر نومحلوی

مُسکرا کے دیکھ

راہِ وفا میں دل کو مکمل بنا کے دیکھ
ٹھوکر جو لازمی ہے تو ٹھوکر بھی کھا کے دیکھ

آنکھوں میں کیا رکھا ہے مرے دل میں آکے دیکھ
در تک پہنچ چکا ہے تو گھر میں بھی آکے دیکھ

تصویر اُن کے ساتھ کھنچی ہے مری تو کیا
تیور جدا جدا ہیں جفا و وفا کے دیکھ

احساسِ مرگ اِدھر تو اُدھر سعیِ چارہ گر
اُمید زندگی کی بہانے قضا کے دیکھ

جو مٹ گئے طلب میں طلب اُن پہ مٹ گئی
مٹتے بقا سے بھی ہیں فزوں تر فنا کے دیکھ

وہ دن گئے کہ حُسن کو زعمِ نگاہ تھا
اب تو مری نظر سے نظر کو ملا کے دیکھ

[illegible] حرص و آز کہاں جستجو کہاں
مل جائے گا خدا ابھی خودی کو مٹا کے دیکھ

[illegible] کے بعد کوئی بھی اتنا نہ کہہ سکا
اے برقِ طور پھر تو ذرا مسکرا کے دیکھ

[illegible] ہیں مٹانے سے وہ نامور ہوئے
عالم جدا جدا ہیں فنا و بقا کے دیکھ

آئیں گے ہاتھ جب دُرِ مضموں ترے عزیزؔ
دریائے غور و فکر میں غوطہ لگا کے دیکھ

(سید عزیز الحسن عزیزؔ منھلاوی)

ٹکڑے اُڑا دیئے

دل کے جمالِ یار نے ٹکڑے اُڑا دیئے
آتش نے مے کی شیشے کے ٹکڑے اڑا دیئے

مجرم وہ ہوں کہ میری سفارش کو اُٹھیگا
وہ ہاتھ جس نے چاند کے ٹکڑے اُڑا دیئے

[illegible] سے کرم ترا معراجِ یادِ یار
دونوں جہاں کے خوف کے ٹکڑے اُڑا دیئے

میں نے کہا حضور کا اپنے غلام ہوں
رحمت نے فردِ جرم کے ٹکڑے اُڑا دیئے

لطیف پونوی



طاقت اور تندرستی کے لئے بچوں کو ڈونگرے کا بال امرت دینا ضروری ہے کیونکہ اس میں ادویات پڑی ہوتی ہیں!

حکمت کی نایاب کتاب

طب عثمانی

منظور نظر اعلیٰحضرت آصفجاہ میر عثمان علی خاں صاحب خلد اللہ ملکہٗ نظام دکن
یہ طب یونانی کی جامع اور علم فہم کتاب گیارہ سو صفحات کے قریب ہے جسے علم طب کے
ماہر اکمل حکیم سید مفضل حسین صاحب شاہی طبیب نے سالہا سال کی محنت اور اپنے ۴۰
سالہ تجربات کے بعد تصنیف کیا ہے جو طب عثمانی کے نام سے حضور نظام کے نام
نامی سے معنون کی گئی ہے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ حکیم صاحب موصوف نے اپنے ۴۰ سال
تجربات کے بعد خود تصنیف کیا ہے اور ایسی عمدگی سے ترتیب دیا ہے کہ ہر وہ
شخص جو اردو پڑھ سکتا ہے ہر ایک مرض کی تشخیص اور اس کا علاج خود بخود کر سکتا
ہے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ قیمتی ادویہ کے نسخہ کے بالمقابل کم قیمت یا کوڑی
کے مول کی ادویات کے علاوہ وہ نسخے بھی اس کتاب میں درج کر دیئے گئے ہیں
جن سے عام آدمی مستفید ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ بہت سی خصوصیات ہیں جو
دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں لکھائی چھپائی عمدہ حجم ۱۱۰۰ صفحات مجلد چمڑا
صرف ایک ماہ کے لئے بجائے بارہ روپے آٹھ آنے ۸؍۵

پتہ:- پبلک بک ایجنسی کشمیری بازار لاہور

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

حالات زندگی ۴؍

آج ہی جوابی لفافہ بھیجکر عمر بھر کی زندگی کے حالات طلب
کریں- جھوٹ ثابت کرنے والے کو ایک سو روپیہ نقد انعام
اور ہمارا تیار کیا ہوا طلسم رفی نیوس منگوا کر اس کا اثر دیکھیں
منگل اور سنیچر نہایت ہی منحوس اور طاقتور ستارے ہیں- یہی انسان کی
زندگی پر خراب اثر ڈالتے ہیں اور انسان طرح طرح کی مصیبت میں
ہو جاتا ہے اس مشکل کو حل کرنے کیلئے ہمارا تیار کیا ہوا رفی نیوس منگوا کر
اس کا اثر دیکھیں- سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلے لیکن یہ اپنا
نہیں چھوڑتا- بجلی کی طرح پانچ منٹ پر اپنا اثر دکھاتا ہے- دوسرے
کے لئے بھی تیار کئے جاتے ہیں جوابی لفافہ بھیجکر طلب کریں قیمت

پتہ

عامل قمر الزماں نیوڈیرہ ضلع لاڑکانہ سندھ

نقد و نظر

بھوت

ترجمہ :—— مظہر عزیز

ضخامت $\frac{20 \times 30}{16}$ ، ۱۷۲ صفحات . قیمت عہ/ر

ملنے کا پتہ :— اردو اکیڈیمی - لوہاری دروازہ - لاہور

ہنرک ابسن (۱۸۲۸ء تا ۱۹۰۶ء) ناروے کا وہ شہرۂ آفاق
[ڈراما] نویس تھا جس نے فن تمثیل نگاری کو نئی بنیادوں پر استوار
[کیا] اور جس کے نقش پا پر برنارڈ شا، ہرٹو ہیرو یو اور ہاپٹ مین
جیسے القدر ڈراما نویس بھی چلنے پر مجبور ہوئے - اُس نے ڈراما
[کی تکنیک] کی طرف خاص توجہ کی - اور مکالمے کی بہ نسبت اصول
[ضوا]بط پر زیادہ زور دیا - اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ ڈراما
[جب] نقطۂ عروج " Climax " پر پہنچ جائے تو اس میں
[ایسا] رچید اگر دیا جائے کہ تماشا بین متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں
[ابسن] واعظ نہ تھا بلکہ اُس کے پیش نظر ہمیشہ " آرٹ " کی
[خدم]ت رہی ہے - اس لحاظ سے جو لوگ اُسے دین عیسوی کا دشمن
[اور مادیت] کا حامی اور شیطان کا چیلا قرار دیتے ہیں وہ بھی نہیں
[جانتے کہ] وہ دراصل اُس کے ڈراموں کی روح ہی کو سمجھنے سے
[قاصر ر]ہے ہیں - ادبیات عالم میں ابسن کا صحیح ترین مقام یہ
[ہے کہ ا]س نے تمثیل کے ذریعے سے اپنے زمانے کی ایک جھلک
[دکھانے] کی کوشش کی ہے - وہ نقاد ضرور تھا لیکن مشکلات
[کا حل تجوی]ز کرنا اس کے دائرۂ عمل سے خارج تھا - یوں تو ابسن
[نے بہت سے عم]دہ ڈرامے لکھے ہیں لیکن جو مقبولیت " گڑیا کے
[گھر " اور "]بھوت " کو حاصل ہوئی اس کی نظیر نہیں ملتی - اس
[وقت ہما]رے سامنے " بھوت " کے نام سے اس کے معرکہ آرا
[ڈرامے] Ghosts کا اردو ترجمہ ہے جو ایک صاحب مسٹر مظہر
[عزیز نے کیا] ہے - اس ڈرامے کا محوری نقطہ یہ ہے کہ باپ کے
[گناہوں سے اولا]د پر کس حد تک اثر ہوتا ہے ؟ فنی لحاظ سے اس ڈرامے
[کو ابسن کا شاہک]ار قرار دیا جا سکتا ہے - لائق مصنف نے غیر
[ملکی ما]حول اجنبیت دور کرنے کے لئے افراد کو ہندوستانی
[لباس] اور مکالموں میں " ہندوستانیت " داخل کر دی ہے - مترجم
[کو بعض اوقات اچھی] طرح کھٹکتا ہے " یہ جملے مخمل میں ٹاٹ کے پیوند

ہی سہی لیکن امید ہے کہ ابسن کی روح اور ادب نواز نقادانِ فن
کو گراں نہ گزریں گے " لیکن اس اختلاف سے وہ کوفت دور
نہیں ہو سکی جو ڈرامے کو " آدھا تیتر اور آدھا بٹیر " بنانے سے
قدرتی طور پر محسوس ہوتی ہے - اگر ہندوستانی معاشرت کا پورا
اور پکا رنگ چڑھانے سے " بھوت " کی ڈرامائیت زندہ نہ رہ
سکتی تھی تو رد و بدل کی کیا ضرورت تھی ؟ بہرحال اس نقص سے
ڈرامے کی روح پر بہت زیادہ ناخوشگوار اثر نہیں پڑتا - اور
ہم اسے بلا تامل دورِ حاضر کا بہترین ڈراما قرار دے سکتے ہیں -
ہمیں امید ہے کہ ہر صاحبِ ذوق اس ڈرامے کے مطالعے
سے مستفید ہو گا -

ناگ رانی

مترجمہ :—— سراج الدین نظامی و ڈاکٹر محمد دین تاثیر

ضخامت $\frac{20 \times 30}{16}$ ۱۶۰ صفحات قیمت مجلد دو روپے

ناشرین :—— ہاشمی بک ڈپو - لاہور

الیف - ڈبلیو - بین نے سنسکرت کی بعض قدیم کہانیوں
کو انگریزی کا لباس پہنایا تھا - ان میں سے ایک مجموعے کا
ترجمہ " پریم کا جادو " کے نام سے شائع ہو چکا ہے - اب " ناگ رانی "
کے نام سے الیف - ڈبلیو - بین کے ایک اور مجموعے کا ترجمہ
جلوہ گر اشاعت پر آیا ہے " ناگ رانی " کا ترجمہ سب سے
پہلے ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے شروع کیا تھا - لیکن وہ تعلیمی
مصروفیات میں اس درجہ اُلجھ گئے کہ یہ کام پایۂ تکمیل تک
نہ پہنچ سکا - اب مسٹر سراج الدین نظامی نے اس بیل کو منڈھے
چڑھایا ہے - اندازِ بیان اچھوتا ، دلکش اور پیارا ہے - ممکن ہے
اس قصے کو بعید از حقیقت قرار دیا جائے - لیکن اس کے
متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ اچھی طرح ذہن نشین
کر لینا چاہئے کہ پراچین کے رشی صاف گوئی کی بہ نسبت استعارہ
و تشبیہ کو مرجح خیال کرتے تھے - بہرحال اس طویل قصے کی دل
نشینی سے انکار نہیں کیا جا سکتا - اسے پڑھ کر ایک اعلیٰ درجے

اشارات

مصنفہ:- جوش ملیح آبادی
ضخامت:- $\frac{22 \times 29}{16}$ ، ۳۰۲ صفحات
قیمت مجلد دو روپے
ناشرین:- نگارستان ایجنسی ۔ اردو بازار ۔ دہلی

یہ حضرت جوش ملیح آبادی کے اُن ۳۲ مقالات کا مجموعہ ہے جو آج سے چند سال پیشتر انہوں نے ماہنامہ "کلیم" کے اداریے کے طور پر لکھے تھے جو لوگ جوش کو محض ایک شاعر انقلاب کی حیثیت میں جانتے ہیں انہیں "اشارات" پڑھ کر محسوس ہوگا کہ ان کا خامہ بہار آفریں گلستانِ نثر میں بھی نت نئے گل کھلا سکتا ہے۔ نظم کی طرح جوش کی نثر میں بھی انداز بیان کی ندرت، نشستِ الفاظ کے تناسب اور تشبیہات واستعارات کی رنگینی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ جوش انقلاب و تجدد کا سب سے بڑا پیامی ہے۔ اس لئے نثر میں بھی اس نے اوہام و تقلید اور قدامت کے خلاف نعرۂ بغاوت بلند کیا ہے چنانچہ "عقل کی باتیں" کے عنوان سے وہ لکھتا ہے

"ایک بار پھر سنو اور غور سے سنو کہ تمہارے دماغوں پر تقلید اور اوہام کی برف جمی ہوئی ہے۔ تمہاری ذہنی فضا میں بوسیدہ روایات کا غلیظ دھواں گھٹا ہوا ہے۔ اور تمہارے نفوس کے گرد قدامت پرستی کی کائی سے ڈھکی ہوئی سربفلک دیواریں کھڑی ہیں۔ اب بھی سویرا ہے۔ خدا کے واسطے چونکو، اُبھرو اور پھریرا لے کر کھڑے ہو جاؤ، تقلید واوہام کی برف کو آزاد اندیشی کے تیشے سے کاٹ ڈالو۔ روایات کے دھوئیں کو صحیح تفکر کی تند ہواؤں میں اُڑا دو اور قدامت پرستی کی دیواروں کو روشن خیالی کی توپوں سے مسمار کر ڈالو"

جوش کا رنگ عام طور پر واعظانہ ہے اور جدت پسندی کے جوش میں بعض اوقات اس پر وارفتگی اور جنون کی حالت طاری ہو جاتی ہے، اور اسی عالم میں وہ ایسی کڑوی کسیلی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جن کو کفر والحاد اور زندقہ وبے دینی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ذہن نشین کر لیا جائے کہ جوش دینداد فلسفی یا مدبر نہیں ہے بلکہ محض ایک جوشیلا شاعر ہے تو اس کے مبالغہ آمیز استدلال کو بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ کتاب جوش ملیح آبادی کی نثر نگاری کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ اور اسے عمل کے لئے نہ سہی تفنن طبع اور ادبی ذوق کی آسودگی کی خاطر یقیناً زیر مطالعہ رکھا جا سکتا ہے۔

۱۹۴۲ء کی منتخب غزلیں

مرتبہ:- آغا سرخوش قزلباش

ضخامت $\frac{22 \times 29}{16}$ ۴۵ صفحات قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ:- نگارستان ایجنسی ۔ اردو بازار ۔ دہلی

یہ اردو کے چون (۵۴) مقبول عام [illegible] شعراء کی اُن غزلوں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۴۲ء میں کہیں۔ شاعروں میں جہاں جلیل مانکپوری ۔ نوح ناروی ۔ جوش ملیح آبادی ۔ اثر لکھنوی ۔ یگانہ چنگیزی ۔ علی اختر حیدر آبادی ۔ ظفر علی خان ۔ سیماب اکبر آبادی ۔ وحشت کلکتوی اور فراق گورکھپوری [illegible] قادر الکلام اور اساتذہ سخن شامل ہیں، وہاں [illegible] وامق جونپوری ۔ گوہر دہلوی ۔ ضیاء الاسلام ۔ حزیں امروہوی وغیرہ جیسے نیم معروف شعرا کا نام بھی نظر آتا ہے تاہم غزلوں کے انتخاب میں سخن شناسی اور خوش ذوقی کا ثبوت دیا گیا ہے امید ہے یہ حسین وجمیل مجموعۂ کلام شعریت نواز [illegible] پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

گفت وشنید

مصنفہ:- بشیر ہاشمی
ضخامت $\frac{17 \times 27}{16}$ ، ۱۴۰ صفحات۔
قیمت ۸ ۔ ناشر:- اردو اکیڈمی ۔ لوہاری دروازہ ۔ لاہور

مسٹر بشیر ہاشمی اخبارات ورسائل کی دنیا میں [illegible] نہیں ہیں لیکن جن لوگوں کو آل انڈیا ریڈیو سٹیشن لاہور [illegible] نشریات سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ اُن کے نام سے ضرور واقف ہوں گے "گفت وشنید" ان کے تقریباً ایک درجن نیم مزاحی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ ان میں سے [illegible] مضامین لاہور ریڈیو سٹیشن سے براڈکاسٹ ہو چکے ہیں۔ [illegible] اردو بیرا منشی جی ۔ شاعر اور ہیڈ ماسٹر خاص طور پر دلچسپ اور پر لطف انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مصنف کا مشاہدہ [illegible] کافی گہرا اور وسیع ہے۔ زبان صاف، سادہ اور دلکش ہے۔

جو لوگ ہلکے اور لطیف ادب کی تلاش میں رہتے ہیں انہیں اس کتاب کے مطالعے سے محروم نہ رہنا چاہئیے (شبلی بی کام)

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۴۰ — فہرست مندرجات اگست ۱۹۴۳ء — نمبر ۲

حافظ محمد عالم ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے عالمگیر پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر سید مٹھا بازار لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

نہ پاسِ خلق، نہ خوفِ خدا، نہ شرمِ نبیؐ
نیا ادب ہے کہ سعیٔ فروغِ بے ادبی

آج سے چند سال پیشتر "ترقی پسندانہ ادب" کے پُرفریب نام سے آکسفورڈ میں ایک تحریک شروع ہوئی۔ جس کا مقصد حیاتِ انسانی پر ایک نئے زاویہ سے روشنی ڈالنا تھا۔ چند مغرب گزیدہ ہندوستانی طلبہ کے طفیل جب یہی تحریک ہندوستان آئی تو اپنے جلو میں وہ تمام عفونت انگیز آلائشیں بھی لیتی آئی جن سے مغربی ادب کا دامن آلودہ نظر آتا ہے۔ ہندوستان کا نوجوان ادیب پہلے ہی اپنے رستہ سے بھٹک چکا تھا جب اس نے "ترقی یافتہ ادب" کا گمراہ کن نام سُنا تو "منزلِ مقصود" سمجھ کر اس کی طرف لپکا۔ اور بلا سوچے سمجھے اس سے جا کر لپٹ گیا۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ جسے وہ "چشمۂ صافی" خیال کر رہا ہے وہ دراصل "سراب" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور جو چیز اُسے "شاخِ گل" نظر آتی ہے وہ درحقیقت "مارِ سیہ" ہے جو اس کی ادبی زندگی کا گلا گھونٹ ڈالے گا۔

تاہم یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہندوستان کے اکثر باذوق حلقے جدید عریاں ادب کے خلاف صف آرا ہو رہے ہیں اور جگہ جگہ ادبی مجلسوں کے ذریعے سے "گربہ کشتن روزِ اول" کے اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جن لوگوں نے اُردو ادب کے خرمن میں یہ اخلاق سوز چنگاری ڈالی ہے ان کے ہاتھوں میں ادارہ نشریات کی باگ ڈور ہے۔ اور وہ "ایتھر" کے جھونکوں سے اس آگ کو ہوا دینے میں کامیاب ہو رہے ہیں لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ جن قارئین کے پاس ریڈیو کے لائسنس ہیں وہ حکومتِ ہند کو مناسب اور موثر طریقے سے توجہ دلائیں کہ وہ بے تکی شاعری اور عریاں ادب سے اپنی سمع خراشی کے لئے ایک پائی بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ سر سلطان احمد رکن نشریات نے پچھلے دنوں یقین دلایا تھا کہ وہ سامعین نشریات کے ہر معقول مشورہ پر عمل کرنے کو تیار ہیں لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اُن کی متفقہ آواز بے اثر ثابت ہو۔

~~~

ہمیں یہ دیکھ کر صدمہ ہوتا ہے کہ پنجاب کے بعض رسائل و جرائد بھی اسی رنگ میں رنگین ہو رہے ہیں اور گزشتہ چند برس سے اُن کے دامن میں بھی وہ کثافتیں نظر آتی ہیں جو کسی زمانہ میں یونان اور فرانس کے ادبیات سے مخصوص ہو چکی تھیں۔ "عالمگیر" صحیح و صالح اور جدید و ترقی یافتہ ادب کا مخالف نہیں ہے۔ بلکہ اس کے فروغ کے لئے ہر وقت کمربستہ اور ہمہ تن مصروف ہے۔ لیکن ہم اس ادب کے ہرگز قائل نہیں ہیں جس کا مقصد "ہوس جوئی" اور "طرب طلبی" ہو۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ادب کو "جدید" تقاضوں کے مطابق ہونا چاہئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ "فرائیڈ" کی طرح ماحول کے ہر گوشے کو حرص و ہوس کا مرکز سمجھ لیا جائے۔ ہمارے نزدیک انسانی زندگی کے کئی ایسے خوشگوار پہلو بھی ہیں جن پر ناقدانہ نگاہ ڈالی جا سکتی ہے اور جن کو حرص و ہوس سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ "عالمگیر" اپنے نظریہ پر چٹان کی طرح قائم ہے۔ ممکن ہے اس کے پیشِ نظر عالمگیر کو قدامت پسند خیال کیا جائے لیکن ہم اسد ملتانی کے الفاظ میں ترقی پسند ادیبوں سے مخاطب ہو کر کہیں گے ؎

دو بوالہوس بھی جنھیں جرأتِ گناہ نہیں ... ادب میں ڈھونڈ رہے ہیں علاجِ ...
جدید بھی تو نہیں۔ ادب کہ ہو اس میں ... وہی قدیم ہوس جوئی و طرب ...
پھر ایک بار یہ شیعۂ فرنگ ابھرا ہے ... دبا ہوا ادبِ جاہلیتِ عر...
اسد ادیبِ "ترقی پسند" سے کہہ دو ... رہے تجھی کو مبارک فریبِ خوش نظ...

اُردو کے اچھے اچھے لکھنے والے گمرہی و بے رہروی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ عالمگیر میں صرف ایسے مضامین نظم و نثر کو جگہ دی جائے جو انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی تو ضرور کریں لیکن ان کا معیار اتنا نہ گرنے پائے کہ انسانی تہذیب و شرافت کا صدیوں سے جمع کیا ہوا ... تباہ و برباد ہو کر رہ جائے۔ زیرِ نظر اشاعت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تین تقریریں درج کی جا رہی ہیں جن کے ایک ایک حرف میں حکمت و موعظت کا دریا موجزن ہے۔ "فنِ تنقید اور مرزا غالب"۔ "ماریہ رولاں" اور "عربوں کی ..." بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے خوب ہیں۔ "منصور حلاج" حضرت داتا گنج بخش کی شہرۂ آفاق تصنیف "کشف المحجوب" سے ماخوذ ہے اور افراط و تفریط سے بڑی حد تک پاک ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مضمون سے اس تلخ کلامی کا ازالہ ہو سکے گا جو ... محمد اسمٰعیل کے مقالہ میں نظر آتی تھی۔ کہانیاں سب کی سب آرٹ کے نقطۂ نظر سے کامیاب ہیں۔ منظومات کی سحر طرازی کا سہرا حضرات شعرا کے سر ہے۔

میر فیصل کے دو افسانے — عالمگیر کی گزشتہ دو اشاعتوں میں میر فیصل کے دو افسانے "نہ معلوم صاحبہ" اور "اس نے سوچا" شائع ہو چکے ہیں کسی غلط فہمی کی بنا پر ادارہ کی طرف سے ان افسانوں کو انگریزی سے ترجمہ ظاہر کیا گیا تھا لیکن میر فیصل صاحب کا بیان ہے کہ یہ دونوں افسانے اُن کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا قارئین مطلع رہیں۔ (مدیر)
~~~

اخبار و افکار

از:- ادارہ

سر سلطان احمد کی خدمت میں!

سر سلطان احمد رکن محکمہ اطلاعات و نشریات حکومت ہند نے پچھلے دنوں آل انڈیا ریڈیو سٹیشن دہلی سے جو تقریر کی اس کا ایک ایک لفظ ان لوگوں کی توجہ کے قابل ہے جو نشرگاہ ہند کو تہذیب و تمدن اور ثقافت و معاشرت کا ترجمان بنانا چاہتے ہیں۔ یہ تقریر یقیناً مقرر کے ترقی پسندانہ خیالات کی آئینہ دار ہے اور اس کے ذریعے سے ریڈیو سننے والوں کو دعوتِ تعاون بھی دی گئی ہے۔

سر سلطان احمد ایک تجربہ کار قانون دان اور سلجھے ہوئے ادیب ہیں اس لئے ان کے طریقہ خدمات سے بہت سی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ انہوں نے ریڈیو سننے والوں کو دعوت تعاون دے کر ایک اور سوال پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کیا ریڈیو اسٹیشنوں نے کبھی ہندوستان کی ترقی یافتہ اور مقبول و معروف زبان سے تعاون کیا ہے؟ ہمارے کان سنتے آئے ہیں کہ ریڈیو کی زبان زمانہ قبل از تہذیب کے گھسیاروں کی ترجمانی کرتی ہے۔ غیر مانوس الفاظ و متروکات کا اعادہ اس کا شعار ہے اور صاف اور سلجھے ہوئے مرادفات کو چھوڑ کر کھلیوں اور دلوں کی زبان کو قابل ترجیح سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات تو ایسے مرادفات سنائی دیتے ہیں جو اپنی ثقالت اور غیر مقبولیت کے سبب سنسکرت آمیز ہندی سے بھی خارج کئے جا چکے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ریڈیو سٹیشن نے ہندوستانیوں کی اصلاح ذہنیت پر تعاون و اشتراک عمل کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں تاہم اگر سر سلطان احمد ریڈیو سننے والوں کو خلوص کے ساتھ اپنی طرف بلاتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ ریڈیو کی زبان بھی تعاون لانے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ ہی دہلی ریڈیو سٹیشن پر جو لوگ چھائے ہوئے ہیں وہ "ترقی پسندانہ ادب" کے نام پر ہندوستانی قوم و ملک کے گلے پر ادبی الحاد کی چھری پھیر رہے ہیں کیونکہ "ترقی پسند ادب" کے رنگین پردے میں جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں انھیں ہندوستانی معاشرت کبھی قبول نہیں کر سکتی۔ اور انہی لوگوں کی اجارہ داری کے باعث کسی صحیح و صالح ذہانت کے ادیب کو ریڈیو سٹیشن میں جگہ نہیں ملتی۔ یہ شکوہ محض اس لئے کیا گیا ہے کہ سر سلطان احمد خود ادیب ہیں، وہ ادب کو اصول ادب کی صحیح روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں توقع ہے کہ وہ زبان کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ریڈیو کے نظامی اجزا کی طرف بھی توجہ فرمائیں گے تاکہ ہماری نشرگاہیں صحیح معنی میں ہماری تہذیب کی ادبی ترجمان بن سکیں۔

جے پور اور اُردو

جے پور کا ہندوانہ نظام ریاست اگر خود اُردو کو ہلاک کرنا چاہتا تو ہم اس دورِ تعصب میں شاید اس ظلم کو بھی برداشت کر لیتے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اُردو کی ہلاکت کے لئے اختیارات کی چھری مسلمان وزیر اعظم کے ہاتھ میں دی گئی ہے اور اس افسوسناک حرکت کے لئے جو وجوہ جواز پیش کی جاتی ہیں وہ معقولیت سے کوسوں دُور ہیں۔ چنانچہ سر میرزا محمد اسمٰعیل نے اپنی ایک تقریر میں حقائق سے پوری طرح آنکھیں بند کر کے فرمایا کہ ریاست کی ۹۲ فیصدی کا رسم الخط دیوناگری ہے۔ حالانکہ سرکاری معلومات کے مطابق ہر ملک کی آبادی میں ۳۰ فیصدی شیر خوار بچے ہوتے ہیں اگر سر میرزا کا ارشاد صحیح ہے تو یہ بھی ماننا پڑیگا کہ ریاست جے پور میں ۹۲ میں سے ۳۰ شیر خوار بچے بھی دیوناگری کے خط سے واقف ہیں لہٰذا جس وقت وہ دودھ پینا چاہتے ہیں روتے نہیں بلکہ ایک چٹ پر دیوناگری حروف میں یہ لکھ کر ماں کے حوالے کر دیتے ہیں کہ "ماں مجھے دودھ پلادو"۔ کیا کسی ریاست کے تجربہ کار ترین وزیر اعظم سے اس مضحکہ خیز دلیل کی توقع ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں تو سر میرزا کو اپنی شان یکتائی پر غور کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ایک اور مضحکہ خیز دلیل بھی سن لیجئے۔ ریاست کے اعلان میں بتایا گیا ہے کہ سرکاری دفاتر میں رفتہ رفتہ دیوناگری رائج کی جا رہی ہے اگر ریاست کی ۹۲ فیصدی آبادی دیوناگری رسم الخط کی پوجا کرتی ہے تو پھر رفتہ رفتہ "ترجیح" کا کیا مطلب ہے صرف رسم الخط کی تبدیلی کا اعلان ہی کافی تھا۔ اسی اعلان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اُردو کو ریاستی کاروبار سے خارج کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس دعویٰ کی تردید قول ناصر

"ہماری زبان" اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ انسپکٹر جنرل پولیس کی خدمت میں جب عرضیاں ارسال کی گئیں تو وہاں سے حکم صادر ہوا کہ کوئی درخواست اُردو رسم الخط میں قبول نہیں کی جائیگی جب تک اس کام کے لئے انگریزی یا دیوناگری رسم الخط کا استعمال عمل میں نہ لایا جائے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کو اگر سرکاری کاروبار سے خارج نہیں کیا گیا تو اُردو زبان کی عرضیاں کیوں نامنظور کی جارہی ہیں؟ اس طرزِ عمل سے ظاہر ہے کہ جے پور کے ریاستی نظام کو جھوٹ بولنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ وہ خود ہی اپنے عمل سے اپنے قول کی تردید کر رہا ہے۔ اس قسم کے تاریک نظام میں اُردو کی روشنی ڈھونڈنا بیسود ہے لیکن رسم الخط کی تبدیلی سے دفتری نظام کو جو صدمہ پہنچ سکتا ہے اس سے حکومت کو بھی بہت زیادہ پریشانی کا سامنا ہوگا۔ بایں ہمہ اگر ریاست جے پور" جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کی کہاوت کے مطابق اُردو کو ہلاک اور دیوناگری کو زندہ کرنا چاہتی ہے تو اسے اس امر کا اعلان کردینا چاہئے۔ ہمدردانِ اُردو کو دھوکے میں مبتلا کرنے سے تو حاکمانہ شرافت کا تقاضا پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جن ہاتھوں سے اُردو کا خونِ مظلومی ٹپک رہا ہے انہی ہاتھوں کو اس مظلوم و ستم رسیدہ زبان کا محافظ ٹھہرایا جارہا ہے۔ کیا حکامِ ریاست جے پور اس مضحکہ خیز دو فیصلے پن پر غور کریں گے؟

صغریٰ آرٹسٹ

کچھ عرصہ ہوا ہمیں محترمہ صغریٰ کی مصوری کے شاہکار دیکھنے کا اتفاق ہوا محترمہ صغریٰ سندھ کے ایک متمول گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ اُن کی تعلیم و تربیت شانتی نکیتن میں ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصویروں میں ان تمام محاسن کی جھلک موجود ہے جو ٹیگور سکول آف آرٹ سے مخصوص ہو چکے ہیں محترمہ صغریٰ غالباً پہلی مسلمان خاتون ہیں جنھوں نے اس عہد میں فنِ مصوری کی جانب باقاعدہ توجہ کی ہے۔ ذیل میں ہم ان کے متعلق خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی کی رائے درج کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ماہرینِ فن کے نزدیک صغریٰ کا مقام کیا ہے؟

"مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ کوئی زہرہ۔ زبیدہ یا بقول صغریٰ لڑکی آرٹسٹ بنے اور ان قدیم روایات کو زندہ کرے جو ایران اور اسی طرح ہندوستان میں مغلوں کے وقت قائم کی گئی تھیں۔ ہمیں اپنی تاریخ میں کئی ایک ایسی آرٹسٹ عورتیں ملتی ہیں جن کو فنِ مصوری سے اور خوشخطی سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ اور انھوں نے باوجود نسوانی پابندیوں کے اپنے فرائض کو نہایت احسن طریق سے انجام دیا جسے ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ صغریٰ "جدید زمانے کی آرٹسٹ ہے اس کے کام میں قدیم ہندوستانی آرٹ کا وصف اور طرزِ نگارش بدرجہ اتم موجود ہے اور سنجیدہ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح اپنی ذہنی نشوونما

"عالمگیر" ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء

عالمگیر کی آئندہ اشاعت مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے کس درجہ کشش انگیز اور بلند پایہ ہوگی؟ اس کا اندازہ ذیل کی مختصر فہرست مندرجات سے ہوسکتا ہے۔

علاوہ ازیں

اخبار و افکار — نقد و نظر — ہندوستان کے جواں فکر شعرا کا تازہ کلام وغیرہ

اپنی اوّلیں فرصت میں

حقائق و معارف:۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی تقریریں

از:۔
ظفر علی خاں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رفیق اعلیٰ سے جا ملے اور اجماع اُمت نے حضرت ابوبکر صدیق کو آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نائب منتخب کیا تو اس منزلت پر فائز ہونے کے بعد خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی تقریر جو کی وہ یہ تھی:۔

"مسلمانو! میں تمہاری حکومت کا والی ہوا ہوں مگر تم سے میں بہتر نہیں ہوں۔ قرآن نازل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں نظر سے گزریں۔ آنحضرت صلوٰۃ اللہ علیہ نے ہمیں تعلیم دی ہم نے تعلیم حاصل کی تم کو معلوم ہونا چاہئیے کہ سب سے بڑا دانشمند وہی ہے جو پرہیزگار ہو اور سب سے بڑا نادان وہ ہے جو فاجر و فاسق ہو۔ تم سب میں میرے نزدیک زبردست وہ ہے جو کمزور ہو۔ تاآنکہ میں اس کا حق اس کے لئے واپس لے لوں اور تم سب میں کمزور میرے نزدیک وہ ہے جو زبردست ہے تاآنکہ میں اس سے حق مغصوب واپس لوں۔ لوگو میں صرف متبع ہوں۔ مبتدع نہیں ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی میرا شعار ہے انوکھی باتیں پیدا کرنا میرا شعار نہیں۔ میں اگر اچھا کام کروں تو مجھے مدد دو اور اگر بھٹک جاؤں تو مجھ کو ٹھیک کر دو ـــــ!"

دوسری تقریر اس موقع کی ہے جب تسخیر شام کے لئے سپاہ اسلام کی روانگی منظور ہوئی اور یزید بن ابی سفیان اس کے سرلشکر منتخب ہوئے۔ حضرت ابوبکر ان کو وصیت فرماتے ہیں:۔

"میں نے آزمائش و تجربے کیلئے تجھے والی مقرر کیا ہے اگر تو نے اچھا کام کیا تو مستقل کر دونگا، اور اضافہ بھی کرونگا۔ اور اگر بد عملی کی شکایت ہوئی تو معزولی ناگزیر ہے۔ تجھے خدا کی جناب میں تقویٰ پر کاربند ہونا چاہئیے کہ وہ تیرے باطن کو بھی اسی طرح دیکھتا ہے جیسے تیرے ظاہر کو دیکھتا ہے۔ جب تو اپنے لشکر کی افسری پر فائز ہو تو اُن سے بحسن معاشرت سلوک ہو نیکی و خیر و خوبی کی ابتدا اُن کے حق میں تیری ہی جانب سے ہوا کریں۔ اور انھیں اس کی امید بھی دلایا کر جب ان کو نصیحت کرنا تو مختصر نصیحت کرنا کہ بسیار گوئی بہت سی باتیں بھلا دیتی ہے۔ تو اپنے نفس کی اصلاح کر کہ لوگ تیرے لئے خود بخود اصلاح پذیر ہو جائینگے۔ اپنے راز کو برملا بیان نہ کر کہ تیرے کام میں تزلزل آ جائے گا جب مشورہ مطلوب ہو تو سچی سچی بات کہہ تاکہ مشورہ بھی اس صورت میں سچا ہی ملے گا حقیقت حال کو مشیر سے اٹھا نہ رکھ کہ وہ بات از خود فاش ہو جائے گی۔ بیکار اور بطالت پیشہ لوگوں کو اپنی صحبت میں جگہ نہ دے بلکہ اصحاب صدق و وفا کی ہمنشینی اختیار کر ــــ!"

تیسری تقریر عام ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے۔

"خدا کی جناب میں تقویٰ پر کاربند ہونے کی میں تم کو وصیت کرتا ہوں۔ اور یہ بھی میری وصیت ہے کہ جس ثنا و صفت کا وہ سزاوار ہے ویسی ہی اس کی توصیف کرو اور اس کے متعلق خواہش کو خوف پر مخلوط رکھو اور سوال کو

اصرار سے مقرون کئے رہو۔ اس لئے کہ اسی باب میں وہ حضرت زکریا علیہ السّلام اور اُن کے اہلبیت کی تعریف کرتا ہے انھم کانوا یسارعون فی الخیرات ویدعوننا رغبًا ورھبًا وکانوا لنا خاشعین (وہ نیکوں میں جلدی کرتے تھے۔ رغبت و رہبت سے ہم کو بلاتے تھے اور ہمارے لیے خشوع میں رہتے تھے)۔

بندگان خدا! تمھیں یہ بھی جاننا لازم ہے کہ خدا نے اپنے نبی میں تمھاری جانیں گرو رکھ لی ہیں اور خود تمھارے بہا و پیمان اس پر لے لئے ہیں اور قلیل فانی کے عوض میں کثیر باقی عنایت فرمایا ہے یہ کتاب اللہ تم میں موجود ہے جس کے نہ عجائب فنا ہوتے نہ اس کی روشنی بجھتی ہے خدا کے ارشاد پر بھروسہ کرو۔ اس کی کتاب سے نصیحت پذیر ہو اور تاریکی کے دن کے لئے اس میں سے بصیرت حاصل کرو کہ خدا نے تمھیں اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے اور تم پر کاتبین کرام موکل کئے ہیں۔ جو جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو؟ یہ بھی معلوم رہے کہ تمھاری صبح و شام ایسی اجل میں بسر ہوتی ہے جس کا تمھیں علم نہیں۔ اگر تم سے ہو سکے کہ ایسی حالت میں اجل آئے کہ تم خدا کے کام میں ہو (اور بدوں خدا کی رحمت کے تم سے ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا) تو انقضائے اجل سے پہلے حسن عمل میں سبقت کرو کہ پھر سوء عمل میں پڑ جاؤ گے کیونکہ بہت سی قومیں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اپنی بقا کو دوسروں کیلئے فنا کر دیا۔ لہذا میں تم کو منع کرتا ہوں کہ ایسے نہ ہو جانا۔

بچو! بچو! نجات حاصل کرو۔ کیونکہ تمھارے پیچھے وہ سخت گیر طالب ہے جس کا علم نہیں ٹلتا۔ اور جس کی رفتار بڑی تیز ہے —!"

نعت جامی

زمیں نامۂ امتثالِ محمدؐ — فلک فرد رازِ کمالِ محمدؐ
مہ و مہر نقش خیالِ محمدؐ — جہاں روشن است از جمالِ محمدؐ
دلم زندہ شد از وصالِ محمدؐ

زہے ذکرِ حسنِ محبّت پناہے — زہے ماجرائے تمنائے ماہے
زہے ذوقِ آہے ندائے نگاہے — زہے مسجد و منبر و خانقاہے
کہ در وے بود قیل و قالِ محمدؐ

نظر کی جوانی جمالِ دل آرا — بہارِ تصوّر کسی کا نظارا
یہ معراج در پردہ وہ آشکارا — خوشا چشم کو بنگرد مصطفےٰ را
خوشا دل کہ دارد خیالِ محمدؐ

مبارک ہو عاصم یہ عالی مقامی — کہ شاہی سے بہتر ہے ایسی غلامی
اسی واسطے مثلِ شاہانِ سامی — بصدق و صفا گشتہ بیچارہ جامی
غلامِ غلامانِ آلِ محمدؐ

عاصم جے پوری

عیب پوشی

از:-
نظیر لودھیانوی

رات کتنا لطف زا ہنگام تھا
دُور سینے سے غمِ ایّام تھا

صحنِ گلشن حاصلِ نظّارہ تھا
ماہ گویا نور کا فوّارہ تھا

چھا رہی تھی خامشی اشجار پر
نیند غالب تھی گُل و گلزار پر

تھی سکوت افزا بہارِ نور و رنگ
جلوہ آرا تھا نگارِ شوخ و شنگ

سرو چُپ، آبِ رواں خاموش تھا
ذرّہ ذرّہ باغ کا مدہوش تھا

بے خبر گلزار کا گلزار تھا
دیدۂ نرگس مگر بیدار تھا

عرض کی اے نرگسِ صاحب نظر
چند ساعت آنکھ اپنی بند کر

تو بھی اک ساعت جو خوابیدہ رہے
عاشقوں کا عیب پوشیدہ رہے

بولی نرگس تو مگر دیوانہ ہے
اہلِ دل کے حال سے بیگانہ ہے

عیب جوئی کی جو ہوتی میری خُو
باغ کا ہر خار و گل ہوتا عدو

اہلِ دل دُنیا میں عیباں پوش ہیں
دیکھتے ہیں عیب اور خاموش ہیں

بہرۂ از لطفِ محبوبے بگیر
از یمِ ہستی دُرِ خوبے بگیر

والٹیئر کا انقلابی افسانہ

یہ دُنیا ہے!

مترجمہ:-
احمد شجاع پاشا جالندہری بی۔

(۱)

دنیا پر حکومت کرنے والے فرشتوں میں سے میکائیل کی قلمرو میں براعظم ایشیا بھی شامل تھا۔ وہ ایک رات ستھیا کے رہنے والے بابک کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "بابک! فارس کے رہنے والوں کے گناہ حد سے تجاوز کرتے جا رہے ہیں۔ کل ایک مجلس میں جو آسمان کی بلندیوں پر منعقد کی گئی تھی یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ یا تو اہل فارس کو ان کے گناہوں کی سزا دی جائے یا فارس کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ تم جاؤ۔ فارس والوں کا چلن دیکھو۔ اور آ کر مجھے بتاؤ کہ وہ کس سزا کے مستحق ہیں ——؟"

"مقدس فرشتے!" بابک نے کہا "میں پہلے کبھی فارس نہیں گیا نہ میں وہاں کسی کو جانتا ہوں۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔" ایشیا کے روحانی حاکم نے کہا۔ "تم کسی کی طرفداری نہیں کرو گے۔ جاؤ تمہیں آسمان والوں کے احکام کی تعمیل کرنی چاہئے۔ جہاں بھی تم جاؤ گے تم سے اچھا سلوک کیا جائیگا کسی سے خوف نہ کھانا —— آسمان والوں کی روحانی طاقتیں تمہارے ساتھ ہیں ——"

بابک اپنی اونٹنی پر سوار ہوا اور دو ایک خادم اپنے ساتھ لیکر فارس کی طرف چل کھڑا ہوا۔

کچھ دن کے سفر کے بعد —— ! اس نے ستار کے میدان جنگ میں فارس کی فوجوں کو دیکھا جو ہندوستانی فوجوں کے ساتھ مصروف پیکار تھیں۔

اس نے ایک سپاہی سے پوچھا۔ "اس جنگ کی وجہ کیا ہے؟ دو پڑوسی آپس میں کیوں لڑ رہے ہیں؟"

"دیوتاؤں کی قسم!" سپاہی نے جواب دیا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم، اور مجھے معلوم کر کے ملے گا بھی کیا ——، میرا پیشہ تو لڑنا مرنا ہے۔ میں سپاہی ہوں۔ مجھے تنخواہ ملتی ہے۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑتا ہوں اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ مجھے تو زر تم چاہئے۔ جنگ سے مجھے کچھ واسطہ نہیں۔ سونا مجھے خرید سکتا ہے۔ اور میں سونے کے عوض اپنی جان بیچ سکتا ہوں۔ اگر ہندوستان والے مجھے والوں سے زیادہ تنخواہ دیں تو میں ان کی صفوں میں چلا جا اگر آپ جنگ کی وجہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے سردار سے پوچھئے۔"

بابک سردار کے پاس گیا —— !

"میں کیسے بتاؤں۔ کیونکر بتاؤں۔ میں خود بھی تو نہ جانتا۔ میں تو دارالحکومت سے بہت دور، ایک چھوٹے سے شہ رہتا ہوں۔ جب مجھے اطلاع ملی کہ ہندوستان سے جنگ شہ ہو گئی ہے۔ تو میں اپنی فوج لے کر یہاں چلا آیا۔"

"کیا آپ کے ساتھیوں کو بھی اس بات کا نہیں ——؟" بابک حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں، وہ سب میری طرح دولت و عزت کی تلاش نکلے۔ فاتح بنے تو غازی، مارے گئے تو شہید۔"

"پھر مجھے جنگ کی وجہ کیونکر معلوم ہو گی؟"

"آپ حکام اعلیٰ سے پوچھئے۔ شاید وہ آپ کو کچھ بتا سکیں۔"

بابک ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ایک نے کہا۔ "اس جنگ کا محرک بہت معمولی سا ہے۔ سے بیس برس پہلے فارس کے ایک خواجہ سرا اور ہندوستان ایک کارخانے کے منشی میں کچھ جھگڑا سا ہو گیا تھا۔ جس کی سزا کو مل رہی ہے۔ ہمارے وزرا تو ہمیں یہ یقین دلاتے ہیں کہ جنگ میں انسانیت کی بھلائی ہے۔ اس جنگ میں فارس کو ہے مگر حقیقت کچھ اور ہے۔ لاکھوں بچے یتیم کئے جا رہے ہیں ماؤں کی گودیاں خالی کی جا رہی ہیں۔ لاکھوں عورتیں بیوہ بنائی رہی ہیں۔ کس لئے۔ یونہی ——؟"

دوسرے دن میدان جنگ میں یہ افواہ گشت کرنے لگی دونوں طاقتوں میں صلح ہونے والی ہے۔ طرفین کے سپاہی سن کر غمگین ہو گئے۔ مگر سرداروں نے انہیں زیادہ دیر سوچنے موقع نہ دیا۔ اور دن چڑھے لڑائی شروع ہو گئی۔ آگ اور

خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ انسان کا خون پانی سمجھ کر بہایا جا رہا تھا۔ بابک حیران نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لڑنے والے کپڑوں کی خاطر اپنے زخمی ساتھیوں کی گردنیں اتار رہے تھے۔ وطن دوست اور وطن دشمن کا خیال نہ تھا۔ وہاں تلوار چل رہی تھی۔ انسانوں کے سر گیندوں کی طرح اچھل رہے تھے۔ خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ ایک قیامت تھی۔ ایک طوفان تھا جو رُکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

وہ فوجی ہسپتال میں داخل ہوا — یہاں زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کی جا رہی تھی۔ ان میں سے اکثر حکیموں اور جراحوں کی بے پروائی سے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ درد سے مجبور ہو کر رہتے چلاتے مگر کسی کے کان پر جوں نہ رینگتی۔

"آہ — !" بابک نے کہا۔ "فارس کے رہنے والے انسان نہیں یا درندے ہیں۔ وہ مرتے ہوئے انسان کے حلق میں پانی کے دو قطرے بھی نہیں ٹپکا سکتے — میکائیل کا کہنا درست ہے۔ فارس ضرور تباہ کر دیا جائیگا۔"

اس کے بعد صلح ہو گئی اور بابک کو اپنا خیال بدلنا پڑا۔

(۲)

وہ شہر میں داخل ہوا۔ ایک بڑے دروازے سے جس کے طول و عرض سے وحشت ٹپکتی تھی۔ لوگ قدیم روایات اور قدیم عمارات کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پرانی چیزیں بہت ہی بھدی قسم کی ہوتی ہیں۔

شہر کا اندرونی حصہ جہاں دکانیں تھیں کس قدر گندا تھا۔ کس قدر بدبو آ رہی تھی وہاں سے۔ اور خرید و فروخت کرنے والے لوگ اور دکاندار۔ کیا کر رہے تھے وہ — ؟ دنیا میں برائیوں کی راہ بڑھا رہے تھے۔ جھوٹ بولنے والوں میں اضافہ کر رہے تھے، اس کو گھن آنے لگی۔

وہ آگے بڑھ گیا اور ایک مندر میں داخل ہوا — !

مندر میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ ان کے چہروں پر حسرت برس رہی تھی۔ وہ بہت اداس تھے۔ کچھ پرے ایک رقاصہ رقص کر رہی تھی۔ اس کے گھونگھروؤں کی آواز فضا میں اُداسی بکھیر رہی تھی اور ڈھولک کی دھک دھک غمگین ماحول کو اور غمگین بنا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد — چند مزدور آگے بڑھے۔ ایک بڑا سا پتھر ہٹایا۔ جس کے نیچے آگ جل رہی تھی۔ شعلے نکل رہے تھے۔ اور دھواں اُٹھ رہا تھا۔ وہ گڑھا بہت گہرا تھا۔ کچھ آدمیوں نے ایک لاش کو اُٹھا کر اس گڑھے میں ڈال دیا۔ چیخ چیخ کی آواز آئی۔ دو ایک کڑاکے ہوئے اور پھر خاموشی — ! بابک کا دل متلانے لگا۔ اس نے کہا "کیا یہ لوگ اپنے مُردوں کو بھی وہیں جلاتے ہیں جہاں دیوتا کی پرستش کی جاتی ہے۔ کیا وہ اپنے مندروں کو لاشوں سے سجاتے ہیں؟ اب مجھے معلوم ہوا کہ فارس میں اس قدر وبائیں کیوں پھیلتی ہیں لوگ عموماً بیمار کیوں رہتے ہیں — یہ سڑاند — یہ بدبو — بُری فضا، بُرا ماحول — اس سے بیماریاں نہ پھیلیں گی تو اور کیا ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ فارس میں بھونچال آ جائے۔ اور یہ تباہ ہو کے رہ جائے۔ اور اس کی جگہ نیا شہر بنے۔ نئے لوگ آئیں — جو اس قدر ذلیل اور گندے نہ ہوں — !

(۳)

اسے رات کا کھانا اپنے ایک سپاہی دوست کی بیوی کے ساتھ کھانا تھا۔ اسے اس کے خاوند کا خط بھی پہنچانا تھا۔ اس عورت کا مکان شہر کے دوسرے حصے میں تھا — وہ شہر کی سیر کرتا ہوا جا رہا تھا۔

اور کئی مندر بھی اس کی نظر سے گزرے جو اچھے بنے ہوئے تھے اور جو بابک کو تعریف کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ ان مندروں کے پجاری بھی خوبصورت لباسوں میں ملبوس تھے۔ اُن کی موسیقی بھی پرلطف تھی۔ بابک کا دل اچھل رہا تھا۔ اور اسے کچھ خوشی سی محسوس ہو رہی تھی — وہ آگے بڑھا۔

سڑکوں کے دونوں طرف فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اُن میں سے پانی نکل رہا تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے سبزہ زار — کتنا حسین معلوم ہو رہا تھا یہ سماں۔ دو رویہ درختوں کی قطار۔ ہرے ہرے درخت اور ان قطاروں کے پیچھے اونچے اونچے سربفلک مکانات۔ سڑکیں بالکل صاف تھیں۔ کہیں ایک تنکا بھی نظر نہ آتا تھا — وہ اپنے میزبان کے گھر میں داخل ہوا — !

اس کا گھر کتنا خوبصورت اور سجا سجایا تھا۔ قرینے سے رکھی ہوئی چیزیں۔ سلیقے سے سجائے ہوئے کمرے — !

بابک نے سوچا۔ "مقدس فرشتے کی عقل کو کیا ہو گیا۔ اتنا حسین شہر اگر تباہ کر دیا جائے تو بنی نوع انسان کا ناقابل تلافی نقصان ہوگا — !"

(۴)

کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد اس نے بہت سی ایسی چیزیں دیکھیں جس سے اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ سپاہی کی بیوی ایک خوبصورت نوجوان سے پیار اور محبت کی باتیں کر رہی تھی۔ ایک منصف اپنی بیوی کو چھوڑ کر ایک بیوہ کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی اپنی بیوی ایک خوبرو جوان کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھی چپکے چپکے کچھ باتیں کر رہی تھی۔

فرشتے نے بابک کو جو دل میں گھر کر جانے طاقت عطا کی تھی اس کی مدد سے وہ ان بھیدوں کی تہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے کیا معلوم ہوا۔ یہی کہ لوگوں کے دلوں پر گناہ حکومت کر رہا ہے۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا ——"یہ سوسائٹی بہت جلد فنا ہو جائیگی۔ رقابت —— حسد اور انتقام —— اس دنیا کو تہ و بالا کر دیں گے۔ یہاں روز خون بہے گا اور آنسو بہیں گے —— شوہر یا تو اپنے رقیبوں کو قتل کر دیں گے۔ یا ان کے رقیب ان کی بیویوں کے ساتھ مل کر ان کا کام تمام کر دیں گے۔ مقدس فرشتے کو چاہیئے کہ ان واقعات کے پیش آنے سے پیشتر ہی اس شہر کا نام تک صفحہ ہستی سے مٹا دے —— !"

(۵)

وہ انہی خیالوں میں غرق تھا کہ اس نے ایک بزرگ شخص کو دیکھا جو سیاہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ وہ اس نوجوان منصف سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ منصف نے کاغذوں کا ایک پلندہ اٹھا کر اسے دیدیا اور اس سے بات تک نہ کی۔

"یہ کون ہے؟" بابک نے پوچھا۔

"یہ شہر کا ایک مشہور قانون داں ہے۔ اس نے اپنی عمر کے پچاس قیمتی سال قانون کے مطالعہ میں صرف کئے ہیں۔ اور دوسرا شخص جو منصف ہے ابھی شباب کے اولیں مراحل میں ہے۔ اس کی عمر پچیس کے قریب ہے۔ اور اس نے قانون کا دو دن بھی مطالعہ نہیں کیا۔ یہ بوڑھا وکیل بیگار میں پکڑا گیا ہے۔ اور اسے منصف کے لئے مقدمات کے فیصلے لکھنے پڑیں گے" ایک شخص نے اسے سمجھایا۔

"یہ نوجوان منصف واقعی عقلمند ہے جو بڑے بوڑھوں سے نصیحت طلب کرتا ہے مگر یہ بوڑھا منصف کیوں نہ بنا؟"

"آپ سمجھے نہیں" اس شخص نے پھر کہا۔ "یہاں محنت مزدوری کرنے والوں کو عزت کے پہلو میں نہیں بٹھایا جاتا —— یہ نوجوان اپنے باپ کی دولت کی وجہ سے منصف بن گیا ہے۔ فارس میں ا کرنے کا حق بھی فروخت کیا جاتا ہے ——"

"یہ بدقسمت ملک! یہاں ملازمتیں بھی اُن کو دی جاتی ہ جو امیر ہوں۔ جن کی دولت انھیں اس قابل بنا سکے کہ وہ عزت خرید لیں۔ جہاں انصاف کرنے کا حق بیچا جا سکتا ہے وہاں فیصلے بھی بکتے ہونگے —— انصاف بھی فروخت ہوتا ہوگا —— !"

ایک فوجی افسر نے کہا "اس میں حیران ہونے کی کیا بات۔ میں نے فوج میں عہدہ خریدا ہے۔ مجھ سے قابل اشخاص جو فن سپہگ سے بخوبی واقف ہیں ابھی تک سپاہی ہیں مگر میری دولت نے مجھے اتنا بڑا عہدہ دلوا دیا۔ فارس میں غریبوں کو رہنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ ملک امیروں کے لئے ہے جو غریبوں کا خون چوس چو کر دولت جمع کرتے ہیں۔"

بابک کو حیرت ہوئی۔ اسے افسوس ہوا اس ملک کی قسمت پ جہاں امیر آدمیوں کے بیٹوں کو ملازمتیں ملتی ہیں۔ جہاں قابلیت نہیں دولت سب کام کرتی ہے۔ کیا اہل فارس مساوات کے حامی نہیں ہیں —— ؟

ایک موٹا سا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے فوجی افسر سے کہا "میں تمھیں چالیس ہزار سے زیادہ قرض نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اس دفعہ مجھے بہت تھوڑا لگان ملا ہے۔"

جب بابک نے اس کے متعلق پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ وہ فارس کا ایک زمیندار ہے —— "فارس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہیں۔ بادشاہ ان سے ایک خاص رقم لے کر اپنے ملک کے حصے بخرے کر کے انھیں ٹھیکے پر دے دیتا ہے۔ اور وہ غریبوں پر ظلم کر کے اُن سے روپیہ بٹورتے ہیں —— !"

بابک نے کہا —— "یہ ملک ضرور تباہ ہو جائے گا۔"

(۶)

بابک کو فارس والوں کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ یہ کم عقل انسان کس راستے پر چلے جا رہے تھے۔ ان کی منزل کہاں تھی؟ اس نے ارادہ کیا کہ وہ فارس کے پڑھے لکھے لوگوں سے ملاقات کرے، شاید وہی اس کے دل کو تسکین پہنچا سکیں۔

دوسرے دن —— وہ ایک مکتب میں گیا، جہاں کے اُستاد مذہب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

ایک افواہ پھیل گئی کہ وہ مکتب کی اصلاح کے لئے آیا ہے۔

استاد اس کے پاس آئے اور ایک دوسرے کی چغلی کھانے لگے ——— وہ سب یہی کہتے ——"ہمیں رکھو، ہم قابل ہیں۔ باقی سب کو نکال دو۔" بابک سوچنے لگا ——"یہ لوگ کیسے ہیں؟ عالم ہیں ——— پڑھے لکھے ہیں ——— عوام کو مذہب کی تعلیم دیتے ہیں، مگر خود کدھر جا رہے ہیں۔ کمینے لوگ ——— یہ ایک دوسرے کی چغلی کیوں کھاتے۔ ایک دوسرے کی برائیاں کیوں کرتے ہیں؟ ——— کیا یہ اتفاق سے نہیں رہ سکتے؟ یہ اس قدر خود غرض کیوں ——— اپنی تعریف بھی کوئی تعریف ہے۔ اچھا وہ ہے جس کی تعریف دوسرے کریں۔ انہیں اصلاح کی ضرورت ہے ——— ان کی اصلاح انقلاب ہی کر سکتا ہے۔ نیا زمانہ، نئی چیزیں نئے لوگ، نئے مکتب، اور نئے تلامذہ ——— کاش ایک بھونچال آ جائے فارس غرق ہو جائے اور اس کی مٹی سے ایک نیا فارس بنے جس میں یہ سب چیزیں موجود نہ ہوں ———"

——— (۷) ———

اور پھر ایک دن ——— اس نے چند عالموں کو کھانے پر بلایا۔ وہ سب کے سب کھنچے چلے آئے۔ جیسے مکھیاں شہد کی طرف آ جاتی ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کھانے کے وقت باتیں ہوتی رہیں سب گفتگو میں حصہ لے رہے تھے۔ مگر بابک نے دیکھا کہ یا تو اپنی تعریف کرتے ہیں اور دوسرے ہوؤں کی مذمت ——— ایک کی اچھی بات دوسرے کو بری معلوم ہوتی تھی۔ یہ ایک دوڑ تھی جس میں سب بھاگے جا رہے تھے۔ تیز بھاگنے والے گرنے والوں کو کچل رہے تھے، پیچھے والے آگے والوں کو دیکھ کر جل رہے تھے۔ برابر چلنے والے ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب کچھ ہو رہا تھا در زندگی کی دوڑ جاری تھی ——— بھائی بھائی کا گوشت کھا رہا تھا —— فارس تباہ ہو جانے والا تھا ——— !

——— (۸) ———

مہمانوں کے جانے کے بعد وہ ایک کتاب پڑھنے لگا۔ ایک عشقیہ افسانہ ——— محبت کا فرسودہ موضوع رقابت ——— دیوانگی اور ت ——— ! اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ لکھا ہوا تھا: "پھول حسین ہیں ——— بلبل ان سے پیار کرتی ہے۔ گلستان میں آتی ہے اور گلستان کو دلھن بنا دیتی ہے۔ خزاں کے ظالم ہاتھ سنگار تباہ کر دیتے ——— آہ! زندگی محبت ہے اور محبت زندگی ——— اور اسی قسم کی بیہودہ باتیں۔ یہ ادیب کون سی راہ پر گامزن ہیں ——— ؟ کیا یہ اپنی قوم کو نیا کی میٹھی نیند سلا دینا چاہتے ہیں؟ یہ خود بھی سو رہے ہیں، قوم کو کیونکر بیدار کریں گے؟ یہ انقلاب کی حمایت کیوں نہیں کرتے ——— ؟ لکیر کے فقیر ——— سانپ کے نکل جانے کے بعد بھی لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔ یہ اپنی سوسائٹی کی برائیاں کیوں نہیں بیان کرتے ——— ؟ پرانی ریت کی پرستش کیوں کر رہے ہیں؟ زمانہ آگے بڑھتا ہے اور یہ زمانے کو چھوڑ کر پیچھے جانا چاہتے ہیں ——— انقلاب ——— اے انقلاب ——— ! تیری قوتوں کو کیا ہوا؟ تیری طاقتیں کہاں چلی گئیں؟ کیا تجھ میں زندگی باقی نہیں ——— امیر غریبوں کے نوالوں پر جھپٹ رہے ہیں اور یہ شاعر ان کی تعریف کے پل باندھتے ہیں۔ بادشاہ ظلم کر رہا ہے اور لکھنے والے اسے رحمدل اور عادل کے نام سے یاد کرتے ہیں ——— اس نے کتاب پرے پھینک دی اور دل بہلانے کیلئے باہر چلا گیا۔ اس کی ایک عالم سے ملاقات ہوئی۔ بابک نے اسے تمام قصہ سنایا۔ عالم نے کہا ——"دنیا یہی کہتی اور کرتی آئی ہے برائیاں ہر زمانے میں موجود ہیں۔ ہم کہتے ہیں ہمارا زمانہ بہت خراب ہے، ہمارے باپ دادا بھی یہی کہا کرتے تھے۔ ادب اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی اور ہماری نظر عوام کی خامیاں جلد دیکھ لیتی ہے مگر خوبیاں نہیں دیکھ سکتی، دنیا میں ہر چیز سے انسان کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچتا ہے چاہے وہ چیز بری ہی کیوں نہ ہو۔ آپ نے ان لوگوں کو کھانے پر بلایا جو کچھ نہ جاننے پر بھی بہت کچھ جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ عقلمند وہی ہیں جو اپنی دنیا آپ بناتے ہیں۔"

اور پھر وہ اسے پیر مغاں کے پاس لے گیا۔ اس کی باتوں نے بابک کے دل پر گہرا اثر کیا۔ اس نے سوچا کہ فارس میں نیکی بھی ہے بدی بھی۔ اچھے لوگ بھی ہیں اور برے بھی ——— یہ دنیا ہے ——— دنیا اسی طرح چلتی ہے اچھائی عموماً برائی سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر اچھائی سے بھی بعض اوقات برائیاں نکل آتی ہیں۔ دنیا میں برے لوگ بہت زیادہ اور اچھے لوگ بہت کم ہیں۔ مگر بروں کی برائیاں اچھوں کی اچھائیوں کو نہیں ڈھانپ سکتیں۔ مگر اچھوں کی اچھائیاں بروں کی برائیوں کو ضرور ڈھانپ لیتی ہیں۔

——— (۹) ———

بابک مقدس فرشتے کے پاس واپس آ گیا۔ اور اسے تمام کہانی کہہ سنائی۔ فرشتے نے کہا: "اگر تمام دنیا اچھی نہیں تو کیا غم ہے۔ دنیا فانی ہے۔ مگر فارس کے رہنے والے سو رہے ہیں۔ انھیں سزا ضرور ملنی چاہئے جس قوم کے افراد انقلاب سے خوف کھاتے ہوں۔ جس ملک کے باشندے اپنی برائیاں دور نہ کر سکتے ہوں۔ اس ملک کو اس قوم کو تباہ ہو جانا ہی بہتر ہے دنیا اس کے لئے ہے جو اپنے آپ کو اس قابل ثابت کر دے کہ وہ دنیا،

میرے لئے

از:-
نوح ناروی

یہ حسیں میرے لئے وہ نازنیں میرے لئے
جمع ہیں سامانِ راحت ہر کہیں میرے لئے

کوئے جاناں کی فضائیں کم نہیں میرے لئے
تنگ ہے تفریحِ فردوسِ بریں میرے لئے

اے عطائے حسن و عشق اچھا ترا انصاف ہے
سب کچھ ان کے واسطے کچھ بھی نہیں میرے لئے

چاک کرنا دامن و جیب و گریباں کا محال
آستیں ہے آستیں در آستیں میرے لئے

اور کچھ ملتا نہ ملتا یہ تو تھی قسمت کی بات
ساری دنیا کی جگہ ہوتے تمہیں میرے لئے

کوچۂ محبوب میں مٹی ٹھکانے لگ گئی،
بچ رہی تھی صرف تھوڑی سی زمیں میرے لئے

اُس کی حسرت کیوں کروں میں جس کا ملنا ہو محال
یہ نہیں معلوم کیا ہے کیا نہیں میرے لئے

یا خدا دنیا کے معشوقوں سے جی ملتا نہیں
آسماں سے بھیج کوئی مہ جبیں میرے لئے

دیکھ پاؤں میں جہاں نقشِ کفِ پا آپ کا
فرض ہے سر کو جھکا دینا وہیں میرے لئے

دستِ وحشت کیوں نکل کر دھجیاں کرتا نہیں
آستیں بھی اب ہے مارِ آستیں میرے لئے

درد بھی، آزار بھی، آلام بھی، افکار بھی،
عیش و عشرت کے علاوہ کیا نہیں میرے لئے

اے دلِ مضطر لگا دی تو نے دُنیا بھر میں آگ
اور ایسے میں اک آہِ آتشیں میرے لئے

ساقی و مطرب، سرور و بادہ لطفِ ذوق و شوق
میں جہاں پہنچا یہ سب پہنچے وہیں میرے لئے

دل لگا دینے میں نظر آتی ہیں لاکھوں زحمتیں
جان دینے میں کوئی دقت نہیں میرے لئے

میں سمجھتا تھا جسے ظالم کی چشمِ التفات
بن گئی وہ بھی نگاہِ خشمگیں میرے لئے

کثرتِ عیش و مسرت، قلتِ لطف و نشاط
ہر جگہ تیرے لئے ہے ہر کہیں میرے لئے

دل کے ہوتے عشق میں کیوں دوسروں کا نام لوں
ہے یہی غارت گر ایمان و دیں میرے لئے

آہ کر لوں آٹھویں دسویں کلیجہ تھام کر
عشق میں اتنی اجازت بھی نہیں میرے لئے

وہ ہوئے ناراض کیا کیا التجائے شوق پر،
نامہ بر نے سیکڑوں باتیں سنیں میرے لئے

دفن ہونے پر بھی راحت سے رہا میں دُور دُور
آسماں موجود تھا زیرِ زمیں میرے لئے

آپ اپنی دلنوازی سے مجھے رکھیں معاف
زندگی کا لطف سب کچھ ہے پہ نہیں میرے لئے

عشوہ و انداز و غمزہ نالہ و آہ و فغاں
آں قدر تیرے لئے اور ایں چنیں میرے لئے

دیکھتے ہیں وہ مجھے چشمِ غلط انداز سے
ہے یہ سب کچھ اور پھر کچھ بھی نہیں میرے لئے

نوح جوشِ فکرِ کامل کی تماشے دیکھنا
بحرِ طوفاں خیز نکلی یہ زمیں میرے لئے!

فنِ تنقید اور مرزا غالبؒ

از:-
کمال عظیم آبادی

دنیا کی اکثریت کے سامنے غالب دہلوی کی جو حقیقت اور وقار رہا ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ وہ ایک بہترین شاعر اور اس کے بعد ایک ایسا عدیم المثال نثر نگار تھا جس کے انداز تحریر کی آج تک کوئی نقل نہیں کر سکا - اور نہ اس کے بنائے ہوئے دشوار گزار رستے پر کسی چلنے والے کے قدم جم سکے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ محدود نظریہ اور یہ تنگ خیال محض اس اکثریت کا ہے جس نے غالب مرحوم کے حالات زندگی اور ادبی حیات کا پوری طرح مطالعہ نہیں کیا ہے - نیز اس کی کوتاہ نظریں دیوان غالب اور چند ایسے ادبی خطوط پر جا کر رک چکی ہیں جو کہیں کہیں کسی امتحانی نصاب یا مجموعہ میں آ گئے ہیں اور پریس کی مدد سے طبع ہو کر ادبی حلقوں یا تعلیمی حدود میں شہرت پا رہے ہیں۔

ہمیں تو ایسی جماعت سے کوئی شکوہ نہیں - اس لئے کہ "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" جس کا جس قدر مبلغ علم ہوگا - اور جس کی جس قدر تحقیق ہوگی وہ صرف اسی قدر جان سکتا ہے - لیکن اگر کوئی عربی علوم و زبان سے بے بہرہ عرب کے مشاہیر شعراء "متنبی" اور "امرا القیس" کے متعلق یہ کہے کہ وہ نظم سے زیادہ اچھی نثر لکھتا تھا یا انگلستان کے مشہور انشا پرداز "شیکسپیر" کے بارے میں انگریزی زبان سے ناواقف ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرے کہ وہ بہترین ڈاکٹر تھا تو یہ دعاوی ارباب عقل کے نزدیک ناقابل قبول اور اہل دانش کے سامنے بے وقعت ہونگے۔

میں اسی ناواقف اکثریت کو اپنے زیر قلم مقالہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ غالب محض ایک مسلم الثبوت شاعر یا ایک مشہور خطوط نگار ہی نہیں بلکہ وہ ایک روشن دماغ نقاد اور ایک بے تعصب مبصر بھی تھا - لیکن ساتھ ہی ساتھ اس واضح حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشاہیر کو جس طرح اصناف ادب میں سے کسی نہ کسی صنف میں خصوصیت اور امتیازی شان حاصل تھی (جیسے حالی کو انقلابی شاعری میں - محمد حسین آزاد دہلوی کو سہل و سادہ نثر نگاری میں، شبلی کو محققانہ تاریخی و تنقیدی مقالات میں، علامہ راشد الخیری کو

مرحوم کو سوانح اور جذبات غم کی تصویر کشی میں، چکبست و شرر کو لکھنؤ بیگماتی زبان میں) اس طرح غالب کو تنقید نگاری میں بظاہر کوئی انفرادیت اور یکتائی نہ تھی - بلکہ جس طرح محمد حسین آزاد دہلوی کی فہم نثر نگاری کے مقابلہ میں شاعری کا رتبہ یا حالی کی انقلابی اور تنقیدی شاعری کے سامنے غزل گوئی کا درجہ ہے - بعینہ یہی صورت شاعری اور خطوط نویسی کے بعد تنقید نگاری میں غالب کو حاصل تھی لیکن یہ چیز اس کے معجزات کمال سے قابل فراموش نہیں کہ اس نے جہاں کہیں اور جس چیز پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے - یا کسی حقیقت و واقعیت کے چہرے سے نقاب کشائی کی کوشش کی ہے وہاں ناقابل فہم حد تک نمایاں خصوصیات پیدا کر دی ہیں - اور ایک - ایسا شخص جو غالب مرحوم کی شاعری اور اس کی خطوط نویسی سے ناواقف ہو اس کی تنقید نگاری اور تبصرہ کی بلندی کو دیکھ کر یہی کہے گا کہ غالب صرف ایک بلند پایہ اور اعلیٰ درجہ کا نقاد تھا یا ان اصناف ادب میں جن پر اسے عبور تھا نقادی ہی اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔

غالب کے متعلق آگے چل کر ہم جو تنقیدی مثالیں پیش کرنے والے ہیں ان کے مطالعہ سے پہلے یہ ضروری ہے کہ لفظ "تنقید" پر اجمالی طور سے روشنی ڈالتے چلیں اور بتائیں کہ تنقید کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ آیا وہ جسے عوام سمجھے ہوئے ہیں یا تنقید کوئی ایسی حقیقت ہے جس کی باریکیاں ہر نگاہ آسانی اور سہولت سے نہیں دیکھ سکتی - اور لوگ اس کے مفہوم حقیقی اور محل تصرف کو بھی غلط سمجھے ہوئے ہیں۔

پہلے تو یہی بات تحقیق طلب ہے کہ لفظ "تنقید" صحیح بھی ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ یہ لفظ عربی ہے اور عربی الفاظ کی تحقیق کے لئے کلمات و زبان عرب دیکھنے کی ضرورت ہے - لیکن لغات کی ورق گردانی اور مطالعہ زبان کے بعد بھی کلام عرب میں اس مفہوم کے ماتحت "تنقید" تو نہیں البتہ لفظ "انتقاد" و "نقد" ضرور ملتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ لفظ (تنقید) اب عربی نہیں ہے - بلکہ اردو والوں نے جس طرح "تلاش" لفظ فارسی کا اسم فاعل عربی قاعدہ سے "مستفاعل" کے وزن پر "متلاشی" بنا لیا ہے - اسی

طرح کسی جدت پسند اور اختراع پسند طبیعت نے لفظ نقد کو باب "تفعیل" میں لاکر "تنقید" کر دیا ہے۔ لیکن بہر خاص و عام کی زبان پر رائج ہونے کے باعث نیز اس کلیے کے زیرِ نظر کہ "غلط العام فصیح" ہم بھی اس کی لغوی حقیقت اور ظاہری شان پر کوئی نظر نہ کرتے ہوئے معنیٰ اور مفہوم سے بحث کریں گے۔

میرے اس قول پر کہ لوگ تنقید کے مفہوم کو غلط سمجھے ہوئے ہیں کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ غلط فہمیاں ہمیشہ پیدا ہوتی رہی ہیں اور برابر ہوتی رہیں گی۔ البتہ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر قوم کے عالی دماغ لوگوں اور حقیقت و واقعہ شناس افراد کا یہ اولیں فریضہ ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ اپنی جماعت سے ان غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہیں اور تنقید کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے میں ہمیں نہ صرف ہماری بدمذاقیوں اور نافہمیوں سے دور رکھیں بلکہ تہذیب و ترقی یافتہ جماعتوں کو بھی جو اس ظلمات جہالت میں اکثر و بیشتر بھٹک رہی ہیں نکال کر راہ راست پر لانے میں کوتاہی نہ کریں۔

ہمیں یہ معلوم کرکے انتہائی تعجب ہے کہ تنقید کو اکثر کسی مذموم حرکت کا مرکز اور بغض و عداوت کا آئینہ قرار دے لیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تنقید دراصل غلطیاں معلوم کرنے کے فن کو کہتے ہیں۔ یا یہ کہ وہ طبائع کو [illegible] کو برباد کردیتی ہے۔ کسی صاحب کی رائے ہے کہ تنقیدی نقطۂ نظر ہمیشہ تذلیل و توہین پر آمادہ رہتا ہے۔

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ تنقید نگار کی حیثیت ایک محتسب کی سی ہوتی ہے جو مجرموں اور گنہگاروں کی تلاش میں گلی کوچوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔

مشہور لارڈ بیکنس فیلڈ[4] کو بلزاک[5] کے اس مقولہ پر کامل اعتماد ہے کہ "نقاد وہی ہوتے ہیں جو ادب و فنون لطیفہ میں کمال حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ اور اپنی ناکامی کی تلافی میں دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے تنقید نگاری شروع کر دیتے ہیں۔"

یہ ضرور ہے کہ بعض دفعہ اچھے اچھے انشا پرداز شہرت و عظمت کے فقدان یا زمانہ کی ناقدری سے متاثر ہو کر نفسانی غلبہ کے ماتحت یا اپنے معاصرین میں سے کسی کو غیر معمولی ترقی کرتے دیکھ کر حسد و رشک کے باعث تنقید نگاری پر مجبور ہو گئے ہیں۔ لیکن سچ پوچھو تو یہ تنقید نگاری نہیں ہے . . . . یا . . . تاریخ ادبیات کا مطالعہ کرنے والے جب کسی انگریز نڈر پوپ[1] کی طرح اپنے ہمعصر اڈلیسن[2] کے دامن کمال کو تحسین و آفرین کے خزانوں سے مالامال پاکر تنقیدی اور ہجو آمیز ادبیت کی طرف متوجہ دیکھتے ہوں یا اڈنبرا ریویو[3] کے چند متعصب اور ضدی نقادوں کو اپنے زمانہ کی بعض شخصیتوں کے رستہ میں رکاوٹ بننے کے لئے مضحکہ خیز عبارتیں لکھنے میں مصروف پاتے ہوں تو ممکن ہے کہ نقاد کے متعلق اسی قسم کے خیالات ظاہر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور تنقید کی تعریف اس نقطۂ نظر سے صحیح کہہ دی جائے کہ ہم کسی طرح اس لغو خیال اور غلط تعریف کو ماننے پر آمادہ اور تیار نہیں ہو سکتے کہ تنقید عیب جوئی کو کہتے ہیں۔ یا کسی کے کلام سے معایب و نقائص کا اقتباس ہی تنقید ہے۔

---

[1] یہ 1688ء سے 1744ء تک رہا۔ شاعر کی حیثیت سے خصوصاً ہجو نگاری میں زیادہ مشہور ہے۔ یونانی تصنیفات کے ترجمے بھی کئے تھے لیکن طبیعت کا اچھا نہ تھا اس لئے ہمیشہ بدنامیوں اور غلط فہمیوں کا شکار رہا۔ اپنے دوست اڈلیسن کی دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر بہت جلتا تھا۔ آخر کار ہجو کے ذریعہ سے دل کی بھڑاس نکالی۔

[2] اس نے 1672ء سے 1719ء تک زندگی بسر کی۔ انگریزی زبان کا بہترین انشاپرداز تھا۔ اور ایک پادری کا بیٹا لیکن قسمت میں حکمرانی اور مضمون نگاری لکھی تھی اس لئے تاعمر ادب کی خدمت میں بسر کی۔ اس کے اور اس کے معاصر اسٹیل کے مقالات انگریزی زبان میں لاثانی ہیں۔ اس کی نیک دلی نے پوپ کے مقابلے میں اسے ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔

[3] انگریزی زبان کا مشہور ادبی و تنقیدی رسالہ۔

---

[4] اس کا عہد زندگی 1804ء سے 1881ء تک ہے۔ بنجامن ڈزرائیلی نام یہودی نژاد تھا۔ باوجود قومی منافرت کے انگلستان کی پارلیمنٹ کو صرف اپنی غیر معمولی قابلیت اور عظمت کی وجہ سے اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اس کو اپنا لیڈر اور آخرکار وزیر اعظم بنالے۔ وہ نہ صرف میدان سیاست کا شہسوار تھا بلکہ دبستان ادب میں بھی اسے خاص عظمت حاصل تھی۔

[5] بلزاک 1799ء سے 1850ء تک زندہ رہا۔ اسے اس کے معتقدین "دیو ادب" کہتے تھے۔ فسانہ نگاری اس کی ادبی قوتوں کی جولانگاہ ہے۔ اس کی ـــــ تصانیف بیش قیمت اور کثیر التعداد ہیں۔

عرب کے مشہور عالم بازار "عکاظ" میں جب دور دراز کے عرب شاعر اپنے اپنے کمالات کے اظہار اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے جمع ہوتے تو ایک مستند "علامہ" جو بالکل غیر جانب دار ہوتا صدر نشین بن کر ان کے کلام کو سنتا اور جب ہر قبیلہ کا شاعر اپنا اپنا کلام سنا چکتا تو صدر نشین ان کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار کرتا، ہر شعر کے معائب و محاسن واضح کئے جاتے اور ایک شاعر کو دوسرے پر ترجیح دینے کی صورت میں اس کے کلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی۔ اور جسے ترجیح دی جاتی اس کے محاسن کلام کا اظہار کیا جاتا۔ اور اس زمانہ میں اس تعریف و توصیف اور نقد و نظر کا نام "تقریظ" تھا۔

یہ واقعات اس دور کے ہیں جب اسلام عرب میں ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اور لفظ "تنقید" یا "انتقاد" ان معنی میں اس وقت تک مستعمل نہ تھے۔

لفظ تنقید جو بعد میں جاری ہوا ان دونوں معنی پر حاوی ہے اس کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ "کھوٹے اور کھرے میں امتیاز کرنا"۔۔۔ مگر اصطلاح میں کسی کی تصنیف و تالیف یا کلام (اور بعض جگہ ذاتیات کے بھی) معائب و محاسن کو ایک ایک کر کے دکھانا۔ پس تنقید اس فن کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے دوسروں کے اعمال و افعال اور حرکات و سکنات کو کسی اصول کی روشنی میں پرکھا جائے۔

دوسرے لفظوں میں صحیح غلط، اچھے برے، حق و باطل کے درمیان فرق کرنے، دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دکھانے۔ وقتی معتقدات اور ذاتیات کو ملیامیٹ کرنے نیز صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کا نام "تنقید" ہے۔ تنقید میں نہ صرف تخریبی پہلو ہوتا ہے بلکہ تخلیقی بھی۔ اس کا کام نہ صرف برائیوں کی مذمت کرنا ہے۔ بلکہ اچھائیوں کی صحیح طریقے سے ترجمانی کر کے ان کو ترقی یافتہ بنانے کا نام بھی "تنقید" ہے۔ اور بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ نقاد کو معائب کی طرف رخ ہی نہ کرنا چاہیے۔ لوئس شیخ الیسوعی اپنی مشہور کتاب "علم الادب" کے پہلے حصہ میں تنقید کی تعریف بایں الفاظ کرتے ہیں۔

النقد لغتہ هو النظر فی الدراهم لتمییز جیدها من فاسدها و فی الاصطلاح هو عبارة عن تعقل التالیف والکلام بالبصیرة لبیان محاسنهما و عیوبهما الا الا لتہ علی مغالطهما و شوائبهما (تنقید ایک ایسا لفظ ہے جس کے ذریعے کھوٹے اور کھرے سکوں میں تمیز کی جاتی ہے۔ اور اصطلاح ادب

میں ادبی کتابوں پر غور کرنا۔ اس کی اچھائیوں اور خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے ان کے عیوب و نقائص پر دلیل قائم کرنا بھی تنقید ہے)

مسٹر رابرٹسن "مقالات صفحہ ۱" میں لکھتے ہیں۔ "تنقید النسا معلومات کے تمام شعبوں سے متعلق صرف مقابلہ کرنے یا خیالات کو ترکرنے کا نام ہے"

اور کاؤکن "فورم ۱۷: ۳۵" میں لکھتا ہے کہ "کسی کام کے دو طریقوں کے درمیان موازنہ کرنا اصلی تنقید ہے"

بہرحال ان تمام تعریفوں پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تنقید کسی کے کلام و شخصیت کی عیب جوئی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس لفظ کا اطلاق اگر کسی مفہوم پر ہو سکتا ہے تو وہ "اظہار حقیقت" ہے اور بس۔۔۔!

اب ہم اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہیں۔ میرزا غالب نے اپنے خطوط میں تنقید نگاری کا کمال بھی دکھایا ہے۔ مثلاً انھوں نے چند خطوط چودھری عبدالغفور خاں سرور کے نام لکھے ہیں۔ ان خطوں میں غالب نے عرفی شیرازی کے بعض اشعار پر تنقید کرتے ہوئے اپنی بالغ نظری اور فارسی معلومات کا ایک روشن ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

دیوانگری محبت تو کامرد مسلم است مارا
بیگانہ ز تاج کرد تا رک آوارہ ز کفش کرد پا را

ہم پوچھتے ہیں کہ "دیوانگی" کیوں نہ لکھیں کہ دوسرے شعر کے معنی بے تکلف منطبق اور توجیہات درمیان نہ آئیں۔ فقیر کے نزدیک "دیوانگی محبت" تو صحیح اور بے تکلف ہے۔ اور "دیوانگی و محبت" غلط محض لیکن "دیوانگری محبت" تو تکلف محض۔

دیوانگی اور محبت دو صفتیں ہیں جنھیں کیوں جمع کریں۔۔۔؟ غور کیجئے! "عطف واؤ" یہ چاہتا ہے کہ یہ شخص پہلے سے دیوانہ تھا۔ اور پھر اسی حالت میں اس کو محبت پیدا ہوئی۔ شارح کی توجیہ کہ دیوانگی میں تاج و کفش بیجا تھی۔ محبت پیدا ہونے کے بعد یہ حالت طاری ہوئی "کیا بے مزہ توجیہ ہے۔ ہاں "دیوانگی محبت" یعنی وہ جنون جو فرط محبت میں بہم پہنچا اس نے اس احوال کو بہم پہنچایا۔ تمیز "دیوانگی محبت" کہے گا۔۔ اور "دیوانگی و محبت" کہنے کو منع کرے گا اور "دیوانگری محبت" کہنے کو نہ مانع آئے گا اور نہ تسلیم کریگا۔

"تا ہر چہ گفتی از گو مکرر شنود بیئے"

"شدے" کی رعایت سے کردہ عیبائے مجہول "بے معنی" ہیں شدہ

اور صاحب معنی تو بھی بیائے مجہول" پڑھتے ہیں تاکہ "میلفت" کے معنی پیدا ہوں۔ اس صورت میں خطاب سے غیبت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور "گفتی" بیائے معروف کہ صیغہ واحد حاضر ہے ازمنہ ثلاثہ میں سے اشعار زمانہ ماضی رکھتا ہے۔ اور "شدن" "شود" یہ سب استقبال کے مقتضی ہیں اور "گفتی" ماضی ہے۔ پس اگر "گفتی" بیائے معروف کہیے تو اوپر کے مصرع میں "بدی" (بودی کا مخفف) کہنا ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اگر وہاں "بدی" کہیے۔ تو یہاں "گفتی" بیائے معروف بے تکلف درست اور بیائے مجہول غلط ہے۔ اور اگر وہاں "شدے" کہیے تو یہاں "گفتے" بیائے مجہول کہیے۔ غیبت اور خطاب کا تفرقہ مٹا دیجیے۔ "گفتے" بیائے مجہول میں خطاب حاضر مقرر رہتا ہے اور "تو" کا لفظ قریب ہے وہ اس معنی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کے نظائر فارسی میں بہت ہیں ؎

منکہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب
مرغ اوصاف تو از اوج بیاں انداختہ

"منکہ باشم" اس کی جو شرح چھاپہ میں لکھی گئی ہے اس کو ملاحظہ کیجیے۔ اور معنی میرے خاطر نشان کیجیے تو میں سلام کروں۔

پہلے نظر یہاں لڑنی چاہیے کہ "از اوج بیاں انداختہ" کا فاعل کون ہے؟ اور مفعول کون ہے؟ اگر "عقل کل" کو "انداختہ" کا مفعول اور "منکہ" کے "کاف" کو "کدائیہ" ٹھہراؤ گے تو بے شبہہ "انداختہ" کے فاعل دو ٹھہریں گے ایک "ناوک انداز ادب" اور دوسرا "مرغ اوصاف تو"۔ ایک فاعل اور دو مفعول، یہ کیا طریق اور کیسی تخلیق ہے؟ اب فقیر سے اس کے معنی سنئے۔ "من" "انداختہ" کا مفعول "را" مقدر۔ "منکہ" کا کاف توصیفی۔ "ناوک انداز ادب" ادب آموز یعنی استاد۔ "مرغ اوصاف تو" فاعل۔ اب معنی یہ ہوئے کہ مجھ کو کہ عقل کل کا استاد ہوں تیرے مرغ توصیف نے اوج بیان سے گرا دیا ہے اور عقل کل تک کہ وہ علویوں میں اعلیٰ ہے اس ناوک پہنچ سکتا۔ مگر مرغ اوصاف اس مقام پہ ہے جہاں اس ناوک انداز کو ناوک پہنچانے کی گنجائش نہیں "اوج بیان سے گرنا عاجز آنا ہے"۔ قدرت وہ کہ عقل کل سے بھی زیادہ اور عجز یہ کہ اوج بیان سے گر گیا۔ مرغ اوصاف کی بلندی کا اچھا مبالغہ ہے اور اظہار عجز باوجود دعوی قدرت کا مضمون کیا خوب ہے ؎

---

۱ اوپر کا مصرعہ غالبؔ نے خط میں نہیں لکھا ہے۔

انعام تو بردوختہ چشم و دہن آز
احسان تو بشگافتہ ہر قطرۂ یم را

پہلے مصرع کے معنی تو وہی ہیں جو چھاپہ میں لکھے ہیں لیکن ثانی کی شرح میں گمراہ ہو گیا۔[2] "احسان تو ہر قطرۂ دریا شگافتہ تاہم بقید حساب نیامد" یہ ہیچمداں اس معنی کے معنی نہیں سمجھا بات ہے مگر اساتذہ کے مسلمات معلوم ہوں جب خیال میں آئے کمال ایثار و عطا میں مروارید و یاقوت اور بحر و معدن کم حقیقتی آتی ہے۔ لعل و دُر کا معدوم ہو جانا اور بحر و کان کا خالی ہو جانا نئی نئی طرح سے باندھا ہے۔ چنانچہ میں نے کسی زمانے میں ایک قصیدہ لکھ کر وزیر الدولہ والی ٹونک کو بھیجا تھا۔ اس میں کے شعر لکھتا ہوں ؎

ناموس نگہداشتی از جود بگیتی
جز پردگیان حرم معدن و یم را
وقت است کہ ایں قوم بہر کوچہ و بازار
پرسند زہم نشاں، رسوائی ہم را

"پردگیان حرم معدن و یم" لعل و گوہر جو کثرت ایثار سے کوچہ بازار میں خاک آلودہ پڑے ہوئے ہیں وہ باہم دگر دردمندانہ یہ گفتگو کرتے ہیں کہ اس شخص نے سب کی حرمتیں رکھ لیں اور سب کی آبرو بچائیں۔ ہم کو اس قدر بے حرمت اور ذلیل کیوں رکھا ہے؟ قطرہ دریا کا حساب کے واسطے چیر ڈالنا بے حساب ہے۔

مقولہ عرفی کا یہ ہے کہ "جتنے موتی دریا میں ہاتھ آئے وہ بخش دیے اور بخشش کا ذوق باقی رکھا۔"

چونکہ قطرہ میں موتی ہو جانے کی استعداد بالقوت ہے تو اس احتمال سے ہر قطرہ دریا کو چیر ڈالا کہ اگر موتی ہاتھ آویں تو وہ سائلوں کو دیے جائیں۔[3] پہلے مصرع میں حرص کا سیر کر دینا موافق مسلمات شعر، ممتنع ...

---

[3] مختصر یہ کہ شارح کے معنی کے مطابق تو احسان نے دریا کے قطروں کو اس لیے چیرا کہ وہ بذل و عطا کے حساب میں پورے اتریں۔ مگر میرزا صاحب کے معنی نہایت شاعرانہ اور لطیف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قطرے چیرنے کی غرض یہ تھی کہ ان میں استعداد موتی بننے کی دریافت کی جائے اور اگر ان میں ایسی استعداد موجود ہو تو وہ سب موتی انعام میں دیدیئے (آگاہ ...)

---

[2] یہاں گمراہ کا فاعل شارح محذوف ہے ۱۲

اور اس کا مرفوع میں آنا اغراق ہے اور دوسرے مصرع میں باحتمال ستعر او بالقوۃ قطرہ کو چیر ڈالنا۔ اور پھر اس طرح کہ ہر قطرہ کو موتی ہونا چاہیئے اغراق سے گزر کر تبلیغ و غلو ہے۔

من آں دریائے آشوبم کہ از تاثیر خاصیت[1]

دو کانوں کا علی التواتر آنا دوسری بات ہے۔ "دریائے آشوب" یا یکسال یا ہر لفظ ہے۔ استعارہ یا کنایہ صحیح مگر یہ محل نہیں ہے۔ یہاں تو دریا چاہیئے بے شائبہ کنایہ و استعارہ۔ عیاذاً باللہ! عرفی اگر ایک بڑا قدح بھنگ کا یا ایک بوتل شراب کی پیئے ہوئے ہوتا تو بھی یوں نہ لکھتا۔ اس غریب کا مصرع یوں ہے ؎

من آں دریا پر آشوبم کہ از تاثیر خاصیت

"دریا" موصوف۔ "پر آشوب" صفت۔ اور دوسرے مصرع کا "کاف" صفت کی تفسیر ــــــ"

مرقومہ بالا اقتباسات کو پڑھ کر جو غالب ہی کے مجموعہ خطوط "اردوئے معلی" اور "عود ہندی" وغیرہ سے لیئے گئے ہیں صحیح طور سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب محض ایک خوشگو شاعر یا ایک عام فہم اردو فارسی نثر نگار ہی نہیں تھا بلکہ اس کے اندر انتقاد کی صحیح اور حقیقی روشنی بھی مخفی تھی جس کی چمک ناواقف لوگوں کو حقیقت اور غیر حقیقت کے سمجھنے میں دشواریاں پیدا کر دیتی ہے۔ یعنی جب ان کے سامنے غالب کا صحیح معیار تنقید پیش کیا جاتا ہے تو وہ حقیقی انتقاد سے ناواقف ہونے کے باعث تنقید اور عیوب شماری میں کوئی فرق نہیں کر سکتے۔

(سابقہ صفحہ سے آگے) علامہ عبدالجلیل بلگرامی کا یہ شعر میرزا کے خیال اور معانی کی تصدیق کرتا ہے۔

وان فاق الورٰی فی الجنس والفعل
فان اللہ یبعث العطی فی الاصل!

علیٰ ہذا القیاس متنبی کا یہ شعر بھی اسی معنی کا موید ہے ؎

وان تفق الانام وانت منہم
فان المسک بعض دم الغزال!

[1] عرفی کے ایک قصیدہ نعتیہ کے اڑتالیسویں شعر ؎

من آں دریائے آشوبم کہ از تاثیر خاصیت
کہ تسکین است موج انگیز و آرام است طوفانش

کا پہلا مصرع ہے۔ یہ قصیدہ قاآنی کے اس قصیدے کے جواب میں ہے جس کی ابتدا یہ ہے ؏

عادل من پیر تعلیم است و من طفل زباندانش

رباعیات

محمد یوسف جمال انصاری ایم اے

مذہب ہے جدید روح انساں ہے قدیم
تلقینِ کتب سے ذوقِ عصیاں ہے قدیم
یہ عزمِ صلوٰۃ زہد ہے کل کی بات
رندی و مئے ناب کا پیماں ہے قدیم

قرنوں تیری صفات کو پوجا ہے
دو روز سے ہم نے ذات کو پوجا ہے
توحید کا بت تراشنے سے پہلے
ہر ذرہ کائنات کو پوجا ہے

خود کوزہ گر و کوزۂ سرشار ہے تو
خود ساقی میخانہ و میخوار ہے تو
کچھ اپنی حقیقت سے خبردار ہے تو
میں ہوں کہ مری جان گنہگار ہے تو

ڈھونڈیں گے بہشت میں تجھے اہلِ کتاب
پائیں گے جہنم میں تجھے رندِ خراب
کس شخص پہ کس رنگ میں ظاہر ہوگا
یہ مسئلہ ہونے کو ہے طے روزِ حساب

مدت سے اٹھا رہا ہوں غم ہستی کا
اک عمر سے کھا رہا ہوں غم ہستی کا
دے بندہ کہ قبلِ مرگ انصاف و جزا
ساقی چکھ لوں میں کیف و کم ہستی کا

میری منزل

از:-
نثار اٹاوی

جہاں زندگی ہے وہاں جا رہا ہوں

جُدائی کے کانٹوں کو پامال کرتا
حدودِ جفا و وفا سے گزرتا
تصوّر کی تصویر میں رنگ بھرتا
بصد آرزو شادماں جا رہا ہوں
جہاں زندگی ہے وہاں جا رہا ہوں

فضا میں مسرّت کے نغمے لٹاتا
زمانے کی رفتار پر مسکراتا
حکایاتِ ماضی پہ ہنستا ہنساتا
ظفر مندِ عزم کامراں جا رہا ہوں
جہاں زندگی ہے وہاں جا رہا ہوں

اُڑاتا ہوا پرچمِ کامرانی،
لٹاتا ہوا دولتِ نوجوانی
بڑھاتا ہوا زندگی کی روانی
بفکرِ متاعِ گراں جا رہا ہوں
جہاں زندگی ہے وہاں جا رہا ہوں

حجاباتِ دیر و حرم سے گزر کر
غمِ عشق کے کیف و کم سے گزر کر
کرم سے گزر کر ستم سے گزر کر
کسی سمت دامن کشاں جا رہا ہوں
جہاں زندگی ہے وہاں جا رہا ہوں

مقاماتِ پستی سے رفعت کی جانب
مصیبت کے نرغے سے راحت کی جانب
غرض میں دیارِ محبت کی جانب
عیاں جا رہا ہوں نہاں جا رہا ہوں
جہاں زندگی ہے وہاں جا رہا ہوں

افسانہ

زنجیریں

از:-

محمد امین تنشر قیوری

ٹن - ٹن - ٹن ......

اس نے نیم غنودگی کے عالم میں چونک کر دیکھا۔ دیوار گیر گھنٹہ بج رہا تھا۔ کھڑکی سے ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ سرد سرد جھونکے ۔۔۔ چھجے پر بیٹھا ہوا پنچھی خوش الحانی سے بول رہا تھا جیسے وہ صبح کی ۔۔۔کے گیت گا رہا ہو۔ اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کر رہا ہو، مگر وہ سویا ۔۔۔ب تھا۔ اس کے پپوٹے نیند کے بوجھ سے بھاری ہو رہے تھے جیسے ۔۔۔م رات اس نے آنکھوں میں کاٹی ہو۔ کمرے کی دیواروں کو حسرت ۔۔۔ی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جو چوبیس گھنٹے اس کی رفیق تھیں۔ ۔۔۔کے غم میں شریک تھیں۔ "کتنی بے حس ہیں یہ ——!" آہستہ سے ۔۔۔میرے دکھ کا اسے مطلق احساس نہیں۔ شب و روز مجھے تڑپتے ۔۔۔ دیکھتی ہیں۔ کاش! یہ میرے دکھ کا درمان بن سکیں۔" پھر اسے ۔۔۔یاد آ گیا ہو کہ یہ پتھر کی ہیں۔ پتھر بھی کبھی پسیج سکتا ہے۔ بالکل ۔۔۔ باپ کی طرح جس نے اسے کمرے میں محبوس کر دیا تھا۔

۔۔۔ جماہی لیکر اٹھا۔ کھڑکی میں سے کھڑا باہر جھانک رہا تھا۔ اس ۔۔۔ہوئی نظریں بہت دور تک جا رہی تھیں۔ سامنے وسیع چٹیل ۔۔۔میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں باریک سفید دھاریوں کی طرح ۔۔۔ئی تھیں۔ پہاڑی کے دامن میں ہری ہری کھیتیاں لہلہا رہی ۔۔۔ں کہیں کسان ہل چلاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس کی نظریں ۔۔۔ پر رک گئیں۔ جہاں عورتیں قطار باندھے ہوئے جا رہی ۔۔۔تے ہوئے۔ ان کی سرخ اوڑھنیوں کے پلو ہوا میں لہرا رہے ۔۔۔ جھول رہے تھے۔ نیم عریاں مٹیالے بازو فضا میں اس طرح ۔۔۔ہے تھے جیسے کسی کی حنا آلود انگلیاں پیانو پر نہایت سرعت ۔۔۔ نا ہوں —— دھرتی پہ نغمے بکھیر رہی ہوں۔ میٹھے اور

—!

۔۔۔ پیارے گیت گا رہی ہیں؟" مسکرا کر بولا۔ اسے ایسا محسوس ۔۔۔ دھرتی کا ہر ذرہ ان کے پاؤں سے چھو کر کندن بن گیا ۔۔۔یاں جگمگا رہی ہیں روپہلی کرنوں سے ——! اس کے جی ۔۔۔ اٹھی۔ سرد آہ بھر کر بولا —— "کاش وہ بھی ان پگڈنڈیوں پر چل پھر سکتا۔ ان ذرّوں کو چھو سکتا۔" وہ بہت دیر کھڑا دیکھتا رہا ان اڑتے ہوئے ذرّوں کو۔

——— (۲) ———

زینے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے ——

"کون ہے؟" آپ ہی آپ بولا۔ "دھنش ہوگا!"

"آ رہا ہے مجھے کوئی نیا حکم سنانے کے لئے، کچھ کھانے پینے کے متعلق۔ کچھ وید کے بارے میں۔"

"کھٹ کھٹ ——!" آہستہ سے آواز آئی۔

بولا —— "آ جاؤ ——!"

"آپ کی آنکھ کھل گئی۔" دھنش مسکراتا ہوا داخل ہوا۔ وہی معمول کا فقرہ —— "آج تو آپ بہت خوش نظر آتے ہیں۔" وہ ہر روز یہی کہتا تھا۔ "رات خوب نیند آئی ہوگی۔" یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ "وید جی مہاراج سے کہہ رہے تھے کہ آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔" مدت سے وہ یہی کہتا چلا آ رہا تھا۔ پھر جیسے وہ اس کی باتوں سے اکتا گیا ہو۔ گردن اٹھا کر باہر دیکھنے لگا۔ دور باغ میں کوئل بول رہی تھی۔ کو کو ——

"بڑی پیاری آواز ہے۔" خوشامدی نوکر بولا۔

"ہاں ——!" کنور چونک کر بولا۔

"راج محل میں ایک شخص بڑا خوبصورت پنچھی لایا ہے۔ بولتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی گا رہا ہے۔ حکم ہو تو یہاں لے آؤں سرکار ——!"

"وہ گیت گاتا ہے!" اس کے کانوں میں نغمے گونجنے لگے۔

"ہاں سرکار ——!"

کنور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاؤں کھڑکی کی طرف جا رہے تھے۔ رکتے ہوئے بولا۔ "دھنش! تم ان عورتوں کو جانتے ہو جو صبح گاتی ہوئی پہاڑی کی طرف جاتی ہیں —— ؟"

"ہاں سرکار —— وہ مزدور عورتیں ہیں، بھوکی اور ننگی —— صبح سے شام تک پتھر پھوڑتی ہیں۔ چار چھ آنے کما لیتی ہیں —— . اپنا اور

بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے۔"

"گیت بہت میٹھے گاتی ہیں۔" وہ بات کاٹ کر بولا۔ "جی چاہتا ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ گاؤں ۔۔۔"

"سرکار آپ راجہ ہیں۔"

وہ پیشانی پر شکن ڈال کر بولا۔ "کیا کہا تم نے؟"

"سرکار یہ کہہ رہا تھا کہ یہ بات آپ کو زیب نہیں دیتی۔ مہاراج کو معلوم ہو گیا تو اچھا نہ ہو گا۔" بات کا پہلو بدل کر "میں ابھی لیکر آتا ہوں۔ بہت میٹھے گیت گاتا ہے سرکار ۔۔۔" مسکراتا ہوا تیزی سے باہر نکل جاتا ہے۔

ایک خوبصورت پنجرا دھنش کے ہاتھ میں تھا۔ کنور کے قریب آکر بولا ۔۔۔ "دیکھئے سرکار کیسے خوبصورت پر ہیں اس کے۔ سونے جیسے سنہرے۔ یہ ابھی بولے گا سرکار۔" سیٹی بجا کر بولا۔ "بولو ۔۔۔ ہاں ہاں بولو۔"

"یہ نہیں بولے گا اب؟" کنور نے کہا۔ "پنجرے میں بند پنچھی کبھی بول سکتا ہے بھلا؟"

"نہیں سرکار! یہ ابھی بول رہا تھا۔" چمکارتے ہوئے بولا۔ "بولو تم چھوٹے سرکار کے دربار میں کھڑے ہو۔" پرندہ تعجب سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

وہ پنجرے کو انگیٹھی پر رکھتے ہوئے بولا۔ "نئی جگہ دیکھ کر گھبرا رہا ہے سرکار! ابھی مانوس ہو جائے گا۔ بہت اچھا گاتا ہے۔ مہاراج نے اس کے مالک کو دو ہزار دیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم نے ایسا خوبصورت پنچھی اس سے پہلے نہیں دیکھا۔" مسکرا کر کنور کو دیکھ رہا تھا اور کنور کہنی کا سہارا لئے پلنگ پر چپ چاپ پڑا تھا۔

—— (۳) ——

"سرکار ویدجی آرہے ہیں۔"

کنور پلنگ پر لیٹ گیا۔

"کہئے طبیعت کیسی ہے اب؟" ویدجی بولے "کھانا ہضم ہو گیا۔"

"میں کھاتا ہی کیا ہوں۔ پتلا دلیا اور دودھ۔"

"پھر کیا کھانے کو طبیعت چاہتی ہے؟"

"کوئی ایسی چیز جسے میں پیٹ بھر کر کھا سکوں۔" ویدجی ہنس پڑے۔ دربار سے ہر روز انھیں ایک خلعت انعام میں ملتی تھی۔ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

کھانے کا وقت ہوا۔ وہی دونوں چیزیں چن دی گئیں۔ دھنش

ان کو میرے سامنے سے لے جاؤ۔"

"کھا لیجئے سرکار، مہاراج بگڑیں گے۔"

"بگڑنے دو انھیں۔" اس نے طشتریاں اٹھا کر باہر پھینک دیں۔

"یہ کیا کیا سرکار ۔۔۔؟"

"کچھ نہیں ۔۔۔" وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر سے اُتر رہا تھا۔ باغ کی روشوں پر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

"کہاں چلے سرکار۔؟" دھنش کھڑکی سے چلا کر بولا۔

وہ چپ چاپ جا رہا تھا۔ محل سے باہر نکل کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ سڑک پر ایک دیہاتی لڑکی پوٹلی اور ایک برتن سر پر دھرے جا رہی تھی۔ اس کی اوڑھنی لہرا رہی تھی۔ لہنگا جھول رہا تھا وہ مسکرا کر بولا۔

"یہ کیا ہے تمھارے سر پر؟"

"باپ کا کھانا لے کر جا رہی ہوں۔"

"تمھارا باپ کیا کام کرتا ہے؟"

"ہل چلاتا ہے اور کھیت جوتتا ہے۔"

"یہ کھانا مجھے دیدو میں بھوکا ہوں۔"

"تم سونے کا کنٹھا پہنے ہو۔ ایسا کھانا کیا کھاؤ گے؟"

وہ گلے سے کنٹھا اُتار کر بولا۔ "لو تم اسے لے لو۔ میں کھانا کھاؤں گا ۔۔۔"

جگمگاتا ہوا موتیوں کا ہار لڑکی کے ہاتھ میں تھا۔ بولی۔ "یہ امیر پہنتے ہیں۔" وہ گلے سے کانچ کے موتیوں کا کنٹھا دکھا کر بولی "میرے پاس ہے۔ یہ تمھارے ہی گلے میں اچھا لگتا ہے۔"

"نہیں لڑکی! تم اسے پہن لو۔ تمھارے سندر گلے میں بہت بھلا معلوم ہو گا۔"

لڑکی کے لبوں پر حیا آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گردن جھکا کر انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی۔ کنور کے ہاتھ پوٹلی پر پڑے کھول کر دیکھا۔ پوٹلی میں کالی کالی دو روٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

"برتن میں کیا ہے؟"

"چھاچھ ہے۔" برتن اتار کر بولی۔

کنور نے منہ برتن سے لگا دیا۔ غٹ غٹ پیتے ہوئے بولا "کتنی لذیذ ہے اور ٹھنڈی۔"

"کیا مجھے روز پلاؤ گی؟"

لڑکی تعجب سے بولی! "تم نے کبھی نہیں پی چھاچھ؟"

"بالکل نہیں۔ میں نے اس کا نام آج ہی سنا ہے۔"
لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بولی۔ "تعجب ہے تم نے اس کا نام بھی نہیں سنا۔"

"تم نہیں جانتی ہو لڑکی، میں آزاد نہیں ہوں۔"

"سرکار ——!" یکایک اس کے کان میں آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دھنش کھڑا تھا۔

"سرکار غضب ہو گیا۔ مہاراج نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔ جلدی چلئے ——" کنور کے پاؤں آہستہ آہستہ لوٹ رہے تھے۔ کمرے میں آکر پلنگ پر گر پڑا۔

—— (۴) ——

"آپ سو رہے ہیں ——؟"
اس نے مندی ہوئی آنکھیں کھول دیں۔ راجکماری کھڑی تھی۔ اس کی منگیتر!"

"کیا ہے؟" وہ روکھے پن سے بولا۔
راجکماری مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "میں اس دن کی خوشی کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتی ہوں۔ جب آپ عسل سعت فرمائیں گے۔ راج محل دلہن کی طرح سجا ہوگا۔ شہر میں آئینہ بندی ہوگی۔ اور ——"

"اور کیا؟ رک کیوں گئیں۔ کہے جاؤ۔" وہ بے صبری سے بولا۔
"آپ راج گدی پر بیٹھیں گے۔"
"اور تم رانی ہو گی۔" راجکماری نے ہنستے ہوئے منہ پھیر لیا۔
"بس یہی چاہتی ہو نا تم؟" وہ سنبھل کر بولا۔ اس کے چہرے پر ہ کے آثار امنڈ آئے۔ راجکماری بولی۔ "مہاراج کا خیال ہے یں گدی سونپ کر یاترا کے لئے چلے جائیں۔ میری رانی بننے کی ہش ....." کہتے ہوئے اس کی نظریں کنور کے چہرے پر پڑیں ب کر بولی۔ "کیا ہوا آپ کو؟ آپ کا سانس بہت تیزی سے رہا ہے ——!"

"کچھ نہیں۔" وہ ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "جاؤ راجکماری چلی جاؤ ی باتوں میں تصنع کی جھلکیاں ہیں۔ لالچ کی بو ہے۔ تم میری رانی بن سکتیں! میری رانی وہ ....." وہ رک گیا۔ ہار کے ھرسے سوسنے لگا۔

راجکماری تڑپ کر بولی۔ "مہاراج نے سب سن لیا ہے۔ اب ہر نہیں جا سکیں گے۔ زینے کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔"

اس نے چونک کر دیکھا۔ بولا۔ "یہ سچ ہے راجکماری ——؟"
"ہاں —— !" پنجرے میں مقید پنچھی پھڑپھڑایا۔ راجکماری کی نگاہ پنجرے پر پڑی۔

"بہت خوبصورت پرندہ ہے۔ لال لال چمکتے ہوئے پر۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ——" پلٹ کر کنور کو دیکھا۔
"آپ چپ ہیں۔"
"کیا راجکماری۔" وہ چونک پڑا۔
"میں کہہ رہی ہوں یہ پنچھی تو بہت سندر ہے۔"
"ہاں۔" وہ بولا۔ "پنجرے کا دروازہ کھول دو۔"
"کھول دوں؟ اڑ نہ جائے گا؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"
وہ تیز ہو کر بولا —— "راجکماری پنجرے کا دروازہ کھول دو۔"
راجکماری کے ہاتھ پنجرے پر تھے۔

دھنش نے دیکھا پنجرہ خالی پڑا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، کنور کو دیکھ کر بولا۔ "سرکار! مہاراج نے اس کے دو ہزار دیئے تھے۔"
جواب میں کنور مسکرا دیا۔
اس کی نظریں شام کے دھندلکے میں پگڈنڈیوں پر جمی ہوئی تھیں جہاں مزدور عورتیں بھوکی اور ننگی چار چھ آنے کے بدلے محنت مشقت اٹھا کر گھروں کو لوٹ رہی تھیں۔ اچھلتی اور گاتی ہوئی۔ ان کی اوڑھنیوں کے پلو ہوا میں لہرا رہے تھے —— لہنگے جھول رہے تھے۔ گیت ان کے ہونٹوں پر ناچ رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ گائے —— لہک لہک کر گائے —— کوئی پیارا پیارا گیت۔ میٹھی میٹھی راگنی —— دن بھر کٹھن مشقت اٹھائے —— اور شام کو اسی طرح ہنستا ہوا —— اچھلتا اور گاتا ہوا گھر لوٹ کر آئے۔

پھر اسے اپنی مجبوریوں کا احساس ہوا۔ "زینے کا دروازہ بھی بند ہے ——" بولا۔
اس کی بھٹکتی ہوئی نظریں خالی پنجرے پر پڑیں —— "میں بھی اڑ سکتا ہوں —— اس قید سے رہائی پا سکتا ہوں۔ ان بندھنوں کو توڑ سکتا ہوں ——" کہتے ہوئے وہ دھم سے کھڑکی سے نیچے کود پڑا ——!

فریاد

از:-
شفیق کوٹوی

شکوۂ جور مجھے بانیٔ بیداد نہیں!
یہ تو مجبور اک آواز ہے فریاد نہیں

اک عجب نغمۂ دلسوز ہے فریاد نہیں
کیا خبر اُس کو جو لذّت کشِ بیداد نہیں

ضبط اے دیدۂ خونبار کہیں بات نہ جائے
عشق کے ظرف میں گنجائشِ فریاد نہیں

ایک میں ہوں کہ وظیفہ ہے مجھے نام اُن کا
ایک وہ ہیں کہ انھیں نام مرا یاد نہیں

خوگرِ رنج ہے کیا کام اسے راحت سے
شاد ہو جائے تو میرا دلِ ناشاد نہیں

کتنے معصوم ہیں اللہ یہ اربابِ وفا
ظلم پر بھی تو کوئی مائلِ فریاد نہیں

غیر معلوم بڑھا تھا مری جانب اک ہاتھ
کیا ہوئے جیب و گریباں یہ مجھے یاد نہیں

مٹ کے میں سوزِ محبت میں ترے خاک ہوا
طور برباد ہے لیکن ابھی برباد نہیں

تیرے جلووں سے ہوا تھا مرے جلووں کا ظہور
جو ہے تو میں بھی وہی ہوں تجھے کیا یاد نہیں

میری تنہائی کا احساس کر اے موجِ بہار
کیا قفس میں مرے گنجائشِ صبا نہیں

نزع میں آئے ہیں وہ میری عیادت کو شفیق
جب خدا کے سوا بندے کو کوئی یاد نہیں!

سوانح

ماریہ رولان

از:
ڈاکٹر جی۔ ایم۔ اکمل

ماریہ رولان فرانس کی ایک ممتاز ترین خاتون تھی جس نے اپنی غیر معمولی لیاقت کی بنا پر وہ عروج حاصل کیا کہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ ماریہ رولان کی پیدائش ۱۷۵۴ء میں ایک غریب [illegible] گھرانے میں ہوئی [illegible] دولت سے مالا مال [illegible] تھا۔ وہ چونکہ اپنے [illegible] کی اکلوتی بچی تھی اس لئے انہوں نے اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ [illegible] میں اسے مدرسے بھیج دیا گیا۔ اس نے مدرسہ میں حصول علم کے لئے [illegible] شوق ظاہر کیا کہ تمام لڑکیوں پر سبقت لے گئی۔ ماریہ نے موسیقی اور مصوری میں بھی مہارت حاصل کی۔ تاریخ و سیر اور ادب و اخلاق سے اسے خاص لگاؤ تھا۔ زیادہ تر وہ تاریخ سے دلچسپی لیتی تھی۔ اور قوموں کے عروج و زوال پر غور کرتی رہتی تھی۔ طالب علمی کے ماحول میں ماریہ قدرتاً سادگی پسند ہو گئی۔ نہ اسے نوجوانوں کے ساتھ سیر و تفریح کی فرصت تھی۔ نہ اس کی توجہ اپنے بناؤ سنگار کی طرف مائل [illegible] اور عزلت پسندی ہی چیزیں [illegible] غور و فکر کی [illegible] ماریہ اپنا وقت [illegible] گزارتی [illegible] بڑا حصہ [illegible] غربت نے گھوار رستے میں [illegible] سے ماتوس تھی [illegible] غریبوں کی مشکل [illegible] مصائب کا احساس تھا وہ اچھی طرح [illegible] تھی کہ فرانس کے غریبوں پر عرصہ حیات کس قدر تنگ ہے کیونکہ [illegible] باپ نے بچپن ہی میں اسے امیروں کے بُرے خصائل و عادات [illegible] اخلاق ناہموار سنا کر سب کی طرف سے بدظن کر دیا تھا۔ جب [illegible] تھی تو باپ اس کی انگلی پکڑے باہر لے جاتا۔ پیرس کی سڑکوں [illegible] دولتمندوں کا کروفر، امیرزادوں کا سیر و تفریح کو نکلنا، ان [illegible] کا ٹھاٹھ اور ان کے جلو میں خدم و حشم اور ان کا باہم لغو [illegible] مذاق کرنا۔ ان کے گھوڑوں کا غریبوں کو ٹھوکریں دے کر نکل [illegible] غریبوں کو حقارت و ذلت کی نظر سے دیکھنا سب اسے [illegible] [illegible] نے ماریہ کو امیروں سے سخت نفرت اور غریبوں سے [illegible] تھا۔ ایک مرتبہ ماریہ کو شاہی محل دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

عیش و عشرت کے حیرت انگیز سامان دیکھ کر اس کے نازک دل پر [illegible] چوٹ لگی۔ فرانس کے [illegible] اور غریبوں کی زندگی کے موازنہ نے [illegible] اور شاہی [illegible] کو پر نم نگاہوں سے دیکھتی اور [illegible] کا خون چوس [illegible] تمام لوازم عیش غریبوں [illegible] گئے ہیں۔

اب فرانسیسی دوشیزہ [illegible] شباب کی کلیاں چٹک رہی تھیں اور اس کی [illegible] و سیرت کا دور دور تک چرچا پھیلا ہوا تھا۔ پیرس کے ایک دولتمند سوداگر نے اس سے شادی کی درخواست کی اس کے والدین تو رضامند ہو گئے۔ مگر یہ نامور خاتون جس کے [illegible] میں غریبوں کے جذبات کی ترجمانی خدا نے لکھی تھی شادی سے انکار [illegible] اور بھی ملک کے متعدد امیروں نے اس کے ساتھ شادی کی درخواستیں کیں لیکن ماریہ ہمیشہ انکار ہی کرتی رہی اور صاف کہہ دیتی تھی کہ [illegible] کسی دولتمند انسان سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے دولتمندوں سے نفرت ہے۔ والدین اسے بہت مجبور کرتے لیکن غریبوں [illegible] کی حالت زار [illegible] [illegible] [illegible] اور اس [illegible] تام ایک غریب شخص سے [illegible] سے محبت ہو گئی۔ [illegible] پیسہ بھی نہ تھا۔ اور اس کی عمر [illegible] ماریہ سے بائیس [illegible] لیکن اس کے سینہ میں وطن پرستی کی آگ بھڑک رہی تھی [illegible] غریبوں سے محبت تھی۔ اور غریبوں کی [illegible] قربان کر دینا اپنا فخر سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی [illegible] ماریہ [illegible] ساتھ شادی کرنے پر مجبور کر دیا۔ گو اس کے والدین [illegible] کی مگر یہ شیر دل خاتون اپنے ارادے سے [illegible] ۱۷۸۰ء میں رولان سے شادی کر لی۔ اور ماریہ [illegible] رولان بن گئی۔ شادی کے بعد چند روز تک تو دونوں پیرس میں رہے۔ پھر شہر [illegible] میں چلے گئے اور اس کے بعد لیون کے [illegible] قصبہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اور قومی تحریکات میں حصہ لینے لگی۔ سفر [illegible]

کسان انھیں اپنا محسن اور مہربان سمجھتے اور یہ بھی ان کی امداد پر ہر وقت کمربستہ رہتے۔ ماریہ کا دستور تھا کہ ہر روز تھوڑا سا وقت نکال کر مریضوں اور محتاجوں کی خبرگیری میں صرف کرتی۔ اپنے پاس سے دوائیں دیتی اور انھیں تسلی دیتی رہتی۔ وہ لوگ اس کے حد سے زیادہ گرویدہ ہوگئے اور سارے گاؤں میں اُس کی خوبیوں کی دھوم مچ گئی۔

اسی اثنا میں انقلاب و بغاوت کا فرانس میں یک بیک ہنگامہ برپا ہوگیا جو تاریخ عالم کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ یہ ستمبر ۱۷۹۲ء کی خونچکاں داستاں ہے۔ جمہوریت کا سب سے بڑا مدعی فرانس اس وقت جبر و تشدد کا بدترین مرکز بنا ہوا تھا۔ حکومت کے آہنی شکنجہ میں جمہور کی روح کو اس وقت کچلا جا رہا تھا۔ نہ رعایا کی عزت نہ جان و مال کا خیال۔ شہنشاہ کے خونیں پنجہ میں تڑپ تڑپ کر جان دے دینا وفاداری کا تقاضا تھا۔ حرف فریاد زبان پر لانا گویا بغاوت کا دوسرا نام تھا۔ ہر طرف بیگناہوں کے خون بہ رہے تھے اور تین دن میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ نوجوان بجرم وطن پرستی پیرس کے اندر تہ تیغ کردیئے گئے۔ مگر اس پر بھی وطن پرست باز نہ آئے جہاں حکومت شمع حریت کے ایک پروانے کو فنا کرتی وہاں دس پروانے اور آجاتے۔ ان میں مرد بھی ہوتے اور عورتیں بھی۔ متعدد خواتین نے آزادی فرانس کے لئے اپنی زندگیاں قربان کردیں۔ ماریہ رولاں کو جب اس جوش و برہمی کا حال معلوم ہوا تو فوراً مظلوموں کی امداد کو تیار ہوگئی۔ لوگوں کا جوش بڑھانا شروع کیا۔ اور بغاوت و سرکشی کی آگ اور تیز کردی۔ وہ بچپن ہی سے امارت کی مخالف اور رعایا کی طرفدار تھی۔ یہ ہنگامہ شروع ہوا تو سمجھی کہ ملک و قوم کی اصلاح کے لئے اس سے بہتر وقت شاید کبھی نہ ملے گا۔ اس نے پیرس میں آکر ایک رسالہ شائع کیا اور تقریریں کیں۔ اس کی سحر بیانی اور صدق و خلوص سے سیکڑوں جوان آمادہ ہوگئے۔ ماریہ کی ذاتی کوشش سے تھوڑے عرصہ بعد اس کے مُریدوں نے ملک کے بیشتر حصہ پر قبضہ کرلیا۔ اور اس کا شوہر موسیو رولاں نئی انقلابی حکومت کا ایک وزیر مقرر ہوا۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد اس پارٹی میں بھی تفرقہ پڑ گیا ماریہ کے چند مخالفوں نے اسے گرانے کی پوری کوشش کی۔ یہاں تک کہ اس کے دشمنوں نے اس کے شوہر پر جھوٹا الزام لگا کر مقدمہ چلا دیا ماریہ کی قربانیاں رنگ لا رہی تھیں۔ ملک شاہراہ آزادی پر تیزی



سے گامزن ہو رہا تھا۔ وہ اپنے عروج و اقتدار کی متمنی نہ تھی۔ اس نے جب اپنی پارٹی میں افتراق دیکھا تو چاہا کہ اب سیاسیات سے کنارہ کشی کر کے گاؤں چلی جائے۔ لیکن شوہر کی گرفتاری نے اسے پیرس کی رہائش پر مجبور کر رکھا تھا۔ اس نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنے شوہر کے مقدمہ کی پیروی کی۔ فیصلہ کی تاریخ مقرر ہوئی حاکم نے جیوری سے رائے طلب کی۔ جیوری نے بلا تامل بری ہونے کا فیصلہ کر دیا۔ مگر اس فیصلہ نے ماریہ کے مخالفوں کے سینوں میں اور آگ بھڑکا دی وہ سانپوں کی طرح بل کھانے لگے اور انھوں نے ماریہ کے خلاف کچھ ایسی سازش کی کہ اسے فوراً گرفتار کر کے قید خانے میں بند کر دیا گیا۔ ماریہ کو اس بات پر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جو ہستیاں قوم کے لئے سب کچھ قربان کرتی ہیں ان کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ فرانسیسی حسینہ کو انھی لوگوں کے ہاتھوں جن کی آزادی کے لئے اس نے جد و جہد کی تھی قید خانہ کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ وہ کافی دن تک قید خانہ میں رہی اور وہاں بھی اسے بہت ستایا گیا۔ ماریہ اپنی قید کی زندگی میں اپنے ہم الم قیدیوں کی خبر گیری اور ان کی تسلی و تشفی اور دلدہی و حوصلہ افزائی میں زیادہ تر مصروف رہتی۔ ماریہ نے وہاں ایک کتاب بھی لکھی جس میں اس نے اپنے تاریخی حالات و واقعات قلمبند کئے۔ لیکن دشمنوں نے ماریہ کے خلاف قید میں بھی اپنی سازشیں جاری رکھیں۔ آخر اکتوبر سنہ ۱۷۹۳ء کو یک بیک اسے عدالت میں بلایا گیا اور اس پر سنگین ترین الزامات عاید کئے گئے اور بغیر اس کے کہ اسے کچھ کہنے سننے کا موقع دیا جائے عدالت نے سزائے موت تجویز کر دی اور حکم دیا کہ گلوٹین سے اس کا گلا کاٹ کر جان لی جائے۔ دوسرے دن صبح فرانسیسی سپاہی اسے زنجیروں میں جکڑ کر قتل گاہ میں لے آئے۔ ماریہ نے مسکرا کر "فرانس زندہ باد" کا نعرہ بلند کیا اور یہ کہہ کر اپنا سر جلاد کی تلوار کے سامنے جھکا دیا۔ "آزادی تیرے نام پر انسان جان تک قربان کر دیتا ہے۔"

آخری دفعہ ماریہ نے کاغذ اور قلم بھی مانگا تا کہ اپنے آخری خیالات قلمبند کر سکے۔ مگر اس سے انکار کر دیا گیا۔ اور بغیر کچھ کہے سنے اس کا گلا کاٹ دیا گیا۔ افسوس کہ وہ اپنے قیمتی خیالات بھی اپنے ساتھ لے گئی۔

نوائے راز

پاک بیں ہوں نہ پارسا ہوں میں
رندِ مشرب ہوں بے ریا ہوں میں

اک مسافر ہوں، بینوا ہوں میں
پھر بھی دُنیا کا رہنما ہوں میں

وہ کہاں ہے یہ جانتا ہوں میں
دل کی آواز سُن رہا ہوں میں

خود نمائی بھی حق نمائی ہے
صاف گوئی کا آئینا ہوں میں

انتہا ہے یہ میری وسعت کی
بزمِ ہستی کی ابتدا ہوں میں

پیرِ میخانۂ محبت ہُوں
رازِ میخانہ جانتا ہوں میں

کوئی سمجھے نہ صاحبِ باطن
اہلِ ظاہر کا ہمنوا ہوں میں

شکریہ اس وفا نوازی کا
بیوفا! خیر، بیوفا ہوں میں

ڈھونڈتی پھرتی ہے ہوائے وطن
دشتِ غربت میں کھو گیا ہوں میں

اپنی تقدیر پر نہیں کچھ زور
حسنِ تدبیر کا خدا ہوں میں

رازؔ یہ بھی ہے ایک طرزِ فغاں
گو بظاہر غزل سرا ہوں میں!

رازؔ چاندپوری

ہم

از:- الم مظفرنگری

سُن رہے ہیں اک صدائے آشنا ساحل سے ہم
ناخدا نزدیک شاید آگئے منزل سے ہم

اقتدا کرتے ہیں خود ہی دل کی راہِ عشق میں
خود ہی بڑھ جاتے ہیں آگے کاروانِ دل سے ہم

دل سے اُٹھ کر آنکھ تک آنسو نہ پہنچے شامِ غم
دو گھڑی روئے بھی تو روئے بڑی مشکل سے ہم

روح میں ہے دل میں ہے یا ہے فقط احساس میں
آج تک واقف نہیں ہیں درد کی منزل سے ہم

ہونگے باطل سب فسانے جس سے حسن و عشق کے
داستاں ایسی لکھے جاتے ہیں خونِ دل سے ہم

تنگ دامانی کا اپنی بعد میں آیا خیال
دونوں عالم لے چکے جب آستانِ دل سے ہم

اکتسابِ سوز با ہم سے ہیں زندہ اہلِ سوز
ہم سے پروانہ ہے اور پروانہ محفل سے ہم

دل کی آنکھوں سے اُٹھا لیتے ہیں پہلے سب حجاب
دیکھتے ہیں پھر اُنھیں، ہر پردۂ حائل سے ہم

دیکھیے اب کون سا طوفاں جگاتا ہے ہمیں
مُنہ چھپا کر سو رہے ہیں دامنِ ساحل سے ہم

اضطرابِ دل رہا وابستۂ اُمید و بیم
سنتے تھے جب تک خدا حافظ لبِ ساحل سے ہم

اب نہیں احساس ناکامی میں باقی لذتیں
اب تو باز آجائیں شاید سعیِ لاحاصل سے ہم

سامنے منزل ہے اور آہستہ اُٹھتے ہیں قدم
پاس آکر ہو رہے ہیں دُور پھر ساحل سے ہم

دل کے ہر ذرّے میں تیری ہی تجلّی جذب ہے
کیوں نہ لاکھوں دل بنالیں ذرّہ ہائے دل سے ہم

اب کوئی اعجاز وقتِ آخری اے ناخدا!
گھر چکے طوفان میں دُور آچکے ساحل سے ہم

اے الم کب تک رہیں اس عالمِ بیرنگ میں
آگئے ہیں تنگ اب ویرانیٔ محفل سے ہم

افسانہ

جھونکا

از:- جبار عباسی بی-اے (علیگ)

زہرہ اپنے سونے کے کمرے میں لیٹی ہوئی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ [illegible] لالٹین دروازے سے لٹک رہی تھی اور اس کے [illegible] تھی اور وہ اس کی گرمی کو اپنے چہرے اور بالوں پر محسوس کر رہی تھی۔ [illegible] گرما کے تمام آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ مچھر بھنبھنا رہے تھے اور اس کے کانوں کے پاس اڑ اڑ کر اسے دق کرتے تھے۔ وہ رسالہ کو ہوا میں جنبش دیکر انہیں بھگا دیتی اور پھر پڑھنے لگتی۔

[illegible] مختصر سا تھا۔ ایک طرف پلنگ اور دوسری دیوار سے لگا ہوا ایک تخت تھا جس پر سفید فرش بچھا ہوا تھا اور اس پر جگہ جگہ کئی ایک [illegible] پڑ گئے تھے۔ تخت کے نزدیک ہی کونے میں ایک میز تھی جس پر [illegible] شیشیاں تیل، عطر اور کریم وغیرہ کی رکھی ہوئی تھیں۔ [illegible] وہ کمرے میں دیواروں پر کیلنڈر یا تصویروں کی قسم کی [illegible] چیز نہ تھی۔ کمرہ سادہ تھا اور زہرہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی رسالہ [illegible] رہی تھی۔ اور مچھروں سے تنگ آ کر کبھی کبھی رسالہ کو ہوا میں جنبش دے رہی تھی۔

صحن میں باتوں اور قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے لیٹے لیٹے [illegible] جھانک کر دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ اور ساڑی کے آنچل کو [illegible] سنبھالتے ہوئے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

لالٹین کی روشنی میں آنے والوں کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ جعفر کو دیکھ کر ہنس دی۔ اس کے قدموں میں لغزش پیدا ہو گئی تھی [illegible] لہجہ بھی بدل گیا تھا۔ اس نے زہرہ کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں اور [illegible] کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ زہرہ بول اٹھی۔ اور دونوں ہاتھوں کو آگے [illegible] بڑھا کر بولی۔ "حضور تشریف لائیں۔" وہ جعفر [illegible] ہی رہی تھی۔ اکثر جب جعفر بہت پی کر زہرہ کے پاس جاتا تو وہ [illegible] آمیز دلچسپی لینے لگتی تھی۔ "زہے نصیب!" وہ خالد [illegible] لگی۔ "حضور نے بھی کرم کیا ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب آپ [illegible]۔" اور بے تکلف یہ مصرع پڑھنے لگی۔ "وہ آئیں گھر میں [illegible] خدا کی قدرت ہے۔" خالد جھینپ سا گیا۔

زہرہ مسکرا کر بولی۔ "آئیے تشریف لائیے۔" جعفر پلنگ پر [illegible] زہرہ [illegible] خالد [illegible] زہرہ سے انکساری سے [illegible] دیکھتے ہوئے کہا۔ "شکریہ۔ کوئی تکلیف نہیں۔"

جعفر اپنا ہاتھ زہرہ کے کندھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ "اور کہو زہرہ کیا حال ہے؟"

"دعا ہے آپ کی!" پھر وہ خالد سے مخاطب ہو کر ہنس کر کہنے لگی۔ "بڑے رنگ پر ہیں آج جعفر صاحب!"

جعفر شرابیوں کی طرح بولا۔ "ارے بھائی! —— میں کب رنگ پر نہیں رہتا —— بے رنگ زندگی بھی کیا ہوئی؟"

زہرہ ہنس دی۔ اسے جعفر کی بات بات پر ہنسی آ رہی تھی۔ خالد بھی مسکرا رہا تھا کہ ان کے مکالمے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ زہرہ کے تبسم اور آنکھوں کی شعاعیں اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔ اسے زہرہ کی باتوں میں ایک لذت سی مل رہی تھی۔ اس کی نظریں آپ ہی آپ اس کے چہرے پر جم جاتیں اور جب زہرہ اس کی طرف مخاطب ہوتی اور دونوں کی نظریں مل جاتیں تو وہ ادھر ادھر یا فرش کی طرف دیکھنے لگ جاتا۔ لیکن زہرہ کی نگاہیں بدستور ایک جگہ قائم رہتیں۔ اسے بس ہلکا سا احساس ہوتا جیسے وہ چھپا جاتی۔ خالد کے اس طرح چھپا چھپا کر دیکھنے کو وہ کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ وہ دل میں سوچتی کہ سب ہی دیکھتے ہیں۔ یہ بھی ہے۔ وہ کیسے سمجھتی کہ ان دزدیدہ نگاہوں میں زندگی کی ایک لطیف و نازک حقیقت پنہاں ہے —— لطیف و نازک جذباتی و غم انگیز ——

روز ہی، آج سے نہیں کئی سال سے۔ اسی طرح کتنے ہی دلوں کی تپش، کتنے ہی جذبات کا اضطراب نگاہوں نگاہوں میں اس کے چہرے پر لوٹا مچلا تھا۔ اور اس نے اس کا اچھا سا مداوا کر دیا تھا۔ وہ ان نگاہوں کی سطحیت سے خوب واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پیچھے ایک آتشیں بپھرے ہوئے وقتی طوفان کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ان ناتجربہ کار لڑکیوں کی طرح نہیں تھی جو ان جذبات کا چھوٹتے ہوئے سینے اور نشیلی آنکھوں سے خیر مقدم کرتی ہیں۔ وہ

رہ کر گھبراتی ہیں۔ اور اپنے ہی جذبات کی پیچیدگیوں میں اُلجھ اُلجھ کر رہ جاتی ہیں۔ تجربے نے تو اسے ایک کامیاب حکیم بنا دیا تھا اور اُس کے پاس مجرب نسخے تھے جن سے وہ ان کا مداوا کردیا کرتی تھی۔

جعفر زہرہ کو گُدگُدا کر چھیڑ رہا تھا۔ وہ بناوٹ سے چہرے پر تیوری ڈال کر کہتی "مت پریشان کیجیے۔ آپ تو آپے سے باہر ہوئے جارہے ہیں۔" پھر وہ ہلکے سے حجاب کے ساتھ خالد کی طرف دیکھ کر کہتی "ان کو تو ہوش نہیں رہ گیا ہے" یا پھر وہ جھنجھلا کر کہتی۔ "بیٹھیے نا ٹھیک سے۔ یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟" پھر وہ فوراً ہی ہنس دیتی۔ اور جعفر کی آنکھوں کو دیکھنے لگتی اور ہنسکر کہتی "دیکھو آنکھیں کیسی چڑھ رہی ہیں" اور قہقہہ لگا دیتی۔ جعفر نے اسے کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا اور زبردستی اس کے منہ سے منہ لگانا چاہا۔ اُس نے اپنے گالوں پر ہاتھ رکھ لیا اور دوسری طرف منہ کرکے کہنے لگی "توبہ آپ کے منہ سے کتنی بدبو آرہی ہے" وہ جعفر کی آغوش سے علیحدہ ہوکر بیٹھ گئی۔ ایک دوسرے شخص کی موجودگی کے احساس کی وجہ سے سُرخی کی ایک لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی تھی۔ خالد کی طرف مخاطب ہوکر وہ بولی "ابھی میں ان کو درست کرتی ہوں" اور یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

خالد کو جعفر کی اس بیباکی پر شرم آرہی تھی۔ وہ اس کوچے میں بالکل ہی نووارد تھا ——— ناتجربہ کار اور لاعلم۔ اس کی نظر سے اس قسم کے نظارے بہت کم یا یوں کہئے گزرے ہی نہ تھے۔ گزرگاہوں پر ——— یونیورسٹی میں، بازاروں، سینماؤں اور اپسراؤں میں اسے ہزاروں تیتریاں نظر آتیں، خوبصورت خوبصورت، پیاری پیاری، متاثر کرنے والی تیتریاں۔ لیکن وہ انھیں اپنی حقیقی دنیا سے دور کسی اور دنیا کا تصور کرتا۔ وہ سمجھتا کہ انھیں انسانی ہاتھ کبھی نہیں چھوتے۔ یہ محض نمائش کے لئے، دیکھے جانے کے لئے تخلیق کی گئی ہیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا کہ ابھی چھوتے ہی یہ اُڑ جائیں گی، اور ایک رنگین رومانی دُنیا میں واپس چلی جائیں گی۔ جہاں جاکر وہ پھر کبھی نہ آئیں گی۔ اگر وہ اپنے شاعرانہ تخیل پر ذرا بھی غور کرتا تو شاید اسے خود ہی اپنی حماقت پر ہنسی آجاتی۔ لیکن اگر غور بھی کرتا تو کیا؟ وہ تو صرف اس حد تک سمجھ سکتا تھا کہ یہ عورتیں بھی دنیا کی ہر چیز کی طرح نظام عالم کا ایک جزو ہیں۔ انہی سے نسل انسانی کی بقا ہے ..... وغیرہ ..... وغیرہ لیکن پس پردہ جہاں عورت بے نقاب ہوکر آتی ہے ——— وہ عجیب وغریب حقیقت جبکہ تمام شاعرانہ تخیلات پاش پاش ہوکر رہ جاتے ہیں اور یہ گتھی سلجھ جاتی ہے کہ "بے پردہ لوگ کیسے ہیں" تجربات سے حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ ان سے قطعی ناآشنا تھا۔

[...]سے شرم آتی تھی اور حیرت بھی۔ زہرہ جب چلی گئی تو جعف[...] دروازے کی طرف دیکھ کر بولا "اماں خالد! ذرا سگریٹ تو جلا[...] ———" خالد نے سگریٹ جلا کر اسے دیدی اور وہ مست بیٹھا ہوا سگر[...] پیتا رہا۔ زہرہ ایک ہاتھ میں سوڈے کی بوتل اور گلاس اور دوسرے میں شراب کی بوتل لئے ہوئے آگئی۔ دروازے ہی پر سے جعفر کو شراب کی بوتل ذرا اوپر اٹھا کر دکھا کر کہنے لگی "پیئیں گے؟"

جعفر چلا پڑا ——— "اوہ زہرہ! تم بڑی اچھی ہو ——— لاؤ رکھو[...]" زہرہ نے گلاس اور بوتل میز پر رکھدی اور شراب کی ایک اچھی خاص[...] مقدار میں سوڈا ملا کر جعفر کو دیدیا۔ زہرہ جب میز پر جھکی ہوئی شرا[...] انڈیل رہی تھی تو اس کی لمبی سیاہ چوٹی گردن اور شانے کے درمیا[...] لٹک رہی تھی۔ خالد سے ضبط نہ ہوسکا اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "ارے شراب میں سانپ!" اس مذاق کی لطافت پر سب ہنس دیئے۔ جعفر دیر تک شرابیوں کی سی ہنسی ہنستا رہا۔ زہرہ اپنی شوخ نظروں سے خالد کو دیکھ کر مسکرادی اور بولی "ہمیں تو آپ نے ڈرا ہی دیا تھا ———" جعفر بھی ترنگ میں آکر بولا "میرے ساقی کو تم نے کیوں ڈرادیا خالد؟ ——— بڑے کمبخت ہو ——— میرا اچھا سا ساقی" یہ کہہ کر اس نے شراب کا لمبا سا گھونٹ لیا۔ "میرا پیارا ساقی ——— میرا مُنّا سا ساقی" اس وقت اس کے جذبات میں انتہائی خلوص و محبت کے احساسات بھرے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب سے بٹوہ نکالا اور زہرہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ تمھارا ہے۔ اسے رکھ لو" زہرہ نے بغیر انکار کئے ہوئے بٹوہ لے لیا اور سرہانے تکیے کے نیچے رکھدیا۔ وہ ہر بات پر مسکرا رہی تھی اور کبھی کبھی کسی بات پر ہنس بھی دیتی تھی۔

جعفر نے پے بہ پے کئی پگ چڑھا لئے۔ وہ مدہوش سا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اور بدحالی اس پر غفلت چھا گئی۔ خالد اور زہرہ نے اسے سہارا دیکر آرام سے پلنگ پر لٹا دیا۔

زہرہ جعفر کی طرف دیکھ کر خالد سے بولی "یہ اچھا ہی ہوا ——— کبھی کبھی یہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور مجھے بہت دق کرتے ہیں" وہ کسی خیال سے شرما گئی اور کہنے لگی ——— "پھر میں ان کا اسی طرح علاج کردیتی ہوں"

"ہوں" خالد نے کہا "لیکن میرے لئے تو مصیبت ہی ہوگئی"

زہرہ اس جملے کے معنی نہ سمجھ کر خالد کی صورت دیکھنے لگی۔

"اب میں ان کو یہاں سے کیسے لے جاؤنگا۔" وہ کسی قدر متفکر ہو کر بولا۔

"وہ یہیں سو رہیں گے۔ اکثر سو رہتے ہیں۔"

تجویز غیر مانوس تھی اور خالد کو عجیب سی معلوم ہوئی۔ وہ اس مسئلے پر سوچنے لگا۔

"اور آپ بھی یہیں سو رہئے گا۔"

وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ "تمہیں زحمت ہوگی۔" اس نے کہا۔

"زحمت کیا، کوئی تکلف تھوڑا ہی ہے ——— ہاں البتہ ——— جو آپ کو زحمت نہ ہو ——— کوئی آپ کا منتظر تو نہ ہوگا؟"

خالد اس جملہ کی معنی آفرینی پر مسکرا دیا۔ "نہیں، کوئی نہیں، میں تنہا ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

زہرہ یکایک سنجیدہ ہوگئی۔ ایک جانگداز خیال، ایک مایوس حسرت اس کے دل میں پیدا ہوگئی۔ "کوئی آپ کا منتظر تو نہ ہوگا۔" اس جملہ میں بہت کچھ پنہاں تھا۔ بہت کچھ۔ عورت کی حیات معنوی کا ایک حقیقی عنصر۔ ایک ایسی داستان جس کے تاثرات سے کبھی کبھی اس کے دل کا گوشہ گوشہ لبریز ہو جاتا تھا۔ اور وہ ایک سہانے خواب میں ——— جو اس کے لئے سہانا بھی تھا اور غم انگیز بھی کھو جاتی ——— یہ شیرینی اس کے لئے کتنی تلخ تھی۔ جو اکثر اُسے تنہائی کا احساس دلا کر اس کی طبیعت کو مکدر کر دیتی تھی ——— اس کی خاموش داخلی دنیا میں جہاں موت کے مبہم، پراسرار سکوت کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔ طوفان آجاتا اور اس کی کشتیٔ حیات جو بغیر انتظام و اشارے کے محض بے خیالی میں آپ ہی آپ ایک سمت کو بہی چلی جا رہی ہے ہچکولے کھانے لگتی۔

انہی لطیف و نازک احساسات نے اسے عام طوائفوں سے قطعی مختلف بنا دیا تھا۔ اس کی اپنی انفرادیت تھی ——— اس لعل کی طرح جو کیچڑ میں پڑا ہوا نگاہوں سے چھپ گیا ہو۔ زمانے نے اسے ایک اندھے تاریک کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ جہاں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صدیوں سے پڑی ہوئی اسی تاریکی و غلاظت کا ایک جزو بنتی جا رہی ہے۔ لیکن اس ظلمت میں اس کی آنکھوں کا نور بالکل ہی زائل نہیں ہوگیا تھا۔ دُور ستاروں کی کمزور تھراتی ہوئی روشنی اس کی آنکھوں میں سما جاتی اور اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کے مانند تیز ہوا کے جھونکوں میں لرزنے لگتا۔ کبھی کبھی وہ محسوس کرتی کہ وہ اپنی زندگی کی پوری قوت سے، اپنی تمام بیقراری کے ساتھ ان ستاروں کی جانب، انھیں اپنی آغوش میں لے لینے۔ انھیں کھینچ لینے کے لئے افلاک کی بلند و بالا لامتناہی فضا میں پرواز کر رہی ہے۔ اور پھر راہ میں کوئی سخت چٹان حائل ہوگئی۔ اور وہ اس سے ٹکرا کر پھر اسی اندھے کنوئیں میں آگری۔ شکستہ، مجبور، مظلوم ——— رینگنے کی بھی سکت نہیں ——— وہ ان یاسگدازانہ تاثرات سے گھبرا کر رونے لگتی۔

زہرہ کے خاموش ہوتے ہی کمرہ میں سکوت طاری ہوگیا۔ وہ خالد کے پاس تخت پر اپنے احساسات و خیالات میں گم سم بیٹھی رہی۔ اُس کے دونوں ہاتھ آپس میں بل کھاتے ہوئے زانو پر دھرے تھے اور اُس کی نگاہیں خلا میں تیر رہی تھیں۔

لالٹین اسی طرح دروازے سے لگی ہوئی جل رہی تھی۔ جعفر مست و غافل سو رہا تھا۔ کمرے میں عجب طرح کا سکوت طاری تھا۔ جعفر کے تنفس کی سرسراہٹ سے کمرے میں زندگی کا احساس ہوتا تھا ورنہ کمرے کی تمام چیزوں پر جمود سا چھا گیا تھا۔ لالٹین، پلنگ، تخت میز، بوتلیں، حتیٰ کہ جعفر، زہرہ اور خالد بھی بے جان بُت ہو کر رہ گئے تھے۔

خالد نے شغلاً جعفر کے سرہانے پڑے ہوئے رسالہ کو اٹھا لیا اور اُسے اُلٹنے پلٹنے لگا۔ اس کی نقل و حرکت نے اس خاموشی میں ہلکی سی جان ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ رسالہ کے اوراق کو اُلٹتے ہوئے زہرہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کیا سوچ رہی ہیں آپ؟" زہرہ جیسے اپنے خواب سے چونک گئی۔ ایک مضمحل سا تبسم اس کے ہونٹوں پہ آگیا۔ پتلیاں اسی طرح تھمی تھمی اور نظروں میں وہی سکوت تھا۔ وہ اسی طرح سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کچھ نہیں۔"

آہستہ سے اُس کے دونوں ہاتھ کھل گئے۔ اور ایک لمحہ کے بعد خالد کی طرف گردن پھرا کر بولی۔ "خالد صاحب! آپ بھی کہتے ہیں میں کیسی عورت ہوں۔ کبھی ہنستے ہنستے رونے لگتی ہوں اور کبھی روتے روتے ہنسنے لگتی ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر وہی سوگوار تبسم تھا۔ آنکھیں انتہائی احساس غم سے بند سی ہو رہی تھیں۔ اور آنسوؤں کی ایک باریک سی تہہ نے پتلیوں کو دھندلا کر دیا تھا۔

"خالد صاحب!" اُس نے کہا۔ "میں بھی انسان ہوں۔ گوشت پوست کی بنی ہوئی۔ میرے پاس بھی دل ہے، دماغ ہے۔ احساسات ہیں، آرزوئیں ہیں، تمنائیں ہیں، میرے ساتھ بھی غم ہیں، خوشیاں

ہیں۔ اور کیا بتاؤں کیا کیا؟ یہ میری بھی ایک تخیلی دنیا ہے، جہاں میں رہنا چاہتی ہوں، جہاں میری طبیعت کو، میری روح کو، میرے دل کو آرام مل سکتا ہے۔ لیکن ——— لیکن ———" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور دو بڑے بڑے قطرے پلکوں پر تھرتھرانے لگے۔ خالد زہرہ کے ان آنسوؤں کو جن میں غم و الم کی بیتاب، اُبلتی ہوئی، اور گہری داستان پوشیدہ تھی اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے رسالہ کو اپنے زانوؤں پر رکھے ہوئے اس کی صورت دیکھتا رہا۔

"لیکن ——— لیکن ———" زہرہ نے پھر کہا۔ "یہ تخیلی دنیا مجھے کہیں نہیں ملتی۔ میری آرزوئیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ میری تمناؤں کا خون ہوتا ہے۔ خون کیا ہوتا ہے ہو چکا ——— میں جل چکی، تباہ ہو چکی، برباد ہو چکی، لُٹ چکی، اور اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ دیکھئے ———" اس نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ وہ شدت جذبات سے تپ رہی تھی۔ وہ خود کو بھی بھولی جا رہی تھی۔ ایک گہرے اُبلتے ہوئے غم کے دھارے میں اس کا کمزور جسم بہا جا رہا تھا۔ "یہ دیکھئے، میرے پاس کچھ بھی نہیں ——— میرے جسم و جان، میری زندگی میں کچھ بھی نہیں۔ میں مُردہ ہو چکی ہوں ——— مُردہ ——— زندگی ہی میں سڑی گلی مٹی کا ڈھیر ہو چکی ہوں۔"

پھر وہ خاموش ہو گئی اور تھوڑی دیر یونہی بیٹھی رہی ——— "میں کبھی کبھی گھبرا کر اپنی اس تخیلی دنیا میں پناہ لیتی ہوں۔ لیکن اب وہاں بھی سکون نہیں ملتا۔ غم کا ہجوم ہوتا ہے۔ میرے دل کے گوشے گوشے سے غم کے دھارے پھوٹ نکلتے ہیں اور پھر میں اس سے چھٹکارا پانے کے لئے اس غم کی کیفیت کو دور کر لیتی ہوں ——— شراب پی لیتی ہوں۔ اور اس کا نشہ ... تمام رنج و محن کو دور کر دیتا ہے ... ——— جاتے ہیں، اگر یہ شراب نہ ہوتی" وہ ... کی طرف دیکھ کر بولی۔ "تو میں زندہ نہ رہ سکتی۔ میں خودکشی کر لیتی۔ اب تک میں اسی کے سہارے زندہ ہوں" پھر اس نے بڑھ کر شراب کی بوتل اور گلاس کو اٹھا لیا اور کہنے لگی ——— "میری طبیعت چاہتی ہے کہ میں شراب پیوں۔"

خالد اسی طرح گم سم زہرہ کی باتیں سُنے جا رہا تھا۔ اسے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی زبردست سانحہ ہوا ہے، جس نے اسے غمزدہ بنا دیا ہے۔ اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن شراب تندرستی کو تباہ کر دیتی ہے۔ کل جو میں نے شراب پی تھی تو ———"

"ہاں ہاں یہی ہوتا ہے" وہ فوراً بولی۔ "لیکن میں اس زندگی کو لیکر کیا کروں گی۔ مجھے اس کی خواہش نہیں۔"

زہرہ کی مایوسانہ باتوں سے خالد کے تمام ہمدردانہ جذبات سمٹ کر ایک مرکز پر آ گئے۔ وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر خاموش پانی میں ستاروں کے جامد و ساکت عکس کی طرح گم کر رہ گئیں۔ وہ ضبط نہ کر سکا۔ اور پوچھ بیٹھا۔ "اگر تمھیں عذر نہ ہو تو میں پوچھوں، تمھیں کس بات کا رنج ہے شاید میں ......"

"نہیں نہیں، خالد صاحب! شکریہ، یہی میرے لئے بہت ہے" یہ کہہ کر اس نے گلاس میں شراب انڈیلی اور مُنہ سے لگاتے ہوئے بولی "آج صبح ہی سے میری طبیعت بہت سُست تھی۔ اداس تھی۔ میں اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی ———" اس نے ایک گھونٹ لیا پھر کہنے لگی۔ "میں بالکل تنہا ہوں خالد صاحب! کبھی کبھی میری طبیعت بہت گھبراتی ہے۔ اس دن میں اپنی دکان نہیں لگاتی۔ چھٹی مناتی ہوں۔ میری طبیعت کسی ایسے شخص سے بات کرنے کو چاہتی ہے جو مجھ سے اچھی اچھی باتیں کرے۔ جو مجھ سے طوائف سمجھ کر نہیں، بلکہ عورت سمجھ کر خوش گپیاں کرے، اور میں اس سے ایک طوائف کی طرح نہیں، ایک عورت کی طرح ملوں، ہنسوں، باتیں کروں، لیکن میرے یہاں آنے والے ایسے بہت کم لوگ ہیں۔ وہ تو سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے آتے ہیں۔ اور میری طبیعت کو اور بھی مکدر کر دیتے ہیں۔ میں چپ رہتی ہوں۔ کچھ کہہ نہیں سکتی کیونکہ اس طرح تو میری دکان نہیں چل سکتی نا؟ ———" اس نے ایک اور گھونٹ لیا اور ہونٹوں کو دبا کر بولی ——— "لیکن جعفر مجھے اپنے تمام ملاقاتیوں میں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ وہ جب آ جاتے ہیں تو میں بہت خوش ہوتی ہوں وہ مجھ سے اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں، کیونکہ مجھے اس چیز سے رنج ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ باتیں صرف باتیں کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ میری خاطر نہیں۔ میری دلدہی کے لئے نہیں ———" زہرہ تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گئی۔ اور اس نے ایک گھونٹ شراب کا لیا۔ خالد ڈوبی ہوئی آواز میں بولا ———

"ہاں زہرہ! دنیا میں کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اپنی زندگی شدید روحانی اور جسمانی عذاب میں گزار رہے ہیں۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ ان غریبوں پر کیا کیا مظالم ہو رہے ہیں۔ اور اگر جانتے بھی ہیں تو بے پروائی سے ٹال جاتے ہیں ——— یا تھوڑی سی لفظی ہمدردی

کر دیتے ہیں اور بس!"

"ہاں ٹھیک ہے" وہ پھر بولی۔ "کون کسی کا ہوتا ہے"

"اور میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں" خالد نے کہا۔ "کہ کسی سے لاکھ کہیئے، لاکھ سمجھایئے۔ لیکن پریشانیوں میں کمی نہیں ہوتی [illegible] بات تو یہ ہے کہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی کچھ نہیں [illegible] کو کچھ آپ ہی سمجھتے ہیں۔ اور کہہ بھی لیجئے تو کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دل میں اپنی اپنی زندگی ہوتی ہے اور اپنا اپنا غم ۔۔۔ [illegible] اس وقت تک رہے گا ۔۔۔ [illegible] زندگی کا بوجھ [illegible] سے نہ اتر جائے ۔۔۔"

خالد کی ہمدردانہ باتوں نے اس کے دل [illegible] کا کام [illegible] ہی سہی لیکن تھے تو اسی کے [illegible] وہ ہاتھوں میں گلاس لئے [illegible] پھر [illegible] آہستہ سے [illegible] بولی۔ [illegible] ان باتوں کو۔ آپ کی طبیعت [illegible] باتوں [illegible] ہوگی۔ اور یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ غم اور خوشی [illegible] ہیں۔ یہاں تک اس کی پرواہ کی جائے۔"

"نہیں نہیں!" خالد بولا۔ "میری طبیعت [illegible] میں اتنی بھی آپ کی خدمت نہیں کر سکتا!"

"شکریہ!" [illegible] صاحب!" وہ بولی [illegible] آپ [illegible] ہیں۔ واقعی آپ بہت شریف ہیں [illegible] گلاس کی بقیہ شراب بھی ختم کر لی۔ اور گلاس کو میز پر رکھتے ہوئے بولی ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار دے یا اسے رو کر گزار دے

پھر وہ ہنس دی۔ اسی طرح جیسے کہ وہ پہلے ہنس رہی تھی۔

[illegible] رات کافی گزر چکی تھی اور فضا میں خاموشی پھیل گئی تھی۔ زہرہ نے جو تھوڑی سی شراب پی لی تو اسے [illegible] آنے لگی۔ اور وہ [illegible] سے تخت ہی پر اپنی بانہوں کے سہارے لیٹ گئی۔ اور [illegible] لیٹے لیٹے سو گئی۔ پھر کمرے میں سکوت پھیل گیا۔ جعفر کے تنفس [illegible] سرسراہٹ اور مچھروں کے بھنبھانے کی آواز صاف سنائی دینے [illegible] لالٹین دروازے سے لٹکی ہوئی اسی طرح جل رہی تھی اور اس [illegible] پیلی پیلی دھندلی روشنی سے کمرے کی خاموشی میں غم برسنے لگا تھا۔ زہرہ اس [illegible] تخت پر سو رہی تھی اور جعفر دوسری دیوار کے پاس پلنگ پر غافل پڑا ہوا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ زہرہ ایک بیمار بچے کی طرح روتے روتے سو گئی ہے۔ اور وہ اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تیمارداری کر رہا ہے۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا اور خیالات [illegible] کے دماغ میں چکر لگاتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں نیند بالکل نہ تھی اور [illegible] کو اس [illegible] چاہتا تھا۔ واقعات کی نوعیت کی بنا پر وہ سوچنے لگا۔ [illegible] عجیب [illegible] دنیا ہے۔ پھر یہاں کی ہر چیز عجیب ہی معلوم ہوتی [illegible] اور اس [illegible] سے خواب کا گمان ہونے لگتا۔ پھر خالد [illegible] تعجب مٹ جاتا اور ہر چیز اپنے حقیقی رنگ میں آنکھوں کے سامنے [illegible] ۔۔۔

[illegible] اسے تکلیف ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنی [illegible] اور تخت پر دیوار سے [illegible] بیٹھ [illegible] زہرہ کا چہرہ [illegible] سامنے تھا۔ لالٹین کی زرد روشنی اس کے چہرے پر [illegible] تھی۔ [illegible] آنکھیں [illegible] کی طرح [illegible] ہونٹ بند تھے اور بالوں کی ایک لٹ [illegible] پیشانی پر آ گئی تھی۔ اس کی سیاہ لمبی چوٹی شانے اور گردن کے درمیان [illegible] ہوئی سامنے آ پڑی تھی۔ سب کچھ وہی تھا جو اس کے [illegible] میں کئی بار آ چکا تھا۔ ہاں وہ ہنسی نہ تھی۔ وہ تبسم نہ تھا۔ زہرہ [illegible] اور آنکھیں بند تھیں ۔۔۔ [illegible] تصویر [illegible] سامنے [illegible] اس طرح [illegible] کھینچکر [illegible] اور حسن کے [illegible] زیادہ [illegible] تھی۔ اسے خواہش ہوئی کہ وہ اسے دیر تک دیکھتا رہے [illegible] اسے نہیں دیکھا [illegible] تھیں جن کے ملتے ہی اس کے دل میں [illegible] سا پیدا ہوتا اور نگاہیں جھک جاتیں۔ زہرہ سو رہی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی نگاہیں زہرہ کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ زہرہ کے لئے دل میں ایک کشش محسوس کرنے [illegible] ۔۔۔ لطیف نازک ۔۔۔ اور سرور [illegible]!

کمرے میں مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ زہرہ کبھی کبھی بے خیالی میں اپنا ہاتھ جھٹک دیتی تھی۔ اس نے سرہانے سے اپنا ہاتھ نکال لیا تھا۔ جس سے سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ خالد نے دور [illegible] سو جانے والے [illegible] سرہانے ایک [illegible] کا تکیہ لگا دیا [illegible] اٹھا کر جس وقت وہ [illegible] سرہانے رکھ رہا تھا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ ریشم کی طرح نرم و نازک بالوں سے مس ہو رہے

ہیں۔ اس کا سر اس کے بالوں میں ایک خوبصورت کھلونے کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور وہ خود اسے ایک بچے کی طرح اسے معصوم طفلانہ پیار سے اپنے سینہ سے لگا لینا چاہتا ہے۔ بالوں کی بھینی بھینی خوشبو اس کے دماغ میں سرایت کر رہی تھی جس سے اُسے نیند آنے لگی تھی۔

اس نے اس کا سر آہستہ سے رکھ دیا اور رسالہ سے پنکھا کرنے لگا ہوا کے چھوٹے چھوٹے جھونکوں سے اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی لٹ لوٹنے لگی۔ اور کسی ٹھنڈے خوشگوار احساس نے اسے ہوشیار کر دیا۔ کوئی اسے پنکھا جھل رہا تھا اور سر کے نیچے کسی نرم چیز کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے نیم وا آنکھوں سے دیکھا صرف ایک لمحے کے لئے۔ دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ ساکت و خاموش اور ایک ہاتھ ہوا میں ہل رہا تھا۔

اس نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسے خیال ہوا کہ رات بہت زیادہ گزر گئی ہے اور خالد ابھی تک نہیں سویا ہے۔ اسے چاہئے کہ اصرار کر کے اسے سلا دے۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ یوں ہی خاموش پڑی رہی اور ان نظروں کو اپنے چہرے پر اور ہوا کی ہلکی ہلکی موجوں کو اپنے چہرے، بالوں، کپڑوں اور ہاتھوں پر محسوس کرتی رہی۔ وہ پھر نہ سو سکی۔ اسے لمحہ بہ لمحہ اپنے پاس ——— خود سے بہت قریب ——— اپنی تنہا سُونی دنیا میں ایک اور موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس پر سایہ کئے ہوئے ہے؟ کوئی مضبوط ہاتھ اس کی حفاظت کر رہا ہے۔ اور ہوا کی ہلکی ہلکی موجوں میں اپنے خلوص و محبت کو اس کے تمام جسم پر بکھیر رہا ہے۔ وہ بڑے بڑے خوشگوار اور لطیف احساسات کے مزے لیتی رہی۔ اس کی طبیعت چاہی کہ وہ اسی طرح آنکھیں بند کئے رہے اور ہوا اس کے جسم سے مس ہوتی رہے۔ اور یہ سہانے لطیف احساسات ——— یونہی قائم رہیں۔

یکایک اس کے دل میں مایوسی پیدا ہو گئی اور سہانے لطیف احساسات کی دنیا منتشر ہو گئی۔ جیسے وہ فضا میں اڑتی اڑتی زمین پر آ گری ہو ——— اسی اندھے اور تاریک کنوئیں میں ——— اس کی دنیا میں ایک دھند سا پھیل گیا ——— موجوں پر سکوت چھا گیا۔ اور خاموش ساحل پر جادو ساکت شام کی تاریکی مسلط ہو گئی۔

فکرِ لطیف

میں ہوں ہر آسان ہر مشکل سے دُور
تُو نے مجھ کو کر دیا کیا کیا دِل سے دُور

داغِ غم کب تک رہے گا دل سے دُور
تیرگی ہو گی مہِ کامل سے دُور

مجھ سے غافل ہو نہ میرے ناخدا
میری کشتی ہے ابھی ساحل سے دُور

کارواں منزل پہ جا پہنچا مگر
میں بھٹکتا رہ گیا منزل سے دُور

دیکھئے کب تک رہے گی بارِ دوش
میری گردن خنجرِ قاتل سے دُور

میں ترے در تک پہنچ ہی جاؤں گا!
کوئی در ہوتا نہیں سائل سے دُور

جب قریبِ شمع پہنچا بزم میں
ہو گیا پروانہ ہر مشکل سے دُور

کچھ نہ تھی تعمیرِ دل تخریب پاس
میری ہر کوشش رہی حاصل سے دُور

کیا تری ترکیبِ نوائے زندگی
رہ سکے گی میری آب و گِل سے دُور

حلقۂ ہر موج تھا نقشِ خیال
ناؤ جب کھنچنے لگی ساحل سے دُور

ڈھونڈنے والوں کو مل ہی جائے گا
جادۂ نَو جادۂ مشکل سے دُور

خلد میں پہنچوں اگر پہنچوں وہاں
آج تک انور ہوں جس محفل سے دُور

لطیف انور

بادۂ حافظ

از :-
حافظ غازی پوری

خرد کو مے سے جو قابو میں لا نہیں سکتے
کتاب اُٹھائیں وہ ساغر اُٹھا نہیں سکتے

شکوکِ ذہنِ رسا کو مٹا نہیں سکتے
نکل کے پردۂ دل سے جو آ نہیں سکتے

ہمیں اجازتِ شکرِ چمن نصیب کہاں
فریبِ برق پہ بھی مسکرا نہیں سکتے

یہ پردہ داریٔ حسن و ادا ارے توبہ
مری نگاہ کے آگے وہ آ نہیں سکتے

تڑپ ہے جس کی ازل سے پتنگ کے دل میں
وہ شمعِ بزم کے جلووں میں پا نہیں سکتے

یقین ہے مری فطرت، یہ جلوہ ہائے طرب
توہمات کا منظر دکھا نہیں سکتے

رہیں گی حسن کی رنگینیاں نگاہوں میں
انھیں وہ لالہ و گل میں چھپا نہیں سکتے

وہ ڈال سکتے ہیں گلشن کی روز طرحِ دگر
مگر کلی مرے دل کی کھلا نہیں سکتے

چھپائیں خود کو وہ میری نگاہ سے لیکن
مری نظر سے مجھے تو چھپا نہیں سکتے

طوافِ "آتشِ بیگانہ" اُن کی فطرت ہے
خودی کی آگ جو دل میں جلا نہیں سکتے

قدم قدم پہ ہے آشوب و فتنۂ ہستی
جو ہم بچائیں تو دامن بچا نہیں سکتے

سرود و نغمہ و آہ و فغاں بجا، لیکن
ہم اپنے دل کا فسانہ سنا نہیں سکتے

وجود، ایک تبسم، شہود، صد جلوہ
شعاعِ برق و نظر کو مٹا نہیں سکتے

نہیں ہوں خلد کے قابل یہ کیا کہا زاہد
وہ سر چڑھا کے نظر سے گرا نہیں سکتے

معاملہ غمِ دیرینہ سے ہے قسمت کو
بنانے آئے ہیں بگڑی بنا نہیں سکتے

فریبِ جلوۂ گل و لالہ دیں تو دیں لیکن
مری نگاہ کو رنگیں بنا نہیں سکتے

چمن چمن ہے سبو، پھول پھول ہے ساغر
یہ کیا کہا کہ وہ پی کر پلا نہیں سکتے

مٹانے آئے ہیں وہ "تلخیٔ حیات" مری
جو دردمند کو دم بھر ہنسا نہیں سکتے

یہ پاسداریٔ رازِ وفا ہے اے حافظ
کہ دل کی بات زباں تک بھی لا نہیں سکتے

منصور حلاجؒ

از:۔
غلام دستگیر نامی

حضرت داتا گنج بخشؒ کی نظر میں!

مولانا سید محمد احمد خطیب مسجد وزیر خاں لاہور حضرت علی بن عثمان جلابی غزنوی المشہور داتا گنج بخش لاہوری کی کتاب کشف المحجوب مطبوعہ بہ طبع سلیا نوف سمرقندی کا فارسی سے اردو ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس میں شیخ حسین حلاجؒ کا حال پڑھ کر مجھے سالنامہ نمبر عالمگیر ۱۹۴۳ء میں شائع شدہ حضرت نامیؔ کا مضمون یاد آ گیا۔ اسے پڑھا اور حضرت داتا صاحبؒ کے فرمان سے مقابلہ کیا تو ثابت ہوا کہ حضرت داتا صاحبؒ کا مضمون افراط و تفریط سے پاک اور حلاجؒ کے متعلق قول فیصل ہے۔ لہذا یہ قارئین کے مطالعہ میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ حقیقت شیخ حسین واضح ہو جائے۔

حضرت علی بن عثمان رضوانی سنہ ۴۶۵ھ تحریر فرماتے ہیں ابو المغیث حسین بن منصور حلاجؒ مستغرق معنی اور مبتلائے وجد تھے۔ آپ مشتاق و مست طریقت تھے۔ آپ کی حالت مضبوط اور ہمت عالی تھی۔ آپ کے متعلق مشائخ کی رائیں مختلف ہیں۔

حلاجؒ کے متعلق مختلف رائیں

ایک گروہ کے نزدیک آپ مردود امت ہیں۔ مثلاً عمرو بن عثمان المکی۔ ابو یعقوب نہرجوری۔ ابو یعقوب اقطع اور علی بن سہل اصفہانی کے نزدیک۔

جو گروہ آپ کو مقبول امت مانتا ہے۔ اس میں ابن عطا محمد بن خفیف، اور ابو القاسم نصر آبادی رضی اللہ عنہم شامل ہیں اور تمام متاخرین نے اسے قبول کیا ہے۔

ایک گروہ نے شیخ حسینؒ کے بارے میں توقف کیا ہے مثلاً جنیدؒ شبلیؒ جریریؒ اور حصریؒ وغیرہ نے۔

ایک اور گروہ نے حلاج کی طرف سحر کے اسباب کو منسوب کیا ہے۔

مگر ہمارے زمانے میں شیخ المشائخ ابو سعید ابو الخیر، شیخ ابو القاسم گرگانی اور شیخ ابو العباس رضی اللہ عنہم نے شیخ حسینؒ کو صاحب بہتر و بزرگ مانا ہے۔ لیکن استاد ابو القاسم قشیری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر حسینؒ ارباب معانی و حقیقت میں سے تھے تو لوگوں کی بدگوئی سے وہ برے نہیں ہو سکتے اور اگر مہجور طریقت اور مردود حق تھے تو خلقت کے قبول کرنے سے وہ مقبول نہیں بن سکتے۔ لہذا ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑتے ہیں۔ ہاں ہم نے جس قدر ان میں نشان حق پایا ہے اسی قدر ان کو بزرگ مانتے ہیں مگر تمام مشائخ میں سے بجز چند کے ان کی مقبولیت کا کوئی بھی منکر نہیں بلکہ ان کے کمال فضل، صفائی حال اور کثرت اجتہاد و ریاضت کے قائل ہیں۔ ان کے حالات کا اس کتاب میں ذکر نہ کرنا بددیانتی تھی۔ کیونکہ بعض ظاہر بین لوگ ان کی تکفیر کرتے ہیں اور ان کی شان کے منکر ہیں۔ اور انہیں فریبی، حیلہ باز اور جادوگر بتاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حسین بن منصور حلاجؒ حسین بن منصور صالح ہے۔ حالانکہ مؤخر الذکر محمد بن زکریا کا استاد ملحد بغدادی تھا اور ابو سعید قرمطی کا رفیق۔ مگر وہ حسین جس کے بارے میں اختلاف ہے فارسی بیضاوی ہے

مشائخ کے طعن کی وجہ

حسین بیضاوی کے دین و مذہب کے بارے میں مشائخ کا رد و ہجر اس وجہ سے ہے کہ آپ (حسینؒ) پہلے تستر میں سہل بن عبداللہ کے مرید ہوئے، وہ بے اجازت چل دیئے۔ پھر عمرو بن عثمان کے پاس پہنچے اور ان کے پاس سے بھی بغیر اذن کے نکل گئے اور حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے منہ نہ لگایا۔ اس لئے انہیں سب نے مہجور کر دیا پس وہ مہجور معاملت ہوئے نہ کہ مہجور اصل۔

تم نہیں دیکھتے کہ حضرت شبلیؒ نے کیا فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں انا و حلاج فی شیء واحد فخلصنی جنونی و اھلکہ عقلہ۔ میں اور حلاج ایک ہی طریق پر ہیں۔ مجھے میرے جنون نے خلاصی دلا دی اور اُسے اس کی عقل نے ہلاک کر دیا۔ اگر حلاج بے دین ہوتے تو شبلیؒ کبھی نہ فرماتے کہ میں اور حلاج ایک ہی طریق پر ہیں۔ اور محمد بن حنیفؒ نے فرمایا ہے ھو عالم ربانی۔ آپ عالم ربانی ہیں اور اسی طرح اور بھی ... آپ کو طریقت میں ہجران و وحشت لاحق ہوئی وہ مشائخ کی خوشنودی اور حقوق کی آزردگی کا نتیجہ تھی۔

حسین منصورؒ کی تصانیف

آپ کی تصانیف اظہر ... اور اصول و فروع میں آپ بڑے ... کلام و موزوں کے مالک ہیں۔ شیخ علی بن عثمان جلابیؒ نے ... اور اس کے نواح میں آپ کی پچاس تصانیف ملاحظہ کی ... کچھ ہندوستان میں، کچھ فارس میں اور کچھ خراسان میں ہیں ... سب میں ایسی باتیں ہیں جو مرید ابتدائے سلوک میں کہا کرتے ہیں۔ بعض بہت اچھے تھے، بعض بہت کمزور ... بہت مشکل۔ بات یہ ہے کہ جب کسی پر تجلی حق ہوتی ہے تو اس سے قوت استعداد ... نقل سے ایسی ... ہوتی ہیں جن پر سے خود تعجب ہوتا ہے۔ اس وقت ... تعجب ہی نہیں کرتا بلکہ اس کا وہم اس کے سننے سے منقطع ہو جاتا ہے اور عقل اس کے سمجھنے سے رہ جاتی ہے ... پکار اٹھتے ہیں کہ کلام بڑا بلند ہے۔ ایک گروہ اپنی جہالت کی وجہ سے منکر اور دوسرا متحیر ہو جاتا ہے۔ اقرار بھی ... پر مبنی اور انکار بھی۔ مگر جب محقق اور صاحب بصیرت ... تو وہ ان کے بیان میں محو ہوتے ہیں اور نہ ... میں ... وہ تعریف و مذمت سے الگ ہو کر ... تکلیف سے بری رہتے ہیں۔

الزام سحر کی تردید

... حسینؒ پر جادوگری کا الزام ناقابل تسلیم ہے ... سنت والجماعت کے اصول کے ... ہے ... یہ ہے کہ کمال دل میں ... سحر ... کرامت کا اظہار ... حال ہی معرفت ... کے قہر و غضب کا نتیجہ ہے اور کرامت رضائے الٰہی کا ثمرہ۔ اور میں اس بحث کو اثبات کرامت کے باب میں مفصل بیان کروں گا۔ اور اہل سنت میں جو اہل بصیرت ہیں ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مسلمان خواہ سحر اور ساحر اور کافر مکرم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سحر اور کرامت ایک دوسرے کی ضد ہیں اور جمع ضدین محال ہے۔ اور حسینؒ عمر بھر لباس صلاحیت سے آراستہ رہے۔ وہ نماز کے پابند تھے۔ ان کا تمام وقت ذکر میں ... رہا۔ انہوں نے متواتر روزے رکھے اور شغل حمد و ثنا میں عمر بسر کر دی اور باب توحید میں نہایت لطیف نکتے بیان فرمائے۔ اگر وہ جادوگر ہوتے تو صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور ذکر و اذکار میں سرگرمی محال تھی۔ پس ثابت ہو گیا کہ وہ صاحب کرامت تھے اور کرامت ولی کے سوا اور کسی سے ظاہر نہیں ہو سکتی۔

شیخ حسینؒ کے کلام پر بحث

بعض اہل تصوف حسینؒ کا اس وجہ سے ... کہتے ہیں کہ ان کے بعض کلمات میں امتزاج اور اتحاد کے مذہب کا مفہوم نکلتا ہے۔ یہ اعتراض عبارت پر ہے نہ کہ معنے پر۔ صوفی غلبہ حال میں بعض اوقات ایسا مغلوب ہو جاتا ہے کہ عبارت صحیح ادا نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی عبارت کے معنے ایسے مشکل ہوں کہ سننے والے کا وہم ان تک نہ پہنچ سکے اور وہ صحت زبان کہنے والے کا منکر ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ انکار سامع کے قصور فہم پر مبنی ہوگا نہ کہ عبارت کے غلط ہونے پر۔ میں نے بغداد اور اس کے نواح میں ملحدین کا ایک گروہ دیکھا جو حسینؒ کی محبت کا دم بھرتا، ان کے کلام کو اپنے الحاد و زندقہ کی تائید میں بطور دلیل پیش کرتا اور حلاجی کہلاتا تھا اور حسینؒ کے معاملے میں اسی طرح غلو کرتا تھا جیسے رافضی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں کرتے ہیں۔ میں اس گروہ کے کلمات کا ایک علیحدہ باب میں رد کروں گا۔ انشاء اللہ عزوجل۔

مگر یہ خیال رہے کہ حسینؒ کا کلام لائق اقتدا نہیں۔ کیونکہ وہ ... مغلوب تھے متمکن نہ تھے اور ... رحمہ اللہ تعالیٰ حسینؒ کو اپنے ... طرح ... مستقیم الحال نہیں ... ان کے احوال

میں بڑے نقصے ہیں۔ میری ابتدا سے نوردیں معاملات کو دیکھنے اور پرکھنے کی طاقت قوی تر رہی ہے۔ میں نے ایک کتاب حسینؒ کے کلام کی شرح میں لکھی ہے اور اس میں دلائل و براہین سے ان کے کلام کی بلندی اور صحت حال کو ثابت کیا ہے۔ علاوہ ازیں میں نے ایک اور کتاب منہاج نام میں حسینؒ کا ابتدا سے انتہا تک حال بیان کر دیا ہے اور یہاں بھی کچھ لکھ دیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طریقے کی اصلیت کو اعتراض رفع کر کے ثابت کرنا پڑے اُس سے تعلق رکھنا اور پیروی کرنا ٹھیک نہیں۔ مگر خواہش نفسانی اور راستی میں شدید موافقت نہیں۔ بندگان ہوا وہوس ہمیشہ ایسی باتوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن سے کجی اور نفرت پیدا ہو ان سے بچنا چاہئے)

شیخ حسینؒ کا ایک کلمہ ہے۔ الالسنۃ مُسْتَنْطِقَات نُطْقُهَا مُسْتَهْلِكَات (زبانیں طالب گویائی ہیں اُن کی گویائی ہلاک ہونے والی) یعنی زبا نہائے گویا ہلاک ولہے خاموش است (بولنے والی زبانوں کی گویائی طالب ہلاکت ہے) یہ عبارت سراپا آفت ہے۔ اور معنی حقیقت معلوم نہ ہوں تو عبارت بیہودہ دکھائی دیتی ہے۔ جب معنی حاصل ہوں تو عبارت سے مقصود نہیں ہوتے۔ اور اگر معنی ہی گم ہوں تو عبارت انہیں موجود نہیں کر سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گمراہ پیدا ہو کر طالب کو ہلاک کر دیتا ہے۔ ہاں اگر عبارت پڑھ کر صحیح معنے سمجھ لئے جائیں تو اور بات ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت داتا صاحبؒ عالم اجل اور ولی کامل تھے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری اور شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہم جیسے بزرگوں نے اُن کے مزار پر چلہ کشی کرنا باعث سعادت جانا ہے۔ انہیں فوت ہوئے تقریباً نو سو سال ہو چکے ہیں، وہاں کا روحانی فیض اب تک جاری ہے لوگ عقیدت سے کھچے آتے ہیں۔ انہوں نے شیخ حسین علاج بن منصور کے متعلق جو کچھ بیان کر دیا ہے۔ اس پر کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ میں نے جو حضرت داتا صاحبؒ کے بیان سے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ حسینؒ مغلوب الحال بزرگ تھے اور غلبۂ حال کی وجہ سے کسی بزرگ کی خدمت میں جم کر نہیں رہے۔ اسی غلبۂ حال نے اُن سے ایسی باتیں کہلائیں جو عوام کے فہم سے بالاتر اور موجب فتنہ تھیں اور لائق اظہار نہیں۔ حلاجی فرقے نے انہیں اپنے زندقہ و الحاد کا آلۂ کار بنا لیا اور وہ غلبۂ حال سے مغلوب ہو کر انا الحق پکار اُٹھے اور علما کے فتوے سے مقتول یا مصلوب ہوئے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

چو قلم در دست غدارے بود ۔۔۔ ہمچو منصورے بردارے بود

یعنی جب قلم غدار کے ہاتھ میں ہو تو منصور جیسے شخص کو سولی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

ایک اور شخص انا الحق کے دعوے کے اثبات میں ایک نادر توجیہہ بیان کرتے ہیں ؎

روا باشد انا الحق از درختے ۔۔۔ چرا نبود روا از نیک بختے

یعنی جب کوہ طور پر ایک درخت سے انا ربک کی آواز بلند ہو جاتی ہے تو ایک نیک بخت شخص کے منہ سے نکلی ہوئی آواز کیوں قابل گرفت ہوئی۔

پیر مراد شاہ مراد العاشقین میں فرماتے ہیں ؎

بجز شرع رسول پاک و اطہر ۔۔۔ طریقت ما طریقے نیست دیگر
مئے ناب شریعت تلخ و تیز است ۔۔۔ مصفا و بسے خوش نشہ خیز است
ازیں مے مست شد شبلی و عطار ۔۔۔ جنید و بایزید و پیر انصار
تنک ظرفی ازیں مے کرد منصور ۔۔۔ ز مستی در جہاں افگند صد شور

یعنی طریقت پیروی شریعت سے ملتی ہے۔ بزرگان دین مئے شریعت ہی سے مست تھے منصور نے چھچھورے پن سے کام لیا اور دنیا میں ایک شور ڈال دیا۔ پھر فرماتے ہیں۔ اے قادری اگر تو بھی منصور کی طرح مست ہو کر کام کرے گا تو شرعی سزا سے نہیں بچ سکتا پس سکوت و ضبط ہی بہتر ہے۔ کیونکہ ؎

بگفتن گو ترا صد خوف جان است ۔۔۔ زبان تو بیک نقطہ زیاں است

بیباکانہ گفتگو موجب ہلاکت ہے۔ زبان ایک نقطے سے زیاں بن جاتی ہے۔ اکبر الہ آبادی فرماتے ہیں ؎

قصۂ منصور سن کر بول اُٹھی وہ شوخ مست
کیسا پاگل لوگ تھا باتوں کو کیوں پھانسی دیا

داتا صاحبؒ چونکہ کامل ولی اور متبع شریعت بزرگ تھے اس لئے اُنہوں نے حلاجؒ کی سزر پہنا تھا، افسوس نہیں کیا۔ بلکہ فرما دیا ہے کہ کلام وے اقتدا را نشاید۔ اور اندرا ستے فتنہ بسیار است پس علاج کے لئے اپنی حالت فتنہ ثابت [illegible]

کاش میں عورت نہ ہوتی

ہر مہینہ تکلیف اٹھاتی ہوں

وہ رو رہی تھی اور اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی کہ بہن اگر میں عورت نہ ہوتی تو اچھا تھا یا اگر ہوتی تھی تو پھر مجھ میں شرم کرنیکی عادت نہ ہوتی۔ آج سات سال ہوگئے۔ میری زندگی تمام ہوئی جاتی ہے اور تمہارے بھائی کو کچھ خبر نہیں، کہ میں ہی ہوں بس وہ یہ دریافت کرکے چپ ہو رہتے ہیں کہ "آپ زیادہ ترلیٹی کیوں رہتی ہیں"؟ پیاری بہن! تم ہی بتاؤ میں کس منہ سے کہوں کہ میں کیا بیمار ہوں۔ مجھے تو اپنی زبان سے کہتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے کہ میں ماہواری ایام کی بیماری میں مبتلا ہوں اور مجھے اس زمانہ میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ذرا تم کسی ذریعہ "ان" تک یہ بات پہنچا دو۔ شاید وہ میرا علاج کرادیں۔

سہیلی نے جواب دیا۔ پیاری بہن! اب ہمیں اپنے مردوں تک ایسی بات پہنچانے کی ضرورت ہی نہیں ہی ہیں نے بہت سے اخباروں میں پڑھا ہے کہ عورتوں کی [illegible] کی بہترین دوائیاں دہلی کے "زنانہ دواخانہ" میں ملتی ہیں۔ اور مجھے خود بھی تجربہ ہے کہ اس دواخانہ کی ہر دوا نہایت عجیب اثر رکھتی ہے بات یہ ہے کہ عورتوں کی بیماریوں کو عورتیں ہی بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس دواخانہ کی دوا "کورس" بہت عجیب چیز ہے۔ اگر کوئی عورت ماہواری ایام کی بیماری میں مبتلا ہو، ایام کم آتے ہوں یا ایام کی اور کوئی خرابی ہو بہرصورت یہ دوا اپنا اثر کرتی ہے اور خواہ کیسی ہی کمی زیادتی ہو اس دوا کے استعمال کرنے کے بعد عورت کو ہر مہینہ بالکل صحیح وقت پر اپنی مقررہ مقدار میں بغیر کسی درد اور تکلیف کے ایام ماہواری آنے لگتے ہیں۔ بڑی عجیب دوائی ہے میں جانتی ہوں کہ اس دوا کو سینکڑوں بہنوں نے استعمال کرکے اپنی صحت ٹھیک کرلی ہے اسی طرح تم بھی

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ نمبر ۲۴ بی دہلی کے پتہ پر خط لکھکر دوا "کورس" کی ایک شیشی منگاکر استعمال کرلو۔ تندرست ہو جاؤ گی۔ اور ہاں! دوا کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔ ایک شیشی "کورس" دو روپے آٹھ آنے کو ملتی ہے اور نو آنے محصول کے خرچ ہونگے

چنانچہ اس بیچاری نے کورس کی شیشی منگاکر استعمال کرلی۔ اب وہ بالکل تندرست ہے ہر ماہ اپنے مقررہ وقت پر وہ ایام سے فارغ ہو جاتی ہے بس جو عورتیں اس بیماری میں مبتلا ہیں وہ بھی اسکے استعمال سے تندرستی ٹھیک کرلیں۔ پھر ماہواری بغیر تکلیف کے آنے لگے گی۔

ٹیلیفون نمبر ۶۲۶

عورت کے سیلان الرحم کی تیر بہدف دوا

جب عورت سیلان الرحم کے مرض میں مبتلا ہوجاتی ہے تو اسکے خفیہ جسم سے ہر وقت یا کبھی کبھی سفید پانی (لیسدار سفید رطوبت خارج ہونے لگتی ہے یہ مرض عورت کی جوانی کیلئے زہر ہے اور اس کا فوراً علاج کرانا ضروری ہے۔ ورنہ رفتہ رفتہ عورت کی جوانی ختم ہوجاتی ہے وہ سفید پانی دراصل جوانی کا جوہر ہوتا ہے پس اگر کسی عورت کے خفیہ جسم سے سفید رطوبت وقت بیوقت خارج ہوتی ہو۔ اور وہ ہر وقت جسم میں ایک تکلیف اور بے چینی محسوس کرتی ہو تو اُسے چاہیے کہ سب کام چھوڑ کر اس کا فوراً علاج کرے۔ اسکی ترکیب یہ ہے کہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ اے۔ بی ۳۴۲ دہلی

کے پتہ پر خط لکھکر ایک شیشی دوا "روک" منگالے۔ اس دوا کے استعمال شروع کرنے کے تیسرے ہی دن اگر سفید رطوبت نکلنی بند نہ ہوجائے تو ہمارا ذمہ۔ پوری شیشی استعمال کرنے کے بعد عورت کا اندرونی جسم (رحم) بالکل تندرست ہوجاتا ہے سفید رطوبت کا اخراج بھی بند ہوجاتا ہے اور عورت اپنے اندر پھر جوانی اور جوانی کی اُمنگ محسوس کرتی ہے۔ آزمودہ مجرب دوا ہے اور ہزارہا عورتوں کو تندرست کرچکی ہے۔ ایک شیشی دوا "روک" کی قیمت تین روپے ہے۔

پارسل پر نو آنے محصول ڈاک خرچ ہوگا۔

ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۸

لیکوریا کی بہترین دوا ہے

ہندوستانی معلم

از:-
شفا ندوی

وارثِ قارون اے سرمایہ دار اے بے خرد
ہوش میں آ عظمتِ انسانیت سے نابلد

اے خرابِ بادۂ ثروت یہ تو نے کیا کہا
نوکروں میں ایک نوکر ہے معلم ہند کا

رفعتِ شانِ معارف تو نے پہچانی نہیں
تو یقیناً بہرہ مندِ لطفِ یزدانی نہیں

اہرمنِ اعمال اے فرعونِ وقت حال کے
آنکھ پر پردے پڑے ہیں تیرے جاہ و مال کے

میں بتاؤں تجھ کو سن اے دشمنِ ایمان و ہوش
میں ہوں تیرے خانۂ تاریک میں جلوہ فروش

تیرے بننے اور بگڑنے کا میں ذمہ دار ہوں
میں تری نسلوں کے قصرِ عمر کا معمار ہوں

پاؤں سے ساری بلائیں میں نے مل دیں قوم کی
میرے ان ہاتھوں نے تقدیریں بدل دیں قوم کی

میرے ہاتھوں سے اساسِ قوم سنگیں ہو گئی
میرے دم سے کائناتِ دہر رنگیں ہو گئی

میرے دم سے قومِ مردہ میں ہے روحِ انقلاب
ہے مرا مرہونِ منت ملک و ملت کا شباب

میرے ہی الفاظ میں ہے ملک و ملت کا بھرم
ہے وطن کا ذرہ ذرہ میرا مرہونِ کرم

قوم کی بدحالیوں سے برسرِ پیکار ہوں
میں ہی اس کاشانۂ تاریخ کا معمار ہوں

جب ہوئے عازم بھٹک کر وادیٔ پرخار کے
میں نے ملکوں کو دکھائے راستے گلزار کے

ہے مرے ہاتھوں میں تنظیمِ نشاطِ زندگی
میں اگر چاہوں الٹ ڈالوں بساطِ زندگی

معرفت کا بدھ نے خط سے مرے رستہ لیا
میرے ہی الفاظ سے نانک نے درسِ حق دیا

میرے ہی الفاظ سے خالق کی پہچان آ گئی
حق تو یہ ہے میرے دم سے روح میں جان آ گئی

آ کے ایرانی سیاست کے فسانے لے گئے
غیر آ کر میرے سینے کے خزانے لے گئے

میرے ہی اعجاز سے ٹیپو و سیواجی اٹھے
قم کہا میں نے تو یہ قوموں کے مردے جی اٹھے

ملک کو حاصل ہوا ہے مجھ سے فیضِ جاریہ
میری ہی محفل کے تھے اک رکن درنا جاریہ

قالبِ بیجاں میں شعورِ زندگانی بھر دیا
ہے تو یہ ٹیگور کو ٹیگور میں نے کر دیا

میرا ہی نقدِ ادب ہے غالب و اقبال میں
سب کے سب سکے ڈھلے ہیں یہ مری ٹکسال میں

میر و سودا، ذوق و مومن، حالی و نواب داغ
میرے ہی گھر کے دیئے سے ہیں یہ سب روشن چراغ

میرے پرتو سے ہے روشن آفتابِ زندگی
قوم ہے قدموں سے میرے کامیابِ زندگی

بحرِ خدمت کی اگر میں آشنائی چھوڑ دوں
طالبانِ علم کی حاجت روائی چھوڑ دوں

آنے والی نسل کی گر رہنمائی چھوڑ دوں
کشتیٔ امت کی گر ناخدائی چھوڑ دوں

شائبہ بھی ہو جو غفلت کا دلِ بیدار میں
قوم کا بیڑا ابھی غرقاب ہو منجدھار میں

میں جو رفعت دوں تو دم میں قوم کو معراج ہو
میں اگر چاہوں تو اپنا ملک اپنا راج ہو

افسانہ

بادلوں کے ٹکڑے

از :-
جناب طفیل ملک

"دیکھو! بیٹا —" ماں بیٹے کی بلائیں لیتے ہوئے بولی۔ "جیسے ہی پہلی تنخواہ ملے منی آرڈر کر دینا۔ حضرت پیر دستگیر کی نیاز دلوانی ہے نا! یاد ہے تمھیں، گیارہویں والے پیر کی منت مانی تھی۔ جونہی نوکری ملیگی پہلی تنخواہ کی نیاز دلواؤں گی" اور اپنے بچے کے دہنے بازو پر امام ضامن کا روپیہ باندھتے ہوئے بولی۔ "جا بیٹا کوئی فکر نہ کر۔ پردیس میں اللہ تیرا رکھوالا ہوگا۔"

آج ماں کی آرزوؤں، بہنوں کے ارمانوں اور عزیز و اقارب کی تمناؤں کے پورا ہونے کا وقت آ پہنچا تھا اور واقعی یہ لوگ کئی سال سے اس دن کا بےچینی سے انتظار کر رہے تھے۔ آج ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انھیں دنیا کی تمام مسرتیں حاصل ہو گئی ہیں۔

"پردیس کا معاملہ ہے میرے چاند" ماں بچے کو نصیحتیں کرنے لگی "اور تم جانتے ہو کہ تمھاری بہنوں کا بیاہ اس لئے رکا ہوا ہے کہ ہمارے پاس جہیز کے لئے روپیہ نہیں ہے" اور اس کی ماں یہ کہتے کہتے رک گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے۔

ماں کو داماد دیکھنے کی کتنی آرزو ہوتی ہے؟

بہنوں سے اُسے بڑا پیار تھا۔ وہ محبت کے مارے پھولا نہ سمایا۔

"بیسے دنوں میں ضرور آنا۔ جانتے ہو خالہ اعجاز کی لڑکی افتخار کی شادی ہے۔"

ایف۔اے پاس کرنے کے بعد اس نے یونیورسٹی کی تعلیم سپورٹس سینما، تھیٹر — ملں بہنوں اور عزیز و اقارب وغیرہ کو چالیس روپیہ ماہوار پر چھوڑ دیا۔ جب وہ اپنے رشتہ داروں اور عزیز و اقارب سے رخصت ہو کر اسٹیشن کی طرف چلا۔ تو مال روڈ کی سلیٹی صاف و شفاف سڑک پر حسین و جمیل تیتریوں کو دیکھ کر اس کی نگاہیں، مرمریں بانہوں ننگی پنڈلیوں، نیم عریاں سینوں اور یاقوتی ہونٹوں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔ وہ تانگے میں بیٹھا رنگا رنگ تیتریوں کو گزرتے دیکھ رہا تھا۔ کسی پتلون کوٹ والے نوجوان کے کندھوں پر کسی دیوی کا ہاتھ ہے کوئی کسی کا بازو تھامے ہوئے ہے — اور ایک لڑکی نے اپنا انگوری رنگ کا دوپٹہ سر سے سرکا کر گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ اور جس کے پاؤں اور ہاتھوں کے ناخن کیوٹکس کے رنگ سے چمک رہے تھے۔ پیا کی یاد میں گنگناتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس وقت کوئی نوجوان سائیکل پر گذرا۔ اور لڑکی کے قریب سے گزرتے وقت ذرا اونچی آواز میں "O, beautiful you are" لڑکی کی بھنویں تن گئیں، لال پیلی ہو گئیں۔ اور لڑکا اسے "سلوٹ" کر کے اور "very handsome" کہہ کر ہوا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ خواہشیں جھلملانے لگیں اور حریص نگاہیں زندگی کی سطح مشاہدہ کرنے لگیں۔

موضع دیرکوٹ میں وہ ایک معمولی پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے وارد ہوا۔ پکی اینٹوں کی یک منزلہ عمارت جس کی محراب پر ایک بورڈ جس پر اردو اور انگریزی حروف میں "پوسٹ آفس" لکھا تھا۔ نہایت بیدردی کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ ڈاکخانہ — اداس سب سے غیر دلچسپ جگہ۔ جہاں نئے پوسٹ ماسٹر کو اپنے مستقبل کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔

وہی پوسٹ ماسٹر تھا، وہی ٹکٹ اور خط بیچنے والا بابو اور تار بابو — سارے ڈاکخانے کا واحد مالک۔ وہ چھ پیسے کے لفافے اور تین پیسے کے کارڈ کی طرف اس طرح دیکھتا جیسے اس میں ہر ایک میں کسی کا دل پڑا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان میں کیا کچھ بھرا ہوتا ہے۔ محبت، ہمدردی، تسلی، ناراضی،

اور زینو اچانک ہی اس کی زندگی میں داخل ہو گئی۔ وہ دیرکوٹ کے ایک فوجی پنشنر کی بیٹی تھی۔ وہ اپنے باپ کو بیحد عزیز تھی اور یہ لڑکیاں، 'پرایا دھن' والدین کو ہوتی ہی عزیز ہیں۔ اور زینو تو بے ماں کی بچی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا باپ جب فوج میں بھرتی ہو کر سمندر پار جانے لگا تو اپنا وارث اسی کو مقرر کر گیا۔ مہینے کے بعد سمندر پار سے زینو کے نام ایک خط اور ہر دوسرے مہینے بیس روپیہ کا منی آرڈر آتا۔ خط لینے اور منی آرڈر وصول کرنے کے لئے اسے ڈاکخانے جانا ہوتا۔

جب زینو ڈاکخانے کے بابو کے سامنے آتی تو وہ اسے

شاید اس کی نگاہیں زینو کے چہرے میں ایک خاص دلکشی اور دلچسپی محسوس کرتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ روز بعد ہی وہ دلچسپی اور اس کا یہ شغل ایک قسم کی "ہمدردی" کی سنجیدہ صورت اختیار کرنے لگا۔

ایک معصوم، دلنواز، شیریں سی مسکراہٹ ہر وقت زینو کے ہونٹوں پر پھیلی رہتی اور ایک چنچلاہٹ سی ہر لمحہ اس کی کالی کالی آنکھوں میں جھلکتی رہتی۔

زینو اپنے دلکش قد و قامت، سانولے رنگ، دیہاتی لباس اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی وجہ سے اسے بیحد حسین دکھائی دیتی۔ وہ اسے ہر روز دیکھتا کہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ مٹی کی گاگر کولھے پر رکھے یا سر پر اُٹھائے قطار باندھے آہستہ آہستہ جا رہی ہوتی۔ اور چلتے وقت زینو کے کولھوں کی جنبش؟ —— حتیٰ کہ اسے زینو کی چال اور اس کے انداز میں ایک تمکنت اور حد درجہ دلکش متانت محسوس ہوتی۔

پہلی مرتبہ جب زینو کو پوسٹ ماسٹر نے دیکھا تو اس نے صرف اتنا محسوس کیا۔ کہ زینو کا چہرہ اس کے لئے مسرت اور اطمینان کا پیغام ہے لیکن انسان کی زندگی میں بعض ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب اس کا سامنا کسی عورت سے ہوتا ہے وہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے عورت کی نگاہیں اس کے دل کی تمام خوابیدہ تمناؤں کو چھیڑ دیا۔ وہ اس کی پہاڑ سی تنہا راتوں کے بیچین خوابوں کی زندہ تعبیر تھی۔

خط سناتے وقت پوسٹ ماسٹر کی آنکھیں اس کی طبیعت کے خلاف غیر اختیاری طور پر زینو کے چہرے پر جم جاتیں۔ اور جب وہ خط سناتے سناتے ایک دم خاموش ہو جاتا تو زینو اس کی طرف دیکھتی اور اس کا چہرہ شرم و حیا کی وجہ سے سرخ ہو جاتا اور پوسٹ ماسٹر اس وقت کوشش کرتا کہ اپنی نگاہیں زینو کے چہرے سے ہٹا لے۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد وہ خود بخود ایک برقی کشش کے ساتھ پھر زینو کے چہرے پر جم جاتیں اور پوسٹ ماسٹر کا دل چاہتا کہ اسی وقت اس سے لپٹ جائے۔ اس کے پیارے پیارے گلاب آسا ہونٹوں اور کالی کالی غزالی آنکھوں کو چوم لے۔

اور اس کی نگاہیں سامنے سفید میلی کچیلی دیوار پر چسپاں شدہ اشتہارات پر گھومنے لگتیں۔

ایک دن پوسٹ ماسٹر جب زینو کا انگوٹھا منی آرڈر پر لگوا رہا تھا۔ تو اس نے زینو کے ہاتھ کو محبت سے دباتے ہوئے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی پلکوں کو جلدی سے چوم لیا۔

زینو کانپنے لگی۔ اس کی گردن جھک گئی۔ اس کی نگاہیں نیچی تھیں۔ اور اُس کے رخساروں پر شرم و حیا کی زردی چھا گئی۔ اس کا سارا جسم پسینہ پسینہ ہو گیا۔ شرم و حیا نے تاریکی کی طرح اس کے عضو عضو کو گھیر لیا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دو۔" زینو کانپتے ہوئے لجائے ہوئے لہجہ میں بولی ——،

"زینو ——!" پوسٹ ماسٹر نے للچائی ہوئی پیاسی نگاہیں اُس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔" زینو شرماتے ہوئے لہجہ میں بولی۔ "میرا ہاتھ چھوڑ دو۔" ڈاکخانہ، ساری بستی اس کی نگاہوں کے سامنے نہایت تیزی سے گھوم رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں، ان کے قہقہے، اور ——

زینو کی حالت متغیر ہو رہی تھی۔ اس کا خون اس کی رگوں میں بڑی تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا گلا خشک ہو گیا ہے اور وہ کچھ کہہ نہیں سکتی۔

پوسٹ ماسٹر کے تاریک دل میں اُمید کی منور شعاع نے اچانک بجلی کی طرح چمک کر تمام تاریکی کو دور کر دیا۔

زینو کے ساتھ اس کی خوب گاڑھی چھنتی زیادہ تر ڈاکخانے ہی کی باتیں ہوتیں۔

"اجی یہ تار اتنی جلدی کیسے پہنچ جاتی ہے؟"

"میں تو بڑی حیران ہوں کہ تم لوگ ٹک ٹک سے باتیں کرتے ہو۔"

"ڈاک بابو تمھیں کیا تنخواہ ملتی ہے؟"

"تمھارے کتنے بہن بھائی ہیں اور تم یہاں کس لئے آئے ہو؟" اور زینو ہنسنے لگتی۔ اور اس کے قہقہے ڈاکخانہ کی خشک اور غیر دلچسپ فضا میں گونج اُٹھتے۔

کبھی کبھی پوسٹ ماسٹر اُسے اچھے اچھے شاعروں کی رومانی نظمیں سناتا۔ اس کی روح میں ایک عجیب لذت انگیز درد لہریں لینے لگتا بس یونہی اپنی دلپسند نظمیں زینو کو سناتا رہوں اور زینو بڑے غور سے سنا کرتی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی کہ اس کا پوسٹ ماسٹر کتنا اچھا ہے۔ اوروں کی طرح بالکل نہیں۔

پوسٹ ماسٹر کے محبت آمیز دل کی مُہر زینو کے نازک دل پر اچھی طرح نقش ہو چکی تھی۔ پوسٹ ماسٹر سے گفتگو کرنے میں اسے اتنا لطف آتا گویا وہ کسی نئے اور دلکش مقام کی سیر کر رہی ہے۔ سہیلیوں کی چھوٹی چھوٹی بے معنی باتیں اب اس کا دل نہ بہلا سکتی تھیں۔ رات کو وہ بستر پر لیٹ کر سوچا کرتی کہ پھر کب صبح ہو گی اور پوسٹ ماسٹر کب

شام کی تاریکی میں ڈاک بابو اپنے سینے پر پہاڑ سا بوجھ لاد کر چوروں کی طرح چپ چاپ گاؤں کو الوداع کہہ گیا۔ گاؤں سے رخصت ہوتے وقت زینو کے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کے سینے سے ایک گہری آہ نکل گئی۔ اور وہ آہ ہوا میں مل کر گم ہو گئی۔

چھ برس گزر گئے۔ زمانہ انقلاب کی کئی کروٹیں بدل چکا تھا۔ ڈاک بابو کی ایک بار پھر تبدیلی اسی گاؤں میں ہوئی جہاں زینو رہتی تھی۔ اس کے دل میں چھ سال قبل کی تمنائیں اور آرزوئیں بیدار ہو گئیں۔

شہروں اور پردیس کے پرمسرت لمحوں میں بھی اس نے زینو کو فراموش نہ کیا تھا۔ بلکہ ہر وقت اس کی یاد اور اس کے تصور میں کھویا کھویا سا رہتا۔ اور زینو کا تصور اس کے دماغ کے گوشہ گوشہ میں گھوما کرتا۔

جب گاڑی دیر کوٹ کے سٹیشن پر ٹھہری تو اسے اسٹیشن اس طرح نیا معلوم ہوا گویا اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اسٹیشن کے کنارے کی جھاڑیاں اور آس پاس کے لمبے ترنگے درخت اُسے اجنبی اور غیر مانوس نظر آ رہے تھے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اب یہی چیزیں پہلے سے بہت زیادہ بدصورت اور بدنما نظر آ رہی تھیں۔ اور ڈاک بابو کی پرنم آنکھوں کے سامنے ایک ایک واقعہ پانی کے بہاؤ کی طرح گزرنے لگا۔ اور جب وہ شہر سے اس کے لئے چوڑیاں اور کانٹے لایا تھا تو اس کا انتظار شوق عظیم کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اب بھی اسے ایسی امید تھی۔ زینو ——! نہ جانے اس کے بغیر اس کی زینو کے دن کیسے کٹ رہے ہونگے؟ وہ اپنے دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی مایوسی کی گھڑیاں شوق سے گنی جا رہی ہونگی اس کی آمد کے انتظار میں معصوم آنکھیں راہ تک رہی ہونگی —— اور اسے دو آنکھیں یاد آ گئیں۔ دو کالی کالی آنکھیں، آنسوؤں سے لبریز و مضطرب آنکھیں —— ہر گزرنے والے لحظے کے ساتھ اس کے دل کی بیتابی بڑھتی جا رہی تھی۔ تو کیا اب زینو کنکھیوں سے —— تمنا اور محبت بھرے دل کے ساتھ اس کی طرف نہ دیکھے گی؟

اس طرح کی آرزوئیں اور اُمیدیں دل میں لئے ہوئے دیر کوٹ کی بستی جو اس کی راحتوں اور تمناؤں کا ملجا و ماویٰ تھی پہنچ گیا۔ یقیناً زینو ڈاکخانے کے پاس اسٹیشن کو آنے والی سڑک کو تک رہی ہوگی۔ جوں جوں اُس کے قدم آگے بڑھتے اور ڈاکخانہ کا درمیانہ فاصلہ کم ہوتا گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی گئی آخرکار جب وہ ڈاکخانے کے پاس پہنچا تو نہ اسے سڑک پر کسی کی صورت دکھائی دی نہ ڈاکخانے کے اردگرد —— ایک عجیب طرح کی دہشت سی ہونے لگی۔ جیسے کوئی سانحہ عظیم پیش آیا ہے —— لڑکھڑاتی چال سے ڈاکخانہ کی سیڑھی پر قدم رکھا تو سائن بورڈ کے حروف "پوسٹ آفس" اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے اسے یوں محسوس ہوا کہ ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی ہے —— اُسے وہ باتیں یاد آ گئیں جب اس نے زینو سے ازراہ مذاق کہا تھا۔ "زینو! میں ایک سرکاری نوکر ہوں۔ اور سرکاری نوکر چلتی پھرتی چھاؤں ہیں۔ آج یہاں کل وہاں —— اور پھر —— تبدیلی کا کیا اعتبار" اس کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے تھے۔ اور زینو نے بات کا پہلو بدلتے ہوئے کہا تھا —— "ڈاک بابو تم شہر کے رہنے والے ہو۔ اور جب شہرن تمھارے گھر آ جائے گی تو ہماری طرف بھول کر بھی نظر نہیں اُٹھاؤ گے۔" اور اس نے کہا تھا "جب تک دم میں دم ہے زینو تمھاری یاد سے غافل نہ رہونگا۔"

تو زینو بولی تھی۔ "زمانہ بدل جایا کرتا ہے ڈاک بابو اور اس کے ساتھ ہی طبیعتیں بھی تبدیل ہو جایا کرتی ہیں۔"

ڈاک بابو نے کہا تھا —— "تمھاری طبیعت بدل جائے تو جائے —— آخر تم بھی تو کہیں بیاہی جاؤ گی نا؟"

"اونہہ ——!" اور زینو نے جواب دیا تھا۔ "میں شادی ہی نہیں کرونگی۔ بھلا یہ کبھی ہو سکتا ہے۔"

ڈاک بابو سوچنے لگا۔ زینو! شاید اس نے مجھے یاد رکھا۔ یا نہیں —— معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ غیر شعوری چیزوں سے کہیں زیادہ اس جوار کے انسان بدل گئے ہیں۔

وہ حیران تھا کہ زینو ابھی تک کیوں نہیں مجھ سے ملی۔ کیا سچ مچ مجھے بھول گئی ہے۔ یا کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے۔

شام کے قریب ڈاک بابو بستی کے میدان میں ٹہل رہا تھا اُس نے زینو کو وہاں دیکھا۔ وہ ایک اچھا لباس پہنے تھی۔ اس کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے لڑکے اُنگلی پکڑے تھے —— وہ اب بھی خوبصورت تھی۔ ڈاک بابو مبہوت سا بنا دیر تک زینو کو دیکھتا رہا —— اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے دل میں ایک چرکا سا لگا۔ کاش زینو میری بیوی ہوتی۔ اور وہ اسی طرح میرے

بچوں کو لے کر ٹہلتی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے دیکھا کہ زینو کتنی بدل گئی تھی۔ شادی نے اس میں ایک عظیم تغیر پیدا کر دیا تھا ں کی آنکھوں میں کاجل تھا اور اس کے چہرے پر ایک قسم کی خوبصورتی ــــ لیکن یہ خوبصورتی جھوٹی ہو چکی تھی۔ اور اس کے خوبصورت رخسار اور شیریں لب چومے جا چکے تھے۔

زینو کو اپنے سامنے دیکھ کر ڈاک بابو کے دل میں ایک طرح کا اضطراب، افسردگی اور کچھ بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ اس کے دل میں زینو کو اپنے بازوؤں میں لے کر اس کے خوبصورت رخسار اور شیریں لب چوم لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ بیاہی ہوئی زینو کے گالوں اور ہونٹوں کو چوم لینے کی ــــ

"زینو ــــ!" ڈاک بابو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور دو چار آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک کر زمین میں جذب ہو گئے۔

زینو ڈاک بابو کی آواز سُن کر ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس نے اپنی گردن جھکالی اور نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

"زینو! زینو!" ڈاک بابو آنسو پونچھتے ہوئے اس کے بازو کو ہولے سے جھنجھلاتے ہوئے بولا۔ "بولتی کیوں نہیں۔ بھول گئی ہو؟ ــــ آخر وجہ؟ ــــ میں تو تمہیں نہیں بھولا ــــ زینو میری طرف تو دیکھو! ــــ کتنی مشکلوں اور افسروں کی خوشامدوں سے میں نے یہاں پھر تبادلہ کرایا ہے۔ لیکن ــــ زینو! تم بولتی کیوں نہیں۔۔۔۔؟"

اتنی مدت کے بعد ڈاک بابو کو اپنے سامنے دیکھ کر زینو کے چہرے پر ایک قسم کی چمک پیدا ہوئی اور اس کا چہرہ مسرت سے تمتما اُٹھا۔ جیسے چراغ بجھنے سے پہلے ایک بلند اور تیز لپک پیدا ہوتی ہے اسی رح زینو کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک پیدا ہوئی۔ لیکن فوراً بُجھ ئی۔ زینو کی آنکھوں سے دو روشن ستاروں سے آنسوؤں کے چشمے نکلے۔ اور اس کی آنسو بھری آنکھوں میں پھیکی مسکراہٹ کی لہریں وڑنے لگیں۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے دونوں ڑکوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اور مری ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے ول جاؤ ڈاک بابو! میری شادی ہو چکی ہے۔ میرے بچے اور میرا ہر میرا ایمان اور میری دنیا ہے۔ میرے لئے اپنی زندگی کو باد نہ کرو۔ خدا کے لئے اپنی جوانی پر رحم کھاؤ۔ میں تم کو بھول نے کی کوشش کرونگی۔ اور تم بھی مجھے بھول کر اپنی زندگی بنانے شش کرنا۔"

پھر کچھ دیر ٹھہر کر اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "ہاں! ــــ تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب کی بار ڈاک بابو آئے گا۔ تو اس کے ساتھ اس کی چاند سی دُلہن بھی ہو گی۔" اور زینو چپ ہو گئی۔

"تمہیں بھول جاؤں زینو؟" ڈاک بابو نے آہستہ سے کہا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے اور دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ زینو نے اپنی گردن جھکالی اور چھوٹے لڑکے کو اپنی گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔

کتنی ہی دیر ڈاک بابو خاموش رہا۔ نہ اس کے پاؤں تلے زمین تھی، نہ اس کے سر پر آسمان ــــ! بستی کا میدان، درخت مکانات اور ڈاکخانے کی خشک اور غیر دلچسپ عمارت سب اس کے اردگرد نہایت تیزی سے گھوم رہے تھے۔

ڈاک بابو نے آہستہ سے اپنی جیب میں سے سفید رومال نکالا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زینو کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اپنے پاس رومال واپس دیکھ کر زینو بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "لیکن وہ چوڑیاں اور کانٹے تو ابھی تک میرے پاس ہیں ــــ" اور اس کی کالی کالی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ڈاک بابو اس کے آنسو دیکھ نہ سکا۔ مگر اس نے نہایت ہمت اور ضبط سے کام لیا۔ اور ڈاکخانے کی طرف آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ اس نے اپنی مایوس نگاہیں وسیع آسمان کی طرف اُٹھائیں۔ جو شاید مایوسیوں کا آخری سہارا ہے۔ اور جہاں سورج کی ڈوبتی ہوئی کرنوں میں سرخ رنگ کے بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔

یاد

از:۔
عبادت بریلوی ایم۔اے

مسرور چاندنی میں یہ گومتی کا منظر
دھیمے سُروں میں ہر شے کچھ گنگنا رہی ہے
مشرق کی سمت ہٹ کر وہ سامنے نظر کے
چھوٹی سی ایک کشتی کچھ ڈگمگا رہی ہے
اور میرے سامنے اک بیتی ہوئی کہانی
رہ رہ کے اپنے رُخ سے گھونگھٹ اُٹھا رہی ہے

عورت کی ظاہری جوانی

عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہو کر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو یہ بہت بدصورتی کہلاتی ہے ایسی میں شباب کی کشش ختم ہو جاتی ہے یہ خرابی عورت کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہر سال بچوں کو دودھ پلانے پر مجبور ہو جائے یا کسی بیماری یا بد احتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہو کر بدنما معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر بیٹھتی ہے۔

ایسی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آ سکتی ہے } سائنس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوا ہے جس کے استعمال سے عورت کے ڈھیلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ گول اور سخت ہو کر عورت کو از سر نو جوان لڑکی کے روپ میں پیش کرنے لگتے ہیں۔ اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں۔ یہ لگانے کی دوا ہے اور اس کا نام "برسٹین" ہے۔ یہ وہی دوا ہے جس کی بدولت اب تک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں۔ وہ بڑی عمر کے باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اس کے ہر روز کا استعمال عورت کو ثابت کرتا رہتا ہے کہ کتنی جلدی اس کے سینہ میں دوبارہ ابھار اور سختی پیدا ہوئی ہے۔ جن عورتوں کو ضرورت ہو

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۔ اے۔ بی ۱۲ دہلی } کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی "برسٹین" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں۔ ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی بنا دیگی اور اس کے سینہ کی سب خرابیاں دور ہو کر مستقل ابھار اور سختی پیدا کر دیگی۔ ایک شیشی "برسٹین" کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر صرف نو آنے محصول لگتا ہے۔

نوٹ:۔ اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچہ کے دودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی اور بچہ نہایت اطمینان سے ساتھ دودھ پیتا رہے گا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔

ٹیلیفون نمبر ۶۹۲

میں بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتی

عورت میں یہ خواہش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ کسی بیماری کے باعث اتنی کمزور اور ناتواں ہو گئی ہو کہ بچہ کی پیدائش کی سخت مشکلات کا سامنا کر سکے یا بعض عورتیں اپنی مفلسی کی وجہ سے بھی زیادہ اولاد سے گھبراتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو چاہیئے کہ سائنس کی جدید ایجاد دوا روہیل سے فائدہ اٹھائیں۔

جبتک چاہو بچہ نہیں ہوگا } دوا روہیل کے استعمال میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عورت جبتک چاہے اولاد سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ اور ماہواری ایام میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں پڑتی۔ یعنی ماہواری ہر ماہ آتی رہیگی۔ دوا "روہیل" کی ایک شیشی میں اتنی مرتبہ استعمال کے لائق دوا ہوتی ہے اور اس کے استعمال کی صورت یہ ہے کہ عورت ...... سے دس منٹ پہلے ایک خوراک دوا "روہیل" کھائے۔ تو پھر اس کے بعد .... اس رات عورت کو "بچہ کی امید" نہیں ہو سکے چنانچہ عورت جبتک .... سے پہلے یہ دوا کھا لیا کریگی۔ "امید" سے بچی رہیگی۔

جب چاہو بچہ ہونے لگیگا } اور جب عورت اس دوا کا استعمال ترک کر دیگی تو پھر جس طرح عام طور پر عورتوں کے بچہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے ہاں بھی ہونے لگے گا۔ دوا کے استعمال سے عورت کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ جس عورت کو ضرورت ہو

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۔ اے۔ [illegible] دہلی کو خط لکھ کر دوا "روہیل" کی شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگائے۔ ایک شیشی [illegible]

مجھے اپنے دلبر کی یاد آ رہی ہے

از:-
عبدالواسع عصری چکنوری

گھٹاؤں کی وہ کالی کالی قبائیں
وہ مستانہ چال اور ٹھنڈی ہوائیں
وہ شاخوں کا مستی میں لینا بلائیں
چلو جھولا ڈالیں ملاریں بھی گائیں
مجھے اپنے دلبر کی یاد آ رہی ہے

وہ سبزہ، وہ نہروں کے دلکش کنارے
وہ وادی میں ہر سمت سیماب پارے
بٹے سبز مخمل سے ہیں کھیت سارے
یہ منظر دلوں پر چلاتے ہیں آرے
مجھے اپنے دلبر کی یاد آ رہی ہے

پپیہے کی پی پی وہ کوئل کی کوکو
وہ طاؤس کا رقص سبزے پہ ہر سو
وہ شاخوں کا جھکنا لچک کر لب جو
وہ کلیوں کی رنگت وہ پھولوں کی خوشبو
مجھے اپنے دلبر کی یاد آ رہی ہے

سر شام نکلوں تو ہوتی ہے وحشت
جو دیکھوں شفق کو تو بڑھتی ہے کلفت
نہاں اس میں ہیں میرے ارمان و حسرت
سمجھتا ہوں سرخی کو خون محبت
مجھے اپنے دلبر کی یاد آ رہی ہے

تبسم جو کھیلا تھا اک دن لبوں پر
مجھے یاد آتا ہے اب بھی وہ منظر
نگاہوں میں پھرتا ہے "وہ سین" اکثر
الٰہی اُسے پھر میں دیکھوں گا کیونکر؟
مجھے اپنے دلبر کی یاد آ رہی ہے

یہ خاموش منظر یہ سناٹا شب کا
کوئی حال دیکھے تو مجھ جاں بلب کا
مصیبت میں کب ہے خیال اپنے رب کا
نہ رحمت کا اس کی نہ اس کے غضب کا
مجھے اپنے دلبر کی یاد آ رہی ہے

مجھے آہ راحت کے بدلے ملا غم
یہ آنکھیں ہوئیں اس کی فرقت میں پُرنم
کبھی دردِ دل آہ ہوتا نہیں کم
سحر ہو کہ شب بس یہ ہے دل کا عالم
مجھے اپنے دلبر کی یاد آ رہی ہے

سحر کا وہ منظر سہانا سہانا
شعاعوں کا سورج کی وہ جھلملانا
کسانوں کا کھیتوں میں ہل لیکے جانا
وہ شبنم کا چپکے سے آنسو بہانا
مجھے اپنے دلبر کی یاد آ رہی ہے

محبت ہی مذہب محبت خدا ہے
اسی سے تو دنیا میں سب کچھ ہوا ہے
محبت کا جلوہ ہی یہ جابجا ہے
مرا دل بھی عصریؔ اک الفت کدہ ہے
مجھے اپنے دلبر کی یاد آ رہی ہے

قلب (دل) اور اعضائے رئیسہ کو تقویت دینے والی لاثانی اور اکسیر صفت دوا

نمونہ کی شیشی ۳۲ گولی قیمت ایک روپیہ

مکمل کورس ۱۰۰ گولی قیمت تین روپے

قلبی رجسٹرڈ

[illegible]

قلبی اختلاج قلب سانس کا پھولنا۔ ہاتھ اور پاؤں کا سرد رہنا ٹخنوں کا متورم ہونا نبض کی تیز رفتاری۔ تھوڑی سی غذا کھا لینے کے بعد دل کی دھڑکن کا تیز ہو جانا۔ یہ تمام علامات قلب کے ضعف سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس دوا کی خاصیت یہ ہے کہ قلب کے عضلات کو تقویت دیکر حقیقی مرض کو دفع کرتی ہے۔ چند روز استعمال کرنے سے جملہ علامات غایب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ چہرے پر رونق آجاتی ہے لمبے بخاروں کے بعد پیدا ہونے والی کمزوریوں کو رفع کرنے میں لاثانی ہے۔ دواخانہ شفائے عالم رجسٹرڈ۔ لوہاری منڈی۔ لاہور

جناب "شفاء الملک" حکیم محمد حسن صاحب قریشی

پرنسپل طبیہ کالج لاہور

کی رائے

طبیہ عجائب گھر قادیان کے متعلق

"حکیم عبدالعزیز صاحب (مالک طبیہ عجائب گھر قادیان) نے مجھے قیمتی اور نادر مفردات کا ذخیرہ دکھایا۔ مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ انکی فراہم کی ہوئی دوائیں عمدہ اور معیاری ہیں۔ آج کل مصنوعی اور ادنیٰ درجہ کی دواؤں کی گرم بازاری ہے اس لئے جو دواخانے عمدہ اور اصلی دواؤں کی بہم رسانی کرتے ہیں جمہور کو ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ مجھے امید ہے کہ عوام کے علاوہ اطبائے کرام بھی طبیہ عجائب گھر قادیان کی خدمات سے فائدہ اٹھائینگے۔ اور حکیم عبدالعزیز صاحب معیاری دواؤں کی بہم رسانی میں بیش از بیش جد و جہد کرتے رہینگے۔"

محمد حسن قریشی

فہرست مفت طلب کریں

طبیہ عجائب گھر قادیان

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

حالات زندگی

آج ہی جوابی لفافہ بھیج کر عمر بھر کی زندگی کے حالات طلب کریں جھوٹ ثابت کرنے والے کو ایک سو روپیہ نقد انعام اور ہمارا تیار کیا ہوا طلسم رفی نیوس منگوا کر اس کا اثر دیکھیں کیونکہ منگل اور سنیچر نہایت ہی منحوس اور طاقتور ستارے ہیں یہی انسان کی زندگی پر خراب اثر ڈالتے ہیں اور انسان طرح طرح کی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ہمارا تیار کیا ہوا رفی نیوس منگا کر اس کا اثر دیکھیں سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے لیکن یہ اپنا اثر نہیں چھوڑتا۔ بجلی کی طرح پانچ منٹ پر اپنا اثر دکھاتا ہے۔ دوسرے کام کے لئے تعویذ دئیے جاتے ہیں جوابی لفافہ بھیجکر طلب کریں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

عامل قمر زمان۔ نیوڈیرو۔ ضلع لاڑکانہ۔ سندھ

ادبیات:-

عربوں کی قادر الکلامی

از:-
(شیخ) غلام مجتبیٰ

قرون اولیٰ کے عربوں کی قادر الکلامی مشہور ہے۔ چنانچہ حج کے موقع پر ادر عکاظ و ذوالمجاز کے میلوں میں تمام قبائل عرب جمع ہو کر اپنے اپنے قبیلہ کی امتیازی خصوصیات کو تفاخر و تکاثر کی صورت میں پیش کرتے تھے۔ ان کا بندۂ کلام جس سے وہ فی البدیہہ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتے تھے وہ قصائد ہیں جن کی ادبی لطافتوں سے ہم آج بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور طرفہ یہ ہے کہ یہ قصائد نہ تو ترتیب دیتے وقت لکھے جاتے تھے نہ سننے والے ہی ان کو ضبط تحریر میں لاتے تھے۔ بلکہ ادھر قصیدہ پڑھا گیا اُدھر جھٹ سامعین نے ازبر کر لیا اور وہ اشعار بچہ بچہ کی زبان پر رواں ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عرب اپنے آباو اجداد کے جنگی کارناموں کو "تفاخر" کے طور پر مجمعوں میں بیان کرتے اور اپنے آباو اجداد کی شجاعت و مردانگی۔ سخاوت و فیاضی کے واقعات انھیں نسلاً بعد نسل یاد رہتے تھے۔ لیکن زبان پر اس درجہ عبور ہونے کے باوجود عرب لکھنے پڑھنے کے فن سے نابلد تھے۔ فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر انسان کے بعض قویٰ بیکار ہو جائیں تو وہ ان کی قوت بعض دوسرے قویٰ میں منتقل کر دیتی ہے۔ اسی اصول کے مطابق اگرچہ عرب ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند سے بے بہرہ تھے تاہم انھیں یادداشت کے لئے قلم و قرطاس پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنے دل و دماغ سے کام لینا پڑتا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ عربوں کی ذہنی و دماغی قوتیں بہت زیادہ تیز ہو گئی تھیں اور وہ طویل قصائد کو باسانی مرتب یا حفظ کر لیتے تھے۔ عربی ادبیات میں عربوں کی قادر الکلامی کی بہت سی مثالیں ہیں لیکن ذیل میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہو سکے گا کہ عربوں کو اپنی زبان پر کس درجہ عبور تھا۔

ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان نے اپنے دربار کے شعراء اُدبار اور فضلا کی مجلس منعقد کی اور کہا کہ تم میں سے کوئی ہے جو مجھے انسانی بدن کے اعضا کے نام حروف معجم کی ترتیب سے گنائے۔ میں اسے مُنہ مانگی مراد دونگا۔ یہ سنتے ہی ایک ادیب سوید بن غفلہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور بغیر کسی غور و فکر کے انسانی بدن کے اعضا کے نام حروف معجم کی ترتیب سے گنوانے لگا۔

انف (ناک) بطن (معدہ) ترقوۃ (ہنسلی کی ہڈی) ثغر (سامنے کے دانت) جمجمہ (کاسۂ سر) حلق۔ خد (رخسار) دماغ۔ ذکر۔ رقبۃ (گردن) زند (بند دست) ساق (پنڈلی) شفۃ (ہونٹ) صدر (سینہ) ضلع (پسلی) طحال (تلی) ظہر (پشت) عین (چشم) غبب (طوق گلو) فم (دہن) قفا، (پس سر) کف (ہتھیلی) لسان (زبان) منقر (سوراخ بینی) نغنوغ (گوشت بن کام) ہامۃ (سر) وجہ (چہرہ) ید (ہاتھ)

جب سوید حروف معجم کے مُطابق الف تا ی تمام نام سُنا چکا تو ایک دوسرا درباری ادیب اُٹھا اور بولا۔ یا امیر المومنین میں سوید سے زیادہ نام گنوا سکتا ہوں۔ سوید نے جب یہ ماجرا دیکھا اور اسے اپنی شکست کا احساس ہوا۔ تو وہ بھی اٹھا اور کہا۔ علیٰ رسلک یا امیر المومنین۔ یعنی میری گذارش سُن لیں پھر جو چاہیں عمل میں لائیں۔ عبدالملک نے کہا۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ سوید نے کہا۔ میں نے چونکہ نام سنانے میں پہل کی ہے اس لئے معروض ہوں کہ ایک دفعہ اور مجھے بیان کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس کے بعد اگر کسی میں ہمت و جرأت ہو تو وہ مجھ سے زیادہ اسماء اعضائے انسانی بیان کرے۔ پھر فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔ عبدالملک نے دوسرے ادیب کو بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ اور سوید سے کہا کہ وہ بیان کرے۔ سوید نے خلیفہ کے حکم کی اطاعت کی اور بغیر کسی سوچ بچار کے فی الفور کہنا شروع کیا۔

انف۔ اذن (کان) اسنان (دانت) بطن۔ بنصر (انگلی) بزۃ (ہیئت جسم) ترقوۃ۔ تمرۃ۔ کیر۔ تبنۃ (پیٹھ) ثغر۔ ثنایا (سامنے کے دانت) ثدی (پستان)۔ جمجمہ۔ جنب (پہلو)۔ جبھۃ (پیشانی) حلق۔ حنک۔ (تالو) حاجب (ابرو) خد۔ خنصر۔ (انگلی) خاصرۃ کمر۔ دبر۔ (پیٹھ) دماغ۔ دراد یر (چمکیلے دانت) ذقن (ٹھوڑی) ذکر۔ ذراع (بازو) رقبۃ۔ راس (سر) رکبۃ (زانو) زردمۃ

سر) حلقوم۔ زب۔ کیر۔ زند۔ ساق۔ سرۃ (ناف) سبابۃ (انگشت
شہادت) شفۃ۔ شعر (بال) شارب (مونچھ) صدر۔ صدغ
(کنپٹی) صلعۃ (پیشانی) ضفیرۃ۔ ضرس۔ طحال۔ طرۃ (پیشین
سر) طرف (آنکھ) ظہر۔ ظفر۔ (ناخن) ظلم (چمکیلے دانت) عین
عنق (گردن) عاتق (دوش) عنبب۔ غلصمۃ۔ غنۃ (آواز
بینی) فم۔ فک (جبڑا) فواد (دل) قدم۔ قفا۔ قلب۔ کف
تف۔ (شانہ) کعب (ٹخنہ) لسان۔ لحیۃ (ڈاڑھی) لوح
نحر۔ مرفق (کہنی) منکب (ٹخنہ) نغنوغ۔ نابن (دندان پیشین)
ن (موئے کمزور) ہامۃ۔ ھیاۃ (شکل) ھیف (نازک کمر)
نہ، وجنتہ (رخسار) ورک (سرین) یمین (دست راست)
ار (دست چپ) یافوخ (بالوں سے خالی سر)۔

سوید یہ تمام سنا کر بیٹھ گیا۔ عبدالملک نے حاضرین مجلس کو مخاطب ہوئے کہا تم میں سے اگر کوئی سوید سے زیادہ نام سنانا چاہے تو سنادے سی کو ہمت وجرات نہ ہوئی۔ جب عبدالملک نے اہل مجلس کا جواب سے دیکھا تو اس نے سوید کی قادر الکلامی سے خوش ہو کر اسے بہت سا دیا اور اس کی عزت افزائی کی۔

تنویر اختر

از:۔
آختر راز چاندپوری

جذبات کا وہ طوفاں برپا ہے چاندنی میں
لہریں سی اُٹھ رہی ہیں دریائے زندگی میں
سجدہ کیا ہے اس کو جب میں نے بیخودی میں
اک جان پڑ گئی ہے بیجان بندگی میں
سو انقلاب آئے اک دورِ زندگی میں
کوئی کمی نہ دیکھی دنیا کی دلکشی میں
ساقی رہے سلامت میکش رہیں سلامت
بیجا ہے فکرِ فردا امروز میکشی میں
پڑتی ہیں سب کی نظریں محفل میں بے محابا
اللہ کیا کشش ہے کافر کی سادگی میں
رکھیں گے یاد مجھ کو اہلِ جہاں ہمیشہ
بھر دی ہے روحِ اُلفت دنیا کی زندگی میں
ذوقِ سخن کو اختر جس وقت چھوڑ بیٹھا
باقی نہیں رہے گا کچھ لطف زندگی میں

تاثرات :-

ایک شام

از :-

سید بدر عالم شاہ جونپوری

نندو ایک مزدور تھا ـــــ لیکن حساس ـــــ لکھا پڑھا تو نہ تھا۔ لیکن اس کی فطری ذکی الحسی اور زمانہ کے نشیب و فراز نے یا یوں کہئے کہ خود اس کے ذاتی مشاہدات نے اس میں وہ جوہر پیدا کر دیئے تھے جو تمام پڑھے لکھے آدمیوں میں بھی نہیں ہوتے ۔ وہ فطرتاً فلسفیانہ دماغ کا مالک تھا۔ وہ ہر واقعہ کی ماہیت پر غور کرتا اور اپنی بساط کے مطابق سمجھنے کی کوشش بھی کرتا۔ بارہا ایسا بھی ہوتا کہ اپنی دھن میں کچھ سوچتا ہوا اپنی منزل سے بہت آگے نکل جاتا لیکن پھر یک بیک چونک کر واپس آ جاتا تھا۔

آج کارخانہ چار ہی بجے بند ہو گیا تھا۔ اور پھاٹک سے انسانی سیلاب اُمنڈتا ہوا نظر آ رہا تھا ۔ آہستہ آہستہ لوگ گزرتے رہے اور بھیڑ کم ہوتی گئی ۔ نندو آج بھی حسب معمول سب سے بعد میں نکلا۔ شاید وہ سب سے بعد میں نکلنے پر مجبور تھا۔ تمام دن کی سخت محنت کے بعد اس میں اتنی سکت کہاں کہ مجمع کو چیرتا پھاڑتا آگے نکلنے کی کوشش کرے۔ اس کی گرد آلود پنڈلیاں جن پر سیاہی غالب تھی اور مجموعی ہیئت کذائی صاف بتا رہی تھیں کہ وہ کوئلہ ڈھوتا رہا ہے۔ اس کی نڈھال آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت تھکا ہوا ہے ـــــ معلوم نہیں وہ روزانہ اتنا ہی تھکا رہتا تھا یا آج غیر معمولی طور پر تھکا ہوا تھا۔

بائیں ہاتھ پر ایک خوشنما تالاب تھا ۔ شہر کے منچلے، بے فکرے، اور کچھ طلبا سیر و تفریح کے لئے آئے ہوئے تھے ۔ کچھ بنگالی حسن کے شاہکار بھی محو خرام تھے ۔ نندو بھی اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ تھکا ہوا تو تھا ہی تالاب کی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا نے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ مچھلیاں تیرتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں اپنی طرف تھوڑے ہی فاصلے پر لڑکیاں مچھلیوں کے کھانے کے لئے پھینک رہی تھیں اور ان کی اچھل کود سے لطف اندوز ہو رہی تھیں ۔ کبھی کبھی کوئی مچھلی جب کود کر سطح آب سے کچھ اونچی ہو جاتی تو سب کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل جاتی ـــــ یہ سب تو مچھلیاں دیکھ رہی تھیں ۔ اور لوگ انہیں دیکھ رہے تھے ۔ لیکن نندو ؟ ـــــ

نندو یہ محسوس کر کے خوش ہو رہا تھا کہ مچھلیاں آج بھوکی نہیں رہیں گی وہ غور کرنے لگا ۔ "پانی کے اندر معلوم نہیں انہیں پیٹ بھر کر غذا بھی ملتی ہے یا نہیں ۔ شاید وہ بھی کبھی کبھی فاقہ کرتی ہوں ۔ اور انہیں بھی بھوک کی تکلیف اٹھانا پڑتی ہو ۔ اور یہاں ان کا اِدھر اُدھر دوڑتے پھرنا تو اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا لیکن آج تو انھوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہوگا ۔ آج رات کو نیند بھی اچھی آئیگی" وہ انہی خیالات میں غرق تھا کہ لڑکیاں مچھلیوں کو کھلا کر رخصت ہو گئیں اور مچھلیاں بھی ایک ایک کر کے دوسری سمت کو جانے لگیں ـــــ وہ بھی وہاں سے چل دیا۔

ابھی تالاب سے بمشکل ۲۰ گز چلا ہوگا کہ بائیں طرف سے آواز آئی "سورداس کو دو بابا" اسے محسوس ہوا کہ وہ اسی سے مانگ رہا ہے وہ ضرور بھوکا ہوگا ۔ مڑ کر دیکھا تو ایک اندھا درخت کے نیچے ـــــ سنگریزوں کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا آواز لگا رہا ہے ۔ اس کی آواز سے غم و اندوہ ٹپک رہا تھا ۔ لیکن جب وہ کہتا کہ "ایک بار بولو پریم سے رام رام رام" تو یہ دیوتا کی آواز معلوم ہوتی ۔ اس میں کشش تھی اور ہر شخص اس کے دہرانے پر مجبور ہو جاتا تھا ۔ نندو بھلا کیسے متاثر نہ ہوتا ۔ وہیں کھڑا ہو گیا ۔ اندھا دو تین دفعہ "ایک بار بولو پریم سے رام رام رام" کہنے کے بعد "سورداس کو دو بابا" کی صدا لگاتا ۔ "معلوم نہیں یہ اس کے کس گناہ کی پاداش ہے کہ وہ دنیا کی نعمت سے محروم کر دیا گیا" وہ یہیں تک سوچنے پایا تھا کہ داہنی طرف سے بندروں کے لڑنے کی آواز آئی ۔ دیکھا کہ باغ کے جنگلے پر سے ایک شخص بندروں کو کیلے بانٹ رہا ہے اور اسی پر وہ لڑ رہے ہیں ۔ اس نے ایک نظر بندروں پر ڈالی ـــــ اور دوسری اندھے فقیر پر ـــــ اس کی قسمت میں مٹھی بھر چنے بھی نہیں ہیں اور ان کی خوراک کیلا ـــــ ایسا کیوں ہے ؟ کیا واقعی یہ دیوتا ہیں؟ اُف ! نجات کے لئے بھی سرمایہ کی ضرورت ہے ؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا پھر دیوتا کو تو حاجت روا ہونا چاہیئے ۔ حاجتمند نہیں ؟" وہ سوچتا رہا لیکن کچھ نہ سمجھ سکا ۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں ۔ اور وہ چل دیا ۔

اب وہ مال روڈ پر تھا۔ ایک جم غفیر دو رویہ سڑک پر کھڑا تھا جینیوں کا جلوس گزر رہا تھا ––– وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ نوجوان حسینت پائجامہ اور کالی شیروانی پہنے گھوڑوں پر گزر رہے تھے۔ جلوس کے ایک ایک متنفس سے سرمایہ داری ٹپک رہی تھی۔ گھوڑوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ہاتھیوں کا تانتا بندھ گیا۔ لوگ سونے چاندی کے ہودوں میں بیٹھے گزر رہے تھے۔ سب سے اخیر میں دو بیلوں کا ایک رتھ نکلا۔ دفعۃً دو آدمیوں نے لڈو سے بھری ہوئی تھالی بیلوں کے منہ سے لگا دی۔ انھوں نے کچھ کھایا کچھ گرا دیا۔ نندو سوچنے لگا "یہ یقیناً ان کے پچھلے جنم کا بدلہ ہے مگر ایسا کیوں؟ اگر انھوں نے کوئی ایسا ہی کام کیا تھا کہ بیل ہونے کے بعد بھی لڈو کھائیں تو پھر انھیں انسان ہی کیوں نہ بنا دیا گیا۔ لیکن ہمیں تو لڈو نہیں ملتے" وہ کانپ رہا تھا "یہ اچھا ہوا وہ آدمی نہ ہوئے۔ ورنہ میری طرح انھیں بھی فاقہ کرنا پڑتا" وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ جلوس گزر گیا۔ اور وہ بھی غیر ارادی طور پر چل پڑا۔ ابھی نہر کے پاس ہی پہنچا تھا جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے کہ دو بھینسوں کو ہانپتے دیکھا۔ وہ کوئلہ بھری گاڑی چڑھائی پر لیے جا رہے تھے۔ اور گاڑی بان انہیں سٹراسٹر پیٹ رہا تھا۔ کہ ایک بھینسا اتنے میں تلملا کر بیٹھ گیا ––– نندو کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئلوں سے بھری ہوئی ٹوکری لے کر گر پڑا ہے۔ اس کا سر چکرانے لگا ––– اور آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔

وہ چلتا رہا ––– یہاں تک کہ اپنے دروازے پر پہنچ گیا۔ وہ کھویا ہوا تھا۔ "ماں! بابو آگئے" یہ اس کی پنج سالہ بچی کی آواز تھی۔ وہ چونک پڑا اور اپنے آپ کو مکان کے صحن میں کھڑا پایا۔ کملائے مسکراتے ہوئے پانی کا ایک لوٹا لا کر اسے پکڑا دیا۔ اس کے بعد ––– اس کے بعد وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔

کسان

از:-
انجم جامی

بھوک کا پروردہ فاقہ مست گلہ بان کساں ——— صفحۂ ہستی پہ جیسے ایک مبہم سا نشاں
محنتِ پیہم سے بیچارے کے ہے ہونٹوں پہ جاں ——— دھوپ کی سختی بھی کیا ہے الحفیظ و الاماں
خال و خط بے نور چہرہ مضمحل زار و نزار ——— خشک لب بکھرے ہوئے بالوں پہ کچھ گرد و غبار
ہائے کتنی ہے کساں کی زندگی حسرت فروش ——— کس قدر عبرت فزا ہے سیلِ غربت کا خروش
ہائے کتنا تلخ تر ہے جامِ صہبائے حیات ——— کس قدر ہول آفریں ہے جوشِ سودائے حیات
داستانِ حادثاتِ آب و گِل کس سے کہے ——— رازِ دل کس کو بتلائے حالِ دل کس سے کہے
ہمنشیں کوئی نہیں اور ہم نوا کوئی نہیں ——— سچ تو یہ ہے اس کا جُز ذاتِ خدا کوئی نہیں
دلرُبا کس کو کہے، درد آشنا کس کو کہے ——— ڈوبتی کشتی کا اللہ ناخدا کس کو کہے
اے فلک تو ہی بتا تیرا کوئی مقصد بھی ہے ——— تیرے جور و ظلم کی آخر تو کوئی حد بھی ہے
سیلِ دریا ایک جانب کو کبھی بہتا نہیں! ——— ایک حالت پر نظامِ دہر بھی رہتا نہیں
چھا چکا ہر ذرّۂ ہستی پہ رنگِ اضطراب ——— جلد اُٹھے گی زمانے سے صدائے انقلاب
انقلاب، اب آسماں کی دھاک مٹ جانے کو ہے ——— غم نہ کر انجمؔ زمیں پر انقلاب آنے کو ہے

سچ تو یہ ہے اس قیامت کی سحر ہونے کو ہے
یہ نظامِ زندگی زیر و زبر ہونے کو ہے

نقد و نظر

سچی کہانیاں

از:- پریم پجاری
ضخامت:- ۲۲×۲۹/۱۶ ۲۷۲ صفحات قیمت تین روپے۔ناشرین:- کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی،

۱۹۳۴ء میں ڈاکٹر عندلیب شادانی (ڈھاکہ یونیورسٹی) نے "پریم پجاری" کے فرضی نام سے "ساقی" مرحوم میں سچی کہانیوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔جو عوام میں بہت زیادہ پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا۔اب یہ کہانیاں کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔فاضل مصنف کا بیان ہے کہ ان کہانیوں میں انھوں نے اپنی اور دوسروں کی زندگی کے بعض اہم اور غیر معمولی واقعات صاف ستھری اُردو میں بلا کم و کاست بیان کر دیئے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض باتیں غیر معمولی ہونے کی وجہ سے "غیر فطری" نظر آتی ہیں۔لیکن ڈاکٹر صاحب عذر خواہی کے طور پر لکھتے ہیں۔ "واقعات میں کتر بیونت کر کے اس عیب کو بڑی آسانی سے مٹایا جا سکتا تھا۔لیکن میں نے صداقت کا خون کرنا کسی حال میں گوارا نہیں کیا۔"بہرحال فاضل افسانہ نگار کی یہ جرأت لائق داد ہے کہ انھوں نے افسانہ نویسی میں بھی صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اس طرح اپنی کہانیوں میں وہ عنصر پیدا کر دیا ہے جس کی بنا پر حقیقت افسانے سے بھی زیادہ دلچسپ نظر آنے لگتی ہے۔ممکن ہے فاضل افسانہ نگار کا طرزِ بیان آرٹ کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکے لیکن جہاں تک عاشقانہ جذبات و احساسات کی تصویر کشی کا تعلق ہے یہ کہانیاں عوام میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل کر سکتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین اس مجموعہ کے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں گے۔

سودائی

از رشید اختر ندوی۔ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ ۲۲۳ صفحات
قیمت دو روپے۔ناشرین:- اُردو بک سٹال لاہور

گزشتہ چند برس سے اردو ادب کا رجحان مختصر افسانہ نویسی کی طرف رہا ہے۔لیکن خوشی کی بات ہے کہ اب اچھے اچھے لکھنے والے "پھر ناول نگاری" کی جانب مائل ہو رہے ہیں۔"سودائی" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اس ناول میں بورژوا سوسائٹی کی زندگی پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ پڑھنے والے کو نہ تو امرا کے طبقہ سے نفرت پیدا ہوتی ہے نہ وہ اس کی مغربی سج دھج اور آزادہ روی کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔لائق ناول نویس کا اسلوب تحریر صد درجہ سادہ اور دلنشین ہے۔بحیثیت مجموعی اس ناول کے

از:-
ادارہ

کامیاب ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

ربطِ شکستہ

مرتبہ:- ابوالقلم دبیر
صفحات ۱۶۵۔ضخامت ۲۷×۱۷،
قیمت:- عہ ناشرین:- ادارہ نشر اردو محبوب پورہ حیدرآباد دکن

یہ حیدرآباد دکن کے پانچ نوجوان ادیبوں کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ہر افسانہ کسی نہ کسی خوبی کا حامل ہے۔بحیثیت مجموعی یہ انتخاب تحسین و تبریک کا مستحق ہے۔اگر افسانہ نویسوں کی حوصلہ افزائی کی گئی تو امید ہے آئندہ بھی وہ بہترین چیزیں پیش کر سکیں گے۔قارئین اوپر کے پتہ سے طلب کریں۔

آرسین لوپن جاسوس

ترجمہ:- منشی تیرتھ رام فیروزپوری
ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۲۰۔قیمت تین روپیہ۔ناشرین:- لکشمن دیو نانگیہ تاجر کتب راولپنڈی

آرسین لوپن ایک جاسوس تھا جس کے حیرت انگیز کارناموں نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی۔اس ناول میں اس کی زندگی پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔جو لوگ جاسوسی ناولوں کے شائق ہیں انھیں یہ ناول ضرور پڑھنا چاہیئے۔

سیہ کاران اعظم

ترجمہ:- منشی تیرتھ رام فیروزپوری
ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶۔قیمت ۱۲/ عہ
ناشرین:- لکشمن دیو نانگیہ تاجر کتب راولپنڈی۔

اس کتاب میں ان اشخاص کے حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں جو بدکاری و بدقماشی کی طرف مائل ہو کر بدنام ہوئے۔مجرمانہ ذہنیت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید رہے گا۔

مغرب کی حسین اور گنہگار عورتیں

ترجمہ:- منشی تیرتھ رام فیروزپوری ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶۔ ۱۲۰ صفحات قیمت ایک روپیہ
ناشرین:- لکشمن دیو نانگیہ تاجر کتب راولپنڈی۔

اس مجموعہ میں یورپ کی چھ ایسی سیاہ کار عورتوں کی داستانیں بیان کی گئی ہیں جن کے دامِ تزویر کا سلسلہ شاہان یورپ کے درباروں تک وسیع تھا۔کہانیاں بالعموم دلچسپ اور عبرت انگیز ہیں۔

(ع۔ق)

ایک اور کامیاب سال
۱۹۴۴ء
کے نئے بیمہ جات

۹۵۰۰۰۰۰۰ روپیہ سے زاید رقم کے لئے ہیں اور کفالت کے سلسلہ میں عوام الناس کے اعتقاد اور بڑھتے ہوئے اعتماد کا ثبوت ہیں جو ہندوستان کی سب سے بڑی اور مضبوط ترین بیمہ زندگی کی کمپنی

اورینٹل
گورنمنٹ سیکورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

بہم پہنچاتی ہے

صدر دفتر:۔ بمبئی — قائم شدہ ۱۸۷۴ء

برانچ سکریٹری:۔ دیوان گوپال داس سونی۔ ایف سی۔ آئی۔ ایف آر۔ ای۔ ایس (لندن)

۴۷۔ سی۔ دی مال۔ لاہور

مفت منگائیے

نیوگولڈ اور زیورات کے ایجنسی کے لئے ہر شہر و قصبہ میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ شرایط ایجنسی بالکل مفت منگائیے چوڑیاں۔ کانٹے۔ انگوٹھیاں اور لاکٹ وغیرہ زیورات کے نمونے بھی طلب کرنے پر ارسال کئے جاتے ہیں —

نیوگولڈ ورکس لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۲۴ (اے ایل) لاہور

JOIN THE INDIAN AIR FORCE

AND LEARN A TRADE



Apply to the nearest Technical Recruiting Office.

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی معیاری ماہناموں میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۱۴ فہرست مندرجات ستمبر ۱۹۴۲ء نمبر

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر [illegible]

مُلاخطات

" عالمگیر" کو حسب ضرورت کاغذ نہ ملنے کی وجہ سے جن ناقابل بیان دقتوں کا سامنا ہو رہا ہے اس سے قارئین ناواقف نہیں ہیں تاہم میسرز بنسی دھر کپور اینڈ سنز نے ہماری مشکلات کو کسی حد تک آسان بنا دیا ہے۔ چنانچہ گزشتہ ماہ سے جو کاغذ زیر استعمال ہے اس کا ایک حصہ اسی فرم نے مہیا کیا ہے۔ ہم میسرز بنسی دھر کپور اینڈ سنز کی کرمفرمائی کے ممنون ہیں۔ اور اس اندھیر گردی کے زمانہ میں ان کے دیانتدارانہ طرز عمل کو بہت زیادہ تعریف و توصیف کا مستحق سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم ان سے پرزور استدعا کرینگے کہ وہ عالمگیر کے لئے دیسی کاغذ کی زیادہ سے زیادہ مقدار وقف کرنے کی کوشش کریں تاکہ انھیں بھی علم و ادب کی خدمت میں شریک ہونے کا موقع مل سکے اور جنگ کے بعد جب قدرتی طور پر کاروبار میں توسیع ہوگی وہ ہمارے بہترین تعاون کے مستحق ہو سکیں۔

زیر نظر اشاعت مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ علمی و ادبی مضامین کا افتتاح حضرت مولٰنا ظفر علی خاں کے "حقائق و معارف" سے ہوتا ہے جس میں مولٰنا نے علامہ اقبال کے ایک شعر کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ اسلام قومی تعصب اور نسلی امتیاز کا قائل نہیں ہے — "سلطان محمد فاتح"، "سیرت نگاری" اور "مسلمانوں کا ذوق تصنیف" بھی اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت زیادہ حقیقت افروز مقالے ہیں۔ افسانوں میں "صاعقہ"، "رومال کا شعر"، "بیوقوف"، اور "حباب" ترقی یافتہ افسانہ نویسی کے قابل قدر نمونے ہیں۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور دونوں سگی بہنیں ہیں۔ دونوں کی افسانہ نویسی غالبًا ایک ساتھ شروع ہوئی لیکن حیرت کی بات ہے کہ دونوں کی رفتار ترقی بھی یکساں ہے اور دونوں نہایت خاموشی سے افسانہ نویسی کے میدان میں آگے قدم بڑھاتی ہوئی جا رہی ہیں۔ اگر ان کی مشق جاری رہی تو وہ اردو ادب میں اپنے لئے بہت جلد امتیازی جگہ پیدا کر لیں گی۔ حمید صحرائی کے تیور بھی بتا رہے ہیں کہ ان کی افسانہ نویسی کا مستقبل بہت زیادہ درخشاں ہے۔ عزیز احمد غالبًا پہلی مرتبہ محفل عالمگیر میں شریک ہو رہے ہیں لیکن ان کی تحریر پختہ مشقی کی آئینہ دار ہے۔ حصہ نظم میں اساتذہ کے دوش بدوش نوجوان شعرا کا تازہ کلام بھی شامل ہے۔ (ادارہ)

عالمگیر اکتوبر ۱۹۴۳ء

عالمگیر کی آئندہ اشاعت کن علمی و ادبی خصوصیات کی حامل ہوگی؟ اس کا اندازہ ذیل کی مختصر فہرست مضامین سے کیجئے۔

جواہر ریزے	مولٰنا ظفر علی خاں
طوفان نوح	حضرت نوح ناروی
آج عید ہے	(افسانہ) محترمہ ہاجرہ مسرور لکھنو
تشطیر	حضرت محمود اسرائیلی
احمد شاہ ابدالی	مولوی نور احمد خاں فریدی
ہلال عید	حضرت شفیق کوٹی
سونے کے کھلونے	(افسانہ) جناب اختر ملیح آبادی
سوز و ساز	حضرت اعجاز صدیقی
ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات	جناب پیر غلام دستگیر نامی
میں ہوں	حضرت عاصم جےپوری
نفرت	(افسانہ) محترمہ شفیق بانو نجیب
مزار ٹیپو سلطان	حضرت عصری جیکنگلوری
ٹوٹے ہوئے تارے	(افسانہ) حضرت بدر ازند
غزل	حضرت لطیف انور گورداسپوری
سر یوں کی کہانت	جناب شیخ غلام محی الدین

علاوہ ازیں

مشاہیر شعرا کا تازہ کلام - اخبار و افکار

نقد و نظر

تین خاص نمبر مفت

حاصل کرنے کیلئے سال بھر کی خریداری قبول کیجئے

سالانہ صرف پانچ روپے صہ

ادارۂ عالمگیر - لاہور

اخبار و افکار

اصلاح ادب کانفرنس

اُردو ادب ایک عبوری دَور سے گزر رہا ہے۔ عملی ترقی و ارتقا کو ایک ہولناک انقلاب کا سامنا ہے۔ سائنسی نقطۂ نگاہ تبدیل ہو چکا ہے۔ پرانے نظریے نئے سانچوں میں ڈھالے جا رہے ہیں اور تہذیب و تمدن کا قصر رفیع نئی بنیادوں پر استوار ہو رہا ہے۔ اس برق آسا تغیر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اکثر کہنہ مشق ادیب اور شاعر بوکھلا گئے ہیں اور حالات پر قابو پانا ان کے بس کا روگ نہیں رہا۔ چنانچہ وہ جادۂ مستقیم سے بھٹک کر گمرہی و ضلالت کی تاریک ترین وادیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ بعض مغرب گزیدہ افسانہ نویسوں نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر اس آلائش کو دنیائے ادب میں بکھیرنا شروع کر دیا ہے جس سے یورپی ادب کا دامن صدیوں تک آلودہ رہا ہے۔ جو مبتدی شعر پر عبور حاصل نہیں کر سکے اور عربی و فارسی شاعری سے یکسر نابلد ہیں انہوں نے آزاد شاعری کا کاغذی ڈھول پیٹنا شروع کر دیا ہے، اور جو کچھ ان کے ذہن میں آتا ہے اسے صفحۂ قرطاس پر اگل کر "جدید شاعری" کے نئے نمونے بنانے میں مصروف ہیں۔ ان کی پشت پر چونکہ پراپیگنڈے کا ہتھکنڈا ہے اس لئے ان کا "سٹنٹ" بڑی حد تک کامیاب ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا اس قسم کا ادب انفرادی اور اجتماعیت کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا فحش کہانیاں اور عریاں ... انسانی دماغ پر کوئی خوشگوار اثر ڈال سکتی ہیں؟ کیا مغربی انداز ہندوستانی ذہنیت کے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے؟ کیا ترقی پسندی ... زندگی کر یونان اور فرانس کے اُس دَور کی یاد تازہ ... جب عریاں نویسی ہی کو معیار ادب خیال کیا جاتا تھا؟ اگر ہرگز نہیں تو کیا ارباب ذوق سلیم کا یہ اولین فرض نہیں کہ وہ ... جدید رجحانات کی شدت سے مخالفت کریں۔ اور اپنی آہنی ... سے اس بچہ افعی کی گردن مروڑ کر رکھ دیں؟ ہمیں دیکھ کر مسرت ... کہ بعض اخبارات و رسائل اور علمی و ادبی مجلسوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو رہا ہے اور انھوں نے اُردو ادب کے مضرت رساں رجحانات کے خلاف صف آرا ہونا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں بمبئی میں راجہ صاحب محمود آباد کی زیر سرپرستی "اصلاح ادب کانفرنس" کے نام سے ایک جلسہ ہوا۔ جس میں مشرقی و مغربی علوم کے ماہرین اور شعراء و ادباء شریک ہوئے۔ اس جلسے میں بے قافیہ شاعری کی شدید مذمت کی گئی اور اس ادب کو ہندوستانی دماغ کے لئے مہلک قرار دیا گیا جو "جدید" اور "ترقی پسند" کے فریب کارانہ ناموں سے پرورش پا رہا ہے چنانچہ جناب ماہر القادری (صدر جلسہ) نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا —

"ہم محتسب نہیں ہیں۔ دنیا میں ہر شخص کو اپنے ذاتی خیالات و تصورات کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ مگر شاعری کی سطح دل آزاری سے ہمیشہ بلند رہی ہے۔ قدیم مادہ پرست اور دہریئے شاعروں نے بھی کہیں کہیں چھینٹے اڑائے ہیں۔ مگر گندگی نہیں اچھالی۔ لیکن آج خدا اور مذہب کی توہین کو سٹیج پر لا کر دل آزارانہ ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ یہ ادبی اور علمی جلسہ ہے ورنہ میں بتاتا کہ خدا اور مذہب کے ماننے والے عقلی دلیلیں رکھتے ہیں۔ اور وہ عقلیت کی منزل میں امیر کارواں ہیں۔

اُردو زبان کا ایک خاص مزاج ہے اور اس کا مزاج بہت سی جدتوں کو قبول نہیں کر سکتا۔ عربی اور فارسی کی بہت سی مزاحف بحروں کو اُردو شاعری نے قبول نہیں کیا۔ بلینک ورس اُردو شاعری کے ساتھ مذاق ہے۔ شعر و ادب میں آسانی ڈھونڈنے والی طبیعتیں آرٹ کی بلندیوں اور نزاکتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ شعر و ادب کے بعض بنیادی تصورات ناقابل تبدیل ہیں۔ دنیا کی ہنگامی تحریکوں کے پیمانے سے شعر و ادب کو ناپنا چاہیئے۔ پابندیوں اور قیدوں سے چھٹکارا ممکن نہیں اس عالم اسباب اور کائنات کے گل میں قدم قدم پہ پابندیاں موجود ہیں ہر قید اور ہر پابندی توڑی نہیں جا سکتی ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے ادب کی گمراہی زندگی کی گمراہی ہے زبان و ادب کی گمراہی اور بے راہ روی پر اُردو کے دردمند خاموش نہیں رہ سکتے۔ یہ آواز جو بھیگی ہوئی رات کے پرسکون لمحوں میں باب الہند سے بلند ہو رہی ہے ہندوستان کے ہر گوشہ سے اس کی بازگشت آنی چاہیئے۔"

آخر میں مندرجہ ذیل قرار دادیں باتفاق رائے منظور کی گئیں۔

(۱) اُردو اصلاح ادب بمبئی کا یہ جلسہ عام اس جدید شاعری سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے جس میں خدا اور مذہب کی دل آزارانہ توہین کی جاتی ہے۔ اس قسم کی شاعری زبان۔ اخلاق، ادب، انسانیت اور شاعری کے عالمگیر "بنیادی تصور محبت" کو نہ صرف مجروح بلکہ بدنام کرتی ہے۔

(۲) یہ جلسہ ترقی پسند ادب کے اس عنصر کو اُردو زبان کے لئے انتہائی مہلک اور تباہ کن سمجھتا ہے۔ جو مہمل گوئی۔ الفاظ کے غلط استعمال اور زبان اُردو کی بنیادی روایات کی تخریب کے سوا کچھ نہیں۔

بلینک ورس کو اُردو شاعری کے مزاج ساخت اور فطرت کیلئے ناساز گار مخالف اور مضر خیال کرتا ہے۔ اس قسم کی کوششوں کو [illegible]

خقایق و معارف!

علامہ اقبال کے گنجِ شائیگاں کا ایک موتی

از مولانا ظفر علی خاں

قطعاع الطریق یوں تو دنیا میں اور بھی ہونگے لیکن ہمیں اپنے اندازِ رہزنی پر ناز ہے۔ علامہ اقبال کے جواہر خانہ پر ہم نے پھر چھاپہ مارا اور مٹھی بھر جواہر لے ہی اُڑے۔ ہمارے ایک بھائی مولوی اسحٰق علی صاحب علوی نے جنہیں دنیا "ظفر الملک" کے پرشکوہ لقب سے جانتی ہے ہمیں اقوام جرائم پیشہ کا سردار بنایا ہے۔ یہ خطاب بالکل بجا اور برمحل ہے۔ اپنی اس خصوصیت کی اتنی شرح ہم اور کئے دیتے ہیں جس میں ہمارا رنگ دوسرے ڈاکوؤں سے الگ ہے کہ ہمارے ہم پیشہ دوست تو جو مال لوٹتے ہیں اُس کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگنے دیتے۔ لیکن ہم ہیں کہ لوٹ کا مال لٹانے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اور جو موتی کہیں سے ہاتھ آتے ہیں سر بازار سر پر نچھاور کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو مال ہمیں علامہ اقبال کے گنج شائیگاں سے ہاتھ آیا ہے۔ اُس کی لُٹس میں بھی ہم ناظرین کو برابر کا ساجھی بنانا چاہتے ہیں۔ ہماری شان ایثار ملاحظہ ہو۔

مسلمانوں کا خدا ایک ہے۔ رسول ایک ہے۔ روایات ایک ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ پرستار توحید اپنی شان نوعی د آنِ خصوصی میں جوہر فرد نہ ہو۔ مسلمانوں کا خدا لم یلد ہے ولم یولد ہے اور لم یکن لہٗ کفواً احد ہے۔ نہ وہ کسی کے صُلب سے پیدا ہُوا۔ نہ کوئی اُس کے صُلب سے پیدا ہُوا۔ نہ اُس کا کسی کے ساتھ رشتہ ناطہ ہے۔ پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی قومیّت کے پاؤں میں ولدیت اور رشتہ داری کے اُن علائق کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں جن کے بغیر دوسری قوموں کا شیرازہ بندھ ہی نہیں سکتا۔ مسلمان مسلمان اس لئے نہیں کہ اس کا باپ فلاں ہے اور ماموں فلاں ہے۔ یا وہ عرب میں رہتا ہے یا چین کا باشندہ ہے بلکہ وہ اس لئے مسلمان ہے کہ اس کا زاد بُوم توحید ہے۔ قرآن اُس کا گھوارہ ہے اور کائنات اس کی جولانگاہ ——! انھیں حقائق کا ترانہ لسان توحید نے اس طرح گایا ہے ؎

فارغ از باب وام و اعمام شو — ہمچو سلماں زادۂ اسلام شو
عشق ورزی از نسب باید گزشت — ہم ز ایران و عرب باید گزشت
ہر کہ پا در بند اقلیم وجد است — بے خبر از لم یلد، لم یولد است
مومنے بالائے ہر بالا ترے — غیرتِ او بر نتابد ہمسرے
آنکہ ذاتش واحد است ولاشریک — بندہ اش ہم در نسازد باشریک

صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے بھائی کا انتقال ہو گیا۔ آپ کو بھائی سے بے حد محبت تھی۔ بازو کی قوت کے ٹوٹ جانے سے دل پاش پاش ہو گیا۔ کلیجے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے

سینے میں درد کا ایک آتشیں طوفان اُٹھا جو زبان پر آکر آبلہ بن گیا۔ اس آبلہ کا زہراب اگر دجلہ و فرات کی موجوں پر ٹپکتا تو اُن پر تبخالے ہی تبخالے پیدا ہو جاتے۔ اس عالم گداز میں عبداللہ ابن مسعود نے ایک نوحہ کیا جسے ضسا جو ارثی العرب ہے اگر سن پاتی تو مدتوں سر دُھنا کرتی۔

جناب عبداللہ بن مسعود اگر دورِ جاہلیت کا تتبع کرتے تو بھائی کا بین کرتے وقت کہتے کہ ہائے یہ بھائی وہ بھائی تھا جس کا نیزۂ جوشن گداز ہزاروں نبرد آزمایانِ صف شکن کو ایک ہی وار میں چھید کر رکھ دیتا تھا۔ یہ بھائی وہ بھائی تھا جس کی سخاوت حاتم طائی سے بھی اس کے مرقد میں بھی داد و احسنت وصول کرتی تھی۔ ان نالوں سے جناب عبداللہ بن مسعود فضائے عرب میں ایک تلاطم بپا کر سکتے تھے۔ لیکن نہیں جاہلیت جا چکی تھی۔ اسلام آچکا تھا۔ اخوت و یگانگت کے پرانے عصبی رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ عبداللہ ابن مسعود اور اُن کے برادر مغفور کی یاد ان اقتدارات سے بالا ہو چکی تھی۔ عرش بریں کی سقف میں وہ یہ کہہ کر شگاف ڈالتے ہیں کہ ہائے اب میں نماز کی صف میں جا کر شریک ہونگا تو میرا بھائی میرے پہلو بہ پہلو نہ کھڑا ہوگا۔ ہائے رسول اللہ کے دربار میں جاؤں گا، تو اکیلا ہونگا، میرا بھائی میرے ساتھ نہ ہوگا۔

درد اسلامی کے اس دریائے زخار کی اس موج گوناگوں کو علامہ اقبال نے ایجاز کے بلیغ کوزے میں بند کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

عشق در جان و نسب در پیکر است
رشتۂ عشق از نسب محکم تر است

مولانا جامی نے بھی اس خیال کو اپنے رنگ میں خوب ادا کیا ہے ؎

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

لیکن اقبال کی پرواز تخیل بلند تر ہے۔ جامی نے محض ایک حقیقت بیان کر دی تھی۔ کہ عشق ذات کو نہیں پوچھا کرتا۔ اور نسب کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کا ثبوت بھی دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ عشق کے رُوئے دلآرام کو مشاطۂ نسب کی کیوں حاجت نہیں۔ اور ثبوت کیسا لطیف ہے کہ نسب کا تعلق تو صرف کالبد خاکی سے ہے جو بے اعتبار محض ہے لیکن عشق پیوندِ جان ہے۔ جو حقیقت اصلی ہے۔ پھر اُس کا رشتہ نسب کے مقابلہ میں کیوں نہ استوار ہو؟

امواجِ تغزل

آج خالی ہاتھ اٹھتے ہیں تری محفل سے ہم

از: حضرت سیماب اکبرآبادی

داد لینگے پردہ داری کی حجابِ دل سے ہم
ایک دن جب خود نکل آئینگے اس محمل سے ہم

ہاں نہیں ہیں مطمئن اس گرمیٔ محفل سے ہم
مطمئن کیا ہوں کہ واقف ہیں مزاجِ دل سے ہم

ماسوائے دل نہ خوش ہونگے کسی منزل سے ہم
دیر و کعبہ سے نہیں بچھڑے ہوئے ہیں دل سے ہم

کیا ضرورت ہے کہ ہو حسنِ حقیقت آشکار
جب الجھ جاتے ہیں اکثر جلوۂ باطل سے ہم

پھر حضورِ حسن بھی جائینگے سجدوں کیلئے
آزمالیں سر ذرا سنگِ درِ محفل سے ہم

اے تن آسانی ہمارا دامنِ ہمت نہ کھینچ
مشکلوں کی حد تک آئے ہیں بڑی مشکل سے ہم

صبحِ محفل دیکھ کر فق کیوں ہوا چہرے کا رنگ
کیا نہ تھے آگاہ اب تک فطرتِ محفل سے ہم

ہم سے دامن کش ہے کیوں منزل سمجھ کر گردِ راہ
رہ نہ جائینگے لپٹ کر دامنِ منزل سے ہم

یہ ہوا معلوم تھے صدیوں سے محوِ بےخودی
دفعتاً چونکے جو آوازِ شکستِ دل سے ہم

شمع رکھ کر سامنے دیتے ہیں دل کو درسِ سوز
اک اثر لے آئے ہیں پروانۂ محفل سے ہم

ذہن میں ہیں جادۂ ہستی کے کچھ دھندلے نقوش
جیسے پہلے بھی کبھی گزرے ہیں اس منزل سے ہم

موج اٹھی ہے تو اب طوفاں سے کھیلیں گے ضرور
پیاس کیوں اپنی بجھالیں شبنمِ ساحل سے ہم

تا جہانِ حسن سے پیدا کوئی موسیٰ کریں
بجلیاں چمکاتے پھرتے ہیں سوادِ دل سے ہم

دل کشا، دل آزما، دلسوز، دلجو، دلنواز
دل ہے عالم ساز جو چاہیں بنالیں دل سے ہم

حادثاتِ نو کا اے سیماب اندیشہ نہیں
آجکل ٹکرا رہے ہیں اپنے مستقبل سے ہم

(دل و محفل کے مخصوص قوافی ہیں)

لیجئے دل کی نہ مانی اُٹھ چلے محفل سے ہم ——— یہ نہ سوچا آپ نے دل ہم سے ہے یا دل سے ہم
اب نہ دل مانوس ہے ہم سے نہ خوش ہیں دل سے ہم ——— یہ کہاں کا روگ لے آئے تری محفل سے ہم
از سرِ نو دل کی محفل کو سجانے کیلئے ——— اک نئی تصویر لے آتے ہیں ہر محفل سے ہم
ہائے وہ ہر سو نگاہی وہ جنوں وہ شورشیں ——— بیدلی یہ تو بتا پھر کب ملیں گے دل سے ہم
دل کے ٹکڑے خاک پروانوں کی آنسو شمع کے ——— کچھ نہ کچھ لیکر اُٹھیں گے آپ کی محفل سے ہم
اُن پہ بن جائے نہیں بنتی کوئی ایسی سبیل ——— یوں اگر چاہیں تو اک دنیا بنالیں دل سے ہم
غور کرنا ہے مآلِ شامِ محفل پر ہمیں! ——— چھان کر لائے ہیں کچھ خاکستر محفل سے ہم
دیکھئے اس خانہ ویرانی کا کیا انجام ہو ——— اپنی دنیا لیکے نکلے ہیں کسی کے دل سے ہم
بانیٔ محفل سلامت تیرا جبر و اختیار ——— آج خالی ہاتھ اٹھتے ہیں تری محفل سے ہم
دل میں حسرت آنکھ میں حیرت نظر میں محویت ——— ایک محفل لیکے اُٹھے ہیں تری محفل سے ہم
آؤ ڈھونڈیں پھر کہیں کھوئے ہوئے جلوے کلیم! ——— طور سے تم روشنی پھینکو سوادِ دل سے ہم
دیکھنا سیماب جنت میں ہماری نازشیں ——— پھر اسی محفل میں ہیں نکلے تھے جس محفل سے ہم

ہیں کہاں سیماب گہرائی کے موتی دستیاب
کچھ صدف پارے ہیں جو چن لائے ہیں ساحل سے ہم

صاعقہ

دلگداز کہانی

از محترمہ ہاجرہ مسرور لکھنوی

گلابی معطر لفافہ ——! میں نے سب سے پہلے اسی کو کھولا۔ کیونکہ تحریر کچھ شناسا سی معلوم ہوتی تھی۔ لکھا تھا۔

پیاری شاداں! شاد رہو۔

اُف تم نے تو سچ مچ بھلا دیا۔ یقین نہیں آتا کہ تم وہی شاداں ہو۔ جسے میرے بغیر ایک پل بھی چین نہ آتا تھا۔ سوچتی ہوں کہ تمہارے اس تغافل کا سبب تم ہی سے دریافت کروں اور وہ بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے۔ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو کرسمس کی چھٹیاں اسی گاؤں میں گزارو۔ اگر آجاؤ گی تو اور کچھ نہیں ماضی کی بے فکریوں کی یاد ہی تازہ ہوجائے گی۔ بولو کیا سچ مچ آؤ گی تم؟

تمہاری "صاعقہ"

صاعقہ! —— میری نظروں کے سامنے آج سے پانچ سال قبل کی زندگی آگئی۔ جب میں اور صاعقہ دنیا کی الجھنوں سے الگ تھلگ اپنی زندگی کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا سمجھتے تھے۔ کتنے اچھے تھے وہ دن ——! اسکول میں ہر وقت نت نئی شرارتیں اور پھر سزائیں کلاس میں برابر برابر بیٹھنا اور پھر بلاوجہ ہنسے جانا۔ جیسے ہماری زندگی کا وہ مختصر دور محض ایک قہقہہ تھا۔ ہاں صرف ایک قہقہہ جو فضا کی لاانتہا وسعتوں میں گم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد صاعقہ کی شادی اور ہماری آپس کی جدائی —— جیسے قہقہے کے بعد ایک دم گھونٹ دینے والی خاموشی ——!

اپنے کئی خطوط کے جواب نہ پاکر میں نے سمجھ لیا کہ صاعقہ ایک تعلقہ دار کی بیوی بن کر کچھ مغرور ہوگئی ہے۔ اس طرح میں نے اپنے دل میں سیکڑوں بدگمانیوں کو جگہ دیدی۔ لیکن آج صاعقہ کا خط پڑھ کر میں اس سے ملنے کے لئے بیقرار تھی۔ میں نے اسی وقت اُسے اپنی آمد کی تاریخ سے مطلع کر دیا۔

مجھے رات بھر اس تصور سے نیند نہ آئی کہ کل میں اپنی بچپن کی دوست سے ملوں گی۔ دوسرے دن صبح ٹرین مجھے لمحہ بہ لمحہ صاعقہ سے قریب کر رہی تھی۔ سُنا تھا کہ صاعقہ کا شوہر امیر و کبیر ہونے کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہے۔ پہلی بیوی دو بچیاں چھوڑ کر عین عالم شباب میں دنیا سے سدھاری۔ اس کے بعد صاعقہ کا آنچل شہاب سے باندھا گیا۔ میں نے سوچا صاعقہ یقیناً ایک قابل رشک زندگی بسر کر رہی ہوگی۔ کیونکہ میں نے اکثر بڑی بوڑھیوں سے سُن لیا تھا کہ دوہاجو کی بیوی اور بادشاہ کی گھوڑی جتنا بھی کود جائے اتنی تھوڑی راستے بھر اسی قسم کے خیالات میرے دماغ میں سرسراتے رہے۔

ٹرین سے اُتر کر میں صاعقہ کے ساتھ موٹر کی پچھلی سیٹ پہ آگئی۔ اور شہاب موٹر "ڈرائیو" کرنے لگا۔ وہ کبھی کبھی کوئی دلچسپ بات کہہ کر ہم دونوں کو ہنسا دیتا۔ خاصا خوبصورت اور دلچسپ آدمی تھا۔

اطمینان سے بیٹھنے پر میں نے غور سے صاعقہ کو دیکھا۔ وہ بہت زیادہ دُبلی ہو رہی تھی۔ اس کی بلند پیشانی پر غور و فکر کی سلوٹیں نمایاں تھیں۔ لیکن مسکراہٹ ——! وہ اب بھی اس کے خشک ہونٹوں پر تھرک رہی تھی۔

موٹر تیزی سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ہرے بھرے کھیتوں میں دیہاتی لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلتی دکھائی دیتی تھیں۔ صاعقہ میرے کندھے پر جھکی مسکرا رہی تھی۔ میں نے بغیر کسی خاص ارادے کے کہا۔ "بہت خوش ہو؟"

"ہاں آج خوش ہوں" وہ اس طرح بول اُٹھی جیسے کسی نے بے جانے بوجھے پیانو کے پردوں پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میں اس کے جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ موٹر ایک عالیشان کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔ سامنے برآمدے سے دو خوبصورت بچیاں دوڑتی ہوئی آئیں اور صاعقہ سے لپٹ گئیں۔ چھوٹی بچی نے منہ بنا کر کہا۔

"امی بڑی دیر کر دی"

صاعقہ نے اسے گود میں اُٹھا لیا۔ "پیاری زرینہ! دیکھو یہ تمہاری خالہ ہیں۔ اگر میں ان کو لینے نہ جاتی تو بھلا یہ کیسے یہاں تک آتیں۔ اوں ٹھیک ہے نا؟" شہاب صاعقہ کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"صاعقہ! تم نے یہ کس کی تصویریں لگا رکھی ہیں ہر طرف؟" دوسرے دن صبح بستر پر بیٹھے لیٹے میں نے ایک ہی عورت کی مختلف تصویریں لٹکتی دیکھ کر پوچھا۔

وہ تولیہ سے مُنہ پونچھتے پونچھتے ایک دم رک گئی۔ اور سامنے لٹکتی ہوئی بڑی سی تصویر پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈال کر بولی۔

"میں نے؟ شاداں! اگر میرا بس چلتا تو میں یہ سب فریم چولھے میں جھونک دیتی"

"تو پھر یہ کس کا بس ہے جو ہر طرف دکھائی دے رہا ہے؟"

"تمھارے دولھا بھائی کا"

"یہ ہے کون؟"

"ان کی پہلی بیوی شاہینہ"

میں ذرا دیر کے لئے الجھن میں پڑ گئی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ صاعقہ جیسی بیوی پاکر شہاب کو کیا سوجھی جو مرحوم شاہینہ کی اتنی بہت سی تصویریں ہر طرف لگا دیں۔ میں نے کہا۔

"تمھارے ہوتے ہوئے ان کی کیا ضرورت تھی؟"

"نہیں یوں کہو کہ ان کے ہوتے ہوئے میری کیا ضرورت تھی؟"

"پاگل نہ بناؤ۔ وہ ہے کہاں؟ اس کو مرے ہوئے بھی چھ سال گزر گئے ——!"

"نہیں شاداں وہ زندہ ہے اور اس وقت تک زندہ رہیگی جب تک کہ صاعقہ نہ مر جائے۔ ارے ان باتوں کو چھوڑو۔ اٹھو مُنہ ہاتھ دھو ڈالو۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"

وہ جلدی سے کمرے کے باہر ہو گئی اور میں سوچ میں پڑ گئی۔

ایک دن شام کو میں اور صاعقہ کوٹھی کے پائیں باغ میں ٹہل رہے تھے۔ میں برابر ادھر اُدھر کی باتیں کئے جا رہی تھی۔ لیکن صاعقہ کچھ کھوئی ہوئی سی تھی۔ وہ میری باتوں کا جواب ہوں، ہاں سے دیتی تھی۔ میں نے اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"صاعقہ! تمھاری زندگی کتنی خوشگوار ہے۔ مجھے تو رشک ہوتا ہے"

"ہاں! ہر چمکتی ہوئی چیز کو دُور سے دیکھ کر سونا سمجھ لینا فطرت کا خاصہ ہے" وہ گلاب کا ایک بڑا سا پھول تکتے ہوئے آواز میں بولی۔

"لیکن میں تو بہت قریب سے دیکھ رہی ہوں"

"اچھا کبھی تم نے اس چیز کو کسوٹی پر بھی کسا؟ کہہ دو نہیں —— پھر بھی تم دعویٰ کرتی ہو کہ وہ چیز سونا ہی ہے —— کتنی ناسمجھی —! کتنا بھولا پن ——!"

وہ آہستہ آہستہ راہ پر آ رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ صاعقہ ضرور مجھ سے کھلے گی۔ اس لئے میں خاموش رہی۔ دفعتہً اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا۔ دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ اس کی ہتھیلیوں سے آگ نکل رہی ہے۔

"تم کو بخار ہے صاعقہ! یہ کیا ہو رہا ہے تمھیں؟" میرے دل میں ایک ٹیس سی ہونے لگی کہ کاش میں کچھ جان سکتی۔

"اُف! خدا کے لئے شاداں تم مجھے یہ یاد نہ دلاؤ کہ میں زندہ ہوں" اس کی آنکھیں آنگوں ہو گئیں۔ اتنے میں زرینہ آ گئی اور اس سے اندر چلنے کو کہنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ زرینہ کو گود میں اٹھاتے ہوئے اس کے چہرے پر انتہائی بیزاری تھی۔ لیکن وہ بظاہر مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"اندر آؤ۔ سردی بڑھ گئی ہے"

لیکن میں وہاں سے نہ اُٹھ سکی۔ صاعقہ کی حالت میرے لئے ایک معمہ سے کم نہ تھی۔ جسے حل کرنے سے میں قاصر تھی۔

دوسرے دن صبح جو میں اُٹھی تو دیکھا صاعقہ اب تک لحاف میں لپٹی پڑی ہے۔ حالانکہ وہ بہت سویرے اٹھنے کی عادی تھی۔ میں نے اسے جگانا چاہا لیکن جیسے ہی میرا ہاتھ اس کے بازو سے مس ہوا میں کانپ کر رہ گئی۔ اسے بہت تیز بخار تھا اور وہ تقریباً بیہوش تھی میں نے جلدی سے شہاب کو مطلع کیا تو وہ خود ہی موٹر لے کر ڈاکٹر کو لینے چلا گیا۔ میں دوبارہ صاعقہ کے پاس آ گئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ وہ بیماری کی حالت میں بھی کتنی حسین معلوم ہو رہی تھی اس کے بکھرے بکھرے بالوں میں اس کا چہرہ بخار کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ وہ کتنی حسین تھی۔ لیکن کتنی دکھی!

شہاب مع بوڑھے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح معاینہ کیا اور نسخہ لکھ کر جانے لگا۔ شہاب اس کے ہمراہ تھا، میرے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ میں بھی ان کے پیچھے ہولی۔

"انہیں کیا ہو گیا ڈاکٹر؟" شہاب نے چلتے چلتے سوال کیا۔

"دق —— افسوس آپ نے بہت دیر میں علاج کی طرف توجہ دی"

"لیکن آج سے پہلے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا تھا —— وہ بظاہر

تو تندرست تھیں ؟"

"جی ہاں! یہ بیماری چپکے چپکے جسم پر قبضہ کر لیتی ہے اور جب ظاہر ہوتی ہے تو تدارک تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔" بوڑھا ڈاکٹر اپنے لمبے لمبے بازو ہلاتا ہوا جا رہا تھا۔

میرے پاؤں کانپنے لگے اور میں نے بڑھ کر دیوار کا سہارا لے لیا شہاب جب ڈاکٹر کو پہنچا کر آیا تو اس کے چہرے پر اندوہ وملال کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا صاعقہ کے کمرے میں چلا گیا۔ اور میں ایک بار پھر سخت کشش و پنج میں پڑ گئی۔

میری چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ میں صبح کی ٹرین سے گھر واپس جانے والی تھی۔ رات کو صاعقہ کی حالت کچھ درست تھی۔ اس نے بہت اصرار سے مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ میں نے کہا۔

"صاعقہ! یہ تمھیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں" وہ خشک سی ہنسی ہنس دی۔

"تو پھر یہ بخار کیسا ہے؟"

"کوئی نیا نہیں"

"لیکن دولہا بھائی تو کہتے تھے کہ ایسا بخار انھیں کبھی نہیں آیا!"

"اوہ، وہ کیا جانیں۔ مرد تو کچھ بھی نہیں جانتے"

"صاف صاف بتاؤ صاعقہ۔ میں تمھاری بچپن کی دوست ہوں"

"پہلے یہ بخار میری روح کو جھلستا رہا۔ اور اب اگر اس نے جسم کو بھی لپیٹ میں لے لیا تو کیا ہوا؟"

"مجھ سے پہیلیاں نہ بجھواؤ" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"اتنی بھولی نہ بنو" وہ مسکرا دی۔

"کیا تمھیں دولہا بھائی سے کوئی شکایت ہے؟"

"ہاں!" اس نے اپنی نظریں چھت سے لگا دیں۔

"کیا شکایت ہے تمھیں؟"

"وہ مجھے نہیں چاہتے"

"پاگل ہو گئی ہو یا تمھاری آنکھیں......"

"میں نے نہ کہا تھا کہ ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھنا انسان کی فطرت ہے"

میں شرمندہ ہو گئی۔

وہ دوبارہ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

"تم نے سنا ہو گا کہ وہ مجھے شاہینہ کہتے ہیں؟"

"سنا تو ہے!"

"تم دیکھتی ہو کہ مجھے لڑکیوں سے کیسا سلوک کرنا پڑتا ہے"

"بالکل ہاں کا سا" میں نے جواب دیا۔

"تم نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ اس گھر کے چپہ چپہ پر شاہینہ حکم اس نے جو چیز جہاں رکھ دی تھی آج بھی وہ اسی جگہ ہے۔ یہ اتنی مجال نہیں کہ میں کسی قسم کا ردو بدل کر سکوں۔ اب میرے بھی وہی ہیں جو کبھی شاہینہ کے تھے۔ مجھے سب شاہینہ کہتے ا سمجھتے ہیں۔ لیکن آہ میری روح شاہینہ کی روح نہ بن سکی" اس آواز بھرا گئی۔ ذرا دیر بعد بولی۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں کہ بظاہر شاہینہ بن جانے میں مجھے اپنی داری کو کس درجہ کچلنا پڑا۔ شاہینہ مرنے کے بعد بھی زندہ۔ صاعقہ جیتے جی مر گئی۔ یہ احساس کس درجہ روح فرسا ہے۔ کاش مجھ سے سب کچھ چاہتے لیکن مجھے صاعقہ سمجھ کر ——— کاش ——— کا اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میں اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن میرا گلا رندھنے اور میری آواز نے الفاظ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ محبت ہمدردی کے ملے جلے جذبات نے میرے دماغ کو سُن کر دیا۔ اور آنکھوں سے آنسو ٹپک کر صاعقہ کی گرم پیشانی پر چمکنے لگے۔ مجھے روتا دیکھ کر بولی۔

"۔۔ تمھاری ہمدردی کا شکریہ! میری دوست۔ لیکن دل آگ آنسوؤں سے تو بجھنے سے رہی ——— جاؤ اب سو رہو۔ سفر کرنا ہے"

میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے پلنگ پر جا پڑی پھر تمام رات تکیوں میں منہ چھپا کر چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔

"آہ مرد کی وفا شعاری بھی کتنی مہلک ہوتی ہے"

میں جانے کے لئے تیار ہوئی تو صاعقہ بھی باوجود منع کرنے مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آئی۔ میرے ٹرین میں سوار ہونے سے کہنے لگی۔

"اب تو شاید ملاقات نہ ہو"

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا "نہیں، میں گرمیوں کی چھٹیاں بھی تمھارے ساتھ گزاروں گی"

"چھٹیوں کو تو پانچ مہینے ہیں اور ان پانچ مہینوں میں

جانے کیا سے کیا ہو جائے گا "

میرا دل ڈوبنے لگا۔ ٹرین نے سیٹی دی اور میں اپنے دل پر جبر کرکے سوار ہو گئی۔ گاڑی رینگی اور جیسے میرا دم گھٹنے لگا۔ میں دُور تک صاعقہ کا ہلتا ہوا رومال دیکھتی رہی۔

گھر پہنچ کر میں برابر صاعقہ کے نام خطوط لکھتی رہی۔ اس کے خطوط سے معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ رو بصحت ہے۔ میں ہر خط میں بند بند الفاظ میں اسے تسلیاں دیا کرتی۔ جس کے جواب میں ایک بار اس نے لکھا۔

" شاداں! تمھارے تسلّی آمیز خطوط مجھے ایسی سنہری دنیا میں پہنچا دیتے ہیں جہاں میں ہی میں ہوں۔ شاہینہ نہیں۔ لیکن جب میری نظریں ہر طرف لٹکتی ہوئی تصویروں سے ٹکراتی ہیں تو میں پھر خود کو اسی جہنم میں پاتی ہوں جہاں میں شاہینہ کی تصویروں کے شکنجے میں جکڑی پڑی ہوں۔ لیکن میں یہ سب زیادہ دن برداشت نہ کر سکوں گی۔ آج کل بخار پھر تیز رہنے لگا ہے۔ دوا پیتی ہوں، لیکن فائدے کے خیال سے نہیں۔ کیونکہ ایسی بیماریوں کا علاج بھی رسماً کیا جاتا ہے۔ گھر میں سب کو سلام۔" تمھاری صاعقہ "

اس کے بعد اس کا کوئی خط نہ آیا۔ میں نے پے در پے خطوط لکھے لیکن جواب کی تمنا ہی رہی۔ دو مہینے انتظار میں گزر گئے

آخر سخت بے چین ہو کر اپنے وہاں پہنچنے کا تار دے دیا۔

اسٹیشن پر میری نظریں شہاب کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن خلاف امید شوفر رحیم مجھے لینے آیا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔ "صاعقہ کیسی ہے؟"

اس کی آنکھیں بھر آئیں اور میں سر تا پا کانپ اٹھی۔

"کیا بتاؤں مس صاحب! حالت خراب تھی۔ اٹھنے بیٹھنے کی سکت نہ تھی۔ لیکن پچھلے جمعہ کی رات کو نہ جانے کیوں اٹھ کر بیٹھ گئیں اور مرحوم بڑی بہو کی میز پر رکھی ہوئی تصویر کو دیکھتی رہیں۔ پھر نہ جانے کیا دل میں سمائی کہ دوڑ کر گئیں اور تصویر اٹھا کر زمین پر پٹک دی۔ لیکن زور میں خود بھی گریں اور جب صاحب نے انھیں اٹھایا تو وہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں "

میری آنکھوں کے آگے ہر چیز گھوم رہی تھی۔ اور میرا دماغ ریل کے انجن کی طرح سنسنا رہا تھا۔ میں بمشکل ویٹنگ روم تک جا سکی۔ پھر مجھے اس وقت ہوش آیا جب ٹکٹ چیکر نے مجھ سے ٹکٹ مانگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

" لکھنؤ گاڑی کس وقت جائے گی؟"

" ساڑھے تین بجے " یہ کہہ کر وہ چلدیا۔

میں پھر کوچ پر پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔

توبہ

حسن کی خود نمائیاں توبہ — آئے دن کج ادائیاں توبہ
حسن ہے یا خدا کی قدرت ہے — اُس کی معجز نمائیاں توبہ
تجھ کو میری وفا کی قدر نہیں — اُف تری بیوفائیاں توبہ
رہ گئی آگ بن کے فطرتِ عشق — حسن کی شعلہ زائیاں توبہ
میری قسمت کے بل نکل نہ سکے — آپ کی کج ادائیاں توبہ
گھس گیا اُن کا سنگِ در آخر — راز کی جبہ سائیاں توبہ

بچل شاہ۔ راز

ایک خاتون کی فرمائشی کہانی

از:-
حضرت آثمی حیدرآبادی

اپنے غم کی داستاں کس سے کہوں
دردِ جانِ خستہ جاں کس سے کہوں
میں بھی آخر رکھتی ہوں منہ میں زباں
ہاں زباں میری بھی ہے آتش بیاں
آہ کوئی سننے والا ہی نہیں
اس اندھیرے میں اُجالا ہی نہیں

بالبِ دمسازِ خود گر جفتمے
ہمچو نے من گفتنیہا گفتمے

آہ جب دنیا میں میں پیدا ہوئی
خلق میری شکل پر شیدا ہوئی
رنگ لایا چاند سا مکھڑا مرا
سب کو بھایا چاند سا مکھڑا مرا
بھولی صورت کا ہر اک دیوانہ تھا
میرے رخ کا شمع بھی پروانہ تھا
تھی خبر مجھکو نہ صبح و شام کی
پل رہی تھی گود میں آرام کی
آنکھ تاروں سے لڑاتی تھی کبھی
چاند ماموں کو بلاتی تھی کبھی
بعد جنبش و ناز میں پلنے لگی
ہنستے ہنستے گھٹنیوں چلنے لگی
خوش ہوئے ماں باپ میری چال پر
سب کو حال آتا تھا میرے قال سے
بھولی باتیں جب سنا دیتی تھی میں
رونے والوں کو ہنسا دیتی تھی میں
ہر گھڑی رہتا تھا چشمِ بد کا ڈر
روز مجھ پر سے اُترتی تھی نظر
[illegible] مناتے تھے مجھے
سب سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے مجھے
[illegible] جان سے پالا مجھے
ہاں بڑے ارمان سے پالا مجھے

یوں ہی میرے رات دن کٹتے رہے
میں بڑھی دن عمر کے گھٹتے رہے

رفتہ رفتہ شکل انسانی ہوئی
ہوتے ہوتے تسمیہ خوانی ہوئی
کام اتنا پھر کیا کرتی تھی میں
کچھ الف بے۔ تے پڑھا کرتی تھی میں
پہلے تو پڑھنے سے کچھ نفرت رہی
ہو گئی پھر علم سے دلبستگی
شوق سے پڑھتی رہی دن رات میں
پھر نہ کرتی تھی فضول اک بات میں
دن برس تعلیم ہی میں کٹ گئے
جہل کے تاریک بادل پھٹ گئے
ایک لمحہ مجھ کو بے کاری نہ تھی
صنعت و حرفت سے بھی عاری نہ تھی
علم و فن میں پوری قابل ہو گئی
بدر کے مانند کامل ہو گئی
بات ہر جلسے میں غالب تھی مری
عقل نیک اور رائے صائب تھی مری
ماہتابِ عمر کامل ہو گیا
سن مرا شادی کے قابل ہو گیا

آسمانِ حسن کی میں بدر تھی
محفل علم و ہنر کی صدر تھی

ہو گئی ماں باپ کو شادی کی فکر
دوسرے معنی میں بربادی کی فکر
آ گئے دس بیس پھر پیغام بھی
نیک بھی تھے جس میں بدانجام بھی
جن میں کچھ جاہل تھے کچھ لکھے پڑھے
کچھ تو چھوٹے آدمی تھے کچھ بڑے
بس بڑے گھر پر پڑی سب کی نظر
دولت و زر پر پڑی سب کی نظر
یہ نہ دیکھا ہے وہ کچھ انسان بھی
یہ نہ دیکھا اس میں ہے ایمان بھی
یہ نہ دیکھا ہے جگر کی پھانس ساس
ٹھنڈے دل لینے نہ دیگی سانس ساس
نند کے عادات سے کیا بحث تھی
دن نہ دیکھا رات سے کیا بحث تھی

سب ہی کہتے تھے کیا داماد ہے
مال و زر سے جس کا گھر آباد ہے

سب کے دل پر زر کا سکہ نقش ہے ۔۔۔ نقشِ سکہ کیا ہی چلتا نقش ہے
زر ہے دلبر، ہر جوان و پیر کا ۔۔۔ نقشِ سکہ نقش ہے تسخیر کا
زر کی خاطر ہے ہر اک بہروپیا
کچھ نہ ہو بس روپیہ ہو روپیہ
گر بریزی بحر را در کوزہ
چند گنجد؟ قسمتِ یک روزہ

الغرض طے ہو گئی سب بات چیت ۔۔۔ ہے زبردستی بڑے بوڑھوں کی ریت
میرے منشا کی ضرورت ہی نہ تھی ۔۔۔ پوچھنے کی مجھ سے حاجت ہی نہ تھی
اک یہی خوبی تو ہے نسوان میں ۔۔۔ زندہ گڑ جاتی ہیں قبرستان میں
بمان و بیدو چپکے بن کر جیتی ۔۔۔ سن لو حکم النکاح سنتی
رات کو وہ دن کہیں یا دن کو رات ۔۔۔ بولنا ہے سخت بےشرمی کی بات
جاؤ چپ چپ بیچ دیں وہ جس کے ساتھ ۔۔۔ اختیار اُن کو ہے بیچیں جس کے ہاتھ
بہرِ نسواں ملت و ایماں سنت ایں
مسلمستان نیست، ہندستاں ست ایں

خیر آخر عقد کا دن آ گیا ۔۔۔ کشتِ دل پر ابرِ حسرت چھا گیا
آئی دنیا میں اُڑاتی خاک صبح ۔۔۔ صورتِ دل تھی گریباں چاک صبح
آ گئی صبحِ قیامت، آ گئی ۔۔۔ آ گئی صبحِ شہادت آ گئی
المدد، اے تشنہ کامِ کربلا ۔۔۔ ٹال دے اکبار یہ آئی بلا
یا علیؓ یا حیدرِ مشکل کشا ۔۔۔ حل کرو مشکل مری بہرِ خدا
پھڑپھڑاتا ہے پرندِ وقتِ ذبح ۔۔۔ چیختی ہے بھیڑ کیسا وقتِ ذبح
ہائے یاں اتنی اجازت بھی نہیں ۔۔۔ چیخنے رونے کی طاقت بھی نہیں
سینے میں دم گھٹتے گھٹتے رُک گیا
سوزِ باطن سے کلیجہ پھُک گیا

لو سنو، وہ آئی باجے کی صدا ۔۔۔ صورِ اسرافیل بھی جس پر فدا
لیجئے وہ آ گئے دولھا میاں ۔۔۔ یا امان الغیاث ...
آمدِ قاضی میں پھر کیا دیر ہے ۔۔۔ دل دہاڑے کس قدر اندھیر ...
پوچھنے کچھ لوگ آئے میرے پاس ۔۔۔ جن کے آتے ہی گئے میرے حواس
دور ہی کچھ دکھا دی فردِ جرم ۔۔۔ یعنی مجرم کو سنا دی فردِ جرم
خاک میں مجھ کو ملا کر چل دیئے ۔۔۔ قتل کا فتویٰ سنا کر چل دیئے
آپ تو کچھ کہہ نہیں سکتی تھی میں ۔۔۔ یاس سے اک اک کا منہ تکتی تھی میں
بیوقوفی پر مری ہنستے ہوئے ۔۔۔ جس طرح وہ آئے تھے واپس گئے
ہو گیا فرضی سب ایجاب و قبول ۔۔۔ خوب کی پابندیٔ شرعِ رسول
بس بزرگوں نے جو چاہا ہو گیا ۔۔۔ عقد کا پورا سیاپا ہو گیا
دورِ دورِ عام ہے اندھیر کا ۔۔۔ یہ سیاپا نام ہے اندھیر کا
آہ یہ سب تھی تباہی بخت کی ۔۔۔ تھی سیاپے میں سیاہی بخت کی
کتنا جلدی ڈھل گیا شادی کا دن ۔۔۔ کل سے ہے آغازِ بربادی کا دن
نقشِ دل پر نامرادی ہو گئی
لوگ کہتے ہیں "کہ شادی ہو گئی"

ہائے اللہ وقتِ رخصت آ گیا ۔۔۔ آ گیا پیغامِ رحلت آ گیا

نور تا نہ گھر میں نوشہ آ گیا — خوف سے سینے میں دم گھبرا گیا
گھر کی مہماں عورتوں کی عید تھی — شوق میں ہر آنکھ محوِ دید تھی
تھی نظر ہر اک کی دولہ کی طرف — تھا رخِ نوشاہ تیرِ دل کا ہدف
دیکھنے میں محو تھے خورد و کلاں — اُٹھ رہی تھیں ہر طرف سے انگلیاں
صورتِ نوشہ پہ دیدہ گڑ گیا — پردے کی آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
فرطِ غم سے میں اِدھر بیہوش تھی — مجھ سے میری زندگی روپوش تھی
چھینٹے دے دے کر اُٹھایا پھر مجھے — بختِ خفتہ نے جگایا پھر مجھے
وہ مجھے سب سے چھڑا کر لے چلے — گھر سے مردے کو اُٹھا کر لے چلے
رہ گئیں منہ دیکھتی ہمجولیاں — بولنے پائیں نہ اپنی بولیاں
دھارِ تیغ زندگی کی مڑ گئی — اُڑ گئی سونے کی چڑیا اُڑ گئی
ماں ہے گریاں، باپ الگ مغموم ہے — رونے کی شادی کے گھر میں دھوم ہے
الروآہ و بکا ہے ہر طرف — مجلسِ ماتم بپا ہے ہر طرف
الوداع اے شادمانی الوداع! — الوداع اے زندگانی الوداع
ڈرتی ہوں آج میں ماں باپ کو — دفن کر دیتی ہوں اپنے آپ کو

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

سر ار کھدیا خنجر تلے — بھیڑ کو مسلخ کی جانب لے چلے
مجھکو سواری میں سوار — قبر کی مانند تھا جس میں فشار
ہوتی جا رہی ہے داستاں — مختصر کرتی ہوں اب اپنا بیاں
اختصر بھی کچھ سن لیجئے — کچھ ہے ہمدردی تو ماتم کیجئے

کیا کہوں کیونکر کٹی جلوے کی رات
ڈھونڈتی تھی موت کو میری حیات

جب آئے جس دم میرے پاس — کھو گئے آئے ہوئے میرے حواس
لال آنکھیں خوں ٹپکتا کف دہاں — اک قدم پڑتا تھا یاں اور اک وہاں
لڑکھڑا کر گر پڑے وہ ایک بار — اُڑ رہا تھا منہ سے بدبو کا غبار
گرنے کی آواز سن کر آئی ماں — بولی ہیں؟ کیا ہو گیا تم کو میاں!
مجھ سے پھر پوچھا کہ تو نے کیا کیا — سچ بتا، قطامہ، پاجی، بے حیا
جادوگرنی تو نہیں ہے تو کوئی — میرے بیٹے کی یہ حالت کیوں ہوئی
خیر یک جھک کر اُٹھا کر لے گئے — ایک ڈائن سے بچا کر لے گئے

صبح تک مجھ سے کسی نے کی نہ بات
کیوں بہن کیسی کٹی جلوے کی رات

بعد کا قصہ ہے طولانی بہت — سن کے تم کو ہوگی حیرانی بہت
یعنی میرا زیور و زر بک گیا — جو دیا تھا باپ نے گھر بک گیا
طالعِ بد، رات دن چکر میں تھا — سر مرا سرتاج کی ٹھوکر میں تھا
نام لینا میرا اُن کو عار تھا — نام میرا اُن کے ہاں "مُردار" تھا
ساس نندوں کے ستم اس کے سوا — رہتے تھے روز سو ہن سی گلا
ساس موذی اور نندیں بدزباں — گالیاں دیتے الگ دھمکیاں

بختِ بد اتنی ترقی پا گیا!
فاصرِ نوہن کا بھی وقت آ گیا

حال میرا بد سے بدتر کر دیا — یعنی اک دن گھر سے باہر کر دیا

بیٹی اپنے باپ کے گھر آ گئی
جاں نکل کر تن سے لب پر آ گئی
صورت از بے صورتی آمد بروں
باز شد انا الیہ راجعون

سلطان محمد فاتح

ایشیائے کوچک کا اولوالعزم تاجدار

مولوی نور احمد خاں فریدی فاضل ادب

ایشیائے کوچک کے اوپر اور آبنائے باسفورس کے دہانے پر ایک عظیم الشان شہر واقع ہے جسے استنبول کہتے ہیں۔ پہلے اس کا نام قسطنطنیہ تھا۔ اگر ... ب بھی جغرافی لحاظ سے اس شہر کو بہت اہم خیال کیا جاتا ... ساڑھے تیرہ سو سال پہلے اپنی شان و شوکت کے سبب ... پر تفوق رکھتا تھا۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی فتح کے بڑے آرزومند تھے۔ اور انھوں نے اس مہم پر جانے والوں کے لئے بہشت کی خوشخبری دے رکھی تھی۔ چنانچہ آنحضرت کے فوراً بعد جونہی مسلمانوں کو عرب، ایران اور مصر کی فتوحات سے فرصت ملی۔ ایک بڑے لشکر سے اس شہر پر حملہ آور ہوئے مگر سخت گھمسان کی لڑائی لڑنے پر بھی اسے فتح نہ کر سکے۔ کیونکہ یہ شہر اٹھارہ میل کے احاطہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اور فصیل کے دو حصے سمندر کی جانب تھے۔ تیسرا حصہ ... مضبوط تھا کہ فصیل پہاڑ کا پہاڑ معلوم ہوتی تھی۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ اس جنگ میں کام آئے۔ سالار لشکر نے کافروں کے خوف سے انھیں دفن کر کے اوپر سے قبر کا نشان مٹا دیا۔ اس کے بعد بھی صدیوں تک مسلمان بادشاہ اس شہر کے فتح کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ انجام کار سلطان محمد نام ایک اولوالعزم تاجدار اپنے دو لاکھ فداکار جاں نثاروں کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا۔ اور اپنی بے پناہ شجاعت اور بے نظیر قابلیت سے تمام مشکلات پر غالب آکر اسے فتح کر کے دنیا اور آخرت میں سربلند ہوا۔ اور وہ شہرت پائی کہ آج اسے دنیا سے رخصت ہوئے پانچسو سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کل کی بات ہے۔

ابتدائی حالات

سلطان مراد کا یہ بلند اقبال فرزند ۱۴۲۹ء میں ایڈریا نوپل کے مشہور شہر میں پیدا ہوا۔ سلطان نے اپنے والد کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اس کا نام بھی سلطان محمد رکھا۔ چونکہ سلطان خود بہادر اور جنگجو آدمی تھا اس لئے اس نے اپنے ہونہار فرزند کو بھی نیزے، تیر، اور تلوار کے تمام کرتب سکھلائے۔ سلطان کی حقیقی ماں فوت ہو چکی تھی اس لئے سوتیلی ماں سلطانہ مارا نے شہزادے کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا اور یورپ کی لاطینی، یونانی اور سلوانی زبانیں بھی سکھائیں۔ ان کے علاوہ عربی اور دینیات کی تمام کتابیں شہزادے نے اپنے عالموں سے پڑھیں۔ ابتدا سے شہزادے کو ملک گیری اور رزم آرائی کا بڑا شوق تھا۔ اس لئے سکندر اعظم۔ سائیرس۔ جولیس سیزر اور یونانی و عربی بہادروں کی سوانحعمریاں اسے بہت پسند تھیں۔ چودہ برس کی عمر تک شہزادہ نے امور سلطنت اور فنون حرب میں اس قدر قابلیت پیدا کر لی کہ سلطان مراد تخت اس کے حوالے کر کے عبادت الٰہی کے لئے ایک گوشہ میں جا بیٹھا لیکن بادشاہ ہنگری کے حملہ کرنے پر مجبوراً سلطان کو پھر سیاسیات میں حصہ لینا پڑا۔ ۱۴۵۱ء میں جب شہزادہ کسی مہم پر گیا ہوا تھا سلطان بارہ روز کی علالت کے بعد انتقال کر گیا۔

تخت نشینی

شہزادہ نے سلطان محمد ثانی کے لقب سے موروثی تخت پر قدم رکھا۔ چونکہ صلح پسند طبیعت پائی تھی اس لئے انتظامیہ امور میں کچھ تبدیلی نہ کی۔ اپنے وزیر اعظم خلیل پاشا کو عہدے پر بحال رکھا اپنی مشفق ماں سلطانہ مارا کو مقدونیہ کی زرخیز جاگیر عطا کی اور اسے یہ بھی اجازت دیدی کہ وہ اپنے والد کے پاس چلی جائے۔ اناطولیہ کے سرداروں نے سلطان کے انتقال کی خبر سن کر بغاوت کر دی۔ اس لئے سلطان محمد بغیر کسی توقف کے وہاں پہنچا۔ اور بڑی خونریزی کے بعد انھیں مطیع کیا۔

فتح قسطنطنیہ

ان دنوں عثمانی سلطنت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور قسطنطنیہ کا شہر ان کی وسیع سلطنت کے بالکل درمیان میں تھا اس کے

فرمانروا خوب جانتے تھے کہ جس دن عثمانی تاجداروں کو اندرونی شورش سے نجات ملیگی فوراً ادھر کا رُخ کرینگے۔ اس لئے وہ اپنے خفیہ ہتھیاروں سے کام لیکر سلطنت عثمانیہ کے اندرونی صوبوں میں بغاوت کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے۔

سلطان محمد جب اپنی سلطنت کے انتظام سے فارغ ہو چکا تو اس نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے سلطان نے باسلیکا نام کی ایک بڑی بھاری توپ بنوائی جس میں بارہ من وزنی پتھر کا گولہ رکھ کر ایک میل تک مار کی جا سکتی تھی۔ اس کے کھینچنے کے لئے پانچسو مضبوط اور توانا بیلوں کی جوڑیاں وقف کر دی گئیں سات سو آدمی اس کی دیکھ بھال اور فائرنگ پر مقرر ہوئے اور تین ہزار سپاہیوں کو اس کی حفاظت پر مامور کیا گیا۔

۲۶ مارچ ۱۴۵۳ء کو سلطان دو لاکھ فوج کے ساتھ جس میں تیس ہزار عیسائی بھی شامل تھے ایڈریانوپل سے حرکت میں آیا۔ اور گیلی پولی سے سلیمان بک امیر البحر تین سو جنگی جہازوں کے زبردست بیڑے کے ساتھ روانہ ہوا۔

خلیل پاشا کی طلبی

اثنائے سفر میں سلطان کو معلوم ہوا کہ خلیل پاشا وزیر اعظم قیصر سے رشوت لے چکا ہے۔ اور اس مہم میں روڑا اٹکانا چاہتا ہے۔ سلطان نے آدمی رات کے وقت اُسے بلا بھیجا۔ عرصہ سے وزیر اعظم کو تنہائی میں سلطان سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ خلاف معمول ایسے وقت میں بلانے کا حکم سُن کر خوف سے کانپنے لگا۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ دشمنوں کی سازش اپنا کام کر گئی ہے۔ اس لئے ڈرتے ڈرتے بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا۔ سلطان نے دیکھا کہ سفید ریش وزیر اعظم نوکروں کی طرح سر پر اشرفیوں کا بھرا ہوا کٹورہ رکھے کانپتا تھرتھراتا چلا آتا ہے تو بستر سے چلا اُٹھا کہ اے میرے بزرگ چچا! یہ کیا بات ہے؟ خلیل نے نہایت ادب سے جواب دیا کہ جہاں پناہ! یہ قدیم کا دستور ہے کہ بادشاہ عہدے داروں کو بے وقت بلائے تو ان کو ظل اللہ کے حضور خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیئے۔

سلطان سنبھل کر بستر پر اُٹھ بیٹھا اور بولا "اسے پرے رکھ دو مجھے تمہاری اشرفیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تو صرف یہ ضرورت ہے کہ مجھے قسطنطنیہ کی فتح میں مدد دو"۔ وزیر اعظم معاملہ سمجھ گیا۔ اور نہایت ادب سے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ جس خدا نے حضور کو یونانی سلطنت کے تمام صوبوں کا مالک بنا دیا ہے وہ اس سلطنت کا دار الحکومت بھی ضرور عنایت کریگا۔ اور میں اپنی جان و مال حضور پر سے قربان کر دونگا"۔

سلطان سنبھل کر بستر پر اُٹھ بیٹھا اور نرمی سے بولا۔ "میرے بستر کی طرف دیکھو، میں اس پر تمام رات کروٹیں لیا کرتا ہوں۔ میں تم کو صرف یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سونے اور چاندی کی طمع سے نرم نہ ہو جانا۔ آؤ ہم اپنے ارادہ کو پختہ اور مضبوط کر کے یونانیوں سے لڑیں اور خدا پر بھروسہ کر کے قیصروں کے مسکن کو فتح کرنے کی کوشش کریں"۔

قیصر سے خط و کتابت

ان دنوں قسطنطنیہ کا فرمانروا قیصر پالیولوگس تھا۔ اگرچہ عوام اور شہر کے مذہبی پیشوا اس کے مخالف تھے اور دشمن کی فوج بھی بے قیاس تھی۔ بایں ہمہ اس بہادر تاجدار نے اخیر دم تک اپنے شہر کو غیروں کے تصرف سے بچانے کا تہیہ کر لیا اور ساتھ ہی یورپ کے عیسائی بادشاہوں کو مذہب اور اخلاق کے واسطے دیکر امداد کے لئے پکارا۔ مگر کوئی نہ آیا۔ ہاں البتہ جینوا والوں نے پانچ جہازوں کا ایک جنگی بیڑہ امداد کے لئے بھیجا مگر ترکوں کے سیلاب نے اُسے غرق کر کے رکھ دیا۔ امیر البحر جوستینانی بڑی مشکل سے بچ کر قسطنطنیہ پہنچا اور قیصر نے شہر کی حفاظت کا انتظام اس کے سپرد کیا سلطان محمد نے اتمام حجت کے طور پر قیصر کے نام یہ پیغام بھیجا کہ اگر آپ صلح کے ساتھ شہر ہمارے سپرد کر دیں تو سلطان تمام رعایا کو کامل آزادی عطا کریگا اور ان کے کسی معاملے میں دخل نہ دیگا۔ اور ساتھ ہی آپ کو بھی اس شہر کی بجائے بلاد مورا کی حکومت دی جائیگی"۔

قیصر نے سلطان کے اس پیام پر غور کرنے کے واسطے کونسل طلب کی اور ان سے صلاح چاہی۔ سب کے سب ممبروں نے اظہار رضامندی کے لئے سر جھکا لیا۔ مگر قیصر کے غیور دل نے غلامی پر موت کو ترجیح دی اور قاصد سے کہا جا کر اپنے بادشاہ سے کہدے کہ قیصر اپنے شہر کو بچانے کے لئے آخری دم تک جنگ کریگا"۔

اس کے فوراً بعد قیصر نے ترکوں کی گھٹا کو روکنے کے لئے فصیل پر بسیار توپیں چڑھا دیں اور سمندر کی جانب سے اپنے جنگی بیڑے کا زنجیرہ باندھ دیا۔

زمین پر جہاز رانی

اب سلطان کی فوج تو خشکی کی طرف سے قسطنطنیہ کی دیواروں تک پہنچ چکی تھی

نگی بیڑا ابھی تک دُور کھڑا تھا۔ سلطان نے انجینیروں کے مشورہ سے دیا کہ جہازوں کو آبنائے باسفورس سے نکال کر اس وادی کے یعے سے جو شاخ زریں سے جاملتی ہے۔ بندرگاہ میں پہنچا دیا جائے ملنے کی دیر تھی کئی ہزار آدمیوں نے جھٹ پٹ وادی سے چھوٹی دنی جھاڑیاں اور پودے اکھاڑ کر رستہ صاف کر دیا۔ اور ایک رے سے دوسرے سرے تک تنگ نہر کھود کر اس میں مضبوط او تیروں کا فرش باندھا گیا۔ اور ان پر تارکول چربی اور موم ب مل دیا گیا۔ ۲۲ اپریل کی درمیانہ رات کو یہ جہاز اور تیز رفتار شتیاں اسی طرح خشکی میں چلا کر آبنائے باسفورس میں اتار دی یں۔ صبح کو یونانیوں نے جب ترکی بیڑے کو فصیل کے نیچے کھڑا دیکھا ان کے ہوش اڑ گئے۔ اور پھر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے جہازوں کا لک پل تیار ہو گیا اور اس پر ترکوں نے اپنے توپ خانے کی چودہ بیٹری نصب کر دی۔

فیصلہ کُن جنگ

۲۷ مئی کو سلطان نے اپنی جنگی کونسل طلب کی۔ خلیل پاشا، یعقوب پاشا اور محمد پاشا صلح کر لینا بہتر جانتے تھے۔ خاص کر خلیل پاشا نے سلطان کی توجہ یورپ کی طرف منعطف کرائی کہ قسطنطنیہ کی مہم میں سب عیسائی فرمانروا متحد ہو کر مقابلہ پر نکل آئیں گے اور ہمیں بڑی کالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر قیصر تاوان جنگ پر صلح کرنا چاہتا ہے تو ہمیں کر لینی چاہیے۔ مگر زگن پاشا نے ان کی سخت مخالفت کی ور دھاوا کرنے کا مشورہ دیا۔ جس پر ۲۹ مئی کی صبح کے دو بجے عام حملہ کیا گیا۔ اور سلطان خود گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کی صفوں ں گشت لگاتا ہوا بہادروں کی ہمتیں بڑھانے لگا۔ اور منادی کرا دی ہ جو شخص سب سے پہلے قلعہ کی فصیل پر چڑھے گا اسے سلطنت عثمانیہ کے زرخیز صوبے کا گورنر بنا دیا جائے گا۔ اس اعلان پر فوج میں ایک غیر معمولی جوش سا پیدا ہو گیا۔ پہلے تو دو گھنٹے تک بہادر ترکوں کی عام سپاہ خندق کو ریت اور روڑے کنکر سے بھرنے کے لئے بڑھتی رہی۔

مسلح گاڑیاں

جب ذرا یونانی فوج تھک گئی تو پھر باقاعدہ فوج نے چاروں طرف سے ایسی حرکت کی کہ ایک ایک گروہ لکڑی کے بنے ہوئے متحرک برج آگے دھکیلے جاتا تھا۔ ان پر سامنے کی طرف بارہ کھالیں منڈھ دی گئی تھیں اور پھر ان کو پانی سے تر کیا جاتا تھا۔ تاکہ آگ سے جل نہ جائیں۔ ان برجوں میں لڑاکے ترک نقب لگانے کے ہتھیار لئے بیٹھے تھے۔ بڑی بڑی سیڑھیاں اور کمندیں بھی ان کے پاس موجود تھیں ادھر قیصر خود فصیل پر کھڑا یونانیوں کی ہمت بندھا رہا تھا۔ جس پر انھوں نے بڑی سرعت سے برجوں پر گولہ باری شروع کی۔ توپوں کی دنادن سے زمین لرز اٹھی اور فضائے آسمانی دھواں دھار ہو گئی۔

حسن ابدالی

اسی اثنا میں حسن ابدالی نام ایک مسلمان اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر سیڑھی کے ذریعہ سے فصیل پر چڑھ گیا اور تلوار نکال دشمنوں کا صفایا کرنے لگا۔ یونانیوں نے چاروں طرف سے اس تن تنہا مرد مجاہد پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ جس سے اس کا سارا بدن چھلنی ہو گیا۔ اس کے بدن میں کھڑے ہونے کی سکت نہ رہی تو وہ ایک زانو پر کھڑا بہادری کے جوہر دکھاتا رہا۔ یہاں تک کہ نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑا۔ بیشک حسن ابدالی ایک بہادر سپاہی اور سچا مسلمان تھا۔ اب مسلمانوں کا جوش بڑھ چکا تھا۔ اور توپوں نے وہ گولے اگلے کہ دیواروں میں رخنے پڑ گئے۔ اور ان کے ملبے سے خندق جگہ جگہ سے پٹ گئی۔ قیصر روم نہایت بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا اور سلطان جان پر کھیل کر شہر میں گھس گئے اور دنیا کا وہ عظیم الشان شہر جو انتیس ۲۹ مرتبہ محاصرے کی مار کھانے پر بھی کسی سے مسخر نہ ہوا تھا آج تین لاکھ محافظ رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو ترکوں کے ہاتھ سے نہ بچا سکا۔

اعلان آزادی

سلطان خدا کے سجدۂ شکر میں زمین پر سر رکھے شہر میں داخل ہوا سپاہ نے قیصر کی لاش ڈھونڈ کر پیش کی تو اس کا احترام کیا اور قیصر کی بہادری کی تعریف کرتے ہوئے شاہانہ اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کے اجداد کے مقبرے میں دفن کرا دیا۔ اس کے بعد شہر والوں کو امان دے دی گئی اور انھیں ہر طرح مذہبی اور سیاسی آزادی عطا کی۔ یہاں تک کہ قدیم دستور کے مطابق انھیں بطریق (Batriarch) منتخب کرنے کی بھی اجازت دی اور اسے اپنے ہاتھ سے معزز عہدے کا خلعت پہنا کر عصا اور انگوٹھی مرحمت کی جس پر "بطریق" نے صدق دل سے سلطان کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "ایسے اعزاز د

اکرام کا نمونہ میرے پیشرو بزرگوں نے عیسائی حکمرانوں کے زمانہ میں بھی نہیں دیکھا۔"

جامع ابو ایوب انصاریؓ

کچھ عرصہ بعد سلطان نے شمس الدین ولی کے نشان کرنے پر حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار کا تعویذ ڈھونڈ نکالا۔ جس پر صحیح کتبہ بھی موجود تھا۔ یہ وہ بزرگ صحابی تھے جو مسلمانوں کی پہلی مہم میں قسطنطنیہ آکر شہید ہوئے تھے۔ مزار پر نہایت خوبصورت مقبرہ تعمیر کیا اور پاس ہی نہایت شاندار مسجد بنوائی جو آج تک اسی شان سے موجود ہے۔

وفات

فتح قسطنطنیہ کے بعد سلطان نے اور بہت سے ملک اور قلعے فتح کئے جس سے سلطان کا نام محمد فاتح پڑ گیا۔ ۱۴۸۱ء میں سلطان نے دو عظیم الشان لشکر ترتیب دیئے۔ ایک کو قبرص کی مہم پر مقرر کیا اور دوسرا لشکر ہمراہ لے کر ایران فتح کرنے چلا لیکن ابھی راستے میں تھا کہ موت کا پیغام آ پہنچا اور دنیا کا یہ سخی عالم اور شجاع سلطان دنیا سے چل بسا۔ اس کا جنازہ لکبوزہ کے مقام سے بڑی شان کے ساتھ اٹھا اور اس کی اپنی مسجد میں سپرد خاک کیا گیا۔

سلطان کی شخصیت

سلطان بڑا باہمت اور جلیل القدر شہنشاہ تھا۔ اس کی خوبیاں بےشمار ہیں وہ سخی عالم اور شجاع تھا اور دانشمندی میں اپنے زمانہ کا فرد یگانہ تھا۔ کثرت فتوحات کے باعث اسے دنیا کے نامور فاتحین کی صف میں جگہ ملی ہے مصوری سے اسے بیحد دلچسپی تھی اس نے بندقیہ کے ایک مشہور مصور کو طلب کر کے بیشمار انعام جواہر کا کنٹھا اور سونے کا مرصع تاج عطا کر کے بڑی عزت کے ساتھ وطن بھجوایا یا علماء اور فضلا کے امتحانات میں وہ خود شامل ہوا کرتا تھا اپنی مملکت کے جملہ مدرسین اور علما کے لئے اس نے بیش بہا وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ الغرض یہ سلطان ہر لحاظ سے اپنے زمانہ کا بےنظیر بادشاہ تھا۔

آہ

مجھی سے کیوں مری حالت چھپائی جاتی ہے

از حضرت عاصم جے پوری

وہ جس کی شکل نظر میں سمائی جاتی ہے!
نگاہ اُس سے بہ مشکل ملائی جاتی ہے

چھپا رہا ہوں زمانہ سے لیکن آنکھوں میں
کسی کے حسن کی تصویر آئی جاتی ہے

نہیں حجاب میں صرف اجتناب کا پہلو
نگاہِ شوق بھی کچھ آزمائی جاتی ہے

فریبِ حسن سہی میں یہی سمجھتا ہوں
اب آرزوئے محبت بر آئی جاتی ہے

یہ بات کیا ہے کہ ظالم تری اداؤں میں
وہ بے کلی بھی ہے جو دل میں پائی جاتی ہے

زہے گناہِ محبت کہ پارسائی کی
اسی گناہ سے قسمت بنائی جاتی ہے

یہ کیا شگون ہے اے چارہ گر خدا کے لئے
مجھی سے کیوں مری حالت چھپائی جاتی ہے

مجھے بھی اپنی خموشی کا غم انھیں بھی گلہ
کہ یوں بھی حسرتِ پنہاں جتائی جاتی ہے

شکوۂ جلوہ کی خیر آپ کی اداؤں پہ
حجابِ حسن کی تہمت لگائی جاتی ہے

چھپا رہا ہوں ہنسی میں جس آہ کو عاصم
وہ آہ سارے زمانہ پہ چھائی جاتی ہے

ہندوستان کی آندھیاں

نظم

از حضرت سروش ملیح آبادی

یہ ممکن ہے کہ نبضِ گردشِ ایام رک جائے | یہ ممکن ہے کہ گردوں خاک پر سجدے میں جھک جائے

یہ ممکن ہے قضا آئے عروسِ زندگی بن کر | یہ ممکن ہے لبوں تک ہچکیاں آئیں ہنسی بن کر

ہے ممکن ہو گدازِ شمع پیدا قلبِ آہن میں | ہے ممکن آگ لگ جائے حسیں شبنم کے دامن میں

یہ ممکن ہے کہ پیچھے کو رواں ہو وقت کا دھارا | ہے ممکن راکھ ہو جائے کبھی سورج کا انگارا

یہ ممکن ہے شبِ یلدا کے رخساروں سے ضو نکلے | ہے ممکن برف کے تودوں کی پیشانی سے لو نکلے

ہے ممکن پھول مہکے دل کا دشتِ نامرادی میں | ہے ممکن راگ کے چشمے بہیں اشکوں کی وادی میں

ہے ممکن صبح دے خورشیدِ شب کی رونمائی میں | ہے ممکن ماہ کا کنگن ہو ظلمت کی کلائی میں

ہے ممکن اژدروں کا سینۂ دریا میں مسکن ہو | ہے ممکن مچھلیوں کا تنگ غاروں میں نشیمن ہو

یہ ممکن ہے نہنگوں کا ہو مسکن کوہساروں میں | یہ ممکن ہے سفینے ہوں خراماں ریگزاروں میں

یہ ممکن ہے کریں چیتے بھی گلّوں کی نگہبانی | ہے ممکن بھیڑیوں کی فرق پر ہو تاجِ سلطانی

یہ ممکن ہے چلے فرمان دریائی سمندروں کا | یہ ممکن ہے زمیں پر راج ہو خونی درندوں کا

مگر ہے غیر ممکن چرخ چاہے خون برسائے
کہ اس ہندوستاں کی آندھیوں کی سانس رک جائے

رُومال کا شعر

افسانہ

از جناب حمید صحرائی

دہنے ہاتھ کی دو اُنگلیوں میں لرزتے ہوئے سفید سگریٹ کا دُھواں روشندان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اور میرے مثلث نما ہاتھ کی کہنی جو دیر تک میز پر رکھی رہنے سے اور میرے سر کی بوجھ کی وجہ سے دُکھنے لگی تھی اور میں بالکل اس مجسّمے کی طرح جسے ہوشیار سنگتراش نے پوری کاوش سے تراشا ہو ساکت وجامد بیٹھا سوچ رہا تھا — اور دماغ خاموش تنکاری کی طرح دل کی دھڑکنیں گن رہا تھا۔

فطرت کا یہ قانون کس قدر بعید ہے کہ بعض اوقات زندگی کی بے ربط دھڑکنیں اضطراب کی بجائے سکون آشنا ثابت ہوتی ہیں۔ اور بعض اوقات اطمینان کی بجائے اضطرار کی حامل — زندگی کے مختصر افسانے کو طول دینے کے لئے ان دھڑکنوں کے اعداد ہی شمار کرنا پڑتے ہیں۔ بعض مبہم ہوتے ہیں اور بعض بہت گہرے — گہرے اور بہت گہرے — جیسے مسکراتی ہوئی صبح کا روشن پرتو یا خوفناک رات کی ظلمت۔ کبھی کبھی یہ اس درجہ متضاد بھی ہوتی ہیں کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون زیادہ حسین ہے۔ صبح کا پرتو یا رات کی ظلمت —!

اس دن بھی میرا دل کئی کروٹیں بدل چکا تھا۔ اور ہر کروٹ میں دھڑکنیں لرز رہی تھیں۔ اور میں بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا — بیکار اور بالکل لاحاصل — یونہی جیسے — جیسے ہمارے گاؤں کی آبادی بہت محدود ہے۔ ہر اتوار کو وہاں ایک چھوٹا سا بازار بھی لگتا ہے۔ عجیب عجیب چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ پیلی مرچیں۔ بھوری بھوری ہلدی۔ نری کی جوتیاں۔ کھدر کے تھان رنگ کی چیٹی چوڑیاں، اور پھر دوپہر کے بعد انا اور تندرست کسان خریداری میں مصروف نظر آتے ہیں۔ وہی میلی میلی دھوتی ٹخنوں سے اونچی۔ کھدر کا میل خوردہ انگرکھا۔ بھاری سا پگڑ۔ پیتل کی شام چھ ہاتھ لمبی کندھے پر رکھی ہوئی لاٹھی کے سرے پر — سر کے اوپر گرد میں اَٹی ہوئی جوتیاں — اسی روز تنبولن اپنی

لال چندری اوڑھکر اور مانگ میں سیندور بھر کر دکان پر بیٹھتی تھی۔ کالو کی آلو کی پکوڑیاں بھی خوب بکتی تھیں۔ گاؤں والے خریدتے تھے وہ بناتا رہتا تھا۔ اور اس کی ادھیڑ عمر کی عورت ہاتھ مٹکا مٹکا کر فروخت کرتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ پیسہ دیتے وقت جب کسی منچلے نے اپنی آنکھ بھینچ لی یا اس کا ہاتھ آہستہ سے دبا دیا تو بھونڈی اور بھدی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ اور اس نے شوہر کی نگاہ سے محفوظ رکھنے کے لئے ہونٹوں کے بیچ میں داب لی۔ ..... اور پھر مجھے نازو کا خیال آ گیا۔

نازو کو جب پہلی مرتبہ میں نے دیکھا وہ اپنے کوٹھے پر کھڑی عید کا چاند دیکھ رہی تھی۔ میں نے قد آدم دیوار کی جالیوں میں سے اُسے دیکھا۔ وہ موسم بہار کی حسین چاندنی کی طرح خاموش کھڑی اوپر دیکھ رہی تھی۔ ہیاں مندر کے سنہرے کلس پر جنگلی کبوتر منڈلا رہا تھا۔ اس کے پرے مرغابیوں کی ایک لمبی قطار بسیرے کے لئے جھیل کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ اور نیلے آسمان کے مغربی کنارے پر شفق پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے کسی حسینہ کے گہرے نیلے دوپٹہ پر سُرخ گوٹ۔

کچھ دیر بعد جب زوردار زناٹے کے ساتھ پٹاخے کی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی غایب ہو گئی تھی تو اس کے ہاتھ چاند کی طرف اُٹھ گئے تھے۔ جو مسجد کی بُرجی پر دوشیزۂ فطرت کے کان کی باریک بجلی کی طرح جھلملا رہا تھا۔

اور جب میں نے دریافت کیا تھا کہ "کہاں ہے چاند نازو؟" تو وہ شرما سی گئی تھی۔ اس اچانک پیدا ہو جانے والے اضطراب نے اُسے اور بھی زیادہ دلکش بنا دیا تھا اور پھر ایکدم نیچے بھاگ گئی تھی۔ کس قدر عجیب تھی وہ بالکل ان خطوط کی طرح جو قدرت کے ہاتھ نے تقدیر کے صفحہ پر کھینچ رکھے ہوں۔

نازو عیدن تبلن کی سوتیلی لڑکی تھی۔ ویسے تو ماں بیٹی میں دو چار سال ہی کی چھٹائی بڑائی ہو گی۔ لیکن آخر تھی تو وہ بیٹی ہی —

خالص ہندوستانی ماحول میں پرورش پائی ہوئی بیٹی۔ جہاں محبوس پرندے کی طرح جوان لڑکی کو اپنی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کو فرض کی قربانگاہ پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ ماتا ماری ماں اور شفیق باپ دونوں داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ اب اس وسیع دنیا میں بے یار و مددگار نازو کے لئے صرف ایک سہارا تھا۔ اور وہ تھی عیدن کی ذات جب وہ دوکان پر بیٹھ کر دال، سیو، چنے اور گڑ بیچنے سے گھبرا گئی تھی تو نازو ہی نے اُسے تمبولن کا کام کرنے کی ترغیب دی تھی۔ طوفان کے پیہم تھپیڑے سنگین چٹانوں کو اور زیادہ مستحکم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ زمانہ کی گردش نے نازو کو بھی مستقل بنا دیا تھا۔ پچھلے دو برس سے اس میں نمایاں تبدیلی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ بدن میں گدراہٹ اور چہرہ پر سرخی جھلکنے لگی تھی۔ وہ اپنی بارہ مربع فٹ کوٹھری میں جس کے ایک چوتھائی حصے کو دکان کا تخت گھیرے ہوئے تھا رہنے لگی تھی۔ شاذ ہی باہر نکلتی تھی۔ شاید اسے اجنبی راہگیروں سے حجاب محسوس ہونے لگا تھا۔ جب ہی تو اس نے تخت کے گرد ٹاٹ کا پردہ لٹکا کر دکان کو رہائش کی جگہ سے علیحدہ کر دیا تھا۔

عیدن اپنی بھونڈی شکل کو تیل پھلیل سے دلکش بنانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ کتھے چونے کی کلھیوں۔ سگریٹ کے پیکٹ۔ بیڑی کے بنڈلوں۔ سبز سبزیاں اور مصالحے کے ڈبوں کے وسط میں بیٹھی ہوئی وہ خاصی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ محلے کے کئی جوان چھوکرے لالٹین کی زرد زرد روشنی میں کافی رات گئے تک اُس کی دکان کے گرد بیٹھے ہوئے اپنی شجاعت کی طبعزاد داستانیں دُہراتے رہتے تھے۔ اور عیدن مسکرا مسکرا کر ان کی طرف دیکھ لیا کرتی تھی جیسے وہ کہہ رہی ہو — آخر کیوں نہ ہو۔ تم بہادر — ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے بھی تو تمہیں ہی آزاد کرانا ہے۔"

عیدن دکان پر بیٹھی بے ضرورت بے ربط اور بے ڈھنگی باتیں سنتی رہتی۔ اور نازو اندر بوسیدہ بچھونے پر کرم خوردہ پلنگ کے جھکولے میں جھولتی رہتی، سوچتی رہتی اور ہوائی قلعے تعمیر کرتی رہتی۔ جیسے وہ خود ایک بہت بڑی ملکہ ہے۔ نیلے آسمان جیسی وسیع زمین پر اس کی حکمرانی ہے۔ کسی کنواری کے سیاہ آنچل کی طرح شام آتی ہے۔ چاندنی کے بکھرے ہوئے پھولوں کی طرح صبح ہوتی ہے۔ عدل و انصاف کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ خلوص و ایثار کا جذبہ کارفرما ہے۔ سرمایہ داری ناداری کا خون نہیں چوستی۔ ظلم سر نہیں اٹھاتا۔ ہر طرف شادمانی ہے۔ اور ہر طرف مسرت — اور پھر یکایک جب کوئی بھنبھناتا ہوا مچھر اس کے کان کے پاس سے گزر جاتا۔ یا کوئی کھٹمل اس کی باہوں پر سرکتا، تو اس کے ہوائی قلعوں کی بنیادیں ڈگمگا جاتیں اور اس کی خاموش آنکھوں پر غربت کے احساس سے آنسوؤں کے کئی قطرے جھلملا جاتے۔

نازو کی خیالی دنیا کا سورج ہمیشہ ایک ہی محور کے گرد چکر کاٹتا رہتا تھا۔ لیکن عیدن کی طرزِ معاشرت میں تبدیلی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ دکان پر بیٹھنے سے پیشتر اس کی آنکھوں میں حزن و ملال غائت طور پر نمایاں رہتا تھا۔ پھر دکان پر بیٹھ کر وہ مرحوم شوہر کے غم کو فراموش کرنے لگی تھی۔ افسردہ نگاہوں میں زندگی کی روشنی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ پھر چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مسکراہٹ نظر آنے لگی تھی۔ اب تو کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔ لبوں پر تبسم جلوہ نما رہنے لگا تھا۔ رفتار میں تصنع اور گفتار میں بناوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اور کبھی کبھی تنہائی میں اُسے ایسا محسوس ہونے لگتا کہ اس کے دل کی خاموش دنیا میں پیدا ہونے والی دھڑکن کسی انقلاب عظیم کا پیش خیمہ ہے۔

اپنے مکان سے دُکان قریب ہونے کی وجہ سے میں کبھی کبھی وہاں چلا جاتا تھا۔ یونہی — کبھی دیاسلائی کا بکس لینے۔ اور کبھی سگریٹ کا پیکٹ۔ اور جب کبھی میں عیدن سے کہتا۔

"تمہارا رات کا پان کڑوا کیوں تھا؟"

تو وہ مسکراتے ہوئے کہتی۔ "چھوٹے بابو! کبھی کبھی مُنہ کا ذائقہ ہی تلخ ہو جایا کرتا ہے۔ ممکن ہے رات کو تمہارا ذائقہ بھی تلخ ہو۔"

اور مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میری آنکھوں کے آگے بہت سی پریاں ناچ رہی ہیں۔ ان کے گندے اور گھناونے چہرے مسکرانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کالج سے واپس آ کر مجھے تانگہ کا کرایہ ادا کرنے کے لئے ریزگاری کی ضرورت پڑتی تو میں عیدن سے دریافت کرتا۔

"روپے کے پیسے تو ہونگے تمہارے پاس؟"

وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر جواب دیتی۔ "کہاں حضور! روپے کے پیسے تو شاید دن بھر میں بھی جمع نہیں ہوتے۔" اور جب میں نا امید ہو کر پوچھتا۔ "چار آنے کے پیسے تو ہونگے ہی تمہارے پاس"۔ اور پھر اس کے خاموش جواب کو نفی میں سمجھ کر جب میں واپس ہونے لگتا تو نازو اپنی باریک آواز میں کہتی۔ "ہاں! میرے پاس ہیں چار آنے کے پیسے"۔ اور جب وہ پردے کے پیچھے سے اپنی صندلی باہوں کی مخروطی انگلیوں میں چار آنے کے پیسے داب کر عیدن کی طرف دراز کرتی تو کسی نامعلوم خوشی سے اس کے ہاتھوں میں رعشہ سا پیدا

ہو جاتا۔ اور بلوری ہاتھ کی شریانوں میں خون تیزی سے دوڑتا ہُوا محسوس ہوتا۔

انہی ایام میں ایک واقعہ ایسا رونما ہُوا جو میری اس داستان کی سنہری تمہید کہے جانے کے لائق ہے۔ یا یُوں کہئے کہ عفّت کی شادی میرے نزدیک اس لئے اہمیت نہیں رکھتی کہ اس میں مجھے بہت سے عزیزوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ بلکہ وہ اس لئے بھی یادگار بن کر رہ گئی کہ اس نے میرے اور نازو کے درمیان سے حجاب کی خلیج مٹانے کی کوشش کی تھی۔ اس تقریب کے تمام مدارج بہ حُسن و خوبی انجام دینے کے لئے چند اہلِ محلہ مستورات کی امداد حاصل کی گئی تھی اور ان میں نازو بھی تھی۔ تمام دن وہ ایک محنتی اور مشاق لڑکی کی طرح تمام کام انجام دیتی رہتی تھی۔ اور جب رات کو آرام کرنے کے لئے بڑے دالان کے برابر والے کمرے میں جاتی تو کتنی ہی رات گزرے تک بیٹھی کچھ نہ کچھ کرتی رہتی۔ سب ہی اس سے خوش تھے۔ لیکن مجھے اس کی معصوم فطرت سے ایک شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ یہ کہ جب کبھی وہ میرے سامنے آجاتی تو اس کا چہرہ تمتما اٹھتا۔ اور کان کی لَو تک سُرخ ہو جاتی نہ معلوم کیا سمجھتی تھی وہ — بھولی نازو! کبھی مجھے اس کی معصومیت پر رحم آجاتا اور میں سوچنے لگتا کہ کس قدر عجیب بات ہے، مرحوم گنگو کی چھوکری نازو اور زندگی کی دھڑکن —!

دن گزرتے گئے اور شادی کی تقریب بخیر و خوبی انجام پا گئی جس طرح دن ختم ہونے کے بعد سمندر کی سطح پھر خاموش ہو جاتی ہے یا تمام دن کی تمازت کے بعد مُرجھائی ہوئی کونپل پھر تازہ ہونے لگتی ہے اسی طرح ہمارے گھر کا ہنگامہ پرور ماحول شادی کے بعد سکون آشنا ہو گیا تھا۔ نازو بھی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ لیکن اب بھی جب سورج اپنی آخری شعاعوں سے بلند پہاڑوں کی برفستانی چوٹیوں پر جھلملاتا ہوا ڈوب جاتا، سفیدی مائل نیلے آسمان پر چھوٹے چھوٹے تارے کسی خوش نصیب زاہد کے اعمال کی طرح منوّر ہو جاتے اور دن کے درخشاں چہرے پر ظلمت اپنا نقاب ڈال دیتی تو وہ میلی سی چادر میں لپٹی ہوئی ہماری ماما آمن کے پاس نماز سیکھنے آجاتی اور تھکی ہوئی زندگی کی طرح کافی دیر تک بیٹھی رہتی اور جب مؤذن کی آواز فضا میں تھرتھرا کر شب کے سکوت میں ڈوب جاتی تو واپس چلی جاتی۔ یونہی خاموش، اُداس اُداس —!

دن ہوا کے جھونکے کی طرح گزرتے جا رہے تھے —!

میں ہر غم و فکر سے آزاد، خوشی سے معمور لمحات گزار رہا تھا۔ جب کبھی عیدن کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہُوئے میں وہاں کسی ضرورت سے ٹھہر جاتا۔ تو پردہ کے پیچھے سے دو مضطرب آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آتیں اور ہمدردی کا ایک طوفان میرے دل میں برپا ہو جاتا اور میں بہت دُور تک اُس کے مستقبل کے متعلق سوچتا ہوا چلا جاتا — چند روزہ حیات کو کامیاب طور پر بسر کرنے کے لئے مددگار کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی ذی حس بساطِ زیست پر بغیر کسی کی مدد کے بازی نہیں جیت سکتا — اور پھر نازو بھی تو وسیع کائنات کی بساط پر ایک مُہرہ ہی تھی۔ کوئی غیبی قوت مجھ سے کہتی کہ کتنا اچھا ہو اگر وہ بھی اپنی افسردہ جوانی کو شادماں بنا سکے۔ اور پھر میرا دماغ اس کے مددگار کی صفات میں منہمک ہو جاتا — جیسے وہ نازو ہی کی قوم کا کوئی شکیل، نیک اور خوبصورت نوجوان ہے۔ بھرے بھرے بازو، کشادہ پیشانی، گھنی پلکیں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ سیاہ آنکھوں میں استقلال نمایاں اور دل کے ہر گوشے میں بیوی کی محبت جاگزیں —!

میں یونہی بہت کچھ سوچتا ہوا بڑھتا چلا جاتا۔ یہاں تک کہ موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دیتی۔ اور جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا تو اسکول کی لاری میں بھری ہوئی لڑکیاں اپنے رنگ رنگ کے ملبوسات میں بیٹھی ہوئی پریاں معلوم ہوتیں۔ اور جب وہ ایک لمحہ کے لئے میرے پاس سے گزرتی تو اس میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں عجیب عجیب شکلیں اختیار کر لیتیں کالی۔ کھدری۔ نکٹی — اور پھر میرے تمام خیالات منتشر ہو جاتے۔

اسی دوران میں موسم گرما کی تعطیلات کی وجہ سے کالج بند ہو گیا۔ اتفاق امر یہ ہے کہ مجھے چھٹیاں کشمیر میں گزارنا پڑیں اور جب دو ماہ بعد واپس آیا تو ایک عجیب خبر سُنی — عیدن کسی فوجی سپاہی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اور نازو کو والد صاحب نے اپنے یہاں رکھ لیا تھا۔ کسی کھوئے ہوئے مسودہ کے اچانک مل جانے سے جو خوشی کسی ادیب کو ہوتی ہے وہی مجھے دیکھ کر نازو کو بھی ہوئی تھی۔ جب وہ چائے کی کشتی پر ناشتہ لے جا رہی تھی۔ اور میں شب خوابی کے لباس میں برآمدہ میں ٹہل رہا تھا۔ یکایک اُس کی نگاہیں مجھ پر پڑ گئی تھیں اور وہ ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ اور پھر جب میں بالکل خاموش کچھ کہے بغیر واپس ہو گیا تھا تو وہ بھی چلی گئی تھی۔

دن میں کئی مرتبہ میرا اور اس کا سامنا ہُوا تھا اور ہر بار جھجک جھجک۔ اور سمٹ سمٹ کر اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا تھا جو

سطحی نظر سے بہت بلند کہی جا سکتی ہیں - تو کوئی بھی تجربہ ... کی ... میں اس کے جذبات کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا تھا - لیکن پھر بھی اس کی نگاہوں میں خالص اور ٹھوس جذبات جلوہ گر تھے - ایسے جذبات جو معصوم محبت کے باب کی تمہید کہے جاتے ہیں -

رفتہ رفتہ وہ گھریلو کاموں میں ہر وقت منہمک رہنے کے باوجود میرے لئے وقت نکالنے لگی تھی - نہ معلوم اُسے میری ذات سے کیا دلچسپی تھی - وہ اپنے وقت کا کچھ نہ کچھ حصہ میرے لئے وقف کئے جا رہی تھی - کمرہ کی صفائی، کتب کی ترتیب اور تصویروں کی آرائش میں وہ کافی انہماک سے کام لینے لگی تھی - ادھر اُدھر پڑے ہوئے کپڑوں کو سلیقہ سے رکھ دیتی گلدان میں تازہ پھول روز لگا دیتی تھی - اور تعجب تو مجھے اس روز ہوا جب میں نے اس جوتے میں نئے فیتے لگے ہوئے دیکھے جس کے فیتے ٹوٹ گئے تھے - اور جس کی شکل بغیر پالش کے بھونڈی بن کر رہ گئی تھی اب نئی پالش نے اُسے بالکل موزوں کر دیا تھا - میلے میز پوش کو سن لائٹ سوپ سے دھو کر حد درجہ صاف کیا گیا تھا - اور الماری میں رکھی ہوئی قلوپطرہ کی تصویر کو کلنڈر کے نزدیک لٹکا دیا گیا تھا - اپنے کمرہ میں آج یہ تبدیلی دیکھ کر مجھے تعجب بھی ہوا اور حیرت بھی - اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ گھر کے سب لوگ آج تقریب میں گئے ہیں اور سوائے نازو کے گھر میں کوئی نہیں تو میں سمجھ گیا کہ یہ سب تبدیلی نازو ہی کی کاوش کا نتیجہ ہے - اور میں سوچنے لگا کہ یہ بھولی بھالی لڑکی میرے لئے اس قدر کیوں تکلیف برداشت کر رہی ہے - نہ معلوم کیا ہونے والا ہے -

یہی سوچتا ہوا جب میں اپنے کمرہ میں داخل ہوا نازو حسب معمول آراستگی اور صفائی میں مصروف تھی - آج اس نے فرنیچر کو معمولی تبدیلی کے بعد قرینے سے لگا دیا تھا جس سے کمرہ کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا تھا - اور اب دروازے کے سامنے بیٹھی ہوئی صوفے کی پشت سی رہی تھی - جو کئی جگہ سے اُدھڑ گئی تھی پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پر اوس کی بوندوں کی طرح چمک رہے تھے اور بالوں کی لٹیں داہنے کان پر سے گزر کر رخسار کے قریب لٹک رہی تھیں -

میرے اچانک آجانے سے وہ گھبرا سی گئی - اور جب میں نے دریافت کیا کہ "کیا کر رہی ہو نازو؟" تو بجائے جواب دینے کے اُس کی پلکیں لرزنے لگی تھیں - اور جواب دیا تھا تو کس قدر عجیب -

"کچھ بھی تو نہیں ——"

"پھر بھی کچھ تو ——؟"

"جی ——!"

"تمام دن کے کام سے تم تھک جاتی ہو نازو —— پھر مزید میرے کمرہ کی صفائی سے مجھے شرمندہ نہ کیا کرو۔"

"آپ بھی وہی کہہ رہے ہیں جو سب کہتے ہیں۔ کام سے تو مجھے آرام ملتا ہے۔ اور پھر آپ کا کمرہ، —— آپ کا کمرہ تو ویسے بھی سب سے اچھا ہے"

"پگلی! کمرے سبھی اچھے ہیں۔ یہاں کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہاں! میری بجھی بجھی طبیعت یہاں آکر خوشی محسوس کرنے لگتی ہے۔"

ایسا کہتے ہوئے اس کے چہرے پر شباب کی سرخی جھلکنے لگی تھی اور محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن کوئی غیر مرئی قوت اسے مجبور کر رہی ہے۔

"بھولی نازو!" میں نے کہا۔ "میں تمہارے دل کی بات سمجھنے لگا ہوں۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ تم جس خیال کو اپنے دل میں جگہ دیئے ہوئے ہو اُسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دو۔ کیونکہ محبت —— میں مجبور ہوں۔" پھر کسی ملاقاتی کے آجانے سے میں چلا گیا اور بات ادھوری رہ گئی۔

زندگی کی لکیریں بھی کس قدر آڑی ترچھی ہیں۔ بعض گہری اور بعض مبہم۔ قدرت نے بکھروں ہی کی ترتیب سے زندگی مرتب کردی ہے چنانچہ قدرت کے اٹل قوانین میں ترمیم کرنا انسان کی طاقت سے یقیناً بالاتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات حادثے اور واقعات اس قدر اچانک ہوتے ہیں کہ انسان کا خیال بھی وہاں نہیں پہنچ سکتا لیکن جب وہ سامنے ہوتے ہیں تو بالکل عجیب شکل میں —— بالکل خلافِ امید اور اچانک ——!

گزشتہ واقعات کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ ادھر کچھ تو مہمانوں کی آمد کچھ اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے میں بہت کم زنانخانے میں گیا تھا اس دوران میں نہ تو میں نے نازو کو دیکھا تھا نہ اپنے کمرہ میں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس کی تھی۔ بہت ممکن ہے میں سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کہ اس کی وجہ میری ہر وقت کی کمرہ کی نشست ہے۔ اگر مجھے یہ نہ بتایا جاتا کہ نازو بیمار ہے۔ اور جب میں نے بیماری کی نوعیت دریافت کی تو وہ بھی بالکل عجیب تھی۔ یونہی —— طبیعت میں گھبراہٹ، دل اُچاٹ اُچاٹ، قلب میں اضطراب، اور زندگی کی دھڑکن اُداس اُداس اور بے معنی دھڑکن ——!!

قبل اس کے کہ میں نازو کیلئے کوئی ہوشیار معالج اور تیمار دار مقرر کرتا۔ مجھے خود ایک افتاد سے دوچار ہونا پڑ گیا تھا۔ چچا کی علالت کا تار موصول ہوتے ہی مجھے کلکتہ جانا پڑا۔ وہاں بغیر کسی تسلسل اضطراب کے ایک ماہ بخیر و خوبی گزر گیا۔ اور ایک غمگین شام کو جب میں نے کلکتہ کو الوداع کہا تو میرا دل کسی نامعلوم جذبے سے ملول ہو رہا تھا اور مجھے رہ رہ کر نازو کا خیال آ رہا تھا۔ اب تو تندرست ہو گئی ہوگی وہ —— نادان لڑکی۔ مجھ سے محبت کر رہی ہے۔

خیالات دکان گھر اور نازو کا تصور مجھے تمام رات گھیرے رہا۔

آج ہی صبح جب میں گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ نازو کہیں چلی گئی ہے کہاں؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ میں اس بے یار و مددگار لڑکی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میز کے دراز میں سے مجھے سفید رومال پر یہ شعر لکھا ہوا ملا۔ اس وقت رومال میرے سامنے کھلا پڑا ہے اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا ماضی بزاز کے تھانوں کی طرح کھلا ہوا محسوس ہو رہا ہے —— کتنا عجیب ہے یہ شعر ؎

تم کو مبارک ہوں اونچے محل یہ
ہم کو ہیں پیاری ہماری یہ گلیاں

(البغداد)

تنویرِ اختر

نتائج فکر: [illegible]

کسی سے محبت کئے جا رہا ہوں
اسی آسرے پر جئے جا رہا ہوں

کوئی مست آنکھوں سے جامِ محبت
دیئے جا رہا ہے، پیئے جا رہا ہوں

نگاہِ عدو سے نگاہیں بچا کر
نگاہوں سے سجدے کئے جا رہا ہوں

میں تیرا ہوں تجھکو اپنا بناؤں
یہی آرزو تھی لئے جا رہا ہوں

کبھی تو مقدر کا چمکے گا اختر
اسی آرزو میں جئے جا رہا ہوں

500 پونڈ نقد انعام

آپ سو سال تک جوان رہ سکتے ہیں

اوٹوجن OTOGEN جسے ہالی وڈ میں پک می کوک (PICK MEQUICK) کے نام سے پکارا جاتا ہے دنیا میں سب سے پہلی دوائی ہے جس کے استعمال سے بڑھاپے کی وجہ سے گرے ہوئے دانت نئے سرے سے پیدا ہوتے ہیں اور سر کے سفید بال نئے سرے سے کالے نکلتے ہیں یہ دوائی سائنس کی ایک لاثانی ولامثال ایجاد ہے جو مرد یا عورت کو اس کی اصلی عمر کی نسبت دہ اسے بیس سال کم عمر کا جوان بنا کر دکھا دیتی ہے اور پہلے روز کے استعمال سے حیرت انگیز طور پر قوت اور زندگی بھر دیتی ہے۔ اس کے استعمال سے اس قدر تازہ خون پیدا ہوتا ہے کہ چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور خون کے انجکشن لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر آپ احتلام۔ سرعت انزال۔ نامردی۔ جریان۔ کمزوری۔ ناکارہ پن۔ سستی۔ خرابی خون۔ پژمردگی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانے اور دماغی یا جسمانی تھکاوٹ وغیرہ کی وجہ سے تکلیف اٹھا رہے ہوں تو یہ پیام صحت آپ کی شعاع امید ہے اس مشہور و معروف ایجاد کے حیرت انگیز اثرات کو ہالی وڈ میں نہایت کامیابی سے آزمایا جا چکا ہے اور وہاں کے ایکٹر اور ایکٹریسیں ساٹھ ساٹھ اسی اسی سال تک کی عمر تک جوان رہ کر سٹیج پر کام کرتے ہیں۔

اوٹوجن OTOGEN قوت دینے میں بینظیر ہے ایک ہفتہ کے اندر پانچ سے دس پونڈ وزن بڑھانے کے قابل بنا دیتی ہے۔ ہم اس بات کی گارنٹی دعوی کے ساتھ کرتے ہیں کہ اوٹوجن کے استعمال کے بعد آپ کے جسم اور چہرہ کی طرف دیکھ کر کوئی ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی عمر بیس یا پچیس سال سے زاید ہے خواہ آپ کتنے ہی بوڑھے کیوں نہ ہوں اس دوائی نے سائنس کی دنیا میں اس قدر ہلچل پیدا کر دی ہے کہ امریکہ کے بڑے بڑے سائنسدان دیکھ کر دنگ رہ گئے ہیں یہ دوائی سٹرل دودھ بھی ہضم کرنے میں جادو کا اثر رکھتی ہے تو تمام مردی کے خواہشمند اسے ضرور استعمال کر کے جوانی کا لطف حاصل کریں لکھنے کو بہتر انسے دوائی کے۔ مسے لکھا گیا ہے کہ یہ سائنس کی زبردست ایجاد ہے جو کہ دنیا میں اپنی مثال آپ ہے بوڑھے مرد و عورتیں اس دوائی کو استعمال کر کے اپنے چہرہ اور جسم کو ویسا ہی بنا لیں جیسا کہ طالبعلمی کے زمانہ میں سکول میں پڑھنے کے وقت ہوا کرتا تھا جبکہ آپ کے چہرہ اور جسم کی کھال تازہ اور ملائم ہوا کرتی تھی اگر آپ جوانی کی ابتدا و انتہا دیکھنا چاہتے ہیں اگر آپ زندگی کی تمناؤں کے آرزومند ہیں اور قابل رشک طاقت چاہتے ہیں اور بڑھاپے کو جوانی میں تبدیل کرنے کے خواہشمند ہیں تو آج ہی اوٹوجن کا استعمال شروع کر دیں یہ جسم کے بیرونی حصوں کو حیرت انگیز ترقی پہنچاتی ہے رخسار و پر گلاب کی سی سرخی پیدا کرتی ہے جسمانی طور پر سو فیصدی تبدیلی کر دیتی ہے چہرے پر عین اس طرح کی چمک دمک آتی ہے جیسے جوانی میں ہوتی ہے

اوٹوجن OTOGEN کو جلد از جلد استعمال کر کے دیکھیں نتیجہ خود بخود آپ پر حقیقت آشکار کر دیگا لیکن اسے آزمانے سے پہلے اپنا وزن کر لیں اور فوٹو لے لیں اور سات روز کے بعد پھر فوٹو دیکھ کر غور کریں کہ آپ دیکھنے بھالنے اور کام کاج میں کیسا محسوس کر رہے ہیں ضروری ہے کہ آپ اس وقت اوٹوجن کے استعمال سے حاصل کردہ نتیجہ کی ضرور داد دیں گے اوٹوجن کو ہندوستان میں مقبول عام بنانے میں کچھ عرصہ کیلئے قیمت تین روپیہ بارہ آنہ کر دی گئی ہے اور محصولڈاک و پیکنگ خرچ معاف ہوگا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ حالات کے مطابق کب اس کی قیمت میں اضافہ ہو جائے اس لئے آج ہی آپ اپنے لئے ایک شیشی منگوا لیں نوٹ: یہ کوئی اشتہاری دوائی نہیں ہے۔ یہ وہ دوائی ہے جس کو پارکر اینڈ ڈیوس PARKER Panna نے عرصہ سات کے تجربات کے بعد تیار کیا ہے۔ اوٹوجن ہر موسم میں ہر عمر کے مرد و عورت کے لئے یکساں مفید ہے براہ مہربانی اپنا پتہ خوشخط لکھیں ورنہ آرڈر کی تعمیل نہ ہوگی گارنٹی: مبلغ پانچسو پونڈ انعام اس ڈاکٹر یا عوام میں سے کسی اس شخص کو دیا جائیگا جو ہماری اس ایجاد کو ناکارہ ثابت کر دکھائے نوٹ نمبر ۲ پبلک کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ہماری اوٹوجن کسی دوافروش سے ہرگز نہ خریدیں چونکہ دوافروشوں کے پاس پرانا سٹاک ہوتا ہے تازہ دوائی اوٹوجن ہمیشہ براہ راست بذریعہ وی پی طلب کریں

مغربی سائنسدانوں اور ڈاکٹروں کی رائے

پروفیسر ایف سی براؤن چیف منسٹر آف ہیلتھ ان دی ہاؤس آف لارڈز Prof F.C. Brown Chief Minister of Health in The House of Lords نے ماضی قریب میں ایک ایسے مریض پر اوٹوجن کا تجربہ کیا جس کی عمر ایک سو سال سے زاید تھی مریض بہت عرصہ سے جسم میں خون نہ ہونے کی وجہ سے بالکل زندگی سے بیزار ہو گیا تھا۔ اوٹوجن کے استعمال سے اسکی صحت میں وہ نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی کہ نئے سرے سے بیس سال کا نوجوان ہو گیا اور حال ہی میں اس نے ایک دوشیزہ سے نئی شادی کی ہے۔

دی ہالی وڈ گولڈون اینڈ دی لیکسو لیبارٹری نمبر ۱ نکلسن روڈ پوسٹ بکس نمبر ۳۲۰ لاہور

پیاروں کی زندگی

دردآفریں ہے درد کے ماروں کی زندگی

حضرت عیشؔ فیروزپوری

ہر جنبشِ نظر ہے ہزاروں کی زندگی
پیاری ہے سب کو تیرے اشاروں کی زندگی

ہر جامِ مے ہے بادہ گساروں کی زندگی
اور میکشوں کے دم سے بہاروں کی زندگی

آنا ہو گر تو آیئے، لب بند ہو چکے
دم توڑ دے نہ چند اشاروں کی زندگی

ہجر و وصالِ یار میں پائی ہے بارہا
پھولوں کی زندگی کبھی خاروں کی زندگی

کیونکر کریں نہ تیری جفاؤں کا شکریہ
پائی ہے ہم نے شکر گزاروں کی زندگی

روؤں جگر کو دل کو کہ اب چشمِ تر کو میں
مٹی میں مل گئی مرے پیاروں کی زندگی

گردش میں جامِ مے جو نہیں آج ساقیا
کیا ہو چکی نصیب کے ماروں کی زندگی

روشن ہیں دل کے داغ ترے فیضِ عشق سے
تو میرا چاند میرے ستاروں کی زندگی

جیتا ہوں اچھی صورتوں کو دیکھ دیکھ کر
کیا جانفزا ہے اچھے نظاروں کی زندگی

رکھنا سنبھال کر دلِ پُر آرزو کو تم
ہمراہ لے چلو ہو ہزاروں کی زندگی

جب درد اُٹھائے اُٹھیے بٹھائے تو بیٹھیے
درد آفریں ہے درد کے ماروں کی زندگی

نیچی نظر اُٹھا کے کوئی تیر ماریئے
ہے کشمکش میں سینہ فگاروں کی زندگی

تم کوستے ہو میں تمھیں سمجھاؤں کس طرح
پیاروں کو پیاری ہوتی ہے پیاروں کی زندگی

کیوں کر چمک چمک کے ادھر کا نہ رُخ کریں
ہے میرے آشیاں سے شراروں کی زندگی

جو گلرخوں کے عشق میں اے عیشؔ مر مٹے
گلریز ہے انھیں کے مزاروں کی زندگی

سیرت نگاری

مختصر مضمون

از :- جناب عبدالرحمٰن مستقیمی

"تذکرہ"۔ "سیرت"۔ "سوانحعمری"۔ جس نام سے بھی ماضی کی شخصیتوں کے حالات زندگی جمع کئے جائیں بہر نوع ان سے ہم اپنی زندگی بنانے اور انسانیت کو سنوارنے کا کام لیتے ہیں۔ یہ ہماری زندگی کا وہ متحرک آئینہ ہے۔ جس میں انسانی زندگی کے مقاصد، انسانوں کی شخصیت، اُن کے رنج و غم، ان کی ہنسی خوشی اور ان کے تمام دوسرے احساسات و خیالات کی تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جہاں ہم اسلاف کے کارناموں کو پڑھ کر اپنے اندر جوش و ولولہ اور قوت و توانائی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہاں ہمارے اندر قوت ارادی بھی بیدار ہو جاتی ہے اور ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے لگتے ہیں اس لئے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ سیرت نگاری کا وجود ہمارے تمام ادبی کارناموں کے مقابلہ میں زیادہ سودمند ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ خیال اپنی ذات کی حفاظت کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اپنے کارنامہ حیات اور اعمال کا۔ چنانچہ یہ جذبہ متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی سب قوموں کے اندر موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب صفحۂ قرطاس اور نقوش قلم کے ذریعہ سے یہ یادگاریں محفوظ کی جاتی ہیں۔ اور اگلے دنوں کے لوگ اسے مختلف صورتوں اور نقش و نگار کی شکل میں باقی رکھتے تھے۔ علاوہ بریں پہلے یہ فن امراء و روسا اور اہل جاہ و ثروت کیلئے مخصوص تھا۔ اور اب اس فن کے لئے منصب و مرتبہ کی تخصیص نہیں جس کسی کی زندگی میں روح عمل موجود ہو اس کی زندگی فن سیرت کا موضوع بن جاتا ہے۔

چنانچہ علامہ شبلی کہتے ہیں۔ "علوم و فنون کی صف میں سیرت (بیاگرفی) ایک خاص درجہ ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالات زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیل راہ ہیں چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے۔ کیا کیا منصوبے باندھتا ہے۔ اپنے چھوٹے سے دائرہ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے۔ کیونکر ترقی کے زینہ پر چڑھتا ہے۔ کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ کیا کیا مزاحمتیں اُٹھاتا ہے۔ تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔ سستاتا ہے۔ اور پھر آگے بڑھتا ہے۔ غرض سعی و عمل۔ جد و جہد۔ ہمت و غیرت کی جو عجیب و غریب نیرنگیاں سکندر اعظم کی زندگی میں موجود ہیں بعینہ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔"

سیرت کی ابتدا

یوں تو تمام قدیم ترین ادبی شاہکار اسی صنف سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی ابتدا انسان اول سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی سوانحعمری حضرت آدم سے منسوب کی جاسکتی ہے۔ انگریزی شاعر ملٹن اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "فردوس گمشدہ" میں حضرت آدم کی زبان سے ان کے ابتدائی حالات اس طرح ادا کراتا ہے۔

"مجھے یوں محسوس ہوا کہ میٹھی نیند سے بیدار ہوا ہوں اور پھولوں کی سیج پر لیٹا ہوا ہوں۔ سورج نے میرے جسم سے شبنم کے خوشبودار قطرے اپنی کرنوں سے چُن لئے۔ میں نے اپنی متحیر نظریں آسمان پر گاڑ دیں۔ پھر ایک فوری جذبے سے متاثر ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پہاڑ وادیاں۔ جنگل۔ میدان۔ چشمے۔ چاروں طرف مسکرا رہے تھے۔ اور خوش الحان طیور چہچہا رہے تھے۔ میرا دل مسرت سے لبریز ہو گیا پھر میں نے اپنی طرف دیکھا۔ اپنے اعضاء پر نظر دوڑائی۔ جی چاہا تو چلنے لگا۔ جی چاہا تو دوڑنے لگا۔ لیکن میں کون ہوں۔ کہاں سے آیا ہوں؟ میری زندگی کا مدعا کیا ہے؟ مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کچھ کہنے کو جی چاہا تو بے اختیار زبان سے یہ الفاظ نکلے ــــــ "اے چمکنے والے سورج! اور اے منور زمین! اے پہاڑو اور وادیو! چشمو اور دریاؤ! اور اے اُڑتے پھرتے پرندو! بتاؤ میں کدھر سے آیا ہوں تم نے دیکھا نہیں؟ میں یہاں کس طرح پہنچا؟ خود بخود تو نہیں آیا؟ ضرور کوئی میرا پیدا کرنے والا ہے۔ جس کی قدرت مجھے یہاں لائی ہے بتاؤ اس تک پہنچنے کا کیا ذریعہ ہے؟ اسے خوش کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ یہ کہتے کہتے میں نہ معلوم کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ نیند

غالب آ گئی۔ اور میں عالم خواب میں گم ہوگیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ میری زندگی کا پہلا دن تھا"

خواب میں خالق ذوالجلال نے انھیں اپنی ہستی سے آگاہ کیا اور نوید دی کہ تم نوع انسانی کے مورث اعلیٰ ہو۔ تمام دنیا پر تمھاری اولاد حکمرانی کرے گی۔ اور تمھارا نام لاکھوں برس زندہ رہے گا۔

یہ واقعات حضرت آدم نے اپنی رفیقۂ حیات کے سامنے بیان فرمائے دنیا کا پہلا انسان دوسرے انسان کو پہلی ملاقات میں اپنے واقعات سنا رہا تھا۔ اور گویا پہلا تذکرہ مرتب کر رہا تھا۔

پہلی سوانحعمری

اگرچہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ انسانی زندگی کی پہلی سوانحعمری زبان قلم پر کب آئی۔ لیکن چینی۔ ہندی۔ مصری اور مغربی ایشیا کی سب سے قدیم اور اس فن کی پہلی کتاب مختلف اوراق پریشاں میں ملی ہے۔ اور وہ سوانح دسیر کے نام سے منسوب ہے۔ اور اس کے اکثر حصے تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب سے قدیم اور پہلی سوانحعمری حضرت یوسف کے ان قصص و حکایات پر مشتمل ہے جن کا ذکر مقدس کتابوں میں ہے۔ کیونکہ فن سیرت کو بجائے تاریخی حوادث کے حالات انسانی سے زیادہ تعلق ہے۔ اور بیجا نہ ہوگا اگر زینوفون کی اس کتاب کو جو سائرس فارسی کے حالات پر مشتمل ہے صف اول کی کڑیوں میں منسلک کر دیا جائے۔

ہندوستان میں بھی جب پہلے پہل کتابیں لکھی گئیں تو رامائن ان میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی جو شری رامچندر جی کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح دنیا میں جس کتاب کی اشاعت سب سے زیادہ ہے وہ انجیل ہے جس کے عہد نامہ جدید میں متی۔ مرقس۔ لوقا اور یوحنا نے اپنے آقا حضرت مسیح کی سیرت رقم فرمائی ہے۔ بدھ مت اور مسلمانوں کی بعض اولیں کتب بھی سیرت سے تعلق رکھتی ہیں۔

پہلا سیرت نگار

فن کی حیثیت سے سب سے پہلا مصنف جسے سیرت نگار کہا جا سکتا ہے وہ پلوٹارک ہے جس نے ۵۰ء میں اس نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا۔ اور اپنے علم و فضل اور خداداد ذہانت کی بدولت فن سیرت نگاری میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ اگر کوئی شخص اس کے کارناموں کا اندازہ لگانا چاہے تو اس کی پہلی تالیف "مشاہیر یونان و روما" کا مطالعہ کرے جس سے اس کے کمالات انشاپردازی اور حسن بیان کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ اور اس کے اندر وہ تمام خصوصیات بھی ملیں گی جو ایک اچھے اور بہترین سوانح نگار کے لئے ضروری ہیں۔ بلا شبہ اس کی تصنیف کو غلطیوں سے پاک نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں مصنف نے واقعات کے نقل کرنے میں تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں کیا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں چونکہ دنیا کا شعور و احساس اتنا تیز نہیں تھا اور نہ اس نے علم و فن میں اتنا نمایاں کمال حاصل کیا تھا اس لئے پلوٹارک کی تصنیف قابل قدر ضرور ہے اور حقیقت یہ ہے کہ پلوٹارک اس فن میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔

سیرت نگاری کا علمی طریقہ

انیسویں صدی کے اواخر میں سیرت نگاری میں علمی طریقے کا اضافہ ہوا اس کی ترتیب و تدوین بالکل علمی طریقہ سے شروع ہوئی۔ اس نئے باب کے اضافے سے لوگوں کو معلوم ہوا کہ کس طرح ایک انسان کے محاسن حالات زندگی سے الگ ہو کر بیان کئے جا سکتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جس طرح علمائے علم النفس عناصر کیمیاوی کا درس دیتے ہیں کیونکہ علمی پیرایہ بیان یہ ہے کہ صاحب سیرت کے واقعات اور حالات اس طرح نقل کئے جائیں کہ اس کے خیالات، احساسات، اور اخلاقی حالت افراط و تفریط کی آمیزش سے پاک ہو۔ سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ اس اصول کو پیش نظر رکھے اور اس کی بہترین صورت تو یہ ہے کہ اسے علم النفس کی ایک شاخ قرار دیا جائے اس صورت میں افراط و تفریط کا احتمال بھی کم ہو جائے گا اور سوانح کا علمی طریقہ زیادہ مفید ہوگا۔ اور اگر سیرت علمی طریقہ پر نہیں لکھی گئی۔ اور سوانح نگار نے سیرت نگاری میں ذاتی رجحانات سے کام لیا ہے تو خود اس پر اور اس کی تصنیف کے پڑھنے والے دونوں پر اس کا برا اثر پڑیگا۔ سوانح نگار کے اخلاق و عادات پر تو اس لئے برا اثر پڑیگا کہ وہ بے سر و پا اور بے اصل باتوں کی تبلیغ کا عادی ہو جائیگا[۴]

---

[۴] جس سے اس کے اخلاق میں استواری باقی نہ رہے گی۔ اور قارئین کے اخلاق و عادات پر وہ اثر پڑے گا جو بری صحبت یا کمزور اخلاق کی رفاقت کا نتیجہ ہوتا ہے

اقبالؒ

نظم

حضرت بسمل دہلوی

جہانِ شعر میں وہ میرؔ کی آشفتہ فرمائی — ملائک نے لکھی اُس کے مقدر میں پذیرائی
وہ اس کی شاعری برہم زنِ عہدِ شکیبائی — کہ ہر ہر لفظ میں اک دردِ ہستی اک غم آرائی
اُسے فطرت نے بھیجا تھا یہاں اپنی زباں دیکر
ستم خوردہ تمناؤں کی اک طرزِ بیاں دیکر

درِ غالبؔ پہ وہ فکرِ معلیٰ کی جبیں سائی — وہ داغِؔ زمزمہ گو کی زباں وہ نکتہ آرائی
وہ احساساتِ حالیؔ کی تغیر کیش رعنائی — کہ جس سے قوم خوابیدہ نے لی ہلکی سی انگڑائی
یہاں سے شاعری کے رنگ میں کچھ انقلاب آیا
کشاکش نے سحر دیکھی حمیت پر شباب آیا

مگر اقبالؔ کی نُدرت وہ اندازِ بیاں اُس کا، — وہ نوعِ کشمکش، وہ دفترِ سوزِ نہاں اُس کا
یہ کب ممکن ہے بالائے فلک ہو آشیاں اُس کا — بعید فہم ہے اندازۂ حدِ گماں اُس کا
وہ اپنے دل میں طوفانِ حرارت لیکر آیا تھا
جگر میں سوز آنکھوں میں مروت لیکر آیا تھا

وہ تاریکیٔ زنداں دیکھ لیتا تھا نشیمن سے — حریمِ ناز کے پردے اُٹھا دیتا تھا چتون سے
پئے صحرا نہ لیتا تھا گل و لالہ وہ گلشن سے — بدل دیتا تھا ایجادِ سکندر قلبِ آہن سے
ہُما اُس کی نگاہِ دُور رس کی زد میں رہتا تھا
جنوں تک عالمِ ادراک کی سرحد میں رہتا تھا

کبھی اس نے رموزِ بیخودی کا درس فرمایا — کبھی نظمِ حیاتِ مستقل کا نکتہ سمجھایا
کبھی وہ شانِ اسرارِ خودی کو سامنے لایا — کبھی دنیا کے منظر پہ مع ضربِ کلیم آیا
درِ معبود پر پہنچا دلِ دردآشنا لیکر
کبھی شکوہ بلب ہو کر کبھی بانگ درا لیکر

جنوں میں اک تدبر اور تدبر میں جہانبانی — جہاں بانی میں درویشی مگر مسجودِ سلطانی
سمجھتا ہوں کہ اب کیوں ہے فرشتوں کو پشیمانی — ہوئی اقبالؔ سے تکمیلِ احساساتِ انسانی
دریں عالم غمِ اقبال بسملؔ رہنما دارم
بکوشش میتوانم شد اگر بختِ رسا دارم

بیوقوف

نفسیاتی افسانہ

جناب عزیز احمد بی۔اے (علیگ)

گو بیچارہ اس نے گاڑی کے انتظار میں سارا وقت ہنس ہنس کر کاٹا۔ اور رخصت ہوتے وقت ہاتھ ملاتے ہوئے بھی وہ مسکراتا ہی رہا۔ لیکن اس کی روح کی گہرائیوں میں یاس کے نشتر تیر رہے تھے اور اس کے ذہن پر ایک مسلسل کرب و اضمحلال کی کیفیت طاری تھی۔ آشا تک سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے اس گرمجوشی کا اظہار کیا جس کی بدولت وہ سوسائٹی میں خلیق اور ملنسار مشہور تھا۔ لیکن جب ریل چلی تو اس کا دل بھر آیا اور جوں جوں آشا کا ہلتا ہوا رومال اس کی نظروں سے دور ہوتا گیا، اس کی آنکھیں پُرنم ہوتی گئیں۔ جب گاڑی تقریباً ایک میل جا چکی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ رو رہا تھا۔ اس نے چونک کر آنسو خشک کئے اور سامان کو قاعدے سے رکھ کر سیٹ کے ایک کونے میں ٹک گیا۔

رات بہت سرد تھی۔ اس نے انگوٹھوں سے مل کر ناک کو گرم کیا اور السٹر کے کالر ذرا اوپر کھینچ لئے تاکہ کان ٹھنڈک سے محفوظ رہیں۔ اب اس کے ذہن میں یکایک یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ کیوں جا رہا ہے؟ دو سال قبل جب وہ علی گڑھ آیا تھا تو کیا وہ سوچ بھی سکتا تھا کہ اتنی جلد وہ غمگین و ملول واپس جائے گا؟ پھر اس کے ذہن میں وہ لفظ گونجنے لگے "بیوقوف!" ... [illegible] گفتگو کر رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی ہنسا تو اس کے قہقہے کے زیر و بم میں اسے اپنی توہین نظر آئی۔ باہر ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھنا شروع کیا۔ رات تاریک تھی اور انجن سے چنگاریاں اڑ اڑ کر تاریکی میں نورانی لکیریں بنا رہی تھیں جیسے "تارا ٹوٹے" ...... اس نے سوچا۔ "میری امیدوں کا تارا بھی تو اسی طرح ٹوٹ کر لامتناہی فضاؤں میں گم ہو چکا ہے" جیسے قسمت اس کی بیوقوفی پر تبسم تھی۔ اس کو یکایک پھر ایک تحقیر محسوس ہوئی۔ ذرہ ذرہ چیخ رہا تھا۔ "بیوقوف! بیوقوف!! بیوقوف!!!" وہ رو پڑا اور اس نے اپنا سر بازوؤں میں چھپا لیا۔

وہ علی گڑھ آیا تو [illegible] گزشتہ واقعات پر [illegible] سی بھولے ہوئے نغمے کی لے کی طرح اس کے دل و دماغ میں گونجنے لگی۔ واقعات تصور کے چور دروازے کے ذریعے ذہن لاشعور سے نکل کر ذہن کی سطح مرتفع پر تیرنے لگے۔ اور خیالات کی ایک موج نے اسے دو سال پیچھے پھینک دیا۔

ان دنوں وہ الہ آباد میں پڑھتا تھا۔ سردیوں کی تعطیل میں گھر پہنچا تو اسے علی گڑھ سے اپنے ایک ہم جماعت منیر کا تار ملا کہ کرسمس میرے ساتھ بسر کرو۔ اپنی روانگی کی اطلاع دیکر وہ فوراً علی گڑھ روانہ ہو گیا۔ سٹیشن پر منیر کا کنبہ اس کے استقبال کے لئے آیا ہوا تھا۔ باری باری اس کا تعارف سب سے کرایا گیا۔ اس کی مخصوص مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلتی رہی اور ہر ایک نے اس سے ہاتھ ملاتے وقت یہی محسوس کیا کہ اس سے مل کر اسے سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔

رات کے کھانے کی ملاقات بہت مختصر رہی۔ صبح چار پر اس نے خاندان کے تمام افراد کا جائزہ لینا شروع کیا۔ مسز رائے گندمی رنگ کی ایک فربہ اندام خاتون تھیں لیکن ان کی نشیلی آنکھیں ان کے دیغا پر دور شباب کی غمازی کر رہی تھیں۔ وہ اپنے لڑکے منیر کی طرح صاف اردو بولتی تھیں لیکن درمیان میں کثرت سے انگریزی کے الفاظ استعمال کرتی تھیں۔

آشا ایک تندرست سی لڑکی تھی۔ رنگ زیادہ صاف نہ تھا لیکن اس کی آنکھوں میں غیر معمولی ذہانت کی چمک بہت ہی دلآویز تھی اور اس کی گھنی لانبی پلکیں اور مفکرانہ انداز نوجوانوں کا دل موہ لینے کے لئے کافی تھے۔ وہ بالعموم سنجیدہ تھی اور بہت کم بولتی تھی۔ لیکن کوئی معقول جملہ سن کر اس کے ہونٹوں پر تبسم کا نکھار ظاہر کرتا تھا کہ وہ بات کی تہ تک پہنچ گئی ہے۔ اس کے [illegible] ہوئے ہاتھ [illegible] اور رخسار [illegible] [illegible]

[illegible] برقرار ہے۔

وہ ملاقات [illegible] اور ایک [illegible] تھی [illegible] جیسے اس کی [illegible]

نقوش میں بے تکلفی کی جھلک تھی۔ لیکن اس کی ناک اور لبوں کے قریب چھلوں کے نشانات ظاہر کرتے تھے کہ وہ زندگی میں جُوا کھیلنے کی عادی ہے۔ اور کامیابی کی موہوم سی اُمید پر بھی اپنا سب کچھ داؤ پر لگا سکتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ نادانی کی حد تک صاف گو اور تیز تھی۔ آشا سے وہ تقریباً دو برس چھوٹی تھی۔

چا‎ء کے دوران میں منیر نے پوچھا "کیوں بھئی پورن۔" اپنا سنسار" لگ رہا ہے۔ دیکھنے نہیں چلوگے؟"

" ویسے چلونگا۔ لیکن میں دیکھ چکا ہوں" وہ بولا۔

" کیسا ہے؟ — اشوک کمار ہے اس میں؟" گیتا نے پوچھا۔

" ہے تو سہی، لیکن وہ فن کاری سے زیادہ عوام کے مذاق کے متعلق محتاط نظر آتا ہے" پورن نے جواب دیا۔

" تعجب ہے۔ پہلے تو اس نے کبھی اس طرح فن کا خون نہیں کیا۔"

" کیوں نہیں۔ "کنگن" "بندھن" اور اس سے پہلے ان گنت تصویروں میں وہ کہیں بھی عام سطح سے بلند نہیں ہوا۔ اور پھر اُس کے گانے! توبہ، کس بُری طرح موسیقی کا خون کرتا ہے۔ اور لوگ انہی گانوں پر سر دھنتے ہیں"

" معاف کیجئے گا اشوک کمار کے متعلق آپ کا فیصلہ کسی قدر جانبداری پر مبنی ہے"

" کیوں ٹھیک تو ہے گیتا! اس کی ایکٹنگ سے آج تک کسی غیر فانی کردار کی تخلیق نہیں ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے گانے جذباتی ہونے کی وجہ سے کانوں کو بھلے لگتے ہیں ورنہ ان میں روح کی تسلی کا سامان کہیں بھی نہیں ملتا" آشا نے خلاف معقولات کرتے ہوئے کہا۔

" ارے جانے بھی دو لڑکیو! مہمان خاموش بیٹھے ہیں اور تم آپس میں مہا بھارت مچائے ہوئے ہو" مسز رائے نے جھگڑا چکا دیا۔

" آپ کی کوٹھی کی situation بہت اچھی ہے" پورن نے جان بوجھکر گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

" ارے منیر! ذرا پورن کو سارا مکان تو دکھا دو" مسز رائے نے تجویز کیا۔ پورن اس کے ساتھ ہولیا اور رائے نے ایک ایک کمرہ دکھانا شروع کر دیا۔

" یہ ڈرائنگ روم ہے۔ یہ تو کھانے کا کمرہ ہے ہی۔ یہ پاپا جی کا دفتر یہ ایک بیڈ روم۔ یہ دروازہ باتھ میں کھلتا ہے۔ اور ادھر کو یہ ممی کا کمرہ، یہ گیتا کا کمرہ ہے . . . . ."

" اشوک منزل کہو" پورن بولا۔ منیر چونک پڑا۔ مڑ کر دیکھا تو مینٹل پیس پر اشوک کمار کے تقریباً ایک درجن پوز خوبصورت چوکھٹوں میں مقید تھے۔

" واقعی! اور یہ آشا کا کمرہ ہے" منیر ایک اور کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ یہ ایک سادہ سا کمرہ تھا۔ ایک طرف کو لکھنے کی چھوٹی سی میز کے ذرا اوپر ایک تصویر کے فریم پر ایک مُرجھایا ہوا ہار پڑا تھا۔ پورن نے غور کیا تو حیرت سے اس کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہ اس کی اور منیر کی تصویر تھی جو انھوں نے الہ آباد میں کھچوائی تھی۔

وہ سوچنے لگا کہ آخر اس نے وہ تصویر اپنے کمرے میں کیوں لگا رکھی ہے؟ اور پھر اس پر پھولوں کا ہار۔ ممکن ہے کہ اس نے یونہی بے خیالی میں اسے تصویر پر ڈال دیا ہو۔ اور وہ وہاں پڑے پڑے سوکھ گیا ہو لیکن اس نے وہی تصویر کیوں لگائی؟ اگر وہ منیر کی تصویر لگانا چاہتی تو اس کی بہت سی اکیلی تصویریں بھی گھر میں تھیں —— اور میں —— لیکن مجھے تو وہ جانتی تک نہ تھی۔ کیا وہ مجھے —— لیکن یہ کیا؟ کچھ نہیں وہ اس گتھی کو حل نہ کر سکا۔ سوالات نے اس کے دماغ میں ایک جال سا بُن دیا تھا جس کو سلجھاتے سلجھاتے اس کے قویٰ تھک گئے اور وہ بیجان سا ایک طرف کو صوفے میں ڈھلک گیا۔

خیالات کی ایک اور یورش ہوئی۔ اور اس کا دماغ صحیح معنوں کی آماجگہ بن گیا۔ "گیتا شوخ ہے چنچل ہے، لیکن آشا کی سنجیدگی اور متانت میں کچھ اور ہی وزن ہے۔ اس کا دراز قد اس کے متناسب اعضا۔ اس کی سُریلی آواز جس میں بلبل کی نغمگی، کوئل کا سُریلا پن اور پپیہے کا درد مضمر ہے، اور سب سے بڑھکر اس کا خلوص آمیز انداز گفتار . . . اور . . . لیکن مجھے یہ سب سوچنے کا حق ہی کیا ہے میں ایک ہفتہ کے لئے یہاں آیا ہوں، پھر واپس چلا جاؤنگا — اور منیر ٹھہرا میرا دوست — پھر وہاں جمنا مجھ سے آس لگائے بیٹھی ہے . . . ." اس وقت اسے جمنا کے رخصتی جملے یاد آگئے "یہ دس بڑے دن آپ کے بنا کیسے کٹیں گے؟ دیکھئے میں کہتی ہوں نہ جائیے! یا پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلئے" اس نے مخصوص بنگالی بھولے پن سے کہا تھا۔ جس پر اس نے تسلی دی تھی۔ " پاگل ہوئی ہو جمنا! میں تو ہر آن تمہاری یاد میں مگن رہونگا۔ اور روز تمہیں ایک چٹھی لکھا کرونگا تم پریشان بلا وجہ ہو رہی ہو۔ میں کوئی زیادہ دنوں کے لئے تھوڑے ہی جا رہا ہوں" لیکن اس نے اب تک ایک خط بھی نہ لکھا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے جمنا کی یاد بھی نہ آئی تھی اور پچھلے تین دنوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے جمنا کے خیال کو اپنے دل میں جگہ دی تھی۔

"آپ کھانا کتنے بجے کھانے کے عادی ہیں؟" اس نے سُنا اور چونک پڑا۔ مڑ کر دیکھا تو گیتا دروازے کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ اور اس کی گھنی پلکیں اس کے رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں۔

"آپ لوگ عموماً کس وقت کھاتی ہیں؟" اس نے دریافت کیا۔

"یہی، کوئی گیارہ بجے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں بھی اسی وقت کھاؤں گا۔"

گیتا جانے لگی۔ اس نے پکارا۔ "ذرا سنئے!"

"جی ——!"

"میری صبح والی باتوں کا آپ نے بُرا تو نہیں مانا؟"

"کیسی باتیں؟" وہ متعجب ہو کر بولی۔

"میں نے جو کچھ اشوک کمار کے متعلق کہا تھا اس سے میرا مطلب ہرگز آپ کی دلآزاری نہ تھا۔ اور نہ مجھے علم تھا کہ آپ کے دل میں ان کی اتنی قدر ہے۔ ورنہ . . . ."

"آپ بھی کیا کہتے ہیں۔ ۔ ۔ میں بُرا ماننے کی کیا بات تھی؟ اگر آپ خود مجھے بھی کچھ کہہ لیتے تو بھی میں بُرا نہ مانتی۔"

"میں ——؟"

"جی ——!"

چھ دن آنکھ جھپکتے گزر گئے۔ اس دوران میں وہ گھر بھر سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ اور خاندان کے ایک رکن کی طرح رہنے لگا تھا۔ آشا کا رویہ حسب دستور خاموش اور مخلصانہ تھا۔ ہاں گیتا اس سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ اور موقع ملتے ہی اپنا زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارتی۔ اس کے باوجود اسے جو تسکین اور خوشی آشا کے مختصر جملوں اور گہرے تبسم سے ہوتی وہ گیتا کی طویل باتیں اور مترنم قہقہے بھی مہیا نہ کر سکتے۔ عجیب بات تھی کہ جیسے جیسے گیتا اس کے قریب ہوتی گئی اسی قدر آشا کی منزلت اس کے دل میں بڑھتی گئی۔ ان چھ دنوں میں کتنے ہی بار گیتا نے دل موہ لینے والے گانے گائے اور کتنی ہی مرتبہ سینما میں اس کے پہلو بہ پہلو بیٹھی۔ لیکن ان باتوں سے اس کے جذبات میں کوئی ہلچل نہ مچ سکی۔ مگر آشا کی پر اسرار خاموشی نے اس کی روح کو ایک خاص قسم کے درد کی لذت سے آشنا کر دیا تھا۔

جب وہ واپس جانے لگا تو آشا اور گیتا اسٹیشن نہ جا سکیں۔ مسز رائے نے انھیں بچوں کی دیکھ بھال کے لئے گھر ہی پر روک دیا۔ جب سامان تانگے میں رکھا جا چکا تو منیر نے کہا "گیتا اور آشا سے مل لو۔" دونوں علیحدہ علیحدہ کمروں میں تھیں۔ پہلے وہ گیتا سے ملا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہاتھ ملاتے وقت وہ بے اختیار رو گئی۔ آشا اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی اسے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"آپ جا رہے ہیں۔ دیکھئے پھر ضرور آیئے گا۔ اور منیر بھیا کے ساتھ خط لکھتے رہئے گا۔ ارے ہاں گیتا سے مل چکے؟"

"مل چکا۔ اچھا بائی بائی۔"

"چیرو ——!"

ساری گفتگو کی دوران میں آشا کی سنجیدہ مسکراہٹ ایک لمحے کے لئے بھی اس کے ہونٹوں سے غائب نہ ہوئی۔

الٰہ آباد پہنچ کر اسے گیتا کے کئی خط ملے۔ لیکن ہر خط میں وہ آشا کا ذکر تلاش کرتا۔ اور جو جملہ آشا کے متعلق ہوتا اسے کئی کئی بار پڑھتا۔ جب وہ لکھی دیکھتا "آشا بوا سلام شوق لکھواتی ہیں" تو وہ سوچتا کیا سچ مچ اس نے سلام لکھوایا ہوگا۔ یا گیتا نے اپنی طرف سے لکھ دیا ہے۔ اسی سوچ میں وہ اکثر خطوط کو غور سے پڑھنا بھول جاتا لیکن ان خطوط میں ہوتا ہی کیا تھا؟ یہی کہ آپ خط کا جواب ضرور دیجئے گا۔ اور منیر بھیا ایسٹر میں گھر آئیں گے یا نہیں؟ آشا بوا کہتی ہیں کہ آپ بھی ان کے ساتھ آ جایئے۔ اور کیسا رہے اگر آپ اگلے سال یہیں داخلہ لے لیں —— وغیرہ۔

اور عجیب اتفاق ہوا کہ جولائی میں اس کے والد نے اسے علی گڑھ یونیورسٹی جانے پر مجبور کیا۔ جب وہ علی گڑھ پہنچا تو سارے خاندان نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ مسز رائے کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا لڑکا کسی دور دراز سفر سے واپس آ گیا ہو۔ گیتا اپنی خوشی کو نہ چھپا سکی اور دیوانوں کی طرح باتیں کئے گئی۔ آشا حسب دستور خاموش تھی۔ اس نے صرف اس قدر کہا۔ "آپ کو الٰہ آباد کی یاد نہ ستائے گی؟" لیکن اس کی نظروں اور اداؤں میں سب سے زیادہ پیش پیش وہی تھی —— خاموشی، انتظار، اور بے عذر!

انھی دنوں یونیورسٹی کے جوار میں ہیضہ پھیل جانے کی وجہ سے یونیورسٹی کے کھلنے کی تاریخ دو ہفتہ بڑھا دی گئی۔ اب اسے دو ہفتہ اور رائے فیملی کے ہاں رہنا تھا۔ اسی دوران میں اس کی کلائی پر ایک پھنسی نکل آئی جس نے بڑھ کر پھوڑے کی شکل اختیار کر لی۔ پہلے تو وہ اجنبی جگہ اس نئی مصیبت کو دیکھ کر گھبرایا لیکن جب

اس نے دیکھا کہ گیتا کا کنبہ اس کی تیمارداری میں لگا رہتا ہے تو اُسے ایک گونہ اطمینان ہوا — اور وہ اس بیماری کو بھی بالائے غمہائے دگر جان کر خاموش ہو گیا۔ مسز رائے خود اسے روز ڈاکٹر کے یہاں لے جاتی تھیں اور لڑکیوں کو انھوں نے اس کی تیمارداری پر مامور کر دیا تھا۔ گیتا اپنا زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارتی تھی۔ وہ پہروں اس کے پاس بیٹھی باتیں کیا کرتی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں، اُستانیوں کے تذکرے۔ شکار کے قصے، دعوتوں کے چرچے اور جانے کیا کیا — آشا اس کے پاس کم بیٹھتی۔ لیکن جب آتی تو مسیحائی کا سارا سامان ساتھ لاتی۔ وہ خاموشی سے گرم پانی لاتی، اس کی پٹی بدلتی، زخم دھوتی، اسے سینکتی، اور چلتے وقت جب وہ پوچھتی "اب کچھ آرام ہوا؟" تو وہ محسوس کرتا جیسے ساری کائنات کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں جیسے اس نے اس سنسار میں خلوص کے علاوہ اور کچھ دیکھا ہی نہیں، پھر وہ ایک طویل "بہت" کہہ کر ایک نامعلوم نشے کی کیفیت میں ڈوب جاتا۔

صبح نکھر چکی تھی، اور فضا میں ایک لطیف اور سماوی سی خوشبو تیر رہی تھی۔ پورن باتھ سے نکل کر آئینے کے روبرو کھڑا کنگھا کر رہا تھا۔ کہ گیتا پیچھے سے آئی اور اس کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس نے مڑ کر اس کا سلام لیا اور خیریت دریافت کی۔ وہ ایک ہلکی فیروزی ساری میں ملبوس تھی اور اس کے کھلے ہوئے بال جوگنوں کی طرح اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ دونوں میں مختصر گفتگو ہوئی۔

"آج آپ بہت سویرے اُٹھ گئے۔"

"میں تو تقریباً روز اسی وقت اُٹھ جاتا ہوں۔"

وہ مسکرائی اور اپنے بائیں شانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہاں سونگھئے۔ دیکھئے! میں نے کتنا عمدہ سینٹ لگا رکھا ہے۔"

وہ اپنی ناک اس کے قریب لے گیا۔ وہاں کوئی بھی خوشبو نہ تھی وہ اعتراض کرنے ہی والا تھا کہ اس نے اپنے رخساروں پر سانس کی گرمی محسوس کی۔ گیتا کے لب اس کے رخسار سے مس ہو رہے تھے، وہ چونک پڑا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے ساری کائنات گھومتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اگرچہ گیتا نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ نادانستہ طور پر اس کے ہونٹوں اور پورن کے رخسار کا اتصال ہوا لیکن وہ فوراً تاڑ گیا کہ یہ حرکت جان بوجھ کر کی گئی ہے۔

اس کے دل میں بھول کر بھی یہ خیال نہ گزرا تھا کہ گیتا اتنی جرأت کر سکتی ہے۔ وہ ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ اس دعوت سے گریز کرے یا اسے قبول کرے کہ یکایک اس کی نظر آئینے پر پڑی جہاں اُسے آشا کا عکس نظر آیا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپ کر آشا سے الگ ہو گیا یا ایک ثانیے کے لئے اس کی نگاہیں آشا سے چار ہوئیں۔ لیکن وہ فوراً واپس چلی گئی۔ اس نے مڑ کر گیتا کی طرف دیکھا وہ ایک رسالے کے اوراق اُلٹ رہی تھی۔ اس ناخواندہ حادثے نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ وہ اس کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا اور بیدم ہو کر ایک صوفے پر گر پڑا۔

وہ پھر سوچنے لگا۔ سوچنا اس کی عادت میں داخل تھا۔ وہ ہر بات کے ریشے ریشے کو ادھیڑ کر اس کی تہ میں جانے کی کوشش کرتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ گھنٹوں غور کیا کرتا۔ اسے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ گیتا کی بے تکلفی اس حد تک پہنچ جائے گی۔ "اس کا اس سے منشا کیا تھا؟ — اور آشا! اس نے اپنے دل میں کیا سوچا ہوگا؟ اسے یقیناً غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ اور اس نے قصوروار مجھی کو ٹھہرایا ہوگا —" اور نہ جانے کیا کیا خیالات اس کے دل میں چکر لگا رہے تھے۔ وہ پریشان تھا کہ آخر وہ آشا کا سامنا کیسے کرے گا؟ اور اگر مسز رائے کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو؟ — مگر نہیں آشا اتنی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتی۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی۔

تھوڑی دیر بعد اسے پھر بلایا گیا تو وہ اپنی رگ رگ میں ایک خلش محسوس کر رہا تھا۔ لیکن جلد ہی اسے معلوم ہو گیا۔ کہ کسی کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ البتہ آشا کا سکوت کچھ اور بھی پراسرار اور معنی خیز ہو گیا تھا۔

زندگی کو صاف، سیدھی اور کشادہ شاہراہ مرغوب نہیں، وہ اپنے استقرار کے لئے پیچ در پیچ موڑ اور گھماؤ اور اُلجھی ہوئی پگڈنڈیوں کے جال چاہتی ہے۔ کچھ عرصے تک پورن کے دن یکسانی و بے کیفی کا شکار ہوئے بغیر گزرتے رہے۔ یونیورسٹی کی رنگینیوں میں کھو جانے کے باوجود رائے فیملی سے اس کا ربط اب تک قائم تھا۔ گیتا کے لب و رخسار کی لطف اندوزیاں اس کی ہو چکی تھیں لیکن اس کا دل آشا کی روح کی گہرائیوں میں اترنے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ وہ یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ آشا کے دل میں اس کے لئے کیسے جذبات ہیں۔ آشا کا جسم اور اس کی روح دونوں پورن کے لئے باعث کشش تھے۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا عضو عضو کسی مقناطیسی قوت

سے آشا کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔" اس کا سبب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آشا میرے لئے محسوس کرتی ہو" وہ سوچتا لیکن اس کی ہمت نہ پڑتی کہ اس کی طرف بڑھے۔ وہ کیفیتوں کے اسی دور سے گزر رہا تھا کہ اس کی زندگی میں نجمی داخل ہوا۔

نجمی اس کا پرانا دوست تھا۔ سکول کا ساتھی، وہ ایک شاعرانہ طبع کا انسان تھا۔ چھریرے بدن کا دلکش لڑکا ـــــ ہر شخص کے دل میں گھر کرنے والا۔ اور ہر محفل پر چھا جانے والا۔ وہ کمسن ہونے کے باوجود باتوں کو خوب سمجھتا تھا۔ اور ایک ماہر نفسیات کی طرح ہر چیز کی تحلیل کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ اس کے سامنے اپنا ظاہر و باطن ایک رکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ عینک میں سے جھانکتی ہوئی اس کی حسین آنکھیں ہر کسی کے دل میں اُتر جاتی تھیں اور اس کے جسم و روح کے آہنگ کو پا لیتی تھیں۔ صنفِ نازک کا طبقہ اسے عزیز رکھتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس سے خائف بھی تھا کیونکہ وہ تکلف اور تصنع کا سخت دشمن تھا۔ اور بڑی بے رحمی سے بناوٹ کی دھجیاں اُڑایا کرتا تھا۔ وہ دوستی میں تندرستی کا قائل تھا۔ اور اکثر ان نوجوانوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا جو تیر نظر کے گھائل ہو کر آہیں بھرا کرتے ہیں۔

رائے فیملی میں پورن کے ذریعہ نجمی متعارف ہوا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے سب کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن گیا۔ اس کے شگفتہ فقرے، اس کا دلربا انداز گفتگو۔ اس کا لطیف تبسم اور اس کا شستہ مذاق سارے گھر کو مسحور کئے رہتے۔ وہ اس سوسائٹی کا بت بن گیا تھا اور سب ہی اسے پوجتے تھے۔

دن گزرتے گئے۔ اور رائے فیملی میں نجمی کی مقبولیت بڑھتی گئی لیکن وہ کبھی پورن کے رستے میں نہیں آیا۔ پورن حسب دستور بینا کے ہونٹوں کی مٹھاس اور آشا کی آنکھوں کا خمار اپنی روح میں حل کرتا رہا۔ وہ پہلے کی طرح مترنم صداؤں سے نور و نغمہ اخذ کرتا رہا۔ جب محفل جمتی تو نجمی چھا جاتا اور پورن پس منظر میں پڑ جاتا گیتا اس کے چوڑے چکلے سینے کو دیکھنے کے بجائے نجمی کے نازک جسم کو باندھ لیتی۔ اور آشا کی ہمدرد نگاہیں بھی اس کو نظر انداز کر کے نجمی کی عینک میں جگہ کرتی نظر آتیں۔ مسز رائے اس کی گفتگو پر تحسین کہتی تھیں اور پورن غیر شعوری طور پر اس ساری کیفیت میں شریک رہتا۔

پورن کو علی گڑھ آئے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ اور اس عرصہ میں گیتا اس کے بازوؤں کی گرمی اور اس کے ہونٹوں کی حرارت کو اپنے ریشے ریشے میں محسوس کر چکی تھی۔ لیکن آشا حیرتناک حد تک دبی دبی رہی۔ اس کا لہجہ مخلصانہ ہونے کے باوجود اب تک اتنا ہی موقر تھا۔ جتنا کہ پہلی ملاقات کے موقع پر۔ اس کی سنجیدگی پورن کے لئے اب بھی ایک راز تھی۔ اب وہ اپنے دل میں ایک بے پناہ جذبہ محسوس کر رہا تھا جو اسے لمحہ بہ لمحہ آشا سے قریب کئے دیتا تھا۔ اس کی خلش میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اور آخر اس نے سوچا کہ کیوں نہ خود آشا سے بات کر کے اپنے متعلق اس کی رائے معلوم کی جائے۔

ایک دن دونوں تنہا تھے۔ پورن نے ہمت کر کے گفتگو چھیڑی۔

"آشا! میں علی گڑھ چھوڑ رہا ہوں۔"

وہ چونک پڑی اور پوچھنے لگی۔ "کیوں؟"

"آشا ہر کوئی اپنی زندگی میں ایک سہارا ڈھونڈتا ہے میں دو سال سے علی گڑھ میں ہوں لیکن کسی کو اپنا نہ سکا۔ اب مجھ سے اپنی روح کی تنہائی برداشت نہیں ہوتی۔"

"اوہ! آپ کتنے بیوقوف ہیں۔" آشا نے اکتائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"بیوقوف؟" تاسف اور تعجب کے ملے جلے انداز میں اس کی زبان سے نکلا۔

"جی ہاں!" وہ گلوگیر آواز میں کہہ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ پورن تلملا گیا۔ اس نے سمجھا کہ اس کی دعوت کو رد کر دیا گیا ہے اس کی التجا کو ٹھکرا دیا گیا ہے۔ وہ عورت کے دل میں نہ جھانک سکا۔ اور اس نے آشا کو غلط سمجھا!

جب اس نے نجمی سے سارا حال کہہ سنایا تو وہ بولا۔ "تم بیوقوف ہو۔ تم نے اس کے جملوں کو بالکل غلط سمجھا۔ آشا کو تم سے محبت ہے، بے اندازہ محبت ـــــ! اس کی خاموشی پر نہ جاؤ، یہ ظاہری ہے۔ اس ساکن سطح کے نیچے جذبات کا اتھاہ سمندر لہریں لے رہے ہیں۔ تم اس کی قدر کرو دوست! تم اس کی محبت کی قدر کرو۔ بیوقوف مت بنو اپنی آغوش تمنا وا کرو۔ اور فوراً اسے اپنا لو۔"

لیکن نجمی کی اس تقریر کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے سوچا نجمی کو صرف ظاہر کی خبر ہے۔ اور میں خود اس سے دریافت کر چکا ہوں ساکن سطح کے نیچے جذبات کے اتھاہ سمندر ـــــ! یہ کچھ نہیں، یہ سب فلسفہ و نفسیات کی قیاس آرائیاں ہیں۔ "بیوقوف مت بنو!" سچ مچ میں بڑا بیوقوف ہوں۔ میں نے سب سے بڑی بیوقوفی یہ کی کہ اتنے دنوں تک آس لگائے بیٹھا رہا۔ آشا نے بھی تو مجھے بیوقوف

ہی کہا تھا۔ "بیوقوف!" یہ لفظ اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔

پورن نے علی گڈھ چھوڑنے کی دھمکی اس اُمید پر دی تھی کہ آشا اس سے محبت کا اظہار کرے گی۔ اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیگی۔ یا اسے اپنے کلیجہ میں بٹھالے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا اس کے ذہن میں کسی خیالی افسانے کی ہیروئن کا نقشہ جما ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ افسانے اور حقیقت میں کتنا تضاد ہوتا ہے۔ غریب! اسے کیا معلوم کہ ہمارے افسانہ نگار زندگی کی کس قدر فرضی تصویریں پیش کرتے ہیں اور اسی بھولے پن کی وجہ سے وہ راہ محبت میں ٹھوکر کھا گیا تھا۔ آشا کے اقرار کو اس نے انکار سمجھا۔ اور اپنی زندگی کو بے کیفیتوں کی نذر کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کرے۔ علی گڈھ چھوڑ دینا مذاق نہ تھا۔ اسے اپنے والدین کو جواب دینا پڑتا۔ ایک ہفتہ اسی ششش و پنج میں گزرا تھا کہ ایک نیا واقعہ پیش آیا۔

پنجاب سے ایک مشہور ہاکی ٹیم آئی ہوئی تھی اور ہیلیٹ پارک میں اس کا شو میچ تھا۔ پورن نے رائے فیملی کو میچ پر مدعو کیا۔ مسز رائے نے مشغولیتوں کی بنا پر معذرت کر دی اور کہا "تم دونوں کو لیتے جاؤ۔" گیتا تیار ہوگئی لیکن آشا کے سر میں درد تھا لہٰذا اس نے مجبوری ظاہر کی۔ ادھر وہ گیتا کو لے کر گیا ہی تھا کہ آشا کی ایک دوست خورشید نے اسے فون کیا کہ "فوراً آجاؤ سینما چلنا ہے۔" اس نے چند عذر کیا لیکن خورشید نے براہ راست مسز رائے سے گفتگو کی اور کہا "آپ آشا کو بھیج دیجئے۔ میں اباجی سے کوئی دوا پلوا دونگی۔ اور اگر فوراً درد اچھا ہوگیا تو سینما لے جاؤنگی۔ ورنہ گھر پہنچوا دونگی۔" مسز رائے کے کہنے سننے پر اسے تیار ہونا پڑا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ جائے کس طرح؟ کار مسٹر رائے لے گئے تھے۔ اور سائیکل گیتا لے کر چلی گئی تھی۔ اتنے میں بجمی اپنی چھوٹی سی کار لے کر آگیا۔ اب کیا تھا۔ مسز رائے نے کہا "بیٹا! ذرا کی ذرا آشا کو میرس روڈ خورشید کے یہاں تک پہنچا آؤ۔"

دونوں خورشید کے یہاں پہنچے تو اس نے بجمی کو بھی سینما چلنے پر راضی کر لیا۔ ادھر جب میچ ختم ہوا تو پورن اور گیتا واپس ہوئے اتفاق سے سینما ہال دونوں کے رستے میں پڑتا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ آشا بجمی کے ساتھ ہال کے دروازے پر کھڑی ہے فرط ندامت سے اس کے ہاتھ کانپ گئے اور اگر وہ ذرا نہ سنبھلتا تو قریب تھا کہ سائیکل سے نیچے آجاتا —— "تو یہ تھی انکار کی وجہ۔ ٹھیک ہے! میں بالکل بیوقوف ٹھہرا نا! اور بجمی ہے عقلمند چست چالاک! مجھے اس کی جیسی پیچیدار باتیں کرنا جو نہیں آتیں۔ یہ لڑکیاں دل نہیں دیکھتیں بلکہ فلرٹیشن چاہتی ہیں۔ بجمی سچ کہتا تھا کہ میں بیوقوف ہوں —— اس کے ذہن میں خیالات کے مرغولے اٹھنے لگے۔

جب وہ گھر پہنچا تو مسز رائے نے اسے کھانے کے لئے روکنا چاہا۔ لیکن اس نے ایک نہ سُنی اور طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے فوراً ہوسٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

تین گھنٹے اس نے سسکیوں اور آہوں میں گزار دیئے اور ساڑھے دس بجے رات کو جب بجمی کی کار کی آواز سنائی دی تو وہ سیدھا اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ کپڑے اتار رہا تھا۔

"کہو دوست کھیل کیسا رہا؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ ایسا اچھا نہیں تھا۔ معمولی سا تھا۔"

"لیکن تم نے تو اسے بہت پسند کیا ہوگا؟"

"نہیں تو۔ میں جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مگر لڑکیاں پیچھے پڑ گئیں اس لئے چلا گیا تھا۔"

"اچھا تو گویا اصرار ہمیشہ لڑکیوں کی طرف سے ہوا کرتا ہے؟"

"کیا مطلب ——؟"

"مطلب؟ کیا کرو گے مطلب پوچھ کے بجی؟" اس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا — اب بجی چونکا — وہ فوراً معاملہ کی تہ تک پہنچ گیا اور بولا۔

"بیوقوف ہوتے ہو کیا پورن؟ میں تو ......"

"ہاں ٹھیک کہتے ہو — میں بیوقوف ہوں — بہت بڑا بیوقوف! لیکن آئندہ مجھ سے کوئی بیوقوفی سرزد نہیں ہوگی۔" اس نے انتہائی طنز کے ساتھ کہا اور باہر نکل گیا — بجی پکارتا ہی رہ گیا — لیکن اس نے ایک نہ سنی — بجی کا دماغ چکرا گیا — وہ اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا تھا لیکن پورن نے اسے اتنا موقع ہی نہ دیا۔

اور دوسرے دن جب وہ اسٹیشن پر رائے فیملی کے ایک ایک فرد سے ہاتھ ملا رہا تھا تو اس کے دماغ میں رہ رہ کر ایک ہی خیال آ رہا تھا — "بیوقوف! بیوقوف!! بیوقوف!!!" بجی اور آشا کے خیالات میں کتنی ہم آہنگی تھی، کتنا ربط تھا —! جیسے ایک ہی ساز کی دو نوائیں ہوں — جیسے ایک ہی نغمے کی دو گونجیں! لیکن اب وہ بیوقوف نہیں بنے گا — اس کے لبوں پر تبسم تھا، اس کی زبان پر شیریں الفاظ تھے — لیکن اس کی رگ و پے میں غلط فہمی کا زہر سرایت ہو چکا تھا اور سینے میں آنسوؤں کا ایک سمندر موقع ملتے ہی آنکھوں کی راہ اُبل پڑنے کا منتظر تھا۔

گاڑی رات کی تاریکی میں روشنی کی ایک لہر دوڑاتی چلی جا رہی تھی — اس نے سوچا "کیا عجب یونہی میری زندگی کی تیرہ و تار فضا نور کے سیلاب سے لبریز ہو جائے۔" اور اس نے طے کر لیا کہ گزشتہ واقعات پر افسوس کرنے کے بجائے ایک نئی زندگی، ایک روشن مستقبل کی تعمیر کرے گا — اور ٹونڈلہ اسٹیشن پر اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے جمنا کو اپنی آمد کا تار دے دیا — شاید یہ کسی دوسری بیوقوفی کا پیش خیمہ تھا —!

کون لے گیا؟

وہ جذبۂ خلوص و وفا کون لے گیا

جناب سید جعفر شیرازی

جاں کا سرور دل کا مزا کون لے گیا
وہ لطف و کیفِ صبح و مسا کون لے گیا

وہ مست مست سجدوں کی بارش کہاں گئی
وہ جذبِ دل وہ ذوقِ دعا کون لے گیا

وہ دن کہاں گئے کہ تمنا جوان تھی
وہ چاندنی شبوں کا مزا کون لے گیا

وہ سوز و ساز، صبر و سکوں، لذتِ وصال
اُس شوخ کا شعارِ وفا کون لے گیا

اب ہم ہیں اور اشکوں کی بارش ہر رات دن
وہ ضبط و خوئے صبر و رضا کون لے گیا

وہ کائناتِ عشق کا افسوں کدھر گیا
لطف و سرورِ لغزشِ پا کون لے گیا

وہ مست مست لمحے وہ موسم کدھر گئے
وہ احترامِ آب و ہوا کون لے گیا

وہ زیست کی بہارِ فسوں ساز کیا ہوئی
وہ نکہت و خرامِ صبا کون لے گیا

اس شوخ کی عنایتِ پیہم کا شکریہ
وہ جذبۂ خلوص و وفا کون لے گیا

مدت سے اب ہیں جعفرِ غمگیں اُداس اُداس
مت پوچھ ذوقِ شعر و نوا کون لے گیا

کیا آپ خوبصورت عورت سے نفرت کرتے ہیں؟

کیا خوبصورت عورت نفرت کرنے کے قابل چیز ہے؟

کیا کسی جوان عورت کا خوبصورت ہونا بُرا ہے؟

دنیا کے کسی مرد سے پوچھ لیجئے۔ ان تینوں سوالات کا اس کے پاس ایک ہی جواب ہوگا — "نہیں" — خوبصورت عورت یقیناً ایک بے مثال تحفہ ہے لیکن یہ سب مانتے ہیں کہ اس تحفہ کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ خوبصورتی اور حُسن زیادہ دیر نہیں رہا کرتے۔ مگر جتنی دیر بھی ٹھہرتے ہیں۔ مرد کے دل کا طوفان بنے رہتے ہیں اور مرد اس طوفان کو بڑی رغبت اور خواہش کے ساتھ برداشت ہی نہیں کرتا۔ بلکہ چاہتا ہے کہ یہ طلاطم خیزیاں زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اسکے دل کی دنیا میں قیامت بپا رکھیں۔ تاکہ وہ اپنی لرزہ براندام تمناؤں اور حسرتوں کو اس دنیا کی حسین سرزمین پر بکھیر دے۔ پھیلا دے اور حسن کے دیوتا کے سامنے اپنے بکھرے ہوئے خزانہ کو سمیٹنے کے بہانہ سرنگوں ہوجائے۔

مگر یاد رہے دنیا میں ہر چیز کا ایک دشمن ہے۔ ہر تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہوتا ہے۔ بہار کیلئے خزاں موجود ہے۔ حُسن کے لئے بھی کوئی دشمن ضرور ہوگا۔ اور پھر عورت کا حُسن — ا — گلاب کے پھول سے زیادہ نازک جو معمولی گرم ہوا سے مُرجھا جائے۔ اسلئے ہر عاقل اپنے دشمن سے آگاہ رہتا ہے۔

اگر آپ کسی خوبصورت عورت کے مالک ہیں

کی سرپرستی میں کوئی حُسن معصوم جوانی کی منزلوں میں قدم رکھ رہا ہے آپ کا فرض ہے کہ اس گلاب کے پھول کو گرم ہوا سے بچائیں عورت کے حُسن کا سب سے بڑا دشمن ایک ہے اور وہ لیکوریا کی بیماری ہے یہ بیماری جس عورت کو ہوجائے سمجھ لو اسکی جوانی گئی۔ رنگ روپ گیا حُسن اور خوبصورتی ختم ہوئی۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کا کہنا ہے کہ لیکوریا کی بیماری جسے سیلان الرحم اور پردر کی بیماری بھی کہتے ہیں اور جسے بعض لوگ پانی کی بیماری بھی بولتے ہیں۔ خوبصورت اور جوان عورت کے لئے بہت ظالم چیز ہے۔ اسلئے ہر سمجھدار عورت کا فرض ہے کہ وہ لیکوریا میں دیر تک مبتلا نہ رہے۔ بلکہ فوراً علاج کرے۔ ورنہ اسے اپنے چہرہ کی جوانی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ کیونکہ عورت کے خفیہ جسم سے وقت بے وقت سفید پانی جو گرتا ہے یہ جوانی کا جوہر ہوتا ہے اور اس کے نکلنے سے عورت کے بدن میں کمر میں پیٹ میں ناف نلوں میں درد ہونے لگتا ہے اور پھر ماہواری میں بھی گڑبڑ ہوجاتی ہے۔

بہت آسان طریقہ

اس بیماری سے تندرست ہونے کا بہت آسان طریقہ ہے۔ جسے لاتعداد ڈاکٹروں نے سالہا سال کے تجربے کے بعد تسلیم کیا ہے کہ عورت کی لیکوریا کی بیماری کیلئے ہندوستان میں سب سے زیادہ بااثر علاج یہ ہے کہ ایسی بیمار عورت کو صرف ایک شیشی دوا "روک" کھانی چاہیئے اس دوا کا اثر عجیب ہے کہ استعمال شروع کرنیکے ٹھیک تیسرے دن پانی گرنا بند ہوجاتا ہے اور پوری شیشی استعمال کر لینے سے سیلان الرحم (یعنی لیکوریا) کی جڑ بنیاد ختم ہوجاتی ہے۔ اور عورت کے چہرہ پر دوبارہ جوانی کی سرخیاں دوڑ جاتی ہیں۔ بہترین دوا ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۳۴ نمبر اے. بی دہلی

کو خط لکھکر بذریعہ وی. پی پارسل منگا لیجئے۔ ایک شیشی دوا "روک" کی قیمت تین روپے ہے۔ پارسل پر صرف نو آنے محصول خرچ ہوگا اور اس معمولی رقم میں عورت کی خوبصورتی اور جوانی تباہ ہونے سے بچ جائیگی۔ کیونکہ لیکوریا کی بیماری اگر زیادہ دن تک رہی تو عورت کے بدن سے جوانی کا جوہر نکل جائے گا۔

ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۸

اشارے

نظم

از حضرت حامد اللہ افسر

ہجر کی راتیں ہوئی جاتی ہیں طولانی بہت
زُلف کی بڑھتی چلی ہے اب پریشانی بہت

رہ گیا مایوس ہو کر تو ہی اے نادان خود
ہیں خزف ریزوں میں اب بھی لعلِ رمّانی بہت

اب اُٹھا ہی چاہتی ہے ہوش کی رُخ سے نقاب
بھر چکی ہے عقل کا بہروپ نادانی بہت

مل نہیں سکتا ہے آدم کا سرورِ اضطراب
گو فرشتوں کو میسر ہے تن آسانی بہت

پھر کوئی موسیٰ کہیں بیتابِ نظارہ ہے کیا
دل کی دنیا میں ہے پھر جلووں کی طغیانی بہت

دے رہی ہے آپ کو دعوت عمل کی بارگاہ
ہو چکی ممبر سے واعظ شعلہ افشانی بہت

گامزن صدیوں سے ہے گو جادۂ تہذیب پر
دُور ہے انسانیت سے نوعِ انسانی بہت

کس سے پوچھیں چھپ گئی زندہ دلی جا کر کہاں
بستیوں پر ہے مسلط آج ویرانی بہت

اُٹھ گیا انسان کی نظروں سے محنت کا وقار
بخش دی تہذیبِ حاضر نے تن آسانی بہت

بکنے نکلے ہیں سرِ بازار سوکھی ہڈیاں
فاقہ مستوں کو ہوا ہے شوقِ عُریانی بہت

نظم کہنے میں ہے آسانی نہوں گر بندشیں
اور پھر کچھ بھی نہ کہنے میں ہے آسانی بہت

آئیے اب خود کو بھی محنت سے کر لیں آشنا
ہو چکی مزدور کی افسرؔ ثنا خوانی بہت

مسلمانوں کا ذوقِ تصنیف

مضمون
الحاج مولوی عبدالقیوم ندوی

اسلام کی ہمہ گیر اور فیاض طبیعت نے مسلمانوں کے خمیر میں یہ بات ودیعت کر رکھی ہے کہ وہ اپنے فضائل و کمالات سے دوسروں کو فائدہ پہنچائیں۔ اور اپنے تمدنی و ثقافتی خزانے دوسروں کی صلاح کیلئے وقف کر دیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "خیر الناس من ینفع الناس"۔ بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے۔ اس پاکیزہ ارشاد کی تعمیل میں مسلمانوں نے جہاد کئے۔ اپنے مقدس خون سے زمین کو لالہ زار کیا۔ اپنے بچوں کو خاک و خون میں تڑپایا۔ اپنی عزت و آبرو کو قربان کیا۔ یہ سب کیوں؟ صرف اس لئے کہ خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل ہو اور دوسروں کو فائدہ پہنچے خود بھوکے رہے کہ دوسروں کے پیٹ بھر سکیں۔ خود تکلیف میں رہے کہ دوسرے آسودہ حال رہ سکیں۔ خود سفر کی مشکلات برداشت کیں کہ دوسروں کو آرام مل سکے۔ خود مبتلائے آلام اور شکار حوادث رہے کہ دوسرے ان سے محفوظ رہ سکیں۔

اسی مقدس جذبے کے ماتحت مسلمانوں نے علم سیکھا۔ ایک ایک بات کیلئے ہزارہا میل پا پیادہ سفر کیا اور عمریں صرف کیں صرف اس لیے کہ جاہلوں کو عالم اور وحشیوں کو مہذب بنائیں۔ اور علم کے ذریعہ سے حقیقی طور پر ان کو اپنی خودی سے روشناس کرائیں اور دین و دنیا کے خزانوں کی چابیاں ان کے حوالے کر سکیں۔

مسلمانوں نے علوم و فنون کی اشاعت اور خدمت کس طرح فرمائی ہے یہ ایک نہایت طویل داستان ہے۔ اتنی طویل کہ سو دو سو کیا بلکہ ہزار دو ہزار صفحات میں بھی پوری طرح بیان نہیں ہو سکتی، لیکن ذیل میں چند بزرگوں کے احوال واقعی کا تعارف کرایا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ انھوں نے حقیقت کے سچے موتیوں کے لٹانے میں کتنی فیاضی اور دریا دلی سے کام لیا۔ اور کس طرح اُن کا بیشتر حصہ مکہ، مدینہ، بغداد اور دہلی کی بجائے یورپ میں محفوظ ہے۔

علامہ امام ابو محمد ابن حزم اندلسی المتوفی ۴۵۶ھ فقہ، اصول حدیث، انساب، تاریخ وغیرہ کے زبردست امام گزرے ہیں۔ علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں۔ "وکان حافظاً عالماً بعلوم الحدیث وفقہہ" الخ یعنی وہ حافظ حدیث اور علوم حدیث کے ماہر تھے (ابن خلکان جلد اول ص ۴۲۸) علامہ یاقوت کا بیان ہے۔ "فانہ اکثر اہل الاسلام تصنیفاً" وہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ صاحب تصانیف تھے (معجم الادبا جلد ۵ ص ۸۸) کشف الظنون کے مصنف علام نے بھی اس کی تائید کی ہے اور مفصل طور پر اس کا تذکرہ کیا ہے (دیکھو کشف الظنون جلد اول ص ۳۱۴) آپ کی تصنیفات جو صرف مناظرہ، انساب اور رجال سے متعلق ہیں ان کی تعداد چار سو ہے اور صفحات کا اندازہ اسی ہزار ہے۔ دیگر فنون پر تصنیفات اس کے علاوہ ہیں۔ (فہرست ابن ندیم جلد اول)

امام ابن قیم جوزی ساتویں صدی ہجری کے گوہر نایاب ہیں ۵۹۷ھ میں وفات پائی۔ تین سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود شوق علم نے بڑے ہو کر یہ کرشمہ دکھایا کہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے امام مانے گئے۔ شیخ سعدی انہی کے شاگرد تھے۔ ایک دن ممبر پر فرمایا کہ ان انگلیوں نے دو ہزار کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی تصنیفات ہر موضوع پر ہیں۔ بعض کا تذکرہ مصنف مفتاح السعادۃ نے کیا ہے (دیکھو مفتاح السعادۃ جلد اول ص ۲۰۷) اس کے علاوہ درس بھی دیتے جس میں ایک ایک لاکھ کا مجمع ہوتا۔ اور وزرا و بادشاہ اور امرا و علما سبھی طبقوں کے لوگ شریک ہوتے تھے (دیکھو تذکرۃ الحفاظ جلد اول بیان ابن جوزی) آپ اپنے قلم کا تراشا جمع کرتے جاتے تھے۔ جب وفات کا وقت قریب آیا تو وصیت فرمائی کہ قلم کے تراشے سے پانی گرم کر کے مجھے غسل دیا جائے چنانچہ بعد وفات ایسا ہی کیا گیا۔ مگر وہ اس قدر تھا کہ اس کے باوجود بہت سا بچ رہا۔

علامہ ابن تیمیہ حرانی متوفی ۷۲۸ھ ان کا مفصل تذکرہ علامہ ابن حجر نے درر کامنہ جلد اول ص ۱۴۶ میں کیا ہے۔ مشہور امام اور محدث ہیں۔ اگرچہ درس و تدریس اور مناظرہ سے آپ کو وقت

کم تھا اور اپنی حقگوئی کی وجہ سے امراو سلاطین کے موردِ عتاب رہے مگر اس کے باوجود ہر ماہ کوئی نہ کوئی تازہ تصنیف منظرِ عام پر ضرور آجاتی اور اس شان سے آتی کہ دشمن بھی آپ کے علم و فضل، کمال اور قوت استدلال کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکتے۔ عمر کا کثیر حصہ قید خانہ میں گزرا۔ لیکن وہاں بھی یہ سلسلہ نہ چھوٹا۔ بالآخر بادشاہ وقت نے قلم دوات ضبط کر لی۔ اس پر بھی آپ کا ذوق نشر علم سرد نہ ہوا۔ کوئلہ سے دیواروں پر لکھنا شروع کر دیا اور کئی کتابیں آپ کی اسی طرح دیواروں سے نقل کی گئی ہیں (حیٰوۃ العلما)۔ وفات کے بعد حساب لگایا گیا تو ہر روز پیدائش سے وفات تک علاوہ دیگر مشاغل کے تین جزو روزانہ تصنیف کے پڑے۔

علامہ ابن جریر تیسری صدی ہجری کے مشہور علما سے ہیں۔ بجد کثیر التصانیف ہیں۔ آپ کی تفسیر آج بھی مقبول خواص و عوام ہے۔ اور علما کا مقولہ ہے کہ وہ ام التفاسیر ہے یعنی سب تفسیروں کی ماں اور جڑ۔ نیز تاریخ بھی مستند اور مقبول عام ہے۔ جب اس تاریخ کے لکھنے کا ارادہ فرمایا تو شاگردوں کو خوشخبری دی کہ میرا ارادہ ہے کہ تم لوگوں کے لئے ایک ایسی مفصل اور جامع تاریخ لکھوں جو ساٹھ ہزار صفحات پر مشتمل ہو۔ شاگردوں نے عرض کی کہ حضرت! اس کے پڑھتے پڑھتے ہماری عمریں تمام ہو جائیں گی مگر وہ شاید تمام نہ ہو۔ آپ نے فرمایا سبحان اللہ ہمتیں پست ہوگئیں۔ پس آپ نے چھ ہزار صفحات پر تاریخ لکھی جو آج بھی کتب خانوں کی زینت ہے۔ (تاریخ الحفاظ)

ابن ہیثم مشہور ریاضی دان گزرے ہیں۔ ایک بار کسی بحری سفر میں آپ کی سو تصانیف سمندر میں غرق ہوگئیں مگر ذرا بھی افسوس نہ کیا اور پھر سے لکھنا شروع کر دیں۔ اور اس قدر لکھیں کہ ان کی فہرست و تبصرہ ابن صبیعہ نے چار سو صفحات پر لکھے ہیں۔ (اخبار السلف جلد اول)

علامہ ابوریحان بیرونی ادب۔ ریاضی۔ نجوم وغیرہ کے بڑے ماہر تھے۔ آپ پہلے شخص ہیں جو ہندوستان آکر یہاں کے پنڈتوں سے علم نجوم وغیرہ سیکھا تھا۔ آپ کی تصنیفات اس قدر ہیں کہ ۶۰ صفحات میں ان کی فہرست آتی ہے۔

علامہ جاحظ کی اکثر کتابیں ناپید ہیں۔ مگر اب بھی دو سو سے زاید مل سکتی ہیں جو علم و ادب۔ بلاغت و فصاحت پر سند ہیں

۵۵۲ھ میں کتابوں کے گرنے سے زخمی ہوئے اور پھر اسی صدمہ سے وفات پائی۔ مشہور ہے کہ عالم کو تصنیف کا سلیقہ انہی نے سکھایا۔ علامہ ابن خلکان کا بیان ہے کہ "ھو صاحب التصانیف فی کل فن" وہ ہر فن کے مصنف ہیں۔ (ابن خلکان جلد اول ص۴۰۹)

شیخ محی الدین ابن العربی بڑے بزرگ عالم گزرے ہیں، کثیر التصانیف ہیں۔ ایک بار آپ نے اپنی تصانیف سے ۴۰۰ کتابوں کے نام ایک بادشاہ کو بغرض مطالعہ روانہ فرمائے (ابن ندیم)

محمد ابن الجماعہ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ ایک ہزار سے زاید کتابیں تصنیف فرمائیں جو علوم قرآن وحدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، نجوم، تاریخ، ہیئت، طب رمل، کیمیا وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ ابوموسیٰ جابر ابن حیان کا بیان ہے کہ میں نے ۳۰۰ کتابیں مختلف علوم کے بارے میں ۱۰۱۳ رسالے آلات جنگ کے متعلق اور ۵۰۰ رسالے فلسفیوں کے خلاف لکھے ہیں۔

امام غزالی المتوفی ۵۰۵ھ علوم منقولہ ومعقولہ کے زبردست امام گزرے ہیں۔ تصوف آپ کا خاص موضوع تھا۔ آپ کی احیاء العلوم آج بھی علوم کو حیات بخش رہی ہے۔ وفات کے بعد آپ کی تصنیفات کا شمار کیا گیا تو ۵۰۰ سے زاید نکلیں جو اخلاق انسانی، علوم الہیہ اور فلسفہ شریعت پر سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

ابن فرات ایک محدث ہیں جب وفات پائی تو ۱۸ صندوق کتابوں کے چھوڑے جنہیں سے اکثر خود انہی کی تصنیفات تھیں اور کمال یہ کہ ان کا لکھا ہوا محدثین کے نزدیک صحت و اعتماد میں حجت ہے۔

یوسف مزی مشہور محدث ہیں۔ اکثر خاموش رہتے بات بہت کم کرتے نہایت مخلص اور بلند اخلاق کے حامل تھے۔ کثیر التصانیف ہیں صرف ایک کتاب تہذیب الکمال دو سو جلدوں میں ہے اور کتاب الاطراف ۸۰ جلدوں میں۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ کس قدر علم کی خدمت میں کی ہوگی۔

ان کے علاوہ ان علما اور مصنفین کا شمار ہزاروں سے اوپر ہے جنھوں نے سیکڑوں کی تعداد میں کتابیں لکھیں اور ان بزرگوں کا تذکرہ میں نے قصداً نہیں کیا جن کو بیشمار علوم وفنون زبانی یاد تھے۔ اور انھوں نے اپنے حفظ و یادداشت سے نفع رسانی، خدمت خلق، اور اشاعت علوم کا فریضہ ادا فرمایا۔

کاش یہی مقدس جذبہ ہمارے سینوں میں بھی کارفرما ہوتا کہ علوم سیکھنے اور سکھانے میں عمریں صرف کر دیتے۔ اور اس ساری کاوش اور جد و جہد میں خیر الناس من ینفع الناس کا پاکیزہ جذبہ پوشیدہ ہوتا تو عزت حقیقی اور حیات جاودانی ہمارے قدمبوس ہوتی۔

محبّت آزمائی جا رہی ہے!

از:۔
حضرت راز مراد آبادی

نگاہوں سے پلائی جا رہی ہے
مری مستی بڑھائی جا رہی ہے

یہ کس نے لے دیا نام محبت
خرد کو نیند آئی جا رہی ہے

تغافل اک حسیں دھوکہ ہے ناصح
محبت آزمائی جا رہی ہے

لُٹا بیٹھا ہوں، لیکن اُن کی خاطر
ہنسی ہونٹوں پہ آئی جا رہی ہے

سہارا چاہتا ہوں غیرتِ دل
شکایت لب پہ آئی جا رہی ہے

کلیمِ آرزو

غم کا سرور اُس سے پوچھ جس پہ خوشی حرام ہے

از :- حضرت اعجاز صدیقی اکبرآبادی

رفعتِ حسن و عشق کا کون سا یہ مقام ہے
لب سے نہیں نگاہ سے آرزوئے کلام ہے

جانبِ منزلِ حیات رُوح جو تیز گام ہے
اُس کی نظر میں غالباً کوئی نیا مقام ہے

عرضِ نیازِ شوق کا اذن تو خیر عام ہے
اس کا مگر ہے کیا علاج جنبشِ لب حرام ہے

ہاں تو نہیں غم آشنا سرخوشِ دورِ جام ہے
غم کا سُرور اُس سے پوچھ جس پہ خوشی حرام ہے

آپ عیاں چمن چمن، آپ رواں دمن دمن
پردہ کشی تو آپ کی صرف برائے نام ہے

وجد میں دل کی کائنات رقص میں روحِ شش جہات
نکہتِ گل کے ساتھ ساتھ کیا کوئی خوش خرام ہے

روح دبی دبی سی ہے درد ہے کچھ بڑھا ہُوا
شامِ الم طراز کا صبح سے اہتمام ہے

ہائے یہ دل کی بے بسی، ہائے یہ جبرِ عاشقی
ہے جو حریفِ زندگی لب پہ اُسی کا نام ہے

اور جرأتیں ابھی اپنی نظر سے کر عطا
نوحۂ زندگی مرا، نالۂ ناتمام ہے

ضد ہے جبینِ شوق کو اور کوئی نہ سر جھکے
مانعِ ذوقِ بندگی اُن کا سلوکِ عام ہے

فرصتِ انتظار میں وقت کو رائیگاں نہ کر
آہ بھی کوئی کام ہے، نالہ بھی کوئی کام ہے

اُن کے حریمِ ناز سے، ہے مجھے نسبتِ نیاز
تیرا جنونِ بندگی خام ہے ناتمام ہے

ہمتِ عرضِ غم نہیں، جُرأتِ شرحِ غم نہیں
چُپ ہے، کلیمِ آرزو اور وہ ہمکلام ہے!


ہر عورت اولاد چاہتی ہے
اگر کسی عورت کو بچہ نہ ہوتا ہو
جس عورت کی شادی کو زیادہ دن گذر گئے
ہوں اور بچہ پیدا نہ ہوتا ہو تو ا
بہت آسان ترکیب ہے اسکے بعد ہر سال
اس عورت کے ہاں اولاد ہونے لگے
یہ سائنس کا جدید کارنامہ ہے جسکی
بدولت گذشتہ پندرہ سال سے لاتعـ
عورتوں کی گود میں بچے کھیل
رہے ہیں۔
پہاڑی جڑی
بوٹیوں سے ایک خاص دوا تیار ہوتی ہے۔
نام "محافظ اولاد" ہے۔ اسکی ایک ایک خوراک
سات رات تک عورت کو کھلائی جائے۔ ان سات رات
وہ ہر قسم کا خاص پرہیز کرے۔ اور ٹھیک آٹھویں رات ......
اسی آٹھویں رات عورت کو بچہ کی "اُمید" ہو جائیگی۔ ایک شیشی میں پو
سات خوراک دوا ہوتی ہے۔ جسکی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ جس کو ضرورت ہو
لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ اے۔ بی ۳۴ دہلی
کے پتہ پر خط لکھکر یہ دوا بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیجئے۔ پارسل پر نو آنے محصول لگے
ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۸
Shahi

جواب

دلگداز افسانہ

از محترمہ خدیجہ مستور لکھنوی

"تمھاری آنکھیں کس قدر خوبصورت ہونگی۔ ان میں شراب کا ساسُرور ہوگا لیکن آہ میں نہیں دیکھ سکتا" اندھے ریحان کا ہاتھ شبنم کی آنکھوں ٹٹول رہا تھا لیکن اس کی بے نور آنکھیں کسی دوسری طرف تھیں۔

"تمھارے گلابی ہونٹ کتنے حسین ہونگے —" وہ کہنے لگا، "کاش میں ایک بار دیکھ سکتا۔ ہاں صرف ایک بار شبنم میری بے نور آنکھوں میں روشنی آجائے" اس کے لبوں سے ایک طویل آہ نکل گئی۔ اور ہاتھ آنکھوں سے ہٹ کر لب ٹٹولنے لگے۔

"شبنم!" وہ پھر مضطربانہ بولا۔ "مست گھٹاؤں کی طرح تمھارے بال شانوں پر جھومتے ہونگے۔ لیکن خدا نے مجھے اس حسین منظر کے دیکھنے سے محروم کر دیا" ریحان کی پلکیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں۔ اور آنسو آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر رخساروں پر پھیل گئے۔ شبنم نے اُس کے آنسو اپنے پلّو میں سمیٹ لیے اور محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر مسکرانے لگی — جیسے وہ اس کی اندھی محبت سے بہت خوش تھی۔

وہ دن بھی کتنا منحوس تھا کہ جب شادی سے دو یوم قبل ریحان ایک حادثے سے دوچار ہوا اور اپنی آنکھوں کی روشنی کھو بیٹھا۔ شبنم کے والد نے ریحان کے ساتھ شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن شبنم نے بھی کہہ دیا کہ قدرت سے کون لڑ سکتا ہے۔ اندھا ہونا کوئی جرم نہیں۔ میری شادی ہوئی تو ریحان کے ساتھ ورنہ نہیں۔ باپ تو اندھے کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی کا پلو باندھ کر زیادہ دن زندہ نہ رہا۔ لیکن شبنم کی زندگی مسکراتے ہوئے پھولوں سے زیادہ حسین گزر رہی تھی۔ شام کے پرکیف مناظر پھولوں کے کنج میں ریحان کے ساتھ گزرتے پھولوں کے گلدستے بنا کر اسے پیش کرتی۔ پھر ان کے حسن کا نقشہ الفاظ میں بیان کر کے ریحان کو ان کی نزاکت کا احساس دلاتی۔ رات کو ستار پر اُسے ستار کر موسیقی کے دریا بہاتی۔ یہاں تک کہ وہ غفلت میں سو جاتا۔ شبنم اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔ گویا اس کی زندگی کا مقصد ایک مرد اور وہ بھی اندھے مرد کو خوش رکھنا تھا۔ شبنم اس وقت خوشی سے پھولے نہ سماتی جب ریحان اس کے جسم کو چھو کر اُس کے حسن کی تعریف کرتا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ دنیائے تخیل میں اس کے حسین و جمیل پیکر بنایا کرتا تھا۔

یوں ہی زندگی کی حسین و جمیل شام مسرت کے جھولے جھول رہی تھی۔ لیکن ریحان اکثر اندھیری دنیا میں بُری طرح بڑبڑانے لگتا اور اس کی رنگینیاں اُسے ستاتیں۔ پھر شبنم کو دیکھنے کی تمنا بھی کروٹیں لینے لگتی۔ بعض وقت تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اُس کی آنکھوں میں روشنی آگئی ہے۔ حسین چہرے مسکراتے ہوئے لب۔ ساغر کی طرح چھلکتی ہوئی آنکھیں اور لہراتی ہوئی ساریاں آنکھوں کے سامنے ناچ کر رہ جاتیں۔ اس وقت وہ سب کچھ بھول کر اپنے بازوؤں میں سختی سی محسوس کرنے لگتا۔ گویا وہ ان نازک جسموں کو اپنی باہوں میں جکڑنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کے بازو ٹوٹ جائیں۔ اُف! اندھے کے لئے آنکھوں کا تصور بھی کتنا حسین ہوتا ہے۔

لیکن شبنم اس خیال ہی سے کانپ جاتی کہ ریحان کی آنکھوں میں روشنی آسکتی ہے۔ وہ ریحان کے قائم کئے ہوئے خیال کے مطابق نہ تھی بلکہ ایک معمولی صورت کی عورت جس کی آنکھیں بڑی ضرور تھیں لیکن ان میں شراب نہ تھی۔ نہ گیسو ہی مست گھٹاؤں کی طرح کاندھوں پر جھومتے۔ بلکہ وہ چوٹی کے بندھنوں میں گرفتار رہتے۔

نو وارد ماہر امراض چشم ڈاکٹر ضیا کی شہرت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اُس نے کتنے ہی ایسے اندھے جن کی آنکھیں حادثات زمانہ کی نذر ہو چکی تھیں علاج کر کے دنیا میں رہنے کے قابل بنا دیا تھا۔ ریحان نے بھی ضیا کی تعریف سنی اور اپنی آنکھوں کے تصور میں گم ہو گیا۔ وہ بھی صرف ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مایوسی کے خوف سے لرز جاتا۔ تمام ڈاکٹر اسے جواب دے چکے تھے کہ وہ اپنی آنکھوں کی آس چھوڑ دے اور سمجھ لے کہ دنیا بحر ظلمات ہے۔ لیکن یاس و امید کا دامن تھامے رہتی ہے۔ پھر وہ کیوں قطعی ناامید ہو جاتا۔

کئی دن تک وہ امید و یاس کے دامن میں منہ چھپائے پڑا رہا۔ اگر آنکھوں میں روشنی نہ آئی تو کیا ہوگا؟ اس خیال سے

وہ مضطرب ہو جاتا۔ آخر اس نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک آخری کوشش ضرور کرے گا۔

ڈاکٹر بغور آنکھوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ ریحان بے چینی سے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے بیقرار، اور شبنم اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالے کمرے کے باہر مضطربانہ ٹہل رہی تھی۔ ڈاکٹر معاینہ کرنے کے بعد کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور کسی گہری فکر میں غوطے لگانے لگا۔

"آپ کی آنکھوں میں روشنی آجائیگی" اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"کیا یہ سچ ہے ڈاکٹر!" ریحان خوشی سے تقریباً چیخ اُٹھا۔

"ہاں! اگر آپ نے میری ہدایات پر عمل کیا"

"اندھیرے سے روشنی میں آنا کون پسند نہ کرے گا" ریحان کی پتلیاں جلدی جلدی گھوم رہی تھیں۔

"تو پھر اُمید رکھئے کہ دنیا کی رنگین آغوش آپ کو گم کرنے کے لئے کھلی ہوئی ہے" ڈاکٹر مسکرا رہا تھا۔ ایک شریر تبسم! اور باہر کھڑی ہوئی شبنم ٹھٹک کر رہ گئی۔

آج چار بجے ریحان کی آنکھوں کی پٹیاں کھلنے والی تھیں۔ اس کا دل امید و یاس کے ملے جلے جذبات سے دھڑک رہا تھا اور شبنم، پریشان شبنم، قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنا سراپا دیکھ رہی تھی۔ خشک اُلجھے ہوئے بال اور میلے کچیلے کپڑے۔ جس دن سے ریحان کی آنکھوں کا علاج شروع ہوا تھا اس نے نہ تو کپڑے تبدیل کئے اور نہ بالوں کی خبر لی۔ اُسے تو بس ایک ہی فکر کھائے جاتی تھی۔ کہ جب وہ اسے دیکھے گا تو اس کے حسین تخیلات کی شکست ہو جائے گی۔ وہ اس سے نفرت کرنے لگے گا۔ اور پھر دُنیا کی رنگین آغوش میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ ہو گی۔ وہ آئینے پر کسی قدر جھک کر اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی ——— "وہ کہتے ہیں میری آنکھوں میں شراب سی ڈھلتی ہو گی۔ لیکن یہاں تو بڑی بڑی میلی سی آنکھیں۔ جن میں کوئی کیف نہیں، اور ان کا خیال ہے کہ میرے ہونٹ گلابی ہونگے۔ لیکن یہ تو ذرا موٹے ہیں۔ سرخی نام کو نہیں۔ کچھ سفید سے بھلا یہ بھی گلابی کہے جانے کے لائق ہیں۔ اور یہ بال کس قدر خراب ہیں بے ڈھنگے سے گھونگھر نام کو بھی نہیں کہ مست گھٹاؤں کی طرح جھومیں اُف! یہ پیشانی کا داغ کتنا بُرا لگتا ہے۔ نہ معلوم بچپن میں کب

گڑی تھی رنگ بھی سانولا سا۔ کاش میں انھیں پہلے بتا دیتی کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں صرف ایک محبت کرنے والی عورت ـــ!

وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ کر کرسی پر دراز ہو گئی۔ اس کی نظریں ٹک ٹک کرتے ہوئے کلاک پر پڑیں۔ دو بج چکے تھے اب صرف دو گھنٹے رہ گئے تھے۔ وہ متوحش نظروں سے کمرے کی ہر ایک چیز کو دیکھنے لگی اور پھر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بڑی بڑی آنکھیں جن کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اسے حیرت و استعجاب سے دیکھ رہی ہیں۔ اور جیسے پوچھ رہی ہوں کہ کیا شبنم تمھیں ہو؟ اس نے خوف سے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

"شبنم! شبنم!" ریحان اُسے پکار رہا تھا۔

وہ تیز تیز قدموں سے اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا بجا ہے شبنم؟ اب تو وقت کاٹے نہیں کٹتا۔"

"تین ـــ بس تھوڑی دیر اور صبر کرو۔" شبنم اس کا ہاتھ سہلا رہی تھی۔

"اُف! اب تو صبر نہیں ہوتا۔ میں ان پٹیوں کو نوچ کر پھینک دوں گا"

اس کے ہاتھ پٹیوں کی طرف اُٹھ گئے۔

"کیا کرتے ہو ریحان؟" "یہ اضطراب تمھاری آنکھوں کو نقصان پہنچا کر رہے گا۔ کیا ڈاکٹر کی ہدایت نہ تھی کہ پٹیاں وقت معینہ سے پہلے نہ کھولی جائیں۔"

"لیکن شبنم دل تو یہی چاہتا ہے کہ اب جلد سے جلد اپنی باوفا حسین شبنم کو دیکھوں۔"

"دیکھ لینا۔ اب صرف ایک گھنٹہ کی دیر اور ہے۔ خاموشی سے بیٹھے رہو۔" وہ یہ کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

ریحان آدھے گھنٹے تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ مضطرب انسان کے لئے انتظار بھی کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ زیادہ انتظار نہ کر سکا اور یکلخت اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب اس سے صبر نہ ہوتا تھا وہ ٹٹولتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا اور اندر سے زنجیر چڑھا دی۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر جلدی جلدی پٹیاں کھولنے لگا۔ وہ کھول رہا تھا لیکن کوئی روکنے والا نہ تھا۔ اس نے پٹیاں کھول کر ایک جھٹکے سے پھینک دیں۔ پھولے ہوئے پپوٹے کانپے۔ اور آنکھوں کے سامنے ایک چکا چوند سی ہو گئی۔ میز۔ کرسیاں۔ کلاک۔ تصاویر۔ اور کمرے کی ہر چیز اسے ناچتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"شبنم! میری آنکھوں میں روشنی آ گئی۔" وہ فرطِ مسرت سے چیخ اُٹھا۔ پاؤں لڑکھڑائے۔ وہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور جلدی جلدی آنکھیں کھولنے بند کرنے لگا۔ اسے اپنی بینائی پر شک ہو رہا تھا۔ لیکن ہر چیز اس کے سامنے تھی۔ وہ خوشی کے مارے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ لیکن ایک خیال نے اُسے چونکا دیا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا دروازے کی طرف بڑھا اور زنجیر کو کھول کر گھر کی ہر ایک چیز کو مسرت سے دیکھنے لگا۔ تمام سامان قرینے سے لگا ہوا تھا لیکن گھر کی مالکہ شبنم اسے کہیں نظر نہ آئی۔ وہ بند کمرے کی طرف بڑھا اور دروازہ پیٹنے لگا۔

"کھولو! کھولو! دیکھو تو میری آنکھوں میں روشنی آ گئی شبنم!"

ریحان کوئی جواب نہ پا کر دروازہ پیٹے جا رہا تھا۔ لیکن شبنم آرام کرسی پر پڑی ہلتے ہوئے دروازے کو تک رہی تھی۔

"شبنم! کیا تم کو میری آنکھوں کے لئے کوئی مسرت نہیں؟"

ریحان چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ اور کواڑ پیٹنے سے کمرے میں زلزلہ سا آ گیا تھا۔ شبنم نے ایک کھوئی سی نگاہ آئینے پر ڈالی اور زنجیر کھول دی۔

بھاری پپوٹوں کو جنبش ہوئی۔ اور ایک بھدا سا سانولا مجسمہ ریحان کے سامنے تھا۔

"کیا تم ہی شبنم ہو؟" ریحان متحیر ہو رہا تھا۔

"ہاں میں ہی شبنم ہوں جس نے تمھاری دنیائے تخیل کو آباد کرکے اُسے لوٹ لیا"

"اُف! تم نے مجھے کتنے سخت دھوکے میں رکھا۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں شبنم؟"

"میں نے کیوں نہیں بتایا۔ یہ خود بھی نہیں جانتی۔ لیکن کیا آپ مجھے پہلے کی طرح نہ چاہیں گے؟"

شبنم کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور وہ ریحان کو امید و بیم کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"جواب دیجئے۔" شبنم نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن ریحان کی نگاہیں کھڑکی کی موٹی موٹی سلاخوں کو پار کرکے مقابل کے دریچے میں جھانکتے ہوئے ایک حسین جمیلہ چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

شاید یہ شبنم کے سوال کا جواب تھا ـــ!



یہ ہیں عورتوں کی آوازیں

ایک عورت نے دوسری عورت سے کہا

ایک نے کہا۔ بہن کیا بتاؤں اب تو شاید مرنے کا وقت آگیا ہے۔ روز بروز میرا حال پتلا ہوتا جا رہا ہے۔
دوسری نے کہا۔ یہ عورتوں کے پیچھے ایسی مصیبت لگی ہے کہ ہر مہینہ پانچ چھ دن رو رو کر کٹتے ہیں۔
تیسری نے کہا۔ جب مجھے ماہواری شروع ہوتی ہے تو میرا تمام جسم پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا ہے۔
چوتھی نے کہا۔ اور میرے .... جب شروع ہوتے ہیں تو میری کمر میں اور پنڈلیوں میں اور ناف کے نیچے بہت ہی سخت درد معلوم ہوتا ہے۔
پانچویں نے کہا۔ اور بہن! مجھے تو یہ دن قیامت معلوم ہوتے ہیں۔ دن بھر سر چکراتا ہے۔ پنڈلیوں میں اور پیٹ میں ہر وقت ایک اینٹھن رہتی ہے۔
چھٹی نے کہا۔ مجھے ایک نئی تکلیف ہے۔ ایک مہینہ میں دو مرتبہ ہوتے ہیں۔ بہت ہی کمزور ہوتی ہوں۔
ساتویں نے کہا۔ میں اس تکلیف میں مبتلا ہوں کہ رک رک کر آتے ہیں اور بہت ہی درد ہوتا ہے۔
آٹھویں نے کہا۔ میری تکلیف سب سے الگ ہے۔ یعنی کئی کئی مہینے بعد ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہوتے ہیں تو بس اسی تکلیف کے ساتھ کہ تو بہ ہی بھلی۔
نویں نے کہا۔ میرے ساتھ یہ مصیبت ہے کہ ماہواری کے ساتھ ساتھ سفید پانی کی بھی کثرت ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے بدن میں سے کوئی جان کھینچ رہا ہے۔ کبھی پہلے رطوبت جاتی ہے کبھی بعد۔

کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیوں ہے،

یہ سب عورتیں ماہواری ایام کی مریض ہیں۔ اگر ماہواری ایام بغیر درد کے باقاعدہ ہر مہینہ وقت مقررہ پر آجایا کریں تو کبھی ان میں سے کوئی تکلیف نہ ہو۔ ہندوستان کی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں عورتوں کو معلوم ہے۔ اور انہوں نے ذاتی تجربہ کیا ہے کہ اگر کوئی عورت مندرجہ بالا تکلیفوں میں سے کسی ایک یا بہت سی تکلیفوں کا شکار ہو جائے تو اسے بہت جلد تندرست کرنے کیلئے "دوا" "کورس" سے بہتر ہندوستان میں دوسری دوا نہیں ہے "دوا کورس" استعمال کرنیکے بعد عورت کو ہر مہینہ نہایت پابندی کے ساتھ مقررہ وقت پر صحیح مقدار میں بغیر کسی تکلیف اور بغیر کسی درد کے ماہواری ایام آنے لگتے ہیں۔ "کورس" کی ایک شیشی کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے جن بہنوں کو ضرورت ہو

لیڈی ڈاکٹرز زنانہ دواخانہ ۳۴ اے بی دہلی

کو ایک خط لکھکر بذریعہ وی پی پارسل منگالیں۔ محصول پارسل پر نو آنے خرچ ہوتے ہیں۔ ٹیلیفون نمبر ۲۲۹۵

اردو

نظم

حضرت بہار کوٹی

اسیرِ زلف نہ دلدادۂ خمِ گیسو / شہیدِ ناوکِ مژگاں نہ کشتۂ ابرو
مریدِ ساقیٔ رعنا نہ پیرِ میخانہ / نہ وقفِ بادۂ رنگیں نہ رہنِ جام و سبو
مہا سبھائی نہ لیگی نہ کانگریسی میں / ابوالکلام کا چیلا، نہ بندۂ نہرو
مجھے ہوئی ہے ودیعت متاعِ علم و ادب / ہے پُر جواہرِ افکار سے مرا پہلو
عطا ہوا ہے مجھے ذوقِ شعرِ بے پایاں / مری حیات کا مقصد ہے خدمتِ اردو
اسی میں آئی ہے مجھکو نظر فلاحِ وطن / یہی کریگی عزیزانِ ملک کو یکسو
اسی کا فیض اسی کا تو یہ کرشمہ ہے / کہ ہمکنار ہیں عبدالحق اور سپرو

وہ قوم مردہ ہے جس کا ادب ہے ناکارہ / یہ گھر کی بات ہے اور اس کو پا گئے ہیں گرو
نزاعِ ہندی و اردو کی ہے یہی غایت / سمجھ چکے ہیں اسے خوب گاندھی و نہرو
انھیں یہ فکر کہ ہندی ہو ہندیوں کی زباں / مجھے یہ ضد کہ ہو "لنگوا فرینکوا" اردو
یہ ادعائے تدبر یہ دعوتِ تخریب / تفو بر این خرد و عقلِ ہرزہ کار تفو
وہ سینچتے ہیں زر و سیم سے چمن اپنا / میں نخلِ شعر و ادب پر چھڑک رہا ہوں لہو
اگر ہیں اُن کے خزانوں میں گوہرِ نایاب / تو میرے دیدۂ نمناک میں بھی ہیں آنسو
بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں اس کی زینت میں / کیا ہے تارِ رگِ جاں سے اس کا چاک رفو
وہ اپنی تیغِ تعصب کو آزما دیکھیں / مٹا سکے ہیں نہ اس کو مٹا سکیں گے عدو
دبائیں گے اسے جتنا یہ اور ابھرے گی / اسے ازل سے ودیعت ہوا ہے ذوقِ نمو

صبا! یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا / اگر ملیں تجھے موتی و گاندھی و نہرو
کہ گر ہے مسلم ہندی کی دوستی مطلوب / تو چاہئے کریں اردو سے دوستی ہندو

رومانی خطوط

وصیت نامہ

از جناب ممتاز حسین بسمل فاضل اسسٹنٹ

فیض آباد - ۲۲ راکتوبر ۱۹۴۲ء

پیاری ریحانہ!

تمہیں خوب یاد ہوگا کہ سکول میں اکثر سہیلیاں مجھے "جلد باز بیگم" کہہ کر چڑایا کرتی تھیں - خوبی تقدیر سے میں نے اپنی زندگی کا رفیق چننے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے - اور آج مجھے اپنے جلد باز ہونے پر خوشی اور فخر کا احساس ہے - میں تمہیں ساری داستان سناؤں گی میرے تنگ سینہ میں جذبات اور مسرت کا طوفان اُمڈ رہا ہے اور میں تمہیں اپنی خوشی میں شریک کرنا چاہتی ہوں -

ایک مہینہ ہوا میں اپنے ایک عزیز کو ملنے پٹنہ گئی - گھر میں سب بوڑھے اور بزرگ تھے اس لئے میرا دل وہاں نہیں لگتا تھا - ایک دن غروب آفتاب کے وقت میں پائیں باغ میں تنہا بیٹھی دُور افق پر بادلوں کو امڈتے اور لہراتے ہوئے دیکھ رہی تھی - فضا میں شام کا سناٹا چھایا ہوا تھا - تاریکی دبے پاؤں بڑھتی چلی آتی تھی - پرندے درختوں پر بسیرا کر رہے تھے - اور ہوا پھولوں کی باس سے بسی تھی - اچانک میں نے قدموں کی آہٹ سنی - میرے سامنے ایک بلند قامت خوبرو نوجوان کھڑا تھا - اس کے لبوں پر ایک رنگین تبسم کھیل رہا تھا - اور آنکھوں میں محبت کی آگ روشن تھی - میں نے اپنی اقامت کے مختصر عرصہ میں اسے کئی بار دیکھا تھا - مگر آج وہ مجھے ایک دیوتا کی مانند دکھائی دیتا تھا - وہ میرے پاس بیٹھ گیا - ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں وہ میرے خاندانی حالات سے آگاہ تھا - وہ ابا جان کی زمینداری اور غیر معمولی علالت سے واقف تھا - اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں ابا جان کی حقیقی بیٹی نہیں ہوں بلکہ لے پالک ہوں - اس نے مجھے دوستانہ مشورہ دیا کہ ابا جان کے وصیت نامہ سے غافل نہ رہوں کیونکہ اس قانونی دستاویز کی موجودگی میں جائداد کا مالک رفیق ہوگا - رفیق وہ تندرست اور حسین لڑکا جو ابا جان کا قریبی رشتہ دار ہے - اس کے بعد شام کے دھندلکے میں جب ستارے آنکھیں کھول رہے تھے میرے حسین دیوتا نے مجھ سے اظہار محبت کیا - اس وقت اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے - آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی - اس نے میرا نرم ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا - اور مجھے ہدیۂ دل پیش کیا - میں اس کی وجاہت اور لیاقت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی - اور اس کی رفیقۂ حیات بننا منظور کر لیا - دوسرے دن میں وہاں سے چلی آئی اب میرا سینہ درد محبت سے شاداب ہے اور مجھے دنیا کی ہر شئے میں اپنے محبوب کا جلوہ دکھائی دیتا ہے - میرے محبوب کا نام شاہد ہے - وہ عمر میں مجھ سے دس گیارہ سال بڑا ہے - گویا میں اس کے تجربہ سے فائدہ اُٹھاؤں گی - وہ مجھے ہفتہ میں دو بار محبت بھرے خط لکھتا ہے - جن کا مطالعہ میرے لئے سرمایۂ حیات ہے - وہ ہر بار وصیت نامہ کے متعلق تاکید سے لکھتا ہے - اُسے ہر وقت میرا مفاد مدنظر ہے اُسے یقین ہے کہ وصیت نامہ کی عدم موجودگی میں رفیق تمام جائداد کا مالک ہوگا - میں نے اسے لکھ دیا ہے کہ ابا جان مجھے بہت عزیز رکھتے ہیں اور اپنی وصیت میں مجھے فراموش نہیں کریں گے -

پیاری سہیلی! میں نے ابا جان سے شاہد کا ذکر نہیں کیا - میرا شاہد اس مقدس پیمان کو عوام میں مشتہر کرنا پسند نہیں کرتا - تم میری جان سے پیاری سہیلی ہو - اس لئے میں نے ساری داستان لکھ دی ہے - اب میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے مبارک دینے کے لئے ایک طویل جوش مسرت سے لبریز خط لکھو - مگر کسی دوسرے سے اس کا ذکر نہ کرنا -

تمہاری نوشابہ

فیض آباد - ۲۸ راکتوبر ۱۹۴۲ء

پیاری ریحانہ!

تمہارا محبت نامہ ملا - تم نے نصائح کے کڑوے گھونٹ میرے حلق سے اتارنے کی کوشش کی ہے - میں اس کے لئے تمہاری ممنون ہوں - میں تمہاری جانب سے ایک ایسے مکتوب کی منتظر تھی جس کی ہر سطر میں مسرت کروٹیں لے رہی ہو - اس کے برعکس تم نے ایک جہاندیدہ بڑھیا کی طرح مجھے جلی کٹی سنائی ہیں -

مجھے حیرت ہے کہ تمہارا بھائی شاہد کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے مگر اس کی اکثر اطلاعات بالکل غلط ہیں - میں مانتی ہوں کہ شاہد غریب ہے

وہ اپنی تنگدستی کا خود اعتراف کر چکا ہے۔ گر غریب ہونا کوئی جرم نہیں کیا تم چاہتی ہو کہ میں سونے چاندی کے چند حقیر سکوں کے گھمنڈ میں شاہد کا محبت بھرا دل ٹھکرا دوں؟ ہرگز نہیں۔ میں اس کے ساتھ ایک جھونپڑے میں عیش و آرام سے زندگی گزار سکتی ہوں مگر اس کے بغیر شاہی محلات میرے لئے سونے ہیں۔

تمہارا خیال ہے کہ شاہد مجھے دولت کی وجہ سے بیاہنا چاہتا ہے میں اسے ماننے کو تیار نہیں۔ شاہد کو گھوڑ دوڑ سے بہت دلچسپی ہے اس لئے ممکن ہے کہ وہ گھوڑ دوڑ میں شرط بدتا ہو۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ میرا پیارا شاہد جوئے خانے کے تاریک کمروں میں ذلیل جواریوں کے ساتھ جوا کھیلے۔ ہر شریف آدمی میں کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ جب ہم بیاہ کے مقدس رشتے سے بندھ جائیں گے تو ذمہ داری کا احساس میرے شاہد کو ہر قسم کی برائیوں سے دور لے جائے گا۔

تم لکھتی ہو کہ یہ آوارہ لڑکیوں کے پیچھے گھومتا ہے پیاری سہیلی! میرے شاہد نے بڑی پیاری اور من موہنی صورت پائی ہے۔ اگر تم اس کی ایک جھلک دیکھ لو تو یہ زہد دھرا رہ جائے اور اس کی محبت میں دیوانی ہو جاؤ۔ ممکن ہے کہ کالج کی رنگین تیتریاں اس کا دل لبھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ مگر انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوگی کیونکہ شاہد کا دل میرا ہو چکا ہے۔

ہمارے پیمان محبت کے متعلق کسی سے ذکر نہ کرنا کیونکہ شاہد ہر خط میں اس کے متعلق تاکید سے لکھتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے مبارک کا ایک طویل خط لکھو جسے پڑھ کر میری روح جھوم جائے۔

تمہاری نوشابہ

فیض آباد۔ ۵ نومبر ۴۲ء

پیاری ریحانہ!

میں تمہارے طویل مکتوب کی شکرگزار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری بہتری چاہتی ہو اور میری خوشی کی طالب ہو۔ میں نے شاہد کو اس ایکٹرس کے متعلق لکھا تھا۔ وہ جواب میں لکھتا ہے کہ میرے بہت سے دشمن ہیں جو میرے متعلق غلط افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ اس نے ابا جان کی علالت پر مجھے ایک طویل خط لکھا ہے جس کی ہر سطر سے ہمدردی۔ غمگساری اور محبت کی بو آتی ہے۔ وہ میری دولت کا خواہاں نہیں بلکہ میری محبت کا طالب ہے۔ اگر میں ایک غریب بھکارن لڑکی بن جاؤں تو وہ مجھے بدستور نفس واپسیں تک محبت کے جذبے سے چاہتا رہیگا

ابا جان کی طبیعت کئی روز سے علیل تھی۔ کل رات وہ مجھ سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے اپنے بچپن کا حال سناتے رہے جوانی کے رنگین ایام کا ذکر کیا۔ اس کے بعد اچانک میری ماں کی بات چیت چھڑ گئی۔ میری بدنصیب ماں کی کہانی بہت لمبی ہے۔ ابا اُس سے محبت کرتے تھے۔ مرحوم نے ان کی رفیقہ حیات بننا منظور کیا تھا مگر بعد میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اور مرحومہ نے کسی دوسرے آدمی سے بیاہ کر لیا۔ چند سال کے بعد ابا جان کو اس بدنصیب عورت کا ایک خط ملا۔ وہ اسی روز اس سے ملنے گئے۔ وہ بیماری دم توڑ رہی تھی۔ اور تین سال کی ایک معصوم بچی اس کے پہلو سے لپٹی ہوئی آنسو بہا رہی تھی۔ ابا جان اس بچی کو یعنی مجھے اپنے گھر لے آئے۔ اور اولاد کی طرح پرورش کیا۔

رات کافی گزر چکی تھی اور لیمپ کی مدھم روشنی ابا جان کے بالوں پر لرز رہی تھی۔ وہ مجھے میری ماں کی کہانی سنا رہے تھے۔ اور اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک بڑی الماری سے ایک چھوٹا سا صندوقچہ نکالا اس میں چند چٹھیاں۔ نسوانی بالوں کی ایک لٹ اور کچھ مرجھائے ہوئے پھول تھے۔ انھیں دیکھ کر ابا جان کے آنسو ٹپک پڑے۔ اور مجھے رونا آ گیا۔

"میں جب تک زندہ ہوں یہ میرے لئے ہیں اور اس کے بعد سب تمہارا ہے۔" انھوں نے کہا۔ اس وقت ان کی آواز شدت جذبات سے لرز رہی تھی۔ اور چہرے پر ایک عجیب روشنی تھی۔

اس کے بعد رفیق کے متعلق بات چیت شروع ہوئی۔ وہ ابا جان کی بہن کا بیٹا ہے اور میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اس کو اسی گھر میں دیکھا ہے وہ بچپن کے معصوم کھیلوں میں میرے ساتھ شامل رہا ہے۔ ہم دونوں چاندنی راتوں میں بیرون باغ میں آنکھ مچولی کھیلتے رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے گلدستے بنائے ہیں۔ روٹھے ہیں۔ بگڑے ہیں۔ منے ہیں اور لڑے ہیں مگر وہ زمانہ اب گزر گیا ہے۔ رفیق کلکتہ کے ایک کالج میں تعلیم پاتا ہے اور اپنے درجے کے ذہین لڑکوں میں شمار ہوتا ہے۔

ابا جان دیر تک رفیق کے متعلق ذکر کرتے رہے اور آخر کار کہنے لگے۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم رفیق سے شادی کر لو اور میں مرنے سے پہلے تم دونوں کو شاد اور آباد دیکھ لوں۔"

ابا جان کی یہ تجویز سن کر میں تشویش میں ڈوب گئی۔ شاہد کا

محبت میری جان ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں۔"

تمھاری نوشابہ

فیض آباد ۔ ۱۱ ر نومبر ۱۹۴۲ء

پیاری ریحانہ !

اتوار کی شام رفیق کلکتہ سے آیا۔ چونکہ ابا جان نے اس سے میری شادی کا تذکرہ کیا تھا۔ اس لئے میں نے اسے ایک عورت کی نظر سے دیکھا وہ خوبصورت اور دلچسپ نوجوان ہے۔ اگر میں شاہد کی نہ بن چکی ہوتی تو رفیق سے ضرور بیاہ کر لیتی۔ دوسرے دن ابا جان دیر تک تنہائی میں رفیق سے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد جب وہ مجھے ملا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور ہونٹ خشک تھے۔ میں ابا جان کی طبیعت سے واقف ہوں۔ مجھے شک گزرا کہ ابا جان رفیق سے میری شادی کے متعلق ضرور ذکر کریں گے۔ اس لئے پیش بندی کے طور پر میں نے رفیق سے اس کے متعلق بات چیت شروع کر دی۔

"رفیق تم کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔ خیر تو ہے؟" میں نے کہا۔

"نوشابہ" اس نے جواب دیا "میں فکر اور پریشانی کے بوجھ سے دبا جاتا ہوں۔ میں نے پچھلے دنوں بہت سا روپیہ خرچ کیا ہے —— میں مقروض ہوں"

"معمولی بات ہے۔ گھبراتے کیوں ہو" میں نے کہا "آج کل کالج کے طلبا عموماً مقروض رہتے ہیں۔ میں تمھیں راز کی ایک بات بتانا چاہتی ہوں"

"کہئے !" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"ابا جان کی خواہش ہے کہ میں تم سے بیاہ کر لوں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں ایک اور آدمی سے پیمان وفا باندھ چکی ہوں اب میرے اقرار نباہ تمھارے ہاتھ ہے"

رفیق بے خیالی کے عالم میں دیوار کو تکتا رہا اور پھر کہنے لگا "نوشابہ میں بھی اپنا دل کسی کی اداؤں پر قربان کر چکا اور ایک کافرہ کی محبت میرا ایمان ہے"

میں کیوپڈ —— اس ننھے شریر تیر انداز کو اپنا معبود بنا چکی ہوں اس لئے مجھے رفیق کی داستان محبت میں بڑا لطف آیا۔ اس نے مجھے اپنی محبوبہ کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ وہ اپنے کالج کی ایک لڑکی صفیہ کی محبت میں گرفتار رہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے پیمان وفا باندھ چکے ہیں۔

شاہد اور صفیہ نے ابا جان کی تجویز درہم برہم کر دی ہے رفیق نے کہ چلنے سے پہلے کل ابا جان سے اپنا دردِ دل کہہ دے اور اپنی قسمت کا فیصلہ سن لے۔

تمھاری نوشابہ

فیض آباد ۔ ۱۵ ر نومبر ۱۹۴۲ء

پیاری ریحانہ !

کل رفیق کلکتہ چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے دیر تک ابا جان سے بات چیت کی۔ اس کے بعد جب میں نے اسے دیکھا تو اس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس کے بعد میں ابا جان سے ملی اُن کی طبیعت بےچین تھی۔ رات ابا جان کی تکلیف بڑھ گئی۔ اور میں صبح تک ان کے پاس بیٹھی رہی۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ ابا جان رفیق سے ناراض ہیں۔ وہ اسے بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیجنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ موسیقی اور مصوّری کے خبط میں مبتلا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا مقروض ہونا ابا جان کو ناپسند ہے آج ابا جان نے تار دیکر لکھنؤ سے اپنے قانونی مشیر مسٹر سکسینہ کو طلب کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ رفیق کے ماہوار وظیفہ میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کئی جھگڑے ہیں جن میں قانونی مشورے کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسٹر سکسینہ کی ذہانت اس گتھی کو سلجھائیگی۔ اور اس کے بعد ابا جان کی تشویش کم ہو جائیگی

تمھاری نوشابہ

فیض آباد ۔ ۲۲ ر نومبر ۱۹۴۲ء

پیاری ریحانہ !

میں یہ چند سطریں بہت عجلت میں گھسیٹ رہی ہوں۔ پرسوں مسٹر سکسینہ آئے۔ اور دیر تک ابا جان کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ جب وہ چلے گئے تو میں ابا جان کو دیکھنے گئی۔ ان کے چاروں طرف کاغذوں کے انبار تھے۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے مگر ان کے چہرہ پر اطمینان چمک رہا تھا۔ میں نے ان کی مدد سے وہ کاغذات الماری میں بند کئے اور اس کے بعد ابا جان آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ آدھی رات کے وقت ابا جان کو دورۂ قلب کا دورہ ہوا۔ سارا گھر جاگ اُٹھا۔ نوکر اسی وقت ڈاکٹر کو بلا لایا اور اس نے ٹیکہ کیا۔ صبح ابا جان کمزور مگر خوش و خرم تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔

"اب تمھیں مستقبل میں کسی قسم کا ڈر نہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم

بنیق سے اچھا برتاؤ کرو گی - وہ ذرا بگڑ گیا ہے "

مجھے ہمدردی اور محبت سے بھرا ہوا ایک طویل خط لکھو - تم نے دیر سے شاہد کے متعلق کچھ نہیں لکھا - اس نے بڑی ہمدردی اور شفقت سے اباجان کی مزاج پرسی کی ہے اور بذریعہ تار ان کی صحت کی خبر منگوائی ہے مگر وہ بار بار وصیت کے متعلق لکھے جاتا ہے - بھلا ایک بیمار - کمزور اور مہربان انسان سے منہ پھوڑ کر وصیت کے متعلق پوچھنا کہاں کی دانائی ہے؟ تمھاری نوشابہ

فیض آباد - ۱۱ر دسمبر ۴۲ء

پیاری ریحانہ! میں پچھلے دنوں بہت مصروف تھی اس لئے خط لکھنے میں دیر ہو گئی اباجان بیمار تھے اور میں دن رات ان کی تیمارداری میں مصروف رہی اب وہ اچھے ہیں مگر میری اپنی صحت بگڑ گئی ہے اباجان چاہتے ہیں کہ تبدیل آب و ہوا کی غرض سے چند روز کیلئے پٹنہ چلی جاؤں - ہم نے ایک نرس ملازم رکھ لی ہے اور میں کل پٹنہ جا رہی ہوں - میرا دل دھڑک رہا ہے شاہد کی صورت آنکھوں کے سامنے ہے - میں خود بخود مسکرا رہی ہوں - پٹنہ میں شاہد سے ملونگی اور پھر تمھیں لکھوں گی - میں نے نوکر کو مفصل ہدایات دے دی ہیں - اگر اباجان کو تکلیف بڑھ گئی تو وہ مجھے بذریعہ تار اطلاع دیگا -

تمھاری - نوشابہ

فیض آباد - ۱۷ر دسمبر ۴۲ء

پیاری ریحانہ! میں پٹنہ سے جلد واپس آ گئی ہوں - اُف کلیجہ کو آتا ہے میں اتوار کو پٹنہ پہنچی اور سوموار کو اباجان کو دورہ ہوا - نوکر نے بذریعہ تار اطلاع دی میں اسی وقت گاڑی میں سوار ہو گئی مگر سٹیشن پر اترتے ہی اُن کی سناؤنی سُن لی - تم میرے اضطراب کا اندازہ نہیں لگا سکتیں - رگ رگ میں جلن ہے - آج میں اس دنیا میں یتیم اور بے یار و مددگار ہوں - سوموار کی رات اباجان دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھے رہے چٹھیں لکھیں - کاغذات ترتیب دیئے اس کے بعد لیٹ اور پھر بستر سے اُٹھنا نصیب نہ ہوا - میں نے رفیق کو اطلاع دے دی ہے - کل اباجان کا جنازہ اٹھایا گیا - میلوں تک آدمیوں کا سمندر لہریں لے رہا تھا انھوں نے اپنی زندگی میں لاکھوں کو نوازا تھا اور وہ سب ان کی وفات پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہے تھے - شام کو انھیں سپرد خاک کیا گیا اور ان کی پیاری صورت ہمیشہ کیلئے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی - مسٹر سکسینہ آج رات آ رہے ہیں خدا جانے کیوں ——؟

تمھاری نوشابہ

فیض آباد - ۱۰ر دسمبر ۴۲ء

پیاری ریحانہ! یہ صرف تمھارے لئے ہے کسی دوسرے کو اسکی خبر نہ

کل رات مسز سکینہ آئے ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ابا جان کو رفیق کی فضول خرچی ناپسند تھی اس کے علاوہ اس نے مجھ سے بیاہ کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لئے ابا جان نے ساری جائداد مجھے دیدی اور اس کے متعلق وصیت نامہ مرتب کیا۔ مسز سکینہ کی اطلاع نے مجھے ایک گہری سوچ میں غرق کر دیا۔ رفیق مجھے غاصب اور بُرا سمجھے گا۔ انجام کار میں نے اس منحوس وصیت نامہ کو تلف کرنے کا ارادہ کر لیا۔ آدھی رات کے وقت میں چوروں کی طرح اٹھی۔ چپ چاپ ابا جان کے کمرے میں گئی۔ چابیاں میرے پاس تھیں۔ میں نے الماری کھولی۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد مجھے وہ مذموم وصیت نامہ مل گیا۔ میں نے اسے ایک نظر پڑھا۔ سب کچھ میرے لئے تھا۔ رفیق اسے انصاف سے بعید سمجھتا۔ ممکن تھا کہ دولت کیلئے مجھ پر ڈورے ڈالتا اور میرے شاہد کا دشمن بن جاتا۔ میں نے اسی وقت وصیت نامہ کو دیا سلائی دکھا دی اور اس کے بعد چین سے جا کر سو رہی۔ آج سارا دن رفیق اور مسز سکینہ وصیت نامہ تلاش کرتے رہے مگر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ تمہاری نوشابہ

فیض آباد - ۲ جنوری ۱۹۴۳ء

پیاری ریحانہ! تمہارا خیال کتنا بیہودہ ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا اگر مجھے ایک چیز کی ضرورت نہ ہو تو اسے لینے سے کیا حاصل؟ وصیت نامہ کے جل جانے سے صرف مجھے نقصان پہنچا ہے۔ میں نے کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑا۔ تم سمجھتی ہو کہ میں نے اسے بلا سوچے سمجھے پھونک دیا۔ اگر میں اس کے متعلق پہروں سوچتی تو آخر کار اس کا یہی انجام ہوتا۔ پیاری سہیلی وصیت نامہ کے جلنے کے متعلق کسی کو خبر نہ ہو کیونکہ مسز سکینہ اپنی قیمتی دستاویز کی جستجو میں بولائے ہوئے ہیں۔ جب وصیت نامہ کے ملنے سے سب ناامید ہو گئے تو مسز سکینہ نے قانوناً رفیق کو جائداد کا وارث ٹھہرایا ہے۔ اب میں ایک غریب لڑکی ہوں گویا میرے شاہد کا خیال درست ثابت ہوا ہے۔ میں خوش قسمتی سے ایک شریف آدمی سے پیمان وفا باندھ چکی ہوں۔ میں نے شاہد کو تمام حالات سے اطلاع دے دی ہے اور لکھا ہے کہ جلد آؤ اور اس بے خانماں غریب لڑکی کو بیاہ لے جاؤ۔ رفیق ہر گھڑی میرے آرام کا خیال رکھتا ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ ہر ماہ ایک کثیر رقم مجھے اخراجات کے لئے دیا کرے مگر مجھے اس کے سہارے زندگی بسر کرنا ناگوار ہے۔ میں شاہد کے قدموں کی آہٹ سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوں۔ تمہاری نوشابہ

فیض آباد - ۱۰ جنوری ۱۹۴۳ء

پیاری ریحانہ! میں تمہاری ہمدردی کی ممنون ہوں۔ تم نے میرے [illegible] کردار کی بہت تعریف کی ہے۔ میں نے آخر کون سا قلعہ سر کیا ہے۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا جلا دینا کہاں کی بہادری ہے؟ مجھے خوشی ہے کہ ابا جان کی جائداد رفیق کو ملی ہے اس نے ابھی سے زمینداری کا انتظام سنبھال لیا ہے عوام سے اس کا برتاؤ نہایت شریفانہ ہے۔ وہ اپنے نوکروں اور کاشتکاروں سے برادرانہ برتاؤ کرتا ہے اور وہ لوگ اس کی خاطر مٹنے پر آمادہ ہیں اس نے کئی قسم کے نذرانے اور شکرانے اڑا دیئے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے نوکر اور مزارع سب پیٹ بھر کر کھائیں خوش و خرم زندگی بسر کریں۔ وہ ان کی تعلیم کا بندوبست کر رہا ہے ان کے مفت علاج کے لئے ایک شفا خانہ کھولنے کی تجویز ہے اس نے لگان کم کر دیا ہے اور چاروں طرف واہ واہ ہو رہی ہے۔ میں تمہیں اخبار "ہمدرد" کا ایک تراشہ بھیج رہی ہوں جس میں ایڈیٹر نے رفیق کے اوصاف حمیدہ کے متعلق ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ کیا یہ کارنامہ میرے نامۂ اعمال میں ایک نمایاں نیکی نہیں میں نے اس منحوس وصیت نامہ کو جلا کر ہزاروں دلوں میں شادمانی کی لہر دوڑا دی ہے۔ تمہاری نوشابہ

فیض آباد - ۲۱ جنوری ۱۹۴۳ء

پیاری ریحانہ! آج کل رفیق بہت مصروف ہے۔ شام کے وقت جب ہم دونوں باغ میں چہل قدمی کیلئے آتے ہیں تو اس کی نگاہیں مجھے ایک خاموش پیغام سناتی ہیں۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا۔ پیاری سہیلی! میں نے محبت کی بازی ہار دی ہے۔ میری روح ایک عظیم بوجھ کے نیچے کراہ رہی ہے۔ میں سب کچھ لکھنا چاہتی ہوں مگر لکھ نہیں سکتی۔ میں نے شاہد کو کئی بار لکھا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا مجبور ہو کر میں نے ایک معتبر ملازم کو ایک دستی رقعہ دیکر بھیجا جب وہ شاہد سے ملا تو وہ ایک بازاری ہوٹل میں ایک آوارہ ایکٹریس کو بغل میں لئے شراب پی رہا تھا۔ میرا رقعہ دیکھ کر بہت بگڑا اور مجھے گالیاں دیں پھر قاصد سے کہنے لگا "اس بدکار چھوکری سے کہدو کہ کوئی اور دروازہ دیکھے"۔ پیاری بہنیلی! نوکر کی زبانی یہ پیغام سن کر میرے جذبۂ خودداری کو سخت ٹھیس لگی ہے۔ میں دنیا اور دنیا والوں سے بیزار ہوں مگر جب تمام واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور کرتی ہوں تو اس قادر مطلق کا شکر ادا کرتی ہوں جس کے کرم سے میں نے اس بدذات سے خلاصی پائی ہے اب میں چاہتی ہوں کہ کسی سکول میں معلمہ بن جاؤں کیا تم اس معاملہ میں میری کوئی امداد کر سکتی ہو؟ پیاری ریحانہ! کہیں یہ گمان نہ کرنا کہ میں اس وصیت نامہ کے جلا دینے پر نادم ہوں۔ اب صاف ظاہر ہے کہ شاہد میری دولت کا طالب تھا اگر میں کاغذ نہ جلاتی تو اس کے دام میں گرفتار ہو جاتی۔ شکر ہے کہ میں نے اس فریبی کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھ لیا اگر میں اس سے بیاہ کر لیتی تو تمام عمر ایک عذاب میں کٹتی۔ میری تنگدستی بھی خدا کی رحمت ہے کیونکہ اسی وصف نے مجھے اس ظالم

کے پیچھے سے چھڑایا ہے۔ تمہاری نوشابہ

فیض آباد - ۲ر فروری ۱۹۴۳ء

پیاری ریحانہ! اف بدبختی، میں سخت بے چین ہوں۔ اپنے آپ میں نہیں غریب رفیق اباجان کی جائداد سے محروم کر دیا گیا۔ ہم بالکل بیخبر تھے اچانک بجلی گری اور ہمارے خرمن مسرت کو جلا کر خاک کر دیا۔ میں نے تمہارے مشورہ کے مطابق رفیق سے شاہد کی بیوفائی کا ذکر کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسی وقت جا کر اس بدذات کو اس کی عیاری کا مزہ چکھائے مگر میں نے اسے روک دیا۔ اس کے بعد اس کا رویہ بڑا ہمدردانہ اور شریفانہ تھا اور وہ ہر معاملہ میں میری دلجوئی مدنظر رکھتا۔ پھر ایک دن ایک اجنبی ہمارے گھر آیا۔ وہ اباجان کی جائداد کا حقیقی وارث ہے اس کا نام رشید ہے اور وہ حیدرآباد دکن میں ملازم ہے اس نے وہاں اخبارات میں اباجان کی وفات کے متعلق پڑھا اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے یہاں دوڑا آیا۔ دوسرے دن مسٹر سکینہ بلائے گئے۔ قانون اس کی حمایت پر تھا۔ وہ اباجان کے چھوٹے بھائی محمود کا بیٹا ہے جو عالم شباب میں وطن چھوڑ کر حیدرآباد چلا گیا تھا اس کا دعویٰ مکمل تھا اس لئے رفیق کو جائداد سے محروم کر دیا گیا اور وہ میری طرح خانماں برباد اور غریب ہو گیا۔ میں اسے انصاف سے بعید سمجھتی ہوں مگر قانون کی طاقت بالاتر ہے اب مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس وصیت نامہ کو کیوں جلایا۔ مگر تقدیر کے سامنے تدبیر بے سود ہے۔ تمہاری نوشابہ

پیاری ریحانہ! ایک اور مہمان، مزید اضطراب، تشویش، پریشانی پرسوں رفیق کی منگیتر بلائے بے درماں کی طرح یہاں پہنچی اس نے اخبارات میں اباجان کی وفات کے متعلق پڑھا تھا۔ افسوس آجکل ہر ایک شمع دولت کا پروانہ ہے ایمان، اصول اور وفاداری زمانہ ماضی کی بھولی بسری داستانیں ہیں۔ صفیہ کو رفیق کی بیدخلی کے متعلق معلوم نہ تھا۔ وہ میرے ساتھ دیر تک گھر میں ادھر اُدھر گھومتی رہی بڑی باتونی عورت ہے اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے جب رفیق نے اسے اپنی مفلسی کی کہانی سنائی تو ایک لمحہ کے لئے وہ حیرت سے اس کے منہ کی طرف تکتی رہی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اباجان کی زمینداری کا اصلی وارث آ گیا ہے اور رفیق کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں تو وہ بادل کی طرح گرجی، برسی، ہمیں گالیاں دیں اور لڑ جھگڑ کر شام کی گاڑی سے واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد رفیق بہت پژمردہ اور اداس تھا میں نے اس کا دل بہلانے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ افسوس ہم دونوں افلاس کے پھندے میں گرفتار ہیں ناکام محبت ہیں مستقبل تاریک ہے۔ خدا جانے واقعات کی رو ہمیں کہاں لے جائیگی؟ شام کے وقت ہم دونوں ایک کونے میں اداس بیٹھے تھے اور اپنے دلوں کو فریب دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے شاہد کی برائیاں گنیں

اُس نے صفیہ کی فضول خرچی اور خود غرضی بیان کی۔ باتوں باتوں میں اُس نے مجھ سے اظہارِ محبت کیا اور میں نے اپنے آپ کو اُس کی کھلی آغوش میں دیدیا۔ میری پیاری ! اب کے تم مجھے مبارک باد کا خط ضرور لکھنا۔ میں نے اچھا کیا کہ اس وصیت نامہ کو جلا کر خاک کر دیا۔ اگر وہ منحوس کاغذ باقی رہتا تو مجھے بدطینت شاہد کی باندی بن کر زندگی بسر کرنی ہوتی۔ اور میرا پیارا رفیق صفیہ کے دامِ فریب میں گرفتار ہو کر اپنی زندگی تباہ کر لیتا۔ میں نے اس رات وہ کاغذ جلا کر اپنے آپ کو اور رفیق کو ایک بڑے عذاب سے بچا لیا ہے۔ رفیق کو میری دولت کی ضرورت نہیں وہ میری محبت کا طالب ہے۔ میں جلد کسی مدرسہ میں معلمہ بن جاؤنگی اور وہ فوٹوگرافی کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لیگا۔ اس کے بعد ہم دونوں نکاح کے مقدس رشتے میں بندھ جائیں گے۔ نوکر اور مزارع رشید کو ناپسند کرتے ہیں مگر قانون کے سامنے ہر ایک کو سر جھکانا ہوتا ہے۔

تمہاری نوشابہ

فیض آباد۔ ۹ رفروری ۴۳ء

پیاری ریحانہ ! آسمان نے مجھ ناتوان کے کمزور دل کو مشقِ جفا کے لئے چن لیا ہے۔ ابا جان کی وفات، شاہد کی بیوفائی، تنگدستی کا عذاب کس کس مصیبت کا رونا روؤں مگر اب ایک نئی آفت نازل ہوئی ہے بدقسمتی سے، وصیت نامہ کے چند نیم سوختہ اجزا مل گئے ہیں اور اب میرے پیارے رفیق پر شک کیا جا رہا ہے۔ افسوس خادمہ ابا جان کے کمرے میں کمرے میں جھاڑو دے رہی تھی۔ وہاں دری کے نیچے ایک کاغذ کے نیم سوختہ اجزا ملے۔ چونکہ مسٹر سکسینہ کئی روز تک یہاں کاغذات تلاش کرتے رہے تھے اس لئے منشی نے چپکے سے وہ اجزا لکھنؤ بھیج دیئے۔ مسٹر سکسینہ نے انھیں فوراً پہچان لیا۔ وہ ابا جان کی وصیت کے اجزا تھے۔ کل مسٹر سکسینہ یہاں آئے اور وہ اجزا مجھے دکھائے۔ انھیں اس وقت رفیق پر شبہ تھا۔

"مسٹر سکسینہ ! اب اس قصہ کو چھوڑیئے" میں نے کہا۔ "میں اور رفیق جائداد سے محروم ہو چکے۔ اب اس سے کیا فائدہ ؟"

"وصیت نامہ جلانا یا تلف کرنا جرم ہے" مسٹر سکسینہ نے جواب دیا۔ "قانون مسٹر رفیق کو سخت سزا دے گا"

میرا رفیق اور سزا ——؟ میں لرز اٹھی اور اعتراف گناہ کر لیا۔

"نوشابہ !" مسٹر سکسینہ نے کہا۔ "تم اصل میں رفیق کو قانونی گرفت سے بچانا چاہتی ہو۔ مگر عدالت تمہارے بیان پر یقین نہیں کرے گی"

مجبور ہو کر میں نے مسٹر سکسینہ کو تمام داستان کہہ سنائی اور بتقدیرسے انھوں نے میرا اعتبار کر لیا۔

افسوس ! میرے جرم کے لئے میرے رفیق کو مصیبت میں مبتلا ہونا پڑا۔ کاش میں اس منحوس کاغذ کو ہاتھ نہ لگاتی۔ اب رشید مجھے اپنے دام میں پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پیاری سہیلی میں سراپا مصیبت ہوں۔ میری صبحیں اشکباری میں اور راتیں سوگواری میں بسر ہو رہی ہیں۔ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھو۔

تمہاری۔ نوشابہ

فیض آباد ۱۵ رفروری ۴۳ء

پیاری ریحانہ !

غم کے بادل چھٹ گئے۔ میرے دل میں جہاں یاس کا اندھیرا تھا اب وہاں آفتابِ مسرت کی خوشگوار روشنی کا بسیرا ہے۔ پرسوں رشید نے مجھے اور رفیق کو گھر سے نکل جانے کا نادر شاہی حکم سنایا۔ ہم دونوں نے اپنا اسباب باندھا اور روتے دھوتے اس گھر سے نکل آئے جہاں ہم نے بچپن سے لیکر جوانی تک کی بہاریں دیکھی تھیں۔ میں اپنے ساتھ وہ صندوقچہ اُٹھا لائی جس میں میری والدہ کے خطوط اور بالوں کی لٹ تھی۔

رشید نے اپنے خبثِ باطن کی وجہ سے ہمارے اسباب کی تلاشی لی۔ جب وہ صندوقچہ کھولا گیا تو اس میں سے ایک کاغذ نکلا۔ جس نے ہماری قسمت کو تبدیل کر دیا۔ اور ہمیں بھکاری سے بادشاہ بنا دیا وہ ابا جان کی لکھی ہوئی آخری وصیت تھی جو انھوں نے اپنی وفات سے ایک رات پہلے مرتب کی تھی۔ اور اپنی تمام جائداد مجھے اور رفیق کو بانٹ دی تھی۔

مسٹر سکسینہ بلائے گئے۔ وصیت نامہ قانون کی رو سے ہر طرح مکمل تھا۔ اب مسٹر رشید کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور وہ اسی روز حیدرآباد چلا گیا۔

اب میں خوشی سے دیوانی ہو رہی ہوں۔ رفیق میرا ہے اور ایک خوش آئند زندگی میرے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔

تمہاری۔ نوشابہ

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی معیاری ماہناموں میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ١ — فہرس ماہِ اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء — نمبر ۵

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

پچھلے دنوں ادارۂ تحریر "خیام" کے سالنامہ ۱۹۴۴ء کی ترتیب میں شب و روز منہمک رہا اس لئے ماہ اکتوبر کا "عالمگیر" چند روز دیر سے شائع ہو رہا ہے امید ہے قارئین اس جبری تعویق کو نظرانداز فرمائینگے - آئندہ کیلئے ایسے انتظامات کئے جا رہے ہیں کہ "عالمگیر" ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو بلکہ اس سے بھی بہت پہلے لاہور میں شائع ہو جایا کرے - تاکہ قارئین کو زحمتِ انتظار نہ ہو ! وما توفیقی الا باللہ -

حکومتِ ہند کی آئینی مصلحتوں نے "عالمگیر" کو اخباری کاغذ کی ... سے فیضیاب ہونیکی اجازت نہیں دی - دوسری طرف بازار کے نرخ میں بھی کسی قسم کی تخفیف کا امکان نظر نہیں آتا - اس کے باوجود ہم یہ اعلان کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے اس سال بھی حسبِ معمول "عالمگیر" کا خاص نمبر ۱۹۴۴ء یکم دسمبر ۱۹۴۳ء کو شائع کیا جائیگا - اس نمبر کو ظاہری و معنوی حیثیت سے بہت زیادہ کامیاب بنانے کے لئے وسیع پیمانے پر تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں - کاغذ کی حوصلہ شکن گرانی کے باوجود "خاص نمبر" اعلیٰ درجے کے سفید دبیز کاغذ پر طبع کیا جائیگا - اور مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے یہ نمبر بلاشبہ **"خاص نمبر"** ہوگا - اہلِ قلم معاونین سے التماس ہے کہ وہ اپنے اپنے جواہرِ افکار **۲۰ اکتوبر ۴۳ء** تک دفتر میں ضرور بھجوا دیں تاکہ نومبر کی اشاعت میں اُن کا اعلان ہو سکے - اس تاریخ کے بعد موصول ہونے والے مضامین کو شریکِ اشاعت نہ کیا جا سکے گا - خاص نمبر میں چونکہ تنوع پیدا کرنا مقصود ہے اور صفحات کی تعداد کافی ہونے کے باوجود محدود ہوگی اس لئے **اختصار کا خاص طور پر خیال رکھا جائے** طویل مضامین کی اشاعت پر غور نہ ہو سکے گا -

زیرِ نظر اشاعت مضامینِ نظم و نثر کی رنگارنگی کے باعث کشش انگیز ہے حضرت مولینا ظفر علی خاں مدظلہ العالی کے "حقائق و معارف" باذوق حلقوں میں بہت زیادہ مقبول ہو رہے ہیں اس مرتبہ جو مقالہ شریکِ اشاعت ہے اسمیں حضرت مولینا نے اسموئل بن عادیا کی شاعرانہ فضیلت پر روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی اُس بے انصافی کا ازالہ کیا ہے جس کا ثبوت قادر لوئس شیخو نے اپنی تعلیق میں دیا تھا - "جدید عربی ادب کا ایک درسی انتخاب"

از ــــــ ادارۂ تحریر

جناب کارشش کا ایک محققانہ مضمون ہے جس میں عربی ادب کے جدید رجحانات پر مفصل گفتگو کی گئی ہے فاضل مقالہ نویس نے اس بحث کا کوئی گوشہ تاریک نہیں رہنے دیا اس لئے امید ہے یہ مضمون بہت زیادہ معلومات افزا ثابت ہوگا - مولینا نور احمد خاں فریدی نے بطلِ حریت احمد شاہ ابدالی کی حربی سرگرمیوں پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے اور اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے - پیر غلام دستگیر صاحب نامی نے عہدِ جہانگیری کے ایک بہت بڑے فاضل اجل اور محدث سے قارئین کا تعارف کرایا ہے - اس قسم کے بزرگوں کا تذکرہ آجکل کے بے راہرو اور سطحی دماغوں کے مالک نوجوانوں کے لئے بہت زیادہ نصیحت آموز ثابت ہو سکتا ہے - اس اشاعت میں کم و بیش چھ افسانے شامل کئے گئے ہیں جناب ضبط نے روس کے مشہور ترین افسانہ نویس میکسم گورکی کی ایک رومانی کہانی کا ترجمہ کیا ہے ممکن ہے بعض قارئین کو یہ افسانہ پڑھتے وقت محسوس ہو کہ اس قسم کا ایک قصہ پہلے بھی نظر سے گزر چکا ہے - لیکن اس کی وجہ در اصل یہ ہے کہ میکسم گورکی کے اس شاہکار کو بہت سے ادبا نے اپنانے کی کوشش کی ہے لہٰذا ہم نے اصل شائع کر دیا ہے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے - اختر ملیح آبادی ایک سلجھے ہوئے اور باذوق افسانہ نویس ہیں "سونے کے کھلونے" اپنے اچھوتے موضوع کی وجہ سے یقیناً مقبولیت کی نظروں سے دیکھا جائیگا - محترمہ شفیق بانو ایک مشاق افسانہ نویس ہیں - اُن کا ایک افسانہ زیرِ نظر شمارہ میں درج کیا جا رہا ہے - اُنہوں نے عالمگیر میں مستقل طور پر لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے "گیسو" ٹوٹے ہوئے تارے اور ڈاکیہ بھی اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے خوب ہیں :

حصۂ نظم بہت زیادہ کامیاب ہے - آجکل عام رسائل و جرائد میں "آزاد شاعری" کے نمونے بکثرت شائع ہو رہے ہیں - "عالمگیر" نے اس قسم کی بے معنی اور لچر نظموں کو اپنے دامن میں جگہ دینے سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ قارئین ہمارے طرزِ عمل سے متفق ہیں اس اشاعت میں اساتذۂ سخن کے دوش بدوش نوجوان شعرا کا تازہ کلام بھی درج کیا جا رہا ہے امید ہے قارئین اسمیں اپنے ذوق کی تسکین کا سامان پائیں گے - ہم نوح ناروی، علی اختر، دل شاہجہانپوری، یوسف جمال، شفیق کوٹی، اعجاز صدیقی، محمود اسرائیلی، نشتر امادی اور پنڈت ... جیسے شعرا کے علی الخصوص شکر گزار ہیں کہ وہ بالالتزام اپنا تازہ کلام "عالمگیر" کو مرحمت فرماتے رہتے ہیں - فجزاہم اللہ احسن الجزا -

اخبار و افکار

اُردو رسم خط کی اصلاح

از:- ادارہ

اُردو کو ہمہ گیر زبان بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے رسمِ خط میں موجودہ اقتضا کے مطابق اصلاح کی جائے۔ چنانچہ پچھلے دنوں انجمن ترقی اُردو ہند نے اہل الرائے کی ایک مجلس منعقد کی جس نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد اپنی تجاویز شایع کر دی ہیں۔ اور اہل ذوق کو دعوت دی ہے کہ وہ بھی اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ ذیل میں مجلس اصلاح رسمِ خط کی تجاویز کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ ہر تجویز کے بعد ایک دو سطروں میں "عالمگیر" کی رائے بھی لکھ دی گئی ہے۔

۱۔ سفارش کی جاتی ہے کہ اُردو کی کتابت اور خاص کر چھاپے میں اِن امور کی پابندی کی جائے۔

(ا) دو لفظوں کے درمیان واضح فاصلہ رکھا جائے اور یہ فاصلہ یکساں ہو نیز یہ فاصلہ اس فاصلے سے زیادہ ہو جو ایک ہی لفظ کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں رکھا جائے۔

(ب) ایک لفظ کے اوپر دوسرا لفظ یا ایک حرف کے اوپر دوسرا حرف کسی حالت میں نہ لکھا جائے، یعنی "سرفراز" لکھا جائے۔ نہ کہ "سرفراز"۔ "درد" لکھا جائے؛ نہ کہ "درد"، "گھبراہٹ" نہ کہ "گھبراہٹ"

عالمگیر۔ ان تجاویز کی معقولیت میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اعلیٰ درجے کے رسائل و جرائد اور کتب و تصانیف میں ان امور کی پابندی پہلے ہی کی جاتی ہے۔ لیکن ہر مصرعے میں الفاظ کی تعداد چونکہ برابر نہیں ہو سکتی اس لئے نظم میں بعض الفاظ کو ایک دوسرے کے اوپر بھی ڈالنا پڑتا ہے۔

(ج) مرکب لفظ، جو دو یا زیادہ لفظوں سے بنے ہوں، آپس میں ملا کر نہ لکھے جاویں۔ بل کہ ہمیشہ الگ الگ لکھے جائیں۔ البتہ اِن کے درمیان میں فاصلہ صرف اُتنا ہو جتنا ایک ہی لفظ کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں، جیسا کہ ان مثالوں سے واضح ہوگا۔ جیسے آج کل۔ بن مانس پت جھڑی۔ کل جگ۔ کل مُنہا۔ کل دار۔ شاہ نامہ۔ شاہ جہان آباد۔ شاہ جہان پور۔ جون پور۔ ادے پور۔ جے پور۔ اُدے پور۔ فرخ نگر۔ ناگ پور۔ کان پور۔ دل لگی۔ گل کاری۔ پھل کاری۔

(د) بعض مفرد لفظ دو طرح لکھے جاتے ہیں، بی بی اور بیبی اور دلدل۔ ان کی منفصل لکھاوٹ اختیار کی جائے اس طرح۔ کھل بلی۔ چھٹ پٹا۔ جھن جھنا۔ کن کنا۔ ہل چل۔ گل گلا۔ رس گلا۔ لس لسا۔ کھٹ کھٹانا۔ کھٹ گھٹاہٹ۔ کھن کھنا کھن کھناہٹ۔ دانا کل کل۔ جھن جھٹ۔

عالمگیر۔ ہم اصولی طور پر اس تجویز سے متفق ہیں۔ البتہ تف میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

(ہ) ہمزہ جب کسی منفصل حرف کے بعد آئے تو بالکل جدا لکھ اس طرح پر کہ اس کی لیے کوئی شوشہ نہ ہو اور نہ ہمزہ کسی ح کے اوپر لکھا جائے، بل کہ یوں ہو:-

آئی آئے آئیں بھائی نائی ملائی بھلائی برائی روئی اوئی سوئی سوئیاں دھوئیں۔ سوئیں ڈوئیں ڈوئیاں آئے جائیے سنائیے کھائیے ترش روئی بدخوئی عیب جوئی یوسف زئی زائل قائل طائر مائل گھ سائل زائد فائدہ قائدہ قائم دائم دائر سا لاطائل ضائع شائع جرائم وظائف تائید رئیس عزرائیل میکائیل (خود عربی میں ان لفظوں لکھاوٹ کو دیکھئے:- براءۃ قراءۃ سموءل)

عالمگیر۔ اسے قاعدہ کلیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ بعا حالات میں ہمزہ حروف کے اوپر لکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً مؤمنین یش تشاؤن۔ مطمئن۔ اسی طرح عربی کے بعض الفاظ ایسے ہیں جن ک اُردو میں استعمال کرتے وقت ہمزے کو اُڑا دیا جاتا ہے۔ مثلاً علم شعرا۔ اُدبا۔ عشا وغیرہ۔ ان الفاظ کے آخر میں اب ہمزہ ڈالنا ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا اس قاعدے کی مستثنیات کو نظرا نہیں کیا جا سکتا۔

(و) فارسی لفظ بہ، نہ، چہ، کہ، نِ وغیرہ جو خود فارسی میں بھ کبھی دوسرے لفظ سے ملا کر اور کبھی الگ لکھے جاتے ہیں، اُردو

عبارت میں الگ لکھے جائیں، جیسے
بہ خوبی، بہ ہر حال، بہ کمالِ شفقت، بہ دولت، نہ خورد، نہ گفت، چہ کنم، چہ می گوئی، چہ می گوئیاں، حال آں کہ، بل کہ، چوں کہ، چناں چہ، غرض کہ، تا وقتے کہ، بہ شرطے کہ، بے شک، بے تحاشا، بے محابا، وغیرہ

عالمگیر - اِن الفاظ کو اگر علیحدہ علیحدہ لکھا جائے تو چنداں حرج واقع نہیں ہوتا۔ لیکن نظم میں چونکہ بعض حروف تقطیع میں نہیں آتے۔ اس لئے اکٹھا لکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ "چہ میگوئی" کو "چہ می گوئی" لکھ کر اصل لفظ کا حلیہ بگاڑنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

لمبی ے کو جو خاص کر ٹائپ میں دقتیں پیدا کرتی ہے۔ اور اکثر بہت بدنما ہوتی ہے قطعاً ترک کر دینا چاہیے۔ اس کی جگہ دائرے والی ی سے کام لیا جائے۔ اور جب ی سے پہلے مفتوح حرف ہو، تو بھی ی آدھے دائرے کی ہو مگر اس پر جزم ضرور ہو، جیسے جیْ ۔ نیْ مَیْ نے ہے۔

عالمگیر - یہ صحیح ہے۔ لمبی ے کی جگہ آدھی دائرے والی ی سے کام لیا جائے تو بہتر ہے۔

دھ ڈھ رھ ڑھ لکھنے میں دو دو حروف ہیں حالانکہ ایک ہی ایک آواز کو ادا کرتے ہیں۔ ان کو ملا کر لکھنا چاہیے اور مفرد حرف قرار دینا چاہیے یعنی کسی حال میں اگلے حرف سے نہ ملیں۔ اس طرح ان کی شکلیں یہ قرار پاتی ہیں۔

ڡ (یا دھ)، ڈھ (یا ڈھ) ڑھ (یا ڑھ)

مثالیں:۔ دُھن (بجائے دُھن) اُدھورا (بجائے ادھورا) کی طرح دھان، دھرتی، دھرم، دھوبی، ڈھولی، دھانپ، کاڑھنا، کڑھائی، ڈیڑھ وغیرہ،

نون غنہ ہمیشہ منفصل لکھا جائے اور شکل اس کی یہ ہو۔ ں

مثالیں:۔ باں س، پھاں س، پھیں س، کھوں س، ہم س، یہ نہیں ملیں گے۔ میں نہاڑ ہے کہاں لکھتے ہیں؟

عالمگیر - یہ دونوں تجویزیں سراسر غیر معقول ہیں۔ ممکن ہے کہ پہلے قاعدے میں حروف کی یہ شکلیں مفید ہوں لیکن رسائل اور تصانیف و کتب میں اس قسم کے رسم خط کا استعمال نامناسب ہے۔

د- عربی لفظوں کی کتابت کے متعلق سفارش کی جاتی ہے کہ

(ل) اِن، عن، مِن، فی (جو خود عربی میں الگ لکھی جاتی ہیں) اُردو میں بھی دُوسرے لفظ سے ملا کر نہ لکھے جائیں، بلکہ یوں لکھنا چاہیے:۔ اِن شاء اللہ، عن قریب، من جانب، فی صد، فی کس وغیرہ، [1]

البتہ جب ایسے کسی لفظ کے بعد عربی کی ضمیر آئے تو وہ ملا کر لکھی جائے؛ جیسے عنھم، عنہ، منہ، منھم، فیھا۔

(ب) عربی کے حرف تعریف (ال) کی کتابت کے متعلق طے ہوا کہ:۔

(۱) اَل کے بعد کا لفظ اگر قمری حرف (یعنی ا، ب، ج، ح، خ، ع، غ، ف، ق، ک، م، و، ہ، ی، میں سے کسی حرف) سے شروع ہوتا ہو، اور اَل سے پہلے بھی کوئی لفظ آکر اُس سے مرکب ہوا ہو تو ال کے صرف الف پر گول جزم (بہ طور سکوت کی علامت کے) ہو، اس طرح بالکل۔ بالفعل۔ عبدالجبار۔ عبدالقادر۔

(۲) اَل کے بعد کا حرف اگر شمسی حرف (یعنی ت۔ ث۔ د۔ ذ۔ ر۔ ز۔ س۔ ش۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ل۔ ن۔ میں سے کسی حرف) سے شروع ہوتا ہے تو اَل کی ل پر سکوت کی علامت ہو (الف پر ضرورت نہیں)؛ لیکن اگر اَل سے پہلے کوئی عربی لفظ آکر اُس سے مرکب ہوا ہو، تو الف اور ل دونوں پر (اسی طرح سے: اَلْ) سکوت کی علامت ہو جیسے "السّلام علیکم"، مگر "علیکم السّلام" ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ الف پر سکوت کی علامت ہو، ل خالی رہے۔ مگر شمسی حرف پر تشدید ضرور لگائی جائے۔ اس صورت میں سیکھنے والے کو یہ بتایا جائے کہ اگر اَل کے بعد والے حرف پر تشدید ہو تو ال تلفظ میں نہ آئے گا۔

عالمگیر - یہ تجویزیں غیر معقول نہیں ہیں۔

(ج) وہ عربی لفظ (یا نام) جو خود عربی میں دو طرح لکھے جاتے ہیں ان کی اس لکھاوٹ کو اختیار کرنا چاہیے جو اُردو لکھاوٹ کے مطابق یا اس سے قریب ہے اور ان کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) ابرٰھیم	ابراھیم	اُردو میں صرف دوسری طرح لکھے جاتے ہیں۔ یعنی ابراہیم، سلیمان، لقمان، شیطان، اور اسی طرح لکھنا چاہیے۔
سلیمٰن	سلیمان	
لقمٰن	لقمان	
شیطٰن	شیطان	
(۲) اسمٰعیل	اسماعیل	اُردو میں بھی دونوں طرح،

[1] فارسی والوں نے انہیں ملا کر لکھنے پر اصرار کیا مگر یہ سراسر بے جا اور غلط ہے۔

رحمٰن — رحمان — مگر ان کو بھی صرف دوسری طرح، (اسماعیل- رحمان لکھنا چاہیے-

(۳) حیٰوۃ	حیاۃ	اُردو میں حیات- نجات- ربا- منات لکھتے ہیں اور اسی طرح لکھنا چاہیے-
نجٰوۃ	نجاۃ	
ربٰوا	ربا	
منٰوۃ	مناۃ	
(۴) زکٰوۃ	زکاۃ	اُردو میں زکات، صلات، مشکات لکھنا چاہیے-
صلٰوۃ	صلاۃ	
مشکٰوۃ	مشکاۃ	

[فائدہ :- عربی میں ان لفظوں کی پہلی لکھاوٹ بہت پرانی ہے- اور جب قرآن کا متن پہلے پہل لکھا گیا- تو یہ لکھاوٹ اختیار کی گئی- اس کے بعد ان کو بدلنا پسند نہیں کیا گیا اور اب تک ہر حرف اسی پرانی صورت اور ہیئت میں موجود ہے- مگر جب عربی میں کتابت کے اصول مقرر کئے گئے تو یہ لفظ پوری الف سے لکھے گئے اور ماسوا قرآن کے عربی کتابوں میں اکثر و بیشتر پوری الف والی لکھاوٹ پائی جاتی ہے- یہاں تک کہ بڑی مستند کتابوں میں جب قرآن کی آیتیں نقل ہوئی ہیں اور ان میں ایسے لفظ آ گئے ہیں تو بھی پوری الف سے لکھے گئے ہیں-]

(د) عربی کی ۃ کو اُردو میں ہمیشہ ت لکھنا چاہیے-

وہ عربی لفظ جن میں الف مقصورہ لکھنا غلط ہے (مگر لوگ نادانستہ ان میں بھی مقصورہ حرف لکھ دیتے ہیں جیسے اِستغنٰی- ارتضٰی- اجتبٰی، اصطفٰی) صحیح طریقے سے لکھے جائیں یعنی یوں استغنا، ارتضا، اجتبا، اصطفا،

(ی) عربی میں جو لفظ الف مقصورہ سے لکھے جاتے ہیں اُردو میں وہ معمولی الف سے لکھے جائیں اور ان کی تفصیل یہ ہے -

اعلیٰ- ادنیٰ- اَقْلیٰ- اُولیٰ- علیٰ حالہ- علاحدہ- مولیٰ- مولٰنا مُعلّیٰ- مُصلّیٰ- مُعمّیٰ- مجلّیٰ- مربّیٰ- معرّیٰ- مدعیٰ علیہ وغیرہ ان میں بہت سے لفظ اُردو (اور فارسی) میں معمولی الف سے لکھے جاتے ہیں، جیسے مُربّا، مُعرّا، مُصلّا، مُعمّا، مُنقّا، تقاضا، تماشا، تمنا، تبرّا، تولّا، کچھ لفظ دونوں طرح لکھے جاتے ہیں- جیسے مولا (یا مولیٰ) مولانا (یا مولٰنا) مُعلّا، مُدّعا علیہ کچھ ایسے ہیں کہ ایک زمانے میں سیدھے الف سے لکھے جاتے تھے، مگر لوگوں نے رجعت کی اور وہ پھر الف مقصورہ سے لکھے جانے لگے- جیسے اقلا، ادنا، اولا[1] "علاحدۃ" دو لفظ ہیں (اور عربی میں کبھی ملا کر نہیں لکھے جاتے) مگر اُردو والے اُن کو ملا کر لکھتے ہیں" علیٰحدہ" یا "علیحدہ" بہتر ہے کہ "علاحدہ" لکھا جائے- ان سب لفظوں کو یوں لکھنا چاہیے: ادنا- اعلا- اقلا- اولا- مولا- مولانا- مدعا علیہ- متوفا- مستثنا- مصلا- علا- مجلا- معما- مربا- علاحدہ- ناموں کو بھی یوں لکھ سکتے ہیں- عیسا- موسا- مصطفا- مرتضا- کسرا- صغرا- کبرا وغیرہ

عالمگیر- ہمیں مجلس کی رائے سے اتفاق ہے لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ عربی الفاظ کی نئی لکھاوٹ سے کہیں معنی میں فرق نہ پڑ جائے-

۶- فارسی اور عربی کے سوا کسی غیر زبان کا لفظ اردو میں لکھا جائے تو اُس کے صوتی ٹکڑوں کو، جہاں تک ہو سکے الگ الگ کر کے لکھنا چاہیے: جیسے (انگریزی):- اِن فارمل- اِنس پک ٹر- مس ٹر- مِم بر- ڈاک ٹر- ک لک ٹر (کلکٹر) ڈائرک ٹر- ادورسی عر — سوپروائزر- انس ٹی ٹیوٹ- کانگ رس- کان فرنس- ریڈیو سوپرانٹن ڈنٹ- یونی ورسٹی- ٹی لی فون- اس ٹیشن، ڈی پارٹ منٹ-

کمیٹی کو اس امر کا پورا احساس ہے کہ کسی غیر زبان کے لفظوں کو ٹھیک ٹھیک تلفظ کے مطابق ادا کرنے کے لئے یہ تدبیر ناکافی ہے اور لغت اور لسانیات وغیرہ کی کتابوں کے لئے ہر زبان کی خصوصیتوں کو پیش نظر رکھ کر زیادہ تفصیلی تجویزیں عمل میں لانے کی ضرورت ہے اس لئے تجویز کی گئی کہ یہ مسئلہ کسی آئندہ موقع تک ملتوی رکھا جائے-

عالمگیر- واقعی غیر زبان کے الفاظ کی صحیح تلفظ کے لئے یہ تدبیر ناکافی ہے اور اس پر مزید غور و خوض ہونا چاہیے-

۷- رسم خط کو زیادہ آسان بنانے کی غرض سے چند اور تحریکیں بھی پیش ہوئیں جن پر دیر تک بحث ہونے کے بعد طے ہوا کہ تعلیمی ضرورتوں خاص کر بالغوں کی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے ان امور کی سفارش کی جائے-

[الف]- مصدر یا کسی صیغے کے آخر میں جو نا (نی، نے) تا (تی، تے) وغیرہ آتے ہیں وہ اصل (یا مادے) سے الگ کر کے لکھے جائیں- جیسے لے نا- لے تا، لے تی، لے تیں، دے نا، دے نی، دے نے، لکھ نا، لکھ تے، لکھ تی، لکھ تیں سمجھ نا، سمجھ تے، سمجھ تی، بھیج نا، بھیج وانا، دل وانا وغیرہ

(باقی بر صفحہ ۵۶)

[1] خود عربی میں اس قسم کے لفظ بعض حالتوں میں معمولی الف سے لکھے جاتے ہیں، جیسے اعلاھم- ادناہ- مولائی وغیرہ

طوفانِ ذوق و شوق

کھوٹی جو اُن کی بات تھی وہ بھی کھری ہوئی

از:۔ حضرت نوحؔ ناروی

حسنِ نظر سے دل کی اگر ابتری ہوئی / تو جانیے فغاں بھی ہے لب پر دھری ہوئی
بوتل جو دیکھ لی کہیں مے سے بھری ہوئی / میرے لیے وہ حور ہوئی یا پری ہوئی
اچھی ہمارے ساتھ یہ جادوگری ہوئی / کھوٹی جو اُن کی بات تھی وہ بھی کھری ہوئی
بخشی حیات تو ہمیں شغلِ شراب نے، / رہتی تھی پہلے اپنی طبیعت مری ہوئی
پہنچی خزاں کہ رنگِ مسرت بدل گیا / آئی بہار اور طبیعت ہری ہوئی
پہلو سے دل کو لے گئے وہ یوں نکال کر / جیسے اُنھیں کی تھی یہ امانت دھری ہوئی
طول اس قدر دیا مری فردِ حساب نے / عقبیٰ کی بازپرس سے دُنیا بری ہوئی
پھر زندگی کے رنج و غم آئیں گے روبرو / پھر جی اُٹھے گی حشر میں خلقت مری ہوئی
سمجھا کسی نے بھی نہ مرے دل کا مدعا / عشقِ مجاز میں تھی حقیقت بھری ہوئی
کیا پوچھنا بہار میں حسنِ بہار کا / نکلی جو شاخِ گل وہی بڑھ کر پری ہوئی
دے دو ہمیں خدا کے لیے دل کو ڈھونڈ کر / پائیں گے چیز ہم نہ تمھاری دھری ہوئی
ساقی کسی کا ظرف نہیں اور اس قدر / خالی کروں گا میں ہی صُراحی بھری ہوئی
میں کوئے ذوق و شوق کے حالات کیا کہوں / رکھے نہ تھے قدم بھی کہ غارت گری ہوئی
ہم تو نہ یہ کہیں گے زمانہ کہا کرے / ہر بات آپ کی ہے صداقت بھری ہوئی
مل کر کسی نے کام سب اپنے بنا لیے / پردے میں دل دہی کے غضب دلبری ہوئی
آنکھوں سے اشک بہنے لگے اُن کو دیکھ کر / کچھ اس طرح تھی اپنی طبیعت بھری ہوئی
دل بھی مٹا، جگر بھی مٹا، میں بھی مٹ گیا / ہونے کے واسطے وہ نظر سرسری ہوئی
دیکھا نہ میں نے کوثر و تسنیم کی طرف / مثلِ سبو رہی مری نیت بھری ہوئی
بدلا نظر نے رنگ دلِ داغدار کا / بجلی گری تو اور یہ ڈالی ہری ہوئی

طوفانِ ذوق و شوق میں سب کو ڈبو دیا
اے نوحؔ تیرے دم سے بڑی ابتری ہوئی

حقائق و معارف

کبوتران ابلق

از:- مولٰنا ظفر علی خاں مدظلہ

ایران کے یک جفت کبوتران ابلق" تو وہ تھے جو جُدا جُدا معلق رہتے تھے۔ آسمان تک تو ان کی پرواز تھی مگر اپنے کابک سے باہر نکلنے کا نام بھی نہ لیتے تھے۔ ہندوستان کے شیرازی کبوتر نامہ بری کے لئے اس لبِ بام تک صعود کرتے تھے۔ جیسے بوسہ دیتے ہوئے فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔ مگر عرب کے کبوتران ابلق کی شان امتیازی ان سب سے الگ تھلگ واقع ہوئی تھی۔ یہ "کبوتر بام حرم" نہ تھے جو "مرغانِ رشتہ بر پارا" کے دلوں کی تڑپ سے آگاہ نہ ہوں۔ یہ بام حریم ابلق کے کبوتر تھے۔ جنھیں مرغانِ رشتہ بر پارا کے دلوں کی تڑپ ہی نے پیدا کیا تھا۔ اور جواب بھی ہر ایک دل میں وہی تڑپ پیدا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

عرب کے مشہور مقام "تیما" کے متصل ایک بہت ہی پرانا قلعہ تھا۔ جس کی تاریخ تعمیر قدامت کی تاریکی میں گم ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ "اعشیٰ بن تعلبہ" حسب اصطلاح عرب اس کا بانی حضرت سلیمان علیہ السلام کو کہتا ہے۔ عربوں کی عادت تھی کہ قبل تاریخ کے آثار قدیمہ کو حضرت سلیمان یا قوم عاد سے منسوب کیا کرتے تھے۔ علامہ قزوینی کی "آثار البلاد" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ حجاز و شام کے مابین واقع تھا۔ اس کی عمارت سرخ و سفید پتھروں کی تھی۔ اور اسی مناسبت سے اس کو "ابلق" یا "ابلق الفرد" کہتے تھے۔ اس قلعہ کا مالک اَسموئل بن عادیا تھا۔ جو جاہلیت کا ایک نامور شاعر ہے۔ اور ابو تمام طائی کے منتخب دیوان میں بھی اس کا کلام موجود ہے۔ کبوتران ابلق سے ہماری مراد اس قلعہ نشین ابلق (سموئل بن عادیا) کا کلام ہے جس میں کبوتر صبا رفتار کا نغمہ اور شاہین تیز بال کی شجاعت ایک ساتھ جمع ہیں اور جس کے متعلق ایک پرانا مقولہ مشہور ہے کہ "مرغانِ اولی اجنحہ کو اگر غیر اللہ کی تسبیح جائز ہوتی تو حمامۂ ابلق کی تسبیح کرتے۔" (عربی میں حمامہ کبوتر کو کہتے ہیں)

دنیائے علم و ادب میں سموئل آج تک صرف اپنے ایک ممتنع المثال قصیدے کے باعث نامور تھا کشف الظنون میں اگرچہ اس کے دیوان کا تذکرہ بھی ہے۔ مگر ایک دنیا تھی کہ اس کے دیوان کے لئے دیوانہ تھی اور اس کا کہیں نشان نہ ملتا تھا۔ کچھ زمانہ ہوا یہ گنج شائیگاں ایک عیسائی پادری (فادر لوئس شیخو) کے ہاتھ آگیا۔ جس نے بیروت کے رومن کیتھولک پریس سے اس کو شایع کیا ہے۔ اس پر تعلیق کی ہے اور اس پر ایک محققانہ مقالہ بھی لکھا ہے۔ بالفعل یہی دیوان ہمارے زیر نظر ہے اور ہم اس پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

سموئل بن عادیا کا سن وفات معلوم نہیں۔ لیکن اس قدر مسلم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیشتر اس کا زمانہ تھا اور چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر میں وہ زندہ تھا۔ اور مرنے کے بعد شریح بن سموئل بن عادیا اس کا جانشین ہوا تھا۔ جس کے فضائل پر اعشیٰ کی ایک نظم مشہور ہے۔

مسلمانو! وفائے عہد و امانت پروری میں عہد جاہلیت کے ایک عرب کا تو یہ حال تھا۔ تم تو اسلام کی یادگار رہو جس کا حکم ہی یہ ہے کہ لا ایمان لمن لا امانۃ لہ اور ان العہد کان مسئولا جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔ اور عہد ـــ ایک ذمہ داری ہے۔ صبح ازل میں تم سے بھی تو عہد لیا گیا تھا اور تمھیں بھی قرآن کی امانت تفویض ہوئی تھی۔ کہ اسے تمام دنیا میں پہنچانا اور سارے جہان کو قرآن کا پیغام سنانا۔ پھر کیا تم اس عہد پر قائم ہو اور اس امانت کے حق سے عہدہ برآ ہو رہے ہو؟

یہاں بہ سبیل استطراد اس تاریخی واقعہ کا اعادہ خالی از لطف نہ ہوگا کہ امرؤ القیس اپنے پشتینی دشمن نامدار حیرہ کی دست بُرد سے بچ نکل کر جب قیصر روم کے پاس استمداد کو گیا تھا۔ تو رستے میں سموئل ہی کے قلعے میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ ایک تو امرؤ القیس اور سموئل میں پہلے سے دوستانہ رسم و راہ تھی۔ دوسرے وہ اس کا مہمان ہو گیا۔ ..

ظاہر ہے کہ عربوں میں مہمان کا حق میزبان پر دنیا جہان کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کے حقوق سے بڑھا ہوتا ہے۔ عرب اپنی جان پر کھیل جائیگا اپنے بال بچوں کو قربان کر ڈالے گا۔ لیکن اس شخص کو جو اس کے خیمہ کی طناب چھو چکا ہے اور اس طور پر اس کے ظلِ حمایت میں آ چکا ہے خواہ وہ اس کے بیٹے کا قاتل ہی کیوں نہ ہو کبھی اس کے دشمن کے حوالے کرنا پسند نہ کرے گا۔ اسی لئے جب چلتے وقت امرؤ القیس نے اپنے وفا کیش میزبان کے پاس چند زرہیں امانت رکھدیں کہ واپسی پر اپنا مال لے لے گا تو سموئل پر فرض ہو گیا کہ اس امانت کی حفاظت میں اپنی جان و مال اور قوت و طاقت کو ایک ساتھ صرف کر دے۔ امرؤ القیس کڑیاں جھیلتا، دشت و کہسار کو قطع کرتا ہُوا قسطنطنیہ پہنچا، اور قیصر سے امداد کا طالب ہُوا۔ قیصر نے مدد کا وعدہ کیا۔ لیکن امرؤ القیس کی فاسقانہ رنگین مزاجی جس کے لئے وہ عرب بھر میں بدنام تھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شعرائے جاہلیت کی مذمت کرتے ہوئے اس کا ذکر "قائدہم الی النار" کے انداز ساتھ کرنا پڑا۔ رنگ لائے بغیر نہ رہی۔ قیصر کی مہ جمال بیٹی کے تھا اس نے ناجائز تعلقات پیدا کر لئے اور گو بیٹی کو تو اپنا بنا لیا ن باپ کو اپنی اس حرکت سے اپنی طرف سے برگشتہ کر لیا۔ قیصر سلطنت" دورانِ قیام قسطنطنیہ میں تو اس سے کچھ نہ کہا لیکن جب بد المراجعتہ کچھ دنوں کے لئے انقرہ (انگورہ) میں فروکش ہوا پیچھے پیچھے کچھ شاہی ایلچی اس کے لئے ایک قیصری سراپا لئے ہوئے ۔ اس خلعت فاخرہ کا تار تار زہر میں ڈوبا ہُوا تھا۔ امرؤ القیس ب اسے زیب جسم کیا تو تھوڑی ہی دیر میں اس کا مرغِ روح کدان عنصری سے پرواز کر گیا۔

امرؤ القیس دنیا سے سدھار چکا تھا۔ لیکن اس کی یاد اس کے ر دوست سموئل کے دل میں بدستور جاگزیں تھی۔ اور زرہیں ن اسے اب بھی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ فرمانروائے حیرہ ث بن ظالم کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج سموئل کے بھی کہ امرؤ القیس کی پانچوں زرہیں اس سے چھین لیں۔ ابن بلق کا محاصرہ کر لیا۔ اور قلعہ دار کو اپنے آقا کا پیغام بھیج ل نے جواب دیا کہ میں وہ نہیں ہوں جو امانت میں خیانت اصرہ نے طول کھینچا۔ اور سموئل نے اس شدت و قوت حفاظت کی کہ محاصرین کے چھکے چھڑا دیئے۔ لیکن اس دوران میں محصورین نے سموئل کے بیٹے کو جو شکار کے لئے باہر گیا ہُوا تھا موقع پاکر گرفتار کر لیا۔ لڑکے کو قلعہ کی دیوار کے نیچے کھڑا کر کے حارث نے سموئل سے پوچھا کہ جانتے ہو یہ کون ہے؟ اس نے کہا ہاں یہ میرا بیٹا ہے۔ اس پر حارث نے کہا کہ اگر اس کی جان کی خیر چاہتے ہو تو اب بھی زرہیں میرے حوالے کر دو۔ ورنہ ابھی کھڑے کھڑے اس کی گردن اُڑا دوں گا۔ سموئل نے جو جواب دیا وہ رہتی دنیا تک وفا پرستی کے حلقوں میں یاد رہے گا۔ کہتا ہے کہ "جو جی میں آئے کر گزر، اس کا سر کاٹ ڈال۔ اس کے تکّے بوٹیاں اُڑا دے لیکن مجھ سے یہ نہ ہو گا کہ اپنا عہد توڑ دوں اور جو مال میرے مہمان نے تیرے پاس امانت رکھا تھا۔ وہ تجھے دے ڈالوں۔" حارث نے یہ سُن کر تلوار اٹھائی اور ایک ہی تُلے ہوئے ہات میں لڑکے کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ پھر محاصرہ کے اُٹھانے کا حکم دیا اور بے نیلِ مرام حیرہ کی راہ لی۔ اس پر سموئل نے کہا۔ (ترجمہ) "میں نے امرؤ القیس کے بارے میں وفا کی۔ میں تو وہ ہوں کہ ایسی حالت میں جب کہ قومیں مذموم الفعل ثابت ہو رہی ہیں میں وفائے امانت پر ثابت قدم رہا۔ لوگوں نے کہا۔ یہ زرہیں ایسا خزانہ ہیں کہ خواہ مخواہ اُدھر رغبت ہوتی ہے۔ کچھ بھی ہو خدا کی قسم ایں تو جب تک زندہ ہوں غدار نہ بنونگا۔"

فادر لوئس شیخو نے سموئل بن عادیا کو مذہبًا عیسائی ثابت کرنا چاہا ہے۔ اور ابو عبداللہ نفطویہ ابراہیم بن محمد التوفی ۳۲۳ھ ۹۳۵ء کی روایت سے اس کا ایک شعر نقل کیا ہے جو یہ ہے ؎

وسلیمان والحواریی یحیی

ومتی یوسف کانی ولیت

اس شعر میں جن لوگوں کے نام آئے ہیں وہ ان سب کو مسیح علیہ السلام کے حواری قرار دے کر سموئل کو مسیحی المذہب ثابت کرنے کے درپے ہیں لیکن یہ صرف تاویل ہی تاویل ہے۔ البتہ ایک نیا قصیدہ سموئل کی جانب سے تصنیف کیا گیا ہے۔ جس کے انکشاف کا فخر یورپ کے نامور مستشرق ہرشفیلڈ کو حاصل ہے۔ قصیدہ عربی میں ہے لیکن لکھا ہوا عبرانی حروف میں تھا۔ جسے یورپ نے بجنسہٖ شایع کر دیا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں انگلستان کے پروفیسر مارگولیتھ نے دی ایشیاٹک انگلش ریویو میں اس کو عربی حروف میں شایع کیا۔ لوئس شیخو نے اس کے علاوہ موصل و شام کے دو یادریوں سے اس کے دو نسخے اور بھی حاصل کئے جن کی تاریخ کتابت سنہ ۱۹۲۱ء ہے اس قصیدے کا مقطع جس سے

...مُوں کی مسیحیت پر استدلال کیا جاتا ہے حسب ذیل ہے ؎

وفی آخر الایام جاء مسیحنا
فاھدی نبی الدنیا سلام الکامل

یعنی آخری زمانہ میں ہمارا مسیح آیا۔ (علیہ الصلوٰۃ و السلام) جس نے دنیا والوں کے روبرو کامل و مکمل سلامتی کا تحفہ و ہدیہ پیش کیا — لیکن لطف یہ ہے کہ یہ شعر شفیلڈ کے نسخے میں نہیں مارگولتھ کے نسخے میں نہیں۔ قادر کرملی کے نسخے میں نہیں فقط ایک داؤد اور سیلو لو موملی کے نسخے میں ہے جو ۱۹۱۶ء کی تحریر ہے —— اور اسی پر لوئس شیخو کا استناد ہے —— !

حسین مہمان سے

ابھی موتی پسینے کے جبیں پر نور افشاں ہیں
کانِ راہ کے آثار چہرے سے نمایاں ہیں
نہرے بال اپنے باندھ لے رخ پر پریشاں ہیں
حسیں مہمان اتنی جلد رخصت کی طلب کیوں ہے؟

ھر آ تیری پلکیں صاف کر دوں اپنے بوسوں سے
ی آنکھوں میں میٹھی نیند بھر دوں اپنے بوسوں سے
ابِ خستہ کو حسنِ دگر دوں اپنے بوسوں سے
حسیں مہمان اتنی جلد رخصت کی طلب کیوں ہے؟

فرا میرے گھر کو آج کی منزل سمجھ لے تو
نبِ سفر کے روز کا حاصل سمجھ لے تو
آغوشِ وا کو حسن کی محمل سمجھ لے تو
حسیں مہمان اتنی جلد رخصت کی طلب کیوں ہے؟

ابھی شب کی سیہ مستی سے اکتانے نہ تو پائے
کہ سورج کے نکلتے مجھ کو مرگِ ناگہاں آئے
جوانی کی شبوں میں تجھ کو یہ شب یاد رہ جائے
حسیں مہمان اتنی جلد رخصت کی طلب کیوں ہے؟

نظم

از حضرت یوسف جمال انصاری ایم-اے علیگ

تری منزل مسرت ہے، مری منزل محبت ہے
بہم کٹ جائے جتنی راہ دونوں کی غنیمت ہے
کم از کم آج کی شب ایک ہی اپنی مسافت ہے
حسیں مہمان اتنی جلد رخصت کی طلب کیوں ہے؟

ترے قدموں میں پہلو چیر کر میں اپنا دل رکھ دوں
نہ میرا نام تو پوچھے نہ میں تیرا پتہ پوچھوں
یہ بھیگی رات ہو اور بیخودی ہو تو ہو اور میں ہوں
حسیں مہمان اتنی جلد رخصت کی طلب کیوں ہے؟

مسلسل رات بھر اک داستانِ شوق جاری ہو
پیالے اشکباری بیقراری شب گزاری ہو
یہ شب کچھ ایسی شب ہو اور پھر یہ شب ہماری ہو
حسیں مہمان اتنی جلد رخصت کی طلب کیوں ہے؟

کریمیا کا خان

میکسم گورکی کی ایک رومانی کہانی

از جناب ضبط ایم-اے

کئی سال ہوئے کریمیا میں ایک خان رہتا تھا اس کا نام تھا "اشراب"۔ اس کے ایک بیٹا تھا جس کا نام "اتولائمک الگالا" تھا" ایک اندھے تاتاری بھک منگے نے ان لفظوں سے اپنی کہانی شروع کی۔ جزیرہ نمائے کریمیا میں ایسے بہت سے قصے مروج ہیں۔ جن کے دامن میں ماضی کی بےشمار یادگاریں چھپی ہوئی ہیں۔

وہ اندھا بھکاری بھورے رنگ کے ایک درخت کے چٹکتے ہوئے تنے کے سہارے بیٹھا تھا۔ اس کے چاروں طرف اور کئی تاتاری بیٹھے ہوئے تھے جو کائی رنگ کی چمکتی ہوئی صدریاں پہنے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر زرکار ٹوپیاں زیب دے رہی تھیں۔ وہ جہاں بیٹھے تھے وہ ایک ناہموار مقام تھا۔ جو کسی خان کے محل کا کھنڈر معلوم ہوتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ آفتاب تیزی کے ساتھ افق مغرب کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ اس کی سرخ سرخ کرنیں کھنڈر کے آس پاس اُگے ہوئے درختوں سے چھن چھن کر زمین اور کائی سے ڈھکے ہوئے پتھروں پر پڑ رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے درختوں کی شاخوں اور پتیوں میں جھنجھناہٹ پیدا کر رہے تھے۔ جیسے فضا سے آبشاریں گر رہی ہوں۔

کبیر السن اندھے بھکاری کی آواز دھیمی دھیمی اور لرزہ آمیز تھی۔ اس کے چہرے سے سختی کا اظہار ہو رہا تھا لیکن اس کے چہرے کی جھریاں سکون و اطمینان کے سوا کسی اور طرح کے جذبے کو ظاہر کر رہی تھیں اس کے کہانی کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے کہانی کا ایک ایک لفظ ازبر ہے۔ وہ اپنے سامعین کے سامنے ماضی کو حال کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اندھے بھکاری نے کہنا شروع کیا۔ "خان بوڑھا ضرور تھا لیکن اس کے حرم میں کئی دوشیزائیں تھیں۔ جو ایک بوڑھے سے محبت کرتی تھیں وجہ یہ تھی کہ بڑھاپے کے باوجود اس میں اب بھی کافی جوش و ولولہ موجود تھا اس کے بوسے گرم جوش اور نشاط آفریں ہوتے تھے۔ عورتوں کی خاصیت ہے کہ وہ اس مرد سے محبت کرتی ہیں جس میں جوش و خروش ہو۔ خواہ اس کے بال سفید ہی کیوں نہ ہوں اور اس کے چہرے پر جھریاں ہی کیوں نہ پڑ گئی ہوں۔ عورتوں کی کشش کے لئے مردانگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ نرم و نازک کھال اور سرخ و سپید چہرے کی نہیں۔

ہاں تو خان کی سب بیویاں اس سے محبت کرتی تھیں لیکن ایک قازق دوشیزہ کی طرف جو لونڈی بنا کر لائی گئی تھی خان کا خاص رجحان تھا حرم کی دوسری عورتوں کی بہ نسبت جن کی تعداد تین سو سے بھی زیادہ تھی، اور جو مختلف ممالک کی تھیں خان اس قازق دوشیزہ کو زیادہ چاہتا تھا موسم بہار کے پھولوں کی طرح وہ تھی بھی نہایت حسین و دلفریب۔ بہرحال خان کے حرم کی تمام عورتیں نہایت عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی تھیں خان نے ان کے کھانے پینے اور کھیل کود نیز رقص و سرود سے لطف اندوز ہونے کا کافی سامان مہیا کر دیا تھا۔

خان قازق دوشیزہ کو اپنے محل کے سب سے اونچے بالاخانے پر بلایا کرتا تھا۔ جس سے لہراتا ہوا سمندر صاف دکھائی دیتا تھا۔ محل کا یہ بالاخانہ ان تمام چیزوں سے آراستہ تھا جو ایک عورت کے عیش و عشرت اور راحت و آسائش کے لئے ضروری ہو سکتی ہیں۔ نفیس و خوشنما پوشاکیں سونے کے جڑاؤ زیورات۔ لذیذ و خوش ذائقہ کھانے۔ ملک ملک کی شیریں نوا اور نغمہ طراز چڑیاں، اور سب سے بڑھ کر خان کا نشاط آمیز اور سرور انگیز بوس و کنار۔ وہ تمام دن اپنی محبوبہ کے ساتھ رومانی بات چیت کرنے میں گزار دیتا تھا۔

خان کی ابتدائی زندگی روس کے سرحدی علاقوں میں چیتے کی طرح حملہ کرنے، ڈاکہ ڈالنے، عورتوں کو بھگا لانے اور بستیوں کو تباہ و برباد کرنے میں گزری تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا اس کے رعب و اقتدار میں کمی نہ ہونے دے گا بلکہ اس میں مزید اضافہ کرے گا۔ اس لئے اب اس نے آرام و اطمینان کی زندگی اختیار کر لی تھی۔

ایک مرتبہ خان کا بیٹا روس پر حملہ کر کے واپس آیا تھا۔ خان نے اس کے اعزاز میں ایک جشن مسرت منعقد کیا۔ جس میں جزیرہ نما کے بڑے بڑے امراء و وزراء مدعو کئے گئے۔ کھیل کود اور ناچ گانے کا معقول انتظام تھا۔ اپنے بازوؤں کی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے بڑے بڑے

تیرانداز سرداروں نے قیدیوں کی آنکھوں کو نشانہ بنایا۔

بوڑھا خان بیٹے کی کامیابی اور فتح مندی پر پھولا نہ سماتا تھا۔ اور بوڑھے کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور ہو بھی کیا سکتی تھی؟ کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا شجاع اور بہادر بیٹا اس کا جانشین ہوگا۔ اپنی محبت کا مظاہرہ کرنے کے لئے امیروں اور سرداروں کی موجودگی میں شراب کا پیالہ اُنڈیلتے ہوئے خان نے بیٹے سے کہا۔ "میرے پیارے بیٹے! اللہ سب سے بڑھ کر قوی اور توانا ہے۔ خدا اپنے پیغمبرؐ پر اپنی رحمت نازل فرمائے ....." پیغمبر کا نام سنتے ہی سب نے کھڑے ہو کر بلند آواز سے خان کے الفاظ کو دُہرایا۔ بعد ازاں خان نے کہا۔

"مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا میری زندگی ہی میں میری شجاعت وجوانمردی میرے بیٹے کو عطا کر دی گئی ہے۔ اگرچہ میری بصارت کمزور ہو چکی ہے۔ پھر بھی میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ جب سورج کی روشنی میری نظروں سے اوجھل ہو جائے گی اور کیڑے میرے بدن کو چھلنی بنا ڈالیں گے۔ اُس وقت بھی میں اپنے بیٹے کے اندر موجود رہوں گا۔ اللہ سب سے برتر و قوی ہے اور محمدؐ اس کے سچے پیغمبر ہیں۔ اللہ نے مجھے ایک بہادر بیٹا عطا فرمایا ہے۔ اس کے بازو فولاد کے سے قوی، دل شیر کا سا جری اور اس کی پیشانی پانی کی طرح مجلا ہے۔ انگالا! تم اپنے باپ سے کس چیز کے خواستگار ہو؟ تم جو مانگو میں تمھیں دینے کے لئے تیار ہوں۔"

خان نے ابھی اپنی تقریر ختم نہ کی تھی کہ انگالا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی کالی کالی آنکھوں میں بلی کی طرح پتلیاں چمک رہی تھیں۔

"میرے بادشاہ، اور میرے باپ! روس سے جو دوشیزہ لونڈی پکڑ لائی گئی ہے، وہ مجھے بخش دو۔" انگالا نے کہا۔

یہ سنتے ہی خان پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اور کوشش کے باوجود دیر تک اس کی زبان سے ایک بھی لفظ نہ نکل سکا۔ جب اسے ذرا سکون ہوا تو اس نے بلند اور پر استقلال آواز میں کہا۔ "جاؤ، لو! دعوت کے بعد سے وہ تمھاری ہو چکی۔"

فرطِ مسرت سے انگالا کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھیں چمکیں۔ وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے باپ سے بولا۔ "میرے بادشاہ اور محترم باپ! تم جو چیز مجھے دے رہے ہو۔ تمھارے نزدیک اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اور تم اسے کس قدر محبوب رکھتے ہو۔ مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ میں تمھارا غلام ہوں، تمھارا بیٹا ہوں۔ میرا خون تمھارے لئے وقف ہے۔ تم جب چاہو اسے قطرہ قطرہ نچوڑ لو۔ میں تمھارے لئے ایک بار نہیں بار بار مرنے کو تیار ہوں۔"

خان نے کہا۔ "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" یہ کہتے ہوئے خان کا سفید سر جو فتحمندی اور بہادری کے باعث ہمیشہ بلند رہتا تھا۔ یکایک جھک گیا۔

دعوت ختم ہو گئی، اور وہ دونوں محل سے نکل کر حرم کی طرف چلے۔ لیکن دونوں خاموش تھے۔ آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ چاند کی صورت نظر آتی تھی۔ نہ تارے کی جھلک دیتی تھی۔ ایک کالے پردے نے سب کو ڈھانپ رکھا تھا۔

کچھ دُور تک خاموش چلنے کے بعد بالآخر خان بولا۔ "میری روح رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ میرے قلب کی حرکت میں بھی ضعف آتا جا رہا ہے۔ اس نازک لونڈی کی محبت ہی میری زندگی کی ضامن و کفیل تھی۔ کیا تمھیں سچ مچ اس کی ضرورت ہے؟ میرے حرم میں دوسری ہزاروں عورتیں موجود ہیں۔ تم چاہو تو ایک لونڈی کے سوا باقی تمام عورتوں کو لے سکتے ہو۔ بتاؤ کیا تمھیں یہ بات منظور ہے؟" انگالا نے ایک لمبی سانس لی اور زبان سے کچھ نہ کہا۔

بوڑھے نے پھر کہا۔ "اب میری زندگی ہی کتنی باقی ہے۔ میں تو اس دوشیزہ کے سہارے جی رہا ہوں۔ وہ بھی اس بات کو اچھی طرح جانتی ہے۔ جبھی تو مجھ سے اس قدر محبت کرتی ہے۔ میرے جیسے بوڑھے کے لئے اگر اس کی محبت کا سہارا بھی باقی نہ رہا تو میں اور کس سہارے پر زندہ رہ سکتا ہوں؟"

انگالا بھی اسی طرح خاموش تھا۔ بوڑھا کہتا گیا۔ "یہ دیکھ کر کہ تم اس کے بازوؤں میں بندھے ہوئے ہو۔ اور وہ تمھارا بوسہ لے رہی ہے میں کس طرح زندہ رہ سکتا ہوں؟ تو لاٹک! ایک عورت کے معاملہ میں باپ بیٹے کا رشتہ باقی نہیں رہ جاتا۔ وہاں ہم دونوں کی حیثیت ایک مرد کی سی باقی رہ جاتی ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ میں یہ رات دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہتا"

انگالا نے اب بھی کوئی بات نہ کی۔ دونوں حرم کے دروازے پر پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ وہ نہ جانے کب تک وہاں کھڑے رہے۔ ان کے چاروں طرف گہری تاریکی مسلط تھی۔ بادل ایک طرف سے دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے ہلتے ہوئے درخت ایک قسم کی موسیقی پیدا کر رہے تھے۔

انگالا دھیمی آواز میں بولا۔ "والد صاحب! میں نہ جانے کب سے اس پر فریفتہ ہوں۔"

خان نے کہا۔ "یہ بات مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو اس سے محبت کرتا ہے لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ تجھ سے محبت نہیں کرتی۔"

"اس کا خیال آتے ہی میرا دل تڑپ اٹھتا ہے۔"

"تو کیا اب وہی میرے دل کی حالت نہیں ہے؟"

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ انگالا نے ایک سرد آہ بھری۔

کچھ ٹھہر کر خان کے بیٹے نے کہا۔ "ملا کا کہنا صحیح نکلا۔ عورت مرد کے لئے ضرر رساں ثابت ہوتی ہے۔ اگر وہ حسین اور قبول صورت ہے تو دوسروں کو اپنی جانب مائل کئے بغیر نہیں رہتی۔ ایسی حالت میں فطری طور پر لوگوں کے دلوں میں اس کے حصول کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور سب اس کے شوہر سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور اگر کسی کی بیوی بدصورت ہوئی تو پھر وہ خود ان لوگوں سے حسد کرنے لگتا ہے۔ جن کی بیویاں حسین و خوشجمال ہوتی ہیں۔ اور اگر ان دونوں کے برعکس اوسط درجے کے رنگ روپ والی ہوئی تو ابتدا میں مرد اسے حسین سمجھ کر اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کی غلط فہمی دور ہو جاتی ہے تو پچھتاتا اور افسوس کرتا ہے۔ غرض عورت کا وجود ہر حالت میں مرد کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔"

خان بولا ——"لیکن یہ حکیمانہ باتیں دل کی بےچینی کو تو دور نہیں کر سکتیں۔"

"والد صاحب! واقعہ یہ ہے کہ ہم دونوں کی حالت قابل رحم ہے۔"

خان نے سر اوپر اٹھا کر ایک بار غم آلود نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

بیٹا بولا۔ "کیوں نہ ہم اس عورت ہی کا خاتمہ کر دیں۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر خان نے کہا۔ "اتنی خود غرضی! اپنی خواہش کے سامنے میرا اور اس کا بالکل لحاظ نہ کرنا۔"

"ہاں! لیکن آپ بھی تو........"

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔

خان نے ٹھہر کر کہا۔ "ہاں، میں بھی........"

شدت غم سے خان کی حالت ایک بچے کی سی ہو گئی۔

"تو پھر اس کا کام تمام کر دیا جائے۔"

"نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کہ میں تمھیں اس کے حوالے کر دوں۔"

"اب میرا صدمہ بھی تو ناقابل برداشت صورت اختیار کر چکا ہے۔ ایسی حالت میں دو ہی باتیں ممکن ہیں۔ یا تو آپ میرے سینے میں چھرا بھونک دیجئے۔ یا اس عورت کو میرے حوالے کر دیجئے۔"

خان چپ تھا۔

"کیا ہم چٹان کے اوپر سے اسے گہرے پانی میں نہ پھینک دیں؟"

خان نے بھی بیٹے کے الفاظ دہرائے۔ مگر اس کی آواز اتنی مدھم تھی، جیسے بیٹے کی آواز کی صدائے بازگشت ہو۔

اس کے بعد دونوں حرم میں داخل ہوئے۔ فانق دوشیزہ دری پر پڑی سو رہی تھی۔ وہ اس کے پاس پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ اور ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگے۔ بوڑھے خان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اور اس کے بیٹے کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ وہ فرط غضب سے دانت پیس رہا تھا۔ بوڑھے نے جیسے ہی فانق دوشیزہ کو چھوا وہ جاگ اٹھی۔ اس کا چہرہ شفق کی طرح دلفریب اور لالہ گوں تھا۔ نرگس صبح کی طرح اس کی آنکھیں حیا آلود تھیں اس لئے وہ انگالا کو دیکھ نہ سکی، اور اس نے بوسے کے لئے بوڑھے کی طرف اپنے گلگوں ہونٹ بڑھا دیئے۔ خان نے آہستہ سے کہا۔ "اٹھو، اور ہمارے ساتھ چلو۔"

اب اس نے انگالا کو دیکھا۔ اور خان کی اشک آلود آنکھوں کو بھی۔ اسے صورت حال کو سمجھتے دیر نہ لگی۔ اس نے کہا۔ "میں بالکل تیار ہوں۔ شاید تم نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کسی کی ہو کر نہ رہوں۔ سنگدل مرد اس کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

وہ سمندر کی پگڈنڈی پہ ہو لئے۔ تینوں خاموش تھے۔ وہ خارزار تنگ پگڈنڈی پر سے گزر رہے تھے۔ ہوا سن سن کرتی ہوئی چل رہی تھی۔

نازک اندام فانق دوشیزہ تھک گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ لیکن اس نے اپنی تھکن کا اظہار نہ ہونے دیا۔

خان کا بیٹا اس کی سست روی کو دیکھ کر بولا۔ "کیا تم چلتے ہوئے ڈر رہی ہو؟"

دوشیزہ نے اپنی غضب آلود آنکھوں سے پیروں کی جانب اشارہ کیا جن سے لہو جاری تھا۔

انگالا نے اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آؤ! میں تمھیں گود میں اٹھا لوں۔"

لیکن دوشیزہ نے اس کی ہمدردی کو قبول نہ کیا۔ اس نے اپنی بانہیں بوڑھے خان کے گلے میں ڈال دیں۔ خان نے اسے ایک بچے کی طرح گود میں اٹھا لیا۔ خان کی آنکھوں کو رستے کے جھاڑ جھنکاڑ سے بچانے کے لئے دوشیزہ اپنے نازک ہاتھوں سے ان کو ہٹاتی جا رہی تھی۔ اس طرح وہ دور نکل گئے۔ تو انھیں ایک طرف پانی کے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ تو لالک ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس نے باپ سے کہا۔ "مجھے آگے نکل جانے دو۔ ایسا نہ ہو کہ میں تمھاری گردن پر کٹار چلا دوں۔"

"اچھا چلے چلو۔ خدا تمھاری آرزو کو پورا کرے گا۔ یا تمھیں تو کر دے گا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ میں بحیثیت باپ کے تمھیں معاف کرتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ محبت انسان کو کہاں تک پاگل اور اندھ

دیتا ہے"۔

وہ سمندر کے کنارے جا پہنچے - ان کے قدموں کے نیچے گہرا غار تھا،
ں کی چٹان سے سمندر کی لہریں ٹکرا رہی تھیں - نیچے تاریکی ہی تاریکی
ں- دوشیزہ کا بوسہ لیتے ہوئے خان نے اسے الوداع کہا - انگالا نے
الوداع کہتے ہوئے سر جھکایا - دوشیزہ نے غار کے نیچے نظر ڈالی جس
لہریں ٹکرا رہی تھیں - اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا - وہ دونوں
ھوں سے سینے کو دبا کر دل کی دھڑکن کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگی -

دوشیزہ نے کہا - "میں تیار ہوں - مجھے سمندر میں پھینک دو"۔

انگالا نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے ہاتھ اس کی جانب بڑھا دئے،
ن خان نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا - اور اسے اپنے سینے سے لگا کر
ں کا بوسہ لیا - پھر اسے اپنے سر تک اونچا اٹھا کر چٹان کے نیچے
ینک دیا -

نیچے لہریں سر ٹپک ٹپک کر اس طرح اپنے غیظ و غضب کا اظہار
رہی تھیں - ان کی چیخ میں دوشیزہ کے گرنے کی آواز گم ہو گئی - اس کی
ی چیخ پکار سنائی نہ دی - خان اسی چٹان پر بیٹھ گیا - اسے حد نظر
پانی اور اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا - لہریں اس طرح
شور مچا رہی تھیں اور ہوا کے جھونکے اس کی داڑھی کو حرکت دیتے ہوئے
ایک طرف سے دوسری طرف کو نکلتے چلے جا رہے تھے - اس کے پاس ہی
تولانگ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے سنگین بت کی طرح کھڑا
تھا - اس حالت میں دونوں کو کافی دیر گزر گئی - ہوا گہرے کالے بادلوں
کو اڑائے چلی جا رہی تھی - خان اپنے خیالات میں غرق اسی طرح سمندر
کے کنارے چٹان پر بیٹھا ہوا تھا -

تولانگ بولا "والد صاحب! ہمیں اب واپس چلنا چاہیے"۔

خان نے شاید بیٹے کی آواز سن لی - اس کے منہ سے نکلا "ٹھہرو"

کسی طرح پھر وقت گزرنے لگا - چٹان کے نیچے لہریں اسی طرح
شور و غل مچا رہی تھیں - اوپر ہوا چٹانوں سے ٹکراتی اور درختوں کو
جھنجوڑتی اپنا راستہ طے کر رہی تھی -

انگالا نے پھر کہا "والد صاحب چلیئے"۔

لیکن خان اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں - وہ اسی طرح اس جگہ بیٹھا
رہا - جہاں سے اس نے اپنی محبوبہ کو ہمیشہ کے لئے رخصت کیا تھا
لیکن تھوڑی ہی بعد یہ سوچ کر کہ آخر ایک روز سبھی کا خاتمہ ہونے
والا ہے - وہ اٹھ کھڑا ہوا - اس میں ایک نئی چستی اور تیزی آ گئی - اس

نے اطمینان آمیز لہجہ میں کہا۔ "چلو"

دونوں چل پڑے۔ لیکن خان تھوڑی ہی دُور چل کر رک گیا اور بیٹے سے بولا۔ "میں کہاں جا رہا ہوں۔ مجھے اب جانا ہی کہاں ہے۔ اب میرا زندہ رہنا عبث ہے۔ میری زندگی کی صلاحیت تو اس کے ساتھ چلی گئی۔ بڑھاپے میں مجھ سے محبت کون کرے گا؟ اور جب کوئی محبت کرنے والا ہی نہیں رہا تو ایسی زندگی سے فائدہ ہی کیا؟"

"والد صاحب! آپ دولتمند آدمی ہیں۔"

"مال و دولت کو اس کے ایک بوسے پر تمہارے لئے قربان کر سکتا ہوں مال و دولت تو فانی چیزیں ہیں۔ باقی تو صرف عورت کی محبت ہے۔ جہاں عورت کی محبت نہیں زندگی نہیں۔ محبت سے محروم انسان کی حیثیت ایک بھکاری سے زیادہ نہیں۔ اچھا بیٹیا رخصت، خدا ہر حال میں تمہارا حافظ و ناصر رہے۔" یہ کہہ کر خان اُلٹے پاؤں واپس چل دیا۔

تولانگ نے پکارا۔ "والد صاحب! والد صاحب!!"

اس سے زیادہ اس کے مُنہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ خان تو راضی خوشی مَوت سے ہم آغوش ہونے جا رہا تھا۔ ایسے شخص سے کوئی کہہ بھی کیا سکتا ہے؟ اور اسے کون ایسی ترغیب دے سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے محبت کرنے کو تیار ہو جائے۔

"مجھے جانے دو۔"

"اللہ . . . . ."

"وہ ہر جگہ موجود ہے۔"

خان تیز تیز قدم اٹھاتا سمندر کی طرف بڑھتا گیا۔ اور چٹان پر پہنچ کر پانی میں کود پڑا۔ بیٹا اسے روک نہ سکا۔ اسے اتنا موقع ہی نہ ملا۔ سمندر سے اس مرتبہ بھی کوئی آواز نہ آئی۔ صرف نیچے سے لہروں کے ٹکرانے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور اوپر ہوا شور و غل مچا رہی تھی۔

تولانگ دیر تک چٹان پر کھڑا نیچے کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اس کے مُنہ سے نکلا۔

"خدا مجھے بھی ایسا ہی جری دل عطا فرما۔"

وہ رات کی تاریکی میں واپس آ گیا۔ اور اس طرح خان اشتر کے بعد اس کا بیٹا تولانگ انگالاکریمیا کا فرمانروا ہوا۔

میں ہوں

کسی کی جستجو ہے اور میں ہوں

حضرت عاصم جے پوری

فریبِ آرزو ہے اور میں ہوں — وہ گویا روبرو ہے اور میں ہوں
کلی دل کی کھلی وہ مسکرائے — بہارِ رنگ و بو ہے اور میں ہوں
ہر اک شے پر محبت چھا رہی ہے — کسی کی جستجو ہے اور میں ہوں
نگاہ منتظر گھبرا رہی ہے — خیالِ چار سو ہے اور میں ہوں
کہیں رسوا نہ ہو رازِ محبت — نگاہِ شوق تو ہے اور میں ہوں
محبت کی چمن بندی تو دیکھو — مرے دل کا لہو ہے اور میں ہوں
زیادہ ہو گیا احساسِ ہستی — تمہاری آرزو ہے اور میں ہوں
قدم پڑنے لگے منزل سے آگے — جنونِ جستجو ہے اور میں ہوں

مرے پہلو میں عاصم دل نہیں ہے
کوئی آئینہ رو ہے اور میں ہوں

لطیف دھوکا

دل کیا بجھا کہ لطفِ تماشا نہیں رہا

از:- حضرت علی اختر حیدر آباد دکن

تھا وہ جو اک لطیف سا دھوکا نہیں رہا
لے اب یقینِ وعدۂ فردا نہیں رہا

گزری وہ لذتِ غمِ پنہاں کی فصل بھی
دل اب خلش پذیرِ تمنّا نہیں رہا

صبحِ بہارِ عطر فشاں اب ہوئی تو کیا
وہ اہتمامِ شوق وہ سودا نہیں رہا

لازم نہیں کہ رخ پہ ہو حسرتوں کا رنگ
دل وقفِ آرزوئے شکیبا نہیں رہا

دل میں کھٹک رہا تھا جو کانٹا نکل گیا
ساغر میں حسنِ لرزشِ صہبا نہیں رہا

اب اُن کو دیکھ کر بھی نہیں جھومتی نگاہ
دل کیا بجھا کہ لطفِ تماشا نہیں رہا

اختر غمِ حیات نے اُلٹی بساطِ عیش
وہ اہتمامِ ساغر و مینا نہیں رہا

جدید عربی ادب کا ایک رُوسی انتخاب

از:— جناب کارشش

لینن گراڈ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ نے مشرقی زبانوں اور ادب پر بعض نہایت عالمانہ کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ اب ماسکو اکیڈمی آف سائنس کا جزو ہے۔ رُوسی ادیب قدیم ادب کے مقابلے میں نئے ادب کی طرف زیادہ مائل ہیں اور لینن گراڈ انسٹی ٹیوٹ کی تمام مطبوعات میں شاید سب سے دلچسپ کتاب "۱۸۸۰ء سے ۱۹۲۵ء تک کے عربی ادب کے تازہ ترین نمونے" مؤلفہ (K. V. ode - Vasiliev) ہے۔

محمد عبدہٗ:— اس مجموعہ میں پہلی چیز محمد عبدہٗ (۱۹۰۵-۱۸۴۹) کا لکھا ہوا تبصرہ ہے جو اپنے زمانے میں جدید اسلامی تحریک کے بانیوں میں سے تھا اور مرتے وقت مصر کا مفتیٔ اعظم تھا۔ یہ جمال الدین افغانی (۱۸۹۷-۱۸۳۹) کا شاگرد اور رفیق کار تھا۔ جو انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اسلام کا سب سے بڑا سماجی اور سیاسی کارکنوں میں سمجھا جاتا تھا۔ محمد عبدہٗ نے عربی پاشا کی قومی تحریک میں حصہ لیا جو مصر کی آزادی کے لئے جاری کی گئی تھی۔ مصر پر برطانویوں کا قبضہ ہونے کی وجہ سے اُسے کئی سال کے لئے وطن چھوڑنا پڑا۔ ۱۸۸۴ء میں محمد عبدہٗ بیروت میں عارضی طور پر مقیم تھا۔ اس تبصرے میں اپنے اس قیام کا ذکر کرتا ہے اور شام کے حالات اپنے خاص انداز میں پیش کرتا ہے۔ جس زمانے سے یہ کتاب متعلق ہے اس زمانے کے حالات پر اس تبصرے سے بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ دُنیائے عرب میں اس کے اسلوب بیان کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ اور وہ اس کا مستحق بھی ہے اگرچہ عام طور پر اس کی قدر و منزلت کا اندازہ اس کی اس زمانے کی تصنیفات کی بنا پر ہوتا ہے جب اسلام کا مذہبی پہلو اس کی تمامتر دلچسپیوں کا مرکز تھا۔ اس ضمن میں اس نے جو کام کیا ہے یورپ کی تازہ تصانیف نے اُسے دنیا سے بخوبی روشناس کر دیا ہے۔ حال ہی میں تاشقند میں اس کا سسلی کا سفرنامہ شائع ہوا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور مزاحیہ بھی۔

الکواکبی:— اگر محمد عبدہٗ کو اس کے سیاسی و سماجی خیالات اور اس کے اخیر زمانے کی سرگرمیوں کی بنا پر ارتقا پسند سمجھا جائے تو اس کے ہمعصر الکواکبی (۱۹۰۲-۱۸۴۹) کو جسے دُنیا کم جانتی اور کم سمجھتی ہے، انقلاب پسند ماننا پڑے گا۔ یہ حلب کا رہنے والا اور ایک اخبار نویس تھا۔ عبدالحمید کے عہد حکومت میں اسے اپنی صحافتی سرگرمیوں کی بدولت سزا ہو گئی اور اسے ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کی بقیہ زندگی دنیائے اسلام کے دور دراز مقامات کی سیر و سیاحت میں گزری۔ حتّےٰ کہ یہ ہندوستان اور وسط افریقہ تک پہنچا۔ یہ قاہرہ میں گمنامی کی موت مرا۔ لیکن اس کی وفات کے بعد اس کی دو اہم تصانیف "استبداد کی حقیقت" اور "امتہ البلاد" (مکّہ) کی قدر ہونی شروع ہوئی۔ پہلی کتاب سیاسی علم قانون کے متعلق ہے اور بتاتی ہے کہ یہ کن کن صورتوں میں اسلامی ممالک میں رائج ہے اور دوسری ایک چھوٹی قسم کی مثالی کتاب ہے جس میں دُنیائے اسلام کی مکہ میں ایک خیالی کانفرنس کا ذکر ہے (یہ کتاب اس خوش اسلوبی سے لکھی گئی کہ بہت سے محققین اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ ۱۸۹۸ء میں واقعی مکّے میں کوئی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی) ان دونوں کتابوں میں مصنّف نے نہ صرف اہل عرب بلکہ دیگر اسلامی ممالک کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتابیں ٹھوس اور وسیع معلومات سے بھری ہوئی ہیں۔ اور ان میں ایک نہایت دوررس بصیرت کارفرما ہے۔ یہ کتابیں انیسویں صدی کے اواخر میں اسلامی دُنیا کے بہترین نمائندوں کی امنگوں کو سمجھنے کا اچّھا خاصہ ذریعہ ہیں۔ اس انتخاب میں "استبداد اور سائنس" کے عنوان سے جو اقتباس شامل ہے وہ دراصل الکواکبی کی کتاب "استبداد کی حقیقت" کا ایک باب ہے۔

ادیب اسحاق (۱۸۸۵-۱۸۵۶) دمشق میں پیدا ہوا

زندگی کی تیس بہاریں بھی نہ دیکھیں، نہ صرف اپنی فطرت سے بلکہ اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی انقلاب پسند تھا۔ گو وہ اپنے نظریات کے لئے شام کا خاص کر بطرس البستانی کے دائرہ کا مرہونِ منّت ہے۔ تاہم اُسے سیّد جمال الدین افغانی کا چیلا سمجھنا ہوگا۔ اُس کی سیاسی سرگرمیاں بالخصوص مصر سے متعلق رہیں۔ وہ ایک جذباتی قسم کا ذہین مقرّر تھا۔ وہ ایک نئے صحافتی اسلوب کا موجد تھا جو شگفتہ، پُرزور اور اشتعال انگیز تھا۔ اُس کی تقریر ایک چھپی ہوئی تحریر لگتی تھی۔ اس انتخاب میں جمال الدین افغانی کا اپنا کوئی مضمون شامل نہیں ہے۔ بلکہ جمال الدین افغانی پر ادیب اسحاق کا لکھا ہوا مضمون اس کتاب میں درج ہے۔ عربی اُس کی مادری زبان نہ تھی۔ لیکن اس کی کچھ تصانیف کا اُس کے شاگردوں نے عربی میں ترجمہ کیا۔ جمال الدین افغانی کی سیرت کی تصویر جیسی ادیب اسحاق نے اپنے مضمون میں کھینچی ہے ویسی جمال الدین کی اپنی تصنیفات میں بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ مضمون اُس نے جمال الدین افغانی کی ملاقات سے متأثر ہو کر تحریر کیا ہے۔ اُن دنوں جمال الدین ہندوستان سے اپنی جلاوطنی کے ایّام پورے کر کے لوٹا تھا۔

اسحاق کا دوسرا مضمون بھی اخبارات سے لیا گیا۔ اس کا موضوع مشرق اور بالخصوص عربی دنیا اور اس کا یورپی سیاسیات سے تعلق ہے۔ اس کے دو آخری چھوٹے چھوٹے مضمون ۱۸۸۰ء "شہادت کے بعد راحت" اور "یورپ اور مشرق" کے عنوان "القاہرۃ" نامی اخبار میں پیرس سے شائع ہوئے۔ اس وقت اس کی خداداد قابلیت اور اسلوب بیان نے ایک خاص انفرادی اختیار کر لیا تھا۔ دوسرے مضمون میں خاص دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس نے رُوس کی اس وقت کی سیاسی روش پر بھایا ہے۔

نجیب الحدّاد (۱۸۶۷-۱۸۹۹) ایک شامی لیکھک تھا جو نہایت ہر دلعزیز ہے۔ وہ الیازجی گھرانے کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اس خاندان نے عربی ادب کے نئے دور کی بہت سرگرم شخصیتیں پیدا کیں۔ اس نے ڈرامہ نویسی میں خاص شہرت ڈرامے اس نے یا تو ترجمہ کئے یا دوسروں کی پیروی میں ہے۔ اب تک کھیلے جاتے ہیں۔ اس کی پبلک لائف زیادہ تر گزری۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مصر پر برطانوی قبضہ تھا اور اہل عرب برطانیہ کے خلاف شروع شروع میں

لڑ بھڑ کر اپنی سماجی زندگی کے سدھار میں مصروف ہو گئے تھے۔ اس کے مضامین میں اسحاق کی انقلابی سپرٹ معدوم ہے۔ اس کا طرزِ بیان نرم اور اصولی قسم کا ہے۔ اس کے دونوں مضامین "آزادی کیا ہے" اور "تم برطانویوں کے لئے کام کر رہے ہو" (جو اس کتاب میں شامل ہیں) سے ظاہر ہے کہ وہ ارتقا اور خود دلنوی کا حامی ہے۔ آخر الذکر مضمون میں اُس نے اُس وقت کے مصری اخبارات کا نقشہ کھینچا ہے جو خاص توجہ کا مستحق ہے۔

سلیمان البستانی (۱۸۵۶-۱۹۲۵) ایک مشہور شامی تھا جو اپنے ہمعصر ادیب اسحاق کے چالیس سال بعد تک زندہ رہا۔ حالانکہ انھوں نے بیروت میں ایک ہی وقت میں اور ایک ہی ادبی انجمن میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن ان کے زندگی کے طور طریق بہت مختلف تھے۔ البستانی بیک وقت مدبّر، منتظم مالیات کا ماہر اور اخبار نویس بھی تھا۔ یہ جدید عربی سماج اور ادب میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ یہ قدیم و جدید عربی شاعری کا زبردست نقاد تھا۔ اس نے ہومر کے (Iliad) کا ترجمہ اپنی مادری زبان میں کیا۔ اس نے ایک سیر حاصل زندگی بسر کی اور کئی میدانوں میں اپنا نقش چھوڑا۔ جب وہ ترکی پارلیمنٹ کے انتخابات میں کھڑا ہوا تھا تو اس نے ایک کتاب موسومہ "ترکی دستور اساسی سے پہلے اور بعد" کے نام سے شائع کی تھی۔ اور اس کتاب کا ایک باب اس رُوسی انتخاب میں شامل ہے۔ اس باب کا عنوان "دستور اساسی اور ہجرت" ہے۔ اس میں ہجرت کے مسئلے پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ عرب میں بالعموم اور شام میں بالخصوص اس مسئلہ نے ۱۸۹۰ء سے خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔ البستانی نے نہ صرف عربی ممالک کے عربوں بلکہ امریکہ کے عربوں سے بھی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ امریکہ میں عربوں کی پہلی بستی کی بنیاد اُس کی زندگی ہی میں پڑ چکی تھی اور جب وہ مرا تو اس نئی آبادی نے مادرِ وطن کی ادبی زندگی پر بڑا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ عربی ممالک کے حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں اور سلسلۂ ہجرت کے بارے میں اُس کے نظریئے اوّل درجہ کی تاریخی و دستاویزی اہمیت لئے ہوئے ہیں۔

گذشتہ نسل کے دور کے اخبار نویسوں کے بعد جیت ناول نگار نظر آتے ہیں۔ انہوں نے تاریخی ناول کی بنیاد رکھی جو حکایتی نثر کی تمام قسموں میں جدید عربی ادب میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے اور جس نے

اُن چند ادبی کارناموں کو از سرِ نو زندہ کر دیا جو ہماری خاص توجہ کی مستحق نہیں۔ ناولوں سے جو اقتباسات لیئے گئے وہ اس غرض سے کہ نہ صرف اُس دَور کے عرب مصنّفوں کی شخصیتیں روشنی میں آجائیں بلکہ اُن کے زمانے کے بعض اہم واقعات اور اوقات کے بارے میں اُن کے نظریئے معلوم ہو سکیں۔ ان مصنّفوں میں سب سے پہلا جمیل المدور (۱۸۶۲ - ۱۹۰۷) ہے۔ ان اقتباسات میں اس کے آٹھویں خط کا کچھ حصّہ شامل ہے جو ہارون الرشید کے عہد سے متعلّق ہے۔ اس ناول سے اُس کی بڑی شہرت ہُوئی۔ اس میں کہانی کے ہیرو کی شہنشاہِ فرنگ کے دربار میں سفارت، اس کے سفرِ شام اور دمشق کے حالات اور وہاں کی شہرۂ آفاق مسجد اموی کا مفصّل ذکر ہے۔

جرجی زیدان (۱۸۶۱ - ۱۹۱۴) جدید عربی ادب میں نہایت ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محض ناول نویس ہی نہیں بلکہ ایک مؤرّخ، ایک ادبی مؤرّخ اور ایک جرنلسٹ بھی تھا۔ اس کا اپنا طریق کار تھا۔ جس پر وہ سختی سے کاربند رہا۔ اس نے ایک اخبار بھی جاری کیا جو اُس کی موت کے بعد بھی کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس کے بے شمار ناولوں سے حتی الوسع وہ اقتباسات نقل کئے گئے ہیں جو تاریخِ عرب کے مختلف اَدوار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کا ناول مصری ارمانوں کا اُنیسواں باب مصر پر عربوں کے قبضے اور اس سے پہلے کے حالات کی تصویر کھینچتا ہے۔ اس کے "الرشید کی بہن العبّاسہ" کے بائیسویں باب میں وہ زمانہ دکھایا گیا ہے جب خلافتِ عبّاسیہ پورے جاہ و جلال پر تھی۔ درباری زندگی کو ابتدائے اسلام کے ان سورماؤں کی سیدھی سادی زندگی سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ جرجی زیدان نے اٹھارویں اور اُنیسویں صدیوں کی تاریخ کے بارے میں ایک دوسرا سلسلۂ تصانیف شروع کیا اور اُس کا تیسرا ناول "مہدی کا قیدی" انہیں تصانیف میں سے ہے۔ اس ناول میں (۱۸۸۰ - ۱۸۹۰) کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں سوڈان کے مہدی کے انگریزوں کے خلاف بغاوت کے حالات درج ہیں۔ چوالیسویں باب میں بتایا گیا ہے کہ یہ بغاوت کس طرح عمل میں رُونما ہوئی اور مہدی نے اپنے پیروؤں کو کس درجہ متاثر کیا۔

فرح انطون (۱۸۷۴ - ۱۹۲۲) وہ تیسرا ناولسٹ ہے جو اس انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں زیدان کی سی ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ زیدان کے برعکس فرح انطون کی سرگرمیوں سے ظاہر ہے کہ وہ عصبی المزاج اور توازن سے بے بہرہ تھا۔ یہ بھی زیدان کے مانند ایک اخبار نویس تھا۔ لیکن یہ گویا اس کا مقدر کہ وہ معہ اپنے اخبار کے انگلینڈ رہا سے قاہرہ، پھر وہاں سے امریکہ اور پھر انگلینڈ رہا واپس ہو۔ ایک مرتبہ اُس کے محمد عبدہ کے درمیان اسلامی تمدّن کی تاریخ کے مسئلہ پر بحث چھڑ گئی جس نے دنیا نے عرب کو اپنی طرف بہت متوجّہ کیا۔ زندگی کے آخری ایّام میں اُس کی آرزو رہی کہ وہ ڈرامہ نویسی پایہ بلند کرے۔ یہ خود بھی ڈرامے لکھتا رہا۔ لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہُوئی۔ اس کے ناولوں میں سب سے اچھا "نیا یروشلم" ہے۔ اس انتخاب میں اس ناول کا پہلا باب شامل ہے جس سے عرب کی فتوحات سے پیشتر مقامی آبادی کے رویّہ کا پتہ چلتا ہے اور اُنیسویں باب میں یروشلم کے ہتھیار ڈال دینے کے موقع پر خلیفہ عمرؓ سے "اسقفِ اعظم سفرونیہ" کی ملاقات کی تفصیل ہے۔

ایسے لوگ کثرت سے ملیں گے جو عربی النسل نہیں ہیں۔ لیکن جنہوں نے مصر کو مادرِ وطن بنا لیا ہے **ولی الدین یکین** (۱۸۷۳ - ۱۹۲۱) اُن میں سے ایک تھا۔ یہ ایک معروف ترک خاندان کا تھا۔ اس کی جوانی استنبول میں گزری۔ اس نے نوجوان ترکوں کی تحریک میں زبردست حصّہ لیا جس کے لیئے اُسے عرصۂ دراز تک سیواس میں بطور ایک جلا وطن کے رہنا پڑا۔ ۱۹۱۸ء کا ترکی انقلاب ہوا تو اُسے بھی رہائی نصیب ہُوئی۔ اس کے بعد وہ زیادہ تر مصر میں رہا جہاں وہ عربوں اور ترکوں کے اتحاد کے لئے بڑی کوشش کرتا رہا۔ وہ شاعر بھی تھا اور اخبار نویس بھی۔ لیکن اُس کی صحافتی زندگی پر سیاست چھائی ہوئی تھی۔ اس کا اسلوب انتہا درجہ لئے ہوئے ہے جو پُر زور بھی ہے اور پُر جوش بھی۔ انقلاب سے پیشتر ترکی کے جو مرقعے اس نے قلمبند کئے ہیں وہ اپنی اپنی خوبی کے اعتبار سے عربی زبان کے بہترین نمونوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ اپنے مقالے "مشرق میں ادیب کس طرح مرتا ہے" میں بتاتا ہے کہ اپنے سماج کی عدمِ توجہی کی وجہ سے ادیب کس طرح بھوکے مرتے ہیں۔ اور اس غفلت کا سبب یہ ہے کہ سماج مغرب پرستی کی وجہ سے اپنے سو دیشی ادب کو نہ ہی سمجھ سکتی ہے اور نہ ہی اس سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔

اپنے مضمون "طاقت کی رات" میں اُن مسلمانوں کی زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے جن کا مذہبی زاویۂ نگاہ کچھ عجیب سا ہے وہ توہم اور تعصّب کے ہاتھوں مغلوب ہیں ...

مضمون "باسفورس ایک حادثے کی رات میں" کے مطالعے سے سلطان عبدالحمید کا زمانہ آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے اور اُس نے اس میں جو ڈرامائی زورِ بیان دکھایا ہے اُس کے لئے نہ صرف ادبی قابلیت بلکہ ذاتی تجربہ بھی ضروری تھا۔

السید مصطفیٰ لطفی المنفلوطی (۱۸۷۶-۱۹۲۴ء) خالص مشرقی انشاء پرداز تھا جس نے پورے طور پر دین کا پابند ہوتے ہوئے اسلامی ادب میں اتنا بڑا رتبہ پایا۔ وہ کسی بھی یورپی زبان سے واقف نہ تھا تاہم اُسے یورپی ادب حتیٰ کہ ٹالسٹائی سے بھی پوری پوری واقفیت تھی۔ وہ ٹھیک ٹکسالی زبان کا حامی تھا۔ اور اُس کا اسلوب بھی بہترین ہے۔ المنفلوطی ایک سرگرم مبصر تھا جو نہ صرف قدیم بلکہ جدید ادب کا بھی مدّاح تھا۔ اُس نے اپنے زمانے کے لکھاریوں کے اسلوب کی بنا پر تنقید کیا تھا۔ اُن کی سیرتوں پر جو مختصر مگر پُرمغز مقالے لکھے ہیں۔ وہ اس کے شدید اور پُرفکر تجزیے کی شاہد ہیں۔ زیدان کی سیرت پر اس نے جو مقالہ تحریر کیا اس انتخاب میں شامل ہے۔ اس کی تخلیقی قوتیں ساری کی ساری اس میں شامل ہیں۔ یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ مطالعہ دستوری کشمکش کی تمہید کا کام دیتا ہے جس نے جدید عربی شروع ہی میں مسلمانوں اور عرب کے مسیحی لیکھوں کے باہمی برا اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

امین ریحانی ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا۔ یہ موجودہ عرب مصنفوں میں سب سے دلعزیز ہے۔ یہاں سے اس اردو انتخاب کا آغاز اُن لوگوں سے ہوتا ہے جو ہمارے ہمعصر ہیں اور جن میں سے بیشتر ... بارہ سال کی عمر میں ریحانی نے اپنے وطن شام کو خیرباد کہا اور امریکہ جا پہنچا۔ یہاں اس کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز اوّل انگریزی میں اور بعد کو عربی میں ہوا۔ یا تو زیادہ تر ان مختلف النوع اخلاقی موضوعات پر چھوٹے چھوٹے مضامین تحریر کرتا ہے یا ... طویل منثور نظمیں کہی ہیں جو اس سے قبل نہ لکھی گئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ والٹ وٹمین سے بہت متاثر ہے۔ ان ادبی سرگرمیوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کہ وہ عربی النسل ہے یا یورپی النسل ... ترکی انقلاب اور خاص طور پر جنگِ عظیم نے اُس کے نظریات میں زبردست تبدیلی پیدا کی۔

... اپنے وطن میں لوٹ آیا۔ اس کے بعد اس نے مصر، عرب ... کی جزیرہ نما کی سیاحت کی اور دو جلدوں میں ایک کتاب بعنوان "بادشاہانِ عرب" شائع کی جس میں جزیرہ نمائے عرب کے حالات درج ہیں۔ سرِدست وہ اہلِ نجد اور وہابیوں کی تاریخ تیار کر رہا ہے۔ اس سیاحت نامے کا دیباچہ اس انتخاب میں شامل ہے۔ یہ دیباچہ نہ صرف اسلوبِ بیان کا ایک درخشاں نمونہ ہے اور اس کتاب کا اچھی طرح تعارف کراتا ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں مصنف کی خود نوشت آپ بیتیاں موجود ہیں۔ اس قسم کے اعترافات کرنا نہ صرف اُسی کی بلکہ اُس دَور کے تمام تارکِ وطن ادیبوں کی خصوصیت ہے۔ اُس کی شعر نما نثر یعنی "انقلاب" اور "اے وادی کی دیوی مجھے شفا بخش" اس انتخاب میں شامل ہیں۔ یہ اُس کے ابتدائی دَور سے لے کر ۱۹۱۰ء تک کی تخلیقی قوتوں کا نمونہ ہیں۔

جبران خلیل جبران جو ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا ایک دوسرا تارکِ وطن ہے جو ہر دلعزیزی کے اعتبار سے کسی ہمعصر عربی لیکھک سے کم نہیں۔ یہ شامی ہے۔ اور اس نے اپنی جوانی کا کچھ حصّہ نیویارک اور کچھ پیرس میں بسر کیا ہے۔ یہاں اس نے نقشہ کشی سیکھی جس قدر وقت ادب کو دیتا ہے اتنا ہی نقشہ کشی پر صرف کرتا ہے۔ اس کی تصانیف میں اکثر اس کے بنائے ہوئے خاکے پائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں یہ زیادہ تر نیویارک رہا۔ جہاں یہ لیکھوں کی یونین کا صدر رہا ہے۔ اضلاع متحدہ امریکہ کے سارے لیکھک اس یونین کے ممبر ہیں۔ اُس کے ابتدائی ادبی کارنامے ہلکے پھلکے افسانوں پر مشتمل ہیں جو دو جلدوں میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک مسلسل افسانہ "ٹوٹے ہوئے پر" بھی ہے۔ ان کہانیوں کا مواد گزشتہ اور موجودہ شامی زندگی سے فراہم کیا گیا ہے۔ "ٹوٹے ہوئے پر" کے دو باب اس انتخاب میں شامل ہیں۔ عورتوں کے مسائل اور مناظرِ قدرت کی تفصیلات نے اس کتاب کو دلچسپ بنانے میں برابر کا حصّہ لیا ہے۔ ان ہر دو ابواب کا عنوان "قسمت کا ہاتھ" اور "اشتارٹ اور یسوع مسیح کے درمیان" ہے۔ اس کے بعد جبران بھی آل ریحانی کے مانند افسانہ نگاری سے دستبردار ہو گیا اور اس نے نظمِ منثور اور مضمون نویسی شروع کر دی۔ انتخاب میں اس کا مضمون "میں عوام میں انتہاپسندی پسند کرتا ہوں" شامل ہے اور اس کی اس کیفیتِ مزاج کو ظاہر کرتا ہے۔

عبدالمسیح حدّاد۔ ایک دوسرا شامی النسل امریکی لیکھک ہے جو خالص ادب لکھتا ہے۔ اُس کا ایک چھوٹا سا زبردست مزاحیہ

ڈرامہ "مُردوں کے گھر میں" انتخاب میں شامل ہے۔ اس میں وہ واضح طور پر اُن چھوٹی چھوٹی رسم و روایات کو بیان کرتا ہے جن سے آج بھی اہلِ عرب اپنی زندگی کی سنجیدہ ترین گھڑیوں میں بھی نہیں بچ سکتے حالانکہ وہ اُن ممالک میں رس بس رہے ہیں جہاں یورپی تمدن رائج ہے۔

میکائل نعیم ایک اور شاعر ہے جو امریکہ میں رہتا ہے۔ اور جس نے حال ہی میں ایک نڈر ادبی نقاد کی حیثیت سے خاص شہرت پائی ہے۔ اپنے ہمعصر شاعر **احمد شوقی** کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر اُس نے دکھا دیا کہ وہ مانے ہوئے اُستادوں پر بھی چوٹ کرنے سے نہیں چوکتا۔ یہ بتانا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ نعیم نے بسکنتا (لیبنان) اور ناصرہ کے روسی سکولوں میں تعلیم پائی اور اس کے بعد اُس نے پولتاوا میں دار المعلمین کا کورس ختم کیا۔ یہ روس سے امریکہ گیا۔ جہاں اُس نے واشنگٹن یونیورسٹی میں علمِ قانون پڑھا اور ۱۹۱۶ء میں ڈگری حاصل کی۔ انتخاب میں اس کے ڈرامے "باپ اور بیٹے" کا دیباچہ شامل ہے۔ یہ دیباچہ اس کتاب پر تو پوری روشنی نہیں ڈالتا۔ مگر اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں عربی میں تھیٹر کی پیش رفت سٹیج (روزمرہ اور ادبی) زبان اور ایسے ہی دیگر بنیادی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

عباس محمود العقاد ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوا۔ یہ آج مصر کا ہر دلعزیز نقاد اور اخبار نویس سمجھا جاتا ہے۔ اس کی طبیعت میں ہلکی چاشنی پائی جاتی ہے۔ اُن کا اندازِ بیان سُندر اور سہل ہے۔ وہ ادبی موضوعات سے اخلاقی سماجی قسم کے موضوعات کی طرف جا نکلتا ہے اور اپنے خیالات انوکھی وضع سے پیش کرتا ہے۔ اس کے اس نوع کے دونوں ادبی کارنامے "آرام" اور "قوتِ ارادی" انتخاب میں شامل ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں ہلکے پھلکے ناولوں، قصّے، کہانیوں وغیرہ نے عربی ادب میں خاص توجہ مبذول کرنا شروع کی مصنّفوں کا ایک ایسا سلسلہ بندھ چلا ہے جو اپنی تخلیقی قوتیں اس قسم کے ادب کی فراہمی پر صرف کر رہے ہیں۔ نظری مسائل سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے اور رفتہ رفتہ ایسے ادبی کارنامے ظہور میں آ رہے ہیں جنھیں طبعزاد کہا جا سکے۔ اس انتخاب میں ایسی تصانیف کو بھی مناسب جگہ دی گئی ہے۔ یہ تحریک اگر اپنے پوری شد و مد کے ساتھ نہیں ہٹے تو مصر میں۔

عیسیٰ عبید۔ جو اب مر چکا ہے۔ انھیں مصنّفین میں سے ایک تھا جس نے نت نئے اسلوبِ بیان ایجاد کئے۔ اس کی "حکمت خانم کی ڈائری" محض اپنی ادبی خصوصیات کی وجہ سے ہی دلچسپ نہیں، بلکہ اس لئے بھی کہ اس میں اُن مصری عورتوں کے تجربے جو رفتہ رفتہ اپنی چار دیواریوں سے نکل کر سوسائٹی میں کھلے بندوں گھلنے ملنے لگی تھیں۔ وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مصر میں عورتوں نے اپریل ۱۹۱۹ء میں پہلی بار ایک سیاسی تحریک اور اس کے مظاہروں میں حصّہ لیا۔

تیمور برادران محمد اور محمود دو بھائی تھے محمد ۱۸۹۲ء میں پیدا ہو کر جوان مرا۔ محمود ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوا۔ ان کا عربی ادب میں خاص مقام ہے۔ محمد اپنی قوتیں مختلف میدانوں میں صرف کر چکا ہے۔ اُس نے شعر بھی کہے اور مختصر افسانے بھی لکھے۔ جن میں سے بعض قابلِ توجہ ہیں۔ لیکن انجام کار اسے ڈرامہ نگاری کی دُھن لگ گئی۔ اس نے بہترین سماجی کومیڈیاں لکھی ہیں۔ نیز ڈرامے بھی جو اس فن میں ایسا انقلاب پیدا کر رہے ہیں جس سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ ایک روز دُنیائے عرب میں ڈرامائی ادب بھی اپنی مناسب جگہ حاصل کرتا ہوا اندھی تقلید کی بیڑیوں کو اُتار پھینکے گا۔

محمود تیمور عرب تھیٹر کا سب سے پہلا سنجیدہ ڈرامائی نقاد اور مورّخ تھا۔ اس کا مضمون "عزیز عید" انتخاب میں شامل ہے۔ اس میں اُس نے بڑے بڑے ہمعصر اداکاروں اور ڈرامہ نویسوں کی سیرت پر راستہ زنی کی ہے۔

چھوٹا بھائی یعنی محمود تیمور مختصر افسانوں کی طرف لگا رہا اور اس کے افسانے، کہانیاں وغیرہ دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ جب کسی موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے نہایت سوچ بچار اور ایمانداری کے ساتھ۔ اپنے اصولی دیباچوں میں وہ اپنے نظریات کو استدلال سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ادبی مشن کی تکمیل کو ایک ادبی فریضہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے کُل افسانوں کا مواد مصری آبادی کے مختلف طبقوں سے لیا ہے۔ ان میں سے ایک افسانہ "مسافر" انتخاب میں شامل ہے۔

اس انتخاب کا آخری حصّہ ہمعصر عرب لکھنے والیوں کے لئے وقف ہے۔ جس زمانے کے نمونے انتخاب میں شامل ہیں عورتیں اس سے کہیں پیشتر حلقۂ ادب میں شامل ہو چکی تھیں۔ لیکن عام طور پر اُنکی کوششیں شاعری یا مخصوص نسوانی موضوعات تک محدود تھیں۔ مسئلہ نسواں کو عربی مشرق میں ہمیشہ سے نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے جس سے عورتیں خاص طور پر دلچسپی لیتی رہی ہیں۔ لہٰذا یہ عین فطری ہے کہ عورتوں کا دائرہ موضوع اسی وقت وسیع ہو سکتا ہے جب عورتیں ہر معنی میں آزاد ہو جائیں اور یہ مسئلہ زندگی میں عملی طور پر حل ہونے لگے۔

السیدہ ملکہ حفنی ناصف (۱۸۸۱ - ۱۹۱۸) اُن پہلی عورتوں میں سے ایک ہے جس نے مصنّفہ کی حیثیت سے ایک دنیا کی توجہ اپنی جانب کھینچی۔ یہ "صحرائی کھوجی" کے فرضی نام سے مضامین لکھتی تھی اور ایک مشہور مصری ادیب کی بیٹی تھی۔ جو قاہرہ کی یونیورسٹی میں کبھی پروفیسر رہ چکا تھا۔ اس خاتون کے اپنے حالاتِ زندگی ناخوشگوار تھے اور شاید یہی وجہ ہے کہ دنیائے اسلام بالخصوص مصر میں عورتوں کے مرتبے کے متعلق وہ زیادہ تر لکھتی رہتی چونکہ ایک مرتبہ اُستانی بھی رہ چکی تھی۔ اس لئے اس نے تعلیمی مسائل پر بہت زیادہ توجہ دی۔ لیکن اس کی زندگی کی بڑی ہم جو مشہور رہنمائے عورتاں نجات دہندہ **قاسم امین** (۱۸۶۵-۱۹۰۸) کی تھی۔ اس کے مرشد و نتائج بالعموم اعتدال لئے ہوتے ہیں۔ اس کے مضامین کا مجموعہ "عورت" کے نام سے شائع ہوا تھا اور اس مجموعے کے مضامین "بیاہ کا زمانہ" اور "مردوں کی کمزوریاں" اس انتخاب میں شامل ہیں۔

مریم زیادہ جو غالباً ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئی "مائی" کے فرضی نام سے لکھا کرتی۔ یہ اپنے زمانے میں نہایت ہر دلعزیز تھی۔ اسے سیدہ ملکہ حفنی ناصف سے روحانی تلمذ حاصل ہے۔ اس نے لبنان اور بیروت میں تعلیم پائی لیکن اس کی زندگی کا بڑا حصّہ مصر میں گزرا۔ یہ سِنّاً نوعمر ہے پھر بھی اپنے چیدہ چیدہ مضامین اور نظم منثور کی بدولت اس کی شہرت بہت جلد پھیل گئی۔ کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی تصنیفات کا دائرہ سیدہ حفنی ناصف کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہے جو ادبی ع اُس نے اپنے لئے چُنے اور جس طور پر اُنھیں نبایا اُس سے ہے کہ اس میں ایک نقاد اور ادبی مؤرخ کی صلاحیت موجود ہے

جدید عربی ادب میں بہترین تاریخی ادبی سوانح عمری صحرائی کھوجی کی ہے جس میں اس کی تخلیقی استعداد کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ سوانح عمری جو ۱۹۲۰ء میں چھپی مریم زیادہ کا پہلا عظیم ادبی شاہکار ہے۔ اس نے مضمون "گزرا ہوا آوارہ لونی" کا موضوع عربوں کے موجودہ رویّے کے متعلق ہے جو انھوں نے یورپی مصنّفوں کی جانب اختیار کیا ہوا ہے۔ اس رویّے سے ایک کورانہ تقلید کی عادت پیدا ہو گئی ہے جو سب سے پہلے جدید عربی ادیب کی تحریروں سے نمودار ہوئی جواب ایک تعمیری تنقید کی صورت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اُس کی منثور شاعری کے پانچ نمونے اس انتخاب میں شامل ہیں۔ تین تو اُس کے پیش لفظ ہیں جو اس نے اپنے مجموعے "تاریکی اور ترنّم" کے تین حصّوں پر لکھے ہیں اور باقی اُس کے اپنے مضامین ہیں جن کا عنوان "الصفا نری کا گیت" اور "ابوالہول کے قدموں پر" ہے۔

سلمیٰ الصایغ ہماری ہمعصر شامی مصنّفہ ہے جو خالص ادب یا تاریخی ادب کی تحقیق میں وہ پایہ نہیں رکھتی جو سماجی اور اقتصادی مسائل میں اس کو حاصل ہے۔ وہ مسئلہ نسواں کو جبکہ وہ اس کے دیگر موضوعات کی زد میں آتا ہو نظرانداز نہیں کرتی۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ ایک مصنّفہ کو محض اس لئے کہ وہ عورت ہے اپنی تمام تر توجہ مسئلہ نسواں کی طرف ہی مبذول نہ کرنی چاہئیے۔ وہ وقت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا ہے جب مردوں عورتوں کے موضوعات جداگانہ تھے۔ اپنی تائید میں وہ ثابت کرتی ہے کہ ایک مصنّفہ کو نہ صرف یہ حق ہے کہ وہ ہر موضوع پر بحث کرے بلکہ اس کا اسلوب ادبی اور بلند ہونا چاہئیے اور اُس کی زبان بے عیب۔ اُس کی تصنیفات جو انتخاب میں شامل ہیں حال ہی کی ہیں اور شام سے متعلق ہیں جس کے لڑائی کے بعد کے زخم ابھی ابھی ہرے ہیں۔ ان افسانوں میں ایک "دیرہ کے الحجیفہ کی تاریخ" ہے جس میں ایک نوجوان لبنانی عورت کی ٹریجڈی قلمبند ہے۔ یہ زندگی جنگ کے ہاتھوں کم اور سماجی ریت یا رسم کے ہاتھوں زیادہ تباہ ہوئی۔ "شام میں بابل" شام کی گڈمڈ سیاسی حالات کا نقشہ ہے۔ جہاں بے شمار پارٹیاں ہیں اور ان کے درمیان بھی اختلافات اور تفرقے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی تقریر "عربی زبان کی یاد میں" جو عورتوں کے کلب میں کی گئی تھی۔ اس نے بجا طور پر ثابت کیا ہے کہ جب تک سماجی اور سیاسی حالات میں تبدیلی نہیں ہوتی، سماج اور مدرسوں میں عربی زبان

کا مرتبہ بلند کرنے کے ذرائع دقّت سے دستیاب ہوں گے۔ "ہماری اقتصادی زندگی" کی ابتدا اس مزاحیہ مباحثے سے ہوتی ہے کہ آیا کسی عورت کو یہ حق ہے کہ وہ ایسے مسائل پر بحث کرے جو اُس کی جنس سے متعلق نہ ہوں اور آیا منطقی دلائل کی رُو سے ایسی تقسیم ممکن ہے؟ اُس نے شام کے اقتصادی حالات کا خوب مطالعہ کیا اور بتایا کہ ملک کی مستقل نشو و نما کے لئے اقتصادی حالات کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ یہ باتیں اُن نظریوں کی یاد تازہ کرتی ہیں جو تیس برس پہلے نجیب الحدّاد نے مصر کے بارے میں ظاہر کئے تھے بسلی صایغ کہنا ٹھیک ہے کہ ملک کی نجات ہجرت یا فرار میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ ملک کی اُن ثروتوں کا معقول استعمال کیا جائے جن سے ابھی کام نہیں لیا گیا ہے ؛

(آجکل)

اُمّید و بیم

وہ کہہ رہے ہیں ہمیں نیند آئی جاتی ہے

جناب عبدالغنی اثر گوالیاری

نظر سے اُن کی نظر کب ملائی جاتی ہے
یہ چوٹ وہ ہے جو سینہ پہ کھائی جاتی ہے

بھنور میں کشتیٔ اُمید آئی جاتی ہے
سنبھالو ورنہ یہ سب ناخدائی جاتی ہے

ہنسی فسانۂ غم کی اُڑائی جاتی ہے
وہ کہہ رہے ہیں ہمیں نیند آئی جاتی ہے

وہ بات راز تھی جو آج تک مرے دل میں
ہجومِ یاس میں اب لب تک آئی جاتی ہے

شبِ فراق یہ کہہ کہہ کے دل کو سمجھایا
اب اُن کے آنے کی اُمّید پائی جاتی ہے

کسی کی خوبیٔ گفتار واہ کیا کہنا
ہر ایک بات میں اک بات پائی جاتی ہے

وہ بے نقاب ہیں تو کیا کہ بیخودی میری
نقاب بن کے نگاہوں پہ چھائی جاتی ہے

یہ حال ہے مری مایوسیوں کا فرقت میں
سمجھ رہا ہوں کہ اب موت آئی جاتی ہے

خُدا کا پوجنے والا نہیں رہا کوئی
بُتوں کے سامنے گردن جھکائی جاتی ہے

یہ آگ کیسی؟ گلستاں میں ہو نہ ہو صیّاد!
ہماری شاخِ نشیمن جلائی جاتی ہے

ہنسی اب آئی تمہیں دیکھو مسکراتے ہو
وہ آئی دیکھو وہ آئی وہ آئی جاتی ہے

وفا کی آس ابھی تو ہے اُس ستمگر سے
ابھی تو لُطف کی اُمید پائی جاتی ہے

اثر چلے تو ہو محشر میں تم گِلا کرنے
زباں ابھی سے مگر لڑکھڑائی جاتی ہے

نالۂ دل

افسانۂ طولانی نظروں سے ادا ہوگا

حضرت دل شاہجہانپوری

خاموش زباں ہوگی اظہارِ وفا ہوگا
افسانۂ طولانی نظروں سے ادا ہوگا

آگاہ نہ تھے اب تک دل ہم سے جدا ہوگا
دُنیائے محبّت میں اک حشر بپا ہوگا

آغازِ محبت سے انجامِ محبت تک
گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سُنا ہوگا

ناوک جسے کہتے ہو دلکش جسے سمجھے ہو
یہ سینۂ بسمل میں چُبھ جائے تو کیا ہوگا

یہ شدّتِ جوشِ غم چند اشک سرِ دامن
دریا جسے کہتے ہیں قطروں میں فنا ہوگا

ملتی نہیں اے واعظ تحریر مقدّر کی
جو کچھ بھی ہے قسمت میں وہ روزِ جزا ہوگا

ڈوبی ہیں اِدھر نبضیں طعنے ہے اُدھر ان کا
سُنتے تھے کہ اک قیدی زنداں سے رہا ہوگا

اس گریۂ پیہم کی آخر ہے کوئی حد بھی
کس وقت مرا دامن آنکھوں سے جدا ہوگا

ہیں قصۂ مجنوں کی تشریح مرے نالے
اے اہلِ وفا سُن لو اب ذکرِ وفا ہوگا

اک شورشِ طوفاں ہے ہر اشک سرِ مژگاں
دامن پہ جو ٹپکے گا کیا جانیے کیا ہوگا

کوتاہیِ قسمت کا ہر ذکر عبث اے دل
افسانۂ ناکامی اندوہ فزا ہوگا

ٹوٹے ہوئے تار

نوشتہ: بنسی لال

مترجمہ: جناب تابر اورنگ آبادی

ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ چل پڑی۔ حسن تو اس کے چاروں طرف اُمنڈ آیا تھا۔ چمکتا ہوا حسن، نئی ادائیں بھری آنکھیں، منتی بکھیرتی ہوئی وہ آگے بڑھتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس کے دل میں کوئی ہلکے ہلکے گدگدا رہا تھا۔ پھر اسے ہوش کہاں؟ دماغ نے سوال کیا۔ "کہاں چلی نکلی؟" دل نے جواب دیا۔ "پیا ملن کو" وہ ٹھہری نہیں، چلتی رہی۔ سکھیوں نے پوچھا —— "او گیتا! ارے باؤلی! کس کی تلاش میں چلی؟" لیکن گیتا چلتی رہی۔ دیر تک —— بہت دیر تک —— دیوانوں کی طرح۔ "کسی" کی بینا سے نکلی ہوئی آواز کی لہروں پر تیرتے ہوئے گانے آ کر گیتا کے کانوں کے پردے سے ٹکراتے تھے اور وہ اس سریلی آواز میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ بینا کی آواز میں آواز ملانے کو گیتا بے تاب تھی۔ لیکن جب اس نے گانے والے کی درد بھری آواز کو سنا تو دل کے تار ہل گئے۔ وہ تڑپ کر رہ گئی ——!

(۲)

دنیا کی خوفناک الجھنوں نے سرش کی زندگی کے تاروں کو ایک جھٹکے کے ساتھ ہلا دیا تھا۔ بینا کے دل کا تار کانپ اٹھا۔ جس کی جھنکار ایک عجیب قسم کی جھنکار تھی —— دنیا کی گڑگڑاہٹ اور چیخ کا اب تاروں میں سما چکا تھا۔ سرش بھی تو انسان ہی تھا۔ اس کی بینا کی آواز میں دنیا کی چیخ سنائی دینے لگی۔ کتنی خوبصورت تھی وہ بینا —— مگر کتنے خوفناک تھے اس کے بول۔ جیسے ان کی چوٹیں سے وہ بینا ٹوٹ جائے گی۔ تار بکھر جائیں گے۔ خوبصورت الاپوں کا گلا روندا جائے گا۔

سرش کی زندگی کی بینا کتنی سونی تھی۔ نہ اس میں آواز تھی نہ الاپ۔ وہ دنیا کی طرف تاکتا تو دنیا خوفناک طریقے سے بھاگ کھڑی ہوتی اور اگر دنیا والوں کی طرف نظر اٹھاتا تو معلوم ہوتا کہ وہ سب اس کو چپ جائیں گے۔ گڑگڑ —— وہ آگے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ تڑپ اٹھتا۔ کیسی تھی اس کی زندگی؟

"میں جان سکتی ہوں آپ کون ہیں؟"

"اور لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں۔ لیکن لڑکیاں کہتی ہیں آوارہ بدمعاش ——!"

"آپ کا نام"

"سرش۔"

"آپ رہتے کہاں ہیں؟ —— کرتے کیا ہیں؟"

"میرا کوئی گھر نہیں۔ شراب پیتا ہوں —— سب کچھ بھول جانے کے لئے سنسان رات میں۔ جب ساری دنیا نیند کی آغوش میں سوتی ہے۔ میں اُن کوٹھوں پر پہنچتا ہوں جسے لوگ عصمت فروشی کا گھناؤنا اڈا کہتے ہیں۔ جہاں گناہ ہوتے ہیں۔ جہاں چاندی کے چند چھنکتے سکوں کے لئے جسم فروخت کیا جاتا ہے جہاں سے مطلب پرستی کی بو آتی ہے اور جب اس بو سے جی اکتا جاتا ہے تو میں خود کو اس فضا میں لا پھینکتا ہوں۔ تاکہ میں سانس لے سکوں —— زندہ رہ سکوں اور پھر اپنی بینا میں دنیا کی چیخ سنتا ہوں —— اور بس!"

"کہاں تک پڑھا ہے آپ نے؟"

"بی۔ اے تک"

"پھر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

"یونہی —— میں صرف دنیا کی گندگی کا مزا چکھتا ہوں۔ جانتی ہو۔ مجھ میں بھی بہت سی حسرتیں تھیں۔ لیکن قدرت کے کھیل ہی نرالے ہیں۔ امید کے ٹوٹتے ہی میں گوشت کا ایک لوتھڑا رہ گیا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ دنیا کی ساری غلاظت مجھ ہی میں سما جائے گی" کہتے کہتے سرش کی آواز بھرا گئی —— وہ بول نہ سکا۔

(۳)

گیتا کو سرش کی زندگی پسند آ گئی۔ عجیب زندگی ہے اس کی۔ نہ گھر ہے نہ کوئی رشتہ دار۔ دنیا کی طرف سے بے خبر۔ سنسار کی بندشوں سے بہت دور۔ اس کی تکلیف میں نہ کوئی تڑپنے والا نہ اس کی خوشی میں کوئی ہنسنے والا۔ گیتا کے دل میں ایک کسک اٹھی۔ اور وہ سرش کی طرف کھنچ گئی۔ جیسے اس سے سگائی ہو گئی ہو۔ یہ بھی کیسا؟ زندگی کیسے گی؟ ایک شرابی سے لگن! خیالات کو ایک جھٹکا

لگا ــــ اسے سرلش کے پاس جانا ہے ــــ وہ چلی گئی ـ

(۴)

گیتا نے سرلش کو دیکھتے ہی کہا ــ "شاید میں دیر سے آئی"۔
"جی نہیں ــــ بیٹھئے!" پھر کچھ شرما کر ــــ "معاف کرنا۔ کل آپ کا نام پوچھنا میں بھول گیا ـ"
"مجھے لوگ گیتا کہتے ہیں"
"یہاں تنہا آنے میں آپ ڈرتی نہیں ہیں؟ ـ آپ کے پاس بھی تو عورت کا دل ہے ــــ کمزور اور چھوٹا سا"
گیتا نے بھولے پن سے جواب دیا ــــ "جی نہیں! یہاں مجھے بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے اور پھر خوف کس کا؟ ــــ آپ جو ساتھ ہیں!" ــــ دونوں ہنس پڑے ــــ اس ہنسی میں دونوں کے دل بک گئے ـ

رات کا سہانا وقت ـ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی ـ سرلش نے آسمان کی طرف دیکھا جیسے چاند کہہ رہا ہو ــ "دیکھو! کوئی تمہاری آرزو لئے کھڑی ہے ـ تم سے ملنے کو اس کا دل تڑپ رہا ہے ـ کاش! تم سمجھتے ـ" سرلش کو یہ سب کچھ بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا ـ

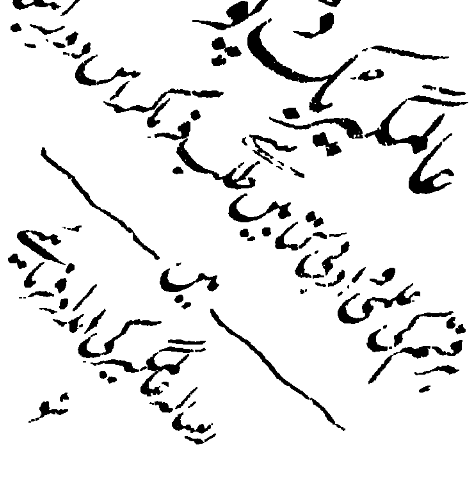
(۵)

ہنسی اور کھیل میں دن گزرتا گیا ـ دونوں محبت بھری باتیں کرتے رہے لیکن . . . . . اب وہ دن آ گیا جب گیتا کے ماں باپ اسے کسی شخص کے ساتھ منسلک کرنا چاہتے تھے ـ وہ عورت تھی ـ اسے غیر شخص کی پتنی بن کر رہنا پڑے گا ـ تمام عمر ــــ تمام زندگی ـ یہ سن کر کانپ اٹھی ـ وہ سرلش کی نہ ہو سکے گی ـ بہت سستے داموں پر وہ بک گئی ـ ایک سوداگر اسے لئے جا رہا تھا ـ کیسا ہوگا وہ سوداگر جسے نہ کبھی اس نے دیکھا ــــ اور نہ سمجھا ـ گیتا کا دل آگ میں پڑے ہوئے کوئلے کی طرح پگھلنے لگا ـ
سرلش نے دیکھا ـ گیتا بدلی ہوئی ہے ـ اس نے پوچھا "گیتا! یہ آنسو کیسے؟"
جواب میں گیتا نے زور سے رو دیا ـ سرلش نے پھر کہا "کیا بات ہے؟"
گیتا نے کہا "سرلش! مجھ سے زبردستی کی جا رہی ہے ـ ماں باپ میری شادی کرنے میں ـ میں بے قصور ہوں سرلش ـ دور ــــ بہت دور ــــ!"
"سماج سے کیسے بچ جاؤگی گیتا؟"

"سماج میری راہ میں روڑا نہیں اٹکا سکتا ہے سرلش!"
"جانتی ہو گیتا ــــ قسمت کا لکھا کسی طرح نہیں ٹل سکتا ـ تم ایک عورت ہو ـ تم سے تن مانگا جائے گا ـ دل مانگا جائے گا اور تمہیں قربانی کرنا ہی پڑے گی ـ اگر ایسا نہ کروگی تو ماں باپ کے دل کو ایک ٹھیس لگے گی ـ جس سے دل پاش پاش ہو جائے گا اور دل ٹوٹنے سے ایک دھیمی سی آواز نکلے گی ـ آہ! اور بس ـ جاؤ گیتا! پاگل نہ ہو"۔
"پتھر نہ ہو سرلش! کیا تم بھی اس پھول کی طرح ہو جس کے دل میں رحم تو ہوتا ہے لیکن محبت کا جواب دینے سے مجبور ہے ـ"
"گیتا! عاشق جب جس سے لپٹنا چاہتا ہے تو دنیا پتھر سا کڑا سینہ کئے سامنے آ جاتی ہے ـ وہ نہیں لپٹ سکتا ـ نہیں مل سکتا ـ محبت کا جواب بھی نہیں دے سکتا ـ" سرلش آگے نہ بول سکا ـ جسم تھرا گیا ــ جیسے کوئی بوجھ اٹھا رہا ہو ـ

(۶)

گیتا کی امیدوں کا بند ٹوٹ گیا ـ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے ـ کاش! وہ سرلش کے سر کو اپنے زانو پر رکھ کر بالوں سے کھیل سکتی ـ گیتا نے سرلش سے گانے کو کہا ـ لیکن بینا کے تار ٹوٹ چکے تھے ـ بج نہ سکے ـ گیتا چلی آئی ـ صرف سرلش رہ گیا ـ نیلے آسمان کے نیچے ـ
اس کی زندگی میں ایک خلا تھا ـ جس میں وہ گھومتا ہوا نظر آ رہا تھا ـ سرلش کی زندگی کی بینا میں قدرت نے ایک تار جوڑنا چاہا لیکن سرلش نے خود ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ـ اس کی زندگی سونی تھی ـ بالکل سونی ــــ!!



شامِ انتظار

حسن سے کر کے عرضِ حالِ عشق کی بات بھی گئی

از:- حضرت نثار اٹاوی

صبر گیا، سکوں گیا، عیش گیا، خوشی گئی
ایک نظر کے ساتھ ساتھ حسرتِ زندگی گئی

اور نہیں کوئی ملال ہے تو فقط ہے یہ خیال
حُسن سے کر کے عرضِ حالِ عشق کی بات بھی گئی

ہائے وہ شامِ انتظار، دشنۂ تیز در کنار
غرقِ بخونِ جانِ زار رات کی چاندنی گئی

پھر گئی چشمِ التفات، نذرِ ستم ہوئی حیات
ہم کو بھی مل گئی نجات، اُن کی بھی برہمی گئی

اب کسے خانقاہ میں سجدۂ شوق کیجیے
تم نے قدم ہٹا لیے لذّتِ بندگی گئی

خمکدۂ بہار میں رات کو تشنگی ڈھل سکی
وقتِ سحر کلی کلی آنکھ بچا کے پی گئی

راز و نیازِ حُسن و عشق کتنے ستم ظریف ہیں
مَوت نہ آئی اور نثار ہاتھ سے زندگی گئی

احمد شاہ ابدالی

پانی پت کے میدان کا بطلِ حریت

از جناب مولوی نور احمد خاں فاضل السنہ شرقیہ

عین جب آپس کے جھگڑوں سے سلطنتِ مغلیہ بے حد کمزور پڑ چکی تھی۔ قریب تھا کہ وہ شمع جسے بابر اور تیمور نے جان جوکھوں میں ڈال کر روشن کیا تھا۔ مرہٹوں کے طوفان سے ہمیشہ کے لئے بجھ جائے کہ اچانک شمال مغرب کی طرف سے ایک اولو العزم جرنیل اپنے مٹھی بھر جان نثاروں کے ساتھ پانی پت کے میدان میں نمودار ہوا۔ جس نے مرہٹوں کے پانچ لاکھ کے لشکر کو ایسی شکست دی کہ صرف ان کی ہندوستان کے شہنشاہ بننے کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ بلکہ اس ملک میں سلطنتِ مغلیہ ایک دفعہ پھر قائم ہو گئی۔ یہ سرفروش اور بہادر سپہ سالار احمد شاہ ابدالی تھا۔ جو سترھویں صدی کے آخر میں ملتان کے مقام پر پیدا ہوا۔ والدین نے اعلیٰ پیمانے پر تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ چونکہ جوہر قابل تھا۔ اس لئے تھوڑے سے عرصہ میں گھوڑا دوڑانے۔ تلوار چلانے۔ کمند پھینکنے۔ نیزہ مارنے اور بندوق چلانے میں ایسی مشق پیدا کر لی کہ سپاہیوں کی نگاہیں پڑنے لگیں۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں یہ بلند بخت اور ہونہار نوجوان اپنے خاندان کے ہمراہ ہرات کو چلا آیا۔ جو ان کا اصلی وطن تھا۔

نادر شاہ کی ملازمت

ان دنوں ایران میں نادر شاہ کا طوطی بول رہا تھا۔ اس نے افغانستان کے قلع قمع کے لئے ہرات پر حملہ کیا۔ جس میں احمد شاہ لڑتا ہوا گرفتار ہو گیا۔ اس نے اپنے مالک کی جو ایک فوجی افسر تھا ایسی صدق دلی سے خدمت کی کہ اس نے سفارش کر کے اسے فوج میں بھرتی کرا دیا۔ اب احمد شاہ کو اپنے جوہر دکھانے کا موقعہ مل گیا۔ پہلے ایک رسالے کا افسر بنا۔ پھر ترقی کرتے کرتے بڑے افسروں میں ہونے لگا۔ اور نادر شاہ کے پہلو بہ پہلو اس بہادری اور جرأت سے تلوار چلائی کہ اس نے خوش ہو کر اسے اپنی فوج کا سپہ سالار بنا دیا۔ اس عزت افزائی اور قدر دانی پر احمد شاہ کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے زیادہ سرگرمی اور تن دہی سے کام کرنا شروع کیا۔

مجذوب کی بڑ

احمد شاہ اسی طرح نادر شاہ کی تربیت میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کر رہا تھا کہ ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا جس نے اس کے خیالات کی دُنیا کو پلٹ ڈالا۔ یعنی جو سپاہی جان نثاری اور مردانگی کے جوہر دکھا رہا تھا۔ اب بادشاہی کے خواب دیکھنے لگا۔ بات یہ ہوئی کہ ایک دن احمد شاہ بادشاہ سے اجازت لے کر اپنے گھر گیا واپسی پر زیارت کے لئے حضرت امام علی رضا کے روضہ مقدس پر حاضر ہوا۔ دیکھا کہ آستان کے قریب شاہ صابر نام ایک درویش نے بچوں کے کھلونے کی طرح چھوٹا سا خیمہ بنا رکھا ہے۔ احمد شاہ ٹہلتا ٹہلتا قریب پہنچا اور پوچھا

"اے درویش! یہ کیسا خیمہ ہے؟"

درویش نے سر اٹھا کر دیکھا اور کہا۔

"کیا احمد ابدالی تو ہی ہے؟"

کہا۔ "ہاں"

جواب دیا۔ "یہ وہ خیمہ ہے جو نادر شاہ کے مرنے پر گرے گا۔ اور تو اس زمانہ میں بادشاہ بنے گا۔"

احمد شاہ نے اپنے ایک مصاحب کو وہیں چھوڑا کہ درویش کی صحبت میں رہے اور خیمے کا خیال رکھے۔ جونہی گرے وقت اور تاریخ نوٹ کر لے اور خود گھوڑے کی باگ اٹھا نادر شاہ کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔ جب نادر شاہ مارا گیا احمد شاہ اپنی خاص فوج کو ہمراہ لے کر لشکر سے بھاگا اور مشہد مقدس میں آ کر اپنے مصاحب سے خیمے کا حال دریافت کیا۔ اس نے وہی وقت بتایا جس میں نادر شاہ کا قتل ہوا تھا۔ احمد شاہ کو اس سے درویش کی صداقت پر یقین آ گیا اور سلطنت کا امیدوار بن افغانستان کو روانہ ہوا جہاں اس نے اپنی قوم کو فراہم کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور اس

طرح ایک غریب سپاہی محض اپنی بہادری، استقلال اور اولوالعزمی کے بطفیل افغانستان کا بادشاہ بن بیٹھا۔ اگرچہ نادر شاہ کے بعد اس کی اولاد میں سخت جھگڑے ہوتے مگر وہ اس کی تخت نشینی میں مزاحم نہ ہوئے۔ بلکہ ان فسادات کی وجہ سے اسے حکومت بڑی آسانی سے حاصل ہوئی۔

پنجاب پر حملہ

محمد شاہ شہنشاہِ ہند نے نادر شاہ کو سنہ ۱۷۴۰ء میں صلح کے وقت جہاں دلی کا سارا خزانہ نذر کیا تھا۔ وہاں پنجاب، کابل اور سندھ کے وہ علاقے بھی پیش کئے تھے جن کا روپیہ کابل کی فوج پہ صرف ہو جاتا تھا۔ اب جو اس نے نادر شاہ کے مرنے کی خبر سنی ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے منصوبے سوچنے لگا۔ چنانچہ لاہور میں ایک گورنر بھی بھیج دیا۔ احمد شاہ کو جب اس امر کا علم ہوا تو سرحد کی حفاظت کے لئے سنہ ۱۷۴۷ء میں دریائے سندھ عبور کر کے پنجاب میں داخل ہوا۔ اور لاہور سے گزرتا ہوا سرہند تک جا پہنچا جہاں شہنشاہ دلی کا ولیعہد احمد شاہ لشکر جرار لئے مقابلے کو موجود تھا اور اعتماد الدولہ معین الملک صفدر جنگ، راجہ ایشر سنگھ سوائی اور ذوالفقار جنگ جیسے رزم آزما سورما بھی اپنے جاں نثاروں سمیت اس کے ساتھ تھے۔ تیرہ یوم تک سخت گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔ انجام کار بادشاہِ دلی کا وزیر اعتماد الدولہ مارا گیا۔ اور مغل فوج پسپا ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ ساتھ ہی احمد شاہ کا میگزین اڑ گیا۔ جس سے اس کی فوج کا بڑا نقصان ہوا۔ اس لئے اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور پنجاب کا خاطر خواہ انتظام کر کے واپس چلا گیا۔

ہندوستان پر دوسرا حملہ

اس مہم کے چند روز بعد محمد شاہ بادشاہ ہند مر گیا اور اس کا بیٹا احمد شاہ تخت پر بیٹھا۔ بدقسمتی سے اس کی بھی امیروں سے بن نہ آئی۔ اور صفدر جنگ کے مقابلہ کے لئے اس نے نظام الملک کے پوتے غازی الدین خاں کو دکن سے بلا بھیجا۔ یہ نہایت قابل نوجوان تھا۔ آتے ہی امیر الامراء کے عہدے پر ممتاز ہوا اور بادشاہ کے اشارے پر صفدر جنگ کو اتنا تنگ کیا کہ آخر اس نے بادشاہ کی ملازمت ہی چھوڑ دی۔ اس بد انتظامی میں بھرت پور کے جاٹوں نے سر اٹھایا۔ ان کی سرکوبی کے لئے امیر الامراء روانہ ہوئے۔ بادشاہ صفدر جنگ کے معزول ہونے پر بھی اپنے آپ کو خطرے سے محفوظ نہ سمجھتا تھا اور امیر الامراء کے اقتدار سے سخت خوفزدہ ہو رہا تھا۔ اس لئے در پردہ دشمنوں سے سازش کی کہ موقعہ پا کر اسے قتل کر دیں۔ اتفاق سے یہ راز فاش ہو گیا اور امیر الامراء مرہٹوں کی مدد سے ان تمام تدبیروں پر غالب آیا۔ اور بادشاہ کو اندھا کر کے جہاندار شاہ کے ایک بیٹے کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھایا۔ اسی اثنا میں امیر الامراء سے ایک اور غلطی ہوئی۔ کہ اس نے مرحوم معین الملک کی بیگم کو جو لاہور پر احمد شاہ ابدالی کی طرف سے صوبیداری کرتی تھی یہ ٹیلیگرام دیا کہ وہ اس کی لڑکی سے شادی کرنے کو آتا ہے۔ وہ بیچاری اطمینان سے اس کی مہمانداری کے انتظام میں مصروف ہوئی۔ مگر اس غاصب نے لاہور پہنچتے ہی اسے دھوکہ سے گرفتار کر لیا۔ اور قید کر کے اپنے ہمراہ دلی لے آیا۔

احمد شاہ کی دادرسی

جب اس مظلومہ کی پکار احمد شاہ کے دربار میں پہنچی تو وہ بے قرار ہو گیا۔ غصہ سے جھلا اٹھا۔ بڑی بھاری فوج سے ہندوستان کا رخ کیا۔ اور بغیر کسی مزاحمت کے دلی جا پہنچا۔ مظلومہ کو وزیر کی قید سے نجات دلائی اور پھر عالمگیر ثانی سے ملاقات کی۔ یہاں ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ ہندوستان کے شہنشاہ نے اپنے حریف احمد شاہ ابدالی سے درخواست کی کہ "مجھے وزیر کے ہاتھ سے جس نے مجھے برائے نام تخت پر بٹھا رکھا ہے اور حکومت کے کاروبار میں دخل نہیں دینے دیتا۔ نجات دلائیے۔ احمد شاہ نے ایک روہیلے سردار نجیب الدولہ کو شہنشاہ کی حفاظت پر مامور کیا۔ اور خود اپنے ملک کو روانہ ہو گیا۔

مرہٹہ راج کے منصوبے

احمد شاہ کے بعد غازی الدین خاں نے اپنا خطاب عماد الملک مقرر کر لیا۔ مرہٹوں سے دوستی قائم کر کے بادشاہ کو اپنے قبضہ میں لے آیا۔ اور ایک موقعہ پر دھوکہ سے قتل کر کے اس کی لاش جمنا میں پھینکوا دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنتِ مغلیہ

کار ہا سہارا تھا بھی اٹھ گیا اور مرہٹے اتنا زور پکڑ گئے کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے۔ ہندوستان کی وسیع مملکت میں نہایت آزادی سے چوہوں کی طرح پھدکتے پھرتے تھے۔ بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی مانند رہ گیا تھا۔ اور باقی صوبیدار اور نواب ان کی ووٹ مار کے خوف سے اپنی آمدنی کا چوتھا حصہ ادا کرنے لگے تھے اب رہ رہ کر انہیں اگر کوئی بیخ کھٹکتی تھی تو وہ احمد شاہ ابدالی کی ذات تھی۔ اس لئے انہوں نے ارادہ کیا کہ احمد شاہ ابدالی کی غیر حاضری میں ہندوستان پر کامل قبضہ کر لیں۔ چنانچہ وہ اپنے دل بادل کے ساتھ دکھن سے روانہ ہوئے اور آگرہ اور دلی کو تاخت کرتے ہوئے سکھوں کی مدد سے لاہور پر جا ٹوٹے اور افغانوں کو وہاں سے بھگاتے ہوئے ملتان کی طرف سے دریائے سندھ کے پار تک نکال دیا۔

افغانوں اور مرہٹوں کی جنگ

احمد شاہ بھلا یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کر لاہور اور ملتان جیسے شہر و ... اس کی سلطنت سے اس طرح مرہٹے نکال لیں۔ وہ فوراً ایک بڑی فوج کے ساتھ دریا سے اتر آیا۔ ... سردار جو مرہٹوں کے حملے سے تنگ آ چکے تھے اس کے شریک ہوئے اور یہ مرہٹوں کو بھگاتا ہوا دلی تک آ پہنچا۔ ملکہ رگھوبا اور ... نے ہزار کوشش کی۔ نہایت بے جگری سے مردانہ وار لڑے۔ مگر افغانی تلوار دو تین آئے ان کی ایک نہ چلی۔ اسی ہزار کا تمام لشکر تباہ و برباد ہوا۔ اور ان کا سردار ... مارا گیا۔ افغانوں نے ... کا تعاقب کیا۔ یہاں سے وہ ایسے بھاگے کہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر دم لیا اور احمد شاہ ابدالی نہایت ... کے ساتھ خوشی کے شادیانے بجاتا ہوا اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

احمد شاہ پانی پت کے میدان میں

اب ... نے مرہٹہ سرداروں ... عام ... فرمان جاری کیا کہ وہ ... فوجیں جمع کریں اور افغانوں کو ہندوستان سے نکال دینے میں ان کی مدد کریں۔ بہت سے ... اس ... ہوئے اور ہندو مرہٹوں اور راجپوتوں کا پانچ لاکھ ... ہندوستان کی سلطنت حاصل کرنے اور افغانوں کو

نہ لگا نہیں سکتے۔ عماد الملک اور نجیب الدولہ کو ملا کر اتفاق سے رہنے اور ملک کو دشمنوں سے بچانے کی تلقین کر کے سلطان احمد ...

شکست فاش دینے کی غرض سے لاہور کو بڑھا۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں جہاں ۱۵۲۶ء میں بابر اور ابراہیم لودھی کی فوجوں نے خون سے ہولی کھیلی تھی۔ مقابل ہوئے۔ اگرچہ مرہٹوں کے مقابلے میں افغانوں کی جمعیت بہت کم تھی۔ مگر احمد شاہ کو اپنے قوت بازو اور اپنی فوج کی وفاداری پر پورا بھروسہ تھا۔ اس نے آخیر دم تک حریف سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پچھلی رات کو گھوڑے پر سوار ہو برق رفتاری سے اس نے اپنے دشمن کے لشکر میں چکر لگائے اور اچھی طرح سے محاذ جنگ کا ملاحظہ کر کے واپس اپنے کیمپ میں لوٹا۔ بیان کرتے ہیں کہ اس گردش میں احمد شاہ کو بقدر چالیس میل کے سفر کرنا پڑا تھا۔ صبح کو نماز ادا کی۔ اور خدا سے فتح و نصرت کی دعا مانگ طبل جنگ بجوا دشمن کے مقابلے میں جا ڈٹا۔ اکیس روز تک گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔ طرفین میں اس قدر خونریزی ہوئی کہ پانی پت کا میدان لالہ زار بن گیا۔ احمد شاہ قلب لشکر میں خود فوج کی کمان کر رہا تھا۔ ایک طرف اس کی بہادر اناں اور دوسری جانب اس کا کوکہ داد شجاعت دے رہے تھے۔ آخری دن جب فیصلے کا وقت قریب تھا۔ جنگ اس قدر خوفناک صورت اختیار کر گئی کہ دونوں طرف کے سورما سینے میں شرار اور جوش سے سراپا انتقام نظر آتے تھے۔ احمد شاہ نے تلوار چلاتے چلاتے جو بائیں طرف نگاہ کی۔ کوکہ کو نہ پایا۔ گھبرا کر اپنی اناں سے پوچھا۔ "ماں! بھائی کہاں ہے؟" ایک امیر نے جو اس سے حسد رکھتا تھا۔ بولا۔ "قبلہ عالم! ایسی گھمسان کی لڑائی میں وہ یہاں کیسے ٹھہر سکتا ہے کہیں پیچھے سر چھپاتا پھرتا ہوگا۔" اناں نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرج کر کہا۔ "احمد شاہ! میں نے اپنے بچے کو وضو کے بغیر کبھی دودھ نہیں پلایا تھا۔ وہ اپنے خداوند نعمت کے ساتھ دھوکہ نہ کرے گا۔" اتنے میں وہ مرد جانباز مرہٹہ سردار وشواس راؤ کا سر لے کر حاضر ہوا اور احمد شاہ کے قدموں میں ڈال دیا۔ مرہٹوں نے جب اپنے سردار کو نہ پایا تو وہ زیادہ دیر تک مقابلے میں نہ ٹھہر سکے۔ بھاگ نکلے اور رگھوبا سر پٹ بھاگتا اپنے ملک کو روانہ ہو گیا۔ اس شکست سے مرہٹوں کے حوصلے اتنے پست ہوئے کہ پھر ہندوستان کے شہنشاہ کا خیال انہیں خواب میں بھی نہ آیا۔ احمد شاہ دو لاکھ مرہٹوں کو قتل کرنے کے بعد دلی میں داخل ہوا۔ اگر وہ چاہتا تو دلی کے تخت پر بیٹھ جاتا مگر اس نے یہ تمام کوششیں مغل سلطنت کے بچانے کے لئے کی تھیں۔ اب اسے یہ تسلی تھی کہ مرہٹے سلطنت مغلیہ

[illegible]

ہلالِ عید شاعر کی نظر میں!

نظم

از: حضرت شفیق کوٹی

سزاوارِ ستائش ہے ہلالِ عید کی رویت
کہ لائی ہے پیامِ عید اس معمورۂ غم میں

مئے عشرت کی بارش ہے ہلالِ عید کی رویت
چھلکنے کو ہے جامِ عید اس معمورۂ غم میں

مگر اک غمزدہ کے حق میں یہ سب کچھ فسانہ ہے
کسی کروٹ کسی پہلو نہیں آتا قرار اس کو

ہلال اُس کی جنوں انگیزیوں کو تازیانہ ہے
نہیں آتا سکوں سامانیوں کا اعتبار اس کو

مہِ نو دیکھتے ہی چیخ اُٹھتا ہے مسرت سے
افق خاکہ اُڑا لائی ہے شاید اُن کی ابرو کا

کبھی خود سر جھکا کر یوں گلہ کرتا ہے قسمت سے
نہاں کیوں کر دیا ہے چاند تو نے میرے پہلو کا

یہ مانا آسماں پر حسن کے جلووں سے ہلچل ہے
مگر میری نگاہِ شوق دھوکا کھا نہیں سکتی

زرافشانی انہی کی خوشنما ساری کا آنچل ہے
یہ تابانی مہِ نو کو میسر آ نہیں سکتی

ہلالِ عید اِن ضبط آزما چالوں سے کیا حاصل
فریبِ عید انہیں دے ہوں جو اُن کی یاد سے غافل!

سونے کے کھلونے

افسانہ

جناب اختر ملیح آبادی

سامنے دالان میں نواب صاحب چاندی کی کرسی پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ سامنے فرشی حقہ جس کی چلم اور پیندہ چاندی کا تھا رکھا تھا۔ پیچھے شہناز کھڑی پنکھا جھل رہی تھی۔ پنکھے کی ڈنڈی سونے کی تھی۔ اور پنکھے پر ریشمی کپڑا سونے چاندی کے تاروں سے کڑھا ہوا چڑھا تھا۔ اس طرح نواب صاحب نقرئی دھول اور سنہری ہوا کھا رہے تھے۔ انہیں اس قدرتی ہوا سے نفرت تھی۔ جس میں گرد و غبار شامل ہوتا ہے۔ یا یہ جتانا مقصود تھا کہ وہ نواب تھے۔ اور بڑے آدمی ہر چیز میں امتیاز کر لیتے ہیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ وہ اوروں سے اونچے ہیں۔

نواب صاحب حقہ پر دم لگاتے تو اتفاقاً سے ہنسنے لگتے تھے کبھی کبھی وہ شہناز کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتے تھے کبھی آنکھ مار دیتے تھے۔ شہناز بھی نواب صاحب کی ہلکی مسکراہٹ کا جس میں جوانی کی شام چھپی ہوتی اپنی جوان اور رنگین مسکراہٹ سے جواب دیتی تھی۔ نواب صاحب کا سن پچاس سے تجاوز کر چکا تھا۔ رخسار کھل گئے تھے۔ چہرہ کی رونق جاتی رہی تھی۔ چہرہ پر جھریاں [illegible] نمودار ہو گئی تھیں۔ آنکھوں میں موتیا نے جال بننا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ابھی تک نواب صاحب کی طبیعت تیس برس کے نوجوان کی طرح تھی۔ وہ ہر وقت بنے سنورے اور رنگے رہتے تھے۔ مونچھوں میں خضاب اور آنکھوں میں ہر وقت سرمہ لگا رہتا تھا۔ اور شہناز ایسی نوخیز باندیوں کو بڑھاپے میں بھی گدگداتے چھیڑتے اور مسلتے رہتے تھے۔

چھوٹے نواب سامنے دری پر سونے کے کھلونوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ کھلونوں میں قسم قسم کے جانور اور پرندے تھے۔ [illegible] بھی تھیں۔ چھوٹے نواب کھیل میں ایسے منہمک تھے کہ [illegible] آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہی نہ تھے۔ نواب صاحب چھوٹے نواب کو کھیلتے دیکھ کر مسلسل ہنستے جا رہے تھے۔

نواب صاحب نے محلہ کے ایک غریب لڑکے کو چھوٹے نواب کے ساتھ کھیلنے کے لئے رکھ لیا تھا۔ رستم غریب ماں کا بیٹا تھا۔ جب وہ نواب صاحب کے یہاں آیا۔ تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ رستم اپنی [illegible] جھونپڑی اور تاریک کوٹھڑی [illegible] کی وسعت سمجھے ہوئے تھا۔ [illegible] آنکھیں [illegible] ہر چیز میں افراط۔ بڑائی۔ پاکیزگی اور نفاست موجود تھی۔

چھوٹے نواب سارا دن رستم کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ رستم خوش قسمت تھا۔ [illegible] چھوٹے نواب اس سے مانوس ہو گئے تھے۔ ورنہ [illegible] لڑکے آئے اور ان کی کسی سے نہ نبھی۔ چھوٹے نواب کی [illegible] تھا کہ رستم کو روٹی ملتی رہی اور اس کی غریب ماں کو بھی۔

چھوٹے نواب کی خوشی اور رضامندی کا ایک راز تھا۔ کبھی کبھی چھوٹے نواب [illegible] رستم کو [illegible] لگتے تھے اور رستم سر جھکا لیتا تھا۔ [illegible] خود چھوٹے [illegible] دوڑاتے تھے۔ دوڑنے کی [illegible] گھوڑا بنا کر [illegible] تھے۔ لیکن اس پر بھی رستم چھوٹے نواب [illegible] کو پورا [illegible] تھا۔ اگرچہ اسے روحانی اور جسمانی دونوں مصیبتیں اٹھانا پڑتی تھیں۔ لیکن وہ سب کچھ سہتا تھا۔ رستم اول تو غریب ماں کا لڑکا تھا پھر غریبی نے اسے سبق دیا تھا کہ امیر لڑکوں کی جائز اور ناجائز خواہشات کو پورا کرے۔ اس کے علاوہ جب کبھی رستم نے ذرا جرأت دکھائی تو اس پر وہ مار پڑی کہ توبہ بھلی۔ جب سے رستم نے کبھی انکار نہ کیا۔

اس کی ماں نے بھی اسے یہی نصیحت کی تھی اور ایک دفعہ شہناز نے بھی کہا تھا۔ چھوٹے نواب کو ناخوش نہ کرنا۔ ان کی ناخوشی [illegible] نقصان پہنچائے گی۔ انہیں خوش رکھو گے تو سب کچھ پاؤ گے۔ وہ جو کچھ کہیں وہی کرنا ——— اچھا ———!

——— (۲) ———

رستم جب چھوٹے نواب کے ساتھ کھیلتا تو سونے کے کھلونے دیکھ کر [illegible] میں کچھ سوچنے لگتا [illegible] اس نے اتنا سونا کبھی دیکھا نہ

دیکھا تھا۔ اس کی ماں کی ناک میں ایک سونے کی کیل تھی۔ جو اس کی بیماری میں بک گئی تھی۔ کھلونے دیکھ کر وہ سوچنے لگا۔ اگر یہ کھلونے مجھے مل جائیں تو میں بھی امیر ہو جاؤں۔ ہماری غریبی دُور ہو جائے۔

ایک دن رستم اپنی ماں سے کہنے لگا "اماں! چھوٹے نواب کے پاس بہت سے سونے کے کھلونے ہیں۔ کہو تو ایک دن کھلونا لا کر تمہیں دکھاؤں" رستم کی ماں نے کہا "نہیں بیٹا! ایسا کبھی نہ کرنا۔ کھلونوں کو چھونا تک نہیں سونا ہمارے لئے انگارہ ہے۔ ہم غریبوں کا خدا مالک ہے۔ وہی ہمیں کھانا دے گا۔ نیت کا ڈانواں ڈول کرنا گناہ ہے۔ خدا خفا ہو جاتا ہے بیٹا! کوئی ایسی بات نہ کرنا کہ لوگ کہیں غریب چور بھی ہوتے ہیں اچھا بیٹا"

رستم نے مرجھا کر جواب دیا "اللہ میاں خفا ہو جائیں گے۔ تو میں کبھی کھلونے چھوؤں گا بھی نہیں۔ چوری بُری عادت ہے۔ میں کبھی ایسا نہ کروں گا"

رستم لیٹ گیا اور اس کی ماں ہاتھ سے پنکھا جھلنے لگی تھوڑی دیر بعد رستم کام پر چلا گیا۔

(۳)

نواب صاحب کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ چھوٹے نواب بہت دعاؤں گنڈے تعویذوں کے بعد ابھی بڑھاپے میں ہوئے تھے۔ جب ہی سے چھوٹے نواب کے بہت لاڈ پیار ہوتے تھے۔ ان کی کوئی ضد ایسی نہ تھی جو پوری نہ جاتی ہو۔ وہ جو کچھ کہتے وہی ہوتا تھا۔ نواب صاحب کے ایک لڑکی نجمہ بھی تھی۔ یہ جوانی کی اولاد تھی۔ نواب صاحب نجمہ کو لڑکوں کی طرح چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کئی اولادیں بھی تھیں۔ جن کو اپنا کہتے شرماتے تھے۔ نجمہ کی شادی ایک خاندانی امیر اور تعلیم یافتہ لڑکے سے کر دی تھی۔ نواب صاحب نے جہیز کے علاوہ نقد روپیہ بھی دیا تھا۔ لیکن اس پر بھی مہدی کا منہ بند ہوتا نہ رہتا تھا۔ اور وہ روپیہ ہی مانگتا رہتا تھا۔ کئی مرتبہ تو مہدی کے مانگنے پر نواب صاحب نے مہدی کو روپیہ دے دیا۔ لیکن مسلسل مانگ پر وہ چپ ہو گئے اور انہیں مہدی سے نفرت ہونے لگی۔ کیونکہ وہ فضول خرچ نوجوان تھا ادھر روپیہ آیا ادھر اڑ گیا۔

نجمہ جب میکے آتی تو گھر میں خوب چہل پہل ہو جاتی تھی۔ گانا بجانا ہوتا۔ مہمان بلائے جاتے تھے۔ دعوتیں ہوتی تھیں —— آج کل بھی نجمہ آئی ہوئی تھی۔ وہ سال میں ایک مرتبہ گھر آ کر اپنے فضول خرچ شوہر کے لئے روپیہ لینے آتی تھی جسے وہ لے کر مہدی کو دیتی اور وہ

تھوڑا روپیہ نجمہ کے لئے ساڑیاں اور زیورات کے لئے چھوڑ کر سب کلب اور دوستوں کی نذر کر دیتا تھا۔

لیکن اب کے نواب صاحب خفا تھے۔ اب وہ سوچتے تھے کہ اگر اسی طرح روپیہ دیا جاتا رہا۔ تو چھوٹے نواب کے لئے کیا بچے گا۔ پھر وہ مہدی کی فضول خرچیوں سے بھی تنگ آ گئے تھے۔ اور اس پہ نجمہ اور مہدی دونوں خفا تھے۔

(۴)

صبح جب چھوٹے نواب نے کھلونے مانگے تو الماری خالی پڑی ٹی۔ پٹھانز نے اپنا سر پیٹ لیا وہ دوڑتی ہوئی بیگم کے پاس گئی بیگم ہ سنا تو حواس جاتے رہے۔ اب گھر میں کہرام مچا تھا۔ کھلونوں کی ری ہو رہی تھی۔ نواب صاحب کا چہرہ دھویں دھویں تھا۔ بیگم نے لگیں:۔

"غضب خدا کا اب تو گھر سے چیزیں چوری ہونے لگیں۔ گھر نہ ہوگیا ا ہوگیا۔ اس معاملہ کو دبانا نہ چاہئے۔ چور کو سزا ملنی چاہئے۔"

ادھر چھوٹے نواب کی بے قراری دیکھی نہ جاتی تھی۔ نواب صاحب ب ماماؤں کو بلایا۔ ان سے پوچھا۔ سمجھایا۔ لالچ دیا۔ اور پھر ی لیکن سب نے انکار کیا۔ آخر میں رستم کو بلایا اور کہنے لگے۔ ر سچ بولنا۔ نہیں تو ہنٹر سے کھال ادھیڑ دوں گا۔ بول ہے کھلونے یں؟"

رستم نے ڈر کر جواب دیا "خدا کی قسم میں نے کھلونے چھوئے تک نہیں ے معلوم کہ کس نے لئے ہیں یا کہاں ہیں؟"

لیکن نواب صاحب کو یقین نہ آیا۔ فوراً دو چار ہنٹر رسید کر دئے۔ گیا۔ لیکن وہی کہتا رہا جو کہے جاتا تھا۔ باہر جا کر نواب صاحب صاحب کو ٹیلیفون کیا۔ تھوڑی دیر میں انسپکٹر صاحب بھی ب صاحب نے سب حالات بتلائے۔ یہ سن کر انسپکٹر صاحب

رکی چوری ہے کسی خادمہ کا کام ہے۔" تحقیقات شروع ہوئی۔ بر ہوئی۔ وہ بھی دوڑی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ "بیگم صاحبہ! کام کیا تو اسے سزا ملنی چاہئے۔ اس نے میرا سر نیچا کر دیا۔" ات کے بعد بھی معاملہ حل نہ ہوا۔ بلکہ اور الجھ گیا۔ تب انسپکٹر صاحب رنگ بدل رہا۔ بڑی چھان بین کے بعد انسپکٹر صاحب نے دوسرے ساور مہدی کو بلا بھیجا۔ جوں ہی مہدی کمرے میں آئے نے کہا "گستاخی معاف ہو۔ یہ بتائیے کہ کھلونے کہاں ہیں؟"

مہدی نوابی کی شان میں آ کر کہنے لگا "آپ میری ہی ہتک نہیں کر رہے بلکہ نواب صاحب کی عزت پر بھی پانی پھیر رہے ہیں۔ آپ کو یہ کہتے شرم نہیں آئی؟"

"میرا بیس سال کا تجربہ ہے۔ اس طرح کی چوریوں میں گھر والوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میں نے جو کہا غلط نہیں کہا لیکن یقین مانئے کہ اس معاملہ کی کسی کو خبر نہ ہوگی۔ شکر کیجئے کہ میں اس جگہ پر ہوں۔ دوسرا ہوتا تو اس معاملہ کو عیاں کر دیتا۔ لیکن میں شریف ہوں اور شریفوں کی شرافت کا خیال رکھتا ہوں۔ اب سب کچھ بتا دیجئے۔ آپ کا راز میرے سینہ میں رہے گا۔ اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوگی"

یہ ہمدردانہ الفاظ اور پولیس کی چال میں آ کر مہدی نے سب حال کہہ دیا۔ سب کچھ سن کر انسپکٹر صاحب مسکرائے اور نواب صاحب کے کمرے کی طرف چلے گئے جہاں نواب صاحب عالمِ انتظار میں ٹہل رہے تھے

(۵)

جوں ہی دروازہ کھلا۔ انسپکٹر صاحب کو دیکھ کر نواب صاحب کھڑے ہو گئے۔ میز کے قریب آ کر انسپکٹر صاحب نے کہا "کھلونے مل گئے۔ گھر کی چوری تھی۔ رستم کا نہیں...... بلکہ مہدی صاحب کا قصور تھا۔ کل کھلونے بہت دور چلے جانے پھر نہ ملتے۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر صاحب چلے گئے۔ اور نواب صاحب کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ پھر نواب صاحب اندر گئے بیگم سے کانا پھوسی کرتے رہے۔ بیگم یہ سن کر رونے لگیں۔ کہ مہدی چور ہے۔ نواب صاحب نے انسپکٹر صاحب کی یوں تعریف کی:۔

"پولیس والوں میں صرف ایک نہایت اچھے آدمی مجھے ملا۔ نہایت شریف۔ با مروت۔ اور کوئی ہوتا تو .... کیا کرتا۔ کچھ وصول کر لیتا۔ شہر میں خبر کر دیتا۔ میری عزت خاک میں مل جاتی۔ لیکن انسپکٹر نے میری عزت محفوظ رکھی اور کسی سے ذکر تک نہ کیا۔"

نواب نے لفافہ میں انسپکٹر صاحب کو پانچ سو کے نوٹ رکھ کر بھیج دئے۔ اسی دن شام کو مہدی نجمہ کے ساتھ روانہ ہو گیا اور نواب صاحب نے ایسے روکا بھی نہیں۔

اب بھی چھوٹے نواب کھلونوں کے ساتھ کھیلا کرتے ہیں۔ جب نواب صاحب کی نگاہ سونے کے کھلونوں پر پڑتی ہے تو ان کی گردن جھک جاتی ہے۔ اور منہ سے آہ نکل جاتی ہے۔ اور مہدی کی تصویر نظروں کے سامنے ناچنے لگتی ہے۔

سازِ بے صدا

نہ ملا درد آشنا کوئی

از:- حضرت اعجاز صدیقی اکبرآبادی

کیوں کرے ترک آسرا کوئی / ناخدا کا بھی ہے خدا کوئی

دلستاں کوئی، دلربا کوئی / نہ ملا درد آشنا کوئی

اُس نے کھویا مجھے سرِ منزل / کیا کرے دل کو رہنما کوئی

حُسن کا بڑھ گیا غرور کچھ اور / ہو نہ مجبورِ التجا کوئی

بن گئی کائنات رقص تمام / لیکر انگڑائی جب اُٹھا کوئی

چھوڑ دیں ساتھ قافلے والے / ہو نہ اتنا شکستہ پا کوئی

سر کو رہنا نہ سنگِ در کا خیال / یوں نہ سجدہ ادا ہوا کوئی

نہ اُمیدیں نہ آرزو نہ خروش / دل بھی دل ہے بجھا بجھا کوئی

کب سے خالی ہے محفلِ منصور / نام لے کاش لے ترا کوئی

تارِ سازِ زندگی کے کانپ اُٹھے / یوں بھی مل کر نہ ہو جدا کوئی

دل بھی مجروح پاؤں بھی مجروح / کھیل ہے منزلِ وفا کوئی؟

ہے یہی انتہائے گم شدگی / کہ پھرے خود کو ڈھونڈتا کوئی

تم نے تارے تو چھپتے دیکھے ہیں / دل بھی دیکھا ہے ڈوبتا کوئی

عشق یوں ہے شکستِ دل کے بعد / جیسے ہو سازِ بے صدا کوئی

وہی وقتِ قبول ہے اعجاز / لب سے نکلے نہ جب دعا کوئی


دلروز
آنریبل ڈاکٹر
سر محمد ظفر اللہ خان صاحب
کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ دلروز کے متعلق فرماتے ہیں
"میرے بائیں بازو کا پھوڑا جو میں نے انجکشن کروایا
تھا مجھے پچھلے دو سال سے تکلیف دے رہا تھا۔ میں نے
اس پر کئی ایک دوائیں برتیں مگر سب بے فائدہ۔ میں تصدیق کرتا
ہوں۔ کہ دلروز کی دو چھوٹی شیشیوں نے اسکو بالکل اچھا کر دیا جس کے لئے
میں آپکا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں"
(ترجمہ از انگریزی)
آپ کو
معلوم نہیں!
کہ آپ ایک خطرناک فیصلہ کر رہے ہیں
اگر آپ اپنے جلدی روگوں کیلئے —
سرجنوں اور جراحوں کے نشتر میں شفا ڈھونڈتے ہیں
سرخ سپید زرد اور سبز مرہموں میں تسکین ڈھونڈتے ہیں
آپ کو لازم ہے۔ کہ اپنی اولین فرصت میں مقامی
دوا فروش سے دلروز طلب کریں۔ کیونکہ دلروز بغیر اپریشن ڈریسنگ اور نہانے
کی ممانعت کے تمام جلدی امراض سے نجات دلاتی ہے۔
قیمت فی شیشی:۔ دو روپیہ — ایک روپیہ — آٹھ آنہ
HAKEE
حکیم طاہر الدین اینڈ سنز دلروز والا۔ فیروزپور روڈ لاہور

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

ایک ترکی بچہ کا علمی ذوق

از جناب پیر غلام دستگیر نامی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی عہد جہانگیر کے فاضل اجل گذرے ہیں۔

علم دین کی ہندوستان میں جتنی خدمت انہوں نے کی ہے شاید ہی کا حصہ تھی کسی ہو۔ ان کی کتاب اخبار الاخیار جس کی تعریف جہانگیر نے بھی اپنے تزک میں کی ہے میرے زیر مطالعہ ہے۔ اس میں حضرت سید عبدالقادر جیلانی کے ذکر کے بعد جن سے ان کو خاص تعلق عقیدت ہے۔ آپ نے اس کتاب کو بزرگان ہندوستان کے حالات کے لئے مختص کیا ہے۔ اور اس میں ان کی تصنیفات و تالیفات مکتوبات و رسائل میں سے معاملات طریقت اور مکاشفات حقیقت وعظ و نصیحت پر مشتمل مضامین بھی درج فرمائے ہیں۔ طبقہ اول میں آپ نے خواجہ معین الدین اجمیری کو لیا ہے اور ان کے اہل عصر و خلفاء اور مریدوں کے ذکر کے بعد طبقۂ دوم میں شیخ فریدالدین گنج شکرؒ اور ان کے معاصرین کو رکھا ہے۔ اور طبقۂ سوم میں شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلویؒ اور ان کے اہل زمان کا ذکر کیا ہے۔ اور اسی طرح علی الترتیب اپنے زمانے تک تمام علما و صلحاء کے حالات درج کئے ہیں۔ اور آخر میں اپنے متعلق بھی روشنی ڈالی ہے اور یہی اس وقت ہمارا موضوع ہے۔

اجداد شیخ

شیخ عبدالحق محدث دہلوی قوم کے ترک ہیں۔ آپ کے اسلاف میں سے آغا محمد ترک بخاری بخارا سے سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد میں دہلی تشریف لائے۔ وہ چونکہ قبیلہ دار اور سردار قوم تھے اس لئے ان کے بعد ترک میں سے جماعت کثیر نے ان کے پیچھے اسی طرف کا رخ کیا۔ ان کو سلطان مذکور نے اپنے عہد سے ... کر آغا محمد کی بادشاہت میں ممالک گجرات اور بنادر کی تسخیر پر مامور فرمایا اور اس مہم کے انصرام کے بعد انہیں وہیں مقیم کر دیا۔ مگر ایک اور اہم مہم میں شریک تھا۔ ان کی بگڑ گئی اور بارگاہ سلطانی میں حاضر ہو گئے۔ بادشاہ نے دہلی ہی میں ان کو منصب جاگیر پر فائز فرمایا۔ سلطان قطب الدین اور تغلق شاہ کے عہد تک ان کی اولاد کی تعداد ایک سو ایک تک پہنچ گئی۔ مگر سب کے سب نقود ثابت عرصہ میں فوت ہو گئے۔ صرف ایک بیٹا جو سب سے بڑا تھا معزالدین نامی باقی رہا۔ اس صدمے سے آغا محمد کا دل لذات دنیا سے بیزار ہو گیا اور سیاہ لباس پہن کر شیخ صلاح الدین سہروردیؒ کی خانقاہ میں معتکف ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد شیخ موصوف نے بمقتضائے اشارۂ غیبی انہیں اہل و عیال کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دی اور بشارت دی کہ انشاءاللہ تمہارے بیٹے معزالدین سے تمہارا سلسلۂ اولاد تا قیامت قائم رہے گا۔ چنانچہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے ان سو متوفین کی نعمت انہی ایک کو عطا فرمائی۔ آغا محمد ترک ۱۰ ربیع الآخر ... کو رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ آپ کا مقبرہ عیدگاہ شمسی کے پس پشت ہے۔ معزالدین کو خدا نے ایک فرزند ملک موسیٰ عطا کیا۔ یہ صاحب فیروز شاہ کے عہد کے بعد کے واقعات سے دل برداشتہ ہو کر ماوراءالنہر کو چلے گئے۔ اور امیر تیمور گورگان کے ہمراہ پھر دہلی پہنچے۔ ملک موسیٰ کے ہاں جو متصف موصوف بیٹا پیدا ہوا اس کا نام شیخ فیروز تھا۔ شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ معنی ولایت و شعر و ظرافت در خانۂ ما از وے پیدا شد۔ یعنی ... زندگی سے علمی شغف ہمارے خاندان میں انہی سے شروع ہوا۔ آپ سلطان بہلول لودھی کے اوائل عہد میں دولت پدری اور فضیلت گستری کی داد دی اور سلطان شرقی اور سلطان بہلول کی لڑائی کا قصہ نظم کیا۔ اس میں سلطان حسین شرقی کی زبانی بہلول لودھی کو یوں مخاطب کرتے ہیں ؎

ایا قابض شہر دہلی شدہ ... حیانت چو خواہی زمیں جابرو
منم قابض ملک نا راستہ ... شہ داد مارا خدا راست ملک

شیخ فیروز حیرا غہ میں شہید ہو کر مدفون ہوئے۔ یہ ۸۶۰ھ کا واقعہ ہے۔ آپ کا مزار مرتا نام ہے۔ آپ کے بیٹے کا نام شیخ سعداللہ ہے جو محدث دہلوی کے دادا تھے۔ ان کو بادشاہ نے خدمات والد کی وجہ سے نوازا جب یہ سات آٹھ سال کے تھے نواسر نے فیم فراست

کا امتحان کرنے کے لئے چند اشرفیاں بستر پر رکھ دیں اور ان سے کہا کہ وہاں سے آئینہ اٹھا لاؤ۔ آپ نے واپس آ کر کہا کہ وہاں چند اشرفیاں بھی پڑی ہیں سو وہ بھی لے آؤں۔ بادشاہ نے فرمایا پڑی رہنے دو تمہیں کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے بعد کوئی جا کر اٹھا لے اور کہے کہ جو بچہ گیا ہے اس نے اٹھائی ہوں گی تو۔ بادشاہ نے اس کی عقلمندی کی داد دی اور رفتہ رفتہ والد ماجد کے درجے تک فائز کر دیا۔ آپ نے مصباح العاشقین شیخ محمد منگن کی بیعت کی اور اپنے بیٹے شیخ رزق اللہ (عم محدث دہلوی) کو بھی مرید بنایا۔ آخر آپ ۹۲۸ھ میں اپنے ہشت سالہ چھوٹے بیٹے شیخ سیف الدین سیفی (والد محدث دہلوی) کو بحالت یتیمی سپرد خدا کر کے واصل بحق ہو گئے۔

محدث دہلوی نے اپنے والد ماجد کے بزرگانہ اقوال کئی صفحوں میں قلمبند کئے ہیں۔ اور اپنے علم و فنون اور باطنی کی تربیت اور دعاؤں کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ یہ ایک علیحدہ مضمون ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ آپ نے حضرت شیخ سید موسیٰ گیلانی ملتانی کی بیعت کی اور محدث صاحب کو بھی انہی کے ارادت سے ممتاز فرمایا۔ آخر ۲۷ شعبان سنہ ۹۹۰ھ کو فوت ہوئے۔

ذہنی قابلیت

محدث صاحب فرماتے ہیں کہ میں تین چار سال کا تھا کہ والد بزرگوار کو ضعف پیری اور غمگسار دوستوں کے جدا ہونے کے رنج کی وجہ سے مرض شدید لاحق ہوا۔ اس وقت میں اُن کے اس درد فراق کی دوا تھا۔ مجھے آپ بزرگان دین کی باتیں سنا کر ان کے نقش قدم پر چلنے کی تعلیم دیتے رہتے۔ ان کی باتوں میں بڑا مزہ آتا۔ ان کی دعا سے خدا نے مجھے ایسا فہم عطا فرمایا کہ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب میں نے دو اڑھائی برس کے سن میں ماں کا دودھ چھوڑا تھا۔ مجھے آپ نے صرف دو تین جز قرآن کا سبق دیا۔ باقی میں نے خود دو تین ماہ میں ختم کر لیا۔ اور یہ کہنا مبالغہ اور جھوٹ نہیں کہ ایک مہینے میں میں نے لکھنا سیکھ لیا۔ اسی طرح انہوں نے مجھے چند جز بوستان، گلستان اور دیوان حافظ کے پڑھائے۔ اور میزان صرف یاد کرائی۔ اور مصباح تک نحو کی تعلیم دی۔ اکثر فرمایا کرتے کہ انشاء اللہ تعالیٰ توحید دانشمند بن جائے گا۔ اور یہ کہ مجھے اس تصور سے بڑا نشاط حاصل ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ تجھے اُس کمال تک پہنچائے گا جو میرے خیال میں ہے۔ اور میں حالت ضعیفی میں تیرے درس پر تکیہ کئے بیٹھا ہوں گا۔ کبھی مجھے فرماتے کہ ہر علم تھوڑا تھوڑا پڑھ لے۔ انشاء اللہ برکت و سعادت کے باب تجھ پر ایسے مفتوح ہوں گے کہ تمام علوم پر تجھے پوری دسترس ہو جائے گی۔ چنانچہ بارہ تیرہ سال کے سن میں میں نے شرح شمسیہ، شرح عقائد پڑھ لی، اور پندرھویں سولہویں سال مطول اور مختصر۔ اور الحمد للہ کہ ایک سال یا اس سے کچھ دن اوپر لگا کر ایسی نعمت حاصل کی جس کے ایک ایک حرف کا شکر یہ سو سال میں بھی ادا نہیں ہو سکتا یعنی قرآن مجید حفظ کر لیا۔ الغرض سات آٹھ سال میں میں نے عربی میں منطق و کلام وغیرہ علوم پر عبور حاصل کر لیا۔ اثنائے درس میں اگر استاد سے کسی امر پر بحث ہوتی۔ تو وہ میرے جواب سے مطمئن ہو کر فرماتے کہ ہم تم سے مستفید ہوتے ہیں۔ اور ہمارا کوئی احسان نہیں خداوند وہ کیسا شوق تھا اور کیسی طلب تھی۔ اگر میں وہی ذوق و شوق طلب مولا اور ریاضت باطنی میں ظاہر کرتا تو کتنے درجے پر پہنچتا۔

غرض تحصیل علم

ایک دن طالب علم اکٹھے بیٹھے تھے۔ سوال پیش ہوا کہ جس غرض سے علم حاصل کرتے ہو۔ بیان کرو۔ بعض نے تصنع سے کام لے کر کہا کہ ہمارا مقصد معرفت الٰہی کی طلب ہے۔ بعض نے سادگی اور راستی سے کہہ دیا کہ تعلیم کی غرض حصول مال دنیا ہے۔ میں اس وقت کافیہ سے بھی ہلکی کتاب پڑھتا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ میں نہیں بتا سکتا کہ تحصیل علم کر کے معرفت الٰہی مترتب ہوگی یا لہو و لعب کا سامان۔ اس وقت تو مجھے شوق یہ ہے کہ معلوم کروں کہ متقدمین علماء عقلاء نے جو گزر چکے ہیں کیا کہا ہے۔ اور رشتہ حقیقت اور معقولات مسائل میں کیا موتی پرو دئے ہیں۔ یہ جاننے کے بعد کیا حالت ہو۔ معلوم نہیں رضائے نفسی میں پڑ جاؤں یا محبت مولیٰ میں۔ دنیا کی طرف رغبت ہو یا عقبیٰ کی جانب۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مشاغل عہد طالب علمی

محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ایام طفولیت کی ابتدا ہی سے مجھے خبر نہیں کہ کھیل کیا ہے۔ اور نیند کسے کہتے ہیں مصاحبت کیا ہوتی ہے۔ اور آرام و آسائش اور سیر و تفریح کس چیز کا نام ہے۔

شب خواب چہ و سکوں کدام است
خود خواب بعاشقاں حرام است

علم کے شوق میں نہ کبھی وقت پر کھانا کھایا اور نہ سویا بلکہ گرمی میں دہلی کے مدرسے میں جو گھر سے دو میل پر تھا، ہر روز دو دفعہ آتا جاتا اور درمیان میں چند لقمے کھانے کو آتا تاکہ حرکت ارادی قائم رہے۔ صبح سے بہت پہلے مدرسے پہنچ جاتا اور چراغ کی روشنی میں مطالعہ اور بحث و تکرار کا ماحاصل اور شروح و حواشی کا مفاد معرض تحریر میں لے آتا۔ رات کا زیادہ اور دن کا کچھ حصہ مطالعہ میں اور رات کا کچھ اور دن کا اکثر حصہ کتابت میں بسر ہوتا۔ ماں باپ کی خواہش رہتی کہ میں بھی محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیلوں کودوں اور رات کو مقررہ وقت پر سو رہوں۔ میں کہتا کہ کھیلنے سے غرض یہی ہے تاکہ دل خوش رہے اور میرا دل مطالعہ ہی میں خوش رہتا ہے۔ لڑکوں کو پڑھنے اور مکتب نہ جانے پر جھڑکا جاتا اور مجھے برعکس خطاب ہوتا۔ اکثر اوقات اثنائے مطالعہ میں آدھی رات سے زیادہ گزر جاتی۔ والد ماجد فریاد کرتے کہ "بابا کیا کرتے ہو" میں لیٹ جاتا تاکہ جھوٹ نہ کہوں اور عرض کرتا: سو رہا ہوں۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ پھر اٹھ کر مشغول مطالعہ ہو جاتا۔ کئی بار پگڑی اور بال چراغ کی لو کی لپیٹ میں آ گئے، اور مجھے جب خبر ہوتی جب گرمی حجرۂ دماغ میں پہنچی ؎

چہ دودہائے چراغے کہ در دماغ نہ رفت
کدام بادۂ محنت کہ در ایاغ نہ رفت
کدام خواب و چہ آسائش و کجا آرام
چہ خارہا کہ بر بستر فراغ نہ رفت
بجیرتم ز دل خود کہ عمر رفت ولے
ز کنج غمکدہ ہرگز بصحن باغ نہ رفت

والد بزرگوار نے جو کثرت صلوٰۃ و اوراد و شب خیزی اور مناجات کی طفولیت سے عادت ڈال رکھی تھی، اس میں مشاغل تحصیل علم کو مخل نہ دیکھ کر لوگ حیران ہوتے تھے۔ یہ سب توفیق الٰہی کی کارسازی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری ہمت کیا۔

یہ بھی خدائے قدوس کی مہربانی ہے کہ مجھے کسی نیک و بد سے کام نہیں۔ کسی بندے کی طرف سے دل میں کدورت نہیں۔ دل اہل و آل کی مصاحبت سے فارغ ہے۔ بلکہ جب ترکیب نحو میں ضرب زید عمرو (زید نے عمرو کو مارا) پڑھتا ہوں، اس سے بھی دل میں ملول پیدا ہوتا ہے ؎

صد شکر کہ با ہیچ کسم کارے نیست
وز من بدل ہیچ کس آزارے نیست
گر بر دل دشمناں ز من بارے نیست
بر خاطر دوستان من بارے نیست

والد ماجد کی وصیت تھی کہ بیٹا ملائے خشک اور ناہموار نہ ہو۔ اسی ارشاد کی بجا آوری میں میں نے دل میں جذبۂ عشق و محبت پیدا کیا اور طریق غربت و دردمندی میں قدم رکھا ؎

بے درد نہ ایم ہرگز از عشق   دائم دل دردناک داریم

اس سے آگے مولانا حقی (تخلص محدث دہلوی) تلاش پیر اور آخر حضرت سید موسیٰ ملتانیؒ سے بیعت کرنے کا حال لکھتے ہیں جو ۹۸۵ھ میں واقع ہوئی۔ پھر ۹۹۵ھ میں عزیمت سفر حج اور وہاں سے ۱۰۰۰ھ میں واپس آنے کا ذکر کرتے ہیں۔ آخیر میں اپنی طویل منظوم مناجات رقم فرماتے ہیں اور کتاب کو اس قصیدہ پر ختم کرتے ہیں جو آپ نے مدینہ منورہ میں حاضر ہو کر سید کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کے حضور پڑھا۔ اس کا مطلع ہے ؎

الا اے دل دست اشتیاقی خود ترک دعوے کن
مے ذوق چشم برصورت نظر در عین معنے کن

اور مقطع ؎

بیا حقی بدہ تصدیع خدام جنابش را
کہ احوال تو معلوم . . . است

(اٹھ گئے ہیں)

بقسمت باش راضی دم مزن الا بشکر حق
سکونت درز و تسکین دل خود را مہیا کن

تاریخ نقل کتاب محرم الحرام ۱۰۲۷ھ جلوس عالمگیری بوقت عصر روز پنجشنبہ بخط سید فاضل جونپوری بحسب فرمودۂ حقائق آگاہ معارف دستگاہ شاہ عنایت اللہ نبیرہ سلطان العارفین برہان العاشقین مخدوم شاہ محمد چشتی درج ہے۔

— — —

تسطیر

بر اشعار حضرت اقبال رح

از:۔ حضرت محمود اسرائیلی

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا — نگاہِ ہر بوالہوس سے چہرہ پر پوشوں کا فگار ہوگا
وہ شمع ہجراں خموش ہوگی جو روح تھی جسم عاشقی کی — سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے — نہ کچھ رہی منزلت رہیگی نہ اب وہ مے کا وقار ہوگا
نہ کوئی پوچھے گا نوعِ بادہ نہ کوئی دیکھے گا ظرفِ میکش — بنے گا سارا جہاں میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کہ جنسِ ناکارہ بیع کرنے کا بھی تمھیں اختیار ہوگا
خرد نے ذوقِ نظر کو بدلا نظر نے جوہر محک کے بدلے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی — جلیں گے پانی پہ نار ریڈیو زمیں پہ بم شعلہ بار ہوگا
ہے اس کے رخ پر ہوس کا جلوہ ہوس کا گلشن نظر کا دھوکا — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا — خدا کے ہوتے تو ناخدا کی نگاہ میں یہ نہ خوار ہوگا
عمل کی طاقت رگوں کے تاروں میں دوڑ جائیگی برق بن کر — ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے — کسی کو دیکھو گے مست و بیخود تو کوئی سینہ فگار ہوگا
ہے شرطِ الفت تو یہ کہ محبوب کی ہو ہر شئے نظر میں پیاری — میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

نفرت!

اگر کوئی سوال کرے سب سے بڑا کون سا دُکھ ہو سکتا ہے؟ تو
یقیناً یہی جواب دینا پڑے گا کہ محبت کے جواب میں نفرت ملے۔
نہ جانے کتنی زندگیاں اس جذبہ نے پھونک ڈالی ہوں گی!!
اخلاق کا صرف نام ہی اخلاق نہ تھا وہ حقیقی اخلاق کا مجسمہ
تھا۔ اس کی بیوی؟ پناہ خدا۔ شاہانہ۔ سب سے اخلاق محبت
سے بات کرتا تھا۔ ہر وقت شیرنی کی طرح غراتی رہتی۔ شباب کے قیمتی
سال گزر گئے۔ ہر واقعہ جو بھی گزرا ایک طرف سے رومان انگیز
دوسری جانب سے نفرت آمیز!
شادی جب ہوئی تو اخلاق کو معلوم ہوا کہ ہونے والی دلہن کو
وزن بہت پسند ہے اس سے پہلے رونمائی میں انگوٹھی
پیش کرتے ہوئے کہا۔
شاہانہ۔ میری حیات شاہانہ یہ انگوٹھی تمہیں محبت کی پہلی یادگار
پہنا رہا ہوں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ رکھا ہے سامنے میز پر گلہ خون
تمہارے لئے لیا ہے۔ تمہارے پھول سے نازک ہاتھ اسے
پہنے ہوئے کتنی حسین معلوم ہوتی ہو!"
حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ شاہانہ بہت حسین نہ تھی چہرہ پر چیچک کے
نشان۔ گندمی رنگ۔ قد ضرورت سے زیادہ لانبا جسم بالکل
بے ڈول۔ اتنی دُبلی کہ ناگوار معلوم ہوتا آنکھیں چمکدار جن میں
کی جھلک نمایاں۔
جب شاہانہ بیمار پڑ گئی تو اخلاق کا یہ عالم تھا کہ نہ سر کا ہوش
پیر کا۔ بس ہر وقت بیوی کا تیماردار بنا بیٹھا رہتا۔ ڈاکٹروں
سینہ کو نمونیہ ہے اور اندیشہ ناک۔ ذرا تیمارداری بچا دے
لیکن جناب کی یہ شان کہ بھوک بھی لگتی تو پلنگ کے پاس
اُلٹے سیدھے کھا لیتے راتیں آنکھوں میں گزار دیں بیر سری
لیکن ہر بلانے والے کو ملنے والے کو صاف انکار سا گر بادل
وقت اٹھے بھی تو معذرت کر کے پھر آ بیٹھے۔
کی حالت بہت کمزور تھی۔ ان کا دل ہر وقت بیٹھا جاتا

حسرت انجام کہانی

از محترمہ شفیق بانو نجیب آبادی

تنہا۔ بُرے بُرے وہم دل میں آتے ہیں آہستہ آہستہ بالوں کا الجھاؤ
سے سلجھاتے ہوئے کہتے۔ میری شاہانہ ۔ میری جانِ زندگی۔ تم اچھی ہو جاؤ۔ جس طرح ہمایوں نے بابر بادشاہ کے گرد
چکر لگا کر دعا کی تھی میں بھی اس کے لئے تیار ہوں۔ تمہارے بعد
زندہ رہنا میں زندگی کی توہین سمجھتا ہوں۔ میں تباہ ہو جاؤں گا۔
تم میرے دل کا کھلا ہوا پھول ہو۔"
جواب میں شاہانہ نے رُخی سے کہتی "بس یہ جھوٹی تسلیاں
رہنے دو۔ مرد تو بہت مکار خود غرض اور بے وفا ہوتے ہیں۔ بڑی بوڑھیوں
کا تجربہ غلط نہیں ہو سکتا۔ کتابوں میں بھی یہی پڑھا ہے۔ اور اکثر
عورتوں کو آنکھ سے بھی دیکھا کہ ساری عمر وفا کرتی رہتی ہیں اور
جفا سہتی رہتی ہیں۔ اگر خدا عقل دے تو عورت بس یقین ہی نہ کیا
کرے۔ اور محبت کو کوئی صحیح جذبہ نہ سمجھے تو کبھی دل کو تکلیف نہ اٹھانی
پڑے۔ مثال بے سود۔ دُور کیوں جاؤ۔ بیچاری خالہ عطیہ کی لڑکی جو
بے شمار جہیز لے گئی۔ صورت شکل بھی اچھی ہے۔ عادت ایسی کہ
غیروں کو پیار آئے لیکن میاں ہیں کہ سایہ سے بھی بیزار۔ کئی کئی
دن گھر میں بھی نہیں گھستے۔ میں نہ ہوتی اس کی بیوی۔ جوتے
لگاتے لگاتے ہوش بھلا دیتی" اخلاق نے ہنستے ہوئے کہا "خدا نے
بڑی خیریت کی۔ جو تم اس کے حصہ میں نہ گئیں ورنہ میں اپنی شاہانہ
کو کہاں پاتا۔ جانِ من تم بہت بدگمان ہو۔ میں ہر قسم کھانے کو تیار
ہوں۔ کہ میں صرف تمہارے لئے ہوں تم بیمار ہو تو ساتھ ہی میرا دل
بیمار۔ تم خوش ہو تو میں بھی خوش ورنہ مرجھا جاتا ہوں تمہاری ہر
تکلیف سے مجھے روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ تمہاری ہر خواہش کو پورا پورا
کر دوں۔ میری زندگی کا مقصد صرف اتنا ہے کہ کسی طرح تم پر نثار کر دوں۔
جائداد بغیر تمہارے کہے جو کچھ بھی تھی تمہارے نام کر چکا۔ جو کچھ آمدنی ہے وہ
تمہاری رضا کے بغیر کبھی اپنی دوا پر بھی ایک پیسہ خرچ نہیں کرتا جن چیزوں
سے تمہیں دلچسپی ہے وہی مجھے کو پیاری۔ خدا کی قسم جس میں تم خوش ہیں
میں اسی میں راضی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے جھک گیا۔ اور اشک آلود نگاہوں سے شاہانہ کو دیکھا ظالم نے مسکرا کر منہ پھیر لیا۔ اخلاق کو یہ ادا بھی بہت پسند آئی اور گھنٹوں سوچتا رہا۔ "قدرت کا یہ الوکھا مذاق۔ جو دل پہ جان دے اسے جھوٹا سمجھا جائے۔ اور جو ٹھوکریں لگائے اس کے پیچھے بھاگتے چلے جائیں۔

جس وقت بھی مقدموں سے فارغ ہو کر گھر میں گھستے تو یہی پوچھتے ہوئے۔ ارے گلزاری بیگم کدھر ہیں؟ —— ابے چھیدو بہرا ہو گیا کیا؟ ہانہ کہاں ہیں؟

حضور مجھے کیا معلوم۔ تھوڑی دیر ہوئی آپا جانی آئی تھیں۔ ان کے ساتھ چمن کی طرف جاتے دیکھا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ میں خود ڈھونڈ لوں گا۔ نالائق ہو تم سب۔ زندگی کی کتاب آدھی ہو چلی۔ ۲۵ سال کی عمر میں شادی۔ بیس سال ساتھ رہتے ہوئے۔ ہنوز محبت کے دو لفظوں سے محروم۔ دو میٹھے لفظوں سے محروم۔

اگر سوتے سوتے کبھی شاہانہ خواب میں بھی کراہتیں یا کروٹیں بدلتی تو اخلاق فوراً مضطرب ہو کر چیخ اٹھتا۔ "کیوں کیا بات ہے شاہانہ؟ تمہیں کیا ہوا؟ بے چین کیوں ہو میری شاہانہ!"

جواب میں بس "اوں ہوں کچھ نہیں۔ سونے بھی تو نہیں دیتے۔" کہکر کروٹ بدل لیتی۔—

اگر انسان صبر سے کام لے تو ہر بات کا کچھ نہ کچھ انجام دنیا ہی میں مل جاتا ہے۔ لیکن بعض بدقسمت باغ لگاتے ہیں۔ لیکن پھل سے محروم چلے جاتے ہیں۔ اخلاق بھی شاید ایسی قسمت لے کر آیا تھا۔ پیشہ بیرسٹری بیوی کا یہ عالم کہ جو نوکروں نے پکا دیا وہ کھا لیا۔ خود دیکھنا کیا معنی۔ پوچھا بھی نہ تھی۔ گرمی کے دن تھے۔ اخلاق تھکا ہوا آیا۔ آتے ہی کھانا کھا لیا۔

کھانا کھاتے جاتے نوکروں سے کہا سالن بچا یا کیا حالت۔ کھانا کھاتے ہی دل برا ہوا۔ الٹی کی۔ ایک دو تین۔ تھوڑی دیر میں سر چکرایا۔ اور پلنگ پر گر پڑا۔ ڈاکٹر حکیم سب آ گئے۔ لیکن مجبور محض۔ قدرت کی طرف سے سب سے بڑے ڈاکٹر موت کا ہاتھ آگے بڑھ چکا۔ مریض دعا اور دوا سے بے پروا خدا کی طرف واپس جا رہا تھا۔ مرتے مرتے بھی یہی خواہش تھی کہ شاہانہ سامنے ہو۔ آواز مشکل سے نکلتی۔ بس یہی شاہانہ تم کدھر ہو؟ ادھر آؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ میں اچھا ہو جاؤں گا؟ دعا کرو تمہارے دل کی آواز خدا ضرور سنے گا۔ ارے آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آتا جا رہا ہے۔ تم کہیں مت جاؤ۔ میرے پاس رہو۔"

ڈاکٹر حکیم سر جھکائے واپس چلے گئے۔ سکرات شروع ہو چکی تھی۔ موت زندگی سے جھگڑ رہی تھی۔ مریض ہاتھ پیر پٹخ رہا تھا۔ شاہانہ کچھ بے دلی سے بیٹھی رہتی۔ کبھی اٹھ کر گھر کے دوسرے کمروں میں چلی جاتی۔ گھر کی رونق لٹ رہی تھی۔ مکان سے مکین چھوٹ رہا تھا۔ یہ وقت تھا کہ غیروں کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اندر اندر سب کے دل کبوتر کی طرح لوٹ رہے تھے۔ آخر کار موت اور قریب آ گئی۔ اخلاق نے کر پکارا "شاہانہ" ادھر آؤ۔ شاہانہ سامنے آئی۔ اخلاق نے کچھ غور سے دیکھا۔ شاہانہ مطمئن تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اخلاق نے ہاتھ میں لیا۔ حس جذبات سے خالی۔ انسانیت سے محروم۔ نفرت سے معمور۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ بولنے کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔ شاہانہ پھر دوسرے کمرے میں جا کر آرام کرسی پر پڑ گئی۔ گویا مرنے والے سے نہ دنیا آباد تھی: ہو رہی ہے۔ مریض کو پھر الٹی ہوئی یہ آخری تکلیف تھی چاروں طرف دیکھا اور لیٹنے کے بجائے بے پروائی آرام کرسی پر گر پڑا۔ ادھر سے گو کوئی بے جان چیز ہو۔ سب دوڑ پڑے ہاتھوں ہاتھ اٹھایا۔ سہارا دے کر لٹایا۔ اخلاق کی زبان پر بس اتنا ہی آیا۔ "اللہ مجھے معاف کر میری توبہ۔ ہائے اللہ۔" آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ سب رونے لگے۔ شاہانہ بھی چیخوں کی آواز سن کر دوڑی۔ لیکن اب کیا رکھا تھا۔ ہلکی سی ایک ہچکی کے ساتھ گردن ڈھلک گئی۔ شاہانہ پکارنے والا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ جو ہر بات پر بحث کر کے دنیا کو زیر و زبر کر سکتا اس سے اپنی محبت کی بحث نہ کی گئی۔ وہ اس مقدمہ میں پورا ناتوان ہار گیا۔ دنیا سے بے چارہ ناکام واپس چلا گیا۔!!

شاہانہ جس نے شاید دل کا آپریشن کرنے کے بعد شادی کی اب بھی اسی شان سے مغرورانہ انداز سے محبت کے پھول کچلتے بے نیاز زندگی گزارنے لگی۔ جیسے اخلاق کی موت ایک بہت معمولی واقعہ تھا۔ چمن لٹ گیا۔ لیکن باغبان کو احساس تک نہ ہوا۔—!

وہ عورتیں جو اپنے اپنے شوہروں کی وفادار جاں نثار تھیں۔ یہ واقعات دیکھتے بھی اور سنتے بھی۔ ایک گہری آہ کے ساتھ زیر لب ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ کہا۔ "کاش ایسا قدردان شوہر ہمارا ہوتا! اُف ہے ایسی محبت پرست ہستی ہمیں ملتی جو مر کر دکھا دیتے۔ افسوس ایسا پروانہ ہماری قسمت میں ہوتا تو ہم شمع بن کر جلتے رہتے۔ اگر یقین ہو جاتا کہ میرا شوہر مجھ سے اتنی شدید انسیت رکھتا ہے تو اس کی موت اپنے سینہ میں خنجر بھونک کر ساتھ ہی جان ختم کر دیتی۔ خدا جوہری کو دیکھ کر "ہیرا" دیا کرتا۔ جو کم از کم پتھر اور ہیرے میں فرق سمجھ سکتا۔!!

تخیّل

نظم

جناب پنڈت اندرجیت شرما

ستارہ صبح کا گردوں پہ جھلملاتا تھا — فسونِ ناز سے فتنہ نیا جگاتا تھا
نظر جو اُس پہ گئی ایک شاہزادے کی — تو آگ دل میں بھڑکنے لگی ارادے کی
وفورِ شوق میں کہنے لگا ستارے سے — فضائے عالمِ بالا کے ماہ پارے سے
نہ ہوگی صرف زمیں میری حکمرانی میں — کروں گا راج میں دنیائے آسمانی میں
بنوں گا مالک و مختار لعل و گوہر کا — خطاب پاؤں گا جاں بخش و روح پرور کا
زمیں کے تخت پہ آجا فلک کے منظر سے — بنا دے گھر کو منور چمک کے منظر سے
چھپا کے رکھوں گا تجھکو میں اپنے سینے میں — رہے گا عالمِ باطن کے تو خزینے میں!
بنوں گا شاہ تو پھر تاج میں لگاؤں گا — جہاں کو تیری ضیا پاشیاں دکھاؤں گا

ستارہ ہو گیا اتنے میں یوں نظر سے نہاں
جہاں سے پھیر لے مُنہ جیسے بے نیاز جہاں

محل کے پاس مگر اک غریب لڑکا تھا — نحیف و زار و حزیں بدنصیب لڑکا تھا
نگاہ اس کی پہنچی اسی ستارے پر — مچل کے رہ گیا دل اس کا بھی شرارے پر
کہا کہ بھوک نے ناچار کر دیا مجھکو — جہاں کی زیست سے بیزار کر دیا مجھکو
زمیں پہ آ، ترے پہلو میں گھر بناؤں گا — لگی ہے آگ جو دل میں مرے، بجھاؤں گا
ڈھایہ کہہ کے جو آگے تو گر پڑا افسوس — پیام موت کا گرتے ہی آگیا افسوس

ستارہ چرخ پہ لیکن وہ ٹمٹماتا تھا
تڑپ کے اشک غم و رنج میں بہاتا تھا

واپسی

دلگداز افسانہ

از جناب سید محمد یونس ہاشمی ٹانڈوی

سعید بے چین تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ سورج اپنی سفید کرنوں کو جلد سے جلد سرخیوں میں تبدیل کر دے۔ لیکن زمانہ کی بیقراری سے سورج کو واسطہ؟ وہ اسی دھیمی رفتار سے اپنا فرض انجام دے رہا تھا۔ سعید نہایت بیقراری سے ٹہل رہا تھا۔ رہ رہ کر اس کی نظریں سورج کی طرف پڑتیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ جب سورج کی سنہری کرنوں سے آخری بار ہمکنار ہو رہا تھا۔ سعید کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ روزی برآمدے سے نکل کر باغیچہ کی طرف آ رہی ہے۔

روزی ہلکے دھانی رنگ کی ساڑھی پہنے تھی۔ اس کے گورے گورے چہرہ پر سرخیاں کھیل رہی تھیں۔ سعید باغیچہ میں ہو رہا۔ روزی نے اپنی ملکوتی آنکھوں سے مسکرا کر سعید کو دیکھا۔ سعید کے بدن میں ایک بجلی سی کوند گئی۔

دونوں باغیچہ کے اسی کونہ میں بیٹھ گئے جہاں روزی نے پہلی بار مسکراتے ہوئے سعید کو وہ کتاب دی تھی جسے اشفاق نے شرارتاً باغیچہ میں پھینک دیا تھا۔

"آپ تو بہت پہلے آجاتے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں۔ آپ کو خیال نہیں"۔ روزی نے جھینپتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ اس کی آنکھوں میں حیا تھی۔ کہنے کو فوراً ہی بعد وہ خوفزدہ ہو کر سوچنے لگی کہیں اس جملہ سے سعید خفا تو نہ ہو جائیگا۔

سعید کا دل دھڑکنے لگا وہ اپنی غلطیوں پر نادم ہو کر جواب نہ دے سکا۔ البتہ مشکوک نگاہوں سے روزی کو دیکھا۔ دفعتاً روزی نے بھی دیکھا۔ نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں۔ دونوں کا دل دھڑکنے لگا۔

محبت کتنی معصوم اور نادان ہوتی ہے۔ سعید کی اس بات۔ روزی کا ننھا سا دل ڈر رہا تھا۔ کہیں وہ خفا تو نہیں۔ سعید کی پیشانی پر بھی پسینہ آگیا تھا۔ محبت کی یہی پر کیف منزل ہے جب دلوں میں ایک معصوم خوف رہتا ہے۔

اطمینان ... ق کے بعد سعید نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"روزی تمہارے اسکول کی ہیڈ مسٹرس کے بارے میں بہت سی باتیں سننے میں آتی ہیں"۔

"ہاں بیچاری کو"۔ روزی نے جواب دیا۔

"یعنی" سعید نے پوچھا۔

"انہیں انسپکٹر صاحب سے کچھ ہمدردی ہے"۔ روزی نے جھینپتے ہوئے کہا۔ نہ جانے کیوں وہ محبت کا نام لیتے ہوئے ڈرتی تھی۔ اور اس نے محبت کے بجائے ہمدردی استعمال کی۔ سعید نے اس جملہ میں ایک لذت محسوس کی۔ اس کے دل میں ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔ اور اس نے دلیری سے پوچھا "اچھا روزی! یہ بتاؤ ایک شخص کو دوسرے شخص سے ہمدردی کیوں ہوتی ہے؟" اس جملہ کو کہتے ہوئے سعید کو ایک جھجھک اور کچھ گدگدی سی محسوس ہوئی۔

روزی شرم سے عرق عرق ہو گئی اس نے گھبرا کر باریک آواز میں نگاہیں نیچی کر کے کہا۔

"میں کیا جانوں" آواز میں معمولی سی خفگی کے آثار تھے۔

سعید ڈر گیا۔ اس نے سوچا شائد روزی خفا ہو گئی۔ وہ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

روزی نے سعید پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پھر سر نیچا کر لیا۔

"تم مجھ سے روزانہ کیا سوچ کر ملتی ہو؟" سعید نے امتحاناً پوچھا۔ اس کا دل اچھل رہا تھا۔ اس سوال میں اسے خاص خوشی محسوس ہوئی۔

روزی کی حالت اس جملہ سے کچھ ایسی متغیر ہو گئی گویا وہ اس جملہ کو سننے کے لئے قطعی تیار نہ تھی۔ شرم و حیا کا ایک سیلاب اس کے بدن میں سرایت کر گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی ملکوتی آنکھیں نم تھیں۔

سعید نے اپنا حوصلہ اتنا بڑھا لیا تھا مگر انجام کی خبر نہ تھی سر میں چکر آ گیا۔ دل میں دھڑکن۔ وہ بدحواس ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"روزی! روزی!" اس نے روزی کی باہیں پکڑتے ہوئے کہا۔

روزی کی ملیح اور ملائم باہوں کو چھوتے ہی سعید کے بدن میں ایک نامعلوم سی لذت دوڑ گئی۔ ایک لمحہ کیلئے اس کے دل و دماغ پر ایک کیفیت سی چھا گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ ایسا لطف و سرور زندگی میں کسی بھی معاوضہ سے نہیں مل سکتا۔ اپنی نازک اُنگلیوں سے روزی نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ ایک اور نئے قسم کی لطافت دوڑ گئی۔

روزی ٹھہر گئی۔ سعید کی آنکھوں نے موتیوں کے دو تین قطرے گرائے۔

"بیٹھ جاؤ"۔ سعید نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا۔

محبت کا یہی سب سے رومان انگیز دور ہوتا ہے جب احساسات و جذبات پھولوں کی نکہت کی طرح کلیوں کی آغوش میں چھپے رہتے ہیں۔

"تو میں اب کل سے نہ آؤنگا؟" سعید نے مغموم آواز میں پوچھا۔

روزی چونک پڑی "کیا آپ خفا ہوگئے؟ آپ کیوں نہیں آئیے گا؟" اس نے لرزتی ہوئی زبان سے پوچھا۔

مسرت کا دریا محبت کی وادی میں موجزن تھا جس سے ایک خمار آگیں نغمہ پیدا ہو رہا تھا۔ محبت کی صبح جلوہ ریز تھی سعید اور روزی میں اتنا ہی قرب ہو چکا تھا جتنا سنگ پر دو بیقرار دھاروں میں۔ سعید کے ان آنسوؤں میں نہ جانے کون سا اثر تھا کہ اس روز تمام رات روزی کروٹیں بدلتی رہی اُسے ایک نامعلوم سی خوشی اور غیر محسوس سی الجھن تھی۔ رہ رہ کر اُسے انگڑائی آتی تھی۔

روزانہ شام کو دونوں باغیچہ میں بیٹھ کر محبت کی بہاروں میں کھوئے رہتے۔ بڑھتی ہوئی محبت کی بھی ایک حد ہوتی ہے لیکن سعید محبت کی لامحدود دنیا میں قدم رکھتا جا رہا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ محبت کی معصوم صبح بہت جلد تمازتِ آفتاب کی نذر ہوجائے گی۔

روزی کے والد اتنے بڈھے ہوچکے تھے کہ چلنے پھرنے کی بھی طاقت باقی نہ رہی۔ یہی وجہ تھی کہ روزی سعید سے اپنے ہی باغیچہ میں روزانہ ملاقاتیں کرتی رہی۔ پچھلے دن اس کے والد نے اُسے ہدایت کی تھی کہ زیادہ دیر تک باغیچہ میں نہ رہا کرو! روزی کے لئے تعمیلِ حکم اس لئے بھی ضروری تھی کہ اُنہیں اصل بات کا علم نہ ہوسکے۔

یہی وجہ تھی کہ آج روزی معمول سے کچھ پہلے ہی جانے کو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ناسمجھ سعید وجہ دریافت کر بیٹھا۔ روزی پھر ایک شرمیلی لڑکی تھی۔ وہ صحیح وجہ کیوں کر بتا سکتی تھی۔ اس نے شوخی سے جواب دیا

"کیونکہ بلا وجہ کافی وقت ضائع ہوجاتا ہے۔ اب تو کل سے ———"

ایسے جُملے محبت کی دُنیا میں بہت ہی جانسوز ہوتے ہیں۔ سعید کو ایک تڑپ سی اور جلن سی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ لیکن روزی کو خوشی محسوس ہوئی۔

سعید نے بدحواس ہوکر کہا "ہائیں روزی! کیا تم کل سے نہ آؤ گی؟ کیوں؟" آواز اکھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی دھندلی سی چمک تھی لہجے میں درد تھا۔

سعید کی بے پناہ محبت سے روزی نے خود کو بلندی پر دیکھا۔ اب اس کے دل میں یہ ارمان پیدا ہوگیا کہ میں ایک دل پر حکمرانی کر دوں۔ اس کے دل میں ملاقات کرنے کا ارمان تھا لیکن عالمِ خودی میں وہ ایسا محو تھی۔ کہ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں اب کل سے نہ آؤں گی۔ میری طبیعت نہیں لگتی"۔ یہ جملہ روزی کے دل سے نہیں بلکہ زبان سے نکلا تھا۔ اس میں روزی کو اور بھی زیادہ لذت اور خوشی محسوس ہوئی۔ لیکن سعید کے لئے یہ پیامِ موت تھا۔ چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ دل میں تلاطم پیدا ہوا۔ ہوش و حواس زائل ہوگئے۔ اس میں اتنا سوچنے کی بھی سکت باقی نہ رہی کہ کیا کرنا اور کیا کہنا چاہیئے؟ محبت کے بحرِ ذخار میں بھولا بھالا سعید طوفانوں کے تھپیڑے کھانے لگا۔

سعید کو کیا معلوم تھا کہ محبت کی دُنیا میں بھی خودداری کی قیمت ہوتی ہے۔ خودداری کا دامن اس کے ہاتھوں سے جاتا رہا روزی میں ناز و غرور آگیا ——— اسی طرح دن گزرتے رہے۔

سعید کو عاجزی کرنا آگیا اور روزی کو ظلم کرنا۔ محبت کی اس محفل میں زبان گنگ ہوچکی تھی۔ دونوں دلوں میں حاکم و محکوم جیسا امتیاز پیدا ہوگیا۔ سعید کی نادان کمزوریوں سے روزی کے حوصلے بڑھ رہے تھے۔ جتنا ہی سعید کا سرِ نیاز خم ہوتا گیا اُتنا ہی روزی کا ظلم بڑھتا گیا۔ سعید اور روزی میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا۔ سعید اتنا بیخود تھا کہ روزی کی نگاہ میں اپنا وقار قائم نہ رکھ سکا۔ اب تو وہ اس کو نہایت بے باکی سے جھڑک دیتی اور وہ سب کچھ سُنا دیتی جس کے سُننے کی اُمید نہ تھی۔

روزی کے دل میں سعید کیلئے بےپناہ محبت تھی۔ لیکن جتنا سعید بیخود ہوتا گیا۔ اتنا روزی کا دل محبت سے خالی ہوتا گیا۔ یہ فطرت کا اصول ہے جو بدل نہیں سکتا۔ نہ روزی اس سے ملنے کی روادار تھی نہ گفتگو کرنے کی۔ وہ اب اتنا ہی جاننا چاہتی تھی کہ سعید بیقرار ہے یا نہیں۔ وہ خود کو سعید سے بہت دور سمجھتی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ سعید اس سے محبت نہ کرے۔

سعید کی تمناؤں کا پیہم خون ہوتا گیا۔ ناکامیوں پر ناکامیاں اٹھاتا رہا۔ زندگی وبال ہو چکی تھی۔ مایوس محبت کو موت کی تمنا ہوتی ہے وہ روزی کو دنیا میں تنہا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ امید کی دھندلی روشنی مایوسی کی تاریکی میں چمک رہی تھی اب سعید نے ایک قاصد کے ذریعہ سے خطوں میں روزی کو گدگدانا شروع کیا۔ قابلِ رحم خطوط کے جواب بھی اتنے ہی تلخ رہے۔!

اب مضطرب سعید کو روزی کے وہی سخت سست جواب ہی تسکین کے لئے مطلوب تھے۔

خودی سے ناآشنا شخص کی کوئی بھی تمنا پوری نہیں ہوتی۔ روزی نے جواب دینا بھی قطعی بند کر دیا۔ فطرت بھولی کا یہی تقاضا ہوتا ہے سعید کی نظر میں دنیا ایک خواب بن گئی تھی۔ اسے نہ تو کوئی چیز اچھی لگتی۔ نہ کسی چیز میں اس کا جی لگتا۔ صرف موت ہی کا تصور اس کے لئے باعث تسکین تھا۔ امتحان کی ناکامی سے اسے اتنا افسوس نہ ہوا جتنا محبت کی ناکامی سے!

اندھیری رات۔ مایوسیوں کے بادل۔ ناکامیوں کی ہیبت ناکیاں سعید کے ننھے سے دل کے چاروں طرف مسلط تھیں۔

سعید اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا اپنی بربادیوں کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں روزی کا خط لرز رہا تھا جس کا مضمون یہ تھا:۔

"سعید! اتنی بےحیائی۔ مجھے امید نہ تھی میرے پاس ہرگز ہرگز کوئی خط نہ بھیجو۔ آئندہ میں کوئی جواب نہ دوں گی۔ اگر کوئی خط آیا بھی تو میں بغیر پڑھے پھاڑ ڈالوں گی۔ فقط

"روزی"

سعید کی دکھیاری آنکھوں سے آنسوؤں کی موٹی موٹی بوندیں گر کر زمین میں جذب ہو رہی تھیں۔ آہ زمانہ میں اس کا کوئی نہ تھا۔ جو ان آنسوؤں کی قدر کرتا۔ بڑی دیر تک وہ اپنی اجڑی ہوئی دنیا پر روتا رہا — سوچتا رہا — روتا رہا۔

وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔ اسٹیشن پر پہنچا۔ ریل ٹرین میں بیٹھ گیا۔

سعید کی تمام بہاریں جب خزاں بردوش ہو گئیں کی تلخیاں اس کی زندگی کا جزو بن گئیں تو دنیا اور دنیا کی ہر شے اس کی نظروں میں ہیچ نظر آنے لگیں اس کے دل میں آخر تمنا پیدا ہوئی کہ میں روزی کو بھول جاؤں۔ مگر سنا تھے ہو کہ کوئی تمنا پوری نہیں ہوتی۔ جب اس میں بھی اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اس نے سوچا کہ اب اس شہر کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں زندگی بسر کر کے روزی کو بھول جاؤنگا۔ تعلیم کو خیرباد کہا اور اڑیسہ کی طرف چلا گیا۔ وہاں ایک دیہات میں زندگی بسر کرنے لگا۔ زمانہ اسے [illegible] کر گیا کہ ایک تعلیمیافتہ ایک گاؤں میں مزدوروں جیسی زندگی گزار رہا ہے۔ ایک فلسفی یا مضمون نگار اس کی زندگی کو جنت بداماں ثابت کر دے لیکن کوئی اس سے پوچھے کہ اس کے اوپر کیا گزر رہی ہے روزی کو بھول جانے کی تمنا پوری نہ ہو سکی۔ ہر وقت روزی کے تصورات کا ایک سلسلہ اس کے دل و دماغ میں گھوما کرتا جو ختم ہونا تھا نہ ہوا۔ نازو دل میں پلا تھا مزدوروں کی طرح محنت کرنا اس کے امکان سے باہر تھا۔ بھوک گھٹتی گئی صحت بگڑتی گئی تڑپ اور بیقراریوں نے ساتھ نہ چھوڑا۔

کئی مہینے گزر گئے مگر چین کی گھڑی نصیب نہ ہوئی آخر اپنی الجھنوں سے تنگ آ کر روزی کو ایک عاجزانہ خط اسکول کے پتہ پر بھیجا۔ اسے امید تھی کہ روزی کو اب ضرور رحم آئیگا۔ جواب کے انتظار میں وہ تصورات کی رنگین اور سنہری عمارتیں بنا بنا کے خوش ہوتا تھا لیکن بدبختیاں اب بھی اس کے ساتھ تھیں۔ روزی نے ایک بہت ہی مختصر جواب دیا جو یہ تھا:——

"مجھے پریشان نہ کرو تو بہتر ہے"

سعید نے اس جملہ کو پڑھا — پھر پڑھا — کئی بار پڑھا اس کے بعد سر چکرایا اور وہ بےہوش ہو گیا۔

نا داری، ناکامی، افلاس اور ناتوانی اس کے ساتھ تھے ہی۔ کمزوری بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ مزدور نہ رہ سکا۔ چنانچہ خط پانے کے دوسرے ہی دن ایک شہر میں چلا آیا یہاں ایک امیر گھرانے کے لڑکوں کو عربی پڑھانے پر نوکر ہو گیا صرف کھانا اور صرف پانچ روپے ماہوار ملتے تھے۔ سعید کو دولت، عظمت کی ضرورت تو باقی نہیں رہی۔ اس نے اسی پر اکتفا کیا۔

وہ ایسی خاموش اور تنہا زندگی گزار رہا تھا کہ وہاں کے لوگوں کیلئے ایک انوکھی چیز بن گیا زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ خدا رسیدہ فقیر ہیں بہت سے لوگ اسے خبطی بھی سمجھتے تھے۔ قرار و سکون اب بھی اس کے دل کو حاصل نہ ہوا دل میں غم کی ٹیسیں بدستور تھیں ایک ہونہار اور نوجوان زندگی اس طرح برباد ہو رہی تھی صحت روز بروز خراب ہوتی گئی محبت کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ زمانہ کی بھی تلخیاں رہتی ہیں مصیبت کے جھونکے مسلسل چلا کرتے ہیں۔ پانچ چھ مہینے گزر گئے سعید کے سر میں پہلے درد شروع ہوا پھر بخار آنے لگا صحت خراب تھی ہی بیماری بڑھتی ہی گئی۔ دوا علاج نے کبھی کوئی خاص فائدہ نہ پہنچایا۔ روزی کا ستایا ہوا سعید اب بھی روزی کیلئے بے چین تھا اپنی بدقسمتی پہ اکثر رویا کرتا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب موت کی آغوش میں جانے کا وقت آگیا اس نے آخری بار تمنا کی کہ مرنے سے پہلے ایک بار روزی کو دیکھ لے یہی خیال بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھا کہ اس نے بیماری کی حالت میں اپنے وطن سہارنپور واپس جانے کا مکمل ارادہ کر لیا۔ لوگوں نے بہت منع کیا لیکن اس نے اپنے ارادے میں تبدیلی نہ کی۔

سعید کو تانگہ پر بٹھا دیا گیا۔ ایک آدمی ساتھ کر دیا گیا کہ اُسے انٹر کلاس کا ٹکٹ خرید کر گاڑی پر بٹھا دے۔ اسٹیشن جا ہی رہے تھے کہ زور شور کی آندھی آئی اور ساتھ ہی ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ بجلی رہ رہ کر کڑک رہی تھی ہوا چلنے سے تانگہ میں پانی کی بوچھاریں اُڑ اُڑ کر آ رہی تھیں بہت بچانے کے باوجود سعید بھیگ کر تر بتر ہو گیا۔ دوسرے کپڑے بدلوا کر اس آدمی نے سعید کو ٹرین کے سپرد کر دیا۔

سعید مریض تو تھا ہی بھیگ جانے نے زہر کا کام کیا۔ بخار بڑھ گیا۔ سر میں درد کی شدت اتنی زیادہ ہوئی کہ برداشت سے باہر تھی۔ وہ زور زور سے کراہ رہا تھا۔ اگر تھرڈ کلاس میں ہوتا تو اس سے ہمدردی کرنے والے بہت سے نکل آتے۔ انٹر کلاس کے امراء کو کسی کے درد کا کیوں احساس ہونے لگا۔ ان کو تو اخبار ہی پڑھنے سے فرصت نہیں۔ اُن مسافروں نے ایسے ڈبے میں بیٹھنا گوارا نہ کیا جس میں کوئی مریض ہو چنانچہ تمام لوگ رفتہ رفتہ ڈبہ خالی کر کے دوسرے ڈبہ میں چلے گئے۔ سعید اکیلا تھا پھر بھی کراہ رہا تھا اس کی حالت پر کون رحم کرتا۔ بیماری بے حد بڑھ چکی تھی بھوک پیاس بھی تھی مگر کون کھلائے کون پلائے۔ نقاہت اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ اٹھنا محال تھا جب برداشت نہ ہو سکا تو خود ہی اٹھنے کی کوشش کی لیکن اتنی قوت کہاں؟ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ گاڑی چلی جا رہی تھی۔

روزی نہایت سرگرمی اور بے چینی سے فیض آباد سٹیشن پر اپنے چچا کو ڈھونڈ رہی تھی کہ وہ ٹکٹ دے کر کہاں چلے گئے اس نے سٹیشن پر ادھر اُدھر کئی چکر لگائے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ سوچتی تھی کہ کہاں اڑ گئے اتنے میں ٹرین آگئی اور وہ انٹر کلاس کے ایک خالی ڈبہ میں بغیر اپنے چچا کو پائے ہوئے بیٹھ گئی کیونکہ سکول کھل چکا تھا اور اسے جلد سے جلد سہارنپور پہنچنا تھا۔ ڈبہ میں ایک مریض کراہ رہا تھا اس نے چاہا کہ دوسرے ڈبہ میں چلی جائے مگر پھر نہ جانے کیوں ٹھہر گئی گاڑی چھوٹ گئی۔ وہ دوسری سیٹ پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ سعید کی یکایک جدائی سے اسے افسوس ہوا تھا اور محبت کا وہ شرارہ جو اس کے دل میں خاموش ہو چکا تھا پھر بھڑک اٹھا تھا اور وہ سعید کیلئے بے چین رہنے لگی اسی دوران میں سعید کا ایک خط بھی آیا لیکن نہ معلوم کیا دل میں آیا کہ جواب تلخ ہی لکھا۔ لیکن اس کے دو ہی ایک دن کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تب سے اس نے کئی خطوط لگاتار بھیجے مگر کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ سعید تو دوسرے دن باہر چلا گیا تھا جواب کہاں سے ملتا اس سے روزی کی بیقراریاں اتنی بڑھ گئیں کہ دیوانی سی ہو گئی اور ہر وقت سعید کی یاد میں گم رہنے لگی اس وقت بھی وہ اپنے کھوئے ہوئے سعید کو یاد کر رہی تھی دفعتہ مریض کے منہ سے "روزی" سن کر یہ چونک پڑی۔ قریب گئی تو دل دھک سے ہو گیا۔ پھر غور کیا تو پہچان گئی کہ میرا سعید بخار کی شدت میں بڑبڑا رہا ہے۔ ایک بجلی سی گری اس کا سر چکرایا آنکھوں سے آنسوؤں کی بیشمار بوندیں گرنے لگیں۔ اپنے زانو پر سعید کا سر رکھ کر بیٹھ گئی۔ آنسوؤں کی لڑیاں پیہم گر رہی تھیں اس نے سعید کو پکارا پھر پکارا ایک بیمار محبت کو ہوش ہو تو لیجیے۔ روزی کا دل بھر آیا وہ چیخی اور پھر سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ سعید بیہوشی میں اپنا سر ادھر اُدھر مار رہا تھا روزی نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سعید کا سر اٹھایا اور اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔ آج اسے جی بھر کے رونے کا ارمان تھا۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ روزی کو اپنے کیے کی ندامت تھی وہ چاہتی تھی کہ میرا پیارا سعید اچھا ہو جائے اور میں اس کے قدموں پر سر رکھ دوں معافی مانگ لوں اور زندگی بھر اس کی خدمت کروں۔ روزی نے کہا "میرے پیارے سعید! مجھے معاف کر دو" اس کی حسرت بھری نظریں بہت ہی پیار سے سعید کے چہرے پر جمی تھیں۔ کاش سعید کو اتنا ہی معلوم ہو جاتا کہ تیری روزی آج تیرے ہی لئے تڑپ رہی ہے۔ جوش محبت میں روزی نے اپنے قرمزی ہونٹوں کو سعید کے بیہوش ہونٹوں پر رکھ دیا۔ روزی اپنی زندگی میں پہلی اور آخری بار سعید کو جی بھر کے چوم رہی تھی وہ اتنا زیادہ پیار کرنا چاہتی تھی جتنا وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔

سعید نے آنکھیں کھولیں۔ روزی کے چہرے پر نگاہیں جم گئیں اور پھر آنسوؤں کے قطرے نکلے۔ روزی کی سسکیاں تیز ہو گئیں اس نے روتے روتے کہا۔ "کائنات کے ہر ذرے سے پیارے سعید! مجھے معاف کر دو" اس نے پھر اپنے نازک ہونٹوں کو سعید کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ سعید کی آنکھوں سے موٹے موٹے قطرے نکلنے لگے۔ دو تین سسکیاں لیں ——— بدن ٹھنڈا ہونے لگا۔ سعید نے بولنے کی کوشش کی لیکن زبان لڑکھڑا کر رہ گئی۔

روزی نے روتے ہوئے زور سے کہا "سعید! پیارے سعید! میرے سعید! بولو کیا مجھ سے تم خفا ہو؟ میں گنہگار ہوں سعید کیا تم معاف نہ کرو گے۔ سعید پیارے ——!" حسرت زدہ نظروں سے وہ سعید کے چہرے کو تک رہی تھی۔ سعید خاموش ہو چکا تھا، دھڑکتا ہوا بے چین دل اب خاموش تھا۔ نبضیں خاموش تھیں۔ بیقرار زندگی کو قرار مل چکا تھا۔ خوش قسمت سعید آج اپنی روزی کی آغوش میں اپنی جوانی قربان کر چکا تھا۔ روزی کی زبان سے چیخ نکلی اور بیہوش ہو گئی۔

انجن چیختا ہوا ٹرین کھینچے لئے جا رہا تھا ——!

گیسو

افسانہ

از جناب مظہر رضوی لکھنوی

عمران کا سگرٹ کیس مجھے بہت پسند آیا۔ یہ کیس اسے کسی نے تحفہ کے طور پر پیش کیا تھا۔ سلولائڈ کا بنا ہوا نازک مگر بے حد حسین معلوم نہیں کن حسین ہاتھوں میں ہو کر گزر رہا تھا۔ جو خود بھی اتنا حسین ہو گیا تھا۔ جب عمران نے پہلی مرتبہ سب کے سامنے کیس کھول کر سگرٹ نکالی تو ہر شخص کے منہ سے بے ساختہ تعریف نکل گئی۔ شاید ہی ہم میں کوئی ایسا ہو جس نے مبالغہ کی حد تک اسے پسند نہ کیا ہو۔ اور میں نے تو اسے گھما پھرا کر دیکھنے کے بعد اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں واپس نہ کرنے پر بضد اور عمران خوشامد میں کرتے کرتے آمادۂ جنگ آمد کے اصول پر اتر آیا۔ مجھ جیسے نحیف الجثہ انسان کو بس کے علاوہ اور چارہ ہی کیا تھا کہ ایک زوردار گھونسہ کھانے کے بعد "اچھا بھائی دیتا ہوں" کہہ کر سگرٹ کیس اس کے حوالے کر دوں۔ عمران نے سگرٹ کیس اپنے قبضے میں کر کے قمیص کی جیب میں رکھ لیا اور شیروانی کے تمام بٹن بند کر لئے۔ اس دن کے بعد وہ سگرٹ کیس عمران کے پاس پھر بھی دکھائی نہ دیا۔ معلوم نہیں اس نے میرے ڈر سے اسے کن پردوں میں چھپا دیا تھا۔ عمران کو ڈرنا بھی چاہیئے تھا۔ ہماری شریعت میں کسی دوست کی چیز موقع پا کر غائب کر دینا گناہ نہ تھا۔ عمران نے کیس چھپا دیا اور مجھ سے گم ہو جانے کا بہانہ بھی تراش دیا۔ لیکن میں اس کی تلاش میں برابر لگا رہا۔

ایک دن میں ایسے وقت عمران کے گھر پہنچا جب وہ موجود نہ تھا۔ موقع غنیمت پا کر میں نے خانہ تلاشی شروع کر دی۔ الماریوں کے بعد الماری اور بکس کے بعد بکس الٹنے پلٹنے لگا۔ مگر جس چیز کی تلاش تھی نہ ملنا تھی نہ ملی میں تنگ کر بیٹھا ہی تھا۔ کہ میری نظر عمران کے پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے ایک بکس پر پڑی۔ سا دوڑ میں نے لپک کر اسے اٹھا ہی تو لیا۔ کھول کر ابھی اسے الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ عمران کمرے میں داخل ہوا۔ اور بولا۔ "ارے! یہ کیا کر رہے ہو؟" اس کے بعد میری گردن زور سے دبائی۔ اور ایک گھونسہ بھی رسید کیا۔ مگر میرا مستقل مزاجی کہاں تک آیا۔ اتفاق سے میری نظر سبز رنگ کے ایک دیدہ زیب لفافے پر پڑی تھی۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ اور ایک کونے سے لہر خوشبو

میرے دماغ کو قدرے معطر کر گئی۔ تعجب اس بات پر ہوا کہ اس میں کاغذ کے ایک پرزے کے علاوہ کوئی اور چیز بھی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ "اس میں کیا ہے؟" اس نے بے پروائی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں۔" نہیں اس کے چہرے کی رنگت نے جواب دیا۔ "اس میں کیا ہے؟" "یہ نہ پوچھو۔ یہ میری زندگی کا راز ہے۔ اسے جہاں سے اٹھایا ہے وہیں رکھ دو۔" لیکن میں نے "کچھ تو ضرور ہے" کہتے ہوئے لفافے کو کھول لیا۔

"عمران یہ کیا۔۔۔؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک عورت کے بال۔" اس نے میرے سوال اور ان سیاہ لمبے بالوں کی لٹ سے بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر اس نے بال میرے ہاتھ سے لے لئے۔ میں سوچنے لگا۔ معلوم نہیں کس حسینہ نے نہ معلوم کتنی تمناؤں سے یہ بال یوں اس کے سپرد کیا ہو گا۔ اور جب وہ قسم کھا رہی ہو گی تو اس نے کاٹ کر اپنے "کسی" کو صرف اس کے دل میں اپنی یاد برقرار رکھنے کے لئے گیسو نشانی پیش کر دیا۔

عمران نے دراز گیسوؤں کی لٹ کو کھولا۔ سیاہ چمکدار دراز گیسو اس نے ان کو مٹھی میں دبا کر اپنے دل سے لگا لیا۔ جیسے دل کی بات زلفوں سے کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے آنکھوں سے لگایا۔ شاید وہ بھی اپنی حسرت بھری آنکھوں سے ان کو دیکھا کرتا تھا۔ عمران خاموش کھڑا تھا۔ اس کی نظریں ... بالوں کی لٹ پر پڑی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر ... انگلیاں ان میں الجھا دیں ... دیر تک وہ زلفوں کو سلجھانے لگا۔ شاید اس کے خیالات بھی آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ اور وہ ان کو سلجھا کر اپنے خیالات کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "عمران! آخر کس کے بال ہیں؟"

"کہہ تو دیا ایک عورت کے۔" لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ خاموش رہنا چاہتا ہے۔ اس قسم ... خیالات ... ہو تو ... "یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ مگر یہ گھوڑے ... دم کے ... "

کے سر کے ہیں۔ لیکن یہ کس عورت کے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔" یہ سوال میں نے اسے پریشان کرنے کے لئے نہیں پوچھا تھا بلکہ اس کے راز میں شریک ہونے کے لئے ۔۔۔ اور اس نے مجھے اپنا شریک بنا لیا ۔۔

"بچپن میں وہ میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی ۔۔ یہ بال ۔ یہ سیہ دراز زلفیں ۔ اس زمانے میں میں ان کا دشمن تھا ۔ جب کبھی مجھے موقعہ ملتا۔ مٹھی بھر بال پکڑ کے نوچ لیتا ۔۔ وہ روتی چلاتی جا کر امی سے شکایت کر دیتی ۔ پٹنے پر میری دشمنی میں اضافہ ہو جاتا ۔۔ اسی طرح زندگی کے کئی سال گزر گئے ۔ بوڑھوں نے اپنی جگہ جوانوں کے لئے خالی کر دی ۔ اور جوانوں کی خانہ پوری ہم کو کرنا پڑی ۔ ہمارے ساتھ ہی ساتھ ہمارے خیالات بھی جوان ہونے لگے ۔۔ اس نے وہی بال جن سے مجھے نفرت تھی بھلے معلوم ہونے لگے ۔۔ اکثر میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کہتا ۔ "کتنے حسین ہیں تمہارے بال" ۔ وہ منہ بنا جاتی ۔ لیکن پھر وہ ان کو اور زیادہ حسین بنانے کی کوشش کرتی ۔"

وہ رکا ۔ میں نے اس کی طرف دیکھا ۔ اس کی انگلیاں ابھی تک بالوں میں الجھی ہوئی تھیں ۔۔

"میں گھر سے پردیس چلا گیا ۔ جدا ہوتے وقت نہ ہماری آنکھوں میں آنسو تھے ۔ اور نہ لب پہ عہد و پیمان ۔ ہم دونوں ایک عرصے تک ساتھ رہے تھے ۔۔ اس لئے ہم میں انسیت ضرور پیدا ہو گئی تھی لیکن جوانی میں جس چیز کا نام محبت ہوتا ہے اس کے جراثیم اس وقت تک ہمارے خون میں داخل نہ ہوئے تھے ۔۔ ہاں تو میں پردیس چلا گیا ۔ اور بہت جلد نئے ملاقاتیوں میں شیر و شکر ہو گیا ۔ گھر والوں کی یاد کے ساتھ نہ مجھے کسی اور کی یاد میں بستر پہ کروٹیں بدلنا پڑیں اور نہ رات کے سناٹے میں جب سارا عالم سوتا ہے میرے دل میں ہوک اٹھتی ۔ مجھے خطوط لکھنے کا مرض بھی نہ تھا ۔ لیکن اپنی خالہ کو اکثر خط لکھا کرتا ۔ یہی کالج کے روزمرہ کے واقعات ۔ وہ خالہ کی لڑکی تھی ۔ اس لئے کبھی کبھی اس کا نام بھی آ جاتا ۔ یونہی سرراہے ۔ "آج کل وہ کیسی ہے ۔ اس کا امتحان کب تک ہو رہا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔۔

ایک عرصے کے بعد میں بیمار ہو کر وطن گیا ۔ وطن کی آب و ہوا نے مجھ پہ جادو کا کام کیا ۔ چند ہی دن میں بھلا چنگا ہو کر پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا ۔ سب سے زیادہ میں خالہ کے یہاں جاتا ۔ کسی اور خیال سے نہیں ۔ صرف گپیں مارنے کے لئے ۔ ایک دن میں خالہ کے ساتھ ثریا کے کمرے میں بیٹھا تھا ۔ ثریا نہ معلوم کس چیز کو ڈھونڈ رہی تھی ۔ اور خالہ کی زبان میں "وہ کمبخت ملتی ہی نہ تھی" بکس کی تمام چیزیں باہر نکال کر پلنگ پر رکھ رہی تھی ۔ جب وہ کسی چیز کو باہر نکال کر رکھتی ۔ میں یونہی تفریحاً اسے الٹ پلٹ لگتا ۔ ثریا نے ایک ریشمیں کڑھے ہوئے کپڑے میں لپٹی کو دوسری طرف رکھ دی ۔" اس نے اسے دوسری طرف کیوں اور میں نے شرارتاً اسے بھی اٹھا لیا ۔ اس نے میرے ہاتھ کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔" اسے نہ دیکھئے ۔ آخر آپ میری کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں ؟ اسے میں نہیں دکھاؤں گی ۔

"تب تو میں ضرور دیکھوں گا ۔" اور اسے پریشان کر لئے میں اس سے چھین کر کمرے سے باہر بھاگ گیا ۔ وہ روتی اور منہ پھلا کر پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی ۔ لیکن مجھے کنکھیوں جاتی تھی ۔ اس کے اشارے میری خوشامد کر رہے تھے ۔" نہ دیکھئے ۔" لیکن میں نے بنڈل کھول ہی لیا ۔ اس میں میرے خطوط تھے جو میں نے کالج سے خالہ کو لکھے تھے ۔ مجھے ملال ہوا ۔ آخر ان میں کونسا راز تھا ۔ جس کو چھپانے کے لئے وہ اتنی کر رہی تھی ۔ میں نے اس کے بال پکڑ کے ہلاتے ہوئے کہا ۔" کیوں یہی بہت چھپانے کی چیز تھی ۔ یہ خط تجھے بہت پیارے ہیں ؟"

"آپ سے کیا ؟" اس نے اداس لہجہ میں کہا ۔ اس نے بار اپنی التجا آمیز آنکھیں میری طرف اٹھائیں ۔ اور میرے سوال کا جواب ان سے دیا ۔" خدا کے واسطے اب تو دے دیجئے ۔ یہ مجھے بہت پیارے ہیں ۔ اپنی جان سے زیادہ ۔" میں نے خطوط اس کے بکس میں ڈال دئے ۔ تھوڑی دیر تک بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا ۔ اور پھر اٹھ کر گھومنے چلا گیا ۔

اس معمولی واقعے نے اچھی خاصی اہمیت اختیار کر لی ۔ میرے خطوط اتنے عزیز کیوں ہیں ؟ وہ ان سے اتنی محبت کیوں کرتی ہے ؟ ان سوالات نے میرے دماغ کو پریشان کر دیا ۔ میرے دل نے جواب دیا ۔ "محبت" اور میں نے محسوس کیا ۔ جیسے میں خود بھی اس سے محبت کرتا ہوں ۔ مجھے اس رات پہلی بار جوانی کی الجھن نے آ گھیرا ۔ میں تمام رات بستر پہ کروٹیں بدلتا رہا ۔ اور جب سارا عالم سو رہا تھا ۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی رہی ۔ آنکھوں آنکھوں میں صبح ہو گئی ۔ اور سویرا ہوتے ہی میں خالہ کے مکان پہنچ گیا اس کا جواب جوانی کو دینے ۔ میں ثریا سے ملنا چاہتا تھا ۔ اور مجھے تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوئی ۔ وہ بہت جلد مجھے اکیلے میں ...

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبا دیا۔ وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں بھی اس سے بات کرنے میں پہلی بار گھبرا رہا تھا۔ لیکن میں نے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں کسی نہ کسی طرح دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔

میرا خیال تھا وہ شرمائے گی۔ اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو جائے گا۔ آنکھیں نیچے کو جھک جائیں گی۔ تنفس تیز ہو جائے گا۔ اور پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگیں گے۔ وہ شرمائی لیکن بہت کم۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور تنفس تیز۔ لیکن اس کی آنکھیں بجائے زمین پر گڑ جانے کے میری آنکھوں میں پیوست ہو گئیں اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن عین موقعہ پر زبان قوتِ گویائی کھونے لگی۔ لیکن عورت جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہے وہ کہہ کر رہتی ہے۔ اس کے لب کھلے۔ اور ان میں سے تھرتھرائی۔ کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

"آپ بالکل سچ سمجھے مجھے آپ سے سچ مچ محبت ہے۔ لیکن کیا یہ جھوٹ ہے کہ کل کے صرف کل کے واقعہ نے آپ کے دل میں میرے لئے اتنی جگہ کر دی۔ مجھے امید تھی۔ میں اسی امید پر جی رہی تھی۔ کہ ایک نہ ایک دن میں اپنے کانوں سے آپ کے منہ سے نکلے ہوئے یہی الفاظ ضرور سنوں گی۔ کاش ہماری زندگی میں کل کا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا۔ میں محبت کے صلے میں محبت چاہتی ہوں۔ اس کی قیمت نہیں۔ کیا آپ مجھ کو میری محبت کی قیمت نہیں دے رہے — ؟ اور میرا جواب یہ ہے کہ مجھے یہ نامنظور ہے۔ کاش میری محبت کی یوں رسوائی نہ ہوتی ——"

تو اس نے مجھے محبت کرتے ہوئے بھی میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ میری تمناؤں کا کتنی جلد خون ہو گیا۔ میں ٹھکرائے ہوئے دل کو وہیں چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ اس دن سے میں نے خالہ کے یہاں آنا جانا کم کر دیا۔ اور ایک دن میں پھر ریل میں بیٹھا وطن سے دور جا رہا تھا ——!

نئے شناساؤں اور نئے مشاغل میں پھنس کر وطن کے ساتھ وطن والوں کی یاد بھی کم ہوتی گئی۔ لیکن ایک خیال کبھی کبھی دل میں چٹکیاں لے جاتا۔ رفتہ رفتہ اس میں بھی کمی شروع ہو گئی۔ اور اب پھر اپنی اصلی حالت پر تھا۔ نہ بستر پر کروٹیں بدل کر صبح کر دیتا اور بے ساختہ عالم سوتا میرے دل میں ہوک اٹھتی۔ لیکن ابھی ایک اور چرکہ میرے دل پر لگنا باقی تھا۔ اور اس نے مندمل زخم کو ناسور کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

ایک شام جب میں گھوم کر واپس آیا تو مجھے دو لفافے ملے۔ ایک لفافہ وزنی تھا۔ اسے میں نے پہلے چاک کیا۔ یہ لفافہ میری خالہ کا تھا ثریا کی شادی ہونے والی تھی۔ اور مجھے کچھ دن قبل بلایا تھا۔ اس میں دعوتی کارڈ بھی رکھا ہوا تھا۔ "ثریا کی شادی ہونے جا رہی تھی کسی اور کے ساتھ"۔ اس خیال نے میرے دل کو مسوس دیا۔ میں نے دوسرا لفافہ کھولا۔ یہ ثریا نے بھیجا تھا۔ لفافے میں یہ بالوں کی لٹ اور ایک پرزہ ملا۔

"امی کے خط سے معلوم ہوا ہو گا کہ میری شادی ہونے والی ہے اور اب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کسی اور کی بیاہی جاؤں گی۔ لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ یہ سیاہ بالوں کی لٹ دیکھ کر آپ کو تعجب تو بہت ہو گا۔ یہ وہی بال ہیں۔ جن سے کبھی آپ کو نفرت اور مجھ کو محبت تھی۔ آپ کی خدمت میں یہ آخری تحفہ پیش کر رہی ہوں"۔ فقط

ثریا

عمران خاموش ہو گیا۔ وہ پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔ اس کی پلکوں پر دو آنسو تڑپے اور مجھے ان میں سیاہ گیسوؤں والی ایک حسین دوشیزہ دکھائی دی۔

اورینٹل شاہراہ ترقی پر

اورینٹل گورنمنٹ سکیورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ ہندوستان کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی ہے۔ جنگ کے ناساعد حالات کے باوجود اس کا کاروبار روبہ ترقی ہے۔ ۱۹۴۲ء کی رپورٹ سے جو ڈائرکٹروں کی جانب سے شائع ہوئی ہے ظاہر ہے کہ کمپنی مذکور نے اس سال چھبیس ہزار سات سو تیرہ نئی پالیسیاں جاری کیں۔ جن کے ماتحت نو کروڑ اکاون لاکھ روپے کی رقم کا بیمہ کیا گیا۔ اس سال کے دوران میں کمپنی کی کل چار لاکھ انتالیس ہزار نو سو چالیس پالیسیاں جاری تھیں اور بیمے کی رقم اٹھاسی کروڑ اڑتالیس لاکھ روپے تک جا پہنچی تھی۔

سالِ زیرِ نظر میں کمپنی نے اپنے گاہکوں یا ان کے وارثوں کو ایک کروڑ چھپن لاکھ روپے کی رقم مطالبات کی مد میں ادا کی۔ کمپنی کی سالانہ آمدنی تقریباً پانچ کروڑ دولاکھ روپے تھی۔ اور خرچ تقریباً تین کروڑ سولہ لاکھ۔ آمد اور خرچ کا فرق ایک کروڑ چھیاسی لاکھ روپے کے قریب رہا۔ پریمیم کی آمدنی اور اخراجات عام کی نسبت جس میں بخششوں کا کمیشن بھی شامل ہے اکیس اعشاریہ دو فیصدی ہے سال کے اختتام پر کمپنی کے پاس تینتیس کروڑ روپے سے زائد کی مالیت موجود تھی۔ سال رواں کے اختتام پر حصہ داروں کو ایک روپیہ پچیس پیسے فی حصہ منافع دیا گیا اور کمپنی کے ہزاروں ملازمین کو ایک ایک ماہ کی تنخواہ بطور انعام تقسیم ہوئی۔ سیوا اعداد و شمار کمپنی کی خوبی

[illegible]

اخبار و افکار بقیہ صفحہ ۸

(ب) ی کی بھی زشکل اور حروفِ علّت آ اور و کی) متقصِل جدولوں میں شامل کی جاءے اور کتابت کی صورتیں تلفظ کے مطابق اس شکل سے ہوں۔

معروف	ماقبل مفتوح	مجہول
بی ن	بَی ن	بے ر
پی ر	پَی ر	پھے ر
شی ر	صَی د	شے ر
پی ٹھ	بَی ٹھ	پے ٹ
کی لا	کَی لاش	کے لا

(ج) خواندگی کی ابتداءی کتابوں میں لفظ کا ہر صوتی ٹکڑا (یا رکن) علاحدہ لکھا جاءے اور حروف متصل کسی حال میں چار سے زیادہ ملاکر نہ لکھے جاءیں، مثلاً

بجاءے "مصیبت" کے "م صی بت" بجاءے "قرینہ" کے "ق ری نہ" بجاءے "گھرکنا" کے "گھ رک نا"

کمیٹی کے نزدیک اس تجویز میں ایک ترمیم یہ کی جاسکتی ہے کہ لفظ کا پہلا حرف اگر ایک صوتی رکن ہو مگر متصل حرفوں میں سے ہو تو وہ اگلے ٹکڑے سے الگ نہ کیا جاءے نیز مشدّد حرف دوبارہ نہ لکھا جاءے یعنی بجاءے "ق ری نہ" کے "قری نہ" اور بجاءے "عزت" "عزّت" لکھا جاءے۔

اس امر کا آخری فیصلہ کہ ان دونوں میں سے کون سی عبارت زیادہ مناسب ہوگی ان اصحاب کی راے پر چھوڑنا چاہیے جن کو تعلیم اور خصوصاً بالغوں کی تعلیم سے تعلق ہے۔

فائدہ:۔ ان تینوں تجویزوں کے متعلق یہ بات بھی بحث میں آءی کہ شاید اس تجویز پر یہ اعتراض ہو کہ اگر ابتداءی تعلیم میں اس طرح کی سہولت بہم پہنچاءی گئی تو جن لوگوں نے اس ڈھنگ سے پڑھنا سیکھا ہوگا وہ معمولی چھپی ہوءی کتابوں کو نہ پڑھ سکیں گے۔ اس لیے کمیٹی یہ بتادینا چاہتی ہے کہ اس طریقے سے تعلیم کے صرف ابتداءی مرحلوں میں کام لیا جاءے گا۔ اور جب پڑھنے والے ترقی کرلیں گے تو انھیں حرفوں کی مروّجہ



جلد [illegible] | نمبر ۹

فہرست مندرجات ماہ نومبر ۱۹۴۳ء

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا سے شائع کیا

ملاحظات

عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۴۴ء مرتب ہو چکا ہے اور کتابت وطباعت کے مراحل طے کر رہا ہے۔ انشاءاللہ یکم دسمبر ۱۹۴۳ء تک قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ یہ نمبر علمی وادبی اعتبار سے کس درجہ بلند پایہ، وقیع اور دماغ افروز ہوگا۔ اس کا اندازہ اس فہرست مضامین سے ہو سکتا ہے جو زیرنظر اشاعت میں کسی دوسری جگہ درج ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "خاص نمبر" کو ہر جہت سے کامیاب اور کشش انگیز بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ کاغذ بہت زیادہ مہنگا ہو چکا ہے اور بدقسمتی سے عالمگیر کو حکومت ہند کے "کوٹا سسٹم" سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کے باوجود خاص نمبر میں اعلیٰ درجہ کا سفید کاغذ استعمال کیا جا رہا ہے اور ضخامت بھی موجودہ سائز کے **دو سو صفحات** سے کم نہ ہوگی۔ اس کے باوجود قیمت صرف **دو روپے** رکھی گئی ہے جو موجودہ نرخوں کے مقابلے میں بہت قلیل ہے۔

سالانہ چندے میں اضافہ

یکم دسمبر ۱۹۴۳ء سے عالمگیر کے زرچندہ میں صرف ایک روپے کا خفیف سا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ آئندہ عالمگیر کا سالانہ چندہ **پانچ روپے** کی بجائے **چھ روپے** ہوگا۔ اس چندے میں سالانہ خریداروں کی خدمت میں دو روپے کا خاص نمبر (جو ہر سال دسمبر میں شائع ہوتا ہے) ایک روپے کا تاریخ نمبر (جو ہر سال اپریل میں شائع ہوتا ہے) اور دو روپے کا سالانہ نمبر (جو ہر سال جون میں شائع ہوتا ہے) مفت پیش کئے جائیں گے۔ یعنی پانچ روپیہ قیمت کے خاص نمبر۔ باقی رہا ایک روپیہ تو ظاہر ہے کہ اس سے ۹ عام اشاعتوں کی لکھائی چھپائی کے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہ معمولی سا اضافہ اگرچہ مجموعی مصارف کے مقابلہ میں چنداں وقعت نہیں رکھتا تاہم کاغذ کی اس ہولناک گرانی ونایابی کے زمانہ میں قارئین کی طرف سے جتنی بھی امداد ہو جائے ہمارے شکریے کی مستحق ہے۔ امید ہے قارئین اس معمولی سے اضافے کو اپنی جیب پر غیر معمولی بار تصور نہ فرمائیں گے اور نہ صرف خود عالمگیر کے دامن سے وابستہ رہیں گے بلکہ اپنے دوستوں اور زیر اثر احباب کو بھی اس کے حلقہ میں شامل ہونے کی دعوت دیں گے۔

خاص نمبر ۱۹۴۴ء

از:- ادارہ

میسرز بنسی دھر کپور اینڈ سنز

اس سے پہلے بھی دو مرتبہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ میسرز بنسی دھر کپور اینڈ سنز اپنے مستقل گاہکوں کو انضباطی نرخ پر بنگال پیپر ملز کا بادامی کاغذ مہیا کر کے بہت بڑی فیاضی و فراخدلی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ ہر ماہ چند رقم عالمگیر کو بھی عنایت فرماتے ہیں۔ جس کے لئے ہم ان کے بصمیم قلب شکرگزار ہیں یہ حصہ رسدی اگرچہ ہماری ضروریات کے مقابلہ میں بہت قلیل ہے تاہم چور بازاری کے اس تاریک دور میں میسرز بنسی دھر کپور کی یہ ہمت بھی قابل قدر ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ عالمگیر کے لئے کاغذ کی زیادہ سے زیادہ مقدار وقف کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ ہم پورے اطمینان سے دنیائے علم وادب کی خدمت انجام دے سکیں۔

زیرنظر اشاعت

زیرنظر اشاعت مضامین نظم ونثر کے اعتبار سے بہت زیادہ کشش انگیز ہے۔ خصوصاً مولانا ظفر علی خاں کے "حقائق ومعارف" اور جناب عبادت بریلوی کا مقالہ "ہجویات سودا پر ایک نظر" یقیناً قارئین سے خراج تحسین حاصل کریں گے۔ طبعزاد افسانوں میں "نئی زندگی" (طفیل ملک) اور "خواب وخیال" (حمید صحرائی) آرٹ کے لحاظ سے بہت بلند پایہ ہیں۔ اور افسانہ نویسی کے جدید ترین رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ منظومات کے حصہ میں اکثر ممتاز ترین مشاہیر شعراء نظر آتے ہیں۔ مثلاً شفق رضوی۔ نثار اٹاوی۔ طالب باغپتی، اعجاز صدیقی۔ یوسف جمال۔ نظر حیدرآبادی وغیرہ لہٰذا اس کے دید افریں اور روح نواز ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

خاص نمبر کے وی۔پی۔

جن معاونین کرام کا سالانہ چندہ ۳۰ نومبر کو ختم ہو چکا ہے۔ خاص نمبر ان کی خدمت میں سال آئندہ کے چندہ کے لئے بذریعہ وی پی پیکٹ ارسال کیا جائے گا۔ امید ہے وہ اس نازک دور میں وی پی وصول فرما کر علم وادب کی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

جن حضرات کی میعاد خریداری ابھی ختم نہیں ہوئی وہ صفحہ ۵ پر "چار آنے کی ٹکٹیں" والا اعلان ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

اخبار و افکار

"عالمگیر" اور "ترقی پسند ادب"

"عالمگیر" کی بعض گزشتہ اشاعتوں میں اُردو ادب کے گمراہ کن جدید رجحانات کی نرم ترین الفاظ میں مخالفت کی گئی تھی۔ اور بتایا گیا تھا کہ جس ادب کو آج "ترقی یافتہ" کہا جا رہا ہے وہ کارل مارکس کے فلسفۂ اشتراکیت اور فرائیڈ کی جنسی نفسیات کی پیداوار ہے۔ اور یہ دونوں قسم کے بیہودیانہ نظریئے چونکہ فی الحال مشرقی ماحول کے لئے سازگار نہیں۔ اس لئے ترمیمات و تحفظات کے بغیر ان کی اشاعت و تبلیغ بے معنی و بے موقع ہے۔ لیکن اس سیدھی سادی عرضداشت نے "ترقی پسند مصنفوں" کے خرمن ہوش پر بجلی گرا دی ہے۔ اور وہ اس درجہ برافروختہ ہوئے ہیں کہ "عالمگیر" کو "رجعت پسند" اور "قدامت پرست" قرار دینے سے بھی نہیں چوکے۔ لیکن اگر "رجعت پسندی" اسی کا نام ہے کہ اردو ادب کو انحطاط و ابتذال سے بچایا جائے اور مغربی مادیت کے پرستاروں کو ڈارون، مالتھس، کارل مارکس، اور فرائیڈ کا مقلد بنتے دیکھ کر صرف اتنا کہا جائے کہ پہلے اس آواز کو سمجھنے کی قابلیت پیدا کرو جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل بطحا کی وادیوں سے بلند ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد فیصلہ کرو کہ تمہیں "آزادی" اور "اخوت اور مساوات" کا صحیح رستہ کس نے بتایا ہے؟ تو یقیناً "عالمگیر" قدامت پرست ہے۔ اور اسے اپنے طرزِ عمل پر فخر ہے۔ کیونکہ وہ سند یافتہ جہلا کے اس نظریئے کو پریشان دماغی سے زیادہ وقعت دینے کو تیار نہیں کہ نئے ادب کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور الٰہیات کے فلسفوں کو بھی نئے سانچے میں ڈھال دینا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک خدا اور رسولؐ کی صداقت کا فیصلہ کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ شراب نوشوں کی محفلوں میں بیٹھ کر سمجھ اور جوڑ کی فلسفہ طرازیوں کو براہین ساطع خیال کر لیا جائے۔ بلکہ اس مقصد کے لئے خالی الذہن ہو کر غور و فکر کی عادت ڈالنے اور دوسروں کے نقطۂ نگاہ کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ زندگی ایک نامیاتی حقیقت organic Fact ہے جو ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اور اس وقت تاریخ نے

انزا۔

ادارۂ تحریر

ہمارے سامنے ایک نیا دَور اور اُس کے نئے تقاضے پیش کئے ہیں، ہماری آنکھیں اس انقلاب کو بھی دیکھ رہی ہیں جو ہماری مجلسی اور سیاسی زندگی کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اور ہم اُردو ادب کو زندگی کی نئی اقدار (values) کے مطابق ڈھالنے کے سب سے بڑے حامی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ترقی پسند ادیبوں کی طرح اخلاقیات کو بھی ایک اضافی اور اعتباری شے سمجھ لیا جائے۔ ہمارے نزدیک "اخلاق و کردار" ایک اٹل حقیقت ہے اور ایک مسلمہ اصول کے ماتحت قائم ہے۔ اور فلاسفہ کی موشگافیوں کے باوجود اخلاقیات میں ایک "مشترک اصول" اور ایک "قاعدہ کلیہ" ایسا ضرور موجود ہے، جس پر تہذیب و شرافت کی بنیادیں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ "ترقی پسندی" کے یہ بھی معنی نہیں کہ ہم آگے بڑھنے کے جوش میں پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھیں۔ اور ماضی کی دلکشیوں کو بہ یک لحظہ فراموش کر دیں۔ ہمیں یقین ہے اور ترقی پسندوں کی "عقل رسا" اس حقیقت کو جھٹلانے کے قابل نہیں ہو سکتی کہ "حال کی جڑ ماضی میں ہوتی ہے"۔ لہٰذا ترقی پسندی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ فیصلہ نہ کر لیا جائے کہ انسانیت کن اَدوار میں سے گزر کر کس مرحلہ تک پہنچ چکی ہے۔ اور اب ہمیں کس منزل سے اپنا سفر شروع کرنا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ "عالمگیر" زیادہ تر تاریخی مضامین کو ترجیح دیتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں "عالمگیر" نے گزشتہ بیس برس کے عرصہ میں جتنی خدمت کی ہے اس کی مثال اردو کا کوئی ماہنامہ پیش نہیں کر سکتا۔

پھر "ترقی پسندی" کا یہ بھی مفہوم نہیں کہ انتہا پسند انقلابیوں کی طرح ہر اس نظریہ کو مردود و مطرود قرار دیا جائے جس پر آج تک انسانی اخلاق کی بنیادیں استوار رہی ہیں۔ زندگی کے حقائق کو عریاں کرنا اور مجلسی نقائص پر کھلے الفاظ میں روشنی ڈالنا بیشک "آرٹ" ہے۔ لیکن "آرٹ" اور "کوک شاستر" کی سرحدیں بہت قریب قریب ہیں اس لئے ہر قدم پر لغزش کا سامنا ہو سکتا ہے۔ جس سے بچنا ہر سمجھدار ادیب کا فرض ہے۔ ترقی پسند ادیب بسا اوقات کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب علی حزیں۔ نظامی گنجوی۔ سعدی۔ داغ۔ میاں نظیر۔ میر حسن اور میر تقی

نے بعض رکیک اشعار کہے ہیں تو ہمیں کیوں مطعون کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو اگر اسلاف سے ایک غلطی ہوئی تو اسے از سر نو زندہ کیوں کیا جائے؟ دوسرے کسی کے دوچار مبتذل شعروں سے یہ سمجھ لینا کہ اس کی زندگی کا مقصد ہی ابتذال کی اشاعت تھی کوتاہ نظری نہیں تو اور کیا ہے؟

باقی رہی یہ بات کہ "عالمگیر" آزاد یا معرّیٰ نظموں Blank or Free Verses کو اپنے دامن میں کیوں جگہ نہیں دیتا سو اس کا جواب یہ ہے کہ "آزاد نظم" اول تو "نیا ادب" نہیں بلکہ سولھویں صدی کی پیداوار ہے۔ دوسرے مغربی ادیبوں نے اس صنف سے صرف "ڈرامائی اثر" پیدا کرنے کا کام لیا ہے۔ جس کو اُردو شاعری بوجوہ احسن انجام دے سکتی ہے۔ تیسرے آزاد نظم میں "غنائی اثر" مفقود ہے۔ اس لئے عوام میں مقبول نہیں ہو سکتی۔ چوتھے اب تک اُردو میں جتنی آزاد نظمیں کہی گئی ہیں ان کا مقصد جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے "قنوطیت پھیلانے اور ہوس پرستی کی اشاعت کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ پانچویں معرّیٰ شاعری کی زبان بالعموم غلط اور قابل اصلاح دیکھی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زبان کو بگاڑنا "ترقی پسندی" نہیں ہے۔

الغرض "عالمگیر" ترقی پسندی کا مخالف نہیں ہے بلکہ اسے قومی و ملکی ضروریات کے لئے ازبس ضروری خیال کرتا ہے لیکن وہ نوجوان دیبوں کی توجہ "ذہنی انحطاط" سے ہٹا کر انسانیت کے بلند مقاصد کی جانب مبذول کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ بلند مقاصد صرف اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب مسائل حیات پر ان اصول کی روشنی میں غور و فکر کی نظر ڈالی جائے جو اسلام نے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ نئے ادب کے حامی ابھی تک خود بھی "ترقی پسندی" کا مفہوم متعین نہیں کر سکے چنانچہ "نیا ادب کیا ہے؟" پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ ہر شخص کے بنیادی تصورات جداگانہ ہیں اور "اپنی اپنی ڈفلی اپنا راگ" والا معاملہ ہے۔ اس کے علاوہ ترقی پسند مصنفین کے ایک مقتدر رکن پروفیسر احتشام حسین رضوی اپنے ایک مکتوب میں خود بھی اقرار کر چکے ہیں کہ "زبان کا غلط استعمال عریاں نویسی اور بُرا ادب، ترقی پسندی نہیں ہے" اگر اسی نظریہ کو "عالمگیر" قدرے وضاحت سے پیش کرتا ہے تو معلوم نہیں ترقی پسندوں کے ماتھے پر شکنیں کیوں نمودار ہو جاتی ہیں؟

بہرحال ہم صاف لفظوں میں اعلان کرتے ہیں کہ "عالمگیر" نہ تو تاریک خیال اور قدامت پرست ہے نہ ادب کے گمراہ کن جدید رجحانات کا ساتھ دے سکتا ہے اس کا رستہ ان دونوں انتہا پسندیوں extremes کے درمیان ہے خیر الامور اوسطہا۔ اس کے علاوہ یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ عالمگیر کسی خاص فرقے یا جماعت کا آرگن نہیں بلکہ اس کا مقصد قارئین کے علمی و ادبی ذوق کو آسودہ کرنا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ عالمگیر کے ذریعہ سے علم و ادب کے نئے نظریئے پیش کرتا رہے لیکن بات چونکہ بڑھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے لہٰذا ایسے مضامین کی اشاعت ہمارے امکان سے باہر ہے جن میں مذہبی دلآزاری کا شائبہ ہو یا جن میں نفس مضمون کی بجائے اشخاص کو موضوع تنقید بنایا جائے۔

چار آنے کی ٹکٹیں!

جن معاونین کرام کا سالانہ چندہ ابھی ختم نہیں ہوا خاص نمبر ۱۹۴۴ء اُن کی خدمت میں بلا قیمت بھیجا جائیگا۔ لیکن رستہ میں چونکہ اس حسین و جمیل مجموعہ کے گم ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے ہر خریدار سے التماس ہے کہ وہ یہ اعلان پڑھتے ہی چار آنے کی ٹکٹیں دفتر عالمگیر لاہور میں بھیج دے۔ تاکہ خاص نمبر بذریعہ رجسٹرڈ پیکٹ ارسال کیا جا سکے۔ لیکن ٹکٹوں کے ہمراہ نمبر خریداری (جو پتہ کی چٹ کے اُوپر چھپا ہوتا ہے) کا حوالہ ضروری ہے۔ ورنہ دفتر ٹکٹوں کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ کاغذ چونکہ بہت زیادہ مہنگا ہے اور عدم وصولی کی شکایت آنے پر خاص نمبر دوبارہ نہ بھیجا جا سکیگا اس لئے ہر خریدار کا اسمیں اپنا ہی فائدہ ہے کہ وہ ٹکٹ ضرور بھیجے۔ (مینجر عالمگیر سید مٹھا بازار - لاہور)

عالمگیر کا خاص نمبر [illegible]

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۴۴ء کی ایک جھلک!

شعر و ادب اور تاریخ و تحقیق کی سرور انگیز شرالوں کا جھومتا ہوا میخانہ

یوں تو "عالمگیر" بیس برس سے اتنے شاندار سالانہ اور خاص نمبر شایع کرتا چلا آیا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک اُردو صحافت کی تاریخ ترقی کا اولین باب کہلا سکتا ہے لیکن اس دورِ انقلاب میں جب کاغذ بھی شہپرِ عنقا کی طرح نایاب ہو چکا ہے کسی شاندار اشاعت کا خیال تک قابل برداشت نہیں۔ بایں ہمہ "عالمگیر" کا خاص نمبر ۱۹۴۴ء زمانہ قبل از جنگ کے امتیازی نمبروں سے بھی زیادہ وقیع و قلیل النظیر ہوگا۔ یہ پرچہ ان تمام خوبیوں اور زینتوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے جلوہ گر ہو رہا ہے جو اردو صحافت کے دامن ترقی پر چار چاند لگانے کا باعث ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل مندرجات کے اس دُھندلے سے خاکے میں پیش کی گئی ہے۔ (ادارہ!)

علمی و تحقیقی مقالات

خاص نمبر میں تاریخ و تحقیق کی جو روشنیاں مختلف علمی مطلعوں سے جمع کر کے پیش کی گئی ہیں اُن کی جلوہ طرازی ملاحظہ فرمایئے۔

حقائق و معارف ——— مولانا ظفر علی خاں،

ان نفوسِ طاہرہ کے حالات جو فقر و فاقہ کے باوجود دولت ایمان سے مالامال تھے۔ اور دین حنیف کی راہ میں جانیں تک قربان کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ اصحاب الصفہ جدید تحقیق کی روشنی میں۔

سلطان ٹیپو کی شہادت ——— پروفیسر محمد علم الدین سالک

سلطان مجاہدین کی شہادت کن المناک و درد آفریں واقعات و حوادث کے ہجوم میں ہوئی؟ اس کا شجاعت آموز جواب یہ سیر حاصل مقالہ ہی دے سکے گا۔

سلاطین ہند کی شاعری ——— مولانا نور احمد خاں فریدی

"کلام الملوک ملوک الکلام" عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے۔ لیکن ابھی تک کسی محقق نے کلام ملوک کو یکجا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس مضمون میں تقریباً تمام سخن گو سلاطین ہند کا نمونہ کلام پیش کیا گیا ہے۔

انسان کی بہیمانہ خدمات کی سرگزشت ——— مولانا محمد اسمٰعیل ناصح،

یہ حضرت انسان کی ان خدمات کی روح فرسا سرگزشت ہے جو وہ ابتدائے آفرینش سے آج تک جانوروں اور چوپاؤں کی طرح انجام دیتا رہا ہے۔

نپولین مشرقی ممالک میں ——— ماسٹر ممتاز حسین بسمل

نپولین کارسیکا کا ایک یتیم بچہ تھا۔ جس نے اپنے بل بوتے پر یورپ کی قدیم سلطنتوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ اور اس کے بعد مصر کی طرف بڑھا۔ یہ اس کی مشرقی مہم کی خونریز داستان ہے۔

ادبی مضامین

ادب ہر قوم کی ذہنی ترقی کا آئینہ ہوتا ہے لیکن اس آئینے کے جوہر چمکانے کے لئے ایک خاص اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے جس کے امانت دار خاص نمبر کے مندرجہ ذیل مضامین ہیں!

غزل کی اہمیت ——— عبادت بریلوی ایم۔اے

آج کل پرانی چیز سے بغاوت کی کچھ ایسی رَو چلی ہے کہ غزل کو بھی ایک فرسودہ صنف ادب خیال کیا جا رہا ہے۔ اس محققانہ مقالہ میں غزل کی اہمیت پر معلومات افزا روشنی ڈالی گئی ہے۔

بیخبر اور غالب ——— میرزا محمد بشیر ایم۔اے

خواجہ غلام غوث بیخبر سے میرزا غالب کو بیحد عقیدت تھی لیکن ان کی باہمی خط و کتابت کا مجموعہ ابھی تک شایع نہیں ہو سکا۔ یہ فروگزاشت اس مقالہ کے ذریعہ سے پوری کی گئی ہے۔

(سامنے کا صفحہ ملاحظہ ہو)

نظم معرّیٰ اور نظم آزاد ——— یوسف جمال انصاری ایم اے

اُردو ادب کے جدید رجحانات میں معرّیٰ شاعری کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ صنف اُردو شاعری کے مزاج کے لئے سازگار نہیں ہے۔

آرٹ اور آرٹسٹ کے فرائض ——— خلیق ابراہیم

ترقی پسند مصنفین کے ایک بہت بڑے رکن نے ترقی پسند اُدبا کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت پوری عقیدت کے ساتھ کی ہے۔ اس کا جواب بھی مضمون کے ساتھ ہی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ادبی بحث تاریخ ادبیات اُردو میں خاص اہمیت اختیار کرے گی۔

انشا و رنگین کی تشبیہات ——— خالد حسن قادری

انشا و رنگین تشبیہات کے بادشاہ تھے۔ اس مقالہ میں دونوں کا موازنہ دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔

افسانے اور ڈرامے

افسانہ اور ڈراما معاشرت و ماحول، نفسیات و کردار، اور سماجی و مجلسی فضا کی بولتی چالتی تصویر ہے۔ لیکن اس تصویر ناطق نے خاص نمبر کی مجلس میں کس درجہ دلفریب نغمہ ریزیاں کی ہیں؟ اس کا جواب یہ فہرست دے گی۔

بگڑے ہوئے گیسو ——— خدیجہ مستور لکھنوی

وہ ایک ایسی شریر لڑکی کا فرضی افسانہ لکھنا چاہتی تھی جو سب کے بال بگاڑا کرتی تھی۔ لیکن ایک دن بال بگاڑتے بگاڑتے وہ خود بھی اپنی زندگی کو بگاڑ بیٹھی۔ یہ افسانہ تھا یا حقیقت؟

اپنے پرائے ——— انتصار حسین نیوتنوی

ایک تحیر زا، پُراسرار ریڈیائی ڈراما۔ جس کو ختم کر کے بھی آپ پوچھیں گے۔ "وہ یتیم بچہ کس کا تھا؟"

اس کے گیت ——— محمد امین شرقپوری

اس کے گیت کتنے میٹھے تھے اور رسیلے۔ لیکن ایک روز یہی رومان آفریں گیت جنگی ترانوں میں تبدیل ہو گئے۔ آخر کیوں؟

کمینے ——— احمد شجاع پاشا جالندھری

"بکری نے شیر کے سر پر پاؤں رکھ دیا اور شیر نے متانت سے گردن جھکا لی ———!!" یہ افسانہ اسی عجیب و غریب فلسفے کے گرد گھومتا ہے۔

ملمّع ——— ہاجرہ مسرور لکھنوی

"دنیا جھوٹی نمائش سے کس قدر مرعوب ہوتی ہے!" وہ سوچنے لگی۔ "بسا اوقات ریشمی برقعے کے نیچے پیوند لگی ساری ہوتی ہے۔ اور قیمتی اوور کوٹ کے اندر ایک بیوہ کا لڑکا ———!!" مجلسی زندگی پر ایک لطیف طنز۔

جونک ——— طفیل ملک

"یہ غریب کتنے بزدل ہوتے ہیں؟ زمین پر رینگنے والے ذلیل ترین کیڑے!" وہ سوچنے لگا۔ "لیکن کیا وہ خود بھی جونک تھا جو ایک بیکس لڑکی کے ہونٹوں کا رس چوسنا چاہتا تھا؟"

نیا ڈاکٹر ——— میر فیصل!

وہ تمام ڈاکٹروں اور حکیموں کی آزما چکا تھا۔ لیکن اسے آرام نہ آیا۔ آخر ایک "نئے ڈاکٹر" کو طلب کیا گیا جو حال ہی میں ولایت سے آیا تھا۔ یہ نیا ڈاکٹر کون تھا؟ اس کا جواب پڑھ کر آپ کھلکھلا کر ہنس پڑیں گے۔

ناگ دیوتا ——— قمر اجنالوی

اس رنگین و دلاویز اور تحیر افزا داستان میں اس عہد قدیم کی نقاب کشائی کی گئی ہے جب ہندوستان میں وحشی قبائل آباد تھے۔ اور ابھی آریاؤں نے یہاں قدم نہ رکھا تھا۔ یہ افسانہ پڑھ کر آپ کو ایک عجیب و غریب ناول کا لطف ملے گا۔

ویٹنگ روم ——— شوکت صدیقی لکھنوی

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ ویٹنگ روم میں جا گھسا یہاں اسے جس رومان انگیز حادثے سے دوچار ہونا پڑا اس کی دلچسپ تفصیل اس افسانے میں دیکھئے۔

دھندلکے ——— اختر ملیح آبادی،

گاؤں پر شام کے دھندلکے چھا رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس کی اپنی زندگی افسردگی کی تاریکی میں چھپ گئی۔ دلگداز کہانی۔

خالد اور وحیدہ ——— پیر غلام دستگیر نامی

صحرائے عرب کی ایک داستان جمیل جس کو ہچنس نے انگریزی کا لباس پہنایا اور نامی صاحب نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا۔

جنّ ——— نصر واسطی

ایک پُر لطف افسانہ جس کے پڑھنے سے جنّ بھوت کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

(ورق اُلٹیئے)

منظومات

نظم و غزل اُن حقائق و جذبات کا مجموعہ ہے جو دل و دماغ کے تعاون اور روح و وجدان کی نامحسوس کیفیات سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان حقائق و معارف کو شعرائے کرام نے جس خوبی سے وجد آفریں الفاظ اور دلنشین طرزِ بیان کا خوشنما جامہ پہنایا ہے اس کا اندازہ ذیل کے عنوانات سے کیجیے

موجِ فصاحت ——— جلیل مانکپوری
چلا ——— سیماب اکبرآبادی
کشتیٔ نوح ——— نوح ناروی
یگانہ آرٹ ——— یگانہ چنگیزی لکھنوی
فنا و بقا کے ترانے ——— شفق مینائی
تشطیر ——— محمود اسرائیلی
شرارے ——— نشار اٹاوی
راز و نیاز ——— ہادی مچھلی شہری
معذرت ——— اعجاز صدیقی
ساقی نامہ ——— ماہر القادری
چھیڑ چھاڑ ——— مختار بارہ بنکوی
رات کا عالم ——— کوکب شاہجہانپوری
یادِ شباب ——— اندرجیت شرما
اپنا افسانہ ——— عاصم جے پوری
پھر بھی ——— شفیق کوٹی
میرے لئے ——— دعا ڈبائیوی
انسانیت کی کشمکش ——— سروش ملیح آبادی

—— علاوہ ازیں ——

خلیل بیگو سرائی۔ شاہ عبدالمجید مضطر۔ اثر گوالیاری۔ مغیث الدین فریدی۔ سلیم علوی۔ لطیف قریشی۔ رعنا رنگپوری۔ قمر رامنگری۔ نیر امرتسری۔ ساقی صدیقی۔ سید اکبر عباس سہارنپوری۔ نفیس سندیلوی۔ سید الیاس علی وغیرہ وغیرہ کا تازہ ترین کلام

ازل کا میخانہ

تضمین بیت حافظ شیرازی

از حضرت شفق بینائی

جب ازل میں کوئی میکش تھا نہ میخانہ تھا
خُم تھا، ساغر تھا، نہ ساقی تھا، نہ پیمانہ تھا

مئے انگور کا کیا ذکر عیاذاً باللہ
نخلِ انگور، نہ انگور کا اک دانہ تھا

نغمہ بے ساز۔ ترانہ تھا جہاں بے آواز
کُنتُ کنزاً کا لبِ غیب پہ افسانہ تھا

شمع بے پردۂ فانوس تھی روشن لیکن
نام کو بھی نہ نشانِ پرِ پروانہ تھا

وہ چمن غیب کا جس میں نہ خزاں تھی نہ بہار
دُور ہم سے صفتِ سبزۂ بیگانہ تھا

جب زمیں ہی نہ تھی صحرا و بیاباں کیسا
کس بیاباں میں نہ جانے ترا دیوانہ تھا

نہ نشاں تھا، نہ مکاں تھا، نہ پتہ تھا کوئی ق
لامکاں نام اک اونچا سا جو کاشانہ تھا

اُسی کاشانے میں سب کچھ تھا جہاں کچھ بھی نہ تھا
کیا بتائیں کہ کہاں جلوۂ جانانہ تھا

محوِ آرائشِ کثرت ہوئی شانِ وحدت
جس کا آئینہ کوئی تھا نہ کوئی شانہ تھا

بے پئے سنتے ہیں اس کیف کی عالم میں شفق
لبِ حافظ پہ عجب نعرۂ مستانہ تھا

"دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند
گِلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند"

اشکِ وفا

اپنا نام نہ لینے دے نام خدا تو لینے دے

حضرت نثار اٹاوی

داغِ تمنا ہستی کے دامن سے دھو لینے دے ۔۔۔ اے پاسِ ناموسِ وفا جی بھر کر رو لینے دے

جانے کب اب وہ خواہاں ہیں جان بھی اُن کو لینے دے ۔۔۔ جو کچھ تیری قسمت میں لکھا ہے ہو لینے دے

آخر اے بیتابیٔ دل کب تک یہ رنگِ محفل ۔۔۔ رات تو گزری آنکھوں میں صبح ہوئی سو لینے دے

اے دنیا کے دیوانے، راز تو اس کا کیا جانے ۔۔۔ دنیا بھی مل جائیگی دنیا کھو تو لینے دے

اُف وہ خمار آلود آنکھیں کس سے دیکھی جائیں گی ۔۔۔ صبحِ قیامت دیر پڑے سوتی ہیں سو لینے دے

اک طوفاں اُٹھ جائیگا جب دھوکہ کھل جائے گا ۔۔۔ دیکھ غلط تسکین نہ دے روتا ہوں رو لینے دے

اب جو نہیں تو روزِ جزا اشکِ وفا کام آئیں گے ۔۔۔ کشتِ حیاتِ فانی میں کچھ دانے بو لینے دے

اب تو نمازوں میں بھی آ کے تو حارج ہوتا ہے ۔۔۔ اپنا نام نہ لینے دے نامِ خدا تو لینے دے

ایسی ہی باتوں سے دل کی بیتابی بڑھ جاتی ہے ۔۔۔ پونچھ نہ اپنے دامن سے اشک مرے رو لینے دے

میری وفاؤں کا بدلہ کوئی جفا سے دیتا ہے

یوں بھی نثار اس دنیا میں غم نا ہی ہو لینے دے

حقائق و معارف

ایک عربی ضرب المثل کا تاریخی پس منظر

إِنَّ أَخَاكَ مَنْ آسَاكَ

(حقیقت میں تیرا بھائی وہ ہے جو اپنے اوپر تجھ کو ترجیح دے)

مولانا ظفر علی خاں مدظلہ کے قلم سے

حکیم شیراز گلستاں میں کہتے ہیں ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی!
دوست مشمار آں کہ در نعمت زند
لافِ یاری و برادرخواندگی!

یہ کس قدر سچی حقیقت ہے اور زندگی کا کیسا صحیح فلسفہ ہے اچھے دنوں کا سب کوئی ساتھی ہوتا ہے لیکن مصیبت میں کتنے ہیں جو ساتھ دیتے ہیں۔ شاید ایک بھی نہ ہو ورنہ یہ کیوں کہا جاتا ؎

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

سعدی کو اس صداقت کے اظہار کے لئے باوصف اس انتہائی بلاغت کے جس میں انھیں امتیاز خاص حاصل ہے ایک نہ دو اکٹھے چار مصرعے کہنے پڑے لیکن خزیم بن نوفل الہمدانی نے اسی سچائی کو چار لفظوں میں ادا کر دیا ہے۔ اِنَّ اَخَاكَ مَنْ آسَاكَ یعنی حقیقت میں تیرا بھائی وہی ہے جو تیری اغراض کو اپنی اغراض پر مقدم رکھے۔ اپنی جان سے تیری جان کو عزیز جانے۔ اور آڑے وقت اسی طرح تیرے کام آئے کہ خود اپنے کام بھی اس طرح نہ کرتا ہو۔

ضرب المثلیں اس طرح تیار نہیں کی جاتیں کہ ایک حجرہ میں قلم دوات لیکر بیٹھ گئے اور دماغ پر زور ڈال کر ایک دل خوش کن جملہ تصنیف کر دیا۔ بلکہ جس طرح جھکڑ کے چلنے، کالی گھٹاؤں کے اُٹھنے اور بجلی کے کوندنے کے بعد قطرۂ باراں بہنا لئے دریا پر گرتا ہے اور تخیل قدیم کی رُو سے شکم صدف میں پرورش پاکر لُولُوئے شاہوار بن جاتا ہے۔ اسی طرح امتحان گاہ حیات کی کٹھن وادیوں میں مشقتیں اٹھانے اور کڑیاں جھیلنے کے بعد مُنہ سے دفعۃً و بغتۃً کوئی ایسا جملہ نکل جاتا ہے جو زندگی کے تجربہ کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اور پھر وہی جملہ ادب کے گنج شایگاں میں داخل ہو کر عروس معنی کے بناگوش کا آویزہ بن جاتا ہے۔

ضرب المثل زیر تنقید کی ابتدا بھی یونہی ہوئی تھی۔ عرب قدیم میں ایک شخص گزرا ہے جس کا نام نعمان بن ثواب العبدی تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ سعد۔ سعید۔ ساعدہ، نعمان اپنے اقران و اماثل میں شرف و مجد اور دانش و فرزانگی کے لحاظ سے سرآوردہ تھا۔ اور از بس کہ عمر بڑی پائی تھی اس کی بات سب مانتے تھے اور اس کے پند و موعظہ کے آگے بڑے بڑے فرزانوں کا سر جھکتا تھا۔ پُر زاغ پہ برف کی بارش ہوتے ہوئے جب کئی سال بیت گئے تو باغ پر خزاں آئی۔ بڈھے باپ نے اپنے تینوں جوان بیٹوں کو بستر مرگ پر بلایا اور چلتے چلتے کچھ وصیتیں کیں۔ جن کا ایک ایک حرف آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے

تینوں بھائیوں میں سعد اپنی بے مثل شجاعت کے لحاظ سے مشہور تھا۔ عرب کے سورماؤں میں کوئی اس کے ٹکر کا نہ تھا۔ کبھی ایسا اتفاق پیش نہ آیا کہ اس کے مقابلے پر کوئی آیا ہو اور اس پر غالب رہا ہو کبھی یہ بات سننے میں نہ آئی۔ کہ اس نے میدان نبرد میں تلوار نیام سے کھینچی ہو۔ اور اپنے حریف کو پیٹھ دکھائی ہو۔ دوسرا بھائی سعید عظمت مراتب اور جلالت قدر میں اپنے باپ کا مماثل تھا اور نعمان کے تمام اوصاف اس کی ذات میں جمع تھے۔ لیکن سب سے چھوٹے بھائی ساعدہ نے لاابالی مزاج پایا تھا۔ شرابیں پیتا تھا اور رنگین مزاج احباب کی صحبت میں دن رات عیش و عشرت سے بسر کیا کرتا تھا۔

نعمان نے سب سے اول سعد کو بلایا اور اس سے کہا کہ بیٹا! میں تو اس دنیا سے رخصت ہوتا ہوں۔ چلتے چلتے میری ایک آدھ نصیحت کان میں ڈال لو۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ تلوار خواہ اس کی باڑھ کیسی ہی کیوں نہ ہو کند بھی ہو جایا کرتی ہے۔ گھوڑا خواہ وہ کیسا ہی ثابت قدم کیوں نہ ہو کبھی کبھی ناخن بھی لیا کرتا ہے۔ نقش خواہ کس درجہ ہی شوخ کیوں نہ ہو مٹ بھی جایا کرتا ہے اس لئے اگر تم زرہ بکتر لگا کر اور بچی بنے ہوئے جنگ کے دنگل میں اترو۔ جہاں یہ حالت ہو رہی ہو کہ چاروں طرف سے شعلے لپک رہے ہوں بڑے بڑے

سورما لرز رہے ہوں۔ ناتوان غلبہ پا رہے ہوں۔ اور دل کی اُمنگیں بھی جرأت کی پھریری لے رہی ہوں۔ تو ایسے وقت میں مصلحت یہی ہے کہ دیر و درنگ ذرا بھی نہ کرو۔ اور اپنے حریف کو ہرگز یہ موقع نہ دو کہ وہ تمھیں نیچا دکھا سکے۔ موقع آن پڑے تو پیٹھ دکھانے میں بھی عار نہ سمجھو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ایسی روگردانی عام مصالح پر مبنی ہو۔ انتقام لینا ہو تو کسی حالت میں راہ فرار اختیار نہ کرو۔ کہ کامیابی اسی کے لئے مقدر ہوتی ہے جو منتقم ہو۔ مدافعت میں نہ پڑو بلکہ ہمیشہ جارحانہ پہلو ملحوظ رکھو۔"

سعد کے بعد منجھلے بیٹے سعید کی باری آئی۔ اس کو نعمان نے ان الفاظ میں وصیت کی۔ "مردِ سخی کے لئے بخل سزاوار نہیں۔ متاع کہنہ و نَو جو کچھ بھی ہو اسے صرف کر ڈالو۔ حاجت مند کو لیل و لعل میں نہ ٹالو۔ تاکہ دنیا میں تمھاری جوانمردی کا شہرہ ہو۔ تم کو ہمیشہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ کسی دوسرے پر اعتماد کرنا شیوۂ احتیاط نہیں۔ اس امتحان میں بہت کم لوگ پورے اُترتے ہیں۔ تم اپنے بھائیوں کو بھی آزماؤ گے تو دیکھ لوگے کہ قول کے سچے اور بات کے پورے اور "دھن کے پکے" ان میں گنتی ہی کے ہوں گے۔ بھلائی ہمیشہ کرو لیکن ان کے ساتھ جو اس کے اہل ہوں۔"

سعید یہ قیمتی نصیحت سن کر چلا گیا۔ اور سب سے آخر میں ساعدہ آیا۔ باپ نے اس سے کہا۔

"جانِ پدر! شراب خواری بڑی بُری چیز ہے۔ جو شخص کثرت سے شراب پیتا ہے اور خم پر خم لُنڈھائے چلا جاتا ہے اس کے قلب میں مادّہ فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی روزی گھٹ جاتی ہے۔ اپنے یاروں دوستوں کو بھی اچھی طرح پرکھ لیا کرو۔ یہ لوگ شہد کی مکھیاں ہیں۔ جب تک تمھارا دسترخوان وسیع ہے ان کا تمھارے گرد ہجوم ہوگا۔ لیکن جب تمھارا ہاتھ کشادہ نہ ہوگا۔ تو تمھیں ان کی صورت بھی نظر نہ آئے گی۔ ایک بات اور سُن لو۔ اپنے اہل بیت کی حمایت تم پر فرض ہے۔ اپنے مدمقابل کی اعانت کا خیال رکھو اور سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ تمھیں ہر بات میں میانہ روی اختیار کرنی چاہئے۔ کہ اسی سے تم کامیاب رہ سکتے ہو۔"

بیٹوں کو یہ وصیتیں کرکے نعمان نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں اور جب اس کی تجہیز و تکفین سے فراغت ہو چکی تو سب سے پہلے منجھلے بیٹے سعید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ باپ کی وصیت پر عمل کرے۔ اور اپنے بھائیوں اور دوستوں کو آزمائے۔ یہ بات جی میں ٹھان کر اس نے ایک مینڈھا ذبح کیا اور اسے اُٹھا کر اپنے خیمے کے ایک گوشے میں لے گیا جہاں اُسے اس نے ایک کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ اس حیلہ سے فارغ ہو کر اس نے اپنے بعض معتمد علیہ دوستوں میں سے ایک کو بُلایا اور کہا۔ کہ بھائی جان! آج ایک بڑی مصیبت آن پڑی ہے۔ آپ پر میرے بڑے حقوق ہیں یقین ہے کہ اس آڑے وقت میں آپ میرے کام آئیں گے۔ دوست نے کہا کہ آپ سچ فرماتے ہیں۔ میں دل و جان سے خدمت کو حاضر ہوں۔ مگر فرمائیے تو وہ کون سی ایسی افتاد ناگہانی ہے جو آپ پر آپڑی ہے؟ سعید نے جواب دیا کہ بھائی بات اصل میں یہ ہے کہ میں نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔ وہ دیکھو خیمہ کے گوشے میں اس کی لاش کپڑے سے ڈھنکی پڑی ہے جب تک میں لاش کو ٹھکانے نہ لگا دوں میں خطرے سے محفوظ نہیں، اس میں تمھاری مدد چاہتا ہوں کہ ہم دونوں مل کر لاش لے جائیں اور کہیں چھپا لگا دیں۔ دوست نے یہ سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرے اور کہا کہ حضرت بس مجھے معاف کیجئے بندہ آپ کا گورکن نہیں۔ یہ کہہ کر دوست صاحب تو چمپت ہوئے اور سعید نے خیمے سے نکل کر ایک اور پرانے لنگوٹئے سے اپنی حاجت بیان کی کہ یہ حضرت رفاقت و اخوت کے بڑے لمبے چوڑے دعوے کیا کرتے تھے۔ لیکن جب سعید اپنی کہانی الف ابجد سے تلئے ثمت تک ختم کر چکا تو یہ دوسرے بھائی صاحب، آنکھیں نکال کر اس لہجہ میں کہ گویا آپ ابا عن جدٍ معصوم عن الخطا چلے آتے ہیں۔ فرمایا کہ۔ خوب! آپ بھائی بچارے کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ میں ایک بے گناہ کے قتل پر پردہ ڈال کر آپ کا ممد و معاون بنوں۔ نہ صاحب! مجھ سے ایسی ناشدنی حرکت کی توقع ہرگز نہ رکھئے۔ اس دوسرے دوست سے بھی ٹکا سا جواب سُن کر سعید نے اسی طرح بہت سے دوستوں سے التجا کی اور سب کی جانب سے ایسے ہی جواب ملتے رہے اور نقشِ وفا کہیں بھی وجہ تسلی نہ ہُوا۔ کہ یہ لفظ شرمندۂ معنی ہونے کے لئے بنایا ہی نہیں گیا تھا۔

لیکن جو بندہ یا بندہ، دنیا اچھوں سے بالکل ہی خالی نہیں ہو گئی ہے

سارے دوست نانی وزبانی ہی نہیں ہوتے۔ کچھ بھائی بھی ہوتے ہیں، آخر سعید اپنے ایک دوست خزیم بن نوفل سے ملا جو سراپا صدق و صفا تھا۔ سعید نے جب اس کے سامنے بھی حسب معمول کل ماجرا دہرایا اور تان استمداد پر توڑی تو خزیم نے کہا۔ کہ اپنے اس غلام کے علاوہ جو ہماری باتیں کھڑا سُن رہا ہے تم نے اس واقعہ کی اطلاع کسی اور کو تو نہیں دی سعید نے کہا کہ بجز میرے اور تمہارے یا اس میرے غلام کے کسی اور شخص کو میرے راز کی کانوں کان خبر نہیں۔ خزیم نے معنی خیز لہجہ میں پھر استفسار کیا کہ اپنے لفظوں کو اچھی طرح جانچ تول لو۔ کہ جو کچھ کہہ رہے ہو اس میں کچھ فرق تو نہیں۔ سعید نے کہا کہ سر مو فرق نہیں۔

یہ سنتے ہی خزیم نے میاں سے تلوار کھینچ لی۔ سعید ہکا بکا رہ گیا، کہ اس نے شمشیر علم کیوں کی۔ لیکن قبل اس کے کہ اس کے منہ سے کوئی بات نکلے یا وہ بیچ بچاؤ کر سکے خزیم نے ایک ہی تُلے ہوئے وار میں غلام کے دو ٹکڑے کر دیئے اور کہا کہ لَیْسَ عَبْدٌ اَخَاكَ تیرا غلام پاس خوت و مراعات حق برادری میں تیرا بھائی نہیں ہو سکتا۔ یہ مثل اسی وقت سے زبان زد خلائق ہو گئی۔

سعید کے دل پر اپنے غلام کی تڑپتی ہوئی لاش کو دیکھ دیکھ کے جو گزری سو گزری۔ بے اختیار اس نے خزیم سے کہا کہ تجھ پر خدا کی سنوار یہ تو نے کیا کیا؟ اس کے جواب میں خزیم نے اپنے قول اول کا تکملہ اس طرح کیا اِنَّ اَخَاكَ مَنْ اَسَاكَ کہ یہ وہی مشہور مثل ہے جس کی تاریخ ہم لکھ رہے ہیں اس پر سعید نے اصل حقیقت کہہ سنائی اور مینڈھے کے ذبح کرنے دوستوں اور بھائیوں کو آزمانے اور بجز خزیم کے اور سب کے اس آزمائش میں پورے نہ اترنے کی کیفیت من و عن بیان کی سعید کی داستان اگرچہ ہمہ تن امتنان تھی لیکن غلام کے قتل کے واقعہ نے انداز بیان میں شکوہ و ملامت کو بھی ملا دیا تھا۔ اس پر خزیم نے ایک اور بلیغ فقرہ کہا کہ وہ بھی آج تک ضرب المثل ہے سبق السیف العذل یعنی ملامت پر تلوار سبقت لے گئی۔

یہ مثل اختیار کا ایک دلاویز مرقع پیش کرتی ہے۔ کہ جب اسلام نہ تھا اس وقت بھی عرب کے اخلاق و عادات میں قدیم ترین متمدن عرب کے بعض خصائص فاضلہ کی شعاعیں کیسی جھلک رہی تھیں۔ اسلام نے یہی شعاعیں اور روشن کر دیں۔ جن سے سارا زمانہ جگمگانے لگا۔ اور اس تمدنی کمزوری کی بھی یوں اصلاح کر دی جو سعید کی اعانت میں پیش دستی دکھانے کے باعث بے گناہ غلام کے قتل کا باعث ہوئی کہ "مسلمان کے لئے تشریع فی الحکم کسی حالت میں بھی روا نہیں۔ اسلام نے صرف ایک چیز میں تشریع جائز رکھا ہے، اور وہ تشریع فی المغفرت ہے"۔ ہم پر خدا کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے اسلام کی نعمت ہمیں عطا کی ——!

راتیں آئیں

از:-
حضرت طالب باغپتی

اُن سے تجدیدِ ملاقات کی راتیں آئیں ——— اے خوشا پھر وہی برسات کی راتیں آئیں
آئی پھر زلفِ معنبر کی مہک بالیں سے ——— پھر نئے سر سے حکایات کی راتیں آئیں
روز ہے غمکدۂ شوق میں عیدِ ارماں ——— پھر وہی لطف و مدارات کی راتیں آئیں
گوشِ الفت جسے سُننے کے لئے تھا بیتاب ——— للہ الحمد اُسی بات کی راتیں آئیں
غمکدے میں کوئی پھر زلف بدوش آنکلا ——— مسکراتی ہوئی برسات کی راتیں آئیں
دل کی، تقدیر کی، دنیا کی، ہماری، اُن کی ——— پھر ہم شکوے شکایات کی راتیں آئیں
چاند مجحوب، ستاروں کی نگاہیں مخمور ——— بے حجابانہ حجابات کی راتیں آئیں
روز و شب، شام و سحر کھل کے گلے ملتے ہیں ——— آئیں، عریانیٔ جذبات کی راتیں آئیں

شاہدِ فکر ہم آغوشِ جنوں ہے طالب
مست و رنگین خیالات کی راتیں آئیں

رندی و مستی

رُباعیات

از حضرت یوسف جمال انصاری ایم اے

(۱)

انداز میں کیا لگاوٹیں ہیں اللہ　　آواز میں کیا گھلاوٹیں ہیں اللہ
وہ مجھ میں سمائے جا رہے ہیں گویا　　پھر کس لئے یہ رکاوٹیں ہیں اللہ

(۲)

ابروئے ہلالی کی کماں اُف توبہ　　یہ تیرِ نظر شوخ و جواں اُف توبہ
دل ہے کہ غمِ دل ہی نشانہ تیرا　　لُطفِ خلش و عیشِ فغاں اُف توبہ

(۳)

عارض ہیں کہ شاداب و خنک انگارے　　کاکل ہیں کہ بہتے ہوئے مے کے دھارے
لب تیرے عقیق کی ہیں توام کلیاں　　ابرو تیرے ہلال آنکھیں تارے

(۴)

مُلّا تری شانِ متقی کے میں نثار　　رندوں کے مزے نقد ہیں زاہد کے ادھار
زاہد کیلئے کوثر و حور و جنت　　رندوں کیلئے بادہ و ساقی و بہار

(۵)

دنیا بھی ہے دین بھی فسانہ ساقی　　ہستی بھی ہے موت بھی بہانہ ساقی
بس وقت ہے سکوں ترے قائم ہو اگر　　ساغر ترا اور میرا ترانہ ساقی

(۶)

اک عمرِ بہشت کی مزے جس نے لئے　　دنیا میں جیئے تو کس سہارے جیئے
گندم ٹھہرے حلال انگور حرام　　دوزخ تو بھرے جرعۂ کوثر نہ پیئے

(۷)

منہ ساقیٔ کوثر کو دکھانا ہے تجھے　　دل حورِ بہشتی سے لگانا ہے تجھے
اس دیس کی ریت سیکھ او بندۂ دہر　　جس دیس کو تا ابد بسانا ہے تجھے

(۸)

پیتا ہی رہا ہمیشہ پیتا ہی رہا　　چاکِ غمِ ایام کو سیتا ہی رہا
مومن تھا تو اوہام و محن سے نہ ڈرا　　اللہ کا نام لیکے جیتا ہی رہا

(۹)

پیتا ہے کوئی غم کو بھلانے کیلئے　　مستی کا کوئی رنگ جمانے کیلئے
عنصر ہے شرابِ ناب ہستی کا مری　　پیتا ہوں فقط آپ میں آنے کیلئے

(۱۰)

پہنچیگی نہ ذہنیتِ زہّاد و عوام　　سمجھیں گے نہ مجھ سے رندِ عالی کا مقام
کہتا ہو جو انا الحق تو سمجھا کہتا ہو　　صہبا ہے مری نغمۂ ذوالجلال والاکرام

نئی زندگی

المناک افسانہ

جناب طفیل ملک

بھٹکی بھٹکی اور پھٹی پھٹی سی نگاہیں کمرے کے نکڑ میں ٹنگے ہوئے انڈین سٹیم نیوی گیشن کے بوسیدہ کلینڈر پر جم گئیں۔ ۱۱ مئی ۱۹۴۳ء اس کے تمام جسم میں سرسریاں سی دوڑ گئیں۔ مایوسیاں اور نا امیدیاں ایک خوفناک اندھیرے کے ساتھ اس کے ارد گرد پھیل گئیں۔ آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے۔ اور ایک ہلکی سی آہ کمرے میں تیرنے لگی۔

اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور جھکی جھکی نظروں سے کمرے کی ہر ایک چیز کو غور سے دیکھا۔ کمرے کی دیواروں کا سفید رنگ کہیں کہیں سے چھوٹ کر دھوئیں کی طرح میلا ہو گیا تھا۔ اور ان میلی کچیلی دیواروں پر آویزاں تصویریں بجلی کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ اور ان کی دلکش ...ملک' اس وقت اس کی اُداس نگاہیں ان خوبصورت تصویروں کی ...ت اُٹھ گئیں۔ کہیں گندیا بھیڑیں چرا رہا ہے۔ کہیں گوالا بنسری ...ہونٹوں میں لئے گوالن کے ساتھ محبت کر رہا ہے۔ اور کہیں کشمیر کے کہسار کی خوبصورت دوشیزہ لہنگا پہنے پریشانی کی حالت میں دور افق کے ...پار دیکھ رہی ہے۔ گویا اس کی نگاہیں سبزہ زار کو چیرتی ہوئی ...حسین خواب دیکھ رہی تھیں۔ اس کے سیاہ لمبے بال اس کی شکن ...پیشانی پر لہرا رہے ہیں۔ اور اس کی نگاہوں غم و الم کی جھلک ...تی ہے۔

اس کی نگاہیں کمرے کے درمیان میں پڑی ہوئی کھردری میز پر ...یں۔ اس کی کتابیں میز پر الٹ پلٹ اور بے ترتیبی سے بکھری ...تھیں۔ سامنے ایک نئی کرسی رکھی ہوئی تھی اور ایک ٹوٹی کرسی کمرے کے کونے میں پڑی تھی۔

اس کے کمرے کے بائیں طرف ایک تنگ و تاریک گلی ہے جو عام ...کیچڑ اور بدبودار پانی سے بھری رہتی ہے۔ ہر وقت چھوٹے ...لڑکے لڑکیاں گھروں کے باہر کھیلنے میں مصروف رہتے ہیں کوئی ...کوئی جاتا ہے۔ فقیروں اور چھابڑی والوں کی صدائیں ہر وقت ...رہتی ہیں۔ اس کی نگاہیں نیچے گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں پر چارپائیاں ...سامنے کے مکان کی کھڑکی سے گزرتی ہوئی ایک آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکی پر۔

وہ بیچاری اس وقت سو رہی ہوگی۔ یا پہلو میں امنگوں بھرا دل لئے چارپائی پر لیٹی اس کے لئے دعائیں مانگ رہی ہوگی۔ وہ چونک پڑا۔ صبح وہ پچیس برس کا ہو جائے گا۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے اس کے لئے بند ہو جائیں گے۔ اور اس کا دل اپنے غیر یقینی مستقبل کے خیال سے کانپنے لگا۔

۱۹۳۹ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے سوچا تھا۔ ہر وقت فلاسفی اور اکنامکس کی ضخیم کتابوں کا مطالعہ، تعلیم حاصل کرنے کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ڈیڑھ دو سو کی نوکری مل جائے گی۔ دفتروں میں مسلمان بی۔ اے ملتا ہی نہیں۔ اس کے لئے بہت چانس ہے۔ نوکری حاصل کرنے کے بعد ایک نیا مستقبل ہوگا۔ ایک نئی زندگی'۔۔۔ وہ آپ ہی آپ اپنی کامیابی پر مسکرا دیا۔ اور رنگین تصورات میں غرق ہو گیا۔

رات کو جب چادر تان کر لیٹتا تو طرح طرح کے ہلکے پھلکے سہانے اور چیٹپٹے خواب آتے۔ وہ ایک نہایت صاف ستھرے کمرے میں مخملی کرسی پر بیٹھا ہے۔ سامنے میز پر لوہے کے ٹرے میں فائیلوں کے پلندے پڑے ہیں۔ اور وہ ان پر ایک مشین کی طرح دستخط کر رہا ہے کمرے کے باہر ایک سفید دیوار پر ایک چھوٹا سا بورڈ۔ جس پر اس کا پورا نام "مسٹر عبدالحمید اعوان بی۔ اے" لکھا ہوا ہے لٹک رہا ہے، وہ ایک افسر ہوگا۔ اُسے خیال گزرا۔ مجھے ہر ایک سے ملنے کی عادت ہے افسر ہو کر اس عادت کو بدلنا پڑے گا۔ ملنے جلنے' بول چال کا ڈھنگ' سب سے علیحدہ ہونا چاہیئے۔ بڑے بڑے انگریز افسر اس کے دوست ہونگے۔ شام کا وقت کاٹنے اور دل بہلانے کے لئے انگلش کلب کا ممبر بھی بننا پڑے گا۔ اور کلب میں انگریز عورتوں سے ملاقاتیں اور بے تکلفی۔۔۔!

"لک ہیئر مسٹر!"

"تھینک یو!"

"ارے "wonderful
"Beautiful"
"Excellent"
"Very Nice"

اس نے اپنے گلے میں کچھ گرہ بڑ سی محسوس کی - کیا کروں، مجبور ہوں، موجودہ تہذیب یہی سکھاتی ہے - انگریز افسروں کو خوش کرنے کے لئے سب کچھ کرنا پڑے گا -

اور برادری کے لوگ اس کے پاس سفارشوں کے لئے آیا کریں گے "جی عرض ہے - لڑکا یتیم ہے - اس سال انٹرنس پاس کیا ہے - بس آپ کی ذرا نظر عنایت چاہئیے" عجب مصیبت ہوگی یار ان دنوں بھی، برادری کا معاملہ ہے - سفارش کرنی ہی پڑے گی - خیر کوئی فکر نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا -

اور ——— ہاں، رضیہ! کتنی شریف اور بھولی بھالی ہے - دیکھنے میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے - ہنستے وقت اس کی مسکراہٹ اور مسکراتے وقت اس کے رخساروں پر دو ننھے ننھے گڑھے کپکپاتے تو اسے وہ کتنے بھلے معلوم ہوتے ہیں - اسے ہر وقت میرا ہی خیال رہتا ہے، میری ملازمت کی کامیابی اس کے لئے خوشی کا باعث ہوگی - اس بیچاری کا دل اُمنگوں سے بھرا ہوا ہے - کہتی ہے تمہاری آس پر بیٹھی ہوں - مجھے ملازمت ملنے پر وہ پھولی نہ سمائے گی - اس کے نازک دل میں میرے لئے اور بھی عزت بڑھ جائے گی - آہ، جب وہ مجھے چوری چوری کنکھیوں سے دیکھتی ہے - اس کی نگاہیں، محبت بھری نگاہیں، اور ان نگاہوں کی مستی، میں بیخود سا ہو جاتا ہوں اور اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور چہرے پر شدید دمک پیدا ہو جاتی - وہ دیر تک آنکھیں بند کئے، چادر تانے اس خیالی دنیا میں مستقبل کے جھروکے سے سہانے خواب دیکھتا رہتا -

خان بہادر مرزا محمد اشرف اس کی برادری میں سے تھے - برادری میں کسی کی شادی تھی - خان بہادر بھی وہاں مدعو تھے - ان کی موجودگی سے بیاہ کی شان دوبالا ہو رہی تھی - اور اس شادی کے برسوں بعد دولہا دلھن کے والدین کہا کریں گے "اجی اس شادی میں خان بہادر مرزا محمد اشرف بھی شریک تھے" محلے والے خان بہادر کی خوبیاں بیان کر رہے تھے - "اجی خان بہادر ——— کیا کہنے، برادری کے بیکار نوجوانوں کا انہیں ہر وقت خیال رہتا ہے - گاموں، اللہ رکھا، معراج دین سب کو کام پر لگوا دیا ہے - غریبوں کے کام آتے ہیں، ان کا نام کیوں نہ روشن ہو

نہ صرف برادری میں بلکہ شہر بھر میں ان کی خدا ترسی، دریا دلی اور ملنساری کی دھوم ہے - جانتے ہو فتو کی لڑکی کی شادی پر دو سو روپے دیئے تھے انھوں نے" اور ایک نے ہولے سے دائیں طرف کے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ——— "لیکن اس بیوہ کا مکان بھی قرق . . . . . "

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے جذبات و احساسات کا گلا گھونٹ کر اونچے طبقے کے لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانے کی نچلے طبقے کے لوگوں کو کافی مشق ہو چکی ہے - جب خان بہادر کی تعریف ہو چکی تو ایک نے دل کو مزید تسکین دینے کے خاطر کہا - "یہ بات تو کسی سے پوشیدہ نہیں مسٹر حمید کہ خان بہادر کا حکومت کی نظر میں کتنا مرتبہ ہے - وہ تو اپنے آدمی ہیں، تمہارا کام کیوں نہ کریں گے - انھیں خود بھی اس بات کا خیال ہوگا کہ سو غیر ان کے پاس نوکری کے لئے آتے ہیں - وہ جس سے وعدہ کرتے ہیں اسے پورا کر کے ہی چھوڑتے ہیں - جتنی جلد نوکری مل جائے اچھا ہے - آخر تمہیں اپنا گھر بھی بسانا ہے - تمہیں کچھ اپنی صحت کا بھی خیال ہونا چاہیئے - کب تک ہوٹلوں اور تنوروں کے دھکے کھاتے رہو گے "

دوسرے روز وہ چار بجے کے قریب خان بہادر کے بنگلے پر حاضر ہو گیا -

" خان بہادر اس وقت آرام فرما رہے ہیں " ایک نوکر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا -

وہ بنگلے کے باہر برآمدے میں ٹہلنے لگا - خدا جانے کب بیدار ہوں پھر غسل بھی کریں گے اور غسل کے بعد چاء - کم از کم دو اڑھائی گھنٹے لگیں گے - اور وہ بےچینی سے ادھر اُدھر قدم اٹھانے لگا - خان بہادر کے بڑے بڑے انگریز افسر دوست ہیں - بس ان کی ایک "ہاں" سے اس کی زندگی بن جائے گی - وہ ایک عجیب کشمکش کی حالت میں ٹہل رہا تھا - کہ ڈرائینگ روم کے ساتھ کے کمرے میں کوئی شخص بھاری بھاری قدم رکھتا ہوا داخل ہوا -

" خان بہادر کپڑے تبدیل کر رہے ہوں گے " اس نے خیال کیا - " اب بوٹوں کے تسمے باندھ رہے ہوں گے - اور ——— دھوپ سے تپتی ہوئی تارکول کی سڑک پر ایک تانگہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا - پیپل کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھا ہوا ایک اندھا فقیر، خاک میں اٹے ہوئے رسی کی طرح بٹے ہوئے بال، اپنی گندی میلی باہیں پھیلا کر بھیک مانگ رہا تھا -

"بابا! خدا کے واسطے ایک پیسہ!"

تین گھنٹے کے بعد خان بہادر صاحب بنگلے سے باہر تشریف لائے۔ اُس نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔

"اوہ حمید تم!" خان بہادر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ "خیر تو ہے؟"

"جی!" وہ اپنی جیب سے بی۔اے کی ڈگری نکالتے ہوئے جھک کر بولا۔

"تمھارا والد میرا بہت گہرا دوست تھا" وہ سر جھکائے نہایت غور سے خان بہادر کی باتیں سننے لگا۔

"شارٹ ہینڈ اور ٹائپ تو تم جانتے ہی ہو گے؟" انھوں نے بی۔اے کی ڈگری دیکھتے ہوئے سفید زین کی پتلون کے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے فضا میں سگار کے دھوئیں کی لہریں بناتے ہوئے کہا۔

"جی، کچھ کچھ"

"خیر کوئی فکر نہیں۔ میں خیال رکھوں گا۔ سب کام ٹھیک ہو جائے گا" خان بہادر نے ظفر مندانہ مسرت کے ساتھ کہا۔

تھوڑی مدت کے بعد جب ٹائپ کی سپیڈ چالیس اور شارٹ ہینڈ کی ایک سو بیس ہو گئی تو وہ کمرے میں پڑے پڑے تصور کرنے لگتا کہ وہ اے۔جی (A. G.) کا سٹینو ہو گیا ہے۔ اس کی ٹائپ ٹک ٹک چل رہی ہے اور دفتر کے چھوٹے موٹے بابو حیرانی سے اس کی سلاخوں کی طرح مضبوط انگلیوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

خان بہادر کے بنگلے پر تیسرے چوتھے روز حاضری دینا اس کا معمول ہو چکا تھا۔ امید تھی کہ ان کی مہربانی سے دو چار ماہ تک کوئی معقول ملازمت مل جائے گی مگر ——— خان بہادر ایک مدت تک وعدے ہی کرتے رہے۔ طرح طرح کی امیدوں سے دل ہی بڑھاتے رہے ———

"بھئی ایک جگہ سٹینو ٹائپسٹ کی خالی ہوئی ہے۔ تنخواہ کچھ زیادہ نہیں۔ چونکہ تم میرے عزیزوں میں سے ہو اور تمھارا والد میرا دوست تھا میں کوشش کر رہا ہوں تمھیں کوئی معقول ملازمت مل جائے۔ بڑے بڑے افسروں سے کہہ رکھا ہے۔ آج ہی مسٹر مدلیئر سے ملا تھا۔ تمھارے متعلق دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ اُمید ہے تھوڑے دنوں تک کوئی معقول ملازمت مل جائے گی" شان کے لہجہ میں تمکنت ہوتی۔

"بہت بہتر جناب عالی!" اور اس کی عاجزی بھری آواز منہ سے نکلتی۔ امید کی ایک ہلکی سی لہر اس کے چہرے پر دوڑ جاتی اور وہ اپنی لرزتی ہوئی سلاخوں کی طرح موٹی انگلیوں میں بی۔اے کی ڈگری کو مضبوطی سے تھام لیتا۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ خان بہادر کے علاوہ کئی سروں کے بنگلوں اور کوٹھیوں پر بھی اس نے حاضریاں دیں۔ صبح کو سر نوازش علی سے ملاقات کی ہے تو دوپہر کو سر رشید احمد کی کار کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ ایسے ایسے لوگوں کی خدمت میں باریاب ہوا جن کی شکل بھی کبھی نہ دیکھی تھی۔ مگر اس تگ و دو اور جد و جہد کا نتیجہ صرف وعدے ہی وعدے، امیدیں ہی امیدیں۔

آخر کار اس نے ڈان، سول، سٹیٹسمین، ٹائمز آف انڈیا کے کالم پڑھ کر مختلف جگہوں کے لئے درخواستیں لکھنا شروع کیں۔ مختلف محکموں میں مختلف جگہ بے شمار اسامیاں خالی ہوئیں مگر اس کی درخواستوں کو کسی نے نہ پوچھا۔ سرخ رنگ کی روشنائی سے جلی حروف میں لکھے ہوئے "فرسٹ ڈویژن مسلمان" پر بھی کسی نے غور نہ کیا۔

۱۹۳۹ء میں اس نے بی۔اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ اور اب تک وہ صرف ایک بار ملازمتوں کے مقابلے کے امتحان میں شریک کیا گیا تھا۔ اسے اپنی محنت اور قابلیت پر ناز تھا۔ کمپٹیشن میں بیٹھتے وقت اسے کامیابی کا بہت یقین تھا۔ ۲۲ اپریل ۱۹۴۲ء کے اخبار میں کمپٹیشن کا نتیجہ نکلا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز چوک کے بک سٹال پہ کھڑا اخبار کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ٹانگیں ڈگمگا رہی تھیں بمشکل کئی صفحے پلٹنے پر اس کو نتیجہ ملا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا۔ شاید اس سے غلطی ہوئی ہو۔ وہ جلدی سے اپنا نام نہ دیکھ سکا ہو۔ نہیں نہیں، ایک اچٹتی ہوئی ناامیدی کی نظر سے ایک ایک امیدوار کے نام کو پرائمری سکول کے طالب علم کی طرح ہجے کر کے شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ مگر اسے اپنا نام کہیں دکھائی نہ دیا۔ اس کی قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ ایک سرد لہر اس کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اخبار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور اس کے منہ سے حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی ایک چیخ نکل گئی۔ بک سٹال پر کھڑے دو چار آدمی اس کا منہ تکنے لگے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکلے اور اس کے ارد گرد اندھیرا چھا گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ پیٹ سے کوئی چیز ہوتی ہوئی اس کے گلے میں آکر اٹک گئی ہے اس کے چہرے کی رونق ایک دم مفقود ہو گئی۔ وہ چوک کی اکتا دینے والی چہل پہل اور پریشان کن شور سے گھبرا کر گھر کی طرف جلد جلد قدم اٹھانے لگا۔

گھر کی اس بے کیف اور اُداس سی گود میں، جہاں اس نے خواہ مخواہ اپنے مستقبل سے کچھ اُمیدیں قائم کر لی تھیں، بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اور اپنے اُمنڈتے ہوئے آنسو پیتا رہا۔ دبی ہوئی آہیں دل سے ہوتی ہوئی لبوں تک آ کر رُک گئیں۔ اس کے ارد گرد چھائی ہوئی اداسیاں اور بھی گہری ہو گئیں۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور ہونٹ یوں سمٹ گئے کہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ امید و بیم کے اس ختم نہ ہونے والے بھنور میں پھنسا ہوا وہ غیر ارادی طور پر ایک پھیکی اور تلخ مسکراہٹ کے ساتھ مسکرا دیا۔ اس مسکراہٹ کی سلوٹوں میں اس کی زندگی کی ناامیدیاں اور غیر یقینی مستقبل کا خوف عیاں تھا۔

بابو لطیف اس کے ساتھ والے مکان میں رہتا تھا۔ وہ شہر کے سب سے بڑے دفتر میں کلرک تھا۔ گلی کی نکڑ یا بازار کے موڑ پر دونوں کا آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ اس سے ازراہ ہمدردی پوچھ لیتا "مسٹر حمید! کوئی چانس ملا ہے"

"جی کوشش کر رہا ہوں" وہ جواب دیتا اور اداسی اس کے چہرے پر چھا جاتی۔ آج صبح جب بابو لطیف اس سے ملنے آیا تو اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی حسب معمول دریافت کیا "کوئی چانس ملا؟"

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے۔ اور ایک ہلکی سی آہ کمرے میں تیرنے لگی۔

بابو لطیف کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ ہو گئیں۔ وہ اس کے قریب ہی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"نوکری نہیں ملتی۔ کہتے ہو بہت کوشش کر چکا ہوں۔ بی۔ اے کی فرسٹ کلاس ڈگری کے لئے تم نے اپنی زندگی کے پندرہ سولہ سال ضائع کر دیئے۔ جھوٹ کہتے ہو۔ اپنے والدین کا روپیہ تعلیم پر ضائع کر کے کہتے ہو کوشش کر چکا ہوں۔ یہ ڈگری آخر تمہارے کس کام آئیگی۔ نوکری —— نوکری کرو گے؟ تم نوکری کر ہی نہیں سکتے۔ کسی کے پاس گئے کسی سے سفارش کے لئے عرض کی؟ نوابوں، سروں اور خان بہادروں کے بنگلوں پر حاضریاں دیں؟ ان کے گھروں کا کام کیا؟ ان کے بچوں کو کبھی سکول چھوڑنے گئے۔ کہیں جوتیاں چٹخائیں؟ میرے دوست نوکری اسی طرح ملا کرتی ہے۔ تم سمجھتے ہو گے ملازمتوں کے لئے زیادہ مشکلوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ تمہارا خیال ہے کہ تمہیں مسلمان ہونے کی وجہ سے چانس مل جائے گا۔ اس خیال کو اپنے دل سے حرف غلط کی طرح نکال دو۔ میری طرف تو دیکھو، بیس سال سے نوکری کر رہا ہوں۔ آج مجھے صرف ننانوے روپے تنخواہ ملتی ہے۔ میرے گھر میں صبح و شام بارہ آدمی کھانے والے ہیں۔ نوکری کرتے کرتے میرا سر سفید ہو گیا ہے۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ آنکھیں اندر کو دھنس چکی ہیں۔ ہر وقت کھانسی اور نزلے کی شکایت رہتی ہے۔ کبھی کبھی چھاتی بھی دُکھنے لگتی ہے۔ تم نے کلرکوں کی حالت نہیں دیکھی، بیچارے کتنے مضمحل اور افسردہ نظر آتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بھی دو چیزیں تو رہ گئی ہیں نوکری اور شادی، پھر ہر سال ایک بچہ" اور کمرے کی نیم تاریک فضا میں کھوکھلی کھانسی گونج اٹھی۔

اس نے بابو لطیف کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سر پر سفید اور سیاہ بالوں کا جھنڈ، شدید سے بے نیاز حیران سا چہرہ، جس پر پریشانیاں برس رہی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی کالی گول مول اُلو کی سی آنکھیں اور ان کے نیچے سیاہ حلقے۔

"حمید بھائی! تم میرے قریبی ہمسائے ہو، میری باتوں کا بُرا نہ ماننا۔ میری خانگی حالت تم سے پوشیدہ نہیں، پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔ جب سے گرانی آئی ہے، میرے گھر کا خرچ چلنا زیادہ مشکل ہو گیا ہے، اور میری حالت قابل رحم، پہلی تاریخ کو جب تنخواہ ملتی ہے میری لڑکیاں مجھ سے لپٹ جاتی ہیں۔ بڑی لڑکی سب کچھ جانتی ہے، وہ خاموش رہتی ہے۔ چھوٹی اصغری مجھے پرانے وعدے یاد دلاتی ہے "ابا تم کہتے تھے نا! جب تنخواہ ملے گی تو ماما کی اونچی ایڑی کی گرگابی لا دونگا" اور ننھی تسنیم کو اپنی بھولی ہوئی چیزیں یاد آ جاتی ہیں۔ "ابا میرے لئے سنہری بندے اور موتیوں کا ہار" اور جب میں ساری تنخواہ بیوی کے ہاتھ پر دھر دیتا ہوں تو وہ گزشتہ مہینہ کا حساب چکانے لگتی ہے۔ بنئے کو میں دینے ہیں۔ گوشت والے کو بارہ، دودھ والے کو نو —— اور وہ مجھ سے گلہ کرتی ہے۔ آخر تمہاری تنخواہ کیوں نہیں بڑھتی؟ تم ہی بتاؤ حمید بھائی! میں اپنی بیوی کو کیا جواب دوں؟ بڑی لڑکی شادی کے قابل ہو گئی ہے۔ اس کی شادی محض اس لئے رُکی ہوئی ہے کہ میرے پاس جہیز کے لئے دولت نہیں ہے۔ میری دوسری بچیاں بھی نیم کے درخت کی طرح بڑھتی جا رہی ہیں مجھے ان کا غم بھی کھائے جا رہا ہے۔ انہیں میں ساری عمر کنوارے تھوڑی بٹھا رکھوں گا۔ خدا کی قسم مجھے اپنی بے زبان بیوی اور معصوم اولاد جینے پر مجبور کر رہی ہے ورنہ اس وقت میں آرام اور سکون کی گہری نیند سویا ہوتا" اور اس کے دل سے ایک گہری آہ نکل گئی۔ بابو لطیف کے چہرے کا رنگ اُڑ رہا تھا۔ اس کی تیوری پر بل آ رہے تھے۔ آنکھوں سے نفرت انگیز غصہ ٹپکنے لگا۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس کے تمام جسم میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر

دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"میں سارے دفتر میں ایک محنتی کلرک کے نام سے مشہور ہوں میں اپنا کام نہایت خلوص دل کے ساتھ کرتا ہوں۔ مگر افسروں اور سپرنٹنڈنٹوں کا برتاؤ میرے ساتھ کچھ نامناسب سا ہے۔ ترقی کے موقع پر کبھی کسی سپرنٹنڈنٹ یا افسر نے میری سفارش نہیں کی۔ مجھ سے جونیئر کلرک ـــــ" بابو لطیف کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ "ہاں مجھ سے جونیئر کلرک ترقیاں پاکر نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے۔ میری سروس بیس برس کی ہے اور میرے سپرنٹنڈنٹ کی عمر صرف ستائیس سال ہے۔ شروع شروع میں اسے کام سکھایا کرتا تھا۔ مگر اب وہ ہر وقت مجھی کو آنکھیں دکھاتا رہتا ہے" دن بھر کی ریں ریں، افسروں اور سپرنٹنڈنٹوں کی جھڑکیاں۔ کمتری کا احساس۔ وہ سہمے ہوئے بچے کی طرح بابو لطیف کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو نہایت غور سے سُن رہا تھا۔ اور اس کو ایسا محسوس ہُوا جیسے وہ اتھاہ گہرائی میں گرتا چلا جا رہا ہو۔

اس نے بابو لطیف کے مایوس کن چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کی زندگی میں نہ کوئی سکون ہے اور نہ اطمینان، کوئی دلچسپی نہیں، بالکل بے کیف اور بے مزہ زندگی۔

دوستوں اور عزیز و اقارب کی وہ رنگین صحبتیں جن کے لئے اس نے بیشتر راتوں کی نیند قربان کر دی تھی اب پھیکی اور بے لطف تھیں، وہ ان سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سینما، کرکٹ، مال روڈ پر کسی اینگلو انڈین لڑکی پر آوازے کسنا۔ رضیہ سے چھپ چھپ کر ملنا، تمام وہ دلچسپیاں جو کبھی اس کی زندگی کے لوازم میں شامل ہو چکی تھیں اب اسے بیہودہ اور بے کیف نظر آ رہی تھیں، بالکل مہمل اور بے معنی، اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ اور اس کی آنسوؤں سے لبریز نگاہیں سامنے میلی کچیلی دیوار پر آویزاں کلینڈر کی طرف اُٹھ گئیں۔

سامنے والے مکان میں کلاک نے اپنی دلکش اور مترنم آواز میں بارہ بجائے تو وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ کلینڈر کی طرف بڑھا۔ کلینڈر کا کاغذ جس پر موٹے حروف میں ۱۱ مئی ۱۹۴۳ء چھپا ہوا تھا ایک لمحہ کے اندر اس کی سلاخوں کی طرح موٹی انگلیوں کی گرفت میں تھا۔ کانپتی اور تھرتھراتی ہوئی انگلیوں نے ایک ناکام کشمکش کے بعد ایک جھٹکے کے ساتھ کاغذ کو کلینڈر سے علیحدہ کر دیا۔ اور کاغذ کا وہ ٹکڑا ایک ننھی سی گولی بنا دیا گیا۔ فلیکس شوز جس کی ٹو گھس گھس کر سفید ہو گئی تھی پورے زور سے ٹھوکر لگائی اور کمرے کی چار دیواری میں اس کے بلند اور بے ہنگم سے قہقہے گونج اُٹھے۔ ۱۲ مئی ۱۹۴۳ء بدعوار!!

چودہ سال تک موٹی موٹی کتابیں پڑھتا رہا ہوں۔ کن کن مشکلوں اور دقتوں سے اپنی تعلیم کو جاری رکھا۔ راتوں کو دیر تک جاگتا رہا۔ . . مگر ـــــ وہ ایک ہلکی اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مسکرا دیا۔ غیر یقینی مستقبل ناکامیوں اور مایوسیوں کے ساتھ بڑی تندی اور تیزی کے ساتھ بڑھا آ رہا تھا۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ زبان کو دانتوں تلے دبا لیا۔ "آج سے گورنمنٹ کے دفتروں کے دروازے میرے لئے بند ہو چکے ہیں۔ میں پچیس برس کا ہو گیا ہوں۔" اوویاج" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا محل ڈھے پڑا۔ کمرے کی میلی کچیلی دیواریں سمٹنے لگیں۔ اور دلکش تصویریں جیسے ایک خوفناک چھناکے کے ساتھ فرش پر آ پڑیں۔ اس کے لئے یہ وسیع دُنیا سراسر تاریک ہو گئی اور ہر سُو سے اپنے اردگرد تاریکیاں، مایوسیاں سب کی سب اپنی مہیب ترین شکلوں میں رونما ہو کر پھیلتی نظر آئیں اس کے جسم کا رواں رواں کانپنے لگا۔ کرسی پر پاؤں جمائے، سر جھکائے آنکھیں بند کئے وہ اپنے مستقبل کے متعلق غور کر رہا تھا۔ اس کی پچیس سالہ زندگی کے ساتھ اس کا دماغ بھی ماؤف ہو چکا ہے ـــــ اور ایک غیر یقینی مستقبل ــ!

اس پر رقت طاری ہو گئی۔ اور وہ کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔

بائیں طرف تنگ و تاریک گلی اس وقت سنسان تھی۔ اندھیرے میں گلی کی نالیوں میں بدبودار پانی چمک رہا تھا۔ اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ آسمان پر تارے ناچ رہے تھے۔ چاند ابھی سامنے مکان کی منڈیر پر تھا۔ ہلکی ہلکی چاندنی میں اس کا بے رونق چہرہ کاغذ کی طرح خشک اور سفید معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر بیشمار شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ رضیہ، شاید وہ اس وقت مزے سے سو رہی ہوگی۔ یا پہلو میں امنگوں بھرا دل لئے چارپائی پر لیٹی اس کے لئے دعائیں مانگ رہی ہوگی۔

"رضیہ" اُس نے سوچا۔ وہ زور سے چلائے اور جھٹ سے سامنے کھڑکی کے کواڑ کھل جائیں اور چارپائی پر لیٹی ہوئی رضیہ آرام کرسی پہ آ کر بیٹھ جائے۔

"نہیں نہیں بدنام ہو جائے گی بیچارگی۔" اس پر ایک مایوس کن خاموشی طاری ہو گئی۔ چہرے پہ حسرت و یاس چھا گئی۔ گلی کے موڑ پر سرکاری لیمپ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کے سامنے ایک کتا بھونکنے لگا اور دور سے چوکیدار کی گرج سنائی دی۔ "جاگتے رہو"

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے کھڑکی میں سے مُنہ موڑنا چاہا۔ مگر یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں پہنا دی ہیں اس کے گلے میں جیسے کسی نے پھندہ ڈال دیا ہے اور اُلجھے ہوئے دل میں جیسے کوئی دہکتا ہوا انگارہ کلبلانے لگا ہے۔

صبح جب سورج کی ابتدائی کرنیں اس کے کمرے میں داخل ہوئیں وہ سو رہا تھا — میٹھی اور گہری نیند۔ ہر طرف ایک سکون چھایا ہوا تھا۔

کمرے کی میلی کچیلی دیوار پر بوسیدہ کلینڈر لٹک رہا تھا۔

۱۲ رمئی ۱۹۴۳ء

گزشتہ تاریخ کا کاغذ ننھی سی گیند کی شکل میں زمین پر لڑھک رہا تھا۔ اسے کی ڈگری اس کی رسی کی مانند تنی ہوئی ٹانگوں کے قریب پڑی ہوئی تھی اور اس کے پاس ہی ٹوٹی ہوئی کرسی کے نیچے نیلے رنگ کی ایک خالی شیشی ———!

جوشِ عقیدت

منزل سمجھ لوں کیوں نہ سرِ رہگذر کو میں

جناب عبد العظیم خاں رونق دکنی

کیوں موردِ دعا کروں وردِ جگر کو میں
جب خوب جانتا ہوں مآلِ اثر کو میں

رنگین اک فریب اگر ہے جمالِ دوست
رکھوں گا اس فریب میں حسنِ نظر کو میں

ملتی ہیں بارگاہ سے گر اُس کی سرحدیں
منزل سمجھ لوں کیوں نہ سرِ رہگذر کو میں

قائم اُمید پر ہے مری زندگیٔ عشق،
دیوانہ جانتا ہوں ہر اک چارہ گر کو میں

دل مرکزِ نشاط تھا لیکن جنوں کے بعد
وارفتگی میں بھول گیا اپنے گھر کو میں

یہ ہے مری حیات کی روداد مختصر
راس آسکا نہ زندگیٔ مختصر کو میں

یا رب نظامِ دہر میں ترمیم چاہیئے
کیونکر سہوں اذیتِ شام و سحر کو میں

محفل میں ان کی بارشِ انوار دیکھنا
پاتا ہوں تنگ اپنی بساطِ نظر کو میں

فطرت کی سادگی ہے، عقیدت کا جوش ہے
کعبہ سمجھ رہا ہوں ترے سنگِ در کو میں

پہلے اثر کو تھی مرے نالوں کی جستجو
نالوں میں آج ڈھونڈ رہا ہوں اثر کو میں

مُڑ مُڑ کے نقشِ پا کو مرے دیکھتا ہے کیوں
کیا راہزن یقین کروں راہبر کو میں

رونق ہوئی یہ اور بھی کچھ وجہِ انتشار
سمجھا تھا دل کا چین متاعِ ہنر کو میں

سلکِ گوہر

میخانے کی سحر ہی ہر اک رات آجکل

از:- حضرت نظر حیدرآبادی

موتی لُٹا رہی ہے جو برسات آجکل
میخانے کی سحر ہے ہر اک رات آجکل

بکھرے ہوئے ہیں شوق کی جذبات آجکل
سُلجھا رہا ہوں زیستِ کے اوقات آجکل

ہر کنج ایک خلوتِ لیلائے وقت ہے
ہر باغ بن گیا ہے خرابات آجکل

آتی ہے پھول پھول سے نکہت مری طرف
کرتا ہے غنچہ غنچہ مدارات آجکل

گرتی ہے بوند بوند مرے پاؤں چومنے
اٹھتا ہے ابر بہرِ ملاقات آجکل

جلوے سجا رہے ہیں مری بزمِ آرزو
نغموں سے ڈھل رہا ہے خرابات آجکل

بادل کی گھن گرج سے ہے سہما ہوا کوئی
اب یوں بھی ہو رہی ہیں عنایات آجکل

ہر دم مہ و نجوم بھی ہیں گردِ رہگذر
طے کر رہا ہوں ایسے مقامات آجکل

چلتا نہیں ہے کس پہ مرا سحرِ نغمگی!
ہوتی نہیں ہے کس سے ملاقات آجکل

خیام ہمنشیں ہے تو غالب ہے پردہ دار
حافظ کے آرہے ہیں پیامات آجکل

سوئی ہوئی ہے میرے سوا ساری کائنات
جاگی ہوئی ہے نبضِ خیالات آجکل

ہجویاتِ سودا پر ایک نظر

تحقیقی مقالہ

جناب عبادت بریلوی ایم اے

آرٹ کا ایک بڑا مقصد سوسائٹی کی خرابیوں کو دور کرنا ہے۔ بڑے بڑے فن کاروں نے اس سے بڑے بڑے کام لئے ہیں اور اپنے خیالات کو موثر بنانے کے لئے مختلف طریقے اور مختلف انداز اختیار کئے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک طریقہ طنز نگاری کا بھی ہے۔ اس کے ذریعے سے مصنف کا مقصد بہت جلد پورا ہوتا ہے اور یہ چیز پڑھنے والے پر بہت جلد اثر کرتی ہے لیکن اردو میں اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر (اکبر الہ آبادی کو چھوڑ کر) بہت کم شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے اور خصوصاً متقدمین کے یہاں تو طنزیات بالکل شخصی ہوتی ہیں ان کے پیش نظر کوئی بڑا مقصد نہیں ہوتا۔ لیکن ان میں غیر شعوری طور پر بعض جگہ وہ خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے جو طنز کی جان ہے۔ چنانچہ سودا کی بہت سی ہجویہ نظموں میں بھی طنزیات کی خوبیاں موجود ہیں۔

اردو ادب میں سودا سے قبل ہجو نہیں ملتی۔ دو چار شعر کسی کے دیوان میں مل جائیں تو دوسری بات ہے۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو میں سب سے پہلے ہجویات کو ایک مستقل فن بنا کر پیش کرنے کا سہرا سودا ہی کے سر ہے۔ یوں تو سودا نے اور حیثیتوں سے بھی اردو کو نکھارا لیکن ہجویات نے ان کا پلہ اور بھی بھاری کر دیا ہے۔ سودا کے زمانے میں شمالی ہندوستان میں غزل کا پرچم لہرا رہا تھا۔ کہنے کو تو دو چار چھ مختصر مثنویاں بھی کہی گئیں لیکن عموماً غزل کا سرمایہ غزل ہی تک محدود تھا۔ اور پھر ابھی اردو کو شمالی ہندوستان میں ادب کا روپ دھارے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ وہ تو ابھی ایک شیر خوار بچے کی طرح تھی۔ سودا نے اردو زبان و ادب کی تمام خامیوں کو محسوس کیا تھا اور وہ اس میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کو یہی دھن تھی کہ کوئی نہ کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے اردو پروان چڑھے اور فارسی کے مقابلے میں اس کا نام روشن ہو۔ ممکن ہے کہ یہ خیال ہجویات کی تخلیق کا باعث نہ ہوا ہو کیونکہ ان کی ہجویات شروع سے آخر تک ایک وقتی تاثر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ شاید اس فن کی اہمیت اور اس کی افادیت ان کے پیش نظر نہ تھی۔ لیکن جب ہم اس دور کے متعلق قیاس ہی پر اپنے خیالات کی بنیادیں رکھ سکتے ہیں تو سودا کے متعلق یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے ان کو ہجویات کی ادبی حیثیت کا احساس رہا ہو۔ سب جانتے ہیں کہ سودا اچھے خاصے پڑھے لکھے سمجھدار آدمی تھے کوئی معمولی انسان نہ تھے جس کو صرف عوام سے کام ہو۔ فارسی سے تو ان کی واقفیت مسلم ہے۔ اس زمانے میں مغربی علوم کا تو چرچا نہ تھا لیکن اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ سودا کے سامنے فارسی و عربی ہجویات کے نمونے نہ ہوں گے اور سودا نے ان سے کافی استفادہ نہ کیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ فارسی کے دامن میں یہ خار نما پھول دیکھ کر انہیں اردو کی کم مائگی کا احساس ہوا ہو اور انہوں نے اس کو اپنی زبان میں رواج دینے کی کوشش کی ہو۔ ان دنوں اردو فارسی کی تقلید پر تلی ہوئی تھی اور ہو بہو فارسی کے نقش قدم پر چلنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اغلب خیال یہی ہے کہ ہجویات کا فن بھی اردو میں فارسی ہی کے ذریعہ سے پہنچا ہوگا۔

سودا کی طبیعت میں شوخی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہی تھی۔ ہر جملے اور ہر بات میں ظرافت پیدا کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ایسی ہی طبیعت ہجو نگاری کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ شاید سودا کو بھی اس کا احساس ہو۔ یہ چیز زندگی بھر ان کے دم کے ساتھ رہی۔ سودا فطرتاً رجائی ([illegible]) واقع ہوئے تھے۔ وہ زندگی کو ہنس کر گزار دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شگفتگی نہ صرف ان کی ہجویات میں بلکہ سارے کلام میں بے نقاب ہے۔ وہ خود ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کلام ایک زعفران زار ہے۔ جس کو دیکھ کر پڑھنے والا ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ آزاد ان کے متعلق لکھتے ہیں۔ "گرمی کلام کے ساتھ ظرافت جوان کی زبان سے ٹپکتی تھی اس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑھاپے تک شوخی طفلانہ ان کے مزاج میں اُمنگ دکھاتی تھی۔" ہجو نگاری کے لئے یہ ظرافت اور شوخی بھی حد درجہ ضروری چیزیں ہیں۔ ہجو کا مقصد یہی ہے کہ کسی چیز کی برائیاں ظرافت کی رنگ آمیزی کے ساتھ دل کھول کر بیان کی جائیں۔ جس کے

نتیجہ میں ایک طرف تو پڑھنے والے کے لبوں پر تبسم کھیلتا ہوا نظر آئے اور دوسری طرف جس کی ہجو کی جائے اس کی تحقیر ہو۔ ظرافت کی چاشنی پڑھنے والوں پر زیادہ سے زیادہ اثر کرے اور اس کے دل میں ہجو کردہ شخص یا چیز کی طرف سے ایک نفرت کا جذبہ کارفرما ہو۔ دنیا کے ہر ادب کی ہجویات میں یہ خصوصیات ہوں یا نہ ہوں لیکن ظرافت ضرور ہو گی۔ ہجویات کی تاریخ میں ایک ہجو نگار بھی ایسا نہ ملے گا جس نے ہنسنے ہنسانے کا سامان اپنے پیش نظر نہ رکھا ہو۔ اور اس خصوصیت ی تہ میں اگر کوئی بڑا مقصد بھی ہے تو اس کی تخلیقوں کا شمار بلا شبہ ادبیات عالیہ میں کرنا پڑے گا۔ سودا کی ہجویات میں شوخی اور ظرافت موجود ہے لیکن ان کے پیش نظر شعوری طور پر کوئی بڑا مقصد نہیں، بعض جگہ وہ فحش نگاری اور پھکڑ پر ضرور اُتر آتے ہیں لیکن پھر بھی اگر ان خامیوں کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر دیا جائے تو ان کی ہجویہ ظموں میں اچھی خاصی ادبیت موجود ہے۔ اور وہ یقیناً اُردو ادب میں بل قدر اضافہ ہیں۔

سودا کی تمام ہجویں قریب قریب شخصی ہیں۔ ان میں زیادہ تر ایسی یں ہیں جو کسی خاص شخص کی تضحیک میں لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں میں سودا ایسی گندگی اچھالی ہے کہ اس کی مثال شاید ہی کسی دوسری جگہ ملے۔ دا کی طبیعت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی تھی کہ وہ کسی کی بات کو برداشت کر سکتے تھے۔ جب کبھی کسی کی بات سے ان کے دل کے آبگینے کو ناگواری یس لگتی تھی تو اُن سے رہا نہ جاتا تھا۔ اور وہ آپے سے باہر ہو جاتے اس وقت جو کچھ ان کے دل میں آتا تھا اس کے کہنے سے باز نہیں تھے ان کو اس بات کا احساس نہ ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں تہذیب کی دنیا میں بُری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ سنجیدگی اس کر چیں بجبیں ہوتی ہے۔ متانت اس سے دور بھاگتی ہے۔ اور ی لوگوں کے علاوہ اس کو کوئی بھی تحسین کی نظروں سے دیکھنا گوارا کرتا۔ ایسے مواقع پر ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ہر طرف سلنے میں قہقہوں کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ اور جہاں تہذیب و ستگی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ ان کی حالت یہ تھی کہ "ذرا سی ناراضی اختیار ہو جاتے تھے۔ کچھ اور بس نہ چلتا تھا۔ جھٹ ہجو کا ایک طومار دیتے تھے۔ غنچہ نام ان کا غلام تھا۔ ہر وقت خدمت میں رہتا رساتھ قلمدان لئے پھرتا تھا۔ جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے نچہ! لا تو قلمدان، ذرا میں اس کی خبر تو لوں۔ یہ مجھے سمجھا کیا ہے ی آنکھیں بند اور بے حیائی کا مُنہ کھول کر وہ بے نقط سناتے تھے کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔" (آزاد) یہ سب حرف بحرف صحیح معلوم ہوتا ہے۔ وہ کچھ ایسے ہی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ وہ کسی کی ذرا سی بات بھی نہ سن سکتے تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا رہتا تھا۔ کہ کہیں ان کی زبان نہ کھل جائے۔ ورنہ پھر سڑکوں پر نکلنا دشوار ہو جائے گا۔ سودا کی لکھی ہوئی ہجو ہر شخص کے لب پر ہوگی۔ گلی کوچوں میں لونڈے ان کے اشعار گاتے پھریں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ انھوں نے بیسیوں آدمیوں کی ہجویں لکھیں۔ میر ضاحک کی ہجو میں ایک مثنوی، ایک ترجیع بند۔ ایک مخمس میر ضاحک کی اہلیہ کی ہجو میں۔ ان مثنویوں میں واقعی سودا نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں کہ ہم حیرت میں رہ جاتے ہیں اور یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کہ آج سے برسوں پہلے جب تہذیب و اخلاق " ہمدوش ثریا" تھی کیسے لوگ یہ سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔ آگے چل کر ہمیں ایک مثنوی فدوی پنجابی متوطن پنجاب کی ہجو میں ملتی ہے۔ پھر ایک ترجیع بند اور ایک مخمس انہی فدوی پنجابی کی ہجو میں اور ہے۔ اس کے بعد بیچارے ندرت کاشمیری کی خبر لی گئی ہے۔ چنانچہ ان کی ہجو میں دو مخمس اور ان کی لڑکی کی ہجو میں ایک مسدس موجود ہے۔ یہ تمام ہجویں شخصی ہجویں ہیں اور ان سب میں سوائے فحشیات کے اور کچھ نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں جب مشرقی تہذیب کو عروج حاصل تھا۔ ایک بلند پایہ شاعر کیسے اس قسم کی باتوں کو اپنے کلام میں جگہ دینے کی ہمت کرتا تھا۔ لیکن خیال یہ کہتا ہے کہ شاید سودا نے یہ ہجویں ادبیات کے سرمایہ میں اضافہ کی غرض سے نہیں لکھیں بلکہ ان کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ جس شخص کی ہجو کی جا رہی ہے۔ وہ دُنیا میں زیادہ سے زیادہ ذلیل اور روسیاہ ہو۔ ان کو شاید اس کا خیال نہ تھا کہ ان کو ادبیات میں جگہ بھی دی جائے گی۔ بس انھوں نے چند وقتی جذبوں سے متاثر ہو کر ایسی ہجویں لکھیں۔ اور ان کو اپنی ادبی کاوشیں نہ سمجھتے ہوئے تہذیب کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

ان ہجویات کے علاوہ سودا کے کلیات میں بعض ہجویں ایسی ملتی ہیں جن کا شمار طنزیات کے زمرے میں کیا جا سکتا ہے۔ سودا کے نزدیک ان کا لکھنا غرض سے خالی نہ تھا۔ یہ ایسی ہجویہ نظمیں ہیں جن میں سودا تہذیب کے دائرے کے اندر رہے ہیں۔ ان نظموں میں قہقہوں کا روپ دھار کر سوسائٹی کی خرابیوں پر خون کے آنسو بہائے گئے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں "قصیدہ شہر آشوب"، "مخمس شہر آشوب"، "قصیدہ در ہجو اسپ المسمی بہ تضحیک روزگار"، "مثنوی در ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہان آباد" خاص طور سے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور نظموں میں بھی جستہ جستہ اس وقت کے سماج کی زبوں حالیوں پر روشنی ڈالی

گئی ہے۔ مثال کے طور پر "مثنوی در ہجو امیر دولتمند بخیل" وغیرہ کی سی نظموں میں اکثر ایسی چیزیں ملتی ہیں جس سے اس وقت کی مٹتی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ "مثنوی در ہجو طفل مشائخ روزگار لکڑی باز" سے اس زمانہ کے ایک خاص طبقہ اور اس کی معاشرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "مثنوی در ہجو حکیم غوث" میں حکیم صاحب کا جو کیریکٹر پیش کیا گیا ہے وہ خود پکار پکار کر یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی اس حالت کو پہنچ گئی تھی کہ طبیب صرف اپنی آمدنی کی خاطر مریضوں کو خواہ مخواہ الجھن میں ڈال دیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض اور نظمیں بھی ہیں جن سے سودا کی افتادِ طبع اور ان کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی شخصیت ان کی ہجوؤں میں بے نقاب ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ ہجویات وطنزیات کو بغض وعناد سے پاک ہونا چاہیئے۔ ان کی تعمیر نفرت کی زمین پر نہ ہونی چاہیئے۔ اور مغربی انشا پردازوں نے ہمیشہ اس سے اپنے دامن کو بچانے کی کوشش کی یہی وجہ ہے کہ مغربی ادبیات میں بہت ہی کم ہیں ایسی ہجویات وطنزیات ملتی ہیں جن میں ذاتی بغض وعناد کو دخل ہو۔ مغربی انشا پردازوں نے تو ہمیشہ اس فن کو بگڑی ہوئی چیزوں کے سنبھالنے کے لئے استعمال کیا۔ ہوریس (Horace) کے وقت سے لے کر سوئفٹ (Swift) کے زمانہ تک دیکھ جائیے۔ آپ کو ان سب کے یہاں ایک خاص مقصد ملے گا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی "طنزیات ومضحکات" میں لکھتے ہیں۔

"ہوریس نے اپنے سنجیدہ اور شگفتہ مذاق طعن وطنز میں ایک مذہبی تقدس پیدا کر دیا تھا۔ آگسٹس (Augustus) کے عہدِ حکومت میں غیر ملکی عنصر جس طرح ملکی عنصر پر غالب ہو گیا تھا اور روم کی مہتم بالشان سیرت خصوصی پر جیسا کچھ اس کا مذموم اثر پڑا تھا ہوریس نے ان پر دلگداز حملے کئے ہیں۔ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس طغیان اور عصیان کا ایک ناقد اور مبصر کی حیثیت سے مطالعہ کر رہا ہے۔ کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اس کے عصیاں زار میں گردش کھا رہا ہے۔ اس کے بعد یکایک اس کا لہجہ بدل جاتا ہے اور وہ سوسائٹی کی سفاہت اور شقاوت اور اس کی بے بصری کا ماتم کرنے لگتا ہے۔ غرض یہ کہ وہ سوسائٹی کی خرابیوں اور زبوں حالیوں کو دور کرنے کے لئے اس صنف کا استعمال کرتا رہا۔ بغض وعناد کو اس میں مطلق دخل نہ تھا۔ اس کے ہر انداز میں ایک تعمیر تھی۔ تخریب سے کوسوں دور تھا۔ جرمنی میں ایک ہجو نگار Lichtenberg ہوا ہے۔ اس کے متعلق شہرۂ آفاق شاعر گوئٹے (Goethe) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ طنز کرتا ہے وہاں کوئی بڑا اور اہم مسئلہ اس کے پیش نظر ضرور رہتا ہے۔ "wherever he makes a joke, a problem lies concealed" سوئفٹ (Swift) سے انگریزی دان طبقہ تو اچھی طرح واقف ہی ہے۔ اس نے نوعِ انسانی پر طنز Gulliver's Travels جس لطیف انداز میں کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ غرض مطلب یہ ہے کہ ہجو نگار یا طنز نگار کے پیش نظر کوئی بڑا مقصد ضرور ہونا چاہیئے۔ ورنہ اس کی تخلیقوں میں کوئی گہرائی نہ ہوگی اور زمانہ بہت جلد اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔

ہمارے شاعر سودا کے پیش نظر کم از کم ہجویات اور طنزیات میں کوئی بڑا مقصد کبھی بھی نہ رہا۔ ان کی قریب قریب تمام ہجویہ نظمیں کسی خاص شخص یا زمانے سے بغض وعناد کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ چند اشخاص سے ناراض نہ ہوئے ہوتے تو شاید وہ نظمیں لکھی ہی نہ جاتیں۔ اگر زمانہ نے ان کو تکلیف نہ دی ہوتی تو شاید شہر آشوب وغیرہ کی سی نظموں کا پتہ نشان بھی نہ ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سودا کی طبیعت میں برداشت کا مادّہ مطلق نہ تھا۔ وہ ہر چیز سے الجھ جانا چاہتے تھے۔ کسی کی بات ان سے سہی نہ جاتی تھی۔ ان کا پیمانۂ صبر ہمیشہ لبریز ہی رہتا تھا۔ وہ ذرا سی ٹھیس لگنے سے چھلک پڑتا تھا۔ اور پھر تو وہ ایسی خبر لیتے تھے کہ دیکھنے والا حیرت سے دنگ رہ جائے۔ ان کی ہر ہجویہ نظم سے بغض وعناد کی بو آتی ہے۔ اگر سودا کے تعلقات شیدی فولاد خاں کوتوال سے خراب نہ ہوئے ہوتے تو شاید ہمیں ان تفصیلات کا ذکر بھی نہ ملتا جو سودا نے اپنی اس نظم میں پیش کی ہیں۔ لیکن سودا میں ان چند خامیوں کے باوجود کچھ خوبیاں بھی ہیں۔ جو غیر شعوری طور پر پیدا ہو گئی ہیں۔ اور جو یقیناً قابلِ قدر ہیں۔ مثال کے طور پر وہ ہجویہ نظم جو سودا نے شیدی فولاد خاں کوتوال دہلی کے متعلق لکھی ہے دیکھی جا سکتی ہے۔ اس نظم میں ہمیں دو پہلو ملتے ہیں۔ ایک تو شیدی فولاد خاں کی ہجو جس کی وجہ سے یہ نظم ظہور میں آئی۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو زیادہ دلچسپ ہے جس میں غیر شعوری طور پر سودا کے قلم نے دلّی اور اس کی مٹتی ہوئی سوسائٹی کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اس زمانہ کی دلّی بدنظمی اور انتشار کا مسکن تھی۔ مغل صرف نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ ساری سوسائٹی کا مذاق بگڑا ہوا تھا۔ تمام حکام رشوت لیتے تھے۔ چور اور ڈاکوؤں کی کثرت تھی۔ افلاس وغربت نے اس چیز کو اور بھی ترقی پر پہنچا دیا تھا۔ اس سے قبل دلّی کی حالت اچھی تھی۔ جیسا کہ سودا نے لکھا ہے ؎

کیا ہوا یارو وہ نسق بہہات ٭ لیموں کے چور کا کٹتا تھا ہاتھ

باندھاجاوے تھاچور پگڑی کا　　مارا جاوے تھا دزد لکڑی کا
شہر میں کیا رہے تھا امن و اماں　　کیسی کرتی تھی خلق خوش گزراں
تھانہ رشوت سے کوتوال کو کام　　شہر میں تھانہ جوئے کا نام

لیکن اس کے بعد یہ حالت نہ رہی۔ جب لوگوں نے قانون کی گرفت ڈھیلی اور سارے نظام کو درہم برہم ہوتے دیکھا تو خود ان کی زبوں حالی نے ان کو چوری اور دوسرے طرح طرح کے جرائم کرنے کے لئے مجبور کیا۔ ان کا دبانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ وہ جان پر کھیل کر اور سر سے کفن باندھ کر ایسا کرتے تھے۔ حکام کی حالت یہ تھی کہ کہنے کو تو وہ حکام تھے لیکن مفلسی ان کے بھی گلے کا ہار ہو کر رہ گئی تھی۔ لاچار رشوت نہ لیتے تو کیا کرتے چنانچہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں سے مل جایا کرتے تھے اور ان کو "اجازت" تھی کہ وہ لوٹ مار کریں۔ حکام ان کے اس کام میں دخل اندازی نہ کریں گے۔ وقت پر حکام کی تنخواہیں بھی نہ ملتی تھیں، بیچارے کیا کرتے۔ ان کو بھی کسی نہ کسی طرح پیٹ بھرنا تھا۔ بس ان کا کام رشوت سے چلتا تھا۔ پھر کیا تھا۔ چوروں نے وہ آفت ڈھائی کہ خدا کی پناہ ؎

اب جہاں دیکھو واں جھمکا ہے　　چور ہے، ٹھگ ہے، اور اُچکا ہے
دیکھی ہم نے جو راہ چاوڑی کی　　چشم ہے رہزنی تلوڑی کی
خاص بازار کا جو سنئے بیاں　　ان کے نزدیک کاٹ ڈالے کان
دمڑی کے سودے کو جو واں جاوے　　پگڑی کھو، سر کو پیٹتا آوے
کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال،　　شیدی فولاد اب جو ہے کتوال
چور کب اس کا زور مانے ہے　　کالا بال اس کو اپنا جانے ہے
ہے یہ کتوال تو وہ مانے زور　　یہ تو پھر کی جھول کا ہے چور
ان سے رشوت لئے یہ بیٹھا ہے　　اس کے دل میں یہ چور بیٹھا ہے
بعضوں کے مفسدوں کا زور ہے یہ　　چور کا بھائی گٹھی چور ہے یہ
اپنے دروازے آگے رکھ نٹ کھٹ　　کئے ہیں ان نے گھر کے گھر چوپٹ
ٹھگ نہ تنہا چڑھے ہے اس کی آنٹ　　مل رہی ہے اچکوں سے بھی سانٹ
سر پہ یہ دیکھیں جس کی ابھی شال　　گویا وہ اس کے باپ کا ہے مال
گشت جب اس کا کرتا آتا ہے　　یہی سر سنگیا بجاتا ہے
سن لو چورو یہ مختصر قصہ　　صبح کو بیچ دیکھو حصہ

اور اس طرح دور تک وہ تمام کیفیت بیان کرتے چلے گئے ہیں
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عام حالت یہی تھی۔ شیدی فولاد خاں اور اس کے زمانہ ہی پر منحصر نہیں۔ سودا کو اس سے گزند پہنچا اور انہوں نے یہ شخصی ہجو لکھ دی لیکن غیر شعوری طور پر اس میں وہ کیفیت پیدا ہو گئی اور چند ایسی باتوں کا ذکر آگیا جس نے اس کو بہت بلند کر دیا۔

ہیں سودا کی ہجویات کو مغربی انشا پردازوں کی کسوٹی پر نہ کسنا چاہیئے۔ سودا ہندوستان میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے۔ اور ہندوستان بھی آج کا ہندوستان نہیں بلکہ آج سے دو صدی ادھر کا ہندوستان، جب مغربیت کا کوئی تصور یہاں کے لوگوں کے دماغوں میں نہ تھا۔ مغرب کے علوم و فنون ہندوستان میں ابھی پہنچے ہی نہ تھے ہندوستانی فرنگیوں کو زیادہ تر تاجروں کی حیثیت سے جانتے تھے جو ہندوستان جنت نشان کو لوٹنے میں جان تن کی بازی لگا کر گھر سے نکلے تھے۔ مغربی شاعری نے ابھی مطلق اثر نہ کیا تھا۔ چنانچہ سودا کو بھی مغربی شاعری اور وہاں کے رنگ کا مطلق پتہ نہ چلا۔ پس ان کے پیش نظر ہجویات و طنزیات کے متعلق مغرب کا تصور نہ تھا۔ کہ اس سے عوام کی حالت بھی سدھاری جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صنف کو وہ کوئی ادبی صنعت نہ سمجھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ فحش اشعار جن میں سودا نے گالیوں تک سے گریز نہیں کیا شاید ان کے قلم سے نہ نکلتے، وہ ہجو صرف ہجو کی خاطر کہتے تھے۔ ان کو اپنی جادو بیانی کا خود احساس تھا۔ لیکن وہ اس جادو بیانی سے کوئی اچھا کام نہ لے سکتے تھے۔ ان کو تو کسی نہ کسی کا مذاق اڑانے سے سروکار تھا ——— خواہ وہ سماج ہو یا کوئی شخص ؎

چل قلم اب قصد کر تو جنگ کا　　اُٹھ چکا پردہ حیا و ننگ کا

اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ قلم جب چلتا تھا تو وہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کی اکثر ہجویں تغلیظ فحشیات کے اس درجہ پر پہنچ گئی ہیں جس کی مثال کسی شائستہ لٹریچر میں ملنی مشکل ہے۔

بزرگوں سے پوچھیئے تو وہ یہی کہیں گے کہ ہمارا زمانہ بڑا اچھا زمانہ تھا۔ تہذیب ویسی تو کیا اس کا شمہ برابر بھی آج کل دیکھنے میں نہیں آتی آج کل کے لوگ کیا جانیں کہ تہذیب ہے کیا۔ غرضیکہ وہ اپنے زمانے کی تعریفوں کے پل باندھ دیں گے۔ اور موجودہ زمانہ کو بہت برا بھلا کہیں گے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ سودا کے زمانہ کو دیکھئے۔ وہ اور ان کے زمانے کی معاشرت قدیم طرز کی تھی۔ لیکن ذرا سودا کی ہجویات کے ان حصوں پر نظر ڈالئے جن میں انہوں نے فحشیات کے انبار لگا دیئے ہیں تو آپ محسوس کریں گے کہ بازاری سے بازاری شخص اور عامی سے عامی آدمی بھی ان حصوں کا پڑھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ ایک شاعر سے اور ایک بلند تہذیب کی فضا میں سانس لینے والے شاعر سے تو اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ گالیوں کو

اپنے کلام کا زیور سمجھے گا اور ایسی باتیں کہنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہ کرے گا جن کو سُن کر خود تہذیب وشائستگی پانی پانی ہو جائیں۔

سودا نے عجیب عجیب قسم کی فحش باتوں کو اپنی ہجویات میں سمویا ہے۔ جب وہ کسی خاص شخص کی ہجو کرتے ہیں تو اس کو ایسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں جو عموماً بازاری لوگوں کی زبان پر ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ مولوی ندرت کشمیری کو کہیں بھڑوا اور کہیں مُرغا کہتے ہیں۔ میر ضاحک کی ہجو میں جو مثنوی لکھی ہے اس میں کہیں اس کو "گیدی خر" اور کہیں دوسرے بُرے الفاظ سے یاد کیا ہے ؎

کیجو میری ہجو تو اے بھڑوے ننٹ　　تو سہی دوں بانس سے تجھکو اُلٹ

جورو اپنی پہ جب کرے ہے نظر　　اس سے کہتا ہے تب یہ گیدی خر

لیکن وہ ہجو کرتے وقت صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ اس کو گالیاں دے کر چین سے بیٹھ جائیں بلکہ وہ اس کی بہو اور بیٹیوں تک پہنچ جاتے ہیں اور اس بُری طرح ان بیچاریوں کی بھی خبر لیتے ہیں کہ جس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ مولوی ندرت کی ہجو کرتے وقت اس کی بیوی کے متعلق کہنے لگتے ہیں ؎

عشق کی تپ سے تری جورو کا تن رہتا تھا تفت
اور عارض بھی ہوئے تھے جوشش سودا سے فت
آخرش کیسے میں ان کے ڈال پیسے کہیں کہ ہفت
ہر ضع مادہ سودائے عطار رفت
نسخۂ قعرہ لشش ہمہ مداوا ریختہ

بعض جگہ ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جن کو ادب گوارا نہیں کر سکتا۔ "آپنے" وغیرہ تو ان کے لئے معمولی بات ہے ؎

ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا
بے وجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا
تب شیخ سدو اس پر اماں کہا کے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

مذکورہ بالا دو ایک مثالیں تو ایسی ہیں جن کو پڑھا جا سکتا ہے لیکن بعض اس درجہ فحش ہیں کہ سنجیدہ آدمی ان کو پڑھنا تک گوارا نہیں کر سکتا۔

عمر باقی تھی غرض پائی شفا　　پھر ہوا سوزاک بند ہوا احتلام
آخرکار اس مرض کی بھی دوا،　　وہ جو مادر خر تھی اس کے کام آئی
ریم سوزاک پدر تو اے شریر　　رحم مادر میں اُلٹ نکلا ہے پیر

لیکن یہ طوفان بدتمیزی سودا نے کیوں کھڑا کیا؟ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سودا کی بڑھتی ہوئی شہرت دیکھ کر لوگ ان سے رشک کرنے لگے تھے۔ اور ان کو دیکھ نہ سکتے تھے سودا کے ساتھ ان لوگوں کا برتاؤ کچھ اچھا نہ تھا۔ ادھر سودا کی طبیعت ہمیشہ سے کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ وہ بات کو برداشت کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ ذرا سی بات پر برس پڑتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض اور لوگ جو کسی صورت سے مرزا کو گزند پہنچاتے تھے۔ وہ ان سے بھی فوراً بدلہ لینے کے لئے بیقرار ہو جاتے تھے۔ ان کے پاس اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ اپنے قلم کا ہتھیار استعمال کریں۔ اور ان کا قلم رجز پڑھ کر میدان میں آنکلے ؎

جلد یاں سے نکل وگرنہ ترا،　　بھرم میں اس طرح سے دونگا کھول
اب بلا کر ڈھنڈھورا اس کو　　یوں سکھا دونگا میں بجا کر ڈھول
خلق اللہ کی سُنے یہ بات،　　ہے اک اُلّو یہ آدمی کا خول
سُن کے عالم ڈھنڈھوریئے کی ندا　　بولے گا دیکھ کر تجھے یہ بول

کس نیاید بزیر سایۂ بوم
در ہماں از جہاں شود معدوم

اور پھر سودا کو کبھی اس کا خیال نہ رہتا تھا کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں یہ سب کا سب فحش ہے یا نہیں؟ اور وہ لکھتے چلے جاتے تھے بس یہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ ان کی طبیعت انتہا پسند تھی۔ یہ انتہا پسندی ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈال دیتی تھی۔ جس سے وہ اور کچھ دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ جس کی ہجو کی جائے اس کو ذلیل کرنا ان کا خاص مقصد تھا۔ ایک وجہ ان کے ہجویات کے فحش ہونے کی اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ان دنوں ان کا یہ خیال نہ تھا کہ یہ کبھی ادب میں بھی شمار کی جائیں گی۔ بلکہ وہ تو ان کو یونہی لکھا کرتے تھے۔ اپنے دل میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کو بجھانے کے لئے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے۔ ممکن ہے سودا اپنی ہجویات لکھ کر عوام کو دے دیتے ہوں تاکہ وہ لوگ مزے لے کر اس کو گلیوں میں پڑھتے پھریں اور اس طرح جس کی ہجو کی گئی ہے اس کی تشہیر جگہ جگہ ہو جائے۔ یہی چند وجوہ ہیں کہ ان کی ہجویات فحش ہیں۔ ورنہ وہ اچھے خاصے سنجیدہ مزاج شاعر تھے۔

ہر چند انھوں نے اپنی نظمیں عوام کے لئے کہی تھیں اور کوئی بلند ادبی مقصد ان کے پیش نظر نہ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی ان میں بعض بعض جگہ بلا کی "ادبیت" پائی جاتی ہے۔ یعنی ان اپنی ہجویہ نظموں میں سودا نے شعریت کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ سودا پیدائشی

شاعر تھے ان کی شاعری اکتسابی شاعری نہ تھی۔ پس جو بات بھی ان کے قلم سے نکلتی تھی وہ تمام تر شاعرانہ خوبیوں میں رنگی ہوئی ہوتی تھی۔ شاعر کے لئے بڑے بڑے موضوعات میں شاعرانہ خوبیاں پیدا کرنا آسان کام نہیں ہوتا لیکن سودا کی فحش باتیں بھی شاعرانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی ہیں۔ حالانکہ عموماً ایسی باتوں کے بیان کے وقت شاعر کا ذہن دوسری طرف رجوع ہوتا ہے۔ اور اسے اپنی باتوں کو شاعرانہ خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن سودا کا یہ بڑا کمال ہے کہ ان کی ہر بات شعریت میں ڈوبی ہوتی ہے۔ اور پھر اس میں آورد نہیں بلکہ آمد کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی شعریت میں نام کو کوئی بناوٹ نہیں۔ چنانچہ وہ باوجود فحش ہونے کے پڑھنے والے کو اچھی معلوم ہوتی ہیں —— وہ مزے لے لے کر پڑھتا ہے اور "ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول" وہ کام کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے۔ میر ضاحک کے جلدی جلدی کھانے کو صرف ایک شعر میں کس عمدگی سے بیان کیا ہے ؎

مارے لقمے تو اس طرح بدذات جیسے جھاڑے کوئی پٹے کے ہاتھ

یا ایک جگہ ضاحک کے منہ میں نوالے کی تصویر اس طرح کھینچی ہے ؎

ان کے باورچی خانے کا احوال چولھے ہر گھر میں جب کریں ہیں عیال
ڈالے ہیں سر پہ خاک ماتم سے لکڑی جلتی ہے آتش غم سے
سینے دیگوں کے مارتے ہیں جوش روتے ہیں ڈھانپ ڈھانپ منہ سرپوش

بعض بعض جگہ ایسی تشبیہات اور استعارات استعمال کرتے ہیں جو صرف ہجو ہی کے لئے مناسب ہیں۔ ان میں اگرچہ کسی قسم کی لطافت تو نہیں ہوتی لیکن اگر ہم اسے ہجویہ نقطۂ نظر سے دیکھیں تو بیساختہ سودا کی قوت تخئیل کی داد دینی پڑتی ہے ؎

شکل سے کس کی اسے تشبیہ دیں ہے وہ سنگ خوک سے شت زبوں
رنگ و دہن اس کا ہے بدبو منیر جیسے کہ جلاّب کا دست اخیر

ادب کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مختلف زمانوں کی سماجی حالت کی تصویریں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اگر ادب میں یہ خوبی نہ ہو تو اس کے خالق کو زمانہ زندہ نہیں رکھتا اور بہت جلد موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ آنے والی نسلیں اس میں ذرا بھی دلچسپی کا اظہار نہیں کرتیں۔ سودا کی ہجویات میں اگرچہ بہت سے نقائص ہیں لیکن ایک یہ ایسی خوبی ہے جس نے ان کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ اس میں اس زمانہ کی مٹتی ہوئی تہذیب کی تصویریں ہیں۔ ان کا ایک ایک شعر ہمارے سامنے مسلمانوں کی سلطنت کی گرتی ہوئی عمارت کا نقشہ پیش کر دیتا ہے۔ بظاہر تو ہم ان کو پڑھ کر مسکراتے ہیں لیکن حساس دل میں اس مسکراہٹ کے ساتھ رنج و غم کا سیلاب بھی موجیں مارنے لگتا ہے۔ جب گھوڑے کی ہجو لکھتے ہوئے وہ یہ کہتے ہیں کہ میدان جنگ میں جاتے وقت اس پر سوار ہونے والا دو کوڑے اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ سائیس اس کے سامنے تھا اور اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک آدمی پیچھے سے ہانک رہا تھا، لیکن اس پر بھی گھوڑا چلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اس وقت اس میں شک نہیں کہ ہنسنے کو ہمارا جی چاہتا ہے لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس کی تہ میں اس زمانہ کی زبوں حالی بے نقاب ہے۔ یہ واقعہ اس زمانہ کی فوج کی دگرگوں حالت کا پتہ دے رہا ہے۔ سودا کا طرز بیان ہمارے لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن دل میں حزن و ملال کی آندھیاں اٹھنے لگتی ہیں اور ہمارا احساس خون کے آنسو روتا ہے۔

سودا کی اکثر ہجویات میں اس قسم کے ماتم کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے حالات کے ہوبہو نقشے بھی ملتے ہیں۔ ان ہجویات میں ہم اس بات کے معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ سودا کے زمانے میں عوام بہت زیادہ توہم پرست تھے۔ وہ بھوت پریت وغیرہ کے قائل تھے۔ خصوصاً شیخ سدو کا زور معلوم ہوتا ہے جن کی قبر آج بھی امروہہ ضلع مراد آباد میں موجود ہے۔ لوگ اس کے نام کی کڑھائی وغیرہ آج بھی چڑھاتے ہیں اور خدا جانے کیا کیا کرتے ہیں چنانچہ سودا نے جو مسدس اہلیہ میر ضاحک کی ہجو میں لکھا ہے اس میں اس کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا بو جبرات ساری ہمسایوں کو جگایا۔
بیٹھک میں اینٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا تب شیخ سدو اس پر امساک کھا کے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

سودا کی ہجویات سے بار بار یہ چیز ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی حالت خراب ہے۔ وہ زمانہ انحطاط کا زمانہ تھا۔ سپاہیوں کی تنخواہیں وقت پر نہ ملتی تھیں۔ ناچار بیچاروں کو قرض لینا پڑتا تھا۔ بنئے قرض دینے کے لئے موجود تھے اور دل کھول کر سود لیتے تھے۔ سپاہی ہمیشہ قرضدار رہتے تھے کیونکہ ادا کرنے کے لئے روپے کی آمد تو کسی طرف سے تھی نہیں۔ کبھی کبھی یہ لوگ ان بنیوں کو مختلف صورتوں میں دھوکا بھی دیا کرتے تھے۔ چنانچہ فدوی پنجابی کی ہجو میں سودا نے اس چیز کو پیش کیا ہے

نیا کہتا ہے ؎

پیسے مرے کرچ ہیں اک سپاہی کے پاس
اس سے نکد ملنے کی مجھکو نہیں ہے اب آس

قصیدہ شہر آشوب میں سودا نے دل کھول کر بھڑاس نکالی ہے۔

اس قصیدہ سے اس زمانہ کی دلی کی تمام کیفیت سے آگاہی ہوجاتی ہے ان دنوں عوام بہت مفلس ہوچکے تھے۔ ایک تو نوکری کہیں ملتی ہی مشکل تھی اور اگر کہیں مل بھی گئی تو جان عذاب میں ہوجاتی تھی۔ نہ تو وقت پر تنخواہ ملتی تھی اور نہ ہی کوئی کھانے پینے کا ٹھیک انتظام تھا۔ اگر گھوڑا نوکری بجانے کے لئے مل گیا تو اس کے گھاس دانے کا انتظام نہیں۔ قرض سے اس کے خور ونوش کا انتظام کیا جاتا تھا۔ جب فاقوں کی نوبت آجاتی تھی تب لوگ بنیوں اور صرافوں کے یہاں دوڑتے تھے ؎

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر — شمشیر جو گھر میں ہے سپر بنیئے کی یاں ہے
کہتا ہے نفر غزہ کو صراف سے جا کر — بی بی نے جو کچھ کھایا ہے فاقے سی میاں ہے
یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ — شوال بھی ماہ مبارک رمضاں ہے

اس رنج سے جب بڑھ گئے چھتیس مہینے — تنخواہ کا پھر پٹنا اس شکل سی یاں ہے
لیتے ہیں بایں روسیہی وہ تو دما ہر — ٹک صوفی و شیخ کے کی جنھیں تاب و تواں ہے

اس سے بہتر نقشہ اس زمانہ کی دلی کا اور کیا ہوسکتا ہے؟ اس کو مغل سلطنت کا مرثیہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ان دنوں زندگی کے ہر شعبہ میں بدنظمی کی حکمرانی تھی اور تباہی و بربادی ہر چیز میں گھل مل گئی تھی — مسلمان اپنے مذہب تک کو بھول چکے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی تو درکنار بہت سے تو اس سے واقف بھی نہیں تھے۔ مسجدوں میں ویرانیوں کا بسیرا تھا۔ ان کو کوئی آباد کرنے والا نہ تھا ؎

قاضی کی جو مسجد ہے گدھا باندھ کر اس میں — بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے
ملا جو اذاں دیوے تو منہ موند کے اس کا — کہتے ہیں کہ خاموش مسلمان کہاں ہے
بولا جو خطیب اس میں تو مارے اسے اک دھول — ہاتھ آگیا واعظ نہیں ورد یہاں ہے
رہنے ہے گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے — نے ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے

جیسا کہ اوپر بھی بیان ہوا ہے۔ ان دنوں ہر پیشہ کی حالت خراب تھی۔ نوکری کرنا گویا اپنے آپ کو بھوکا مارنے کا مصداق تھا۔ کیونکہ بیچارے نوکر رکھنے والے کے گھر میں خود کچھ کھانے کو نہ تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ نوکری بہت سخت بجانی پڑتی تھی۔ رات رات بھر دوزانو بیٹھا رہتا

پڑتا تھا۔ اگر کوئی شخص سوداگری کا پیشہ اختیار کرتا تھا تو بیسوں جگہ کی خاک چھاننے کے بعد بھی اسے کچھ حاصل نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی شخص کھیتی کرتا تھا تو اس پر دنیا جہان کی مصیبتیں ٹوٹ پڑتی تھیں اور نتیجہ بالآخر تباہی کی شکل میں نمودار ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ لڑکے پڑھانے والے ملا۔ خوشنویس اور کاتب۔ غرض ہر پیشہ والے پر ادبار کی گھٹائیں منڈلا رہی تھیں۔ ملک بھر میں انتشار کے باعث انسانوں کی عقلیں بھی خبط ہو چکی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ اگر بیکاری کی زندگی بسر کرتا تھا تو بیوی بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ غرض سماج کے کسی فرد کو کسی صورت میں چین نہ تھا۔ آسودگی کا نام زمانہ سے مٹ گیا تھا ؎

آرام سے کٹنے کا سنا تونے کچھ احوال　　جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام　　عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سو اس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے　　یہ بات بھی گوینده ہی کا محض گماں ہے
یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر　　آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ہجویات سوداؔ کی زبان بھی قابل غور ہے سوداؔ چونکہ اُردو کے مسلم الثبوت استاد تھے اس لئے ان کی ہجویات زبان کی خامیوں سے تمام تر پاک ہیں۔ بعض جگہ زبان کے معاملہ میں سوداؔ نے کچھ جدتیں بھی کی ہیں مثلاً بنئے کی زبان جہاں کہیں بھی نظم کی ہے وہاں اس کو خالص اور ادبی اُردو کا جامہ پہنا کر پیش نہیں کیا ہے بلکہ اسی زبان میں نظم کیا ہے جو بنئے عموماً بولتے ہیں۔ سوداؔ نے اس کے ذریعے اپنے خیالات کو اور بھی زیادہ موثر بنا دیا ہے۔ پڑھنے والا بنئے کے خیالات اور تاثرات اسی کی زبان میں سننا پسند کرتا ہے۔ اور اسی لئے اس سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بعض بعض جگہ سوداؔ نے بلا کی فحش زبان استعمال کی ہے جس کو بازاری لوگوں کے علاوہ اور کوئی استعمال کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔

اگرچہ سوداؔ کی ان ہجویات کو لکھے ہوئے کئی سو برس گزر گئے لیکن وہ آج بھی دلچسپ ہیں آج بھی ہم ان کو پڑھ کر ہنس سکتے ہیں آج بھی ہم ان کے ذریعہ سوسائٹی کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔ آج بھی ہم ان کے ذریعہ مسلمانوں کی مٹی ہوئی عظمتوں کی کہانی سن سکتے ہیں۔ اور اگرچہ سوداؔ کا انداز۔ طرز نگارش۔ شوخی اور بے باکی ہمارے لبوں پر مسکراہٹ پیدا کر دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی سینے میں اشکوں کی ایک لہر سی انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔

آ

از:۔
الحاج مولٰنا حامد حسن قادری

آ مری خلوت میں آ، محفل میں آ　　جسم میں آ، جان میں آ، دل میں آ،
یاس بن کر دعویٔ باطل میں آ　　آس بن کر سعیٔ بے حاصل میں آ،
آ، گرہ بن کر کشودِ کار میں　　بن کے ناخن عقدۂ مشکل میں آ،
بن کے تاثیر آ، دوائے درد میں　　دردِ بے درماں کی صورت دل میں آ،
حوصلہ بن، ولولہ بن، شوق بن　　آ، دلِ واماندۂ منزل میں آ،
قہر بن کر آ، نظر طوفان میں،　　لطف بن کر صورتِ ساحل میں آ،
شوق بن کر آ، دلِ عشاق میں　　زور بن کر بازوئے قاتل میں آ،
عشق بن کر دشت میں آ، نجد کے　　حسن بن کر پردۂ محمل میں آ،
جا، سرِ مستِ مئے دولت سے جا　　آ، دلِ خوں گشتۂ سائل میں آ،

"بیکساں را کس توئی فریاد رس"
حامدؔ بیکس ہے کس مشکل میں آ،

تیر و نشتر

آج ہم مسکرا کے دیکھیں گے

از حضرت اعجاز صدیقی اکبر آبادی

سوزِ غم آزما کے دیکھیں گے — دل کو ایمن بنا کے دیکھیں گے
سُن رہے ہیں کہ تم ہو دل میں نہاں — یہ بھی پردا اُٹھا کے دیکھیں گے
آنسوؤں سے تو ظلمتیں نہ چھٹیں — آج ہم مسکرا کے دیکھیں گے
کون ہوتا ہے یاد پر مجبور — اُنھیں کچھ دن بھلا کے دیکھیں گے
دامنِ حسن جل اُٹھے شاید — آگ دل میں لگا کے دیکھیں گے
غیر کا بن کے تم نے دیکھ لیا — اب ہم اپنا بنا کے دیکھیں گے
یہ بھی صورت ہے ایک بننے کی — دل کی دنیا مٹا کے دیکھیں گے
کوئی تو شکل ہو مسرت کی — دولتِ غم لٹا کے دیکھیں گے
نظر آ، عصمتِ نظر کی قسم! — تجھے سب سے چھپا کے دیکھیں گے
دُور اُن سے رہے تو وہ نہ ملے — کچھ دن اُن میں سما کے دیکھیں گے
اے خردمندِ عشق، وجد میں آ، — اب وہ وحشی بنا کے دیکھیں گے
ہو دُعا مستجاب یا کہ نہ ہو، — خیر، ہم مسکرا کے دیکھیں گے
آ سکے وہ نہ بن کے پروانہ، — شمعِ الفت بجھا کے دیکھیں گے
اب بھنور میں ہے خیر سے کشتی — حوصلے ناخدا کے دیکھیں گے
بن گئے زندگی کی وہ تعبیر، — خواب کیا ماسوا کے دیکھیں گے

اپنے عالم کو ایک دن اعجاز
اُن کے عالم میں آ کے دیکھیں گے

شادی

افسانہ

جناب جوہر چاندوڑی

میں ہوٹل کے نوکروں سے اِدھر اُدھر کی باتیں بناتا اور کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ ہوٹل کے اور نوکروں میں سے ایک میں بھی تھا۔ میرا لباس سادہ! پُھدی کا آچین کا قمیص، کمر سے پیتل کا پٹہ کلبند ھا ہوا، ٹخنے تک پتلون، سر پہ صاف ستھری سفید پگڑی تھی۔ اندر سے ایک آدمی نے بلند آواز سے پکارا:۔ ہرکشن بابو! باہر کوئی آیا ہے، جاؤ، دیکھو کون ہے؟"

اپنے ہاتھ کی سگریٹ دوسرے کے ہاتھ میں دے کر باہر آیا۔ اور بجلی کا پنکھا کھول کر اس کے قریب جاکر پوچھا" کیا چاہئے آپکو؟"

وہ دوشیزہ لڑکی بولی:۔ دو پلیٹ کھانا لاؤ!"

وہ دوشیزہ زریں سیاہ ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ بال اُلٹے ہوئے اور ٹیڑھی مانگ، کانوں میں زنجیر نما بندے، جسم پہ رنگین و مہین جارجٹ کا بلاؤز، اور اندر کالی چولی، گلے میں سفید و سیاہ موتیوں کی نئی مالا۔ غرض اس کا لباس رنگ روپ کے لحاظ سے نہایت موزوں اور دیدہ زیب تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ ایک عمر رسیدہ آدمی بھی تھا۔ جن کا چہرہ نہایت رعب دار، مونچھیں بڑی بڑی، خاکستری رنگ کا نیکر، کالا کوٹ اور اندر قمیص پہنے تھا۔ میں ان دونوں کو غور سے ایک بار دیکھ کر اندر چلا گیا، اور دو پلیٹیں کھانے کی لاکر دونوں کے سامنے رکھ دیں اور ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔ وہ آدمی میری طرف دیکھ کر غصے سے بولا:۔ کیسا بے وقوف آدمی ہے تو؟ کچھ جانتا نہیں! ہم لوگ کھانے کے لئے بیٹھے ہیں۔ پانی کون لائیگا تیرا باپ؟"

میں یہ بلند آواز سن کر گھبرایا۔ اور یہ کڑوی باتیں سنکر غصے کی حالت میں اندر گیا اور پانی کے دو گلاس بھرے ہوئے سامنے لاکر رکھ دیئے۔ وہ پھر بھی میری طرف آنکھیں نکال کر دیکھنے لگا۔ وہ دوشیزہ لڑکی بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔ وہ پھر بگڑ کر بولا:"ہوٹل میں کبھی تیرے باپ نے بھی کام کیا تھا؟ گلاس میں انگلی ڈبو کر پانی لایا ہے؟ ایسا پانی گاہک کو پلاتا ہے؟ بیوقوف کہیں کا؟"

اتنے گاہکوں کے سامنے توہین ہونے سے میں آگ بگولا ہوگیا۔ لیکن ہوٹل کا ملازم تھا۔ صبر سے کام لینا پڑا اور اپنی جگہ پر منہ بنائے کھڑا رہا۔ وہ دونوں باپ بیٹی کھانا کھا رہے تھے۔ میں پیشانی پر کئی بل ڈالے ہوئے، کوٹ کی گھنڈیوں کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے ان کی طرف غضب ناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دوشیزہ لڑکی نے کہا:" تھوڑا کچومر، چار روٹیاں، ایک پلیٹ چاول اور لے آ!"

میں اندر گیا اور فوراً تھوڑا کچومر، چار روٹیاں، پھر چاول لے آیا۔ تھوڑے سے چاول اس مرد کی پتلون پر گر گئے۔ چاول گرتے ہی پارہ اور چڑھ گیا۔ فوراً کرسی سے اٹھا اور ایک تھپڑ تڑاق سے میرے گال پر لگا دیا۔ میری گردن نیچے جھکی ہوئی تھی۔ میرا تمام جسم کانپنے لگا۔ میں سیدھا کھڑا ہوگیا تو اس نے کہا:" بدتمیز! دیکھ پتلون خراب ہوگئی۔ اب کون صاف کریگا؟ تیرا باپ؟"

لڑکی غمگین لہجے میں بولی:۔ جانے دیجئے ابّا جان! — کیوں مارتے ہیں بیچارے کو؟ ہوگئی ....؟"

یہ جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ وہ غصے سے تھر تھر کانپتے ہوئے کہنے لگا:" یہ — یہ — یہ بیچارہ ہے؟"

اتنے میں ہوٹل کے منیجر صاحب تشریف لے آئے۔ وہ کالا کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ سگریٹ پی رہے تھے۔ ان کے کوٹ کے کالر پر دو تمغے لگے ہوئے تھے۔ وہ بولے:" ارے جناب فوجدار صاحب! بات کیا ہے؟"

"جی کچھ نہیں! ہم کھانا کھانے بیٹھے تو پینے کو پانی نہیں، پانی لایا تو گلاس میں انگلیاں ڈبو کر، چاول پتلون پر گرا دیئے۔ پتلون میں بھنا داغ لگ گئے۔ کچھ جانتا بوجھتا نہیں؟ بالکل گنوار ہے گنوار! آپ نے کیسا نوکر رکھا ہے؟ اِسے فوراً نکال دیجئے، ہوٹل کی نوکری کے لائق نہیں!"

منیجر صاحب مسکرا کر بولے:" نیا آدمی ہے معاف کیجئے!"

یہ سنکر وہ چپ چاپ بیٹھ گئے۔ کچھ نہ بولے، کھانا کھانے سے فارغ ہوتے ہی ہاتھ دھوئے اور منیجر صاحب سے کہا۔

"اچھا! گڈ نائٹ"

مینجر صاحب نے مجھے ایک گوشے میں بلا کر کہا: "یہ فوجدار ہے باؤلا۔ ہمیشہ یونہی گالیاں بکتا اور مارتا ہے۔ ذرا کسی سے غلطی ہوئی اور اس نے مارا۔ نیا، پرانا کچھ دیکھتا نہیں!"

"یہ ہیں کون ذات؟"

"بنگالی برہمن ہے۔"

"اس کے ساتھ وہ کون تھی؟"

"اس کی لڑکی!"

(۲)

میں ہاتھ میں منی بیگ لیکر باہر نکلی۔ اور دوسرے کمرے سے اندرا نے کرنے پوچھا: "واپس کب آؤ گی؟"

"ابھی سبزی لیکر......"

میں باہر سے دروازہ بند کرکے گیلری میں آئی تو برابر کے دروازے پر رسالہ "ودیا درشن" کے ایڈیٹر دیپن بابو کھڑے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی ذرا رک گئی، وہ دوسری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا: "آداب عرض دیپن بابو!"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا کر بولے: "اوہو! آداب عرض انیتا کماری! کہاں جا رہی ہو؟"

"سبزی بازار جاتی ہوں، ترکاری لانے کے لئے!"

میرا جواب سنتے ہی ان کی پیشانی پر کئی بل نمودار ہو گئے وہ غور و فکر کرنے لگے۔

ایڈیٹر دیپن بابو مغربی لباس پہنے ہوئے تھے۔ کھلا سر، چھوٹے چھوٹے بالوں میں خوشبودار تیل پڑا ہوا تھا۔ اور داڑھی مونچھ صاف، سرخ و سفید رنگ کا کالر، اونی پتلون، سلک کا قمیص، جو پتلون میں دبا ہوا تھا۔ میں نے ان سے کہا: "آپ! آج کدھر راہ بھول گئے؟"

"میرا بھانجا بیمار ہے اس کو پوچھنے آیا ہوں!"

میں نے تعجب سے پوچھا: "کون؟ ہرلیش بابو! آپ کے بھانجے ہیں؟"

"ہاں! میرا ایک کام کرو گی؟

[illegible]

[illegible] آدھ گھنٹے ہرلیش بابو کے پاس بیٹھی رہو! میں جاتا ہوں ڈاکٹر بوس کو بلانے۔ انھیں لیکر آنے تک یہیں ٹھہرو،

زیادہ نہیں!"

"لیکن کب تک بیٹھنا ہوگا؟"

"بہت جلد واپس آؤں گا!"

اس قدر مشہور و معروف ایڈیٹر صاحب کا فرمان نہ ماننا میرے دل نے گوارا نہ کیا۔ زیادہ پس و پیش نہ کرکے میں گھر میں گئی۔ اور ہرلیش بابو کے پاس جا بیٹھی، اور دیپن بابو، ڈاکٹر بوس کے پاس چلے گئے۔ ہرلیش بابو کو اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہوگا۔ ان کے بستر کے آس پاس کچھ سادے کاغذات، رسائل اور کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ سرہانے موم بتی جل رہی تھی میں ان کے نزدیک ہی بیٹھی ہوئی، ان کتابوں کی ورق گردانی کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ کہیں کہیں کسی ورق کی چند سطریں بھی پڑھ لیتی تھی۔ ہرلیش بابو کو اتنا سخت بخار تھا۔ کہ اس کی حرارت سے قریب بیٹھا نہ جاتا تھا۔ دو ایک کتابوں کی ورق گردانی کے بعد یکایک میری نظر ڈیسک پر پڑی اس پر ہرلیش بابو کا ایک ادھورا لکھا ہوا افسانہ پڑا تھا۔ اس کو پڑھنے لگی۔

"میرا ایک دوست دیوداس نامی کنگال تھا۔ وہ گلی کوچے میں گانے والا قوال تھا۔ اس کی آواز نہایت سریلی اور درد بھری تھی۔ روزانہ گلی کوچوں میں غزلیں گاتا، مارا مارا پھرتا تھا۔ اور جو کچھ دن بھر میں مل جاتا، اسی پر اپنی اور اپنے بال بچوں اور بیوی کی گزر کرتا تھا۔ اس کی شادی کو کچھ عرصہ ہو چکا تھا۔ اسے پیٹ کے درد کا مہلک مرض تھا۔ ایک روز جو میں رات کے وقت اس کے گھر پہنچا تو اسے بستر پر بیمار پڑا پایا۔ اس لئے میں دروازہ ہی پر رک گیا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ تقریباً رات کے دو بجے کا وقت ہوگا۔ گھر میں چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ گیتا' دیوداس کا سر اپنے زانو پر رکھے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ساون کی جھڑی جاری تھی۔ اور ٹکٹکی لگائے چراغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چہرہ پژمردہ تھا۔ اور کچھ دل ہی دل میں سوچ بچار کر رہی تھی،

دیوداس بولا "گیتا! بھوک لگی ہے!"

ساڑھی کے دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے گیتا نے کہا۔

"کھانے کے لئے کیا دوں؟

"جو کچھ گھر میں موجود ہے؟"

"آپ دوا پیتے ہیں؟ اس پر کچھ کھانا نہ چاہئے!"

دیوداس نے مجبوراً صبر کیا اور لیٹ گیا۔ اس کے بعد میں

گھر میں داخل ہوا۔

دوسرے روز بھی میں ان کے گھر گیا۔ سورج کی سنہری کرنیں ہرے ہرے درخت کے پتوں پر پڑ رہی تھیں۔ ہر طرف کھرا کھرا نکھر نکھرا ہوا سماں تھا۔ کسی کام سے گیتا باہر گئی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آئی۔ دیوداس بے آب مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ کسی پہلو آرام نہ آتا تھا۔ گیتا اس کے قریب دو زانو بیٹھ گئی۔ اور غمگین لہجے میں دبی زبان سے بولی: "آج گاؤں کے ڈاکٹر صاحب کے پاس جانا ہے!"

"نہیں! اپنے پاس روپیہ پیسہ کہاں ہے؟"

گیتا نے میری طرف مڑ کر کہا: "اندر ناتھ! شہر میں جا کر میرے یہ کڑے بیچ دیجئے۔ جو کچھ ملے گا اس سے کچھ تو علاج ہو سکے گا!"

میں نے وہ کڑے ہاتھ میں لیکر کہا۔......"

اس کے آگے ہریش بابو نے کچھ نہ لکھا تھا: افسانہ لکھتے لکھتے ہی انہیں بخار چڑھا ہوگا جبھی تو ادھورا افسانہ ہے یہ!"

ہریش بابو اتنے اچھے مضمون نگار ہوں گے۔ مجھے اس کا علم نہ تھا۔ ہمیں ان کے ہمسائے میں رہتے سہتے چند ہی روز گزرے تھے۔ پہلے پہلے تو میرا دل یہی کہتا تھا کہ ہریش بابو سے خوب خوب بات چیت کیا کروں لیکن میرے ابّا جان نے ہوٹل میں ان کی توہین کی تھی۔ اس لئے ان سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ ایسا نہ ہو میں کوئی بات کروں اور ہریش بابو کہیں میری توہین نہ کر دیں!۔

ڈاکٹر بوس اور روپین بابو اندر تشریف لائے۔ میں نے سر ڈھانک لیا۔ ڈاکٹر ہریش کے پاس بیٹھ گئے۔ جیب سے (Stethoscope) نکالا اور ہریش کی چھاتی سے لگایا پھر تپش پیما سے بخار دیکھ کر کہا: "ملیریا ہے!"

"ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے روپین بابو سے کہا: "ہریش بابو اتنے اچھے افسانہ نگار ہوتے ہوئے ہوٹل میں نوکری کرتے ہیں؟"

"یہی تو لوگوں کے لئے حیرت کی بات ہے۔ تجربہ کے لئے وہ مرتے ہیں.... تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ بغیر تجربہ کے کچھ لکھنا بڑی نادانی ہے! انھیں میں نے کئی بار کہا سُنا کہ تم دیوانوں کی طرح ایسا نہ کرو۔ میرے نزدیک آکر رہو۔ لیکن مانتے نہیں۔ انھیں یہ ایک مہلک مرض لاحق ہو گیا ہے کہ نوکری کرکے تجربہ حاصل کرنا، جنگلوں میں مارے مارے پھرنا۔ خانہ بدوشوں کے حالات دیکھنا اور قلمبند کرنا، تجربہ کی باتیں نوٹ بُک میں نوٹ کر لینا۔ کئی ذات کے لوگوں سے ملنا جُلنا۔ ان سے میل جول بڑھانا۔ ان کا سکھ دُکھ دیکھنا۔ امیروں کے گھر کی عیاشی، غریبوں کے ساتھ بے انصافی اور جور و ظلم دیکھنا۔ یہی ان کا مشغلہ ہے۔ کئی مرتبہ میں نے کہا۔ لیکن مانتے ہی نہیں اور اپنی دھن چھوڑتے ہی نہیں۔"

"ہریش بابو نے تعلیم کہاں تک پائی ہے۔"

"میٹرک فیل ہیں، زیادہ نہیں!"

"اُن کے گھر میں کون کون ہیں؟" "انہیں......!"

"وہ اور ان کے ماموں! وہ تو بیچارے بوڑھے ہیں، پہلے وہ ابتدائی مدرسہ میں ٹیچر تھے۔ اب پندرہ روپیہ وظیفہ ملتا ہے اُن کی جان ہریش ہی ہے۔ مگر وہ گھر پر نہیں رہتے! گھر بہت غریب ہے۔ لڑکپن سے میں ہی ہریش کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ ہریش زندہ رہا تو اپنی مرحومہ بہن کا نام زندہ رہیگا۔ اس کے سوا میرا کوئی دوسرا نہیں۔ ...... ہریش کی ممانی عرصہ ہوا فوت ہو گئیں۔ تب سے انھوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ دوسری شادی نہ کرونگا۔ اُسے ہریش سے بیحد محبت تھی۔"

"ہریش بابو کے ماموں ہیں؟ لیکن وہ یہاں آتے تک نہیں!"

"وہ یہاں آنے کے قابل نہیں۔ آنکھوں سے کم نظر آتا ہے اور کان بھی بہرے ہیں۔ اس کے علاوہ دمے کا مرض ہے انہیں۔"

"رسالہ دو یا درشن میں ہریش کے افسانے شائع نہیں ہوتے!"

"کیوں نہیں! افسانہ نگاری کے مقابلہ میں تو انہی کو پہلا انعام ملا۔ انھوں نے اپنا افسانہ دوسرے کے نام سے شائع کرایا تھا۔ اس کے علاوہ کئی گمنام افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تم نے پڑھا نہیں شاید؟!"

"ہاں! پڑھتی ہوں! ہریش بابو کے ماں باپ نہیں ہیں شاید؟"

"کرونا تاتی کی وفات کو آج بیس سال ہوتے ہیں۔ اُن کے چند روز بعد ہی ہریش کے باپ نے بھی انتقال کیا۔"

"ہریش کے گھر کا پتہ آپ کو کیسے چلا؟ کیونکہ آپ بھی ہریش کے گھر آتے جاتے دکھائی نہیں دیتے؟"

"ہاں! تمہارا کہنا بالکل درست ہے! اس سے پہلے خبر نہ تھی۔ کہ ہریش یہاں رہتے ہیں۔ ایک روز ہوٹل میں چائے

پہنچ گیا۔ تو ہوٹل کے مینجر کندن لعل صاحب نے کہا: "آپ کے ہرلیش تین ساڑھے تین ماہ سے ہمارے ہوٹل میں ملازم ہیں۔ مگر وہ آجکل بیمار ہیں۔" یہ سُنکر مجھے بے حد کوفت اور فکر ہوئی۔ پھر اُن سے پوچھا "ہرلیش کے گھر کا پتہ معلوم ہے؟" اُنھوں نے پتہ دیا۔ اور میں یہاں آیا۔"

"مینجر صاحب آپ کے دوست ہیں شاید؟"

"ہاں! ہرلیش اور میں چار سال پہلے اُنھیں کے ہوٹل میں کھانا کھاتے تھے۔ مینجر کو مجبور کر کے تجربہ کے لئے ملازمت کرتے ہیں۔"

تھوڑی دیر تک میں خاموش بیٹھی رہی۔ انھوں نے سگریٹ سلگائی اور منہ سے دھواں چھوڑنے لگے۔ پھر دبی آواز میں کہا: "انیتا کماری! تمھیں اور تھوڑی دیر بیٹھنا ہوگا۔ میں جا کر ہرلیش کے ساتھ رہنے کے لئے اپنے نوکر کو بھیج دیتا ہوں، پھر کھانا کھاتے ہی میں بھی واپس آجاؤں گا۔"

"بہتر ہے۔"

وہ جانے کے لئے اُٹھے اور کوٹ پہنتے ہوئے کہنے لگے "دیکھو، بارہ بجے اس بوتل کی دوا کا ایک حصہ ہرلیش کو پلا دینا۔ اگر میں بارہ بجے تک اندر ہی آگیا، تو میں خود پلا دونگا۔ اچھا میں رخصت ہوتا ہوں۔" یہ کہکر وہ چلے گئے۔

میرا نمسکار یونہی رہ گیا۔

وپین بابو بہت اچھے آدمی ہیں۔ ان کی اور ابا جان کی پرانی جان پہچان ہے! میری بھی اچھی طرح جان پہچان تھی۔ یاد ہے ایک مرتبہ کہا تھا۔ کہ وپین بابو اور میں لنگوٹیا دوست تھے۔ کسی زمانے میں تھے ۔۔۔۔۔

(۱۱)

خدا کے فضل و کرم سے ہرلیش بابو کا بخار کم ہونے لگا۔ میں ایک مہینے تک ان کی خدمت کرتی رہی۔ وپین بابو کو زیادہ کام رہتے تھے۔ اس لئے وہ دن بھر میں ایک چکر ضرور لگا جاتے تھے۔ اپنے ابا سے بھی میں نے ہرلیش کا تعارف کرا دیا۔ تب سے ہرلیش کے متعلق اُن کا جو بُرا خیال تھا وہ جاتا رہا۔ ہرلیش کے افسانے ابا جان کو بہت پسند آتے تھے۔ وہ گمنام ہستی کے نام سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ افسانے لکھنے والا ہرلیش ہے۔ پہلے انہیں یہ علم نہ تھا۔

زیادہ ربط و ضبط بڑھنے کے بعد اُنھوں نے ہرلیش کی بہت تعریف کی۔ اور ہوٹل میں جو توہین کی تھی اس کی معذرت چاہی۔

ہرلیش بابو چلنے پھرنے لگے تو وہ ایک روز میرے پاس آئے۔ اور کہنے لگے "انیتا کماری! میں اب اپنے گاؤں کو جاتا ہوں!"

"نہیں، میں نہ جانے دوں گی ۔۔۔۔ ابھی کمزوری باقی ہے ۔۔۔۔ اور پندرہ بیس روز ٹھہر یئے ۔۔۔ پھر شوق سے جائیےگا!"

"بڑے ابا جان کا گرامی نامہ آیا ہے۔ کہ جلد چلے آؤ" اس لئے ۔۔۔۔۔"

"میں نہیں جانے دوں گی ۔۔۔ میں اپنی محنت کبھی رائگاں نہ ہونے دوں گی۔"

اس کے دوسرے روز میں نے اُنھیں چائے پر بُلایا اور پوچھا: "وپین بابو آپ کے ماموں ہیں شاید؟"

"ماموں ہیں، میری ماں اُن سے بڑی ہے اور وہ چھوٹے! میں نے تو تم سے سب کچھ کہا تھا، شاید بھول گئیں۔"

"اکثر بھول جاتی ہوں، شاید نسیان کا مرض ہے۔"

وہ خاموش بیٹھ گئے

چائے کے بعد آئینے کے سامنے میں کنگھی کرنے لگی۔ ہاتھ ہاتھ میں بال تھامے ہوئے کنگھی کرتے ہوئے اُن کی طرف مُڑ کر بولی۔ "اگر آپ کو کچھ دوں تو لیں گے؟"

"لینے کے قابل کوئی چیز ہوگی تو ضرور لوں گا!"

"لینے کے قابل ہی ہے ۔۔۔۔ لینی ہی ہوگی! خیر وہ رہنے دیجئے ایک طرف ۔۔۔۔ آپ گاؤں کو جانے کے بعد خط وط تو لکھتے رہیں گے نا؟"

"ضرور، میری نہ کوئی بہن ہے نہ بھائی، کسے خط لکھوں؟ ۔۔ آخر منہ بولی بہن ہی کو خط لکھوں گا!"

میں سُنکر حیران ہوگئی: "آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟"

ہرلیش نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا: "بہن!"

میرا چہرہ اُسی وقت کمھلا گیا۔ اور پیشانی پر بل پڑ گئے سینہ اُبھار کر میں نے ایک ٹھنڈی سانس ......

آخر ایک روز ہرلیش جانے کے لئے نکلے ۔۔۔۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ وہ کالا قمیص پہنے تھے۔ کندھے پر زریں و ریشمی رومال، سر میں کنگھا کیا ہوا تھا۔ اُن کی بھی آنکھوں میں آنسو سماتے نہ تھے۔ جو باہر نکلنے کے لئے بیتاب تھے۔ سو روپیہ کا نوٹ

نکال کر اُنھیں دیتے ہوئے میں نے کہا: مہاتما، یہ لیجئے!

"نہیں، نہیں مجھ غریب کنگال آدمی کو کیا ضرورت پیسوں کی؟ اس کے علاوہ مجھ میں واپسی کی طاقت بھی نہیں!"

"واپس لینے کی نیت سے نہیں دیتی ہُوں ہریش بابو۔ گھی کھچڑی میں جاتے تو رنج نہیں ہوتا۔ لیکن وہی گھی، مٹی میں گر جاتے تو دل پر بُرا اثر ہوتا ہے!"

"خیر، ان روپوں کی شرحِ سود اور مدّتِ ادائی؟ یہ میں رکھ نہیں سکتا۔ تھوڑی تھوڑی رقم واپس کر دونگا!"

"مہاتما جی! ان روپوں کا سُود یعنی مجھ سے آپ کا پریم! اور جب ہم دونوں کی ملاقات ہوگی یہی مدّتِ ادائی"!

"روپے واپس نہ کیجئے۔ میں ہرگز نہ لُونگی۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت نہ ہوگی تو واپس کریں ورنہ نہیں! آپ کو مجھ سے محبت ہونا؟ پھر تو میں ان روپوں کو ہاتھ تک نہ لگاؤں گی ہاتھ"!

وہ کچھ نہ بولے، نیچے وکٹوریہ کھڑی تھی۔ وکٹوریہ والا چلّا رہا تھا۔ ہریش نے ہاتھ کی گھڑی کی طرف دیکھا اور کہا: "اچھا خدا حافظ! انیتا کماری، جاتا ہوں..... آداب عرض!"

"کہیں دھوپ میں نہ پھرنا، ورنہ پھر مرض بڑھ جائیگا!"

وہ زینہ اُتر کر نیچے گئے اور وکٹوریہ میں جا بیٹھے، وکٹوریہ چلی، چاندنی رات تھی۔ ہر طرف چاندکی روشنی پھیلی ہُوئی تھی۔ رستے میں بجلی کے قمقمے روشن نہ تھے۔ وکٹوریہ نظر سے غائب ہونے تک میں حسرت سے کھڑی تکتی رہی۔

(۴)

بجلی کے ہرے قمقمے کی روشنی میں میں اور ابّا جان چنگا رانی پتّوں کا ایک کھیل رہے (کھیل رہے تھے، وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور میں بستر پر اوندھے منہ لیٹی کھیل رہی تھی۔ ابّا کا وزیر کب مریگا! اسی فکر میں تھی۔ باہر سخت کڑکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ اس لئے ابّا اوور کوٹ پہنے اور کانوں سے گلا بند باندھے ہوئے تھے، اُنہے کہا: انیتا! آج کھیل میں جی نہیں بہلتا۔ اور کچھ لطف نہیں آتا"!

"ابّا! میں کچھ نہ سنوں گی۔ کھیل رنگ پر اَب آیا ہے۔ وہ دیکھئے آپ کا وزیر پٹ رہا ہے۔ پہلے اُسے بچانے کی فکر کیجئے!"

"وزیر مارا جائیگا، اتنا ہی نا؟ مرنے دو! کھیل بند کرو، اور رکھ دو طاق میں! کل سے ایک فکر لاحق ہے۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں، کیا کیا جائے؟"

میں نے اُن کا مارا ہُوا وزیر ایک طرف رکھ کر کہا "کس بات کی فکر لاحق ہے کہئے؟"

"میرے ایک عزیز دوست نہایت کنگال ہیں، وہ مجھ سے فقط ایک سال بڑے ہوں گے۔ میں نے آج ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کیا، نہ آیندہ کرنے کا ارادہ ہے۔ اُنھیں چنگا رانی کھیل کھیلنے کا بڑا شوق ہے۔ میں اُنہی سے یہ کھیل سیکھا اور تمھیں بھی سکھایا۔ اس کے علاوہ وہ پتّوں کی ہاتھ چالاکی کا کھیل بھی خوب جانتے ہیں، چند سال ہوتے ہیں، میں اُنھیں قول دے چکا ہُوں"۔

"بھلا اِس وقت اتنے سوچ بچار کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس لئے کہ اُنھوں نے مجھے خط بھیجا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "آپ کی صاحبزادی عزیزہ انیتا کی شادی میرے بڑے بھائی کے بیٹے کے ساتھ کرا دیں تو بہتر ہے۔ اسی لئے فکرمند ہُوں"

"خیر، آپ کا کیا خیال ہے؟"

"یہی کہ کر دی جائے!"

یہ جواب سُنتے ہی میرے دل پر بجلی گر پڑی ——— مجھے ہریش بابو کی یاد آگئی۔

وہ پھر کہنے لگے۔ "لکھتے ہیں کہ لڑکی دیجئے اور لڑکا لیجئے"۔ تمہاری شادی وہاں کر دی گئی تو وہ کنگال نہ رہیں گے۔ کیونکہ میری تمام جائداد اُنھیں مل جائے گی۔ اُن کے بھتیجے سشر دیو بہت ہی خوبصورت ہیں۔ وہ جب سات سال کے تھے۔ تب میں نے انھیں دیکھا تھا جب سے اب تک کہیں نہ دیکھا"۔

"آپ کے یہ دوست کہاں رہتے ہیں اور ان کا کیا نام ہے؟"

"ان کا نام کیداس چندن، ہریش جس گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ بھی اسی گاؤں میں رہتے ہیں۔ سشر دیو بھی مشہور مضمون نگار ہیں۔ یہ انھوں نے خط میں لکھ بھیجا ہے"!

ہریش کے چچا کا نام، وہیں بابو سے میں نے دریافت کیا تھا، لیکن اب یاد نہیں رہا، ابّا کو ان کا نام معلوم ہے۔ لیکن ان کے پھوپھا

تو شردیابو کہتے ہیں۔ شردیابو بھی مضمون نگار ہیں! وہ بھی اسی گاؤں میں رہتے ہیں۔ بھول گئے! لیکن دل سے شبہ دُور کرنے کے لئے پوچھا۔ تو کہنے لگے: "اُن کا نام شردھی ہے!"

میں رات کو یہی سوچ بچار کرتے کرتے سو گئی۔ دوسرے روز صبح اُٹھنے کے بعد میں ہرلیش کو خط لکھنے بیٹھی۔

"پریمی ہرلیش بابو!——آداب عرض!"

مجھے یہ لکھتے ہوئے بے حد رنج ہوتا ہے کہ میری شادی ابا نے مقرر کر دی ہے۔ میرے ہونے والے پتی راج' آپ ہی کے گاؤں میں رہتے ہیں۔ چار پانچ روز میں ابا آپ کے گاؤں کو مجھے دکھانے کے لئے لے جانے والے ہیں۔ جب آپ سے ملاقات ہوگی۔ گزشتہ ہفتہ میں ویپن بابو سے ملی تھی۔ وہ یہ سنتے ہی باغ باغ ہو گئے۔ کہ میری شادی ہونے والی ہے۔ مجھے اطلاع دیجئے کہ آپ کے بڑے ابا جان کا نام کیا ہے اور یہ بھی لکھئے کہ آپ کے گاؤں میں شردیابو نامی کوئی مضمون نگار ہیں؟ زیادہ کیا لکھوں! باقی ملاقات میں تمام باتوں کا علم ہو جائیگا!

آپ کی —— انیتا کماری"

میں سویٹر بنتے بیٹھی تھی۔ ابا باہر گئے ہوئے تھے۔ ہرلیش کا خط اب تک کیوں نہیں آیا۔ دل ہی دل میں یہ سوچ رہی تھی۔ کہ کسی نے باہر سے زنجیر کھٹکھٹائی۔ دروازہ کھولتے ہی ہرلیش بابو اندر تشریف لائے۔ میری طرف دیکھتے ہوئے وہ دروازہ ہی میں کھڑے رہ گئے۔

آئینے میں عکس پڑتے ہی انسان کی شکل دکھائی دیتی ہے اسی طرح ہرلیش بابو کا چہرہ دیکھتے ہی اُن کے اندرونی دلی خیالات مجھ پر روشن ہو گئے۔ وہ ایک دم کہنے لگے: "نہیں، نہیں انیتا میں تمھاری شادی کبھی کسی دوسرے سے نہ ہونے دونگا، نہیں!"

"ذرا تھوڑی دیر بیٹھئے تو سہی، پھر ہم آپ بات چیت کریں گے!"۔

"ملازمہ سے چائے کے لئے کہتی ہوں، ذرا آرام تو کیجئے!"

میں اندر گئی، اتنے میں ابا بھی باہر سے تشریف لے آئے اور دیکھتے ہی کہنے لگے: "کون؟ ہرلیش! اچھا ہوا کہ تم بھی آ گئے انیتا کماری کی دو چار روز میں شادی ہونے والی ہے جب تک ہمارے گھر میں ٹھہرو!"

میں پھر اندر سے آئی، تو ہرلیش بابو اور ابا جان آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ابا نے کہا: "انیتا! ہرلیش بابو آ گئے"۔

میں ان کے نزدیک جا کر بیٹھ گئی۔ ابا نے پھر کہا: "ہمارے کیلاس چندن کا بھتیجا، شردیو ہے نا؟ ان کے ساتھ انیتا کی شادی ہوگی!"

ہرلیش بابو ایک دم حیران ہو گئے اور بولے: "کیلاس چندن کا بھتیجا شردیو؟"۔

"ہاں ہاں!"

"یعنی۔ وہ......تو! میں ہی ہوں!"

ابا جان حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے اور بولے: "تم کیلاس چندن کے بھتیجے ہو؟"

"جی ہاں!"

ابا کی عجیب حالت تھی' وہ بولے: "میں نے سات سال کی عمر میں تمھیں دیکھا تھا۔ مجھے اب بالکل خیال نہیں آتا"۔

"لڑکپن میں میں اپنے ماموں جان کے گھر تھا۔ انہیں کے گھر چھوٹے سے بڑا ہوا۔ 'ودّیا ورشن' کے ایڈیٹر صاحب ویپن بابو کو آپ جانتے ہیں نا؟ وہ میرے ماموں جان ہیں ماموں!"

"ویپن بابو تمہارے ماموں ہیں؟ ویپن بابو اور میں نے چار سال تک ایک ہی مدرسے میں تعلیم پائی ہے۔ وہ بڑے ہو کر ایڈیٹر ہو گئے اور میں فوجدار —— پھر اُن کی میری ملاقات نہ ہوئی۔ البتہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہے۔ ویپن سے زیادہ میرا میل جول کیلاس چندن سے تھا۔ وہ میرے عزیز اور مخلص دوست ہیں' دوست بھی کیسے لنگوٹیا دوست!"

"بڑے ابا مجھے شردیو نام ہی سے پکارتے ہیں۔ میرا پیدائشی نام شردیو عرف ہریش بابو ہے۔ ویپن بابو اور گورا ممانی مجھے ہریش نام ہی سے پکارتے تھے!"۔

"میں نے ویپن بابو سے شک دُور کرنے کے لئے پوچھا تھا کہ آپ کے بھتیجے کا نام شردیو ہے؟ تو وہ کہنے لگے "پیدائشی نام تو مجھے یاد نہیں، شاید ہوگا کیونکہ اُن کا نام اُن کے چچا ہی نے رکھا تھا۔ اس کے چھلے کے موقع پر میں موجود تھا!"

"میرے پیدائشی نام کی انہیں کیا ضرورت تھی؟ وہ زائچہ بنانے والے نجومی تو تھے نہیں؟"۔

ابا نے کہا: "معاف کرنا ہریش بابو! میں نے تمہاری ہوٹل میں توہین کی تھی"
"علم ہونے پر کوئی کسی کی توہین کرے تو ضرور رنج و صدمہ ہوتا ہے۔ معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"۔
ابا نے فوجی لباس پہنا اور چائے پینے بیٹھے، پھر کہنے لگے "خیر جانے دو۔ اب تو تم خود گھر چلے آئے ہو۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا"

مجھے بہن کہنے پر ہریش بابو نے معذرت چاہی اور کہنے لگے "میں تمھیں بہن ہرگز نہ کہتا۔ لیکن تمھارے ابا جان ہیں فوجدار۔ اس کے علاوہ غصہ ور اور میں کنگال!! اس کئے تمہارے متعلق کچھ اور خیال کر بیٹھنا اوّل درجہ کی نادانی اور دیوانگی معلوم ہوئی"

(مرہٹی سے)

ناکامِ آرزو

فریب خوردۂ منزل کو راہ نما نہ ملا

جناب مرزا شاھد کیانی

بتائیں کیا تمھیں اے دوست ہم کو کیا نہ ملا
خدائی مل گئی ساری مگر خدا نہ ملا

جو ڈھونڈھا آپ کو اپنا کہیں پتا نہ ملا
ترے خیال میں گم ہو کے راستا نہ ملا

فریبِ زیست کا اے چارہ گر فریب نہ دے
یہ زہر رہنے دے اس زہر میں دوا نہ ملا

کسی کی عشقِ جنوں ساز کی تمنّا میں
مریضِ غم کو محبّت کا آسرا نہ ملا

وہ ہم نے بھول کے کعبہ میں کر دیا سجدہ
اسی لئے تو ہمیں اُن کا نقشِ پا نہ ملا

وہ آئے نزع میں کچھ پوچھنے مگر افسوس
مریضِ غم کی تمنّا کو حوصلا نہ ملا

نہ وہ چمن، نہ بہاریں، نہ خوفِ برق و خزاں
ہزار حیف کہ کس وقت آشیانہ ملا

خیالِ دیر و حرم جب مٹا دیئے دل سے
بڑی تلاش سے پھر تیرا آستانہ ملا

فریبِ زیست کے کچھ راز ہم بھی پا لیتے
ہمیں بزرگ کوئی بھی خضر نما نہ ملا

بزعمِ خود بہت ڈھونڈھا کئے مگر شاہد
فریب خوردۂ منزل کو راہ نما نہ ملا

عورت کی قیمت

(ایک ہندوستانی عورت کا نقطۂ نظر)

ہندوستان کے مرد کی قیمت تو سماج نے خود مقرر کردی۔ وہ عورت کا حاکم ہو گیا۔ اور اسے ہر قسم کا اختیار بھی مل گیا۔ وجہ یہ تھی کہ سماج کی لگام مرد کے ہاتھ میں تھی اس نے جدھر گھمانا چاہا سماج گھوم گیا اسی لئے مرد نے سوسائٹی میں اپنے لئے پوزیشن حاصل کرلی اور وہ خود ساختہ حاکم بن بیٹھا۔

مگر بیچاری عورت ــــ دیکھتی رہ گئی۔ کچھ نہ کرسکی۔ اس کی قیمت کا فیصلہ مرد کے ہاتھ تھا۔ خود غرض مرد کے ہاتھ ــــ جس نے من مانی اسمبلی میں جو چاہا کر ڈالا۔ عورت کو جتنا گرا سکا گرایا۔ اور غریب عورت کو اس خود ساختہ عدالت میں کچھ کہنے کا موقع بھی نہ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عورت "بچہ بنانے کی فیکٹری" اور مرد کے مال اسباب کی چوکیدار بن کر رہ گئی۔ اسے اپنی زندگی پر بھی کوئی اختیار نہ رہا۔ وہ بھی سماج نے مرد کی ملکیت قرار دیدی۔ اور ان سب باتوں کا انجام یہ ہوا کہ مرد اپنی خود مختاری کے زعم میں عورت کے دُکھ درد سے بھی لاپروا ہو گیا۔

ہندوستانی عورت نے یہاں بھی صبر سے کام لیا۔ اور دُنیا کو دکھا دیا کہ مشرقی عورت صبر کی دیوی ہوتی ہے۔ برداشت کا ایک مجسمہ ہے جو شوہر کے ظلم و ستم اور قید و بند کے باوجود مرد کے لئے ہر حال میں راحت کا سبب بنی رہتی ہے اور اتنی حق تلفیوں کے باوجود وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ لیکن ان قربانیوں پر بھی وہ تکلیف کا شکار بنی رہتی ہے۔ آج کتنے گھرانے ایسے دکھائے جاسکتے ہیں جہاں کی عورتیں خوش و خرم ہوں اور تندرست بھی ہوں۔ میرا جواب یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر گھر میں جہاں عورتیں رہتی ہوں۔ ایک خاص افسوسناک وقت ضرور آتا ہوگا۔ جب کوئی عورت تڑپ رہی ہو اور اس کا مرد تفریح کیلئے جانے کی تیاری کر رہا ہو۔ ہندوستان کی اسّی فیصدی جوان عورتیں ماہواری کی بیماریوں میں مبتلا ہیں اور انہیں ہر مہینہ کئی کئی دن سخت درد اور بے چینی کے ساتھ کاٹنے پڑتے ہیں مگر کتنے مرد ہیں جو اپنی عورت کی اس تکلیف پر اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوں؟ حالانکہ وہ اگر چاہیں تو چند پیسے خرچ کر کے عورت کو اس تکلیف دہ بیماری سے نجات دلا سکتے ہیں اگر کسی عورت کو ماہواری تکلیف سے آتی ہو یا زیادہ یا کم یا رک رک کر آتی ہو یا بہت درد کے ساتھ ہوتی ہو اور ان دنوں میں اسکی کمر پیٹ اور پنڈلیوں وغیرہ درد ہوتا ہو تو اس کا بہت آسان علاج ہے۔ ایسی بیمار عورت کو صرف ایک شیشی دوا "کورس" کھلا دینے سے ماہواری ایام بالکل آسانی کے ساتھ ہر ماہ بغیر کسی درد کے صحیح مقدار میں باقاعدہ ہونے لگتے ہیں اور ماہواری کی ہر خرابی دور ہو کر ہر مہینہ باقاعدگی کے ساتھ آنے لگتی ہے۔ یہ دوا جس کا نام "کورس" ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۔ اے بی ۲۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھکر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگائی جاسکتی ہے۔ ایک ہی شیشی سے عورت کی ماہواری کی سب خرابیاں ٹھیک ہو جاتی ہیں ایک شیشی کورس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ خط لکھکر منگالینی چاہیئے محصول پارسل پر صرف نو آنے خرچ ہونگے اور اس طرح معمولی سی رقم سے آپ کی بے زبان عورت ہر ماہ کی مصیبت سے نجات حاصل کرے گی اور پھر ہر مہینہ باقاعدہ بغیر درد اور تکلیف کے ماہواری سے فارغ ہو جایا کریگی۔

یہ دوا تقریباً پندرہ سال سے ہندوستان میں مشہور ہے۔ اور اب تو لاتعداد حکیم اور ڈاکٹر اپنی پریکٹس میں عورتوں پر صرف اسی دوا کو استعمال کراتے ہیں۔ کیونکہ اس کی صرف ایک شیشی سے ماہواری باقاعدہ آنے لگتی ہے۔ اور درد وغیرہ اور بے قاعدگی کی تمام تکالیف ختم ہو جاتی ہیں۔

ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۸

شباب و شراب

نقاب ہی جمال ہے جمال ہی نقاب ہے

از حضرت عیش فیروزپوری

ضرورتِ شباب ہی ضرورتِ شراب ہے
ظہورِ آفتاب ہی، دلیلِ آفتاب ہے

شباب پر بہار ہے، بہار پر شباب ہے
ابھی تو میرے ہر طرف شراب ہی شراب ہے

ابھی تو میرے ہاتھ میں صراحیٔ شباب ہے
ابھی تو اختیار میں ظہورِ آفتاب ہے

ابھی مزاج آشنا، نہیں قرار آشنا
کرم بھی بے حساب تھا ستم بھی بے حساب ہے

ابھی گلوں کے ہار کو گلے سے تو جدا نہ کر
کٹے ہوؤں کا آسرا، لٹا ہوا شباب ہے

ابھی شرف نے آج تک زباں بھی کھولنے نہ دی
وہی سرِ نیاز ہے، وہی تری جناب ہے

بھلا ہو تیرا ساقیا پلائے جا پلائے جا
ابھی مجھے پلائے جا کہ عالمِ شباب ہے

مری نظر کا تجربہ، ہے عمر بھر کا تجربہ
نقاب ہی جمال ہے، جمال ہی نقاب ہے

سبو سے منہ لگا کے پی، کہ خم سے منہ لگا کے پی
ہمیشہ مسکرا کے پی۔ ابھی ترا شباب ہے

تھے ہم بھی تم بھی آشنا، بس اتنا یاد رہ گیا
یہ خواب ہے تو اور بھی بڑے مزے کا خواب ہے

سبو میں، خم میں، جام میں، نہاں ہے روحِ زندگی
شرابِ آتشیں نہیں، کھنچا ہوا شباب ہے

یہ راز اُٹھ کے ساقیا نقاب نے اُٹھا دیا
وہی ترا شباب ہے، وہی شرابِ ناب ہے

یہ تشنہ لب کے قتل کا، ملا ہے غیب سے صلہ
زباں پہ تیغِ یار کی ابھی تک آب آب ہے

مری نظر کا سامنا نظر ملا کے کیجیے
مری نظر کے سامنے نقاب بے نقاب ہے

بلندیٔ نگاہ کی یہ رفعتیں عجیب عجیب
کمالِ عیش کی قسم غزل تو کامیاب ہے

خیال و خواب

نفسیاتی کہانی

جناب حمید صحرائی

برفستانی ہوا کا ایک سرد جھونکا کھڑکی کی راہ سے کمرے میں آیا اور وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ اور ایک خمار آلود انگڑائی لینے کے لئے دونوں ہاتھ سر کے ان بالوں کے اوپر اٹھا دیئے جو موسم کی خوشگوار ہوا سے سنبل کی شاخوں کی طرح تھر تھرا رہے تھے۔ تناسب میں تناؤ پیدا ہو گیا گردن اکڑ گئی اور سینہ ——— اسے محسوس ہوا جیسے کائنات کی ہر شئے اس سے متنفر ہے۔ اور اس کی زندگی بالکل اس شمع کی طرح گزر رہی ہے جس کی روشنی سے نہ کوئی محظوظ ہونے والا ہو، نہ کوئی پروانہ جو اس کے گرد منڈلا کر اسے چومنے کیلئے آگے بڑھے۔

ارے، دھوپ کمرے میں پھیلتی جا رہی ہے۔ اور مجھے تو ابھی بہت کام کرنا ہے۔ رات کے برتن صحن کی صفائی، اور پانی گرم کر کے مالکہ کو جگانا بھی ہے ——— پھر اسے یاد آیا کہ مالکہ تو رات کی گاڑی سے دو روز کے لئے چلی گئی ہے۔ اور آج وہ گھر میں تنہا ہے۔ دو روز تک۔ مالکہ کی واپسی تک وہ تنہا ہی رہے گی۔ بالکل مالکہ کی طرح آزاد اور خود مختار، جب مہترانی گھڑے میں پانی ڈالنے کے لئے کہے گی تو وہ تنک کر جواب دیگی۔ "ٹھہر جا رہی گوری! تو روز صبح صبح تنگ کرنے کے لئے آجاتی ہے" اور جب رام ... دھ ... آئے گا تو وہ اسے گھنٹہ بھر تک دروازے ہی پر کھڑا رکھے گی۔ ... تنگ کر ... آواز دیتے دیتے اس کا گلا پھٹ جائے گا۔ حلق خشک ہو ... نے لگا۔ اس کی ہتھیلی پر خارش سی محسوس ہو رہی۔ اور جب اس نے نظر ڈالی تو ہاتھ کی لکیریں اسے بالکل زندگی کے اس دھارے کی طرح معلوم ہونے لگیں جس کے سہارے اس کی زندگی کی کشتی ہمیشہ سے ڈگمگا رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے جیون ساگر کی ساکت سطح آب منجمد ہو جائیگی۔ اور وہ ان یخ بستہ چوٹیوں کے مانند ہو کر رہ جائے گی جن پر سورج کی آخری شعاعیں نورانی تابش پیدا کر کے مہیب ظلمت اور موت کی سی خاموشی مسلط کر دیتی ہیں۔

پرندے مولسری کے گنجان درخت پر چہچہا رہے تھے اور سورج رانی پربت کی اونچی چوٹی پر چمک رہا تھا۔ مندر کے گھنٹے نے ساڑھے سات کا ادھا بجایا۔ اور اسے فوراً خورشید کا خیال آگیا۔ جس کیلئے روز اسے ناشتہ تیار کرنا پڑتا تھا۔ آج بھی ——— جب گھر کی عنان نظام مکمل طور سے اس کے قبضے میں تھی اسے خورشید کا ناشتہ تو تیار کرنا پڑتا ہی ——— مالک کے کسی دوست کا لڑکا خورشید جو پڑھنے کے لئے یہاں آیا ہوا تھا۔ باہر مردانے میں رہتا تھا۔ کئی مرتبہ کھانے کی کشتی دروازے پر سے اسے دیکھتے ہوئے جب اس کا ہاتھ خورشید کے ہاتھ سے چھو جاتا تو اضطرار کی ایک ہلکی لہر اس کے بدن میں جھنجھناہٹ پیدا کر دیتی تھی۔ اور خورشید ——— کتابوں کا کیڑا۔ اس کی بھی زندگی موسم خزاں کے بے کیف دنوں کی طرح خاموش خاموش اور اُداس اداس گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی جب مالکہ کا سخت لہجہ اس کی افسردہ آنکھوں کی گنجان پلکوں کو نمر آلود کر دیتا اور پھر اتفاقیہ اس کا خورشید سے سامنا ہو جاتا تو ہمدردی کا ایک طوفان اس کے سینے میں پھٹ پڑتا ——— اور وہ کہتا

"کیا بات ہے فیاضی؟"

اشکوں کے کئی گرم گرم قطرے اس کی آنکھوں سے اُمنڈ آتے!!

وہ جواب دیئے بغیر مالکہ کے خوف سے اندر چلی جاتی۔ مبادا وہ اُسے بات کرتے ہوئے دیکھ پائے اور پھر "حرامزادی قطامہ۔ شرم نہیں آتی غیر مردوں سے بات کرتے ہوئے" مالکہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیتی۔ لیکن آج ———! آج تو وہ بالکل آزاد تھی۔

اسے پھر ناشتہ کا خیال آیا۔ اور وہ اٹھ بیٹھی۔ پہاڑی ہوا کے معطر جھونکے اس کے گرد ناچنے لگے۔ اور اس کے ریشم ایسے ملائم بال پیشانی پر بکھر گئے۔ اس نے انھیں جوڑے کی شکل میں باندھ لیا۔ پھر وہ اٹھی اور باورچی خانے میں آئی۔ انگیٹھی میں کوئلے ڈالے اور چائے کا پانی چڑھایا انڈے چھیلے ٹوسٹ سینکے اور نعمت خانے میں سے مالک کے کئی مقوی حلوے اور جام کشتی میں سجا کر رکھ دیئے۔ نہ معلوم اس کا دل آج کیوں خورشید کو اچھے اچھے کھانے کھلانا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں عجیب عجیب ارمان تخلیق پا رہے تھے۔ اور وہ ———

"فیاضی!" خورشید نے پکارا۔ اور ... وہ بھی جواب ... دے اُسے صحن میں ... کی چاپ سنائی دی۔ ...

شب خوابی کے لباس میں خورشید کھڑا تھا۔ اس کے مغربی طرز کے سنہری بال پیشانی پر بکھر رہے تھے اور نیند کا خمار آنکھوں پر چھا رہا تھا۔

"جی! —— آداب!" فیاضی نے دست راست کی مخروطی انگلیوں کو پیشانی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"آداب!" خورشید نے جواب دیا۔ "میرے کھانے کا تم بندوبست نہ کرنا فیاضی! میں دو دن کے لئے باہر جا رہا ہوں۔"

"جی بہتر۔" فیاضی نے افسردہ لہجہ میں جواب دیا۔ "ناشتہ تیار ہے۔"

"وقت کی قلت مجھے مجبور کر رہی ہے۔" خورشید نے اس کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر جواب دیا۔ اور باہر مردانے میں چلا گیا۔

خورشید کی یہ سرد مہری اسے پسند نہ آئی۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی زندگی سنگتراش کے بالکل اس بیجان مجسمہ کی طرح تھی جس میں نہ کوئی رنگینی ہے، نہ کوئی خوبی اور نہ دلکشی نہ جاذبیت۔ اس کے دل میں افسردگی اور بیچارگی کا ایک طوفان پیدا ہو گیا۔ شاید غم کو اس سے اسی قدر محبت تھی جس قدر اس کے مالک کو مالکہ سے —— وادیٔ ہوش و خرد میں قدم رکھنے سے اب تک کوئی دن غم سے خالی نہ رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ وہ مالن کے للّو سے بھی چھوٹی تھی۔ جب اس کی ماں کا انتقال ہو گیا باپ نے دوسری شادی کی۔ پھر وہ بھی چل بسا۔ سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آ کر ایک بھیانک رات کو جب وہ محلہ کے کنوئیں میں ابدی نیند سونے جا رہی تھی۔ مالک جو اس وقت پولیس انسپکٹر ہونے کی حیثیت سے گشت پر تھے اسے روک دیا اور اس کی غم بھری روداد سے متاثر ہو کر اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ چھ سال سے وہ یہیں پرورش پا رہی تھی اور حساب سے اب اس کی عمر سولہ برس کی تھی۔ یہاں آ کر اس کے اضطراب میں تخفیف ضرور ہو گئی تھی۔ لیکن غم —— اس کی عمر کے ساتھ ساتھ غم بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر روز مالکہ کی کوئی نہ کوئی بات اس کے غم میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔

لیکن آج! —— آج تو وہ بالکل آزاد تھی۔ مالکہ کی طرح آزاد، یک کسی فوری خیال کے آجانے سے اس نے چائے کی کشتی تپائی پر رکھ دی اور کیتلی کو انگیٹھی پر رکھ کر باہر صحن میں آگئی۔ دھوپ پھیلتی جا رہی تھی۔ اور مرغابیوں کی ایک قطار پر جوڑے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں مصروف پرواز تھی۔

کھونٹی پر سے تولیہ اور طاق میں سے اکس کی ٹکیہ والی صابن دانی لے کر وہ ایک شانِ استغنا کے ساتھ غسلخانے کی طرف چل دی۔ یکایک الماری پر سے کود کر گھڑے پر رکھا ہوا کٹورہ فرش پر
آ گرا —— مالزادی، قطامہ"، وہ بالکل اپنی مالکہ کی طرح چلا پڑی۔

"جوانی کا نشہ چھا رہا ہے۔ پھوٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔"

اس نے کئی دفعہ کے سُنے ہوئے الفاظ دہرائے۔ اور آہستہ آہستہ خرامانہ رفتار سے چلتی ہوئی غسل خانے میں داخل ہو گئی اور کمانی دار دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔

جب وہ غسل کر کے نکلی۔ مہترانی جا چکی تھی۔ اور رامو دودھ کی بالٹی کھونٹی پر لٹکا کر چلا گیا تھا۔ اس نے صدر دروازے کی چٹخنی لگا دی، اس کی رفتار میں بانکپن اور انداز میں جاذبیت پیدا ہو گئی تھی۔ سیاہ بالوں میں پانی کی بوندیں گوہر آبدار کی طرح لرز رہی تھیں۔ اس نے تولیہ سے انھیں خشک کیا اور تبدیل لباس کے لئے کمرے میں داخل ہو گئی سنہرے حاشیہ کی وہ فیروزی ساری جو اس کے مالک مالکہ کے لئے بنارس سے لائے تھے اور جو اسے بہت مرغوب تھی الماری میں میلے کپڑوں کے خانے میں پڑی تھی۔ اور قرمزی بلاوز اس کے اوپر تہ کیا ہوا تھا، شاید مالکہ اسے یونہی جلدی میں ڈال کر چلی گئی تھی۔

بالکل غیر شعوری طور پر اس نے انھیں اٹھا لیا۔ پھر ان کے استعمال کی ایک موہوم خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ اس نے بلاوز کو گلے میں ڈالا اور وہ اس کے جسم سے بالکل پیوست ہو گیا۔ اور ساری باندھ کر جو ایک مست انگڑائی اس نے لی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کل والی فیاضی نہیں ہے جو میلے لباس میں مالکہ کی فرمانبرداری میں مصروف تھی۔ بلکہ جنت کی کوئی بہت ہی خوبصورت حور ہے جس کو رضوان نے غلطی سے صفحۂ ارض پر بھیج دیا ہے۔ قد آدم آئینے کے سامنے اس نے اپنے جسم کا جائزہ لینا شروع کیا۔

"ارے!" بیساختہ اس کے مُنہ سے نکلا۔ مالکہ جو نیچے انگیا پہن کر بلاوز پہنا کرتی تھی، کبھی اس کے سینہ پر بھی یہ تناؤ پیدا نہ ہوا تھا —— اس نے اپنا ہاتھ سینے کی طرف بڑھایا۔ جو ریشمی بلاوز پر پھسلتا ہوا فراز پر آ کر ٹھہر گیا۔ ایک کیف زا ارتعاش اس نے اپنے جسم پر محسوس کیا۔ اور کئی امنگیں شباب کے احساس کے ساتھ اس کے تصورات پہ چھا گئیں اور جب روغن زلف بنگال، اس نے اپنے دراز بالوں میں ڈال کر حنا کے عطر کی پھریری کان کی لَو کے اوپر والے عمق میں رکھ لی تو اسے محسوس ہوا کہ فردوس کے تمام پھولوں کی خوشبو ناک کی راہ سے دماغ میں سما گئی ہے۔ پھر سنگار میز کی دراز میں سے نکال کر غازہ کی ایک تہ اپنے شہابی رخساروں پر جما کر جب گلگونہ کا استعمال کیا تو وہ ایک ایسی حسین کلی بن گئی جو صحیح معنوں میں گلشن فطرت کی زینت کہی جا سکے۔

آرائش جمال کی تکمیل کے بعد وہ باورچی خانے میں پہنچی - اور خورشید کے لئے تیار کی ہوئی ناشتہ کی کشتی ایک خاص انداز کے ساتھ اٹھا کر اس تخت پہ آ بیٹھی جس پر ایرانی قالین بچھا ہوا تھا اور جس پر اس کی مالکہ بیٹھا کرتی تھی - یہاں بیٹھ کر اس نے بالکل شاہانہ تجمل سے ناشتہ کیا - اور خالی کشتی کو مالکہ کی طرح ایک طرف کو کھسکا دیا جیسے اب اسے "فیاضی" اٹھا کر لے جائے گی - اور برتن صاف کر کے قرینے سے رکھ دیگی - پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی -

"ارے کہاں مر گئی کمبخت ---- خدا سمجھے تجھے فیاضی! دیکھ منحوس برتنوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں ---- چل اٹھا انھیں - اور پاندان اٹھا کر مجھے دے!"

پھر وہ آپ ہی آپ قہقہہ مار کر ہنس پڑی - آج وہ آزاد تھی بالکل مالکہ کی طرح آزاد ---!

کل اور آج میں کس قدر تضاد تھا - کل وہ کچھ بھی نہ تھی - اور آج سب کچھ ---- اس کے دل میں آج ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی - وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسے دیکھے - اس کے سڈول اعضا پہ قیمتی لباس کی پھبن کی داد دے - وہ زینہ پہ آہستہ آہستہ چڑھ کر بالکنی کی طرف گئی - سامنے مرغزار میں چمکیلی دھوپ ہری گھاس پر پھیلی ہوئی تھی - اور پہاڑی ٹیلے سینۂ گیتی پر بالکل اس کی جوانی کے ابھار کی طرح پھیلے ہوئے تھے - پھر یکایک اس کی نگاہیں مندر کے سنہرے کلس پر سے گزرتی ہوئی باغ سے ملحقہ مکان کی چھت پر جا پڑیں جہاں سرخ و سفید رنگ کا ایک نوجوان ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیز ہیجانی جذبہ آنکھوں کی راہ سے بدن میں سرایت کرتا جا رہا ہے - بالکل آزاد ہوتے ہوئے بھی فطری شرم و حیا کی سرخی اس کے صبیح رخساروں پر پھیل گئی - اور اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں - کچھ دیر بعد جب اس نے پھر دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بدستور نظریں جمائے ہوئے تھا - اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کائنات رقص کر رہی ہے اور کوئی رنگین خواب دیکھ رہی ہے -

وہ واپس ہوئی اور مالکہ کے نرم و گداز بستر پر دھڑام سے گر پڑی - اب وہ آرام سے پلنگ پہ لیٹی ہوئی تھی - ریشمی لباس کی ملائم سلوٹوں کے لمس سے اسے اپنے جسم پر گدگدی سی محسوس ہوئی - جیسے کسی دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اس کے جسم پر ناچ رہی ہیں اور ایک سرور انگیز خمار اس پر طاری ہوتا جا رہا ہے -

خیالات سینما کی بے جان روحوں کی طرح اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے - وہ چاہتی تھی کہ آج وہ خوب دل بھر کر کسی سے باتیں کرے، ہنسے اور بولے اور وہ سب کچھ کہہ دے جو اس نے آج تک نہ کہا تھا - جس کو وہ کبھی کہنا گوارا نہ کرتی - لیکن آج ---- نہ معلوم آج کیوں ایک جذباتی کیفیت اس پر طاری ہوتی جا رہی تھی - لیٹے لیٹے اس نے کروٹ بدلی - اور اسے اپنا جسم بالکل اس سبک پرندہ کی طرح محسوس ہوا جو دونوں پر تولے ہوئے فضا کی بلندیوں پر محو پرواز ہو -

کسی فوری احساس سے اس پر ایک جمودی کیفیت طاری ہو گئی - پھر اس نے آپ ہی آپ ملائم تکیہ کو اٹھا کر سینے کے نیچے دبا لیا - ایک عجیب قسم کی لذت محسوس ہوئی اور اس نے دونوں بازوؤں میں اسے زور سے بھینچ لیا - اب وہ بے جان تکیہ اس کے سینے کے زیر و بم کے ساتھ مرتعش ہو رہا تھا - اس کی نشیلی آنکھوں میں گلابی ڈورے پھیلتے جا رہے تھے - تنفس کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور شہابی نتھنے پھڑک رہے تھے - اسے اپنے جسم کے بعض اعضا پر سرسراہٹ محسوس ہوئی اور جب اس نے انھیں سہلایا تو اسے اور زیادہ لذت کا احساس ہوا - تمتمائے ہوئے چہرہ سے جب اس نے دیوار کی جانب دیکھا جہاں لٹکے ہوئے کلینڈر کا تاریخ کا ورق ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا اور مینٹل پیس پر رکھی ہوئی مالکہ کی تصویر مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی تو ایک نفرت انگیز تبسم اس کے لبوں پر رقص کرنے لگا آج اسے مالکہ کی تصویر بھونڈی اور بھدی نظر آئی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے نظام کائنات تبدیل ہو گیا ہے - وہ مالکہ اور مالکہ فیاضی بن گئی ہے - کاش یہ دور دوراں کی زندگی کی گردش کی طرح طویل ہو جائیں -

کیف زا احساس نے اس کی پلکیں بوجھل کر دیں اور وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی -

---

وہ بے خبر سو رہی تھی - اور مدہوش جوانی کی گہری نیند میں خوابوں کے رنگین جزیرے میں پہنچ گئی تھی - اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بہت بڑی ملکہ بن گئی ہے - اس کے زرنگار ملبوسات اور قیمتی زیورات نگاہوں کو خیرہ کر رہے ہیں - وہ بصد احترام تخت طاؤس پہ بیٹھی ہوئی ہے

دو کنیزیں مورچھل لئے کھڑی ہیں اور کئی قطار باندھے بہ ادب اس کے احکام کی منتظر ہیں اور ایک حسین رقاصہ اپنے جسم کے کیف آگیں تھرکنوں سے اظہارِ فن کر رہی ہے۔ سریلے نغمے فضا میں تیر رہے ہیں اور وہ محظوظ ہو رہی ہے۔

اس نے ایک مدہوش کن کروٹ لی اور اس کے لباس نے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ منقش پلّو سینے پر سے ڈھلک کر نیچے آ رہا۔ اور اس کی ایک سرخ و سفید پنڈلی ساری میں سے باہر نکل آئی۔ جب سانس اس کے سینے میں سماتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ اب بلاوز کی دھجیاں بن کر ہوائیں بکھر جائیں گی اور اس کا وہ سڈول سینہ جس کے نیچے لاتعداد ارمانوں کا مخزن ــــ دل دھڑک رہا تھا کوہ آتش فشاں کی طرح فضا میں چنگاریاں بکھیر دے گا۔ اور پھر وہ آپ ہی آپ شرارے بن جائیں گے۔

یکایک اس کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ اسے کمرہ میں پیروں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے فوراً اپنی نرگسی آنکھوں کی گھنی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اور فرطِ حیرت سے اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا ــ سامنے خورشید کھڑا تھا۔

"تم" اس کے منہ سے نکلا۔ اور اس کی پشیمان نظریں خود بخود جھک گئیں۔

"ہاں" خورشید نے جواب دیا۔ "میں واپس آگیا ہوں۔ اور یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے۔ نوابوں کی لڑکی اور محلوں کا خواب ــــ اٹھ کھڑی ہو تیری مالکہ کا تار آ گیا ہے۔ وہ آیا ہی چاہتی ہیں ــــ بیگی!"

اس کے رنگین خیالوں کا قصر مسمار ہو گیا ــــ اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ سنگ خارا کی فلک بوس دیواریں اس کے چاروں طرف کھڑی کر دی گئی ہیں ــــ جن میں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے ــــ کس قدر متضاد تھی اس کے حسین خوابوں کی تعبیر ــــ ابھی وہ مالکہ تھی ــــ اور اب وہ فیاضی! ــــ وہی کل والی فیاضی ــــ ملازمہ! ــــ!!

تمنائیں!

از:- حضرت شفیق کوٹی

معجزہ کوئی تو وحشت میں نمایاں ہو جائے
جیب میں ہاتھ رہیں چاک گریباں ہو جائے

کاش وہ ہو کدۂ دل میں خراماں ہو جائے
کاش اک دن یہ بیاباں بھی گلستاں ہو جائے

حاملِ جلوہ اگر دیدۂ حیراں ہو جائے
ایک نظارہ مجھے حاصلِ ایماں ہو جائے

تیوریاں بدلی ہوئی آج ہیں دیوانوں کی
ان کا دامن نہ کہیں چاک گریباں ہو جائے

میں کسی پھول کو چھو لوں تو بنے سوکھ کے خار
تم جو کانٹا بھی اٹھا لو تو گلستاں ہو جائے

وہ ہی آتے ہیں سرِ قبر نہ ہے جلوۂ شمع
یا الٰہی کوئی جگنو ہی فروزاں ہو جائے

چشم گریاں سے کہو پاسِ ادب لازم ہے
خون آلود نہ اُن کا کہیں داماں ہو جائے

مستقل ایک خلش کا میں تمنائی ہوں
ہاں وہی تیر جو پیوستِ رگِ جاں ہو جائے

زندہ کر لیں گے کہ وہ مار ہی ڈالیں گے مجھے
کچھ تو معلوم مآلِ غمِ پنہاں ہو جائے

اپنی بربادی کا پھر کیوں نہ یقیں ہو مجھ کو
جب تری زلف مرا حال پریشاں ہو جائے

زندگی صرف ہے دشوار پسندی میں شفیق!
کیوں دعا مانگو کہ مشکل مری آساں ہو جائے

بود و نبود

زندگی بن کے بگڑ جاتی ہے بے ذوقِ نمود

حضرت افسر احمد نگری

میرے افکار میں ہے بربطِ فطرت کا سرود ... عشق ہر چیز کی تقویم خودی اصلِ نمود
موجزن اُن کے لہو میں ہے جلالِ محمود ... آج تک جو نہ محراب رہے وقفِ سجود
ہے شب و روز مجھے جلوۂ معنیٰ کی تلاش ... ہمنشیں! تجھکو مبارک ہو صلوٰۃ اور درود
ذہنِ انسان میں اب لذّتِ تخلیق کہاں ... چھپ گیا چشم تماشا سے تماشائے وجود
ہو گئی اب وہ حریفانہ کشاکش معدوم ... نہ خودی ہے نہ خدا ہے نہ عدم ہے نہ وجود
ایک تصویر کے دو رُخ ہیں جلال اور جمال ... وہی گلزارِ خلیل اور وہی نارِ نمرود
عقل سمجھی ہی نہیں کیا ہے مری بُت شکنی ... فہم بُت ساز سے بالا ہے مقامِ محمود
خوگرِ سوزِ غلامی نہ بن اے مردِ غیور ... کہ غلامی سی ہے مطرب کی نوا زہر آلود
عشق بیزارِ خرد عقل جنوں سے بیزار ... کشمکش میں ہے ہر اک مسئلہ بود و نبود
موجِ ہر رنگ نے یہ راز بتایا مجھکو ... محفلِ نسترن و نسریں ہے خزاں کا مقصود

اس حقیقت کو خدارا نظر انداز نہ کر
زندگی بن کے بگڑ جاتی ہے بے ذوقِ نمود


دلروز رجسٹرڈ
آنریبل ڈاکٹر
سر محمد ظفر اللہ خان صاحب
کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ دلروز کے متعلق فرماتے ہیں
"میرے بائیں بازو کا پھوڑا جو میں نے آپکو دکھایا
تھا مجھے پچھلے دو سال سے تکلیف دے رہا تھا میں نے
اس پر کئی ایک دوائیں برتیں مگر سب بے فائدہ میں مسرت کہتا
ہوں۔ کہ دلروز کی دو چھوٹی شیشیوں نے اسکو بالکل اچھا کر دیا جس کے لئے
میں آپکا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔"
(ترجمہ از انگریزی)
دلروز
آپ کو
معلوم نہیں!
کہ آپ ایک خطرناک فیصلہ کر رہے ہیں
اگر آپ اپنے جلدی روگوں کیلئے —
سرجنوں اور جراحوں کے نشتر میں شفا ڈھونڈتے ہیں
سرخ سپید زرد اور سبز مرہموں میں تسکین ڈھونڈتے ہیں
آپ کو لازم ہے۔ کہ اپنی اولین فرصت میں مقامی
دوا فروش سے دلروز طلب کریں۔ کیونکہ دلروز بغیر اپریشن ڈریسنگ اور پھاہے
کی ممانعت کے تمام جلدی امراض سے نجات دلاتی ہے۔
قیمت فی شیشی :- دو روپیہ — ایک روپیہ — آٹھ آنہ
HAKEEM
حکیم طاہر الدین اینڈ سنز دلروز والا۔ فیروز پور روڈ لاہور

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کی بات۔

جب میں باپ نہیں تھا

(ایک ناسمجھ ہندوستانی کی سبق آموز آپ بیتی)

میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں لیکن بہت عرصہ تک ... میں یہ احساس نہیں کر سکا کہ شادی شدہ لوگ کیونکر خوش رہ سکتے ہیں شادی کیوں ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ میرے دوست جب مجھے اپنی بیوی کے قصے سنایا کرتے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے دل کو مسل کر سینے سے باہر نکال دیا ہے اور اس کی جگہ انگیٹھی میں آگ بھر کر رکھ دی ہے۔ بہت دن کے بعد میرے ایک خاص دوست کو میری خفیہ بیماری کا پتہ چل گیا۔ اس نے پوچھا "کیا تمہیں جریان کی بیماری ہے" میں نے کہا نہیں پھر اس نے کہا کیا پیشاب سے پہلے اور اس کے بعد کوئی رطوبت خارج ہوتی ہے میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے خاص بات پوچھی میں نے کہا میں یہ بات جانتا تو ضرور ہوں کہ ایسا ہوتا ہے۔ لیکن آج تک ....

یہ سب کچھ سن کر وہ چونک اٹھا اور تعجب سے کہا کہ تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ اگر اسی زمانے میں بتلا دیتے جب تمہاری شادی ہوئی تھی کہ تم جریان کے مریض ہو تو میں تمہیں صرف پندرہ دن میں تندرست کر دیتا چنانچہ میرے دوست نے اسی وقت "زنانہ دواخانہ" کو خط لکھ کر "جوہر اعظم" دوا کی شیشی تین روپے آٹھ آنے کو منگائی اور مجھے استعمال کیلئے دی میں نے ترکیب کے مطابق اس دوا کا استعمال شروع کر دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دوا شروع کرنے کے ساتویں یا شاید آٹھویں دن پیشاب کے وقت وہ رطوبت خارج ہونی بند ہو گئی اور مجھے اپنے اندر ایک خاص بات ... ابھی دوا پوری ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک نہ .... یوں

جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کی بات

اپنے دوست کی مہربانی کی بدولت اب میں جوانی کی ہری بھری دنیا میں ایک ایسے خوش و خرم نوجوان کی طرح ہوں جیسے کہ مجھ جیسے کسی انسان کو ہونا چاہیے

میری بیوی ایک بچہ کی ماں ہے اور وہ جب اپنے بچے کو کھلاتی ہے اور بچہ ہمک ہمک کر ماں کی طرف دوڑتا ہے۔ اور ماں کے سر کے بال نوچتا ہے تو مجھے یہ بات یاد آتی ہے۔ کہ اس بچے کے باپ کا نام "جوہر اعظم" ہے۔ کیونکہ جوہر اعظم دوا سے ہی میری جریان کی بیماری دور ہوئی اور میری خفیہ طاقت پھر مجھے مل گئی۔ کاش جریان کے تمام مریضوں کو معلوم ہو جائے کہ اس دنیا میں جریان کی اگر کوئی بہتر دوا ہو سکتی ہے تو وہ جوہر اعظم ہے ایک شیشی کی قیمت صرف تین روپے آٹھ آنے ہے اس دوا پر عام فائدے کے خیال سے محصول ڈاک معاف ہے۔

پس ناظرین میں سے جو لوگ میری طرح جریان کی بیماری میں مبتلا ہوں اور پیشاب سے پہلے یا بعد میں قوت مردی پانی کی طرح بہہ جاتی ہو یا رات کو سوتے میں ناپاکی ہو جاتی ہو یا بعض وقت ...... شرمندگی ہوتی ہو تو انہیں چاہیے کہ

منیجر زنانہ دواخانہ اے۔بی ۲۴ دہلی کو

خط لکھ کر "جوہر اعظم" دوا کی شیشی بذریعہ وی۔پی پارسل منگا لیں۔ صرف ایک ہی شیشی تندرست بنا دے گی۔

"جوہر اعظم" وہی مشہور دوا ہے۔ جسے ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا کامرڈ سوسائٹی نے کافی تجربہ کر کے عام اعلان کے ذریعہ پبلک کو مطلع کیا تھا کہ "جوہر اعظم" دوا جریان کے مریض کو یقیناً تندرست کرتی ہے اور تمام ملک سے پر زور اپیل کی تھی کہ جریان کے مریضوں کو اس دوا سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ آل انڈیا کامرڈ سوسائٹی نے جوہر اعظم کا بہت کافی تجربہ کرایا ہے اور ہر جگہ ہر مریض کو اس دوا نے تندرست کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء سے آج تک انجمن مذکور کی ہدایت کے مطابق اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے اور کسی خریدار سے محصول پارسل نہیں لیا جاتا۔ صرف دوا کی قیمت لی جاتی ہے

پھندے

ڈراما

مصنفہ:۔ ساقی

مترجمہ:۔ جناب امداد الصابی

کردار

دمتری ... ... قدیریا کا حاکم شہزادہ

ڈاکٹر اسطورنز ... ... }
کرنل غرنطزا ... ... } قارنز کی محافظ رجمنٹ
میجر وال طیف ... ... } کے سردار
کپتان شلز ... ... }

منظر۔ طازرن میں شہزادے کے محل کا ایک مخصوص کمرہ،

وقت۔ دس بجے رات،

(ایک مخصوص کمرہ جو قدرے بے ترتیبی سے سجا ہوا ہے۔ دیواروں پر بلقانی ساخت کے چند کمبل لٹکے ہوئے ہیں۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی میز جس پر شراب کی بوتلیں اور جام رکھے ہوئے ہیں۔ کچھ اونچے تکیوں کی کرسیاں کمرہ میں ادھر ادھر پڑی ہیں۔ بائیں طرف ٹائل کا بنا ہوا آتش دان۔ درمیان میں دروازہ —— پردا اٹھتا ہے۔ غرنطزا وانطیف اور شلز آپس میں باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

غرنطزا۔ شہزادے کو کچھ شبہ ہو گیا ہے۔ اس کا طرز عمل ہی کچھ ایسا ہے

شلز۔ شبہ ہو گیا ہے تو ہو جائے۔ اب آدھ گھنٹے کے اندر اس کا شبہ یقین میں بدل جائے گا — وہ سب کچھ خود دیکھ لے گا۔

غرنطزا۔ جس لمحہ عندلیف رجمنٹ شہر سے باہر کوچ کرے گی ہم اس کی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوں گے۔

شلز۔ (طمنچہ کو خول سے نکال کر ایک خیالی انسان کی طرف ہتھیاتے ہوئے) اور پھر حضور جہاں پناہ کو فوری نجات! میرا خیال ہے کہ میری زیادہ گولیاں خراب نہ جائیں گی۔

غرنطزا۔ یہ طمنچہ مجھے کبھی پسند نہیں آتا۔ میں تو اس سے کام لوں گا (اپنی تلوار کو نیم برہنہ کرتا ہے اور پھر اسے کھٹاک سے میان میں واپس ڈال دیتا ہے)

طیف۔ ارے بھائی جو چاہیں گے کر لیں گے۔ مجھے تو بڑی بیزاری ہوتی ہے۔ وہ تو بالکل دودھ پیتا بچہ ہے۔ میں تو تب خوش ہوتا جو کسی تگڑی اسامی سے دو دو ہاتھ ہوتے۔ کچھ تو جوان ہوتا وہ....

غرنطزا۔ جب بھی موقع ملے وار خالی نہ جائے۔ جوان آدمی تو شادی کر بیٹھتے ہیں اور پھر اولاد بھی پیدا کرتے ہیں۔ اور پھر سارے خاندان کا صفایا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جہاں ہم نے اس لڑکے کو قتل کیا گویا ہم نے خاندان کا چراغ گل کر دیا۔ اور پھر شہزادہ کارل کے لئے رستہ صاف ہو گیا۔ جب تک ان فرعونوں میں سے ایک بھی باقی رہے گا۔ ہمارا پیارا کارل کبھی تخت و تاج حاصل نہ کر سکے گا۔

والطیف۔ جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔ یہی ہمارے لئے ایک زریں موقع ہاتھ آیا ہے۔ تاہم میرا دل تو یہی چاہتا ہے کہ لڑکا بجائے اس کے کہ ہمارے ہاتھوں سے قتل ہو قدرتی طریقے سے ہمارے راستے سے ہٹ جائے تو اچھا ہے۔

شلز۔ ش — ش — وہ آ گیا ہے۔

(وسطی دروازہ سے شہزادہ دمتری غیر مسلح سواری کی پوشاک میں داخل ہوتا ہے۔ وہ سیدھا کمرے میں چلا جاتا ہے۔ ایک ڈبیہ میں سے سگریٹ نکالتا ہے اور حسرت بھری نظروں سے تینوں افسروں کی طرف دیکھتا ہے۔)

دمتری۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔

(وہ سب آداب بجا لاتے ہیں اور پیچھے کو ہٹ جاتے ہیں۔ شلز سب سے آخر میں جاتا ہے۔ اور شاہزادے پر نہایت معصومانہ انداز میں حیرت بھری نگاہیں ڈالتا ہے۔ شہزادہ درمیان میں کرسی پر بیٹھ جاتا ہے

جونہی دروازہ بند ہوتا ہے وہ ایک لمحہ کے لئے اُسے حیرت سے دیکھتا ہے پھر یکایک ناامیدی اور حسرت کے انداز سے اپنا سر ہاتھوں پر رکھ کے جھک جاتا ہے ...... دروازے پر ایک دستک ..... دمتری اپنے پیروں پر اچھل کر کھڑا ہوتا ہے - اسطورنز شہری وضع قطع میں اندر داخل ہوتا ہے)

دمتری - (آمادگی سے) اسطورنز! خدا گواہ تمھیں دیکھ کر مجھے یک گونہ مسرت ہوتی ہے -

اسطورنز - جی ہاں، ہر شخص کے خیالات اس طرح کے نہیں ہوتے - آپ کو کیا معلوم کہ آپ کے پاس آنے میں مجھے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا - آپ کی صحت کے متعلق ایک معاملہ میں چند ضروری باتیں کرنا تھیں لہٰذا جناب بڑے بڑے احکام گھڑنا پڑے - اور تو اور انھوں نے میرا طمنچہ تک رکھوا لیا - انھوں نے بتایا یہ کوئی نیا قانون ہے -

دمتری - (ایک مختصر ہنسی کے ساتھ) ارے صاحب کسی نہ کسی بہانے سے انھوں نے میرے بھی قبضے سے ہر ہتھیار لے لیا ہے - میری تلوار دوبارہ خول چڑھنے گئی ہے - طمنچہ صفائی کو گیا ہے اور شکار کا چاقو تو کسی نے بالکل ہی غایب کر دیا ہے -

اسطورنز - (ہکا بکا ہوکر) خدا کی پناہ، دمتری! کیا تم نہیں سمجھتے؟

دمتری - ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں - میرے اوپر پھندے ڈالے جا چکے ہیں - تین برس ہونے کو آئے - ۱۴ برس کی عمر سے میں اس تخت پر بیٹھا ہوں - اس وقت سے آج تک میری کڑی نگرانی ہو رہی ہے لیکن یہ پھندے میرے گلے میں اچانک ڈالے گئے ہیں -

اسطورنز - لیکن تمھارے محافظ؟

دمتری - کیا تم نے ان کی وردیوں پر غور نہیں کیا - فارنز کی رجمنٹ شہزادہ کارل سے دل و جان کی طرح خلا ملا ہے - توپخانہ بھی بُری طرح ان کے زیر اثر ہے - اور ان کے جال میں صرف عندرلیف رجمنٹ ہی ایک مشکوک عنصر تھا - جو آج رات شہر سے باہر خیمہ زن ہونے کے لئے مارچ کر رہی ہے - لونادی رجمنٹ ایک آدھ گھنٹہ میں آیا چاہتی ہے - جو شاید ان کے چنگل سے نجات دلا سکے گی -

اسطورنز - حقیقتاً کیا وہ وفادار ہے؟

دمتری - جی ہاں، مگر ان کی وفاداری وقت کے بعد حاصل ہو سکے گی - ایک گھنٹہ یا اس سے بھی زیادہ -

اسطورنز - دمتری تمھیں یہاں قتل ہونے کیلئے نہیں ٹھہرنا چاہئے - جلدی

نکل بھاگو۔

دمتری۔ میرے مہربان اسطورنز! ایک پیڑھی سے بھی پہلے سے کارل فرلق ہمارے وجود کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اس سلسلے کی آخری کڑی میں ہوں۔ کیا تمھارا خیال ہے کہ اب وہ ایسی آسانی سے اپنے چنگل سے نکل جانے دیں گے؟ وہ اتنے پاگل تو نہیں ہیں۔

اسطورنز۔ لیکن بڑی عجیب بات ہے! اور تم ہو کہ اس طرح اطمینان سے بیٹھے باتیں کر رہے ہو۔ گویا شطرنج کی ایک چال حرکت میں ہو۔ اور بس!

دمتری۔ (اُٹھتے ہوئے) آہ! اسطورنز، کاش تمھیں معلوم ہوتا کہ میں موت سے کتنی نفرت کرتا ہوں۔ میں پوچ نہیں لیکن میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تم خود سوچو۔ میں نے جوانی کا لطف بھی نہیں اُٹھایا زندگی کتنی سحر انگیز ہوتی ہے اور میں نے ابھی اس کا مزہ تھوڑا سا ہی چکھا ہے۔ (کھڑکی پر جاتا ہے) ذرا دیکھو تو کوہسار پرستان معلوم ہوتا ہے۔ اور ہرا بھرا جنگل اوپر نیچے کیسا دوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور اس طرف تم عزادیز بھی دیکھ سکتے ہو۔ جہاں میں گزشتہ خزاں کے دوران میں شکار کھیلا کیا۔ اور وہ اس طرف بائیں جانب بلکہ اس سے بھی آگے ویانا کا علاقہ ہے۔ کیا تم نے کبھی ویانا کا علاقہ دیکھا ہے؟ اسطورنز میں تو وہاں بس ایک دفعہ گیا ہوں۔ اور مجھے وہ ایک جادو کا شہر معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عجیب و غریب شہر اس دنیا میں ہوں گے جو میں ابھی تک نہ دیکھ سکا ہوں۔ اُف! اسی لئے تو میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ ذرا سوچو تو آج میں تم سے یہاں بیٹھ کر باتیں کر رہا ہوں اور اسی طرح ہم نے دسیوں بار اسی قدیم بھورے کمرے میں مزے مزے کی باتیں کی ہیں اور کل ایک موٹا بیوقوف ملازم اس کونے سے ایک بڑا سا سرخ نشان دھو رہا ہوگا۔ (بائیں جانب آتش دان کے قریب کونے کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اسطورنز۔ لیکن تمھیں اس طرح ٹھنڈی سانسوں میں قصائی کے کھونٹے پر بھولی گائے کی طرح قربان نہیں ہونا چاہئے دمتری! اگر ...ہوں نے لڑنے کے لئے تمھارے پاس کوئی ہتھیار نہیں چھوڑا ...تو تمھیں اپنے بکس سے ایسی دوا دونگا۔ جو ان کے چھونے سے ...تمھیں فوراً ابدی نیند سلا دے گی۔

...ا۔ جی شکریہ! میرے بوڑھے برخوردار۔ بہتر ہو کہ تم اس مرحلے کے شروع ہونے سے قبل کھسک لو۔ وہ تم کو نہ پھانسیں گے۔ ان کے پھندے میری گردن کے ناپ ہی کے ہیں۔ بہرحال میں خودکشی نہیں کر سکتا۔ میں نے اس سے قبل کسی آدمی کو قتل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ اور اب اس سے بہتر موقع مجھے کب ملے گا۔

اسطورنز۔ تب میں تمھیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ اور جب اس کا موقع آئے گا تو تم بجائے ایک کے دو آدمیوں کو قتل ہوتے دیکھ سکو گے۔

(کچھ فاصلہ سے ایک مارچ کا بینڈ بجتا سنائی دیتا ہے)

دمتری۔ عنقریب رجمنٹ باہر کو مارچ کر رہی ہے۔ اب وہ زیادہ وقت نہ گنوائیں گے۔ (وہ آتش دان کی طرف بالکل کونے میں کھسک جاتا ہے) ہش، وہ آرہے ہیں۔

اسطورنز۔ جلدی کرو۔ ایک ترکیب ہے۔ (ایکدم دمتری کی طرف جھپٹتے ہوئے) اپنا گریبان چاک کر ڈالو۔

(وہ دمتری کے گریبان کو کھول دیتا ہے۔ اور اس کے دل کی حرکت کا معاینہ کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ دروازہ چوپٹ کھل جاتا ہے اور تینوں افسر داخل ہوتے ہیں۔ اسطورنز ہاتھ کے اشارہ سے خاموش رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اور اپنا امتحان جاری رکھتا ہے۔ افسر اس کی طرف حیرت سے تکتے ہیں۔)

غرنطزا۔ ڈاکٹر اسطورنز کیا آپ کمرے سے تشریف لے جانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ ہمیں اعلیٰ حضرت سے کچھ ضروری امور پر گفتگو کرنا ہے۔ بیحد ضروری باتیں ہیں ڈاکٹر اسطورنز۔

اسطورنز۔ (چاروں طرف دیکھتے ہوئے) معزز صاحبان! مجھے افسوس ہے کہ میرا کام آپ سے زیادہ ضروری ہے۔ میرے سپرد انتہائی الم انگیز فرائض ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اپنے شہزادہ کے لئے تم لوگ اپنی جانیں تک آسانی سے قربان کر سکتے ہو۔ لیکن چند ایسے خطرات سے واسطہ پڑ گیا ہے جن کو تمھاری بہادری بھی نہیں بدل سکتی۔

غرنطزا۔ (گھبرا کر) محترم! آپ کیا فرما رہے ہیں؟

اسطورنز۔ شہزادہ نے مجھے بلایا تھا کہ میں ان کے لئے نسخہ تجویز کروں۔ کیونکہ اس پر کچھ بےچینی اور بےکلی کے علامات ظاہر ہوئے تھے۔ میں نے آکر معاینہ کیا۔ اب میرے فرائض میں قدرے بیرحمی شامل ہے —— میں اسے چھ دن سے زیادہ زندگی کا اطمینان نہیں دلا سکتا۔

(دمتری کرسی میں دھنس جاتا ہے۔ اور دل ڈوبنے کا بہانہ کرتا ہے۔ افسر عجیب کشمکش و پیچ میں ایک دوسرے کو تکتے ہیں)

غرنطزا۔ کیا آپ کو کامل یقین ہے؟ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ غلطی تو نہیں فرماتے۔

اسطورنز۔ (اپنا ہاتھ دمتری کے کندھے پر رکھتے ہوئے) خدا کو درمیان لاتا ہوں۔

(افسر ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرتے ہوئے پھر لوٹ جاتے ہیں)

غرنطزا۔ (چلتے چلتے) میرا خیال ہے ہمارا کام ملتوی ہو سکتا ہے۔

دالطیف (دمتری سے) حضور مشیت ایزدی میں کسی کا چارہ نہیں۔

دمتری۔ (دل شکستگی سے) مجھے تنہا چھوڑ دو۔

(وہ سلام کرتے ہیں اور آہستہ سے کھسک جاتے۔ دمتری آہستہ سے اپنا سر اٹھاتا ہے۔ پھر اپنے قدموں پر اچھل پڑتا ہے۔ دروازے کی طرف جھپٹتا ہے۔ اور باہر کو سنتا ہے۔ پھر مگن ہو کر چاروں طرف ناچتا ہوا اسطورنز کی طرف گھومتا ہے)

دمتری۔ بنا دیا اُلّو۔ اسطورنز تمہارا خدا بھلا کرے۔ ترکیب ایک ہی رہی۔

اسطورنز۔ (جو دمتری کی طرف دیکھتے ہوئے خاموش کھڑا ہے) یہ محض واہمہ ہی نہ تھا دمتری۔ تمہاری نظروں میں نظریں ڈال کر غور کرنے سے مجھے اس قسم کا کھٹکا ہوا۔ میں نے اس قسم کے لوگ دیکھے ہیں جن کی نظروں میں ایسی علامات ہوتی ہیں اور جو ایک جان لیوا مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

دمتری۔ چھوڑو جی۔ تمہیں کسی قسم کا خطرہ محسوس ہوا ہو۔ بہرحال تم نے مجھے بچا لیا ہے۔ خوب اکسی بھی لمحہ لونا دی رجمنٹ یہاں ہوگی۔ اور تب غرنطزا کا عملہ کسی قسم کے خطرے پیدا کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا ـــــ تم نے انہیں اُلّو بنا دیا۔ اسطورنز واقعی تم نے انہیں اُلّو بنا دیا۔

اسطورنز۔ (ملال سے) لڑکے میں نے ان کو اُلّو کہاں بنایا ہے (دمتری اس کی طرف ایک لمحہ کے لئے حیرت سے دیکھتا ہے) وہ تو سچا معاینہ تھا جو میں تمہارے دل کا کر رہا تھا۔ اور وہ ظالم تمہیں قتل کرنے کے لئے باہر بیٹھے تھے۔ اور میری اطلاع سچی تھی۔ مرض موجود ہے۔

دمتری۔ (آہستگی سے) کیا یہ سب صحیح تھا۔ کیا تم نے ان سے سچ بولا؟

اسطورنز — ہاں وہ سب سچ تھا تم چھ دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے

دمتری — (حیرت سے) ایک شام میں دو مرتبہ موت میرے لئے آئی میرا خیال ہے وقت آن ہی پہنچا — (جذبات سے مغلوب ہو کر) تم نے مجھے ان کے ہاتھوں قتل کیوں نہ ہو جانے دیا؟ وہ بہتر رہتا بہ نسبت اس کے کہ — "جاؤ چھوڑا جب تک کہ بلایا نہ جائے" کے مخمصے میں پھنسا رہوں۔ (سیدھی طرف کھڑکی کی طرف گزرتا ہے — اور باہر کو دیکھتا ہے۔ یکایک مڑتا ہے) اسطورنز! تم نے ابھی ابھی ظالمانہ موت سے بچاؤ کا ایک طریقہ بتایا تھا۔ اب اس سے بھی زیادہ مظلومانہ طریقے سے مجھے نجات دلاؤ۔ میں ایک شہنشاہ ہوں۔ میں موت کا انتظار نہیں کر سکتا۔ وہ چھوٹی سی شیشی مجھے دو — (اسطورنز جھجکتا ہے۔ پھر ایک چھوٹا ڈبہ نکالتا ہے۔ پھر اس میں سے چھوٹی شیشی کھینچ کر اسے دے دیتا ہے)

اسطورنز — جس کام کے لئے یہ تمہیں مطلوب ہے اس کے چار پانچ قطرے کافی ہوں گے۔

دمتری — شکریہ، اور میرے بوڑھے خیر خواہ اب تم جاؤ۔ ہاں جلد چلے جاؤ — تم نے مجھے قدرے بہادر دیکھا ہے۔ شاید میں بہادری کو برقرار نہ رکھ سکوں۔ میں تمہاری یاد میں بہادر ہی رہنا چاہتا ہوں میرے بہترین دوست الوداع۔ آخری الوداعی سلام۔

(اسطورنز اپنا منہ ہاتھوں سے چھپا کر لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر کو لپکتا ہے — دروازہ بند ہوتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے دمتری اپنے دوست کے پیچھے دیکھتا ہے پھر وہ جلدی سے کونے کی میز پر جاتا ہے اور شراب کی بوتل کا کاگ کھولتا ہے کچھ شیشہ میں کچھ شراب ڈالنا چاہتا ہے کہ اسے ایک زبردست خیال آتا ہے دروازہ پر جاتا ہے اور اسے چوپٹ کھول کر باہر کان لگاتا ہے۔ پھر پکارتا ہے۔ غرنطزا والنطیف، شلز! واپس آ کر کرسی پر دھنستے ہوئے زہر کی پوری شیشی بوتل میں ڈال دیتا ہے اور شیشی کو اپنی جیب میں ٹھونس لیتا ہے۔ تینوں افسر داخل ہوتے ہیں)

دمتری — (چار ساغروں میں شراب ڈالتے ہوئے) شاہزادہ کو مرا ہوا سمجھو شاہزادہ زندہ باد۔ (سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے) دیرینہ قضیہ اب ختم ہو جانا چاہئے۔ اور اب میرے خاندان میں ایک فرد بھی باقی نہیں جو اس جھگڑے کو قائم رکھے۔ شاہزادہ کارل کو تخت و تاج ملنا ہی چاہیئے شہزادہ کارل کی صحت و زندگی کا جام ہو۔ تارنز کے محافظوں کے سردارو اپنے آئندہ شہنشاہ کا جام صحت نوش کرو۔

(تینوں افسر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر پیتے ہیں۔)

غرنطزا — حضور ہم کو تا زندگی والا جاہ جیسے اولوالعزم شہزادہ کی خدمات نصیب نہ ہوں گی۔

دمتری — یہ حقیقت ہے کیونکہ تم کبھی کسی شہزادہ کی خدمت نہ کرو گے دیکھو میں کس اطمینان سے پی رہا ہوں۔ (ساغر خالی کر دیتا ہے)

غرنطزا — آپ کا کیا مطلب ہے۔ کبھی کسی دوسرے شہزادہ کی خدمت نہ کریں گے؟

دمتری — (اٹھتا ہے) میرا مقصد ہے کہ میں عالم فانی سے جا رہا ہوں۔ اور اس طرح کہ تارنز کی رجمنٹ کے محافظوں کی کمان کرتا ہوا۔ آج رات تم لوگ یہاں مجھے قتل کرنے کی غرض سے آئے تھے (وہ سب ہکا بکا رہ جاتے ہیں) تم نے محسوس کیا کہ موت تم سے پہلے یہاں پہنچ چکی ہے میں نے یہ خیال کیا کہ یہ شام فضول نہ گنوائی جائے کیونکہ یہ کچھ معیوب سا معلوم ہوا کہ میں تنہا موت کا مزا چکھوں۔ اس لئے میں نے تم سب کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ بس یہی مطلب ہے اس کا۔

شلز — ارے یہ شراب! اس نے ہمیں زہر دے دیا۔

(والنطیف بوتل کو پکڑتا ہے اور اسے اچھی طرح جانچ کر دیکھتا ہے۔ شلز اپنے خالی جام کو سونگھتا ہے۔)

غرنطزا — اسے ظالم نے زہر دیدیا۔

(وہ اپنی تلوار سونت کر دمتری کی طرف ایک قدم بڑھتا ہے۔ دمتری وسطی میز کے ایک کونے پر بیٹھتا ہے۔)

دمتری — اوہ، یقیناً اگر تم یہ چاہتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ مرض سے میں دو چار دن میں اور زہر سے دو چار منٹ ہی میں مرنے والا ہوں لیکن اگر میرے خاتمہ کے متعلق تم قدرے زیادہ تکلیف گوارا کرنا چاہتے ہو تو میں اس کے لئے تیار ہوں۔ بسم اللہ۔

(غرنطزا چکراتا ہے۔ میز پر تلوار گرا دیتا ہے اپنی کرسی میں غرغرا کر گر پڑتا ہے۔ شلز میز کے نیچے گر پڑتا ہے اور والنطیف دیوار سے ٹکراتا ہے۔ اسی لمحہ ایک شاندار فوجی مارچ کی آواز باہر سے سنائی دیتی ہے۔ دمتری تلوار پکڑ لیتا ہے اور اسے ہوا میں گھماتا ہے۔)

دمتری — آہا، لونادی رجمنٹ آن پہنچی۔ میرے شریف اور وفادار تارنز کی محافظ دوسری دنیا میں جاتے ہوئے میرے ہمرکاب ہوں گے۔ شاہزادہ زندہ باد! خدا حافظ: (دیوانہ وار قہقہے لگاتا ہے) کرنل غرنطزا — مجھے کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ موت بھی آتی ..... دلچسپ ہو سکتی ہے۔

(زمین پر گر پڑتا ہے)

—— پردہ ——

بھگت کبیر

نوشتہ:- رابندرناتھ ٹیگور آنجہانی

مترجمہ:- جناب بیدل صدیقی رہگری

ملک میں خدا رسیدہ اور روشن ضمیر بزرگ کبیر کی معرفت میں ڈوبی ہوئی شاعری پھیل گئی — سادھو، فقیر، جوگی آپ کی بھجنیں گا گا کر راہ حق پر گامزن ہونے لگے۔

آپ کی جھونپڑی کسی وقت خالی نہ رہتی تھی - ہر وقت لوگ آتے جاتے رہتے۔ گوناگوں خیالات کے لوگ آتے تھے - ان میں عورتیں بھی ہوتی تھیں اور مرد بھی - کوئی کہتا "بابا! کچھ سنا کر میرا درد تو مٹا دو" کسی کا سوال ہوتا۔ مجھے خدا سے ملا دو - مجھے بھی اپنے دامن میں جگہ دیدو بھگت راج! ایسی بھی صدائیں بلند ہوتیں۔

عورتیں آپ کے قدموں کو چھو کر کہتیں - "دنیا کے سارے سکھ ہمیں حاصل ہیں لیکن اولاد کا سکھ نہ ہونے سے سب ہیچ ہیں - ایک لڑکا ہو ایسی دعا کر دیجئے حضرت" کہتے وقت ان کی آنکھوں سے ڈھل ڈھل آنسو بہنے لگتے - جیسے وہ سچ مچ دکھی ہوں۔

جہاں ایسے خیالات و اعتقاد کے لوگ آتے تھے - وہاں ایسے خیال کے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی — ایسی آوازیں بھی اٹھتی تھیں کہ یہ مکار ہے، دنیا کو ٹھگ رہا ہے - اور آپ کو مخاطب کر کے کہا جاتا — یہ ڈھونگ چھوڑ دے - دنیا اور دنیا والے بیوقوف نہیں ہیں۔

جواب میں سب کی طرف دیکھتے ہوئے آپ میٹھی ہنسی ہنستے اور کہتے — "بھج من رام، رحیم ... بھج من کرشن، کریم ...!"

اور پھر مولی، باریک، بھدی اور میٹھی ہوئی آوازیں ہم آہنگ ہو کر فضا میں بلند ہوتیں: "بھج من، رام، رحیم، بھج من کرشن کریم"

اس عمل سے جھونپڑی کا گوشہ گوشہ جگمگا اٹھتا - ذرہ ذرہ جھوم اٹھتا - اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ بیجان چیزوں میں بھی جان آگئی ہے اور وہ بھی زبان بے زبانی سے گا رہی ہیں: "بھج من رام رحیم" چاند کی خنک کرنیں جھونپڑی کے قدموں کا بوسہ لیتیں - اور کرنوں کے سہارے یہ نغمے — یہ کیف عرفان، چاند تاروں کی دنیا میں بھی پہنچ جاتے - آدھی رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا - اس کے بعد آہستہ آہستہ مجمع منتشر ہو جاتا - اور بھگت کبیر اپنی جھونپڑی میں تنہا رہ جاتے۔

اس وقت آپ خدا کی یاد میں کھو جاتے - آنکھوں سے آنسوؤں کی تیز دھارا بہ نکلتی - اور روندھے ہوئے گلے سے کہتے - "معبود! میں تو سمجھا تھا کہ تو نے مجھے افلاس و نکبت کی سکون آمیز آغوش عطا کر کے مجھے اپنے بالکل قریب جگہ دی ہے - کنگال اور غریب گھر میں پیدا کر کے مجھے دنیا کے اضطراب انگیز ہنگاموں سے دور رکھا ہے - اور لازوال خوشی و شانتی بخشدی ہے - لیکن اے میرے داتا! یہ راز میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب میں دنیا کے کسی کام کا نہیں - میری ہستی کا کوئی معیار نہیں - تو! پھر دنیا اور دنیا والے مجھے تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیتے - مجھ سے دور کیوں نہیں بھاگتے - کیا تیری منشا سے تو نہیں انسانوں کے جھنڈ میری جھونپڑی میں آتے ہیں - تو خود تو اس ضمن میں دلچسپی نہیں لے رہا ہے اے میرے مالک! مجھے اس جنجال سے چھٹکارا دے - میں دنیا سے گھبراتا ہوں — دنیا کے ہنگاموں سے پریشان ہوتا ہوں — مجھے کہیں الگ لے چل!"

اسی طرح روتے اور خدا سے گڑگڑاتے رات بیت جاتی -

حاسد اور کینہ پرور دلوں میں اضطراب و بے چینی کے اثرات سرعت کے ساتھ پھیل رہے تھے - ان کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سبھائیں اور کمیٹیاں کیا کرتے تھے اور جو آوازیں اٹھتی تھیں - وہ انتہائی حقارت انگیز اور تذلیل آمیز ہوتیں - اخلاقیات سے گری ہوئی ہوتیں — وہ کہتے ایک معمولی حیثیت کا آدمی ایک بلند جگہ پالے - یہ ہم نہیں دیکھ اور سن سکتے - اس ریاکار کے قدموں کی خاک کا بوسہ لیکر لوگ مذہب کی توہین کر رہے ہیں — بے دھرم ہو رہے ہیں - سچ مچ کلجگ آ پہنچا - زمین اس گناہ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی - دھرتی ماتا کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے ہمیں جلد کوئی صورت اختیار کرنی ہوگی - اور انھوں نے مشورہ کر کے ایک بیچ عورت کو بلایا اور روپیہ کا لالچ دیکر خدا کے ایک دوست کو بے عزت کرنے کا ٹھیکہ کیا۔

کپڑا بُن کر بھگت کبیر ایک دن بازار میں بیچنے نکلے۔

چاروں طرف سے حاسدوں نے آپ کو گھیر لیا — اور سکھلائی پڑھائی وہ عورت بھیڑ کو چیرتی ہوئی آ گئی۔ جھوٹ موٹ آنسو بہاتی اور سسکتی ہوئی کہنے لگی: "مکار، تجھ ایک بیکس و مجبور عورت کو اس طرح دھوکہ دینا تھا۔ اس دن تو نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ کیسی کیسی امیدیں دلائی تھیں۔ تیرے وہ قول و قرار کیا ہوئے — کیا وہ سبز باغ جیسی حقیقت رکھتے تھے — مجھے پیٹ کی بھٹی میں جھونکنے کے لئے ایک مٹھی اناج بھی نہیں ملتا۔ تن ڈھانکنے کو پھٹے پرانے کپڑے بھی نہیں۔ اور تو — گیروا لباس پہنے تارک الدنیا بنا پھرتا ہے — وہ کہتی تھی — فریبی دغاباز — عہد شکن اور نہ جانے کیا کیا —"

اور آپ — آپ پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ آپ کی پیشانی پر شکن تک نہ آیا۔ نورانی چہرہ اور بھی چمک اٹھا۔ دلفریب مسکراہٹ کشش انگیز ہنسی میں تبدیل ہو گئی — ہوتی گئی۔

حاسدوں کے طعن آمیز جملے اور بے ہنگم قہقہے فضا میں بلند ہوئے وہ اپنی اس کامیابی پر حد سے زیادہ شاداں تھے۔ کچھ لمحہ بعد آپ مسکراتے ہوئے اس عورت سے بولے: "بیشک مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے معاف کر دو دیوی گھر چلو، میرے ہوتے ہوئے تم ننگی بھوکی نہیں رہ سکتیں"

آپ دنیا اور دنیا والوں پر ہنستے ہوئے اس نیچ عورت کے ساتھ لوگوں کی فحش باتیں جو آپ ہی کے متعلق ہو رہی تھیں سُنتے چلے جا رہے تھے مغلظات بکی جا رہی تھیں۔ پتھر پھینکے جا رہے تھے۔ شور مچایا جا رہا تھا۔ لیکن آپ کو اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ آپ اسی طرح ان کی نادانی پر مسکرائے جا رہے تھے۔ آپ کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ عورتوں اور مردوں کی ٹولیاں بن بن کر آتیں اور آپ پر آوازے کستیں۔ لیکن آپ ان سب سے بے نیاز چل رہے تھے۔ چلے جا رہے تھے۔

اپنی جھونپڑی میں پہنچ کر آپ نے اس عورت کو نہایت احترام سے بٹھایا۔ اس کے آگے کھانے کی چیزیں رکھیں اور ہاتھ جوڑ کر بولے: "بہن گھبراؤ نہیں اور نہ شرماؤ۔ میرے پیارے خدا نے تمہیں مجھ غریب کی جھونپڑی میں بھیج کر مجھ پر اپنا بہت بڑا کرم کیا ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ اب ہم بھائی بہن مل کر اس کی یاد کریں گے"

آپ کے اخلاق اور برتاؤ نے اس عورت کی کایا پلٹ دی۔ اس کا دل لمحہ بھر میں بدل گیا۔ جھوٹے آنسو ختم ہو کر سچے آنسوؤں کی شکل میں بدل گئے۔ اس نے خود کو غیر معمولی تعجیل کے ساتھ آپ کے قدموں میں ڈال دیا۔ اور روتی ہوئی بولی: "مجھے معاف کیجئے حضرت! پیسے کی لالچ میں میں اندھی ہو گئی۔ اور اتنا بڑا گناہ کر ڈالا"

"نہیں نہیں بہن! تم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے —" آپ جلدی سے بول اٹھے: "میں تم سے بہت خوش ہوں"

دیکھتے دیکھتے آپ نے اس بے دھرم اور نیچ عورت کو اونچا کر دیا۔ سارے شہر میں یہ بات پھیل گئی کہ آپ مکار و فریبی ہیں مگر معتقدین کی جماعت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اور آپ بلند ہوتے گئے۔

اسی درمیان —

ایک دن راجہ کے کچھ آدمیوں نے کہا: "بھگت راج آپ کو مہاراج یاد کرتے ہیں" یہ بھی حاسدوں کی ایک سیاسی چال تھی۔

آپ نے انتہائی نرمی سے جواب دیا: "بھائی راج دربار میں میری جگہ نہیں۔ مجھے اس سے کیا کام"

"آپ نہ چلیں گے تو ہم مورد عتاب ہوں گے اور بہت ممکن ہے نوکری سے برخاست کر دیئے جائیں" وہ سب یک زبان ہو کر بولے۔

یہ سُن کر آپ بیتاب ہو گئے — جلدی سے فرمایا: "چلو میں ابھی چلتا ہوں —"

اور اپنی مُنہ بولی بہن کو لے کر آپ دربار میں گئے۔

دربار میں آپ کو دیکھ کر کوئی ہنسنے لگا۔ کوئی آنکھ کا اشارہ کرنے لگا۔ کسی نے آپ کی طرف سے مُنہ موڑ لیا۔ غرض ہر طرف سے نفرت انگیز نگاہیں آپ پر پڑ رہی تھیں — اور بھگوان کے ایک بھگت کی ہنسی اڑائی جا رہی تھی۔

راجہ نے بھی کہا کہ یہ بڑا بیوقوف ہے — اسے شرم نہیں آتی کہ ایک نیچ عورت کو ساتھ لئے پھرتا ہے۔ . . . اور دوسرے لمحہ راجہ کی گرجدار آواز دربار کی فضا میں گونج اٹھی۔

"اسے نکال دو —"

آپ دربار سے نکال دیئے گئے — بے عزت کئے گئے۔ لیکن آپ — مہاتما کبیر —!

چپ چاپ لوگوں کی طرف دیکھتے اور ہنستے ہی چلے گئے چلتے گئے — چلتے گئے۔

آخر ایک دن —

اس منزل پر پہنچ ہی گئے — جہاں کمال کی انتہا اور معراج ہوتی ہے —!" (آزاد ترجمہ)

فکرِ لطیف

بالآخر ہماری زباں کھل رہی ہے

حضرت لطیف انور گورداسپوری

نہ دل میں خوشی ہے نہ لب پر ہنسی ہے
یہی زندگی ہے تو کیا زندگی ہے

نہ اُمیدِ راحت کریں اور نہ کی ہے
ہمیں رنج کا سامنا جیتے جی ہے

حکایت ترے غم کی یہ سرسری ہے
کہ مجھ سے مری ہر خوشی چھین لی ہے

مجھے کیا اگر رنگِ گل عارضی ہے
مجھے کانٹے کانٹے سے دلبستگی ہے

کئی بار ساقی کے ہاتھوں سے پی ہے
ابھی تک مگر شکوۂ تشنگی ہے

کہاں سے چلا ہوں یہ کس کی گلی ہے
متاعِ دل و جاں یہیں لُٹ گئی ہے

جہاں تک ہوا کوششِ ضبط کی ہے
بالآخر ہماری زباں کھل رہی ہے

یہ کیا سُن رہا ہوں، یہ کیا کہہ رہی ہے
کہ میری نہیں تو کسی اور کی ہے

کبھی زمزمہ سنجِ گلشن تھے ہم بھی
کبھی دُھوم اپنی یہاں رہ چکی ہے

مجھے ناخدا پر بھروسہ تھا کیا کیا
مری ناؤ منجدھار میں ڈوبتی ہے

ابھی تک تو ہے آتشِ عشق روشن
ابھی تک تو آنکھوں میں کچھ کچھ نمی ہے

خطاؤں کا امکان ہے شیخ سے بھی
ہماری طرح وہ بھی انسان ہی ہے

اِدھر دیکھ، اے ساقئ بے مروّت
مرے ہاتھ میں جام اب تک تہی ہے

مرے حال کی پرسش بے محل کیا؟
عنایت مرے حال پر آپ کی ہے

کھچا آرہا ہے ادھر اک زمانہ!
ترے در میں آخر کوئی دلکشی ہے

سُنا تو ہے انور کو دیکھا نہیں ہے
خدا جانے کس ڈھنگ کا آدمی ہے

میاں بیوی کا افسانہ

اِن دونوں میں بے حد محبت تھی۔ ایک دوسرے کو چاہتے تھے لوگ کہتے تھے یہ سارس کی جوڑی ہے اور ان دونوں کی زندگی پر رشک کرتے تھے۔

بیوی حسین تھی اور شوخ بھی۔ انہی شوخیوں میں اس کی زندگی بہار سے کھیل رہی تھی۔ شوہر اس کی اداؤں کا دیوانہ تھا۔ لیکن وائے انقلاب! .... وقت کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ پتہ نہیں کیوں یہ خوبصورت پھول مرجھانے لگا۔ شوہر گھبرا گیا۔ بے چین ہوگیا بیوی کے خوبصورت چہرہ پر اداسیاں چھا گئیں اور رفتہ رفتہ ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے اس کا حسن ہوا میں بکھر گیا ہے۔ دیکھنے والے کہنے لگے۔ دق کی بیماری ہے کیونکہ رفتہ رفتہ اس کا چلنا پھرنا بہت ہی کم ہو گیا تھا۔ چہرہ پر زردی چھا گئی تھی۔ ڈاکٹر آئے۔ حکیم آئے۔ طرح طرح کے علاج ہوئے۔ لیکن مریضہ کا چہرہ اُترتا ہی چلا گیا وہ خود کچھ نہ کہتی تھی۔ چپ تھی۔ یہاں تک کہ اسکی زندگی کے لالے پڑ گئے۔ چہرہ بھیانک ہوگیا۔ یہی خوبصورت اور حسن کا پتلہ عورت تھی جو کبھی شوہر کی نظروں میں سمائی رہتی تھی۔ آج اس کا یہ حال دیکھکر شوہر بھی بچنے لگا۔ مرد کی محبت بے نقاب ہوگئی اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ مرد عورت کے حُسن سے اور اسکی جوانی سے محبت کرتا ہے۔ عورت سے نہیں۔

سخت بیماری کے باوجود وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ مگر کرتی کیا۔ اتفاق کی بات کہ اس نے ایک دن کسی اخبار میں کچھ پڑھ لیا۔ وہ سمجھ گئی اُسے کیا بیماری ہے۔ اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ ساتھ ہی اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس بیماری کا اصلی علاج کیا ہے۔ چنانچہ اس نے مسہری پر لیٹے لیٹے ایک خط لکھا اور [illegible] کہاں سے دوا کا پارسل منگا لیا اور دوا شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے دیکھا۔ اسکے چہرہ پر پھر رونق آنے لگی اور رفتہ رفتہ وہ پھر خوبصورت پھول بن گئی اور وہی شوہر جو کل تک الگ رہنے لگا تھا۔ پروانہ کی طرح اس کے چاروں طرف چھا گیا (شمع پھر روشن ہو گئی تھی اور پروانہ کا کتنا ضروری ہو گیا تھا۔

بہت دن بعد پتہ چلا کہ وہ سیلان الرحم یعنی لیکوریا کی بیماری اور وقت بےوقت سفید پانی جانے لگا تھا۔ جو رفتہ رفتہ بڑھ گیا اور بیماری خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ چہرہ کا رنگ روپ اُڑ گیا۔ اتفاق سے اس نے دوا "روک" کی خبر اخبار میں پڑھ لی۔ جس سے اُسے معلوم ہوا کہ لیکوریا کی بیماری کیلئے یہ دوا سب سے بڑا علاج ہے چنانچہ اس نے

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۲۲ بلی ماران دہلی

خط لکھ کر دوا "روک" کی شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگائی اور استعمال کی۔ تیسرے دن سفید پانی کا آنا بند ہوگیا اور پوری شیشی ختم ہونے تک بیماری کا نام نشان بھی نہ رہا۔ اس کے بعد اس نے سب سہیلیوں کو دوا "روک" کا کمال بتایا اور ان میں سے جس کسی کو بھی لیکوریا کی بیماری تھی۔ اس نے دوا "روک" کے استعمال سے صحت حاصل کرلی ایک شیشی دوا "روک" کی قیمت تین روپے ہے۔ پارسل پر دو آنے محصول لگتا ہے۔

نوٹ — سیلان الرحم یعنی لیکوریا کی بیماری کے لئے دوا "روک" اتنی کامیاب ثابت ہوئی ہے کہ آج ہزاروں حکیم و ڈاکٹر لیکوریا کی مریض عورتوں کو اسی دوا کا مشورہ دیتے ہیں کیونکہ دوا "روک" کے استعمال شروع کرتے ہی تیسرے ہی دن سفید پانی گرنا بند ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جن عورتوں کو ضرورت ہو وہ مندرجہ بالا پتہ پر خط لکھکر دوا "روک" منگا لیں۔ ایک ہی شیشی سے یہ بیماری ختم ہو جاتی ہے۔ واضح ہے کہ دوا "روک" تقریباً چھ سال سے تمام ہندوستان میں [illegible] ہے اور نہایت تیزی کے ساتھ ہندوستانی عورتوں میں مقبول ہوئی ہے۔ [illegible] اسی دن سفید پانی گرنے کو بند کر دیتی ہے اسلئے ہم عام عورتوں [illegible] کو بتاتے ہیں۔ [illegible] سمجھتی ہیں اور جب تک کوئی سہیلی لیکوریا کے مرض میں گرفتار ہو جاتی ہے تو اُسے تاکید کرتی ہیں کہ دوا "روک" استعمال کرو۔ دیکھتے دیکھتے بیماری ختم ہو جاتی ہے حقیقت ہے کہ ہمیشہ ہی ان کا یہ کہنا سچ ثابت ہوتا ہے۔

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی و ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۴۴ء

جلد ۴۴ نمبر ۱

فہرست مندرجات

(ورق الٹئے جناب)

منظومات

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شایع کیا۔

ملاحظات

اس زمانہ میں جب کاغذ کی گرانی و نایابی برق خاطف بن کر رسائل و جرائد کے خرمن حیات پر کوند رہی ہے۔ کسی خاص نمبر کی اشاعت کا تصور تک قابل برداشت نہیں۔ بایں ہمہ محسن مطلق کا بے پایاں احسان ہے کہ عالمگیر مصائب و حوادث کی یلغار میں بھی اپنی امتیازی شان کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہا ہے اور "خاص نمبر ۱۹۴۴ء" اپنی جلو میں ان تمام زینتوں اور خوبیوں کو لئے ہوئے جلوہ گر ہو رہا ہے۔ جو اردو صحافت کے دامن میں چار چاند لگنے کا باعث ہوں گی۔ خاص نمبر میں تحقیق و تاریخ اور شعر و ادب کے جو شاہکار شامل کئے گئے ہیں۔ وہ مدیرانہ تعارف کے محتاج نہیں۔ تاہم محض تشکر و امتنان کے جذبات کے اظہار کے لئے چند کرمفرماؤں اور ان کے قلمی رشحات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حقائق و معارف ۔ یہ "عالمگیر" کا ایک مستقل عنوان ہے اور باذوق حلقوں میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ مولانا ظفر علی خاں مدظلہٗ نے اس مرتبہ ان نفوس طاہرہ کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ جو فقر و فاقہ کے باوجود دولت ایمان سے مالا مال تھے۔ لیکن اس کے باوجود "صوفی" نہ تھے۔ مضمون مختصر ہونے کے باوجود مفصل ہے۔ **نظام الملک طوسی کا سیاحت نامہ** مولانا مہر محمد خاں شہاب کا شمار ملک کے مشاہیر محققین اور فضلا میں ہوتا ہے۔ آپ بہت عرصہ سے دنیائے ادب سے تقریباً کنارہ کش ہو گئے تھے۔ لیکن ہمارے اصرار پر آپ بالآخر مہر سکوت توڑنے پر مجبور ہو گئے۔ آپ کا تازہ ترین مقالہ ہدیہ قارئین ہے۔ مولانا کی کسر نفسی کے باوجود یہ مضمون کافی مفصل اور صحیح معنوں میں تنقید ہے۔ امید ہے اہل سیاست کے لئے سبق آموز ثابت ہو سکے گا۔ **سلاطین ہند کی شاعری** ۔ مولانا نور احمد خاں اپنی محققانہ نقد نگاری کے لئے خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ آپ نے تذکرہ نویسوں کی توجہ ایک اہم موضوع کی جانب مبذول کی ہے۔ اور مختصر طور پر سلاطین ہند کی شاعری کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ **انسان کی بہیمانہ خدمات** ۔ مولانا محمد اسمٰعیل ذبیح کا یہ مضمون تاریخ کے اس دور پر روشنی ڈالتا ہے جب انسان سے جانوروں کا سا کام لیا جاتا تھا۔ **بڈشاہ بادشاہ کشمیر کی علمی سرگرمیاں** ۔ یہ مقالہ مولانا محمد دین فوق کی بیس سالہ تاریخی تحقیق و تدقیق کا نچوڑ ہے۔ مولانا کو اس تصنیف کے صلہ میں حکومت کشمیر نے ایک ہزار روپے کے انعام سے بھی سرفراز کیا ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ نے دو صفحے بطور تعارف لکھ دیئے ہیں۔ **ملکہ فرانس کے نام نپولین کے خطوط** ۔ ان تاریخی خطوط سے "نپولین کی مراجعت" پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔ اے۔ آر۔ رشدی ایک مشاق صحافی ہیں۔ ان کا ترجمہ کامیاب ہے۔

خاص نمبر ۱۹۴۴ء پر ایک نظر

از :— ادارہ

"خاص نمبر" میں ادبی مضامین کی اشاعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے **نظم معرّیٰ اور نظم آزاد** ۔ جناب یوسف جمال کا یہ فاضلانہ مضمون اس بدعت کا توڑ ہے جو "آزاد شاعری" کے نام سے اردو ادب میں پیدا ہو رہی ہے۔ امید ہے "ترقی پسند شاعر" اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔ **بیخبر اور غالب** ۔ میرزا محمد بشیر ایم۔ اے کا یہ مضمون تاریخ ادبیات اردو کے ایک نیم متعارف ورق پر روشنی ڈالتا ہے۔ **آرٹ اور آرٹسٹ کے فرائض** ۔ جناب خلیق ابراہیم "ترقی پسند مصنفین" کے ایک سرگرم کارکن ہیں۔ اور مقالہ نویسی کی دنیا میں خاصی شہرت کے مالک ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند ادب کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت پوری عقیدت کے ساتھ کی ہے لیکن ان کے "نکات" کا جواب بھی شریک اشاعت کر دیا گیا ہے۔ **ناسخ کی مثنویاں** ۔ جناب عطاءاللہ پالوی بہار کے ایک مشہور نقد نگار ہیں۔ انھوں نے ایک اچھوتا موضوع منتخب کر کے بتایا ہے کہ ناسخ کی مثنویاں ادبی نقطۂ نگاہ سے بیجا تو نہیں ہیں لیکن قابل لحاظ بھی نہیں ہیں۔ **انشا و رنگین کی تشبیہات** ۔ جناب خالد حسن قادری نے انشا و رنگین کی تشبیہات کا دلکش انداز میں موازنہ کیا ہے —

غزل کی اہمیت جناب عبادت بریلوی لکھنؤ یونیورسٹی کے ریسرچ سکالر ہیں اور متعدد تحقیقی مقالات لکھ کر باذوق حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ "غزل کی اہمیت" اگرچہ نیا موضوع نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے جدید اصول تنقید کے ماتحت اس پر روشنی ڈالی ہے اس لئے فرسودہ پیکر میں بھی زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

زیر نظر اشاعت میں کم و بیش سترہ افسانے اور ڈرامے شامل ہیں۔ اسے ادبی اعجاز کہنا چاہیئے۔ کیونکہ آج کل بازار میں آٹھ دس افسانوں کے مجموعے دو دو روپے میں فروخت ہو رہے ہیں۔ لیکن

خاص نمبر میں ایک ساتھ **سترہ افسانے، چودہ مضامین اور ۳۲ نظمیں** ۔ شائع کی جا رہی ہیں۔ اس کے باوجود خاص نمبر کی قیمت صرف دو روپے رکھی گئی ہے۔ گویا انمول موتی کوڑیوں کے مول لُٹائے جا رہے ہیں۔ **کمال کرتی ہو** ۔ سید احسان علی شاہ ملت کے بعد "سیلولس" کی دنیا میں گھوم پھر کر ادبیات کی وادی میں آئے ہیں لیکن اس شان سے آئے ہیں کہ بڑے بڑے ترقی پسندان کے مقابلہ میں ہیچ نظر آتے ہیں۔ "کمال کرتی ہو" ایک نفسیاتی شاہکار ہے۔ جس میں بورژوا سوسائٹی کی گھریلو زندگی پر ایسے ماہرانہ اور جاذب توجہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہ بے اختیار کہنا پڑتا ہے "بھئی تم نے کمال کر دیا"۔ **بگڑے ہوئے گیسو** ۔ محترمہ خدیجہ کی زبان میں گھلاوٹ اور مٹھاس ہے۔ ان کا افسانہ ہر جہت سے کامیاب ہے۔ **گندی نالی** ۔ اس تہذیب و تمدن کی دنیا میں ہزاروں افراد ایسے ہیں جنھیں سوسائٹی دھتکار چکی ہے اور عضو معطل خیال کرتی ہے۔ لیکن ایک دردمند اور حساس افسانہ نویس کی نظروں میں اس قسم کے لوگ خواہ کتنے غلیظ ہوں "انسانیت" سے محروم نہیں ہوتے۔ میرزا ادیب نے نتھو کے روپ میں ایک ایسے ہی کردار کی نفسیاتی تحلیل کی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ انھوں نے آرٹ کا حق ادا کر دیا ہے۔ **اس کے گیت** ۔ جناب محمد امین بشر قیوری ایک مقبول ترین افسانہ نویس ہیں۔ یہ ان کا تازہ ترین شاہکار ہے۔ **ملمع** محترمہ ہاجرہ مسرور کا ایک یادگار افسانہ ہے۔ ان کی تحریر کی شوخی و بیباکی خاص طور پر متاثر کرتی ہے۔ "ملمع" "ظاہر پسند سوسائٹی پر ایک تلخ ترین تنقید ہے"۔ **اپنے پرائے** ۔ ریڈیائی ڈرامے اردو میں خال خال نظر آتے ہیں۔ سید انتصار حسین نیوتنوی نے اس فرو گزاشت کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ بھی حد درجہ رقت خیز ہے۔ **جونک** ۔ طرز جدید کا شاہکار ہے جس میں سوسائٹی کے ان افراد کے وحشیانہ کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے جو انسانی سمندر میں جونک کا درجہ رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ افسانہ ملک صاحب نے مسٹر کرشن چندر کے ناول "شکست" سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ **کمینے** ۔ اس افسانے میں جناب پاشا نے انسان کی ایک قابل رحم کمزوری کو افسانوی پیرایہ میں بیان کیا ہے ان کے انداز تحریر میں دانشور کی باغیانہ روح پیدا ہو رہی ہے **ویٹنگ روم** ۔ جناب شوکت صدیقی کا ایک رومانی افسانہ ہے جسے پڑھ کر ان کے مشاہدہ و مطالعہ کی داد دینا پڑتی ہے۔ **نیا ڈاکٹر** میر فیصل مزاحی افسانہ نویسی میں کمال حاصل کر رہے ہیں۔ یہ ان کا نیم مزاحی شاہکار ہے جو ایک مشہور لطیفہ پر مبنی ہے۔ **ناگ دیوتا** جناب قسمر اجنالوی طویل افسانوں کی بدولت ادبی دنیا میں مشہور ہو چکے ہیں۔ یہ افسانہ ہندوستان کے قدیم باشندوں سے متعلق ہے۔ اُن کی تاریخی تحقیقات تحسین و تبریک کی مستحق ہے۔ **دھندلکے** ۔ جناب اختر ملیح آبادی کا ایک دیہاتی افسانہ ہے۔ اور حق یہ ہے کہ خوب ہے **بت** ۔ محترمہ شفق بانو نجیب آبادی افسانہ نویس عورتوں میں امتیازی شان کی مستحق ہیں۔ یہ افسانہ ایک نفسیاتی نکتہ کے گرد گھومتا ہے۔ **جن** جناب ظفر واسطی کا ایک اصلاحی افسانہ ہے۔ جن کے پڑھنے سے جن بھوت کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ **خالد اور وحیدہ** ایک عربی رومان ہے۔ جو ہملٹن کے "بدوی رومان" (مطبوعہ ۱۸۲۰ء) سے ماخوذ ہے۔ **قانون** ۔ جناب شوکت ہاشمی کی ایک لطیف طنز ہے۔ آپ کا انداز تحریر بھی جاذب نظر ہے۔ **دردِ دل** جناب رمزی اٹاوی کا ایک ریڈیائی تمثیلچہ ہے جس میں بیدم وارثی کے متصوفانہ کلام پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

منظومات کے متعلق کچھ لکھنا گویا سورج کو ٹمٹماتا ہوا چراغ دکھانا ہے کیونکہ اس میں ہندوستان کے تقریباً تمام جلیل القدر اساتذہ، مشاہیر شعرا اور نوجوان سخن گو شامل ہیں۔ اور یہ فخر صرف "عالمگیر" کو حاصل ہے کہ وہ ملک بھر کے شہرت یافتہ اور صحیح معنی میں ترقی پسند شعرا کا تازہ کلام ہدیہ قارئین کرتا رہتا ہے۔ ہم حضرت جلیل۔ سیماب۔ نوح ناروی۔ علی اختر اور شفق مینائی کے علی الخصوص شکر گزار ہیں کہ وہ بالالتزام اپنا کلام "عالمگیر" کو مرحمت فرماتے رہتے ہیں۔ حضرت یگانہ چنگیزی اور حضرت ناطق گلاوٹھی رسائل و جرائد سے بڑی حد تک بیزار نظر آتے ہیں تاہم انھوں نے "عالمگیر" کی مستقل اعانت کا وعدہ فرمایا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اساتذہ سخن کا کلام اب پہلے کی طرح کشش انگیز نہیں رہا لیکن مذکورہ بالا حضرات کی غزلیں اور نظمیں اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں جعفر محمود اسرائیلی نے "تسطیر" کے ذریعے ایک نئی صنف کو فروغ دینا شروع کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ وہ اپنی کوشش میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہیں۔ حضرت احسان دانش شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی تازہ ترین نظم "پہلی ملاقات" اشاعت کیلئے مرحمت فرمائی۔ کاش یہ نظم قدرے طویل ہوتی۔ حضرت اعجاز صدیقی نے گزشتہ ایک دو برس میں تین چار چیزیں ایسی کہی ہیں کہ ان کا شاعرانہ مقام اب قابل رشک ہوتا جا رہا ہے۔ "معذرت" ان کی ایک دلآویز نظم ہے۔ حضرت ماہر القادری نے "ساقی نامہ" لکھ کر اپنی بخشش کا سامان کر لیا ہے اس قسم کی بلند پایہ نعتیں اُردو میں شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ باقی حضرات کا کلام بھی دل و دماغ پر کیف طاری کئے بغیر نہ رہے گا۔ ہم تمام اہل قلم معاونین کا بصمیم قلب شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے خاص نمبر کو معنوی لحاظ سے کشش انگیز بنانے میں ہماری امداد کی۔

موجِ فصاحت

ہوش کھو کر ہوش میں آتے ہیں ہم

فصاحت جنگ امامِ فن حضرت جلیل مدظلہ

کیا تصوّر میں مزہ پاتے ہیں ہم
تیری صورت میں نظر آتے ہیں ہم

کہتے ہیں شکوہ نہ آنے کا غلط
یُوں نہ آئیں یاد تو آتے ہیں ہم

نالۂ پیہم سے برہم ہوں نہ آپ
سو گئے ہیں بخت چونکاتے ہیں ہم

جان آجاتی ہے دَورِ جام سے
ہوش کھو کر ہوش میں آتے ہیں ہم

بدگمانی کا بُرا ہو، باغ میں
گل سے وہ ہنستے ہیں شرماتے ہیں ہم

سابقہ تم سے پڑا جس روز سے
اپنی دُنیا کچھ نئی پاتے ہیں ہم

کم ہے اس جینے پہ جتنا ناز ہو
مرنے والے تیرے کہلاتے ہیں ہم

ہو جُدا کوئی گوارا یہ نہیں
درد اُٹھتا ہے تڑپ جاتے ہیں ہم

محتسب یہ ظرف ہے کس کو نصیب
تو برستا ہے، پیئے جاتے ہیں ہم

سیرِ گل سے روکتا ہے جب قفس
نکہتِ گل بن کے اُڑ جاتے ہیں ہم

رات بھر تو زندہ رہتے ہیں جلیل
صبح کو کچھ اور ہو جاتے ہیں ہم

ساقی نامہ

نذرِ عقیدت

حضرت ماہر القادری

زمانہ کا رسالت پر تری ایمان ہے ساقی
مگر اُلفت تری ایمان کی بھی جان ہے ساقی

ترے کردار پر دشمن بھی انگلی رکھ نہیں سکتا
ترا اخلاق تو قرآن ہی قرآن ہے ساقی

مشیت بھی تری مرضی کے تیور دیکھ لیتی ہے
بایں اقرارِ عبدیت یہ تیری شان ہے ساقی

تجھے جس نے نہ پایا وہ خدا کو پا نہیں سکتا
کہ تیری معرفت اللہ کی پہچان ہے ساقی

کسی صورت ترے دربار اقدس تک پہنچ جاؤں
مجھے دشوار ہے تیرے لئے آسان ہے ساقی

ترے آتے ہی انسانیتِ کبریٰ اُبھر آئی
زمانہ پر ترا احسان ہی احسان ہے ساقی

گنہگاروں کی نظریں تیری جانب اُٹھ رہی ہونگی
ہجومِ حشر میں تیری یہی پہچان ہے ساقی

کبھی اے کاش سوتے میں ترا دیدار ہو جائے
یہی ارمان تھا ساقی، یہی ارمان ہے ساقی

نہ وہ ایمان کی گرمی نہ وہ تنظیم امت کی
نہ مصر و شام پہلے سے نہ وہ ایران ہے ساقی

خلافت دے کے بھیجا تھا جسے حق نے زمانے میں
وہی انسان اب مغرب زدہ انسان ہے ساقی

مری آنکھوں نے دیکھی ہے عجم کی بزم آرائی
غضب ہے محفلِ بغداد بھی ویران ہے ساقی

نگاہ و دل پہ قبضہ کر لیا ہے علم حاضر نے
کوئی منکر کوئی باغی کوئی حیران ہے ساقی

جہاں میں انتشار و برہمی کا دَور دَورہ ہے
اِدھر طغیان ہے ساقی، اُدھر طوفان ہے ساقی

بُتوں کے بعد قبروں کی طرف پیشانیاں خم ہیں
خدا کے ماننے والوں کا یہ ایمان ہے ساقی

خداوندانِ دولت کی خدائی آہ! کیا کہئے
کوئی فرعون ہے ساقی، کوئی ہامان ہے ساقی

مسلماں نامسلمانوں کی صف میں آئے جاتے ہیں
کہ اب ایمان اک ٹوٹا ہوا پیمان ہے ساقی

جو ڈوبے ہیں نکل آئیں، جو گرتے ہیں سنبھل جائیں
توجہ سے تری اس کا ابھی امکان ہے ساقی

تری رحمت بالآخر رحم فرمائے گی اُمّت پر
یہی اک چیز ہے جس سے کہ اطمینان ہے ساقی

چلا

پنۂ قفس کا ہمارے ہی آشیاں سے چلا

حضرت سیماب اکبر آبادی

اگر نہ میرے سر، اور تیرے آستاں سے چلا
بتا کہ سجدوں کا دستور پھر کہاں سے چلا؟

چلا تھا دل سے جو جادو نہ وہ زباں سے چلا
کسی طرح نہ مرا کام ترجماں سے چلا

رہِ حیات میں چل، زندگی کے شانوں سے
چلا فضول جو بیزار جسم و جاں سے چلا

فلک کے ہاتھ سے، جان آدمی بچا نہ سکا
غریب بچ کے بہت مرگِ ناگہاں سے چلا

تھا آشیاں میں، تو سب ہمنشیں تھے غنچہ و گل
چلا تو ساتھ نہ کوئی بھی آشیاں سے چلا

نشاطِ جادہ و ذوقِ خرام و گرمیٔ شوق
میں بڑھ کے چار قدم گردِ کارواں سے چلا

ہے چل چلاؤ پہ عالم یونہی ہمیشہ سے
بتائے کون کہ یہ سلسلہ کہاں سے چلا؟

پناہ مل نہ سکی اس کو میرے دل کے سوا
تلاش میں جو مکاں کی وہ لامکاں سے چلا

ہمیں نے نغمۂ آزادیٔ وطن چھیڑا
پتہ قفس کا ہمارے ہی آشیاں سے چلا

ہوئی نہ ختم نگاہِ جواں کی دلدوزی
کماں میں آ گیا وہ تیر، جو کماں سے چلا

مری گرانیٔ رفتار پر نہ کر تنقید
یہ غور کر، میں کہاں آ گیا، کہاں سے چلا

نگاہ و دل پہ اک ایسا بھی واقعہ گزرا
کہ جیسے پردہ کوئی اٹھ کے درمیاں سے چلا

ہوس کی چل نہ سکی رعبِ حسن کے آگے
چلا تو دامنِ یوسف مگر کہاں سے چلا

نظر بلند رہی حوصلے بلند رہے
زمیں پہ بھی میں رفتارِ آسماں سے چلا

نشاطِ وقت نے پھر غم بھلا دیا تیرا
پھر ایک لمحہ مری عمرِ جاوداں سے چلا

سخن کا قافلہ تھا سست گام اے سیماب
رواج گرم روی میرے کارواں سے چلا

پہلی ملاقات

رُومان پرور نظم

حضرت احسان دانش

اک چیز تھا وہ پہلی مُلاقات کا عالم
بیتاب اِدھر میں تھا اُدھر تھی وہ حسینہ

وہ عقل کی دہلیز میں ظلمت سی گزر کر
احساس کا جذبات میں مُڑتا ہوا زینہ

جس طرح ہواؤں میں لچکتا ہُوا ریشم
رہ رہ کے وہ پلکوں کی جھپکنے کا قرینہ

گدرائے ہُوئے جسم میں جذبات کی آنچیں
کشمیر کے دیہات میں بھادوں کا مہینہ

پیشانیٔ شفاف پہ ڈھلتی ہوئی بوندیں
آیا ہوا بے داغ جوانی کو پسینہ

ہر سانس پہ رُکتی ہوئی آواز گلے میں
گرداب میں لرزے ہوئے ہونٹوں کا سفینہ

معمُول سے بڑھتی ہوئی دھڑکن کے سبب سے
اک صبح کا تارا تھا کہ نکلس کا نگینہ

سجدے میں بصد عجز وہ مفتوح نگاہیں
شاعر کی قلمرو میں مضامیں کا دفینہ

اخبار و افکار

نیا ادب اور کمیونزم

از:- اِدارۂ تحریر

مشرق و مغرب میں آتش و خون کا ایک لرزہ خیز ہنگامہ برپا ہے جنگ کے قیامت آفریں زلزلے نے تہذیب و تمدن کی بنیادیں ہلا دی ہیں - اور ملکوں کی قسمتیں نئے نئے سانچوں میں ڈھلنے کے لئے آنے والے انقلاب کی راہ دیکھ رہی ہیں - سیاست و معاشرت ایک بالکل نئی کروٹ بدلنے والی ہے - اور ادب چونکہ ہماری سیاسی و معیشی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے - اس لئے وہ بھی ایک بحرانی اور تجرباتی دور میں سے گزر رہا ہے - لیکن جنگ کے بعد اُردو ادب کیا صورت اختیار کرے گا؟ اسکا انحصار اُس سیاسی و معاشی نظام پر ہے جس کی دیواریں موجودہ سرمایہ دارانہ تہذیب و تمدن کے کھنڈروں پر استوار کی جائیں گی - اگر اتحادیوں کو فتح ہوئی تو بہت ممکن ہے ایک ایسا ادب نمودار ہو جو روس و امریکہ کے ادبی رجحانات کے امتزاج سے تیار کیا جائے گا - اور ظاہر ہے کہ اس انقلاب کا عکس ہندوستانی ادبیات پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا - بایں ہمہ اس کے متعلق موجودہ حالات میں کوئی آخری رائے قائم کرنا ممکن نہیں ہے - فی الحال ہمیں ان مسائل کی طرف توجہ کرنا ہے جو اُردو ادب کے تجرباتی دور میں پیدا ہو رہے ہیں -

اگر ادبیاتِ عالم کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ ادب کو جب بھی نئی کروٹ بدلنے کا موقع ملا ہے - ناتجربہ کار ہاتھوں نے اسے انحطاط و ابتذال کے کنوئیں میں دھکیلنے کی کوشش کی ہے - اور غرضمند اسے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں - چنانچہ اٹھارویں صدی میں جب رُوسو کی تعلیمات کے زیرِ اثر انقلاب فرانس کا ہنگامہ برپا ہوا تو ژورژساں George Sand اور پیرآلوئی ایسے ادیب پیدا ہو گئے جو فرانسیسی ادبیات کو "آرٹ" کی بلندی پر پہنچانے کی کوشش میں "کوک شاستر" کی سرحد کے قریب لے آئے - اسی طرح روس میں انقلاب سے کچھ عرصہ پہلے جس قسم کا لٹریچر پیش کیا گیا اُسے "فراریت" Escapism کا نام دیا جاسکتا ہے - اُردو میں دبستانِ لکھنؤ نے جس قسم کے ادب کو فروغ دیا وہ ابتذال و انحطاط کی بدترین مثال ہے -

موجودہ دَور میں اُردو ادب پھر ایک انقلاب کی راہ دیکھ رہا ہے - اس لئے اگر قسم قسم کے "ادبی فتنے" آنکھ کھول رہے ہیں تو تعجب نہ ہونا چاہیئے - لیکن اگر ان فتنوں کی بر وقت سرکوبی نہ کی گئی تو خطرہ ہے کہ وہ آگ کا طوفان بن کر اٹھیں گے اور ہمارے برسوں کے جمع کئے ہوئے ادبی سرمائے کو جلا کر خاک کر دیں گے - ان فتنوں میں کمیونزم کا دیو بصورتِ خاص کر قابلِ توجہ ہے جو آکسفورڈ کے بعض طیلسا پوشوں کی پیٹھ پر سوار ہو کر ادبِ عالیہ سے گویا مسخرگی کر رہا ہے - آج سے تین برس پہلے روس اور برطانیہ و امریکہ میں وہی رشتہ تھا جو آگ اور پانی میں ہو سکتا ہے - روس ایک عالمگیر انقلاب کے خواب دیکھ رہا تھا - اور دنیا کے تمام ممالک کو مارکسزم کی مزدورانہ آمریت کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتا تھا - ظاہر ہے کہ امریکہ و برطانیہ کی سرمایہ دار جمہوریتیں اس جسارتِ بیجا کو برداشت نہ کر سکتی تھیں یہی وجہ ہے کہ کمیونزم پر ہندوستان کا دروازہ بند تھا - اور اس ملک میں اس کا نام لینا بھی سیاسی گناہ تھا - لیکن جنگ کی مجبورانہ مصلحت اندیشیوں نے روس اور امریکہ و برطانیہ کو اتحاد و اتفاق کے پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا - روس نے تھرڈ انٹرنیشنل" کو توڑ دیا اور مذہبی قیود بھی بڑی حد تک اُٹھا دیں - ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کو جب "لامرکزیت" کا سامنا ہوا تو اُس نے اپنا رشتہ برطانوی سیاست سے جوڑ لیا - ان سب باتوں کے باوجود حکومت برطانیہ نے احتیاط پسندی کا دامن نہ چھوڑا - اور مسٹر چرچل نے پارلیمان برطانیہ میں صاف اعلان کر دیا کہ روس کا ساتھ دینے کے ہرگز یہ معنی ہیں کہ اتحادیوں نے کمیونزم کے مسلک کو صحیح تسلیم کر لیا ہے - لیکن ہندوستانی کمیونسٹوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا - وہ حربی پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ مارکسزم کی ان تعلیمات کا زہر بھی پھیلا رہے ہیں جو ہندوستان کی روحانی و مذہبی زندگی

بچے کے لئے ہلاکت کا موجب ہو سکتا ہے۔ اگر یہ پروپیگنڈا محض سیاسیات تک محدود رہتا تو شکایت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کیونکہ روس و امریکہ کا اشتراک عمل بہر حال ایک مفید مصلحت پر مبنی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے ارکان "ترقی پسند مصنفوں" کے بھیس میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اور لکھنؤ، بمبئی اور کلکتہ سے برابر اعلان کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے تمام ادیبوں کو اپنی دماغی صلاحیتیں کمیونزم کے فروغ کے لئے وقف کر دینی چاہئیں۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو ادب کو سیاسیات کا آلہ کار بنانا کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ اگر آج افسانوں اور نظموں کے ذریعہ سے کمیونزم کا پروپیگنڈا کیا جائے تو کل کلاں کانگرس اور مسلم لیگ کی سیاسی اغراض کو بھی ادب کا سہارا ڈھونڈنا پڑے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر ادبیات کو سیاست کا تنکا رہونے کی اجازت دے دی جائے تو وہ "آرٹ" نہیں۔ پروپیگنڈا بن کر رہ جائے گا۔ سرمایہ دار، مزدور، غلامی اور مفلسی بیشک خوشنما اور سماعت نواز الفاظ ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کو سیاسی مسلک کا آلۂ کار بنانا کہاں کی دانشمندی ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ ادب مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن۔ کمیونزم ایک عارضی تحریک ہے۔ دونوں میں اتحاد کیونکر ممکن ہے؟ روس نے نہ صرف "بین الاقوامی نظام زر" میں شامل ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ بلکہ ممالک یورپ کے مجوزہ فیڈریشن کو بھی مقبولیت کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ برطانیہ و امریکہ خود بھی روس کے عالمگیر انقلاب کے تخیل کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لہذا صاف ظاہر ہے کہ ان کا اشتراک عمل عارضی ہے۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک پائدار چیز سے عارضی پیوند کیوں لگایا جائے؟

تیسرے ادب ہمیشہ ملکی ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ کمیونزم ایک غیر ملکی نظریہ ہے۔ لہذا اردو ادب کے لئے اس کی ترجمانی کیونکر ممکن ہے؟

چوتھے۔ کمیونزم کے بعض بنیادی تصورات ہندوستان کے مذہبی رجحانات کے بالکل برعکس ہیں۔ کارل مارکس نہ صرف مزدورانہ آمریت قائم کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس کا فلسفہ "تاریخ کی مادی تعبیر اور جسمانی مسرت" کے گرد گھومتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہندوستانی دماغ اسے قابل قبول خیال نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے اس کے جواب میں کہا جائے کہ اسی لئے تو "ترقی پسند ادیب" مذہب کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن محض خواہش اور ارادے سے ان کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان بھی آباد ہیں جن کے نزدیک مذہب و سیاست ایک ہی نظام کے دو نام ہیں۔ وہ ہرگز برداشت نہ کر سکیں گے کہ ملک میں کوئی ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں روحانیت کی صداؤں کو سیاسیات کے ہنگاموں میں گم کیا جا سکے۔ لہذا "ترقی پسند مصنفین" کو مذہب پرستوں کے فولادی بازوؤں کے مقابلہ میں آنے سے پہلے اپنی ساعدِ سیمیں کی نزاکت پر بھی غور کر لینا چاہیئے۔ لیکن یہ سب سیاسی اور مذہبی تنازعات ہیں جن کا فیصلہ "ادب" کے ذریعہ سے نہیں "علم" کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ اگر ترقی پسند مصنفین کیونزم کو ہندوستان کی نجات کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں تو وہ ادب کے نازک آبگینے سے اُلجھنے کے بجائے علم و تحقیق کے میدان میں آئیں۔ ہم ان کو مطمئن کرنے کے لئے تیار ہیں۔

کاش ہمارے کمیونسٹ دوست اس حقیقت پر غور کرنے کے قابل ہو سکیں کہ ادبیات اردو کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے "ترقی پسندی" کا لیبل لگانے کی ضرورت نہیں۔ نہ کمیونسٹ پارٹی کا رکن بن کر حربی سرگرمیوں میں شریک ہونا کافی ہے۔ اس مقصد کے لئے ملکی ماحول کا مطالعہ شرط ہے۔ اور جب تک ہمارا ادب روس، برطانیہ یا فرانس کی آزاد روی کی ترجمانی کرنے کی بجائے مشرقی زندگی کا آئینہ دار نہ ہوگا اسے فروغ حاصل نہیں ہو سکتا ——!

بنسی دھر کپور اینڈ سنز

"عالمگیر" کے خاص نمبر کے لئے چند رم پیپرز بنسی دھر کپور اینڈ سنز نے کنٹرول نرخ پر مہیا کئے جس کے لئے ہم اُن کے شکر گزار ہیں۔ اس افراتفری کے زمانے میں وہ پنجاب کے تقریباً تمام پریسوں اور پبلشنگ اداروں کو بنگال پیپر ملز کا کاغذ انضباطی نرخ پر مہیا کر کے ایک بہت بڑی قومی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اگرچہ تقسیم کا طریقہ قدرے اصلاح طلب ہے۔ تاہم اس سلسلے میں وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں شکریہ کا مستحق ہے۔

(مہتمم عالمگیر لاہور)

حقائق و معارف

" اندر وقت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب صفّہ نشستہ بودند۔ اندر مسجد وے واز اشغال جملہ اعراض کردہ۔ و ترک معارضہ بگفتہ وخداوند تعالیٰ را بدادن روزی خود باور داشتہ و توکل بروے کردہ تا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامور بود بصحبت و قیام کردن بہ حق ایشاں ۔۔۔ " (کشف المحجوب - شیخ علی ہجویری رح)

بیشتر حضرات صوفیہ اپنے آپ کو اصحاب صُفّہ سے منسوب کرتے ہیں اور سلسلۂ تصوف کو ان بزرگوں تک پہنچاتے ہیں۔ مگر کتب تصوف میں اصحاب صفّہ کے مجمل حالات ایسے پیرایہ میں مذکور ہیں جس پر بے اختیار یہ آیت زبان پر آتی ہے کہ "۔ لا یسمن ولا یغنی من جوع" ۔ یہ نفوس طاہرہ کہ علم برداران اسلام تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت کا اختصاص بھی رکھتے تھے۔ خود قرآن کریم میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضرباً فی الارض یحسبہم الجاہل اغنیاء من التعفف تعرفہم بسیماہم لا یسألون الناس الحافا وما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم ٥ ۔۔ "

یعنی صدقات ان فقراء کے لئے ہیں جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنے آپ کو محصور کر رکھا ہے۔ یہ لوگ زمین پر سفر کرنے کی قدرت واستطاعت نہیں رکھتے۔ ان کے تعفف وخودداری کے باعث جو لوگ نادان وجاہل ہیں وہ انھیں غنی ومالدار سمجھتے ہیں۔ تم ان کو سیمائے صلاح سے پہچان لوگے۔ لوگوں سے وہ اصرار کے ساتھ لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ اور تم لوگ جو مال وزر خرچ کرتے ہو یا خرچ کروگے تو اللہ کو اس کا علم ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمان فقیروں اور تنگ دستوں کا ایک گروہ موجود تھا جس نے اپنی جانیں خدا کی راہ میں نذر کر دی تھیں۔

یہ لوگ فقیر تھے۔ بے نوا تھے اور احصار فی سبیل اللہ کے باعث ان میں اتنی قدرت واستطاعت نہ تھی کہ کسب معاش کے لئے سفر کر سکیں خدا نے مسلمانوں کو ترغیب دی تھی کہ ان غریبوں کو صدقہ دیا کریں۔

اصحابِ صُفّہ علم وتحقیق کی روشنی میں!

مولٰینا ظفر علی خاں

کیونکہ وہ خود کاروبار سے باز ماندہ تھے۔ اور سد کفاف کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ ان میں خودداری تھی۔ تا بحدّے کہ اظہار تعفف کے باعث جو ناواقف ہوتے وہ ان کو غنی سمجھتے۔ فقر وافلاس کی علامت سے ان کو پہچان لیا کرتے تھے۔ کثرت سوال اور سؤل سے اصرار ان کا شیوہ نہ تھا۔ یہ فقراء کون تھے؟ مفسرین وائمہ رواۃ نے بالاجماع اس کا حسب ذیل جواب دیا ہے۔

للفقراء خبر مبتدائے محذوف ۔۔۔ فلا یقع منہم الحاف ۔۔ اس عبارت کا ماحصل یہ ہے: " آیت کا پہلا لفظ مبتدائے محذوف کی خبر ہے مطلب یہ ہے کہ تمہارے صدقے فقیروں کے لئے ہیں۔ دوسرے معنی کسی فعل مقدر سے متعلق مان کر یہ نکلتے ہیں کہ تم جو خرچ کرتے ہو وہ فقیروں کے لئے خرچ کرو۔ یہ وہ فقیر ہیں جنھوں نے اپنی جانیں خدا کی راہ میں نذر کر رکھی ہیں یہ فقرائے مہاجرین تھے جن کی تعداد چار سو کے قریب تھی مدینہ شریف میں نہ ان کے واسطے گھر تھے نہ رہنے کی جگہ تھی۔ نہ اہل خاندان تھے نہ قبائل تھے۔ مسجد نبوی کے صفّہ میں رہتے تھے اور اپنے تمام اوقات تعلیم وعبادت میں مستغرق رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھیجتے تھے ان سب میں یہ بھی جاتے۔ یہ اصحاب صفّہ کے نام سے مشہور تھے۔ خدا نے ان کی نسبت لوگوں کو ترغیب دی کہ انھیں صدقہ دیا کریں۔ اور یہ اصحاب صفّہ کے حق میں خدا کا فضل وکرم تھا کہ صدقات کی ترغیب دیکر ایسے لوگوں کی روزی کا سامان کر دیا جو اللہ کی راہ میں مشغول رہنے کے باعث تجارت وکسب معاش کی غرض سے ملک میں سفر نہیں کر سکتے تھے اور نہ سفر کرنے کی سکت یا قدرت واستطاعت رکھتے تھے۔ یہ لوگ سوال سے پرہیز کرتے تھے متعفف اور مجتنب رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے ناواقف لوگ ان کو بجائے مفلس سمجھنے کے دولتمند سمجھتے تھے۔

آیت میں لفظ "یحسبہم" وارد ہے جس کو قراء سبعہ میں ابن عامر وعاصم وحمزہ نے بہ سین مفتوح پڑھا ہے اور بقیہ اہل تجوید مکسور تلاوت کرتے ہیں۔

" ان فقرائے صفّہ کو تم ان کی علامت سے پہچان لوگے۔ اور وہ علامت ان کا خشوع ہے۔ ان کی تواضع ہے۔ ان کے چہرے کی زردی ہے

ان کا پھٹے حالوں میں رہنا ہے وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتے۔ یعنی قطعاً سوال ہی نہیں کرتے کہ ان میں اصرار کی نوبت آئے"۔

مفاد کلام یہ ہے کہ اصحاب صفہ کو صدقہ دینے کی خدا نے جو ترغیب دی تھی وہ ان بزرگوں کے حق میں خدا کا فضل و کرم تھا۔ اصحاب صفہ فقیر تھے۔ اور ان بے ساز و برگ مہاجرین اصحاب میں سے تھے جو مکہ مبارکہ سے ہجرت کر کے مدینہ شریفہ آئے تھے۔ مگر یہاں بھی ان کے لئے کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اصحاب صفہ تعداد میں چار سو کے قریب تھے۔

مدینہ شریفہ میں یہ لوگ رہتے تو تھے مگر نہ ان کے رہنے کے لئے جگہ تھی۔ نہ گھر بار تھا۔ نہ اہل و عیال تھے نہ عزیز و قریب تھے۔ بالکل بے خانماں اور بے سر و سامان تھے۔ مسجد نبوی کے صفہ میں پڑے رہتے تھے۔ اور مسلمانوں کے صدقات سے ان کی بسر اوقات ہو جاتی تھی۔

ان کا کام یہ تھا کہ ائمہ کی راہ میں لگے رہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مہم بھیجیں تو اس میں شریک ہوں۔ ورنہ شب و روز تعلیم حاصل کریں اور عبادت کرتے رہیں۔

دنیا کے کاروبار کسب معیشت کے لئے جو قابلیت چاہیئے۔ وہ ان میں نہ تھی۔ یا اس قابلیت سے یہ لوگ کام نہ لیتے تھے کہ اس سے بھی ایک اہم کام ان کے پیش نظر تھا۔

ان لوگوں کے چہرے زرد تھے۔ پھٹے حالوں میں رہتے تھے۔ خشوع و تواضع کے خوگر تھے۔ مگر مزاج میں خودداری تھی۔ حتیٰ کہ اس خودداری کے باعث کھانے پینے تک کے لئے کسی سے ذلت سوال برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور باایں ہمہ فقر و فاقہ اپنے ہی عالم میں مگن رہتے تھے۔

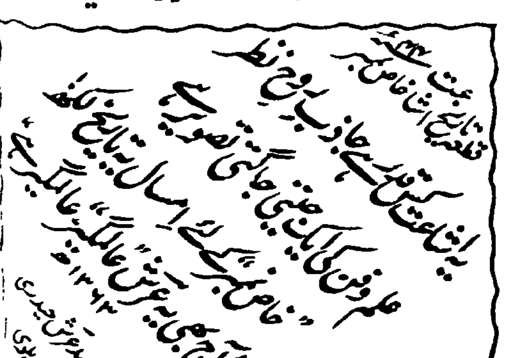
اصحاب صفہ کی چند اور خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) اصحاب صفہ صبح و شام جناب الٰہی سے مشغول رہتے تھے (۲) اصحاب صفہ کی مشغولی محض اخلاص پر مبنی تھی۔ ریا و شمعہ کا اس میں ذرا بھی دخل نہ تھا۔ (۳) اصحاب صفہ پر خدا نے احسان کیا تھا۔ اور وہ خدا کے شکر گزار بندے تھے۔ (۴) اصحاب صفہ ایماندار تھے۔ ان کی سلامتی کا وعدہ تھا۔ رحمت الٰہی کی بشارت دی گئی تھی۔ اور اعلان کر دیا گیا تھا کہ اگر کسی نے براہ جہالت بدکاری بھی کی ہو مگر توبہ کر کے عملاً اپنی اصلاح کر لی ہو تو اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ اور خدا اس پر رحم کرے گا۔ (۵) اصحاب صفہ کی ناتوانی و کمزوری و فقر و فاقہ و غربت و خانہ بدوشی کے باعث جو نام نہاد شرفائے کفار ان کو ذلیل سمجھتے تھے اور اسلام کے قریب آنے کے لئے ان کو دُور و دفع کرنے کی شرط کرتے تھے تو یہ شناخت خدا کی نظر میں اصحاب صفہ کی توقیر کا موجب تھی اور اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی تھی کہ شریف کافروں "کے مسلمان ہونے کی توقع میں ضعیف مسلمانوں کی دلشکستگی ہرگز مناسب نہیں۔ کہ اسلام کی خاص تعلیم اصول مساوات ہے جو مسلمان ہیں وہ سب برابر ہیں۔ ان میں فرق مراتب محض تقویٰ کی زیادتی و کمی پر منحصر ہے۔ اور جو مسلمان نہیں ہیں گو عرفی شرافت کے مدعی ہیں ان پر ضعیف سے ضعیف۔ کم مایہ سے کم مایہ مسلمان امتیاز ترجیحی رکھتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ اصحاب صُفّہ کی تعداد تقریباً چار سو تھی۔ مگر ائمہ رواۃ نے ان میں سے فقط چند بزرگوں کے نام لئے ہیں۔ (۱) حضرت عمار بن یاسر (۲) حضرت صہیب (۳) حضرت خباب (۴) حضرت سلمان فارسی (۵) حضرت بلال حبشی (۶) حضرت عرباض بن ساریہ السلمی (۷) حضرت ابن اُم معبد رضی اللہ عنہم اجمعین۔

جو لوگ اپنے آپ کو اصحاب صُفّہ سے منسوب کرتے ہیں۔ اُن کو غور کرنا چاہیئے کہ صحت انتساب کے لئے کیا اصحاب صفہ کی سعی فی سبیل اللہ، احصار نفس، اعلاء کلمہ اسلام، اخلاص و ایمان، خودداری و خود انکاری کے اوصاف ان میں بھی موجود ہیں۔ اور وہ بھی آج کل اصحاب صفہ ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں؟

اصحاب صفہ میں سے جن بزرگوں کے نام کتب اسماء الرجال میں ملتے ہیں کیا ظاہر شرع کے علاوہ کسی اور چیز پر بھی ان کا عمل تھا؟ کیا عام عبادات کے سوا کچھ اور بھی اذکار و اوراد و اشغال ان کے معمولات میں معدود تھے۔ کیا وہ محض اس لئے ہر کام سے منقطع نہیں ہو گئے تھے کہ جو کام امور دنیویہ سے کہیں زیادہ مقدم ہیں اور اسلام کے مہات احکام میں انھیں سب پر ترجیح تقدم ہے۔ ان کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتے رہیں اور تیار ہوتے رہیں۔ اگر اصحاب صُفّہ ماورائے شریعت اسلامیہ کے کسی دوسری طریقت کے سالک تھے تو کیا براہ مہربانی کوئی صاحب اس کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟



کشتیِ نوح

یہ سیکھا دستِ وحشت نے جنونِ فتنہ ساماں سے
مدد ملتی قفس میں اور کیا جذبِ فراواں سے
یہ مانا میں لئے بڑھ کر دین و ایماں ہیں دل و جاں سے
جنوں کس کس جگہ لے جائے کیا اس کی خبر مجھ کو
نکلنے کا جو موقع بھی ملے تو کیوں نکلنے دیں
یہ شرطِ رحمتِ حق بھی ہے اپنے پھول پینے میں
جنوں میں احترامِ جوشِ سودا اور کیا ہوتا
ہماری خانہ بربادی بھی تھی اک جزوِ رنگینی
یہ مانا خاک اڑانے میں مجھے راحت نہیں ملتی
ضرورت ہے کہ تم مجھ سے ملو تم سے ملوں میں بھی
کھٹکتے تھے جو کانٹے راہ چلتوں کی نگاہوں میں
جراحت کے مزے مجھکو مکرر ملنے والے ہیں
یہ کہہ کر جانے جاتے فاتحہ پڑھنے کو وہ پلٹا
خلش کیسی خلش کا دھیان بھی آنے نہیں پایا
دمِ جوشِ جنوں کچھ اس طرح معلوم ہوتا ہے
خدا جانے کہ دل پر کیا مصیبت ایسی آئی ہے
تماشا یہ نیا دیکھا تری کافر ادائی کا
بہارِ عمر کا تو اب زمانہ ختم ہوتا ہے
علاجِ عشق پر کیا چارہ سازوں کو توجہ ہو
جگہ پہلو میں دیتے وقت یہ میں کیا سمجھا تھا
دمِ وحشت بھی تھی اپنی طبیعت میں جو رنگینی
ابھی شرحِ وفا کو لفظ و معنی کی ضرورت ہے
مصائب جھیل کر دنیا کے پہنچے کنجِ مرقد تک
مجھے اپنے علاوہ اب نظر آتا نہیں کچھ بھی
وہ اس کے واسطے بیکار کیوں زحمت اٹھاتے ہیں
کفن بھی دوش پر حسرت بھی دل میں جان دینے کی
مرے آگے ٹھہرتا تھیں یہ کیا اس کی ہمت تھی

رنگِ قدیم

حضرت نوح ناروی

نکلنا آستیں سے اور اُلجھ پڑنا گریباں سے
نشیمن کو یہاں تک کھینچ لایا میں گلستاں سے
مگر ہے عشق کا رتبہ زیادہ دین و ایماں سے
خدا کا نام لے کر اب نکلتا ہوں بیاباں سے
ہمارے دل کی رونق ہے ہمارے دل کے ارماں سے
وہ برسے میکدے پر ابر جو اُٹھے گلستاں سے
بگولے مجھ کو لینے شہر سے آئے بیاباں سے
کہ فصلِ گل میں نکلے ہوئے گل ہو کر گلستاں سے
مگر وہ کیا کرے جس کو محبت ہو بیاباں سے
ملے موقع تو ملنا چاہیئے انساں کو انساں سے
مرے تلوؤں میں چبھ کر وہ نکل آئے بیاباں سے
وہ چٹکی ڈوب کر نکلی کسی کی پھر نمکداں سے
کوئی آواز دیتا ہے مجھے گورِ غریباں سے
دلِ مجروح اپنا کھیلتا ہے ان کے پیکاں سے
کہ جیسے جھانکتے ہوں وہ مجھے چاکِ گریباں سے
نکلتے ہیں جو آنسو وہ نکلتے ہیں پریشاں سے
مسلماں کیا کہ اس کو لاگ ہے لفظِ مسلماں سے
قفس میں چند کلیاں میں لئے جاؤں گلستاں سے
یہ ہے وہ درد جو کچھ اور بڑھ جاتا ہے درماں سے
نہ پیکاں دل سے چھوٹے گا نہ دل چھوٹے گا پیکاں سے
گلستاں کا سبق پڑھتے ہوئے نکلے گلستاں سے
سناؤں گا میں یہ قصہ کسی دلچسپ عنواں سے
پھنسے ہم دوسرے زنداں میں چھوٹے ایک زنداں سے
کہاں پہنچا نکل کر میں حدودِ کفر و ایماں سے
تہِ مدفن مجھے کیا فائدہ ہوگا چراغاں سے
چلے ہم قتل گاہِ ناز کو اس ساز و ساماں سے
جو میں پہنچا بیاباں میں تو وہ نکلا بیاباں سے

خدا جب ناخدا ٹھہرا تو فکرِ ناخدائی کیا
جنابِ نوحؔ کی کشتی نکل جائے گی طوفاں سے

"کمال کرتی ہو"

نفسیاتی افسانہ

جناب سیّد احسان علی شاہ بی۔ اے (آنرز)

یہ ننھی کی کچھ ہوتی سوتی بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔ ویسی ہی ڈھیٹ اور ضدی۔ ذرا ذرا سی بات پر اتنی ضد کرتی ہے۔ آنار وتی ہے کہ اللہ توبہ۔ آج صبح سے نہ جانے کیا ہو گیا تھا اسے۔ جو روں روں لگائی ہے تو دوپہر ہونے کو آ گئی۔ دس گیارہ مہینے کی اس کھیچی نے گھر بھر کو نگنی کا ناچ نچا دیا۔ ابا میاں نے پچکارا۔ اماں نے لوریاں سنائیں میں نے دودھ ٹھسوایا۔ سبھی جتن کر دیکھے لیکن اس بندریا کی چیخ پکار بند ہونے میں نہ آئی۔ میں بھی آخر آدمی تھی۔ کوئی لوہے کی مشین تو تھی نہیں کہ نہ تھکتی۔ میرا بند بند ٹوٹنے لگا اور اتنا غصہ آیا مجھے کہ میں نے اس کے گال پر زور سے ایک چٹکی لی۔ نرم نرم روئی کے گالے۔ ایسی گال تو تھی۔ چٹکی لیتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ خون اُبل پڑے گا۔ گال انگارے کی طرح سُرخ ہو گئی۔ لیکن میرا غصہ اس پر بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ دو تین کراری قسم کی چپتیں جو رسید کیں میں نے تو یہ بلا بلبلا اٹھی۔ پہلے تو نری روں روں ہی تھی۔ اب اتنے زور سے رونے لگی کہ گھر بھر کو سر پر اٹھا لیا۔ زور سے رونے کی وجہ سے گلے میں ہوئی خراش اور آنسو شروع۔ آنسو اٹک گئے حلق میں۔ اور یونہی غوطہ سا آ گیا۔

لیجئے اتنی سی بات کہ قیامت آ گئی۔ ادہر اماں نے "ہے ہے کیوں مارتی ہو اتنا ۔۔۔؟" کا نعرہ لگایا۔ اور ادھر ابا میاں گھبراہٹ میں جو اُٹھے تو حقہ اُلٹ گیا۔ تمام انگارے قالین پر بکھر گئے۔ اور حقے کا بدبودار پانی غرغراتا ہوا بہنے لگا۔ لیکن ابا میاں نے حقے کے اس احتجاج پر دھیان نہ دیا۔ لپکے ہوئے میری طرف آئے اور گرج کر بولے ۔۔ "بھئی کمال کرتی ہو ۔۔۔ بچوں کو اتنا مارا کرتے ہیں۔۔ کچھ تو صبر ہونا چاہیئے آدمی میں!"

اور میرے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دیکھتے نہیں، صبح سے رو رو کر میرا جینا اجیرن کر رکھا ہے ان کی لاڈلی نے اور اُلٹے میرے ہی سر آتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے سارے جسم کا خون مرکوز ہو کر دماغ پر چڑھ گیا ہے۔ مجھے اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ ابا میاں نے کس وقت اس چڑیل کو میری گود سے لیا کہ باہر سے آواز آئی۔ "ہائے ہائے!" اماں کہہ رہی تھیں۔ "قالین نامراد کا ستیاناس ہو گیا۔ نہ جانے یہ حقے کو کب آگ لگے گی۔"

لیکن ابا نے اماں کی بات پر دھیان دیئے بغیر مجھے ہی مخاطب کیا۔ "بھئی عصمت ۔۔۔! ہمیں اچھی نہیں لگتی یہ پیٹا پائی۔ خدا نے ہمیں پھول سی لڑکی دی ہے ۔۔۔۔ بھئی ایسا ظلم کرنا ہو تو وہیں اپنے گھر کیا کرو۔ ہم سے نہیں دیکھی جاتیں تمہاری یہ باتیں!"

اور جیسے دیوانے کو کسی نے انگلی دکھا دی۔ اب میں اتنی ہی بُری ہو گئی تھی کہ ماں باپ بھی اپنے گھر میں رکھنا پسند نہیں کرتے تھے وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میں ان سے دور ہی رہوں۔ تو پھر بہت اچھا، میں ابھی جاتی ہوں۔ اور میں نے فوراً کپڑے اکٹھا کرنے شروع کر دیئے اور اس طرح شروع کئے کہ گھر بھر میں بھونچال آ گیا۔ ابا کا بستر جو چارپائی پر سے اُچھلا ہے تو زمین سے اُدھر رکا ہی نہیں۔ اور الگنی پر ٹنگے ہوئے اماں کے کپڑے جو اُچھلے ہیں تو کوئی فرش پر کوئی میز پر کوئی الماری پر کوئی طاقچے میں کوئی کواڑ پر۔ غرض ایک ہیجان برپا ہو گیا گھر میں۔ اماں باہر قالین صاف کر رہی تھیں اور ابا میاں اس ننھی کی بچی کو کندھے سے لگائے خرخراتی ہوئی آواز میں "اللہ۔ اللہ ۔۔۔!" کہہ کر اسے سُلا رہے تھے۔ لہٰذا میری کسی حرکت پر حرف زنی نہیں کی گئی۔

میں نے کپڑوں کی پوٹ باندھی۔ برقعہ سر پر لیا اور جل کر جھپٹ کر ننھی کو نیم خوابی کی حالت میں ابا میاں کی گود سے لے لیا۔ ابا میاں حیران میری طرف تکتے ہی رہ گئے۔ اماں سوچتی ہی رہ گئیں اور میں روندھے ہوئے گلے سے "سلام علیکم" کہہ کر کھٹا کھٹ سیڑھیاں اُترنے لگی۔

"کمال کرتی ہے یہ لڑکی ۔۔۔!" ابا کی آواز سنائی دی ۔۔ "اے بی نے کہا عصمت ۔۔۔!" لیکن میں دروازہ پھلانگ گلی میں سے ہوتی ہوئی سیدھی گھر کی طرف ہو لی۔

میرا سسرال مائیکے سے کچھ ایسا دور نہیں۔ لیکن یا تو غصے

کی وجہ سے یا نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ چھوٹی سی مختصر سڑک ختم ہونے میں آتی ہی نہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ "اونہہ کمال کرتی ہوں ہر بات میں کمال ــــ میں ہی تو کرتی ہوں۔ یہ بیچارے بھولے بھالے تو سبھی مظلوم ہیں۔ کسی کے منہ میں زبان نہیں۔" اور نہ جانے کیا انٹ سنٹ خیالات آئے ہیں میرے دماغ میں ــــ اور اسی طرح غصے میں پیچ و تاب کھاتی ہیں گھر پہنچ گئی۔

گھر پہنچی تو پارہ اور تیز ہو گیا۔ ابھی کل ان کے کمرے کو پتلی کی طرح صاف ستھرا کر کے گئی تھی۔ جھاڑو دی۔ چیزیں ٹھکانے پر رکھیں سبھی کچھ ٹھیک تھا۔ اب آ کر دیکھتی ہوں تو بھوت ناچ رہے ہوں۔ بستر میں سے نکلے تو اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ لحاف ٹھیک کر لیں۔ اور نہا اور شیو کرنے کے بعد سامان بھی وہیں کا وہیں پڑا تھا۔ ایک تو بلیڈ ملتے نہیں اور یہ نواب صاحب بلیڈ پانی ہی میں ڈال کر چل دیئے تھے۔ لحاف پر میلا جیکٹ پاجامہ پڑا تھا۔ تولیہ فرش پر گیلا پڑا ہوا تھا۔ اور صابن دانی تکیہ پر رکھی ہوئی تھی۔ کنگھی کتابوں کی میز پر تھی اور تیل والی شیشی کپڑوں کی الماری میں پڑی تھی۔ چپل کا ایک پاؤں پلنگ کے نیچے اور دوسرا شاید بلی کو مارا ہوگا اندر کی کوٹھری میں اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے میرے کرنے کے کتنے کام تھے اس لئے سوچا کہ ننھی کو جا کر اس کی دادی کو دوں اور خود آؤں نیچے یہ کباڑ ٹھیک کرنے۔ نصیب ــــ کیا کرتی۔ اوپر گئی تو ننھی کی دادی اماں پہلے ہی سے منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

"تم بھی کمال کرتی ہو بہو۔ جو کل سے گئیں تو رسید ہی نہیں۔"

اور یہ "کمال کرتی ہو" سن کر میرے تو جسم میں آگ لگ گئی۔ سچ کہتی ہوں۔ انھیں تو خیر کیا جواب دیتی۔ اندر ہی اندر پیچ و بل کھا کر نیچے اتر آئی۔ ننھی کو کھلونے دے کر ایک طرف بٹھایا۔ جھاڑ و بکری اور کوئی آدھ پون گھنٹہ بقول ان کے کمرے کی مالش کرتی رہی۔ پھر نصیبوں کو کوستی اور ابا اماں کو گالیاں دیتی۔ اوپر پہنچی۔ اب ان نواب صاحب کا دفتر سے آنے کا وقت تھا۔ اور میری صورت دیکھتے ہی ساس صاحبہ کو تو جیسے ہر طرح سے فراغت ہو جاتی ہے۔ حقہ لیا اور ہو بیٹھیں ایک طرف کونے میں دھوئیں کے بادل چھوڑنے۔ باورچی خانے میں قدم رکھا ہی تھا کہ وہ آ گئے اور آتے ہی بولے۔

"تم بھی کمال کرتی ہو ــــ"

"کیوں کیا ہوا ہے؟" میں جل ہی تو گئی۔ آخر ان لوگوں نے یہ "کمال کرتی ہو" میرا نام رکھ لیا ہے کیا کہ جو آتا ہے یہی کہتا ہے۔

"مجھے خواہ مخواہ وہاں جانا پڑا۔"

"اور لگا لیجئے مہندی۔"

"اور ابا میاں ناراض ہو رہے تھے کہ غضب منہ زور ہو گئی ہو۔"

"ابا میاں کو اللہ دیں ایسی باتیں۔" میں نے کہا اور میری آواز گھگھیا گئی۔ آخر دنیا میں ان کے سوا میرا اور ہمدرد بھی کون تھا۔ "خواہ مخواہ کو میرے سر آتے ہیں۔ یہ ننھی نے سارا عذاب ڈال رکھا ہے نہ جانے کیا اسے جلدی پڑ گئی تھی اس دنیا میں آنے کی۔ کچھ دن اور ٹھہر کر آ جاتی تو نہ جانے اللہ میاں کے گھر سے کیا کم ہو جاتا۔ کیا معلوم میں نے کیا بگاڑ دیا ہے ابا میاں کا۔ جب دیکھو اٹھتے بیٹھتے میرے ہی پیچھے ــــ"

"میں نے کہا ــــ" نیچے سے اُن کی آواز سنائی دی۔ اور میں ایکدم خاموش ہو کر باہر دیکھنے لگی۔ تو گویا میری اس بات کو سننا بھی گوارا نہیں تھا۔ میں بھونک رہی تھی ان کے خیال کے مطابق کہ یہ چپکے سے نیچے اُتر گئے۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد انھوں نے پکارا۔

"میں نے کہا ــــ وہ کیا نام ہے تمہارا عصمت ــــ وہ ہمارا پائجامہ کہاں ہے بھئی۔"

مجھے غصہ تو تھا ہی بھنا کر بولی ــــ "میں کیا جانوں؟ ــــ مجھے دے گئے تھے آپ جو مجھ سے پوچھتے ہیں۔"

"یہ بھی ایک ہی رہی۔" انھوں نے دھیمی آواز میں کہا۔ اور پھر چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے۔ میں آگ جلانے لگی۔

پھر سیڑھیوں کے قریب سے آواز آئی۔ "میں نے کہا ــــ وہ کیا نام ہے ــــ بستر پر رکھا تھا شاید ــــ!"

میں چپ رہی۔ ایسے فضول سوال کا جواب دینا ہی سراسر فضول تھا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ خود ہی اوپر چلے آئے

"بھئی ــــ وہ بستر پر رکھا تھا۔ ملتا نہیں ہے پائجامہ ہمارا" ایسی لجاجت سے بولے کہ میرا غصہ رفو چکر۔

"اتنا میلا چکٹ ہو رہا تھا ــــ دھو دیا میں نے۔"

"کمال کرتی ہو تم!"

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور جھنک کر بولی۔

"یہ آپ لوگوں نے میرا مذاق بنا رکھا ہے کیا؟ ــــ ہر بات میں کمال کرتی ہو تم ــــ کمال کرتی ہو تم ــــ آخر انسان کو خود بھی خیال ہونا چاہیئے۔ میں نے کیا بگاڑا ہے آپ لوگوں کا؟"

اور میری آنکھوں سے آنسو نہیں ٹپکنے نہ نکلے۔

"کمال کرتی ہو تم" انھوں نے بالکل معصومیت سے کہا۔ "خواہ مخواہ گرم ہونے کی کیا بات ہے۔"

"گرم — ہونے کی —" اور مجھ سے کچھ بھی تو نہیں کہا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری زندگی آنکھوں کے رستے بہ جائے گی۔

لیکن انھیں ذرا بھی تو خیال نہیں آیا۔ بولے۔ "ہوں — ابھی پارہ گرم ہے۔"

یہ کہا — نیچے اُترے اور غایب۔

ان کے چلے جانے کے بعد ساس دلاسا دینے آئیں۔ لیکن بدنصیبی میری ہی کہیئے انھوں نے بھی اپنی الفاظ میں تسلّی دی — "ارے واہ، بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو رہی ہو خواہ مخواہ — کمال کرتی ہو تم بھی — چلو چپ ہو جاؤ — میری اچھی۔"

"ہائے ہائے —" میں نے چلا کر کہا۔ "کہاں نکل جاؤں میرے اللہ — !"

اور اُٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ ساس حیران تو ہوئیں لیکن کہتی کیا۔ پھر حقے کے قریب جا بیٹھیں اور اتنے زور زور سے کش لینے لگیں کہ چھت کانپ اُٹھی۔

خیر شام ہوئی۔ اب میں جل بھن تو رہی تھی۔ جیسا کچھ ہو سکا پکا کے ان کے سامنے رکھ دیا۔ انھوں نے پہلا نوالہ مُنہ میں ڈالا ہی تھا کہ بولے — "ارے رے — بھئی کمال کرتی ہو عصمت! — اتنا نمک۔"

اب تو بات حد سے بڑھ چکی تھی۔ میں نے اپنے غصّہ کی آندھی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بظاہر اطمینان سے کہا۔

"آپ کو کچھ شرم بھی آتی ہے؟"

ایکا ایکی یہ سخت فقرہ سن کر وہ چونک اُٹھے اور پاس کھیلتی ہوئی ننھی کو ڈانٹ کر بولے۔

"اسے روٹی مت کھا، بیمیا کہیں کی۔ پھر رات بھر چلّائے گی۔"

ننھی نے آؤں آؤں کر کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ چلائے اور ہنسنے لگی۔ گویا چڑا رہی ہو۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

"کمال کرتی ہو بیں — کیا کہوں تم سے۔" انھوں نے ایک لقمہ اور بناتے ہوئے کہا۔ میں واضح طور پر دیکھ رہی تھی کہ ان کے ہاتھ غصّے کی شدت سے کانپ رہے تھے۔ اس لئے خاموش رہنا مناسب سمجھا اور انھوں نے جس طرح ہو سکا آٹھ نو لقمے زہر مار کئے۔

رات کے وقت وہ معمول سے بہت پہلے بستر پر لیٹ گئے۔ اور آنکھیں بند کر کے سوتے بن گئے۔ لیکن میں تو آج اس "کمال کرتی ہو" کا فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے ذرا ڈھیل دی اور ظاہر کیا کہ میں اسے برداشت کر رہی ہوں تو میرا نام ہی ایک نہ ایک دن "کمال کرتی ہو" پڑ جائے گا۔ اس لئے میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ ان کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

"میں نے کہا — سو گئے آپ؟"

اور انھوں نے اوں کر کے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ لیکن میں اس طرح ہار مان جاتی تو لوگوں کا دماغ خراب تھا جو مجھے حوّا کی بیٹی کہتے آدم کی بیٹی کہنے میں کیا تکلیف ہوتی تھی انھیں — میں نے کھٹ سے ان کی پسلیوں میں انگلیاں کھبو دیں اور گُدگُدی کرنے لگی۔ انھوں نے میری طرف پلٹ کر جھپکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور بولے۔

"کیا بات ہے — خواہ مخواہ — سونے بھی دو اب۔"

"میری بات سنئے — !"

"بھئی واہ! — وہ ذرا ترشی سے بولے۔ "کمال کرتی ہو۔"

اور میں نے مصنوعی ہنسی ہنس کر کہا — "کمال کرتی ہو — ! یہ آپ نے کہاں سے سیکھ لیا ہے آج؟"

"صبح بتاؤں گا۔" انھوں نے کہا۔

"نہیں، میں تو ابھی پوچھ کے رہوں گی۔"

"حد ہے — اب سونے بھی دو۔" وہ ذرا جھلائے اور میں نے پھر گُدگُدی کی —

"کمال کرتی ہو تم۔" انھوں نے کڑک کر کہا۔ "تمام دن دفتر میں چکّی پیسو اور رات کو انھیں آرام نہیں۔"

یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں یہ ڈانٹ کھا کر ہار گئی۔ نہیں — میں روٹھ گئی۔ اور یہ دل میں عہد کر کے اپنے بستر پر لیٹ گئی کہ اب تمام عمر ان سے نہیں بولوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

بستر پر لیٹتے ہی دماغ میں خیالات نے ہجوم کیا۔ ابّا میاں — اماں — ساس — اور یہ بھی — کمال کرتی ہو — میرا نام ہے کیا ان لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ چلو بھر پانی میں ڈوب نہیں مرتے یہ لوگ، پرسوں ترسوں میں نے کہا کہ آٹا لا دیجئے بازار سے تو بولے کمال کرتی ہو۔ آٹے میں کیا کمال کی بات ہے — بے غیرت کہیں کا۔ مہینے میں پچاس ساٹھ روپے کا سودا لیا جاتا ہے۔ تجھ سے بے حیا کہیں کے۔ دو سیر آٹا نہیں دے سکتا اُدھار — ! آخری تاریخوں میں — یہ دکاندار بنے پھر رہے ہیں کمینے، بدمعاش — !

اور میں دفعتہً چونک پڑی۔ کمال کرتی ہو پر سوچتے سوچتے دماغ کس طرف منتقل ہو گیا۔ بیٹے غریب کی شامت مفت میں آ گئی۔ بھلا اس نے کیا قصور کیا تھا ——— کمال کرتی ہو ——— ان لوگوں نے میری جان لینے کی ٹھانی ہے۔ ان سب نے مل جل کے ——— بے شرم ——— بے رحم قصائی ہزار دفعہ کہا کہ اس سے گوشت نہ خریدا کیجئے۔ آدمی ہڈی دیتا ہے وہ بے ایمان ——— کمال کرتی ہو ——— اگر ایک دفعہ کہا تو منہ نوچ لونگی۔ توبہ، کوئی کھرونچ ماری ہے اس نے نازک نازک گال میں ——— اس بیچاری کی گال میں اتنے زور سے چٹکی لی ——— لال انگارہ ہو گئی معصوم کی گال ———!

اور میں نے اٹھ کر پاس سوئی ہوئی ننھی کی گال دیکھی۔ اب تو وہاں نشان بھی نہ تھا۔ لیکن ننھی کچھ اس انداز سے سوئی تھی کہ میری ساری کائنات پیار بن گئی۔ اور میں نے جھک کر اس کی گلابی سی گال چوم لی۔

"کمال کرتی ہوں میں بھی" دفعتہً میرے ذہن میں آیا۔ اور میں خود ہی چونک پڑی۔ "اب کوئی کہے تو ایسی خبر لوں کہ یاد کریں گے۔ بڑے آئے وہاں سے ———"

اور نہ جانے کیا کیا۔ میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن ابھی آنکھ جھپکی ہی تھی کہ آواز سنائی دی "کمال کرتی ہو" اور میری آنکھیں تڑاق سے کھل گئیں۔ میں نے گھوم کر دیکھا وہ سو رہے تھے۔ ننھی سو رہی تھی۔ لیکن "کمال کرتی ہو تم" کے نعرے جیسے در و دیوار سے پھوٹ رہے تھے۔ کمرے میں رکھی ہوئی ہر چیز جیسے پکار پکار کر کہہ رہی ہو "کمال کرتی ہو ——— کمال کرتی ہو ———" پہلے یہ آوازیں دھیمی تھیں۔ جیسے کوئی چھپ چھپ کر کہہ رہا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ بلند ہونے لگیں۔ اور بلند، اور بھی۔ یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ساری کائنات مل کر چلّانے لگی ہے "کمال کرتی ہو ———" ان تین لفظوں کا شور ——— اف میرے خدا میری سماعت پاش پاش ہوئی جا رہی تھی ——— میرے کان پھٹے جاتے تھے ——— میرے دماغ کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر دیوار سے ٹکریں ماروں۔ اپنے ہاتھوں اپنا گلا دبا دوں لیکن ان بے رحم آوازوں کے شور نے شاید میرے دماغ کے ہر رگ و ریشے میں اپنے ظالمانہ پنجے اس بیدردی سے گاڑ دیئے تھے کہ میری قوتِ عمل سلب ہو گئی۔ اور پھر ایک دفعہ ——— پھر میری آنکھیں کھٹ سے کھل گئیں۔ اور تمام آوازیں یکلخت ایک ہمہ گیر خاموشی میں ڈوب گئیں۔ اور ایک جھینگر کسی درز میں پھنسا تیز آواز سے نہ جانے گا رہا تھا یا رو رہا تھا۔ صرف ایک ہی آواز تھی جو اس تاریک خاموشی میں لہریں سی پیدا کر رہی تھی۔

میں نے ننھی کو زور سے اپنے دھڑکتے ہوئے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ میرا سانس اس تیزی سے چل رہا تھا کہ خدا کی پناہ۔ اس رات تقریباً تمام رات مجھے نیند نہیں آئی۔ مجھے یاد ہے۔ قریب کی مسجد والے مولانا کی اذان کی آواز میٹھی لوری کی طرح میرے کان میں آئی تھی ——— اور الصلوٰۃ خیرٌ من النوم کے الفاظ نے مجھ پر ایک لذیذ نیند طاری کر دی تھی۔

لیکن ابھی شاید آنکھ لگی تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی جھنجوڑ رہا ہے۔ اور میری نیند پھر ٹوٹ گئی۔ میں نے دیکھا، یہ کپڑے پہن کر دفتر جانے کو تیار کھڑے ہیں۔ اور میری ساس سے کہہ رہے ہیں "ڈاکٹر کی طرف ضرور بھیج دیجئے گا۔ بخار کافی تیز معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ تو سر کے ساتھ جیسے کئی سو من کا پتھر بندھا ہو۔ مجھے فوراً محسوس ہوا میرے جسم سے حرارت کے شعلے نکل رہے ہیں۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو انھوں نے کہا۔

"کمال کرتی ہو ——— اتنا بخار ہے اور پھر بھی وہی ہٹ دھرمی۔"

اور میں نے زور سے اپنا سر تکیے میں دے مارا ——— ہائے میرے اللہ اور سامنے تنے ہوئے مکڑی کے جالے میں ایک مکھی بھنبھنانے لگی۔

وہ دفتر چلے گئے اور میں لیٹ گئی۔ خدا جانے میرا دماغ کہاں کہاں گھومتا رہا۔ لیکن ہر خیال کا مرکزی نقطہ وہی "کمال کرتی ہو" کے لفظ رہے اور یہی لفظ میرے رگ و ریشے میں خوفناک غصے کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ آخر کوئی تین بجے کے قریب ڈیوڑھی پر سے کھنکارنے کی آواز سنائی دی ظاہر تھا ابا میاں میری خیر صلاّ پوچھنے آئے تھے۔

ابا میاں آئے تو ان کے چہرے پر نام کو بھی ملال نہ تھا۔ گویا میں نے کل کوئی ایسی بات نہ کی تھی۔ جس سے انھیں دکھ پہنچا ہو۔ انھوں نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ نبض دیکھی اور کہا۔

"بخار کیوں آ گیا۔ کل تو تم اچھی بھلی تھیں؟"

"رات بھی اچھی بھلی سوئی ہے ———" میری ساس نے کہا۔ "نہ جانے دشمنوں کو کیا ہو گیا۔ رات ہی رات میں۔ صبح تو بھٹی کی طرح جل رہی تھی"

"تو تھوڑی سی کونین کھالی ہوتی ——— موسمی بخار ایسے ہی ہوتے ہیں ان کے آنے کا تو پتہ بھی نہیں چلتا۔"

"لیکن یہ کونین کے نام سے تو بھاگتی ہے ——— میں تو کئی بار کہہ چکی ہوں صبح سے ———!"

"کمال کرتی ہو تم بھی عصمت! ——— ہر بات ———"

وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے کہ میں نے ایکدم لحاف چہرے پر سے ہٹا دیا۔ اور چیخ کر بولی۔

"آپ لوگوں نے مجھے مار دینے کی ٹھانی ہے کیا ــــ یہ کیا گھر میں تو باہر تو ــــ کمال کرتی ہو ــــ کمال کرتی ہو ــــ کیا جرم کیا ہے میں نے جس کی یہ سزا دی جا رہی ہے۔"

اور نہ جانے کیا کیا اول فول جو منہ میں آیا میں نے بک دیا۔ اُف میرے اللہ ــــــ ابا میاں کا کتنا حوصلہ تھا اگر میں ان کی جگہ ہوتی تو مہابھارت ہو جانا معمولی بات تھی۔ ساس نے مجھے ٹوکا۔ ابا میاں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن میرا جوش جنون کی حدوں تک پہنچ چکا تھا۔ اور میں نے بغیر کچھ سوچے، بغیر کچھ سمجھے اپنے دل کے بخار کو خوب خوب نکالا۔ اتنا زور زور سے چلائی کہ میرا سانس اکھڑ گیا۔ اور میں اس طرح ہانپ گئی جس طرح بہت اونچی پہاڑی پر سرپٹ بھاگ کر چڑھی ہوں۔

اتنی تھک گئی تھی کہ میرا سر خود بخود جھک کر تکیے پر لگ گیا میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ میں سب کچھ سن رہی تھی لیکن جواب دینے یا کسی عضو کو جنبش دینے کی ہمت مجھ میں باقی نہ تھی ــــ ساس کہہ رہی تھیں۔

"نہ جانے کیا ہو گیا ہے اسے ــــ پہلے تو ایسا نہیں کرتی تھی۔"

"بچہ ہی تو ہے ابھی۔" ابا میاں کی قدرے لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آنسوؤں کو پی جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "خود بخود سمجھ آ جائے گی آہستہ آہستہ۔"

اور پھر وہ چپ ہو گئے۔ غصہ جتنی تیزی سے آتا ہے اس کا ردعمل بھی اسی تیزی اور اسی شدت سے ہوتا ہے۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے۔ اس وقت بھی میری حالت یہی ہوئی۔ ایک دفعہ غصے کے بخارات نکل گئے تو اس کا ردعمل تاسف کی صورت میں فوراً ہی شروع ہوا اور میں نے دل ہی دل میں اس غصہ کا تجزیہ شروع کیا۔ "کمال کرتی ہو" پھر میرے شعور پر کود پڑا۔ لیکن اس میں بات کیا تھی جس کی وجہ سے میں اتنا آپے سے باہر ہو گئی۔ میں ان تمام مختلف واقعات کو سوچ رہی تھی اور اس نتیجہ پر پہنچا چاہتی تھی کہ اگر میں بھی ان واقعات سے دوچار ہوتی تو یقیناً یہی الفاظ استعمال کرتی کہ ابا میاں کی آواز سنائی دی۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں ــــ اس کی باتوں کا بُرا نہ مانیے گا آپ ابھی بچہ ہے ــــ اور نہ جانے بخار میں ــــ"

ابا میاں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔ انھوں نے آہستہ سے میرے چہرے پر سے لحاف ہٹایا۔ میں نے مشکل سے آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا ــــ ابا میاں کی وہ آنکھیں ــــ آنسوؤں سے تر ہو رہی تھیں۔ شاید ان کے نتھنے پھول گئے تھے۔ اور ان کے ہونٹوں میں لرزش سی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے ابا میاں کو دیکھ کر ــــ ہاں مجھے بھی رونا ہی تو آ گیا اور میں نے جلدی سے منہ دوسری طرف موڑ کر چہرہ تکئے کی نرم نرم گہرائیوں میں گاڑ دیا اور رونا جو شروع کیا ہے تو میری گھگھی بندھ گئی ابا میاں نے پیار سے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کھوکھلی ہنسی ہنس کر جس میں رونی آواز غالب تھی۔ بولے "کمال کرتی ہو۔" انھوں نے پھر کہا تھا لیکن اس دفعہ غصے کی بجائے مجھے ہنسی آ گئی

نقشِ سادہ

از:۔
حضرت عاصم جے پوری

اب تو وہ بیداد گر بھی آہ پر آمادہ ہے
ہائے کن مجبوریوں میں کوئی دُور افتادہ ہے

مرحبا ہر ہر قدم پر شوق کی وارفتگی
وائے وہ سجدہ جو رہنِ دامنِ سجادہ ہے

تم نہ سمجھو گے کہ تم کیا ہو، یہ مجھ پر چھوڑ دو
بادہ کیا جانے کہ آخر کیا سرورِ بادہ ہے

کچھ زیادہ چاہیئے رنگینیٔ شانِ جمال
جوہرِ آئینۂ ہستی ابھی تک سادہ ہے

پھر کسی کافر نے دل لے کر نگاہیں پھیر لیں
پھر وہی ہم ہیں وہی سر ہے وہی سجادہ ہے

حسن کہتے ہیں جسے وہ نغمۂ صورت پذیر
عشق کی نیرنگیوں کا ایک نقشِ سادہ ہے

مجھکو لے آئی محبت کس جگہ عاصم جہاں
جادہ بے منزل ہے منزل بے نیازِ جادہ ہے

حریفانِ بادہ پیمائی سے

نظم

از:- حضرت علی اختر حیدرآبادی

تم کو حق ہے مجھ حزیں پر جس قدر چاہو ہنسو
تم نے جن نظروں کے آگے پیش کی جنسِ ہنر
کھوٹ چاندی کو انھوں نے دیدیا سونے کا رنگ
اور جہاں قحطِ خریداری ہے ہے سونا بھی خاک
اس جگہ میرے خزانوں کو خذف سمجھا گیا
رازِ عبرت بن گیا میرے خیالوں کا جمال
تم نے اس محفل میں چھیڑا نغمۂ شعر و ادب
اور مجھے یہ فرض ایسی بزم میں سونپا گیا
خود شناسی کی طرف لیکن نہیں جاتے خیال

تم سراپا شادمانی، میں سراپا اضطراب
اللہ اللہ ان نگاہوں کا شعورِ انتخاب
سنگریزوں کو عطا کی موتیوں کی آب و تاب
مجھکو اُس بازار میں لایا ہے قسمت کا عتاب
اس جگہ کانٹوں سے بدتر ہو گئے میرے گلاب
ننگِ پیری بن گیا میرے ارادوں کا شباب
پختہ کاروں کی طرح "بچے" جہاں ہیں کامیاب
ہیں جہاں ہر چند نظریں محرمِ خوب و خراب
پیر ہوں پھر بھی یہاں بچوں میں ہے میرا حساب

کوئی شاعر موت جیتے جی جسے مطلوب ہو
اس سے یہ کہدو، دکن کی نام سے منسوب ہو
پھول کوئی بے نسیمِ حیثیت کھلتا نہیں
یاں دکن میں آدمی سے آدمی ملتا نہیں

نظام الملک طوسی کا سیاست نامہ

ناقدانہ نظر[1]

از مولینا مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی

نظام الملک طوسی وزیر ملک شاہ سلجوقی اور کاموں اور باتوں کے علاوہ دو حیثیت سے مشہور ہے۔ اوّل یہ کہ اس نے اپنے دورِ عروج میں بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا جس میں امام غزالی متعلم اور معلم رہے۔ اور دوسرے ہمارے مرشدِ روحانی حضرت سعدی شیرازی بھی اسی مدرسہ کے طالب علم تھے۔ دوسری بات یہ مشہور ہے۔ کہ نظام الملک حکیم عمر خیام اور حسن بن صباح کے ہم درس تھے۔ اس بارے میں اہلِ علم میں بہت قیل وقال ہے۔ ہماری زبان میں اس وزیر باتدبیر کی سب سے اچھی سوانح حیاتِ نظام الملک طوسی جناب مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری کی تالیف ہے۔ جو اس وقت بازار میں ملتی نہیں۔ دوبارہ خدا جانے کب شائع ہو۔

نظام الملک کا سیاست نامہ علمی اور فنی اعتبار سے مشہور کتاب ہے۔ اس کے بعض حصّے کالجوں میں پڑھائے جاتے رہے ہیں۔ اس کا ذکر کتاب نظام الملک میں موجود ہے۔ افسوس ہے کہ سطور ذیل لکھتے ہوئے یہ کتاب راقم کے سامنے نہیں ہے۔

سیاست نامہ کے ناقص نسخے یا اوراق نظر سے مدت ہوئی گزرے تھے! اب ایران کا مطبوعہ نسخہ راقم کے سامنے ہے۔ یہ نسخہ "مطبعہ خورشید" میں "کتابخانہ کاوہ وکتاب خانہ معرفت" کے سرمایہ سے چھپا ہے۔ جسے ایک ایرانی فاضل سید عبدالرحیم خلخالی نے مرتب کیا اور مفصل دیباچہ لکھا ہے۔ افسوس ہے۔ کہ اسماعیل کالج جوگیشری بمبئی کے نسخہ میں (جو اس وقت میرے سامنے ہے) دیباچہ کے صرف دو صفحہ موجود ہیں۔ باقی نہیں ہیں۔ نہ معلوم مرتب نے اس بارے میں کیا کچھ کہا ہے۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ایک سو چھیاسی صفحات پر تمام ہوئی ہے اور باریک ٹائپ میں چھپی ہے۔

اس کتاب کی ابتدا میں ایک دیباچہ ہے جس میں پچاس فصلوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ یہ دیباچہ نظام الملک کا نہیں۔ بلکہ اس شخص کا معلوم ہوتا ہے جسے نظام الملک نے ۴۸۵ھ میں بغداد کو جاتے ہوئے اپنا مسودہ سپرد کیا تھا۔ جس کا نام "محمد ناسخ" یا "محمد مغربی" تھا۔ دیباچہ نویس اپنے دیباچے میں کہتے ہیں۔ کہ اصل کتاب کی ۳۹ فصلیں تھیں۔ اور بعد میں ان پر پندرہ باب کا اور اضافہ کر دیا گیا تھا۔ گویا کل ۵۴ فصلیں تھیں۔ لیکن موجودہ کتاب میں پچاس فصلیں شامل ہیں۔ اور بعض فصلوں کے متعلق حاشیہ نگار کا خیال ہے۔ کہ وہ الگ فصل نہیں۔ بلکہ اپنی ماسبق فصل ہی کا حصہ ہیں۔ مثلاً اٹھائیسویں فصل جسے ایرانی مخطوطہ کی بنا پر الگ فصل قرار دیا گیا ہے۔ اور یورپین نسخہ میں علیحدہ نہیں سمجھا گیا۔ کتاب کا دیباچہ لکھنے والا (طابع وناشر نہیں) کہتا ہے کہ اسے اس کتاب کا مسودہ نظام الملک نے دیا تھا۔ اور کتاب کے خاتمہ پر نظام الملک کے قلم سے بھی اس کی تصدیق موجود ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر یہ کتاب ۴۸۵ھ میں "محمد ناسخ یا محمد مغربی" کو دی گئی۔ تو وہ کون ہے جس نے اسے ۹۲۰ھ میں تمام کیا اور اس کا نظام الملک یا محمد ناسخ یا محمد مغربی سے کیا تعلق ہے

کتاب کا خاتمہ اس عبارت پر ہوا ہے: "تم کتاب سیر الملوک بعون الملک المعبود فی نصف شہر محرم الحرام سنہ ۹۲۰ ہجرۃ النبویہ" اس تملم کا کیا مطلب؟ ہتمم کون اور اس کا اصل کتاب سے کیا تعلق ہے۔

نظام الملک کا زمانہ سلجوقیوں کے عہد حکومت کے شباب کا زمانہ تھا۔ اس وقت ایران میں شافعی مشرب کا غلبہ تھا۔ نظام الملک خود شافعی مذہب کا پیرو تھا۔ ہندوستان اسلام سے واقف ہو چکا تھا۔ اس ملک کے اندر احناف کا اور ساحلی علاقوں میں باطنیت اور شافعیت کا اثر تھا۔ وہ سیاسی جماعتیں جو اقلیت میں تھیں۔ مختلف لباسوں اور ناموں کے ساتھ ہر جگہ عالمِ اسلام میں اپنی خفیہ کارروائیوں میں مصروف تھیں۔ کسی کو حق نہیں کہ ان کی سیاسی سرگرمیوں کو برا کہے کہ دنیا کا ہمیشہ سے یہی آئین رہا ہے کہ طاقتور مطعون اور مغلوب مظلوم سمجھے جاتے ہیں۔ اور مغلوب طاقتیں ہمیشہ ان ہتھیاروں سے کام لیتی رہی ہیں۔ جن سے ان کا مطلب برآمد ہوتا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ طاقت ور ہو کر انھوں نے بھی اس سے زیادہ خطرناک اقدامات کئے ہوں۔ جن کے دفعیہ کے لئے وہ جاہد وساعی رہے تھے۔ کتاب کو دیکھنے سے

---

[1] یہ مضمون مفصل اور صحیح معنوں میں تنقید نہیں۔ پڑھنے کے بعد کے معمولی تاثرات کا اظہار ہے۔ (شہاب)

معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی دوسری پرانی کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی سیاسی اور مذہبی اختلافات کے سبب سے چند در چند تحریفات کا شکار ہوئی ہے۔ اور یہ بات اندرونی حوالوں سے ظاہر و باہر ہے۔ مفصل گفتگو کا وقت نہیں چند اشارے اثبات مدعا کے لئے کافی ہوں گے۔

اول تو وہی بات جس کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے یعنی سنین اور تاریخوں کی بحث پھر یہ کہ ابواب ۴۵ ہونا چاہئیں اور ہیں پچاس۔ پھر بعض روایات عجیب و غریب ہیں۔ مثلاً فصل چونتیس کو دیکھئے — عنوان یہ ہے کہ "اندر عتاب کردن با ہر کشیدگان ھنگام خطا و گناہ" ص۸۹ اس عنوان کے ماتحت نہایت معقول بحث ہے۔ اس میں حضرت علی کا قول درج ہے۔ کہ آپ سے پوچھا گیا کہ ——

"از مرداں مرد کدام مبارز تر گفت آن کہ بوقت خشم خویشتن را نگہ تواند داشت و کاری نکند کہ چوں از خشم بیروں شود پشیمان شود و سودش ندارد"

اس میں سیدنا حضرت علی کا نام ہے اور پھر جناب حسین بن علی کے نام سے غلام کے ہاتھ سے سالن گرنے اور آقا کے معاف کرنے کی حکایت مختلف ناموں سے مختلف کتابوں میں آئی ہے تاریخی اعتبار سے حضرت علی کو "امیر المومنین" کہنا بجا ہے۔ حضرت حسن کو اسی لقب سے ملقب کرنا درست ہے۔ لیکن حضرت حسین بن علی کو امیر المومنین کہنا خدا جانے کہاں تک تاریخی طور پر درست ہے۔ لیکن اس ارشاد و حکایت کے بعد اسی عنوان کے نیچے حضرت امیر المومنین معاویہ کا ذکر جس عنوان سے کیا گیا ہے۔ وہ ناممکن ہے کہ نظام الملک کے قلم سے لکھا گیا ہو۔ یہ یقیناً ایسے شخص کا کارنامہ ہے جو علیؓ و معاویہؓ کی آویزش میں علیؓ کا طرف دار اور معاویہ کا مخالف ہے۔ اس میں شک نہیں۔ جناب معاویہ حلیم تھے اور ان کے حلم کو بعض طبقوں میں ان کی "پالیسی" یا کمزوری کہا گیا ہے۔ مگر یہ حکایت حلم کے ثبوت میں نہیں ان پر تبصرہ کرنے کے لئے درج کی گئی ہے یا اسی کتاب کی فصل ۴۶ میں حضرت علی کی انگوٹھی کی سخاوت کا ذکر قرآن میں بتایا گیا ہے۔ جو لوگ اصحاب رسول کی تاریخ کو تاریخ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ اس واقعہ کی صحت یا اس کے قرآن میں ہونے کے خیال پر متفق نہیں۔

مؤلف سیاست نامہ اور صحابہ کے نام جس طرح لیتا ہے۔ اس میں اور حضرت علی اور حضرت حسین بن علی کے نام جس طرح درج کئے گئے ہیں۔ اس میں فرق ہے۔ حالانکہ وہ امتیاز جو ان ناموں کو دیا گیا ہے اس دور کی کتابوں میں پایا نہیں جاتا۔

اس کتاب کی بعض حکایات کو بعد کے مؤلفوں نے نقل کیا ہے جیسا کہ اصل کتابوں اور حاشیہ سے ظاہر ہے۔ مگر بعد والوں نے ان روایتوں کو دوسرے لوگوں کے نام سے نقل کیا ہے۔ اور اس میں کسی اور نام سے نقل کی گئی ہیں۔ مثلاً اس کتاب کے صفحہ ۱۶ پر بہرام گور اور اس کے وزیر "راست روشن" کے اچھے نام اور بُرے کام کی ایک حکایت درج ہے نصیحۃ الملوک امام غزالی میں یہی حکایت "گشتاسب" کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

سیاست نامہ کے صفحہ ۳۴ پر سلطان محمود غازی کی نیکی اور عدالت کا ذکر ہے اور لکھا ہے:-

"پیش ازاو (محمود غزنوی) اسم سلطانی نبود و نخستین کسی کہ در اسلام خویشتن را سلطان خواند محمود است پس او سنت ماند و (او) پادشاہ خدا ترس و دانش دوست و عادل و جوانمرد و بیدار پاک دین و غازی بود۔ در روزگار نیکوان باشد کہ در آن روزگار پادشاہ عادل بود" ص۳۴۔ اسی حکایت کے آخر میں لکھا ہے کہ "از خلفاء بنی عباس ہیچ کس را آن سیاست و عدالت نبود کہ معتصم را بود" ص۳۵۔

اسی حکایت کے آخر میں معتصم کے غلاموں کی تعداد کا ذکر اور ترکوں کے اچھے غلام ہونے کا بیان ہے۔ حاشیہ میں ہے۔ کہ "این حکایت را قاضی تنوخی در کتاب نشوار المحاضرہ بہ خلیفہ معتضد باللہ نسبت دادہ است"۔ راقم مضمون نے غزالی کی نصیحۃ الملوک پڑھی ہے اور قاضی صاحب کی کتاب نظر سے نہیں گزری۔ معلوم نہیں حاشیہ کا کس حکایت کے کس حصہ کی طرف اشارہ ہے۔

اسی حکایت میں سلطان محمود کے ذکر کے آخر میں ہے: "در خبر است کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ گفت العدل عز الدین و قوۃ السلطان و فیہ صلاح الخاصۃ و العامۃ" اور اس کا ترجمہ دیا ہے کہ "عدل عز دین است و قوۃ سلطان و صلاح رعیت و لشکری و زی ہمہ نیکیہا"۔ اس میں "خاصہ و عامہ" کی اصطلاح کسی اور طرف اشارہ کر رہی ہے۔ جس پر گفتگو کا یہ موقع نہیں۔

اسی کتاب میں ص۱۷۳ خرم دینیوں اور باطنیوں کو ایک بتایا گیا ہے کہ "وہ حلال و حرام را یکی داشتند و زنان را مباح کردند"۔ سیاست نامہ ص۱۷۳۔

یہ الزام مزدکیوں پر لگایا گیا ہے خرمیوں پر لگایا گیا ہے باطنیوں پر لگایا گیا ہے۔ میری تحقیق یہ ہے۔ کہ یہ بالکل غلط ہے

یاد ہوگا کہ جب رُوس میں بالشوزم پھیلا تو ہندوستان میں اس کے متعلق ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا۔ کہ ان کے ہاں عورت ملک عام ہے۔ مگر بعد میں یہ محض پروپیگنڈا ثابت ہوا۔ اسی طرح قدیم تحریکات کے متعلق ایسے الزامات اسی قسم کے تعصب کا نتیجہ ہیں۔ کہ ان سے بچتے رہیں۔ اور متنفر ہو جائیں۔ افراد میں غلطیاں ہوں گی مگر کسی کی غلطی اس کی جماعت کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ مروجہ طریقوں کے خلاف آواز اُٹھانا ہمیشہ لوگوں نے ناپسند کیا ہے۔ اور طاقت کے بھوکوں نے عوام کی نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ان کی امداد سے اپنا مطلب نکالا ہے۔ ان میں جو مذہبی تحریکات کے متعلق تاریخی قسم کی بحث ہے وہ ایک افسانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے تحقیق کی روشنی میں دیکھا جائے تو قدم قدم پر حقیقت کچھ اور ہی نظر آئے گی۔

یہاں تک تو صرف ان چند باتوں کی طرف یونہی سا اشارہ کیا گیا ہے جو موجودہ مطبوعہ کتاب کی اندرونی علمی کمزوریوں کا پتہ بتا رہی ہیں۔ لیکن اگر کہانیوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام کتاب عجیب و غریب روایات و حکایات سے آراستہ ہے۔ نمونہ کے طور پر تین چار حکایتوں کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھتا ہوں۔

چوتھی فصل میں بحث یہ ہے کہ بادشاہوں کو وزیروں اور دبیروں کے اعمال کی نگرانی کرنی چاہئے۔ اس میں ایک حکایت بہرام گور کی ہے (جسے امام غزالی نے اپنی کتاب نصیحت الملوک میں گشتاسب کی طرف منسوب کیا ہے) کہ اس کا ایک وزیر راست روشن نام کا تھا۔ بادشاہ نے امورِ سلطنت کے سپرد کر دیئے تھے اور خود سیر و شکار میں مشغول رہتا تھا۔ وزیر نے بادشاہ کو غافل پایا تو خوب کھل کھیلا اور رعیت پر طرح طرح کے ظلم توڑنے لگا اور اپنا گھر بھرنے لگا۔ ملک کی آبادی کم ہوئی اور آمدنی گھٹ گئی۔ بادشاہ حیران تھا کہ اس ابتری کا کیا سبب ہے۔ کوئی نہ تھا جو بادشاہ کے پاس جاتا اور اس بربادی کا حال بتاتا۔ ایک دن بادشاہ درباریوں لشکریوں سے الگ ہو کر جنگل میں نکل گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک جگہ بھیڑوں بکریوں کا ریوڑ بیٹھا ہے۔ چرواہے کا جھونپڑا وہیں ہے اور اس کے دروازے پر ایک کتا پھانسی پر لٹک رہا ہے۔ بادشاہ نے چرواہے سے پوچھا یہ کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ کتا پہلے بہت اچھا تھا۔ بھیڑ بکریوں کی حفاظت کیا کرتا تھا۔ کچھ زمانے کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے جانور گھٹتے جا رہے ہیں۔ پتہ نہ لگتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک دن میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ کہ ایک مادہ بھیڑیا آئی۔ کتا اسے دیکھتے ہی دم ہلانے لگا۔ دونوں میں اختلاط ہوا۔ آخر کتا سو گیا اور مادہ بھیڑیئے نے میدان خالی پاتے ہی بھیڑ کا شکار کیا اور چلی گئی۔ میں نے کتے کو پھانسی دے دی کہ اس کی خیانت کی سزا ہو جائے۔ گڈریے کی کہانی نے بادشاہ کی آنکھیں کھول دیں۔ کہ "راست روشن" کے نام پر بھول کر کہیں میں بھی اسی جرم کا مرتکب تو نہیں ہوا جس کا مرتکب گڈریا تھا کہ کتے کی وفاداری پر بھروسہ کر کے اپنے ریوڑ سے غافل ہو گیا۔ شہر میں گیا۔ پوچھ گچھ شروع کی۔ وہ لوگ جو وزیر کے ڈر سے دم بخود تھے۔ بادشاہ کے یقین دلانے پر بول اُٹھے۔ جیلوں کے دروازے کھل گئے۔ برسوں کے مظلوموں نے وزیر کی سیاہ باطنی کی کتھائیں سنائیں۔ جب ثابت ہو گیا کہ وزیر ہی ملک اور رعیت کی بربادی کا موجب ہے تو اسے کتے کی طرح پھانسی پر چڑھا کر مظلوموں کا تمام مال و متاع ان کو واپس دے دیا گیا۔

یہ کہانی ایران قبل اسلام کی ہے۔ اب ایک کہانی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ کی فرمانروائی اور امارت کی دیکھئے۔ اکتالیسویں فصل کے عنوان کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ خدا کی مخلوق کو بھوک سے اور بے قاعدگیوں اور افراتفری سے ملک کو بچائیں۔ اس عنوان میں کئی حکایتیں ہیں۔ ان میں سے ایک سیدنا عمر فاروق کی ہے۔ کہ ایک دوست کو لے کر حسب دستور آپ شب گشت کو نکلے جنگل میں گئے۔ روشنی دیکھی وہاں پہنچے سنا کہ ایک جھونپڑے سے بچوں کے رونے اور ہنڈیا میں ڈوئی چلنے کی آواز آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر یہی بات دیکھی۔ کہ نہ بچوں کا رونا تھمتا ہے۔ نہ ہنڈیا پک چکتی ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ مدینہ کی کوئی ضعیفہ بھوک سے تنگ آ کر اپنے بچوں کو لیکر اس جنگل میں آن پڑی ہے۔ شہر میں کوئی پرسان حال نہیں۔ یہاں کون ہوتا۔ بچے بھوک کے سبب سے روتے ہیں اور ہنڈیا خالی ہے۔ ڈوئی ان کو بہلانے کا ایک بہانہ ہے۔ بڑھیا نے شکایتہً کہا۔ کہ عمر آپ تو کھا کے سو رہا ہے۔ اور بھوکوں سے غافل ہے۔ آپ نے یہ سنا۔ ساتھی کو ساتھ لیا۔ مدینہ میں واپس آئے۔ بیت المال سے کھانے کے سامان کی گونیاں اُٹھائیں۔ وہاں پہنچے۔ لکڑیاں ساتھی نے اکٹھی کیں۔ عورت کو سالن پکانے کو دیا اور خود آٹا گوندھا۔ چولہا جھونکا۔ بچوں کو کھلایا۔ بچے خوش ہوئے۔ عورت سے معافی مانگی اور دعا کی درخواست کی اور کہا بیچارے عمر کو پتہ نہ تھا اسے معاف کر دو۔

محمود غزنوی کے سترہ حملے سب کو یاد ہیں۔ مگر اس کی بادشاہی میں

ـــــــــــــــ

[1] ایسے مسائل کی تحقیق کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جس تحریک یا مذہب میں حلت و حرمت کو جانچنا ہو اسے انکے اصول کی اساسی کتب کے مطابق دیکھنا چاہئے ورنہ ہر مذہب دوسرے مذہب کے مطابق حلت و حرمت میں ایک دوسرے کا مخالف ہے۔ (شہاب)

رعایا پروری کی کیسی کیسی نظیریں ملتی ہیں۔ جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس کی کئی حکایتیں اس کتاب میں بیان کی گئی ہیں۔

حضرت امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز (مروانی) کے عہد میں قحط پڑا۔ لوگ آپ کے پاس آئے۔ اور بولے کہ بھوک نے ہمارا بُرا حال کر دیا۔ ہم نے اپنا گوشت کھایا اور خون پیا۔ یعنی سوکھ کے کانٹا ہو گئے۔ کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ اور ادھر آپ کے بیت المال میں دولت بھری پڑی ہے۔ وہ دولت یا آپ کی ہے یا خدا کی ہے یا خدا کے بندوں کی ہے۔ اگر وہ دولت خدا کی ہے تو اسے اس کی ضرورت نہیں اور ہم خدا کے بندے ہیں اور ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ اور اگر وہ آپ کی ہے تو اس کو ہم پر صدقہ کیجئے کہ اللہ صدقہ کرنے والوں کو بدلہ دیتا ہے۔ یہ سن کر آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بیت المال کے دروازے لوگوں کے لئے کھول دیئے۔ لوگ مطمئن ہو کر واپس جانے لگے تو آپ نے اُن لوگوں سے دُعا کی درخواست کی۔ انہوں نے دُعا کی۔ مینہ برسا۔ اور ایک کاغذ لکھا ہوا اوپر سے آیا۔ جس میں لکھا تھا۔

براءۃ من اللہ العزیز الی عمر بن عبدالعزیز (واللہ اعلم)

اس کتاب میں یہ اور اسی قسم کی اور عجیب و غریب سبق آموز کہانیاں ہیں۔ اس کے اکثر مشورے آج بھی ایسے ہیں۔ کہ حاکموں کی توجہ کے قابل ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک ہی آدمی کو کئی کام سپرد نہیں کرنے چاہئیں۔ لوگوں کو بیکار نہیں چھوڑنا چاہئے۔ کام اُن کے سپرد کرنا چاہئے۔ جو اہل ہوں۔ قابل لوگوں سے مشورہ لینا چاہئے۔ وغیرہ۔ گزشتہ زمانوں میں سیاست کی بنیاد اس اصول پر نظر آتی ہے۔ بزرگان دین گفتہ اند کہ الملک یبقیٰ مع الکفر ولا یبقیٰ مع الظلم معنی آن است کہ ملک با کفر بپاید و با ظلم نپاید۔ صلا سیاست نامہ۔

اس کتاب میں قیام عدل اور انتفاع ظلم کی بہت سی داستانیں ہیں۔ مثلاً محمود کا اپنے بیٹے کو سزا دینے کے لئے تیار ہو جانا وغیرہ۔ لیکن بادشاہوں کے قیام اور قومی بیداری کے لئے مذہب کے نام سے ہمیشہ فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب دین و دُنیا یا دین و بے دینی کی عجیب کھچڑی نظر آتی ہے۔ اوّل تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دین سے کیا مطلب ہے اور بے دینی کسے کہا گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ بادشاہ کا دین یہ ہے۔ کہ وہ قیام عدل اور رعیت پروری کرے اور رعایا کو ظلم سے بچائے۔ تو کوئی شک نہیں۔ کہ اس کتاب کی حکایات ظاہر ہیں۔ کہ اکثر بادشاہ اپنے اپنے زمانے کے مطابق دین دار تھے۔ ان میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔

لیکن شریعت کی پابندی کو دیکھا جائے تو افسوس ہے کہ کئی اچھے سے اچھے بادشاہ شریعت کے دشمن نظر آتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ محمود کا محتسب محمود کے جرنیل کو شراب نوشی کی تو سزا دے اور محمود جو محتسب مقرر کرتا ہے خود شراب پیتا رہے۔

سیاست نامہ میں بادشاہوں کے لئے مجلس شراب آراستہ کرنے کو بھی لازمی قرار دیا گیا ہے۔ معتصم مجلس شراب میں بیٹھتا اور شراب پیتا ہے۔ اور اسی شراب نوشی کے ساتھ مفتوحوں کی بیٹیوں سے خلوت کرنے پر سجدۂ شکر بجا لاتا ہے۔ شراب کے لفظ پر یاد آیا کہ یہاں شراب بمعنی شربت ہے یا خمر یا مے اس کی ضرورت نہیں ناموں سے کام نہیں بنتا۔ ورنہ یہ شراب وہی ہے جس کے پینے والے پر محتسب کا دُرّہ چلتا ہے۔ ہاں یہاں یہ بھی بحث نہیں ہو سکتی۔ کہ ان بادشاہوں سے زہد کی توقع کیوں کی جانے بجا ہے لیکن دین کے نام سے حکومت کرنے والے بادشاہوں سے ہم کہیں گے کہ پابندی شریعت تو ان کیلئے بھی ضروری ہے۔ وہ زاہد نہ ہوں پابند شرع تو ہوں۔ تعجب ہے کہ عوام کے لئے تو شریعت کی پابندی لازمی سمجھی جائے اور صاحبان تخت و تاج کو پابندی شریعت سے معاف کر دیا جائے۔ پھر حیرت اس کی بھی ہوتی ہے کہ آخر وہ کون دین تھا جس کے لئے جنگ و جہاد کئے جاتے تھے تاریخ بھری پڑی ہے کہ ہر خاندان نے طاقت پا کر وہی کیا جو دُوسرے کیا کرتے تھے۔ نام دین کا لیا جاتا تھا اور حکومتیں افراد اور خاندانوں کی ملک سمجھی جاتی تھیں۔ عرب کیسے تھے۔ عجم کیا تھا ترک کی کیا قیمت تھی۔ حکومت میں خاندان کیا اہمیت رکھتا تھا۔ بادشاہوں کا تموّل، امرا کی دولت پابندئ عدل اور پامالی عدل وغیرہ کی لفظی تصویریں اس کتاب میں بکثرت نظر آتی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے نام سے طاقت ہر خاندان میں حاصل کی جاتی رہی تھی۔ اور مذہب ہی کو پاؤں تلے روندا جاتا تھا۔ عموماً فقہا اور علما اور درباری سب کچھ دیکھتے تھے۔ اور کچھ نہ کہتے تھے نہ کہہ سکتے تھے یا کہنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کیا کرتے تھے حکومت کیسے چلتی تھی۔ درباروں کے رنگ ڈھنگ۔ آداب و تسلیمات، درباریوں کے لباس اور امرا اور درباریوں اور عالموں کے لباس اور خطاب امرا کے مشورے اور اہل سلاح کے اسلحہ جنگ، زمینوں کے لگان دشمنوں سے معاہدات۔ خانہ داری رعیت کے احوال۔ غربا

کی سرپرستی، امرا کی عیش کوشی۔ سازشیں سلطنتیں کیوں کر بنتی تھیں اور بگڑتی تھیں۔ عوام سے کیسے کام لیا جاتا تھا۔ اور بادشاہ اور رعایا میں کیا تعلق ہوتا تھا۔ حکومت میں اپنے اور غیر کی بحث کی کیا اہمیت تھی۔ اس کتاب سے معلوم ہوگا۔ دورِ عروج میں۔ اہل عمل میں اپنوں کے حقوق غیروں پر مقدم تھے اور سیاست مذہب کے نام پر کیا کیا گل کھلاتی تھی۔ اورنگ زیب کی طرح کتنے بیٹوں نے باپوں کو قید اور نظر بند اور طوق و سلاسل سے آراستہ کیا تھا۔ اورنگ زیب نے باپ کو دور اکی لے دینی کا طرف دار بتایا اور نوح نے اپنے باپ نصر بن احمد سامانی کو باطنیت کا شیفتہ ٹھہرایا۔ پھر باپ کو آلۂ کار بنا کر اسی باپ کو قید کیا اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔ اور اسی طرح نوشیروان نے قباد کو قید کیا اور مزدکیوں پر کیا کیا مظالم کئے۔ ایک تماشہ ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور سوچنے کی چیز ہے۔ اس کتاب کی نثر قدیم نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ بالکل سادہ مطلب کی بات تکلف کا نام نہیں۔ بہت سے الفاظ قدیم ہیں۔ اندازِ نگارش سہ نثر ظہوری اور آج کے انشا سے یکسر الگ ہے۔

اس کتاب کا نام سیاست نامہ یا سیر الملوک ہے۔ سیاسی نظریہ کے ارتقا کے سمجھنے کے لئے اس کتاب کا وجود ایک اہم کڑی ہے ضرورت ہے کہ دین و سیاست پر بحث کرنے والے بحث کرتے ہوئے اس کتاب کو بھی دیکھ لیا کریں تو مناسب ہے۔ قرآن سے نئے نظریہ پیش کرنا مبارک ہے۔ لیکن گزشتہ ادوار اپنی قوت کے زمانوں میں اجراء شریعت اور قانونِ الٰہی یا حکومتِ الٰہی کس کس رنگ میں ظاہر ہوئی ہے نظر انداز کرنے کرنے کی چیز نہیں ÷

چھیڑ چھاڑ

ہم جس طرف نگاہ اٹھا دیں بہار ہے

حضرت خمار بارہ بنکوی

وہ بد نصیب ہیں جنھیں غم ناگوار ہے
یہ تو دلیلِ رحمتِ پروردگار ہے۔

غنچے ہیں۔ گل ہیں۔ سبزہ ہے۔ ابرِ بہار ہے
سب جمع ہو چکے ہیں ترا انتظار ہے

آ گے جبینِ شوق تجھے اختیار ہے
یہ دیر ہے یہ کعبہ ہے یہ کوئے یار ہے

اے دوست آ ابھی جا کہ میں تصدیق کر سکوں
سب کہہ رہے ہیں آج فضا خوشگوار ہے

کیونکر نہ ہو عزیز مجھے اپنی معصیت
رحمت سے چھیڑ چھاڑ کی اک یادگار ہے

تازہ ہیں جنکے دل وہ مطیعِ خزاں نہیں
ہم جس طرف نگاہ اٹھا دیں بہار ہے

الفاظ میں نہ ڈھونڈھ مری بیقرار یاں!
اے بے خبر زباں نہیں دل بیقرار ہے

اللہ ری اک نگاہِ عنایت کی وسعتیں
جیسے کہ کائنات مری غمگسار ہے

تنگِ چمن تھا میرا نشیمن سو مٹ گیا
اب واقعی بہار مکمل بہار ہے

صبر و شکیبِ عشق کی اب خیر ہو خمار
اب وہ بھی ساتھ مرے بیقرار ہے

یگانہ آرٹ

علم کا سودا پڑا مہنگا پڑا

حضرت میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

اپنی ہستی ہیں بھی کچھ شک آپڑا[1]
علم کا سودا بہت مہنگا پڑا

آپ سے باہر چلے ہو ڈھونڈنے؟
آہ پہلا ہی قدم چھوٹا پڑا

یہ تو سمجھو خفتہ کیا بیدار کیا؟
ہوش پر جب وہم کا سایا پڑا

قد ہُوا اتنا بڑا تو کیا ہوا؟[2]
جب کوئی مشکل پڑی لمبا پڑا

راست بازی کی ہوس دنیا کے ساتھ؟[3]
کیوں قسم کھائی تھی کیوں مارا پڑا

زندہ رکھا ہے سسکنے کے لئے
واہ اچھے دوست سے پالا پڑا

آج ہی حق سے ادا ہو جایئے
دھیان بھٹکا ولولہ ٹھنڈا پڑا

فکرِ دنیا میں رہے دن بھر خراب
شب ہوئی آنکھوں پہ پھر پردا پڑا

اب ہُوا رنگِ تصرف دیدنی
روح پر جب جسم کا پردا پڑا

واہ سنتے ہی یگانہ کی غزل
اپنے بیگانے کو بھی چسکا پڑا

[1] ...بت کی یہ سادگی و پرکاری اقبالی اُمت کی ذہنیت سے بالاتر ہے یا یوں سمجھ لیجیے کہ سپٹ ہے [2] نو فٹے نواب اتنے لمبے تڑنگے مگر........
[3] ...زندہ رہنا ہے تو اس زمانہ میں قول و قسم کی پابندی یعنی چہ؟

بگڑے ہوئے گیسو

دلگداز کہانی

از:۔ محترمہ خدیجہ مستور لکھنوی

کمرے کے سب دروازے بند تھے۔باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ جو بار بار دروازوں سے سر ٹکرا کر اپنی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔کھڑکی سے پانی کی بوچھاڑ آ رہی تھی۔میں نے اٹھ کر جلدی سے بند کر دی۔اور پیروں پر کمبل ڈال کر چپ بیٹھ گئی۔ نہ معلوم کیوں دل بیحد گھبرا رہا تھا۔ایک طرف آپا منہ لٹکائے کسی گہری فکر میں غرق تھیں۔شاید یہی سوچ رہی ہوں گی کہ اس بارش میں دولھا بھائی کیسے آئیں گے دفتر سے سات بجے فرصت مل جاتی تھی۔لیکن اب وہ بیچارے وہیں کہیں بیٹھے بارش رکنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔میں بھی بارش رکنے کی دعا کر رہی تھی کہ کہیں تھوڑی دیر گھوم آؤں۔بمبئی کے ذرا ذرا سے کمرے۔بس پیٹ کا بُرا حال ہو گیا۔کھانا ہضم ہو نہ بھوک ہی لگے۔لیکن دولھا بھائی آئیں گے بھی تو تھکے ہوئے۔بھلا مجھے کیوں لے جانے لگے۔ فوراً ہی خیال آیا کہ کاش اس وقت افروز آ جاتے تو معاملہ ٹھیک رہتا کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور آپا نے اپنا لٹکا ہوا منہ اٹھا کر پوچھا۔

"کون ــــ؟"

"باہر والا"

"آ جاؤ"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو حضرت افروز گرم سیاہ سوٹ میں ملبوس میرے سر پر کھڑے ہوئے ہیں۔

"کیا ہو رہا ہے جی؟" انھوں نے ایک چپت میرے سر عزیز پر رسید کر کے پوچھا۔

"کیوں جی' یہ تم کمبخت آوازیں بنا کر ہم لوگوں کو دھوکا کیوں دیتے ہو؟" آپا نے کہا۔

"اور آپ دھوکے میں کیوں آ جاتی ہیں ــــ؟" وہ ٹھاٹ سے کرسی پر دراز ہو گئے۔

"سچ میں ابھی آپ کو یاد کر رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"واقعی جب شیطان کو یاد کرو تو وہ آ ہی دھمکتا ہے۔"

"اوں ہوں' جب رحمان کو یاد کرو تو آوازیں بناتا آ جاتا ہے۔"

وہ زور سے ہنس دیئے۔اتنے میں واقعی باہر والا چائے لے کر آ گیا۔شاید افروز نیچے ہی آرڈر دیتے آئے تھے۔مجھے ویسے ہی سردی لگ رہی تھی۔کسی کا انتظار کئے بغیر مزے سے چائے پینے لگی۔اور خیال یہ ستا رہا تھا کہ اب افروز سے کیونکر کہوں کہ مجھے ٹہلا لائیں۔بارش رک چکی تھی۔

"کہو کوئی نیا افسانہ بھی لکھا؟" انھوں نے پوچھا۔

"ارے ہاں' ایک بڑے مزے کا پلاٹ میرے دماغ اقدس میں آیا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا آیا ہے آپ کے دماغ اقدس میں؟"

"ایک شریر سی لڑکی جو سب کے بال بگاڑا کرتی ہے۔ایک دن بال بگاڑتے بگاڑتے اپنی دنیائے دل بھی تباہ کر لیتی ہے۔"

"اچھا' ہاں تو وہ دُبلی پتلی بھی ہو گی' اور چشمہ بھی لگاتی ہو گی۔کیوں؟" افروز نے کہا۔اور آپا نے ایک زور کا قہقہہ لگایا ــــ میں جل کر خاک ہی تو ہو گئی۔

"ارے خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔بھلا میں اپنے لئے کچھ تھوڑا ہی لکھ رہی ہوں۔یہ تو ایک فرضی قصہ ہو گا۔" میں نے مسکین صورت بنا کر کہا۔

آپا بولیں۔" ہاہا! بیچاری کا منہ تو دیکھو ذرا سا رہ گیا ہے۔"

اب تو میں واقعی آپا کی بات پر بُری طرح تپی۔آنکھوں پر سے عینک نوچ کر میز پر پٹک دی۔اور دل ہی دل میں خدا سے دعا کرنے لگی۔اے رب! اگر تجھ میں کچھ بھی قدرت ہے۔تو مجھے بھلا کر پتا کر دے پھر میں مزے سے یہ افسانہ لکھ سکوں اور کوئی مجھے کچھ نہ کہے۔واقعی اگر افروز نے مجھ پر پھبتی کسی بھی تو ٹھیک تھا۔میری عادت بھی تو تھی کہ جہاں جس کے پاس کھڑی ہوئی اور بال بگاڑ دیئے۔دولھا بھائی' آپا' افروز اور آپا تک اپنے بال بچوانے سے نہ بچے تھے۔مجھے بڑا لطف آتا۔جب غریب آپا کے سفید بال منہ پر بکھرے ہوتے۔اگر واقعی مجھے یہ افسانہ لکھنا ہے تو بال بگاڑنے کی عادت چھوڑنا ہو گی

اور موٹا کرنا خدا کے ہاتھ ہے۔ میں افسانے میں جس لڑکی کو دکھانا چاہتی تھی وہ دبلی پتلی، شریر بالکل میری طرح ہوگی۔ ورنہ افسانے میں جان پڑنا مشکل ہے۔

"دیکھنا! بیٹھی جل رہی ہے۔" افروز نے مجھے چپ دیکھ کر کہا۔

"جلنے والی پر خدا کی مار۔" میں نے ہنس کر کہا۔ لیکن دل یہی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر ذرا اپنے ہاتھوں کے جوہر دکھاتے ہوئے دو دو دھکے رسید کر دوں۔ لیکن بزرگی آڑے آ گئی۔ پھر بھی افروز کے بنے سنورے بال بگاڑنے کی دل میں ٹھان لی۔ اور اٹھ کر افروز کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر چپکے سے ہاتھ بڑھایا اور بال بگاڑنے کیا نوچ ہی تو لئے۔

"کیا مذاق کرتی ہے پگلی، میرے بوڑھے بالوں سے۔" افروز نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے تاکہ پھر یہ حرکت نہ کر سکوں۔ میرے دل پر ان کے یہ الفاظ گھونسا بن کر لگے۔ میرے دل میں خدا ہی جانے کیوں ان کی محبت خاموشی سے اثر کر رہی تھی۔ اور میں نہ چاہتی تھی کہ وہ کسی وقت بھی رنجیدہ ہوں۔ گو ان کی زندگی انتہائی غمناک تھی۔ ان کا کوئی بھی سچا مونس و غمخوار نہ تھا۔ یہاں تک کہ بیوی بھی صرف پیسے کی میت تھی۔ اگر وہ مرتے بھی ہوں تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہی کچھ میری زندگی کا حال ہے۔ اگر روؤں تو کوئی آنسو پوچھنے والا نہیں۔ اگر ہنسوں تو میری خوشی میں کوئی شریک نہیں لہٰذا بلا شرکت غیرے میں آپ اپنی شریک حیات ہوں۔ پھر بھی زندگی بے غیرت ہوتی ہے۔ روتی کم ہوں اور ہنستی زیادہ۔ شاید یہ عمر کا تقاضا ہے۔ ادھر غم کے بادل چھٹے اور میں نے کبھی کبھی شروع کی۔ ایک جگہ بیٹھنا میری فطرت کے خلاف ہے ابھی ابھی یہاں بیٹھی ہوں۔ تو ذرا دیر میں کہیں اور کھڑی ہوں، کسی کو مارنا، چھیڑنا۔ بال نوچنا۔ گو افروز چالیس کے لگ بھگ تھے لیکن مجھ سے ان کا بھی ادب نہ ہوتا —— وہ بیچارے بچہ سمجھ کر میری ہر بات کو ٹال دیا کرتے تھے۔

"چھوڑیئے جی! میرے ہاتھ، ورنہ آپ کے سارے بال آپ کے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔"

میں نے بڑے ہی چڑ کر کہا۔ اور جیسے ہی ہاتھ آزاد ہوئے تو آپا کے سر پہ دست شفقت پھیر رہے تھے۔

"خیر تو کمینی! ——" آپا بھی مجھ سے بگڑ گئیں۔ میں بستر سے بدل بدل کر اپنے ناتوان جسم کو بچا رہی تھی کہ دولہا بھائی بھیگی بلی بنے آ گئے۔ آپا نے نہال ہو کر مجھے بخش دیا۔ اور اپنے لاڈلے شوہر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

تھے ہے آپ بھی تھک گئے۔" میں نے منہ بنا کر اظہار افسوس کر دیا۔ اور دولہا بھائی مجھے گھور کر چپ ہو گئے۔ ان کے لئے جلدی سے چائے منگائی۔ کپڑے تبدیل کرائے اور کمبل اڑھا کر آپا نے انہیں آرام کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ ان کی طبیعت کچھ بھاری ہو رہی تھی اس لئے افروز نے اپنے گھر کی راہ لی۔ آپا اور دولہا بھائی نے بزم خلوت کو رونق بخشی۔ رہ گئی میں بیچاری تو چپ تکئے میں منہ چھپا کر اپنی الجھی ہوئی زندگی کے متعلق سوچنے لگی۔ اور پھر نہ معلوم کب سو گئی۔ بیٹھے بیٹھے خواب دکھائی دے رہے تھے۔ صبح تڑکے ہی آنکھ کھل گئی۔ آپا اور دولہا بھائی کے خراٹوں کی آواز ان کے خلوت کدے سے آ رہی تھی۔ میں اپنے بال درست کر کے چپ بیٹھ رہی۔ منہ کون دھوئے۔ سوچ یہ رہی تھی کہ ابھی چائے کی امید دو گھنٹے اور نہ کرنا چاہیئے۔ سونے والے نہ معلوم کب بیدار ہوں گے۔ یہ بھی کوئی بس ہوں کہ رات کے دو بجے تک پڑی تکئے میں سر رگڑا کروں۔ اور تڑکے اٹھ کر سوچوں کہ ع نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟ کیا ٹھاٹ دار زندگی ہے۔ بس خدا کی مار ہے۔

"کہیئے افسانہ نگار صاحبہ کیا سوچا جا رہا ہے؟" دولہا بھائی نے اپنے خلوت کدے کا ایک پٹ کھول کر مجھے دیکھا۔ جیسے میرے افسانہ نگار ہونے پر طنز فرما رہے ہوں۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں نہ معلوم کیوں آج دل نہ چاہتا تھا، کہ دولہا بھائی کی طرف دیکھوں بھی۔ یہ وہی دولہا بھائی ہیں جو صرف ہنسانا اور مذاق کرنا جانتے ہیں۔ دوسروں کے جذبات کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ سر شام میں اپنے بستر پہ گر کر کروٹیں بدلوں، آپا اور دولہا بھائی دو باتیں بھی نہ کریں۔ اور یہ آپا! اُف یقین نہیں آتا کہ یہ وہی ہیں جو بچپن کے کھیلوں میں مجھے اپنے پاس سے ایک منٹ کو جدا نہ کرتیں اور اب جبکہ زندگی کا حقیقی کھیل کھیلنا شروع کیا۔ تو جیسے میں بالکل اجنبی ہو گئی۔ اگر میں ہی انہیں چھیڑوں تو خیر ورنہ کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ میرا جی بہلائے۔ اب تو ان کی ساری دلچسپیاں اپنے حسین شوہر کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھیں۔ آج نہ معلوم کیوں مجھے شدت سے اپنی تھکی ہوئی زندگی کا خیال رنجیدہ کر رہا تھا۔ آپا اور دولہا بھائی ہنس بول رہے تھے۔ دوران گفتگو میں دولہا بھائی مجھ پر بھی پھبتیاں کس رہے تھے۔ لیکن میں چپ تھی۔ اسی طرح سکوت کے عالم میں سارا دن کٹ گیا۔ بس یہی سوچ رہی تھی کہ وہ زندگی زندگی نہیں ہے جو درماندہ ہو۔ شام ہوئی اور میں سب بھول بھال کر افروز

کا انتظار کرنے لگی - یہ میرا روز کا معمول ہو گیا تھا - کہ ان کا بےچینی سے انتظار کروں - جس دن وہ شام کو نہ آتے تو میرا دل ڈوبنے لگتا اور جب وہ دوسرے دن آتے تو میں ان کو دیکھتے ہی باوجود ضبط کے رو دیتی - پھر اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے ناراض ہو جاتی - لیکن وہ مجھے تھپک کر منا لیتے اور میں من جاتی - واقعہ تو یہ ہے کہ میں دن بھر رنجیدہ یا سنجیدہ رہتی - اور شام کو جب افروز آتے تو چہک اٹھتی - خوب جی کھول کر شرارتیں کرتی تب کہیں دل کا بوجھ ہلکا ہوتا - خدا ہی جانے کیوں افروز میرے دل میں بستے ہی جا رہے تھے - حالانکہ افروز مجھے بچوں کی طرح چاہتے تھے لیکن میں انھیں دوسری حیثیت سے دل میں جگہ دے رہی تھی -

رات کے آٹھ بج گئے لیکن وہ نہ آئے - یہاں تک کہ گیارہ ہو گئے اب ان کے آنے کا قطعی امکان نہ تھا - میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی - اور جی چاہتا کہ ابھی ٹیکسی کر کے جہاں بھی ان کے ملنے کا امکان ہو تلاش کروں اور اتنے بال نوچوں کہ ایک بھی نہ رہے - لیکن مجبوری خاموشی سے اپنے مونس و غمخوار بستر سے ہم آغوش ہو گئی -

صبح سو کر اٹھی تو خود کو بیحد رنجیدہ پایا - دل ہنسنے بولنے سے جیسے متنفر سا ہو رہا تھا - اسی حالت میں آج کا سارا دن بھی گزر گیا - اور خدا خدا کر کے شام ہو گئی - پھر انتظار مسلسل تھا اور میں تھی - لیکن زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ وہ آ گئے - میں دل میں خوش ہو گئی - لیکن بظاہر بُرا سا منہ بنا کر ان کی طرف سے پھیر لیا -

"ناراض ہو میری ننھی افسانہ نگار ۔۔۔؟" وہ میرے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگے -

"ہٹیئے جی، میں نہیں بولتی آپ سے!" میں نے ان کا ہاتھ مروڑنے کے انداز سے جھٹک دیا - اور جا کر گیلری میں کھڑی ہو گئی - سامنے پہاڑی کے سر پر چاند چمک رہا تھا - اور سڑک کے دونوں طرف تناور درخت خاموش کھڑے تھے - چاندنی راتوں میں شاید دنیا کا ذرہ ذرہ بےچین ہو جاتا ہے - میں بھی ایسا حسین منظر دیکھ کر مضطرب سی ہو گئی -

"دیکھو بھئی من جاؤ ورنہ میں جاتا ہوں۔" انھوں نے پیچھے سے آ کر ایک چانٹا جھاڑ دیا - لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا - جانتی تھی کہ وہ مجھے منائے بغیر جا نہیں سکتے -

"اچھا چلو، تمھیں سیر کرا لائیں - دیکھو کتنی سہانی رات ہے - کوئی "پلاٹ" ہی مل جائے گا۔"

"چلئے ۔۔۔!" میں جھٹ سے من گئی - لیکن ایک دن نہ آنے کی سزا میں بال ضرور بگاڑ دیئے -

"بس بالکل پاگل ہے تُو۔" انھوں نے اپنے بال درست کر کے کہا - اور پیار سے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا -

"پھر آپ روز کیوں نہیں آتے - میں انتظار کیا کرتی ہوں۔"

"اچھا بابا - اب ایسی غلطی نہ ہو گی - چلو ٹہل آئیں۔" میں جلدی سے تیار ہو گئی - ان کے ساتھ جانے میں مجھے کوئی روک ٹوک نہ تھی - کیونکہ افروز دولھا بھائی کے عزیز دوست تھے بلکہ وہ افروز کو اپنے بڑے بھائی کے برابر سمجھتے اور بالکل ویسا ہی برتاؤ کرتے تھے -

میں اور وہ آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے چل رہے تھے - اور وہ اپنی تازہ غزل کے اشعار گنگناتے جا رہے تھے - ان کے اشعار میں ایک ایسی تڑپ ہوتی جو میرے دل کو بےچین کر دیتی - اسی لئے میں نے کبھی ان سے اپنا کلام سنانے کی تمنا نہ کی -

"آپ اپنی شاعری ہی بگھارتے جائیں گے۔" میں نے جل کر کہا تو وہ چپ ہو گئے اور کسی دلچسپ موضوع پر گفتگو ہونے لگے -

"لے بھئی نہیں پڑھوں گا - بس تم افسانہ نگار بن گئیں لیکن پاگل پن نہ گیا۔"

"ہوں تو خدا کے فضل سے افسانہ نگار، پھر آپ کا کیا جاتا ہے۔" میں نے کہا اور وہ زور سے ہنس پڑے -

"اتنی ننھی سی تو ہو - تمھیں دیکھ کر کون یقین کریگا کہ افسانے لکھتی ہو ۔۔۔؟"

"کرے یا نہ کرے، کوئی میں کسی کے پاس خوشامد کرنے جا رہی ہوں کہ مجھے افسانہ نگار مان لو۔"

"افوہ! کس قدر جل جل کر باتیں کر رہی ہے - یعنی ابھی تمھارا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا - وہ بھی چپ ہی ہو گئے -

"ہم اس پہاڑی سے اس پہاڑی تک جائیں گے۔" میں نے کہا -

"لیکن تم تھک نہ جانا۔"

"ارے نہیں۔" میں نے ذرا تیز چل کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کر دیا -

"چھی، بڑی شریر ہو - اگر گر پڑیں تو؟"

میں واقعی ان کے کہتے ہی ایک پتھر سے ٹکرائی - اور زمیں بوس ہونا ہی چاہتی تھی کہ انھوں نے پکڑ لیا - میں کھسیا کر چپ ہو گئی - اور چلنے لگی -

"وہ دیکھو۔" انھوں نے انگلی سے اشارہ کیا - میں چونک پڑی "کیا ہے؟"

"وہ دیکھو سبز روشنی!"

میں نے عینک لگا کر ان کی انگلی کی سیدھ پر دیکھا - درختوں کے جھنڈ میں ایک خوبصورت بنگلہ بنا تھا - جس کے دروازوں سے سبز شعاعیں نکل رہی تھیں -

"واقعی بڑا حسین منظر ہے"

"اور وہ دیکھو"

میں نے دیکھا کہ ناور درختوں کے پیچھے چاند چھپا ہوا ہے - اور ان کے پتوں سے روشنی چھن رہی ہے - کسی درخت پر کوّے پر پھڑپھڑا کر بول رہے تھے - اور خدا جانے کون سی چڑیا اپنی پیاری آواز میں چہک رہی تھی - میں بےچین سی ہو گئی آخر ایک درخت کا سہارا لیکر کھڑی ہو گئی وہ میرے پاس کھڑے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے - جیسے میں ابھی بالکل دو سال کی بچہ تھی ان کی نظر میں -

"تھک گئیں —— ؟"

"نہیں —— !"

"آخر یہ تم کئی کئی دن کنگھی کیوں نہیں کرتی ہو ؟"

"نہیں کرتی، میرا دل"

"بڑی نامعقول ہو" انھوں نے میرا صاف جواب سن کر کہا —— اور چُپ ہو گئے - میرا دل نہ معلوم کیوں ڈوبا جا رہا تھا - اور میں شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ مجھے افروز سے بے انتہا محبت ہے، لیکن مجھے اس محبت کو چھپانا ہے - میں دیر تک بالکل گم سم کھڑی رہی - پھر ایک پتھر پر بیٹھ گئی -

"آج کل گھر میں کوئی نہیں - بیوی صاحبہ میکے گئیں اور ساتھ ہی خادمہ کو بھی لے گئیں - کھانا کھلانے ہوٹل جانا پڑتا ہے - بڑی تکلیف ہو گئی - کوئی دوسری ملازمہ ملتی ہی نہیں" انھوں نے بھی قریب ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا -

"مجھے رکھ لیجیے نوکر!" میں نے کہا -

"کچھ پاگل ہو گئی ہے ؟"

"نہیں واقعی افروز صاحب، مجھے اپنے یہاں نوکر رکھ لیجیے - میرا دنیا میں کون ہے - دل و جان سے آپ کی خدمت کروں گی - بس دو وقت کھانا اور تین مرتبہ چائے"

ہشت پگلی، خود کو اتنا گراتی ہے - تمھارے سب ہیں بھائی بہن اور چاہنے والی ماں - ویسے تمھارا گھر ہے - جب بہن کے پاس رہنے سے طبیعت گھبرائے تو میرے پاس رہو"

"آپ کی مرضی، ورنہ میں رہوں گی تو نوکر ہی کی حیثیت سے"

"چپ! ایسا نہیں کہتے"

میں ان کے ڈانٹنے پر خاموش ہو گئی - لیکن رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ کاش میں افروز کی خدمت کر سکوں - تاکہ میری خاموش محبت کی تسکین ہو"

"تو پھر واقعی مجھے نوکر نہ رکھئے گا —— ؟" میں نے دور پہاڑی پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا -

"نہیں —— !"

"کیوں —— ؟"

"مجھے اپنے بڑھاپے کا احساس ہے - اور میں خود غرض نہیں ہوں" - انھوں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا - اور میرا دل جیسے دھک سے ہو گیا - یعنی وہ میری دلی کیفیات سے آگاہ تھے - اس انکشاف پر میرا دل چاہا کہ خوب روؤں لیکن آنسو پی کر رہ گئی اور سر نیچا کر کے زمین کریدنے لگی -

"یوں نہیں بیٹھتے سر اوپر اٹھاؤ" انھوں نے دونوں ہاتھوں سے میرا سر اٹھا کر منہ اپنی طرف کر لیا - اور میری آنکھوں سے باوجود ضبط کے آنسو بہ نکلے -

"کیوں روتی ہو - مجھے بتاؤ میری ننھی دوست ؟" وہ واقف ہوتے ہوئے پھر انجان بن رہے تھے -

"کچھ نہیں —— !"

"بتاؤ نا شہلا بی آخر تم چھپ چھپ کر کیوں رویا کرتی ہو - مجھے اپنا مخلص دوست جانو اور سچ سچ بتا دو"

"کوئی بات نہیں" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا -

"بتاؤ گی کیسے نہیں" انھوں نے مجھے شانے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا - بتاؤ میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں - کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ جو کچھ مجھ سے کہو گی - اسے راز نہ رکھ سکوں گا"

"ایسی باتیں نہ کیجیے"

"تو پھر بتاؤ"

"مجھے اپنے پاس نوکر رکھ لیجیے - میرے منہ سے نہ معلوم کیوں بےساختہ نکل گیا - اور ساتھ ہی بُری طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی -

"شہلا بی! زندگی کی الجھنوں میں گرفتار رہ کر اپنی زندگی برباد نہ کرو - ذرا سوچو تو دس بارہ سال بعد میرا کیا حال ہو گا - ضعیفی اٹھنے بیٹھنے سے بھی مجبور کر دے گی - اور پھر موت کا بھیانک منہ مجھے نگل جائے گا

تباؤ اس وقت کیا کرو گی ؛ تم بچہ ہو - اپنے دن ہنس کھیل کر گزار دو - یہ میں خوب جانتا ہوں کہ تمھاری زندگی بیحد دکھی ہے - اور تمھارے والدین نے اس بچپن میں تمھاری شادی کرکے تم پر ظلم کیا - پھر بھی اب رنجیدہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس موذی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا ہو گیا — اب میں کوئی اچھا سا لڑکا ڈھونڈ کر اپنی شہلا کی شادی کر دونگا - خوب کھاؤ کھیلو - پاگل پن اچھا نہیں ہوتا "

میں بالکل چپ ان کی باتیں سنتی رہی - بھلا کیا کہتی - ہاں اس وقت کو یاد کر رہی تھی کہ جب سکھیوں نے خوش ہو کر میرے پیروں میں مہندی لگائی تھی - لیکن میں تو وہ سب کچھ بھول گئی تھی اور حال کی کلفتوں کو یاد کرکے رو یا کرتی تھی - میں بھی کتنے کٹھن رستے پر گامزن تھی - جس کی کوئی منزل ہی نہیں - افروز بالکل چپ بیٹھے بلند ہوتے ہوئے چاند کو دیکھ رہے تھے - ان کے لبوں سے ایک ٹھنڈی آہ سسکتی ہوئی نکل گئی - اور وہ کھڑے ہو گئے -

" چلو شہلا بی ! اب رات زیادہ ہو گئی "

میں اٹھ کھڑی ہوئی لیکن نہ معلوم کیوں آنسو رکتے ہی نہ تھے -

" کیوں روتی ہو پاگل ؟ آنسو پونچھو ورنہ تمھاری سرخ آنکھیں دیکھ کر گھر والے کیا کہیں گے - دیوانی کیا دنیا کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقع دو گی " میں نے آنسو پونچھ ڈالے اور تھکے ہوئے مسافر کی طرح آ کر بستر پر گر گئی - رات بھر نیند نہ آئی - افروز نے میری عجیب و غریب شادی کی یاد دلا کر اور بھی ظلم کیا تھا - صبح اٹھی تو آنکھیں پھولی ہوئی تھیں اور سارا جسم تکان سے ٹوٹ رہا تھا - تین چار پیالیاں چائے کی ڈکارنے کے بعد ذرا طبیعت درست ہوئی تو دولہا بھائی قبلہ نے چھیڑنا شروع کر دیا

" یہ بم کے گولے سوجے ہوئے کیوں ہیں ؟ "

" آپ کے فراق میں رات بھر روئی ہوں " میں نے تپ کر کہا - خدا جانے وہ میری آنکھوں کو بم کے گولے کیوں فرماتے تھے -

" خوب ، دیکھا نا ، تمھارے حسن نے شہلا پر بھی اثر کیا " آپا بھی بولیں کمبخت دولہا بھائی کی طرف مل کر ہمیشہ مجھے چڑاتی تھی -

" میں پوچھتی ہوں کہ جناب نے میری آنکھوں کو بم کے گولے کا کیوں خطاب دیا ہے ؟ "

" تم نہیں جانتی ہو - ارے بھئی یہ موٹی موٹی آنکھیں جس طرف اُٹھ جائیں تو دونوں میں آگ لگ جائے آگ " دولہا بھائی نے کہا -

" خیر میری آنکھیں جو بھی کریں آپ کو کیا مطلب ؟ " میں نے کہا -

" یعنی میں دیکھ کر تعریف بھی نہ کروں ؟ "

" بڑے ندیدے ہیں - کیا دیکھنے کے لئے دنیا میں اور آنکھیں نہیں جڑتیں ؟ " میں نے کہا اور جھٹ سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی - ورنہ آپا اور دولہا بھائی پیچھے پڑتے ہیں تو رُلا کر ہی چھوڑتے ہیں

شام کو انتظار کیا لیکن افروز نہ آئے - یہاں تک کہ کئی دن گزر گئے - اور میری بے چینیاں بڑھتی گئیں - خدا خدا کرکے ایک دن وہ صبح ہی آ گئے - میں انھیں دیکھ کر جیسے سارے غم بھول گئی - واقعی وہ میرے مخلص دوست تھے - میری ہر ضرورت کا اسی قدر خیال رکھتے تھے جیسے اپنی -

" کہو کوئی افسانہ لکھا ؟ " انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا -

" ہاں لکھا ہے "

" کون سا ؟ "

" وہی بال بگاڑتے بگاڑتے اپنی زندگی بگاڑ لی "

" ہشت پگلی "

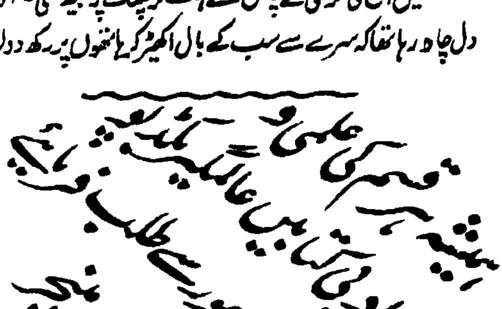
وہ میری طرف گہری نظروں سے دیکھ کر زور سے ہنس دیئے -

" تو اس افسانے کا انجام کیا نکالا ؟ " انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا -

" ایک حسین مسلسل اضطراب " میں نے ہاتھ چھڑا کر کہا - اور بُری طرح رو پڑی - میرے آنسو افروز کی پتلون بھگو رہے تھے - وہ نہ معلوم کیوں مجھے چپ نہ کرا سکے - میں نے خود ہی جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لئے اور افروز کے بال بگاڑ کر زور زور سے ہنسنے لگی - وہ بالکل سنجیدہ تھے - لیکن میرے مسلسل قہقہے کمرے کو سر پر اٹھائے ہوئے تھے -

لیکن کوئی کیا جانے کہ ان قہقہوں میں سسکیاں دبی ہوئی ہیں - گونجتے ہوئے قہقہے سب سنتے ہیں لیکن دبی ہوئی سسکیاں کسی کو سنائی نہیں دیتیں -

میں ان کی کرسی کے پاس سے ہٹ کر پلنگ پر بیٹھ گئی - اور دل چاہ رہا تھا کہ سر سے سب کے بال اکھیڑ کر ہاتھوں پر رکھ دوں -



نظمِ مُعرّیٰ اور نظمِ آزاد

انگریزی اور اُردو میں

جناب یوسف جمال انصاری ایم۔اے

غالب نے کہا تھا ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے

لیکن اِس شعر میں غالب کا مقصد مُروّجہ اصناف کے خلاف شکایت یا اعلانِ بغاوت کا نہ تھا۔ اُس نے محض اِس امر کی جانب اشارہ کرنا چاہا تھا کہ نواب تجمل حسین خاں کی مدح سرائی کے لئے قصیدے کی صنف غزل سے زیادہ موزوں ہوتی۔ ورنہ ہم کلامِ غالب میں کسی نئی صنفِ شاعری کا کوئی نمونہ یا اُس کے اختراع کی ضرورت کے متعلق مکاتیبِ غالب میں کوئی اِشارہ ضرور پاتے۔ دورِ حاضر میں اقبال کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اقبال کی شاعری گل و بلبل والی رسمی شاعری نہیں ہے۔ اقبال کا شمار دنیا کے اُن بڑے شعرا میں ہے جو انسانیت کے لئے ایک پیام لے کر آئے۔ پھر بھی اقبال کی کلیاتِ نظم میں کوئی مغربی وضع کی انقلابی نئی صنفِ شاعری نہیں ملتی۔ اُس کا پیغام مثنوی اور قطعے کی صورت میں ملتا ہے۔ چکبست اور محروم جدید اُردو شاعری میں اپنی ایک مخصوص جگہ رکھتے ہیں اور ایک خاص رتبے کے مالک ہیں۔ تاہم ان کے ہاں اصنافِ سخن نئی نہیں۔ ہر چند کہ خیالات نئے ہیں۔ جدید اُردو شاعری کے سب سے بڑے علمبردار جنابِ جوش ملیح آبادی ہیں۔ بلاشبہ آپ ہندوستان کے شاعرِ اعظم ہیں اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ آنے والی نسلیں جوش کو نہ بھُلا سکیں گی اور جوش کا کلام مشرق و مغرب کو یکساں طور پر متاثر کرتے رہے گا۔ جنابِ جوش نے بھی معیاری اصناف پر اکتفا کیا ہے اور کوئی نئی صنف نہ ایجاد کی ہے، نہ مغرب سے مستعار لی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اُردو شعرا کے ایک مخصوص گروہ کو علی الخصوص جبکہ اُن کے پاس دُنیا کیلئے کوئی خاص پیام بھی نہیں جس کے اظہار کے لئے کسی انوکھی صنف کی ضرورت ہو، مغرب کے سامنے دامن پھیلانے کی حاجت کیوں پیش آ رہی ہے اور کس تقاضائے شعری سے مجبور ہو کر ان حضرات کو اُردو شاعری میں نظمِ معریٰ اور نظمِ آزاد کو رائج کرنا پڑا ہے۔

اردو ادب میں شعر کی تعریف یہ ہے کہ وہ باوزن ہوتا ہے، مقفّٰے ہوتا ہے اور بالقصد ہوتا ہے۔ وزن و قافیہ شعر کے ملبوس ہیں، الفاظ شعر کا جسم اور خیالِ شعر کی جان۔ اُردو شاعری میں وزن و قافیہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ انگریزی شاعری میں دو صنفیں ایسی ضرور موجود ہیں جن میں سے ایک قافیے کو اور دوسری وزن و قافیہ دونوں کو تسلیم نہیں کرتی۔ اول الذکر بلینک ورس یعنی نظمِ معریٰ اور ثانی الذکر کو "فری ورس" یعنی "نظمِ آزاد" کہتے ہیں۔ آزاد شاعری ہر چند نظمِ معریٰ کا ایک منطقی نتیجہ ہے، لیکن یہ خود انگریزی ادب میں ایک نیا فتنہ ہے۔ نہ کہ ادب کی تعمیری شاخ۔ غیر مقفّٰی شاعری البتہ ادبِ انگریزی میں ایک مسلّم حیثیت رکھتی ہے۔ مگر جن ضروریاتِ شعری کے تحت انگلستان میں غیر مقفّٰے شاعری کا رواج ہوا وہ اور تھیں اور ہماری موجودہ ضروریاتِ شعری کچھ اور ہیں۔ پھر یہ کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ انگلستان جغرافی، تمدنی اور لسانی اعتبار سے ہندوستان سے قطعاً مختلف ہے۔ انگریزی زبان پر قدیم یونانی و لاطینی اور جدید یورپین زبانوں اور اُن کے شعر و ادب کا اثر پڑا اور ہماری اُردو زبان پر عربی و فارسی اور ہندوستان کی مختلف زبانوں اور اُن کے شعر و ادب کا۔ اسی لئے اُن کے طرزِ موسیقی اور اصنافِ شاعری اور ہمارے طرزِ موسیقی اور اقسامِ سخن میں بُعد المشرقین ہے۔ ہر چند کہ مقفّٰی شاعری انگلستان میں عام ہے مگر ردیف کا استعمال خال خال ہے اور وہ بھی بیشتر از راہِ مزاح و تمسخر۔ اس کے برعکس ہم ردیف و قافیہ اور وزن و بحر کے بغیر اُردو شعر کا تصوّر دل میں نہیں لا سکتے۔

دیکھیں انگریزی شاعری کے اسالیبِ اظہار ابتداً کیا تھے اور نظمِ معریٰ کی ابتدا اس زبان میں کیونکر ہوئی۔ ولیم فاتحِ انگلستان کے حملے سے پیشتر اور اُس کی آمد کے صدیوں بعد تک اینگلو سیکسن شاعری کی بُنیاد [illegible] یعنی صنعتِ تجنیس پر تھی، نہ کہ قافیہ اور وزن پر، ہر چند کہ تجنیسِ حرفی کی شکل معکوس قافئے سے مشابہ ہے۔ چاسر اور اُس کے معاصرین و متبعین نے فرانسیسی شاعری کے زیرِ اثر باوزن و مقفّٰی شاعری کی بدعتِ حسنہ کا ارتکاب انگریزی میں کیا۔ وقت کا فیصلہ چاسر کے حق میں ہوا۔ چنانچہ پُرانی اینگلو سیکسن شاعری اپنی موت مر گئی اور مقفّٰی شاعری انگریزی زبان کی فطری شاعری قرار پائی۔ چاسر کا دور

افسانہ خوانوں کا دور تھا۔ اُس کا اور اس کے معاصرین و متبعین کا مقفّیٰ کلام مثنوی کے طرز میں ہے کیونکہ مثنوی افسانہ بیان کرنے کیلئے موزوں ترین صنف ہے۔ تاہم فرانسیسی اور لاطینی سے ہفت مصرعی اور نہ مصرعی بند Stanzas بھی مستعار لئے گئے جن میں قوافی کی تکنیک مثنوی سے الگ اور اُلجھی ہوئی ہے۔ ہنری ہشتم کے عہدِ حکومت میں انگلستان بھی یورپ کے نشاطِ ثانیہ سے بہرہ اندوز ہوا اور اہلِ انگلستان بھی فنونِ لطیفہ کی طرف مائل ہونے لگے۔ وِیاٹ نے سانیٹ کو انگریزی زبان میں رائج کیا۔ اُنہی دنوں اَرل آف سرے نے ورجل کی لاطینی رزمیہ "اینیڈ" کے دو دفتروں کا ترجمہ انگریزی زبان میں بصورت نظمِ معریٰ کیا۔ نظمِ معریٰ ایک اطالوی الاصل صنفِ شاعری ہے اور انگریزی ادب سے اس کو متعارف کرانے کا سہرا ارل آف سرے کے سر ہے۔ خود شاعر نے اطالوی شعراء کی تقلید سے زیادہ غالباً اپنی آسانی اور تفریحِ طبع کے خیال سے ایسا کیا۔ وہ ہنری ہشتم کے حکم سے قید تھا اور قید خانے میں دل بہلاؤ کے طور پر غیر مقفّیٰ اشعار میں اس لافانی لاطینی شاہکار کا ترجمہ کرنے میں اس نے اپنے وقت کا ایک حصّہ خوشگوار طریق پر صرف کیا۔ اگر اُس کا مقصد واقعی کسی ادبی تصنیف کا ہوتا تو معیاری مقفّیٰ اشعار کو اپنا ذریعۂ اظہار بناتا۔ لیکن وہ ایسا کرتا تو اُس کے عہد کی ضروریاتِ شعری تشنۂ تکمیل رہ جاتیں۔

آخر وہ کونسی ضروریاتِ شعری تھیں جن کے تحت غیر مقفّیٰ شاعری انگریزی زبان میں رائج ہوئی؟ ڈراما نگاری ملکہ الیزبتھ کے زمانے میں بہت مقبول تھی۔ ڈراما کی زبان اُن دنوں نثر نہ تھی، نظم تھی اور نظم بھی مقفّیٰ۔ ظاہر ہے کہ مقفّیٰ مکالمے ایک بے حد غیر طبعی چیز ہوتے ہونگے۔ لیکن نہ تو اُس زمانے میں مصنّف یہ سوچ سکتا تھا کہ ڈراما نثر میں لکھا جا سکتا ہے اور نہ پبلک اِسے گوارا کر سکتی تھی کیونکہ یونانیوں کے زمانے سے یہ مان لیا گیا تھا کہ ڈراما شاعری کا ایک شعبہ ہے۔ اِن حالات میں نظمِ معریٰ کو مقفّیٰ شاعری اور روزمرہ کی نثر کے بین بین ہونے کی وجہ سے ڈراما کی زبان بنا لیا گیا۔ پھر بتدریج نثر ڈرامے میں داخل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وقت گذرنے پر کامیڈی نثر میں اور ٹریجیڈی غیر مقفّیٰ نظم میں لکھی جانے لگیں۔ آج کل مکالمے کا ذریعہ نثر کو تسلیم کر لیا جا چکا ہے۔ ڈراما (بجز مستثنیات) نثر میں لکھے جاتے ہیں۔ ملٹن نے اپنی رزمیہ "فردوسِ گم شدہ" بھی نظمِ معریٰ میں تصنیف کی۔ ملٹن کا تخیل بلند تھا، مضامین ادق تھے، زبان شاعرانہ تھی اور کردار آسمانی، ملکوتی، مابعد الطبیعاتی۔ مقفّیٰ نظم میں ادا کرنا بہت سی مشکلیں اور پابندیاں اپنے سر لے لینا ہوتا۔ نثر اُسے نہایت ادنیٰ درجے کا ذریعۂ اظہار معلوم ہوتی۔ ویسے بھی رزمیہ شاعری انسانیت کے دورِ ابتدائی سے متعلق ہوا کرتی ہے۔ اس میں تکلفاتِ شاعری سے غرض نہیں ہوتی۔ اس میں ٹھوس تاریخی اور روایتی پلاٹ، طویل مدتِ وقت، ڈرامائی کردار نگاری سے کام لیا جاتا ہے، نہ کہ محض شاعری اور خیال آفرینی سے۔ غرض کہ اس طور پر نظمِ معریٰ انگریزی ادب میں ڈراما اور رزمیہ کی زبان ٹھہری۔ پھر اس درجہ مقبولِ عوام و خواص ہونے کے بعد، از قبیلِ تعجبات نہیں اگر بہت سے بڑے اور بے شمار چھوٹے شعراء نے ڈراما کے خداوند، شکسپیر اور رزمیہ کے واحد مالک، ملٹن کی تقلید میں بہت سی غیر ڈرامائی اور "محض بزمیہ" نظمیں بھی غیر مقفّیٰ کہیں۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ غیر مقفّیٰ شاعری "نیم نثر و نیم نظم" سے زیادہ حیثیت نہیں نہیں رکھتی۔ بلکہ بعض معنیٰ میں انگریزی نثر نگاری غیر مقفّیٰ شاعری کی ممنونِ احسان ہے اور نظمِ معریٰ نظم و نثر کے درمیان کی ایک کڑی ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بجز مغرب کی تقلید کے وہ کونسا جذبہ ہے جس کے تحت اُردو میں نظمِ معریٰ کو جاری کیا جا رہا ہے۔ ڈراما کی زبان نثر تسلیم کی جا چکی اور نظم، عام اِس سے کہ وہ مقفّیٰ ہو یا غیر مقفّیٰ، دیارِ تمثیل نگاری سے خارج البلد ہو چکی۔ چنانچہ سنے ادب کی حدود میں بھی منظوم ڈراما مفقود ہے۔ رزمیہ شاعری کا زمانہ ختم ہوئے صدیاں بیت گئیں۔ اُردو شاعری کی پیدائش سے کہیں پہلے سے دُنیا کے کسی ادب میں کوئی رزمیہ نہیں لکھی گئی۔ لارڈ بائرن نے ضرور اپنی غیر مکمل نیم مزاحیہ نظم "ڈان جان" کو (جو غیر مقفّیٰ نہیں ہے) ابتداً (ایک نئی قسم اور نئی فیشن کی) رزمیہ کہا تھا۔ اُردو میں غالباً جناب حفیظ جالندھری نے بھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے۔ آپ کی خواہش اتنی ہے کہ اپنے شاہنامے سے اسلام کو زندہ کریں اور یہ خواہش بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی کیونکہ اسلام ابھی خود ہی زندہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس "ادبی اوکاسا" سے پھر جوان ہو جائے۔ مشرق کے لئے یہ بات ضرور لائقِ فخر ہے کہ فردوسی کا "شاہنامہ" مقفّیٰ اشعار میں ہے اور پنجاب کے لئے یہ مایۂ ناز ہے کہ جنابِ حفیظ کا "شاہنامہ" غیر مقفّیٰ نہیں۔ بہرحال اب نہ رزمیہ شاعری کا وقت ہے اور نہ اس ارادے سے غیر مقفّیٰ نظم اُردو شاعری میں رائج کی جا رہی ہے۔ نہ فلسفے یا مسائلِ مابعد الطبیعات کے کسی شاعرانہ زاویۂ نگاہ کو بحث میں لانے کے لئے اس نظریئے سے اس صنف کا جواز پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان مباحث کے اظہار کے لئے

نئے اسالیب کے بغیر چارہ نہیں۔ جن شعراء نے یہ صنف منتخب کی ہے اُن کے پاس عنوانات و مباحث بھی یکسر غیر شاعرانہ ہیں۔ وہ بسا اوقات مادیات، معاشیات اور واقعیت کے غیر دلچسپ پہلوؤں پر ارزاں اور سامنے کے خیالات پیش کرتے ہیں اور سب کے سب جنسی بھوک میں مبتلا ہونے کے دعویدار ہیں گویا مجسم "صنعتِ تجنیس" ہو رہے ہیں اور سب کے تقاضے تنگ ہیں۔ ان کا خیال رنگینی اور تندرستی سے معرّیٰ ہے۔ غور کیا جائے تو ان کے مباحث نثر میں بھی پھیکے نظر آتے ہیں کیونکہ اُن میں گہرائی اور وسعت نہیں۔ تاہم ان مباحث کا صحیح ذریعۂ اظہار نثر ہے نہ کہ نظم۔ وہ دن گئے جب قواعد اور حساب کے گُر اشعار میں یاد کرائے جاتے تھے۔ اب نظم و نثر ادب کے دو مختلف شعبے ہیں۔

آزاد شاعری ہنوز انگریزی ادب میں بھی طفلانہ اور تجرباتی حیثیت رکھتی ہے اور ابھی دو چار پشت مستند نہیں کہلا سکتی بشرطیکہ وہ اتنے دن زندہ رہ جائے اور اس میں کلام ہے۔ عہدِ وکٹوریہ کے ادب کے خلاف جو علمِ بغاوت بلند ہوا تھا، وہ جارج پنجم کے عہد میں مختلف صورتوں میں رونما ہوا۔ انہی میں سے ایک صورت آزاد نظم ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم نے اور چیزوں کی طرح ادبی قدروں میں بھی ہیجان و انقلاب برپا کر دیا۔ معیاری شاعری کے خلاف آزاد نظم کا تجربہ کیا جانے لگا۔ انسانیت ایک دماغی خلجان میں مبتلا ہو گئی۔ مگر ایک اور وجہ بھی ہے جس کی بنا پر انگریزی شاعری کی یوں مٹی پلید ہو رہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آج انگلستان میں کئی پشتوں سے کوئی واقعی بڑا شاعر نہیں ہے۔ آزاد شاعری کے جواز میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شاعرانہ خیال نظم کی طرح نثر میں بھی لطافت کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے، چنانچہ اُردو کے ادبِ لطیف میں اشعارِ منثور کی کمی نہیں۔ "شہاب کی سرگزشت" "نگارستان" اور "جمالستان" میں ہر ہر صفحے پر ایسی شاعرانہ حسن کاری کے نمونے ملتے ہیں جن پر بے اختیار سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ "نگار" کے دورِ اولیں میں "اشعارِ منثور" کے عنوان سے مدتوں حسین و لطیف خیالات کا ایک سلسلہ طبع ہو چکا ہے۔ مگر اس شاعرانہ نثر کو نظم نہیں کہا جا سکتا۔

اور جدید نظمِ "آزاد" تو ایک بالکل نئی چیز ہے اور نئی خصوصیات کی حامل۔ ہمارے "آزاد" شعراء اپنی پوری فنکارانہ قابلیت اس امر پر صرف کر دیتے ہیں کہ اُن کی طبعزاد "آزاد نظم" پر ترجمے کا شبہ ہو۔ چنانچہ خیال اور نشستِ الفاظ مغربی وضع کے رکھے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ التزام رکھا جاتا ہے کہ مختلف لمبائی کے ٹکڑے اس طرح جمائے جائیں کہ پڑھنے والے پر یہ اثر پڑے کہ وہ نظم پڑھ رہا ہے نہ کہ نثر، ہر چند کہ اس نظم کے ٹکڑوں کے وزن و بحر اس کی سمجھ سے بالاتر (ہوں)۔

دراصل آزاد و معرّیٰ نظمیں اُس صنفِ شعراء کا عجز ظاہر کرتی ہیں جو شاعرانہ پابندیوں کے ساتھ شعر نہیں کہہ سکتے اور اس لئے غیر موزوں اور ناموزوں اصنافِ سخن کو اپنا ذریعۂ اظہار بناتے ہیں۔ اس میں ایک طرف آسانیاں ہیں اور دوسری طرف وہ جذبۂ فریبِ خود فریبی جو انہیں خود اُنکی اور اُن کے پرستاروں اور مقلدوں کی نگاہ میں مجتہد بناتا ہے۔ شاعرانہ خیالات پر وہ ایسے موضوعات کو ترجیح دیتے ہیں جو غیر شاعرانہ سہی، مگر حلقۂ شعر و ادب میں نئے ہیں۔ کیونکہ حُسن و عشق پر ہزاروں اُن سے بہتر کہہ چکے ہیں اور مادیات و معاشیات پر حقیقی شعراء طبع آزمائی کرنے سے رہے۔ زبان ان کی عامیانہ اور غیر فصیح اور غلط ہوتی ہے مگر زبان کی طرف وہ خیال کرنا بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ زبان کی وجہ سے وہ "خیال" کا خون کرنا نہیں چاہتے مغرب زدگی کی دُھن میں اصنافِ سخن، موضوعات، زبان و محاورہ کو تو وہ کیا قابلِ اعتنا سمجھیں گے۔ بعض نے تو اپنے اچھے خاصے مردانہ ناموں کو رشکِ مستورات بنا لیا ہے۔ خدا رحم کرے اور عقل دے جس انہماک کے ساتھ یہ حضرات خدمتِ ادب میں مبتلا ہیں، کاش اُس کی عشرِ عشیر سنجیدگی سے وہ سوچیں کہ اُن کے "شہ پاروں" سے ادبِ اُردو کو اور اُن کے زاویۂ نگاہ سے ہندوستان کے ادبی اور سماجی مقاصد کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے اور کتنے ناپختہ حضرات کے لئے اُن کی روش خطرناک ہو سکتی ہے۔ ادبی اور سماجی مسائل کا حل مغرب زدگی نہیں ہے!

فنا و بقا کے ترانے

نظم

حضرت شفق مینائی

پانی ہوا کی بن کے گرہ بلبلا ہُوا
عقدہ کشائے رازِ فنا و بقا ہُوا

مٹی میں رنگِ خونِ شہیداں ملا ہوا
لالے کا پیرہن ہُوا گل کی قبا ہُوا

کعبے میں میرا رخ اسی بت کی طرف رہا
قبلہ ہی میرے واسطے قبلہ نما ہُوا

موجوں نے اس کو کھینچ کے ساحل دکھا دیا
جس ناؤ کا بھنور میں خدا ناخدا ہُوا

آہیں مری غریب کی فریاد بن گئیں
نالہ شکستِ شیشۂ دل کی صدا ہُوا

اشکوں سے دل کا داغ ہے روشن خدا کی شان
پانی میں جل رہا ہے چراغ اک بجھا ہُوا

بستر کی ہر شکن پہ تھا صبحِ شبِ فراق
نقشہ کسی کے دل کی تڑپ کا کھچا ہُوا

آنا لہو کا آنسوؤں میں بے سبب نہیں
ٹانکا ہے کوئی زخمِ جگر کا کھلا ہُوا

پوچھا گیا جو قابلِ پرسش گناہ تھا
بخشا گیا وہ جرم جو حد سے سوا ہُوا

اس خونِ بیگناہ کے قربان جو شفق
سرخیٔ داستانِ شہیدِ وفا ہُوا

قطعہ

پیش نظر تھا، گورِ غریباں میں ایک دن
ہر سمت بیکسی کا مرقع کھچا ہُوا

قبریں وہ ٹوٹی پھوٹی نشیب و فراز میں
پامال پائتی تھی سرہانا گھسا ہُوا

ٹھوکر سی ایک دل کو لگی ہائے کیا کہوں
دیکھا شکستہ کاسۂ سر اک پڑا ہُوا

گویا زبانِ حال سے دیتا تھا یہ صدا
تجھکو خبر نہیں کہ مرا حشر کیا ہُوا

بچپن سے میں ترقیٔ عہدِ شباب تک
آغوش میں تھا ناز و نعم کے پلا ہُوا

تکیہ تھا میرا زانوئے محبوبِ دلنشیں
پیوندِ خاک اب صفتِ نقشِ پا ہُوا

یہ سنتے ہی میں دوسری دنیا میں تھا شفق
عالم سے وہ جدا تھا جو عالم مرا ہُوا

ہر مشتِ خاک نے دیا عبرت کا اک سبق
ہر ذرّہ اک معلّمِ درسِ فنا ہُوا

گندی نالی!

نفسیاتی تحلیل

جناب میرزا ادیب بی-اے (آنرز)

اپنی کوٹھری کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کی انگلیاں خود بخود کٹ کی اندرونی جیب سے جا لگیں - اور دوسرے لمحے میں چند اور وزنی سکے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر چمک رہے تھے - ایک ہی نظر اس نے ان تمام سکوں کو شمار کر لیا - پھر انھیں اسی جیب میں رکھ ہنی طور پر کسی کو مخاطب کئے بغیر اپنی زبان سے فحش گالیاں اس طرح گا جیسے کسی بڑی مزیدار چیز کو مزے لے لے کر چبا رہا ہو - یہ رقم چار پانچ دن کی متواتر ناکامیوں کے بعد کہیں جا کر حاصل ہوئی تھی لئے وہ قدرتی طور پر بہت مسرور تھا - اور اس کا دل چاہتا تھا ی شاندار پروگرام بنا کر پوری طرح عیش کرے - چنانچہ عیش د رت کی نئی نئی صورتیں اس کے دماغ میں ناچ رہی تھیں -

کچھ عرصہ سے نہ معلوم لوگوں کو کیا ہو گیا تھا کہ جیسے ہی اس کی صورت تے تھے - ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر اپنی جیبوں تھ رکھ لیتے تھے - یا جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے کہیں بہیں جا پہنچتے تھے - اور وہ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا تھا - پرسوں کے وقت اس نے انارکلی کے کم و بیش دس چکر لگائے تھے - ہر بار بھاری اور وزنی جیبوں کا اندازہ کرنے کے باوجود بابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی - آخر یہ رقم ایک بوڑھے جن کی جیب سے نکل کر اس کی جیب میں آئی تھی - اور ابھی تک جن کی جیب کا میلا کچیلا چھوٹا سا ٹکڑا اس کی قمیص کے جیب پڑا ہوا اسے اس کے حیرت انگیز ہنر کا یقین دلا رہا تھا - یہ کپڑا نے اس لئے محفوظ کر لیا تھا تا کہ اپنے کرتے کے پھٹے ہوئے دامن تو ند لگا لے -

مسلم ہوسٹل کا لذیذ پلاؤ - مزیدار شامی کباب - بھنا ہوا اشتہا بر گوشت اس کی نظروں کے سامنے پھر رہا تھا - لوہاری دروازے ونے پر حلوائی کی دکان پر سجی ہوئی طرح طرح کی مٹھائیاں اس کے ہ کو مہکا رہی تھیں - اور پھر ہیرا منڈی میں شراب کی دکان پر رے کی بوتل —— یکایک اسے رائل سینما میں لگی ہوئی نئی فلم کا

خیال آ گیا - "ہنٹر والی" کا وہ ایک عرصہ سے بڑی بیتابی کے عالم میں انتظار کر رہا تھا - فلم کا تصور کرتے ہی اس کے تخیل میں دو گوشت سے بھرپور، نیم عریاں، شفاف زانو چمکنے لگے - اور جیسے ہی اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا - جنسی احساس کی حلاوت اس کے لعاب میں گھل مل کر نیچے اترنے لگی - ناڈیا، اس کی دلپسند "لڑکی" (ہیروئن) تھی - جس کی ایک ایک فلم کو سات سات آٹھ آٹھ مرتبہ دیکھا تھا - اور جس کے بہادرانہ کارناموں کو وہ اپنے دوستوں کے سامنے بڑے غرور کے ساتھ نتھنے پھلا پھلا کر بیان کیا کرتا تھا - ایک بار اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا - کیوں نہ میں بھی بمبئی پہنچ کر ناڈیا والی کمپنی میں ملازم ہو جاؤں - اور پھر ناڈیا کو دوست بنا لوں کوٹھے سے چھلانگ لگانا میرے لئے بڑا آسان ہے - لیکن یہ خیال نہ معلوم کس جذبے کے زیر اثر اس وقت ذہن کے غیر شعوری حصے میں دب کر رہ گیا - شاید وہ سمجھتا تھا میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں جو شخص پڑھا لکھا نہ ہو اس کی دنیا میں عزت ہی کیا ہے - کمپنی کا مالک مجھے دیکھتے ہی نوکر سے کہدے گا - اسے دھکے مار مار کر کمپنی سے باہر نکال دو -

ایک دو منٹ تک کوٹھری میں کھڑے رہنے کے بعد وہ باہر نکل آیا اور یونہی ایک جگہ کھڑے ہو کر گنگنانے لگا - "میرے لئے جہان میں چین نہ قرار ہے —— میرے لئے جہان میں —" ناڈیا اب نورجہاں میں تبدیل ہو گئی —— ہش، وہ بھی کوئی عورت ہے دبلی پتلی - اور اچانک اسے محلے کی نحیف و نزار بھٹیارن یاد آ گئی - بے اختیاری کے عالم میں قدم اٹھاتا ہوا وہ اس کی دکان پر پہنچ گیا - بھٹیارن اپنی چھوٹی لڑکی کے سر سے جوئیں نکال رہی تھی - اس نے ہاتھ جیب میں ڈالا اور دو پیسے نکال کر بھٹیارن کے آگے لکڑی کے تختہ پر پھینک دیئے - بھٹیارن مسکرا اٹھی - "چنے لوگے؟" اس نے پوچھا

"جو تمھارا جی چاہے دیدو میری جان!" اس نے آنکھ مار کر کہا -

"میں تو کچھ بھی نہیں دیتی ——!" بھٹیارن نے تنگ آ کر

لڑکی کے بالوں کو کھینچتے ہوئے کہا - لڑکی بلبلا اٹھی۔

"بڑی ظالم ہو - اس بیچاری کا کیا گناہ ہے بھلا - تمہارے سر میں جوئیں نہیں ہیں - نہ صابن سے اسے نہلاتی ہو - نہ اچھے کپڑے دیتی ہو میں اپنی لڑکی کو ——— لو چار آنے، صابن لا کر اسے خوب نہلانا ——— اور مارنا نہیں، ورنہ اچھا نہ ہوگا - چنے دو نا اب - مجھ سے زیادہ باتیں نہ کیا کرو - بُرے لوگ ہیں اللہ قسم ——— !" یہ کہتے ہوئے وہ غم و غصّے سے دانت پیسنے لگا - جب اس نے ساڑھے چار آنے اپنے ازار بند میں باندھ لئے - اور دو پیسے کے چنے تول کر اس کی جھولی میں ڈال دیئے - جھولی میں چنے لے کر ایک ایک دانہ مُنہ میں ڈالتا ہوا وہ کوٹھری کے سامنے گندی نالی کے قریب کھڑا ہو گیا - اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا - نالی کے ایک طرف ایک خارش زدہ مردار کتّا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو کرید کر رزق تلاش کر رہا تھا - کچھ دور مائی جمّن نفرت و کراہت سے مُنہ دوسری طرف پھیرے رات کی باسی دال نالی میں بہا رہی تھی - اسی اثنا میں اس نے دیکھا کہ لالہ دولت رام کے مکان سے ان کی بیوی نے کپڑے میں کوئی چیز لپٹی ہوئی پانی میں پھینک دی - اور آپ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی - وہ گندے پانی میں ہلکی سی سرخی کو آہستہ آہستہ پھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ اس کے سامنے سے پیرالٰہی بخش کا پُرانا نوکر اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا گزرنے لگا - اس نے چند دانے نشانہ بنا کر اس کے سر پر مارے اور پھر زور سے ہنس پڑا - نتھو رحم طلب نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"کدھر جا رہے ہے گنجے بابا! اِدھر تو آؤ ذرا" اس نے نتھو کو بلاتے ہوئے کہا - نتھو اس کے پاس آ کھڑا ہوا

"تیری آنکھیں لال ہیں - کیوں کیا بات ہے؟ مارا ہے پیرجی نے کیا؟" اور اس نے پیرجی کی ماں کے ساتھ بڑے خوفناک رشتے کا اعلان کرتے ہوئے تھوک دیا۔

"رویا نہ کرو بیٹا - یہ لوگ بڑے بد ذات ہیں - میری سنو، میری ماں مرگئی تھی تو میرا کوئی بھی نہیں تھا - عمر ہوگی کوئی نو برس کے لگ بھگ میرے چہرے پر، پیٹھ پر بڑے بڑے پھوڑے نکل آئے تھے - لوگ میری طرف دیکھتے بھی نہیں تھے - میری طرف دیکھ کر تھو آتی تھی انھیں پیپ جو بہتی رہتی تھی میرے پھوڑوں سے - کوئی شخص بھی نوکر نہیں رکھتا تھا - سمجھے بیٹا! پھر بھی میں زندہ رہا، لو بیٹا یہ دو روپے لو - تم بھی کیا یاد کروگے؟" اور دو روپے نتھو کی ہتھیلی پر رکھ کر وہ کسی تھیٹر کے ایکٹر کی طرح بولا - "جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں"۔

دونوں ہنس پڑے - اور اس نے نتھو کو از راہ مذاق دھکا دے دیا۔ نتھو کی ایک ٹانگ نالی میں جا پڑی - دونوں کے تہمد خراب ہوگئے۔ نتھو چلا گیا۔

نتھو کے جانے کے دو چار منٹ بعد اس نے خوانچہ فروش سے دو آنے کے رس گلّے لئے - اور انھیں کوٹھری کی دہلیز پر بیٹھ کر مزے سے کھانے لگا - اور ساتھ ہی ساتھ نتھو کی حالت پر بھی غور کرنے لگا - اس نے نتھو کو ہمیشہ منہ بسورتے ہوئے دیکھا تھا - اور اسے دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ سی لگتی تھی - نتھو کی حالت پر غور کرتے کرتے وہ اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔

وہ سوچنے لگا - آخر اس گندی نالی اور اس کی زندگی میں فرق کیا ہے؟ جس طرح لوگ اس گندی نالی کے قریب سے گزرتے وقت اپنے دماغ کو بدبو سے بچانے کے لئے ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں - فرطِ نفرت سے تھوک دیتے ہیں - اس کی ایک آدھ چھینٹ کپڑے پر گر جائے تو کپڑے کو فوراً جسم سے اُتار کر صابن سے دھو ڈالتے ہیں - اسی طرح ہر شریف آدمی اس کے وجود سے، اس کے جسم سے پرہیز کرتا ہے - جیسے اس کے اندر گندگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے - جیسے اس کے جسم سے سخت بدبو آ رہی ہے - گندی نالی کی طرح کیچڑ ——— غلاظت اور طرح طرح کی آلائشوں سے بھرا ہُوا ہے - ایک بار وہ اپنے کسی دوست کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تھا - ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا گندے پانی کے قریب رہنا بہت بُرا ہے کیونکہ گندے پانی میں جان لیوا بیماریوں کے کیڑے ہوتے ہیں - اور اس نالی میں اس قسم کے کیڑے ضرور ہوں گے - اور اس کے اندر بھی ایسے کیڑے ہونگے - اور یکایک اس کے ذہن میں بچپن کا ایک واقعہ کلبلانے لگا - اس کی ماں کے مرنے کے بعد کوئی شخص بھی اس کا پرسان حال نہیں تھا - جسم پر جابجا بڑے بڑے پھوڑے نکل آئے تھے - ماں زندہ تھی تو ان پھوڑوں پر مرہم لگاتی تھی - گرم پانی سے انھیں دھوتی رہتی تھی - مگر جب وہ مرگئی تو کسی نے بھی اس کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا - ہر شخص اُسے دیکھ کر نفرت سے مُنہ پھیر لیتا تھا - اسی زمانے میں اس کی پیٹھ کا پھوڑا اگہرا اور پھیلتا چلا گیا - اور اس میں کیڑے پڑ گئے - شدتِ درد سے وہ تمام رات تڑپتا رہا - پیٹھ پر پھوڑے کے پاس بے اختیار ہو کر مُکّے مارتا رہتا تھا - لیکن درد کی شدت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی تھی - ستم یہ کہ بے شمار مکھیاں اس پھوڑے پر بیٹھ کر اسے تنگ کرتی رہتی تھیں - ایک رات اس نے درد سے بیقرار ہو کر اپنی انگلیاں

پھوڑے کے اندر ڈال دیں۔ زردی مائل لہو کی ایک دھار اس کی ٹُن لُن پر بہ نکلی اور درد سے اس کی رگ رگ پھٹنے لگی۔ جیسے کسی تیز اور گرم نشتر سے اس کا عضو عضو کاٹا جارہا ہو۔ عالمِ وحشت میں وہ چیخ چیخ کر اپنی چھاتی پر دوہتڑ مارنے لگا۔ پھر اپنا گلا گھونٹنے لگا کہ جان نکل جائے۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت کہاں تھی؟ ضعف سے لڑکھڑا کر چولھے پر آگرا۔ صبح اس نے ایک ہمسائے کا برتن چرا لیا اور اسے بیچ کر جراح کے پاس چلا گیا۔ اسی دن اس نے سمجھ لیا کہ دنیا میں اگر اسے زندہ رہنا ہے تو اسی طرح زندہ رہنا ہے اور اس نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ وہ زندہ رہے گا۔ کیونکہ مرنے سے اسے ڈر آتا تھا۔ وہ سوچتا تھا لوگ اس سے اتنی شدید نفرت کیوں کرتے ہیں۔ اس کا کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر بھی کہیں نوکری نہیں ملتی۔ شروع شروع میں یہ احساس ایک نوکدار کنکر کی طرح اس کے دماغ کے گودے میں چبھتا رہا اور اس کے اندر پیوست ہوتا چلا گیا آخر اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا کہ وہ واقعی ہے بھی قابلِ نفرت۔ ذلیل، قابلِ نفرت اور رکردہ ——— اور اس نے پہلے کی طرح عزت و دولت کے تصور میں سرگرداں رہنا چھوڑ دیا۔ اس کی نظروں میں انسانی زندگی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک ذلیل زندگی، اس کی کوٹھری کے باہر بہنے والی گندی نالی کی طرح ——— اور ایک باعزت زندگی جو اس نالی سے پرہیز کرے۔ آج اس کے ذہن میں ایک نیا سوال پیدا ہوا۔ وہ زندہ کیوں ہے؟ اس کی زندگی کی ضرورت کیا ہے؟ فائدہ کیا ہے اس کی زندگی کا۔ وہ تو بدبودار نالی ہے جہاں لوگ محلے بھر کی گندگی پھینک دیتے ہیں۔ کوڑا کرکٹ کا ڈھیر ہے اور کیا ہے؟

اس نے پاس پڑے ہوئے پتے کو اٹھا لیا۔ اور اسے زبان سے چاٹنے لگا۔ ہلکی سی مٹھاس اس کی زبان میں پھیل گئی۔ اور وہ کوٹھری سے باہر دیکھنے لگا۔ مردار کتا ڈھیر کے پاس لیٹ گیا تھا اور اب مائی جمن جوہوں کا بجز ایک بڑے مُردہ چوہیا کو پانی میں پھینک رہی تھی۔

نہ معلوم کیوں وہ خوش ہوکر گانے لگا۔ "میرے لئے جہان میں چین نہ قرار ہے ——— چین نہ قرار ہے ———" یکایک اسے اپنے اوپر غصہ آگیا ——— جیب میں اتنے پیسے موجود ہیں پھر یہاں پڑے رہنے سے فائدہ ———؟ وہ اٹھ بیٹھا اور کوٹھری کے دروازے کو بند کرکے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا انارکلی کی طرف جانے لگا۔

تین دن تک وہ ہیرا منڈی میں اپنے ایک بٹیر باز دوست کے مکان پر پڑا رہا۔ چوتھے دن۔ شام کے وقت دکان سے نکلا تو اس کی جیب میں صرف سوا گیارہ آنے کے پیسے تھے۔ صبح سے اس نے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ راہ میں اس نے نان مچھلی اور کچھ مٹھائی خریدی اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

محلے کی سبز دھم لالٹین کی مدھم روشنی میں کوئی شخص آہستہ آہستہ ہائے ہائے کر رہا تھا۔ وہ ٹھہر گیا۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا اور سر جھکا کر دیکھنے لگا۔

ننھو نیم دراز حالت میں پڑا اپنی گندی انگلیاں کُرتے کے دامن سے پونچھ رہا تھا۔

"کیا ہوا تجھے؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ——— انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔"

"کیوں ———؟" اس نے پوچھا۔

"کہتے تھے تو گھر میں بیماری پھیلا دیگا۔ کسی چیز کو ہاتھ مت لگا۔"

"گنجے پاپی! کہاں چلا گیا تھا میرے روپے لے کر ———؟" اس نے ننھو کے سر پر دھپڑ مار کر کہا "میں نے تو تجھے مٹھائی کھانے کے لئے کہا تھا۔ اور تو جا گھسا کسی ماں کے گھر۔ چل اٹھ اب!"

"کیا کروں سخت درد ہوتا ہے ٹیسیں، اف میرے اللہ!" ننھو نے بیقرار ہوکر کہا ———

"آبدمعاش! اٹھا لوں تجھے۔" اور اس نے ننھو کو گود میں اٹھا لیا اور اپنی کوٹھری میں لے گیا۔ "کچھ کھایا ہے یا نہیں؟" اس نے دیا جلاتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں، دو دن سے۔" وہ تو کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے۔"

"اب رو نہیں جانی، کھالے یہ۔ علاج کرتا ہوں۔ بالکل ارمان آجائے گا۔ اب اگر وہاں گیا تو مار ڈالونگا تجھے گنجے پاپی ———!"

سلاطین ہند کی شاعری

مقالہ

جناب مولوی نور احمد خان فریدی فاضل السنہ شرقیہ

کچھ بلبلوں کو یاد ہیں کچھ قمریوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

عربی کا ایک مشہور قول ہے "کلام الملوک ملوک الکلام" اور یہ اس قدر صحیح تسلیم کیا جاتا ہے کہ کسی نے آج تک اس کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کی۔ بایں ہمہ تعجب اس امر کا ہے کہ کسی [illegible] "کلام الملوک" کے جمع کرنے اور اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا [illegible] نہیں آیا۔ شعر و شاعری کی جب کوئی تاریخ مرتب ہوتی ہے سلاطین کے کلام کو نظر انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ایسے نغز گو سلاطین کا نام اردو اور فارسی کے غیر فانی شاعروں کی فہرست میں ممتاز جگہ پر تحریر کیا جاتا۔ ادب اور تاریخ کی کتابوں میں ایسے شعرا کا نام تو جلی قلم سے لکھا دکھائی دیتا ہے [illegible] شاعری کو [illegible] معاش کی غرض سے اختیار کر رکھا تھا مگر شاعری کے [illegible] سے وابستہ ہو کر خسرو۔ نظیری۔ عرفی۔ طالب آملی اور [illegible] نے شہرت دوام کا درجہ حاصل کیا۔ شعرا کی تاریخ میں ان کا [illegible] نہیں۔ کیا محمود غزنوی جس نے "جز بکام من آمد جواب" کہہ کر فردوسی کو ساٹھ ہزار انعام دیا تھا۔ خود طبع لطیف سے عاری تھا۔ جو عنصری کے کلام پر [illegible] کر کے تین بار اس کا منہ جواہرات سے [illegible] خود کلام موزوں کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ [illegible] نے ایک [illegible] کے بدلے شاعر کو اپنے گلے سے [illegible] مالا اتار کر دیدی تھی۔ اور کیا تاریخ کی کتابوں میں [illegible] نہیں ملتیں۔ کیا شاہ عالم ثانی کا مرثیہ فارسی ادب [illegible] وزیر علی خان کا کلام جس کے سوز و گداز [illegible] کتب سیر میں موجود نہیں ہے؟ کیا [illegible] بہادر شاہ کا کلام جسے حزن و ملال کا صحیح مرقع مانا گیا ہے [illegible] کی صورت میں [illegible] متداول نہیں ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ فارسی اور اردو ادب کی کتابوں میں سلاطین کی شاعری کا الگ باب نظر نہیں آتا؟ اور شبلی۔ حالی اور آزاد جیسے محققین نے اس عنوان پر کوئی جامع تصنیف کیوں نہیں چھوڑی؟ اس کا جواب دینا آسان ہے مگر سوال کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے سائل کی تشفی کرنی مشکل۔ میرا یہ [illegible] اہل ذوق [illegible] کے لئے صلائے عام ہے۔ اگر کسی درجہ [illegible] اس عنوان پر سیر حاصل مقالہ لکھ کر "کلام الملوک" سے مشرقی ادب کو متعارف کرایا۔ تو میں سمجھونگا۔ کہ میری کوشش کامیاب ہوئی۔ ورنہ ممکن ہے کبھی یہ جنون مجھے پٹنہ اور بھوپال لے جائے۔ اور [illegible] کتب خانوں سے استفادہ کر کے مشرقی ادب میں [illegible] کر سکوں۔ والی التوفیق۔

سلطان محمود غزنوی

اگرچہ سلطان کا کلام نہیں ملتا مگر اس کی قدردانی اور شعر فہمی کے تذکروں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اس کے دربار میں شعر و شاعری کا بازار ہمیشہ گرم رہا۔ اور شعرا نے توقع سے بڑھ چڑھ کر انعامات حاصل کئے۔ عضائری رازی نے ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ اور چودہ ہزار درہم انعام میں پائے۔ عنصری عہد محمودی کا ملک الشعراء تھا قصیدہ گو [illegible] اپنا کلام [illegible] کہا کرتے تھے۔ پھر انہیں دربار میں پڑھنے کی [illegible] ایک دفعہ سلطان نے خوش ہو کر اس کے منہ [illegible] بھرنے کا حکم دیا۔

فرخی بھی درباری شاعر تھا سلطان کی قدردانی سے اس کی امارت کا یہ عالم تھا کہ بیس غلام زرین کمر اس کی سواری کے جلو میں چلتے تھے۔

"شاہنامہ" عہد محمودی دربار کی یادگار ہے۔ اسے دقیقی نے شروع کیا۔ ایک ہزار شعر لکھنے کے بعد وہ بیمار پڑ گیا۔ پھر فردوسی نے اسے

رنگ میں لکھنا شروع کیا۔ اور ابھی اسلامی دور رہتا تھا۔ کہ وہ بھی سخت بیمار ہوگیا۔ یہاں تک کہ زندگی سے مایوس ہوگیا۔ بعد ازاں یہ خدمت اپنے اُستاد اسدی طوسی کے تفویض کی۔ اسدی نے کہا۔ کہ ضعف پیری کے باوجود میں اسے مکمل کروں گا۔ چنانچہ چار ہزار شعر استیلائے عرب سے عجم کی طرف حملہ کے پیش [illegible]۔ فردوسی [illegible] تندرست ہوچکا تھا۔ اس نے یہ شاہکار سلطان کی خدمت میں پیش کیا جس پر دربار سے ساٹھ ہزار درہم انعام میں مرحمت ہوئے۔ بعد میں جب سلطان کو شاہنامے کا ایک شعر ؎

اگر جز بکام من آید جواب
من و گرز و میدان افراسیاب

پسند آیا تو اس نے ساٹھ ہزار اشرفیاں اور فردوسی کو بھجوائیں۔ مگر جونہی سلطانی خزانے کا یہ قافلہ طوس میں داخل ہوا۔ فردوسی کا جنازہ دوسرے دروازہ سے نکل چکا تھا۔ یہ خزانہ فردوسی کی لڑکی کے حوالہ کیا گیا۔ مگر اس دریا دل خاتون نے قبول نہ کیا۔ آخر سلطان کے حکم سے طوس میں ایک عظیم الشان سرائے بنا دی گئی۔

سلطان غیاث الدین بلبن

ہندوستان کا یہ تاجدار بڑے دل گردے کا انسان تھا۔ عمر بھر میں کسی نے اسے ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ چہرے سے اتنی ہیبت برستی تھی کہ اس کے مشاہرے سے بڑے بڑے امرا کا زہرہ آب آب ہو جاتا تھا۔ ممالک غیر کے ہزاروں کامل الفن حکما، فضلا، مشائخ اور شعرا اس کے دربار میں جمع ہوگئے تھے۔ اور کئی بادشاہ اور شاہزادے جو چنگیزی سیلاب کی تاب نہ لاکر بے خانماں پھرتے تھے۔ اس کے آستانہ دولت کے نیچے پناہ گزین ہوتے تھے۔ شہر میں پندرہ محلے عباسی۔ سنجری۔ خوارزم شاہی۔ دیلمی۔ علوی۔ اتابکی۔ غوری۔ چنگیزی۔ رومی۔ سنقری۔ یمنی۔ موصلی۔ سمرقندی۔ کاشغری۔ خطائی کے نام سے آباد کرائے گئے تھے۔ جو جس ملک سے آتا۔ اُسی نام کے محلے میں مقیم ہوتا۔ اس طرح لین دین کے معاملات میں کسی کو تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اسّی برس کی عمر میں سلطان کا ولیعہد سلطنت سلطان محمد شہید ہوگیا۔ اگرچہ اس نے ظاہر بڑے ضبط سے کام لیا۔ اور اہل دربار سے کہا۔

من رضا بقضا دادہ از کشتہ شدن سلطان محمد شہید
محزون و متاثرنیم۔

لیکن جب محلسرا میں گیا۔ تو بند مکان میں خوب رویا۔ اور کیوں نہ روتا۔ کہ اس نے ساری عمر کی کوشش سے جو سلطنت حاصل کی تھی۔ اس کی مضبوطی اسی فرزند سے تھی۔ شہزادہ کیا گیا حکومت چلی گئی۔ چنانچہ بوڑھا سلطان نہایت [illegible] میں ان اشعار کو پڑھتا اور خوب [illegible] تھا [illegible] دنیا سے گزر گیا۔

اشعار ؎

نرگس پرپختہ گلبرگ [illegible]	چرا بینی سہ گرد باغ زنداں
پریدہ از چمن کبک بہاری	چرا چوں ابر خسرو چشم بزاری
فرومردہ چراغ عالم افروز	چرا روزم [illegible] دو شب بلیں دوز

جلال الدین خلجی

یہ بادشاہ نہایت [illegible] اور [illegible] طبع واقع ہوا تھا۔ بوڑھاپے میں خداوند تعالیٰ نے ہندوستان کی سلطنت عطا کی۔ چند سال نہایت [illegible] انصاف سے حکومت کرنے کے بعد اپنے بھتیجے علاؤالدین کے ہاتھوں رمضان شریف میں قتل ہوا۔ بادشاہ اس دن روزہ کے ساتھ تھا۔ اور افطار کو چند منٹ کی دیر تھی۔ کہ بدبخت بھتیجے نے جام شہادت پلا دیا۔ یہ شعر اسی سلطان سے منسوب ہے ؎

زخلق ارچہ آزار بینم بسے
نخواہم کہ آزردہ گردد کسے

سلطان محمد تغلق

یہ سلطان [illegible] بڑا فخر رکھتا تھا۔ اور جود و سخا کا یہ عالم تھا۔ کہ [illegible] تمام عمر کی سخاوت اس کے روزمرہ کے معمولی عطیہ کے برابر تھی۔ بلند ہمتی کا تقاضا یہ تھا۔ کہ تمام خزانہ ایک شخص کو بخش دے۔ [illegible] کو ایک دن میں [illegible] ہزار گھوڑے اور کروڑ تنگہ زر سرخ مرحمت کئے۔ ملک سنجر بدخشی کو اسی لاکھ تنگہ ملک الملوک کو ستر لاکھ تنگہ ملک [illegible] الدین کو چالیس لاکھ تنگہ اور ملک غزنوی کو ہر سال کروڑ تنگہ دیا کرتا تھا۔ ایک دن اپنے ایک امیر کو کسی جانب سے رخصت کر رہا تھا۔ فرمایا۔ کہ جو کچھ خزانہ میں ہے سب اسے دے دیا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور خزانہ میں ایک درہم بھی باقی نہ رہا۔ ایک دن مولانا جلال الدین حسام سلطان کی تعریف میں ایک قصیدہ [illegible]۔ [illegible] نے مطلع ہی پڑھا تھا کہ سلطان نے ہزار [illegible] روپے کی تھیلیاں منگوا کر اس کے حوالے کر دیں

اور فرمایا۔ کہ اس سے زیادہ نہ پڑھا جائے۔ کیونکہ میں اس کا صلہ نہ دے سکونگا۔ جب وقت نزع قریب آیا۔ تو فیروز خاں کو ولیعہد قرار دے کر یہ شعر پڑھا ؎

تو سر سبز باشی بشاہنشہی　　کہ من کردہ ام سر ز بالیں تہی

پھر یہ اشعار پڑھے اور جان دیدی ؎

بسیار دریں جہاں چمیدیم　　بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپان بلند بر نشستیم　　ترکانِ گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط آخر
چوں قامتِ ماہِ نو خمیدیم

سلطان محمد شاہ بن علاؤالدین حسن کانکو بہمنی

یہ بادشاہ نہایت بلند ہمت اور شجاع انسان تھا۔ والدہ حج کو تیار ہوئی تو اس نے خزانے کا تمام مال و متاع اور جواہرات بیش بہا نذر کر دیئے۔ بخت آشنا یاور تھا۔ کہ جہاں گیا فتح و نصرت نے آکر قدم چومے۔ بڑے بڑے گردن کش اور مغرور راجے مطیع کئے۔ ایکدفعہ کرسی پر بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ کہ ولیم پٹن کے راجہ کی شکایت پہنچی۔ اسی وقت اپنا خاص گھوڑا شبدیز طلب کیا۔ اس پر سوار ہو ہزاروں سواروں کیساتھ ولیم پٹن کو روانہ ہو گیا۔ ایک مہینے کی مسافت ایک ہفتے میں طے کر کے راجہ کے سر پر جا پہنچا اور اسے کیفر کردار کو پہنچایا۔ اسی طرح بیجانگر کے راجہ پر بھی قضائے مبرم کی طرح جا پڑا۔ چنانچہ اپنی بلند ہمتی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

ببیں از کجا تا کجا تاختیم　　بہ ولیم پٹن سر برافراختیم
بجلکوں سپردم عناں باز چوں　　بر آندم ز بیجانگر جوئے خوں
برانیم چوں بر پشتِ اسپ سیاہ
بخواہد ز من کوہ البرز راہ

سلطان حسین مشرقی

یہ شہریار فن موسیقی کا زبردست ماہر تھا۔ اس نے دھرپد میں تصرف کر کے چار مصرعوں سے دو مصرعے کر دیئے تھے۔ اور آہنگ میں تصرف کر کے اس کا نام خیال اور چٹکلہ رکھا۔ اس کا اثر شاعری پر یہ ہوا کہ گیت غزل کے قریب ہو گئے۔ اور عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش سے زبان پہلے کی بہ نسبت زیادہ صاف ہو گئی۔

سلطان غیاث الدین

یہ بادشاہ ایکدفعہ بیمار ہوا۔ درباری حکمائے نے خارجی علاج کے سلسلہ میں خاص مرکب کا غسل بھی تجویز کیا۔ یہ خدمت شاہی خادماؤں سرو۔ گل اور لالہ نے انجام دی۔ جب بادشاہ شفایاب ہوا۔ تو اس نے ان لونڈیوں کی اس قدر عزت افزائی کی۔ کہ بیگمات رشک سے جلنے لگیں۔ اور انہوں نے از راہِ تحقیر ان لونڈیوں کو غسالہ کہنا شروع کیا۔ بادشاہ کو اس قصے کا علم ہوا۔ تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ چونکہ طبیعت موزوں پائی تھی۔ اس لئے دفعتہً اس کے منہ سے یہ مصرعہ نکل گیا ع

ساقی حدیثِ سرو گل ولالہ مے رود

دوسرا مصرعہ باوجود کوشش کے اس کے ذہن میں نہ آیا۔ درباری شعراء بھی چارہ گری نہ کر سکے۔ آخر اپنے خاص غلام یاقوت کو زر کثیر دے کر خواجہ حافظ کے پاس شیراز بھیجا۔ چنانچہ انہوں نے مصرعہ طرح پر غزل لکھ کر یاقوت کے حوالے کی۔ مطلع حسب ذیل ہے۔

ساقی حدیثِ سرو گل ولالہ مے رود
ویں بحث با ثلاثہ غسالہ مے رود

بعض لوگ مصرعہ ثانی کو خواجہ حافظ کی کرامت سے منسوب کرتے ہیں کہ "ثلاثہ غسالہ" سے انہوں نے کنایتہً سلطانی محل کا تمام واقعہ بیان کر دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سلطان یوسف عادل شاہ والئے بیجاپور

غزل

تا بارِ غم عشق کشد قافلۂ ما　　کُہا شگفد ہر طرف از مرحلۂ ما
با آنکہ بجان با تو نکردیم بخیلی　　پیش دگراں ہر چہ کردی گلۂ ما
تبخالہ بلب آمد بر یادِ عشقت　　رفتیم کہ شد ہادیٔ را آبلۂ ما
با مسئلہ فقہ ندانیم چہ یوسف　　آساں شدہ از عشقِ بتاں مسئلۂ ما

رُباعی

آنکس کہ علم بہ نیک نامی افراشت　　در مزرع دہر تخم نیکوئی کاشت
نیکو ناماں زندۂ جاوید انند　　مرد آنکہ بمرد و نام نیکو نگذاشت

سلطان اسمٰعیل عادل شاہ فرمانروائے بیجاپور

وفائی تخلص تھا۔ اور دکن کے کسی بادشاہ نے اس لطافت

اور متانت سے کلام موزوں نہیں کیا۔ مُلاحظہ ہو ؎

دل بزلغش حکایتے دارد　ازشب غم شکایتے دارد
تاکے آزار اہل دل طلبی　بیوفائی نہایتے دارد
خونِ دل مے خورم زغصہ کہ یار　بارقیباں عنایتے دارد
دل سختش زآہِ من شُد نرم　آہِ عاشق سرایتے دارد
اے وفائی مناں اُو ستمش
کرستم نیز غایتے دارد

سلطان ابراہیم عادل شاہ والئے بیجاپور

نو برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ ہندوستانی موسیقی میں مہارت تام رکھتا تھا۔ اسی شوق سے تین چار ہزار گوئیے اطرافِ ہند کے بیجاپور میں جمع کر لئے۔ دار السلطنت کے قریب نورس پور شہر آباد کیا۔ گوّیوں کے لئے عالیشان محل اور پُر فضا باغات تیار کئے۔ سلطان فارسی میں شعر موزوں کیا کرتا تھا۔ مگر افسوس کہ نمونہ نہیں مل سکا۔ ملکی زبان میں دھرپد پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا دیباچہ نثر ظہوری ہے۔

اعظم السلاطین سکندر لودھی

گلرخی تخلص تھا۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

مارا زخاک کویت پیراہنیست برتن　آنہم زآب دیدہ صد چاک تا بدامن

ولہ ؎

مرا ز تیر ہاستے او پر گشت ہر پہلو　کنوں پر واز خواہم کرد سوئے آں کماں ابرو

سلطان ظہیر الدین محمد بابر شہنشاہ ہندوستان

بابر نہ صرف تلوار کا دھنی تھا۔ بلکہ فن موسیقی، شعر و شاعری اور انشا پردازی کے میدان میں بھی اپنے ہمعصروں سے گوئے سبقت لے گیا تھا۔ ترکی اور فارسی میں قلم برداشتہ لکھتا اور فی البدیہہ کہتا تھا۔ اور خوب کہتا تھا۔ اپنے عہد کے وقائع ترکی زبان میں اس سلاست تحریر کئے کہ فصحا عش عش کر اٹھے۔ عبدالرحیم خانخاناں نے اکبر کے عہد میں اُسے فارسی زبان کا جامہ پہنایا۔ آج تک یہ کتاب خاص و عوام میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ یہ شعر اسی کا طبعزاد ہے ؎

باز آسے اے ہمائے کہ بے طوطی فطت
نزدیک شد کہ زاغ برد استخوان من

کابل کے باہر دامن کوہ میں نوبہار کے نام سے ایک باغ تیار کرایا تھا جس کے چند درجے ابتک باقی ہیں۔ اس میں سنگ مرمر کا ایک خوشنما حوض بنوایا۔ یہ شعر حوض مذکور کے پہلو پر کندہ کیا گیا ؎

نوروز و نوبہار و مے و دلربا خوش است
بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

جب شمشیر افگنی سے فرصت ملتی۔ اس حوض کو شراب انگوری سے بھرتا۔ اور مصاحبوں کو شریک کر کے لطف اندوز ہوتا۔ اگرچہ یہ بادشاہ ٹھیٹ مغل تھا۔ مگر جب ہندوستان میں آیا تو اس ملک کی زبان سے وہ بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس کے ترکی دیوان نوشتہ ۹۳۵ھ جو رام پور کے کتب خانہ میں موجود ہے میں یہ شعر درج ہے ؎

مجکا نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی
مجھ کا پچھ مونگہ
فقرا خلیفہ بس بولغوسیاد رپانی و ردتی
روٹی

سلطان نصیر الدین محمد ہمایوں شہنشاہ ہند

ہمایوں کو بھائیوں کی غداری سے تخت و تاج سے کچھ عرصہ کیلئے محروم ہونا پڑا۔ مگر قسمت کی یاوری سے تمام مشکلات پر غالب آکر دوبارہ ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ ملاحظہ ہو۔ کلام کے حرف حرف سے ہزاروں اُمیدیں اور اُمنگیں ٹپکتی نظر آتی ہیں۔ کابل فتح کرنے پر جو فتحنامہ بیرم خاں کو بھیجا گیا تھا۔ اس کے حاشیہ پر بادشاہ نے یہ اشعار فی البدیہہ موزوں کر کے تحریر فرمائے تھے ؎

باز فتحے زغیب روے نمود　کہ دل دوستاں از و بکشود
شکر للہ کہ باز شادانیم　بررُخ یار و دوست خندانیم
دشمناں را بکام دل دیدم　میوۂ باغ فتح را چیدم
روز نو بیدم اکرت امروز　دل احباب بیغم ست امروز
شاد بادا ہمیشہ خاطر یار　غم نگردد بگرد یار و دیار
ہمہ اسباب عیش آماد است　دل بفکر وصالت اُفتاد ست
کہ جمال حبیب کے بینم　گل زباغ وصال کے چینم
گوش خرم شود ز گفتارت　دیدہ روشن شود ز دیدارت
در حریم حضور شاد بہم　بنشینم خرم و بے غم
بعد ازاں فکر کار ہند کنیم　عزم تسخیر ملک سند کنیم
ہر در بستہ کشادہ شود　ہر چہ خواہیم زاں زیادہ شود

آنچہ خواہیم از زمان و زمین — گوید آمین چو جبرئیل امین
یا الٰہی میسرم گرداں — دو جہاں را مسخرم گرداں

یہ رُباعی بھی بیرم خاں کو فی البدیہہ تحفہ فرمائی۔ رُباعی

اے آنکہ انیس خاطر محزونی — چوں شیخ لطیف خویشتن موزونی
بے یاد تو نیستم زمانے ہرگز — آیا تو بیاد من محزوں چونی

محمد بیرم خاں نے جواب میں یہ رُباعی ارقام کی ؎

اے آنکہ بذاتِ سایۂ بے چونی — از ہر چہ ترا وصف کنم افزونی
چوں مے دانی کہ بے تو چوں مے گذرد — چوں مے پرسی کہ در فراقم چونی

محمد نور الدین جہانگیر پادشاہ

یہ پادشاہ جملہ علوم و فنون میں دستگاہ کامل رکھتا تھا۔ تحقیق کا شوق اس قدر تھا۔ کہ ایک بار صرف موسم سرما کے پھولوں کی فہرست مرتب کرنے کے لئے کشمیر کا سفر کیا۔ شعر و شاعری میں بھی بیحد شغف رکھتا تھا۔ جعفر قزوینی، مولانا شکیبی، مولانا محمد ماثر ندرانی، طالب آملی، آقا صفی، درویش جاوید، موزدن الملک نظیری، عارف ایگی، مولانا وصلی، قزوینی فخر الزمان قزوینی اور شاہ نصیر بیگ جیسے ہزاروں کامل الفن شعرا اس کے دربار کی زینت تھے۔ نہایت خدا ترس بادشاہ تھا۔ اپنے وقائع میں لکھا ہے۔

روز جمعہ بست و دوم حکم کردم کہ جمیع مشائخ و ارباب سعادت را کہ دریں شہر توطن دارند۔ حاضر سازند۔ کہ در ملازمت افطار نمایند۔ وسہ شب بریں وطیرہ گذشت و ہر شب تا آخر مجلس خود بر سر پا استادہ بزبان حال مے گفتم ؎

خداوندگارا تونگر توئی — توانا و دربخشش بندہ پروری توئی
نہ کشور کشایم نفرماں دہم — یکے از گدایانِ ایں درگہم
تو بر خیر و نیکی دہم دسترس — وگرنہ چہ خیر آید از من بکس
منم بندگاں را خداوندگار — خداوند را بندۂ حق گذار

یہ ۱۰۲۷ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت بادشاہ کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ ذیل کی غزل بھی اسی شہریار کی ہے ؎

من چوں کنم کہ تیر غمت بر جگر رسد — تا چشم نارسیدہ دگر بر دگر رسد
مستانہ مے خرامی و مست تو عالمے — اسپند مے کنم کہ مبادا نظر رسد
در وصل او مستم و در ہجر بیقرار — داد از چنیں غمے کہ مرا ہر بسر رسد
مدہوش گشتہ ام کہ بپویم رہِ وصال — فریاد ازاں زماں کہ مرا ایں خبر رسد
وقت نیاز و عجز جہانگیر ہر سحر — اُمید آنکہ شعلۂ نور اثر رسد

شہاب الدین شاہجہان غازی طاب ثراہ

صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے۔ کہ بادشاہ فن موسیقی میں مہارت تمام رکھتا تھا۔ اور سماع کا بیحد مشتاق تھا۔ بختاور خاں خواجہ سرا اپنی کتاب مرآۃ العالم میں لکھتا ہے۔

بعضے از صوفیہ در بزم او و بحالتِ وجد جاں بحق تسلیم کردہ اند۔

اس بادشاہ کا دربار قیصر و کسریٰ کے درباروں پر بھی فوقیت لے گیا تھا۔ علی العموم ہفتہ میں ایک بار دربار میں مشاعرہ ہوتا جس کے منتظم نواب سعد اللہ خاں کے بعد علامی افضل خاں رہے۔ مولانا کیفی، عسکری، نظیری، دوستی سمرقندی، نعمت خان عالی اور چندر بھان برہمن جیسے فخر روزگار شعرا اپنے کلام سے دربار کو گرماتے تھے۔ بادشاہ خود بھی شعر کہتا تھا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

من چرا گریہ کنم از سببِ سستی بخت
بے رضائے تو یکے برگ نہ جنبد از درخت

ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر پادشاہ

اگرچہ اس شہنشاہ کے دور میں شعر و شاعری کا بازار سرد ہو گیا تھا مگر دربار میں موزوں طبع اور عالی دماغ اُمراء کی کمی نہ تھی بعض دفعہ ایسے بلند پایہ قصائد لکھ کر لائے۔ کہ بادشاہ محظوظ ہو کر کئی بار زیر لب انہیں پڑھتا رہا۔ مگر جب انہوں نے اپنا کلام ختم کیا۔ تو فرمایا ایسے بیہودہ کام میں وقت ضائع نہ کیا کرو۔ باوجود اس کے بادشاہ نہ صرف قادر الکلام شاعر تھا بلکہ فن موسیقی میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

غم عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم خاکِ بیاباں را

ولہ ؎

نالہائے کلبۂ احزاں تسلی بخش نیست
در بیاباں مے تواں فریاد خاطر خواہ کرد

سلطان محمد قلی قطب شاہ فرمانروائے گولکنڈہ

اچھے شاعر تھے۔ فارسی میں ظل اللہ اور دکنی میں قطب شاہ تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کلام ؎

ساقیا آ شرابِ ناب کہاں
چند کی پیالی میں آفتاب کہاں

سلطان عبداللہ قطب شاہ والئے گولکنڈہ

اے پری پیکر تیرا انکھ آفتاب
دیکھتا ہوں نور سے نا مجھ میں تاب

ابوالحسن ناناشاہ آخرین فرمانروائے گولکنڈہ

یہ بادشاہ گولکنڈہ کا آخری بادشاہ تھا۔ شعر و سخن اور اہل ادب کا شیفتہ تھا۔ دکنی زبان کی شاعری کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

کس در کہوں جاؤں مجھ دل پہ پھل پھراٹ ہے
ایک بات کہے ہونگے سجن یہاں جی نہی بارہ باٹ ہے

روشن اختر محمد شاہ خاتم السلاطین بابریہ

یہ بادشاہ سلطنت مغلیہ کا سنبھالا تھا۔ اس کے زمانہ میں دہلی کی ہر شب شب قدر اور ہر روز روز عید بن گیا تھا۔ دربار میں رقص و سرود کے نت نئے نمونے دکھائے جاتے تھے۔ موزوں طبع اور لطیفہ گو امرا نے گل افشانیاں کر کے دربار کو دیوارِ قہقہہ بنا دیا تھا۔ دھرپد اور ٹھمریوں میں تصرف کر کے فن موسیقی کو چار چاند لگا دیتے تھے۔ آجتک قوال گاتے ہیں

محمد شاہ پیا بڑے رنگیلے
سدا رنگیلے محمد شاہ

ایک کدارا کی ٹھمری ہے ؎

چمک چمک چمکے جب سریا ۔۔۔ کیسے کی آؤں پیا نوری سجریا
بادل گرجے بجلی چمکے ۔۔۔ اختر پیا کو نہ بھجو خبریا
چمک چماک چمکے بجریا الخ

[illegible]

[illegible] کلام حسب ذیل ہے۔ فارسی ؎

یارہ ز بر صبح بر سر فکر بر جا کنش کنید
عاشقاں شب روز زنجیر در پائش کنید

اردو ؎

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جوانی کی
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گذری کا

ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ

تیموری کی اولاد میں سب سے بدنصیب اور مغلیہ سلاطین کا آخرین برائے نام بادشاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ۶۳ برس کی عمر میں ۲۶ شعبان ۱۲۵۳ھ کو تخت پر بیٹھا۔ ۸۴ برس کی عمر میں اسیر شاہی بن کر رنگون پہنچا۔ اور نوے برس کی عمر میں دار بقا کو رخصت ہوا۔ چونکہ اس کی ساری زندگی حزن و ملال میں بسر ہوئی۔ اس لئے اس کا کلام سوز و گداز اور حزن و ملال سے مملو ہے۔ اس نے فارسی اور پنجابی زبان میں بھی شعر موزوں کئے ہیں۔ مگر ان میں کوئی خصوصیت یا خوبی نہیں ہے۔ وہ محض اردو زبان کا شاعر تھا۔ اور اس نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے۔ اس سے اس کا نام اردو زبان کے غیر فانی شاعروں کی فہرست میں ممتاز جگہ پر لکھے جانے کا مستحق ہے نمونہ حسب ذیل ہے ؎

اسے آدمی نہ جانئے گا خواہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

ولہ ؎

نہ ہو جب تو ہی اے ساقی بھلا پھر کیا کرے کوئی
ہوا کو ابر کو گل کو چمن کو صحن بستاں کو

ولہ ؎

[illegible] ظفر [illegible] ہم سے اگر پوچھو
اپنا [illegible] آپ اپنے شناعت اچھی

نواب آصف الدولہ فرمانروائے اودھ متوفی ۱۷۹۷ء

نواب شجاع الدولہ کے فرزند تھے۔ آصف تخلص کرتے تھے۔ دہلی کے زوال کے بعد نواب آصف الدولہ کی قدر دانیوں نے [illegible] مثلاً آرزو، میر، [illegible] جس سے دربار کی [illegible] آصف الدولہ اپنا کلام میر سوز کو [illegible] ایک دیوان یادگار چھوڑا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں ۔۔۔ وہاں اپنا سر ہم قلم دیکھتے ہیں
جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں ۔۔۔ خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں
گزرتے ہیں سو سو خیال اپنے دل میں ۔۔۔ کسی کا جو نقش قدم دیکھتے ہیں
بتوں کی گلی میں شب و روز آصف ۔۔۔ تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

نصیر الدین حیدر شاہ والئے اودھ

اس بادشاہ نے دس سال حکومت کی۔ "بادشاہ" تخلص تھا۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے — کہ ساقی لئے ساغر مشکبو ہے
چلو قبر فرہاد پر فاتحہ کو — مگر آب شیریں سے لازم وضو ہے
شفق بن گئے ہوتا ہے گردوں پہ ظاہر — یہ کس کشتۂ بے گناہ کا لہو ہے
گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا — نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

رہے سایۂ پنجتن بادشہ پر
خداوند عالم نگہبان تو ہے

سلطان عالم واجد علی شاہ

اودھ کا یہ بد نصیب تاجدار ۱۸۴۷ء میں تخت پر بیٹھا۔ اور ۱۸۵۶ء میں معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ اس بادشاہ کو فن تعمیر سے بہت شوق تھا۔ دو کروڑ روپیہ صرف کر کے لکھنؤ میں قیصر باغ بنوایا۔ اس نے اردو علم ادب کی صحیح معنوں میں خدمت کی۔ اور اردو شاعری کو اس کی ذات سے بے انتہا تقویت پہنچی۔ اسیر۔ برق۔ امانت۔ قلق۔ بحر۔ سحر۔ ذکی۔ درخشاں۔ قبول۔ شفق۔ بیخود۔ مہر۔ عطارد۔ ہلال اور سرور جیسے کامل الفن شعراء اس کے دامن سے وابستہ تھے۔ بادشاہ ہندی میں "جان عالم پیا" اور اردو میں اختر تخلص کرتے تھے۔ رعایت لفظی کا خیال زیادہ ملحوظ رہتا۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

کمر دھوکا دہن عقدہ غزال آنکھیں پری چہرہ
شکم ہیرا بدن خوشبو جبیں دریا زبان عیسیٰ
برائے سیر جو برسا رندمے خانے میں گر آئے
گرے ساگر لنڈھے شیشا ہنسے ساقی بہے دریا

~~~~~~

مسلمان بادشاہ مٹا دیئے گئے۔ نہ ان کی سلطنتیں رہیں۔ نہ ان کے پر شکوہ محل۔ ان کے نظر فریب باغ خزاں کی نذر ہو گئے۔ ان کے حسین و جمیل اور مرمریں ایوان جن میں جواہرات سے مینت کاری کی گئی تھی۔ زمانے کی دستبرد کا شکار ہو گئے۔ اس پر بھی ان کی ایک یادگار باقی ہے۔ اور وہ علم و ادب کی سرپرستی ہے۔ حریفان وطن اس کے مٹانے کی جتنی کوششیں کرتے ہیں۔ یہ نقش اتنا اجاگر ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی پختہ کار نقاش کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ سچ ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما
~~~~~~

تشطیر

بر غزل علامہ اقبال مرحوم

حضرت محمود اسرائیلی

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ — وہاں نگاہِ محققانہ یہاں ہر انداز والہانہ
اُدھر ترقی اِدھر تنزّل اُدھر تگ و دو اِدھر توکّل — وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ
کنارِ دریا خضر نے مجھ سے کہا بہ اندازِ محرمانہ — میں تجھ سے اک رمزِ دہر کہہ دوں کہ تیرا مسلک ہے عارفانہ
نگہ مشیت کی دُور بیں ہے خرد کی آنکھیں ہیں بے بصیرت — سکندری ہو قلندری ہو یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ
حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجھے خدایانِ خانقاہی — ہیں ان کے اقوال جاہلانہ ہیں ان کے اعمال مجرمانہ
مجھے جو تلقینِ ضبطِ پیہم یہ دے رہے ہیں بطورِ ناصح — انہیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ
غلام قوموں کے علم و عرفان کی یہی رمز آشکارا — سمجھ رہے ہیں ہماری تقلید خود کریگا کبھی زمانہ
نہیں ہیں آزاد اب اگر ہم تو مر کے آزاد روح ہو گی — زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بیکرانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی — مگر یہ توجیہہ تو یقیناً کوئی کہے گا نہ عاقلانہ
کہ ہم کو اسلام ہی سکھاتا ہے یہ جمود اور عیش کوشی — عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ
مری اسیری پہ شاخِ گل نے یہ کہہ کے صیاد کو رُلایا — کہ تیرا دل بھی ہو ٹکڑے ٹکڑے جو اس کا سن لے کبھی ترانہ
غضب کیا تو نے اے ستمگر جو اس کو کُنجِ قفس میں رکھا — کہ ایسے پُرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ

اُس کے گیت

افسانہ

جناب محمد امین شرقپوری

اُس کے گیت کتنے میٹھے تھے اور رسیلے —!

جب وہ ہاتھ بڑھا کر تان لگاتا، ایسا معلوم ہوتا کہ وہ دھرتی کو امرت سے سینچ رہا ہے۔ اُس کی لے پر ہل چلاتے ہوئے کسان چونک پڑتے۔! چرواہے لاٹھیوں پر ٹھوڑیاں ٹیک کر سنتے —اور جھومتے۔ ان کے چوڑے چکلے سینوں میں دھڑکتے ہوئے دلوں کی آواز بڑھ جاتی۔

اس کے گیت! ایک تند و تیز رو تھی۔ جو برساتی ندی کی طرح آپ ہی آپ بہتی جارہی تھی۔ اور وہ گیتوں کی ناؤ پر سوار جب سرسبز کھیتوں میں سے گزرتا ایسا معلوم ہوتا کہ دھرتی کا راجہ سنہرے رتھ پر بیٹھ کر اُڑا جارہا ہے۔ درانتی گھماتے ہوئے للکار کر کہتا۔

"میرے شیرو! آگے بڑھو۔ تمہاری ماؤں نے اسی دن کے لئے دودھ پلایا تھا —پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ تم اپنے میلے کپڑوں کو نہ دیکھو۔ یہ تو ڈھالیں ہیں تمہاری۔ تمہارے قوی جثوں سے پسینہ نہیں بہہ رہا۔ یہ وہ ٹھنڈے چھینٹے ہیں جو تمہاری شفقت پر آفریں کے پھول بن بن کر گر رہے ہیں۔ آج دنیا دانے دانے کو محتاج نظر آرہی ہے۔ تمہارے آگے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ مہاجن ان پر مدت سے دانت پیس رہا ہے جبڑا کھولے کھڑا ہے۔ تم اس کی پروا نہ کرو۔ تمہارے بازوؤں میں دم ہے۔ بل ہے۔ طاقت ہے۔ طاقت کے آگے پہاڑ کٹ جاتے ہیں —اور ایک مہاجن —!"

کسانوں کے ہاتھ پھرتی سے چلنے لگتے۔ اُن کے تھکے ہوئے بازوؤں میں ایک قوت عود کر آتی۔ مہینوں کی فصل کی کٹائی دنوں میں ختم ہو جاتی اور جب وہ غلّے کے سنہری ڈھیر پر بیٹھ کر دانے ہاتھ میں لیکر اُچھالتا ایسا معلوم ہوتا جیسے دھرتی کا راجہ جواہرات سے کھیل رہا ہے —اور اس کی رانی —! وہ گاتے گاتے رک گیا۔ کسی کے نرم نرم ہاتھوں کو ٹٹول کر بولا۔

"چھوڑ دو میری آنکھیں —پہچان لیا ہے میں نے —" ہنسی کی ہلکی نقرئی جھنکار کے ساتھ ریشم سامنے آکر بولی — "دن بھر گانے سے جی نہیں بھرتا تمہارا —؟"

مسکرا کر بولا۔ "گانے سے بھی جی بھرتا ہوگا کسی کا —یہ تو میری غذا ہے۔ گاتا ہوں تو پیٹ بھرا رہتا ہے۔ میرے بازو شل نہیں ہوتے۔" کہتے ہوئے اس کے ہونٹ پھر تھرتھرانے لگتے۔ گنگناتے ہوئے بولا۔

"ریشم! یہ تیرا نازک جسم دھوپ کھانے کے لئے نہیں ہے۔ —مگر میں بھولتا ہوں" وہ بولا۔ "تو کسان کی بیٹی ہے۔ کانٹے تیرے پیروں کے نیچے دب کر پھول بن جاتے ہیں۔ کھیتوں کی دھول اور مٹی تیرا سنگار ہے۔ منہ اندھیرے جب عیش پسند نیند کی آغوش میں سوتے ہیں تو بھینسوں کا دودھ نکالتی ہے۔ گوبر سمیٹتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ تیرا کام نیچ ہے۔ اندر کی رانی دیکھ لے تو باندی بن جائے۔ دودھ بلوتے ہوئے تیری چوڑیوں کی جھنکار اس ساز کے نغموں سے زیادہ دلکش معلوم ہوتی ہے اور جو ساری رات کسی کے تھکے ہوئے ہاتھوں میں جھنجھنا تا رہے۔ اور علی الصبح دنیا کو گناہ کے غار میں دھکیل کر دور جا پڑے۔ اسے تھپک تھپک کر سلا دے —تیری چوڑیوں کی جھنکار دنیا کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرتی ہے۔ صبح معصوم پرندوں کی چہکار کی طرح —تو امرت بلوتی ہے۔ تیرے ہاتھوں کی چھاچھ امرت سے بڑھ کر ہے۔ جسے پیتے ہی آنکھ جھپکتی ہوئی رگیں پھر سے ہوشیار ہو جاتی ہیں —یہ کھیت، یہ اناج کے انبار، تیری محنتوں کا صلہ ہیں تیری چوڑیوں کی جھنکاروں کا صدقہ ہیں۔ تیری مسکراہٹ چاندی ایسے دانتوں کی جھلکیاں ——کیا پھوٹتے ہوئے سورج کی کرنوں کے مانند ہیں ——!"

پھر وہ آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "فصل کے بعد چاچا ہمارا بیاہ کر دینگے۔" یہ خوشخبری سنانے کے لئے وہ نہ جانے کب سے بےچین ہو رہا تھا۔ ریشم کے سرخ چہرے پر نیلی دھاریاں چمکنے لگیں۔ وہ جانے کے لئے بڑھی۔ فجو ہنس کر بولا —"یہ نمبردار کا لڑکا شہر سے نیا نیا آیا ہے۔ کل اکڑ کر بولا ——"فجو یہ کیا گاتے ہو۔ ہماری سمجھ میں تو آتے نہیں تمہارے گیت!"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ چھڑی زمین پر مار کر بولا۔

"کبھی شہر کے گیت بھی سُنے ہیں؟"

میں نے پوچھا۔ "کیسے ہوتے ہیں وہ؟"

بولا۔ "گانا وانا بھول جاؤ گے جو سُن لئے۔"

میں ہنس دیا۔ "پرسال گیا تھا حسّو کے ساتھ شہر۔ رات چلتی پھرتی تصویروں کا تماشہ بھی دیکھا۔ اوٹ پٹانگ سے گانے تصویریں گاتی پھرتی تھیں۔"

ریشم ناک پر اُنگلی رکھ کر بولی۔ "تصویریں کیسے گاتی ہیں؟"

"شہر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بے جان چیزیں بھی گاتی ہیں۔"

"ہائیں ——؟" مُنہ سے نکلا۔

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟" مسکرا کر بولا۔ "سوئیوں والا باجہ تو تم نے سُنا تھا؟"

سر ہلا کر بولی۔ "ہاں"

"بس ایسے ہی گاتے ہیں وہاں ——! ہاں تو میری بات پر مُنہ تکنے لگا میرا۔"

میں چھاتی تان کر بولا۔ "یہ مردوں کے گیت ہیں مَردوں کے" جل ہی تو گیا۔ حسّو سے بولا۔ "فجو بڑا بدتمیز ہے۔"

میں نے کہا۔ "بابو کیا کہتا ہے؟" دُم دبا کر چلا گیا —— ہو گا نمبردار اپنے گھر کا —— میں کیا نوکر ہوں اُس کا۔"

ریشم چپ چاپ چلی گئی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی۔ کہ عورتوں کی طرح مانگ نکالے جو دبلا پتلا لڑکا کل چوپال میں بیٹھا ہُوا تھا کیا یہی نمبردار کا بیٹا ہے ——؟ ساتھ ہی اسے یاد آگیا۔ رات ماں، باپ دونوں میں بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ نمبردار کے لڑکے کے بارے میں، کچھ اس کے بیاہ کے متعلق —— ایک ایک کرکے اسے ساری باتیں یاد آگئیں۔

"نمبردار رشتہ مانگ رہا ہے" چاچا نے کہا تھا۔

ماں بولی —— "فجو سے سگائی ہونے والی ہے اس کی۔ اب دوسری جگہ ٹھیک نہیں۔"

"فجو اپنا ہی بیٹا ہے۔ پار کے گاؤں سے لا دونگا رشتہ اس کیلئے۔"

"وہ کچھ اور آس لگائے بیٹھا ہے۔ تم بھی پہلے ہاں کر چکے ہو۔ تمارا سارا کام اس نے سنبھالا ہوا ہے۔ سنے گا تو کیا کہے گا۔"

"میں سمجھا دونگا اسے۔ نمبردار سے کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ لڑکا بارہ جماعتیں پاس ہے۔ چوپال میں باتیں ہو رہی تھیں کہ تحصیلداری ملنے والی ہے۔ نمبردار بڑے صاحب کے بنگلے پر ڈالی لے گیا تھا سنا ہے اس نے وعدہ کر لیا ہے۔"

ماں خوش ہو کر بولی۔ "میری ریشم کیسی مقدر والی ہے" اور وہ لیٹے لیٹے جماہیاں لینے لگی۔ فجو گورا چٹا جوان، گانے کا شوقین اس کی آنکھوں کے آگے گھوم گیا۔ اور کبھی نمبردار کا دبلا پتلا لڑکا آجاتا۔ دونوں کا موازنہ کر رہی تھی۔ رہ رہ کر فجو کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوتا ہے۔ ایک نشہ سا چڑھ جاتا ہے اُسے۔ بیخود ہو کر اچھلنے لگتا ہے۔ اچھلتا ہے۔ اور گاتا ہے ——!

گھر آگیا۔ ریشم اندر جا کر کھاٹ پر گر گئی —— جیسے آج بہت تھک گئی ہو۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ دل ڈول رہا تھا۔ کہیں سچ مچ رات والی باتیں درست نہ ہوں؟ میرا بیاہ ——! وہ چونک پڑی اس کا باپ حقہ ہاتھ میں لٹکائے گھر میں گھُسا۔ اس کی ماں کو دیکھ کر بولا۔ "حسّو کی بہو کو بُلا لینا۔ آج کام زیادہ ہو گا۔ نمبردار رات آئے گا۔ پتہ نشانی ہو جائے تو اچھا ہے۔ بیاہ فصل کے بعد کر دونگا۔"

اور جیسے یہ اڑتی ہوئی خبر کھیت پر فجو کے کان میں پہنچ گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر تھرکتے ہوئے گیت رُک گئے اُس کی مسکراہٹ مٹنے لگی۔ چونک کر بولا۔

"حسّو! سچ کہتے ہو؟"

"ہاں" وہ آہستہ سے بولا۔

"ہُوں" اس کے بند ہونٹوں سے نکلا —— درانتی لے کر کھیت میں گھُس گیا۔

"گاتے نہیں فجو!" برابر سے ایک بولا۔

"ابھی تو گا رہا تھا۔ کیا ہو گیا اسے؟" دوسرے نے کہا۔

پھرتی سے ہاتھ چلاتے ہوئے جیسے فجو کو یاد آگیا تھا کہ گانے سے میرے بازو شل نہیں ہوتے "گانا میری غذا ہے گاتا ہوا تو پیٹ بھرا رہتا ہے —— سوچتے ہوئے اس کے ہونٹ کپکپائے۔ اس نے چھیڑ دیئے وہی گیت —— وہی راگنیاں ——

"میرے شیرو ——! آگے بڑھو۔ تمہاری ماں نے تمہیں اسی دن کے لئے دودھ پلایا ہے۔ تم اپنے میلے کپڑوں کو نہ دیکھو یہ تو ڈھالیں ہیں۔ سپاہی کے لئے ڈھالیں —— تمہارا پسینہ ٹھنڈے چھینٹے ہیں جو تمہاری مشقت پر آسمان سے پھول بن کر —— گرتے ہیں ......"

ادبیاتِ اُردو کا ایک نیم متعارف ورق

جناب پروفیسر میرزا محمد البشیر ایم، اے

بیخبر اور غالب

مرزا غالب کو جو خلوص و عقیدت اپنے ایک دوست خواجہ غلام غوث بیخبر سے تھی اس کا اندازہ ان سطور سے بخوبی ہوتا ہے۔ "ستّر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں ستّر ہزار آدمی نظر سے گذرے ہوں گے۔ زمرہ خواص میں سے عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص الولادیکھے۔ ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ۔ دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ تعالیٰ۔ لیکن وہ مرحوم حسن صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص خاص اس کا میرے ساتھ تھا۔ اللہ اللہ۔ دوسرا خیر خواہ خلق حُسن و جمال چشم بد دور کمال مہر و وفا صدق و صفا نور علیٰ نور۔"[51] مرزا صاحب کے اکثر دلچسپ خطوط خواجہ صاحب کے نام اردوئے معلیٰ و عود ہندی میں موجود ہیں اور عود ہندی کی ترتیب میں بھی خواجہ صاحب کا ہاتھ تھا۔ اس مقتدر ادبی ہستی کا حال مختصر طور پر پہلے کچھ سُن لیجئے۔

خواجہ غلام غوث کے والد خواجہ ظہور اللہ کشمیری تھے جو ترکِ وطن کر کے لاسہ (تبت) ہوتے ہوتے نیپال پہنچے۔ جہاں ۱۸۲۴ء میں غلام غوث پیدا ہوئے۔ اُنکی چار برس کی عمر تھی کہ اپنے والد کے ساتھ بنارس آئے۔ یہاں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ۱۸۴۸ء میں نواب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے نائب میر منشی اور بعد میں عہدۂ میر منشی پر فائض ہوئے اور بڑے اعزاز و خطاب و انعامات حاصل کئے۔ پنشن کے بعد نواب رامپور نے اپنا مدار المہام بنانا چاہا لیکن انہوں نے معافی چاہی۔ ان کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا۔

خواجہ صاحب کو عربی فارسی پر بہت عبور تھا۔ فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ خود فرماتے ہیں "فارسی کے ساتھ کچھ مناسبت جبلی رکھتا ہوں اور اتفاق وقت سے نوکری بھی ملی تو وہ جس میں فارسی ہی سے کام رہا۔"[52] ان کے رقعات و نظم فارسی کا مجموعہ "خونابہ جگر" ہے۔ اُن کی یہ فارسی غزل جب اودھ اخبار میں شائع ہوئی ہو

چشمم کہ باز شد ز خواب   فتنہ از د بچار سو ست
پردہ ز رُخ کہ بر کشاد   مہر ز شرم زرد رو ست

تو مرزا غالب نے ان کو لکھا "کیا کہنا ہے۔ ابداع اس کو کہتے ہیں۔ جدت طرز اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوایان ایران کے خیال میں بھی نہ گذرا تھا وہ تم بروئے کار لائے۔"[53] اُردو میں انکی نہایت گرانمایہ تصنیف "فغانِ بیخبر" ہے۔ یہ رقعات و نثر اُردو کا مجموعہ ہے جس کو نامور پریس الہ آباد نے ۱۸۹۱ء میں شائع کیا۔

"بیخبر اُردو کے بھی شاعر تھے لیکن کم کہتے تھے۔ اُردو میں نثر نگاری و خطوط نویسی کی طرف ۱۸۴۲ء میں توجہ کی۔"[54] لیکن اس توجہ کا سبب وہی ہے جس نے مرزا غالب کو اُردو کی جانب مائل کیا یعنی فارسی کا رواج اُٹھنے لگا۔ دفاتر میں اُردو داخل ہوئی اور خط و کتابت بھی اُردو میں ہونے لگی۔ چنانچہ خواجہ صاحب لکھتے ہیں "خط و کتابت بھی اسی (اُردو) میں ہونے لگی۔ میرے ہمنواؤں نے بھی باوجود اس کے کہ فارسی دانی میں اہل زبانوں کے محسود تھے اسی ہنجار کو اختیار کیا۔ یاروں کی جماعت سے خارج کیونکر ہوتا۔ ناچار مجھے بھی اسی طریقے پر چلنا پڑا۔"[53] "فغانِ بیخبر" کے پہلے حصے میں متفرق نثریں مثلاً خطبہ، تقریظ وغیرہ ہیں۔ خطبات و مضامین میں سادگی کم ہے اور رنگینی و مبالغہ آمیزی زیادہ "تقریظوں وغیرہ میں وہی قدیم رنگ برتتے تھے یعنی مقفیٰ اور مسجع عبارت فارسی کی تقلید میں"[54] لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ خطوط میں سلاست و روانی ہوتی ہے۔

"فغانِ بیخبر" میں نو خطوط مرزا غالب کے نام ہیں۔ مرزا کے خطوں کی طرح ان کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کا شمار اُن مکاتیب میں ہے جو مرزا کے معرکہ آرا خطوط کی تخلیق و تحریر کا باعث ہوئے۔ مرزا غالب نے "مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا" اور اُن کے اس دلفریب طرز بیان نے بیخبر کی روشِ تحریر و انداز بیان پر خاص اثر ڈالا۔ غالب ایک خط میں خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں۔ "مولانا۔ بندگی۔ آج صبح کے وقت شوق دیدار میں بے اختیار

[51] اردوئے معلیٰ ص ۳۳۸ [52] فغان بیخبر ص ۲۔

[51] عود ہندی ص [52] داستان تاریخ اُردو ص ۲۵۵ [53] فغان بیخبر ص ۳ [54] تاریخ ادب اُردو ص ۸۲۔

نہ ریل نہ ڈاک توسنِ ہمت پر سوار چل دیا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تم تک پہنچ جاؤنگا مگر یہ نہیں جانتا کہ کہاں پہنچونگا اور کب پہنچونگا۔ اتنا بخود ہوں کہ جب تک تم اطلاع نہ دوگے میں نہ جانونگا کہ کہاں پہنچا اور کب پہنچا۔[۱] اس خط میں دیگر حالات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں "آج میں اور بھی باتیں کرتا مگر میرا خاص تراش[۲] آگیا۔ مہینہ بھر سے حجامت نہیں ہوائی۔ خط لپیٹ کر ڈاک میں بھیجتا ہوں اور خط بنوا تا ہوں۔" تجبر نے غالب کے خط کا نہایت دلچسپ جواب لکھا۔ "حضرت! آج علی الصباح میں گورکھپور کے میدان میں خیمہ کے اندر اکیلا بیٹھا تھا۔ چکیں جو چاروں طرف کے دروازوں کی چھٹی تھیں صاف قفس کی صورت تھی۔ ہر سمت کو دیکھتا تھا اور تنہائی سے گھبرا کر یہ مصرعہ "ہائے یہ تنہائی اور کنج قفس"۔ دفعتہً ہٹو بچو کا غل ہوا۔ حیرت میں آیا کہ کس کی سواری آتی ہے۔ دیکھا تو دیکھا کہ شوق اور تمنا اور محبت ان سارے حشم و خدم کا آگے آگے اہتمام ہے اور پیچھے ان کے حضرت توسنِ ہمت کو کداتے پھنداتے چلے آتے ہیں۔ پھر تاب کسے تھی۔ بے اختیار دوڑا۔ خیمے سے باہر آیا۔ جھک کر آداب بجا لایا۔ رکاب تھام کر گھوڑے سے اُتارا۔ دوزانو ادب سے سامنے بیٹھا۔" یہ خط مکالمے کی صورت میں ہے آگے چل کر لکھتے ہیں "حضرت (غالب) نے فرمایا[۱۱] اُسی کو دیکھ رہا تھا کہ خاص تراش آگیا اور حارج ہوا۔" یہ سن کر میں نے مُنہ بنا کر کہا۔ اُس وقت میں نہ ہوا ورنہ حجام کی خوب حجامت کرتا کہ اس نے میرا حرج کیا۔"

تجبر کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ "عودِ ہندی" کی ترتیب میں خود انہوں نے کتنی کوشش کی اور کن ذرائع سے غالب کے خطوط اُن کے ہاتھ لگے۔ غالب کو لکھتے ہیں "حضرت! نسخہ "عودِ ہندی" کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے مرتب ہو رہا ہے۔ چودھری عبدالغفور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور ان کا دیباچہ آگیا۔ میں نے سوائے اس کے آپ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبرآباد سے آپ کی تحریریں فراہم ہیں۔ خود سب کو دیکھا جو مضامین لائق اعلان کے تھے ان کو نکال ڈالا۔ کاتب دیکھ رہا ہے۔ میں مقابلہ کر رہا ہوں . . . .
نواب مصطفٰے خاں صاحب شیفتہ۔ منشی حبیب اللہ خاں صاحب ذکا۔ میاں داد خاں صاحب سیاح۔ ان حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ہونگے۔ انہیں لکھا کریں کہ ان کے پاس جو کچھ ہو بسبیل ڈاک میرے پاس بھیجدیں۔ رامپور میں تو میں نے خود لکھا ہے۔ شاید وہاں سے کچھ آجائے۔[۱۲]" مرزا صاحب کا دوسرا مجموعۂ مکتوبات یعنی "اُردوئے معلیٰ" دہلی میں اکمل المطابع نے شائع کیا۔ تجبر نے اس نام کی بیحد مخالفت کی "گستاخی معاف یہ نام "اُردوئے معلیٰ" نہایت بھونڈا رکھا گیا۔ لالہ صاحب یا بابو صاحب کی تجویز ہوگی۔ آپ نے اخلاق سے دخل نہ دیا ہوگا۔ آپ کی تصنیف اور ایسا بھدا نام۔ لاحول ولا۔ اے قبلہ! "قندِ ہندی" نام رکھا ہوتا یا پھر سے جو چھپا ہے "قندِ مکرر" فرمایا ہوتا۔[۱۳]"

دہلی میں تجبر اُس زمانے میں مرزا غالب سے ملے جبکہ مرزا چراغِ سحری ہو رہے تھے۔ انہوں نے مرزا کے عالمِ پیری کا نقشہ اس طرح پیش کیا "حضرت غالب سے دو بار ملا اور انہیں دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ فی الواقع اب وہ پیرِ فانی ہوگئے ہیں اور بڑی بے لطفی یہ ہے کہ سامعہ بالکل باطل ہے۔ لکھ کر باتیں ہوتی ہیں۔ عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہو۔ جی چاہے کہ بہت سی باتیں کیجئے۔ لکھنے میں بھلا کہاں تک لکھئے مگر ہوش و حواس بہت درست۔ شوخی طبیعت و ظرافت کا وہی عالم۔[۱۴]" غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ اُن کے اس شیدائی نے غالب کے ایک اور عاشق زار عبدالرزاق شاکر کے ساتھ آہ و زاریاں کیں ع کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست۔ وہ شاکر کو لکھتے ہیں "ہائے کیا کہئے مولانا غالب کا مرنا۔ اب تک یہ کلمہ زبان پر لانے کو دل نہیں چاہتا۔ آپ سچ فرماتے ہیں۔ کئی مہینے افسردگی کیا رہی ان کے مرنے کا غم جیتے جی نہ جائیگا۔"

"فغانِ تجبر" میں بعض خطوط بیحد دلچسپ ہیں۔ انہوں نے ایک خط شاہ برہان الدین صاحب کو فقیروں کی بول چال میں لکھا ہے۔ ادبی اعتبار سے اللہ والوں کی بولی ٹھولی کا یہ رنگ قابلِ غور ہے۔ آغاز یوں کیا ہے:۔

"یادِ اللہ! کیا بھول گئے جو مدت میں فقیر کو یاد کیا۔ شاد رہو آباد رہو۔ اتنا بھی غنیمت ہے۔ جمع اللہ کی اکثر صورتوں[۵] کو میں لکھتا رہا آپ سے عشق اللہ کہا دیں۔ سب نے یہ لکھا کہ اُن سے دید[۶] وادید نہیں ہوتی۔"

غالب کے زمانے میں اُردو تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال

---

[۱۵] اُردوئے معلیٰ۔ ص ۲۲۹۔

[۱] فغانِ تجبر ص ۲، [۲] ایضاً ص ۱۳۰ [۳] خط بنام مولوی عبدالرزاق صاحب شاکر۔ [۴] سلام [۵] جماعت [۶] اشخاص [۷] ملاقات۔

عام ہو چلا تھا۔ خود مرزا کے خطوط شاہد ہیں۔ بیتجبر کے مکتوبات میں بھی یہ الفاظ بکثرت ہیں لیکن اُن کا استعمال نہایت ہی برمحل ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک جدّت پسند اور نئی روشنی کے دوست کو خط لکھا ہے جو طنز کی اچھی مثال ہے۔" آرٹیکل نہیں کہ آپ پسند کریں، اوپینین نہیں کہ آپ کو مطبوع ہو، اسپیچ نہیں کہ آپ بغور سنیں، ایڈریس نہیں کہ آپ خوش ہوں، لیکچر نہیں آپ ویری ویل کہیں، ڈیبیٹ نہیں کہ آپ بریو فرمائیں، ڈسکس نہیں آپ جی اریس ارشاد کریں، ایک پورانی طرز کی ملاؤں کی دست فرسودہ اس پر مہمل اردو جس میں نہ کوئی لفظ انگریزی نہ نئی روشنی کا پرتو لے"۔ غالب کی طرح منشی صاحب بھی اپنے مکتوبات میں لطائف و ظرائف نہایت دلکش پیرایہ میں لکھتے ہیں جس سے ان کی تحریر کی دلآویزی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں دو لطیفے انہیں کی زبان سے سنئے:۔

"ایک جگہ دو تین آدمی تیراندازی کی مشق کر رہے تھے۔ ایک ولایتی بھی اُدھر سے گذرا۔ اُس کا بھی جی چاہا اور اُن سے تیر و کمان لیکر ایک تیر اُس نے بھی لگایا۔ تیر نشانے تک نہ پہنچا۔ لوگوں نے کہا "آغا صاحب! فش" وہ سمجھے یہ کلمہ تحسین کا میرے حق میں کہتے ہیں تبسم کرکے فرمایا "من چہ فشم۔ برادر کلانِ من بسیار فش است"۔ ایک آزاد فقیر نے اپنے بالکے سے کہا کہ "دن ڈھلتا ہے۔ شام قریب ہوتی جاتی ہے۔ افیون کی فکر کر" اُس نے کہا "مرشد اللہ خدا رزاق ہے"۔ وہ بولا "ابے دال روٹی کا وعدہ خدا نے کیا ہے اس کا وہ بیشک رزاق ہے مگر افیون کی فکر آپ کر لے"۔

ادبی اہمیت کا تقاضا ہے کہ خواجہ غلام غوث بیتجبر کے خطوط کا یہ مجموعہ پردۂ خفا میں پوشیدہ نہ رہے بلکہ جدید اڈیشن کی صورت میں منظرِ عام پر پیش کیا جائے۔ عودِ ہندی کا مطالعہ اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہے گا جب تک "فغانِ بیتجبر" اس کے پہلو بہ پہلو جگہ نہ پائے گی ؎

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

[1] فغان بیتجبر ص ۱۶۷۔

ملمّع

افسانہ

محترمہ ہاجرہ مسرور لکھنوی

وہ ریلوے ٹکٹ گھر کے سامنے سیاہ ریشمی برقعے میں ملفوف کھڑی تھی۔ اُلٹی ہوئی نقاب، کچھ متعجب سی نگاہیں۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے۔ وہ جس گاڑی سے اپنا سفر شروع کرنے والی تھی اس کے آنے میں صرف آدھ گھنٹہ کی دیر تھی۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ ٹکٹ گھر کی کھڑکیاں اب تک بند تھیں۔ اس کی حیران نظریں بند کھڑکیوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اکتا گئیں۔ اس نے ایک نظر اپنے اردگرد ڈالی۔ زمین اور تکلیف دہ بنچوں پر سیکڑوں آدمی لاشوں کی طرح پڑے سو رہے تھے۔ جیسے انھیں سفر کرنا ہی نہ تھا۔

وہ آہستہ سے قلی کی طرف مُڑی جو اس کا ہلکا پھلکا اٹیچی کیس اور مختصر سا بستر سر پر رکھے ہوئے تھا۔

"قلی! اب تک ٹکٹ گھر نہیں کھلا؟"

"یہ گاڑی ہمیشہ لیٹ رہتی ہے۔" قلی نے اپنی دُھندلی سی آنکھ اس کے خوبصورت چہرے پر گاڑ دی۔ اور پیٹھ اس کی دوسری پھوٹی آنکھ کا دھنسا ہوا پپوٹا اپنی پیلی مانگ پر پھیرتی گئی۔

"تو پھر میں کہاں بیٹھوں؟" وہ جیسے اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنی نظریں قریب قریب سوئے ہوئے غریب انسانوں کے ہجوم پر بکھیر دیں۔

"یہیں بیٹھ جاؤ۔"

"یہاں؟" اسے محسوس ہوا کہ اس کا ریشمی برقع، خوبصورت چہرہ اور نفیس اسباب قلی کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اور وہ خاموشی سے تیرتی ہوئی سی کالی چکنی سڑک کی طرف دیکھنے لگی جس پر اکا دکا چرخ چوں کرتے ہوئے یکوں کی میلی جھینیوں والی بتیوں سے ایک کثیف سی روشنی نکل کر سڑک پر رینگ رہی تھی۔ اس کا خیال فوراً ہی اپنی موجودہ حالت کی طرف دوڑ گیا۔ میں کیا ہوں اس وقت؟ دیکھنے والوں کی نظر میں یقیناً ایک امیر کبیر زادی آزاد خیال لڑکی۔ لیکن درحقیقت ایک مٹتے ہوئے خاندان کی قابل لیکن پریشاں حال لڑکی۔ بالکل یکّے کی دُھندلی لالٹین،

"رکھے دیتا ہوں سامان اِسی جگہ۔" قلی بولا۔

"نہیں، میں یہاں نہیں بیٹھوں گی۔" اس نے کسی قدر غصّے سے کہا۔ اور پھر اندھیرے میں گھورنے لگی۔ اندھیرے کو چیرتا ہوا ایک قبول صورت نوجوان بھاری اوورکوٹ پہنے اس طرف بڑھا آ رہا تھا۔ لڑکی سمجھی شاید ٹکٹ لینے آ رہے ہیں حضرت، وہ بیساختہ مسکرا دی۔ نوجوان ٹائی کی گرہ کستا، اس پر ایک چبھتی ہوئی نظر ڈالتا ٹکٹ گھر کے دوسری طرف نکل گیا۔

لڑکی کے کھلے ہوئے ہونٹ سکڑ گئے۔ ہوگا کوئی امیر زادہ بھلا وہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لینے کیوں آئے گا؟

"پھر ہم سامان رکھ کے جائیں گے۔" قلی لڑکی کی خاموشی سے جھنجھلا کر بولا۔

"بکو مت، میں یہاں ہرگز نہیں بیٹھوں گی۔" وہ اونچی آواز میں بولی۔

اچانک وہی نوجوان ٹکٹ گھر کے پیچھے سے نکل آیا۔

"قلی! تم زنانہ انٹر کلاس ویٹنگ روم میں کیوں نہیں لے جاتے؟"

"پھر اتنی دور سے ٹکٹ لینے کون آئے گا؟" — لڑکی قلی ہی سے مخاطب تھی۔

"سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ چاہیئے یا انٹر کا؟" نوجوان بھی جیسے قلی سے پوچھ رہا تھا۔

وہ ایک لمحہ کے لئے سناٹے میں آ گئی۔ معاً اس کا سڈول جسم بجلی کی سی تیزی سے گھوم گیا۔

"قلی! چلو!" وہ بڑے رعب سے بولی۔

آگے آگے قلی تھا۔ اور پیچھے پیچھے وہ۔ اس کی اونچی ایڑی کی سینڈل زمین پر ایک دلچسپ شور بکھیر رہی تھی۔ نوجوان کھڑا اس کے ایڑیوں پر تھرکتے جسم کو دلچسپی سے تاک رہا تھا۔

لڑکی نے ویٹنگ روم میں داخل ہو کر ایک طویل سانس لی قلی نے اسباب ایک طرف لگا دیا۔

"مجبوری میم صاحب!" قلی نے اس کے چرمی بٹوے سے متاثر ہو کر کہا۔

"ابھی نہیں ملیں گے پیسے۔" وہ سنگار میز کے سامنے کھڑی جھرجھری سی کپکپا دینے والی سردی میں۔ رومال سے پیشانی خشک کر رہی تھی۔

"کل ہے؟" قلی کے موٹے موٹے ہونٹ لٹک گئے۔

"اکٹھے لے لینا۔ دیکھو جیسے ہی ٹکٹ گھر کھلے مجھے بتانا آکر۔ سمجھے زیادہ پیسے ملیں گے۔"

قلی اپنے سر پر میلی پگڑی لپیٹتا چلا گیا۔

لڑکی بجائے بیٹھنے کے مضطربانہ ٹہلنے لگی۔ سامنے کی بنچ پر کوئی کمبل میں لپٹا کلبلا رہا تھا۔

عجیب مصیبت ہے۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ یہ کمبخت مرد ہر موقع پر آدھمکتے ہیں۔ کچھ نہیں تو سکنڈ اور انٹر کا شوشہ ہی چھوڑ دیا۔ اب اسے کیا معلوم کہ اس نے جو کچھ میرے پاس دیکھا بس یہی میری کل کائنات ہے۔ اٹیچی کیس اور بستر بند اچھے زمانہ کی یادگاریں ہیں۔ چرمی بٹوہ ایک سہیلی کا تحفہ۔ اور یہ برقع خالہ جان کا مانگ لیا تھا۔ کہ مسافر عورتیں میلے کچیلے برقع والیاں دیکھتے ہی پھیل پھیل کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اب میں ایسی بیوقوف عورتوں کو کیسے بتاؤں کہ کیا ہوا میرا برقع پھٹا پرانا ہے۔ لیکن شکر ہے کہ میری عقل تم لوگوں کی طرح پھٹی پرانی نہیں۔ لیکن یہ جاہل عورتیں تو بس چمکیلے بھڑکیلے کپڑے والیوں کی عزت کرنا چاہتی ہیں۔ جہاں دیکھا کوئی ٹھاٹ دار عورت اندر آئی بس سمٹ سکڑ کر جگہ دے دینگی۔ اس حالت میں اگر میں ذرا "شان" سے سفر کرنا پسند کرتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی قیمتی اوورکوٹ والا نوجوان مجھ سے یہ سوال کرے کہ ٹکٹ کس کلاس کا چاہیئے؟

کمبل میں پھر کوئی کلبلایا۔ وہ ذرا دیر کو ادھر اُدھر دیکھتی رہی اور پھر سوچ میں غرق ہو گئی۔

آج ہی تو چچا جان کی بیماری کا خط ملا تھا۔ امی جان کا اصرار تھا کہ اگر گھر سے کوئی انھیں دیکھنے چلا جاتا تو اچھا تھا۔ ورنہ وہ یہی کہیں گے کہ دیکھو کھانے لوٹنے والے تو سبھی ہیں لیکن بُرے وقت کا کوئی ساتھی نہیں۔ بس اتنے ہی پر میں جانے کو تیار ہو گئی۔ امی جان نے جانے کہاں سے تین روپے نکال کر دیئے کہ لو تم اور عقیل چلے جاؤ عقیل بچہ ہی سہی، لیکن ہے تو لڑکا۔ بس مجھے امی جان کی یہی بات تو بُری معلوم ہوتی ہے۔ جانے وہ لڑکیوں کو کیا سمجھتی ہیں۔ میں نے کہا۔ کیا میں بھی کوئی لڈو پیڑا ہوں جو کوئی کھالے گا۔ آخر سلمیٰ رضیہ وغیرہ بھی تو لڑکیاں کیسے مزے سے ہر روز سفر کیا کرتی ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ بھئی وہ بڑے آدمی کی لڑکیاں ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ واہ امی جان! تب تو انھیں بلا مبالغہ ایک درجن نوکروں کے جھرمٹ میں سفر کرنا چاہیئے۔ چونکہ ہم غریب ہیں اس لئے ایک ہی کا سفر خرچ مشکل سے نکلتا ہے۔ کیا ایک ننھے "محافظ" کے ساتھ جن کی حفاظت خود مجھ پر فرض ہوگی۔" غرض گھنٹوں ان سے بحث کی تب کہیں جا کر عقیل صاحب کے پہرے سے نجات ملی۔

کھانسی کی کھوں کھوں سے وہ چونکی۔ کمبل کی گٹھری کھلی۔ اور ایک جھریوں کا مارا جنگلے کے برجیسا سفید بالوں کا چہرہ ان کے سامنے تھا۔ وہ اپنی ڈھیلی ڈھالی فراک۔ ترشے ہوئے بال اور ٹرنک پر رکھے ہوئے ہیٹ سے کوئی عیسائی بڑھیا معلوم ہو رہی تھی۔

لڑکی نے ایک سخت تنقیدی نگاہ اس سوکھی سڑی بڑھیا پر ڈالی اور پھر دل ہی دل میں اس "خشک سانحہ" پر افسوس کرنے لگی کاش پوکھر کے پانی کی طرح اس راکت بڑھیا کے بجائے کوئی سمندر کی لہروں کی سی بے چین نوجوان عورت یہاں ہوتی۔ جو اس کے ریشمی سیاہ برقع میں دمکتے ہوئے چہرے کو رشک سے دیکھتی۔

بڑھیا نے لڑکی کی طرف دیکھا اور تکیے کے نیچے کچھ ٹٹولنے لگی۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں بیٹی؟" بڑھیا نے اس سے پوچھا۔ اور ایک جماہی لی۔ جس سے اس کا بغیر دانتوں کا غار جیسا دہانہ کھل کر بھیانک معلوم ہونے لگا۔

"آگرہ —" لڑکی جھوٹ بول رہی تھی۔ دراصل وہ اپنی غیر معروف منزل کا نام بتاتے ہوئے شرما رہی تھی۔ اس جگہ کا نام بھی تو بڑا عجیب اور بے معنی سا تھا۔

بڑھیا نے سگریٹ کیس سے ایک لمبی سی سگریٹ نکال کر سلگائی اور کمبل پاؤں پر ڈال کر لمبے لمبے کش لینے لگی۔ کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھر گیا۔ لڑکی کا دم گھٹنے لگا۔ اور اس نے اٹھ کر دروازے کے قریب لڑھکی ہوئی ریلوے ملازمہ کو جھنجوڑ دیا۔

"ارے اٹھو! مجھے پانی چاہیے۔"

کالی کلوٹی عورت اپنی میلی دھوتی سے بجائے تمام جسم کے سر اور پیشانی ڈھانک کر سنبھلنے لگی۔

"نل سے پی لو پانی۔"

"نہیں، تم باہر سے جا کر ٹھنڈا پانی لاؤ۔"

عورت نے ایک بار غور سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اور پھر شاید کچھ انعام ملنے کی اُمید لے کر باہر چلی گئی۔ لڑکی کے سیاہی مائل سُرخ ہونٹوں پر ایک کڑوی مسکراہٹ کھیل گئی۔

"دنیا جھوٹی نمائش سے کس قدر مرعوب ہوتی ہے۔" وہ میز پر کہنیاں ٹیک کر سوچنے لگی۔ "اگر اس عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس ریشمی برقع کے نیچے پیوند لگی ساری ہے تو ———؟"

کتنی تلخ حقیقت تھی؟

اس نے ساکت و صامت بڑھیا کی طرف دیکھا۔ جس کی سوکھی ہوئی انگلیوں میں جلتی ہوئی سگریٹ دھواں اُگل رہی تھی۔ بڑھیا اس وقت بالکل قبر کا مُردہ معلوم ہو رہی تھی جیسے کسی ستم ظریف نے سگریٹ تھما کر بٹھا دیا ہو۔

ملازمہ پانی کا گلاس لیئے اندر آئی ——— لڑکی پورا گلاس چڑھا گئی۔

"گاڑی نہ جانے کب آئے گی؟" لڑکی بڑبڑائی۔

"ٹکس گھر تو کھُل گوا ہے بیم صاحب۔ سب جن اُدھر ہی جات ہیں۔" عورت اپنا سر کھجاتے ہوئے بولی۔

"اچھا دیکھو اب ہمارا قُلی آتا ہوگا۔" اُس نے کہا اور آہستہ آہستہ میز تھپتھپانے لگی۔ عورت پھر دروازے کے قریب ٹِک گئی۔

"میری پریشانی ھا کو پہنچ گئی۔" کارٹون نما بڑھیا بڑبڑائی۔ اور لڑکی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اسے بھی اپنی پریشانی سے پریشان دیکھنا چاہتی ہو۔ لڑکی بدستور میز تھپتھپاتی رہی۔

"آج کل کی لڑکیاں بہت خود سر ہو گئی ہیں۔" وہ پھر کہنے لگی۔

"بوڑھی عورتیں ازل سے یہی کہتی آئی ہیں۔" وہ جیسے بڑھیا کا مضحکہ اڑا رہی تھی۔

بڑھیا نے سگریٹ کا ٹرا ایک جھٹکے سے پھینک دیا۔ اور اپنے چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ وہ سخت بیچین دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگائی۔ ذرا دیر بعد لڑکی سے مخاطب ہوئی۔

"میری لڑکی، میں نے اسے پڑھایا لکھایا . . . . ."

"یہ آپ کا فرض تھا۔" لڑکی نے بات کاٹی۔

"میں نے اس کے لئے بہترین شوہر کا انتخاب کیا تھا۔" بڑھیا نے اپنی بات کو زوردار بنانے کے لئے اپنی گردن کو سینے کی طرف جھٹکا دیا۔

"ممکن ہے وہ انتخاب اس کی نظر میں بدترین ہو۔" وہ جیسے بڑھیا کی لڑکی کی بڑی ہمدرد تھی۔ اور اس لئے وہ اس کی داستان سننے سے گریز کر رہی تھی۔ جو محض الزامات پر مبنی ہو گی۔

بڑھیا جھنجھلا کر سگریٹ کے کش پر کش لینے لگی۔ وہ لڑکی کی حاضر جوابی پر خشم ناک دکھائی دے رہی تھی۔ اسے تو اس وقت کسی سے اپنی لڑکی کی خودسری کا تذکرہ کر کے اپنے دماغ کے بوجھ کو کم کرنے کی خواہش تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ لڑکی کو کمرے سے باہر نکال کر دم لیتی۔ لیکن لڑکی اس کے غصّے سے بالکل بے پروا بیٹھی سوچ رہی تھی۔ کہ بڈھوں کی اس شکایت کا سدباب صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ سائنس کی مدد سے دنیا کے تمام بڈھوں کو جوان بنا دیا جائے. یا تمام جوانوں کو بڈھا۔

"ٹکس گھر کھُل گوا ہے۔" اس کے قلی نے آ کر کہا۔ اور لڑکی اس کے ساتھ ہولی۔ رستے میں وہ برابر اِدھر اُدھر دیکھتی جا رہی تھی کہ کہیں وہ امیرزادہ اسے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیتے نہ دیکھ لے۔ بھلا وہ کیا کہے گا اپنے دل میں۔ لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ لڑکی کسی قدر مطمئن ہو گئی۔

چیختی، چنگھاڑتی ہوئی ریل اسٹیشن کے سینے میں در آئی۔ جب لڑکی قلی کے عقب میں ویٹنگ روم سے نکلی تو اس کی پہلی نظر اسی نوجوان پر پڑی جو بڑی بے فکری سے سگریٹ مُنہ میں دبائے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

اب کیا ہو؟ وہ سوچتی ہوئی جلدی جلدی آگے بڑھنے لگی۔ یول تو اس کے ریشمی برقع اور چرمی بٹوے کی مٹی پلید ہو جائے گی۔ وہ تیزی کے ساتھ مسافروں کے ہڑبڑائے ہوئے ہجوم کو چیرتی ہوئی زنانے درجے کی تلاش میں بڑھی جا رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد اس نوجوان کی نظروں سے چھپ کر اپنی مفلسی چھپانا چاہ رہی تھی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی اور دل کی دھڑکن اسے ہتھوڑے کی چوٹ معلوم ہو رہی تھی۔

اس نے تھوڑی دور سے زنانہ درجہ دیکھا۔ جس میں رنگ رنگ کے میلے کچیلے برقعے والیاں گھبراہٹ میں ایک دوسرے کو دھکے دے رہی تھیں۔ عورتوں کی کاؤں بھاؤں، بچوں کی چل پوں، اور مردوں کی ہدایات۔ "ننھے کی اماں سامان کا خیال رکھنا۔" ایک صاحب ترکی ٹوپی کا پھندنا نچاتے کہے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے مولوی ٹائپ کے آدمی گلا پھاڑ پھاڑ کر فرما رہے تھے۔ "ارے ذرا مُنہ ڈھک کر بیٹھو۔"

لڑکی کا قلی دروازے پر اُمڈے ہوئے مردوں کے درمیان سے نکل کر درجے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

عورتوں اور مردوں کی ایک اور ٹولی زنانے درجے پر حملہ آور ہوئی۔ وہ بیچ میں پھنس کر رہ گئی۔ اس ٹولی کی ایک عورت نے اپنا چاندی کی چوڑیوں میں پھنسا ہوا ہاتھ برقعے کی گدڑی سے نکالا۔ اور لڑکی کو اپنے راستے میں حائل دیکھ کر زور سے دھکا دیا۔ لڑکی ایک جھکولا کھا کر رہ گئی۔ اس کا دل بیساختہ چاہا کہ وہ اس عورت کا جھالروں سے مزین برقع نوچ کر بھاگ جائے یا پھر اسے ریل کے نیچے دھکیل دے، لیکن سامنے جو دیکھا تو وہی نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ارے قلی! یہاں نہیں بیٹھنا ہے" وہ زور سے چلائی۔ اب وہ دوبارہ پلیٹ فارم کی پیمائش کر رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سیکڑوں میلے کچیلے برقعے غباروں کی طرح اُڑ رہے تھے۔ کاش وہ بھی ایک ایسا ہی برقع اوڑھے ہوتی۔ اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ آرزو پھر پھڑ پھڑا رہی تھی۔ وہ ہر پھر کر بلا مقصد ہی درجوں پر لکھی ہوئی عبارت کو پڑھ رہی تھی۔ فرسٹ، سیکنڈ، انٹر، زنانہ انٹر۔ وہ دفعتہ تھم گئی۔ ایک بار پھر عبارت کو پڑھا۔ اور یہ درجہ اسے موسلا دھار بارش میں کسی گھنے درخت کا سایہ معلوم ہونے لگا۔ اور وہ بلا سوچے سمجھے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ قلی باہر ہی متعجب سا کھڑا تھا۔

"لے آؤ، سامان" وہ ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ بولی، قلی سامان رکھ کر اسے پھر گھورنے لگا۔ جیسے وہ لڑکی کی اصلیت کو پہچاننا چاہ رہا ہو۔ لڑکی قلی کے خیال کو بھانپ گئی۔ اس نے بٹوہ کھولا۔ اور ایک چمکتی ہوئی اٹھنی اس کی طرف بڑھا دی۔ قلی کا چہرہ جو حقارت کے جذبات ہونے کی وجہ سے بُری طرح لٹکا ہوا تھا۔ ایک دم کھِل اٹھا۔ قلی نے ایک بار اٹھنی کو ٹٹول کر دیکھا۔ جیسے وہ یقین کرنا چاہتا ہو کہ واقعی اس ہلکے پھلکے اسباب کی مزدوری آٹھ آنے بھی ہو سکتی ہے۔

سیٹی کی آواز سن کر قلی اُتر گیا۔ اور پھر لڑکی کے عنابی ہونٹوں پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ لہرانے لگی۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا اسے میٹھی میٹھی نظروں سے تاک رہا ہے۔

گاڑی کو جنبش ہوئی۔ اور وہ دوڑ کر آگے چلا گیا۔ اسٹیشن کی دکانیں خوانچے والے اور قلی اس کی نظروں کے سامنے سے بھاگ رہے تھے۔ وہ دور تک کھڑی اسٹیشن کی بتیوں کو جو اندھیری رات میں جگنو کی طرح چمک رہی تھیں، گھورتی رہی۔ آخر گھپ اندھیرے میں اس کی نظریں ٹھوکریں کھانے لگیں۔

اب وہ اپنے درجے کی طرف متوجہ ہوئی۔ دو سیٹوں پر دو عورتیں رنگین لحافوں میں لپٹی ہوئی لمبی لمبی لیٹی تھیں۔ اور ان کے ارد گرد بھاری بھاری ٹرنک اور بڑی بڑی پوٹلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ادھر تو بیٹھنے کی جگہ ہی نہ تھی۔ تیسری سیٹ پر ایک کونے میں ایک دبلی پتلی عورت بیٹھی اپنے زرد رو بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس کے قریب ایک دوسرا بچہ جو زیادہ سے زیادہ دو سال کا ہوگا، بیٹھا منمنا رہا تھا۔ بالکل سوکھا، ٹیڑھی۔ ہاتھ پاؤں کی کھال لٹکی ہوئی۔ جیسے وہ پیدائش کے بعد فوراً ہی براہ راست بڑھاپے کی طرف چل دیا ہو۔ درجے پر ایک عجیب قنوطیت سی طاری تھی۔

لڑکی بد دل ہو کر ایک سیٹ پر ٹک گئی۔ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری۔ اور لڑکی کا دل پسلیوں سے سر ٹکرانے لگا۔ اگر کوئی اس وقت اس کا ٹکٹ دیکھے تو ــــــ؟ اسے پھر یریاں آنے لگیں۔ دو منٹ بعد گاڑی چل دی۔ اور لڑکی سوچ میں پڑ گئی۔

آخر اس ملمع سے کیا فائدہ؟ جو ذرا سی رگڑ سے اُتر جائے۔ دنیا میں امیر غریب سبھی تو ہیں۔ بھلا ایک قیمتی اوورکوٹ والے نوجوان سے اس قدر متاثر ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اسے اپنے فعل پر ندامت محسوس ہونے لگی۔

آسمان پر صبح کی روشنی رینگتی جا رہی تھی۔ تارے سہمے سے کانپ رہے تھے۔ گاڑی ایک اور اسٹیشن پر رکی۔ لڑکی نے دروازے سے سر نکال کر اسٹیشن کا نام پڑھا۔ اب اس کی منزل مقصود بہت قریب تھی۔ سوئی ہوئی عورتیں اٹھ بیٹھیں۔ موٹی، بھدی۔ وہ آپس میں جماہیاں لے لے کر کسی دوسرے صوبے کی زبان میں باتیں کر رہی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی لڑکی کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ جیسے وہ اپنے کالے چہروں کے سامنے اس کے کالے برقع کی کوئی حیثیت نہ سمجھتی تھیں۔

دو بچوں والی عورت اونگھ رہی تھی۔ اس کا بوڑھا بچہ آلتی پالتی مارے گردن جھکائے بیٹھا جلدی جلدی پلکیں پیٹ رہا تھا۔ بالکل خاموش، جیسے وہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی سے فکرمند ہو کر اس کے وجوہ پر غور کر رہا ہو۔

لڑکی نے اپنا مختصر اسباب دروازے کے قریب گھسیٹ لیا۔ کیونکہ آئندہ اسٹیشن پر اسے اُترنا تھا۔ گاڑی رکی اور اس نے جلدی سے اپنا بستر پلیٹ فارم پر پھینک دیا۔ پھر اٹیچی کیس لے کر اُتر گئی۔ چھوٹا سا اسٹیشن، گاڑی صرف دو منٹ ٹھہرتی تھی۔

ٹرین نے سیٹی دی اور وہ اس نوجوان پر ایک الوداعی نظر ڈالنے کے لئے رکی رہی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس لئے کہ

اس نے اپنی اصلیت کو نوجوان کی تیز نظروں سے چھپا لیا تھا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر سناٹے میں آگئی کہ وہ نوجوان اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ لڑکی گھبرا کر قلی کو پکارنے لگی۔ ایک بڈھا آنکھیں ملتا ہوا آیا اور اس کا اسباب اٹھا کر دھیمے دھیمے چلنے لگا۔
لیکن لڑکی تقریباً بھاگ رہی تھی۔ اس لئے کہ اب وہ نوجوان سے پہلے گیٹ پاس کر کے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ چھپانا چاہ رہی تھی۔ لیکن جس وقت لڑکی گیٹ کے قریب پہنچی تو وہ گیٹ سے باہر کھڑا اسے آتا دیکھ رہا تھا۔ ٹکٹ دینے کے لئے لڑکی کا ہاتھ بڑھتا ہی نہ تھا۔ اس وقت ٹکٹ اس کے ہاتھ میں ایک من کے بوجھ سے کم نہ تھا۔ وہ چند لمحوں تک تذبذب کی حالت میں کھڑی رہی آخر اسے ٹکٹ بڑھانا ہی پڑا۔

وہ مضمحل قدموں سے باہر نکلی۔ اس وقت اس کی کیفیت اس شخص کی سی تھی جس نے اپنے کپڑے بھگوئے بغیر دریا پار کیا ہو لیکن کنارے پر پھسل کر پانی میں شرابور ہو جائے۔ اسے اب نوجوان کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ شاید وہ اس کی نظروں میں اب کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی۔ یہ احساس اس کے سینہ کو برما رہا تھا۔

وہ تانگے پر بیٹھ کر رو پڑی۔

چچا کے یہاں اس کا استقبال صرف اس لئے بڑی گرم جوشی سے کیا گیا کہ اس نے چچا کو دیکھنے کے لئے اتنا لمبا سفر کیا۔ لیکن وہ ان گرم جوشیوں کے مقابلے میں بہت سرد دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے چائے کی ایک پیالی دوا کی طرح پی۔ اور کوٹھے پر دھوپ کھانے چلی گئی اس کے پیچھے اس کی چچا زاد بہن بھی آگئی۔ وہ ایک جاہل دیہاتی لڑکی تھی جس کی حماقتوں کو اس کے گھر والے بھولا پن کہا کرتے تھے۔

"باجی! یہ برقع تو بڑا اچھا سا بنا ڈالا تم نے۔" وہ الگنی پر پڑے ہوئے برقعے کو چھو کر بولی۔

لڑکی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سورج کے رخ پر کھڑی برقع کو زہر آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ لمبی چوڑی چھت پر ٹہلنے لگی۔ اسے سفر کے سارے واقعات رہ رہ کر یاد آ رہے تھے جنھیں وہ اپنے دل سے محو کر دینا چاہتی تھی۔

اس کی بہن مارے شوق کے اس کا برقع پہن کر کھڑی ہو گئی۔

"کتنا اچھا لگتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی بناؤں گی۔ بالکل ایسا۔" وہ ہر اچھی چیز کو دیکھ کر خود بنانے کو کہا کرتی تھی لیکن شاید ہی وہ ایسا کر سکی ہو۔ لڑکی خاموش ٹہلتے ٹہلتے پڑوس کے مکان میں جھانکنے لگی۔

گوبر سے لپے پتے آنگن میں ایک بانس کی کھری چارپائی پر کوئی تہبند باندھے اوندھا پڑا دھوپ سینک رہا تھا۔ چارپائی پر ایک طرف بیڑی کا ایک بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیہ رکھی ہوئی تھی۔ پھونس کے چھپر میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی باجرے کی موٹی موٹی روٹیاں تھوپ رہی تھی۔ دھوپ کھانے والے نے کروٹ لی اور لڑکی کا دل دھڑکتے دھڑکتے ایک لمحہ کیلئے رک گیا۔

"وہی سٹیشن کا امیر زادہ"۔ اچانک دونوں کی نظریں چار ہوئیں نوجوان نے پھرتی سے کروٹ بدل لی۔ چھپر میں ایک کھونٹی پر قیمتی اوورکوٹ جھول رہا تھا۔

"بو اس مکان میں کون رہتا ہے؟"

"ایک بیوہ، اس کا لڑکا بھی ہے۔ شہر میں پڑھتا ہے بیچاری بڑی سیدھی عورت ہے، ہمارے یہاں کے سب کپڑے وہی سیتی ہے۔ لیکن سلائی بہت کم لیتی ہے"۔

وہ اپنا ریشمی برقع انگلیوں میں مسل رہی تھی۔

کیا کرے کوئی

از جناب ملک محمد رفیق رسوا پنڈوری

حسن پر دل فدا کرے کوئی
عشق کا حق ادا کرے کوئی

وہ نہ آئیں تو کیا کرے کوئی
ہائے کب تک جیا کرے کوئی

چن کے افشاں وہ بام پر آئیں
دن کو تارے گنا کرے کوئی

یہ تمنا ہے داستانِ فراق
میں کہوں اور سنا کرے کوئی

بعد مرنے کے وہ ملیں شاید
جی کے دنیا میں کیا کرے کوئی

وہ ادھر دیکھ لے تسلی ہو
درد دل کی دوا کرے کوئی

جس میں ہوں ہر قدم پہ لاکھوں غم
ایسی دنیا کو کیا کرے کوئی

دل میں پنہاں ہے حسرت دیدار
چھپ کے آئے خدا کرے کوئی

اہل محشر رہیں طالب دیدار
اپنا وعدہ وفا کرے کوئی

مر نہ جائیں تو کیا کریں رسوا
وہ نہ آئیں تو کیا کرے کوئی

شرارے

پھر تو کہنا کہ ہم تمہارے ہیں

حضرت نثار اٹاوی

تم نے جو دل پہ تیر مارے ہیں
اب وہی زیست کے سہارے ہیں

یہ جو کچھ لوگ پیارے پیارے ہیں
دل کی دنیا کے چاند تارے ہیں

موج طوفاں سی ہم کو باک نہیں
تشنہ لب ہیں مگر کنارے ہیں

تم ہمارے نہیں تو کس کے ہو؟
ہم کسی کے نہیں تمہارے ہیں

یہ ستارے، یہ چاند، یہ سورج
سب مری آہ کے شرارے ہیں

حسن وعدہ شکن کی نظروں میں
میرے ٹوٹے ہوئے سہارے ہیں

تیری نظروں کو کون دے الزام
ہم سب اپنی قضا کے مارے ہیں

چشم پرنم ہے عکسِ شامِ فراق
وہی ظلمت وہی ستارے ہیں

نہ تمنا، نہ آرزو، نہ خلش
سب مری زندگی کے دھارے ہیں

زندگی کا تو آسرا ٹوٹا
اے اجل اب ترے سہارے ہیں

صفحۂ حسن کے نقوشِ جمیل
نگہِ عشق نے ابھارے ہیں

شامِ غم میرے آنسوؤں پہ نہ جا
یہ مری صبح کے ستارے ہیں

دل نثارِ فریب ہوتا ہے
پھر تو کہنا کہ ہم تمہارے ہیں

حضرت انسان کی بہیمانہ خدمات کی سرگزشت

از مولانا محمد اسمٰعیل ناصح

انسانی تمدن کے بالکل ابتدائی دور میں انسان کے تمام کام خواہ وہ کتنے ہی سخت اور مشقت طلب کیوں نہ ہوں امداد باہمی کے ذریعہ سے انجام پاتے تھے اس کے بعد جب اس نے بعض جانوروں کو مسخر کر کے ان سے اپنے محنت کے کام لینے شروع کئے تب بھی اس نے اس فطری عادت کو بکلی ترک نہیں کیا اور چوپایوں کو محض اپنا ہاتھ بٹانے والے شریک کی حیثیت دیئے رکھا۔ پھر عرصہ دراز کے بعد جب اس نے ایجاد و اختراع کے ذریعہ سے انواع و اقسام کے آلات اور مشینیں تیار کیں جب بھی اس نے اپنی آبائی خصلت سے دست کش ہونا پسند نہیں کیا حتیٰ کہ آج بھی جب انسان قسم قسم کی کلوں کی بدولت اس نوع کی محنت و مشقت سے گونہ مستغنی ہو گیا ہے اس سے باز نہیں آیا۔ رکشا کلی کی نمایاں مثال آج بھی موجود ہے اور تجارتی مقامات میں دستی یا ٹھیلا گاڑیوں کا وجود قرون غیر متمدنہ کی یادگار بنا ہوا ہے۔

عہد جدید سے پیشتر انسانی سواری اور اس کے سامان کو لادنے اور ڈھونے میں انسان جانوروں کا ہر طرح شریک و سہیم تھا۔ یہ بہیمانہ کام کبھی تو وہ برضا و رغبت انجام دیتا تھا اور کبھی محض جبریہ۔ وہ بہائم اور چوپایوں کی طرح اپنے ابنائے جنس کو پشت اور کندھے پر لادتا، گاڑیوں اور چھکڑوں کو کھینچتا اور بوجھ کو سروں پر رکھ کر ڈھوتا رہتا تھا۔ جہاں تک ان بہیمانہ مشقت کے کاموں کے برضا و رغبت انجام دینے کا تعلق ہے اس میں دلچسپی کا سامان تو ضرور ہے مگر اہمیت و عبرت کا پہلو کم ہے البتہ جب یہی کام جبراً لیا جاتا ہے تو وہ ایک قابل ذکر تاریخی واقعہ بنجاتا ہے اور اس میں دلچسپی کی نشان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طبقہ کے لوگوں میں غلاموں اور اسیران جنگ کی خدمات خاص تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ بہر حال ذیل میں چند بہیمانہ خدمات کا حال جو اب داستان پارینہ ہونے کے سبب تاریخی حیثیت حاصل کر چکے ہیں قارئین کے تفنن طبع کے لئے درج کیا جاتا ہے۔

اسلام سے پہلے غلاموں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی اور ان کے مصائب دردناک۔ ان سے جیسی محنت و مشقت کے کام لئے جاتے تھے ان کی روئداد سنکر بدن لرز جاتا ہے۔ ان غلاموں میں حبشیوں کی حالت زیادہ زبوں تھی کیونکہ وہ اور قومیت کے غلاموں کی بہ نسبت زیادہ مضبوط اور جفاکش ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرعون مصر نے غیزہ میں اہرام کی عظیم الشان عمارت تعمیر کرنے کا ارادہ کیا (جو بعد میں اس کا اور اس کے خاندان والوں کا مقبرہ قرار پایا اور روئے زمین پر ایک ایسی نادر الوجود شے بن گیا کہ وہ عجائبات عالم میں شمار ہونے لگا) تو اس کی دیواروں کے لئے پتھر ڈھونے کا کام حبشی غلاموں ہی کے سپرد کیا گیا۔

جتنی عظیم الشان یہ عمارت بننے والی تھی ظاہر ہے کہ اتنے ہی بڑے حجم کے اور اتنی ہی کثیر تعداد میں پتھر بھی درکار تھے۔ اس کی عظمت کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس اہرام کا زیرین حصہ پہنائی میں ۱۳ ایکڑ اراضی پر محیط ہے اور لبنان میں سینٹ پال کے گرجا والے صلیب سے بھی بقدر ۱۵۰ فٹ کے زائد ہے۔ اس کام کیلئے پتھر ۷۵۰ میل دور حبشہ کے پہاڑوں سے منگوانیکی ضرورت لاحق ہوتی۔ یہ پتھر عموماً ۸۰ ٹن کے ہوتے تھے۔ اس عہد میں رسل و رسائل اور حمل و نقل اسباب کے لئے آجکل کی سی سہولت حاصل نہ تھی۔ اتنی طویل و عریض سڑکیں تھیں نہ باربرداری کے اس طرح کے سامان۔ اس پر طرہ یہ کہ حبشہ کے پہاڑی راستے بالکل دشوار گذار تھے۔ یہ کیفیت فی الحال آج بھی نمایاں ہے۔

ان پتھروں کے بھدے پن کو برنجی آروں سے تراش تراش کر دور کیا جاتا تھا اور سڈول بنایا جاتا تھا۔ برنجی آرا سے اس لئے کام لیا جاتا تھا کہ اس دور میں اہل مصر لوہے کے وجود اور مصرف سے ناواقف تھے۔ یہ لوگ ان آروں کے دندانوں کو زمرد، یاقوت، نیلم وغیرہ کے گھٹیا قسم کے پتھروں سے جو حبشہ کے پہاڑوں میں بافراط ملتے تھے یا ہیرے کی کنی سے جو رودڈیشیا سے آتا تھا ریت پیت کر اور رگڑ رگڑ کر نکالتے تھے۔ بہر حال ان پتھروں کو اچھی طرح تراش خراش کر چکنے کے بعد سگ گاڑیوں پر

جو چھوٹے پہیوں کی ہوتی تھیں بار کرتے تھے۔ اس کے بعد غلاموں کے دَل کے دَل ان گاڑیوں میں جانوروں کی طرح جوت دیئے جاتے تھے جو انہیں کھینچ کھینچ کر منزل مقصود (غیرہ) پر پہنچا آتے تھے۔ یہ راستے جن سے یہ لوگ گذرتے تھے اس قدر بیڑا اور دشوار گذار ہوتے تھے کہ ان پر سے بیلوں اور گھوڑوں کا ... ناممکن تھا۔ ان گوناگوں دشواریوں کی بنا پر رفتار کی شرح اس قدر سست تھی کہ کسی طرح تین میل روزانہ سے زیادہ مسافت طے نہ ہو پاتی تھی جس کی وجہ سے منزل مقصود پر پہنچنے میں کم و بیش دو ماہ کی مدت لگ جاتی تھی۔ پھر راہ کی صعوبتیں اس قدر صبر آزما ہوتی تھیں کہ گاڑی کھینچنے والوں کی کثیر تعداد دوران سفر ہی میں لقمۂ اجل بنجاتی تھی اور جو لوگ صحیح و سلامت پہنچ بھی جاتے تھے انکی حالت شدت خستگی سے مُردوں سے بدتر ہوتی تھی۔ ان کے جسم ہانکنے والوں کے چرمی تازیانوں کی بیرحمانہ ضربوں سے ادھڑے ہوئے ہوتے تھے۔ ان لوگوں میں اگرچہ مصری عرب اور دوسری قومیت کے لوگ بھی ہوتے تھے مگر حبشیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ علاوہ بریں جن مضبوط قیدیوں کو سزائے موت دیجاتی تھی انہیں بھی بجائے جلاد کے حوالہ کرنے کے اسی کام میں لگا دیا جاتا تھا۔

جنگ کے موقع پر انسانوں سے چوپایوں کی سی خدمات لینے جانے کی مجبوری اکثر آپڑتی ہے اور لوگ اس وقت جانوروں کی نیابت کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ عہد عتیق میں اہل قرطاجنہ باربرداری کا کام حبشی غلاموں اور لونڈیوں سے چوپایوں کی بجائے لیتے تھے۔ یہ لوگ قربت کی وجہ سے بکثرت ملتے تھے کیونکہ ان کی قوم سرزمین قرطاجنہ کے جنوب میں آباد تھی۔ ان کی کثیر تعداد فوج کے پیچھے پیچھے ان کا سامان خور و نوش لیکر چلتی تھی۔ یہ اس لئے بھی کہ بہتیرے علاقے جہاں سے فوج گذرتی ایسے ہوتے کہ وہاں کھانے پینے کی چیزیں دستیاب نہیں ہوتیں، ان مزدوروں میں سے ہر مزدور کے ساتھ چھ سات سپاہیوں کا سامان ہوتا تھا۔ ہنیبال جب روم پر چڑھائی کرنے کیلئے کوہ الپس کے پار ہورہا تھا تو اس نے ہاتھیوں کے چارے کے بڑے بڑے گانٹھ ان غلاموں ہی کے سر اور پیٹھ پر لادے ہوئے ہوتے تھے اور فوج کے عقب میں چلتے تھے۔

اسیریا اور بابل والے اس قدر بیرحم واقع ہوئے تھے کہ وہ اسیران جنگ سے جن میں ہر طبقہ و درجہ کے لوگ ہوتے تھے اپنی گاڑیاں کھنچواتے تھے۔ اگر گاڑیاں نہ ہوتیں تو یہ مضحکہ خیز حرکت کرتے کہ ان کی پشت اور کندھوں پر سوار ہوجاتے اور انہیں جانوروں کی طرح ہنکاتے ... علاوہ ان کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا ان کو اپنی بیچارگی و ذلت کا احساس کرانا بھی ہوتا تھا۔ اس بنا پر اس ذلیل خدمت کیلئے سپہ سالاروں، شہزادوں، امیروں وغیرہ اعلیٰ مناصب والوں کا خاص طور پر انتخاب کیا جاتا تھا۔

پندرھویں صدی کے آخیر میں جب ترکوں نے ہنگری کا محاصرہ کیا تھا تو ایک برنجی توپ کو قسطنطنیہ واپس لانے کیلئے ۲۰۰ بیلوں کے ساتھ ساتھ ۲۰۰۰ انسانوں کو بھی اس میں جوت دیا گیا تھا۔ یہ توپ پیتل کی بنی ہوئی اور ۸۰ ٹن وزنی تھی۔ اس سے بڑی توپ اب تک کہیں ڈھلی نہ تھی بلکہ ۱۸۸۰ء سے پیشتر یعنی چار سو سال بعد تک بھی اس کی نظیر دیکھنے میں نہ آئی۔ اس عظیم الہیکل توپ کو ہنگری کے ایک انجینئر نے بنایا تھا اور اس کو کھینچ کر قسطنطنیہ تک پہنچانے میں ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا تھا۔ جب کبھی اس توپ کی گاڑی نرم زمین پر رکر دھنس جاتی یا بلندی پر چڑھانا ہوتا تو اس کو کھینچکر آگے لیجانے کیلئے ہزاروں آدمی اس میں جوت دیئے جاتے۔

ایک بار نپولین بھی دوران جنگ میں انسانوں سے چوپایوں کا کام لینے پر مجبور ہوا تھا۔ یہ ضرورت جینا پر لشکر کشی کرنے کی تقریب پیش آئی تھی۔ پرشیا کی فوج ایک مضبوط اور ناقابل تسخیر مقام پر مورچہ بند تھی۔ یہ جگہ پہاڑ کی طرح بلند اور ڈھلوان تھی۔ نپولین جب دیکھتا بھالتا اس مقام پر وارد ہوا تو اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

"کیا بات ہے کہ توپیں ہنوز اس پہاڑی پر چڑھائی نہیں گئیں؟"

"حضور پہاڑی اس قدر ڈھلوان ہے کہ گھوڑوں اور خچروں کیلئے اس پر چڑھنا اور توپخانوں کا کھینچنا ناممکن ہے۔"

"کیا اس پر آدمی بھی نہیں چڑھ سکتے؟"

"کیوں نہیں۔"

"بہت خوب! انجینروں سے کہو کہ چٹانوں کو کاٹ دیں۔ توپوں کو اُتار لو اور ان میں آدمیوں کو جوت دو۔ اسکے ساتھ کچھ لوگ پیچھے سے بھی دھکیلیں تاکہ وہ پھسلنے نہ پائیں۔"

اس حکم کے بموجب سپاہی تمام رات گھوڑوں کی ڈاک کی طرح توپوں کی اینچا تانی کرتے رہے۔ یار سے صبح ہوتے ہوتے توپیں سب کی سب اوپر چڑھ گئیں اور پرشیا کی فوجوں کو ان کی

آتشبازی کی زد میں لے آیا گیا [1]

عورتوں کی بہیمانہ خدمات کا حال مردوں سے زیادہ دلچسپ اور حیرتناک ہے اگلے زمانہ میں جبکہ لونڈیوں اور غلاموں کا رواج عام تھا تو ان سے بہیمانہ خدمات کا بیرحمی کے ساتھ لیا جانا معمولی بات تھی۔ اس بارے میں ملکہ سمیر آمس اپنی باندیوں کو سزا دینے کے نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرتے رہنے میں خاص شہرت رکھتی تھی۔ یہ عورت انتہائی درجہ کی قسی القلب واقع ہوتی تھی۔ وہ مبغوض لونڈی کو اپنی سبک رفتار گاڑی میں ابلق گھوڑوں کے ساتھ جوت دیتی اور اس پر سوار ہو کر خود ہانکنے کا فرض انجام دیتی۔ دوران رفتار میں اس بدنصیب باندی کو کوڑے مار مار کر گھوڑے کی چال چلنے پر مجبور کرتی۔ لیکن وہ ابھی کچھ ہی دور جانے پاتی کہ تھکاوٹ کے مارے غش کھا کر گر پڑتی۔ سمیر آمس کے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ جب وہ لونڈیوں سے ناراض ہوتی تو ایک دن میں اس انوکھے طریقے سے چھ سات باندیوں کی جان بے دریغ لے لیتی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ ملعون عورت گھوڑے کو کبھی کوڑا مارتے ہوئے نہیں دیکھتی تھی۔ غالبًا اس عورت پر شیطان مسلط تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں بعض جرمن شہروں میں بھی اکثر عورتیں اظہار لینے والے پادریوں کے فتوی پر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی غرض سے کوڑا گاڑی کھینچنے کا ذلیل بہیمانہ کام اپنے ذمہ لے لیتی تھیں۔ اس قسم کی عورتیں گاڑی میں لگتے وقت چہرے پر نقاب ڈال لیتی بلکہ سر سے پاؤں تک برقع اوڑھ لیتی تھیں جس سے ان کی شخصیت مستور ہو جاتی تھی۔ ان کا نام تک کبھی ظاہر ہونے نہ پاتا تھا۔

جو عورتیں شرارت اور جرائم کے ارتکاب پر سزایاب ہوتی تھیں انہیں بھی اسی قسم کی گاڑیوں میں جوت دیا جاتا تھا لیکن بخلاف کفارہ ادا کرنے والی عورتوں کے انکے چہرے اور اعضا کو عامۃ الناس کی نگاہوں سے مستور رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ مزید براں ان کی گردن میں ایک لوح بھی لٹکا دی جاتی تھی جس میں ان کے جرائم کی نوعیت اور سزا کا حال مندرج ہوتا تھا۔ ان عورتوں کو اس طرح سر بازار تشہیر کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچا دیا جاتا تھا جہاں کوڑے کرکٹ ڈھیر کئے جاتے۔ آج اگر ہٹلر نے بھی غیر آریائی رجحان رکھنے والی سرکش خواتین کی تنبیہہ کیلئے اسی قدیم پُر لطف جرمن دستور کو جاری کر دیا ہے تو اس میں کوئی انوکھی بات نہیں۔

زمانۂ قدیم میں ایسے رومی کاشتکار جو بیل رکھنے کی استطاعت سے عاری تھے ہل چلانے کا کام لونڈیوں اور غلاموں ہی سے لیتے تھے۔ اندنوں یہ رواج اس قدر عام تھا کہ لونڈی غلام کی عدم دستیابی پر اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو بھی بلا تکلف ہل میں اسی طرح جوت دیا کرتے تھے۔ آج بھی البانیا اور چیکوسلوواکیا اور جوگوسلاویہ کے بعض حصوں میں عورتوں کے ہل میں جوتے جانیکا دستور رائج ہے۔ انگلستان میں بھی حال تک اس کا رواج ہے چنانچہ انیسویں صدی کی ابتدا میں ڈیلاشائر میں زراعتی مزدوروں کی بیویوں اور بیٹیوں سے ہل میں چلنے کا کام چند پیسوں کی روزانہ اجرت پر لیا جاتا تھا۔ یہ اس لئے کہ بیلوں سے یہ کام لینا نسبتًا گراں پڑتا تھا۔

ڈومیشیان نے کولیزیم واقع روم میں نوجوان عورتوں سے گاڑی کھنچوانے کی رسم جاری کی تھی جن لڑکیوں سے یہ کام لیا جاتا تھا وہ دوڑنے میں بہت مشاق ہوتی تھیں۔ انہیں دو پہیوں کی ہلکی گاڑیوں میں جوت دیا جاتا اور گاڑیبان انہیں ڈانٹ ڈانٹ کر اور تازیانے لگا لگا کر تیز بھگائے پھرتا۔ اس عہد کے رومیوں میں ہار جیت والی مسابقت کا رواج زوروں پر تھا اور یہ گاڑی کھینچنے والی چھوکریاں اس تقریب پر وہی خدمات بجا لاتیں جو آج گھوڑے گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں انجام دیتے ہیں۔ ان سے میدان مسابقت میں کام لئے جانیکا ایک خاص سبب یہ ہوتا تھا کہ برعکس لا یعقل جانورں کے وہ ہدایات پر بخوبی عمل کر سکتی تھیں۔

انیسویں صدی میں ویسٹ انڈیز (جزائر غرب الہند) کے دولتمند کاشتکاروں اور امریکہ کی غلام ساز ریاستوں نے بھی اپنی لونڈیوں سے ٹٹو کا کام لینا شروع کیا تھا۔ پہلے پہل تو انکی حیثیت

---

[1] پرشیا کو جو شکست فاش اس لڑائی میں نصیب ہوئی تھی اس سے ہر کہ ومہ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب یہ ریاست کبھی نہ پنپ سکے گی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اس جنگ میں اسکی فوجی قوت بالکل کچل جانے سے پراگندہ ہو گئی تھی مگر اس سے بھی زیادہ اس بنا پر کہ شرائط صلح سخت کڑی تھیں کہ انکی رو سے نہ صرف بیس ہزار سے زائد فوج رکھنے کی ممانعت تھی بلکہ لازمی فوجی خدمت تک کی اجازت نہ تھی لیکن جلد ہی دنیا نے دیکھ لیا کہ اس نے اپنی غیر معمولی خفیہ تیاریوں کی بدولت اپنا سابقہ عروج و اقتدار دوبارہ بحال کر لیا۔ پرشیا نے یک لشکر جرار مجلس شباب نامی ایک جمعیت کی وساطت سے چپ چپاتے تیار کیا اور ضروری جنگی قواعد سکھانے اور تمام کیل کانٹوں سے لیس کرنے کے بعد اس کے ذریعہ اپنی عظمت رفتہ کو لوٹانے کی باقاعدہ جد و جہد شروع کر دی تھی۔

محض بچوں کے دل بہلاؤں کی ہوتی تھی۔ وہ انکی چھوٹی موٹی گاڑیوں کو کھینچتیں اور انہیں کندھوں پر بٹھاکر دوڑ بھاگ مچاتیں مگر بعد میں ان سے بازیوں میں بھی کام لیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس طریقے نے رواج اور وضع کی صورت اختیار کرلی۔ جن لونڈیوں سے ٹٹو کا کام لیا جاتا مطلوب ہوتا انہیں پہلے جانوروں کی طرح دوڑنے اور کلیلیں کرنے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ بعدہٗ ان کے مُنہ میں لگام ڈال کر انہیں ایک ہلکی سی گاڑی میں جوت دیا جاتا اور جب ان میں ان کے آقا اور مالکہ دونوں آرام فرما ہو لیتے تو یہ انسانی "ٹٹوئیں" دلکی چال سے انہیں قرب جوار کے کاشتکاروں کے گھر گھر پہنچاتی پھرتیں۔ کبھی کبھی ان انسانی ٹٹوؤں کی دوڑ بھی ہوا کرتی تھی جسمیں مقابلہ کرنے والیوں کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ان پر بے تحاشا کوڑے برسائے جاتے تھے۔

قدیم زمانے کی بعض بُت پرست قوموں میں مذہبی رسُوم کی ادائیگی کی تقریب پر رتھ کھینچنے کی خدمت عورتوں ہی سے مخصوص تھی چنانچہ جزیرۂ پیرو کے آفتاب پرست باشندوں میں یہ رسم بہت پرانے زمانے سے منائی جاتی ہے۔ ان کی قومی حکومت کے زمانہ میں چونکہ ان کے سردار جن کا لقب "انکا" تھا ہندوستان کے چھتریوں کے ایک طبقہ کی طرح اپنا سلسلہ نسب سُورج سے ملاتے تھے اور خود کو سُورج بنسی کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس لئے اپنی سالگرہ کی تقریب پر سُورج دیوتا کی پرستش کا خاص اہتمام کرتے اور جشن عام مناتے تھے۔ ان ایام میں انکا ہواُتنا کا یک عظم کی راجدھانی تیا ہوانا کو کی سڑکوں پر سفید پوش دوشیزائیں جن کے سر زریں فیتوں سے بندھے ہوئے ہوتے تھے اور پاؤں میں طلائی بیڑیاں پڑی ہوتی تھیں جن سے انکا قدم تیز اور رلانیا نہیں ہونے پاتا تھا سونے کی ایک وزنی مورت کو کھینچتی نظر آتی تھیں۔ اگرچہ ہسپانوی غاصبوں نے انکا ہوا لپا کی وفات کے بعد ۱۵۲۶ء میں اس رسم کے ادا کرنے کی ممانعت کردی تھی مگر پیرو کے یہ قدیم باشندے دُور دراز مقامات میں چھپکر یہ رسم برابر انجام دیتے رہے اور ابتک دیتے ہیں۔ انکا عقیدہ یہ ہے کہ انکا کسی نہ کسی دن آفتاب کی دُنیا سے ضرور لوٹیں گے اور اپنے مجبور و مخذول اخلاف کو غیر ملکی محکومیت کی لعنت سے نجات دینگے۔ مکزیکو کے آزتک خاندان کا آخری بادشاہ ماننتے زوما جب مر ہے تو اس کے تابوت کے رتھ کو کھینچکر مقبرہ میں پہنچانے کی خدمت بھی شہزادیوں اور کنواریوں ہی نے انجام دی تھی۔

بھوٹان کے علاقہ میں آج بھی عورتیں مسافروں کو پیٹھ پر پہاڑی راستے طے کراتی ہیں۔ کلمپانگ اور تبت کی طرف سفر کرنیوالوں کو پہاڑی منازل قطع کرنے کے لئے ان جنگلی عورتوں کی خدمات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہ عورتیں بڑی مضبوط اور نہایت جفاکش ہوتی ہیں ڈیل ڈول بھی خاصہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی پیٹھ پر چوبی پالان رکھ لیتی ہیں اور اس پر مسافروں کو بٹھاکر پہاڑیوں پر چڑھنا شروع کردیتی ہیں۔ اگر سواری کے اُلٹ کر گر پڑنے کا احتمال ہوتا تو وہ اپنے لنبے لنبے پستانوں کو بلا تکلف مسافروں کے ہاتھ میں سہارے کیلئے پکڑا دیتی ہیں۔

اگلے زمانے کی قساوت قلبی کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ معصوم بچے بھی اس بہیمانہ مشقت کے کاموں سے مستثنیٰ نہیں کئے جاتے تھے اس کا زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ ان سے یہ خدمت جوانوں کی طرح سختی و بیرحمی سے لی جاتی تھی۔ جب تک کانوں کے اندر ٹٹوؤں سے کام لینے کا رواج نہ ہوا تھا پتھر کوئلے کے کانوں کے مختلف گوشوں سے لا لاکر ڈھیر کرنے کی خدمت لڑکوں اور لڑکیوں ہی سے لی جاتی تھی۔ چنانچہ پانچ سال سے لیکر چودہ سال کی عُمر تک کے بچے اور بچیاں نیم برہنہ وضع میں ترتیب وار ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے تنگ نالیوں میں گھُستے تو ایک خاص مقام پر پہنچنے کے بعد کوئلے سے لدی ہوئی ٹرالیوں میں انہیں جوت دیا جاتا۔ پھر جب وہ ان ٹرالیوں کو جانوروں کی طرح کھینچ کر لے چلتے تو پاسبانوں کی جماعت جن کا کام فقط زیادہ سے زیادہ کوئلے اوپر کو بھیجتے رہنا تھا ان کے ساتھ بالکل جانوروں کا سا برتاؤ کرتے حتیٰ کہ جہاں کہیں راستہ کی تنگی بیار کو کام میں لانے سے مانع آتی تو چھڑیوں کی تیز نوکوں سے ان بیچاروں کے کچوکے لگاتے۔ لیکن اب ۱۸۴۲ء سے بچوں اور بچیوں سے کانوں میں کام کرانے کی قانونی ممانعت ہوگئی ہے۔ ہندوستانی کانوں میں تو بالکل حال تک کوئلے بچوں ہی کی مدد سے دہانے پر پہنچانے کا طریقہ رائج تھا۔

افریقہ کے جنگلی باشندے ان بہیمانہ خدمات میں اسقدر مشاق ہیں کہ انہوں نے ان کو اپنا ذریعۂ رزق بنالیا ہے جس کا دلچسپ تماشا مہذب ممالک کے مہمات کے موقع پر اکثر دیکھنے میں آتا ہے وہاں ہر مکتشف کو اشیا خوردنی، گولہ بارود اور دیگر ضروری سامان ایسے گھنے جنگلوں سے لیجانے کیلئے جہاں خچروں اور گدھوں کا گذر نہیں ہوسکتا مزدوروں کی ایک مختصر فوج ساتھ رکھنا پڑتا ہے چنانچہ جب ۲۲ فلم ایکٹروں، ایکٹرسوں اور کیمرامینوں کی ایک جماعت کا

تصویر لینے کی غرض سے افریقہ کے ایک نہایت گھنے جنگل میں گذر ہوا تھا تو ایسے اٹھارہ سو دیسی باشندوں کو بار برداری کے کام کیلئے بحال کرنا پڑا تھا۔ ایکٹرسیں عموماً ڈولیوں پر سفر کرتی تھیں اگرچہ دشوار گذار مقامات میں انہیں پاپیادہ بھی چلنا پڑتا تھا اور اس وقت انہیں اپنا حسین اور نرم لباس اُتار کر اس کی جگہ کرخت خاکی برجس اور اونچی ایڑی کے نرم جوتوں کی بجائے کرڑے بوٹ چڑھا لینے پڑتے تھے تاکہ کانٹوں، سانپوں اور دلدل والے مقامات میں جونکوں کی ایذا سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر جب وہ چلتے چلتے ندی نالوں کے پاس پہنچتیں تو یہ دیو ہیکل مزدور اپنا بوجھ کناروں پر پھینک کر ان نازک اندام لڑکیوں کو اپنے کندھے اور پُشت پر سوار کر لیتے اور اس طرح انہیں پار کر چلنے کے بعد واپس آکر اپنا بوجھ اُٹھا لیجاتے۔

آجکل یہ بہیمانہ خدمات پیشوایان دین و رہبران قوم کی غیر معمولی عزت افزائی کا موجب تصور کی جاتی ہیں۔ تعظیم و تکریم کے اس اظہار کے موقع پر اس محترم بزرگ کی گاڑیوں کے گھوڑے علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں اور معتقدین و متبعین کی جماعت نعرہ ہائے تحسین کے درمیان خود سے کھینچکر ان محترم سواروں کو ان کی فرودگاہ تک پہنچا آتی ہے۔ اس کی ایک شاندار مثال خود ہندوستان کے اندر مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے زمانہ میں ملتی ہے جبکہ علیگڑھ میں عمائد شہر نے ہز ہائینس سر آغا خاں کا جو اس تحریک کے علمبردار خصوصی تھے جلوس نکالے جانے کی تقریب پر گاڑی سے گھوڑوں کو کھول دیا تھا اور خود کھینچکر لے گئے تھے۔

غم کے ہیں لطفِ بیخودی لیتا ہوں
زاہد تری باتوں پہ بھی جی لیتا ہوں
کعبہ یاد کر کے سر لیے
جنت نہ سہی شراب ہی پی لیتا ہوں
تصور ہی سہی

ضبط اکبر

اپنے پرائے

ریڈیائی ڈراما

جناب سید انتصار حسین نیوتنوی

کردار

ثریا۔ تخیل پرست۔ قمر کی بیوی
کوثر۔ ثریا کی بہن
قمر۔ رحمدل، ثریا کا دوسرا خاوند
افضل۔ مضمحل، ثریا کے پہلے شوہر کا لڑکا
سیکرٹری۔ یتیم خانہ کا انچارج
چوکیدار ——
عورت نمبر ۱، عورت نمبر ۲ } مینا بازار کی تماشائی
یتیم بچے ——

جاڑے کی کپکپاتی رات کو بنگلہ کا چوکیدار گشت کرتے ہوئے پہرہ دیتا ہے ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے فضا میں سونے والوں کی کسمساہٹ اور خراٹوں کی آواز سنائی پڑتی ہے۔

چوکیدار۔ پہلے کھکارتا ہے پھر لاٹھی کھٹ کھٹا کر کہنا شروع کرتا ہے علی حیدر —— حیدر علی —— یا علی۔ لمبی تان لے کر سونے والے جاگت رہو، علی حیدر —— حیدر علی

(آواز دور جا کر ڈوب سی جاتی ہے)

ثریا۔ (بہت دھیمی آواز میں) باجی؟

کوثر۔ ہوں۔

ثریا۔ جاگ رہی ہیں آپ اٹھئے نہ اب رات تھوڑی باقی ہے؟

کوثر۔ چوکیدار ابھی گشت کرتا ہوا گیا ہے۔

ثریا۔ وہ تو رات بھر گشت کریگا۔ کچھ لے دیکے سمجھا لینگے اُسے۔

کوثر۔ کہہ نہ دے کمبخت کسی سے؟

ثریا۔ اتنا غیر معتبر تو نہیں معلوم ہوتا۔ اور اگر کہہ دیگا تو کہہ دے۔ رات بیتی جا رہی ہے۔ میرا افضل ...... یتیم بچہ میرا انتظار کرتے کرتے سو جائیگا۔

کوثر۔ آہ ننھی سی جان۔ ابھی تک جاگ رہا ہوگا تم آخر جی کڑا کرکے کسی دن کہہ کیوں نہیں دیتیں؟

ثریا۔ میں نے کئی دفعہ ہمت کی باجی مگر ...... میں ڈرتی ہوں کہ کہیں وہ مجھ سے منحرف نہ ہو جائیں۔ میں اسی لئے دوسری شادی پر رضامند نہ ہوتی تھی، ابا مرحوم نے شادی کر دی۔ اب اگر میں اُن سے کچھ کہوں تو وہ اپنے دل میں کیا سمجھیں گے۔

کوثر۔ مگر وہ تو تمہیں بہت چاہتے ہیں شاید بُرا نہ مانیں۔

ثریا۔ پھر عزیزوں کی بات کا بھی تو خیال ہے سب نے ایک زبان ہوکر کہا تھا کتنے زوروں کی بارات آئی تھی، یہ بات شادی کے وقت کہہ دی جاتی تو اچھا تھا۔

کوثر۔ بڑا گھرانہ تھا بڑے لوگ مصلحتاً ابا جان نے پردا ڈالا کہ تم ایک بچہ کی ماں ہو۔

ثریا۔ اور اب افضل کی جان پر بن گئی۔ آہ معصوم کیا سمجھتا ہوگا دل میں۔ ہم لوگ عیش و عشرت میں زندگی گذاریں اور وہ غریب یتیم خانہ میں دن کاٹے۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر۔

کوثر۔ اچھا اب وقت نہ گزار دو آدھی رات ختم ہو چکی ہے۔ افضل اب تک جاگ رہا ہوگا یا شاید راستہ دیکھتے دیکھتے سو گیا ہو۔ لے ہوئے کمرے میں دیکھ آ۔ قمر بے خبر سو رہے ہیں نہ؟

ثریا۔ وہ بے خبر سونے کے عادی ہیں میں ابھی دیکھ کر آ رہی ہوں۔

کوثر۔ تو پھر اٹھو۔ جوتے باہر چل کر پہن لیں گے۔ ڈرائیور کو سمجھا دیا ہے نہ؟

ثریا۔ جی ہاں ...... کونسی شیروانی لے چلوں باجی اس کے لئے۔ وہ شوخ رنگ کا کپڑا تو پسند ہی نہیں کرتا۔ آپ نے جو

شیروانی سلوائی ہے وہ بھی بھڑک دار ہے۔

کوثری۔ بہن کل عید کا دن ہے۔ سب بچے بھڑک دار شیروانیاں پہن کر گھروں سے نکلیں گے۔

ثریا۔ مگر وہ ادر بچوں کی طرح کب ہے آنکھ تو غیروں کی گود میں کھولی۔ اپنے بھی پرائے ہو گئے۔ اس کا دل ہی مرجھا گیا ہے۔ اچھا یہ سب شیروانیاں لئے چلتی ہوں جو پسند کرے گا رکھ لے گا۔ چلئے۔ اُٹھئے۔ بہت دیر ہوتی جا رہی ہے۔

قدموں کی چاپیں۔ کہیں دُور پر موٹر اسٹارٹ ہو کر چل دیتا ہے کئی بچوں کی ملی جُلی آوازیں بے ترتیب ترنم کے ساتھ سُنائی پڑتی ہیں ؎

ڈھونڈتے کیا ہو غریبوں میں نشانِ زندگی
لو سُناتے ہیں ہم اپنی داستانِ زندگی

موٹر رُک جاتا ہے دونوں عورتیں یتیم خانہ کے اندر داخل ہوتی ہیں بچے ایک ساتھ مل کر نظم گاتے ہیں ؎

مضمحل افسردہ خاطر ایک نقشِ ناگوار
بندگی بے چارگی۔ رُسوائی کے آئینہ دار

سیکرٹری (ڈانٹ کر) پھر سے پڑھو۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر پڑھو۔ کسی کم بخت کی آواز میں درد نہیں۔

(بچے) ظلم کے مارے ہوئے در در کے ٹھکرائے ہوئے
غیرتِ مجنوں پریشاں حال دامن تار تار

سیکرٹری (سمجھاتے ہوئے) غیرتِ مجنوں پریشاں حال دامن تار تار۔ دامن پکڑ کر بتاؤ بدتمیزو۔ کل جلوس نکلیگا اور ابھی تک ایک مصرع ٹھیک نہیں پڑھ سکتے پوری نظم کس طرح پڑھو گے چلو آگے چلو۔

(بچے) صفحہ عالم پہ اک حرفِ غلط نقشِ زبوں
ننگ بزمِ زندگی، احباب کی خاطر کے بار
ہاتھ ہے ہر جانب اکرام کی جانب دراز
آنکھ ہے ہر آنکھ سے الطاف کی اُمیدوار
ڈھونڈتے کیا ہو غریبوں میں نشانِ زندگی
لو سُناتے ہیں ہم اپنی داستانِ زندگی

سیکرٹری۔ ٹھہرو ٹھہرو (سمجھاتے ہوئے) "ہاتھ ہے ہر جانب اکرام کی جانب دراز" یہ مصرع اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر کہو اور پھر جب یہ کہتے ہو "لو سُناتے ہیں ہم اپنی داستانِ زندگی"۔ تو اپنی طرف اشارہ بھی تو کیا کرو (مصرع کو خود پڑھ کر بتاتا ہے)

ثریا۔ چلئے باجی افضل کے کمرہ میں چلیں۔ سیکرٹری اُسے اس قسم کے مجمع میں نہیں شریک کرتا۔

کوثری۔ تم نے منع کر دیا ہے۔

ثریا۔ ہاں۔ خدا نے اس پر ابھی یہ دن نہیں ڈالا ہے کہ دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ جب سے افضل یہاں آیا ہے۔ یتیم خانہ کی سرپرستی میں نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔

کوثری۔ کاش کہ ان سب بچوں کو ایسی ہی مائیں نصیب ہوتیں جیسی کہ تم افضل کی ہو۔

ثریا۔ میں سب کی ماں ہوں باجی۔ میرا افضل یتیم ہے مجھے یتیمی کے درد کا احساس ہے کل عید والے دن سب بچے بھڑک دار شیروانیاں پہن کر نکلیں گے۔ کپڑوں کے سارے اخراجات میں نے اپنے پاس سے دیئے ہیں۔

کوثری۔ خدا تمہارے دل کو یہی چین دیدیتا تو کتنا اچھا تھا۔ سیکرٹری سے کہو اس مجمع کو منتشر کر دے میں بچوں کی دلخراش آوازیں نہیں سن سکتی۔

بچوں کی آوازیں اُبھر کر ڈوب جاتی ہیں۔ "ڈھونڈتے کیا ہو غریبوں میں نشانِ زندگی"۔ قدموں کی چاپ پھر کنڈی کھُلنے کی آواز۔

افضل۔ کون ہے؟

ثریا۔ کھولو میرے لعل۔

افضل (خوشی میں) اُمی (دوڑ کر کنڈی کھولتا ہے) اور کون خالہ بی۔ پھر لپٹ کر رونے لگتا ہے۔

کوثری۔ میرا لعل۔ میرا بیٹا۔ یہ دیکھو میں اپنے افضل کیلئے کھلونے لائی ہوں۔ اور یہ عید کے اچھے اچھے کپڑے دیکھو۔ روتے نہیں ہیں میرے لعل۔

ثریا۔ اور میں یہ چھوٹا سا موٹر کار لیکر آئی ہوں اپنے افضل کیلئے کل اسی پر چڑھ کر گھومے گا۔ پوں۔ پوں کیسا بولتا ہے۔

افضل (پوں پوں کی آواز سُنکر لالچ میں اُٹھتا ہے) ہم آپ سے نہیں بولتے۔

کوثری۔ چل ہٹ۔ یہ میرا بیٹا ہے ثریا کا نہیں۔ اچھا تم نے آج کیا کیا چیزیں کھائیں۔

افضل۔ پلاؤ۔

ثریا۔ چھی چھی۔ کوئی پلاؤ کھاتا ہے۔ ہم لوگ تو دال روٹی کھاتے ہیں۔

فضل۔ خالہ بی۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔
کوثری۔ میں ضرور لے چلوں گی اپنے لعل کو۔ تمہارا ٹرنک کہاں ہے اس میں یہ تمہارے کپڑے رکھدیئے جائیں۔
فضل۔ ٹرنک تو سیکرٹری صاحب اپنے پاس رکھتے ہیں اُنہیں کو کپڑے دیدیجئے۔
کوثری۔ اچھا پکارو تو کھڑے ہو کر یہاں سے سیکرٹری صاحب کو۔
فضل (کھڑے ہو کر پکارتا ہے) سیکرٹری صاحب۔ سیکرٹری صاحب، سیکرٹری صاحب۔
سیکرٹری۔ کون فضل میاں۔ جی سرکار۔
فضل۔ امّی اور خالہ بی آپ کو بلا رہی ہیں۔
سیکرٹری۔ بہت اچھا۔ حاضر ہوا۔ ابھی ابھی (قدموں کی آواز آئی) آداب بیگم صاحب۔
ثریا۔ آداب۔ کیسا مزاج ہے۔
سیکرٹری۔ پرورش ہے آپکی سرکار۔ ارے فضل میاں کیا آپ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ دن بھر ماشاءاللہ لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتے ہیں۔
ثریا۔ بس یہی چاہیئے سیکرٹری صاحب کہ بچہ خوش رہے۔
سیکرٹری۔ آپ سرکار خود ہی پوچھ لیں کسی قسم کی کوئی تکلیف ہے انہیں؟ اور اب تو عادی بھی ہو چلے ہیں افضل میاں تھوڑے تھوڑے شروع شروع تو راتوں کو ایک آدھ دفعہ اُٹھکر رو دیے مگر اب تو سرِ شام ہی سو جاتے ہیں اور صبح ماشاءاللہ ہنستے کھیلتے اُٹھتے ہیں۔ افضل میاں اب آپ بستر پر آرام کیجئے امّی اور خالہ بھی یہیں رہینگی۔
ٹری۔ ہاں بیٹا تم لیٹ کر سو رہو۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ چل کر بیٹھتی ہوں۔
ضل۔ خالہ بی وہ جو لوری آپ مجھے سناتی تھیں بستر پر لٹا کر۔ بہت دنوں سے نہیں سنائی۔
نی۔ چلو میں ابھی چل کر سناتی ہوں۔
آجا ری نندیا مورے بلم کو (ریکارڈ)

وقفہ

(آثار صبح) پہلے مرغ بولے۔ پھر ترنم کے ساتھ اذان کی آواز آئے اکبر۔ دور سے مندر کا گھنٹہ بجتا ہوا سنائی دے۔
یا۔ باجی۔

کوثری۔ ہوں۔
ثریا۔ سو گیا نہ؟ صبح ہو گئی۔
کوثری۔ رات بھر کا جاگا تھا پٹ سے سو گیا۔
ثریا۔ تو پھر چلیئے نا۔ پو پھٹنے سے پہلے بنگلہ پر پہنچ جائیں ورنہ وہ جاگ جائیں گے۔
کوثری۔ تم تو کہتی تھیں وہ دیر میں سو کر اُٹھنے کے عادی ہیں۔
ثریا۔ پھر بھی احتیاطاً پہلے پہنچ جانا چاہیئے۔
کوثری۔ چلو۔
ثریا۔ اچھا سیکرٹری صاحب ہر بات کا خیال رکھیے گا یہ نوٹ لیے رکھ لیجئے افضل کی عید کا خرچ۔
سیکرٹری۔ آپ اطمینان رکھئے بیگم صاحب۔ فضل میاں ہمارے سر تاج ہیں۔
ثریا۔ اچھا خدا حافظ۔ موٹر اسٹارٹ ہو کر چل دیتا ہے۔

وقفہ

غل ہنگامہ۔ خوشیاں۔ چہل پہل۔ مبارک سلامت کا شور وغیرہ وغیرہ۔ (آواز ڈوب جاتی ہے)
قمر۔ بیگم چلو مینا بازار کی سیر کر آئیں عید کا دن ہے۔ بڑا جمگھٹا ہوگا وہاں۔ آپ بھی چلئے باجی۔
کوثری۔ ہاں چلو۔ مجھے تمہارے لئے عید کا تحفہ بھی خریدنا ہے۔
قمر۔ اجی تحفے کی کیا ضرورت ہے گھوم آئیں گے چل کر۔
ثریا۔ ہاں چلئے باجی ذرا دل ہی بہل جائیگا۔
کوثری۔ چلو میں تو تیار ہی بیٹھی ہوں۔
قدموں کی چاپ پھر موٹر اسٹارٹ ہو کر چلتا ہے۔

وقفہ

مینا بازار کا شور و غل۔ یتیم بچوں کا گروہ آتا ہوا نظر پڑتا ہے موٹر رک جاتی ہے

ڈھونڈتے کیا ہو غریبوں میں نشانِ زندگی
لو سناتے ہیں ہم اپنی داستانِ زندگی

آواز آہستہ آہستہ قریب آتی ہے۔

مضمحل افسردہ خاطر ایک نقشِ ناگوار — بندگی بیچارگی رسوائی کے آئینہ دار
ظلم کے مارے ہوئے در در کے ٹھکرائے ہوئے — غیرت مجنوں پریشاں حال دامن تار تار
صفحۂ عالم پہ اک حرفِ غلط نقشِ زبوں — ننگ بزمِ زندگی احباب کی خاطر کے بار
ہاتھ ہے سوئے دامنِ اکرام کی جانب دراز — آنکھ ہے ہر آنکھ سے الطاف کی امیدوار

ڈھونڈتے کیا ہو غریبوں میں نشانِ زندگی
لو سُناتے ہیں ہم اپنی داستانِ زندگی

مجمع موٹر کے قریب آکر بڑھتا ہے اور بڑھتے بڑھتے دُور ہوتا جاتا ہے۔

کھو چکے ہیں اس طرح ہم اپنا احساسِ خودی — سب ہمیں کہنے لگے ہیں پیکرِ بے غیرتی
اک نہ اک دن تنگ آ جائینگے ضبطِ غم سے ہم — تا بکے آخر رہیں گے خوگرِ ظلم و ستم
یتیمی ہم کو اپنانے سے جو منکر ہے آج — لیکے نکلیں گے جنازہ اسکا مستقبل میں ہم
قابلِ اصلاح ہے دنیا کا فرسودہ نظام — آئیگا وہ دن بھی جب اسکو بدل کر لینگے دم

ڈھونڈتے کیا ہو غریبوں میں نشانِ زندگی
اُسناتے ہیں ہم اپنی داستانِ زندگی

(آواز ڈوب جاتی ہے)

قمر۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) یتیم بچے اگر چاہیں تو ابھی دُنیا کو درہم برہم کر دیں۔ معاذ اللہ بیگم ایکی مرتبہ ہم نے بچوں کے لئے یتیم خانہ میں کوئی خاص تحفہ نہیں بھیجا۔

ثریا۔ یہ ساری شیروانیاں جو اس وقت بچے پہنے ہیں آپ ہی کے یہاں کی ہیں۔

قمر۔ (خوش ہو کر) ہاں۔ واقعی۔ آہ تم میری کتنی پیاری بیگم ہو۔

موٹر اسٹارٹ ہوتا ہے شور و غل میں ایک بچہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔

افضل۔ امی۔ خالہ بی۔

ثریا۔ (گھبرا کر) کون ہے۔

افضل۔ امی۔ امی۔ خالہ بی۔

کوثری۔ بول دو نہ۔ کسی کا بچہ ہے تمہیں اُمی کہکر پکار رہا ہے۔ کیا ہے بیٹا۔

قمر۔ کیوں میاں کیا ہے۔ موٹر پر بیٹھو گے۔

ثریا۔ پرائے بچے کو آپ موٹر پر بٹھالیں گے۔

افضل۔ امی۔ امی۔

ثریا۔ بیٹے میں تیری ماں نہیں ہوں۔

قمر۔ نہیں بیٹا یہی تیری امی ہیں۔ بول دو امی کہکر پکار رہا ہے۔

کوثری۔ یہ بچہ شاید اس مجمع سے چھوٹ کر رہ گیا ہے۔

قمر۔ آؤ تم میرے پاس اس موٹر پر بیٹھو۔

ثریا۔ آپ پرائے بچہ کو کس طرح بٹھالیں گے۔

(موٹر اسٹارٹ رہتا ہے)

افضل۔ خالہ بی۔

کوثری۔ اسے ہے کیسا دھوکا ہو رہا ہے بچہ کو۔ یا اللہ اب کیا کیا جائے۔

قمر۔ ارے صاحب تو خالہ یا ماں بن جانے میں کیا حرج ہے ذرا پیار سے اپنے پاس بٹھا لیجئے۔

افضل۔ امی۔ امی۔ خالہ بی۔

قمر۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ تم کہاں رہتے ہو۔

افضل۔ یہ میری امی ہیں۔ یہ میری خالہ بی۔

ثریا۔ چلائیے موٹر۔

قمر۔ رُکو۔ اس وقت تو تم انسانیت سے گذر گئی ہو۔

افضل۔ امی۔ خالہ بی۔ آپ رات کو میرے پاس آئی تھیں۔

کوثری۔ بیٹے تمہاری امی اور خالہ بی اُس سامنے والی دوکان پر گئی ہیں۔ وہ ——— وہاں چلے جاؤ سامنے۔

افضل۔ وہاں۔

کوثری۔ وہ بیٹے جو موٹر کھڑا ہے وہ تمہاری امی اور خالہ بی کا ہے

افضل۔ آپ میری خالہ بی ہیں میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔

کوثری۔ تم بھول رہے ہو بیٹا۔ میں تمہاری خالہ بی نہیں ہوں۔

افضل۔ اور یہ میری امی ہیں۔

ثریا۔ نہیں میں تمہاری امی نہیں ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔ تمہاری امی اور خالہ بی تمہیں آکر لیجائینگی۔ چلئے موٹر چلائیے

قمر۔ یہ اتنا سا بچہ اکیلا کہاں جائیگا۔

ثریا۔ جہاں بھی جائے۔ ہم پرائے بچہ کو لے کر کس طرح جا سکتے ہیں؟

قمر۔ تو پھر اسے یونہی روتا ہوا چھوڑ دو گی۔

ثریا۔ مجبوری ہے۔

افضل۔ امی۔ امی۔ رات کو تو آپ مجھے کھلونے دینے آئی تھیں

ثریا۔ آہ اس کی ماں کی شکل شاید میری ہی جیسی ہو گی بیٹا میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔

افضل۔ خالہ بی وہ لوری سُنا دیجئے۔

کوثری۔ میں تمہاری خالہ بی نہیں ہوں۔ تمہاری خالہ بی سُنائیگی۔ تم یہیں رُکو۔ تمہاری امی اور خالہ بی آتی ہونگی۔

بیک گراؤنڈ میں یہ ریکارڈ بجے آ جاری نندیا
موٹر اسٹارٹ ہو کر چل دیتا ہے۔

کوثری ۔ قمر میاں ذرا اُس مجمع کے سیکرٹری سے پکار کر کہہ دینا کہ کوئی بچہ پیچھے چھوٹ گیا ہے جا کر لے آئیں ۔

موٹر فراٹے بھرتی ہوئی چلی جاتی ہے ۔

افضل ۔ امی ۔ خالہ بی ۔ امی ۔ خالہ بی ۔ امی ۔ خالہ ۔

(آواز ڈوب جاتی ہے)

بہت سے موٹروں کے ہارن ایک ساتھ بجنے شروع ہوتے ہیں اور افضل پکارتا رہتا ہے ۔ امی ۔ خالہ بی ۔ امی ۔ خالہ بی ۔ امی ۔ خالہ ۔

ایک عورت ۔ بہن یہ کس کا بچہ ہے ۔

دوسری عورت ۔ سچ تو ہے ہر اپنے پرائے کو امی اور خالہ بی پکارتا ہے ۔ اللہ کرے اس کی امی اور خالہ بی اسے مل جائیں ۔

افضل ۔ امی ۔ خالہ بی ۔ امی ۔ خالہ بی ۔ امی ۔ خالہ بی ۔

(آواز ڈوب جاتی ہے)

گلزارِ خلیل

وہ کھل کے ہنسے کیا کہ کلی دل کی کھلا دی

حضرت خلیل بیگوسرائی

چھلکاتے ہی دو جام خودی میری مٹا دی
ساقی نے یہ کیا آنکھوں ہی آنکھوں میں پلا دی

پھر آگ سی کچھ حُسن کے جلوؤں نے لگا دی
دیدے کے ہوا دل کی لگی اور بڑھا دی

گم تھی مری دُنیائے طرب ان کے لبوں میں
وہ کھل کے ہنسے کیا کہ کلی دل کی کھلا دی

بے حِس تھی نظر جلوۂ فردوس نظر سے
اُلفت نے مگر حسن کی تقدیر جگا دی

ڈال آئی صبا کوچۂ قاتل میں اُڑا کر
لو! کچھ ہو مری خاک ٹھکانے تو لگا دی

یہ جوشِ مئے حسن یہ سرشار نگاہیں
لغزش جو ہوئی کیف کی اک نہر بہا دی

رونق ہے حسینوں سے مزارِ شہدا کی
ڈال آئے کہیں پھول کہیں شمع جلا دی

دل مست ہے کس کی نگہِ مست سے مل کر
کعبے سے یہ کس نے حدِ میخانہ ملا دی

احسان یہ قاتل کا ہے مجھ تشنہ گلو پر
تلوار کے پانی سے مری پیاس بجھا دی

کیوں سازِ نہ ممنون رہے سوزِ دروں کا
سینے میں تپش ڈال کے سینے سے دبا دی

کیا آتے خلیل انجمنِ ناز سے بچ کر
دے دے کی قسم زہرہ جبینوں نے پلا دی

ہر جوان عورت

ہر مہینہ سخت تکلیف کا شکار بنتی ہے

خوب روتی ہے، چلاتی ہے، کراہتی ہے

ہر مہینہ ۵-۶ دن اس کی کمر اور پیٹ میں درد ہوتا ہے

اور ان سب باتوں کی وجہ ہے ماہواری خرابی

کسی عورت کو ماہواری خون سخت تکلیف دیکر ہوتا ہے۔ کسی کو خون کم مقدار میں آتا ہے۔ کسی کو رک رک کر آتا ہے کسی کو زیادہ خون آتا ہے۔ اور کمزور کر دیتا ہے۔ کسی کو مہینہ میں دو دفعہ اور کسی کو کئی کئی ماہ بعد ماہواری ہوتی ہے اور بڑا درد ہوتا ہے۔ اتنا کہ وہ بے چین ہو جاتی ہے۔

ماہواری خرابی اور ماہواری درد سے بچنے کا ایک ہی علاج ہے

ملک کے بے شمار ڈاکٹر، ویدا اور حکیم یہ تجربہ کر چکے ہیں کہ عورت کی مندرجہ بالا ماہواری خرابیوں کو ٹھیک کرنے کے لئے دواکورس کا استعمال بڑا کارگر ثابت ہوا ہے۔ دواکورس کی ایک شیشی استعمال کرنے سے عورت کی ماہواری پوری باقاعدگی کے ساتھ بغیر درد کے ٹھیک مقدار میں ہر مہینہ ہونے لگتی ہے اور عورت ماہواری کے دنوں میں بھی ہنستی کھیلتی رہتی ہے تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ آسانی کے ساتھ ہر مہینے ماہواری سے بغیر کسی درد کے فارغ ہو جاتی ہے۔ دواکورس کی ایک شیشی کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ اگر آپ کے گھر کوئی بہن ہر مہینہ ماہواری کی سخت تکلیف برداشت کرتی ہے تو۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۳۴ اے۔بی دہلی

کے پتہ پر آج ہی ایک کارڈ لکھ کر دواکورس کی شیشی بذریعہ وی۔پی پارسل منگا لیجئے۔ پارسل پر صرف نو آنے محصول لگے گا۔ اور آپ کو اپنے گھر بیٹھے دوا پہونچ جائیگی۔ وہ دوا جو ہر مہینہ تکلیف اٹھانے والی عورت کیلئے ایک نعمت ثابت ہوگی اور ماہواری ایام کو باقاعدہ کر دیگی۔

ٹیلیفون نمبر ۶۲۰۸

نطقِ ناطق

"بارگاہِ شہِ رزّاق ہے زنداں کے قریب"[1]

حضرت ناطق گلاؤٹھوی

آدمیت نہیں پھٹکی ترے درباں کے قریب
ورنہ آتا تو ہے انسان ہر انساں کے قریب

وضعِ پابندی و آزادیٔ ہستی توبہ
یعنی زنداں سے کہیں دور نہ زنداں کے قریب

جرأت افزائے سوال آئے نہ ہے اندازِ جواب
آ ہی جاتی ہے اب اُس بُت کی نہیں، ہاں کے قریب

ہے تو کچھ حشر کی آمد کا ہمیں بھی کھٹکا!
اس کے آثار تو ہیں گنجِ شہیداں کے قریب

غم واندوہ کا لشکر بھی چلا آتا ہے
ایک گھڑ دوڑ سی ہے عمرِ گریزاں کے قریب

پاؤں دامن سے اُلجھتے ہیں خدا خیر کرے
ہاتھ رہتے ہیں کئی دن سے گریباں کے قریب

قدر افزائیِ ماحولِ وطن کیا کہنا
دامِ یوسف کے بہت آ گئے کنعاں کے قریب

جان کس کس کو سنبھالے کہ سب اجزائے وجود
ہیں پریشانیٔ خاطر سے پریشاں کے قریب

اب تو ناطق کا بس اتنا ہی پتہ ملتا ہے
ہے کہیں گھر سے بہت دور بیاباں کے قریب

[1] یہ مصرع مولانا حسرت موہانی کا ہے!

آرٹ اور آرٹسٹ کے فرائض!

شبلی بی-کام کے نام خلیق ابراہیم کا ایک خط

برادرم شبلی صاحب!

اس طرف تین چار ماہ سے ایک دوست کی بدولت "عالمگیر" دیکھنے کو مل جایا کرتا ہے۔ میں تاریخ کے اس اہم موڑ پر اور ادب کے اس بحرانی دور میں "عالمگیر" سے کسی قسم کی خوش عقیدگی نہیں رکھتا لیکن آپ کی سوجھ بوجھ اور پرکھ کا یقین ہے۔ اس لئے آپ کے چند شذرے دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا کہ ان کے متعلق آپ سے بے لوث محبت اور بیباک صداقت کی بنیادوں پر مبادلۂ خیالات نہ کروں۔

سوال یہ ہے کہ آرٹ ہے کیا؟ - انحراف و بغاوت فطرت سے - منجمد سوسائٹی سے۔ میرے خیال میں پہلا عظیم آرٹسٹ وہ ہے جس نے فطرت سے انسان کی گلوخلاصی کرائی۔ پہلی عظیم بغاوت اور اعلیٰ فن کاری انسان کی یہ تھی کہ عالم ظاہر کی مہیب اور گرانڈیل ہستیوں کی قوتوں کا منکر ہوا ان کی اطاعت چھوڑ دی۔ ان کو اپنے سے کمتر سمجھنا شروع کیا۔ اپنے خداوند بنائے۔ اپنے ذہن سے ان کی شکل و صورت قائم کر کے ان کے بت تراشے۔ یہ سب انسانیت کے عالم باطن کے مشورے سے ہوا (عالم باطن سے میری مراد عالم خیال یا عالم ذہنی ہے) انسانی عالم باطن کی یہ پہلی جنگ فطرت اور عالم ظاہر سے تھی۔ عالم ظاہر کو شکست فاش ہوئی، چاند، سورج، پہاڑ، دریا، آگ اور پانی کا رعب جاتا رہا۔ ان سے جو ڈر اور خوف نئے پیدا شدہ آدم کے دل معصوم میں جاگزیں ہو گیا تھا زائل ہوا اسمان کا حسن بھی اس کی نظروں میں ہیچ ہوا کہ وہ بھی تھی ایک سیمیا کی نمود! اب انسان کے پرجلال دیوتاؤں اور پرجمال دیویوں کی پرستش شروع ہوئی۔ تبکدوں کے در کھلے۔ کفر اپنی تمام انسانی شان اور کروفر کے ساتھ جلوہ آرا ہوا۔ وہ وہ بت بنے جن میں ؎

اعجاز سے زیادہ ہے سحر ان کے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں ہو

باطن کے جلوے طور میں لائے جانے لگے۔ انسانیت کا دور دورہ ہوا، اس حسن کی جو عالم انسانیت نے پیدا کیا۔ اور اس حقیقت کی جو عالم انسانیت نے دریافت کی۔ ہر طرف کارفرمائی شروع ہوئی۔ خوفناک، تباہ کن، ابلتے ہوئے دریاؤں کی حقیقت و حسن نہیں، گرانڈیل مہیب، سربلند پہاڑوں کی حقیقت و حسن نہیں، طوفان خیز ڈراؤنے سمندروں کی حقیقت و حسن نہیں، انسان کے بنائے ہوئے مندروں، ان کی آرائشوں اور ان کے مکین دیوتاؤں اور دیویوں کے حسن و حقیقت نے انسان کے دل کو مسخر کرنا شروع کیا۔ ہر چیز پڑی ہنس رہی ہے ہر چیز میں جان ہے۔ فطری چیزوں اور انسان کے درمیان جو غیریت اجنبیت اور بے تعلقی تھی۔ وہ جاتی رہی۔ اپنی بنائی ہوئی چیزوں سے ربط اور اتحاد قائم ہوا۔ میں انگریزی لفظ ہیومنائز (humanise) یہ بیجز کرتا ہوں جس کے معنی انسانیت کی خصوصیات پیدا کرنا ہیں۔ فن کاری درحقیقت فطری اشیا میں خصائص انسانیت پیدا کرنا ہے۔ آسمان اور زمین پر جتنی چیزیں ہیں ان کو مسخر کر کے "انسانی" بنا لینا ہے۔ آرٹ بشریت گری ہے۔ ہر چیز میں دل پیدا کر دینا اور جان ڈال دینا کہ انسان کا دل اس سے مل سکے۔

تو آرٹسٹ منحرف اور باغی ہے۔ صرف جان کو مانتا ہے، موت کا قائل نہیں۔ انسانیت عالم حیات ہے، آرٹسٹ عالم حیات کا پیامبر ہے۔ جو چیز مائل بہ موت ہو اس کا وہ دشمن ہے۔ بے جانی سے وہ انتہا سے زیادہ متنفر ہے! عابد و زاہد متقی و پرہیزگار، کور باطن انسانوں نے انسانیت کشی شروع کی۔ بتوں سے ڈرنے لگے۔ بے جان پرستش کو عبادت جانا۔ یہ عبادت توہین تھی انسانیت کی۔ داعی باغی اٹھا۔ ان بتوں سے بھی روگردانی کی۔ ان کا بھی منکر ہوا۔ باطنی بے شکل و بے صورت خدا کو لاکھڑا کیا۔ خدا اور انسان کے درمیان انسانی واسطہ پیغمبر کے ذریعے قائم کیا۔ کہ انسان خدا کی نشانی ہے نہ کہ بت۔ اوتاروں اور پیغمبروں کا دور دورہ ہوا۔ الہامی کتابوں نے مذاہب قائم کئے۔ کچھ زمانے کے بعد عقاید اور شریعتوں نے بھی رسوم و رواج کی انجمادی کیفیت پیدا کر لی۔ کور باطنی پھر پھیلی۔ انجماد موت کا پیام ہے۔ منحرف ابدی "آرٹسٹ" پھر جوش میں آیا۔ مومن بے جان کو نئے جاندار کفر کی دعوت دی ؎

مسلماناں مسلماناں! نگہدارید دین خود
کہ شمس الدین تبریزی مسلماں بود کافر شد

عالم باطن سے نیا پیغام لایا اور اس کا ڈنکہ دنیا میں بجایا ؎

مرا آں دلبر پنہاں ہمیں گوید بہ پنہانی
بمن دہ جان بمن دہ جان رہا کن این گراں جانی

یکے لحظہ قلندر شو قلندر را مسخر شو
سمندر شو سمندر شو در آتش رو بآسانی

در آتش رو در آتش رو در آتش دان ما خوش رو
کہ آتش با خلیل ما کند رسم گل افشانی

نمیدانی کہ ما را ما بود شاہنشہ گل ہا!
نمیدانی کہ کفر ما بود مقصود ایمانی؟

خداوندا تو میدانی کہ صحرا از قفس خوشتر ولیکن چند نخسپید زگورستان و ویرانی

تصوف میں بھی زمانہ گزرنے سے ایک انجمادی کیفیت پیدا ہوئی۔ خرقہ پوشی اور خانقاہ نشینی بجائے دل میں آگ پیدا کرنے کے ٹھنڈک اور سیاٹ پیدا کرنے لگی۔ بے جان صوفی کفر ایمانی کی آگ سے خائف ہو کر شریعت کے سرد و خشک پتھروں کے نیچے جا چھپا اور اپنا حشر فقہی کے ساتھ کیا۔ یا قانون کی گندی کیچڑ میں غلطاں ہوا۔ فقہ اور قانون انسانی آتش حیات کو سرد کرنے والی چیزیں ہیں۔ انہی سے عمل انجماد شروع ہوتا ہے۔ یہ ذہن و روح کی درماندگی کے نتائج ہیں۔ حیات مقصود وجود ہے۔ موجودات کی تکمیل حیات ہے۔ حیات میں الکٹرونی کیفیت ہے نہ کہ پروتونی۔ فزکس ——— (Physics) کے محققین نے ایٹم میں دو جز پائے ہیں۔ ایک الکٹرون دوسرا پروتون۔ دونوں کی ماہیتیں الگ الگ ہیں۔ طریقے اور چلن الگ الگ ہیں۔ الکٹرون اپنی گردش میں جگہیں بغیر کسی قاعدے کے بدلتا ہے۔ بچوں کی طرح اچھلتا۔ کودتا پھرتا ہے۔ جب ذرہ جو موجودات عالم کا اصل جز ہے تابع قانون نہیں تو دنیا میں قانون قدرت کی تلاش بسود ہے۔ سائنس کی یہ لاف کہ وہ قوانین قدرت معلوم کرتا ہے کم از کم اس صدی تک تو غلط اور بیہودہ ہی ہے۔ اتنی ہی غلط اور بیہودہ جتنا کہ مسئلہ تقدیر۔ انسان و الکٹرون کے افعال یکساں ہیں۔ حیات جتنی کم ہوتی جاتی ہے پابندی قانون کی جانب مائل ہوتی جاتی ہے۔ جوہر حیات کی زیادتی کا میلان قانون شکنی کی طرف ہے۔ فقہ اور قانون کوزہ پشت بوڑھی بیوہ عورتیں ہیں جو دل میں اپنی جوانی اور سہاگ کا زمانہ یاد کر کے خون کے آنسو بہاتی ہیں لیکن تازہ جان رکھنے والے جوان مرد و عورت کو زندگی کا مزا نہیں اٹھانے دیتیں۔ ان کی راہ میں ہر طرح کے رخنے ڈالنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ بگڑا گویا قوال۔ اور بگڑا آرٹسٹ نقیہ یا مقنن! فقیہ اور مقنن جسے برا اور معیوب کہتے ہیں وہی رند کے نزدیک خوبصورت اور احسن ہے۔ جن باتوں سے فقیہ اور مقنن منع کرتے ہیں انہی پر رند عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس ضد میں کہ جن مقاصد کیلئے فقہ اور قانون بنے تھے وہ اُن سے پورے نہیں ہوتے لہذا وہ بیکار ہو گئے۔ پرانا سانچہ جس میں وہ چیز نہیں ڈھلتی جو ہمیں درکار ہے۔ ہمارے لئے بیکار ہے۔ اسے توڑ کر نیا سانچہ بنانا چاہئے۔ کور باطن قدامت پرست پرانی چیزوں کے بیکار ہونے پر غور نہیں کرتے۔ چیز جتنی پرانی اور بوسیدہ ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اُن کی عزت اور وقعت ان کی نظروں میں بڑھتی جاتی ہے۔ رند کو کہنگی اور بوسیدگی سے نفرت ہے۔ وہ اسے نظر سے گراتا اور اس کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ رندی یا بوہیمینزم (Bohemianism) ہی آرٹسٹ کا چلن ہے

اس کی روح آزاد ہے۔ تابع قانون نہیں۔

ہاں تو تصوف کے بے جان ہونے کے بعد دور علم شروع ہوا۔ انسان اب معاشی اور معاشرتی اعتبار سے کافی ترقی کر چکا تھا۔ مشینوں کا زمانہ آیا اور تجارت و حرفت کو ترقی ہوئی۔ مولوی کی دستار اور درویش کا خرقہ تو پہلے ہی دُنیا کی نظروں میں بے حقیقت ہو چکا تھا۔ اب بادشاہوں کے سر سے تاج اُتر گئے۔ بنیئے اور مہاجن۔ کارخانوں کے مالک اور ان کے پٹھو اپنے بے ڈھنگے پیٹ لیکر سامنے آئے۔ بجائے بادشاہ کے بینک کی حکومت ہوئی۔ بابر و بونا پارٹ کی نبرد آزمائیاں گئیں۔ ان کی جگہ تمام اشیا اور سود خواری کے لئے جنگیں شروع ہوئیں۔ اس نئے دور نے جب استحکام حاصل کیا تو روح کشی کی نئی نئی تدبیریں اختیار کیں۔ اور انسان کو غیر انسان بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ فقہ نے قصر مذہبی میں روح انسانی کو محبوس کیا تھا۔ دور تجارت و مہاجنی نے اس سے زیادہ مستحکم اور مضبوط قلعہ میں اسے قید کیا۔ اس قلعہ کی حفاظت ایک طرف سے فوج اور دوسری جانب سے قانون نے کی۔ "قانون" کی تعریف نئے پیرائے اور نئے مفہوم کے ساتھ کی گئی۔ حقوق انسانی پر حد سماعت کی شرط اور ان کے خرید و فروخت کا نرخ قائم کیا۔ اب حقوق بڑی آسانی سے خریدے جانے لگے۔ بکنے لگے۔ قانون وہ ادارہ تھا جس پر مذہب ایک طرف اور تاج شاہی دوسری طرف جھکے۔ اس سے مستفید ہونے والی صرف ایک جماعت ہے۔ سرمایہ دار! ۔ بیباک باطن رند اور صاف گو آرٹسٹ اس دور میں سب سے زیادہ راندۂ درگاہ ہے۔ وہ حقیقت کا دیکھنے والا اور اس کے اظہار میں بیباک و جری ہے۔ وہ انسانی روح کو مقید نہیں دیکھ سکتا۔ اسے اس دور میں اس طرح رشوت دی گئی کہ ظاہراً آرٹ کا مرتبہ بلند کیا گیا لیکن وہ سرمایہ داروں کے آرائش سے زیادہ اور کچھ نہ سمجھا گیا۔ آرٹسٹ کی قیمت بازیگر و دوکاندار کی بہ نسبت کچھ زیادہ نہ رہی۔ اس سے کہا گیا کہ آرٹ ایک بلند چیز ہے۔ روزمرہ اور کاروباری زندگی کی پستیوں سے نہ اسے کبھی تعلق تھا اور نہ ہے۔ اس کی حالت بوڑھی سوتیلی ماں کی سی ہو گئی جسے گوشۂ عافیت میں بٹھا دیا۔ اس کی قدر و منزلت تو بڑھا دی گئی لیکن گھر کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق اور دخل باقی نہ رہا۔ آرٹ کیا ہوا ہندوستانی بیوہ ہو گئی جسے زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ "یہ شاعرانہ خیال ہے" یعنی غیر حقیقی خیال ہے۔ بات ہے صاف لفظوں میں یہ کہ اصل زندگی سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ روزمرہ کی گفتگو میں "یہ شاعرانہ خیال ہے" کی قسم کے جملے اکثر سنائی دیتے ہیں اور اتنے دہرائے گئے ہیں کہ خود شاعر یہ سمجھنے لگا ہے کہ اس کی شاعری کو انسانی زندگی اور اس کی حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ الامان! بہ

آرٹ جس کی پہنچ عالم باطن تک ہے، جو احساسات، کیفیات اور تحریکات کو معرض ظہور میں لاتا ہے۔ اسے انسانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اس کے کیا معنی ہیں؟ یہی اور صرف یہی کہ ہم بے جان بے روح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بے روح کی زندگی رند حقیقت پرست کے لئے کس درجہ بیجان روح کا باعث ہے! کئی سال ہوئے امیر و ذمنٹ ٹرسٹوں کے حالات دریافت کرنے کے لئے صوبجات متحدہ میں ایک کمیٹی بیٹھی تھی۔ اس کی سفارشوں میں ایک یہ بھی تھی کہ جن رقبات کو ترقی دی جائے ان میں مکانات کے متعلق یہ قید ہو کہ ایک طرح کے ہوں۔ کمیٹی کا خیال حسن قابل داد ہے۔ مکانوں میں بھی مشینی یکسانیت ہو۔ مکان کھڑے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یکساں وردی پہنے ہوئے برابر کے قد کے سپاہی کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔ مکان، مکان بنانے والے کی روح کا مظاہرہ ہے۔ کمیٹی کی سفارش تھی کہ چیونٹیوں کی قطار اور فوج کے دستوں جیسا حسن ہو۔ خدا کے لئے بتائیے یہ کہاں کی بدمذاقی ہے؟ حسن ہے کیا شے؟ یہی نا کہ کسی چیز کو دیکھ کر دل خوش ہو۔ خیر مقصد یہ کہ روح کشی اور انسانیت کشی طرح طرح سے کی جا رہی ہے۔ نازی حکومت نے خاکی وردی کی تاکید کی تھی۔ لیجئے روح لباس کے معاملہ میں بھی برطرف کی گئی۔ قانون پاس ہوتے ہی دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ اگر یہ نظام "با ایں ہمہ طمطراق" اور کچھ عرصہ قائم رہ جاتا جس کی امید اس جنگ نے کم کر دی ہے، تو غالباً محکمہ حفظان صحت غذا میں بھی یکسانیت اور پابندی عاید کر دیتا بہرحال اس جلاد دور کی مرضی یہی ہے کہ انسان کا آرٹسٹک ذہن گھٹ گھٹ کر مر جائے۔

زندان روشن باطن روح کی یہ درگت دیکھتے اور خاموش رہتے، یہ کیسے ممکن تھا! نتیجہ یہ ہوا کہ اس مہاجنی تہذیب، اس سرمایہ دارانہ تمدن کے خلاف واویلا مچا۔ ہر سرمایہ دار حکومت اس نظام کے بچانے کے لئے جان لڑائے ہوئے ہے۔ نازی حکومت جرمنی میں، فاسسٹ اٹلی اور جاپان میں۔ اور اس جنگ سے پیشتر سرمایہ دار جمہوریتیں اپنی اپنی حکومتوں میں اس کے بچاؤ کے لئے بولے ٹیکے ہوئے تھیں۔ سرمایہ داری فی الفور اپنے کیفر کردار کو پہنچے یا نہ پہنچے انیسویں صدی کا وہ فلسفہ جو اس کا محافظ تھا وہ تو پاش پاش ہو ہی گیا اور کم از کم نئی تہذیب کی بنیادیں تو پڑنے ہی لگیں کہنے والے کہیں گے کہ یہ بے تعلق باتیں ہیں۔ کہاں اقتصادی مسئلہ تقسیم دولت اور کہاں آرٹ! — ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ بوئی چیلی کی کسی تصویر کا ذکر ہو۔ رودان کے مجسموں کا حال ہو، میر و سودا کے اشعار ہوں۔ وہ نہ سہی حسرت، جوش اور مجاز کا کلام ہو سب چھوڑ چھاڑ کے بیروزگاری کا رونا رونے بیٹھ گئے۔ امیروں کے عیش اٹھانے پر جلنے لگے۔ میرے محترم بزرگ میرزا محمد عسکری صاحب کی اگر اتفاق سے اس خط پر نظر پڑ جائے تو وہ یہ جملہ ضرور کہیں گے۔ ایک اور صاحب ایک ادبی صحبت میں یہی فرما چکے ہیں، یہ جملہ بہت پرانا ہے، بہت پامال ہو چکا ہے۔ اب اس میں کوئی ندرت خیال نہیں ہے۔ سوال میرے غریب ہونے اور چودھری محمد علی صاحب تعلقدار امیر پور کے امیر ہونے کا نہیں ہے۔ سوال ہے اس سماج کی ساخت کا جس میں انسانی جسم اور انسانی ذہن دبایا نہیں کچلا جا رہا ہے، پیسا جا رہا ہے۔ فنا کیا جا رہا ہے۔ اس خیال سے کہ یہ سطور "عالمگیر" کے لئے لکھی جا رہی ہیں میں نے بہت بچا بچا کر اور بہت سی عریاں حقیقتوں کو بغیر چھوئے ہوئے اپنے قلم کو جنبش دی ہے۔ اور وہ بھی اس وجہ سے کہ اس سے قبل میرے ایک کڑوے اور کسیلے مضمون کو شبلی صاحب "خیام" میں جگہ دے چکے ہیں۔ ورنہ یہ مباحث ایسی عریاں اور تلخ حقیقتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں کہ اگر زیادہ بیباکی سے کام لیا جائے تو شاید بہت سے پڑھنے والے پرچہ اٹھا کر پھینک دیں۔ بہرحال یہ مباحث ایک دل رکھنے والے اور صاحب روح انسان کے لئے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو خون کو جسم سے ہے۔ انہیں اگر کوئی چھوڑتا ہے تو اسے اپنے وجود کو بے سود سمجھ لینا چاہیئے۔ موجودہ حالات انسانیت کے لئے روح فرسا ہیں۔ وہ بیقرار اور بے چین ہے۔ وہ جوان حالات سے متاثر نہ ہو اہل دل اور اہل باطن نہیں بوالہوس ہے۔ یورپ کی پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ دوسری جنگ عظیم روح اور بے روحی انسانیت اور حیوانیت، انصاف اور ظلم۔ زر پرستی اور حق پرستی کے درمیان چھڑی ہوئی ہے۔ ہر سینے میں دل اور رگوں میں تازہ خون رکھنے والا حق پرست کسی نہ کسی طرح اس جنگ میں شریک ہے۔ اس کا امید افزا نتیجہ بطن مستقبل میں ہے۔

شبلی صاحب! مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ راجہ صاحب بہادر محمود آباد کے زیر سایہ جناب مولانا منظور حسین ماہر القادری کی صدارت میں "باب الہند" سے ایک بھیگی ہوئی رات میں جو موت بردوش بڑھاپے کی ایک کرب انگیز کراہ بلند ہوئی اس کی بازگشت آپ کے قلم سے بھی سنائی دی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر نئے ادب اور نئے ادیبوں سے بعض حضرات اس قدر نالاں کیوں ہیں؟ وہ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ ادب فقہ اور شریعت کی ترجمانی کرے؟ ادب کیا کہنا چاہتا ہے اسے چھوڑ کر وہ ادیب کی ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ اس کے فن کارانہ خلوص پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ وہ اس مسئلے کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ خلوص ہی آرٹسٹ کا اخلاق ہے یہی سب کچھ یورپ میں بھی ہوا تھا اور ایک حد تک اب بھی ہو رہا ہے

ساری دنیا کے ترقی پسند ادیب مرنے والی سماج کے علمبرداروں کا ہدف ملامت بنے ہوئے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم سے پیشتر امریکن رقاصہ ایسا ڈورا ڈنکن ایک نیا رقص یورپ میں لائی جس میں جسم کی جنبشوں سے روح کی گہرائیوں کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ لوگوں نے رقص پر اتنی توجہ نہ دی جتنی اس چیز پر کہ آیا ایسا ڈورا فاحشہ ہے کہ نہیں؟ یہ طرز استدلال بہت بوسیدہ ہو چکا ہے۔ کم از کم آپ تو اس سے الگ رہیئے۔

جہاں تک میں نے دیکھا ہے 'نئے ادب کی مخالفت ان بنیادوں پر ہوتی ہے کہ (۱) اس میں عریانی زیادہ ہے جو مخرب اخلاق ہے (۲) مذہب کی علی الاعلان مخالفت ہوتی ہے (۳) سوائے مزدور کے چیتھڑوں اور کسان کی بوسیدہ جھونپڑی کے ترقی پسند ادیب کو کچھ اور نہیں سوجھتا اور ان سب سے زیادہ جو چیز قدامت پرستوں کے لئے موجب تکلیف ہے۔ وہ اُردو میں نظم آزاد کا رواج ہے۔

جہاں تک عریانی کا سوال ہے میں یا ستناد یہ بتا سکتا ہوں کہ آپ کا قدیم ادب آج کے ادب سے کہیں زیادہ عریاں، فحش سے لبریز اور کثیف جذبات کو ابھارنے والا ہے۔ آپ آج کے افسانے اور نظمیں دیکھتے وقت خواجہ میر درد ایسے ثقہ شاعر کی مثنویاں، مومن کے منظوم قصے اور جرأت کی معاملہ بندیاں کیوں بھول جاتے ہیں۔ گو میں اسے مانتا ہوں کہ جس طرح روس میں فراری ادب نے (Saninism) کی تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اسی طرح ہمارے بعض ادیب تحلیل نفسی اور شعور و لاشعور کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو کر حقیقت پرستی اور واقعیت نگاری سے ہٹ سے گئے ہیں۔ لیکن ہر نیا ادیب تو ترقی پسند ادیب نہیں ہو سکتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ آج کا ادیب جب سماج کے کسی گھناؤنے رُخ سے پردہ اُٹھاتا ہے تو اس کا مقصد سفلی جذبات کو اُبھارنا نہیں ہوتا بلکہ صنفی ناہمواری کو آشکارا کرنا ہوتا ہے۔ اپنے پرانے شعرا کے جن کا میں نے حوالہ دیا انداز اور طرز بیان کا آج کے ادیب کے انداز اور طرز سے مقابلہ کر لیجئے۔ پرانے ادب کو بہت سے مسیح و خضر پیدا کرنے کا غرہ ہے لیکن آج کا ادیب کہتا ہے ؎

مسیح و خضر کی کہنے کو گو کمی ہی نہیں
کنارِ دہر میں اندازِ مریمی ہی نہیں

یہی "انداز مریمی" ترقی پسند ادیب کنار دہر میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ آپ نہ جانے کس بات کے خواہشمند ہیں۔ رہی مذہب کی مخالفت، سو اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کی ایک ملحد کو بھی ویسی ہی اجازت ہونی چاہیے جیسی ایک واعظ اور مبلغ کو اپنے مذہب کی اشاعت کی ہوتی ہے۔ پھر بقول اختر رائے پوری شاعر اگر شراب نہ دینے والے خدا کو گالی دیتا ہے تو اسے "صوفی" اور "رند" کہہ کر درگزر کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر روٹی نہ دینے والے خدا کو کچھ کہئے تو ہر شخص لاٹھی لے کر پیچھے بھاگنے لگتا ہے۔

رہی آزاد نظم —! تو اس پر گفتگو کرنا ماہر القادری صاحب ایسے لوگوں کے بس کی بات نہیں، انھیں نہیں معلوم کہ آزاد نظم اپنی ٹکنیک اور گہرائی کے اعتبار سے پابند نظم سے کہیں مشکل چیز ہے۔ زندگی روز بروز گہری اور پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ اسی کے ساتھ انسانی ذہن کے سامنے آج ایسے ایسے مسائل ہیں جن کا اگلے لوگوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا بقول ڈاکٹر تاثیر ؎

تھے بہت خوش نصیب و خوش انجام   اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام

اس لئے کہ ان کی دنیا محدود تھی۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ۔ بادشاہ یا نواب صاحب کا دربار۔ اللہ اللہ خیر صلا! آج حالت یہ ہے کہ پروانے شمع پر نہیں آتے اس لئے کہ بجلی کے قمقموں میں اس سے زیادہ چمک ہے روشنی ہے۔ صیاد اب بلبل کے لئے جال نہیں پھیلاتا بلکہ "عمر بلبلیں خود ہیں آج دام بدوش"۔ شاعر کو داد کی اتنی ضرورت نہیں ہے، جتنی روٹی کی — زندگی کٹھن ہے اور پیچیدہ۔ انسان ارتقا کی طرف گامزن ہے۔ وقت اور فاصلے کا دھیرے دھیرے بطلان ہوتا جا رہا ہے۔ نفس اور تحت نفس کی پیچیدگیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ خدا کے لئے آپ اپنی حسن و عشق والی غزل گوئی یا زیادہ سے زیادہ مسدس حالی والی اخلاقی شاعری میں پڑے رہئے اور واہ واہ کیجئے۔ ہم دل جلوں کے سینے کے زخم دیکھنے کی کوشش نہ فرمایئے۔

بھائی شبلی! آپ جانتے ہیں یہ تجرباتی اور بحرانی دَور ہے۔ ترقی پسند ادیبوں میں کمزوریاں بھی ہیں اب سے چند سال قبل کارل راڈیک نے سویت روس کے ادیبوں کی کمزوریوں پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی تھی "مجھے اپنے نئے ادیبوں میں کئی کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں۔ اور جب تک وہ دُور نہ ہوں وہ اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتے۔ ایک تو یہ کہ ان میں رکھ رکھاؤ اور آداب کی کمی ہے۔ یہ یوں ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو تمدن کی جمع پونجی سمجھے بیٹھے ہیں لیکن انھیں کارخانوں اور کھیتوں کے سوا اور کیا دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ کارخانہ اور اپنا علاقہ — یہی ان کی دنیا ہے۔ اور اس دنیا میں صرف دو جاندار رہتے ہیں، سرمایہ دار اور مزدور۔ مگر مارکس کی تعلیم یہ نہیں ہے۔ اس کا قول ہے کہ دنیا کو ہر زاویے سے دیکھو۔ کیونکہ اس کا ایک ایک ذرہ اپنے میں عجیب و غریب کائنات رکھتا ہے۔ دوسری کمی یہ ہے کہ ان کا طرز بیان پھیکا ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ

قدیم ادب نے اس کے لئے مناسب اسالیب پیدا نہیں کئے۔ اس کے لئے بڑی جانفشانی کی ضرورت ہے۔ وقت اور صبر کی ضرورت ہے۔ ہمارے ادیبوں کو چاہئے کہ وہ قدیم اور جدید ادب کے تمام بڑے نمایندوں کا مطالعہ کریں اور ان میں جو سیکھنے کی باتیں ہیں انھیں سیکھیں۔ لیکن انھیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہمارا اصل فرض عوام کو بیدار کرنا ہے۔ اور ادب اس روش کا ایک وسیلہ ہے —!"

ترقی پسند ادب، وہ ادب جو عصر نو کا پیغامبر ہے۔ ابھی کم از کم ہند میں گھٹنوں چل رہا ہے۔ اسے بنجر زمینوں کو توڑ کر زرخیز بنانا ہے۔ سے یہ امید رکھنا کہ بچپن ہی میں بڑے بڑے شاہکار پیدا کرے گا عبث ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ حقیقت کا سچا روپ پیش کر[نے] میں اس کا کوئی ثانی نہیں —!

نیاز آگیں۔ خلیق ابراہیم

شبلی بی، کام کا جواب

محترم خلیق ابراہیم!

آپ کا مضمون جسے آپ نے "مراسلہ" قرار دیا ہے۔ موصول ہوا۔ آپ نے "ترقی پسند ادب" کے موضوع پر چونکہ "بے لوث محبت" اور "بیباک صداقت" کی بنیادوں پر گفتگو کرنا چاہی ہے۔ اس لئے مضمون "عالمگیر" کے اوراق کی زینت ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اجازت دیجئے کہ میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کردوں۔

آپ نے مراسلہ کی ابتدائی سطور میں فرمایا ہے۔ کہ "میں تاریخ کے اس اہم موڑ پر اور ادب کے اس بحرانی دور میں" عالمگیر" سے کسی قسم کی "خوش عقیدگی" نہیں رکھتا"۔ تو جناب! "عالمگیر" کو آپ کی خوش عقیدگی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں "اصول" کا سوال ہو وہاں کسی کی "عقیدت" کام نہیں آیا کرتی۔ تاہم آپ کی غلط فہمی کے ازالہ کے لئے اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ "عالمگیر" ہر اس صحیح و صالح ترقی پسندانہ تحریک میں حصہ لے رہا ہے جو انسانی دل و دماغ کی تربیت کے لئے معرض ظہور میں آئے۔ لیکن وہ اُس گمراہ کن ترقی پسندانہ روش کا ساتھ نہیں دے سکتا جس کا اصل مقصد یہودیت کمیونزم، قنوطیت۔ اور ہوس پرستی کی اشاعت ہے۔ "عالمگیر" کے حلقہ ارادت میں غالب اکثریت ایسے قارئین کی ہے جو فحش اور عریاں کہانیوں یا لچر اور بیہودہ آزاد نظموں کی بجائے اعلیٰ درجہ کے ٹھوس اور محققانہ مضامین پسند فرماتے ہیں۔ اور چونکہ جریدے کا مقصد قارئین کے علمی و ادبی ذوق کی تسکین ہوتا ہے۔ اس لئے "عالمگیر" ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایسا مواد فراہم کرنے پر مجبور ہے۔ جو قدرتی طور پر آوارہ مزاج کمیونسٹ نوجوانوں کو پسند نہیں آسکتا۔

آپ کے مضمون کے پہلے اڑھائی صفحات چنداں قابل التفات نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ نے "ادب" کو فن کاری کے وسیع معنوں میں لیا ہے جس سے اُصولی طور پر مجھے اختلاف نہیں ہوسکتا۔ البتہ آپ نے غال[باً] اپنی پریشان دماغی پر پردہ ڈالنے کے لئے بحث کو پُرشکوہ الفاظ کی بھول بھلیوں میں کچھ اس طرح چھپا دیا ہے کہ یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

میں مانتا ہوں کہ "ادب" "آرٹ" کی ایک شاخ ہے۔ اور آرٹ ہمارے باطن یا وجدان کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ کیونکر ثابت ہوگیا کہ انسان کسی قانون کا پابند نہیں رہ سکتا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ "قانون شکنی" کا مادہ انسان کی سرشت اور جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اس جبلت کو قائم رکھا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق ہی کیا رہ جائے گا؟ نہ جانے آپ تہذیب و ترقی سے کیا مراد لیتے ہیں لیکن میرے نزدیک تو اس کے یہ معنی ہیں کہ انسانی جبلت کو "اصول ارتقا" کے ماتحت اتنا بلند کیا جائے کہ "حیوانیت" پر "انسانیت" غالب آجائے۔ اگر آپ نے نفسیات کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان کی جبلت بڑی حد تک حیوان کی جبلتوں سے مشابہ ہیں۔ لیکن قدرت نے چونکہ [انسان کو] سوجھ بوجھ کی قوت عطا فرمائی ہے۔ اس لئے وہ آدم سے تا ایندم اس کوشش میں رہا ہے کہ اپنی فطری جبلتوں کو سلجھی ہوئی خواہشوں میں تبدیل کرے۔ چنانچہ اس نے صدیوں کی سوچ بچار کے بعد اپنے لئے کچھ اصول و ضوابط تجویز کئے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے وہ اپنی حیوانیت پر غالب آسکتا ہے۔ انہی اصول و ضوابط کو ہم "قانون" کہتے ہیں۔ ا[ور] قانون کی پابندی کا جو نتیجہ ہوتا ہے اسے ہم تہذیب و ترقی کا نام دیتے ہیں۔ اگر "قانون" نہ ہو تو انسانی ہیئت اجتماعیہ ایک منٹ کے لئے بھی اپنی بنیادوں پر استوار نہیں رہ سکتی۔ اور انسانیت اُلٹی زقند لگا کر صدیوں پہلے کے اس تاریک دور میں پہنچ جائے جب حیوا[نیت]

غاروں میں پڑی سسک رہی تھی - اور ابھی اُسے "انسانیت" کی ہوا تک نہ لگی تھی - آپ ہی غور کیجئے - اگر آپ کے کرایہ دار کرایہ دینے سے انکار کردیں - یا جوائی ٹولہ کی کسی پُرپیچ گلی میں ڈاکو آپ کے کپڑے اُتار لیں - تو کیا آپ انھیں یہ کہہ کر معاف کردیں گے کہ چھینا جھپٹی انسانی فطرت میں داخل ہے - اور یہ لوگ "ماحول" سے بغاوت کر رہے ہیں - لہذا مجھے قانون کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے؟ اسی طرح اگر آپ اصول زبان اور اسلوب نگارش کو مدنظر رکھے بغیر اُلٹی سیدھی لکیریں ڈالنا شروع کردیں - یا کھانا مُنہ میں ڈالنے کی بجائے چہرے پر تھوپ لیں اور اپنی ان حرکتوں کے جواز میں یہ نعرہ لگائیں کہ "میں فطرت کا سب سے بڑا باغی ہوں اور مجھ پر الکٹرونی کیفیت طاری ہے" - تو کیا آپ سمجھتے ہیں - کہ یہ "ترقی پسندی" ہوگی - اور اسی دن شام کو آپ بریلی کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نہ کھا رہے ہوں گے؟

لہذا میرے بھائی! قانون تو ترقی پسندی کی بنیاد ہے - آپ کسی طرح اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے - آپ کسی خاص حکومت یا سوسائٹی کے کسی خاص قانون کی جزئیات سے اختلاف رکھ سکتے ہیں لیکن اصول قانون کو من حیث المجموع مسترد نہیں کر سکتے - اگر قانون کی پابندی چھوڑ دی جائے تو "آرٹ" کا حسن بھی زایل ہو جائے گا - دیکھئے نا — تاج محل کتنی دیدہ زیب اور خوبصورت عمارت ہے - لیکن اس کے ایک ایک خط اور ایک ایک نقش کو اقلیدس اور فن مصوری کے کسی نہ کسی اصول کے ماتحت بنایا گیا ہے - اگر تاج محل کا معمار بھی آپ کی طرح "ہلزم" یا لاقانونیت کا قائل ہوتا تو آج یہ پُرشکوہ عمارت فن کاری کا ایک فقید المثال نمونہ نہ ہوتی - بلکہ پتھروں کا ایک بے ترتیب ڈھیر ہوتی جس کی طرف کوئی دیکھنا بھی پسند نہ کرتا -

آپ فرماتے ہیں کہ "فقہ و قانون کوزہ پشت بوڑھی بیوہ عورتیں ہیں جو اپنی جوانی اور سہاگ کا زمانہ یاد کرکے خون کے آنسو بہاتی ہیں - لیکن تازہ جان رکھنے والے جوان مرد و عورت کو زندگی کا مزا اٹھانے نہیں دیتیں" - اچھا تو اصل میں یہ دکھ ہے آپ کو؟ واقعی یہ بوڑھی عورتیں بڑی نالائق ہیں جو آپ کو کھل کھیلنے کی اجازت نہیں دیتیں - لیکن میرے بھائی! میرا مشورہ قبول کرو تو فوراً شادی کرلو - آپ کی دماغی پریشانی بڑی حد تک دور ہو جائے گی - اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنے ترقی پسند بھائی میراں جی کے اس مشورے پر عمل کیجئے - جو وہ اپنی آزاد نظموں میں اکثر پیش کرتے رہتے ہیں - اگر آپ یہ بھی پسند نہ فرمائیں تو روس تشریف لے جائیے - جہاں سنا ہے افلاطون کے نظریئے کے مطابق "زر — زمین — اور زن" مشترک دولت ہے - اگر آپ کو ہندوستان میں رہنا ہے تو مشرقی اخلاق و تہذیب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے لیکن یہ خیال نہ کیجئے کہ مشرقی اخلاقیات محض غیر ضروری پابندی کا نام ہے اگر آپ سنجیدگی سے غور فرمائیں تو یہ اخلاقی پابندیاں انسانی معاشرت اور عمرانی نظام کے قیام کے لئے اشد ضروری ہیں - اور ان کے بغیر فوضویت (انارکی) کے پھیلنے کا اندیشہ ہے - اور فوضویت آپ کو معلوم ہونا چاہیئے اس انسانی روح کے لئے زہر قاتل ہے جس کا آپ نے جابجا ذکر فرمایا ہے -

آپ نے ہر پرانی چیز کو فرسودہ کہہ کر اس کی قدر و قیمت کو گھٹانا چاہا ہے لیکن اگر آپ ذرا سے وسیع النظری سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ ہر پرانی چیز ناکارہ نہیں ہوتی مثلاً یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند، یہ سورج اور یہ ستارے کروڑوں برس سے اسی طرح قائم ہیں - لیکن کیا آپ ان کی دلکشی یا افادیت سے انکار کر سکتے ہیں؟ وہ ایک ہی قانون کے سختی سے پابند ہیں - کیا آپ قدرت کا مضحکہ اڑانے کی جُرأت کر سکتے ہیں؟ کیا آپ اس فرسودہ ماحول سے اکتا کر خودکشی کرنے کو تیار ہیں؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو ترقی پسندی اور حقیقت شناسی کا دعویٰ خود بخود باطل ہو گیا - اس کے علاوہ آپ تو "ترقی پسند مصنفین" کے نمائندے ہیں - جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اُن میں سے نوّے فیصدی شراب نوش ہیں - آپ انہی سے دریافت کر لیجئے - کیا وہ "مئے کہنہ" کے طلبگار نہیں رہتے؟ کیا یہ مردانِ خرابات ہر شام کو "شراب کہنہ!" کا نعرہ لگایا کرتے ہیں؟ — باقی رہے ہمارے مجلسی یا سیاسی قوانین، تو انھیں فرسودہ قرار دینا ان کے تاریخی پہلو سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے - مجلسی اور اخلاقی قوانین ہنگامی اور فوری طور پر نافذ نہیں ہوا کرتے - وہ صدیوں کے غور و تفکر کا نتیجہ ہیں اور محض اس لئے حرکت میں آتے ہیں کہ خود انسان ہی نے اپنی مجلسی زندگی کے لئے انھیں مفید پایا ہے - البتہ جزوی طور پر بعض حاکمانہ قوانین سے اختلاف ہو سکتا ہے - جیسے مثال کے طور پر آپ نے امپرومنٹ ٹرسٹ کے مکانوں والی سکیم یا ناتسی حکومت کی خاکی وردی والی تجویز کا ذکر کیا ہے - لیکن اس عارضی اختلاف کے یہ معنی نہیں کہ ہم اصول قانون کے وجود ہی سے انکار کر دیں - اگر آپ کو کسی قانون میں سقم نظر آتا ہے تو اس کے خلاف شوق سے صدائے احتجاج بلند کیجئے - اور اس کی جگہ نیا قانون پیش کیجئے - لیکن خدارا یہ تو نہ کہیئے کہ انسانی زندگی الکٹرون سے مشابہ ہے جو تابع قانون نہیں ہے -

آپ نے فن کاری کی بحث میں روحانیت کے عروج و زوال پر

روشنی ڈالی ہے لیکن کیا آپ نے مضمون کا اتنا حصہ لکھنے سے پیشتر اپنے ترقی پسند رفقا سے مشورہ کر لیا تھا؟ کیونکہ جہاں تک میں نے ترقی پسند ادبا کی فلسفہ طرازیوں کا مطالعہ کیا ہے مجھے تو روحانیت کا کہیں نام نظر نہیں آیا۔ ترقی پسند ادیب تو "ادب برائے زندگی" کے قائل ہیں۔ اور زندگی ان کے نزدیک صرف اتنی ہے جتنی حواس خمسہ کے دائرے میں سما سکے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جو چیز تجربہ و مشاہدہ میں نہ آسکے یا ہمارے محسوسات سے باہر ہو اسے زندگی سے خارج سمجھنا چاہیئے علم الروح چونکہ مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتا ہے اس لئے حیات انسانی کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ بایں ہمہ اگر آپ روحانیت کے قائل ہیں تو بڑا مبارک خیال ہے۔ کاش آپ ترقی پسند مصنفین کو بھی اپنا ہم نوا بنا سکیں۔ اس کے بعد اگر آپ مزید غور و فکر سے کام لیں تو ایک قدم آگے بڑھنے پر معلوم ہوگا کہ جس چیز کو آپ "عالم خیال" یا "عالم باطن" کہتے ہیں اسی کی ایک ترقی یافتہ اور سلجھی ہوئی دنیا کا نام "الہام" اور "وحی" ہے اگر آپ "الہام" یا "وحی" کے قائل ہوگئے ہیں تو مذہب، تصوف، فقہ اور قانون کے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اور آپ کو اندھیرے میں تیر چلانے کی ضرورت نہ رہے گی۔

"باب الہند" سے ایک بھیگی ہوئی رات کو جدید ادب کے گمراہ کن رجحانات کے خلاف جو آواز اٹھی وہ موت بردوش بڑھاپے کی ایک کرب انگیز کراہ تھی یا شباب کے نشے میں چور ایک مرد مجاہد کی ضرب محمود جس نے "ترقی پسند مصنفین" کے ان خیالی بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا جو وہ مغربی بتکدوں سے چرا کر لائے تھے۔ مجھے اس سے بحث نہیں لیکن میں نے کب کہا کہ ادب کو فقہ و شریعت کی ترجمانی کرنی چاہیئے یا میری تحریر سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ادیب کے مافی الضمیر کو چھوڑ کر ذاتیات پر اتر آنا چاہیئے؟ آپ نے جدید ادب کی عریانی پر یہ کہہ کر پردہ ڈالنا چاہا ہے کہ قدیم ادب بھی اس قسم کے فحاشی سے لبریز تھا۔ لیکن بندہ پرور آپ تو تقلید کے حامی نہیں ہیں پھر قدیم ادب کی نقل اتارنے کے کیا معنی؟ البتہ اگر سماج کے رخ سے پردہ اٹھاتے وقت وہ انداز اختیار کیا جائے جسے آپ "انداز مریمی" کہتے ہیں تو میرے نزدیک یہ آرٹ ہے لیکن جیسا کہ آپ کو خود اعتراف ہے آج کل کے بعض ادیب فرائیڈ کی تقلید میں تحلیل نفسی اور شعور و لاشعور کی بھول بھلیوں میں اس درجہ گرفتار ہو گئے ہیں کہ وہ "آرٹ" اور "کوک شاستر" میں تمیز نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اگر ہم اس قسم کے ادیبوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں تو آپ لوگ چیں بجبیں کیوں ہوتے ہیں؟

آپ کا یہ ارشاد بجا ہے کہ ایک ملحد کو بھی اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کی اسی طرح اجازت ہونی چاہیئے جس طرح ایک واعظ یا مبلغ کو حاصل ہے۔ لیکن "ملحد" کو "منافق" تو نہ ہونا چاہیئے۔ وہ صاف طور پر اعلان کیوں نہیں کر دیتا کہ میں نہ مسلمان ہوں نہ ہندو بلکہ ایک ملحد ہوں جس نے اپنی دماغی خوراک کارل مارکس اور فرائیڈ کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں سے حاصل کی ہے۔ اگر آپ کے ترقی پسند ادبا اس اصول پر کاربند ہوں تو شکایت کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن وہ اسلام کا چولا اوڑھ کر ہمارے سامنے آتے ہیں اور اسرائیلی تعلیمات کا کاغذی ڈھول پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کہاں کی ترقی پسندی ہے؟

باقی رہی "آزاد نظم ——!" تو اس کے متعلق گزشتہ اشاعت میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ اور زیر نظر شمارہ میں بھی ایک مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے آپ کی رہنمائی کر سکے گا۔ لیکن آپ کی زبان قلم سے یہ سن کر تعجب ہوا کہ آزاد نظم اپنی تکنیک اور گہرائی کے اعتبار سے پابند نظم سے کہیں زیادہ مشکل چیز ہے۔ میرے خیال میں تو آزاد نظم کہنے کے لئے کسی تردد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جتنی دیر میں غزل کہی جا سکتی ہے اتنی دیر میں آزاد نظم کا ایک ضخیم دیوان مرتب ہو سکتا ہے۔ جب پابندی نہیں ہے تو خیالات کو بے لگام ہونے میں کیا دیر لگتی ہے؟ یہ تو ٹھیک ہے کہ زندگی روز بروز گہری اور پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن معاف کیجیئے، آج کل کے لکھنے والے نوجوانوں کا دماغ بہت زیادہ سطحیت پسند نظر آتا ہے۔ پرانے زمانے میں شاعر اور ادیب کیلئے "عالم" ہونا ضروری تھا لیکن آج کل جس شخص نے انگریزی کی دو چار تنقیدی کتابیں پڑھ لیں یا کسی بڑے آدمی کی سفارش سے کسی یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی۔ وہ بزعم خود "جدید ادب کا علمبردار" بن جاتا ہے۔ اور انگریزی ادب کی عینک سے مسائل حیات کی پیچیدگیوں پر گفتگو کرنے لگ جاتا ہے۔ کوئی پوچھے تمہارا مبلغ علم تو نصاب کی چند کتابوں سے آگے نہیں بڑھ سکا تم اخلاقیات الٰہیات۔ فلسفہ۔ قرآن، حدیث، فقہ و تصوف کے مسائل پر کیا روشنی ڈال سکو گے؟ آپ کے آخری پیراگراف سے مجھے اتفاق ہے۔ ترقی پسند ادیبوں میں واقعی کمزوریاں بھی ہیں۔ اور انہی کمزوریوں کو دور کر کے ہم اردو ادب میں قوت حیات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ آپ کا آخری فقرہ بہت زیادہ مبالغہ آمیز ہے۔ ترقی پسندی کے دعویدار ہندوستان کی موجودہ حالت کا سچا روپ نہیں پیش کر رہے بلکہ وہ مغربی ماحول کی نمائندگی کر رہے ہیں کاش آپ ایسے سمجھدار ادیب انہیں کپلنگ کا یہ ارشاد سنا دیں کہ "جہاں تک اخلاق و کردار کا تعلق ہے مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ دونوں میں کبھی ملاپ نہیں ہو سکتا" والسلام

شبلی

نظم

از حضرت اعجاز صدیقی اکبرآبادی

معذرت

دوست! کیوں ساتھ مجھے اپنے لئے جاتا ہے!

قوتِ جذب و کشش سے مجھے انکار نہیں
میں نے مانا ہے وہاں حسن برافگندہ نقاب
میں نے مانا ہے وہاں ماہِ درخشاں کا جواب
میں نے مانا ہے وہاں رقص کناں موجِ شراب
میں نے مانا، ہیں وہاں عیش کے سارے اسباب
میں نے مانا، کہ وہ ہے جلوہ گہِ حسن و شباب
میں نے مانا، ہیں وہاں روح فزا چنگ و رباب
میں نے مانا ہے وہاں نکہتِ نسرین و گلاب
میں نے مانا، ہیں وہاں عالمِ فردوس کے خواب
اور مرا ذوقِ جوانی بھی نگوں سار نہیں
دوست! کیوں ساتھ مجھے اپنے لئے جاتا ہے!

(۲)

کب میں کہتا ہوں کہ وہ شوخ فسوں کار نہیں
وہ تو اک شعلۂ جوالہ ہے اک موجۂ نور
وہ اگر چاہے تو پیدا کرے سو عالمِ طور
جو اُسے دیکھ لے بے بادہ کشی ہو مخمور
اُس کی آنکھوں سے برستی ہے مئے کیف و سرور
وہ جوانی کی نگاہوں میں ہے فردوس کی حور
لبِ رنگیں کے تکلم سے رواں موجِ طہور
دل کے نذرانے کئے جاتے ہیں پیش اس کے حضور
اور وہ نشۂ پندارِ جوانی سے ہے چور
کب میں کہتا ہوں وہ رشکِ گل و گلزار نہیں
دوست! کیوں ساتھ مجھے اپنے لئے جاتا ہے!

(۳)

یہ نہیں ہے کہ مجھے جرأتِ دیدار نہیں
میں اُسے روح کی خلوت میں بٹھا سکتا ہوں
بلکہ قصرِ محبت کی بنا سکتا ہوں
پریت کے گیت بھی ساتھ اس کے میں گا سکتا ہوں
عشق کیا، حسن کو بھی وجد میں لا سکتا ہوں
روٹھ جائے وہ اگر اس کو منا سکتا ہوں
تابِ نظارہ لئے سامنے آ سکتا ہوں
دل سے دل، آنکھ سے میں آنکھ ملا سکتا ہوں
یہ نہیں ہے کہ میں جلووں کا طلبگار نہیں
دوست! کیوں ساتھ مجھے اپنے لئے جاتا ہے!

(۴)

تیری دنیائے بصیرت ابھی بیدار نہیں
تو سمجھتا ہے جسے ایک گرانمایہ گہر
وہ ہے نظروں میں مری جنسِ سرِ راہگذر
تو سمجھتا ہے جسے غیرتِ خورشید و قمر
وہ ہے نظروں میں مری ظلمتِ ماقبلِ سحر
تو سمجھتا ہے جسے دولتِ دامانِ نظر
وہ ہے نظروں میں مری رہزنِ تنویرِ بصر
تو سمجھتا ہے جسے عشرتِ تقدیرِ بشر
وہ ہے نظروں میں مری زہر چکاں اک نشتر

ان حقائق سے ابھی تک تو خبردار نہیں
دوست! کیوں ساتھ مجھے اپنے لئے جاتا ہے!

(۵)

ساتھ دینے کے لئے میں ترا استیار نہیں
اس کے ہونٹوں میں ہے اک آتشِ خاموش بھری
اور بڑھ جاتی ہے جس سے تپشِ تشنہ لبی
اُس کے گیسو نہیں بکھرے ہوئے کچھ ہیں افعی
جن کا کاٹا ہوا بچتا نہیں تریاق سے بھی
جب وہ آتی ہے جھروکے میں پئے جلوہ گری
اور برساتی ہے آنکھوں سے شرابِ عشقی
کوئی ہو جاتا ہے بیتاب تو مضطر کوئی
غرض اک تیر سے کرتی ہے ہزاروں زخمی
کسی صورت سے مناسب ترا اصرار نہیں
دوست! کیوں ساتھ مجھے اپنے لئے جاتا ہے!

(۶)

نوجوانی سے میں اپنی ابھی بیزار نہیں
کام لینے ہیں ہزاروں پئے تعمیرِ وطن
ہے رگ و پے میں نہاں جذبۂ تعمیرِ وطن
بار نظروں پہ ہے بیرنگئ تصویرِ وطن
خواب بے معنی ہوئی جاتی ہے تعبیرِ وطن
میں کہ اک مدتِ کافی سے ہوں دلگیرِ وطن
توڑنا چاہتا ہوں حلقۂ زنجیرِ وطن
کیوں میں ہو جاؤں اسیرِ بتِ بے پیرِ وطن
میں ہوں خوددارِ وطن، ضامنِ توقیرِ وطن
مجھے منظور شکستِ سرِ پندار نہیں
دوست! کیوں ساتھ مجھے اپنے لئے جاتا ہے

(آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر شدہ)

عشرتِ حزیں

از:-
حضرت نظر حیدرآبادی

حلقۂ احباب میں جب جھومتی ہو زندگی
قہقہوں کی گونج میں دب جائے آہوں کا خروش
پھیل جائے دو جہاں میں جب فرشتوں کی ہنسی
آسماں پر بن رہے ہوں کہکشانی راستے
سیلِ موسیقی میں بہ جائے سکوتِ کائنات
اور ایسے میں کسی کی مست نظروں کا پیام

سو گئی ہو حال کے زانو پہ جب فکرِ مآل
نور کے سانچے میں ڈھل جائے فضاؤں کا جمال
چاندنی کی گود میں سو جائے فطرت کا جلال
نیم وا کلیوں میں جاگے پھول بننے کا خیال
دُھل گئی ہو جب دلوں سے خود بخود گردِ ملال
ہاں فقط میرے لئے بن جائے مبہم سا سوال

پھر کسی صورت دلِ شاعر بہلتا کیوں نہیں
نغمہ و انوار کی زد میں مچلتا کیوں نہیں

جونک

نفسیاتی افسانہ

جناب طفیل ملک

خوب جی بھر کر پانی پی چکنے کے بعد کالی سلوں کے درمیان دائرے بناتی ہوئی لہروں میں اس نے اپنا عکس دیکھا۔ ہیٹ سر سے اتار کر پاؤں میں رکھی اور قمیص کے کھلے کالروں کو باہر نکال کر کوٹ کے کالروں پر اچھی طرح لگایا۔ اس کی قمیص کے کھردرے کالر کسی ہندوستانی فلم کے ہیرو کے کالروں کی طرح ہوا میں جھومنے لگے۔ اس وقت وہ سچ مچ اپنے آپ کو کسی فلم کا ہیرو تصور کر رہا تھا اور وہ کسی خیال میں محو ہو گیا۔

لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا جب وہ پہاڑ پر چڑھ رہا تھا پتھر کی ناہموار پگڈنڈی پر اس کے چمکتے ہوئے براؤن بوٹوں سے کریچ کریچ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ اور اب یہ آواز پہاڑوں کی تنگنائیوں اور گہرائیوں میں گم ہو چکی تھی۔

اس چشمے میں جونکیں تیر رہی تھیں۔ دو چار لمحوں کے بعد پانی کی سطح کچھ ابھری۔ جھاگ پیدا ہوئے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں نمودار ہوئیں اور دائرے بناتی ہوئی لہروں میں جب اس کا عکس لرزنے لگا تو اس کی نظریں پرے کھیتوں پر جا پڑیں۔

زعفران کے کھیتوں میں کتنی چہل پہل ہے۔ نوجوان خوبصورت لڑکیاں اور بوڑھی عورتیں سب کھیتوں میں کام کر رہی ہیں۔ کیا یہاں کی سبھی عورتیں خوبصورت ہوتی ہیں؟ ایک لمحہ کے لئے اس نے سوچا اور اس کے تمام جسم میں ایک خلش آمیز کپکپی سی دوڑ گئی۔ کشمیری حسن تو ویسے ہی مشہور ہے مگر کھیتوں میں ایسا معلوم ہوتا کہ سارا حسن یہیں اکٹھا کر دیا ہے۔ گوری گوری گردنیں۔ کالی کالی آنکھیں۔ نازک چکیلے اور رسیلے ہونٹ۔ سفید خوبصورت دودھ سے گال۔ چغتائی کی تصویروں سے کہیں مختلف۔ یہ حسن۔ روشنی کا محتاج۔

اس نے دیکھا دور نیچے ایک جھونپڑی کے نزدیک ایک جوان گوجر گاں کا دودھ دوہ رہا تھا۔ اور ایک نوجوان لڑکی اس کے پاس کھڑی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر دوسری طرف ایک بوڑھا آدمی کھاٹ پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ قریب ہی دو چار گائیں بھینسیں ڈکرا رہی تھیں۔

اور دور تھکی ہوئی نیم مدہوش سی آوازیں ہاشی ہاشی ہا گھاٹیوں۔ ڈھلوانوں اور وادیوں کی تنگنائیوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے خوبصورت وادی پھیلتی چلی گئی۔ وادی کے مکان۔ ۔۔۔ اور جیسے ایسے نظر آ رہے تھے جیسے دھوبی نے گھاٹ پر کپڑے سکھانے کے لئے رکھے ہیں۔ وادی میں رہنے والے اور کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مکانوں کی چھتوں سے دھواں آہستہ آہستہ دائرے بناتا ہوا فضا میں گم ہو رہا تھا۔ اور دھند کا ہلکا سا غبار درختوں کی سبز چوٹیوں پر پھیلتا جا رہا تھا۔ وادی کے پھیلاؤ میں ایک چھوٹی سی ندی بل کھاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ درختوں کی شاخوں سے چھنتی ہوئی دھوپ نیچے ندی کے پانی پر پڑ رہی تھی۔ اور ندی کا پانی نقرئی فیتے کی طرح چمک رہا تھا۔

شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک نیلے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک بھرے بھرے پتھروں کی چٹانیں۔ جھاڑیاں۔ اونچے اونچے شاہ بلوط اور صنوبر کے جنگل نظر آتے اور دور چوٹیوں پر چٹانوں کے ایک انبار کی طرح کہیں کہیں کوئی گاؤں اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ شہر اور تہذیب سے دور بہت دور ——— دور دور تک مکئی کے کھیت لہلہا رہے تھے۔

پہاڑوں کی تنگنائیوں میں دوڑتی ہوئی ہواؤں کی چیخیں۔ صنوبر اور چیل کے لمبے لمبے درختوں کا بدمست شرابیوں کی طرح جھومنا اور پتوں کا بے بسی سے کھڑکھڑانا۔ ہوا کے ہلکے لطیف اور فرحت بخش جھونکے۔ ایک سکون آمیز لہر سی اس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی۔

کھرر کھرر۔۔۔۔ کھرر۔۔۔۔ پگڈنڈی پہ بے ترتیب قدموں سے نیچے اترنے کی آواز سنائی دی۔ ہیونا زرد کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی سبزوں سے بھری ہوئی لمبوتری ٹوکری کمر پہ لادے ہلکے ہلکے قدموں سے نیچے اتر رہی تھی۔

نوجوان لڑکی اور پردیسی راہی۔ چوڑے زرد کپڑے اور سفید کریم کا سوٹ۔ بے ترتیبی سے ڈھلکے ہوئے بال اور دلکش کریم سے جمے ہوئے

بال ۔میلی کچیلی سفید چادر اور قیمتی ہیٹ ۔

"تمہیں کوہی بگڈنڈی جاتی ہے؟" اس نے یونہی پوچھا اور مسکراہٹیں اس کے چہرے پر بکھر گئیں ۔

"جی صاحب!" غریب لڑکی کی نظریں چشمے پر جا پڑیں۔ جس میں جونکیں تیر رہی تھیں ۔

دو چار لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا "انڈے بھی بیچتی ہو؟"

"جی صاحب" وہ ٹوکری کمر پر سے نیچے رکھتے ہوئے بولی ۔

وہ اس کے اور قریب ہو گیا ۔لڑکی خاموشی سے حسرت آمیز مجبوری کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگی ۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بدنما اور بدصورت دکھائی دیتے تھے ۔لیکن کہنیوں ۔گھٹنوں وغیرہ کے قریب جہاں قمیص پھٹی ہوئی تھی جلد کی رنگت انڈے کی طرح سفید اور بے داغ نظر آ رہی تھی ۔

اس کے سارے حواس پر ایک دلربا غنودگی سی چھا گئی ۔زعفران کے کھیتوں سے ہلکی ہلکی خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں ۔ باس متی کے دھان کی خوشبو کتنی پیاری اور دلآویز ہوتی ہے ۔ اس لڑکی کا ابھرا ہوا سینہ میلی پھٹی ہوئی قمیص دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ سینے کا اتار چڑھاؤ ہوا میں اڑنے والے ربڑ کے دو ہلکے پھلکے غباروں کی طرح پھیل جاتا ۔اس کے لب ذرا موٹے سے تھے ۔مگر دلفریب ۔ اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اور ان آنکھوں میں حرکت کرتے ہوئے دو چمکتے ہوئے نقطے ۔اس کا گداز جسم ۔ لے دے میں انہی چیزوں کا اس وقت احساس تھا ۔ یہ چیل اور صنوبر کے خاموش درخت پہاڑیں ۔ چشمے کا بہتا ہوا پانی ۔غرض اس لڑکی کے نوجوان جسم کے علاوہ ہر چیز اسے فضول سی معلوم ہونے لگی ۔ وہ ایک اجنبی تھا ۔تہذیب یافتہ شہری ۔بہتے ہوئے چشمے میں ایک بھاری پتھر کی طرح ۔

اس کے دل میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا ۔ اس بے کس لڑکی کی قربت سے اس کے جذبات مشتعل ہونے لگے ۔ اچانک کوئی دھندلا سا خیال اس کے دماغ میں رینگتا اور غائب ہو جاتا ۔ اور اچانک ہی موٹر لاری کا واقعہ اس کے دماغ میں بہتے ہوئے چشمے کی طرح رینگنے لگا ۔

لاری آہستہ آہستہ چل رہی تھی ۔ اونچے اونچے سایہ دار درختوں کی دو رویہ قطاریں پیچھے کی طرف بھاگی جا رہی تھیں ۔حد نگاہ تک لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا ۔

لاری میں اس کے ساتھ ایک تعلیم یافتہ سنجیدہ مزاج سادہ لباس میں ملبوس نوجوان بیٹھا تھا ۔ اس سے ذرا پرے ایک پنڈت جی تشریف فرما تھے ۔ اور پنڈت جی کے ساتھ ہی ایک سیدھی سادی خوبصورت لڑکی خاموش بیٹھی تھی ۔ پنڈت جی اور اس لڑکی کے پیچھے بے ڈھنگے بے ترتیب سروں کا ہجوم شروع ہو جاتا تھا ۔ لاری کی اگلی رو میں ایک انگریز لیڈی بیٹھی ہوئی تھی ۔عمر چالیس پچاس سال سے کیا کم ہو گی! لیکن اس کا شباب ابھی پچیس سال کی نوجوان شہزادی کی طرح پھوٹ رہا تھا ۔اس کے بھورے رنگ کے ریشمیں اور ملائم بال سونے کے تار معلوم ہوتے تھے اور اس کی ابھری ہوئی چھاتی کا تناؤ ــــــــ

اس کے پاؤں اور ہاتھوں کے ناخن کیوٹکس کے رنگ سے چمک رہے تھے ۔اس کے لب گلاب کی پتیوں کی طرح سرخ تھے ۔پیرس بیوٹی کے پاؤڈر سے اٹے ہوئے اس کے شہابی رخسار ۔ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد وہ اپنے بٹوے میں سے مستطیل شکل کا ایک چھوٹا سا آئینہ نکالتی اور اپنے چہرے کو دیکھتی ۔شہابی رخساروں پر پیرس بیوٹی کے ہلکے سے غبار اور اپنے لبوں کی لالی کی گہرائی کو دوبارہ ٹھیک کر لیتی ۔اس کے سامنے بیٹھا ہوا ایک ۱۴ ــ ۱۵ سالہ نوجوان لڑکا اس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے تک رہا تھا ۔

عین سڑک کے درمیان بھیڑ بکریوں کے ایک ریوڑ کی وجہ سے لاری رک گئی ۔ دو چار ننھے منے بچے لاری کے نیچے آتے آتے رہ گئے ۔ ڈرائیور جو شاید میدانی علاقے کا رہنے والا تھا غصے سے تلملا اٹھا ۔ اس کی آنکھیں دھوپ میں موٹر کی دو روشن آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں ۔ وہ غصے سے بھرا ہوا لاری سے نیچے اترا ننھے منے بچوں کو زور زور سے دو چار چانٹے رسید کئے ۔ ناک بہتے ہوئے اور جگہ جگہ غلاظت اور گندگی پھیلانے والے بچے درد کی وجہ سے بلبلا اٹھے ۔سہمی ہوئی شکلیں خوف اور ڈر کے مارے ان کی آنکھوں سے آنسو ابلنے لگے ۔

اور ڈرائیور اپنی سائیکل کے ہینڈل کی طرح مڑی ہوئی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوا گرجدار آواز میں بولا "سور کے بچے!"

انگریز لیڈی کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی ۔ اور اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ سی پھیل گئی ۔ اس کے دانت خونخوار بھیڑیے کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگے ۔ چودہ پندرہ سالہ نوجوان لڑکا اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا ۔تعلیم یافتہ سنجیدہ مزاج نوجوان نے اپنی حسرت بھری نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں ۔ پنڈت جی نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھ کر بولے

"ہے بھگوان!"

بچے کملائے ہوئے پھولوں کی طرح تھے ۔ جوانوں اور بوڑھوں کے چہروں پر غربت ۔فاقہ ۔بھوک ۔مصیبت ۔ غلامی ۔جہالت اور ایک مکروہ اور پھیکی قسم کی خوشحالی نظر آتی تھی ۔

اور جو عورتیں اپنے خاوندوں کے ساتھ ساتھ ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں ان میں سے کسی کی عمر بھی بیس پچیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ ان کے رخساروں کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ان کے کولھے کافی چوڑے تھے۔ بعض کی چھاتیوں کا ابھار نظر ہی نہ آتا تھا۔ اور بعض کی چھاتیاں بالکل ڈھلک چکی تھیں۔ بیس پچیس سال کی بوڑھی عورتیں۔

پیوند زدہ کپڑوں میں ملبوس نوجوان لڑکیاں خوف اور حسرت سے ذلیل نظروں سے لاری میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا منہ تکنے لگیں۔ یہ لڑکیاں انڈوں اور سبزی سے بھری پیالہ نما ٹوکریاں کمر پر لادے بیچنے جاتی ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ نوجوان لڑکیاں سادگی اور بھولے پن کی وجہ سے عموماً جوان پردیسیوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں اور بن بیاہے ہی ایک دم مائیں بن جاتی ہیں۔ اور ان میں سے بعض پگڈنڈیوں پر بار بار گڑگڑا کر جان دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ان کے جسموں میں خون کا نام تک نہ تھا۔ اونچے اور متوسط طبقہ کے لوگ ان کا خون تک چوسنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس کی نظریں سامنے ایک ٹنڈمنڈ درخت پر جا پڑیں۔ جسے دیمک لگا ہوا تھا۔ زرد۔ پژمردہ۔ خشک پتے بے جان ہو کر زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ وہی ہوگا جو درخت کو دیمک لگ جانے سے ہوتا ہے۔

زمین پر رینگنے والے کیڑوں میں سے ذلیل ترین کیڑے۔ ان کی زندگیاں مدتوں سے تاریک۔ خاموش اور اداس ہیں۔ ان کی روحیں صدیوں سے مردہ ہو چکی ہیں۔ ان کے چہروں پر بے بسی اور بے چارگی جھلک رہی تھی۔

ایک بوڑھے کسان نے جس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور ناک ٹیڑھی تھی اور جس کے چہرے پر بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں کی طرح جھریاں چھائی ہوئی تھیں التجا کی "معاف کرو بھائی"۔ اس کے بڑھے ابرو سکڑ گئے۔ اور اس کی گول مول آلو کی سی آنکھیں ڈرائیور کے چہرے پر جم گئیں۔

ڈرائیور اپنا سینہ کشادہ کئے رعب دار انداز میں اول فول بک رہا تھا۔ الو کا پٹھا عین سڑک کے بیچ میں بھیڑ بکریوں کو لئے پھرتا ہے۔

بڑبڑا رہا ہے ——— ڈرائیور بڑبڑا رہا تھا۔ چالیس پینتالیس سال کی انگریز عورت بدستور مسکرا رہی تھی۔ اور چودہ پندرہ سالہ نوجوان لڑکا جو رنگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

گھاں گھاں کی خوفناک آواز کے ساتھ لاری پھر سڑک پر رینگنے لگی۔ تھوڑی دور جا کر لاری ایک نہایت ہی دلکش مکان کے سامنے رک گئی۔ گلاب اور نرگس کے پودوں نے جو اس مکان کی چھت تک پہنچ رہے تھے۔ چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ پائیں باغیچہ پھولوں کی ایک بساط معلوم ہوتا تھا۔ جس میں رنگ رنگ کے چھوٹے بڑے پھول قدرتی طور پر بے ترتیبی سے ادھر ادھر اُگے تھے۔ ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ کھڑکیوں میں زرد۔ نیلے اور اودے رنگ کے پھول دیوار تک لٹک رہے تھے۔ برآمدے میں عشق پیچاں کی ایک بیل عنابی پھولوں سے جو خون کے دھبوں کی مانند معلوم ہوتے تھے لدی لٹک رہی تھی۔ یہ کسی انگریز افسر کا بنگلہ تھا۔ انگریز عورت نے جلدی سے بٹوے میں سے مستطیل شکل کا آئینہ نکال کر اپنے چہرے کو دیکھا۔ پیرس ہوٹی کے پاؤڈر سے اٹے ہوئے شہابی رخساروں اور لبوں کی لالی کی گہرائی کو ٹھیک کیا۔ اسے یہیں اترنا تھا۔ چودہ پندرہ سالہ نوجوان لڑکے کے چہرے پر اداسی کی ایک لہر دوڑ گئی اور تھکی ہوئی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ وہ یونہی مسکرا دیا۔

کچے جھونپڑے۔ سہمی ہوئی غم انگیز شکلیں۔ مڑی ہوئی ناکوں والے بوڑھے۔ حسرت و یاس میں الجھے ہوئے جسم۔ بیس پچیس سال کی بوڑھیاں چوڑے کولھے۔ پیوند زدہ لباس میں بے کس نوجوان لڑکیاں اور چالیس پینتالیس سال کی نوجوان عورت۔ پھولوں سے لدا ہوا بنگلہ۔ عنابی پھول اور خون کے دھبے۔ اس کے گلے میں تلخی سی ہونے لگی۔ زبان تالو سے چمٹ گئی۔ اس وقت اسے ان لوگوں کی بے چارگی کا احساس ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ اس کا سانس چلتے چلتے رک گیا ہے ——!

اور اب یہی احساس لئے ہوئے ایک نقش کی طرح اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ یہ غریب بزدل ہوتے ہیں۔ زمین پر رینگنے والے کیڑوں میں سے ذلیل ترین کیڑے۔ دفعتاً اسے خیال گزرا کہ وہ خود ایک جونک ہے جو اس بے کس لڑکی کے ہونٹوں کا رس۔ اس کی جوانی اور اس کا خون چوسنا چاہتا ہے اور ——

یہ ساکن اور خاموش درخت۔ اس نے اپنا منہ زور سے جھنجوڑا

دو ایک بار منہ میں زبان پھیری۔ بڑی مشکل سے تھوک نگلی۔ اس نے محسوس کیا کہ ہوا چلتے چلتے رک گئی ہے اور وہ کسی اندھے گڑھے میں گرا جا رہا ہے۔ اس کے جسم کی نس نس اور رگ رگ پھڑکنے لگی دماغ میں ایک قسم کا طوفان امنڈ پڑا۔ اس کے چہرے پر انگریز عورت کے دانتوں کی طرح حریص نگاہیں تیکھنے لگیں۔ اور وہ اپنی خواہشوں کے منوں بوجھ تلے دب گیا۔ اس وقت بالکل تنہائی تھی۔ اس کا جی

چاہتا تھا کہ وہ بس اسی جگہ اس لڑکی کو سینے سے چمٹا لے اور اس کے ہونٹ کا بوسہ لے لے۔ اس کا جسم کیا اسی لئے نہیں تھا کہ اسے گود میں لے کر خوب زور زور سے بھینچا جائے۔

اس نے ہمت کر کے اپنا ہاتھ لڑکی کی کمر میں ڈال دیا۔ اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر اس کے سیاہ لمبے بالوں کو چوم لیا۔ لڑکی ہچکچائی ڈری۔ شرم و حیا۔ بزدلی۔ بےبسی اور بےچارگی اور کچھ اس کے رعب سے اس کی آواز تک نہ نکل سکی۔ اس کی جھجک آمیز نگاہیں جن میں مجبوری اور بےکسی کی لہریں پنہاں تھیں اس کے چمکتے ہوئے براؤن بوٹوں پر گڑ گئیں اور وہ ایک وحشیانہ بےخودی کے ساتھ اسے پیار کرنے لگا۔

ایک عجیب قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ان چیل اور صنوبر کے بلند درختوں کے گھنے جنگل کے درمیان۔ اس آسمان اور نیلی دھند کے نیچے۔ اس گہری تنہائیوں میں وہ غریب نوجوان لڑکی کے اور قریب ہو گیا۔

وہ بیچاری اپنی چھاتیوں کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ اس تنہائی میں اس کا منہ تاک رہا تھا۔ اس کے سارے جسم میں ایک عجیب قسم کے رنج سے ملی ہوئی مسرت کی ایک عارضی لہر دوڑ گئی جس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اور وہ خاموشی سے اپنے سفید کریم کے سوٹ کی شکنیں درست کرنے لگا۔ لڑکی اپنے میلے کچیلے کھردرے ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رو رہی تھی۔ انڈوں اور سبزی سے بھری ہوئی لمبوتری ٹوکری پاس دھری تھی۔ سورج کے سامنے بادل کا ایک ٹکڑا آ گیا۔ اور ہر طرف دھندلی سی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ پہاڑی پگڈنڈی پر خشک پتیاں تہہ بہ تہہ لدی ہوئی تھیں اور ان مرجھائی ہوئی پتیوں سے خوشبو آ رہی تھی۔

ساری فضا میں ایک عجیب اداسی چھا گئی۔ ایک گہرا آزردہ سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس گہرے سناٹے میں ایک کراہت آمیز تسلسل کے ساتھ اس لڑکی کی مدھم سسکیاں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں تو اس کے تمام جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اور ایک جھینپی اور بیہودہ ہنسی کے ساتھ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

لمبے لمبے قدم بڑھاتا ہوا وہ پہاڑ سے نیچے اترنے لگا۔ پتھر کی ناہموار پگڈنڈی پر اس کے چمکتے ہوئے براؤن بوٹوں کی آواز کرچ کرچ پیدا ہو رہی تھی۔

لڑکی کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اس کی بھولی معصوم مسکراہٹ۔ سیدھی مانگ۔ سیاہ لمبے بال بےترتیبی سے ڈھلکے ہوئے تھے۔ ایک نامعلوم سا خوف۔ چھاتیوں کے موہوم سے خم اور نگاہوں میں پریشانی۔ اس کی پریشان متجسس آنکھیں جن میں غم کی بدلیاں پنہاں تھیں۔ ملتجیانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی دلگداز چمک جن میں آنسوؤں کی نمی تھی برچھی کے ایک گہرے زخم کی طرح اس کے کلیجے تک اتر گئی۔

زعفران کے کھیتوں میں خوبصورت لڑکیاں اور بوڑھی عورتیں کام کر رہی تھیں۔ وادی کے مکانوں کی چھتوں سے دھواں آہستہ آہستہ دائرے بناتا ہوا فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ ندی کا پانی نقرئی فیتے کی طرح چمک رہا تھا۔ دور دور تک مکئی کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ پگڈنڈی کے اس پار ایک بوڑھا آدمی کھاٹ پر لیٹا حقہ پی رہا تھا۔ دور۔ تھکی ہوئی نیم مدہوش سی آوازیں ہانپتی ہانپتی گھاٹیوں۔ ڈھلوانوں اور پہاڑوں کی تنہائیوں میں گونج رہی تھیں۔

کھرر۔ کھرر..... کھرر.... جیسے کوئی اوپر کی پگڈنڈی سے تھکے تھکے قدموں سے نیچے اتر رہا ہو۔ آس پاس پہاڑوں کی بلند چوٹیاں اسے اپنے اوپر جھکی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ اس کا دم جیسے گھٹنے لگا۔ اور یہ واقعہ غیر شعوری انداز میں اس کے دماغ کی تہہ میں گھسنے لگا۔ اس کے چہرے پر ندامت کی زردی دوڑ گئی۔ اور اس نے ندامت کے ایک بہت گہرے اور دل میں چھپے ہوئے احساس کے ساتھ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور اس کی نگاہیں کائی سلوں کے درمیان بہتے ہوئے چشمے پر جم گئیں جس میں جونکیں تیر رہی تھیں۔

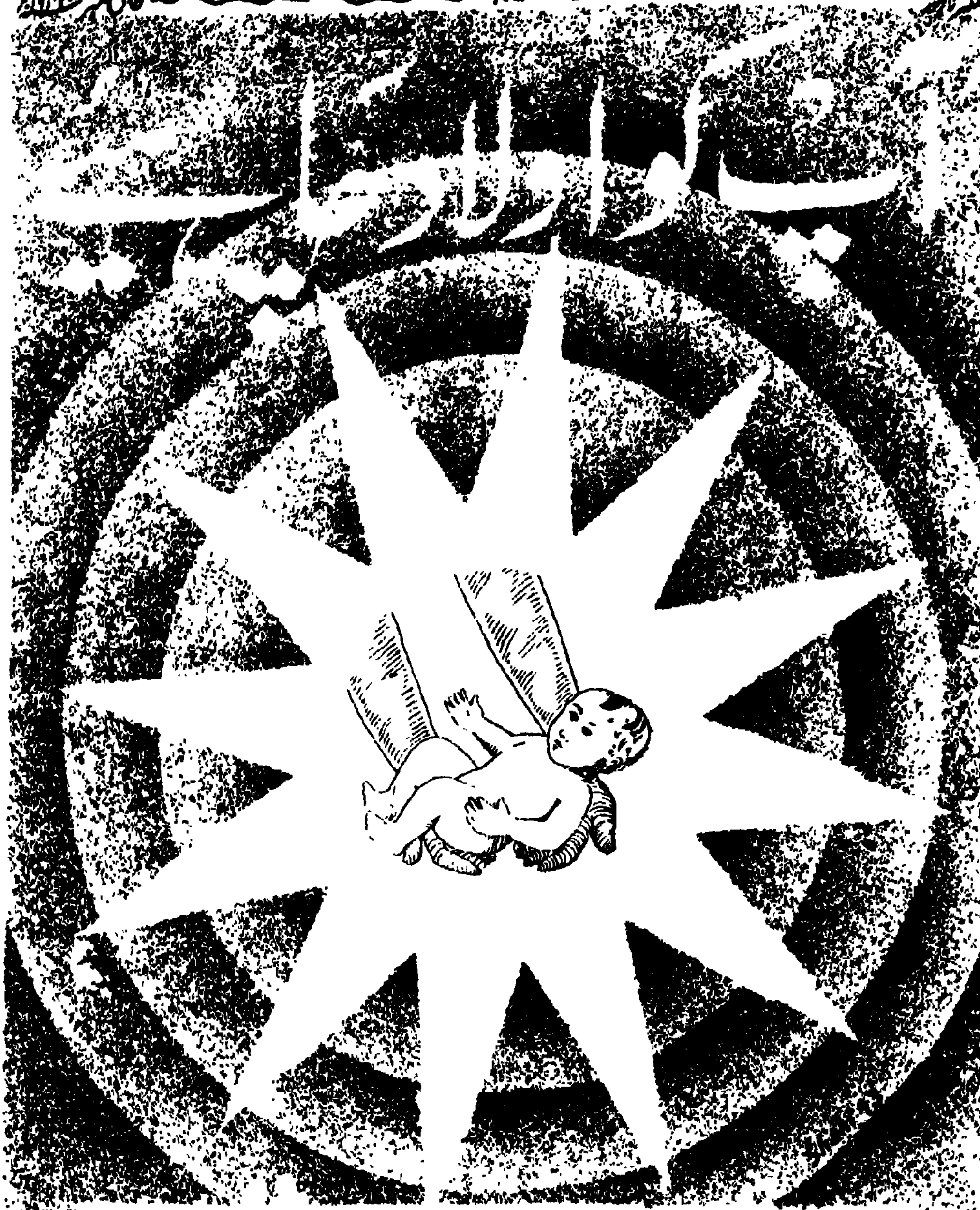
کیوں ہو؟

جناب راز مرادآبادی

مرا دیوانہ پن وجہِ شکستہ خاطری کیوں ہو
نہیں جب واسطہ مجھ سے تو میری فکر بھی کیوں ہو

وہ سجدہ جس سے بو آتی ہے زہد و حور و کوثر کی
فریبِ بندگی کہیے خدا کی بندگی کیوں ہو

انہیں بھی راز ترکِ عشق سے بے حد اذیت ہے
مگر چہرے سے احساسِ غمِ بیگانگی کیوں ہو!


آپ کو اولاد چاہیے

ناسخ کی مثنویاں

تنقیدی مقالہ

جناب عطاء اللہ پالوی

خدابخش، خدابخش خیمہ دوز کے خلف امام بخش ناسخ اپنے عہد کے امام زبان تھے اور شاعری میں ان کی تحقیق اور استادی مسلّم تھی۔ بالخصوص وہ "لکھنؤ اسکول" کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کی مشہور "مثنوی سراج" بھی اس دور انقلاب کی سب سے پہلی مثنوی سمجھی جاتی ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ "نظم سراج" تاریخی نام ہے جس کے اعداد ۱۲۵۴ھ ہوتے ہیں۔ اسی سال "گلزار نسیم" بھی لکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں "نظم سراج" کو "لکھنؤ اسکول" کی سب سے پہلی مثنوی نہیں کہہ سکتے۔ مولٰنا اصغر گونڈوی مرحوم نے عام خیال کے خلاف "گلزار نسیم" کو "لکھنؤ اسکول" کی سب سے پہلی مثنوی قرار دی ہے مگر یہاں بھی وہی اعتراض عاید ہوتا ہے کہ "نظم سراج" کیوں نہ پہلی مثنوی کہی جائے جبکہ وہ بھی اسی سال شائع ہوئی ہے؟ میری دانست میں یہ بحث فضول ہے کہ "لکھنؤ اسکول" کی سب سے پہلی مثنوی کون ہے بلکہ صرف یہ دیکھنے کی چیز ہے کہ "لکھنؤ اسکول" کا سب سے پہلا شاعر کون ہے۔ سو یہ ماننے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ "لکھنؤ اسکول" کا سب سے پہلا شاعر ناسخ ہے۔

ناسخ کے متعلق صاحب "شعر الہند" کا تو فرمانا ہے کہ انہوں نے "مثنوی کو ہاتھ ہی نہیں لگایا"۔ لیکن صاحب "گل رعنا" کا بیان ہے کہ ان کی "ایک مثنوی حدیث مفضل کے ترجمہ میں ہے اور ایک "مولود شریف" ہے۔ صاحب "مثنویات" نے تحریر فرمایا ہے کہ:-

> "نظم سراج سے دو تین سال پہلے ناسخ نے ایک مثنوی اور لکھی تھی جس میں جناب امیر علیہ السلام کے تولد کا بیان اور بعض احادیث کا ترجمہ تھا۔"

مگر صاحب "آب حیات" کا بیان ہے:-

> "ایک مثنوی حدیث مفضل کا ترجمہ ہے میر علی اوسط رشک نے اسے ترتیب دیا اور اس کا تاریخی نام "نظم سراج" رکھا ہے اور ایک "مولود شریف" بھی شیخ صاحب کی تصنیف ہے۔"

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ "مولود شریف" ایک مثنوی یقینی ہے رہی "نظم سراج" یا "ترجمہ حدیث مفضل" سو اس میں اختلاف ہے۔ بقول صاحب "مثنویات" یہ دو مثنویاں ہیں اور بقول صاحب "آب حیات" ایک ہی مثنوی ہے۔ صاحب "آبحیات" نے یہ فرماتے ہوئے کہ:-

> "نظم سراج لوگوں کی رائے میں ان کے رتبہ عالی سے گری ہوئی ہے مگر چونکہ پابندی ترجمہ حدیث کی ہے اس لئے ان پر گرفت بیجا ہے۔"

بطور نمونہ انہوں نے وہ چند شعر پیش کئے ہیں۔ جو "زبان" کی تعریف میں ہیں مگر یہ شعر اس بحر میں نہیں ہیں جس بحر میں "ترجمہ حدیث مفضل" کے اشعار نظر آتے ہیں۔ نیز ان اشعار کو "حدیث" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ آزاد کو دھوکا ہوا۔ دراصل "ترجمہ حدیث مفضل" اور "نظم سراج" دو علیحدہ علیحدہ مثنویاں ہیں۔ اور انہوں نے جو اشعار پیش کئے ہیں وہ "ترجمہ حدیث مفضل" کے نہیں بلکہ "نظم سراج" کے ہیں۔ اس کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ "ترجمہ حدیث مفضل" کو ۱۹۳۱ء میں جناب حبیب اللہ خاں غضنفر نے کتابی صورت میں علیحدہ شائع کیا ہے اور اس کے دیباچہ میں فرمایا ہے:-

> "ناسخ کو تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا اور انہوں نے متعدد نادر مادّے نکالے ہیں۔ ہر دیوان کا تاریخی نام ہے۔ دوسری مثنوی کا نام "نظم سراج" تاریخی ہے۔ مگر نہیں معلوم یہ مثنوی اس شرف سے کیوں محروم رہی۔ نہ تاریخی نام ہے نہ کوئی قطعہ تاریخ ہے۔"

ان سطور کی موجودگی اور مطالعہ کے بعد صاحب "تاریخ مثنویات اردو" نے پھر بھی "آبحیات" کے الفاظ میں یہ طرفہ تحریر سپرد قلم فرمائی ہے کہ:-

> "ایک مبسوط مثنوی جو انہوں نے حدیث مفضل کے

ترجمہ میں "نظم سراج" نامی لکھی ہے اور اگرچہ وہ غیر معروف ہے مگر بندشیں اور شستہ زبان اور صحت لفظی ناسخ کے خصوصی اجتہاد کا بیّن ثبوت ہیں .... دو ایک سال کا زمانہ گزرا کہ اس مثنوی کو غضنفر علی خاں ایم۔ اے ریسرچ اسکالر الہ آباد نے چھپوا دیا ہے۔"

بہر حال اپنی اپنی تحقیق ہے۔ ان مباحث سے کم از کم اتنا نتیجہ ضرور نکلا کہ ناسخ نے "مولود شریف"۔ "ترجمہ حدیث مفضل" اور "نظم سراج" تین مثنویاں لکھی ہیں مگر مجھے ان کی ایک اور مثنوی ملی ہے جو "شہادت نامۂ آل نبیؐ" کے نام سے موسوم ہے۔ غالباً اسی مثنوی کا نامکمل ذکر صاحب "مثنویات" نے کیا ہے۔ اس میں شہدائے کربلا کے حالات نظم ہوئے ہیں اس صورت سے ناسخ کی چار مثنویاں ہو جاتی ہیں۔

"شہادت نامہ آل نبیؐ"

حضرت امام حسین اور ان کے رفقا کے مصائب کے بیان میں ولی سے اس وقت تک نظم و نثر کا ایک بے پناہ ذخیرۂ ادب جمع ہو گیا ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ میر انیس سے پہلے ہو یا بعد کسی نے بھی اس ادب میں وہ جذب و اثر اور وہ گھلاوٹ اور خود گداختگی پیدا نہیں کی جو انیس کے یہاں ہے۔ ناسخ تو خیر جانتے ہی نہ تھے کہ شعر میں جذب و اثر بھی کوئی چیز ہے اور وہ کیسے پیدا کیا جاتا ہے لہٰذا ان کی یہ مثنوی میرے خیال میں "تبرک" اور ان کی دانست میں "ذریعۂ نجات" کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ ابتدائی اشعار حسب قاعدہ یا حسب عقیدۂ شیعی اس طرح کے ہیں ؎

علی کی مدح سے مملو ہے قرآں　　علی تھا مثل قرآں آب فرقاں
علی کا نام ہے قرآن ناطق　　علی تھا دفتر اخبار صادق
علی تھا عالم علم لدُنی　　علی تھا کاشف سرّ سلونی

آخری اشعار وہ ہیں جن میں شہادت امام حسین کا واقعہ نظم ہوا ہے۔ دُنیا کے سب سے زیادہ پُر درد اور حسرتناک سانحہ کا ذکر ان الفاظ میں ہے ؎

ہوئی جب پیاس کی شدت نہایت　　چلے دریا کی جانب واں سے حضرت
لیا بحر کرم نے اک کف آب　　کہ تا وہ مالک کوثر ہو سیراب

شاعری کے لحاظ سے سوائے رعایت کے کچھ نہیں اور روایت کے اعتبار سے سوائے شاعری کے کچھ نہیں۔ وہ مجسم ایثار جس کے سامنے اس کے بھتیجوں، بھانجوں اور بیٹوں کو تین دن کا بھوکا پیاسا رکھ کر ذبح کر دیا گیا ہو یہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ وہ مجمل فرات کی طرف رُخ بھی کرے مگر چونکہ ناسخ کے نزدیک "مالک کوثر کی اہمیت بڑھانی تھی لہٰذا ان کے چلو میں پانی ڈال ہی کے رہے۔ شہادت کے متعلق بھی آخری اشعار سُن لیجئے ؎

ہوئے زخموں سے آخر چور شبیر　　غزا سے ہو گئے معذور شبیر
لگے انیس سوز خم ان کے تن پر　　نہیں جا ایک جز ثابت بدن پر
گرا لرزتے زمیں پر کشت زیں سے　　گرا خورشید چرخ چارمیں سے
نہیں آگے بیاں کی مجھ میں طاقت　　زباں میں جوش گریہ سے ہے لکنت

کوئی جو درد و کرب، کوئی جو جذب و اثر اور کوئی جوش و ولولہ ہو۔

"نظم سراج"

اس مثنوی کی بڑی شہرت ہے اور اس میں شُبہ نہیں کہ ناسخ نے اس مثنوی میں جو چیز پیش کی ہے وہ اعلیٰ ہے مگر انداز بیان میں کوئی رس اور مزہ نہیں ہے۔ جس وجہ سے یہ مثنوی کوئی مرتبہ حاصل نہ کر سکی۔ نمونتاً چند وہ اشعار مُلاحظہ ہوں جو زبان سے متعلق ہیں ؎

کی خدا نے جو یہ زبان عطا　　ہے بلا شک عطیۂ عظمیٰ
اس سے ہے مختلف مزوں کی تمیز　　اس سے پاتے ہیں لذت ہر چیز
کوئی کڑوی ہے کوئی ہے میٹھی　　نمکیں کوئی، کوئی کھٹ میٹھی
کوئی اچھی ہے کوئی زشت و زبوں　　مزے سب چیز کے ہیں گونا گوں
سب مزوں سے زباں ہی واقف ہے　　نہیں اسرار کی یہ کاشف ہے
جو نہ ہو یہ تو کچھ نہ ہو معلوم　　نہ ہوتی کوئی مزہ کبھی مفہوم
اور بھی ہوتے ہیں زباں سے کام　　ہے ممد وقت بلع آب و طعام
اس سے احکام بہر ندان ہے　　قوت تام بہر دنداں ہے

مانا کہ زبان میں سب خوبی ہے مگر ناسخ کی زبان اپنی خوبیاں اس صورت سے نہ بیان کر سکی کہ کچھ مزہ آ جائے۔

"ترجمۂ حدیث مفضل"

اس مثنوی کے نام ہی سے اس کا موضوع ظاہر ہے۔ اس میں پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ولادت کا بیان ہے اور اسکے بعد ان احادیث کے ترجمے مختلف عنوانات سے پیش کئے گئے ہیں۔ جو حضرت علی سے متعلق ہیں یا وہ قرآنی آیات ہیں جو حضرت علی سے متعلق کی جاتی ہیں۔ نمونتاً چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

خدا کا ہے حاضر کلام مبیں — کہ ہے اس میں "کونو مع الصابریں"
ائمہ سے وارد ہوا یہ کلام — کہ ہیں صادقیں آل خیر الانام
علی ولی ان کا سردار ہے — علیم خدا سے خبردار ہے
بیان "الذی جاء بالصدق" کا — مفسر رقم کرتے ہیں جا بجا
"دُرِّ د" جو سیوطی کی تفسیر ہے — یہ مضمون صاف اس میں تحریر ہے
کہ مقصود اس سے ہے شیر خدا — وہی ہے بڑا صاحب اتقا

اس مثنوی کے متعلق صاحب "مثنویات" کا بیان ہے کہ:۔

"قافئے بیحد سست ہیں .... وقف عام صفتیں مصرعوں کا وزن پورا کرنے کے لئے بے ضرورت استعمال کی گئی ہیں اور ایک شعر بھی اس قابل نہیں کہ ... نقل کیا جائے۔"

لیکن غضنفر صاحب نے اس مثنوی کو کلیتاً شائع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ:۔

"زبان صاف و شستہ ہے۔ بندش پختہ ہیں .... ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔ بندش کی پختگی اور ترکیبوں کی دل آویزی ہر جگہ موجود ہے۔"

"ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا"

ایک ادیب اس سرے پر ہیں اور دوسرے اُس سرے پر۔ ایک اتنے خوش عقیدہ ہیں کہ ان کے نزدیک یہ مثنوی کلیتاً شائع کرنے کے قابل ہے اور شاعرانہ اعتبار سے نہایت ہی پاکیزہ ہے اور دوسرے کی دانست میں یہ مثنوی قطعی ناقص ہے اور اس قابل ہی نہیں کہ اس کا کوئی شعر بھی پیش کیا جائے۔ یہ افراط تفریط ادب میں مہمل ہے۔ یہ ایک مذہبی رنگ کی معتقدانہ مذہبی ہے اور اس میں صرف ان احادیث کو نظم کیا گیا ہے جن میں حضرت علی کی عظمتیں مسطور ہیں۔ یہاں تک کہ ناسخ نے حضرت عائشہ تک سے روایت کرنے میں اغماض نہیں کیا ہے ؎

یہ ہے حضرت عائشہ سے کلام — کہ فرماتے تھے مجھ سے خیر الا
مرے بعد ہوں گے خوارج شقی — کہیں گے بہت آپ کو متـ
رہیں گے بہت صرف صوم و صلوٰۃ — بظاہر وہ ہونگے حمیدہ صفـ
مگر کافروں سے ہوں باطن میں بد — نہیں ان کے کفر و شقاوت
کریگا انہیں قتل دیندار ایک — وہ ہوگا مری ساری امت
کہا میں نے وہ کون ہے یا نبی — نبی نے کہا وہ ہے میرا

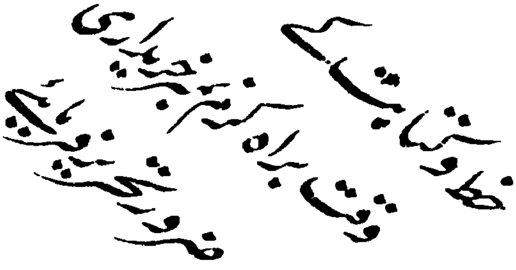
ظاہر ہے کہ اس صورت میں کوئی شعر اخلاقی حیثیت سے ایسا نہیں ہو سکتا جو پست ہو اور کسی کو سنایا یا کسی جگہ نقل نہ کیا جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ مذہبی پابندیوں کی وجہ سے یہ لت بلند بھی نہیں ہو سکتے کہ ان کو کوئی خاص مرتبہ دیا جائے۔

"مولود شریف"

یہ مثنوی باوجود تلاش کے مجھے نہ ملی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ بھی اسی رنگ کی ہو گی کیونکہ مولود میں تو اور بھی گنجائش تجاوز نہیں۔ تاہم یہ دیکھنے کی چیز ہو گی اس لئے کہ مولود یکسر نظم میں ابتک مفقود ہے۔ بہرکیف ناسخ کی مثنویاں اسی دریا عام مثنویوں کا رنگ دیکھتے ہوئے بیجا نہیں معلوم ہوتیں مگر عام طور سے ان کی وقعت تسلیم نہیں کیجاتی ہے۔ غالب نے بھی مرزا حاتم علی مہر کو لکھا ہے کہ:۔

"ناسخ مرحوم جو تمہارے اُستاد تھے اور میرے بھی دوست صادق الوداد تھے مگر ایک فنی تھے۔ صرف غزل لکھتے تھے۔ قصیدہ اور مثنوی سے انہیں کچھ علاقہ نہ تھا۔"

مگر خود غالب ہی کو مثنوی سے کیا علاقہ تھا؟ یہ شاید غالب کو معلوم نہ تھا۔



فریب

افق کے کناروں میں سورج چھپا بھی
دھندلکا اندھیرے میں گم ہو گیا بھی
نظر اب تو آتا نہیں راستا بھی
وہ جلنے ہیں دیپک
مگر تم ابھی تک مری منتظر ہو

برسنے کو مچلی ہوئی ہیں گھٹائیں
خنک سی ہوئی جا رہی ہیں ہوائیں
بھیانک ہیں چمگادڑوں کی صدائیں
بجھے سے ہیں انجم
ابھی تک مگر تم مری منتظر ہو

یہ ظلمت، یہ تنہائیاں، یہ خموشی
یہ برباد مندر، یہ ویران جھاڑی
اس افتادگی میں کھڑی ہو اکیلی
ندی کے کنارے
میں قرباں تمہارے مری منتظر ہو

کہو اب بھی کیا تم مری منتظر ہو؟

جناب علی احمد بی۔اے

سمجھتا ہوں تم مجھ سے کیا چاہتی ہو
وفاؤں کے بدلے وفا چاہتی ہو
محبت کا اپنی صلا چاہتی ہو
یہ کیا کر رہی ہو
مجھے چاہتی ہو، مری منتظر ہو

وفا کی امید اور اک اجنبی سے
لگایا تھا میں نے تو دل دل لگی سے
محبت کی پیماں کئے تھے ہنسی سے
فریب اب نہ کھاؤ
بڑی ناسمجھ ہو مری منتظر ہو

حقیقت کو کب تک چھپاؤں سنو تو
تمہیں آج سچ سچ بتا دوں سنو تو
میں شہنا کو دل دے چکا ہوں سنو تو
کھڑی کیوں ہو گم صم
کہو اب بھی کیا تم مری منتظر ہو

کمینے

نفسیاتی افسانہ

جناب احمد شجاع پاشا بی۔ اے

اُسے تعجب ہُوا۔ تعجب کیوں نہ ہوتا۔ بات ہی ایسی تھی۔ بکری نے شیر کے سر پر دونوں پاؤں رکھ دیئے اور شیر نے متانت سے گردن جھکا لی۔ اور بھی بہت سے کام کیے تھے بکری نے۔ وہ ہارمونیم کی آواز پر رقص کرتی رہی۔ دو اڑھائی اِنچ چوڑی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ مگر یہ کام کچھ زیادہ تعجب انگیز تھا۔ اس قدر جرأت۔ تالیاں بجنے لگیں۔ اور شامیانے کے چاروں طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہُوئیں رِنگ ماسٹر داد طلب نگاہوں سے حاضرین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ عجب شان غرور سے اپنا سر بلند کئے ہنٹر کو ہوا میں گھما رہا تھا اور بیچارہ شیر خموش کھڑا تھا۔ ساکت و صامت۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے جسم میں جان نہیں ہے۔ جیسے شیر کی کھال میں بھوسہ بھر کے سٹیج پر رکھ دیا گیا ہے ورنہ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ جنگل کا بادشاہ ذلیل بکری کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو جائے۔ اپنی قسم کا نیا سرکس آیا تھا اس شہر میں۔ انوکھے کھیل دکھائے جا رہے تھے اور مہینہ بھر سے یہ تفریح عوام کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ گھاس پر بیٹھنے والے بھی تھے اور کرسیوں کے مالک بھی۔ شہر بھر کے لوگ جمع تھے وہاں، ان کے چہرے مسکرا رہے تھے۔ ان کے دل دھڑک رہے تھے اور ان کی آنکھیں حیران تھیں۔ ایاز نے سگریٹ سلگایا اور اپنے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ ساڑی کے پلو سے ماتھے کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔

"دیکھا تم نے سلمیٰ!" اس کے ساتھی نے کہا۔

"جی . . . . ." سلمیٰ نے دھیرے سے جواب دیا۔ "کس قدر ذلیل ہے شیر کو۔ . ." اس مکروہ چہرے والے شخص نے قہقہہ لگایا۔ اور دیکھنے لگا۔ ایاز کے دماغ کے پردے پر خیالات کا ایک بے پناہ ہجوم سوئیاں سی چبھوتا ہوا گزر رہا تھا۔ وہ پڑھتا آیا تھا۔ سنتا تھا کہ شیر جنگل کا بادشاہ ہے۔ جانور اس کے نام سے لرزتے ہیں اس کی بُو پاتے ہی دُم دبا کر بھاگتے ہیں۔ اس کے غار کے قریب سے گزرنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کی ہیبت سے انسان تھر تھر کانپتا ہے۔ پھر اسے خلافِ فطرت کام کرنے پر کیونکر مجبور کیا جا سکتا ہے ایک بکری اسے کس طرح ذلیل کر سکتی ہے؟ وہ بھی عوام کی طرح رِنگ ماسٹر کی قابلیت کی داد دینے لگا۔ آدھی رات کے قریب تماشا ختم ہوا اور عوام شیر کی منکسر المزاجی کی تعریف کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔

ایاز بھی دھیرے دھیرے اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا۔

بہت دور تھا اس کا مکان۔ شہر کے ایک تنگ و تاریک محلے میں وہاں شام ہونے سے پہلے ہی اندھیرا چھا جایا کرتا تھا۔ ٹوٹی ہوئی سڑکیں شکستہ مکان اور گندگی۔ چونکہ ادھر کبھی کسی موٹر کا گزر ہی نہ ہوتا تھا اس لئے ڈامر کی سڑکیں بنانا میونسپلٹی کے لئے ضروری نہ تھا۔ صرف چوراہے پر ایک لیمپ لگا دی گئی تھی۔ جسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ روشنی بھی اپنی فطرت کے خلاف اندھیرے سے سہمی ہوئی ہے۔ اس جگہ تھا ایاز کا مکان۔ کچی دیواریں تھیں اس کی۔ چھت سے عموماً مٹی گرا کرتی تھی۔ اور برسات میں وہاں سونا ایاز کے لئے کچھ کم تکلیف دہ نہ تھا۔ ایک دکان کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ "دو پیسے کے سگریٹ دینا بھائی" اس نے دکاندار سے کہا۔ "اور ایک پان۔" اس نے اپنے پھٹے ہوئے کوٹ کی جیب کو ٹٹولا۔ ایک اکنّی یہی پونجی تھی اس کے پاس۔ ساڑھے چار آنے کا ٹکٹ خرید کر اس نے سرکس دیکھا۔ اس سے پہلے کچھ پیسے کھانے پر صرف کئے۔ اور اب اس کے پلے یہی کچھ تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے اسے بیکار پھرتے ہوئے۔ پہلے وہ ایک سیٹھ کے ہاں ملازم تھا۔ اسے تنخواہ مل جاتی تھی۔ اس طرح گزر ہو جاتی تھی۔ سیٹھ کی خفگی پر اسے اپنی ملازمت چھوڑنی پڑی۔ مجبور تھا وہ آخر انسان تھا، تکلیفیں اٹھاتا رہا۔ ذلتیں برداشت کرتا رہا۔ مگر اس کا آقا کسی پہلو اسے آرام لینے ہی نہ دیتا تھا۔ صبح سے لیکر شام تک ایاز کولہو کے بیل کی طرح کام کرتا۔ رات کو سیٹھ کے پاؤں دباتا۔ موٹر صاف کرتا۔ مگر سیٹھ کی فرعونیت کسی طرح کم نہ ہوتی۔ وہ اسے "کمینے کتے" کہہ کر پکارتا۔ اور بات بات پر گالیاں دیتا۔ دنیا والوں نے غلامی کو بہت پہلے نیست و نابود کر دیا تھا۔ ایاز بھی یہی سنتا تھا کہ اب دُنیا میں غلامی کا نشان

تک باقی نہیں۔اب انسان خریدے اور بیچے نہیں جاتے۔مصر کے فرعونوں کی سلطنتیں ختم ہو چکی تھیں۔اور تہذیب کی روشنی درندوں کے اندھیرے غاروں تک پہنچ چکی تھی۔پھر اسے اس قدر ذلیل کیوں کیا جاتا ہے۔کیا یہ صدیوں کا وہی پرانا نظام نہیں تھا؟ اس کی رگ حمیت پھڑکی۔اسے سیٹھ اور سیٹھ کی حرکات سے گھن آنے لگی۔نفرت.... وہ ہر بات سے نفرت کرنے لگا۔بالآخر اس نے جرأت سے کام لیکر سیٹھ کی ملازمت چھوڑ دی۔

"کیوں؟ کیا ارادہ ہے؟" سیٹھ نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں...." اس نے جواب دیا۔

"لاٹری نکل آئی ہے کیا؟ معلوم ہوتا ہے تم امیر ہو گئے ہو۔"

"جی نہیں.... میں آپ کے یہاں رہنا نہیں چاہتا" سیٹھ کے گال غصے سے سرخ ہو گئے۔

"کہاں جاؤگے—؟" اس نے تڑخ کر کہا۔

"کہیں اور...."

"دیکھونگا—" سیٹھ متعجب ضرور تھا کہ ایاز میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی۔وہ اتنا دلیر کیسے ہو گیا۔یہ گستاخی— یہ دلیری! خیر خوددار غریب بھوکوں ہی مرا کرتے ہیں—ایاز نے سگریٹ سلگائی پان کا بیڑا منہ میں ڈالا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی حالت کا جائزہ لینے لگا۔اس کے چہرے پر گرد جمی ہوئی تھی۔یہ سرمایہ داروں کے موٹروں کی نشانی تھی۔اس نے قمیص کے دامن سے چہرے کی گرد صاف کی۔وہ کچھ آگے بڑھا۔سن سے ایک موٹر دھول کے بادل اڑاتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئی۔وہ زیر لب کچھ بڑبڑایا۔یہ ذلیل کرتے ہیں ہم لوگوں کو—اس نے سوچا۔خدا بنے بیٹھے ہیں ہمارے۔ہمیں تو ان کے پاس بھی نہیں جانا چاہئے۔اگر ہم ایک ہو جائیں اور بغاوت کر دیں تو یہ ہماری طرح ننگے دھڑنگے ہو جائیں گے۔ہم ہی تو ہیں ان کی مشینوں کے پرزے۔قابل نفرین ہے یہ نظام— یہ چند سیٹھ جو کروڑوں مزدوروں کی قسمتوں کے مالک ہیں۔یہ بھی تو انسان ہیں آخر— ہم سے کسی طرح اچھے نہیں۔ہم ان سے بدرجہا بہتر ہیں۔ہم میں وہ برائیاں موجود نہیں جو ان میں ہیں۔اگر ہم ارادہ کر لیں تو یہ مجبور ہو کر اس نظام کو بدل دیں گے— اور اس نے ارادہ کر لیا کہ اب وہ کسی سیٹھ کے یہاں جا کر ذلیل نہ ہوگا۔وہ اپنے ساتھیوں کو بھی اکسائے گا چاہے وہ مر جائے۔چاہے اس کے ماں باپ تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔اور اس کا ارادہ عزم صمیم کی صورت اختیار کر گیا۔

بھوک نے ستایا اس نے کلیجہ پر پتھر رکھ لیا۔پھرتا رہا بیکار دیوانوں کی مانند۔سودائیوں کی طرح۔غلاموں کو اکساتا رہا مگر کچھ بن نہ آئی۔پھوٹی کوڑی بھی پاس نہ تھی۔سگریٹ خریدنے کے لئے بھی پیسہ موجود نہ تھا۔ادھار سدھار لیکر گھر والوں کا پیٹ بھرتا رہا مگر عزت کی نوکری کہیں نہ ملی۔جس جگہ بھی گیا۔اسے ڈانٹ پلائی گئی۔وہ تنگ آگیا۔بیزار ہو گیا جینے سے۔اس کی ماں نے کہا "بیٹا! یوں کام کب تک چلتا رہے گا؟"

"ماں! عزت کی نوکری کہیں نہیں ملتی۔"

"عزت کی نوکری کس بلا کا نام ہے؟" اس کی ماں نے تعجب سے پوچھا۔

"ماں تم کیا جانو بڑے لوگ ہمیں بہت ذلیل کرتے ہیں مجھے دکھ ہوتا ہے"

"تمہاری ماں بھوک سے دم توڑ دیگی بیٹا پھر دکھ نہ ہوگا تمہیں؟"

"ہاں!" اس نے کہا اور ایاز کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔واقعی وہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔اگر وہ بھوکی رہے تو... ایاز کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے روئیں روئیں سے لہو پھوٹ کر نکلے گا۔کیا وہ بھوک سے مر جائیگی؟ کیا اسے روٹی نہ مل سکے گی۔کیا اس کے بوڑھے جسم کو ڈھانپنے کے لئے کپڑا میسر نہ آئے گا۔کیا اس کی ضعیف ہڈیاں یہ بوجھ برداشت کر سکیں گی؟ وہ مر جائیگی، اس نے بہت صدمے اٹھائے ہیں۔اس نے بہت فاقے کئے ہیں۔بھوک—غربت—ذلت—عورت روٹی— روٹی—اس کا دماغ چکرانے لگا۔حلق میں کانٹے سے پڑ گئے زبان تالو سے چمٹ گئی۔اور وہ دیکھنے لگا۔دور— دور افق کی طرف جہاں بادل آپس میں ٹکرا رہے تھے چھوٹے بادل۔بڑے بادلوں سے بڑے بادل اور بڑے ہوتے جا رہے تھے——!

"تم آگئے ایاز؟" سیٹھ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔"میرا بھی یہی خیال تھا"

"جی ہاں حضور— اب تو بھیک مانگنے آیا ہوں"

"مگر اس دفعہ پہلے سے کم ملے گی—!"

ایاز نے ایک سرد آہ کھینچی اور کہا—"اچھا سرکار"

سیٹھ کی لڑکی نے ایاز سے کہا "اچھا کیا تم آگئے خواہ مخواہ تکلیف ہوتی تمھیں" اور ایاز نے سوچا کہ وہ بہت ہمدرد ہے۔وہ غریب نواز ہے وہ دیوی ہے۔وہ سراپا محبت ہے— بکری نے شیر کے سر پر پاؤں رکھا اور شیر نے متانت سے گردن جھکالی— ایک معصوم لڑکے نے اپنی ماں سے پوچھا "اماں یہ کیسے۔ماسٹر جی کہتے ہیں پرانے بادشاہوں کے زمانہ میں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیا کرتے تھے۔مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ بکری شیر کے سر پر بھی رکھ دیا کرتی تھی—"

"بیٹے!" اس کی ماں نے فلسفیانہ انداز میں کہا—"تم نہیں سمجھے

دمہ کے بیمار ختم ہو گئے

دمہ کی بیماری کو صرف ایک ہفتہ میں ختم کر دینے کا آسان طریقہ

۱۹۳۲ء میں ہندوستان کے اندر دمہ کی بیماری عام ہوگئی تھی مگر اب اس بیماری سے تکلیف اٹھانے والے بہت کم نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ۱۹۳۲ء سے آج تک چالیس ہزار دمہ کے مریضوں کو آرام ہو چکا ہے اور اب بہت کم مریض اس بیماری کے نظر آتے ہیں

دمہ کے مرض کو ختم کرنے کی آسان ترکیب

اتنے تھوڑے عرصے میں دمہ کے چالیس ہزار مریضوں کو بالکل تندرست کر دینا ایک ایسی زبردست کامیابی ہے جسکی مثال تاریخ میں بھی نہیں مل سکتی حالانکہ اب سے کچھ پہلے عام حکیم اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ دمہ کا مریض مشکل سے اچھا ہوتا ہے مگر اب وہ بھی چپ ہیں۔ دوا "سانسول" نے ان کا منھ بند کر دیا ہے یہ دوا جس مریض کو دی گئی اس کا دمہ جاتا رہا۔ درحقیقت یہ دوا ہندوستان کی آب ہوا کے لحاظ سے کچھ ایسی موافق آئی ہے کہ خود موجد کو تعجب ہے دمہ کا دورا پڑتا ہو۔ سانس پھولتا ہو رات رات بھر بیٹھے گذر جاتی ہو اور کسی دوا سے آرام نہ ہوتا ہو تو وہاں "سانسول" استعمال کرائیے۔ اس کی ہر خوراک مرض کی کمی کا باعث ہوگی اور چند ہی دنوں میں مریض دمہ کے مرض سے آزاد ہو جائیگا۔ سب سے بڑی خوبی اس دوا میں یہ ہے کہ پہلی ہی خوراک سے مریض کو تسکین ہو جاتی ہے اور اسے پورا اعتقاد ہو جاتا ہے کہ دمہ کا مرض دور کرنے کے لئے یقیناً "سانسول" ہی کی ضرورت ہے اب تک چالیس ہزار سے زیادہ مریض سانسول کے استعمال سے دمہ کا مرض دور کر کے پوری طرح تندرست ہو چکے ہیں اور کہتے رہتے ہیں کہ سانسول کی چھوٹی سی شیشی میں سائنس کا انتہائی کمال پوشیدہ ہے۔ سانسول کی ایک شیشی کی قیمت ایک روپیہ چھ آنے ہے منیجر زنانہ دواخانہ اے بی ۲۴ دہلی کو خط لکھکر بذریعہ وی پی پارسل منگالیں۔ پارسل پر نو آنے محصول لگتا ہے تین شیشی ایک ساتھ منگانے پر محصول ڈاک معاف۔

بال کالا کرنے کی کھانے کی دوا

ہندوستان کے متعدد ڈاکٹر حیران ہیں کہ ایک ہندوستانی نے عجیب و غریب خضاب ایجاد کر دیا ہے جس سے سفید بال ایک ہفتہ میں سیاہ ہو جاتے ہیں خضاب لگایا نہیں جاتا۔ کھایا جاتا ہے یعنی کھانے کی دوا ہے۔ اس دوا کے استعمال سے سر اور ڈاڑھی کے سفید بال بھی رفتہ رفتہ کالے ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے ابھی اس حیرت انگیز دوا سے فائدہ نہیں اٹھایا وہ فوراً منگا کر دیکھیں صرف ایک ہفتے کے استعمال کے بعد اس دوا کا کرشمہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے یعنی جو بال اب تک سفید ہو گئے ہیں ان کی جڑیں بھی سیاہ ہو جائینگی اور آئندہ سے سیاہ بال پیدا ہونگے ہندوستان کے ہزاروں مرد اور عورتیں اس عجیب ایجاد سے فائدہ اٹھا چکے ہیں اور ہر جگہ اس دوا نے زندہ ثبوت پیش کیا ہے اس دوا کا نام "کیشول" ہے۔ ایک شیشی میں پورا کورس دوا ہے قیمت فی شیشی چار روپے دو آنے۔ محصول تیرہ آنے لگتا ہے۔ جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ ایک خط لکھکر کیشول کی ایک شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگالیں۔

پتہ:۔ منیجر زنانہ دواخانہ اے بی ۲۴ دہلی

عورت کا سینہ

بچوں کو زیادہ دودھ پلانے سے یا اور کسی بیماری یا بے احتیاطی سے بعض اوقات عورت کا سینہ (یعنی پستان) بہت نرم اور ڈھیلے پڑ کر نیچے کو ڈھلک جاتے ہیں اور اس طرح عورت کی ظاہری جوانی ختم ہو جاتی ہے۔ عورت کے ظاہری حسن کیلئے اس کے سینہ کو بھی جوان ہونا ضروری ہے۔ اگر نرم اور نیچے کو ڈھلکے ہوئے پستان پر مشہور دوا "برسٹین" کا استعمال کیا جائے تو یہ ثمر شباب (یعنی پستان) پھر از سر نو گول اور سخت ہو جاتے ہیں اور عورت پھر نوجوان لڑکی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اگر گود میں بچہ ہو اور وہ دودھ پیتا ہو۔ تب بھی کوئی ہرج نہیں دوا نقصان نہیں کرتی۔ اس زمانہ میں بھی دوا "برسٹین" استعمال ہو سکتی ہے۔ پستان کو دوبارہ سخت اور گول کرنے کے لئے یہ دوا سالہا سال سے مشہور ہے۔ ایک شیشی کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر نو آنے محصول لگتا ہے

دوا منگانے کا پتہ :- لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۳۴ اے۔ بی دہلی

مجھے اولاد نہیں چاہیئے

عورت میں یہ خواہش اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ کسی بیماری کے باعث اتنی کمزور اور ناتواں ہو گئی ہو کہ بچہ کی پیدائش کی سخت مشکلات کا سامنا نہ کر سکے یا بعض عورتیں اپنی مفلسی کی وجہ سے بھی زیادہ اولاد سے گھبراتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو چاہیئے کہ سائینس کی جدید ایجاد دوا " روہیل " سے فائدہ اٹھائیں۔

جب تک چاہو بچہ نہیں ہوگا } دوا روہیل کے استعمال میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عورت جب تک چاہے اولاد سے محفوظ رہ سکتی ہے اور ماہواری ایام میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں پڑتی یعنی ماہواری بدستور ہر ماہ آتی رہیگی۔ دوا " روہیل " کی ایک شیشی میں اسی مرتبہ استعمال کے لائق دوا ہوتی ہے اور اسکے استعمال کی صورت یہ ہے کہ عورت .... سے دس منٹ پہلے ایک خوراک دوا " روہیل " کھائے تو پھر اس کے بعد .... اس رات عورت کو " بچہ کی امید " نہیں ٹھہر سکتی۔ چنانچہ عورت جب تک .... سے پہلے یہ دوا کھا لیا کریگی۔ " امید " سے بچی رہیگی۔

جب چاہو بچہ ہونے لگے گا } اور جب عورت اس دوا کا استعمال ترک کردیگی تو پھر جس طرح عام طور پر عورتوں کے ہاں بچہ ہوتا ہے۔ پھر اسکے ہاں بھی ہونے لگے گا۔ دوا کے استعمال سے عورت کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ جس عورت کو ضرورت ہو

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۳۴ اے۔ بی دہلی کو خط لکھکر دوا روہیل کی شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگائے۔ ایک شیشی کی قیمت چار روپے آٹھ آنے ہے پارسل پر تیرہ آنے محصول لگتا ہے۔

ٹیلیفون نمبر ۹۲۶۸

ویٹنگ روم

رومانی افسانہ

از جناب شوکت صدیقی

گاڑی آنے میں ابھی کئی گھنٹے تھے، سوچا، اتنی دیر میں اگر ایک نیند سو لوں تو طبیعت کی کسل مندی کچھ دُور ہو جائے گی مگر یہاں ویٹنگ روم میں پہلے ہی سے مسافر ڈٹے ہوئے تھے، غنیمت ہوئی کہ ایک کرسی کمر سیدھی کرنے کو مل گئی۔

معمولی سا اسٹیشن تھا۔ ویسا ہی ویٹنگ رُوم بھی بیچ میں ایک بڑی سی میز پڑی تھی۔ پاس ہی آرام کرسی پر ایک ادھیڑ سی عمر کا آدمی آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ ہاتھ میں اخبار تھا جو اُونی کمبل پر لرز رہا تھا کونے میں سنگار میز لگی تھی جس سے ملا ہوا ایک بڑا تخت تھا جس پر بابا جی مزے سے ٹانگیں پسارے سو رہا تھا۔ ذرا ہٹ کر فرش پر ایک بستر بچھا ہوا تھا اس پر بھی کوئی سکڑا سکڑایا لیٹا تھا میز کے قریب ایک اور بڈھا تھا۔ جو کھسکا کر وہاں لایا گیا تھا اس طرف نظر اُٹھاتے ہی ایک پتلی سی کلائی نظر آئی جو جھلملاتی ہوئی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھی اور بس! جھٹ سے نظر ہٹالی سفر سے تھکا ہارا آ رہا تھا۔ چہرہ پریشان اور بال بکھرے ہوئے ایسی حالت میں اُدھر دیکھ کر کیا کرتا۔

غسل خانہ میں جا کر منھ ہاتھ دھویا اگر سردی زیادہ نہ ہوتی تو شاید غسل بھی کر ڈالتا۔ باہر آ کر بال درست کئے اور کرسی کو بڑی میز کے قریب لا کر اس پر بیٹھ گیا۔ اب اس کی طرف نظر پھیر کر دیکھا۔ وہ خاموش پڑی تھی کھلی ہوئی آنکھیں سامنے والی دیوار کو تک رہی تھیں مگر آرام کرسی پر لیٹا ہوا آدمی شاید اُونگھ رہا تھا میرے بیٹھتے ہی وہ کسمسا کر اُٹھ بیٹھا۔ اور میری طرف دیکھنے لگا۔

"آپ کہاں جائیے گا"

"گھر"

میرے اس جواب پر اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل کر کچھ کشادہ ہو گئیں پھر ناک کو کچھ پھلا کر زور سے "ہُوں" کی آواز بلند کی اور اخبار اُٹھا کر بالکل آنکھوں سے ملا کے اُسے پڑھنے لگا۔ اچھا ہی ہوا میری تو یہ آرزو ہی تھی کہ وہ بات نہ کرے طبیعت نڈھال ہو رہی تھی وہ نیچے بھٹکنے اور دماغ چاٹنا شروع کر دیتا۔ کبھی ابھی

گاڑی میں ایک بار ٹرین سے جھٹکا را ملا تھا پھر وہی مصیبت نظر آئی تو کیا کرتا۔ جان تو کسی طرح چھڑانا ہی تھی۔

وہ اخبار زیادہ دیر تک نہ پڑھ سکا۔ نظریں گڑ گڑو کے تو دیکھ رہا تھا۔ اخبار اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بیچ لیں میں برابر اس کی آنکھوں کی طرف تکتا رہا لیکن اُس نے جو آنکھیں بند کیں تو پھر کھولی ہی نہیں، چاروں طرف نظر ڈال کر میں نے لڑکی کی طرف دیکھا وہ اسی طرح چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی، میری طرف مڑ کر نظر ڈالی اور کروٹ بدل کر چہرہ دوسری طرف کر لیا میں چونک سا پڑا اس بیکار نوجوان کی طرح جو آفس کے باہر "نو ویکنسی" کی تختی دیکھ کر ٹھٹک کر رہ جائے کمرے میں ایک طمانیت بخش خاموشی چھائی ہوئی تھی البتہ مسافر خانے میں آتی رات گئے بھی دھیما دھیما شور گونج رہا تھا۔ یہ اُن کی دنیا تھی جن کو گھڑی بھر کو بھی سکون نہیں۔

صرف ایک بتی روشن تھی جس کی جھکی ہوئی شعاعیں صرف میز پر سمٹ کر رہ گئی تھیں، دیواروں پر گہرے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ جن میں اُلجھ کر روشنی مٹیالی پڑ گئی تھی، یہ ہلکی ہلکی روشنی، یہ بے پناہ سناٹا اور ایک لڑکی! میں کرسی کے بازو پر اس کی طرف جھک گیا۔ اتنا کہ نصف شانہ کرسی کے باہر آ گیا۔ مگر وہ بے خبر لیٹی تھی ملگجا سا ریشمی لحاف سینہ تک پڑا ہوا تھا۔ جس کے اُوپر اس کا بازو تک عریاں ہاتھ پھیلا تھا۔ پھولوں کی طرح نرم اور خوبصورت۔ اس کے لمس کے احساس ہی سے ایک جھرجھری سی آ گئی جیسے کوئی نئی کونپل ہوا کے جھونکے سے کان پر رینگ گئی ہو۔

وہ برابر جاگتی رہی کئی بار جسم کسمسایا، سر کو انگلی سے کھجلایا۔ کبھی ٹانگیں پھیلائیں کبھی سمیٹ لیں۔ مگر کروٹ نہ بدلی۔ اور مجھے بھی کرسی پر اُلجھن ہونے لگی۔ کبھی اس پہلو کبھی اس پہلو۔ کرسی گوشت میں گڑ رہی تھی۔ ٹرین میں بیٹھے بیٹھے کمر تختہ ہو گئی تھی وہی مصیبت یہاں بھی آ گئی آخر میز پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں [illegible] کے تختہ

پر نیند آجاتی ہے، آتی ہو گی۔ یہاں تو کرسی پر بھی لحظہ بھر کو آنکھ نہیں لگتی۔ یونہی آنکھیں بند کئے پڑا تھا کہ فوجی نے "خوں خوں" کر کے لمبی لمبی سانسیں لیں۔ گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر اُس نے گردن بڑھا کر دروازے کی طرف نظر ڈالی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ چہرے پر بکھرے ہوئے بڑے بڑے بالوں کو کھبڑ کھبڑ خوب کھجا کر دونوں ہاتھوں سے ان کو پیچھے پلٹ لیا۔ پھر کھڑے ہو کر لمبا سا خاکی کوٹ پہنا اور دروازے تک جا کر باہر جھانک کر دیکھا۔

"او بڈھے یہاں آ"

اور پھر وہاں سے آ کر میرے پاس آیا۔ مجھ سے کہنے لگا "ذرا ماچس ہو تو دیجئے" میں نے چپ چاپ جیب سے ماچس نکال کر اس کی طرف بڑھا دی اُس نے کوٹ میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا "لیجئے"۔

نیچوں سگریٹ تھا۔ یوں بھی سگریٹ پینے کو دل نہ راغب تھا۔ کہہ دیا "اس وقت تو نہ پیوں گا" پھر اس نے کچھ نہ کہا اور میں نے غور سے دیکھا وہ صرف نائک تھا "پاس" بھی تیسرے ہی درجے کا ہوگا مگر اس کے ٹھاٹھ کیا کسی کے ہوں گے۔ میرے پاس تو انٹر ہی کا ٹکٹ تھا لیکن وہ فرش پر پڑا ہوا آدمی کوئی اچھا معزز ہی آدمی معلوم ہوتا کسی بڑے ہی درجے کا مسافر بھی ہوگا۔ اس کی پوشاک اور سامان سے امارت ٹپک رہی تھی لیکن بے چارے کو جگہ کہاں ملی؟ اور یہ کس شان سے لیٹا تھا۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا بس چلتا تو سب سامان اٹھا کر باہر پھینک دیتا۔

بڈھے نے اندر آ کر پوچھا "کیا حکم ہے حضور"؟ نائک اور اینٹھ گیا۔ سگریٹ کا بہت سا دھواں چھوڑ کر خالص فوجی انداز میں بولا۔

"چائے لاؤ"

وہ چپ چاپ چلا گیا۔ نائک وہیں کھڑا سگریٹ پیتا رہا۔ آرام کرسی پر لیٹا ہوا وہ آدمی بھی جاگ اٹھا مگر صرف آنکھیں کھولے تکتا ہی رہا۔ کچھ بولا نہیں۔ نائک نے ماچس واپس کرتے ہوئے کہا۔

"آپ تو بہت تھکے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں کہیں دور سے آ رہے ہیں؟"

"کل رات سے گھڑی بھر کو نہیں سویا"

"گاڑی آنے میں ابھی دیر ہے تھوڑی دیر آرام کر لیجئے"

"آرام؟" مجھے اُس پر اور غصہ آیا کس اطمینان سے کہہ رہا تھا آرام کرنے کی جگہ پر تو خود قبضہ مخالفانہ کر رکھا تھا۔ گویا مجھے کبھی فرش پر لٹانے کا ارادہ تھا جس کے لئے میں کسی حالت میں بھی آمادہ نہ تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ میری پشت پر آ گیا۔

"اگر لیٹنا چاہیں تو میری جگہ پر چلے جائیے میں تو خوب سو چکا"

حیرت سے اس کی طرف مڑ کر دیکھا وہ لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھٹ سے نظریں گھما کر کہہ دیا "اب تو گھر ہی پہ جا کر اطمینان سے سوؤں گا۔ سفر میں تو آج کل یہی مصیبتیں ہیں مگر وہ نہ مانا۔

"بیکار طبیعت خراب ہو جائے گی زیادہ جاگنا اچھا نہیں"۔

"بات تو یہی تھی ابھی سے طبیعت گری جا رہی تھی اگر اس رات کو بھی سونا نہ ملتا۔ تو بیمار پڑ جانا لازمی تھا چپ چاپ اٹھ کر اُس کے بستر کے پاس جا پہنچا اس نے اپنا بچھونا لپیٹ کر الگ رکھ دیا۔ میں نے اپنا بستر بند کھول کر اس پر بچھا دیا اور لحاف اوڑھ کر اس میں دبک گیا۔ بڑا آرام ملا۔ ہاتھ پاؤں اینٹھ رہے تھے اور آنکھیں کھٹک رہی تھیں لیٹتے ہی جیسے کسی نے تمام تکلیفیں دور کر دیں۔ آنکھ بند بھی نہ لگی کہ نائک چیخنے لگا۔

"اتنی دیر لگا دی"

میں نے پہلو بدل کر اس طرف دیکھا۔ بڈھا دونوں بغلوں میں ہاتھ دبائے سکڑا سکڑا یا کھڑا تھا اتنی سردی ہو رہی تھی اور اس کا لباس وہی ہلکا پھلکا سا تھا۔ صرف ایک اُونی "ویسٹ کوٹ" گرم کپڑوں میں گنی جا سکتی تھی۔ بھلا اس سے کیا ہوتا! ابھی اس موٹے السٹر میں تو میں خود بیٹھا ٹھٹھر ٹھٹھر رہا تھا۔ اس کے بگڑنے پر وہ خوشامد کرنے لگا۔

"اسٹال بند ہے مسافر خانے سے جا کر لایا ہوں"

"ہوں" اور وہ "سڑپ" "سڑپ" بدتمیزی سے چائے پینے لگا۔ آخر چائے پی کر پیالی دیدی۔ پیسوں کے لئے پہلے روپے کی ریزگاری کے لئے پوچھا۔ ریزگاری اور آجکل؟ جواب وہی نفی میں ملا تو کہہ دیا کہ پھر دیدیں گے اس نے مطلق پس و پیش نہ کی خاموشی سے "بہت اچھا" کہہ کر چلا گیا۔ اور اس نے کوٹ کی آستین سے منہ پونچھ کر دونوں پیر میز پر پھیلا دیئے اور نیم دراز ہو کر لڑکی کی طرف دیکھنے لگا میں نے میز کے نیچے سے دیکھا۔ لڑکی نے کروٹ بدل لی تھی۔ اب اس کے چہرے کا رُخ اسی طرف تھا۔ ایکا ایکی میری طبیعت اُداس ہو گئی، یہاں ناحق آیا۔ وہیں بیٹھا رہتا تو اچھا تھا لیکن یہ پشیمانی کا احساس زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اگر وہاں موجود بھی رہتا تو کیا ہوتا اس نے تو اُدھر رُخ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ کتنی دیر تک تو میں وہاں بیٹھا رہا۔

اور نتیجہ ؟ اور یہی سوچ کر میں نے کروٹ بدل لی۔

کچھ غنودگی سی معلوم ہو رہی تھی۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں کہ پھر ہنگامہ برپا ہوا۔ کوئی نیا مسافر وارد ہوا تھا لیکن میں نے اس کو دیکھا نہیں آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ مگر نائک کو شاید میرا آرام سے پڑا رہنا پسند نہ آیا۔ آہستہ سے شانہ جھنجھوڑنے لگا "بابو صاحب۔ بابو صاحب" میں ٹس سے مس تک نہ ہوا سست ہو کر خاموش پڑا رہا۔ آخر ہار کر وہ چلا گیا۔ کتنی دیر تک اس عالم میں رہا۔ پھر آہستہ سے ہاتھ کھسکاتے کھسکاتے روشنی میں کلائی کر لی۔ گھڑی دیکھی۔ گاڑی آنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ مگر اس وقت تک نہ اٹھا جب تک وقت بالکل قریب نہ ہو گیا۔

اٹھ کر بیٹھا تو دیکھا کہ وہ بستر کے بنڈل پر بیٹھا اونگھ رہا تھا ہر بار جھوم کر آنکھ کھول لیتا۔ مجھے جاگتا ہوا پایا تو آنکھیں مل کر پاس آ گیا "سو چکے آپ" ؟ گو سو تو نہ سکا تھا مگر انگڑائی لے کر کہہ دیا۔

"خوب جی بھر کے"

وہ مسکرانے لگا اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن جب میں نے اپنا بستر لپیٹتے ہوئے پایا تو حیرت ضرور ہوئی لیکن توجہ نہ دی اپنی گرد کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک انگریز سارجنٹ بیٹھا ہوا تھا۔ اچھا تو اس وقت وہی آیا تھا جس کی خاطر اسے اپنی جگہ چھوڑ کر یہاں آنا پڑا۔ نائک نے میرا بستر باندھ کر درست کر دیا۔ اور میں باہر چلا گیا کہ اپنے قلی کو ڈھونڈ کر لاؤں پلیٹ فارم پر سناٹا پڑا ہوا تھا۔ پل کے نیچے چند قلی میلی میلی چادریں میں لپیٹے سکڑے سکڑائے پڑے تھے اور ایک جو نکڑ پر پڑا تھا اسے دیکھ کر تو سچ مچ میں سہم گیا۔ کہ کہیں مر تو نہیں گیا بے تحاشہ سردی پڑ رہی تھی میرا چہرہ بھیگ کر بھیگ گیا تھا ناک سے بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

آفس میں جا کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہے واپس آ کر دیکھا تو میری جگہ خالی تھی نائک بستر پر آنکھیں بند کئے جھوم رہا تھا۔ سارجنٹ کو بستر پر سلا دیا ہو گا۔ کرسی پر بیٹھ اس آدمی کو دیکھا وہ خاموش پڑا تھا۔ آنکھیں بند تھیں! وہ لڑکی شاید بیٹے لیٹے تھک گئی تھی، اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پہلے ہی میرے اور اس کے درمیان کتنا فاصلہ تھا۔ اب کرسی اور نزدیک آ گئی تھی۔ سگریٹ پینے کو جی نہ چاہنے کے باوجود میں نے سگریٹ نکال کر اس کی طرف دیکھا "پی سکتا ہوں" ؟ اور جب اس نے کوئی جواب نہ دیا تو سلگا کر دھواں اسی طرف چھوڑنا شروع کر دیا۔ وہ کھسک کر نکڑ پر چلی گئی لیکن میں اسی طرح دھواں چھوڑتا رہا۔

اس نے پاس لیٹے ہوئے آدمی کو آواز دی "بابو جی۔ بابو جی اٹھئے" اور میری طرف نظر ڈالی۔ واقعی میں کچھ گھبرا گیا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے سنبھل گئے۔ اور کئی بار پلکیں جھپکا کر پوچھنے لگے۔

"کیا ہے ؟"

"گاڑی آنے والی ہے"

اس نے اس دفعہ پھر میری طرف دیکھا اور میں جھٹ سے بیچ میں بول اٹھا "ابھی گاڑی آنے میں دیر ہے" مگر وہ نہ مانی اپنی بات پر اڑی رہی۔

"نہیں اب وقت ہو گیا"

"میں پوچھ کر آیا ہوں گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہے"

انھوں نے بھی میری ہاں میں ہاں ملا دی "گاڑیاں آجکل عام طور پر لیٹ آ رہی ہیں۔ تم بھی سو جاؤ ابھی بہت وقت پڑا ہے" نیند کے مارے ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ بلی کی طرح انہوں نے پھر آنکھیں میچ لیں اور اسی وقت دھوئیں کا ایک لکہ میں نے اس کی طرف اگل دیا اس نے منہ پچکا کر دوسری طرف پھیر لیا۔

پلیٹ فارم پر سامان لے جانے والے لوہے کے چھکڑے کی کھڑ کھڑ ہوئی تو نائک اٹھ بیٹھا۔ شاید اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ گھبرا کر زور سے پوچھنے لگا "گاڑی آ گئی" اور میں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں"

لیکن وہ گھبرا گھبرا کر پلیٹ فارم کی طرف نظر اٹھا کر کبھی نہ دیکھا یہ بھی دستور کیا کہ اس کے علاوہ اور بھی تو مسافر جانے والے ہیں آخر وہ بھی اطمینان سے پڑے ہیں مگر نیند کا اثر گہرا معلوم ہوتا تھا۔ یہ باتیں اس کو سوجھی ہی نہیں بس لپک کر سارجنٹ کو جھنجھوڑنے لگا "صاحب گاڑی آ گئی" وہ بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ جھانک کر دروازے سے دیکھا۔ وہاں سناٹا پڑا تھا۔ ہم لوگوں پر نظر ڈالی سب مزے میں لیٹے تھے۔ مجھے اس نے اس بے تمیزی سے جھنجھوڑا تھا۔ اور میں خاموش ہو رہا تھا۔ مگر وہ کٹیلا سارجنٹ کہاں باز آنے والا اس کی طرف گھور کر دیکھا "نانسنس" اور کمبل تان کر لیٹ گیا۔ مجھے اس پر ہنسی آ گئی کہیں وہ دیکھ کر برا نہ مانے۔

نائک نے پھر تو نظر بھی نہ اٹھائی اس قدر خفیف ہوا کہ جھٹ پٹ سامان درست کیا اور خود بھی کمرے سے باہر جا کر ٹہل کر کھڑا ہوا، ساری ہوا بگڑ گئی دروازے پر بوڑھا کھڑا تھا اسے جاتے دیکھ کر اس نے خاص قسم کا سلام کیا مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی سیدھا چلا گیا۔ بوڑھا اس کا منہ ہی تکتا رہ گیا۔

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ سنبھل کر اب پھر میرے سامنے آ گئی تھی

کرشمہ سازیاں

میں نے ابھی کہی نہیں تم نے ابھی سنی نہیں

حضرت دعاؔ ڈبائیوی

اُن کی نگاہِ ناز کو لاگ کسی سے بھی نہیں / جو کوئی زد میں آگیا پھر اُسے چھوڑتی نہیں

اُن کی شبیہ اور وہ دونوں میں فرق ہی نہیں / وہ نہیں بولتے تو کیا یہ بھی تو بولتی نہیں

اُن کے بغیر آج تک ہم نے شراب پی نہیں / نیتِ نیک ہو اگر میکشی میکشی نہیں

معجزہ ہے یہ محتسب اُنکی نگاہِ مست کا / مجھکو شراب کی قسم میں نے شراب پی نہیں

ایک نگاہِ ناز کی دو ہیں کرشمہ سازیاں / سینہ میں درد ہے ابھی سینہ میں درد ابھی نہیں

یونہی غلط سمجھ لیا عشق کی داستان کو / میں نے ابھی کہی نہیں تم نے ابھی سنی نہیں

جوشِ طلب سے کام رکھ عزم کو مستقل بنا / طالبِ دید ہو کوئی جلوؤں کی کچھ کمی نہیں

شکوۂ غم اتفاق سے میری زباں پہ آگیا / آپ عبث بگڑ گئے آپ کا نام بھی نہیں

مستِ مئے شباب ہو حسن میں لاجواب ہو / تم کو ہو میرا ہوش کیا اپنا تو ہوش ہی نہیں

مُسلمِ بدنصیب پر اپنا کرم خدا کرے / نسبتِ حیدری تو ہے جرأتِ حیدرؓ ہی نہیں

اُن کی خوشی کو دیکھ کر شاد نہ ہو دلِ حزیں / ایسی خوشی کی کیا خوشی جو ہے ابھی ابھی نہیں

محتسب اُن کے عشق سے باز نہ آئیگا دعاؔ
دل کا ہے یہ معاملہ یہ کوئی دل لگی نہیں

وادیٔ کشمیر کا ایک سخن پرور بادشاہ

تاریخ کشمیر کا ایک ورق

جناب محمد عبداللہ قریشی

کشمیر کے کشمیری بادشاہوں میں سلطان زین العابدین بڑا خوش نصیب اور بلند اقبال بادشاہ ہوا ہے۔ اس نے پچاس برس سے زیادہ عرصہ تک داد حکمرانی دی اور ۸۷۷ھ میں انہتر برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔ وہ بڑا خلیق، نہایت شفیق، با تدبیر، بیدار مغز، صلح کل، بے تعصب، رعایا پرور، عدل گستر، فیاض اور ہر دلعزیز شہنشاہ تھا۔ اس نے اکبر اعظم سے کئی سال پیشتر اپنے ملک میں متحدہ قومیت کی بنیاد رکھی۔ اور ہندو مسلمانوں کا دل اپنی مٹھی میں لے لیا۔ اس کے کاروبار سلطنت میں دونوں قوموں کے ہاتھ پاؤں دماغ برابر کے شریک تھے۔ اور وہ ہر شعبہ کو ترقی دینے میں ایک دوسرے سے پیش پیش تھے۔ عام ہندو رعایا اس کی بلائیں لیتی اور اسے "بٹ شاہ" (یعنی ہندوؤں کا بادشاہ) کہتی تھی۔ مسلمان اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے اور "بڈشاہ" (یعنی بڑا بادشاہ) کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ اس کے عدل و انصاف کے قصے دور دور تک مشہور تھے۔ اس کے فیض کرم سے دلوں کی کھیتیاں سرسبز ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب و ملت کے کشمیری اس کے کارناموں پر فخر کرتے اور آج تک اس کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں۔

اس کی مملکت کا دامن اتنا وسیع تھا کہ ہر دو تبت پر اس کا قبضہ تھا، کاشغر کی سلطنت جو گلگت سے تقریباً ایک ماہ کی مسافت پر ہے اس کے زیر اثر تھی، سندھ کی وادی اس کے اقتدار میں تھی، پکھلی کا وسیع رقبہ جسے آجکل ہزارہ کہتے ہیں اس کے ماتحت تھا، سوات وغیرہ جیسی کئی سرحدی ریاستوں اور یاغستان جیسے آزاد علاقوں پر اس کا رعب داب قائم تھا، پنجاب سے پشاور اور سرہند تک اس کا تسلط تھا، پونچھ، راجوری اور جموں کے علاقے اس کے مقبوضات میں شامل تھے۔ کئی چھوٹے چھوٹے راجے اس کے باجگذار تھے۔ اس کی حکومت بڑی مضبوط اور فوجی قوت مانی ہوئی تھی، وہ خود شجاع اور بہادر تھا مگر خواہ مخواہ کسی پر چڑھائی نہ کرتا تھا۔ ہمسایہ ملکوں کے بادشاہ اس کی دوستی پر فخر کرتے اور اکثر اسے تحفے تحائف بھیجتے رہتے تھے۔ اس کا دربار بڑے ٹھاٹھ کا دربار ہوتا تھا۔

خاقان چین کے سفیر کشمیر میں اور کشمیر کے سفیر چین میں آتے جاتے تھے، اس کا ملک امن و امان کا گہوارہ اور اس کی رعایا خوش حال اور فارغ البال تھی۔ اگر اس کے بیٹے اسے چین سے بیٹھنے کا موقع دیتے اور ہر وقت اسے بغاوتوں کے فرو کرنے میں نہ الجھائے رکھتے تو خدا جانے وہ کشمیر کو رفعت کی کن منازل پر لیجاتا۔

وہ ایسا بادشاہ نہ تھا کہ ہر وقت داد عیش و عشرت دیتا اور ہمیشہ اپنا جاہ و جلال دکھلانے ہی میں مست رہتا، اگر ایک طرف اسے ملکی و مالی مہمات میں مصروف دیکھا جاتا تھا تو دوسری طرف وہ علماء و صلحا کی مجلسوں میں علمی مباحثے اور مناظرے کرتا ہوا بھی نظر آتا تھا۔ اس کے زہد و اتقاء نے اسے کشمیر میں بادشاہ ہونے کے علاوہ ایک ولی اللہ اور کامل صوفی کا درجہ دے رکھا تھا جو اسے اس حال میں دیکھتا تھا ایک عرب شاعر کا ہمنوا ہو کر یہی کہتا تھا ؎

اذا اردت شریف الناس کلھم   فانظر الی ملک فی زی مسکین

(اگر تم سب سے زیادہ شریف انسان کو دیکھنا چاہتے ہو تو ایک بادشاہ کو فقیرانہ لباس میں دیکھو)

اس کی وفات کے کئی سال بعد جب شہنشاہ اکبر اور جہانگیر نے کشمیر فتح کیا اور کشمیریوں کے دلوں پر اس کی اس طرح حکومت دیکھی تو اس کی ہر دلعزیزی کی بیحد تعریف کی۔ سچ ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اس کی نظر کیمیا اثر تھی، وہ مٹی کو ہاتھ لگاتا تو وہ سونا ہو جاتی تھی۔ کشمیر کے فلک پیما کوہستانوں میں قدیم بھولے ہوئے زمانوں سے بیش بہا معدنی خزانے مدفون چلے آ رہے تھے، اس نے انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور حکومت کے دامن کو لعل و یاقوت اور سیم و زر سے بھر دیا۔ کئی ٹیکس منسوخ کئے۔ کئی محصول معاف کئے، مالگذاری کو کم کیا۔ کاشت کرنے والوں کو خاص خاص مراعات دیں، مردہ زمینوں کو زندہ کرنے کے وسائل اختیار کئے، آبپاشی کے ذرائع کو سہل اور وسیع بنایا اور زراعت کو ترقی دیکر آمدنی اور خرچ کو۔

برابر کر دیا۔ وہ خود اگرچہ مختارِ مطلق تھا مگر اپنے ذاتی اخراجات ذاتی جاگیر سے حاصل کرتا اور خزانۂ شاہی کو قومی امانت تصوّر کرتا تھا۔

اس کے عہد میں صنعت و حرفت اور تجارت کا بازار گرم تھا، دُور دراز ممالک سے ہر فن کے ماہر اور صنعت گر کھنچے چلے آتے تھے، اس کی حوصلہ افزائی اور قدردانی سے کاغذسازی، حکاکی، قالین بافی، پیپر ماشی اور بیشمار صنعتیں مُلک میں رائج ہوگئیں، ریشم کے کارخانے کھُل گئے، اور کشمیری مصنوعات دُنیا کے گوشے گوشے سے خراج تحسین وصول کرنے لگیں، جھیلوں میں مصنوعی جزیرے اور تیرنے والے کھیت اور جھُولنے دار پُل اس کی جدت پسندی کی بعض حیرت انگیز یادگار ہیں۔

شاعری، موسیقی اور مصوّری کے علاوہ فن تعمیرات کو بھی اسکی سرپرستی میں بیحد فروغ حاصل ہُوا۔ اس نے بے آباد بستیوں کو پُر رونق شہروں سے، سنسان جنگلوں کو آباد سڑکوں سے اور بنجر وادیوں کو سرسبز کھیتوں اور پھلدار درختوں سے بدل کر کشمیر کو حقیقی معنوں میں جنت بنا دیا، اس نے کئی جگہ لنگر اور شفاخانے کھولے، کئی جگہ دریا پر پُل باندھے، کئی محل تعمیر کئے، کتنی ہی نہریں نکالیں اور آخر اندر کوٹ میں دُودھ اور شربت کے حوض بنا کر اہل وطن کی رُوح کو شادکام کر دیا۔

وہ خود شاعر اور ادیب تھا، علوم و فنون سے اسے خاص دلچسپی تھی، اس نے جہالت کے عفریتوں سے ایک مردانہ جنگ لڑی۔ کئی نازک خیال طباع اور ذہین اشخاص کو منتخب کرکے سرکاری خرچ پر دوسری ولایتوں میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے بھیجا۔ راجدھانی نوشہرہ میں ایک بہت بڑا دارالعلوم جاری کیا، پڑھنے والوں کے لئے وظیفے مقرر کئے، بلکہ ان کے لباس اور خوراک کا خرچ بھی اپنے ذمہ لیا، دُوسرے شہروں میں بھی مکاتب کھولے، خانقاہیں اور مسجدیں تعمیر کرائیں، ہندوؤں کی مذہبی تعلیم کیلئے کئی مندروں کو جاگیریں عطا کیں، یہاں تک کہ سارے مُلک میں تعلیم مُفت کر دی۔ ہندوستان۔ خراسان اور روم سے جلیل القدر عالم بُلوائے اور انہیں مناصبِ جلیلہ پر ممتاز کرکے اپنے پاس رکھا عورتوں کو دایہ گری کی تعلیم دلائی اور تبلیغ کرنے والے واعظوں کے امتحان کا طریقہ رائج کیا۔ دارالترجمہ اور دارالتصانیف کی بُنیاد ڈالی اور ہر مذہب و ملت کے فاضلوں کو وہاں مُلازم رکھ کر علم و ادب کی نشر و اشاعت کی، سنسکرت اور کشمیری زبانوں کی کئی مفید کتابوں کو فارسی میں اور فارسی کتابوں کو سنسکرت اور کشمیری میں ترجمہ کرایا، اور علم و حکمت کے گرانمایہ موتیوں کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا، سفارتیں بھیج بھیج کر دُوسرے مُلکوں سے نادر علمی کتابیں حاصل کیں، تفسیر کشاف کی شہرت سُن کر ایک کاتب کو حجاز میں اس کی نقل لانے کے لئے روانہ کیا، اور اس طرح کشمیر کو علم و فضل کا مرکز، فنونِ لطیفہ کا معدن، اخلاق و ادب کا مخزن اور صنعت و حرفت کا گھر بنا دیا، بچّہ بچّہ علم و عرفان کی روشنی سے منوّر ہوگیا، اور وہ پامال ذرّے جو پہلے کبھی سے اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے تھے اپنے ارتقاء کی ممکنہ منزلوں کو طے کرکے چاند سُورج کی طرح جگمگانے لگے۔

وہ دراصل اس شیریں چشمہ کی مانند تھا جو پہاڑ کی آغوش سے پھُوٹ نکلتا ہے وادی و کہسار میں دریا کی طرح بہتا ہے۔ جنگلوں۔ میدانوں اور گلزاروں سے گذرتا، پیاسی زمینوں کو سیراب کرتا، صُلح و آشتی کا راگ گاتا، آزادی کے نغمے فضا میں بکھیرتا آخر کار موت کے سمندر سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

اس کی زندگی کے حالات کشمیر کی تاریخ کے سُنہری ورق اور اس کے زرّین عہد کو کشمیر کے شباب کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ ؎

ہر چیز پر بہار ہر اک شے پہ حُسن تھا
دُنیا جوان تھی میرے عہدِ شباب میں

مشہور مؤرخ منشی محمد الدین صاحب فوق نے گذشتہ پچیس سال کی محنت و جانکاہی کے بعد اس لذیذ حکایت کو "تاریخ بڈشاہی" کے نام سے قلمبند کیا ہے، اور تمام تفصیلی اور جزئی واقعات کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ جس سے بڈشاہ کا دور اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ نظروں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ کتاب کی تصنیف و تدوین میں فاضل مُصنف نے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کسی ماخذ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حکومت کشمیر نے اس کتاب کا مسودہ دیکھ کر مُصنّف کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک ہزار روپیہ کا عطیہ پیش کیا ہے اور مہاراجہ بہادر نے اس معرکہ آرا تصنیف کو اپنے نام معنون کرنے کی خاص اجازت بخشی ہے۔ کتاب زیر طبع ہے۔ عنقریب چھپ جائیگی اور دُنیا تسلیم کرے گی کہ اس کتاب کو فوق صاحب کی علمی فتوحات کا شاہکار کہنا چاہئے۔ اس کتاب کا ایک باب اسی اشاعت میں ہدیۂ قارئین ہے!

بڈشاہ بادشاہ کشمیر کی علمی سرگرمیاں

جدید تحقیق کی روشنی میں

زیر طبع کتاب کا ایک باب

جناب منشی محمد دین فوق

بڈشاہ کئی زبانیں جانتا تھا:-

بڈشاہ اپنے زمانہ کے علم و ادب ہی میں مہارت تامہ نہیں رکھتا تھا بلکہ اس زمانہ کی متعدد زبانوں سے بھی اچھی طرح واقف تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے علم اور علما دونوں کی قدر دانیوں سے اپنے ادبی کارناموں کو ناپایدار شہرت دی ہے۔ آج ہندوستان و کشمیر کے مصنفوں اور مورخوں کے علاوہ یورپ کے محقق و مورخ بھی اس کے برمحل علمی عطیات اور اس کے ماہر علوم ہونے کی تعریف کر رہے ہیں [1]

کشمیری زبان تو بادشاہ کی ملکی اور مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ تبتی، فارسی، سنسکرت اور ہندی زبانیں بھی جانتا تھا۔ بلکہ ان زبانوں کا عالم و فاضل تھا [2] فارسی میں اس کے اشعار بھی موجود ہیں۔ وہ علوم ریمیا و سیمیا میں بھی ماہر تھا۔

کرنل سر ولزلی ہیگ تاریخ ہندوستان کی تیسری جلد میں لکھتے ہیں [3] "زین العابدین کو فارسی۔ ہندی۔ تبتی۔ اور اپنی مادری (کشمیری) زبان پر پورا عبور تھا۔ اور وہ شاعری، مصوری اور موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اس نے سنسکرت سے مہابھارت اور راج ترنگنی کا جو راجگان کشمیر کی مشہور منظوم تاریخ ہے فارسی میں ترجمہ کرایا اور کئی فارسی و عربی زبان کی کتابوں کو ترجمہ کے ذریعہ ہندی لباس پہنایا۔"

بادشاہ ایک مصنف کی حیثیت سے:-

سری ور کی راج ترنگنی سے بادشاہ کی دو تصنیفوں کا پتہ ملتا ہے۔ پہلی کتاب کا نام "سوال و جواب" ہے۔ جو آتش بازی بنانے اور شورہ وغیرہ تیار کرنے کے بارہ میں ہے۔ سری ور لکھتا ہے کہ بادشاہ نے حبیب میر آتش کو فارسی زبان میں آتشبازی کے متعلق جو ہدایات بطور سوال و جواب لکھوائیں۔ ان کی ایک مختصر سی کتاب بن گئی۔ یہ پہلی کتاب تھی جو بادشاہ کے نام سے لکھی گئی۔ پھر بادشاہ کی تقلید میں کئی اور مصنفوں نے اسی طریق پر اپنی کتابیں تصنیف کیں۔ طبقات اکبری کا مصنف بھی اس آتش باز کا ذکر کرتے ہوئے کتاب "سوال و جواب" کے متعلق لکھتا ہے کہ: "متضمن فواید بسیار است۔ سلطان بہ اتفاق او تصنیف کردہ"۔ لیکن آج یہ کتاب بالکل نابود و معدوم ہے۔

بادشاہ کی دوسری تصنیف کا نام "شکایت" ہے۔ اس کتاب میں اس نے اپنے روحانی صدمات کا ذکر کیا ہے۔ بقول سری ور یہ کتاب بھی فارسی زبان میں تھی۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری کا ذکر کیا گیا تھا۔ اور نالائق و ناخلف اولاد کے ہاتھوں تنگ رہنے اور رنج و مصایب اٹھانے پر لاولد رہنے کو ترجیح دی گئی تھی۔ یہ کتاب بھی آج عنقا کا حکم رکھتی ہے۔

بادشاہ کی شاعری:-

سری ور نے اپنی تاریخ میں اکثر جگہ بادشاہ کی شاعری اور شعر نوازی کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔ جب مانڈو کے فرمانروا گلکش کو اس کے تحائف و ہدایا کے جواب میں بادشاہ نے اپنے ملک کی بعض قیمتی اشیا ارسال کیں تو اپنی ایک نظم بھی اپنے ایلچیوں کے ہاتھ اسے بھیجی جو کشمیری زبان میں تھی۔

بادشاہ کے چند اشعار کشمیر کی قدیم بیاضوں سے فارسی زبان میں بھی ملتے ہیں۔ لیکن جن دو نظموں کا ذکر کشمیر کے اسلامی مورخوں نے اپنی تاریخوں میں کیا ہے۔ ان کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ مثلاً کشمیر میں ایک مناجات عربی زبان میں بطور وظیفہ پڑھی جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ بڈشاہ کی تصنیف ہے۔ لیکن کسی تاریخ دان و تاریخ نویس کو اس پر وثوق و اعتبار نہیں ہے۔ پھر سب سے پہلے عہد جہانگیری کے حیدر ملک چاڈورہ کی تاریخ میں بادشاہ کی فارسی شاعری کے متعلق

---

[1] اسلامک کلچر ان کشمیر بحوالہ لفٹنٹ نیول جے۔ اے۔ ایس ص ۱۶۴

[2] وجیز التواریخ فارسی،

[3] کرنل سر ولزلی ہیگ کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ ایم۔ جی۔ ایم آ ... ن یونیورسٹی کے شعبہ شرقیہ میں فارسی زبان کے لکچرار تھے۔ ۱۹۲۸ء میں ... نے تاریخ ہند کی تیسری جلد لکھی جو کیمبرج یونیورسٹی پریس نے شائع ... کے بارہویں باب میں کشمیر کے مسلمان بادشاہوں کا اجمالی ذکر ہے۔

ہمیں یہ چند سطور نظر آتی ہیں۔

"خود ہم سلطان سخنور بود و قطبی تخلص داشت چنانچہ این دو بیت رنگیں از نتیجہ طبع وقار سلطان است نہ ازاو می باید ؎

اے بگرد شمع رویت عالمے پروانۂ
در لب شیریں تو شور نیست در ہر خانۂ

من بچندیں آشنائی می خورم خون جگر
آشنا را حال این است وائے بر بیگانۂ"

ان کے علاوہ ایک قدیم بیاض میں جو پیر شمس الدین صاحب حیرت پانداثی (سرینگر کشمیر) کے پاس محفوظ ہے چند دیگر شعرا کی غزلوں کے ساتھ جو اسی زمین اور اسی قافیہ میں ہیں پہلے اشعار کے بعد یہ دو شعر بھی بڈشاہ کے نام درج ہیں ؎

منزلِ غمہائے تو شد سینۂ نالان من
لاجرم شد ہمنشیں گنجے بہ ہم ویرانۂ

ماہ من گر میتوانی رحم کن بر بیدلاں
کز تو ماند این حکایت در جہان افسانۂ

گر محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں خواجہ محمد اعظم نے جو تاریخ "واقعات کشمیر" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے پہلے دو شعروں کو سلطان قطب الدین یعنی بڈشاہ کے دادا کے نام سے موسوم کیا ہے۔ بلکہ ان دو کے علاوہ ایک اور شعر لکھا ہے جس میں قطب تخلص بھی ہے اور وہ یہ ہے ؎

قطب مسکیں گر گناہے میکند عیشش مکن
عیب نبود گر گناہے میکند دیوانۂ

مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد کا مصنف و مورخ پنڈت بیربل کاچرو بھی مندرجہ صدر شعر نقل کر کے لکھتا ہے۔

"اکثرے میل خاطر بہ شعر و سخن مے نمود و قطب تخلص خود می خواند و دیوان قطبی از زادۂ طبع او مشہور است۔"

لیکن تعجب ہے وہ دیوان مشہور بھی ہے۔ لیکن اس مشہور دیوان میں سے جو مورخ اس کے اشعار کا حوالہ دیتا ہے صرف یہی دو تین شعر لکھ دیتا ہے۔ اس لئے یہ اشعار بڈشاہ کے نہیں بلکہ سلطان قطب الدین ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ شاعر بھی تھا اور صاحب دیوان بھی۔ مورخ اس کے دیوان کا نام بھی دیوان قطبی بتاتے ہیں اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

البتہ فارسی میں بڈشاہ کا ایک مصدقہ شعر ملک الشعرا ملا احمد کے حالات میں ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن بزم آراستہ تھی۔ بادشاہ سلامت تخت پر جلوہ افروز تھے۔ ملا احمد کاشمیری جو بڈشاہ کے دارالترجمہ اور دارالتصانیف کی روح رواں تھا۔ دستار کا شملہ پیشانی پر شلخ دار لٹکا کر جھومتا جھامتا دربار میں آیا۔ بادشاہ نے مسکرا کر فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

شاخ پیشانی ملا احمد کشمیری ببیں
گر نہ دیدستی تو در آفاق انسان شاخدار

ملا احمد نے بادشاہ کا شعر سنا اور فوراً جواب دیا ؎

شاخ پیشانی خدیو گرگ وارے داشتم
تا نیایم درمیان مادہ گاواں در شمار

اسی طرح چند شعر بیاض نامی[1] (غیر مطبوعہ) میں نظر سے گزرے ہیں، جن کو بڈشاہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک حسب ذیل ہے ؎

جہاں نتواں ستردن نقش عشق شیرکن ہرگز
حکایت ہا زبان تیشۂ فرہاد می گردد

سو سال کے بعد حضرت یعقوب صرفی کاشمیری نے اکبر اعظم کے زمانہ میں اس کی تضمین اس طرح کی ؎

نگردد کم نوائے بلبل از شور زغن ہرگز
نہ سازد محو ہنگام خزاں حرف چمن ہرگز
غم دنیا نہ سازد تلخ فکر عیش من ہرگز
جہاں نتواں ستردن نقش عشق شیرکن ہرگز
حکایت ہا زبان تیشۂ فرہاد می گردد

بیاض سرخوش میں ایک رباعی درج ہے۔ اور اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ رباعی سلطان کی ہے ؎

تا شام حساب ملک گیری کردم
بر تخت بلند قدر میری کردم
چوں بست جہاں بہ خواب غفلت عہدے
من رفتم و فکر عہد پیری کردم

دارالترجمہ اور دارالتصانیف کا اجراء۔

بادشاہ نے اس زمانہ میں جبکہ ہندوستان کے علاوہ دیگر تمام ایسے ممالک بھی جنہوں نے علوم جدیدہ کی شعاعوں سے آج تمام عالم

---

[1] محمد اسمٰعیل نامی مرحوم بقال تبت

کو منوّر کر رکھا ہے اشاعت علوم و فنون کے طریقوں سے محض بے خبر تھے۔ علمی وظائف کے علاوہ دار الترجمہ اور دار التصانیف کے شعبے قائم کیے۔ جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی مذہبی، تاریخی اور عام اخلاقی و طبی کتابوں کے تراجم ہوتے اور نئی تصانیف بھی قابل مصنفوں سے معقول مشاہرہ دے کر لکھوائی جاتی تھیں۔ ملا احمد۔ زونراج، پنڈت یودی بٹ۔ اور ملا نادری ان شعبہ جات کے معزز ارکان تھے۔ سب سے پہلے ملا احمد ہی نے مہابھارت کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ مولانا آزاد[1] لکھتے ہیں کہ ایک کتاب ہندی زبان کی جس کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا۔ بادشاہ نے فارسی میں ترجمہ کرائی۔ اور نام اس کا "فسانۂ ہندی" رکھا۔ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ اب کہیں نہیں ملتی اکبر نے ملا عبدالقادر بدایونی سے فرمایا۔ اس کی فارسی غیر متعارف ہے۔ اسے مانوس فارسی عبارت میں لکھ دو۔ ملا نے دو تین مہینے کے اندر کتاب تیار کر دی۔ اکبر نے دس ہزار تنگہ مرادی اور ایک گھوڑا انعام دیا۔ اور نام اس کتاب کا "بحر الاسمار" رکھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ ہندی کی صرف ایک ہی جلد بادشاہ کے حکم سے ترجمہ ہو سکی تھی جیسا کہ دربار اکبری کی سطور ذیل ظاہر کرتی ہیں

> "بادشاہ نے ابوالفضل سے فرمایا۔ افسانہ ہندی کی صرف ایک جلد ہی سلطان زین العابدین کے حکم سے ترجمہ ہوئی ہے۔ بہت سی جلدیں اس کی باقی ہیں۔ انہیں ترجمہ کر کے پورا کر دو۔ چنانچہ اس کتاب کی آخری جلد جو ساٹھ جزو کی ہے۔ ابوالفضل نے پانچ مہینوں میں تیار کر دی ہے۔"

شریور زینہ راج ترنگنی میں لکھتا ہے۔ بادشاہ نے دس اوتار اور راج ترنگنی کا جو سنسکرت زبان میں کشمیر کی تاریخیں تھیں فارسی زبان میں ترجمہ کرایا۔ ان کے علاوہ ریہات کتھا سارا۔ ہاتک شور۔ ستے تا اور بیان جیسی ہندو مذہب کی کتابیں بھی ملیچھ (مسلمان) اپنی زبان میں پڑھ سکتے ہیں۔

شریور بادشاہ کی علم پرستیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ بادشاہ نے ایک دفعہ مجھ سے وشسٹ برہم درشن کی کتھا سنی۔ یہ کتاب بالمیک جی کی تصنیف تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے روح کو ایک قسم کی شانتی حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ اس کتاب کے سننے سے بہت محظوظ ہوا۔ اس لئے اس کتاب کا اور دوسری کئی کتابوں کا فارسی اور کشمیری زبانوں میں ترجمہ کرایا۔ یہاں تک کہ اب علم نباتات اور علم کیمیا کا مطالعہ ہر شخص اپنی مادری زبان میں کر سکتا ہے۔

علم و علما کی سرپرستی۔

بادشاہ نے اپنے ممالک کے اکثر لوگوں کو جو علم کی اہلیت اور اس کا شوق رکھتے تھے۔ وظائف دیکر بیرونی ملکوں میں بھیجا۔ ان میں جو لوگ شادی شدہ تھے ان کے اہل و عیال کے اخراجات کا بوجھ بھی خزانہ شاہی پر ڈالا۔ علاوہ ازیں بیرونی ممالک مثلاً سندھ، ہرات، ہندوستان، بخارا، خراسان، عرب وغیرہ سے فارسی، عربی اور سنسکرت کے عالم بلوائے۔ ان کو معقول تنخواہیں دیں۔ اور ان تنخواہوں کے لئے خاص خاص دیہات وقف کر دیئے۔ جو اہل علم زیادہ قابل تھے۔ ان کو جاگیریں بھی عطا کیں۔ بعض علما و فضلا ملک روم سے بھی کشمیر میں آئے جیسا کہ بہاء الدین متو اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

> "در عہد او از دیگر امصار علما و فضلا در ایں شہر آمدند مثلاً محمد باقر رومی و مولانا احمد رومی کہ برادر یک دگر بودند از سلطان بہرہ انعامات شدہ دریں شہر سکونت ورزیدند۔۔۔۔!"

خواجہ محمد اعظم "واقعات کشمیر" میں بادشاہ کے استاد مولانا کبیر کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ اس نے ان کو نوشہرہ دار الحکومت کے دار العلوم کا صدر اعلیٰ مقرر کیا۔ اور طالبان علوم کے اخراجات کے لئے چند مواضعات وقف کر دیئے تاکہ ناداری کی وجہ سے علم کے اس چشمے سے کوئی پیاسا نہ رہنے پائے۔

ہندوؤں کے علوم کی اشاعت:۔

بادشاہ نے ہندو علوم کی کتابیں جن کو مہاجر کشمیری پنڈت اس کے باپ اور بھائی کے زمانہ میں اپنی جلاوطنی کے ساتھ ہی پنجاب وغیرہ ممالک میں لے گئے تھے۔ ہندوستان سے منگوا کر ملک میں تقسیم کیں۔ شریور[2] لکھتا ہے۔

> سکندر بادشاہ کشمیر کے زمانہ میں یاونوں (مسلمانوں) کے اثر و اقتدار سے ہندو علوم کی تمام کتابیں یا جلائی جا چکی تھیں یا کسی نہ کسی طرح ضائع ہو گئی تھیں۔ جو ہندو ان ایام میں کشمیر سے ہجرت کر گئے ان میں جو اہل علم و

---

[1] دربار اکبری اردو مصنفہ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد دہلوی صـ۱۱ا۔

[2] شریور مسلمان سلاطین کے عہد میں جہاں کہیں مسلمانوں کا ذکر آتا ہے۔ ملیچھ لکھتا ہے اس لئے سمجھ لینا چاہئے کہ ہندوؤں کو ان ایام میں کس قدر آزادی حاصل تھی۔

فضل سے وہ بھی اکثر کتابیں اپنے ہمراہ لے گئے تھے، اور ملک اچھی کتابوں سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے ان کتابوں کو ممالک غیر سے مختلف ذرائع سے حاصل کر کے پھر اپنے ملک میں علم و فن کو رونق دی۔ باہر سے پُران لائے گئے اور فلسفہ و حماسہ وغیرہ علوم کی کتابیں اپنے ملک کے علما میں باہر سے منگوا کر تقسیم کیں۔"

کسی نے یجر وید کا ایک نسخہ ہدیہ دیا۔ بادشاہ نے اس کی تصدیق و توثیق کے لئے چند آدمی دکن بھیجے تاکہ وہ اس کا مقابلہ کر کے صحیح نسخہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کریں۔

تاریخ ملا بہاؤالدین متو میں بھی ان کتابوں کے کشمیر میں منگوائے جانے کا ذکر ہے جو کشمیری مہاجرین اپنے ساتھ ہندوستان میں لے گئے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

"دفاتر کفر و صحائف شرک کہ ازیں دیار او کشیدہ بودند
باز طلبیدند۔"

عالی حوصلگی، وسیع القلبی، بے تعصبی اور سرپرستی علوم کی ایک ایسی مثال ہے کہ اس کی نظیر نہ پہلے کی تاریخوں میں مل سکتی ہے۔ اور نہ آج کوئی ملک اور کوئی بادشاہ بلا تفریق مذہب و ملت اس قسم کی دلجوئی رعایا کا ثبوت پیش کر سکتا ہے۔

علوم و فنون کی کتابوں کے لئے بادشاہ کے تحائف۔

بادشاہ کو علمی ذخائر جمع کرنے اور ان سے اپنے ملک کو مستفیض کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ وہ غیر ممالک کے بادشاہوں کو کشمیر کے بیش قیمت تحائف بھیجا کرتا تھا۔ جنھیں ایک معزز جماعت لے کر جایا کرتی اور بادشاہ اس جماعت کے اخراجات کا کفیل ہوا کرتا۔ جو مراسلہ اپنے ہم عصر بادشاہ کے نام ہوتا اس میں صرف مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے متعلق ہوں خواہش کیا کرتا چنانچہ بہاءالدین متو اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

"دریں دیار کتب ہائے علوم کم بود۔ بہ ہمیں وجہ بادشاہ بہ
دیگر سلاطین وقت ہدیہ و تحفہ ہائے می فرستاد [illegible]
کتاب ہا در مختلف علوم و تصانیف کثیر آورا رسید۔"

بادشاہ نے اس طریق سے ایک ایسا کتب خانہ بنا لیا جو اس کے عہد میں اس کے کسی ہم عصر بادشاہ کے پاس نہ تھا۔ یہ کتب خانہ بادشاہ کے بعد ایک سو سال یعنی سلطان فتح شاہ کے وقت تک دستبرد زمانہ کے ہاتھوں محفوظ رہا۔ اس کے بعد دیگر تمام فانی اشیاء کی طرح یہ خزانہ علوم و فنون بھی جس میں خدا جانے کیسے کیسے بیش قرار علمی جواہر تھے فنا و نابود ہو گیا۔

عہد بڈشاہی میں فراوانیٔ علوم و فنون۔

شرِیور لکھتا ہے۔ میں کیا لکھوں اور کہاں تک لکھوں کہ اس بادشاہ کے عہد میں کشمیر نے کس قدر ترقی کی۔ انتہا یہ ہے کہ مزدوروں اور باورچیوں تک شاعر اور مصنف بن گئے۔ اور عورتوں تک نے حصول علوم میں نام پیدا کر لیا۔ ان لوگوں کی تصنیفات اس وقت تک گھر میں موجود ہیں[۵]۔ وہ لوگ جن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ علم ہمارے نصیبوں میں ہوگا وہ بھی علوم مختلفہ حاصل کر کے اور قابل و لائق ہو کر بادشاہ کے درباریوں میں شامل ہو گئے۔

جو طلبا بیرونجات سے پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ بادشاہ نے ان کے لئے دار الاقامے قائم کئے جہاں ہر طالب علم کی کتاب و خوراک وغیرہ کے مصارف خزانہ شاہی سے ادا کئے جاتے تھے۔ شریور لکھتا ہے تاریخ طب۔ نباتات۔ کیمیا۔ کوئی علم ایسا نہیں جو مدارس میں پڑھایا نہ جاتا ہو۔

سیاسی حیثیت کے علاوہ علمی حیثیت سے بھی سرینگر یعنی دار الحکومت کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور ماتحت راجگان و رؤسا اپنے فرزندوں اور عزیزوں کے ساتھ اپنے علاقہ جات کے دیگر طلبا کو بھی اسی جگہ حصول تعلیم کے لئے بھیجا کرتے تھے۔

ایک کتاب کے لئے مکہ معظمہ کو ایک کاتب کی روانگی۔

علامہ جار اللہ کی تصنیف تفسیر کشاف کا اصل نسخہ بہت کمیاب تھا۔ اس کے حصول کے لئے بادشاہ نے ہندوستان کے علاوہ ترکستان اور ماوراء النہر کے اطراف میں بھی آدمی دوڑائے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ایک مرتبہ جب کشمیری حجاج کا قافلہ اپنے وطن میں واپس آیا تو ان میں جو حاجی علم دین کے ماہر تھے انہوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ علامہ جار اللہ کی اصل تصنیف کا نسخہ مکہ معظمہ میں موجود ہے۔ بادشاہ نے یہ سن کر "یک مرد کاتب را خرچ راہ و اہل و عیال دادہ بہ ہمیں غرض بمکہ فرستاد" چنانچہ وہ کاتب عرصہ دراز تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہا اس نے کتاب کے اصل نسخہ سے اس کی نقل کی۔ پھر نقل کو بعد مقابلہ صحیح کرایا۔ اور تصدیق کے

---

۵ یعنی تا عہد سلطان فتح شاہ بادشاہ کشمیر ۸۶۲ھ لوکک موافق ۱۲۸۴ء مطابق ۱۴۹۱ء

سلسلے میں اکابر علمائے مکہ کے خطوط حاصل کیے۔ جب یہ تفسیر کشمیر پہنچی تو شعرائے نظمیں لکھیں۔ چنانچہ ایک نظم کے چند شعر درج ذیل ہیں لہ

شہر راز مدینہ نور برہاں آمد — رنجوری اہل دیں بدرماں آمد

آمدز جزو ادفتر اخلاص ادب — (یہاں کاغذ کرم خوردہ ہے)

(یہاں کاغذ کرم خوردہ ہے) — باسلطاں بارسول قرآں آمد

اصل نسخہ تفسیر کشاف کی یہ مصدقہ نقل مرزا حیدر کاشغری کے زمانہ تک کشمیر میں موجود تھی۔ جب کشمیریوں اور مغلوں میں جنگ ہوئی تو بیشتر مغل جان سے مارے گئے اور میرزا حیدر بھی قتل ہو گیا اس وقت یہ کتاب ایک قاضی صاحب کے قبضہ میں آئی جو مرزا کے ہمراہیوں میں تھا۔ وہ اپنی جان بچاکر اور کتاب کو بغل میں دباکر اپنے وطن چلا گیا۔ ۲ہ

بادشاہ کے حکم سے جامع مسجد سرینگر کی شمال کی طرف ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ جس میں عربی فارسی کے علاوہ سنسکرت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ بادشاہ نے اس کے اخراجات و مصارف کے لئے چند دیہات وقف کر دیئے تھے۔ قاضی میر علی بخاری جو چنگیز خاں کی اولاد سے تھے اس دارالعلوم کے صدر بنائے گئے۔ ۳ہ

نوشہرہ میں بادشاہی دارالعلوم۔

مرزا حیدر تاریخ رشیدی میں لکھتے ہیں۔ نوشہرہ (دارالحکومت) میں شفاخانہ اور لنگر خانہ ہی نہ تھا بلکہ دولت خانہ شاہی کے بالکل متصل راجدھانی (نوشہرہ) میں اعلیٰ پیمانہ پر ایک شاہی بیت العلوم بھی جاری کیا گیا۔ کئی گاؤں طالب علموں کے وظیفے اور ان کے اخراجات اور ان کے استادوں کو فکر معاش سے آزاد رکھنے کے لئے وقف کئے گئے۔ اس بیت العلوم میں دارالاقامہ بھی تھا۔ جہاں طالب علم رہا کرتے تھے۔ مولانا کبیر جو بادشاہ کے استاد تھے۔ اس دارالعلوم کے صدر مدرس یا پرنسپل تھے۔

اس مدرسہ میں مندرجہ ذیل مسلمان استادوں کا نام تاریخوں میں گزرا ہے۔ ملا پارسا۔ ملا محمد۔ ملا احمد۔ ملا نادری۔ ملا یحییٰ۔ ملا نیلی۔ جو بڈشاہی عہد کے نامور شاعر اور ادیب تھے۔ اور قاضی

لہ از بعض بوسیدہ ملوکہ خواجہ محمد اسمٰعیل ناجی نبت بقال سرینگر۔

۲ہ تاریخ بہارالدین متو

۳ہ از بیان واقعہ حالات مسجد جامع اردو مصنفہ مولوی محمد شاہ سعادت کشمیری۔

حمیدالدین جنھوں نے بڈشاہ کے زمانہ میں کشمیر کی تاریخ لکھی ہے لیکن وہ آج کل بلکہ عرصہ دراز سے نایاب ہے۔ ۵ہ غرض ؎

اس کے زریں عہد میں جاری تھے وہ دارالعلوم
جن کی شہرت کے ہیں شاہد آج بھی شمس و نجوم
جن کے علم و فن پہ نازاں ہند و سندھ و شام و روم
جن سے بچ بچ کر نہیں چلتی رہی باد سموم
گردشیں ایام نے شکلیں وہ ایسی میٹ دیں
آج ان تعلیم گاہوں کا نشاں تک بھی نہیں

عہد بڈشاہی کی بعض تصانیف سنسکرت۔ فارسی اور کشمیری میں۔

بڈشاہ خود صاحب علم تھا۔ اس لئے اس نے اہل علم کی قدر کی اور اس کے عہد میں علما و فضلا نے بھی علم و فضل میں کشمیر کا نام روشن کیا۔ وہ خود شاعر تھا۔ اس نے شعرا کی حوصلہ افزائی کی۔ فارسی اور کشمیری زبان کے صاحب کمال پنڈت اور مسلمان شعرا اس کے سلک ملازمت میں منسلک تھے۔ وہ خود مصنف تھا۔ اس نے اپنے زمانہ کے مصنفوں، مورخوں اور مترجموں کو دربار میں ممتاز جگہ پر سرفراز کیا ان کو حضوری میں رکھا۔ اور بلا تمیز مذہب و ملت ان کے دامن سوال کو گوہر مراد سے پر کیا۔

مختلف کتابوں اور تاریخوں کی چھان بین کے بعد عہد بڈشاہی کی جن تصانیف کا پتہ مل سکا ہے ان کی ایک فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) زینہ ترنگنی یا راجہ ولی از تصنیف پنڈت زونراج کے یہ دونوں
(۲) زینہ راج ترنگنی از تصنیف پنڈت شریور تاریخیں بزبان سنسکرت چھپی ہیں اور ان کا ترجمہ بزبان انگریزی بھی چھپا ہے۔
(۳) زینہ پرکاش۔ از تصنیف اوتار بٹ۔ یہ وہی اوتار بٹ ہے جس کو شاہنامہ فردوسی از بر تھا۔ اس کتاب میں بادشاہ کے فرائض ارشادات اور بعض احکامات بزبان سنسکرت درج تھے۔
(۴) اینشور شاتک منظوم۔ از اوتار — یہ بھی سنسکرت میں ہے اور نایاب ہے۔
(۵) شرح مہابھاشیہ۔ از پنڈت بتن جلی۔ یہ کتاب دراصل مہاراجہ کنشک کے عہد ۱۵۰ء میں بتن جلی کاشمیری نے علم صرف و

۵ہ از تاریخ حسن قلمی ص۱۵۸

نحو کے متعلق لکھی تھی۔ بڈشاہ کے زمانہ میں رام آنند نام ایک نحوی پنڈت نے اس کی آسان شرح سنسکرت زبان میں لکھی۔ شرح اور اصل دونوں نایاب ہیں۔

(۶) مانک - از سوم پنڈت در علم موسیقی۔

(۷) پرتھوی راج وجے - (ٹیکا) مصنف نامعلوم - پنڈت ونراج نے سنسکرت میں اس کی شرح لکھی۔ اس کا صرف ایک نسخہ بوہلر کو ملا تھا

(۸) کرت ارجنیا - (ٹیکا) " " " " " "

(۹) لوک پرکاش ٹیکا - سنسکرت زبان میں لغت کی ایک کتاب ہے جس کو مشہور کشمیری مصنف کھیمندر نے گیارہویں صدی عیسوی میں ۱۰۲۵ء سے ۱۰۱۱ء کے درمیان تصنیف کیا اور جونراج نے بڈشاہ کے زمانہ میں اس کی شرح لکھی۔ یہ کتاب عام طور پر مل جاتی ہے۔

(۱۰) شری کنٹھ چرت ٹیکا (منظوم) اس کا اصل مصنف کشمیری شاعر منکا ہے جو کلہن مصنف راج ترنگنی کا ہمعصر تھا۔ شرح اس کی جونراج نے لکھی۔

(۱۱) کتھا کوتک - مترجم پنڈت شریور۔ اصل کتاب فارسی زبان میں مختلف حکایات پر مشتمل تھی جس کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ شریور نے اس کا ترجمہ سنسکرت میں کیا۔ اس ترجمہ کا ایک نسخہ بوہلر محقق کو ملا تھا۔

(۱۲) زین - از یودھابٹ - یہ کتاب علم موسیقی میں تھی۔

سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی زبان میں :-

(۱) وقائع کشمیر - ترجمہ راج ترنگنی مصنفہ پنڈت کلہن - مترجم ملا احمد ملک الشعرا فاضل زبان سنسکرت - کتاب نایاب ہے۔

(۲) ترجمہ مہابھارت - مترجم ملا احمد و سوم پنڈت - کتاب نایاب ہے

(۳) شرح کلام نورالدین - مترجم ملا احمد - شیخ نورالدین ولی کا کلام سنسکرت نما کشمیری میں تھا۔ ۱۸۲۵ء میں مشہور سیاح مسٹر ہے چل کو اس کا ایک نسخہ ملا تھا۔

(۴) ترجمہ دش اوتار چرت - مصنف و مترجم نامعلوم - شریور نے بادشاہ کی علمی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۵) شرح ریہاہت کتھا سرا - مصنف و مترجم نامعلوم - بحوالہ شریور دیکھو کلچرس آف کشمیر جے سی دت صفحہ ۱۴۶۔

(۶) شرح ہاٹ کیشور سم ہتھا - " " " " " " " "

(۷) پرانوں کے ترجمے - مترجم نامعلوم " " " " "

(۸) ہندی کہانیاں - اس کا ترجمہ بڈشاہ نے سنسکرت سے فارسی میں کرایا اور نام اس کا افسانہ ہندی رکھا - جب اکبر کو فتح کشمیر

(۹۹۵ھ) کے بعد اس کتاب کا حال معلوم ہوا تو اس نے ملا عبدالقادر بدایونی کو اس کے آسان ترجمہ کا حکم دیا اور افسانہ ہندی کی جگہ اس کا نام بحر الاسمار رکھا۔

کشمیری زبان میں عہد بڈشاہی کی تصنیفات۔

(۱) زینہ چرت (نثر) جس میں سوم پنڈت نے بادشاہ کے حالات زندگی شرح و لبسط کے ساتھ لکھے ہیں۔ شریور نے اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب آج تک کسی کو نہ مل سکی۔

(۲) زینہ ولاس (منظوم ناٹک) مصنف یودھابٹ - اس میں بادشاہ کی زندگی کے ایک واقعہ کو ڈراما کی صورت میں لکھا گیا ہے۔

(۳) بان آسرور - مصنف و مضمون نامعلوم - بوہلر نے لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ مجھے ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد بڈشاہی کی تصنیف ہے۔

(۴) اشلوک شیخ نورالدین - شیخ نورالدین ولی کا منظوم کلام نہایت ادق کشمیری زبان میں ہے جس میں سنسکرت کا زیادہ حصہ ہے۔ اس منظوم کلام کو سب سے پہلے بڈشاہ کے عہد میں مرتب کیا گیا۔

فارسی زبان میں عہد بڈشاہی کی تصنیفات۔

(۱) تاریخ کشمیر - مصنفہ ملا نادری - کتاب ناپید ہے۔

(۲) تاریخ کشمیر - مصنفہ قاضی حمید - "

(۳) مقامات - مصنفہ حاجی بابا ابراہیم، یہ اولیا و صوفیائے کرام کے حالات ہیں،

(۴) دیوان اویسی - حضرت محمد امین اویسی کا صوفیانہ منظوم کلام۔

(۵) سوال و جواب متعلق فن آتش بازی - از بڈشاہ بادشاہ

(۶) شکایت (منظوم) از بڈشاہ بادشاہ اس کتاب میں بادشاہ نے خدا سے منظوم شکایت کی ہے کہ مجھے بادشاہ تو بنا دیا لیکن سکون اطمینان اور آرام و چین نہ دیا۔ اولاد جان کی دشمن نکلی۔ ساری عمران کے پیچھے سرگرداں رہا لیکن بے فائدہ کیا اسی اولاد کیلئے لوگ مارے مارے پھرتے اور دنیا جہان کو مکر و فریب سے لوٹتے ہیں۔ غرض اس قسم کے حالات اس کتاب میں بیان کئے جاتے ہیں بقول شریور یہ شکایت نامہ فارسی نظم میں تھا۔ یہ کتاب بھی نایاب کیا ناپید ہے۔

(۷) کفایہ منصوری - اس کا دوسرا نام کفایہ مجاہدہ ہے - یہ علم طب کی ایک لاجواب کتاب ہے اور اچھی خاصی ضخیم ہے - اس میں کئی مقدمے ہیں ہر مقدمے میں کئی مقالے ہر مقالے میں کئی باب اور ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ اگرچہ کتاب نولکشور پریس میں چھپ چکی ہے بلکہ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ مگر راقم الحروف کو اس کا ایک قلمی نسخہ بھی ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کشمیر میں دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جو ۱۲۴۳ھ کا نقل کیا ہوا ہے۔ نقل کنندہ کا نام محمد اکرم ہے جو نعل بند پورہ سرینگر کشمیر کا رہنے والا ہے۔ مصنف[2]

[2] کا نام منصور بن محمد بن احمد بن یوسف بن قیصر الیاس ہے

نیا ڈاکٹر

نیم مزاحی افسانہ

از ــــ میر فیصل

بیرسٹر نے ہائیکورٹ میں ایک زبردست مقدمہ جیتا۔ اور جب وہ عدالت کے احاطے میں اپنی کار پر بیٹھا۔ تو چاروں طرف سے سیاہ لباس والوں نے اُسے گھیر لیا۔ ہر طرف سے مبارکباد کی بوچھاڑیں ہونے لگیں۔

بیرسٹر سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے اپنے مداحوں کا شکریہ ادا کرتا رہا۔

کار برق رفتاری سے اپنی منزلِ مقصود کی طرف جا رہی تھی اب بیرسٹر کے دماغ میں صرف "مبارکباد" کی بلند اور کرخت آوازیں گونج رہی تھیں جو رفتہ رفتہ موٹر کی گڑگڑاہٹ میں تحلیل ہونے لگیں۔ چند لحظوں کے بعد ہی بیرسٹر خالی الذہن ہو کر بڑبڑایا۔

"کتنی ناپائیدار ہے یہ انسانی مبارکباد....."

وہ ابھی اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ کار ایک جھٹکے کے ساتھ کوٹھی کے سامنے رُکی۔ بیرسٹر کے دماغ میں ایک زلزلہ آیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ کسی نے اُسے جنت سے اٹھا کر جہنم میں جھونک دیا ہے۔ کوٹھی اب اس کے لئے ایک قید خانہ تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے قیدیوں کے لئے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیاں۔

جب وہ ہال میں داخل ہوا تو اُس کے دل میں سوئیاں سی چبھنا شروع ہو گئیں۔ آراستہ و پیراستہ ہال نے جائزہ دے کر اُس کی آنکھیں اندھا دیں اور وہ بمشکل سنبھلتے ہوئے کرسی پر بیٹھا۔

اُس کے سیکرٹری نے حسبِ عادت کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے مقدمہ کی کامیابی پر مبارکباد کہی، اور بے اختیار مسکراتے ہوئے بیرسٹر کے مغموم چہرے کو دیکھنے لگا۔

"اُس خوشی نے وقتی طور پر مرض بھلا دیا تھا۔ نہ معلوم گھر آتے ہی دل کو کیا ہو گیا۔ ابھی خاصی بحث کی ہے۔ میں ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر کرتا رہا اور کسی قسم کی تھکن محسوس نہ ہوئی۔ لیکن یہاں آتے ہی بگڑ گیا ہے نامرض...."

بیرسٹر کی پیشانی پر سلوٹ پڑ گئے۔ وہ اپنے ہاتھ سے اپنے پہلو کو دبائے ہوئے تھا۔

"ڈاکٹر بشرا کو بلایا جائے؟"

سیکرٹری قریبی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں اس کے علاج سے مایوس ہو چکا ہوں"

"ڈاکٹر عشرت؟"

"وہ بھی ناکام معالج ہے"

"مسیح الوقت حکیم دولت خاں؟"

"کوئی نیا ڈاکٹر..... کوئی نیا ڈاکٹر....."

بیرسٹر اٹھ کر ٹہلنے لگا اور سیکرٹری کسی سوچ میں پڑ گیا۔

بیرسٹر جب قدِ آدم آئینے کے سامنے آ کر رُک گیا، سیکرٹری دوڑا ہوا آیا۔

"یاد آ گیا!..... ابھی کل ہی مسٹر نسیم ایڈووکیٹ کہہ رہے تھے کہ شہر میں ایک نیا ڈاکٹر عادل نبی آیا ہے۔ امریکہ اور جرمنی کی کئی ڈگریاں حاصل کر چکا ہے۔ وہ مریضوں کے نفسیاتی تجزیہ کے بعد ڈاکٹر فرائڈ کے اصول پر علاج کرتا ہے..... بہت کامیاب ڈاکٹر ہے..... کیا اسے؟"

"بلا لاؤ"

بیرسٹر نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ سیکرٹری بے تحاشہ مخالف سمت کے دروازے کی طرف لپکا۔ اور باہر نکلتے ہی خانسامے سے جا ٹکرایا۔ خانساماں اپنی پگڑی سنبھالتے ہوئے بولا۔

"صاحب آج چائے نہیں پئیں گے؟"

"کیا معلوم؟ اب تو وہ اپنے کمرے میں چلے گئے"

سیکرٹری کار کی طرف دوڑا۔ خانسامے نے سامنے والے کمرے پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی، اور ایک گہری سانس لے کر واپس چلا گیا۔

چند دن سے سیکرٹری کے سوا بیرسٹر کے کمرے میں ہر شخص کا داخلہ

منع تھا۔

سردیوں کی سیاہ اور طوفانی رات تھی۔ باغ کے درخت خوفناک چیخیں مار مار کر اپنی جڑوں پر ناچ رہے تھے۔ میز پر شراب کی ایک خالی بوتل۔ اور اس کے قریب ایک لبریز پیمانہ تھا۔ بیرسٹر اپنے پلنگ پر سر بسر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کبھی ہلکا سا قہقہہ لگاتا اور کبھی بڑبڑانا شروع کر دیتا اس نے اپنی جیب سے ایک پرانا تار نکالا اور سرسری نظر ڈال کر اُسے جیب میں رکھتے ہوئے اٹھا۔ پیمانے کو منہ سے لگا کر خالی کیا۔ اور آئینے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"آٹھ بجے نیا ڈاکٹر آئے گا ابھی بہت دیر ہے"

پھر اس نے غور سے اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھنا شروع کر دیا۔

"اب مجھے کوئی غم نہیں .... میں کامیاب انسان ہوں ... ہوش ہی میرا مرض ہے .... کاش کوئی ایسی شراب بنتا جو زندگی بھر مجھے مدہوش رکھتی"

گھڑی نے ساڑھے سات بجائے۔ بیرسٹر نے چونک کر آئینے میں دیکھا۔ کہ ایک قوی ہیکل انسان سیاہ سوٹ پہنے کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ بیرسٹر نے فوراً پلٹ کر دروازے کی جانب رُخ کیا۔ نو وارد کے سیب ایسے گالوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی، اس کے ہاتھوں میں ایک ریشمی اور آنکھوں پر رنگین چشمہ تھا۔ بیرسٹر حیرت کے ساتھ آگے بڑھا۔

باہر درخت ہوا کے تند و تیز جھونکوں سے بے تاب ہو کر خوفناک چیخیں مار رہے تھے۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب! آپ توقع سے پہلے ہی تشریف لے آئے ہیں"

"میں ہمیشہ مریضوں کی توقع سے پہلے ہی آیا کرتا ہوں"

"آخر کیوں؟"

بیرسٹر نے ڈاکٹر کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

"اس لئے کہ مجھے مریضوں کی تکلیف کا بہت احساس ہے"

بیرسٹر نے ایک فرمائشی قہقہہ لگاتے ہوئے خالی بوتل کو میز پر سے اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"ڈاکٹروں سے اپنے حالات چھپانا مناسب نہیں اسے میز ہی پر رہنے دیں"

"شکریہ" بیرسٹر نے ڈاکٹر کے چشمے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "مجھے درحقیقت آپ ہی ایسے بے تکلف ڈاکٹر کی ضرورت تھی"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیرسٹر اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا اور جیب سے تار نکال کر بولا۔

"میرے مرض کا آخری اور زبردست حملہ یہ کاغذ ہے آپ کو اس کاغذی مرض پر تعجب ہو گا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ یہ کاغذ نہیں بلکہ میری بچی کھچی مسرتوں کا فرمانِ موت ہے۔ مرض کے جراثیم اس کاغذ سے نگاہوں کے ذریعے میرے دل تک پہنچے ہیں.... مگر آپ کے نزدیک شاید یہ ہنوز کاغذ کا ایک معمولی ٹکڑا ہو"

"میں کاغذ کی قیمت کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ آخر ملزموں کی پھانسی کا حکم بھی تو انہیں کاغذوں پر لکھا جاتا ہے"

بیرسٹر نے تار کو جیب میں رکھ کر کہا۔

"آپ صحیح فرماتے ہیں ڈاکٹر صاحب! آپ یقیناً میرے مرض کو سمجھ سکیں گے..... میرا مرض درحقیقت دِل کی کمزوری ہے اور اس کمزوری کا باعث میرے نزدیک ایک محبت کی ناکامی ہے۔ یہ کوئی پہلا موقع نہیں۔ میں کئی مرتبہ ایسا تجربہ کر چکا ہوں۔ لیکن ہر مرتبہ محبت نے مجھے دھوکا دیا۔ شاید میری روحانی ناکامی میرے مزاج کا تلوّن تھا۔ کیونکہ زندگی میں ہمیشہ وقتاً فوقتاً میری محبّت کا مرکز بدلتا رہا"

بیرسٹر رُک گیا۔ ڈاکٹر نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

"دُکھوں کا مہمان ہمیشہ بھوکا رہتا ہے"

"بجا ہے۔ اگر میری محبت ایک ہوتی تو شاید میری رُوح آج تشنہ نہ رہتی لیکن میں چاہتا ہوں کہ چند الفاظ میں اپنی زندگی کے حالات سُناؤں۔ یقیناً آپ کو میرے علاج میں ان سے بہت مدد ملے گی.... ڈاکٹر صاحب میرے نزدیک زندگی محبت ہے۔ اور محبت زندگی، اگر محبت کامیاب ہو۔ تو زندگی بھی کامیاب ہے دگرنہ — آپ مجھے دیکھ ہی رہے ہیں"

بیرسٹر نے نادم ہو کر گردن جھکالی۔ ڈاکٹر نے اپنی دستی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ شوق سے بیان جاری رکھیں"

باہر بجلی چمکی۔ اور بادل گرجے۔ بیرسٹر قدرے سنبھلتے ہوئے بولا۔

ہر کام میں کامیابی کی شرط قربانی اور محنت ہے اور یہ محبت کے بغیر ناممکن ہے۔ میری زندگی کا مرکز بھی محبت ہی تھا لیکن افسوس وقتاً فوقتاً غیر شعوری طور پر اس کا مرکز بدلتا رہا اور یہی میرا مرض ہے۔ پہلی محبت والدین کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ میٹرک پاس کیا۔ تو دونوں نے یکے بعد دیگرے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی جانب سے مجھے ایک روحانی محبت سے محروم ہونے پر ایک معمولی ٹیس ہوئی۔ اور چند دوست نما دشمن رشتہ دار ورثہ میں ملے۔ جب میری خوشیاں دیکھنے والا کوئی نہ رہا۔ تو میں کیوں مزید تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اگرچہ مجھے وظیفہ مل چکا تھا۔ لیکن میری ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ دوستوں کے اصرار پر میں کالج کی چار دیواری میں داخل ہوا۔ کلاس میں تمام دن متفکر بیٹھا وقت گزار دیتا۔ مجھے تعلیم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں شاید بہت جلد اس ماحول کو خیرباد کہہ دیتا۔ لیکن ایک محبت جلوہ گر ہوئی۔ میرا شباب اس کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھا۔ اور وہ ایک لڑکی تھی جو کلاس میں میرے ساتھ بیٹھتی تھی۔ اسے مجھ سے کچھ ہمدردی سی ہو گئی۔ میرے دل میں بھی کچھ انس سا پیدا ہوا۔ اور ہم دونوں گہرے دوست بن گئے۔"

ڈاکٹر نے پھر اپنی گھڑی دیکھی۔ بیرسٹر نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"وہ اس شہر کے ایک کامیاب بیرسٹر کی ایک اکلوتی لڑکی تھی اس کی وجہ سے اس کے والد کو بھی مجھ سے ہمدردی ہو گئی زمانہ اچھا تھا اس تعلق کی وجہ سے مالی امداد بھی ملنے لگی اور بالآخر اسی محبت کے بل بوتے پر میں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور ولایت سے واپس آ کر اس سے شادی کر لی۔ میرے دل و دماغ پر محبت کا نشہ تھا اسی نشے سے سرشار رہ کر میں نے اپنا پیشہ شروع کیا۔۔۔۔ لیکن چند سال کے بعد جب میں کامیاب بیرسٹر ہوا۔ تو میری بیوی نے مجھے داغِ مفارقت دے دیا۔ قریب تھا کہ میں پاگل ہو جاتا لیکن بیوی کی ایک یادگار کی نگہداشت میرے ذمے تھی مجھے گوارا نہ ہوا کہ اسے تنہا چھوڑ دوں۔ کئی جگہ سے مجھے شادی کے پیام آئے لیکن میں نے انکار کر دیا میری زندگی کا اب صرف ایک مقصد تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ میں جتنا بھی روپیہ کماؤں گا۔ وہ میرے لڑکے کے کام آئے گا۔ اس کی بہبود پر صرف ہو گا۔ یقین مانو ڈاکٹر میں نے اسی خیال کی بنا پر اتنی تن دہی اور محنت سے کام کیا مگر میری دولت چند سال کے اندر تگنی ہو گئی ۔۔۔ اور میرا لڑکا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان چلا گیا۔"

بیرسٹر پلنگ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ڈاکٹر بدستور بے حس و حرکت کرسی پر بیٹھا رہا۔ وہ دلچسپی سے بیرسٹر کی گفتگو سن رہا تھا۔ بیرسٹر ایک چکر کاٹ کر ڈاکٹر کے سامنے آیا۔ اور اپنی جیب سے وہی پرانی تار نکال کر ڈاکٹر کو مخاطب کر کے بولا۔

"اس کاغذ نے میرے مرض کو لادوا ثابت کر دیا ہے مجھے کسی ڈاکٹر کے علاج پر بھروسہ نہیں مجھے اب دنیا کی کسی چیز سے محبت نہیں۔ کیونکہ جن چیزوں سے میں محبت کرتا تھا۔ وہ اب دنیا میں نہیں رہیں۔۔۔۔ ڈاکٹر میں دیوانہ ہوں۔۔۔۔ میں دیوانہ۔۔۔"

بیرسٹر نے بے اختیار قہقہے لگانے شروع کر دیئے قہقہے سن کر ڈاکٹر کرسی سے اٹھ بیٹھا۔ بیرسٹر نے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے نالائق لڑکے نے انگلستان میں عیاشی سے تپ دق کا مہلک مرض پایا۔ اور اپنی زندگی اس پر نثار کر دی۔"

بجلی چمکی اور بادل کی ایک مہیب آواز سے کائنات کا ذرہ ذرہ مرتعش ہوا۔

"میرے خدا" بیرسٹر نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کا چہرہ نامعلوم کیوں سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے دفعتاً اپنی دستی گھڑی کو دیکھ کر فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"بیرسٹر تم نے دنیا کے محاذ تو بڑی کامیابی سے جیتے لیکن اپنے مقدمے کی تیاری کا کوئی خیال نہ کیا۔ بہرحال جہاں تمہارے مرض کا تعلق ہے۔ تمہیں میرے علاج سے مایوس نہیں ہونا چاہئے خدا نے میرے ہاتھ میں شفا دی ہے"

بیرسٹر نے حیرت سے ڈاکٹر کے چہرے کو دیکھا اسے محسوس ہوا کہ ڈاکٹر کے چشمے میں آنکھوں کی جگہ دو انگارے دہک رہے ہیں وہ کچھ ڈر سا گیا۔ ڈاکٹر نے دفعتاً چشمہ اتار کر بیرسٹر کو گھورا۔ بیرسٹر کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر کی مقناطیسی نگاہیں اس کے بدن کے ذرے ذرے کو ایک زبردست قوت کے ساتھ اپنی جانب کھینچ رہی ہیں۔ ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ بیرسٹر کا کانپتا ہوا ہاتھ غیر شعوری طور پر اس کی گرفت میں چلا گیا۔ بیرسٹر دیدے پھاڑ کر حیرت سے ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے رکتے رکتے کہا۔

"ڈاک۔۔۔۔۔ٹر عادل جی؟"

ڈاکٹر نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بیرسٹر کو پلنگ پر لٹاتے ہوئے کہا۔

"میں عادل جی نہیں۔ عادل جی آرہا ہے۔ لہٰذا میں رخصت ہوتا ہوں"

بیرسٹر چیخ کر بولا۔

"کون! ملک الموت؟" پراسرار اجنبی نے اثبات میں سر ہلایا۔

گھڑی نے آٹھ بجائے۔ نزدیک ہی کہیں بجلی گری۔ برقی قمقمہ بالکل مدھم ہو کر دوبارہ روشن ہوا تو اجنبی غائب تھا۔

اصلی ڈاکٹر عادل جی اور سیکرٹری کمرے میں داخل ہوئے

"بیرسٹر اپنی زندگی کا مقدمہ ہار چکا ہے"

ڈاکٹر نے نبض دیکھ کر کہا۔

سیکرٹری شراب کی خالی بوتل دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔

(طبعزاد)

بیباک گفتاری

جناب چودھری عبدالرشید تبسم بی اے

ازل سے حسن نے بدلے کئی رنگِ جفا کاری   نہ بدلا عشق نے اکبار اندازِ وفاداری
حرم والو! نہ پوچھو تنگدل سے کیوں محبت ہے   پسند آئی مجھے بت سے برہمن کی وفاداری
میں مائل ہو گیا صیاد کی شیریں زبانی پر   وگرنہ دام سے ممکن نہ تھی میری گرفتاری
نہ دل زخمی ہو جس کا ہم اسے بیمار کہتے ہیں   ہے انساں تندرست اتنا ہی جتنا زخم ہو کاری
گنہگارانِ الفت کا ہو کیوں کر فیصلہ یارب   یہاں مجرم بھی اقراری ہے نامجرم بھی اقراری
بہرحالت اب اس پر حسن کے اسرار کھلتے ہیں   برابر ہے دلِ آگاہ کو خواب اور بیداری
ہزاروں راز کہہ ڈالے کسی نے جوش میں آکر   بہت کام آئی خلوت میں مری بیباک گفتاری
تمہاری کم نگاہی نے مجھے ثابت کیا بے بس   نہ تھی غماز ورنہ میری مسکینی و ناداری
بیک جنبش لڑا دی موج سے موج آبگینے میں   دکھا دی چشمِ ساقی نے زمانہ کو فسوں کاری
رقابت ہے دل و دیدہ میں باہم دشمنِ جاں ہیں   مگر خوں رو کے دیدہ کر رہا ہے دل کی غمخواری

خدا کے نام سے کرتا ہے دل آغازِ مے نوشی
تبسم دید کے قابل ہے اس کافر کی دینداری

ناگ دیوتا

ہندوستان کے قدیم باشندوں کا افسانہ

از جناب قمر اجنالوی

یہ افسانہ ہندوستان کے اس عہد قدیم کی نقاب کشائی کرتا ہے جب وحشی انسان جنگلی جانوروں کا شکار کھیلتے' اور غاروں میں زندگیاں بسر کرتے تھے۔ تاریخ دانوں کے بقول ہمالیہ کے دامن میں گھنے جنگل پھیلے ہوئے تھے جن میں انسان شکار کی تلاش میں ڈھونڈتے پھرتے اور طاقت کے بل بوتے پر جنگلی حیوانوں سے گتھ جاتے لیکن انانیت اور قوت وجبروت کے ان وحشیانہ مظاہروں کے باوجود سانپ کو مقدس سمجھ کر اس کی پرستش کی جاتی تھی۔ اس افسانہ کا محور ان کی یہی فطری کمزوری ہے۔

ایک اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ پہاڑ کے دامن میں بسنے والے لوگ کالے نہیں ہو سکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دراوڑ دراصل خود ہندوستان کے اصلی باشندے نہ تھے لیکن چند لمحوں کے لئے اگر ایسا تصور بھی کر لیا جائے تو جغرافی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں ہندوستان اور افریقہ دونوں ایک ہی ملک تھے لیکن ہیبتناک زلزلوں نے دو ٹکڑے کر کے ان کے درمیان وسیع سمندر حائل کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ زمین کے پھٹنے کے خوف سے انسان پہاڑوں کی پناہ میں آ گئے ہوں۔ بہرحال آریاؤں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے جو لوگ یہاں آباد تھے ان کی رنگت قدرے کالی یا سانولی تھے۔

آریا وسط ایشیا کے میدانوں سے نکل کر قافلہ در قافلہ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور دراوڑ قوم کا اکثر حصہ یا توجنوب کی طرف دھکیل دیا گیا یا وہ فاتحوں میں مل جل گئے۔ لیکن غلامانہ حیثیت سے۔

اس افسانہ میں "ڈرامائی عنصر" بہت کم نظر آئے گا۔ کیونکہ جنگلی اور پہاڑی ماحول کے قدیمی اثرات میری توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں ـــــ

(قمر اجنالوی)

نئے لوگ

ایک روح فرسا چیخ کے ساتھ ہی قبیلہ کے تمام افراد حیرت و اضطراب کے عالم میں غاروں سے باہر نکل آئے۔ ننگے دھڑنگے نوجوان جو درختوں کے پتوں سے اپنے برہنہ جسم ڈھانپے ہوئے تھے۔ گول گول آنکھوں کو گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ان سب سے آگے ایک بوڑھا جس کی داڑھی مونچھوں نے سیاہ چہرے پر عجیب ہیئت کذائی پیدا کر دی تھی ایک لاٹھی کے سہارے کھڑا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی موٹی موٹی آنکھوں والی ایک سانولی عورت ـــــ ننگی چھاتیوں پر نوکیلی ہڈیوں کا ہار لٹکائے ـــ ذہنانی ترائی پر اگے ہوئے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔

پھر وہی چیخ ـــــ خوف اور دہشت کے اثرات میں ڈوبی ہوئی ـــــ لرزہ انگیز۔

بوڑھے نے اپنی لاٹھی کو بازوؤں میں تھام لیا۔ اور غصہ بھری نظروں سے نوجوانوں کو گھورنے لگا۔

"گوسی!" اس نے ایک لمحہ خاموش رہ کر کہا۔" یہ لفظ سن کر تمام افراد کے چہروں پر خوف اور اضطراب چھا گیا۔ انھوں نے وفادارانہ انداز میں بوڑھے کو دیکھا۔ گویا اس کے حکم کے منتظر ہیں اور اپنے بھاری کلہاڑے اور موٹے موٹے برچھے مضبوطی سے پکڑ کر تیار ہو گئے۔

تیسری بار جب چیخ کی آواز سنائی دی تو تمام نوجوان اس کے تعاقب میں بھاگ نکلے۔ چٹانوں ـــــ پتھروں اور تنگ دہانے والے غاروں کو پھلانگتے ہوئے۔ انھوں نے عجیب وغریب نعرہ لگایا۔ برچھے گھمائے۔ کلہاڑے بلند کئے ـــــ فضا میں ایک شور سا پیدا ہو گیا۔

آس پاس درختوں کی کھوکھلی جڑوں اور پہاڑی کھڈوں میں چھپے ہوئے بھیڑیئے اور لومبڑ نکل نکل کر بھاگنے لگے۔ ایک ٹنڈ منڈ درخت پر سے چند چیلیں اپنے لمبے لمبے پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی اُڑیں ——— دور——— کوہستانی ترائی کے گھنے جنگل میں سے ایک گورخر نے اپنی لمبی گردن اُٹھا کر بھاگتے ہوئے انسانوں کو دیکھا۔ اور پھر خوف کے مارے درختوں کی آڑ میں چھپتا چھپاتا ایک سمت کو چلنے لگا۔

چند گھاٹیوں، وزنی پتھروں سے اَٹے ہوئے پر پیچ راستوں۔ اور چند پہاڑی درختوں کے چکر کاٹ کر ابھی وہ ایک چشمہ پر پہنچے تھے کہ دور سے ان کو قبیلہ کے سردار کی لڑکی گوسی دکھائی دی۔ جو بے تحاشا بھاگی آرہی تھی ——— ڈری ہوئی ——— خوفزدہ!

ایک نوجوان نے آگے کو بڑھی ہوئی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک بلند آواز مُنہ سے نکالی اور گوسی کو اپنی موجودگی کا علم دیا۔ پھر خود بھی اس کی طرف بھاگنے لگا۔

گوسی سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں اضطراب کی چمک تھی۔ جس کو دیکھ کر نوجوان سندھو نے سمجھ لیا کہ کوئی غیر معمولی خطرہ درپیش ہے۔ اس نے گوسی کے کاندھوں پر نوکیلی ہڈیوں کے ہار کو بے ترتیبی سے لٹکتے ہوئے دیکھا۔ جو تیز بھاگنے کی وجہ سے کسی درخت کی شاخ سے الجھ کر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ اس کی گول اور اُبھری ہوئی چھاتیاں نیچے اوپر ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک پہاڑی رستے کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی خوفزدہ نظروں سے ادھر دیکھنے لگی ——— سندھو نے گھنی بھوؤں کو آنکھوں پر سکیڑ لیا۔ اور گوسی کی انگلی کی سیدھ میں نگاہیں گاڑ دیں۔ اچانک وہ چونک اٹھا ——— اس کے سامنے ایک ایسا خطرہ تھا جس کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ اس نے خوب غور سے دیکھا ——— دُور گھاٹیوں کے عقب میں بے شمار سفید فام اور چوڑے چکلے آدمی لمبی لمبی ایالوں والے گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر سوار چلے آرہے تھے۔ جن کے ہاتھوں میں لوہے کے نئے ہتھیار چمک رہے تھے۔

"آریا ———" سندھو نے گھبرا کر کہا۔ اور گوسی کا ہاتھ پکڑ کر واپس بھاگنے لگا۔

چند لمحوں کے اندر سب افراد غاروں کے سامنے اکٹھے ہو گئے جن کی تعداد اسّی کے قریب تھی۔ کالے کلوٹے بچے ——— لڑکیاں اور عورتیں ——— نوجوان ——— بوڑھے ——— بعض ننگے اور بعض درختوں کے پتوں سے ڈھنپے ہوئے۔ عورتوں کے گلوں میں ہڈیوں کے [illegible] سینے سب کے ننگے تھے۔ پچھلی طرف گردن سے نیچے بعض لڑکیو[ں نے] مردہ راج ہنسوں کے کٹے ہوئے سر لٹکا رکھے تھے ——— بچے لیکر بوڑھے تک ننگے پاؤں اور ننگے سر۔ البتہ گوسی کے باپ [جو] قبیلہ کا سردار تھا اپنے بالوں کے ساتھ عقاب کے چند پر باندھ [رکھے] تھے۔ جن کی وجہ سے وہ سب میں ممتاز نظر آتا تھا۔

خطرہ آہستہ آہستہ ان کے نزدیک آرہا تھا۔

بوڑھے سردار نے اپنے برچھے کو ہوا میں بلند کیا ——— [یہ اس] بات کا اعلان تھا کہ ہم دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ اس نے سب [کو] مستفسرانہ نگاہوں سے گھورا۔ سب نے سر جھکا لیئے مگر ایک [ادھیڑ] عمر آدمی اسی طرح کھڑا رہا ——— سربلند ——— گویا اپنی حرکت سے سردار کو مقابلہ کے لئے للکار رہا تھا۔ کسی قبیلہ کے سردار کے حکم کے [آگے] سر نہ جھکانا اس بات کی صریح علامت تھی کہ اسے سردار کی رائے [سے] اختلاف ہے۔ یا وہ اتنا طاقتور ہو گیا ہے کہ خود سردار بننے کے لئے حریف سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔

سردار نے خون آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ [وہ] بدستور اسی طرح کھڑا رہا۔

"رشنو!" سردار چیختے ہوئے بولا۔

رشنو نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیئے ——— یہ مقابلہ کی [دعوت] تھی۔ جسے بوڑھا سردار برداشت نہ کر سکا۔ وہ غصہ میں دانت [پیستا ہوا] آگے بڑھا۔ اور رشنو کے سامنے جا کر رک گیا۔ دونوں ایک لمحہ [تک] ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے۔ آ[خر] سردار نے غصہ کے جوش میں کانپتے ہوئے اپنے ہاتھ کو جنبش [دی۔] برچھا فضا میں لہرایا۔ اور قبل اس کے کہ وہ اپنا کام سرانجام دیتا [رشنو] نے پوری طاقت سے سردار کی ٹھوڑی کے نیچے ایک مکا رسید [کیا۔] بوڑھا تیورا کر گر پڑا۔ رشنو اس کے سینے پر چڑھ گیا اور نہایت [زور] سے مکے مارنے لگا۔

تمام افراد حیرت پاش نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ آخر رشنو نے سردار کو نیم جان کر کے اپنے دونوں ہاتھ اُس کی گردن میں سمو دیئے۔ بوڑھے کے سفید سفید ڈیلے باہر اُبل پڑے۔ ایک بھیانک خرخراہٹ کے ساتھ اس کا بدن دو تین بار کانپا اور پھر رشنو نے اس کی لاش کو پاؤں کی ٹھوکر دے کر نیچے گھاٹی کی طرف لڑھکا دیا۔

وہ لپک کر ایک بلند چٹان پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے وحشیانہ نگاہوں سے قبیلہ کے تمام افراد کو گھورا۔ گویا جس شخص کو اب اس کی سرداری سے انکار ہے وہ اسے مقابلہ کے لئے میدان میں آنے کی دعوت دے رہا ہے۔

سندھو نے غضبناک نظروں سے اسے دیکھا۔ اپنے دائیں بازو کو جس میں برچھا تھاما ہوا تھا۔ ایک عجیب انداز میں کمر پر رکھا۔ وہ جوش میں ہانپنے لگا۔ مگر گوسی نے یہ معلوم کر کے کہ وہ رشنو سے قوت آزمائی پر آمادہ ہے اس کے ہاتھ میں چٹکی لی اور اسے کمر سے نیچے جھٹک دیا۔

سندھو نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ گوسی نے آنکھ کے اشارے سے اُسے منع کر دیا۔

جب رشنو نے دیکھا کہ کوئی شخص مقابلہ کی جرأت نہیں کر سکا تو اس نے اپنا بازو بلند کیا —— سب جھک گئے۔ سندھو نے بھی اپنا سر خم کر دیا۔

پہاڑی رستے پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی —— دور کسی بوڑھے گدھ نے چیخ کر خطرے کا اعلان کیا۔

رشنو نے کہہ دیا کہ وہ اپنے نئے دشمن کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتا چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل میں سب لوگ غاروں میں جا چھپے۔ آن کی آن میں چاروں طرف ایک سناٹا چھا گیا۔ غاروں کے منہ بڑے بڑے پتھروں سے بند کر دیئے گئے اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہاں کبھی کوئی متنفس آباد ہی نہیں تھا۔ البتہ نچلی گھاٹی کی ایک چٹان پر بوڑھے سردار کی خون آلود نعش انسانی زندگی کا پتہ دے رہی تھی۔

گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز لحظہ بہ لحظہ قریب آ رہی تھی جب بوڑھا گدھ آخری بار چیخ کر لمبے لمبے پر پھڑپھڑاتا ہوا اُڑ گیا۔ تو غاروں میں چھپے ہوئے انسانوں نے پتھروں کے سوراخوں اور دراڑوں میں سے جھانک کر دیکھا —— گھاٹی کی اوٹ میں سے سب سے پہلی لمبی لمبی ایالوں والے گھوڑوں کی چند گردنیں نمودار ہوئیں —— پھر ان کی ننگی پشتوں پر جمے ہوئے سفید فام —— مضبوط انسانی پیکر —— تیر و کمان لٹکائے اور لمبے لمبے نیزوں کو لئے ہوئے۔ ان میں سے بعض بھورے رنگ کے چست کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اور بعض جنگلی جانوروں کی کھالیں پہنے ہوئے —— بیس سواروں کے گزرنے کے بعد۔ چند عورتیں اور بچے نظر آئے۔ جو دوسرے مردوں کے ساتھ پیدل چل رہے تھے عورتوں کے سیاہ بال کندھوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ اور انھوں نے کپڑوں سے اپنی برہنگی کو ڈھانپا ہوا تھا —— پھر کچھ بکریاں اور ان کے بچے۔ جن کی کھالوں پر سنہری ریشم کی طرح چمکدار بالوں کے لمبے لمبے گچھے بنے تھے۔ اور سب سے پیچھے چند جسیم مرد نیزے ٹیکتے ہوئے چل رہے تھے۔ یہ مختصر سا قافلہ جس کی تعداد ڈیڑھ صد کے قریب تھی شمال سے جنوب کی طرف آ رہا تھا۔

جنگل کا بادشاہ نئے گوشت کی بو سونگھ کر خوفناک انداز میں دہاڑا۔ اور فضا میں ایک ہولناک گرج گونج اٹھی۔

قافلہ رُک گیا —— سواروں میں سے دو نوجوانوں نے تیر کمان پر چڑھائے۔ چند لمحوں کے اضطراب گیر سکوت کے بعد دور جھاڑیوں میں دو خوفناک آنکھیں چمکیں، اور پھر سنسناتے ہوئے تیر فضا کے سینے کو چیر کر نکل گئے۔

ایک زہرہ گداز اور ہولناک گرج —— ایک لرزا دینے والی خونیں دہاڑ، جس نے سارے جنگل میں خوفناک کپکپاہٹ پیدا کر دی اور اس کے ساتھ ہی شیر کا بھاری بھرکم لاشہ زمین پر تڑپنے لگا۔ حریف کو گرتے دیکھ کر سواروں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور جھاڑیوں کو پھلانگتے ہوئے وہاں پہنچے۔ ایک نوجوان نے اپنے نیزے کی انی کو اس کے سینے میں گاڑ دیا —— اور پھر اس کا مردہ جسم ایک گھوڑے پر لاد لیا گیا ——!

قافلہ آگے بڑھا —— اور شام کی سیاہیوں اور جنگل کے گھنے درختوں میں غائب ہو گیا۔

قربانی

رشنو کی سرداری کے ساتھ ہی۔ جو پہلی بات قبیلہ کے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ اس نے نئے لوگوں کا مقابلہ کئے بغیر انہیں آگے بڑھنے دیا۔ اور اس کا مطلب یہ تھا کہ دراوڑ قوم جو عرصہ سے ہمالیہ کی چوٹیوں اور اس کے جنگلوں میں آباد تھی بزدل ہے۔ لیکن اس کی شجاعت کے ڈر سے کسی نے چوں و چرا نہ کی کیونکہ بوڑھے سردار کی موت کا حال انھوں نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا تھا۔ اور اب کسی کو زبان ہلانے کی جرأت نہ تھی۔ البتہ سندھو نے اس سے مقابلہ کرنا چاہا تھا مگر گوسی نے کسی مصلحت کی بنا پر اسے روک دیا۔

طلوع آفتاب کے ساتھ چند نوجوان شکار کی تلاش میں وا

ہوگئے اور ان کے واپس آنے تک رات کے جنگلی ہرن کا کچھ بچا ہوا گوشت بچوں کو کھانے کے لئے دے دیا گیا۔

سندھو اور گوسی غار سے نکل کر ایک طرف کو چلنے لگے۔ رشنو نے گھور کر انھیں دیکھا اور پھر نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ گوسی اپنے نوجوان عاشق کو بوڑھے سردار کے انتقام پر اکسائے گی۔

ایک جھیل کے کنارے پہنچکر گوسی نے اپنی ٹانگیں پانی میں لٹکا دیں اور سندھو کو دیکھ کر مسکرائی جو پانی پر جھکے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھا تھا۔ ان سے کچھ دور دوسرے کنارے پر جہاں چھوٹے چھوٹے خاردار درختوں کا جھرمٹ تھا شاخوں میں سے کسی جانور نے اپنی تھوتھنی نکالی ــــ شاید وہ پانی پینے آیا تھا۔ گوسی نے اسے دیکھ لیا اور پھر آنکھوں کے اشارے سے اس نے سندھو کو بتا دیا کہ اس کی پشت پر ایک شکار اس کا منتظر ہے۔ درخت پر بیٹھے بیٹھے وہ تیزی سے پلٹا۔ اور جھاڑیوں میں سر چھپاتے ہوئے جانور پر اپنا برچھا پھینکا ــ نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ جانور جس کی شکل وشباہت افریقی بھینسے سے ملتی جلتی تھی اور جس کا بدن موٹا تازہ اور گٹھا ہوا تھا جھاڑیوں میں بھاگنے لگا۔

اپنے شکار کو فرار ہوتے دیکھ کر سندھو نے پانی میں چھلانگ لگائی اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ دشمن کی آہٹ پاکر جانور پلٹا اور بلبلاتا ہوا سندھو پر حملہ آور ہوا۔ مدافعت کی بجائے سندھو نے لپک کر اس کی موٹی گردن کو بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا اور زور آزمائی کرنے لگا۔

ایک حیوان ــــ اور ایک انسان گتھم گتھا تھے۔

لیکن اس قسم کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ اکثر اوقات جب شکار زخم کھا کر بھاگنے لگتا یا حملہ آور ہوتا تو اسی طرح زور آزمائی کرکے اسے زیر کیا جاتا۔ لیکن یہ کام بہت خطرناک تھا۔ کئی لوگ شکار کرتے کرتے خود شکار ہو گئے تھے۔ جانور کو دھکیلتے ہوئے سندھو نے پوری قوت سے اس کی گردن مروڑی اور اسے زمین پر گرا دیا۔ پھر اس نے اس کے جسم میں سے اپنا برچھا نکالا۔ خون کی ایک دھار بہنے لگی۔

سندھو نے گھسیٹ کر اس کا جسم پانی میں پھینکا۔ خود بھی ساتھ ہی کودا اور تیرتا ہوا مردہ جانور کو کھینچنے لگا۔ نیلگوں پانی کی سطح پر ہلکی ہلکی لکیریں پھیلنے لگیں۔

شکار کو کندھوں پر اٹھائے۔ وہ دونوں غار میں پہنچے ــــ رشنو نے خلافِ معمول سندھو کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے کندھوں کو تھپتھپایا اور اس کی چھاتی سے نکلتے ہوئے خون کو پتوں سے صاف کرنے لگا ــــ کیا رشنو اس سلوک سے اس آگ کو بجھانا چاہتا تھا جو سندھو کے سینے میں سلگ رہی تھی ــــ؟ آخر اس شفقت کا کیا مطلب؟؟

کھال اتار کر تازہ شکار کو غار کے اس نوکیلے پتھر کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔ جس کے نیچے آگ روشن تھی۔ اور پھر اس وسیع غار کے پتھروں پر جمے ہوئے کئی حیوان نما انسانوں نے حریصانہ انداز میں اسے دیکھنا شروع کیا ــــ کالے اور سانولے چہروں پر بھوکی آنکھیں چمکنے لگیں۔ جن میں سردار کے خوف کی تلخی کارفرما تھی۔ اگر ان کا بس چلتا تو ان کے بھوکے معدے کچے گوشت کو بھی ہضم کر سکتے تھے ــــ لیکن وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی ایک شخص کے ماتحت تھے ــــ مجبور ــــ اور یہی انسان کی ازلی کمزوری ہے ــــ جو ان کے خوفناک چہروں پر رینگ رہی تھی۔

آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں غار روشن ہو گیا تھا۔ وہ اتنا وسیع تھا کہ ایک وقت تین صد کے قریب آدمی اس میں سما سکتے تھے۔ سکٹے ہوئے پتھروں اور قدرت کی تراشیدہ چٹانوں نے ایک ٹیڑھے ترچھے کمرہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جہاں چھت کے ساتھ بعض مردہ جانوروں کے سر لٹک رہے تھے ــــ سامنے کی عمودی چٹان پر کوئلے سے ایک بھیانک اور خوفناک ناگ کی شبیہ اتاری گئی تھی۔ پاس ہی شیر ببر کی سوکھی ہوئی لاش رکھی تھی۔ جس کا منہ کھلا تھا۔ کئی سال گزرے جب گوسی کے باپ نے جوانی کے دنوں میں اس خطرناک جانور کا شکار کھیلا تھا۔ تو اس کے جسم کو کھانے کے بجائے یادگار کے طور پر رکھ لیا گیا تھا۔ چٹانوں کے آس پاس گھاس کے بستر تھے ــــ اور ان سب چیزوں سے پرے ایک کھلے شگاف میں کالے ریچھ کی کھال بچھی ہوئی تھی ــــ یہ سردار کا بستر تھا۔

آگ جلتی رہی ــــ گوشت پکتا رہا ــــ اور بھوکے انسانوں کی تیز نگاہیں وحشیانہ انداز میں اس پر جمی رہیں۔

غار کے اندر ہوتے ہوئے ایک خوشگوار بدبو پھیل رہی تھی۔ گوشت کی سڑاند اور لکڑیوں کے دھوئیں میں ملی جلی ــــ جس نے بھوکے انسانوں کے معدوں میں ایک آگ سی بھڑکا دی تھی ــــ آگ، جو ہر بھوکے انسان کے معدے میں بھڑکتی ہے۔

جب دو مضبوط اور کالے کلوٹے مردوں نے بھنے ہوئے شکار

کو اتار کر نیچے رکھا - تو بعض نوجوان اس پر یوں لپکے جیسے باز کسی چڑیا پر ـــــ رشنو جو ایک فاتح کی طرح چٹان پر بیٹھا دیکھ رہا تھا گرج کر آگے بڑھا - وہ انسان جن کے پنجے اور دانت گرم گرم گوشت میں پیوست ہو چکے تھے سہم کر پیچھے ہٹ گئے ـــ انسانی فطرت کی یہ کمزوری ان وحشی انسانوں میں بھی پائی جاتی تھی، جو تہذیب و تمدن سے کوسوں دُور ـــ زندگی کی شاہراہوں سے بہت پیچھے پہاڑی غاروں اور پرخطر جنگلوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

بھُنے ہوئے گوشت کی باس انسانی نتھنوں سے ٹکرائی - معدوں کی آگ اور زور سے بھڑکنے لگی - للچائی ہوئی بھوکی حریصانہ نظریں تیز پنجوں کی طرح حیوانی گوشت میں گڑ گئیں، اور پھر ایک ساتھ رشنو کے چہرے پر پھیلنے لگیں ـــ گھنی داڑھی مونچھوں اور سر کے پریشان بالوں میں سے دو خوفناک آنکھیں چمکیں - اور سہمے ہوئے انسان دو قدم اور پیچھے ہٹ گئے۔

رشنو تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھا - گھٹنے ٹیک کر بھُنے ہوئے شکار کے پاس بیٹھ گیا اور ایک چھری نما لوہے سے گوشت کے ٹکڑے کاٹنے لگا - پھر اس نے ایک بوڑھے کو بلایا جس کا سیاہ چہرہ بالوں میں چھپا ہوا تھا - اس کے ہاتھ میں گوشت کے کٹے ہوئے ٹکڑے دیئے اور غار کی دیواروں کے ساتھ چمٹے ہوئے بچوں کی طرف اشارہ کیا - بچے باوجود کہ رات کے ہرن کا پس خوردہ کھا چکے تھے - لیکن پھر بھی جب انھیں گرم گرم اور تازہ گوشت ملا تو اس پر پل پڑے۔

بچوں اور عورتوں کے بعد مردوں کی باری آئی - تیز تیز دانت حرکت میں آئے اور بھوکے کتوں کی طرح گوشت کو چچوڑنے لگے۔

اچانک ایک ہیبتناک پھنکار کو سن کر تمام افراد خوفزدہ ہو گئے - غار میں ایک لمحہ کے لئے اضطراب انگیز سناٹا چھا گیا۔ رشنو کی گھنی بھنویں دوڑ کر آپس میں مل گئیں - اور پھر ایک ساعت کے اندر اندر خوف اور دہشت کے مارے اس کی گول گول آنکھوں کے ڈیلے اُبھر آئے - چہرہ پھیل گیا - وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹا - غار کے دروازے میں ایک کالا ناگ ـــ تنے کا تنا - پھن پھیلائے آہستہ آہستہ رینگتا آرہا تھا ـــ تمام افراد موت خطرہ محسوس کرتے ہوئے پیچھے کی طرف سرکنے لگے - اور غار کی پتھریلی دیواروں میں دبک گئے - ان کے چہروں پر زردیاں کھنڈ گئیں ـــ وہ رینگتی ہوئی موت سے ڈرنے لگے - لیکن موت انہیں سے ایک کے لئے بہر حال لازمی تھی - کیونکہ کالا ناگ جب کبھی جنگل سے نکل کر غار کا رخ کرتا تو کوئی نہ کوئی اس کے زہر سے ضرور ہلاک ہوتا تھا - اور اسی طرح آج تک بیسیوں افراد اس کا لقمہ بن چکے تھے۔

وحشی حیوانوں اور خطرناک جنگلی درندوں کا شکار کرنے کے باوجود وہ کالے ناگ سے ڈرتے تھے - اور آج تک کسی نے اس پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کی تھی - کیونکہ ایک مرتبہ جب کسی نوجوان نے اسے برچھا مارا تھا تو ناگ نے اسے اپنی دُم میں لپیٹ کر اس زور سے زمین پر پٹخ دیا تھا کہ گرتے ہی اس کی تمام ہڈیاں چور چور ہو گئی تھیں۔

جب ناگ رینگتا اور پھنکارتا ہُوا غار کے وسط میں آگیا تو غیر ارادی طور پر تمام افراد کی گردنیں جھک گئیں - گویا وہ اُن کا دیوتا تھا ـــ انھوں نے اپنے ازلی دشمن کے سامنے فطری کمزوری کا اظہار کیا ـــ ناگ! آدم کا پہلا دشمن 'اور دیوتا ـــ! انسانی دماغ نے ابھی اس معمہ کو حل نہیں کیا تھا۔

وحشیانہ پھنکار کے ساتھ اس نے اپنا زہریلا پھن پھیلایا اور جھومنے لگا ـــ پھر وہ ایک نوجوان لڑکی پر لپکا - جو خوف سے دبک کر دوہری ہو گئی تھی۔

ایک دردانگیز چیخ گونجی اور موت کی سسکیوں میں تبدیل ہو گئی - پھر کالا جسم دھم سے نیچے آ پڑا - قبیلہ میں سے ایک اور عورت زہر کا لقمہ بن گئی۔

کالا ناگ اپنا خراج وصول کر کے واپس چلا گیا - خوفزدہ انسانوں نے دہشت اور غم میں ملی جلی نظروں سے زمین پر پڑی ہوئی نعش کو دیکھا - جس کے نتھنوں میں سے زہر کے اثر کی وجہ سے سیاہ خون بہ رہا تھا - رشنو سامنے کی عمودی چٹان پر ناگ کی شبیہ کی طرف پلٹا اور گھٹنے ٹیک کر سر خمیدہ ہو گیا - باقی افراد نے بھی اس کی پیروی کی - چند لمحے ساکت رہ کر رشنو اُٹھا اس کے ساتھ باقی انسانوں نے بھی اپنے سر اُٹھائے۔

"قربانی کو یہاں لاؤ" - اس نے حکم دیا۔

چند آدمی لاش کی طرف لپکے - اور اُسے لا کر ناگ کی شبیہ کے سامنے رکھ دیا۔

پھر رشنو کی نگاہیں گوسی کی طرف اُٹھیں جو نوجوان سندھو کے پہلو میں کھڑی تھی - قربانی کی رسم ادا کرنے کے لئے یقیناً اب اُسے

ناچنا پڑے گا۔ غیر ارادی طور پر اس کے پاؤں میں حرکت پیدا ہوئی پھر وہ چل کر عورت کے جسم کے نزدیک کھڑی ہو گئی۔ تمام افراد نے اس کے گرد ایک نیم دائرہ سا بنا لیا۔

"گوسی! ناچ شروع کرو۔" رشنو نے کہا۔

گوسی کے پاؤں حرکت میں آئے۔ وہ ناچنے لگی۔ اس کے ساتھ باقی افراد بھی اپنے پاؤں پر ہلنے لگے۔ ایک شخص بیٹھ کر پتھروں کے ٹکڑے سے لوہے کی تھالیاں سی بجانے لگا۔ کالے کالے ـــ ننگے ـــ غلیظ پاؤں ہلتے رہے ـــ گوسی ناچتی رہی ناچتی رہی۔ حتیٰ کہ تھک کر گر پڑی ہلتے ہوئے پاؤں رک گئے۔ تھالیاں بجنی بند ہو گئیں ـــ رشنو نے آنکھیں پھاڑ کر گوسی کی طرف دیکھا۔

"گوسی! ناچو۔" اس نے اپنے پھیپھڑوں کا سارا زور لگا کر کہا۔ "ناچو"

"میں تھک گئی ہوں!" گوسی نے مظلومانہ لہجہ میں کہا۔

"لیکن ابھی تمہیں اور ناچنا ہے۔" رشنو چیخا۔ "اور ناچو۔"

سندھو نے غصہ بھری نظروں سے رشنو کو گھورا۔ رشنو نے بھی دیکھ لیا کہ اس کے حریف کی نظروں میں مقابلہ کی للکار ہے۔ وہ مٹھیوں کو بھینچتا ہوا اٹھا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ حملہ کرنے کے لئے ایک دوسرے پر جھپٹتے گوسی نے ناچ دوبارہ شروع کر دیا۔ پھر انھوں نے اس طرح سے نظریں ملائیں گویا ایک نے دوسرے پر رحم کھا کر اس کی موت کو آئندہ وقت پر ٹال دیا ہے۔

گوسی ناچ رہی تھی۔ اس کو ناچتے ہوئے دیکھ کر کالے کالے ننگے پاؤں ہلنے لگے۔ تھالیاں بجنے لگیں اور ایک مرتبہ پھر وہ بھیانک اور ڈراؤنی آوازیں غار میں گونجنے لگیں جن کے پیچھے موت کے خوف کی تلخیاں ناچ رہی تھیں۔ یہ انسانی کمزوریوں کا اظہار تھا ـــ لیکن کتنا ہیبتناک ـــ کتنا بھیانک!!

خونیں عبادت

جس طرح دھوئیں کے پیچ و خم کھاتے ہوئے مرغولے بھڑکنے والی آگ کا پتہ دیتے ہیں۔ اسی طرح سندھو اور رشنو کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی بجلیاں اس امر کا اعلان کر رہی تھیں کہ ان کے پیچھے باد و باراں کا ہیبتناک طوفان امڈا چلا آ رہا ہے۔ جو ایک خطرناک تباہی کا پیش خیمہ ہو گا۔

ناگ دیوتا کی قربانی کی رسم کے وقت اگر گوسی بروقت ناچ نہ شروع کر دیتی تو فیصلہ ہو کے رہتا۔ شاید گوسی نے عقلمندی سے کام لیا۔

قبیلہ کی قدیم رسم کے مطابق ہر ماہ ایک نوجوان لڑکی منتخب کی جاتی۔ اس کے بدن سے خون نکال کر ایک پیالہ میں بھرا جاتا۔ رات کو تمام افراد اس پیالہ کو لے کر جنگل کے اس بوڑھے برگد کے نیچے جاتے جس کی کھوکھلی جڑوں میں کالا ناگ رہتا تھا۔ ایک چٹان پر پیالہ رکھ دیا جاتا۔ لڑکی کے مردہ جسم کو پتوں پر لٹا کر اس پر خون کے چھینٹے دیئے جاتے۔ مرد و زن سر ہلا ہلا کر ناچتے۔ بانسلیاں اور تھالیاں بجتیں۔ اس وحشیانہ رقص کے اہتمام کے بعد ناگ جھومتا ہوا نکلتا اور چٹان کے قریب کنڈلی مار کر اپنی زہریلا پھن کھول دیتا ناچ دیر تک جاری رہتا۔ پھر قبیلہ کا سردار آگے بڑھ کر ناگ پر انسانی خون چھڑکتا۔ تمام لوگ سجدہ میں گر جاتے۔ انسان کی حماقت پر ناگ پھنکارتا ہوا اپنے مسکن میں چلا جاتا۔ عبادت کے ختم ہو جانے پر لڑکی کے جسم کو اٹھایا جاتا اور سب لوگ ہاتھوں میں جلتی ہوئی لکڑیاں پکڑے واپس آ جاتے ـــ لڑکی جس کے خون سے عبادت کی رسم ادا کی جاتی چند روز بیمار رہ کر یا تو مر جاتی یا ایک لمبے عرصے کے بعد جا کر تندرست ہوتی تھی ـــ لیکن جب کبھی یہ خونیں عبادت وقت مقررہ پر ادا نہ کی جاتی تو کالا ناگ جنگل سے نکل کر پہاڑی غار کا رخ کرتا اور قبیلہ کے کسی فرد کو ڈس آتا۔ گویا وہ اپنے پجاریوں کی غفلت پر غضبناک ہو کر انھیں سزا دیتا تھا۔ پھر موت کے ڈر سے اسی رات عبادت ہوتی۔ وحشی ناچتے ـــ بانسلیاں اور تھالیاں بجتیں ـــ اور ان کی خوفناک آوازوں کو سن کر ناگ دیوتا جھومتا ـــ!

اب کی دفعہ عبادت کی رسم مقررہ وقت پر ادا نہ ہونے کے باعث ناگ نے قبیلہ کی ایک عورت کو ڈس لیا تھا اور یہ اس امر کا اعلان تھا کہ عبادت آج ہی رات ہونی چاہیئے۔

تمام لڑکیاں خوفزدہ تھیں۔ کیونکہ خون سے پیالہ بھرنے کے لئے ان میں سے کسی نہ کسی کا انتخاب ضروری تھا۔ ان کی گھبرائی ہوئی نظریں رشنو کے بھیانک چہرے پر جم گئیں۔ جو ناگ کی شبیہ کے سامنے آنکھیں موندے دوزانو تھا ـــ چند لمحے موت کی سی منحوس خاموشی میں گزر گئے۔

"جھینگی!" رشنو نے پکارا اور آنکھیں کھول دیں۔

یہ سن کر ایک لڑکی نے چیخ ماری اور موت کے خوف سے زمین پر گر پڑی ـــ کئی نگاہیں اسے گھورنے لگیں ـــ عبادت کی رسم ادا کرنے کے لئے جھینگی کے جسم سے خون نکالا جانا تھا۔

زخمی سورج کی سسکتی ہوئی شعاعوں کی مُردہ روشنی میں چند ہاتھ خوفزدہ جھینگی کو تھامے غار کے دہانہ سے باہر نکلے۔ دور ٹنڈ منڈ درخت پر سے چند گدھوں نے لمبے لمبے پر پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑان بھری اور اونچے ہوتے ہوتے نیلے آسمان میں معلق ہوگئے۔

جھینگی کو ایک چٹان پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے پاؤں دھوئے گئے پھر رشنو برچھا لئے آگے بڑھا۔ خوفزدہ جھینگی سہم گئی۔ اس کی سفید آنکھوں سے موت نے جھانکا۔ پھر کچھ آنسو ڈھلک آئے۔ رشنو نے اس کی ننگی ران کو اپنے کھردرے ہاتھوں سے مسلا اور پھر برچھے کی تیز دھار سے اس کو چیر دیا۔ ایک دلگداز چیخ کے ساتھ ہی جھینگی نیم مردہ سی ہو کر پیچھے کو لٹک گئی۔ سرخ سرخ خون کی دھاریں پیالہ میں گرنے لگیں۔

چیخ کی آواز سن کر ـــــ دور جھاڑیوں میں سے کسی گیدڑ نے جھانکا۔ اور پھر ایک طرف کو بھاگ نکلا۔ گدھ نیلے آسمان میں معلق تھے۔ وقت کا اژدہا سورج کی خونیں نعش کو جبڑوں میں دبائے مغرب کے کثیف غاروں میں اتر رہا تھا۔ اور جنگل پر شام کی سیاہیاں اپنے پر پھیلا رہی تھیں ـــــ ران سے سرخ سرخ خون ٹپکتا رہا۔ حتیٰ کہ پیالہ بھر گیا۔

رشنو کے ہاتھ اٹھانے کے ساتھ ہی ایک شخص نے آگے بڑھ کر جھینگی کے زخم پر جنگلی بوٹی لگائی۔ پھر اس میں راکھ بھر دی۔ خون رِسنا بند ہو گیا۔

چند مردوں کے سوا قبیلہ کے کسی فرد نے اس کارروائی کو نہ دیکھا تھا۔ جب رشنو نے ناگ دیوتا کی جے پکاری تو باقی لوگ غار سے نکلے۔ دو مردوں نے نیم جان جھینگی کو اپنے بازوؤں میں اُٹھایا۔ اور سب رشنو کے پیچھے پیچھے جنگل کی طرف چلنے لگے۔

چند پُرپیچ راستوں کو عبور کرنے کے بعد وہ خاردار جھاڑیوں اور لمبی لمبی گھاس میں چلنے لگے۔ یہاں سے گھنا جنگل شروع ہوتا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ بڑے بڑے درختوں کے تاریک سایوں میں سے ہوتے ہوئے وہ بوڑھے برگد کے پاس آکر رک گئے۔ رشنو نے آگے بڑھ کر خون کا پیالہ چٹان پر رکھ دیا۔

لمبی لمبی جٹاؤں والا پرانا درخت اتنا پراسرار اور ڈراونا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے سیکڑوں زہریلے سانپ شاخوں کا روپ دھار کر لٹک گئے ہوں۔ جنگل کی تاریکی ـــــ ہوا کی سائیں سائیں، ناگ دیوتا کی بیلوں کے کالے کالے ننگے دھڑنگے جسم۔ وحشی پھنکاریں اور کبھی کبھی درندوں کی خوفناک صدائیں ـــــ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا ایک منحوس اور بھیانک درندگی کا نام ہے۔

جب رشنو جھینگی کے بیہوش بدن پر خون کے چھینٹے دے چکا تو تمام افراد نے ہلال کی طرح نیم دائرہ بنا لیا۔ اور بانسلیوں اور تھالیوں کے بجنے کے ساتھ ہی ناچ شروع ہو گیا۔

وحشتناک آوازیں سن کر درخت کے تنے سے لپٹے ہوئے چند اُلو چیخے۔ پھر خاموش ہو گئے۔ جھاڑیوں میں دبکے ہوئے چند جانوروں کی آنکھوں نے جھانکا ـــــ ناگ دیوتا کی زہریلی پھنکار سنائی دی اور کھوکھلی جڑوں میں سے ایک تنے کا تنا جھومتا باہر نکلا۔ ایک لمحہ کے لئے رک کر تمام افراد سجدے میں گر گئے۔ پھر ناچ شروع ہو گیا۔ اور چٹان کے قریب کالے ناگ نے کنڈلی مار کر پھن کھول دیا۔

آدھی رات تک ناچ ہوتا رہا آخر رشنو نے بڑھ کر پیالہ اٹھایا اور مست و بیخود ناگ پر خون چھڑکا۔ ایک بار پھر تمام لوگ سجدہ میں گر گئے ناگ پھنکارا۔ جب انھوں نے سر اٹھایا تو وہ واپس جا چکا تھا۔

پھر مقررہ اصول کے مطابق چند لکڑیاں روشن کی گئیں اور ان کی لرزتی ہوئی شعاعوں میں تمام افراد غاروں کی طرف چلنے لگے جھاڑیوں میں سے کئی خوفناک آنکھیں اب بھی انھیں جھانک رہی تھیں۔

موت کے دہانہ میں

دوسرے دن رشنو نے حکم دیا کہ آئندہ ماہ عبادت کی رسم ادا کرنے کے لئے گوسی کے بدن سے خون نکالا جائے گا۔ یہ بالکل ایک نئی چیز تھی کیونکہ آج تک کسی لڑکی کا اتنا عرصہ قبل انتخاب نہیں کیا گیا تھا۔ سندھو نے سمجھ لیا کہ مجھے ہلاک کرنے کے لئے سردار نے چال چلی ہے۔

گوسی سندھو کی محبوبہ تھی ـــــ وہ سانولی لڑکی تھی۔ تیکھے تیکھے نقشوں والی جس کے رخسار ابھرے ہوئے تھے۔ اور گول گول ننگی چھاتیاں جنگلی سیبوں کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ قبیلہ کی تمام لڑکیوں میں وہی سب سے زیادہ جاذبِ نگاہ تھی۔

"خونیں عبادت" اور اس کے تصور کے ساتھ ہی سندھو ایک لمحہ کے لئے لرز اٹھا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ گوسی یا تو ہمیشہ کے لئے اس سے چھوٹ جائے یا اس قابل نہ رہے کہ کوئی مرد اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کے دل میں مختلف قسم کے خیالات ابھرے۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ رشنو کے اس حکم کو تسلیم نہ کیا جائے۔ آخر قبیلہ کے باقی افراد بھی تو اس سے نفرت کرتے ہیں ـــــ لیکن یہ ناگ دیوتا کی پوجا کا سوال تھا۔ اور اس امر میں کوئی شخص بھی رشنو کی مخالفت نہ کرتا کیونکہ عبادت کی

آڑ لیکر وہ افراد کو مشتعل کر سکتا تھا۔ اور اس کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا کہ سندھو کو ناگ دیوتا کا دشمن مشہور کر کے اس کے خلاف عام نفرت پھیلا دی جائے اور پھر تمام لوگوں کے سامنے کلہاڑوں اور برچھوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ اپنے اس انجام سے وہ کانپ اٹھا۔ یقیناً رشنو کا یہی مقصد ہے۔ اگر اس موقع پر میں نے اسے للکارا تو سمجھا جائے گا کہ میں ناگ دیوتا کی عبادت میں مخل ہونا چاہتا ہوں۔ آبائی رسم کی مخالفت کرتا ہوں۔ یہ سوچتے سوچتے اس کا دماغ موہوم آوازوں سے گونجنے لگا جیسے کسی غار میں بھوت ناچ رہے ہوں۔ اگر وہ خاموش رہے تو گوسی کی زندگی خطرے میں تھی۔ اگر رشنو کی مخالفت کرے تو ایک بھیانک انجام کلہاڑے — برچھے — اور اس کے جسم کے چیتھڑے۔

رشنو دوہری چال چل گیا تھا۔ اس نے سندھو کو فریب دیا تھا۔ فریب! کیوں نہ وہ بھی فریب سے کام لے۔ آخر فریب کا جواب فریب ہی سے ہو سکتا ہے — یہ سوچ کر وہ ایکدم چونک اُٹھا۔ اور غار سے باہر نکل آیا۔ گوسی دوڑ کر اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے مظلومانہ نظروں سے سندھو کی طرف دیکھا۔

"سندھو!" گوسی نے رونی آواز میں کہا۔ اور پھر سوالیہ نگاہیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں گویا پوچھتی ہے اس وقت کہاں جا رہے ہو؟ سندھو نے کوئی جواب نہ دیا فقط اسے گھورتا رہا پھٹی پھٹی آنکھوں سے جن کی گہرائیوں میں ایک خوفناک ارادہ ایک لرزہ خیز دھوکا کروٹیں لے رہا تھا۔ اس نے گوسی کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ اور بھاری پتھروں — وزنی چٹانوں کو پھلانگتا ہوا جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ وہ کہاں جا رہا ہے کیا کرنا چاہتا ہے؟ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک کیوں تھی؟ گوسی نے یہ سب کچھ سوچا لیکن وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ اس کا دماغ کسی سوال کا جواب نہ دے سکا۔ اس نے دور جنگل کی جھاڑیوں میں سندھو کو غائب ہوتے دیکھا اور پھر اندھا دھند ایک طرف کو بھاگی۔ لیکن نیم شعوری حالت میں ایک بھاری چٹان سے جا ٹکرائی اور گر کر بیہوش ہو گئی۔

رشنو نے سندھو کو جنگل کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا وہ اس کے تعاقب میں چلنے لگا۔ تاریکی کا اژدہا روشنی کی آخری کرن بھی نگل چکا تھا۔ مٹیالے اندھیرے آہستہ آہستہ گہرے ہوتے جا رہے تھے جنگل کی فضا پراُداس رات، اُفقی کناروں سے ملے ہوئے اپنا تاریک دامن پھیلائے سستا رہی تھی۔ اور سندھو اس تاریکی میں جھاڑیوں کو ہٹاتا لاابالیانہ انداز میں چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس کے پاؤں رُک گئے وہ دم سادھے کھڑا ہو کر اپنے عقب میں چلنے والی آواز کو پہچاننے لگا کیا کوئی جنگلی جانور اس کا پیچھا کر رہا ہے؟ لیکن آواز اب بند ہو چکی تھی وہ پھر چلا، اس کے عقب سے پھر آواز آئی۔ چلتے چلتے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اپنی گول گول آنکھیں پھاڑیں۔ اندھیرے میں اسے کچھ بھی نظر نہ آ سکا لیکن اس کا تیز دماغ جو ایسے موقعوں پر بجلی ایسی سرعت سے کام کیا کرتا تھا فوراً سمجھ گیا کہ کوئی انسان اس کے تعاقب میں ہے۔ انسان — اور رشنو کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ اس نے چاہا کہ جھاڑیوں میں چھپ کر اچانک اس پر جا ٹوٹے۔ لیکن رشنو اتنا بیوقوف نہیں تھا کہ غفلت میں مار کھا لیتا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ آج جو دشمن اس کے مقابلے میں آیا ہے اس کے ساتھ کن داؤ پیچ سے پیش آنا چاہیئے۔

سندھو نے جان بوجھ کر تغافل کیا اور اپنے دشمن پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں نے ابھی اس کی آہٹ نہیں پائی بے پروائی سے چلنے لگا۔ لیکن یہ چال رشنو کو دھوکہ نہ دے سکی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ سندھو نے آہٹ سن لی ہے اور اب اس کا یوں بے پروائی سے چلنا محض ایک فریب ہے دونوں ایک دوسرے کو اپنی زد پر لانے کے لئے جھاڑیوں میں دبک دبک کر گھٹنوں کے بل آگے بڑھنے لگے۔ یہ دیکھ کر کہ سندھو کا رخ بوڑھے برگد کی طرف ہے رشنو نے ایک پل کے اندر اندر معاملہ کی نوعیت معلوم کر لی اس نے کتنا خوفناک ارادہ کر لیا ہے — ناگ دیوتا سے مقابلہ — یہ سوچ کر اسے سندھو کی حماقت پر غصہ آ گیا۔ اور اسی غصہ میں وہ ذرا اچھل کر آگے بڑھا۔ لمبی لمبی جنگلی گھاس اور جھاڑیوں میں سے اس کا جسم اُبھرا۔ لیکن یہ اس کی غلطی تھی کیونکہ اس کا دشمن جو چند قدم پر چھپا ہوا تھا بڑی آسانی سے اسے اپنے خونخوار برچھے کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ فوراً اس نے اس غلطی کو محسوس کیا اور پھر دبک گیا۔

سندھو بڑی چالاکی سے کھسکتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ رشنو کے خلاف جو چال اس نے چلنا چاہی تھی اُس کی نوعیت بدل چکی ہے۔ کیونکہ اس وقت وہ دو دشمنوں کے خلاف گھر گیا تھا۔ ایک طرف رشنو — اور دوسری طرف کالا ناگ — اب صرف ایک ہی چارہ باقی تھا کہ پہلے وہ انسان سے نپٹ لے زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے خطرہ کا احساس کیا۔ برگد صرف چند گز کے فاصلہ پر رہ گیا تھا۔ اور سانپوں کی طرح لٹکتی ہوئی جٹاؤں کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ انتہائی خطرہ کے وقت وہ ان کا سہارا لیکر بھی اپنے حریف کے حملہ سے بچ سکتا ہے۔

گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے رشنو کے صحیح مقام کا اندازہ کیا اور اندھیرے میں برچھا پھینک دیا۔ رشنو زخمی ہو گیا — برچھا

اُس کے دائیں کولھے میں پیوست تھا۔ لیکن اس نے اپنے زخمی ہو جانے کا احساس نہ کیا ——— ایک چکر ——— ایک نیم غشی سی۔ پھر وہ فوراً سنبھل گیا اس نے دونوں ہاتھوں سے برچھا اپنے جسم سے نکالا۔ خون بہنے لگا۔

ایک غیر شعوری سی حالت میں اس نے سندھو کو برگد کی طرف لپکتے دیکھا۔ شاید وہ حملہ کی ابتدا کر کے محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ رشنو نے اس کا یہ ارادہ معلوم کر کے اپنے زخمی جسم کو بازوؤں سے تھام کر اُٹھایا۔ اور بھاگ کر سندھو پر وار کیا۔ سندھو نے اسے برچھا پھینکتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک لٹکتی ہوئی جٹا کو پکڑ کر جھول گیا۔ اور برچھا برگد کے تنے میں گڑ گیا۔ اپنے وار کو خالی جاتے دیکھ کر سردار غصہ میں کانپ اٹھا۔ اور کلہاڑا لیکر آگے بڑھا۔ اب آمنے سامنے ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

جنگل میں کہیں دور چند گیدڑ ایک ساتھ چیخے۔ پھر ان کی ماتمی آواز فضا میں بھیانک تھرتھراہٹ پیدا کر کے رات کے اندھیرے سینہ میں ڈوب گئی۔ چاروں طرف تاریکی کے بھوت ناچ رہے تھے۔ اور شمالی ہوائیں درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر منحوس سنسناہٹوں میں منتقل ہو رہی تھیں۔

تاریکی کے پردوں کو چیر کر نوجوان سندھو کی نگاہوں نے سردار رشنو کو جھنجھلا کر آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اصل مقابلہ اب شروع ہوا ہے۔ چنانچہ دشمن کے حملے کو روکنے کے لئے اس نے بھی کلہاڑا سنبھال لیا۔ سندھو کو تیار دیکھ کر سردار کا حوصلہ پست ہو گیا۔ اُس نے اپنی رگوں میں کوئی خنک شے دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ یہ خوف کی لہر تھی جو زندگی میں پہلی بار اس کی رگوں میں دوڑی ——— لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ایک تجویز سوچی ——— فریب ——— اگر چل جائے تو پھر کوئی قوت اس کے حریف کو موت کے مُنہ سے نہیں بچا سکتی۔

"کون ——— سندھو؟" اس نے انتہائی تعجب انگیز لہجہ میں کہا۔

"ہاں ———!" اندھیرے میں دو گول گول آنکھیں چمکیں۔

"میں ہوں رشنو۔" یہ کہہ کر سردار نے کلہاڑا زمین پر پھینک دیا اور ہولے ہولے آگے بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ سندھو کے بالکل سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ انسان کی بُو پا کر برگد کی کھوکھلی جڑوں میں ناگ پھنکارا۔

"میں سمجھتا تھا شاید کوئی آ رہا ہے۔" سردار نے آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا ہُوا میں نے تمھیں پہچان لیا۔"

"اگر نہ پہچانتے تو ———؟" سندھو کا لہجہ کرخت تھا۔

"میں کوئی مہلک وار کر بیٹھتا۔" یہ کہہ کر اس نے سندھو کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیئے۔ سندھو کو ابھی اس فریب کا گمان بھی نہ ہوا تھا کہ سردار نے موقع پا کر پوری قوت کے ساتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے مُکا رسید کیا۔ سندھو نے گرتے گرتے کلہاڑے سے وار کیا لیکن اس کا وار مہلک نہیں تھا۔ کیونکہ وہ خود گر چکا تھا۔ کلہاڑے نے صرف سردار کے ایک بازو کی ہڈی توڑ ڈالی تھی۔ وہ بلبلا کر اٹھا اور زمین پر سے کلہاڑا اٹھا کر سندھو کے سر پر پے در پے مارا۔ ایک روح فرسا ——— بھیانک خرخراہٹ کی آواز آئی ——— نیم مردہ سندھو نے اٹھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن اس کی کوشش اب بے سود تھی۔ کلہاڑے کی متواتر ضربوں نے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ رشنو ہانپ رہا تھا۔ خود اس کے بدن سے خون کے کئی سوتے جاری تھے۔ کندھے اور بازو کے زخموں کے علاوہ خاردار جھاڑیوں نے اس کی جلد کو بری طرح چھیل ڈالا تھا۔ انتہائی نفرت کے ساتھ اس نے سندھو کے مردہ سر پر ٹھوکر ماری اور درد و کرب سے تلملاتا اندھیرے میں غار کی طرف بھاگنے لگا۔

تلاش

سردار کو اس طرح زخمی دیکھ کر تمام افراد متحیر رہ گئے۔ انھوں نے خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"گوسی کو لاؤ۔" رشنو لڑکھڑاتے ہوئے درشت لہجہ میں بولا۔ اور پھر ایک گھاس کے بستر پر گر پڑا۔ اس کے زخموں سے ابھی تک خون بہ رہا تھا۔ بدن پر جگہ جگہ خراشیں تھیں۔ ڈاڑھی اور سر کے بال پریشان تھے ——— "پانی!" زخمی سردار نے مُنہ کھول کر کہا اور ہانپنے لگا۔

ایک شخص لوہے کا موٹا کٹورا لیئے آگے بڑھا اور سردار کے منہ میں پانی ٹپکانے لگا۔ پھر اس کے زخموں پر جنگلی بوٹی لگائی گئی۔ تکلیف کی شدت سے وہ کراہ رہا تھا۔ لیکن بوٹی کے لگنے سے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بیہوش ہو گیا۔ قبیلہ کے سب لوگ ڈر رہے تھے۔

غار کے اندر ایک لمبی لکڑی روشن تھی جس کی مردہ شعاعوں میں ان کے چہرے بھیانک معلوم ہوتے تھے۔ سب کی خوفزدہ نظریں سردار کے جسم پر مرتکز تھیں۔ جس پر خون کی چھینٹیں جم گئی تھیں۔ وہ بالکل ایک مُردہ دکھائی دے رہا تھا ——— بے حس و حرکت ——— ساری رات وہ بیہوش رہا۔ صبح جب اس کی آنکھیں کھُلیں تو سب سے پہلے اس نے گوسی کو طلب کیا۔ مردوں اور عورتوں کے چہرے پر خوف کی لہریں پھیل گئیں۔

"گوسی کہاں ہے؟" اس نے کرخت لہجہ میں چیخ کر کہا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ تمام افراد دہشت زدہ تھے۔

"گوسی ———!" وہ پھر چیخا۔

"گوسی یہاں نہیں ہے" ایک بوڑھے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

یہ سُن کر اس کی آنکھوں سے غصہ کے شرارے نکلے۔ وہ جوش میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"گوسی اور سندھو رات سے غایب ہیں" بوڑھے نے کہا۔

"ذلیل عورت" رشنو نفرت انگیز لہجہ میں بولا "وہ ناگ دیوتا کی قربانی ہے۔ اس نے سندھو کو دیوتا کے قتل پر اکسایا تھا۔

"دیوتا کا قتل؟" تمام افراد حیران و ششدر رہ گئے "کیا کوئی انسان دیوتا کے قتل کی بھی جرأت کر سکتا ہے؟" یہ ایک معمہ تھا جو ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ جب سردار نے انھیں رات کا واقعہ سنایا۔ تو حیرت سے ان کے مُنہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ آج تک کسی نے ایسی جرأت نہ کی تھی سندھو نے اپنے کیئے کی سزا پائی۔ لیکن گوسی ——؟ وہ بھاگ کر کہاں جا سکتی ہے؟ عبادت کی رسم ادا کرنے کے لئے اس کا خون نکالنا ضروری تھا۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ناگ دیوتا سے اسے اپنا خون عزیز ہے۔؟

ایسی حرکت کے بعد قربانی کا غایب ہو جانا تعجب خیز تھا۔ یقیناً دیوتا ناراض ہو جائے گا۔ اور پھر تمام لوگ اس کے قہر و غضب کا نشانہ بنیں گے۔ عبادت کی رسم سے قبل اس کی تلاش کرنا چاہئے۔ خواہ وہ زمین کے کسی کونے میں چھپ جائے۔

اسی دن تمام مرد گوسی کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ انھوں نے غاروں پہاڑی کھڈوں اور جنگل کا کونہ کونہ چھان مارا۔ لیکن گوسی نہ ملی۔ شام کے قریب جب سب لوگ ناکام واپس آئے تو رشنو غصہ میں لال پیلا ہو گیا۔ اس کے نتھنے ہلنے لگے —— "وہ ناگ دیوتا کی قربانی ہے۔ اگر وہ نہ ملی تو دیوتا ہم سے ناراض ہو جائے گا"

"لیکن عبادت کی رسم ادا کرنے کے لئے کسی اور لڑکی کو منتخب کیا جا سکتا ہے" ایک بوڑھے نے کہا اور سردار کے خوفناک چہرے کو دیکھنے لگا۔

"نہیں ——" رشنو چیخا "اس کا یہ مطلب ہے کہ جس لڑکی کو منتخب کیا جائے گا وہی بھاگ جائیگی۔ یہ ذلت ہے۔ ناگ دیوتا کی توہین ہے"

پھر کچھ دیر خاموش رہکر وہ بولا —— "میں اس ذلیل لڑکی سے دیوتا کی توہین کا انتقام لینا چاہتا ہوں" اب گوسی کی تلاش ضروری تھی کیونکہ اس کا یوں غایب ہو جانا واقعی قبیلہ کی لڑکیوں کیلئے ایک گمراہ کن مثال تھی اگر اسی طرح تمام لڑکیاں بھاگ جائیں تو پھر ناگ دیوتا کی عبادت کی رسم ادا کرنے کیلئے خون کہاں سے آئے؟

خوفناک لڑائی

چوتھے دن قبیلہ کے ایک آدمی نے گوسی کو دیکھ لیا جو جنگل سے پرلی طرف

ایک ٹیلے پر چڑھ رہی تھی۔ وہ بے تحاشا اس کی طرف بھاگنے لگا۔ گوسی نے ج
تو خوفناک چیخ مار کر ایک طرف کو تیز تیز بھاگنے لگی لیکن جلدی میں اس کا
پھسل گیا اور وہ گر پڑی۔ لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا وہ آدمی عین اس
سر پر پہنچ گیا اور ابھی وہ دوبارہ سنبھل کر بھاگنا چاہتی تھی کہ مضبو
ہاتھوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ گوسی نے حیرت پاش نگاہ
اس آدمی کی طرف دیکھا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "بھاگ جا
جلدی —— یہاں سے بھاگ جاؤ"

"کیوں ——؟" اس نے پوچھا۔

"ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے" گوسی کہنے لگی "میں سچ کہتی ہوں۔ ا
تمھیں اپنی جان عزیز ہے تو جلدی بھاگ جاؤ"

"یہاں کون ہے؟"

"آریا —— !"

"لیکن ہم تمھیں کئی دن سے تلاش کر رہے ہیں سردار کا حکم ہے وہ تم سے انتقام
"میں جانتی ہوں"

"اس نے کہا ہے وہ تمھیں کلہاڑوں سے پھاڑ ڈالے گا —— اس نے
سندھو کو بھی کلہاڑے سے مار دیا ہے"

"مجھے علم ہے" گوسی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "سردار وحشی ہے۔
مجھے اس کی ہر حرکت کا پتہ ہے۔ لیکن اس وقت یہاں نہ ٹھہرو۔ ورنہ آریا
تمھیں ہلاک کر دے گا۔ بھاگ جاؤ —— جاؤ"

گوسی نے تقریباً اسے دھکّا دیا۔ وہ حیران سا ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔ کیا
گوسی کو کوئی خطرہ نہیں؟ آریا تو ہم سب کے دشمن ہیں لیکن جب گوسی نے
گردن کو جھکا کر سر سے اشارہ کیا تو وہ سمجھ گیا کہ خطرہ واقعی قریب ہے اور اگر
وہ جلدی بھاگ نہ گیا تو موت کا لقمہ بن جائے گا —— یہ سمجھ کر خوفزدہ
وہ بھاگنے لگا۔ اور آخر گھنے جنگل میں غایب ہو گیا۔

گوسی ایک لمحہ تک اُسے دیکھتی رہی پھر نیچے اترنے لگی۔ آس پاس چٹانیں بکھری تھیں۔ کہیں کہیں کوئی درخت یا جنگلی بیروں کی جھاڑیاں نظر آجاتیں۔ جن کے پتوں پر گرد جم گئی تھی۔ ڈھلوان کی طرف دور ایک کھلے میدان میں چند سفید فام آدمی درختوں کی شاخوں سے جھونپڑیاں بنا رہے تھے عورتیں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ ان کی پشت پر لمبی لمبی گھاس میں بکریاں اور گھوڑے چر رہے تھے جن کی حفاظت کے لئے کئی نوجوان نیزے اور تیر کمان لئے مختلف جگہوں پر بیٹھے تھے۔ اگر کوئی جانور ادھر آ نکلتا تو وہ اسے ہلاک کر ڈالتے۔

جونہی گوسی ٹیلے سے نیچے اُتری ایک خوبصورت جوان آدمی گھاٹی کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ اس کے ہانپنے سے معلوم ہوتا تھا کہ؟

بھاگتا ہوا آیا ہے۔ سیاہ آنکھوں میں گھبراہٹ کی چمک تھی۔ اس نے اپنا نیزہ زمین پر ٹیک دیا اور سوالیہ نگاہوں سے گوسی کو گھورنے لگا۔ گوسی مسکرائی سفید سفید دانت چمکنے لگے۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشاروں سے نوجوان راین سمجھایا کہ اس کے قبیلہ کا ایک آدمی اس کی تلاش میں ادھر آنکلا تھا۔ لیکن ریاؤں کے خوف سے واپس بھاگ گیا ہے۔ اور پھر وہ راین کے جسم پر چیتے کی دھاریدار کھال کو دیکھنے لگی۔ راین مسکرایا۔ گوسی بھی مسکرائی۔ گویا انھوں دراوڑوں کی بزدلی کی ہنسی اڑائی۔ لیکن فوراً ہی راین نے اپنی ہنسی روک پھر اس نے گوسی کی طرف انگلی اٹھائی اور بولا ——"دراوڑ"

گوسی نے اس کا مافی الضمیر سمجھ لیا یعنی راین نے کہا تھا کہ تم بھی دراوڑ ہو کھلکھلا کر ہنس دی۔ ہنستے وقت اس کا سانولا چہرہ قدرے خوبصورت نظر لگا۔ اسے ہنستے دیکھ کر راین بھی ہنسنے لگا۔ لیکن اس کی ہنسی میں شرمندگی ملک تھی۔ پھر گوسی نے کہا —"دراوڑ" اور ساتھ ہی آنکھوں کو پورا دیا۔ اس کی بھنویں تن گئیں ماتھے پر جھریاں پڑ گئیں۔ چہرے سے خوف ٹپکنے لگا۔ نچلے لب کو دانتوں میں دبا کر اور جسم کی مختلف حرکات ہاتھ کے اشاروں سے اس نے بتایا کہ دراوڑ در اصل بزدل نہیں بلکہ وہ بہادر ہیں۔ وہ جانوروں سے کشتیاں لڑتے اور ان کی گردنیں توڑتے ہیں۔ انھوں نے آریوں کے کئی قافلوں کا مقابلہ کیا لیکن باہر سے آنے کے پاس چونکہ نئے ہتھیار ہیں اس لئے وہ ان کے مقابلے میں کامیاب سکے۔ اور ان سے ڈرتے ہیں۔ ورنہ سوائے ناگ دیوتا کے آج تک نے کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

گوسی نے یہ سب باتیں اشاروں میں بیان کیں۔ راین کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا اسے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ دراوڑ بزدل نہیں ہیں۔ لیکن ناگ دیوتا کا سوال حیران کن تھا۔ گوسی اس سے قبل اسے اپنے قبیلہ کی آبادی تھی۔ جو ناگ دیوتا کی عبادت کے وقت ادا کی جاتی تھی اور راین پہلے حیران ہوا تھا کہ انسان —اور سانپ کی پوجا؟ اپنے دشمن کی عبادت؟ اس لئے کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں اس عبادت کا اور کوئی مقصد نہیں عبادت اس کی کرنا چاہیئے۔ جس کی قوت انسانی طاقتوں سے بالا ہو۔ جس پر کوئی بس نہ چل سکے۔ اس کے دماغ میں مختلف خیال چکر لگا رہے تھے ان میں سے آج تک کسی نے سانپ کی پوجا نہ کی تھی۔ نہ کسی اور جنگلی اور نہ سورج کو اپنا دیوتا تسلیم کرتے تھے اور طلوع و غروب کے وقت اس کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ اسے دراوڑوں کی حماقت پر غصہ آیا۔ بجلیاں اس کی نگاہوں میں ناچنے لگیں۔ پھر گوسی — جس کی معصوم سی صورت نے اس کے دل میں محبت کی چنگاری سلگا دی تھی، اور ساتھ ہی اس نے گوسی کو دیکھا اس کی گردن میں نوکیلی ہڈیوں کا ہار لٹک رہا تھا خشک بال کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ جنگلی سیبوں کی طرح تنی ہوئی ننگی چھاتیاں سانس کی آمد و شد کے ساتھ ہل رہی تھیں۔ اور ان سب چیزوں کے علاوہ اس کی سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں سوئی ہوئی البیلی وحشت! ایک لفریب کشش کیا اس کے قبیلہ کے وحشی لوگ ایسی پیاری اور جوان لڑکی کو بھی خوامخواہ ناگ پر قربان کرنے کو تیار ہو گئے ہے؟ اس نے گوسی کو اشاروں میں پوچھا کہ آج تک کتنی لڑکیاں اس وحشیانہ رسم کی نذر ہو چکی ہیں؟ گوسی نے ہاتھ کی انگلیوں پر گن کر ان کی تعداد بتائی —"ستائیس"۔ یہ ان لڑکیوں کی تعداد تھی جو گوسی کی زندگی میں ہلاک ہوئی تھیں اور جو لڑکیاں زندہ بچی تھیں وہ بہت کمزور رہ گئی تھیں گوسی نے یہ بھی بتایا کہ سردار نے اس کی تلاش کا حکم دیا ہے اور اگر وہ کہیں تنہا مل گئی تو قبیلہ کے لوگ زبردستی اسے اٹھا کر لے جائیں گے پھر —کلہاڑوں سے اس کے بدن کے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے۔

ایک فوری جذبہ کے ماتحت راین نے اس کا ہاتھ پکڑا اور جنگل کی طرف چلنے لگا گوسی حیران و ششدر رہ گئی۔ چلتے چلتے اس نے اپنے سر کو جنبش دی آنکھوں کو گھمایا۔ جواب میں راین نے نیزے کو بلند کیا اور جنگل کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ناگ دیوتا کے قتل کا ارادہ کیا تھا۔ گوسی رک گئی اور خوفزدہ ہو کر اپنے سر کو ہلانے لگی پھر اس نے راین کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے بتایا کہ کوئی شخص ناگ دیوتا کو ہلاک نہیں کر سکتا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ لیکن راین اس کی کسی حرکت سے متاثر نہ ہوا اس کے ہونٹوں پر نفرت انگیز مسکراہٹ پیدا ہوئی جس میں گوسی کے قبیلہ کی حماقت پر آنے والا غصہ کروٹیں لے رہا تھا —وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز جنگل کی طرف چلنے لگا۔

جنگل میں داخل ہونے کے ساتھ ہی ان کے سامنے دھم سے کوئی چیز گری یہ انسانی گوشت کا ایک لوتھڑا تھا جس کے پاس چیل کا ایک سایہ متحرک تھا۔ جو اس کے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ گوسی نے خوف آگیں نظروں سے راین کی طرف دیکھا۔ شگون اچھا نہیں تھا۔

جھاڑیوں کے اینچ پینچ اور بڑے بڑے درختوں کے جھرمٹ میں بے پروائی سے چلتے ہوئے وہ آگے بڑھتے گئے۔ انسانوں کی آہٹ پا کر ڈرپوک جانور اپنی کمینگاہوں میں دبک گئے۔ چند لنگور بندر جو ایک پھیلے ہوئے درخت کی شاخوں سے لٹک رہے تھے اپنے چوڑے منہ کھول کھول کر دانت چمکانے لگے۔ گویا وہ خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ حد نظر تک درخت پھیلے تھے دور پرے نہاں سبز گوں پانی کی ایک جھیل تھی کہیں کہیں مگرمچھ نے ... پانی میں ڈبکی لگانے کی آواز سنائی دی۔ سامنے کی گھنی جھاڑیوں کے اندر سے بھیڑیئے کی خوفناک آنکھیں چمکیں۔ تیز تیز ... حرکت میں آئے

گوسی نے رابن کو فوراً خطرہ سے آگاہ کیا جو جھیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور قبل اس کے کہ جنگلی دشمن حملہ کرتا ایک سنسناتا ہوا تیر اس کی چھاتی میں ترازو ہو چکا تھا۔

سورج کی زرد شعاعیں بھیڑیئے کے مُردہ جسم پر تھرتھرا رہی تھیں۔ اور بندروں کی ٹولی یہ خونیں منظر دیکھ دیکھ کر "کچ کچ" کرتی اور قلابازیاں بھرتی ایک طرف کو بھاگ نکلی۔ تقریباً ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد انہیں اہلِ دشمن کا مسکن نظر آیا۔ بوڑھا برگد ـــ دبیز تناؤ ـــ لمبی لمبی پُراسرار جٹائیں جیسے سانپ لٹک رہے ہوں۔ اور اس سے پرے پہاڑی گھاٹیاں۔ اونچے نیچے بے ترتیب بکھرے ہوئے پتھر ـــ تنگ دہانوں والے غار ـــ دراوڑوں کے گھر ـــ

گوسی نے ہاتھ اٹھا کر ادھر اشارہ کیا۔ مقابلہ کا میدان آ گیا تھا۔ رابن نے نیزے کو چھاتی کے تیندوے چیتے کی کھال میں پھنسایا اور کمان ہاتھ میں سنبھال لی۔ اب وہ برگد کے بالکل سامنے آ گئے تھے۔ انسانی بُو پا کر کالا ناگ پھنکارا اور اپنا موٹا سر باہر نکال کر جھومنے لگا۔ آج پہلی بار اس نے کسی اجنبی کی بُو پائی تھی۔ گوسی اس کی بھیانک شکل دیکھ کر لرز گئی۔ رابن نے ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر نشانہ باندھا اور تیر چھوڑ دیا۔ لیکن ناگ کے ہل جانے سے نشانہ چوک گیا۔ اور تیر برگد کے بھاری تنے میں جا گڑا۔ رابن نے بجلی کی سی سرعت سے دوسرا تیر کھینچا اور کمان میں جوڑا۔ اتنے میں ناگ نے ایک ہیبت ناک پھنکار ماری اور پھن پھیلاتا ہوا اس کی طرف دوڑا۔ خوفزدہ گوسی لپک کر رابن کی پشت پر آ گئی۔ جب تک رابن نے دوسرا تیر چھوڑا ناگ اس کی زد سے نکل چکا تھا۔ دوسرا وار بھی خالی جاتے دیکھ کر رابن کو طیش آ گیا اس نے جلدی سے نیزہ سنبھالا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ گوسی بھاگ کر پیچھے ہٹ گئی۔

اب انتہائی جرأت و چالاکی کا وقت تھا۔ قریب آ کر ناگ زمین سے تقریباً دو گز اُبھر کر کھڑا ہو گیا اور حملہ کرنے کیلئے اپنا زہریلا پھن پھیلانے لگا گویا مجسم موت جھول رہی تھی۔ رابن کی زندگی خطرے کی آخری سرحد پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے موقع پا کر ناگ کے چوڑے چوڑے سفید سینہ پر نیزے کی تیزانی سے حملہ کر دیا۔ زخم کھاتے ہی ناگ جھنجھلایا اس نے دو تین بل کھائے اور پھر وحشیانہ انداز میں اپنے دشمن پر لوٹ پڑا۔ لیکن رابن اس کی اس حرکت سے پہلے ہی اچھل کر پیچھے ہٹ چکا تھا۔ اس نے سنبھل کر پوری قوت کے ساتھ نیزے کو ہلایا ناگ کے اُبھرے ہوئے بدن پر ایک زبردست چوٹ پڑی وہ رپٹتا ہوا زمین پر گرا۔ رابن نے ایک اور وار کیا۔ ناگ لوٹنے لگا اس کی دُم متحرک ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ زمین سے تین گز اُبھر کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنا آخری حملہ کرنے والا تھا۔ دو تین بار جھول کر اس نے اپنی گردن گھمائی اور ایک دم آگے کو جھک گیا۔ اگر رابن جلدی سے اچھل نہ جاتا تو یقیناً زہر کا لقمہ بن جاتا۔ دشمن کو بچتے دیکھ کر وہ خوفناک پھنکار کے ساتھ فضا میں لہرا گیا۔ رابن نے اس کے داؤ کو سمجھ کر نیزے کو پھر گھمایا۔ ناگ رپٹ کر دور جا گرا۔ رابن لپک کر آگے بڑھا۔ اور ساتھ ہی نیزے کی انی ناگ کے جسم میں کھب گئی۔ وہ اچھل کر دُم کو گھمانے لگا۔ لیکن رابن نے پورے زور سے اسے دبائے رکھا چند لمحے کی کشمکش کے بعد ایک لمبا لاشہ زمین پر تڑپنے لگا۔ رابن نے نیزہ اس کے جسم سے نکالا اور متواتر چوٹوں سے اس کا خاتمہ کر دیا۔

پہاڑی چوٹیوں پر سے وحشی انسانوں نے اس لڑائی کو دیکھ لیا تھا وہ برچھے اور کلہاڑے لیکر بھاگے۔ گوسی نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر رابن کو اشارہ کیا کہ اب بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کیونکہ وہ اپنے دیوتا کا انتقام لینے کے لئے اسے ہلاک کر دیں گے۔ لیکن رابن کو یہ اطلاع بے وقت ملی کیونکہ قبیلہ کے لوگ قریب آ چکے تھے اس نے گوسی کو جھاڑیوں میں چھپ جانے کے لئے کہا۔ اور خود کمان سنبھال کر تیار ہو گیا۔ اس کے ترکش میں صرف چھ تیر تھے۔ وحشی برچھے گھماتے اور کلہاڑے لہراتے بے تحاشا بھاگے آ رہے تھے۔ رابن نے یکے بعد دیگرے سب تیر چلا دیئے۔ چھ انسان ڈھیر ہو چکے تھے۔ لیکن ناگ دیوتا کے پجاری جوش غضب میں بھاگے چلے آ رہے تھے سب سے پہلے رشو نے برچھا پھینکا لیکن رابن نے نیزے سے اُسے ہوا میں اڑا دیا۔ پھر بے شمار برچھے ایک ساتھ پھینکے گئے جو رابن کے جسم میں پیوست ہو گئے وہ لڑکھڑاتا ہوا گر پڑا اور دم توڑنے لگا۔ وحشی انسان بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے اور کلہاڑے مار مار کر اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اپنے دیوتا کے قاتل کو ہلاک کر چکنے کے بعد وہ مردہ ناگ کے سامنے جھک گئے۔ آفتاب جنگل کے درختوں میں غروب ہو گیا تھا اور مُردہ دن کی روشنی میں گوسی جھاڑیوں اور لمبی لمبی گھاس میں چھپتی ہوئی فرار ہو رہی تھی۔

انتقام

گوسی کو اپنے قبیلہ کے رسم و رواج سے نفرت ہو چکی تھی وہ وحشیانہ زندگی سے اُکتا گئی تھی۔ آپس میں دشمنی اور رقابت ـــ حسد اور بغض، عورتوں سے ازلی حقارت، خونیں عبادتیں، یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ یہ بھی کوئی زندگی کا مقصد ہے؟ اس کے برعکس آریاؤں کی زندگی سراپا جہد و عمل تھی وہ عورتوں کو مساوی درجہ دیتے تھے۔ ان کا ایک نظام تھا۔ تمام افراد اسی نظام کے ماتحت چلتے۔ ان کی زندگی نئی تھی۔ زندگی کے اصول نئے تھے وہ سورج کی پرستش کرتے تھے ان کا طریق عبادت بھی دراوڑوں کی طرح بھیانک اور وحشیانہ نہ تھا۔ اس کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے ناگ دیوتا کے پجاریوں کی مکروہ اور خوفناک شکلیں گھومنے لگیں۔ ننگے دھڑنگے کالے کالے جسم۔ برگد کی پراسرار کھوکھلی جڑیں۔ خون کا پیالہ۔ بانسلیوں اور

تھاپوں کی خوف طاری کر دینے والی آوازیں — وحشیانہ رقص — لیکن اب اس کے دل سے ایک نامعلوم سا بوجھ اُتر رہا تھا۔

جھاڑیوں میں چھپتی اور جنگلی جانوروں سے بچتی وہ بے تحاشا بھاگی جا رہی تھی۔ جنگل سے نکل کر اس نے ایک چیخ ماری۔ آریا لوگ نیزے لہراتے اور تیر کمان سنبھالے اس کی طرف لپکے۔ اُس نے اشاروں سے سردار کو بتایا کہ دراوڑوں نے راہن کو مار ڈالا ہے۔ سردار نے چند لمحے کچھ سوچا۔ پھر دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ انھوں نے اطاعت سے سر جھکا دیئے۔ آن کی آن میں وہ لوگ گوسی کو ساتھ لئے جنگل میں گھس گئے۔ برگد کے نیچے وحشی لوگ اظہارِ عقیدت میں ناچ رہے تھے۔ ناچے جا رہے تھے۔ یکایک تیروں کے سنسنانے کی آوازیں سنائی دیں اور ساتھ ہی چند لاشیں زمین پر تڑپنے لگیں۔ ناچ رک گیا۔ انھوں نے حیرت پاش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور درختوں میں ان کو چند آریاؤں کی شکلیں نظر آئیں۔ وہ خوفزدہ ہو گئے لیکن اب بھاگنا بے سود تھا۔ کیونکہ نہایت چالاکی سے بے خبری کی حالت میں ان کو گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ رشنو کے حکم کے ساتھ ہی وہ سب زمین پر لیٹ گئے۔ کیونکہ وہ تیروں کی زد سے نکلنا چاہتے تھے۔ برچھے اور کلہاڑے ہاتھوں میں سنبھالے وہ مختلف سمتوں کو کھسکنے لگے۔ گھیرا آہستہ آہستہ تنگ ہونے لگا۔ آخر آریاؤں نے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے انسانوں پر تیروں سے حملہ کر دیا۔ جواب میں انھوں نے بھی اپنے برچھے پھینک دیئے۔ معمولی سے تصادم کے بعد تمام دراوڑ ہلاک کر دیئے گئے۔ گوسی نے آگے بڑھ کر رشنو کی لاش پر ٹھوکر ماری۔ پھر ایک برچھا اُٹھا کر وہ ناگ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگی۔

افسردہ شام کے ماتمی اندھیرے میں آریا پہاڑی غاروں کی طرف بڑھے۔ خطرہ کو دُور ہوتے دیکھ کر جنگل میں چھپے ہوئے مردار خوار جانوروں نے جھاڑیوں میں سے اپنی تھوتھنیاں نکالیں اور کچلیاں چمکاتے انسانی لاشوں کی طرف لپکے — ان کی غوغا سن کر برگد کی شاخوں کے ساتھ چمٹے ہوئے چند اُلو چیخے اور ان کی منحوس آوازیں فضا کے زخمی سینے پر لہرائیں۔ جنگل کے دہشت ناک سناٹے میں گم ہو گئیں۔

ناگ دیوتا کا مسکن اس وقت مُردار خوار جانوروں کی رسدگاہ بنا ہوا تھا —!

شہلا

پسِ پردہ

از

جناب عزیز احمد بی اے عثمانیہ

اک جھلک اپنی دکھا کر چھپ گئی
حسن کی دُنیا بسا کر چھپ گئی

بج رہی تھیں آسمانی چوڑیاں
نغمۂ دلکش سنا کر چھپ گئی

ایک ہنگامہ ہے بزمِ زیست میں
حسرتوں کو گدگدا کر چھپ گئی

کہتے کہتے حالِ دل شرما گئی
مدعا ہونٹوں پہ لا کر چھپ گئی

آرزوؤں کے بھڑک اٹھے چراغ
سوتے فتنوں کو جگا کر چھپ گئی

مجھ کو دے دے کر فریبِ التفات
سامنے دم بھر کو آ کر چھپ گئی

ڈھونڈتی ہی رہ گئیں نظریں مری
تشنگیٔ دل بڑھا کر چھپ گئی

آسمانوں سے زمیں پر آ گیا
آنکھوں آنکھوں سے پلا کر چھپ گئی

ہو گئیں آباد دل کی بستیاں!
میری نظروں میں سما کر چھپ گئی

گیت گاتا ہوں میں حسن و عشق کے
شاعرِ رنگیں بنا کر چھپ گئی

جذبات کا عالم

دوری میں بھی حاصل ہے ملاقات کا عالم

حضرت کوکب شاہجہانپوری

یہ ہے مری نظروں کی مناجات کا عالم
ذرّے بھی دکھاتے ہیں سمٰوات کا عالم

ہر پرتوِ بے مثل میں ہے ذات کا عالم
اللہ ترے حسن کی آیات کا عالم

ہے ہجر میں بھی حسن کے لمعات کا عالم
کیا ہوگا سحر کو، جو یہ ہے رات کا عالم

کھلتی ہیں یہ کلیاں وہ چمکتے ہیں ستارے
ہر سمت ہے درپردہ پیامات کا عالم

ہے تیری تمنّا بھی ترے اذن پہ موقوف
پنہاں نہیں تجھ سے مری حاجات کا عالم

پرنور ترے حسن سے آغوشِ تصوّر
دوری میں بھی حاصل ہے ملاقات کا عالم

ہر درد میں راحت ہے کوئی رنج نہیں رنج،
کیا لطف ہے کیا حسنِ مراعات کا عالم

ایما کا ہے فیضان کہ احساس کا احسان
ایک ایک جفا میں ہے مدارات کا عالم

ہر زخم ہے جاں بخش، ہر اندوہ مسرّت
کیا کہیئے محبت کی کرامات کا عالم

ایک ایک ادا حسن کی دنیائے محاسن،
ایک ایک نگہ عشق کی جذبات کا عالم

کچھ اور ہے اے دل وہ محبت نہیں ہرگز
نالوں سے نہ پیدا ہو جو نغمات کا عالم

جلووں کی یہ کثرت ہے کہ حیران ہیں آنکھیں
آئینے دکھاتے ہیں حجابات کا عالم

کھلتا نہیں اے عشق یہ جنت ہے کہ دوزخ
ہے لطف و تعب میں وہ مساوات کا عالم

اب شکر و شکایت سے نہیں کوئی تعلق
میں ہوں مرے آلام کی لذّات کا عالم

دل پر نہیں قابو تو زباں لاکھ ہو بس میں
نظروں سے جھلکتا ہے خیالات کا عالم

ایجابِ محبت کی ضرورت نہ تمنّا
اس حد پہ ہے الفت کی علامات کا عالم

سرگوشیاں کرتی ہے نسیم آج بھی مجھ سے
اب تک ہے وہی ان کی ہدایات کا عالم

ہر موجِ نفس ان کی مہک سے ہے معطّر
پنہاں ہے تغافل میں عنایات کا عالم

کیا ذکرِ سخن ان کی خموشی میں بھی کوکب
انگڑائی اشار[illegible] الفاظ ہے کہ اشارات کا عالم

انشاؔ و رنگینؔ کی تشبیہات

ریختی کے دو بادشاہ

جناب خالد حسن قادری

جس طرح سرزمین دکن کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے ریختہ کا دلکش و دلربا ترانہ اسی خاک سے بلند ہوا اسی طرح یہ فخر بھی دکن ہی کو حاصل ہے کہ ریختی کی شیریں و سُریلی لے بھی دُنیائے شاعری نے سب سے پہلے اسی ادب پرور سرزمین سے سُنی۔ ریختہ کے باوا آدم نے دکن میں جنم لیا اس لئے نظم اردو کی ماں حوا ریختی نے بھی اسی دیس سے اپنا حسنِ عالم افروز دکھا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ولی اور ہاشمی دونوں دکنی ہی تھے۔ ہاشمی کے بعد خاکی، رحیم، قیس وغیرہ نے بھی اس طرف توجہ کی لیکن شمالی ہند میں اس عروسِ سخن کی رونمائی کا سہرا رنگین کے سر ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے شمالی ہند میں باقاعدہ طور پر ریختی گوئی شروع کی۔

یہ صنفِ نظم باوجود زلیخائے سخن ہونے کے یوسفِ ریختہ سے زیادہ مہ جبین تھی جس نے بھی اسے دیکھا خواہ زبان سے زلیخا کی ہم جولیوں کی طرح بُرائی ہی کی ہو لیکن دل میں اس کے حُسن کی مقناطیسی کشش کا ضرور اعتراف کیا۔ زبان سے اگرچہ یہی کہا کہ:-

"بھائی تیرا باپ رسالدار مسلم، لیکن برچھی بھالے کا ہلانیوالا، تیغ کا چلانیوالا تھا۔ تو ایسا قابل کہاں سے ہوا اور کراہی پن (یا کلاہی پن) جو بہت مزاج میں . . . آگیا ہے لو ریختہ چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں۔" (انشاؔ)

لیکن عالمِ تحیر و استعجاب اور اس کے ساتھ مسرت کا امتزاج کچھ ایسا تھا کہ خود بھی لیموں کی جگہ انگوٹھا تراش گئے اور رنگین پر "زہر کھائے" بغیر نہ رہ سکے چنانچہ ایک دیوان تو دبھی "رنڈیونکی بولی" میں تصنیف کر دیا۔

ریختی میں اگرچہ بے حیائی کے جذبات اور فحش و مبتذل کلام ہی ملتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بیگماتی زبان، نسوانی محاورات (عہدِ مغلیہ کے آخری دور کے طرزِ معاشرت کی جھلک مذہبی ہیجانِ طبع اور عورتوں کے معتقدات بھی ملتے ہیں جنکا رواج اگرچہ اب نہیں لیکن اس کا نام ضرور ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ لال پری کی بیٹھک اگرچہ اب کوئی نہیں دیتا لیکن اس کا پتہ ریختی کے توسل سے مل جاتا ہے۔ شیخ سدو، میاں زین خاں، پیر ہٹیلے، ننھے میاں، جہل تن، شاہ دریا، لال پری، دریا پری کی معتقد آج شاید سارے ہندوستان میں کوئی نہ نکلے لیکن ریختی کی بدولت ان کا نام دریا برد ہونے سے بچ گیا۔ اس طرح کچھ ایسے رسم و رواج جن کا دُھندلا سا نقش بھی کہیں موجود نہیں ریختی کی وجہ سے آج بھی زندہ ہیں۔

یہ سب بجائے خود فحشیات سے قطع نظر قابلِ قدر ہیں، کتنے نسوانی محاورات ایسے تھے جو اس زمانہ میں بھی عوام الناس کی فہم سے بالا تھے اور آج تو وہ ہمارے ذہن میں بھی نہ ہوتے اگر ریختی کے ذریعہ سے اس قیمتی خزانہ کی حفظ و بقا کا انتظام نہ کیا جاتا۔ اس وقت ہمارا مطمحِ نظر صرف انشاؔ و رنگینؔ کی تشبیہات ہیں۔ جانؔ صاحب نازنیںؔ اور بعد کے ریختی گو شعرا سے انکا تقابل و موازنہ بھی مقصود نہیں۔ اس لئے ریختی کے اس افادی پہلو پر کسی دوسرے مضمون میں روشنی ڈالی جائیگی۔

رنگینؔ

آج سے پچاس برس پہلے کیا صرف پچیس برس پہلے بھی (اور آجکل غیر تعلیمیافتہ طبقہ میں بھی) ہونٹوں پر مِسّی کی دھڑی جمانے کا رواج تھا۔ آجکل یہ چیز خلافِ فیشن سمجھی جاتی ہے۔ اس کی جگہ سُرخی (لپ اسٹک) نے لیلی ہے مِسّی لگانے سے دانت ضرور چمک اُٹھتے تھے لیکن لبِ لالہ رنگیں بننے کی جگہ سیاہی مائل ہو جاتے تھے۔ رنگینؔ نے مسّی شدہ ہونٹوں کی تشبیہ دی ہے ؎

ہونٹھ کو تو نے دوا اپنی بنایا ہے جونک کیا مری جڑ ہے دھڑی کا یہ جمانا تیرا

مشہور بات ہے کہ مچھلی پانی سے نکل کر بہت بے قرار رہتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

یوں ہے اس دل کو دوگانا کی نشانی کی ہوس
ریت میں مچھلی کو جوں ہوتی ہے پانی کی ہوس

کاہ ربا (کہربا) ایک قسم کا پودا ہوتا ہے جس میں مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ اور یہ گھاس پھوس کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس سے تشبیہ دی ہے ؎

دولت سے اپنے مثل کاہ ربا　　میں تو ہوتی ہوں برگ کاہ سے خوش

پھر کہتے ہیں ؎

دھیان یوں مجھ کو ہے دوگانا کا　　کہربا کو ہو جیسے کاہ کا شوق

عورتیں لال پری سبز پری دریا پری کی بہت معتقد تھیں کسی منت کے پورا ہونے پر ان کی بیٹھک دی جاتی تھی۔ سفید سوزنی بچھائی جاتی نہا دھو کر جوڑا پہنایا جاتا اور میاں شیخ سدو یا میاں شاہ سکندر یا ننھے میاں یا پریاں ان کے سر پر آتی تھیں۔ یہ رسم عموماً جمعرات کو ادا کی جاتی اس سے تشبیہ دی ہے ؎

خانم زر سے پرے ہے یہ دوگانہ میرا　　ہے پھر اس گھر میں نگوڑی لال پری کی بیٹھک

چکئی بچوں کا دل پسند کھیل ہے۔ لٹو کے بعد دلچسپی میں اسی کا نمبر ہے۔ ڈور اور چکئی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک بغیر دوسری چیز بیکار ہے۔ اس سے تشبیہ دی ہے ؎

ملتے نہ ناخنی جیسے پیش قرباں اسکے ہوں　　ہم میں چکئی ایک ہے اور ایک ڈور ہے

لیکن چکئی صرف ڈور کے اشارے پر گھومتی ہے۔ اس سے دوسری تشبیہ دی ہے ؎

ہے چلنا پھرنا میرا دوگانا کے اختیار　　یہ جان لو کہ میں ہوں چکئی اور وہ ڈور ہے

بہار کو ایک دوشیزہ فرض کیا ہے اس کے بعد کیا لاجواب تشبیہ دی ہے۔ ؎

برسات اس کو کہتے ہیں باجی جس بہار میں　　سر پر ہوا کے ہوتی ہے بادل کی اوڑھنی

یہ شعر ریختی کا معلوم ہی نہیں ہوتا۔

بندر کا بھبکی دینا مشہور ہے کہتے ہیں ؎

سنتی ہے میرے منہ سے جب نام ترا رنگیں　　دیتی ہے مجھے آپا بندر کی طرح گھرکی

قد کو سرو سے بہت پرانی تشبیہ ہے۔ لیکن اس طرز ادا نے اس تشبیہ میں ندرت پیدا کر دی ؎

جب دوگانا باغ میں چلتی ہے کیا ناز سے　　سرو کو کہتی ہوں میں ہٹ جا بلند آواز سے

ایک قصیدہ نوری شہزادے اور شاہ دریا میاں کی تعریف میں کہا ہے تمہید گریز اور خاتمہ بہت عمدہ ہے۔ بالکل قصیدہ کی ہی شان ہے۔ ممدوح سے فرماتے ہیں ؎

جن اور بھوت ترا نام سن کے یوں بھاگیں
شعلۂ مہر سے اڑ جائے جس طرح شبنم

ایک خط زنانی کو لکھا ہے۔ اس کا مضمون بڑا دلچسپ اور جدید ہے ؎

اے دلبر و دلبر یگانہ　　دے فتنہ و فتنۂ زمانہ

سے شروع کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تو جو مجھ سے خفا ہے تو آخر کیوں میں تجھ سے کس بات میں کم ہوں ؎

سمجھے ہے تو کیوں حقیر مجھ کو　　کاہے پر ہے یہ گھمنڈ تجھ کو

اگر تو اپنے آپ کو حسین سمجھتی ہے تو میں بھی کچھ تجھ سے کم نہیں ہوں ؎

پیشانی ہے تیری گر کشادہ　　تو میری جبیں ہے لوح سادہ

اس کے بعد بھنوؤں کا ذکر کر کے کہتے ہیں ؎

جو تیری ہیں ماہ نو کی ثانی　　تو میری ہیں تیغ اصفہانی
ناوک جو مژہ ترے بلا ہیں　　تو پلکیں یہ پنجۂ بلا ہیں
رخسارے ہیں تیرے سیب سے پر　　تو میرے بھی گال ہیں مہ جوز

ناک کو تشبیہ دیتے ہیں ؎

بینی جو تری الف عیاں ہے　　تو میری بھی ناک سو تواں ہے
گر ہونٹھ ترے ہیں برگ گل ناب　　تو ٹکڑے ہیں لعل کے مرے لب
گر دانت ہیں تیرے سلک گوہر　　تو مرے ہیں موتیوں سے بہتر

گردن کے متعلق کہتے ہیں ؎

گردن ہے تری بیاض ناگن　　تو میری بھی ہے صراحی گردن

بازوؤں کے متعلق سنئے ؎

ساعد جو ترے ہیں شاخ سنبل　　تو بانہیں مری بھی ہیں رگ گل

قد کو دیکھئے ؎

قامت ہے ترا جو سرو آزاد　　تو میرا بھی قد ہے نخل شمشاد

ابروؤں کی ایک نادر تشبیہ ملاحظہ ہو ؎

دونوں ابرو دھواں، عجب گردن
ساری نک سک درست چال پری

انشاء

زلفوں کو ناگ سے تشبیہ قدیم ہے۔ انشاء کہتے ہیں ؎

چوٹی پہ تری سانپ کی ہے لہر دوگانا　　کھاتی ہوں ترے واسطے میں زہر دوگانا

اس تشبیہ کو دوسرے طریقہ سے ادا کیا ہے۔ حسن ادا قابل داد ہے ؎

لہریں چوٹی کے ترے ڈر کے مارے کانپ کانپ
چونک چونک اٹھتی ہوں میں راتوں کو کہکے سانپ سانپ

عشق و محبت کے دشوار گذار راستوں سے باوجود واقف ہونے کے

اس کے بعض مناظر ایسے نظر فریب ہوتے ہیں کہ ہر شخص بلا سوچے سمجھے قدم رکھ دیتا ہے۔

دیکھئے انشاء کیسی عمدہ تشبیہہ کے ساتھ اس مضمون کو ادا کرتے ہیں ؎

بیگما چاہ کے دریا کے بڑے پاٹ کو سوچ
بے دھڑک پاؤں نہ دھر پہلے تو گھر گھاٹ کو سوچ

پھر اسی "چاہ" کو دوسرے طریقے سے ادا کیا ہے ؎

بہ جاتے ہیں پہاڑ اسمیں کہاں تھل بیڑا
دھار تلوار سے بھی تیز ہے اس کاٹ کو سوچ

"چاہ" اور "آہ" کی دوسری نئی تشبیہہ دیکھئے ؎

بیگما چاہ بھی پہاڑ ہے ایک
اسمیں ایک ٹھنڈی سانس جھاڑ ہے ایک

"چاہت" میں دل سوختہ کی تشبیہہ کیسی جدید اور عجیب دی ہے ؎

چاہت کی آگ سے یہ بھنا دل کہ اے ددا
گودی میں اپنے بھر گئی بھونے چنے کی باس

علاوہ خیال کے دل کو چنے سے تشبیہہ کیسی نادر اور مکمل ہے۔

جب دوگانا کی بے اعتنائیوں اور الاچی کی بے وفائیوں سے دل کملا گیا تو کہتے ہیں ؎

مرجھا گیا دل اپنا تو نقشہ یاد آیا
بے اختیار مجھ کو اس پھول کی کلی کا

مرمریں اور نازک انگلیوں کی تشبیہات تو بہت نظر سے گذری ہونگی لیکن ایک جدید تشبیہہ دیکھئے ؎

نرماہٹ انگلیوں کی انکی نہ پوچھ مجھ سے
ہے صلِ علیٰ کہ عالم اک مونگ کی پھلی کا

دوگانا کے حسن کی مختصر مگر جامع تعریف صرف ایک تشبیہہ کے ذریعہ سے کسقدر دلچسپ انداز میں ادا کی ہے ؎

کیوں پڑا تھلکے نوجی میرے کلیجے میں بھلا
ہے تمہارا روپ ایسا جیسے سونے کا ڈلا

گال پھلانا خاص محاورہ ہے۔ بمعنی ناراض ہونا خفا ہونا۔ ان پھولے ہوئے گالوں کی تشبیہہ ملاحظہ ہو ؎

مشک کی طرح گال اپنے پھلاتا کیوں ہے،
ارے او سقہ کے لونڈے تو نہ پانی چھلکا

صبح کے وقت ہری دوب پر شبنم کے قطرات دیکھ کر کہتے ہیں ؎

یہ نہیں بکھرے ہوئے سبز پتے تو کیا بھگوی
لائی تھی تیرے نچھاور کیلئے موتی صبح

گرمیوں میں جب چاند چاندی کے ورق سے برساتا ہے تو اس کی ٹھنڈی اور پرکیف روشنی میں کھلی چھت پر سونے میں ہی خاص لطف ملتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

پھلی چاندنی کی طرح سے تھلکتی چادر ہی
آج کوٹھے پر لگا دو میرے سونے کا پلنگ

کس قدر حسین تشبیہہ ہے!

ایک اور جاندار تشبیہہ ملاحظہ ہو ؎

بیگما نے لے لیا شیشہ تو سارے گھٹ گئیں
کیا طرح بن کے ہیں اس سے غٹا غٹ بوتیں

"غٹ غٹ" کے لفظ نے جان ڈالدی۔

اکثر کیاری میں سہواً پانی ڈالنا بھول جاتے ہیں۔ ایسی خشک کیاری کی تر تشبیہہ دیکھئے ؎

لعلی نرگس کی جو کیاری میں نہ دیکھا پانی
ہے ہماری طرح تجھکو بھی کیاری آزرو

انشاء نے ہندی و ہندوستانی تاریخ سے بھی اپنی تشبیہات اخذ کی ہیں ؎

دھر مکٹ انشاء کی سر کہے جی کنہیا لعل کی
بن کے کھڑی ہو رادھکا کھیلتی ہولی ہے تیجے

لکھنؤ کے متعلق فتویٰ سنیئے ؎

ہزاروں دیوؤں کو یہاں کی پریوں نے پچھاڑا ہے
نہیں یہ لکھنؤ کے راجہ اندر کا اکھاڑا ہے

چوسر عورتوں کا مرغوب کھیل تھا۔ اس میں ہار جیت لازمی تھی۔ لیکن کھسیانی بلی کھمبا نوچے ہارنے والی اپنی فطری جبلت پر اترا تی اور جیتنے والی کو کوسنے لگتی ؎

یوں لگی کوسنے چوپڑ میں جو ہاری وہ پری
ستی ہو جائے ومن مر ترا ارابہ تو بہ جائے

آنکھوں کو کنہیا جی سے تشبیہہ دیتے ہیں ؎

سینکڑوں آنکھیں کنہیا بن کے مخلوط ہو گئیں
کیوں کر انشاء ناف کو تیرے نہ سمجھے بندرابن

ایک اور عجیب تشبیہہ ملاحظہ ہو ؎

ہے نہر اسمیں تو دو موہی سانپ سے بھی قہر
نیفہ میں تیرے جو ہے بجیلہ ازار بند

ازار بند کو دو موہی سے تشبیہہ دینا داد طلب ہے۔

ایک اور بالکل جدید تشبیہہ دیکھئے ؎

گھڑی جیسے فرنگی بولتی ہے دل بھی ہے یوں ہی
یہ خطرہ ہے کہ تو کوئی بگاڑ اس کی نہ کل ڈالے

گھڑی بھی ٹک ٹک کرتی ہے اور دل بھی دھڑکتا ہے۔ دونوں نازک چیزیں ہیں۔ یہ تشبیہہ تو بیسویں صدی کی معلوم ہوتی ہے۔

ان تشبیہوں کے علاوہ انشاء اور رنگین دونوں کے ہاں کچھ فحش تشبیہیں بھی ملتی ہیں۔ یہ کچھ زیادہ قابل ذکر نہیں ہیں۔

ریختی اگرچہ انشاء نے رنگین کے بعد اور ان کے اتباع میں کہی تھی، جیسا کہ خود رنگین نے کہا ہے ؎

ریختی کہنا اجی رنگیں کا یہ ایجاد ہے
منہ چڑھاتا ہے موا انشاء جیا کس واسطے

اور کہتے ہیں ؎

زبس ہے ریختہ ایجاد رنگیں
اسی خاطر کہا کرتا تھا اکثر
موا انشاء بھی اب کہنے لگا ہے
چہ خوش اس حیونٹے کے بھی ہوئے پر

لیکن حق یہ ہے کہ انشا کی ریختی گوئی کو مُنہ چڑھانے سے تعبیر کرنا کھسیانے پن کی دلیل ہے اور انشاء کے ساتھ رقیبانہ سلوک ہے۔

شمالی ہند میں اولیت کا سہرا رنگین کے سر سہی لیکن انشاء بحیثیت مجموعی رنگین سے پیچھے نہیں۔ بلکہ اکثر جگہ ایک قدم آگے ہی ہیں۔ مثلاً تشبیہات میں۔ دونوں کی تشبیہات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انشاء رنگین سے بہتر ہیں۔ رنگین نے بعض تشبیہیں بہت عُمدہ دی ہیں بعض بہت جاندار ہیں۔ بعض بہت نادر ہیں۔ مثلاً جونک والی یا چکنی کی اور بعض بہت رنگین و تغزل آمیز ہیں۔ مثلاً ؎

برسات اس کو کہتے ہیں جی جس بہار میں
سر پر ہوا کے ہوتی ہے بادل کی اوڑھنی

لیکن رنگین کی سب تشبیہات یکساں ہیں اور سب سامنے کی ہیں ان میں کوئی تنوع اور جدت نہیں۔ برخلاف اس کے انشاء کی تشبیہات اکثر نئی اور عُمدہ ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف چند پُرانی تشبیہات کو اپنے خاص انداز بیان سے مانجھنے پر اکتفا کرنا پسند نہ کیا بلکہ انہوں نے اپنے گرد و پیش پر تنقیدی نظر ڈالی اپنے ماحول کا بہ امعانِ نظر مطالعہ کیا اس کے بعد انہوں نے اس سے تشبیہات اخذ کیں۔ اسی لئے ان میں ندرت جدت اور تازگی ہے۔

اصل میں اس نمایاں فرق کی سب سے بڑی وجہ اپنی اپنی طبیعتوں کا خاصہ بھی ہے انشا کی سی جودت طبع اور اختراع دماغ رنگین میں نہ تھا انشاء کی سی ہمہ گیر طبیعت بھی نہ پائی تھی۔ اسی لئے ان کے ہاں انشاء کا سا تنوع اور رنگا رنگی بھی نہیں۔

ہندی تاریخ سے اس قدر اور ایسی تشبیہات کسی ریختی گو شاعر نے بھی نہیں لیں۔ یہی ان میں اور دوسرے ریختی گو شعرا میں نمایاں فرق ہے بعد کے ریختی گویوں نے اس زمین کو آسمان بنا دیا ہر قسم کے مضامین ادا کئے لیکن ہندی تاریخ سے ایسی تشبیہات کسی نے نہیں لیں۔

انسانیت کی کشمکش

حضرت سروش ملیح آبادی

ہے بھڑک جانے کو مضطر وقت کا آتش فشاں
اپنے جبڑوں سے مگر شعلے اگل سکتا نہیں

پنجۂ بھارت میں اک خنجر ہے مثلِ آفتاب
نیام کے اندر دمکتا ہے ابل سکتا نہیں

گو وفورِ درد سے سینہ ہوا جاتا ہے شق
چشمِ عالم سے مگر آنسو نکل سکتا نہیں

سامنے ہے شامِ یلدا کا ستونِ روشنی
دیکھتا ہے کارواں صحرا میں چل سکتا نہیں

پھونک رہا ہے وقت کی بھٹی میں سونا روح کا
تپ رہا ہے دیر سے لیکن پگھل سکتا نہیں

طاق میں انسانیت کے مضطرب ہے اک چراغ
ایک مدت سے دھواں اٹھتا ہے جل سکتا نہیں

ساحلِ مشرق پہ مضطر ہے سفینہ مہر کا
صبح کے پُرنور دریا میں مچل سکتا نہیں

سر سے اونچا اٹھ چکا ہے وقت کا گرزِ غضب
دیوِ استبداد کے سر کو کچل سکتا نہیں

کھولتا ہے خون مزدوروں کی نبضوں میں سروش
ہڈیوں کو توڑ کر باہر نکل سکتا نہیں

دھندلکے

دیہاتی افسانہ

جناب اختر ملیح آبادی

گاؤں کے باہر لمبے پیڑوں کی پھنگیوں پر سورج کی پیلی کرنیں اس طرح مچل رہی تھیں جیسے ماں کی گود میں اس کا لاڈلا مچلتا ہے۔ گاؤں کے چاروں طرف مٹیالے رنگ کے بگولے اٹھ رہے تھے کچھ دیر بعد پیڑوں کی پھنگیوں پر سے کرنیں غائب ہو گئیں اب آسمان پر سرخی پھیل گئی تھی اور ان سرخیوں کے پیچھے شام کے دھندلکے بڑی آن بان کے ساتھ آ رہے تھے۔ پنگھٹ کی طرف سے گاؤں کی عورتیں اور کنواریاں بھرے پانی کے گھڑے سروں اور کولھوں پر رکھے آ رہی تھیں ان کے سرخ، سبز، سیاہ لہنگے اور رنگ رنگ کے دوپٹے ہوا میں لہرا رہے تھے کنواریوں کے رنگ رنگ کے دوپٹے جو سینوں سے ڈھلکے ہوا میں لہریں لے رہے تھے وہی سماں پیدا کر رہے تھے جو فصل کے زمانے میں پکی فصل کے پودے اور بالیاں دکھاتی ہیں۔ یہ کنواریاں ہنستی، ایک دوسرے کو چھیڑتی آ رہی تھیں ان کی چوڑیوں کی جھنکار فضا میں نغمہ بکھیر رہی تھی۔ ان کے سروں پر سے کوّے، طوطے، اور چڑے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے تھے!

دھندلکے گاؤں پر چھا چکے تھے لیکن "دینو" اس خمیدہ کمر پیڑ سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا۔ جو تالاب کے کنارے جھکے ہوئے بڈھے کی طرح کھڑا سستایا کرتا تھا۔ "دینو" کھڑا کنواریوں کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ ان کی کمروں کی لچک، ان کے عریاں سینے، ان کی سادہ مسکراہٹیں اور ان کی معصوم باتیں سن رہا تھا، لیکن دینو ان میں سے کسی کا منتظر نہ تھا وہ تو کسی اور دیہاتی دوشیزہ کا منتظر تھا۔ جس کا نام تھا "چمپا" ——— دینو نے دیکھا چمپا آ رہی تھی چوڑیوں، اوڑنی اور پیر کے کڑوں کی آواز قریب آ گئی تھی۔ چمپا پیلی چھینٹ کا لہنگا پہنے تھی۔ جو ہر ٹھوکر پر پیچ و خم کھا رہا تھا۔ چھوٹی سی لال انگیا پہنے تھی، اس کا پینڈولی کے رنگ کا سفید اور سڈول پیٹ کھلا تھا۔ ہرے رنگ کا دوپٹہ شانوں پر پڑا ہوا اٹھکھیلیاں کر رہا تھا۔ اس کے سر پر پانی کا گھڑا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گھڑا سنبھالے تھی اس کے سینے کا ابھار اور زیادہ ہو گیا تھا جب چمپا قریب سے گزری تو دینو نے پکارا "چمپا"۔ چمپا نے مڑ کر کہا: "کون ہے؟" دینو بولا۔ "میں ہوں کیا ڈر گئیں؟" دینو آڑ سے نکلتا ہوا کہنے لگا اور ہنسنے لگا۔ چمپا نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ سینہ پر ڈالا اور کہنے لگی "کسی دن میں ڈر نہ جاؤں ایسے نہ پکارا کرو"۔

"اور میں تمھیں ایک دن ڈراؤں گا دیکھوں تمھارا کیا حال ہوتا ہے"۔ دینو کہنے لگا۔

"میرا گھڑا ٹوٹ جائے گا دوسرا گھڑا بھی نہیں ہے"

"میں لا دوں گا ... میں تمہیں چاندی کا گھڑا بنوا دوں گا —— چاندی کا گھڑا"۔ یہ کہہ کر دینو ہنسنے لگا۔

"چاندی کا گھڑا ...."

"میری فصل پک جائے تو کیا مشکل ہے ہم کسان ہی تو زمینداروں کو سونے کی اینٹیں دیتے ہیں چمپا کے لئے چاندی کا گھڑا لانا کون مشکل بات ہے"

"میں چاندی کا گھڑا نہ لوں گی"

"کیوں"

"چاندی کے گھڑے کے لئے سونے کا ساگر ہونا چاہیئے مٹی کا کنواں نہیں"۔ یہ کہہ کر چمپا ہنسنے لگی۔

"ہمارے پریم کا ساگر سونے کا ساگر ہے تم اس میں سے پانی لانا اور ہم دونوں پریمی پریم کے ساگر کا پانی پی کر ایک دوسرے سے پریم کیا کریں گے ..... ادھر کیا دیکھ رہی ہو چمپا ...؟"

"کل باغ کے پاس کیشو ملا تھا، تاڑی خانہ سے آ رہا تھا مجھ سے کہتا تھا میں تمہارا پریم بگاڑ کر رہوں گا اور .... کہتا تھا مجھے مرنا پڑے گا ...."

"چھوڑ دو چمپا یہ باتیں نہ یاد کرو۔ ہمارے پریم سے کیشو جلا جاتا ہے۔ اگلی فصل پر میں روپیہ جمع کر لوں تو تم سے بیاہ کر لوں گا پھر ہم دونوں ...

"اگلی فصل پر..." چمپا نے خوش ہو کر لیکن منہ پھیرتے ہوئے پوچھا
"ہاں چمپا کچھ دن اور باقی ہیں... میں تمہارے لیئے چاندی کے گہنے بنوا دوں گا چوڑیاں ہنسلی، کڑے پھر تمہیں یہ پیتل کے کڑے اتار دینا پڑیں گے"

"میں نے تو کبھی چاندی کی صورت بھی نہیں دیکھی"

"میں تمہارے لئے چاندی کے گہنے لاؤں گا جیسے تم عمر بھر پہنا چمپا... میں محنت کروں گا اور تمہارے لئے گہنے بنوا تا رہوں گا نئے نئے سندر گہنے" یہ کہہ کر دینو چمپا کے قریب آ گیا اور اپنا منہ چمپا کے منہ کے قریب کر دیا۔"

دوپہر کو گاؤں بھر میں ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔ چمپا پیڑ کے نیچے سائے میں بیٹھی تھی۔ ٹانگیں پھیلی تھیں۔ لہنگا سمٹ کر اوپر چڑھ آیا تھا۔ صاف پنڈلیاں دکھائی دے رہی تھیں، پیروں میں پیتل کے کڑے تھے یہی اس کے پاس ایک زیور تھا۔ دوپٹہ الگ پڑا تھا وہ پنکھے بنا رہی تھی۔ جب تک اس کی ماں اچھی رہی وہی پنکھے بناتی تھی اب چمپا یہ کام کرتی تھی کیونکہ کھانے کا یہی ایک ذریعہ تھا ابھی تھوڑی دیر ہوئے کیشو اس کی ماں کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا۔ اگرچہ کیشو اس کا رشتہ دار تھا لیکن چمپا اس سے نفرت کرتی تھی اسی لئے وہ کیشو کے ساتھ بیاہ کرنے پر راضی نہ ہوئی تھی وہ جانتی تھی کہ کیشو اس کی ماں کو خوش کرنے کی فکر میں ہے۔

اتنے میں چمپا کی سکھی "روپی" آ گئی۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں آج "روپی" نے ایک نیا زیور پہنا تھا اور وہی چمپا کو دکھانے آئی تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد روپی کہنے لگی "دیکھو چمپا کتنی سندر چوڑیاں ہیں"

"بہت اچھی ہیں...... بالکل نئی ہیں" اور روپی ہنس کر کہنے لگی یہ اور کیا یہ تو ابھی ابھی سنار کے پاس سے آئی ہیں"

"جب ہی اتنی چمک رہی ہیں...... میرے پاس چاندی کا ایک بھی گہنا نہیں ہے" چمپا اداس ہو گئی۔

"جب تیرا بیاہ ہو گا تو تیرا بینی بھی گہنے لائے گا.... ایسے آدمی سے بیاہ کرنا جو گہنے لا دے۔ اچھا" روپی نے چمپا کے چٹکی لی اور ہنسنے لگی۔ چمپا جھینپ گئی۔ اُسے دینو کا وعدہ یاد آ گیا تھا دینو نے بہت سے نئے چاندی کے گہنے لانے کا وعدہ کیا ہے۔ چمپا سوچنے لگی وہ دن آئے گا تو وہ بھی روپی کی طرح گاؤں میں پھر کر سب کو اپنے گہنے دکھائے گی۔ چوڑیوں کی جھنکار نے چمپا کے خیالات منتشر کر دیئے۔ روپی ہنستی اور چوڑیوں کو دیکھتی جا[رہی تھی] اور چمپا پھر کچھ سوچنے لگی۔ وہ دُور کھیتوں کے پاس پار چرتے ہو[ئے] جانوروں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا تخیل اسے دُور گہنے دکھا رہا [تھا] چاندی کے چمکیلے گہنے جو دھوپ میں اور چمک رہے تھے پھر گہنے چمپا کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ چمپا کو ہنسی کی ہنسی [...] ڈراؤنی معلوم دی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں — پیڑ کو[...] پر کوا بیٹھا کاؤں۔ کاؤں کر رہا تھا — چاندی کے گہنوں [کا] تخیل مٹ چکا تھا — !!

گاؤں بھر میں ڈپٹی صاحب کے پڑاؤ کی خبر پھیل گئی تھی گاؤں والوں کو ڈپٹی صاحب کا آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ بہتوں [کو] ان کے کھیتوں سے بیدخل کرتے کسی کو سزا ہو جاتی۔ کئی کو جرما[نے] ہوتے۔ اس کے علاوہ بیگار مفت لی جاتی لیکن گاؤں کے لڑ[کے] اور لڑکیاں بہت خوش ہوتیں۔ گاؤں سے فاصلہ پر بڑے میدا[ن] میں خیمے لگ رہے تھے۔ تحصیل دار نے کیشو کو بھی کام پر لگا [دیا] تھا۔ گاؤں کے لڑکے ٹولیاں بنا بنا کر پڑاؤ اور اس کی چہل پہل [دیکھنے] جا رہے تھے۔ رات کو گاؤں کی کنواریاں جاتیں۔ چمپا کا بھی [جی] چاہتا تھا۔ اس نے سُنا تھا ڈپٹی صاحب کا ہاتھی بھی آیا ہے۔ ایک د[فعہ] کسی کا ہاتھی گاؤں سے گزرا تھا تو وہ ڈر گئی تھی۔ چمپا کا شوق اور بڑھ گیا تھا لیکن چمپا کی ماں اُسے جانے نہ دیتی تھی۔

رحمان ڈپٹی صاحب کا خاص نوکر تھا اور کیشو کا دوست [تھا] ہی نے کیشو کو تحصیل میں ملازمت دلائی تھی اب کیشو اس کوشش میں تھا اسے گاؤں میں کچھ کھیت معافی میں مل جائیں اور وہ آرام سے زند[گی] گزارے لیکن ابھی کامیابی نہ ہوئی تھی اس مرتبہ کیشو نے پھر رحمان سے کہا، رحمان کہنے لگا: "کوشش کر رہا ہوں شاید کامیابی ہو جائے پر تم ایک کام کرو تو آج کام ہو جائے" کیشو نے پوچھا "ہاں۔ بتا" رحمان کہنے لگا۔

"بات یہ ہے کہ صاحب ذرا رنگیلے آدمی ہیں انہیں عورتیں بہت پسند ہیں اگر کسی کو لا سکتے ہو تو لے آؤ۔ صاحب خوش ہو جائیں گے...... کام ہو جائے گا"

"لیکن گاؤں کی لڑکی بھلا صاحب کیا پسند کریں گے"

"تو کیا جانے میں صاحب کی طبیعت پہچانتا ہوں.....
انہیں عورت چاہیئے۔ عورت، چاہے شہری ہو یا دیہاتی..؟" دو

کیشو نے وعدہ کر لیا لیکن وہ سوچنے لگا۔ گاؤں میں کسبیاں بھی تو نہیں رہتیں پاس والے گاؤں میں ایک کسبی رہتی ہے لیکن وہ ٹھاکر صاحب کی ہے لیکن اس نے تو وعدہ کر لیا تھا اور اب اُسے الجھن ہونے لگی، راستہ بھر وہ یہی سوچتا رہا ـــ شام کو اُسے پہرہ پر جانا تھا۔ صاحب کو رحمان نے بتا دیا ہوگا۔ یہ تو بُرا ہوا۔ نوکری الگ جائے گی سزا مفت میں ملے گی اب وہ بہانہ ڈھونڈنے لگا کوئی بہانہ کر دے گا جان بچ جائے گی۔ کل قصبہ سے کسی کو لیتے آئے گا۔ کیشو پڑاؤ کی طرف چلا۔ شام کے دھندلکے بازو پھیلانے لگے تھے۔ پنگھٹ پر چمپا اکیلی مل گئی کیشو کہنے لگا: "چل تجھے پڑاؤ دکھا لاؤں ..... دیکھ شہر بسا ہے شہر بہت سے آدمی، کئی سو خیمے، چھولداریاں۔ گھوڑے اور ہاتھی ... تیری ماں تو بیمار ہے ابھی تھوڑی دیر میں آ جانا کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا" چمپا کا دل دھڑک اٹھا۔ گاؤں کی تمام لڑکیاں دیکھ آئی تھیں لیکن وہ ابھی تک نہیں گئی تھی۔ اور کیشو کے ساتھ ہو لی۔ کیشو راستہ بھر کچھ جی ہی جی میں سوچتا رہا۔ پڑاؤ کے قریب پہنچ کر کیشو نے اُسے اپنی چھولداری میں بٹھا دیا اور خود رحمان سے جا کر کہنے لگا "رحمان بھیا۔ ایک چیز لایا ہوں جو اور میں ایسی نہ ملے گی ... وعدہ نہ بھول جانا"

"اب تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ کئی کھیت کے مالک ہو گے اچھے خاصے زمیندار" اور کیشو نے چھولداری کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں چمپا بیٹھی تھی ـــ!

کیشو پہرہ دے رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ صاحب اور چمپا کے خیمے سے بھی اب آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں جب کیشو آدھی رات کے بعد سونے گیا تو اس نے خواب میں دیکھا اس کے کھیت لہلہا رہے ہیں۔ پکی فصلیں مسکرا رہی ہیں اور کیشو انہیں دیکھ کر خوش ہو رہا ہے لیکن کھیت کے پاس اس کی نظر چمپا پر پڑی جو کھڑی زار زار رو رہی تھی اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ بال الجھے اور رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ چمپا کہہ رہی تھی "تم نے دھوکے سے میری آبرو برباد کرا دی اس کے بدلے میں تمہیں کھیت ملے لیکن خوش نہ ہو یہ کھیت بھی تباہ ہو جائیں گے اور تمہاری امیدیں پوری نہ ہوں گی ..." اور جب کیشو نے پھر کھیتوں کی طرف دیکھا تو کھیت مرجھا چکے تھے اور کیشو کو دیکھ کر بُری ہنسی ہنس رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہی کیشو بے ہوش ہو کر زمین پر پڑا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ پہرہ داروں کی آواز گونج رہی تھی اس نے دوسری کروٹ لی اور سو گیا ـــ!

گاؤں میں چمپا کے گم ہو جانے کے چرچے تھے۔ سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے "چال چلن کی اچھی نہیں تھی۔ ۔"

دوسرا کہتا "جب ہی تو بھاگ گئی"

تیسرا کہتا "ادھر وہ بہت آنکھیں لڑایا کرتی تھی۔ ۔"

چوتھا کہتا "جانے دو بھاگ گئی اچھا ہوا گاؤں سے پاپ مٹا۔ ۔ ۔ ۔ بدمعاش لڑکی کے جانے کا رونا ہی کیا" لیکن دینو کہتا "چمپا بُرے چال چلن کی نہیں تھی ۔ ۔ ۔ وہ بھاگی نہیں اُسے کوئی بہکا کر لے گیا ہے" اور بہت سے کسان دینو کی بے وقوفی پر ہنسنے لگتے تھے۔

دو تین دن تو صاحب نے چمپا کو اپنے خیمہ میں رکھا۔ چوتھے دن چمپا کہیں بھاگ گئی۔ یہ بات رحمان نے کیشو کو بتائی تھی اور یہ سن کر کیشو ہکا بکا رہ گیا تھا ـــ اب کیشو اپنے کئے پر نادم بھی ہوا تھا لیکن یہ سب دکھاوا تھا۔ کیشو جب دینو کو چمپا کا کھوج لگاتے دیکھتا تو طنزیہ ہنس ہنس کر کہتا "کیوں دیوانے ہوئے ہو چھوڑو بھی پاپ کے خیال کو تم چمپا کو پہچان نہ سکے وہ تو لالچی تھی کسی نے اُسے گہنے دیئے اور وہ اُسی کے ساتھ بھاگ گئی" کیشو تو یہ کہہ کر چلا جاتا لیکن تنہائی میں دینو کے کانوں میں چمپا کی آواز سنائی دیتی "دینو تم کیشو کے کہنے پر یقین نہ کرنا یہ جھوٹا ہے، دغا باز ہے، اسی نے میری جان لی ہے اسی نے مجھے دھوکا دیا ہے" اور بیر کی پتیاں، جنگل کے درخت اور دور بیٹھی ہوئی فاختہ کہتی "ٹھیک ہے چمپا ٹھیک کہتی ہے وہ معصوم ہے کیشو ہی نے اُسے دھوکا دیا ہے" اور دینو کیشو کی طرف جھپٹ پڑتا تا کہ رستے ہی میں اُسے مار ڈالے لیکن کیشو پہلے ہی وہاں سے بھاگ جاتا ـــ!

دینو اُسی خمیدہ کمر درخت کے پاس کھڑا پنگھٹ کی طرف دیکھ رہا تھا اُسے چمپا کا انتظار تھا۔ پنگھٹ سے کنواریاں پانی کے گگرے سروں پر رکھے آ رہی تھیں، سلکا رنگ بھیگے، دوپٹے، اُن کے آدھے کھلے ہوئے پیٹ اور ابھرے سینے دُور سے نزدیک اور نزدیک سے دُور ہو جاتے تھے، شام کے دھندلکے پھیل رہے تھے اور دینو چمپا کو گگرا سر پر رکھے آتا دیکھ رہا تھا چھینٹ کا لہنگا۔ چھوٹی سی لال کرتی نیچے کا پیٹ کھلا ہوا ہرا دوپٹہ سانپ کی طرح لہراتا ۔ ۔ ۔ جب چمپا قریب آئی تو دینو نے پکارا "چمپا ۔ ۔ ۔"

"کون ـــ؟"

"میں ہوں دینو کیا تم ڈر گئیں ۔ ۔ ۔ تم کہاں چلی گئی تھیں۔ کیسا

تم نے مجھے بھلا دیا تھا۔ گاؤں والے تم پہ عیب لگانے لگے تھے میں کہتا تھا چمپا بھاگی نہیں وہ بُرے چال چلن کی نہیں ہے، اُسے چاندی کے گہنے نہیں بھگا لے گئے۔ اور سب مجھ پہ ہنستے تھے جیسے میں جھوٹ کہتا تھا...... میں نے تم سے گہنے بنوانے کو کہا تھا میری فصل پک جائے میں چاندی کا گھڑا بنا دوں گا... تم سے بیاہ کر دوں گا اور پھر ہم تم دونوں ایک ساتھ رہیں گے کبھی نہ الگ ہوں گے ہم کو کوئی الگ نہ کر سکے گا...." یہ کہہ کر دینو آگے بڑھا کہ چمپا کی کمر میں ہاتھ ڈال دے لیکن چمپا وہاں کہاں تھی؟ وہ تو دینو کا خیال ہی خیال تھا — البتہ شام کے دھندلکے گاؤں پر چھائے تھے، کالی کالی بدلیوں کی طرح — !

جب رات کے دھندلکے آپس میں مل گئے تو جنگل سے کوئی پکار اٹھا "چمپا... چمپا..." آواز دور ہوتی گئی دھندلکے پھیلتے رہے دھوئیں کی طرح اور آواز بھی ان دھندلکوں میں گھل مل گئی — !!!

یادِ شباب

نظم

جناب پنڈت امار جیت شرما

عجب وہ نور کا منظر تھا آفتاب کے ساتھ
عیاں تھیں حسن کی نیرنگیاں حجاب کے ساتھ
سکون قلب کو ملتا تھا اضطراب کے ساتھ
مگر یہ راز کھلا دورِ انقلاب کے ساتھ
مزہ حیات کا حاصل تھا کچھ شباب کے ساتھ

نہ وہ حصولِ مسرت کی آرزو باقی!
شرابِ ناب کے پینے کی وہ نہ خُو باقی
نہ وہ خوشی کا فسانہ نہ گفتگو باقی!
گُلِ حیات وہ باقی نہ اُس کی بُو باقی
کہاں وہ جوشِ جنوں سر میں اضطراب کے ساتھ

دیا تھا جس نے کبھی رُوح کو پیامِ حیات
ملا تھا جس کے سبب لطفِ زندگی دن رات
بھلائے بیٹھا ہے دل اب اُسی کے احسانات
اسی کی دل میں کھٹکتی ہے خار بن کر بات
انھی کا نام لبوں پر ہے اجتناب کے ساتھ

گیا وہ دورِ زمانہ اڑا وہ رنگِ چمن!
نشاط و عیش کے منظر ہوئے ہیں وقفِ محن
لہو رولاتی ہے آنکھوں کو داستانِ کہن
دلِ حزیں کو ہے اب آرزوئے گور و کفن
ثوابِ زیست کا ہے ذکر بھی عذاب کے ساتھ

کہاں وہ ساقی و مطرب کہاں وہ میخانہ
کہاں وہ بادۂ گلگوں کہاں وہ پیمانہ
ہوا میں ہوش اڑا ہے خیالِ مستانہ
نہ کوئی بات ہے اگلی نہ کوئی افسانہ!
گمانِ بحر ہی جاتا رہا سراب کے ساتھ

وعدۂ وفا

قضا سے پوچھ وہ آتی ہے یا نہیں آتی؟

جناب قاری شاہ عبدالمجید مضطر

وفا تو خیر وفا ہے جفا نہیں آتی
ابھی شباب کی کوئی ادا نہیں آتی

بہار بن کے چمن میں گھٹا نہیں آتی
بکھر کے دوش پہ زلفِ رسا نہیں آتی

کیا تھا خواب میں آنے کا اس نے کیوں وعدہ
کہ نیند آنکھ میں شب بھر ذرا نہیں آتی

تجھے بھی پاس اسیروں کا کچھ نہیں بجلی
کہ جا کے آگ چمن میں لگا نہیں آتی

اسے بھی ملتی ہے کیا لذتِ قدم بوسی
کہ پھر پلٹ کے چمن میں حنا نہیں آتی

تمہاری نرگسِ بیمار کو بھی دیکھ لیا
کسی کو دردِ جگر کی دوا نہیں آتی

میں خود ہوں جان کا دشمن ابھارتے کیا ہو
یہ کیا کہا کہ کسی کو وفا نہیں آتی

اگر یہ سچ ہے وہ اے نامہ بر نہیں آتے
قضا سے پوچھ وہ آتی ہے یا نہیں آتی

دل اپنا ڈھونڈتا پھرتا ہوں کوئے جاناں میں
اور اُن لبوں پہ ہنسی تک ذرا نہیں آتی

میں اور تم کو کہوں بیوفا معاذ اللہ
تمہارے وعدہ کو لیکن وفا نہیں آتی

یہ ذوقِ حُسن پرستی یہ وضع اے مضطر
ذرا حیا تجھے مردِ خدا نہیں آتی

غزل کی اہمیت

ایک تبصرہ

جناب عبادت بریلوی ایم۔ اے

آج کل پرانی چیزوں سے بغاوت کی کچھ ایسی روچل نکلی ہے کہ خواہ ان میں سے بعض میں اچھائیاں بھی ہوں لیکن چونکہ وہ پرانے زمانے کی ہیں اس لئے ان لوگوں کے نزدیک قابل قبول نہیں جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ ہر چیز کو بدل دیا جائے۔ دنیا ایک نئے کلچر۔ ایک نئی تہذیب اور ایک نئے نظام کا پرچار دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ان کے نزدیک زندگی میں نئی قدروں کا پرچم لہرانے کے لئے سب سے پہلا ضروری قدم یہ ہے کہ ان کو سب سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں ان کا نظریہ عقلیاتی اور منطقی ہونے کی بجائے جذباتی زیادہ ہے۔ وہ اس معاملے میں دماغ کی بجائے دل سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ ان اعتراضات کے جواب میں بھی اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس میں بھی جذباتیت Sentimentalism کو زیادہ دخل ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وقت کے اس اہم مسئلے پر ٹھنڈے دل سے عقل کی روشنی میں غور کیا جاتا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان ابھی تک اس سے محروم ہے اس منزل سے کوسوں دور ہے۔ وہ تاریکی میں بھٹک رہا ہے۔ آج جب غزل کو ایک طرف فرسودہ چیز سمجھ کر گلا گھونٹ دینے کی کوشش کی جارہی ہے اور دوسری طرف اس کو نیم وحشی صنف ادب کہا جارہا ہے۔ ضروری ہے کہ ان حالات میں غزل کے متعلق ہر سمجھدار انسان تنقید ادب کے صحیح اصول کی روشنی میں غور کرے۔

غزل وہ صنف سخن ہے جس کا وجود سوائے فارسی کے اور کہیں نہیں ملتا۔ فارسی کے ذریعہ یہ اردو میں پہنچی اور پھر دوسرے ملکوں نے بھی اس کو اپنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ترکی زبان میں بھی غزلیں ملتی ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ صنف سخن فارسی ہی میں پیدا ہوئی فارسی ہی میں پروان چڑھی۔ اور فارسی غزل گو شعراہی نے اس کو معراج کمال پر پہنچایا اور اپنے ایسے ایسے شاہکار پیش کئے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آج ہم ان پر سر دھنتے ہیں۔ اور جب تک انسان کے جذبات واحساسات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، وہ انسانیت کے دلوں پر قبضہ کئے رہیں گے۔ انسان ان کے نغموں پر ہمیشہ جھوم جھوم اٹھے گا۔

غزل کی داغ بیل سب سے پہلے ایران میں رودکی کے ہاتھوں پڑی۔ جو آج بھی غزل کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ اس سے قبل ایران کی شاعری میں غزل کا کوئی علیٰحدہ وجود نہیں ملتا۔ اس سے قبل ایران کی شاعری میں قصیدے کا رواج تھا۔ قصیدے ہی میں عشقیہ اشعار کو جگہ دی جاتی تھی شعرا اسی میں اپنا زور طبع دکھاتے تھے۔ اس چیز کو عربی میں "تشبیب" کہتے ہیں۔ رودکی نے قصیدہ سے ان عشقیہ اشعار کو الگ کیا۔ لیکن ان کی صورت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی چنانچہ آج ہم اس چیز کو غزل کے نام سے جانتے ہیں۔ رودکی کی غزلوں میں بڑی دلکشی ہے۔ اور وہ اپنے وقت کا مسلم الثبوت استاد تھا۔ عنصری نے لکھا ہے ؎

غزل رودکی وار نیکو بود   غزلہائے من رودکی وار نیست

غرض رودکی نے یہ پودا لگایا۔ اور مختلف شعرا مثلاً دقیقی۔ حکیم سنائی۔ واحدی۔ مراغی۔ فریدالدین عطار۔ عراقی۔ مولانا روم سعدی۔ خسرو۔ حسن۔ سلمان۔ خواجو اور حافظ وغیرہ نے اس کو سینچ سینچ کر سرسبز و شاداب رکھا۔ حتیٰ کہ اس نے نئے نئے رنگ کے گل بوٹے کھلائے۔

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے بات کرنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عورت ہمیشہ ہمیشہ سے دنیا میں انسان کی محبوب ترین چیز رہی ہے اور ہر دل و دماغ پر اس نے ہر دور میں بے پناہ اثر کیا ہے بڑے بڑے شاعروں۔ انشا پردازوں اور فلسفیوں نے اس کے متعلق عجیب عجیب باتیں کہی ہیں۔ وہ حقیقتاً جیسا کہ Hargrave نے لکھا ہے دنیا کی شاعری ہیں بالکل اسی طرح جیسے ستارے آسمان کی شاعری ہیں۔ وہ ایسے ستارے ہیں جو انسان کی قسمت پر حکومت کرتے ہیں۔

"women are the poetry of the world in the same sense as the stars

are the poetry of heaven, clear, light-giving harmonious; they are terrestial planets that rule the destinies of mankind

پس غزل نے اگر دنیا کی شاعری کو اپنا موضوع بنایا تو کوئی تعجب نہیں۔ چنانچہ عرصہ تک وہ عورت مرد کے تعلقات کے بیان پر مشتمل رہی علامہ شبلی نے لکھا ہے "غزل کی تحریک عشق و محبت کے جذبات سے ہوتی ہے۔ لیکن ایران میں مدت تک جنگی جذبات کا زور رہا۔ غزل کی ترقی کی تاریخ تصوف سے شروع ہوتی ہے۔ تصوف کا تعلق تمام تر واردات اور جذبات سے ہے اور اس کی تعلیم کی پہلی ابجد عشق و محبت ہے۔ تصوف کی ابتدا اگرچہ تیسری صدی کے آغاز میں ہوئی لیکن پانچویں صدی اس کے اوج شباب کا زمانہ ہے۔ اور یہی زمانہ غزل کی ترقی کا پہلا نوروز ہے" (شعر العجم) عشق و محبت انسان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ وہ تو گویا انسان کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ جو ہمیشہ ہمیشہ انسان کے دم کے ساتھ رہے ہیں اور رہتی دنیا تک رہیں گے۔ خواہ دنیا کتنی ہی مشین اور سائنس کے جھگڑوں میں پھنس جائے۔ وہ عقل و خرد کا کتنا ہی بڑا لبادہ پہن لے اس میں تہذیب و تمدن کی دیوی مسلط ہو کر جذبات کو کتنا ہی سرد کر دے لیکن وہ اس جذبے سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتی۔ دیکھئے دنیا کے بڑے بڑے دماغوں نے عشق و محبت کی تعریف میں بہترین خیالات ظاہر کیا ہے اور ان کو بہترین لباسوں میں ملبوس کر کے پیش کیا ہے Leon Gorka نے لکھا ہے کہ عشق ہی سب کچھ ہے۔ وہ کہتا ہے

dove is everything; dove is God

Richter کہتا ہے۔ وہ جگہ فردوس بریں ہے جہاں محبت کا راج ہو۔

Paradise is always where love dwe

ان تمام لوگوں کے اقوال کہاں تک کہے جائیں۔ لیکن ہی عشق و محبت کی آفاقیت سے تمام لوگ واقف ہیں وہ کبھی کسی حال میں پرانا ہونے والا موضوع نہیں۔ مشہور جرمنی شاعر Heinrich Heine نے لکھا ہے کہ عشق و محبت اگرچہ ایسی کہانی ہے جو پرانی ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود نئی ہے۔

It is an old story yet remains ever new

دنیا کے دماغوں نے جتنی طبع آزمائی عشق و محبت موضوع پر کی ہے اتنی شاید کسی اور موضوع پر نہیں کی۔ ہر ایک نے اپنے خیال کے لئے مختلف اسالیب اختیار کئے۔ عمدہ سے عمدہ لباسوں میں اپنے خیالات کو ملبوس کر کے پیش کیا۔ اور ہزاروں کو اس چیز نے زندہ جاوید بنا دیا۔ غزل بھی اظہار خیال کا ایک ذریعہ اور طریقہ ہے اور ہندوستانیوں کے اظہار خیال کا ذریعہ۔ پس آج بیسویں صدی میں بھی کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ غزل پرانے دور کی چیز تھی۔ اب اس کو ختم ہو جانا چاہئے۔ اگر غزل کو ختم کیا جائے گا تو یہ چیز پہلے سمجھ لینی چاہئے کہ اس کے ساتھ ساتھ صدیوں کی بنائی ہوئی تہذیب اس کی روایات اور اس کی افتاد طبع کا خون پہلے کر دینا ہوگا۔ اور ایکدم ایسا ہونا دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ آج بھی آپ کسی مجلس میں دیکھئے! آپ کو غزل کے ایک ایک شعر پر بیسیوں سر دھننے والے مل جائیں گے غزل کا ایک ایک شعر بیسیوں ایسی چیزوں کو ہمارے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے جس کے پس منظر میں ہم اپنی تہذیب اپنے کلچر اور اپنی روایات کو بے نقاب دیکھتے ہیں وہ سب مل کر ہم پر ایک ایسا اثر ڈالتی ہیں۔ جو ہمارے لطف کا باعث ہوتا ہے اور لطف کی اس کیفیت کا بیان الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔

ہر ادب اور اس کی اصناف سخن اس قوم اور ملک کی افتاد طبع کا پتہ دیتی ہیں۔ جو حالات و واقعات اور روایات کے سلسلے میں پرورش پاکر اس قوم کے افراد تک پہنچتی ہے۔ ہندوستانیوں کو دیکھئے کہ انگریزی موسیقی میں انھیں ذرا بھی لطف نہیں آتا۔ حالانکہ انگریز اس کی ہر تان پر سر دھنتا ہے اور اس پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی موسیقی میں انگریزوں کو کوئی دلچسپی نہیں ملتی یہ تو خیر مشرق و مغرب اور ہندوستان و انگلستان کی باتیں ہیں۔ دور کیوں جائیے آپ ایران و ہندوستان کو دیکھئے۔ ان دونوں ملکوں میں کتنا میل جول رہا ہے۔ اور وہ دونوں کتنا ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں اس کی مثال شاید ہی کہیں اور ملے۔ لیکن آج کل ایران جدید کی موسیقی ہمارے لئے مطلق دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتی۔ آج سے کچھ سال پہلے میرے استاد پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب صدر شعبہ اردو و فارسی بغرض سیر و سیاحت ایران تشریف لے گئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ وہاں کئی ایسی محفلوں میں شریک ہوئے جن میں موسیقی کے کمال دکھائے گئے لیکن انھوں نے اس سے مطلق اثر قبول نہ کیا۔ حالانکہ وہ ہندوستانی موسیقی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ لیکن اتنا دور کیوں جائیے۔ آپ اپنے ہی ملک کے مختلف طبقوں کو دیکھئے آپ کے یہاں کے دیہاتی، پاکسان وغیرہ جس طرح گاتے بجاتے ہیں اور اس میں لطف لیتے ہیں آپ کو اس سے لطف نہیں آتا۔

بلکہ اگر آپ کبھی ایسی جگہ پھنس جائیں تو آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔ اگر ان کی کوئی صحبت رات کو آپ کے پڑوس میں اپنی موسیقی کی تانوں سے ساری بستی کو سر پر اٹھائے تو آپ کی نیند حرام ہو جاتی ہے ذہنی انتشار آپ کو سونے اور آرام کرنے سے باز رکھتا ہے۔ حالانکہ وہ لوگ اس میں ایک قسم کا سرور محسوس کرتے ہیں۔ بالکل یہی حال ادب کا ہے کہ وہ بھی روایات کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ اور اسی کے سائے میں ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ ہمارا ادب بھی اس سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ ہماری صنف ادب غزل بھی ہمیں اپنے آبا و اجداد سے ترکہ میں ملی ہے۔ اور ہم اس سے غیر شعوری طور پر لطف لیتے ہیں۔ اس کا ایک ایک شعر ہمارے لئے گھنٹوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔ لیکن بڑی مشکل یہ آپڑی ہے کہ ہمارے نکتہ چینوں نے اپنے دعوی کی دلیل کے طور پر ہماری غزلوں کے ایسے اشعار پیش کرنے شروع کر دیئے ہیں جن کو ہم خود بھی اچھا نہیں سمجھتے۔ ہم ایسے غزل گو شعرا کو کوئی جگہ نہیں دینا چاہتے جو شاعر نہیں بلکہ متشاعر ہیں — غزل کی شاعری اتنی آسان نہیں جتنا لوگوں نے اس کو سمجھ رکھا ہے۔ اور خصوصاً موجودہ دور میں تو غزل کی شاعری کوئی استاد دماغ Master Mind ہی کر سکتا ہے۔ ورنہ یوں تو ہندوستان کی ہر بستی میں (خواہ وہ شہر ہو یا گاؤں) ہر پڑھنے لکھنے والا شاعر ملے گا۔ جن میں سے زیادہ نے غزلیں کہہ کہہ کر دیوان بھی مرتب کر لئے ہوں گے۔ تخمینہ لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج ہندوستان میں کئی ہزار غزلیں روزانہ کہی جا رہی ہیں۔ وہ غزلیں جو اخبارات و رسائل میں چھپ کر ہم تک پہنچتی ہیں ان کی تعداد کا علم نہیں جو کہی جاتی ہیں اور ان کو اشاعت کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ جو صرف محدود حلقوں میں دلچسپی کا باعث بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گمنامی کے غاروں میں سو جاتی ہیں)۔ بات یہ ہے کہ غزل میں اظہار خیال کرنے کو لوگ آسان سمجھتے ہیں۔ میں نے کئی مشہور غزل گو شاعروں کو قافئے لکھ لینے کے بعد انہی کی مدد سے شعر کہتے دیکھا ہے۔ یعنی ان کا خیال قافئے کا تابع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی غزل کے اشعار میں مطلق جان نہیں ہو سکتی۔ اور وہ ذرا بھی ہماری طبیعتوں کو گدگدا نہیں سکتے۔ ہزاروں ایسے خیالات ہیں جن کو ہمارے قدیم غزل گو باندھ چکے ہیں۔ ایک عامی غزل کہنے والا انھیں خیالات کو ذرا الفاظ کے الٹ پھیر کے بعد باندھ دیتا ہے اور پھر دوسروں کو سنانے کے لئے بے چین پھرتا ہے۔ لیکن ان کی غزل گوئی درحقیقت غزل گوئی نہیں — ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ غزل گوئی بڑی مشکل چیز ہے۔ نئے نئے خیالات کو نئے نئے انداز سے ساتھ صرف دو مصرعوں میں سما دینا بلاشبہ دریا کو کوزے میں بند کر دینے کا مصداق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں سیکڑوں غزل گو شعرا ہوئے لیکن شہرت کی دیوی سے ہمکنار صرف چند ہوئے۔ جو حقیقتاً شاعر ہوتے ہیں ان کو زمانہ پرکھتا ہے اور زندہ رکھتا ہے۔ باقی کو گلا گھونٹ کر موت کی نیند سلا دیتا ہے۔

غزل کی شاعری بہت بلند اور مشکل قسم کی شاعری ہے۔ اس میں طبع آزمائی کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے ذہین و فطین genius ہونے کی ضرورت ہے۔ غزل میں عموماً واردات قلبی کا بیان ہوتا ہے اس لئے ہم اس کا شمار اس قسم کی شاعری میں کر سکتے ہیں جس کو انگریزی میں Lyric Poetry کہتے ہیں۔ انگریزی میں ایسے ہی خیالات اس قسم کی شاعری میں باندھے جاتے ہیں جس کے لئے غزل مخصوص ہے صرف صورت کا فرق ہے اور یہ صورت کا فرق دو قوموں کی افتاد طبع اور روایات کے اختلاف کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ وہ اصلاح کے خیال سے اس میں اتنی زیادہ تبدیلی پیدا کر دے کہ غزل اپنی موجودہ صورت میں باقی ہی نہ رہے۔ مولانا حالی نے غزل کی اصلاح کے سلسلے میں مقدمہ شعر و شاعری میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ یقیناً بالکل ٹھیک ہیں اور ہر سمجھدار انسان کے لئے قابل قبول بھی۔ غزل میں اصلاح ہو سکتی ہے لیکن غزل ہی کے دائرے میں رہ کر۔ ہم غزل کی موجودہ صورت کو مسخ کر کے نظم یا سانیٹ وغیرہ کا روپ نہیں بھر سکتے۔ اس کی صورت میں خود ایک قسم کی دلکشی ہے جو ہمیں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ غزل چونکہ انسانی جذبات و احساسات کی تصویریں پیش کرتی ہے اس لئے اس کی صورت بھی انھیں جذبات و احساسات کے عین مطابق ہے۔ ان دونوں میں ایک طرح کی ہم آہنگی ہے۔ انسان کے دل میں مختلف اوقات میں مختلف قسم کے خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک طرح پر نہیں سوچتا اور پھر جب احساس میں شدت ہو طبیعت میں انتشار ہو تو ایسی کیفیت کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ غزل کے ہر شعر میں بھی ایک نیا مضمون باندھا جاتا ہے۔ گویا اس میں بھی ایک قسم کا تنوع ہوتا ہے۔ انسان فطرتاً تنوع پسند ہے۔ غزل ہمارے لئے تنوع کا سامان فراہم کرتی ہے اس لئے صورت کے لحاظ سے وہ بالکل انسانی فطرت کے مطابق ہے پس ہمارے ایک نقاد کا یہ اعتراض کسی طرح صحیح نہیں کہ "غزل کا صوری حسن ہمارے دماغ کو جمالیاتی تسکین نہیں بخشتا"۔ (کلیم الدین احمد) اس میں تسکین پہنچانے کی صلاحیتیں موجود ہیں بشرطیکہ کوئی تسکین

حاصل کرنے کے لئے تیار ہو۔ اٹلی کے مشہور نقاد کروچے Benedetto Croce نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاعری اور آرٹ کا کوئی شاہکار اس وقت تک اپنا اثر نہیں کرتا جب تک پڑھنے والا اس سے اثر لینے کے لئے تیار نہ ہو۔

Picture poetry and every work of art produces no effect, save on souls prepared to receive them.

اور یہ حقیقت بھی ہے۔ کسی آرٹ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی طرف پڑھنے والے کا برتاؤ ہمدردانہ ہو۔ پڑھنے والا اگر اس سے بدگمان ہوا تو سمجھ لیجئے کہ اس نے اس کو سمجھنے سے ہاتھ دھو لئے۔ ہمارے کلیم صاحب کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اپنے ادب اور لکھنے والوں سے بدگمان ہیں۔ وہ ان سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ وہ مغربیت میں بُری طرح ڈوبے ہوئے ہیں اس وجہ سے انھیں ہمارے ادب کی ایک بات بھی پسند نہیں۔ ہماری کسی صنفِ ادب کو تہذیب یافتہ نہیں سمجھتے۔ اور ان کے نزدیک ہمارا ایک شاعر بھی شاعر نہیں۔ پس غزل کے متعلق بھی اگر وہ اس طرح سوچیں کہ وہ نیم وحشی صنفِ ادب ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

غزل کے اشعار میں اگرچہ ایک طرح کا انتشار رہتا ہے لیکن اس کے باوجود بقول پروفیسر فراقؔ گورکھپوری ہم ایک بڑے فنکار کی غزل کے اشعار میں ایک قسم کا ربط محسوس کرتے ہیں۔ اس کے اشعار میں ایک [illegible] سنبھلی ہوئی کیفیت ہوتی ہے۔ غزل کے بکھرے ہوئے اشعار بھی اپنے اندر ایک خاص کیفیت رکھتے ہیں۔ جس کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ سمندر یا دریا کی بیکل موجوں سے بیقرار دلوں کو تسکین ہوتی ہے۔ دیکھئے غزل کے بکھرے ہوئے اشعار اور دریا کی لہروں میں کس درجہ مناسبت ہے؟ چنانچہ غزل کے بکھرے ہوئے اشعار بھی دکھیا دلوں کی تسکین کا باعث بنتے ہیں۔ شاعری میں رنج و غم کا بیان جیسا کہ ان مغربی نقادوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ زیادہ مقبول ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ رنج و الم ہمیشہ انسان کے دم کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہاں انسان [illegible] ہے اور [illegible] زیادہ ہے۔ آج بھی بیسویں صدی میں اگرچہ دنیا تہذیب و تمدن کی سیکڑوں منزلیں طے کر چکی ہے اور سامانِ آرام و آسائش بہت زیادہ فراہم ہیں لیکن اس کے باوجود اگر کوئی غور کرے اور دنیا اور آنسوؤں کو ایک ترازو میں تولے تو آنسوؤں ہی کا پلڑا بھاری نکلے گا۔ چنانچہ Marc Andre' نے شاعری کی تعریف کی ہے کہ شاعری رنج و غم کی بہن ہے۔ ہر وہ شخص جو تکلیف اٹھاتا ہے شاعر ہے۔ ہر آنسو ایک شعر ہے اور ہر دل ایک نظم

Poetry is the sister of sorrow; every man that suffers and weeps is a poet. Every tear is a verse & every heart a poem.

انگریزی کے مشہور شاعر شیلے نے بھی اس خیال کا اظہار متعدد جگہ کیا ہے۔ ایک تو اس کا وہی مصرع جو قریب قریب ضرب المثل ہو چکا ہے

Our sweetest songs are those that tell of saddest thought

یہ ہمارے شیریں دلکش اور رسیلے نغمے وہی ہوتے ہیں جن میں رنج و غم کے خیالات کا بیان ہو۔ دوسری جگہ وہ شاعروں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ جو کچھ گیتوں کے ذریعہ سکھاتے ہیں بڑی ہی تکلیف کے عالم میں حاصل کرتے ہیں۔

They learn in suffering what they teach in song.

غزل میں بھی رنج و غم کے خیالات کا اظہار زیادہ ہوتا ہے اس لئے اس کی صورت بھی دریا یا سمندر کی انھیں لہروں کی طرح ہونی چاہئے جو رنجیدہ دلوں کی تسکین کا باعث بنتی ہیں پس اگر ہم غزل کو نظم کی شکل دے دیں تو اس میں اس کیفیت کا فقدان نظر آئے گا جو غزل کے اشعار کے انتشار میں ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو آپ کو ہر حسین چیز میں کچھ نہ کچھ انتشار اور ایک قسم کا الھڑ پن کا نظر آئے گا۔ حسین چیزوں میں ربط ذرا کم ہی ہوتا ہے مثال کے طور پر آپ نیلے نیلے آسمان میں چمکتے ہوئے تاروں کو لیجئے کیا ان میں ربط ہوتا ہے؟ کیا ان میں کسی قسم کی باقاعدگی آپ کو نظر آتی ہے؟ نہیں وہ اس چیز سے کوسوں دور ہیں لیکن اس کے باوجود حسین معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم ٹکٹکی باندھ کر ان کو دیکھتے رہیں۔ بائرن (Byron) انگریزی کا مشہور شاعر انھیں دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھا تھا "اے ستارو! تم آسمان کی شاعری ہو"

Ye stars! which are the poetry of heaven.

لیکن چونکہ وہ ہر رات ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں اس لئے ہماری نظروں میں ان کی اہمیت اتنی کچھ زیادہ نہیں رہ گئی ہے لیکن حساس دل و دماغ رکھنے والے اب بھی ان میں دلکشی کی دنیائیں دیکھتے ہیں۔ ایمرسن Emerson نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر یہ ستارے دنیا میں ایک ہزار سال کے بعد نمودار ہوا کرتے تو ساری دنیا رات بھر ان کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی اور پھر ایک ہزار سال اس بےچینی کے عالم میں گزار دیتی کہ وہ پھر نظر آئیں —— بالکل یہی حال عورت کے

لحاظ سے غزل کے اشعار کا سا ہے۔ وہ بھی غزل میں ستاروں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔ ان میں بھی ستاروں کا سا حسن ہوتا ہے بشرطیکہ اس حسن سے کوئی لطف اندوز ہونا چاہے۔ پھر آپ دیکھئے فطرت کی کسی چیز میں، اس کے کسی منظر میں آپ کو کوئی باقاعدگی نظر نہ آئے گی۔ غزل کے اشعار میں بھی سادگی ہے۔ اس میں تصنع نہیں۔ اس میں حسن ہے جو فطرت کے عین مطابق ہے۔ پس یہ اعتراض کہ غزل کی صورت ہمارے احساس جمال کو تسکین نہیں دیتی بالکل لایعنی سی بات ہے۔

کلیم صاحب غزل کو نیم وحشی صنف ادب کہتے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ وحشی آرٹ پر Primitive Art پر بہت تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "وحشی اپنے آرٹ میں مواد کی زیادتی اور اس کی شوکت پر زور دیتا ہے۔ جزئیات کے حسن کو تو وہ سمجھ سکتا ہے لیکن صورت کے حسن اور تکمیل سے بے اعتنائی برتتا ہے۔" غزل میں صورت کے حسن کا مکمل بیان اوپر ہو چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مواد کی زیادتی غزل میں ہوتی ہے یا نہیں؟ غزل کی تو سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بڑے سے بڑے خیال کو صرف دو مصرعوں میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر اس میں مواد کی زیادتی کہاں ہے؟ اختصار غزل کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ فرانس کے مشہور مفکر ادیب والٹیر (Voltair) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاعری کی ایک خصوصیت سے تو کم لوگوں کو انکار ہوگا۔ اور یہ کہ وہ بہت کچھ کہتی ہے اور نثر سے کم الفاظ میں کہتی ہے۔ One merit of poetry few persons will deny, it says more & in fewer words than prose. غزل پر یہ خیال بالکل صادق آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ والٹیر نے اس خیال کا اظہار جیسے غزل ہی کی شاعری کے لئے کیا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کلیم صاحب غزل پر اتنی سخت تنقید روا رکھتے ہیں ان پر جوبرٹ (Joubert) کا یہ قول صادق آتا ہے کہ وہ لوگ جو تنقید کرنے میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں وہ مشکل ہی سے اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ Those readiest to criticise are often least able to appreciate یہی حال کلیم صاحب کا ہے کہ انہوں نے نہ صرف غزل بلکہ سارے اردو ادب کو سمجھنے میں بڑی جلد بازی سے کام لیا ہے۔

غزل کے ہر شعر میں اختصار کی خصوصیت بعض ایسی خوبیاں پیدا کر دیتی ہے جس کو شعر کی جان اور آرٹ کا ایمان سمجھنا چاہئے۔ چونکہ شعرا کو ایک خاص خیال ایک محدود جگہ میں پیش کرنا ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے فن کا سہارا لے کر اس کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کی تخلیق میں art lies in concealing art. کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے جس کے متعلق Quintillian نے کہا تھا کہ آرٹ کی معراج اس کی ایمائیت ہے۔ The perfection of art is to conceal art. غزل کے زیادہ اشعار میں یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے غزل کے ہر شعر میں ایک لطیف سی کیفیت ہمارے دلوں میں چند لمحے کے لئے گدگدی پیدا کر دیتی ہے۔ آرٹ کی دنیا میں اور خصوصاً آج کل کے آرٹ کی دنیا میں ایمائیت Suggestiveness اور ابہام Ambiguity کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ غزل میں ایسا زیادہ ابہام تو نہیں پیدا ہوتا لیکن ہاں اس کے ہر شعر کی ایمائیت قدم قدم پر ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے۔ اختصار کے باعث ان فنی خوبیوں کے پیدا ہو جانے کے علاوہ غزل آج ہمیں وقت کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ہم جس پیچیدہ ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ اس میں ہمارے پاس وقت کی کمی ہے۔ ہماری زندگیاں مشغول زندگیاں ہیں۔ آج سے ایک صدی ادھر حالت یہ تھی کہ ان دنوں بڑے بڑے ناول لکھے اور پڑھے جاتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی نظموں کی جگہ طویل نظموں کا رواج تھا۔ لیکن آج دنیا کی بدل چکی ہے۔ آج کا مشغول انسان ناول کی جگہ مختصر کہانیاں پڑھتا ہے۔ طویل نظموں کی جگہ مختصر نظموں کو پسند کرتا ہے۔ غزل کا ہر شعر چونکہ ایک نظم ہوتا ہے اس لئے آج کل کی دنیا میں اس کا پسند کیا جانا یقینی ہے۔ اس سے زیادہ اختصار اور کہاں مل سکتا ہے۔

غزل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بلا کا لوچ ہے اور اس لوچ کے باعث وہ ہر طرح کے خیالات کو اپنے دامن میں سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ چنانچہ غزل کے ارتقا پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ غزل کی ابتدا تو عشق و محبت کے خیالات سے ہوئی اور عرصے تک وہ انہیں خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنی رہی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر شعرا نے اس میں بلند خیالات کو بھی جگہ دینی شروع کر دی۔ وہ صوفیوں کے ہاتھوں میں آئی تو تصوف کے سیکڑوں رازہائے سربستہ اس کے ذریعہ سے بے نقاب ہو کر عوام کے سامنے پہنچے۔ پھر فلسفیوں نے بھی اس کو نہ چھوڑا۔ اور بڑے بڑے فلسفیانہ مسائل کو اس کے

کہ ایک شعر میں سمو دیا۔ بڑے بڑے مسائل کو چھوٹی سی جگہ میں بیان کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا اشاروں اور اشاریت سے کام لینے پر کام لینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ایک طرف تو غزل میں وہ خوبی پیدا ہو گئی جس کو ایمائیت کہتے ہیں۔ جس کا بیان ایک حد تک اوپر ہو چکا اور جس کے متعلق جرمنی کے مشہور مفکر، شاعر، ناول نگار اور نقاد گوئٹے نے لکھا ہے کہ آرٹ میں کھلم کھلا ساری چیزوں کو بیان کرنے کی بجائے یہ کہیں زیادہ بہتر ہے کہ ایمائیت سے کام لیا جائے۔ In art to express the infinite one should suggest more than is expressed.

اور دوسری طرف شعرا اس چیز سے کام لینے کے لئے مجبور ہو گئے جس کو اشاریت Symbolism کہتے ہیں۔ غزل میں قفس و آشیانہ۔ جام و شراب، ساقی و پیمانہ، ہجر و وصل، گل و بلبل، صرف چند چیزوں کے نام اور چند کیفیتوں کا بیان ہی نہیں بلکہ ان کے پردے میں سیکڑوں ایسی چیزیں نہاں ہیں جو ہمیں پتے کی باتیں بتاتی ہیں۔ ساری دنیا کی شاعری میں اشاریت کو بڑا دخل ہے۔ میرے استاد پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی ادیب نے اپنی کتاب "ہماری شاعری" میں اس [illegible] ایسے واقعات نقل کئے ہیں۔ جن کو پڑھنے کے بعد کسی شخص کو یہ ہمت نہ ہوگی کہ وہ ساقی و پیمانہ۔ مے و میخانہ۔ قفس و آشیانہ وغیرہ کو ان کے اصلی معنی میں دیکھے۔ ان میں بڑی وسعت اور گہرائی ہے۔ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار دہلی کا ایک شعر دیکھئے:

نہ تنگ کیوں ہمیں صیاد یوں قفس میں کرے
خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے

اگر اس شعر کو ہم نے صرف اس نظر سے دیکھا کہ صیاد و بلبل کی کہانی ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کی تمام خوبیوں کا خون ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر کی زندگی جس طرح گزری اس سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے اور اگر اس چیز کو پیش نظر رکھ کر اس کا مطالعہ کریں تو ہمیں ایک ایسی حقیقت معلوم ہوگی جس پر تمام ہندوستان خون کے آنسو بہائے بغیر نہ رہے گا۔

ادب اور شاعری کو زندگی اور سماج کا عکس کہا جاتا ہے۔ ہر دور کے حالات و واقعات، طرز معاشرت اور رہن سہن کی جیتی جاگتی تصویریں ہمیں ادب میں ملتی ہیں۔ شاعری ہر زمانہ کی معاشرت کے ساتھ چلتی ہے۔ اس کے ذریعہ ہم ایک خاص زمانہ کے تمام حالات بخوبی معلوم کر سکتے ہیں۔ غزل کی شاعری میں بھی ترتیب قریب قریب ہر اس دور کی تصویریں ملتی ہیں [illegible] ہو کر وہ گزری لیکن قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں [illegible] انشاپرداز فلپ ہنڈرسن Philip Henderson کے اس جملے کو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ کسی دور کے ادب کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس دور کی معاشی حالت اور طبقاتی نظام کو بغور مطالعہ کیا جائے۔ It is only by understanding the economic [illegible] the class structure of [illegible] any genuine understanding of the literature & thought of an age can be arrived at. Literature and a changing Civilisation

غزل کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں اس چیز کو دیکھنا ہی پڑے گا کہ وہ اپنی زندگی میں کن کن [illegible] سے گزری اور [illegible] کو وقت کے تقاضے نے کیسے کیسے بھیس بدلوائے [illegible] کتنی گرتی ہوئی عمارتوں کو دکھایا [illegible]

[illegible]

کرنے سے یہ حقیقت ہم پر [illegible] اپنے وقت کی ترجمان ہے اور صحیح ترجمان ہے [illegible] اس دور کو دیکھئے جب مغلیہ سلطنت کو [illegible] تلواریں خون کا مینہ برسا چکی تھیں۔ ہندوستان [illegible] ڈرے سہمے ہوئے تھے۔ ہر طرف انتشار و بدامنی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ہر شخص پریشان حال تھا۔ اس وقت کی غزل گوئی میں ایک سوگوارانہ کیفیت ملتی ہے۔ ایک دبی ہوئی سی چیخ کا عالم، سوز و گداز اس میں قدرتاً ہونا ہی چاہیئے۔ میر و سودا کی غزلوں میں یہی کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔ ہر چند سودا میر کی طرح حساس نہ تھا۔ وہ رنج و غم [illegible] تھا۔ چنانچہ اس کی شاعری میں بھی قہقہوں کی [illegible] ضرور ہے۔ اس کی غزلوں میں کچھ نہ کچھ رجائیت ضرور ملتی ہے جو اس کی طبیعت کے طفیل ہے۔ لیکن اس کی تہ میں ہم ایک [illegible] عالم محسوس کرتے ہیں۔ میر چونکہ زیادہ حساس تھا اس لئے اس کی شاعری میں ایک مستقل سلگنے کی سی کیفیت ہے۔ اس زمانے کے انتشار اور بدنظمی سے تنگ آ کر بہتوں نے تصوف کے گوشے میں بیٹھنا پسند کیا تھا۔ بدنظمی کے عالم میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ بعض سلگ [illegible] زندگی [illegible]

بعض گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر۔ بعض ساغر و مینا سے لَو لگا کر۔ صدیاں گزر گئیں جب چین کو تاتاریوں نے اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا۔ تو وہاں کے بڑے بڑے شاعر تنہائی کے گوشے میں بسیرا لینے لگے تھے۔ اور اپنی آنکھوں کے سامنے "آتش سیال" کا پردہ ڈال کر ساری دُنیا سے بے خبر ہو گئے۔ چین میں جب ہُن خاندان (hun dynasty) کا خاتمہ ہوا تو اس وقت بھی بہت سے شاعروں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اور ساغر و مینا کے ساز پر گیت گانے لگے۔ سلطنت مغلیہ کے غروب آفتاب کے وقت ہندوستان کا گوشہ نشین شاعر درؔد تھا۔ جس نے ایک دفعہ دنیا کو چھوڑ کر پھر اس کی طرف نہ دیکھا۔ اپنی ہی شراب سے سرشار ہو کر گیت گاتا رہا۔ یہ تینوں شاعر اس دور کی شاعری کی صحیح معنوں میں نمائندگی کرتے ہیں۔ میؔر و سوؔدا کی شاعری میں یوں تو اس انتشار و بدنظمی اور مٹتی ہوئی شان و شوکت پر خون کے آنسو ملتے ہیں۔ نہ صرف شہر آشوب اور مثنویوں وغیرہ کے روپ میں بلکہ غزلوں میں بھی۔ میر کی غزلوں کے بیسیوں اشعار اس زمانے کی حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں لیکن ان میں کوئی زور شور نہیں بلکہ ایک گھٹی گھٹی سی کیفیت ہے — ایک دبی دبی سی چیخ — ایک زخمی سی آواز ؎

اک آن اس زمانے میں دل نہ وا ہُوا   کیا جانئے کہ میر زمانے کو کیا ہوا؛

شعر کے پردے میں میں نے غم سنایا ہے بہت   مرثیے نے دل کو میرے بھی رُلایا ہے بہت

کیا زمزمہ کروں ہو خوشی تجھ سے ہم صفیر   آیا ہوں میں چمن میں تو جاتی رہی بہار

یا قافلہ در قافلہ رستوں میں تھے کچھ لوگ   یا ایسے گئے یاں سے کہ کچھ کھوج نہ پایا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے   یہ نگر سو مرتبہ لُوٹا گیا

یہ اشعار کسی نہ کسی پہلو سے اس زمانے کے انتشار اور بدنظمی کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں لیکن بہر حال یہ غزل کے اشعار ہیں کسی واقعاتی نظم کے بیانیہ ٹکڑے نہیں۔ ان میں بہت کچھ ہمیں اپنے ذہن کی مدد سے پورا کرنا ہے اور سمجھنا ہے۔ ان سے نتائج نکالنا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ یہ اجڑی ہوئی کیفیت یہ غم آمیز حالت، عرصے تک دلی کی شاعری میں کارفرما رہی۔ قائم ہی نہیں رہی بلکہ اس کی رگ و پے میں سرایت کرتی گئی۔ دلی سیکڑوں بار لٹی۔ اس پر کئی دفعہ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے۔ پھر کس طرح شعرا ان حالات سے اثر نہ لیتے — غالبؔ و مومنؔ اور ذوقؔ کا ہمعصر ہمیں ایک ایسا شاعر بھی ملتا ہے جس کی شاعری سر سے پاؤں تک حسرت و ناکامی کی تصویر ہے۔ وہ بہادر شاہ ظفرؔ آخری تاجدار دہلی ہے۔ اس نے اپنی متعدد غزلوں کے اشعار میں اپنی بے بسی، ناکامی، پریشانی اور دشمنوں کی دست درازی کی تصویریں کھینچی ہیں۔ اس کے بعض اشعار تو بالکل سیاسی رنگ لئے ہوئے ہیں ؎

کس سے حمایت ڈھونڈیں ہم اور کس سے مرہم چاہیں ہم
رکھتے نظر ہیں اپنے خدا پر وہ ہی ہمارا حامی ہے

آہ و فغاں کے ساتھ دھواں سا ہر دم منہ سے نکلے ہے
دل تو جل کر خاک ہوا پر اب کے جگر میں خامی ہے

شیشۂ سنگ سے دُور ہی بہتر ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا
یعنی نازک دل متحمل کیا ہو ممکن سختی کے

الفت مال و زر نہیں جن کو ان کو غرض کیا قضیوں سے
سارے قضیئے دنیا کے ہیں مال و زر کے قضیئے سے

سوا ہمارے نہ سُن ہماری حکایت غم سُنی سنائی
جو ہم پہ گزری وہ ہم سے پوچھو کہے ہے عالم سُنی سنائی

کیسا رنج اور کیسی راحت کس کی شادی کس کا غم
یہ بھی نہیں معلوم مجھے میں جیتا ہوں یا مرتا ہوں

الٹی سیدھی یہ گفتگو کیا ہے   تجھکو منظور جنگجو کیا ہے

نہ تنگ کیوں ہمیں صیاد یوں قفس میں کرے   خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے

ہوتی خبر گر پہلے مجھے میرے دشمن جانی جاتے ہیں
حضرت دل پھر کاہے کو یوں میری بغل میں پل جاتے

ایک ظفر ہی پر منحصر نہیں، دلی کے قریب قریب ہر غزل گو کی یہی کیفیت ہے۔ سب پر ایک افسردگی ہے۔ ان کی آہوں اور کراہوں نے شعر کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ظفرؔ کی شاعری میں یہ چیز زیادہ نمایاں اس وجہ سے ہے کہ وہ براہ راست تمام مصیبتوں کا شکار رہا۔ اس پر وہ مصیبتیں پڑیں کہ خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ اس کی شاعری بھی انھیں کا عکس ہے، فرانس کے مشہور شاعر، انشا پرداز اور ناول نگار الیگزنڈر ڈیوما (Alexander Dumas) کا قول ہے کہ آرٹ کے لئے تنہائی تکلیف اور جذبات کی ضرورت ہے۔ Art needs solitude or misery or passion. یہ تمام خصوصیات دلی سکول کے شاعروں کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کی شاعری ان کی آنکھوں سے اشکوں کے بہے ہوئے موتی ہیں جنھوں نے الفاظ کا روپ دھار لیا ہے — وہ ان کے دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔

لیکن دلی کو چھوڑ کر جب ہم لکھنؤ شاعری پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک حیرت انگیز تغیر نظر آتا ہے۔ یہاں سرے سے وہ چیز مفقود ہے جو دلی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ لکھنؤ کے شاعروں نے انسانی جذبات و احساسات کی تصویریں نہیں کھینچیں۔ وہ خارجیت میں کھو گئے۔ اور پھر ان کے ماحول نے انھیں ایسی چیزوں کے بیان کرنے پر مجبور کیا جن کا بیان نہ

کرنا ہی بہتر تھا۔ معشوق کے ایک ایک عضو کا بیان وہ یوں مزے لے لے کر کرتے ہیں جیسے بازاری لوگ اپنی صحبتوں میں ہنسی مذاق۔ اسی لئے سنجیدہ طبقہ کو ان کے زیادہ اشعار بے کیف معلوم ہوتے ہیں۔ بعض جگہ ان میں ایسا ابتذال ہوتا ہے کہ بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ان کے یہ سب کچھ کرنے میں بھی انہیں کا قصور نہیں، وہ تو اس تہذیب اور مذاق کو پیش کرنے کے لئے مجبور تھے جس کا ان دنوں دور دورہ تھا۔ اور جس کے سائے میں وہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان دنوں کا لکھنؤ آج کا سا لکھنؤ نہیں تھا۔ ان دنوں ہر طرف عیش و عشرت کی گرم بازاری تھی۔ شاہدان بازاری سے محلے کے محلے آباد ہو گئے تھے۔ ہر شخص ایک وقتی کیف کے نشے سے سرشار تھا ان کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔ اور عورت بھی کوئی شریف عورت نہیں گھر میں بیٹھنے والی عورت نہیں ہے۔ بلکہ بازاری عورت۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کسی جنسی بھوک sex hunger کا پتہ بھی نہیں چلتا جو ہمیں دلی کے شعرا کے یہاں نظر آتی ہے۔ اس زمانے کی شاعری ایک تمدن سماج کی ترجمانی کرتی ہے جس کی بنیادیں ریت پر قائم تھیں لیکن جس کی اوپری شان و شوکت ہر ایک کی آنکھوں میں ایک چکا چوند کا سا عالم پیدا کر دیتی تھی۔ اس زمانے کے سماج میں تصنع اور بناوٹ ایک خاص چیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کی شاعری میں بھی تصنع اور بناوٹ کو زیادہ دخل ہے۔ اس زمانہ کی شاعری بالکل اس عورت کی طرح ہے جو غازہ اور پوڈر سے اپنے حسن کو دوبالا کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن پھر بھی اس کا حسن جاذب نظر نہیں ہوتا۔ لیکن بہرحال وہ شاعری بھی ہماری تاریخ کے ایک خاص دور کی نمائندہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں ۔

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا
آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھکو (ناسخ)

کس کے محرم آب رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا (آتش)

یاد آجاتی ہے لکڑی اس کبوتر باز کی
کیا اڑا دیتے ہیں میری نیند تارے رات کو (ناسخ)

جو میٹھی میٹھی نظروں سے وہ دیکھے
نہوں آنکھوں کو میں بادام شیریں (ناسخ)

بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے ایذا ان کو
منہ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں حیا سے پیدا (آتش)

دے دوپٹہ تو اپنے ململ کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا (ناسخ)

مجھکو سودائی بنایا ہے دکھا کر آنکھیں
تم دعتورسے کا لیا کرتے ہو بادام سے کام (ناسخ)

شب وصال میں کھولے قبائے یار کے بند
کمر سے کھول کے پٹکے کو میں نے دے ٹپکا (آتش)

اُٹھ گئے ساقین جاناں سے جو شب کو پائنچے
اک دو شاخہ نور کا محفل میں روشن ہو گیا (امانت)

لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد لکھنؤ کی تاریخ کے کچھ ورق اُلٹے۔ جب یہ محفل ختم ہو گئی۔ اس منظر پر اُداسی چھا گئی۔ یعنی ۱۸۵۶ء کے بعد جب جانِ عالم پیا واجد علی شاہ لکھنؤ سے مٹیا برج سدھارے تو عیش و عشرت کے چہرے فق ہو گئے۔ یہاں کی رنگین صحبتوں پر اوس سی پڑ گئی۔ نتیجہ وہی حزن و یاس کی صورت میں نمایاں ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد لکھنؤ میں ہمیں کچھ ایسے شاعر ملتے ہیں جو گریہ و بکا اور آہ و ماتم کے سوا اور کچھ کہنا ہی نہیں جانتے۔ میت گور و کفن، قبرستان، شب غم اور شب تنہائی کا ذکر ان کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ لیکن اس میں بھی ایک قسم کا تصنع ہے۔ یہ بھی ان کا قصور نہیں بلکہ اس تہذیب کی کارفرمائی ہے جس کے دامن میں انھوں نے آنکھ کھولی۔ اور جس کی آغوش میں انھوں نے پرورش پائی تھی۔ لیکن بحث یہاں ان تمام باتوں سے نہیں، ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح اردو غزل گوئی ہر دور میں اپنے سماج کا نقشہ پیش کرتی رہی ہے۔ وہ زندگی سے کوئی علیحدہ چیز نہیں، اس میں زندگی کے ہر دور کی دھڑکنیں کارفرما ہیں۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد بھی غزل ہماری زندگی کے مڑتے ہوئے دھارے کا پتہ دیتی ہے۔ غدر کے بعد کا زمانہ ہماری زندگی میں ایک قسم کے ٹھہراؤ اور قدرے سکون کا زمانہ ہے۔ جب ہم نے سات سمندر پار سے آئی ہوئی طاقتوں کے مقابلے میں سپر ڈال دی تھی۔ جب ہم نے مجبوراً اپنے گلے میں طوق اور پاؤں میں سلاسل پہن لی تھی۔ جب ہم کسی کے زیر سایہ رہنے میں ایک حد تک اپنی نجات سمجھنے لگے تھے۔ جب ہم اپنی ہر چیز کو مغرب کے زیر اثر بدل دینے کے متمنی تھے۔ اس زمانہ کی غزل گوئی میں بھی ایک سنبھلی ہوئی کیفیت ہے خیالات میں الجھاؤ نہیں۔ البتہ ذہنی پریشانی کا احساس کہیں کہیں ضرور ہوتا ہے۔ ان دنوں حالی نہ صرف ہماری غزل، بلکہ ساری شاعری نہیں نہیں بلکہ سارے ادب پر چھایا ہوا تھا۔ اس کی غزلوں میں زمانے کے ساتھ ساتھ ایک بدلی ہوئی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ پھر ایک زمانہ وہ آیا جب ہم سیاسی اعتبار سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ جب ہمارے سینوں میں بغاوت کی آگ کے شعلے وقت کی ہوا پا کر کچھ کچھ انگڑائیاں سی لینے لگے تھے ـــــ یعنی جنگ عظیم اور اس کے بعد کا زمانہ ـــــ

اس زمانہ میں غزل گوئی کی دو صورتیں ـــ ایک طرف تو اس میں فرار کی سی کیفیت ہے ـــ یعنی ہمارے شاعر زندگی اور اس کی پیچیدگیوں سے بھاگ کر صنف نازک کی کیف ہم آغوشی یا شراب ناب کے سُرور میں کھو جانا پسند کرتے ہیں ـــ وہ اپنی دنیا الگ بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے زندگی میں سکون حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو رومان کی آغوش میں دے دیا ہے۔ ایسے غزل گو شاعروں میں وہ تمام لوگ ہیں جن کا موضوع سوائے حسن و عشق کے اور کچھ نہیں ـــ اور دوسرے وہ ہیں جو غزل ہی میں اپنے سینے کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بھر دیتے ہیں۔ اول الذکر شعرا میں حسرت، فانی، جگر اور اصغر وغیرہ ہیں اور آخر الذکر میں اقبال، جوش، حفیظ اور فراق وغیرہ۔ فراق میرے خیال میں عصر حاضر کا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں ایک ایسا بے پایاں سمندر ہے جس میں مد و جزر کی وجہ سے زندگی کے آثار نمایاں ہیں۔ اس بحر بے پایاں میں ہمیں طرح طرح کی چیزیں نظر آتی ہیں کہیں حسن و عشق کی واردات و کیفیات کا بیان اچھوتے انداز میں کہیں معاشی مسائل کی گہرائیاں اور ان کی بے نقابی شاعرانہ رنگ میں کہیں سیاسی مسائل پر تبصرہ مگر تغزل کے روپ میں: کہیں فلسفیانہ مسائل کا بیان مگر ہنستے اور مسکراتے طرز ادا کے ساتھ ـــ غزل کو سربلند کرنے میں اس کا بڑا مرتبہ ہے۔ اس کی غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک طویل نظم کی وسعت لئے ہوئے ہوتا ہے ـــ وہ انقلاب، اس کی آمد، اس کی ضرورت، اس کی اہمیت اور اس کے احساس کا تذکرہ بھی غزل ہی میں کرتا ہے۔ وہ ہندوستان کی غلامی پر خون کے آنسو بھی غزل ہی میں روتا ہے ـــ وہ ایک نئی دنیا بسانے کا خواب بھی غزل ہی کے ذریعہ بیان کرتا ہے۔ وہ سیاسیات اور معاشیات کے مسائل کو بھی غزل ہی کے پردے میں بیان کرتا ہے ـــ غرض کیا چیز ہے جو اس کی غزل میں نہیں ملتی ـــ اس کے چند اشعار دیکھ کر آپ خود اندازہ لگا لیں گے۔

حیات بھی ہو معراج آسمان و زمیں
مرا وجود بھی میرا وجود ہے کہ نہیں

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

ہر انقلاب کے بعد آدمی سمجھتا ہے
کہ اس کے بعد نہ پھر لیگی کروٹیں زمیں

ہیں بال مرتبہ مائل بہ پستی معکوس
اُبھارتے ہیں زمانے کو چند خاک نشیں

اگر تلاش کریں کیا نہیں ہے دنیا میں
جز ایک زندگی کی طرح زندگی کہ نہیں

جو بھولتیں بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں
تری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں کہیں

چین سے جن کی کٹ گئی ان سے حیات اٹھی تو کیا
خیر سے موت آگئی پائی تھی زندگی تو کیا

پورے شباب پر کہاں آیا ہے دورِ آسماں
میکدۂ جہاں کا رنگ بعد کو دیکھ ابھی تو کیا

گل نہ سنیں تو یہ بھی ہے کہنے کی بات اے صبا
یوں ہی بکس کے رہ گئی دل کی کلی کھلی تو کیا

چمکتے درد کھلے چہرے مسکراتے اشک — سجائی جائے گی اب طرزِ نو سے بزمِ حیات

دیکھا آپ نے — ؟ غزل میں کس قدر وسعت ہے۔ کوئی ایسا موضوع نہیں جو اس کے دامن میں نہ سما سکے۔ وہ نہ صرف انسانی جذبات و احساسات کی تصویریں پیش کرتی رہی ہے بلکہ اس نے سماج کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ اور عصرِ حاضر میں اس نے سیاسیات، معاشیات، عمرانیات، فلسفہ و نفسیات اور ہماری تہذیب کے دوسرے شعبوں کے مسائل کو بھی جگہ دینی شروع کر دی ہے۔ کیا ایسی حالت میں بھی آپ اس کو ختم کرنے کے لئے تیار ہیں؟ کیا اب بھی آپ اس کو نیم وحشی صنفِ ادب کا نام دینا پسند کریں گے — ؟

غزل گوئی نے مغرب والوں پر بھی اپنا جادو کیا ہے۔ چنانچہ حافظ کی شاعری آج بھی یورپ میں بڑی وقعت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ اور اس کی تعریف میں بڑے بڑے نقادوں نے بہترین الفاظ استعمال کئے ہیں

Barbeer de Meynard اس کو Greatest Lyrist کہتا ہے۔ جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے (Goethe) حافظ کے متعلق اپنے West Aesthelcher Diwan میں لکھتا ہے:-

Over the Mediterranean Sea,
Bright the Oriental sun has sprung
Only he, who Hafiz knows & loves
Knows what Calderon has sung.

امریکہ کے مشہور انشا پرداز ریلف والڈو ایمرسن (Ralph Waldo Emerson) نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ حافظ فارسی شاعری کا شہزادہ ہے۔ اور اس کی خداداد قابلیتوں میں پنڈار، ہوریس اور اینا کریان Anacraeon کے صوفیانہ فکری کارناموں کا اضافہ کرتے ہیں۔

Hafiz is the prince of Persian poets & in his extraordinary gifts adds to none of the attributes of Pindar, Anacraeon, Horace & Burns, the insight of a mystic.

سر گور اوسلے Sir Gore Ousley حافظ کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کا ایک عجوبہ تھا۔ Wonder of the learned age in which he lived.

پروفیسر براؤن نے اپنی مشہور کتاب تاریخ ادبیات ایران میں حافظ کے متعلق Miss Gertrude Lowthian Bell کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کیا ہے۔ وہ حافظ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "The pictures that Hafiz draws represents a wider landscape though the immediate foreground may not be so distinct."

ظاہر ہے کہ حافظ ایک غزل گو شاعر تھا۔ مغربیوں کی تعریف بھی آپ نے اس کی شان میں سُن لی۔ اب آپ ذرا غور کیجئے کہ آخر کیوں غزل گوئی نے مغرب پر بھی اپنا جادو کر دیا۔ ہم آج اپنے شعرا کے دیوانوں کے ترجمے بھی مغربی زبانوں میں شایع کریں تو کیا وہ مقبول نہ ہونگے؟ ان حالات میں ہم کس طرح غزل گوئی کو نیم وحشی صنف سمجھ کر اس کو ختم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ ہمیں تو غزل کی صنف سخن پر ناز کرنا چاہئے۔ جس کی مثال اور کسی ملک میں نہیں ملتی۔ اور جو ہماری تہذیب کا ایک مقدس ترکہ ہے

لیکن غزل گوئی کی اہمیت سے متعلق یہ تمام باتیں کہنے کے باوجود میرا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے ادب میں صرف غزل ہی کو باقی رہنا چاہئے۔ اور جو دوسری نئی نئی راہیں ہماری نظم کی اصناف میں پیدا ہو رہی ہیں وہ ختم ہو جائیں نہیں نہیں —— غزل کے ساتھ ساتھ وہ بھی چلیں —— دنیا ایک تجرباتی جگہ ہے۔ انسان نئی نئی باتیں سوچتا ہے —— نئی نئی چیزیں ایجاد کرتا ہے وقت کے دھارے کے ساتھ پتہ نہیں ادب کی مختلف اصناف میں بھی کتنے نئے نئے راستے اور نکلیں۔ آج وقت کے تقاضے نے ہمیں نظم معرا Blank Verse اور نظم آزاد Free Verse میں طبع آزمائی کرنے کے لئے مجبور کیا ہے۔ اور میں بھی اس کے حامیوں میں سے ایک ہوں —— وہ بھی غزل کے ساتھ چلتے گی چلتی رہے گی —— پھر کیوں ہم اس کی راہ میں روڑا بن کر آئیں —— یہ سب ایک ساتھ پھولا کریں تو کیا ہرج ہے —— نظم آزاد بھی سدا بہار رہے اور ساتھ ہی ساتھ غزل بھی ——!!

نظر آیا

از:-

جناب سید اکبر عباس سہارنپوری

چمک کے برق گری کچھ دھواں نظر آیا — چمن میں پھر نہ مرا آشیاں نظر آیا
قفس سے چھوٹ کے جب گلستاں نظر آیا — نئی زمین نیا آسماں نظر آیا
بہار شوق کی مدہوشیوں میں ختم ہوئی — کھلی جو آنکھ تو دورِ خزاں نظر آیا
کیا جو غور کبھی منزلِ عدم کی طرف — زمانہ گردِ پسِ کارواں نظر آیا
یہ صرف دیر و حرم پر ہی کچھ نہیں موقوف — جہاں خیال کیا تو وہاں نظر آیا
کبھی خیال سے تیرے سکوں ملا دل کو — کبھی خیال ترا جانستاں نظر آیا
رہا کسی کا سفینہ خوشی سے ہم آغوش — کوئی غریق غمِ بیکراں نظر آیا
ہمیں جنونِ وفا سے بڑی امیدیں تھیں — یہ آسرا بھی مگر رائیگاں نظر آیا

تری ہی دین ہے غم اس خیال سے اکبر
ملول ہو کے بہت شادماں نظر آیا

بُت

نفسیاتی افسانہ

محترمہ شفیق بانو شفق نجیب آبادی

شام کا وقت تھا۔ ہلکی ہلکی بارش کے قطرے عروس کے آنسوؤں کی طرح گر رہے تھے۔ میں سر جھکائے رابندر ناتھ ٹیگور کی کتابیں دیکھ رہی تھی۔ ...ھ دوسرے مصنفوں کی کتابیں بھی سامنے تھیں جن کے نام کی شہرت قطعی ...تھی لیکن نفس مضمون بہترین تھا۔ خیال کہیں سے کہیں پرواز کر رہا تھا، ...یکدم کسی نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"کون؟" میں نے ہاتھوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ساری کو چھوا ...لیوں کو شناخت کرنے کی کوشش کی۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ میرے ...غ میں "ایوننگ ان پیرس" کی خوشبو پہنچی، میں چیخ اٹھی — "اوہو ...اب یاسمین صاحبہ ہیں —" یاسمین کے قہقہوں سے میرا کمرہ گونج ...میں نے کہا۔ "خدایا خیر — ! یہ کیا مصیبت ہے کہ بڑا بوجھ زمین و ...ن سر پر اٹھائے پھر رہی ہو۔"

منہ بناتے ہوئے بولی "معاف کیجیے! آپ کی طرح میں تخیل پسند تو ...نہیں کہ بس گردن جھکائے ساری دنیا کے احساس میں اپنا دم ...تی رہوں۔ میرا اصول تو یہ ہے۔ کھاؤ پیو اور خوش رہو — جیو ...جینے دو۔ ہنسو اور ہنسنے دو۔ دنیا میں رہو اور رہنے دو — کھیلو ...آزاد —" یاسمین بکے جا رہی تھی۔ میں اس کا منہ تک رہی تھی ...نے جل کر مجھے آرام کرسی سمیت فرش پر گرا دیا۔ میرے سامنے کی ...کتابیں الماری میں پٹک دیں۔ کہنے لگی — "کیا میری قسمت ...پھوٹی ہوئی ہے کہ سب کے سب بُت ہی بن جائیں۔ گھر میں اما ...ں — ابا سنجیدہ — بھیا فلسفی — بہن تنک مزاج — ...نائی پسند۔ سسرال بدتمیز ملی تو اور بھی سبحان اللہ نورٌ علیٰ نور۔ ...پ شاہ کا روزہ رکھے ہوئے۔ سسر حقہ کے مرید۔ دیور ...۔ نند بیجان تصویر۔ سلور سب کے سردار یعنی اینجانب کے ...ار تو بس "خاموش دیوتا" ہیں۔ تجھ بیہودہ کو سہیلی بنایا تھا کہ ...ن کو آزادی نصیب ہو گی تو تو سب کی ماما حوا نکلی۔ جب دیکھو ...لم — جب آؤ سامنے کتابیں — پھونک دونگی سب۔ اگر اب ...نے والیوں کے سامنے بت بن کر بیٹھیں — !"

...، توبہ! آندھی ہو یاسمین یا تم طوفان — تمہاری زبان کے سامنے تو شاید بہترین مقرر بھی سرنگوں ہو جائے۔ باز آئی میں تیری دوستی سے دولہا بھائی بیچارے کے تو دماغ کے کیڑے چاٹ جاتی ہو گی۔ جبھی تو غریب "خاموش دیوتا" بن گئے اور تجھے اپنی پجارن بنا دیا۔

"چپ رہ نالائق — ایک تو بیچاری ہے۔ اور ایک وہ جسے بولنے کی بھی تمیز نہیں۔"

"تم اگر اپنی مشین بند کرو تو وہ کچھ بولیں۔ فضول کیا بکیں۔"

یاسمین منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ جیسے خفا ہو گئی ہے۔ میں نے چھیڑنے کے لیے کہا۔ "یاسمین! تمھیں ہر بات کا اظہار کرنا خوب آتا ہے۔ کبھی قہقہے، کبھی تبصرہ۔ کبھی ناراضی کا انداز — بہت اچھی ایکٹنگ کرتی ہو — لاؤ میرا پیڈ اور ایک لفافہ ادھر دو۔ میں کسی فلم ڈائرکٹر کے نام خط لکھے دیتی ہوں کہ میری بہن یاسمین بہت حسین ہے اور نیچرل ایکٹنگ کر سکتی ہے۔ آہیں بھی بھر سکتی ہے۔ ایک ایک منٹ بعد قہقہوں سے آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے — کمرے کی تمام چیزیں بہت سلیقے سے بکھیر سکتی ہے۔"

"اپنی بہن لکھتے ہوئے تجھے غیرت بھی آئے گی؟"

"کیوں، کیا بُری بات ہے۔ فن ہے — دیکھ لے خورشید عبد اللہ کو جو ایک افسر کی بیوی ہے۔ دیوکا رانی — درگا کھوٹے۔ شانتا آپٹے یہ سب بھی تو اونچے گھرانوں کی ہیں۔"

"بس بس، بکومت — ورنہ تمھیں اٹھا کر تیسری منزل پر بند کرا آؤں گی۔ بڑی آئیں بیچاری میری ہمدرد — تو کیا جانے میرے دل پر کیا کیا گزرتی ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔ میں تو دیکھتی ہوں رنگ، گلاب کی طرح۔ ہنستی ہے تو پھولوں کے کھلنے کا شبہ ہوتا ہے۔ کپڑے ایسے نفیس کہ دیکھ کر پیتری کا دھوکہ ہو۔ خوشبو ایسی لگاتی ہے کہ ہوائیں معطر ہو جائیں۔ گھر ایسا سجا ہوا کہ دیکھنے سے بھوک بھاگ جائے۔ شوہر اتنے اچھے کہ جواب بھی دینا نہیں آتا۔"

"کمبخت، تجھ میں جذبۂ احساس بھی نہ رہا۔ کیا صرف یہ چیزیں زندگی بنا سکتی ہیں۔ خواہ یہ سب چیزیں نہ ہوتیں صرف ایک بات ہوتی۔"

"وہ کون سی بات؟"

"بولنا آتا — یہ کوفت جو مجھے اب ہے۔ یہ تو نہ ہوتی — آہ میرے دل میں زخم بنتے جا رہے ہیں۔ کاش اگر مینا طوطا بھی ہوتا تو وہ بھی بولنا سیکھ جاتا۔"

یاسمین کے چہرے سے سخت تکلیف کا اظہار ہونے لگا۔ اب تک میں مذاق سمجھ رہی تھی۔ لیکن اب متاثر ہونا پڑا۔ وہ ایک تصویر کی طرف نگاہیں جما کر گھورتے ہوئے بولی۔ "یہ تصویر ہے۔ صرف فن کاری کا نمونہ ہی تو ہے۔ جو کمرے میں سجا رکھی ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان اسی تصویر کی طرح خاموش کمرے میں بیٹھ جائے یا لیٹ جائے تو کتنی وحشت ہوگی؟"

"ہاں ہے تو ٹھیک۔ لیکن کیا دولھا بھائی اس درجہ خاموش رہتے ہیں؟"

"جی جناب! بس مورتی سمجھ لیجیے۔ جس کے گلے میں ہار ڈالنے کی کسر رہ گئی ہو۔ اکثر تو میرے دل میں دھوئیں کے بادل اٹھ اٹھ کر بخار ہو جاتا ہے۔ پاگل کی طرح کمرے میں چاروں طرف ٹہلتی ہوں۔ تم نہیں سمجھ سکتی ہو کہ مجھے کتنی روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ اس سجے ہوئے ایوان عالیشان کے بدلے ایک ٹوٹا ہوا جھونپڑا ہوتا۔ ان زرق برق ریشمی ساریوں کے بجائے پھٹے ہوئے کپڑے ہوتے جو جسم کے حسن کو اور بھی چمکا دیتے — ان مست خوشبوؤں کی ضرورت نہ تھی۔ ان سے بہتر جنگلی پھول ہوتے۔ جن کو پہن کر میں بن کی رانی دکھائی دیتی — لعنت بھیجتی ہوں میں شہری تہذیب پر جس نے میرا سکون چھین لیا۔"

"اخاہ! تو یہ کہئے، ہماری یاسمین آج کل رومان کے حسین تخیل میں گم ہیں — پھر تو تمہارے لئے شاعر ہوتا۔ یا مصوّر — جو ہر ہر ادا پر شعر کہتا۔ یا مصوّری کی رنگینیاں بکھیر دیتا۔ چکور کی مانند ...."

"تم اگر مذاق کرتی ہو تو لو میں جاتی ہوں — اور پھٹکار اس پر جو تمہیں اپنا سمجھے۔"

میں نے دوڑ کر یاسمین کو پکڑا۔ "ہٹ پگلی! اتنی سی بات پر اتنی خفگی —؛ لو کہو! میں سن رہی ہوں۔"

"تم ہی بتاؤ کہ شادی سے پہلے کیا کیا باتیں دل میں ہوتی ہیں؟ ہماری بات کیا ہوئی۔ ذرا لطیفہ سنئے! مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہوئیں۔ ہجولیاں بناتے بناتے کمرے سے ندارد ہوئیں۔ نوشہ صاحب تشریف لائے۔ میں نے تو تم لوگوں سے نہ جانے کیا کیا گپ سُنی تھی لیکن ہر بات میں سنجیدگی، خاموشی۔ مُنہ دیکھنا چاہا۔ میں اور جھک گئی، دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا لیا۔ جناب نے خاموشی سے انگوٹھی انگلی میں ڈال دی۔ شاید پوری گفتگو میں مشکل سے چھ سات لفظ بولے ہونگے — میرا دل

اس طرز عمل سے جیسے کچھ کھلا سا گیا۔ اب اس کے بعد روزمرہ کی زندگی شروع ہوئی۔ کوئی خاص دلچسپی نہ ہوئی۔ مذاق تو گویا گناہ عظیم— کھانے کا وقت ہوا۔ آکر گھڑی دیکھی۔ میں سمجھ گئی کہ بے زبان "کھانا مانگ رہے ہیں۔ کھانے کے بعد گلاس کو ہاتھ میں لیا۔ میں اشارہ جان گئی۔ سونے کے وقت ہوا بستر پر نگاہ گئی —— میں نے نوکروں سے ٹھیک کرا دیا۔ کپڑوں کی ضرورت ہوئی تو ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر بہت مختصر" کپڑے —" لیجئے صاحب! اس حکم کی تعمیل بھی ہو گئی —— میں سمجھتی رہی کہ شاید بچوں میں دل بہلے گا۔ دو بچے بھی خدا نے دیدیئے۔ پھر بھی وہ خاموش بچے اگر بولے بھی تو وہ گھبرا کر باہر چلے گئے۔ لیجئے اور بھی خاموشی بڑھ گئی۔ اگر کبھی میں عاجز ہو کر شکایت کرتی یا لڑتی ہوں کہ تمہارے نہ بولنے سے مجھے بہت دکھ ہوتا ہے تو سادگی سے جواب ملتا ہے "مجھے باتیں کرنا نہیں آتیں۔ تمہاری باتوں کا تو شاید دس انسان بھی جواب نہ دے سکیں"۔ یہاں پہنچکر یاسمین کوچ پر گر پڑی اور سسکیاں لے کر رونے لگی۔ اب مجھے اس کی دلی کوفت اور ذہنی الجھن کا احساس ہوا —— آہ — میری بولنے والی کوئل —— میری حسین چہکنے والی بلبل کو ایسا "بت" ملا —— یاسمین کے رونے سے میرا دل نکلا جا رہا تھا۔ جس کے کان محبت کے حسین لفظوں سے محروم رہے — جو خاموشی کی تکلیف سہتے سہتے پاگل ہوئی جا رہی تھی —— جیسے دکھ تھا کہ دنیا میں باتوں کی لطافت سے ازلی بدنصیب ہے۔

گرمی سے کمرے کا حبس بڑھ گیا۔ بجلی کا پنکھا چل رہا تھا۔ یاسمین کی حسین خوشنما، چمکتی ہوئی جھلمل ساری ہوا سے کانپ رہی تھی جیسے کسی گنہگار کا قلب —— یا بے گناہ کا جسم —

میں آنکھیں یاسمین کے چہرے پر جمائے اس کے حسرت نصیب دل کی بات پر غور کر رہی تھی —— کتنی عجیب آرزو!

"خاموشی بہترین چیز ہے" یہ فقرے میں نے نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھے ہوں گے —— آج مجھے ان لفظوں سے نفرت سی ہو گئی ہے ——!

مسافر

از جناب لطیف قریشی

۱

میرے رنگین تصور کا وہ دلچسپ سفر
دور اڑتے ہوئے چاند اور ستاروں سے بلند
دور اڑتے ہوئے خاموش نظاروں سے بلند
میں کہیں دور کہیں دور چلا جاتا ہوں
کھول کر اپنے تخیل کے سنہرے شہپر
میرے رنگین تصور کا وہ دلچسپ سفر

۲

ایک مبہم سی تمنا دل بیتاب میں ہے
جی میں آتا ہے کہ اس عالم فانی سے پرے
حسن اور عشق کی ہنگامہ فشانی سے پرے
ایسی دنیا میں رہوں میں جو ابھی خواب میں ہے
نہ کوئی قید تخیل نہ کوئی حد نظر
میرے رنگین تصور کا وہ دلچسپ سفر

۳

وقت اور موت کی زنجیر سے آزاد ہو عشق
حسن مجبور نہ ہو جلوہ نمائی کے لئے
فکر پابند نہ ہو عقدہ کشائی کے لئے
دور آئین وفا سے کہیں آباد ہو عشق
ہم سفر ہو مری فطرت تو مشیت رہبر
میرے رنگین تصور کا وہ دلچسپ سفر

التماس

ترے حضور ہی کرنا ہے التماس مجھے

حضرت شفیق کوٹی

یہ عشوے اور یہ ادائیں بٹھا کے پاس مجھے
سمجھ لیا ہے ستمگر نے بدحواس مجھے

کیا ہے درد کی لذت سے روشناس مجھے
تمہارے غم نے دیئے ہیں نئے حواس مجھے

یہ شوقِ دید کہیں کر نہ دے انہیں خود بیں
سمجھ نہ جائیں کہیں وہ ادا شناس مجھے

یہ بیخودی ہی کا نشہ بہت غنیمت ہے
نہ دے خدا کے لئے زحمتِ حواس مجھے

خفا نہ مجھ سے ہو اس میں مری خطا کیا ہے
ترے کرم نے نہ دی فرصتِ سپاس مجھے

کس آسرے پہ نشیمن سے ساز باز کروں
یہ چار تنکے ہی شاید نہ آئیں راس مجھے

جھلک دکھا کے غم بیحساب سونپ گئے
بندھا کے آس مری کر گئے نراس مجھے

ہے ذرہ ذرہ ہزار آفتاب در آغوش
مرا نصیب نہ آیا جو عشق راس مجھے

تجھی کو آج سُنانی ہے سرگزشتِ فراق
ترے حضور ہی کرنا ہے التماس مجھے

بجا رہینِ ستمہائے روزگار ہوں میں
مگر تو کم نگہی سے نہ کر نراس مجھے

نکل ہی آئینگے پہلو امید کے بھی شفیق
رکھے گی زیست کہاں تک اسیرِ یاس مجھے

جنّ

سبق آموز افسانہ

جناب ظفر واسطی شاہ آبادی

تڑاق ــــ!

بڑے زور کا طمانچہ لگنے کی آواز آئی - اور پھر ــــ!

" اگر اب کے گستاخی کی تو جان سے مار ڈالوں گا"!

آواز عورت کی تھی لیکن صیغہ مذکر استعمال کیا گیا تھا ۔

میں نے اخبار پلنگ پر رکھ دیا اور دبے پاؤں ٹین کی دیوار کے پاس جاکر ایک چھوٹے سے سوراخ سے آنکھ لگا دی ۔

نیچے صحن میں ایک موٹی تازی عورت چارپائی پر سیدھی لیٹی ہوئی پٹیوں پر اپنے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم کے کسی حصہ میں بہت شدید درد ہے - اور وہ درد کی برداشت کی تاب نہ لاکر تڑپ رہی ہے - اس کی چارپائی کے قریب دوسری چارپائی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی وہ سولہ برس کی کچھ مغموم اور سہمی ہوئی سی بیٹھی تھی - لڑکی کے قریب غالباً اس کی دادی بیٹھی ہوئی تھیں اس ہاتھ پاؤں مارنے والی عورت کو پنکھا جھل رہی تھیں - اور دوسری طرف ٹوٹی ہوئی کرسی پر ایک منحنی سا آدمی زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا اور دو ایک منٹ کے وقفوں کے بعد اس عورت پر دم کرتا جاتا تھا - جب وہ پھونک مارتا تھا تو عورت آنکھیں نکال کر رعب دار آواز میں کہتی تھی ۔

" ہم نہیں جائیں گے - ہم نہیں جائیں گے "۔

میں اس مکان میں نیا نیا اٹھ کر آیا تھا - اور میرے آنے کے بعد یہ واقعہ پہلی مرتبہ رونما ہو رہا تھا ۔

دفعتہً عورت کو اور زیادہ جوش سا اٹھا جیسا کہ اس کا درد ایک دم کئی گنا زیادہ ہو گیا اور چارپائی پر ایک ایک فٹ اوپر نیچے اچھلنے لگی - اس کے اچھل اچھل کر گرنے کا یہ منظر بہت عجیب تھا - بڑے گٹھے ہوئے جسم کی عورت تھی - سر تو بالکل ننگا تھا - گلے میں بھی باریک ململ کا ایک تنگ کرتا نہ ہونے ہی کے برابر تھا - اور ٹانگوں میں چست پاجامہ اس قدر چست تھا کہ کیا عرض کروں - عمر کوئی تیئیس چوبیس برس کی ہوگی - ظالم غضب کی حسین تھی - ساس نے بیٹے سے کچھ کہا اور عورت نے اس کی طرف ایسے گھور کر دیکھا جیسے کھا جائیگی ۔

بیٹا جوتا پہن کر باہر جانے لگا ۔

ساس کرخت آواز میں عورت سے مخاطب ہوکر بولیں ۔

" وہی کرے گا تیرا علاج - اب کے تجھے لوٹے میں بند نہ کرایا تو سلیمن نام نہیں "۔

عورت انہیں مارنے کو اٹھی اور بولی تیز آواز میں " اب کے آنے دو - اس مردود کو بھسم نہ کر دیا تو "۔

سیڑھیوں میں کسی کے چڑھنے کی آواز آئی - میں لپک کر کرسی پر بیٹھ گیا - اور اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا ۔

اس عورت کا شوہر تھا - آتے ہی کہنے لگا ۔

" مہربانی فرما کر ایک تار لکھ دیجئے "!

" خیریت تو ہے ؟" میں نے تجاہل سے کام لیکر پوچھا - اس کے داہنے رخسار پر تین انگلیوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے ۔

" جی ہاں اور تو خیریت ہے - بس بیوی میں جن آ گیا ہے - ہمارے ایک رشتہ دار ہیں حافظ جی انہیں بلانا ہے "۔

" یہاں بھی تو بہت سے بزرگ ہیں انھیں دکھائیے نا "

" اجی وہ جن بہت خراب ہے - کسی کے بس میں نہیں آتا - وہ تو حافظ جی کو خدا جانے کیا علم یاد ہے - کہ ان کے آگے یہ نہیں ٹھہرتا - ورنہ بہت سے سیلنے بلائے - مگر کسی کا زور نہ چلا - حافظ جی کو بھی کبھی کبھی بہت تکلیف کرنی پڑتی ہے - جب کہیں جاکر یہ بھاگتا ہے "۔

" جب جن آتا ہے تو آپ ہر دفعہ ہی حافظ جی کو تار دے کر بلاتے ہیں ؟"

" جی نہیں ــــ اصل میں حافظ جی یہیں رہتے ہیں - اس مرتبہ تو وہ ایک مہینے سے چھٹی گئے ہوئے ہیں "۔

حافظ جی دو دن کے بعد آئے - ان دو دنوں میں عورت پر کبھی تو جن کا غلبہ بہت زیادہ ہو جاتا - چیختی ، دھاڑیں مارتی ، تڑپتی اور اچھلتی اور کبھی بے سدھ ہوکر خاموش لیٹ جاتی - البتہ جن روزانہ آدھا ایک

گھنٹہ کے لئے اپنے باغات وغیرہ دیکھنے یا کسی اور بہت ضروری کام کی وجہ سے چلا جاتا۔ تو عورت کو ہوش آجاتا۔ اور ساس فوراً اُس کے لئے حلوا بنا لاتیں یا گرم گرم دودھ کا پیالہ بھر کر پلا دیتیں۔ اور کہتیں "بہو تم تو بالکل ہلکان ہوگئیں"۔ جب یہ کھانی چکتی تو جن صاحب پھر آدھمکتے۔ اور پھر وہی ہاتھ پاؤں مارنا تڑپنا۔ اچھلنا اور چیخنا چلانا شروع ہو جاتا۔

مجھے اُس سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کہ جہاں فرصت ملی اور صحن کی دیوار کے پاس جاکر کسی سوراخ سے آنکھ لگا کر بیٹھ گیا۔ اور نیچے کے حالات کی سیر دیکھنے لگا۔ میں نے دیوار میں کئی سوراخ معلوم کر لئے تھے جن سے مناسب وقت پر کام لیا جا سکتا تھا۔ چونکہ سوراخ بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ اس لئے صرف ایک میں سے نیچے کا تمام صحن نظر نہ آسکتا تھا۔ وہ صحن کے یا بیٹھک کے جس حصے میں ہوتے مجھے اُسی حصے کے زاویئے والے سوراخ سے دیکھنا ہوتا تھا۔

عورت کو اچھلتا، تڑپتا اور ہاتھ پاؤں مارتا دیکھ کر تو مجھے خوب لطف آتا تھا۔ لیکن لڑکی کے رنج و غم کا نقشہ نہ دیکھا جاتا۔ بیچاری دہن ماں کے پلنگ کے پاس خاموش بیٹھی اُسے تکتی رہتی یا پنکھا جھلتی رہتی۔ چہرے پر ہوائیاں سی چھوٹ رہی ہوتیں۔ اگر دادی اماں کوئی کام کرنے کو کہتیں تو جلدی سے وہ کام پورا کر کے پھر اپنی ماں کے پاس آبیٹھتی۔

تیسرے دن حافظ جی صبح ہی صبح آئے۔ میں نے جو اجنبی آواز سنی تو ایک دم نیچے جھانکا۔ اُس عورت کی عمر کا ایک مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کا مرد اکڑا اکڑا تھا۔ خوبصورت تو بے شک نہ تھا۔ لیکن اُس کے چہرے کے نقوش میں ایک خاص قسم کی کشش تھی۔

ساس کہہ رہی تھیں۔ "آج تیسرا دن ہے حافظ جی! اس نے ہم سب کی جان عذاب میں کر رکھی ہے!"

"یہ کمبخت باز نہیں آیا۔ اب کے اسے وہ چنے چبواتا ہوں کہ آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرے!"

ساس دعائیں دینے لگی "خدا تمہاری دلی مرادیں بر لائے"۔

حافظ جی نے عورت کے برابر والی چارپائی پر بیٹھ کر کچھ پڑھنا شروع کیا۔ جب حافظ جی آئے تو عورت خاموش لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن اُن کے آتے ہی پہلے کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگی اور دو ایک فٹ اوپر اچھلنے لگی۔ جب حافظ جی نے پہلی مرتبہ دم کیا تو

عورت نے ایک چیخ ماری اور اور زیادہ تیزی سے اچھلنے لگی۔ دوسری پھونک ماری تو کمبخت نے دونوں ٹانگیں اٹھا کر اس زور سے حافظ جی کے رسید کیں کہ بیچارے پرے جا کر گرے۔ اور بولی "ہمیں پھونکتا ہے!"

حافظ جی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اٹھے۔ اور اُس کے شوہر سے کہنے لگے "جو اُسی وقت بیت الخلا سے نکلا تھا"۔ "بھئی ان کی چارپائی ذرا بیٹھک میں کرا دو۔ اس مرتبہ پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمبخت نے اپنے استاد کو بھیج دیا۔ بہرحال میں ابھی قابو میں کرتا ہوں"۔

سرہانے کی جانب سے حافظ جی نے پکڑی اور پائنتی کی طرف سے شوہر نے اور چارپائی عورت سمیت بیٹھک میں پہنچا دی گئی۔

شوہر تو ہاتھ منہ دھو کر بازار چلا گیا۔ ساس حافظ جی کے لئے انڈوں کا حلوا اور چائے تیار کرنے لگیں۔ حافظ جی کو انڈوں کا حلوا بہت مرغوب تھا۔ اور یہ بات اُن کے سب رشتہ داروں کو معلوم تھی۔ لہٰذا وہ جہاں کہیں بھی جاتے اُن کے لئے اُن کا یہ مرغوب کھانا ضرور مہیا کیا جاتا۔ لڑکی دادی کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی۔ بیٹھک کے تین دروازے تھے۔ جن میں سے ایک سرے کا کھلا تھا۔ اس لئے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں کچھ دیر بیٹھا جھانکتا رہا۔ پھر اُٹھ کر نیچے گلی میں چلا گیا۔ بیٹھک کے تین دروازے گلی کی سمت بھی کھلتے لیکن یہ تینوں تو ہمیشہ ہی بند رہتے تھے۔ رات گئے کبھی کھول لیتے ہوں تو کھول لیتے ہوں۔ جی میں آیا کہ کسی دروازے کے درازوں سے اندر جھانکوں لیکن گلی کا معاملہ تھا۔ آدمی آجا رہے تھے ایسا کرنا تو ممکن نہ تھا۔ تاہم میں نے دروازوں کے بہت نزدیک سے دو تین چکر کاٹے اور کان اُسی طرف لگائے رکھے اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا لیکن اتنا ضرور محسوس ہوا کہ عورت اس وقت بھی شاید پٹیوں پر اپنے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

پھر اوپر آگیا اور اپنے کاموں میں لگ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر جھانکا کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ البتہ لڑکی بیچ کے دروازے کے ایک سوراخ سے اپنی آنکھ لگائے اندر کی جانب جھانک رہی تھی پھر اُس کی دادی کے پاس چلی گئی جب وہ دادی کی جانب جانے کے لئے مڑی تو اس کے چہرے سے درد و کرب ٹپکا پڑتا تھا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد حافظ جی نے شوہر کو آواز دی جو بازار سے واپس آکر صحن میں بچھی ہوئی ایک چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔ اور کوئی مصرع گنگنا رہا تھا۔

میں پھر صحن کی دیوار کے پاس جا بیٹھا۔

حافظ جی بیٹھک کے درمیان والے دروازے میں کھڑے تھے ایک فاتحانہ تبسم اُن کے ہونٹوں پر کھیل رہا تھا۔ اور وہ کہہ رہے تھے۔

"اس مرتبہ میں نے وہ عمل کیا ہے۔ کہ اب اگر یہ جن حلال کا ہوگا تو کبھی ادھر کا رُخ نہ کرے گا۔"

عورت مجھے نظر تو نہ آ رہی تھی۔ لیکن اُس کی آواز آئی جو کافی بلند تھی۔ "ہاں ہاں اب میں اگر حلال کا ہونگا تو کبھی ادھر نہ آؤنگا۔ اب مجھے چھوڑ دو میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔"

حافظ جی ہنسنے لگے۔

شوہر اُس کی لڑکی اور ماں تینوں بیٹھک میں عورت کے پاس چلے گئے۔ اب اُنہوں نے تیسرا دروازہ بھی کھول دیا۔ عورت نے پھر دردتے کہا: "مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔ حافظ جی میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اب کبھی ادھر کا رُخ نہ کرونگا۔"

اور عورت نے حافظ جی کی طرف رُخ کر کے دراصل اپنے دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔

حافظ جی نے شوہر اور اس کی ماں سے کچھ کہا جو میں نہ سن سکا لیکن شاید یہ دریافت کیا تھا۔ کہ اب آپ لوگوں کی کیا مرضی ہے۔ پھر اُن دونوں نے ایک ساتھ کچھ جواب دیا۔

اس پر حافظ جی نے عورت کے سرہانے سے اُس کی اوڑھنی اٹھائی جس میں کئی گانٹھیں دے رکھی تھیں اور ایک ایک کر کے ساری گرہیں کھول ڈالیں۔ آخری گرہ کھل جانے پر عورت اٹھ بیٹھی لیکن بہت نڈھال معلوم ہو رہی تھی۔ سر کے بال بھی پریشان تھے۔ ایک لمبی سی انگڑائی لے کر وہ پھر لیٹ گئی۔

جن کے نکل جانے سے سب کے لئے عید سی ہو گئی۔ حافظ جی نے خوب حلوا کھایا اور چائے پی۔ عورت کو بھی حلوا اور دودھ دیا گیا۔ لڑکی خاص طور پر بہت مسرور تھی۔ اٹھلاتی ہوئی پھر رہی تھی۔

اس کے بعد حافظ جی نے باقی چھٹی منسوخ کرا لی اور دوسرے تیسرے دن آنے لگے اور آ کر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ وہ ایک مقامی روزانہ اخبار کے دفتر میں تھے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ کیا تھے۔ دفتری تھے، رپورٹر تھے، کلرک تھے یا خدا جانے کیا تھے۔ اتنا ضرور معلوم ہوا کہ حافظ صرف نام کے تھے۔ میں جب بھی اُن کی آواز سن کر نیچے جھانکتا تو وہ عورت کے برابر والی چارپائی پر بیٹھے ہوتے تھے۔ اُن آگے کسی چیز میں ڈاک کے بہت سے استعمال شدہ ٹکٹ رکھے ہوتے اور وہ ایک چھوٹی سی قینچی سے اُن ٹکٹوں کے کہیں کہیں سے ذرا ذرا سے کنارے کاٹ کر ایک کابی میں رکھتے رہتے۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ عورت سے برابر باتیں کرتے رہتے۔ یہ دونوں ہمیشہ بیٹھک میں بیٹھتے تھے۔ کبھی کبھی ساس اور لڑکی بھی آ بیٹھتیں۔ ورنہ اکثر وہ دونوں گھر کے کام کاج میں لگی رہتیں۔ عورت عام طور پر چارپائی پر لیٹی ہوتی تھی۔ اور نہایت بے تکلفی سے کبھی اپنی قمیص اٹھا کر اپنا پیٹ اور کبھی شلوار کا پائنچہ اوپر کھینچ کر گھٹنا کھجلانے لگتی۔ حافظ جی اُس کے جسم کے اس طرح عریاں ہو جانے والے حصوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر مسکرا پڑتے۔ عورت بھی مسکرا پڑتی۔

مہینے میں ایک آدھ دفعہ عورت میں جن ضرور آ جاتا تھا اور حافظ جی بعض دفعہ بڑی آسانی سے اُس جن کو بھگانے میں کامیاب ہو جاتے اور بعض دفعہ بڑی مشکل سے۔ لطف یہ کہ ہر مرتبہ اُس سے وعدہ لے لیتے کہ پھر وہ کبھی اُدھر کا رُخ نہ کرے گا۔ مگر جن بہت ہی جھوٹا اور مکار تھا۔ جب موقع دیکھتا آ ہی پہنچتا۔ حافظ جی اُس کے آنے کی مختلف تاویلیں کرتے رہتے۔

شوہر کو کبھی کبھی اپنی بیوی کا حافظ جی سے اس طرح ہنسی مذاق کرنا یا گھنٹوں تنہا بیٹھے باتیں کرنا ناگوار گزرتا اور وہ ناراض ہو کر اُسے لعنت ملامت کرتا یا طلاق دینے کی دھمکی دیتا تو اتفاق ایسا ہوتا کہ اس واقعہ کے دو چار دن کے بعد جن آ جاتا اور پھر عورت ایک ایک فٹ چارپائی پر اچھلتی اور پٹیوں پر اپنے ہاتھ پاؤں مارتی چیختی چلاتی اور سارا گھر سر پر اٹھا لیتی اور اس طرح اُن سب کا آرام خاک میں مل جاتا۔ شوہر نئے نئے سیانے اور سائیں لوگ بلا کر لاتا۔ مگر مجال ہے کہ جن کسی کے قابو میں آ سکے۔ فلیتے جلاتے جاتے۔ دھونیاں دی جاتیں مگر ان سب کا اثر یہ ہوتا کہ جن کو اور زیادہ غصہ آ جاتا۔ اور نتیجہ کے طور پر عورت اور زیادہ تیزی سے اچھلنے لگتی اور ہاتھ پاؤں مارنے لگتی۔ پھر دو تین دن کے بعد شوہر کا غصہ اتر جاتا یا اُسے بیوی کی حالت پر رحم آ جاتا۔ ماں اور بیٹی کی مسلسل خوشامدیں اور التجائیں اُس کا غصہ فرو کرنے میں بہت مدد دیتیں اور وہ جا کر حافظ جی کو بلا لاتا۔ حافظ جی بھی ایسے سیدھے سادے صاف دل اور نیک انسان تھے۔ کہ جہاں یہ بلانے گیا اور فوراً اٹھ کر ساتھ چلے آتے اور آ کر لگے پھونکیں مارنے۔ کبھی کبھی جن بہت ہی ضدی بن کر اڑ جاتا۔ اس دن تو حافظ جی کی بھی گویا مصیبت ہی آ جاتی۔ ایک ایک پھونک پر چپت لگتے۔ لیکن حافظ جی بھی تھے ہمت کے

تھے جن کو نکال ہی دم لیتے۔ اگر چپت کھاتے تو چپت لگاتے بھی تھے۔ جن کو نکلنے کے بعد انہیں ان کا مرغوب کھاجا انڈوں کا گرم گرم حلوا ملتا اور پھر از سرِ نو آنا جانا شروع ہو جاتا۔

لڑکی جب اس کا باپ باہر ہوتا کواڑ کے درز سے لگ کر بیٹھ جاتی اور اندر جھانکتی رہتی۔ دادی کو گو کم نظر آتا تھا پھر بھی وہ اُسے منع کرتیں۔ لیکن یہ باز نہ آتی۔ باپ ذرا باہر گیا۔ اور یہ فوراً بیٹھک کے کواڑوں سے جا لگی۔

پھر ایک دن بدقسمتی سے اُس لڑکی میں بھی جن آگیا۔ لگی ماں کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے اور اُچھلنے۔ باپ تو باہر گیا ہوا تھا۔ دادی نے فوراً حافظ جی کو بُلا بھیجا۔ ماں روکتی رہی کہ حافظ جی کو نہ بلاؤ۔ اُنہیں کیا تکلیف دیتی ہے۔ مسجد کے امام صاحب کو بُلا لیتے ہیں۔ وہ جھاڑ جائیں گے۔ لیکن دادی نے کہا: "حافظ سب سے سیانا ہے وُہی اس جن کا علاج کریگا۔ میرے خیال میں تو تمہارے ہی والا جن اس میں آگیا ہے۔ میں بہت منع کرتی۔ لیکن یہ کواڑ سے لگی جھانکتی ہی رہتی تھی۔

حافظ جی کرسی پر بیٹھے لڑکی کو جھاڑ رہے تھے کہ اس کا باپ باہر سے واپس آگیا۔ اُس نے جو دیکھا کہ اب لڑکی میں بھی جن آنے لگا تو خدا جانے کیوں وہ غصہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اور اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک کونے میں سے ڈنڈا اُٹھا کر اس کی وہ درگت بنائی کہ خدا کی پناہ۔ ماں، بیوی اور حافظ جی بہتیرا ہاتھ پکڑتے رہے۔ لیکن اس نے بس نہ کی۔ لڑکی نے تو دو چار ڈنڈے کھا کر ہی چلانا شروع کر دیا تھا۔ "ابا جی مجھے بخش دیجئے، ابا جی مجھے بخش دیجئے!"

اس کے بعد لڑکی میں تو لڑکی میں کبھی اُس کی ماں میں بھی جن نہیں آیا :

عہدِ رنگیں

وہاں لڑائی ہے آنکھ دل نے جہاں مجالِ نظر نہیں ہے

از جناب کلام صدیقی لکھنوی

جمالِ روئے حبیب جب سے ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے
گناہگار و یہ کیا ہے آخر غرض پرستی اگر نہیں ہے

شباب سایہ فگن ہے سر پر نظر میں مستی بھری ہوئی ہے
ہے روکشِ آفتاب ذرہ ذرا اس ہیئت کو کوئی دیکھے

نفس نفس میں بسے ہوئے ہیں نظر نظر میں سمائے ہے ہیں
وہ آج ہم سے جو ملتفت ہیں تو عرش پر ہے دماغ اپنا

اداسی چھائی ہے شامِ غم کی مسرتوں کی سحر نہیں ہے
کرم پر اُس کے نظر لگی ہے خطا پر اپنی نظر نہیں ہے

خبر وہ رکھیں گے کیا کسی کی انہیں خود اپنی خبر نہیں ہے
وہاں لڑائی ہے آنکھ دل نے جہاں مجالِ نظر نہیں ہے

اور اس پہ کہتے ہیں شوخیوں سے کسی جگہ میرا گھر نہیں ہے
ہے ابتدا پر نظر ہماری اور انتہا پر نظر نہیں ہے

زمانہ گذرا ہے ایک وہ بھی کہ ہم پہ اُن کی نوازشیں تھیں
کلام قسمت کا پھیر دیکھو اب انکی سیدھی نظر نہیں ہے

خالد اور وحیدہ

عربی رومان

جناب سید پیر غلام دستگیر نامی

مہارب اور ظہیر دو سگے بھائی تھے ۔ عرب ان کو "جڑواں بچے" کہتے ہیں ۔ دونوں شجاعت و شہامت میں مشہور تھے ۔ مہارب سردارِ قبیلہ تھا اور ظہیر وزیر ۔ اتفاق سے ان میں شدید جھگڑا ہوگیا ۔ ظہیر بہت ملول ہوکر اپنے خیمہ میں آیا ۔ اسے کچھ سوجھتا نہ تھا کہ کیا کرے ۔ اس کی بیوی نے یہ حال دیکھ کر پوچھا ۔ کیا بات ہے ؟ ظہیر نے کہا ۔ کیا بتاؤں ؟ جس سے جھگڑا ہوا ہے ۔ میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا اور نہ اس سے برا سلوک کرسکتا ہوں ۔ وہ میرا رفیق اور سگا بھائی ہے ۔ اگر کوئی اور ہوتا تو میں بتا دیتا کہ جس سے تم نے بگاڑ پیدا کیا ہے وہ کیسا جھاڑ کا کانٹا ہے ۔ اور میں اسے مزہ چکھا دیتا ۔ سردارانِ عرب دیکھ لیتے کہ میری طاقت کتنی ہے ۔

اس کی بیوی نے سن کر کہا کہ اسے اپنے حال پر چھوڑ کر الگ ہوجاؤ ۔ ایک شاعر کا مقولہ ہے کہ اپنے والدین کی طرف سے بھی بے عزتی برداشت نہیں کی جاسکتی ۔

ظہیر نے بیوی کے مشورے کو قبول کرلیا ۔ سفر کی تیاری کردی ۔ خیمے اکھاڑ دیئے ۔ اونٹوں کو لاد لیا اور قبیلہ سعد کی طرف جو اس کا حلیف تھا روانہ ہوگیا ۔ تاہم اسے روانگی کے وقت بھائی کی جدائی کا صدمہ تھا ۔ اس نے روانگی کے وقت کہا ۔ یہ سفر جو میں اختیار کر رہا ہوں ۔ مجھے ہزاروں سال کا معلوم ہوتا ہے اور ہر سال ہزاروں فرسنگ کا ۔ اس وقت تم مجھ پر مہربانیوں کے اتنے انبار لگا دو کہ ہر ڈھیر کی قیمت ہزاروں مصر ہوں ۔ اور ہر مصر میں ہزاروں نیل ۔ تو بھی میں انہیں بڑی حقارت سے رد کردوں ۔ جب تک میں تم سے دور رہ کر تھوڑی چیز پر قناعت کروں گا اور یہ شعر پڑھوں گا ۔ جو نفیس میں موتیوں کے ہار سے بھی گراں بہا ہے (ترجمہ) جب انسان کی اپنے قبیلے کی سرزمین میں بے آبروئی ہو تو اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے بھائی تم نے جس برے طریقے سے مجھے دکھ دیا ہے ۔ اس کا بدلہ خدائے حی و قیوم تمہیں دے گا ۔

ظہیر قبیلہ سعد کی طرف روانہ ہوگیا ۔ اور وہاں پہنچنے پر اس کا بڑی شان سے خیر مقدم ہوا ۔ اور اسے کہا گیا کہ تمہارا ہم میں رہنا ہمارے لئے بڑی مسرت کا باعث ہے ۔ اس کی بیوی جلد ماں بننے والی تھی ۔ اس نے اس سے کہا کہ اگر لڑکا پیدا ہوا تو ھو المراد ۔ اگر لڑکی ہوئی تو ظاہر یہی کرنا کہ لڑکا ہوا ہے تاکہ میرے بھائی کو خوشی کا موقع نہ ملے ۔

مگر تقدیر الٰہی سے لڑکی پیدا ہوئی ۔ انہوں نے اس کا نام وحیدہ رکھا ۔ مگر مشہور کیا کہ لڑکا پیدا ہوا ہے ۔ اور اس کا نام وحید رکھا ہے ۔ بات کو پختہ کرنے کے لئے والدین نے کئی روز صبح و شام لوگوں کو ضیافتیں دے کر اظہار مسرت کیا ۔

انہی دنوں اس کے بھائی مہارب کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ۔ جس کا نام اس نے بطور تفوّل خالد رکھا ۔ کیونکہ ظہیر کے جانے کے بعد اس کے کاروبار میں ترقی رہی تھی ۔

دونوں بچے پل کر جوان ہوگئے ۔ اور ان کا شہرہ عرب میں دور و نزدیک پھیل گیا ۔ ظہیر نے اپنی بیٹی کو گھوڑے پر چڑھنا سکھایا اور ان تمام فنون کی تعلیم دی جو ایک بہادر جنگجو شخص کے لئے سیکھنے ضروری ہیں ۔ اس نے اسے سخت سے سخت مشقتیں اٹھانے اور اور سختیوں کا مقابلہ کرنے کا عادی بنا دیا ۔ لڑائی کے موقع پر وہ اسے دیگر عربی قبائل کے ساتھ روانہ کرتا ۔ اس نے جلد ہی اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ بہادر شہسواروں کے ساتھ شریک جنگ ہو ۔ حتیٰ کہ وہ شہسواری میں سب پر بازی لے گئی ۔ وہ بالکل بے خوف ہوکر شیروں پر ان کے بھٹوں میں گھس کر جا حملہ کرتی ۔ نوبت تا بایں جا رسید کہ اس کا نام سن کر ہی لوگوں کے کلیجے دہل جاتے اور وہ حریف پر فتح پاکر نعرہ مارتی کہ میں وحید ہوں ۔ ظہیر کا بیٹا ۔ شاہسوار قبائل ۔

اس اثنا میں وحید کے عمزاد خالد نے اپنے آپ کو دلاوری میں ممتاز بنا لیا ۔ اس کے والد مہارب نے جو دانا اور مدبر شیخ قبیلہ تھا ۔ مسافروں کے لئے مقامات رہائش و تفریح آراستہ کر رکھے تھے سواروں کی خاص طور پر آؤ بھگت ہوتی تھی ۔ خالد مردانِ جنگی کو

مصاحبت میں پلا تھا۔ اسی تربیت گاہ میں اس کے جوش نے ترقی پائی تھی۔ اس نے سواری سیکھی تھی۔ اور وہ ایک بیباک اور حریف کو دہشت زدہ کرنے والا بہادر بن گیا تھا۔

اس نے اپنے عمزاد وحید کے کارناموں کی خبریں سنیں۔ اس لئے اسے شوق پیدا ہوا کہ جاکر اسے ملے اور اس کی جنگی قابلیت کا ملاحظہ کرے۔ مگر اس کا باپ مانع تھا۔ کیونکہ وہ اپنے بھائی کے فرزند کو پسند نہ کرتا تھا۔ خالد کا شوق دبا رہا۔ حتیٰ کہ اس کا باپ اس کے لئے مناصب۔ دولت اور زمین چھوڑ کر مر گیا۔ اس نے اپنے والد کی روایات مہمان نوازی۔ غریب پروری اور برہنہ پوشی کو جاری رکھا۔ وہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر مردانِ جنگی کو ساتھ لئے میدان مارتا رہا۔ اور قوت اور جرأت میں نامور ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد قیمتی تحائف فراہم کرکے وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے چچا سے ملنے روانہ ہوگیا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور بڑے پیمانے پر اس کی ضیافت کی۔ کیونکہ وہ اپنے اس بھتیجے کی شجاعت کی داستانیں سن چکا تھا۔ خالد بڑی خوشی سے وحید سے ملا۔ پہلے سلام کیا۔ پھر مصافحہ اور پھر معانقہ۔ اس کی پیشانی کو بھی چوما کیونکہ وہ تو اسے جواں مرد سمجھتا تھا۔ اسے اس کے ساتھ رہ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ وہ چچا کے ہاں دس دن مقیم رہ کر مردانِ جنگی کے ساتھ شہسواری اور لڑائی کے کرتبوں کی نمائش کرتا رہا۔

وحیدہ اس کی خوبصورتی اور ہنرمندی دیکھ کر عاشق ہوگئی۔ اس کی بھوک جاتی رہی۔ اور نیند حرام ہوگئی۔ جب اس کا عشق ایسے مقام تک پہنچ گیا۔ اور اس نے اپنے دل کو خالد کی محبت میں ازخود رفتہ پایا تو اسے ماں سے کہنا پڑا۔ "اے ماں! اگر خالد مجھے یوں ہی چھوڑ کر چلا گیا تو میں اس کے فراق میں مر جاؤں گی۔"

ماں کو اس کی حالت پر رحم آیا۔ اس نے اسے ملامت نہیں کی۔ کیونکہ اسے معلوم ہوگیا۔ کہ اس سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوگا۔ بلکہ کہا۔ "وحیدہ! اپنی بے تابی کو ظاہر نہ ہونے دو۔ غم دور کرو۔ تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ کیونکہ جسے تم نے پسند کیا ہے وہ تمہارا عمزاد اور تمہاری ہی نسل اور قبیلے کا آدمی ہے۔ علاوہ ازیں تم خوبصورتی اور دلکشی میں اس کا جوڑ اور دلیری اور شہسواری میں وہ تمہارا مثیل ہے۔ کل جب اس کی ماں آئے گی۔ تو میں اس سے بات کروں گی۔ تمہاری شادی یقیناً ہو جائے گی اور ہم اپنے دیس واپس چلے جائیں گے۔"

ظہیر کی بیوی بڑی بے تابی سے والدۂ خالد کے آنے کی منتظر رہی۔ اس نے اپنی بیٹی کے سر کے بال جو کندھوں تک پہنچتے تھے۔ ننگے کر دئے تھے۔ خالد کی ماں اس دلکشی کو دیکھ کر حیرت سے بول اٹھی:۔

"کیا یہ تمہارا بیٹا وحید ہے؟"

جواب ملا "نہیں۔ یہ وحیدہ ہے"

خوبصورتی کا چاند آخر طلوع ہوگیا۔ پھر اس نے جو بات اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان ہوئی تھی سب کھول کر بیان کر دی۔ خالد کی ماں نے کہا:۔ "اے میری خاتون قبیلہ! میں ابھی تک حیرت میں ہوں۔ میں نے عرب کی اتنی خوبصورت عورتیں دیکھی ہیں۔ مگر وحیدہ سے زیادہ خوبصورت کسی کو نہیں پایا۔" پھر وحیدہ کی ماں نے کہا۔ "کہ میرا اس افشائے راز سے مطلب یہ ہے کہ یہ پیکرِ حسن میں تمہارے سپرد کر دوں۔ بیشک اسے تمہارے بیٹے سے بیاہ دوں اور پھر ہم اپنے وطن جا کر رل مل بیٹھیں۔"

خالد کی ماں نے فوراً اظہارِ رضامندی کر دیا اور کہا۔ "میرا بیٹا وحیدہ کو زوجہ بنا کر یقیناً بڑا خوش ہوگا۔" اس کے بعد وہ جلد اٹھ کر خالد کے پاس آئی۔ اور تمام سرگزشت بیان کی اور کہا "عرب بھر میں نہ کوئی صحرائی نہ شہری لڑکی وحیدہ کا حسن میں لگا کھا سکتی ہے۔ وہ حسن کی مکمل تصویر ہے۔ اس سے زیادہ من موہنی اور دلربا لڑکی کہیں نہ ہوگی۔ بیٹا! ابھی چچا کے پاس جاؤ۔ اور اس سے درخواست کرو کہ مجھے اپنی فرزندی سے شرف بخشو۔ تم بڑے خوش قسمت ہوگے۔ اگر اس نے تمہاری التجا مان لی۔ بیٹا! وقت ضائع نہ کرو۔ اور حصولِ مراد کے لئے کوشاں رہو۔"

یہ بات سن کر خالد نے اپنی نظر زمین پر گاڑ دی۔ اور ایک عرصہ تک سوچ میں پڑا رہا۔ پھر بولا:۔

"ماں! میں یہاں اب نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے اپنے لشکر اور سواروں کے ساتھ وطن واپس جانا ہے۔ میں اب چچا سے اور کوئی بات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے یقین ہے کہ وحیدہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کا مزاج اور فلسفہ ناقابلِ اعتماد ہے۔ اس کا اندازِ گفتگو غیر متقین اور خام ہے۔ میں مردانِ جنگی میں رہنے کا عادی ہوں۔ ان پر میں نے اپنی دولت خرچ کی۔ اور سپاہ گری میں نام پیدا کیا ہے۔ اگر میری چچا کی بیٹی کو مجھ سے محبت ہے۔ تو وہ اس کی نسوانی کمزوری ہے۔ کیونکہ وہ ایک ناتجربہ کار لڑکی ہے۔"

خالد نے اپنے ہتھیار سجائے ۔ گھوڑے پر سوار ہوا ۔ اپنے
...ا الوداع کہا اور فوراً رخصت ہو جانے کا اعلان کیا ۔
ظہیر نے کہا ۔ "اے بھتیجے اتنی جلدی!"
خالد نے کہا ۔ "میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا ۔ گھوڑے
...ڈ بتا کر پویہ دیا اور سرپٹ دوڑا کر یہ جا وہ جا نظروں سے
...ب ہو گیا ۔ اس کی ماں نے وحیدہ کے سامنے سب ماجرا بیان
...یا اور ایک اونٹ پر سوار ہو کر اپنے وطن کو راہی ہوئی ۔

وحیدہ کی ذکی الحس طبع نے خالد کے اس جواب کو اپنی بے عزتی
...ول کیا ۔ اور اس میں اتنی محو ہوئی کہ نہ نیند رہی نہ اشتہائے
...ک ۔ چند روز بعد جب کہ اس کا والد ایک دشمن پر حملہ کرنے
لئے سواروں کو تیار کر رہا تھا ۔ اس کی نظر وحیدہ پر پڑی ۔
...کہ اس کا چہرہ متغیر ہے اور جوشِ طبع سرد ۔ مگر اس نے خاموشی
...و مناسب سمجھا ۔ یہ سوچ کر کہ کچھ دنوں بعد یہ خود ہی سنبھل جائے گی ۔

ظہیر نظروں سے اوجھل ہوا ہی تھا کہ وحیدہ نے اپنی آپ
...ت کی سی حالت میں پا کر اور آثارِ دیوانگی ملاحظہ کر کے ماں سے
... ماں! میں اپنے آپ کو قریب الموت خیال کرتی ہوں اور
...تی ہوں کہ خالد اسی طرح قوتِ حیات میں ہے ۔ میں چاہتی
... کہ خدا مجھے ہمت دے تو اسے حزاتِ موت کا مزہ چکھا دوں
...ں کے درد و کرب میں مبتلا کر دوں ۔

یہ کہہ کر وہ شیرنی کی طرح اٹھی ۔ ہتھیار سنبھالے ۔ گھوڑے پر
...ی اور ماں سے کہا کہ میں شکار کھیلنے جا رہی ہوں ۔ ایک لمحہ
...م کئے بغیر وہ ٹیلوں اور پہاڑیوں کو گرد کی طرح پیچھے چھوڑتی
... اپنے عمزاد کی قیامگاہ تک پہنچی ۔ چونکہ اس نے بھیس بدلا ہوا تھا
... لئے وہ مسافر خانے میں جا اتری ۔ اور کسی نے اسے شناخت
... ۔ چونکہ اس کے خود کا جھکا ہوا کنارہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کوئی
...زی شہسوار ہے ۔ اس لئے خدمتگاروں نے اس کی بڑی
...ت و تکریم کی ۔ یہ سمجھ کر کہ وہ ملک کی ایک جلیل القدر شخصیت ہے ۔
رات اس نے آرام کیا ۔ صبح جنگی مشغلوں میں حصہ لیا ۔ کئی
...دروں کو بطور مبارز طلب کیا اور ایسے ہنر اور شجاعت کا ثبوت
...کہ حاضرین عش عش کر اٹھے ۔ اور دوپہر سے پہلے پہلے سب نے
...کا تفوق تسلیم کر لیا ۔

خالد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ آخر اس نے خود اس سے مقابلے
...ٹھانی ۔ وہ تمام دن مقابلہ کرتے رہے ۔ جارحانہ حملے اور بچاؤ
کے سب ہنر ایک ایک کر کے دونوں نے ظاہر کر دئے ۔ مگر شام تک کوئی فیصلہ
نہ ہو سکا ۔ دونوں میں سے کسی کو زخم نہ آئے ۔ نہ کوئی جیتا نہ ہارا ۔ نظارہ بین
گو وحیدہ کی تعریف کر رہے تھے ۔ مگر یہ دیکھ کر انہیں ضرور صدمہ تھا کہ
ان کے سردار کا مدمقابل فنونِ جنگ میں ماہر ہونے کی وجہ سے دبتا دکھائی
نہیں دیتا ۔ خالد نے کہا کہ میرے حریف کی خوب خاطر و مدارات کرو اور
خود رات بھر سوچتا رہا ۔ کہ یہ کس قبیلے کا نوجوان ہے ۔ جو مجھ سے مغلوب نہیں
ہو سکا ۔ اگلی صبح پھر مقابلہ گرم ہوا ۔ اور شام تک وہی دیروزہ عالم رہا ۔ اسی
طرح تین دن گزر گئے ۔ وحیدہ نے ابھی تک ظاہر نہیں کیا تھا کہ میں کون ہوں
اور نہ ہی خالد نے استفسار کیا تھا ۔

چوتھے دن کی صبح کو خالد سے نہ رہا گیا ۔ سوار ہو کر وحیدہ کی قیامگاہ
تک آیا ۔ دیکھا کہ وہ بھی سوار ہو رہی ہے ۔ اس نے اسے سلام کیا ۔ اور اس
نے جواب دیا ۔ پھر خالد نے پوچھا ۔ اے شریف عرب! میرا تم سے ایک سوال
ہے ۔ جو میں آج تک نہیں پوچھ سکا ۔ اب للہ! مجھے بتاؤ ۔ تم کہاں کے
شہزادے ہو ۔ مجھے تم جیسے بہادر لڑاکے سے کبھی واسطہ نہیں پڑا ۔
تم فنونِ حرب سے پورے آگاہ اور بے نظیر ہو ۔ میں تمہارا حال دریافت
کرنے کے لئے بڑا بے قرار ہوں ۔

وحیدہ مسکرائی ۔ اور اپنا خود الگ کر کے بولی ۔ خالد! میں
عورت ہوں ۔ مردِ جنگی نہیں ہوں ۔ میں تمہارے چچا کی بیٹی وحیدہ ہوں ۔
جسے تم نے شادی میں قبول نہ کیا ۔ اس غرور سے کہ تم بڑے مردِ
میدان اور ہتھیار چلانے میں ماہر ہو ۔ یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کی باگ
موڑی ۔ ایڑ لگائی اور سرپٹ دوڑا کر اپنے وطن کی طرف چل دی ۔

وحیدہ کے چلے جانے کے بعد خالد بڑا مضطرب ہوا ۔ اس کی محبت
اس کے دل میں گھر کر چکی تھی ۔ اسے کچھ سوجھتا نہ تھا ۔ اس کی سپاہیانہ
روح جواب دے گئی ۔ اور عورتوں کی طرف سے جو نفرت جاگزینِ قلب
تھی ۔ وہ مبدل بہ محبت ہو گئی ۔ اس نے ماں کو بلوایا اور جو کچھ گزرا تھا
کہہ سنایا ۔ ماں نے کہا ۔ بیٹا! اب تمہارے دل میں وحیدہ کی زیادہ
چاہ ہونی چاہئے ۔ صبر کرو ۔ میں اس کی ماں کے پاس جا کر خواستگاری
کرتی ہوں ۔ چنانچہ وہ اونٹ پر سوار ہوئی ۔ اور وحیدہ کی راہ پہ چلتی چلتی
منزلِ مقصود پر پہنچ گئی ۔ چونکہ ظہیر ابھی مہم سے واپس نہیں آیا تھا ۔
اس لئے اس نے اس کے رشتہ داروں کو وسیلہ بنایا اور وحیدہ
کا سوال پیش کیا ۔ جب وحیدہ نے اپنی ماں سے بات سنی تو بولی ۔
یہ کبھی نہیں ہو سکتا ۔ خواہ مجھے موت کا پیالہ پینا پڑے ۔ میں نے جو خالد
کے خیمے میں جا کر کام کیا ۔ وہ رنج و غم کی آگ بجھانے اور روح کی

بے تابی دُور کرنے کے لئے تھا۔

یہ جواب سن کر خالد کی ماں مایوس ہوگئی۔ اپنے بیٹے کے پاس واپس پہنچی۔ اور بتا دیا کہ صاف جواب ہے۔

خالد نے جو پہلے ہی فراق کے عذاب میں گرفتار اور عشق کے ہاتھوں زبوں تھا۔ بہت پریشان ہوا۔ اور وحیدہ کا مایوس کن جواب سن کر اگرچہ وہ بڑے اضطراب میں پڑا۔ مگر دل میں آتشِ محبت اور تیز ہوئی۔ اور چلّا اٹھا۔ ماں! بتا اب کیا کیا جائے۔

ماں نے کہا۔ بیٹا! اب صرف ایک ہی علاج ہے کہ عرب کے ممتاز شیوخ کو جمع کرو۔ اور اپنے دوستوں کو ساتھ لے کر چچا کی خدمت میں اس کی مراجعت کے بعد پہنچو۔ اور مردانِ جنگی کے سامنے اس سے سوال کرو۔ اگر وہ کہے کہ میری کوئی بیٹی نہیں۔ تو اسے تمام ماجرے سے اطلاع دو۔ اور دباؤ ڈالو حتیٰ کہ وہ مان جائے۔

جب خالد کو پتہ ملا کہ اس کا چچا مہم سے فارغ ہوکر واپس آگیا ہے تو اس نے قبیلے کے سرداروں کو اکٹھا کیا اور تمام کہانی سنائی۔ یعودی کرز جو اس کا دلدادہ ترین ساتھی تھا چلّا اٹھا۔ یہ عجیب معاملہ ہے۔ ہم نے تو سنا ہوا تھا۔ کہ تمہارے چچا کا ایک ہی بیٹا ہے۔ وحید نام۔ مگر حقیقت اب معلوم ہوئی ہے۔ تم سے زیادہ چچا کی بیٹی کا اور کوئی حقدار نہیں۔ ہم سب کو اکٹھے ہوکر اس کے پاس جانا اور منت کہنا چاہیے کہ تم اپنے کنبے کی طرف واپس چلو۔ اور بیٹی کسی اجنبی کو نہ دو۔

خالد نے کسی اور کی بات سنے بغیر اپنے ساتھ سو بہادر سوار جو محارب اور ظہیر کے ساتھ بچپن سے رہے تھے ساتھ لئے اور انہیں بیش از بیش تحائف دے کر روانہ ہوا۔ تا آنکہ قبیلہ سعد کے درمیان پہنچ گئے۔ خالد نے چچا کو اس کے مہم سے کامیاب آنے پر مبارکباد کہی۔

ظہیر کو حیرانگی تھی کہ خالد دوسری دفعہ سردارانِ قبیلہ کو ساتھ لے کر کیوں آیا۔ اسے بالکل علم نہ تھا کہ اس معاملے میں وحیدہ کا کچھ تعلق ہے۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ بھتیجا واپس جانے کی ترغیب دینے آیا ہے۔ اس نے ہر طرح سے حق مہمان داری ادا کیا۔ خیمے مہیا کئے اور بھیڑیں اور اونٹ ذبح کرکے بڑی پرتکلف دعوتوں کا انتظام کیا۔ تین دن یہی سلسلہ قائم رہا۔

چوتھے دن خالد نے اٹھ کر بعد شکریہ کہا۔ چچا جان! مجھے اپنی فرزندی میں قبول کریں اور گھر واپس تشریف لے جائیں۔ ظہیر نے کہا۔ میرے ہاں کوئی لڑکی نہیں۔ صرف وحید ہے۔ خالد نے

کیفیتِ حال اور اپنی اور وحیدہ کی سرگزشت سے اسے مطلع کیا ۔

یہ سن کر ظہیر شرمندہ ہوا ۔ اور آنکھیں نیچی کر لیں ۔ پھر اس خیال سے کہ صورتِ حال بگڑ نہ جائے ۔ حاضرین کو مخاطب کر کے کہا ۔ بھائیو ! میں زیادہ دیر اس بھید کو چھپا نہیں سکتا ۔ جتنی جلدی ہو سکا ۔ لڑکی کی شادی کر دوں گا ۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ خالد سب سے زیادہ مستحق ہے ۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور خالد نے اس کے ساتھ اپنا ہاتھ ملایا اور سرداروں کے روبرو شادی کی بات پختہ ہو گئی ۔ خالد نے عہد کیا کہ وہ بطور ساچق پانچ سو زرد رنگ کے سیاہ چشم اونٹ اور پانچ سو اونٹ یمن کے پسندیدہ تحائف سے لدے ہوئے لائے گا ۔ قبیلہ سعد کو جس میں ظہیر رہتا تھا ۔ اس معاملے سے الگ رکھا گیا ۔

جب ظہیر نے بیٹی کے پاس آکر رضامندی طلب کی تو وہ باپ کی کارروائی پر بہت ستپٹائی ۔ مگر جب اسے معلوم ہوا کہ باپ اسے کنوارا نہیں رکھ سکتا ۔ تو اس نے کہا ۔ کہ باپ ! اگر میرا عمزاد مجھ سے بیاہ کرنا چاہتا ہے ۔ تو میں اس کے خیمے میں نہیں جا سکتی ۔ جب تک کہ وہ تقریب شادی پر ایک ہزار اونٹ ذبح کرنے کا اقرار نہ کرے ۔ اور وہ اونٹ بھی وہ ہوں ۔ جو برچھوں کو ہوا میں لہرانے والے ملاک کے بیٹے غنام سے حاصل کئے گئے ہوں ۔ خالد نے یہ شرط بھی مان لی ۔ مگر ظہیر کی سپاہ کے سالاروں نے اسے جانے نہ دیا ۔ تا آنکہ اس نے مالِ غنیمت کو اپنے ساتھ وطن لے جانے کے لئے جمع نہ کر لیا ۔

یہ تیاریاں ہو چکیں تو خالد ہزار سواروں کو لے کر روانہ ہوا ۔ اور قبیلہ عامر پر فتح پائی ۔ "برچھوں کو ہوا میں لہرانے والا" تین دفعہ زخمی ہو کر اپنے ہمراہیوں سمیت کھیت رہا ۔ اس نے ان کا مال لوٹا ۔ اور جو اسے وہاں سے ملا وہ وحیدہ کے مطالبہ سے بہت زیادہ تھا ۔ وہ مالِ غنیمت لاد کر واپس ہوا اور اپنی کامیابی میں سرشار تھا ۔ جب اس نے درخواست کی کہ شادی کی تاریخ مقرر کی جائے ۔ تو وحیدہ نے اس سے بات کرنے کی اجازت چاہی اور اس سے یوں خطاب کیا :۔

"اگر تم مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو ۔ تو پہلے میری تمنا پوری کرو ۔ اور وہ یہ کہ میری شادی کے دن میرے اونٹ کی مہار ایک سردار کی بیٹی نے پکڑی ہو ۔ وہ آزاد ہو (لونڈی نہ ہو) میری مراد ہے کہ وہ بڑے معزز شہزادے کی بیٹی ہو ۔ تاکہ تمام دخترانِ عرب سے میری عزت بڑھ جائے ۔

خالد نے یہ شرط بھی مان لی ۔ اور تکمیل فرمائش کے لئے روانہ ہو گیا ۔ اس نے اپنے سواروں کو لے کر میدان اور وادیاں طے کیں ۔ یمن کی سرزمین کو چھانتا ہوا وہ خطۂ حجر اور ریگستانی ٹیلوں تک جا پہنچا وہاں اس نے معاوک پسر مبزال کے قبیلے پر حملہ کیا ۔ وہ ان پر طوفان کی طرح جا پڑا ۔ اور اس نے اپنی تلوار سے سواروں کے پرخچے اڑا دئے ہوئے امیمہ دخترِ معاوک کو عین اس وقت گرفتار کیا ۔ جب کہ وہ راہِ فرار اختیار کر رہی تھی ۔

الغرض بڑے بڑے بہادروں کو شکست دیتا ہوا اور تمام عرب کی دولت سمیٹتا ہوا گھر واپس آیا ۔ مگر اس نے خیمے میں اس وقت تک داخل ہونا پسند نہ کیا ۔ جب تک کہ اس نے وہ تمام مال اکٹھا نہ کر لیا ۔ جو مختلف جگہوں میں پڑا تھا ۔

جوان لڑکیاں گاتی بجاتی اس کے آگے آگے چل رہی تھیں تمام قبائل نہایت مسرت سے اس کا خیر مقدم کرنے کھڑے تھے خالد نے پہنچ کر بیواؤں اور یتیموں میں کپڑے تقسیم کئے اور سب ساتھیوں اور دوستوں کو جشنِ شادی پر مدعو کیا ۔ تمام ملک کے عرب شاملِ کتخدائی ہونے کے لئے جوق در جوق جمع ہوئے ۔ جب وہ تمام مصروفِ طعام تھے ۔ خالد دس غلاموں کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف نکل گیا ۔ تاکہ شیروں اور شیرنیوں پر حملہ کر کے انہیں بچوں سمیت پکڑ لائے ۔ اور مہمانوں کو گوشت کھلائے ۔

وحیدہ کو اس کی اطلاع مل چکی تھی ۔ اس نے مردانہ لباس زیب تن کیا ۔ گھوڑے پر سوار ہوئی خیموں سے نکلی ۔ ابھی ضیافت میں تین دن باقی تھے ۔ اس نے خالد کا تعاقب کیا اور جنگل میں اسے جا لیا ۔ وہ اس پر جنگلی جانور کی طرح حملہ آور ہوئی اور بڑی تندی سے گرج کر بولی ۔ اے عرب ! گھوڑے سے اتر آؤ ۔ زرہ اور اسلحہ اتار دو ۔ اگر تم نے تامل کیا ۔ تو میں یہ نیزہ تمہارے جگر کے پار کر دوں گا ۔ خالد نے اس کے مقابلے کی نیت کر لی ۔ اور لڑائی شدت سے شروع ہو گئی ۔ جو دو گھنٹے سے زیادہ جاری رہی ۔ جب خالد کو اپنے مدِ مقابل کی بدلی ہوئی نظر دکھائی دی کر خوف پیدا ہوا ۔ تو پھر سوار ہو گیا ۔ اور مقامِ جنگ سے گھوڑا موڑ کر چلا یا ۔

تمہیں عربی وقار کی قسم ! مجھے سچ سچ بتاؤ ۔ تم صحرائے عرب کے کون سے شہسوار ہو ۔ مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ تمہارے حملوں کی شدت ناقابلِ برداشت ہے ۔ تم نے مجھے تکمیلِ ارادہ سے باز رکھا ہے ۔ اور میں اس کام سے رک گیا ہوں ۔ جو میں کرنا چاہتا تھا ۔"

یہ الفاظ سن کر وحیدہ نے خود اتار دیا ۔ تاکہ وہ اس کا چہرہ دیکھ لے ۔ اور چیخ کر بولی ۔ اے خالد ! کیا یہ اس لڑکی کے لئے

جس سے تم محبت کرتے ہو ضروری ہے کہ وہ وحشی جانوروں پر حملہ کرے ۔ تاکہ دختران عرب سیکھ جائیں کہ یہ صرف جنگجو مردوں کا کام نہیں ہے (کیونکہ جس فنِ حرب میں مرد ماہر ہوں ۔ وہ عورتوں کو بھی سیکھنا پڑتا ہے)

ان چبھتے ہوئے الفاظ کو سن کر خالد نادم ہوا اور بولا ۔

عربی عزت کی قسم ہے کہ مجھے تمہارے سوا کوئی مغلوب نہیں کر سکتا ۔ کیا کسی اور مرد نے تمہیں چیلنج دیا یا تم صرف اپنی طاقت نمائی کے لیے یہاں آئی ہو ۔ وحیدہ نے کہا ۔ مجھے ناموس عرب کی قسم ہے کہ میں محض تمہیں وحشی جانوروں کے شکار میں مدد دینے کے لئے آئی تھی ۔ تاکہ تمہارے چاہی مجھے زوجہ انتخاب کرنے پر ملامت نہ کریں ۔ یہ لفظ سن کر خالد فرطِ حیرت و مسرت سے وجد میں آگیا ۔ کہ وحیدہ کس قدر جوش اور مستحکم ارادے کی مالکہ ہے ۔

اس کے بعد وہ دونوں گھوڑوں سے اتر پڑے اور شیر وں کے بن میں داخل ہوئے ۔ خالد نے دو غضبناک وحشی جانوروں کو پکڑا اور وحیدہ نے حملہ کر کے ایک شیر اور دو شیرنیوں کو لے لیا ۔ اس کے بعد دونوں نے تبادل مبارک دی ۔ اور وحیدہ خالد کی بہادری سے خوش ہوئی ۔ اس اثنا میں وہ بولی ۔ میں ابھی اپنے خیموں سے اجازت رخصت نہ دوں گی ۔ تاوقتیکہ شادی نہ ہو جائے ۔ یہ کہہ کر وہ اسے چھوڑ کر اپنی منزل گاہ کی طرف دوڑ گئی ۔

خالد اپنے پس گزاشتہ غلاموں کی طرف بڑھا ۔ اور انہیں شکار کئے ہوئے جانوروں کو خیموں میں اٹھا لے جانے کا حکم دیا ۔ وہ خالد کے اس کارنامے کو دیکھ کر خوف سے کانپ اٹھے اور بولے کہ خالد اپنے تمام ہمسروں سے بہادری میں سبقت لے گیا ہے ۔

اس اثنا میں ضیافت ہوتی رہی ۔ اور تمام مہمانوں کی بوجہ احسن خاطر و مدارات ہوئی ۔ کنیزکوں نے دلکش انداز میں ساز بجائے ۔ غلاموں نے ہوا میں تلواریں گھمائیں اور چھوٹی لڑکیاں صبح سے شام تک گاتی رہیں ۔ ایسے دلکش سماں میں وحیدہ اور خالد کی شادی ہوئی ۔ مالک کی بیٹی امیمہ نے دلہن کے اونٹ کی نکیل پکڑی ہوئی تھی ۔ اور سب زن و مرد وحیدہ کا گیت گا رہے تھے ۔!

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں (منیجر)

برق سینائی

فقط نظر سے ہے روشن چراغِ زیبائی

از حضرت آفسر احمد نگری

اُٹھا صبُوحی میں طوفانِ سوز و رعنائی
مری نظر جو مئے لالہ گوں سے ٹکرائی

دیارِ عشق میں تا چند فکر سود و زیاں
یہی ہے پردۂ حائل یہی ہے رسوائی

مذاق پردہ دری کا نہ مانگ مجھ سے جواز
مری سرشت میں ہے ذوق آشکارائی

مجھے پسند نہیں ہے زلالِ مغربیاں
کہاں ہے پیرِ خرابات عقل و دانائی

نظر نہیں تو اندھیرا ہے بزمِ فطرت میں
فقط نظر سے ہے روشن چراغِ زیبائی

شباب نام ہے "سوزِ خودی" کا اے ناداں
نہ "ماسوا نگری" نئے جمال و زیبائی

میں مہر و ماہ سے لیتا ہوں کام قاصد کا
مری فغاں کا پیمبر ہے کاخِ مینائی

یقین و عزم کے بدلے خرد قبول نہ کر
یہ آبجو ہے! چمن ہے وہ خارِ صحرائی

تری نظر سے لرز جائے کائنات تمام
جلالِ فقر اگر ہو شریکِ بینائی

تجھے خبر نہیں منزل ہے کتنی دُور کہ تو
ہے ناشناس رہ و رسم جادہ پیمائی

مقامِ حیرتِ محمود سے ہوں ناواقف
خطاب مجھکو ملا ہے ازل میں سودائی

نگاہ بابِ اثر تک پہنچ گئی شاید
ہر ایک لحظہ چمکتی ہے برقِ سینائی

حریفِ سوزِ محبت ہے اس جہاں کا ضمیر
جنونِ عشق کی ممکن نہیں پذیرائی

وجودِ کفر نظامِ حرم کا جزوِ عظیم
نمودِ شب میں ہے آغازِ صبحِ رعنائی

فروغِ مصطفویؐ ہے وفورِ بو الہبی
رہینِ ابر ہے بجلی کی شعلہ پیدائی

مری حیات کا سرمایہ اک سیاہ گلیم
نہ اوجِ بختِ سکندر نہ تختِ دارائی

تری نوا پہ ہزار اس درود اے اقبالؒ
ترا کلام ہے میرا رفیقِ تنہائی

قانون

طنز آمیز افسانہ

جناب شوکت ہاشمی

انسپکٹر اپنی لمبی لمبی بھوری مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا آگے بڑھا اور نواز کی نحیف اور کانپتی کلائیوں کو قانون کی آہنی زنجیروں سے جکڑ دیا۔ نواز کی پلکوں پر دو موٹے موٹے آنسو پارے کی طرح تھرتھرانے لگے اس نے سر اٹھا کر مظلومانہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ لوگ سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ اور بار بار حقارت آمیز نظروں سے اس کی جانب دیکھتے بھی جاتے۔ قریب سے کسی نے آہستہ سے کہا "کیا زمانہ ہے کیلی میں شہزادے پھرتے ہیں۔ نواز اس طنز کو سمجھ گیا۔ شرم اور ندامت کے جذبات سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ ہچکیاں روکنے کی خاطر اپنے ہاتھ کا انگوٹھا دانتوں سے کاٹنے لگا۔

"رحیم خاں!" انسپکٹر گرج کر بولا "لے چلو اس بدمعاش کو تھانے"

نواز چونک اٹھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے رحیم خاں کے کرخت چہرے کی طرف دیکھا۔ جو عجیب وحشیانہ انداز میں زیرِ لب مسکراتا ہوا اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ چیخ اٹھا۔ "حضور! میں بے قصور ہوں۔ خدا جانتا ہے میں بے قصور ہوں۔ میں نے کبھی ہاتھ نہیں ڈالا۔ منیم جی نے جھوٹ کہا ہے۔ میں نے آج تک چوری نہیں کی۔ میں شریف آدمی ہوں حضور! میں چوری کر ہی نہیں سکتا۔"

رحیم خاں نے اپنے ہونٹ سکیڑ لئے اور قریب آ کر زور سے ایک تھپڑ نواز کی کنپٹی پر رسید کیا۔ "بڑے آئے شریف کہیں کے سالے! تیرے جیسے بہت سے شریف سرکار کے ہاں مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔" اور پھر اس نے داد طلب نظروں سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

"شاباش" انسپکٹر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

نواز کا سارا جسم تھرا اٹھا۔ اس نے رنج اور غصہ کے مارے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور رحیم خاں کی آنکھوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ "تم... تم... تم نے مجھے گالی دی... تم نے..."

اور جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کہہ نہ سکا۔ اس نے اپنے دانت پیسے اور انسپکٹر کی طرف گھوم کر بولا۔ "قانون نے تمہیں ہم غریبوں کی عزت کا محافظ ٹھہرایا ہے۔ حکومت نے ہمارے سکھ اور آرام کے لئے تمہارے سر پر یہ سرخ پگڑیاں دھری ہیں۔ لیکن ہم غریب تمہاری آواز سن کر کانپتے ہیں۔ ہم شریف ہی تمہاری صورتوں سے ہیبت کھاتے ہیں۔ تم نے منیم جی کے کہے پر اعتبار کر کے ان بیوی کے سامنے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ مجھے تھپڑ مارا۔ مجھے گالی دی۔ تم... تم خائن ہو۔ تم نے حکومت کے اس اعتماد کی توہین کی۔ جو حکومت نے رعایا کے حق میں تم پر کیا۔ تم نے قانون کا مذاق اڑایا ہے۔" اور پھر اس نے ایک سرد آہ بھرلی اور زیرِ لب غرا کر بولا "تم نے یہ سب اس لئے کیا کہ میں غریب ہوں اور تمہاری جیبوں کو سنہری اور روپہلی ٹھیکریوں سے بوجھل نہیں بنا سکتا۔

انسپکٹر گرج کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا بکتے ہو جی! — رحیم خاں! کیا دیکھتے ہو۔ مارو اس خبیث کو۔" اور رحیم خاں کا منہ نہایت بیدردی سے اپنی آتشیں زبان نکالے نواز کے جسم کا خون چاٹنے لگا۔

رات نہایت بھیانک اور تاریک تھی جیل کی سیاہ دیواریں نواز کو یوں محسوس ہو رہی تھیں۔ جیسے الف لیلےٰ کی محیر العقول داستانوں کے خوفناک عفریت۔ جو اپنے کالے کالے پروں کو لاتے ہوئے اس کے چاروں طرف ناچ رہے ہوں۔ دروازے کے پاس عظیم الجثہ چوکیدار اپنے بھاری بھرکم جوتوں کی کھٹ کھٹ کے ساتھ ساکن فضا کو متلاطم کر رہا تھا — دور کسی گھڑیال نے دو بجائے۔ نواز نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور کروٹ بدل کر زیرِ لب بڑبڑانے لگا۔ اسے تعجب تھا کہ اپنی معصومیت اور بے گناہی کے باوجود وہ خداوندانِ قانون کا موردِ عتاب کیوں ہے؟ معاً اسے اپنی بیوی اور سہ سالہ بچی کا خیال آیا اور وہ تلملا اٹھا۔

باہر چوکیدار زور سے کھنکارا۔ نواز نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دروازے کے باہر جھانکا۔ تاریکی — بے پناہ تاریکی — جیل کے کتے اچانک ہم آواز ہو کر غرائے اور ساری فضا ان کی چیخوں سے گونج اٹھی۔

"چوکیدار جی!" نواز نے آہستہ سے کہا۔

جوتوں کی آہٹ تھم گئی۔ اور چوکیدار قریب آکر کندھے سے بندوق اتار کر بولا "کیا ہے بھائی!"

نواز نے غم آلود لہجے میں کہا "میں کب گھر جا سکوں گا؟"

چوکیدار جنگلے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا "جب کورٹ کا فیصلہ ہو گا بھیّا! ابھی تو کئی پیشیاں ہوں گی۔"

نواز خاموش رہا۔ اسے اپنے دوست ہیرا کے وہ لفظ یاد آئے کہ "دو سال سے پیشیاں بھگت رہا ہوں بھیّا! ضمانت نہ ہوتی تو اتنی مدت جیل میں سڑا کرتا" ۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

اپنی چونتیس سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ نواز نے جیل کا منہ دیکھا تھا اور کورٹ کے ٹین لگے کٹہرے پر کہنیاں ٹیکی تھیں۔ مجسٹریٹ صاحب نے چند لمحوں تک بغور نواز کی طرف دیکھا اور پھر کاغذات کا معاینہ کرنے لگے۔

"تمہارا نام نواز ہے؟" کورٹ انسپکٹر نے اپنی عینک کے موٹے شیشوں سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

نواز ریگستانی چشمے کی طرح پھوٹ پڑا۔ "سرکار! میں بے قصور ہوں منیم جی نے دیر سے آنے پر گالی دی۔ اور میں نے غصے میں انہیں تھپڑ دے مارا۔ لیکن سرکار میں نے بیسیوں موٹی موٹی اور گالیاں سن لی تھیں... انسپکٹر صاحب نے مجھے مارا بھی۔ میں شریف آدمی ہوں۔ بال بچے دار ہوں۔ میں چوری کیا جانوں منیم جی نے مجھ سے بدلہ لیا ہے۔ میں نے کیش میں ہاتھ نہیں ڈالا۔ میں بے قصور ہوں ــــ سرکار سنا ہے یہاں انصاف ہوتا ہے۔ مجھ سے بھی انصاف کیجئے۔ میری بیوی معصوم بچی کل شام سے میری راہ تکتی ہوں گی حضور مجھے جانے دیجئے میں منیم جی سے معافی مانگ لوں گا۔ سرکار حکم دیں گے تو میں یہ شہر چھوڑ دوں گا۔ میں بے قصور ہوں سرکار! میں.... میں.....

مجسٹریٹ صاحب نے زور سے میز پر مکا مارا۔ "آرڈر۔ آرڈر" عدالت میں خاموشی چھا گئی۔ اور نواز سسکیاں لیتے ہوئے منتظر نظروں سے ان کا چہرہ تکنے لگا۔ جیسے کوئی جاں بلب مریض ڈاکٹر سے اپنے مرض کی پوری کیفیت بیان کر چکنے کے بعد اس کے نسخہ کا انتظار کر رہا ہو۔ مجسٹریٹ نے ایک بار پھر کاغذات پر نظریں گاڑ دیں۔ اور چند لمحوں تک سرنگوں رہنے کے بعد بولے "۵۰۰ روپے ضمانت اور ۲۸ مارچ۔"

حیرت و استعجاب کی ایک ہلکی سی چیخ نواز کے کپکپاتے ہونٹوں سے باہر نکل گئی۔ میرے رحیم اللہ! میری پانچسو روپے کی ضمانت کون دے گا؟ اور پیشی ۲۸ مارچ یعنی ۱۴ دن بعد ــــ وفورِ غم سے اس کا سر چکرا گیا اور وہ کٹہرے کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے غش کھا کر گر پڑا۔

اسی سیاہ جنگلے سلیٹی دیواروں کے سائے میں نواز نے موسم باراں کی ۱۴ رومان پرور شامیں سسکتے اور بلکتے گزار دیں۔ اس کی بیوی اپنی سہ سالہ بچی کو کاندھوں پر لاد کر کئی مرتبہ اس سے ملنے کے لئے آئی۔ وہ سیاہ جنگلے کے ابھرے ہوئے کونوں کو اپنی شفاف پیشانی کے تازہ خون سے رنگ دیتی۔ ہر بار وہ آکر نواز کے قدموں پر بسورتی ہوئی بچی کو ڈال دیتی اور اس کی قمیص کا دامن تھام کر کہتی۔

"تم نے منیم جی کو تھپڑ کیوں مارا؟ تم سے ذرا سا غصہ برداشت نہ ہو سکا۔ تمہیں اپنی بچی کا بھی خیال نہیں تھا۔ تم ایک چھوٹی سی گالی بھی نہ سن سکے؟ تم کیسے غریب ہو جی! غریب بننے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے ــــ۔ دیکھو! بچی نے تین دن سے پیٹ بھر کر دودھ نہیں پیا۔ میں نے کل کریم کی خالہ سے ایک چونی ادھار لے کر کھانا کھایا" اور پھر وہ ایک میلی سی پوٹلی آگے بڑھا دیتی۔ جس میں ابلے ہوئے چنے اور نمک مصالحے سے چپڑی ہوئی سوکھی چپاتیاں پڑی ہوتیں۔ "لو تم بھی کھاؤ۔"

نواز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ ننھی بچی چند لمحوں تک باپ کی طرف ساکن و متحیر نظروں سے تکتی اور پھر وہ بھی باپ کی ہمنوائی میں مصروف ہو جاتی۔ اور یوں چوکیدار وقت ختم ہونے سے قبل ماں بیٹی کو بازو سے گھسیٹ کر باہر نکال دیتا۔

۱۴ شامیں یوں بیت گئیں۔ سامنے کے کیکر اور ببول کے ہرے بھرے درختوں پر ننھی چڑیوں اور سبز و سرخ پروں والے شرارتی پرندے اڑ اڑ کر آتے اور اپنی طنزیہ چیں چیں سے نواز کے قلب کو مجروح کر دیتے۔ متعدد مرتبہ خاکی طرّے اور بھوری نوکیلی مونچھوں والا انسپکٹر اپنا بید لہراتا جنگلے کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا اور اپنی تیز عقابی نظروں سے نواز کی چھاتی میں بیسیوں شگاف کر دیتا۔

"کیوں رحیے! کیسے ہو؟ کوئی تکلیف تو نہیں یہاں؟ سگرٹ پیو گے؟" اور پھر وہ سلگتے ہوئے سگرٹ کا آخری ٹکڑا اس کی طرف بڑھا دیتا۔

لیکن نواز نے کبھی اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ انسپکٹر چند لمحوں تک تن کر کھڑا رہتا اور پھر اپنے بید سے جوتوں کی خاک جھاڑتا

ہوا چلا جاتا ــــــ!

بہر طور چودہ شامیں یوں ہی بیت گئیں - اور پندرھویں صبح کو نواز پھر مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا - لیکن اس کے دل نے اس کے کانوں کی سچائی کی ہامی نہ بھری - جب اس نے کورٹ انسپکٹر کی زبان سے دوسری پیشی کی تاریخ سنی تو وہ جیل کے سپاہیوں کی نگرانی میں لڑکھڑاتا ہوا خاموشی سے اپنی سابقہ قیامگاہ کو لوٹ آیا۔

دو پیشیاں اور بھی گزر گئیں - شروع شروع میں جیل کی زندگی کا ایک دن ایک ہزار سال سے زیادہ طویل اور صبر آزما محسوس ہوتا تھا - لیکن رفتہ رفتہ اس کے قلب کو طمانیت سی محسوس ہونے لگی - اب وہ دو ڈھائی ماہ سے اپنی بیوی کی آمد و رفت سے بھی بے نیاز ہو چکا تھا - ننھی بچی کی سسکیاں سن کر اور بیوی کے پپڑیاں جمے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر وہ طنزیہ انداز سے زیر لب مسکرا دیتا - انسپکٹر صاحب اپنے سابقہ ٹھاٹھ کے ساتھ اپنے بھاری بھرکم جوتوں سے زمین کی جھاتی پر ٹھوکر دیتے ہوئے آتے تو وہ قہقہہ لگا کر کھڑا ہو جاتا -

"آ گئے حضور! ایک کش تو لگوائیے سرکار!" اور ان کے چلے جانے کے بعد وہ دوسرے قیدیوں کے پاس پالتی مار کر بیٹھ جاتا - اور انگلیوں سے زمین پر ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچنے لگتا -

کل اس کی پانچویں پیشی تھی - دن بھر پورب کی طرف سے کالی کالی گھٹائیں امڈ امڈ کر آتی رہیں - اور بوندا باندی ہوتی رہی ... اس دن کام بند تھا - شام کو جب بادل چھٹ گئے - تو قیدیوں نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا -

دادو پہلوان اپنی کوٹھڑی کے دروازے سے چلا کر بولا -

"آ جاؤ بھئی سب - اب تو فرصت کا گھنٹہ بجنے کو ہے" اور سب قیدیوں نے مل کر داروغہ جیل سے کچھ دیر پہلے اپنے کھول دئے جانے کی درخواست کی - نواز بھی اپنی نم آلود آنکھوں اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ سب کو سلام کرتا ہوا باہر آیا - اور ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گیا - دادو نے زور سے نواز کی پیٹھ پہ ہاتھ مارا اور بولا :-

"کیوں پٹھے! آج چپ چاپ سے ہو - کیا بات ہے؟"

نواز چونک اٹھا - وہ دادو کی طبیعت سے بخوبی واقف تھا - جیل کے سارے سپاہی اس سے کانپتے تھے - یہاں تک کہ داروغہ صاحب کے ہاں اس کی مانی جاتی تھی - دوسرے قیدیوں سے اس نے سنا تھا کہ دادو نے ایک بار تین خون کئے - لیکن کسی نے ڈر کے مارے اس کے خلاف گواہی نہ دی - اور وہ صاف بری ہو گیا - دوسری مرتبہ اس نے راج گڑھ کے زمیندار کے ہاں ڈاکہ ڈالا اور گرفتار ہو گیا - تو عدالت نے اسے پانچ سال قید سخت کی سزا دی -

نواز مسکرایا "نہیں دادو بھیا! کوئی خاص بات تو نہیں میں سوچ رہا ہوں - کہ لوگ حکومت کے قانون کا کس نفاست سے مذاق اڑاتے ہیں - تم نے تین خون کئے اور بری ہو گئے - میں نے منیم جی کو تھپڑ مارا تو چوری کے الزام میں گرفتار ہو گیا - اور قانون کے فیصلہ سے قبل قانون کے دیوتاؤں نے مجھے مجرم تصور کر رکھا ہے"

"کیا مطلب؟" دادو پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا -

"میرا مطلب یہ ہے کہ یہ جو تین مہینوں سے میں جیل میں سڑ رہا ہوں - کس جرم کی پاداش میں؟"

دادو قہقہہ لگا کر ہنس پڑا - "ہم سب بنتے ہو؟ چوری جو کی ہے پٹھے!"

نواز اپنے کندھوں کو جھٹک کر بولا "مگر میں نے چوری نہیں کی - اور پھر ابھی عدالت کا فیصلہ بھی تو نہیں ہوا -"

دادو نے مترحم نظروں سے چند لمحوں تک نواز کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا - اور پھر اس کی پیٹھ تھپکا کر بولا :- "یہی تو تم نے غلطی کی تم نے چوری کی ہوتی تو تمہارا دل مطمئن ہوتا -" اور پھر اس نے دوسرے قیدیوں کی طرف دیکھا اور اپنی قمیص کے بٹن ٹھیک کرتے ہوئے بولا

"میں نے ۸۸ ہزار روپے کی چوری کی - روپیہ گم کر دیا - ۵ سال جیل بھگتوں گا - اور پھر ٹھاٹھ سے محل بنوا کر رہوں گا - لیکن تمہارا قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا - کیونکہ وہ مجھے سزا دے چکا ہے سمجھے گودن؟"

دوسرے قیدی اس زور سے قہقہہ لگا کر ہنسے کہ کیکر کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے پرندے اڑ گئے اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپی ہوئی بھڑ بھڑیاں پھدک اٹھیں -

---

دوسری صبح دو موٹے موٹے سپاہیوں نے ۳۱ کے ہاتھوں پر ہتھکڑیاں جکڑ دیں اور اسے کورٹ کی طرف لے چلے - آج پیشی تھی - نواز نے اپنی چھاتی تان لی - اور تن کر ان کے ہمراہ چل پڑا - رستے میں لوگ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتے اور پھر ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگتے - لیکن نواز ایک عجیب شانِ استغنا کے ساتھ ان سپاہیوں کے درمیان چل رہا تھا - جیسے

کوئی فوجی جرنیل اپنے باڈی گارڈز کی معیت میں میدانِ کارزار میں اپنے حریف سے ڈوئل لڑنے جا رہا ہو۔

ایک چوراہے پر اس نے اپنے بچپن کے دوست شہباز کو دیکھا جو اپنی بیوی کے ساتھ پھل والے کی دکان پر انگوروں کے گچھوں کا سودا کر رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیئے دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ اور شہباز ناک سکیڑ کر پھل والے کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا۔

نواز ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی ہتھکڑیوں کو جھنکار کر ہاتھوں میں تولا اور پھر اپنے چوڑے چکلے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ سپاہی کے ہاتھ سے زنجیر چھڑا کر اسے زور سے اپنے سر کے گرد گھمائے اور شہباز کی چندیا پھوڑ ڈالے۔ اور پھر بازار میں کھڑا ہو کر سوداگر کو بے شمار گالیاں دے۔ یہاں تک کہ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ اور دنیا بھر کے موٹے موٹے پولیس انسپکٹر اور سربفلک عدالتیں جھاگ کے اس طوفان میں غرق ہو جائیں۔ لیکن معاً اس کا جوش فرو ہو گیا اور وہ خاموشی سے سپاہیوں کے ہمراہ آگے بڑھنے لگا۔

کورٹ کے دروازے پر اس نے منیم جی کو منس منس کر میکا سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ نواز کو آتے دیکھ کر منیم جی نے چھاتا بغل میں دبایا اور دھوتی کے پلو سے گردن کا پسینہ پونچھتے ہوئے ایک طرف چل دئے۔ ایک سرد آہ نواز کے خون کو منجمد کرتی ہوئی اس کے ہونٹوں سے باہر نکلی اور وہ اپنے ہونٹ کی کھال دانتوں سے کاٹنے لگا۔

اردلی پکارا:۔ "نواز ملزم حاضر ہے ؟ ؟ ؟"

اور سپاہیوں نے اس کے ہاتھوں سے ہتھکڑیاں کھول کر اسے کٹہرے میں دھکیل دیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے کاغذات پر سے نظریں اٹھائیں اور چند لمحوں تک کورٹ انسپکٹر سے سرگوشیوں میں مصروف رہے۔ نواز نہایت اطمینان سے ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔

مجسٹریٹ صاحب کی کرسی کے اوپر حضور ملک معظم کی بڑی تصویر لٹک رہی تھی۔ نواز بہت دیر تک تصویر کی جانب تکتا رہا۔ جیسے وہ اپنے قلب کی تمام کیفیات تصویر کے دماغ میں منتقل کر دینا چاہتا ہو۔ اچانک مجسٹریٹ صاحب کی پُر رعب آواز ہال میں گونجی۔

"نواز! قانون نے تمہارے خلاف عائد کردہ الزام کی پوری پوری تحقیقات کی اور ہمیں اس اظہار سے مسرت ہے کہ تم بے گناہ ثابت ہوئے۔ قانون تمہیں باعزت بری کرتا ہے۔"

نواز قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ "باعزت ؟" وہ بھوکے شیر کی طرح غرایا۔ "قانون مجھے باعزت بری کرتا ہے۔ خوب۔ خوب۔" اور پھر اچانک سنجیدہ ہو کر اس نے چاروں طرف پُر رعب نظروں سے دیکھا اور زور زور سے سانس لینے لگا۔

"قانون مجھے باعزت بری کرتا ہے نا ؟ — شکریہ، شکریہ لیکن کیا معزز قانون مجھے اس امر کا اختیار بخش سکتا ہے کہ محلے کے تمام لوگوں کے سامنے ایک بار جی بھر کر انسپکٹر کو گالیاں دوں۔ رحیم خاں کے منہ پر زور سے تھپڑ ماروں اور پھر تمام خداوندانِ قانون کو تین ماہ کے لیے جیل کے تنگ و تاریک کمروں میں ٹھونس دوں تاکہ اپنی کھوئی ہوئی عزت اور وقار کا انتقام لے سکوں۔ اپنا کلیجہ جس میں قانون نے خدائے قہار کی دوزخ سے زیادہ گرم اور عذاب ناک شعلے بھڑکا دئے ہیں ٹھنڈا کر سکوں۔

اس نے پھر دیوانہ وار ایک قہقہہ لگایا اور پاگلوں کی طرح پنجوں کو پھلانگتا ہوا عدالت سے باہر نکل گیا۔

رباعیات

از

جناب ضبط ایم اے

کیا اور مزا شباب میں رکھا ہے
جلوہ ترا ماہتاب میں رکھا ہے
مستی ہو کہ لطفِ زندگانی ساقی!
سب کچھ تری شراب میں رکھا ہے

انداز بہت خوب ہے مے نوشی کا
دیتا ہے سبق یہ خود فراموشی کا
خود کو کھو کر کسی کو پا لیتا ہوں
احسان بڑا مجھ پہ ہے بے ہوشی کا

اگر کسی مرد کو جریان کی بیماری ہے

تو اسکے لئے ایک ہی عِلاج ہے

جس سے

ہزاروں مریض تندرست ہو چکے ہیں

اس بیماری کی دوا کا نام ہے

"جوہر اعظم"

جِریان کا مشہور علاج ۔ لاتعداد ڈاکٹروں حکیموں اور وَیدوں کا اپنا آزمایا ہوا ۔ جنہوں نے محض اس
ب دوا سے جِریان کے بیشمار مریضوں کو تندرست کر دیا ۔ مَرد بنا دیا ۔ کون نہیں جانتا کہ دوا جوہر اعظم

جریان کا اصلی عِلاج ہے

ن کی ایک شیشی سے جِریان کی بیماری ختم ہو جاتی ہے پیشاب کے پہلے یا بعد سُفید رطوبت کا گرنا ۔ خواب
نا (احتلام ہونا) وغیرہ سَب تکالیف دوا "جوہر اعظم" کی ایک شیشی سے ٹھیک ہو جاتی ہیں ۔ اگر کوئی
ائی جریان کے مریض ہوں تو انہیں چاہیئے کہ

مجرزانہ دواخانہ اے بی ۳۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر دوا "جوہر اعظم" کی شیشی
بذریعہ وی پی پارسل منگالیں ۔ ایک
شی کی قیمت تین روپے آٹھ آنے ہے ۔ پارسل محصول معاف ہے ۔

ٹیلیفون نمبر ۳۲۶۸

دردِ دل

تمثیلچہ

جناب ابوالاسرار رمزی اٹاوی

(ذیل کا تمثیلچہ بیدم وارثی مرحوم کے کلام پر مبنی ہے جو ریڈیو اسٹیشن جودھپور سے ۱۵ اکتوبر کو براڈکاسٹ کیا گیا)

لالہ جی: — وکیل صاحب! اجی وکیل صاحب۔ حضور والا ذرا ادھر بھی۔ ایک نظر غریبوں پر بھی۔ یوں چھڑی ہلاتے ہوئے کدھر کی ٹھانی ہے —؟

وکیل صاحب — اوہو! آپ ہیں۔ میاں کہاں پھرتے ہو مارے مارے کبھی تو انسان کی طرح ایک جگہ رہا کرو۔

لالہ جی — جب ہی تو یہ شیطان آپ سے پوچھتا ہے کہ حضور کی سواری بے وقت کہاں جا رہی ہے؟

وکیل صاحب — کہیں نہیں ذرا گھر سے نکلا ہوں بس یہیں تک۔

لالہ جی — آپ خود نکلے ہیں یا نکالے گئے ہیں؟ اس وقت آپ کہیں ہوم گورنمنٹ کے شکنجہ میں تو نہیں آ گئے۔

وکیل صاحب — ارے خدا کے بندے! بازار میں تو ایسی باتیں نہ کیا کر۔ اب آوارگی بڑھتی جاتی ہے۔

لالہ جی — تو گھٹا دیجئے صاحب!

وکیل صاحب — ہاں صاحب کچھ انتظام تو کرنا ہی پڑے گا —— (پان کی ڈبیا دیتے ہوئے۔ اس کی آواز ہوتی ہے) لیجئے سرخرو ہوجئے۔ آپ کی خاطر تو کرنا ہی پڑے گی۔

لالہ جی — وکیل صاحب! توبہ توبہ کہاں ہے آپ کا خیال؟ ابھی نالی میں چلی جاتی نا؟ آپ ڈبیا کسے دے رہے ہیں۔ ہوا کو؟ —— یا —— بندے کو؟

وکیل صاحب — بھلے آدمیوں کی طرح دیکھ بھال کر چلا کیجئے۔ دیکھئے حضرت! پیچھے دیکھئے مڑ کر۔ یہ کون بھوں بھوں کرتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ (موٹر کی آواز) ابھی نکل جاتا اتا کچومر۔ بال بال بچ گئے شیرینی بانٹئے۔

لالہ جی — شیرینی تو پھر بٹتی رہے گی۔ اپنی چھڑی تو ٹھکانے سے رکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی آنکھ ناک پھوڑنے کا ارادہ ہے اسے بغل ہی سے نکالئے —— مہربانی کیجئے۔

وکیل صاحب — ایسا نیک کام میرے حصے میں ہی تو آنا چاہ مہربانی فرما کر ذرا قدم اٹھایئے۔

لالہ جی — آخر کہاں منہ اٹھائے چلیں۔ آخر ارادہ کیا ہے؟

وکیل صاحب — جہاں ہمارا ارادہ ہے وہیں چلو —— جو امام کی وہی مقتدی کی —— تلا کی دوڑ مسجد تک —— بس ذرا پارک تک جانا ہے۔

لالہ جی — اور اب اس وقت؟

وکیل صاحب — (سگرٹ سلگاتے ہوئے ماچس بکس کی آواز) اس وقت کیا ہوا؟ کیا آپ کو ڈر لگتا ہے۔ شریفوں کے نکلنے کا یہی تو وقت ہوتا ہے۔

لالہ جی — ہاں شریف صاحب! پہلے ماچس بجھایئے اور پھر چھڑی کی خیر منایئے۔ آپ سے ذرا سی چھڑی نہیں سنبھلتی۔ وہ بغل سے رخصت ہو رہی ہے۔ ارے لو وہ گر گئی (چھڑی گرنے کی آواز ہوتی ہے)

لالہ جی — آخر اس چور پنج دار لکڑی کو اس جوڑ تب اور پر امن زمانے میں رکھنے کا کیا مطلب ہے؟ اس ڈیڑھ چھٹانک لکڑی سے آپ کس کو ماریں گے؟

وکیل صاحب — آپ کو کون سمجھائے۔ آپ ہیں پورے چور پنج۔

لالہ جی — چور پنج تو ہیں آپ۔ پان کا گلا منہ میں دبا ہوا ہے اور اس پر سگرٹ کا طرّا اڑا رکھا ہے۔

وکیل صاحب — جی ہاں! آپ کی جیسی سمجھ میں طرا ہوگا بندے کا تو طرہ ہے۔

لالہ جی — کیا خاک کا طرہ ہے۔ ایسی حرکت تو زمانہ پان کھانے والے کیا کرتے ہیں۔

وکیل صاحب ۔ زنانہ پان کونسا ہوتا ہے، مرد ہو کے بتاؤ ۔
لالہ جی ۔ بغیر زردہ کا پان زنانہ ہی تو ہوتا ہے ۔
وکیل صاحب ۔ پلاؤ والا پان مردانہ ہوتا ہوگا؟ آپ چھوڑیئے
ان پلاؤ زردوں کے قصّوں کو ۔
لالہ جی ۔ اچھا بھئی چھوڑا ۔ شعر تو سنو گے؟
وکیل صاحب :۔ خوشی ہے ۔
لالہ جی ۔

درد دل سے زندگی ہے زندگی
جان صدقے دل فدائے درد دل

وکیل صاحب ۔ یہ کس کا شعر ہے؟
لالہ جی ۔ ایک صوفی کا ۔
وکیل صاحب ۔ اجی صوفیوں اور سادھوؤں کا تو نام ہی نہ لو ۔ آپ برا نہ مانیں ۔ مجھے تو ان سے سخت نفرت ہے ۔ ان بھیھوتیا فقیروں کو جو سنڈے منڈے دھونی رمائے بیٹھے رہتے ہیں ۔ اچھا نہیں سمجھتا ۔ یہ لوگ اچھے خاصے انسان سے اُلٹے لنگور بننے کی کوشش میں دن رات لگے ہوئے ہیں ۔ سب سے بڑا گناہ تو یہی کرتے ہیں کہ وہ دنیا چھوڑ کر جنگل میں جا بستے ہیں ۔ اور خدا کی مخلوق کی کوئی خدمت نہیں کرتے ۔ دیکھئے! اس میں ان کا بھی نقصان ہے ۔ خود اپنے ہی کو دھوکا دے رہے ہیں ۔ کونسی چیز ایسی ہے جو ان کے پاس نہیں ہوتی ۔ گانجے ان کے یہاں بندھی ہوتی ہے ۔ شاندار باغیچہ لگا ہوا ہے ۔ کمال کے فرش اور رنگینے ان کے حجروں میں ہیں ۔ حلیم ہے ۔ سلفہ ہے ۔ رنگ ہے ۔ بھنگ ہے ۔ سبھی کچھ ہوتا ہے ۔ دیکھنے میں ایک چمٹا اور راکھ نظر آتی ہے ۔ مگر سونے کے ڈھیر ان کی راکھ میں دبے ہوئے ہیں ۔ وہی مثل ہے کہ رام نام جپنا پرایا مال اپنا ۔
لالہ جی ۔ نہیں صاحب! یہ بات نہیں ہے ۔ جھوٹے سچّوں میں اور سچّے جھوٹوں میں ہوتے ہی ہیں ۔ اچھے بُرے لوگ کس گروہ میں نہیں ہوتے ۔ آپ ایک کی وجہ سے سب کو بُرا نہیں کہہ سکتے
وکیل صاحب ۔ مگر سب کی وجہ سے ایک کو تو بُرا کہہ سکتے ہیں ۔ اب آپ رستے پر آئے ۔
لالہ جی ۔ تو کیا میں بھٹک رہا تھا ۔
وکیل صاحب ۔ نہیں صاحب! آپ رہنمائی کرتے چلئے ۔ آپ میرے مقتدا ہیں ۔ میں مقتدی ہوں ۔

... کی تبرت

لالہ جی ۔ میرا مطلب وکیل صاحب یہ ہے کہ صوفی لوگ خدا کے د... ہوتے ہیں ۔ انہیں بُری نظر سے نہ دیکھئے ۔
وکیل صاحب ۔ بری نظر سے تو حسینوں کو دیکھا جاتا ہے ... بری نظر کو ان سے کیا واسطہ ۔ کیا تعلق؟ ؎

اچھی شے بھی کیا بُری شے ہے
جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی

اپنے شعر...

لالہ جی ۔ جی! آپ چلنے سے تعلق رکھیں ۔
وکیل صاحب ۔ ہاں! چل ہی تو رہا ہوں لیکن آپ انہیں دیو... نہ سمجھیں ۔ یہ ہے ہماری عرض ۔ باقی آپ کی مرضی ۔ کیو... یہ لوگ کسی کے اچھے بُرے میں شریک نہیں ہوتے ۔ گویا انسانیت سے کوسوں دور ہیں ۔ حقوقِ خدا کے ساتھ حقوقِ عباد بھی تو ضروری ہیں ۔ دیکھئے یہ سب ... بدّیا ہے ۔ سارے ڈھونگ دھرم کی آڑ میں روٹی کما... کے لئے رچائے جاتے ہیں ۔ یہ لوگ اپنا اُلّو خوب سیدھا کرتے ہیں ۔
لالہ جی ۔ اُلّو سیدھا کرنے کی خوب کہی؟
وکیل صاحب ۔ کیوں اس میں جھوٹ کیا ہے ۔ میں پہلے ہی تم سے کہہ چکا ہوں ۔ وہ جنگل میں بیٹھ گئے تو کیا ہوا ۔ ان کا دل ۔ ان کا دماغ تو دنیا میں لگا رہتا ہے ۔ یہ لوگ دنیا کے سب بکھیڑے رکھتے ہیں ۔ یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اور آپ ہیں کہ اپنی افلاطونی ہانکے جا رہے ہیں ۔ بس عقل کے پیچھے لٹھ لے لیا ہے ۔
لالہ جی ۔ ارے آپ تو بہت دور چلے گئے ۔
وکیل صاحب ۔ تمہارے پاس ہی تو چل رہا ہوں دور کہاں چلا گیا ۔
لالہ جی ۔ میرا منشا یہ ہے کہ آپ نے شعر سن کر یہ کیسے نتیجہ نکالا کہ اس شعر کا کہنے والا بھی دغاباز، مکار فقیروں کی طرح ہوگا ۔
وکیل صاحب ۔ آپ ان کا نام بتایئے آخر وہ کون صاحب ہیں؟
لالہ جی ۔ یہ جناب والا ہمدم مرحوم ہیں ۔ جنہوں نے نہ تو جنگل میں جھونپڑی ڈالی نہ چمٹا بجایا ۔ ہمیشہ گھر گرہستی میں رہے ۔ اور دنیا داروں کی طرح دنیا کے ساتھ رہے ۔ محبت سے رہے ۔ ملتے جلتے تھے ۔ ان کے ساتھ کھاتے پیتے تھے ۔ اٹھتے بیٹھتے تھے ۔ اور پھر اپنے مرشد کے اشارے پر چلتے تھے ۔ ان کو انہوں نے اپنا رہبر اور سب کچھ سمجھ رکھا تھا ۔ اپنے شیخ سے گہری عقیدت

رکھتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

دریا سے وجودِ قطرہ ہے قطرہ سے نمودِ دریا ہے
دریا قطرہ قطرہ دریا۔ وارث مجھ میں میں وارث ہیں

وہ نقطہ خط تقدیر ہوں میں وہ خامہ ہے اور تحریر ہوں میں
میں صورت ہوں اور وہ معنی وارث مجھ میں میں وارث ہیں

وکیل صاحب — یہ وارث کون ہیں؟

لالہ جی — ان کے شیخ۔

وکیل صاحب — تو پھر ان کے مرشد ان میں کیسے اور وہ مرشد میں کیسے بھئی بڑی عجیب بات ہے۔

لالہ جی — وارث سے مراد خدا ہے۔ خدا ہی ہمارا وارث ہے۔ اور ان کے مرشد کا بھی یہی نام ہے۔ پھر آپ کو کیا اعتراض ... کیا شک کی گنجائش ہے۔ فقیروں کو یوں بھی مرشد میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

سب نقشِ خیالی ہیں کعبہ ہو کہ بت خانہ
تو مجھ میں ہے میں تجھ میں اے جلوۂ جانانہ

اس کے بعد کہتے ہیں ؎

زاہد مری قسمت میں سجدے ہیں اسی در کے
چھوٹا ہے نہ چھوٹے گا سنگِ درِ جانانہ

آگے کا شعر تو غضب کا ہے ؎

مٹ کر بھی نہ ہے باقی جو تجھ پہ مٹے ساقی
جب مٹتے ہیں بنتے ہیں خاکِ درِ میخانہ

وکیل صاحب — یوں تو لوگوں نے ہزاروں شعر کہے ہیں۔ شعر لکھنا اور بات ہے۔ سچا فقیر ہونا دوسری بات ہے۔

لالہ جی — مگر صاحب! یہ تو قال نہیں ہے حال ہے۔ بیدم صاحب خود اسی حالت میں رہتے تھے۔ میں نے خود انہیں آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کی آنکھوں سے عشق کا خمار برستا تھا وہ سچا دردِ دل رکھتے تھے۔ کہتے ہیں سنئے ؎

اس کے حرمِ ناز میں عقل و خرد کو دخل کیا
جس کی گلی کی خاک کا ذرہ نہانِ راز ہو

وکیل صاحب — ایسی اونچی باتیں کم از کم میری تو سمجھ سے باہر ہیں۔ ہم تو دردِ دل کا مطلب یہ سمجھتے ہیں ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

اور اسی کا ترجمہ اس انگریزی جملے میں ہے:—

The best way to love God is to love one's fellow creatures

لالہ جی — ہاں درست ہے۔ آپ نے انگریزی جملے کی اچھی دھونس دی۔ بس جو انگریزی میں بات ہو وہ مان لی جائے۔

وکیل صاحب — نہ مانئے۔ یوں تو مجھے بھی بہت سے شعر یاد ہیں مگر فارسی کے پسند ہیں۔ بہرحال آپ کو اردو کی رباعی سناتا ہوں ؎

مسجد ہے تبکدہ ہے دل ہے اک کو ہے
جس سمت دیکھتا ہوں اس سمت تو ہی تو ہے
ناقوس کی فغاں میں آوازۂ اذاں میں
تیرا ہی تذکرہ ہے تیرا ہی رنگ و بو ہے

لالہ جی — اس طرح کے اشعار ہندی میں بھی ہیں ؎

پریتم بتیاں جب لکھوں جو کوئی ہو بدیش
تن میں من میں نین میں تا کو کہا سندیش

جناب وکیل صاحب! ہندی والوں نے کچھ کم اشعار نہیں کہے ہیں۔ ایک شعر ہے ؎

ایک تو نے نام دھن بھرے دوجے اگن سما
یہ باؤرے کر دیت ہیں متوارن ہتھیار

دوسرا دوہا ہے ؎

امی ہلاہل مد بھرے شبیت شام رتنار
جیت مرت جھک جھک پڑت جہ چتوت اک بار

آپ دیکھئے وکیل صاحب یہ سب اہلِ دل دردِ دل کی ہی تو باتیں ہیں

وکیل صاحب — یہ دردِ دل تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔

لالہ جی — نہ آپ کی سمجھ میں آئے۔ آپ کوشش بھی نہیں کرتے۔ آپ بیدم صاحب کے ان اشعار پر غور فرمائیے ؎

کہاں کا طور؟ مشتاق تھا وہ آنکھ پیدا کر
کہ ذرہ ذرہ ہو نظارہ گاہ حسنِ جانانہ

آگے کیسی گہری فلاسفی ہے ؎

جب دونوں ہی روشن ہیں اک تیری تجلی سے
پھر کعبہ تو کعبہ ہے بت خانہ کو کیا کہئے

اس سے بھی گہرا مضمون ملاحظہ فرمائیے کہتے ہیں ؎

یہاں ہونا نہ ہونا ہے نہ ہونا عین ہونا ہے

وکیل صاحب۔ یہ شعر تو واقعی گہرے پانی کا ہے۔ ہاں۔ سب مجھے خواہ مخواہ کی ضد نہیں آتی۔ جو بات معقول ہوتی ہے مان لیتا ہوں۔ ظالم نے کیا اشعار کہے ہیں۔

لالہ جی۔ اجی صاحب اور سنئیے ؎

جلوہ گاہ ناز کے پردوں کا اٹھنا یاد ہے
پھر ہوا کیا اور کیا دیکھا یہ کس کو ہوش تھا؟

فی اللہ کیسی سچی تصویر کھینچی ہے۔ عالم محویت کا صحیح بیان ہے آپ دردِ دل کی تشریح ہی چاہتے ہیں تو پوری غزل سنئیے ؎

کیا سنائے مبتلائے دردِ دل — کیا سنو گے ماجرائے دردِ دل
دردِ دل سے زندگی ہے زندگی — جان صدقے دل فدائے دردِ دل
موت کرتی ہے علاج اہلِ درد — دردِ دل خود ہے دوائے دردِ دل
ہم نے دل سی چیز دے دی آپ کو — آپ کیا دیں گے سوائے دردِ دل

دردِ دل پیدا ہوا دل کے لئے
اور دل بیدم برائے دردِ دل

وکیل صاحب۔ پہلے آپ اسی غزل کا شعر سنا چکے ہیں؟

لالہ جی۔ جی ہاں۔

وکیل صاحب۔ کچھ اور سنائیے۔

لالہ جی۔ خوب یاد دلائی۔ آج جمعرات ہے۔ چلئے پیر جی کے یہاں باقاعدہ محفل ہو رہی ہوگی یہیں سے گلی میں مڑ چلئے۔

(چمن پیر جی کا نوکر مل جاتا ہے)

چمن۔ آداب عرض لالہ جی۔

لالہ جی۔ آداب عرض۔ ارے بھئی آج محفل نہیں ہو رہی۔

چمن۔ ہو رہی ہے نا صاحب۔ وہ دیکھئے روشنی ہو رہی ہے اسی کے انتظام میں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں میرے ساتھ چلئے۔

لالہ جی۔ وکیل صاحب! لو کام بن گیا۔ اچھا موقع مل گیا۔

(پیر جی کے مکان پر پہنچ جاتے ہیں۔ مجمع کا شور ہوتا ہے)

لالہ جی۔ آداب عرض پیر جی!

پیر جی۔ تسلیم! بہت دن میں آنا ہوا؟

لالہ جی۔ وہ تو وکیل صاحب کی بدولت یاد آ گئی ادھر گھوم پڑے۔

پیر جی۔ لالہ جی! وکیل صاحب آپ کے دوست ہیں۔ آپ ان کو خوب لائے

لالہ جی۔ جی ہاں! تو اب شروع ۔ ۔ ۔ ۔

پیر جی۔ محفل؟ ہاں شروع ہونے والی ہے۔

لالہ جی۔ لیکن گزارش یہ ہے کہ وکیل صاحب کو کوئی حقانی چیز سنوا دیجئے۔

پیر جی۔ اچھا بھئی جلال الدین! ذرا ہو جائے۔

(قوالی شروع ہو جاتی ہے)

کاش مری جبینِ شوق سجدوں سے سرفراز ہو
یار کی خاکِ آستاں تاجِ سرِ نیاز ہو
ہم کو بھی پائمال کر عمر تری دراز ہو
مست خرامِ ناز ادھر مشقِ خرامِ ناز ہو
چشم حقیقت آشنا دیکھے جو حسن کی کتاب
دفترِ صد حدیثِ راز ہر ورقِ مجاز ہو
سامنے روئے یار ہو سجدہ میں ہو سرِ نیاز
یونہی حریمِ ناز میں آٹھوں پہر نماز ہو
اس کے حریمِ ناز میں عقل کو خرد کو دخل کیا
جس کی گلی کی خاک کا ذرہ جہانِ راز ہو
تیری گلی میں پا کے جا۔ جائے کہاں ترا گدا
کیوں نہ وہ بے نیاز ہو تجھ سے جسے نیاز ہو
بیدمِ خستہ ہجر میں بن گئی جانِ زار پر
جس نے دیا ہے دردِ دل کاش وہ چارہ ساز ہو

(قوالی ختم ہوتی ہے بھیڑ کی آواز)

لالہ جی۔ کہئیے وکیل صاحب! کچھ لطف آیا؟

وکیل صاحب۔ ہاں صاحب! بات سچی کہی جائے گی۔ پیر صاحب کی ہر بات میں نور معلوم ہوتا تھا۔ اٹھنے میں بولنے میں۔ مسکرانے میں عجیب کشش تھی۔ اور جب تالی بجتی تھی تو دل پر چوٹ لگتی تھی۔

لالہ جی۔ دیکھ لیجئے! سچے پیروں میں یہی کرامت ہوتی ہے نہیں اس محفلِ سماع کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمیں تو تصوف والوں نے بتایا ہے کہ یہ محفل علاجاً منعقد کی جاتی ہے۔ ہر کوئی اس کا اہل بھی نہیں ہے۔

وکیل صاحب۔ مگر لالہ جی! اس کے علاوہ اور بھی بات ہے جب ڈھول پر تھاپ پڑتی ہے تو دل دھڑکتا تھا تھاپ وہاں پڑتی تھی۔ اور ضرب قلب پر معلوم ہوتی تھی اور دل ایسا بے قابو ہوا جاتا تھا گویا کسی نے چٹکی لے لی ہے۔

لالہ جی۔ بس۔ بس۔ یہی تو دردِ دل ہے۔ اب نہ کہئیے گا۔ دردِ دل کیا چیز ہوتی ہے۔

آنسو

نظم

جناب عبدالواسع عصری چکگلوری

خداوندا مجھے دنیا میں کیوں راحت نہیں ملتی

سکوں نا آشنا ہوں اور برباد مصیبت ہوں
اگرچہ گلشن ہستی میں اک غنچے کی صورت ہوں
تماشا گاہ عالم میں بس اک تصویر عبرت ہوں
ہزاروں حسرتیں چھائی ہوں جس پر ایسی تربت ہوں

خداوندا مجھے دنیا میں کیوں راحت نہیں ملتی

مسرت نغمۂ بلبل سے بھی حاصل نہیں ہوتی
کسی امید سے روشن مری محفل نہیں ہوتی
مری تدبیر بھی تعریف کے قابل نہیں ہوتی
کسی صورت بھی آساں اب مری مشکل نہیں ہوتی

خداوندا مجھے دنیا میں کیوں راحت نہیں ملتی

مئے ارماں سے خالی میرا جام نوجوانی ہے
الم انگیز، حسرت خیز میری ہر کہانی ہے
سراپا درد و کلفت آہ میری زندگانی ہے
کہاں کا نغمہ عیشِ رفتہ کی یہ نوحہ خوانی ہے

خداوندا مجھے دنیا میں کیوں راحت نہیں ملتی

جنھیں سمجھا تھا اپنا اب وہ دشمن ہوتے جاتے ہیں
جہاں رکھا قدم ویراں وہ گلشن ہوتے جاتے ہیں
بھروسا جن کو مجھ پر تھا وہ بدظن ہوتے جاتے ہیں
ہزاروں حسرتوں کے دل میں مدفن ہوتے جاتے ہیں

خداوندا مجھے دنیا میں کیوں راحت نہیں ملتی

فدا کی جن پر اپنی جان وہ بھی بے وفا نکلا
جنھیں غمخوار سمجھا وہ بھی آخر پُر دغا نکلے
جو مخلص بن کے آئے تھے وہ مطلب آشنا نکلے
عزیز و آشنا احباب سارے پُر جفا نکلے

خداوندا مجھے دنیا میں کیوں راحت نہیں ملتی

یہ حالت ہے کہ ویرانوں سے الفت ہوتی جاتی ہے
مجھے آبادیوں سے اب تو وحشت ہوتی جاتی ہے
مجھے یارانِ محفل سے بھی نفرت ہوتی جاتی ہے
کسی کی یاد بھی اب تو مصیبت ہوتی جاتی ہے

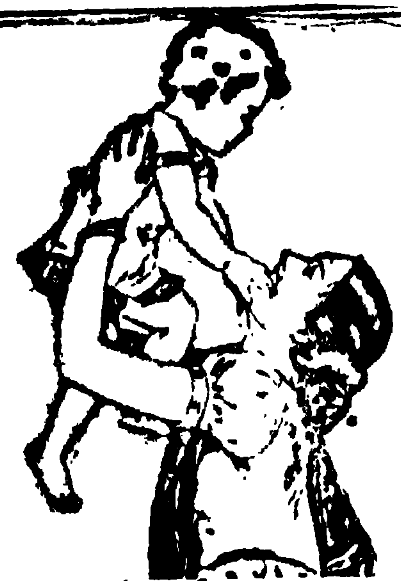
خداوندا مجھے دنیا میں کیوں راحت نہیں ملتی

کسی کی یاد عصری دل کو جب آباد کرتی ہے
مرے ہر لحظہ آرام کو برباد کرتی ہے
نکل کر دل سے ہر اک سانس یوں فریاد کرتی ہے
مجھے رونے دے اے قسمت بھلا کیوں شاد کرتی ہے

خداوندا مجھے دنیا میں کیوں راحت نہیں ملتی

۱۰

۱۱



طاقت اور تندرستی کے لئے بچوں کو ڈونگرے کا بال امرت دینا ضروری ہے کیونکہ اس میں ادویات پڑی ہوتی ہیں

خدا کی ہزار بار لعنت ہو جھوٹے اشتہار بازوں پر

اگر ہم مخلوق کو دھوکہ دیں تو خدا اور رسول کو دھوکہ دیں

اگر خدا کو درمیان رکھ کر کہدو گے کہ آپ کی دواؤں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو تمام قیمت واپس کردی جائے گی۔ خبردار ہر قسم کے مرض کے لئے سند یافتہ
ِکیم حاذق ہی سے علاج کراؤ۔ ضرور کامیابی ہوگی۔ دوائی کی قیمت سب سے کم فائدہ سب سے زیادہ ہوگا۔

طلا مار سیاہ رجسٹرڈ ۔ یہ طلا بڑے غضب کا بنا ہوا ہے۔ نہایت مجرب طلا ہے لیکن خدا کی قدرت اور اتفاق سے اس کے بنانے کی
ِیہ ترکیب استعمال اور ایسی مجرب اور نایاب چیز ہے جو ہم کو دستیاب ہوگئی ہے۔ اب آپ تمام اشتہار بازوں سے بچیں اور ہمارے کہنے سے صرف ایک بار
کاکر استعمال کریں۔ پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیں۔ یہ طلا جلن۔ احتلام سستی۔ کجی۔ کوتاہی اور لاغری کے لئے بے انتہا مفید اور نایاب چیز ہے۔ یہ
ا پہلے ہی روز اپنا اثر دکھا کر آپ کو بتا دے گا کہ میں کیا چیز ہوں۔ ایک شیشی طلا مار سیاہ۔ اسی کے ہمراہ دوسری شیشی فربہی اور درازی اور کھانے
ِ لئے بڑی زبردست گولیاں مقوی باہ ہیں۔ اور ان کی خفیہ ترکیب۔ دواؤں کی قیمت ۵ روپے علاوہ محصولڈاک۔

ِرت امساک ۔ بوقت خاص اگر اس کو استعمال کرو گے تو عورت سے ہرگز شرمندہ نہ ہوگے۔ جب تک ترشی نہ کھاؤ گے اثر برابر رہے گا۔ لکاوٹ
ِ بہترین چیز ہے۔ قیمت فی شیشی ۔ ۲ گولی ۴ علاوہ محصولڈاک۔

ِل جریان ۔ ہر قسم کے شدید جریان۔ سرعت انزال۔ کثرت احتلام کے لئے اکسیر ہے۔ اور عورتوں کے مرض سیلان الرحم سفید پانی کے لئے
ِہ ہے۔ عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ سفوف دگولی کی قیمت تین روپے علاوہ محصولڈاک۔

پتہ :۔ حکیم سید آفتاب علی خاں موجد مار سیاہ ناظم دواخانہ شباب جوانی دہلی ۱۰۲

ملکۂ فرانس کے نام

نپولین بوناپارٹ کے تاریخی خطوط

از:۔
جناب اے آر۔ رُشدی

نپولین نے روس کو سر کرنے کے لئے جو مہم شروع کی تھی اور اس میں اسے جو ناکامی ہوئی اس کا حال ان خطوط میں اپنے اصلی رنگ میں ملتا ہے جو اس نے ملکہ میری لوئی کو لکھے تھے۔ انہی تاریخی خطوط سے ذیل کے اقتباسات لئے گئے ہیں۔ نپولین نے شکایت کی ہے کہ قسمت اور تقدیر نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ مگر حقیقت سے قریب تر ہونے کے لئے اسے اتنا اور کہہ دینا چاہئے تھا۔ کہ روسی آفاتِ نصیب ثابت ہوئے۔ آجکل روسی محاذ پر ہٹلر کی فوجیں بھی کچھ اسی طرح پسپا ہو رہی ہیں۔ کہ امید ہے ان جنگی حالات کی روشنی میں یہ مضمون دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

اسمولنسک ۱۸ اگست ۱۸۱۲ء

آج صبح سے میں اسمولنسک میں ہوں یہاں میں نے ۴۰ ہزار روسیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اس شہر پر قبضہ کیا اور اس سے نکلنے والوں کو مجروح کیا یا قیدی بنایا۔ میری صحت اچھی ہے۔ گرمی بڑھ رہی ہے میرے تمام کام اچھی طرح ہو رہے ہیں شوارزنبرگ نے یہاں سے ۲۰۰ فرسخ کے فاصلے پر روسیوں کو شکست دی ہے۔

ڈوروگوبژ ۲۵ اگست

میں کل دن بھر سفر کرتا رہا۔ میں نے اپنا صدر مقام یہاں سے آگے بڑھا لیا ہے۔ دشمن نے میرا انتظار نہیں کیا۔ میرا ہراول ماسکو سے ۴۰ فرسخ پر ہے۔ گرمی بہت تیز ہے۔ میری صحت نہایت اچھی ہے۔ اور میرے تمام کام بخوبی انجام پا رہے ہیں۔

(۲۹ اگست کو نپولین دیازما میں داخل ہوا۔ جہاں اسے اپنی فوج کے لئے بمشکل رسدیں مل سکیں۔ مگر روسیوں نے پل کو جلا دیا تھا۔ اور شہر کے کئی حصوں میں آگ لگا دی تھی)

دیازما ۳۰ اگست

...... میں یہاں کسی قدر اچھے شہر میں ہوں یہاں ۳۰ گرجے ۱۵ ہزار باشندے اور متعدد دکانیں ہیں جو فرانسی برانڈی اور فوج کے کام کی دوسری اشیا فروخت کرتی ہیں کسی قدر بارش ہوئی ہے جس سے گرد جم گئی ہے اور موسم کچھ سرد ہو گیا ہے۔

۵ ستمبر [illegible]

مجھ کو [illegible] قیدی [illegible] اس پر متفق ہیں کہ ماسکو میں انتہائی ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ اور روسی فوج میں عام انتشار ہے۔ اور اختلاف رائے بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اس کو بھاری نقصانات برداشت کرنے پڑے ہیں کئی جنرل معطل کر دیئے گئے ہیں۔ جنرل بارکلے ڈی ٹالی پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے۔ کہ اس نے اپنی مورچہ بندی کو علیحدہ علیحدہ شکست کھانے کا موقع دیا۔

گژاتسک ۲ ستمبر

میں آج رات ماسکو [illegible] روانہ ہو رہا ہوں۔ موسم [illegible] یہاں میرے [illegible] موسم بالکل ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے جیسا کہ [illegible] میں معلوم ہوتا ہے۔ اناج کے گودام بھرے ہوئے ہیں ہر طرف سبز ترکاریاں اُگی ہوئی ہیں۔ فوجیں اچھی حالت میں ہیں جو سب سے اہم بات ہے۔ میرے تمام امور بخوبی انجام پا رہے ہیں۔ میری صحت اچھی ہے۔

خاص اعلان!

بورودینو ۷ ستمبر

سپاہیو! جس لڑائی کے تم اس قدر متمنی تھے وہ اب شروع ہونے والی ہے۔ وہ ہمارے لئے سامان کی فراہمی کو آسان بنا دیگی ہمیں اچھے اچھے کوارٹرز ملیں گے اور ہم جلد ہی وطن واپس جا سکیں گے۔ آسٹرلز، فریڈ لینڈ، ویٹیپسک اور اسمولنسک میں جس طرح تم نے اپنے جوہر دکھائے تھے یہاں بھی اسی طرح کارنامے کر دکھاؤ۔ تاکہ تمہاری اولاد کی اولاد تمہارے متعلق فخر کے ساتھ کہہ سکے: وہ ماسکو کی دیواروں کے نیچے عظیم الشان جنگ میں لڑا تھا!"

(جنگ بورودینو اس عہد کی انتہائی خونریز جنگ ثابت ہوئی)

نپولین کے بھاری نقصانات ہوئے - آٹھ جنرل مارے گئے اور ۹ زخمی ہوئے)

بروڈینو ۸ ستمبر

میں آپ کو بروڈینو کے میدانِ جنگ کے متعلق لکھ رہا ہوں۔ کل میں نے روسیوں کو شکست دی - ایک لاکھ بیس ہزار فوجیوں کی ایک زبردست روسی فوج وہاں موجود تھی - دشمن نے سخت مقابلہ کیا ۲ بجے سہ پہر تک ہم فتح حاصل کر چکے تھے - میں نے کئی ہزار قیدی بنائے اور ۶۰ توپوں پر قبضہ کیا - ان کے اندازاً ۳۰ ہزار آدمی کھیت رہے جن میں سے کئی کو ہلاک و مجروح کیا - خدمتگاروں کا گورنر کاؤلن کورٹ مارا گیا - میری صحت اچھی ہے، موسم کس قدر سرد ہے۔

(نپولین اس وقت ماسکو جانے والی سڑک پر ہے)

موزائسک ۹ ستمبر

مجھے سخت سردی محسوس ہو رہی ہے - صبح ۲ بجے میں اپنی بیرونی چوکیوں کا معائنہ کرتے وقت پانی میں بھیگ گیا تھا - جس سے زکام ہو گیا ہے - امید ہے کہ کل تک طبیعت ٹھیک ہو جائے گی - علاوہ ازیں میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔

ٹارچی ۳ ستمبر:-

پیرس میں اس وقت موسم بڑا خوشگوار ہوگا - یہاں سردی کی لہر کے باعث کچھ ہلکا پڑ گیا ہے - میرا زکام ختم ہو رہا ہے - میں ماسکو سے ۲۰ فرسخ کے فاصلے پر ہوں۔

۱۶ ستمبر:-

میں آپ کو پہلے ہی سے ماسکو سے لکھ چکا ہوں۔ جہاں میں ۱۴ کو پہنچا تھا - یہ شہر پیرس کی طرح بڑا ہے - یہاں ۱۶۰۰ بلند عمارات ہیں - ہزار سے زائد خوبصورت محلات ہیں - شہر میں ہر چیز کا انتظام کیا گیا ہے - امرا یہاں سے چلے گئے ہیں - تجارت پیشہ افراد کو جانے پر مجبور کیا گیا ہے - صرف عوام یہاں باقی رہ گئے ہیں میری صحت اچھی ہے - میرا زکام اچھا ہو چکا ہے - جہاں تک اندازہ ہو سکتا ہے دشمن کازان کی طرف پیچھے ہٹ رہا ہے - یہ شاندار فتح جنگِ ماسکو ورکے نتیجہ میں حاصل ہوئی ہے۔

جب نپولین کی فوج ماسکو میں داخل ہوئی تو گورنر نے شہر میں آگ لگا دی - ہزاروں بیمار اور زخمی روسی شعلوں میں تڑپتے ہوئے ہلاک ہو گئے - نقصان کا اندازہ کئی ارب فرانک کیا جاتا ہے نپولین روس کے قلب پر ضرب لگانے کی امید رکھتا تھا، صرف راکھ کا ڈھیر ملا - اس نے شکستہ آواز میں کہا "یہ ناقابلِ یقین ہے" اس کا سینہ جذبات سے زیر و زبر ہو رہا تھا "یہ جنگ مصافیات کی ایک ایسی ملعون شکل کے استیصال کے لئے لڑی جا رہی ہے - جس کی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی - آنے والی صدیاں تہذیب سوزی کے اس اقدام کے محرکین پر لعنت بھیجتی رہیں گی")

ماسکو ۱۸ ستمبر:-

میں ماسکو سے پہلے ہی آپ کو خط لکھ چکا ہوں - اس شہر کا میرے ذہن میں کوئی تصوّر نہ تھا - اس میں ۵۰۰ محل ایلیسی نپولین کی طرح خوبصورت ہیں - ان میں سے متعدد میں فرانسیسی مذاق کے مطابق آرائش کی گئی ہے - کئی شاہی محلات، بارکیں اور شاندار ہسپتال ہیں ہر شے برباد ہو گئی ہے اور گزشتہ چار روز کی آتش زدگی نے خاک و خاکستر کے سوا کچھ نہیں چھوڑا ہے - متوسط طبقہ کے لوگوں کے مکانات چونکہ لکڑی کے بنے ہوئے تھے - ذرا کی ذرا میں جل گئے - یہ گورنر اور روسیوں کی حرکت ہے - جنھوں نے اپنی شکست سے اکتا کر اس خوبصورت شہر کو نذرِ آتش کر دیا - دو لاکھ باشندے نکبت و فلاکت کے عالم میں بے خانماں برباد ہو گئے - البتہ فوج کے لئے کچھ نہ کچھ موجود ہے اور فوج کو ہر قسم کی قیمتی چیزیں ملی ہیں، کیونکہ اس بدنظمی اور افراتفری میں ہر چیز لٹ رہی ہے - روسیوں کو زبردست نقصان پہنچا ہے - اور اس کے نتیجہ کے طور پر ان کی تجارت بری طرح گر جائے گی - یہ تباہی و بربادی اس حالت تک پہنچی ہے کہ نلوں کو اکھاڑ دیا گیا ہے یا تباہ کر دیا گیا ہے - میرا زکام ختم ہو رہا ہے - میری صحت اچھی ہے۔

ماسکو ۱۸ ستمبر:-

میں آج دن بھر شہر کا معائنہ کرتا رہا - بڑا خوبصورت شہر ہے اس کو برباد کر کے روسیوں نے خود اپنا سخت نقصان کیا ہے صرف ایک ہزار مکانات باقی رہ گئے ہیں - فوجیوں کو رسد اور سامان مل گیا ہے - ان کے پاس کافی چیزیں ہیں - اور فرانس کی شراب بھی موجود ہے۔

(دو روز بعد آگ کی تیزی و شدّت نے نپولین کا کریملن میں رہنا ناممکن بنا دیا - وہ ڈسنیا میں قلعہ پیٹروسکی چلا گیا۔)

ڈسنیا ۲۰ ستمبر:-

میں موسمِ سرما کے صدر مقام پر جا رہا ہوں - موسم شاندار ہے

مگر یہ زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہے گا ماسکو چھوڑ کرنا [illegible] ہو چکا ہے اور چونکہ میرے درپردہ منصوبوں کے لحاظ سے یہ اب کوئی فوجی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لئے مجھے اس کو چھوڑنا پڑیگا میں [illegible] سے حفاظتی فوج واپس بلالوں گا۔ میری صحت اچھی ہے۔ اور میرے تمام کام بخوبی انجام پا رہے ہیں۔

(اسی روز سہ پہر کے بعد جبکہ آگ بجھ گئی تھی۔ نپولین کریملن [illegible] آگیا)

ماسکو ۲۲ ستمبر:-

اب آگ بجھ چکی ہے صرف شہر کا ایک چوتھائی حصہ بچا ہے باقی تین چوتھائی جل گیا ہے

(دوسرے روز نپولین نے سینٹ پیٹرس برگ امن کی پیشکش کے لئے ایک سفیر بھیجا۔ اسے فرانس کی یادشاہی تھی۔ لیکن زار نے کوئی جواب نہ دیا۔ ۵ اکتوبر کو ایک اور خط بھیجا گیا۔ اور اس نے اپنے سفیر کو یہ آخری ہدایات دیں:-

"میں امن چاہتا ہوں، مجھے امن کی ضرورت ہے اور میں اس پر مصر ہوں۔ اس کو باعزت ہونا چاہئیے [illegible] لیکن روسیوں کو صلح کی تجاویز سے کوئی [illegible]

مارشل کٹوزوف نے مورچہ بندی کے لئے [illegible] کر دی تھی۔ اس نے فرانسی فوج کے عقب [illegible] قدم جما لئے اور جنوبی صوبوں سے رسد و کمک حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور فرانسی خطوط مواصلات کو خطرہ لاحق کر دیا۔ نپولین کو آنے والے واقعات کے متعلق شبہ تھا۔ سینٹ پیٹرس برگ پر کسی قسم کا جارحانہ حملہ خارج از بحث تھا۔ اس نے اسمولنسک [illegible] آجانے کا فیصلہ کیا۔ اور بیمار اور مجروح سپاہیوں کا اس شہر میں آنا ۱۵ اکتوبر سے شروع ہوا۔ اس کی فوج جس میں ایک لاکھ [illegible] سپاہی اور ۵۰ ہزار گھوڑے تھے۔ تیزی کے ساتھ ماسکو سے روانہ ہوگئی۔

فلوم کوئی ۲۲ اکتوبر:-

میں کریملن کو ہوا میں اڑانے کے بعد ماسکو سے روانہ ہوگیا اس تباہ حال شہر میں صرف ۲۰ ہزار آدمی رہ گئے ہیں۔ موسم بہت اچھا ہے۔ علی الصبح سے سہ پہر کے ۲ بجے تک کہر چھایا رہتا ہے۔ اس کے بعد موسم نہایت دلکش ہو جاتا ہے شام کو سہانا معلوم ہوتا ہے۔ دھوپ میں تپش ہے۔ [illegible] تک پانی [illegible] رہا ہے۔ ایسا موسم بے نظیر ہے۔ [illegible]

میری فوج کو [illegible] کریملن تباہ کرکے ماسکو چھوڑنا [illegible] موسم سرما بسر کرنے کے لئے وہ میری تجویز کے مطابق موزوں نہیں تھا۔ میری صحت اچھی ہے۔ موسم عمدہ ہے۔ میرے سب کام [illegible]

[illegible] جنگ میں [illegible] خون کے دھبے [illegible] شکم [illegible] کی شکل اختیار کرلی)

[illegible]

آپ کو [illegible] سے معلوم ہوگا کہ [illegible] پولینڈ کی [illegible] مالی مستقر [illegible] اور [illegible] جائیں گے [illegible] میری صحت بالکل اچھی ہے [illegible]

([illegible] باقی ماندہ حصے میں زیادہ سے زیادہ انتشار پھیل رہا تھا [illegible] سمور کا کوٹ پہنے پریشان حال نپولین تھا)

۷ نومبر [illegible]

[illegible] اسمولنسک میں ہوں گا یا [illegible] برفباری کے آثار نظر آرہے ہیں۔

(نپولین ۹ نومبر کو اسمولنسک پہنچ گیا عجیب سراسیمگی کا منظر تھا شہر [illegible] حیرت ہو رہے تھے۔ رسد ختم [illegible] والی فرانسی فوج کا رسد منقطع کرنے کی [illegible] اس لئے جلد [illegible] منقطع ہونے سے [illegible] نومبر کو نپولین اسمولنسک سے روانہ ہوگیا [illegible] حال بد سے بدتر [illegible] تھی۔ مگر اس نے اس کے متعلق اپنے خط میں کچھ نہیں کہا۔)

زبردست فوج کے نام فرمان

اورشا ۱۹ نومبر:-

تم میں سے بہت سے بھاگ گئے ہیں اور اکیلے ہی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے فرض اور فوج کی عزت و سلامتی کو مجروح کیا ہے۔ اس قسم کی بدنظمی کو ختم ہو جانا چاہیئے ۔۔۔ مجرموں کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اور سخت سزا دی جائے گی۔

اورشا ۲۰ نومبر:-

قازقوں نے ہمارے رسل و رسائل پر چھاپے مارے ہیں۔ میری حالت اچھی ہے اور آپ سے قریب تر ہوتا جا رہا ہوں۔ چند روز میں رسل و رسائل کا سلسلہ پھر جاری ہو جائے گا ۔۔۔ یہ خبر ملکہ نیپلز اور والسٹریہ کو بھی پہنچا دیجئے۔ میرا خط آرچ ڈیوک کو دکھا دیجئے گا۔

(فرانسیسی فوج بریسنیا کے دلدلی کناروں پر پھنس گئی بعید کنارے پر ایڈمرل تشی شاگوف کا تسلط تھا۔ فرانسیسی بازو کو ایک دوسری روسی فوج سے خطرہ لاحق ہو گیا۔ جو دریا کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ شمال سے نیچے کی جانب بڑھ رہی تھی پیچھے ایک تیسری روسی فوج تھی۔

بھاگ نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ بوری سوف میں ایک پل پر سے تھا۔ روسی چھاپہ ماروں نے پل کو جلا دیا۔ لیکن نپولین کی فوج کے باقی ماندہ سپاہی اور آگے دو فرسخ کے فاصلہ پر ایک گھاٹ سے دریا کو پار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۲۷ نومبر کی شب کو نپولین زامبوسکی میں ایک جھونپڑی کے اندر سویا اور دوسری صبح روسیوں نے ایک دوہرا حملہ کر دیا۔)

زیلکین ۲۸ نومبر:

میں جانتا ہوں کہ تین دن کے کوچ کے فاصلے پر دو ہرکارے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے آپ کے دو خط مل جائیں گے۔ مجھے یہ خیال کر کے سخت پریشانی ہوتی ہے کہ آپ کو میرے متعلق کئی دن تک کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ غیر معمولی موقعوں پر مجھے آپ کی ہمت اور طاقت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ میری صحت اچھی ہے موسم بہت خراب اور سرد ہے۔

ایلیا یکم دسمبر:-

۲۰ ہرکارے جو لائینہ میں اُمید ہے کہ کل تک پہنچ جائیں گے۔ اس وقت مجھے آپ کی خیریت معلوم ہو گی۔ جس کے لئے میں اس قدر بے چین ہوں میرے تیز رفتار ہرکاروں کے ذریعہ آپ کو خط بھیجنے ہیں موسم بہت سرد ہے۔ میری صحت نہایت اچھی ہے۔

(نپولین کی فوج کے شکستہ حال باقی ماندہ فوجیوں پر قازق برابر پریشان کن حملے کرتے رہے۔ چار کمپنیوں پر مشتمل ایک مقدس دستہ تشکیل دیا گیا جو آخری بچے کھچے گھوڑوں پر سوار تھا۔ اس کے کپتان جنرل تھے اور اس کے نان کمشنڈ افسران کرنل۔ یہ شہنشاہ کا باڈی گارڈ تھا)

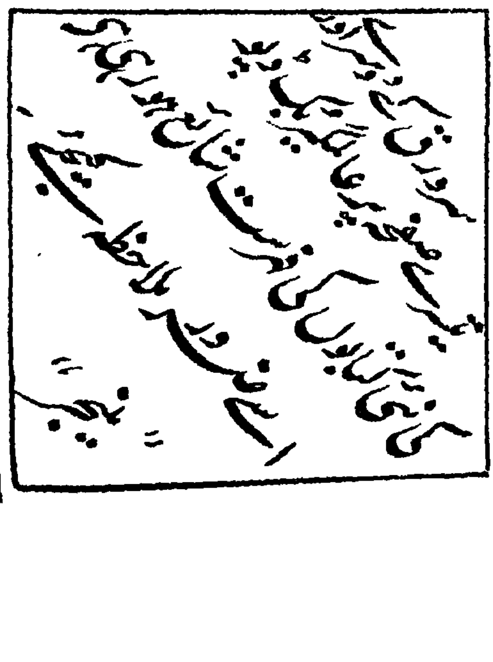
سموسگونی ۵ دسمبر:-

آپ کو جس قدر بے چینی ہے۔ میں اس سے بیحد پریشان ہوں۔ جو کم از کم شاید دس پندرہ دن اور رہے گی۔ تاہم میری صحت کبھی اچھی نہیں رہی۔ آپ نے فوجی احکام میں دیکھا ہو گا کہ تمام چیزیں میرے حسب منشا نہیں ہوئیں۔ پھر بھی امور اس وقت اچھی طرح انجام پا رہے ہیں موسم انتہائی سخت اور روح فرسا ہے۔

(اسی روز نپولین نے فوج کے اعلیٰ افسران کو جمع کیا اور شاہ نیپلز مورات کو سپریم کمان سونپ دی۔ وہ خود رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اور بھیس بدل کر ولنا۔ وارسا۔ ڈریسڈن۔ لیپزگ اور منیز کی راہ سفر کرتا ہوا پیرس پہنچا۔ جہاں وہ ۱۸ دسمبر کو سات ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر نمودار ہوا۔)

سینٹ ہلینا ۱۸۱۵ء:-

میں ہتھیار بند سپاہیوں سے لڑنے گیا تھا لیکن ناسازگار قدرت سے؟ میں نے ان کی فوجوں کو شکست دی۔ مگر میں آگ کہر بے حسی اور موت پر فتح حاصل نہ کر سکا۔ قسمت مجھ سے زیادہ طاقتور نکلی!!



پردۂ سیمیں

مسز واڈیا مووی ٹون

مسٹر سہراب مودی تاریخی فلمیں تیار کرنے میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کا تازہ ترین شاہکار "پرتھوی ولبھ" بمبئی میں پردۂ فلم پر پیش کیا جا چکا ہے اور ڈیڑھ دو ماہ سے خوب رش لے رہا ہے اس فلم کے متعلق ناقدین کی رائے یہ ہے کہ مسٹر مودی نے اسے ہر جہت سے کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اداکاروں میں سہراب مودی، درگا کھوٹے، سجن، مینا، صادق علی، کے این سنگھ، نورین یا گنگ قابلِ ذکر ہیں۔ کہانی مسٹر کے ایم منشی کی ہے مکالمے اور گانے پنڈت سدرشن نے تیار کئے ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ "پرتھوی ولبھ" کے بعد مسٹر مودی "میرزا غالب" بنائیں گے۔ اس کے علاوہ "پرکھو"، "چنگیز خاں"، "پتھروں کا سوداگر" اور "بھگت رانے داس" بھی زیرِ تکمیل ہیں۔

تلوار پروڈکشن

تلوار پروڈکشن پنجاب کی بہترین فلم ساز کمپنیوں میں سے ہے وہ اب تک تقریباً چار فلمیں تیار کر چکے ہیں۔ مسٹر تلوار اس کمپنی کے ڈائرکٹر اور پروڈیوسر ہیں۔ آجکل آپ "شکریہ" کے نام سے ایک فلم بنا رہے ہیں۔ مسٹر رویل اس فلم کو ڈائرکٹ کریں گے۔ [illegible] کہانی، ہدایت کاری اور مکالمے [illegible] "شکریہ" میں تقریباً وہی اداکار حصہ لے رہے ہیں جو خزانچی، منگلی، اور پردیسی ڈھولا وغیرہ میں کام کر چکے ہیں۔ یعنی راگنی، ستیش، سنگھ، گیانی، امرا اور رشید وغیرہ۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کمپنی بہت جلد فلمسازوں کی صفِ اوّل میں آ جائے گی۔

ستارہ فلمز

ستارہ فلمز لاہور کو قائم ہوئے چند ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے۔ اسکے باوجود اس نے جن ترقی پسندانہ سرگرمیوں کا اظہار کیا ہے وہ بہت زیادہ مستحقِ تبریک ہیں۔ اس کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر لالہ ہرکشن لال جی بھلہ ہیں۔ ستارہ فلمز نے جن فلمساز کمپنیوں کی ایجنسی حاصل کی ہے اُنہیں سے پربھات، راجہ مووی ٹون، یونین پکچرز، گیتا نجلی مووی ٹون اور کمل رائے پکچرز قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ اس وقت پربھات کی

موشن پکچرز کی فلم [illegible]

فلمی اطلاعات پر ایک نظر

"فلم بین" کے قلم سے

"نئی کہانی" ستارہ فلمز کی معرفت لاہور میں دکھائی جا رہی ہے۔ اور حال ہی میں اس نے "شہنشاہ اکبر" ریلیز کی ہے جو ریجنٹ سینما لاہور میں ہجوم آور ثابت ہو رہا ہے۔ ستارہ فلمز نے اپنی فلموں کو کامیاب بنانے کے لئے ایک علیحدہ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ قائم کیا ہے جس کے لئے ماہرینِ فن کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ ہم اس کمپنی کی ترقی و کامیابی کے دل سے خواہاں ہیں۔

سکینہ اینڈ کمپنی

سکینہ اینڈ کمپنی دہلی اور لاہور کے بہت پرانے ڈسٹری بیوٹر ہیں اور بہترین فلمیں پیش کرنے میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ کمپنی کے مالک مسٹر چاند بہادر سکسینہ خلیق، ملنسار اور ہمدرد واقع ہیں وہ شالی مار پکچرز، اننت برادرز، رنجیت پروڈکشن اور یونائیٹڈ فلمز کی ایجنسی حاصل کر چکے ہیں۔ آجکل وہ شالیمار کی تازہ فلم "من کی جیت"، یونائیٹڈ فلمز کی "نئی زندگی"، اننت برادرز کی "زمین"، رنجیت پروڈکشن کی "کرن" اور "بھابھی" کی بکنگ زور شور سے کر رہے ہیں۔

فضلی برادرز

فضلی برادرز نے نئے نئے فلمسازی میں [illegible] اول ہی نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ اُن کی فلم [illegible] لوگوں تک [illegible] "معصوم" اور "چودھری" آمدنی کے لحاظ سے [illegible] سے کافی بلند تھیں۔ اب اُن کی تازہ پیشکش "فیشن" دہلی، کانپور اور [illegible] سے چل رہی ہے۔ اس فلم میں چندر موہن، سبیتا دیوی اور سردار اختر وغیرہ نے کام کیا ہے۔ فضلی برادرز نے حال ہی میں پنجاب کے ایکبیر نلسٹ مسٹر شوکت ہاشمی کی خدمات بطور پبلسٹی منیجر حاصل کی ہیں مسٹر ہاشمی اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

واڈیا پیراماؤنٹ پکچرز

واڈیا پیراماؤنٹ پکچرز شمالی ہند کے بہترین ڈسٹری بیوٹرز ہیں۔ اُن کے پاس تقریباً ایک درجن فلم کمپنیوں کی ایجنسی ہے۔ آجکل اُنکی معرفت جینت پروڈکشن کی فلم "بھگت راج" ریلیز ہوئی ہے اس فلم کو مسٹر جینت ڈیسائی نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ دہلی میں آٹھ دس ہفتوں سے برابر رش لے رہی ہے۔ واڈیا پیراماؤنٹ عنقریب تلوار پروڈکشن کی فلم "شکریہ" [illegible]

عالمگیر بکڈپو کے ذخیرہ ادب میں نیا اور شاندار اضافہ

(تصانیف ڈاکٹر ٹیگور)

خاموش حسن - ڈاکٹر ٹیگور کے دلکش اور رنگین افسانوں کا مجموعہ جس میں خیالات کی بلندی - مذاق کی پاکیزگی اور زبان کی لطافت قابل داد ہے عہ

ڈاک گھر - ڈاکٹر صاحب کا وہ زندہ جاوید ڈرامہ جو نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں سٹیج کیا جا چکا ہے - قیمت ۱۲ ار

پھول اور کلیاں - ڈاکٹر صاحب کے بیس افسانوں کا بہترین ترجمہ قیمت عہ

قربانی - ڈاکٹر صاحب کا ایک پاکیزہ ناول عہ

الجھن - ڈاکٹر صاحب کے ایک بہترین انگریزی ناول کا شاندار اردو ترجمہ - قیمت عہ

کبیر والی - ڈاکٹر صاحب کے مشہور بنگالی ناول کا اردو ترجمہ از … جالندھری قیمت سہ ر

(بنگال کے سب سے بڑے ناول نویس شرت چندر چٹرجی کے شاہکار)

زمانہ ساز - جس نے بنگالی لٹریچر میں انقلاب پیدا کر دیا تھا - قیمت عہ

دیہاتی سماج - انسانی زندگی کی نہایت شاندار تصویر ر عہ

رقاصہ - آہوں اور آنسوؤں کا طوفان مترجمہ آتش عہ

(منشی پریم چند)

آخری تحفہ - اس کا ایک ایک افسانہ یادگاری تحفہ کا درجہ رکھتا ہے عہ

وفا کی دیوی - قاتل - جیل - آخری تحفہ کے تین حصے فی حصہ ۱۵ ار

(احسان بی - اے)

مہرو ماہ - اس کا ہر ایک افسانہ اپنے اندر محبت اور نفرت کی ایک حیرت انگیز کشمکش اور ذہن انسانی کے مد و جزر کا عکس ہے - قیمت عہ

بیٹے - امریکہ کی نامور ادیبہ پرل ایس بک کی انگریزی ناول کا ترجمہ عہ

(جمیل احمد کند …)

خواب شکستہ - یورپ کے بہترین افسانہ نگاروں کے افسانوں کا ترجمہ عہ

آغاز و انجام - سرمایہ داری اور غریبی کی دردناک داستان ہے - عہ

طلوع و غروب - موپاساں - چیخوف - گورکی اور … وغیرہ نامور افسانہ نگاروں کے چیدہ افسانے - قیمت عہ

آرٹ - اس کتاب میں "ناول" "مختصر افسانہ" اور "ڈرامہ" کے آرٹ پر مکمل عالمانہ بحث کی گئی ہے - عہ

آغا حشر - اس میں آغا حشر کاشمیری کے سوانح - دو ڈرامے اور چند نظمیں درج ہیں آغا حشر کے آرٹ پر مکمل بحث کی گئی ہے - عہ

(راجہ مہدی علی خاں)

دنیا کی رنگین مزاج عورتیں - یہ کتاب دنیا کی مشہور … شہزادیوں … ملکاؤں کی عشقیہ داستانوں پر مشتمل ہے - قیمت عہ

(منشی …)

دھڑکن - دھڑکن پڑھنے کے بعد آپ مدتوں اپنے دل … عہ

پربت کا دیوتا - از سیاح … جس … افسانے … مدت العمر فراموش نہ کر سکیں گے - قیمت عہ

کرشمہ جہالت - اس میں جہالت کی تباہ کاریاں پڑھنے کے لائق ہیں ۱۲ ار

شمع محفل - اخلاقی افسانوں کا ایک نادر مجموعہ … قیمت عہ

غریبوں کا بہشت - ہندوستان کے ہر ایک … عہ

طلوع سحر - غریبوں کا بہشت کے بعد اسی قسم کا دوسرا مجموعہ قیمت عہ

ساتھی - ایک رقاصہ کی قربانی ایثار اور پاکیزہ محبت کی داستان عہ

فلمی پریوں کی داستان - فلمی دنیا کی پر اسرار زندگی کا رنگین عکس قیمت عہ

اپہار - ڈاکٹر ٹیگور کے شاہکار افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ

آرسین لوپن جاسوس - نامی شریف چور آرسین لوپن … حیرت … مترجمہ تیرتھ رام فیروزپوری قیمت سہ

سیاہ کاران اعظم - دنیا کے ان مشہور بدنام مردوں اور عورتوں … حیرت انگیز حالات زندگی - جنھوں نے … اور … تمام پاپا از منشی تیرتھ رام فیروزپوری عہ

مغرب کی حسین اور گنہگار عورتیں - یورپ کی ان … حسین عورتوں کے دلکش حالات جنھوں نے اپنے حسن کے زور سے انقلابات پیدا کئے - از منشی تیرتھ رام فیروزپوری عہ

رقاصہ - ایک مشہور بنگالی افسانے کا ترجمہ جس میں ایک رقاصہ … دور میں ساری زندگی خون کے آنسو بہاتی ہے - … سات … افسانوں کا ترجمہ مجلد عہ

دولت کا نشہ - ڈاکٹر ٹیگور کے بہترین اخلاقی … معاشرتی افسانوں کا … ۱۲ ار

تیاگ - ٹیگور کے وہ زبردست افسانے جو اردو … پہلی مرتبہ چھپے ہیں قیمت عہ

شکست - شرت بابو کا ایک بہترین ناول - قیمت عہ

پہلی پوجا - ٹیگور کے بہترین افسانوں کا مجموعہ … قیمت عہ

غریب کی دنیا - ایک غریب بنگالی خاندان کی دردناک داستان عہ

عشق اور موت - مترجمہ منشی تیرتھ رام فیروزپوری عہ

ستارے - ہندوستان کے بارہ مایہ ناز افسانہ نویسوں کے بہترین …